یوجنا

یکم تا ۱۵ اپریل ۱۹۸۵ء

ایک روپیہ

مرکزی بجٹ — ۸۶ — ۱۹۸۵

(پروفیسر آر. سی. بھٹناگر)

سنگیت ناٹک اکاڈمی

(بھبوناتھ بھٹاچاریہ)

۸۵ — ۱۹۸۴ء کا

اقتصادی جائزہ

مرکزی وزیرِ خزانہ شری وشنو پرتاپ سنگھ نے ۱۵ مارچ کو پارلیمنٹ میں بجٹ سے قبل کا اقتصادی سروے برائے سال ۱۹۸۴ - ۸۵ پیش کیا۔ اس میں کہا گیا ہے کہ چھٹے منصوبے کے آخری سال کی کارگزاری اور کارناموں سے ملک کی اقتصادی حالت کی صورتِ حال مستحکم ہوئی۔

چونکہ ۱۹۸۴ - ۸۵ چھٹے منصوبے کا آخری برس ہے۔ اس لیے جائزے میں اس مدت کی شاندار کامیابیوں کی جانب توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ ۱۹۸۴ - ۸۵ میں مجموعی قومی پیداوار میں چار فی صد متوقع اضافے سے ملک کی معیشت پچھلے پانچ برسوں میں چھٹے پلان کے ۲ر۵ فی صد سالانہ اضافے کا نشانہ حاصل کرے گی اور فی کس آمدنی تین فی صد سالانہ کی رفتار سے بڑھ گئی ہوگی جائزے میں خاص طور پر اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ خارجی ماحول کسی طور پر بھی موافق نہیں رہا اور اکثر ترقی پذیر ملکوں میں ترقی کی رفتار میں کمی ہوئی ہے۔ ملک کی اقتصادی کامیابیوں کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ پچھلے پانچ برسوں میں اناج کی پیداوار میں اضافہ ہوا۔ پچھلے دو برسوں میں صنعتی ترقی کی رفتار میں کمی آئی اور توانائی و خام تیل کے کلیدی شعبوں میں بنیادی ترقی کی رفتار میں کمی آئی اور توانائی اور خام تیل کے کلیدی شعبوں میں بنیادی سہولیات بڑھیں۔ جائزے میں خاص طور پر اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا گیا کہ پیداوار اور پیداواری صلاحیت میں توسیع کے ساتھ ساتھ افراطِ زر میں کمی ہوئی۔ اور ادائیگیوں کی صورتِ حال میں نمایاں بہتری ہوئی۔

زرعی پیداوار

سروے میں بتایا گیا ہے کہ سالِ رواں کے دوران موسمی حالات نہایت غیر تسلی بخش رہے۔ جنوب مغربی مانسون کسی قدر غیر یقینی رہی اور سردیوں کی بارشیں بھی ناکافی تھیں۔ پھر بھی خوردنی اجناس کی پیداوار سال ۱۹۸۳ - ۸۴ء کی سطح پر آجانے کی توقع ہے جوکہ ایک ریکارڈ پیداوار تھی اور کل زرعی پیداوار کے سال ۱۹۸۳ - ۸۴ کی ریکارڈ پیداوار سے بھی کچھ تجاوز کرنے کی اُمید ہے۔ تاہم جائزے کے مطابق خریف کی پیداوار میں کچھ کمی ہونے کا خدشہ ہے لیکن یہ کمی ربیع کی فصل سے پوری ہو جائے گی۔

سروے میں بتایا گیا ہے کہ ناخوشگوار موسمی حالات میں گذشتہ برس کی نہایت موثر کارکردگی زراعت کی پیداواری بنیاد کے استحکام کی دلالت کرتی ہے۔

ایک نارمل بنیادی سال کی بنا پر رجحان کا تجزیہ کرتے ہوئے جائزے میں کہا گیا ہے۔ کہ چھٹے پنجسالہ پلان کی مدت میں اناج کی پیداوار میں اضافے کی رفتار میں تیزی آئی ہے۔ یہ تیزی ضروری لوازمات خاص طور پر آبپاشی، کیمیاوی کھادوں اور زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں کی بہم رسانی میں اضافہ کرنے کی حکمتِ عملی پر زوردار عمل کے سبب ممکن ہو سکی ہے۔

لیکن جائزے میں بتایا گیا ہے کہ زرعی کارکردگی میں اب تک اضافہ کا زیادہ تر انحصار گندم اور چاول کی پیداوار میں اضافے پر رہا ہے۔ اس کے علاوہ پیداوار میں اب تک اضافے کچھ خاص علاقوں میں ہوئے ہیں حالانکہ یہ رجحان پانچ سال پہلے کے مقابلے میں کم تھا۔ مستقبل میں متواتر زرعی ترقی کے لیے ملک کے مشرقی اور جنوبی خطوں میں جو پیداوار میں پیچھے رہے ہیں، اضافی کوششوں اور دالوں تلہن اور بارانی کھیتی کے شعبوں میں نئی تکنیکوں کے ارتقا کی ضرورت ہوگی۔ (مسلسل جاری کور صفحہ ۳ پر)

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر : آر. ٹھکرال
ایڈیٹر : لکشمی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر : محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر : وسیم حیدر

جلد ۵	یکم تا ۱۵ اپریل ۱۹۸۵	شمارہ ۱

۱۱ تا ۲۵ چیتر، شک ۱۹۰۶

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے، ۲ سالہ ۳۵ روپے، ۳ سالہ ۵۰ روپے

فی کاپی ۱ ایک روپیہ

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کیلئے دس فیصد کی رعایت

اس شمارے میں

بزنس منیجر : ایل. آر. بترہ ؛ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر. ایس. منچال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر. کے. پورم (مین) نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

ترسیل زر کا پتہ : بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

عوامی بجٹ

مرکزی وزیر خزانہ نے ۱۶ مارچ کو پارلیمنٹ میں ۱۹۸۵-۸۶ کا بجٹ پیش کیا۔ اس بجٹ میں ملک کے مالی وسائل سے بہتر استفادہ کے لیے عملی اندازِ نظر اپنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے قوم کے نام اپنی پہلی نشری تقریر میں عوام سے جو وعدے کئے تھے، اس بجٹ میں ان کو نباہنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ اس سے زرعی، صنعتی اور اقتصادی محاذ پر انتظامیہ کو نئے جوش و خروش سے چلانے کے عزم کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے ترقی کی رفتار تیز کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے پیداواری صلاحیت اور پیداوار بڑھے گی۔ یہ اضافہ زراعت اور صنعت ہر دو جگہ عمل میں آئے گا۔ ترقی کے نتیجے میں روزگار کے مواقع سامنے آئیں گے اور صنعتی پیداوار بڑھانے کے لیے فضا سازگار ہو سکے گی۔ اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ صنعتی اور زرعی ترقی سے ہونے والے فائدے غریب ترین عوام تک پہونچ سکیں اور دیہی عوام کو زیادہ سے زیادہ سماجی انصاف اور سماجی تحفظ مل سکے گا۔ اس مقصد کے لیے زراعت کے جدید ترین طریقے اپنانے پر زور دیا جائے گا۔ کسانوں کو فصلوں کے لیے قرضے دئے جائیں گے، اور نفع بخش قیمتوں کو یقینی بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ بے زمین کھیت مزدوروں اور دیگر ایسے افراد بھی ان اسکیموں سے فائدہ اٹھا سکیں گے جو کسی دیگر امدادی اسکیم سے فائدہ نہیں اٹھا سکے ہیں۔

اس بجٹ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دیہات کی مربوط ترقی کے پروگرام، دیہات میں روزگار کے قومی پروگرام، دیہات کے بے زمین افراد کے لیے روزگار کی ضمانت کے پروگرام، نیز تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے از خود روزگار کے پروگرام اور دیگر ترقیاتی پروگراموں کو نہ صرف بہتر اور مستحکم طور پر چلانا چاہتی ہے بلکہ ان پر عمل درآمد کی رفتار بھی تیز سے تیز تر کرنا چاہتی ہے۔ چنانچہ اس میں مذکور ہے کہ روزگار کے مواقع بڑھانا ہمارے ترقیاتی پروگراموں اور ترقیاتی کوششوں کا بنیادی مقصد ہے۔

وزیر خزانہ نے اعلان کیا ہے کہ فصلوں کے بیمے کی جامع اسکیم رائج کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس کے تحت ابتدا میں گندم، دھان، تلہن اور دلہن کی فصلیں مستفید ہوں گی۔ چھوٹے کسانوں کو مرکز اور متعلقہ ریاستی حکومت کی طرف سے مساوی بنیادوں پر انشورنس کے دو تہائی اخراجات امدادی رقوم کی صورت میں ملیں گے۔ بے زمین مزدوروں، چھوٹے کسانوں اور روایتی انداز کے دستکاروں کے غریب کنبوں میں سے اگر کمانے والے کی موت واقع ہو جائے گی تو سماجی تحفظ کی اسکیم کے تحت متوفی کے متعلقین کو ۳ ہزار روپے ملیں گے۔ ابتدا میں یہ اسکیم سَو حلقوں میں شروع کی جا رہی ہے۔

اس بجٹ میں صنعتی پالیسی کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی ہے اور بہت سی صنعتوں سے لائسنس کی شرط ہٹالی گئی ہے۔ ایم۔آر۔ٹی۔پی کی بالائی حد سَو کروڑ روپے کر دی گئی ہے۔ کمپنی ٹیکس گھٹائے گئے ہیں۔ زور اس بات پر ہے کہ ٹیکسوں کی چوری کو روکا جائے اور ٹیکسوں کی شرحوں کو کم رکھا جائے تاکہ چوری کے امکانات از خود گھٹنے شروع ہو جائیں۔ درآمدات اور محصولات میں نرمی سے بالخصوص الیکٹرانکس کی صنعت میں فراخدلی دکھانے سے، ملک کی صنعتی ترقی کی رفتار تیزی سے آگے بڑھے گی۔ ڈیوٹی اور سرچارج کی منسوخی سے عوام کے دلوں میں سرکار کے لیے خیر سگالی کا جذبہ پیدا ہوا ہے۔ بجٹ میں بونس کے بارے میں بھی اعلان کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق جہاں ملازم کی تنخواہ یا اجرت ۷۵۰ روپے سے تجاوز کر جاتی ہے، وہاں اس کی ادائیگی کا حساب اس طرح لگایا جاتا ہے۔ جیسے کہ اس کی تنخواہ ۷۵۰ روپے ماہانہ ہو۔ اب یہ حد بڑھا کر ۱۶۰۰ روپے ماہانہ کروئے جانے کی تجویز ہے۔ ۱۹۸۵-۸۶ کے منصوبے کے لیے ۱۸۵۰۰ کروڑ روپے مختص کئے گئے ہیں۔ جبکہ پچھلے بجٹ میں یہ رقم ۱۵۱۲۰ کروڑ روپے تھی۔ ریاستوں کو منصوبوں کے لیے دی جانے والی رقومات میں بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ ۱۹۸۴-۸۵ کے ۴۳۱۲ کروڑ روپے کے مقابلے ۱۹۸۵-۸۶ میں چھ ہزار کروڑ روپے مختص کئے گئے ہیں۔ ہمیں وزیر اعظم کے اس قول کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہر شعبے میں ہمیں خود کفیل ہونا ہے اور معیشت کو متحرک بنانا ہے تاکہ ہمارا ملک دیگر ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل ہو سکے۔

(ایڈیٹر)

پروفیسر آر۔ سی۔ بھٹناگر

مرکزی بجٹ ۱۹۸۵۔۸۶

۱۶ مارچ ۱۹۸۵ کو نئے وزیر خزانہ شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے ۸۶ - ۱۹۸۵ کا مرکزی بجٹ لوک سبھا میں پیش کیا۔ آٹھویں لوک سبھا کے سامنے پیش ہونے والا یہ پہلا بجٹ ہے۔ چونکہ یہ سال ساتویں پنجسالہ پلان کا پہلا سال ہے، اس لیے بھی اس بجٹ کا ایک اہم کردار ہے۔ شری راجیو گاندھی کی نئی سرکار نے عوام کی بھلائی کے جس عہد کے ساتھ حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تھی، اُسے پورا کرنے میں بھی یہ بجٹ یقیناً نمایاں سماجی فوائد کے مقررہ نشانوں کو پورا کرے گا، ہمیں یہ اُمید کرنی چاہیئے اور ایسا سوچنا حق بجانب ہے۔

شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کے پیش کردہ بجٹ کا عوام نے دل سے خیر مقدم کیا ہے۔ تاجروں، صنعت کاروں اور تنخواہ دار لوگوں نے اسے ترقیاتی اور حکمت عملی والا بجٹ کہا ہے۔ دیہی اور صنعتی ترقی کے جو پروگرام بجٹ کے تحت شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے، اُن سے یقیناً ہمارا ملک ترقی کرے گا۔ سماج کے کمزور طبقوں کا اس بجٹ میں خاص خیال رکھا گیا ہے۔ کسانوں اور مزدوروں کی خوشحالی کے لیے کچھ خاص اقدامات بھی اُٹھائے گئے ہیں تاکہ انھیں بھی راحت دی جا سکے۔

آئندہ مالی سال کے دوران کُل آمدنی ۴۶،۴۳۵ کروڑ روپے کی ہوگی۔ جب کہ خرچ ۵۱۲۹۵ کروڑ روپے کا ہے۔ اِس حساب سے بجٹ کا کُل گھاٹا ۳۶۶۰ کروڑ روپے کا ہوگا۔ مگر وزیر خزانہ نے ۳۱۱ کروڑ روپے نئے ٹیکسوں سے مرکز کے لیے حاصل کرنے کا اعلان کیا ہے۔ چنانچہ ان ٹیکسوں کو شامل کرنے کے بعد گھاٹا صرف ۳۳۴۹ کروڑ روپے رہ جائے گا۔ ترقیاتی پروگرام پر کئے جانے والے خرچے کو مدِنظر رکھتے ہوئے اور پچھلے سال کے گھاٹے کو دیکھتے ہوئے، اس رقم کو زیادہ نہیں کہا جا سکتا۔

تنخواہ داروں کو راحت دینے کی غرض سے اُن کی آمدنی پر لگنے والے اِنکم ٹیکس کی شرح میں ہر سطح پر کمی کی گئی ہے۔ ۱۸۰۰۰ روپے کی سالانہ آمدنی تک اِنکم ٹیکس ختم کر دیا گیا ہے۔ اس اعلان سے ۴۰ لاکھ انکم ٹیکس دینے والوں میں سے ۱۰ لاکھ لوگوں کو اس ٹیکس سے بری کر دیا گیا ہے۔ ایک لاکھ سے اوپر کی آمدنی پر بھی ٹیکس کی شرح کو ۶۰ فیصدی سے کم کر کے صرف ۵۰ فیصدی کر دیا گیا ہے۔ اِنکم ٹیکس پر لگنے والے ۱۲½ فیصدی سرچارج کو بھی ختم کرنے کا اعلان ہوا ہے۔

یکم اپریل ۱۹۸۵ سے سی۔ ڈی۔ ایس Compulsory Deposit Scheme کو بھی بند کر دیا گیا ہے۔ مگر وزیر خزانہ نے یہ اعلان کیا ہے کہ اپریل ۱۹۸۵ میں سی۔ ڈی۔ ایس کی جو قسط لوگوں کو ادا کی جانی تھی، اُسے ایک سال کے لیے ملتوی کر دیا جائے گا۔

اس کے علاوہ شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے اسٹیٹ ڈیوٹی Estate Duty کو بھی ختم کر دینے کا اعلان کیا ہے۔ یہ ٹیکس مرحوم کی اُس جائداد پر لگایا جاتا تھا جس کی قیمت ۱½ لاکھ روپے سے زیادہ ہوتی تھی۔

اسی طرح ویلتھ ٹیکس Wealth Tax بھی اب ۱½ لاکھ کی بجائے ۲½ لاکھ روپے سے شروع ہوگا۔ اس ٹیکس کی شرح میں بھی ہر سطح پر کمی کی گئی ہے۔

ٹی۔ وی، ریڈیو اور وی سی۔ آر پر بھی سالانہ فیس معاف کر دی گئی ہے تاکہ ہر سال ڈاک گھر کے چکّر لگا کر عوام کو پریشان نہ ہونا پڑے اور ساتھ ہی، جیسا کہ وزیر خزانہ نے اپنے انٹرویو میں کہا کہ ہر شخص ٹی۔ وی کو کھولتے ہی سرکار کو اس راحت کے لیے یاد کر سکے"۔ ان اشیاء پر اب ایک بار ہی سو روپے کی ایک مُشت رقم دینی ہوگی۔

اس بجٹ میں وزیر خزانہ نے عام استعمال کی اشیاء کو نئے ٹیکسوں کی زد سے باہر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ گھریلو صنعتوں، بڑی صنعتوں،

کچھ خاص قسم کے کمبلوں اور کپڑوں پر بھی ٹیکسوں میں رعایت کا اعلان ہوا ہے۔ کمپیوٹر انڈسٹری کو ہر طرح مدد دینے کا وعدہ کیا گیا ہے۔

کارپوریٹ سیکٹر میں بھی آمدنیوں پر لاگو ٹیکس کی شرح میں ۱۰ فیصدی کی کمی کا اعلان کرنے کے ساتھ ساتھ وزیر خزانہ نے اگلے سال اس ٹیکس میں ۵ فیصدی اور کمی کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اُمید ہے کہ اس سے ان کمپنیوں کو اور زیادہ ترقی کرنے کا موقع ملے گا۔

فیکٹری کے مزدوروں کی بہبود کے اقدام کے طور پر چوٹ لگنے، زخمی ہونے یا موت کی حالت میں ۲۰۰۰۰ ہزار روپے کی رقم معاوضے کا اعلان کیا گیا ہے تاکہ اُس کے کنبہ کو مالی مدد مل سکے۔ کسانوں کی امداد کے لیے فصلوں کے بیمے کی ایک اسکیم جاری کی جا رہی ہے تاکہ انھیں قدرتی حوادث سے محفوظ کیا جا سکے۔

ٹی۔بی T.B اور کوڑھ Leprosy جیسی بیماریوں کی روک تھام میں استعمال کی جانے والی دواؤں پر درآمد ٹیکس میں پوری چھوٹ دینے کا اعلان کرنے کے ساتھ ساتھ ہومیوپیتھک دواؤں پر بھی ٹیکس کی کمی کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس چھوٹ میں ڈاکٹری استعمال کی کچھ مشینیں بھی شامل ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ کچھ اشیاء پر ٹیکسوں میں اضافہ بھی کیا گیا ہے مگر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم ایک طرف اپنے ملک کی ترقی کے لیے خرچے میں اضافہ تو کریں مگر ٹیکسوں سے خود کو محفوظ رکھیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ٹیکس صرف اُن اشیاء پر لگائے جائیں جہاں اُن کا بوجھ غریب عوام پر نہ پڑے۔ اور یہی پالیسی اس نئے بجٹ میں برتی گئی ہے۔

بنیادی Basic اور معاون Auxiliary پیداواری محصول میں جن اشیاء پر اضافہ ہوا ہے اُن میں پٹرول اور اس سے بنی اشیاء، سیمنٹ، سنگِ مرمر اور ٹائلز، سبزیوں سے بنی اشیاء، سوڈا لیمن، کاغذ، پان مسالہ، بہتر قسم کا صابن اور ماچس وغیرہ شامل ہیں۔

کالے دھن پر قابو پانے کے لیے خاص عدالتوں کو مقرر کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے، تاکہ اُن لوگوں کے خلاف کارگر قدم اٹھائے جا سکیں جو ٹیکسوں کی چوری میں شامل ہیں۔

چونکہ ۸۶-۱۹۸۵ کا سال ساتویں پنجسالہ پلان کا پہلا سال ہے اس لیے مرکزی منصوبوں پر خرچ کی جانے والی رقم کو ۱۸۵۰۰ کروڑ روپے کر دیا گیا ہے۔ پچھلے سال یہ رقم ۱۵۱۰۳ روپے تھی۔

دیہی ترقی پر اس بجٹ میں ۱۳۲۹ کروڑ روپے خرچ کرنے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور اہم خرچے اس طرح ہیں:۔

کھیتی اور کوآپریٹو پر۔	۷۴۰ کروڑ روپے
کیمیائی کھاد کے نئے کارخانے پر۔	۱۶۵ روپے
بے زمین مزدوروں کے روزگار پر۔	۴۰۰ 〃
تعلیم پر۔	۴۲۱ 〃
خاندانی بہبود پر۔	۵۰۰ 〃
بجلی اور کوئلے پر	۳۱۳۱ 〃
پسماندہ طبقات کی بہبود پر۔	۲۰۷ 〃

بیس نکاتی پروگرام پر ۹۱۰۴ کروڑ روپے خرچ کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے جو پچھلے بجٹ سے تقریباً ۸۰۰ کروڑ روپے زیادہ ہے۔

توقع یہ ہے کہ یہ نیا بجٹ عام آدمی کو راحت دے سکے گا اور نوکری پیشہ لوگ بھی کچھ چین کی سانس لے سکیں گے۔ صنعتی ترقی سے لوگوں کی آمدنی بڑھے گی۔ روزگار کے بہتر امکان بھی پیدا ہوں گے۔ لوگوں کو غریبی اور بیکاری سے راحت ملے گی۔ دیہی ترقی کے لیے خصوصی ماحول پیدا ہوگا۔ ساتھ ہی پچھڑی اور کمزور جاتیوں کے حالات میں بھی سدھار ہوگا۔

مگر ان حالات میں قیمتوں پر قابو رکھنا بھی بہت ضروری ہے۔ کیوں کہ ان کا اثر منصوبہ بندی کے تخمینوں پر پڑتا ہے، آمدنی اور خرچ کی دوری بڑھ جاتی ہے اور پھر سرکار کو گھاٹے کو پورا کرنے کے لیے نئے نوٹ جاری کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے۔ ان حالات میں قیمتوں کو اور ہوا ملتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ سرکار تاجروں اور صنعت کاروں پر کڑی نظر رکھے۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ملک کی پیداوار کو بڑھایا جائے۔ پیداوار کے اضافے سے قیمتوں کو روکنے اور ملک کو خود کفیل بنانے میں مدد ملتی ہے۔

ہمیں یہ بھی توقع ہے کرنی چاہیے کہ شری راجیو گاندھی کی نئی سرکار ترقیاتی پروگراموں کو حکمت عملی سے لاگو کرے گی تاکہ ان کے فوائد کو ہر شخص تک پہنچایا جا سکے اور لوگ خوش حال ہو کر مطمئن رہیں۔

★

یادِ رفتہ

جلیلی الٰہ آبادی

اک نیا درس خیالوں کو مِلا ہے یارو
اک نئے دَور کا آغاز ہوا ہے یارو
اِندرا نام ہے جس عقل کی شہزادی کا
اِک نیا موڑ سیاست کو دیا ہے یارو
کوئی مشکل ہو کبھی ماتھے پہ آئی نہ شکن
حوصلہ بھی بڑا نایاب مِلا ہے یارو
یُوں تو کہنے کے لیے اہلِ سیاست ہیں بہت
اِندرا وقت کی مقبول صدا ہے یارو
یک بیک بیٹھ گیا تھک کے اپاہج کی طرح
جب بھی ہنگامہ کوئی حد سے بڑھا ہے یارو

راجیندر انجم

دلّی میں
صنعتی مزدوروں کی فلاح و بہبود

حصولِ آزادی کے بعد دلّی کی صنعتوں میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ آج یہاں تقریباً ۴۵ ہزار چھوٹے پیمانے کی صنعتیں مختلف اشیاء کی پیداوار میں مصروف ہیں۔ اسی طرح یہاں دکانوں اور تجارتی اداروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ اس وقت ان میں ۸ لاکھ سے بھی زیادہ مزدور کام کر رہے ہیں۔

دلّی میں صنعتوں کی نشو و نما کے ساتھ ساتھ ان میں مزدوروں اور اُن کے مسائل میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ مزدوروں کے روز کے مسائل کو حل کرنے کے لیے دلّی کا مزدوروں سے متعلق محکمہ نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔ صنعتی بدامنی کا مطلب ہے زندگی میں بے چینی۔ جہاں بھی بدامنی بڑھے گی، وہاں ماحول میں اشتعال پیدا ہوگا اور اس کا اثر عام شہری کی زندگی کو بھی متاثر کرے گا۔ صنعتی امن قائم رکھنے کے لیے مزدوروں سے متعلق محکمہ اور اُس کی مشینری کو ہمیشہ چاق و چوبند رہنا پڑتا ہے۔ ہر قدم پر احتیاطی اقدامات لینے کے باوجود بھی اس محکمہ میں ہر ماہ ۵۰۰ شکایتیں موصول ہو جاتی ہیں۔

شکایتوں کے علاوہ سمجھوتہ مشینری کا کام صنعتی جھگڑوں کو نپٹانا ہے۔ اس محکمہ کو ہر ماہ تقریباً ۱۰۰ صنعتی جھگڑوں کی شکایتیں موصول ہوئی ہیں اور باقی کو انصاف کے لیے صنعتی عدالتوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ اعداد و شمار حوصلہ افزا نہیں ہیں۔ اس محکمہ کی یہی کوشش رہی ہے کہ کم سے کم جھگڑے ہوں۔ لیکن جب حالات ایسی صورت اختیار کر لیں تو جھگڑوں کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ پھر بھی یہ بات باعثِ تسکین ہے کہ دوسرے صوبوں کی نسبت دلّی میں کبھی ایسے ناخوشگوار حالات پیدا نہیں ہوئے۔

مزدوروں کا معیارِ زندگی اُونچا کرنے کے لیے اُن کے کام کے گھنٹوں اور تنخواہ کا تعین بہت ضروری ہے۔ اس کے لیے کم سے کم اُجرت دینے کا ایکٹ لاگو کیا گیا۔ اِس وقت اس ایکٹ کے تحت ۲۶ صنعتیں آتی ہیں۔ یہ صنعتیں دلّی انتظامیہ کی مقررہ اُجرت کی شرح سے کم تنخواہ کسی کو نہیں دے سکتیں۔ مزدوروں، اُن کے نمائندوں اور کارخانہ مالکوں کی دِقتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس وقت وِشوکرما نگر، شاہدرہ، گوری نگر، نئی دہلی اور کرم پورہ نئی دہلی میں علاقائی لیبر آفس اِن علاقوں کے جھگڑوں کے تصفیہ کے لیے کام کر رہے ہیں۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ لیبر ڈیپارٹمنٹ کا کام صرف مزدوروں اور مِل مالکوں کے جھگڑے نپٹانا ہی ہے۔ لیکن اسے اس کے ساتھ ساتھ مزدوروں کی تفریح، صحت اور فلاح و بہبود کا کام بھی سرانجام دینا ہوتا ہے۔ دلّی میں اس وقت مختلف محنت کش کالونیوں میں اس محکمہ کی جانب سے ۱۴ مراکز چلائے جا رہے ہیں جہاں اِن کی فلاح و بہبود سے متعلق مختلف سہولیات بہم پہنچائی جا رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہاں محنت کشوں کے کنبوں کے لیے لائبریری اور ریڈنگ روم کی سہولیات بھی ہیں۔ اس کے علاوہ گوری نگر، وشوکرما نگر، وزیر پور، کملانگر، مندر مارگ اور آزاد پور کے بہبودی مراکز میں مزدوروں کے کنبوں کی خواتین کو سلائی، کٹائی، کشیدہ کاری، بنائی اور گڑیا بنانے کے فن میں مُفت تربیت بھی دی جا رہی ہے۔ یہاں تربیت حاصل کرنے والی بہت سی خواتین یا تو نوکری کرنے لگی ہیں یا اس کی بدولت گھر میں سامان تیار کر کے روزی کما رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اُس کی اس آمدنی سے کنبے کو معاشی تقویت مل رہی ہے اور اُن کا معیارِ زندگی پہلے سے بہتر ہوتا جا رہا ہے۔

مزدوروں کی تفریح کے لیے اُن کے کنبے کے افراد کو مُفت فنِ موسیقی سیکھنے کی سہولت بھی وزیر پور، کرم پورہ، مندر مارگ، کملانگر،

[illegible] دستیاب ہے۔ [illegible] کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ ان مراکز میں ٹیلی ویژن دیکھنے اور ٹیلی ویژن کے پروگرام بھی دکھانے کی سہولت ہے۔ ہر ماہ دو فلمیں بھی دکھائی جاتی ہیں۔ ان مراکز میں محنت کشوں اور ان کے کنبوں میں کھیل کود کے لیے دلچسپی پیدا کرنے اور اپنی صحت برقرار رکھنے کی بھی سہولیات دستیاب ہیں۔

جن صنعتی مزدوروں کی ماہوار تنخواہ ۴۰۰ روپے یا اس سے کم ہے اور وہ اپنے بچوں کو نرسری کلاسوں میں داخلہ دلانے میں معذور ہیں، اُن کی سہولت کے لیے پانڈو نگر، وزیر پور، کرم پورہ، وشو کرما نگر اور گری نگر مراکز میں نرسری کلاسیں چلائی جا رہی ہیں۔ یہاں ۳ سے ۵ برس تک کے بچوں کو داخلہ دیا جاتا ہے، اور اُن سے برائے نام ۵۰ پیسے فی ماہ فیس لی جاتی ہے۔ اس وقت ہر کلاس میں ۴۰ بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

کچھ محنت کش کنبے ایسے ہیں جو کم تنخواہ کے سبب سلائی کی مشینیں نہیں خرید سکتے۔ جو خواتین ان مراکز میں آکر سلائی، کڑھائی کی تربیت حاصل کرتی ہیں اُنھیں اس کا فائدہ اٹھانے کے لیے بلا سود آسان قسطوں پر سلائی کی مشینیں دی جاتی ہیں۔

دلی ایک بڑا شہر ہوتے ہوئے بھی بھارت کے دوسرے صوبوں کی نسبت بہت چھوٹا ہے۔ اس کے اپنے ذرائع بھی محدود ہیں۔ اس کے باوجود بھی دلی میں کام کرنے والے صنعتی کارکنوں اور مزدوروں کے لیے دلی انتظامیہ نے ۴۴۸۴ مکان صنعتی بستی کرم پورہ، نہرو نگر، گری نگر، اور وشو کرما نگر میں صنعتی مکان اسکیم کے تحت تعمیر کیے ہیں۔ ان مکانوں کے مالکانہ حقوق اُن میں رہنے والے لوگوں کو آسان شرطوں پر دے دیے گئے ہیں۔ دلی ہی پہلا مقام ہے، جہاں صنعتی کارکنوں کو آسان قسطوں پر مکانوں کی قیمت ادا کرنے کے بعد مالکانہ حقوق دیے گئے ہیں۔

صنعتی کرمچاری مطالعہ دورہ اسکیم کے تحت دلی کے مزدوروں اور کارکنوں کو ملک میں ہو رہی صنعتی ترقی کی جھلک دکھائی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لیے مختلف کارخانوں اور اداروں سے محنت کشوں کو منتخب کر کے انھیں مختلف صنعتی شہروں میں لے جایا جا رہا ہے۔ اب تک اس طرح کے ۳۹ دوروں کا اہتمام کیا جا چکا ہے اور ان میں شامل لوگوں کو اُتر پردیش، راجستھان، مہاراشٹر، اُڑیسہ، گجرات، کشمیر، آندھر پردیش اور مغربی بنگال کے بڑے بڑے شہروں میں لے جایا جا چکا ہے۔ خواتین کارکنوں پر مشتمل کچھ گروپوں کو بھی اس اسکیم کے تحت مختلف صوبوں میں اہم مقامات دکھائے گئے ہیں۔ ان دوروں میں حصہ لینے والے لوگوں کو دلی انتظامیہ کی طرف سے آنے جانے، گھومنے اور ٹھہرنے کی مفت سہولت کے ساتھ ساتھ روزانہ دس روپے خوراک الاؤنس بھی دیا جاتا ہے۔

گرمیوں کے دنوں میں اپنے کنبے کے ساتھ پہاڑوں میں چھٹیاں گزارنا مزدوروں کے تصور تک ہی محدود تھا۔ اس کے اخراجات اُن کے بل بوتے سے باہر تھے۔ دلی انتظامیہ نے اُن کے اس مسئلے کا بھی حل نکالا ہے۔ گرمیوں میں مزدوروں اور کارکنوں کے کنبوں کو چھٹیاں گزارنے کے لیے ہردوار اور مسوری میں ہالی ڈے ہوم کھولے گئے ہیں۔ پہلا ہالی ڈے ہوم مسوری میں ۱۹۷۳ میں کھولا گیا تھا۔ دوسرا ۱۹۷۶ میں ہردوار میں کھولا گیا تھا۔ مسوری کا ہالی ڈے ہوم مال روڈ اور ہردوار کا ہولی ڈے ہوم اسٹیشن اور ہرکی پوڑی کے درمیان شاہراہ پر واقع ہے۔

ان ہالی ڈے ہوم میں صنعتی تنازعہ ایکٹ کے تحت آنے والے کرمچاریوں میں کوئی بھی آدمی مع کنبے کے ان مقامات پر سات دن تک ٹھہر سکتا ہے۔ جن کرمچاریوں کی ماہانہ تنخواہ ۵۰۰ روپے تک ہے اُن سے یہاں فی یوم ٹھہرنے کا ایک روپیہ اور اس سے زیادہ تنخواہ حاصل کرنے والوں کو دو روپے فی یوم کے حساب سے کرایہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ بجلی پانی کے علاوہ یہاں چارپائی، گدّے، کمبل اور چائے اور کھانا بنانے کے برتن بھی دستیاب ہیں، جن کا کوئی کرایہ نہیں لیا جاتا۔ جن لوگوں کی تنخواہ ۵۰۰ روپے ماہوار یا اس سے کم ہے، اُنھیں زیادہ سے زیادہ ۱۰۰ روپے تک ایک طرف کا کرایہ بھی دیا جاتا ہے۔

اِن ہالی ڈے ہوم میں تفریح کے لیے ریڈیو، ٹیلی ویژن سیٹ بھی لگائے گئے ہیں۔ بچوں کے کھیلنے کے لیے کمروں میں کھیلے جانے والے کھیلوں کا سامان بھی بلا فیس دستیاب ہے۔ اس کے علاوہ اخبار، رسالے اور کتابوں کا بھی یہاں انتظام ہے۔

اِن ہولی ڈے ہوم پر آنے والے لوگوں کی بھیڑ کو دیکھتے ہوئے دلی انتظامیہ شملہ، نینی تال اور سری نگر میں بھی ایسے ہوم کھولنے کی تجویز پر غور کر رہا ہے۔ اِن کے لیے مناسب جگہ کی تلاش کی جا رہی ہے۔ امید ہے کہ اگلے برس کے دوران ان تینوں مقامات پر اس طرح کے تفریحی مراکز کھولے جائیں گے۔

دلی انتظامیہ کے مزدوروں سے متعلق محکمہ کی جانب سے ایک ہندی ماہنامہ "شرم چترکا" بھی شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں مزدوروں سے متعلق قانونوں کا خلاصہ، کم سے کم مقرر کی گئی تنخواہوں کی فہرست، ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے خاص فیصلے، صنعتی اتھارٹی اور لیبر کورٹ کے فیصلے نوٹیفکیشن، مزدوروں کے مسائل پر مضامین، کہانیاں اور نظمیں شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ ماہنامہ دلی کے سبھی صنعتی اداروں، فیکٹریوں اور کارخانوں میں مفت تقسیم کیا جاتا ہے۔

(باقی صفحہ پر)

سنگیت ناٹک اکاڈمی

دلی کا کتھک کیندر ہو یا امپھال کی جواہر لال نہرو ڈانس اکاڈمی یا پھر ریاستوں میں پھیلا ہوا اکاڈمیوں کا جال، ان سب میں تال میل رکھنے والی سب سے بڑی تنظیم ہے۔ سنگیت ناٹک اکاڈمی جو راجدھانی کے راجندر بھون میں واقع ہے اور جسے ملک کا ثقافتی ہیڈ کوارٹر کہا جاتا ہے۔

یہ اکاڈمی ۱۹۵۳ میں قائم ہوئی تھی اور ابھی تک دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ اس کا کام ملکی سطح پر سنگیت، رقص اور ناٹک کو فروغ دینا اور ان فنون کی تربیت کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھنا ہے۔ اس کے علاوہ رقص، ناٹک اور سنگیت کی مختلف صورتوں کا احیا اور تحفظ و تشہیر اور اعلیٰ پایہ کے فنکاروں کے لیے اعزاز کا قیام بھی اس کے مقاصد میں شامل ہے۔ اس کا سالانہ بجٹ (منصوبہ جاتی و غیر منصوبہ جاتی) ۸۰ لاکھ ۴۰ ہزار روپے سالانہ ہے اور یہ رقم اُسے مرکزی وزارت تعلیم و ثقافت کی طرف سے عطیات کے طور پر دی جاتی ہے۔

جواہر لال نہرو کے ایما پر ۳۲ برس پہلے پارلیمنٹ نے ایک قرارداد منظور کی تھی جس میں بھارتی رقص، ناٹک اور سنگیت کے شعبوں میں تحقیق و مطالعہ کو فروغ دینے اور اس مقصد کے لیے ایک لائبریری اور عجائب گھر قائم کرنے کو کہا گیا تھا تاکہ دوسرے ملکوں کے ساتھ ثقافتی تبادلہ کو بڑھاوا دینے کے لیے تکنیکوں کو مالا مال کیا جا سکے۔ چنانچہ اس سب کے لیے اکاڈمی کا قیام عمل میں آیا۔

اکاڈمی کے افتتاح کے موقع پر مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا تھا کہ فنون عوام کے بل پر ہی پنپ سکتے ہیں اور حکومت کے لیے ضروری ہے کہ وہ عوام کے عزم کا منظم طور پر اظہار کرتے ہوئے اُن کی دیکھ بھال کرے اور انھیں فروغ دے۔

کتھک کیندر "کتھک مندر" کے نام سے موسوم ہے۔ مسٹر جیون پانی اس کے ڈائریکٹر ہیں اور رقص کے مشہور فنکار برجو مہاراج اس کے معلم اعلیٰ ہیں جو کوئی ۱۳۵ طلبا اور طالبات کو تربیت دے رہے ہیں۔ ان طلبا کی عمر ۶ سے ۲۶ برس تک ہے اور وہ ۱۲ برس تک کتھک کے بارے میں سب سیکھ لیتے ہیں۔

اس مرکز میں کتھک رقص کے علاوہ صوتی موسیقی، پکھاوج اور طبلے سے متعلق بھی متعدد نصاب رائج ہیں۔ اس میں ایک پروڈکشن یونٹ بھی ہے جو تجرباتی طریقوں سے کتھک تکنیکوں اور اس کے خزانے کو مالا مال کرنے میں مصروف ہے۔ تربیت فنون کے شعبے میں اس مرکز کی طرف سے طلبا کو رقص میں پیشہ ورانہ کیریئر کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ مرکز نے یوگا کی کلاسیں بھی شروع کی ہیں، تاکہ طلبا کے جسم میں لچک آ سکے اور اُن کا ذہن تخلیقی بن جائے۔

اس کیندر کی سرگرمیاں اس کے احاطے تک محدود نہیں ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس کی ایک کتھک ٹیم نے جس کی رہنمائی خود برجو مہاراج نے کی تھی، مئی ۱۹۸۲ میں برطانیہ کے "بھارتی میلے" میں اپنے فن کا شاندار مظاہرہ کیا تھا۔ غیر ممالک میں ایسے پروگرام پیش کرنے کے علاوہ ملک کے اندر بھی اس کیندر نے اپنے کمال فن کے لیے دادِ تحسین حاصل کی ہے۔

کتھک کیندر کی مانند ہی جواہر لال نہرو منی پور ڈانس اکاڈمی کا امپھال میں آغاز ہوا۔ منی پور ڈانس کالج کی بنیاد ۱۹۵۴ میں پنڈت نہرو کی طرف سے دیے گئے ایک علامتی عطیے سے رکھی گئی تھی۔ اس کے تین برس بعد یہ کالج سنگیت ناٹک اکاڈمی کی تحویل میں آگیا۔ تب سے یہ کالج منی پور کے رقص اور علاقے کے قبائلی رقصوں کی تربیت دینے کے لیے ایک مرکزی ادارہ کے طور پر کام کر رہا ہے۔

منی پوری رقص کے چوٹی کے استاد مرحوم گرو اموبی سنگھ اور گورو اتومبا سنگھ جنھوں نے اکاڈمی اعزاز حاصل کیے تھے انھوں نے اس ڈانس اکاڈمی کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچانے میں اہم حصہ لیا۔

سنگیت ناٹک اکاڈمی

سنگیت ناٹک اکاڈمی نے عوامی اور قبائلی

رقصوں اور ناٹک کی تکنیکوں کی بے شمار صورتوں کی از سر نو دریافت کی ہے۔ جنھیں اب مالی اور تکنیکی وسائل سے فروغ دیا جا رہا ہے۔ ایک وقت تھا جب راجے مہاراجے اور جاگیردار ان فنون کی سرپرستی کرتے تھے جو بعد میں معدوم ہو گئے۔ اب اکاڈمی کی طرف سے ان کی بعض صورتوں کا احیا کیا گیا ہے۔ اُن گوروؤں کو وظائف دیے جا رہے ہیں جو اس سلسلے میں تحقیق و مطالعہ کر رہے ہیں۔

گورو صورت رام گرگ کی رہنمائی میں ہماچل پردیش کے لوک گیتوں کی فراہمی کی جانب خاص توجہ دی جا رہی ہے۔ ایسی ہی کوشش کچھ میں کی جا رہی ہے جو ریاست گجرات کے اپنے نواحی علاقوں سے کٹا ہوا ہے۔ وہاں ہیروں، لانگاؤں اور دوسرے خانہ بدوش قبائل کے سنگیت اور رقص کے نادر نمونوں کو فراہم کر کے اُنھیں نئی زندگی دی جا رہی ہے۔

سنگیت ناٹک اکاڈمی کی طرف سے کچھ عرصہ پہلے قبائلی ثقافت کی ترقیاتی اسکیم کے تحت بھیج میں ایک چھ روزہ میلے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جب ایک ہی پلیٹ فارم پر کچھ، کافی، لوک وارتا، الغوزہ، سنگیت ناٹک اور لوک گیت پیش کئے گئے تھے۔ اکاڈمی نے بھارتیہ لوک کلا منڈل کے ساتھ مل کر اُدے پور میں بھی ایک قبائلی میلے کا اہتمام کیا تھا جس میں بھیلوں، مِیناؤں، رَوتا، کتھوڑیا اور کنجروں جیسے نایاب قبائل کی طرف سے پروگرام پیش کئے گئے تھے۔

اُدے پور بھارت کے اُن علاقوں میں سے ایک ہے جہاں کسی وقت کٹھ پتلی کا ناچ اپنے عروج پر تھا۔ راجاؤں اور اُمراء کی سرپرستی ختم ہونے اور مالی مشکلات کے باعث یہ فن تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ اسی طرح کنیا کماری سے کشمیر تک اور پنجاب سے آسام تک کئی علاقے ایسے کٹھ پتلی ناچ کے لیے مشہور تھے۔ کٹھ پتلی ناچ کی ایک شاندار روایت کی دریافت مغربی بنگال (خصوصاً مرشد آباد کے مسلمانوں میں)، منی پور اور تری پورہ میں دریافت کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں تحقیقی سرگرمیاں انجام دی جا رہی ہیں۔

وزارت تعلیم و ثقافت کی طرف سے ایک وظیفے کی بدولت کلکتہ پپٹ تھیٹر کے پُرجوش ڈائریکٹر سُریش دتّا نے روایاتی کٹھ پتلیوں کے بعض نادر نمونوں کی دریافت کی ہے جو اُن فنکاروں کے وارثوں کی طرف سے خاندانی یادگار کے طور پر محفوظ رکھے گئے تھے جنھوں نے اس فن کو کمال پر پہنچایا تھا۔ یہ ایک ایسا شعبہ ہے جو سنگیت ناٹک اکاڈمی کی توجہ کا مستحق ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ سنگیت ناٹک اکاڈمی شروع سے ہی طلباء، ریسرچ سکالروں، کلچرل منتظموں، فنکاروں اور ایسے بیشتر دوسرے اشخاص کی ضروریات پوری کر رہی ہے جو اس کے محافظ خانوں اور اُس کمرے میں رسائی کے خواہاں ہیں جو سنگیت سنائے جانے کے لیے وقف ہے۔ ★

بقیہ:۔ دلّی میں صنعتی مزدوروں کی فلاح و بہبود

مزدوروں کی سہولت کے لیے دلّی انتظامیہ کی طرف سے ایک چلتی پھرتی ڈسپنسری بھی شروع کی گئی ہے۔ یہ ڈسپنسری کارخانوں میں جا کر کرمچاریوں کی صحت کی جانچ کرتی ہے تاکہ کسی بھی آدمی کو اپنی ڈیوٹی سے غیر حاضر رہ کر اسپتال کے چکر نہ کاٹنا پڑیں۔ یہ چلتی پھرتی ڈسپنسری دلّی کے صنعتی مزدوروں کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی ہے اور اب تک اس سے بڑی تعداد میں لوگ فائدہ اٹھا چکے ہیں۔

کارخانوں میں ہونے والے حادثات کو روکنے اور پیداوار میں اضافہ کرنے کے مقصد سے ہر برس ایک مقابلہ منعقد کیا جاتا ہے۔ ان میں ایسے کارخانوں کو جہاں سال بھر میں کوئی حادثہ نہ ہوا ہو شرم ویر انعام دیا جاتا ہے۔ حادثوں کی روک تھام سے متعلق اچھی تجویز پیش کرنے والے کرمچاریوں کو بھی انعامات دئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم سے جہاں کارخانوں میں حادثات کی تعداد میں کمی واقع ہوئی ہے وہاں اُن کی پیداوار میں اضافہ بھی ہوا ہے اور اس کے ساتھ ہی اِن میں کام کرنے والے لوگوں کی قابلیت اور صلاحیت بھی بڑھی ہے۔ ★

بقیہ:۔ ۱۹۸۴-۱۹۸۵ کا اقتصادی جائزہ

کو ملک کے باہر مقیم بھارتیوں سے ترسیل زر اور بھارتی بنکوں کی جمع کردہ رقموں سے برابر فائدہ پہنچ رہا ہے۔ بہرحال دونوں قسم کی آمدنیوں میں تیز اضافہ کی رفتار سست ہو گئی ہے اور آئندہ امکانات غیر یقینی ہیں۔

مسئلے اور توقعات

جائزے کے مطابق اگر ساتویں پنجسالہ منصوبے کے دَوران معیشت کو ۵ فیصد سالانہ کے حساب سے ترقی کرنی ہے تو زرعی کارگذاری کو متواتر بہتری دکھانی ہوگی۔ اس کے حصول کے لیے جائزے میں مشرقی اور جنوبی خطوں میں آبپاشی کی موجودہ صلاحیت کا بہتر استعمال کر کے دھان کی پیداوار کے بڑھانے کی ضرورت بتائی گئی ہے۔ اس کے لیے جائزے میں زرعی پیداوار کے لیے ضروری اشیاء کی فراہمی کو بھی بہتر بنانے پر زور دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تلہن اور دالوں کی پیداوار کو بھی متواتر بہتر بنایا جانا ہوگا۔ اس اقتصادی جائزے میں مذکور ہے کہ اس کے لیے ٹیکنالوجی میں بنیادی کامیابی حاصل کرنا ضروری ہے۔ ★

خلیل اکمل

خلائی تحقیق اور اُس کی منصوبہ بند ترقی

ہندوستان میں یوں تو زندگی کے ہر شعبہ مثلاً زراعت، صنعت، دفاع، انجینیرنگ وغیرہ میں ترقی ہوئی ہے لیکن خلائی تحقیق میں بھی اس نے دنیا میں ساتواں مقام حاصل کرلیا ہے۔ خلائی تحقیق کا اصل مقصد کرۂ ارض کے اوپری سطح کے حالات کی پیشین قیاسی ہے، تاکہ کرۂ ارض پر انسانی زندگی کو زیادہ سے زیادہ آرام دہ بنایا جا سکے۔ ان حالات میں فضائی تابکاری دباؤ، رطوبت، کاسمک شعاعوں کا اخراج ان کی حدت اور ارتکاز، زمین کی قوت ثقل، بادلوں کی نقل و حرکت شامل ہیں۔ ان تمام پُرامن مقاصد کے علاوہ خلائی تحقیق سے ملک کے دفاع کو طاقتور اور مضبوط بنانا بھی مطلوب ہے تاکہ جنگ کے موقع پر بموں کو فضا میں ہی بے اثر کیا جا سکے اور سیارہ بردار گاڑی (راکٹ) کی مدد سے بموں کو ٹھیک ٹھیک نشانوں پر پہنچا دیا جائے۔ پہلے پہل خلائی تحقیق میں دفاعی مقاصد کو اولیت دی گئی لیکن بعد میں اس کو کائنات کی تسخیر اور بنی نوع انسان کی خدمت پر مرکوز کیا جانے لگا۔ چنانچہ آج ہم ارض و سما کے حالات جیسے ستاروں کی پیدائش، نظام شمسی، شہاب ثاقب اور زمین کے مقناطیسی حلقے میں خطرناک شعاعوں کے ارتکاز سے واقفیت حاصل کر رہے ہیں۔

ہندوستان میں خلائی تحقیق کی ابتدا کوئی ایک صدی قبل کی گئی۔ جس کا مقصد صرف زمین کی بدلتی ہوئی مقناطیسیت اور موسمی حالات کے متعلق معلومات فراہم کرنا تھا۔ چنانچہ ۱۸۴۱ء میں شملہ، بمبئی، مدراس، ترلوندرم میں زمین کی مقناطیسیت کے مشاہدات کئے گئے اور ۱۹۰۲ میں اس کام کو تقویت پہنچانے کے لیے سروے آف انڈیا کے محکمہ نے ہندوستان کا ایک مقناطیسی نقشہ تیار کیا اور اس کے بعد مقناطیسی خطِ استوا پر ہونے والے تغیرات کا مشاہدہ کیا گیا۔ ہومی بھابھا نے ۱۹۴۰ میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس (بنگلور) میں ایک تجرباتی مرکز قائم کرکے اس میں سورج کی کاسمک شعاعوں کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ اور ایسے ہی تجربات بوس انسٹی ٹیوٹ (کلکتہ) مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) میں بھی کئے گئے۔ آخرکار ۱۹۴۸ میں ایک علیحدہ ریسرچ لیباریٹری احمد آباد میں قائم کی گئی۔

خلائی تحقیق میں ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈامنٹل ریسرچ Tata Institute Of Funda-mental Research نے بھی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۵۹ میں اسی ادارے نے کوئی ۱۰۰ غبارے اپنے تحقیقی پروگرام کے تحت حیدرآباد سے چھوڑے۔ اور یہ تجربات کوئی ۲ سال جاری رہے۔ آخرکار اس کام کو مزید ترقی دینے کے لیے ۱۹۶۰ میں جوہری توانائی کے محکمہ کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ خلا کو پُرامن مقاصد کے لیے تلاش کرے۔ اس ادارے سے جب وکرم سارابھائی نے خلائی تحقیق کی شروعات کی تو اُس وقت اُن کے ساتھ صرف چند ماہرین اور انجینیر تھے۔ جنھوں نے امریکہ میں تربیت حاصل کی تھی۔ لیکن انھوں نے بہت جلد یہ محسوس کیا کہ خلائی مہم کو سَر کرنے کے لیے نہ صرف اچھے تربیت یافتہ دماغ کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ ایک کثیر سرمایہ کی بھی۔ چنانچہ ۱۹۷۲ء میں انھوں نے روس کے اشتراک اور تعاون کی پیشکش کو قبول کرکے انڈین سائنٹفک سیٹلائٹ پراجیکٹ کے محکمہ کو پہلے مصنوعی سیارہ کی تیاری کا حکم دیدیا لیکن اس اقدام سے قبل وکرم سارابھائی نے ۱۹۶۲ میں انڈین نیشنل کمیٹی برائے خلائی تحقیق کا قیام عمل میں لایا۔ ۱۹۶۳ میں تھمبا راکٹ اسٹیشن اور اور ایک تجرباتی سیٹلائٹ کمیونیکیشن ارتھ اسٹیشن قائم کیا۔ پھر انھوں نے تھمبا راکٹ اسٹیشن کے قریب سائنس اور ٹکنالوجی کا مرکز قائم کرنے کی سفارش کی جہاں سے ۱۹۶۷ میں مصنوعی سیاروں کو خلا میں لے جانے والا پہلا راکٹ داغا گیا۔ جو بہت ہی کامیاب رہا۔

روس کے تعاون کے کوئی ڈھائی سال بعد ہندوستان کا پہلا مصنوعی سیارہ آریہ بھٹ تیار ہوا جس کے لیے ۴ء۳ کروڑ روپے کا صرفہ ہوا۔ آریہ بھٹ کو بتاریخ ۱۹ اپریل ۱۹۷۵ء کو فضا میں داغ کر ہندوستان میں خلائی تحقیق کے ایک نئے

باب ۴۲ فٹ تھا۔ اس سیارہ کا وزن صرف ۳۶۰ کلوگرام تھا۔ یہ قطر میں ڈیڑھ میٹر اور سوا میٹر اونچا تھا۔ یہ ۹۶ منٹ میں زمینی مدار کا ایک چکر مکمل کر سکتا تھا۔ اس کے تمام الیکٹرانک آلات ہندوستان میں تیار کئے گئے لیکن اس کی برقی ضروریات کے لیے شمسی بیٹریاں روس سے درآمد کی گئیں جن کی مجموعی قوت صرف ۴۶ واٹ کے برابر تھی۔

آریہ بھٹ کے تین اہم مقاصد تھے۔ پہلا ستاروں میں رونما ہونے والے تغیرات کے دوران خارج ہونے والی X-ray شعاعوں کا مشاہدہ۔ دوسرا فضا کی کثافت اور کیمیائی تعملات میں بالا بنفشی شعاعوں Ultra-Violet، کے اثرات کا مطالعہ اور تیسرا مقصد سورج کی روشنی سے گاما GAMA شعاعوں کے اخراج کے ذریعہ اس کے اندرونی حالات سے واقفیت شامل ہے۔

آریہ بھٹ کے بعد بھاسکر۔ اوّل سیارہ ۷ جون ۱۹۷۹ کو روسی حاّل راکٹ کے ذریعے فضا میں داغا گیا۔ اس سیارہ کا نام بارہویں صدی کے مشہور فلکی طبیعات کے ماہر و ریاضی داں بھاسکر پنڈت کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس کا وزن ۴ سو کیلوگرام تھا۔ اس سیارے کو داغنے کا کام ہندوستانی سائنسدانوں نے کیا جبکہ اس کا کنٹرول ہندوستانی اور روسی ماہروں کی مشترکہ ٹیم نے انجام دیا۔ بھاسکر اوّل پہلے سے زیادہ پیچیدہ سیارہ تھا جس کے ذریعے پہاڑوں پر برف کی موجودگی کا پتہ چلایا گیا۔ ساحلی کھوج میں مدد دی گئی۔ سمندر کی سطح پر درجہ حرارت اور فضا میں آبی بخارات کی مقدار کا تعین کیا گیا۔ اس سے ہندوستانی دریاؤں میں سیلابی کیفیت اور بارش کی پیشن قیاسی کی گئی۔ اس کے علاوہ اس سے خشک سالی اور قحط اور جنگلاتی درجہ حرارت کا صحیح اندازہ لگایا گیا۔ اور اس سے بہتر مواصلات اور دیہی علاقوں میں تعلیم کے وسائل میں اضافہ کیا گیا۔

بھاسکر۔ دوم سیارہ ۱۹۸۰ میں فضا میں داغا گیا۔ اس سیارے کا نام مشہور ریاضی داں حساب و ہندسہ کے ماہر بھاسکر دوم کے نام سے موسوم کیا گیا۔ جو علم نجوم سے گہرا تعلق رکھتا تھا۔ بھاسکر دوم کا مقصد سیاروں کی نقل و حرکت، شمسی و قمری نظام کی رفتار، سورج و چاند گرہن، ستاروں کے میل و ٹکراؤ اور گردش کا مطالعہ کرنا تھا۔

خلائی تجربات میں اب تک مصنوعی سیاروں کو فضا میں داغنے کے لیے بیرونی ٹکنالوجی سے مدد لی گئی لیکن ۱۹۸۰ میں سیارہ داغنے والی گاڑی Satellite Iaunching Vehiole-Slv-3 کو فضا میں داغ کر ہندوستانی سائنسدانوں نے شاندار کام انجام دیا۔ یہ گاڑی دراصل چار مرحلوں والا راکٹ تھا۔ جس کا وزن ۱۷ ٹن اور لمبائی ۲۲ میٹر تھی۔ جس کو وکرم سارا بھائی کے محکمہ ISRO نے تیار کیا۔ ان چاروں مرحلوں کو ایک المونیم کے خول میں پیوست کر دیا گیا تھا۔ راکٹ بنانے کا کام ۱۹۷۰ کے اوائل سے ہی شروع ہوا لیکن دس سال کے عرصہ میں ۱۷ کیلو سے ۱۷ ٹن وزن کے راکٹ بنا کر ہندوستان نے دنیا میں اپنا ساتواں مقام حاصل کیا ہے۔ اس سے قبل روس، امریکہ، برطانیہ، فرانس، چین اور جاپان بنا چکے ہیں۔ بھاسکر۔ اوّل و دوم کے بعد روہنی سیارہ، SLV-3 داغیہ گاڑی کے ذریعہ سری ہری کوٹہ کے مقام سے فضا میں داغا گیا۔ اِس سیارہ کا مقصد موسمیات کی پیش قیاسی، قدرتی وسائل کا جائزہ اور مواصلات کو ترقی دینا تھا۔ SLV-3، کی تیاری اور اس کو فضا میں داغنے کے تجربہ سے ہمیں خلائی تحقیق میں خود اعتمادی پیدا ہوئی جس کی بنا پر ہم مستقبل قریب میں ۳ یا ۴ سو ٹن کی داغیہ گاڑی فضا میں داغ سکیں گے۔

آریہ بھٹ، بھاسکر اوّل و دوم اور روہنی سیارہ کے بعد ہندوستان کا عظیم مصنوعی سیارہ ایپل Apple ۹ جون ۱۹۸۱ کو مواصلاتی ترسیل کے اہم مقصد کے لیے خلا میں داغا گیا۔ یہ سیارہ خلائی تحقیق کے ادارے ISRO کی قابلِ فخر مہم ہے۔ یہ ایسے دیگر سیاروں سے کافی مشابہت رکھتا ہے Apple سے مُراد Aryane Passenger Pay Load Experiment ہے۔ اس کو یہ نام دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے، اس سیارہ کو یوروپین اسپیس ایجنسی کے راکٹ آریانے سے داغا گیا۔ ایپل ساڑھے تین سال کی مختصر مدت میں تیار کیا گیا۔ جس پر ایک کروڑ، ۱۰ لاکھ روپیہ کا صرفہ آیا۔ اس کی ساخت ایک سلنڈر کے مانند تھی۔ جس کا قطر اور لمبائی دونوں ۱۲۰ سینٹی میٹر تھے۔ یہ سیارہ زمین سے ۳۶ ہزار کیلو میٹر دوری پر تھا۔ جو ۱۰ گھنٹہ ۴۰ منٹ میں زمین کے مدار کا ایک چکر مکمل کر سکتا تھا۔ یہ سیارہ اپنی برقی ضروریات شمسی بیٹریوں اور نیکل کیڈمیم کی دھاتی بیٹریوں سے پوری کرتا تھا شمسی بیٹریاں بوقت گردش سورج کے مقابل آتے ہی کھل جاتی تھی لیکن اس کے دو شمسی پینل میں سے صرف ایک ہی کھل سکا اور اس کو مطلوبہ برقی قوت نہ مل سکی جس کی وجہ سے اس کی کارکردگی ختم ہوگئی۔

کائنات کی تسخیر کے بعد خلائی تحقیق کی منصوبہ بند ترقی کا دوسرا پہلو ایک آدمی کی زندگی کو خوشحال اور آرام دہ بناتا ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کی خاطر انسیٹ (INSAT) یعنی Indian National Satellite سیارہ تیار کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ اس قسم کے سیارے ترقی یافتہ ممالک جیسے روس، امریکہ اور برطانیہ میں ایک عرصہ سے کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ روس میں Molniya اور Orbita امریکہ میں ATS-3 ٹی وی پروگرام کے لیے Manpack دفاعی امور کے لیے

یکم تا ۱۵ ماہ [illegible]

اور پھر برطانیہ میں Skynet سیاروں سے استفادہ کیا جارہا ہے۔ ہندوستان میں انسیٹ تیار کرنے اور اس کو فضا میں داغنے کی ذمہ داری Indian Space Research Organisation یا ISRO کے محکمہ کو سونپی گئی۔ اس ادارہ کا کام انسیٹ کی قیمت کا تعین، تیاری اور فنی ٹیکنک کی سہولیتں اور جانچ وغیرہ کا جائزہ لینا ہے۔

اسرو ISRO کے ادارہ نے امریکہ کی دو مشہور کمپنیوں یعنی جنرل الیکٹرک کمپنی اور ایر کرافٹ کارپوریشن کے وسیع تجربات سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہندوستان میں انسیٹ تعلیم کو عام کرنے کے لیے ایک اچھا ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کو موسمیات کی پیشن قیاسی، دور دراز مقامات میں ٹیلی فون رابطہ کی بحالی کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یوں تو انسیٹ ریڈیو نشریات، دفاع، ڈاک و تار، ریلوے، شہری ہوا بازی، جہاز رانی اور خبروں کی ترسیل کے لیے بھی ممد و معاون ہے۔

ہندوستان کا پہلا مصنوعی سیارہ Insat-IA ، ۱۰ را اپریل ۱۹۸۲ بوقت دوپہر ۱۲ بجکر ۱۷ منٹ پر بمقام کینیڈی اسپیس سنٹر (فلوریڈا) سے داغا گیا۔ جو زمین کے مدار میں صرف ۱۹ منٹ بعد داخل ہوا۔ اس سیارہ کو داغنے کا سہرا محکمہ خلائی تحقیق کے صدر نشین پروفیسر ستیش دھون کے سر ہے۔ اس سیارہ کی تیاری میں تقریباً ۷۵ کروڑ روپے صرف ہوئے اور اس کی کارکردگی کا اندازہ ۷ سال لگایا گیا تھا اس پہلے مصنوعی سیارہ کا وزن (۱۱۵۰) کیلوگرام تھا۔ جو امریکن FORD Aerospale Corporation نے تیار کیا۔ اس سیارہ کو کنٹرول کرنے کے لیے کرناٹک کے مقام ہاسن پر ایک اسٹیشن قائم کیا گیا۔ اس سیارہ میں چند فنی خرابیوں کے باعث اس کی کارکردگی متاثر ہوئی۔ لیکن اس کے فوراً بعد یعنی ۳۰ راگست ۱۹۸۳ کو INSAT-IB فضا میں داغا گیا۔ جو آج تک اپنی بہترین کارکردگی کا مظہر ہے۔ اور آج ہم اس کی بدولت اپنے قومی اور تفریحی پروگراموں سے گھر بیٹھے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اور اس سیارے سے اب تک تقریباً ۳ ہزار ٹیلیفون رابطے قائم ہو چکے ہیں۔ اور امید ہے کہ یہ رابطے بہت جلد ۷ ہزار تک پہونچ جائیں گے۔

INSAT-IB خواندگی کو عام کرنے اور تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ چنانچہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے خواندگی میں اضافہ کرنے کے لیے ایک باقاعدہ پروگرام شروع کیا ہے۔ جو روزانہ ٹی۔وی پر ۲ تا ۴ ساعت شام دیکھا جاسکتا ہے۔ تعلیمی پروگرام اور مواصلاتی نظام کو ترقی دینے کے لیے INSAT-IC کو ۱۹۸۶ ء میں داغنے کا منصوبہ بنا لیا گیا ہے۔

ہند و سوویٹ خلائی جہاز سویوز ٹی۔ ۱۱ میں دو روسی خلا بازوں کے ساتھ راکیش شرما کی اڑان ہمارے خلائی منصوبے کی ایک کڑی ہے۔ اس سے ہندوستانی قوم کو چودھواں مقام حاصل ہوا۔ جس نے پرواز میں مع انسان خلائی سیارہ جہاز داغا ہے۔ سویوز ٹی۔ ۱۱ ۳ ر اپریل ۱۹۸۴ کو شام چھ بجکر ۲۸ منٹ پر خلا میں بھیجا گیا جو پہلے سے گردش کرنے والے سوویٹ خلائی اسٹیشن سلیوٹ۔ ۷ سے ۴ راپریل کی شام کو جڑ گیا۔ سویوز ٹی۔ ۱۱ ' ۹۱ واں انسان بردار خلائی جہاز تھا جبکہ پہلا ۱۹۶۱ میں داغا گیا جس میں یوری گگارین کو بھیجا گیا تھا۔ اور راکیش شرما گیارہویں قوم کا سمونات تھے، جنھوں نے خلا میں پرواز کی۔ اس سے پہلے چیکوسلواکیہ، مشرقی جرمنی، پولینڈ، بلغاریہ، ہنگری، کیوبا، ویٹ نام، منگولیا، فرانس اور رومانیہ کے خلا باز اڑ چکے ہیں۔ اب تک ۹۰ اڑانیں داغی جاچکی ہیں جن میں ۵۰ روس اور ۴۰ امریکہ کی ہیں۔

اس مہم کا مقصد ہندوستانی سرحدوں اور سرزمین کی تصویریں لینا۔ قدرتی وسائل کا جائزہ، جغرافیائی، موسمیاتی اور بحر ہند سے قریب علاقوں کا بغور معائنہ۔ ہمالیہ پہاڑ کے سلسلوں اور دریاؤں کے منبع کا مطالعہ تھا۔ جس کی مدد سے جنگلات، نقشہ نویسی، کارٹوگرافی، اوشنوگرافی، ارضیات کے مطالعہ اور تجزیہ میں مدد ملے گی، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معدنیات، کاشتکاری، ماحولیات، بحری وسائل اور دوسرے میدانوں میں ہندوستان کو تقریباً سات سو کروڑ روپیہ کا فائدہ ہوگا۔

ان تمام خلائی تجربات سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اب ہندوستان اس قابل ہو گیا ہے کہ وہ راکٹ مصنوعی سیارے، خلائی جہاز خود تیار کرے۔ انھیں ترقی دے اور پھر داغیہ گاڑی کی مدد سے فضا میں داغے۔ خلائی محکمہ کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ آئندہ پانچ سال میں ہم خلائی تحقیق اور تسخیر میں خود اعتمادی اور خود مختاری حاصل کریں گے اور ہمارا یہ اقدام جہالت، تعلیم بالغان، قدرتی ذرائع اور وسائل کا مطالعہ اور استعمال، ٹیلی مواصلات کے مسائل کا حل اور ملک سے افلاس اور بے روزگاری دور کرنے کا موجب ثابت ہوگا۔

ابوسعد

ٹاٹا لوہا اور فولاد کا کارخانہ

لوہے اور فولاد کی صنعت بنیادی طور پر اشیا کی تیاری سے متعلق صنعت ہے۔ یہ صنعتیں ایسے آلات فراہم کرتی ہے جس کے ذریعے مختلف اشیاء بنائی جاتی ہیں۔ اسے جہاز سازی، ریلوے اور موٹر کے انجنوں، پُل، سُرنگوں اور پائپ لائنوں کی تعمیر میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی صنعت سے کسی ملک کی صنعتی ترقی کی بنیاد پڑتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی ملک کی معاشی ترقی لوہے اور فولاد کی صنعت پر انحصار کرتی ہے۔

ہندوستان میں لوہے اور فولاد کی صنعت بہت پُرانی ہے۔ یہ صنعت دو ہزار سال پہلے بھی رائج تھی۔ لوہا پگھلانے، ڈھالنے اور فولاد تیار کرنے کا کام چھوٹی ذات کے لوگ کرتے تھے۔ ہمارے ملک میں لوہے اور فولاد کی صنعت سے صرف مقامی ضروریات ہی پوری نہیں ہوتی تھیں بلکہ یہاں سے لوہے اور فولاد کی بنی ہوئی اشیا غیر ممالک کو بھیجی جاتی تھیں۔ قطب مینار کے نزدیک نصب کردہ لوہے کی لاٹ اس بات کا مکمل ثبوت ہے کہ ہندوستان میں فولاد کی صنعت کتنے عروج پر تھی۔ یہ لوہے کی لاٹ صدیوں سے بارش اور دھوپ برداشت کرنے کے بعد بھی ویسی ہی بنی ہوئی ہے جیسے پہلے تھی۔ دنیا کے ایک سے ایک میٹالرجسٹ Metallurgist ابھی تک پتہ نہ چلا سکے کہ یہ لوہے کی لاٹ کن کن دھاتوں سے ملاکر بنائی گئی ہے۔ لیکن مغربی ممالک میں لوہے اور فولاد کے جدید کارخانوں کے قائم ہوجانے سے ہندوستانی لوہے اور فولاد کی صنعت کو کافی نقصان ہوا اور ہمارا ملک جو لوہے اور فولاد کو برآمد کرنے والا خاص ملک تھا، درآمد کرنے والا ملک بن گیا۔

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے ۲۲ مارچ کو نئی دلی میں انجینئرنگ کی مصنوعات کی برآمدات پر قومی کانفرنس کا افتتاح کیا۔ اس پس منظر میں بھی لوہے اور فولاد کی صنعت پر زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہے۔

ہندوستان میں لوہے اور فولاد کے جدید کارخانوں کی بنیاد ڈالنے کی کوشش سب سے پہلے جنوبی بھارت میں ارکاٹ ضلع میں دو انگریز "موٹلے فرکوہر اور جوشیا ہیتھ" کے ذریعہ ۱۷۷۹ء اور ۱۸۳۰ء میں کی گئی۔ مگر یہ دونوں کوششیں ناکام رہیں۔ ۱۸۷۴ء میں مغربی بنگال میں جھریا کی کوئلہ کان کے پاس کلٹی میں "بارا کار لوہے اور فولاد" کی کمپنی قائم کی گئی۔ ۱۸۸۹ء میں یہ کارخانہ "بنگال لوہا اور فولاد" کمپنی کے ماتحت چلا گیا۔ ۱۹۰۷ء میں بہار کے سنگھ بھوم ضلع میں ساکچی گاؤں میں ہمارے ملک کے مشہور صنعت کار شری جمشید جی ٹاٹا کے ذریعہ "ٹاٹا لوہا اور فولاد کی کمپنی TISCO" کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس کارخانے میں ڈھلے لوہے کی پیداوار پہلی بار ۱۹۱۱ء میں اور فولاد کی پیداوار ۱۹۱۳ء میں ہونا شروع ہوئی۔

ٹاٹا لوہا اور فولاد کا کارخانہ ہندوستان کا سب سے بڑا فولاد کا کارخانہ ہے۔ جہاں سے ملک کا دو تہائی فولاد تیار ہوتا ہے۔ یہ کارخانہ بہار کے سنگھ بھوم ضلع میں ہے جس کے شمال میں سُبرن ریکھا - Suberna rekha اور مغرب میں کھارکائی Kharkai ندیاں بہتی ہیں انھیں دونوں ندیوں کی تقریباً پانچ کلومیٹر چوڑی وادی میں یہ کارخانہ قائم ہے۔ یہاں اس صنعت کی ترقی کا سبب یہ ہے کہ کچی دھات اور کوئلہ فولاد کے مراکز کے نزدیک ہی حاصل ہوتا ہے۔ اس کمپنی کو ملک میں اور بیرونی ملک وسیع بازار حاصل ہے۔ یہاں با مہارت محنت کاروں کی وافر رسد، وافر سرمایہ کی فراہمی اور موثر نظام نقل وحمل اور دیگر موافق عوامل ہیں۔ اس کارخانے کے لیے لوہا گرو مہیا ثانی Gorumahisani بادام اور سلیپات Sulepat کی پہاڑیوں سے حاصل ہوتا ہے جو یہاں سے صرف ایک سو کلومیٹر دور ہے۔ کچی لوہے کی کچی دھات کا لگ بھگ پچاس فی صد میور بھنج ضلع کی کانوں سے حاصل ہوتا ہے۔ نوامنڈی کی کانوں سے بھی کچا لوہا نکالا جاتا ہے۔ کوئلہ جھریا کی کانوں سے آتا ہے جو اس کارخانہ سے

صرف ایک سو ساٹھ کلومیٹر کی دوری پر شمال میں واقع ہے۔ دھلا ہوا کوئلہ مغربی بوکارو جام ڈوبا اور بوجھوڈیہہ سے حاصل ہوتا ہے۔

چونا اور ڈولومائٹ Dolomite تین سو بیس کلومیٹر دور ہاتھی باری کٹنی اور پان پوش وغیرہ جگہوں سے آتا ہے جبکہ مینگنیز اڑیسہ میں گنگاپور یونائی اور مدھیہ پردیش سے حاصل ہوتی ہے۔ ۹۵ فیصد والی کوارٹزائٹ Quartsite اور ۵۴ فیصد والی کرومائٹ چٹانیں بھی سنگھ بھوم ضلع میں ہی مل جاتی ہیں۔ ٹنگسٹن مدناپور اور جودھ پور سے حاصل کیا جاتا ہے۔ ٹائٹینیم جنوبی بھارت سے اور آتشی مٹی بیل پہاڑ سے حاصل کی جاتی ہے۔ سُبرن ریکھا ندی کی بالو مٹی لوہا ڈھالنے کے لیے موزوں ہے۔ لوہے اور فولاد کے کارخانوں میں میٹھے یا تازے پانی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ کارخانہ اچھی جگہ پر قائم ہے۔ سُبرن ریکھا اور کھارکائی ندیوں کا پانی ایک بڑے حوض میں جمع کر لیا جاتا ہے۔ اس طرح خام مال اور بازار کی نظر سے یہ کارخانہ بہت اچھی جگہ پر قائم ہے۔

ساکچی گاؤں جہاں ٹاٹا لوہا اور فولاد کا کارخانہ قائم ہوا تھا اب بہت بڑا شہر بن چکا ہے۔ یہ شہر بہت ہی خوبصورت اور دلکش ہے۔ اس شہر کو ہم جمشید پور کے نام سے جانتے ہیں۔ جمشید پور اب ایک جدید صنعتی شہر بن چکا ہے۔ جمشید پور کا کارخانہ جنوب مشرقی ریلوے لائنوں کے ذریعے کلکتہ اور بمبئی سے جڑا ہوا ہے۔ ان دونوں شہروں کی بندرگاہوں تک تیار مال آسانی کے ساتھ بھیجا جا سکتا ہے۔ کلکتہ کے نزدیک مختلف قسم کی انجینئرنگ صنعتیں قائم ہیں۔ ان صنعتوں میں "ٹاٹا لوہا اور فولاد" کے کارخانہ سے بنے لوہوں، فولادوں کی بہت زیادہ کھپت ہوتی ہے۔ اس کارخانہ میں بہار، اتر پردیش، مدھیہ پردیش اور بنگال کے تقریباً پچاس ہزار مزدور کام کرتے ہیں۔

ٹاٹا لوہا اور فولاد کے کارخانے میں سلاخیں، گارڈر، ریل کے ڈبے، پہیئے اور پٹریاں، چادریں، سلیپر اور فیش پلیٹ وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ اس کارخانے کے نزدیک دوسری صنعتیں بھی قائم ہو گئی ہیں جن میں ٹاٹا کمپنی کے بنے ہوئے سامانوں کو استعمال میں لایا جاتا ہے۔ مثلاً ٹن پلیٹ، جمشید پور انجینئرنگ اور مشین کمپنی، ٹاٹا نگر فاؤنڈری، کھیتی کے آلات بنانے والی ایگریکو کمپنی اور ریلوے انجن کا کارخانہ وغیرہ۔ اس فولاد کے کارخانہ میں ۶ بلاسٹ فرنیس Blast Furnaces لگی ہوئی ہیں جن کی موجودہ فولاد بنانے کی صلاحیت بیس لاکھ ٹن سالانہ ہے جسے بڑھا کر چالیس لاکھ ٹن کیا جائے گا۔ اس کارخانے میں ایک الیکٹرک فرنیس بھی نصب ہے جس سے مختلف دھاتوں کے مرکب والی فولاد کی چادریں مختلف قسم کے مشینی آلات، اسپرنگ اور اسلحے وغیرہ بنانے کے لیے تیار کی جاتی ہیں۔

اس کارخانے میں لوہا اور فولاد کی پیداوار میں لگاتار اضافہ ہوا ہے۔ امسال اس کارخانہ میں فولاد اور لوہے کی ریکارڈ پیداوار ہوئی ہے۔ مارچ ۱۹۸۴ء تک پیداوار اور فروخت بالترتیب ۱٫۶۲۶ ملین ٹن اور ۱٫۵۰۷ ملین ٹن رہی جبکہ مارچ ۱۹۸۳ء کے خاتمہ تک پیداوار اور فروخت بالترتیب ۱٫۶۲۱ ملین ٹن اور ۱٫۴۸۳ ملین ٹن تھی۔ سال کے خاتمے مارچ ۱۹۸۴ء کے آخر تک لوہے کی پیداوار سترہ لاکھ پینتالیس ہزار سات سو ٹن اور رقیق فولاد کی پیداوار انیس لاکھ بہتر ہزار چھ سو ٹن تھی۔

یہ کارخانہ ہندوستان کے لیے سرمایۂ فخر ہے۔ ایسے ہی کارخانوں کے لیے پنڈت جواہر لعل نہرو نے کہا تھا کہ یہ بڑے کارخانے ہمارے لیے مندر اور مسجد ہیں ہمیں جتنا سکون مندروں اور مسجدوں کے اندر ملتا ہے اس سے زیادہ سکون ان بڑے کارخانوں کو دیکھ کر ہوتا ہے۔

★

غزل

حسرت رسالپوری

یہ کس نے چھیڑ دی ہے تری بے رُخی کی بات
اشکوں میں ڈھل گئی ہے غمِ زندگی کی بات

اے دوست ظلمتوں میں تری بزم کے سوا
ہم کو نظر نہ آئی کہیں روشنی کی بات

دنیا کرے نہ قدر تو یہ اور بات ہے
عنوانِ عقل ہے مری دیوانگی کی بات

جب میکدہ فروش ہیں ساقی بھی رند بھی
ہم کیا کہیں کسی سے بھلا تشنگی کی بات

اس کائناتِ حسن میں آئینہ کے سوا
پیدا کہیں ہوئی نہ تری ہمسری کی بات

گونجا فضا میں نعرۂ زنجیر مرحبا!
زنداں میں گھٹ کے رہ نہ سکی زندگی کی بات

یہ کیا کیا کہ عرضِ تمنا پہ ہنس دیے
عقدہ بنی ہوئی تھی غمِ زندگی کی بات

جینے کو یوں تو پھولوں کے سائے میں بھی جیے
لیکن کہاں وہ زُلف کی ہمسائیگی کی بات

آخر ہے انتہا بھی کوئی تیرے ظلم کی
جب دیکھئے زباں پہ وہی بے رُخی کی بات

حسرت ہمارے دل کی تو حسرت نکل گئی
ہم دل لگی میں کہہ ہی گئے دل لگی کی بات

★

وسنت ساٹھے

معاشرتی انقلاب کی جانب
اقتصادی جمہوریت کا مقدمہ

چھٹا باب

متبادل نظام کیا ہو — قسط : ۱۷

آخر وہ کون سا نظام ہے جسے لاگو کیا جائے۔ یہ ہے وہ سوال جسے فیصلے کی سطح پر ممکن بہت سے لوگ یا اقتصادی سرگرمیوں پر اثر انداز ہونے والے بیشتر افراد پوچھیں گے۔ وہ یہ بھی سوال کریں گے کہ اس کے حل سے شخصی یا گروہی مفادات کے فوری حل میں کس طرح مدد ملے گی۔ حقیقت پسند افراد کے سامنے تحریک عمل بخشنے والا ایک ہی تصور کارفرما رہتا ہے کہ اپنے پاس موجود اقتدار کے ذرائع کے استعمال سے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت کس طرح بٹور لی جائے اور اُسے کن آسان طریقوں کے ذریعے حاصل کیا جائے اور پھر اس دولت سے مزید اقتدار کیسے حاصل کیا جائے۔ یہ بات سیاسی اور اقتصادی ہر دو شعبوں پر صادق آتی ہے۔ حقیقت پسندانہ طور پر وہ بلاشبہ یہ جانتا ہے کہ کن بلند و بانگ دعووں اور اعلیٰ حالات کا سہارا لے کر عوام میں انھیں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ وہ مذہبی جذبات سے کھیلنا جانتے ہیں۔ اور مذہبی رہنماؤں اور پیشواؤں کے مذہبی مقولے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان حالات میں میرا نقطۂ نظر ان لوگوں کے لیے قابلِ قبول کیسے ہو سکتا ہے جن کے اپنے مخصوص مفادات ہیں اور جو ملک کی اقتصادی زندگی کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہیں۔ بیوروکریسی میں یقین رکھنے والے انتظامیہ کے لیے بھی یہی بات صادق آتی ہے خواہ وہ پبلک سیکٹر میں ہوں یا اعلیٰ سیاسی اقتدار کے حامل ہوں۔

لیکن ان مخصوص مفادات کے نمائندوں سے بھی میرا یہی کہنا ہے کہ عملی نقطۂ نظر سے موجودہ نظام ان کے مفادات کے لیے موزوں نہیں ہے۔ ہر شخص ہر مقام پر شخصی مفاد کو سامنے رکھتا ہے، اس لیے ہمارا اندازِ نظر محدود ہو جاتا ہے اور فائدے بھی محض مختصر پیمانے پر ہوتے ہیں۔ کسی ملک کے وزیر اعظم بننے کی خواہش کی تکمیل کے لیے، پہلے ایک چھوٹے خطے کے رہنما بننے کا تصور اس کے دل میں آئے گا۔ یہ صورتِ حال اس طرح بھی سامنے آ سکتی ہے کہ متعلقہ شخص خطے کی نمائندگی کی بجائے کسی فرقے یا چھوٹے سے گروہ کا سربراہ بن جائے اس طرح یہ آدمی اپنے آپ کو اور مختصر کر لیتا ہے اور اس طرح کے گروہی مفادات کے ٹکراؤ سے ملک میں انتشار پسندوں کو بڑھاوا ملتا ہے۔

ایک حقیقت کبھی نظرانداز نہیں کرنی چاہیے اور وہ یہ کہ ہندوستان کی تاریخ شاہد ہے کہ یہ ملک اسی حالت میں اور اسی وقت عظمت سے ہمکنار رہا ہے جبکہ اس نے وسیع تر پس منظر میں کام کیا ہے یعنی کہ عالمگیر پیغام دیا ہے، خواہ وہ ویدوں کے ذریعے دیا ہو یا مہاتما بدھ کے ذریعے یا پھر اشوک کے ذریعے یا پھر اس کے بعد اسی طرح وسیع پیمانے پر اپنے پیغام کی اشاعت کی ہو۔ جب کبھی یہاں کے راجہ مہاراجہ آپس میں ٹکرائے تو بیرونی طاقتوں نے انھیں مغلوب کر لیا۔ یہ بات آج بھی سچ ہے۔ سیاستدان اقتدار کی خاطر کسی بھی حد تک گر جانے کو تیار ہیں۔ اسی کی خاطر وہ انتشار پسند، علاقائی، لسانی اور فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا دیتے ہیں حالانکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ماضی قریب میں ایک بڑا سا ملک تقسیم ہو گیا۔ لیکن شخصی مفادات کے جذبے سے مغلوب ہو کر کچھ سیاستداں نوجوں تک سے یہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ فرقہ وارانہ بنیادوں پر طرفداری کریں اور وہ اسے [illegible] نظر کا نام دیتے ہیں۔ کیا یہ اقدام [illegible] کے لیے انتہائی نقصان دہ اور [illegible]

یوجنا، نئی دہلی

نہیں ہے۔ سیاسی سطح پر ملک کی تقسیم کے بارے میں سوچا جاتا ہے۔ اقتصادی محاذ پر عدم توازن کو بڑھنے دیا جاتا ہے۔ اس طرح غریبی بڑھتی ہے، اس بے روزگاروں کی ایک فوج بنتی ہے اور وہ اس کا انتظار کرتے ہیں کہ کب وہ دن آئے کہ عالی پلٹا کھائیں۔

بہر صورت مجھے معلوم ہے کہ میں مخصوص مفادات سے اپیل نہیں کر سکتا۔ اور وہ خود کو اس پنجرے سے باہر نہیں نکال سکتے جس میں وہ گھرے ہیں۔ البتہ میری اُن دانشوروں سے اور اس نوجوان طبقے سے اپیل ہے کہ جو کہ مقابلتہً آزاد ہے، اور جن کے دماغ ابھی تک کالے دھن کی ذہنیت کے تابع نہیں ہوئے ہیں۔ البتہ جو لوگ ابھی تک یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم کو بحیثیت قوم زندہ رہنا ہے اور ہم زندہ رہ سکتے ہیں، اُن سے میری اپیل ہے کہ ہم اپنے عوام کو ہمہ جہت ترقی دلا سکتے ہیں اور سیاسی جمہوریت کے ساتھ اقتصادی جمہوریت لا سکتے ہیں، اور ملک کے سبھی عوام کے لیے مواقع نکال سکتے ہیں اور انتظامی اصلاحات سے ایسی فضا بنا سکتے ہیں جس سے صنعتوں کو بڑھاوا ملے، پیداواری سرگرمیوں میں توسیع کو یقینی بنایا جا سکے اور عوام کا معیارِ زندگی بلند کیا جا سکے اور فنونِ لطیفہ ادب، کھیل، نیز تمام شعبوں میں ترقی کو یقینی بنایا جا سکے۔ جو لوگ محض اعتماد ہی نہیں بلکہ قوتِ ارادی بھی رکھتے ہیں، کہ فی الواقعی ملک کو ترقی کی راہ پر آگے بڑھانا ہے، اُن سے میری اپیل ہے کہ عوام کی بحیثیت مجموعی ترقی کے بارے میں عملی اندازِ نظر اپنائیں اور چند کی خاطر سب کے نفع کو قربان نہ کریں۔ جو شخص محض اپنے منافع کے بارے میں ہی سوچتے ہیں، میرا اُن سے بھی یہی کہنا ہے کہ بحیثیت قوم سب کے نفع سے ہر فرد کے لیے نئے مواقع سامنے آسکیں گے، اور سب کی خواہشات کی تکمیل [illegible] [illegible]

ذہن رکھنے والا انسان بھی سوچ سکتا ہے۔

ایک طرف ہر شعبے میں قومی ترقی کے زبردست امکانات ہیں، نئے نئے مواقع سامنے ہیں اور سبھی لوگوں کو تخلیقی صلاحیتوں کی تکمیل کے لیے مواقع موجود ہیں جن سے کہ دنیا کی نظر میں پوری قوم کا اعزاز اور اس کی قوت بڑھ سکے۔ دوسری طرف آپسی انتشار اور انحطاط اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور ہڑپ کر جانے کی ذہنیت سامنے ہے۔ اس ملک کا اتحاد اور سلامتی خطرے میں ہے اور ڈر ہے کہ ملک سیاسی طور پر نہ سہی، اقتصادی طور پر دوسروں کا دست نگر نہ ہو جائے۔

قومیت کا جذبہ جب مدھم پڑ جاتا ہے اور جارحانہ علاقائیت کا جذبہ پروان چڑھتا ہے، تو اس سے دل شکستگی، مایوسی، قنوطیت کو بڑھاوا ملتا ہے۔ نوجوانوں کو غصہ آتا ہے، اور وہ سلگنے لگتے ہیں۔ آج ہمارے ملک میں آسام ایجی ٹیشن، خالصتان، تیلگو دیشم کی شکل میں لاوا اُبل رہا ہے۔ ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں مزید تاخیر کی گنجائش بھی نہیں۔

آج چند افراد یا سچ پوچھئے تو کم سے کم ایک فرد ایسا ہے جو قوم اور عوام کو تنگ نظری پر مبنی خیالات سے اوپر اٹھا سکتا ہے اور قومی اعتماد کا نقیب بن سکتا ہے۔ ایسے افراد کی تلاش مشکل نہیں جن پر عوام کو اعتماد اور بھروسہ ہے۔ ایسی صورت میں گویا کہ قومی رہنما کی عدم موجودگی میں چھوٹے چھوٹے خطوں اور تنگ نظری پر مبنی خیالات کی ترجمانی کرنے والی قیادت کو فروغ مل سکتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ بھی ممکن ہے کہ قومی سطح کی قیادت کسی دوسری شکل میں ظاہر ہو یا کسی اقدام سے آئے۔ اس طرح کی اُمید پر ہمیشہ [illegible] جا سکتا ہے۔ لیکن یہ خیالات [illegible]

کی طرف لے جانے والے ہیں۔ آج جب کہ ہم اس حالت میں ہیں کہ کوئی تعمیری قدم اٹھا سکیں، ہمیں ملک کو انتشار پسندی سے بچانا ہے۔ معقولیت پسند، فکر رکھنے والوں کو ایک ساتھ مل بیٹھنا ہے اور ملک کے نوجوانوں کو ایک پلیٹ فارم پر آنا ہے تاکہ ملک کی ترقی اور ہمہ جہت فروغ کے حصول کے لیے طریقے تلاش کر سکیں۔

کبھی کبھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہندوستان کے تمام کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے نوجوانوں اور ان نوجوانوں کو جن کے پاس تخلیقی صلاحیت دکھانے کے مواقع نہیں ہیں، اپنے غصے کے اظہار کے لیے یونی ورسٹیوں سے باہر نکل کر اپنے کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے شیشے توڑنے کی بجائے یا بسوں کو آگ لگانے کی بجائے ایک ساتھ مل بیٹھ کر تمام سیاسی لیڈروں اور مفکروں، ماہرینِ اقتصادیات، صحافیوں اور انجینئروں وغیرہ سے پوچھنا چاہیے اور ان کو ایک ساتھ مل کر اس کے حل کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے۔ ہو سکے تو ان کو ایک جگہ بند کر کے اس وقت تک رہا نہ کریں جب تک وہ اس کا جمہوری حل تلاش نہ کر سکیں۔ جس سے کہ ملک کی سالمیت برقرار رہ سکے۔ اور جمہوری ڈھانچے میں رہتے ہوئے ملک کی ہمہ جہت ترقی ہو سکے اور اگر ایجی ٹیشن کی ضرورت بھی ہو تو انھیں لائنوں پر ہو۔ ایسا نہ ہوا تو نوجوانوں کا غصہ مقامی شورش کی شکل میں ظاہر ہوتا رہے گا جس سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔

لہٰذا میری ہر ذی شعور انسان سے اپیل ہے نیز ہر اُس انسان سے اپیل ہے جو انسانی صلاحیت میں یقین رکھتا ہے، اور جو یہ سمجھتا ہے کہ انسان عالمگیر قوت کے ایک حصے کے طور پر ماحول کو اپنے قابو میں رکھ سکتا ہے، جو خلا میں جھانک سکتا ہے، سمندر کو کھنگال سکتا ہے، انٹارٹیکا کے برفیلے بیابانوں میں قدم رکھ سکتا ہے، چاند پر قدم رکھ سکتا ہے، خلا میں اسٹیشن قائم کر سکتا ہے، علم [illegible] کی مدد سے زندگی کو طول دے سکتا ہے اور اسی طرح [illegible]

دنیا اور کائنات کے ساتھ ہم آہنگی قائم کر سکتا ہے۔ میرا ایسے کامل انسان سے ہے جو تسخیر کے نام پر سب کچھ کر سکتا ہے اور جو ہر طرح کے بوجھ برداشت کرنے کی صلاحیت کا مظاہرہ کرتا ہے، جو کوہ ایورسٹ پر قدم رکھ سکتا ہے اور ہمالیہ کے طول و عرض میں گھوم سکتا ہے۔ میں ایسی ہمت و جرات کے مالک مردوں اور عورتوں سے مخاطب ہوں۔ میرا یقین ہے کہ اگر وہ پورا پورا عزم کر لیں تو وہ عوام کو سستی اور کاہلی سے نکال سکتے ہیں اور شخصی نیز تنگ نظری والے مفادات کی دلدل سے انسان کو باہر کر سکتے ہیں۔ یہی لوگ ملک میں ان لوگوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں جو نام نہاد طریقے پر خود کو حقیقت پسند کہتے ہیں اور جو کہ لالچ کے تحت منہ پر منافقت کا نقاب ڈالے ہیں۔ یہ باہمت لوگ حقیقت پسندی کا لبادہ اوڑھنے والوں کی اصلی حقیقت کو سامنے رکھ سکتے ہیں۔ عقلیت پسند اور باشعور نوجوان ہمت سے کام لے کر عوام کے ذہنی اُفق کو روشن کر سکتے ہیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے ایسے ہی لوگوں کے لیے لکھا تھا:

جہاں دماغ پر کسی طرح کا خوف طاری نہ ہو
جہاں ہر انسان کا سر فخر سے اونچا رہے
جہاں علم و دانش کا دور دورہ ہو اور اس
کے لیے کوئی رکاوٹ نہ ہو
جہاں دنیا تنگ نظری پر مبنی تاریک گلیوں
کے ذریعے ٹکڑوں میں نہ بٹی ہو۔
جہاں حلق سے سچ کے سوا کچھ اور نہ نکلے
جہاں تکمیل کی خاطر کوششوں کا تانتا بندھا ہو
اور اس کے لیے انتھک کوششیں برابر جاری رہیں
جہاں علم و دانش اور عقلیت پسندی نے اپنا راستہ
نہ کھویا ہو۔
اور جہاں مُردہ رسومات اور از کار رفتہ عادات
کے تھکا دینے والے ریگستان کا گزر نہ ہو
جہاں ذہن کی پرواز اور فکر و عمل کی دنیا
ہمیشہ آگے کی طرف بڑھتی دکھائی دیتی ہو

میرے پتا! میرے ملک میں ایسی ہی
بیداری لا دے جس سے صحیح معنی میں آزادی
کی جنت اسے نصیب ہو سکے۔

اقتصادی جمہوری نظام کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ اس سے محض فرد کی آزادی یقینی ہی نہیں بن جاتی بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر تجارت اور کاروبار میں مصروف افراد کو اپنی صلاحیتیں دکھانے کا پورا موقع ملتا ہے۔ از خود روزگار والے بھی اپنی خواہش کے بموجب اپنے لیے میدان تلاش کر سکتے ہیں۔ سامان اور خدمات کی تیاری اور فراہمی کے لیے محنت کرنے والوں کی آزادی کا تحفظ بھی یقینی ہو جاتا ہے۔ درحقیقت یہ مساوی مواقع فراہم کرتا ہے۔ اس نظام کے تحت سب کو حصہ لینے اور اپنی صلاحیتیں دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ کسی گروپ یا پارٹی کے تحت یہ نظام لادا نہیں جاتا۔ اس کے تحت آزادی سے حقیقی طور پر لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ اقتصادی جمہوریت کے مقاصد اس کے تحت پایۂ تکمیل کو پہونچتے ہیں۔ یہ نظام کمیونسٹ نظام سے مختلف ہے جہاں مطلق العنانہ طور پر ایک ہی پارٹی کنٹرول کرتی ہے اور وہی تمام اقتصادی، سماجی اور جمہوری زندگی پر حاوی ہوتی ہے۔ لیکن اس نظام سے سرکار کی مداخلت کم سے کم ہوتی ہے، خواہ یہ حکومت کسی بھی سیاسی پارٹی کی کیوں نہ ہو۔ سرکار کا عملاً اس کے سوا اور کوئی رول نہ ہوگا کہ وہ اس نظام کے تحت مرتب کردہ قواعد و ضوابط کی روشنی میں مختلف اداروں کی کارکردگی کا جائزہ لے۔ سرکار ان سرگرمیوں کو آگے بڑھانے کی ہمت افزائی کر سکتی ہے۔ وہ کنٹرول یا مداخلت کی بجائے راستہ کی مشکلات ہٹانے کے لیے کام کرے گی۔ یہ مقولہ کہ بہترین سرکار وہی ہے جو کم سے کم کنٹرول رکھتی ہے، اس نظام پر صادق آ سکے گا۔ یہ ملک کی ترقی میں معاون ہوگی۔ اس کے ذریعے سرمایہ دارانہ نظام والے حکومتی ڈھانچے کی خرابیاں ختم ہو سکیں گی۔ کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد تو استحصال پسندی پر ہے۔

لہٰذا وہ تمام لوگ جو کہ فرد کی آزادی میں یقین رکھتے ہیں، انھیں مذکورہ بالا نظام کے تحت کوئی دشواری نہ ہوگی۔ البتہ وہ طبقہ پریشان رہے گا جو مخصوص مفادات کا حامل ہے اور جو صنعتی اور تجارتی شعبوں میں غلط فہمیاں پیدا کریں گے اور اس کو صحیح رنگ میں پیش نہیں کریں گے۔

اسی طرح انتظامیہ اور دفتر شاہی نظام میں مخصوص مفادات کے مالک اور اسی طرح وہ لوگ جنھیں کالے دھن کا چسکا پڑ گیا ہے، اس کی مخالفت کریں گے، کیوں کہ کالے دھن کمانے کے اُن کے طریقے مسدود ہو جائیں گے۔ اسی لیے وہ بڑی چابکدستی سے ایسی دلیلیں نکالیں گے، جس سے اس جمہوری نظام کو خراب بنا دیا جائے۔ مثلاً وہ کہیں گے کہ اگرچہ یہ ایک اچھا نظام ہے لیکن قابلِ عمل نہیں۔ مطلب یہ کہ کسی نہ کسی طرح استحصال پسندی والا نظام ہی چلتا رہے۔

سیاسی میدان میں بھی چند مخصوص مفادات ہیں۔ وہ بھی اس طریقِ کار کو پسند نہ کریں گے۔ وہ چند لوگ جو صاحبِ اقتدار ہیں، انھیں کالے دھن میں سے کافی بڑا حصہ گھر بیٹھے مل جاتا ہے، لہٰذا سیاسی، انتظامی اور اقتصادی شعبوں میں جو لوگ اس وقت نفع کی حالت میں ہیں، جدید ماڈل میں انھیں کوئی دلکشی نظر نہ آئے گی۔ اس میں تو سبھی کو اقتصادی جمہوری نظام میں شریک کرنا ہوگا۔ اسی لیے بہت سے لوگ اسے غیر عملی کہہ کر ناقص بتا دیں گے۔

سیاستداں یہ تجربہ کر چکے ہیں کہ خواہ انھوں نے کتنا ہی روپیہ جمع کیا ہو، اور خواہ کتنی ہی رقم خرچ کیوں نہ کی ہو، لیکن اس رقم کے بل بوتے پر ان کو انتخابات میں کامیابی نہیں مل سکی ہے اور نہ ہی اس کے سبب ان کا اقتدار [illegible] یقینی

یوجنا، نئی دہلی

ن سکتا ہے۔ صنعت کاروں اور تجارتی برادری ابھی تجربہ یہی ہے کہ ان کی طرف سے کمایا گیا لا دھن اور ان کے کالے دھن سے بنائی گئی فلک عمارتیں نیز نام و نمود کی خاطر خرچ کی ئی بے پناہ رقوم، اس وقت تک بے کار رہیں ب تک کہ غریبی کا سمندر اور بے روزگاری کا سیلاب ان کی بے پناہ دولت کے لیے ہر وقت خطرہ بنا ہوا ہے۔ کیونکہ یہ تمام امارت اور امیری عمارت ہر وقت خطرے میں ہے۔ وہ یہ سمجھتے یں کہ یہ خدشات فرضی یا جھوٹے نہیں ہیں کیونکہ ہندوستان کے مختلف مقامات پر رونما ہونے والی شورشیں اس کی مظہر ہیں، حالانکہ یہ مختلف شکلوں میں رونما ہوتی ہیں۔

بدقسمتی سے وہ غریب عوام جن کا استحصال ا جاتا ہے، منظم نہیں ہیں، اور چونکہ سیاسی اد پرست لوگ اپنے مفاد سے آگے دیکھنا نہیں چاہتے، لہٰذا عوام کی بے اطمینانی اور غصہ صحیح ست میں اقتصادی نظام میں تبدیلی لانے کی مانگ شکل میں ظاہر نہیں ہوتا بلکہ یہ غلط روپ دھارن لیتا ہے۔ اور جذباتی انداز میں توڑ پھوڑ کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ ایسی صورت میں مخصوص ادات فوجیوں کے ہاتھ میں طاقت دے یتے ہیں تاکہ وہ عوام کو کچل دیں اور اس کے اتھ ہی مخصوص مفادات کو اقتصادی میدانوں من مانی کا موقع ملتا رہے۔ یہ سب کام ندوق کے سائے تلے ہوتا ہے۔ ایسی صورت ں استحصال پسندی کے موقعے مل جاتے ہیں ور سامراجیت پسند فوجی جنتا کی حمایت کرنے لگتے یں۔ اس طرح کے سیاسی دیوالیہ پن کو بدترین ٹریجڈی ہی کہا جا سکتا ہے۔

یہ وہ مقام ہے کہ ہر مکتبۂ فکر کے افراد مل کر بیٹھیں کیوں کہ جمہوریت بگڑتی ہے لیڈرشپ میں تبدیل ہو جاتی ہے اور یہ [illegible] کے پاس

ہی اس کا تجربہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا ایسی پالیسیاں جو انتشار پسندانہ ہیں اور جن سے ملک کے اتحاد کو خطرہ ہے، ان سے ملک کا قومی تانا بانا کمزور ہو جاتا ہے۔ اور جمہوریت خطرے میں پڑ جاتی ہے، لہٰذا اس مقالے کی بنیادی بات یہی ہے کہ سماج کے ہر ذی شعور سے اپیل کی جائے اور کم سے کم اسے سوچنے اور تبادلۂ خیال کے لیے آمادہ کیا جائے تاکہ وہ کھلے دماغ سے یہ سوچے کہ اس نظام میں کیا خرابی ہے، نیز عوام کی متوازن ترقی کیوں عمل میں نہیں آ رہی ہے۔ سماج کے سبھی لوگوں کے لیے آزادی اور ترقی کرنے کا پورا پورا موقعہ فراہم کرنے کو کیسے یقینی بنایا جا سکتا ہے، یہ غور طلب امر ہے۔

اقتصادی محاذ پر جنگ، بالکل اسی طرح ہے جیسا کہ کسی اور محاذ پر جنگ ہوتی ہے۔ اس کے لیے تمام افرادی اور مادی وسائل کو حرکت میں لانا ہوتا ہے۔ جمہوری ڈھانچے اور اس کے تانے بانے میں ہر طرح کی خامیوں کو دور کرنا ضروری ہے۔ جمہوری نظام ڈسپلن کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا۔ لوٹ مار یا استحصال پسندی پر مبنی کسی نظام کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا نظام کیسے برداشت کیا جا سکتا ہے جہاں چند لوگ سبھی دیگر لوگوں کا استحصال کریں اور یہ کام جمہوری آزادی کے نام پر انجام دیں۔ اس مقصد کے لیے نیم دلی کے ساتھ اقدامات انجام نہیں دیے جا سکتے اور مخصوص مفادات کے ساتھ سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ استحصال پسندی کے نظام کو جاری رہنے نہیں دیا جا سکتا ورنہ نئے سماجی و اقتصادی نظام کے قیام کی ہماری تمام کوششیں بے سود ہو کر رہ جائیں گی۔

ہمارے ملک میں ذہین افراد کی کمی نہیں ہے۔ ہر شعبے میں ہمارے ماہرین موجود ہیں۔ اس کا ثبوت بار بار مل چکا ہے۔ بدقسمتی سے زیادہ تر ذہین افراد پرائیویٹ صنعتوں میں لگے ہیں اور غیر ضروری

اور غیر ترجیحی اشیا کی تیاری میں لگے ہیں اور زیادہ سے زیادہ نفع کما رہے ہیں۔ دولت کمانے کے لیے خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو، اقتصادی اور سیاسی اقتدار کا حصول ضروری ہے۔ اس کے لیے سماجی مرتبہ بھی ضروری ہے۔ اس نے روایتی اقدار کو کھو دیا ہے۔ سب سے زیادہ نقصان سماجیات میں ہوا ہے جہاں کہ غریب اور بھی غریب ہوا جا رہا ہے اور غیر انسانی حالات میں دھکیلا جا رہا ہے۔ اس بگڑتے ہوئے نظام کو سدھارنا ضروری ہے۔

مشہور ماہر اقتصادیات اور ہندوستان کے ایک دوست مسٹر گنار مرڈل کا نظریہ یہاں دہرانا مناسب رہے گا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں ذہانت کی کمی نہیں ہے، بلکہ یہاں ایک سے ایک اعلیٰ ذہن ہے۔ اقتصادی ترقی اور سماجی انصاف میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور ان دونوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں۔ چنانچہ ترقی کے عمل کو مستحکم بنانے کے لیے بنیادی نوعیت کی سماجی اور اقتصادی اصلاحات ضروری ہیں۔

میرے اس مقالے میں دی گئی دلیلیں اور ان سے ہم آہنگ پیش کی گئی عملی پالیسی کی تجاویز وثوق اور یقین کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ ان کو اعلیٰ ترین صلاحیت کے لوگوں کی تائید حاصل ہے۔ ان اصلاحات پر عمل درآمد کا سوال باقی رہ جاتا ہے۔

(ہمارے سابق) وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کو جو اقتدار حاصل ہوا، وہ مہاتما گاندھی اور خود شریمتی اندرا گاندھی کے والد شری جواہر لال نہرو کو بھی حاصل نہ ہوا۔ اس کا سبب یہی ہے کہ سیاسی سطح پر انھوں نے اپنی صلاحیت کا ثبوت دیا۔ ۱۹۷۱ میں پاکستان میں جس فوجی جنتا کا راج تھا اور جس سے لڑائی ہوئی تھی اس میں شریمتی اندرا گاندھی کی کامیاب اور تحریک بخشنے والی قیادت نے اس عمل کو اور آگے بڑھایا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی عظمت کا سبب یہ

[illegible] سے بیکار فرسودہ
[illegible] اقتصادی نظام اور مارکسزم
[illegible] ہو چکے ہیں۔

رال پری بیش کے خیالات

رال پری بیش نے ایک کتاب اقتصادی نظام کی تبدیلی کے بارے میں لکھی ہے جس کا نام Towards a theory of change
اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ میں سوشلزم اور لبرلزم کے درمیان امتزاج چاہتا ہوں، گویا ایسا سوشلزم جو فرد کی آزادی پر مبنی ہو اور جس میں سماجی بقائے باہم کے نئے انداز ہوں۔

سوشلزم نظام کے تحت ریاست پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ جمہوری طریقوں کے ذریعے اس کا فیصلہ کرے کہ فاضلات کا سماجی و اقتصادی بنیادوں پر کس طرح استعمال ہو تاکہ تکنیکی ترقی کے فائدوں کا حصول اور ان کی تقسیم زیادہ بھرپور طریقے پر عمل میں آسکے۔

لبرلزم Liberalism کے تحت اقتصادی آزادی پر زور دیا جاتا ہے۔ یہ اس لیے بھی کہ سیاسی آزادی کے لیے ایسا ہونا ضروری ہے اور حقوقِ انسانی کے تحت بھی ایسا ہونا ضروری ہے۔

رال پری بیش سے ایک انٹرویو

ساؤتھ :۔ کیا آپ لاطینی امریکہ کے ان ماہرینِ اقتصادیات سے اتفاق کریں گے جو یہ کہتے ہیں کہ مالیات اور زر سے متعلق پالیسیوں کے اثرات اعلان شدہ مقاصد کے بالکل مخالف ظاہر ہوتے ہیں۔

رال پری بیش :۔ میں مالیات اور زر سے متعلق اُن کے نظریات کو قطعی انحراف سمجھتا ہوں اور میں اپنی موجودہ تحریروں سے اس انحراف کو واضح کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اب اس پر پورا پورا یقین آچکا ہے جو کہ ۱۹۵۵ء [illegible]

[illegible] کہ افراطِ زر محض مالی نظریہ نہیں ہے بلکہ یہ اقتصادی نظام کا اثر ہے۔ لیکن کیا کیا جائے؟ یہ بالکل واضح ہے کہ امریکہ میں بھی وہ یہ نہیں جانتے کہ انھیں کیا کرنا ہے۔

ساؤتھ :۔ کیا امریکہ اور اس کے آس پاس کے ملکوں کا مسئلہ ایک سا ہی ہے؟

رال پری بیش :۔ میں تو یہ نہ کہوں گا، لیکن آس پاس کے ملکوں میں کیا کیا جائے، اس سوال نے مجھے اس نتیجے پر پہنچایا ہے کہ نظام میں بنیادی تبدیلی لائے بغیر یہ مسئلہ حل نہ ہو سکے گا۔

ساؤتھ :۔ آپ نے حال ہی میں کہا ہے کہ لاطینی امریکہ کے ملکوں اور تیسری دنیا کے دیگر ملکوں میں سرمایہ دارانہ نظام کے طرز پر جو نظام اپنایا گیا ہے، وہ کام نہیں کرتا۔ ایسا کیوں ہے؟

رال پری بیش :۔ میں اب اس نظریے پر ہی کام کر رہا ہوں۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کی نقل ہے۔ ہم سنٹر یعنی مرکز کی تکنیکیں اپنا لیتے ہیں، اسی کی طرح خرچ کرتے ہیں، اسی کے خیالات، نظریات اور روایات اپنا لیتے ہیں۔ اسے اپنے سماجی تانے بانے میں ملانے کی کوشش کرتے ہیں، جبکہ ہمارے ملکوں کے سماجی تانے بانے، بڑے ملکوں کے سماجی نظام اور طریقِ کار سے بالکل مختلف ہیں۔ اس طرح تضادات کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے ملکوں کو ان بڑے ملکوں کے طرز پر آگے نہیں بڑھا سکتے۔

میں نے جو نظام کا پیش کیا ہے، وہ اقتصادی جمہوریت کے تصور سے قریب ترین ہے۔ اس کے ذریعے سیاسی آزادی مکمل ہو سکتی ہے۔ اگر تبادلۂ خیال سے اس میں اصلاح [illegible]

[illegible] کی بات ہے مقصد [illegible] یہ ہے کہ تاریخ جلد سے جلد حاصل ہو [illegible] زدہ افراد عرصۂ دراز تک انتظار نہیں کر سکتے۔ ان مقاصد کے حصول سے پورے سماج کی اقتصادی اور سماجی زندگی کا صحت مند فروغ عمل میں آسکے گا۔ لہٰذا ایک ایسا نظام درکار ہے جس میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ حسبِ ضرورت تبدیلی لاکر صورتِ حال کو ٹھیک کر سکے اس کی مثال جسمِ انسانی کی ہے کہ اسے دوا کی ضرورت ہی جب پڑتی ہے جب اندرونی نظام خراب ہو جائے۔

میں نے اقتصادی جمہوریت کا ایک ایسا ماڈل پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جو اس سیاسی جمہوری نظام سے میل کھا سکے جو ہم نے اپنایا ہے یہ ماڈل ڈکٹیٹرشپ کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ یہ ان لوگوں کے لیے بھی قابلِ قبول نہ ہوگا جو پہلے ہی سرمایہ داری سے فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ لیکن دیر یا سویر ایک ایسا نظام ہم کو تسلیم ہی کرنا پڑے گا جس میں مساوات کا اصول حقیقت بن کر سامنے آسکے اور وہ محض فراخدلانہ نظریاتی فلسفہ ہی نہ رہے۔ آخر میں سنسکرت کی قدیم کہاوت دہراتا ہوں، جو منصوبہ سازوں پر گویا کہ ان کے لیے جو کہ ملک میں عوام کو مناسب اقتصادی و سماجی حالات سے ہمکنار کرنے کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں، صادق آتی ہے۔ اس کہاوت کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی لفظ بھی غیر مقدس نہیں ہے، کوئی جڑی بوٹی اپنے خواص سے خالی نہیں، کوئی آدمی بے کار نہیں۔ یہ صرف منصوبہ ساز اور منتظم کی ذمہ داری ہے، مگر ان دونوں زمروں کا تلاش کر لینا آسان نہیں ہے۔

(آئندہ شمارے میں ملاحظہ ہو:
"مستقبل کے امکانات" [illegible])

بلکہ وہ بنیادی نوعیت کی سماجی اور اقتصادی اصلاحات لائی تھیں۔ ایک بار پھر ہندوستان اریخ کے نازک مرحلے پر پہونچ گیا ہے جبکہ یہاں کے عوام اور پوری دُنیا کے ہندوستان کے تمام دوست اس سے اُمید باندھے ہوئے ہیں۔ وہ یہ جانتی تھیں کہ اس مقصد میں کامیابی کے لیے نرم و نازک سیاسی عمل اور محض الفاظ کام نہیں دے سکتے۔

ہندوستان میں اُمید کا ایک اور منبع ہے۔ وہ ہے ان لکھوکھا عوام کا گروہ جو انتہائی علی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ ان میں دانشور، پیشہ ورانہ ماہر، صنعتی رہنما وغیرہ شامل ہیں اُمید ہے کہ وہ نئے مواقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے، اور وہ باہمت طریقے پر کام کر کے انصاف اور ترقی کی قومی مہم کو آگے بڑھائیں گے اور اس راستہ میں مختصر اور محدود قسم کے نجی مفادات کو حارج نہ ہونے دیں گے۔

لہٰذا ہمیں عوام میں یقین رکھنا ہے اور ہر مکتبۂ فکر کے اچھے اچھے لوگوں سے کام لینا ہے۔ ہمیں اُن کے کاموں کا اندازہ ان کے نتائج سے کرنا ہے۔ ملک میں دستیاب افرادی اور مادّی وسائل کو حرکت میں لانا ہے، اور انھیں ملک و قوم کی بھلائی کے کاموں میں جُٹانا ہے۔

اقتصادی جمہوریت کے ڈھانچے کو فراہم کرنے کے بارے میں غور کرتے وقت ایک بات یہ بھی سوچنی ہے کہ ایک سیاسی جمہوریت میں دو یا دو سے زیادہ سیاسی پارٹیاں عوام کو زیادہ موثر متبادل نظام مہیا کر سکتی ہیں۔ حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ یہ پارٹیاں قطعی مخالف نظریاتی طریق کار کی حامی ہوں۔ سیاسی پارٹیاں یا سیاسی قوتیں آپس میں اس طرح کی دشمنی نہیں سوچیں کہ وہ جائز یا ناجائز کسی بھی طریقے سے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کریں۔ بلکہ وہ ایک دوسرے کا احترام کرتے ہوئے کام کر سکتی ہیں۔ اور ہر ایک پارٹی دوسری کی ایمانداری، سالمیت اور حُب الوطنی پر مبنی اعلیٰ اقدار کی سراہنا کر سکتی ہے۔ مقابلہ ہو تو صرف اس بات میں کہ کارگزاری کس کی اچھی ہے، اور اس کی بنیاد پر ہی عوام کا اعتماد حاصل کرنا چاہیئے نہ کہ ایک دوسرے کو نیچا دکھا کر۔

سیاسی سطح پر اس طرح کے صحت مند نظریے کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ تبھی ہوگا جب یہ یقین ہو جائے کہ اقتصادی جمہوریت کو یقینی بنا کر شہری جمہوریت کی بقا کو یقینی بنایا جا سکتا ہے اور یہ کہ یہ بات تمام شہریوں کے مفاد میں ہے۔

لہٰذا اس بات میں یقین پختہ ہو جانے کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ ہم متحد نہ ہو جائیں بھلے ہی کچھ ہمارے ذاتی مفادات بھی ہوں لیکن ہم متحد ہو کر قوم کی تعمیر میں اپنی قوتوں کو لگا سکتے ہیں اور ملک کے سبھی لوگوں کو آگے بڑھنے کا موقع مل سکتا ہے، جس سے کہ وہ ملک کی متوازن ترقی کو یقینی بنایا جا سکے گا۔

جب ہم میں سے ہر شخص پیداواری کام میں لگا ہوگا، تو قومی مجموعی آمدنی کا تمام کا تمام تصور بالکل بدل جائے گا اور شرح ترقی میں ۲ فیصد، ۳ فیصد یا ۵ فیصد اضافے کی بات بے ربط ہو جائے گی۔ میں نے اقتصادی جمہوریت کا یہ پراجیکٹ بحیثیت معاشیات اور سیاسیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے تیار کیا ہے۔ یہ ایک ایسے طالب علم نے تیار کیا ہے جو اقتصادی ترقی کی اُن کلاسیکی تھیوریوں سے واقف ہے جو گزشتہ برسوں میں مغربی دُنیا میں منظر عام پر آئی ہیں اور جس نے یہ دیکھا کہ کارل مارکس کی طرف سے پیش کردہ تھیوریاں کمیونسٹ تجربے کی صورت میں عملی شکل میں آئیں اور چین کے تجربے رُوس اور دیگر ملکوں میں کیے گئے۔ یہ ایک ایسے طالب علم کا پراجیکٹ ہے جس نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ جن ترقی پذیر ملکوں نے سیاسی آزادی حاصل کر لی ہے اور جہاں فرد کی آزادی کا احترام کیا جاتا ہے ان کے لیے بہترین اقتصادی ڈھانچہ کیا ہو سکتا ہے، جس سے کہ فرد کی آزادی کو یقینی بنایا جا سکے اور اس کے ساتھ ہی سماج کے لیے متوازن اقتصادی ترقی کا عمل وجود میں آ سکے۔ اس سلسلے میں میں نے گنار مرڈل اور رال پری بیش جیسے دو مشہور ماہر اقتصادیات کی تحریروں اور افکار سے مطابقت پائی۔ میں نے ان کے خیالات اور افکار کو اس کتاب میں کئی جگہ پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے افکار کو اور بھی پیش کرنا چاہوں گا تاکہ اقتصادی نظام میں تبدیلی کی ضرورت واضح ہو سکے۔

گنار مرڈل نے کم ترقی یافتہ خطوں کے لیے اقتصادی تھیوری پیش کی ہے، ان کی کتاب کا نام ہے۔ Economic theory and under developed Regions اس میں انھوں نے کہا ہے کہ زبردست شعوری انقلاب کے اس دور میں اگر کم ترقی یافتہ ملکوں کے نوجوان ماہرینِ اقتصادیات ترقی یافتہ ملکوں کے اقتصادی نظریات و افکار سے متاثر ہو کر، اگر بہک جائیں گے تو یہ ایک افسوسناک امر ہوگا، جب کہ خود ترقی یافتہ ملکوں میں یہ ماہرین اقتصادیات اپنے ان میلانات کے باعث معتدل پسندی کی کوششوں کو آگے بڑھانے سے قاصر رہے ہیں۔ کم ترقی یافتہ ملکوں میں یہی رُجحانات وہاں کے دانشوروں کی کوششوں کے لیے مہلک ثابت ہوں گے۔ میری خواہش ہے کہ وہ جرأت سے کام لیں اور ان بے معنی، بے ربط اور ناکافی اصولوں سے ہٹ کر از سر نو خود یہ سوچیں کہ ان کے اپنے مسائل اور تقاضے

[illegible] رشیدی

کتب بینی - ایک دلچسپ مشغلہ

انسانی زندگی میں عیش و آرام کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ انسان کی ساری تگ و دو کا ماحصل یہی ہوتا ہے کہ وہ آرام سے زندگی بسر کر سکے۔ ہر انسان دل بہلانے کی خاطر یا یہ کہیے کہ زندگی کی تگ و دو سے تھوڑی دیر کے لیے چھٹکارا حاصل کرنے کی خاطر مختلف تفریحات اور مشاغل میں مبتلا ہوتا ہے۔

انسانی مشاغل پر اگر ہم ایک سرسری نظر دوڑائیں تو ایک لمبی چوڑی فہرست سامنے آ جائے گی۔ کوئی پتنگ بازی میں مصروف ہے تو کوئی کبوتر بازی میں، کسی کو فلم دیکھنے کا شوق ہے تو کسی کو کسی اور کھیل کا۔ غیبت، چغلی، ساڑیوں اور زیوروں پر تبصرے عورتوں کے محبوب ترین مشاغل ہیں۔ ٹکٹ جمع کرنا، قلمی دوستی پیدا کرنا یہ تمام مشاغل میں شامل ہیں۔ غرضیکہ ہر سرے سودائے۔

مشاغل آدمی کی شناخت ہوتے ہیں۔ یہ انسان کو بناتے بھی ہیں اور بگاڑتے بھی ہیں۔ یہ باعث نام و نمود بھی تو باعث رسوائی بھی۔ اس کی وجہ سے ہم نے لوگوں کے گلے میں پھولوں کے ہار بھی دیکھے ہیں اور لوگوں کو سڑکوں پر پٹتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ اس لیے ایک شخص کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی مشغلے کو اختیار کرنے سے پہلے یہ دیکھے کہ وہ اس کے لیے سودمند ہے یا نقصاندہ۔ ہمیں نقصاندہ مشاغل سے کوئی بحث نہیں۔ ہاں سودمند مشاغل بھی بہت ہیں، ان کی ایک طویل فہرست تیار ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر میں یہ کہوں کہ کتب بینی ان میں سر فہرست ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

زمانہ جدید میں تعلیم کی اہمیت و افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ یہ بات پیش پا افتادہ ہے کہ بغیر تعلیم کے ایک شخص اچھا انسان نہیں بن سکتا۔ تعلیم آج کے دور میں اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ غذا۔ پڑھے لکھے، تعلیم یافتہ شخص کے لیے کتب بینی سے بہتر کوئی اور مشغلہ ہو ہی نہیں سکتا۔

ایسے مشاغل کی کمی نہیں جن میں سوائے پیسے اور وقت کی بربادی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن کتب بینی بعضوں کے لیے نہ صرف مفت کا سودا ہے بلکہ بزنس بھی کیونکہ ایسے حضرت نہ صرف کتابیں دوسروں سے مانگ کر پڑھتے ہیں بلکہ اسے لوٹاتے بھی نہیں۔ نہ ہلدی لگتی ہے نہ پھٹکری لیکن رنگ چوکھا آتا ہے۔

جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ ایک شخص اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ اگر کسی کے ذوق یا اس کے خیالات کا پتہ لگانا ہو تو یہ دیکھئے کہ وہ کیسی کتابیں پڑھتا ہے۔ کتابیں متعلقہ شخص کے خیالات اور افکار پر بہت گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ اچھی کتابیں ایک شخص کو بلندی پر پہنچا سکتی ہیں تو بری کتابیں پستی کا باعث بھی ہو سکتی ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ کتابوں کا انتخاب نہایت سوچ سمجھ کر کیا جائے۔ ورنہ یہ کہنا پڑے گا کہ کتابوں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے۔

اگر ہم دنیا کی اہم ترین شخصیتوں پر ایک نظر ڈالیں تو غالباً یہ بات سب میں مشترک نظر آئے گی کہ انھیں کتب بینی کا شوق تھا۔ پنڈت نہرو کتابوں کے رسیا تھے اور وہ کتابوں کو نہایت سلیقے اور حفاظت کے ساتھ رکھتے تھے۔ اس سے کتابوں کے متعلق ان کی محبت کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنا زیادہ تر وقت کتب بینی میں صرف کرتے اور والد کی ناراضگی کے سبب راتیں لحاف میں منہ ڈالے چراغ کی روشنی میں چوری چھپے مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔

کتابیں وقت گزاری کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ اس کی بہترین مثال اس وقت نظر آتی ہے جب آپ کو کوئی سفر درپیش ہوتا ہے۔ ریلوے اور بس اسٹیشنوں پر کتابوں کے مال اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ تنہا سفر تنہا شخص کے لیے ایک بہترین رفیق ہونے کا حق صرف کتاب ہی کو حاصل ہے۔ اسی کتاب کے ذریعے آپ دوسروں کی توجہ اور نگاہوں کا مرکز بھی بن سکتے ہیں۔ اگر آپ کو اس کا تجربہ کرنا ہو تو کوئی خوبصورت سرورق والا رسالہ یا فلمی میگزین خرید کر ٹرین یا بس میں سوار ہو جائیے، تمام لوگوں کی نگاہیں آپ اور آپ کے رسالے پر ہوں گی۔ جو وقت آپ کا آسانی سے کٹ جائے گا وہی دوسروں پر گراں گزرے گا۔ ادھر آپ نے رسالہ رکھا نہیں کہ کئی ہاتھ آپ کی طرف بڑھیں گے۔ کیا یہ اس بات کی گواہی نہیں کہ کتاب وقت گزاری کے لیے ایک بہترین ساتھی ہے۔

کتب بینی کا شوق صرف وقت گزاری کے لیے ہو تو وہ ہمارے لیے مفید نہیں ہو سکتا۔ سائنس کی ہر شاخ، تاریخ کا ہر زمانہ، فلسفہ اور منطق، علم نجوم، غرض یہ کہ ہر علم کا خزانہ ہمیں کتابوں سے حاصل ہو سکتا ہے۔ کتب بینی کا سلسلہ جاری رکھنے سے انسانی معلومات میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ وہ شخص جس کو کتب بینی کا بڑا چسکا لگا رہتا ہے، زندگی بھر ہر روز تھوڑا بہت مطالعہ کیے جاتا ہے۔ لیکن اگر ہم اپنے بچوں پر نظر ڈالیں تو ہمیں مایوسی ہوگی۔ ان کا زیادہ تر رجحان کھیل کود کی طرف ہوتا جا رہا ہے اور مطالعہ کا شوق دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا ثبوت ہے بچوں کے رسائل کا فقدان۔ اردو کے ان رسائل کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے جو بچوں کے لیے دلچسپ معلومات فراہم کرتی ہوں۔ ان کے بجائے انگریزی میں بچوں کے رسائل میں سر فہرست ہیں کامکس۔ کامکس میں مختلف کہانیوں کو تصویروں کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے۔ بچے ان تصاویر کی وجہ سے انھیں بہت زیادہ دلچسپی سے پڑھتے ہیں اور گھنٹوں ان میں منہمک رہتے ہیں۔ ان کامکس کے ذریعے سائنسی معلومات، جغرافیائی معلومات، تاریخی معلومات اور ایسی بہت سی معلومات دی جا سکتی ہیں۔ اور اب تو شیکسپیئر کے ڈراموں کو بھی کامکس کے ذریعے پڑھایا جا رہا ہے۔

کامکس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کی وجہ سے بہت سے ادارے اب صرف روپیہ جوڑنے کی خاطر انھیں شائع کر رہے ہیں۔ آج کل شائع ہونے والے کامکس میں زیادہ تر فوق البشر ہستیوں کے قصے اور مار دھاڑ کی کہانیاں ہوتی ہیں اس سے بچوں پر غلط اثرات پڑنے کا بھی خدشہ ہے۔

بات ہو رہی تھی اردو میں بچوں کے رسائل اور مطالعہ کے فقدان کی۔ اس لیے کامکس کی بات درمیان میں آ گئی کہ اگر اردو میں بھی اس طرح کی کوشش کی جائے تو ہمارے بچوں میں مطالعہ کا شوق بڑھ سکتا ہے۔ مطالعہ کی کمی کی وجہ سے ہمارے بچے صرف کورس کی کتابوں تک ہی محدود ہو کر رہ گئے ہیں اور نصابی کتب سے بھی ان کو کتنی دلچسپی ہے یہ سبھی جانتے ہیں۔ ان کا علم محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ جملے باز تو ہوتے ہیں لیکن جملہ ساز نہیں۔ مطالعہ کی کمی کی وجہ سے بہتات ایسے بچوں کی ہے جو صحیح جملہ بھی نہیں بنا سکتے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان میں مطالعہ کا شوق پیدا کیا جائے۔ اور میرے خیال میں کامکس اس کا بہترین ذریعہ ہو سکتے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ عوام کو کتب خانوں کی اہمیت و افادیت سے بھی آگاہ کیا جائے۔ پبلک کتب خانے تعلیم کی ترقی میں بہت زیادہ حصہ لیتے ہیں۔ لیکن اگر ہم اپنے اردگرد نظر ڈالیں تو کتب خانوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہوگی جن کے نام سے صرف گھٹیا قسم کے ناول اور کتابیں جاری کی جاتی ہیں۔ ادبی کتابوں کا شوق دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔ اچھی کتابیں ہی ایک اچھا انسان بنا سکتی ہیں۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ایسی کتابوں سے پرہیز کریں جن سے ہمارے خیالات و افکار پر برے اثرات پڑتے ہوں۔

غرضیکہ کتب بینی نہ صرف ایک دلچسپ مشغلہ ہے بلکہ اس میں بے شمار فائدے ہیں۔ کیونکہ کتاب ہی ایک ایسا چلتا پھرتا باغ ہے جسے آستین میں رکھا جا سکتا ہے اور وہی ایسی سرسبز سیرگاہ ہے جو انسان کے ساتھ جہاں چاہے جا سکتی ہے۔ کتاب مُردوں کی زبان ہے اور زندوں کی آواز۔ صبح و شام کے وقت آپ سے ملنے والا ایک ایسا دوست ہے جو اس وقت تک نہیں سوتا جب تک آپ خود نہ سو جائیں، اور ہمیشہ وہی بات کرتا ہے جس سے آپ کو خوشی ہوتی ہے۔ کبھی آپ کا راز فاش نہیں کرتا۔ وہ انتہا درجے کا وفادار ہمسایہ ہے، معقول دوست ہے، فرمانبردار ساتھی، سفر میں آپ کا بہترین رفیق، منکسر المزاج پروفیسر ہے، ایک ماہر و مفید انسان جو نہ کبھی کسی معاملے میں بحث کرتا ہے اور نہ اپنے مالک سے اکتاتا ہے۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

...دی سہولتیں

توانائی اور ٹرانسپورٹ پر مشتمل بنیادی
...ت کے بڑے بڑے شعبوں کی کارگذاری
۱۹۸۴ء میں عام طور پر اچھی رہی اور
...ے عام طور پر صنعتی ترقی میں اضافے میں
... خام تیل کی پیداوار ۱۹۸۳-۸۴ء
...کروڑ ۶۰ لاکھ ٹن اناج تک پہونچ گئی تھی
...وال میں اس کے ۱۵ کروڑ ۶۰ لاکھ ٹن
...ہونچ جانے کی توقع ہے۔ بجلی کی پیداوار
...لمنے کی شرح ۱۹۸۲-۸۳ میں کم ہوکر
...فی صد رہ گئی تھی لیکن ۱۹۸۳-۸۴ میں
... قدرے بہتری آئی اور شرح ترقی ۷٫۶
ہوگئی۔ چالو مالی سال میں بجلی کی پیداوار
...یل سے دسمبر ۱۹۸۴ کے پہلے نو ماہ میں
...تہ برس کی اس مدت کے مقابلے میں
...فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ تاہم جائزے
... کیا گیا ہے کہ بجلی کی پیداواری صلاحیت
...مافہ کی رفتار سست ہوگئی ہے۔
...وئلے کی پیداوار ۱۹۸۳-۸۴ میں ۵٫۸
...رفتار سے بڑھی تھی۔ اس میں بھی تیزی
... حالانکہ چالو مالی سال میں ترقی کی رفتار
...ر کے نشانے سے کم رہے گی۔ چالو مالی
... مال کی نقل و حمل کے سلسلے میں ریلوں
...رگاہوں کی کارگردگی میں بہتری ہوئی ہے۔

... پیداوار

...جائزے میں کہا گیا ہے کہ صنعتی پیداوار
...کی شرح چالو مالی سال میں ۷ فیصد
...کی توقع ہے جو ۱۹۸۳-۸۴ میں ۵٫۵
...ر ۱۹۸۲-۸۳ میں ۳٫۹ فی صد تھی۔
...ب سے منصوبے کی مدت میں صنعت
...ترقی کی اوسط تقریباً ۷ فی صد سالانہ
... جو گذشتہ پانچ برس کی ۵٫۳ فیصد
...اسے قدرے بہتر ہے۔

جائزے میں زور دیا گیا ہے کہ اگر معیشت کو ۵ فیصد کی شرح سے آگے بڑھتے رہنا ہے اور اگر روز افزوں محنت کشوں کی تعداد کو روزگار مہیا کرنا ہے تو صنعتوں کی رفتار ترقی کو تیز کرنا ہوگا۔

جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ گذشتہ کچھ برسوں میں حکومت نے ضابطوں کو بہتر اور صنعتی پالیسی کو آزاد بنانے کے لیے کئی اقدام کئے ہیں تاکہ صنعت کو اپنی صلاحیت کو بہتر بنانے اور پیداواری توسیع کرنے کے لیے ترغیب عمل دی جاسکے۔ اسی مہم کے سلسلے میں نومبر ۱۹۸۴ء میں ایک نئی کمپیوٹر پالیسی کا اعلان کیا گیا جس کے تحت کمپیوٹر سازی کے لیے لائسنس دینے کا طریقہ کار آسان کر دیا گیا ہے۔

مالی پالیسی

۱۹۸۴-۸۵ میں مالی پالیسی نے چھٹے منصوبہ کے نشانوں کو پورا کرنے کی غرض سے منصوبے کے اخراجات کے لیے بڑی رقمیں فراہم کرنے کی ضرورت اور قیمتوں کو بڑھنے سے روکنے کی ضرورت کے درمیان (جو سال کے پہلے نصف میں بڑھتی رہیں) ایک مشکل توازن قائم رکھنے کی کوشش کی۔ ۱۹۸۴-۸۵ء کے بجٹ میں گزشتہ سال کے بجٹ کے تخمینوں کے مقابلے میں مرکزی منصوبے کے اخراجات میں پچیس فی صد کا اضافہ کرنے کی تجویز رکھی گئی تھی۔ کسٹم محصولات بڑھائے گئے تھے لیکن انکم ٹیکسوں کی شرحوں میں کافی کمی کرکے انکم ٹیکس ادا کرنے والوں کو کافی راحت دی گئی تھی۔ بچتوں اور سرمایہ کاری کے لیے مالی ترغیبات کو مزید مستحکم کیا گیا تھا۔ یہ اس سے پہلے کے دو برسوں میں کئے گئے ایسے ہی اقدامات کا سلسلہ تھا۔ پیداوار کو فروغ دینے کے لیے کپڑے اور کاغذ کی صنعتوں کو بالواسطہ ٹیکس میں خصوصی راحت دی گئی تھی۔

اس جائزے میں ۱۹۸۴-۸۵ کے دوران مرکزی بجٹ پر مختلف دباؤں کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ مذکورہ سال کے دوران ریاستوں کے بجٹوں پر بھی شدید دباؤ ہیں۔ ۱۹۸۴-۸۵ میں مالی پالیسی گزشتہ سال میں سکہ کی فراہمی اور ریزرو سکہ میں اضافہ کی اعلیٰ شرح کے پس منظر میں تیار کی گئی تھی۔

ادائیگیوں کا توازن

اس جائزے کے مطابق ملک کی ادائیگیوں کے توازن میں، جس میں ۱۹۸۳-۸۴ میں قابلِ ذکر بہتری آئی تھی، موجودہ سال میں مزید بہتری آئی ہے۔

حکومت نے بین الاقوامی مالی فنڈ کے ساتھ انتظام کے تحت دستیاب پانچ ارب ایس۔ ڈی۔ آر (SDR) میں سے صرف ۳٫۹ ارب ایس ڈی آر نکال کر یکم مئی ۱۹۸۴ء کو مذکورہ بندوبست کو رضاکارانہ طور پر ختم کر دیا۔ موجودہ سال میں بین الاقوامی مالی فنڈ سے ملنے والی رقم بند ہوجانے کے باوجود غیر ملکی زرمبادلہ کے ریزرو میں (جن میں سونا اور ایس ڈی آر شامل ہیں) جنوری ۱۹۸۵ کے اختتام تک تقریباً ۷۴۵ کروڑ روپے کا اضافہ ہوا تھا۔ یہ اضافہ جزوی طور پر امریکی ڈالر کی قیمت میں نمایاں اضافے کی وجہ سے ہوا۔

۱۹۸۴-۸۵ کے پہلے آٹھ مہینوں میں تجارتی خسارے کا تخمینہ ۳۰۱۷ کروڑ روپے لگایا گیا ہے جو ۱۹۸۳-۸۴ میں اسی مدت کے دوران ۳۰۸۰ کروڑ روپے کے خسارے سے ذرا کم ہے۔ جائزے میں بتایا گیا ہے کہ ملک کی مجموعی آمدنی کی فیصد کے طور پر تجارتی خسارہ جو ۱۹۸۰-۸۱ میں ۴٫۶ فیصد تھا کم ہوکر ۱۹۸۳-۸۴ میں تین فیصد ہوگیا اور ۱۹۸۴-۸۵ میں اس کے مزید کم ہونے کی توقع ہے۔ جائزے میں مزید بتایا گیا ہے کہ ادائیگیوں کے توازن

(باقی صفحہ پر)

Regd. No. D(DN) 985
R N. 37032/81
VOL-5, NO 1 YOJANA (URDU) 1-15th April 1985
Licensed U(DN) to post without pre-payment at Civil Lines Post Office, Delhi-110 054.

۱۹۸۵–۸۶ کا منصوبہ جاتی بجٹ

۸۶ - ۱۹۸۵ء کے مرکزی منصوبہ جاتی بجٹ میں ۱۸۵۰۰ کروڑ روپے کے اخراجات رکھے گئے ہیں۔ اس میں سے ۱۱۸۴۷ کروڑ روپے مرکزی منصوبے کی بجٹ امداد کے لیے ہوں گے جبکہ ۶۶۵۳ کروڑ روپے مرکزی منصوبے میں اضافی بجٹ وسائل کی صورت میں ہوں گے۔

ریاستی منصوبوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے لیے مرکزی امداد ۶۶۲۲ کروڑ روپے ہوگی۔

درج ذیل گوشوارے سے ۸۵ - ۱۹۸۴ء اور ۸۶ - ۱۹۸۵ء کے تقابلی اعداد و شمار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

کروڑ روپوں میں

	بجٹ ۸۵–۱۹۸۴	بجٹ ۸۶–۱۹۸۵
۱۔ مرکزی منصوبے کے لیے بجٹ امداد	۱۱۴۲۰	۱۱۸۴۷
۲۔ ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے منصوبوں کے لیے مرکزی امداد	۵۰۵۰	۶۶۲۲
۳۔ بجٹ میں منصوبے کے لیے مجموعی رقم	۱۶۴۷۰	۱۸۵۰۹
۴۔ مرکزی منصوبے کے لیے اضافی بجٹ	۵۹۳۱	۶۶۵۳
۵۔ منصوبے کے مجموعی مرکزی مصارف (۱+۴)	۱۷۳۵۱	۱۸۵۰۰

۸۶ - ۱۹۸۵ء کے بجٹ کی چند دیگر اہم تجاویز درج ذیل ہیں:

- فصلوں کے بیمے کی جامع اسکیم شروع۔
- غریب ترین افراد کے لیے سماجی تحفظ کی اسکیم۔
- دیہی بے زمین افراد کے واسطے روزگار ضمانتی پروگرام کے تحت پراجیکٹوں کے لیے ۴۰۰ کروڑ روپیہ۔
- تیز تر صنعتی پیداوار کے لیے متعدد اقدامات۔
- چھوٹے پیمانے کے حلقے کے لیے سرمایہ کاری کی حد میں اضافہ۔
- صنعتی مزدوروں کے لیے متعدد اقدامات۔
- بونس کی حد بڑھا کر ۱۶۰۰ روپے کردی گئی۔
- پنشن پانے والوں کو مزید راحتیں۔
- ریاستی منصوبوں کے لیے مرکزی امداد میں ۳۹ فی صد کا اضافہ۔
- خاندانی بہبود اور تعلیم کے لیے زیادہ رقم۔
- انکم ٹیکس کی چھوٹ کی حد بڑھا کر اٹھارہ ہزار روپے کردی گئی۔
- غیر کارپوریٹ انکم ٹیکس کے دہندوں کے لیے سرچارج ختم۔
- انکم ٹیکس کی زیادہ سے زیادہ شرح گھٹا کر ۵۰ فی صد کردی گئی۔
- لازمی ڈیپازٹ اسکیم ختم۔
- ٹیکس چوری کرنے والوں پر مقدمہ چلانے کے لیے خاص عدالتوں کے قیام کی تحریک۔
- خام پیٹرول پر کسٹم ڈیوٹی میں اضافہ۔
- کمپیوٹروں، چھوٹے سائز کے بلیک اور وہائٹ ٹی۔ وی کی قیمتوں میں کمی۔
- ایک سو چیزیں مخصوص ایکسائز ڈیوٹی سے مستثنیٰ۔
- بیڑی، پان مصالحہ اور سوڈا واٹر کی قیمتوں میں اضافہ۔
- چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور بڑی صنعتوں کے لیے رعائتیں۔
- ریڈیو، ٹیلی ویژن سیٹوں کے لیے لائسنس ختم۔
- بین الاقوامی انعام جیتنے والے کھلاڑیوں کے لیے رعائتیں۔
- ۳۳۴۹ کروڑ روپے کا خسارہ چھوڑ دیا گیا۔

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi 110001

یوجنا

۱۶ تا ۳۰ اپریل ۱۹۸۵ء

ایک روپیہ

ریڈیو پر زرعی تعلیمی نصاب

(ڈاکٹر اے ڈبلیو سوہونی)

روزگار اور ڈگریاں

(ایم۔ ایل کپور)

یونس صدیقی

۱۹۸۵-۸۶ کا سالانہ منصوبہ

۸۶-۱۹۸۵ء کے مرکزی منصوبے کے لیے ۱۸۵۰۰ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔ جب کہ ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۱۵۱۷۳ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی تھی۔ اس سال پچھلے سال کے مقابلے ۶ء۶ فی صد رقم زیادہ رکھی گئی ہے۔

ریاستی منصوبوں کے لیے مرکزی امداد سال زیر تبصرہ میں بڑھا کر ۶ ہزار کروڑ روپے کی جا رہی ہے۔ جب کہ گزشتہ برس یہ ۴۳۱۳ کروڑ روپے تھی۔ پچھلے سال اس مد کے لئے جو رقم رکھی گئی تھی، وہ ایک سال قبل کے مقابلے ۱۳ فی صد زیادہ تھی مگر اس سال اس میں یہ اضافہ ۳۹ فی صد ہے۔

ریاستوں کو منڈیوں سے قرض لینے کے معاملے میں یہ اجازت دی گئی ہے کہ پہلے کے مقابلے زیادہ رقم لے سکیں اور یہ حد ۱۶۰۰ کروڑ روپے تک کر دی گئی ہے جو ۸۵-۱۹۸۴ء کے مقابلے ۲۰ فی صد زیادہ ہے۔ ریاستیں وسائل کو حرکت میں لانے اور انہیں بڑھانے کے لیے کیا کوششیں کریں گی، اس بارے میں مکمل اطلاع اس وقت فراہم ہو سکے گی جب کہ ان کے ریاستی منصوبے حتمی شکل پا جائیں گے۔

مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے مصارف

مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے لیے منصوبے کے اخراجات ۶۳۹ کروڑ ۵۶ لاکھ روپے رکھے گئے ہیں جب کہ ۸۵-۱۹۸۴ء میں یہ ۵۵۸ کروڑ روپے تھے۔ اس میں ۶۱ کروڑ ۵۶ لاکھ روپے کی وہ فاضل رقم بھی شامل ہے جو کہ مرکز کے زیر انتظام علاقے از خود فراہم کریں گے۔

۸۶-۱۹۸۵ء کے دوران ان پراجیکٹوں کی تکمیل پر زور دیا جائے گا۔ جو پہلے سے چلے آ رہے ہیں۔ نئے پراجیکٹوں کے شروع کرنے کے مقابلے اس کام کو ترجیح دی جائے گی۔

دیہی ترقی، زراعت اور تعلیم

مرکزی منصوبے میں زراعت، زرعی تحقیق اور تعلیم کے لیے ۷۹۰ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں تاکہ ریاستوں کی بحیثیت مجموعی کوششوں کو آگے بڑھایا جا سکے۔ اس کے علاوہ ۱۶۵ کروڑ روپے سے بمبئی ہائی گیس پر مبنی فرٹیلائزر پلانٹ کھولے جائیں گے۔ جو کہ گونا اور اونیا میں واقع ہوں گے۔

دیہی ترقی کے لیے ۹۳۲ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ دیہات میں بے زمین افراد کے لئے روزگار کی ضمانت کے پروگرام کے تحت ۸۰۰ کروڑ روپے اس سلسلے کے مختلف پراجیکٹوں کے لئے رکھے گئے ہیں۔

خاندانی بہبود

خاندانی بہبود کے پروگرام کے لئے ۵۰۰ کروڑ روپے کے اخراجات رکھے گئے ہیں۔ دیہات میں پینے کے پانی کی فراہمی کے لئے چھٹے منصوبے میں ۹۲۵ کروڑ روپے رکھے گئے جب کہ منصوبے کے شروع میں اس مد پر صرف ۶۰۰ کروڑ روپے خرچ کرنے کا نشانہ تھا۔ اس کی وجہ سے چھٹے منصوبے میں ۲ لاکھ ایسے دیہات میں پانی پہنچایا گیا جہاں پانی کی فراہمی ایک مسئلہ تھی۔

سائینس اور ٹکنالوجی

سائینس اور ٹکنالوجی کے تحت جدید کاری اور ترقیاتی پروگراموں کو آگے بڑھانے پر ۱۰۶۸ کروڑ روپے کے اخراجات کا اندازہ ہے۔ یہ رقم سائینس اور ٹکنالوجی کی وزارت، ماحولیات، ایٹمی انرجی، خلا، بحری ترقی اور الیکٹرانکس کی وزارتوں کے لئے فراہم کر دی گئی ہے۔

انرجی کا شعبہ

بجلی کے محکمے کو دو ہزار کروڑ روپے کے مصارف بہم پہنچائے گئے ہیں۔ جب کہ ۸۵-۱۹۸۴ء کے دوران ۱۴۴۶ کروڑ روپے کے مصارف رکھے گئے تھے۔

انرجی کے شعبے میں تیل پر انحصار کم کر کے کوئلے اور بجلی کی طرف بڑھنے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ چھٹے منصوبے کے آخر تک بجلی تیار کرنے کی فاضل کی صلاحیت ۱۴ ہزار میگاواٹ ہو جائے گی۔ منصوبے کے شروع میں بجلی تیار کرنے کی جس قدر صلاحیت تھی، یہ اس میں ۵۰ فی صد اضافہ ظاہر کرتی ہے۔

کوئلے کے محکمے کو ۱۱۰۲ کروڑ روپے دیئے گئے ہیں تاکہ کوئلے کی پیداوار ۸۵-۱۹۸۴ء کی ۱۴۷ء۵ ملین ٹن سے بڑھ کر ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۱۵۸ء۵۰ ملین ٹن ہو جائے۔

۸۶-۱۹۸۵ء میں پٹرولیم کے محکمے کے لئے ۳۲۶۱ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔ ۸۵-۱۹۸۴ء میں خام تیل کی پیداوار بڑھ کر ۲۹ء۴ ملین ٹن ہو گئی جب کہ ۸۱-۱۹۸۰ء میں گویا کہ چھٹے منصوبے کے آغاز میں یہ ۱۱ء۳۴ ملین ٹن تھی۔ حال ہی میں گیس اتھارٹی آف انڈیا قائم کی گئی ہے اور اسے ۱۰۰۰ کروڑ روپے کے مصارف کی منظوری دی گئی ہے۔ جنگلات کے محکمے اور جنگلی جانوروں کی زندگی کے تحفظ کے لئے ۱۴۵ کروڑ روپے دیئے گئے ہیں۔

(باقی کور ۳ پر)

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر :- آر۔ ٹھکرال
ایڈیٹر :- لکھی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر :- محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر :- وسیم حیدر

جلد: ۵	۱۶ تا ۳۰ اپریل ۱۹۸۵	شمارہ ۲
۲۷ چیتر تا ۱۰ بیساکھ، ۱۹۰۷		

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے۔ ۲ سالہ ۳۵ روپے۔ سہ سالہ ۵۰ روپے
فی کاپی :- ایک روپیہ

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت

اس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

بزنس منیجر : ایل۔ آر۔ بترہ ★ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس۔ منچال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :-
ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین) نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

ترسیل زر کا پتہ : بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

ساتویں منصوبے میں دیہی ترقی اور غریبی سے نجات

چھٹا منصوبہ ختم ہو رہا ہے اور ساتواں منصوبہ شروع ہونے والا ہے۔ اس میں غریبی دور کرنے کے پروگراموں کو خصوصی ترجیح دی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لیے سرمایہ کاری بڑھائی جائے گی اور اسے ہر شعبے کے ترقیاتی پروگراموں سے مربوط کیا جائے گا۔ اس عرصے میں ایسے پروگراموں کو خصوصی ترجیح دی جائے گی۔ جو اقتصادی طور پر مضبوط ہوں اور جن کا نظم و نسق دسترس سے باہر نہ ہو بلکہ جن کو مقامی طور پر آسانی سے چلایا جا سکے اور جن کے لیے مقامی طور پر زیادہ سے زیادہ وسائل حاصل ہو سکیں۔ دیہات کی مربوط ترقی کے پروگرام اور دیہات میں روزگار کی فراہمی کے قومی پروگرام کا دائرہ کار اور وسیع کیا جائے گا۔ تاکہ ان کے تحت وہ لوگ حقیقی طور پر فائدہ اٹھا سکیں جو غریبی کے خط سے نیچے ہیں۔ اور جن کو خط افلاس سے اوپر اٹھانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ غریبی دور کرنے کے پروگرام اور دیہی ترقی کے پروگرام دراصل ایک ہی مسئلے کے دو رخ ہیں۔ زرعی پیداوار بڑھانے کی کوشش ہوں۔ پسماندہ علاقوں کو تیزی سے آگے لے جانے کے اقدامات ہوں، زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں کی کاشت ہو، بارانی کھیتی کے علاقے میں ترقیاتی پروگرام ہوں، آبرسانی کی سہولتوں میں اضافہ ہو۔ کیمیاوی کھادوں کی فراہمی ہو، جراثیم کش دواؤں کی فراہمی ہو، چھوٹے کسانوں کی آمدنی بڑھانے کے لیے ضروری اقدامات ہوں، ان سب کا تعلق غریبی دور کرنے سے ہی ہے۔ اس سلسلے میں اصلاحات اراضی کے تحت اراضی کی از سر نو تقسیم ضروری ہے تاکہ بے زمین کسانوں کے لیے بھی زمین فراہم ہو سکے۔ اسی طرح لگان داری کے تحفظی اقدامات بھی ضروری ہیں۔ ان اقدامات کے ذریعے غریب کسانوں کی آمدنی کو ایک کم سے کم سطح تک یقینی بنا دینے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور اہم ضرورت ہے کہ بنکوں کے ذریعے قرضوں کی فراہمی کو زیادہ مؤثر انداز میں بروئے کار لایا جائے۔ اس سے دیہات کے ان لوگوں کو فائدہ پہنچانے پر زور دیا جانا ضروری ہے جو کہ حقیقتاً غریب ہیں۔ اور جن کو نفع پہنچانا اس اسکیم کا اصل مدعا ہے۔ اس لئے علاقائی دیہی بنکوں اور کسانوں کی امداد کے لیے قائم دیگر مالیاتی اداروں کے کام کو از سر نو نئی سمتیں دینے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں طریق کار کو اتنا سہل بنانا ضروری ہے جس سے دیہات کے ناخواندہ افراد بآسانی فائدہ اٹھا سکیں۔ اس کے لیے جہاں ضروری ہو وہاں سود کی شرحوں اور دیہی ترقی کے لیے قرض اور سبسڈی کے معیارات میں ضروری تبدیلیاں لائی جا سکتی ہے۔

دیہی علاقوں میں محنت کش طبقے کی نصف تعداد کے لگ بھگ عورتیں ہیں۔ ان کی ضرورتوں اور حالات کو سامنے رکھ کر خصوصی اقدامات درکار ہیں۔ ان کے لیے تربیت کی سہولتیں، اور ضروری وسائل مہیا کئے جانے ہیں۔ تاکہ وہ اقتصادی سرگرمیوں میں جی کھول کر حصہ لے سکیں اور اپنے گھر کی آمدنی بڑھا سکیں۔ اس سلسلے میں مناسب طریق کار اور دیگر معاون سہولتوں کو فراہم کرنا ضروری ہے۔ اس طرح سے وہ ملک کی پیداوار میں معاون اور کارآمد انسانوں کے اصل دھارے میں شریک ہو سکیں گی۔ ہمارا ملک وسیع و عریض ہے۔ یہ بہت سی ریاستوں پر مشتمل ہے، یہاں ہر ریاست میں غریبی کی سطح مختلف ہے۔ لہٰذا ترقیاتی پروگراموں اور غریبی دور کرنے کے پروگراموں کے لیے وسائل کو مختص کرتے وقت اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ علاقے ایسے ہیں جو جغرافیائی اعتبار سے اور آب و ہوا کے لحاظ سے نقصان میں ہیں۔ وہ اکثر خشک سالی کی زد میں آیا کرتے ہیں یا پھر وہ ریگستانی علاقے ہیں، لہٰذا ہر علاقے کی اپنی ضروریات اور حالات کے مطابق ہی پروگرام وضع کرنے ہوں گے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ملک کے غریب عوام کو روزمرہ کی اشیائے ضروری کی فراہمی یقینی بن سکے۔ تو اس کی پیداوار اور تیاری میں اضافہ ضروری ہے۔ بہت سا سامان دیہات میں چھوٹے پیمانے کے صنعتی سیکٹر میں تیار کیا جانا چاہیئے۔ صحیح پالیسی کی ترتیب و تشکیل میں یہ پہلو سامنے رکھنا بہت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی سرکاری دکانوں کے ذریعے ضروری اشیاء کی تقسیم کے نظام کا استحکام از بس ضروری ہے۔ پیداواری وسائل اور اثاثہ جات کا مناسب استعمال اکثر ان کی بروقت فراہمی کے نہ ہونے کے سبب رک جاتا ہے۔ دیہی سطح سے لے کر ضلع کی سطح تک کا انتظامیہ اس فراہمی کو یقینی بنا سکتا ہے چنانچہ مناسب تربیت اور مقامی انتظامیہ کو ضروری اطلاعات فراہم کر کے اس کمی کو دور کیا جا سکتا ہے۔ خاص کر بلاک اور ضلع کی سطح کے انتظامیہ کے لیے یہ تربیت بہت ضروری ہے۔ دیہی ترقی کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ وہاں کی بہت سی روایتی ہنرمندیوں پر اور ان کو آگے بڑھانے پر خصوصی توجہ نہیں دی جا سکی ہے۔ عوامی سطح پر ان قدمات کی مانگ بھی ہے اور ان کی اہمیت بڑی حد تک محسوس کی گئی ہے۔ مثلاً لوہار، سنار، موچی، کمہار، بڑھئی، دائی اور وید وغیرہ۔ اس سے دیہات میں پیشہ ورانہ ڈھانچہ پوری طرح متاثر ہوا ہے۔ اس عدم توجہی نے دیہات اور شہروں کی آبادی کے درمیان فرق کو بھی بڑھا دیا ہے۔ ان تمام پیشوں کو پوری طرح ترقی دینی ہے۔ اس کام کو انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹس، پولی ٹکنیک اداروں، اور نئے تربیتی اداروں کے استحکام کے ذریعے انجام دیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے دیہی نوجوانوں کی تربیتی اسکیم کو جسے ٹرائی سم کے نام سے پکارا جاتا ہے مستحکم کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

غریبی دور کرنے کے پروگرام خواہ وہ دیہی علاقوں میں ہوں یا شہری علاقوں میں بنیادی اشیاء کی فراہمی کے متعدد پروگراموں کے بغیر نامکمل رہیں گے۔ صحت، صفائی، تغذیہ بخش خوراک، تعلیم، پینے کے صاف پانی کی فراہمی، تعمیر مکانات وغیرہ جیسی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اس سلسلے میں جن پروگراموں کو شروع کیا جا چکا ہے، ان کی رفتار ترقی جانچنے کے لیے بھی ایک نظام کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ان اسکیموں سے فائدہ انہیں کو پہنچنا چاہیئے جن کے لیے وہ وضع کی گئی ہیں۔ اگر ان پروگراموں پر صحیح ڈھنگ سے عمل درآمد نہ کیا گیا۔ اور ان کا فائدہ ان لوگوں تک نہ پہنچ سکا، جن کو فائدہ پہنچانا مقصود ہے، تو اصل مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ اس کام میں رضاکار ادارے ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ ان کے تعاون سے ضروری اشیاء ملک کے غریب عوام تک پہنچ کر ان کا معیار زندگی اوپر اٹھایا جا سکتا ہے۔ مزید برآں نشر و اشاعت کے ادارے اس سلسلے میں عوام کے شعور کو بیدار کرنے کی ذمہ داری کو نبھا سکتے ہیں۔ ان کے ذریعے ملک کے غریب عوام کو غیر رسمی تعلیم مل سکتی ہے۔

ایڈیٹر

سید اطہر رضا بلگرامی

ہندوستان کی زرعی ترقی کا نیا دور

سبز انقلاب

"اِنقلاب" سیاسی میدان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی مکمل تبدیلی کے یا "کایا پلٹ" کے ہیں۔ جب کسی طے شدہ مقصد کے حصول کے لیے متحد و منظم لگن کے ساتھ جد و جہد کی جاتی ہے تو ایسی سرگرم عمل کارروائیوں کو انقلاب کا نام دے دیا جاتا ہے۔ اب اس حربہ کو محض سیاسی میدان تک محدود نہیں رکھا گیا ہے بلکہ اقتصادیات کے میدان میں بھی سیاست سے زیادہ پائیدار کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جارہا ہے۔ اس کی پہلی مثال فرانس میں "صنعتی انقلاب" کی شکل میں ملتی ہے۔ اور پھر دوسری جنگِ عظیم کے بعد تباہ شدہ معیشتوں کی تعمیرِ نو کی شکل میں ملی۔ آج ہر ترقی یافتہ و ترقی پذیر ملک اس کا سہارا لے کر زراعت، صنعت و حرفت، تجارت اور رسل و رسائل کے میدانوں میں نمایاں کامیابی حاصل کر رہے ہیں۔

سبز انقلاب کا پس منظر

ہندوستان کا زرعی انقلاب جس کو عرفِ عام میں "سبز انقلاب" کہا جاتا ہے اپنی ایک چھوٹی سی تاریخ رکھتا ہے۔ ہندوستان کا دوسرا پانچ سالہ منصوبہ مزاج، سمت اور سائز کے اعتبار سے صنعتی تھا، جس میں بنیادی و بھاری صنعتوں کو خصوصی توجہ کے ساتھ ترجیح دی گئی۔ نتیجتاً ایسی صنعتوں پر بھاری سرمایہ کے لگنے کی بدولت فوری طور پر آمدنی و روزگار میں اضافہ ہوا جس کے نتیجے میں مجموعی مانگ میں بھی اُسی قدر اضافہ ہوا۔ دوسری طرف بڑھتی ہوئی آبادی نے بھی اس بڑھتی ہوئی مانگ کو اور شہ دی۔ اس طرح ملک کو فوری طور پر تیزی سے بڑھتی ہوئی مانگ کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ مانگ دو رُخ سے بڑھ رہی تھی۔ اوّل روزگار و آمدنی کی شکل میں اور دوسری آبادی کی شکل میں۔ اس بڑھتی ہوئی طلب کی تسکین کے لیے پیداوار کیا تھی۔ لوہے اور اسپات کے کارخانے، مشینوں کو ڈھالنے کی صنعتیں، بجلی پیدا کرنے والے جنریٹرز، ڈیم، کھاد کے کارخانے جن کی ابھی ابتدا ہوئی تھی اور جن کو اپنی پیداوار شروع کرنے کے لیے بھی کافی عرصہ درکار تھا۔ وہ بڑھتی ہوئی بنیادی اشیاء کی مانگ کو تو پورا نہیں کر سکتے تھے۔ ان صنعتوں پر لگا ہوا سرمایہ آمدنی و روزگار کو تو بڑھا سکتا تھا لیکن اُن کے ذریعے بڑھی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کا اہل نہ تھا۔ یہ تو صرف زراعت کا ہی دم خم ہے جو ایسی صورت حال میں ایک مضبوط و مستحکم سہارے کی شکل میں کام آتا ہے اور مستقبل کی پائیداری کی ضمانت بنتا ہے۔ لیکن چوں کہ زراعت کو نظر انداز کیا گیا تھا اس لیے یہ احساس ہو گیا کہ جب تک زراعت ایک مضبوط سہارا نہیں بنے گا، اس مزاج کے منصوبے بری طرح ناکامیاب ہوں گے اور مستقبل کا ہندوستان ایک مضبوط معیشت کے بجائے ناپائیدار معیشت کا آئینہ دار ہوگا جہاں آسودگی، خوشحالی اور بہتر معیارِ زندگی کے بجائے غربت، افراطِ زر کا دباؤ، عدم توازن و نابرابری اپنی انتہا پر پہنچ چکی ہوگی۔

دوسرے منصوبے میں، زراعت نے مایوس کیا اور ماہرین نے خطرہ کی بو سونگھ لی۔ بس اسی خطرہ کے پیشِ نظر دوسرے منصوبہ کے آخری سال میں فورڈ فاؤنڈیشن کے ماہرین کو دعوت دی گئی کہ وہ یہاں کی زرعی پیداوار و پیداواری صلاحیتوں کو بڑھانے میں تجاویز دیں۔ اپریل ۱۹۵۹ کو اس ٹیم نے اپنی رپورٹ داخل کردی جس کا عنوان تھا "ہندوستان کا غذائی مسئلہ اور اُس کو حل کرنے کے اقدامات INDIA'S FOOD CRISIS AND STEP TO MEET IT)

اس رپورٹ میں ملک کے منتخب علاقوں میں زرعی پیداوار اور پیداواری صلاحیتوں کو بڑھانے کے لیے عمیق جد و جہد کا مشورہ دیا گیا اور اس بات پر زور دیا گیا کہ جدید ذرائع بالخصوص کھاد، بیج، اوزار، کریڈٹ اور خرید و فروخت کی سہولتوں کو مہیا کیا جائے۔ ان مشوروں کی بنیاد پر

حکومت نے سات ریاستوں کے سات اضلاع میں ترقی کے گہنے پروگرام (AN INTENSIVE DEVELOPMENT PROGRAMME) ۱۹۶۰ سے کی جس کو (INTENSIVE AREA DEVELOPMENT PROGRAMME) یا IADP کہا جاتا ہے۔ اس پروگرام کے تحت جو ضلعے چنے گئے اُن میں چند خصوصیات کا خاص خیال رکھا گیا۔ مثلاً وہاں آبپاشی کی پوری سہولت ہو، وہاں کم سے کم قدرتی تباہ کاریاں جو سیلاب، خشک سالی، زمین کے کٹاؤ یا بہاؤ کی شکل میں ہوتی ہوں، وہاں گاؤں کی سطح پر چند خاص و بنیادی اداروں کا قیام ہو اور جہاں کم سے کم مدت میں زرعی پیداوار کو بڑھانے کی پوری صلاحیتیں موجود ہوں۔ ان سات اضلاع کے نام اس طرح ہیں:۔

آندھرا پردیش سے گوداوری، بہار سے شاہ آباد، مدھیہ پردیش سے رائے پور، تامل ناڈو سے تھنجاؤر، پنجاب سے لدھیانہ، اُترپردیش سے علیگڑھ اور راجستھان سے پالی۔ ان میں اول چار اضلاع چاول کی پیداوار کے لیے، اس کے دو اضلاع گیہوں کی پیداوار کے لیے اور آخیر کا ایک باجرہ کی کاشت کے لیے چُنا گیا۔ ۱۹۶۵ء تک اس پروگرام کو کل ۳۲۵ اضلاع میں سے ۱۱۴ اضلاع تک پھیلا دیا گیا اور اس کا نام INTENSIVE AGRICULTURAL AREAS PROGRAMME) یا IAAP رکھا گیا۔

"سبز انقلاب" کے لیے ۱۹۶۰ کی دہائی کا درمیانہ دور بڑا کارآمد ثابت ہوا۔ پروفیسر نارمن بورلاگ Prof. NORMAN BORLOUG اور اُن کے ساتھیوں نے میکسیکو میں گیہوں کی ایک نئی قسم بنائی جو پیداوار کے اعتبار سے انتہائی زرخیز ثابت ہوئی۔ اس کو HIGH-YIELDING VARIETIES OF WHEAT یا "HYV" کا نام دیا گیا۔ بہت سے ملکوں نے اس کا تجربہ کیا اور ہر ملک میں یہ انتہائی موثر ثابت ہوا۔ میکسیکو میں گیہوں کی اس قسم کے بیج کے استعمال سے فی ہیکٹیر پیداوار ۵،۶ ہزار کیلو تک بڑھ گئی۔ تائیوان (TAIWAN) میں بھی کچھ اسی طرح کی کامیابی حاصل ہوئی۔ بیج کی یہ قسم بنیادی طور پر کھاد، آبپاشی کی مناسب سہولت اور کیڑے مکوڑوں سے تحفظ کی خاطر دواؤں کے استعمال چاہتی ہے۔ ہندوستان نے اپنے نئے پروگرام کے تحت یہ سہولتیں مہیا کر لی تھیں اس لیے اس کو ان نئے بیج کے استعمال میں کسی طرح کی کوئی ہچکچاہٹ نہ ہوئی۔ ۱۹۶۶ء میں خریف کی فصل پر اس کا پہلا تجربہ کیا گیا اور یہاں اس کا نام HIGH YIELDING VARIETIES PROGRAMME یا HYVP رکھا گیا۔ چونکہ یہ ایک منتخب شدہ پروگرام تھا اس لیے اس کو Package Programme کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ابتدا میں اس پروگرام کو صرف ۱،۸۹ ملین ہیکٹیر رقبے پر آزمایا گیا۔ لیکن چوتھے پانچسالہ منصوبے کی شروعات تک اس کا رقبہ بڑھ کر ۹،۲ ملین ہیکٹیر اور پھر ۸۳-۱۹۸۲ تک ۴۶،۸ ملین ہیکٹیر ہو گیا جو مجموعی کاشت کے رقبے کا تقریباً ۲۸،۵ فی صد رقبہ ہے۔ اس طرح ہندوستان کا "سبز انقلاب" دراصل دو پروگراموں کا مجموعہ ہے۔ INTENSIVE AGRICULTURAL AREA PROGRAMME (IAAP) اور دوسرا HYVP۔ ان دو پروگرام کے تحت ہندوستان کے اپنے پسماندہ زرعی سیکٹر کو زیادہ سائنٹفک اور زیادہ ٹیکنیکل بنانے کا پروگرام بنایا اور نتیجتاً پیداوار میں بے یقینی کیفیت، پست سطح، اتار چڑھاؤ کو دور کر کے استحکام، تیز رو ترقی، اور جدیدیت پیدا کر لی۔ یہی ٹھہراؤ و استحکام دوسرے سیکٹر کی تیز رو ترقی کی ضمانت بنا اور آج فخریہ ہندوستان سے اپنے آپ کو زرعی پیداوار میں نہ صرف خود کفیل سمجھتا ہے بلکہ دوسروں کی مدد کرنے کے قابل بھی، اضافوں کو جمع کرنے اور اُن کو وقت ضرورت استعمال کرنے اور زرمبادلہ کا ذریعہ بنانے کا اہل بھی۔

سبز انقلاب کے اثرات کا جائزہ

چونکہ سبز انقلاب کو منتخب فصلوں تک محدود رکھا گیا ہے اس لیے سبز انقلاب کے اثرات کا جائزہ مجموعی زرعی پیداوار اور پیداواری صلاحیتوں کے طور پر لینا غلط ہوگا۔ جن فصلوں کو چُنا گیا وہ گیہوں، چاول، جوار، باجرہ اور مکئی ہیں۔ ان فصلوں کا رقبہ، پیداوار اور پیداواری صلاحیت کا جائزہ آخر میں دیے گئے نقشہ میں دیا گیا ہے۔ اس نقشہ پر نظر ڈالنے سے جو سب سے پہلی بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان تمام منتخب شدہ فصلوں میں سب سے زیادہ اثر صرف گیہوں اور چاول نے قبول کیا جب کہ دیگر فصلیں کوئی خاص ترقی کا اظہار نہیں کر سکیں۔ گیہوں اور چاول میں بھی سب سے بہتر نتائج گیہوں کی پیداوار نے دیے۔ گیہوں کی پیداوار کا رقبہ ۶۱-۱۹۶۰ میں ۱۳ ملین ہیکٹیر سے بڑھ کر ۸۱-۱۹۸۰ تک ۲۲ ملین ہیکٹیر ہو گیا۔ اور پیداوار ۱۱ ملین ٹن سے بڑھ ۳۶ ملین ٹن ہو گئی۔ پیداواری صلاحیت ۸۵۱ کیلو فی ہیکٹیر سے بڑھ کر ۱۶۳۸ کیلو فی ہیکٹیر ہوئی۔ دوسری طرف چاول کا رقبہ ۳۴ ملین ہیکٹیر سے بڑھ کر ۴۰ ملین ہیکٹیر ہوا اور پیداوار ۳۵ ملین ٹن سے بڑھ کر ۵۳ ملین ٹن اور پیداواری صلاحیت ۱۰۱۳ کیلو فی ہیکٹیر سے بڑھ کر ۱۳۳۸ کیلو فی ہیکٹیر ہوئی۔

دیگر اجناس مثلاً جوار، باجرہ اور مکئی میں اس قدر اضافہ نہیں ہوا۔ جوار میں تو رقبہ اور پیداوار دونوں گھٹیں لیکن پیداواری صلاحیت

میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ پیداواری صلاحیت ۵۴۳ کیلو فی ہیکٹر سے بڑھ کر ۷۰۳ کیلو فی ہیکٹر ہوئی جبکہ رقبہ ۱۸ ملین ہیکٹر سے گھٹ کر ۱۲ ملین ہیکٹر رہ گیا اور پیداوار ۱۰ ملین ٹن سے گھٹ کر ۱۱ ملین ٹن رہ گئی۔ باجرہ کے سلسلے میں مثبت رُجحان ملتا ہے۔ یہاں رقبہ اور پیداوار دونوں بڑھیں۔ ساتھ ہی ساتھ پیداواری صلاحیت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ باجرہ کا رقبہ صرف ایک ملین ہیکٹر یعنی ۱۱ ملین سے بڑھ کر ۱۲ ملین ہیکٹر اور پیداوار ۳ ملین ٹن سے بڑھ کر ۵ ملین ٹن ہوئی۔ پیداواری صلاحیت ۲۸۶ کیلو فی ہیکٹر سے بڑھ کر ۴۲۲ کیلو فی ہیکٹر ہوگئی۔ مکئی کا رُجحان بھی مثبت رہا۔ اس کا رقبہ ۴ سے ۶ ملین ہیکٹر اور پیداوار ۴ سے ۷ ملین ٹن ہوگئی۔ جب کہ پیداواری صلاحیت میں بڑا نمایاں اضافہ ہوا۔ یہ صلاحیت ۹۲۶ کیلو فی ہیکٹر سے بڑھ کر ۱۱۳۷ کیلو فی ہیکٹر ہوگئی۔

اِن اعداد و شمار کے تجزیہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ سبز انقلاب کے لیے منتخب شدہ فصلوں میں صرف گیہوں و چاول ایسی فصلیں ہیں جنھوں نے جدید ٹیکنالوجی (نئے بیج و کھاد، آبپاشی، کیڑے مکوڑوں کی روک تھام کے اقدامات) کا اچھا اثر قبول کیا اور حسبِ منشاء پیداوار و پیداواری صلاحیتوں میں اضافہ کیا۔ دیگر فصلیں بہت اچھا اثر قبول نہ کرسکیں۔ اُن میں اضافہ ضرور ہوا لیکن اتنا حوصلہ افزا نہ ہوا کہ اُن کو انقلاب کے دائرہ میں گنا جاتا۔ اس لیے یہ کہنا یقیناً درست ہوگا کہ ہندوستان کا زرعی انقلاب صرف گیہوں، چاول کی پیداوار تک محدود ہے۔ اس کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جبکہ مجموعی اجناس کی پیداوار کا انڈیکس ۶۶-۱۹۶۵ میں ۸۰٫۵، سے بڑھ کر ۷۱-۱۹۷۰ میں ۹٫۰، ۱۱۲ اور ۸۳-۱۹۸۲ میں ۶٫۲، ۱۴۴ تھا، گیہوں کی پیداوار کا انڈیکس ۶۶-۱۹۶۵ میں ۶٫۵۷ سے بڑھ کر ۷۱-۱۹۷۰ میں ۱٫۱۳۲ اور ۸۳-۱۹۸۲ میں ۴٫۲۳۵ ہوگیا۔ اسی طرح جبکہ مجموعی اجناس کی پیداواری صلاحیت ۶۱-۱۹۶۰ء میں ۷۱۰ کیلوگرام تھی ۷۲-۱۹۷۱ء میں ۸۵۸ کیلوگرام اور ۸۳-۱۹۸۲ میں ۱۰۴۱ کیلو گرام فی ہیکٹر ہوگئی، گیہوں کی فی ہیکٹر پیداواری صلاحیت ۶۱-۱۹۶۰ میں ۸۵۱ کیلو گرام تھی جو ۷۲-۱۹۷۱ میں ۱۳۸۰، اور ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۱۸۳۶ کیلو فی ہیکٹر ہوگئی۔ دیگر اجناس کے مقابلے میں گیہوں کی پیداوار میں یہ نمایاں کامیابی دیکھ کر کچھ مفکرین اس سبز انقلاب کو محض "گندم کا انقلاب" کہتے ہیں اور کسی حد تک اُن کا یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے۔

چند اعتراضات

کسانوں کے موجودہ جوت کے رقبے، غریب، مفلس و بے زمین کسانوں کی بہتات، بے زمین محنت کش کسانوں کی شرکت اور مجموعی حیثیت سے پس ماندہ زرعی معیشت کے پیشِ نظر سب سے پہلا اعتراض یہ کیا گیا کہ اس طرح کا سرگرم عمل پروگرام زرعی سیکٹر میں سرمایہ دارانہ نظام کی ابتدا کر رہا ہے۔ دراصل اس پروگرام پر عمل درآمد ہونے کے لیے کچھ پابندیاں ہیں اور وہی پابندیاں سرمایہ دارانہ نظام کا بیج بو رہی ہیں۔ اس پروگرام کے لیے ضروری ہے کہ جدید آلات، جدید کھاد، آبپاشی کا بہتر انتظام، کیڑے مکوڑوں سے تحفظ کے لیے جدید دوائیوں کے استعمال کا انتظام، قصبہ جات، و بازاروں کا بہتر انتظام لازم ہے۔ ان سب سہولتوں کو بہم پہنچانے کے لیے حکومت ایک بڑے سرمایہ کو لگائے گی۔ اور اس سے صحیح فائدہ کون کسان اٹھائے گا، وہی جس میں ان اخراجات کو برداشت کرنے اور ان جدید آلات کو استعمال کرنے کی صلاحیت ہوگی۔ یعنی صرف بڑی کاشت والا بڑا کسان یا امیر کسان۔ کسی درمیانی یا چھوٹے کسان میں نہ تو اتنی صلاحیت ہوگی اور نہ اُس کے وسائل اُس کو اجازت دیں گے کہ وہ ایسا قیمتی انقلاب اپنا سکے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ بڑا و امیر کسان جن کی مجموعی تعداد درمیانی اور چھوٹے کسانوں کے مقابلے میں بہت تھوڑی ہے مکمل طور پر برسراقتدار آجائیں گے اور باقی کسان طبقہ انھیں کے زیر اثر بطور محنت کش کام کرتا رہے گا۔ اس طرح یہ "سبز انقلاب" دراصل امیر و غریب کسانوں کے درمیان خلیج کو وسیع کرنے والا، سرمایہ داروں اور محنت کشوں کے درمیان چلنے والی ازلی لڑائی کو قائم کرنے والا اور غریبوں کے استحصال کا موجب ہوگا۔

اس سلسلے میں اشوک رُودرا، ماجد و طالب کی تحقیقات اور اُس سے برآمد ہونے والے نتائج بڑی ٹھوس نظیریں پیش کرتی ہیں۔ انھوں نے پنجاب پر ایک سروے کیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ ۵۶-۱۹۵۵ تا ۶۸-۱۹۶۷ کے دَوران بڑے کسانوں کے قبضے میں زمین میں اضافہ ۹٫۵ فیصد ہوا۔ جو کسان ۲۵-۲۰ ایکڑ کے درمیان زمین پر قابض تھے اُن کی زمینوں میں صرف ۴ فیصد اور جو کسان ۱۵۰-۱۰۰ ایکڑ کے درمیان زمین پر قابض تھے ۴۰ فیصد کا اضافہ ہوا۔ اور سب سے زیادہ قابلِ توجہ بات یہ کہ یہ ۴۰ فیصد اضافہ زمینوں کو خرید کر کیا گیا۔ USAID کے ماہر FRANCINE FRANKNEL نے جنھوں نے اس انقلاب کے کسانوں پر ہونے والے سماجی و معاشی اثرات کا مطالعہ کیا تقریباً کچھ ایسے ہی نتائج پر پہونچے۔

U. THANT جو سابق یو این کے سیکریٹری جنرل تھے انھوں نے بھی تمام ترقی پذیر ممالک کو یہ کہہ کر آگاہ کیا کہ اگر اس انقلاب کے اثرات کو بازاروں کی طاقت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے تو یقیناً یہ صرف اُن کسانوں کو فائدہ پہونچائے گا جو کمرشیل پیداوار کر رہے ہیں۔ اور غریب کسانوں کو فائدہ نہیں پہنچائے گا۔ مزید کمرشیل کسانوں میں بھی صرف اُن کے لیے فائدہ مند

بے [illegible] کسان [illegible] کے لیے زمین کی
[illegible] جلد سے جلد
[illegible] جائے۔
[illegible] دائرہ عمل کی تشنگی سے
[illegible] سبز انقلاب کو صرف غذائی
پیداوار [illegible] محدود رکھا گیا ہے اور اس میں
[illegible] اجناس کو چن لیا گیا ہے۔ غیر غذائی
پیداوار جن کو کمرشیل کاشت کہا جاتا ہے، مثلاً
[illegible]، کپاس، تلہن، تمباکو، جوٹ وغیرہ کو شامل
نہیں کیا گیا اور پھر غذائی پیداوار میں بھی سبھی
اجناس کو شریک نہیں کیا گیا۔ مثلاً دالیں شریک
نہیں ہیں۔ اس طرح کا انتخاب مجموعی پیداوار
میں عدم توازن اور پھر اس کے نتیجے میں آمدنی،
روزگار، رہن سہن و معیار زندگی میں نابرابری کا
ذمہ دار بنے گا۔ زرعی پیداوار کو فروغ دینے
کا یہ منتخب پروگرام جس کو پیکیج پروگرام بھی
کہا جاتا ہے ایک محدود دائرہ میں اپنا اثر رکھتا
ہے لیکن اس کے منفی اثرات جن کو اوپر
بیان کیا جا چکا ہے ایک وسیع دائرہ اثر
رکھتے ہیں۔

پھر ایک یہ بھی اعتراض ہوا کہ اس
طرح کے پروگرام پر عمل درآمد ہو کر ہم مجموعی حیثیت
سے زرعی معیشت کو غربت افلاس و پسماندگی
کی دلدل سے نکالنے میں ناکامیاب رہیں گے کیونکہ
اس طرح کے پروگرام کی نوعیت بہت ہی بندشوں
میں جکڑی ہوئی ہے اور پھر محدود بھی ہے۔ اگر ہم
زرعی معیشت کو مجموعی حیثیت سے مضبوط، مستحکم
اور ترقی یافتہ دیکھنے کے خواہشمند ہیں تو ہم کو دو
رُخ سے انقلاب لانا ہوگا۔ ایک زرعی ڈھانچے
میں تبدیلی اور دوسری تیکنیکی تبدیلی۔ ہم جب تک
زمینوں کی ملکیت اُن کے رقبہ کے بٹوارے و
سائز، لگان وغیرہ کے اصول میں زمینوں کے جوتنے
والوں کے مفاد کے مدنظر تبدیلیاں مکمل نہیں کر لیتے
اس طرح کی "پیوندکاری" جیسے پروگرام کسانوں کو
صحیح فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ اس طرح کے پروگرام
متوسط و چھوٹے اور غریب کسانوں کو کسی فائدے
کے بجائے نقصان ہی پہنچائیں گے۔ ایک مکمل تبدیلی
کے لیے زرعی ڈھانچے میں اس طرح کی تبدیلی لازم
ہے۔ پھر تیکنیکی رُخ سے کھاد، بیج، آبپاشی، قرضوں،
دوائیوں جیسی بنیادی وسائل کی وافر سپلائی کی
سہولتیں پہنچانا ہوں گی جو بلاتفریق ہر معیار کے
کسانوں کی پہونچ کے اندر ہوں۔ اگر ہم نے چھوٹے
اور متوسط کسانوں کی دشواریوں، ان کی استعداد و
صلاحیتوں اور قوتِ خرید کو نظرانداز کر کے صرف
ایسی سہولتیں مہیا کیں جو صرف بڑے کسانوں کو فائدہ
پہنچائیں تو یقیناً وہ عدم مساوات، معاشی تفریق
اور امیری و غریبی کی خلیج کو وسیع کرنے کا وسیلہ
بنے گی۔

ایک تجزیہ

سبز انقلاب خواہ وہ کتنا ہی محدود کیوں
نہ ہو، اور وہ چاہے کسی مخصوص زرعی طبقہ کے
لیے سُودمند و دیگر کے لیے غیر سُودمند کیوں نہ
ثابت ہو رہا ہو اس حقیقت سے انکار نہیں
کیا جا سکتا کہ سبز انقلاب کا تجربہ ہندوستان
میں ایک کامیاب تجربہ ثابت ہوا ہے۔ کامیاب
اس معنی میں کہ اس کی بدولت آج ہندوستان
اپنے قیمتی زرمبادلہ کو اناج کی درآمدات پر
لگانے کے بجائے برآمدات کے ذریعے زرمبادلہ
کمانے کے قابل بن گیا ہے۔ کامیاب اس معنی
میں بھی کہ اس کی بدولت کم سے کم گیہوں اور چاول
کی پیداوار میں خودکفیل بن گیا ہے اور وقت
ضرورت کام آنے والے ایسے ذخائر کے قابل بن
چکا ہے جو کسی ہنگامی صورت حال کا مقابلہ کر
سکتے ہیں، بغیر باہری ملکوں کے سامنے ہاتھ
پھیلائے۔ اور کامیاب اس معنی میں بھی کہ آج
گیہوں و چاول کی پیداوار و پیداواری صلاحیتیں
ہمارے تمام دیگر منصوبوں اور پوری معیشت
کی کامیابی و استحکام کی ضمانت بن چکی ہیں۔
ہم نے اسی کامیابی کے تعین پر دیگر سمتوں میں
ترقی کی راہیں ہموار کی ہیں۔

یقیناً اعتراضات کسی حد تک درست ہیں،
لیکن زمین شعار پروگرام، زمینوں کی ملکیت کا
تعین، لگان میں شعار اور اس کا تعین، قومی
بینکوں کے ذریعے چھوٹے کسانوں کو رعایتی
قرضہ جات کی فراہمی، اُن کو ضروری وسائل کی
فراہمی، سستی کھاد، بیجوں کی فراہمی اُن تمام
اندیشوں کو دُور کرنے میں یقیناً مددگار ثابت ہو
رہے ہیں جن کا یہاں اظہار کیا گیا ہے۔ پھر کوآپریٹو
سوسائٹی، کوآپریٹو کریڈٹ سوسائٹیز، ایسے
ادارے بھی کام کر رہے ہیں جو ان اندیشوں کو
غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ مزید، اب
اس سبز انقلاب کا دائرہ عمل اور وسیع کیا جا رہا
ہے جہاں زیادہ سے زیادہ اضلاع اور زیادہ سے
زیادہ فصلیں اس کے تحت آ جائیں گی۔ دراصل
جیسے جیسے بنیادی وسائل مضبوط ہوتے جائیں گے
اس انقلاب کا دائرہ عمل وسیع ہوتا جائے گا اور
یہ وسعت میں سمجھتا ہوں پوری زرعی معیشت کو
اپنی لپیٹ میں لے لیگی۔ پھر شاید یہ شکایت نہ
رہے کہ اس طرح کی پیوندکاری والے پروگرام زرعی
طبقہ میں محض سرمایہ دارانہ کھیتی کے نظام کی بنیاد
ڈال رہے ہیں۔ سبز انقلاب کو اپنے ابتدائی
دور میں جیسی کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ یقیناً
اس بات کی ضمانت ہے کہ یہ انقلاب اُس وقت
تک کامیاب نہیں سمجھا جائے گا جب تک غریب
سے غریب کسان اس سے بھرپور فائدہ نہ اٹھانے
لگے۔ اسی مقصد اور نظریہ کے تحت یہ انقلاب
لایا جا رہا ہے۔

نقشہ اگلے صفحہ پر
ملاحظہ فرمائیے۔

سبز انقلاب کے تحت اجناس کا رقبہ، پیداوار و پیداواری صلاحیت کا جائزہ (۱۹۶۰ – ۶۱، ۱۹۸۰–۸۱ء)

اجناس	۱۹۶۰ – ۶۱	۱۹۶۴ – ۶۵	۱۹۷۰ – ۷۱	۱۹۷۳ – ۷۴	۱۹۷۸ – ۷۹	۱۹۸۰ – ۸۱
چاول						
۱. رقبہ	۳۴	۳۹	۳۸	۳۸	۴۰	۴۰
۲. پیداوار	۳۵	۳۹	۴۲	۴۴	۵۴	۵۳
۳. پیداواری صلاحیت	۱،۰۱۳	۱۰۷۳	۱۱۲۳	۱۵۱،	۱۳۳۹	۱۳۳۸
گیہوں						
۱. رقبہ	۱۳	۱۴	۱۸	۱۹	۲۲	۲۲
۲. پیداوار	۱۱	۱۳	۲۴	۲۲	۳۵	۳۶
۳. پیداواری صلاحیت	۸۵۱	۹۱۳	۱۳۰۷	۱۱۷۱	۱۵۷۰	۱۶۴۸
۴ جوار						
۱. رقبہ	۱۸	۱۸	۱۷	۱۷	۱۶	۱۶
۲. پیداوار	۱۰	۱۰	۸	۹	۱۲	۱۱
۳. پیداواری صلاحیت	۵۳۳	۵۰۳	۴۶۶	۵۴۴	۷۱۸	۶۷۳
باجرہ						
۱. رقبہ	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴	۱۱	۱۲
۲. پیداوار	۳	۴	۸	۱۸	۶	۵
۳. پیداواری صلاحیت	۲۸۶	۳۸۰	۶۲۲	۵۴۰	۴۸۶	۴۶۶
مکئی						
۱. رقبہ	۴	۵	۶	۶	۶	۶
۲. پیداوار	۴	۵	۷	۶	۶	۷
۳. پیداواری صلاحیت	۹۲۶	۱۰۰۹	۱۲۷۹	۹۶۵	۱۰۷۶	۱۱۳۷

رقبہ = ملین ہیکٹر۔ پیداوار = ملین ٹن۔ پیداواری صلاحیت = فی ہیکٹر کیلوگرام

بقیہ: گنگا کا ترقیاتی پراجیکٹ

کے لیے پلانٹ نصب کئے جائیں اور ایسے اقدامات کئے جائیں جن سے کارخانوں کے زہریلے فاضلات کو اس مقدس دریا میں بہنے سے روکا جاسکے۔

ان پلانٹوں پر ہر سال ۲۵ کروڑ روپے خرچ کئے جانے کا پلان ہے۔ یہ پلانٹ جہاں گندے نالوں کا پانی صاف کریں گے وہاں فاضلات سے کھاد اور کھانا بنانے کی گیس بھی تیار کریں گے۔ یہ گیس اُن قصبوں اور متعدد علاقوں میں سپلائی کی جائے گی جو گنگا کے کنارے پر واقع ہیں۔ اس طرح ان پلانٹوں سے جو آمدنی ہوگی اس سے نہ صرف اُن کے اخراجات پورے کئے جائیں گے بلکہ اُن سے ہر سال کم از کم ۱۱ کروڑ روپے کا منافع بھی ہوگا۔

اس پراجیکٹ میں ماحولیات کی طرف بھی توجہ دی گئی ہے۔ چنانچہ اس کے تحت تیرتھ استھانوں میں گھاٹوں کو صاف ستھرا رکھا جائے گا۔ صحت و صفائی کی سہولیات اور دیگر سروسیں بھی مہیا کی جائیں گی۔ یاتریوں کے لیے واجبی کرایوں پر ٹھہرنے کے لیے ہوٹلوں اور دھرم شالاؤں کی تعمیر بھی کی جائے گی۔ اس کے علاوہ اُن مردہ جانوروں کو بھی ٹھکانے لگانے کی تجویز کی گئی ہے۔ جو اس وقت دریا میں بہادیے جاتے ہیں۔

اس پراجیکٹ کے تحت بعض مقامات پر گنگا کو گہرا کیا جائے گا تاکہ اس میں جہازرانی کو فروغ دیا جاسکے۔ اس سے آبی آمد و رفت اور تجارت کو بڑھاوا ملے گا۔

ایم ایل بجاج

گنگا کا ترقیاتی پراجیکٹ

گنگا کو بھارت کی سماجی واقتصادی اور تہذیبی وروحانی زندگی میں جو بلند مقام حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ دنیا کے کسی بھی دوسرے دریا کے تئیں عوام اس قدر عقیدت نہیں رکھتے جس قدر بھارت کے لوگ گنگا کے لیے رکھتے ہیں۔ بلکہ وہ اُس کی پوجا تک کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں خصوصاً شمالی بھارت کے ہندوؤں کی زندگی اس کے ساتھ اس قدر پیوست ہے کہ وہ اسی کے ساتھ شروع ہوتی ہے اور اسی کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے اُس کے مُنہ میں گنگا جل ڈالا جاتا ہے۔ خوشی غم کے موقع پر گنگا جل کا استعمال کیا جاتا ہے اور جب اُس کی زندگی کا سفر ختم ہو جاتا ہے تو آخری گھڑیوں میں اُس کے مُنہ میں گنگا جل ڈالا جاتا ہے۔ ایک ہندو کی تو خواہش ہی ہوتی ہے کہ اُس کے کنارے پر ہی اُس کا دَم نکلے۔ اگر ایسا نہ ہو تو کم ازکم اُس کی استھیاں (ہڈیاں) اُس کے مقدس پانی میں ڈالی جائیں۔

گنگا کو "ماتا" کہا جاتا ہے کیونکہ یہ ایک حقیقی ماں کی طرح نامعلوم یگوں (اَدوار) سے شمالی بھارت کے لوگوں کو اپنے آنچل میں لیے ہوئے اُن کی "پرورش" کر رہی ہے۔ دراصل بھارت اور گنگا اس قدر لازم وملزوم ہو گئے ہیں کہ کسی ایک کے بغیر دوسرے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر دریائے گنگا اور اُس کے معاون دریا نہ ہوتے تو خصوصاً شمالی بھارت آج لق ودق صحرا کے سوائے کچھ نہ ہوتا۔ اس نے بھارت کو زندگی دی ہے، خوشحالی دی ہے اور طاقت دی ہے اور اسی کے کناروں پر ہماری تہذیب پروان چڑھی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس ملک کے لوگ اس کے تئیں اس قدر عقیدت رکھتے ہیں بلکہ اس کی پوجا تک کرتے ہیں۔

بے نظیر اوصاف

دریائے گنگا جو ہمالیہ کے گنگوتری کے مقام سے نکل کر پہاڑوں سے ہوتا ہوا اور میدانی علاقوں میں بہتا ہوا کلکتہ کے نزدیک سمندر میں جا گرتا ہے، بے نظیر اوصاف کا حامل ہے۔ طویل عرصے تک رکھے جانے پر بھی اس میں بدبو یا سڑاند پیدا نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کے ذائقہ میں کوئی فرق آتا ہے۔ اس کا پانی خود بخود صاف ہونے کی خاصیت رکھتا ہے۔ جس کی توثیق گذشتہ صدی کے اواخر میں ایک برطانوی سائنسداں کے تجربوں سے بھی ہو گئی تھی۔ ۱۸۹۶ء میں مسٹر ہینکن نے وارانسی کے ایک ایسے مقام سے پانی کے چند نمونے لیے جہاں گندے نالے کا پانی گنگا میں جا رہا تھا اور ایک لاش پانی میں تیر رہی تھی۔ دونوں جگہ ہیضہ اور دیگر امراض کے جراثیم موجود تھے۔ ان دونوں نمونوں کو الگ الگ بوتل میں رکھا گیا۔ چھ گھنٹے کے بعد اُن کا معائنہ کیا گیا۔ دونوں پانیوں میں جراثیم ہلاک ہو چکے تھے۔ اس کے بعد ہینکن نے اپنی طرف سے اُن میں ہیضے کے جراثیم بڑی مقدار میں ملا دئے اس بار بھی چھ گھنٹے کے بعد جراثیم پھر ہلاک ہو چکے تھے۔ اسی طرح ایک فرانسیسی ماہر طبیعات ڈاکٹر ڈی ہیریل کے تجربوں سے بھی گنگا کے پانی کی ان پُراسرار خاصیتوں کی تصدیق ہو گئی جن کی بدولت چند گھنٹوں کے اندر ہی پیچش اور ہیضے کے جراثیم کا قلع قمع ہو گیا تھا۔

گنگا کے پانی کی اس بے نظیر خاصیت کا اظہار اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ گذشتہ صدی میں جب برطانوی سمندری جہاز کلکتہ سے گنگا کا پانی لے کر چلتے تھے تو وہ لندن پہونچنے پر بھی خراب نہیں ہوتا تھا جب کہ لندن سے واپسی پر دریائے ٹیمز کا پانی مصر تک پہونچنے سے پہلے ہی پینے کے لائق نہیں رہتا تھا۔

عظمت پارینہ

گنگا کو اپنے ان اوصاف کے باعث شروع سے ہی تقدس حاصل ہے۔ مہابھارت میں اسے "دودھ کی مانند سفید اور گھی کی مانند شفاف اور ملائم" بیان کیا گیا ہے۔ آیور وید کے

...ہو چکے ... کوئی دو ہزار سال قبل گنگا کے
پانی کو "قوت بخش، شفا بخش، متبرک ... خوشذائقہ
... " قرار دیا تھا۔

اکثر ہندوؤں کے نزدیک گنگا ایک مقدس دریا ہے جو اُن کے عقائد کے مطابق انھیں دُنیاوی فوائد فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے گناہوں کو بھی "بہا" کرلے جاتا ہے تو اسلامی دَور میں بھی مسلم حکمرانوں اور عام مسلمانوں کے لیے یہ اپنے جملہ اوصاف کے باعث کم اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ پینے اور کھانا پکانے کے مقاصد کے لیے گنگا کا پانی ہی استعمال کرتے تھے، اس لیے نہیں کہ وہ اس کے لیے کوئی دلی عقیدت رکھتے تھے بلکہ اس لیے کہ انھیں رفتہ رفتہ اس کے پانی کے اوصاف کا پتہ چل گیا تھا۔

آئینِ اکبری میں ابوالفضل نے لکھا ہے کہ شہنشاہ اکبر گنگا کے پانی کو "آبِ حیات" بتاتا تھا۔ وہ گھر میں اور سفر میں گنگا کا پانی پیتا تھا۔ جب وہ پنجاب جاتا تھا تو اُس کے لیے جو کھانا بنایا جاتا تھا اُس میں بارش کا پانی یا پھر جمنا اور چناب کا پانی استعمال ہوتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی تھوڑا سا گنگا کا پانی بھی ملا لیا جاتا تھا۔

مورخین کے مُطابق مغل شہنشاہوں میں گنگا جل پینے کا رواج اورنگ زیب کے عہد تک رہا۔ خود اورنگ زیب بھی گنگا کے پانی کا استعمال کرتا تھا۔ جہانگیر جہاں بھی جاتا تھا اُس کے لیے وہاں ہی گنگا کا پانی لایا جاتا تھا۔ ایک انگریزی سیاح ٹولپ یا لاڈ ہوس کے مطابق ۱۷۰۲ء تک جنوبی ہند (دکن) میں آیا تھا گنگا جل مسلمانوں میں بہت بھاری قیمت پر فروخت ہوتا تھا۔ ... اس کے اوصاف کے باعث قدیم ہندوؤں نے اسے "ماتا" اور "دیوی" کا درجہ دے رکھا تھا اور اس کے ارد گرد بہت سی کتھا کہانیوں ... تھا۔

آلودگی

لیکن مقام افسوس ہے کہ آج ہماری غفلت اور ناسمجھی کے باعث یہ مقدس دریا جس کا پانی خود بخود صاف ہونے کی بے مثال خاصیت رکھتا ہے۔ بتدریج بڑھتی ہوئی آلودگی کا شکار ہو رہا ہے۔ اس میں نہ صرف اس کے کناروں پر آباد شہروں اور قصبوں کا کوڑا کرکٹ بے دریغ پھینکا جارہا ہے اور گندے نالوں کا پانی ڈالا جارہا ہے بلکہ کارخانوں کے زہر آلود فاضلات بھی بے دردی سے بہائے جارہے ہیں۔ رشی کیش اور ہردوار میں ادویات اور بجلی کے بڑے بڑے پلانٹ ہیں اور کانپور میں بیشتر کارخانے ہیں۔ ان سے نہ صرف ہوا بلکہ گنگا کے پانی میں بھی آلودگی بڑھتی جارہی ہے۔ سب سے بدتر صورتِ حال مقدس شہر وارانسی کی ہے۔ جہاں گزشتہ نصف صدی میں آلودگی حد سے بڑھ گئی ہے۔ کیوں کہ وہاں نہ صرف لاشیں پھینکی جاتی ہیں بلکہ مُردہ جانوروں کو بھی اُس میں بہا دیا جاتا ہے۔ اس سے پانی نہ صرف پینے بلکہ نہانے لائق بھی نہیں رہا۔

یہ آلودگی کس حد تک بڑھ گئی ہے اس کا جائزہ چند اداروں کی طرف سے گزشتہ چند برسوں میں لیا گیا ہے۔ رڑکی، کانپور اور وارانسی کے بعض اداروں نے جن میں بنارس ہندو یونیورسٹی بھی شامل ہے۔ بعض علاقوں میں گنگا کے پانی کی جانچ کی ہے۔

اگرچہ برطانوی عہد حکومت میں بھی اس سلسلے میں کچھ کام ہوا ہے لیکن وہ زیادہ تر ہردوار اور چند دوسرے مقامات تک محدود رہا ہے۔ ہردوار میں تو یاتری ٹیکس یعنی ٹول ٹیکس لگایا گیا ہے جو ابھی تک نافذ ہے اس سے گھاٹوں کی تعمیر میں بھی کچھ بہتری ہوئی ہے۔ پل بنائے گئے ہیں اور کناروں کے ساتھ ساتھ گھاس کے میدان بنا دیئے گئے ہیں لیکن آلودگی کے بنیادی مسئلے کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو علاقائی میونسپل بورڈوں سے حل نہیں ہوسکتا مگر اس کام میں ان کا تعاون ضروری ہے۔ یہ عظیم مسئلہ قومی سطح پر حل کیا جاسکتا ہے۔

گنگا اتھارٹی پراجیکٹ

مقام مسرت ہے کہ تعمیر و ترقی کے سلسلے میں نئی حکومت کی اولین نگاہ اس مسئلہ پر گئی ہے جو بیک وقت اقتصادی ہے اور جذباتی بھی۔ چونکہ یہ بھارت کا طویل ترین دریا ہے جو متعدد ریاستوں میں سے گزرتا ہوا خلیج بنگال میں جا گرتا ہے اور اس سے تمام تر ملک کی خوشحالی وابستہ ہے اس لیے مرکزی حکومت کا اس کی جانب متوجہ ہونا قدرتی امر ہے۔ اس کام پر اربوں روپیہ خرچ آنے کا امکان ہے اس لیے یہ کسی ایک ریاست کے بس کا روگ نہیں کہ وہ اس عظیم کام کو اپنے ہاتھ میں لے۔ چنانچہ بھارت سرکار نے اس مسئلے کو قومی سطح پر حل کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس سلسلے میں ایک پلان بنایا ہے جو عظیم تر گنگا اتھارٹی کے نام سے موسوم ہے۔

ابھی حال ہی میں صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ نے نئی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے اس اتھارٹی کے قیام کا پلان پیش کیا ہے۔ جو پانچ برس میں مکمل ہوگا۔ اس پر کوئی اڑھائی ارب روپے کی لاگت آنے کا امکان ہے۔

اس پراجیکٹ کا مقصد ہمارے اس عظیم قومی اثاثہ کا تحفظ کرنا ہے۔ اس کی ترتیب میں ماحولیات، جنگلات اور توانائی کے غیر مروجہ وسائل کے محکموں نے بھی حصہ لیا ہے۔

گو اس پراجیکٹ کی تفاصیل کو ترتیب دیا جارہا ہے تاہم اس کی جو بڑی بڑی باتیں معلوم ہوئی ہیں اُن کے مُطابق یہ تجویز کیا گیا ہے کہ گنگا کے کنارے پر واقع تمام بڑے بڑے شہروں میں جن میں ہردوار، وارانسی اور پٹنہ وغیرہ شامل ہیں، گندے نالوں کے پانی کو قابلِ استعمال بنانے

(باقی صفحہ پر)

ریڈیو پر زرعی تعلیمی نصاب

آل انڈیا ریڈیو اپنے "فارم سکول" پروگرام کو ملک کے تمام سٹیشنوں سے نشر کرنے کا پلان بنا رہا ہے۔ یہ پروگرام بہت مقبول عام ہوا ہے اور دیہی سامعین، سائنسدان اور ریاستوں کے زراعتی محکموں کے فیلڈ افسران اس میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں

یوں تو آل انڈیا ریڈیو اپنے ابتدائی دنوں سے ہی دیہاتی عوام اور خصوصاً کاشتکاروں کے لیے سود مند پروگرام نشر کر رہا ہے، تاہم ۱۹۶۶ء میں اس نے اس سلسلے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہوئے اپنے ۱۰ اسٹیشنوں میں مخصوص "فارم اینڈ ہوم" یونٹ قائم کئے۔ اس پروگرام کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے اس نے مزید ایسے یونٹ شروع کئے اور اب ان یونٹوں کی تعداد ۶۴ تک پہنچ گئی ہے جو آل انڈیا ریڈیو کے مختلف سٹیشنوں پر کام کر رہے ہیں۔

ہر یونٹ دن میں ایک سے ڈیڑھ گھنٹے کے پروگرام تیار کرتا ہے جو تین نشریات میں پیش کئے جاتے ہیں۔ صبح سویرے ۵ سے ۱۰ منٹ کے لیے زراعت سے متعلق مفید باتیں، دوپہر کو دیہی خواتین کے لیے پروگرام اور شام کو ۴۵ منٹ سے ایک گھنٹے تک مختلف دیہی موضوعات اور زراعت سے متعلق پروگرام نشر کئے جاتے ہیں۔ یہ پروگرام کیونکہ مقبول عام ہوئے ہیں، ان کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ "فارم اینڈ ہوم" یونٹوں کو ہر ماہ سامعین سے اوسطاً ۵۰۰ سے ۱۰۰۰ مراسلات موصول ہوتے ہیں، اور ان کی سالانہ تقاریب میں دیہاتی عوام اور کاشتکار بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ زراعتی یونیورسٹیوں، "آئی سی اے آر" اداروں اور "انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونکیشن" وغیرہ کی طرف سے جو متعدد مطالعات کئے گئے ہیں ان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ "ریڈیو" کسانوں کو جانکاری بہم پہنچانے کا اہم ذریعہ ہے۔

دیہی عوام کو مفید جانکاری دینے کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو نے ان پروگراموں کو دلچسپ بنانے کے لیے مزید کچھ اقدامات کئے ہیں جن سے کسانوں کو بڑا فائدہ پہنچ رہا ہے اور وہ انھیں کاشتکاری میں عملی صورت دے رہے ہیں۔ ان جدید نشریات میں ایک پروگرام ہے، آل انڈیا ریڈیو پر "فارم اسکول" جو نہایت مقبول عام ثابت ہوا ہے۔ یہ پروگرام ۱۹۷۳ء میں آل انڈیا ریڈیو کے دو سٹیشنوں، ترچور اور جے واڑہ میں شروع کیا گیا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کے "سامعین کے ریسرچ یونٹ" کی طرف سے لیے گئے ایک جائزے کے مطابق ان تجربات کے نتائج بہت حوصلہ افزا ثابت ہوئے ہیں۔ بعد کے برسوں میں فارم اینڈ ہوم یونٹوں نے آل انڈیا ریڈیو کے دوسرے سٹیشنوں پر اس پروگرام کو شروع کیا اور اس وقت آل انڈیا ریڈیو کے ۳۱ سٹیشنوں پر یہ پروگرام نشر کیا جا رہا ہے۔

پروگرام کی خاص باتیں

اس پروگرام کی اہم باتیں درج ذیل ہیں:

۱۔ زمین کی ساخت، حالات، آب و ہوا، فصلوں اور دیگر زرعی۔ طبیعاتی امور کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ایک مشترکہ موضوع کا انتخاب کیا جاتا ہے اور اس کے لیے ایک ایسے مخصوص علاقے کی ضروریات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے جس کے لیے آل انڈیا ریڈیو کا اسٹیشن پروگرام تیار کرتا ہے۔ اس موضوع کا انتخاب ... کی طرف سے کیا جاتا ہے ... کرنے کے لیے ...

یوجنا، نئی دہلی

[illegible] اور ان کاشتکاروں کے تماشہ دوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

۲۔ نصاب اسی کمیٹی کی طرف سے تیار کیا جاتا ہے جو موضوع کا انتخاب کرتی ہے۔ منتخبہ موضوع سے متعلق تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی جاتی ہے اور اسباق کا ایک سلسلہ وضع کیا جاتا ہے۔ کمیٹی ہر سبق کے لیے ایک مناسب ماہر کی بھی تجویز کرتی ہے جو اپنے سبق کے لیے تکنیکی مواد تیار کرتا ہے۔

۳۔ ریڈیو اعلانات، مقامی اخبارات اور محکمہ زراعت کے فیلڈ سٹاف کی مدد سے بھی پہلے سے موزوں پبلسٹی کی جاتی ہے۔ اکثر اوقات پرچے اور گشتی مراسلے بھی امکانی سامعین میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ ان اسباق کو باقاعدہ طور پر سنا جائے اس کے لیے سامعین کو مدعو کیا جاتا ہے کہ وہ نصاب کے لیے اپنے ناموں کا اندراج کرائیں۔ نصاب کے اندراج کے لیے کوئی فیس نہیں ہے اور کوئی بھی اپنے بارے میں ذاتی تفاصیل ارسال کر کے اپنے نام کا اندراج کرا سکتا ہے۔ یہ جاننا موجب دلچسپی ہوگا کہ یکم جنوری ۱۹۸۱ء سے یکم جنوری ۱۹۸۴ء تک ایسے سامعین کی تعداد ۱۰۸۲۹۶ تھی جنھوں نے اپنے ناموں کا اندراج کرایا تھا۔ اس لحاظ سے دیگر سامعین کی تعداد کئی گنا زیادہ ہو سکتی ہے۔

۴۔ اس پروگرام کے سبق ہفتے کی مقررہ تاریخوں پر نشر کیے جاتے ہیں اور اس کے لیے اوقات بھی مقرر ہوتے ہیں۔ سامعین کو اسباق کے بارے میں اس کے پروگرام سے پہلے مطلع کیا جاتا ہے تاکہ وہ کوئی سبق سننا نہ بھولیں۔ لیکچر اور مباحثے کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ہر سبق کے آخر میں ماہر سبق کے مضمون سے [illegible] سوال دریافت کرتا ہے [illegible] سٹیشن کے پروگرام [illegible]

دیہات میں تحریری امتحانوں کے پروگرام کے بارے میں مائکروفون پر پہلے سے پبلسٹی کی جاتی ہے اور مندرج سامعین سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ تحریری امتحان دینے کے لیے آئیں۔ ماہر آسان سوالوں کا ایک پرچہ تیار کرتے ہیں اور جائزے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن کی طرف سے جوابات کے لیے کاغذات اور پنسلیں وغیرہ مہیا کی جاتی ہیں اور دیہی اسکول امتحان کے لیے جگہ فراہم کرتے ہیں۔

تحریری امتحانات ختم ہونے کے بعد آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن تقسیم انعامات کی تقریب کا انعقاد کرتا ہے۔ ریاستی حکومت کے تمام متعلقہ محکمہ جات، تحقیقی ادارے اور کالج وغیرہ اس تقریب میں حصہ لیتے ہیں جو کاشتکار تحریری امتحانات میں پورے اترتے ہیں انھیں انعامات تقسیم کیے جاتے ہیں اور تمام مندرج کاشتکاروں کو سندیں دی جاتی ہیں۔ متعدد سرکاری ادارے اور بینک وغیرہ انعامات دینے کے لیے میدان میں آتے ہیں اور ۸۴ ـ ۱۹۸۱ کے دوران آل انڈیا ریڈیو کے مختلف سٹیشنوں پر اس پروگرام میں کامیابی حاصل کرنے والوں کو کل ۱۹۹۸ انعامات بانٹے گئے ہیں۔ انعامات میں ہل، پودوں کا تحفظ کرنے والا ساز و سامان، آبپاشی کے پمپ سیٹ، کیمیاوی کھاد، بیج، ٹرانزسٹر، دیواری گھڑیاں، تھرموس بوتلیں، گفٹ چیک، نقد رقوم، دودھیل گائیں، پریشر ککر اور دیگر اشیا دی گئی ہیں۔

اب یہ تجویز کیا گیا ہے کہ انعامات بانٹنے کے بجائے جیتنے والے کاشتکاروں کو ملک کے اُن مقامات کے مطالعاتی دورے پر بھیجا جائے جو زراعتی طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں آل انڈیا ریڈیو کے ترچور اسٹیشن کی طرف سے پہلے ہی قدم اٹھایا جا چکا ہے۔

[illegible] ریڈیو پروگرام [illegible] ایک تازہ حالیہ [illegible] ہے [illegible]

یہی وجہ ہے کہ نصاب کے آخر میں تمام مواد کتابی صورت میں شائع کیا جاتا ہے اور مندرج سامعین میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۹۷۳ سے ۱۹۸۱ تک آل انڈیا ریڈیو کے ۳۱ اسٹیشنوں نے ۳۳۸ نصاب پیش کیے جو ۲۲ موضوعات کے بارے میں تھے اور ان کی طرف سے ۴۰۰۰۰ سے زیادہ کاشتکاروں کا اندراج کیا گیا جن میں سے ۴۰ ہزار سے زیادہ امتحانات میں شریک ہوئے۔

اسی طرح ۱۹۸۱ سے ۱۹۸۴ تک آل انڈیا ریڈیو کے ۷۰ اسٹیشنوں کی طرف سے ۱۹۳ موضوعات سے متعلق ۲۰۰ نصاب پیش کیے۔ ایک لاکھ سے زیادہ کاشتکاروں کا اندراج کیا جن میں سے ۲۵ ہزار سے زیادہ نے تحریری امتحانات میں شرکت کی۔ آل انڈیا ریڈیو کے فارم اسکول پروگرام نے فصلوں اور مویشیوں کی افزائش کی جانب ہی توجہ مرکوز نہیں کی بلکہ اس نے گوبر گیس ٹیکنالوجی، زرعی مارکیٹنگ اور بندوبست، ناکارہ زمینوں کو قابل کاشت بنانے، ریشم کے کپڑے پالنے، شہد کی مکھیاں پالنے اور تغذیہ وغیرہ کے موضوعات کے بارے میں بھی نصاب پیش کیے ہیں۔

دیہی سامعین اور ریاستی محکموں کے فیلڈ افسروں اور سائنسدانوں میں بھی یہ پروگرام بڑی دلچسپی کا موجب بنا ہے۔ چنانچہ آل انڈیا ریڈیو یہ پلان بنا رہا ہے کہ جہاں کہیں ممکن ہو یہ پروگرام اس کے تمام اسٹیشنوں پر نشر کیا جائے گا۔"

متبادل عمارتی سامان کی کھوج

صنعتِ تعمیر ہر ملک کی معاشرتی و اقتصادی ترقی میں اہم پارٹ ادا کرتی ہے۔ اس سے ملک کے صنعتی شعبے میں اضافہ ہوتا ہے، سرمایہ بڑھتا ہے اور لوگوں کو پہلے سے زیادہ ملازمت کے مواقع میسر آتے ہیں۔ عمارتی تعمیر کی صنعت ایک ایسی صنعت ہے جس میں مزدوروں کی ضرورت بہت زیادہ پیش آتی ہے۔ یہ صنعت عارضی طور پر آجر بھی بن جاتی ہے نیز اس سے عمارتی سامان تیار کرنے والی صنعتوں کو بڑھاوا ملتا ہے۔

تعمیر کی کل لاگت کا معتدبہ حصہ عمارتی سامان پر صرف ہوتا ہے اور عمارتی سامان کی قلت یا بہ آسانی دستیابی کام کے آگے بڑھنے پر بجری اثر انداز ہو سکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں کسی ملک کی اقتصادی خوشحالی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہاں عمارتی سامان کتنا تیار ہوتا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ سیمنٹ اور عمارتی سامان کی دیگر صنعتوں کا قوم کی ضروریں اور اقتصادی و سماجی اُمنگیں پوری کرنے میں کتنا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔

ہندوستان میں عمارتی سامان میں سے سب سے زیادہ اہم سیمنٹ خیال کیا جاتا ہے اور اس کی بھاری مانگ ہے۔ چھٹے پلان کے شروع میں ملک میں ۲ کروڑ ۹۰ لاکھ ٹن سیمنٹ تیار کرنے کے کارخانے قائم تھے لیکن اب جتنے کارخانے قائم ہیں ان میں ۴ کروڑ ۳۰ لاکھ ٹن سیمنٹ تیار کیا جا سکتا ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ ساتویں پلان کے آخر تک ۶ کروڑ ۲۰ لاکھ ٹن سیمنٹ تیار ہونے لگے گا۔

دوسری طرف ملک کی گوناگوں ترقی کے پیشِ نظر سیمنٹ کی مانگ بھی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ آبادی کے اضافے اور مزدور طبقے کی شہروں کی جانب ہجرت نے مکانات کی قلت کا مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ نئے مکانات کی ضرورت کے متعلق ۱۹۸۱ء میں ایک سروے کرایا گیا تھا جس سے پتہ چلا کہ ملک میں ۲ کروڑ چالیس لاکھ مزید مکانات کی ضرورت ہے۔ اور ان میں سے ایک کروڑ ۹۰ لاکھ رہائشی یونٹوں کی ضرورت دیہات میں ہے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ مرکزی وزارت تعمیرات اور مکانات نے ساتویں پلان میں مکانوں کی تعمیر کے لیے ۴۴ ارب ۲۵ کروڑ روپے کی رقم رکھے جانے کا مطالبہ کیا ہے جبکہ چھٹے پلان میں اس مقصد کے لیے ۱۴ کروڑ ۱۹ لاکھ روپیہ رکھا گیا تھا۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر شہری کی اُمنگ کو پورا کرے کہ اس کے پاس اپنا مکان ہو اور بے گھر لوگوں کے پاس سر چھپانے کی جگہ ہو۔

چونکہ سیمنٹ، عمارتی سامان کی مانگ بڑھنے سے ان چیزوں کی قلت پیدا ہو رہی ہے اس لیے ضروری ہو گیا ہے کہ نئی نئی قسم کا عمارتی سامان تیار کیا جائے اور اس غرض سے نئی ٹیکنالوجی اور طور طریقے ڈھونڈے جائیں۔ نیز یہ بھی ضروری ہو گیا ہے کہ خام مال کے لیے ذخیرے تلاش کیے جائیں۔ چنانچہ اس جستجو کے سلسلے میں نگاہیں ان فضولیات کچروں کی طرف اُٹھنے لگی ہیں جنہیں ہم فضول اور ردی سمجھ کر پھینک دیتے ہیں۔ یہی فضلے یا کچرے جو آجکل فضا کو آلودہ کرنے کا باعث بن رہے ہیں اگر کام میں لائے جا سکیں تو ان سے دولت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اُن سے عمارتی سامان تیار کیا جا سکتا ہے جس سے ملک میں بہتوں کا بھلا ہو سکتا ہے۔ فضلے یا کچرے کئی قسم کے مانے گئے ہیں۔ زراعتی فضلے، صنعتی فضلے اور شہری و دیہاتی فضلے۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ زراعتی فضلے ہندوستان میں ۳۰ کروڑ ٹن سالانہ پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں گیہوں اور چاول کی پیال، بھوسی، گنّے کا کھوجڑا، ناریل کا ریشہ، کیلے کے ڈنٹھل اور پھلوں کا پوست و چھلکا شامل ہیں۔ اسی طرح صنعتی و معدنی فضلے مثلاً کوئلہ استعمال کرنے والے بجلی گھروں سے نکلنے والی راکھ اور دھات کا میل جو کچی دھات کو صاف کرنے میں نکلتا ہے، اور کھڑیا مٹی ۵ کروڑ ٹن کے لگ بھگ سالانہ پیدا ہوتی ہے۔ جہاں تک شہری و دیہاتی کچرے، کوڑا کرکٹ اور سبزیوں اور پھلوں کے پھوک اور چھلکوں کا تعلق ہے، یہ اشیاء ہندوستان میں ہر سال ۱۰۰ کروڑ ٹن سے بھی زیادہ وزنی ضائع ہو جاتی ہیں۔

اب سائنسداں، ٹیکنالوجی کے ماہرین، انجینئر، فضائی آلودگی کو دور کرنے کے خواہاں لوگ کہہ رہے ہیں کہ ان تمام فضلوں کو استعمال میں لایا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ صحیح جگہ پر پہنچائے جا سکیں۔ ایسی جگہ پر پہنچ جانے سے جہاں ان کی ضرورت ہوتی ہے، یہی فضلے قیمتی مادے بن جاتے ہیں۔ ان سے سستا [illegible] عمارتی سامان تیار کیا جا سکتا ہے۔ [illegible] پر جس عمارتی مسئلے [illegible]

ماہنامہ جامعہ نئی دہلی

اُس میں وہ فضلے کام میں لائے جا سکتے ہیں، جو کاغذ، چینی اور کاربائیڈ کے کارخانے پیدا کرتے ہیں۔

اسی طرح کوئلے سے پیدا ہونے والی راکھ اور دھات کا دانے دار میٹیل جو لوہے اور اسپات کی بھٹیوں سے نکلتا ہے، اگر سیمنٹ کے کسی کارخانے کے نزدیک دستیاب ہو تو انھیں سیمنٹ میں ملا کر کئی طرح کا مخلوط سیمنٹ تیار کیا جا سکتا ہے۔ قدرت کوئی چیز بیکار پیدا نہیں کرتی۔ یہاں تک کہ طرح طرح کے پھوک، لکڑی کا بُرادہ، چھیلن اور خشک پتّے بھی کام میں لائے جا سکتے ہیں۔ چکنی کیچڑ اور دیگر صنعتی فضلوں سے عمارت سازی کا مسالہ، فرش میں کام آنے والے ٹائیل اور تختے وغیرہ تیار کئے جا سکتے ہیں۔ چکنی مٹی اور کوئلے کی راکھ کی اینٹیں بن سکتی ہیں۔ کھڑیا مٹی بھی بڑے کام کی چیز ہے۔ اس سے دیواروں اور چھت پر پلستر کرنے کا کام لیا جا سکتا ہے۔

ریشے دار زراعتی فضلہ نہ تو مویشیوں کو کھلانے کے کام آتا ہے اور نہ ہی کھاد کے طور پر استعمال ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سے چھتوں اور دیواروں کے لیے تختے اور طرح طرح کے بلاک تیار کئے جا سکتے ہیں۔ کیلے کے فضلے کو اُبالنے سے لیئی جیسا رنگدار مادہ نکلتا ہے۔ اسے سستے مکانوں میں واٹر پروف کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اور بہت سے فضلے ہیں، مثلاً پُرانے اور بیکار ٹائر، ربڑ کا فضلہ، گھٹیا درجے کا مجُورا، کوئلہ، درختوں کی چھال، گھریلو کوڑا کرکٹ اور گندہ تیل وغیرہ جنھیں کام میں لایا جا سکتا ہے۔

بڑے بڑے شہروں میں پُرانی اور بوسیدہ عمارتوں کو گرانے اور سڑکوں کو اکھاڑنے سے جو ملبہ نکلتا ہے اُسے لیجا کر نشیبی علاقوں میں پھینک دیا جاتا ہے اور اس طرح ان نشیبی علاقوں کی سطح ہموار کی جاتی ہے۔ لیکن اب سوچا جا رہا ہے کہ پُرانے کنکریٹ کو کُوٹ چھان کر دوبارہ عمارت سازی کے کام میں لایا جائے۔

خبر ہے کہ جلد ہی ایک نیشنل ہاؤسنگ اسکیم تیار کی جائے گی جس کا مقصد سماج کے سبھی طبقوں کے لوگوں کو سَر چھُپانے کی جگہ مُہیا کرنا ہوگا۔ اس سے عمارتی پراجیکٹ اُمبھر کر سامنے آئیں گے۔ اور مکان تعمیر کئے جائیں گے۔ اس لیے اور بھی ضروری ہو گیا ہے کہ آئندہ برسوں میں عمارتی ساز و سامان کی تیاری اور زیادہ بڑھائی جائے۔

اِن تمام باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے حال ہی میں دلّی میں ایک تین روزہ مذاکرہ ہوا جس کا موضوع یہ تھا کہ عمارتی سامان تیار کرنے والی صنعتیں فضلوں سے دولت پیدا کرنے کے سلسلے میں کیا پارٹ ادا کر سکتی ہیں۔ اس کا انتظام سیمنٹ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے کیا تھا اور ایسے بہت سے دیگر اداروں کا تعاون حاصل تھا۔ مذاکرے کا موضوع بڑا پُر معنی تھا۔ اس کا ایک پہلو تو یہ نکلتا تھا کہ ماحول کو مزید خراب ہونے سے بچایا جائے کیوں کہ ملک میں صنعتی اور زراعتی فضلوں کی مقدار روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ دوسرے اس سے یہ اُمید پیدا ہوتی تھی کہ ان تمام فضلوں کو کارآمد اشیا کی شکل دی جائے اور ملک کی دولت میں اضافہ کیا جائے۔ اس کا تیسرا پہلو سماجی ذمّے داری کے متعلق تھا، یعنی کہ ہم کس طرح مناسب لاگت سے متبادل عمارتی سامان تیار کر سکتے ہیں جو کہ سماج کے لاکھوں لوگوں کے کام آئے۔ مذاکرے میں ماہرین سَر جوڑ کر بیٹھے اور انھوں نے اپنے اپنے علم اور تجربوں کا آپس میں تبادلہ کیا تاکہ کوئی معقول اور قابلِ عمل حکمتِ عملی تیار کی جا سکے۔ اُمید کرنی چاہیئے کہ اس مذاکرے کا نتیجہ خاطر خواہ نکلے گا اور ہمارے ماہرین ایسے طریقے نکالیں گے جن کی مدد سے مختلف النوع فضلوں سے عمارتی سامان تیار کیا جا سکے گا۔ یہ سامان دیہاتی اور نیم شہری علاقوں کے لیے خاص طور پر مفید ثابت ہوگا۔

★

غزل

شمس غازی آبادی

خیالِ گردشِ لیل و نہار مت کرنا
سفر سفر ہے مرا انتظار مت کرنا

قدم اٹھیں گے تو اٹھے گی گرد بھی لیکن
تم اپنے عزم کو نذرِ غبار مت کرنا

عجیب نہیں کوئی رہبر نما ہی رہزن ہو
تم اپنے سائے کا بھی اعتبار مت کرنا

جنوں کا کام اُلجھنا ہے خارزاروں سے
کہیں بھی خواہشِ فصلِ بہار مت کرنا

یقین و امنِ حسنِ خودی کی دولت ہے
یقیں کا دامنِ دل داغدار مت کرنا

ٹھہر نہ جانا رہِ پیچ و خم سے گھبرا کر
جنونِ ذوقِ سفر سے فرار مت کرنا

یہ اور بات ہے کانٹوں کی تشنگی نہ بجھے
تم اپنے زخمِ کفِ پا شمار مت کرنا

نظر میں بس وہی اک منزلِ جمال رہے
کہیں بھی تذکرۂ حسنِ یار مت کرنا

چلے ہی جانا جہاں تک قدم جواب نہ دیں
جو گر بھی جاؤ تو اُٹھنا قرار مت کرنا

اُبھرنا شمسِ سحر کے پیامبر بن کر
ادائے لیلیٔ شب تار تار مت کرنا

ایم ۔ ایل گپتہ

روزگار اور ڈگریاں

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے ۵ نومبر ۱۹۸۴ کو قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ سرکار ڈگری کو ملازمتوں کے لیے غیر ضروری قرار دینے کے سوال پر غور کر رہی ہے۔ اسی طرح ایک کھلی یونیورسٹی قائم کرنے کے سوال پر بھی غور کیا جارہا ہے جہاں سے ہر طالب علم کو کالج اور یونیورسٹی میں جائے بغیر اعلیٰ تعلیم حاصل ہوسکے۔ شری راجیو گاندھی نے یہ بھی کہا کہ تعلیم کا سماج کی پیداواری سرگرمیوں سے قریبی رابطہ ہونا چاہیئے نیز پیشہ ورانہ تعلیم کی اس طرح تنظیم نو ہونی چاہیئے جس سے وہ صنعت، زراعت، مواصلات اور ملک کے دوسرے پیداواری شعبوں کے افرادی قوت کے تقاضے پورے کرسکے۔

وزیر اعظم کا یہ اعلان ملک کے لیے ایک نئی تعلیمی پالیسی کی تشکیل کا پیش خیمہ ہے۔ اس اعلان کے بعد ملک بھر میں ڈگریوں کو ملازمتوں سے الگ کرنے کے سوال پر سرگرمی سے غور و فکر شروع ہوگیا۔

تعلیم کا مقصد اور روزگار

ملک میں غیر ملکی حکومت کے قیام کے بعد تعلیم کا سب سے بڑا مقصد اچھا روزگار حاصل کرنا رہ گیا تھا۔ جب جاگیردارانہ نظام ختم ہوا اور ملک کے دیہی و معاشی ذرائع پر غیر ملکی یلغار ہوئی تو اقتصادی نظام اس طرح درہم برہم ہوا کہ سماج میں سب سے معزز پیشہ سرکاری ملازمت یا بڑی بڑی کمپنیوں میں تقرری رہ گئی جن پر غیر ملکی سرمایہ داروں کی اجارہ داری تھی۔ برطانوی حاکموں کو اپنی دفترشاہی کے لیے بڑی تعداد میں ملازم مطلوب تھے۔ یہ ضرورت پوری کرنے کے لیے انھوں نے ملک میں ایسا تعلیمی نظام رائج کیا جس سے نکلنے والا ہر طالب علم ملازمت اور بالخصوص سفید پوش سرکاری ملازمت کا متلاشی تھا۔ عوام کی اس تعلیمی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کالج اور یونیورسٹیاں قائم کی گئیں اور ان یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ایسے تعلیمی نصاب رائج کئے گئے جن کا مقصد طلبا کو ایک ہی قسم کی تعلیم دینا تھا۔ آہستہ آہستہ ان کالجوں اور یونیورسٹیوں سے تعلیم پاکر نکلنے والے طلبا کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ وہ سب ایک ہی قسم کی نوکریوں کے طلب گار تھے اس لیے اچھی سرکاری اور ادارہ جاتی ملازمتوں کے لیے سرٹیفکیٹوں اور ڈگریوں کی شرط عائد کر دی گئی جو آج تک برقرار ہے۔ بلکہ جوں جوں اس قسم کی تعلیم پانے والے افراد کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے ملازمتوں کے مزید زمروں کے لیے ڈگریوں کی شرط عائد ہوتی چلی گئی ہے۔

ملک میں روزگار کے مواقع کم تھے تھوڑی تعلیم سے کوئی روزگار نہیں ملتا تھا اور تھوڑی تعلیم کسی طالب علم کو کسی روزگار کے قابل بھی نہیں بنا سکتی تھی اس لیے ہر طالب علم کی تعلیمی کوشش کا ایک ہی نصب العین رہ گیا کہ وہ کسی کسی طرح کوئی ڈگری حاصل کرے اور پھر روزگار کے میدان میں اپنا مقدر آزمائے۔

ملک میں روزگار کے وسیلوں کی کمی اور ملازمت محفوظ ترین ذریعہ معاش خیال کئے جانے کے سبب والدین کی بھی یہی خواہش رہی کہ اُن کے بچے کوئی ڈگری حاصل کرکے برسرِ روزگار ہوجائیں۔ اس طرح ڈگریوں کو ملک کے معاشی نظام میں بہت بلند مقام حاصل ہوگیا ہے اور پورے تعلیمی نظام میں زیادہ زور تعلیمی معیار کو بلند کرنے پر نہیں بلکہ ڈگریوں کے حصول پر دیا جانے لگا ہے۔ چنانچہ ملک کے تعلیمی نظام میں جو بہت سی خامیاں نظر آتی ہیں اُن کا بڑا سبب بھی ڈگریاں حاصل کرنے کی یہ دوڑ ہی ہے۔

کالجوں اور طلبا کی بھرمار

ڈگری حاصل کرنے کی اس دھن میں ملک کا ہر طبقہ اور ہر فرد چاہتا ہے کہ اُس کا اپنا یا اُس کے علاقے کا اپنا کوئی نزدیکی کالج ہو جہاں سے اُن کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکیں اور اچھی ملازمتوں پر فائز ہوسکیں۔ اس جذبے کے تحت ملک کے تعلیمی نظام میں کتنی توسیع ہوتی ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں پانچ لاکھ پرائمری، ۶۰ ہزار سیکنڈری سکول، پانچ ہزار کالج اور ۱۴۰ یونیورسٹیاں ہیں۔ صرف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد ۳۴ لاکھ ہے۔ دنیا میں پرائمری اسکول میں داخل

ہونے والا ہر چھٹا بچہ، ثانوی اسکول میں داخل ہونے والا ہر ساتواں بچہ اور کالج میں داخل ہونے والا ہر آٹھواں بچہ ہندوستانی ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اساتذہ کی کل تعداد نیوزی لینڈ کی کل آبادی سے زیادہ ہے۔

کالجوں سے ڈگریاں حاصل کرنے کی دوڑ اتنی بڑھ چکی ہے کہ شہروں اور قصبات میں دھڑا دھڑ کالج کھل رہے ہیں۔ حالانکہ اُن میں سے کئی کالج ایسے ہیں جن کے لیے مطلوبہ تعداد میں طلبا بھی نہیں ملتے۔ تقریباً دو ہزار کالج ایسے ہیں جہاں طلبا کی تعداد ایک ہزار اور پانچ سو کے درمیان ہے۔

کالج یا یونیورسٹی کا سرٹیفکیٹ یا ڈگری روزگار کی ضمانت نہیں ہے لیکن ملک کے موجودہ ماحول میں لوگوں کے دِلوں میں یہ بات گھر کر گئی ہے کہ کسی سرٹیفکیٹ یا ڈگری کے بغیر کوئی ڈھب کا روزگار حاصل نہیں ہو سکتا۔ اخبارات میں سرکاری یا غیر سرکاری اشتہاروں میں ملازمت کے لیے پہلی شرط کوئی نہ کوئی ڈگری ہوتی ہے۔ ملازمت کا کوئی طلبگار خواہ کتنا ہی ذہین اور تجربہ کار کیوں نہ ہو جب تک اُس کے پاس کسی یونیورسٹی کا کالج کا ڈگری کا پروانہ نہ ہو اُس سب مہارت اور ذہانت بے کار سمجھی جاتی ہے۔ اسی دَوڑ میں ڈگریاں حاصل کرنے والوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ ڈگری ملازمت کی ضمانت نہیں رہی بلکہ بے کاری کی علامت بنتی جا رہی ہے۔

ڈگریاں اور بے روزگاری

ڈگریوں اور سرٹیفکیٹوں کے لیے کالجوں میں داخلے کی بھیڑ نے ملازمت کے میدان میں بے روزگاروں کی تعداد میں کتنا اضافہ کیا ہے، اس کا اندازہ ملک میں روزگار دلانے والے دفتروں میں مندرج پڑھے لکھے بے روزگاروں کی تعداد سے لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۹۸۴ء کے آخر میں زراعت کے ۱۰ ہزار علاج مویشیاں کے ایک ہزار، بی ایڈ یعنی اساتذہ ایک لاکھ ۲۴ ہزار فنون یعنی آرٹس کے چار لاکھ ۴۵ ہزار گریجویٹ آرٹس کے ۴۰ ہزار پوسٹ گریجویٹ، سائنس کے ایک لاکھ ۹۶ ہزار گریجویٹ، ۱۳ ہزار پوسٹ گریجویٹ، کامرس کے ایک لاکھ ۴۵ ہزار گریجویٹ، ۹ ہزار پوسٹ گریجویٹ اور دوسرے مضامین کے دو لاکھ تین ہزار گریجویٹ بیکار تھے۔ اس طرح روزگار دلانے والے دفتروں میں نام درج کرانے والے کل بے کار گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ افراد کی تعداد کا تخمینہ ۱۳ لاکھ ۲۴ ہزار ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے گریجویٹ ایسے بھی ہیں جو مالی مجبوریوں کے سبب ایسی ملازمتیں قبول کر لیتے ہیں جن کے لیے ڈگری کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن اُن آسامیوں پر کام کرتے ہوئے اُنھیں ایک بے اطمینانی اور بے چینی کا احساس جاری رہتا ہے اور یہ بے اطمینانی سماج کے تئیں اُن کے رَویّے سے جھلکتی رہتی ہے۔ دوسری جانب بہت سے گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ اپنی علمی قابلیت سے کم ملازمتیں قبول کرنا ہتک سمجھتے ہیں اور اُن کا غصہ مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

جموں و کشمیر میں اعلیٰ تعلیم عام اور مفت ہے۔ ہر طالب علم کوئی نہ کوئی ڈگری حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن ریاست میں روزگار کے زیادہ وسیلے نہیں ہیں۔ چنانچہ بے کار تعلیم یافتہ افراد کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ راقم الحروف کا ذاتی مشاہدہ ہے کہ وہاں بے کار گریجویٹوں نے اپنی انجمنیں اور یونینیں بنا رکھی ہیں، جو منظم ہو کر حکومت سے ملازمتوں کے مطالبے کرتی رہتی ہیں۔ سرینگر کے محلّے محلّے میں بے کار گریجویٹ یونینیں بنی ہوئی ہیں۔ کسی بھی سرکار کے خلاف کوئی جلوس نکلے یہ لوگ اپنے اپنے بینچ اٹھا کر اس میں نعرے لگانے کے لیے شامل ہو جاتے ہیں۔

ملک میں میٹرک اور ہائر سیکنڈری کے سرٹیفکیٹ یا ڈپلومہ رکھنے والے بیکاروں کی تعداد کا تخمینہ ۳۳ لاکھ ۱۴ ہزار ہے۔ اس طرح ملک میں تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی کل تعداد کا تخمینہ ۴۶ لاکھ ۵۶ ہزار ہے۔

اتنا بڑا تعلیمی نظام اور پڑھے لکھے بے روزگاروں کی اتنی بڑی تعداد کسی بہت بڑی خامی کی طرف اشارہ کرتی ہے جو ہمارے تعلیمی نظام میں موجود ہے۔ ایک بچّہ جو آج پیدا ہوتا ہے، اکیسویں صدی میں یونیورسٹی کا طالب علم ہوگا۔ لہٰذا جو تعلیم مستقبل کے تقاضوں کو مدنظر نہیں رکھتی وہ صحیح معنوں میں تعلیم نہیں کہلا سکتی۔ یہ قول ہمارے دَور کے لیے اور بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ زمانہ حال بے مثال رفتار سے مستقبل کی جانب آگے بڑھ رہا ہے۔ علم کے ہر شعبے میں بے پناہ ترقی ہو رہی ہے۔ ہر ڈگری دو چار برس بعد پرانی بلکہ فرسودہ دکھائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ ہر محکمے میں اعلیٰ ملازمتوں پر فائز افراد کو بھی اُن کی لائنوں کی تازہ ترین معلومات سے بہرہ ور کرنے کے لیے اُنھیں ریفریشر کورس کی تربیت کے لیے بھیجنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ملک کے تعلیمی نظام کی پرکھ اس معیار سے کی جانی چاہیے کہ وہ آئندہ صدی میں ایک خوددار اور خودکفیل ملک کے طور پر داخلے کے لیے اُسے علم و ہنر کی بنیاد کہاں تک مہیا کر سکتا ہے؟

مذکورہ بالا امور کا یہ مطلب نہیں کہ تعلیمی نظام کی خامیوں کو دُور کرنے کے لیے اب تک کچھ نہیں کیا گیا۔ ہمارے دانشوروں اور قومی رہنماؤں نے وقتاً فوقتاً اس ضرورت کو سمجھا اور ان خامیوں کو دُور کرنے کے لیے دوسرے ملکوں کے تعلیمی نظاموں کی روشنی میں کئی تجربات بھی کیے گئے ہیں بلکہ یوں کہنا درست ہوگا کہ آزادی کے بعد سے ہی یہ ملک تعلیم کے محاذ پر بھی مقدر کی لڑائی لڑ رہا ہے۔ اگرچہ اس کے نتیجے خاطر خواہ نہیں نکلے اور ہمارا پیچیدہ تعلیمی نظام وقت

کے تقاضے پورے نہیں کرتا۔

تعلیمی نظام صرف روزگار کا مسئلہ ہی حل نہیں کر سکتا بلکہ یہ سوال بھی پوچھا جا رہا ہے کہ یہ ہمارا ہمہ گیر نظام قومی ترقی اور یکجہتی کے عمل میں کیا حصہ ادا کر رہا ہے۔ ملک میں عام طور پر یہ احساس پایا جاتا ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام نوآبادیاتی نظام کے قائم کردہ تعلیمی سلسلے کی جکڑ بندیوں کو نہیں توڑ سکتا۔ اس طرح یہ نظام سماجی اور اقتصادی ترقی کی سطح کو بلند کرنے کے لیے درکار راہیں مہیا کرنے کی ذمہ داریوں پوری کرنے کے لیے بھی نہایت ناکافی ثابت ہوا ہے۔

اس لیے حکومت اور تعلیمی سطح پر یہ ضروری سمجھا جا رہا ہے کہ قومی نصب العین اور طویل المدت تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کچھ فوری اقدامات کی ضرورت ہے جن سے ہماری تعلیمی کوششوں کو نئی تحریک ملے اور انھیں سماجی تبدیلیوں کا مؤثر آلہ کار بنایا جا سکے۔

ڈگری کی ملازمت سے علیحدگی کی ضرورت

ملک کے تعلیمی نظام کے سلسلۂ امتحانات میں بھی بے شمار خامیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس کا سبب بھی یہی ہے کہ ڈگری کو ملازمت کا پروانہ سمجھ لیا گیا ہے۔ طلبا اعلیٰ قابلیت حاصل کرنے کی بجائے کسی نہ کسی طرح ڈگری حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ نوٹس، خلاصوں، نقل اور دوسری دھاندلے بازی سے ڈگری لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ امتحانوں کے پورے نظام پر ازسرِنو غور کرنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ یہ بھی سوچا جا رہا ہے کہ امتحان نصاب کے آخر میں نہیں بلکہ پورے نصاب کے دوران جاری رہنے چاہئیں۔ علاوہ ازیں امتحان خارجی نہیں بلکہ داخلی ہونے چاہئیں۔

امتحانی اصلاحات کے علاوہ درجِ ذیل ضروریات کے پیشِ نظر ملازمتوں کو ڈگریوں سے الگ کرنے کی تجویز پر سرگرمی سے غور ہو رہا ہے:-

۱۔ دنیا میں ٹیکنیکل تبدیلیوں کا عمل اتنا تیز ہے کہ تعلیم یافتہ افراد کی ہنرمندی بے کار ہوتی جا رہی ہے۔ انھیں پھر سے تربیت دلانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

۲۔ تعلیمی نظام سماجی نظام میں ہو رہی تبدیلیوں کو پورا نہیں کر رہا جس سے تعلیم اور روزگار کا باہمی رشتہ ٹوٹ رہا ہے۔

۳۔ تعلیم یافتہ افراد اور روزگار کے شعبے میں یہ عدم مساوات ترقی پذیر ملکوں میں بہت زیادہ ہے۔ اس کا سبب یہ ہے ترقی پذیر ملک تعلیم کے عالمی راستے پر چل نکلے ہیں اور ان کے پاس ترقی یافتہ ملکوں کے تعلیمی نظام کی نقل کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔

ماہرینِ تعلیم اور روزگار کی رائے ہے کہ اگر ڈگری کی شرط کو ملازمت سے الگ کر دیا جائے تو کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم پر دباؤ بہت کم ہو جائے گا۔ اگر ملازمتوں کے لیے ڈگری کی شرط لازم نہ رہے اور کالج کی تعلیم پر دباؤ کم ہو جائے تو اعلیٰ تعلیمی اداروں کے عام فرض یعنی علمی تحقیق و توسیع کے کام کو بحال کرنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

اسی طرح جب ملازمت اور ڈگری کا رشتہ ٹوٹ جائے گا اور ہر امیدوار کو ڈگری کی سرنگ میں سے گزر کر آنے پر اصرار ختم کر دیا جائے گا تو علم حاصل کرنے کا عمل بھی نئی ٹیکنالوجی کی تحقیق اور ترقی کی نئی راہیں تلاش کرنے کے لیے آگے بڑھنے لگے گا۔

امیدواروں کی پرکھ

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ سرکاری یا منظم دائرۂ کار میں ملازمت کے خواہش مند امیدواروں کی قابلیت کی جانچ کے لیے کوئی نہ کوئی پیمانہ تو ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں سوچا جا رہا ہے کہ مختلف ملازمتوں کے لیے درکار اہلیت اور امیدوار کے استحقاق کی پرکھ کے لیے ایک قومی مقابلہ شروع کر دیا جائے۔ اس قومی امتحان کی بنا پر امیدواروں کو مختلف کاموں کے لیے زمرہ بندی کی جا سکتی ہے اور یہ امتحان ان کی پرکھ کے لیے کسوٹی کا کام دے سکتا ہے۔ یہ امتحان بلا لحاظ زبان اور علاقہ سب امیدواروں کے لیے غیر امتیازی ہوگا اور قومی پیمانے پر امیدواروں کی جانچ کا ایک غیر جانبدارانہ ذریعہ بھی بن جائے گا۔

پیشہ ورانہ تعلیم

ہمارا ملک ایک غریب ملک ہے بہت کم لوگ صرف اعلیٰ قابلیت کے لیے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان کے لیے جو تعلیم روزگار مہیا نہیں کر سکتی وہ تعلیم نہیں ہے۔ چنانچہ آزادی کے بعد تعلیم کے ذریعہ روزگار کے پہلو پر بھی غور ہوا ہے۔ منصوبے بنانے والوں نے پیشہ ورانہ تربیت کی ضرورت کے پیشِ نظر تعلیم کے ڈھانچے میں ضروری تبدیلیاں کرنے کی سفارشیں بھی کی ہیں۔ ان سفارشات میں کہا گیا ہے کہ دسویں کے بعد دو یا تین برس کی تعلیم میں ایسی پیشہ ورانہ شاخیں شامل کی جائیں جو طالب علموں اور روزگار کی منڈی کی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہائر سیکنڈری اور کالج کے نچلے درجوں میں تعلیم کو پیشہ ورانہ رنگ دیا جائے۔ کوٹھاری کمیشن کی سفارشات اس ضمن میں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن ان پر عمل کی رفتار بہت سست رہتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے سماج میں مختلف دستکاریوں اور کام دھندوں کو زیادہ عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا اور جب تک اچھی ملازمت کے لیے ڈگری کی شرط موجود ہے ہر طالب علم کی نگاہ ڈگری کی چوٹی کی جانب ہی لگی رہتی ہے۔ اس لیے طالب علم اور ان کے والدین پیشہ ورانہ نصابات کے انتخاب سے ہچکچاتے ہیں۔

ڈگری کی شرط کو ملازمت سے الگ کرنے کے

سوال پر غور کرنے کے لیے پارتھا سارتھی کمیٹی قائم کی گئی ہے۔ اُس کی سفارشات ابھی موصول نہیں ہوئیں۔ سفارشات موصول ہو جانے پر انھیں ملک کی نئی تعلیمی پالیسی میں شامل کیا جائے گا جس کا ایک بڑا مقصد یہ ہوگا کہ پوسٹ گریجویٹ نصابات میں داخلے اور عام نوعیت کی بہت سی ملازمتوں کے امتحانوں کے لیے ڈگری کی شرط ہٹا دی جائے اور ملازمت کے لیے اُمیدواروں کی جانچ کے لیے قومی پیمانے پر امتحان کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ یہ نئی تعلیمی پالیسی اس برس ماہ جولائی سے شروع ہو جانے کا امکان ہے۔

کھلی یونیورسٹی

وزیر اعظم نے ایک کھلی یونیورسٹی کے قیام کی ضرورت پر بھی توجہ دلائی ہے، جہاں کسی کالج میں داخلہ لیے بغیر اعلیٰ تعلیم حاصل کی جا سکے۔ اس یونیورسٹی کی ضرورت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ اگر ملازمتوں کے لیے ڈگری کی شرط نہ رہے، اور امیدواروں کی قابلیت کی جانچ کے لیے قومی پیمانے کا [پر امتحان] شروع ہو جائے تو طلبا کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش پوری کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی اہتمام کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں حکومت اور تعلیمی اداروں کی سطح پر کافی دیر سے غور و خوض جاری ہے۔

اپریل ۱۹۷۴ میں اس سوال پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی قائم کی گئی تھی۔ اس کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ یہ کمیٹی کارکن آبادی کے ایسے افراد کے لیے جو باقاعدہ سے یونیورسٹی ملازمت میں شامل نہیں ہو سکتے اور خانہ دار عورتوں کے لیے جو مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہوں تعلیم کا خصوصی پروگرام بنائے۔ اس وقت اس کمیٹی نے جو سفارشات کیں ان پر غور کرنے کے بعد یہ محسوس کیا گیا کہ ابھی ایسی یونیورسٹی قائم کرنے کا وقت نہیں آیا۔

لیکن اب حالات کافی بدل چکے ہیں۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں پر دباؤ متواتر بڑھتا جا رہا ہے۔ دور افتادہ علاقوں میں بھی کالج کھولنے کی مانگ کی جا رہی ہے۔ قومی نصب العین اور ملکی اتحاد کو بڑھانے کے لیے طلبا میں ضروری اہلیت اور بیداری پیدا کرنے کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ کھلی یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے حالات ویسے بھی سازگار ہوتے جا رہے ہیں۔ ہندوستان کو مواصلاتی ٹیکنالوجی میں کافی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ مصنوعی سیارہ انسیٹ وَن بی چالو ہو جانے سے ہم ملک کے دُور دراز حصوں تک اپنے پروگرام آسانی سے پہنچا سکتے ہیں۔ اس لیے بجائے اس کے کہ پورے وقت کے کالجوں کی تعداد بڑھائی جائے، یہ بہتر ہوگا کہ مواصلاتی ذرائع سے طلبا کی تعلیمی ضروریات پوری کی جائیں۔

کھلی یونیورسٹی کے دو بڑے فائدے ہو سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ قومی پیمانے کی کھلی یونیورسٹی جو پورے ملک کے لیے کام کرے گی، اس کا موجودہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصابات اور تکنیک پر فیصلہ کن اثر پڑے گا۔ اور دوسرے یہ کہ قومی یونیورسٹی جس کے لیے ریاستوں یا نو بانوں کی کوئی قید نہیں ہوگی، ملک میں قومی یک جہتی اور اتحاد پیدا کرنے کا ایک بڑا ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔ کھلی یونیورسٹی تعلیم میں نئے نئے تجربات بھی کر سکتی ہے۔ طلبا کو بہت سے مضامین میں سے اپنی پسند کے مضامین منتخب کرنے کی چھوٹ دی جا سکتی ہے۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ کھلی یونیورسٹی کے تعلیمی پروگرام اس ڈھنگ سے وضع کیے جا سکتے ہیں جن سے طلبا کی شخصیت کا ارتقا ہو اور اُن میں تخلیقی قوت، بیداری اور ہنرمندی پیدا ہو۔

ماہرینِ تعلیم کا خیال ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ کھلی یونیورسٹی کے پروگرام کسی ڈگری سے وابستہ ہوں۔ البتہ جہاں طالب علم ضروری قابلیت کا مظاہرہ کریں اُن کے لیے ڈگری دینے کا اہتمام بھی ہو سکتا ہے۔ ماہرین کی یہ بھی رائے ہے کہ کھلی یونیورسٹی میں کوئی نصاب مقررہ مدت میں ختم کرنے کی زور نہیں دینا جانا چاہیے اور نہ ہی داخلے کے لیے کم از کم قابلیت پر زور دیا جانا چاہیے ورنہ یہ یونیورسٹی کھلی یونیورسٹی نہیں رہے گی۔

کھلی یونیورسٹی میں کلاسوں کی ضرورت نہیں ہوگی۔ چھپا ہوا مواد، ریڈیو، ٹی۔ وی سے سبق، کیسٹ، ٹیپ وغیرہ تعلیم دینے کے لیے استعمال ہونے چاہئیں۔ ایسی یونیورسٹی ملک کے مختلف مقامات پر اپنے مطالعاتی مرکز بھی قائم کرے گی جہاں سے طلبا کو ہدایات اور تعلیمی سامان حاصل ہو سکے گا۔ پارتھا سارتھی کمیٹی کا خیال ہے کہ وقت پاکر ہم کھلی یونیورسٹی کے لیے ریڈیو اور ٹی۔ وی کے اپنے چینل قائم کرنے کے بارے میں بھی سوچ سکتے ہیں جو صرف تعلیمی مقاصد کے لیے استعمال کیے جائیں۔

کمیٹی کا خیال ہے کہ اگرچہ ایسی یونیورسٹی میں داخلہ لینے والے طلبا کی تعداد کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اُس میں کسی طالب علم کو داخلے سے انکار نہیں کیا جائے گا۔ اس یونیورسٹی کے پروگرام ایسے ہوں گے جن سے طلبا میں روزگار اور ہنرمندی حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی وہ اپنے روزگار بھی شروع کر سکیں گے اور حتی المقدور اپنی علمی صلاحیتوں میں بھی اضافہ کر سکیں گے۔

اس طرح قومی پیمانے پر امتحان اور ایک کھلی یونیورسٹی کا قیام ڈگری کو ملازمتوں سے الگ کرنے کے لیے بہت حد تک مددگار ثابت ہوگا کیونکہ روزگار کے مواقع کے لیے مقررہ قابلیت کے اُمیدوار ڈگری کی شرط کے باوجود حاصل ہو سکیں گے اور جو لوگ ملازمتوں میں رہ کر یا یونیورسٹی کالجوں میں گئے بغیر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہیں اور جس قسم کی بھی تعلیم حاصل کرنا چاہیں وہ انھیں ایک کھلی یونیورسٹی کے ذریعے حاصل ہو سکے گی۔ ★

وسنت ساٹھے

مُعاشرتی اِنقلاب کی جانِب

اِقتصادی جمہُوریت کا مُقدمہ

مُستقبل کے امکانات

قِسط : ۱۸

نوع انسانی ایک غور وفکر کرنے والی مخلوق ہے اور اُس کے دوگونہ مقاصد ہیں۔ اوّل بقاء حاصل کرنا اور دوئم علم کے توسط سے ارتقائی بلندیوں پر پہونچنا۔ اگرچہ اس تمام تر ارتقائی عمل میں انسان خود کو کمی و ناداری کے خلاف محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے، تاہم اس کے ساتھ ہی وہ اپنے اردگرد کی دُنیا کو زیادہ سے زیادہ جاننے کے لیے کوشاں ہے۔ وہ تمام تر تخلیق کے ماخذ اور سب کو جاننے کی تگ و دَو کر رہا ہے اور اس عمل میں وہ متواتر کوئی نہ کوئی نئی دریافت اور نئی چیز ایجاد کر رہا ہے! اسطرح اگرچہ اُس کی ذہنی صلاحیتوں کا متواتر ارتقا ہو رہا ہے تاہم وہ ایک قسم کے عدم سلامتی کے احساس سے پریشان ہے جو زیادہ تر اُسے اپنی ہستی کے فنا ہونے کے خوف سے پیدا ہوگیا ہے۔

ہر غور و فکر کرنے والا شخص خواہ اُس کی پوزیشن کچھ ہو ایٹمی جنگ سے ہونیوالے خطرے سے آشنا ہے۔ تاہم اس موہوم اُمید میں کہ پہلے پہل وار کرکے دُشمن پر قابو پا لیا جائے ہتھیاروں کی دَوڑ جاری ہے جس پر ہر سال اربوں کھربوں ڈالر خرچ کئے جا رہے ہیں۔ خواہ کوئی متعلقہ حکام اور عوام کو یقین دلا بھی دے کہ اس امر کا کوئی ڈر نہیں ہے کہ کوئی بٹن دَبا کر تباہی خیز ایٹمی جنگ شروع کر دے گا پھر بھی اس امر سے زیادہ تباہ کُن ایٹمی ہتھیار رکھنے کی خواہش کو تحریک ملے گی کہ کسی اور کے اسلحہ خانے میں ایٹمی ہتھیار موجود ہیں۔

ہندوستانی دیومالا میں ارتقاء کا تصور موجود ہے جو کم و بیش ڈارون کے نظریے سے مطابقت رکھتا ہے۔ آبی زندگی کے مرحلے سے لے کر ارتقائی عمل بُدھ کے بعد کے زمانے تک پہنچا ہے اور اس عمل کے آخری مرحلے میں کلکی اَوتار دکھایا گیا ہے۔ جو گھوڑے پر سوار ہے اور ہزاروں سُورجوں کی طاقت سے تمام کائنات کو فنا کر رہا ہے اور اس کے بعد تخلیق کا نیا سلسلہ دوبارہ شروع ہو جائیگا۔ کونسا گھوڑ سوار یا کونسا مُہم جُو سیاستدان بٹن دبا سکتا ہے، یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا محض اندازہ لگاتے ہی خوف سے لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

نسلِ انسانی کو سب سے زیادہ خطرہ ان نام نہاد عملی انسانوں سے ہے جن کے پاس بے پناہ طاقت ہے اور جو ملکوں کے سربراہ ہوتے ہوئے اس پوزیشن میں ہیں کہ وہ اس تمام کرۂ ارض کو اُڑا سکتے ہیں۔ ان سب کو فنِ خطابت میں کمال حاصل ہے اور وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں امن و خوشحالی، افلاس، بھوک اور امراض کے اِنسداد اور عالمی بھائی چارے جیسے خوش کن الفاظ کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ خدا اور اُس کے پیغمبروں کے نام پر کیا جاتا ہے، لیکن جب یہ لیڈر جرنیلوں سمیت اپنے ساتھی ناظموں، صنعت کاروں یا ہتھیاروں کا کاروبار کرنے والے تاجروں پر مشتمل چھوٹی سی میٹنگ بلاتا ہے تو اُس وقت وہ ایک مختلف انسان بن جاتا ہے۔ وہاں وہ ایسے ہتھیاروں کی تیاری کی تجویز کا چرچا ہی نہیں کرتا بلکہ اُس کی پُر زور حمایت کرتا ہے جن پر خواہ کتنی بھی لاگت آجائے لیکن جو اس امر کی ضمانت دے سکیں کہ اس سے پہلے کہ دُشمن اُس کے ملک کو تباہ کر سکے دُشمن کا قلع قمع کر دیا جائے گا۔

یہ عظیم طاقت رکھنے والے لوگ نیز چند سائنسداں اور صنعت کار بھی اب چاند پر خلائی قصبوں میں یا پھر انٹارکٹیکا جیسے متروک خطوں میں نئے مسکن تلاش کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں اور وہ یہ کام اس اُمید کے ساتھ کر رہے ہیں کہ کم از کم اُن میں سے کچھ لوگ فنا یا قیامت سے بچ جائیں۔ کُل کائنات کے سیاق و سباق میں تمام تر کرۂ ارض کو اُڑانا بھی گروہ کے ایک چھوٹے

ے ذرّے کو اڑانے کے مترادف ہوگا۔ اس
اظ سے دراصل کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ البتہ
لوگ کائنات کی کلّیت کے نظریہ سے سوچتے
یا وہ بھی چاہتے ہیں کہ نسلِ انسانی کو بقا حاصل
ر اور وہ مزید ارتقاء کرے۔ مادی لحاظ سے مالک
نے کا مطلب اکثر غیر واضح ہوتا ہے اور عام طور
سمجھا جاتا ہے کہ کوئی شخص جس چیز کی خواہش
تا ہے وہ اُس کا مالک بننا چاہتا ہے اور پھر جب
سی کو تجربہ کی بنا پر معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا میں
سی باتیں ہیں جو کسی کی خواہشات کے باوجود عمل
ں آتی ہیں تو اُن پر عبور پانے کا تصور بے معنی
جاتا ہے۔ روحانی لحاظ سے مالک بننے کے لیے
سی صلاحیت ضروری ہے جس سے علم اور معلومات
استعمال کرتے ہوئے بہترین مقصد کے لیے
حول سے مطابقت پیدا کی جائے اور اس کے ساتھ
ا انسان مضبوطی سے اُن آفات کا سامنا کرنے
ے قابل ہو جائے جو تمام احتیاطی تدابیر اختیار کرنے
ے باوجود نتیجتہً عمل میں آسکتی ہیں۔ یہ سائنسی
وحانیت کا دستور کار ہوگا جس سے انسان کو بنیادی
حاظ سے خود کا اور ساری کائنات کا مالک بننے
ے لیے اعتماد حاصل ہوگا۔

منٹ۔ ۱۰ لاکھ ڈالر کیونکر بچائے جائیں؟

جب میں اقوام متحدہ کی قیادت میں تمام تر
ے انسانی کی تحریک کی حمایت کرتا ہوں تو میں
ریکہ، سوویت یونین، یورپ، ایشیا، افریقہ،
لینی امریکہ اور آسٹریلیا کی غالب اکثریت کی توجہ
ں امر کی طرف دلانا چاہتا ہوں کہ ایٹمی تباہی
، صورت میں صرف چند لوگ، غالباً لیڈر تقریباً
قابلِ رسائی مسکنوں میں نقل مکانی کر سکیں گے
ر کروڑوں لوگ جو اپنے گھروں کو چھوڑ نہیں
لیں گے یقیناً فنا ہو جائیں گے۔ یہاں یہ یاد دلانا
ے موقع و محل نہیں ہوگا کہ انہی عوام کے نام پر
ر انہی سے حمایت حاصل کر کے یہ نام نہاد لیڈر
زیادہ تر وہ ہو صنعت اسلحہ سازی پر چھائے ہوئے ہیں،
زیادہ سے زیادہ مہلک ہتھیار بنانے کے لیے
ہتھیاروں کی جنونانہ دوڑ میں متواتر
مصروف ہیں۔ ایک حالیہ اخباری اطلاع میں بتایا
گیا ہے کہ آج دُنیا ایسے ۵۰ ہزار سے زیادہ ایٹمی
ہتھیاروں کے ڈھیر پر بیٹھی ہوئی ہے جن کی مجموعی
طاقت دس لاکھ ہیروشیما قسم کے بموں کے برابر
ہے۔ اگرچہ ۴۰ ہزار سے زیادہ بچے ہر روز بھوک
اور کم غذائیت سے مر رہے ہیں تاہم دُنیا ہر منٹ
ہتھیاروں پر دس لاکھ ڈالر خرچ کر رہی ہے۔
لہٰذا وقت آگیا ہے کہ دنیا بھر کے لوگ اپنی بقا ر
کے مفاد میں بیٹھ کر سوچیں کہ کیا وہ اس پاگل پن
کو روک سکتے ہیں۔ اگر ضروری عزم پیدا کیا جائے اور
اس کے ساتھ ہی اُسے تمام نسلِ انسانی کی مناسب
تحریک حاصل ہو تو خود اقوام متحدہ کو نئی "ایک دنیا"
کی وفاقی حکومت میں منتقل کرنا ممکن ہو جائے گا۔
ہتھیاروں کے تمام تر ذخیرے کو منجمد کیا جا سکتا ہے۔
مختلف ممبر ملکوں کے تمام ہتھیار عالمی وفاق کی
فرماں روائی کے تحت ایسے ہی آسکتے ہیں جس طرح
وہ امریکہ جیسے ایک وفاقی ملک یا سوویت یونین
جیسے ایک کمیونسٹ ملک کی فرماں روائی کے تحت
ہیں۔ آج کی دنیا میں قومی بالادستی کا تصور از خود
بے معنی اور تنگدلانہ تصور بن گیا ہے اور خاص
ممبر ملکوں کے عوام کے مفاد کو کسی طرح گزند نہیں
پہنچے گی۔ اگر تمام دُنیا کے ہتھیار جمع کر کے ایک
عالمی وفاقی حکومت کو زیادہ تر نگرانی کے مقصد
کے لیے سونپ دیئے جائیں۔

تب ملکوں کے درمیان اسی طرح تباہ کُن
جنگیں نہیں ہوں گی جس طرح آج امریکہ میں یا اسی
طرح سوویت یونین میں ایک وفاقی ریاست کی طرف
سے دوسری ریاست کے خلاف جنگ شروع
کرنے کا کوئی خوف نہیں ہے لیکن بعض ملکوں
کی طرف سے اس قدر نفسیاتی جنون پیدا ہو گیا
ہے کہ لوگ ہتھیاروں کی تیاری کو روکنے پر سوچ
بچار کرنے کے لیے تیار بھی نہیں ہیں۔ سائنس
جس رفتار سے ترقی کر رہی ہے اور جس طرح
فاصلے سمٹ رہے ہیں اُسے دیکھتے ہوئے وقت
آگیا ہے کہ عوام ہتھیاروں کی تیاری پر روک لگانے
کے لیے سنجیدگی سے سوچنا شروع کریں۔ توقع ہے کہ
دانشور اس سلسلے میں رہنمائی کریں گے۔ لیکن یہ ہمارا
تجربہ ہے کہ عام لوگوں کو زیادہ فہم و فراست حاصل
ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنے طور پر عاجزانہ ڈھنگ
سے نہ صرف بھارت کے لیڈروں بلکہ اقوام متحدہ
کے سرکردہ اصحاب سے گزارش کر رہا ہوں کہ جب
ہم ۲۱ ویں صدی میں قدم رکھیں تو اس سلسلے میں بعض
خاص مقاصد کے ساتھ ایک تحریک شروع کی جائے۔
اس تحریک میں زیادہ تر ساری دنیا کے نوجوانوں
کو شامل ہونا چاہیئے۔ جن کے لیے مستقبل بڑی
اہمیت کا حامل ہے۔ ۲۱ ویں صدی کی اس
تحریک کے سلسلے میں ۲۱ ویں صدی کے کلبوں کا
ایک سلسلہ شروع کیا جانا چاہیئے۔ میں نہیں سمجھتا کہ
اس تحریک کو کیوں مشکل تصور کیا جانا چاہیئے۔
جبکہ اس سے اقوام متحدہ یا کسی ممبر ملک پر کوئی
مالی بوجھ نہیں پڑے گا۔ لوگ خود ہی کلب شروع
کریں گے۔ انھیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہے
اقوام متحدہ کی حمایت و رہنمائی۔ یہ نوعِ انسانی کے
اُن لیڈروں کے عزم کی علامت کے طور پر ضروری
ہے جو اس عالمی ادارے میں جمع ہوئے ہیں لیکن
مختلف ملکوں کی حکومتوں کی مانند یہ عالمی ادارہ بھی
روزمرّہ کے فوری مسائل میں اُلجھا ہوا ہے جو کہ
ایک قدرتی امر ہے۔ لیکن اگر عالمی لیڈر نسلِ انسانی
کی بقا کے بنیادی مسئلہ کو سمجھ نہیں سکتے تو وہ
اپنے فوری مسئلوں کو بھی نہیں حل کر سکیں گے۔

ہر کوئی متفق ہے کہ آج سائنس اور ٹیکنالوجی
نے نوعِ انسانی کو اس قدر طاقت دی ہے کہ وہ
دھرتی ماتا کے دستیاب انسانی و مادی وسائل
کا مناسب استعمال کر کے ہی روٹی، کپڑا، مکان
اور ادویات کی کمی جیسے افلاس کے بنیادی
مسائل کو حل کر سکتی ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ ہتھیاروں

کی محنت ... پر جو بھاری بھرکم رقم خرچ کی جا رہی ہے اس کے ایک حصے سے ہی افلاس اور امراض سے پیدا ہونے والے مسائل کو حل کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ روپیہ بھارت جیسی ایک زرخیز زمین کے دریاؤں کو منسلک کرنے کے پراجیکٹ پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے نتیجے میں بھارت ایک ایسا کھلیان بن جائیگا جو نہ صرف اپنی بڑھتی ہوئی آبادی بلکہ دوسرے ضرورتمند ملکوں کو بھی اناج فراہم کر سکے گا۔ ایسا ہی افریقہ اور جنوبی امریکہ کے وسیع براعظموں میں کیا جا سکتا ہے۔ کیا انھیں ناممکن خواب تصور کیا جا سکتا ہے جب کہ ان کا بدل نسلِ انسانی کا فنا ہونا ہے؟ لہٰذا مستقبل تقدیر پرستی میں نہیں ہے اور نہ ہی نسلِ انسانی کے امور کو انجام دینے کا کام ذہنی طور پر پریشان، خود غرض اور صحیح طور پر نہ سوچنے والوں کو سونپا جانا چاہیئے خواہ وہ سیاست کے شعبے میں ہوں یا صنعت میں۔ ابتدائی ذمہ داری اُن لوگوں پر عائد ہوتی ہے، جو تعلیم یافتہ ہیں اور عظیم تر عالمگیر تناظر میں سوچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کم از کم اُن کے لیے ضروری ہے کہ وہ سطحی مسئلوں میں اُلجھ کر اپنی دانشوری اور توانائی کو ضائع نہ کریں۔ اگرچہ ان مسئلوں کو حل کرنا ہوگا تاہم یہ کام اُن کا ہے کہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور تمام تر نسلِ انسانی کی بقا کے مفاد میں اپنے غریب ساتھی انسانوں کی رہنمائی کریں۔ اگر کافی اور مضبوط عزم ہو تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے جو حل نہیں کیا جا سکتا۔

مَیں نے اس کتاب میں ایک ایسا ماڈل پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس سے سیاسی جمہوریت کے پہلو بہ پہلو چلنے والی اقتصادی جمہوریت کے لیے ایسے حالات پیدا کئے جا سکتے ہیں جو تمام تر سماج کی متوازن ترقی کے لیے تمام عوام کی شرکت کو یقینی بنا سکتے ہیں۔ مَیں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ یہ ایک کامل ماڈل ہے یا یہ حتمی ماڈل ہے، کیونکہ ایسی کوئی بھی چیز نہیں ہو سکتی جسے حتمی کہا جا سکے کیونکہ سارے کرۂ ارض کے اُڑ جانے کے بعد بھی کچھ نہ کچھ باقی رہ جائے گا۔ جب عقلیت پسند لوگ اکٹھے ہونگے اور تعصب اور جانبداری کے بغیر، بُرے مقاصد کے بغیر، زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کئے بغیر اور برتری کی خواہش کے بغیر آزادی سے سوچنا شروع کریں گے، تو مجھے کوئی شبہ نہیں کہ اس آدرش میں بھی بہتری کی جا سکتی ہے اور اس کے ساتھ ہی خوشحال لوگ ایک نئی اور زیادہ خوبصورت دُنیا کی تخلیق کرنے میں مدد دے سکتے ہیں جس میں انسانی کنبے کے تمام افراد رہ سکتے ہیں۔

مَیں پہلے بتا چکا ہوں کہ میرے خیال و فکر پر گنار میرڈال اور رال پری بیش نے چھاپ لگائی ہے، لیکن جس شخص نے میرے بچپن سے ہی مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ بلاشبہ جواہر لال نہرو تھے۔ اشتراکی جمہوریت کا مجوزہ اقتصادی ڈھانچہ جس میں کچھ خوبیاں بھی ہیں اور کچھ بُرائیاں بھی ہو سکتیں، میرا ہے، تاہم مَیں نے ترقی پذیر ملکوں کے لیے ایک نہایت موزوں آدرش کو فروغ دینے کی جسارت کی ہے۔

مَیں اپنے عاجزانہ ڈھنگ سے متواتر سوچ رہا ہوں کہ تمام تر انسانی کنبہ اس امر کے لیے کیونکر تحریک حاصل کر سکتا ہے جس سے نہ صرف اُس کی بقا یقینی ہو بلکہ تمام نسل انسانی کے لیے ایک بہتر مستقبل کی تعمیر بھی کی جا سکے۔ ۱۹۷۰ء میں کسی وقت مَیں نے بھارت کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کو ایک مراسلہ لکھا تھا جس میں یہ تجویز کیا گیا تھا کہ "۲۰ ویں صدی کے کلبوں" کی صورت میں "۲۱ ویں صدی کی تحریک" شروع کی جائے۔ انھوں نے بکمال مہربانی مجھے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی سلور جوبلی اجلاس کے لیے ایک ڈیلی گیٹ کے طور پر شامل کر لیا وہاں مَیں نے تیسری کمیٹی کے بھارتی وفد کی قیادت کی تھی۔ مَیں اقوام متحدہ میں کوئی اڑھائی مہینے رہا۔ اُس عرصے کے دَوران مَیں نے اُس وقت کے سکریٹری جنرل اوتھان کے ساتھ اس تجویز پر بات چیت کی تھی۔ مَیں نے ڈائریکٹر رابرٹ مُلر سے بات چیت کی اور مجھے اوتھان سے بات چیت کرنے کا ایک اور موقع ملا۔ انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ انھوں نے میری تجویز کو دلچسپ اور مفید پایا ہے اور اگر وہ سکریٹری جنرل بنے رہے تو وہ اس بارے میں کچھ کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن اُن کا مشورہ ہے کہ اقوام متحدہ ابتدائی طور پر ایک بین الحکومتی ادارہ ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ اگر کوئی ممبر ملک اس معاملے کو اُٹھائے۔ انھوں نے سجھاؤ دیا تھا کہ بھارت کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی خود اس تجویز پر پہلکاری کرنے کے بارے میں غور کر سکتی ہیں۔

مَیں نے مسز اندرا گاندھی کو یہ مشورہ پہنچا دیا تھا لیکن انھوں نے شاید یہ محسوس کیا ہوگا کہ ابھی یہ مناسب وقت نہیں ہے کہ جب بھارت کی طرف سے پیش کی جانے والی اس قسم کی تجویز کو موافقانہ ردّ عمل موصول ہو اس لیے یہ معاملہ وہیں کا وہیں رہ گیا۔

اس کے فوراً بعد ۱۹۷۲ میں پھر مسز اندرا گاندھی کی کرم فرمائی سے مَیں مہاراشٹر کے اکولہ حلقے سے ضمنی چناؤ میں پارلیمنٹ کے لیے منتخب ہو گیا۔ مَیں نے پھر اس تجویز پر اُس وقت کے سکریٹری جنرل کرٹ والڈہیم سے بات چیت کی اور اس موضوع پر اقوام متحدہ کے اہل کاروں سے خط و کتابت بھی کی۔

شیڈولڈ کاسٹ
اور
شیڈولڈ ٹرائب

شیڈولڈ کاسٹس اور شیڈولڈ ٹرائب کی بہبود
مختلف پروگراموں کو مرکزی منصوبے کے تحت
۲ کروڑ روپے فراہم کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ
روڑ روپے کی رقم اس کام کے لئے رکھی گئی ہے
سری لنکا سے آئے ہوئے شرنارتھیوں کو
۸۵ کے دوران پھر سے بسایا جائے۔

للاعات ونشریات

۸۶-۱۹۸۵ء میں اطلاعات ونشریات کے لئے
کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔ ملک کی ۰، فی صد
ی کو ٹی۔ وی پروگراموں سے مستفید کرنے کے لئے
ویژن ٹرانسمیٹروں کی تعداد ۳۱ مارچ ۱۹۸۵ء
۱۸۰ کردی گئی ہے۔

بس نکاتی پروگرام

بیس نکاتی پروگرام پر عمل درآمد کی رفتار
کرنے کے لئے مرکزی منصوبے میں ۸۶-۱۹۸۵ء
دوران ۴۹۰۰ کروڑ روپے خرچ کئے جائیں گے
ب کہ ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۴۱۴۱ کروڑ روپے خرچ
ئے جانے تھے۔ اس طرح اس سال کے اخراجات
پلے سال سے ۱۸٫۳ فی صد زیادہ ہیں۔

مل درآمد پر زور

انتظامی طریق میں چند ضروری تبدیلیاں لاکر
۱۹۸۵ء میں عمل درآمد کو تیز تر کیا جائے گا۔
۱۹۸۵ء میں آٹھویں مالیاتی کمیشن کی سفارشات
روشنی میں ریاستوں کو پہلے کے مقابلے زیادہ
م دی جارہی ہیں۔ ریاستوں کو دی جانے والی
دی رقوم ۸۵-۱۹۸۴ء کے بجٹ کے تخمینوں میں
کروڑ روپے تھیں جب کہ ۸۶-۱۹۸۵ء کے
ٹ تخمینوں میں یہ رقم بڑھا کر ۱۲۱۵ کروڑ روپے
ی گئی ہے۔

غیر منصوبہ جاتی اخراجات

۸۶-۱۹۸۵ء میں ۳۲۷۸۶ کروڑ روپے کے غیر منصوبہ جاتی اخراجات کا اندازہ ہے جب کہ ۸۵-۱۹۸۴ء کے نظر ثانی شدہ تخمینوں میں یہ رقم ۲۹۷۴۰ کروڑ روپے تھی۔ اس میں ۳۰۰ کروڑ روپے کی وہ رقم بھی شامل ہے جو مرکزی سرکار کے ملازمتوں کے فاضل مہنگائی بھتے کی ادائیگی کے لئے ہے۔

دفاعی اخراجات ۷۶۸۶ کروڑ روپے کے بقدر ہوں گے۔ سود کی ادائیگیوں کی مد پر ۷۰۷۵ کروڑ روپے کے اخراجات کا اندازہ ہے۔ خوراک کی مد پر سبسڈی ۱۱۰۰ کروڑ روپے اندرون ملک تیار کئے گئے کیمیاوی کھاد کی مد پر سبسڈی ۱۲۰۰ کروڑ روپے اور درآمد شدہ کھاد پر سبسڈی ۶۰۱ کروڑ روپے دی گئی ہے۔

چھٹا منصوبہ ۸۵-۱۹۸۴ء کے مالی سال کے خاتمے پر ختم ہورہا ہے۔ اس کے مصارف بڑھ کر ۱۱۰ ہزار کروڑ روپے تک پہنچ گئے ہیں۔ شروع میں ان اخراجات کا اندازہ ۹۷۵۰۰ کروڑ روپے لگایا گیا تھا جو کہ ۸۰-۱۹۷۹ء کی قیمتوں کی بنیاد پر تھا۔

دیگر اہم امور

۸۶-۱۹۸۵ء کے بجٹ کی کچھ اور اہم باتیں یہ ہیں۔ اس میں تمام فصلوں کا احاطہ کرنے والی بیمہ کی ایک اسکیم شروع کی گئی ہے۔ گندم اور چاول کی سہارا دینے والی قیمتوں کا موجودہ نظام تلہنوں اور دالوں وغیرہ جیسی دیگر اہم فصلوں کے لئے شروع کیا جاتا ہے مقصد یہ ہے کہ کسانوں کو فصلوں کے اگانے میں گھاٹا نہ رہے بلکہ وہ مناسب نفع کما سکیں فصلوں کی بیمہ اسکیم سے فصلوں کے لئے دیئے جانے والے قرضوں کے بیمے کی گنجائش خود بخود نکل آئے گی۔ فصلوں کے بیمے کے لیے ۴ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں تاکہ کسانوں کو خشک سالی، سیلابوں، پالے، طوفان بادوباراں، کیڑے لگنے، پودوں کی بیماریوں، فسادات اور ہڑتالوں وغیرہ کے سبب ہونے والے نقصانات سے بچایا جاسکے۔

بجٹ میں دیہات میں سماجی تحفظ کی ایک اسکیم شامل کی گئی ہے جس سے بے زمین کنبوں، چھوٹے کسانوں مارجنل کسانوں، روایتی دستکاری اور دیگر کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والے ارکان کو فائدہ پہنچے گا۔ اس کے تحت اگران کنبوں میں سے کمانے والے فرد کی کسی حادثے میں موت ہوجاتی ہے۔ تو اس کے لواحقین کو ۳ ہزار روپے ملیں گے بشرطیکہ اسے دیگر کسی بیمہ اسکیم یا محنت کش طبقے کو معاوضے کی اسکیم کے تحت فائدہ نہ ملا ہو۔ شروع میں یہ اسکیم ملک کے سو حلقوں میں شروع کی جارہی ہے۔

۸۶-۱۹۸۵ء کے بجٹ میں نئے ٹیکسوں سے ۵۴۷ کروڑ روپے کی آمدنی ہوگی پھر بھی اس کا خسارہ ۳۳۴۹ کروڑ روپے رہے گا۔ مزید برآں لازمی ڈپازٹ اسکیم اور اسٹیٹ ڈیوٹی ہٹائی گئی ہے۔ ریڈیو اور ٹی۔ وی پر سے لائسنس فیس ختم کردی گئی ہے۔ آمدنی ٹیکس سے معافی کی حد ۱۵ ہزار روپے سے بڑھا کر ۱۸ ہزار روپے کردی گئی ہے۔ بونس پانے والوں کے لیے ۷۵۰ روپے کی حد سے بڑھا کر ۱۶۰۰ روپے کردی گئی ہے۔ دولت ٹیکس سے معافی کی حد ڈیڑھ لاکھ روپے سے بڑھا کر ڈھائی لاکھ روپے کردی گئی ہے۔ موت یا ریٹائرمنٹ کی صورت میں گریجوٹی کی حد ۳۶ ہزار روپے سے بڑھا کر ۵۰ ہزار روپے کردی گئی ہے۔ ایم آر ٹی پی کی حد پر نظر ثانی کرکے اسے ۲۰ کروڑ روپے سے بڑھا کر ۱۰۰ کروڑ روپے کردیا گیا ہے۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے فروغ کے لیے پلانٹ اور مشینری کی صورت میں سرمایہ کاری کی بالائی حد ۲۰ لاکھ روپے سے بڑھا کر ۳۵ لاکھ روپے کردی گئی ہے۔ معاون صنعتوں کے ضمن میں یہ بالائی حد ۲۵ لاکھ روپے سے بڑھا کر ۴۵ لاکھ روپے کردی گئی ہے۔ سیاسی پارٹیوں کو سیاسی مقاصد کے لئے عطیات کی اجازت دے دی گئی ہے۔ جو کہ کمپنیاں اپنے منافع میں سے دیتی ہیں۔ اس سے کالے دھن میں کمی آئے گی۔

Vol. 5 No. 2 YOJANA (URDU) 16-30 April 1985
[illegible] at Civil Lines Post Office, Delhi-110 054

[illegible]

سماج پر آزادیٔ نسواں کے اثرات

جیسا کہ انسان کی تاریخ بتاتی ہے کہ ابتدا سے ہی عورت اور مرد دونوں نے زندہ رہنے کے لیے اور زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کیا چاہے وہ جنگلوں میں رہنے کا دور ہو، پتھر کا دور ہو یا اور آگے کا زمانہ جسے تہذیب کا دور کہتے ہیں ہر صورت حال میں عورت اور مرد نے کندھے سے کندھا ملا کر زندگی کی صعوبتوں کو جھیلا ہے اور زندگی کو خوبصورت بنانے کی جدوجہد کی ہے۔ ہر چند کہ عورت کو قدرت نے مردوں جیسی طاقت نہیں دی ہے پھر بھی [illegible] صبر، ہمت اور حالات کو سازگار بنانے کی صفت نے دونوں کو خاندان اور پھر سماج کی تشکیل میں ایک دوسرے کا ہمدم اور ہم قدم رکھا ہے۔

انسانی تاریخ میں ایسے ادوار بھی آئے ہیں جب مردوں اور عورتوں کا تعاون افراتفری کا شکار ہوا اور رفتہ رفتہ ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جس میں مردوں نے اپنے لیے بہت زیادہ سہولتیں حاصل کر لیں اور عورتوں کو گھروں کی چہار دیواری تک محدود کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرہ آدھی آبادی کی صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکا اور سماج میں ایک زوال کی کیفیت پیدا ہوئی۔ ظاہر ہے اس صورتِ حال کو بہت لمبے عرصے تک برقرار نہیں رکھا جا سکتا تھا کیونکہ یہ بنائے فطرت نہیں ہے۔ اس طرح آزادیٔ نسواں کے تصور نے جنم لیا اور عورتوں نے مردوں کے شانہ بشانہ آکر زندگی کے ہر گوشہ میں ذمہ داری اٹھانے کی جدوجہد شروع کر دی۔

آزادیٔ نسواں نے سماج پر دور رس اثرات مرتب کیے ہیں۔ آیئے دیکھیں کہ آزادیٔ نسواں سے پہلے سماج کی کیا کیفیت تھی اور اب کیا ہے یعنی ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا۔

سماج کیا ہے؟ سماج کسی گروہ یا جرگہ کا نام نہیں ہے بلکہ اس شعور کو کہتے ہیں جس کے تحت کچھ قدروں کی پابندی کرنی ہوتی ہے۔ یہ تمام حقیقت ہے کہ انسان اکیلا نہیں رہتا بلکہ دوسرے انسانوں کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارتا ہے۔ اس کیفیت کی وجہ سے فرد کو گروہ کے ساتھ تعاون کرنا پڑتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ پابندیاں عائد ہوتی ہیں اور [illegible]

کچھ سہولتیں بھی ملتی ہیں۔ یہ پابندیاں اور سہولتیں مرد اور عورت دونوں کے لیے ہوتی ہیں۔

سماجی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ آج جو بات بہت اہم سمجھی جاتی ہے ضرورت کے تحت کل اس میں تبدیلی بھی ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ کسی تحریک سے سماج پر جو اثر پہنچے اس سے چونکنا ہونے اور ہر حال میں اس سے بچنے کی کوشش فضول ہے۔ نہ تو تحریک سے ڈرنا چاہیئے نہ طرز کہن پر اڑنا چاہیئے۔

آزادیٔ نسواں نے سماج کو بہت بہتر نظریوں سے روشناس کرایا ہے۔ تعلیم ہی کو لیجئے ہمارے سماج میں ایک ایسا بھی دور تھا جب عورتوں کی تعلیم کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔ بلکہ کہیں کہیں تو اسے معیوب سمجھا جاتا تھا۔ یہ بہت بڑی محرومی کا دور تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ عورتوں کی تعلیم کا رجحان بڑھا جس کی وجہ سے اب خواتین بھی کافی تعداد میں تعلیم یافتہ ہونے لگیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں عورتوں کو حصہ ملنے لگا۔ تعلیم نسواں نے جو آزادیٔ نسواں کا ایک پہلو ہے سماج کو بہتر بنانے میں بہت مدد کی ہے۔

ایک عام سماجی تصور یہ بھی تھا کہ عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش کام نہیں کرنا چاہیئے بلکہ گھروں میں رہنا چاہیئے۔ سماج کی اس قدر پر تعلیم نسواں کے ساتھ ساتھ مشینی دور نے بھی زبردست حملہ کیا۔ وہ وقت چلا گیا جب ہر کام جس میں قوت درکار ہوتی تھی مرد ہی کر سکتا تھا۔ مشینی قوت نے جسمانی قوت کی جگہ لے لی۔ اس طرح مردوں کی برتری ختم ہو گئی اور عورتوں نے بھی اسی طرح باہر نکل کر کام کرنا شروع کر دیا جس طرح مرد کرتے تھے۔ اس تبدیلی نے معاشرے کی آدھی آبادی کو جو جامد کر دی گئی تھی فعال بنا دیا۔ اب ہر میدان میں عورتیں مردوں کے دوش بدوش اور ساتھ ساتھ ہیں۔ اس طرح عورتوں کے لیے بہت سے راستے کھل گئے ہیں اور ان کی دست نگری ختم ہو گئی ہے۔ آج یہ نہیں ہوتا [illegible]

[illegible] زندگی گزارنا پڑتا اب وہ عورتیں معاشی طور پر خود کفیل ہو جاتی ہیں۔ اس وسعت نظری نے بہت سی نامناسب باتوں کو بھی جنم دے رکھا تھا اور عورتیں اپنے آپ کو بے بس پاتی تھیں۔ اب عورتیں محنت اور اطمینان سے اپنی روزی خود کما سکتی ہیں۔ اس معاشی آزادی نے سماج کی اخلاقی قدروں میں بھی تبدیلی پیدا کی ہے۔ اب ایسا نہیں ہے کہ عورت کے گھر سے نکلنے پر بھی شکایت ہو اور انگلیاں اٹھائی جائیں۔ کیرکٹر کا جو ایک کھوکھلا تصور تھا آزادیٔ نسواں کی بدولت اس میں تبدیلی آئی ہے۔ کیرکٹر دراصل قول و عمل کی سالمیت اور مضبوطی کا نام ہے۔ صرف گھر سے باہر نکلنے پر کیرکٹر پر حرف نہیں آتا۔

آزادیٔ نسواں نے سماج کو جہاں نئی اخلاقی اور معاشرتی قدروں سے روشناس کرایا ہے وہیں فرد اور خاندان کی زندگی اور ماحول پر بھی اثر ڈالا ہے۔ تعلیم حاصل کر کے اور جہالت کے پردے کو چاک کر کے عورتوں نے اپنے اردگرد روشنی پھیلائی ہے وہ سماج جس میں عورتیں جاہل ہوں توہمات کا شکار ہوتا ہے اور بجائے ترقی کے تنزلی ہوتی ہے۔ آزادیٔ نسواں نے سماج کو نئے خیالات اور نئی باتوں سے روشناس کرایا ہے اور اس کو نئی منزلوں کی طرف گامزن کیا ہے۔

یہیں پر یہ بھی کہہ دینا ضروری ہے کہ اگر آزادیٔ نسواں کی لہر میں وہ سب باتیں بھی جائز کر لی جائیں جو معاشرہ پر برا اثر ڈالتی ہیں تو نقصان ہی نقصان ہے۔ مثال کے طور پر یہ فطری امر ہے کہ خواتین بچوں کی پرورش کریں اور خاندان کی دیکھ بھال کرتی رہیں لیکن آزادیٔ نسواں سے یہ مراد لی جائے کہ عورتیں خاندان اور بچوں سے بھی بے نیاز ہو جائیں تو یہ نقصان کا رجحان ہے۔ اس طرح کے خیالات سے احتراز لازم ہے۔ ایک بار پھر یہ کہہ دیا جائے کہ قدرت نے مرد اور عورت دونوں کو ایک دوسرے کا ہمدم اور ہم قدم بنایا ہے۔ عورتوں کی آزادی کا مطلب مردوں سے بے نیازی نہیں۔ آج انتخاب اس میں نہیں ہے کہ آزادیٔ نسواں [illegible] کا کھونا بلکہ اگر زندگی کا حسن دونوں سے [illegible] کی ضرورت ہے۔ [illegible]

[illegible]

یوجنا

یکم تا ۱۵ مئی ۱۹۸۵ء

ایک روپیہ

ریڈیائی آئسوٹوپس اور ان کے فوائد

(ڈاکٹر زینت رشید)

قبائلی آبادی کے ترقیاتی پراجیکٹ۔ ایک جائزہ

(ایس۔ سنگھل)

چائے

شہباز حسین

چائے ایک ایسا مشروب ہے جو بچے، جوان بوڑھے سبھی کو پسند ہے۔ چائے پیش کرنا ہماری اخلاقی شائستگی کا مظہر ہے۔ چائے پی کر اور پلا کر نہ صرف ہم خود خوش ہوتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی خوش کرتے ہیں۔

چائے ہماری زندگی کا ایک نہایت اہم جزو بن گئی ہے۔ ہماری صبح چائے سے شروع ہوتی ہے اور دن بھر چائے کی پیالیاں کھنکتی رہتی ہیں معاملہ گھریلو ہو یا ادبی، ملکی ہو یا غیر ملکی چائے کے دوران ان کا بڑا اچھا حل نکل آتا ہے۔ کیونکہ خوشگوار اور ناخوشگوار دونوں باتیں خوشی خوشی پی لی جاتی ہیں۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ اگر چائے کا رواج ختم ہو جائے تو ہماری زندگی کتنی بے کیف، پھیکی اور بے مزہ ہو جائے گی۔

دنیا میں چائے نوشی کا رواج سب سے پہلے چین میں شروع ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ چین کے شہنشاہ شن ننگ نے جو حضرت عیسیٰ سے ۲۷ سو برس پہلے گزرے ہیں اس کو رواج دیا۔ اس کے بعد جاپان برما، تھائی لینڈ میں اس کا رواج شروع ہوا مگر ابتداً دوا کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ چائے یورپ میں سترھویں صدی میں پہونچی چینی زبان میں چائے کے لئے "ٹے" (TAY) کا لفظ استعمال کیا گیا تھا اس سے اس کا انگریزی نام ٹی (TEA) پڑا۔ اور اب یہ مشروب ساری دنیا میں مقبول ہے۔ مگر چائے کے سب سے زیادہ شوقین انگریز ہیں جو اوسطاً چھ پیالی چائے روز پیتے ہیں۔

آسام (ہندوستان) میں چائے کا پودا ایک خودرو پودے کی حیثیت سے ۱۸۳۲ء میں دریافت ہوا اور دنیا میں اس کی مانگ کے پیش نظر اس کی کاشت شروع کی گئی ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو اس وقت تک ایک سیاسی طاقت بھی بن چکی تھی یہ کاروبار اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور پہلی بار آٹھ بکسے مئی ۱۸۳۲ء میں لندن بھیجے گئے۔

ہندوستان میں چائے کی پیداوار کے دو خاص علاقے ہیں۔ ایک شمالی مشرقی ہندوستان میں اور دوسرا جنوبی ہندوستان میں۔ ہمارے ملک کے علاوہ دنیا کے تقریباً ۴۶ ملکوں میں چائے پیدا ہوتی ہے جن میں لنکا، بنگلہ دیش، انڈونیشیا کینیا، چین، جاپان، روس اور ترکی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۹۸۴ء کے درمیان چائے کی عالمی پیداوار ۲۱۰۰ ملین کلوگرام تھی۔ جو ۱۹۸۳ء کے مقابلے میں ۶ فی صد زیادہ ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ ۱۹۸۵ء میں یہ بڑھ کر ۲۱۷۵ ملین کلوگرام تک پہونچ جائے گی۔ عالمی پیداوار کا اسّی فیصد حصّہ ایشیائی ملکوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ہندوستان میں چائے کی پیداوار ۱۹۸۳ء میں ۵۸۸ ملین کلوگرام اور ۱۹۸۴ء میں ۶۳۰ ملین کلوگرام تھی۔ ۱۹۸۵ میں ۶۵۵ ملین کلوگرام کا نشانہ رکھا گیا ہے۔ ۱۹۸۴ء کے درمیان ہندوستان نے ۲۱۵ ملین کلوگرام چائے برآمد کی اندرونِ ملک ۴۱۵ ملین کلوگرام کی کھپت ہوئی۔ چائے کی برآمد سے ۱۹۸۴ء کے درمیان ۷۵۰ کروڑ روپے کا زرِمبادلہ حاصل ہوا۔ ہندوستان سے چائے تقریباً ۸۰ ملکوں کو جاتی ہے۔ جس میں برطانیہ سرِفہرست ہے۔

ہندوستان میں چائے کے باغات کی اوسط پیداوار ۱۸ ہزار پاؤنڈ فی ہیکڑ ہے جو دنیا کی اوسط پیداوار کے مقابلے میں خاصی کم ہے۔ مختلف اقدامات کی وجہ سے اب پیداوار بڑھ رہی ہے ٹی بورڈ چائے کی اچھی پیداوار، برآمد اور بہتر انتظام کا ذمہ دار ہے۔ چائے کے درخت لمبے اور جھاڑی نما ہوتے ہیں۔ پودوں سے ایک کلی اور دو پتیاں توڑی جاتی ہیں۔ چائے کے باغوں میں کام کرنے والے مرد اور عورت بانس کی بنی ہوئی ٹوکریاں اپنی پیٹھ پر باندھ لیتے ہیں اور ان میں پتیوں کو پھینکتے جاتے ہیں۔ ان پتیوں کو مختلف مشینی عمل کے ذریعے سکھایا جاتا ہے۔ اور ان کو اقسام کے لحاظ سے الگ الگ کر دیا جاتا ہے۔ پھر نیلام کے لئے بازار بھیج دیا جاتا ہے۔ چائے کی فروخت کا یہی طریقہ شروع سے رائج ہے۔ غیر ملکی خریداروں کے ایجنٹ منڈیوں میں موجود ہوتے ہیں اور بولی دے کر حسبِ ضرورت مال خریدتے ہیں۔

چائے کی بہت سی قسمیں ہیں۔ اعلا قسم کی چائے پتیوں والی ہوتی ہے۔ اور اس میں خوشبو ہوتی ہے۔ ذائقہ بھی عمدہ ہوتا ہے۔

عام استعمال میں آنے والی چائے کی پتیاں کالے رنگ کی ہوتی ہیں جو پانی میں ڈالنے کے بعد پھیل جاتی ہیں۔ معمولی قسم کی چائے چورے (Dust) کی شکل میں ملتی ہے۔ چائے کی ایک اعلا قسم سبز چائے بھی ہے۔

(باقی ص۲۰ پر)

اس شمارے میں

منصوبہ بندی سے متعلق ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر ——— آر. ٹھکرال

ایڈیٹر ——— لکشمی رام رانا

اسسٹنٹ ایڈیٹر ——— محمد عادل صدیقی

سب ایڈیٹر ——— وسیم حیدر

جلد ۵	یکم تا ۱۵ مئی ۱۹۸۵ء	شمارہ ۳

۱۱ تا ۲۵ ویشاکھ شک ۱۹۰۷

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے، ۲ سال ۳۵ روپے، ۳ سال ۵۰ روپے

فی کاپی ——— ایک روپیہ

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فیصد کی رعایت

بزنس منیجر: ایل. آر. بترہ ✻ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر. ایس. منچالے

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر. کے. پورم (مین)

نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

ترسیل زر کا پتہ: بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

نئی امپورٹ ایکسپورٹ پالیسی

گزشتہ مہینے بجٹ تجاویز اور امپورٹ۔ ایکسپورٹ کی اعلان کردہ پالیسی اس بات کی مظہر ہے کہ ملک میں رائج الوقت اقتصادی صورت حال کو پوری طرح نظر میں رکھا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نظام کی کمزوریوں اور اس کی مخفی قوتوں کا بھی صحیح صحیح اندازہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان تمام اقدامات کو ملک کے فرسودہ ترین جمہوری ڈھانچے میں رہتے ہوئے انجام دیا جاتا ہے۔ اس پالیسی میں بیوپاری برادری اور صنعت کاروں کی مشکلات کا پوری طرح احساس کرتے ہوئے انہیں راحت دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس پالیسی کا صنعت کاروں کی طرف سے جس طرح خیر مقدم کیا گیا وہ اس کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ اس کے ذریعے برآمدات کو بڑھانے کی کوششیں کی جائیں گی۔ اور درآمد کی جانے والی اشیاء کے نعم البدل اور متبادلات تلاش کرنے پر زور دیا جائے گا۔ اس پالیسی کا اہم پہلو یہ ہے کہ اب اس کی مدت ایک سال کی بجائے تین سال کردی گئی ہے۔ خودکار لائسنسوں کے زمرے کی منسوخی بھی اس کا ایک اور اہم پہلو ہے۔ اس طرح اب طویل المدتی بنیادوں پر منصوبہ بندی ممکن ہو سکے گی۔ توسیع، استحکام اور تسلسل کے نقطۂ نظر سے ایسا کرنا مفید ہوگا۔ اس نئی پالیسی کے تحت تین سال کی مدت سامنے رکھ کر نشانے مقرر کئے جا سکتے ہیں۔ لائسنسوں کا اجراء اگرچہ سال بہ سال ہوا کرے گا لیکن اس پالیسی میں مذکور ہے کہ سرکار اس پالیسی میں ترمیم کے اپنے حق کو محفوظ رکھتی ہے جس کی ضرورت عوامی مفاد کے لیے وقتاً فوقتاً ہو سکتی ہے۔ خودکار لائسنسوں کی منسوخی سے اس عمل کی دشواریوں کو دور کیا جا سکے گا۔ اور اس میں تاخیر کا عنصر کم ہو سکے گا۔ زیادہ تر آئٹم کھلے عام لائسنس کے زمرے میں منتقل کر دیئے گئے ہیں۔ چھوٹے پیمانے کے صنعتی کارخانوں کو پانچ لاکھ روپے تک کے اضافی لائسنسوں کی درخواست پر فیصلے کا حق ریجنل لائسنسنگ اتھارٹیز کو دے دیا گیا ہے۔ بڑے صنعتی اداروں میں ۵ لاکھ روپے تک کے اضافی لائسنسوں کی درخواستوں کا فیصلہ بھی اب یہی افسر کر سکیں گے۔ اس طرح اب بہت سے فیصلے نئی دہلی میں نہ ہو کر علاقائی سطح پر ہو جائیں گے اور تاخیر کے امکانات کم سے کم ہوں گے۔ اوپن جنرل لائسنس کے تحت درآمد کی جانے والی صنعتی مشینری کے آئٹموں کی تعداد ۲۰۱ کردی گئی ہے۔ اس سے کارخانوں کو جدید لائنوں پر لانے میں مدد ملے گی اور آٹوموبیل، چمڑے، الیکٹرانکس کی صنعتوں میڈیسن اور پارچات کی صنعت سے وابستہ افراد کو فائدہ ہوگا۔ اس میں الیکٹرانکس اور کمپیوٹر کی صنعتوں کو بڑھانے کے لیے خصوصی مراعات دی گئی ہیں۔ ۸۴-۱۹۸۳ء میں ہمارے ملک کی برآمدات کی مالیت ۹۸۶۷ کروڑ ۱۵ لاکھ روپے تھی جب کہ اس سال تجارتی خسارہ ۵۸۹۵ کروڑ ۴۴ لاکھ روپے تھا۔ ۱۹۸۴ء میں دسمبر تک ہماری برآمدات ۸۱۴۶ کروڑ ۱۷ لاکھ روپے تھی۔ جبکہ تجارتی خسارہ ۵۹۹۳ کروڑ ۹۷ لاکھ روپے تھا۔ توقع ہے کہ اب اس نئی پالیسی سے ہمارا تجارتی خسارہ کم سے کم رہ جائے گا۔ اور یہ درآمدات کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوگی۔

نئی تعلیمی پالیسی

ملک میں نئی تعلیمی پالیسی تشکیل پا رہی ہے، یہ بہت جلد سامنے آنے والی ہے۔ یہ دور رس نتائج کی حامل ہوگی۔ اس کے اُن پہلوؤں کو سامنے رکھا جا رہا ہے جو اب تک توجہ سے محروم رہے ہیں اسے ملک کے سماجی اور اقتصادی تانے بانے سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ عوام کو ہر محاذ پر بڑی بڑی امیدیں بندھی ہیں، کوشش یہ کی جا رہی ہے کہ یہ پالیسی ملک کے نوجوانوں کی آرزوں اور امنگوں کو پورا کر سکے۔ اس کی کامیابی کے لیے یہ بات اہم ہے کہ یہ پالیسی ہندوستان کے ثقافتی تانے بانے کی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر بنائی جائے اور ماضی سے وابستہ رہتے ہوئے نئے تقاضوں کی تکمیل کی جائے۔ قدیم اور جدید کا یہ امتزاج ایک حسین تجربہ ثابت ہوگا۔ آج کے نوجوان کو اکیسویں صدی میں لے جانے کی یہ ایک دلچسپ کوشش ہے۔ ہندوستان کے منظر نامے میں کثرت میں وحدت اور ملک کی سماجی و سیاسی وحدت کو سامنے رکھ کر یہ کام قدم بہ قدم اور سیڑھی بہ سیڑھی انجام پاتا ہے۔ اس سلسلے میں جو بھی تبدیلی لائی جائے، اس کا آغاز پہلی سطح سے کارآمد ثابت ہوگا اس لیے پرائمری اور ثانوی سطح کی تعلیم کو جدید سائنس اور ٹکنالوجی سے جوڑنا ضروری ہے۔ ہمارے ملک میں حصول آزادی سے قبل ہی قومی سطح کی قیادت نے تعلیم کی ضرورتوں پر توجہ دی ہے۔ مشہور وردھا اسکیم اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کے خط و خال مہاتما گاندھی نے تیار کئے تھے۔ مہاتما گاندھی نے جس انداز کی تعلیم و تربیت پر زور دیا تھا اس میں دل، دماغ، ہاتھ تینوں کی مربوط ترقی کو ضروری سمجھا تھا۔ اس میں ہاتھ کے کام کی عظمت کو پوری طرح واضح کیا گیا تھا۔ آج کے دور میں ہاتھ کے کام کی عظمت کو وسیع تر پس منظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ آج ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ سائنس اور ٹکنالوجی کو بھی ملحوظ رکھنا ہے۔ حصول آزادی کے وقت ایک شدید مسئلہ یہ تھا کہ نوآبادیاتی نظام کے نتیجے میں جو صورت حال ملک میں پائی جاتی تھی اور اس کے ساتھ ہی عوام کے دلوں میں نئی امنگوں اور آرزوں کی تکمیل کی جو شدید خواہش موجزن ہوئی تھی ان دونوں کے درمیان ایک توازن قائم کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ آج پھر اسی طرح کی ایک تبدیلی کا مسئلہ ہے، دیکھنا یہ ہے کہ ہماری ضرورتوں اور قومی عہد کی موجودہ ضرورتوں کے درمیان ایک بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ البتہ اب ہمارے پاس اتنے بیش قیمت تجربات ہیں کہ ان کی روشنی میں ہم ملک کی تعلیم و تربیت کے لیے روشن خیال پر مبنی اور وقت کی ضرورت پوری کرنے والی ایک پالیسی تشکیل دے سکتے ہیں گزشتہ تیس برسوں میں تعلیمی محاذ پر بہت کچھ ترقی دیکھنے کو ملی ہے لیکن ایک بات قابل ذکر یہ ہے کہ ہمارے عوام کو پبلک اسکولوں میں اپنے بچوں کو داخل کرانے کا جو شوق ہے، اس پر بھی نظر ڈال جائے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے فروغ کے لیے سائنسی مزاج کو فروغ دینا ضروری ہے۔ تعلیمی نظام کے ذریعے سیکولر اور سماج وادی نظریات کا فروغ بہت ضروری ہے۔ قومی یکجہتی کی اساس کو مضبوط بنانے کے لیے تعلیمی نظام میں تبدیلی وقت کی بڑی ضرورت ہے۔ تاریخی حقائق کی پردہ پوشی کر کے فرضی داستانوں اور واقعات پر جو غیر ضروری زور ہے، اسے صحیح پس منظر میں پیش کرنا ضروری ہے۔ امید کی جا رہی ہے کہ ہماری نئی تعلیمی پالیسی ان جملہ حقائق کا احاطہ کر سکے گی۔

(ایڈیٹر)

محترمہ اندرا گاندھی کا ایک حسین خواب
سبز انقلاب
ایک واردات

یوں تو سبز انقلاب (Green Revolution) نئی اصطلاح نہیں ہے، تاہم ہر دور میں یہ اصطلاح زرعی پیداوار کے لئے اکسیر کا درجہ رکھتی ہے ــــ تقریباً سولہ برسوں سے مختلف ممالک جیسے بھارت، سری لنکا، فلپائن، تھائی لینڈ.... وغیرہ "سبز انقلاب" کی اصطلاح کو غذائی اجناس میں حیرت انگیز پیداواری اضافے کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔

بھارت ایک زراعتی ملک ہے۔ اس لئے اس کی زرعی پیداوار کو خود کفالت کی منزل تک بڑھانا بے حد ضروری تھا۔ لہٰذا پنجسالہ منصوبوں میں اس ضرورت کی جانب خصوصی توجہ دی گئی اولین دو منصوبوں کے بعد ۶۸-۱۹۶۷ء و ۶۹-۱۹۶۸ء کے دوران زرعی پیداوار میں اضافہ اتنا زیادہ تھا کہ ایسا لگتا تھا کہ بھارت نے زراعتی میدان میں زبردست پیش رفت کی ہے، ایک سال میں زرعی پیداوار ۵۰ فیصد تک بڑھ جانا معمولی اضافہ نہیں ہے.... ملک کے منصوبہ سازوں نے اس حیرت انگیز اضافے کو ہی سبز انقلاب کا نام دے دیا ہے۔ یہ نام دیا جانا اس لئے بھی مناسب ہے کہ گذشتہ چند سالوں سے بھارتی زراعت نچلے معاش کی سطح (Subsistence Level) سے اوپر اٹھ کر بہت بلند سطح (Surplus Level) پر آ چکی تھی، یعنی ہم غذائی پیداوار کے معاملے میں خود کفیل ہو گئے ہیں۔

سبز انقلاب کیا ہے؟

مندرجہ بالا مختصر تمہید کو ذہن میں رکھتے ہوئے، سبز انقلاب کی کسی جامع تعریف تک پہنچنا بہت آسان ہوگا ــــ عام الفاظ میں سبز انقلاب سے ہماری مراد وہ انقلابی اقدامات ہیں جن کے ذریعہ زراعتی پیداوار میں زبردست اضافہ ہو ــــ اسی وجہ سے چوتھے پنجسالہ منصوبے میں "سبز انقلاب لاؤ" کا نعرہ بلند کیا گیا تھا ــــ شاستری جی کے "جے جوان، جے کسان" نعرے نے بھی 'سبز انقلاب' میں زبردست روح پھونکی تھی۔

مذکورہ زراعتی پیداوار کے اضافے کو سبز انقلاب کا نام دینے سے ہی کئی نکات ذہن میں جنم لے لیتے ہیں ــــ مثلاً، پیداوار بڑھانے کے لئے معقول سینچائی کا بندوبست، عمدہ کھاد اور بیج کی فراہمی، قابل کاشت آراضی کو مزید زرخیز بنانے کی تدابیر، ترقی یافتہ سائنسی آلات کا استعمال اور کئی فصلیں حاصل کرنے کی کوششیں.... وغیرہ ــــ یعنی، پیداوار کو مزید بڑھانے کے لئے وسیع پیمانے پر کیے جانے والے اقدامات کو ہی سبز انقلاب کہا جانا چاہیئے، جیسا کہ آنجہانی شریمتی اندرا گاندھی نے فرمایا تھا: "سبز انقلاب سے مراد یہ نہیں کہ کھیتوں کی حد بندی کروا کر پھاوڑے، کدالی، ہل.... وغیرہ جیسے دیگر کھیتی کے مفید و کار آمد ذرائع فراہم کر کے کاشتکاری کی جائے، بلکہ ان ذرائع کے استعمال سے زرعی پیداوار میں کافی اضافہ کرنا بھی ہے۔" سورگیہ اندرا جی کے بیس نکاتی پروگرام نے "سبز انقلاب" میں نئی روح پھونک دی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اندرا جی دلہنوں کی پیداوار کو بھی 'سبز انقلاب' کا جزو بنا گئی ہیں۔

سبز انقلاب کے فیوض و برکات

سبز انقلاب کی لہر نے بھارت کے پالیسی سازوں کو شعبہ زراعت کی ترقی کے لئے جن جن خصوصی و اہم مساعی کی جانب متوجہ کیا، ان کا مختصر تذکرہ مندرجہ ذیل ذیلی عنوانات کے تحت کیا جا رہا ہے۔

زیادہ پیداوار دینے والی فصلوں کا پروگرام (H.Y.V.P)

گذشتہ برسوں میں زیادہ پیداوار دینے والی قسموں کا استعمال کر کے پیداوار کو کئی گنا بڑھایا گیا ہے۔ مختلف فصلوں کی ترقی یافتہ قسموں کے نام اس طرح ہیں۔

(۱) گندم : کلیان سونا ۲۲۷ ، سونارا ۶۴ ، نرمدا ۹۸ ، ہیرا ، موتی ، پنجاب ۱۹۲۵ ، ۱۹۷۷ اور ڈبلیو ایچ ۲۰۰ و ۳۶۱ ، کلیان اور یو پی ۳۰۱ ، ۳۰۹ ، ۳۰۷ ، ۳۱۰ وغیرہ ان قسموں کے استعمال سے گندم کی پیداوار میں آٹھ گنا سے بھی زیادہ اضافہ ہوا ہے۔

(ب) دھان یا چاول : تائی چنگ نیٹو، جیا، پدما، جمنا، رتنا، بالا، وجیا، کرشنا، سابرمتی، پوسا ۲۲۱، پنکج اے ڈی ٹی ۲۷ وغیرہ ——— ان اقسام نے دھان کی پیداوار میں تقریباً دوگنا اضافہ کیا ہے۔

(ج) مکئی : سنکر قسمیں، گنگا ۱۰۱، ۱۰۳، ۵۰۱ مشترکہ قسمیں، امبار، سونا، کسان، وکرم وغیرہ ——— مکئی کی ان قسموں کی وجہ سے مکئی کی پیداوار بھی کسی حد تک بڑھی ہی ہے۔

(د) جوار : سی ایچ ایس ۱ و ۲ اور سورن ——— پیداوار میں ڈیڑھ گنا اضافہ ہوا ہے۔

(ر) باجرہ : اے بی ا و ۴ ——— پیداوار دوگنی ہو چکی ہے۔

پیکیج پروگرام

پیکیج پروگرام نامی پراجیکٹ ۷۲-۱۹۷۱ء میں چند منتخبہ اضلاع میں رُو بہ عمل لایا گیا تھا۔ اس کے خصوصی مقاصد تھے (۱) تیزی سے مادّی ترقی کے لئے پیداوار میں اضافہ کرنا (۲) پیداور میں اضافے کے لیے نمائش وغیرہ کے ذریعہ کسانوں کو تیار کرنا اور انہیں سبھی وسائل جیسے بیج، کھاد، جراثیم کش دوائیں، زرعی آلات اور قرض وغیرہ فراہم کرنا . . . . . مذکورہ پروگرام کی قابلِ ذکر کامیابی کو دیکھ کر دیش کے دیگر ان علاقوں میں بھی یہ پروگرام شروع کیا گیا جو سینچائی وغیرہ کی سہولیات سے نسبتاً کم فیضیاب تھے۔ ان علاقوں میں اس پروگرام کی خصوصیات یہ ہیں (۱) پروگرام کی اکائی ایک قطعۂ اراضی ہوتی ہے (۲) صرف چند چیدہ فصلوں کی پیداوار بڑھانے کے لئے ہی اس پروگرام کو نافذ کیا گیا ہے۔

ایک سے زیادہ فصلوں کا پروگرام

اس پروگرام کا خاص مقصد سینچائی اور کھادوں کا معقول بندوبست کر کے ہر سال دو سے زیادہ فصلیں حاصل کرنا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کر کے مندرجہ ذیل نتائج ہیں سے بیش تر برآمد کر لیے گئے ہیں۔

(i) دھان، جوار، مکئی و باجرا کی کم مدتی فصلوں کی توسیع و ترقی۔

(ii) فصل ہیر پھیر کے نئے طریقے۔

(iii) زرعی ماہرین کے ذریعہ یہ ثابت کر دینا کہ بارانی علاقوں میں ایک سال میں ۴ فصلیں تک حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اور ثبوت کے حصول کے لئے پیش رفت جاری ہے۔

زرخیز کھادوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال

پنجسالہ منصوبوں کے تحت دیش میں کھادوں کی پیداوار اور استعمال دونوں میں ہی تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ اس وقت کھادوں کے معاملے میں بھارت کا مقام دنیا میں بہت اونچا ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں تو کیمیاوی کھاد کا استعمال بہت ہی بڑھا ہے۔ مثلاً ۶۸-۱۹۶۷ء میں ۱۱٫۷ لاکھ ٹن کیمیاوی کھاد کا استعمال کیا گیا تھا جو ۷۵-۱۹۷۴ میں بڑھ کر ۲۷٫۷ لاکھ ٹن ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۶۰٫۶ لاکھ ٹن اور ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۷۲ لاکھ ٹن کے قریب ہو گیا۔

ترقی یافتہ بیجوں کا زیادہ استعمال

دیش میں ترقی یافتہ بیجوں کا استعمال مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔ ۷۱-۱۹۷۰ء میں دھان، گندم، جوار و باجرے کی نئی قسمیں استعمال کی گئیں ——— قومی بیج کارپوریشن (N.S.C.) کے ذریعے کی گئی بیجوں کی کھوج کے باعث ترقی یافتہ بیجوں کے استعمال کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ ۶۷-۱۹۶۶ء میں ۱۹ لاکھ ہیکٹر زمین میں ہی ایسے بیجوں کا استعمال کیا گیا تھا، جب کہ ۷۲-۱۹۷۱ء میں ۱۸۲ لاکھ ہیکٹر زمین میں، ۷۶-۷۵ میں ۳۱۹ لاکھ ہیکٹر زمین میں، ۸۱-۸۰ میں ۴۵۳ ہیکٹر زمین میں، ۸۲-۸۱ میں ۴۶۷ ہیکٹر زمین میں اور ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۵۱۰ ہیکٹر زمین میں ان بیجوں کا استعمال کیا گیا ہے جس کے نتیجے میں فی ہیکٹر پیداوار بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ مثلاً میسور میں چاول کی فی ہیکٹر پیداوار ۵۵۰۰ کلوگرام تھی، جو سبز انقلاب کی برکت سے ۱۴۰۰۰ کلو گرام سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ دیگر فصلوں کے اضافے کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔

بہتر سینچائی کی سہولیات

پنجسالہ منصوبوں میں سینچائی کی بہتر سہولیات کی فراہمی کا مزید معقول بندوبست کیا گیا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں کل ۲۲۶ لاکھ ہیکٹر زمین ہی سیراب ہو پاتی تھی، جب کہ سینچائی کا رقبہ بڑھتے بڑھتے ۸۳-۱۹۸۲ء کے آخر یا ۱۹۸۴ء کے آغاز تک ۶۰۰ لاکھ ہیکٹر سے بھی زیادہ ہو چکا ہے۔ ۱۹۵۰ء سے ۸۰ تک ۱۱۲۷ سینچائی کی بڑی یوجنائیں شروع کی گئی تھیں، جن میں سے ۵۴۵ یوجنائیں پوری ہو چکی ہیں۔

جدید سائنسی آلات اور اوزار

زرعی پیداوار میں اضافہ کرنے اور فی ایکڑ لاگت کم کرنے کے لئے وسیع پیمانے پر جدید زرعی آلات اور اوزاروں کا استعمال کیا جانے لگا ہے۔ بھارتی زراعت میں آئے انقلاب کا سہرا خاص طور پر ٹریکٹروں، بلڈوزروں، ڈیزل انجنوں، بجلی کے پمپنگ سیٹوں اور بونے کاٹنے جیسی مشینوں کے سر

ہے۔ خصوصاً ٹریکٹروں کی بھارت میں تیاری سے سبز انقلاب کو پھلنے پھولنے میں بڑی مدد ملی ہے۔ ۱۹۵۱ء میں دیش میں کل ۸۶۰۰ ٹریکٹر تھے، جن کی تعداد ۱۹۸۱-۸۲ء میں بڑھ کر ۴ لاکھ ہو چکی تھی۔ چھٹے منصوبے کے آخر تک ایک لاکھ ٹریکٹروں کی تیاری ہونے لگے گی۔

کھڑی فصلوں کی حفاظت

فصلوں کی حفاظت ایک اہم ترین کام ہے۔ جیسے پہلے ہمارے ملک میں انجام دینے کا بندوبست نہیں تھا۔ اندازہ ہے کہ ۸۰-۱۹۷۹ء میں ۴۵ ر ۴ کروڑ ہیکٹر زمین پر پودوں کی حفاظت کے لئے تدابیر کی گئیں۔ پودوں کی حفاظت سے متعلق تربیت (Training) کے لئے حیدر آباد میں ایک مرکزی ادارہ سرگرم عمل ہے ۔۔۔۔ ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۸۴ ہزار ٹن جراثیم کش دواؤں کا استعمال کر کے پودوں کی حفاظت بڑے پیمانے پر کی گئی تھی۔ اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

تحفظ اراضی

دیش میں ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۹ء تک ۵۴،۴۰ لاکھ ہیکٹر زمین پر حفاظتی اقدامات کئے گئے تھے۔ چوتھی یوجنا کی مدت میں ۴۰۶۴ لاکھ ہیکٹر اراضی کے تحفظ کے لئے ۱۵،۸ کروڑ روپے مخصوص کئے گئے تھے۔ پانچویں منصوبے میں اس مد کے لئے ۲۲،۱ کروڑ روپیہ اور چھٹے منصوبے میں ۵۰،۴ کروڑ روپیہ مختص کیا گیا ہے۔ اس طرح ۸۲-۱۹۸۱ء تک ۲۴۹ لاکھ ہیکٹر رقبہ میں تحفظ اراضی کا کام کیا گیا جب کہ ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۵۹۸ لاکھ ہیکٹر رقبہ پر تحفظ کے اقدامات کیے جا چکے ہیں۔ مزید اقدامات جاری ہیں۔

قرضہ جات کی سہولیات

زراعت کی ترقی کے لیے کسانوں کو آسان شرائط پر قرضوں کی سہولیات مہیا کی جا رہی ہیں۔ یہ مالی امداد باہمی انجمنوں اور متعدد بینکوں کے توسط سے دی جاتی ہے۔ ۱۹۶۹ء میں بیس اہم بینکوں کو قومیا کر کسانوں کو قرض کی مزید سہولیات فراہم کی گئی تھیں۔ ادارہ ARC کے قیام کا مقصد بھی قرضوں کی فراہمی کے سلسلے میں پیچیدگیوں کو کم سے کم کرنا تھا ۔۔۔۔ جون ۱۹۸۰ء تک سبھی تجارتی بینکوں کے ذریعے ۳،۹۷ کروڑ روپے زرعی قرضوں کی شکل میں دئے گئے تھے۔ اس میں سے سرکاری تحویل والے بینکوں نے جون ۱۹۸۰ء تک ۲۲۹۹ کروڑ روپے اور جنوری ۱۹۸۲ء تک ۳۴۹۶ کروڑ روپے بطور زرعی قرض دئیے ہیں۔

نگموں کا قیام

زرعی ترقی کے نئے متعدد نگموں یا کارپوریشنوں کا قیام عمل میں آیا ہے۔ ان کے ذریعے کسانوں کو مختلف ضروری سہولیات و مراعات دی جا رہی ہیں ۔۔۔۔ مثلاً اچھے قسم کے بیجوں کی تیاری و فراہمی جدید آلات زراعت مہیا کرنا، زراعت کے شعبے میں تحقیقات کرنا اور ان کے خوشگوار و مفید نتائج سے کسانوں کو آگاہ کرنا ۔۔۔ وغیرہ راشٹریہ بیج نگم، راشٹریہ کرشی آیوگ، کرشی ادیوگ نگم اور بھارتیہ کرشی انوسندھان پریشد وغیرہ ایسے قابل ذکر ادارے ہیں جنہوں نے زرعی ترقی میں اپنا گرانقدر تعاون پیش کیا ہے۔

کسانوں کو مناسب قیمت دلانے کا بندوبست

کرشی مولیہ آیوگ نے کسانوں کی پیدا کردہ فصلوں کی مناسب قیمت دلانے کا بندوبست کر کے کسانوں کے استحصال میں کافی کمی کر دی ہے۔ اب ساہوکار کسانوں کی مجبوری کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھا پاتے ہیں۔ کسانوں کی محنت کا شیریں پھل ملتے رہنے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان میں پیداوار بڑھانے کی لگن مزید بڑھ گئی ہے ۔۔۔۔ بہت سے اجناس کی صحیح قیمت دلانے کے مقصد سے سرکار خود بھی انہیں خریدنے کا اہتمام کرتی ہے۔

تجزیہ

اس میں شک نہیں کہ 'سبز انقلاب' کی خوشگوار ہوا نے مذکورہ متعدد غذائی اجناس کی پیداوار میں قابل فخر حد تک اضافہ کیا ہے۔ اس اضافے کی وجہ سے کاشتکاری اب ایک فائدہ مند پیشہ بن چکا ہے۔ کسانوں کا معیار رہائش بہتر ہوا ہے۔ پیداوار بڑھنے سے غذائی اجناس کی درآمدات کی در نہ صرف کم ہوئی ہے، بلکہ چند ایک کو تو برآمد کرنے کی پوزیشن میں ہے ہمارا ملک! پیداوار کے اضافے نے قیمتوں میں کمی کر کے صارفین کو راحت عطا کی ہے۔ اس کے طفیل صنعتی دھندوں کو توسیع و ترقی نصیب ہوئی ہے .... اس طرح "سبز انقلاب" کے فیوض و برکات سے قومی آمدنی میں بھی اضافہ ہوا ہے، خوشحالی کی کرن نظر آئی ہے اور ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑے ہونے کی آرزو برآنے کا بھی امکان روشن ہوا ہے ۔۔۔۔ ڈاکٹر سی ایچ ہنومنت راؤ کے الفاظ میں "سبز انقلاب کے فائدوں سے گاؤں کے سبھی طبقوں کو حصہ ملا ہے اور اس سے حقیقی مزدوری اور روزگار میں اضافہ ہوا ہے ..."۔ لہٰذا اگر سبز انقلاب کو لگن اور خلوص دل سے نافذ کیا جائے تو یقیناً زراعت کے لیے وردان ثابت ہوگا۔

سبز انقلاب میں کچھ خامیاں بھی در آئی ہیں ۔۔۔۔ مثلاً، انقلاب کچھ فصلوں تک ہی محدود رہا ہے۔ ہریانہ، پنجاب اور تامل ناڈو ... وغیرہ جیسے صوبوں تک ہی اس کی برکات پہنچ سکی ہیں۔ ان سے خصوصاً بڑے کسانوں کو ہی زیادہ فائدہ ہوا ہے، یعنی غریب کسان اور غریب اور امیر کسان اور امیر ہوتے جا رہے ہیں۔ نئے نئے زرعی آلات کی ایجاد نے دیہاتی

(باقی صفحہ پر)

ڈاکٹر [illegible]

ریڈیائی آئسوٹوپس

آج کا ترقی یافتہ انسان ایک نئی ترقیاتی تہذیب کے راستے پہ کھڑا ہے۔ آج کے اس انسان کا مقابلہ اب سے ہزاروں سال پہلے کے اُس انسان سے کیا جاسکتا ہے جس نے توانائی کا ایک نیا ذریعہ تلاش کیا تھا جو "آگ" تھا۔ آج کے ترقی یافتہ انسان کے لئے ایک بے حد چھوٹے ایٹم سے توانائی کی ایک بڑی مقدار کے پیدا ہونے کی کہانی بھی کافی دلچسپ اور پرانی ہے اس کہانی کی شروعات تاریخ کے بے حد پرانے دور سے ہوتی ہے چار سو سال ق م (Demoeri tus) نام کے یونان کے فلاسفر کا خیال تھا کہ قدرت میں پائی جانے والی ہر چیز چھوٹے چھوٹے ذرات سے مل کر بنتی ہے جن کو اس نے ایٹم کا نام دیا تھا اُس وقت لوگوں کا خیال تھا کہ ایٹم اتنے چھوٹے ذرات ہوتے ہیں جو مزید تقسیم ہونے کے قابل نہیں ہوتے یہ خیال تقریباً ۲۳۰۰ سال تک بے توجہی کا شکار رہا لیکن ۱۸۰۸ میں جون ڈالٹن نام کے انگریز اسکول ماسٹر نے اس فرسودہ خیال میں تبدیلی پیدا کی۔ ایٹم کی تھیوری میں مزید نئے نئے خیالات کا اضافہ ہوا۔ ڈالٹن کے بعد اور بھی بہت سے سائنسدانوں نے ایٹم کا مطالعہ کیا اور ہمارے لئے ایٹم سے متعلق معلومات میں اضافہ کیا۔ لیکن ۱۸۹۸ میں میڈم کیوری نے جب ایک نئے مادّے "ریڈیم" کو ایجاد کیا تب ہی سائنسداں اس بات کو صحیح طریقے سے سمجھ سکے کہ ایٹم میں مزید تقسیم ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے ۱۹۰۵ میں البرٹ آئنسٹائن وہ مشہور سائنسداں تھے جنہوں نے دنیا کے سامنے یہ حقیقت پیش کی کہ ایٹم جیسے چھوٹے ذرات میں توانائی کی لامحدود مقدار پائی جاتی ہے۔

ایٹم میں پائی جانے والی اس لامحدود طاقت کا انکشاف دنیا کے سامنے ۶ اگست ۱۹۴۵ کو ہوا جاپان کے شہر ہیروشیما میں صبح کے صاف وشفاف آسماں پر گرد وغبار، دھندلے اور پانی کے ذرات کے گہرے اور کثیف بادل چھا گئے اور ایٹمی دور کا آغاز دنیا کے ہر شہر تک آناً فاناً پہنچ گیا۔ وقت کے ایک چھوٹے سے لمحہ میں شہر کا مرکزی علاقہ بے اندازہ گرمی اور آگ سے جل جھلس کر راکھ ہوگیا ۴/۲ کلومیٹر کے دائرے میں پائی جانے والی ساری عمارتیں اور گھر مسمار ہوگئے، تقریباً سو ہزار کے قریب انسان جان بحق ہوگئے، اور جو بد قسمتی سے زندہ بچے ان کی حالت مردوں سے بھی بدتر تھی اور اسی وقت دنیا کے سامنے یہ بات منظر عام پر آئی کہ ایک ایٹم کے حقیر سے ذرّے میں تباہی کی کتنی بڑی طاقت موجود ہے۔ لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رُخ ہے۔ تصویر کا دوسرا رُخ ہمارے لئے بہتر مستقبل ترقی، کامیابی آرام وآسائش کی راہ متعین کرتا ہے، کیوں کہ ایٹم کی اس بے کراں اور تباہ کن طاقت کو اگر قابو میں کرلیا جائے تو دنیا میں اس طاقت کا ایک جزء بڑے پیمانے پر پُرامن استعمال کیا جاسکتا ہے۔ فی زمانہ ایٹمی یا جوہری توانائی پیدا کرتے وقت اس سے خارج ہونے والے دیگر مادّوں کا استعمال ایسے امراض کے علاج کے لئے کیا جاتا ہے جو کبھی لاعلاج سمجھے جاتے تھے زراعت میں ان مادّوں سے نئے اقسام کی کھادیں تیار کی جاتی ہیں فیکٹریوں میں بھی ان مادّوں کا بڑے پیمانے پر استعمال کیا جاتا ہے نیوکلیائی توانائی کے کارآمد اور مفید استعمال کی شروعات ۱۹۴۲ میں برقی توانائی کو حاصل کرنے کے لیے، دنیا کے سب سے پہلے نیوکلیر ری ایکٹر کی تشکیل سے ہوئی یہ نیوکلیر ری ایکٹر شکاگو یونیورسٹی کے سٹیگ فیلڈ (Stagg Field) مقام پر قائم کیا گیا تھا ۱۹۸۲ کے آغاز تک پوری دنیا میں برقی توانائی کو حاصل کرنے کیلئے، ۲۵۰ سے زیادہ نیوکلیر ری ایکٹر قائم ہوچکے تھے آجکل تقریباً ۳۰۰ نیوکلیر ری ایکٹرز زیر تعمیر ہیں۔ ان نیوکلیر ری ایکٹروں سے جو بجلی پیدا کی جاتی ہے اس کا استعمال مختلف صنعتوں میں کیا جاتا ہے۔ ان جوہری کارخانوں میں بجلی بنانے کے علاوہ ایک اور بیحد اہم کام انجام دیا جاتا ہے اور وہ ہے "ریڈیو آئسوٹوپس" بنانا۔

ہندوستان میں نیوکلیائی توانائی کے استعمال کو فروغ دینے اور اسی سلسلے کے تحقیقاتی کاموں کو بڑھاوا دینے کے لیے بھابھا اٹومک ریسرچ سینٹر کا قیام ٹرامبے کے مقام پر کیا گیا۔ اس ادارے میں تقریباً ۵۰ سے زائد اقسام کے ریڈیو ایکٹو آئسوٹوپس بنائے جاتے ہیں۔ جو ہندوستان اور باہر کے تقریباً ۱۵۰۰ اداروں کو سپلائی کیے جاتے ہیں۔ آئسوٹوپس کا استعمال ہمارے ملک میں کئی طرح سے کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ گورنمنٹ کے اور بھی بہت سے دوسرے ادارے ہیں

ریڈیو آئسو ٹوپس بنائے جاتے ہیں۔ جو کہ مناسب قیمت پر مختلف کمپنیوں کو فروخت کر دیئے جاتے ہیں۔ ان آئسو ٹوپس کا استعمال اتنے بڑے پیمانے پر کیا جاتا ہے کہ جسکا اندازہ لگانا محال ہے۔

انسانی بہبودی کے لیے ریڈیو آئسو ٹوپس کے استعمال کو فروغ پچھلے ۳۰ سال کے عرصہ میں ملا ہے۔ یہ مادّے مختلف امراض کی تشخیص اور ان کے علاج کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان مادّوں نے مختلف صنعتوں کو اس قابل بنایا ہے کہ پہلے سے بہتر اور سستی اشیاء تیار کی جا سکیں۔ ان ہی مادّوں کی مدد سے اناجوں کی بہتر اور تندرست قسمیں تیار کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ غذاؤں کو لمبے عرصہ تک محفوظ رکھنے کی تکنیک کو بھی فروغ ملا ہے۔

مختلف بیماریوں میں ریڈ آئسو ٹوپس کا استعمال

ریڈیو ایکٹو آئسو ٹوپس کا استعمال بیماریوں کے علاج میں کافی زیادہ کیا جانے لگا ہے جیساکہ ہم جانتے ہیں کہ جو ایٹم ریڈیو ایکٹو ہوتے ہیں وہ ریڈیائی شعاعیں خارج کرتے ہیں یہ شعاعیں بالکل اس قسم کی ہوتی ہیں جیسی شعاعیں ریڈیم سے خارج ہوتی ہیں۔ اگر یہ شعاعیں بہت زیادہ قوّت کی نہ ہوں اور ان کو کنٹرول کر لیا جائے تو یہ ڈاکٹروں اور سائنسدانوں کے لیے بیحد کار آمد اور فائدے مند ثابت ہوتی ہیں مثال کے طور پر کینسر کے نسیجوں اور خلیوں کو برباد کرنے کے لیے ریڈیم کی جگہ ریڈیو ایکٹو کو بالٹ کا استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ ریڈیم کے مقابلے میں ریڈیو ایکٹو کو بالٹ کی قیمت بہت کم ہے۔ اس لیے اس مادّے سے علاج کرنا زیادہ آسان ہے۔

اسی طرح ریڈیو ایکٹو سوڈیم کی مدد سے جسم میں دَوران خون کی جانچ کی جاتی ہے۔ اگر چوٹ لگنے یا کسی دوسری وجہ سے جسم کے کسی حصّے میں خون صحیح طور سے سپلائی نہ ہو سکے تو اسی جگہ کا نکاسی بن جاتی ہے۔ اس پریشانی سے بچنے کے لئے ریڈیو ایکٹو سوڈیم سے نمک تیار کیا جاتا ہے جس کی ایک قلیل مقدار کو پانی میں گھول کر انجکشن کے ذریعہ جسم میں دوڑنے والے خون میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ اس ریڈیو ایکٹو سوڈیم کی مقدار اتنی کم ہوتی ہے کہ اس سے جسم کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچتا پھر (Gieger Counter) نام کی ایک ایسی مشین کو جو ریڈیائی مادّوں کی موجودگی کا پتہ دیتی ہے جسم کے اس حصّے کے نزدیک رکھ دیا جاتا ہے۔ اگر مشین ریڈیائی مادے کی موجودگی کی طرف اشارہ کرے تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ جسم کے اس حصّے میں خون کی صحیح مقدار پہنچ رہی ہے۔

ہمارے جسم میں آیوڈین Iodine نام کے کیمیاوی مادے کی بھی کچھ مقدار پائی جاتی ہے حالانکہ یہ مقدار کافی کم ہوتی ہے لیکن یہ گلے میں پائے جانے والے تھائیرائیڈ گلینڈس (Thyroid glands) کے لیے بہت ضروری ہوتی ہے۔ کبھی کبھی گلے میں پائے جانے والے یہ گلینڈ اپنا کام صحیح طور پر نہیں کر پاتے جس کے نتیجہ میں جسمانی اور دماغی چستی کم ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹروں نے پتہ لگایا ہے کہ تھائیرائیڈ گلینڈ کی کام کرنے کی صحیح صلاحیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ وہ کس رفتار سے خون سے آیوڈین کی مقدار لے رہے ہیں۔ ڈاکٹر ریڈیائی آیوڈین کی بے حد قلیل مقدار (تقریباً ... ،.... ۰۰۱ را آونس) جو کہ نقصان دہ نہیں ہوتی مریض کے جسم میں داخل کر دیتے ہیں اور (Gieger Counter) کو گلے کے نزدیک رکھ کر تھائیرائیڈ گلینڈ کی آیوڈین جذب کرنے کی صحیح مقدار کا پتہ لگا لیتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے تحقیق کر کے پتہ لگایا ہے کہ ریڈیو ایکٹو آیوڈین کی قلیل مقدار اگر ایسے مریضوں کو دی جائے جن کے تھائیرائیڈ گلینڈ ضرورت سے زیادہ تیز رفتاری سے کام کرتے ہیں تو ان کی بیماری کو ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔

ریڈیو ایکٹو فاسفورس کی مدد سے دماغ میں پائے جانے والے ٹیومر کا پتہ لگایا جاتا ہے اس کے علاوہ اس کی مدد سے انسانوں اور جانوروں کی ہڈیوں کی ٹوٹ پھوٹ کے ٹھیک ہونے کی رفتار اور عمل کا پتہ بھی لگایا جاتا ہے۔ ریڈیو ایکٹو فولاد کے ذریعہ یہ معلومات فراہم کی جاتی ہیں کہ کس جگہ اور کس طرح خون کے خلیے بنتے ہیں۔

موجودہ دَور میں ریڈیو ایکٹو ایٹموں کو بطور (Tracers) استعمال کر کے انسانی جسم کے مختلف نظاموں کی جانچ کی جاتی ہے اور یہ بھی پتہ لگایا جاتا ہے کہ انسان کا جسم کس طرح سے مختلف کاموں کو سر انجام دیتا ہے۔ اس طرح سے طبّی تحقیق سے متعلق سائنسدانوں کو انسانی زندگی کے مختلف نظاموں کا مطالعہ کرنے میں مدد ملتی ہے

اور فوٹو گرافک فلم کی مدد سے سائنسداں یہ تجربہ کر رہے ہیں کہ کس طرح سے ریڈیائی کاربن انسان کے زندہ نسیجوں میں حرکت کرتا ہے۔ اس بات کی امید کی جاتی ہے کہ اس قسم کے تجربات کی مدد سے پولیو اور کینسر جیسے موذی امراض کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم ہو سکیں گی۔

طبّی میدان ریڈیو آئسو ٹوپس کا ایک اور بیحد مفید اور کار آمد استعمال جراثیموں کو مارنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ ریڈیائی مادّوں سے خارج ہونے والی ایک خاص قسم کی شعاعوں میں جن کو "گاما شعاعیں" بھی کہتے ہیں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ ہر قسم کے جراثیموں کو یہاں تک کہ "بیکٹیریا" کو بھی مارنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

عام طور سے ڈاکٹر اپنے کام میں آنے والے اوزاروں اور دوسرے آلوں کو جراثیم سے پاک رکھنے کے لیے گرم یا کھولتے ہوئے پانی میں رکھتے ہیں۔ لیکن یہ طریقہ ہمیشہ نہیں استعمال کیا جا سکتا چند مادّے ایسے ہوتے ہیں جن کو ہم زیادہ تیز درجہ حرارت پر نہیں رکھ سکتے مثلاً پنسلین (Penicilline) کو پہلے پیک کر دیا جاتا ہے اور بعد میں کھولتے ہوئے پانی کے بجائے گاما شعاعوں سے گزارا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں پنسلین کے اندر پائے جانے والے سارے جراثیم مر جاتے ہیں۔ مختلف انجکشن لگانے کی سوئیاں اور دوسرے ڈاکٹری اوزار ان ہی گاما

شعاعوں کی قدرت سے ہوشیار ہو کے بچاتے ہیں۔

بھارت میں ٹرامبے میں آسو ٹوپس (ISOMED) نام کا ایک ایسا [illegible] ہے جو صنعتی پیمانے پر جراثیم کش کم شعاعیں تیار کرتا ہے۔ ان مادوں کو ملک کے دوا سازی کے کارخانوں میں سپلائی کیا جاتا ہے۔ بمبئی میں ریڈیائی ادویات کا ایک ایسا مرکز بھی قائم کیا گیا ہے جو ریڈیو آئسو ٹوپس کی ادویاتی اہمیت اور امراض کی تشخیص کی صلاحیتوں کا پتہ لگانے کے سلسلے میں تحقیقاتی کام سرانجام دے رہا ہے۔

زراعت میں ریڈیو آئسوٹوپس کا استعمال

زراعت کے میدان میں ہونے والے تحقیقاتی کاموں میں ریڈیو آئسوٹوپس کا استعمال اور افادیت قابلِ داد سمجھی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر پیڑ پودوں کی تندرستی اور نشوونما کا مطالعہ کرنے کے لئے ریڈیو ایکٹو کھادوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ان تجربات سے پتہ لگایا جاتا ہے کہ ریڈیو ایکٹو کھاد کا کسی بھی پیڑ کی نشوونما پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم کیا جاتا ہے کہ پیڑ پودوں کو کس قسم کی معدنیات کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان ریڈیائی ایٹموں کا استعمال پیڑ پودوں کی مختلف بیماریوں کو ٹھیک کرنے کیلئے بھی کیا جاتا ہے۔

کچھ ریڈیو آئسوٹوپس کی ریڈیائی شعاعیں پیڑ پودوں کی نسل کو بہت تیزی سے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ پیڑ پودوں میں نئی اور بہتر خصوصیات کا اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے اور پیڑ پودوں کی نئی اور بہت قسمیں بھی پیدا کی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر گیہوں کے پودے کی ایسی قسم بنائی گئی ہے۔ جسکی لمبائی کم ہوتی ہے اور فصل جلد پک کر تیار ہو جاتی ہے۔ دوسرے اناجوں کی ایسی قسمیں پیدا کر لی گئی ہیں جن پر پودوں میں لگنے والی بیماریوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ امید کی جاتی ہے کہ آئندہ آنیوالے چند سالوں میں دنیا میں غذا کی کمی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے

علم نباتات میں مزید خاص قسم کی ترقی ہو سکے گی جسکا تعلق براہِ راست ریڈیائی شعاعوں سے ہوگا۔ زراعتی میدان میں ریڈیو آئسوٹوپس کی اپنی ایک اور بڑی اہمیت بھی ہے یعنی ان کو پیڑ پودوں کے مختلف نظاموں کا پتہ لگانے کے لئے سراغ رساں کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً گیہوں ایک ایسا پودا ہے۔ جو فاسفورس کی کچھ مقدار تو مٹی سے جذب کرتا ہے اور بقیہ مقدار کھاد سے لیتا ہے اس مقدار کے صحیح تناسب کا پتہ لگانے کے لئے ریڈیائی فاسفورس کو کھاد میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ جس کو پودا جذب کر لیتا ہے۔ اور اس ریڈیائی فاسفورس کی صحیح مقدار پتہ کر لی جاتی ہے۔ اس طرح گائے بھینسوں کے چارے میں وٹامن کی صحیح مقدار ملائی گئی ہے یا نہیں اس کا پتہ بھی بہت چھوٹی زندگی کے ریڈیو آئسوٹوپس کی مدد سے چلا لیا جاتا ہے (چھوٹی زندگی کے ریڈیو آئسوٹوپس کی ریڈیائی قوت بہت جلد ختم ہو جاتی ہے) ریڈیو آئسوٹوپس کا ایک اور اہم استعمال مختلف اناجوں کو کیڑوں مکوڑوں سے محفوظ رکھنے کے سلسلے میں کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ریڈیو آئسوٹوپس کی مدد سے چاول، گیہوں، مونگ پھلی، جوٹ، گنے اور سرسوں کی ایسی قسمیں تیار کی جا چکی ہیں جن پر بیماریوں اور کیڑوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان آئسوٹوپس کی مدد سے جلدی سڑنے یا خراب ہو جانے والی غذائی اشیاء کو بھی محفوظ کیا جاتا ہے۔ اگر ان غذائی اشیاء کو ریڈیائی شعاعوں سے گزار دیا جائے تو بغیر ریفریجریٹر میں رکھے ہوئے یہ غذائیں بیحد لمبے عرصہ تک سڑنے کے خطرے سے محفوظ ہو جاتی ہیں۔ ریڈیائی شعاعوں کی مدد سے آلو اور اسی قسم کی دوسری سبزیوں کو ایک لمبے عرصہ تک کے لئے محفوظ کیا جاتا ہے عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ آلوؤں کو اگر لمبے عرصہ تک محفوظ رکھنے کے لئے کولڈ اسٹور Cold storage میں رکھا جائے تو اس میں سے کلے پھوٹنے لگتے ہیں لیکن اگر آلوؤں کو بیحد مدھم قسم کی ریڈیائی شعاعوں سے گزار دیا جائے تو نہ ہی ان میں کلے پھوٹتے ہیں اور نہ ہی آلو جلد خراب ہو سکتے ہیں۔

صنعت میں ریڈیو آئسوٹوپس کا استعمال

پچھلے ۳۰ سال کے عرصہ میں انسانی بہبودی کے سلسلے میں ریڈیو آئسوٹوپس کے استعمال کو بے پناہ فروغ دیا گیا ہے۔ کیونکہ ان مادوں نے جہاں غذائی تکنیک کو بہتر سے بہتر بنانے میں مدد دی ہے وہاں مختلف صنعتوں کو بھی اس قابل بنانے میں مدد دی ہے کہ پہلے کے مقابلے میں بہتر قسموں کی سستی پائیدار اور جلد تیار ہو جانیوالی اشیاء بنائی جا سکیں۔ ریڈیائی قوت کی مدد سے بنائی جانے والی صنعتی اشیاء کی نہ صرف کوالٹی اچھی ہوتی ہے بلکہ زیادہ بہتر اور پائیدار اشیاء بھی بنائی جا سکتی ہیں جو جلد بن کر تیار ہو جاتی ہے اسطرح سے وقت اور پیسے دونوں کی بچت ہوتی ہے اور بیکار مادے بھی کم خارج ہوتے ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ریڈیو آئسوٹوپس اور ریڈیائی قوت کا صنعتی ترقی سے کافی گہرا تعلق ہے اور مستقبل میں اس بات کے کافی قوی آثار پائے جاتے ہیں جب ساری ہی صنعتیں جوہری توانائی اور جوہری شعاعوں پر انحصار کریں گی۔ اور ظاہر ہے کہ مختلف صنعتوں کی ترقی کے نتیجہ میں ہی بلڈنگ میٹیریل، کپڑا آمد و رفت وغیرہ بہتر طریقے سے مہیا کیے جا سکتے ہیں۔ اور اس بات سے بھی ہم سبھی اچھی طرح واقف ہیں کہ خاطر خواہ مقدار میں توانائی اور غذا اگر کسی بھی ملک کو میسر ہو تو مختلف ممالک کے بیچ میں اقتصادی فرق کم سے کم رہ جائیگا جس کا ایک خوشگوار نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا سے جنگوں کا خطرہ جسے آج ہم سب بری طرح محسوس کر رہے ہیں، کم سے کم ہوتا جائے گا۔

ریڈیو آئسوٹوپس کو صنعت میں دو طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً مختلف کارخانوں میں ہونے والے حادثات سے بچاؤ کے لئے بھی ریڈیو آئسوٹوپس کافی بڑے پیمانے پر استعمال میں لانے

جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب کارخانوں میں جلد آگ پکڑنے والے رقیق مادّے پائپوں میں بہتے ہیں تو اس بہاؤ سے ایک قسم کی برقی رو پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتیجہ میں کارخانے کو آگ لگنے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے ریڈیو ایکٹو آئسوٹوپس اس برقی رو کو ختم کر دیتے ہیں اور اس طرح سے آگ لگنے کے خطرے سے کارخانوں کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔

اسی طرح کی برقی رو اس وقت بھی پیدا ہوتی ہے۔ جب سیلولائیڈ یا دوسرے پلاسٹک مادے بنائے جاتے ہیں اور جب مصنوعی کیمیاوی دھاگوں مثلاً نائلون، سٹرون، پولی اسٹر وغیرہ سے کپڑا بنا جاتا ہے۔ اس برقی رو کے پیدا ہو جانے سے مٹی اور دھول کے ذرات اس کی طرف پھیلنے لگتے ہیں جس کی وجہ سے کپڑوں پر دھول اور مٹی کے دھبے پڑ جاتے ہیں۔ جن کو چھڑانے کے لئے کافی رقم درکار ہوتی ہے اور وقت بھی برباد ہوتا ہے۔ ریڈیو ایکٹو مادے اس برقی رو کو ختم کرنے میں مددگار ہوتے ہیں اور اس طرح سے کپڑے کی صنعت کو ہونے والے نقصان سے محفوظ رکھتے ہیں۔ ٹوتھ پیسٹ کو جب ٹیوب میں بھرا جاتا ہے یا دوسری ایسی اشیا جن کو ٹیوب یا ڈبوں میں بھرا جاتا ہے تو ان کی صحیح مقدار کو چیک کرنے کے لئے بھی ریڈیو ایکٹو مادے استعمال کئے جاتے ہیں جو برق رفتاری سے ان کاموں کو سر انجام دیتے ہیں۔ گاما شعاعوں کا استعمال اب ولڈنگ کے کارخانوں میں بھی کیا جانے لگا ہے یہ شعاعیں ولڈنگ میں پائے جانے والے نقائص کا پتہ دیتی ہیں زمین دوز میلوں لمبے پائپ میں اگر کسی جگہ سوراخ ہو جائے تو بجائے اس کے کہ زمین کو کھود کر پورے پائپ کو چیک کیا جائے اگر تھوڑی سی مقدار ریڈیائی مادے کی اس پائپ میں ڈال دی جائے اور (Gieger counter) کو پائپ کے راستے پر زمین کے اوپر رکھ کر دیکھا جائے تو جس جگہ پائپ سے ریڈیائی مادہ سوراخ کے ذریعہ باہر آئے گا۔ اس کا پتہ Gieger counter کے اشارے سے چلایا جا سکتا ہے۔

مختلف کارخانوں میں لگے ہوئے کل پرزے ایک دوسرے سے رگڑ کھانے کی وجہ سے گھستے رہتے ہیں ان پرزوں کو اگر کھول کر دیکھا جائے تو اس کے لئے کافی وقت درکار ہوتا ہے اس لئے پرزوں کی گھساوٹ کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے ریڈیو ایکٹو دھات کے بنے ہوئے چھلّوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ چھلے جب رگڑ سے گھستے ہیں تو ریڈیائی مادے انجنوں میں استعمال کئے گئے تیل میں آجاتے ہیں، اس تیل کی جانچ کرنے سے پتہ لگایا جاتا ہے کہ کس انجن کے پرزے کس رفتار سے گھستے ہیں۔ اس طرح سے جو کام ہفتوں میں ہوتا تھا وہ اب صرف چند گھنٹوں میں کر لیا جاتا ہے۔

جراثیم کش دواؤں کے کارخانوں میں بھی اب ریڈیائی مادے استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً جن فیکٹریوں میں (B.H.C.) نام کی جراثیم کش دوائی بنائی جاتی ہے ان میں بنزین Bengene اور کلورین Chlorine کا عمل کرایا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں B.H.C. یا Benzene hexa chloride تیار ہوتی ہے اس عمل کی رفتار بڑھانے کے لئے بریڈر ری ایکٹروں سے خارج ہونے والی توانائی کا استعمال بہت کارآمد سمجھا جاتا ہے اسی طرح سے پولی ایتھائیلین Polyethylene نام کے پلاسٹک بنانے کے کیمیاوی عمل کی رفتار کو بھی گاما شعاعوں کی مدد سے بڑھایا جاتا ہے۔

مستقبل میں جیسے جیسے جوہری توانائی اور ریڈیو ایکٹیوٹی پر زیادہ سے زیادہ تحقیقاتی کام ہوں گے جوہری توانائی اور ریڈیو آئسوٹوپس ہمارے لئے پہلے کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ ضروری ہوتے جائیں گے کیوں کہ جو جوہری توانائی تباہی کے لئے استعمال کی جا سکتی ہے وہ امن کے لئے بھی استعمال کی جا سکتی ہے اگر زیادہ سے زیادہ لوگ جوہری توانائی اور ریڈیائی شعاعوں کو صحیح طور سے سمجھ سکیں اس کے استعمال کو جانیں اس کے نقصانات اور فوائد کو پہچانیں تو ہم اتنی بڑی ایجاد سے بے حد فائدہ اٹھا سکتے ہیں ہم اپنی دنیا کو بہتری کی طرف موڑ سکتے ہیں اور یہی ایک ایٹم کا دنیا سے وعدہ ہے۔ ہم کو بھی اس کا بطور امن استعمال کرنا چاہیئے۔

یوجنا ہندی دہلی

بقیہ، عورتوں کی تعلیم و ترقی

میں ہائی اسکول تک لڑکیوں کے لئے مفت تعلیم ہے۔ ہندوستان میں لڑکیوں کی تعلیم و ترقی کے لئے ابھی مزید اقدامات کئے جانے ہیں۔ ہندوستان میں عورتوں کو قومی ترقیاتی کاموں میں مردوں کے ساتھ ساتھ رکھا جائے گا۔

عورتوں کی بہبود سے متعلق اقوام متحدہ کے دہے میں عورتوں کی سیاسی، انتظامی، قانونی، سماجی، اقتصادی اور ثقافتی مساوات کے لئے کوشش کی گئی ہیں۔ ہندوستان میں پارلیمنٹ میں حال ہی میں ایک قانون بنا ہے۔ یہ فیملی کورٹس سے متعلق ہے۔ اس کے ذریعے تاخیر کے عنصر کو ختم کرنے پر زور ہے۔ یہاں بہت سے رضاکارانہ ادارے نچلی سطح پر کام کر رہے ہیں۔ سرکاری کوشش اپنی جگہ ضروری درست اور بجا تاہم اس کے لئے سماج کا مزاج بدلنا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ رضاکار ادارے اس سلسلے میں اہم خدمات انجام دے سکتے ہیں۔

مارچ ۱۹۸۴ء میں نئی دلی میں منعقدہ ناوابستہ ممالک کی ساتویں چوٹی کانفرنس نے یہ مشورہ دیا تھا کہ جولائی ۱۹۸۵ء میں نیروبی میں عورتوں کے موضوع پر اقوام متحدہ کی کانفرنس بلانے سے قبل ایک میٹنگ اور ہونی چاہیے ——

ہندوستان میں ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۵ء کے دہے میں عورتوں کی بہبود کے لئے بہت سے ایسے قوانین وضع کئے گئے جن سے ان کو مساوی درجہ مل سکے ان میں سے کچھ یہ ہیں۔ مساوی اجرتوں سے متعلق ایکٹ ۱۹۷۶ء۔ فیکٹریز ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۶ء شادی بیاہ کے قوانین کا ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۶ء کم سنی کی شادی کی روک تھام سے متعلق ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۶ء زچہ بچہ کی بہبود سے متعلق ایکٹ ۱۹۷۶ء اور انسداد بدکاری ایکٹ ۱۹۷۸ء۔

سید افضل پیرزادے

ہماری معاشی زندگی اور بجٹ

آج کا یہ معاشی واقتصادی نظام اتنا پیچیدہ ہوگیا ہے کہ ایک عام آدمی، سرمایہ کار، صارف، تاجر کوئی بھی فیصلہ تن تنہا کرنے سے قاصر ہے۔ ان سب کا کام سرمایہ کاری، تجارت، خرید و فروخت حکومت کے فیصلوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مثلاً ایک سرمایہ کار اپنا سرمایہ لگانا چاہتا ہے۔ اپنا سرمایہ لگانے سے پہلے وہ سوچے گا اس کو کتنی آمدنی ہوگی اور ٹیکسوں کے ادائیگی کے بعد کتنی رقم بچی اخراجات کے لئے بچ جائے گی۔ اس طرح سے ایک صارف کسی چیز کے استعمال سے پہلے یہ سوچنے پر مجبور ہوگا کہ وہ کونسی چیزیں خریدے تاکہ اسکو کم سے کم ٹیکس دینا پڑے۔ ان مثالوں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہمارا معاشرتی کردار حکومت کے فیصلوں سے متاثر ہوتا ہے۔ اس طرح ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ حکومت کی طرف ترقی کے کاموں میں لگایا جانے والا سرمایہ بھی عام آدمی کی زندگی پر کافی اثر ڈالتا ہے۔ مثلاً حکومت کی طرف سے شروع کی جانے والی صنعتیں کافی بڑی تعداد میں روزگار فراہم کرسکتی ہیں ان مواقع کی فراہمی کے ساتھ ہی لوگوں کی زندگی میں سدھار آتا ہے۔ ان کی قوت خرید میں اضافہ ہوتا ہے اور اس طرح سے اشیائے صرف کی مانگ میں اضافہ ہوتا ہے۔ دوسری مثال ہم یہ لے سکتے ہیں کہ حکومت کی طرف سے تعمیر کیے جانے والے باندھ ملک کی زرعی اور صنعتی زندگی میں ایک انقلاب لاتے ہیں۔ ہزاروں ایکڑ زمین قابل کاشت ہو جاتی ہے اور زرعی پیداوار میں نمایاں اضافہ ہو سکتا ہے۔ دوسری طرف بجلی کی فراہمی سے ہزاروں کارخانوں میں جان پڑ جاتی ہے۔

ہمارے لیے بجٹ کا کلی تجربہ کرنا

اس وقت بہت آسان ہوگا جب کہ قومی سطح پر صرف ایک بجٹ پیش کیا جائے۔ مگر دیکھا یہ گیا ہے کہ ایک ہی ملک میں الگ الگ سطحوں میں مختلف بجٹ پیش کیے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک بجٹ جو مرکزی حکومت پیش کرتی ہے، دوسرا بجٹ جو صوبائی حکومتیں بناتی ہیں اور تیسرا بجٹ وزارت ریل کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ سبھی بجٹ عام آدمی کی زندگی پر پوری قوت کے ساتھ اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثلاً چند اشیائے صرف پر مرکزی حکومت پانچ فی صد ٹیکس عائد کرتی ہے۔ قیمتوں میں اضافہ ریلوے بجٹ پر بھی منحصر ہوگا۔ اگر وزارت ریلوے اشیائی نقل و حمل پر دس فی صد ٹیکس عائد کرتی ہے تو قیمتوں میں کل اضافہ پندرہ فی صد ہوگا۔ صوبائی حکومتیں اپنے دائرہ اثر میں آنے والی اشیا پر ٹیکس عائد کرے گی نتیجتاً ایک عام آدمی کی زندگی محال ہو جائے گی۔

اب ہم اس پس منظر میں حالیہ بجٹ کا ایک سرسری جائزہ لے سکتے ہیں۔ حالیہ بجٹ ضرورت سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے پس پردہ ایک خاص سیاسی فلسفہ کام کر رہا ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ شریمتی اندرا گاندھی کے ناگہانی قتل کے بعد عنان حکومت جواں سال راجیو گاندھی کے ہاتھوں آئی۔ ان کا معاشی واقتصادی فلسفہ مرحومہ اندرا گاندھی سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ملک ہر لحاظ سے خود کفیل ہو، غربت کی شدت میں کمی ہو، بے روزگاری اور زیادہ نہ بڑھنے پائے اور امیروں اور غریبوں کے درمیان خلیج کم ہو۔ ان تمام مقاصد کو ہم روایتی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ راجیو گاندھی یہ بھی چاہتے ہیں کہ ملک کو اکیسویں صدی کے لیے تیار کیا جائے۔ آنے والے سالوں میں ملکوں کے درمیان معاشی و اقتصادی مقابلہ تیز سے تیز تر ہوگا۔ اس مقابلے کے لئے ہم کو کافی تیاری کرنی ہوگی۔ ہماری یہ صلاحیت اس بات پر منحصر ہوگی کہ ہمارے پاس ٹیکنالوجی کا کیا معیار ہے۔ بقول بہت

غفلت ہمیں کافی پیچھے دھکیل سکتی ہے اور ہمارے لیے یہ ناممکن ہوگا کہ اکیسویں صدی کے اوائل کی اندازاً ۱۱۰ کروڑ کی آبادی کا بوجھ اٹھا سکیں۔

۱۹۸۵-۸۶ کا بجٹ فراخدلانہ ہے۔ یہ ان نکتہ چینیوں کا ازالہ کرے گا کہ بھارت میں ٹیکس کی شرح سب سے زیادہ ہے ٹیکسوں کی شرح میں جو کمی کی گئی ہے اس سے تقریباً ۳۹۷ کروڑ روپے کا نقصان ہوگا۔ مگر حکومت یہ سوچتی ہے کہ ٹیکس کے نظام میں سدھار لاکر ۲۰۰ کروڑ روپے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اس طرح سے کل نقصان ۳۹۷ کروڑ روپیوں سے گھٹ کر ۱۹۷ کروڑ روپے رہ جائیگا ملک کے مالدار طبقے تاجروں، صنعت کاروں اور سرمایہ کاروں نے ٹیکسوں میں چھوٹ اور انکی شرح میں کمی کا نہایت ہی گرم جوشی سے استقبال کیا ہے ان سب کی یہ متفقہ رائے ہے کہ ملک میں سرمایہ کاری میں قابل رشک حد تک اضافہ ہوگا اور صنعتی ترقی میں تیزی آئے گی۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں غربت و افلاس کی شدت ہے یہاں بہت ہی کم لوگ انکم ٹیکس اور ویلتھ ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ ستر کروڑ والے اس ملک میں ہم ان کی تعداد انگلیوں پر گن سکتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ انکم ٹیکس اور ویلتھ ٹیکس کی رعایتوں کا فائدہ بالکل ہی محدود لوگوں کو ہوگا اور ایک عام آدمی کو ان سے مطلق فائدہ نہیں ہوگا۔ البتہ اگر ہم آنے والے دس یا پندرہ سالوں کا احاطہ کریں تو یہ بات عین ممکن ہو سکتی ہے کہ ان رعایتوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے صنعت کار، سرمایہ کار اور تاجر ملک میں زیادہ سے زیادہ صنعتیں قائم کریں گے۔ اس سے پیداوار میں بھی اضافہ ہوگا اور روزگار کے ذرائع بھی بڑھ سکتے ہیں۔ مگر فی الفور ایک عام آدمی کو ان رعایتوں کا کچھ بھی فائدہ نہیں ہوگا۔

یہاں پر یہ امر لازمی بن جاتا ہے کہ ہم دیکھیں کہ بجٹ کے وہ کون سے پہلو ہیں جو ایک عام آدمی کی زندگی کو سیدھے متاثر کر سکتے ہیں۔ وہ کونسے نکات ہیں جو اس کی زندگی میں راحت بھی لا سکتے ہیں یا اس کی مشکلات میں اور بھی زیادہ اضافہ کر سکتے ہیں۔ چند ایک اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) پٹرول اور پٹرول سے بنی ہوئی چیزوں پر زیادہ ٹیکس۔
(۲) سیمنٹ پر زیادہ ٹیکس
(۳) ۳۳۴۹ کروڑ روپیوں کا خسارہ جس کی بھرپائی نہ ہو سکے گی۔

پٹرول ایک ایسی چیز ہے جسکا استعمال معاشرے کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والا فرد کرتا ہے۔ یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ پٹرول کی قیمتوں میں اضافہ صرف امیروں کو متاثر کرے گا جن کے پاس اپنی کاریں ہوتی ہیں۔ بات تو دراصل یہ ہے کہ امیروں کے پاس کافی مالی وسائل ہوتے ہیں۔ ان کی قوت برداشت زیادہ ہوتی ہے۔ پٹرول اور اسطرح کی دوسری چیزوں کی قیمتوں میں اضافہ کا ان پر کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ یہ غریب اور درمیانی درجے کے ہی طبقات ہیں۔ جو پٹرول کی قیمتوں میں اضافہ سے بری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ ایک ہی مقام پر تمام اشیاء خوردنوش دستیاب نہیں ہوتیں۔ یہ کہیں اور اگائی یا بنائی جاتی ہیں اور ان کا استعمال کہیں اور ہوتا ہے لازماً ان اشیاء کو مقام پیداوار سے بازار تک لایا جائے۔ اگر ایسے وقت میں ذرائع رسد مہنگے ہوں تو اشیاء کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہوگا۔ کوئی تاجر صنعت کار مہنگے ذرائع نقل و حمل کا بوجھ خود برداشت نہیں کرے گا بلکہ اس بوجھ کو قیمتوں میں چھپا کر صارفین پر لاد دیگا۔ اس اضافے کا سارا بوجھ غریبوں کو ہی برداشت کرنا پڑے گا۔ اگر ایسے وقت ریلوے وزارت اپنے کرایوں میں اضافہ کرتی ہے تو غریبوں کی حالت اور بھی ابتر ہو جائے گی۔ ایک طرف محدود آمدنی اور دوسری طرف بڑھتی ہوئی قیمتیں یہ دو چیزیں غریبوں کی زندگی کو اور بھی زیادہ دشوار کر دیتی ہیں۔

سیمنٹ کی قیمتوں میں جو اضافہ کیا گیا ہے اس کا اثر درمیانی طبقے پر ہوگا اور ان کی تعمیراتی سرگرمیاں متاثر ہو سکتی ہیں۔ امیر اور مالدار لوگ کہیں نہ کہیں سے سیمنٹ حاصل کر لیں گے۔ وہ لوگ سیمنٹ کو کالا بازار میں خریدنے سے بھی پس و پیش نہیں کریں گے۔ مصیبت کا سامنا تو درمیانی طبقے کو کرنا پڑے گا۔ ایک تو یہ کہ کوٹہ (QUOTA) حاصل کرنے کے مہینوں انتظار کرنا پڑتا ہے اور جب کوٹہ حاصل ہوتا ہے اس وقت تک دوسری تعمیراتی اشیاء مہنگی ہو جاتی ہیں۔ دوم یہ کہ زائد محصول کی وجہ گورنمنٹ کوٹہ سے حاصل ہونے والا سیمنٹ اور بھی زیادہ مہنگا ہو جاتا ہے۔

موجودہ حکومت ایک فلاحی حکومت ہے فلاحی اور سماجی بہبودی کے کاموں کے لیے کروڑوں روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ سماج کے چند ایک شعبے ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں نجی سرمایہ کار اپنا سرمایہ لگوانا پسند نہیں کرتے کیونکہ اس طرح کی سرمایہ کاری سے زیادہ منافع حاصل نہیں ہوتا لازماً حکومت کو ہی سرمایہ لگانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس وقت جبکہ قیمتیں لگاتار بڑھتی چلی جا رہی ہیں، سرمایہ میں لگنے والی رقم اندازہ سے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ایسی حالت میں بجٹ میں ایک کافی بڑا خسارہ پیدا ہوگا۔ جاری سال کا بجٹ کا خسارہ تقریباً ۳۳۴۹ کروڑ روپے بتایا گیا ہے۔ اس خسارہ کا فوراً اثر یہ ہوگا کہ زر کی افراط ہو گی۔ ایک طرف بازار میں دستیاب ہونے والی اشیاء کی محدود سپلائی اور دوسری طرف افراط زر۔ نتیجتاً قیمتوں میں اور بھی اضافہ ہوگا

(باقی صفحہ ۴۰ پر)

م ایک ۔ مہتاب



سورج بھان دھرتی کی پیداوار ہے جسے دھرتی سے الگ کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا زمین میں سے گنے کو جڑ سے اکھاڑنا۔ اس لمبے اونچے کسان کو زراعت وراثت میں ملی ہے۔ اس کا علم و آگاہی اپنی زمین اور زرعی معلومات کی وراثت تک محدود ہے۔ اُسے مختلف فصلوں کی کاشت، آبپاری، کٹائی، زمین کے زاویے اور موسموں کے ہیر پھیر کے متعلق اتنے قصے کہانیاں محاورے اور پشت در پشت دیہات میں سنائے جانے والے گیت یاد ہیں کہ اگر اُنہیں قلمبند کر لیا جائے تو اچھی ضخیم کتاب بن سکتی ہے۔ کھیتی کی ہر بات کے لئے اُسکے پاس کہنے کو ایک محاورہ یا ضرب المثل موجود ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دیہی زندگی کے بارے میں ہمارے بزرگوں کا روائتی علم اور آگاہی کتنی مضبوط بنیادوں پر قائم تھی۔ رگ رگ میں سمائے ہوئے اِس علم کی موجودگی میں کسی کسان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے کھیتوں پر جدید تجربے کر کے اپنے اثاثہ کو خطرے میں ڈالے گا۔

لیکن سورج بھان کی صورت میں ایسا نہیں کہا جا سکتا۔ ضلع رہتک کے ایک گاؤں کا رہنے والا کسان جو اب عمر کے چھٹے دہے میں پہنچ چکا ہے ترقی پسند ہے۔ وہ کھیتی کے جدید طریقوں یعنی نئی قسم کے آلات زراعت، ٹریکٹروں، کیڑے مار دواؤں کیمیائی کھادوں، گہائی اور کٹائی کی مشینوں کا بلا وجہ مخالف نہیں اگر کوئی جدید طریقہ قدیم اور روائتی طریقوں سے زیادہ فائدہ بخش ہے تو اسے اپنانے میں کوئی اعتراض نہیں۔ البتہ اسے یہ اعتراف ہے کہ دھرتی کتنے دیہاتی غریب لوگوں کا پیٹ بھرتی ہے۔ اگر اُن کی جگہ مشینیں لگا دی جائیں تو وہ غریب پیٹ بھرنے کے لئے کیا کریں گے؟ اُسے زمینداروں اور غریب مزدوروں کے قدیم رشتوں اور ایک قسم کے بھائی چارے کا جو دیہی زندگی کی ایک مضبوط بنیاد تھی، مشینوں کے سبب ٹوٹنا پسند نہیں۔ بلکہ وہ اس بات کا قائل ہے کہ زمینوں سے زیادہ سے زیادہ پیداوار ہو اور اس سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار ملے۔ پیٹ بھرنے کا وسیلہ حاصل ہو۔

یہی سبب ہے کہ سورج بھان ہر فصل کے لئے ہمارے سٹور سے کیمیاوی کھاد خریدنے کے لئے آتا ہے۔ وہ بہت دلچسپ آدمی ہے۔ گاؤں کی زندگی کی قدیم اور جدید نسلوں کے پُر لطف قصے اپنے خصوصی انداز میں سناتا ہے اور گھنٹہ دو گھنٹے بولتے رہنا تو اُس کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ وہ چائے سگریٹ کا شوقین نہیں البتہ اسے چلم پینے کا شوق ہے جو وہ ہمیشہ اپنے پاس رکھتا ہے۔ مٹی کی بنی سُرخ چلم کے اوپر تھوڑا تمباکو رکھ کر اُس میں ایک دو کوئلے رکھ دیتا ہے اور نچلے حصّے پر سفید رنگ کا کھدر کا ٹکڑا جسے وہ صافی کہتا ہے بھگو کر لپیٹ لیتا ہے۔ اب صافی میں منہ رکھ کر ایک عجیب انداز سے کش لگاتا ہے۔ چلم کے اوپر دھواں یا چھوٹا سا شعلہ نکلتا ہے۔ پہلے کش پہ تو وہ قدرے کھانستا ہے لیکن دوسرے دم کے بعد وہ سر دُھنتا ہے گویا اُسے لطف آ رہا ہو۔ چلم پیتے پیتے سورج بھان کی سفید مونچھوں کے درمیانی حصّے کے بال زرد رنگ کے ہو گئے ہیں۔ یہ اس امر کی نشانی ہے کہ وہ باقاعدگی سے چلم پیتا ہے۔ وہ جب بھی سٹور میں آتا ہے پانی یا شربت پینے کے بعد اس کا پہلا مطالبہ یہی ہوتا ہے: "بیٹا دو کوئلے آگ ملے گی کیا؟" چلم ہاتھ میں لینے کے بعد سورج بھان اپنے رنگ میں آجاتا ہے پھر زراعت سے لے کر سیاست تک جو قصہ چاہو اُس سے سُن لو۔ ہمارے باپو سے اُس کی خاص دوستی ہے کھاد ہو یا کیڑے مار دوائیاں۔ بیج ہوں یا کھیتی کا کوئی اور سامان وہ کہیں سے خریدنے نہیں جائے گا۔ باپو کو بھی یقین ہے کہ سورج بھان [illegible] ہے اُس کے ہاں [illegible]

بلکہ سوالیے ہو کر ہی لوٹتے ہیں اِس لئے سورج بھان کی آمد پر اُس کی عزت بھی ہوتی ہے اور خاطر و مدارات بھی۔

حالانکہ سورج بھان کوئی بڑا کسان نہیں چار بیگھے زمین کا مالک ہے پھر بھی ہم اُسے چوہدری صاحب کے لقب سے پکارتے ہیں۔ اُس کے حقے کا انتظام کر کے اُس سے ایک دو گھنٹے پُر لطف باتیں سننے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ وہ بڑی پتے کی باتیں کرتا ہے اور دیہی دانش کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ لیکن اب ایسا دکھائی دیتا ہے کہ شہروں کی دانائی نے دیہات کی دانش پر غلبہ پا لیا ہے۔ کچھ عرصے سے وہ کوئی بات حکم لگا کر نہیں کہتا بلکہ ساتھ ساتھ کہے جاتا ہے۔

"بھئی ہم نے تو یہی سنا، یہی سیکھا یہی کیا۔ اب شہروں کے عقلمند لوگ شاید اِس پر یقین کریں یا نہ کریں؟" اُسے اب گلہ رہنے لگا ہے کہ شہروں میں تو بڑے بوڑھوں کی قدر اور توقیر ختم ہوئی ہی تھی اب یہ ہوا دیہات تک بھی آ پہنچی ہے نئی نسل کے لوگ رات کو بزرگوں کی چارپائیوں کے گرد آکر نہیں بیٹھتے۔ کہانیاں نہیں سنتے۔ ہدایت نہیں لیتے۔ حقہ بھر کر نہیں دیتے۔ ایسے دکھائی دیتا جیسے چھاپے کی کتاب نے تجربے کی کتاب کو اُکھاڑ پھینکا ہو۔ دیہات میں بزرگ لوگ بے عزت، بے آبرو اور بے کار ہو کر رہ گئے ہیں جنہیں کچھ دن بعد اُٹھا کر پھینک دیا جائے گا۔

دھان کی کاشت کے موقع پر سورج بھان آیا تھا چلم کے دھوئیں کے گرد محفل بھی منعقد ہوئی تھی لیکن سورج بھان نے کیا دے گیا دانائیاں۔ [illegible] [illegible]

کہ وہ ہر نئی سہولت مہیا کرنے میں پیش پیش رہتا ہے۔ لیکن گیہوں کی کاشت سے پہلے بھی وہ ہمارے سٹور پر ہی آیا۔ البتہ اُس نے ہمارے سٹور سے کچھ خریدا نہیں۔ باپو نے اس سے کہا۔

"چوہدری صاحب پیسے کی فکر نہ کرو جو کچھ لینا ہے لے جاؤ۔" لیکن اُس کا کہنا تھا کہ اُسے ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے وہ اب بھگوان کے بھروسے کھیتی کرنا چاہتا ہے۔

ایک ترقی پسند کسان کے منہ سے یہ الفاظ عجیب سے دکھائی دے رہے تھے۔ ہاں شام کو جب وہ چارپائی پر بیٹھا چلم پی رہا تھا اور ہم اس کے گرد موڑھوں پر بیٹھے تو یہی الفاظ دہراتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک بلند قامت جفاکش کسان کی آنکھوں کا ڈبڈبا آنا کوئی معمولی بات نہیں تھی آنسوؤں کے یہ چند قطرے جو اس کی آنکھوں میں تیر رہے تھے کسی اندرونی ٹیس اور کسی دلی صدمے کا عکس تھے۔ اور جب ہم نے اُس کے جذبات کو کریدنے کی کوشش کی تو آنکھوں میں رُکا ہوا جھرنا بہہ ہی نکلا۔ ٹپ ٹپ کرتے دو چار آنسو پلکوں سے جھڑ کر اس کی سفید مونچھوں میں اٹک گئے۔

وہ بتا رہا تھا کہ آخر وہ کس کے لئے زمین پر جان مارے؟ دھرتی پر کیوں نئے نئے تجربے کرتا رہے جب اس کے سوا کسی اور کو اس میں دلچسپی ہی نہیں ہے۔ اُس نے اپنے بیٹے جنسی کو اسی زمین کی آمدنی سے پالا پوسا پڑھایا لکھایا۔ پھر حصار کی زراعتی یونیورسٹی میں بھیجا تاکہ وہ کھیتی کا جدید علم حاصل کرے۔ [illegible]

اُس کے پاس ایسی پیداوار بڑھانے کے طریقے سیکھیں۔ مویشی پالنے، مرغیاں پالنے، مچھلی پالنے، مکھیاں پالنے کے طریقوں سے اپنی آمدنی بڑھانے کے گر سیکھیں اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو تو اُسے اطمینان ہو کہ اُس نے اپنے ٹیوب ویل پر ایک ایسا ثمر آور درخت لگایا ہے کہ اس کے سایہ میں چاروں طرف سے لوگ آکر بیٹھے ہیں اور فیضیاب ہوتے ہیں۔

لیکن جنسی نے پڑھائی ختم کرنے کے بعد اس کا دل توڑ دیا تھا وہ چار بیگھے کی کھیتی کو منافع بخش کھیتی نہیں سمجھتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہاں پسینہ بہانا اور اپنے علم کا استعمال کرنا بے کار ہے۔ سورج بھان نے اُسے بہت سمجھایا کہ نئے طریقوں کے استعمال سے کھیتوں سے پانچ گنا پیداوار حاصل ہو سکتی ہے ملک کے کئی حصوں میں فی ایکڑ پیداوار امریکہ سے بھی زیادہ ہو رہی ہے۔ پھر ہمارے کھیت پانچ گنا آمدنی کیوں نہیں دے سکتے۔ جب پانچ گنا آمدنی ہوگی تو آمدنی کے اور راستے بھی نکل آئیں گے لیکن سورج بھان کو یوں دکھائی دیتا تھا گویا جنسی کو شہروں کی غلامی نے جکڑ لیا تھا وہ اب گاؤں کی آزاد فضاؤں میں رہنا نہیں چاہتا تھا بلکہ شہر کی بیڑیاں اپنے پاؤں میں ڈالنا چاہتا تھا جہاں انسان ہوا پانی دودھ مٹی اناج روشنی ہر چیز کے لیے دوسروں کا محتاج رہتا ہے۔

دھان کی کاشت کے موقع پر سورج بھان نے جنسی کو بہت سمجھایا لیکن اُس میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا عزم پیدا نہیں کر سکا کیونکہ جنسی شہروں کے چکا چوند کا متوالا ہو چکا تھا اُسے دلی کے کسی زراعتی دفتر میں ملازمت مل گئی تھی اور وہ دھان کی کاشت کو درمیان میں ہی چھوڑ کر چلا گیا تھا سورج بھان کو اپنے [illegible]

[illegible]

[illegible] کا بازو کٹ گیا ہو۔ اس نے جوں توں کھیتی کروا دی لیکن دھان کے سرسبز کھیت دیکھ کر اُسے کوئی خوشی نہیں ہوئی کیونکہ انسان امیدوں کے سہارے زندہ رہتا ہے اور جب اسے خدشہ ہو کہ اس کے آخر ہونے سے ہی یہ لہلہاتے کھیت بکھر جائیں گے تو خوشی کا جذبہ کیوں نہ سرد ہو جائے گا۔

سورج بھان اپنے بیٹے بنسی سے ملنے دلی کے کرشنا بھون میں بھی گیا تھا۔ ایک لمبی اندھیری سی گلی میں سے گذر کر وہ بنسی کے کمرے میں گیا۔ کمرے میں کہیں سے بھی سورج کی روشنی اور ہوا کا دخل نہیں تھا۔ روشنیوں سے بھرپور کمرے میں اپنے بیٹے کو بیٹھا دیکھ کر اُسے یوں لگا گویا بنسی کو کسی نے بجلی کے بلب کے اندر بند کر دیا ہو۔ سورج بھان زیادہ دیر اس جدید قید خانے میں نہیں بیٹھ سکا۔ اُسے اُمید تھی کہ ایک نہ ایک دن بنسی گاؤں لوٹ آئے گا لیکن ایک دو ماہ بعد وہ اور اس کی بیوی بنسی کے بلاوے پر پھر شہر گئے بنسی کو ایک عمارت کی چوتھی منزل پر دو کمرے کا کوارٹر مل گیا تھا۔ جب بنسی آج لئے نیچے سے تین روپے کی ڈبل روٹی خرید کر لایا تو سورج بھان یہ سوچ کر پانی پانی ہو گیا کہ بیسیوں افراد کو روٹی کھلانے والے کسان کا بیٹا ذلت کے کون سے گڑھے میں جا گرا ہے۔ لیکن سورج بھان کے لئے اس سے بھی بڑا صدمہ یہ تھا کہ بنسی نے اپنے ہی دفتر میں کام کرنے والی ایک خوبصورت نئے ڈھنگ کی شہری لڑکی سے شادی طے کر لی تھی اور انہیں مقامی مندر میں یہ لڑکی قبول کرنی تھی۔ سورج بھان نے محسوس کیا کہ اب شہر نے بنسی کو مکمل طور پر نگل لیا ہے۔ اس قسم کی رنگی پوتی لڑکی کبھی گاؤں کی دھول پھانکنے نہیں آئے گی۔ اُسے ٹیوب ویل اور [illegible] کی آواز کبھی سہانی نہیں لگے گی [illegible] سے خوشبو نہیں بلکہ [illegible] گوبر کی بدبو آنے لگی اور وہ اپنے بچوں کو بھی [illegible] کے گوبر کے نزدیک بھی نہیں پھٹکنے دے گی۔ سورج بھان کے لئے یہ لڑکی قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ وہ چکر جو بنسی کے دلی جانے سے شروع ہوا تھا اب مکمل ہو گیا تھا جس کے ٹوٹنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔

دل شکستہ سورج بھان جو ترقی پسند مگر روایت پرست تھا بے آبرو ہو کر گاؤں لوٹ آیا تھا۔ اسے ٹیوب ویل سے لیکر اُفق تک ایک خلا ہی خلا نظر آتا تھا جس کے درمیان وہ معلق تھا۔ فی ایکڑ پیداوار پانچ گنا کر دینے کے منصوبے پت جھڑ کے خشک پتوں کی طرح بکھر گئے تھے۔ وہ سوچتا رہتا تھا کہ اگر انسان دھرتی پر اپنے پسینے سے آبپاشی نہیں کرنا چاہتا اگر اُسے آزادی نہیں غلامی کی زنجیریں پسند ہیں تو بہتر یہی ہے کہ قدرت سے لڑائی نہ لڑی جائے اور جو کچھ وہ دے اُسے جھولی میں سمیٹ لیا جائے۔"

سورج بھان کی چلم کی آگ مدھم ہو گئی تھی جسے وہ ماچس میں سے ایک تیلی جلا کر پھر سے سلگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی آواز ایک ٹوٹتے ہوئے دل کی بے ہنگم آواز تھی جس سے کوئی نغمہ مرتب نہیں ہو رہا تھا۔

"چودھری سورج بھان!" ہمارا بابو اُسے خاموش دیکھ کر کہہ رہا تھا "کیا صرف بنسی ہی تمہارا بیٹا ہے؟ یہ لڑکے جو بیٹھے تیری باتیں سُن رہے ہیں یہ بھی پیٹ بھرنے کے لئے تمہاری طرف ہی دیکھتے ہیں۔ سچا کسان تو وہی ہے جس کا ہاتھ آخری دم تک ہل پہ رہتا ہے چودھری جی"

سورج بھان خاموش بیٹھا چلم پیتا رہا۔ اُس کی آنکھیں اب بھی نمناک تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ پگڑی درست کرتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا:

"ست رام تم ٹھیک کہتے ہو کھاد کے تھیلے ٹرالی میں رکھوا دو۔"

بقیہ: سبز انقلاب

مزدوروں میں بے روزگاری کو بڑھایا ہے ....

یہ ایسی خامیاں، کمیاں یا نقائص ہیں، جنھیں خصوصی توجہ سے دور کیا جا سکتا ہے ـــــــ اور سرکار اس جانب توجہ دے بھی رہی ہے۔ مثلاً سبز انقلاب پروگرام کو دوسرے صوبوں میں بھی نافذ کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ سینچائی کی سہولیات کو بڑھایا جا رہا ہے اور غریب یا چھوٹے کسانوں کو آسان شرطوں اور قسطوں پر قرض مہیا کیے جا رہے ہیں ـــــ اگر ہم بغور جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ محترمہ اندرا گاندھی جی کا بیس نکاتی پروگرام سبز انقلاب کے پروگرام کو پورے ملک میں پھیلانے کے لئے ایک زبردست قدم ہے ـــــــ اور ہمیں یقین ہے کہ ہمارے نوجوان قائد شری راجیو گاندھی، وزیر اعظم ہند سبز انقلاب کے جگمگاتے خواب کو تعبیر سے ضرور اور جلد نوازیں گے۔

محمد معظم الدین، نثار اختر انصاری، سرداری لال نشتر

قومی یکجہتی کی ضرورت و اہمیت

گذشتہ دنوں ہندوستان کی وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کے سفاکانہ قتل کے بعد ملک میں قومی یک جہتی کی ضرورت ایک بار پھر شدومد سے محسوس کی گئی۔ چنانچہ ہمارے بہت سے قارئین نے اس موضوع پر اپنے اپنے انداز سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ ذیل میں ان کے تاثرات مختصر طور پر پیش کئے جارہے ہیں۔

(ایڈیٹر)

علی گڑھ سے جناب محمد معظم الدین نے لکھا کہ:

"ہندوستان ایک کثیرالمذاہب ملک ہے۔ یہاں پر مختلف وقتوں میں مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ آتے رہے اور یہیں کے ہوتے گئے۔ ان کے رسم و رواج الگ الگ، رہن سہن کے طریقے جُداجُدا، ملبوسات ایک دوسرے سے مختلف، زبانیں الگ الگ، تہذیبیں الگ الگ، عبادت کرنے کا ڈھنگ بھی ایک دوسرے سے مختلف اور مرنے جینے کی رسمیں بھی جُدا جُدا۔ یہ رنگارنگی ہونے کے باوجود بھی یہ بات قابلِ فخر ہے کہ ہم سب ہندوستانی ہیں۔ اور ایک ہی مشترکہ میراث کے وارث ہیں۔ اور ہندوستان کا یہی نمایاں وصف ہے کہ کثرت میں وحدت کا جلوہ نظر آتا ہے۔ ہندوستان کی طویل تاریخ شاہد ہے کہ جو بھی قومیں یہاں آئیں وہ یہیں پر بستی چلی گئیں اور پھر یہاں کے اصلی باشندوں کے ساتھ اس طرح گھل مل گئیں کہ انھیں الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا۔ اسی میل ملاپ سے ایک نیا معاشرہ وجود میں آیا جو ہندوستانی معاشرہ کے نام سے جانا جاتا ہے اور جو ایک اِکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔

غیر ملکی طاقتوں نے اس اِکائی کو مختلف حصوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی اور کامیاب بھی ہوئے۔ بانٹو اور حکومت کرو (DIVIDE & RULE) کی پالیسی اپنائی اور ہندوستان کی دو بڑی قوموں (ہندو اور مسلم) کو آپس میں لڑاتے رہے۔ نفرت اور عداوت کا جو بیج بو گئے تھے، آج وہ ایک تناور درخت بن چکا ہے۔ اور مختلف شاخوں کی شکل میں نمایاں ہے۔ ہماری کوشش تو یہ ہونی چاہیئے تھی کہ اس ناپاک درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتے لیکن ہم خود اس کی آب پاشی کرکے اسے اور مضبوط بنا رہے ہیں۔ ہم ہیں کہ لڑتے آرہے ہیں اور ایکدوسرے کو مٹانے کے درپے ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کو گزند پہنچا کر خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ اب ہماری ترقی کی راہ ہموار ہو گئی ہے۔ لیکن انھیں یہ نہیں معلوم کہ اس ملک میں بسنے والی کسی قوم کا نقصان ملک کا نقصان ہے۔ اور کسی قوم کی ترقی اس ملک کی بھی ترقی ہے جہاں وہ قوم بستی ہے۔ ان کے ذہنوں میں یہ بات گھر کر چکی ہے کہ ایک قوم کو مٹا کر ہی دوسری قوم ترقی کرسکتی ہے۔ ذرا ذرا سی بات کو قومی رنگ دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ انفرادی واقعات کو اجتماعی رنگ دے دیا جاتا ہے۔ اگر ہم اختلاف کرنے پر اُتر آئیں تو ہر بات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ کیا ذات پات کا جھگڑا کیا فرقہ پرستی، کیا علاقہ پرستی، کیا زبان پرستی۔ اس میں سے ہر شے ہماری پسماندگی کا سبب ہے۔ ہم ایک دوسرے سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ انسان کی کوئی قدر نہیں۔ خون پانی سے بھی سستا کہ گلیوں اور سڑکوں پر بہتا نظر آتا ہے۔ انتہائی ترقی کے باوجود بھی آج ہم پستی کی طرف گامزن ہیں۔ اگر انسانی تہذیب کے ارتقا پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ تہذیب اپنی ابتدائی منزل میں تھی۔ تو لوگوں کا شعور اتنا بالیدہ نہیں تھا کہ وہ اپنی ہستی اور ذات کا تعین خود کرتے۔ لیکن اتنا شعور ضرور تھا کہ انسان، انسان کی قدر کرتا تھا۔ ایک دوسرے کا جانی دشمن نہیں تھا۔ آج کا معاشرہ تہذیب و تمدن اور فیشن پرستی میں بہت آگے نکل چکا ہے اس کے باوجود بھی انسان حیوانیت کا ننگا ناچ ناچنے پر تُلا ہوا ہے۔ انسان، انسان کا دشمن، ایک تہذیب دوسری تہذیب سے

بدظن۔ ایک فرقہ دوسرے فرقے سے نالاں۔ غیر ملکی طاقتوں نے ہماری اسی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر ہمارے ملک کو غلام بنایا۔ فرقہ پرست اور رجعت پسند عناصر ہماری ترقی کی راہ میں حائل ہوتے رہے۔ یہ ہے ہمارے دیش کی حالت، جسے دیکھ کر علامہ اقبال کی بھی آنکھیں نم ہیں ؎

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو!
کہ عبرت خیز ہے ترا فسانہ سب فسانوں میں

ہندوستان صرف مختلف مذاہب، ذات اور عقائد کا گہوارہ ہی نہیں بلکہ تہذیب و تمدن اور پیار و محبت کا مرکز بھی ہے۔ اگر کسی چمن میں صرف ایک قسم اور ایک ہی رنگ کے پھول ہوں تو وہ دیر تک ہماری خوشی اور لطف اندوزی کا باعث نہیں ہو سکتے۔ چمن کی خوبصورتی اور دلکشی تو اس بات میں ہے کہ اس میں طرح طرح کے رنگ برنگے پھول ہوں۔ ان کی رنگت جُدا جُدا ہو اور نکہت جدا جدا۔ ہندوستان بھی ایک گلشن کی مانند ہے، جس کی خوبصورتی و رعنائی اس بات میں مضمر ہے کہ یہاں پر موجود سبھی قومیں خواہ وہ ہندو ہوں یا مُسلم، سکھ ہوں یا عیسائی آپس میں متحد ہو کر رہیں۔ عدم اتحاد کی صورت میں ملک کی سالمیت کو برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ کیوں کہ کسی قوم سے الگ ہونا یا نقصان پہنچانا ملک کے اس حصے سے بھی الگ ہونا اور نقصان پہنچانا ہے جہاں وہ قوم بستی ہے۔ اور اگر ہم ہندوستان کے کسی بھی خطے کو نقصان پہنچاتے ہیں یا پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم ہندوستانی کہلانے کے حقدار نہیں ہیں۔ اور یہ ملک سے غداری کے مترادف ہے۔

قطرہ دریا سے الگ رہ کر اپنے وجود کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ پھول کی پنکھڑی پھول سے الگ ہو کر وہ خوبصورتی اور نکہت نہیں دے سکتی جو پھول سے ملتی ہے۔ کسی تنہا فرد سے خاندان نہیں بنتا اور کوئی اکیلا خاندان سماج کی تعمیر نہیں کر سکتا ہے۔ قطرہ کو اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ دریا سے جا ملے۔ قطرہ اگر یہی چھلکتے ہوئے پتھر پر پڑ جائے تو پھر وہ چھپا ہی گیا۔ خدا ہی حافظ ہے، پھول کی خوبصورتی اس میں ہے کہ اس کی تمام پتیاں آپس میں متحد ہوں۔ خاندان کی بقا اس میں ہے کہ اس کے تمام افراد مل جل کر رہیں۔ سماج کی تعمیر و ترقی اس بات میں پوشیدہ ہے کہ سبھی خاندان متحد رہیں اور سماج کو ایک ہی سمت لے جانے کی کوشش کریں۔

اس وقت جبکہ ملک نازک ترین دَور سے گزر رہا ہے ضروری ہے کہ سبھی اقوام ایک ہو کر رہیں۔ اور ملک کی فلاح و بہبود کو مدِ نظر رکھیں۔ ملک کو مضبوط بنانے اور وطنیت کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے لازم ہے کہ جہاں ایمانداری، خلوص، سماجی انصاف اور ملک کے مفاد کا سوال آئے وہاں ہم کو یہ محسوس کرنا چاہیے کہ ہم پہلے انسان اور ہندوستانی ہیں اور بعد میں کچھ اور۔

قومی یکجہتی کے راستے میں سب سے زیادہ مزاحمت پیدا کرنے والی شے مذہبی تعصب ہے۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہوگا کہ ملک کے کسی نہ کسی حصے میں اس موذی اور شرمناک حادثہ کی خبر نہ سنتے ہوں۔ کتنے تنگ نظر اور نادان ہیں۔ وہ لوگ جو اپنے مذہب کا احترام اور دوسرے مذاہب کی توہین کرتے ہیں۔ درحقیقت دوسرے مذاہب کی توہین کرنا خود اپنے مذہب کی بے حرمتی کرنے کے مترادف ہے۔ اگر تمام مذاہب کا مطالعہ کریں تو جو عناصر ہمیں مشترک ملیں گے وہ ہیں سچائی، ہمدردی، خلوص، ایمانداری، اخوت و بھائی چارگی، میل ملاپ اور انسان دوستی۔ تو پھر اپنے مذہب کا احترام اور دیگر مذاہب کی توہین کیا معنی رکھتا ہے۔ یاد رہے کہ دنیا کا کوئی مذہب ہمیں تنگ نظری اور فسادات دشمنی کا درس نہیں دیتا۔ بقول اقبال ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

آج ملک کے کونے کونے میں بڑے شد و مد سے سیکولرازم کا نعرہ بلند کیا جا رہا ہے پھر بھی ہم اس کے مفہوم کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ سیکولر ہونے کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہے کہ ہم لامذہب ہو جائیں بلکہ اس کا سیدھا سادہ اور عام مفہوم یہ ہے کہ تمام مذاہب کو یکساں نظر سے دیکھا جائے۔ مذہب جیسی پاکیزہ شے بدنام نہیں کی جا سکتی۔ اس کی قدر لازمی ہے۔ مذہب بُرا نہیں ہوتا۔ یہ ہمارے اور آپ کے سوچنے کے انداز ہیں جو بُرے ہوتے ہیں۔

جواہر لال نہرو، جن کی عظمت کا اعتراف ہم اور آپ سبھی کرتے ہیں، ہندوستان کی تاریخِ آزادی میں ایک لافانی کردار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھیں ذات پات اور فرقہ پرستی جیسی گندی چیزوں سے بے حد نفرت تھی اور ہمیشہ ان کی مخالفت کی ہے۔

" فرض کیا گیا ہے کہ ہندوستان کسی اور چیز سے پہلے ایک مذہبی ملک ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی وغیرہ اپنے مذہب پر ناز کرتے ہیں اور اُن کی صداقت ثابت کرنے کے لیے اپنے سر پھوڑتے ہیں۔ جس چیز کو مذہب یا منظم اعتقاد کا نام دیا جاتا ہے ہندوستان میں اس کے نظارے دیکھ کر مجھے وحشت ہوتی ہے۔ مَیں نے ہمیشہ اس کی مذمت کی ہے اور چاہا ہے کہ اس کا صفایا کر ڈالوں۔ تقریباً ہمیشہ یہ اندھے یقین اور رجعت پسندی کے جامد تصورات اور تعصب، توہم اور استحصال اور مفادِ خصوصی کے استحکام کی ترجمانی کرتا ہے[1]۔"

" اگر چہ ہم ہوشیار نہ رہے اور ہم نے بروقت اقدام نہ کیے تو فرقہ واریت کا زہر جس نے ہمیں تباہ کر دیا ہے، ہماری آزادی کو بھی لے ڈوبیگا۔ اسی خطرے کا الارم دینے کے لیے گاندھی جی نے اپنا آخری برت رکھا تھا[2]۔"

---

[1] "شیرازہ" (نہرو نمبر) جولائی ۱۹۶۴ء ۔ صفحہ ۱۶۱
[2] ایضاً ۔۔ ۔۔ صفحہ ۱۹۳

یوجنا، نئی دہلی

یکم تا ۱۵ مئی ۱۹۸۰ء

جیسا کہ گاندھی جی جیسے عظیم قومی رہنما نے بھی مذہب پرستی اور ذات پات کے جھگڑے کو ہمیشہ معیوب قرار دیا ہے۔ گاندھی جی ہمیشہ عدم تشدد اور امن و آشتی کا پیغام دیتے رہے۔

"اتحاد ایک طاقت ہے، یہ صرف کتابی کہاوت نہیں بلکہ زندگی کا ایک اصول ہے، جو سب سے واضح طور پر ہندو مسلم اتحاد کے سوال پر صادق آتا ہے۔ اگر ہم میں پھوٹ ہوگی تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ اگر ہم ہندو مسلمان ایک دوسرے کے گلے کاٹنے پر تیار رہیں گے تو کوئی بھی تیسری طاقت آسانی سے ہندوستان کو غلام بنا لے گی ہندو مسلم اتحاد کا مطلب صرف ہندوؤں اور مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ ان سب جماعتوں کا اتحاد ہے جو ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتی ہیں، چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتی ہوں[2]۔"

"میں ہندو ہوں، تم مسلمان ہو یا میں گجراتی ہوں اور تم مدراسی ہو۔ ہمیں اس طرح کی تنگ نظری کو یکسر فراموش کر دینا چاہیئے۔ ہمیں مشترک بھارتی قومیت میں "میں" اور "میرا" کے احساس کو بالکل مٹا دینا چاہیئے[3]۔"

قومی یک جہتی اور ملک کی ترقی میں سیاسی رہنماؤں کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے اور یہی نظام کو چلاتے ہیں۔ ہمارے ملک کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہاں کی قوم اور مذہب کی اکثریت کے ساتھ سیاسی جماعتوں کی بھی بہتات ہے۔ پارٹیاں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی غرض سے ملک کے مفاد کو یکسر فراموش کر دیتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ملک بدنظمی اور پستی کی طرف مائل ہے۔ ان میں اتحاد کا کوئی سوال نہیں۔ خاص طور پر مخالف پارٹیوں کا رویّہ ہمیشہ تخریبی رہا ہے۔ ملک میں آئے دن کوئی نہ کوئی سیمینار ہوتے رہتے ہیں۔ کہیں قومی یک جہتی سیمینار ہو رہا ہے کہیں "فرقہ وارانہ فساد۔ اسباب و علاج" پر سیمینار منعقد ہوتا ہے کہیں "اردو اور قومی یکجہتی" پر بڑے زور شور اور شد و مد سے غور و خوض ہوتا ہے۔ نئے نئے تعارفیے اور اصول بنتے ہیں۔ لیکن سب بے سود۔ ان کی آواز صرف سیمینار کی عمارتوں میں گونج کر رہ جاتی ہے۔ اصول و قوانین صرف کاغذ کے چوکھٹے میں قید ہو کر رہ جاتے ہیں۔ عملی زندگی میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اور پھر دیہی افراتفری بھی ہے۔ سیکولرازم اور یک جہتی کا نعرہ بلند ہوتا لیکن عمل اس کے بالکل خلاف ہوتا ہے۔ اگر ہماری یہی صورت حال رہی اور آپس میں منافرت پھیلاتے رہے اور اس کو زندگی کا نصب العین سمجھتے رہے تو قومی یک جہتی تو درکنار ہم اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ قومی اتحاد اس وقت ممکن ہے جبکہ سیاسی پارٹیاں متحد ہو جائیں ورنہ ملک کی ترقی ناممکن ہی نہیں بعید از قیاس بھی ہے۔

ملک کی موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر سبھی ہندوستانیوں کا، خواہ وہ کسی بھی مذہب کے پیروکار ہوں اور دیش کے کسی بھی حصّے سے تعلق رکھتے ہوں، فرض ہے کہ آپس میں متحد ہو کر رہیں۔ وقت کی اہم ضرورت یہ ہے کہ ہم مذہب پرستی، زبان پرستی، فرقہ پرستی، علاقہ پرستی، نسل پرستی یا کوئی اور پرستی ہو، بالکل فراموش کر دیں۔ ہم ان بے کار چیزوں کو اپنے ذہن میں بھی جگہ نہ دیں۔ آیئے ایک بار پھر ہم سبھی ہندوستانی اس بات کا عزم کریں کہ وہ خواب جو ہمارے قومی اور سیاسی رہنماؤں نے دیکھا تھا اور جس کے حصول کے لیے آزادی کی جنگ لڑی تھی۔ اس کو پورا کر کے رہیں گے۔ آیئے ایک بار پھر ہم اپنی محنت، جانفشانی اور وطن پرستی سے ہندوستان کو رشکِ چمن بنا دیں تا کہ علامہ اقبال کی یہ بات رائیگاں نہ جائے جو انھوں نے اس دیش کے بارے میں کہا ہے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

جناب نثار اختر انصاری، مومن پورہ، ناگ پور سے لکھتے ہیں:۔

شری جواہر لال نہرو نے ۱۹۶۱ میں نئی دہلی میں منعقدہ قومی یک جہتی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "میں قومی یک جہتی کے سوال کو ہر ایک کے لیے چیلنج سمجھتا ہوں۔ قومی یکجہتی کا مسئلہ زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ ہمیں چند مشکلات ماضی سے ورثہ میں ملی ہیں۔ لیکن پھر بھی ہم آگے بڑھ رہے ہیں اور ان بُرائیوں کا مقابلہ کر رہے ہیں جو ہماری راہ میں حائل ہیں۔ ہم کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر ہندوستانی خواہ اس کا مذہب کچھ بھی ہو، آپس میں بھائی بھائی ہے۔"

شری کرشن جی نے ارجن کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا "اپنے فرض سے مُنہ مت موڑو، چاہے وہ کتنا ہی مشکل ہو۔" شری کرشن کے اس قول کی روشنی میں ہمیں بہت سے مسائل کا دلیری سے مقابلہ کرنا ہے اور اُن طاقتوں کو شکست دینا ہے جو ہماری قومی یک جہتی کی راہ میں روکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔ ملک میں نئے ۲۰ نکاتی پروگرام اور شری راجیو گاندھی جی کی قیادت میں ایک نئی کرن نمودار ہوئی ہے۔ تحریکِ آزادی کے دوران تمام قوموں نے متحد ہو کر لگن و ہمّت کے ساتھ قربانی دی تھی۔ اس اتحاد نے ہمیں آزادی کی نعمت سے سرفراز کیا۔ ہمیں جمہوری بھارت کے شہری ہونے پر فخر ہے۔ آزادی کے بعد ہم نے ہر محاذ پر کامیابی حاصل کی ہے۔

گاندھی جی نے کہا تھا "میں ہندو ہوں، تم مسلمان ہو، میں گجراتی ہوں، تم مدراسی ہو،

---

[2] شاعر (گاندھی نمبر) اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۶۹ء صفحہ ۲۶۲
[3] " " " " " صفحہ ۲۶۳

ہمیں اس طرح کی تنگ نظری کو بالکل فراموش کر دینا چاہیے۔ متحدہ بھارتی قومیت میں "میرا" اور "تیرا" کے احساس کو بالکل مٹا دینا چاہیے۔ ہم سب ایک ہی خدا کے بندے ہیں۔ جس کی بندگی ہم مختلف ناموں سے ادا کرتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے لازمی اتحاد کو محسوس کریں اور انسانوں کے درمیان چھوٹ چھات، برتری اور کمتری کے احساس کو ترک کر دیں۔"

شریمتی اندرا گاندھی نے کہا تھا "قومی یکجہتی کی بنیاد محض اخلاقیات نہیں ہے بلکہ یہ ہماری قومی بقا کے لیے ایک لازمی جز ہے۔ اگر ہم ہمارے ترقیاتی منصوبوں کو تکمیل تک پہنچانا چاہتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ ملی جل کر رہا جائے۔" شریمتی گاندھی نے بھارت میں ذات پات کے امتیاز کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کی اور اپنی تمام تر زندگی اس مقصد کے لیے وقف کر دی۔

قومی یک جہتی محض ایک نعرہ نہیں بلکہ ایک نظام کار، ایک دستور العمل ہے۔ پچھلے ایک سال سے تخریبی عناصر قومی یکجہتی کی جڑوں کو کھودنے میں معروف ہیں۔ ہم سب کو متحد ہو کر ان عناصر کا مقابلہ کرنا ہے۔ عملی مساوات کا باغ لگانا ہے۔ تعصب سے اس پوتر دھرتی کو پاک کرنا ہے۔ اور قومی یکجہتی کے پھول سے سارے گلشن کو معطر بنانا ہے۔

جواہر لعل نہرو نے کہا تھا "بھارت ایک ایسا ملک ہے، جہاں مختلف فرقوں کے لوگ آباد ہیں۔ جب تک ہم آپس میں مل جل کر ایک دوسرے کے عقائد کا احترام نہیں کریں گے ہم ایک عظیم اور متحد قوم کی تشکیل نہیں کر سکتے۔ مختلف مذاہب کے درمیان ہم آہنگی اور دوستی کی فضا پیدا کی جانی چاہیئے، نیز آپسی غصہ اور تلخی کو بڑھنے سے روکنا چاہیئے۔" لال بہادر شاستری نے قومی یک جہتی کے متعلق ایک تقریب میں کہا تھا "ہمیں قومی یکجہتی کو فروغ دینا ہوگا اور آہستہ آہستہ دلیش میں ایک ایسی فضا قائم کرنی ہوگی جس میں تمام لوگ خوش و خرم رہیں۔ آج نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان، نہ سکھ، نہ عیسائی۔ بلکہ سب کے سب صرف بھارتی ہیں۔"

گاندھی جی کا پختہ یقین تھا کہ تمام مذاہب کی منزل ایک ہی ہے۔ ونوبا بھاوے کا کہنا تھا کہ دو مذہب کے پیروکاروں میں کبھی تنازعہ نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ تمام مذاہب برائی اور ناانصافی کے خلاف جدوجہد کی دعوت دیتے ہیں۔ گوتم بدھ، گرونانک اور مسلمان صوفیوں نے صرف ذات پات کے خلاف ہی جہاد نہیں کیا، بلکہ امن، اخوت اور یک جہتی کا بھی درس دیا۔ سرزمین بھارت ہمیشہ رشیوں منیوں، صوفیوں کا مسکن رہی ہے۔ جن کی اعلیٰ تعلیمات سے ہم بھارت واسی ہمیشہ فیض پاتے رہے ہیں۔ شری گیانی ذیل سنگھ فرماتے ہیں! "مذہب فرد کا ذاتی معاملہ ہے۔ ہندوستانی ہونے کے ناطے ہمیں چاہیئے کہ تمام مذاہب کو احترام کی نظر سے دیکھیں۔ میں تمام مذاہب کی عبادت گاہوں میں جاتا ہوں، میں اس نظریے کا قائل ہوں کہ خدا ہر جگہ موجود ہے۔ ہمیں اُسے انسانوں میں تلاش کرنا چاہیئے۔ انسانیت سے بڑھ کر کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

جمہوریت کے استحکام کے لیے یہ ضروری ہے کہ ملک کے تمام باشندوں میں یک جہتی، ہم آہنگی قائم رہے۔ اگر چند لوگوں کے درمیان عدم اعتماد اور منافرت کا جذبہ کار فرما رہتا ہے تو ملک کی ترقی کو زبردست نقصان پہنچتا ہے۔ ملک میں انتشار پسند طاقتیں ہمارے اتحاد و اتفاق کو برباد کرنے پر تُلی ہوئی ہیں۔ لہٰذا قومی یک جہتی کی اہمیت آج اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے۔

دُنیا کے تیرتھوں سے اُونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں

ایک مقالہ جناب سردار لال اختر کے لکھا گیا۔

جمہوریت اور قومی یک جہتی دونوں ایک ہی اصول کے دو پہلو ہیں۔ دونوں کا ایک دوسرے پر مکمل انحصار ہے۔ دراصل یہ دونوں ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں، کیونکہ کسی ملک کی ترقی اور اُس کے تحفظ و بقا کے لیے جمہوریت اور قومی یک جہتی کے اصول سب سے ہی مفید بتائے ہیں۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ قومی یک جہتی کے بغیر جمہوری طرزِ نظام کامیاب نہیں ہو سکتا۔

درحقیقت جمہوری نظام میں ہی ہر انسان آزاد ہوتا ہے۔ اس کو اپنی ترقی کرنے کے پورے پورے مواقع ملتے ہیں۔ اُس کے حقوق و اختیارات سلب نہیں ہوتے۔ اس کو اپنی محنت کا پورا فائدہ ملتا ہے۔ اس کی وجہ ہے کہ جمہوری طرزِ زندگی میں "فردِ واحد" کی قدر و منزلت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس نظام میں ہر شخص بطور "فردِ واحد" اہم مقام کا حامل ہوتا ہے۔ اور "توقیرِ انسان" کو بہت بلند مقام دیا جاتا ہے۔ تبھی ایسے نظام میں انسانی کردار پھلتا پھولتا ہے اور انسانوں کے باہمی معاملات اور اُن کے اعلیٰ ترین اعتقادات رواں دواں رہتے ہیں۔ کامیاب جمہوریت وہی ہے جس میں ہر فرد کو مکمل شخصی آزادی حاصل ہو۔ اور انسانی اقدار کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اُسے تخلیقی ترقی کے مواقع ملیں۔ اسی میں حقیقی مسرت کا راز پوشیدہ ہے۔ ایسی جمہوریت صرف روائتی نہیں ہوتی بلکہ اس کا تعلق ذہن و دماغ سے بھی ہے۔ یہ ایک ایسی متحرک ذہنی قوت ہے، جو اپنی حدود میں اضافہ کرتے ہوئے ہمیں ذہنی طور پر مدد دیتی ہے۔ اور دوسروں کے خیال سے مطابقت پیدا کرنے پر مائل کرتی ہے۔ اُن کے اندر رواداری کا جذبہ موجزن کرتی ہے اور اسی طرح ہمارے سیاسی اور معاشرتی مسائل کو سلجھانے

[illegible] طور پر معاون ثابت ہوتی ہے۔

چوں کہ اعلیٰ جمہوریت کی بنیاد انسانی قدروں پر رکھی گئی ہے، اس لیے اس میں "جیو اور جینے دو" کے حق کو پوری طرح ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ یہ جمہوریت ہی ہے جو فرد کی اہمیت تسلیم کرتی ہے۔ اور سارے سماج کا اخلاقی تصور بھی محفوظ رکھتی ہے۔ ایسی جمہوریت میں حکومت عوام کی نمائندہ ہوتی ہے۔ جس کے تحفظ کا حق عوام کے پاس ہوتا ہے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں عوام ہی سرچشمۂ اقتدار و قوت ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوری نظام عوام کو ہی اپنے بنیادی حقوق استعمال کرنے کی پوری ضمانت دیتا ہے اور جمہوریت کے ذریعے ہی عوام کے شعور کو بالیدگی ملتی ہے۔ اسی لیے اس طرزِ حکومت میں عوام کے سارے طبقات کی بھلائی، بہتری، بہبودی اور مفاد کو بلا تفریق مذہب و رنگ و نسل، پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جمہوریت صحیح معنوں میں اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب کہ عوام کی اکثریت قومی و جذباتی ہم آہنگی کے ذریعہ اقلیت کے لیے معاشی و سماجی برابری کا ماحول پیدا کرے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ قومی یک جہتی پیدا کرنے کے لیے جمہوریت سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ جس کا اولین فرض ہے کہ وہ ہر شہری کو مکمل تحفظ اور حقوقِ شہریت دے کر اس میں ملک کے لیے ایثار و قربانی اور پیار و محبت کا جذبہ پیدا کرے ایسے جذبے سے ہی وہ معاشرہ وجود میں آتا ہے جس کا مقصد قومی یک جہتی اور عوام کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔

جہاں ہمیں جمہوری نظام سے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ وہاں ہم پر کچھ فرائض بھی عائد ہوتے ہیں جن کو ادا کرنا اشد ضروری ہے۔ کہ ہم پورے انسان ہو کر انسانی طور پر جینا سیکھیں۔

• جمہوریت کی بقا کے لیے آج قومی یکجہتی وقت کی سب سے بڑی پکار ہے۔ موجودہ حالات اور ملک کے مجموعی مفاد کا بھی تقاضا ہے کہ ہم سب آپس میں مل جل کر رہیں۔ ایک ہو کر رہیں تاکہ قومی یک جہتی کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے اور ملک کی وحدت کمزور نہ ہو۔ ایک دوسرے سے ہم آہنگی اور میل ملاپ ہی دراصل زندگی ہے۔ یہ زندگی محبت کی لگن اور صدق دل کے ساتھ ہی بارونق اور پُروقار بنتی ہے۔ اس لیے ہماری یہی کوشش ہونی چاہیے کہ ہم سب قومی یکجہتی کی مضبوط بنیادوں پر قائم رہ کر اپنے ملک کے سیکولرازم اور جمہوریت کو مضبوط تر بنائیں تاکہ

• ہماری آزادی مستحکم و دیرپا ہو۔ اور ملک میں امن و ترقی کا مقدر دورہ ہو۔

زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح جمہوریت اور قومی یک جہتی" کی اولین ضرورت نظم و ضبط بھی ہے۔ جس سے سب کے لیے احترام کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور جس سے ہم سب ایک دوسرے کے ساتھ منسلک رہتے ہیں۔ اس جذبے کا فقدان ہمیں انسانیت کے درجہ سے گراتا ہے۔ کیوں کہ رواداری اور محبت ہی انسانیت ہے، اور یہی فضائل قومی یک جہتی کی تحصیل و تکمیل کا سرچشمہ ہے۔

بقیہ: قبائلی آبادی کے ترقیاتی پراجیکٹ

پراجیکٹ افسر کو بلحاظ عہدہ قبائلی آبادی کی بہبود کے محکمے میں جائنٹ ڈائریکٹر کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے جب کہ یہ عہدہ قبائلی آبادی کی بہبود سے متعلق ڈسٹرکٹ آرگنائزر اور ڈپٹی ڈائرکٹر، ٹرائیبل ایک علاقے میں مذکورہ دونوں پروگراموں کا بہ یک وقت شروع کرنا گڑبڑی پیدا کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر یہ دونوں تنظیمیں از خود روزگار کی متوازی اسکیمیں چلا رہی ہیں۔ مگر ہر دو پروگراموں کے تحت دیئے جانے والے منافع الگ الگ سطحوں پر ہیں حالانکہ ان دونوں کا مقصد سماج

	دیہات کی مربوط ترقی کے پروگرام	قبائل کی مربوط ترقی کے پراجیکٹ
سبسڈی بحساب فی صد	کل اخراجات کا ۵۰ فی صد	کل اخراجات کا ۱۵ فی صد
سبسڈی کی رقم	زیادہ سے زیادہ ۵ ہزار	زیادہ سے زیادہ ۷۵۰ روپے
تعلیمی صلاحیت	کسی طرح کی کوئی پابندی نہیں	آٹھویں درجہ یا اس سے زیادہ کی تعلیم

ویلفیئر کے عہدوں سے برتر ہے۔ اس سے انتظامی دشواریاں پیدا ہوتی رہیں۔ ۸۰-۱۹۷۹ء میں دیہات کی مربوط ترقی کا پروگرام شروع کیا گیا اور اب یہ مدھیہ پردیش کے تمام اضلاع پر جاری ہے۔ ان میں وہ اضلاع بھی آجاتے ہیں جہاں قبائل کی مربوط ترقی کے پراجیکٹوں کو شروع کر دیا گیا ہے دیہات کی مربوط ترقی کا پروگرام مقابلتاً بہتر ہے اور اس کے تحت مطلوبہ آبادی کی ٹھیک طرح سے مدد کی جاتی ہے اور یہ طریق کار قبائل کی مربوط ترقی کے پراجیکٹوں کے تحت دی جانے والی امداد سے بہتر ہے۔ البتہ کے کمزور طبقات کو فائدہ پہنچانا ہے۔ اس کا ایک تقابلی جائزہ مندرجہ بالا گوشوارے میں دیا گیا ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ دیہات کی مربوط ترقی کے تحت فائدے زیادہ فراخدلانہ ہیں۔ دوسرے اس کے تحت نوجوانوں کو از خود روزگار کی تربیت کی سہولتیں بھی حاصل ہیں۔ یہ تربیت سرکاری خرچ پر دی جاتی ہے۔ اس اسکیم کا نام ہے ٹرائی سم اس کے مقابلے قبائل کی مربوط ترقی کے فائدے کم ہیں۔ اس سے مقامی آبادی میں غلط فہمی پیدا ہو رہی ہے۔

"یوجنا" نئی دہلی

بقیہ: چائے

چائے بنانے کے طریقے بھی مختلف ہیں۔ عام طریقہ تو یہ ہے کہ پتیاں ابلتے پانی میں ڈالی جاتی ہیں پھر حسب ضرورت دودھ اور چینی ملائی جاتی ہے۔ مگر بعض لوگ سبھی چیزیں ایک ساتھ ڈال دیتے ہیں۔ اور لب سوز اور لب دوز چائے تیار کرتے ہیں۔ ہندوستان کے عام ہوٹلوں میں جو چائے ملتی ہے اس میں چائے برائے نام اور دودھ اور چینی بھرپور ہوتی ہے مغربی ممالک میں بغیر دودھ کی چائے پی جاتی ہے کچھ لوگ چینی کے بدلے نمک استعمال کرتے ہیں کشمیر کی سبز چائے نمکین ہی پسند کی جاتی ہے

چائے دوا کے طور پر اب بھی استعمال کی جاتی ہے۔ زکام میں ادرک کی چائے پی جاتی ہے۔ پیٹ میں خرابی ہو تو لیموں کی چائے دی جاتی ہے۔ بخار میں چائے عام طور سے مفید سمجھی جاتی ہے۔

کچھ لوگ چائے نوشی کو صحت کے لئے مضر سمجھتے ہیں اور بچوں کو چائے نہیں دیتے مگر کیمیاوی تجربے کے ذریعے معلوم کیا گیا ہے کہ چائے میں ایسا کوئی عنصر نہیں ہے جو نقصان دہ ہو۔ کثرت سے چائے نوشی مضر ہو سکتی ہے مگر کثرت تو ہر چیز کی بری ہوتی ہے۔ چائے پینے کے بعد لوگ چستی محسوس کرتے ہیں اور تکان دور کرنے میں بھی چائے معاون سمجھی جاتی ہے۔

مجلسی زندگی میں چائے بے حد اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ کوئی بھی پارٹی یا جلسہ چائے کے بغیر نامکمل ہوتا ہے۔ دوستوں کی صحبت کا لطف چائے نوشی سے دوبالا ہو جاتا ہے اور ریستورانوں میں محبوب کے ساتھ لطف ہم نشینی چائے کی ہی بدولت ہے۔

چائے کی حریف کافی کا بھی رواج بڑھ رہا ہے مگر ہندوستان کے بڑے حصے میں چائے کی ہی حکمرانی ہے۔

چائے کا ذکر ہمارے ادب میں بھی آیا ہے۔ مگر مولانا ابوالکلام آزاد نے چائے کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہ ادب عالیہ کا حصہ بن گیا ہے۔ ایک اقتباس آپ بھی پڑھئے

" وقت وہی ہے مگر افسوس وہ چائے نہیں ہے جو طبع شورش پسند کو سرمستیوں کی اور فکر عالم آشوب کو آسودگیوں کی دعوت دیا کرتی تھی۔ وہ چینی چائے جس کا عادی تھا کئی دن ہوئے ختم ہو گئی اور احمد نگر اور پونا کے بازاروں میں کوئی اس جنس گراں مایہ سے آشنا نہیں، مجبوراً ہندوستان کی اسی سیاہ پتی کا جوشاندہ پی رہا ہوں جسے تعبیر اور تسمیہ کا اس قاعدے کے بموجب کہ 'برعکس نہند نام زنگی کافور' لوگ چائے کے نام سے پکارتے ہیں اور دودھ ڈال کر اس کا گرم شربت بنایا کرتے ہیں۔"

اکبر الہ آبادی کا مشہور شعر ہے۔

ان کے دست نازنیں سے پائی[1] ٹی
اب کہاں باقی ہے ہم میں پائیٹی[2]

زہر یا تقدس باقی رہے یا نہ رہے، مگر جب کبھی دست نازنیں چائے پیش کرے تو انکار نہ کیجئے ورنہ آپ خون ناحق کے ذمہ دار ہوں گے۔

بہ قول شاعر:

چائے پینے سے جو انکار کروگے صاحب
خون ہو جائے گا ناحق مرے ارمانوں کا

---

[1] پائی = TEA (چائے)
[2] پائیٹی = PIETY (تقدس، پاکیزگی) ●●

بقیہ: ہماری معاشی زندگی

ایک عام آدمی کی زندگی اور زیادہ مشکل ہو جائے گی۔

۱۹۸۵-۸۶ کے بجٹ کے چند ایسے روشن پہلو بھی ہیں جو ملک کی زرعی اور صنعتی انقلاب کی راہ آسان کریں گے۔ مثلاً:

(۱) کھاد بنانے والے ضروری ساز و سامان کی درآمدات پر ایکسائز ڈیوٹی ختم۔

(۲) بجلی پیدا کرنے والے ضروری ساز و سامان کی درآمدات پر ایکسائز ڈیوٹی میں کمی۔

(۳) کچے لوہے اور کچے میگنیز کی برآمدات پر ایکسپورٹ ڈیوٹی ختم۔

(۴) کاغذ کی تیاری میں استعمال ہونے والی لکڑی کی درآمدات پر لگنے والا محصول ختم۔

(۵) ٹی وی سیٹوں اور ریڈیو پر لائسنس فیس ختم۔

(۶) کمپیوٹرس کی خرید و فروخت پر ایکسائز ڈیوٹی ختم۔

(۷) پورٹیبل بلیک اینڈ وہائیٹ ٹی وی پر ایکسائز ڈیوٹی ختم۔

(۸) سائیکل کے کل پرزوں کی خرید و فروخت پر لگنے والی ایکسائز ڈیوٹی کا خاتمہ

(۹) ایم آر ٹی پی ایکٹ کے تحت سرمایہ کاری کی حد ۲۰ کروڑ روپیوں سے بڑھا کر ۱۰۰ کروڑ روپے کر دی گئی ہے۔

(۱۰) چھوٹے اور درمیانی درجے کی صنعتوں میں سرمایہ کاری کی حد ۲۰ کروڑ روپیوں سے بڑھا کر ۲۵ کروڑ روپیے کر دی گئی ہے۔

ان نکات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہم یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بجٹ ملک کی صنعتی زندگی میں زیادہ سے زیادہ سدھار لائیگا سرمایہ کاری میں اضافہ ہوگا آنے والے سالوں میں ترقی کی رفتار اور بھی زیادہ تیز ہوگی۔ یہ بجٹ ایک نئے اقتصادی فلسفے کی عکاسی کرتا ہے ★

ایس۔ سنگھل

قبائلی آبادی کے ترقیاتی پراجیکٹ

ایک جائزہ

۱۹۴۷ء میں ہمارا ملک آزاد ہوا، اس کے کچھ
ے بعد ہی حکومت ہند نے بہت سے ایسے
اتی پروگرام شروع کئے جن کا مقصد سماج کے
ہ سے زیادہ طبقات کو فائدہ پہنچانا تھا اور ان کی
مادی حالت بہتر بنانا تھا۔ ان پروگراموں
ام کی زندگی پر اچھا اثر پڑا اور ملک کے سبھی
استدنے ان سے فائدہ اٹھایا۔ البتہ ان تمام
ششوں کے باوجود ملک کے اکثر حصے ایسے بھی
جہاں ان پروگراموں سے خاطر خواہ حد تک
ہ نہیں اٹھایا جا سکا ہے۔ قبائلی آبادی والے
علاقے بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ خیال کیا
ہے کہ ان پسماندہ قبائل نے ملک کے ترقیاتی
راموں سے مطلوبہ حد تک فائدہ نہیں اٹھایا
۔ وہ آج بھی ناخواندگی اور غریبی کا شکار ہیں۔
کا ایک اور تاریک پہلو یہ ہے کہ چوں کہ ان
ندہ خطوں تک رسل و رسائل کی سہولتیں کافی
لے میسر آگئی ہیں۔ لہٰذا باہر کے لوگوں نے وہاں
کر خوب نفع اٹھانے کی کوشش کی۔ ان خطوں
یتی معدنیات اور جنگلاتی دولت سے فائدہ
نے والوں میں یہ باہر کے لوگ ہی زیادہ تر شامل
۱۹۷۰ء کے بعد اس صورت حال کا جائزہ لیا
۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ ان خطوں کی ترقی خصوصی
چاہتی ہے۔ ان کے لیے ایک خصوصی زمرہ
گیا جسے ذیلی منصوبے والے خطے کے نام سے
گیا۔ ہر علاقے کے لیے اس کی خصوصی ضرورتوں
پیش نظر ایک منصوبہ تیار کیا گیا اور اسے

ریاستی منصوبے میں شامل کیا گیا۔ ہر علاقے کے لیے مربوط نوعیت کا ترقیاتی پراجیکٹ وضع کیا گیا اور اس کے لیے ایک پراجیکٹ افسر مقرر کیا گیا۔ مدھیہ پردیش میں قبائلی آبادی کا تناسب ملک کی مجموعی آبادی کے ۲۰ فی صد کے بقدر ہے۔ یہاں علاقہ وار ۶۲ ذیلی منصوبے تیار کئے گئے۔ اس ذیلی منصوبے کے تحت تمام محکموں کی ترقیاتی کوششوں کو مربوط طریقے پر آگے بڑھایا جاتا ہے۔ ہر علاقے میں ترقیاتی کاموں کا مسلسل جائزہ لیا جاتا ہے اور پراجیکٹ افسر ان کاموں کی ترجیحات کا تعین کرتا ہے جو اس علاقے کے لیے ضروری ہیں۔ اس رپورٹ کی روشنی میں تمام متعلقہ محکمے ترقیاتی اسکیمیں وضع کرتے ہیں یہ اسکیمیں قبائلی آبادی کی بہبود سے متعلق محکمے کو بھیج دی جاتی ہیں۔ اس پر عمل درآمد کے لیے مختلف محکموں کو رقومات دی جاتی ہیں۔ چونکہ ہر علاقے کی جملہ ضرورتوں کو بہ یک وقت پورا نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا ترجیحات کی روشنی میں سالانہ اور پنجسالہ منصوبوں کو ترتیب دیا جاتا ہے۔ چونکہ بجٹ میں شامل سرکاری وسائل محدود ہوتے ہیں لہٰذا پراجیکٹ افسر اپنے منصوبے میں مالیاتی حدود کو اپنے سامنے رکھتا ہے اور اس وجہ سے اگر وہ چاہے تو کسی اسکیم کو ترک بھی کر سکتا ہے۔ پراجیکٹ افسر کو البتہ ایسے اختیارات نہیں دیئے گئے ہیں کہ وہ اپنے علاقے میں کام کرنے والے مختلف محکموں کے افسروں پر انتظامی کنٹرول رکھ سکے۔ ہر محکمے کے تحت فیلڈ پر کام کرنے والا عملہ اپنے ہی محکمے کے افسر

کے تابع ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر پراجیکٹ افسر چاہتا ہے کہ صحت سے متعلق مرکز، تعمیر ہو سکے اور ان ڈاکٹروں کی رہائش کے لیے کوارٹر بنائے جائیں جہاں کہ وہ ڈاکٹر کو رکھنے کی سفارش کرتا ہے۔ اسے اس کام کے لیے پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ سے درخواست کرنی پڑے گی اور اگر یہ محکمہ کسی وجہ سے راضی نہیں ہوتا تو پراجیکٹ افسر کی کوششیں رائیگاں چلی جاتی ہیں۔ پراجیکٹ افسر یا تو اپنا خیال ترک کرے گا یا پھر وہ ڈسٹرکٹ کلکٹر سے کہے گا کہ وہ اپنی سطح سے اس موضوع پر بات چیت کرے۔

اس طرح کی شکایتوں اور کوششوں سے افسروں کے مابین تعلقات کشیدہ ہو جاتے ہیں۔ ڈسٹرکٹ کلکٹر کے پاس پہلے ہی کام کافی ہوتا ہے اور اکثر اس کے پاس اس معاملے کو نمٹانے کا وقت نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ مالی اختیارات بھی سرکار کے ہاتھوں میں ہی ہوتے ہیں۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ سرکار کی طرف سے منظور شدہ اسکیمیں ذیلی پلان کی اسکیموں سے میل نہیں کھاتیں۔ مثال کے طور پر اکثر ذیلی پلان ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں اکثر سڑکوں کی تعمیر، مقامی آبادی کو زراعت کے جدید طریقوں کی تربیت، ماہی گیری وغیرہ کے پروگراموں کی اہمیت واضح کی جاتی ہے تاکہ قبائلی آبادی کو تغذیہ بخش خوراک مل سکے اور ان کی بود و باش بہتر ہو سکے، لیکن بجٹ میں اس طرح کے کسی آئیٹم کے لیے رقم نہیں دی جاتی۔

(باقی ص19 پر)

* ایڈیشنل کلکٹر، ڈسٹرکٹ سدھی۔ مدھیہ پردیش

Regd. No. D(DN) 985
R.N. 97032/81

Licensed U(DN) to post without pre-payment
at Civil Lines Post Office, Delhi-110 054.

Vol. 5 No. 3 YOJANA (URDU) 1-15th May, 1985

وسیم حیدر

عورتوں کی تعلیم و ترقی سے متعلق کانفرنس

نئی دلی میں حال ہی میں ناوابستہ ممالک اور دیگر ترقی پذیر ممالک کی کانفرنس منعقد ہوئی جس کا موضوع تھا ”ترقیاتی پروگراموں میں عورتوں کا رول“ اس کا افتتاح ۱۰ اپریل کو وزیر اعظم ہند شری راجیو گاندھی نے کیا۔ آپ نے اس موقع پر ایک تقریر میں کہا کہ ترقی پذیر ممالک میں عورتوں کا رول بہت اہم ہے۔ ملک کو ترقی کی راہ پر لے جانے میں مختلف طرح سے ان کا تعاون درکار ہے۔ ان کی ترقی سے ملک کی ترقی کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ آپ نے کہا کہ روئے زمین پر ناوابستہ اقوام نوعِ انسانی کے ایک بڑے گروہ پر مشتمل ہیں۔ روایتی طور پر ہم نے سامراجیت، نوآبادیاتی نظام، نسل پرستی اور ہر طرح کے امتیاز اور ہر طرح کی بالادستی کے خلاف جنگ کی ہے۔ ہماری مسلسل یہی کوشش ہے کہ ایک منصفانہ سماجی اور اقتصادی نظام قائم ہو۔ جس طرح تمام ناوابستہ ممالک میں عورتوں کی تعلیم و ترقی اور ان کی بہبود نیز ان کے حقوق کے لیے جدوجہد کی جا رہی ہے انھیں لائنوں پر یہاں بھی عورتوں کو حقوق دلانے کی برابر کوششیں جاری ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک طرح سے عورتیں ملک کے سماجی شعور کی علامت ہیں۔ ان کے سبب سماج ایک دھاگے میں بندھے رہتے ہیں۔ ترقی پذیر ملکوں میں عورتیں تمام شعبوں میں سرگرم عمل ہیں اور سیاسی شعبوں میں اہم عہدوں پر فائز ہیں۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ نچلی سطح پر ہم ان کو نقل و حرکت کی خاطر خواہ آزادی نہیں دلا سکے ہیں جس سے کہ وہ ہر طرح کے امتیاز سے بالاتر ہو سکیں۔ ہمیں جس سماج میں عورتوں کی بہبود اور انھیں اوپر اٹھانے کے لیے کام کرنا ہے وہ ایسا سماج ہے جہاں ہزاروں سال سے مردوں کی بالادستی قائم ہے۔

اطاعت خواہ کسی ملک کی ہو یا کسی فرد کی، ایک ہی سی بات ہے۔ عورتیں مردوں کی دست نگر ہیں۔ انھیں سماج میں اس دلدل سے باہر نکال کر اوپر لانا ہے۔ یہ ایک ایسی ہی کوشش ہے جیسا کہ ناوابستہ ملکوں کو ایک ساتھ لانے اور ان کی تعمیر و ترقی کے لیے کام کرنے کی کوشش۔ مقصد یہ ہے کہ انھیں ان ترقیاتی کوششوں سے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع مل سکیں۔ عورتیں سماج میں آدھے کی مالک ہیں، لہٰذا سماج کی ترقی کا کوئی بھی پیمانہ وضع کیا جائے ان میں عورتوں کی ترقی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی ترقی کے عمل کو تیز تر کرنے کے لیے ان کی ذہنی صلاحیتوں اور قوتوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انھیں کام کرنے اور نقل و حرکت کی پوری آزادی ہونی چاہیے۔ عورتیں ہر شعبے میں مردوں کے مساوی ہیں خواہ یہ روحانی ترقی کا معاملہ ہو یا سیاسی نظریات ہوں، یا قربانیوں کی تاریخ کا مطالعہ ہو، بہادری کی تاریخ کا مطالعہ ہو، وہ ہر معاملہ میں مردوں کے دوش بدوش ہیں۔ جنس کی بنیاد پر کسی طرح کی کوئی کمی کہیں دیکھنے میں نہیں آنی چاہیے۔ عورتوں نے اعلیٰ ترین مراتب حاصل کیے۔ اعلیٰ ترین قربانیاں دیں، اعلیٰ ترین بہادری کی مثالیں قائم کیں۔ ہمارے ملک کی جدوجہد آزادی کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے۔ ہمیں عورتوں کو اس پسماندگی سے باہر نکالنا ہے۔ جو ان پر لاد دی گئی ہے خواہ وہ سماجی ہو یا ثقافتی۔ مردوں کی بالادستی دیگر ہر شعبے کے مخصوص مفادات کی طرح سے ہی انسانوں کو نقصان پہنچا رہی ہے۔ تمام مردوں اور عورتوں کو اس صورت حال سے نپٹنا ہے۔ تعلیم، روزگار، ترقی وغیرہ میں عورتوں کے حقوق پہنچانے ضروری ہیں۔

نوعِ انسانی کی تاریخ گواہ ہے کہ ہر جگہ عورتوں کی قربانیاں کسی سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ لیکن پھر بھی تعلیم اور روزگار میں ان کو وافر مواقع دستیاب نہیں۔ ہندوستان میں اس کے ازالے کی تدابیر کی جا رہی ہیں۔ یہاں عورتوں کی بہبود اور ترقی کے لیے بہت سے اقدامات کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں بنیادی چیز تعلیم ہے۔ لہٰذا ہندوستان

(باقی صفحہ ۹ پر)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by Skylark Printers, 11355, Id-Gah Road, New Delhi-110055

یوجنا

۱۶ تا ۳۱ ر مئی ۱۹۸۵

ایک روپیہ

لے دھن سے پاک معیشت
ایک مذاکرہ
(مالکم ایس ادی سیشیہ)

ترقی کی دوڑ میں خواتین کا حصہ
(شریمتی پریم ارورہ)

ابو سعد

کپاس کی کاشت اور اس کی اہمیت

ہندوستان میں تین قسم کی کپاس پیدا کی جاتی ہے۔ ۱۔ اوّل قسم کی کپاس (Gossypium Hirsutum) اس طرح کی کپاس کی کاشت ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے کی جا رہی ہے اس کا ریشہ اچھا ہوتا ہے۔ ریشے کی لمبائی ۲٫۳ سینٹی میٹر سے زیادہ ہوتی ہے۔ ایسی کپاس پنجاب، ہریانہ، مغربی اُتر پردیش، راجستھان میں بیکانیر، مدھیہ پردیش کے کچھ علاقوں میں آندھرا پردیش، تامل ناڈو، کرناٹک اور مہاراشٹر وغیرہ صوبوں میں ہوتی ہے۔ ۲۔ دوئم قسم کی کپاس، (Gossypium Herbaceum) ہے اس طرح کی کپاس کی کاشت مصر و سوڈان سے بیج منگا کر شروع کی گئی ہے اس کے ریشے کی لمبائی ۱٫۹ سینٹی میٹر سے ۲٫۳ سینٹی میٹر تک ہوتی ہے۔ اس قسم کی پیداوار گجرات، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، تامل ناڈو، کرناٹک اور آندھرا پردیش میں ہوتی ہے۔ ۳۔ سوئم قسم کی کپاس، (Gossypium Arboreum) ہے اس قسم کی کپاس چھوٹے ریشے والی اور کھُردری ہوتی ہے۔ اس کا ریشہ ۱٫۹ سینٹی میٹر سے کم لمبا ہوتا ہے اس قسم کی پیداوار ملک کے سبھی کپاس پیدا کرنے والے صوبوں میں ہوتی ہے۔

ہمارے ملک میں کپاس پر جدید سائنسی تحقیق کے سلسلے میں اہم ترین کام کیا گیا ہے اور کپاس کی نئی نئی قسمیں تیار کی گئی ہیں۔ ناگپور میں کپاس پر تحقیق کرنے کے لیے سنٹرل کاٹن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں آیا۔ آئی۔سی۔اے۔آر نے آل انڈیا کاٹن امپروومنٹ پروجیکٹ کی تشکیل دی اور مختلف شعبوں کے سائنسدانوں نے کپاس کی بہتری کے لیے قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ہر صوبے کی آب و ہوا اور مٹی کی قسموں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ پیداوار دینے والی کپاس کی اقسام تیار کی گئی ہیں جو کیڑوں اور بیماریوں سے بہت حد تک محفوظ رہ سکتی ہیں اور جلدی خراب نہیں ہوتی ہیں، ان قسموں میں ویرالکشمی، سُجاتا، سوون، ویرم ۲۶۳ اور ۳۶۴، وی، بجے، دیوی راج، کلیان، جے ونت اور وی۔سی ۱۹۱، وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

نشوونما کے طبعی عوامل

کپاس کے لیے گرم اور کم معتدل آب و ہوا درکار ہوتی ہے۔ کپاس کو اپنی نشوونما کے دوران نمی کی کافی مقدار کی اس وقت تک ضرورت پڑتی ہے جب تک کہ اس پر پھول نہ آجائیں۔ پودوں پر پھول آجانے کے بعد خشک دھوپ والے موسم کی ضرورت پڑتی ہے۔ فصل کے تیار ہونے پر بارش نہایت نقصان دہ ہوتی ہے کیونکہ کھلے بونڈوں (Bolls) کے بھیگ جانے سے کپاس خراب ہو جاتی ہے۔ کپاس کی اچھی کاشت کے لیے ۲۵ ڈگری درجۂ حرارت موزوں ہے۔ فصل کو بوتے وقت درجۂ حرارت ۲۰ ڈگری سینٹی گریڈ اور بونڈ (Boll) کے تیار ہوتے وقت درجۂ حرارت ۲۵ اور ۳۰ ڈگری سینٹی گریڈ کے بیچ ہونا چاہیئے۔ ہندوستان میں عام طور سے ۲۰ سے ۳۱ ڈگری سینٹی گریڈ درجۂ حرارت والے علاقوں میں کپاس کی کاشت ہوتی ہے۔ زیادہ سرد موسم میں پالا پڑنے کی وجہ سے فصل کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس کی نشوونما کے دوران ۲۰۰ دن پالا نہیں پڑنا چاہیئے۔ پودوں میں پھول کھلنے کے دوران آسمان صاف، تیز دھوپ اور گرمی ضروری ہے۔ رات میں ہلکی ٹھنڈک مفید ہوتی ہے۔ کپاس کی فصل کے لیے سمندری ہوائیں بہت ہی فائدہ مند ہوتی ہیں۔ لہٰذا دنیا میں بہترین قسم کی کپاس سمندری ساحلی علاقوں میں پیدا کی جاتی ہے۔

کپاس کے لیے بارش کا سالانہ اوسط ۵۰ سے ۱۱۰ سینٹی میٹر تک ہونا چاہیئے۔ جہاں ۵۰ سینٹی میٹر سے کم بارش ہوتی ہے وہاں سینچائی کی ضرورت پڑتی ہے اور خشک آب و ہوا والے علاقوں میں فصل کو پانی کی دوگنی ضرورت ہوتی ہے زیادہ بارش والے علاقوں میں اس فصل کی اچھی کاشت نہیں ہو سکتی۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مغربی ٹکساس صوبہ میں ۶۵ سینٹی میٹر اور جنوبی میسیسپی (South Missisipi) میں ۱۲۵ سینٹی میٹر بارش والے علاقوں میں کپاس کامیابی کے ساتھ اُگائی جاتی ہے۔ دنیا میں زیادہ تر کپاس کی کاشت ۱۰۰ سے ۱۱۰ سینٹی میٹر بارش والے علاقوں میں کی جاتی ہے۔ سوویت ایشیا، پاکستان اور ہندوستان کے پنجاب، ہریانہ اور مغربی اتر پردیش میں کپاس کی بہترین قسم سینچائی کے ذریعہ پیدا کی جاتی ہے

(باقی کورٹ پر)

منصوبہ بندی سے متعلق ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنیوالا

پندرہ روزہ

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر ——— • آر ٹھکرال
ایڈیٹر ——— • لکشمی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر ——— • محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر ——— • وسیم حیدر

شمارہ ۴	۱۶ تا ۳۱ مئی ۱۹۸۵ء	جلد ۵
۲۶ بیساکھ تا ۱۰ جیٹھ شک ۱۹۰۷		

فون نمبر: ۶۰ ۱۸ ۱۸

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے، ۲ سال ۳۵ روپے، ۳ سال ۵۰ روپے
فی کاپی ——— ایک روپیہ
طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فیصد کی رعایت

اس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

بزنس منیجر: ایل۔ آر۔ بترہ ✲ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس۔ منچالے

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:۔
ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین)
نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

ترسیل زر کا پتہ:۔ بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

[illegible] سیکٹر کا [illegible]
[illegible] بات ہے کہ غیر محسوب [illegible]
[illegible] نہیں ہے جس کا تعین کیا جا سکے بلکہ
[illegible] کے قانونی اور باقاعدہ سیکٹر میں ہی
پیدا ہوا ہے۔ ان کو ملانے سے

اور دیگر ترقی یافتہ ملکوں کے غیر محسوب سیکٹروں سے وسیع
بنا دیتا ہے۔ صنعتی ممالک میں دس کمانے والوں میں
سے نو تنخواہ دار افراد ہوتے ہیں جو اپنی آمدنی کو کم بتا کر
یا چھپا کر ٹیکس سے نہیں بچ سکتے۔ اس کے برعکس
بھارت میں بہت سے کمانے والے افراد تنخواہ دار

ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔ (یعنی زراعت جس کا ذکر پہلے
کیا جا چکا ہے) جو غیر محسوب آمدنیوں کی توسیع و اضافہ
کو وسعت دیتا ہے، شامل ہیں۔ یہ ایک اہم بات
ہے کہ بھارت میں سروس سیکٹر اتنی ہی وسعت اختیار
کر چکا ہے جتنی کہ ریاستہائے متحدہ اور جاپان کی صنعتی
سوسائٹیوں نے کی تھی کیونکہ سروس یا خدمات کے

> **ادائیگی ٹیکس سے پہلوتہی کی اصطلاح اس وقت استعمال کی جاتی ہے جب آمدنی یا دولت کو کم کرکے دکھایا جائے یا سرے سے دکھایا ہی نہ جائے۔ اس کے مقابلے میں ٹیکسوں سے احتراز کی اصطلاح کا استعمال وہاں کیا جاتا ہے جہاں آمدنی یا اثاثہ کا حساب کتاب اس طرح مرتب کیا جائے کہ تھوڑا ٹیکس دینا پڑے۔**

ٹیکس سے مستثنیٰ ذیلی
کام کرتے ہیں۔ زراعت کا [illegible]
سیکٹر، غیر رجسٹرڈ کاروباری و تجارتی ادارے، ٹرسٹ
اور غیر تحریری معاہدات۔ ٹیکس ادا کرنے والے
قانونی اور محسوب سیکٹر اور ٹیکس سے بچنے والے غیر
محسوب اور غیر قانونی سیکٹر کے درمیان باہمی تعلق
کی سب سے عام مثال ہے ہر شہر میں ہونے والے
مکانات کی خرید فروخت ہے جس میں طے شدہ قیمت
کا ایک حصہ محسوب رقوم میں سے اور باقی بلکہ زیادہ
بڑا حصہ غیر محسوب رقوم میں سے ادا کیا جاتا ہے۔
غیر محسوب سیکٹر اور محسوب سیکٹر کے درمیان ایک
طرف سے دوسری طرف رقوم کی یہ منتقلی محسوب اور

نہ ہو کر خود اپنے اپنے دھندوں میں لگے ہوئے
لوگ ہوتے ہیں، یا اپنا بیوپار کر رہے ہوتے ہیں یا
اپنے چھوٹے، درمیانی یا بڑے کارخانے چلا رہے ہوتے
ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کمانے والوں کی بیشتر
تعداد کی صحیح آمدنی کا تعین کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کا
نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگ ٹیکس
دینے سے بچتے ہیں اور غیر محسوب سیکٹر میں کام کرتے
ہیں تاکہ اپنے کاروبار کی خفیہ اور غیر مجاز توسیع کر
سکیں، اپنی مستقبل کی ضروریات کے لیے فنڈ جمع
کر سکیں اور اپنی پانچ ستارہ ثقافت اور پانچ ستارہ
مصارف کے لیے روپیہ فراہم کر سکیں۔ بھارت میں

سیکٹر میں کھپت پیداوار کے
ساتھ ساتھ بیک وقت ہوتی ہے جس کا کوئی حساب
کتاب نہیں رکھا جاتا۔

ایک متوازی معیشت

یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ بین الاقوامی
مالی فنڈ کے عملے نے مختلف ملکوں میں معیشت کے
غیر محسوب سیکٹر کا جو سروے کیا ہے اس میں بتایا گیا
ہے کہ ریاستہائے متحدہ اور کینیڈا میں اس سیکٹر کا
حجم مجموعی قومی پیداوار کا بیس فیصد، اٹلی ا۔
سویڈن میں پندرہ فیصد اور برطانیہ اور سوویت
روس میں دس فیصد اور جاپان میں پانچ فیصد

> **ٹیکس ادا کرنے والے قانونی اور محسوب سیکٹر اور ٹیکس سے بچنے والے غیر محسوب اور غیر قانونی سیکٹر کے درمیان باہمی تعلق کی سب سے عام مثال آج ہر شہر میں ہونے والی مکانات کی خرید و فروخت ہے جس میں طے شدہ قیمت کا ایک حصہ محسوب رقوم میں سے اور باقی بلکہ زیادہ بڑا حصہ غیر محسوب رقوم میں سے ادا کیا جاتا ہے۔**

غیر محسوب سیکٹروں کے درمیان خطِ تقسیم کو اتنا زیادہ
دھندلا بنا دیتی ہے جس سے غیر محسوب سیکٹر کو پہچاننا
مشکل ہو جاتا ہے۔

آمدنی چھپانے کی بدعت

تیسرے بھارتی معیشت میں ایک ایسا پہلو ہے
جو اس کے غیر محسوب سیکٹر کو دوسرے ترقی یافتہ

جو خصوصی حالات پائے جاتے
ہیں ان میں تجارت میں منافع اور قرضوں پر سود کی
اونچی شرح ہیں، جنھیں چھپایا جا سکتا ہے اور چھپایا
جاتا ہے۔ ایک بہت بڑے غیر منظم اور بے قاعدہ
سیکٹر کی موجودگی جو اس طرح کی آمدنی کو چھپانا ممکن بناتا
ہے، نیز ایک اہم اور وسیع سیکٹر کی موجودگی جو

ہے۔ سروے میں اس اندازے کی تائید
کی گئی ہے کہ بھارت میں یہ مجموعی قومی پیداوار کا،
جو موجودہ قیمتوں کی بنیاد پر ۸۳-۱۹۸۲ میں ۱،۲۱،۴۵۱
کروڑ روپے تھی، پچاس فیصد ہے۔ اس حساب سے
بھارت کی غیر محسوب سیکٹر کی وسعت ۶۰،۰۰۰ کروڑ روپیہ

۱۶ تا ۳۱ مئی ۱۹۸۵

یوجنا، نئی دہلی

ے بقدر ہے۔ میرے اپنے مطالعات کے مطابق یہ ذریعے کم یعنی مجموعی قومی پیداوار کا لگ بھگ ۲۰ فیصد اور ۵۰،۰۰۰ کروڑ روپے ہے۔" وزارتِ مالیات نے ۱۹۸۳ء میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک فائنینس اینڈ پالیسی سے غیر محسوب سیکٹر کا جائزہ لینے کو کہا تھا۔ اس سرکاری جائزے کی رپورٹ مکمل ہو گئی ہے اور حکومت کے زیرِ غور ہے۔ اس رپورٹ سے بھارت میں غیر محسوب آمدنی اور دولت کا زیادہ قابلِ اعتماد اندازہ جلد ہی میسر ہو جائے گا۔

"کالے دھن کے بغیر معیشت" کے لیے منصوبہ بنانے میں زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ خفیہ اور غیر محسوب آمدنیوں اور دولت کا صحیح حجم دریافت کرنے کی کوشش کرنے کے بجائے اس بات کا پتہ لگایا جائے کہ ایسی آمدنی اور دولت کیوں اور کیسے پیدا ہوتی ہے اور اس سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا کرنے سے غیر محسوب سیکٹر سے پاک معیشت کا مقصد حاصل کرنے کا کوئی راستہ نکل آئے۔

غیر محسوب دولت پیدا ہونے کی وجہ: غیر محسوب آمدنی اور دولت کے پیدا ہونے کی جو وجہ اقتصادی مطالعوں اور عوامی تحریروں میں بیان کی جاتی ہے وہ یہ ہے، ٹیکسوں کی اونچی شرحیں کمانے والوں کو ٹیکسوں کی ادائیگی سے بچنے کی ترغیب دیتی ہیں جس سے غیر محسوب آمدنی اور دولت پیدا ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت بھی کچھ ایسا ہی سمجھتی ہے کیونکہ وزیر مالیات نے فروری ۱۹۸۴ء میں بجٹ پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ٹیکسوں کی موجودہ شرحیں بھی کم کر کے ایسی سطح پر لے آئی گئی ہیں جو میں سمجھتا ہوں کہ حقیقت پسندانہ اور عین مناسب ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اس اقدام کا ہمارے ٹیکس دہندگان پر نمایاں اثر پڑے گا اور وہ آگے آئیں گے اور از خود اپنی صحیح آمدنی ظاہر کریں گے۔" اس بات کے پیچھے بنیادی سچائی یہ ہے کہ ٹیکس سسٹم اور غیر محسوب معیشت کے درمیان ایک تعلق ہے۔ اس کو سیدھے تسلیم کیا جا سکتا ہے اگرچہ اس سے مسئلے کی پوری تشریح نہیں ہوتی۔ میں نے اس مقالے کے شروع میں ہی غیر محسوب آمدنیوں اور دولت کی تشریح یوں کی تھی کہ یہ غیر محسوب دولت وہ دولت ہے جو ٹیکس حکام کی نگاہوں سے چھپی ہوتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ غیر محسوب سیکٹر ٹیکسوں کے سبب ہی وجود میں آتا ہے، اسی بات کو دوسرے الفاظ میں کہنے کے مترادف ہے جو یہ کہنے کے برابر ہے کہ غیر محسوب آمدنیوں اور دولت کو ٹیکسوں کو ختم کر کے ختم کیا جا سکتا ہے۔

زیادہ سنجیدہ بات تو یہ ہے کہ ٹیکس کی کمتر شرحوں، ٹیکس سے بچنے کی کمتر شرحوں اور ٹیکس ادا کرنے کی اونچی شرحوں کے درمیان کسی براہِ راست تعلق کا کوئی عملی ثبوت نہیں ہے۔ بھارتی ٹیکس کی شرحیں ۷۶-۱۹۷۵ء میں گھٹائی شروع کی گئیں اور یہ ۹۷٫۷۵ فیصد کی شرح سے گھٹا کر ۷۹-۱۹۷۸ء میں ۶۰ فیصد کر دی گئیں۔ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ۷۶-۱۹۷۵ء میں ہنگامی حالات کے اعلان سے پیدا شدہ خوف اور ڈسپلن کی وجہ سے ٹیکسوں سے حاصل ہونے والی آمدنی بڑھ کر ۱۲۱۴ کروڑ روپے تک پہنچ گئی۔ لیکن اس سے اگلے سال یہ آمدنی گھٹ گئی اور اس سال اور اس کے بعد کے دو سالوں میں ملک میں منفی شرح ترقی ریکارڈ کی

> صنعتی ممالک میں دس کمانے والوں میں سے نو تنخواہ دار افراد ہوتے ہیں جو اپنی آمدنی کو کم بتا کر یا چھپا کر ٹیکس سے نہیں بچ سکتے۔ اس کے برعکس بھارت میں بہت سے کمانے والے افراد تنخواہ دار نہ ہو کر خود اپنے اپنے دھندوں میں لگے ہوئے لوگ ہوتے ہیں، یا اپنا بیوپار کر رہے ہوتے ہیں یا اپنے چھوٹے، درمیانی یا بڑے کارخانے چلا رہے ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کمانے والوں کی بیشتر تعداد کی صحیح آمدنی کا تعین کرنا ممکن نہیں ہے۔

> "کالے دھن کے بغیر معیشت" کے لیے منصوبہ بنانے میں زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ خفیہ اور غیر محسوب آمدنیوں اور دولت کا صحیح حجم دریافت کرنے کی کوشش کرنے کے بجائے اس بات کا پتہ لگایا جائے کہ ایسی آمدنی اور دولت کیوں اور کیسے پیدا ہوتی ہے اور اس سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا کرنے سے غیر محسوب سیکٹر سے پاک معیشت کا مقصد حاصل کرنے کا کوئی راستہ نکل آئے۔

گئی اور تین برسوں میں ٹیکس چوری کی شدت اور کل رقم بڑھ گئی۔

موافق حالات

اُن کوششوں کا بھی کچھ ایسا ہی تجزیہ کیا جا سکتا ہے جو یہ دکھانے کے لیے کی جاتی ہیں کہ غیر محسوب معیشت کے وجود میں آنے کی وجہ کنٹرول اور لائسنسوں کا نظام ہے۔ اگر لائسنس اور کنٹرول نہ ہوں تو بڑے اور درمیانہ درجے کے پروڈیوسر بازار پر حاوی ہو کر چھوٹے پروڈیوسر کو میدان سے باہر دھکیل دیں گے۔ جیسا کہ وہ اب بھی نامی سوروں کے ذریعے کر رہے ہیں۔ کنٹرول کے سسٹم کو، جس کا اہتمام انڈسٹریز (ضابطہ بندی و ترقی) ایکٹ کے باب سوم میں کیا گیا ہے، ختم کرنے کا دارومدار بالکل مختلف بنیادوں پر ہے۔ مثلاً اس سے متعلق پالیسی میں غیر مطابقت، اس سے صنعتی ترقی کا مسدود ہونا اور اس کا سیاسی و دفتری بدعنوانیوں کا سرچشمہ بن جانا۔ ایسے حالات میں جہاں پبلک سیکٹر کے ذریعے سے ریاست معیشت کی بلندیوں کو کنٹرول کرتی ہو، تمام تر بنک کاری، قرضوں اور زر کی فراہمی کو اپنی تحویل اور ضابطہ بندی میں رکھتی ہو نیز پرائیویٹ سیکٹر کے تمام اہم اداروں کے حصص کی بڑی تعداد کی مالک ہو۔ یہی وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر حکومت نے بیشتر مادی کنٹرولوں کی جگہ مالی کنٹرول لگانے کا درست فیصلہ کیا ہے۔

غیر محسوب سیکٹر کا بنیادی سبب معیشت خود اس کا طرز عمل ہے۔ اس طرز عمل کے اہم پہلو ہیں، جمود، سرمایہ اور پیداوار کا بڑھتا ہوا تناسب، بڑھتی ہوئی بچتیں اور بڑھتی

> نیادہ سنجیدہ بات تو یہ ہے کہ ٹیکس کی شرحوں، ٹیکس سے بچنے کی کمتر شرحوں اور ٹیکس ادا کرنے کی اُونچی شرحوں کے درمیان کسی براہ راست تعلق کا کوئی عملی ثبوت نہیں ہے۔

ہوئی شدتِ سرمایہ، جن علاقوں میں سرمایہ کاری زیادہ ہے، وہاں کم صلاحیت کا استعمال، لگاتار جاری رہنے والی افراطِ زر، پلان کے مادی نشانوں یا اہم نصب العینوں کا پورا نہ ہونا، سیاسی اور سماجی بے چینی اور عوام میں غریبی کا بڑھنا۔ اس طرح کی معیشت میں اُس منافع میں، جو کوئی شخص تجارت اور پیداوار کے شعبے میں قوانین، ٹیکس نظام اور کنٹرولوں کی پابندی کئے بغیر حاصل کر سکتا ہے، اور جو وہ قوانین کا پابند رہ کر جائز طور پر کما سکتا ہے بہت فرق ہے۔ جوں جوں یہ فرق بڑھتا جاتا ہے غیر محسوب سیکٹر پنپتا ہے اور تیزی سے بڑھتی ہوئی ایک خود مختار قوت بن جاتا ہے جس کا ملک

> اس منافع میں، جو کوئی شخص تجارت اور پیداوار کے شعبے میں قوانین، ٹیکس نظام اور کنٹرولوں کی پابندی کئے بغیر حاصل کر سکتا ہے، اور جو وہ قوانین کا پابند رہ کر جائز طور پر کما سکتا ہے بہت فرق ہے۔ جوں جوں یہ فرق بڑھتا جاتا ہے، غیر محسوب سیکٹر پنپتا ہے اور تیزی سے بڑھتی ہوئی ایک خود مختار قوت بن جاتا ہے جس کا ملک کی سیاسی قوتوں اور عناصر سے قریبی تعلق ہو جاتا ہے اور موخرالذکر غیر محسوب معیشت پر انحصار رکھنے لگتے ہیں۔

کی سیاسی قوتوں اور عناصر سے قریبی تعلق ہو جاتا ہے اور موخرالذکر غیر محسوب معیشت پر انحصار رکھنے لگتے ہیں۔

اور اسکے نتائج : غیر محسوب معیشت سے برآمد ہونے والے نتائج مختلف النوع ہیں۔ مثلاً یہ کہ حکومت کو ٹیکسوں سے ہونے والی آمدنی کم ہو جاتی ہے، ٹیکس کی ادائیگی سے بچنے والوں کے پاس جائداد اور اثاثہ بڑھ جاتا ہے، ایک پلنپتا ہوا ثقافت پھیلنے لگتی ہے، ملک کی زر مبادلہ کی صورت میں ہونے والی آمدنی میں سے خورد برد ہونے لگتی ہے، غیر محسوب روپے کو اُجالا جاتا ہے اور وہ NRI سرمایہ کاری کے ایک حصے کے طور پر واپس آ جاتا ہے، پنجسالہ پلانوں کی پالیسیاں اور ترجیحات ناکام ہو جاتی ہیں کیونکہ چالیس فیصد معیشت اس کے دائرے سے باہر کام کرتی ہے۔ اسی وجہ سے حکومت اور ریزرو بنک آف انڈیا کی افراط زر کو روکنے کے لیے بنائی گئی پالیسیاں بے اثر رہتی ہیں، اعلان شدہ سماجی ترجیحات چھوٹ جاتی ہیں، غیر محسوب وسائل غیر ترجیحی سیکٹر میں داخل ہونے لگتے ہیں اور ترجیحی سیکٹر میں قرضوں کا داخلہ شروع ہو جاتا ہے اسی طرح جیسے صنعتی لائسنسوں کا طریقہ چھوٹی صنعتوں کی ترقی یا پسماندہ طبقات کی ترقی کے لیے اختیار کیا جاتا ہے لیکن اس کا توڑ زمین دوز معیشت کی خفیہ یا بے وجود فیکٹریاں اور غیر اعلان شدہ صلاحیتیں کرنے لگتی ہیں یا جیسے زر مبادلہ میں اضافے کی کوششوں اور امپورٹ کنٹرولوں کا توڑ اسمگلنگ اور دیگر محسوب طریقوں سے ہوتا ہے، گھریلو سیکٹروں کی بچتوں میں ہونے والے غیر معمولی اضافے کا پتہ نہیں لگایا جا سکتا۔ سیاسی سسٹم اور بیوروکریسی میں غیر محسوب دولت کا داخلہ اور ساری کی ساری معیشت کا غیر محسوب آمدنیوں اور دولت پر قریب قریب مکمل انحصار۔

وابستہ ہو جانا۔ مذکورہ بالا تجزیے کی روشنی

میں یہ نہیں سمجھتا کہ ہم غیر محسوب آمدنیوں اور دولت کو موجودہ سیاسی معیشت کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے اور معیشت کو نقصان پہنچائے بغیر جڑ سے اکھاڑ سکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم "کالے دھن کے بغیر معیشت" کا آدرش حاصل نہیں کرسکتے۔ ہمارے سامنے ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ ہم غیر محسوب سیکٹر کو برداشت کی حد کے اندر رکھیں۔ اپنی بات کو مختصر کرنے کے لیے میں خفیہ سیکٹر پر آج کی بھارتی معیشت کے مکمل انحصار کے بارے میں ایک جائزے سے مندرجہ ذیل حوالہ پیش کرتا ہوں، جس سے میں پوری طرح متفق ہوں۔

> میں نہیں سمجھتا کہ ہم غیر محسوب آمدنیوں اور دولت کو موجودہ سیاسی معیشت کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے اور معیشت کو نقصان پہنچائے بغیر جڑ سے اکھاڑ سکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم "کالے دھن کے بغیر معیشت" کا آدرش حاصل نہیں کرسکتے۔ ہمارے سامنے ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ ہم غیر محسوب سیکٹر کو برداشت کی حد کے اندر رکھیں۔

"کیونکہ کالے دھن کو کم کرنے سے ترقی کی رفتار سست ہو جاتی ہے اور باقاعدہ ٹیکس ادا کرنے کے بعد منافع کی شرح کم ہو جانے کی وجہ سے نجی سرمایہ کاری کی ترغیب و توسیع بھی کم ہو جاتی ہے، رقوم کے حصول کے کچھ وسائل مسدود ہو جاتے ہیں، عیش و عشرت کی بہت سی چیزوں کی، جو نجی کوششوں اور تحریکِ عمل کو بڑھانے میں معاون ہوتی ہیں، کھپت کم ہو جاتی ہے اور ترقی کے لیے غیر نجی سیکٹر کے اداروں کی طرف دیکھنے کے لیے دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ کالے دھن کی بیخ کنی کا طریقہ موثر ثابت نہیں ہو سکتا۔ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ جب کالے دھن کا حجم، اس کی تقسیم اور شرارت طاقتوں کے توازن میں بگاڑ پیدا کر دے اور ریاست کی نسبتی خود مختاری پر اثر انداز ہونے لگے تو اسے اتنی حدود میں رکھنے کی محدود کوشش کی جائے جو برداشت ہو سکے۔

مختصر المدت اقدامات: غیر محسوب سیکٹر کو کنٹرول اور قابلِ برداشت حدود میں رکھنے کے لیے فوری طور پر درج ذیل اصلاحی اقدامات کیے جا سکتے ہیں:-

۱۔ ٹیکس سسٹم کے انتظام اور ٹیکس جمع کرنے کے کام کو مستحکم بنایا جائے اور ٹیکس کی ادائیگی سے بچنے والوں کو سزا دی جائے۔ اس کے لیے قانون میں اصلاح کی جانی چاہیے جس سے کہ چھاپہ پڑنے یا غیر محسوب دولت یا اثاثے کا پتہ لگنے کے بعد کوئی بھی شخص بچ کر نہ نکل سکے۔

۲۔ بنک کھاتوں، بنک ڈرافٹوں اور بنکوں میں نقد جمع کی جانے والی رقوم کے بارے میں اطلاعات حاصل کرنے کا انتظام کیا جائے اور بنکوں میں جمع غیر محسوب بچتوں کا پتہ لگایا جائے۔ ۳۔ جس جائداد کی قیمت فروخت کاغذات میں کم بتائی گئی ہو، اسے لازمی طور پر سرکاری قبضے میں لے لیا جائے اور اس کے لیے ساتویں شیڈول کے تحت قانون بنایا جائے۔ ۴۔ ادائیگی ٹیکس سے احتراز کو روکنے کے فائننس ایکٹ ۱۹۸۴ میں مندرج آٹھ اقدامات کی مزید توسیع کی جائے۔ ۵۔ جس طرح انسان اپنے جسم کو زہریلے مادوں سے پاک کرنے کے لیے کبھی کبھی جلاب لیتا ہے اسی طرح کبھی کبھی بڑی مالیت کے نوٹوں کو غیر قانونی قرار دے دیا جانا چاہیے۔ اس سے غیر محسوب کرنسی نوٹوں کی شکل میں رکھی ہوئی غیر محسوب دولت یا آمدنی کا ۱۵ تا ۲۰ فیصد حصہ ضائع ہو جائے گا۔ ۶۔ انتخابات سے متعلق اصلاحات کے طور پر تمام قومی، ریاستی یا مقامی انتخابات کے لیے مالیات ریاست فراہم کرے اس کا پورا حساب کتاب رکھے اور باقاعدہ آڈٹ کرواتی رہے۔

اور طویل المدت اقدامات

طویل المدت اقدامات، جن سے غیر محسوب معیشت کی توسیع اگر پوری طرح نہیں رکے گی تو حقیقتاً سست ضرور ہو جائے گی، یہ ہیں:- معیشت کو ازسرِ نو اس طرح سے تنظیم دی جائے کہ مالکِ اثاثہ و خوشحال اقلیت اور بے اثاثہ و غریب اکثریت کے درمیان جو خلیج ہے وہ پٹ جائے اور ایک مقابلتاً کم غیر منصفانہ اقتصادی نظام وجود میں آ جائے۔ ملکیتِ اراضی کی موثر حد مقرر کی جائے، زمین کو منصفانہ ڈھنگ سے تقسیم کیا جائے اور اسی قسم کے دوسرے اقدامات کے ذریعے اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ ہر دیہی خاندان کے پاس کچھ اثاثہ ہو۔ کارخانوں کے شعبے میں پبلک سیکٹر کو اس طرح منظم کرنا ہوگا کہ اس کے ادارے تجارتی طور پر منافع بخش ہوں۔ اس سے نجی سیکٹر بھی اس کی چھتر چھایا اور کنٹرول کے تحت آ جائے گا۔ اور متفقہ سماجی و اقتصادی پالیسیوں اور ترجیحات کو موثر طور پر لاگو کیا جا سکے گا۔ اس سے ایسی فضا پیدا ہوگی جس میں غیر محسوب معیشت کا حجم اتنا رہ جائے گا جو قابلِ برداشت ہوگا۔ ★

پوجا نئی دہلی

کمل نین کابرا

کالا دھن
ناپید نہیں، کم ضرور کیا جا سکتا ہے

اس مضمون میں کمل نین کابرا نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ کالا دھن معیشت سے دور نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اسے قدرے کم کیا جا سکتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ملک میں کالے دھن کی پیداوار کا اصل سبب ریاست کی طرف سے کی گئی وہ مداخلت ہے جو معیشت کو اس کے داخلی راستے سے مختلف سمتوں میں لے جانے کے لیے کی گئی ہے۔ انھوں نے متنبہ کیا ہے کہ اگر تیزی سے بڑے پیمانے پر بڑھتے ہوئے کالے دھن کے خلاف سخت کارروائی کی گئی تو اس سے سرمایہ کاری کی فضا پر خراب اثر پڑے گا۔ اور ریاستیں متاثر ہوں گی۔ اس برائی کا حل ان لوگوں کے سامنے جھک جانا بھی نہیں ہے جو کہ اس کے اصل محرک ہیں یا جو اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ انھیں رعائتیں دے کر بھی اس برائی کو دور نہیں کیا جا سکتا۔ کالے دھن کو روکنے کے لیے از سر نو تطبیق کی ایک نئی پالیسی درکار ہے۔ وہ اس کے لیے کام کرنے پر زور دیتے ہیں

ہندوستان میں کالے دھن کو پیدا کرنے کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ یہ تو ایک ان چاہی دولت ہے، یا یوں کہئے کہ بہت سے اقتصادی، سیاسی اور سماجی عناصر کے باہمی عمل اور ردعمل سے پیدا ہونے والا ناجائز دھن ہے جو کہ ہر جگہ پھیلا ہوا ہے اور اس کا سکہ تقریباً ہر جگہ چلتا ہے۔ اگر ریاست کی طرف سے معیشت کو ایک مختلف سمت میں لیجانے کے لیے مداخلت نہ کی گئی ہوتی اور اسے اپنے داخلی راستے سے کسی دوسری سمت میں قدم بڑھانا ہوتا تو ہندوستان میں کالا دھن پیدا نہ ہوتا۔ لیکن کیا اس صورت میں ہر شخص کو فراغت کی زندگی میسر آتی کیونکہ کم قسم سے سرف دھن نے معاشی نظام کی کارکردگی کو کتنا فربہ کیا ہوتا؟

بظاہر جو کچھ ہم معاشی ترقی، اس کے ڈھانچے کی تبدیلی اور اس کا تنوع دیکھتے ہیں" وہ عمل میں نہ آئی ہوتی اور محض انگریزوں کے یہاں سے چلے جانے سے بات نہ بنی ہوتی جب تک کہ اقتصادی شعبے میں ریاست کی طرف سے بالواسطہ اور بلاواسطہ مداخلت نہ ہوئی ہوتی۔

ریاست کی طرف سے مداخلت کیوں؟

اس سے ایک نتیجہ یہ اخذ ہوتا ہے کہ محض ریاستی مداخلت ہی نہیں بلکہ اس کی نوعیت، اس کی مختلف شکلیں نیز یہ کہ یہ مداخلت کس حد تک ہے، کالی معیشت کو جنم دیتی ہیں۔ موجودہ صورت میں کالی معیشت جس بڑے پیمانے پر ہے، اس کے پیچھے پورے یہی اسباب کارفرما ہیں۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو کالی معیشت کا دائرہ اتنا وسیع نہ ہوتا اور یہ اپنی حد میں ہوتی جس کا نظم و نسق ممکن ہوتا۔

اس صورت حال کا تجزیہ آسان نہیں۔ اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ اگر ہمارا ترقیاتی نظام پرائیویٹ سیکٹر کو زیادہ آزادی کے ساتھ پھلنے پھولنے دیتا تو ریاست کو زیادہ سے زیادہ ایسے حالات پیدا کرنے ہوتے جس سے پرائیویٹ کارخانے پھل پھول سکتے، ان کی توسیع عمل میں آسکتی اس کے بعد ریاست دست کش ہو جاتی۔ اس طرح متوازی معیشت کی تکلیف دہ ترقی رک سکتی تھی اور معاشی ترقی کی رفتار بھی تیز ہوتی۔ متبادل منظرنامہ قومی منصوبہ بندی کو زیادہ تفصیل کے ساتھ پیش کرتا۔ اس میں پبلک سیکٹر کا دائرہ بڑا اور ترقی پذیر ہوتا۔ ترقی کے طریقوں پر اثر انداز ہونے کے لیے، آمدنی اور دولت کی تقسیم، سرمایہ کاری کی راہوں کے تعین، درآمدی سامان پر پابندی، ٹیکنالوجی اور برآمدات کو بڑھانے کے لیے تفصیلی باضابطہ نظام کی ضرورت نہ پڑتی۔ ترقی کا عمل آہستہ آہستہ ترقی پاتا اور روزگار پر اس کے اثرات اچھے ہوتے اور ترقی کے فائدے آہستہ آہستہ نچلے طبقے تک بھی پہنچتے۔

ریاستی مدد اور تعاون بے حد ضروری

ریاستی تعاون کے بغیر کوئی ترقی ممکن نہیں۔

یوجنا، نئی دہلی

ترقی کے عوامل جو کہ بچت کرتے ہیں، کوششوں کو آگے بڑھانے میں مدد دیتے ہیں، نئے صنعت کاروں کو نظم و نسق کی خدمات مہیا کرتے ہیں، اُن سب کے لیے ریاستی مدد درکار ہے۔ اگر کہیں پبلک سیکٹر بہت ضروری تھا تو اسی کی ابتدائی مشکلات پر قابو پانے

ٹیکسوں کا ہلکا سا بوجھ

اس نظام کے مضمرات سے متعلق جملہ تفاصیل میں جانا ضروری نہیں ہے۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ ایسا نظام بھی ممکن نہیں جہاں کوئی ٹیکس نہ ہو۔ البتہ یہ ضرور توقع کی جا سکتی ہے کہ ٹیکسوں کا بوجھ زیادہ نہ رہے۔ سرکاری سطح پر ہونے والے اخراجات

مقابلے کہیں کم کالے دھن والی معیشت ہے۔ اس سلسلے میں منڈی کے نظام پر تیزی سے آگے بڑھنے والی معیشت مشرقی ایشیا اور لاطینی امریکہ کے ملکوں جیسا کہ برازیل میں ہے۔ اگر استدلال کا یہ طریقہ درست ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آج کالے دھن کی معیشت جس ہیبت ناک صورت میں ہے، وہ سماج وادی نظام کے ساتھ ایک

> **اگر ریاست کی طرف سے معیشت کو ایک مختلف سمت میں لے جانے کے لیے مداخلت نہ کی گئی ہوتی اور ملک نے اپنے داخلی راستے سے کسی دوسری سمت میں قدم رکھا ہوتا تو ہندوستان میں کالا دھن پیدا نہ ہوتا۔**

کے بعد جیسا کہ جاپان یا پاکستان میں، اسے پرائیویٹ سیکٹر کو منتقل کیا جا سکتا تھا۔

کارپوریٹ سیکٹر کو زراعت کو شامل کرنے کی اجازت دی جانی چاہیے۔ خاص کر برآمدات والے مال کی تیاری کے لیے تو اسے شامل کرنا اور بھی ضروری ہے، تازہ ترین ٹیکنالوجی کی درآمدات کے لیے ادائیگی کے واسطے ایسا کرنا بہت ضروری ہے۔ جاپان یا جنوبی کوریا کی طرح سے اصلاحات

کے لیے در کار مالیات پر توجہ دی جانی ضروری ہے۔ قیمتوں کے آزادانہ نظام کے تحت شخصی اور کارپوریٹ ٹیکسوں سے منافع کی وافر رعایتیں مل سکتی ہیں۔ اس طرح اس منافع کو دوبارہ سرمایہ کاری کے طور پر لگایا جا سکتا ہے۔ ہماری صنعتی کمپنیاں اور بڑے ادارے سستی محنت کا فائدہ اٹھا کر اس قدر آگے بڑھ سکتے تھے کہ ان کا شمار

مشغول ہے۔ یہ نظام اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ اس سے سماج وادی نظام اور جمہوری طریق کار کو بڑھاوا ملے گا لیکن سماجی انصاف کی ترقی کے خواب کہاں گئے؟ ملک میں پھلتی پھولتی کالے دھن والی معیشت کا دور دورہ ہے اور اس حقیقت سے سبھی واقف ہیں۔

کالے دھن کی معیشت کیوں فروغ پاتی ہے؟

منڈی سے ہونے والے

> **اگر ہمارا ترقیاتی نظام پرائیویٹ سیکٹر کو زیادہ آزادی کے ساتھ پھلنے پھولنے دیتا تو ریاست کو زیادہ سے زیادہ ایسے حالات پیدا کرنے ہوتے جس سے پرائیویٹ کارخانے بھی پھل پھول سکتے، اُن کی توسیع عمل میں آ سکتی اس کے بعد ریاست دست کش ہو جاتی۔ اس طرح متوازی معیشت کی تکلیف دہ ترقی رک سکتی تھی اور سائنسی ترقی کی رفتار بھی تیز ہوتی۔**

اراضی کا عمل تیزی سے انجام پانا چاہیے۔ تاکہ مؤثر نوعیت کی کھیتی باڑی سے متعلق معیشت جو کہ صنعت کاروں کو ترقی پذیر منڈی کو دینے کی صلاحیت رکھتی ہو، ابھر کر سامنے آ سکے، سیاسی طور پر یہ ممکن نہ تھا کیونکہ برطانیہ نے ہندوستان سے جانے سے پہلے اراضی کا تقسیم نو کا عمل مکمل نہیں کیا تھا۔ ورنہ ممکن تھا کہ ہم بڑے بڑے کھیتوں پر مشینوں کی مدد سے کھیتی باڑی شروع کر دی ہوتی اور زراعت میں سرمایہ کے داخلے کی آزادانہ طور پر اجازت دے دی ہوتی اور صنعتوں کی طرح سے ہی ان کی مدد کی ہوتی۔ جنھوں نے زراعت کو صنعت کاری کے ڈھنگ پر لانے کی کوشش کی۔

دنیا کے بڑے صنعتی اداروں میں ہوتا۔ سستے اور مقابلے پر آنے والے مال کی بکری سے صارفین کو فائدہ ہوتا۔ یہ توقع کرنا تو عبث ہے کہ ٹیکسوں کی ادائیگی کا نظام اتنا موثر ہو سکتا ہے کہ اس میں کالے دھن کے باقی رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ یہ قدرے بہتر ہو سکتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق معیشت کے مجموعی سائز کے تناسب سے کالا دھن ۱۵ تا ۵۰ فیصد ہے۔ مذکورہ بالا طریقہ اپنانے والے ممالک کا تجربہ اگر ہمارے لیے کوئی رہنمائی فراہم کرتا ہے تو ہماری معیشت آج کے

منافعوں میں حد سے زیادہ ریاستی مداخلت اور زبردستی پرائیویٹ کارخانوں کی معیشت میں سرکاری مداخلت نیز جمہوریت کے نام پر ترقی اور انصاف کو ایک ساتھ رکھنے کی کوشش نے کالا دھن پیدا کیا ہے۔ منڈی کے نظام پر انحصار کرنے والی معیشت کے حامیوں کا کہنا ہے کہ ترقی پر زور اور اس کے پیچھے مثبت سرکاری امداد سے ملک میں ایک بڑی صنعتی قوت ابھر سکتی ہے اس کے ساتھ ہی ٹیکسوں کی کمتر شرح سے ٹیکسوں سے حاصل ہونے والی آمدنی زیادہ

[illegible] سے غریبوں کی بہتر طور پر بہبت
[illegible] اس کے بعد بھی چند ایسے لوگ
[illegible] جو آمدنی کو چھپاتے لیکن اس کے
باوجود [illegible] اس شے بیلنے پر پرورش نہ
پا سکا جیسا کہ آج کے حالات میں ہے۔
ماضی کی پیش کش گزرے ہوئے حالات پر
منطبق نہیں ہوتی۔ اس طرح زندگی میں اقتصادی
سیاسی اور سماجی قوتوں کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔

طبقے کی کھپت کم ہوتی اور اس سے بے روزگاری نہ
بڑھی ہوتی۔ آمدنی اور دولت کے مقابلتاً زیادہ
ارتکاز سے مانگ اور طلب کا جو نقشہ سامنے آیا
ہوتا، وہ بھی روزگار کے لیے مناسب نہ ہوتا۔ ترقی
کے لیے مصنوعات اور ٹیکنالوجیوں کے انتخاب کے
سبب روزگار پر جو خراب اثر پڑتا، اس کا
ازالہ مشکل سے ہی زیادہ شرح ترقی سے ہو سکتا
تھا۔
زراعت اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں

بھی نہیں کی جاتی تھی۔ اجرتوں پر حاصل کی گئی محنت
کی لاگت کے نظام، ادارہ جاتی مالیات اور نگرانی
کے نظام کی عدم موجودگی سے مختلف طرح کی خامیاں
وجود میں آگئیں۔ ارتکاز کی قوتوں کی موجودگی سے
چھوٹے کارخانوں کو نقصان پہنچا، خاص کر ایسی
صورت میں جبکہ ریاست کی طرف سے ان کے لیے
تدارکی اقدامات نہ ہوں۔

کالا دھن سیاست کو خراب کر سکتا ہے۔

آج ہم محض کالے دھن کی برائی محض قانونی
یا اخلاقی بنیادوں پر نہیں کرتے۔ ہم اس کی برائی اس
لیے کرتے ہیں کیونکہ جس طرح کے نتائج یہ سامنے
لاتا ہے اور جس طرح یہ سیاست کو خراب کرتا ہے
اور جس طرح کے سماجی نظام کو یہ بڑھاوا دیتا ہے،
اس پر ہمیں شدید تشویش ہے اور ہم اس کی
اجازت نہیں دے سکتے۔ سرکاری مداخلت کے
بغیر منڈی کے نظام سے بھی غیر پسندیدہ نتائج قانونی
طور پر اُبھر سکتے تھے۔

> اس سلسلے میں منڈی کے نظام پر تیزی سے آگے بڑھنے والی معیشت مشرقی ایشیا اور لاطینی امریکہ کے ملکوں میں جیسا کہ برازیل میں ہے۔

منڈی کے ایک ایسے نظام میں جہاں ریاست کی
کارفرمائی نہ ہو، جمہوریت کی نوعیت اور شہریوں
کی آزادی یقیناً بہت محدود ہوتی اور سماجی گروہ
بندی اپنی انتہا پر ہوتی۔ عالمگیر پیمانے پر حق
رائے دہندگی بالغان اور سیاسی طور پر ایک سے
زیادہ حق رائے دہندگی کی صورت میں بالعموم وہی
طریقہ اپنانے کے لیے رہ جاتا ہے جو کہ ہندوستان
نے ۱۹۵۰ کے بعد اپنایا۔

زیادہ ترقی۔ کم روزگار

پالیسی کے انتخاب کے سلسلے میں وضاحت
کے لیے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ریاست کی مداخلت
کے بغیر پرائیویٹ صنعتوں کے تحت منڈی کے نظام
پر مبنی ترقی کی خاطر ہندوستان میں ۱۹۵۰ء سے
۱۹۷۰ تک کے درمیانی عرصے میں صورت حال کیا رہی
ہوتی۔ پسماندہ ایکسٹرا پولیشن (Extra
polation) کی بنیاد پر اگر پیداوار اور خاص کر
صنعتی پیداوار کی شرح ترقی مقابلتاً زیادہ بھی ہوتی
تو بھی روزگار کی صورت حال موجودہ حالت سے
بہتر نہ ہوتی۔ سرکاری کارخانوں میں اکثر عملے کی کثرت
کی شکایت ہوتی ہے۔ منظم پرائیویٹ سیکٹر سے
روزگار کی صورت حال پر مشکل ہی سے کوئی اچھا اثر
پڑ سکتا تھا۔ اس لیے متبادل ترقیاتی نظام میں محنت کش

بین الاقوامی جوڑ توڑ اور پیش رفتوں کے اثرات
کی تصویر کو دیکھنے سے مذکورہ بالا قسم کے خیالات
اور امکانات کو اور زیادہ تقویت پہنچتی ہے۔
سرکاری مداخلت سے عاری پرائیویٹ کارخانوں
سے مانگ اور طلب کا جو نقشہ اُبھرتا، اس کے
تحت غیر ملکی ٹیکنالوجی کی مانگ بڑھ جاتی، نیم مصنوعہ
مال اور بھاری پائیدار اشیا کے صارفین کی مانگ
بڑھ جاتی۔ اس طرح کی درآمدات کی مسلسل مانگ
سے غیر ملکی قرضہ بڑھ جاتا اور لاطینی امریکہ کے ملکوں
کی طرح سے ہی افراطِ زر کا بحران پیدا ہو گیا تھا۔

خوش قسمتی سے سماجی، سیاسی اور اقتصادی
قوتوں کے توازن کے سبب ہم غیر جمہوری کھلے
پرائیویٹ نظام والی ریاست اور ایسی معیشت
سے بچ گئے ہیں جس میں کالے دھن کو جائز پیداوار
سمجھا گیا ہو۔ لیکن اس سے انکار بھی ممکن نہیں کہ
ہمارے ماہرین شماریات، پبلک سیکٹر کی منصوبہ
بندی کے ذمہ داروں اور کنٹرولوں پر مبنی ملی جلی معیشت

> آج ہم محض کالے دھن کی برائی محض قانونی یا اخلاقی بنیادوں پر نہیں کرتے۔ ہم اس کی برائی اس لیے کرتے ہیں کیونکہ جس طرح کے نتائج یہ سامنے لاتا ہے اور جس طرح یہ سیاست کو خراب کرتا ہے اور جس طرح کے سماجی نظام کو یہ بڑھاوا دیتا ہے، اس پر ہمیں شدید تشویش ہے اور ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے۔

نجی کوششوں سے کی جانے والی زراعت
سے جو منڈی کا نظام اُبھرتا، اس نے بہت سے
چھوٹے کسانوں کو بے گھر کر دیا ہوتا اور انہیں
صنعت یا دیگر سیکٹروں میں کھپانے کی کوئی کوشش

اور جمہوری طریقوں نے جو کارگزاری پیش کی،
وہ افراطِ زر، بے روزگاری [illegible]
[illegible]

باقی آئندہ [illegible]

اب ہمیں اس طریقے پر لوٹنا ہوگا جسے ہم نے ۱۹۹۰ء کے آس پاس یہ سمجھ کر ٹھکرا دیا تھا کہ یہ ہمارا بنا محافظا نہیں بن سکتا۔

سیاسی طور پر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سیاسی اقتدار کے لیے حلقہ ہائے انتخاب کو عوام کے کثیر طبقات اور بڑی تعداد سے محروم کر کے چند مخصوص گروہوں یا چند مخصوص طبقات تک محدود کر دیا جائے۔ جمہوریت کے

موجود ہے۔ اگر اس کے خلاف سخت کارروائی کی گئی تو اس سے سرمایہ کاری کی فضا پر بُرا اثر پڑے گا جو کہ نظام کے بدلنے کے لیے بنیادی ضرورت ہے۔ اگر اسے ایسے ہی رہنے دیا جائے تو یہ رضا کارانہ طور پر قانون کے دائرے میں نہیں آجاتا، اس سے بہت کم لیکن پھر بھی کافی ٹیکس آنا شروع ہوگا جبکہ ابھی تک اس پر کوئی

مالی طور پر مستحکم کاشتکاروں سے اگر وسائل جٹانے کا کام نہ بھی لیا جائے اور انھیں ایسے ہی چھوڑ دیا جائے تو بھی وہ مطمئن نہیں ہونگے کیونکہ صنعتوں کی سربراہی کی ان کی حیثیت خراب ہو جائے گی۔ افراطِ زر کی حالت میں تجارتی شرائط

> اس سے انکار بھی ممکن نہیں کہ ہمارے ماہرینِ شماریات، پبلک سیکٹر کی منصوبہ بندی کے ذمہ داروں اور کنٹرول پر مبنی ملی جلی معیشت اور جمہوری طریقوں نے جو کارگزاری پیش کی، وہ افراطِ زر، بے روزگاری، بیرونی ماحول کی خرابی اور کالے دھن کی کثرت کی تصویر ہے۔

لیے اس کے مضمرات منفی ہیں کیوں کہ منصوبے کی ترجیحات میں شامل بہت سے استحقاق، سہولتیں، امدادی رقوم ان لوگوں سے چھن جائیں گی جو انھیں استعمال کرتے ہیں۔

اقتصادی سطح پر تکنیکی فرق بڑھ گیا ہے۔ غیر ملکی زرِ مبادلہ کی دقتوں کی موجودگی میں نئے مواقع کی کھوج کرنی ہوگی۔ خاص کر ایسی صورت میں جبکہ ہماری برآمدات کم ہوتی جا رہی ہیں۔ تجارتی شرائط غیر موافق ہوتی جا رہی ہیں۔ تیسری دُنیا کے برآمدات کے امکانات بالعموم کم ہو رہے ہیں۔ بدیسی قرضوں کے لیے فضا سازگار نہیں۔ قرضہ۔ سروس تناسب قرضوں کی واپسی کی اجازت نہیں دیتا۔ نہ صرف ہندوستان کے لیے قرضے کا حال ایک چیلنج ہے بلکہ قرضہ دینے والے کا حال بھی ایک چیلنج ہے کیونکہ قرض دینے والے میکسیکو، برازیل، پولینڈ اور بھارت جیسے بہت سے ملکوں کو بہ یک وقت قرض نہیں دے سکتا۔

ریاست کی مداخلت سے پاک فراخدلانہ اور نجی نوعیت کے منڈی کے نظام کی طرف آنا ایک اور لحاظ سے بھی مشکل ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ پہلے حالات تیزی سے بڑھنے والا کالا دھن

ٹیکس لیا جاتا ہی نہیں۔ کالے دھن کے ساتھ مانگ اور طلب کے ڈھانچے، ترقی اور سرمایہ کاری کے ڈھانچے کا رُخ ایسے آئٹموں کی طرف ہو جائے گا جیسا کہ موٹر، اسکوٹر، سامانِ تعیش، تفریحی الیکٹرانکس والے آلات اور سامان وغیرہ۔ اس سے بے روزگاروں پر بُرا اثر پڑے گا، محنت کشوں کے مطلب کے سامان کی کمی آجائے گی اور افراطِ زر بڑھ جائے گا۔

ریاست راتوں رات اپنی سرگرمیوں کے دائرے کو گھٹا نہیں سکتی۔ پرائیویٹ سیکٹر کے لیے مواقع اور وسائل کی فراہمی کو بڑھانے کی خاطر، اسے پبلک سیکٹر میں سرمایہ کاری

اور خراب ہو جائیں گی۔ غریبوں میں رعائتی نرخ پر اشیاء کی تقسیم اور ان کی حصول کی ضرورت بڑھ جائے گی اور افراط زدہ عوام کو اشیاء کی فراہمی کی ضرورت بڑھ جائے گی۔ مختصراً یہ کہ سرکاری مداخلت والی اور ملی جلی معیشت والے راستے کو ترک کرنا آسان نہیں اور اسے کالے دھن سے پاک بنانا بھی مشکل ہے۔ اس سے کم پیداواری صلاحیت کا مسئلہ حل کرنا بھی دشوار ہے، اس کے علاوہ تکنیکی پسماندگی اور سرمائے نیز پیداوار کے بڑھتے ہوئے تناسب وغیرہ مسائل کا حل بھی دشوار ہے۔ بلاشبہ نظام کی تبدیلی

> کالے دھن کے نظام کے بانی مبانیوں اور اس سے فائدہ اُٹھانیوالوں کو دباؤ کے آگے جھکنے سے، یہ بُرائی دُور نہیں ہوسکتی۔ یہ بُرائی ان کو رعائتیں دے کر بھی دُور نہیں کی جاسکتی۔

کو کم کرنا ہوگا اور غریبی دُور کرنے جیسے پروگراموں کو بھی کم کرنا ہوگا۔ لیکن سرمایہ کاری اور بدیشی قرضے پرائیویٹ سرمایہ کاری کو تیزی سے آگے بڑھاتے ہیں۔ سرکاری سیکٹر کی کمی سے سماجی اور اقتصادی مضر نتائج کا ایک چکر شروع ہو جاتا ہے۔

ملی جلی معیشت: ایسی صورت میں بڑے اور

بے روزگاری، غریبی، اشیائے صرف کی کمی وغیرہ مسئلوں کا حل نہیں۔ یہ درحقیقت ان مسائل پر بلاواسطہ حملے کے لیے تیار بھی نہیں کیا گیا ہے۔

دباؤ کے آگے جُھکنا نہیں

کالے دھن کے نظام کے بانی مبانیوں اور اس سے فائدہ اُٹھانے والوں کو دباؤ کے آگے جھکنے سے، یہ بُرائی دُور نہیں ہوسکتی۔ یہ بُرائی ان کو رعائتیں دے کر بھی دُور نہیں کی جاسکتی۔ سرکاری پالیسی

اور جمہوریت کے مقاصد کے ڈھانچے کو اس غرض سے تبدیل کرنے کے لیے جس سے کہ عوام کا مفاد ثانوی حیثیت اختیار کرے اور نظام میں براہِ راست شرکت کرنے والی طاقتور قوتوں کو اوّلیت حاصل رہے، جو کام کیا جائے، وہ کھل کر کیا جائے اور اسے محض کالے دھن کو روکنے کے کام پر نہیں کیا جاتا ہے۔ اس طرح کی تبدیلی اب تک قائم کردہ مقاصد کا وجود ہی ختم کر دیتا ہے اور کالے دھن سے پیدا ہونے والے نتائج کو جائز قرار دیتی ہے۔ بہت سے لوگوں کے لیے ترقی ہی اپنی جگہ ایک حتمی مقصد ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ کالے دھن پر روک سے ترقی کا عمل رُک جائے گا۔

کالے دھن کا علاج۔ سات نسخے

اس کے لیے حکمت عملی اور پالیسی کے تحت مختلف طرز کے عملی تطبیق کی ضرورت ہوگی۔

پہلا طریقہ:۔ کالے دھن، اثاثہ جات وغیرہ کا پتہ چلانے کے لیے بے نامی معاملات اور سودوں کی گنجائش کو ختم کرنا ہوگا یا کم سے کم اُسے اقتصادی اطلاعات کے باضابطہ نظام کی مدد سے محدود رکھنا ہوگا۔ بالغوں اور تنظیموں کو شہریت کی شناخت کا نمبر جاری کرنے کا نظام جاری کرنا ہوگا۔ شہریوں کا قومی رجسٹر مرتب کرنا ہوگا۔ شناخت نمبر کی بنیاد پر ہی اقتصادی سودے کرنے ہوں گے۔ ان تمام معلومات کا اکٹھا کرنا کالے دھن کو ختم کرنے میں معاون ہوگا۔

دوسرا طریقہ:۔ اعلیٰ کرنسی نوٹوں کی منسوخی۔

تیسرا طریقہ:۔ عام استعمال کی اشیاء کی تیاری بڑے پیمانے پر اور اگر ممکن ہو تو سرکاری نگرانی میں کی جائے تاکہ اشیاء کی کمی سے کالے دھن کے امکانات کو روکا جاسکے۔

چوتھا طریقہ:۔ تعمیر مکانات کا بڑا پروگرام۔ جائدادوں اور اراضی سے متعلق تمام سودے پبلک سیکٹر کی اسٹیٹ کارپوریشنوں کے توسط سے کئے جائیں۔

پانچواں طریقہ:۔ سامان تعیش کے اخراجات اور حصول پر سخت کنٹرول، زندگی کو سادگی سے گزارنے پر زور اور فاضلات کو ایسے کاموں اور ایسی اشیاء کی تیاری پر لگایا جائے جس سے عوام کو روزگار ملے، غریبی دور ہو اور عام ثقافتی ذوق کو پروان چڑھانے میں مدد ملے۔ کالے دھن والی معیشت غیر مبنی بر انصاف اور معاشی نظام کی دلیل ہے۔

چھٹا طریقہ:۔ سیاسی عوامل کے تحت امیر اور غریب کے غیر مساوی نفعوں اور آسائشوں میں پائے جانے والے فرق کو دور کرنا۔ اس سلسلے میں سیکٹر وار اور سیاسی سطح پر بہت سی اصلاحات ضروری ہیں۔ آئین میں سیاسی پارٹیوں کے تسلیم کئے جانے کے طریق کار کے ساتھ ساتھ انھیں میٹنگ کرنے، پوسٹر چھپوانے اور انتخابی مینی فیسٹو شائع کرانے، ذرائع ابلاغ سے مواقع فراہم کرنے، ووٹنگ مشین کے استعمال سے بہرہ ور کرنے وغیرہ کی صورت میں بہت سی سہولتیں فراہم کرنی چاہئیں۔ اس کے ساتھ ہی انفرادی اور پارٹی کے وسائل کے ان مقاصد کے استعمال پر پابندی لگائی جانی چاہیئے۔ ان مقاصد کی تکمیل سرکار کے ذریعے ہونی چاہیئے۔ ان اصلاحات کی منطقی توسیع نمائندگی کے متناسب نظام کی شکل میں عمل میں آنی چاہیئے۔ سیاسی پارٹیوں کے کھاتے ضابطے کے تحت لازماً دیکھے جانے چاہئیں اور کمپنیوں اور کوآپریٹو اداروں کی طرح سے ہی سیاسی پارٹیوں کی اندرونی جمہوری کارکردگی قانون کے ذریعے سے ہی یقینی بنادی جانی چاہیئے۔

ساتواں طریقہ:۔ ضابطوں کو سہل بنانا، ایک ہی جگہ پر مختلف کاموں کی انجام دہی کا نظام فائلوں وغیرہ کا وقت مقررہ کے اندر نپٹان، آسان اور فوری انصاف، حفاظتی ضابطوں سے آزاد اور عام نوعیت کے فائلوں کی عوام کے ذریعے جانچ، نیز سرکاری ملازموں اور سیاستدانوں کو ضمیر کی آواز پر کام کرنے کی تربیت سے بھی بدعنوانی رُک سکتی ہے اور کالے دھن کو ختم کیا جاسکتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ اقدامات دُور رس نوعیت کے حامل ہو سکتے ہیں لیکن اُمید کی جاتی ہے کہ جرأت مندانہ اور سائنسی اندازِ نظر پر مبنی پیش قدمیاں آج کی سب سے بڑی ضرورت ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس دوڑ میں ہم پیچھے رہ جائیں۔

★

غزل

حیات لکھنوی

ذات کا آسیب ہر منظر بدلتا جائے گا
مَیں جدھر جاؤں گا کوئی ساتھ چلتا جائے گا

کیا عجب وابستگی ہے خواہشوں کے دشت سے
جو بھی جائے گا کفِ افسوس ملتا جائے گا

روشنی دن کی کوئی منظر سجا سکتی نہیں
رات کی پرچھائیوں سے دل بہلتا جائے گا

کام آجائے گی لفظوں کی حرارت ایک دن
موم کی صورت کوئی پتھر پگھلتا جائے گا

چہرا چہرا مسکراؤں گا مَیں سب کے واسطے
لمحہ لمحہ مجھ میں کوئی شخص جلتا جائے گا

چار سُو اٹھتی ہوئی نظریں ٹھہرتی جائیں گی
کوئی پیکر ساحری آنکھوں میں ڈھلتا جائے گا

آج گزرا ہے جہاں سے ٹھوکریں کھاتا حیاتؔ
کل انہی دشوار راہوں سے سنبھلتا جائے گا

★

ڈاکٹر راجے چھالیہ

ایک مذاکرہ

سرکار اپنا فرض ادا کر رہی ہے

اس حقیقت کو سب جانتے ہیں کہ کالے دھن کی پیداوار اور جائز و ناجائز مقاصد کے لیے اس کا استعمال ہندوستانی معیشت میں غیر معمولی طور پر بڑھ گیا ہے۔ اس کی وجہ سے سرکار کو آمدنی کا بڑا نقصان ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے سبب معیشت کے لیے وسائل کی تخصیص کا نظام بگڑ جاتا ہے۔ اس سے رقومات کا استعمال غلط طور پر ہوتا ہے اور فضول خرچی کو بڑھاوا ملتا ہے۔ کالے دھن کمانے کا بڑا ذریعہ ٹیکسوں کی چوری ہے۔ اس سے ٹیکس دہندگان میں بڑے پیمانے پر عدم توازن پیدا ہوتا ہے اس کی وجہ بے ایمانی سے ٹیکسوں کی ادائیگی کو روکنے والوں اور ایمانداری سے ٹیکس ادا کرنے والوں یا ان لوگوں کے درمیان جو کہ ٹیکس کی ادائیگی کو روک نہیں سکتے، بڑا فرق دیکھنے کو ملتا ہے۔

سرکار کو اب اس مسئلہ کی شدت کا احساس ہو چلا ہے۔ کالے دھن کے خطرے سے نپٹنے کے لیے دو طرفہ حکمت عملی اپنانی ہوگی۔ سب سے پہلے کالے دھن کی پیداوار کے بڑے اسباب کو اس حد تک دور کیا جانا چاہیئے جو کہ سرکار کی گرفت میں آ سکتے ہیں۔ اس کے لیے کچھ ایسے عملی کنٹرول اٹھا لینے ہوں گے جن کا تعلق کالا دھن پیدا کرنے سے ہے، اور ٹیکسوں کی ادائیگی کے لیے شرحوں کو معقول بنانا ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی انتظامیہ کو بہتر بنانا ہوگا اور افسروں کے اخلاقی معیار کو بلند کرنا ہوگا۔ قوانین کو مکمل طور پر نافذ کرنے کے لیے بھی کچھ اقدامات ضروری ہیں، ان اقدامات سے سرکار کو کچھ دنوں میں فائدے ہو سکتے ہیں اور کالے دھن کو ایک حد تک کم کیا جا سکتا ہے پھر بھی یہ کام کرنے کے لیے ایک معقول عرصہ درکار ہوگا۔ (ق)

رحمٰن حمیدی

وٹامن اے

وٹامن ایک حیاتیاتی مادہ ہے جس میں زبردست نامیاتی قوت پائی جاتی ہے۔ ہر انسان اور حیوان کے لیے نباتات کے ذریعہ وٹامن کا حاصل کرنا نہایت ضروری ہے اور کوئی بھی جاندار اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ سمندر اور دریاؤں میں مچھلیاں سمندری گھاس سے غذا حاصل کرتی ہیں جس میں وٹامن پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ مچھلیوں کے جگر میں وٹامن اے کا خاصا ذخیرہ ہو جاتا ہے اس لیے مچھلی کے جگر سے تیل نکالا جاتا ہے۔ اس میں وٹامن اے کافی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ وٹامن اے نمو، نسل، رضاعت اور جسم کے ہر قسم کے حیات کی حفاظت کے لیے لازمی ہے جبکہ شکرقند میں گندم اور چاول سے تین گنا اور آلو سے ایک گنا زیادہ نشاستہ کا مادہ پایا جاتا ہے اور مکئی سے ایک گنا زیادہ پروٹین اس میں پایا جاتا ہے۔ شکرقند بہت ہی مفید غذا ہے۔ اس میں وٹامن اے بہت کافی مقدار میں اور وٹامن سی بھی مناسب مقدار میں پایا جاتا ہے۔ ابلی ہوئی شکرقند میں بھی بھنی ہوئی شکرقند سے زیادہ وٹامن پایا جاتا ہے کیونکہ بھنی ہوئی شکرقند میں درجۂ حرارت کی زیادتی کے سبب وٹامن کا بہت بڑا حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔ بہت سے لوگوں کے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ سیب، انگور اور کیلے میں شکرقند، گاجر، پالک، ہری مرچ، سبز دھنیا، ٹماٹر، مکوہ، انڈہ اور مکھن کے مقابلہ میں بہت کم وٹامن پایا جاتا ہے۔ وٹامن کا تجربہ ایک خاص قسم کے چوہوں پر اس طرح کیا گیا کہ انھیں وٹامن اے کے علاوہ پوری غذا دی گئی۔ چوہوں پر اس کا اثر یہ ہوا کہ ان کی قوت نمو ختم ہو گئی اور اعضا پر اضمحلال کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ ان کے بال گرنے لگے، دانت ٹوٹنے لگے، ناک، کان گرم رہنے لگے اور آنکھوں کی سیاہی ختم ہو گئی اور ان کی آنکھیں سفید ہو گئیں۔ اس کے بعد وٹامن اے کا چوہوں کی غذا میں اضافہ کر دیا گیا تو ان میں نمو شروع ہو گئی بال گرنے بند ہو گئے، ناک اور کانوں کی گرمی زائل ہونے لگی اور آنکھوں کی پتلیاں جن میں سفیدی چھا گئی تھی، درست ہو گئیں۔

وٹامن اے کا اثر چھوٹے جانوروں کی نمو ہی تک محدود نہیں ہوتا بلکہ بڑے حیوانات اور انسانوں میں قوت تولید بھی اس سے متاثر ہوتی ہے۔ جن جانوروں کے استعمال میں وٹامن اے کم آتا ہے وہ رات کو اندھے ہو جاتے ہیں۔

آفاق صدیقی

مدھوکر گپت

روزگار بڑھانے کے پروگرام: صحیح سمت کی ضرورت

تمام منصوبوں کا مقصد غریبی اور بے روزگاری بشمولیت نیم روزگاری کو ختم کرنا بتایا گیا ہے۔ چھٹے پانسالہ منصوبے کا مقصد خطِ افلاس کے نیچے رہنے والی آبادی کو ۸۰-۱۹۷۹ء کی ۵۱ فیصد تعداد سے کم کرکے ۸۵-۱۹۸۴ میں ۳۰ فیصد کرنا اور ۹۵-۱۹۹۴ء میں ختم ہونے والے ۱۵ برس کی مدت میں ۱۰ فیصد سے بھی کم تر کرنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے چھٹے منصوبے میں عام علاقائی منصوبوں کے علاوہ بعض خصوصی پروگرام بھی شروع کئے گئے تھے۔ ان میں سے بعض قابلِ ذکر پروگرام درج ذیل ہیں۔

مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام

جس کا مقصد چیدہ غریب کنبوں کو پیداواری اشیاء فراہم کرنا ہے اور قومی دیہی روزگار پروگرام" جس کا مقصد دیہی علاقوں میں مستقل اہمیت کی تعمیرات کے لیے عام تعمیراتی کام کے ذریعے دیہی غریبوں کو زائد روزگار کے ذرائع مہیا کرنا ہے۔ اس منصوبے کے دوران ہی محسوس کیا گیا کہ دیہی غریبوں سے جن میں بے زمین دیہی مزدور بھی شامل ہیں۔ براہِ راست رابطہ قائم کیا جائے خاص طور پر انہیں سودمند روزگار کے زائد مواقع دستیاب کرے۔ اس کے علاوہ ایک پروگرام ہے "بے زمین دیہاتیوں کے لیے روزگار کی گارنٹی کا پروگرام" جس کا مقصد ہے کم از کم ایک رکن کو ۱۰۰ دن کے لیے روزگار فراہم کرنا۔

گذشتہ تجربے کا جائزہ

اس حقیقت کا احساس بہت پہلے ہی ہو گیا تھا کہ یہ اندازہ کہ پیداوار میں بڑھتی ہوئی افرادی قوت کو کافی حد تک کھپا لیا جائے گا۔ حقیقی نتائج پر پورا نہیں اترا۔ لہٰذا وقتاً فوقتاً روزگار پیدا کرنے والے متعدد پروگرام عمل میں لائے گئے۔

۶۱-۱۹۶۰ کے آخری مرحلے میں " دیہی افرادی قوت پروگرام" شروع کیا گیا اور اس کے تحت ۶۵-۱۹۶۴ کے آخر تک ۱۰۰۰ حلقہ جاتی ترقیاتی بلاکوں کو لیا گیا۔ اس کا مقصد تیسرے منصوبے کے آخری برس تک کم از کم ۲۵ لاکھ اشخاص کو ہر برس ۱۰۰ دن کے لیے روزگار فراہم کرنا تھا۔ لیکن محدود وسائل کے باعث بنیادی طور پر مختص ۱۵۰ کروڑ روپے کے اخراجاتی منصوبے میں سے صرف ۲۰ فیصد سے کچھ زیادہ ہی فراہم کیا جا سکا اور ۶۹-۱۹۶۸ میں یہ پروگرام ختم ہو گیا۔

اس کے بعد ۱۹۷۱ میں تین برس کے لیے "دیہی روزگار کریش پروگرام" شروع کیا گیا جس کا سالانہ خرچ ۵۰ کروڑ روپے تھا۔ اس پروگرام کا مقصد ہر برس ملک کے ۳۵۰ ضلعوں میں سے ہر ایک ضلع میں ۱۰۰۰ لوگوں کو روزگار کے مواقع فراہم کرنا تھا۔ حالانکہ روزگار کے ایام محنت کی صورت میں نشانے کافی زیادہ تھے۔ (حقیقی روزگار کے ایام محنت کی تعداد ۳۱۵۰ لاکھ ۹۲ ہزار تھی جبکہ ہر برس ۳۰۰ دنوں کی شرح سے بھی ۳۱۵۰ لاکھ ایام محنت کی ضرورت تھی)۔ لیکن دراصل براہِ راست روزگار اور تعمیرات دونوں کی صورت میں یہ پایا گیا کہ اس کے فوائد غیر منظم طور پر بکھرے ہوئے تھے منصوبے کی صورت میں کمی کے باعث اور تعمیراتی پروگرام کے مستقل نہ ہونے کی وجہ سے۔

اس تجربے کو دیکھتے ہوئے محسوس کیا گیا کہ ملک کی بے روزگاری کی حالت پر ان منصوبوں کا براہِ راست اثر پڑ سکے، اس کے لیے زیادہ منصوبہ بند مساعی کی گئیں۔ لہٰذا نومبر ۱۹۷۲ میں ۱۵ حلقہ جاتی ترقیاتی بلاکوں میں ۳ برس کے لیے" دیہی روزگار کریش پروگرام" کے ساتھ ساتھ "رہنمایانہ" تیز رفتار دیہی ترقیاتی پروگرام" شروع کیا گیا۔ اس پروگرام کے مقاصد تھے۔ ہنرمند مزدوروں کے لیے زائد روزگار کے مواقع فراہم کرنا' ایسی تعمیرات اور ڈھانچوں کی تعمیر جس سے نئے اور مسلسل اہمیت کے روزگار کے مواقع میسر ہوں، علاقائی تعمیری پراجیکٹ کے ذریعے نئے ہنرمند کاریگر تیار کرنا اور ان سے بھی زیادہ اہم پروگرام تھا تنخواہ یافتہ مزدوروں کے لیے افرادی قوت کا بجٹ تیار کرانا تاکہ ملک کے دیگر حصوں کے لیے انجام کار ایک جامع پروگرام مرتب کیا جا سکے۔ اس پروگرام کا جائزہ لینے کے لیے اکتوبر ۱۹۷۴ میں ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی۔

تین برس بعد ۲۰ لاکھ ٹن فاضل اناج کے ذخائر کے پیشِ نظر یکم اپریل ۱۹۷۷ سے "کام کے بدلے اناج" پروگرام شروع کیا گیا۔ اس پروگرام کے تحت ۷۸-۱۹۷۷ سے ۸۰-۱۹۷۹ تک کی تین برس کی مدت میں کل ۷۰ کروڑ ۹۳ لاکھ ۲۳ ہزار ایام محنت کا روزگار دستیاب کرایا گیا اور کئی تعمیرات بھی عمل میں آئیں۔ ۸۰-۱۹۷۹ میں جب ملک زبردست خشک سالی کا شکار ہوا تو یہ پروگرام نہایت مقبول عام ثابت ہوا اور اسے دیہی روزگار اور ترقیات کے بہت بڑے وسیلے کے طور پر دیکھا گیا۔ لیکن

منصوبہ بندی کمیشن کی پروگرام سروے تنظیم کی طرف سے اس پروگرام کا جائزہ لیے جانے کے بعد اس کی بعض خامیوں کا پتہ چلا جس کے نتیجے میں اس پروگرام کو ازسرِ نو ترتیب دے کر اسے "قومی دیہی روزگار پروگرام" کے طور پر ۲ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو شروع کیا گیا اور اپریل ۱۹۸۱ سے یہ ایک باقاعدہ منصوبہ جاتی پروگرام بن گیا۔

گذشتہ تجربے سے سب سے زیادہ اہم سبق یہ ملا ہے کہ "دیہی افرادی قوت پروگرام" اور قومی دیہی روزگار پروگرام کے علاوہ دیگر تمام پروگرام عارضی بنیاد پر چلے اور حتیٰ کہ دیہی افرادی قوت پروگرام بھی محدود وسائل کے باعث اس حالت کو پہنچ گیا۔

دیہی روزگار پروگراموں کی ضرورت

ملک میں بہت بڑی تعداد میں بے روزگار لوگ ہیں اور بیشتر لوگ نیم روزگاری کا شکار ہیں۔ اسی لیے دیہی اقتصادی نظام کے موجودہ حالات میں ضمنی آمدنی دستیاب کرانے کے اقدام کے طور پر خصوصی روزگار پروگراموں کی واضح ضرورت ہے۔ لیکن گذشتہ تجربات کی بنا پر اس کا طریقہ یہ ہونا چاہیئے کہ ایک طویل المدتی پالیسی کی صورت میں ایسے پروگراموں کا مقصد ایک خاص سطح پر جینے والے لوگوں یا غریب طبقہ میں سے کسی ایک چھوٹے سے طبقے کو فائدہ پہنچانا ہونا چاہیئے۔ اس سطح پر وہ لوگ آئیں گے جن کے پاس کوئی بھی جائداد نہیں ہے اور جن کی محنت کی صلاحیت بھی کم ہے۔ ایسے مقصد کو بامعنی طور پر عملی صورت دینے کا ایک ہی طریقہ یہ ہے کہ ایسے کنبوں میں سے کم از کم ایک فرد کو سال میں ۹۰ دن سے لے کر ۱۰۰ دن تک کے روزگار کی گارنٹی دی جاتے۔ ساتویں منصوبے میں ایسے کنبوں کے بارے میں سنجیدگی سے غور کیا جانا چاہیئے۔

قومی دیہی روزگار پروگرام کا جائزہ

قومی دیہی روزگار پروگرام کے تحت اخراجات کے اہتمام نیز استعمال اور دستیاب کرائے گئے روزگار کی صورت میں اب تک ہوئی پیش رفت ذیل کے گوشوارہ میں دکھائی گئی ہے۔

تعمیرات کی ضرورت پر زور دینے سے مزدوری اور سامان کی قیمت کے تناسب میں ۵۰:۵۰ کے اخراجات کا اہتمام کیا گیا تھا۔

برس	کروڑوں روپوں میں			کروڑ ایام محنت
	برس کے دوران جاری کی گئی رقم	کل دستیاب وسائل گذشتہ باقیات بشمول رقم	استعمال میں لائی گئی رقم	دستیاب کرائے گئے روزگار
۱۹۸۰-۸۱	۳۱۶٫۲۸	۴۴۲٫۳۲	۲۱۷٫۵۳	۴۱٫۳۵۸
۱۹۸۱-۸۲	۳۳۳٫۵۸	۴۶۱٫۸۷	۳۱۹٫۴۸	۳۵٫۴۵۷
۱۹۸۲-۸۳	۳۹۹٫۲۳	۵۴۱٫۹۳	۳۷۸٫۲۰	۳۵٫۵۱۰
۱۹۸۳-۸۴	۴۰۰٫۰۰	۵۱۳٫۴۹	۳۹۰٫۰۲	۳۰٫۲۰۲
۱۹۸۴-۸۵	۴۹۰٫۰۰[1]	.. ...	.. ...	.. ...

[1] ۱۹۸۴-۸۵ کے لیے طے شدہ رقم

روزگار دستیاب کرانا

مزدوری کی شرح میں اضافے اور تعمیری سامان کی متواتر بڑھتی ہوئی قیمتوں کے باعث روزگار میں لگاتار کمی ہو رہی ہے۔ تاہم نئے روزگار کے مواقع فراہم کرانے کے لیے مقررہ نشانوں کو برابر حاصل کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ جن لوگوں اور کنبوں کو روزگار مہیا کیا گیا اُن کی تعداد اور طبقے کے بارے میں کوئی اعداد دستیاب نہیں ہیں لہٰذا پروگرام کے تمام تر نتائج کا جائزہ نہیں لیا جا سکا۔ یہ بہت بڑی خامی ہے جسے پہلے بتائے گئے طریقے کے مطابق مطلوبہ طبقے تک پہنچ کر اور اس کی صحیح نشاندہی کر کے پورا کیا جا سکتا ہے۔

تعمیرات میں کمی

۱۹۸۲-۸۳ء تک سماجی جنگل بانی، تحفظ اراضی اور آبپاشی کے چھوٹے موٹے کاموں میں بتدریج کمی ہوتی گئی ہے، جبکہ عمارتوں اور سڑکوں کی تعمیر میں تیزی آئی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ۱۹۸۰-۸۱ کے ابتدائی چھ مہینوں میں کام کے بدلے اناج پروگرام بھی لاگو تھا۔ جس میں تعمیراتی سرگرمیوں کا کوئی اہتمام نہیں تھا جبکہ اس میں مزدوری اور اراضی سے متعلق کاموں پر زور دیا گیا تھا۔ قومی دیہی روزگار کے پروگرام شروع ہونے پر اس کے ساتھ ہی ۱۹۸۳-۸۴ میں اس پر نظرِ ثانی کر کے ۵۰:۵۰ کا تناسب مقرر کیا گیا۔ اس لحاظ سے صورتِ حالات بہتر ہو جائے گی کیونکہ تعمیراتی سرگرمیاں مستقل بنا پر انجام دی جا سکیں گی۔ اگرچہ ریاستوں میں آبپاشی، سڑکوں، اسکولوں اور کنوؤں کی تعمیر میں کافی کام ہوا ہے۔ لیکن ابھی تک ان میں بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ اڑیسہ، بہار اور اتر پردیش میں بیشتر دیہات کو (حتیٰ کہ "کم از کم ضرورت کے پروگرام" کے محدود معیار والے ۱۵۰۰ اور اس سے زیادہ آبادی والے دیہات کو بھی) سڑکوں کے ذریعے جوڑا جانا باقی ہے اور چھٹے منصوبے کے نشانوں کے مطابق بھی اُن میں کمی آنے کا امکان ہے۔ اتر پردیش اور اڑیسہ میں اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس کے برعکس ان دو ریاستوں میں "قومی دیہی پروگرام" کے تحت ہی بالترتیب ۵۰۰۰ اور ۴۰۰۰ کلومیٹر سڑکوں کی تعمیر ہونے کی اطلاع ملی ہے تاہم ان ریاستوں میں ۳۰۰۰ اور ۱۸۰۰۰ دیہات ایسے ہیں جنہیں سڑکوں کے ذریعے نہ تو جوڑا جا سکا اور نہ ہی اُن پر توجہ دی جا سکی۔

سماجی جنگل بانی

سماجی جنگل بانی کے پروگرام کا جائزہ لینے پر ہمیں ایسی صورتِ حالات دکھائی دیتی ہے۔ سڑکوں کے

کاٹھ سے پیڑ لگانے کے پروگراموں کے علاوہ جو ہر جگہ معمول عام ہوتے ہیں، بعض ریاستوں میں چھوٹے اور بڑے کسانوں کو پودے تقسیم کرنے کے مقصد سے نرسری لگانے کے کام کو بھی پروگرام میں شامل کر لیا گیا اور بعض ریاستوں میں دیہات میں بھی پیڑ لگائے گئے ہیں اور قیمت یا جسمانی محنت کے معیار پر عمل نہیں کیا گیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ نہ صرف سرمایہ کی تخصیص میں تبدیلی کی گئی بلکہ خصوصاً مطلوبہ طبقے کے لیے طویل المدتی آمدنی اور روزگار کے بارے میں بھی کوئی موثر پالیسی اختیار نہیں کی گئی۔

تعمیراتی کام کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ تعمیرات کے عمل کی کوئی واضح صورت یا سمت نہیں ہے اور کوئی بھی شخص اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ اس پروگرام میں لاپرواہی اور ناقص طریقہ کار سے کام لیا گیا ہے۔

مجوزہ پروگرام

مذکورہ بالا جائزہ اور مجوزہ مقاصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے پروگرام کے تحت تعمیراتی کاموں کے جن بعض امکانات اور ترجیحات پر توجہ دی جانی چاہیے وہ درج ذیل ہیں:۔

۱۔ جہاں کہیں بھی قابل کاشت بیکار اراضی اور چھوٹی چھوٹی زمینیں ہیں، وہاں اُن کی ترقی کے لیے قدم اٹھائے جائیں اور اس عمل میں ان قطعات اراضی سے درحقیقت مستفید ہونے والے لوگوں کو روزگار بھی دستیاب کیا جائے جو بکھرے قطعات ہیں اُن کی جمع بندی کرکے بھی انھیں قابلِ کاشت بنایا جائے۔

۲۔ بیکار پڑے ہوئے پبلک تالابوں کی بڑے پیمانے پر مرمت کرکے انھیں امداد باہمی کی بنا پر مچھلی پالن کے لیے استعمال میں لایا جائے۔ اور اس میں مطلوبہ طبقوں کے لوگوں کو شامل کیا جائے۔

۳۔ سماجی جنگل بانی کے پروگراموں کو ایندھنی لکڑی کی کھیتی اور چراگاہوں یا چارے کی کھیتی کی صورت میں شروع کیا جائے۔ یہ کام اُن لوگوں کو دیا جائے جن کے پاس زمین نہیں ہے۔

۴۔ بے زمین اشخاص کے لیے مکانوں اور سبزی کی کاشت کے لیے چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی اور مشترکہ رہائشی پراجیکٹوں پر (باغ باغیچوں سمیت) غور کیا جائے۔

۵۔ کھیتی کے کاموں پر جن میں شیڈول ذاتوں اور منجھولے کسانوں کے نجی تالاب، کنوئیں اور نالیاں شامل ہو سکتی ہیں۔ اور منجھولے کسانوں کے تالابوں کے ترقیاتی کاموں پر خاص طور پر توجہ دی جائے۔

۶۔ چھوٹے چھوٹے تالاب اور بڑے بڑے آبرسانی کے منصوبوں کو اس شرط کے ساتھ شروع کیا جائے کہ اس پروگرام سے مستفید ہونے والے اُن لوگوں سے جو مطلوبہ طبقے میں نہیں آتے ایک مقررہ شرح پر رقم وصول کی جائے گی اور یہ وصول شدہ رقم ایک ایسے مقامی فنڈ میں جمع ہوگی جن سے علاقہ جاتی تعمیرات وغیرہ کا رکھ رکھاؤ اور دیکھ بھال کی جائے گی۔

۷۔ پہلے سڑکوں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ان کاموں کو ایک مقررہ وقت کے اندر مکمل کیا جائے اور اس میں "کم از کم ضرورت کے پروگرام" کے معیار پر سختی سے عمل کیا جائے اور مقامی ترجیحات کا خاص طور پر خیال رکھا جائے۔

۸۔ اس کے علاوہ اگر تعمیری کام شروع کیے جائیں تو ان میں بینکوں، اناج کے گوداموں، مطلوبہ طبقے کے لوگوں کے لیے کارخانوں، دکانوں اور کمزور طبقوں کے رہائشی علاقوں میں بازاروں کی تعمیر وغیرہ شامل ہونی چاہیے۔

۹۔ تمام ترقیاتی ضروریات کے تحت اسکولوں، پنچایت گھروں جیسی خالص سماجی و علاقہ جاتی قسم کی تعمیرات کو خصوصی روزگار اور پبلک تعمیرات کے پروگراموں کی نسبت کم اہمیت دی جانی چاہیے۔

بعض غور طلب امور

پروگرام کے نشانوں اور مجوزہ سمتوں کی مجوزہ نئی اصطلاح کا مقصد "خصوصی روزگار پروگراموں" کو محض پبلک تعمیرات پروگراموں کی صورت میں دیکھنے کے بجائے انھیں غریبی مٹانے کے پروگرام کا بڑا حصہ بنانا ہے۔

روزگار کے ضمن میں ان پروگراموں کو محض جزوی تصور کرنا ہی مناسب ہوگا اور ان سے یہ توقع کرنا فضول ہے کہ وہ براہِ راست غریبی کا انسداد کر سکیں گے۔

یہ کام تب تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ بلاک سطح پر رجسٹریشن اور تحقیق کرنے والے اداروں کو فروغ نہ دیا جائے۔ ان کے ذریعہ ہی ہمیں دیہی علاقوں میں روزگار سے متعلق ضروریات نیز بے روزگاری اور نیم روزگاری کی جانکاری مل سکتی ہے۔ اس امر کی اہمیت کو اُن دو اعداد کے فرق کی روشنی میں دیکھنا ہوگا۔ جن کے تحت ۱۹۸۰ میں بے روزگاروں کی تعداد کا اندازہ ۲ کروڑ، ۷ لاکھ ۴ ہزار لگایا گیا تھا جبکہ یہ کہا جا رہا تھا کہ ۳۳ کروڑ ۹۰ لاکھ افراد خطِ افلاس کے نیچے رہ رہے ہیں۔

علاوہ ازیں روزگار دستیاب کرانے کے لیے پراجیکٹوں کا انتخاب بھی احتیاط سے کرنا ہوگا۔ پنچایت یا گاؤں کو بنیاد بنا کر چھوٹے موٹے کام ہاتھ میں لینے کے رجحان سے بچنا ہوگا۔ جہاں کہیں ممکن ہو وہاں بلاک کی سطح پر ماسٹر پلان بنانا ہوگا۔ ★

شریمتی پریم اروڑہ

ترقی کے دور میں خواتین کا حصہ

ایک قانون کے تحت سماج و خواتین کی بہبود سے متعلق ایک الگ وزارت کا قیام وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کی اس خواہش کا مظہر ہے کہ وہ بھارتی خواتین کو ۲۱ویں صدی میں لیجانا چاہتے ہیں۔ بھارتی خواتین کو مرد طویل عرصے سے اپنے اچھے اور بُرے مقاصد کے لیے آلۂ کار بنا رہے ہیں۔ چند برس قبل نئی دلّی کے ایک روزنامے میں خبر شائع ہوئی تھی کہ ایک آدی باسی عورت، کملا کو چند سو روپیہ میں ایک اخباری نمائندے کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ اس خبر نے سنسنی پھیلا دی اور اس موضوع خیال، پر ایک فلم بھی تیار کی گئی۔ اخبارات میں عورتوں پر ستم توڑے جانے اور انھیں زندہ جلائے جانے کے بارے میں خبریں متواتر نمایاں طور پر شائع ہو رہی ہیں۔

متعدد عالموں، سیاستدانوں اور کمیٹیوں کی طرف سے خواتین کی حالتِ زار کو بہتر بنانے کے بارے میں مختلف تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ پارلیمنٹ نے ۱۹۷۵ میں ایک قرارداد کے ذریعے اُس وقت کی وزیر اعظم سے اپیل کی تھی کہ وہ "خصوصی قانونی اور انتظامی اقدامات" کا ایک ایسا جامع پروگرام شروع کریں جس کا مقصد حتی الامکان ان سماجی اور اقتصادی ناانصافیوں، معذوریوں اور امتیازی اقدامات کا سد باب کرنا ہو جن کا بھارتی خواتین متواتر شکار ہو رہی ہیں۔ [illegible] سے متعلق کمیٹی کی [illegible] بھی خواتین کی حالتِ زار کا ذکر کیا گیا تھا۔ اس کے بعد خواتین سے متعلق قومی منصوبہ عمل وجود میں آیا۔ قومی منصوبہ عمل خواتین کے بین الاقوامی سال سے متعلق قومی کمیٹی اور دیگر اصحاب کے روبرو رکھا گیا جنھوں نے ۱۷ فروری ۱۹۷۶ کو وزیر اعظم کی زیر صدارت میٹنگ میں شرکت کی تھی۔ اس میٹنگ میں ریاستی حکومتوں کے نمائندے اور بھارت سرکار کے محکموں اور وزارتوں کے نمائندے بھی شامل ہوئے تھے۔ قومی منصوبہ عمل کا مسودہ ایک جامع دستاویز ہے جس میں خواتین کی بہبود کے مسائل کا ضروری قانون سازانہ اقدامات اور ضروری انتظامیہ اقدامات کے پیشِ نظر بغور جائزہ لیا گیا ہے۔ ان میں تعلیم نسواں پر نظرِ ثانی، خواتین کے لیے روزگار کی پالیسیوں میں تبدیلی، خواتین کی صحت کی دیکھ بھال اور تغذیہ کی بہتری اور سماجی بہبود کے ایسے اقدامات شامل ہیں جو خواتین کی ترقی کے لیے درکار ہیں۔

قانون سازی سے متعلق اقدامات

قومی منصوبہ عمل کے مسودے میں سفارش کی گئی ہے کہ "موجودہ قوانین پر نظرِ ثانی کی جانی چاہیے تاکہ تمام فرقوں اور مذہبوں کی خواتین کے لیے مساوات اور سماجی انصاف کو یقینی بنایا جا سکے۔ جہاں اقلیتی گروپوں کے موجودہ شخصی قوانین میں ترامیم ضروری ہوں، وہاں ایسے اقلیتی گروپوں کے اندر تبدیلی کی خواہش پیدا کرنے کے لیے ابتدائی اقدامات کیے جانے چاہئیں۔ خواتین کو ان کے حقوق سے آگاہ کرنے کے لیے ایک زوردار مہم شروع کی جانی چاہیے اور تمام فرقوں میں ایک مشترکہ سول کوڈ کے لیے خواہش پیدا کی جائے جو ۱۹۸۵ء میں خواتین سے متعلق اقوام متحدہ کی دہائی کے اختتام سے پہلے پایۂ تکمیل کو پہنچ جانی چاہیے۔ اس قابلِ تعریف سفارش سے متعلق صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ اب تک کچھ نہیں کیا گیا کیونکہ مختلف اقلیتی گروپوں کے افراد کو ترغیب دینے کے معاملے میں بعض پیچیدگیاں شامل ہیں۔ قومی منصوبہ عمل میں خاندانی عدالتیں قائم کرنے کی بھی سفارش کی گئی ہے تاکہ تمام خاندانی مقدمات کو تیزی سے موثر طور پر نپٹایا جا سکے۔ یہ سفارش ابھی تک کاغذوں پر ہی ہے۔ اس حقیقت سے سب لوگ عام طور پر آشنا ہیں کہ موجودہ عدالتی نظام میں خواتین کو پورا پورا انصاف نہیں ملتا۔ اور اس سلسلے میں عدالتوں کی طرف سے دیے گئے فیصلوں کے خلاف خواتین کی بہبود سے متعلق نامور خاتون وکلا اور دیگر جماعتوں کی طرف سے احتجاج اور مظاہرے بھی کیے گئے ہیں۔

جہیز کی بدعت زوروں پر

قومی منصوبہ عمل کی ایک دوسری سفارش تھی جہیز کی بدعت کا انسداد۔ اس کے بارے میں ذرائع نشر و اشاعت کے ذریعے کافی پبلسٹی کی گئی ہے لیکن اس سے ابھی تک کافی ٹھوس نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ دراصل اس کے برعکس جہیز کی بدعت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے، جس کے نتیجے میں

لڑکیوں کے والدین کی زندگی اجیرن ہو رہی ہے۔ جہیز کے رواج کا صرف اُس صورت میں انسداد ہو سکتا ہے جب سماج کے افراد اسے ایک بُرائی تصور کریں اور عہد کریں کہ وہ نہ ہی جہیز لیں گے اور نہ ہی دیں گے۔ بلاشبہ اس کے بارے میں قانون موجود ہے، لیکن وہ زیادہ تر ایک کاغذی مشق بنا ہوا ہے۔

قومی منصوبہ عمل میں خصوصاً دیہی علاقوں میں صغر سنی کی شادی کے امتناعی قانون کی دفعات پر عمل درآمد کرنے اور صغر سنی کی شادیوں کے خلاف رائے عامہ بیدار کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ اخبارات میں اور خصوصاً دیہی علاقوں میں دُور درشن (ٹیلی ویژن) پر قدرے پروپیگنڈے کیا جا رہا ہے جس میں صغر سنی کی شادی کی حوصلہ شکنی کی جا رہی ہے۔

لیکن یہ ایک سماجی اصلاح کا معاملہ ہے جو صرف رفتہ رفتہ انجام پائے گا۔ تاہم شہری علاقوں میں خواتین کی شادی بڑی عمر میں ہو رہی ہے۔ اور بعض بڑے شہروں کے اخبارات میں ازدواجی اشتہارات پر نظر ڈالنے سے اس حقیقت کا انکشاف ہو رہا ہے کہ متوسط طبقہ اور اعلیٰ متوسط طبقہ کے کنبوں میں لڑکیوں کی شادی عام طور پر ۲۷ یا ۲۸ برس کی عمر میں ہو رہی ہے۔ بلاشبہ اس کا اثر پڑ کر رہے گا اور اس امر کا امکان ہے کہ ان کے ہاں بچے کم پیدا ہوں گے۔

کام پر مبنی تعلیم

تعلیمی شعبے میں کام سے لڑکیوں کی تعلیم کے خلاف پائے جانے والے تعصبات دُور ہو جائیں گے۔ یہ تعصبات ان خدشات سے سماجی مزاحمت کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں کہ تعلیم لڑکیوں کو روایات اور سماجی اقدار سے دُور لے جائے گی جس سے وہ اپنے امکانی شوہروں اور سسرال سے مطابقت پیدا نہیں کر سکیں گی۔ لہٰذا ہمیں اپنی تمام تر مساعی لڑکیوں میں ابتدائی تعلیم مقبول عام بنانے پر لگا دینی چاہیے۔ اور دیکھنا چاہیے کہ وہ تعلیم ادھوری نہیں چھوڑتیں۔ اس سلسلے میں مناسب ہوگا کہ لڑکیوں کو مڈل اسکول تعلیم کے دوران ہی کھانا بنانے، کپڑے سینے، کڑھائی اور بُنائی وغیرہ کی تربیت دی جائے تاکہ والدین کو لڑکیوں کو اسکول سے اٹھانے کا خیال ہی نہ آئے۔ دیہی علاقوں میں لڑکیوں کو کاشتکاری کی بھی تربیت دی جائے تاکہ وہ فصلوں کی بوآئی اور کٹائی کے وقت اپنے والدین کی مدد کر سکیں۔ لڑکیوں کو اس مرحلے میں امور خانہ داری، خاندانی زندگی کی تعلیم، تغذیہ اور شہریت کے حقوق و فرائض کے بارے میں بنیادی تربیت دی جائے۔

تعلیم نسواں میں پیش آنے والا ایک بڑا مسئلہ ہے کافی تعداد میں معلماؤں کی تلاش، اس شعبے کے دیگر مسائل ہیں:۔

۱۔ معلماؤں کے طور پر ملازمت کے لیے کافی تعداد میں تعلیم یافتہ خواتین کی کمی۔ ۲۔ جو خواتین ضروری قابلیتوں کی مالک ہیں اُن کے معاملے میں ضروری تربیت کا فقدان۔ ۳۔ خصوصاً بڑی عمر کو پہنچنے پر بھرتی کے لیے اُنہی معیاروں کے اطلاق کا مسئلہ۔ یہ بات عام جانی پہچانی ہے کہ شادی کے وقت یا بچوں کی پیدائش پر خواتین ملازمتیں چھوڑ دیتی ہیں تاکہ وہ بچوں کی دیکھ بھال کر سکیں۔ بعد ازاں آٹھ یا دس برس کے وقفہ کے بعد جب وہ پھر ملازمت کرنے کی پوزیشن میں ہوتی ہیں، انھیں صاف طور پر بتا دیا جاتا ہے کہ اب ملازمت میں داخلے کے لیے اُن کی عمر گذر چکی ہے۔ سماج اور حکومت کو کنبے اور بچوں کے بارے میں خواتین کی ذمہ داری کو تسلیم کرنا چاہیے اور تعلیم یافتہ خواتین کو معلمی میں دوبارہ لانے کے بارے میں قواعد کو نرم بنانا چاہیے۔ بلاشبہ خواتین کو خود یہ لڑائی لڑنی ہوگی اگر وہ اس سلسلے میں کامیابی حاصل کرنے کی متمنی ہیں۔

شہری لڑکیوں کے معاملے میں پالی ٹیکنک ہونے چاہئیں جو انھیں ایسی تربیتی سہولیات فراہم کریں جن سے وہ خود روزگار پا سکیں۔ دیہی علاقوں میں بھی خواتین کو تعلیم اس ڈھنگ سے دی جائے کہ وہ خود اعتمادی حاصل کر سکیں، اور خود روزگار بن سکیں تاکہ وہ آزادانہ طور پر سوچ بچار کر سکیں اور خود فیصلے کر سکیں۔

روزگار

ہمارے ملک میں خواتین کے کام دھندے روایتی طور پر فارموں، باغات اور کسی حد تک چھوٹی چھوٹی فیکٹریوں اور دیگر صنعتی اداروں تک محدود رہے ہیں۔ خواتین کو کم روزگار ملنے کے اسباب درج ذیل ہیں۔

۱۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خواتین کو ملازمتیں دینے سے مردوں کے لیے روزگار کے مواقع کم ہو جائیں گے جنھیں گھر میں روزی کمانے والا تصور کیا جاتا ہے۔

۲۔ روایتی طور پر کارکن خواتین کے تئیں رویہ موافقانہ نہیں پایا جاتا کیوں کہ اُن کا کردار محض ایک ماں کا اور ایک صاحب خانہ کا خیال کیا جاتا ہے۔

۳۔ آجر خواتین کے تئیں اس لیے تعصب رکھتے ہیں کیونکہ اُن کے خیال میں خواتین کے ہاتھ سے کم کام نکلتا ہے اور دوسرے اُن میں مستعدی بھی مقابلتہً کم ہوتی ہے۔

۴۔ یہ بات عام طور پر کہی جا سکتی ہے کہ خواتین کو تعلیمی قابلیت اور تربیتی مواقع کم ملتے ہیں۔

۵۔ خواتین کو کیریر کے بارے میں رہنمائی کے لیے معلومات حاصل کرنے میں مشکل پیش آتی ہے۔

۶۔ خواتین کو گھر کے کام کاج کی دیکھ بھال کرنے، بچوں کی پرورش کی ذمہ داریاں اٹھانے اور اس کے ساتھ ہی ملازمت کی ذمہ داریاں نبھانے میں مشکلات پیش آتی ہیں۔

خود روزگار

چوں کہ ملازمتوں کی تعداد نہایت محدود ہے اور اُن کے مواقع عموماً شہری اور نیم شہری علاقوں تک محدود ہیں۔ اس لیے ایسی کوششیں کی جانی چاہئیں جن سے چھوٹے قصبوں اور دیہی علاقوں میں خواتین کے لیے خود روزگاری کے

امکانات بڑھ جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی بڑے بڑے قصبوں اور شہروں میں کارکن خواتین کی چھوٹی سی تعداد کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ انھیں بھی خود روزگار کے مواقع فراہم کئے جانے چاہئیں دیہی خواتین کے لیے روزگار کے مواقع دیہی صنعتوں کو فروغ دے کر بڑھائے جاسکتے ہیں، جہاں وہ پہلے ہی بڑی تعداد میں کام کر رہی ہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ جہاں خواتین کی طرف سے آزادانہ طور پر کاروبار شروع کیا جائے وہاں بینکوں وغیرہ کو انھیں قرضہ دینے کے معاملے میں جانبداری سے کام نہیں لینا چاہیے۔ خاتون صنعت کاروں کو قرضوں، لائسنسوں، خام مال کے حصول اور مارکیٹنگ انتظامات میں امداد دی جانی چاہیے۔

حفظانِ صحت و تغذیہ

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نیم شہری اور دیہی علاقوں میں زچہ اور بچہ کی صحت کی دیکھ بھال کی سہولیات بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ زیادہ خطرہ والی حاملہ ماؤں کو قوت بخش غذا دی جائے اور لڑکیوں نیز حاملہ ماؤں کو اسکولوں، ہسپتالوں، ابتدائی صحتی مرکزوں کے ذریعہ قوت بخش غذاؤں اور صحت کے بارے میں جانکاری دی جائے۔ چھوٹے قصبوں اور دیہی علاقوں میں، خصوصاً پسماندہ اور قبائلی علاقوں میں خاندانی منصوبہ بندی کی سہولیات کو تقویت دینے کی بھی ضرورت ہے۔ چھوٹے قصبوں اور دیہی علاقوں میں اسقاطِ حمل کی طبی سہولیات بھی فراہم کی جانی چاہئیں۔

رضاکار اداروں کا فروغ

شہری گندی بستیوں، دیہات اور پسماندہ قبائلی علاقوں میں خاص طور پر رضاکار اداروں کو فروغ دیا جائے تاکہ وہ مصیبت زدہ خواتین کی مدد کرسکیں اور ایسی خواتین کی آبادکاری میں ہاتھ بٹاسکیں۔ قومی منصوبہ عمل کے مطابق ہر گاؤں میں مہلا منڈلوں کا قیام عمل میں لایا جائے تاکہ وہ سماجی اور اقتصادی بہبود کے لیے علاقائی سطح پر کام کرسکیں۔

خواتین کی ترقیات میں پیشقدمی

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خواتین کی حالت کو بہتر بنانے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ تاہم مرکزی اور ریاستی حکومتوں نیز دیگر رضاکار اداروں کی مساعی کی بدولت بھارت میں خواتین کی حالت میں نمایاں سدھار ہوا ہے۔

متوقع عمر جو ۱۹۵۱ میں ۷ء۳۱ برس تھی، وہ ۱۹۸۱ میں بڑھ کر ۷ء۵۰ فیصد ہوگئی۔ اسی طرح خواتین کی جنسی شرح کا مخالف رجحان پلٹ گیا ہے۔ یہ شرح ۱۹۷۱ میں کم ہوگئی جب ایک ہزار مرد کے مقابلے میں ۹۳۰ خواتین تھیں۔ ۱۹۸۱ میں ملکی آبادی میں ایک ہزار مرد کے مقابلے میں ۹۳۵ خواتین تھیں۔ اس کی وجہ حاملہ خواتین کو چھوت کے ٹیکے لگانے، حاملہ اور دودھ پلانے والی ماؤں کو ضمنی غذائیت فراہم کرنے اور روایاتی دائیوں کی تعداد بڑھانے جیسے پروگراموں کی کامیابی ہوسکتی ہے جس سے بچہ جننے کے وقت خواتین کی شرح موت کم ہوگئی ہے۔

تعلیم کے شعبے میں بھی خواتین نے ترقی کی ہے۔ ۸۱-۱۹۸۰ میں ختم ہونے والی دہائی کے دوران پہلی سے پانچویں جماعتوں میں بھرتی میں لڑکیوں کی سالانہ شرح افزائش ۸ء۲ فیصد تھی۔ اور چھٹی سے آٹھویں جماعتوں میں ۳ء۴ فیصد تھی۔ ۵۱-۱۹۵۰ میں پرائمری اسکولوں میں معلماؤں کی تعداد ۲۸ ہزار تھی جو ۸۰-۱۹۷۹ میں بڑھ کر ۳۲۰۰۰۰ ہوگئی۔ ۸۲-۱۹۸۱ میں یہ تعداد ۳۵۲۰۰۰ تک پہنچ گئی۔ اسی طرح ۵۱-۱۹۵۰ میں مڈل اسکولوں میں معلماؤں کی تعداد تقریباً ۱۳ ہزار تھی جو ۸۰-۱۹۷۹ میں بڑھ کر ۲۵۰۲۰۷ ہوگئی۔ ۸۲-۱۹۸۱ میں اس میں مزید اضافہ ہوا اور یہ تعداد ۲۶۶۶۲۳ تک پہنچ گئی۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ ۱۹۶۱ کے مقابلے میں ۱۹۷۱ میں کارکن خواتین کی تعداد میں بھاری کمی ہوئی۔ لیکن ۱۹۷۱ سے ۱۹۸۱ تک کی دہائی میں کارکن خواتین کی تعداد ۸۷ء۱۱ سے بڑھ کر ۱۴ء۴۳ فیصد ہوگئی۔ کارکن خواتین کی تعداد نہ صرف معلمی، طب اور نیم طبی پیشوں جیسے روایاتی سیکٹروں میں بڑھی ہے بلکہ غیر روایاتی سیکٹروں، جیسے الیکٹرانکس، اسمبلی ورک (آلات و مشینیں وغیرہ جوڑنے کا کام) اور کمپیوٹر پروگراموں میں بھی بڑھی ہے۔

مرکز نے ریاستی حکومتوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ خواتین کی ترقی کے لیے خصوصی محکمے قائم کریں اور خاتون صنعت کاروں کو قرضے، مالی امداد اور خصوصی تربیتی سہولیات فراہم کرنے کے معاملے میں اولیت دیں۔ یہ اقدام وزیراعظم شری راجیو گاندھی کی خواہش کے مطابق کیا گیا ہے۔ حال ہی میں خاتون صنعتکاروں کی ترقی سے متعلق ایک بین الاقوامی ورکشاپ کا انعقاد نئی دلی میں ہوا تھا جس میں ۱۴ ترقی پذیر ملکوں کی خاتون صنعتکاروں نے شرکت کی تھی۔ بھارت میں ایسی ورکشاپ کا انعقاد اس امر کا مظہر ہے کہ اس ملک کی خواتین اب تیزی سے صنعتی میدان میں آتر رہی ہیں اور اپنی بہترین صلاحیت کا اظہار کر رہی ہیں۔

گو یہ تمام باتیں مسرت انگیز ہیں تاہم ایک بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ خواتین کو اپنی ترقی کے لیے اب خود میدان میں آنا ہوگا۔

بقیہ: وٹامن اے

وٹامن اے کے زیادہ مقدار میں استعمال سے انسان اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا ہے۔ اس کی ایک اچھی مثال یہ ہے کہ جب ہم اچانک سینما ہال میں اندھیرے میں داخل ہوتے ہیں تو تھوڑی دیر کچھ نہیں دیکھ سکتے پھر فوراً آنکھیں روشن ہوجاتی ہیں۔ جدید تحقیقات سے وٹامن اے کی اہمیت بہت بڑھ گئی اور اس کا استعمال مختلف طریقوں سے بہت زیادہ ہونے لگا ہے۔ وٹامن اے جسم کی تمام جھلیوں کی حفاظت اور سلامتی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اس کے عدم استعمال سے جھلیاں کمزور ہوجاتی ہیں اور ان کی تقویم میں ضرر رساں عوامل کے پیدا ہونے کی وجہ سے کمی آجاتی ہے۔ سانس لینے کی نالی میں جراثیم جگہ کرلیتے ہیں اور نزلہ و زکام کی تحریک اور پھیپھڑوں میں سوزش شروع ہوجاتی ہے۔

اترپردیش	۲۱	۳۸	۰٫۴۹
دوسرے صوبے	۲۸	۲۱	۰٫۲۷
میزان	۸۰۷۹	۷۲۹۰	۹۹٫۹۲

اور کرناٹک ملک کی ۵۵ فیصد سے زیادہ کپاس پیدا کرتے ہیں۔ شمالی ہند میں کپاس پیدا کرنے والی اہم ریاستیں یو۔ پی کے نصف مغرب سے جنوبی پنجاب تک پھیلا ہے۔ اس کے علاوہ تامل ناڈو، راجستھان، آندھرا پردیش، ہریانہ وغیرہ صوبوں میں کپاس کی پیداوار قابلِ ذکر ہے۔ مہاراشٹر میں دھولیا، اورنگ آباد، ناگ پور، احمد نگر، ناسک، شولاپور اور پربھنی وغیرہ ضلعے کپاس کی پیداوار کے لیے اہم ہیں۔ یہاں کپاس کی فی ہیکٹر پیداوار کم ہے۔ ہندوستان کی ۲۲ فیصد کپاس مہاراشٹر میں پیدا ہوتی ہے۔ گجرات میں احمدآباد، بھروچ، بڑودا، پنچ محل اور خان دیش وغیرہ ضلعوں میں کپاس زیادہ پیدا ہوتی ہے۔ گجرات میں کپاس کی فی ہیکٹر پیداوار ۱۵۶ کلوگرام ہے۔ یہاں ملک کی ۲۳ فیصد کپاس پیدا کی جاتی ہے۔ پنجاب کپاس پیدا کرنے والے اہم صوبوں میں سے ایک ہے جہاں ہندوستان کی ۱۲ فیصد کپاس پیدا ہوتی ہے۔ پنجاب کی کپاس بڑھیا اور لمبے ریشے والی ہوتی ہے۔ کرناٹک میں ملک کی تقریباً ۹ فیصد کپاس پیدا کی جاتی ہے۔ ہریانہ میں ملک کی ۸ فیصد، راجستھان میں ۶ فیصد اور آندھرا پردیش میں ۵ فیصد کپاس پیدا ہوتی ہے۔ جس کی تفصیل مندرجہ ذیل جدول سے واضح ہے:۔

کپاس کی عالمی تجارت

بین الاقوامی تجارت میں خام کپاس کو ایک اہم مقام حاصل ہے پوری دنیا میں کپاس کی کل پیداوار کا تقریباً ۳۰ فیصد برآمد کردیا جاتا ہے۔ مصنوعی ریشے کے استعمال کی وجہ سے اس کی برآمد میں کچھ کمی واقع ہوئی ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ دنیا میں کپاس کا سب سے بڑا برآمدکار ملک ہے اور ایک اندازے کے مطابق کپاس کی عالمی برآمد کا تقریباً ۳۴ فیصد صرف امریکہ برآمد کرتا ہے۔ سوویت روس کپاس کا دوسرا اہم برآمد کار ملک ہے۔ خام کپاس برآمد کرنے والے دوسرے ممالک میں مصر، برازیل، میکسیکو، یوگانڈا، تنزانیہ، سوڈان اور پاکستان وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ خام کپاس درآمد کرنے والے ملکوں میں یوروپی ممالک اور جاپان شامل ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے ہندوستان سے بہت زیادہ کپاس دوسرے ملکوں کو برآمد کی جاتی تھی۔ مگر بٹوارے کے بعد ہندوستان لمبے ریشے کی کپاس درآمد کرنے والا اہم ملک بن گیا۔

پھر بھی بھارت کی چھوٹے ریشے والی کپاس کی مانگ ریاستہائے متحدہ امریکہ اور جاپان میں بہت ہے جہاں اس کو اون کے ساتھ ملاکر موٹے کپڑے اور کمبل بنائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں لمبے ریشے والی کپاس ریاستہائے متحدہ امریکہ، مصر اور سوڈان وغیرہ ممالک شامل ہیں۔ ★

ہندوستان میں کپاس کے تحت رقبہ پیداوار (۱۹۸۰ء)

صوبے	رقبہ ہزار ہیکٹر میں	پیداوار۔ ہزار گانٹھوں میں	ملک کی پیداوار کا فیصد
مہاراشٹر	۲۵۸۸	۱۶۹۶	۲۲٫۰۵
گجرات	۱۷۱۷	۱۷۸۵	۲۳٫۲۱
کرناٹک	۹۸۵	۷۰۶	۹٫۱۸
مدھیہ پردیش	۶۷۰	۲۶۴	۳٫۴۳
پنجاب	۶۳۶	۱۲۲۱	۱۵٫۸۷
آندھرا پردیش	۴۰۸	۴۲۱	۵٫۴۷
راجستھان	۳۸۷	۴۷۹	۶٫۲۲
تامل ناڈو	۳۰۴	۴۶۹	۶٫۰۹
ہریانہ	۳۱۷	۵۹۰	۷٫۶۷

یوجنا، نئی دہلی

گلابوں کا وطن

ریاض اختر

طوفانوں کا مسکن نہ سرابوں کا وطن ہے
یہ ارضِ مقدس تو شبابوں کا وطن ہے
سرمدنے یہیں جام پیے بادۂ حق کے
عرفانِ محبت کی شرابوں کا وطن ہے
پیغام یہی ہر ورقِ گُل پہ ہے تحریر
اے علم کے طالب یہ کتابوں کا وطن ہے
یہ حسنِ خود آرا کی حسیں بزم ہے یارو
یہ عیشِ انا سوز کے خوابوں کا وطن ہے
خوشبو سے شب و روز معطر ہیں یہاں کے
یہ روزِ ازل ہی سے گلابوں کا وطن ہے
ہر چہرۂ نورانی پہ چلمن ہے حیا کی
یہ لیلیِ اُلفت کی نقابوں کا وطن ہے
جڑے ہیں محبت کے گُہر جن سے مسلسل
یہ ایسے جواں بخت سحابوں کا وطن ہے
قدرت کا سنوارا ہوا شہکار یہی ہے
جنت جسے کہتے ہیں وہ گلزار یہی ہے

★

عالمی پیداوار

پودوں کے بڑھنے کے وقت زیادہ بارش کی ضرورت پڑتی ہے مگر لگاتار بارش پودوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔ ژالہ باری بھی کپاس کے پودوں کے لیے مضر ہے۔

کپاس کی فصل مختلف قسم کی مٹیوں میں سطح سمندر سے تین ہزار دو سو فٹ بلندی تک اُگائی جا سکتی ہے۔ گہری کالی اور چونے کی آمیزش والی مٹی میں یہ فصل خوب بڑھتی، پھلتی اور پھولتی ہے۔ دریاؤں کی بچھائی ہوئی باریک مٹی اور لاوے والی مٹی کپاس کی کھیتی کے لیے مثالی مٹی کہی جاتی ہے۔ ایسی کالی مٹی جس میں نمی جذب کرنے کی صلاحیت موجود ہو کپاس کے لیے موزوں ہوتی ہے۔ کم زرخیز زمین میں فاسفورس، نائٹروجن، چونا، پوٹاشس اور اچھے قسم کی کھاد ڈال کر کپاس کی کاشت کی جا سکتی ہے۔ عام طور سے ہندوستان میں تین قسم کی مٹیوں میں کپاس کی کھیتی کی جاتی ہے۔

۱۔ بھاری کالی دومٹ مٹی۔ اس طرح کی مٹی گجرات اور مہاراشٹر میں پائی جاتی ہے۔ ہندوستان کا اہم ترین کپاس کا علاقہ بھروچ، احمد آباد، خان دیش وغیرہ ضلعوں میں پھیلا ہے جہاں بھاری کالی دومٹ مٹی پائی جاتی ہے۔

۲۔ لال اور کالی چٹان مٹی:۔ ایسی مٹی دکن، برار اور مالوہ کے پٹھار میں پائی جاتی ہے۔ ۳۔ گنگا کی باریک مٹی یا کچھاری والے علاقے:۔ ایسی مٹی پنجاب، ہریانہ اور مغربی اتر پردیش میں پائی جاتی ہے۔ اس مٹی میں کپاس کی فی ہیکٹر پیداوار بہت زیادہ ہے۔

۱۹۸۰ء میں دنیا کی کپاس کی کل پیداوار ۱۳٫۵ ملین میٹرک ٹن تھی۔ کپاس پیدا کرنے والے اہم ممالک ۳۵ درجہ شمالی اور ۲۰ درجہ جنوبی عرض البلد کے درمیان واقع ہیں، حالانکہ روس میں ۴۰ درجہ شمالی طول البلد اور ارجنٹینا میں ۲۸ درجہ طول البلد میں بھی کپاس کی کاشت کی جاتی ہے۔ یہ فصل دنیا کے تقریباً ۷۰ ملکوں میں پیدا کی جاتی ہے۔ کپاس کی کھیتی سوویت روس، ریاستہائے متحدہ امریکہ، چین، بھارت، پاکستان، مصر، ٹرکی، برازیل، سوڈان، میکسیکو اور پیرو جیسے ممالک میں خاص طور سے بڑے پیمانے پر کی جاتی ہے یہ ممالک کپاس کی عالمی پیداوار کا اسّی فیصد سے زیادہ پیدا کرتے ہیں۔ جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:۔

خاص ملکوں میں کپاس کی پیداوار ۱۹۸۰ء

ممالک	پیداوار لاکھ میٹرک ٹن	عالمی پیداوار کا فیصد
سوویت روس	۲۸	۲۰٫۷۴
ریاستہائے متحدہ امریکہ	۲۴	۱۷٫۷۷
چین	۲۳	۱۷٫۰۳
ہندوستان	۱۳	۹٫۶۲
پاکستان	۶	۷٫۴۴
ٹرکی	۵	۳٫۷۰
مصر	۴	۲٫۹۶
برازیل	۴	۲٫۹۶
سوڈان	۳	۲٫۲۲
میکسیکو	۲	۱٫۴۸

کپاس کی فی ہیکٹر پیداوار دنیا کے سبھی ملکوں میں مختلف ہے۔ فی ہیکٹر سب سے زیادہ کپاس پیدا کرنے والا ملک مصر ہے۔ اس کے علاوہ فی ہیکٹر زیادہ کپاس پیدا کرنے والے ممالک سوویت روس، پیرو، میکسیکو، ریاستہائے متحدہ امریکہ، سوڈان وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ہندوستان اور چین میں کپاس کی فی ہیکٹر پیداوار بہت کم ہے جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:۔

دنیا کے منتخب خاص ملکوں میں کپاس کی پیداوار

ممالک	فی ہیکٹر ۔ کلوگرام میں
مصر	۶۲۰
پیرو	[illegible]
میکسیکو	۴۳۰
سوویت روس	۴۱۰
ریاستہائے متحدہ امریکہ	۲۷۰
پاکستان	۲۲۰
برازیل	۱۹۵
بھارت اور چین	۱۶۰

ہندوستان کو کپاس کی پیداوار میں عالمی سطح پر چوتھا مقام حاصل ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے ہندوستان کو کپاس کی پیداوار میں عالمی سطح پر دوسرا مقام حاصل تھا۔ کپاس پیدا کرنے والے اہم ترین علاقے پاکستان میں چلے گئے۔ ۱۹۵۰-۵۱ء میں ملک کی کپاس کی کل پیداوار ۳٫۰ ملین گانٹھ تھی جبکہ ۱۹۸۲-۸۳ میں یہی پیداوار بڑھ کر ۷٫۷۰ ملین گانٹھ ہو گئی۔ اس طرح گذشتہ تیس سالوں میں کپاس کی پیداوار میں ۱۵۲ فیصد اضافہ ہوا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل جدول سے ظاہر ہوتا ہے۔

ہندوستان میں کپاس کی پیداوار

سال	پیداوار ۔ ہزار گانٹھوں میں
۱۹۵۰-۵۱	۳٫۰۰
۱۹۶۰-۶۱	۵٫۶۰
۱۹۷۰-۷۱	۴٫۷۶
۱۹۸۰-۸۱	۷٫۰۱
۱۹۸۲-۸۳	۷٫۷۰

ہندوستان میں کپاس کے اہم ترین علاقے

ہندوستان میں کپاس کی کاشت کا علاقہ بہت زیادہ بکھرا ہوا ہے۔ ان علاقوں میں مختلف آب و ہوا اور مٹیاں پائی جاتی ہیں اس لیے ہر ایک علاقہ کی کپاس دوسرے علاقوں سے مختلف ہوتی ہے۔ زیادہ تر کپاس دکن پٹھار کی کالی مٹی والے علاقوں میں پیدا کی جاتی ہے۔ گجرات، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش

(باقی صفحہ [illegible] پر)

Regd. No. [illegible]
R.N. 97052/81

[illegible] U(DN) 65 to post without pre-payment
[illegible] Lines Post Office, Delhi-110 054

Vol. 5 No. 4 TO 16-31 May. 1985

انوار انصاری

قومی اقتصادیات میں گھریلو صنعت کی اہمیت

یہ امر ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قومی اقتصادیات میں گھریلو صنعت کا ایک اہم مقام ہے۔ کوئی بھی ملک اس وقت تک خوشحالی کے زینے پر نہیں پہونچ سکتا ہے جب تک اس ملک میں گھریلو صنعت کا جال نہ بچھ جائے۔ مختلف ماہرین نے گھریلو صنعت کی تعریف مختلف طریقوں سے کی ہے۔ گھریلو صنعت کے ایک ماہر کا کہنا ہے کہ جو صنعت چھوٹے پیمانے پر مزدوروں کے گھروں میں کم سرمایہ لگا کر چلائی جائے اور جو مخصوص حلقے کی ضرورتوں کو پورا کرے اسے ہم گھریلو صنعت کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔ مگر یو۔پی کی انڈسٹریل کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں بتایا ہے کہ جو صنعت چھوٹے پیمانے پر چھوٹے کارخانے کی شکل میں دس بیس مزدوروں کی مدد سے چلائی جائے اور اس میں پاور کا استعمال نہ ہوتا ہو اسے گھریلو صنعت کہا جائے۔ مگر شری وشوناتھن نے گھریلو صنعت کی جامع تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "گھریلو صنعت ہم اسی کو کہیں گے جہاں ۹ سے کم مزدور بحال نہ ہوں اور وہ اپنا کام آزاد ہوکر یا کسی کے ماتحت گاؤں یا شہر میں چھوٹے کارخانے میں اپنا کام انجام دیں اور ان کے کارخانے کی مانگ نہ صرف مقامی ہو بلکہ باہر بھی ہو۔

اگرچہ ہمارا ملک ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے جہاں اسّی فیصد انسان کھیتی پر بسراوقات کرتے ہیں اب کھیتی کے نمایاں ترقی کر جانے کی وجہ سے ہمارا ملک اناج کے معاملے میں خود کفیل ہو گیا ہے، مگر پلاننگ کمیشن کی ایک رپورٹ میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ ۱۹۸۲ تک ہندوستان کے لوگ کھیتی پر بھروسہ کرنے والے یعنی کھیتی کی آمدنی سے بسراوقات کرنے والے صرف ۵۰ فیصد ہی ہیں اور ۲۶ فیصد انسان ایسے ہیں جو یا تو گھریلو صنعت میں لگے ہوئے ہیں یا کھیتی کے ساتھ ہی کچھ گھریلو کام انجام دے رہے ہیں اور اس سے اپنی گذر بسر کر رہے ہیں۔

ہندوستان کی موجودہ گھریلو صنعت ملک کی بڑی صنعتوں سے زیادہ اہم ہے۔ ڈاکٹر وی۔ کے۔ آر۔ وی۔ راؤ نے تحقیق کر کے پتہ لگایا ہے کہ بڑی صنعتوں میں ابھی ۴ کروڑ ۴۱ لاکھ ۸۲ ہزار انسان کام کر رہے ہیں برخلاف اس کے گھریلو صنعت میں ۸ کروڑ ۳۰ [illegible] ۳۲ ہزار انسان کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اس[illegible] پتہ چلتا ہے کہ گھریلو صنعت میں انسانوں کی [illegible]یت زیادہ ہے۔

تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ۴ کروڑ سے زائد انسان صرف کرگھے کی صنعت پر انحصار کرتے ہیں جن میں ۲ کروڑ انسان ایسے ہیں جو سال بھر تک مزے سے اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں۔ کرگھے کی صنعت ۲۵ سے ۳۰ فیصدی تک ملک کے کپڑوں کی ضرورت پورا کرتی ہے۔

ہندوستان جیسے عظیم اور آبادی سے بھرے ملک میں گھریلو صنعت ہی ایک ایسی صنعت ہے جو ملک کے بہتیرے انسانوں کو کام دلا سکتی ہے اور ملک کے معیار رہائش میں اضافہ کر سکتی ہے۔ بڑی بڑی صنعتیں یا بڑے بڑے کارخانے اس ملک کے لیے زیادہ مفید ہو سکتے ہیں جہاں کی آبادی کم ہو۔ مثلاً جرمنی، انگلینڈ، امریکہ وغیرہ۔ وہاں بڑی صنعتیں شان و شوکت اور حسن و خوبی سے قائم ہیں۔ اور اچھی طرح چل رہی ہیں۔

گھریلو صنعت کو ترقی دینے سے ملک کی بیشتر آبادی کام میں منہمک ہو جائے گی۔ "گھریلو صنعت" کے معاملے میں جاپان نے نمایاں اور امتیازی ترقی حاصل کی ہے۔ اس لیے ہندوستان کو بھی جاپان کے نقش قدم پر چلنا چاہیئے تاکہ ہندوستان سچ مچ عظیم ہو جائے اور یہاں کے لوگ خوشحال ہو جائیں۔

ملک کی معاشی بدحالی اور اقتصادی بحران کو دور کرنے کے لیے صوبائی اور مرکزی سرکار نے اب ہر جگہ انڈسٹریل کمپلکس کھول دیا ہے اور گھریلو صنعت کا ایک جال بچھا دیا ہے۔ ہر ضلع میں انڈسٹریل اسٹیٹ قائم کر دی گئی ہے اور چھوٹی چھوٹی یونٹوں کو چھوٹی صنعت قائم کرنے کے لیے حکومت نے زمین اور پیسہ بھی مہیا کیا ہے تاکہ ملک کی بے کاری ختم ہو، غربت دور بھاگے اور ملک کی آمدنی میں اضافہ ہو۔ حکومت کا یہ بہت ہی مستحسن قدم ہے اور وہ دن دور نہیں جب ملک کا بیشتر حصہ گھریلو صنعت سے پھر جائے گا اور ہمارا ہندوستان دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش کھڑا ہو جائے گا۔

دیہی نوجوانوں کو از خود روزگار کے لیے قومی سطح پر جو تربیتی اسکیم شروع کی گئی ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ ہر سال تقریباً دیہی نوجوانوں کو تربیت دے کر ان کی غریبی دور کی جائے، اس لحاظ سے گھریلو صنعتیں اور بھی زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہیں۔

یوجنا

یکم تا ۱۵ ؍ جون ۱۹۸۵ء

ایک روپیہ

گنگا کی کیسے صفائی کی جائے

(ڈاکٹر نیلے چوہدری)

خطِ افلاس کے نیچے

(ڈاکٹر ایم۔ ایل۔ گپت)

ڈاکٹر ایم۔ اسلم پرویز

انرجی کے متبادل وسائل

گذشتہ دہے میں انرجی کے متبادل
مسائل اس انداز میں سامنے آئے، جیساکہ وہ آج ہمارے
سامنے ہیں۔ ہوا یوں کہ ۱۹۷۳ کے آخر میں تیل کی
درآمد پر رکاوٹ لگ گئی۔ جس کے نتیجے میں تیل کی قیمتیں
آسمان کو چھونے لگیں۔ اس کے بعد یہ مسئلہ شدومد
سے سامنے آیا۔ بدقسمتی سے شروع ہی سے صنعتی طور
پر ترقی یافتہ شمالی ملکوں اور جنوب کے غریب اور
پسماندہ ملکوں میں تجارتی انرجی کے نظام کی بنیاد
زیادہ تر خام تیل کے استعمال پر ہی رہی ہے۔ اس کی
وجہ یہ بھی ہے کہ تیل وافر مقدار اور مناسب قیمتوں
میں ملتا رہا۔ ان کے استعمال اور فراہمی میں اس زمانے
میں کوئی خاص دشواری نہ تھی۔ اس کی قیمت بھی
واجب تھی، اور ایسی نہ تھی جو ادا نہ کی جا سکے۔ یہی
وجہ ہے کہ بہت سے ممالک خام تیل پر انحصار کرنے
لگے۔ چنانچہ اُن علاقوں میں جہاں کہ یہ انرجی کے
متبادل ذریعہ کے طور پر استعمال ہو سکتا تھا، تیل
سے ہی کام لیا جاتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انرجی کے
اس وسیلے سے حد سے زیادہ کام لیا گیا اور اسی پر
بڑی حد تک ہماری معیشت کا انحصار رہا۔
اس وجہ سے انرجی کے دیگر قابلِ تجدید اور
مقامی وسائل پر توجہ نہ دی جا سکی۔ تیل کی قیمتوں میں
اُچھال آنے سے ترقی پذیر ملکوں کے معاشی نظام
پر بے حد مضر اثرات پڑے اور وہ ممالک خاص طور
پر اس صورتِ حال سے متاثر ہوئے جو کہ تیل باہر
سے منگاتے ہیں۔ صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملکوں میں
مندے کے رجحانات رُونما ہونے سے ترقی پذیر ملکوں
کی معیشت اور زیادہ متاثر ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی
ان ملکوں کو غیر ملکی امداد بھی کم ہی ملی جس نے اس
صورتِ حال کو اور زیادہ سنگین بنا دیا۔ عالمی بینک
کی ۱۹۸۳ کی ترقیاتی رپورٹ کی روشنی میں ۱۹۸۲ء
میں ترقی پذیر ملکوں کے خسارے کا کھاتہ ۱۱۸ بلین ڈالر
تھا جو ۱۹۸۰ کے مقابلے میں دوگنا ہو گیا۔ یہ مجموعی
قومی پیداواری صلاحیت کے ۵ فیصد اور ان کی
برآمدات کے چوتھائی کے مساوی تھا۔ اس کے برعکس
۱۹۷۵ میں خسارہ مجموعی قومی پیداواری صلاحیت کے
۳ر۳ فیصد اور برآمدات کے ۱۷ر۵ فیصد کے
مساوی تھا۔ ہندوستان میں تیل کی موجودہ ضرورتوں کا
اندازہ ساڑھے تین کروڑ ٹن ہے۔ حالانکہ یہ اپنی
ضرورتوں کا ۶۵ فیصد حصہ اندرونِ ملک وسائل سے
ہی پورا کر لیتا ہے لیکن پھر بھی صرف باقی ۳۵ فیصد
کی درآمدات پر ۵ ہزار کروڑ روپے سالانہ خرچ
کرنے پڑتے ہیں۔ یہ رقم غیر ملکی زرِ مبادلہ کے طور پر
ادا کرنی پڑتی ہے۔ تیل کی قیمتوں میں اضافے کے
سبب عالمی معاشی نظام بری طرح مجروح ہوا ہے
تیل کے ذخائر گھٹتے جا رہے ہیں۔ لہٰذا مقامی وسائل
اور انرجی کے متبادل وسائل کی کھوج وقت کی
ضرورت ہے کیونکہ ان کے بغیر معاشی ترقی کا
استحکام ممکن نہیں۔
اس سلسلے کی پہلی کوشش کے طور پر تیل سے
ہٹ کر کوئلے کے استعمال کو مقبولِ عام بنانے کی
حمایت کی جاتی ہے۔ مختلف پلیٹ فارموں سے
مختلف ماہرین نے اس طریقِ کار کو اپنانے کے لیے
کہا ہے۔ چنانچہ معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے
موجودہ نظام اس تبدیلی کا پتہ دیتا ہے۔ عالمی صنعت
میں پیٹرولیم کا استعمال ۱۹۷۰ کے ۶۱ لاکھ ۲۰ ہزار میٹرک
ٹن سے گھٹ کر ۱۹۸۳ میں ۵۳ لاکھ ۱۰ ہزار ٹن رہ
گیا گویا کہ اس عرصے میں اس میں ۲۰ فیصد کمی آئی۔
اس کے برعکس دنیا میں کوئلے کی پیداوار ۱۹۷۳ء
اور ۱۹۷۹ء کے درمیانی عرصے میں ۳ر۱ فیصد بڑھی
اور اس کے بعد پانچ برسوں میں اس میں ۲ر۶ فیصد اضافہ ہوا۔
اس سلسلے میں یہ مطالعہ خالی از دلچسپی نہیں کہ موجودہ
اندازوں کی روشنی میں دنیا میں ۶۶۳ بلین میٹرک ٹن
کوئلہ ہے جو کہ کھپت کی موجودہ شرحوں کے حساب
سے ۲۴۰ سال تک کافی ہو سکتا ہے۔ اس وقت دنیا
میں کوئلے کے کل ذخیروں کا ۹۰ فیصد حصہ دس ملکوں
بشمول ہندوستان میں ہے۔ ۱۹۷۷ میں انرجی کے
وسائل سے متعلق جو عالمی کانفرنس ہوئی تھی، اس
میں کہا گیا ہے کہ اس وقت ۸۰ ممالک ایسے ہیں جہاں
کوئلے کے ذخیروں کی بازیافت اقتصادی طور پر مفید
ہو سکتی ہے۔ ہندوستان میں کوئلے کی تمام تر ضرورتیں
اندرونِ ملک وسائل سے ہی پوری کی جاتی ہیں۔
۱۹۸۲-۸۳ میں ہندوستان میں کوئلے کی کھپت
۱۳ کروڑ ۹ لاکھ دس ہزار ٹن تھی جب کہ ۱۹۷۰-۷۱
میں یہ صرف ۷ کروڑ ۲۹ لاکھ ۵۰ ہزار تھی۔

(باقی کور صفحہ ۲ پر)

اس شمارے میں

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر ۰ آر۔ ٹھکرال

ایڈیٹر ۰ لکھی رام رانا

اسسٹنٹ ایڈیٹر ۰ محمد عادل صدیقی

سب ایڈیٹر ۰ وسیم حیدر

جلد ۵	یکم تا ۱۵ جون ۱۹۸۵ء	شمارہ ۵

۱۱ تا ۲۵ جیشٹھ ۱۹۰۷ ٭ ٹیلیفون نمبر: ۶۰۱۸۱۸

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:-

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴ لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین) نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

بزنس منیجر: ایل۔ آر۔ بترہ ٭ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن): آر۔ ایس۔ منجال

ترسیلِ زر کا پتہ: بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

صحت ۔ قوم کی خوشحالی کی ضامن

ہماری زندگی کی آب و تاب صحت ہی سے ہے ۔ یہ دراصل ہماری سرگرمیوں کی کلید ہے قوم کی صحت افراد کی صحت پر منحصر ہے ۔ اس کے بغیر ہم زندگی کے کسی بھی شعبے میں کامیاب نہیں ہو سکتے ، ملک کی پائیدار ترقی اور با مقصد نظریات کا فروغ معاشرے کی صحت پر ہی انحصار رکھتا ہے ، اسی بنا پر سرکار کی اولین ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری یہ ہے کہ ملک کے عوام کی صحت بنانے کے لیے مناسب طور پر خدمات مہیا کرائے ۔ اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ سماج کے سبھی طبقوں کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ صحت کی اہمیت اور ضرورت کیا ہے ۔ اور اس کے لیے کن کن باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے ، یہی نہیں بلکہ ملک میں صحت سے متعلق ذمہ داروں اور ڈاکٹروں وغیرہ کا بھی یہی فرض بنتا ہے کہ وہ ملک کے ذمہ دار شہری کی حیثیت سے صحت کی خدمات کی فراہمی اور اس کی اہمیت کو سمجھیں ۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آدمی یہ دیکھے کہ وہ جس ماحول میں زندگی گذار رہا ہے ، وہ صحت کے لحاظ سے ٹھیک ہے یا نہیں ، اس طرح صحت کے معیار کو ٹھیک رکھنے کی مہم دراصل عوامی مہم بن جاتی ہے ۔ لیکن کبھی کبھی یہ افسوسناک حقیقت سامنے آتی ہے کہ غریب تو غریب ملک کا خوشحال طبقہ بھی صحت کی برقراری کے لیے صاف ستھرے ماحول کی ضرورت کو نہیں سمجھ پاتا ۔ صحت کا پروگرام دراصل بحیثیت مجموعی قومی ترقی کا ہی ایک جزو لازم ہے ۔ ہمارے رشیوں منیوں نے بھی ذہنی ، جذبات اور جسم کے قریبی تعلق کی اہمیت کو ہمیشہ ہی ماجاگر کیا ہے ۔ ایک کا اثر دوسرے پر پڑتا ہے ۔ اس لیے ظاہری طور پر اور جسمانی طور پر ماحول کو صاف ستھرا بنا کر صحت کی حقیقی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع مل سکتا ہے ۔ صحت کے تئیں ہمارے رویئے میں تبدیلی درکار ہے ۔ صحت محض اتفاقی امر نہیں ، اس کے لیے قسمت کو قصوروار ٹھہرانا بھی ٹھیک نہیں ۔ اس کے لیے پوری جدوجہد اور مقررہ پروگرام کے مطابق زندگی کو ڈھالنا بہت ضروری ہے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ سخت محنت کرتے ہیں ، ان کی صحت بالعموم ٹھیک رہتی ہے ، اس کے لیے زندگی میں خود کو محنت کا عادی بنانا پڑتا ہے ۔ ایک ہفتہ ذرا بے توجہی برتنے پر صحت پر اس کا اثر ہونا شروع ہو جائے گا ۔ بیماری بھی آتی ہے اور بہت سی حالتوں میں اس سے بچنا مشکل ہے لیکن بالعموم اچھی عادتیں اپنا کر اور زندگی کے تئیں صحت مند رویے اپنا کر بہت سی بیماریوں سے بچا جا سکتا ہے ۔ اس سلسلے میں والدین ، اُستادوں اور ڈاکٹروں کا رول بے حد اہم ہے ۔ ہماری صحت بنانے میں صرف ڈاکٹر ہی کافی نہ ہوں گے ۔ ہماری منصوبہ بندی ترقی میں تعلیم ، زراعت ، صنعتوں کی منصوبہ بندی ، سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی ، خوراک اور دواؤں کا محتاط استعمال ، ان سب کے بارے میں واقفیت ضروری ہے اور ان کی مدد سے ہی اور ان کے تئیں عملی دلچسپی رکھنے سے ہی قوم کو صحت مند بنایا جا سکتا ہے ۔ ہماری بہت سی بیماریاں ہماری پسماندگی کی دلیل ہیں ۔ لیکن ترقی اور صنعتی عمل کی توسیع بھی بیماریاں لا سکتی ہیں ۔ لہٰذا ہوا اور پانی کی آلودگی سے تحفظ کے اقدامات وقت کی اہم ضرورت بن گئے ہیں ۔ صحت کی تعمیر و تشکیل میں ہماری خوراک کی بڑی اہمیت ہے ، لیکن ہمارے عوام تغذیہ بخش خوراک کا علم نہیں رکھتے ۔ ترکاریاں ہمارے لیے کس قدر ضروری ہیں ، اس حقیقت سے ہم ناواقف ہیں ۔ ایک غلط فہمی بالعموم یہ پائی جاتی ہے کہ صرف مہنگی خوراک ہی ہمارے معدنی اجزا اور پروٹین کی ضرورتیں پوری کر سکتی ہے حالانکہ ہمارے دیہات اور ہمارے پہاڑی علاقوں میں ایسی بہت سی چیزیں پیدا ہوتی ہیں جو تغذیہ بخش ہونے کے سبب جسم کو بنانے میں معاون ہیں ۔ صحت سے متعلق ذمہ داروں کو ہر جگہ کی ضرورت کے لحاظ سے مقامی طور پر دستیاب سبزیوں ، اور جڑی بوٹیوں کے استعمال اور ان کی افادیت سے عوام کو روشناس کرانا ضروری ہے ۔ ہمارا تصور یہ ہے کہ غیر ملکی دوائیں ہی زیادہ موثر ہوتی ہیں لیکن اگر احتیاط سے زندگی گزاری جائے اور مقامی طور پر دستیاب جڑی بوٹیوں کی افادیت کا علم ہو تو ہمارے عوام بہت سی بیماریوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں ۔ ہماری خوراک بالعموم متوازن نہ ہونے کے سبب ہمارے جسم میں بہت سی بیماریاں نفوذ کر لیتی ہیں ۔ بھلے ہی کوئی دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانا کھاتا ہو لیکن اس کی خوراک متوازن نہیں ہے ، زچہ بچہ کی دیکھ بھال کے مراکز ، رضاکارادارے ، بچوں کے اسکول اور اسی طرح کی مختلف تنظیمیں ، بچوں میں شروع ہی سے متوازن خوراک کا شعور بیدار کر سکتی ہیں ۔ لہٰذا آج کے دور میں مہنگی ہوتی جا رہی ہے اور بہت سے غریب لوگ علاج سے محروم رہ جاتے ہیں ، ایک اندازے کے مطابق ہم ہندوستان میں آج جتنا کچھ صحت پر خرچ کرتے ہیں ، اس کا دس گنا بھی خرچ کیا جائے تو بھی ہم عوام کو کلی طور پر ڈاکٹری علاج کے ذریعے تحفظ نہیں دے سکتے ۔ ہم نے یہاں سے بہت سی بیماروں کا قلع قمع کیا ہے ۔ چیچک ملک سے مکمل طور پر نیست و نابود کر دی گئی ہے ۔ کوڑھ کے خلاف جدوجہد جاری ہے ۔ امید ہے کہ آئندہ بیس برسوں میں اس موذی مرض سے ملک کو پاک و صاف کر لیا جائے گا ۔ اندھے پن کی روک تھام کے اقدامات جاری ہیں ، اس سلسلے کی اہم ایک کڑیاں ہے ،

(باقی صفحہ ۴۳ پر)

سی۔ ایس۔ ویدانت

جنگلات کے تحفّظ کے لیے نئی پالیسی کی ضرورت

حالیہ ہی میں ایتھوپیا پر جو تباہی نازل ہوئی ہے اُس کا ایک بڑا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ گذشتہ ۵۰ برس کے دَوران جنگلات کو بے تحاشہ کاٹا گیا ہے۔ اس عرصے میں جنگلاتی رقبہ زائد از ۵۰ فیصد جغرافیائی علاقے سے کم ہو کر ۳ فیصد رہ گیا ہے۔ زمین کے شدید کٹاؤ سے ایتھوپیا کی زراعتی زمین کی پیداواری صلاحیت بہت کم ہو گئی ہے۔ یہ تمام ترقی پذیر ملکوں کو ایک بڑی تنبیہ ہے کہ اگر وہ ایسی ہی تباہی سے بچنا چاہتے ہیں تو اُن کے لیے جنگلات کو اُس سے زیادہ اہمیت دینا ضروری ہے، جتنی وہ اس وقت دے رہے ہیں۔ بھارت میں بھی ایسی ہی صورتِ حال پیدا ہو سکتی ہے، کیونکہ گذشتہ چند برسوں میں صنعتکاری کے زور، زراعت کی توسیع اور آبادی میں اضافے کے باعث جنگلات کی بھاری تباہی ہوئی ہے۔ جو جنگلات بچ گئے ہیں وہ بھی مقامی آبادی کے حقوق کے بوجھ تلے دب گئے ہیں۔ لیکن اب واضح ہو گیا ہے کہ حکام اور عوام کے دلوں میں جنگلات کے فطری توازن کے بگڑنے کے بارے میں کچھ بیداری پیدا ہو گئی ہے۔ حتیٰ کہ ایک عام دیہاتی بھی آج جنگلات کی تباہی کے نتائج سے جتنا زیادہ واقف ہے اتنا وہ پہلے کبھی نہیں تھا خواہ وہ ایسی تباہی کی روک تھام میں زیادہ ہاتھ نہ بٹاتا ہو۔ لیکن وہ آج مجبور ہے کیونکہ اُسے اپنے مویشیوں کو چارہ اور گھر کو ایندھن فراہم کرنا ہے۔ حکومت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اُسے ایسے متبادل فراہم کرنے کی کوشش کرے جس سے جنگلات پر اُس کا زیادہ سے زیادہ انحصار ختم ہو۔ ملک کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام تر وسائل اس مقصد کے لیے مجتمع کرے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو ہمارے جنگلات کی تباہی بے روک ٹوک ہوتی رہے گی۔

افزائشِ مویشیاں

دیہاتی عوام چارے اور ایندھن سے متعلق اپنی ضروریات کے لیے زیادہ تر جنگلات پر انحصار رکھتے ہیں۔ یہ جنگلات اور چراگاہیں جتنے مویشیوں کو چارہ مہیا کرتی ہیں اُن سے زیادہ تعداد میں مویشی ان زمینوں پر چر رہے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ان زمینوں پر چرنے والے مویشیوں کے لیے دستیاب چارے کی مقدار اور قسم میں بتدریج گراوٹ آ رہی ہے۔ کل پیداوار کو برقرار رکھنے کے لیے کسان زیادہ مویشی رکھنے کے لیے اور زیادہ مجبور ہو جاتا ہے۔ اس شیطانی چکر کا ٹوٹنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

ہمارے ملک میں کسان زیادہ تر کھاد کے لیے مویشیوں کے بڑے بڑے جھنڈ پالتے ہیں۔ یہ مویشی بمشکل دودھ دیتے ہیں۔ کئی بار جنگلات کے انتظام سے متعلق عملی پلانوں میں ضرورت سے زیادہ چرائی کے مسئلہ پر بحث ہوئی ہے۔ بارہا یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ چرائی کے لیے بھاری فیس وصول کی جائے تاکہ غیر پیداواری مویشی پالنے کے لیے کسانوں کی حوصلہ شکنی ہو، لیکن یہ تجاویز عوام کے لیے ناگوار ہیں جو اپنے منتخبہ نمائندوں کے ذریعے حکومت پر دباؤ ڈالتے ہیں کہ وہ ایسے اقدامات نہ کرے۔ بعض ریاستوں میں چرائی کی زمینیں قطعاً ختم کر دی گئی ہیں اور اس طرح موجودہ جنگلات میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی کہ وہ جنگلات اور دیگر چراگاہوں میں چرائی کو منضبط کر سکیں۔

کرناٹک کے مغربی گھاٹوں میں مویشیوں کے روندنے سے زمین اُدھڑ کر کھابڑ ہو گئی ہے۔ ٹھیکیداروں کی طرف سے ایندھن اور اس سے قبل عمارتی لکڑی کے لیے اندھا دھند درخت کاٹے گئے ہیں اور آگ کا سسٹم رائج کرنے سے سدا بہار اور نیم سدا بہار جنگلات کی ہریالی کو بھاری نقصان پہنچا ہے۔ کئی سدا بہار درختوں کی قدرتی ہریالی جاتی رہی ہے۔ گھاس جنگل کی زمین پر اس قدر پھیل گئی ہے کہ ہریالی کا قدرتی عمل بمشکل کام کر رہا ہے۔ اگر یہ رُجحان جاری رہا تو درختوں کی یہ انواع عنقا ہو جائیں گی۔ کرناٹک کے محکمہ جنگلات نے اپنی نایاب انواع کے

تھی ہیں۔ بہت سی زمینوں میں اگانے اور بعد ازاں انھیں اُن سدا بہار اور نیم سدا بہار جنگلات میں لگانے کی اسکیمیں شروع کی ہیں جہاں ان انواع کا دوبارہ پیدا ہونا مشکل ہو گیا ہے۔ ایسی اسکیموں سے محض محدود کامیابی اس وجہ سے ہوئی ہے کہ جب تک چارے، ایندھن اور عمارتی لکڑی کے لیے ٹھیکیداروں کے دباؤ کو کم کرنے کے لیے کوئی ٹھوس اقدامات نہیں کئے جاتے تب تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔

اس صورت حال کا مداوا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ افزائش مویشیان کے بہتر طریقوں اور گھاس زمینوں اور چراگاہوں کے سائنسی انتظام کے بارے میں جانکاری دینے کے لیے پروگرام شروع کئے جائیں۔ ان دونوں پروگراموں میں اس طرح تال میل پیدا کیا جائے کہ اُس سے غیر ضروری اور غیر پیداواری مویشیوں کی تعداد کم کی جائے جو چارے کے نایاب وسائل ہڑپ کرتے ہیں، گھاس زمینوں کی اقسام اور پیداواری صلاحیت کو بہتر بنایا جائے اور انجام کار بہتر نسل کے مویشی پیدا کئے جائیں۔ گھٹیا قسم کے مویشیوں کو بانجھ بنا کر غیر پیداواری مویشیوں کی تعداد میں مزید اضافے کی روک تھام کی جائے۔

متعدد اسکیمیں جن کا مقصد مویشیوں کی نسل کو بہتر بنانا اور گھٹیا قسم کی گھاس والی زمینوں اور چراگاہوں کی پیداواری صلاحیت بڑھانا ہے۔ پہلے ہی ملک میں مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام اور خشک سالی والے علاقوں کے پروگرام کے تحت عمل میں لائی جا رہی ہیں۔ ملک کے بیشتر حصوں میں اعلیٰ قسم کی گھاس رائج کی گئی ہے۔ گھاس کی کئی اقسام غیر ممالک سے منگوائی گئی ہیں۔ یہ پروگرام تال میل کے بغیر سختی سے عمل میں لائے جا رہے ہیں۔ تاہم کئی بار عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ کسی ایجنسی کی طرف سے بعض اسکیموں کے تحت جنگلاتی علاقوں میں بھیڑ بکریاں بھی تقسیم کی جاتی ہیں اور یہ جانور جنگلات کے قدرتی دشمن ہیں۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کیوں کہ دیہی ترقیاتی پروگرام میں حصہ لینے والی ہر ایجنسی اپنے شعبے کے اندر خود کو ایک ایسا با اختیار ادارہ تصور کرتی ہے جس پر انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی۔ ان مسئلوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ تمام ایجنسیوں سے گہرا سوچ بچار کرنے کے بعد ہر ضلع کی ترقی کے لیے ایک ماسٹر پلان بنایا جائے۔

چرائی کے قواعد

چراگاہوں اور گھاس والی زمینوں کے مستعد انتظام کے لیے ضروری ہے کہ چراگاہوں کی پیداواری صلاحیت کے مطابق ہی چرائی سے متعلق سخت قواعد بنائے جائیں۔ ہر چراگاہ میں چرائی کچھ عرصہ تک ملتوی کی جائے یا باری باری سے اُن پر چرائی کی جائے۔ ایسا اس لیے ضروری ہوتا ہے تاکہ قوت بخش اور خوش ذائقہ گھاس کی جگہ بھدی اور بد ذائقہ اقسام کی گھاس نہ اُگنے پائے۔ چرائی کے ان طور طریقوں کو تب تک لاگو کرنا مشکل ہے جب تک کہ عوام چراگاہوں پر ضرورت سے زیادہ چرائی کے بُرے اثرات سے آگاہ نہ ہوں۔ انھیں اس بارے میں سمجھانے کے لیے لگن رکھنے والے توسیعی کارکنوں کی ایک بڑی جماعت کی ضرورت ہوگی۔ اس امر پر بھی شک ہے کہ آیا دیہاتیوں کو محض جانکاری دینے سے کام چل جائے گا، اور وہ منضبط چرائی کی بعض صورت کو اختیار کریں گے۔ وہ ان اقدامات کو اختیار کر سکیں اس کے لیے بعض ترغیبات کی ضرورت ہوگی۔

ان بنیادی مسئلوں میں ایک اور مسئلہ جڑ گیا ہے اور وہ ہے چراگاہوں اور گھاس والی زمینوں کی حد میں بتدریج کمی۔ حکومت پر بھاری دباؤ پڑ رہا ہے کہ وہ بے زمین لوگوں کو چراگاہیں اور گھاس والے میدان الاٹ کرے۔ یہ زمینیں زراعتی مقاصد کے علاوہ دیگر مقاصد کے لیے بھی ترقیاتی پراجیکٹوں کے لیے دی جا رہی ہیں۔ اس نظام میں ایسے دباؤ کی آسانی سے مزاحمت نہیں کی جا سکتی لیکن یہ دیکھنا ضروری ہے کہ عوام کی ضروریات پوری کرنے کے مفاد میں ملک کے طویل المدتی مفادات قربان نہ کئے جائیں۔ ہم ایسے اہم معاملوں پر جذباتی نہیں ہو سکتے۔ ملک کو فطری توازن کی تباہی سے بچایا جانا ضروری ہے۔

بنا دھوئیں کے چولہے

اب پایا گیا ہے کہ بنا دھوئیں والے چولہوں سے عام چولہوں کے مقابلے میں ایندھن کی قوت ۵۰ فیصد تک بڑھ جاتی ہے۔ عام چولہوں کی قوت ۱۵ فیصد ہوتی ہے (پیدا ہونے والی حرارت کا جتنا فیصد مفید طور پر استعمال ہوتا ہے اُسے ایندھن کی قوت کہتے ہیں)۔

اس سادہ سی ایجاد سے جس کی تعمیر پر ۲۰۰ روپے سے کم لاگت آتی ہے جو امکانات پیدا ہوئے ہیں، وہ بے پناہ ہیں۔ ملک میں ایندھن کی کھپت فی گھرانہ تقریباً ۳۸۰۰ کلوگرام سالانہ ہے۔ اگر بنا دھوئیں کے چولہوں کے استعمال سے ۵۰ فیصد ایندھن لکڑی کی بچت ہو جائے تو ایک گھرانے کی طرف سے سال میں ۱۹۰۰ کلوگرام لکڑی کی بچت ہوگی جو تقریباً ۹ عام سائز کے درختوں کے برابر ہوگی۔ جنگلاتی وسائل جو ملک میں مساوی طور پر منقسم نہیں ہیں۔ جنگلاتی علاقوں میں ایندھن کا بڑا وسیلہ ہیں۔ جن علاقوں میں جنگلات نہیں ہیں وہاں زراعتی فاضلات، جھاڑیاں اور گوبر کے اُپلے ایندھن کا کام دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں دیہی آبادی کا محض ایک حصہ ہی واقعی جنگلات سے حاصل ہونے والی ایندھنی لکڑی پر انحصار رکھتا ہے۔ اس طرح جنگلات کے نواح میں رہنے والے لوگوں کو بلا قیمت بنا دھوئیں کے چولہے بانٹنے کے پروگرام سے جنگلات پر دباؤ کم کرنے میں مدد ملے گی اور اس کے ساتھ ہی دیہی خواتین کا وہ وقت بھی بچ جائے گا جو وہ ایندھن جمع کرنے پر صرف کرتی ہیں۔

گوبر گیس کے پلانٹ

گوبر گیس کے پلانٹوں سے زراعتی فاضلات کو صلاحیت سے استعمال کرنے اور ٹھکانے لگانے کے تصور میں انقلاب آیا ہے۔ حکومت کے اہتمام

(باقی صفحہ پر)

ڈاکٹر ایم۔ ایل گپتا

خطِ افلاس کے نیچے

ذیل کے مضمون میں مصنف نے خطِ افلاس کے نیچے رہنے والے لوگوں کی نشاندہی کی ہے۔ ۱۹۷۶-۷۷ کی قیمتوں کی سطح کو بنیاد فرض کرتے ہوئے دیہی علاقوں میں رہنے والے جن لوگوں کی ماہانہ آمدنی ۶۱،۸۰ روپے سے کم اور شہری علاقوں میں رہنے والے جن لوگوں کی ماہانہ آمدنی ۷۱،۳۰ روپے سے کم ہے اُنھیں خطِ افلاس کے نیچے رہنے والا تسلیم کیا گیا ہے۔ ۱۹۸۰-۸۱ میں خطِ افلاس کے نیچے رہنے والے لوگوں کی تعداد ۳۴ کروڑ ۹۰ لاکھ تھی جو ملک کی کُل آبادی کا ۵۱،۱ فیصد تھی۔

بھارت کے جواں سال وزیرِ اعظم راجیو گاندھی نے کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کا اتفاق رائے سے لیڈر منتخب ہونے کے فوراً بعد ۳۱ دسمبر ۱۹۸۴ کو پارلیمنٹ کی مرکزی نشست گاہ میں ملک کے عوام کی غریبی دُور کرنا سرکار کا پہلا کام بتایا۔ بلاشبہ غریبی کا مسئلہ حکومت کے لیے سب سے بڑا چیلنج ہے جسے دُور کرنا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہوگی۔

جب کم از کم بسراوقات کے وسائل کی کمی ہوتی ہے تو ایسی صورتِ حال کو غریبی کا نام دیا جاتا ہے۔ اقتصادی لحاظ سے ایسے بدحال طبقے کو مفلس کہتے ہیں، جو ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کرنے کے قابل نہ ہو۔ دُوسرے الفاظ میں ضروری اشیا پر خرچ کرنے کی قوت نہ ہونا یعنی اُتنی آمدنی نہ ہونا افلاس کا مظہر ہے۔ "کم از کم متوقع کھپت" کی مقدار کا مطلب اتنی کلوریز (حرارتوں) کی کھپت سے ہے جو انسانی زندگی کو بنائے رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ اگر آبادی کا ایک حصہ کم از کم حرارتوں کے حصول کے لیے ضروری آمدنی فراہم نہیں کرسکتا تو ایسے طبقے کو مفلس ترین کہا جاتا ہے۔ ایسی آبادی ہی خطِ افلاس کے نیچے رہنے والی آبادی کہلاتی ہے۔

تیسری دنیا کے زیادہ تر ملکوں کی بھاری تعداد خطِ افلاس کے نیچے رہتی ہے۔ الگ الگ ملکوں میں کم از کم گذر اوقات کی رقم وہاں کی قیمتوں کی سطح اور معیارِ زندگی کی بنیاد پر الگ الگ طے کی جاتی ہے۔ بھارت میں مفلسی کی حدود کے بارے میں وقتاً فوقتاً مطالعات کئے گئے ہیں جن سے یہ نتیجہ نکلا ہے کہ اضافہ آبادی آمدنی میں معمولی اضافہ، افراطِ زر اور اقتصادی تفاوت کے باعث بھارت کے عوام کا ایک بڑا حصہ خطِ افلاس کے نیچے زندگی بسر کر رہا ہے۔

خطِ افلاس کا پھیلاؤ

زیادہ تر زرعی پیداوار کے اُتار چڑھاؤ بھارت کی قومی آمدنی، فی کس آمدنی اور عام قیمتوں کی سطح ہی معیارِ زندگی اور افلاس کی حدود کا تعین کرتی رہی ہے۔ چند برسوں کو چھوڑ کر افلاس بڑھتا گیا ہے۔ لہٰذا خطِ افلاس کے نیچے رہنے والی آبادی کے تناسب میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔

۱۹۶۰-۶۱ میں بھارت کے اُن عوام کو خطِ افلاس کے نیچے تصور کیا گیا جن کی ماہوار خرچ کرنے کی آمدنی ۲۰ روپے سے کم تھی۔ جب کہ ۱۹۶۸-۶۹ میں اُن لوگوں کو خطِ افلاس کے نیچے تسلیم کیا گیا جن کی ماہانہ آمدنی ۴۰ روپے سے کم تھی۔ لہٰذا ۱۹۶۰-۶۱ اور ۱۹۶۸-۶۹ میں خطِ افلاس کے نیچے رہنے والے لوگ بالترتیب ۱۷ کروڑ ۱۰ لاکھ اور ۲۱ کروڑ ۹۰ لاکھ تھے۔ آئندہ ۸ برسوں میں گذر اوقات کا اشاریہ بڑھ جانے سے کم از کم گذر اوقات کا خرچ بدل گیا اور ۱۹۷۶-۷۷ کی قیمتوں کی سطح کو بنیاد بتاتے ہوئے دیہی اور شہری آبادی کے لیے ٹاسک کمیشن نے کم از کم گذر اوقات کی رقم بالترتیب ۶۱،۸۰ فیصد اور ۷۱،۳۰ روپیہ ماہوار کے حساب سے طے کی۔ اس بنیاد پر اُن لوگوں کی تعداد کا اندازہ کیا گیا جنھیں دیہی علاقوں میں ۶۱،۸۰ اور شہری علاقوں میں ۷۱،۳۰ روپیہ ماہانہ کی بھی آمدنی نہیں تھی ایسے لوگوں کی تعداد ۱۹۷۷-۷۸ میں ۲۹،۳ کروڑ تھی جو اس وقت کی کُل آبادی کے ۴۶،۳ فیصد کے برابر تھی۔ انھیں خطِ افلاس کے نیچے زندگی بسر کرنے والی آبادی بتایا گیا۔ اس آبادی میں ۳۴،۹۰ کروڑ

دیہی آبادی (کل دیہی آبادی کا ۹ء۴۸ فیصد) اور ۵ء۵ کروڑ شہری آبادی (کل شہری آبادی کا ۲ء۴۰ فیصد) تھی۔ پلاننگ کمیشن نے ۸۰-۱۹۷۷ کے لیے خطِ افلاس کے نیچے آنے والی آبادی کے جو تخمینے طے کیے تھے وہ چھٹے پنچسالہ منصوبے کے مسودے میں دیے گئے تھے۔ ۱۹۸۰ کے آغاز میں ترمیم شدہ چھٹا منصوبہ (۸۵-۱۹۸۰) بنایا گیا۔ ان دونوں منصوبوں میں خطِ افلاس کے نیچے آبادی سے متعلق تخمینہ لگاتے وقت پلاننگ کمیشن نے دیہی اور شہری علاقوں کے لیے کم از کم بسراوقات کا خرچ اتنا ضرور تصور کیا جو دیہی شخص کے لیے ۲۱۰۰ حراروں کے برابر خوراکی سامان اور دیگر ضروری اشیاء فراہم کرسکے۔ ترمیم شدہ پنچسالہ منصوبے (۸۵-۱۹۸۰) کے آغاز میں کم از کم بسراوقات کا خرچ شہری علاقوں کے لیے ۸۸ روپے اور دیہی علاقوں کے لیے ۷۶ روپے فی کس ماہانہ طے کیا گیا۔ جس کا اندازہ ۸۰-۱۹۷۹ کی قیمتوں کی سطح پر لگایا گیا تھا، گذر اوقات کے لیے خرچ کی اتنی قوت نہ رکھنے والوں کو خطِ افلاس کے نیچے تسلیم کرلیا گیا۔ ایسی آبادی دیہی علاقوں میں ۲۶ کروڑ (کل دیہی آبادی کا ۷ء۵۰ فیصد) اور شہری علاقوں میں ۷ء۵ کروڑ (کل شہری آبادی کا ۳ء۴۰ فیصد) نیز پورے ملک میں ۷ء۳۱ کروڑ (کل آبادی کا ۳ء۴۸ فیصد) طے کی گئی۔ اس طرح ۸۱-۱۹۸۰ کے آغاز میں ملک کی ۳ء۴۸ فیصد آبادی خطِ افلاس کے نیچے آچکی تھی۔

اگست ۱۹۸۳ میں پلاننگ کمیشن نے چھٹے منصوبے (۸۵-۱۹۸۰) کا جو وسط مدتی جائزہ شائع کیا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ ۱۹۸۱ کی آبادی کے تجزیوں کو ذہن میں رکھا جائے تو ۸۱-۱۹۸۰ کے آغاز میں خطِ افلاس کے نیچے رہنے والی آبادی ۱ء۳۳ کروڑ تھی، جو اس وقت کی کل آبادی کا ۱ء۵۱ فیصد تھی۔ اس طرح پلاننگ کمیشن نے اپنے تخمینوں میں ترمیم کرتے ہوئے ۸۱-۱۹۸۰ میں خطِ افلاس کے نیچے آنے والی آبادی میں سے ۳ء۴۸ فیصد کی جگہ ۱ء۵۱ فیصد کا تعین کیا۔

ایک اوسط ہندوستانی کے لیے گذر اوقات کا اشاریہ بہت کم مانا گیا ہے جو شاید اس کے پیٹ اور پیٹھ کو جوڑے رکھنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ اگر دیگر ممالک کے شہریوں کے معیارِ زندگی کے ضمن میں علاج معالجے، تعلیم، تفریح وغیرہ کی سہولیات کو بھی گذر اوقات کا ضروری حصہ تصور کیا جائے تو کم از کم گذر اوقات کی رقم کہیں زیادہ ہوگی۔ جو بھی ہو اتنی کم رقم ماننے پر بھی پلاننگ کمیشن کے تازہ ترین تخمینوں کے مطابق چھٹے منصوبے کے آغاز میں ملک کی نصف سے زیادہ آبادی ایسی تھی جو اپنی گذر اوقات کے لیے متوقع آمدنی نہ پانے کے باعث ضروریات زندگی کی ضروری اشیا پر کم از کم خرچ کرنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتی تھی اور زیادہ کمی نیز اقتصادی مشکلات کا شکار ہونے کے باعث خطِ افلاس کے نیچے رہتی تھی۔ پلاننگ کمیشن نے اندازہ لگایا ہے کہ چھٹے منصوبے کے آخری برس ۸۵-۱۹۸۴ء میں ملک کے ساڑھے ۲۱ کروڑ عوام خطِ افلاس کے نیچے رہیں گے جو کل آبادی کا ۳۰ فیصد ہوں گے۔ یہ بھی اندازہ ہے کہ دیہی اور شہری دونوں علاقوں میں ۳۰-۴۰ فیصد عوام خطِ افلاس کے نیچے رہیں گے۔ ۱۹۹۰ تک ملک سے افلاس دور کردیا جائے گا۔ یہ نشانہ بھی طے کیا گیا ہے۔

بیشتر قدرتی وسائل اور عظیم افرادی قوت سے مالا مال بھارت کو سیاسی غلامی سے نجات حاصل کیے ۳۸ برس ہوچکے ہیں لیکن ابھی تک اقتصادی بدحالی ختم نہیں ہو پائی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بھوکے، ننگے، ان پڑھ، کوڑھی اور اپاہج کروڑوں لوگ حیات بخش اشیاء کے لیے ترس رہے ہیں۔

یہ ایک بڑا سوال ہے کہ کیا اقتصادی منصوبہ بندی کے ۳۴ برسوں میں بھارت کے لوگوں کی دکھتی، غریبی مٹی؟ قومی آمدنی میں معمولی اضافے، آبادی پر کنٹرول میں ناکامی، اقتصادی بدحالی اور قیمتوں میں اضافے کے باعث یہاں کے لوگوں کی فی کس آمدنی میں مناسب بہتری نہیں ہوئی۔ ۶۱-۱۹۶۰ میں اوسط فی کس آمدنی ۵۰ پیسے روزانہ تھی، جو ۶۹-۱۹۶۸ میں ۵۲ پیسے ہوگئی۔ اس نام نہاد اضافے پر طنز کرتے ہوئے ڈانڈیکر اور رتھ نے لکھا کہ "۶۱-۱۹۶۰ میں جس غریب کا روزانہ خرچ ۵۰ پیسے تھا، وہ ۸ برسوں کے بعد ۶۹-۱۹۶۸ میں ۵۲ پیسے ہوا ہے۔ یہ اس بیچارے کی سمجھ میں کیونکر آسکتا ہے! اور جو ۶۱-۱۹۶۰ میں آدھا بھوکا رہتا تھا اس سے کہا جائے کہ کیا تم نہیں جانتے کہ دس برس پہلے تم ۵۰ فیصدی بھوکے رہتے تھے جبکہ اب ۴۸ فیصد بھوکے رہتے ہو تو یہ سب اس غریب کی سمجھ میں کیونکر آسکتا ہے؟ ملک کے افلاس کا نقشہ دیکھنے پر ایسا لگتا ہے کہ گویا اقتصادی چوہے نے پہاڑ کھودنا شروع کیا ہے۔

یہ تلخ حقیقت ہے کہ افلاس کی گاڑی وہیں رکی پڑی ہے۔ کم آمدنی اور پست معیارِ زندگی کے باعث ملک میں افلاس کا کوڑھ بڑھتا جا رہا ہے۔ ہر گلی کوچے میں جانوروں کی مانند کوڑے کچرے میں سے کھانے کی تلاش کرتے ہوئے بھوکے اور انجان بچے بھارت کے مستقبل کی کھوکھلی اور مرجھائی ہوئی چمڑی میں بھارت کا افلاس جھلکتا ہے۔ چھلے ہوئے ہاتھ، پھٹے ہوئے پاؤں اور کند ذہن رکھنے والے کروڑوں لوگ مہنگائی کی ضربات سے تڑپ کر فٹ پاتھوں، گندی بستیوں اور سڑاند بھرے نالوں میں پناہ لیتے دیکھے جاسکتے ہیں۔ کروڑوں نوجوان، بچے اور عورتیں روزگار کی تلاش میں در در بھٹکنے کے لیے مجبور ہیں۔ روزی روٹی کی امید میں یونہی بھٹکتے ہوئے لوگوں کے بارے میں ڈانڈیکر اور رتھ نے لکھا ہے کہ روٹی کی امید میں جب یہی افلاس شہروں میں پہنچتا ہے تو اس کی صورت مکروہ ہو جاتی ہے۔ گندی بستیوں میں یا فٹ پاتھ پر بیٹھ کر سامنے کی عالیشان عمارتوں کی تڑک بھڑک دیکھتے ہوئے وہاں کی عیش پسندی کی رنگ کے شرون گھونٹتے ہوئے اس سے پیدا ہونے والی حرص اور حسد کو دباتے ہوئے یا اس کا شکار ہوکر [illegible]

چھپنے لگتی ہے اور دوسری طرف اس ملک میں جمع خوری، منافع خوری، اسمگلنگ، چور بازاری اور رشوت خوری کے باعث بڑے صنعتی گھرانوں کے مالکوں بدعنوان افسروں اور سیاستدانوں کے گھروں میں عیاشی کا ننگا ناچ ہوتا ہے۔ یہ طبقہ بھارت کی معیشت کے نایاب وسائل کا بڑا حصہ ہڑپ کر جاتا ہے۔ یہ طبقہ وہی ہے جو مفلس ترین لوگوں کی زندگی پر قہر بپا کر رہا ہے۔ یہ طبقہ دن بدن موٹا ہوتا جا رہا ہے تبھی تو چھوٹے طبقہ کی حالت بدتر ہوتی جا رہی ہے۔

فلاحی ریاست کے مقصد کو عمل میں لاتے ہوئے اقتصادی منصوبہ بندی، جمہوری سوشلزم، امدادِ باہمی، سماج واد اور پبلک سیکٹر اور کنٹرول کی پالیسیوں کی پیروی کرنے پر بھی سال بہ سال بھارت میں اقتصادی تفاوت بڑھا ہے جس سے غریبی کا انسداد کم اور "غریبوں کا انسداد" زیادہ ہوا ہے۔ کم پیداوار اور حقیر فی کس آمدنی کے ساتھ ساتھ افلاس خوفناک حد تک بڑھا ہے کیونکہ متعلقہ تقسیم کے اصول کورے اُترے ہیں۔ افلاس میں اقتصادی تفاوت گویا کوڑھ میں کھجلی ہے۔ ڈاکٹر کے این راج کا یہ بیان قطعی درست معلوم ہوتا ہے کہ "آج آمدنی اور دولت میں غیر مساوات منصوبہ بند ترقی کے دور کے آغاز کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ اگرچہ اقتصادی نظام آج بھی ملا جلا ہے تاہم اس اشتراک کے عناصر اُسے سوشلسٹ نظریئے کے بجائے سرمایہ داری کے نظریئے سے زیادہ قریب لے جاتے ہیں۔

ترمیم شدہ چھٹے پنجسالہ منصوبہ (۸۵-۱۹۸۰) کی کامیابیوں پر رائے زنی کرتے ہوئے اگست ۱۹۸۳ میں شائع شدہ "وسط مدتی جائزہ" میں کہا گیا ہے کہ منصوبے کے پہلے دو برسوں (۸۱-۱۹۸۰) اور (۸۲-۱۹۸۱) کے دوران متعدد روزگار پروگراموں اور ترقیاتی پراجیکٹوں سے ملک کے ۵ کروڑ ۰۷ لاکھ افراد کی غریبی دور کی جا سکی ہے جو کہ منصوبے کے شروع میں خطِ افلاس کے نیچے تھے۔ اس تحقیق، مطالعے کے مطابق اپریل ۱۹۸۲ کے آغاز میں ۲۸ کروڑ ۳۰ لاکھ افراد جو کل آبادی کا ۱۵ء۴۱ فیصد تھے خطِ افلاس کے نیچے رہتے تھے جبکہ ۲ برس پہلے یعنی اپریل ۱۹۸۰ میں ایسے افراد کی تعداد ۳۳ کروڑ ۹۰ لاکھ تھی جو کل آبادی کا ۱۱ء۵۱ فیصد تھی۔ اس طرح ۲ برس میں ۶ء۹ فیصد افلاس کم ہوا۔

انسدادِ افلاس کے سلسلے میں مذکورہ ۲ برس میں جو پیش رفت ہوئی وہ خواب تھا یا حقیقت؟ پروفیسر راج کرشن اور وسنت گماسطے کے مطالعات سے نتیجہ نکلتا ہے کہ افلاس اتنا کم نہیں ہوا جتنا کہ وسط مدتی جائزے کی رپورٹ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ پروفیسر راج کرشن نے "مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام" "قومی دیہی روزگار پروگرام" اور قومی آمدنی میں اضافے کے رجحانات کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ ۸۱-۱۹۸۰ اور ۸۲-۱۹۸۱ کے عرصے میں زیادہ سے زیادہ ۷۷ لاکھ افراد خطِ افلاس سے اوپر اُٹھے ہیں نہ کہ ۵ کروڑ ۰۷ لاکھ افراد۔ اس طرح اپریل ۱۹۸۲ کے آغاز میں خطِ افلاس کے نیچے رہنے والی آبادی ۳۲ کروڑ ۱۰ لاکھ یعنی کل کا ۴۸ء۸ فیصد تھی۔ وسنت گماسطے کی رائے کے مطابق زیرِ بحث دو برس کے عرصے میں روزگار بڑھانے کے پروگراموں سے زیادہ سے زیادہ ۱۴ لاکھ کنبوں یعنی ۷۰ لاکھ افراد کو فائدہ پہنچا۔

دراصل چھٹے منصوبے کے دو برس گذر جانے پر اپریل ۱۹۸۲ میں سرکاری حلقوں کے مطابق ملک کے ۴۱ء۵ اور غیر سرکاری تشخیص کے مطابق ۴۸ء۵ فیصد افراد خطِ افلاس کے نیچے زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ بحث زیادہ اہمیت کی حامل نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسداد افلاس کا پروگرام چیونٹی کی چال سے چلا ہے۔ اس لیے منصوبہ سازوں کا یہ بیان مارچ ۱۹۸۵ تک خطِ افلاس کے نیچے صرف ۳۰ فیصد افراد رہ جائیں گے معقول نظر نہیں آتا۔ ۱۹۹۰ تک ملک سے پورے طور غریبی مٹانے کا عزم تو اور بھی زیادہ مضحکہ خیز ہے۔

دن کب بدلیں گے

اقتصادی تفاوت کو مٹاتے ہوئے اقتصادی نظام کے عمل کو تیز کرنے پر ہی غریب طبقہ کے دن بدل سکتے ہیں۔ اگر متعدد اقتصادی پروگراموں کو مؤثر طور پر عمل میں لاتے ہوئے روزگار اور آمدنی میں اضافہ نہیں ہوا تو عوام کا ان منصوبوں پر سے اعتماد اُٹھ جائے گا۔ ٹی ایس پپولا کا بیان ہے کہ غریبی کی لعنت کو کم کرنے کے لیے نااہل انتظامیہ کو بدلنا اور اُسے لچکدار بنانا ہوگا۔ بی سی نوانیری کا سجھاؤ ہے کہ ملک کے ترقیاتی پراجیکٹوں کی تشکیل کرتے ہوئے اُن پروگراموں کو ترجیح دینی چاہیئے جن سے خوشحال طبقہ کے بجائے غریب لوگ مستفید ہو سکیں۔

لہٰذا کروڑوں مفلس افراد لوگوں کی تقدیر بدلنے کے لیے حکومت کو چاہیئے کہ وہ اجارہ داری اسمگلنگ اور قیمتوں میں اضافے کو روکے، نہ کمائی ہوئی آمدنی پر زیادہ ٹیکس لگائے، قومی ملکیت کو سماجی بہبود کا ذریعہ بنایا جائے، منصوبہ بند ترقی کے عمل میں سُست روی نہیں آنی چاہیئے اور ایک ساتھ ہی روزگار بڑھانے والے پروگرام عمل میں لائے جائیں۔

بقیہ: سائنس اور ٹکنالوجی میں ہماری پیش رفت

میں انسیٹ ون۔بی خلاء میں چھوڑا گیا۔ انسیٹ ون۔بی سے ملک کی مواصلات، نشر و اشاعت اور معلومات کی فراہمی کے میدان میں انقلاب بپا ہو گیا۔ گذشتہ کئی ماہ سے ریڈیو، دوردرشن، ڈاک تار، ترسیل و مواصلات اور موسمیات کے محکمے اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

اور گذشتہ ۳ اپریل کو ہندوستانی فضائیہ کے اسکواڈرن لیڈر راکیش شرما نے ہند و روس مشترکہ خلائی پرواز میں دو روسی خلابازوں کے ساتھ خلا میں جانے والے پہلے ہندوستانی ہونے کا شرف حاصل کیا۔ وہ دنیا کے ۱۳۸ ویں خلا باز ہوئے اور ہندوستان اپنے کسی شہری کو خلاء میں بھیجنے والا ۱۴ واں ملک ہو گیا۔

ڈاکٹر نیلے چودھری

گنگا کی کیسے صفائی کی جائے

مرحوم وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ایما پر تیار کیے گئے گنگا کی صفائی سے متعلق منصوبۂ عمل کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے کہا ہے کہ اس دریا میں اس کے کناروں پر آباد ٹھیک ۱۰۰ قصبوں کے گندے نالوں کا پانی اور کارخانوں کے آلودہ فاضلات بہائے جا رہے ہیں۔ ان ۱۰۰ قصبوں میں ۲۷ بڑے شہر ہیں ان کا بیان ہے کہ اگر ان بڑے شہروں کے آلودہ پانی کو گنگا میں نہ بہنے دیا جائے تو دریا کی ۷۰ فیصد آلودگی پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

کیا ہم گنگا کو صاف نہیں کر سکتے

مرحومہ وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے کوئی ایک سال پہلے مجھ سے سوال کیا تھا۔ یہ سوال مختصر اور دلیرانہ تھا لیکن جواب اس سے بھی زیادہ مختصر اور پھسپھسا تھا۔ میں نے کہا "ہاں لیکن ..." انھوں نے فوراً کہا کہ "تب جاؤ اور ایک منصوبۂ عمل تیار کرو، اور اگر ضروری ہو تو اس منصوبۂ عمل کی تعمیل کے لیے ایک اتھارٹی کے قیام کا سجھاؤ بھی دو۔"

مانگنے سے پہلے ہی اتنی زیادہ حمایت پانے پر کوئی بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتا چنانچہ میں بھی پیچھے نہیں ہٹا۔ تب تک مرکزی آلودگی کنٹرول بورڈ سات متعلقہ ریاستی آلودگی کنٹرول بورڈوں (ہریانہ، ہماچل پردیش، راجستھان، مدھیہ پردیش، اتر پردیش، بہار اور مغربی بنگال) کی سرگرم حمایت سے دو جامع رپورٹیں مرتب کر چکا تھا۔ ایک کا تعلق جمنا کے بارے میں اور دوسری کا تعلق گنگا سے تھا جو اعداد و معلومات دستیاب تھیں انھیں فراہم کرنے اور ترتیب دینے میں اور آلودگی سے متعلق امکانی جانکاری، دریائی پانی کی کوالٹی کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے اور دریائی پانی کے استعمال کے بارے میں جو معلومات دستیاب نہیں تھیں ان کی رپورٹ تیار کرنے میں ۵ برس لگ گئے۔ مرکزی آلودگی کنٹرول بورڈ نے رپورٹ کی حتمی ترتیب اور سات نقشوں کی تیاری کے لیے خصوصی ایجنسی کی خدمات حاصل کیں۔

منصوبے کی تشکیل

مرکزی آلودگی کنٹرول بورڈ کو معلومات کا وسیع خزانہ مل جانے اور شریمتی اندرا گاندھی کی یقینی حمایت حاصل ہو جانے سے گنگا کو صاف کرنے سے متعلق ایک منصوبۂ عمل کو مرتب کرنے کا کام آسان ہو گیا۔ مئی کے مہینے تک انھوں نے تمام ساتوں ریاستوں کو مرکزی آلودگی کنٹرول بورڈ کی دونوں رپورٹوں کے بارے میں لکھ دیا تھا اور ساتوں ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ سے مشترکہ منصوبۂ عمل کے نتیجے میں ان کے ردعمل کے بارے میں جاننا چاہا تھا۔ ستمبر ۱۹۸۴ تک ہم مرکزی آلودگی کنٹرول بورڈوں کے لوگ گنگا کے منصوبۂ عمل کے اولین پنچسالہ پروگرام کے لیے تیار ہو گئے تھے ہم نے چار مہینے کے ریکارڈ عرصے میں اس مقصد کے ساتھ پلان کی تیاری مکمل کر لی کہ منصوبہ عمل کو ملک کے ساتویں پنچسالہ منصوبے کے ساتھ ساتھ رکھا جائے گا۔ رپورٹ جس کا عنوان تھا "گنگا کا منصوبہ عمل۔ اولین پانچ برس" اکتوبر ۱۹۸۴ میں چھپ گئی لیکن شریمتی گاندھی کی طرف سے قوم کو باضابطہ طور پر پیش نہیں کی جا سکی۔ وہ اسے اپنے پیچھے نئے وزیراعظم کے لیے چھوڑ گئیں۔ نئے وزیراعظم نے اپنے عہدے کا چارج سنبھالنے کے بعد قوم کے نام اپنے افتتاحی خطبے میں گنگا کے منصوبۂ عمل کو شامل کیا اور یہ امر مرحومہ شریمتی گاندھی کو شاندار خراج عقیدت ہے جنھوں نے صاف ستھرے اور بہتر ماحول کے کاز کے لیے ہمیشہ آواز اٹھائی۔

منصوبہ عمل کا مقصد

گنگا کے منصوبہ عمل کے اولین پنچسالہ پروگرام کا مقصد گنگا کے بڑے دریائی راستہ کو صاف کرنا ہے۔ اسے کہاں سے صاف کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اسے ان مقامات پر سے صاف کیا جائے گا جہاں سے گندہ پانی یا آلودہ فاضلات کو دریا میں گرایا جاتا ہے۔ گنگا کے کنارے پر ٹھیک ۱۰۰ ...

آباد ہیں۔ (یو۔پی میں ۲۶) بہار میں ۱۵ اور مغربی بنگال میں ۵۹)۔ان سو مقامات میں سے گنگا میں گھروں کی نالیوں کا گندہ پانی اور کارخانوں کے آلودہ فاضلات بہائے جاتے ہیں۔ گنگا کے منصوبہ عمل کے اولین پنجسالہ پروگرام میں بڑے بڑے شہروں سے ہونے والی آلودگی کو ختم کیا جائے گا۔ یہ دریائے گنگا کے کنارے پر آباد ۲۷ ایسے شہر ہیں جو درجہ اوّل کے شہروں کے طور پر موسوم ہیں۔ درجہ اوّل کے شہروں میں جہاں ۱۹۸۱ کی مردم شماری کے مطابق آبادی ایک لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے اگر ان ۲۷ شہروں کو دریائے گنگا میں آلودگی بہانے سے روک دیا جائے تو اس دریا میں براہ راست آنے والی آلودگی کے ۸۴ فیصد پر قابو پا لیا جائیگا۔ اگر ۱۰۰ شہروں میں سے ۲۷ شہروں سے آنے والی آلودگی پر قابو پانے سے ۸۴ فیصد آلودگی پر قابو پایا جا سکتا ہے تو اسے درست استدلال کہا جائے گا کہ ۱۰۰ مقامات پر کام کرنے کے بجائے ۲۷ شہروں میں کام کیا جائے۔

گنگا کے منصوبہ عمل میں ان ۲۷ مقامات میں آلودگی پر کیونکر قابو پانے کی تجویز کی گئی ہے۔ بڑے شہروں میں آلودگی کے منظر پر نظر ڈالنا مناسب ہوگا۔ ۲۷ میں سے صرف ۱۰ شہروں میں زمین دوز گندے نالوں کا سسٹم ہے جو کل آلودگی کے ایک تھوڑے سے حصے کو نپٹاتا ہے۔ بہار کے پٹنہ اور مغربی بنگال کے جنوبی ڈم ڈم میں ۲۵ فیصد آلودہ مواد کو ان گندے نالوں میں بہایا جاتا ہے۔ دونوں مقامات پر شہر کے گندے نالے پانچ سے زیادہ مقامات پر گنگا میں ملتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان گندے نالوں کا رُخ موڑ دیا جائے اور انھیں دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ کسی موزوں مقام پر لے جا کر اُن پر مزید کیمیاوی عمل کیا جائے، فوری کام ہے کہ موزوں مقامات پر کیمیاوی عمل کی سہولیات کا قیام، جہاں گندے نالوں کا رُخ موڑا جائے۔ چونکہ شہری فاضلوں کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ پائپ لائن کے ذریعہ گندے پانی کا رُخ موڑنے پر لاگت بڑھتی جاتی ہے اسلیے تجویز کیا گیا ہے کہ موڑ کی لمبائی کو کم از کم کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک شہر میں جہاں گندے نالے کا رُخ موڑا جا سکتا ہے وہاں ایک سے زیادہ مقامات اس مقصد کے لیے ہو سکتے ہیں۔ یو۔پی میں کانپور، الہ آباد اور وارانسی، بہار میں پٹنہ اور مغربی بنگال میں بھاٹ پاڑہ، جنوبی ڈم ڈم، جادوپور اور جنوبی سُندربن جیسے بڑے شہروں کو ایک سے زیادہ ایسے مقامات کی ضرورت ہے جہاں گندے نالوں کا رُخ موڑا جائیگا۔ گنگا کے منصوبہ عمل میں ایسے ۴۵ مقامات تجویز کیے گئے ہیں جہاں گندے نالوں کا رُخ موڑا جا سکتا ہے۔

منصوبہ کیونکر کام کریگا

ان تمام ۴۵ مقامات پر آپ ایک فیکٹری کے قیام کا تصوّر کریں جو "ری سورس ری سائکلنگ ان کارپوریٹیڈ" کے نام سے موسوم ہوگی یعنی فاضلات کو دوبارہ قابل کار بنانے کا ادارہ۔ "ری سورس ری سائکلنگ یونٹ میں" خام گندے پانی کو خام مال تصوّر کیا جاتا ہے اور اُس سے مختلف اشیا تیار کر کے فروخت کی جاتی ہیں۔ ری سورس ری سائکلنگ یونٹ کے فیکٹری شیڈ میں مندرجہ ذیل صنعتی عملوں کے قیام کی تجویز ہے۔ گندے پانی کو ایک ایسے عمل میں سے گذارا جائے گا۔ جہاں ٹھوس مادہ سیّال اشیاء سے الگ ہو جاتا ہے۔ ٹھوس مادے ڈائی جیسٹر (DIGESTER) میں جاتے ہیں۔ جہاں میتھین گیس اور ڈائی جیسٹڈ سالڈ (DIGESTED SOLID) یعنی "جامدات" تیار ہوتے ہیں۔ میتھین گیس کو گیس ٹربائن میں داخل کیا جاتا ہے جس سے بجلی تیار ہوتی ہے جسے فیکٹری کو چلانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور فاضل بجلی صارفین کو فروخت کی جاتی ہے۔ ڈائی جیسٹڈ جامدات کو کھاد کے طور پر فروخت کیا جاتا ہے۔ مذکورہ بالا عمل میں الگ ہونے والا سیّال مادہ حیاتیاتی ایریٹر (AERATOR) میں جاتا ہے۔ جہاں سے مزید جامدات یا پانی کو اتنا زیادہ صاف کیا جاتا ہے کہ وہ کائی اُگانے اور مچھلیاں پالنے کے کام آتا ہے۔ کائی سے مرغیوں کا چارہ تیار کیا جاتا ہے اور مچھلیاں فروخت کی جاتی ہیں۔ ازاں بعد پانی آبپاشی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح ہر ری سورس ری سائیکلنگ یونٹ توانائی، کھاد، مرغیوں کا چارہ، مچھلیاں اور آبپاشی کا پانی تیار کرتا ہے۔ اس طرح ان مصنوعات کی فروخت کو بھی ری سورس ری سائکلنگ یونٹ کا جزو لاینفک تصور کیا گیا ہے۔

منافع بخش کاروبار

تو اس اسکیم کو کیونکر عملی صورت دی جائے؟ ایک اسکیم صرف اُس صورت میں قابلِ تعریف ہوتی ہے جب اُسے بخوبی عمل میں لایا جائے اور اس کے بعد وہ کامیابی سے کام کرے۔ چنانچہ اس اسکیم کو شروع کرنے والے اور عوام کی بھاری تعداد یہ دیکھنے کے لیے بے قراری سے انتظار کر رہی ہے کہ یہ اسکیم کیونکر عمل میں لائی جاتی ہے۔ تصوراتی طور پر ۴۵ مقامات میں ہر اسکیم ایک دوسرے جیسی ہوگی جس میں مقام کی ضروریات کے مطابق تھوڑا سا ردوبدل ہوگا۔ بنیادی طور پر ہر یونٹ میں گندے نالے کا پانی خام مادے کے طور پر آئیگا اور ہر یونٹ میں پانچ مصنوعات، عمل توانائی، کھاد، مرغیوں کا چارہ، مچھلیاں اور آبپاشی کا پانی تیار ہوگا۔ فیکٹری ہر جگہ ایک جیسی ہوگی۔ اس سے ڈیزائن کے اخراجات میں بچت ہوگی اور تعمیری لاگت میں بھی کمی ہوگی۔

ریاستوں کا کردار

۲۷ شہروں کے درمیان ترجیحات کے مابین مزید نظرثانی کرنے کا بمشکل امکان ہے۔ گنگا کے منصوبہ عمل میں پہلے ہی ترجیحات کے مابین انتخاب کرنے کے کام پر کافی غور کیا جا چکا ہے۔ ہر اسکیم کے اجزائے ترکیبی عیاں ہیں جس بات کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہر مقام کو دیکھتے ہوئے

ہونے کے لیے مختلف قسم کے تیار کیا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے حکومت کے مرکزی اور ریاستی سیکٹروں میں اور حکومت کے باہر متعدد ٹھیکیدار ہیں جو ایسی فیکٹریوں کے مختلف اجزاء کے ترکیب کی تعمیر کے لیے مقابلے پر بولی دے سکتے ہیں۔ ریاستی سطح کی ہیرنگ کمیٹی بجارت مرکزی سطح کی ہیرنگ کمیٹی کے ساتھ نگرانی کے کام کی مشغولی رہے گی۔ ظاہر ہے ریاستی آلودگی کنٹرول بورڈ ہیرنگ کمیٹیوں کی امداد میں غالب کردار ادا کرے گا۔ ریاستی آلودگی کنٹرول بورڈ کے کردار کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ملک کے وہ ادارے ہیں جنھوں نے آلودگی کے کنٹرول کے معاملے پر داؤ لگا رکھا ہے۔ ایک بار فیکٹریاں تیار ہو جائیں تو انھیں منافع کی بنا پر چلانا بہت اہم ہے۔ یہ کہنا زیادہ غیر موزوں نہیں ہو سکتا کہ بھارت کو ان سسٹموں کے رکھ رکھاؤ میں دسترس حاصل نہیں ہے۔ بیشتر صنعتیں اپنی مقررہ صلاحیتوں سے بہت کم صلاحیت پر مال تیار کرتی ہیں۔ گو ایسی کم پیداوار کو حق بجانب ٹھہرانے کے لیے اُن کے پاس عذروں کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔ تاہم کوئی بھی غیر موزوں رکھ رکھاؤ کو اس فہرست میں شامل نہیں کرتا۔ مبادا کہ اس سے خود منتظمین پر حرف گیری ہو۔ ان فیکٹریوں میں جو گندے پانی کو چھانتی ہیں، رکھ رکھاؤ تمام سسٹم کی کمزور ترین کڑی ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لیے بہت اہم ہے کہ ایسے یونٹوں کے انتظام کو بڑی سنجیدگی سے دیکھا جائے۔

فاضلات کو قابلِ کار بنانا

ہر ری سورس ری سائکلنگ یونٹ نہ صرف دریا کو صاف کرنے کا ایک یونٹ ہے بلکہ کسی فیکٹری کی مانند اُسے مال بھی تیار کرنا چاہیے، جسے فروخت کر کے منافع کمایا جا سکے۔ جیسا کہ سوچا گیا ہے۔ ہر ری سورس ری سائکلنگ یونٹ فیکٹری کا چلانے کے لیے [illegible] ۲۳ ہزار روپیہ خرچ کرے گا اور اپنی [illegible] فروخت کر کے [illegible] ۱۱ ہزار [illegible] کے

جہاں سے منافع کمایا جائے گا۔ اسی طرح اگر ہر یونٹ ایک لاکھ کی آبادی کے لیے کام کرے تو اُسے سال میں ۱۱ لاکھ روپیہ کا منافع ہوگا۔ لہذا منافعوں کی ایک ایسی جماعت قائم کرنا اہم ہے جہاں یونٹوں کو منافع کے ساتھ چلایا جائے گا۔ یہ بھی گنگا کے منصوبہ عمل کا حصہ ہے۔ دنیا میں کسی بھی ملک نے اتنے بڑے دریا کو صاف کرنے کا منصوبہ اپنے ہاتھ میں نہیں لیا جو گنگا کی لمبائی کے برابر ہو۔ یہ امر یاد رہے کہ ہم ایک ایسے دریا کی صفائی کا کام اپنے ہاتھ میں لے رہے ہیں جس کی گذرگاہ کی جسامت ۹ لاکھ مربع کلو میٹر ہے اور گنگا کے بڑے راستہ کی لمبائی ۲۵۰۰ کلو میٹر ہے۔ یہ بھارت کی ۲۶ فیصد زمین کو مستفید کرتا ہے اور اس میں ملک کی ۲۵ فیصد آبی دولت پائی جاتی ہے۔ بھارت کے عوام اور دوسرے ملکوں کے لوگ بھی گنگا کی صفائی کی پیش قدمی کو بڑی دلچسپی سے دیکھیں گے۔ ●

بقیہ
جنگلات کے تحفظ کے لیے نئی پالیسی کی ضرورت

شدہ پروگراموں کے ذریعہ امداد دی جاتی ہے۔ لیکن عام کاشتکاروں کی اتنی استعداد نہیں ہے کہ وہ دو سے تین ہزار روپیہ کا سرمایہ بھی لگا سکیں اور شاید یہی ایک سبب ہے کہ گوبر گیس پلانٹ دیہات میں بہت زیادہ مقبول عام نہیں ہوا، گو عام دیہاتی گوبر گیس پلانٹوں کے فوائد سے آگاہ ہیں۔

بھارت میں بجلی کے پراجیکٹوں میں بہت زیادہ سرمایہ کاری کی گئی ہے لیکن یہ پراجیکٹ خام مال کی عدم دستیابی، ورکروں اور منتظموں کی نااہلیت اور فرائد مشروں کے مسائل کا شکار رہتے ہیں جس کے نتیجے میں بھاری نقصان ہوتا ہے۔ ملک اپنے قیمتی وسائل کا ایک بڑا حصہ ان پلانٹوں سے ہونے والے نقصان کو پورا کرنے کے لیے صرف کر رہا ہے۔

ایسی سرمایہ کاری [illegible] اُس کی بجائے اس سے غیر ضروری ہو سکتا ہے کہ بہتر ہو [illegible] کو پوری امداد دینے کی جانب زیادہ روپیہ منتقل کیا جائے تاکہ وہ ان گوبر گیس پلانٹوں کو خرید سکیں۔ چونکہ یہ گوبر گیس پلانٹ انفرادی پراجیکٹ ہیں اس لیے اُن کا مؤثر استعمال ہوگا اور آخر میں ملک اعلیٰ سرمایہ کاری کی اقتصادیات پر اپنا انحصار کم کر کے بھاری بچت کر سکے گا۔ ملک تب مشکلات سے باہر نکل سکتا ہے اور گاندھی جی کے ڈھنگ سے حقیقی خود اعتمادی کی جانب پیش قدمی کر سکتا ہے۔

نئے دستورِ کار کی ضرورت

جنگلات کے مہتمم کی تکنیکی قابلیت میں کوئی خامی نہیں ہے لیکن یہ مہتمم کے کنٹرول سے باہر دیگر امور ہیں جو جنگلات پر زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ جنگل بانی الگ تھلگ طور پر کامیاب نہیں ہو سکتی اگر مہتمم جنگلات کی مساعی سے بہتر نتائج حاصل کرنا مقصود ہے تو جنگل بانی کو درپیش بنیادی مسائل کے تئیں ہمہ انضباطی دستورِ کار اختیار کرنا ضروری ہے۔ ورنہ ہمارے جنگلات کی بربادی جاری رہے گی اور یہ ہم سب کے لیے عظیم ترین المیہ ہوگا۔

سبھاش جے ریلے

گنگا۔ آج جس کا پانی سب سے گندہ ہے

اس بات پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہ آج دنیا کے دریاؤں میں گنگا کا پانی سب سے گندہ ہے، صاحبِ مضمون نے اس دریا کو مزید آلائش سے بچانے کے لیے مرکزی گنگا اتھارٹی کے قیام کا خیرمقدم کیا ہے۔ انھوں نے تجویز کیا ہے کہ دریا میں کارخانوں کے بےکار کیمیاوی مادّوں کے بہائے جانے کے عمل کو کم کرنے، کوڑے کچرے اور فضلات کو سائنسی عمل سے صاف کرنے، اسکولی نصابات میں مطالعۂ ماحول کا مضمون شامل کرنے نیز تشہیر اشاعت کے وسائل کے توسط سے عوام میں دریا کو آلائش سے پاک رکھنے کی ضرورت کا احساس پیدا کرنے کے لیے فوری اقدامات کیے جانے چاہئیں۔

"گنگا بھارت کی صدیوں پرانی تہذیب و ثقافت کی علامت ہے۔ ہمیشہ تغیر پذیر، ہمیشہ رواں و دواں" اس گنگا نے پنڈت نہرو کو اتنا متاثر کیا کہ اُنھوں نے اپنی وصیت میں اس کا شاندار الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے آج دنیا کے دریاؤں میں گنگا کا پانی سب سے زیادہ گندہ ہے۔ آنجہانی شریمتی اندرا گاندھی نے ۱۹ مارچ ۱۹۸۴ کو لوک سبھا میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا تھا کہ "گنگا کے قنوج، کانپور، الٰہ آباد، وارانسی، پٹنہ اور کلکتہ سے متصل حصّے آلودہ ہیں اور ان حصّوں میں گنگا کا پانی انسانی استعمال کے لیے ناموزوں ہے۔ بایو کیمیکل آکسیجن کے لحاظ سے احمدآباد سے نیچے کی جانب دریائے سابرمتی کا پانی گنگا سے زیادہ آلودہ ہے۔"

آلائش سے پانی کے تحفظ سے متعلق ریاستی کنٹرول بورڈ کے تازہ ترین مطالعات کے مطابق ضلع ہاوڑہ میں یرگو بیریا سے ۲۴ پرگنہ میں واقع ڈائمنڈ ہاربر اور اس سے آگے تک گنگا کا ایک وسیع حصہ گذشتہ چند برسوں میں اس قدر آلودہ ہو چکا ہے کہ دریا کے دونوں کناروں کی آبادی دریا کے پانی کو نہ صرف پینے کے بلکہ آبپاشی تک کے لیے بھی ٹھیک نہیں سمجھتی۔ لیکن زیادہ خطرناک بات تو یہ ہے کہ گنگا کے پانی کی آلودگی صرف مغربی بنگال کے علاقوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ اتر پردیش کے زیادہ گنجان آبادی والے علاقوں، بالخصوص کانپور اور الٰہ آباد میں یہ دریا دن بدن زیادہ آلودہ ہوتا جا رہا ہے۔ حالیہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ الٰہ آباد میں دریا کا بیکٹیریائی جز جو تین سو فی ایم۔ ایل ہے اور کانپور سے نیچے کی جانب پچاس کلومیٹر لمبا ٹکڑا بہت ہی زیادہ آلودہ ہو چکا ہے۔

آلائش سے پانی کے تحفظ سے متعلق مرکزی کنٹرول بورڈ نے دریا کے پانی کا وسیع پیمانے پر تجزیہ کیا ہے جس سے معلوم ہوا ہے کہ ۲۰۰۳ کلومیٹر پانی میں سے ۴۸۰ کلومیٹر پانی آلودہ ہے کہیں کم، کہیں زیادہ۔ سائنس دانوں کی ایک جمعیت نے ایک حالیہ تجربے کے مطابق اس میں ہیضہ، ٹائیفائڈ اور آنتوں کی سوزش کے جراثیم پائے گئے۔ اتر پردیش، بہار اور مغربی بنگال میں قریب قریب ہر کلومیٹر کے بعد کوڑا کرکٹ، شہر کا گندہ پانی اور کارخانوں کے بیکار کیمیاوی مادّے دریا میں انڈیل دیئے جاتے ہیں۔

گندے پانی کو سائنسی عمل سے صاف کرنا

گنگا کے کناروں پر واقع بڑے شہروں میں کوئی سیوریج ٹریٹمنٹ پلانٹ نہیں ہے۔ اگرچہ ان میں سے بیشتر شہروں میں جزوی طور پر سیورج سسٹم کی سہولیات موجود ہیں۔ تمام ملاکر درجہ اول کے ۸۴ اور درجہ دوم کے ۶۰ شہروں کا سیوریج وغیرہ کا غیرصاف شدہ گندہ پانی ہر روز دریا میں بہایا جاتا ہے۔ بہت سی فیکٹریاں اپنے بے کار

[illegible] کے لیے دریا میں جہاں [illegible] ہندوستان کی دیگر سرگرمیاں مثلاً دریا میں نہانا، کپڑے دھونا، مُردوں کی استھیوں اور ادھ جلی لاشوں کو بہانا وغیرہ، پانی کو اور زیادہ آلودہ بنا دیتی ہیں۔ کیڑے مکوڑے مارنے والی دوائیں بنانے کے کارخانے، چمڑہ رنگنے کی فیکٹریاں، کاغذ اور گتے کی ملیں، پیٹرو کیمیکل مصنوعات، کیمیاوی کھاد اور ربڑ تیار کرنے کے کارخانے بیکار جانے والے کیمیاوی مادّوں کو دریا میں پھینک کر اپنی جان چھڑاتے ہیں۔

وارانسی میں گنگا کے پانی کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوا کہ اس میں کیڈمیم (رانگ کی طرح کی سفید نیلگوں دھات)، کرومیم، تانبا، پارہ، جست، نِکل، کچلا، سرمہ اور رانگ جیسی زہریلی دھاتیں موجود ہیں۔ ایک اور سروے کی رپورٹ کے مطابق جو انڈین جرنل آف ہیلتھ میں شائع ہوئی ہے، دریا کا پانی انسانی استعمال کے لیے محفوظ نہیں سمجھا جا سکتا، کیونکہ لوگ غیر صاف شدہ گنگا جل مذہبی عقیدت کی وجہ سے پیتے ہیں۔ اس لیے چند ماہ پیشتر لوگوں کو اس خطرے سے آگاہ بھی کر دیا گیا تھا۔ ماہرین امور ماحول کی ایک ٹیم نے تو حال ہی میں یہ رپورٹ دی ہے کہ بنارس کے خطّے میں گنگا کا پانی نہانے تک کے لیے بھی ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ یہ دیکھا گیا ہے کہ اس کا استعمال کرنے والے کچھ لوگوں کو جلدی بیماریاں لاحق ہو گئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس تیرتھ کے قریب شہر کا سیوریج (Sewage) یعنی گندہ پانی دریا میں گرایا جاتا ہے اور منی کارنیکا گھاٹ پر مُردوں کو جلایا جاتا ہے۔

آلودگی کو روکنے کی تدابیر

دریائے گنگا کی روز افزوں آلودگی کو دیکھتے ہوئے مرکزی اور متعدد ریاستی حکومتوں نے گنگا کے پانی کی آلودگی کے تدارک کے لیے اقدامات کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں مرکزی حکومت کا ایک مرکزی گنگا اتھارٹی قائم کرنے کا فیصلہ ایک خوش آئند فیصلہ ہے۔ مرکزی حکومت نے ریاستی حکومتوں کے تعاون سے کچھ ماہ پیشتر یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ مُردوں کو سپرد آب کرنے کے طریقے کو روکا جائے۔ یہ پہلا سنجیدہ قدم ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس فیصلے کو ابھی تک زیر عمل کیوں نہیں لایا گیا ہے۔ گنگا کے پانی کی آلودگی شہری نسلوں کے لیے ایک سخت سزا بنتی جا رہی ہے۔

گندے پانی سے پیدا ہونیوالی بیماریاں

اُتر پردیش کے محکمۂ صحت کے ایک جائزے کے مطابق گیارہ بڑے شہروں میں پینے کا پانی حد درجہ جراثیم آلود اور انسانی استعمال کے لیے مُضر ہے۔ ماحولیات سے متعلق قومی انجینئرنگ اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سائنسدانوں نے پتہ لگایا ہے کہ بھارت میں دستیاب پانی کا ستر فیصد حصہ گندہ اور آلودہ ہے۔ شمال میں ڈل جھیل سے لے کر جنوب میں پیریار اور چلیپار دریاؤں تک، مشرق میں دامودر اور ہُگلی سے لے کر مغرب میں تھانہ کریک تک پانی کی آلودگی کی تصویر یکساں طور پر تاریک ہے۔ پانی کے جو نمونے اکٹھا کیے گئے ان میں مختلف اقسام کی گندگی گھلی ہوئی پائی گئی اور آکسیجن کا فقدان دیکھنے میں آیا۔ اس سے پانی کا توازن یکسر بگڑ گیا ہے اور پانی دھیرے دھیرے اثر کرنے والے زہر جیسا خطرناک بن گیا ہے۔ کانپور، لکھنؤ، وارانسی، الٰہ آباد، بلیا، آگرہ، جونپور، گورکھپور، بستی، سیتا پور اور اٹاوہ میں ۵۰ تا ۸۰ فیصدی لوگ پیٹ کے کسی نہ کسی مرض میں مبتلا ہیں۔ تجزیے سے معلوم ہوا ہے کہ ان میں سے بیشتر امراض پانی سے پیدا ہونے والے ہیں مثلاً ہیضہ، آنتوں میں خرابی کی وجہ سے ہونے والا بخار، آنتوں کی سوجن (Gastro Enteritis) (Emoebiasis) پیٹ کے کیڑوں کی بیماری۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پانی کے سبب پیدا ہونے والی بیماریوں کی وجہ سے ہر سال سات کروڑ تیس لاکھ کام کے دن ضائع ہو جاتے ہیں۔ بیماروں کے علاج کے خرچ اور پیداوار کے نقصان کا اندازہ چھ سو کروڑ روپے سالانہ ہے۔

گندے پانی سے پیدا شدہ بیماریوں کے سبب ہونے والی اموات دنیا بھر میں عام ہیں۔ آلودگی کی روک تھام کے لیے ہر ملک اپنے طریقے سے کام کرتا ہے۔ بہت سے ملکوں میں اس قسم کی آلودگی کا علاج صحت و صفائی کے اقدامات کو بہتر بنا کر اور پانی کو سائنسی طریقے سے صاف کر کے کیا گیا ہے۔ کارخانوں کے بے کار کیمیاوی مادّے مقامی اتھارٹی کے تعمیر کردہ سیوروں میں ڈالے جاتے ہیں۔ مسئلے کو حل کرنے کے لیے نہایت سادہ ٹیکنالوجی کی ضرورت ہے۔ اکثر اوقات انجینئر پانی کی حیاتیاتی صفائی کے وہ طریقے کام میں نہیں لاتے جو چالیس سال سے مشہور ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سب سے بڑی ضرورت ایک اہل انتظامیہ اور مالیاتی تحریک عمل اور کنٹرول نیز بہترین دستیاب ٹیکنالوجی استعمال کرنے کی ہے۔

قانون کیا کر سکتا ہے؟

بہت سے ملکوں میں عوام نے اپنی حکومتوں کو صاف ہوا کا قانون اور پانی کی آلودگی کے تدارک کا قانون پاس کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک میں عوام نے خاطر خواہ تحفظات کے بغیر صنعتوں کی ترقی و توسیع کی پالیسیوں کو للکارا ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں تو ایک فیڈرل قانون موجود ہے جو لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ کوئی بھی چیز جو ماحول پر اثر انداز ہوتی ہو اور سماجی و اقتصادی ڈھانچے کو تبدیل کرتی ہو یا انسانی زندگیوں کو خطرے میں ڈالتی ہو، اس کے بارے میں فیصلے کرنے میں عوام بھی شریک ہوں۔

اگرچہ بھارت میں پانی کو آلودگی سے بچانے کی غرض سے ریاستی کنٹرول بورڈ قائم ہو چکے

ہیں۔ لیکن وہ موثر ثابت نہیں ہوئے ہیں۔ انھیں ایسی کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے جسے وہ کارنامے کے طور پر دکھا سکیں۔ ان کی سرگرمیاں محض کاغذی کاموں اور ایک دفتر چلانے تک محدود ہیں۔ وسیع پیمانے پر دریاؤں کی آلودگی ان کے ذہنوں کو شکی بنا رہی ہے اور لاکھوں عوام کی صحت کے لیے خطرہ بڑھتا اور سنگین ہوتا جا رہا ہے۔ ریاستی بورڈ کچھ نامعلوم اسباب کی وجہ سے دریاؤں میں بیکار کیمیاوی مادّوں کو چھوڑنے والے غلط کارخانوں کے خلاف کارروائی کرنے میں ہچکچا رہے ہیں۔ انھوں نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا ہے کہ کارخانوں کو نوٹس جاری کر دیے ہیں کہ وہ اپنے یہاں پانی کو سائنسی عمل سے صاف کرنے کے پلانٹ لگائیں۔ جو کہ کارخانوں کی ایک آئینی ذمہ داری ہے۔ لیکن چونکہ حکام خود پانی کی آلودگی کو روکنے میں سنجیدہ نہیں ہیں اس لیے کارخانے بھی نوٹسوں اور وارننگوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ اگر ہمارے کارخانہ دار چاہیں تو وہ پیداوار کے بہتر طریقے نکال سکتے ہیں۔ جن سے بیک وقت دو مقصد حاصل ہو سکیں۔ ایک تو یہ کہ اس وقت جو کیمیاوی مادّے بیکار سمجھ کر پھینک دیے جاتے ہیں انھیں کام میں لایا جا سکے اور دوسرے یہ کہ بیکار کیمیاوی مادّوں کا دریا میں پھینکا جانا بھی کم ہو جائے۔

ایک بڑا مسئلہ

سیویج کا پانی کہاں جائے ؟

شہروں کے نالوں اور بدروؤں کا پانی ہمارے آبی وسائل کے لیے ایک زبردست خطرہ ہے۔ تمام سیویج کا صرف نصف حصہ ہی سائنسی طریقے سے صاف کیا جاتا ہے، باقی دریاؤں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ہر ریاست کو پانی کی سپلائی کو صاف بنانے کے لیے کارگر طریقے اختیار کرنے چاہئیں اور وہ کر بھی سکتی ہے۔ موجودہ سہولیات کو جدید انداز کا بنانا چاہیے۔ بہت سی ریاستوں میں دریاؤں کے کنارے واقع فیکٹریاں، بے کار مادّے لگاتار دریاؤں میں داخل کرتی رہتی ہیں اور بیشتر کیسوں میں متعلقہ منتظمین اس قسم کے بے کار مادّوں کو صاف کرنے پر دھیان نہیں دیتے۔

نامور ماہر ماحولیات ڈاکٹر رشمی میئور نے نئی حکومت کے ایک مرکزی گنگا اتھارٹی قائم کرنے کے فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ چونکہ پانی کی آلودگی کا مسئلہ ہمہ گیر نوعیت رکھتا ہے، اس لیے حکومت جو اتھارٹی قائم کرنا چاہتی ہے صرف وہی کافی نہ ہوگی۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ماحول کے تحفظ کے لیے ایک علیحدہ وزارت بنائی جائے جس کے اندر ہم ایک ڈویژن دریاؤں کی آلودگی کے مسئلے کے لیے بھی رکھ سکتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، بھارت کی رفتار کا انحصار اس کے دریاؤں پر ہے۔ ڈاکٹر میئور کے نزدیک جہاں دریاؤں کی صفائی کے لیے کثیر رقوم درکار ہونگی وہاں ایک بڑی مشکل سماجی و مذہبی رسوم کے بدلنے کی ہے۔ یہ سچ مچ ایک بہت بڑا کام ہے۔ مُردوں کو جلانے کے بجائے ہمیں ان کا داہ سنسکار بجلی کے شمشانوں میں کرنا چاہیے۔

بیداری پیدا کرنے کی ضرورت

عوام کو زمینی وسائل کے، جن میں پانی سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، دانشمندانہ اور باضبط استعمال کی ضرورت سے آگاہ کیا جانا چاہیے۔

یہ ایک اچھی بات ہے کہ نئی حکومت ہمارے تعلیمی نظام میں عظیم تبدیلیاں لا رہی ہے ماحول سے متعلق تعلیم وقت کی اہم ضرورت ہے بوقت آگیا ہے کہ مرکزی اور ریاستی حکومتیں ٹیلی ویژن، فلموں، دستاویزی فلموں اور تشہیر و اشاعت کے دوسرے وسائل کے ذریعے عوام کو گنگا اور دوسرے دریاؤں کو آلودہ ہونے سے بچانے کی ضرورت بتلائی جائے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہمارے اسکولی نصاب میں ماحولی مطالعات کو شامل نہ کیا جائے۔ اگر ہمارا نقطۂ نگاہ وسیع النظری اور روشن خیالی پر مبنی ہو اور سماجی و سیاسی ادارے بھی اپنا تعاون دیں تو ہمارے دریاؤں کے پانی کی دیکھ بھال اچھی طرح کی جا سکتی ہے۔ ★

بقیہ : اداریہ

اضافہ آبادی کی روک تھام۔ یہ بات اُمید افزا ہے کہ اب ہمارے عوام اس مسئلے کی اہمیت سے بخوبی واقف ہو گئے ہیں۔ ہمارے بچوں کو محض خوراک ہی تو نہیں چاہیے۔ حصولِ آزادی کے بعد ہمارے نوجوانوں کی اُمنگوں اور آرزوؤں میں جو بے پناہ اضافہ دیکھنے کو ملا ہے، انھیں موجودہ شرح سے بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ کس طرح پورا کیا جا سکتا ہے، ۲۰۰۰ء تک شرح پیدائش گھٹا کر ۲۱ فی ہزار کر دینے اور شرح اموات گھٹا کر ۹ فی ہزار کر دینے کا نشانہ رکھا گیا ہے۔ یہ یقیناً ایک قابلِ عمل نشانہ ہے۔ توقع ہے کہ اس نشانے کو پورا کرکے ملک کو ترقی کی راہ پر تیزی سے آگے بڑھایا جا سکے گا۔ بنیادی طور پر خاندانی منصوبہ بندی ذاتی معاملہ ہے۔ یہ محض سرکاری پروگرام کی حیثیت سے ہی ترقی نہیں کر سکے گا۔ محض سماجی کارکن، خواہ وہ کتنی بھی لگن سے کام کریں اس کو اپنے طور پر کامیاب نہیں بنا سکتے۔ اسے عوامی تحریک کی صورت میں آگے بڑھنا ہے اور رضاکار اداروں کے توسط سے اس کا پیغام گھر گھر پہنچانا ہے۔ ★

ایس۔ ایس یزدانی اور بی سنگھ

زہر آلود مستقبل کی جانب

ہم جس ہوا میں سانس لیتے ہیں، جس پانی کو ہم پیتے ہیں اور جس خوراک کو ہم کھاتے ہیں وہ تمام کے تمام کیڑے مار کیمیکلوں سے آلودہ ہو چکے ہیں۔ کثافت سے بھرا ماحول انسانی زندگی کے لیے بھی خطرہ ہے اور چرند و پرند کے لیے بھی، مٹی، پانی، ہوا اور خوراک میں کیڑے مار کیمیکلوں کی باقیات پائی جاتی ہیں۔ اگر ہم نے کیڑے مار دواؤں کا استعمال مسلسل جاری رکھا تو قدرتی طور پر حفاظتی قوتیں اپنا اثر کھو دیں گی۔ دونوں مصنف یہاں اس بات سے خبردار کرتے ہیں کہ فطری توازن کو بگڑنے نہ دیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں اس طرح سوچنے، پلان بنانے اور کام کرنے کی ضرورت ہے جس سے فطری توازن برقرار رہے۔

انسانی تہذیب جوں جوں پروان چڑھی، انسان کی خوراک کی ضرورتیں بھی بڑھتی گئیں۔ اس کے نتیجے میں اراضی کے وسائل کا مختلف طرح سے استعمال کیا گیا۔ اس سے قدرتی ماحول پر دباؤ بڑھا۔ اضافہ آبادی سے پیداوار میں اضافے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ یہ ضرورت اب بھی بدستور محسوس کی جا رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں حفاظتی ٹکنالوجی اپنائی گئی ہے تاکہ فصلوں کو کیڑے مکوڑوں سے بچایا جا سکے۔ اس طرح ذخیرہ کیے گئے اناج کو کیڑوں سے بچانے کے لیے بھی حکمت عملی اپنائی گئی۔ پیداوار اور تحفظ کی حکمت عملیاں ایک دوسرے سے اس قدر جڑی ہوئی ہیں کہ کسی ایک حکمت عملی سے صرف نظر کر کے فصلوں کی پیداوار کو نہیں بڑھایا جا سکتا۔

حالیہ برسوں میں فصلوں کو لگنے والی بیماریوں سے ان کے نقصانات کا اندازہ بہت زیادہ ہے۔ صرف ایک دھان کی فصل کے ضمن میں ملک بھر میں مختلف تجربے کیے گئے واقعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آئی۔ آر۔ ۸ کی پیداوار میں ۱۰.۸ فی صد اضافہ ہوا اور ٹی این۔ ۱ میں ۱۹.۴ فیصد اضافہ ہوا لیکن یہ اضافہ فصلوں کو کیڑوں سے بچانے کی کوشش کا مرہون منت ہے۔ دیگر فصلوں میں بھی ان اقدامات کی افادیت اس طرح واضح ہو جاتی ہے۔

کیڑے مار کیمیکلوں سے انسانی زندگی کو خطرہ

۱۹۳۶ میں پال ملر نے ڈی ڈی ٹی کی کیڑے مار خاصیتوں کی دریافت کی جس سے چالیس کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں فصلوں کو کیڑے مکوڑوں سے بچانے کا کام زور شور سے ہونے لگا۔ اس کیڑے مار دوائی سے دنیا بھر میں ساٹھ کی دہائی کے ابتدائی برسوں تک فصلوں کو کیڑے مکوڑوں سے بچانے میں مدد ملی اور کاشتکاروں اور زراعتی سائنسدانوں کے لیے فصلوں سے زیادہ پیداوار لینے کا امکان بڑھ گیا۔

اس کے بعد برطانوی اور فرانسیسی کارکنوں نے ایک اور ایسی ہی اچھی کیڑے مار دوائی کی دریافت کی جس کا نام "بنیزین ہیکسا کلورائڈ" (BENZENE HEXACHLORIDE) یا مختصراً (BHC) تھا۔ ازاں بعد کیڑے مار دوائیاں بڑی مقدار میں بازار میں آ چکی ہیں جن کے بارے میں دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ وہ کیڑے مکوڑوں کے مسئلے پر موثر طور پر قابو پا رہی ہیں۔ شروع میں بلاشبہ ان سے نمایاں کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ لیکن ان کے بے سوچے سمجھے اور بے تحاشہ استعمال سے سنگین مسائل پیدا ہوئے جنھوں نے انسانی معاشرے کے وجود کو ہی چنوتی دیدی۔

جب مطلوبہ مقصد پورا ہو جانے کے بعد کیڑے مار دوائیوں کے بڑے ضمنی اثرات ماحول میں رہتے ہیں تو وہ خصوصاً ماحولی خطرے کا ایک بڑا وسیلہ تصور کیے جاتے ہیں۔ خوراک کے سلسلے میں کیڑے مار دوائیوں کی متواتر موجودگی ماحول کو آلودہ کرنے کا سب سے بڑا سبب ہے۔ بعض اوقات زمین میں چھوٹے چھوٹے جراثیم سے زہریلا مادہ بڑھ جاتا ہے۔

زہریلے اثرات کو ختم کرنے کے لیے موزوں انیزائم بنانے سے متعلق ان کی اہلیت نیز کیمیکلوں اور جراثیم وغیرہ میں ٹکراؤ دیگر اسباب ہیں جو ماحول میں آلودگی کے ذمہ دار ہیں، ماحول میں آلودگی عام طور پر زمین، پانی، ہوا اور خوراک کے ذریعہ ہوتی ہے۔ بڑا سبب ان امور سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ کیڑے مار دوائیوں کے کارخانوں کے صنعتی فاضلات۔ ۲۔ کھیتوں اور باغات کی پیداوار

فاضلات کی باقیات۔ ۳۔ کھیتوں میں کیمیکلوں کا چھڑکاؤ ۴۔ ہوا میں کیمیکلوں کا اڑنا۔ ۵۔ ان کیمیکلوں کا اچانک بہہ جانا۔ ۶۔ زمین اور پودوں سے بخارات کا اڑنا۔

کیا ہم کیڑے مار کیمیکل کھاتے ہیں؟

بھارت میں مختلف غذائی اشیا کے جو نمونے بازار سے لیے گئے ہیں ان میں کیڑے مار کیمیکلوں کی باقیات کا سروے کرنے پر پتہ چلا ہے کہ ان میں ڈی ڈی ٹی کا زہریلا مادہ ۹۱ء۰ فیصد تھا۔ ایک حالیہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ فصلوں اور سبزیوں پر کیڑے مار کیمیکلوں کا استعمال بہت زیادہ کیا جاتا ہے۔ ان پر قابو نہیں رکھا جاتا۔ اور نہ ہی ان کے استعمال میں صارفین کی صحت کا کوئی خیال کیا جاتا ہے۔ سبزیاں اگانے والے نہ صرف سبزیوں اور پھلوں کی نشوونما کے دوران کیڑے مار کیمیکلوں کا اندھا دھند چھڑکاؤ کرتے ہیں۔ بلکہ وہ پھل اور سبزیاں توڑتے وقت بھی ان کیمیکلوں کا استعمال کرتے ہیں۔ سبزیاں اور پھل توڑتے وقت چھڑکاؤ اس جھوٹے خیال سے کیا جاتا ہے کہ اس سے وہ اشیا نئی معلوم ہوں گی۔ خوردنی اناج کے جتنے نمونوں کا اب تک تجزیہ کیا گیا ہے، تقریباً ان تمام سے پتہ چلا ہے کہ ان میں کیڑے مار کیمیکلوں کا زہریلا مادہ بہت حد تک تھا۔

گیہوں، مکئی اور باجرہ کے نمونوں میں دیگر کیڑے مار دوائیوں کے علاوہ ڈی ڈی ٹی کی باقیات بھی بہت زیادہ تھیں۔ دودھ کے نمونوں میں باقیات کے تجزیہ سے انکشاف ہوا کہ جن ۱۷ نمونوں کا تجزیہ کیا گیا ان میں سے ۱۳ میں ڈی ڈی ٹی کی سطح ۲ء۰ پی پی ایم سے ۵ء۰ پی پی ایم تھی۔ دودھ اور مکھن کے مقابلے میں انڈوں میں ڈی ڈی ٹی کی سطح بہت کم تھی۔ ایک تخمینہ کے مطابق ایک اوسط بھارتی کی روزمرہ کی خوراک میں تقریباً ۲ء۰ ملی گرام ڈی ڈی ٹی پائی جاتی ہے۔ دنیا میں اب تک انسانی چربی کے نمونوں کا جو سروے کیا گیا ہے ان سے پتہ چلتا ہے کہ دلی میں انسانی چربی میں ڈی ڈی ٹی کی سطح سب سے اونچی ہے۔ یہ دیکھنا موجب دلچسپی ہوگا کہ دلی کے علاقے کے شہری جو اپنے پیشوں کے باعث نسبتاً ڈی ڈی ٹی کے رابطے میں نہیں آتے ان کی چربی میں امریکی شہریوں کے مقابلے میں ڈی ڈی ٹی کی سطح بلند ہے۔

زمین کی آلودگی

کیڑے مار دوائیوں سے زمین کا آلودہ ہونا بہت اہم بات ہے۔ بھارت میں کیڑے مار دوائیاں بہت بڑے تناسب میں کھڑی فصلوں پر استعمال کی جاتی ہیں۔ لیکن زمین کی آلودگی کیڑے مار دوائیوں سے اس وقت خاص طور پر زیادہ سنگین ہو جاتی ہے جب وہ مسلسل کئی برس تک استعمال کی جاتی ہیں۔ کیڑے مار دوائیوں کی باقیات کا زمین کے چھوٹے چھوٹے بیکٹیریا پر برا اثر پڑتا ہے اور وہ زمین کی زرخیزی پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو فصلیں آلودہ زمین پر پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں بھی کیڑے مار دوائیوں کی باقیات ہو سکتی ہیں اور اس طرح وہ انسانی اور حیوانی کھپت کے لیے موزوں نہیں ہوتیں۔

پانی بھی مبرا نہیں

کیڑے مار کیمیکل کئی طرح سے پانی میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہ سطحی اور زمینی پانی کو آلودہ کر سکتے ہیں۔ ہوائی جہازوں سے کاشت شدہ رقبوں پر کیڑے مار کیمیکلوں کے چھڑکاؤ، زمینی پانی سے کیڑے مار دوائیوں کی نقل و حرکت، نالیوں میں کیمیکل کے بہنے اور کیڑے مار دوائیوں کے کارخانوں کے فاضلات سے سطحی گرد اڑنے سے پانی آلودہ ہو جاتا ہے۔

کوئی ۴۳ ہزار ٹن کیڑے مار دوائیاں اور کیمیکل ہر سال بھارت میں زراعت میں استعمال ہوتے ہیں، اور ایک لاکھ دس ہزار ٹن مصنوعی صابن (DETE-RGENTS) کی صفائی اور دھلائی میں کھپت ہوتی ہے۔ ان میں سے ۲۵ کیمیکل ایسے ہیں جو ساحلی سمندری ماحول میں چلے جاتے ہیں۔ بمبئی کا قریبی اور بمبئی بائی کا نزدیکی علاقہ سب سے زیادہ آلودہ علاقہ ہے۔ شہروں میں سپلائی کئے جانے والے پانی کو کلورین سے خالص بنایا جاتا ہے۔ کلورین کا عمل خالصتاً مرکب ہوتا ہے جس سے ہائیڈروکلک ایسڈ اور آکسیجن الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ ایسڈ پانی میں موجود الکلی سے مل کر بے ضرر ہو جاتا ہے جبکہ آکسیجن جو جاندار اجسام نامی کو تباہ کرنے کی عظیم قوت رکھتی ہے خاموش قسم کے وائرسوں کو جنم دیتی ہے۔

صرف چند برس پہلے ایک مرض جس کا نام انتہائی طور پر متاثرہ گاؤں کے نام پر "ہنڈی گوڈو" رکھا گیا تھا کرناٹک میں چک منگلور اور شموگہ کے دیہی علاقوں میں دیکھا گیا تھا۔ یہ مرض دھان اور کافی کے کھیتوں میں کیڑے مار دوائیاں چھڑکنے سے پیدا ہوا تھا۔ اس مرض کی تشخیصی علامتیں تھیں کولہے اور گھٹنوں کے جوڑوں میں درد، متعدد ہڈیوں کا غیر معمولی طور پر بڑھ جانا اور بعض حالتوں میں سر کی نسوں میں تبدیلیاں ہونا۔ یہ دیکھنا موجب دلچسپی ہوگا کہ صرف وہی اشخاص اس مرض میں مبتلا ہوئے جنہوں نے آلودہ تالابوں اور دریاؤں سے مچھلیاں، مینڈک اور کیکڑے کھائے تھے۔

ہوا بھی آلودہ

ہوا میں کیڑے مار کیمیکل، چھڑکاؤ کے عمل، زمین یا پودوں سے کیمیکلوں کے اڑنے یا ایسے پودوں کے جلنے سے پہنچتے ہیں جن میں کیڑے مار دواؤں کی باقیات ہوتی ہیں۔ ڈی ڈی ٹی کی بڑی مقدار انسانی جسم میں اس لیے پہنچتی ہے کیونکہ بھارت میں گھروں کے اندر کیمیکل چھڑکنے کا رواج ہے۔

حیاتیاتی کنٹرول

حیاتیاتی آفات کا ایک اور اہم پہلو ہے فطری توازن جس پر زرعی پیداوار کا انحصار ہے۔ اس فطری نظام کے تحت بعض کیڑے مکوڑے پودوں کو کھاتے ہیں اور اس کے بدلے میں دیگر کیڑے اور پرندے ان کیڑے مکوڑوں کو چٹ کر جاتے ہیں۔

اس فطری نظام سے کیڑے مکوڑوں کی تعداد کنٹرول میں رہتی ہے۔ جن کیڑے مکوڑوں کو خوراک کے لیے کسی خاص پودے کی ضرورت ہوتی ہے انھیں

وہ سب سے کیڑے کنٹرول میں رکھتے ہیں جو انھیں اپنا شکار بناتے ہیں۔ اس طرح کیڑے مکوڑوں کی تعداد پر اہم حیاتیاتی کنٹرول بنا رہتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اناج، منافع بخش فصلوں اور سبزیوں کو لگنے والے کیڑوں پر کنٹرول کی کوشش میں یہ فطری رشتے ٹوٹ گئے ہیں اور ان رشتوں کو بنائے رکھنے والا نظام قابو سے باہر چلا گیا ہے۔ نئے کیڑے مار کیمیکلوں کے وسیع استعمال سے بعض بڑے بڑے کیڑے مکوڑے تو مر گئے ہیں لیکن فطری توازن بگڑ گیا ہے۔ کیڑے مکوڑوں کو کھانے والے چوہے، پرندے اور طفیلی کیڑے ان کیمیکلوں سے کیڑے مکوڑوں کے مقابلے میں اکثر زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ اس طرح کیڑے مار کیمیکل جن کا کام کیڑے مکوڑوں کو ختم کرنا ہے کئی فصلوں کے لیے مسئلہ بنتے جا رہے ہیں۔ اگر ہم نے ان کیمیکلوں پر وسیع پیمانے پر انحصار جاری رکھا تو قدرتی صورت سے کنٹرول کی بحالی تقریباً ناممکن ہو جائے گی۔

زمین کا بڑھتا کٹاؤ

اگرچہ صحیح اعداد دستیاب نہیں ہیں تاہم اندازہ کیا گیا ہے کہ کوئی ۹ کروڑ ہیکٹیئر اراضی زمینی کٹاؤ سے متاثر ہوئی ہے۔ پانی کے کٹاؤ سے ہر سال کوئی ۶۰ ہزار ٹن مٹی اپنی جگہ چھوڑ دیتی ہے۔ کٹاؤ کا سبب قدرتی ہریالی کی تباہی ہے جو ضرورت سے زیادہ پیڑوں کو کاٹنے اور ضرورت سے زیادہ مویشیوں کے چرنے سے ہوتی ہے۔ پانی سے ہونے والا کٹاؤ ملک کے زمینی وسائل کے لیے سنگین ترین خطرہ ہے۔ صرف اس لیے نہیں کہ اس سے زمین براہ راست بنجر ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس لیے بھی کہ اس سے آبی ذخیروں اور تالابوں میں مٹی اور ریت جمع ہو جاتی ہے۔

یہ مسئلہ اُس وقت خاص طور پر سنگین صورت اختیار کر لیتا ہے جب گدلا پانی برسات کے موسم کے دَوران دریا میں جا کر بہتا ہے۔ خشک اور نیم خشک علاقے میں جہاں بارش کم اور بے قاعدہ ہوتی ہے زمین کے اعلیٰ تر مواد کا بڑا حصہ اُن نہایت تیز رفتار ہواؤں سے اُڑ جاتا ہے جو مون سون سے قبل علاقے میں چلتی ہیں۔ اس سے ہوا اور ماحول میں آلودگی پیدا ہوتی ہے۔

زمین کی زرخیزی پر بُرا اثر

زراعتی زمین کو جب بہت زیادہ مصنوعی کھاد دی جاتی ہے تو اُس سے اُڑنے والے نائٹریٹ سے پانی کی سپلائی بڑے پیمانے پر آلودہ ہو جاتی ہے اُس سے فصلوں کی نشوونما کو مزید نقصان پہنچتا ہے۔

پینے لائق پانی میں نائٹریٹ اپنے طور پر کیمیاوی خطرہ ہیں۔ آنتوں میں بعض بیکٹیریا انھیں "نائٹرائٹ" میں منتقل کرتے ہیں جو خون میں پہنچنے کے بعد اس کی آکسیجن بردار صلاحیت یا خون کے خلیوں میں ہیموگلوبن کو تباہ کر دیتے ہیں جن بچّوں کی غذائی اشیاء ایسے پانی سے تیار کی جاتی ہیں انھیں بہت زیادہ نقصان پہنچتا ہے اور کئی تو دم گھٹنے سے بھی مر جاتے ہیں کیمیکل صنعت کی مصنوعات اور ان کے فاضلات زمین کی زرخیزی کو بحال نہیں کرتے۔ بلکہ وہ اُسے کم کرتے ہیں اور اگرچہ مختصر وقت کے لیے پیداوار بڑھ جاتی ہے۔ تاہم اُس کی پیداواری قوت کم ہو جاتی ہے۔ کیمیاوی کھاد سے پودوں کی نشوونما اور افزائش پر بھی اثر پڑ سکتا ہے اور وہ کیڑے مکوڑوں کے حملوں کے لیے زیادہ حساس ہو سکتے ہیں۔

آبپاشی سے آلودگی

آبپاشی کی سہولیات میں اضافے سے شور زمین اور پانی کے رکاوٹ کے مسائل پیدا ہوتے ہیں جن رقبوں میں آبپاشی کی جاتی ہے وہاں کیمیاوی کھاد کی نقل وحرکت زیادہ تیز ہو جاتی ہے اور غالباً وہاں کیمیاوی کھاد کی آلودگی بھی بڑھ جاتی ہے۔

ہم گاہے گاہے پڑھتے رہتے ہیں کہ ہمارے ملک کے بعض حصوں میں اچانک سیلاب آنے یا باندھ کے ٹوٹنے سے جان ومال کا بھاری نقصان ہوتا ہے۔ باندھوں، آبی ذخیروں، جھیلوں اور نہروں سے کام لینے اور اُن کی دیکھ بھال میں ہر برس بہت بھاری رقم خرچ کی جاتی ہے۔

پودوں کی مدافعتی قوت میں کمی؛ مکئی کی فصل نے گذشتہ ۳۰ برسوں میں چند وجوہات سے عظیم تر ترقی کی ہے۔ یقین کیا جاتا ہے کہ مکئی جھلسی ٹیوسنٹس (ایک قسم کی گھاس) سے پیدا ہوتی ہے۔ میکسیکو کے مکئی کے کھیتوں میں ٹیوسنٹس کی مسلسل موجودگی سے ایسی مخلوط تولیدی خاصیتیں بڑھ گئی ہیں جس سے مکئی کی پیداوار میں بھاری اضافہ ہوا ہے۔ اب یہ ایک افسوسناک امر ہے کہ ٹیوسنٹس تیزی سے ختم ہوتی جا رہی ہے۔

جب کاشتکار کیڑے مار کیمیکلوں یا دوسرے طریقوں کو بروئے کار لا کر مصنوعی طور پر پودوں کا تحفظ کرتے ہیں تو کاشت اور کٹائی کے دَوران پودوں کی قوّت مدافعت غیر شعوری طور پر ختم ہو سکتی ہے۔ جن پودوں کی کارکردگی اور عملوں پر دباؤ نہیں پڑتا وہ عام طور پر زیادہ مستعدی سے کیڑے مکوڑوں کے حملوں کی مزاحمت کرتے ہیں۔ اور جس کیمیکل سے اُن کی قدرتی کارکردگی میں تبدیلی آتی ہے اُس سے پودوں کے زیادہ حساس ہونے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔

اُن زمینوں کی جہاں ایسی ٹکنالوجیاں استعمال کی جاتی ہیں جو مذکورہ بالا ماحولی مسائل کے لیے ذمہ دار ہیں۔ درحقیقت غذائی پیداوار بڑھ گئی ہے۔ خواہ یہ غیر نامیاتی نائٹروجن فرٹیلائزر کا استعمال ہے یا زیادہ پیداوار دینے والی اقسام کا فروغ یا ضرر رساں کیڑے مکوڑوں اور امراض پر کنٹرول، ان میں سے بیشتر مستحکم معاشیات والے اسباب ٹکنالوجیکل پیش قدمیوں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ماحول آلودگی کا باعث بنتے ہیں۔ اگر ہم ان موجودہ رجحانات میں سے بعض کو درست نہیں کریں گے یا کوئی دانشمندانہ راہ اختیار نہیں کریں گے تو قدرت کا از سرِ نو تقسیم کا سخت ہاتھ ہماری گردن پر پڑنا یقینی ہے۔ ہم ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں (قدرتی) قانون اور امن کا دَور دورہ ہے اور ہر نتیجے کا کوئی نہ کوئی سبب موجود ہے۔ ہمیں انجام کار قدرت کے اٹل قوانین کی مسلسل خلاف ورزی کی پاداش بھگتنی ہوگی اگر ہم اپنی غلطیوں کو درست نہیں کریں گے اور دانشمندانہ راہ اختیار نہیں کریں گے۔ ہمیں اس طرح سوچنے، پلان بنانے اور کام کرنے کی ضرورت ہے جس سے فطری توازن برقرار رہے۔ اگر ایسا ہو سکے تو عمل درآمد کرنے والے ادارے زمینوں پر استعمال ہونے والی ٹکنالوجیوں سے برآمد ہونے والے بیشتر نتائج کی سنگینی کا اندازہ کر سکیں گے۔ ★

نوجوانوں کا بین الاقوامی سال

نوجوانوں تمہیں تمہارا سال مبارک
یہ سال تمہارا ہے
صرف تمہارے نام
تمہیں لگن اور حوصلے کا
پیام دیتا ہے
لیکن پھر بھی ہم میں سے چند
ہمیشہ کی طرح
آوارہ گھوم رہے ہیں
مستی میں جھوم رہے ہیں
کچھ اپنے بزرگوں کا
مذاق اڑا رہے ہیں
پرانی قدروں کی
ہنسی اڑا رہے ہیں
نوجوانوں تمہیں تمہارا سال مبارک
آگے بڑھو، بڑھتے چلو
منزل تمہاری ہے
چمن تمہارا ہے
وطن تمہارا ہے
گگن تمہارا ہے
لیکن اتنا خیال رہے
کل تمہیں بھی بوڑھا ہونا ہے
اس لئے نوجوانوں
تمہارے عالمی سال میں
کسی بزرگ کو تکلیف نہ ہو

منظر اختر انصاری

غزل

محفل میں میرا ہونا یقین تھا گماں نہ تھا
لیکن میں آج رات جہاں تھا وہاں نہ تھا
سوچا تو ایک شخص نظر آیا گھات میں
دیکھا تو کوئی اس کے مرے درمیاں نہ تھا
پوچھو نہ زندگی کا سفر کیسے طے کیا
سورج تھا تیز اور کوئی سائباں نہ تھا
ہر اک ہوا میں ٹوٹ کے گر جائے اے خدا
ایسا تو خستہ حال مرا بادباں نہ تھا
یوں تو نیاز اس سے بڑی رسم و راہ تھی
مجھ سے بچھڑ کے روئے گا اس کا گماں نہ تھا

نیاز اعظمی

ضبط تولید

یہ فسانہ نہیں حقیقت ہے
ضبط تولید اک ضرورت ہے
چار چھ کی تو بات ہی چھوڑو
دو سے بڑھنا بھی اک حماقت ہے
اِک مصیبت ہے کثرتِ اولاد
گویا کثرت ہی اک مصیبت ہے
کس قدر بڑھ رہی ہے آبادی
آج خطرے میں پورا بھارت ہے
شور برپا ہے گھر میں دیکھو تو
کتنے بچوں کی یہ شرارت ہے
خاندان، جتنا ہو مختصر اچھا
یہ بھی اِک وقت کی ضرورت ہے
گھر کے بچے اگرچہ ہیں دولت
زیادہ دولت مگر مصیبت ہے
پھول دو ہوں جہاں بھی اے مختار
ایسا آنگن تو باغ جنت ہے

مختار ٹونکی

غزل

تھوڑا سا سکوں طبعِ پریشان میں رکھ دے
ٹکڑا کوئی بادل کا بیابان میں رکھ دے
دکھلانے کے قابل نہیں یہ زرد سا چہرہ
کچھ سرخ لہو بھی مری شریان میں رکھ دے
قطرے سے پشیمان ہے میری تنک آبی
دریا کو مرے وسعتِ طوفان میں رکھ دے
شعلوں سے نچوڑوں گل و لالہ کی طراوت
کچھ ایسی کرامت کفِ امکان میں رکھ دے
دل خون نہ کر دیں غمِ دوراں کے شب و روز
کچھ اپنا تصور بھی مرے دھیان میں رکھ دے
تو گھر سے نکل ریشمی ملبوس پہن کر
زخموں کی قبائیں مرے سامان میں رکھ دے
وابستہ ہو مجھ سے نئی صبحوں کی بشارت
خورشید کوئی چاکِ گریبان میں رکھ دے
اے موجِ قلم ان لب و عارض سے اڑا کر
کچھ رنگِ بہاراں مرے دیوان میں رکھ دے

سردار شفیق

مدن لعل منچندا

بکھرتے خواب

"نیرو"

میں چونک کر پلٹی۔ آواز تو کچھ جانی پہچانی سی تھی۔ لیکن دو تین بار آنکھیں جھپکانے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ شاید میرے گلاسز کے نمبر میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ میں نے عینک الگ کرتے ہوئے اپنے ذہن پر زور دیا۔

"آپ" میں نے قدرے تامل سے پوچھا۔

"جی" ایک باریک سی آواز ابھری۔ لیکن بدلے ہوئے تیور صاف صاف کہہ رہے تھے۔

"کیوں بن رہی ہو آنٹی، کیا نئی ہیوی سٹائل نے نئی میڈم کا سر پھیر دیا ہے جو جان بوجھ کر اندھی بن رہی ہو۔"

"او تو" میرے منہ سے بے اختیار نکلا اور میں اپنے ہونٹوں پر ایک دلآویز مسکراہٹ لاتے ہوئے اپنی دیرینہ سہیلی سرلا کے گلے جا لگی۔ میری گرمجوشی نے سرلا کے چہرے کی آڑی ترچھی لکیریں تو غیر ہموار کر دیں لیکن میں دل ہی دل میں بے حد شرمسار تھی۔ نہ جانے سرلا میرے بارے میں کیا خیال کرے گی۔

کالج میں ہم دونوں ایسے رہتی تھیں جیسے دو سگی بہنیں۔ اس ربط کی دو بڑی وجوہ یہ تھیں کہ ہم دونوں پڑھائی میں کافی ہوشیار تھیں۔ امتحان میں بھی اوّل پوزیشن ہمیں میں سے کسی کی ہوتی تھی۔ نہیں بلکہ شرارتوں میں بھی ہماری حیثیت ایک ہمجولی کی تھی۔ ہماری ذہنی اختراع نے کالج میں شرارتوں کے ایک ایسے سلسلے کی ابتدا کی تھی کہ اچھے اچھوں نے کان کو ہاتھ لگا لیا تھا۔ کالج کے کئی لڑکوں کو ہم نے فرضی محبت نامے بھیج کر بُدھو بنایا تھا اور کئی ایک کو معموں کے صحیح حل کے انعامات کے جعلی تار بھجوا کر فُول بنایا تھا۔ حتیٰ کہ ایک پروفیسر صاحب بھی ہماری ان چھوٹی موٹی اسکیموں کا شکار ہوتے ہوتے بچے۔ ان کارناموں کی بدولت ہم دونوں کالج کے لڑکوں کے لیے ایک اچھا خاصا خطرہ بن چکی تھیں۔ سبھی ہم سے ذرا گھبراتے تھے۔

لیکن پریم کے مقابلے میں نہ جانے ہمیں کیوں شکست ہوئی۔ اُس کے خلاف ہماری سب اسکیم ناکام ہوئی اور ہمیں ہر محاذ پر مُنہ کی کھانا پڑی۔ پریم بلا کا ذہین تھا، وہ ہماری ہر چال کو پہلے ہی بھانپ لیتا تھا اور اُسے ناکام بنا دیتا تھا۔ ہمیں اپنی ناکامی پر اکثر خفت اٹھانا پڑی۔ بلکہ ایک دو مرتبہ تو ہم اپنی چالوں میں خود ہی پھنس کر رہ گئیں۔

پریم لڑکوں میں بے حد ہر دلعزیز تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک اچھا کھلاڑی بھی تھا۔ اور کالج کی ہاکی ٹیم کا کپتان ہونے کے علاوہ وہ کالج کی ڈی بیٹس سوسائٹی کا جنرل سکریٹری بھی تھا۔

کالج کی بیشتر لڑکیاں بھی پریم کی پرستار تھیں۔ لڑکیوں میں اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے بارے میں واضح طور پر کچھ کہنا تو شاید مشکل تھا۔ کیونکہ ان پری چہروں کے لیے اس کی کسی بھی ادا پر جان دینا ایک معمولی سی بات تھی۔ لیکن بالعموم ایسا خیال کیا جاتا تھا کہ اس کی بھنوری مائل نیلی آنکھیں جو ہو بہو ہالی وُڈ کے مشہور اداکار کرک ڈگلس جیسی تھیں، اُس کی ہر دلعزیزی کا باعث تھیں۔ یوں بھی وہ ایک لمبے اور چھریرے بدن کا وجیہہ جوان تھا۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر اس کی دلچسپ اور میٹھی باتیں تھیں جو دل کو موہ لیتی تھیں۔ وہ ایک حد تک بے تکلف ضرور تھا لیکن کسی لڑکی کو لفٹ دینے میں وہ کبھی بھی سیریس نہیں تھا۔ لیکن کبھی بات کا بن جانا ایک قدرتی اور فطری امر ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ وہ نہ بننے والی بات کو بھی ایک حسین موڑ پر لا کر چھوڑ دینے کا عادی تھا۔

"خوبصورت کون؟ مرد یا عورت" اس موضوع پر ایک شام ہمارے کالج میں مباحثہ تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ موضوع کی دلچسپی دوسرے کالج کے طلبا کو بھی کھینچ لائی تھی۔ لڑکیاں بھی ایک خاصی تعداد میں موجود تھیں۔ سرلا بھی اس مباحثے میں حصہ لے رہی تھیں۔ اُس کے اسٹیج پر آتے ہی سب کی نظریں اُس کی طرف اٹھیں۔ وہ سیاہ بارڈر والی سفید ساڑھی میں بیحد اسمارٹ نظر آ رہی تھی۔ اسٹیج کی تلملاتی لائٹ میں اُس کی ابروؤں پر پنسل سے بنے ہوئے سیاہ ڈورے واضح طور پر نمایاں ہو رہے تھے اور اُس کا سفید چہرہ اور بھی نکھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

اُس نے نسوانی خوبصورتی کی برتری کے حق میں عالمی تواریخ سے مثالیں پیش کیں اور بتایا کہ کیسے عورت نے حُسن کی ایک جھلک پانے کے

لیے ملکومتیں پلٹ دی گئیں۔ آبادیاں جلا کر راکھ کر دی گئیں۔ ہزاروں۔ بڑی بیڑے لڑائی میں جھونک دئے گئے۔ ایک حسین چہرے کی خوشنودی کی خاطر مردوں نے وحشی جانوروں کا مقابلہ کیا۔ اور ایک حسینہ کے رومال کی خاطر ایک من چلے نے شیر کی ماند میں ہاتھ ڈال دیا۔ شاعر کے تخیل کی پرواز مصوّر کے شاہکار کی روحِ رواں عورت ہی ہے۔ افسانہ نگار کی ہر تخلیق میں عورت کے حُسن کا پرتَو جھلکتا ہے۔ اون کے ہر بنڈل کا لیبل۔ ڈبّہ پاؤڈر کے ہر ٹیوب، صابن کی ہر ٹکیا، وائل کے ہر تھان پر عورت ہی کا حُسن جلوہ گر ہے۔ گویا عورت ہی قادرِ مطلق کی حسین ترین تخلیق ہے۔

چاروں طرف سے تالیوں کی گونج سُنائی دی۔ عورت کے حُسن سے بھلا کون منکر ہو سکتا تھا۔ اور پھر سرلا کا اندازِ بیان بھی کوئی کم قابلِ تعریف نہ تھا۔ سامعین نے سرلا کو جی بھر کر داد دی۔

ہال ابھی تالیوں سے گونج رہا تھا کہ پریم کُود کر اسٹیج پر پہونچ گیا اور ایک مشاق سپیکر کی طرح مائیک کے قریب خاموش کھڑا ہو گیا۔ دھیرے دھیرے تالیوں کی گونج کم ہوتی گئی۔ حتّٰی کہ چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ اُس نے ڈرامائی انداز میں بولنا شروع کیا۔

"میں کہتا ہوں آپ کو سو فیصدی دھوکا ہوا ہے۔ آپ کی اپنی آنکھوں نے ہی آپ کو دھوکا دیا ہے۔ انسان حُسن کی پرکھ میں آپ اپنی بصیرت کھو چکے ہیں۔ آپ اس معاملے میں ہپناٹزم کے زیرِ اثر ہیں۔ اس لیے میں آپ کو اپنے لامحدود دائرے سے باہر لے جانا ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ قدرت کے بنائے ہوئے ذرا دوسرے جوڑوں پر نظر ڈالیں۔ مُرغے اور مُرغی کو دیکھیے، مور اور مورنی، بیل اور گائے، شیر اور شیرنی اور آپ خود ہی اپنے دل میں فیصلہ کیجئے کہ قدرت کے بنائے ان لاتعداد جوڑوں میں سے آپ کو نر دلکش نظر آتا ہے یا مادہ۔ آپ یقیناً متفق ہوں گے کہ زیادہ دلکش اور حسین نر ہی ہے۔ اس لیے آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ خالقِ قدرت نے انسانی جوڑے کی تخلیق میں کوئی غلطی نہیں کی ہے۔

اس لیے اگر آپ مرد کے مقابل عورت کو حسین تصوّر کرنے کی غلطی کا مرتکب ہو چکے ہیں تو یہ بلاشبہ آپ کی نظر ہی کا دھوکا ہے۔"

ابھی پریم نے بولنا بند بھی نہیں کیا تھا کہ کالج کے شرارتی لڑکوں نے واہ، واہ اور ویل ڈن کے نعروں سے ہال سر پر اٹھا لیا۔

کافی دیر بعد جب مباحثہ ختم ہوا تو میں اور سرلا ہال سے باہر آئیں اور چُپ چاپ ہاسٹل کی طرف بڑھ گئیں۔ جب ہم ٹک شاپ کے موڑ سے ہاسٹل کے بائی لین میں داخل ہوئیں تو پیچھے لڑکوں کے گروپ کی کھسر پُھسر کے درمیان ایک آواز بلند ہوئی جو ہمارے کانوں تک بھی پہنچ گئی اور اس کے ساتھ ہی پریم کا ایک قہقہہ۔ ایسی کئی تضحیک آمیز باتیں ہم لڑکیوں کے کانوں میں اکثر پڑتی رہتی ہیں اور ہم سُنی اَن سُنی کر کے چل دیتی تھیں۔ میں نے اور سرلا نے یونہی پلٹ کر دیکھا، لڑکوں کا گروپ ٹک شاپ میں جا چکا تھا۔ سرلا تیز تیز قدموں سے ہاسٹل میں داخل ہوئی اور تیزی سے اپنا کمرہ کھولتے ہوئے چارپائی پر گر پڑی۔ میں قریب ہی کُرسی پر بیٹھ گئی۔

"سرلا، تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"ہاں" اُس نے ایک لمبی آہ کھینچی اور پھر بولی

"وہ ہوتے کون ہیں ایسی باتیں کرنے والے۔"

"ان شرارتی لڑکوں میں سے تم کس کس کا مُنہ روکو گی۔"

"لیکن مجھے تو اُس بد تمیز پر غصّہ آ رہا ہے۔"

"کس پر؟"

"بد تمیز پریم پر جسے ہنسنے اور بات کرنے کا شعور نہیں۔" اُس نے اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔

"میں اُسے سبق سکھا کر چھوڑوں گی۔"

"ڈیر تم ناحق جذباتی ہو رہی ہو اور پھر میرے خیال میں پریم کا کوئی خاص قصور تو نہیں ہے۔"

دوسرے دن جب میں اور سرلا کالج کے پارک میں ٹہل رہی تھی تو ٹینس کورٹ سے پریم آتا ہوا دکھائی دیا۔ قریب آتے ہی ہمیں مسکرا کر ہیلو کہا۔ کل رات کا قصّہ یاد آتے ہی میں نے چُپ سادھ لی، اور نظریں نیچی کئے اس بات کا انتظار کرنے لگی کہ دیکھیں سرلا کا کیا ردِّ عمل ہے۔ اور شاید وہ میری ہی طرح چُپ رہ کر اپنے غصے کا اظہار کرے۔

"ہیلو، سرلا کی آواز سُن کر میں حیران سی ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ سرلا کے چہرے پر غم و غصہ کے بجائے ایک دلفریب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور پریم کی سنہری مائل نیلی آنکھیں جو اُس کے سپورٹس کورٹ سے میچ کر رہی تھیں۔ میری طرف بلاوجہ گھور رہی تھیں پریم کے چلے جانے کے بعد میں نے سرلا کی تعریف کی۔

"ڈیر تم واقعی بڑی ٹیکٹ فل ہو۔" سرلا کا چہرہ بھی کھِل اُٹھا۔

دن گذرتے گئے۔ ہمارا فائنل امتحان قریب آ گیا۔ ایک روز میں درخت کے تنے سے لگ کر اپنی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھی اور قریب ہی درخت کی اوٹ میں سرلا بھی گھاس پر بیٹھی اپنی کتابوں میں جُٹی ہوئی تھی۔ میں اتنی محو تھی کہ ماحول سے بالکل بے خبر تھی۔ اچانک کسی کے قدموں کی آہٹ پا کر میں چونکی اور سامنے پریم کو کھڑے پایا۔ میں ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ وہ کاغذ کا ایک پُرزہ میرے ہاتھ میں تھما کر اپنے لمبے لمبے قدموں سے واپس چلا گیا۔ میں نے گھبراہٹ اور تجسّس کے ملے جلے جذبے میں پرچے کو کھولا۔ پہلا لفظ پڑھتے ہی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، "ڈیر" کے لفظ کے گرد دائرے گھومتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اور میں مزید کچھ نہ پڑھ سکی۔ سرلا بھی غالباً آہٹ پا کر درخت کی اوٹ سے سامنے آ گئی تھی۔ میں پریم کے اس رویے پر حیران تھی۔ میں نے کبھی اُسے لفٹ نہیں دی تھی۔ سرلا کے بارے میں اگرچہ میں کچھ وضاحت سے تو نہیں کہہ سکتی تھی۔ لیکن اگر پریم کو کسی سے راہ و رسم تھی تو وہ سرلا ہی تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے وہ کاغذ

کا پُرزہ سُرلا کی طرف بڑھا دیا۔
سُرلا جیسے پہلے ہی منتظر تھی، اُس نے وہ کاغذ کا پُرزہ فوراً لے لیا اور پڑھنے لگی۔ وہ پڑھتی جا رہی تھی اور اُس کی بھنویں تن کر کمان ہوتی جا رہی تھیں۔ اُس نے ایک معنی خیز نظر مجھ پر ڈالی۔

"اوہ، تو یہ بات ہے؟"

"کیسی بات؟"

"ڈیر، تم نے پہلے ہی بتا دیا ہوتا کہ تم سیریس ہو" اُس نے وہ کاغذ کا پُرزہ لوٹاتے ہوئے کہا۔

"نان سینس" میں اُس کی مشتبہ نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے بولی اور اُس کاغذ کے پُرزے کو بغیر پڑھے ہی اُس کے سامنے پھاڑ کر پھینک دیا۔

ہم فائنل کی تیاری میں مصروف تھیں۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ امتحان کے بعد ہم ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے۔ ہمارے راستے الگ الگ تھے۔ میں نے میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے لیا۔ اور برسوں ہماری ملاقات نہ ہو پائی۔ بلاشبہ سُرلا سے ملاقات کے لیے میں بے تاب رہی۔ اور وہ شروع شروع میں تو مجھے بیحد یاد آئی وہ کتنی اسمارٹ تھی۔ اُس کی جسمانی خوبصورتی کا تصور برسوں میرے ذہن کے پردے پر جھلملاتا رہا اور خالی لمحات میں مجھے اس دلچسپ مباحثے کی یاد دلاتا رہا۔ وہ میرے لیے ایک آئیڈیل سے بھی بڑھ کر ایک ماڈل کی حیثیت رکھتی تھی۔ ایک حسین تاج محل لیکن آج اس اتفاقیہ ملاقات پر یہ حسین تاج محل یکایک گر کر مسمار ہو گیا تھا۔ وہ کتنی دُبلی پتلی تھی۔ اور اب کتنی بے ڈھب لگ رہی تھی۔ اُس کے فربہ پن نے میری آنکھیں چندھیا دی تھیں اور وہ پہچان میں نہیں آ رہی تھی۔

اس اتفاقیہ ملاقات سے پُرانی یادیں تازہ ہو اُٹھیں۔ لیکن پارٹی کے دوران میں اپنے خیالوں میں گم سُم سُرلا کے فربہ جسم کے بارے میں زیادہ سوچتی رہی۔ وہ سُرلا جو ایک ماڈل تھی آہ بالکل ایک مریضہ لگ رہی تھی۔ وہ شوخیاں اور رعنائیاں سراسر غائب تھیں۔ جسم میں نہ وہ [illegible] بجلیاں، نہ رگ و پے میں وہ خون [illegible]

اور ڈھیلا جسم میرے ذہن کے پردوں پر ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ میں اس عبرتناک جسمانی تبدیلی کی ممکن وجوہات کا جائزہ لیتی رہی۔ ذہنی بیزاری سے بھوک تیز تر ہو جاتی ہے جس کا آسان سا [illegible] ہے۔ نفسیاتی طور پر موٹاپے کا تعلق زندگی کی کسی فرسٹریشن سے نہایت گہرا ہوتا ہے۔

میرا ذہن تیزی سے اس سمت سوچ رہا تھا۔ سُرلا کے چہرے پر سوچ کی کچھ گہری پرچھائیاں تھیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ اُس کے ذہن میں بھی کچھ انتشار تھا۔ بظاہر خاموش چہرے کے پس پردہ کوئی طوفانی ہلچل بپا تھی۔

پارٹی ختم ہوئی اور مہمان اِدھر اُدھر منتشر ہونے لگے۔ کاروں کے ہارن یوں ایک ساتھ بجنے لگے کہ جیسے کئی گینڈے جنگل کی خاموش فضا میں اکٹھے چیخ رہے ہوں۔ سُرلا مجھے سڑک کے پار ایک طرف کو کھینچ کر لے گئی اور نہایت رازدارانہ انداز میں پوچھنے لگی۔

"وہ کیسے ہیں؟"

"وہ کون اور کیسے کیا؟؟" میں مُسکرائی۔

"میرا مطلب پریم سے ہے" اُس نے جھلا کر کہا۔

"پریم! — مجھے کیا خبر۔"

"تو وہ شادی کا مشترکہ دعوت نامہ کس نے بھجوایا تھا" سُرلا کی متجسس نگاہیں سرچ لائیٹ کے قمقمے کی طرح روشن ہو اُٹھیں۔

"میری تو اُس سے اُس دن کے بعد ملاقات تک نہیں ہوئی۔"

"نہیں — تو کیا یہ محض پریم کی ٹرِک تھی۔"

اُس نے ایک لمبی سانس لی — جیسے اُس کے سر سے کوئی بھاری وزن گر گیا ہو، اُس نے بڑھ کر مجھے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ لیکن اُس کے روئی سے بھی زیادہ نرم جسم سے لگتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں ڈنلپ پیلو ربڑ فوم میں دھنسی جا رہی ہوں لیکن اُس کے جسم کی یہ اذیت ناک نرمی میرے تخیل میں کانٹے چبھو رہی تھی اور مجھے رہ رہ کر یہ خیال ستا رہا تھا کہ کہیں پریم اس ملکۂ حسن کو دیکھ لیتا تو کیا کہتا۔ ★

ادارہ

اِدھر اُدھر سے

وقت کا تقاضا ہے کہ ایک جامع قومی مواصلاتی پالیسی وضع کی جائے جو ان حدود کی نشاندہی کرے جس کے اندر سرکار، پریس، الیکٹرانک ذرائع ابلاغ اور پیام رسانی اپنا متعین کردہ کردار ادا کریں۔ صرف اس قسم کی پالیسی سے ایک صحت مند، متحرک، ترقی پسند اور پیش بین معلوماتی نظام قائم ہو سکتا ہے۔ اخبارات کی نکتہ چینی حقائق پر مبنی ہونی چاہیئے نہ کہ سنی سنائی باتوں، افواہوں اور گپوں پر۔ پریس آزاد ہونا چاہیئے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ پریس ذمہ دار، صحت مند ہو اور کسی کی مدد پر نہ چل رہا ہو۔ ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملک میں پریس کا مناسب رول ترقی کے عمل میں مدد دینا ہے۔

(شری وی۔ این۔ گیڈگل کی ایک تقریر کا اقتباس)

اگرچہ سڑکوں کے ذریعہ نقل و حمل کو ایک بنیادی طور پر اہم شعبہ تسلیم کیا جاتا ہے، تاہم اس شعبے کی ضرورت کے مطابق رقوم کی تخصیص نہیں کی جاتی۔ اس لیے سڑکوں کی تعمیر و ترقی کے پراجیکٹوں کے لیے غیر روایتی طریقوں سے سرمائے کی فراہمی کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اگر سڑکوں پر چلنے والی گاڑیاں معمولی سی احتیاطی تدابیر بھی اختیار کریں اور سلامتی کے اصولوں پر سختی سے کاربند رہیں تو سڑکوں پر ہونے والے حادثات میں نمایاں کمی لائی جا سکتی ہے۔

(نقل و حمل کے محکمے کے سکریٹری مسٹر پد کاشی نراین کی تقریر کا اقتباس)

ہماچل میں باغبانی اور جنگلات کی ایک مکمل یونیورسٹی قائم کی جائے گی۔ اس یونیورسٹی کے قیام سے ریاست میں باغبانی اور جنگل بانی کے عمل کو تقویت ملے گی۔

(مرکزی وزیر زراعت شری بوٹا سنگھ)

مویشیوں کی افزائش نسل سے بھارت کی معاشیات میں [illegible] کے دوران مجموعی طور پر [illegible] کروڑ روپے کی مالیت کا اضافہ ہونے کی توقع تھی جو زراعت سے ہونے والی مجموعی پیداوار سے ہونے والی [illegible] کروڑ روپے آمدنی کا [illegible] فیصد تھا۔

(زراعت اور کوآپریشن کے محکمے کی سالانہ رپورٹ)

کوئلے کی افادیت

ہندوستان میں ایک اندازے کے مطابق کوئلے کے ذخائر ۱۴۴۴۰۰ ملین ٹن ہیں۔ چھٹے منصوبے میں کوئلے کے استعمال اور اس کی حصولی کو بڑھانے کے لیے ایک پروگرام شروع کیا گیا ہے۔ جس کے مطابق ۸۵-۱۹۸۴ تک ملک میں کوئلے کی پیداوار بڑھ کر ۱۶ کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن ہو جائے گی۔ اس پروگرام کے تحت کان کنی کے جدید ترین طریقوں سے استفادے پر زور دیا جائے گا اور کوئلے کے نئے ذخیروں کی دریافت کے لیے کوششوں کو بڑھایا جائے گا۔ نیز کانوں میں مشینوں کے استعمال سے ان کی صلاحیت بڑھائی جائے گی تاکہ کوئلے کی حصولی باسانی اور باکفایت طریقے پر ہو سکے۔

انرجی کا ایک متبادل ذریعہ شمسی توانائی ہے۔ ہندوستان اور دیگر بہت سے ملکوں میں سورج کی روشنی بہ افراط ہے۔ سال میں ۲۵۰ تا ۳۰۰ دن سورج خوب چمکتا ہے۔ ملک کے زیادہ تر حصوں میں یہ روشنی میسر ہے۔ کم گریڈ کی گرمی سے شمسی توانائی آسانی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ تمام ملکوں میں بشمول ہندوستان کے انرجی بجٹ کا تہائی سے زیادہ حصہ اس گرمی کو پیدا کرنے پر خرچ ہوتا ہے جو سورج سے بآسانی مل سکتی ہے۔ شمسی توانائی سے بہت طرح سے کام لیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ٹھنڈا کرنے کے کام، مکانات کو ٹھنڈا رکھنے، ایر کنڈیشنر چلانے وغیرہ میں اس سے بجلی مدد مل سکتی ہے۔ سورج جب پوری آب و تاب سے چمکتا ہے تو مکانات وغیرہ پوری طرح سے ٹھنڈے کیے جا سکتے ہیں۔ ان کی وجہ سے بجلی کی مانگ زیادہ نہ رہے گی، اور بجلی کی تیاری سے متعلق گرڈ پر ذمہ داری کم ہو سکے گی۔ شمسی توانائی کو فوٹو وولٹکس کے عمل سے بجلی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ یہ سورج کی روشنی کو براہ راست بجلی میں تبدیل کرنے کا عمل ہے اس کا تجربہ سب سے پہلے ۱۹۵۰ کے بعد کیا جا سکا اس سے مدار میں گھومنے والے سیٹلائیٹ کو طاقت دی جا سکی۔ البتہ جب تک شمسی توانائی کی تیاری کی لاگت نہ گھٹائی جا سکے گی اُس وقت تک اس کے بڑے پیمانے پر استعمال اور عوام میں اس کی مقبولیت کے امکانات کم ہوں گے۔ اس کے لیے تکنیکی صلاحیت اور اس کی بڑے پیمانے پر تیاری درکار ہوگی۔ کچھ ریاستی سرکاروں کے نمائندوں اور انرجی کے فاضل وسائل کے موضوع سے متعلق کمیشن کے ماہرین پر مشتمل ورکنگ گروپ پچھلے سال قائم کیا گیا تھا تاکہ شمسی توانائی اور ہوا کے ذریعے حاصل ہونے والی توانائی کا بڑے پیمانے پر استعمال ہو سکے۔ پن چکیوں کو واٹر پمپوں سے چلانے کا عمل بڑے پیمانے پر شمسی توانائی سے شروع کرنے کی بڑی گنجائش ہے۔

حیاتیاتی فضلہ

اقتصادی ترقی کے پیش نظر نیز تجارتی استفادے کے لیے انرجی کے متبادل وسائل میں اضافے کے طور پر ہندوستان میں حیاتیاتی فضلے اور دیگر طرح کے کچرے وغیرہ سے استفادے کی بڑی گنجائش محسوس کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر گلے سڑے گوبر، انسانی فضلہ، کھیتوں وغیرہ سے حاصل ہونے والی گھاس اور دیگر بے کار اشیا اس سلسلے میں کارآمد ہو سکتی ہیں۔ اس وقت ملک میں ۸۵ ہزار بائیو گیس پلانٹ کام کر رہے ہیں اور انرجی کے فاضل وسائل نے متعلق کمیشن نے ۸۵-۱۹۸۴ میں ڈیڑھ لاکھ بائیو گیس پلانٹوں کو لگانے کی منظوری دی ہے۔ اس پروگرام کے تحت انرجی کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے میں مدد ملے گی۔ اور دیہی گھر ان سے بطور خاص استفادہ کر سکیں گے۔ اس سے ایندھن لکڑی پر زور کم رہے گا اور نامیاتی کھاد بھی مل سکے گا جو کہ کھیتی کے لیے بہت ضروری اور بیش قیمت ہے۔ ان کے استعمال سے دیہی علاقوں میں فضا کی کثافت بھی کم ہو سکے گی۔ نیز عورتوں کو کام کرنے میں سہولت رہے گی اور وہ چولہا پھونکنے کی مصیبت سے نجات پا سکیں گی۔ اس اہم وسیلے کو فروغ دینے کی بڑی گنجائش ہے۔ دیہی علاقوں میں اس سے استفادے کی ضرورت ہے۔ یہی نہیں بلکہ روشنی اور آبرسانی کے کام بھی اس سے لیے جانے کے امکانات واضح ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے سبب دیہی سماج اپنی ضرورتوں میں بڑی حد تک خودکفیل بن سکے گا۔ کچرے کے دوبارہ استعمال نیز انسانی فضلے اور مویشیوں کے گوبر کے دوبارہ سے استعمال کی تکنیک سے کھاد، میتھین گیس اور دیگر بہت سی اشیا تیار ہو سکتی ہیں۔ دیہی سطح پر اس طرح کا شعور اور بیداری ایک ایسا بنیادی ڈھانچہ فراہم کر سکے گی۔ جہاں قدرتی وسائل سے استفادہ کر کے انسانی زندگی کو خوشحال بنایا جا سکے گا۔

ایندھن

مستقبل میں ایندھن کی ضرورتیں ہائیڈروجن سے بھی پوری کی جا سکتی ہیں۔ یہ تیل کی بہ نسبت تین گنا زیادہ گرمی پیدا کرتی ہے۔ اس سے فضائی آلودگی کا خطرہ بھی نہیں ہے۔ اس کے لیے ہائیڈروجن کار کا نمونہ تیار کیا جا رہا ہے۔ اس پر انڈین انسٹی ٹیوٹ کانپور میں کام ہو رہا تھا۔ اسے سوئٹزر لینڈ کی فیڈرل انسٹی ٹیوٹ کا تعاون حاصل ہے۔ یہ انسٹی ٹیوٹ ری ایکٹر کی تحقیق کے کام کے لیے مشہور ہے اور یہ ایک پرائیویٹ کثیرالاقوام ادارہ ہے۔ یہ پراجیکٹ سوئس فیڈرل انرجی ریسرچ فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام چل رہا ہے۔ اس کار کی جانچ سوئٹزر لینڈ میں کی جا رہی ہے۔ اُمید ہے کہ یہ جلد ہی اپنا کام شروع کر دے گی۔

طاقتور لہریں

جہاں لہریں ۵ میٹر کی بلندی تک اچھلتی ہیں، ان سے بھی انرجی مل سکتی ہے۔ ہندوستان میں تین علاقے ایسے ہیں جہاں ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ خلیج کھمبات جہاں لہریں گیارہ میٹر کی بلندی تک جاتی ہیں، یہ دنیا کی سب سے اونچی لہروں میں ہیں۔ خلیج کچھ اور سندربن کا علاقہ جہاں لہریں سو میٹر کی بلندی تک جاتی ہیں۔ ★

R.N. 37052/81 — Licensed U(DN) 65 to post without pre-payment at Civil Lines Post Office, Delhi-110054.
Vol. 5. No. 5 — YOJANA (URDU) — 1-15th June 198

سید قمر حیدر رضوی بلوری

سائنس اور ٹکنالوجی

میں ہماری پیش رفت

"زندگی کی تمام سمتوں اور شعبوں میں سائنس نے انقلاب بپا کر دیا ہے۔ مستقبل اب سائنس کے ہاتھوں میں ہے اور ان کے جو سائنس کے دوست ہیں۔"

یہ مبنی بر حقیقت قول جدید ہندوستان کے معمار موجد مرحوم پنڈت جواہرلال نہرو کا ہے۔ دنیا میں بالعموم اور ہندوستان میں بالخصوص سائنس اور ٹکنالوجی کی رفتار ترقی و توسیع پچھلی ایک دہائی میں تعجب خیز حد تک بڑھ چکی ہے۔ گذشتہ دو برس میں علم البحر، علم الخلاء، نیوکلیائی توانائی اور کائنات و ماورائے کائنات نظر کی حدود کئی منزلیں طے کر چکی ہے۔ فلکیات، ہیئت اور نجوم نے خلاء کی حدوں کو بھی پار کر لیا ہے۔ آج ارضیات سے فلکیات تک اور بحر سے مہر تک ہمارے سائنسدانوں نے جو کمند ڈالی ہے، وہ بڑے بڑے ترقی یافتہ ممالک کے لیے بھی حیرت انگیز ہے۔ پہاڑوں کی سینہ تسگافی، سمندر کی تہوں سے ذرائع اور وسائل کو نکالنے سے لیکر قطب جنوبی پر اپنا پرچم لہرانے تک ملک کی تمام سائنسی میدانوں میں پیش رفت پورے عالم کے لیے اب باعث حیرت و رشک بنتی جا رہی ہے۔

مختصر یہ کہ ہندوستان سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں قطب جنوبی کے برفانی سمندر سے افلاک کی سربلند تسخیر تک اپنا رنگ جما چکا ہے۔ جوہری بھٹیوں میں ایندھن کے طور پر یورینیم کا استعمال، تیز توانائی کے بحران پر قابو پانے کے لیے شمسی توانائی کا استعمال بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

آج تک ہوئی سبھی سائنسی اور تکنیکی ترقیات کو دو لفظوں میں ادا کیا جا سکتا ہے، شدت اختصار اور سرعت رفتار، اسی محور کے گرد ساری جدید ترقیاں محو گردش ہیں۔

سمندر معدنیات کا لامتناہی خزانہ ہے اس میں ملنے والے تیل اور گیس کے علاوہ مینگنیز، نکل، کوبالٹ اور تانبے کے ڈلے اہمیت کے حامل ہیں۔ جنوری ۱۹۷۲ میں سرکار نے سمندری مطالعہ و تحقیق کے واسطے آئل اینڈ نیچرل گیس کمیشن کی بنیاد رکھی جس کے مزید علاقائی مراکز کوچین، بمبئی اور والیئر میں ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں پہلے تحقیقی ملکی جہاز "گویشنی" نے سمندری سائنس میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ ایندھن کے روایتی اور مروجہ وسائل کے مائل بہ زوال ہونے کی وجہ سے طوفان، سمندر کی لہروں اور اس کے پانی کے مختلف درجۂ حرارت سے نمایاں توانائی حاصل کرنے کی کوشش جاری ہے۔ مغربی ساحل پر وزنی معدنیات میں رتناگیری کے مقام پر المینائٹ اور کیرالا میں مونازائٹ و المینائٹ کے ذخائر ملے ہیں۔ بمبئی میں پٹرولیم گیس کے ذخیروں کی دریافت کے بعد اب گجرات کے مقام پر اور کچھ میں مشرقی کنارے پر اسی طرح کی کھوج ہوئی ہے۔

ملکی جہاز "سمندر منتھن" نے سمندر کی تہوں سے معدنیات کی تفتیش شروع کر دی ہے۔ مغربی جرمنی سے خریدے گئے تحقیقی جہاز "ساگر کنیا" کا کام بحیرۂ عرب میں شروع ہو چکا ہے۔ اس سے موسمیات، طوفان، بارشوں اور دوسرے اثرات کو بآسانی جانا جا سکے گا۔ دسمبر ۱۹۸۱ء میں سائنسدانوں نے ناروے کے جہاز "پولرسرکل" پر ڈاکٹر ظہور قاسم کی سربراہی میں پہلا قطب جنوبی کا سفر کامیابی کے ساتھ پورا کیا، ان لوگوں نے وہاں ہوا کے درجۂ حرارت، دباؤ، نمی، رفتار اور رخ، سمندری سطح پر پائی جانے والی اوزون گیس، بادلوں کی نمود، بنفشائی شعاع زنی کے علاوہ جانوروں و پیڑ، پودوں کے متعلق مشاہدات کئے۔ ایک نئے پہاڑ کی دریافت کر کے اس کا نام "اندرا ماؤنٹ" رکھا مزید دکھشن "گنگوتری" نام کا ایک موسمیاتی اسٹیشن قائم کیا۔ یہاں بے شمار دولت پوشیدہ ہے۔ ۱۹۸۲ میں اسی جہاز پر ڈاکٹر وادیا کے رینا کی سربراہی میں ۲۰ ممبروں پر مشتمل ایک دوسرا قافلہ وہاں پہنچا اور اس نے ارضیات، ہیئت، موسم، نباتات وغیرہ کے ساتھ ہی ساتھ معدنیات کا مطالعہ کیا۔ دسمبر ۱۹۸۳ میں تیسرا قافلہ فن لینڈ کے جہاز "فنسی پولیرس" پر ڈاکٹر ایچ۔ کے گپتا کی سربراہی میں وہاں گیا اس بار دو خواتین سائنسداں بھی قطب جنوبی پر گئیں اس بار وہاں پر مستقل ریسرچ اسٹیشن کا قیام کیا گیا ساتھ ہی ساتھ بنیادی کیمپ اور جہاز درمیان ترسیلی و مواصلاتی کڑی کی تشکیل بھی کی گئی۔ ۱۲ ہندوستانی سائنسداں اب بھی وہاں تحقیق میں لگے ہوئے ہیں۔

اپریل ۱۹۶۱ میں خلاء میں جانے والے پہلے انسان روس کے یوری گگارین تھے۔ ہندوستان نے اس کے فوراً ہی بعد خلائی پرواز کی کوشش شروع کر دی لہذا ۱۹۶۱ء میں تھمبا سے موسمی تجربہ کے لیے ایک راکٹ خلاء میں چھوڑا گیا۔ جون ۷۰ء میں سرکار کی خلائی کارگزاریوں کے لیے صلاح و مشورہ دینے کے لیے انڈین اسپیس ریسرچ آرگنائزیشن کا قیام وجود میں آیا جس کا ہیڈ کوارٹر بنگلور میں ہے اس کا بنیادی مقصد ملک میں قومی یکجہتی، تعلیم، مواصلات اور مانسون کے وقت پر برسنے یا دیر سے بارش ہونے کے متعلق سائنسی معلومات، ملک کے قدرتی وسائل کی دریافت، موسمی جانکاری کی زراعت اور جنگلات میں مدد جیسے امور کو انجام دینا ہے۔ ۱۹۷۵ء میں آریہ بھٹ، ۱۹۷۹ء میں بھاسکر، خلاء میں چھوڑا گیا۔ مگر جولائی ۸۰ء میں ملکی راکٹ ہی سے روہنی۔ ا۔ سیارہ سری ہری کوٹہ سے چھوڑا گیا پھر مئی ۱۹۸۱ میں روہنی۔ ۲۔ اور جون ۱۹۸۱ میں ملک میں تیار ہونے والے پہلے تجرباتی، اطلاعاتی مصنوعی سیارے "اسپل" کو یوروپین راکٹ "ایرین" کے ذریعہ فرنچ گائنا سے داغا گیا۔ اس کے ذریعے ترسیلی مواصلاتی TV سگنلس کو حاصل کرنے اور موسم کے مطالعے کا کام [illegible] ہوا۔ نومبر ۸۱ء میں بھاسکر۔ ۲۔ اور اپریل ۸۲ء میں ملک کے مختلف مقصد والے مصنوعی سیارے "انسیٹ ون۔ اے" کو ساکت ارضی دائرے میں مقیم کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اپنے ملک کو سیاروں کا اقتصادی اور سماجی ترقی کے لیے استعمال کرنے والا دنیا کا [illegible] ملک بن جانے کا فخر حاصل ہوا۔

اپریل ۸۳ء میں روہنی۔ ۳۔ اور اگست ۸۳ء

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

یوجنا

۱۶ تا ۳۰ جون ۱۹۸۵ء

ایک روپیہ

ذہنی انتشار میں مبتلا یا دھوکے کے شکار؟

(اکمل نعیم کابرا)

حقیقت یا فریب

(ایس. کے. ڈے)

ساتویں منصوبے کا مسودہ

جولائی ۱۹۸۵ تک مل جانے کی توقع

جولائی ۱۹۸۵ کے آخر تک ساتویں پنج سالہ منصوبے کا مسودہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ منصوبہ بندی کمیشن کی سالانہ رپورٹ برائے سال ۸۵-۱۹۸۴ء میں کہا گیا ہے کہ ساتویں منصوبے کے مسودے کی تشکیل میں منصوبے کے تئیں انداز نظر، واضح کردہ پالیسیوں اور تقاضوں کی تکمیل کی خاطر کی جا رہی ہے۔ یہ دستاویز جولائی ۱۹۸۴ء میں قومی ترقیاتی کونسل کے سامنے رکھی گئی تھی۔ اس کونسل نے جب اسے منظوری دے دی تو پھر اسے ایوان میں پیش کر دیا گیا تھا۔

منصوبہ بندی کمیشن کے پلان کوآرڈی نیشن ڈویژن نے ساتویں منصوبے کے ابتدائی خد و خال تیار کیے تھے اور انھیں ستمبر ۱۹۸۳ء میں ریاستی حکومتوں کے پاس بھیجا گیا تھا۔ حتمی منظوری کے بعد مرکزی وزارتوں اور ریاستی حکومتوں کو تفصیلی رہنمایانہ خطوط ارسال کیے گئے تھے تاکہ ان کی روشنی میں ساتویں منصوبے کو تشکیل دیا جا سکے۔

ساتویں منصوبے میں مختلف پہلوؤں سے متعلق ۱۲۲ ورکنگ گروپ قائم کیے گئے تھے۔ تاہم پہلے سے متعلق ڈویژنوں نے منصوبہ بندی کمیشن کے شعبوں کو کچھ رہنمایانہ خطوط جاری کیے تاکہ ان ورکنگ گروپوں کی سفارشوں کی روشنی میں جائزہ رپورٹیں تیار کی جا سکیں۔ یہ رہنمایانہ خطوط مفید ثابت ہوئے اور سیکٹر وار نیز ذیلی سیکٹروں کی بنیاد پر ان ورکنگ گروپوں کی سفارشوں کو مرتب کرنے میں ایک مربوط نظام سامنے آ سکا۔

سالانہ منصوبے کی دستاویز میں جدت :-

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ یہ پہلا موقع ہے جبکہ ۸۵-۱۹۸۴ء کے سالانہ منصوبے میں چند جدتیں اپنائی گئیں۔ مقصد یہ کہ اسے زیادہ مفید اور واضح بنانے کے لیے کوشش کی گئی۔ اس دستاویز سے سیکٹر وار اور ذیلی سیکٹروں کے پلان اور پروگراموں کی نوعیت واضح ہوتی ہے۔ اس میں چھٹے منصوبے کے مصارف جو کہ پانچ سال میں ہوئے، وہ درج کیے گئے ہیں اور اس میں ۸۵-۱۹۸۴ء کے بجٹ میں شامل منصوبہ جاتی مصارف بھی شامل کیے گئے۔

ڈویژن کی سرگرمیاں

منصوبہ بندی کمیشن کی سب کی سب ۲۶ ڈویژنوں نے ساتویں منصوبے کے تئیں انداز نظر سے متعلق دستاویز تیار کی اور پھر سال کے دوران قومی ترقیاتی کونسل کے غور و خوض کے لیے اس دستاویز کو پیش کیا۔ ساتویں منصوبے کے وسائل کا جائزہ بھی ان ڈویژنوں نے لیا۔ ساتویں منصوبے کے پہلے سال اور چھٹے منصوبے کے آخری سال کے لیے بھی انھوں نے وسائل کا جائزہ لیا۔ انھوں نے مختلف ریاستی حکومتوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں اور مرکزی وزارتوں سے بھی تبادلۂ خیال کیا تاکہ ۸۶-۱۹۸۵ء کے سالانہ منصوبے کو آخری شکل دی جا سکے۔ جو کہ ساتویں منصوبے کا پہلا سال ہے۔ ساتویں منصوبے (۹۰-۱۹۸۵) کی تیاری کے لیے اور ۸۶-۱۹۸۵ء کے سالانہ منصوبے کے لیے منصوبہ بندی کمیشن نے ریاستوں، مرکز کے زیر انتظام علاقوں اور مرکزی وزارتوں سے وسائل کا تخمینہ طلب کیا۔ کمیشن نے ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے افسروں سے تبادلۂ خیال کیا تاکہ اتفاق رائے سے وسائل کا تخمینہ [illegible] اور مرکز [illegible] ہو سکے۔ [illegible]

[illegible] ساتویں منصوبے [illegible] کی گئی۔ [illegible] کے ایک حصے کے طور پر [illegible] کی [illegible] سال [illegible] کی رپورٹوں کی تیاری بھی اس سلسلے کی ایک اہم کڑی تھی۔ اس کے علاوہ ساتویں منصوبے میں [illegible] اور وسائل پر افراط زر کے اثرات کو بھی مد نظر رکھنا ضروری تھا۔

غریبی دور کرنے کے اقدامات

کمیشن کی کوشش کے طور پر وزارت زراعت نے قدرتی آفات سے نپٹنے کے لیے ایک تنظیم کے قیام کی تجویز پیش کی ہے۔ اس کے تحت قدرتی آفات سے نپٹنے کے واسطے چند اسکیمیں ساتویں منصوبے میں مرکز کے زیر اہتمام شروع کی جاتی ہیں۔ مثلاً طوفان اور باراں سے بچنے کے لیے پناہ گاہوں کی تعمیرات، طوفان باد و باراں اور موسمی پیشین گوئیوں کے نظام کو مزید مستحکم بنانا، طوفان سے متاثرہ افراد کی راحت کے لیے ضروری سامان کی خرید نیز عملے کی تربیت وغیرہ۔

کمیشن نے غریبی دور کرنے کے اقدامات سے متعلق چند دستاویزات بھی مرتب کیں۔ مثلاً غریبی دور کرنے کی اسکیموں کا دیہی معیشت پر اثر، روزگار کے خصوصی پروگرام اور [illegible] کے پروگرام [illegible] ترقی اور غریبی دور کرنے کے پروگرام [illegible] تنظیموں اور [illegible] اسکیموں [illegible] دیہی ترقی کا [illegible] وغیرہ وغیرہ۔ کمیشن نے [illegible]

اس شمارے میں

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر ❖ آر۔ ٹھکرال

ایڈیٹر ❖ لکھی رام رانا

اسسٹنٹ ایڈیٹر ❖ محمد عادل صدیقی

سب ایڈیٹر ❖ وسیم حیدر

جلد ۵ ۱۶ تا ۳۰ جون ۱۹۸۵ شمارہ ۶

۲۶ جیٹھ تا ۹ آساڑھ تک ۱۹۰۷ شک سون نمبر: ۶۰۱۸۱۸

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے، ۲ سالہ ۳۵ روپے، سہ سالہ ۲۵ روپے

فی کاپی :- ایک روپیہ

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:-

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین)

نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

بزنس منیجر : ایل۔ آر۔ بترہ * اسسٹنٹ ڈائرکٹر : (پروڈکشن) آر۔ ایس۔ منجال

ترسیل زر کا پتہ:- بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

کھادی اور دیہی صنعتیں

ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے کھادی اور دیہی صنعتوں کی ترقی بہت ضروری ہے۔ ان کاموں سے دیہی نوجوانوں کو واقف کرانا بہت اہم ہے۔ اس تعمیری سرگرمی سے اگر ہمارے نوجوانوں نے دلچسپی لی تو وہ دنیا میں سربلند ہو سکتے ہیں۔ خاص کر یہ صنعتیں عورتوں کو روزگار دلانے میں بہت معاون ہیں۔ عورتیں اگر کمانے لگیں تو سماج میں ان کا مرتبہ یقینی طور پر بلند ہوگا۔ اس وقت دیہات سے شہروں کی طرف آنے کا رجحان زوروں پر ہے۔ جس نے شہری علاقوں کے مسائل خطرناک صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ شہروں کی بے تحاشہ بڑھتی ہوئی آبادی کو بنیادی سہولتیں فراہم کرنا دشوار سے دشوارتر ہوتا جا رہا ہے۔ اگر ہمارے دیہات میں صنعتی ترقی زور پکڑلے تو یقیناً عوام کا شہروں کی طرف بھاگنا رک سکتا ہے۔ آج کے دور میں بے پناہ ترقی دیکھنے کو ملتی ہے۔ دیہی زندگی میں جدید سہولتوں کی فراہمی سے دیہی عوام کی بہت سی مشکلات دور ہو سکتی ہیں۔ گاندھی جی کی سودیشی مہم کا مقصد یہ نہ تھا کہ مشینوں کے استعمال سے گریز کیا جائے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ جدید مشینوں سے استفادہ کیا جانے لگا۔ حتیٰ کہ آج کا چرخہ بھی ابتدائی دور کے چرخے سے مختلف ہے۔ اس طرح کی تبدیلی ناگزیر ہے۔ چرخے کے پرانے ماڈل سے نہ تو کافی دھاگا ملتا تھا اور نہ ہی ان کی آمدنی کافی ہوتی تھی۔ ٹکنالوجی سے مراد یہ نہیں ہے کہ بڑی یا متوسط درجے کی صنعتیں چلائی جائیں یا صرف چھوٹے پیمانے کی صنعتیں فروغ پائیں۔ اس سے مراد یہی ہے کہ دیہی صنعتوں کو آگے بڑھایا جائے۔ آٹا پیسنے والی چکیوں میں بھی اسی طرح کا تغیر دیکھنے کو ملتا ہے، حالانکہ لوگ اس بات کو مانتے ہیں کہ ہاتھ کی چکی سے پسا ہوا آٹا زیادہ مزیدار اور تغذیہ بخش ہوتا ہے۔ بیل گاڑی کی بناوٹ میں بھی یہی تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اب ان میں ٹائر والے پہیے لگ جانے سے ان کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔ اور سڑکوں کو بھی کم نقصان پہنچتا ہے۔ چنانچہ یہ سب کوششیں ہمارے سائنسدانوں اور ماہرین ٹکنالوجی کی مرہونِ منت ہیں۔ یہ سب اقدامات ایک طرح سے غریبی دور کرنے کی سمت میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔

ملک میں کھادی کے فروغ کے لیے ایک مرکزی بورڈ ہے۔ اس کے علاوہ ریاستوں میں بھی ایسے ہی بورڈ ہیں۔ اس کے ذریعے نہ صرف کھادی کو مقبول عام بنانا ہے بلکہ ہمارے ادب میں دھاگے کی جس پاکیزگی پر زور دیا گیا ہے، اسے قائم رکھنا ہے اور سودیشی تحریک کی عظمت کو پہچاننا ہے۔ ہمارے ملک میں اب سودیشی کا جذبہ تو کم ہو رہا ہے، البتہ کھادی بطور فیشن استعمال کی جانے لگی ہے۔ غیر ممالک میں اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے زیر اثر ہندوستان کے عوام بھی اسے پہنتے ہیں۔ بہرصورت اس سے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک کھادی کی مانگ بڑھی ہے۔ غیر ممالک کے عوام اکثر ہاتھ سے بنی ہوئی چیزوں کا استعمال بیحد پسند کرتے ہیں۔ وہاں ہاتھ سے تیار کردہ مصنوعات کی قیمت مشین پر تیار کی گئی اشیاء سے کئی گنا زیادہ ہے۔ یہ ایک ایسا پہلو ہے جس پر ہمارے ملک میں تحقیق کی جانی چاہیئے۔ آج کے دور میں آئے دن فیشن کی تبدیلی ظہور میں آتی ہے۔ اس سے مصنوعات کی فروخت میں مدد ملتی ہے۔ لہٰذا مستقبل کے تقاضوں کو پہچاننا بہت ضروری ہے۔ ہمیں کھادی کو مقبول بنانے اور اس کی بنیادیں مستحکم کرنے کے لیے کوششیں کرنی ہیں تاہم جیسا کہ گاندھی جی نے کہا تھا کہ ہمیں اپنے ذہن کی کھڑکی کھلی رکھنی چاہیئے تاکہ پوری دنیا کی ہوا اس میں آ سکے۔ چنانچہ کھادی کو ملک کے اندر اور باہر مقبول بنانے پر زور دیا جانا چاہیئے۔ اس کے علاوہ صابن، کاغذ اور بہت سی دیگر مصنوعات دیہی صنعتوں کے طور پر فروغ پا سکتی ہیں۔ اور ان کی ترقی و توسیع کی بڑی گنجائش ہے۔ ان کی فروخت بڑھانے کے لیے محض اخباری اشتہارات ناکافی ہوں گے، اس کے لیے ذاتی رابطے اور قریبی تال میل بہت ضروری ہے۔ کھادی ہو یا کوئی بھی دیہی صنعت، معیار میں اصلاح و بہتری کی ہر وقت ضرورت ہوگی۔ شروع میں کھادی پہننا ایک دوسرے جذبے سے تھا، خواہ وہ کیسی بھی گھٹیا کیوں نہ ہو۔ لیکن اب وہ بات نہیں۔ اب اچھی چیز درکار ہے۔ لہٰذا کھادی کو خوبصورت ڈیزائنوں اور بہتر معیار کے ساتھ پیش کرنا بہت ضروری ہے۔ اس کی لاگت کم کرنے کے لیے مقامی طور پر دستیاب بہت سی چھالوں وغیرہ کے ذریعے رنگسازی کا کام لیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں تحقیق کو فروغ دینا بھی ضروری ہے۔ اس دنیا میں کوئی چیز بے کار نہیں، البتہ ان کا استعمال جاننا ضروری ہے۔ جاپان کی ترقی کی مثال آج ہمارے سامنے ہے۔ کھادی اور دیہی صنعتوں میں مصروف افراد کو دیگر شعبوں کی طرح وافر اجرت نہ ملنے کی شکایت رہتی ہے لیکن یہ شکایت محض اسی ایک شعبے کی نہیں بلکہ یہ اکثر جگہ پائی جاتی ہے۔ اکثر انتظامی صلاحیتوں کی کمی بھی اس کے فروغ میں رکاوٹ ہے۔ یہ کام کوآپریٹو بنیادوں پر بہتر صورت میں ترقی کر سکتا ہے لیکن یہ تحریک ہمارے اکثر علاقوں میں بہت کمزور ہے۔ بہار، اُتر پردیش وغیرہ میں تو یہ برائے نام ہی ہے۔ جو ادارے ہیں بھی وہ اقتصادی طور پر کمزور ہیں۔ اس پہلو پر توجہ دی جانی بھی ضروری ہے۔

(ایڈیٹر)

یوجنا نے نومبر ۱۹۸۴ میں "رضا کار اداروں پر گہری نظر" کے موضوع پر ایک خصوصی شمارہ شائع کیا تھا' اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں نے اس شمارے کو بیحد پسند کیا اور اس کے سبب اس بحث میں ایک نئی دلچسپی پیدا ہوئی۔ چنانچہ حال ہی میں نئی دلّی کے دین دیال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے ہندوستان میں تعمیری سرگرمیوں کی تحریک کو تقویت بخشنے کے موضوع پر تین روزہ ورک شاپ کا اہتمام کیا۔ اس میں مشہور و معروف مفکّرین اور رضا کارانہ تحریک سے وابستہ خصوصی ماہرین نے حصّہ لیا جن میں شری نرمل دیش پانڈے، شری ایس۔ کے۔ ڈے، شریمتی سوشیلا نیر' شری بنکر رائے، شری نانا دیش مکھ اور شری ترلوک سنگھ شامل تھے۔

یوجنا کو اِن مشوروں اور نتائج کی ایک نقل فراہم کی گئی جو کہ اس ورک شاپ کی بحث کے نتیجے میں سامنے آئے۔ زیرِ نظر مضمون میں اس ورک شاپ میں جن نتائج کو اخذ کیا گیا' اُن کو پیش کیا جارہا ہے اور اس کے ساتھ ہی پروفیسر کا براکا ان نتائج پر تبصرہ اور شری ایس۔ کے۔ ڈے کے تاثرات پیش کئے جارہے ہیں۔

اُمید ہے کہ ہمارے قارئین رضا کارانہ تحریک کے موضوع پر اس دلچسپ بحث سے محظوظ ہوں گے۔

تعمیری سرگرمیوں کو مستحکم بنانے کیلیے رضا کار اداروں کی اِمداد ضروری ہے

رضا کارانہ تحریک کو مضبوط بنانے کے موضوع پر منعقدہ ورکشاپ میں یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ اگر مختلف رضا کار اداروں کو منصوبہ بندی اور پروگراموں پر عمل درآمد میں پوری طرح شریک کر لیا جائے اور ان کے رول کی اہمیت کو بخوبی تسلیم کر لیا جائے، تو اس سے سماج کا بحیثیت مجموعی فائدہ ہوگا۔ اس میں یہ تاثر بھی پیش کیا گیا کہ رضا کار اداروں میں سماج کے کمزور طبقات کو منظم کرنے کی بھرپور صلاحیت ہے۔ ان میں یہ بھی صلاحیت ہے کہ وہ سماج کے کمزور طبقات کے جائز حقوق کی حفاظت کریں اور ان کا استحصال کرنے والی قوتوں کا مقابلہ کریں۔ وہ سماج کے قریب رہ کر سرکاری مفادات کی نگرانی میں مثبت رول ادا کر سکتے ہیں۔ ان کے پاس اس کے کثیر مواقع ہیں کہ وہ نت نئے تجربات کریں اور ترقیاتی پروگراموں کو آگے بڑھانے کا نیا نمونہ پیش کریں۔ البتہ اس میں کہا گیا کہ ان اداروں کو اپنے کام کی بجا آوری میں نظم و ضبط اور اپنی خود اختیارانہ حیثیت کو پہچاننا ہوگا۔

ہندوستان میں ہر جہت ترقی دیکھنے کو ملی ہے اور مادی اعتبار سے ہر گوشے میں اس نے پیش رفت دکھائی ہے۔ لیکن ان تمام ترقیوں کے باوجود یہاں بہت سے سنجیدہ اور اہم مسائل ایسے ہیں جن کا ابھی تک کوئی حل تلاش نہیں کیا جا سکا۔ مثلاً غریبی کا مسئلہ جس کی جڑیں بہت گہری ہیں، کم روزگاری اور بے روزگاری، عورتوں کی ناخواندگی، عورتوں کی پسماندگی، تغذیہ بخش خوراک کی کمی، بچوں کی صحت کی خرابی کے مسائل نیز دیہات میں غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گذارنے والے افراد کی تعداد میں اضافہ اور اس طرح دیہات میں بڑے کسانوں کی خوشحالی میں اضافہ، بے زمین مزدوروں، کاشتکاروں، خشکی کسانوں، حاشیائی کسانوں، دیہی دستکاروں کے مسئلے، انسانی وسائل سے بھرپور کام نہ لیے جانے کا مسئلہ، بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کا مسئلہ، پینے کے پانی کی فراہمی یا ایندھن کی فراہمی وغیرہ کے مسائل، دیہی نوجوانوں کا شہروں کی طرف آنا۔ ملک کے بیشتر حصوں میں ماحول کی آلودگی کا مسئلہ۔ ان حالات میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں نیز لوکل باڈیز کے اداروں کی خدمات تو ہیں ہی، لیکن ان کے ساتھ ہی ملک میں سماج کو بحیثیت مجموعی حرکت میں لانا اور رضا کارانہ عمل کے تمام وسیلوں کو فروغ دینا اور انہیں مستحکم بنانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ خاص کر یہ ضروری ہے کہ ایک ایسا ماحول تیار کیا جائے جس میں محض سرکار پر غیر ضروری طور پر انحصار نہ کرکے ہر علاقے کے لوگ رضا کارانہ طور پر اور اجتماعی طور پر اپنی صلاحیتوں اور قوت ارادی سے کام لیں اور اپنے مسائل از خود حل کر لیں اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہوں اور اپنے وسائل اور ممکنہ صلاحیتوں کو یکجا کرکے مسائل پر قابو پانے کی کوشش کریں۔

تعمیری کام کے لیے ملک گیر پیمانے پر تحریک ضروری

ایسے رضا کار ادارے جو بلا لحاظ مذہب و ملت اور بغیر کسی تخصیص سماج کی خدمت میں مصروف ہیں، ان کی سرگرمیوں سے یہ واضح ہے کہ وہ سماج کے کمزور طبقات کو منظم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کے جائز حقوق کی حفاظت کر سکتے ہیں اور ان کا استحصال کرنے والی قوتوں سے نبرد آزما ہو سکتے ہیں اور مقامی سطح کی کوششوں کا دائرہ وسیع کر سکتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھانے والوں کو بہتر خدمات یقین کے ساتھ مہیا کرا سکتے ہیں۔ انھوں نے مقامی وسائل کو نئی نئی سمتوں میں لگایا ہے اور اس کے لیے انھوں نے سائنس اور ٹکنالوجی سے استفادہ کیا ہے۔ اس طرح سے ان کی خدمات دیہی عوام کے لیے بے حد مفید ثابت ہوئی ہیں۔ اگر مناسب طور پر ان کی حمایت کی جائے تو یہ رضا کار ادارے ہر جگہ اپنا کام شروع کر سکتے ہیں اور ان وسائل کو بھی حرکت میں لا سکتے ہیں جن سے ابھی تک فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا ہے اور جن کو ابھی تک چھوا نہیں جا سکا ہے۔ اس سلسلے میں قیادت اور پیش قدمیوں کی جو کمی اب تک دیکھنے میں آئی ہے وہ دور ہو سکتی ہے۔ ایک رضا کار وہ ہیں جو طویل عرصے سے گاندھیائی اقدار کو ساتھ لے کر کام کر رہے ہیں، دوسرے وہ جو خصوصاً آزادی کے بعد

وجود میں آئے ہیں اور جنھوں نے سماجی خدمات کی نئی نئی سمتیں دکھائی ہیں، غرضیکہ ہر دو طرح کے رضاکار اداروں نے رضاکارانہ طور پر کام کرنے کی تحریک کو مستقل بنیادوں اور ملک گیر پیمانے پر آگے بڑھانے کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کی ہے۔ لہٰذا سب کو اس بات سے اتفاق کرنا چاہیے کہ ایک ایسا سماج تشکیل دینے کے لیے جہاں سب برابر ہوں، جہاں ذات پات کا کوئی بھید نہ ہو، جہاں طبقاتی درجہ بندی نہ ہو اور جو جمہوری آئین میں یقین رکھتا ہو، نیز جو سیکولر اقدار کا حامی ہو، اس تحریک کی بنیاد کو مضبوط بنانا بہت ضروری ہے۔

رضاکارانہ خدمات کا رول

غریبی دور کرنا اور دیہی ترقی کو بہتر بنانا

پچھلے دہے میں مرکزی اور ریاستی سرکاروں نے عوام کی غریبی دور کرنے کے لیے متعدد اقدامات کیے۔ ان کے لیے روزگار کے مواقع بڑھائے گئے، بنیادی ضرورت کی اشیا کی فراہمی بڑھائی گئی، دیہی معیشت کو مضبوط بنانے کی کوشش کی گئی، پسماندہ طبقات، شیڈولڈ ذاتوں، شیڈولڈ قبائل کی بہبود کے اقدامات کیے گئے اور پیداواری صلاحیت کی سطح اوپر لانے کی کوشش کی گئی۔ اجتماعی خدمات میں توسیع کی گئی اور مختلف طرح کی سماجی اور اقتصادی ناکامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ ساتویں منصوبے میں ان تمام خدمات اور پروگراموں کو مزید ترقی دی جائے گی۔ بنکوں اور مالیاتی اداروں کی طرف سے قرض دے کر معیشت کے بہت سے شعبوں میں بجٹ میں مخصوص کردہ وسائل کو اور تقویت دی جائے گی۔ ان تمام مختلف پروگراموں سے عوام کے معیار زندگی پر کس حد تک مطلوبہ اثرات ظاہر ہوں گے، اس کا انحصار اس بات پر ہے ان کے نظم و نسق اور ان کو بروئے کار لانے کا معیار کیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان پروگراموں سے درحقیقت انھیں کو فائدہ پہنچے جن کے لیے یہ

پروگرام وضع کیے گئے ہیں۔ ان پر عمل درآمد کے دوران تضییع اور بدعنوانی کے عناصر کی روک تھام ضروری ہے۔ رضاکار ادارے اس سلسلے میں نگرانی کے فرائض انجام دے سکتے ہیں اور سرکاری اداروں کے ساتھ ساتھ وہ عوام کے مفاد کی نگرانی کر سکتے ہیں۔ ان کا رول مثبت ہونا چاہیے اور انھیں دیہی عوام کو اُن کے مفاد کے پیش نظر منظم کرنا چاہیے۔ ترقیاتی پروگراموں پر عمل درآمد اور ان کی منصوبہ بندی میں ان کے تسلیم شدہ رول کو بروئے کار لاکر سماج کا بھلا ہو سکتا ہے۔

ماحول کا تحفظ

پہاڑی اور قبائلی آبادی والے علاقوں میں عوام کی بڑھتی ہوئی تعداد سے مجبور ہو کر، جنگل کٹنے لگے ہیں جس سے مٹی کا کٹاؤ بڑھ گیا ہے اور ماحول کی آلودگی کا خطرہ سامنے آیا ہے اور اس سے غریبی اور محرومی کے احساسات کو تقویت ملی ہے۔ چنانچہ مٹی اور پانی کے تحفظ اور سماجی جنگل بانی اور شجرکاری نیز اراضی کے متبادل وسائل کی کھوج کے ذریعے ماحول کا تحفظ ضروری ہے۔ یہ معیشت کے وہ شعبے ہیں جہاں رضاکار ادارے عوام کو ان خطرات سے باخبر کرنے میں موثر کردار ادا کر سکتے ہیں اور ان کا عملی تعاون حاصل کر سکتے ہیں نیز سماجی اور اقتصادی منصوبہ بندی کے ساتھ طبیعاتی منصوبہ بندی کو جوڑ سکتے ہیں۔ رضاکار ادارے ان پروگراموں پر عمل درآمد پر نظر رکھیں گے تاکہ غیر منضبط اور بے تحاشہ صنعتی ترقی کے نتیجے میں بنیادی وسائل کو نقصان نہ پہنچنے پائے۔

قومی وعدے

قومی سطح پر بہت سے ایسے مقاصد سامنے رکھے گئے ہیں جن کے لیے ملک میں عوام سے وعدہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن ابھی تک اس بات کو یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ کیا وہ پورے کیے جا سکیں گے مثلاً ملک گیر پیمانے پر پرائمری تعلیم کا انتظام، عمر رسیدوں سے ناخواندگی دور کرنا۔ اضافۂ آبادی کی روک تھام،

سب کے لیے صحت خدمات، سب کے لیے بنیادی ضرورتوں کی فراہمی، سب کے لیے کام، کاشت کاروں کے لیے مالکانہ حقوق اور لگان داری کا تحفظ، قانون کے مطابق کم سے کم اُجرتوں کی ادائیگی کو یقینی بنانا، علاقائی نابرابریوں کو کم کرنا، پسماندہ علاقوں کی بسرعت ترقی مبنی برانصاف اور مساوی سماج لانے کی کوششیں، ہر طرح کے سماجی اور اقتصادی استحصال سے نجات، پسماندہ طبقات بشمول شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ قبائل کو ملک کے باقی طبقات کی سطح پر لانا، عورتوں اور بچوں کے لیے ضروری خدمات مہیا کرنا، گاؤں کے پڑھے لکھے طبقے کے لیے منصوبہ بند ترقی، مستقبل کی تعمیر و تشکیل میں ان کی شرکت، علاقہ وار منصوبہ بندی میں نوجوانوں کی شرکت، یہ سب قومی سطح پر مقرر کردہ نشانے وہ ہیں جن کے لیے ہندوستانی عوام کا بحیثیت مجموعی تعاون درکار ہے۔ اس کے بغیر ایسا نیا سماجی نظام معرض وجود میں آنا دشوار ہے جس سے سب کو یکساں طور پر فائدہ پہنچ سکے۔ اتنے عظیم مقصد کی تکمیل کے لیے مرکزی سرکار اور ریاستی سرکاروں کے ساتھ ساتھ نیز مقامی جمہوری اداروں اور پنچایت راج اداروں کی خدمات کو ساتھ لے کر بھی رضاکار اداروں کی خدمات حاصل کرنا ضروری ہیں۔

ترقی کے نئے نمونے اور نئے تجربات

رضاکار اداروں کو ایسے مواقع میسر آنے چاہییں جن کے ذریعے وہ ترقی کے نئے ڈھانچے پیش کر سکیں، اور اس سلسلے میں نئے نئے تجربات کر سکیں۔ وہ ترقی کے ایسے نمونے پیش کر سکتے ہیں جن سے قومی اور ریاستی سطح پر منصوبہ بندی کو مستحکم بنایا جا سکے۔ رضاکار ادارے پہلے ہی سے ملک بھر میں کچھ ایسے کام کر رہے ہیں جن سے دیگر رضاکار اداروں اور مرکز اور ریاست کی سطح کے منصوبہ سازوں اور دیگر ماہرین کو کافی دلچسپی ہے۔ اس طرح کی رہنمایانہ

کوششوں کا ٹھوس طریقے پر اندازہ کیا جانا ضروری ہے۔ اس طرح سے تجربات کا تبادلہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ بنیادی سطح پر سوچے سمجھے عملی پروگرام شروع کرکے اس کام کو زیادہ پائیدار اور موثر بنایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر دیہات کی مربوط ترقی، روزگار کی فراہمی، غریبی دور کرنے، زراعت کو ترقی دینے، بارانی کھیتی کو بڑھاوا دینے، مٹی اور پانی کا تحفظ کرنے، سماجی جنگل بانی وغیرہ کے پروگرام رضاکار اداروں کی اعانت اور معاونت سے بہتر نتائج دکھا سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ دیہی دستکاروں کی تعلیم اور بحالی، تغذیہ بخش خوراک اور صحت کے پروگرام، دیہات میں سماجی بہبود کی خدمات کی فراہمی سے متعلق پروگرام نیز پیداواری صلاحیت بڑھانے اور انسانی وسائل سے بھرپور کام لینے کے نیز دیہی سماج کی تعلیم نو کے پروگرام وغیرہ کے لیے بھی ان اداروں کی خدمات بہت زیادہ قیمتی ہیں۔

عورتیں اور نوجوان

عورتیں اور نوجوان مستقبل کو بنانے کی کنجی ہیں۔ تعمیری سرگرمیوں میں ان کے رول کی بڑی ضرورت اور افادیت ہے۔ عورتوں کو منصوبہ بند ترقی کے ہر شعبے میں مساوی حیثیت سے حصہ لینا ہے۔ عورتیں تبدیلی لانے میں موثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔ نوجوان بھی اسی طرح تمام چیلنجوں سے مقابلہ کرنے میں مفید خدمات اور کردار ادا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ تمام اجتماعی اداروں میں عورتوں اور نوجوانوں کی نمائندگی مستقبل کی تعمیر کے نقطۂ نظر سے بہت ضروری ہے۔

رضاکارانہ کام کرنے والوں کا کیڈر

ماضی کے برعکس حال میں رضاکار اداروں کے سامنے کام کرنے کے بہت سے میدان ہیں۔ سماجی لیڈرشپ کے ذریعے عوام کی ضرورتوں اور مفادات کی تکمیل کے لیے رضاکار ادارے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ دور حاضر میں بہت سی تکنیکی معلومات کی ضرورت ہے اور عوام کو کسی کام کی طرف راغب کرنے کے لیے مسلسل کوششیں درکار ہیں۔ لہٰذا رضاکار اداروں میں ایسے تربیت یافتہ عملے کی ضرورت ہے جو اس عظیم تعمیری کام کو بحسن و خوبی انجام دے سکے۔ قومی منصوبہ بندی کے ضمن میں اس طرح کی رضاکارانہ سرگرمیاں اور بھی ضروری ہیں۔ یہ ادارے ایسے عملے کے لیے تربیتی نصاب کا بندوبست کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں دیگر اداروں کا تعاون بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ تربیت عملی ہونی چاہیے اور فیلڈ میں ہونی چاہیے۔ زراعتی اور دیگر یونیورسٹیوں میں دستیاب تربیتی سہولتوں سے بھی یہ رضاکار ادارے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

مرکزی اور ریاستی اداروں، زرعی اور دیگر یونیورسٹیوں، دیہی ترقی کے اداروں وغیرہ میں یہ عملہ تربیت پا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں سرکاری اداروں اور رضاکار اداروں کی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر تربیتی پروگرام وضع کئے جا سکتے ہیں۔ یہ دراصل افرادی قوت کی منصوبہ بندی کا ہی ایک حصہ ہے۔ سرکاری اداروں اور تعمیری کاموں سے وابستہ دیگر اداروں میں عملے کو حاصل شدہ تجربات سے باہمی طور پر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

تعمیری کاموں میں آپسی تعاون

رضاکار ادارے چوں کہ چند مخصوص مسائل کو حل کرنے کے لیے وجود میں آتے رہے، لہٰذا اُن کا خاص کام محض اپنے مخصوص مسائل کو حل کرنے تک ہی محدود رہا۔ ایک ہی سے کاموں کی انجام دہی کے دوران ان میں آپس میں تال میل قائم نہ ہو سکا۔ اس طرح وہ ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ اب مختلف ریاستوں میں تعمیری سرگرمیوں میں معروف تنظیموں کے درمیان اطلاعات و تجربات کا تبادلہ ضروری ہے۔ اس طرح کی معلومات اور تجربات کو آپس میں ایک دوسرے تک پہونچانا بہت ضروری ہے اور اس سلسلے میں کارکنوں اور برادریوں کے درمیان براہ راست ربط قائم کیا جانا ضروری ہے۔

رضاکار تنظیموں کے درمیان آپسی تال میل بڑھانے کے لیے اور ان کے مشترکہ مسائل اور ضرورتوں کا پتہ چلانے کے لیے نئی دلی ورکشاپ میں حصہ لینے والوں نے تعمیراتی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے لیے گروپوں کی صورت میں کام کرنے پر اتفاق کیا۔ ملک کے مختلف حصوں میں بہت سے رضاکار اداروں نے اس طرح کے گروپوں کی صورت میں کام کرنے کی پیش کش کی ہے۔ باہمی مشورے سے ایک ایسا نیشنل فورم تشکیل پا سکے گا جس کا کام تعمیری سرگرمیوں میں میل جول بڑھانا ہوگا۔ نیشنل فورم قومی پالیسی اور منصوبہ بندی کے طور پر تعمیری سرگرمیوں کی ضرورتوں اور امکانات کا جائزہ لے گا۔ رضاکار ادارے، خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، اپنے طور پر اپنا کام جاری رکھیں گے اور ایک دوسرے کی مدد کے ذریعے اپنی اجتماعی طاقت کو مستحکم بنائیں گے۔

یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں کے ساتھ تعاون

ہماری یونیورسٹیوں میں سماجی سائنس اور دیگر علوم کے پڑھانے کی سبھی سہولتیں میسر ہیں۔ یہاں زراعتی یونیورسٹیاں، انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی، انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ اور دیگر تعلیمی ادارے ہیں۔ اس طرح ہندوستان میں رضاکار تنظیموں کی بنیادی سرگرمیوں کے لیے درکار تمام سہولتیں مل سکتی ہیں۔ ان اداروں میں زیر تعلیم طلبا، عوام اور ان کی بہبود سے متعلق مسائل کا پہلے ہی مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں تحقیقی کوششوں کو اور بڑھاوا دیا جا سکتا ہے تاکہ علمی تحقیق اس میں شامل کی جا سکے۔ لہٰذا علمی اداروں اور رضاکارانہ تنظیموں میں آپسی تال میل کی بڑی گنجائش ہے، جس سے دونوں کا بھلا ہوگا۔ ان رابطوں سے ٹھوس اندازے فراہم کئے جا سکتے ہیں اور نئے نئے تجربے کئے جا سکتے ہیں۔ ان

سکے تو شکسا سے معلومات اور تجربات کا تبادلہ وسیع پیمانے پر ہوسکتا ہے۔

وسائل اور منصوبہ بندی

ساتویں منصوبے میں وسائل کے سوال پر غور و خوض جاری ہے اور قومی منصوبہ بندی میں رضا کار اداروں کی امداد اور تعاون حاصل کرنے کے مسئلے پر بھی توجہ دی جا رہی ہے۔ ماضی میں ایسے بہت سے رضا کار اداروں پر توجہ دی گئی جو غیر ملکی رقومات پر انحصار رکھتے تھے۔ اس طرح کی رقومات سرکاری توسط سے ہی آنی چاہئیں۔ رقوم کی خاطر خواہ فراہمی نہ ہونے سے ملک میں رضا کار ادارے بھرپور ترقی نہیں کر سکے ہیں۔ رقومات کی فراہمی اکثر محدود پیمانے پر کسی ایک پراجیکٹ کے لیے ہوتی ہے۔ اس طرح رضا کار اداروں کی طویل المدتی بنیادوں پر ترقی رُک گئی ہے۔ اور وہ مقامی ضرورتوں اور سماجی کوششوں کو بروئے کار نہیں لا سکے ہیں۔

رضا کار تنظیموں کی اصل قوت اس بات میں چھپی ہے کہ وہ مقامی وسائل سے کس حد تک کام لے سکتے ہیں اور انھیں کس حد تک کام میں لا سکتے ہیں۔ مقامی طور پر افرادی قوت اور قیادت کو حرکت میں نہیں لایا جا سکا، ایک مخصوص ماحول میں ایسے نئے تجربات جو مقامی ضرورتوں کو پورا کر سکیں، عمل میں نہیں آ سکے۔ رضا کار تنظیموں کو تکنیکی امداد درکار ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ تمام سرکاری ادارے خواہ وہ مرکز میں ہوں یا ریاست میں، رضا کار تنظیموں کی اہمیت سے باخبر رہیں اور ان کو تکنیکی رہنمائی فراہم کرتے رہیں۔ رضا کار ادارے مالی امداد بھی چاہتے ہیں۔ ان کے پاس ایسے مقامی اثاثہ جات ہونے چاہئیں۔ جو ان کی کفالت کر سکیں۔ منصوبہ بندی کمیشن کے ماہرین پر مشتمل وہ گروپ جو ملک سے غریبی دُور کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا اور جس کے سربراہ پروفیسر ایم ایس سوامی ناتھن تھے، انھوں نے اپنی رپورٹ میں رضا کار اداروں کے تئیں انداز نظر اور ان کی اہمیت واضح کر دی تھی۔ گروپ نے فروری ۱۹۸۲ میں جو رپورٹ دی اس میں کہا کہ "منصوبے میں ترقی کے تمام پہلوؤں کے لیے بڑے پیمانے پر وسائل فراہم کئے گئے ہیں۔ یہ تمام وسائل سرکاری محکمے براہ راست استعمال کرتے ہیں۔ رضا کار اداروں کو بہت حقیر اور معمولی سی رقم خرچ کے لیے دی جاتی ہے اور موجودہ مرکزی اور ریاستی منصوبوں میں دیہی ترقی کے لیے رضا کارانہ کوششوں کے فروغ اور اُن کی توسیع کے لیے بہت معمولی رقم میسر آتی ہے۔ چونکہ مختلف علاقوں میں ترقیاتی اسکیمیں، سرکاری اداروں کے توسط سے ہی بروئے کار آتی ہیں، اس لیے بھی رضا کار اداروں کے لیے معمولی سی رقم رہ جاتی ہے۔ دیہی ترقی کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جہاں رضا کار ادارے موثر ثابت ہو سکتے ہیں اور وہاں ان کی تعمیر و تشکیل کی حوصلہ افزائی کی جا سکتی ہے۔ یہ پروگرام وضع کرنے میں منصوبہ بندی کمیشن اور متعلقہ مرکزی وزارتیں اور ریاستی محکمے ایسے گوشوں کی نشاندہی کر سکتے ہیں جہاں رضا کار ادارے عمل درآمد کی سطح پر موثر کام کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ انھیں ضروری انتظامی اور تکنیکی رہنمائی ملے۔ چھٹے منصوبے میں زرعی ترقی اور دیہی ترقی کے پروگراموں کے عمل درآمد پر نظر ثانی درکار ہے۔ اس جائزہ کمیٹی میں منصوبہ بندی کمیشن، دیہی تعمیر نو کی وزارت، وزارت زراعت کے نمائندے ہونے چاہئیں۔

امید ہے کہ منصوبہ بندی کمیشن اس طرح کے ورکنگ گروپ تشکیل دینے میں عجلت سے کام لے گا۔ دیگر شعبوں میں بھی اسی طرح کے اقدام کی ضرورت ہے۔ مثلاً یہ کہ زراعت، تعلیم، صحت، سماجی بہبود، تعمیر مکانات، دیہات میں پانی کی فراہمی اور دیہی صنعت کاری وغیرہ۔

سماج کے امیر طبقے جن میں صنعتوں نیز تجارت کے نمائندوں اور پیشہ ورانہ مہارت رکھنے والوں کو شمار کیا جا سکتا ہے، رضا کارانہ کاموں کے لیے وسائل فراہم کر سکتے ہیں۔

بقیہ: حقیقت یا فریب

اور کام کرنے میں دو رخی" والی جاگیرداری جو بھارتی کردار کی جڑوں میں موجود ہے۔ کام کے سلسلے اگر اس سے باہر آنے کی کوئی صورت ہو جس سے راستہ مختصر ہو جائے۔

۱۵۔ افکار حرکیات، تال میل اور استحکام کیسے امتزاجی افزائش۔

۱۶۔ بھارت کے وسیع دیہی اور شہری علاقوں میں فاقہ کشی اور تیز رفتار آلودگی میں دھرتی کو چھوڑ کر ٹیکنالوجی و عمرانیات و زندگی کی جانب جانے کے رجحان کی روک تھام۔

۱۷۔ کسی مسٹر "ہارپیڈ" کو کسی مسٹر "جاکانٹی" کو پچھاڑ کر آگے جانے سے کیونکر روکا جائے؟"

ان سوالات کے جوابات از خود واضح ہیں۔

بقیہ: سائنس اور ہمارے ملک کی ترقی

ماضی میں علم کے مطابق ہمارا نظریہ ترکیبی امتزاجی تھا اور چند امور تک ہی محدود تھا۔ اب ہمیں سائنسی پہلو کو اُجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ حالات اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ ساری دنیا کو اپنے مطالعہ اور سائنسی تحقیق و جستجو کی زد میں لے آئیں۔ ترکیب و امتزاج اور سائنس و ٹکنالوجی پر زور دینا ہمارے لیے ضروری ہی نہیں بلکہ لازمی ہے۔ کیونکہ سارا ملک فکر و عمل کی وُسعت کا متمنی ہے۔ جدید سائنس کی ترویج و تبلیغ نے ہمارے کام کو ممکن بنا دیا ہے۔ اس لیے اس نقطۂ نگاہ اور نظریے کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے۔ اور اس میں تمام ممالک اور اقوام کی شمولیت لازمی ہے۔ اس طرح ہم دوسرے ملکوں اور لوگوں کے ساتھ تعاون کرکے اپنی طاقت میں بیش بہا اضافہ کر سکیں گے جس کے باعث ملکی ترقی کی رفتار حیرت انگیز ہوگی اور جواہر لال نہرو کے الفاظ ہیں:۔

"ہم ہر زمانے اور ہستی کے تماشائی بن سکتے ہیں۔" ●

ذہنی انتشار میں مبتلا یا دھوکے کی شکار؟

اجتماعی عمل کے ڈھانچے کی منطق پر نکتہ چینی کرتے ہوئے پروفیسر کابرا نے اس تھیسس پر اعتراض کیا ہے کہ "یہ تمام بڑے نصب العین حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ بھارت کے عوام کی تمام تر قوت اور وسائل کو استعمال کرتے ہوئے ساری قوم کو ایک نیا سماجی نظام قائم کرنے کے لیے حرکت میں لایا جائے جس میں انتہائی غریب عوام کے ساتھ ساتھ سبھی لوگوں کی برابر و یکساں بہبود امر یقینی بن جائے۔"

شری کابرا کہتے ہیں کہ "ایک ایسے سماج میں جہاں کمزور طبقوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جن کا ایک اقلیت کے ہاتھوں، استحصال ہوتا ہے اور جنھیں ان کے جائز حقوق سے محروم کیا جاتا ہے، ترقی اور فلاح و بہبود کو صرف اسی طرح یقینی بنایا جا سکتا ہے کہ الگ الگ طبقوں پر الگ الگ توجہ مبذول کی جائے اور انتہائی غریب لوگوں کی ضروریات کو زیادہ ترجیح دی جائے۔"

پیچیدہ مسائل سے گھرے ہونے کے باوجود جو چیز ہمارے دلوں میں اُمید کی شمع روشن کرتی ہے، وہ ہے مختلف شعبوں میں نئے حلوں کی مسلسل تلاش۔ دیہی ترقی یا نچلی سطح پر ترقی میں رضاکار ایجنسیوں کے نظریئے، کردار، طریق کار اور ممکنہ اثر کے بارے میں اکثر جو گرما گرم بحث ہوتی رہتی ہے وہ ایک زیادہ موزوں نظریئے کے لیے کی جانے والی تلاش مسلسل کا ہی ایک حصہ ہے۔ بھارت میں تعمیری کام کی تحریک کو مضبوط بنانے کے لیئے منعقدہ ورکشاپ کے اخذ کردہ نتائج اور تجاویز کو جو زیادہ تر رضاکار اداروں کے بارے میں ہیں اسی طور کا جز و سمجھا جا سکتا ہے۔ اس مسئلے پر ہوئی بحث میں "یوجنا" کے رضاکار ایجنسیوں سے متعلق خصوصی شمارے نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اصول مرتب کرنے والوں اور انھیں زیر عمل لانے والے سرکردہ ماہروں، تجربہ کار منصوبہ سازوں اور ایڈمنسٹریٹروں کے ذریعے منعقد کی جانے والی تعمیری کام کی ورکشاپ میں اخذ کردہ ان نتائج کو اور آگے لے جا سکتی ہیں۔

مرکزی نقطہ

تعمیری کام کی ورکشاپ کے مطابق رضاکار ایجنسیوں کو اُن "بہت سے سنگین اور فوری نوعیت کے غیر حل شدہ سوالوں" پر توجہ دینی ہے جن کا آج بھارت کو سامنا ہے۔ ورکشاپ کی دستاویز میں ایسے مسائل کی ایک طویل فہرست ہے مگر اُس میں متروک روائتی دانشمندی۔ مثلاً مجموعی قومی پیداوار کی سست رفتار ترقی، اس تناسب سے صنعت کاری کی رفتار سست کرنے اور سرمایہ اور پیداوار کے بگڑتے ہوئے تناسب وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ یہ مشہور اصطلاحات اور ماضی میں جو اہمیت انھیں دی گئی اس نے ہمیں "فوری اور غیر حل شدہ مسائل" کے پیچھے چھوڑ دینے میں کچھ کم پارٹ ادا نہیں کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تعمیری کام کی ورکشاپ ہماری اُن "قومی ذمہ داریوں" سے پوری طرح آگاہ ہے جو ایک منصفانہ اور مساوات پر مبنی سوسائٹی کی تشکیل کی جانب پیش قدمی اور اقتصادی و سماجی استحصال کو ختم کرنے کی رفتار تیز نہ ہونے کی وجہ سے ہونے والی ناکامیوں سے پیدا ہوئی ہیں۔

غریب ترین کی بہبود (انیتودے)

رضاکار ایجنسیوں کے ذریعے اجتماعی عمل کے ڈھانچے کا تجزیہ کرنے پر ہمیں کچھ ایسے خاذ ہولے نظر آتے ہیں جو میرے خیال میں زیادہ جانچ پڑتال کے محتاج ہیں۔ ورکشاپ مذکور کا کہنا ہے کہ "یہ تمام بڑے نصب العین حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ بھارت کے عوام کی تمام تر قوت اور وسائل کو استعمال کرتے ہوئے ساری قوم کو ایک نیا سماجی نظام قائم کرنے کے لیے حرکت میں لایا جائے جس میں تمام لوگوں کی مساویانہ فلاح و بہبود امر یقینی بن جائے بشمول اُن لوگوں کے جو انتہائی غریب ہیں۔" میرے خیال میں سب سے غریب اور مظلوم لوگوں کی حالت بہتر بنانے (یعنی انتیودے) کے بغیر سب کی مساویانہ فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا ممکن نہیں ہے خاص کر ایسے حالات میں جب یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ "رضاکار ایجنسیاں لوگوں کے کمزور طبقوں کو منظم کر کے ان کے جائز حقوق

کی حفاظت کرتی ہیں اور استحصال کی مخالفت کرتی ہیں۔" ایک ایسے سماج میں جہاں کمزور طبقوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، جن کا (ایک اقلیت کے ہاتھوں) استحصال ہوتا ہے اور جنھیں ان کے جائز حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے، ترقی و فلاح و بہبود کو یقینی بنانے کے عمل کے دوران الگ الگ طبقوں پر الگ الگ توجہ دینے اور سب سے غریب اور پسماندہ ترین کی ضروریات کو زیادہ ترجیح دینے کی ضرورت ہے۔ اگر ہمیں ترقی و بہبود کو سب سے نچلے طبقے تک پہنچانا ہے اور اس طبقے کو اوپر اٹھانا ہے تو پھر سبھی طبقوں کی بہبود برابر یا مساویانہ کیسے ہو سکتی ہے۔؟

غریبوں کے جائز حقوق کی حفاظت کرنے، ان کے استحصال کو ختم کرنے"، "کاشتکاروں کو تحفظ اور مالکانہ حقوق دینے" اور "سب کے لیے کام" اور "کم سے کم جتنی اجرت ملنی چاہیے"۔ اس کا اہتمام کرنے کے عمل سے سبھی لوگوں اور طبقوں کی، جن میں سب سے غریب و مفلوک الحال طبقہ بھی شامل ہے، برابر دیکساں بہبود کو یقینی نہیں بنا سکتا۔ جو لوگ اجتماعی کوشش کے حامی ہیں، جو عوام کی قوت اور وسائل کو حرکت میں لانا چاہتے ہیں اور جو موجودہ نظام میں چھپی ہوئی ناانصافیوں اور خرابیوں کو تسلیم کرتے ہیں اور "ایک نئے سماجی نظام" کی ضرورت کے حق میں دلیلیں دیتے ہیں انھیں دو میں سے ایک کو چُننا ہوگا۔

مخصوص حلقے کے لوگوں کے جال سے ہوشیار!

"خود اعتمادی رکھنے والے شہریوں" کو باہم مل کر رضاکارانہ اجتماعی کوششوں کے ذریعے ترقی کے لیے بامعنی کوششیں کرنی چاہئیں اور خود غرضی پر مبنی عنصر کو ترک کر دینا چاہیے چاہے یہ چھپی ہوئی کیوں نہ ہو، مثال کے طور پر جب یہ طے کیا جاتا ہے کہ درجِ فہرست ذاتوں، قبیلوں اور دوسرے پسماندہ طبقوں کو "باقی قوم" کے برابر لانا ہے۔ اب یہ بات دیکھنے کی ہے کہ باقی قوم اور شناخت شدہ کمزور گروپوں کی سطح ایک ہی نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب ہم دوسروں کی حاصل کی ہوئی کسی فرضی سطح کو مطمحِ نظر بناتے ہیں تو ہو سکتا ہے زیادہ نہ ہو پائے۔ یعنی خود انحصارانہ ترقی۔ تقلید اور نقل پرستی کا نقطۂ نگاہ رکھنے والی قومیں ناکامیوں کا شکار بنتی ہیں۔ یہی حال مثال مشمول کرنے والے پسماندہ سماجی گروپوں کی "ترقی" کی کوششوں کا ہوتا ہے۔ رضاکارانہ کوششیں حملاتی نوعیت کی ہونی چاہئیں تاکہ وہ پسماندہ طبقوں کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کریں اور انھیں ترقی کے لیے باعمل بنائیں۔ یہ فرض کرنا درست نہ ہوگا کہ اچھا مقام رکھنے والے سماجی گروپ از خود ترقی کے منصوبے بنا سکتے ہیں اور انھیں پورا کر کے ترقی کو دوسروں کو دے سکتے ہیں اسی طرح جس طرح کوئی چیز بنا کر، ڈبوں میں بند کر کے لیبل لگا کر دوسروں کو دی جائے۔ ایک حملاتی ذریعہ کو اتنا نہیں بڑھایا جا سکتا کہ وہ ترقی کا خاص یا بڑا ایجنٹ یا انجن بن جائے۔ بہتر ہوگا کہ رضاکار ایجنسیاں ان مخصوص حلقوں کے جال سے بچیں۔

تعمیری کام کی ورکشاپ میں جو مختلف پروگرام تجویز کیے گئے ہیں وہ یکسر غیر معمولی ثابت ہو سکتے ہیں خاص کر اس لیے کہ وہ خاص خاص مقامی حالات کو مدنظر رکھ کر بنائے گئے ہیں اور قومی سطح کی مرکزی اسکیموں کی مشینی تصویر نہیں ہیں۔

لیکن رضاکار ایجنسیوں کے ذریعے زیرِ عمل لائے جانے والے دیہی ترقی کے پروگراموں کا ڈیزائن سرکاری پلانوں سے اخذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جن میں "مینجمنٹ کی برابری"، "تفہیم اور کورپشن سے بچنے"، اور "اثاثوں اور وسائل کی کھلی اور منصفانہ تقسیم یا مختصر الفاظ میں کہنا ہو تو ٹارگیٹ گروپ کو فائدہ پہنچانے پر زور دیا جاتا ہے۔

سرکاری امداد کیوں؟

اسی بنیاد پر اور رضاکار ایجنسیوں کو غیر ملکی مالیات سے دور رکھنے کے لیے تعمیری ورکشاپ نے سرکار کی مالی امداد کی وکالت کی ہے۔ اس طرح یہ ایجنسیاں مقامی وسائل، پلان کے وسائل اور عطیات سے کام کریں گی۔ ٹیکس کی چھوٹ یا رعائتوں کی وجہ سے یہ چندے یا عطیات انجام کار سرکاری خزانے سے ہی حاصل ہوں گے۔ اسی مرحلے پر اجتماعی عمل کے نام پر غیر سرکاری تنظیموں کی طرح کی کوئی چیز ورکشاپ مذکور سے سرکاری پروگراموں اور پراجیکٹوں کو پورا کرنے کے لیے ابھرتی نظر آتی ہے۔ اگرچہ یہ تجویز کیا گیا ہے کہ رضاکار ایجنسیوں کے پاس ایسی ترقی کے لیے ایسے نئے نئے طریقے نکالنے کے عجیب و غریب موقعے ہیں، جن کی تقلید قومی اور ریاستی پلانوں میں کی جا سکتی ہے تاہم جب وسائل اور پروگراموں پر غور کیا جاتا ہے تو رضاکار ایجنسیوں کے لیے پبلک فنڈز کو انسٹی ٹیوشنلائز کرنے کی ضرورت کی حمایت کی جاتی ہے۔ رضاکار ایجنسیاں "مفوضہ سرگرمیوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نظر آتی ہیں۔ افسران "عمل کے اُن علاقوں کی نشاندہی کرنے کو تیار نظر آتے ہیں جنھیں ضروری انتظامیہ اور تکنیکی رہنمائی اور مالیات کے ساتھ آگے دوسروں کو سونپا جا سکتا ہے۔" ان وسائل کو عالموں کی ایکشن ریسرچ اور "سماج کے خوشحال طبقوں کے، جن میں صنعت کار، تاجر اور پیشہ ور، شامل ہیں۔ عطیات سے بڑھانا ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ورکشاپ میں حصہ لینے والوں کی پلاننگ کمیشن سے بات چیت کا خاص موضوع رضاکار ایجنسیوں کی وسائل اور تکنیکی امداد کی فراہمی کے ذریعے حوصلہ افزائی تھا۔ ایک اور اہم تجویز یہ ہے رضاکار ایجنسیوں کی اجتماعی طاقت اور باہمی امداد کو بڑھاوا دینے کے لیے ان ایجنسیوں کا کسی قسم کے قومی فورم سے تعلق قائم کیا جائے۔ یہ تجویز بھی رکھی گئی ہے کہ رضاکار ایجنسیوں کو تجربہ کار کیڈر پر مبنی بنایا جائے جس سے کہ تعمیری کام کی تنظیموں میں سرکاری عملے اور تربیت یافتہ کیڈروں کا باہم تبادلہ ہو سکے۔

تعمیری کام کی ورکشاپ کا تجزیہ کرنے سے

قبل اس بات پر توجہ دی جانی ضروری ہے کہ ترقی — بالخصوص ایسی ترقی جو استحصال کے شکار لوگوں کے مفاد اور مزدوروں کو نظر میں رکھتے ہوئے کی جاتی ہے، غیر سرکاری اور عوام کی رضاکارانہ کوششوں کی متقاضی ہے۔ اس بات کی امید کرنا سراسر زیادتی ہوگی کہ یہ سارے کا سارا کام موجودہ حکومت کرے۔

تعمیری کام، رضاکارانہ مساعی، نچلی سطح کے مقامی عوام کی جانب سے کی گئی پہل اور اپنی مدد آپ کرنے کی کوشش محروم لوگوں میں ایک نئی بیداری، ایک نیا احساس اور ایک نیا اعتماد پیدا کرتی ہیں۔ وہ ترقی کے لیے لامرکزی سیاسی اور سماجی سلسلے وار عمل کا ایک حصہ ہیں جن کے لیے ایک گمراہ کن انداز میں "مائکرو پالیٹکس" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

تعلق کس کیساتھ اور کس لیے ؟

سوال یہ ہے کہ غیر سرکاری تنظیموں کی سرگرمیوں کا تعلق کس سے اور کس لیے جوڑا جائے۔ اگر تعمیری کام کی ورکشاپ کی سفارشوں پر عمل کیا جائے تو اس کا نتیجہ سرکار کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی والی رضاکار ایجنسیوں کی صورت میں برآمد ہوگا۔ جن کا کام اُن کو عملدرآمد کے لیے "سونپے ہوئے" کاموں کو سمجھنا اور عمل میں لانا نیز ان کے بارے میں عوام میں بیداری پیدا کرنا اور سرکاری پروگراموں پر نگہبانی کرنا ہوگا۔ ان اقدامات سے ترقیات کی بیوروکریسی چُننے کا ایک نیا ماڈل دستیاب ہوگا۔ رضاکار ایجنسیوں میں ایسا تربیت یافتہ عملہ ہوگا جس کا تبادلہ سرکاری کارکنان سے کیا جاسکے گا۔ اور یہ ایجنسیاں حکومت کے پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے والا ایک ایسا بازو بن جائیں گی جو از خود منتخب کیا ہوا، از خود مقرر کیا ہوا اور از خود تحریک عمل حاصل کرنے والا ہوگا۔ درست ہے کہ اس میں ایسے اختراع پسندانہ پروگراموں کے لیے کچھ گنجائش ہوسکتی ہے جو نچلی سطح کے حالات کے لیے موزوں ہوں گے۔ تاہم اگر اس صورت میں جیسا کہ [illegible] میں ریسرچ [illegible] اپنایا جائے اور کچھ اچھے عالموں کو اس کام کی طرف راغب کیا جائے۔ لیکن کام کی رضاکارانہ نوعیت سرکاری مدد، حمایت، سرکاری مالیات، تکنیکی تربیت اور عملے پر مشتمل ہوگی۔ اگر منصوبہ ساز رضاکار ایجنسیوں کے کردار و فرائض کا تصور ایڈھاک یا عارضی انداز میں نہ کریں بلکہ ان کی مجوزہ سرگرمیوں کو ایک کثیر سطحی عملی منصوبہ سازی کے تحت باقاعدہ طور پر ضلعوں اور بلاکوں کے منصوبوں سے مربوط کریں تو رضاکار ادارے ایک اور قسم کے پبلک ادارے بن جائیں گے اور ان کی غیر سرکاری تنظیم کی نوعیت ایک فسانہ بن جائے گی۔

جن لوگوں کو فائدہ پہنچانا مقصود ہے وہ ان کوششوں اور سرکار کی طرف سے کی جانے والی پہلوں اور مداخلت میں تمیز نہ کرسکیں گے۔ اگر ٹیکس کی رعایت یا چھوٹ سے تجارتی اور صنعتی حلقوں سے ملنے والے عطیات اور ترقی کا ایک مشابہ نقطۂ نظر دیہی علاقوں میں اور غریبوں اور محروم لوگوں کی جھونپڑیوں تک پہونچ جائے تو یہ "مائکرو پالیٹکس" تجارت و صنعت کی "سماجی ذمہ داریوں" کے نظریئے کو مقبول بنانے کی ایک مشق ہوگی۔ یہ رقوم دھیرے دھیرے آنے کا سلسلہ غیر سرکاری نوعیت کا ہوگا اور یہ اس نظریئے پر مبنی ہوگا کہ خوشحال لوگوں کی خوشحالی سے بدحال لوگ اپنی حالت کے بہتر ہونے کی امید کرسکتے ہیں۔ اگرچہ سماج کے زینے پر بدحال ہمیشہ نچلی سیڑھی پر ہی رہیں گے۔ غریبوں کے لیے اس کا مطلب یہ ہے کہ انھیں ہمیشہ بیرونی مددگاروں کی طرف دیکھنا ہے۔

صرف ایک اضافی رول

لہٰذا جس بات کی ضرورت ہے وہ ہے ترقی کے عمل میں عوام کو سرگرم اور شرکتی رول ادا کرنے کا موقع دینا اور کرنے کی کوشش، جس کے لیے بیرونی امداد کی ضرورت نہ پڑے، جب کہ ضرورت یہ ہے کہ خود غریبوں میں بھی یقین و اعتماد ایک حد تک پیدا ہوچکا ہے۔ یا کم از کم مستقل رضاکارانہ ایجنسیوں کے ذریعے غریبوں میں بیرونی انحصار سے رغبت پیدا کرنا بے کار ہوگا۔ منصوبے ترقی کا ایک بڑا ہتھیار بنی رہیں گے لیکن منصوبہ بندی جن سیاسی طریقوں کے تابع ہے۔ ان پر کنٹرول رکھنے کے غیر حل شدہ سوالوں کو روایتی سیاسی عمل کے ذریعے حل نہیں کیا جاسکتا۔ رضاکارانہ عمل کو روایتی سیاسی عمل کا تتمہ سمجھنا چاہیئے۔ رضاکارانہ سرگرمیوں کو پلان کے پروگراموں کے بالکل متوازی نہیں چلانا چاہیئے لیکن انھیں منصوبے کے پروگراموں میں مدغم نہیں ہونا چاہیئے نہ ان پر انحصار رکھنا چاہیئے۔ رضاکارانہ سرگرمیوں کو نگراں اور اصلاحی ادارے کے طور پر ایسی متبادل طاقت بننا ہے جس سے منصوبہ سازی کی پالیسیاں غریبوں کے حق میں بدل جائیں۔ نچلی سطح پر سچی ترقی کے لیے غریبوں میں سرگرمیوں کو اس طرح منظم کیا جانا چاہیئے کہ وہ اپنی اندرونی طاقت کے بل پر چل سکیں اور آگے بڑھ سکیں۔ ایسا نظر آتا ہے کہ تعمیری کام کی ورکشاپ نے ان سوالات سے پہلو تہی کی ہے۔ چنانچہ کوئی بھی یہ سوچنے پر مجبور ہوسکتا ہے کہ یا تو یہ ذہنی انتشار میں مبتلا ہے یا دھوکے کی شکار ہے۔ ★

بقیہ : ساتویں منصوبے کا مسودہ

مل سکے، اصلاحاتِ آراضی اور ریکارڈ کا تازہ ترین آنکڑوں سے لیس ہونا اور ضلع کی سطح پر سبھی تربیتی مراکز کا قیام۔ کمیشن نے دیہات کی مربوط ترقی کے پروگرام کے تحت رقوم کی تخصیص کی۔ یہ رقوم ہر علاقے کی اپنی ضرورتوں اور اس میں غریبی کے اثرات دیکھ کر متعین کی گئی۔ پہلی بار سائنس اور ٹکنالوجی کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر اُن سے کام لینے پر [illegible] ★

ایس کے ڈے

حقیقت یا فریب

> دین دیال اُپادھیائے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے حال ہی میں منعقد کئے گئے رضاکار اداروں سے متعلق ایک ورکشاپ پر پروفیسر کابرا کے تبصرہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے مصنف نے رضاکار اداروں کے بارے میں بیجا خدشات کے خلاف خبردار کیا ہے اور کہا ہے کہ بھارت کے عوام۔ شہروں کے عام لوگوں اور ناخواندہ دیہاتیوں میں اُن کی قطعی بقاء سے متعلق فطری رُجحان نے زور پکڑ لیا ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ بھارت میں رضاکارانہ سرگرمیاں ترقیاتی عمل میں صدقدلی سے اُس وقت تک اپنا حصّہ ادا نہیں کر سکتیں، جب تک کہ یہ عظیم ملک اور اس کے عوام پہلے مرکز سے دیہات تک ترقیات کے وسائل، ذمہ داری اور اختیارات میں باہمی طور پر شریک نہیں ہوتے۔

پلاننگ کمیشن کوئی قانونی ادارہ نہیں ہے، نہ ہی یہ بھارت سرکار کا کوئی حصہ ہے۔ تاہم سیاسیات کے دائرہ کے باہر وہ ابتدا ہی سے بھارت کی تمام تر ترقیات، اس کے عوام اور اُن کے منصوبوں کو محیط کئے ہوئے ہے۔ یہ بالکل مناسب تھا کہ اس کے جریدہ "یوجنا" کی طرف سے جو متعدد زبانوں میں شائع ہوتا ہے اُس کے نومبر ۸۴ کے خصوصی شمارہ میں "رضاکارانہ سرگرمیوں" کے غیر قدامت پسندانہ موضوع کو اُجاگر کیا گیا۔ اس نے جنوری ۱۹۸۵ میں جزوی طور پر اس موضوع کو اختیار کیا۔ کیا ایک قومی جریدہ کے طور پر اُس سے یہ اُمید کرنا بہت زیادہ ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً ایسے معاملوں کو اُٹھاتا رہے گا جو بھارت کی زندگی کے لیے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ لازمی طور پر اُسے اُن سخت حدود کو پاش پاش کرنا ہوگا جن کے اندر وہ عام طور پر اپنی تحریرات کو مقید رکھتا ہے۔ اپنے زعم میں ہم یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ جو فطری ساخت کا ایک حصہ ہے وہ غیر منقسم ہے۔

یہ ابھی جاننا ہے کہ نومبر ۸۴ کے شمارے میں جن وسیع خیالات افکار کا اظہار کیا گیا ہے، پلاننگ کمیشن نے اُن کے بارے میں کیا کیا ہے؟ لیکن ایک تنظیم ہے دین دیال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جو عقیدتمند مجرّد ڈاکٹر ناناجی دیشمکھ کی سربراہی میں کام کرتی ہے اور جس نے "یوجنا" کے اس خصوصی شمارے کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ یہ تنظیم [illegible] عقیدتمند ساتھی کارکنوں کی جماعت کے ساتھ انسان اور معاشرے کے [illegible] کے مطالعہ کے لیے وقف ہے۔ اس معاملے کو یونہی نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ ناناجی اب سماجی خدمت کے لیے وقف ہیں اور سیاسیات سے قطعاً کنارہ کشی کر چکے ہیں۔ وہ اب ایک عقیدتمند مجرّد کے طور پر گونڈہ کے نادار دُور افتادہ ضلع میں خدمتِ خلق میں جُٹے ہوئے ہیں۔ وہ تب سے ایسا کئے ہوئے ہیں جب سے انھوں نے جنتا حکومت میں ایک سیاسی عہدہ قبول کرنے سے انکار کیا اور گونڈہ سے اُس وقت کی پارلیمنٹ کے ممبر کے طور پر اُن لوگوں کی خدمت کا بیڑہ اٹھایا جنھوں نے انھیں منتخب کیا تھا۔ گونڈہ کی کچھ اپنی ہی بتانے لائق داستانیں ہیں۔ حالیہ ورکشاپ کی صدارت ہمارے نامور دوست سردار ترلوک سنگھ نے کی تھی جو اتنے ہی پرانے ہیں جتنا کہ پلاننگ کمیشن اور بلاشبہ بھارت کی آزادی۔ اس تین روزہ ورکشاپ میں جو دلی میں منعقد ہوا۔ ملک کے مختلف حصّوں سے عام کارکنوں نے شرکت کی۔ انھوں نے اپنے اعلیٰ تجربات بیان کئے۔ یہ ساتھی کارکنوں کے درمیان غور و فکر کا پہلا باب تھا۔ پلاننگ کمیشن کے ممبروں نے ورکشاپ کے وفد کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا۔ وہ لوگ جن عارضی نتائج پر پہنچے اُن کے بارے میں تبادلۂ خیال ہوا۔

قدرے ابتری موجود ہے

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن کے پروفیسر کے این کابرا نے چند سوالات اٹھائے ہیں۔ انھوں نے یوجنا کے نومبر ۸۴ کے خصوصی شمارہ [illegible] ادا کیا ہے۔ ان کے موجودہ سوال کا عنوان ہے "ابتری یا نظم ربط؟" یہ بات ٹھیک کر کہنا مشکل ہے کہ کوئی ابتری نہیں ہے۔ دنیا بھر میں زندگی ہر لحاظ سے مجموعی طور پر ایسے نہایت پُر آشوب اور تغیر کے دَور میں سے گذر رہی ہے جس کا انسان کو پہلے کبھی سامنا نہیں ہوا تھا۔ بھارت قبل از بودھ دَور سے ۲۱ ویں صدی کی جانب وقت اور ثقافت کی گوناگونی اور رنگارنگی کے ساتھ پیش قدمی کر رہا ہے۔ یہ ایک بیہودہ بات ہوگی اگر بھارت اپنی اس پیش قدمی میں ابتری کے کرب سے بے نیاز ہو۔ وہ نوآبادیاتی دَور سے نکلا ہے۔ اس کے بعد گاندھی اور نہرو کا دَور آیا پھر اندرا اور قلیل المدتی جنتا کے دَور آئے۔ آج ہم نہروں کی حکومت کو پیچھے چھوڑ کر ایک نئی صبح کی جانب بڑھ رہے ہیں جو دُنیا بھر میں نمودار ہو رہی ہے۔ نوجوان وقت کے دائرے کا چکّر لگانے کے بعد آگے بڑھ رہے ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ خوب اور خوب ترین میں گہرا تضاد پایا جاتا ہے۔ دستاویز کے آخری حصّے میں جس صورت میں اُس کا مسودہ تیار کیا گیا ہے مجبوراً سب لوگوں کے لیے سب چیزوں کی ضمانت کی گئی ہے۔

نادار توجّہ کے قابل

لیکن یہ امر کسی شک وشبہ کے بغیر واضح کیا جا سکتا ہے کہ ورکشاپ کا تمام تر جھکاؤ معاشرے کے کمزور طبقوں مفلسوں اور ناداروں کی جانب تھا۔

پروفیسر کابرا نے جس بظاہر بیہودگی پر اعتراض کیا ہے وہ اُس سالی ہندو اندازِ فکر کے باعث ہے کہ "سانپ کو مارا جائے، لیکن لاٹھی بھی نہ ٹوٹنے پائے"۔ افلاس بھارت میں۔ بلکہ مجموعی طور پر دنیا بھر میں کیوں ایک مفاد خصوصی ہے۔ تمام جنگیں اس لیے لڑی گئی ہیں کیونکہ غریب موجود تھے، جنھیں تیر یا بارود کے طور پر استعمال میں لانے کے لیے بیوقوف بنایا گیا۔ برسراقتدار قوتوں نے اپنے نائبین کے ساتھ مل کر غریبوں کو جاگیردارانہ نظام میں جکڑ رکھا ہے۔ مذہب نے بھی اس میں اپنا حصّہ ادا کیا ہے۔ گو ہاتھ میں تسبیح لے کر۔ نہ ہی پروفیسر کابرا اور نہ ہی کسی دوسرے کو یہ دعوٰی کرنے کی ضرورت

ہے۔ بھارت کے عوام ۔ خصوصاً [illegible] اور
ناخواندہ دیہاتیوں میں اب ایک قطعی نیا رجحان
پیدا ہو گیا ہے۔ بلاشبہ قوم مجموعی طور پر کینسر کے اس
وائرس سے مجروح ہو گئی ہے جس نے اس کے اندر
ہی حملہ کر دیا ہے۔ یہ ہے عظیم عدم مساوات جو "بہل
بار بھی" اور "بیشتر" لوگوں کے درمیان پیدا ہو گئی
ہے۔ بے چینی خواہ پنجاب اور آسام میں ہو یا بیشتر
قبائلی علاقوں میں پھیل گئی ہو معاشرے میں اسی
کینسر سے پیدا ہوئی ہے۔ عوام اب سیاست میں
پیچیدگیوں، سوانگوں اور حتیٰ کہ بہانوں کو
مزید برداشت کرنے کے لیے اپنی طاقت کھو چکے
ہیں۔ سمندر میں طوفانی لہریں مرئی طور پر اٹھ رہی
ہیں۔ جو سمندر میں تیر رہے ہیں انھیں خبردار رہنا
چاہیے جو تیر رہے ہیں انھوں نے آنکھیں کھول کر
ڈٹے رہنے اور مصائب سے لڑنے کا عزم کیا ہے۔

مصنف نے اس سے پہلے "یوجنا" میں اس
موضوع پر تمام پابندیوں سے آزاد ہو کر جو کچھ لکھا
ہے اُسے برقی پیغام (تار) کی صورت میں بھی دہرانا
غیر ضروری ہے۔ بھارت میں رضاکارانہ سرگرمیاں
ترقیاتی عمل میں صدق دلی سے اپنا حصہ ادا نہیں کر
سکتیں۔ اگر یہ عظیم ملک اور اس کے عوام پہلے مرکز
سے دیہات تک ترقیات کے وسائل، ذمہ داری
اور اختیارات میں باہمی طور پر شریک نہیں ہوتے۔
یہ نہرو کے دور میں اُن کے آئینی وفاقیت کے تصور
کے طور پر بڑا عقیدہ تھا کیونکہ پارلیمنٹ قانون ساز اداروں،
ضلع پریشدوں اور نچلی سطح کے اداروں کو سیاسی
جمہوریت کا ڈھانچہ اور نظام بنانا مقصود تھا۔

امداد باہمی کے اداروں پر مشتمل سہکاری سماج
کو جس کی وفاقی دیہات سے ملکی سطح تک پھیل ہو،
اقتصادی جمہوریت کا بازو بننا تھا۔ پانچویں اسٹیٹ
کو جسے ابھی "عوام کا فورم" بننا ہے۔ رضاکارانہ
طور پر عوام، خصوصاً آج کے گونگوں اور بہروں کی
زندگی کا رضاکارانہ طور پر اظہار کرنا ہوگا۔ یہ
تمام باتیں نہرو کے ساتھ سوچ سمجھ کر طے کی گئی
تھیں۔ "نئے بھارت" کی سیاسی تنظیم، معیشت اور

[illegible] ۔ [illegible]
انقلاب دکھائی تھی۔ لیکن جس کو اُنھوں نے استعمال کیا
وہ اُسی وقت سر بہ مہر کر دیا گیا۔ جہاں تک "انسان
سازی" کا تعلق ہے، پس روی بڑے پیمانے پر
شروع ہوئی۔ اس امر کے قطع نظر کہ ساتویں منصوبہ
کی جسامت، صورت اور تخفیف کیا ہے۔ اس راستے
کوئی فرار نہیں ہے جس پر سے ہمیں گزرنا ہے۔
ورنہ "نئی صبح" پیدائشی مُردہ ہوگی۔ ملک میں ترقی
ہوگی۔ مشینی انسان ہوں گے لیکن "انسان" نہیں
ہوں گے۔

بھارت سرکار بلندی سے پس روی کی سمت
میں متواتر حرکت کر رہی ہوگی۔ بلاشبہ بھارت کے
اندر اور باہر ہماری تمام تر ناکامیوں کے لیے قربانی
کے بکرے ہمیشہ تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ پلاننگ
کمیشن کو ہمیشہ پیشہ وروں کی ایک غیر سیاسی جماعت
کے طور پر مختصر راستوں کے چکر میں نہ پڑ کر حقیقت
پسندی سے کام لینا چاہیے۔

اگر حکومت اور پلاننگ کمیشن اپنی ناکامیوں
اور محدود نتائج میں رضامند رضاکاروں کو
شریک کرنا بھی چاہیں تو یہ قطعی سادہ منطق ہے کہ تمام
موجودہ توقعات کے برعکس اس چال کا اُلٹا اثر
ہوگا۔ ناخواندہ عوام اب اُن بیوقوفیوں کو برداشت
نہیں کریں گے جو اب تک ان سے کی گئی ہیں
یہ عوام میں پائے جانے والے بھارتی کلچر کی عظمت
ہے گو یہ خواص میں بھی موجود ہے۔ آزادی کی لڑائی
عوام کے عزم سے پیدا ہوتی ہے جس کے پیشرو طلبا
ہوتے ہیں اور پھر آئیڈیسن، گیلیلو، ارشمیدس، آکلیڈیس،
لیونارڈو ڈاونسی، نیوٹن، جگدیش بوس، سیتن بوس،
سی۔ وی۔ رامن، راما نجن، پی سی رائے، حتیٰ کہ
آئن اسٹائن جیسے مشہور سائنسدان نمودار ہوں گے۔
ہم اپنے عالموں کو اپنی عظیم سرکاری لیبارٹریوں
میں چھوڑ سکتے ہیں تاکہ وہ خلائی بلندیوں میں
سائنس اور ٹیکنالوجی کے بارے میں تجربے کریں
انھیں بیل گاڑیوں کے بارے میں فکر مند ہونے کی
کیوں ضرورت ہے۔ وہ تمام نامیاتی فاضلات

[illegible] پانی، ہوا، دھوپ اور سادہ
اوزاروں کے بارے میں تحقیق کریں جن سے کہ
کروڑہا لوگوں کے لیے قابل تجدید بنیادی قوت
حاصل ہو سکتی ہے اور انھیں یہ کام ضرور کرنا چاہیے
جدید بود و باش میں دیہی آلات اور اوزاروں
کے بارے میں فوقاً آرائی کیوں کی جائے۔ نئی
نسل کے سائنسدان کسانوں اور خانہ دار عورتوں کو
نو تربیت یافتہ کاریگروں کی وساطت سے ایسے
اوزار دے سکتے ہیں جن کی بدولت انھیں کمر شکن
محنت سے نجات مل سکتی ہے اور انھیں ملکی و
غیر ملکی طبقہ خواص کے جھوٹوں پر انحصار کرنے کی ضرورت
نہیں۔ ضمناً گو اس بات کا براہ راست تعلق نہیں
ہے تاہم سنت ونگووال کا تازہ ترین بیان ان کی
دیہاتی حکمت کے لحاظ سے متحیر کن ہے۔ اُن کا کہنا ہے
کہ وہ آنند پور صاحب قرارداد کو قطعاً فراموش
کر دیں گے اگر بھارت ریاستوں کو ایسی ہی خود
مختاری دے جو امریکہ، سوویت یونین اور کینیڈا
میں موجود ہے۔ افسوس ہے کہ انھوں نے اپنی ریاست
اور دوسری ریاستوں میں ضلعوں نیز ان سے نیچے
کے اداروں کو ایسی ہی مقابلے کی پیش کش نہ کر کے
اپنے بیان کو غیر متوازن بنا لیا ہے۔

عوامی جوش: رضاکارانہ سرگرمیوں کے
لیے "عوام" کا ہونا ابتدائی شرط ہے۔ وہ اپنی
مکمل ترقی کو سُرعت سے عمل میں لا سکتے ہیں۔ اگر اُن
کے نزدیک کوئی آزادی کا فورم ہو۔ یہ وہ مقام ہے
جہاں رضاکار ادارے آتے ہیں جیسا کہ مصنف نے
۱۶ تا ۳۱ جنوری [illegible] "یوجنا" کے شمارے میں بتایا ہے
اس پر اُن معمر لوگوں کو عمل کرنا چاہیے جو دنیا
میں بہت عمر گزار چکے ہیں اور اپنے نام میں "پنڈت"
نزدیکی دریاؤں میں ڈال کر سنیاس لینے کو تیار
ہیں۔ اس رول کے لیے انعامات ۔ حتیٰ کہ صدارتی
اعزاز کی ہوس کے بغیر بھی بیشتر دعوے دار پیدا
ہو جائیں گے۔ اگر ایک بار صحیح ڈھنگ سے تحریک
شروع ہو جائے۔ ایماندارانہ کام اور ایماندار کارکنوں
پر بعد از مرگ بھی دہری رحمت نازل ہوتی ہے۔

جوان اور تیس برس سے نوجوانوں کو سیاسی طور پر پارٹی بازی سے الگ رہنا چاہیے اور دس برس تک انھیں سرکاری ملازموں کا پیشہ اختیار نہیں کرنا چاہیے موخرالذکر کو تربیت نظم و ضبط اور سلامتی حاصل ہے انھیں اپنا کام کسی جانبداری یا ذاتی منافع سے بے نیاز ہو کر انجام دینا ہوگا۔ ممبروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ نگرانی اور عقیدت مندی کی اسپرٹ کو بنائے رکھیں اور تحریک دیتے رہیں۔ رضاکار اداروں کا کام زیادہ تر براہ راست ریاستی یا پبلک سروس کے اداروں کے تحت پروگراموں میں جدت لانا، پلانوں کے بارے میں تجربے کرنا اور زیر عمل کام کا جائزہ لینا ہوگا۔ رضاکار ادارے دیہات سدھار کے لیے سرکاری یا رابطہ عامہ کے کارکنوں کے طور پر تربیت لے سکتے ہیں۔ کسی بھی حالت میں کسی بھی رضاکار ادارے کو "باہم تبادلے" کے طور پر پلان کے وسائل کا حصہ دے کر پلان کے کسی تجزیہ کی قبولیت نہیں کرانی چاہیے، ایسے اقدام کے نتائج رضاکار اداروں اور حکومت دونوں کے لیے تباہ کن ہوں گے۔ اگر رضاکار ادارے اپنی نجی قومی تنظیم بنانا چاہیں تو یہ ان کا اپنا کام ہوگا۔ حکومت کو ایسی تنظیم بنانے یا اس کے لیے سرمایہ دینے کے لیے کچھ نہیں کرنا چاہیے۔ نہرو جی کہا کرتے تھے "آپ بیوروکریسی کو سونا دیجیے۔ سونے کی باہری چمک دمک جلد ہی جاتی رہے گی۔ اور پھر کچھ عرصہ بعد اس (بیوروکریسی) کی بالعموم وسیع تر ایمانداری، اخلاق اور نظم و ضبط کے باوجود اس کا خود اندرونی خول ہی غائب ہو جائے گا۔

تعمیری سرگرمیوں کا طوفان

سائنس اور ٹیکنالوجی ذات پات اور طبقوں میں جکڑے ہوئے معاشرے پر، جو ابھی تک بھارت میں زیادہ تر جاگیردارانہ نوعیت کا ہے، زبردست ضرب لگانے کی سمت میں رواں ہیں۔ نوجوان اقتدار کے مرکز میں آنے کے لیے زور شور سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس کے پیچھے پرانا جاگیردارانہ نوجوانوں کو وقت کے دھارے کے خلاف اپنے چنگل [illegible] رکھنے کے لیے اپنی تمام توانائی ہوئی جدوجہد کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ کوئی بھی حکومت اس طوفان کو نہیں روک سکتی۔ حتیٰ کہ کوئی فوجی حکومت بھی زیادہ ہو سکتا ہے کہ طوفان کو نہیں روک سکتی۔ "قوموں کے اندر دو قوموں یعنی "اکثریت" کے خلاف "چند" کو توازن کی راہ اختیار کرنا ہوگی۔ زندگی میں مساوات کو قطعاً کوئی مقام حاصل نہیں ہے۔ لیکن اگر زندگی کو بقا حاصل کرنا ہے تو (سماجی) انصاف اور توازن کا ہونا ضروری ہے۔ ہمارے لیے نباتات، حیوانات اور حتیٰ کہ کیڑے مکوڑوں کی دنیا کی طرف توجہ دینا بھی ضروری ہے۔ اس سمت میں افزائش کو بڑھاوا دینے کے لیے رضاکار اداروں کا رول واضح ہے۔ بھارت میں ایسی ترقی ہو کر رہے گی، خواہ ہم میں سے کچھ اس کے خلاف سازش یا کوشش کریں۔ پروفیسر کابرا کا نظر فریبی کا خوف بیجا ہے۔ اگر ہمارے پاس دیکھنے کے لیے ابھی آنکھیں ہیں تو ہم دیکھ سکتے ہیں۔ کہ دنیا میں طوفان کا رخ بدل رہا ہے۔ خلائی دور از خود اس نظر فریبی کے خلاف توازن بنائے رکھنے والی قوت ہے۔

تتمہ

اس کا اختتام ان سوالات سے متعلق مختصر تتمہ کے ساتھ ہو سکتا ہے جو مصنف کی طرف سے اس مقالے میں زیر بحث ورکشاپ سے کیے گئے ہیں۔ یہ ان اشخاص کے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں جن کے اپنے ذہن ابھی تک تھکے نہیں ہیں۔

۱۔ زندگی کے ڈانڈے باہمی رشتوں سے اسی طرح ملے ہوئے ہیں جس طرح آزادی کے ڈانڈے زندگی سے ملے ہوئے ہیں۔

۲۔ زندگی کیا ہے؟

وہ عمل جو زندگی کو "زندہ رہنے" اور "زندہ رہنے دو" کے قابل بناتا ہے۔

۳۔ آزادی کیا ہے؟

جس میں ہر ایک کو اپنے ضمیر کے مطابق "زندہ رہنے" اور "کام کرنے" کا حق ہو اور کوئی دوسرا اس میں مداخلت نہ کرے۔

۴۔ کیا اب رجحان "آزادی" یا "جاگیرداری" کی طرف جا رہا ہے؟

۵۔ تعمیری کام ــ کیا اس کے لیے عوام کو آزادی نہیں ہے اور انھیں خود پر بھروسہ نہیں ہے؟

۶۔ چار اسٹیٹ۔

قانون سازی
انتظامیہ۔ } کیا یہ کافی ہیں؟
عدلیہ۔
اظہار خیال۔

۷۔ کیا دنیا بھر میں پانچویں اسٹیٹ کی سخت ضرورت ہے؟ "عوام کی اسٹیٹ" "آزادی اور خود اعتمادی سے متعلق فورم"۔ ایسے لوگوں کے فورم جو دوسروں کے لیے خواہ مخواہ اپنا لہو جلا سکیں۔

۸۔ رضاکارانہ کارروائی ان باتوں کا تقاضا کرتی ہے۔

ا۔ قیادت نیز رضاکار جو کلیتہً رضامندی سے کام کریں۔

ب۔ رہنماؤں اور رضاکاروں، دونوں کی تربیت۔

ج۔ "تحقیق و مطالعہ" اور "توسیع" نیز تجربوں کے لیے ادارے۔

د۔ تنظیمات برائے ۱۔ منصوبہ بندی۔ ۲۔ انتظام۔ ۳۔ تشخیص و جائزہ۔ ۴۔ وسائل۔

۹۔ عوامی تربیت کے سلسلے میں حکومت یا رابطہ عامہ کے اداروں کے لیے تکنیکی عملہ فراہم کرنا۔

۱۰۔ شراکت دار کے طور پر حکومت کے مقابلے میں رضاکار ادارے "شریک"؟ یا "راستہ بنانے والے" یا راستہ دکھانے والے؟

۱۱۔ جمہوریت ـ سیاسی، اقتصادی، سماجی، عملی؟

۱۲۔ رضاکار ادارے بمقابلہ سیاسی پارٹیاں۔

۱۳۔ رضاکار ادارے بمقابلہ عام سطح کے لوگ۔

۱۴۔ "سوچنے میں دور رس"۔ برتنے میں "دور رس"

(باقی صفحہ پر)

غزلیں

محمد حسین عباسی پرویز

ہم اشک کے تاروں کو لفظوں میں پرو لیں گے
آوازِ غمِ دل کو گیتوں میں سمو لیں گے

اچھا ہے کہ وہ ہم کو دیوانہ سمجھ بیٹھے
جب چاہیں گے ہنس لیں گے جب چاہیں گے رو لیں گے

جب چاندنی راتوں میں ٹپکے گا لہو دل کا
ہم چاند کی کرنوں سے ہر زخم کو دھو لیں گے

ان سے بھی بہت آگے منزل ہے محبت کی
کعبے سے بھی ہو لیں گے بتخانے سے ہو لیں گے

یا اس کو جنوں کہیے یا اپنی ادا کہیے
خود آپ جو چاہیں گے دیوانے وہ بولیں گے

امڈا ہوا طوفاں ہے آنکھوں میں نہ ٹھہرے گا
ہم آگ کے دریا میں دامن کو بھگو لیں گے

ساحل پہ نظر آئے کیوں ڈوبنے والوں کی
کشتی کو ڈبو دیں گے اپنے کو ڈبو لیں گے

پرویز کوئی شکوہ ہے اُن کی نگاہوں میں
ہم اُن کی نگاہوں کو اب دل میں چبھو لیں گے

قاشیں

تسنیم شاہ جہانپوری

حالات کے اثر سے بڑھیں بے نیازیاں
دونوں کی زندگی کے تقاضے بدل گئے

کچھ آپ نے بھی ہم کو فراموش کر دیا
کچھ ہم بھی احتیاط کے سانچے میں ڈھل گئے

ہو کے احساسِ کمتری کا شکار
اپنی نظروں سے گر گیا ہوگا

تم جب آئینہ دیکھتے ہو گے
آئینہ تم کو دیکھتا ہوگا

میکدہ میں نہیں کوئی تفریق
خاص پیتے ہیں، عام پیتے ہیں

جن کی فطرت ہے انقلاب پسند
وہ بدل کر نظام پیتے ہیں

نور محمد یاس

پوچھوں، چلی کہاں سے یہ کیا یا مہک بھری
دیکھے اگر نہ مجھکو وہ نظروں سے شک بھری

ہمراہیانِ دشت! سمندر قریب ہے
زخموں کو چومتی ہیں ہوائیں نمک بھری

کیا پھول کوئی لمس کی گرمی سے جل اُٹھا
تتلی نے جست شاخ سے کیوں یک بیک بھری

جنگل کی طرح پھیل گئیں جب سے بستیاں
خطروں سے اپنے شہر کی اک اک سڑک بھری

مجھ سے نفس نفس کوئی کھینچتا چلا گیا
اتنا کہا تھا: سانس ہے کتنی مہک بھری

زخموں کی بات کھل گئی لہجے کے رنگ سے
گویا لہو میں تھی مری آواز تک بھری

کیا پا لیا ہے ذات کے صحرا میں تم نے یاس
چہرہ ہے پُر غبار اور آنکھیں چمک بھری

مناظر حسن شاہین صدیقی

تقدیر میں اپنی گل نہ سہی پر جشنِ بہاراں کر لیں گے
کانٹوں سے سجا کر ویراں کو تزئینِ گلستاں کر لیں گے

ہر سمت اندھیرا نفرت کا یہ قلب و نظر کی تاریکی
ہم پیار کی شمع روشن کر ہر دل کو درخشاں کر لیں گے

اِس دل کے شکستہ گوشے میں یادوں کے اُجالے رہنے دو
جب شامِ الم تڑپائے گی پلکوں پہ چراغاں کر لیں گے

کیا ہم سے بھلا ٹکرائیں گے آلام و مصائب کے شعلے
منزل پہ پہنچنے سے پہلے جب عزم کو طوفاں کر لیں گے

باتوں سے نہیں کچھ ہونے کو، یہ دورِ عمل ہے اے شاہیں
تدبیر کے ہاتھوں سے اپنی تقدیر درخشاں کر لیں گے

[illegible]

عجب حالات تھے موسم کی سازش ہر طرف تھی
جدھر دیکھو سمندر ہی پہ بارش ہر طرف تھی

بس اپنی دھوپ اوڑھے ایک طرف تنہا کھڑا تھا
وہ کیا کرتا، گھنے سایوں کی یورش ہر طرف تھی

بظاہر تھا خود اپنی ذات میں ہر آدمی گم
اسی چہرے اسے پانے کی کوشش ہر طرف تھی

سجاتا کتنی شمعوں کو وہ اب پلکوں پہ اپنی
اسی دہلیز پر چلنے کی خواہش ہر طرف تھی

سنبھلنے کس کو دیں گی عمر کی چکنی ڈھلانیں
سرِ منزل بھی واں قدموں میں لغزش ہر طرف تھی

بہت دشوار تھا ہجرت کے زنداں سے نکلنا
وہی خمیازہ گاہِ دود و آتش ہر طرف تھی

ہم اربابِ ہنر بھی کیا ہنر کی داد دیتے
وہی بے شیوہ و بے وضع دانش ہر طرف تھی

ہمیں تھا اپنی بستی میں پرانا عہد نامہ
نئے لہجوں کی بے معنی سفارش ہر طرف تھی

نہ وہ عقدے، نہ وہ ناخن، نہ وہ مرہم نہ وہ زخم
فقط اس دور میں بے صرفہ کاوش ہر طرف تھی

آزاد غزلے

کرشن موہن

حکایاتِ قدیمہ سے سہارا مانگ لیتا ہوں
کہ میں اسطور کی کھونٹی پہ فکرِ نو کا جامہ ٹانگ دیتا ہوں

میرا باطن فسردہ ہے، شکستہ ہے
بظاہر تو وجیہ ہوں

اُمیدوں اور شکستوں کی ندی میں
ہوس کی ناؤ کھیتا ہوں

قدم چومے نہیں نصرت نے
زمانے کا چہیتا ہوں

میرے جذبات بنجارے ہیں، من بنجارہ بستی کرشن موہن
استقامت کو ترستی ہے

مگر یہ کیفیت کیا ہے کہ ہر بنجارہ کہتا ہے میں اس بستی
کا نیتا ہوں

ڈاکٹر مسعود جعفری

نیشکر (گنّا) کی معیاری فصل اور اُس کا حصول

نیشکر کی معیاری فصل میں شکر (Suo rose) کی مقدار ۱۵ فیصد سے زیادہ ہوتی ہے۔ تجربہ گاہوں میں اس کا کیمیاوی تجزیہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ جب فصل بلوغیت (Matu rity) کے دور (Period) میں آجاتی ہے۔ تو اس کے رس (Juice) کی پاکیزگی (Purity) اور شکر کی مقدار معلوم کرتے ہیں۔ عموماً اس دور میں پاکیزگی ۸۵ فیصد سے زیادہ اور بازیابی (Recovery) ۹٫۵ فیصد رہتی ہے۔ حالانکہ اس سے کم بازیابی کے باوجود بھی شکر کی تیاری ممکن ہے لیکن اسی فصل کو مکمل طور پر پختہ (Mature) تصور نہیں کیا جاتا۔ نیشکر کی بلوغیت اور شکر کی بازیابی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ چونکہ بازیابی کا انحصار تنوں میں ریشے (Fiber) کی مقدار پر ہے اور نیشکر کی قسموں میں یہ تفریق نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ قدرتی طور پر مسلّم ہے کہ نیشکر کی جس قسم میں ریشے کی مقدار زیادہ ہوگی اس میں رس کم ہوگا اور شکر کی بازیابی بھی کم ہوگی۔

بلحاظ بلوغیت نیشکر کی قسموں کو تین زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ جلد تیار ہونے والی (Early Matu ring) ۲۔ متوسط (Mid.Maturing) اور ۳۔ تاخیر سے تیار ہونے والی (Late Maturing) مشاہرے سے معلوم ہوا ہے کہ جلد تیار ہونے والی قسم میں بلوغیت کے آثار جلد نظر آجاتے ہیں حالانکہ اس سے فی ہیکٹیر پیداوار کم ملتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ نباتاتی اور دیگر کیڑے مکوڑوں والی بیماریوں سے جلد متاثر ہوتی ہے۔ ذیل میں ایسی قسموں کا ذکر ہے جن کی کاشت استوائی اور نیم استوائی علاقوں میں ہوتی ہے۔

نیم استوائی علاقے

نام ریاست	جلد تیار ہونیوالی قسمیں	متوسط اور تاخیر سے تیار ہونے والی قسمیں
اترپردیش :-	Cos .۵۱۰ ، Co .۹۹۵ Co .۹۸۷	Cos..۶۵۸ ، Co.۱۱۵۸ ، Co.۱۱۴۸ ، Cos .۷۷۰ Co .۱۳۴۷ ، Cos .۷۶۷ Co.۶۲۳۹۹ ، Co.۶۸۱۲ Co.S.۷۶۷ B.O.۷۰ ، B.O.۳۴ ، B.O.۱۷ Co.۱۱۵۷ B.O.۵۴ ، B.O.۷۱ Co.S.۶۳۳ ، C.O.۹۹۱۱
ہریانہ :-	Co.J ۵۸۸ ، Co ۶۹۱۴ Co. ۷۷۱۷	Co.۱۱۵۸ ، Co.۹۷۵ Co.J ۹ Co ۱۱۴۸
پنجاب :-	Co.J ۶۴	Co.J ۶۷ Co.۱۱۵۸ ، Co.۹۷۵ Co.۱۱۴۸ ، Co.J ۴۶
بہار :-	B.O.۷۵ B.O.۴۳ B.O.۹۹ B.O.۹۰ C.O.P.۲	B.O.۷۶ ، B.O.۷۰ ، B.O.۳۴ B.O.۸۸ B.O.۸۹ B.O.۹۱ Co.۱۱۸۵ ، Co.۱۱۸۸ ، B.O.۸۹
ناگالینڈ :-	Co.۹۹۷ ، Co.۳۱۳	Co.۴۲۱، Co ۹۶۱ ، C.O.۷۴۰ ، Co ۴۱۹
آسام :-	Co.۱۰۰۸ ، Co ۹۹۷	Co.۶۳۱۵ ، Co.۱۱۳۲ ، Co.۷۴۰

راجستھان:۔	Co.۹۹۷، Co ۴۴۹، Co ۷ ۳۹	Co.۴۱۹، Co.۱۰۰۷، Co.۵۲۷، B.O.۱۷، Co.۱۲۵۳، Co.۳۱۲، Co.۱۱۱۱، Co.S.۲۴۵
مغربی بنگال:۔	Co.۹۹۷، Co ۳۱۳، Co.۶۲۰۱۰	Co.۶۳۱۵، Co ۸۴۲، Co.۸۰۱، Co.۱۴۳۲، Co ۱۱۳۲، Co.۹۶۱، B.O.۱۷، Co.۱۰۰۸، Co ۶۲۰۱۱، Co.۱۱۴۸، Co ۱۱۵۸، Co.۵۲۷، Co.۴۱۹

"استوائی علاقے"

نام ریاست	جلد تیار ہونے والی قسمیں	متوسط اور تاخیر سے تیار ہونے والی قسمیں
مہاراشٹر	Co.۷۷۵، Co.۴۱۹	Co.۶۲۱۷۵، Co.۶۷۸، Co.۷۴۰، Co.۸۵۳، Co.۷۹۸
آندھرا پردیش:۔	Co.۸۲۷، Co.۹۹۷، CoA ۷۱-۱، Co ۶۹-۷، CoA.۷۶-۱	Co.۴۱۹، Co.۹۷۵، CoA.۷۶۰۲، Co.۶۲۱۷۵
کرناٹک:۔	Co.۶۴۱۵، I.C ۲۲۵، B.O.۳۷۱۷۲	Co.۴۴۹، Co ۷۴۰، Co.۴۱۹، H-۲۰۴۵، Co.۶۲۱۷۵
تامل ناڈو	Co.۷۷۱، Co.C.۶۷۱، Co.C.۷۷۳، Co.C.۷۷۲	Co.C.۷۷۴، Co.۶۳۰۴، Co.C.۷۷۸، Co.C.۷۷۵، CoC.۷۷۹، Co.S.I.۷۷۶
گجرات:۔	Co.۹۵۵، Co.۷۷۵	Co.۷۹۱، Co.۴۱۹
مدھیہ پردیش:۔	Co.۷۷۵، Co.۵۲۷، Co.۱۱۰۱، Co.۱۱۴۹	Co.۱۳۰۷، Co.۶۷۸، Co.۴۱۹، Co.۶۳۰۴، Co.۱۳۰۵، Co.۸۵۳، Co.۶۱۷، Co.۶۲۱۷۵
کیرالا:۔	Co.۶۵۸، Co.۹۹۷	Co.۳۲۱۷۵، Co.۶۳۰۵، Co.۴۴۹، Co.۷۸۵

اڑیسہ:۔	Co.۵۲۷، Co.۹۹۷، Co.۹۷۵، Co.۷۴۰، Co.۴۱۹، Co.۶۲۱۷۵، Co.۱۰۵۳
گوا:۔	Co.۶۲۱۷۵، Co.۷۴۰
پانڈیچری:۔	Co.C.۶۷۱، Co ۷۴۰، Co ۷۷۲، CoC.۷۷۱، Co.C.۷۷۳، Co.۴۴۹، Co.۴۱۹، Co.۶۳۰۴، Co.۸۵۳، Co.C.۷۷۵، Co.C.۷۷۴، Co.C.۷۷۷، Co.S.I ۷۷۶، Co.C.۷۷۹، Co.C.۷۷۸

جغرافیائی محلِ وقوع اور آب و ہوا

مہاراشٹر

جن ممالک میں نیشکر کی زراعت ہوتی ہے ان میں وہ ممالک جو خطِ استوا کے دونوں جانب (شمال اور جنوب میں) ۱۶ سے ۲۱ درجہ طول البلاد کے درمیان واقع ہیں بلحاظ بازیابی نسبتاً دیگر ممالک کے زیادہ افضل ہیں۔ منطقائی درجۂ حرارت بازیابی پر اثر ڈالتا ہے۔ شمالی بھارت میں زیادہ سے زیادہ (Maximum) درجۂ حرارت ۲۳ سے ۲۲ سنٹی گریڈ اور کم سے کم (Minimum) ۱۰ سے ۱۴ سنٹی گریڈ بازیابی کے لیے موافق دریافت ہوا ہے۔ اگر سرمائی درجۂ حرارت ۳ سنٹی گریڈ سے کم ہو جائے یا اس موسم میں بارش کی وجہ سے بھی شکر کی بازیابی میں کمی آجاتی ہے۔ موسم سرما میں پالے سے فصل کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ لہٰذا ایسے علاقوں میں جہاں پالے کا اندیشہ رہتا ہے وہاں نیشکر کے کھیتوں میں چاروں طرف اوپر کی تین چار قطاریں بوتے ہیں اور پالے کے امکان پر کھیتوں میں آبپاشی کر دیتے ہیں۔ اس عمل سے نیشکر کی فصل پالے سے محفوظ رہتی ہے کیونکہ آبیاری کی وجہ سے کھیت کی

مٹی کا درجۂ حرارت فضائی درجۂ حرارت سے متاثر نہیں ہوتا۔

کیمیاوی کھادوں کا اثر

نائٹروجن والی کھاد سے پودوں کی بالیدگی پر نمایاں اثر پڑتا ہے کیونکہ نائٹروجن سے پتیوں اور نسیجوں میں نمی خوب رہتی ہے جو کیمیاوی عمل میں معاون ہے لیکن غیر متوازن اور تاخیر کردینے پر اس کا منکوسس اثر پڑتا ہے۔ فصل تاخیر سے تیار ہوتی ہے اور رس کی کوالٹی (Juice quality) گر جاتی ہے۔ لہٰذا کاشتکاروں کو چاہئے کہ وہ کیمیاوی کھادوں کا استعمال نیشکر کی بوائی سے دو سے تین ماہ کے اندر پورا کرلیں۔ شمالی بھارت میں مانسون سے قبل تک یہ ممکن ہے لیکن پندرہ سے اٹھارہ ماہ والی فصل جسے ادسالی (Adsali Crop) کہتے ہیں۔ تاخیر کا اثر نہیں ہوتا۔ پھر بھی فصل کے تیار ہونے سے تین ماہ قبل کیمیاوی کھاد کا استعمال بند کردیں۔ گرم مرطوب موسم میں نائٹروجن والی کھاد کی تاخیر کے سبب نیشکر کے رس میں شکر کی مقدار کم ہوتی ہے۔ جو شکر سازی یا گڑ سازی میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔

فاسفیٹ والی کھاد کا رس کی کوالٹی پر مفید اثر پایا گیا ہے۔ خصوصاً ان علاقوں میں جہاں کی مٹی میں فاسفیٹ یا فاسفورس کی کمی ہے فاسفورس کی موجودگی سے نیشکر کا رس زیادہ مصفا رہتا ہے۔

بھارت کے کچھ علاقوں کی مٹی میں پوٹیشیم کی کمی ہے۔ لہٰذا وہاں پوٹاسیم کھاد سے پیداوار اور بازیابی دونوں کو فائدہ ہوا ہے۔ پوٹیشیم سے پودوں میں کیمیاوی عمل بخوبی انجام پاتے ہیں، نسیجوں میں نمی کی فراوانی رہتی ہے۔ اور پودے سرسبز و شاداب رہتے ہیں

کھیتوں کی نرائی اور گڑائی

(Hoeing & Weeding)

مشاہدے سے دریافت ہوا ہے کہ نیشکر کے کھیتوں میں فاضل گھاس پھوس (Weeds) کی زیادتی سے نیشکر میں ریشے (Fiber) کی فیصد مقدار زیادہ ہو جاتی ہے کیونکہ یہ گھاس پھوس خوراکی اجزاء کے علاوہ پانی کی وافر مقدار استعمال کرلیتے ہیں اور نیشکر کے پودوں کو پانی کم ملتا ہے۔ تنوں کے نسیجوں میں نمی کی کمیابی سے پودوں کی بالیدگی متاثر ہوتی ہے بالآخر پودوں میں رس کم ریشہ زیادہ بنتا ہے۔ کاشتکاروں کو چاہئے کہ کھیتوں کی وقت پر نرائی گڑائی کا لحاظ رکھیں۔

آبپاشی اور پانی کی نکاسی

(Irrigation & Drainage)

صحیح وقت پر فصل کی آبپاشی اچھی پیداوار اور حصول شکر دونوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ آبپاری سے پودے تناور بنتے ہیں، اور پتیاں سبز اور چوڑی نکلتی ہیں۔ ان میں شعاعی ترکیبی عمل (Photosynthesis) خوش اسلوبی سے انجام پاتا ہے جو پتیوں میں شکر کی تالیف میں معاون ہے۔

اگر کھیتوں میں مسلسل پانی بھرا ہے یا بارش کے دوران فاضل پانی کی نکاسی نہ کی جائے تو پودوں کی بالیدگی مسدود ہوجاتی ہے۔ پودے گر جاتے ہیں اور ان کی بالیدگی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ ایسی حالت میں سفید مکھی (White Fly) اور نباتاتی بیماری ولٹ (Wilt) کا حملہ پر زور بڑھ جاتا ہے۔ اور متاثرہ فصل کی بازیابی کم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا بارش میں یا اس سے پیشتر اگر فصل تناور ہو جائے تو پودوں کی جڑوں پر مٹی چڑھادیں (Earthing up) تنوں کو سیدھا رکھنے کے لیے انھیں قطاروں میں ایک دوسرے سے باندھتے ہیں۔ باندھنے کے لیے پودوں کی فاضل پتیاں استعمال کی جاتی ہیں۔

پودوں میں پھولوں کی نمود

(Flowering Arrowing)

یہ عام خیال ہے کہ جب نیشکر کی فصل پک جاتی ہے اس وقت پودوں کے بالائی سرے سے پھولوں کی نمود شروع ہوجاتی ہے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ نیشکر کی کچھ قسمیں ایسی بھی ہیں جن میں دور پختگی (Maturity Period) سے بہت پہلے بھی پھول نکل آتے ہیں خصوصاً 00 ۲/۹ میں۔ پھولوں کی نمود سے پودوں کی نشوونما ختم ہوجاتی ہے اور رس میں شکر کی تخفیف یقیناً ہے اس کا تدارک کیمیاوی ادویات کے ذریعے ممکن ہے۔

بیماریوں کا اثر

نباتاتی اور کیڑے مکوڑوں والی مختلف بیماریوں سے بھی نیشکر کی کوالٹی پر مضر اثر پڑتا ہے جیسے پائیریلا (Pyrilla) ایک قسم کا کیڑا ہے۔ ریڈ راٹ (Red rot) ایک قسم کی نباتاتی بیماری۔ ولٹ (Wilt) یہ بھی نباتاتی بیماری ہے۔ سوراخ کرنے والا کیڑا (Borer) بھی مضرت رساں ہے مختلف کیمیاوی ادویات کے ذریعے ان بیماریوں پر قابو پا سکتے ہیں۔

فصل کی کٹائی اور نیشکر کی کوالٹی

فصل کو کاٹنے کے بعد اگر اسے زیادہ دنوں تک استعمال نہ کیا جائے تو تنے خشک ہونے لگتے ہیں اور رس میں شکر کی تخفیف شروع ہو جاتی ہے۔ تخفیف کا سبب کیمیاوی ردعمل ہے جس کے ذریعے شکر (Sucrose) کے ذرات پھلوں کی شکر (Invert Sugar) میں تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ لہٰذا فصل کے کٹنے کے بعد اسے شکر سازی کے کارخانوں تک جلد پہنچانے کا بندوبست کرنا چاہئے۔ اس کے علاوہ کارخانوں میں پیرائی کی تاریخوں کا لحاظ کرکے فصل کی کٹائی کریں تاکہ اس کی نقل و حمل میں تاخیر نہ ہو۔ اگر تاخیر لازمی ہو تو کٹے ہوئے گنوں کو اس کی خشک پتیوں سے ڈھک دیں ممکن ہو تو اس پر پانی بھی چھڑک دیں اس عمل سے تبخیر کم ہو جائے گی اور نیشکر خشک ہونے سے محفوظ رہے گا۔

کوالٹی کو بہتر بنانے کا مصنوعی طریقہ

ان علاقوں میں جہاں موسم سال کے زیادہ دنوں تک گرم اور مرطوب رہتا ہے خصوصاً بھارت کے جنوبی علاقوں میں شکر کی فصل کافی تاخیر سے تیار ہوتی ہے۔ لہٰذا کارخانوں کو بہتر فصل مہیا کرنے کے لیے ایک مصنوعی طریقہ مروج ہے۔ اس طریقے سے فصل کی آبپاشی کا وقفہ بڑھا دیتے ہیں تاکہ پودوں کے نسیجوں میں نمی ہو جائے۔ ایسا کرنے سے فصل بلوغیت کی جانب راغب ہو کر جلد تیار ہو جاتی ہے۔ ایک تنومند پودے میں پتیوں کی میانوی نمی (Sheath moisture) ۸۳ فیصد اور آٹھویں سے دسویں پودوں تک ۸۴ فیصد رہتی ہے۔ آبیاری کو موقوف یا وقتی طور پر متروک کر دینے سے یہ نمی علی الترتیب ۷۳، اور ۷۴، فیصد رہ جاتی ہے۔

یہ مصنوعی طریقہ جزیرہ ہوائی میں کافی مقبول ہے۔ صوبہ بہار کے نیشکر کے علاقوں میں ایک کیمیاوی مرکب جسے ۲-۴-ڈی (2-4 D) کہتے ہیں اس عمل کی جگہ پر مستعمل ہے۔ اس کا ۰.۵ فیصد محلول (سوڈیم سالٹ) کھڑی فصل پر چھڑکتے ہیں۔ تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ اس مرکب سے نیشکر کی کوالٹی بہتر ہو گئی ہے۔ سب سے پہلے یہ تجربہ کیوبا میں کیا گیا تھا۔

فصل کی بلوغیت کی جانچ

بہتر فصل اور زیادہ حصول شکر کی خاطر ضروری ہے کہ فصل کو اسی وقت کاٹا جائے جب اس میں شکر کی مقدار اپنے عروج پر پہونچ جائے۔ اس کے لیے سرسری طور پر جانچ کر سکتے ہیں: ایک طریقہ تو یہ ہے کہ پودوں کا مشاہدہ کریں۔ بلوغیت کے دوران پودوں کی پرانی پتیاں خشک ہو کر جھڑ جاتی ہیں، باقی زرد اور سخت ہو جاتی ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک توانا تنہ میں وسط سے تھوڑا اوپر چاقو سے شگاف لگا دیں۔ کٹے ہوئے حصے کا رُخ سورج کی شعاعوں کی جانب کریں۔ اگر اس میں چمک نظر نہ آئے تو سمجھیں کہ فصل ابھی تیار نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس اگر اس میں چمک نظر آئے تو یہی اشارہ ملتا ہے کہ فصل بلوغیت کی جانب مائل ہے۔

تجربہ گاہ میں بلوغیت کی جانچ

تجربہ گاہ میں نیشکر کے رس کی جانچنے کے کئی طریقے ہیں۔ اس میں پھلوں کی شکر (Innert Sugar) اور پاکیزگی (Purity) کو کیمیاوی طریقے سے معلوم کرتے ہیں۔ اگر پھلوں کی شکر ۱.۰ فیصد سے کم اور پاکیزگی ۸۵ یا ۸۰ فیصد سے تجاوز کر جائے تو فصل کو تیار سمجھنا چاہیے حالانکہ ۱ فیصد سے کم پھلوں کی شکر کے باوجود گڑ بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی ثقل یا برکس (Brix) کے ذریعے بھی فصل کی بلوغیت کا اندازہ ممکن ہے۔ ۱۷ سے زیادہ برکس والے رس کو بہتر تصور کرتے ہیں۔ لیکن یہ طریقہ عموماً توانا فصل کے لیے مناسب ہے۔

بقیہ: احساس کی خوشبو

اور جہیز میں بالکل یقین نہیں رکھتا تھا۔ وہ کاکی کو کب سے اپنا مان چکا تھا اور اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ کاکی کے بارے میں اپنے گھر چھٹی لکھ دے گا۔ کاکی ایک یتیم اور غریب لڑکی تھی تو کیا ہوا۔ وہ انسان تو تھی اور کاکی سے اچھی لڑکی اور کون ہو سکتی تھی۔ آنند اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ کاکی اچانک اٹھ کر کالج کے دفتر کی طرف جانے لگی۔

آنند نے اپنے کمرے میں پہونچ کر سب سے پہلے اپنی ماں اور اپنے چاچا کے نام ایک لمبی چوڑی چھٹی لکھ دی۔ اسے ڈر تھا کہ اس کے گھر والے کاکی کے ساتھ اس کی شادی کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں گے۔ کیوں کہ یہ شادی گاؤں میں شاید ان کی بدنامی کا سبب بن جائیگی۔ لیکن ماں تو اسے بہت چاہتی تھی اور وہ شاید چھٹی سن کر مان جاتے اور دوسروں کو بھی منالے۔ چھٹی ڈال کر اس نے آٹھ دس دن تک بڑی بے تابی سے جواب کا انتظار کیا۔ جتنی لمبی چھٹی آنند نے لکھی تھی اتنا ہی چھوٹا جواب پندرہ دن کے بعد اس کے پاس آگیا۔ یہ جواب اس کے چاچا نے سب گھر والوں کی طرف سے لکھا تھا۔ اس میں صرف دو ہی فقرے تھے کہ جہیز نہ لینے اور نہ دینے کی قسم تو سب گاؤں والوں نے پہلے ہی کھا رکھی تھی اور اونچ نیچ اور چھوا چھات میں اس کے گھر والوں کا بالکل وشواش نہیں ہے۔ اس لیے اگر آنند کو کاکی پسند ہے، تو سب گھر والوں کو بھی پسند ہے۔

آنند یہ چھٹی لے کر دیوانہ وار کالج کے اسٹاف روم کی طرف دوڑا لیکن کاکی وہاں نہیں تھی۔ وہ باہر نکل کر لان کی طرف چل دیا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ کاکی اس وقت کوئی پیریڈ نہیں تھا۔ کاکی لان میں درختوں کی طرف ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھی ہوئی ایک کتاب پر جھکی ہوئی تھی۔ ان چند دنوں میں وہ ایک دوسرے سے ملے بھی نہیں تھے۔ آنند لپک کر اس کے پاس پہونچ گیا اور اس نے کاکی کو گھر سے آئی ہوئی چھٹی دیدی۔ پھر وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"کاکی کیا تم اب بھی مسکرا کر کسی کو زندگی نہیں دوگی؟"۔

کاکی نے مسکرا کر اپنا ہاتھ آنند کے ہاتھ میں دے دیا اور آنند نے وہ ہاتھ اچھی طرح تھام لیا۔ آنند نے اچانک محسوس کیا کہ فضا میں ایک خوشگوار خنکی تھی اور کالج کا سارا لان ایک عجیب سی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ ★

م۔م۔ راجندر

احساس کی خوشبو

ٹھاکر ہر پھول سنگھ کا لڑکا آنند ایم۔ اے کی ڈگری لے کر گھر آیا تو ہر پھول سنگھ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ اس گاؤں میں آنند پہلا لڑکا تھا، جس نے اتنی تعلیم حاصل کر لی تھی۔ پھر اس نے ایم اے انگریزی ادب میں کیا تھا اور اس کی سیکنڈ ڈویژن آئی تھی۔ اس کی ماں، دادی اور چھوٹا بھائی رنبیر جو خود بھی ہائر سیکنڈری میں پڑھ رہا تھا آنند کی کامیابی پر اتنے خوش تھے کہ ان کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ آج گھر میں جو آ رہا تھا اسے لڈو کھلائے جا رہے تھے۔ ٹھاکر ہر پھول سنگھ اگرچہ گاؤں کا سب سے خوشحال کسان تھا مگر آنند گھر کا پہلا لڑکا تھا جو اتنا پڑھ گیا تھا۔ خود ہر پھول سنگھ صرف پانچ چھ جماعت تک پڑھا تھا جبکہ آنند کی ماں اور دادی تو بالکل بھی نہیں پڑھی تھیں۔ آنند کے ایم۔ اے پاس کر کے گھر آنے کی خبر گاؤں میں آناً فاناً پھیل گئی اور ٹھاکر ہر پھول سنگھ کے گھر دن بھر مبارکباد دینے والوں کا تانتا لگا رہا۔ شام کو گھر کے باہر آنند کے کچھ دوستوں نے خوشی میں ناچنا شروع کر دیا اور ہر پھول سنگھ بھی خوشی کے مارے ان لڑکوں میں شامل ہو گیا۔ رات کو دس گیارہ بجے تک اسی طرح گھر پر رونق اور ہنگامہ رہا۔

آنند شہر میں کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں رہا کرتا تھا اور اگرچہ ہر پھول سنگھ ہر مہینے گھر سے گھی اور کھانڈ بھیجا کرتا تھا لیکن سب گھر والوں کو یہ فکر رہتی تھی کہ آنند کو کچھ کھانے کو ملتا بھی ہے کہ نہیں۔ چنانچہ جب آنند چھٹیوں میں گھر آ جاتا تھا تو سارا گھر اسے دودھ، گھی اور میوہ پڑی کھیر اور حلوہ کھلانے میں لگ جاتا تھا۔ آنند کو بھی ان چیزوں کا بڑا شوق تھا اور وہ شہر میں ان چیزوں کی کمی کو اپنے گھر ہی پورا کرتا تھا۔ کالج کا ہوسٹل اسکول کے ہوسٹل سے بڑا مختلف تھا۔ کالج کے ہوسٹل میں نہ کوئی لڑکا گھر سے گھی منگاتا تھا اور نہ گھی کھاتا تھا۔ ہوسٹل میں صبح ملنے والا دودھ اسے بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ اپنے گھر سے آتے ہوئے گھی اور کھانڈ کا کوئی خاص استعمال کبھی نہ ہو سکا اور اکثر اسے انھیں کسی نہ کسی کو دے دینا پڑتا تھا۔ مگر آنند کے منع کرنے کے باوجود گھر والوں نے گھی بھیجنا بند نہیں کیا کیونکہ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ گاؤں میں ورزش کرنے اور سیروں دودھ اور گھی کھانے والا آنند شہر میں ان کے بغیر رہ سکتا ہے۔

گاؤں آ کر ابھی آنند نے مشکل سے چند دن ورزش کر کے اور دودھ اور گھی کھا کر اپنی صحت کی طرف توجہ دی تھی کہ اسے اپنے ہی کالج سے چٹھی مل گئی، جس میں اسے وہاں انگریزی کے لیکچرار کے طور پر ملازمت کی پیش کش کی گئی تھی۔ اس چٹھی کو پڑھ کر آنند کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا اور جب اس نے اپنی ماں اور دادی کو بتایا کہ اسے شروع میں ہی ایک ہزار سے زیادہ تنخواہ ملےگی تو ماں اور دادی خوش بھی ہوئیں اور حیران بھی اور انھوں نے فوراً آدمی بھیج کر ہر پھول سنگھ کو کھیت پر سے بلوا لیا۔ اب یہ خبر بھی سارے گاؤں میں آناً فاناً پھیل گئی کہ آنند کالج میں پروفیسر بن گیا ہے اور ایک دفعہ پھر گھر میں میلہ لگ گیا اور سب کو لڈو کھلائے گئے۔ ہر پھول سنگھ اپنی چارپائی پر بیٹھا ہوا اور حقہ پیتا ہوا سب آنے والوں کو بار بار بتا رہا تھا۔

"آنند کو کالج میں پروفیسر ہو گیا ہے۔ ایک ہزار سے زیادہ تنخواہ ملے گی۔ پہلے اتنی تنخواہ ڈپٹی کمشنر کو بھی نہیں ملتی تھی۔"

جب آنند لیکچرار بن گیا کالج پہنچا تو اسے کچھ عجیب سا لگا کیونکہ ابھی کچھ ہی دنوں پہلے وہ اسی کالج میں پڑھتا تھا اور اب وہ خود اس میں پڑھائےگا۔! دوسرے اس کے ساتھی وہ سینئر لیکچرار اور پروفیسر ہوں گے جن سے وہ کل خود پڑھتا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ جذبہ ختم ہو گیا اور اسے یہ احساس ہو گیا کہ انگریزی ادب میں اس کی دلچسپی کچھ قدرتی ہے اور وہ بڑی خود اعتمادی سے پڑھاتا ہے۔

کالج کی زندگی بڑی دلچسپ اور متنوع تھی اور آنند کا وقت بڑی ہنسی خوشی اور اطمینان میں کٹ جاتا۔ وہ بڑی محنت سے پڑھتا اور پڑھاتا تھا اور وہ چند مہینوں میں ہی کالج میں بڑا مقبول ہو گیا۔ پھر اس میں اور کالج کے طالب علموں میں صرف چار پانچ سال کا فرق تھا۔ اس لیے ذہنی طور پر وہ اپنے

آپ کو ان کے قریب پاتا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ یہ بھی محسوس کرنے لگا کہ اس کا ذہن شاعری کی طرف مائل تھا اور اس نے ایک روز انگریزی میں ایک چھوٹی سی نظم لکھ لی اور جب اس نے اسے اپنے کالج کی لٹریری سوسائٹی میں پڑھا تو سب کو ہی یہ نظم بہت پسند آئی۔ آنند کالج میں زیادہ سے زیادہ مقبول ہوتا چلا گیا۔

آنند بنیادی طور پر گاؤں کا رہنے والا تھا، اگرچہ وہ لمبے قد کا مضبوط جسم کا ایک خوبصورت نوجوان تھا لیکن وہ نفاست اس میں نہیں تھی جو شہری زندگی سے وابستہ تھی۔ اس نے اپنے بالوں اور لباس کی طرف وہ توجہ نہیں دی تھی جو اس کی عمر کا ہر شہری لڑکا دیتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے چہرے پر ایک ایسی دل کشی تھی جسے صرف سادگی ہی پیدا کرسکتی تھی۔ جذباتی طور پر بلاشبہ وہ اپنے گاؤں کے ماحول کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا اور انگریزی ادب اور شاعری کے مطالعے نے اس کی شخصیت کو یکسر بدل دیا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اس کی سوچ میں ایک افقی اجنبیت اور رومانیت بس گئی تھی۔

اگلے سال آنند کے ڈیپارٹمنٹ میں ایک اور لیکچرار کا اضافہ ہوگیا۔ وہ ایک ہلکے سانولے رنگ کی لڑکی تھی جس کا نام کاکی تھا۔ یہ نام آنند کو بڑا عجیب سا لگتا تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ کاکی اُس کی ہی طرح گاؤں کی ہوگی۔ کیونکہ اُسے بھی شہریت نام کی کسی شے نے ابھی تک نہیں چھوا تھا۔ وہ بغیر کسی میک اپ کے ایک بہت ہی سادہ ساڑھی میں آتی تھی۔ اور اس کے پاؤں میں پرانی وضع کے سینڈل ہوتے تھے۔ اس کے بال گھنے اور لمبے تھے جنھیں وہ ایک لمبی چوٹی کی شکل میں گوندھ لیتی تھی۔ لیکن اس کے چہرے اور بدن میں ایک مخصوص کشش تھی، اگرچہ کاکی کو شاید اس کا احساس نہ ہو۔ آنند نے اسے پہلی دفعہ دیکھا تو وہ کچھ کھو سا گیا۔ بہت عرصے سے اس نے ایسا سادہ لیکن پرکشش نسوانی چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ کاکی کے چہرے پر سنجیدگی اور اُداسی کا ایک ایسا سنگم تھا جو آنند کو بہت اچھا لگتا تھا اور سب سے پرکشش اس کی آنکھیں تھیں جو بڑی بڑی ہونے کے علاوہ ہر وقت کچھ ڈھونڈتی ہوئی سی معلوم ہوتی تھیں۔

آنند اور کاکی ایک دوسرے سے اپنے کام کے سلسلے میں کالج کے اسٹاف روم میں کبھی کبھی ملتے تھے۔ وہ ادب کے کئی پہلوؤں پر بات کرتے تھے اور آنند کاکی کی ذہانت سے متاثر ہوتا چلا گیا اور آہستہ آہستہ اسے شدت سے یہ احساس ہونے لگا کہ وہ کاکی سے پیار کرتا ہے۔ ایک روز آنند نے کالج کے میگزین میں چھپی ہوئی کاکی کی فوٹو کے نیچے ایک انجانے جذبے کے تحت یہ فقرہ لکھ دیا۔

" ایک ایسا چہرہ جو سمندر پر ہزاروں سفینوں کو حرکت میں لے آئے!"

بلاشبہ یہ انگریزی کا ایک مشہور تاریخی یا ادبی فقرہ تھا جس کا یہ ترجمہ آنند نے کردیا تھا۔ مگر کاکی کا چہرہ تو ایسا ہی کتابی چہرہ تھا اور یہ فقرہ اس کے جذبات کی ترجمانی کرتا تھا۔ لیکن ایک خیال کے آتے ہی اس نے اس فقرے کو اپنے قلم سے بری طرح کاٹ دیا تاکہ کوئی اسے پڑھ نہ سکے۔ اگرچہ میگزین کی یہ کاپی اس کی اپنی ہی تھی۔ مگر اس کے کمرے میں کالج کے طلبا اور اسٹاف کے دوسرے ممبر بھی آتے تھے اور آنند کے اس فقرے کو کوئی بھی پڑھ سکتا تھا۔

آنند کاکی کے بارے میں زیادہ ہی سنجیدہ ہوتا چلا گیا۔ اب انھیں ساتھ ساتھ پڑھاتے، بولتے اور ملتے ہوئے کئی مہینے ہوگئے تھے اور شاید کاکی بھی اُسے دل ہی دل میں چاہنے لگی تھی۔ لیکن اس بارے میں کاکی نے واضح طور پر اپنے دل کی بات کبھی ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔ لیکن ایک دن جب وہ کالج کے لان میں اکیلی بیٹھی تھی تو آنند اسے دیکھ کر اس کے پاس پہونچ گیا اور وہ دونوں پاس پاس بیٹھے ہوئے ایک دوسرے سے مسکرا مسکرا کر بات کرتے رہے۔ اس وقت کاکی کے پاس کالج کا وہی میگزین تھا۔ آنند نے میگزین کو کاکی کے ہاتھ سے لے کر اس کی فوٹو کے نیچے یہ فقرہ لکھ دیا۔

" مسکراہٹ۔ کوئی دم توڑ دے گا۔"

اور پھر آنند نے میگزین کاکی کی طرف بڑھا دیا اور جب کاکی نے وہ فقرہ پڑھا تو آنند آہستہ سے بولا۔

" شاید میں اپنی بات ٹھیک طرح نہیں کہہ پایا ہوں لیکن میں تمھاری مسکراہٹ کو ان سے بہتر لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ کم از کم یہ فقرہ میرے جذبات کی ترجمانی تو کرتا ہے۔"

کاکی مسکرانا چاہتی تھی مگر اس نے اپنی مسکراہٹ کو دبا دیا اور بڑی سنجیدگی سے بولی۔

" بھلا ایسی مسکراہٹ کو جسے دیکھ کر کوئی مر جائے دلکش مسکراہٹ کون کہے گا۔ مسکراہٹ تو وہ ہوتی ہے جو کسی کو زندگی دے۔"

" ہاں" آنند بولا " تم شاید ٹھیک کہتی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تم مجھ سے بہتر فنکار ہو۔"

یہ کہہ کر آنند چپ ہوگیا اور چند لمحے سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اچانک کاکی بولی۔

" کیا آپ واقعی مجھ سے پیار کرتے ہیں؟"

جواب میں صرف آنند نے کاکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کاکی بولی۔

" آپ نے آج تک میرے بارے میں مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ میں ایک یتیم لڑکی ہوں جس نے زندگی میں بڑا دکھ دیکھا ہے۔ میں ایک نیک بزرگ کی مالی مدد کے سہارے سے اور اپنی محنت سے پڑھ لکھ کر آج اپنے پاؤں پر کھڑی ہوگئی ہوں۔ لیکن اب بھی میرے پاس چند کپڑوں کے سوا اور کوئی اثاثہ نہیں ہے اور پھر میں ایک ایسی لڑکی ہوں جسے اچھوت سمجھا جاتا ہے اور آپ ایک بڑے کسان گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ شاید چاہتے ہوئے بھی میرے ساتھ شادی نہیں کرسکیں گے اور پھر آپ کے گھر والے مجھے اپنی بہو کے طور پر کیسے قبول کرلیں گے۔"

آنند خیالات میں کھویا ہوا کاکی کی جھیل کی طرح گہری اور بڑی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ وہ ایک پڑھا لکھا نئی پیڑھی کا آزاد خیال نوجوان تھا اور ذات پات

(باقی صفحہ ۵۱ پر)

مہروازی لال نشتر

سائنس اور ہمارے ملک کی ترقی

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ کسی ملک کی ترقی اور اعلیٰ معیارِ زندگی محض سائنس کی مرہونِ منت ہے۔ عہدِ حاضر کی تہذیب و ترقی کا دار و مدار سائنس اور اس کی آفریدہ صنعت و حرفت اور تجارت پر ہے۔ اسی لیے مغربی ممالک شروع ہی سے سائنس اور ٹکنالوجی کی طرف خصوصی توجہ دے رہے ہیں۔ اب ہمارے ملک نے بھی قوتِ اختراع سے کام لے کر سائنس کی ترقیوں سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا ہے اور اپنے قومی مسائل کو حل کرنے کے لیے قومی منصوبے میں سائنس اور ٹکنالوجی کو ایک اہم مقام دیا ہے۔ کیونکہ یہی ہمارے ملک کی اقتصادی، معاشرتی اور سماجی ترقی کے اہم ستون ثابت ہوں گے۔ یہ حقیقت اس بات سے واضح ہو جاتی ہے کہ ۱۹۵۱ میں اس مد پر ۵ کروڑ خرچ ہونے والے اخراجات کے مقابلہ میں ۱۹۸۱ میں یہ اخراجات بڑھ کر ۶ ارب تک پہونچ گئے تھے۔ گذشتہ صدی کے وسط میں یورپ کی یونیورسٹیاں طلباء کو علم تحقیقِ اشیاء کی تعلیم دیتی تھیں۔ یہ شعبہ تین حصوں میں منقسم تھا۔ یعنی طبیعات، کیمیا اور حیاتیات۔ اس شعبے کی تینوں شاخوں میں بنیادی نوعیت کی تحقیق اور تجربات پر بہت زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ کیونکہ وہ ممالک سمجھتے تھے کہ سائنس میں خود کفالت حاصل کرنے کے لیے "بنیادی تحقیق" نہایت اہم جزو ہے۔ [illegible] دوران سائنسی تحقیق و جستجو کے بے شمار مرکز قائم ہوئے [illegible] ٹکنالوجی کے فروغ میں مصروف ہیں۔ [illegible] طبیعات [illegible] کیمیا [illegible] شامل ہے۔

ہمارے ملک میں بھی سائنسی اور صنعتی تحقیقات میں تال میل اور ربط پیدا کرنے اور اسے ترقی دینے کے لیے کونسل آف سائنٹفک اور انڈسٹریل ریسرچ قائم ہے جس کی نگرانی میں کئی قومی لیبارٹریاں اور سائنسی ادارے کام کرتے ہیں۔ یہ سائنسی اور صنعتی تحقیقاتی کونسل، اہم معلومات اور اطلاعات فراہم کر کے، نیز بنیادی سائنس کی تحقیق اور تجربے کر کے، نہایت قابلِ قدر کام کر رہی ہے! اس کے علاوہ، اور بھی بہت سی تحقیقاتی تنظیمیں، یونیورسٹیاں، ادارے اور مختلف صنعتوں کی لیباریٹریاں بہت مفید کام کر رہی ہیں۔ ان میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس (بنگلور)، بوس انسٹی ٹیوٹ (کلکتہ)، سائنس انسٹی ٹیوٹ (لکھنؤ)، انڈین ایسوسی ایشن آف سائنس (کلکتہ) اور فزیکل ریسرچ لیبارٹری (احمدآباد) کے نام خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایٹمی توانائی اور خلائی تحقیقات کے میدان میں انسٹی ٹیوٹ آف نیوکلر فزکس، کلکتہ، وکرم سارابھائی سینٹر، سنیٹرل ریسرچ لیبارٹری (مدراس)، اور بمبئی کے نزدیک ٹرامبے کا ایٹمی توانائی کی تحقیق کا مرکز بھی "تکنیکی تحقیقات" میں مصروف ہیں۔ سائنسی تحقیق و جستجو کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے حال ہی میں جنوری ۱۹۸۵ میں انڈین سائنس کانگریس کے ۷۲ویں اجلاس میں ڈاکٹری لے۔ ایس پٹیل نے اپنے صدارتی خطبے میں سائنس کو عہد حاضر کی تمام ترقیوں کا "باپ" اور علم تحقیقِ اشیاء کو اُن کے "دادا" کا نام دیا ہے۔

سائنس کے کرشمے تو ہم سب پر عیاں ہیں مگر سائنس کا علم بذاتِ خود ایک کرشمہ ہے جس کی مدد سے انسان نے تہذیب و تمدن کے کئی حیرت انگیز کرشمے پیدا کئے ہیں۔ خلا میں مصنوعی سیاروں کا داغا جانا، انٹارکٹیکا کی سائنسی مہم اور خلائی پرواز۔ ۱۹۸۲ میں "انسیٹ ۔ ایک، بی" کو داغ کر، ہند نے زبردست سائنسی کامیابی حاصل کی، جب ملک کے دور افتادہ علاقوں کے لیے دستیاب وسائل کی مدد سے مواصلات کا سلسلہ قائم کیا گیا۔ اسی طرح بحرِ منجمد جنوبی پر پہنچنے والا ہند تیز ترقی پذیر ملک بن گیا جب ۱۹۷۵ میں پہلا مصنوعی سیارہ "آریہ بھٹ" خلا میں پہنچایا۔ ۱۹۶۲ میں خلائی سائنس کے تحقیقاتی پروگرام کی ابتدا ہوئی اور ۱۹۶۹ میں انڈین اسپیس ریسرچ آرگنائزیشن (ISRO) کی زیرِ نگرانی روس کے تعاون سے اس سلسلہ میں انسانی فلاح و بہبود کے لیے نہایت اہم معلومات حاصل کی گئیں جو اقتصادی اور سماجی مقاصد کی حصولی کے لیے بیحد کارآمد اور مفید ثابت ہوئی ہیں۔ اس سے قبل بھی "ایپل" سمیت چھ مصنوعی سیارے تجرباتی طور پر مدار میں چھوڑے گئے تھے۔ اور اپریل ۱۹۸۴ کی خلائی پرواز کے تاریخی کارنامے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہمارا ملک خلائی سائنس میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ خلائی تحقیق کے جو سائنسی تجربات کئے گئے، وہ یقیناً ہمارے ملک کو درپیش مسائل حل کرنے میں بیحد مددگار ہوں گے۔ درحقیقت اسکواڈرن لیڈر راکیش شرما کا خلائی سفر نہ صرف ہمارے ملک کے لیے بلکہ تمام ایشیا کے لیے ایک قابلِ فخر کارنامہ ہے۔

اس عظیم تاریخی کارنامے کے علاوہ ہمارے ملک نے سائنسدانوں کو انٹارکٹیکا پہنچا کر، ایک اور قابلِ ستائش کامیابی حاصل کی ہے۔ پہلی سائنسی مہم جنوری ۱۹۸۲ میں، دوسری مہم دسمبر ۱۹۸۲ میں، اور تیسری مہم دسمبر ۱۹۸۳ میں اس برفیلے خطے میں پہونچی تھی۔ ان سائنسی مہموں کے دوران کئے گئے تجربات سے واضح ہو چکا ہے کہ "انٹارکٹیکا" میں بیش بہا معدنیات کا ذخیرہ موجود ہے۔ جن میں تیل، گیس اور کوئلے کے علاوہ "یورینیم" (URANIUM) اور "پلاٹینیم" (PLATINUM) جیسی قیمتی دھاتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ معدنیات کے علم کے علاوہ، برف کے پہاڑوں سے پانی کی دولت بھی حاصل ہونے کے امکانات ہیں۔

(باقی صفحہ پر)

Licensed U(DN) 55 to post without prepayment at Civil Lines Post Office, Delhi
YOJANA URDU
Vol. 5 No. 5

پنر نوا
ایک اہم ادویاتی پودا

پنرنوا کے لفظی معنی ہیں دوبارہ جوانی (پنر- دوبارہ، نوا- نیا) دینے والا۔ جیسا کہ پودے کے نام سے ظاہر ہے کہا جاتا ہے کہ اس کے استعمال سے مریض دوبارہ روبصحت ہوتا ہے۔ پنرنوا کا پودا ہزاروں سال سے ہندوستانی طریقہ علاج آیورویدا میں مختلف امراض کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ زیادہ تر اس پودے کی جڑوں ہی کا استعمال مختلف نسخہ جات میں کیا جاتا ہے۔ مگر کبھی کبھی اس کے عرق (Juice) کا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ گجراتی زبان میں اس پودے کو ستودی (Satodi) ہندی میں سنت (Sant) تامل میں موکرتتائی کرے (Mookrattai Kire) اور انگریزی میں اس کو ہاگ ویڈ (Hog weed) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس پودے کا لاطینی یا نباتاتی نام (Boarhavia diffusa Linn) ہے اور یہ نکٹا جینیسی (Nyctaginaceae) نامی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ پنرنوا کا پودا پورے ہندوستان میں خودرو پایا جاتا ہے اور بنگال میں تو اس کی کاشت بھی کی جاتی ہے۔ برسات کے موسم میں یہ بکثرت دستیاب ہوتا ہے اور چونکہ ہندوستانی طریقہ علاج آیوروید میں اس کا استعمال کافی عام ہے اس لیے بڑے پیمانے پر اس کی تجارت بھی کی جاتی ہے۔

آیوروید میں اس کا استعمال مختلف امراض کے علاج کے لیے کیا جاتا ہے مگر سب سے اہم خصوصیات اس کی پیشاب کو لانے اور رطوبتوں کو خارج کرنے کے لیے بتائی جاتی ہے، جس کی وجہ سے بدن کی سوجن دور ہوتی ہے اور گردے (Kidneys) صحیح کام کرتے ہیں۔ آجکل اس کا استعمال خون کی کمی، دل کی اور عام کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے کافی حد تک کیا جا رہا ہے۔ جب سے اس پودے میں پنرنوین (Punor navin) نامی کیمیا کی دریافت ہوئی ہے تب سے طبیبوں نے اس پودے کے عرق کو استعمال میں لانا شروع کر دیا ہے اور تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ یہ خون اور غذا میں شامل گندی رطوبتوں کو صاف کرنے میں بھی معاون ہوتا ہے۔

یہ قدرتی طور پر پسینہ کو خارج کرتا ہے اور جب وبائی بخار، یرقان، ٹائی فائیڈ اور جگر کے امراض سے (چاہے وہ وائرس (Virus) سے ہوں) کمزوری آجائے اس وقت اس کے پودے کا استعمال بہت سود مند ثابت ہوتا ہے۔ اگر اس پودے کا ایک چمچ تازہ عرق مریض کو صبح سویرے کچھ ہفتوں تک استعمال کرایا جائے تو جگر اور گردے کے تمام امراض دور ہو جاتے ہیں اور چہرے پر رونق آجاتی ہے۔

پنرنوا کے اور بھی بہت سارے امراض میں فائدے پائے گئے ہیں۔ خاص طور پر عورتوں میں دوران مرض حیض پورے جسم اور جوڑوں میں سوجن آجاتی ہے تب اس کے استعمال سے کافی فائدہ ہوتا ہے، جس کی وجہ سے عورتوں کا جسم پتلا، سڈول اور صحت مند رہتا ہے۔

اگر پنرنوا کا استعمال ترپھلا (Tirphala) اور پاشان بھید (Pashanbhed)، نامی دواؤں کے ساتھ ملا کر کرایا جائے تو پیشاب میں بنی چھوٹی پتھریوں کو ختم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ان مریضوں میں جن کو جوڑوں کا پرانا درد اور گٹھیا ہو اس کے استعمال سے بہت افاقہ ہوتا ہے۔

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by ... Printers, ..., Id-Gah Road, New Delhi-110055

یوجنا

یکم تا ۱۵ جولائی ۱۹۸۵

ایک روپیہ

فصلوں کا بیمہ

(کے۔ این۔ اردھاناریسورن)

بہتر تعلیم، بہتر قوم

(آر۔ کے۔ بھنڈاری)

اندرا گاندھی کے تعلیم کے بارے میں اہم نظریات

اندرا گاندھی ایک عظیم سیاستداں، ہر دل عزیز رہنما اور ایک قابل حکمراں ہی نہیں تھیں بلکہ ایک مفکر اور مصلح قوم بھی تھیں۔ ایک مفکر اور مصلح کی فکر کے دو رُخ ہوتے ہیں، ایک پر حالات کے عمل اور ردِ عمل کا رنگ چڑھا ہوتا ہے اور وہ اُن کے آتار چڑھاؤ میں پھنسا رہتا ہے۔ فکر کا دوسرا رُخ اُن کے ذہن کی ان گہرائیوں میں پایا جاتا ہے جو وقتی حالات سے بالاتر ہو کر غیر محدود اور آفاقی حقیقتوں میں اپنا اصل رنگ تلاش کرتا ہے۔ فکر کا یہی رُخ اُس کی رہنمائی کا اصل رُخ ہوتا ہے اور اسی سے تاریخ میں اُس کا رُتبہ متعین ہوتا ہے۔ اندرا گاندھی کی فکر کا یہ رُخ واضح طور پر ہمہ گیر انسانی برادری کی طرف تھا۔ ان کا یہ رُخ بھی مختلف رنگوں میں جھلکتا تھا۔ کبھی یہ سبز انقلاب کی شکل میں اور کبھی امن و شانتی، قومی یکجہتی اور انسانی برادری کے بے داغ سفید رنگ ہیں۔ وہ ایک ایسے صاف ستھرے سماج کی تشکیل چاہتی تھیں جس میں بھوک، افلاس، ذات پات، نفرت اور توہم پرستی کا شائبہ تک نہ ہو۔ ایسا سماج قائم ہونے کے لیے سب سے بڑا ذریعہ تعلیم ہے۔ اندرا جی کے خیال میں "تعلیم انسانی زندگی میں توازن لانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور زندگی میں یہ توازن ہی انسانیت کا اولین اصول ہے۔ تعلیم کے ذریعہ ہی ہم ایک ایسی شخصیت بنا سکتے ہیں جس کا نہ صرف زندگی میں بھی توازن ہو اور ساتھ ہی دوسری زندگیوں اور فطری ماحول سے بھی اس کا صحیح ربط اور توازن ہو۔"

ساتویں کل ہند مسلم تعلیمی کانفرنس دہلی میں انھوں نے فرمایا تھا "تعلیم خاص طور پر اسکولی تعلیم کا مقصد سوجھ بوجھ والی شخصیتوں کا بنانا ہوتا ہے اور اس قسم کی شخصیتیں اُس وقت بن سکتی ہیں جبکہ ہمارے سامنے تمدنی روایات کا صحیح اور قابلِ قبول تصور ہو اور اُس کی روشنی میں پڑھنے پڑھانے کا ماحول پیدا کیا جائے۔"

اندرا جی کے ذہن میں تعلیم کا بہت وسیع اور گہرا مفہوم تھا۔ انھوں نے ہمیشہ انفرادی تعلیم کے مقابلہ میں قومی تعلیم کا تصور پیش کیا۔ اُن کے خیال میں تعلیم کو فرقہ واریت سے دور ہونا چاہیے۔ ساتویں کل ہند مسلم تعلیمی کانفرنس ۱۹۷۰ء کے اپنے افتتاحی خطبہ میں انھوں نے فرمایا تھا: "میرے خیال میں تعلیم کو مسلم تعلیم، ہندو تعلیم یا عیسائی تعلیم کے ناموں سے پکارنا درست نہیں۔ ہر شخص کو مذہبی تعلیم حاصل کرنے کا اختیار ہے اور بعض اخلاقی اور روحانی خوبیاں اُسے اپنے مذہب کے مطابق اپنے بچوں کو ذہن نشین کرانا ضروری ہے لیکن تعلیم کی بنیاد قومی ضرورتوں اور اونچے خیالات کو بنایا جائے تو اچھا ہے۔"

اجتماعی اور قومی تعلیم کا ہمہ گیر تصور ہندوستانی سماج کے لیے نہایت ضروری ہے کیونکہ تعلیم قومی ترقی اور معاشی بہبود کا سب سے بڑا ذریعہ ہے تعلیم ایک ذہنی عیاشی نہیں بلکہ اس کا مطمحِ نظر اور نصب العین سماج کی بہتری ہونا چاہیے۔ لاکھوں کے ایک کالج میں انھوں نے تعلیم کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا تھا "تعلیم ہمارے سماج کے ہر طبقہ کے لیے لازمی اور ضروری ہے جب کی ہماری ترقی کے لیے سب کا تعلیم سے باخبر ہونا لازمی ہے۔ ترقی کے لیے تعلیم سے زیادہ کوئی اور کامیاب ذریعہ نہیں ہے۔ تعلیم سب کا پیدائشی حق ہے اور ہر مرد عورت کے لیے اس کا حاصل کرنا ضروری ہے۔"

آزادی کے حصول کے بعد ہم نے سب سے بڑی غلطی یہ کی تھی کہ تعلیمی ڈھانچے کو مناسب طور پر نہیں بدلا اور اسی غلطی کی قیمت ہم آج ادا کر رہے ہیں۔ یوں تو ہم نے دوسرے شعبوں کی طرح اس شعبے میں بھی بڑی ترقی کی ہے۔ یونیورسٹیوں کی تعداد کئی سو گنا بڑھی ہے۔ ان میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد میں آٹھ سو گنا اضافہ ہوا ہے لیکن پھر بھی ہم اس طریقۂ تعلیم سے مطمئن نہیں ہیں کیونکہ تعلیم کے اس پھیلاؤ نے وہ فائدے نہیں پہنچائے جن کی ہمیں توقع تھی۔ محترمہ اندرا گاندھی کے ذہن میں یہ بات بار بار آتی تھی اور وہ اکثر موقعوں پر خصوصاً یونیورسٹیوں کے تقسیم اسناد کے جلسوں میں یہ سوال دہرایا کرتی تھیں "کیا ہمارا موجودہ تعلیمی ڈھانچہ اور مروّج طرزِ تعلیم ملک کی ضرورت کے مطابق ہے؟" اس سوال کا جواب پانے کے لیے آزادی کے بعد سے کئی کمیشن مقرر کیے گئے لیکن ایک بھی صحیح اور اطمینان بخش جواب حاصل نہیں کر سکا۔ اس ڈھانچہ کا سب سے بڑا نقص تو یہ ہے کہ اس نے ضرورت سے زیادہ عام گریجویٹس اور پوسٹ گریجویٹس پیدا کیے جو کسی خاص کام کے ماہر نہیں تھے۔ اس سے ایک طرف بے روزگاری میں اضافہ ہوا تو دوسری طرف تعلیم بے مقصد بن کر رہ گئی۔ اندرا جی کے خیال میں تعلیم کا مقصد صرف ڈگری حاصل کرنا ہی نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کا نتیجہ سماج اور قوم کے لیے سود مند بنانا اور ملک کے [illegible] ترقی حاصل کرنا ہونا چاہیے۔

منصوبہ بندی سے متعلق ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنیوالا

پندرہ روزہ

نئی دہلی

اس شمارے میں

چیف ایڈیٹر ——— • آر. ٹھکرال

ایڈیٹر ——— • لکشمی رام رانا

اسسٹنٹ ایڈیٹر ——— • محمد عادل صدیقی

سب ایڈیٹر ——— • وسیم حیدر

جلد ۵	یکم تا ۱۵ جولائی ۱۹۸۵	شمارہ ۷

۱۰ تا ۱۴ اسارٹھ شک ۱۹۰۷ ● فون نمبر ۶۰۱۸۱۸

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے، ۲ سال ۳۵ روپے، ۳ سال ۵۰ روپے

فی کاپی ——— ایک روپیہ

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فیصد کی رعایت

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

بزنس منیجر: ایل. آر. بترہ ● اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر. ایس. منچاندہ

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر. کے. پورم (مین)

نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

ترسیل زر کا پتہ: بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

تعلیمی اصلاحات

ہمارے ملک میں سائنس اور ٹکنالوجی کا ایک مضبوط ڈھانچہ بن چکا ہے۔ یہاں مختلف علوم وفنون کی تربیت اور تحقیق کا ایک وسیع میدان ہے۔ چند ہی دیگر ممالک میں اس طرح کا تعلیمی و تربیتی وسیع جال ہو سکتا ہے۔ پچھلے تیس برسوں میں تعلیم نے پسماندہ خطوں اور پسماندہ طبقات کو اُوپر اٹھانے میں اپنا رول ادا کیا ہے۔ اس سے سماجی طبقات میں حرکت پیدا ہوئی ہے اور آپس میں ایک دوسرے سے قریب آنے کا موقع ملا ہے۔ ہمارا سیاسی نظام حق رائے دہندگان بالغان پر منحصر ہے۔ ہمارا اقتصادی نظام سماج وادی ہے۔ اس نظام میں سماج کے کمزور طبقات کی بہبود پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ ہمارا تعلیمی نظام سب کے لیے یکساں مواقع کی فراہمی پر زور دیتا ہے۔ ہمارے ملک میں ایک ایسے سیاسی اور اقتصادی جمہوری نظام کو لانے نیز اُسے مضبوط بنانے کی کوشش ہے جس میں عوام کے سبھی طبقے شریک ہوں۔

ماضی میں تعلیمی ترقی کی اہمیت پر زور تو ضرور دیا گیا لیکن عملاً تعلیم کو ایک سماجی سہولت کے طور پر آگے بڑھایا گیا۔ لیکن تعلیم توانائی وسائل کے فروغ کا اہم ترین ذریعہ ہے اور اس کے بغیر سماجی اور اقتصادی ترقی کو آگے نہیں لے جایا جا سکتا۔ چنانچہ ۱۹۸۰ میں تعلیم سے متعلق جو ورکنگ گروپ قائم کیا گیا تھا، اس نے تعلیم کو انسانی وسائل کے فروغ میں معاون بتایا تھا اور اسے سماجی اور اقتصادی کایا پلٹ کے لیے بنیادی عنصر سے تعبیر کیا تھا۔ چھٹے پلان میں اس پہلو کو خصوصی اہمیت دی گئی چنانچہ تعلیمی ترقی کے پروگراموں کی تشکیل اور ان پر عمل درآمد سے تعلیم کے مذکورہ رول کی ضرورت و اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ریزرویشن کے سلسلے میں علمی اور سیاسی حلقوں میں کافی بحث چلی ہوئی ہے۔ سماج کی ایک اہم ذمہ داری یہ ہے کہ صدیوں سے چلے آ رہے امتیازات کے نتائج اور اُن سے پیدا ہونے والی نابرابریوں کو ختم کرے۔ کچھ نوجوانوں کا کہنا ہے کہ ان کے بچے اپنے بزرگوں کی غلطیوں کا خمیازہ کیوں بھگتیں۔ مگر ہر شخص کو یہ سب کچھ برداشت کرنا ہے، خواہ وہ یہ سب کچھ خوشی سے کرے یا مجبوری سے۔ قطع نظر اس کے کہ ہم کون ہیں، یا ہم کہاں رہتے ہیں یا ہماری حیثیت اہم ہے یا نہیں، ہمیں اپنے عمل اور اپنی سوچ اور اپنی فکر سے مستقبل کی تعمیر میں لگ جانا ہے۔ تاریخ سے مفر ممکن نہیں۔ خواہ یہ ماضی کی تاریخ ہو یا اُس مستقبل کی جس کی تعمیر میں ہم مصروف ہیں۔

طلبا کو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اُن کے اُستاد اُن سے ہمدردی نہیں رکھتے۔ سوچنے کا یہ انداز غلط ہے کہ طلبا کا کوئی طبقہ یہ سوچے کہ اُن کو انصاف صرف اپنی ذات پات کے استادوں یا بڑوں سے مل سکتا ہے۔ اُستادوں کی پوری برادری کو اس طرح کے تصور کے ازالے کے لیے خصوصی کوشش کرنی چاہیئے۔ ریزرویشن اور کوالٹی کے درمیان کسی تناؤ یا تضاد کی ضرورت نہیں۔ ذہانت کسی ایک طبقے کی جاگیر نہیں ہے۔ یہ کسی ایک ذات کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔ تعلیمی نظام کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ہر شخص، ہر فرد اور ہر طبقے کو اُن خامیوں کو دُور کرنے میں مدد دے جو حالات یا پیدائش وغیرہ کے سبب اس سے جڑی ہوئی ہیں۔ تعلیمی نظام کے ذریعے اُس کی خوابیدہ صلاحیتیں اُجاگر ہو کر سامنے آنی چاہیئیں۔

کچھ رجحانات خاص طور پر پریشان کُن ہیں۔ مثلاً بہت سے تعلیمی اداروں کا تجارتی پیمانے پر چلنا، کچھ ریاستوں میں انجینئرنگ اور میڈیکل کالجوں کی توسیع، ایسے اسکول اور کالج جو فرقہ وارانہ اور طبقاتی کشمکش کو ہوا دیتے ہیں۔ کچھ ریاستی سرکاروں کی تعلیمی اداروں میں مداخلت تاکہ کسی آئیڈیالوجی سے انھیں جوڑ دیا جائے اور انھیں اس کا تابع بنا دیا جائے۔ ملک کے کچھ لوگ درسی کتابوں میں دانستہ اور غیر دانستہ طور پر ایسا مواد بھر دیتے ہیں جس سے فرقہ وارانہ اور نظریاتی تعصب کی بو آتی ہے، کہیں کہیں کے پی ٹیشن (Capitation) فیس کا رواج سماج کے کچھ طبقوں کو غیر ضروری مراعات دیتا ہے اور دوسروں پر غیر ضروری بوجھ ڈال دیتا ہے۔

تعلیم روزگار دلانے کا کوئی آسان طریقہ نہیں ہے بلکہ یہ بہتر انسان اور بہتر صفات پیدا کرنے کی ایک تربیت ہے۔ سوامی وویکانند نے کہا تھا کہ اہم بات یہ نہیں کہ ایک شخص کتنا کچھ جانتا ہے بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا بنتا ہے۔ تعلیمی اصلاحات اس پس منظر میں بیحد ضروری ہو گئی ہیں۔ (ایڈیٹر)

کے. این. اروھانا رلیسوٹن[1]

فصلوں کا بیمہ

۱۹۸۵ کی خریف کی فصل سے فصلوں کے بیمے کی ایک جامع اسکیم لاگو ہوگی جس میں چاول، گندم، دالیں، موٹے اناج اور تلہن کی فصلیں شامل ہوں گی۔ اس اسکیم کو جنرل انشورنس کارپوریشن آف انڈیا کے زیر اہتمام چلایا جائے گا۔ اس کارپوریشن کو ریاستوں کا تعاون بھی حاصل ہوگا۔ اس طرح کے اشتراک عمل سے کسانوں کو فصلوں کے اگانے میں ہونے والے نقصانات پر راحت مل سکے گی ورنہ تو یہ نقصانات کسانوں کے لیے ناقابل برداشت ہوتے ہیں۔ اس مضمون میں مصنف نے بتایا ہے کہ اس اسکیم نے اپنی ارتقائی منازل کیسے طے کیں اور اب یہ کس شکل میں ہے اور اس پر کیسے عمل درآمد ہوگا۔

ہندوستان میں مجموعی قومی پیداوار کا ۴۰ فیصد زراعت کا رہین منت ہے۔ اس سے ملک کے ۷۰ فیصد محنت کش طبقے کو روزگار ملتا ہے۔ زراعت نہ صرف مجموعی قومی پیداوار میں زبردست اضافے کا باعث ہے، بلکہ اس سے ملک کی عام معیشت پر خوشگوار اور اہم اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس کے ذریعے بنیادی نوعیت کا سامان ملتا ہے اور خام مال پانے کا یہ ایک اہم وسیلہ ہے۔ مختلف صنعتی اشیا کے لیے منڈی بھی اس کے دم سے ملتی ہے، اور ان کی مانگ کا بھی یہی سبب ہے۔ فصلوں کی پیداوار زرعی سیکٹر کا ایک اہم جزو اور حصہ ہے۔ ہمارے ملک میں زرعی پیداوار میں زبردست اضافہ ہوا ہے، لیکن یہ اضافہ زیادہ تر آبپاشی والے رقبے پر ہوا ہے۔ ہمارے ملک میں چھوٹے اور مارجنل کسانوں کی بڑی تعداد ہے۔ لیکن ان کو اس بڑھی ہوئی پیداوار سے کم ہی نفع مل سکا ہے۔ یہ کسان زیادہ تر ایسے علاقوں میں ہیں جہاں فصلوں کے لیے بارشوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے ملک میں جس قدر رقبے پر کاشت ہوتی ہے، اس کا تقریباً ۷۰ فیصد حصہ وہ ہے جہاں پیداوار کے لیے بارشوں کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ رقبہ ملک میں خوراکی اجناس کی پیداوار میں ۴۰ فیصد ہوتے ہوئے بھی صرف ۴۲ فیصد کے بقدر پیداوار دیتا ہے۔ لہٰذا مستقبل میں پیداوار بڑھانے اور زرعی محاذ پر کامیابی حاصل کرنے کا بڑی حد تک دارومدار اس بات پر ہوگا کہ ہم نے بارانی کھیتی والے علاقوں میں زرعی پیداوار بڑھانے اور اسے یقینی بنانے کے لیے کیا اقدامات کیے اور ان سے کیا کچھ نتائج ملے۔ بارانی کھیتی والے علاقوں میں زرعی پیداوار حاصل کرنے میں زبردست جوکھم اور خطرہ ہے۔ اس کے بعد بھی ان قطعات اراضی کی پیداواری صلاحیت کم ہے اور پھر ہر علاقے کی پیداوار گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ بارانی کھیتی والے علاقوں میں زبردست سرمایہ کاری درکار ہوتی ہے۔ یہاں بہتر بیج، کیمیاوی کھاد، مٹی کی جانچ اور کیڑوں وغیرہ پر کنٹرول کی ضرورت بہت زیادہ ہے۔ چھوٹے اور مارجنل (حاشیائی) کسان ان علاقوں میں سرمایہ کاری کے لیے مشکل ہی سے رضامند ہوتے ہیں۔ ان کو اس پیداواری عمل میں شریک کرنے کے لیے مختلف اقدامات کی ضرورت ہے، چنانچہ فصلوں کا بیمہ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے اور اس غرض سے اس اسکیم کو شروع کیا جا رہا ہے۔

فصلوں کا بیمہ کیوں ؟

ساتویں منصوبے کے تئیں انداز نظر سے متعلق دستاویز میں کہا گیا ہے کہ اس مدت میں ملک میں غذائی اجناس میں ۵ فیصد کی شرح ترقی کا نشانہ رکھا گیا ہے جبکہ زرعی سیکٹر میں ۴ فیصد کا بحیثیت مجموعی اضافہ ہوگا۔ اس کے لیے کسانوں کو بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کرنی ہوگی۔ مگر محض سرمایہ کاری سے مطلوبہ نشانے پورے نہیں ہو سکتے جب تک کہ ان کو یہ یقین دہانی نہ کرائی جائے کہ ان کی فصلیں قدرتی آفات سے محفوظ ہوں گی اور اس کے لیے انہیں بیمہ کے ذریعے تحفظ دیا جائے گا۔

فصلوں کو قدرتی آفات وغیرہ سے جو بے پناہ نقصانات ہوتے ہیں، ان سے کسانوں کے ذہنوں کو صاف رکھنے کے لیے فصلوں کا بیمہ مفید ہوگا۔ یہ نقصانات اتنے وسیع پیمانے پر ہوتے ہیں کہ کسان

[1] ایڈیشنل سکریٹری، وزارت زراعت و دیہی ترقی

اُن کو نقصانات سے نہیں جھیل سکتے۔ اس طرح فصلوں کے بیمے سے کھیتوں کی آمدنی کو یقینی بنانے اور کسانوں کو نقصانات سے بچانے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اس سے دیہی سماج کے عام اقتصادی حالات میں زبردست استحکام آسکے گا۔ کسانوں کو نئی ٹکنالوجی اپنانے کی سہولت میسر آسکے گی اور ان میں اعتماد پیدا ہوگا، نیز نئی ٹکنالوجی جو مقابلتاً مہنگی ہے اُسے اپنانے کی طرف وہ مائل ہو سکیں گے۔ زرعی قرضے کے تعلق سے کسانوں کی حالت بہتر ہو سکے گی، قرض کی واپسی میں وہ پیچھے نہیں رہیں گے اور اس طرح نئے قرضے پانے کے لیے اُن کا استحقاق بنا رہے گا۔ فصلوں کی خرابی کی صورت میں انھیں جو نقصان ہوگا، وہ فصلوں کے بیمے سے پورا کیا جا سکے گا۔ اس طرح کسان دوبارہ سے قرضہ حاصل کرنے کے لیے بدستور مستحق رہیں گے۔ یہاں ایک احتیاط کی طرف متوجہ کرانا ضروری ہے۔ کسانوں کو اس اسکیم سے کسی نفع کی اُمید نہیں رکھنی چاہیئے۔ فصلوں کا بیمہ، زندگی کا بیمہ کی طرح سے ہی غیر متوقع نقصانات کے خلاف تحفظ فراہم کرتا ہے۔

مستحکم اسکیم کا فروغ

حصولِ آزادی کے بعد حکومتِ ہند کی برابر یہ کوشش رہی کہ ملک میں فصلوں کے بیمے کی ایک مستحکم اور جامع اسکیم شروع کرے۔ اس سلسلے میں حکومتِ ہند نے متعدد اسکیمیں تیار کیں اور ان کو ریاستی حکومتوں کو بھیجا لیکن ان میں سے کسی بھی ریاست نے اتفاق نہیں کیا اور ان پر عمل درآمد کے لیے رضامندی ظاہر نہیں کی، جس کا سبب مالی وسائل کی کمی تھا۔ بعد میں جنرل انشورنس کارپوریشن آف انڈیا نے کیبادی کھاد بنانے والوں کے اشتراک سے انفرادی بنیادوں پر کچھ تجربے کئے۔ لیکن ناقص مالی نتائج کے سبب یہ تجربے اور اس طرح کی اسکیمیں غیر موزوں قرار پائیں۔ بھارت ایک وسیع و عریض ملک ہے اور یہاں قطعات اراضی بہت زیادہ ہیں، لہٰذا یہاں انفرادی طور پر فصلوں کے بیمے کی اسکیم رائج کرنا دشوار ہے اول تو یہ کہ اس سلسلے میں ضروری اعداد و شمار ہی میسّر نہیں اور دوسرے یہ کہ اس کے لیے زبردست انتظامی اخراجات درکار ہوں گے۔ پالیسیوں کے اجرا، فصلوں کی کٹائی کے تجربات اور کلیموں کے تصفیے وغیرہ کے لیے زبردست پیمانے پر انتظامی کارروائی کرنی پڑے گی۔ لہٰذا کافی غور و خوض کے بعد یہ مناسب سمجھا گیا کہ یہاں اس مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ فصلوں کے بیمے کی جو بھی اسکیم رائج کی جائے وہ رقبہ پر مبنی ہو۔

اس مقصد کے پیشِ نظر جنرل انشورنس کارپوریشن آف انڈیا نے ۱۹۷۹ میں فصلوں کے بیمے کی ایک اسکیم مرتب کی۔ اس وقت سے یہ اسکیم رائج ہے اور یہ ریاستی حکومتوں کے اشتراکِ عمل سے چل رہی ہے۔ یہ اسکیم فصلوں کے لیے دی گئی پیشگی رقومات اور قرضوں سے جڑی ہوئی ہے اور اگر یکساں حالات والے رقبوں پر پیداوار ضمانت شدہ پیداوار سے کم رہتی ہے تو کسانوں کو اس کمی کے حساب سے اس کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ یہ تجربہ کامیاب رہا اور بارہ ریاستوں میں اس اسکیم کو لاگو کیا جا سکا۔

اسکیم جو منظرِ عام پر آئی

اس اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ اگر کسان کی فصل خشک سالی، سیلاب، جراثیم کے حملے، ژالہ باری یا کسی اور قدرتی آفت کے باعث تباہ ہو جائے تو اسے مالی امداد دی جا سکے۔ کسان اس اسکیم کے تحت فصل کی تباہی کے بعد بھی اگلے موسم اور اگلی فصل کے لیے قرض پانے کا مستحق ہوتا ہے، اس کے ذریعے اناج، دالوں اور تلہنوں کی پیداوار بڑھانے کے لیے تحریکِ عمل مل سکے گی۔ خریف ۱۹۸۵ سے سرکار ملک گیر پیمانے پر فصلوں کے بیمہ کی ایک جامع اسکیم شروع کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ اس اسکیم کو جنرل کارپوریشن آف انڈیا زیرِ عمل لائے گی۔ اس میں ریاستی حکومتوں کا تعاون بھی شاملِ حال رہیگا۔ کوآپریٹو کریڈٹ بنکوں، تجارتی بنکوں، اور علاقائی دیہی بنکوں سے حاصل شدہ قرضوں سے استفادہ کرنے والے کسانوں کو اس اسکیم سے مربوط کر دیا گیا ہے۔ فصلوں کے لیے حاصل کردہ قرضوں کے بیمہ کی اس میں از خود گنجائش ہوگی۔ ابتدا میں چاول، گندم، موٹے اناج، تلہن اور دالیں اس اسکیم سے فائدہ اٹھائیں گی۔ چاول، گندم اور موٹے اناجوں کے لیے بیمہ کردہ رقم کا ۲ فیصد بیمہ کے ذریعے حفاظت کی لاگت سمجھی جائے گی۔ تلہنوں اور دالوں کے لیے یہ لاگت صرف ایک فی صد ہوگی۔ ان فصلوں کے اُگانے کے لیے جس قدر قرضہ منظور کیا جائے گا اس کی ۱۵۰ فیصد رقم کا بحساب فی کسان بیمہ کیا جائے گا۔ بیمہ شدہ رقم پر بیمہ لیا جائے گا۔ یہ اسکیم ایسے تمام علاقوں میں لاگو کی جائے گی جس کے بارے میں فصلوں کی پیداوار کے پچھلے ۵ سال کے آنکڑے دستیاب ہیں۔ اس اسکیم کے تحت یکساں رقبہ ایک بلاک ہی کو متصور کیا جائے گا۔ اس اسکیم کے تحت اگر صراحت شدہ رقبے کے لیے بیمہ شدہ فصل کی فی ہیکٹر پیداوار، شرحِ پیداوار سے کم رہ جاتی ہے تو اس صراحت شدہ رقبے میں اُس فصل کو اُگانے والے تمام کسانوں کے بارے میں یہ سمجھا جائے گا کہ ان کی پیداوار کم رہی ہے اور ان کو اس کا معاوضہ دیا جائیگا۔

عمل درآمد کیسے ہو؟

اسکیم پر عمل درآمد کے لیے جنرل انشورنس کارپوریشن آف انڈیا تمام انتظامات کرے گی۔ یہ ریاستی راجدھانیوں میں فصلوں کے بیمے کے لیے شعبوں (سیل) کا قیام کرے گی۔ یہ شعبے ریاستی سرکاروں سے تال میل قائم کریں گے۔ ریزرو بنک آف انڈیا، زراعت اور دیہی ترقی، قومی بنک، ریاستوں کے کوآپریٹو بنک، تجارتی بنک اور علاقائی دیہی بنک سے رابطہ قائم رکھے گی۔ ریاستی حکومتیں فصلوں کے بیمے سے متعلق فنڈ قائم کریں گی۔ شروع میں یہ ایک تا ۲ کروڑ روپے کے بقدر ہوگا۔ یہ رقم ریاستی سرکار اور مرکزی سرکار میں مساوی بنیادوں پر تقسیم ہوگی۔ فصلوں کے بیمے سے متعلق ریاستی فنڈ کا نظم و نسق اعلیٰ اختیارات کی

جائیں ایک کمیٹی کے ذمے ہوگا۔ ریاستی حکومت کا چیف سکریٹری اس کمیٹی کا سربراہ ہوگا۔ یہ کمیٹی اس اسکیم کے عمل درآمد کا مسلسل جائزہ لیتی رہے گی۔

چھوٹے اور مارجنل کسانوں کی طرف سے جو پریمیم ادا کیا جائے گا اس کی نصف رقم بطور امداد دی جائے گی۔ اس مد کے اخراجات مرکز اور ریاستی سرکار برابر برابر تقسیم کریں گے۔ کسانوں کو فصلوں کے قرضے منظور کرتے وقت مالی ادارے پریمیم جمع کرالیں گے اور اس طرح جمع شدہ پریمیم کی رقم رقبہ کی تفاصیل اور بیمہ شدہ رقم وغیرہ کی تفاصیل کے ساتھ جنرل انشورنس کارپوریشن کو بھیجدی جائیگی۔ اس کی بنیاد پر کارپوریشن لہٰذا کی طرف سے مالی ادارے کو ایک ماسٹر پالیسی جاری کر دی جائے گی۔

مرکزی سرکار چھوٹے اور مارجنل کسانوں کو سبسڈی کے طور پر جو رقم دے گی، اس کے باعث ۸۶-۱۹۸۵ میں اس کے مصارف ۵۰ر۴ کروڑ روپے ہوں گے۔ جمع شدہ پریمیم سے فاضل نقصانات کا انحصار موسمی حالات پر ہوگا۔ لہٰذا ان کے بارے میں صحیح اندازہ لگانا دشوار ہے۔ بیمہ شدہ فصل کے کٹنے کے ایک ماہ کے اندر ریاستی سرکار جنرل انشورنس کارپوریشن کو صورت حالات سے مطلع کرے گی۔ ریاستی سرکاروں سے اعداد و شمار موصول ہونے پر جنرل کارپوریشن آف انڈیا ہر بنک کی طرف سے یہ ایک تصریح شدہ رقبے میں کلیموں کی ادائیگی کے طور پر ادا کی جانے والی رقومات کا تعین کرے گی۔ جنرل کارپوریشن آف انڈیا کی طرف سے کلیموں کی رقومات موصول ہو جانے پر متعلقہ بنک قرض لینے والے کسان کے کھاتے کی رقم (Indemnity) کھاتے میں جمع کرادے گا۔ نقصان کا ایک تہائی حصہ متعلقہ ریاستی حکومت برداشت کرے گی، لہٰذا کلیم کی تہائی رقم جنرل انشورنس کارپوریشن آف انڈیا کے مشورے پر ریاستی سرکار ادا کریگی۔ یہ رقم فصلوں سے متعلق ریاستی فنڈ سے ادا کی جائیگی۔ کلیموں کے جلد سے جلد تصفیے کے لیے ریاستی بیمہ فنڈ بنک کھاتے کے توسط سے ہی کام کریگا۔ یہ بالکل اسی طرح کام کریگا جیسا کہ دیہات کی مربوط ترقی کے پروگرام میں ہوتا ہے۔
(باقی صفحہ پر)

اِدھر اُدھر سے

۴ جون کو نئی دلی میں منصوبہ بندی کمیشن کا مکمل اجلاس وزیراعظم شری راجیو گاندھی کی صدارت میں ہوا اور اس میں ساتویں منصوبے کے ایک لاکھ ۸۰ ہزار کروڑ روپے کے مصارف کو حتمی شکل دی گئی۔ یہ رقم مرکز اور ریاستوں میں نیز مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں خرچ کی جانی ہے۔ اس میں مرکز کے لیے ۹۵،۴۴ کروڑ روپے، ریاستوں کے لیے ۸۰،۴۹ کروڑ روپے نیز ۸۰۵،۳ کروڑ روپے مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے لیے ہوگی۔ اس میٹنگ میں ان حدود کے پیش نظر مختلف سیکٹروں کے لیے رقومات کی تخصیص عمل میں آئی۔ ان رقومات اور اخراجات کے بارے میں منصوبہ بندی کمیشن مرکزی وزارتوں نیز ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں سے پہلے ہی تبادلۂ خیال کر چکا ہے۔ اس موقع پر وزیراعظم نے اپنی تقریر میں منصوبے پر عمل درآمد اور اس پر نگاہ رکھنے کی ضرورت بتائی۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے پبلک سیکٹر کی کارگزاری بہتر بنانے پر زور دیا۔ اس میٹنگ میں شرکت کرنے والوں میں وزیر دفاع شری پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ، وزیر مالیات شری وی۔ پی۔ سنگھ اور منصوبہ بندی کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین ڈاکٹر من موہن سنگھ، منصوبہ بندی کمیشن کے ارکان اور دیگر سینیئر افسران شامل تھے۔

- ۲۸ مئی کو نئی دلی میں ہندوستان اور فرانس کے درمیان ایک معاہدے پر دستخط ہوگئے۔ اس کی رُو سے کوئلے کے سیکٹر میں باہمی اشتراک عمل کو بڑھاوا ملے گا۔ یہ معاہدہ ہند۔ فرانس ورکنگ گروپ کی اس موضوع پر دو روزہ بات چیت کے خاتمے پر ہوا۔
- نئی دلی میں پبلک سیکٹر کے ادارے بھارت ہیوی الیکٹریکلز لمیٹڈ کو لیبیا میں بجلی کے کاموں کی مرمت کرنے کا ایک بڑا ٹھیکہ ملا جس کی مالیت ۴ کروڑ روپے ہے۔
- وزیراعظم مسٹر راجیو گاندھی نے گنگا کی صفائی سے متعلق ایک پراجیکٹ تیار کرنے پر زور دیا۔ یہ پراجیکٹ اقوام متحدہ کے زیر اہتمام چھٹی عالمی کانگریس میں پیش کیا جائے گا۔ یہ کانگریس ۱۰ جون ۱۹۸۵ء سے برسلز میں آبی وسائل کے موضوع پر منعقد کی جا رہی ہے۔
- عالمی بنک ۲۵۰ ملین ڈالر کا قرض دے گا تاکہ سنگرولی، ریہانڈ کمپلکس میں تھرمل پاور پلانٹوں کو جوڑنے اور بجلی کی تقسیم کے عمل کو آسان بنانے میں مدد مل سکے۔
- پانی کی قلت والے گاؤں کو پینے کے پانی کی فراہمی، صحت سے متعلق ابتدائی دیکھ بھال کی سہولیات بہم پہنچانے، گوبر گیس پلانٹ لگانے اور گندی بستیوں کو بہتر بنانے کی اسکیمیں، بیس نکاتی پروگرام کے تحت ان متعدد اسکیموں میں سے ہیں جن پر عمل درآمد میں ۸۵-۱۹۸۴ کے مالی سال کے دوران مختلف ریاستوں میں نمایاں پیش رفت ہوئی ہے۔ منصوبہ بندی کمیشن کی جانب سے لئے گئے ایک جائزہ کے مطابق ان شعبوں میں مذکورہ سال کے لیے مقررہ نشانہ کی ۱۳۰ فیصد سے زائد کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ مذکورہ سال کے دوران ۲۶۷ ابتدائی صحتی مراکز قائم کئے گئے جبکہ ایسے ۱۹۲ مراکز قائم کرنیکا نشانہ مقرر کیا گیا تھا، جو نشانہ سے ۱۳۹ فیصد سے بھی زیادہ ہے۔ ۴۱۵۳۰ گاؤں کو پینے کا پانی فراہم کرنے کے مقررہ سالانہ نشانہ کے مقابلہ میں ۵۶۰۵۹ گاؤں کو پینے کے پانی کی سہولت مہیا کی گئی جو نشانے کا ۱۳۵٫۷ فیصد ہوتا ہے۔ ★

پی بھٹا چاریہ

پمپ سے جمع کیے جانے والے پانی سے بجلی کی تیاری

دُنیا بھر میں توانائی کے بحران کو ختم کرنے کے لیے نئے نئے پلان بنائے جا رہے ہیں۔ ذیل کے مضمون میں مصنف نے بتایا ہے کہ پمپ کے ذریعہ جمع کیے جانے والے پانی سے بجلی کیونکر تیار کی جاتی ہے۔

ذرا تصور کیجیے کہ دلی میں وزیر آباد جمنا کے کنارے پر پہاڑیوں کے درمیان دریا کی تہہ سے ۱۰۰ میٹر اونچی پانی کی ایک بڑی جھیل بنائی گئی ہے۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟ رات کے وقت جب شہر میں بجلی کی مانگ کم ترین ہو جاتی ہے تو جمنا کے ایک پائیں تالاب سے رُخ بدلنے والی ٹربائنوں کی مدد سے جو تب پمپ کی طرح کام کرتی ہیں۔ پانی اوپری جھیل میں پہنچایا جاتا ہے۔ اس طرح رات کے وقت کی فاضل بجلی استعمال میں لائی جاتی ہے۔ دن کے وقت چوٹی کے اوقات میں جمع شدہ پانی چھوڑا جاتا ہے۔ اس سے ٹربائنیں گردش کر کے فاضل بجلی پیدا کرتی ہیں اور اس طرح بڑھی ہوئی مانگ کو پورا کیا جاتا ہے۔

یہ بلاشبہ خیالی کہانی ہے۔ تاہم دلی میں ایسی کوئی سہولت نہیں ہے۔ لیکن سوویت یونین کی ریاست یوکرائن کی راجدھانی کیف جو صنعتی طور پر ایک ترقی یافتہ شہر ہے، کے شہریوں کے لیے ایسی سہولت ۱۹۷۱ سے موجود ہے۔ سوویت ماہرین جو یوکرائن کی راجدھانی میں پمپ سے پانی جمع کرنے والے پلانٹ کو بہت کارآمد پا رہے ہیں، اب سوویت یونین کے دوسرے علاقوں میں بھی ایسے ہی متعدد پلانٹوں کی تعمیر میں مصروف ہیں۔

پمپ کے پانی سے چلنے والے پلانٹ

یہ بات ہر ایک کو معلوم ہے کہ دن کے وقت توانائی کے سسٹم پر بوجھ میں اُتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے۔ رات کے وقت یہ عام طور پر زیادہ سے زیادہ مانگ کا دو تہائی رہ جاتا ہے۔ بعض راتوں کو تو یہ ۵۰ فیصد کی سطح سے بھی کم ہو جاتا ہے لیکن بجلی اُسی رفتار سے پیدا ہوتی رہتی ہے اور اس فاضل بجلی کو جمع کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ پمپ سے کام کرنے والے ایسے پلانٹ تیار کیے گئے ہیں، جو فاضل بجلی کو جمع کرتے ہیں اور اُس وقت اُس کا استعمال کرتے ہیں، جب بجلی کی مانگ بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ایسے پلانٹوں کے دو تالاب ہوتے ہیں جن میں ایک کا پانی دوسرے میں جاتا ہے۔ ان میں سے ایک قدرتی چھت پر کھودا جاتا ہے جو پائیں تالاب سے کم از کم ۱۰۰ میٹر اونچائی پر ہوتی ہے۔ اونچائی کا یہ فرق اس پراجیکٹ کے انتخاب کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ رات کے وقت فاضل بجلی پائیں تالاب سے اوپری تالاب کو پانی پمپ کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ جمع شدہ پانی دن کے وقت ٹربائنوں کو گردش دینے اور بجلی پیدا کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح پمپ کے پانی سے چلنے والے پلانٹ جوہری اور حرارتی بجلی کے بڑے بڑے کارخانوں کو چلاتے ہیں۔

رُوسی پلانٹ

ماسکو کے علاقے میں ایسے بڑے دریا نہیں ہیں جن سے ایک ۱۲ لاکھ کلو واٹ کا پن بجلی گھر بنایا جا سکے۔ لیکن "کوتیا" کا چھوٹا دریا بھی جو ماسکو سے ۲۵ کلومیٹر دُور پہاڑیوں میں چکر کاٹتا ہوا بہتا ہے، اور زنگورسک قصبے کے نواح میں واقع ہے، اتنی بڑی امکانی قوت رکھتا ہے کہ وہ اتنی بڑی پیداواری صلاحیت کے پلانٹ کو چلا سکتا ہے۔ زنگورسک کا پمپ کے پانی سے چلنے والا پلانٹ اب بنایا جا رہا ہے۔

دریائے کوتیا پر پائیں تالاب (پانی کا ذخیرہ) میں ۳ کروڑ ۲۰ لاکھ مکعب میٹر پانی جمع ہوگا جس میں سے ۲ کروڑ ۲۰ لاکھ مکعب پانی رات کے وقت پمپ سے بالائی تالاب میں جائے گا۔ اس پراجیکٹ میں چھ ۲ لاکھ کلو واٹ کی دو طرفہ ٹربائنیں ہوں گی جو پمپوں اور ٹربائنوں کے طور پر کام کریں گی جن میں سے ہر ایک کی الگ الگ پائپ لائنیں ہوں گی۔ عموماً یہ پائپ لائنیں سٹیل کے پائپوں کو جوڑ کر بنائی جاتی ہیں، گو یہ ثابت ہو گیا ہے کہ پانی کے سٹیل پائپوں کے حادثے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ان میں اچانک بڑے بڑے شگاف پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ زنگورسک کے پلانٹ میں سٹیل اور کنکریٹ سے

بنے ہوئے پائپ استعمال کئے جائیں گے۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ زیگو رسک پراجیکٹ سے سال میں، لاکھ ٹن سے زیادہ مروجہ ایندھن کی بچت ہوگی جو بصورت دیگر مروجہ بجلی گھروں کی غرض سے زیادہ سے زیادہ مانگ کے وقت بجلی پیدا کرنے کے لیے جلایا جاتا ہے۔

پانی کے بہاؤ کا عمل

سوویت یونین کا ۲۲۵۰۰۰ کلوواٹ کا پہلا ایسا پلانٹ جو کیف (یوکرائن) میں جمع کئے ہوئے پانی سے کام کرتا ہے ۱۹۷۱ میں شروع ہوا تھا۔ اس کی کارکردگی سے ایسے بجلی گھروں کی پیداواری صلاحیت کی توثیق ہوتی ہے۔ ایک اور ایسا پراجیکٹ جس کی پیداواری صلاحیت ۱۶ لاکھ کلوواٹ ہے لتھوانیا (بالٹک جمہوریہ) کے "کیسیاڈورلیس" کے مقام پر بنایا جارہا ہے۔ زیگو رسک اور کیسیا ڈورلیس" پلانٹ اس قسم کے معیاری بجلی گھروں کے ایک جال کے صدر پراجیکٹ ہوں گے، جو اوسطاً ۱۰۰ میٹر کی بلندی پر بنائے جائیں گے۔ ان کی معیار بندی سے ایسے پلانٹوں کی تعمیر پر لاگت میں کمی آئے گی۔

پمپ کے پانی سے چلنے والے پلانٹوں کا ایک جال بنانے کا پلان بنایا گیا ہے جن کی مجموعی پیداواری صلاحیت ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ کلوواٹ ہوگی۔ ایسے پراجیکٹ لینن گراڈ خطہ میں دریائے ڈنیسٹر، وانگا کی سطحی وادی اور ایسے دوسرے علاقوں میں قائم کئے جائیں گے جو امکانی مقامات کا ارضی سروے کرنے کے بعد منتخب کئے گئے ہیں۔ ان بجلی گھروں میں زیادہ تر ۱۰ لاکھ - ۱۶ لاکھ کلوواٹ کے یونٹ ہوں گے۔ ۶۴ لاکھ کلوواٹ کے کانیف پلانٹ جیسے بڑے بڑے بجلی گھر بنانے کا بھی پلان بنایا گیا ہے۔

ایسے پلانٹوں کی مؤثر کارکردگی کا انحصار پانی کے وسیلے پر ہے۔ پانی کے وسیلے میں اضافے کے ساتھ بعض نصب شدہ پیداواری صلاحیت کے بجلی گھر کو اپنی زیادہ سے زیادہ کارکردگی کے لیے کم پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وسطی روس کے ریجنوں اور شمال مغربی خطوں میں جہاں اکثر ۱۰۰ میٹر سے زیادہ بلندی نہیں ہے پمپ سے زیادہ پانی جمع کرنے کی بمشکل توقع کی جاسکتی ہے۔ لیکن پہاڑی خطوں میں بلندی ۴۰۰ سے ۵۰۰ میٹر تک ہے۔ ایک پائیں تالاب کھود کر اور زمین کی سطح کے نیچے بجلی گھر کی عمارت بنا کر پانی ۱۰۰۰ میٹر تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ مستقبل میں یورپی روس میں ایسے بجلی گھروں کی تعمیر کے لیے سازگار انجینئرنگ اور ارضیاتی حالات میسر ہوں گے۔ ڈیزائن انجینئر پہلے ہی ۱۲ لاکھ کلوواٹ کا ایک ایسا پراجیکٹ تیار کرچکے ہیں جس کے حصہ ۲ لاکھ کلوواٹ کے یونٹ ہیں اور جس کے لیے ۱۲۰۰ میٹر کی گہرائی میں ایک زمین دوز تالاب کھودا گیا ہے۔

زیادہ پیداواری صلاحیت کے بجلی گھر

پمپ کے پانی سے چلنے والے پلانٹ اعلیٰ پیداواری صلاحیت کے بجلی گھر ہیں۔ وہ اعلیٰ پایہ کی خودکاری اور سادہ رکھ رکھاؤ کے لیے مشہور ہیں۔ ان میں مروجہ حرارتی بجلی گھروں کی نسبت تھوڑا عملہ کام کرتا ہے اور انھیں چلانے پر لاگت بھی کم بیٹھتی ہے۔ لیکن ان پراجیکٹوں کی کچھ اپنی خامیاں بھی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک پاور گرڈ سے جب ایسے پلانٹوں کے ذریعہ ۱۰۰ KWH بجلی حاصل کی جاتی ہے تو صرف ۷۵ KWH بجلی موصول ہوتی ہے۔ لیکن یہ کمی اس امر سے پوری ہو جاتی ہے کہ رات کے وقت مروجہ پاور پلانٹوں سے جو فاضل بجلی پیدا ہوتی ہے اس کی یہ کھپت کرتا ہے۔

پانی کے تالابوں کو کھودنے کے مقصد سے جو گردش ہوتی ہے اس سے مٹی کو ہٹانا ایک اور مسئلہ ہے۔ لیکن دستیاب پانی کے ذخیروں کا پائیں تالابوں کے طور پر استعمال کئے جانے کا امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ مثال کے طور پر دریائے یتمان پر کوناس ہائیڈرو پاور اسٹیشن کے پانی کے ذخائر کیسیاڈورلیس پلانٹ کے پائیں تالاب کے طور پر استعمال ہوں گے۔ ڈنیپر، وانگا ہائیڈرو پاور اسٹیشن ورکس کے آبی ذخائر پر مبنی متعدد پلانٹ بنانے کے پلان بنائے گئے ہیں۔

بھارت میں امکانات

بھارت میں پمپ کے پانی سے چلنے والے پلانٹوں کے امکان کا پتہ لگانے کی ابھی کوشش نہیں کی گئی۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بیشتر پہاڑی خطوں میں سے گزرنے والے دریاؤں کی بھاری تعداد ایسے پلانٹوں کے ایک سلسلے کی تعمیر کے لیے شاندار موقع فراہم کرتی ہے۔ یہ آگے چل کر ایک روز قومی پاور گرڈ کا ایک نہایت مفید حصہ بن سکتے ہیں۔ بیشتر دوسرے شعبوں کی مانند اس شعبے میں بھی بھارت اپنے دوست سوویت یونین کے مفید تجربے کا بھارت کے عوام کے فائدے کے لیے استعمال کرسکتا ہے، یہ موقع ہے کہ بھارت کے پالیسی ساز اس جانب توجہ دیں۔ ●

بقیہ: فصلوں کا بیمہ

تال میل کی ضرورت: اسکیم کو بآسانی چلانے کے لیے ریاستی سرکاروں کے مختلف محکموں کے درمیان تال میل ضروری ہے۔ یہ محکمے جنرل انشورنس آف انڈیا اور مرکزی حکومت کے ساتھ تال میل قائم رکھیں گے۔ بہرصورت اس اسکیم پر عمل درآمد آسان کام نہیں ہے۔ یہ زرعی ترقی میں معاون ثابت ہو، اس کے لیے کوشش کرنی ہے۔ اس کے توسط سے زرعی پیداواری صلاحیت بڑھانی ہے۔ زرعی پیداواری اضافے کے لیے جو ٹھوس پروگرام بنائے گئے ہیں، ان پر مجموعی طور پر عمل درآمد سے ہی زرعی پیداواری میں اضافہ ممکن ہے۔ ریاستی سرکاروں کو ابتدائی مراحل پر اس اسکیم کو موثر اور مفید بنانے کے لیے کلیدی رول ادا کرنا ہوگا۔ علاقائی زبانوں اور نشر و اشاعت کے مختلف ذرائع سے اس کی اشاعت کرنی ہوگی۔ فی الحال فصلوں کے بیمے کا زیادہ تر تعلق ہے جو اکثر ریاستوں میں ۲ تا ۳ سالوں میں بٹا ہوا ہے۔ ریاستی سرکاروں کو عمل درآمد کے موجودہ نظام کو مستحکم بنانا ہوگا۔ اس لیے یہ طے کیا گیا ہے کہ ریاستی سرکاروں کو مساوی بنیادوں پر مالی امداد دی جائے۔ (بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

گوپال سکسینہ

دیہات میں ٹیلی ویژن کے بڑھتے قدم

دُور درشن کو ہمارے ملک میں دو بڑے رول ادا کرنے ہیں۔ اوّل! اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ سماجی تبدیلی کے ذریعے کے طور پر تعلیم اور جانکاری دے۔ دوم! اسے تفریح مہیا کرنے کے لیے عوام کی توقعات کو پورا کرنا ہے۔

دُور درشن نے حال ہی میں اپنی سِلور جوبلی منائی۔ ۲۵ برس پہلے اس کے ذمّہ جو کام سونپا گیا تھا اُس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ مغربی ممالک کی ٹیلی ویژن تنظیموں کے برعکس اس کے ذمہ یہ کام لگایا گیا تھا کہ وہ "سماجی تبدیلی کے ذریعے" کے طور پر کام کرے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ تھا کہ بھارتی ٹیلی ویژن کو "تفریح طبع" کے بجائے "تعلیم اور جانکاری" دینے کے لیے زیادہ رول ادا کرنا تھا۔

اسی تصور کا اطلاق ہمارے دیہی پروگراموں پر کیا گیا، جب جنوری ۱۹۶۶ میں ایک زرعی ٹیلی ویژن سروس شروع کی گئی جس کا نام رکھا گیا "کرشی درشن"۔ اب دیہی پروگرام تمام میٹرو پالٹن مرکزوں (دلّی مدراس، بمبئی اور کلکتہ) اپ گرہ دُور درشن مرکزوں اور موجودہ انسیٹ سروس سے نشر کیے جاتے ہیں۔ ایک طرح سے تمام "لو-پاور" ٹرانسمیٹروں سے بھی زرعی پروگرام نشر کیے جاتے ہیں، کیوں کہ وہ دلّی دُور درشن کے تمام پروگراموں کو جن میں کرشی درشن شامل ہے، ریلے کرتے ہیں۔

ٹیلی ویژن پر دکھائے جانے والے دیہی پروگراموں کے بنیادی مقاصد مختصر طور پر درج ذیل ہیں۔

ا۔ دیہی ناظرین کو کاشتکاری، زرعی اوزاروں، کیمیاوی کھاد، اچھی کوالٹی کے بیجوں، گھریلو صنعتوں، دیہی ترقی اور موسمی پیشگوئیوں کے بارے میں جدید ترین تکنیکی اور سائنسی معلومات سے روشناس کرنا۔

ب۔ صحتمندانہ تفریحی مواد فراہم کرنا جیسے لوک سنگیت، ناٹک، کٹھ پتلیوں کے ناچ وغیرہ۔

ج۔ ناظرین کو تعلیم، حفظانِ صحت اور خاندانی بہبود وغیرہ کی اہمیت سے باخبر کرنا۔

۱۹۷۵ میں بھارت نے ایک نیا پروگرام شروع کیا جو سٹیلائٹ انسٹرکشن ٹیلی ویژن ایکسپریمنٹ (SITE) کے نام سے موسوم تھا۔ یہ ایک سالہ پروگرام تھا اور اسے پیغام رسانی کے شعبے میں ایک نہایت پُرجوش تجربہ قرار دیا گیا۔ چار لسانی گروپوں والی چھہ ریاستوں کے ۲۴۰۰ دیہات میں بیک وقت ایک پروگرام دکھانا از خود ایک بڑا کارنامہ تھا۔

بھارت نے ٹیلی ویژن کی توسیع کے لیے ملک میں انسیٹ (انڈین نیشنل سٹیلائٹ) رائج کر کے سٹیلائٹ ٹیکنالوجی سے استفادہ کیا۔ ۱۹۸۲ میں انسیٹ-۱ میں کچھ خرابی پیدا ہو جانے کے بعد اُسے ترک کر دیا گیا اور اس کے بعد اکتوبر ۱۹۸۳ میں انسیٹ-۱(ب) کو مکمل طور پر قابلِ کار بنایا گیا۔ (ٹیلی ویژن کے علاوہ اسے ریڈیو، ٹیلی مواصلات اور موسمی پیشگوئیوں وغیرہ کے لیے بھی استعمال میں لایا جا رہا ہے)۔

جہاں تک ٹیلی ویژن کا تعلق ہے، انسیٹ-۱(ب)، کو بھارت کے دُور افتادہ حصوں میں دیہی اور قبائلی علاقوں تک ٹیلی ویژن نشریات پہنچانے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس پراجیکٹ کے تحت چھہ ریاستوں (آندھرا پردیش، اڑیسہ، مہاراشٹر، اُتر پردیش، بہار اور گجرات)، میں ہر ایک میں سے تین تین اضلاع کو چُنا گیا ہے جہاں سرکاری خرچ پر اجتماعی طور پر ٹیلی ویژن دکھانے کی سہولیات فراہم کی گئی ہیں۔ چیدہ دیہات میں اجتماعی طور پر ٹیلی ویژن دکھانے کے لیے ۲ ہزار سیٹ مہیا کیے گئے ہیں۔ ان میں سے نصف ڈی۔آر۔ایس (DIRECT RECEIVING SET) اور نصف وی۔ایچ۔ایف (VERY HIGH FREQUENCY) سیٹ ہیں۔

انسیٹ پروگرام لازماً "تعلیمی" ہیں: انھیں وسیع طور پر دو زمروں میں بانٹا جا سکتا ہے۔

۱۔ علاقہ کے خصوصی پروگرام جیسے دیہی پروگرام وغیرہ اور ۲۔ پرائمری اسکولوں میں پڑھنے والے ۵ سے ۸ برس اور ۹ سے ۱۱ برس کی عمر کے بچوں کے لیے تعلیمی پروگرام۔ علاقہ کے خصوصی پروگراموں میں زراعت، افزائشِ مویشیاں، صحت وصفائی، خاندانی

بہبود، تعلیم بالغان، معاشرتی بیداری، قومی یکجہتی، موسمی پیشگوئیوں اور کسانوں کے لیے حالات حاضرہ کی جانکاری سے متعلق پروگرام شامل ہوتے ہیں۔

پروگراموں کی تیاری

پروگرام زیادہ تر اُن علاقوں میں تیار کیے جاتے ہیں جہاں کام ہوتا ہے۔ صرف کم از کم پروگرام سٹوڈیو کے سوفسطائی ماحول میں تیاری کے لیے چھوڑے جاتے ہیں۔ پروگراموں کا پلان دُوردرشن کے پروڈیوسروں کی طرف سے مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے اُن متعدد محکموں کے مشوروں کے ساتھ بنایا جاتا ہے جو زراعت اور دیہی ترقیاتی سرگرمیوں میں شامل ہوتے ہیں۔ (ان میں زراعتی یونیورسٹیاں اور تحقیقی ادارے شامل ہیں) پھر پروڈیوسر اور ٹیلی ویژن دیکھنے والوں کے بارے میں تحقیق کرنے والوں میں تال میل اور اشتراک کا رہتا ہے۔

"انسیٹ" پروگرام شاہدین تک پہنچانے کے لیے جو انتظامات کیے گئے ہیں اُن سے اُن انتظامات میں بہتری ہوئی ہے جو "سائٹ" کے تحت کیے گئے ہیں۔ سائٹ کی حالت میں نشریات کا مشاہدہ خاص طور پر بنے ہوئے "ڈی آر ایس" پر کیا جا سکتا تھا۔ لیکن انسیٹ کے نشریات "ڈی آر ایس" اور "ڈی ایچ ایف" دونوں پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اول الذکر سیٹ براہِ راست "سٹیلائٹ" سے پروگرام موصول کرتے ہیں اور موخرالذکر ارضی ٹرانسمیٹروں سے سگنل پکڑتے ہیں۔ درحقیقت ارضی ٹرانسمیٹر ایک "ڈی آر ایس" پر پروگرام موصول کرتے ہیں اور ازاں بعد وہ انھیں "ڈی ایچ ایف" سیٹوں کو نشر کرتے ہیں۔ یہ "ری براڈ کاسٹنگ سسٹم" کے نام سے موسوم ہے اور اس کے ذریعے ایک عام "ڈی ایچ ایف" سیٹ "نو منتشر شدہ" سگنلوں کو آسانی سے موصول کرتا ہے۔ قدرتی طور پر انسیٹ سسٹم خصوصاً دیہی اور دُور اُفتادہ علاقوں میں زیادہ کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

آپ گرہ دُور درشن کیندر (سٹیلائٹ ٹیلی ویژن سینٹر) نئی دلی کی طرف سے "مظفر پور میں زراعت کے جائزہ" کے بارے میں کیے گئے سروے کے مطابق۔ بیشتر جواب دہندگان نے زراعت پر مبنی پروگرام "چوپال" کی تعریف کی جس نے انھیں جدید کاشتکاری، فرٹیلائزر، کیڑے مار دواؤں، فصلوں اور مویشیوں کے امراض وغیرہ کے بارے میں جانکاری ملی۔ لیکن جواب دہندگان نے کہا کہ اگرچہ ٹیلی ویژن ایک زبردست ذریعہ (پیغام رسانی) ہے تاہم اس کا اُن پر محض محدود اثر پڑا ہے کیونکہ جو پروگرام نشر کیے گئے تھے وہ دلچسپ نہیں تھے اور نہ ہی علاقے کی ضرورت کے مطابق تھے۔"

رُکاوٹ کیا ہے؟

لیکن ہمارے دیہی ٹیلی ویژن پروگراموں سے "حقیقی دیہاتی پن" کا اظہار کیوں نہیں ہوا ہے۔؟ ان سے کسی کو یہ تاثر کیوں ہوتا ہے کہ ان میں بناوٹ ہے اور وہ سطحی نوعیت کے ہیں۔ ان میں دیہاتی فضا، دیہاتی گرمجوشی اور عوامی رنگ نہیں ہے۔ اس افسوسناک صورت حالات کے کئی اسباب ہیں۔

اول، دُوردرشن دیکھنے والے شہری لوگ ہمارے واحد چینل کے ٹیلی ویژن پروگراموں سے متعلق اپنے نجی انتخاب کے بارے میں ہمیشہ حاوی رہے ہیں۔ اور اپنی بات منواتے رہتے ہیں۔ اُن کے ذوق و شوق اور پسند کو ہمارے خاموش مگر کثیر التعداد دیہی شاہدین کی ضرورتوں اور دلچسپیوں پر فوقیت رہتی ہے۔ مثال کے طور پر پوسٹ سائٹ سینٹروں کو شروع میں فیچر فلمیں دکھانے میں دلچسپی نہیں تھی لیکن اُن علاقوں کے شہری باشندوں کے اصرار پر اتوار کی فیچر فلمیں اُن کے باقاعدہ نشریات کی حصہ بن گئیں۔ حال ہی میں جمعرات کی فلموں اور چیتر ہار کے بارے میں بھی اُن کی مانگیں مان لی گئیں، حتیٰ کہ "کھیڈا نشریات" میں بھی جو ایک تجرباتی پراجیکٹ ہے اب فیچر فلمیں دکھائی جا رہی ہیں۔

دوئم، معلوم ہوتا ہے کہ قومی نیٹ ورک پروگراموں کے رائج ہونے اور تمام "ایل پی ٹی" سینٹروں سے دلی دُوردرشن کے پروگرام ریلے ہونے سے ٹیلی ویژن دیکھنے والوں میں "شہری - دیہاتی تقسیم" کے بنیادی تصور میں ایک انقلابی نوعیت کی تبدیلی آئی ہے۔ اب سب پروگرام سب کے لیے ہیں۔ یا تو کوئی انھیں دیکھتا ہے یا پھر سیٹ کو بند کر دیتا ہے۔ اور یہ قدرتی امر ہے کہ دلی کے پروگرام زیادہ دلچسپ ہونے کے باعث دیہاتیوں کی طرف سے پسند کیے جاتے ہیں۔

سوئم، دیہات اور شہروں میں دستیاب ٹیلی ویژن سیٹوں کے درمیان تناسب میں بہت زیادہ فرق ہے۔ دوسرے الفاظ میں شہری اور نیم شہری علاقوں میں دیہات کی نسبت بہت زیادہ سیٹ ہیں۔ شائد زیادہ تعداد والوں کو جمہوریت میں فوقیت حاصل ہوتی ہے۔

چہارم، دیہی حلقہ جات میں ٹیلی ویژن دکھانے کی اسکیم کا از سرِ نو جائزہ لیا جانا ضروری ہے اور اگر ضروری ہو تو اُس پر نظرِ ثانی بھی کی جانی چاہیے۔ بر وقت بھارت کے ۵ لاکھ ۷۵ ہزار دیہات کے لیے تقریباً ۹ ہزار حلقہ جاتی سیٹ ہیں۔ اگرچہ دیہات میں لوگوں کے پرائیویٹ سیٹ زیادہ نہیں ہیں، تاہم حلقہ جاتی سیٹوں کی تعداد تو بہت کم ہے، پر کچھ ایسے مسائل ہیں جیسے کہ۔

ا۔ دیہات میں بجلی کی باقاعدہ سپلائی کا فقدان۔

ب۔ سیٹ نگرانوں کی طرف سے وقت پر سیٹ چالو کرنے میں بے قاعدگی۔

ج۔ سیٹوں کی مرمت کے لیے افرادی قوت اور مشینری کی کمی۔

د۔ پروگرام کے دکھانے کے لیے کافی جگہ کا نہ ہونا اور فی سیٹ کے حساب سے دیکھنے والوں کی تعداد کا کم ہونا۔ دیہی پروگراموں کو موثر طور پر دیکھنے کے لیے ان کا ہونا ابتدائی شرط ہے۔

پنجم، دُوردرشن کے تمام پروڈکشن سینٹر شہری حدود میں واقع ہیں۔ بیشتر ٹی۔وی پروڈیوسر شہری ثقافتی پس منظر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ٹی۔وی پر بولنے والوں اور حصہ لینے والوں کی اکثریت شہری علاقوں سے آتی ہے۔ یہ قدرتی امر ہے کہ دیہات کی ثقافت اور جذبات اور دیہاتی عوام کی اُمیدوں اور اُمنگوں کی ہمارے

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

شاہین پروین

یہ ہندوستان ہے

ہندوستان ایک عظیم ملک ہے۔ یہاں مختلف رنگ و نسل کے لوگ آباد ہیں جن کی زبانیں الگ الگ ہیں، یہاں ۲۲ ریاستیں اور ۹ مرکز کے زیر انتظام علاقے ہیں۔ حصولِ آزادی کے بعد ۱۹۸۱ میں چوتھی مردم شماری ہوئی۔ ہمارے ملک کی آبادی کا عارضی تخمینہ ۶۸،۳۸،۱۰،۰۵۱ نفوس پر مشتمل ہے۔ ہندوستان کا شمار دنیا کے چار بڑے ملکوں میں ہوتا ہے۔ یہاں کی آبادی دنیا میں دوسرے نمبر پر سب سے بڑی آبادی ہے۔ یہاں کی آبادی دنیا کی آبادی کا ۱۵ فیصد ہے۔

ریاستوں اور مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں کا رقبہ، آبادی، راجدھانی، خاص زبانیں اور زراعت مندرجہ ذیل ہیں۔

ریاست	رقبہ مربع کیلو میٹر	آبادی (۱۹۸۱ کی مردم شماری کے مطابق)	راجدھانی	خاص زبانیں	زراعت
آندھرا پردیش	۲،۷۵،۰۶۸	۵،۳۵،۴۹،۶۷۳	حیدر آباد	تیلگو اور اردو	۔ خاص پیداوار چاول، تمباکو، تلہن، کپاس اور گنا۔
آسام	۷۸،۴۳۸	۱،۹۸،۹۶،۸۴۳	دس پور	آسامی	۔ خاص پیداوار چاول، پٹ سن، چائے، کپاس، تلہن، گنا، ان کے علاوہ آلو وغیرہ بھی کثیر مقدار میں پیدا ہوتا ہے۔
بہار	۱،۷۳،۸۷۷	۶،۹۹،۱۴،۷۳۴	پٹنہ	ہندی	۔ خاص فصلیں ہیں، دھان، گیہوں، مکا، راگی اور دلہن، نقد فصلیں ہیں، گنا، تلہن، تمباکو اور پٹ سن۔
گجرات	۱،۹۶،۰۲۴	۳،۴۰،۸۵،۷۹۹	گاندھی نگر	گجراتی	۔ خاص فصلیں ہیں باجرا، جوار، چاول اور گیہوں۔ نقد فصلیں ہیں، کپاس، تمباکو اور مونگ پھلی۔
ہریانہ	۴۴،۲۱۲	۱،۲۹،۲۲،۶۱۸	چنڈی گڑھ	ہندی	۔ خاص فصلیں ہیں گیہوں، چاول۔ نقد فصلیں، گنا، تلہن اور کپاس۔
ہماچل پردیش	۵۵،۶۷۳	۴۲،۸۰،۸۱۸	شملہ	ہندی اور پہاڑی	۔ گیہوں، مکا اور چاول یہاں کی خاص فصلیں ہیں۔ نقد فصلیں پھل، آلو، ادرک، انجیر اور زیتون کی کاشت پر زور دیا جا رہا ہے۔
جموں و کشمیر	۲،۲۲،۲۳۶	۵۹،۸۷،۳۸۹	سری نگر، جموں	کاشمیری، ڈوگری، گوجری، اردو، بلتی، دار دیرو، پہاڑی اور لداخی۔	۔ خاص فصلیں، چاول، مکا، گیہوں اور جو۔ نقد فصل سیب ہے۔
کرناٹک	۱،۹۱،۷۹۱	۳،۷۱،۳۵،۷۱۴	بنگلور	کنڑا	۔ خاص فصلیں چاول، راگی، جوار، گیہوں، باجرا، نقد فصلیں ہیں، گنا، کپاس، تلہن، تمباکو، ناریل، سپاری، کافی، کاجو، الائچی، کالی مرچ، سنترا اور انگور۔
کیرالہ	۳۸،۸۶۳	۲،۵۴،۵۳،۶۸۰	ترونندرم	ملیالم	۔ خاص فصلیں چاول، گیہوں۔ نقد فصلیں ہیں، کاجو، سپاری، ناریل، کپاس، تلہن، کالی مرچ، گنا، ربڑ، کافی، چائے، ادرک اور بڑی الائچی۔
مدھیہ پردیش	۴،۴۳،۴۴۶	۵،۲۱،۷۸،۸۴۴	بھوپال	ہندی	۔ خاص فصلیں جوار، گیہوں، چاول اور چنا۔ نقد فصلیں ہیں تلہن، کپاس، گنا۔
مہاراشٹر	۳،۰۷،۶۹۰	۶،۲۷،۸۴،۱۷۱	بمبئی	مراٹھی	۔ خاص فصلیں ہیں گیہوں، چاول، جوار، مکا، باجرا، اور دالیں۔ نقد فصلیں ہیں کپاس، تلہن، گنا، مونگ پھلی اور تمباکو۔
منی پور	۲۲،۳۲۷	۱۴،۲۰،۹۵۳	امپھال	منی پوری	۔ دھان خاص فصل ہے۔ کچھ علاقوں میں مکا کی کاشت ہوتی ہے۔
میگھالیہ	۲۲،۴۲۹	۱۳،۳۵،۸۱۹	شیلانگ	کھاسی گارو اور انگریزی	۔ خاص فصلیں ہیں آلو، گنا، تلہن، کپاس، پٹ سن، تمباکو، سپاری۔
ناگالینڈ	۱۶،۵۷۹	۷،۷۴،۹۳۰	کوہیما	آؤ، کونیاک، انگامی، سیما اور لوتھا۔	۔ خاص فصل چاول ہے۔

اُڑیسہ	۱,۵۵,۷۰۷	۲,۶۳,۷۰,۲۷۱	بھونیشور	اُڑیہ	• خاص فصلیں ہیں چاول، دالیں، تلہن، پٹ سن، گنّا، ناریل اور ہلدی۔
پنجاب	۵۰,۳۶۲	۱,۶۷,۸۸,۹۱۵	چنڈی گڑھ	پنجابی	• خاص فصلیں گیہوں اور چاول ہیں اس کے علاوہ مکّا، باجرا، جوار، چنا، جَو اور دالیں۔ نقد فصلیں تلہن، گنّا، تمباکو، کپاس اور آلو ہیں۔
راجستھان	۳,۴۲,۲۳۹	۳,۴۲,۶۱,۸۶۲	جے پور	ہندی اور راجستھانی	• خاص فصلیں ہیں جوار، باجرا، مکّا، چنا، گیہوں، تلہن، نقد فصلیں کپاس، گنّا، اور تمباکو ہیں۔
سکم	۷,۰۹۶	۳,۱۶,۳۹۵	گنگٹوک	لیپچا، بھوٹیا، ہندی، نیپالی اور لمبو۔	• چاول، جَو اور جوار خاص فصلیں ہیں۔ الائچی، سنترا، آلو، سیب، انناس اور نیبو نقد فصلیں ہیں۔
تامل ناڈو	۱,۳۰,۰۵۸	۴,۸۴,۰۸,۰۷۷	مدراس	تامل	• چاول، مکّا، جوار، باجرا اور راگی خاص فصلیں ہیں ـــ نقد فصلیں گنّا، تلہن، کپاس، مرچ، کافی، چائے اور ربڑ ہیں۔
تری پورہ	۱۰,۴۸۶	۲۰,۵۳,۰۵۸	اگرتلہ	بنگالی، تری پوری، گلیبورک اور منی پوری۔	• چاول، پٹ سن، آلو، تلہن، گنّا اور کپاس یہاں کی خاص فصلیں ہیں۔
اُتر پردیش	۲,۹۴,۴۱۱	۱۱,۰۸,۶۲,۰۱۳	لکھنؤ	ہندی۔	• گیہوں، چنا، چاول، جَو، مکّا اور باجرا یہاں کی خاص فصلیں ہیں۔ نقد فصلیں ہیں کپاس، مونگ پھلی، گنّا، تِل، سرسوں اور تمباکو۔
مغربی بنگال	۸۸,۷۵۲	۵,۴۵,۸۰,۶۴۷	کلکتہ	بنگالی	• چاول خاص فصل ہے اس کے علاوہ کم مقدار میں گیہوں، دالیں، تلہن، جَو، مکّا کی بھی کاشت ہوتی ہے۔ نقد فصلیں ہیں، پٹ سن، چائے اور پان کے پتے۔

مرکز کے زیر انتظام علاقے

ریاست	رقبہ مربع کیلومیٹر	آبادی (۱۹۸۱ کی مردم شماری کے مطابق)	راجدھانی	خاص زبانیں	زراعت
انڈمان اور نکوبار	۸,۲۴۹	۱,۸۸,۷۴۱	پورٹ بلیر	بنگالی، ہندی، نکوباریز اور تامل۔	• خاص فصلیں ہیں چاول، ناریل اور سپاری۔
اروناچل پردیش	۸۳,۷۴۳	۶,۳۱,۸۳۹	ایٹا نگر	مستی، ڈفلا، آدی، وانچو، موپا، نوکش، بنگالی، انگریزی۔	• خاص فصلیں ہیں دھان، مکّا، گیہوں اور سرسوں۔
چنڈی گڑھ	۱۱۴	۴,۵۱,۶۱۰	چنڈی گڑھ	ہندی اور پنجابی۔	• خاص فصلیں ہیں دھان، گیہوں، مکّا اور آلو۔
دادر نگر حویلی	۴۹۱	۱,۰۳,۶۷۶	سلواسہ	گجراتی، ہندی، بھیلی/بھیلودی	• خاص فصلیں ہیں دھان اور راگی، کچھ علاقوں میں گیہوں کی کاشت ہوتی ہے۔
دہلی	۱,۴۸۳	۶۲,۲۰,۴۰۶	دہلی	ہندی، اُردو اور پنجابی	• خاص فصلیں ہیں گیہوں، دھان، چنا، مکّا، باجرا اور جوار۔ نقد فصلیں ہیں گنّا، سرسوں، تمباکو۔
گوا، دمن اور دیو	۳,۸۱۴	۱۰,۸۶,۷۳۰	پناجی	مراٹھی، کونکنی اور گجراتی	• یہاں کی خاص فصل چاول ہے۔ اس کے علاوہ دالیں اور راگی بھی ہوتی ہیں۔ نقد فصلیں ہیں گنّا، ناریل، کاجو، سپاری، انناس، آم اور کیلا۔
لکش دیپ	۳۲	۴۰,۲۴۹	کوارتی	ملیالم	• خاص فصل ناریل ہے۔
میزورم	۲۱,۰۸۱	۴,۹۳,۷۵۷	آئزول	میزو اور انگریزی	• خاص فصلیں ہیں مکّا اور دھان۔ اس کے علاوہ دالیں، گنّا، لال مرچ، ادرک، تمباکو، ہلدی، آلو، کیلا اور انناس کی کھیتی ہوتی ہے۔
پانڈیچری	۴۹۲	۶,۰۴,۴۷۱	پانڈیچری	تامل اور فرانسیسی	• دھان خاص فصل ہے۔ کم مقدار میں جوار، باجرا اور راگی کی کھیتی ہوتی ہے۔ مونگ پھلی، کپاس اور گنّا نقد فصلیں ہیں۔

غزلیں

قاضی انصار

دل لے کے چلی ہے یہ جگر لے کے چلی ہے
مجھ کو مری تخلیق کدھر لے کے چلی ہے
پوچھو مرے کردار کی عظمت ذرا پوچھو
دُنیا مرا اندازِ ہُنر لے کے چلی ہے
تاریکیاں غمناک' المناک اُجالے
کاندھے پہ رکھے شام و سحر لے کے چلی ہے
ظالم کی صفت خونِ شہیداں کا نظارہ
نیزوں پہ سجائے ہوئے سر لے کے چلی ہے
کیا بات ہے کیوں ٹوٹ رہی ہے مری ہمت
کیا جانئے کس بات کا ڈر لے کے چلی ہے
اے مری انا تھوڑی سی تسکین کی خاطر
کیوں مجھ کو کسی اور کے گھر لے کے چلی ہے
مل جائے گی انصار یقیناً مجھے منزل
جس سمت بھی یہ راہگذر لے کے چلی ہے

تاج پیامی

ضمیر بیچے کوئی شخص بھی اگر اک بار
سمجھنا چاہیئے اُس کو نہ صاحبِ کردار
بنائیں تاج محل ایک پھر محبت کا
گرائیں مل کے، چلو آج ظلم کی دیوار
پلک جھپکتے ہی صدیوں کا فرق ہوتا ہے
ہے اس صدی میں بہت تیز وقت کی رفتار
خموش بیٹھنا محفل میں ہے خلافِ ادب
نہ جانے کتنے ہیں دنیا میں موضوعِ گفتار
سُنائی کیسے دیں اے تاج دل کی آوازیں
کھڑی ہے بیچ میں خاموشیوں کی اک دیوار

★

مُشتاق المحوی

مستند ہے وہ انتساب لیے
ماہ و انجم ہیں اُس کی تاب لیے
شانِ ہندوستاں بڑھی جس سے
وہ جواہر تھا اک گلاب لیے
تشنہ لب تشنہ لب پیامِ نشاط
منتظر ساقیا شراب لیے
ڈھونڈتا ہوں کہاں گئی دُنیا
اپنی پلکوں پہ کل کا خواب لیے
دل مسرت سے رقص فرما ہے
فصلِ گُل آئی ہے شباب لیے
بزمِ شعر و سخن میں ہے مشتاق
اپنی تخلیقِ انتخاب لیے

●

قطعات

قاضی حسن رضا

مہک لے کر چمن میں آج اندرا کا گلاب آیا
خدا کا شکر ہے ہندوستان میں انقلاب آیا
اندھیرا دور کرنا چاہتی تھیں جس سے اندرا جی
پیامِ صبح لے کر ملک میں وہ آفتاب آیا

کوئی تخریب کاری اور ریاکاری نہیں ہوگی
زمیں ہوگی کسانوں کی زمینداری نہیں ہوگی
کوئی مظلوم ہوگا اب نہ کوئی ظلم ڈھائے گا
کسی صورت سے مجرم کی طرفداری نہیں ہوگی

★

ہمارا وطن

عظیم الرّحمن عظیم

یہ ہندوستاں جو ہمارا وطن ہے
یہ نہرو کے خوابوں کا پیارا چمن ہے

بہاروں کی مہکی ہوئی انجمن ہے
یہ دھرتی اُجالوں کا اک بانکپن ہے
یہ دھرتی ستاروں کا ایسا گگن ہے
اُفق در اُفق کہکشاں ضوفگن ہے

یہ ہندوستاں جو ہمارا وطن ہے
یہ نہرو کے خوابوں کا پیارا چمن ہے

محبت، مروّت کا ہر سُو چلن ہے
ہر اک شخص محنت میں اپنی مگن ہے
یہ گاندھی کی دھرتی کے گنگ و جمن ہے
مدرسوں میں بھی زندگی موجزن ہے

یہ ہندوستاں جو ہمارا وطن ہے
یہ نہرو کے خوابوں کا پیارا چمن ہے

ترقی کے مظہر کئی کارخانے
خلاء میں بھی ہندوستاں کے ترانے
ہوائیں معطر تو موسم سُہانے
مسرت کے بجنے لگے شادیانے

یہ ہندوستاں جو ہمارا وطن ہے
یہ نہرو کے خوابوں کا پیارا چمن ہے

آر. کے. بھنڈاری

بہتر تعلیم
بہتر قوم

مصنف نے ۱۹۵۰ کے بعد سے تعلیمی ترقی کا جائزہ لیا ہے اور وقتاً فوقتاً اختیار کی جانے والی پالیسیوں اور اُن سے برآمد ہونے والے نتائج پر بحث کی ہے۔ اُس نے ساتویں پانچ سالہ منصوبے کے دستور کار کے ضمن میں مرکزی مالی امداد بڑھانے، تعلیمی اداروں کی توسیع پر روک لگانے اور ڈگریوں کو روزگار سے الگ کرنے جیسے بعض کلیدی معاملے اُٹھائے ہیں اور اُن کے عمل سجھاؤ دئے ہیں۔

آزاد بھارت نے اپنا آہنگ بھرا پانچ سالہ منصوبہ ۱۹۵۱ میں شروع کیا۔ یہ ایک جمہوری ملک کے لیے جس کی معیشت زرعی اور پسماندہ تھی اپنے انسانی اور مادی وسائل کے منصوبہ بند انتظام کے ذریعے اپنی اقتصادی ترقی میں تیزی لانے کے سلسلے میں ایک بے مثل تجربہ تھا۔ اقتصادی ترقی کے مقصد کے لازمی معانی تھے ملک کی تعلیمی ترقی۔

پہلے منصوبے میں یہ ذکر کیا گیا تھا کہ چوں کہ تعلیم ملک کی منصوبہ بند ترقی میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے اس لیے تعلیمی مشینری کو اُن خصوصی کاموں کے لیے تیزی سے حرکت میں لایا جائے جو ملک نے منصوبے کے ذریعے اپنے سامنے رکھے ہیں، تاکہ مختلف شعبوں میں مطلوبہ رفتار پر موزوں قابلیت کا عملہ دستیاب کیا جائے۔ دوسرے منصوبے میں کہا گیا تھا کہ تعلیمی نظام نے اُس رفتار کا تعین کیا ہے جس پر اقتصادی ترقی کا حصول ہوا ہے اور اُن فوائد کا پتہ چلا ہے جو اس سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ تیسرے منصوبے میں تعلیم کو تیز رفتار اقتصادی ترقی اور ٹکنالوجیکل پیش قدمی کے حصول اور ایک ایسے سماجی نظام کے قیام میں اہم ترین واحد عنصر بیان کیا گیا ہے جس کی بنیاد آزادی، سماجی انصاف اور مساوی مواقع پر ہو۔ چوتھے منصوبے میں موجودہ تعلیمی نظام کی خامیوں کو دور کرنے اور اُسے زیادہ موثر طور پر سماجی اور اقتصادی ترقی کی بڑھتی ہوئی مانگوں کے ساتھ جوڑنے نیز پہلے تین منصوبوں کے دوران پیدا ہونے والے اندرونی دباؤ کو دور کرنے اور اس نظام کو سماجی، تقاضوں اور اقتصادی ضرورتوں کے مطابق توسیع کرنے پر زور دیا گیا۔ پانچویں منصوبے میں بتایا گیا کہ مختلف کاموں کے لیے جتنے اور جیسے ضروری افراد درکار ہیں، تعلیم عوام میں موزوں رجحانات، ہنر، امتیازی شخصیت اور مناسب فضا پیدا کرکے اُن کی فراہمی کرتی ہے۔ چھٹے منصوبے میں انسانی وسائل کے ترقیاتی عمل میں اور ابتدائی تعلیم اور تعلیم بالغان کو عام کرنے کے پروگراموں کے ذریعے عوامی سطح پر تعلیم مہیا کرنے کے لیے تعلیم کو کلیدی رول عطا کیا گیا۔

چھٹے پانچ سالہ منصوبے کی تکمیل کے نتیجے میں ملک کے تعلیم کے شعبے میں نمایاں توسیع ہوئی ہے۔

ادارتی توسیع

ملک میں تسلیم شدہ تعلیمی اداروں کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ ابتدائی اسکول جن کی تعداد ۱۹۵۱ میں دو لاکھ ۹ ہزار تھی وہ اس وقت ۵ لاکھ ۰۵ ہزار (تقریباً ۲ گنی) ہو گئی ہے۔ مڈل اسکولوں کی تعداد ۱۴ ہزار سے بڑھ کر ایک لاکھ ۴۰ ہزار (تقریباً ۱۰ گنا) ہو گئی ہے اسی طرح ہائی اور ہائر سیکنڈری اسکولوں کی تعداد ۷ ہزار سے بڑھ کر ۶۰ ہزار تک (۹ گنا سے زیادہ) پہنچ گئی ہے۔ اس عرصے کے دوران یونیورسٹیوں کی تعداد میں ۵ گنا اور کالجوں کی تعداد میں ۷ گنا اضافہ ہوا۔ ملک میں ۵۱–۱۹۵۰ میں تعلیمی درس گاہوں میں جانے والے طلبا کی تعداد ۲ کروڑ ۴۰ لاکھ تھی جو اب ساڑھے ۱۲ کروڑ ہو گئی ہے۔ تعلیمی اخراجات میں جو اضافہ ہوا ہے اُسے دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ۳۵ برس کے عرصے میں وہ ۱۵ گنا سے زیادہ بڑھ گئے

ہیں۔ ۱۹۵۰-۵۱ میں تعلیم پر ۱۴ کروڑ روپے خرچ ہوتے تھے جو اب ۱۹۸۴-۸۵ میں ۶۰۰۰ کروڑ سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ اس سے مختصر طور پر ۳۵ برس میں تعلیمی شعبے میں ہوئی ترقی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

عدم توازن کو دُور کرنے کے اقدامات

اس توسیع سے تعلیمی مواقع میں مزدوری مساوات لانے اور کسی حد تک علاقائی عدم توازن کو دُور کرنے میں بھی مدد ملی ہے اور اس طرح لوگوں کو بڑی تعداد میں کام دھندوں کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا پڑا ہے، پسماندہ گروہوں کو فائدہ پہونچا ہے اور معیشت اور معاشرے کو متوازن بنانے کی غرض سے کارکنوں کے نئے گروپ پیدا ہوئے ہیں۔ دراصل ترقی یافتہ تعلیمی نظام کی بدولت نہایت قابل اور تربیت یافتہ سائنسی افرادی قوت پیدا ہوئی ہے جو کسی بھی ترقی یافتہ ملک کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ لیکن تعلیم کے متعدد ضمنی شعبوں میں غیر متوازن اور یکطرفہ توسیع ہوئی ہے۔ چونکہ سماج کے کمزور طبقوں کے بچے جن میں لڑکیاں شامل ہیں، پورے وقت تک اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے اس لیے ابتدائی تعلیم کے اس رسمی سسٹم سے تعلیم کو عام کرنے کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ بچوں کے اس زمرہ کے لیے اور تعلیم مکمل کرنے سے بغیر اسکول چھوڑنے والوں کے لیے بھی (ایسے بچوں کی تعداد ۵۰ فیصد ہے) غیر رسمی تعلیم کو بڑے پیمانے پر شروع کرنے کی سفارش کی جاتی ہے تاکہ ۱۴ برس کے تمام بچوں کو بنیادی تعلیم مہیا کی جا سکے۔

تعلیم بالغان

۱۹۹۰ تک ناخواندگی کا انسداد ایک قومی پراجیکٹ ہے جو ساتویں منصوبے میں شامل کیا گیا ہے اور جس کا مطلب ہے ۱۵ سے ۳۵ برس کے گروپ میں تقریباً ۱۱ کروڑ ناخواندہ اشخاص کو خواندہ بنانا۔ اس پروگرام کے لیے زیادہ زور اس امر پر دیا جائے گا کہ سماج کے غریب لوگوں کو تعلیم دی جائے اور تعلیم بالغان کے اس وسیع پروگرام میں رضاکارانہ اداروں اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو شامل کیا جائے۔ تحریک و ترقی کے مقاصد کے لیے الیکٹرانک اور عوامی ذرائع تعلیم کا بھی استعمال کیا جائے گا۔

تکنیکی تعلیم

تجویز کیا گیا ہے کہ ساتویں منصوبے کے دوران بنیادی ڈھانچے اور سہولیات کے زیادہ سے زیادہ استعمال، مشکل شعبوں کی نشاندہی اور ابھرتی ہوئی ٹکنالوجی کے نئے شعبوں میں بنیادی ڈھانچے کی تخلیق، تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے، لیباریٹریوں کی جدید کاری اور تمام تر سسٹم کے مؤثر انتظام پر زور دیا جائے۔ جن امور پر زور دیا جائے گا وہ ہیں ۱۔ پالی ٹیکنک اداروں میں بہتری۔ ۲۔ فرسودہ طریقوں کو ختم کرنا۔ ۳۔ کمپیوٹروں کا استعمال۔ ۴۔ تعلیم نسواں۔ ۵۔ ترقی کے لیے سائنس اور ٹکنالوجی کا اطلاق و توسیع۔ ۶۔ تعلیم کا جاری رکھنا۔ ۷۔ تکنیکی تعلیم اور صنعتوں کے درمیان تفاعل اور ۸۔ علاقائی عدم توازن کو ختم کرنا۔

بڑی پالیسیاں

تعلیم سے متعلق ساتویں پانچ سالہ منصوبے کے مقاصد کے حصول کے لیے بڑی پالیسیاں دیگر باتوں کے علاوہ درج ذیل ہیں:-

۱۔ بلاک اور اسکول کی سطح پر منصوبہ بندی کو جس میں حلقہ کے لوگ شامل ہوں اور مقامی ماحول اور ترقیاتی سرگرمیوں کے ساتھ اُن کی گہری وابستگی ہو، ایک بڑی حکمتِ عملی کے طور پر دیکھا گیا ہے جس کا مقصد عالمگیر ابتدائی تعلیم کے نصب العین کے حصول سے وابستہ رکاوٹوں پر قابو پانا اور ناخواندگی کا انسداد کرنا ہے۔

۲۔ تعلیم کے معیار اور افادیت کو بہتر بنانا جس میں دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ تمام سطحوں پر سائنس اور ریاضی کی تعلیم اور معلّموں کی تربیت میں بہتری شامل ہے۔ مقاصد کے حصول کے لیے ایک اور اہم بات حکمتِ عملی ہے۔

۳۔ غیر رسمی تعلیم اور کھلے سسٹموں سے اُن اشخاص کو تعلیمی مواقع مہیا کرنے کے بارے میں سوچا گیا ہے جو ایک یا دوسرے سبب سے رسمی سسٹم کی سہولیات سے استفادہ نہیں کرتے۔

۴۔ پیشوں کو خاص طور پر فروغ دے کر وہ ہُنر سکھائے جائیں گے جو اقتصادی ترقی کے لیے ضروری ہیں اور جو پیداواری قوت بڑھا کر اس کی افزائش کے لیے نیا جوش و خروش پیدا کریں گے۔

۵۔ سیکنڈری اور اعلیٰ تعلیمی شعبوں میں معیار بندی کی بہتری اور متعلق تعلیمی اصلاحات کے نفاذ کے لیے خصوصی مساعی کی جائیں گی۔

۶۔ پرائیویٹ سیکٹر سے زائد وسائل کی فراہمی کے علاوہ کم لاگت کے اقدامات اختیار کرنا مالی کمی کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک اور حکمتِ عملی ہے۔

۷۔ تعلیمی نظام کی اندرونی اہلیت کو بہتر بنانا تاکہ اعلیٰ سطح کی کارکردگی حاصل ہو اور اُسے برقرار رکھا جائے جس پر ساتویں منصوبے میں زور دیا گیا ہے۔

مالی ضروریات

چھٹے پانچ سالہ منصوبے میں تعلیمی ترقیاتی پروگراموں پر خرچ کے لیے ۲۵۲۴ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی تھی جبکہ ساتویں پانچ سالہ منصوبے کے لیے تعلیم و ثقافت اور کھیلوں سے متعلق اسٹیرنگ گروپ نے ۱۵۴۲۴ کروڑ روپے کی سفارش کی ہے۔ ظاہراً یہ خرچ بہت زیادہ دکھائی دے سکتا ہے لیکن ابتدائی تعلیم کو ملک گیر بنانے اور ناخواندگی کا انسداد کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیمی ڈھانچے میں تبدیلی لانے کے مقاصد کے حصول سے متعلق عظیم کام کا خیال کرتے ہوئے یہ تخمینہ جات کم از کم ہیں جو اس مقصد کے لیے درکار ہیں۔ تعلیم کے شعبے میں بیشتر دیگر سماجی شعبوں کی مانند غیر منصوبہ جاتی اخراجات پبلک اخراجات پر (۷۰ فیصد) غالب رہے ہیں۔

اگر کافی فنڈ دستیاب نہیں ہوئے تو وہ مقاصد اور مادی نشانے جو ساتویں منصوبے میں تجویز کیے گئے ہیں پورے نہیں ہو سکیں گے اور تعلیم کے معیار میں بہتری کی رفتار بہت سست ہو سکتی ہے کیونکہ ابھی تک ابتدائی تعلیم کو ملک گیر بنانے کا آئینی مقصد حاصل نہیں ہوا۔

ساتویں منصوبے کا دستور کار

ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں تعلیم سے متعلق جو دستور کار اختیار کیا گیا ہے اس میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ "موجودہ نظام کے بارے میں یہ وسیع طور پر محسوس کیا گیا ہے کہ اس کے معمولات اور عوامل سے ملک کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں اور انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت پوری کرنے سے بھی یہ قاصر ہے: تعلیمی محققوں اور ناظموں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ موجودہ تعلیمی نظام قومی ترقی کے ساتھ وابستہ نہیں ہو سکا جس کے نتیجے میں تعلیمی نظام اور افرادی قوت کی ضروریات اور سماج کی ضروریات میں اس امر کے باوجود بڑی تفاوت رہ گئی ہے کہ تعلیمی سہولتیں میں بے مثل توسیع ہوئی ہے اور اعلیٰ ہنرمند افرادی قوت پیدا ہوئی ہے جس میں سے زیادہ تر کا استعمال دوسرے ملکوں کی طرف سے کیا جا رہا ہے۔

ساتویں منصوبے میں تعلیم سے متعلق سٹیرنگ گروپ کی رپورٹ میں ایک نئی طرز کی تعلیم کی سفارش کی گئی ہے جو لچکدار تنوع پذیر، برمحل اور وسیع طور پر گوناگوں مقامی ثقافت اور سماجی ماحول سے وابستہ ہو۔ اس میں جدت پسندی، کم لاگت کے متبادلوں اور معاشرتی شمولیت پر زور دیا گیا ہے جن سب کا مقصد تعلیم کو مؤثر طور پر طالب علم، روزگار اور ترقیات سے وابستہ کرنا ہے۔ تعلیم سے متعلق ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں مندرجہ ذیل بڑے بڑے پروگرام تجویز کیے گئے ہیں۔

۱۔ ۱۹۹۰ تک ابتدائی تعلیم کو ملک گیر بنانا۔

۲۔ ۱۵ سے ۳۵ برس کے گروپ میں ناخواندگی کو دور کرنا۔

۳۔ تمام مرحلوں میں تعلیم کا معیار بہتر بنانا اور اسے نئی سمت دینا تاکہ وہ قومی ضروریات اور ترقیات کے ساتھ منسلک ہو جائے اور اس کے ساتھ ہی ہائر سیکنڈری تعلیم میں پیشوں کی تربیت، سیکنڈری مرحلے میں سائنس کی تعلیم میں بہتری، تعلیم کے معیار میں بہتری، اعلیٰ تر تعلیم میں نصابوں کی از سر نو ترتیب اور یونیورسٹی مرحلے میں اپلائیڈ ریسرچ سہولیات کی توسیع پر زور دینا۔

تکنیکی تعلیم کی جدید کاری

تعلیم گو اب ایک ایسا مشترکہ معاملہ ہے جو سر دست لازماً ریاستی حکومتوں کے دائرہ کار میں ہے۔ اگرچہ ریاستی حکومتیں اوسطاً اپنی آمدنی کا ۲۵ فیصد تعلیم پر خرچ کر رہی ہیں، مرکز تعلیم پر محض ۳ فیصد خرچ کر رہا ہے۔ یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ اگر مرکز نے پسماندہ علاقوں کے لیے خاص طور سے بنائی ہوئی اسکیموں کے ذریعے امداد نہ بڑھائی تو قومی مقاصد اور انجام کار قومی یکجہتی کے حصول کے سلسلے میں بہت کم پیش رفت ہو سکتی ہے۔ اگرچہ تعلیم کے لیے منصوبے میں رقم بڑھانے کی ضرورت ہے، یہ بھی ضروری ہے کہ کفایت شعاری کے لیے پوری پوری کوشش کی جائے اور تعلیم کے لیے دستیاب وسائل کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے۔ تعلیمی ترقی کے لیے دستیاب منصوبہ جاتی اور غیر منصوبہ جاتی فنڈوں پر وقتاً فوقتاً نظر ثانی کرنے کے علاوہ موجودہ بنیادی ڈھانچے کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے، غیر منصوبہ بند توسیع کی روک تھام کی جائے، امدادی عطیات دینے کے متعلق ضابطۂ عمل میں ترمیم کی جائے جس سے اخراجات کم کرنے اور مستعدی بڑھانے سے متعلق انتظامی اقدامات کیے جائیں اور مستقبل میں توسیع کے لیے حکومت پر بوجھ کم کیا جائے۔

ایک بڑا عام معاملہ جس پر بحث اور فیصلے کی ضرورت ہے وہ ہے رسمی سسٹم کے تحت ابتدائی اسکولوں میں ٹیچروں کی بھرتی، ابتدائی تعلیم کے شعبے میں آمدنی بجٹ کا ۹۵ سے ۹۰ فیصد ٹیچروں کی تنخواہوں پر خرچ ہو جاتا ہے۔ عام طور پر ٹیچروں کی تمام آسامیاں منصوبے کے حصے میں سے پُر کی جاتی ہیں جب کہ آسامیاں غیر منصوبہ جاتی حصے میں خالی رکھی جاتی ہیں، جس سے اس شعبے کے لیے دستیاب منصوبے کے قلیل وسائل ختم ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ تجویز کیا گیا ہے کہ جیسا کہ "سی اے بی ای" نے سفارش کی ہے۔ ریاستی حکومتوں سے ٹیچروں کی بھرتی پر نظر ثانی کرنے کو کہا جائے۔ اور غیر منصوبہ جاتی حصے میں سے آسامیاں پُر کرنے کے لیے اقدامات کیے جائیں جس سے مستقبل میں ٹیچروں کی ضروریات کم کرنے میں مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ اگر ٹیچر، طالب علم کا موجودہ تناسب جو ۱ : ۴ ہے، بڑھا کر ۱ : ۵ کر دیا جائے۔ اس سے معلّمی کے عمل پر کوئی خاص اثر نہیں ہوگا کیوں کہ ابتدائی جماعتوں میں روزانہ اوسط حاضری تقریباً ۷۰ فیصد ہوتی ہے اور حقیقی طور پر تناسب ۱ : ۳۵ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں مزید ٹیچروں کی بھرتی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں! البتہ پسماندہ علاقوں اور دور دور تک بکھری آبادیوں میں نئے اسکول کھولے جا سکتے ہیں۔ اس سے فنڈوں کی کافی بچت ہو جائے گی۔ اسی طرح سکنڈری اسکولوں میں بھی بچت کی جا سکتی ہے۔

ڈگریوں کو ملازمتوں سے الگ کرنا

متعدد گروہوں کی طرف سے ڈگریوں کو ملازمت سے الگ کرنے کی سفارش کی گئی ہے لیکن اس سلسلے میں کوئی منصوبۂ عمل تیار نہیں کیا گیا اور نہ ہی پالیسی کے بارے میں فیصلہ کیا گیا ہے۔ چونکہ اس اقدام سے کالجوں اور یونیورسٹیوں نصابوں کی غیر منصوبہ بند توسیع پر روک لگنے کا امکان ہے اس لیے اس اصلاح کی جانب فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے جس سے تعلیمی ترقی کے لیے دستیاب قلیل منصوبہ جاتی وسائل میں کفایت کرنے میں مدد ملے گی۔

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

مسرور جہاں

آوارُدے

ٹرین پورے چار گھنٹے لیٹ تھی۔ اگر صحیح وقت پر روانہ ہوتی تو سات بجے شام تک مالکھن پور فرلا پہونچ جاتی۔ لیکن تاخیر سے روانہ ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ٹرین جس وقت مالکھن پور کے چھوٹے سے اسٹیشن پر پہونچ کر دھیمی ہوئی ___ اور گویا احسان جتا کر رُکی ۔ اس وقت گیارہ بج کر بیس منٹ ہو چکے تھے۔ چھوٹا سا اسٹیشن جس کی عمارت صرف ایک کمرے پر مشتمل تھی ۔ اپنی اکلوتی لالٹین کی زرد بیمار روشنی میں خاصا پُر اسرار لگ رہا تھا۔ اسٹیشن کے دونوں طرف کھیت چُپ چاپ سوئے ہوئے پڑے تھے، اور گاؤں کو جانے والی کچی سڑک سیل پا ئی کی طرح بچھی ہوئی تھی اور ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں کھیتوں کے بیچ سے ہو کر نہ جانے کس سمت جا رہی تھیں۔ لیکن جا بھی کہاں رہی تھیں ___ وہ تو اندھیرے کی چادر میں لپٹی ___ ٹھنڈے کہرے سے ڈھکی ___ چُپ چاپ دُبکی پڑی تھیں۔ یہ پگڈنڈیاں روز سویرے تڑکے جاگ پڑتی تھیں ۔ اور سارا دن دھوپ اور گرد و غبار سے بے حال اور بیل گاڑیوں کے بھاری پہیوں کے نیچے کچلی دبی۔ سخت پریشان رہتی تھیں۔ شام اُترتے ہی یہ پگڈنڈیاں تھکن سے چُور ہو کر سو جاتی تھیں۔

ٹرین نے جس وقت دو مسافر اُگل کر آگے کی راہ لی ___ اسٹیشن ماسٹر ___ جو ایک ساتھ کئی فرائض انجام دیتا تھا، اپنے کمرے میں جا کر لیٹ رہا۔ اب ساری رات کسی ٹرین کو یہاں سے نہیں گزرنا تھا۔ اُترنے والے دو مسافر ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے، کیوں کہ وہ الگ الگ ڈبوں سے اُترے تھے۔ ایک تو اوسط قد کا گٹھے ہوئے بدن کا تھا۔ اس نے موٹے کپڑے کا تنگ موری کا پاجامہ اور گرم کوٹ پہن رکھا تھا، اور سر کو ایک کمبل سے چھپا رکھا تھا۔ اس کا داہنا ہاتھ کوٹ کی جیب میں رکھے پستول کو گرفت میں لیے تھا۔ شاید پستول کی موجودگی نے اسے کچھ بے خوف بھی بنا دیا تھا۔ جب ہی تو وہ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر لمبے لمبے قدم رکھتا سڑک پر ہو لیا۔ دوسرا مسافر لمبے قد اور مضبوط ہاتھ پاؤں کا پھرتیلا انسان تھا۔ اس نے پتلون پر جیسٹر پہن رکھا تھا۔ اور پگڑی کے اوپر مفلر بھی لپیٹ رکھا تھا۔ اس کی داڑھی اور مونچھیں خوب کس کر بندھی ہوئی تھیں، جس سے اس کا چہرہ کچھ زیادہ تنا تنا لگ رہا تھا اور بالکل ایک سخت گیر انسان سا چہرہ لگ رہا تھا۔ اس کے چوڑے چوڑے ہاتھ جیسٹر کی گہری جیبوں میں پڑے تھے اور وہ اندر ہی اندر اپنی کرپان کو بار بار ٹٹول رہا تھا جیسے اپنے آپ کو اطمینان دلانے کی کوشش کر رہا ہو ___ دونوں مسافر ساتھ ہی اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکلے اور ایک ہی راستے پر چل پڑے۔ یقیناً وہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ جب ہی تو ایک دوسرے سے بات چیت کئے بغیر راستہ چل رہے تھے، لیکن ایسا لگتا تھا کہ وہ اجنبی ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے ایک پل بھی جُدا ہونے کے لیے تیار نہیں تھے کیونکہ ان میں سے کوئی ایک قدم بھی آگے بڑھ جاتا تو پیچھے والا لپک کر اس کے پہلو میں پہنچ جاتا۔ دونوں کی پوری کوشش تھی کہ وہ پہلو بہ پہلو اور ساتھ ساتھ چلیں۔ لیکن چُپ چاپ ___ اور ایک دوسرے سے لاپرواہ۔ لیکن ایک دوسرے سے پوری طرح چوکنا ___ بلکہ مشکوک ___ کیا پتہ کب ___ کوئی انجانے میں اپنا وار کر جائے ___ دھوکے سے مارے جانے سے اچھا ہے کہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بہادری سے مر جائے ___ کم از کم مرتے وقت یہ غم تو نہیں رہے گا کہ دھوکے میں مارے گئے ___ اگر زندگی ایک بار ملتی ہے تو موت بھی بس ایک ہی بار آتی ہے۔ اس لیے جتنی اہمیت زندگی کی ہوتی ہے، اس سے بھی زیادہ اہمیت موت کی ہوتی ہے' پھر بہادری کی موت عزت بھی بخشتی ہے ___ ورنہ مرنے کو تو لوگ روز ہزاروں کی تعداد میں مرتے ہیں۔ اور ڈھور ڈنگروں کی مانند مرنے والوں کی تعداد کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے ___ ان دونوں میں سے کوئی بھی گمنامی یا بزدلی کی موت مرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ آگ کے جن شعلوں کو لانگھتے ہوئے وہ لوگ اپنے گاؤں تک زندہ سلامت پہنچے تھے ___ اس نے ان کا تن تو راکھ نہیں کیا تھا لیکن من ضرور جلا کر خاک کر دیا تھا ___ اور اب وہی شعلے ان کے دلوں میں بھڑک رہے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ وہ ایک دوسرے پر اعتبار کرنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھے۔ حالانکہ ان کا آپس میں کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ کوئی دشمنی نہیں تھی۔ دشمنی کیسی۔ وہ تو ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں تھے۔ لیکن ایک رشتہ ان کے درمیان ضرور تھا، یہ رشتہ تھا زمین کا۔ زمین کی سوندھی باس کا۔ گندم کی سنہری بالیوں کا۔ ٹھنڈے میٹھے پانی کا اور فضاؤں میں رچی بسی اُس مخصوص خوشبو کا رشتہ جو گاؤں کی فضا کی ایک مانوس سُگندھ ہوتی ہے، گندم، مکئی، سرسوں، دودھ، دہی، مکھن اور مٹی سے مل کر ایک نئی خوشبو کا جنم ہوتا ہے۔ یہ خوشبو — نہ شہروں میں ہوتی ہے، اور نہ یہ سُگندھ برفیلے پہاڑوں پر ملتی ہے، اور جب یہ مانوس سی مخصوص خوشبو ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلتی ہے تو وطن پر لوگ ذات پات سے اوپر اٹھ کر اپنی جانیں تک وار دیتے ہیں۔ لیکن — اب تو اپنے ہی وطن میں۔ ایک اَن دیکھے ہاتھ نے زمین پر لکشمن ریکھا کھینچ دی تھی۔ جس کے پار جانا بھی مشکل تھا، اور ریکھا کے اس پار رہ کر اُدھر کا تماشا دیکھنا بھی مشکل تھا۔

گٹھے ہوئے بدن والے نے جیب سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبائی — ماچس کی تیلی کے سرے پر ننھا سا ایک شعلہ بھڑکا — اور اس ننھے سے سُرخ شعلے کی روشنی میں پہلی بار دونوں نے آنکھیں چار کیں۔ چاروں آنکھوں میں نفرت کے زہریلے ناگ پھن کاڑھے بیٹھے تھے۔ ماچس کا ننھا سا شعلہ آنِ واحد میں بجھ گیا۔ بس سگریٹ کا سِرا ایک ننھی سی چنگاری کی مانند رہ رہ کر چمک اٹھتا تھا۔ جیسے تنہا جگنو بھٹک کر آ نکلا ہو۔ کالی پگڑی اور تنے ہوئے چہرے والے نے کڑوے کسیلے دھوئیں کی بُو کو بڑی ناگواری سے سانس کے ساتھ کھینچا۔ اور جلدی سے خارج کر دیا۔ غصّے اور نفرت کی ایک تیز لہر اس کے خون میں تیر گئی۔ اس نے اپنی کرپان کو ٹٹولا — پھر کچھ سوچ کر کرپان پر اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ آگے پیچھے ہو کر چلنے سے اچھا تھا کہ اس 'بُو' کو برداشت کیا جائے — کم از کم اس 'بُو' سے کوئی خطرہ تو نہیں تھا۔ سگریٹ ختم ہو جائے گی تو 'بُو' بھی ختم ہو جائے گی۔ کالی پگڑی والے نے سوچا — اور غصّے پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا — اور دھوئیں سے بچنے کے لیے اس نے اپنا مفلر تھوڑا سا ناک پر کھسکا لیا۔

اچانک راستے میں کوئی لمبی سی چیز پڑی نظر آئی۔ دونوں ساتھ ساتھ ٹھٹھک گئے — اور وہ چیز ملگجے اندھیرے میں سرسراتی ہوئی قریبی کھیت میں اوجھل ہو گئی — دونوں کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک ساتھ خوف کی لہر پیدا ہوئی اور آہستہ آہستہ ختم ہوتی گئی۔ خوفزدہ ہونے کا عمل دونوں میں ایک ساتھ پیدا ہو کر ایک ساتھ ختم بھی ہو گیا۔ ان کے موٹے موٹے ہونٹوں سے اطمینان اور سکون کی ایک لمبی سی سانس خارج ہوئی۔ لیکن انھوں نے ایک دوسرے سے اپنے خوف کا اظہار نہیں کیا۔ اور نہ ہی بچ جانے کے شکھ پر خوشی ظاہر کی — وہ ایک موذی سے بچ جانے کے باوجود ایک دوسرے کے لیے اب تک اجنبی تھے۔ اب وہ اپنے بھاری بھاری بوٹوں سے زمین پر دھمک پیدا کرتے ہوئے چل رہے تھے تاکہ ان کے اَن دیکھے دُشمن خود ہی راستے سے ہٹ جائیں۔

ابھی وہ ذرا ہی دُور چلے ہوں گے کہ قریبی کھیتوں میں چٹ چٹ کی آواز آنے لگی۔ جیسے کوئی پتلی پتلی ہری ٹہنیاں توڑ رہا ہو — ان کے ہاتھ غیر اختیاری انداز میں اپنے پستول اور کرپان پر سختی سے جم گئے۔ لیکن کہیں کچھ نہ تھا — شاید ان کا واہمہ ہی ہو — یا پھر ان کے دل میں۔ ان کے دماغ میں — ان کی شریانوں میں — اعتبار اعتماد — خلوص اور محبت کی ہری ہری ٹہنیاں ٹوٹ رہی ہوں۔ ایسی ہی آواز ہوتی ہے ان کے ٹوٹنے سے — اور نظر کچھ نہیں آتا — بس آوازیں آتی رہتی ہیں۔ چٹ چٹ، چٹ چٹ۔

انھوں نے چور نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا — اور ان کے ہونٹ نفرت سے سکڑ گئے — اور ان کے قدموں کی دھمک کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ تو خیر ہوئی کہ سامنے کچھ فاصلے پر آبادی کے آثار نظر آنے لگے۔ کچھ روشنیاں جگنوؤں کی مانند چمک رہی تھیں۔ اور پھر جیسے جیسے وہ بڑھتے گئے روشنی کی ایک لکیر — لالٹین کی شکل اختیار کر گئی۔ کوئی کمبل میں لپٹا ہوا — ہاتھ میں لالٹین لیے کھڑا تھا۔ وہ بھی شاید آنیوالوں ہی کا منتظر تھا — ورنہ اتنی ٹھنڈک میں باہر کھڑے ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ ان کے نزدیک پہونچتے ہی وہ چلّایا۔

"پرشوتم بھیّا — تم ٹھیک ٹھاک پہنچ گئے نا؟" — ہم تو کب سے تمھاری راہ دیکھ رہے ہیں۔

"ارے فضلو بھائی — تم اتنی سردی میں باہر کیوں کھڑے ہو؟"

گٹھے ہوئے بدن والا خوش ہو کر چہکتی ہوئی آواز میں چیخا — اور لپک کر فضلو کے پاس پہنچ گیا — دونوں جگری یار تھے۔ مدّت کے بعد مل رہے تھے۔ وہ بھی ایسی حالت میں کہ اسٹیشن سے یہاں تک کا راستہ گھٹن — خاموشی اور سہم میں گذرا تھا۔ اب جا کر یہ کوفت مٹی تھی — لگتا تھا کہ وہ برسوں سے اسی طرح چل رہا ہو — ڈرا۔ سہما — خاموش اور چوکنّا —

"راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی بھیّا؟"

"نہیں فضلو بھائی — آرام سے پہونچ گئے۔ بس ذرا گاڑی لیٹ ہو گئی — ورنہ اور پہلے آ جاتے۔"

کالی پگڑی والا دو قدم کے فاصلے پر کھڑا ان کی باتیں سُن رہا تھا۔ شاید وہ فضلو کے مخاطب ہونے کا منتظر تھا۔ فضلو کو بھی دوسرے آدمی کی موجودگی کا خیال آیا تو اس نے لالٹین اُونچی کر کے اس کو دیکھا تو حیرت اور خوشی سے چلّا کر بولا —

"ارے جسبیر — تو بھی آیا ہے؟" —

جسبیر سنگھ اس کی طرف بڑھا اور خوش دلی

سے بولا۔

"ہاں بھیا۔ میں نے سوچا کہ گاؤں اور گھر کی خیریت لے لوں۔"

"چلو اچھا ہوا جو تم بھی آ گئے۔ اب اندر آؤ۔ باہر کب تک کھڑے رہو گے۔ بڑی ٹھنڈ ہو رہی ہے۔"

فضلو گھر کے اندر دروازہ کھول کر گھسا۔ اس کے پیچھے وہ بھی اندر چلے گئے۔ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جس کی چھت دھنی اور چھاپ سے بنی تھی۔ دیواریں بنا پلاسٹر کی تھیں۔ فضلو نے لالٹین ایک کیل میں ٹانگ دی اور تخت کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔

"تم لوگ جوتے اُتار کر آرام سے بیٹھ جاؤ۔"

اور اس نے دہکتی ہوئی انگیٹھی ان کے قریب ہی رکھ دی۔ جسبیر نے دستانے اُتار کر جیسٹر کی جیبوں میں ٹھونسے۔ اور انگاروں پر ہاتھ سینکنے لگا۔ پرشوتم بھی اطمینان سے بیٹھ گیا۔ وہ سردی کے مارے منھ سے ہُو ہُو کی آوازیں بھی نکال رہا تھا۔ شاید آگ کے سامنے بیٹھ کر سردی کا احساس کچھ زیادہ ہی ہونے لگا۔ اس کے ہُو ہُو کرنے سے جسبیر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ پرشوتم جھینپ گیا اور ہاتھ سینکنے لگا۔ فضلو نے اندر کھلنے والے دروازہ میں منھ ڈال کر بیوی سے کہا۔

"شبن کی ماں۔ ذرا جلدی سے چائے بنا دے۔ پرشوتم اور جسبیر شہر سے آئے ہیں۔"

"اب اتنی رات میں بھابھی کو نہ جگاؤ۔ تکلیف ہو گی۔" پرشوتم نے جلدی سے کہا۔

"تکلیف کیسی بھیا۔ ابھی بنی جاتی ہے۔ ماسٹر جی تو گاؤں کا رستہ دیکھ کر واپس چلے گئے، کہہ رہے تھے گاڑی بہت لیٹ ہے۔ پرشوتم کو تم اپنے پاس ہی روک لینا۔ کہہ دینا سویرے سویرے، گھر آ جائے۔ گاڑی کی آواز سنی، ابھی سے میں باہر کھڑا تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

"ہاں آج تو گاڑی بہت لیٹ ہو گئی۔ بابا پریشان ہوں گے۔ میں تو ہمیشہ منع کرتا ہوں کہ مجھے اسٹیشن لینے نہ آیا کیجئے۔ میں کیا بچہ ہوں جو اکیلے گھر نہیں پہونچ سکتا۔"

"اب ماسٹر جی کو تو جانو۔ تمہارا آنے کا سماچار پا کر کیسے دوڑے چلے آتے ہیں۔ پھر یہ بھی کیا عالم تھا کہ جسبیر بھی اس گاؤں سے آ رہا ہے۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا کہ تم دونوں مل گئے۔ بات چیت میں رستہ اچھا کٹا ہو گا۔"

دونوں نے چور نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، دونوں کے ہونٹوں پر جھینپی جھینپی سی مسکراہٹ تھی۔ ذرا دیر پہلے وہ کیسی حماقت کے مرتکب ہوئے تھے۔ اگر فضلو کو پتہ چل جائے۔ تو وہ کیا مذاق اُڑائے۔؟

"ادئے جسبیر۔ کیوں ہنس رہا ہے۔ اچھا سمجھ گیا تیری ہنسی کا مطلب۔"

فضلو نے بات ادھوری چھوڑ دی ___ تو جسبیر حیرت سے اس کا منھ تکنے لگا۔

"کل بزار (بازار) میں تیرا باپو ملا تھا" کہہ رہا تھا کہ جسبیر کی دُلہن کے لیے سامان خریدنا ہے۔ کیوں ___ ہے نا مزے دار بات۔ جب ہی تو ___ تو دَوڑا دَوڑا آ گیا ___ ورنہ کاہے کو آتا۔"

پہلے تو جسبیر اس کی بات سن کر بے اختیار ہنس پڑا۔ پھر شرما کر چُپ ہو گیا۔ اس کی بچکانہ اور بے ساختہ حرکت پر فضلو اور پرشوتم زور سے ہنس پڑے۔

دروازے کے قریب چوڑیاں کھنکیں ___ فضلو نے بڑھ کر چائے کی پتیلی لے لی۔ پھر ایک سُریلی آواز نے نقرئی گھنٹیاں سی بجائیں۔

"اُدھر تپڑے پر گلاس دھرے ہیں جی۔"

فضلو نے گلاس اٹھائے ___ اور بھاپ اٹھتی ہوئی گرم گرم چائے اُنڈیلی۔ جسبیر اور پرشوتم کو ایک ایک گلاس تھما کر ایک گلاس خود اٹھا لیا۔

اور تینوں مزے سے چائے کی چسکیاں لینے لگے۔ گُڑ کی چائے خوب سوندھی اور مزیدار تھی۔ اور اس ٹھنڈی رات میں کچھ زیادہ ہی مزہ دے رہی تھی۔

چائے ختم ہوئی تو فضلو نے اندر سے دو کمبل لا کر تخت پر رکھ دئے اور کھاٹ پر سے دو تکیے اٹھا کر ایک طرف رکھے۔ پھر اندر جاتے ہوئے بولا۔

"لو اب آرام سے سو جاؤ۔ تڑکے جگا دیں گے۔"

پرشوتم نے اپنا کوٹ اُتار کر کھونٹی پر ٹانگا، اور جسبیر نے جیسٹر تہہ کر کے اپنے سرہانے رکھ لیا۔ اور دونوں تخت پر کمبل اوڑھ کر پہلو بہ پہلو لیٹ گئے۔

جسبیر نے پرشوتم سے پوچھا۔

"کیا تم ماسٹر جی کے منجھلے بیٹے ہو؟"

"ہاں جی۔"

"شہر میں تمہاری کیرانہ کی دوکان ہے۔ ماسٹر جی نے بتایا تھا۔"

"کیا تم میرے بابو کو جانتے ہو۔" پرشوتم نے پوچھا۔

"انھیں کون نہیں جانتا۔ آس پاس کے چار چھ گاؤں میں ان کے بہتیرے شاگرد ہیں۔ وہ سب کے گرو ہیں۔"

میرا چھوٹا ویرا۔ ماسٹر جی کی مہربانی اور واہ گُرو کی کرپا سے کناڈا میں ملازم ہے اور اچھے پیسے کما رہا ہے۔"

"تم کیا کرتے ہو۔"

"میں جموں میں ٹرک چلاتا ہوں۔ یوں کہو کہ نہ پڑھنے کی سزا کاٹ رہا ہوں۔"

"اِدھر کم ہی آتے ہو؟"

"ہاں۔ سال میں بس دو ایک بار آتا ہوں۔"

"جب ہی میں نے تم کو نہیں دیکھا۔"

"ہاں جی ___ ورنہ ___ اس طرح چُپ چاپ رستہ نہ چلتے۔ ایک دوسرے سے ہم کیسے چوکنا اور ڈرے ہوئے تھے۔ فضلو بھائی نہ ملتا ___ تو

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

بقیہ: مسلم ممالک میں خاندانی منصوبہ بندی

قدامت پرستی، فرسودہ رسم و رواج اور جہالت بھرے عقیدے سے جکڑے ہوئے ہیں۔ اور جب تک جہالت سے موثر ڈھنگ سے جہاد نہ کیا جائیگا تب تک خاندانی منصوبہ بندی یا بنی نوع انسان کی خوشحالی، ترقی، معاشی بہتری، سماجی فلاح یا ایک کامیاب اور خوش خرم زندگی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

کچھ مسلم ممالک ایسے ہیں جنہوں نے صدیوں سے جہالت کے شکنجے میں جکڑے اپنے عوام کو روشن خیال اور بیدار مغز بنانے میں بڑے کارگر اقدام اٹھائے۔ ان کی مسلسل کوششیں اور جدوجہد بے کار نہیں گئیں بلکہ بار آور ثابت ہوئیں اور نتیجتاً وہاں خوشحالی اور شادمانی کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آیا۔

وہاں کے علما مذہبی پیشواؤں اور مفتیوں نے معقولیت پسندی پر مبنی ایسے فتوے بھی دیئے کہ خاندانی منصوبہ بندی کے معاملے میں مذہب مانع نہیں۔ ان فتووں میں ابتدائے اسلام سے ایسی مدلل مثالیں بھی پیش کی گئیں جو خاندانی منصوبہ بندی یا ضبط تولید کے حق میں تھیں۔

انسان کو خدا نے عقل سلیم عطا فرمائی ہے، اس لئے کہ وہ اس سے کام لے۔ زندگی کے ہر شعبے میں وہ دانشمندانہ طرز عمل کو اپنائے۔ غیر دانشمندی، ناعاقبت اندیشی اور حقائق سے چشم پوشی کا شکار نہ ہو۔

کوئی بھی ذی فہم انسان بڑھتی آبادی کے مہیب مسئلے سے منہ موڑ نہیں سکتا۔ دنیا کے صرف ایک ملک کی مثال بھی مد نظر رکھی جائے تو وہ آبادی کے اژدہے کی شکل میں انتہائی ہولناک نظر آئے گی۔ ہمارا ملک ہندوستان ہے۔ ماہرین کا قیاس ہے کہ اس صدی کے آخر تک یا ۲۰۰۰ء کے شروع ہونے تک ملک کی آبادی ایک ارب ہوجائے گی۔ ورنہ ایک محتاط اندازے کے مطابق موجودہ شرح آبادی کی رفتار یہی رہی تو بیسویں صدی ختم ہوتے ہوتے ہمارے ملک کی آبادی ۹۶۱ کروڑ تک تو ضرور پہنچ جائے گی بلکہ گمان غالب ہے کہ اس سے بھی تجاوز کر جائے گی۔ ۱۹۸۴ء میں جب ملک کی آبادی تقریباً ۷۰ کروڑ ہے تو ہمارے عوام کے ایک بے حد خستہ حال طبقے کے تقریباً ۲۰ کروڑ لوگوں کو آدھے پیٹ ہی رہ جانا پڑتا ہے۔ اس پس منظر میں تصور کیا جائے کہ سن ۲۰۰۰ء میں جب ملک کی آبادی ایک ارب ہوجائے گی یا اس سے بھی تجاوز کر جائے گی۔ تب کتنے کروڑ لوگوں کو بھوکے پیٹ سونے بھکری یا فاقہ کشی کا شکار ہونے پر مجبور ہونا پڑے گا؟ وہ نقشہ کتنا دہشت ناک، ہولناک اور دل دہلانے والا ہوگا۔؟

بقیہ: دیہات میں ٹیلی ویژن کے بڑھتے قدم

ٹیلی ویژن پروگراموں میں زیادہ عکاسی نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ اُن پروگراموں میں بھی نہیں ہوتی جو خاص طور پر دیہاتیوں کے لیے ہوتے ہیں۔

ششم: ایک عام آدمی کے نقطۂ نگاہ سے ٹیلی ویژن ابھی تک ایک قیمتی چیز ہے۔ نشریات موصول کرنے والے سیرے پر بنیادی ڈھانچہ فراہم کرنے میں آنے والی بھاری لاگت ایک رکاوٹ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیلی ویژن کی طرف سے دلچسپ پروگرام پیش کئے جانے کے باوجود ریڈیو آج بھی دیہی علاقوں میں موثر اور مقبول عام ہے۔ کوئی بھی کاشتکار اپنے کندھے پر ٹرانزسٹر لٹکا کر اپنے کھیت، جھونپڑی یا بازار میں جا سکتا ہے۔

اور انجام کار دیہی علاقوں میں تفریح کے تصور میں وسیع اور تیز رفتار تبدیلی آرہی ہے۔ وہ فیچر فلموں اور دیگر اعلیٰ تفریحی پروگراموں کو اُسی طرح زیادہ سے زیادہ پسند کرتے ہیں جس طرح شہر کے لوگ کرتے ہیں۔ مثل سند پروگراموں کو (ٹیلی کے ذریعے) اور فلموں کو (نزدیکی قصبوں میں اکثر بار جاکر) مسلسل طور پر دیکھنے سے اُن کے ذوق و شوق اور رُجحان میں بھاری تبدیلی آئی ہے۔

"سافٹ ویئر فار دُور درشن" سے متعلق جوشی ورکنگ گروپ نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے "کرشی درشن جیسے بیشتر ترقیاتی پروگراموں کے بارے میں مصیبت یہ ہے کہ وہ اکثر سٹوڈیو کے اندر دیہی لبادہ میں ملبوس شہری لوگوں کی طرف سے تیار کئے جاتے ہیں۔ یہ اکثر دیہی پروگراموں کا شہری منظر یا شہری رنگ میں رنگے ہوئے دیہات کے مسائل کا منظر ہوتا ہے۔ افلاس کے خلاف لڑنے کے عظیم کام کا خیال کرتے ہوئے ہم سفارش کرتے ہیں کہ دُوردرشن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا نصف سے زیادہ وقت ترقیاتی اور تعلیمی پروگراموں پر صرف کرے۔ ●

بقیہ: بہتر تعلیم، بہتر قوم

تعلیم بالغان میں مدد

تعلیم بالغان کے عظیم کام کو اکیلا محکمہ تعلیم ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔ اس پروگرام کو ایک عوامی پروگرام کے تحت اختیار کرنا ہوگا جس میں دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ سیاسی پارٹیوں، صنعت و تجارت جو ناخواندہ اشخاص کو ملازمت دیتی ہیں، رضاکار اداروں، پڑھے لکھے نوجوانوں، دیہی پنچایتوں اور سماج کو شامل ہونا ہوگا۔

چونکہ مختلف ترقیاتی شعبے تعلیم یافتہ افرادی قوت کا استعمال کر رہے ہیں جو تعلیمی اداروں کی طرف سے تیار کی جاتی ہے اس لیے ان محکموں کی ابتدائی ذمہ داری ہونی چاہیئے کہ وہ اُس مالی اور انتظامی بوجھ کو اُٹھانے میں شریک ہوں جو مطلوبہ افرادی قوت کی تیاری میں اُٹھانا پڑتا ہے، ان محکموں اور ان سرگرمیوں میں مصروف پرائیویٹ سیکٹر کے ساتھ بھی موزوں وابستگی، بحث کے لیے ایک اور اہم معاملہ ہے تاکہ اس سلسلے میں ایک موزوں نظام قائم کیا جائے۔ ●

بقیہ: تعلیم کے بارے میں اندرا گاندھی کے نظریات

گاندھی گرام کے رورل انسٹی ٹیوٹ کے سترہویں جلسۂ تقسیم اسناد میں انھوں نے فرمایا تھا" تعلیم کا مقصد صرف چند جسمانی پیشہ ورانہ اور دماغی مہارتوں میں چمک دمک پیدا کرنا ہی نہیں ہے بلکہ یہ تو ہمہ گیر ترقی کا ایک عمل ہے اور یہ ہمہ گیر ترقی سماجی اور عملی تعلیم سے ہی حاصل ہو سکتی ہے"۔

اسی موقع پر انھوں نے یہ بھی فرمایا تھا۔

" ہمارے سماج کو تقسیم کرنے کے لیے بہت سی دیواریں ہیں۔ انسان مختلف فرقوں، ذاتوں اور پیشوں میں بٹا ہوا ہے۔ تعلیم ان دیواروں کو گرا سکتی ہے لیکن اسی وقت جب تعلیم اور کام کا ربط قائم ہو جائے لیکن صرف اصولی (تھیوری) تعلیم ایک دیوار اور بڑھا دے گی۔ تعلیم کے ساتھ کام کا ربط نوجوانوں کو محنت کش بنا دے گا۔ چاہے ہم اعلیٰ تعلیم یافتہ محنت کش ہوں یا کم تعلیم یافتہ محنت کش"

اب اکیسویں صدی کی آمد آمد ہے اور ترقی کے نئے نئے راستے بنائے جا رہے ہیں۔ تعلیم کے بھی نئے نئے راستے متعین ہونے چاہیئں۔ ہمیں تعلیم کے ذریعے ان تمام مسائل کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہونا چاہیئے جو آئندہ زندگی میں پیش آتے ہیں۔

محترمہ اندرا گاندھی کی دُور بین نگاہیں ایسے ہی مستقبل کو دیکھ رہی تھیں۔ اسی لیے وہ تعلیم میں ایک انقلابی تبدیلی کی خواہاں تھیں۔ یہ ضرور ہے کہ انھیں ملک کے سیاسی اور معاشی حالات نے اتنا مصروف بنا دیا تھا کہ وہ اس طرف اپنی توجہ زیادہ مبذول نہیں کر پائیں۔ پھر بھی ان کا ذہن ملک کی تعلیمی پالیسی کے لیے بالکل صاف تھا۔ وہ تعلیم کے ذریعے علم و عمل میں گہرے ربط کی قائل تھیں۔ اُن کی نظر میں تعلیم نوجوانوں کو آگے بڑھانا اور مستقبل میں آزمائش کو قبول کرنا سکھاتی ہے۔ اُن کو زمانے کا خزانہ عطا کرتی ہے۔ موقع شناس بناتی ہے اور نئے ماحول میں خود کو کارآمد بنانا سکھاتی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے اسپیشل کانووکیشن ۱۹۷۳ء میں انھوں نے تعلیم کے اس پہلو پر ان الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

" جو علم حاصل کیا جائے اس کو زندگی میں استعمال کیا جائے۔ اس علم کے ذریعے زندگی کے مسئلوں کو حل کیا جائے۔ اس کی مدد سے صورت حال کے ساتھ خواہ وہ کتنی ہی نازک اور پیچیدہ کیوں نہ ہو سمجھوتہ کرنا چاہیئے۔ ہاں ایسا کرتے وقت اپنے تمدّنی ورثہ کی حفاظت کا پورے طور پر خیال رکھا جائے۔ ہمیں اپنے دیش کے تہذیبی اور تمدّنی ورثہ پر فخر کرنا چاہیئے"

اندرا گاندھی یقینی طور پر تمدّنی ورثہ کے ساتھ سائنسی اور ٹیکنیکل تعلیم کو بھی بہت ضروری سمجھتی تھیں۔ انسانی تکنیکی قوتوں کی ملک کو بہت ضرورت ہے۔ ملک کی ترقی اور خوشحالی کا دارومدار ہماری تکنیکی صلاحیتوں پر ہے۔ جیسے جیسے آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے پیداواری قوتوں میں اضافہ کی ضرورت بڑھ رہی ہے۔ نظم و نسق کا کام بھی برابر پھیلتا جا رہا ہے۔ ملک کو تکنیکی نوجوانوں کی ضرورت بڑھتی جا رہی ہے۔ اس لیے ہماری تعلیم کو "تعلیم کے ساتھ کام"۔ لیاقت کے ساتھ تجربہ اور مہارت "کی پالیسی اپنانا چاہیئے۔ اس طرح اندرا گاندھی کے خیال میں "تعلیم کو تمام اچھی پرانی قدروں کو قائم رکھتے ہوئے نئی نئی باتوں کو اپنانا چاہیئے"۔ یہ کام ایک منصوبہ اور پلان کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ اسی لیے محترمہ اندرا گاندھی کی نظر میں ملک کے تعلیمی ڈھانچے کو ایک زبردست منصوبہ اور پلان کی ضرورت ہے۔ ●

بقیہ: آواز دے

یونہی خوف ہمارے دلوں میں بیٹھا رہتا۔ اور یہ بھی اچھا ہوا کہ ہم بس ڈرتے رہے۔ کوئی بُرا خیال آتا۔ تو ماسٹر جی کو کیا منہ دکھاتے ؟"

جسبیر بولا۔

" رستہ بھی تو کیسا لمبا ہو گیا تھا۔ کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ انجانے میں ایک دوسرے کو دشمن ہی سمجھ بیٹھے تھے ہم۔ اب پتہ چلا کہ ہم کتنے قریب اور کیسے اپنے تھے ؟"

" دراصل غلطی ہماری ہی ہے پرشوتم "

جسبیر نے گہرے دکھ سے کہا۔

" کیسی غلطی جسبیر ؟"

" یہی کہ ہم نے اپنے آپ پر اعتماد کھو دیا ہے۔ دوسروں کے ہاتھوں کھلونا بن گئے ہیں۔ اپنا بُرا بھلا پہچاننے کی تمیز نہیں رہی۔ اب یہیں دیکھو نا۔ ہم دونوں میں سے کسی نے بھی بات کرنے میں پہل نہ کی، اس کے بجائے۔ اپنی کرپان اور پستول کو ٹٹولتے رہے۔ اور اندر ہی اندر خوف سے کانپتے رہے" ہاں۔ یہ تو ہے۔ میں بھی سوچ رہا ہوں کہ۔ پہلے میں ہی تم کو آواز دے لیتا۔ لیکن "

" اچھا اب سو رہو۔ رات زیادہ آگئی ہے"

اور دونوں نے سر تک کمبل کھینچ لیا۔ ذرا دیر کے بعد۔ دونوں کے پُرسکون خرّاٹے کمرے میں گونجنے لگے۔ ●

تعلیم اور کام کا ربط

شریمتی اندرا گاندھی نے ایک جگہ اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا "ہمارا یہ غریب ملک اتنی بڑی تعداد میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لیکن غیر تربیت یافتہ نوجوانوں کا بوجھ برداشت کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اس لیے تعلیم اگر بے روزگاری پھیلاتی ہے تو ہماری تعلیمی پالیسی میں کوئی بڑا نقص ہے۔ عجیب بات ہے کہ ایک طرف کہا جاتا ہے کہ تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے تو دوسری طرف خصوصی کاموں کے لیے تربیت یافتہ نوجوان دستیاب نہیں ہوتے۔ ہمیں اپنے تعلیمی نظام کے اس نقص کو دور کرنا چاہیے۔"

ایک اور سوال بھی اندرا جی کے ذہن میں بار بار آتا تھا۔ "جب بھی تعلیم کا ذکر ہوتا ہے تو صرف چند فی صدی نوجوانوں کی تعلیم کی بات آتی ہے وہ نوجوان جو اعلیٰ تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ ذہین ہیں اور ہر طرح کے ذرائع رکھتے ہیں"۔ اندرا جی کو اُن نوجوانوں کی تعلیم کی بھی فکر تھی جو غریب، پچھڑے ہوئے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور دُور دراز علاقوں میں زندگی کی جدّوجہد میں لگے ہوئے ہیں۔ انھیں اپنے گھریلو کاموں یا دوسرے چھوٹے موٹے کاموں میں لگا رہنا پڑتا ہے۔ کیا یہ لوگ تعلیم کے مستحق نہیں ہیں؟۔ یہ بھی سوچنا ہے کہ ان کی تعلیم کیسی ہو اور اس کا کیا مقصد ہو سب نہ تو ڈاکٹر بنائے جا سکتے ہیں اور نہ انجینئرز۔ ان کی تعلیم کا مقصد انھیں اپنے پیروں پر کھڑا کرنے میں مدد کرنا اور اُن کی زندگیوں کو بہتر بنانا ہے۔ یہ دونوں باتیں اسی وقت ممکن ہیں جب تعلیم اور کام کا آپس میں ربط قائم ہو۔ اس لیے تعلیم کا ربط ان کاموں اور پیشوں سے ہونا ضروری ہے جو ملک اور سماج کے لیے ضروری ہیں۔ اس لیے محترمہ اندرا گاندھی تعلیم کو صرف مخصوص طبقہ کے لیے مخصوص کرنے کی سخت مخالف تھیں۔ اُن کی نظر میں ... تعلیم کا نظریہ نہ صرف ملک میں سماجی اور نفسیاتی جہات سے خلاف ہوگا بلکہ نئے مسائل کو جنم دے گا۔ ہزاروں سال بعد ہمارے ملک کے پچھڑے اور پسماندہ طبقہ کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے اور محدود نظریۂ تعلیم ان سے یہ موقع چھین لے گا۔

ہمارے بے مقصد تعلیمی ڈھانچے کا دوسرا رُخ یہ بھی ہے کہ ہم نے تعلیم کی ترقی کا مقصد صرف نئے نئے اسکول اور کالج کھولے جانے تک محدود کر دیا ہے۔ پچھلی دو دہائیوں میں ہر جگہ زیادہ سے زیادہ تعلیمی ادارے کھولے گئے۔ ہر قصبہ اور گاؤں کی ترقی کا انحصار صرف وہاں اعلیٰ تعلیمی ادارے کھولے جانے پر رکھا گیا۔ اس کی وجہ سے ہر شخص اپنی تعلیم کا مقصد صرف سارٹیفکیٹ اور ڈگریاں حاصل کرنا سمجھنے لگا ہے۔ تاکہ اس کے ذریعے ملازمت حاصل کر سکے۔ اس سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ تعلیم صرف ملازمت کے لیے ہی ضروری ہے؟ کیا ملازمت کے لیے صرف ڈگریاں یا عام سارٹیفکیٹس ہی ضروری ہوں گے؟" محترمہ اندرا گاندھی کے خیال میں ان دونوں سوالوں کے جوابات نفی میں ملیں گے کیوں کہ اگر ان کے جوابات مثبت میں مانے جائیں تو ہماری تعلیم نہ صرف بے معنی ہو جائے گی بلکہ ملک کے لیے نقصان دہ۔ ایسی پالیسی ایک طرف بے روزگاری کو جنم دے گی تو دوسری طرف نوجوانوں میں بے حسی، بے چینی اور انتشار پیدا کرے گی۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ تعلیم کے لیے اچھے اداروں کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ اچھے اسکول۔ بہتر کالج اور اچھے اعلیٰ تعلیمی ادارے تعلیم کے لیے بڑے معاون ثابت ہوتے ہیں لیکن تعلیم کا صرف کلاس روم تک محدود ہوتی ہے۔ اندرا جی کے خیال میں یہ ایک مسلسل اور پیہم عمل ہے جو ولادت سے آخری سانس تک قائم رہتا ہے۔ ہمارے چاروں طرف جو کچھ ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے ہماری تعلیم کا ایک ذریعہ ہونا چاہیے۔

"دراصل اگر ہم یہ اچھی طرح سیکھ جائیں اور سمجھ جائیں کہ ہمارے چاروں طرف کیا ہو رہا ہے تو ہمیں اس کی اچھائی برائی سمجھ میں آسکتی ہے اور یہی سمجھ بوجھ تعلیم ہے"۔ (گاندھی گرام رورل انسٹی ٹیوٹ کے تیرہویں تقسیم اسناد کے جلسہ میں ۱۵ر جنوری ۱۹۷۳ء) اسی موقع پر تعلیم کے بارے میں اپنی تقریر میں محترمہ اندرا گاندھی نے فرمایا تھا "میں نے بہت سے اسکولوں میں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کی، اُن میں کچھ بہت اچھی درسگاہیں بھی تھیں اور کچھ اتنی اچھی نہیں تھیں لیکن میں بڑی ایمانداری سے کہتی ہوں کہ میں نے جو کچھ تعلیم حاصل کی وہ صرف ان درسگاہوں کے اندر نہیں حاصل کی بلکہ باہر سے حاصل کی۔ ہاں ان درسگاہوں نے مجھے اپنے ماحول سے تعلیم حاصل کرنا سکھایا۔ سوامی ویویکانندجی نے ایک دفعہ کہا تھا "تعلیم وہ نہیں جو ایک شخص حاصل کرتا ہے بلکہ وہ ہے جو وہ بنتا ہے"۔ اس لیے تعلیم کا مقصد صرف اسکولوں اور کالجوں سے سارٹیفکیٹ اور ڈگریاں حاصل کرنا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ زندگی میں سمجھ بوجھ پیدا کر کے اور اپنے آپ کو سماج کے لیے فائدہ مند بنانا ہونا چاہیے۔ اگر صرف ڈگری حاصل کر لی لیکن نہ تو سمجھ بوجھ آئی اور نہ ہی کسی کام کو اچھی طرح کرنے کی اہلیت تو ایسی تعلیم کا کیا مقصد؟۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ڈگریاں اور سارٹیفکیٹ ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ ہم دوسروں سے افضل ہیں اور ہمیں اب جسمانی کام کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ اس طرح صرف ڈگریوں والی تعلیم ہمیں نہ صرف غلط قسم کے احساسِ برتری کا شکار بناتی ہے بلکہ کاہل بھی بنا دیتی ہے۔ اسی لیے مہاتما گاندھی نے بنیادی تعلیم کے ساتھ جسمانی کام پر زور دیا تھا۔ اندرا جی بھی تعلیم میں کام کو بڑی اہمیت دیتی تھیں۔ وہ تو اعلیٰ تعلیم کو بھی کام سے منسلک کرنے کی حامی تھیں۔ اُن کے خیال میں یونیورسٹی کی تعلیم اور کارخانوں میں تال میل ہونا چاہیے۔ اکثر ملکوں میں یہ نظریۂ تعلیم بڑا کامیاب ہو رہا ہے۔

(باقی صفحہ پر)

ممالک میں خاندانی منصوبہ بندی

خاندانی منصوبہ بندی ہمارے وقت کی اہم ترین ضرورت ہے اور ہر ذی شعور اسے اپنانے کے حق میں ہے۔ مسلم ممالک میں بھی بے شمار غیر مسلم ممالک کی تقلید میں سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر خاندانی منصوبہ بندی کو اپنایا گیا۔

ہمارے پڑوسی ملک پاکستان میں کچھ لوگوں کی مخالفت کے باوجود ۱۹۶۰ء میں خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام پر سرکاری سطح پر عمل درآمد شروع ہوگیا تھا۔

ترکی بھی ایک اہم مسلم ملک ہے، وہاں خاندانی منصوبہ بندی پر ۱۹۶۵ء سے عمل شروع ہوگیا تھا۔ پٹرولیم کی دولت سے مالا مال ملک ایران کی معاشی حالت بہت سارے ممالک سے بہتر تھی اس کے باوجود وہاں ترکی سے بھی ایک سال قبل ۱۹۶۴ء میں ہی خاندانی منصوبہ بندی کو اپنا لیا گیا تھا۔

مصر، مراقش، ٹیونس اور ملیشیا نے اس پروگرام کو سن ۱۹۶۶ء سے اپنایا اور اس پر ٹھوس طریقے سے عمل کیا۔

۱۹۶۰ء سے قبل انسانی آبادی میں اضافے کی ویسی طوفانی رفتار نہ تھی جو ۱۹۶۰ء اور اس کے بعد کے برسوں میں رہی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ۱۹۶۰ء سے قبل دنیا میں بڑھتی ہوئی آبادی پر کنٹرول کے لیے اس طرح توجہ نہ دی جا سکی جس طرح سن ۱۹۶۰ء اور اس کے بعد کے برسوں میں دی گئی۔

شرح آبادی میں مسلسل اضافے کا اثر پوری دنیا پر پڑا۔ ظاہر ہے کہ مسلم ممالک بھی اس سے متاثر ہوئے۔ مثلاً انڈونیشیا، نائجیریا اور چاڈ وغیرہ۔

آبادی کے لحاظ سے انڈونیشیا سب سے بڑا مسلم ملک ہے۔ اس ملک میں خاندانی منصوبہ بندی کی طرف بروقت توجہ نہ دی گئی نہ ہی تیز رفتار آبادی کی روک تھام کے لیے منظم مستحکم کوششیں اور تدابیر کی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کی ایک چوتھائی سے بھی زیادہ آبادی کی حالت بے حد خستہ اور ابتر ہے۔ یہاں ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ لوگ ایسے ہیں۔ جنہیں پیٹ بھر کھانا نصیب نہیں ان بدنصیبوں کو کھانا نصیب بھی ہوتا ہے تو آدھا پیٹ۔ ان میں سے بہت سارے لوگوں کو تو آدھا پیٹ کھانا بھی میسر نہیں۔

بھوک مری کے شکار ان لوگوں کو دیکھ کر کسی بھی بیدار مغز انسان کے دل سے یہی بات نکلتی ہے کہ انہیں جب یوں مرنا یا زندہ درگور ہونا تھا تو یہ پیدا ہی نہ ہوتے۔ بس اتنے ہی لوگ جنم لیتے جن کی کفالت بحسن و خوبی ممکن تھی۔

بنگلہ دیش بھی ایک بڑا مسلم دیش ہے، مسلم آبادی کے لحاظ سے دنیا کا دوسرا سب سے بڑا ملک۔ یہاں ۲ کروڑ ۰۰ لاکھ لوگ ایسے ہیں جو یا تو ناقص غذا کے شکار ہیں یا پھر انہیں بھر پیٹ کھانا ہی نصیب نہیں ہوتا۔ نائجیریا افریقی براعظم میں مسلم اکثریت والا ملک ہے یہاں بھی ایک کروڑ ۴۰ لاکھ فاقہ کشی پر مجبور ہیں۔ افریقہ میں ہی واقع ایک اور ملک ہے چاڈ۔ یہاں کا ہر دوسرا آدمی ناقص و ناکافی غذا کے باعث بے موت مرنے پر مجبور ہے۔

دنیا میں ہر روز تقریباً ۳۰ ہزار افراد محض اس وجہ سے مر جاتے ہیں کہ انہیں کھانا میسر نہیں ہوتا۔

دنیا میں ہر منٹ ۲۴ افراد مر جاتے ہیں، ان میں بچوں کی تعداد ہوتی ہے ۱۸۔ وجہ بھوک! ۱۹۸۲ء میں ترقی پذیر ممالک میں ہر روز ۴۰ ہزار بچوں کی موت ہو جاتی تھی۔ خود ہمارے ملک بھارت کی جو صورت حال ہے، اس میں صرف ایک ہی برس ۱۹۸۴ء میں تقریباً ۳۰ لاکھ بچوں کے مر جانے کے خدشے کا اظہار کیا گیا۔ وجہ؟ وہی ناقص و ناکافی غذا!۔

۱۹۸۰ء میں ۹۸ ترقی پذیر ممالک کے دیہی علاقوں کی ایک ارب ۳۴ کروڑ آبادی میں سے نصف سے بھی زیادہ لوگ کنگالی، بدحالی یا انتہائی غربت کی زندگی گزار رہی تھی۔

یہ اور ایسے ہی بہت سارے تلخ حقائق ہیں جن سے مسلم ممالک بھی کم و بیش آگاہ ہیں۔ بڑھتی آبادی کے طوفانی رفتار کے نتائج کتنے بھیانک، ہولناک اور تباہ کن ہو سکتے ہیں، اس کا صحیح احساس اور اندازہ جن جن مسلم ممالک کو ہوا انہوں نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے بروقت اس گر کو سمجھ کر خاندانی منصوبہ بندی میں ذرا سی بھی کوتاہی نہیں برتی۔

دنیا بھر میں ۴۵ ایسے ممالک ہیں جن میں مسلم اکثریت ہے۔ ان ۴۵ ممالک میں شرح اموات انہیں ملکوں کی کم ہے، جن کی شرح پیدائش کم ہے۔ جنہوں نے خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کو اپنانے میں ذرا بھی کوتاہی نہیں برتی، خوشحالی انہیں کے قدم چومتی نظر آئی۔ جنہوں نے اس معاملے میں ڈھیل ڈھال برتی، وہ لازماً زبوں حالی کا شکار ہوئے۔

خاندانی منصوبہ بندی کو گھر گھر میں عام کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ناخواندگی کا خاتمہ کیا جائے اور تعلیم کو عام کیا جائے۔ دنیا میں کروڑوں لوگ ایسے ہیں جو [illegible]

[illegible]

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
[illegible]

یوجنا

۱۶ تا ۳۱ جولائی ۱۹۸۵

ایک روپیہ

سرکاری ملازمتیں ڈگری کی شرط سے مبّرا — مسئلہ کا حل نہیں

(کمل نین کابرا)

معیشت کو نئی حرکت

(ایل. کے. جہا)

ایل. کے. جھا

معیشت کو نئی حرکت

مصنف کا جو ایک نامور ماہر اقتصادیات ہیں، بیان ہے کہ وزیر اعظم نے جو نئی اقتصادی پالیسیاں شروع کی ہیں اُن کا مطلب اُن بنیادی مقاصد سے انحراف نہیں ہے جن کے لیے ملک کافی عرصہ پہلے پابند ہو چکا ہے۔ تاخیری ضابطے اور سست اقتصادی ترقی کے لیے ذمہ دار کنٹرول دُور کئے جا رہے ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ نئی اقتصادی پالیسیوں کا بڑا مقصد سماجی انصاف اور بیرونی امداد پر کم انحصار کے ہمراہ تیز رفتار ترقی ہے۔

حکومت کی نئی اقتصادی پالیسیوں کے بارے میں جو بحث جاری ہے اُس میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن میں سے بعض پُر امید طور پر اور دوسرے رنج کے ساتھ زور دے کر کہتے ہیں کہ وہ منصوبہ بند ترقی کے بنیادی مقاصد سے انحراف کرتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیشتر لوگوں کا یہ یقین معلوم ہوتا ہے کہ کنٹرول منصوبہ بندی کے ستون ہیں۔ آج متعدد کنٹرولوں کو کم یا ختم کیا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں کنٹرولوں کا جو سسٹم ہے اُس کا ارتقاء دوسری عالمی جنگ کے دوران ہوا تھا اور وہ منصوبہ بندی کے سیاق و سباق میں مرتب نہیں کیا گیا تھا۔ شروع شروع میں اس سسٹم نے اچھا کام کیا لیکن آج اس کی وجہ سے صنعتی ترقی کی رفتار سست پڑ گئی ہے۔ یہ سمجھنے کے لیے کہ ایسا کیوں ہوا ہے یہ ضروری ہے کہ ہم اس تاریخی تناظر میں اس کنٹرولی نظام کے ارتقاء کا جائزہ لیں۔

کنٹرول کیونکر عمل میں آئے؟

جب منصوبہ بندی کا آغاز ہوا تو اس امر کو یقینی بنایا گیا کہ سرمایہ جو نہایت ہی قلیل تھا منصوبے کی ترجیحات کے مطابق صنعتوں میں لگایا جائے۔ ضابطہ فوجداری کی کوڈ کی دفعہ ۱۴۴ میں جو اصول کارفرما تھا اس کا اطلاق صنعت پر کیا گیا۔ ایک قانون منظور کیا گیا جس کی رو سے حکومت سے لائسنس حاصل کئے بغیر متعدد کلیدی صنعتوں میں سرمایہ کاری ممنوع قرار دی گئی۔ دراصل اس کا مقصد ایسی سرمایہ کاری کی حوصلہ شکنی کرنا نہیں تھا بلکہ اس امر کا یقین دلانا تھا کہ بعض شعبوں میں وہ بہت زیادہ نہ ہو جائے اور دوسرے شعبوں میں وہ بہت کم نہ رہ جائے۔ نہرو کے دَور میں لائسنس حاصل کرنے کے لیے تین مہینے سے زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔ ایک بار لائسنس منظور ہو جانے پر سرکاری اداروں سے تمام امداد اور سہولیات مزید پوچھ تاچھ کے بغیر دستیاب ہو جاتی تھیں۔

بعد کی دہائیوں میں پیچیدگیاں پیدا ہونے لگیں۔ صنعتی لائسنسوں کی پالیسی دیگر تمام قسم کے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بن گئی۔ اگر ایسے اضلاع تھے جن میں کوئی صنعت نہیں تھی تو ہر لائسنس کے درخواست دہندہ سے کہا جاتا تھا کہ وہ اُن میں سے ایک ضلع میں جائے ورنہ اسے لائسنس نہیں دیا جائے گا۔ پسماندہ اضلاع میں صنعتوں کے لیے زیادہ کشش پیدا کرنے کے لیے کوئی ٹھوس اقدامات نہیں کئے جاتے تھے جو بات فراموش کی جاتی تھی وہ یہ تھی کہ کنٹرول ایک رسی کی مانند ہے، آپ اس کے ساتھ کھینچے جا سکتے ہیں لیکن دھکیلے نہیں جا سکتے۔

مقابلے کی حوصلہ شکنی

جس بات نے معاملات بدتر بنا دئے وہ یہ تھی کہ لائسنسنگ حکام نے ایسی پالیسیوں کی تعمیل شروع کر دی جس سے مقابلہ بازی کو دبا دیا گیا۔ اگر کسی صنعت میں بعض یونٹوں کی صلاحیت بیکار رہتی تھی، کیوں کہ وہ کوالٹی، قیمت یا کسی دوسرے سبب سے اپنی مصنوعات کو فروخت نہیں کر سکتے تھے تو اُن کے مقابلہ بازوں کو اپنی صلاحیت کی توسیع کرنے اور حتیٰ کہ اپنی نصب شدہ صلاحیت سے پیداوار بڑھانے کی بھی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ صنعتی لائسنسنگ کے نقطۂ نگاہ سے اجازت پانے کے بعد ایسی باتوں کی الگ الگ طور پر جانچ پڑتال شروع ہو جاتی جیسے مشینری کی درآمد —— نیز ایم آر ٹی پی ایکٹ (اجارہ داری سے متعلق قانون) اور زر مبادلہ کے تبادلے سے متعلق قانون کے تحت غیر ملکی اشتراک کار کی شرائط

کنٹرولوں اور کنٹرولروں کی بڑھتی ہوئی توسیع کے ساتھ پراجیکٹ کی تعمیل شروع ہو سکنے سے پہلے حکومت سے ضروری اجازت حاصل کرنے میں برسوں لگ جاتے تھے۔ چونکہ کارخانہ قائم کرنے اور پیداوار شروع کرنے میں مزید چند برس لگ جاتے تھے۔ (باقی [illegible] پر)

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

نئی دہلی

اس شمارے میں

چیف ایڈیٹر ٭ آر۔ ٹھکرال
ایڈیٹر ٭ لکھی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر ٭ محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر ٭ وسیم حیدر

جلد ۵ | ۱۶ تا ۳۱ جولائی ۱۹۸۵ | شمارہ ۸

۲۶ جیسٹھ تا ۹ اساڑھ شک ۱۹۰۷ ٹیلیفون نمبر ۶۰۱۸۱۸

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپیہ ۔ ۲ سالہ ۳۵ روپے۔ ۳ سالہ ۵۰ روپے
فی کاپی : ایک روپیہ
طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :۔

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین) نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

بزنس منیجر : ایل۔ آر۔ بترہ ٭ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) : آر۔ ایس۔ منجال

ترسیل زر کا پتہ : بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

ہوابازی کے فن میں ہندوستان کی شاندار پیش رفت

آج کے دَور میں ایوی ایشن (طیارہ اُڑانے کا فن) انتہائی پیچیدہ ہو گیا ہے۔ دَورِ حاضر میں پائلٹ کو انتہائی جدید قسم کے طیارے سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس کے لیے زمینی سہولتوں سے استفادہ کرنا اور اس فن کے آغاز سے قبل اس کی اعلیٰ تربیت و مہارت حاصل کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ خوش قسمتی سے ہندوستان میں یہ تمام سہولتیں میسر ہیں اور یہاں اس موضوع پر مستقل تحقیق کا کام جاری ہے۔ اس عمل سے شہری اور دفاعی ضرورتوں کو پورا کرنے اور جدید ترین پیش رفتوں سے آگاہ ہونے پر برابر زور دیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں ہندوستان ایرونا ٹکس لمیٹڈ کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ یاد رہے کہ یہ ادارہ ۱۹۶۴ میں پبلک سیکٹر کے تحت آ گیا تھا۔ اس کے علاوہ سائنسی اور صنعتی تحقیق کی جو کونسل ۱۹۵۹ میں قائم کی گئی تھی، نیز ۱۹۵۰ میں بھارتی فضائیہ نے جو انسٹی ٹیوٹ آف ایوی ایشن میڈیسن قائم کیا تھا، انھوں نے بھی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ شہری ہوابازی کے محکمے میں تحقیق و ترقی کا جو شعبہ قائم ہے، وہ شہری ہوابازی کے طیاروں کی افادیت اور ان کے ڈیزائن کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ کوشش اس بات کی رہی ہے کہ جہاز میں استعمال میں آنے والے آلات اندرونِ ملک ہی تیار ہو سکیں۔ یہی نہیں بلکہ گلائیڈروں اور تربیتی طیاروں کی تیاری بھی اندرونِ ملک عمل میں لائی گئی ہے۔ ان طیاروں کے ڈیزائن تیار کرنے میں حفاظتی پہلو پر سب سے زیادہ زور رہا ہے۔ اس وقت ملک میں متعدد فلائنگ کلب اور تربیتی ادارے ہوابازی کی تربیت دے رہے ہیں۔ یہ ادارے امرتسر، بنگلور، بھوبنیشور، بمبئی، کلکتہ، کوئمبٹور، گوہاٹی، حصار، حیدرآباد، اندور، جے پور، جمشید پور، جالندھر، کرنال، لکھنؤ، لدھیانہ، مدراس، ناگپور، نئی دلی، پٹیالہ، پٹنہ، رائے پور، تری وندرم اور وڈودرا وغیرہ میں واقع ہیں۔ پونا میں محکمہ جاتی گلائیڈنگ سنٹر اس کے علاوہ ہے۔ ملک کے مختلف مقامات پر گلائیڈنگ کلب واقع ہیں مثلاً آگرہ، پٹنہ، احمدآباد، امرتسر، دیولالی، حصار، جے پور، جالندھر، کانپور، لدھیانہ، نئی دلی، پٹیالہ، پلانی اور رائے پور وغیرہ۔

الہ آباد میں سول ایوی ایشن ٹریننگ سنٹر میں ایک ایروڈروم اسکول اور ایک کمیونی کیشن اسکول کام کر رہے ہیں۔ اس میں ایر ٹریفک کنٹرولروں، ریڈیو آپریٹروں اور تکنیشینوں وغیرہ کی تربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

ہندوستان ایرونا ٹکس لمیٹڈ کی چھ مختلف ریاستوں میں گیارہ فیکٹریاں قائم ہیں۔ ایک کوراپٹ میں اور ایک ناسک میں ہے۔ یہ دونوں مِگ طیاروں کے کمپلکس پر مشتمل ہیں۔ لکھنؤ اور حیدرآباد کی فیکٹریاں معاون پرزے بنانے میں مدد دے رہی ہیں۔ کانپور کی فیکٹری میں ایچ ایس۔ ۷۴۸ طیارہ بن رہا ہے۔ یہیں پر بسنت نامی وہ طیارہ تیار ہو رہا ہے جس سے جراثیم کش دوائیں کھیتوں پر ڈالنے میں مدد لی جاتی ہے۔ ہندوستان ایرونا ٹکس نیٹ Gnat جیٹ طیارے کا بہترین ڈیزائن تیار کرنے میں مصروف ہے اور کئی ایسے طیارے بنائے ہیں جو تربیت دینے کے لیے کارآمد ہیں۔ پچھلے تیس برسوں میں یہ ادارہ جنوب مشرقی ایشیا کا اعلیٰ ترین ادارہ بن چکا ہے۔ اس میں تکنیکی طور پر تربیت یافتہ ۴۰ ہزار سے زیادہ افراد برسرِ روزگار ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ آف ایوی ایشن میڈیسن کی ۱۹۵۰ میں تشکیل دی گئی تھی۔ یہ بھارتی فضائیہ کے میڈیکل افسروں پر مشتمل تھی۔ یہ وہ ڈاکٹر تھے جنھوں نے غیر ملکوں میں تربیت حاصل کی تھی۔ اس کے ذمے پائلٹوں کا طبی معائنہ کرنا تھا۔ اس ادارے کی تحقیقی اور تربیتی سرگرمیاں پہلے کے مقابلے اب کہیں زیادہ ہیں۔

گذشتہ چند برسوں میں ہمارے ملک میں ایرونا ٹکس کے شعبے سے نوجوانوں کی دلچسپی بڑھی ہے۔ چنانچہ جو باتیں کسی دَور میں ناممکن معلوم ہوتی تھیں، وہ آج ممکن بن گئی ہیں۔ بلاشبہ سائنس اور ٹکنالوجی کے بہت سے شعبوں میں تحقیق و ترقی کی بدولت یہ سب کچھ ممکن ہو سکا ہے، لیکن ان سب ترقیاتی پروگراموں میں ایروناٹیکل سائنس کا حصہ کسی سے کم نہیں۔ ہندوستان نے اس شعبے میں جو ترقی کی ہے، وہ کم سے کم وقت میں کی جانے والی ایک ایسی ترقی ہے جس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں، ہندوستانی سائنسدانوں کی شب و روز کی محنت کا ہی نتیجہ ہے کہ صرف دس سال کے مختصر عرصے میں ہندوستان نے زمین کی کشش سے خود کو اوپر اٹھا کر اور اس کی قید سے آزاد ہو کر خلائی دَور میں قدم رکھ لیا ہے۔

(ایڈیٹر)

کمل نین کابرا

سرکاری ملازمتیں ڈگری کی شرط سے مُبرّا۔ مسئلہ کا حل نہیں

سرکاری ملازمتوں کو ڈگریوں کی شرط سے مبرّا کرنے کی تجویز کے بارے میں کافی بحث مباحثہ ہو رہا ہے۔ ذیل کے مضمون میں مصنف نے یہ رائے پیش کی ہے کہ "آئی اے ایس" "آئی ایف ایس" اور "آئی پی ایس" جیسی درجہ اوّل کی سروسوں کے لیے ایسے اقدام کے دُور رس نتائج نکل سکتے ہیں۔ جن لوگوں کو ملک کی ترقی و بہبود سے دلچسپی ہے، انھیں اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔ مسٹر کابرا کی رائے ہے کہ اس سے ملازمتوں میں اضافہ نہیں ہوگا بلکہ نادار کنبوں میں سے نوجوانوں کے انتخاب کے مواقع کم پڑ جائیں گے۔

سرِدست فوری کارروائی کے لیے

ایجنڈے پر جو بیشتر اصلاحات نمایاں طور پر رکھی گئی ہیں، اُن سے تعلیمی نظام میں بعض بنیادی تبدیلیوں کے بارے میں سُنا جا رہا ہے۔ تعلیم کے پیداواری قوتوں کے ساتھ لازمی تعلق پر زور دیتے ہوئے جو تبدیلیاں سرگرمی سے زیرِ غور ہیں وہ ہیں ڈگریوں کو سرکاری ملازمتوں سے الگ کرنا، اعلیٰ تر تعلیم تک بہتر رسائی کے لیے کھلی یونیورسٹی شروع کرنا پیشہ ورانہ تعلیم پر زیادہ زور دینا، ہر ضلع میں ایک سینٹرل اسکول کھول کر ایسے اسکولوں کی توسیع اور قومی میراث اور ثقافت کی جانکاری کے لیے نصاب میں تبدیلیاں نیز اُس میں سے فرقہ وارانہ اور علاقائی نفرت پھیلانے والی باتوں کو نکالنا۔

ان تجاویز کے متعدد عناصر کے بارے میں کافی تفاصیل دستیاب نہیں ہیں۔ لیکن پتہ چلا ہے کہ بعض ماہروں سے کہا گیا ہے کہ وہ ان کی تفاصیل مرتب کریں اور ان اسکیموں کے خدوخال تیار کریں۔

یہ تجاویز وقتاً فوقتاً منظر پر آئی ہیں اور اُن پر کسی حد تک غور کیا گیا ہے۔ خصوصاً ڈگریوں کو سرکاری ملازمتوں سے الگ کرنے کے بارے میں ستّر کی دہائی کے وسط میں اچھی طرح غور کیا گیا تھا۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ اقتصادی نظامتی اصلاحات کمیشن نے اس مطلب کی تجاویز پیش کی ہیں کہ سرکاری ملازمتوں کے لیے انتخاب ۱۰+۲ کے مرحلے پر کیا جائے۔

ڈگریوں کو ملازمت سے الگ کرنے کی تجویز کے سوائے تمام دیگر تجاویز کو کسی حد تک یا کسی صورت میں زیرِ عمل لایا گیا ہے اور وہ کلیتہً نئی نہیں ہیں۔

سرکاری ملازمتوں، خصوصاً چوٹی کی درجہ اوّل کی سروسوں جیسے "آئی اے ایس"، "آئی ایف ایس"، "آئی پی ایس"، "آئی آر ایس" وغیرہ سے (اور غالباً نام نہاد درجہ دوئم کی ملازمتوں سے بھی) ڈگریوں کو الگ کرنے کی تجویز سے دُور رس نتائج نکل سکتے ہیں۔ صرف نئی نسل اور اُن کے والدین کو ہی اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ ہر ایسے شخص کے لیے جو ملک کی ترقی و بہبود سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اعلیٰ تر تعلیم کیوں؟

ڈگریوں کو تعلیم سے الگ کرنے سے کیا کچھ حاصل کرنے کے بارے میں سوچا جا رہا ہے؟ بتایا جاتا ہے کہ ہماری اعلیٰ تر تعلیم اُس بھاری تعداد کے بوجھ تلے دبی جا رہی ہے جو اُس نے پیدا کی ہے اور جس کی ضروریات کو پورا کیا جاتا ہے۔ اعلیٰ تر تعلیمی مرکزوں میں ۳ لاکھ سے کم طلبا کی تعداد ۸۳-۱۹۸۲ء میں تقریباً ۱۰ گنا بڑھ گئی ہے۔ پوسٹ گریجویٹ اور ریسرچ کی سطح پر یونیورسٹی کے داخلے میں بہت بھاری اضافہ ہوا ہے۔ زیادہ تعلیم، زیادہ بدتر تعلیم ہو رہی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اس تعلیم کا کوئی مقصد نہیں اور وہ قومی ترقی کے لیے غیر موزوں ہے۔ اس تحریک کے حامیوں کا بیان ہے کہ اعلیٰ تر تعلیم کی مانگ اس لیے بڑھی ہے اور بڑھ رہی ہے کیونکہ ایڈمنسٹریٹوں، اعلیٰ تر سرکاری ملازمتوں کے لیے یونیورسٹی ڈگری لازمی ہے جو اس وقت بھارتیہ روزگار منڈی میں بہترین تصوّر کی جاتی ہیں۔ اگر ان اعلیٰ ملازمتوں کے حصول کے لیے ڈگریوں کی ضرورت باقی نہ رہے تو بتایا جاتا ہے کہ بہت سے لوگ کالج یا یونیورسٹی میں جانے کا خیال ہی چھوڑ دیں گے۔ چنانچہ وہی اشخاص جو مختلف پیشوں اعلیٰ ریسرچ وغیرہ کو اختیار کرنے کا رُجحان رکھتے ہیں،

یونیورسٹیوں میں جائیں گے بعد یہ توقع کی جاتی ہے کہ تعداد کم ہو جانے سے یونیورسٹیوں میں بہتر سہولیات، معلم متعلم کی بہتر شرح، سیکھنے اور پڑھانے کی عظیم تر تحریک اور ہماری اعلیٰ تر تعلیم کی پیداواری صلاحیت بڑھ جائے گی۔ بنیادی طور پر تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لیے تعداد میں کمی کی حمایت کی جاتی ہے۔ یہ بھی مزید بتایا جاتا ہے کہ چونکہ ڈگری یافتہ اشخاص کی تعداد اس طرح کم ہو جائے گی اس لیے تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی تعداد میں کمی آجائے گی۔ ایک شدید تعصب میں کمی آجائے گی۔ اگر ڈگریوں کی علیحدگی کے ساتھ سیکنڈری تعلیم میں پیشوں کی تربیت دی جائے تو نوجوانوں کو موزوں ہنر حاصل ہو جائیں گے جس سے تعلیم اور پیداواری ذرائع میں رشتے گہرے ہو جائیں گے۔

ڈگریوں کی علیحدگی سے کیا حاصل ہوگا؟

مجوزہ اسکیم کا ایک اور فائدہ یہ ہوگا کہ چونکہ سرکاری افسران چھوٹی عمر میں بھرتی کئے جائیں گے، جس میں وہ زیادہ تاثر قبول کرتے ہیں۔ انھیں ان ضروریات کے مطابق وسیع اور شدید تعلیم و تربیت دی جائے گی جن کا اظہار اُن کی مہارت اور سروسوں کو استعمال کرنے والوں کی طرف سے کیا جاتا ہے اس سے ہمیں بہتر اور قابل بیوروکریسی حاصل ہو سکتی ہے۔ منتخبہ امیدواروں کے علم و ہنر اور ملازمتوں کے لیے درکار ضروریات میں غیر مطابقت کم ہو جائے گی۔ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس سے ایڈمنسٹریشن زیادہ کارگر ہو جائے گا۔

ترقی پرور حقیقت کے لیے اعلیٰ تر تعلیم

ایسے مؤثر معاملے کے لیے گہری پڑتال کی ضرورت ہے مبادا کہ ہم خیالی مفروضات پر مبنی ایک لغو آغاز کریں۔ ایک بات یہ ہے کہ کیا ہماری یونیورسٹیوں اور کالجوں میں طلبا کی تعداد حد سے زیادہ ہے۔ بے حد کل تعداد اور سالانہ شرح ترقی (جو ۶۰ کی دہائی میں ۱۲ فیصد سے کم ہو کر ستر کی دہائی میں تقریباً ۴ فیصد رہ گئی ہے) کے لحاظ سے ہمارے ہاں کالج اور یونیورسٹی طلبا کی واقعی ایک بہت بھاری فوج ہے۔ نوآبادیاتی دور میں اعلیٰ تر تعلیم کو نظر انداز کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ایک دبی ہوئی مانگ ایک ترقی پذیر معیشت کی ضروریات اور بڑھتی ہوئی صنعتی و شہری ترقی کے ساتھ سیاسی تنظیم ابھرتی ہوئی آئی اور ان سب کا مقصد تھا بہتر تعلیم یافتہ افرادی قوت کو تیار کرنا تاکہ تیزی کے ساتھ بڑھ کر سائنسی اور ٹیکنالوجیکل انقلاب کے ساتھ قدم ملا کر چلا جائے۔ اس سے ہمارے اعلیٰ تر تعلیمی اداروں میں طلبا کی تعداد کا بڑھنا قطعی قابل فہم ہے لیکن متعلقہ عمر کے گروپ (۱۷ سے ۲۳ برس) میں تعداد کا تناسب ۱۹۸۱ میں تقریباً ۸.۰ فیصد تھا اور بعد میں یہ بڑھتی ہوئی تعداد رک گئی ہے۔ پرائمری اور سکینڈری طلبا سے کالجی طلبا کا تناسب بہت زیادہ نہیں ہے۔ لہٰذا یہ کہنا مجہولانہ اور گمراہ کن ہے کہ یونیورسٹی طلبا کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس تعداد سے اعلیٰ تر تعلیم کے شعبے میں کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو رہا۔ ہمارے ہاں فی طالب علم کا خرچ قدرے کم ہے۔ گو یہ مختلف ریاستوں اور یونیورسٹیوں میں وسیع طور پر مختلف ہے۔ معلم متعلم کی شرح بھی بہت اچھی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ہاں اعلیٰ تر تعلیم کی توسیع کم لاگت کی ہے کیونکہ اس سیکٹر کو جتنی شرح ترقی کی اجازت دی گئی ہے اُس کے مطابق اسے وسائل مہیا نہیں کئے گئے۔ گریجویٹوں کی تعداد میں اضافہ اُس شرح سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہوا ہے جس پر ہم انھیں روزگار فراہم کر سکتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں گریجویٹ بے روزگاروں کی تعداد بڑھ گئی ہے۔

روزگار کم، گریجویٹ زیادہ

چنانچہ کالجوں میں طلبا کے بڑھتے ہوئے ہجوم کو بہت زیادہ خیال کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس سے سہولیات اور وسائل میں بھاری کمی ہو جاتی ہے۔ (تقریباً ۲۳۰ روپے فی طالب علم) اس کے علاوہ ہم ایک ایسی شرح پر گریجویٹ تیار کرتے ہیں، جو روزگار کے دستیاب مواقع سے کہیں زیادہ ہے۔ پہلے استدلال میں وزن ہو سکتا ہے اگر اعلیٰ تر تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے سے متعلق مواقع ختم ہو چکے ہوتے اور بھاری تعداد سے یہ اصلاحات رک گئی ہوتیں۔ آج بہت کم ایسے لوگ پائے جائیں گے جو یونیورسٹیوں میں جو کچھ سکھایا جائے اس کی موزونیت کی حمایت کر سکیں۔ پیشہ ورں، پیداواری نظام کی ضروریات اور تعلیم کے درمیان عظیم تر تعلق اور بہتر کام کا جواز ڈگریوں کی علیحدگی سے عمل میں نہیں آسکتا جبکہ ڈگریوں کی علیحدگی سے پیشوں کی تربیت پائے ہوئے لوگوں کے لیے روزگار پیدا نہیں ہوگا جو سماجی طور پر مناسب کام کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ طلبا میں علم کو سمونے کی صلاحیت کم ہے کیونکہ سیکنڈری تعلیم کے مرحلے میں خرابی پائی جاتی ہے اور کہنے کا ماحول اور حالات زندگی مفلسی کے باعث اچھے نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ دیگر اسباب ہیں۔ ہماری لسانی پالیسی اور اعلیٰ تر علم کے لیے معیاری درسی کتابوں کی تیاری کی اہلیت کا فقدان نیچرل اور سوشل سائنسوں اور لبرل مضامین میں نقل پن ہوتا ہے اور اُن کا ہمارے حالات، سیاق و سباق، ضروریات اور امنگوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ٹیچر جو خود ایک غیر مؤثر، غیر موزوں اور بے عمل تعلیم کی پیداوار ہیں اور عملی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے لازمی ضروریات سے محروم ہیں، صرف پست معیار کے گریجویٹ پیدا کر سکتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر معیاری تبدیلیوں کے لیے بمشکل زائد اخراجات کی ضرورت ہوگی۔ بے رحمانہ، سوجھ بوجھ سے محروم اور نقل ساز تعلیمی اداروں پر بہت سے تعلیمی اخراجات ضائع کئے جا رہے ہیں۔ محض کم لاگت کی عمارتیں، سامان اور فرنیچر بنا کر روپیہ تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کی پالیسیوں کے لیے پایا جا سکتا ہے۔ خود یونیورسٹیوں کے پھیلاؤ نے روپے کی بربادی ہوئی ہے اور معیار گرا ہے۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ جب بیشتر دوسرے شعبوں (تجارت، صنعت، سیاسیات، ایڈمنسٹریشن اور سماجی رسم و رواج) میں

نمائش و نمود، سامانِ تعیش اور دیگر فضول باتوں پر روپیہ ضائع کیا جا رہا ہے تو تعلیم ان متعدی امراض سے بمشکل بچ سکتی ہے۔ بات یہ ہے کہ اگرچہ مزید روپیہ خرچ کئے بغیر بھاری تعداد کو معیاری تبدیلیوں سے زیادہ بامقصد، بہتر اور موثر تعلیم دی جا سکتی ہے، تاہم کالجوں میں داخلہ پانے والوں کی تعداد میں کمی ہی سے کوئی قابلِ ذکر بہتری تب تک عمل میں نہیں آسکتی جب تک وہ معیاری تبدیلیاں عمل میں نہیں لائی جائیں جو بہت پہلے عمل میں آجانی چاہئے تھیں۔

معیاری تبدیلیوں کی دیرینہ ضرورت

یہ بلاشبہ سچ ہے کہ روزگار اور آمدنی کے مواقع فراہم کئے بغیر اعلیٰ تر اور قیمتی تعلیم دینا روپیہ کی بھاری بربادی ہے اور یہ ہمارے تعلیمی نظام پر ناقابلِ معافی جرم ہے۔ لیکن کیا تعلیم سے روزگار کو فنڈوں کی منتقلی سے کوئی نمایاں فرق پڑ سکتا ہے جب ایک روزگار کے موقع کی تخلیق پر لاگت ایک شخص کو تعلیم دینے والی لاگت سے سو گنا زیادہ ہے کیا طلبا اس لیے قابلِ روزگار ہو جاتے ہیں کیونکہ تعلیم سے باضابطہ طور پر وہ ضرورت سے زیادہ "قابل یا کم قابل" ہو جاتے ہیں۔؟ آخر کار روزگار کے لیے عرصہ انتظار میٹریکولیٹوں کے مقابلے میں گریجویٹوں کے لیے کم تر ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ تر تعلیم کے حصول سے روزگار کا امکان بہتر ہو جاتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اعلیٰ تر تعلیم سے زندگی بھر کمانے کا امکان بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ روزگار کی ایک تقابلی منڈی میں یہ محض مناسب ہے کہ کوئی شخص اعلیٰ تر تعلیم حاصل کرکے اپنے مقابلے کے موقع کو بہتر بنائے۔

روزگار نہیں بڑھے گا

ملازمتوں کو ڈگریوں سے الگ کرنے سے ظاہراً روزگار کی دستیابی میں اضافہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا گریجویٹ بے روزگاری کا بوجھ میٹریکولیٹ بے روزگاری پر آجائے گا اگر ڈگریوں کی علیحدگی سے اعلیٰ تر تعلیم کی نجی مانگ میں واقعی کمی ہو گئی۔ اگرچہ جس حد تک کام کاج کے مواقع کی دستیابی کا پھیلاؤ ہے اس کے مقابلے میں اعلیٰ تر تعلیم کا پھیلاؤ بہت زیادہ ہے۔ تاہم موخرالذکر میں کمی کرنے سے زیادہ فائدہ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ راستہ اختیار کرنے سے روزگار کے مواقع نہیں بڑھ سکتے۔

غریب متاثر ہوں گے

ڈگریوں کی علیحدگی سے ابتدائی انتخاب کی عمر کم ہونے کا امکان ہے۔ اس سے نادار کنبوں، دیہی علاقوں اور کاشتکاری اور دستکاری جیسے پیشوں سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کے انتخاب کے مواقع کم پڑ سکتے ہیں جہاں کنبے میں تعلیمی معیار نسبتاً پست ہے۔ زیادہ آمدنی والوں، اونچا سماجی اور تعلیمی رُتبہ نیز بہتر سماجی تعلقات رکھنے والوں اور شہروں، میٹروپالٹن علاقوں میں رہنے والوں کو اعلیٰ تر سرکاری ملازمتوں تک بہتر رسائی حاصل ہوگی جو نوجوان پڑھائی کے ساتھ کمائی کر کے تعلیم حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں وہ بعد کی عمر میں تقابلی قابلیت حاصل کرتے ہیں، اُن کے لیے مجوزہ ڈگریوں کی علیحدگی سے بیشتر ملازمتوں میں داخلہ مسدود ہو جائے گا۔

تعلیم یافتہ نوجوانوں میں وسیع بے روزگاری کا دردناک مسئلہ جس قدر معیشت، اس کے انتظام اور عمل سے تعلق رکھتا ہے اس قدر تعلیمی نظام سے نہیں رکھتا۔ دستیاب ہُنروں کا فائدہ نہ اٹھا سکنے والی کم ہُنروں والی معیشت اور تعلیمی سرگرمیوں سے ہُنروں کی ناکافی اور غیر موزوں ترقی میں جو تضاد پایا جاتا ہے اس سے ہمارے اقتصادی اور سماجی نظام کی بعض بنیادی کمزوریوں کا پتہ چلتا ہے۔

عوامی بھلائی کے لیے اعلیٰ تر تعلیم

جہاں تک تعلیم کے معیار اور روزگار کے مواقع کی دستیابی کا تعلق ہے ہماری یونیورسٹیوں کی قدر و قیمت کو گرانے والی بھاری تعداد کے نظریہ پر شدید شبہات کا اظہار کرنے کے بعد آؤ! ہم اعلیٰ تر تعلیم کی مانگ کے سوال کی جانب رُخ کریں۔ کیا ہم اعلیٰ تر سرکاری ملازمتوں کے حصول کے لیے یونیورسٹی ڈگری کی ضرورت ختم کر کے اعلیٰ تر تعلیم کی نجی مانگ کو کافی حد تک کم کر سکتے ہیں؟ اعلیٰ تر تعلیم ایک عوامی خوبی ہے جس کی مانگ پرائیویٹ افراد طلبا اور اُن کے والدین کی طرف سے متعدد اسباب سے کی جاتی ہے۔

بہتر امکانات کے لیے

ملازمتوں (ان کے حصول میں آسانی اور ان سے ہونے والے متوقع فوائد کے لحاظ سے) کے امکانات میں بہتری ہونے کے باعث یقیناً اعلیٰ تر تعلیم کی نجی مانگ بہت حد تک بڑھ جاتی ہے۔ محض گریجویٹ کامیاب آئی اے ایف امیدواروں کی تعداد کا تھوڑا سا حصہ ہیں۔ ہر برس محض یونیورسٹی ڈگری پر اصرار کئے بغیر چند ہزار لوگوں کو کل ہند اور ریاستی سطح کی سروسوں میں لے کر کالج تعلیم کی مانگ کے تھوڑے سے حصے کو متاثر کیا جا سکتا ہے۔ کچھ طویل عرصے کے بعد باقیماندہ ڈگریوں سے، البتہ ملازمتوں کے لیے مقابلہ شدید تر ہو سکتا ہے جس سے کالجوں میں داخلے کے لیے رَش بڑھ سکتا ہے۔

ملازمتوں کی خاطر ہی نہیں

ہمارے گریجویٹوں کی ایک بڑی اکثریت درجۂ سوئم میں کامیابی حاصل کرتی ہے اور ناکامی کی شرح بھی بہت اونچی ہے۔ اُن کی پست عالمانہ قابلیت کے باوجود یہ یقین کرنا بہت مشکل ہوگا کہ وہ چوٹی کے درجے کی سرکاری ملازمتوں کے مقابلے میں اپنی محدودیت سے آگاہ نہیں ہیں۔ اگر وہ پھر بھی اعلیٰ تر تعلیم کے پیچھے بھاگتے ہیں تو وہ اعلیٰ تر سرکاری ملازمتوں کے سوائے دیگر ملازمتوں اور دیگر اسباب کے لیے ایسی مساعی کرتے ہیں۔

سماجی رُتبے کے لیے

اسکولی تعلیم پانے والوں کے لیے روزگار کے مواقع کے فقدان، سماجی وقار اور رُتبے (جس میں اعلیٰ تر تعلیم کے باعث سرکاری ملازمتوں اور سہولیات تک رسائی شامل ہے) یونیورسٹی تعلیم کے بعد بعض مستحکم روزگار حاصل کرنے کی اُمنگ، خصوصاً سرکاری امداد کے ساتھ بعض خود روزگار پراجیکٹ کے

... کے نسبتاً بہتر مواقع، بھارتی متوسط طبقے کی تعلیم حاصل کرنے کی قدر و قیمت جو از خود اچھی تصور کی جاتی ہے اور قدر سے اعلیٰ تر تعلیم کے بغیر لڑکیوں سے شادی کرنے میں بہتوں کو پیش آنے والی مشکل بعض ایسے اسباب ہیں جن سے بھی اعلیٰ تر تعلیم کی مانگ بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اعلیٰ تر تعلیم کے حصول پر آنے والی تھوڑی سی نجی لاگت سے بھی اس کے لیے مانگ بڑھ گئی ہے۔ اگر آپ سرکاری ملازمتوں اور ڈگریوں کو الگ الگ کر بھی دیں تو بھی "شادی مارکیٹ" میں سماجی ترجیحات سے اعلیٰ تر تعلیم کی مانگ کو بڑھاوا ملیگا۔ اعلیٰ تر تعلیم (زیادہ تر سندوں کے لیے) کی زیادہ اور بڑھتی ہوئی مانگ سے نپٹنے کے لیے سائنسی افرادی قوت کی منصوبہ بندی، شدید اقتصادی توسیع نیز ہنروں اور سائنسی مزاج کی افزائش کو بڑھاوا دینے کے سلسلے میں تعلیم کے لیے گہری دلچسپی درکار ہے۔

ڈگریوں کی علیحدگی سے پست معیاری

بیشتر دیگر اسباب ڈگریوں کو ملازمتوں سے الگ کرنے کے مجوزہ انتظام کے تحت انتخاب کے معیار پر بُرا اثر ڈال سکتے ہیں۔ جتنی کم عمر میں انتخاب کیا جائے گا اُتنے ہی کسی کے لیے اپنے پیشے کے انتخاب کے پورے معانی کو سمجھنے کے مواقع کم ہوں گے۔ خود احساسی کا دار و مدار بہت حد تک اس امر پر ہے کہ کوئی شخص اپنے مفادات، صلاحیتوں اور رجحانات کو سمجھنے کی کتنی قابلیت رکھتا ہے لیکن چھوٹی عمر میں والدین کا اثر خصوصاً ایسے معاشرے میں ناقابل مزاحمت حد تک غالب ہوتا ہے جس میں باپ کو برتر مقام حاصل ہوتا ہے۔ پس آزمائشی ملازموں کو اپنے پیشوں کے بارے میں زیادہ انتخاب نہیں کرنا ہوگا اور چونکہ اُنھیں کسی دوسرے شعبے میں تربیت حاصل نہیں ہوگی اس لیے بعد کے مرحلے میں اُن کے لیے ملازمت میں کسی دوسری جگہ کے بارے میں انتخاب کرنے کا مشکل زیادہ امکان ہوگا۔

سماجی انصاف کے خلاف: ڈگریوں کی علیحدگی کا

سنگین ترین منفی نتیجہ سماجی انصاف کے لحاظ سے ہوگا۔ ایسا کون ہوگا جو سماج کے مختلف طبقوں، دیہی شہری اور میٹرو پالیٹن علاقوں اور اونچی ذاتوں اور درج فہرست ذاتوں اور قبائل کے لیے ہمارے اسکولوں کی نہایت غیر منصفانہ نوعیت سے آگاہ نہیں ہے؟ اچھے اور زیادہ اچھے کالجوں کے درمیان فرق مختلف قسم کے اسکولوں کے مابین فرق کے مقابلے میں قدرے کم ہے۔ اونچی فیس کی بنا پر کالجوں کے مابین فرق، اگر کہیں ہے تو شاذ و نادر ہے۔ بہتر اور زیادہ قیمتی اسکولوں کے طلبا کی طرف سے اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کی اجارہ داری دیہی و شہری ناداروں اور پسماندہ فرقوں کے مواقع کے لیے قطعی سماجی "ناانصافی" کا باعث ہوگی۔ اس سے قیمتی، برتر، اسکولوں میں داخلے کے لیے "پریمیم" (فیس سے زیادہ رقم) بڑھ جائیگا اور ان اسکولوں میں داخلے میں بڑے پیمانے پر بے قاعدگیاں بڑھ جائیں گی۔

ناداروں کے خلاف

سرکاری افسروں کا سماجی اور کنبہ جاتی پس منظر اُن کی سماجی ہمدردیوں اور عقیدتوں کا تعین کرنے میں رول ادا کرتا ہے۔ خوشحال طبقوں سے آنے والے افسروں پر متوسط اور کم آمدنی والے گروپوں سے آنے والے افسروں کی نسبت سماجی مسائل کا کم ردعمل ہونے کا امکان ہے۔ چنانچہ ڈگریوں کی علیحدگی سے کم عمر کا انتخاب ناداروں کے حق میں اچھا نہیں ہوگا اور وہ ایڈمنسٹریشن کی ہمدردی کا رُخ سماجی انصاف سے موڑ دیگا۔

مساوات کے خلاف

دراصل ڈگریوں کی علیحدگی کی وکالت کرتے ہوئے کسی نے بھی اُن لوگوں کے بارے میں سوالات نہیں پوچھے جو نہ ہی اعلیٰ تر سرکاری ملازمتوں کے لیے منتخب کئے جائیں گے اور نہ ہی یونیورسٹیوں میں داخلہ پائیں گے (کیونکہ ایسا کرنے کی ترغیب مفروضہ طور پر کمزور ہوگی) اور نہ وہ ملازمتیں حاصل کرسکیں گے۔ ڈگریوں کی علیحدگی کی تجویز ان نوجوانوں کے مفادات کا خیال کرکے پیش نہیں کی جارہی۔ تعلیم مساوات لانے والی ایک بڑی قوت ہے اور تعلیمی مواقع پر پابندی سے مساوات کی قوتیں کمزور پڑتی ہیں۔

بے توجیہہ اصلاح

دراصل جزوی اصلاحات اور بلا سوچی سمجھی ہوئی اصلاحات نہایت خطرناک ہوتی ہیں۔ ملازمتوں سے ڈگریوں کی علیحدگی کچھ ایسی ہی تجویز ہے۔ اگرچہ یہ اعلیٰ تر تعلیم کی مانگوں کو جوں کا توں چھوڑ سکتی ہے اس سے اعلیٰ سرکاری افسروں کی "کوالٹی" (معیار) سماجی انصاف اور دنیا میں اچھے مقام کے لیے جد و جہد کرنے والے نوجوانوں کے حوصلوں پر بُرے اثرات مرتب ہوسکتے ہیں۔ یہ ایک مسخ اصلاح ہوگی۔ ایک بے توجیہہ اصلاح ہوگی جو پیداوار کے منافی ہوگی۔ اور ان بیماریوں کو بگاڑ دے گی جن کا علاج کرنا اس کا مقصد ہے۔

بقیہ: تبدیلی

وہاں کھڑے تھے۔ انھوں نے دریافت کیا: "کیا میں اندر آسکتا ہوں"؟

"آپ بھی عجیب آدمی ہیں، آپ کو بھی اجازت لینے کی ضرورت ہے؟" میں نے پکڑ کر انھیں اندر کھینچ لیا۔

"معاف کرنا میں غلطی پر تھا۔ تمھاری اجازت ہو تو میں ہوٹل سے اپنا سامان لے آؤں"؟

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں حیرت زدہ تھی کہ ان میں یہ تبدیلی خود بہ خود کیسے آگئی۔؟

انھوں نے خود وضاحت کی: "ایک دن میں تمھارے اسکول گیا تھا۔ تم اس دن وہاں نہیں تھیں۔ وہاں کے حالات دیکھ کر سچ مچ مجھے اپنے اُوپر غصہ آنے لگا۔ میں سخت نادم ہوں، انھوں نے اعتراف کیا کہ ناداروں، یتیموں اور معذوروں کی مدد سے بڑھ کر کوئی دوسرا اچھا کام نہیں ہوسکتا"۔

*

ویریندر اگروال

سرکاری ملازمتوں سے ڈگریوں کی شرط ہٹا لینا بامقصد ہوگا

جس بیماری نے بھارتی تعلیم کو لڑکھڑا دیا ہے اُس کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے کہا ہے کہ سرکاری ملازمتوں سے ڈگریوں کی شرط ہٹا لینے اور تعلیم کو پیشہ ورانہ اور بامقصد بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ محسوس کیا جارہا ہے کہ سرکاری ملازمتوں کے خواہاں طلبا کا جمع ۲ کے بعد انتخاب کیا جاسکتا ہے اور پھر اُن کی ملازمتوں سے متعلقہ مضامین کے بارے میں خصوصی پیشوں کی اکادمی میں تربیت دی جاسکتی ہے۔

وزیر اعظم راجیو گاندھی کی طرف سے تعلیمی نظام میں اصلاح کرنے کے وعدے کے ساتھ ہی تعلیم کے بارے میں پھر چرچا ہونے لگا ہے۔ جب ہم اُن اور اُن کے افسرانِ اعلا کی طرف سے اس اسکیم کے وا ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ محض مناسب ہے کہ ہم لوگ اُس بیماری کے بارے میں غور کریں جس نے بھارتی تعلیم کو لڑکھڑا دیا ہے۔ یہ موضوع نیا نہیں ہے۔ اور یہ تقریباً ایک صدی سے زیرِ غور ہے تب سے بلاشبہ نئی مشکلات پیدا ہوئی ہیں اور پُرانی مشکلات زیادہ بدتر ہوگئی ہیں۔ مثال کے طور پر تب تعداد اس قدر خوفناک نہیں تھی۔ ہمارے بزرگوں کو کالج اور یونیورسٹی کے مرحلے میں ذریعۂ تعلیم کے بارے میں کوئی تشویش نہیں تھی۔ عوام کی تعداد نسبتاً محدود تھی۔ ٹیچروں کی تنخواہیں قلیل تھیں لیکن معاشرے میں ان کا قیام یقینی تھا اور ان پر دباؤ ڈالا جاسکتا تھا تاکہ وہ اپنے کام میں دلچسپی لیں۔ پیشہ معلمی تنظیمی سرگرمیوں سے ناآشنا تھا۔ وسائل محدود تھے، لیکن وہ بہت زیادہ حد تک ناکافی نہیں تھے۔

کامیابیوں میں کمی

بھارت کے تعلیمی پروگرام کے ہر حصے میں عملاً ایک یا دوسرے سبب سے کامیابیوں میں کمی آ رہی ہے۔ مثال کے طور پر تعلیم کو ملک گیر بنانے کی اسکیم میں یہ مسئلہ پیدا ہوگیا ہے کہ طلبا کی بھاری تعداد اسکولی تعلیم کو ادھورا ہی چھوڑ دیتی ہے اور اس کے نتیجے میں پھر ناخواندگی بڑھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تعلیمی منصوبہ ساز اُن خصوصی سماجی، اقتصادی چنوتیوں کا سامنا کرنے کے لیے بہت کم کوشش کرتے ہیں جو دیہاتی برادری نے پیدا کردی ہیں تعلیمی سروے سے بلاشبہ وہ سماجی اسباب نمایاں ہوئے ہیں جو تعلیمی ترقی کے عوامی سطح پر منفی ردِّعمل کے ذمّہ دار ہیں۔ ان رپورٹوں پر عمل کرنے کے لیے کافی کچھ نہیں کیا جارہا۔ جن اسباب سے طلبا تعلیم ادھوری چھوڑ دیتے ہیں اُنھیں دُور کرنے میں صحیح طور پر کیا مشکلات ہیں؟ سچائی تو یہ ہے کہ سکول اور جمع ۲ کی سطحوں پر جو تعلیم دی جارہی ہے وہ نصاب اور معیار کے لحاظ سے پست ہے۔ اس کی وجہ سے زیادہ تر اُن طلبا کو جو اسکول اور جمع ۲ کے نصابوں کو سیکھ کر آتے ہیں۔ اُنھیں آسانی سے ملازمتیں نہیں ملتیں، اُنکی قابلیت کا معیار آجروں کی توقع سے بہت پست ہوتا ہے۔ اور جُزوی طور پر یہی وجہ ہے کہ یونیورسٹی ڈگری کو اس امر کے باوجود کہ ملازمت اور ڈگری نصاب کا کوئی آپسی تعلق واضح نہیں ہے، پھر بھی اکثر ملازمتوں کے لیے اسے لازمی قرار دے دیا گیا ہے۔

ڈگریوں کے جنون پر قابو پانا

ملازمتوں سے ڈگریوں کو الگ کرنے کی تجویز پر کوئی بحث تب تک لاحاصل رہے گی جب تک مرکزی حکومت بعض بنیادی امور پر غور نہیں کرتی۔ جن کا حل اسکول یا کالج کی استعداد کے اندر نہیں ہے۔ بعض عالموں کی اس رائے میں وزن ہے کہ اسکول یا کالج کا فرض نہیں ہے کہ وہ صنعت یا حکومت کے لیے کوئی بنا بنایا ہنر فراہم کرے۔ جس امر کی یقین دہانی کرنی ہے وہ یہ ہے کہ حکومت یا صنعت کی طرف سے طلبا کو کارخانے یا سرکاری دفتر میں صنعتی زندگی کے حالات سے دوچار کرنے کے لیے انتظامات شروع کیے جائیں اور اُن کی حمایت کی جائے اور ان کے علاوہ وہ متعلقہ تعلیمی سطحوں پر تربیت کے اہتمام میں شرکت کریں۔ جس کے ذریعہ وہ اس طرح فروغ پائے ہوئے ہنروں کو اختیار کرسکیں۔ اس سے تعلیم خود بخود بامقصد ہو جائے گی۔ اگر تعلیم کے معیار میں بہتری کی جائے تو علمی اداروں اور آجروں کے درمیان تبادلوں کے ایک نئے سسٹم کی تنظیم سے ڈگری کے جنون کا یقیناً

علاج ہو جانے گا اور اس کے علاوہ یونیورسٹیوں کو اعلیٰ تعلیم کے ادارے بنانے میں مدد ملے گی۔

ملک گیر تعلیم ابھی دور کا معاملہ

تعلیمی نظام کی اصلاح کرنے سے متعلق کمیٹیوں کی رپورٹوں اور ماہروں کی آرا میں کوئی کمی نہیں ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُن سے کوئی زیادہ فائدہ نہیں پہنچا۔ کیا اس مسئلے کو حل کرنے سے متعلق نئی حکومت کے اعلانیہ عزم سے کوئی نتیجہ نکلے گا۔ ہم اکثر دنیا میں تیسری بڑی سائنسی افرادی قوت ہونے کی بڑ ہانکتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہمارے ہاں سب سے زیادہ ناخواندہ لوگ موجود ہیں۔ سکول سہولیات کی اس طرح توسیع ہوئی ہے کہ تعلیمی ادارے جن کی تعداد ۱۹۴۷ میں ۱۲۵۰۰۰ تھی وہ ۱۹۸۲ میں بڑھ کر ۷۴۰۰۰۰ ہو گئی۔ تمام سطحوں پر داخلہ ۱۴۷ لاکھ سے بڑھ کر ۱۲۰۰ لاکھ ہو گیا۔ لیکن تعلیم کو ملک گیر بنانے کا مقصد ہنوز دور ہے۔ اس حقیقت کے علاوہ کہ ۱۵ فیصد بچے اسکول جاتے ہیں۔ صرف ۱۰۰ میں سے ۴۰ پانچویں جماعت تک پہنچتے ہیں۔ اور آٹھویں تک پہنچتے پہنچتے وہ ۳۰ فیصد رہ جاتے ہیں۔ داخلہ نہ پانے والوں اور تعلیم ادھوری چھوڑنے والوں میں سے بیشتر کمزور طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ دیہاتی لوگ جو کاشتکاری کرتے ہیں اُنھیں اپنے بچوں کو اس قسم کی تعلیم دلانے میں کوئی مقصد دکھائی نہیں دیتا جس سے وہ ہاتھ سے کام کرنے میں عار محسوس کریں گے۔

ہمیں علاقے میں مروّج اقتصادی سرگرمیوں اور دیہی اسکولوں کے نصاب کے درمیان ایک مرئی تعلق اور کام کے اُس ضابطہ اخلاق کے اجرا کے حق میں آواز اٹھانے کی ضرورت ہے جو گاندھی جی نے تعلیم کی مانگ کو تحریک دینے کے لیے پیش کی تھیں۔ شہری علاقوں میں زیادہ اسکول مہیا کرنے کے لیے وسائل دستیاب نہیں ہیں۔ اس لیے پرائیویٹ سیکٹر مانگ اور سپلائی کے فرق کو دور کرتا ہے بلکہ وہ ارزاں تعلیم کے بجائے معیاری تعلیم فراہم کرتا ہے۔

تعلیم کو پیشہ ورانہ بنانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ پیشہ ورانہ نصاب مقبول عام نہیں ہیں کیونکہ وہ حقیر تصور کئے جاتے ہیں۔ اور روزگار منڈی میں ایسے نصابوں کی مانگ کے بارے میں بھی کوئی پیشگوئی نہیں کی جا سکتی۔ اس پروگرام کی ایک بڑی کمزوری ہے سیکنڈری اسکولوں کی طرف سے پیشہ ورانہ نصابوں کی ترتیب و انتظام کے لیے کافی تیاری نہ کرنا۔ ہمیں ایک اچھا نصابی ڈھانچہ مہیا کرنا ہے، اور اس کے ساتھ ہی تعلیمی سرگرمیوں کی حمایت کرنا ہے۔

اعلیٰ تر تعلیم کا منظر

اعلیٰ تر تعلیم کے شعبے میں منظر زیادہ مایوس کُن ہے۔ کالجوں پر دباؤ بڑھ رہا ہے اور یہ اُن سہولیات کے تناسب سے بڑھتا جا رہا ہے جو پیش کی جا سکتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ معیار کو نقصان پہنچا ہے اور کیمپس میں اضطراب پھیل رہا ہے۔ جمع ۲ کے مرحلے کے آگے تقریباً ۳۵ لاکھ طلبا ہیں۔ ملک میں ۱۲۵ سے زیادہ یونیورسٹیاں اور ادارے ہیں جو ڈگریاں دیتے ہیں۔ یونیورسٹیوں کے ساتھ طلبا ۵۰ فیصد نمبر پاتے ہیں۔ یہ ایک وسائل کی بربادی کا نظام ہے جس میں ۸۵ فیصد سے زیادہ طلبا ناکامی کے زمرے میں آتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بیشتر کالج محض "پڑھائی کی دکانیں" بن گئی ہیں۔ اعلیٰ تر تعلیم میں بے لگام توسیع اور خصوصاً کالجی ٹیچروں کی بھرتی ایک مایوس کُن عمل رہا ہے۔ کالجی ٹیچروں کی تعداد ۲۱۱۰۰۰ تک پہنچ گئی ہے اور ہر برس ۶ ہزار ٹیچروں کو بھرتی کیا جاتا ہے۔ اُن کے موزوں انتخاب کی جانب کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔

ملازمت سے ڈگری الگ کرنا

اس پس منظر میں ملازمتوں سے ڈگری کو الگ کرنے کا خیال سوچا گیا ہے۔ یہ محسوس کیا گیا ہے کہ سرکاری ملازمتوں کے خواہشمند طلبا جمع ۲ کے بعد منتخب کئے جا سکتے ہیں اور اُنھیں اُن کاموں سے متعلقہ مضامین کے بارے میں ایک خصوصی پیشہ وروں کی اکادمی میں تربیت دی جا سکتی ہے جن کی انجام دہی اُن کے ذمہ لگائی جائے گی۔ دوسرے پیشہ ورانہ نصابوں کے لیے جن میں بینکوں اور دیگر پبلک سیکٹر اداروں کی بھرتی شامل ہے ایسا ہی دوسرا انتظام کیا جائے۔ اس سے کالجوں پر بوجھ کم کرنے میں مدد ملے گی جو تب اُن طلبا کی ضرورت پوری کر سکتے ہیں جو واقعی ایک علمی یا ریسرچ پر مبنی کیریئر کے حصول میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس سے اُن "پڑھائی کی دکانوں" کی دھڑا دھڑ افزائش بھی رُک جائے گی جو اُن طلبا کو ڈگریاں پیش کرتے ہیں جنھیں وہ ملازمت کے حصول کے لیے درکار ہوتی ہیں۔

ابتدائی تعلیم کی نوعیت

قومی تعلیمی فارمولا (۱۰+۲+۳) کم از کم سرِدست تسلیم شدہ ہے۔ اس وقت بڑی اولیت ملک گیر ابتدائی تعلیم کو دی جا رہی ہے۔ ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہے پرائمری سطح پر موجودہ سٹاف کے فارمولے میں اصلاح کرنے کے لیے دلیرانہ اقدام اور پرائمری سکولوں کے لیے کافی فنڈوں کا جاری کیا جانا۔ تاکہ ٹیچروں، عمارتوں، سازوسامان اور پڑھائی کے سامان میں بہتری لائی جائے۔ دیہی اور پسماندہ علاقے خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ مڈل مرحلے تک تعلیمی ضروریات کو سماجی طور پر پورا کیا جائے۔ اس کا مطلب ہو سکتا ہے "تمام جونیئر اسکول جہاں ایک سے آٹھ تک کلاسیں ہوں اور اس کے بعد ۹ سے ۱۲ کلاسوں تک سینیئر چار سالہ اسکول ہوں جونیئر اسکولوں میں فیس والدین کی آمدنی کے حساب سے وصول کی جائے۔

ٹیچروں کے لیے ضابطۂ اخلاق

ٹیچروں کے لیے ایک ضابطہ اخلاق کی فوری ضرورت ہے کیونکہ سماج اُن سے توقع رکھتا ہے کہ وہ تمام نیکیوں کا مجسمہ ہوں۔ مستند اور تربیت یافتہ تعلیمی ایڈمنسٹریٹروں کی ایک مضبوط جماعت خود ٹیچروں کی برادری ہی میں سے تیار کی جانی چاہیئے سیاسیات کو تعلیمی اداروں سے باہر رکھا جانا ضروری

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

روبی کنٹھ پالیا

بھارت میں سیّاحت کا فروغ

جب سے تہذیب انسانی کا ارتقا ہوا ہے، سیاحت کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ موجود رہی ہے۔ جوشِ مہم جوئی، جوشِ تجسس اور کھوج و دریافت کے ولولے کی تاریخ مقرر نہیں کی جا سکتی۔ جب کولمبس نے ۱۴۹۲ء میں امریکہ کی دریافت کی تھی تو اُس کا جوشِ مہم جوئی اس قدر شدید تھا جس قدر آجکل کے ایک ایسے سیاح کا ہے جو وادی راجگان، اہرامِ مصر، ایورسٹ یا تاج محل کی "دریافت کرنے" کا آرزومند ہے۔ بلاشبہ جسے جو کوئی دیکھنا چاہتا ہے وہاں پہنچنے کے ذرائع سفر و سیاحت بہت زیادہ آسان ہو گئے ہیں۔ لیکن ان کی تہہ میں پائی جانیوالی مہم جوئی کی اسپرٹ ویسی ہی ہے جیسے کہ اُن کی تہہ میں پائے جانے والے خطرات۔ ہر برس کوہ پیماؤں کی ہلاکتوں سے اس کا پتہ چلتا ہے۔

لیکن دوسری عالمی جنگ کے اختتام کے ساتھ ایک نیا مسئلہ پیدا ہوا۔ جنگ سے تباہ شدہ معاشیات اور نو آزاد ملکوں نے خود کو شدید اقتصادی، مالی بحران میں پایا جنہیں درآمدات کی بھاری ضرورت تھی لیکن جن کے پاس اُس کے بدلے میں برآمد کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس پس منظر میں سیاحت کو زرِ مبادلہ کمانے والے ایک اہم وسیلے کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ لہٰذا یہ قدرتی امر ہے کہ سیاحت آمدنی و روزگار پیدا کرنے والا وسیلہ بن گئی اور اس کے نتیجے میں وہ تیز رفتار اقتصادی ترقی کا سبب بن گئی۔

اگرچہ بھارت نے شروع میں اپنی معیشت پر سیاحت کے اثر کو تسلیم کرنے میں سست روی سے کام لیا لیکن اُسے جلد ہی احساس ہو گیا کہ اقتصادی ترقی کے دیگر شعبوں کی مانند سیاحت کی جانب بھی کافی توجہ دیا جانا ضروری ہے۔ چنانچہ چھٹے پانچ سالہ منصوبے کے مسودے میں کہا گیا ہے کہ "ملکی اور غیر ملکی سیاحت کو متعدد سماجی و اقتصادی فوائد کی تخلیقی قوت کے طور پر تیزی سے تسلیم کیا جانے لگا ہے جیسے قومی یکجہتی اور بین الاقوامی مفاہمت کا فروغ، روزگار کے مواقع کی تخلیق، علاقائی عدم توازنوں کا تدارک، اندرونِ ملک میں نئے ترقیاتی مرکزوں کا افتتاح، غیر ملکی زرِ مبادلہ کے وسائل کا بڑھاوا۔ جس سے ادائیگیوں کے توازن کا مسئلہ حل ہوتا ہے۔ اس امر کا تذکرہ بھی برمحل ہے کہ سیاحت کے متعدد سماجی و اقتصادی فوائد نسبتاً کم سرمایہ کاری سے حاصل ہوتے ہیں۔"

دوسری عالمی جنگ کے بعد کے زمانے میں سیاحت ترقی یافتہ اور بعض ترقی پذیر ملکوں میں نہایت تیزی سے بڑھنے والا ایک تجارتی سیکٹر بن گئی ہے۔ ان ملکوں کی طرف سے سیاحت کے ضروری بنیادی ڈھانچے کو فروغ دینے کے لیے مناسب اقدامات کئے جا رہے ہیں۔

بھارت میں سیاحت دوسرے پانچ سالہ منصوبے کے ساتھ ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ روپے کے عطیے سے شروع ہوئی۔ تیسرے پانچ سالہ منصوبے میں اس کے بارے میں احساس بڑھا اور اس کے لیے ۸ کروڑ روپے کا عطیہ دیا گیا۔ ۱۹۶۶-۶۹ کے برسوں میں مندہ آیا اور اس کے بعد چوتھے پانچ سالہ منصوبے (۱۹۶۹-۷۴) میں اُسے پہلی بار بڑا بڑھاوا ملا جب اس کے لیے ۳۶ کروڑ ۶۸ لاکھ روپے کے عطیات دئے گئے۔ اس منصوبے نے سیاحت کے شعبے میں مرکزی حکومت کی براہِ راست شرکت کے دروازے بھی کھول دئے اور اس سلسلے میں بھارتی سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن (آئی ٹی ڈی سی) کا قیام عمل میں آیا، جو اب پبلک سیکٹر کا ایک بڑا ادارہ ہے۔ پانچویں پانچ سالہ منصوبے میں سیاحت کے شعبے میں سرمایہ کاری کا بڑھتا ہوا رجحان جاری رہا۔ اور اس کے لیے ایک ارب ۱۳ کروڑ ۹ لاکھ روپے کے عطیات دئے گئے اور اس کے ساتھ ہی اسے مارکیٹنگ کا ایک نیا تصور دے کر سیاحوں کو منزل تک پہنچانے کا اہتمام کیا گیا۔

پانچواں پانچ سالہ منصوبہ اپنی عام مدت سے ایک برس پہلے ہی ختم ہو گیا اور اس کے بعد دو سالانہ منصوبے عمل میں آئے جن میں مجموعی طور پر ۴۵ کروڑ ۱۹ لاکھ روپے کے عطیات کا اہتمام کیا گیا۔ چھٹے پانچ سالہ منصوبے میں عطیات مزید بڑھا کر ایک ارب ۸۰ کروڑ ۴۶ لاکھ روپے کر دئے گئے اور ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں عطیات ۳ ارب ۴۴ کروڑ ۱۹ لاکھ روپے تک بڑھانے کی تجویز کی گئی ہے۔

کے بجائے پابندی سے کام لیا جاتا ہے۔ ان تبدیلیوں نے گاؤں کی سماجی زندگی کو بہت حد تک بدل ڈالا ہے۔

۲۔ تعلیم کی ایک خاص سطح اور روزگار میں ترقی نے معیار زندگی کو اوپر اٹھانے کے علاوہ نیا سماجی و معاشی ماحول قائم کیا۔

۳۔ (MODERNIZATION) کا اثر مزدور اور ان کی خدمات میں نمایاں ہے۔

۴۔ گاؤں کی روایتی تنہائی ختم ہوئی ہے۔ اور وہ بیرونی دنیا سے مکمل طور پر منسلک ہو چکے ہیں۔ ٹرانسپورٹ، ڈاک سروس، حکومتی و غیر حکومتی ایجنسیوں، اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور دوسری چیزوں نے تنہائی کا احساس ختم کر دیا ہے۔ کئی گاؤں شہروں کی تجارتی زندگی سے بہت اہم بن چکے ہیں کیونکہ شہروں میں بکنے والا مال وہیں سے آتا ہے۔

۵۔ جو گاؤں شہروں کے نزدیک واقع ہیں، وہاں جدیدیت کا عمل زیادہ نمایاں اور گہرا ہے۔

تعلیمی اداروں اور تعلیم کے پھیلاؤ نے ہندوستانی معاشرے میں وسیع پیمانے پر تبدیلی لائی جو مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے صاف ظاہر ہے۔

سال	اسکول میں طلبا کی تعداد
۱۔ ۱۹۵۰-۵۱	ایک کروڑ ۹۴ لاکھ
۲۔ ۱۹۸۳-۸۴	۸ کروڑ ۳۰ لاکھ

اسی مدت میں سیکنڈری سطح پر ۸ لاکھ اور کالج سطح پر ۲۰ لاکھ طلبا زیر تعلیم تھے۔ ہر ریاست میں پرائمری سطح تک اور ریاست جموں و کشمیر میں یونیورسٹی سطح تک تعلیم مفت فراہم کی گئی۔ نئی تعلیم نے نئی نسل میں نئے خیالات و افکار پیدا کئے اور اسے جدید معاشرے اور جدید زندگی کے لیے تیار کیا۔ اس تعلیمی تبدیلی کی وجہ سے بڑوں اور چھوٹوں کے تعلقات، اساتذہ اور طلبا کے تعلقات، اور معاشرے میں طلبا کے رول پر کافی اثر پڑا۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں پر گھریلو گرفت کمزور پڑ گئی اور وہ اپنے ہم عمر گروہ (PEER GROUP) کے زیادہ پابند بنے۔ خاندان سے آزادی نے ایک طرف نوجوانوں میں سوچنے سمجھنے اور کسی پر نکتہ چینی کئے بغیر کام کے آغاز کا مادہ پیدا کیا لیکن دوسری جانب گھریلو اور اخلاقی ذمہ داریوں سے بھی دور کر دیا۔ آزادی کے بعد ہندوستان کا طریقۂ تعلیم ایک جیسا نہیں رہا بلکہ نجی اسکولوں نے اونچے اور سرکاری اسکولوں نے درمیانی درجے کے معیار قائم کئے جس کی وجہ سے سماجی درجہ بندی اور تعلیمی قابلیت میں تفاوت بڑھ گیا۔ مزید اعلیٰ اور متوسط طبقوں سے تعلق رکھنے والے طلبا ہی زیادہ تر کالجوں اور یونیورسٹیوں پر چھائے رہے۔ لیکن نچلے طبقوں کے لوگ بھی تعلیمی میدان میں کسی حد تک آگے بڑھے جس کی وجوہات حکومت کی حوصلہ افزائی، ان کے لیے ریزرویشن کی پالیسی اور ان کی اپنی سعی و جہد ہیں۔

ان ساری سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی تبدیلیوں نے ہندوستان کے معاشرتی ڈھانچے کو بدل دیا۔ خاندان جو پہلے تربیت (SOCIALIZATION) کا واحد ذریعہ تھا۔ یہ حیثیت کھو چکا ہے۔ اب بچوں کی تربیت گھر سے زیادہ اسکول اور سوسائٹی میں ہوتی ہے۔ والدین کے خیالات کے مقابلے میں بچے اسکول اور سوسائٹی کے خیالات کو قبول کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ مشترکہ گھرانے (JOINT FAMILY) جس کا پہلے عام رواج تھا، کی جگہ علیحدہ گھرانے (جن میں خاوند، بیوی اور ان کے اپنے بچے ہوتے ہیں) کا رواج بڑھ گیا۔ یہ عمل زیادہ تر شہروں میں نمایاں ہے۔

ہندوستان کی معاشرتی زندگی میں مغربی تہذیب سرایت کر چکی ہے۔ اعلیٰ طبقہ کے لوگوں نے اسے مکمل طور پر اپنا لیا ہے۔ متوسط طبقے کے لوگ اگرچہ اس تہذیب سے بہت مغلوب ہیں۔ لیکن وہ ہندوستانی تہذیب کو بھی زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے دونوں تہذیبوں میں سمجھوتہ کر کے ایک جدید ہندوستانی تہذیب بنائی ہے۔ نچلے طبقے کے لوگ شہروں میں قدیم و جدید کی کشمکش کے شکار ہیں اور گاؤں میں روایتی تہذیب کے پجاری ہیں۔ اس صورت حال کے پس منظر میں صحیح بات یہ ہے کہ ہندوستانی معاشرہ اگرچہ جدید (MODERNIZE) ہوتا جا رہا ہے، لیکن روایت پرستی ابھی قائم ہے۔ گاؤں کی زندگی ذات پات کے اصولوں کی پابند ہے اور ان اصولوں سے بغاوت کرنے پر سزا ملتی ہے۔ شہری زندگی میں بھی مختلف قسم کی روایات پائی جاتی ہیں۔

ملکی تبدیلی نے سماجی رشتوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ نئے قسم کے رشتے جو پہلے ناپید تھے وجود میں آرہے ہیں۔ مختلف طبقوں اور سماجی ماحول سے آئے ہوئے لوگ کالجوں، یونیورسٹیوں، کانفرنسوں، جلسوں، قومی میلوں اور مذہبی تہواروں پر ملتے رہتے ہیں اور ایک نئی یگانگت میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ایک علاقے کے لوگ دوسرے علاقوں میں جا کر وحدت کا نیا ماحول قائم کرتے ہیں۔

حکومت کی مسلسل کوششوں سے بھی کافی سماجی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ بیماریوں کی پوری روک تھام ہوئی ہے۔ شرح پیدائش میں اضافہ، شرح اموات اور بچوں کی اموات میں خاصی کمی واقع ہوئی ہے۔ تعلیم سب لوگوں تک پہونچی ہے۔ باشندگان ملک کو بغیر کسی تفریق کے بنیادی انسانی حقوق ملے ہیں، اور استحصال کے مختلف طریقوں کو ختم کیا گیا ہے۔

اوپر کی سماجی تبدیلیوں کا جائزہ لینے کے بعد یہی کہا جا سکتا ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستانی معاشرے میں ہمہ جہتی اور ہمہ پہلو تبدیلی واقع ہوئی ہے لیکن یہ تبدیلیاں ابھی ان سب تقاضوں کو پورا نہیں کر سکی ہیں جو جدید سماجی انقلات کے لوازمات ہیں۔ ●

شیام سندر

ملک کی ترقی میں تغذیہ بخش خوراک کی اہمیت

ہندوستان میں ناقص غذاؤں کا مسئلہ کافی بڑے پیمانے پر ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے اس محاذ پر براہِ راست مداخلت کی جاتی رہی ہے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ لیکن اس طرح کے پروگراموں کی کامیابی محدود ہے اور ان پر آنے والی لاگت بہت زیادہ ہے، اسی لیے ملک کے سبھی عوام اُن سے فائدہ نہیں اُٹھا سکے۔ اس مسئلہ کا تعلق ملک کے سماجی اور اقتصادی حالات سے ہے۔ تغذیہ بخش غذاؤں کے براہِ راست پروگراموں سے کچھ جسمانی بیماریوں پر قابو پایا جا سکا ہے۔ جیسا کہ یہاں کی آب و ہوا میں ہونے والی گلہڑ کی بیماری، وٹامن اے کی کمی سے ہونے والی آنکھ کی بیماریاں، خون کی کمی، بچوں کی ناقص غذاؤں کے سبب صحت کی خرابی وغیرہ وغیرہ۔ اس کے لیے محض اقتصادی ترقی بھی ناکافی ہے اور یوں بھی اقتصادی فائدے عام آدمی تک کم ہی پہونچ رہے ہیں۔ ہندوستان میں سبز انقلاب نے اگرچہ ناقص غذاؤں کی کمی دُور کرنے میں نمایاں پارٹ ادا کیا ہے لیکن کسی بھی ترقیاتی پراجیکٹ کے تحت ناقص غذاؤں کا مسئلہ معمولی پیش رفت ہی دکھا سکا ہے۔

ہندوستان میں جن دنوں میں زراعت کا کام تیزی پر ہوتا ہے اور فصل کاٹی یا بوئی جاتی ہے، اُن دنوں میں کھیت پر کام کرنے والی عورتوں کو بچوں کو دودھ پلانے اور اُن کی دیکھ بھال کے لیے کافی وقت نہیں ملتا۔ اس سلسلے میں تحقیقی مطالعے سُود مند ہوں گے، افریقی ملکوں میں اس بارے میں کچھ مفید مطالعے کئے گئے ہیں۔ جن دنوں میں ماؤں پر کام کا بوجھ زیادہ ہوتا ہے، ان دنوں میں بچہ کی صحت اور دیگر ایام میں بچوں کی صحت کے درمیان ایک خاص فرق پایا گیا ہے۔ ماؤں اور بچوں کی ناقص غذاؤں کا ایک بڑا سبب دیہی غریبی ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے دیہی عوام کی آمدنی بڑھانی ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ شعور بھی بیدار ہونا چاہیئے کہ بڑھی ہوئی آمدنی سے بچوں کی صحت پر ہی توجہ دی جائے۔ اکثر ہوتا یہ ہے کہ آمدنی بڑھ جانے پر بھی وہ دوسری مدات پر خرچ کر لی جاتی ہے۔ تھائی لینڈ، میکسیکو اور سوڈان میں اس سلسلے کے مطالعوں سے یہ اندازہ ہوا کہ آمدنی میں اضافے سے بالغوں کی غذا اور ان کے استعمال میں آنیوالے حراروں (کیلوری) میں تو اضافہ ہو جاتا ہے مگر بچے بدستور ناقص غذاؤں اور کیلوری کی کمی کا شکار رہتے ہیں۔ آمدنی بڑھانے کے لیے عورتوں کو گھر سے باہر رہ کر زیادہ کام کرنا ہوگا۔ اس کا مطلب ہے کہ بچوں کی غور و پرداخت میں کمی، لہٰذا آمدنی میں اضافے کے اقدامات کرتے وقت اس طرح کے عناصر پر غور و خوض کرنا ہوگا۔ تغذیہ بخش خوراک کے لیے توسیعی کاموں سے وابستہ عورتیں مفید رول انجام دے سکتی ہیں۔ ہندوستان میں چھ سال سے کم عمر جس قدر بچے مرتے ہیں، اُن کی تقریباً نصف تعداد ناقص غذاؤں اور پوری نیز صحیح خوراک نہ ملنے کے سبب مرتی ہے۔ اس طرح یہ بچے غریبی اور لاشعوری کا شکار ہوتے ہیں۔ یوں تو اس مسئلے کے حل کا تعلق براہِ راست غریبی دُور کرنے سے ہے، تاہم کچھ ایسے طریقِ کار ضرور سامنے آنے چاہئیں جس سے سماج کو بڑے پیمانے پر تغذیہ بخش غذاؤں کی فراہمی کے پروگرام میں شریک کیا جا سکے۔ ناقص غذائیں دراصل دیہات کے اقتصادی، سماجی اور ثقافتی تانے بانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لیے دیہات کے عوام کی پسماندگی کا علاج ضروری ہو جاتا ہے۔ ہمارے ملک کے کئی حصے ایسے ہیں جہاں اصلاحات اراضی کا کام بہت ڈھیلا ہے۔ دیہات میں دوسروں پر انحصار اور دوسروں کے استحصال کا سلسلہ جاری ہے اور ابھی تک بھی بندھوا مزدوری سے پوری طرح نجات نہیں ملی ہے جس کی وجہ سے ایک طبقہ کافی خوشحال ہے جبکہ دوسرا طبقہ جو تعداد میں زیادہ ہے، ناداری کا شکار ہے۔ ایسی صورت میں اس مسئلے کا حل کیا ہو؟ اس کے لیے عملی حل تلاش کرنا بہت ضروری ہے۔ ناقص غذاؤں کے سبب بیماریوں کا شکار ہونے والے بچے اپنے گھروں میں رہ کر ہی ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ اس کام کو ایک تحریک کی صورت میں آگے بڑھانے کی ضرورت ہے تاکہ ماؤں کو تغذیہ بخش خوراک کے بارے میں ضروری معلومات ہوں۔ ایسا نیم طبی عملہ جو گھر گھر جا کر اس بارے میں عورتوں کا شعور بیدار کر سکے، بہت زیادہ کارآمد ہوگا۔ لیکن اس کام کو کرنے کے لیے تربیت یافتہ عملہ بھاری تعداد میں درکار ہوگا۔ سماج میں تغذیہ بخش

غذاؤں کا علم مہیا کرانے والے افراد، معاون نرسیں، دائیاں، صحت کے پروگراموں کی نگرانی کرنے والا عملہ اور اسی طرح کے دیگر بہت سے لوگ اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں عملی تعاون دے سکتے ہیں۔ اگر مناسب اور قوت دینے والی غذائیں باقاعدگی سے فراہم کی جاتی رہیں تو اس سے بچّہ کی صحت پر خوشگوار اثرات مرتب ہوں گے اور وہ بہت سی بیماریوں سے از خود بچ سکے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ خوراک کی کمی پوری کرنے والے اجزا پر مبنی غذا محض بچّے کو ہی نہیں بلکہ اس کی ماں کو بھی ملنی چاہیے۔ متوازن غذا کا نظام دراصل پورے کنبے کے لیے ضروری ہے۔ محض کسی ایک فرد کو متوازن غذا دینا ناکافی ہوگا۔ خوراک کی کمی کے سبب لاحق ہونے والے امراض کچھ دیگر امراض بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسہال اور سانس کی بیماریاں وغیرہ۔ ان کا فوری علاج ضروری ہے۔ عام آدمی ناقص غذاؤں کے سبب پیدا ہونے والے امراض کا پتہ اپنے وزن اور اونچائی سے چلا سکتا ہے۔ بچّوں میں عمر کے لحاظ سے وزن اور وزن کے لحاظ سے اونچائی سے بڑی حد تک یہ پتہ چل سکتا ہے کہ یہ بچّہ تغذیہ بخش خوراک کی کمی کا شکار ہے۔ کچھ ملکوں میں ہر کنبے میں مقررہ مدت کے بعد وزن کرانے کا رواج ہے۔ یہ وزن تو وہ خود اپنے گھر پر کم کر لیتے ہیں یا پھر کسی ایک مقام پر جمع ہو کر وزن کرا لیتے ہیں۔ سماج میں گاہے بگاہے طبی معائنوں کا رواج اس لحاظ سے مفید رہتا ہے کہ اس سے بیماریوں کی ابتدا میں ہی شناخت ہو جاتی ہے۔ حاملہ ماؤں کی طبی دیکھ بھال اور غور و پرداخت تو بہت ہی ضروری ہے۔ تغذیہ بخش غذاؤں کی فراہمی کے پروگرام پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ اس سے متعلق چند ضروری معلومات کی باقاعدگی سے فراہمی بھی سرکار اور سماج کے لیے مفید رہتی ہے۔ مثلاً کم سنی میں مرنے والے بچّوں کی تعداد، بچّوں کی اونچائی اور ان کا وزن، پیدائش کے وقت بچّہ کا وزن، بنیادی خوراک کی اشیاء اور ان کی قیمتیں وغیرہ۔ اس طرح کی معلومات سے امراض کی شناخت میں آسانی ہو جاتی ہے اور ان سے بچنے کے لیے حفاظتی اقدامات کیے جا سکتے ہیں۔

اس طرح کی معلومات کی فراہمی سے قومی سطح پر بچّوں کی صحت سے متعلق پروگرام وضع کیا جا سکتا ہے۔ تغذیہ بخش خوراک دراصل صحت کے پروگرام کا بھی ایک اہم جزو ہے۔ یہ پینے کے پانی کی فراہمی، ماحول کی صفائی اور دیہی علاقوں میں صفائی کی طرح سے ہی ایک اہم پروگرام ہے۔ ریڈیو، ٹی۔ وی، کیسٹ وغیرہ صحت کے پروگراموں اور تغذیہ بخش خوراک کا علم عام کرنے میں موثر کردار ادا کر رہے ہیں۔ لیکن ابھی اس طرح کے پروگراموں کی تعداد بڑھانی ہے۔ اس کام کو صحت، زراعت اور تعلیم تینوں شعبے مل کر موثر ڈھنگ سے کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ان تینوں محکموں میں تال میل کو بڑھانا بہت ضروری ہے۔ ملک میں آج کل بچّوں کی مربوط ترقی کی اسکیم نافذ ہے۔ اس کے تحت بچّوں کے ٹیکہ لگانا، ان کی صحت کی دیکھ بھال، مناسب غذاؤں کی فراہمی اور کنبہ کی منصوبہ بندی، ان سب پروگراموں کو مربوط ڈھنگ سے آگے بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان پروگراموں کو گھر گھر عام کرنے کے لیے تربیت یافتہ عملہ درکار ہے جس کے لیے تربیتی سہولتوں کو عام کرنا بہت اہم ہے اور پہلے سے مامور عملے کے لیے وقتاً فوقتاً ریفریشر کورس درکار ہیں۔

ہندوستان کا شمار ان چند ملکوں میں ہوتا ہے جس نے حصول آزادی کے فوراً بعد صحت کے پروگراموں کو منصوبہ بند طریقے پر آگے بڑھایا۔ ہندوستان میں گزشتہ پینتیس برسوں میں صحت کے پروگراموں کو عام سماجی و اقتصادی ترقی کا ایک ضروری حصّہ قرار دیا گیا۔ ۱۹۵۲ میں اجتماعی ترقی کے پروگرام شروع کیے گئے تھے۔ یہ دیہات کی ہمہ جہت ترقی سے متعلق پروگرام تھا چنانچہ اجتماعی ترقی کے لیے قائم کردہ ہر ایک بلاک میں پرائمری ہیلتھ سنٹر قائم کر دیا گیا تھا۔ اس کے ارد گرد بہت سے ذیلی ہسپتال کھول دیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی صحت کے تحفظ کے لیے احتیاطی تدابیر اور صحت کے مربوط پروگراموں پر خصوصی توجہ دی گئی۔ بیماریوں اور صحت کی خرابی کی روک تھام کے لیے یہ پرائمری ہیلتھ سنٹر ضروری علاج فراہم کرتے ہیں۔

بقیہ: سرکاری ملازمتوں سے ڈگریوں کی شرط ہٹالینا بامقصد ہوگا

ہے اور کسی بھی سیاسی پارٹی کو یہ اجازت نہیں دی جانی چاہیئے کہ وہ اپنے پارٹی مقاصد کے لیے طلبا یا ٹیچروں کا استعمال کرے انھیں خود کو سختی سے غیر سیاسی بنا پر منظّم ہونے کی ضرورت ہے۔ اس نظام کو عمل میں لانے کے لیے عقیدتمندی کی فضا کی ضرورت ہے اور اس میں سے بھی زیادہ ضرورت ہے اچھی تعلیم پر قومی اتفاق رائے کی۔ ایسے بنیادی امور پر زور دینے کی ضرورت ہے جن سے نوعمر نسل کو انسانی شخصیت کو مالا مال کرنے کے لیے معیاری تعلیم مل سکے جو تنہا ہی ہمارے ملک میں جمہوری اداروں کو تقویت دے سکتی ہے۔ تعلیم کی حقیقی اصلاح اس امر میں پائی جاتی ہے کہ اُسے پھر بھارت کی مروجہ جڑوں کے ساتھ وابستہ کیا جائے۔ بھارت ممتاز اور طاقتور دانشورانہ روایات کا وارث ہے۔ لیکن بھارت میں اعلاتر تعلیم کو صحیح سمت اور مقصد حاصل نہ ہونے سے نقصان پہنچ رہا ہے۔ ہماری بعض تعلیم تو اعلیٰ معیار کی ہے جیسا کہ ہمارے میڈیکل اور انجنیئرنگ گریجویٹوں کی طرف سے سمندر پار کے ممالک میں ثابت کیا جا رہا ہے اور ہمارے بہترین طلبا دنیا میں کہیں بھی شاندار کارنامے انجام دے سکتے ہیں۔

ہمیں افرادی قوت کی بہتر منصوبہ بندی اور نصابوں کی گوناگونی کے ذریعے اعلیٰ تعلیم کی اصلاح کی ضرورت ہے تاکہ خصوصی ضروریات کو پورا کیا جا سکے۔ ملازمتوں اور تعلیم کے درمیان رابطہ ضروری ہے۔ اس طرح کے براہِ راست رابطے کے بغیر تعلیمی نظام کامیابی کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ ملازمتوں کی اچھی کارکردگی ہی ضروری سند عطا کر سکتی ہے۔ ہمارے نظام تعلیم میں ایسا کوئی طریقہ نہیں جس سے اس بات کا جائزہ لیا جا سکے کہ زیر تعلیم طلبا کا بہتر مندی اور صلاحیت کا معیار کیا ہے۔

تبدیلی

نغمہ

اِدھر کچھ دنوں سے میں تنہائی اور کم مائیگی کے احساس کا شکار ہو گئی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا گھر کی دیواریں میرے لیے پنجرے کی تیلیاں سی ہو گئی ہیں۔ اگر میں ان میں سے آزاد نہ ہو سکی تو میرا دم گھٹ جائے گا۔

کوئی پچیس سال پہلے میری شادی اسلم سے ہوئی تھی۔ ہماری ازدواجی زندگی خوشگوار تھی اور ہماری دو اولادیں تھیں آفتاب اور شیریں۔ اب دونوں شادی شدہ اور برسرِ روزگار تھے۔ اب وہ ہم سے دور رہتے تھے۔ میں شروع سے ہی اپنے گھر کا کام کاج خود کیا کرتی تھی۔ شوہر کی خوشنودی اور ان کے آرام کا خیال کرنا یا بچوں کی نگہداشت ہی میری زندگی کا اوّلین فرض رہا تھا۔

گھر سے باہر کی دنیا میرے لیے اجنبی تھی اکثر و بیشتر میرے پڑوس میں رہنے والی عورتیں میری گوشہ نشینی کی شکایت کرتیں تو میں ہنس کر ٹال دیتی یا اپنی مشغولیت کا عذر پیش کرتی۔ ادھر میری خواہش ہوتی کہ میں کچھ کروں، لوگوں سے ملوں جلوں۔ ایک دن میں نے اپنے جذبات و خیالات کا اظہار اپنے شوہر سے کیا۔ ویسے یہ کوئی اہم بات نہ تھی نہ میرا انداز باغیانہ تھا لیکن پتہ نہیں اسلم نے کیا سمجھا کہ برس پڑے۔

"رضوانہ! تم ایسی باتیں کیسے سوچتی ہو؟ کیا میں نے تمھیں وہ ساری چیزیں نہیں مہیا کردی ہیں جس کی خواہش کوئی عورت کر سکتی ہے؟ میں آج بھی تم سے اسی قدر محبت کرتا ہوں، دلجوئی کرتا ہوں، تمھاری خواہش کا احترام کرتا ہوں — تمھیں اور کیا چاہیئے؟"

اسلم آفس چلے گئے اور میں اپنے کو لعنت و ملامت کرنے لگی کہ سچ مچ میں احسان فراموش ہوں کہ ان باتوں کا اقرار نہیں کرتی۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اب کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاؤں گی اور ان کے آتے ہی معذرت کروں گی۔ یہ سوچ کر گھر کے کام کاج میں لگ گئی۔ دوپہر ہوتے ہوتے سب کام ختم کر کے بیٹھی تو پھر تنہائی کا احساس ڈسنے لگا۔ اکثر شام کو بھی یہی ہوا کرتا تھا کہ وہ مرزا صاحب کے یہاں شطرنج کھیلنے چلے جاتے یا کسی سے ملنے نکل جاتے اور میں اکیلی اس وسیع و عریض مکان میں بیٹھی ان کا انتظار کرتی رہتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وقت کا کوہِ گراں کیسے کاٹوں؟

ایک دن دوپہر کے بعد میں اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں باہر آئی۔ دروازے پر چند معمر عورتیں کھڑی تھیں۔ میں ان میں کسی کو نہیں جانتی تھی۔ میں نے انھیں اندر آکر بیٹھنے کو کہا اور اس کے بعد ان کے آنے کا مقصد دریافت کیا۔ ایک عورت نے میری جانب ایک کارڈ بڑھایا اور کہنے لگی۔

"ہم لوگوں نے یتیم، نادار اور اپاہج بچوں کے لیے ایک اسکول قائم کیا ہے جہاں بلا تفریق مذہب و ملت اپنے سارے بچوں کو طعام و قیام کے ساتھ تعلیم و تربیت دی جاتی ہے جو اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے ان باتوں سے محروم تھے۔"

میں نے انھیں پچاس روپے دیتے ہوئے کہا "آپ لوگوں کا یہ کام قابلِ صد ستائش ہے۔ خدا کرے آپ لوگ مقصد میں کامیاب ہوں۔"

"بہت بہت شکریہ، لیکن ہمیں صرف مالی تعاون ہی کی ضرورت نہیں بلکہ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ آپ خود کبھی آئیں، اس کا معائنہ کریں اپنے مفید تعمیری مشوروں سے نوازنے کی زحمت گوارہ کریں۔"

شام کے وقت اسلم آئے تو میں نے یہ ساری باتیں ان سے کہہ دیں اور ان کی دعوت کا بھی ذکر کر دیا اور اپنی خواہش کا اظہار بھی کر دیا کہ میں ایک دن ان کا اسکول دیکھنا چاہتی ہوں۔

"یہ سب بکواس ہے۔ وہ تم سے روپے ٹھگ کر لے گئیں۔ اس شہر میں ایسے نام نہاد بہتیرے ادارے ہیں۔ تمھارے جیسے معصوم لوگوں کو فریب دینے کے لیے انھوں نے یہ طریقۂ کار اختیار کیا ہے۔ تم بیکار ان کا اسکول تلاش کرتی پھروگی۔ وہ تو فرضی ہے۔"

مجھے اسلم کی باتیں بالکل اچھی نہیں لگیں "آپ کی عادت ہو گئی ہے کہ دوسروں کو شک کی نظر سے دیکھیں۔ بغیر دیکھے یا جانے کسی کے حق میں کوئی فیصلہ صادر کر دینا — یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

اسلم نے اور بھی برا سا منہ بنا کر کہا "پھر تو بھی میں آتشے کرو۔ لیکن ایک بات غور سے سن لو کہ اس طرح روپے برباد نہ کیا کرو۔"

میں نے آخر کار فیصلہ کر لیا کہ اس آدمی سے

زیادہ بحث و مباحثہ کرنا لاحاصل ہے۔ لیکن میں نے دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ ایک دن ان کا اسکول دیکھنے ضرور جاؤں گی۔ اسلم کے آفس جانے کے بعد میں نے ان کا دیا ہوا کارڈ لیا اور اس جگہ کے لیے چل پڑی۔ اتفاق سے وہ جگہ میرے مکان سے بہت دور نہیں تھی۔

اسکول کے احاطے میں میں جیسے ہی داخل ہوئی ایک عورت تیز تیز چلتی ہوئی میرے پاس آئی۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ اس دن ان عورتوں میں وہ بھی تھی۔ انھوں نے مجھے اسکول کی پرنسپل سے ملایا۔ انھوں نے بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا اور مجھے اسکول کے مختلف کمرے دکھایا۔ میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ تھی کہ سارے بچے تندرست اور خوش نظر آرہے تھے۔ صاف ستھرے اسکول یونیفارم میں بچے درجوں میں بیٹھے لکھنا پڑھنا سیکھ رہے تھے۔ یا کوئی کام سیکھ رہے تھے۔ کمرے صاف ستھرے تھے، فرنیچر قرینے سے سجے تھے۔ نظم و ضبط کا اعلیٰ معیار دیکھنے کو مل رہا تھا۔ قریب دو سو بچے وہاں تھے لیکن کہیں شور و غل کا نام نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر میں بڑی متاثر ہوئی۔ میں نے کچھ بچوں سے باتیں کیں۔ ان کے جواب دینے کے انداز نے مجھ پر جیسے جادو کا کام کیا۔ میرے دل میں خواہش مچلنے لگی کہ میں اپنی فرصت کا کچھ وقت ان کے ساتھ گزاروں۔

میں وہاں سے رخصت ہونے لگی تو میں نے ان کی خوب خوب تعریف کی۔ میری باتیں سن کر پرنسپل صاحبہ نے کہنا شروع کیا۔

"نہیں، نہیں یہ کون سا بڑا کام ہے؟ دراصل ایسے لوگ نہیں مل پاتے جو انھیں اچھی تربیت دے سکیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ ادارہ ان کی محنت کا عوض یا نذرانہ پیش کرنے سے معذور ہے۔ مثلاً ہمارے پاس کوئی ایسا آدمی نہیں جو انھیں سلائی اور بنائی کا کام سکھائے۔ آپ کی واقفیت میں کوئی ایسا ہو جو اس کام کی ذمہ داری لینے کو تیار ہو جائے تو ہم ان کے بہت بہت شکر گزار ہوں گے۔"

میں نے سلائی اور بنائی میں باضابطہ تربیت حاصل کی تھی۔ اور میرے پاس وقت بھی تھا اور پیسوں کی ایسی ضرورت نہیں تھی کہ میرا کام بند ہو رہا ہو۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر میں نے اپنی خدمات انھیں پیش کر دیں۔ انھوں نے بہت بہت شکریہ ادا کیا اور مجھے صدر دروازہ تک رخصت کرنے آئیں۔

گھر آکر مجھے بڑا سکون سا ملا۔ میں نے اسلم سے کہا "آپ کا خیال غلط تھا۔ ایک دن چل کر دیکھ لیجیے کہ ان کا اسکول کیسا ہے؟ سلائی اور بنائی کی ٹیچر ان کے پاس نہیں تھی۔ میں نے اس کام کی ذمہ داری سنبھالنے کی پیش کش کر دی ہے۔"

اسلم نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا: "عجیب شوق ہے! اس میں تضیع اوقات کے سوا اور کیا ہے؟ اگر وہ کچھ معاوضہ دیتیں تو خیر ایک بات ہوتی۔ تمھاری اس خود پسندی کے حق میں میں نہیں ہوں۔"

"آپ جس حق میں ہوں لیکن میں نے ان سے وعدہ کر لیا ہے۔ اور میں اپنے وعدے سے مکر نہیں سکتی۔ میں پچیس برسوں سے آپ کے ایک ایک اشارے پر ناچتی رہی۔ آپ کی ہر خواہش کا احترام کرتی رہی۔ اب گھر میں تنہا بیٹھا رہنا مجھ سے نہیں برداشت ہوتا۔ میں نے یہ کام حصولِ زر کے لیے نہیں کیا ہے۔ یہ خدمتِ خلق ہے۔ مجھے ایسا کام کرنے میں بڑی مسرت ہوگی۔ آپ محض ایک دن ان بچوں کے چہروں کی معصومیت دیکھ لیں تو آپ کو خود بھی ان سے ہمدردی ہو جائے گی۔"

"مجھے تلقین کرنے کا کوئی حاصل نہیں۔ میں تمھارے دکھائے راستہ پر چلنے کے لیے نہیں بنا ہوں میں تمھیں خبردار کر دینا چاہتا ہوں کہ تمھارا یہ شوق تمھیں کافی مہنگا پڑے گا۔" اسلم نے دھمکی دی۔

"کیا مطلب؟" میں نے بھی اسی لہجہ میں پوچھا۔

"مطلب ظاہر ہے۔ میں گھر چھوڑ کر الگ رہنا پسند کروں گا۔" اسلم نے اس بار اور زیادہ اکڑ کر کہا۔

"یہ شوق! آپ بھی اپنی مرضی کے مالک ہیں میں اور زیادہ آپ کا تحکمانہ انداز برداشت نہیں کر سکتی۔ میں آپ کی بیوی ہوں، کوئی لونڈی باندی نہیں!"

میرا جواب ان کے لیے خلافِ توقع تھا وہ اٹھے اور آفس روانہ ہو گئے اور میں دس بجے اسکول کے لیے روانہ ہو گئی۔ میں کئی دنوں تک جاتی رہی۔ نہ انھوں نے اس سلسلے میں کوئی بات کی اور نہ میں نے اس سلسلے میں کچھ کہنا پسند کیا۔ ہمارے بیچ ایک عجیب سرد مہری کی خلیج حائل تھی۔

اس طرح ایک ماہ گزر گیا۔ ایک دن اسلم نے اپنا سامان پیک کرنا شروع کیا۔ میری خواہش ہوئی کہ میں ان سے کچھ دریافت کروں لیکن خاموش رہی۔ سامان پیک کرنے کے بعد انھوں نے اعلان کیا "میں ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

یہ سن کر میرا دل بھر آیا کہ اس عمر میں بھلا اسلم کو کیا سوجھی ہے۔ میں نے کہا: "آپ کیوں جا رہے ہیں۔ یہ گھر آپ کا ہے، آپ رہیے، میں جاتی ہوں۔"

لیکن وہ باہر چلے گئے اور ایک تانگہ پکڑ کر لے آئے اور تانگے والے نے ان کا سامان اٹھا لیا۔ میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں ہاتھ جوڑ کر ان سے آرزو منت کروں اور روک لوں، لیکن میرے باغی ذہن نے میرا دامن کھینچ لیا۔ ہماری زندگی میں یہ پہلا صدمہ تھا، پہلا سانحہ!

اب میں اپنا زیادہ وقت اسکول میں گزارتی کیوں کہ گھر آنے کے بعد تنہائی کا عفریت مجھے دبوچ لیتا۔ کبھی جی میں آتا کہ مستقل طور پر اسکول میں ہی رہوں لیکن پھر سوچتی لوگ دریافت کریں گے تو میں کیا جواب دوں گی؟

اتوار کا دن تھا۔ اسکول سے فرصت تھی۔ میں دوپہر کے وقت اداس بیٹھی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے سمجھا کوئی اسکول سے آیا ہوگا۔ میں نے فوراً دروازہ کھولا اور دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ اسلم

(باقی صفحہ پر)

غزلیں

منصور عثمانی مرادآبادی

میرے احساس کی سرحد سے گزرتے جاؤ
تم تو خوشبو ہو، فضاؤں میں بکھرتے جاؤ

تم کو جانا ہے صداؤں سے بہت دور مگر
میری آواز سنی ہے تو ٹھہرتے جاؤ

آئینہ کچھ بھی سہی، عکس کہاں رکھے گا
آؤ تم میری نگاہوں میں سنورتے جاؤ

میں ہوں وہ نقش جو تا عمر رہے گا دل پر
تم بھی اک گیت ہو ذہنوں میں اُترتے جاؤ

وہ درخت آج کہاں ہے جو کہا کرتا تھا
میرے سائے میں بھی کچھ دیر ٹھہرتے جاؤ

جن سرابوں میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
ان سرابوں سے بھی منصور گزرتے جاؤ

شفاعت فہیم

یہ خوف ہے کہ زمانہ مجھے بھلا دے گا
میں آدمی ہوں مجھے دیوتا بنا دے گا

مری وفا کا صلہ اور کیا بھلا دے گا
پڑا جو وقت تو تو بھی مجھے بھلا دے گا

وہ پوچھتے ہیں کہ اس کی کمر جھکی کیسے
میں پوچھتا ہوں کہاں تک وہ بوجھ لادے گا

مکاں کی شکل رہے یا عجیب سا ہو جائے
وہ بیچوں بیچ میں دیوار تو اٹھا دے گا

یہ نرم پتہ جو گرمی سے پیچ و تاب میں ہے
ذرا سا جھونکا ہوا کا اسے اُڑا دے گا

میں کس کو ڈھونڈنے نکلا تھا کچھ خبر ہی نہیں
مجھے ایسے کھوئے کو کیا کوئی رہنما دے گا

دھرم پال عاقل

فسانہ زمانے میں ہر بات ہو گی
کہ بدلی ہوئی شکلِ حالات ہو گی

جب اُس ماہ رُو سے ملاقات ہو گی
ہر اک رات پھر چاندنی رات ہو گی

غمِ زندگی کو بھی دیکھیں گے، لیکن
ابھی عشقِ جاناں کی ہی بات ہو گی

اب آ ہی گئے ہو تو کچھ دیر بیٹھو!
خدا جانے پھر کب ملاقات ہو گی

نہ پائیں گے جنت، نہ دیکھیں گے حوریں
نہ یہ بات ہو گی نہ وہ بات ہو گی

نظر آسکے گا کیسے تیرا جلوہ
نہ جب تک تری یاد دن رات ہو گی

بغیر اُن کے جب لُطف آئے نہ عاقل
تو کس کام کی ایسی برسات ہو گی

عزمِ نو

ڈاکٹر محمد منشاالرحمٰن خاں منشا

نئی نئی منزلیں نئے نئے ہیں مرحلے
بڑھے چلو بڑھے چلو نوائے عزم کے تلے

ہزار بجلیاں گریں، ہزار آندھیاں چلیں
کسی بھی طور کم نہ ہوں جنونِ دل کے ولولے

نئی فضا نئی ہوا نیا ہے کاروبارِ شوق
نئی نئی ہے جستجو نئے ہوں مشغلے

فروزاں ہر قدم پہ ہوں نئے چراغِ آرزو
جلائے جاؤ ان میں جس قدر بھی خونِ دل جلے

وہ چلچلاتی دھوپ ہو کہ موسموں کی سختیاں
رواں دواں، رواں دواں ہوں تیز گام قافلے

جو اپنی دھن میں مست رہ کے چلتے رہتے ہیں مدام
کبھی وہ جانتے نہیں ہیں فاصلوں کو فاصلے

اُنھیں کو ہوتا ہے نصیب لُطفِ گرمیٔ حیات
دلوں میں جن کے موجزن ہوں گرم گرم حوصلے

پکارے جاتی ہیں ہمیں حیاتِ نَو کی منزلیں
اے منشا اب دراز تر ہوں محنتوں کے سلسلے

قطعات

واحد پریمی

(۱)

حوصلہ بنتا ہے اک روز نشانِ منزل
مشعلِ راہِ طلب عزمِ سفر ہوتا ہے
بعد تکلیف کے راحت ہے یقینی واحد
رات کا آنا ہی پیغامِ سحر ہوتا ہے

(۲)

آلامِ روزگار کے بدلے نشاط کو
افسانۂ حیات کا عنواں بنائیں گے
واحد ہو جس میں امن و مساوات کا پیام
ہم سازِ زندگی پہ وہی نغمہ گائیں گے

(۳)

دلوں میں گر خلوصِ باہمی بیدار ہو جائے
ہر اک غنچہ پھول بن جائے جہاں گلزار ہو جائے
اگر ہو بازوؤں میں قوتِ عزمِ جواں واحد
تو ہر اک موجِ طوفاں بڑھ کے خود پتوار ہو جائے

(۴)

دل میں تم سوزِ محبت کی جلاؤ شمعیں
ہو نہ جائے کہیں تاریک شبستانِ وطن
آؤ ہم عہد کریں مل کے خلوصِ دل سے
مٹنے دیں گے نہ کبھی حُسنِ بہارانِ وطن

بقیہ: معیشت کو نئی حرکت

سرمایہ کاری کی تجاویز کے ٹھوس پن کا وزراء کی نسبت کہیں زیادہ موثر طور پر جائزہ لے سکتے ہیں بلکہ وہ ان ترجیحات کی تعمیل بھی کر سکتے ہیں جو حکومت کی طرف سے ان کے لیے وضع کی جاتی ہیں۔

مالی پالیسیوں میں ترمیم

اس کے علاوہ مالی پالیسیوں کو از سر نو ترمیم کی ضرورت ہوگی۔ اول خاص شعبوں میں سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی یا حوصلہ شکنی کے لیے جیسا ہو سکے دوم، صنعتوں میں پیداواری لاگت کم کرنے کے لیے جو بھاری مشینری بنانے کے سامان اور دیگر ضروری اشیا پر ایکسائز ڈیوٹی اور کسٹم ڈیوٹی میں اضافہ کے باعث یقیناً بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ کم پیداواری لاگت سے نہ صرف قیمتیں کم ہوں گی اور زیادہ مصنوعات کم آمدنی والے لوگوں کو پہنچ میں آ جائیں گی بلکہ وہ برآمدی منڈیوں میں زیادہ مقابلہ کریں گی جس سے معیشت اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکے گی۔ سماجی انصاف یا بیرونی امداد پر کم انحصار کے ہمراہ ہمارے ترقی کے مقاصد کا تیز رفتاری سے حصول اس طرح نئی اقتصادی پالیسیوں کا بڑا مدعا ہو سکتا ہے۔

بقیہ: اردو صحافت پر ایک نظر

شائع ہوتا ہے۔

سرکولیشن کا بیشتر انحصار اخبار کی ہیئت اور صورت پر ہوتا ہے۔ آج قاری بازار سے صرف وہی اخبار خریدتا ہے جس سے اس کے ذوق کی خوب خوب آسودگی ہوتی ہو۔ اردو اخباروں کے گیٹ اپ میں بہتری اور مشمولات کے تنوع میں اضافے کا رجحان تو نظر آتا ہے لیکن متعدد اخبارات کے مندرجات کی تازگی اور جاذبیت محل نظر ہوتی ہے۔ ٹیلی پرنٹر سے کام کرنے والی نیوز ایجنسیوں سے خبروں کی خریداری کر کے اپنے روزناموں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے لیکن اپنے نامہ نگاروں اور بالخصوص کل وقتی نامہ نگاروں سے خبریں فراہم کرنے کے فریضے سے اکثر پہلو تہی کی جاتی ہے۔ بہرحال یہ امر اطمینان بخش ہے کہ ملک کے تقریباً ہر خطے کے روزنامے علاقائی حدود سے نکل کر کل ہند سمتیں دریافت کر رہے ہیں۔ نئی دہلی کے اردو روزناموں کی برتری ختم ہو چکی ہے۔ اور اب پنجاب، حیدرآباد اور بمبئی کے روزنامے سرکولیشن میں ان سے آگے نکل گئے ہیں۔

اس کامیابی کا راز ان اخباروں کی صحافت شناسی، زمانہ آشنائی اور تجارتی اصولوں کی پہچان ہے۔ ہندوستان کی اردو صحافت کو آج ان ہی اوصاف کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ ●

بقیہ: بہار میں صنعت سیاحت کا فروغ

جا کر دنیا کو دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

چہارم، ایسے لوگوں کی تعداد بڑھنے سے جہاں کنبے کے دو افراد کماتے ہیں اور ہر کنبے میں کم بچے ہونے سے لوگوں کی آمدنی صحیح معنوں میں بڑھ گئی ہے۔

مسٹر جب نے اس توقع کا اظہار کیا کہ سیاحوں نے ۱۹۸۱ میں جو ۶۔ ارب ۵ کروڑ روپے خرچ کئے ہیں، اُن سے زرمبادلہ کے محفوظ ذخائر میں ۵۔ ارب ۸۰ کروڑ روپے کا اضافہ ہوگا جس سے سیاحت غالباً نمبر تین کی نہیں بلکہ نمبر ایک کی برآمدی صنعت بن جائے گی۔

یوجنا

۱۵ اگست کا خصوصی شمارہ

اس شمارے میں ان مسائل اور چیلنجوں سے نئے انداز نظر سے نمٹنے کی بات کہی گئی ہے، جو آج ہمارے سامنے موجود ہیں۔ نئے انداز نظر پر افکار و خیالات پیش کرنے والوں میں شامل ہیں، ملک کے نامور مفکر، ادیب اور دانشور جنھوں نے اس بحث کو بامقصد بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ خصوصی شمارہ یکم تا ۱۵ اگست اور ۱۶ تا ۳۱ اگست کے شماروں کو یکجا کر کے مربوط صورت میں قارئین کی نذر کیا جائے گا۔

صنعتی ترقی

اس لیے اس پلان کے دوران چند بڑے پراجیکٹ ہی مکمل ہو پاتے تھے۔ جس میں وہ شروع کیے جاتے تھے۔

یہ سستی پبلک سیکٹر کے پراجیکٹوں میں اس لیے بھی زیادہ بڑھ جاتی تھی۔ کیوں کہ انھیں تعمیلی مرحلے میں بھی جب پلانٹ اور مشینری کے لیے آرڈر دیے جاتے تھے اور جب کارخانے کی تعمیر کا کام ہوتا تھا حکومت سے منظوری حاصل کرنا ضروری ہوتا تھا۔

ایک پلان میں شامل بیشتر پبلک سیکٹر کے پراجیکٹوں میں آئندہ پلان نہیں بلکہ اس کے بعد کے پلان میں پیداوار شروع ہوتی تھی۔

اس کے نتیجے میں صنعتی ترقی کی شرح جو ۱۹۵۰ کی دہائی میں ۴ء۷ فیصد تھی وہ ۱۹۷۰ کی دہائی میں گر کر ۴ء۳ فیصد رہ گئی۔ گو اس عرصے میں سماج میں بچت کی شرح دو گنی سے بڑھ گئی اور سرمایہ جو صنعتی لائسنسنگ کے لیے ضروری تھا اس کی کمی بہت حد تک دور ہوگئی۔

پراجیکٹوں کی تعمیل میں مقررہ سے زیادہ وقت لگنے سے مقررہ سے زیادہ پیداواری لاگت بڑھ گئی۔ قیمتیں لاگت سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھنی شروع ہوئیں کیونکہ صنعتی لائسنسنگ کی سختیوں اور تاخیری عمل سے مانگ ہمیشہ سپلائی سے بڑھ جاتی ہے۔ فروخت کنندگان کی منڈی میں مصنوعات قیمت اور کوالٹی کا لحاظ کیے بغیر فروخت ہو سکتی ہیں۔ صرف برآمدی منڈیوں میں وہ مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ چنانچہ ہماری غیر ملکی تجارت میں خسارہ بہت زیادہ بڑھنا شروع ہوا جسے بیرونی امداد اور قرضوں اور اندرون ملک میں سمندر پار ممالک میں کمانے والے بھارتیوں کی ارسال کردہ رقومات سے پورا کیا جاتا رہا۔

دلیرانہ اقدامات

لہٰذا مرحوم وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے نہ صرف کنٹرول نظام بلکہ مجموعی طور پر اقتصادی نظام کو سرے سے درست کرنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے اقتصادی نظامتی اصلاحات کمیشن (ای اے آر سی) قائم کیا جس کا میں تین برس سے زائد عرصہ سے صدر ہوں۔ لیکن اس کی رپورٹ کا انتظار کیے بغیر بھی انھوں نے متعدد دلیرانہ فیصلے کیے۔ انھوں نے سیمنٹ پر قیمت اور تقسیم کے کنٹرولوں کو کافی نرم کیا۔ اس کے نتیجے میں اس کی چور بازاری اور بدعنوان طور طریقے ختم ہوگئے۔ ملکی پیداوار بڑھ گئی، اور درآمدات غیر ضروری ہوگئیں۔

انھوں نے ۱۹۸۳ کو "پیداواریت کا سال" منانے کا اعلان کیا۔ جس سے نصب شدہ صلاحیت سے پیداوار کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے پر بعض پابندیاں اٹھالی گئیں جو صنعتی لائسنسنگ حکام کی جانب سے نافذ کی گئی تھیں۔ صنعتی ترقی کی شرح میں اضافہ ہوا جو اس سے بھی زیادہ بڑھ جاتا اگر برقی قوت کی کمی نہ ہوتی۔ اگرچہ یہ کہنے میں جلدبازی ہوگی کہ وزیر اعظم جناب راجیو گاندھی نے جو پالیسیاں شروع کی ہیں، لازماً وہی ہیں جو وہ خود بے وقت موت نہ ہونے کی صورت میں عمل میں لاتیں۔ میرے دل میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ جو اقدامات اب کیے جا رہے ہیں، ان کا مطلب ان بنیادی مقاصد میں کوئی تبدیلی نہیں ہے جن کے تئیں ملک نے خود کو سماج کے لیے سوشلسٹ ڈھانچے کا انتخاب کر کے پابند کیا ہے۔ انتخابات کے بعد برسر اقتدار آنے کے چند روز کے اندر ہی وزیر اعظم راجیو گاندھی نے اعلان کیا۔

"ہم چند مہینوں میں ساتواں منصوبہ شروع کریں گے۔ ہمارے پرانے دشمنوں، افلاس، بے روزگاری، بیماری اور جہالت کے خلاف ہماری جنگ جاری ہے۔ آنے والے مہینوں میں ہم اس امر کی یقینی دہانی کے لیے اپنی موجودہ پالیسیوں اور پروگراموں پر نظرثانی کریں گے کہ انصاف پر مبنی ہمارے ترقی کے بنیادی مقاصد مقررہ وقت کے اندر پورے ہو جاتے ہیں۔"

اب زود رفتار پر دیا جا رہا ہے۔ تاخیری ضابطے اور ان کے لیے ذمہ دار کنٹرول ختم کیے جا رہے ہیں۔

مقابلہ بازی کی ضرورت

ہماری آبادی دس لاکھ ماہانہ سے زیادہ کی شرح پر بڑھنے کے ساتھ وقت ایک ایسا وسیلہ ہے جس کی ہمیں بہت زیادہ کمی ہے جسے ہم محض ضائع کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے جو صنعتیں قومی طور پر اہم خیال کی جاتی ہیں، ان میں سرمایہ کاری کے لیے اب متعدد امور سے متعلق سرکاری منظوری کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ جو لوگ کام کے نگراں ہیں، وہ کام کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ البتہ ان کے ماتحت کام کرنے والے ہی کام کے ماہر ہوتے ہیں۔ کسی کو یہ یقین نہیں کرنا چاہیے کہ ہم عدم مداخلت کی معیشت کی جانب واپس جا رہے ہیں۔ اگرچہ صنعت کو کنٹرولوں سے زیادہ آزادی حاصل ہوگی، تاہم اسے اندرونی اور بیرونی مقابلے سے آزادی نہیں ملے گی۔

کاروبار کو پہل کاریاں کرنے کی آزادی دینے اور انھیں مقابلہ بازی کی قوتوں کے تابع رکھنے کی اہمیت کو ان ملکوں نے بھی تسلیم کیا ہے جہاں پیداوار کے ذرائع "کلیتہً" مملکت کے کنٹرول میں ہیں۔

بھارت میں جہاں بڑا پرائیویٹ سیکٹر ہماری ملی جلی معیشت کا جزو لاینفک ہے بعض کنٹرولوں کا ہونا ضروری ہے تاکہ پلان کی ترجیحات کے ساتھ مطابقت یقینی ہو چونکہ تقریباً تمام بڑے بڑے پراجیکٹوں کو مالی اداروں سے امداد کی ضرورت ہے جو پبلک سیکٹر میں ہیں وہ نہ صرف

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

Regd. No. D(DN) 204
R.N. 3/052/81
Licensed U(DN) 55 to post without pre-payment
at Civil Lines Post Office, Delhi-110 054
Vol. 5 No. 8 YOJANA URDU 16-31 July 1985

جی۔ ڈی چندن

اُردو صحافت پر ایک نظر

آج ہر صبح ملک کے کم از کم سات لاکھ ۳۶ ہزار لوگوں کے ہاتھوں میں اُردو کا کوئی نہ کوئی روزنامہ ہوتا ہے۔ ان روزناموں کی کُل تعداد ۱۳۴ ہے۔ اس تعداد کی بدولت آج ہندوستان کی اُردو صحافت مختلف زبانوں کے روزناموں کے لحاظ سے ہندی کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ لیکن اپنے تمام اخباروں اور جریدوں کے لحاظ سے یہ ملک کی سولہ بڑی زبانوں میں ہندی، انگریزی اور بنگالی کے بعد چوتھے نمبر پر ہے۔

ان حقائق کا انکشاف پریس رجسٹرار کی تازہ ترین سالانہ رپورٹ میں ہوا ہے جس میں ۱۹۸۲ کے اعداد دیئے گئے ہیں اور جو حال ہی میں پارلیمنٹ میں پیش کی گئی۔

اس رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۱ کے مقابلے میں ہندوستان کے اُردو اخباروں کی مجموعی تعداد ۱۲۹۹ سے بڑھ کر ۱۳۳۰، اور مجموعی اشاعت ۲۲ لاکھ ۵۴ ہزار سے بڑھ کر ۲۲ لاکھ ۶۹ ہزار ہوگئی۔

۲۵ سال پہلے، ۱۹۵۷ میں جب پریس رجسٹرار کی اوّلین مکمل سالانہ رپورٹ شائع ہوئی تھی تو اُردو اخباروں کی کُل تعداد ۵۱۳، اور مجموعی اشاعت سات لاکھ ۴۸ ہزار تھی۔ آج ان دونوں شعبوں میں تقریباً تین تین گنا اضافہ ہو چکا ہے۔

اپنی تعداد کے اعتبار سے آج اُردو کو ملک کی ان پانچ زبانوں میں شامل ہونے کا شرف بھی حاصل ہے جن کے اخباروں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے۔ یہ ہندوستان کی اُن چھ ممتاز زبانوں میں بھی شامل ہے جن میں ایک سو سے زیادہ روزنامے ہیں، ان کے علاوہ اُردو میں ۶۵۴ ہفت روزہ، ۱۸۸ پندرہ روزہ جریدے، ۳۰۷ ماہ نامے اور ۴۱ دیگر رسائل ہیں۔

ملک کے چاروں میٹروپالیٹن شہروں یعنی بمبئی، کلکتہ، دہلی اور مدراس سے اُردو کے اخبار، جن میں ممتاز روزنامے بھی شامل ہیں، چھپتے ہیں۔ دراصل اُردو پریس سارے ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے۔ ملک کی ۱۴ ریاستوں اور دو یونین علاقوں سے اُردو کے اخبارات شائع ہوتے ہیں۔

ان ریاستوں میں اتر پردیش سرِ فہرست ہے جس کے اخباروں اور جریدوں کی کُل تعداد ۲۵۵ تھی۔ اس کے بعد پانچ اور ایسی ریاستیں تھیں جن سے ایک سو سے زیادہ اخبار چھپ رہے تھے۔ ان میں آندھرا پردیش سے ۲۵۴، دہلی سے ۲۱۶، مہاراشٹر سے ۱۳۳، جموں و کشمیر سے ۱۲۷، اور پنجاب سے ۱۰۴، اخبارات چھپ رہے تھے۔

ان ریاستوں میں جموں و کشمیر کی اُردو صحافت نے زبردست ترقی کی ہے۔ ۱۹۶۵ میں، جب وہاں اخبار شماری کا باضابطہ سلسلہ شروع ہوا، اس کے اردو اخباروں کی کُل تعداد صرف ۴۲ تھی آج اس میں تین گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ روزناموں کے لحاظ سے یہ ملک کی پوری اُردو صحافت میں سرِ فہرست ہے۔ ۱۹۸۲ میں ان روزناموں کی تعداد ۲۲ تھی۔

اگرچہ اپنی عددی طاقت کے لحاظ سے اُردو صحافت ملک کی مجموعی صحافت میں چوتھے نمبر پر ہے۔ تاہم اپنے سرکولیشن کے اعتبار سے اس کا نمبر آٹھواں ہے۔ اس میں صرف تین ایسے اخبار یا جریدے تھے جن کا شمار سرکولیشن کے بڑے زمرے یعنی ۵۰ ہزار سے زیادہ چھپنے والوں میں ہو سکتا تھا۔ صرف ۱۳، ایسے اخبار یا جریدے تھے جن کا شمار درمیانہ زمرے یعنی پندرہ ہزار سے ۵۰ ہزار کے درمیان چھپنے والوں میں ہو سکتا تھا۔ باقی سب یعنی ۱۲۱۴ چھوٹے اخباروں کے زمرے میں شامل تھے یعنی فی اشاعت پندرہ ہزار سے کم چھپتے تھے۔ ان میں سے بھی بہت سارے دو ہزار سے بھی کم چھپتے تھے۔

لیکن یہ اندازہ سرکولیشن کے ان اعداد پر مبنی ہے جو اخباروں کے ناشروں نے پریس رجسٹرار کو مہیا کیے۔ ۱۹۸۲ میں ان کی تعداد ۵۳۵ تھی یعنی نصف سے زیادہ اُردو اخباروں نے جن کی تعداد ۷۹۵ بنتی ہے، سرکولیشن کے بارے میں اپنی تفصیلات مہیا ہی نہیں کیں۔

بہرحال دستیاب اعداد کی بنا پر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو اخباروں کا مجموعی سرکولیشن معرکہ آرا نہیں ہے۔

اندازہ ہے کہ ملک میں اُردو کو اپنی مادری زبان تسلیم کرنے والوں کی تعداد تقریباً ساڑھے تین کروڑ ہے لیکن اُردو سمجھنے اور بولنے والوں کی تعداد اس سے بہت زیادہ ہے۔ اس تعداد کی ضرورت اور طلب اُردو پریس کے ۲۲ لاکھ ۶۹ ہزار کے موجودہ مجموعی سرکولیشن سے بہت زیادہ ہونی چاہئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اخبار خرید کر پڑھنے کی بجائے اسے مانگ کر پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

مزید تعجب کی بات یہ ہے کہ اُردو کے ۱۳۴، روزناموں کی اشاعت صرف سات لاکھ ۳۶ ہزار ہے۔ ان میں سے بھی تقریباً ایک تہائی حصہ ان نو روزناموں کے حصے میں چلا جاتا ہے جو سرکولیشن کے بڑے یا درمیانہ زمرے میں شامل ہیں۔ ان نو روزناموں میں بھی صرف ایک ایسا اخبار ہے جس کی روزانہ اشاعت ۵۰ ہزار سے زیادہ ہے۔ یہ اخبار جو حصولِ آزادی کے بعد ۱۹۴۸ میں شروع ہوا پنجاب کے شہر جالندھر سے

(باقی صفحہ پر)

خصوصی شمارہ ۱۵ اگست

جلد ۵
شمارہ ۹، ۱۰

قیمت
۲ روپے

یوجنا

بیہودگی آخر کب تک

مذہب پر لگام

رومیش تھاپر
ہیرین مکرجی
جسٹس وی۔ آر کرشنا آئر
عرفان حبیب
خواجہ احمد عباس

جذبۂ انسانیت کا فروغ

پی۔ این۔ ہکسر
وسنت ساٹھے
یش پال
جمال قدوائی
موہت سین
پی۔ سی۔ جوشی

تعلیم کا نیا ڈھانچہ

پی۔ ایم۔ بھارگو
مالکم ایس آدی سیشیہ
رئیس احمد
کے۔ این۔ کابرا

ذرائع نشر و اشاعت کا استعمال

نکھل چکرورتی
خشونت سنگھ
این۔ سی۔ مینن
پی۔ سی۔ چٹرجی

سرکار کے زیرِ اہتمام نشر و اشاعت کے اداروں کا جہاں تک تعلق ہے، تقریباً انھیں اپنے جواز کے لیے زندگی اور تخلیقی صلاحیتوں کا ثبوت دینا ہوگا۔ اُن کے ذریعے ہمارے مُلک میں نشاۃ ثانیہ یا بیداری یا اصلاحی کوششیں بروئے کار لائی جا سکتی ہیں۔ مجھے اپنے ملک کی اِس روایت پر بے حد فخر ہے کہ یہاں کے لوگ تنازعات کو واد وِواد (آپسی گفت و شنید) سے حل کر لیتے ہیں۔ ہمارے ریڈیو اور ٹی۔ وی سے جو پروگرام پیش کیے جاتے ہیں اور جن میں کلاکاروں، مصنفوں، سائنسدانوں اور دیگر تخلیق کاروں کا تعاون شامل ہوتا ہے، اُن کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ معاشرتی، سیاسی، عقلی یا اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہیں اور اسی لیے وہ بے جان اور کمزور ہیں۔ ریڈیو اور ٹی۔ وی نے اگر کہیں کامیابی حاصل کی ہے تو وہ اس بات میں کہ عوام کی اور اُن کے شاہدین کی خواہشات کیا ہیں۔ اسی لیے وہ اخلاقی معیار کی گراوٹ اور انتشار کا واحد سبب ہیں۔ ٹی۔ وی اور ریڈیو پروگراموں میں طبع زاد کوششوں کا فقدان ہے۔ ہر چیز مستعار لی گئی ہے اور وہ ہماری حقیقی ضرورتوں سے لگّا نہیں کھاتی۔ دریں اثنا ہمارا بیچارہ مصنوعی سیارہ مدار میں گردش کر رہا ہے۔ لیکن اُس سے حقیقی ضرورتوں کی تکمیل کا کام مشکل ہی سے لیا جا رہا ہے۔

پی۔ این۔ ہکسر

اداریہ

آج کے حالات کس قدر افسردگی، دل شکستگی لانے والے اور بد دل کرنے والے ہیں۔ ہر طرف تشدد، فرقہ وارانہ جنونیت، مذہبی کتابوں پر اندھ وشواس، ان کی کورانہ اور اندھی تقلید، دیرینہ عقائد پر جمے رہنے کی خواہش اور ان سے چپٹے رہنے کی تمنا۔ سوال یہ ہے کہ ہم آخر اس دلدل میں کیسے پھنسے۔ اور اس خوفناک اور مہیب صورت حال نے ہماری زندگیوں کو خانوں میں کیوں بانٹ دیا ہے؟

محترم قارئین! اس المناک صورت حال کا تجزیہ کرنے اور اس کے اسباب کا پتہ چلانے کی جو ہماری کوشش ہے، اس میں آپ بھی ہمارے ساتھ شریک ہوں اور اس کے حل کی تلاش کے لیے غور کریں۔ سب سے پہلے ہمیں اس صورت حال کے پس پردہ جو محرکات کارفرما ہیں، ان کا پتہ چلانا ہے اور پھر اس خطرے کے مقابلے کے لیے وضع کی گئی حکمت عملی کی جانچ کرنی ہے۔ یہاں اس سلسلے کی تفاصیل میں جانا مقصود نہیں بلکہ اسے اس کے اصل پس منظر میں پیش کرنا ہے۔

آیئے ابتدا سے ہی نظر ڈالیں ——— ہماری شروعات اپنے کنبے سے ہوتی ہے، کنبہ میں رہتے ہوئے ہم بڑے ہوتے ہیں۔ جہاں مذہبی رسومات، طور طریق، ہماری مقدس کتابیں، ہماری زندگی کو ڈھالتی ہیں۔ زندگی کے اس ڈھیر کو لے کر ہم باہری دنیا میں قدم رکھتے ہیں جہاں کے نظام کو سنبھالنے والے ہیں صرف مٹھی بھر سیاستداں، بیوروکریٹس، واعظ، مبلغ اور دیوی دیوتا وغیرہ اس نظام کو چلانے والوں میں کاروباری لوگوں کا بالائی طبقہ نیز پڑھے لکھے لوگ اور مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے اعلیٰ طبقات کے لوگ مثلاً ڈاکٹر اور انجینیر وغیرہ بھی شامل ہیں۔ ان میں یہاں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ہمارے میڈیا والے یعنی ذرائع ابلاغ کے ذمہ دار جو بڑی سرگرمی سے اس نظام پر اثر انداز ہوتے ہیں لیکن یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اس تمام نظام کو وضع کرنے والے ہم میں ہی سے ہیں اور ہم جیسے ہی ہیں نیز وہ بھی سماج کا ایک حصہ ہیں اور اس سے کسی بھی طرح جدا نہیں۔

ہمارے سماج کی بنیاد ہے ہم جیسے افراد پر مشتمل وہ اکثریت جو محض خاموش تماشائی ہے۔ اس کو چلانے کے جو ذمہ دار ہیں، وہ بھی دراصل ہمارا ہی عکس ہیں۔ لیکن آخر ہم سب ہیں کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وسیع و عریض دنیا میں ہم اپنے ہی طرح کے لوگوں کے معاشرے کے ساتھ جینا پسند کرتے ہیں اور اس طرح ہم رہ جاتے ہیں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور نہ جانے کیا کیا۔ ہم اپنے ان جذبات کو لیے ہوئے اپنے فرقے، جماعت اور مذہب کی مخصوص رسومات میں الجھے رہتے ہیں اور اتنا ہی نہیں بلکہ ایک ساتھ مرنے اور جینے کو تیار رہتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ہمارے واعظ، ہمارے فرقے کے رہنما ہم میں پہلے سے موجود ایک جھوٹے قسم کے فخر اور تعصب و تنگ نظری کے جذبات کی پرورش کرتے ہیں۔ اور اس عمارت کو پختہ سے پختہ تر بنانے کی کوشش کرتے ہیں، اس طرح ہم ان چالاک قائدین کے لیے ایسا زرخیز میدان فراہم کر دیتے ہیں جہاں وہ اپنا دام فریب بآسانی بچھا سکیں اور ہمیں اس میں پھنسا سکیں۔ ہماری تعلیم اور پرورش بھی ایسی نہیں کہ ہم ان کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت کریں اور آزادانہ طور پر اپنے دماغ سے کام لیں۔ ہماری زندگی اس طرح گزرتی ہے کہ گویا یہ ہمارے لیے مقدر ہو چکی اور یہ ان کی خواہشات کے مطابق ہی چلتی ہے۔ زندگی کا جب یہ ڈھب ہو تو نتیجہ معلوم۔ اس طرح طبقوں میں بٹے ہم لوگ زندگی بھر باہمی آویزش اور کشمکش کے لیے وقف ہو جاتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور فرقہ وارانہ ذہنیت کے درمیان امن کی حیثیت سراب کی سی ہو جاتی ہے۔ ہر طرف فرقہ واریت کا ہی بول بالا ہوتا ہے۔ لیکن کیا یہ فرقہ واریت ہماری زندگی میں کوئی نئی چیز ہے۔ ہرگز نہیں۔ یہ تو ہماری زندگی کے ساتھ ساتھ چلی ہے۔ دراصل یہ ہمیں وراثت میں ہی ملی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ چلتے آئے ہیں فرقہ وارانہ فسادات، مارکاٹ، لوٹ مار اور تشدد کے واقعات۔ غیر ملکی حکومت کے زمانے میں سیاسی وجوہ کی بنا پر ہم غیر ملکیوں کو فرقہ واریت کا زہر پھیلانے کا الزام دے سکتے تھے لیکن خود ہماری جدوجہد آزادی کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ یہ زہر مسلسل موجود رہا ہے اور اپنا کام کرتا رہا ہے۔

ہم ہمیشہ سے ہی اس مرض کی گرفت میں رہے ہیں۔ اس وقت بھی ہم میں پھوٹ تھی اور آج بھی ہم میں پھوٹ ہے۔ اس وقت کی پھوٹ کے سبب ہم نے ملک تقسیم کیا اور آج پھر اسی طرح بٹے ہوئے تقسیم کے بیج بو رہے ہیں۔ ہمارا مذہب اس وقت بھی ولن کا رول ادا کر رہا تھا اور آج بھی ہمارا مذہب وہی رول ادا کر رہا ہے۔

معزز قارئین! اب ہم اس المیے کے نقطۂ عروج کے قریب ہی ہیں ——— عوام میں ہماری حیثیت محض ایک بھیڑ سے زیادہ نہیں۔ ہم جس ماحول میں رہتے ہیں، اور زندگی میں پروان چڑھتے ہیں، وہی ہماری زندگی کے سانچے تیار کرتا ہے۔ گھروں میں ہماری روایتیں، رسم و رواج اور پرکھوں سے چلے آ رہے ثقافتی مہرے ہماری زندگی کو ڈھالتے ہیں، اسکولوں اور کالجوں میں مروجہ طریق تعلیم ہمیں کھوکھلی اور عملی زندگی کے لیے تیار کرتی ہے۔ یہ نظام ہمارے مقدر کا فیصلہ کرتا ہے مگر زندگی کی اس ڈگر اور روزمرہ کی مصروفیات کے اس ڈھیر سے جڑے ہوئے اس نظام کو آخر چلاتا کون ہے؟ ظاہر ہے کہ اس تمام کی ذمہ داری ہم نے اس نظام کو سونپی ہے جو کہ ہم نے اپنے لیے چنا ہے۔ انتظامیہ کو ہم نے ہدایت کی

بہت ہو چکا

کہ وہ سوشلزم یعنی سماج واد اور سیکولرازم ہی کی راہ پر چلے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ انتظامیہ اس ہدایت پر کس حد تک عمل کر رہا ہے۔

یہاں ہم سماج واد یا سوشلزم کی بات نہیں کریں گے کیوں کہ یہ وہ موضوع ہے جس پر آپ سال بھر 'یوجنا' کے صفحات میں کالم بھرے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہاں ہماری بحث کا زور اور اس کا تعلق اس وعدے کی تکمیل سے ہے جسے سیکولرازم کا نام دیا گیا ہے۔

یقین جانئے! ہماری حکومت پوری ایمانداری، پورے خلوص اور اپنی بہترین صلاحیت کارکردگی سے سیکولرازم، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، قومی یک جہتی اور جذبۂ حب الوطنی کو فروغ دیتی ہے۔ سرکار کے پاس خاص طور سے ایسے ذرائع ہیں جن کے ذریعے چشم زدن میں اس خوش نصیب ملک کے دور دراز علاقوں میں بسنے والے لکھوکھا عوام کے گھروں تک رسائی ہو سکتی ہے۔ سیکولرازم کو عوام کے دلوں میں بٹھانے کے لیے حکومت میڈیا یعنی ذرائع ابلاغ کا استعمال بھی پوری ہنرمندی اور چابکدستی سے کرتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے بھی مذہب کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اکثر میڈیا کے ذریعے دیے جانے والے پیغامات اس طرح کے ہوتے ہیں:۔

"ہم ایک ہیں، ہمارا اتحاد ہماری گوناگونی میں ہے، رواداری ہمارا قابلِ فخر ثقافتی سرمایہ، ہماری روایات قابلِ فخر اور شاندار ہیں، ہمارے مذاہب عالمگیر بھائی چارے کو بڑھاوا دیتے ہیں۔

سیکولرازم کو بڑھاوا دینے کے لیے اور نام نہاد ملی جلی ثقافت کے لیے سبھی مذہبی کتابوں کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ سبھی مذہبوں کی مثالیں پیش کر کے سبھی کو خوش کرنے کا جتن کیا جاتا ہے۔ جذباتی تسکین کے لیے حکومت نے پوری ایمانداری اور خلوص سے قومی یک جہتی کونسل کی سفارشات کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ حتیٰ کہ قومی یک جہتی کا دن تک منایا جاتا ہے۔

معزز قارئین! دیکھئے آخر ہم بھی تو سرکار کے اندر ہی ہیں۔ چاہیں تو آپ اسے سیکولرازم کو مستحکم کرنے کی ہدایت پر عمل درآمد کی پالیسی بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ان سب کا نتیجہ اور ماحصل کیا ہے؟ کیا ہم کسی بھی لحاظ سے پہلے سے بہتر یا اپنے مقصد کی تکمیل سے قریب ہیں۔ بہرکیف سچ تو آخر سچ ہی ہے۔ اس کا سامنا کرنے سے ہمیں منہ نہیں موڑنا چاہیئے۔ اب وقت آ چکا ہے جب ہمیں پوری ایمانداری، حوصلے اور جرأت مندی سے اس کا سامنا کرنا ہوگا، آیئے ہم ایمانداری سے اس سچائی کو تسلیم کریں کہ ابھی تک اس سمت ہماری تمام تر کوششیں ناکام رہی ہیں۔ ہم میں آج بھی ویسے ہی پھوٹ ہے جیسے کہ ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے تھی۔ پھر کیوں نہ ہم اپنے اس نظامِ کار پر پھر سے غور کریں؟ اگر یہ کارگر اور مؤثر ثابت نہیں ہوا تو پھر یہ بیکار ہے اور یہ کارگر ہو بھی کیسے سکتا تھا جبکہ اس کی بنیاد ہی معقولیت پسندی اور عقلیت پسندی پر نہیں تھی۔ بہت دیر سے ہم جو اسے برداشت کرتے چلے آ رہے ہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ اب ہم غور و فکر سے کام لیں اور کوئی دوسرا کارگر طریقہ سوچیں۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ــــ اس اصول کے مطابق معقولیت پسندی، دانشوری اور سوجھ بوجھ اور عقل کی باتوں نیز زندگی میں پائی جانے والی لغویت، بے ہودگی اور خرافات کے درمیان حدِ فاصل قائم کریں اور مشترکہ ثقافت کے ڈھونگ کا پردہ چاک کرتے ہوئے مشترکہ تمدن کی از سرِ نو تعمیر کریں۔ اس کے لیے ہمیں وہی زندگی اپنانی ہوگی جو صحیح معنوں میں فہم و فراست والی زندگی ہو اور جو عقل کی کسوٹی پر کھری اترے ــــ

پیارے قارئین! ہم یہ دعویٰ نہیں کر رہے کہ ہمیں اُن تمام باتوں کا پورا پورا علم ہے جن کا تعلق زندگی کے بے تکے پن اور لغویت سے ہے۔ ہم آپ کے سامنے عقل کا پٹارہ کھول کر بھی نہیں رکھ رہے ہیں۔ البتہ اس سلسلے میں ہم آپ کے سامنے ملک کے عظیم مفکروں اور دانشوروں کے خیالات پیش کر رہے ہیں، صرف یہ بتلانے کے لیے کہ ہماری زندگی با مقصد، پُر مغز اور کامیاب کیسے رہ سکتی ہے۔ ہم نے جس مقصد کے تحت عظیم مفکروں کو دعوتِ فکر دی، وہ یہ ہیں:۔

۱۔ مذہب پرائیویٹ ہو۔ اسے صرف گھروں اور عبادت گاہوں تک ہی محدود رکھا جائے۔ ۲۔ حکومت مذہب کے پرچار سے ہاتھ کھینچ لے اور صرف عقلیت پسندانہ اندازِ نظر اور جذبۂ انسانیت کو فروغ دے۔ ۳۔ نظامِ تعلیم میں انسانی ارتقا کی معقولیت پسندی پر مبنی وضاحتوں اور جانکاری پر زور ہو۔ تعلیمی ادارے نوعِ انسانی سے محبت اور جذبۂ انسانیت کے فروغ نیز معقول پسندی کے نظریات کو پھیلائیں۔ ۴۔ سرکاری ذرائع ابلاغ کا استعمال جذبۂ انسانیت کے فروغ کے لیے ہو، نہ کہ جیسا اب ہو رہا ہے۔ یہ خوش آئند ہے کہ ان دانشوروں نے اِن موضوعات سے گہری دلچسپی لی۔ اُن کا ردِعمل ان کے بارے میں بصیرت افروز رہا۔ چنانچہ اگلے صفحات کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ بھی ہم سے متفق ہوں گے اور یہ کہیں گے کہ بس بہت ہو چکا۔ یہ لغویت، یہ بیہودگی، یہ خرافات آخر کب تک۔ یہ مشترکہ ثقافت ڈھونگ ہے اس کا پردہ چاک کرنا ہے اور مشترکہ تمدن کی از سرِ نو تعمیر کرنی ہے۔ آیئے۔ پھر ہم ایسی کوششیں شروع کریں جن سے اکیسویں صدی میں قدم رکھنے کے لیے ہم پوری طرح متحد، سیکولر، معقول پسند اور فعال نیز سرگرم قوم کی صورت میں اُبھر سکیں۔

اس شمارے کے ساتھ یوجنا کے ہمارے کنبے میں دو اور نو زائیدہ رسالوں کا اضافہ ہو رہا ہے یعنی کنڑ اور پنجابی۔ اس طرح پوری ایک درجن زبانوں یعنی اُردو، انگریزی، ہندی، پنجابی، گجراتی، مرہٹی، تیلگو، کنڑ، تمل، ملیالم، بنگالی اور آسامی میں یہ رسالہ شائع ہونے لگا ہے۔

چیف ایڈیٹر

رومیش تھاپر

آج اگر میں بادشاہ ہوتا تو ...

ہائے اگر میں بادشاہ ہوتا، دلکش شخصیت کا مالک، عوام کا منتخب کیا ہوا، قوت و سرپرستی کا مرکز، وزیر عوام کے خادم بن گئے ہوتے اور خادم وزیر، اور میں ہر لحاظ سے ہندوستانی ہوتا، تو اس ابتری اور ناسمجھی کے لمحے میں سارے گندے مواد کو نکال دیتا، مذہبوں کی بگڑی ہوئی شکلوں اور غلط مذہبی رواجوں کے شکستہ اثرات کو بے اثر کر دیتا اور انسانیت، معقولیت پسندی اور نیکی کا پُر اثر انجکشن دے کر اخلاقی و روحانی تن درستی کو بحال کرتا۔

میں تشہیر و اشاعت کے تمام ذرائع کو پوری طرح استعمال میں لاتا، بالخصوص الیکٹرانک میڈیم، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو جو آج شہروں اور دیہات میں گھر گھر پہونچ رہے ہیں۔ میں تعلیم کو مقدس کتابوں کے تفریق پیدا کرنے والے مواد، دیوی دیوتاؤں، نیم حکیموں اور "کرشمہ سازوں" سے نجات دلاتا اور ایسی تعلیم کا انتظام کرتا جو بڑا احتیاط تحقیق کے بعد لکھی گئی تاریخ پر مبنی ہوتی۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے کیوں کہ گذشتہ صدیوں کے دوران ہمارا طرزِ فکر اور طرزِ عمل نادانستہ طور پر کچھ ایسا بن گیا ہے گویا مذہب کی بگڑی ہوئی رسوم زیادہ اہم ہیں بہ نسبت اس پیغام کے جو ہمارے دانشوروں نے گذرے ہوئے زمانے میں ایک ایسے وقت دیا جب زندگی تشدد سے پُر، غیر مستحکم اور بے معنی تھی اور انسان ایک قسم کے وحشیانہ وجود سے اوپر اُٹھ رہا تھا۔ لیکن آج مردوں اور عورتوں میں گہری تبدیلی آچکی ہے۔ معصیت اور بدی کی پُرزور لہروں کے درمیان ان کے اندر کی انسانیت محفوظ ہے۔ لیکن مذہب اور مذہب کی کو رانہ تقلید بہت سی تبدیلیوں کے باوجود سرسبز و شاداب ہی ہے اس دلیل کی بنا پر کہ انسانیت اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

مذہبی اور غیر مذہبی کے درمیان خطِ امتیاز کھینچنے کی کوشش اکثر کی جاتی ہے لیکن اس حقیقت کو کبھی واضح نہیں کیا جاتا کہ مذہب کا ڈھونگ ہر قسم کی معصیت و گنہگاری کو چھپانے کا ایک پردہ ہے، نیز یہ کہ جو لوگ اپنے دیوتاؤں اور اپنی "مقدس" کتابوں کو سجدہ کرتے ہیں وہ صرف اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ اور یہ گناہ ــــ یہ غلطی ایک بہت بڑی اور بھدی غلطی ہے۔ خاص کر ہمارے اس سیکولر دیش میں۔ کیا یہ مبالغہ ہے؟ ذرا سوچیے تو معلوم ہوگا کہ یہ بات حقیقت سے بہت قریب ہے جس سے ہم بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو بھارت یقیناً دنیا کے سب سے روشن خیال، نیک، فکر انگیز اور اتفاق پسند ملکوں میں ہوتا اور مجھے بادشاہ ہونے اور انقلاب لانے کی بات نہ سوچنی پڑتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت بنیادی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم اپنے مندروں، مسجدوں، گوردواروں، وہاروں اور گرجاؤں کو حقیر اور غلط جذبات ابھارنے کی اجازت دیتے ہیں۔ باقی سب باتیں معمولی ہیں۔ مگر ان پر بھی روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

خواہ یہ گوشت نہ کھانے والا اور کٹر ہندو ہو جو ذرا سا اشتعال دلانے پر، اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے ہریجن اور مسلمان کو، اور اب سکھ کو بھی جو کبھی خون کے رشتے سے اس کا بھائی ہوا کرتا تھا لیکن جو اب بہت زعیم اور ضدی ہو گیا ہے) برباد کر دیتا ہے، خواہ یہ مسلمان، شیعہ یا سنی، بوہرہ یا مومن ہو جو یہ محسوس کرتا ہے کہ اگر اس کے مذہبی قوانین کو جو عہدِ وسطیٰ میں بنائے گئے تھے، چھوا گیا اور اس کے ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کے حق پر کوئی روک لگائی گئی تو اس کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے گا، خواہ یہ سکھ ہو جس نے اپنے دھرم کے بنیادی اصولوں پر اعتماد کھو دیا ہے اور جنگجوئی پر آمادہ ہو گیا ہے، جس کی تلقین ماضی میں گورو صاحبان نے مغل نا انصافیوں کے خلاف کی تھی لیکن جو آج کے زمانے میں بے تعلق و بے معنی ہے، بہر حال ہمیں اس تمام ہنگامے کو بگڑے ہوئے سیاسی کا پس منظر رکھنے والی بیماری سمجھنا چاہیے۔ اس منظر میں وہ لوگ بھی شامل ہیں

---

* ایڈیٹر سیمینار، نئی دہلی۔

۱۵ اگست خصوصی شمارہ

ہیں جو "مقدس" کتابوں، دیوی دیوتاؤں، سادھوؤں اور سنتوں کو سیدھے سادے عام لوگوں کے حریصانہ استحصال کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

بھارت میں یہ گمراہی دکجروی خطرناک صورت اختیار کر چکی ہے۔ ہمارے عوام ابھی تک مذہب کے نام پر فریب دینے والے اور مذہب کو صحیح طور پر نہ جاننے والے لوگوں کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں، جو تاریخی یا سماجی تبدیلیوں یا اصل اخلاقیات کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ روزمرہ زندگی کی ناکامیاں اور محرومیاں ہی انھیں ایسے لوگوں کے چکر میں ڈالتی ہیں۔ آخر نئے نئے پڑھنا لکھنا سیکھنے والے لوگ مذہبی کتابچوں کے سوا کونسی کتابیں پڑھتے ہیں؟ پھر عمدہ کتابوں کے ترجمے بھی دستیاب نہیں ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ خواندگی کی اشاعت کا مطلب مذہب کے دیرینہ اور بنیادی اصولوں کی اشاعت ہی سمجھا جاتا ہے۔ سیاست داں بھی لوگوں کے دیوتا بننے کی مضحکہ خیز کوشش کرتے ہیں۔ اور اس کے لیے ٹیلی ویژن اور ریڈیو کا استعمال کرتے ہیں۔

ہندو پن کی نشانیاں اور یہ علامتی ٹیکے جو اسے جدید بھارت کے گنہگار روپ میں نقل کی ہوئی پانچ ستارہ کلچر میں رہتے ہوئے لگاتے ہو گروؤں کی تعلیمات کے خلاف، انتقام کی کیسری پگڑیاں پہنو اگرچہ تم میں، جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بارے میں سچائی بیان کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ اپنی داڑھیاں چھانٹو، مولویوں جیسی بنالو اور طوطے کی طرح اپنی پرارتھنائیں رٹو اور اس "کلچر" کو اُن لوگوں تک پہنچاؤ جنھیں تمہاری تقلید کرنے میں "روشنی" نظر آتی ہے! عدم تشدد پر مبنی بودھ دھرم کے پیرو بنو کیونکہ یہ ایک دانت کے بدلے میں کسی کے ایک یا دو دانت توڑنے سے نہیں روکتا!

کیا ہم سب خود کو ایک دوسرے کے خون سے رنگنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں؟ بھیونڈی، دہلی اور کانپور میں کیا ہوا اور اب احمد آباد میں کیا ہو رہا ہے جہاں ہر کوئی ہر کسی کو مار رہا ہے۔

غصہ، بدلہ، انتقام، حسد و رقابت — یہ سب مذہب کے نام پر حقوق کے ادعا میں کارفرما ہیں، لوٹ مار ایک عام اصطلاح ہے۔ مذہب، جاتیاں، طبقے اور نسلیں اشتعال پیدا کرتی ہیں، لیکن ان کے آلۂ کار ہم سب بنتے ہیں، کیوں کہ کسی نہ کسی طرح سے ہم اس میں شامل ہوتے ہیں۔ یعنی ہم جرم کے ارتکاب میں مددگار بنتے ہیں۔

لیکن ہمیں خود کو یا اپنے عوام کو بُرا بھلا نہیں کہنا چاہیے۔ کیوں کہ اصل مجرم وہ نہیں ہیں۔ انھیں تو شکار بنایا گیا ہے ان کی سادہ لوحی اور ناسمجھی کی وجہ سے۔ انھیں کس نے شکار بنایا؟ ان لوگوں نے جو خود کو اُستاد، صحافی، رابطۂ عامہ کا کارکن، عوام کی رائے بنانے والا اور نیتا کہتے ہیں۔ نیتا جو اپنے دیوی دیوتاؤں، "مقدس" کتابوں کے نام پر گروہ بندی کرتے اور ووٹ اکٹھا کرتے ہیں۔ کیا یہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی؟

اس بارے میں کوئی غلطی نہ کیجیے!

مَیں بادشاہ بننا چاہتا ہوں کیونکہ مذہبی گمراہیوں کا کینسر جسے کبھی افیون کا نام دیا گیا تھا، ایک ہزار مختلف طریقوں سے اپنا اثر دکھاتا ہے اور ہر سطح پر اس کے سرپرست طاقتور اور بارسوخ افراد ہوتے ہیں۔

"تمام مذہبوں کے" بھجن یا دھارمک گیت ہر روز صبح صبح فضا کو معمور کر دیتے ہیں۔ ان کی آواز ہر گھر میں پہونچتی ہے لیکن بھجن وغیرہ کی دلکشی کو دیکھا یا سمجھا نہیں جاتا، یہ محض عقیدے کا اعلان ہوتا ہے۔

- جب گندی اور بدسلیقہ دوکان کھول جاتی ہے تو دکاندار ایک مختصر کا ہَوَن ارتھنا کرتا ہے گویا اس سے کاروبار — جو عام طور پر کرپٹ کاروبار ہوتا ہے — خوب چمکے گا۔
- سبزی خوری کا اصول جس کی ایک تاریخ رواج کے طور پر کبھی کوئی وضاحت نہیں ہوئی۔

اسے تو بس آلودگی کے خلاف ایک "مقدس" تحفظ سمجھا جاتا ہے۔

- جھٹکا اور حلال کا مسئلہ۔ اسے بھی مذہبی اربنا دیا گیا ہے بغیر یہ دیکھے کہ ان میں سے کون سا طریقہ کب اور کن حالات میں اپنایا گیا۔
- ہریجن کے مقابلے میں براہمن کے پکائے کھانے کو ترجیح دی جاتی ہے قطع نظر اس کے کہ آج کون بہتر کھانا بناتا ہے۔
- جو ہاتھ غلاظت صاف کرنے کے کام آتا ہے اسے کھانے کے لیے استعمال نہ کرنا، خواہ اسے صابن سے صاف کیوں نہ کر لیا گیا ہو۔

اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے

قدیم پابندیوں کا سلسلہ، جن پر مذہبی توہم پرستی کی گہری پرت چڑھی ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ ہماری نام نہاد عبادت گاہوں تک پہنچتا ہے۔ جو ایک طرح کی پناہ گاہ بن گئی ہیں۔ جن کا اکثر غلط استعمال کیا جاتا ہے اور جن میں سے بیشتر خستہ حال ہوتی ہیں اور جن کی ٹھیک سے دیکھ بھال بھی نہیں کی جاتی۔ اور اب تو ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جب کبھی کوئی غیر ذمہ دار شخص چاہتا ہے، سڑک یا شاہراہ پر کچھ سرکاری زمین پر قبضہ کر لیتا ہے اور ضروری سہولیات بھی حاصل کر لیتا ہے۔ اپنی آنکھیں کھلی رکھئے آپ کو ہر جگہ ایسے لوگ نظر آ جائیں گے۔

ہمیں ایک دوسرے کو موردِ الزام نہیں قرار دینا چاہیے۔ کیوں کہ قصور انفرادی اور اجتماعی طور پر ہم سب کا ہے۔ آج کی دنیا میں مذہبی رسوم پر جو زور دیا جا رہا ہے وہ مضحکہ خیز نظر آتا ہے۔ جیسے مُنڈن کی رسم، جنیو سنسکار، شادی کی رسومات جو بنیادی طور پر اَن پڑھ پنڈت یا پروہت ادا کرواتے ہیں اور جو اپنے ججمانوں (سرپرستوں) کو اس وقت تک نچوڑتے رہتے ہیں جب تک کہ موت انھیں جُدا نہ کر دے۔ ہم اس مذہبی

پبلک میل کے آگے جھکتے رہتے ہیں، صرف اس لیے کہ سماج میں قابلِ قبول ہوں اور وہ ہم پر نکتہ چینی نہ کرے۔

میں "مقدس" کتابوں، دیویوں اور دیوتاؤں میں یقین نہیں رکھتا، یہ ہمارے عوام کی تاریخ، ان کے دیرینہ عقائد اور اقدار حتیٰ کہ جادو اور رموز و اسرار کی نمائندگی کرتے ہیں، مذہب جس شکل میں ہم تک پہونچا ہے وہ محض ہمارے اندر خوف اور نا سلامتی کے جذبے کے برقرار رہنے کی علامت اور خود کو اپنی بھیانک کمزوریوں اور خامیوں سے محفوظ رکھنے کی مسلسل کوشش ہے۔ مجھے ان بے معنی سہاروں کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دیگر لاکھوں افراد بھی ایسا ہی محسوس کرتے ہیں۔

پھر وہ اس کا اظہار کیوں نہیں کرتے؟ اور سیکولر اسٹیٹ کیوں ان معاملات میں اُلجھتی ہے جو ذاتی امور کے دائرے میں آتے ہیں۔ کیا یہ ایک قسم کی مُسکّن چیز کو بڑھاوا دینے کے مترادف نہیں ہے؟ اور کیا ہمارے عوام کو اتنے خطرناک طریقوں کا اسیر نہیں بنایا جارہا ہے؟ جب کوئی مُسکّن چیز عادی ہوجاتی ہے تو کیا ہوتا ہے؟ اس پر کوئی قابو نہیں رہتا اور وہ لاکھوں جنونیوں کو پیدا کرتی ہے جو اپنے خیالی دیوی دیوتاؤں اور اپنی "مقدس" کتابوں کے سامنے مجنونانہ قسمیں کھاتے ہیں۔

اگر میں بادشاہ ہوتا تو میں یہ لازمی قرار دیتا کہ مذہب کو گھر کی چار دیواری اور عبادت گاہوں تک ہی محدود رکھا جائے۔ عوامی شخصیتوں کے لیے کوئی عام اور مذہبی رسوم یا تقریبات، جن کا پرچار تشہیر و اشاعت کے مختلف ذریعوں سے کیا جاتا ہے نہ کی جائیں۔ پبلک تقریبات میں نام نہاد روحانی عنصر کو شامل کرنے کے لیے کسی قسم کے گیت سنگیت کا اہتمام نہ کیا جائے۔ مذہبی جلوس یا پریڈیں نہ نکالی جائیں۔ سیکولر سماج کے شعار کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ میں تخلیقی منصوبہ سازوں کو اس کام پر لگاتا تاکہ وہ عوامی تقریبات اور ضروری ہو تو نجی تقریبات کے لیے بھی دستورالعمل تیار کریں۔ ایسا دستورالعمل جس میں ماضی کی جمالیات بشرطیکہ بدلتے ہوئے حال اور مستقبل کے خطوط کا امتزاج ہو۔ یہ زندگی کے ہر شعبے کے لیے ضروری ہے۔ ورنہ ہم عہدِ وسطیٰ کے توہمات میں ہی پھنسے رہیں گے۔ ایسا کیوں ہے کہ جب کبھی ہم اپنی ہندوستانیت پر زور دیتے ہیں تو ہم اپنی زندگی کو ان توہمات سے جوڑے رکھتے ہیں۔ یہ سراسر لغو اور غیر دانشمندانہ ہے۔

اگر میں بادشاہ ہوتا تو میری ایک بڑی فکر یہ ہوتی کہ دکھاوٹی مذہب پرستی اور پبلک زندگی کی ہر سطح پر اس کے قابلِ مذمت داخلے کی گہرائی سے جانچ پڑتال کروائی جاتی۔ میں اس بارے میں ایک کھلی بحث کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں کہ آج مذاہب پر جس طرح سے عمل کیا جارہا ہے اس میں کیا غلط باتیں شامل ہوگئی ہیں اور ان سے کیا خطرات درپیش ہیں نیز مملکت کا ان کے بارے میں کیا رویّہ ہے اور کیا ہونا چاہیے۔

اس راہ پر چلتے ہوئے کہیں نہ کہیں تو بھارت کا دماغ ان زنجیروں کو توڑ پھینکے گا جن میں وہ جکڑا ہوا ہے۔ وہ دماغ جس نے کبھی سب سے پہلے ایسے اہم موضوعات پر گہرے فلسفیانہ افکار پیش کئے جیسے کائنات میں انسان کا کیا مقام ہے، وہ کون سی قوتیں تھیں جنھوں نے تمام مخلوق پر انسان کی فوقیت و بالادستی متعین کی اور وہ کون سے نظریات تھے جنھوں نے نئی روشنی حاصل کرنے کے لیے اس کے دماغی توازن کو محفوظ و برقرار رکھا۔ ہندوستان زمانے میں ایسے بھی لوگ تھے، کوئی مذہب یا فرقہ نہیں۔

لیکن افسوس کہ آج وہ نیتا کہاں ہیں جو پبلک پلیٹ فارموں سے اس سچائی کو تسلیم کریں۔ یہی ہماری ٹریجڈی ہے۔ ہمیں اس پر فتح پاکر ایک ایسی نشاۃ ثانیہ کے لیے کام شروع کرنا ہے جس کی جڑیں ملک کی ٹھوس کامیابیوں اور کارناموں میں اور اُن بڑے کاموں میں ہوں جو ہم مستقبل میں کرنے کا منصوبہ بنارہے ہیں۔ اگر ہم حرکت میں نہیں آئیں گے تو ہم سیاسی ہنگامے کھڑے کرنے والے ہارے اور ٹھکرائے ہوئے لوگوں کے پیرو بنے رہیں گے۔ اور میں بادشاہ ہونے کی بات سوچتا ہی رہوں گا۔ ●

بقیہ: تفرقے کی جڑ مذہب ہے

۶۔ حکومت کو چاہیئے کہ پٹاپارتھی کے ستیہ سائی بابا جیسے سادھو مہاتماؤں پر مقدمے چلائے جو لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں اور حوصلے کو پست کرتے ہیں۔

۷۔ مملکت کو ہر سطح پر مذہبی امتیاز سے بالاتر رہنا ہوگا اسے کسی طرح کی بھی مذہبی رسوم میں شامل نہیں ہونا ہوگا۔

۸۔ تمام سرکاری ملازموں اور وزیروں کو پبلک طور پر مذہبی رسوم میں شرکت کرنے کی ممانعت ہونی چاہیئے۔

ہم چند برسوں میں کامیاب نہیں ہوپائیں گے لیکن معقولیت پسندی اور سائنسی نظریے کی حوصلہ افزائی کرکے اور پبلک زندگی میں مذہبی گھس پیٹھ کی حوصلہ شکنی کرکے ہم کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال لیں گے۔

میں نے شروع میں تعلیم، پانی اور بجلی کے مسائل کا ذکر کیا تھا لیکن ذکر میں نے صرف تعلیم کا کیا ہے۔ تعلیم کی طرح پانی اور بجلی کے مسائل کو بھی ہم حل نہیں کر پائے ہیں۔

یاد رکھیے کہ اگر ہم ان مسئلوں کو حل کرلیں گے تو پھر کوئی طبقہ ایسا نہیں رہ جائے گا جسے ہم ٹوٹ کھسوٹ سکیں یعنی بندھوا مزدور یا گھریلو ملازم۔ کیا ہم اس کے لیے تیار ہیں؟

پروفیسر یشپال

مذہب پر لگام

وقت آگیا ہے کہ ہم مل بیٹھیں، سوچیں اور عمل کریں

چیف ایڈیٹر: یہ افسردگی کا منظر، تشدد، فرقہ وارانہ فساد، اور مذہبی دیوانگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یہ ہم ایک غار کی طرف کھینچے لیے جا رہے ہیں۔ آپ کو یہ دور زندگی کیسا دکھائی دیتا ہے؟

پروفیسر یشپال: میرا خیال ہے کہ ہم آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ سماج میں جہاں کہیں کوئی اختلاف دکھائی دیتا ہے لوگ اسے غلط طور پر استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ مذہبی جنون کا یہ رجحان درحقیقت ہماری بے بسی کا مظہر ہے۔ ہم مسائل کو حل کرنے میں ناکام ہوتے ہیں۔ کچھ کر نہیں پاتے۔ تو ہر چیز کو قسمت اور خدا کے حوالے کر دینے کی سوچتے ہیں۔ خدا اور قسمت کو اپنے مسائل سپرد کر دینے کے لوگوں نے مختلف طریقے اپناتے ہیں۔ اور یہی طریقے ان میں نفاق کی وجہ بنتے ہیں، کیونکہ ان میں کوئی معقولیت تو ہوتی نہیں۔ لوگ گروہ بندی کرتے ہیں۔ ایک سے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ ایک زبان بولتے ہیں اور ایک قسم کے صحیفے پڑھتے ہیں۔ ایسا ہندوستان میں ہی نہیں ہو رہا۔ ایک نہ ایک انداز سے یہ عمل ساری دنیا میں جاری ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ یہ ایک بہت خطرناک بات ہے جو ظہور پذیر ہو رہی ہے۔ حیرانی اس بات کی ہے کہ یہ اس دور میں ہو رہا ہے جبکہ ان لعنتوں سے آزاد ہونے کے سارے ذرائع موجود ہیں۔

چیف ایڈیٹر: مذہبی تشخص کو برقرار رکھنے اور انہیں ہوا دینے کی اس لہر کے پیچھے آیا خواندہ لوگوں کا ہاتھ ہے۔ یا مذہبی رہنماؤں کا؟

پروفیسر یشپال: اس امر کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جو لوگ دوسروں کی طرح نہیں ہوتے ان میں ایک جبلی خوف رہتا ہے۔ یہ ایک قبائلی احساس ہے جسے ہم پالتے آ رہے ہیں اور اس سے چھٹکارا نہیں پا سکے۔ اور اس احساس کو غلط استعمال کرنے والوں میں سبھی لوگ شامل ہیں۔ چاہے وہ خواندہ ہوں یا ناخواندہ۔ میرا خیال نہیں کہ جس قسم کی تعلیم ہم پا رہے ہیں یعنی پڑھنا لکھنا حساب کے سوال ہی کرنا یا سائنس۔ اس کے ذریعے ہم کوئی بچاؤ کا راستہ ڈھونڈ سکیں گے۔ میرا یقین ہے کہ اس کا صحیح حل نہرو کے بتائے ہوئے راستے میں ہے یعنی سائنسی مزاج پیدا کیا جائے۔ اور وہ اس تعلیم سے جو اب ہمیں دی جا رہی ہے بالکل مختلف چیز ہے۔ مان لیجئے کہ مذہبی رہنما صورت حال سے فائدہ اٹھائیں گے کیونکہ وہ گروہ کے سربراہ ہیں اور اسی میں انھیں اپنا فائدہ نظر آتا ہے۔ عوام میں کسی قسم کا اختلاف غلط طور پر استعمال ہو سکتا ہے اور یہی کچھ اب ہو رہا ہے۔

چیف ایڈیٹر: زندگی کو گدلا کرنے میں مذہب کا ہاتھ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مذہب ہی کی بنا پر ہم لوگ معقولیت سے سوچنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ کیا آپ کا ایسا خیال نہیں۔ اس ضمن میں کچھ فرمائیے۔

پروفیسر یشپال: میں ایک مذہبی آدمی نہیں ہوں۔ اگرچہ میرا مذہب سے کوئی بیر نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں مذہبیت کو ایک اعتبار سے پسند کرتا ہوں۔ ایک اس قسم کے احساس کو جو ہمیں اپنے آپ سے پرے سوچنے اور مادے کے وجود کو ڈھونڈنے اور ان کا آپس میں تعلق معلوم کرنے پر مائل کرتا ہے۔ یہ احساس لگ بھگ ویسا ہی ہے جیسا کہ سائنس کی مصروفیت یا شعر کی تخلیق کے وقت انسان میں پیدا ہوتا ہے۔ بہت سے ایسے مذہب کے پرستار ہیں جن کی میں قدر کرتا ہوں۔ اگرچہ ان کے اعتقاد پر میں صاد نہیں کرتا۔ لہٰذا جو لوگ مذہب کے پیروکار ہیں، یا مذہبی خیالات کے ہیں میں ان لوگوں کی عزت کروں گا بشرطیکہ ان کی یہ مذہبیت اپنی شخصیت کے فروغ کے لیے ہو۔ نہ کہ ایک منظم سماج یا گروہ کی صورت میں لیکن جب کوئی مجھ سے یہ کہے کہ میرا مذہب مجھے دوسروں کی زندگی میں دخل انداز ہونے کا حق دیتا ہے اور میں ایک لکیر کے فقیر کی طرح عمل کروں گا تو اس سے مجھے اختلاف ہے۔ اور یہ مذاہب کی جس طرح تشکیل ہوئی ہے اس سے یہی روش ملتی ہے۔ اور اس طرح یہ مذاہب انسان سے اس کے بنیادی حقوق چھین کر اسے اپنے طور پر سوچنے اور عمل کرنے سے محروم کر دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح مذہب کئی خرابیوں کا باعث بنتا ہے۔

چیف ایڈیٹر: مذہب کی ذرا اور بات ہو جائے۔ مذہب ہم میں ایک غلط قسم کا غرور بھر دیتا ہے اور ایسے متعصبانہ خیالات کو جنم دیتا ہے جس سے انسانوں میں بعد پیدا ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں آپ کا کیا خیال ہے؟

پروفیسر یشپال: میں اس بات سے متفق ہوں کہ منظم مذاہب نے انسانوں کو باہم ملانے کی بجائے کئی ایک

● سکریٹری، شعبہ سائنس و ٹکنالوجی، نئی دہلی۔

گروہوں اور فرقوں میں بانٹ دیا ہے۔ یہاں تک کہ مذاہب کے اندر بھی ایسے گروہ ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف ہیں علاوہ ازیں کئی اور باتیں ہیں جن کی بنا پر ہم ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں۔ ہم بنیادی ایکتا کی طرف صحیح طور پر توجہ نہیں دیتے۔ مثلاً جو اتحاد ہمارے آئین میں ہے یا جس طرح سے ہم زندگی گزار رہے ہیں بلکہ تمام انسانوں، تمام زندگیوں تمام مادہ میں جو وحدت موجود ہے۔ یہی نہیں انسانوں کا آسمانی ستاروں اور سیاروں سے تعلق یا ان کا زمین سے تعلق اور زمین کا تمام دنیا سے رشتہ۔ اس قسم کا احساس ہمارے ہاں موجود نہیں ہے۔ یہ تو ہے کہ بعض مذاہب ان باتوں کا ذکر کرتے ہیں لیکن وہ اپنی قسم کی خاص زبان استعمال کرتے ہیں۔ اور جب تک وہی طرز گفتگو نہ ہو مطلب حاصل نہیں ہوتا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اگر مذاہب کی جگہ کسی اور چیز کو دے دی جائے تو حالات میں کچھ بہتر تبدیلی ہو جائے گی۔ خرابی اس امر میں ہے کہ انسان اپنی کمزوری پر قابو نہیں پا سکا کہ جو چیز اس سے مختلف ہے وہ اس کی دشمن ہے۔ میری تو سمجھ سے باہر ہے کہ ہم سکون حاصل کرنے کے لیے اپنی ہی قسم کے لوگوں کے گلے کیوں چپٹے رہتے ہیں۔ شاید ہم ہر ایک سے یکسانیت نہیں پاتے۔ شاید یہ سائنس کا ہی کرشمہ ہو۔ لیکن محض سائنس کی الف، بے پڑھنے سے یہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ میرا خیال ہے کہ اس ماحول کو سمجھنے کے لیے ہمیں سائنس کے ساتھ ساتھ اخلاقی معیار بھی استعمال کرنا ہوگا۔ مذہبی نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی تاکہ ان باتوں کو صحیح طور پر سمجھ سکیں۔ اب تک ایسا نہیں ہوا۔ لیکن وقت آ گیا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے

یہ ایک المیہ ہے کہ سائنس کی تعلیم اور اس کے تجربات محض استعمال کی حد تک ہی رہے ہیں۔ اس کی بنیادی اقدار پر جو صاف عیاں ہیں، دھیان نہیں دیا گیا۔ میرا خیال ہے کہ یہ سائنس کا دور نہیں ہے یہ ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے ہم صحیح طور پر اس فرق کو نہیں سمجھ رہے۔ میں پھر دہراتا ہوں کہ سائنس کا زمانہ نہیں۔ میری دعا ہے کہ سائنس کا دور دورہ ہو اور ہم اس پر زیادہ سے زیادہ زور دیں۔

چیف ایڈیٹر: پھر ایک بار۔ میں کہوں گا کہ یہ مذہب ہی تو ہے جو ہمیں فرقہ بندی سکھاتا ہے اور انسانی ذہن کو فروغ پانے نہیں دیتا۔ اور اپنی جیلوں میں رہتے ہوئے ہم تندی و ترشی کا شکار ہوتے ہیں۔ جو ہماری زندگیوں میں آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر طوفان پیدا کر دیتی ہیں۔ آپ کا اس ضمن میں کیا خیال ہے؟

پروفیسر یشپال: ہاں تو یہ صحیح ہے کہ اگر کوئی شخص محض چند لوگوں تک محدود رہے، وہی صحیفہ پڑھے جو وہ پڑھتے ہوں۔ اور انہی دستور پر چلے جو ان کا وطیرہ ہو تو وہ سوچنے لگتا ہے کہ زندگی گزارنے اور سوچنے کا یہی ڈھنگ برحق ہے۔ تو اس طرح وہ محدود ہو کر رہ جائیگا۔ لیکن یہ بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ اس کی پشت پر انسانی پیدائش کا بھی ہاتھ ہے۔ آپ علم زندگی معلوم نہیں کر سکتے۔ جو بات شاید میں واضح طور پر نہ کہوں وہ یہ ہے کہ سنسکرت کے شلوک تمام سچ کے مظہر ہیں۔ ہر ایک لفظ سچ ہے اور دوسری طرف چونکہ میں ان کی سریلی لے کو بچپن سے سنتا آ رہا ہوں۔ ان کا میرے ذہن کی یادوں پر گہرا اثر پڑا ہے۔ میں ان سے کھل اٹھتا ہوں۔ کلچر کے میدان میں اگر ہم ان سے لطف اندوز ہوں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہم آخر دوسری تہذیبی باتوں سے بھی تو لطف حاصل کرتے ہیں۔ جیسا کہ مجھے موسیقی سے دلچسپی ہے لیکن جو یہ کہے کہ دوسرا جو میری طرح نہیں خراب آدمی ہے۔ یہ بات برحق نہیں۔ لہذا ہر انسان کو یہ احساس ہونا چاہیئے کہ میں جو کچھ بھی ہوں اس کی پشت پر میرے بچپن کے تجربات کا ہاتھ ہے اور دوسرا بھی اسی طرح اپنے بچپن کے تجربات سے بنا ہے۔ ہم دونوں میں کوئی وجہ اختلاف نہیں۔ چونکہ ہم دونوں ایک ہی طرح کے عمل سے گزرے ہیں، اور اسی یکسانیت کی ہمیں نشاندہی کرنا ہوگی۔ اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ ہم ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں یا مختلف زبانیں بولتے ہیں یا مختلف کتابیں پڑھتے ہیں۔

میں سمجھ نہیں پا رہا کہ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ آخر انسانوں میں دشمنی کی وجہ کیا ہے۔ غالباً ہم اب تک خود کو سمجھ نہیں پائے۔ یہ بات سچ ہے کہ اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن، باہمی گفتگو اور ذاتی یا گروہی جلسوں میں ہم یگانگت کی بجائے اختلاف پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اس طرح ہم لوگوں کو موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ چند انسانوں کو دوست اور دوسروں کو دشمن خیال کرنے لگیں۔ یہ محض فضول سی بات ہے کیونکہ حقیقت میں کچھ بھی وجہ اختلاف نہیں۔

چیف ایڈیٹر: تو اس پریشان کن صورت حال سے کیسے نکلا جائے؟ ایسا کیوں نہ کریں کہ قدیم طرز زندگی کو آخری سلام کر دیں، اور نئی قسم کی دانشمندانہ اور انسان دوستی کی طرز زندگی کو اپنا لیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

پروفیسر یشپال: ہاں بھئی۔ اگر حکومت اسی کو پالیسی بناتی ہے تو شاید یہی ریاستی مذہب بن جائے۔ جو پہلے کی طرح تندی و ترشی کا موجب ہوگا۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ ہم معقول پسندی کی طرف کیوں مائل نہیں ہوتے۔ ہم ایک دوسرے کی طرف ہمدردی سے کیوں نہیں دیکھتے۔ ہم ان اختلافات کو جو حال ہی میں پیدا کیے گئے ہیں، کیوں عزیز رکھتے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے کوئی مذہب بھی ۵ ہزار برس سے زیادہ پرانا نہیں جہاں کہ انسانیت کروڑوں برس پرانی ہے۔ مذہب انسانی تاریخ کا بہت معمولی باب ہے۔ بہت سے مذہب تو اس سے بھی کم عمر کے ہیں اور ان کی چند شخصیتیں تو حال ہی میں ظہور میں آئیں۔

میں حیران ہوتا ہوں کہ انسانیت کو کیا ہو گیا ہے اس ماحول میں اسے کس قسم کا تہذیبی بوجھ اٹھانا پڑ رہا ہے اور یہ انسانی زندگی کا کیسے ایک لازمی جزو بن گیا ہے میں محسوس کرتا ہوں کہ وقت آ گیا ہے کہ ہم مل بیٹھیں کر وچار کریں اور موجودہ حقیقت کے پیش نظر قدم اٹھائیں۔ اگر ہم ایسا کر پائیں گے تو گویا کہ ہم ایسی ذمہ داری اٹھا رہے ہوں گے جو اکثر لوگ اٹھانا پسند نہیں کرتے بلکہ وہ اس کا تصور تک نہیں کرتے۔ وہ پہلے کی مثالیں ڈھونڈتے ہیں یہ کیونکر ہو۔ ہم جس بات کے خواہاں ہیں وہ کوئی معمولی چیز نہیں۔ ہم لوگوں سے کہہ رہے ہیں کہ وہ مثالوں کو چھوڑ کر نئے انداز سے عمل پیرا ہوں۔ انسان کو جب بھی کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو وہ نئے سرے سے سوچتا ہے۔ اور یہ ذرا مشکل سی بات ہے۔ کیونکہ اس کے لیے تو کچھ کر کے دکھانا ہوتا ہے ہمیں کچھ ایسا طریقہ نکالنا چاہیئے جس سے ہم جو کچھ خیال کریں اسے مجموعی طور پر صحیح اور دوسرے لوگ بھی

اندازسے غلط نہ مانیں۔ یہ بات تو ٹھیک ہے۔ ہم ایک طرح عمل کرتے ہیں اور دوسرے دوسری طرح۔ لیکن یہ دونوں طریقے صحیح ہیں۔ لیکن یہ مناسب نہیں کہ ہم ایک نقطے سے دوسرے پر چھلانگ لگا دیں۔ اگر ہم غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ پرانی لکیر کو پیٹنے کی ہمیں کوئی ضرورت ہی نہیں لیکن اس قسم کے طور طریقوں کو سماج میں رائج کرنا کار آزار ہے۔ عوام کو ایسا کرنے کے لیے کچھ راستہ دکھانا ہوگا۔ بدقسمتی سے یہ لوگ مختلف مذاہب اور اعتقادات سے گزرتے ہوئے آتے ہیں۔ ان کی اچھائیوں کو، ان کی بہترین خوبیوں کو کس طرح اخذ کیا جائے۔ اور کس طرح ان کو نئی اقدار کا روپ دیا جائے۔ جو سماجی طور پر قابل اعانت ہوں۔ اور جن کی حفاظت کی جا سکے۔ انسانوں کو ان اقدار سے یہ جانتے ہوئے کہ یہ پائیدار نہیں ہیں۔ ان پر چلنا چاہیئے۔ جیسے جیسے ہمارے سماج میں تبدیلیاں واقع ہوں گی۔ ان اقدار میں بھی تبدیلی آئے گی۔ انسانیت سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ نیم جمودی حالت سے ایک انقلابی زندگی کی طرف بڑھ رہی ہے اور یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ انقلابی زندگی ان دنوں تو جینے کے مترادف ہے۔ ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں، جہاں تبدیلیاں تیزی سے رونما ہو رہی ہیں۔ انسان اتنی جلدی مرتے نہیں ہیں جتنی تیزی سے ان کے گیان میں اضافہ ہوتا ہے۔ لگاتار تبدیلی اور علم و فن میں اضافہ اتنی تیزی سے ہو رہا ہے کہ یہ سب کچھ ایک انسان اپنی چھوٹی سی زندگی میں دیکھ سکتا ہے۔ لہذا انقلابی انداز سے جینے سے بہتر کوئی جینا نہیں ہے۔ اور یہ ایسی بات ہے۔ جسے دنیا کے بڑے سے بڑے رہنما بھی محسوس نہیں کر پاتے لہذا اگر ہم اس طرف قدم بڑھاتے ہیں تو ایک مبہم ماحول میں پہنچ جاتے ہیں۔ انسان یقینی طور پر بوکھلا جائے گا اگر وہ قدیم زمانے سے جو روایات چلی آ رہی ہیں ان میں سے کسی ایک کا سہارا نہیں لے گا۔ لیکن اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ اس میں بامعنی زندگی ہوگی اور اختلافات کی کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ لیکن اس کو حاصل کرنا بہت مشکل بات ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مستقبل میں ایسا نہیں ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ تصور ہی جانے خود ایک اعتقاد بن جائے

اور ہم پھر اس کے چکر میں کھو جائیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں بہت سے عقیدے بنانے سے گریز کرنا چاہیئے۔ یہ دور آزادی کا۔ مکمل آزادی کا ہے۔ اور ہمیں اس کے لیے کوشاں رہنا چاہیئے۔ محض معقولیت پسندی ہونا کافی نہیں۔ ہمیں کلی طور پر آزاد بھی ہونا چاہئے۔

چیف ایڈیٹر: جس طریقہ سے تعلیم دی جا رہی ہے اس میں بنیادی خرابیاں ہیں۔ ورنہ کیا بات ہے کہ ہمارا پڑھا لکھا طبقہ اس جھنڈ کی رہنمائی کرتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

پروفیسر میشپال: تعلیم میں بہت سی خرابیاں ہیں، اور یہ خرابیاں جان بوجھ کر پیدا نہیں کی گئیں بلکہ کچھ تو لاعلمی سے رونما ہوئیں۔ اور زیادہ تر اس لیے کہ تعلیم ایک نظام بن گیا ہے۔ ہم ہمیشہ تعلیمی نظام کی بات کرتے ہیں اور یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ تعلیم میں جمود دور زندگی سے بھی زیادہ لمبے عرصے کا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے نصاب کو تبدیل کرنے میں اس سے زیادہ وقت صرف ہوتا ہے جتنی عمر میں کہ طالب علم اسکول سے فارغ تحصیل ہو جاتا ہے تعلیمی نظام میں خرابیاں اس لیے ہیں کہ یہ ایک نظام ہے اور اس نظام میں جمود طاری رہی ہے۔ لہذا یہ روایاتی نظام بن کر رہ گیا ہے۔ جو نظام ایک خاص قسم کی تعلیمات ایک خاص قسم کی تشریحات چاہتا ہو۔ اگر ہم اس پر نظر نہیں رکھیں گے تو وہ روایتی بنتا چلا جائے گا۔ اس طرح اس سخت قسم کی ضروریات کی وجہ سے تعلیم اپنا مقصد کھو بیٹھے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جو کچھ بن گئے ہیں وہ محض باقاعدہ تعلیم سے نہیں جو ہمیں درسگاہوں میں دی گئی بلکہ جو ہم نے اپنے روزمرہ کے میل جول سے حاصل کی۔ ہم باہری دنیا سے جو تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ اس تمام تعلیم سے جو ہمیں اسکولوں میں دی جاتی ہے بہت زیادہ ہوتی ہے اور یہی ہمارے اطوار و کردار کی تشکیل کرتی ہے اور یہ بھی ہمارے تعلیمی نظام کا ایک جزو ہے۔ یوں کہئے کہ یہ مسئلہ انڈا پہلے یا مرغی سا بن جاتا ہے۔ سوال اٹھتا ہے کہ تمام سماج کو بدلا جائے جس نے مجھے تعلیم کے ذریعہ ڈھالا۔ یا میں پہلے اپنے آپکو سدھاروں تاکہ میں سماج کو سدھار سکوں۔ اس طرح یہ ایک مخلوط ردعمل ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ ہم کس کو اولین مان سکتے

ہیں۔ جب انسان میں تبدیلی آنا شروع ہوتی ہے تو معاشرہ بھی تبدیل ہونا شروع ہوتا ہے تعلیمی نظام بھی بدل جاتا ہے۔ اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ انسان زیادہ سے زیادہ بدلتے جاتے ہیں۔ لہذا آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہی ایک عنصر ہے اور کوئی دوسرا عنصر اس پر ردعمل پیدا نہیں کرتا۔ یہ ایک مخلوط نظام ہے۔ یہ اپنا خود جواز پیدا کرتا ہے۔ ہمیں ہر قسم کے عناصر پر نظر ڈالنی ہوگی۔ یقینی ہو سکتا کہ اگر ہم نے نصاب تعلیم میں تبدیلی لا دی تو ہر چیز میں تبدیلیاں شروع ہو جائیں گی۔

لیکن یہ بات تو واضح ہے کہ عام تعلیمی نظام سے انسان کی آزادی ممکن نہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ زیادہ پڑھے لکھے لوگ زیادہ آزاد منش ہوں گے۔ ان میں شاید زیادہ سوجھ بوجھ ہو۔ لیکن وہ آزاد نہیں ہیں۔

جب کوئی اپنی فیکٹری، یا مشین یا اپنے ذاتی تجربے میں مصروف ہوتا ہے تو بہت سائنسی مزاج اور منطق سے کام لیتا ہے۔ لیکن جب وہ مذہبی جنونیوں یا متعصب لوگوں سے ملتا ہے تو اسے یا تو ان کا ہم خیال ہونا پڑتا ہے یا وہ ایک الگ تھلگ زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے یہ ایک ایسا نظام ہے جہاں زندگی کی یک جہتی ممکن نہیں زندگی یوں ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے اور جب ان ٹکڑوں میں مذہبی جنون سما جاتا ہے تو ایک ہی ٹکڑے پر بھروسہ کیا جاتا ہے اور دوسرے ٹکڑے نظر انداز ہو جاتے ہیں اور یہی وہ جزو زندگی ہوتا ہے جو بسوں کو جلاتا ہے یا کسی کو قتل کر دیتا ہے، یا پاگلوں کی طرح نعرے لگاتا ہے — لہذا سوال یہ نہیں ہے کہ کسی انسٹی ٹیوشن کو تبدیل کر دیا جائے بسوال اس کے تمام لائحہ عمل میں تبدیلی لانے کا ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ میرے پاس اس کا جواب نہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہم نے سوالات کو صحیح طور پر پیش ہی نہیں کیا۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ بھلے بنو۔ نیک رہو۔ یا کتاب پڑھو۔ وہ کتاب پڑھو۔ یہ صحیفہ پڑھو۔ تم اچھے بنو گے۔ لیکن کونسی ایک کتاب یہ مقصد حاصل کر دے گی۔ کیا میں ان سب کو پڑھ ڈالوں۔ میں ان سب کو پڑھنے کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ میں صحیح اور نیک انسان بن جاؤں۔ لیکن کوئی حل پیش نہیں کیا گیا۔ اور یونہی نیک اعمال

گروہوں اور فرقوں میں بانٹ دیا ہے۔ یہاں تک کہ مذاہب کے اندر بھی یہ گروہ ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف ہیں علاوہ ازیں کئی اور باتیں ہیں جن کی بنا پر ہم ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں۔ ہم بنیادی یکسانیت کی طرف صحیح طور پر توجہ نہیں دیتے۔ مثلاً جو اتحاد ہمارے آئین میں ہے یا جس طرح سے ہم زندگی گزار رہے ہیں بلکہ تمام انسانوں، تمام زندگیوں تمام مادوں میں جو وحدت موجود ہے۔ یہی نہیں انسانوں کا آسمانی ستاروں اور سیاروں سے تعلق یا ان کا زمین سے تعلق اور زمین کا تمام دنیا سے رشتہ۔ اس قسم کا احساس ہمارے ہاں موجود نہیں ہے۔ یہ تو ہے کہ بعض مذاہب ان باتوں کا ذکر کرتے ہیں لیکن وہ اپنی قسم کی خاص زبان استعمال کرتے ہیں۔ اور جب تک وہی طرز گفتگو ہے مطلب حاصل نہیں ہوتا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اگر مذاہب کی جگہ کسی اور چیز کو دے دی جائے تو حالات میں کچھ بہتر تبدیلی ہو جائے گی۔ خرابی اس امر میں ہے کہ انسان اپنی کمزوری پر قابو نہیں پا سکا کہ جو چیز اس سے مختلف ہے وہ اس کی دشمن ہے۔ میری تو سمجھ سے باہر ہے کہ ہم سکون حاصل کرنے کے لیے اپنی ہی قسم کے لوگوں کے گلے کیوں چمٹے رہتے ہیں۔ شاید ہم ہر ایک سے یکسانیت نہیں پاتے۔ شاید یہ سائنس کا ہی کرشمہ ہو۔ لیکن محض سائنس کی الف، بے پڑھنے سے یہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ میرا خیال ہے کہ اس ماحول کو سمجھنے کے لیے ہمیں سائنس کے ساتھ ساتھ اخلاقی معیار بھی استعمال کرنا ہوگا۔ مذہبی نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی تاکہ ان باتوں کو صحیح طور پر سمجھ سکیں۔ اب تک ایسا نہیں ہوا۔ لیکن وقت آگیا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔

یہ ایک المیہ ہے کہ سائنس کی تعلیم اور اس کے تجربات محض استعمال کی حد تک ہی رہے ہیں۔ انکی بنیادی اقدار پر جو صادقیاں ہیں، دھیان نہیں دیا گیا۔ میرا خیال ہے کہ یہ سائنس کا دور نہیں ہے یہ ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے۔ ہم صحیح طور پر اس فرق کو نہیں سمجھ رہے۔ میں پھر دہراتا ہوں کہ سائنس کا زمانہ نہیں۔ میری دعا ہے کہ سائنس کا دور دورہ ہو اور ہم اس پر زیادہ سے زیادہ زور دیں۔

چیف ایڈیٹر: پھر ایک بار، میں کہوں گا کہ یہ مذہب ہی تو ہے جو ہمیں فرقہ بندی سکھاتا ہے اور انسانی ذہن کو فروغ پانے نہیں دیتا۔ اور اپنی جھنڈ میں رہتے ہوئے ہم تندی و ترشی کا شکار ہوتے ہیں۔ جو ہماری زندگیوں میں آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر طوفان پیدا کر دیتی ہیں۔ آپکا اس ضمن میں کیا خیال ہے؟

پروفیسر یشپال: ہاں تو یہ صحیح ہے کہ اگر کوئی شخص محض چند لوگوں تک محدود رہے اور وہی صحیفہ پڑھے جو وہ پڑھتے ہوں۔ اور انہی دستور پر چلے جو ان کا وطیرہ ہو تو وہ سوچنے لگتا ہے کہ زندگی گزارنے اور سوچنے کا یہی ڈھنگ برحق ہے۔ تو اس طرح وہ محدود ہو کر رہ جائیگا۔ لیکن یہ بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ اس کی پشت پر انسانی پیدائش کا بھی ہاتھ ہے۔ آپ علم زندگی معلوم نہیں کر سکتے۔ جو بات شاید میں واضح طور پر نہ کہوں وہ یہ ہے کہ سنسکرت کے شلوک تمام سچ کے مظہر ہیں۔ ہر ایک لفظ سچ ہے اور دوسری طرف چونکہ میں ان کی سریلی سے کو بچپن سے سنتا آ رہا ہوں۔ ان کا میرے ذہن کی یادوں پر گہرا اثر پڑا ہے۔ میں ان سے کھل اٹھتا ہوں۔ کلچر کے میدان میں اگر ہم ان سے لطف اندوز ہوں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہم آخر دوسری تہذیبی باتوں سے بھی تو لطف حاصل کرتے ہیں۔ جیسا کہ مجھے موسیقی سے دلچسپی ہے لیکن جو یہ کہے کہ دوسرا جو میری طرح نہیں خراب آدمی ہے۔ یہ بات برحق نہیں۔ لہذا ہر انسان کو یہ احساس ہونا چاہئے کہ میں جو کچھ بھی ہوں اس کی پشت پر میرے بچپن کے تجربات کا ہاتھ ہے اور دوسرا بھی اسی طرح اپنے بچپن کے تجربات سے بنا ہے۔ ہم دونوں میں کوئی وجہ اختلاف نہیں۔ چونکہ ہم دونوں ایک ہی طرح کے عمل سے گزرے ہیں اور اسی یکسانیت کی ہمیں نشاندہی کرنا ہوگی۔ اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ ہم ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں یا مختلف زبانیں بولتے ہیں یا مختلف کتابیں پڑھتے ہیں۔

میں سمجھ نہیں پا رہا کہ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ آخر انسانوں میں دشمنی کی وجہ کیا ہے۔ غالباً ہم اب تک خود کو سمجھ نہیں پائے۔ یہ بات سچ ہے کہ اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن، باہمی گفتگو اور ذاتی یا گروہی جلسوں میں ہم یگانگت کی بجائے اختلاف پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اس طرح ہم لوگوں کو موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ چند انسانوں کو دوست اور دوسروں کو دشمن خیال کرنے لگیں۔ یہ محض فضول سی بات ہے۔ کیونکہ حقیقت میں کچھ بھی وجہ اختلاف نہیں۔

چیف ایڈیٹر: تو اس پریشان کن صورت حال سے کیسے نکلا جائے؟ ایسا کیوں نہ کریں کہ قدیم طرز زندگی کو آخری سلام کر دیں، اور نئی قسم کی دانشمندانہ اور انسان دوستی کی طرز زندگی کو اپنا لیں۔ آپکا کیا خیال ہے؟

پروفیسر یشپال: ہاں بھئی۔ اگر حکومت اسی کو پالیسی مانتی ہے تو شاید یہی ریاستی مذہب بن جائے۔ جو پہلے کی طرح تندی و ترشی کا موجب ہوگا۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ ہم معقول پسندی کی طرف کیوں مائل نہیں ہوتے۔ ہم ایک دوسرے کی طرف ہمدردی سے کیوں نہیں دیکھتے۔ ہم ان اختلافات کو جو حال ہی میں پیدا کئے گئے ہیں، کیوں عزیز رکھتے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے کوئی مذہب بھی پانچ ہزار برس سے زیادہ پرانا نہیں جہاں کہ انسانیت کروڑوں برس پرانی ہے۔ مذہب انسانی تاریخ کا بہت معمولی باب ہے۔ بہت سے مذہب تو اس سے بھی کم عمر کے ہیں اور ان کی چند شخصیتیں تو حال ہی میں ظہور میں آئیں۔

میں حیران ہوتا ہوں کہ انسانیت کو کیا ہو گیا ہے اس ماحول میں اسے کس قسم کا تہذیبی بوجھ اٹھانا پڑ رہا ہے اور یہ انسانی زندگی کا کیسے ایک لازمی جزو بن گیا ہے میں محسوس کرتا ہوں کہ وقت آگیا ہے کہ ہم مل بیٹھیں سوچ وچار کریں اور موجودہ حقیقت کے پیش نظر قدم اٹھائیں۔ اگر ہم ایسا کر پائیں گے تو گویا کہ ہم ایسی ذمہ داری اٹھا رہے ہوں گے جو اکثر لوگ اٹھانا پسند نہیں کرتے بلکہ وہ اسکا تصور تک نہیں کرتے۔ وہ پہلے کی مثالیں ڈھونڈتے ہیں ہر کیونکر ہو۔ ہم جس بات کے خواہاں ہیں وہ کوئی معمولی چیز نہیں، ہم لوگوں سے کہہ رہے ہیں کہ وہ مثالوں کو چھوڑ کر نئے انداز سے عمل پیرا ہوں۔ انسان کو جب بھی کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو وہ نئے سرے سے سوچتا ہے۔ اور یہ ذرا مشکل سی بات ہے۔ کیونکہ اس کے لیے تو کچھ سرمایہ درکار ہوتا ہے ہمیں کچھ ایسا طریقہ نکالنا چاہئے جس سے ہم جو کچھ خیال کریں اسے مجنونانہ طور پر صحیح اور دوسروں کو اسی

انداز سے غلط نہ مانیں۔ یہ بات تو پختگی ہے۔ ہم ایک طرح عمل کرتے ہیں اور دوسرے دوسری طرح۔ لیکن یہ دونوں طریقے صحیح ہیں۔ لیکن یہ مناسب نہیں کہ ہم ایک نقطے سے دوسرے پر چھلانگ لگا دیں۔ اگر ہم غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ پرانی لکیر کو پیٹنے کی ہمیں کوئی ضرورت ہی نہیں لیکن اس قسم کے طور طریقوں کو سماج میں رائج کرنا کارآمد ہے۔ عوام کو ایسا کرنے کے لیے کچھ راستہ دکھانا ہوگا۔ بدقسمتی سے یہ لوگ مختلف مذاہب اور اعتقادات سے گزرتے ہوئے آتے ہیں۔ ان کی اچھائیوں کو، ان کی بہترین خوبیوں کو کس طرح اخذ کیا جائے۔ اور کس طرح ان کو نئی اقدار کا روپ دیا جائے۔ جو سماجی طور پر قابل اعانت ہوں۔ اور جن کی حفاظت کی جا سکے۔ انسانوں کو ان اقدار سے یہ جانتے ہوئے کہ یہ پائیدار نہیں ہیں۔ ان پر چلنا چاہیئے جیسے جیسے ہمارے سماج میں تبدیلیاں واقع ہوں گی۔ ان اقدار میں بھی تبدیلی آئے گی۔ انسانیت سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ نیم جمودی حالت سے ایک انقلابی زندگی کی طرف بڑھ رہی ہے اور یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ انقلابی زندگی ان دنوں تو جینے کے مترادف ہے۔ ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں، جہاں تبدیلیاں تیزی سے رونما ہو رہی ہیں۔ انسان اتنی جلدی مرتے نہیں ہیں جتنی تیزی سے ان کے گیان میں اضافہ ہوتا ہے۔ لگاتار تبدیلی اور علم و فن میں اضافہ اتنی تیزی سے ہو رہا ہے کہ یہ سب کچھ ایک انسان اپنی چھوٹی سی زندگی میں دیکھ سکتا ہے۔ لہذا انقلابی انداز سے جینے سے بہتر کوئی جینا نہیں ہے۔ اور یہ ایسی بات ہے۔ جسے دنیا کے بڑے سے بڑے رہنما بھی محسوس نہیں کر پاتے لہذا اگر ہم اس طرف قدم بڑھاتے ہیں تو ایک مبہم ماحول میں پہنچ جاتے ہیں۔ انسان یقینی طور پر بوکھلا جائے گا اگر وہ قدیم زمانے سے جو روایات چلی آ رہی ہیں ان میں سے کسی ایک کا سہارا نہیں لے گا۔ لیکن اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ اس میں بامعنی زندگی ہوگی اور اختلافات کی کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ لیکن اس کو حاصل کرنا بہت مشکل بات ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مستقبل میں ایسا نہیں ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ تعصب ہو جائے خود ایک اعتقاد بن جائے اور ہم پھر اس کے چکر میں کھو جائیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں بہت سے عقیدے بنانے سے گریز کرنا چاہیئے۔ یہ دور آزادی کا۔ مکمل آزادی کا ہے۔ اور ہمیں اس کے لیے کوشاں رہنا چاہیئے۔ محض معقولیت پسندی ہونا کافی نہیں۔ ہمیں کلی طور پر آزاد بھی ہونا چاہیئے۔

چیف ایڈیٹر: جس طریقہ سے تعلیم دی جا رہی ہے اس میں بنیادی خرابیاں ہیں۔ ورنہ کیا بات ہے کہ ہمارا پڑھا لکھا طبقہ اس جمنڈ کی رہنمائی کرتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

پروفیسر یشپال: تعلیم میں بہت سی خرابیاں ہیں، اور یہ خرابیاں جان بوجھ کر پیدا نہیں کی گئیں بلکہ کچھ تو لاعلمی سے رونما ہوئیں۔ اور زیادہ تر اس لیے کہ تعلیم ایک نظام بن گیا ہے۔ ہم ہمیشہ تعلیمی نظام کی بات کہتے ہیں اور یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ تعلیم میں جمود دور زندگی سے بھی زیادہ لمبے عرصے کا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے نصاب کو تبدیل کرنے میں اس سے زیادہ وقت صرف ہوتا ہے جتنی عمر میں کہ طالب علم اسکول سے فارغ تحصیل ہو جاتا ہے تعلیمی نظام میں خرابیاں اس لیے ہیں کہ یہ ایک نظام ہے اور اس نظام میں جمود طاری رہی ہے۔ لہذا یہ روایاتی نظام بن کر رہ گیا ہے۔ جو نظام ایک خاص قسم کی تعلیمات ایک خاص قسم کی تشریحات چاہتا ہو۔ اگر ہم اس پر نظر نہیں رکھیں گے تو وہ روایتی بنتا چلا جائے گا۔ اس طرح اس سخت قسم کی ضروریات کی وجہ سے تعلیم اپنا مقصد کھو بیٹھے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جو کچھ بن گئے ہیں وہ محض باقاعدہ تعلیم سے نہیں جو ہمیں درسگاہوں میں دی گئی بلکہ جو ہم نے اپنے روزمرہ کے میل جول سے حاصل کی۔ ہم باہری دنیا سے جو تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ اس تمام تعلیم سے جو ہمیں اسکول میں دی جاتی ہے بہت زیادہ ہوتی ہے اور یہی ہمارے اطوار و کردار کی تشکیل کرتی ہے اور یہ بھی ہمارے تعلیمی نظام کا ایک جزو ہے۔ یوں کہیئے کہ یہ مسئلہ انڈا پہلے یا مرغی سا بن جاتا ہے۔ سوال اٹھتا ہے کہ تمام سماج کو بدلا جائے جس نے مجھے تعلیم کے ذریعہ ڈھالا۔ یا میں پہلے اپنے آپکو سدھاروں تاکہ میں سماج کو سدھار سکوں۔ اس طرح یہ ایک مخلوط ردعمل ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ ہم کس کو اولین مان سکتے ہیں۔ جب انسان میں تبدیلی آنا شروع ہوتی ہے تو معاشرہ بھی تبدیل ہونا شروع ہوتا ہے تعلیمی نظام بھی بدل جاتا ہے۔ اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ انسان زیادہ سے زیادہ بدلتے جاتے ہیں۔ لہذا آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہی ایک عنصر ہے اور کوئی دوسرا عنصر اس پر ردعمل پیدا نہیں کرتا۔ یہ ایک مخلوط نظام ہے۔ یہ اپنا خود جواز پیدا کرتا ہے۔ ہمیں ہر قسم کے عناصر پر نظر ڈالنی ہوگی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اگر ہم نے نصاب تعلیم میں تبدیلی لا دی تو ہر چیز میں تبدیلیاں شروع ہو جائیں گی۔

لیکن یہ بات تو واضح ہے کہ عام تعلیمی نظام سے انسان کی آزادی ممکن نہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ زیادہ پڑھے لکھے لوگ زیادہ آزاد منش ہوں گے۔ ان میں شاید زیادہ سوجھ بوجھ ہو۔ لیکن وہ آزاد نہیں ہیں۔

جب کوئی اپنی فیکٹری، یا مشین یا اپنے ذاتی تجربے میں مصروف ہوتا ہے تو بہت سائنسی مزاج اور منطق سے کام لیتا ہے۔ لیکن جب وہ مذہبی جنونیوں یا متعصب لوگوں سے ملتا ہے تو اسے یا تو ان کا ہم خیال ہونا پڑتا ہے یا وہ ایک الگ تھلگ زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے یہ ایک ایسا نظام ہے جہاں زندگی کی یک جہتی ممکن نہیں زندگی یوں ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے اور جب ان ٹکڑوں میں مذہبی جنون سما جاتا ہے تو ایک ہی ٹکڑے پر بھروسہ کیا جاتا ہے اور دوسرے ٹکڑے نظر انداز ہو جاتے ہیں اور یہی وہ جزو زندگی ہوتا ہے جو بسوں کو جلاتا ہے یا کسی کو قتل کر دیتا ہے، یا پاگلوں کی طرح نعرے لگاتا ہے — لہذا سوال یہ نہیں ہے کہ کسی انسٹی ٹیوشن کو تبدیل کر دیا جائے بسوال اس کے تمام لائحہ عمل میں تبدیلی لانے کا ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے! میرے پاس اس کا جواب نہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہم نے سوالات کو صحیح طور پر پیش ہی نہیں کیا۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ بھلے بنو۔ نیک رہو۔ یا کتاب پڑھو۔ وہ کتاب پڑھو۔ یہ صحیفہ پڑھو۔ تم اچھے بنو گے۔ لیکن کونسی ایک کتاب یہ مقصد حاصل کر دے گی۔ کیا میں ان سب کو پڑھ ڈالوں۔ میں ان سب کو پڑھنے کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ میں صحیح اور نیک انسان بن جاؤں۔ لیکن کوئی حل پیش نہیں کیا گیا۔ اور یونہی نیک انسان

بد تعلیم کی نشر ہو کی جاتی ہے تو میرا خیال ہے کہ ہم پھر ایک دلدل میں پھنس جاتے ہیں۔

چیف ایڈیٹر: ہم دیکھ رہے ہیں کہ الیکٹرونک کے آلات مواصلات اور نشر و اشاعت نے ہماری زندگیوں میں بے حد دخل دینا شروع کیا ہے۔ ہمارے پاس اب سب سادھن ہیں۔ آپ بتائیے اس رو کو کیسے روکا جا سکتا ہے؟

پروفیسر بیشپال: براڈ کاسٹنگ کو ہی لیجئے۔ اور اگر سلسلۂ مواصلات براڈ کاسٹنگ جیسا ہی رہا جہاں چند ایک لوگوں کو بہت زیادہ لوگوں سے خطاب کرنے کا موقع ملتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ ہم براڈ کاسٹنگ کا کوئی نصاب بنا پائیں۔ جو آزاد ہو، اور سرفرازی کا موجب بنے۔ یا اس قسم کے نصاب کو ممکن بنا دے لیکن ایسا ہوتا نظر نہیں آتا۔ لہٰذا کوشش یہ کی جانے گی کہ ہم معاشرہ کے ہر عنصر کو خوش رکھیں۔ اس سے یہ رجحان پیدا ہوگا کہ ہم سماج کے مختلف عناصر کے تعصبات کو بھی ہوا دیں۔ اور یہ تو صرف براڈ کاسٹنگ کا مسئلہ ہے۔ اور میرا خیال نہیں کہ یہ کوئی دل پسند اور اچھی بات ہوگی۔

میرا یہ خیال ہے کہ ہمیں میڈیم کی جانب آہستہ آہستہ جانا چاہیئے۔ جہاں لوگوں سے خطاب ہی نہیں کیا جاتا بلکہ جہاں لوگ بھی خطاب کر سکتے ہیں جہاں لوگ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہاں مختلف نظر آنے والوں میں کوئی یکسانیت بھی ظاہر ہو سکتی ہے اور اسی باہمی اختلاط سے ہم ان لوگوں کو جو ایک دوسرے سے دور ہی کیوں نہ ہوں۔ سمجھنے اور ان کی قدر کرنے کے اہل ہو سکتے ہیں۔ میں نے لوگوں کو دور دراز علاقوں میں ناچتے اور کچھ کرتے دیکھا ہے۔ یہ بجائے خود ایک اکائی نہیں بن جاتے۔ لیکن ایسا ہو سکتا ہے۔ لیکن نہ ہونے سے یہ کچھ تو غنیمت ہے۔

لیکن ان کا آپس میں ردعمل دکھانا اور براڈ کاسٹنگ یا کسی دوسرے میڈیم سے ان کا اختلاط ظاہر کرنا۔ ایک چیلنج ہے۔ جس کی طرف آہستہ آہستہ رجوع کرنا چاہیئے۔ اور جب ایسا کریں گے تو جغرافیائی دوری بلکہ احساس اور تجربات کے اختلافات جو حقیقی معنوں میں انسان کو بانٹتے کے ذمہ دار ہیں۔ یہ سب دور ہو جائیں گے۔

یہ ایک امید کی کرن ہے۔ ضروری نہیں کہ ایسا ہو جائے کیونکہ جب ہم کبھی دوری کا ذکر کرتے ہیں تو ہم ہمیشہ ایک خاص موضوع کا انتخاب کرتے ہیں۔ نازک معاملات کو چھوڑ دیتے ہیں۔ ایک ہی خاندان کیوں چنا جائے۔ جب ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا اس قدر عام ہے۔ تو تمام خاندان کیوں نہ چن لیے جائیں۔ ہر ایک انسان دوسرے کو دیکھ سکتا ہے۔ اور اثر انداز ہو سکتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہو رہا۔ کیونکہ ہم ایک خاص چیز کو جسے ہم باعزت سمجھتے ہیں۔ چنتے ہیں اور اسی پر ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں۔ جب ہم کسی چیز کو فضول پاتے ہیں تو ہم ایک دوسرے کو چھوتے تک نہیں ہیں ہم باہم تبادلۂ خیالات نہیں کرتے۔ ہم باہم مل کر ہنستے تک نہیں۔ لیکن ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ ہو (مواصلات کا) جہاں یہ ممکن ہو سکے تو شاید ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ہم ان رکاوٹوں کو جو بناوٹی طور پر کھڑی کر رکھی ہیں، توڑ سکیں اور نعرہ بازی سے اوپر اٹھ کر حقیقی معنوں میں یہ محسوس کرنے لگیں کہ ہم ایک ہیں۔ ایک جیسے ہیں۔ ہم ایک طرح چیختے ہیں، ایک طرح ہنستے ہیں۔ ایک طرح زخم دیتے ہیں۔ اور ان باتوں کو ہم اپنے گھر والوں پوری طرح سمجھنے لگیں گے۔

جب میں یہ سب کچھ کہہ رہا ہوں۔ مجھے اس امر کا بھی احساس ہے کہ شاید یہ سب ممکن نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس ضمن میں بہت سی رکاوٹیں ہیں۔ محبت ایک جذبہ ہے جب اس کو بہت سے لوگوں میں بانٹا جاتے گا تو وہ محض نام کی محبت رہ جائے گی۔ اب ایک بناوٹی لہر چل نکلی ہے جس کی مختلف صفات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی خاندان میں آپ ایک کو دوسرے سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ لیکن اس احساس کو جب آپ ایک سے زیادہ پیار کرتے ہوں تو دوسرے کو پیار کے نااہل نہیں کہنا ہوگا۔ لیکن آپ کو اس سے نفرت تو نہیں کرنی ہوگی۔ آپ کو دیوار کے اس طرف تو نہ چلا جانا ہوگا۔ یہ شاید انسانی یا جبلی کمی ہے۔ چند سے ہم بے حد پیار کریں گے لیکن ہمیں اس امر کی اجازت ہونی چاہیئے کہ میں جسے چاہوں چن لوں۔ اور ان کو دوست بناؤں جو میری دوستی کے اہل ہیں۔ لیکن ایسا ہوتا ہے کہ سب لوگ یہ آزادی عمل حاصل نہیں کر پاتے جبکہ یہ ضروری ہے آزادی ہر ایک انسان کو میسر ہونی چاہیئے۔ لیکن یہ کہنا کہ اگر میں کسی کا دوست نہیں ہوں، تو میں اس کا دشمن ہوں یہ مناسب نہیں احساس سے ہمیں کسی نہ کسی طرح چھٹکارا پانا ہوگا۔

چیف ایڈیٹر: نشر و اشاعت کے تمام موثر ذرائع حکومت کے کنٹرول میں ہیں۔ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ سرکار کو ان ذرائع سے مذاہب کی ترویج کرنے کی بجائے انسانیت اور معقولیت کو فروغ دینے کا کام سرانجام دینا چاہیئے؟

پروفیسر بیشپال: میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کونسا ذریعہ نشر و اشاعت زیادہ موثر ہے اور سرکاری کنٹرول میں ہے۔ ہم اس امر پر زور دیتے ہیں کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن بہت موثر ذرائع ہیں۔ شاید یہ درست ہے۔ اور شاید یہ درست نہ بھی ہو۔ (دوسری طرف) ہم جو کچھ منہ سے کہتے ہیں جو کچھ بازاروں میں ہوتا ہے۔ جو کچھ ان جگہوں پر ہوتا ہے جہاں لوگ آتے جاتے اور مل بیٹھتے ہیں۔ مذہبی مقامات بھی ان میں شامل کیجئے۔ یہ سب زبردست اثر ڈالتے ہیں۔ اب یہ ایک فیشن بن رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بات صحیح بھی ہو کہ موثر ذرائع مواصلات و نشر و اشاعت سرکاری تحویل میں ہیں لیکن اخبارات تو نہیں۔

اس امر کے باوجود جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا۔ یہ ذرائع ہر ایک طبقہ کو خوش رکھنے کے لیے ان کے ہر قسم کے تعصبات کو ہوا دیتے ہیں اور ان کی بری بھلی باتوں کو نشر کرتے ہیں۔ اگر اس سے وہ کامیاب ہو جاتے ہیں تو وہ اس کو دہراتے رہتے ہیں۔

آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کچھ چیزوں کو ممنوع قرار دینا چاہیئے۔ ان کی نشر و اشاعت کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ وہ غیر معقول چیزیں ہیں۔ وہ انسان کی ترقی کی بجائے اس کے انحطاط کی ذمہ دار ہیں۔ میں اس بات کو مانتا ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کون واضح کرے گا کہ کس چیز کو ممنوع قرار دیا جانا چاہیئے اور جب ہم ایسا کرنا چاہیں گے تو بہت سے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ میں اس امر کو تسلیم کرتا ہوں کہ ہمیں انسانیت اور معقولیت کی نشر و

(باقی صفحہ ۱۳ پر)

ہیرن مکرجی*

مذہب پر لگام

نہیں ہمیں برداشت نہیں کرنا چاہیے

یوجنانے پوچھا ہے "خرافات کو کیوں برداشت کیا جائے؟ اس استفسار کا مطلب ایسے جوابات حاصل کرنا ہے جن سے انسان دوستی کے جذبے کو فروغ دینے کی کوشش میں مدد مل سکے۔ اس سادہ مگر اعلیٰ اصطلاح کی فکر اور عمل کے لحاظ سے بنیادی حدود ہیں جالانکہ بدلتے ہوئے تاریخی عمل میں ان میں تبدیلی ہو رہی ہے۔ آج کے ہندوستان میں جہاں خالصتان اور دوسری تخریبی اور ذلیل فرقہ وار شرارتیں منظر پر چھائی ہوئی ہیں۔ ہم قومی یکجہتی کے لیے جو کچھ بھی کر سکے ہیں اُسے ایک مایوس کن انتشار کا سامنا ہے ایسے حالات میں انسان دوستی کی تلاش بنیادی طور پر اہم ہے۔

آج کل صحافت میں موضوعات کو سنسنی خیز ڈھنگ سے پیش کرنے اور مسائل کو دیدہ دانستہ اشتعال انگیز زبان میں بیان کرنے کا جو فیشن ہے اُس سے ہم ایک قسم کی چڑ سی محسوس کر سکتے ہیں۔ ہمیں اپنے روشن خیال طبقے کے بارے میں بھی زیادہ وہم و گمان نہیں ہو سکتا جو ایک مشکوک طبقہ ہے کیوں کہ جہاں تک سرگرم شہری صفات کا تعلق ہے وہ عام طور پر اپنے ہی حال میں مست کنوئیں کے مینڈک کی مانند ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ اس امر سے بھی واقف ہوں گے کہ گلے شکوے خواہ وہ کتنے بھی ایماندار ہوں اور اچھے الفاظ میں کئے جائیں، اکثر بے کار اور بے مطلب ہوتے ہیں۔ کیا ہندوستان کی قدیم دانش نہیں یہ درس نہیں دیتی کہ "آتما یعنی رُوح پند و نصیحت سے حاصل نہیں ہو سکتی"۔ پھر بھی یہ اچھا ہے کہ یوجنانے سنجیدگی سے یہ سوال کیا کہ خرافات کو کیوں برداشت کیا جائے؟ حالاں کہ اس ضمن میں اپنے پڑھے لکھے طبقے کے بارے میں سوچ کر ہی مجھے ہنسی آتی ہے۔"

یہ لفظ خرافات یا بے ہودگی ہے جو "سودیشی" پر مہاتما گاندھی کی عظیم تقریر کی یاد دلاتا ہے جب ۱۴ فروری ۱۹۱۶ کو انھوں نے اپنے منفرد انداز بیان میں کہا "ہاں تو ہندوستان ایک عجیب و غریب ملک ہے۔ کیا یہ بیہودگی نہیں ہے کہ جب ایک نیک مسلمان آپ کو صاف ستھرا پانی پینے کے لیے پیش کرے لیکن آپ اپنی پیاس کو نہ بجھائیں اور ہزاروں ہندو پیاس سے مرنا پسند کریں گے لیکن کسی مسلم گھر سے پانی نہیں پئیں گے۔ ایسے بیوقوف لوگوں کو اگر ایک بار یقین ہو جائے کہ اُن کا دھرم کیا ہے کہ اُنھیں صرف ہندوستان میں بنے ہوئے کپڑے پہننے چاہئیں اور ہندوستان میں پیدا ہوا اناج کھانا چاہیئے تو وہ کہیں اور بنا ہوا کپڑا پہننے اور کہیں اور سے آئی خوراک کھانے سے انکار کر سکتے ہیں۔" اُس وقت ہندوستان کی عوامی زندگی میں یہ ایک قطعاً نئی آواز تھی۔ ایک ایسے انسان کی آواز جو ہندوستان کی دھرتی سے اُٹھا تھا، ایک انسان جو عجیب و غریب متضاد اور ناممکن باتیں کہہ رہا تھا۔ لیکن وہ یہ باتیں اپنے اعتقاد کے دباؤ اور شدت اور اپنے لوگوں کی عام زندگی میں شرکت کے جذبے سے کہہ رہا تھا جو پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

ہندوستان کے مشہور رہنما کے طور پر اپنے بہترین دنوں میں گاندھی جی (اُن کے ہی الفاظ میں) آگ سے کھیلے اور شاید اپنے وقت کے تقاضوں کے سبب مذہب کو سیاست میں داخل کیا۔ اگرچہ انھوں نے ایسا اپنی نیک نیتی اور توقعات کے مطابق کیا لیکن یہ کوشش اکثر بجائے خود شکست کا سبب بنی۔

کیا مہاتما جی نے اپنے آپ کو مایوس نہیں پایا؟

جب تقسیم شدہ ہندوستان کو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو آزادی ملی تو مہاتما گاندھی جن کا خدا اور انسان نے

* ماہر امور پارلیمنٹ

۱۵ اگست خصوصی شمارہ

ساتھ نہ دیا۔ آزادی کی خوشیوں میں شریک نہیں ہو سکے۔ اگرچہ یہ لنگڑی اور کٹی پھٹی آزادی تھی۔ پھر بھی آزادی تو تھی؟ دنیا کے چالاک ترین سامراج نے ہم سے ہماری سیاسی ناکامی کی قیمت جبراً وصول کر لی تھی (یہ صرف گاندھی جی یا کانگریس کی ناکامی ہی نہیں تھی) اور یہ ناکامی ہمالیہ سے لے کر سمندر تک ہماری چمکتی ہوئی سرزمین کے اتحاد کی اُمیدوں کی موت تھی۔ تاہم ہندوستان کی آزادی کی جد و جہد کو مہاتما گاندھی کی سب سے بڑی دین یہ ایمان اور یقین تھا جسے انھوں نے عملی طور پر ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اگر بنیادی طور پر کوئی تبدیلی لانی ہے تو ہمارے کروڑوں عوام کو متحرک کر کے عمل کی ترغیب دینی ہو گی۔ آج ہم انسان دوستی کی جو تلاش کر رہے ہیں اور جس کے لیے ہمیں اپنے ذہن و قلب سے رسوم و روایات کے بنائے ہوئے جالے صاف کرنے کی ضرورت ہے وہ مذاکروں یا مباحثوں یا اعلیٰ طبقے کی بیداری سے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ صرف عوام کو متحرک کر کے حاصل ہو سکتی ہے جو حقیقی زندگی کے منطق سے آگاہ ہوں۔ لہٰذا ہمیں دانشوروں کی مفروضہ اعلیٰ بانیوں کی اس رائے سے ہی مطمئن نہیں ہو جانا چاہیے، مثلاً یہ کہ مذہب کو اُس کے مناسب مقام پر رکھا جائے یا عوامی زندگی میں سیکولر سیاست کا عمل دخل نہیں ہونا چاہیے۔ یا یہ کہ ہم آج مذہب کو گرفت میں لے کر ایسا کر سکتے ہیں کہ وہ گھروں یا عبادت گاہوں تک ہی محدود رہے۔" بے شک یہ ایک اچھا خیال ہے لیکن بدقسمتی سے ہم ایسا سوچتے ہوئے اپنی بے ڈھب صورتِ حال اور اپنے سامنے مسائل کو بھول جاتے ہیں جو ہمارے لیے ایک قسم کا فوری اور خطرناک چیلنج ہے، اور جس کے بارے میں ایک بار کارل مارکس نے کہا کہ یہ تمام نسلوں کی ایک روایت ہے"۔

مہاتما گاندھی کے شاید سب سے جدید خیال پیلے جواہرلال نہرو نے دوسری دہائی کے وسط میں یہ محسوس کیا کہ ہندوستان کو اتنا خطرہ اشتراکیت سے نہیں جتنا فرقہ داری سے ہے۔ انھوں نے ۱۹۲۶ء میں اپنے ایک دوست کو خط میں لکھا:۔

"مذہب کی یہ جائز اور ناجائز اولاد میری برداشت سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔" جب عوامی تحریکوں کے زور کے بغیر جن کا تعلق ہمارے عوام کی حقیقی زندگی سے ہو محض اخلاقی ترغیبات کی بنا پر ہندو مسلم اتحاد کا خیال کمزور ثابت ہوا اور محض اعلیٰ طبقے کی سرگرمی اگر بے حقیقت نہیں تو نہایت ناکافی محسوس ہوئی تو گاندھی جی نے ایک غیر معمولی موقع پر یکم اپریل ۱۹۲۶ء کو جواہرلال نہرو کو لکھا "مجھے تمھاری اس رائے سے اتفاق ہے کہ ہمیں امیروں اور پڑھے لکھے با آواز لوگوں کی مدد کے بغیر تحریک چلانی چاہیے لیکن ابھی اس کے لیے وقت نہیں آیا۔"

مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے متشددانہ طریقوں کے استعمال کے بارے میں متواتر آمادگی کے باوجود انھوں نے عوام کو متحرک کرنا مناسب سمجھا گاندھی جی اپنے فلسفیانہ تصوّرات کے سبب اُن طریقوں سے محتاط رہے جنھیں انھوں نے صدی کی تیسری دہائی کے آخر میں ایک بار "انقلاب اور سرخ تباہی" کے نام سے پکارا۔ تاہم یہ ایک الگ کہانی ہے۔

جواہرلال نہرو کے والد موتی لال کسی طور پر انقلابی نہیں تھے لیکن وہ اکثر اپنے خیالات کے بارے میں بڑے صاف گو تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس معاملے کی تہہ تک پہنچے۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے ایک حامی کے طور پر اپنے ساتھی ایم۔اے انصاری کو (۷ار فروری ۱۹۳۰) کو لکھا کہ یہ اتحاد اس کی خوبیوں یا فوائد کا پرچار کر کے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں یہ کام اس طرح سرانجام دینا چاہیے جس سے ہندو یا مسلمان یہ محسوس نہ کریں وہ اتحاد کے لیے کام کر رہے ہیں اور یہ کام خاص طور سے ملک کی آزادی کی لڑائی کے عمل کے دوران اقتصادی بنیادوں پر کیا جا سکتا ہے۔" یہ وہ خیال تھا خواہ اس کا ادراک محدود تھا اور جو ماسوائے اقلیتی تحریکوں کے کبھی ہمارے عوام تک مناسب پیمانے پر نہیں پہنچایا گیا، جس نے آزادی کے بعد ہندوستان کو اُس راستے کو اختیار کرنے سے باز رکھا جو پاکستان نے اختیار کیا ہے اور جس کی بدولت وہ اپنے آپ کو ایک سیکولر ملک کہہ سکا ہے اور جہاں عوام کو بلا لحاظ مذہب و ملت (ملک بے دین ہونے پر بھی) شہریت کے پورے حقوق حاصل ہیں۔

یہ ایک اچھا قدم تھا لیکن ہمارے ماضی کے تقاضوں کے سبب یہ زیادہ پیش رفت نہیں کر سکا۔ اس کا سبب صدیوں کی محرومی اور تقریباً دو صدیوں کی سامراجی غلامی ہے جس کی لطیف اخلاقی کمزوری کی کیفیت کو ہم ابھی تک خیرباد کہنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ روس میں ہمارے سفیر شری کے پی ایس مینن نے جب پاکستان کے موضوع پر اسٹالن سے ملاقات کی تو اسٹالن نے کہا "یہ کتنا فرسودہ اور قدیم خیال ہے کہ ایک ملک کی بنیاد مذہب پر رکھی جائے۔" لیکن آج بھی کتنی ہی ظلمتیں، احیائے مذہب کی تحریکیں اور تاریخی تضاد ہمیں آزادی کی تکمیل کے لیے عوامی ضروریات پر مبنی، عقلی اور حقیقت پسندانہ ترقی سے دُور رکھتے ہیں۔

جواہرلال نہرو نے آزادی کے بعد کہا تھا "ہم کسی فرقہ پرستی کو برداشت نہیں کریں گے اور ہم ایک ایسے آزاد سیکولر ملک کی تعمیر کر رہے ہیں جہاں ہر مذہب اور عقیدے کو پوری آزادی اور عزت حاصل ہے۔" سیکولرازم کی یہ موزوں تعریف تو نہیں تھی البتہ کام چلانے کے لیے کافی تھی۔ جواہرلال نہرو نے کم از کم اُس وقت اپنی یاد کے منوانے کی کوشش کی جب صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد نے نجوم کے علم کی وجوہ پر جمہوریت کے افتتاح کے لیے ۲۶ جنوری کے دن کے انتخاب پر اعتراض کیا۔ وہ صدر کی سومناتھ مندر یا کنبھ میلے کی یاترا کی تشہیر پر بھی ناک بھوں سکیڑتے تھے۔ تاہم بدقسمتی سے خود اُن کی لڑکی اندرا نے عبادت گاہوں اور "خدا رسیدہ" مرد عورتوں کے پاس جا جا کر جس کی اخباروں میں خوب

تشہیر ہوئی سیکولرازم کو کمزور کیا۔ شکر کا مقام ہے کہ اُن کی یہ زیارتیں صرف ایک مذہب تک ہی محدود نہیں تھیں۔ راشٹرپتی بھون میں آج جو صدر جمہوریہ ہیں انھوں نے مشتبہ سنتوں کے آگے سر جھکایا ہے اور مسلح افواج کے سپریم کمانڈر کے عہدے سے تقاضوں کے خلاف سورن مندر میں جمع دہشت پسندوں کو نکالنے کے لیے ناگزیر فوجی کارروائی کے لیے گرنتھیوں کی سرزنش کو قبول کیا ہے۔ اس لیے اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ جہاں تک ہندوستان کے سیکولرازم کا تعلق ہے اُس میں کچھ تنزلی ہوئی ہے جو ہماری ملکی سیاست کے لیے خطرے کی علامت ہے۔

آج شاید چند عالی مرتبہ لوگ ہی این۔ ٹی راما راؤ پر پتھر اٹھا سکتے ہیں جو بھگوے کپڑے پہنتا ہے، چیتنیہ رتھ کی سواری کرتا ہے اور جس کے مخلص پیرو کار ناریل کے پانی سے اُس کے پاؤں دھوتے ہیں اور جیسے کہ کھلے عام چھپا ہے اس پانی کو پیتے ہیں۔ ایسے موقع پر ہمیں ۱۹۲۱ میں رابندر ناتھ ٹیگور کے گاندھی جی کو بھیجے احتجاج کی یاد آتی ہے کہ سستی خوش فہمی، حقارت آمیز اور ایک بُرائی ہے۔ انھوں نے لکھا "کہ اگر گورو کے پاؤں کی پرستش کرنے سے جنت ملتی ہو تو میں اُس کو ٹھکرا دوں گا" زمانۂ قدیم میں سانپوں اور درختوں کی پوجا تو سمجھ میں آسکتی ہے لیکن ہندوستان کے تعلیم یافتہ حلقوں میں روحانی گوروؤں کی مروّج تعظیم اور جیوتش و نجوم جیسی چیزوں کے لیے غیر منطقی کمزوری کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔

اگر شرارت کرنے والوں کو ہندوستان کے نئے استعمار پسند دشمن جو ہمارے ملک کے عدم استحکام سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، درپردہ یا کھلے عام مدد دیں۔ اور اس سے اُنھیں بدمعاشی کرنے بلکہ بغاوت کا بھی موقع ملے تو اِس میں حیران ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

بمبئی ہائی کورٹ کے ایک فیصلے میں مذہبی اعتقاد اور مذہبی عمل میں امتیازی خط کھینچا گیا ہے۔ اس فیصلے کے مطابق مذہبی اعتقاد وہ ہے جس کی حفاظت سرکار کی ذمہ داری ہے لیکن مذہبی عمل کی آزمائش مفاد عامہ کی کسوٹی پر کی جاتی ہے۔ تاہم ہندو دھرم کا چھوت چھات کا ہولناک عمل اِسے ختم کرنے کے قانون کے نفاذ کے بعد بھی جاری ہے۔ اس کی موجودگی میں قدامت پسند لوگ کس بنیاد پر جنوبی افریقہ کی نسلی بھید بھاؤ کی پالیسی کی مذمت کرتے ہیں۔ یہ ایک حیران کُن امر ہے۔ یہاں ونوبا بھاوے مرحوم کی گئو کشی پر پابندی جیسی عجیب تحریک کے لیے بھی مقدس شور و غوغا بلند ہونے لگتا ہے حالانکہ خود گاندھی جی نے کہا تھا کہ یہ پابندی ہندوؤں کے لیے ہے ساری دُنیا کے لیے نہیں اور یہ خود آگاہی کے ذریعے عمل میں آنی چاہیئے۔

کھلے عام دھارمک نمائشیں یا جلوس آج بھی تشدد اور وحشیانہ فسادات کے لیے آسان بہانہ ہیں۔ سروجنی نائیڈو کی دُہائی کو کون سُنتا ہے کہ خدا کے کانوں میں مندر کی گھنٹیوں اور مؤذن کی اذان کی آواز ایک جیسی سُنائی دیتی ہے۔ ۱۹۲۳ میں کوکناڈا میں کانگریس کے صدر محمد علی کی مشہور پُکار کسے یاد ہے کہ " اگر اذان پیپل کے درخت اور دھارمک جلوس ہی ہماری ادراک کی آخری حد ہیں تو آیئے اس معاملے کو یہیں ختم کر دیں کیونکہ اس ڈھونگ کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اس کے برعکس جہاں بھیونڈی، احمد آباد، مراد آباد، بہار شریف اور دوسرے مقامات جیسے سنگین فسادات ہوتے ہیں اور نہ صرف شیواجی بلکہ خود شِوا کے نعرے لگا کر شیوسینا جیسی قابلِ نفرت جماعتیں جدید اور مہذب سمجھے جانے والے مقامات پر بھی کھیل کھیلتی ہیں۔ اس وقت سماج کے پچھڑے ہوئے اور زبردستی محروم کیے گئے طبقوں کے لیے ریزرویشن کے سوال پر تباہ کُن غارت گری جاری ہے۔ جس کے لیے محاسن کی منضبت کی آڑ لی جا رہی ہے لیکن یہ نہیں سوچا جاتا کہ ہمارے عوام میں سے کتنے ہی لوگوں کو کتنی دیر سے سماجی انصاف سے محروم رکھا جا رہا ہے۔

اس میں حیرانی کی کیا بات ہے کہ سکھ اصلیئے مذہب کے نام نہاد سنت جو ایران کے شیعہ مذہبی رہنماؤں سے ملتے جُلتے ہیں حالات کو اپنے لیے سازگار پا رہے ہیں۔ اُن کی خالصتان کے لیے مُہم جو اگرچہ اُن کے بیانوں سے عیاں ہے۔ لیکن ایک خطرناک بغاوت ہے۔ وہ ہندوستان کے نہ صرف جسم بلکہ رُوح کے لیے بھی ایک زوردار صدمہ ہے۔

ضمیر اس حد تک بے حس یا کمزور ہو گیا ہے کہ دھوکہ بازی اور بُزدلی کے ایک گھناؤنے فعل کی بھی کھلے بندوں تعریف کی جانے لگی ہے، جیسے کہ اندرا گاندھی کو اُن کے اپنے ہی محافظوں نے گھر کے احاطے میں انتہائی قریب سے گولیاں چلا کر ہلاک کر ڈالا۔ لیکن اعتدال پسند اکالی رہنما ان قاتلوں کو کھلے عام اپنے دھرم کے شہید کا نام دے رہے ہیں۔ مذہبی اشتعال انگیزی نے کشیدگی کی فضا اتنی گرم کر دی ہے کہ مذمت میں بھی بعض وجوہ کے سبب احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس گندگی کو رُسوا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ مذہبی عقیدے کی توہم پرستی رسوم پرستی، جارحیت اور ایسی ہی دوسری بنیادیں مغلوب ہونے کی بجائے بڑھ پھول رہی ہیں اور اُن اشتعال انگیزیوں کو ڈھانپے ہوئے ہیں جن پر ہمیں غالب آ جانا چاہیئے تھا۔

کسی نے کہا تھا کہ یگیہ ولک سے لے کر دیکانند تک ہمیں غیر صحت مند ترغیب عمل کثرت سے حاصل ہوتی رہی ہے۔ اب بھی اپنی روحانیت کی ڈینگ مارنا بہت آسان دکھائی دیتا ہے لیکن ایسا کرتے ہوئے ہم بھول جاتے ہیں کہ یہ ایک فرضی پردہ ہے جس میں ہم اپنے آپ کو ذلت اور کلفت کے سرد جھونکوں سے بچ کر گرم رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارا بالائی طبقہ جو ذہنی طور پر نادار اور روحانی طور پر شکست الوجود ہے

کبھی بھی نئے بھگوان کے سامنے ٹیٹنے نے نہیں ہچکچاتا۔ یہ بھگوان یا اللہ والے رام کرشن اور رمن مہارشی جیسے سنتوں سے کہیں مختلف ہوتے ہیں اور اقتدار کے بسیروں یا دولت کی آماجگاہوں میں بیسیوں اور درجنوں کی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ غیر ملکوں کے ہیے ہمارا اشتیاق اس زرداری کو عزّت بخشتا ہے جو حشیش تلاش کرنے والے غیر ملکیوں سے بھی زیادہ خطرناک اور بنیادی طور پر بے اُصول ہے جن کے لیے گوا اور وارانسی جنّت کے دروازے ہیں۔ ہم اپنے عوام کے بھولے بھالے عقیدے کا احترام تو کر سکتے ہیں جو کاشی اور پریاگ راج میں لاکھوں کی تعداد میں پہنچ جاتے ہیں، لیکن اُس بھونڈے پن کی عزّت نہیں کر سکتے جو بعض حلقوں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ اگر آپ زندگی کے آرام دہ زُمرہ سے تعلق رکھتے ہیں تو آپ اس نقطے کو بائرن کی ان سطروں میں پہچان سکتے ہیں: "رُوح اس قدر پُرسکون ہوتی ہے کہ بلاشبہ وہاں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ جو کیفیت مغرح غرق رم کی ہے، وہی حقیقی مذہب کی ہے۔" اور حکمران طبقوں کو گبن کی تلاش کردہ سچائی کا ہمیشہ علم رہا ہے، کہ رُومن سلطنت میں عبادت کے جو مختلف طریقے رائج تھے لوگ اُن سب کو ایک جیسا حقیقی فلاسفر یکساں طور پر جھوٹا اور مجسٹریٹ ایک جیسا مفید خیال کرتے تھے۔"

مذہب نے سماج کو یکجا رکھنے میں سیمنٹ کا کردار ادا کیا ہے، اقتدار کو سہارا دیا ہے اور ایک ہی حالت کو بنائے رکھنے کی ضمانت دی ہے۔ خدا اچھا ہے لیکن کسی شخص کو یہ سمجھ نہیں آتی کہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ شیطان اور بدمعاش ترقی کرتے اور خوشحال ہوتے ہیں مگر نیک لوگ نقصان اُٹھاتے ہیں، تو "اُنھیں یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا کے طریقے پُراسرار ہیں اور خدا کی باتیں خدا ہی جانتا ہے۔" جہاں دولت جمع ہو جاتی ہے تو اُسے خدا کی مہر کا نام دیا جاتا ہے لیکن جہاں دولت نہیں ہوتی وہاں لافانی خوشی کے لیے دولت کی کوئی اہمیت نہ ہونے پر زور دیا جاتا ہے۔ جیوُ یعنی زندگی کو شیو کا نام دے کر اور خدا کو پا لینے کے لیے سب کے ایک جیسے ادھیکار کی حمایت میں شلوک پڑھ کر اس ملک میں ایک ظالمانہ طبقاتی نظام کو برقرار رکھا جا رہا ہے۔ جسے زندگی کے ایک بہتر ماحول میں پیز جنم کے سوا تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ کرم کی فلاسفی میں طے کر دیا گیا ہے کہ اگر آپ آئندہ کم تکلیف دہ زندگی چاہتے ہیں تو وہ آپ کو تمام سماجی ذمہ داریاں خواہ کتنی ہی درد انگیز اور ذلّت آمیز کیوں نہ ہوں پاکیزگی سے پوری کر کے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ عام مذاہب میں غریبوں کے لیے ایسا "معاوضہ" موجود ہے لیکن ہندو دھرم میں اس کی ایسی باکمال قاعدہ بندی کی گئی ہے کہ نہ صرف ذات پات بلکہ چھوت چھات کے بھی ہمیشہ قائم رہنے کا خطرہ ہے۔

مدر ٹریسا (اُس پر خدا کی رحمت ہو) خُدا کی اس لیے تعریف کرتی ہے کہ اُس نے غریبوں اور مفلوک الحال لوگوں کو بنایا جنھیں وہ اتنے شاندار طریقے سے امداد دیتی ہے۔ گاندھی جی غریبوں کے لیے اپنی دلی ہمدردی کا اظہار اُنھیں ہریجن کا نام دے کر اور اُن کے لیے درد نارائن سے پرارتھنا کر کے کرتے ہیں اور ہر وقت اُمید رکھتے ہیں کہ امیر طبقے کے پاکباز لوگ دردمندی کے محتاط اظہار سے نیکی کریں گے۔ چنانچہ اعلیٰ ترین لوگ بھی غربت کے بنیادی اسباب کا پتہ لگانے اور اس کا علاج ڈھونڈنے سے ڈرتے ہیں۔ اس لیے اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ کارل مارکس نے اپنی پیغمبرانہ برہمی میں "جاگیردارانہ فیّاضی کی خیرات کرنے کی قلابازیوں کی ملامت کی ہے۔"

ان قدیم بیماریوں کا علاج کیپسولوں سے نہیں کیا جا سکا۔ تاہم غور و فکر کرنے والے افراد میں اتفاق رائے پیدا ہو رہا ہے کہ اگر لوگوں کی حقیقی سماجی اور اقتصادی فلاح کا ماحول پیدا ہو جائے تو اُس میں مذہب کی اِن تسلّیوں کی ضرورت نہیں رہیگی۔ جہاں اُنیسویں صدی میں جرمنی مذہب پر پابندی لگانا چاہتا تھا (البانیہ ہی ایک ایسا ملک ہے جس نے قانوناً ایسا کرنے کی کوشش کی ہے) وہاں مارکس ازم مذہب کے خلاف سیاسی جنگ کے بے ہودہ جُوئے کا مخالف ہے اور سماج وادی ممالک کا تجربہ ثابت کرتا ہے کہ عقل مندی یہی ہے کہ یہ دونوں مل کر انسان کی خدمت کریں۔ کون نہیں جانتا کہ مارکس نے مذہب کو عوام کے لیے افیون کا نام دیا تھا لیکن بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ اُس نے اس کے ساتھ ہی مذہب کو "دنیا کا ایک عمومی نظریہ، ناموسی خلاصہ اور "مقبول عام منطق" بھی کہا تھا۔ کوئی بھی خاص طور پر اشتراکی جن کے اعتقاد کی بنیاد تاریخ پر ہے، اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ کتنی موسیقی، فنِ تعمیر ادب اور انسانی زندگی کی تخلیقی قوتوں کا اظہار مدتوں سے مذہبی اشکال میں ہوتا آیا ہے۔ یہ بھائی چارے اور خوشی کے لیے ترغیب عمل کی وسیع دولت اور انسانی کوششوں کی لامحدود صلاحیتوں کا خزانہ ہے۔ سماجی تاریخ کے طویل ادوار میں استحصال کا ظہور اور حرص کی حکمرانی اور خطرناک مفاد پرستی اُن طاقتوں کے بیے ذمّہ دار ہیں جنھوں نے مذہب کے نام پر تاریخ کے اوراق کو پراگندہ کیا ہے اور ہمارے ہندوستان کے حالات میں ہمارے وجود کو روسیاہی اور تذلیل کا خطرہ بنی ہوئی ہیں۔

ہم نصابی کتابوں کی تعلیم اور سماجی و سیاسی تقریروں سے نہیں بلکہ متحرک سیاسی ادارے سے مذہب کے کردار میں تبدیلی لا سکتے ہیں اور اُن لوگوں سے مؤثر طور پر نمٹ سکتے ہیں جنھیں جواہرلال نہرو نے ۱۹۲۷ء میں مذہب کی جائز اور ناجائز اولاد کا نام دیا تھا جو شدید قومی بے چینی کا باعث ہے۔

•

جسٹس وی آر کرشنا آئیر*

مذہب پر لگام

ڈھونگی فرشتے اور بے رحم انسان

اِس سے مذہب اور اس کے پیدا شدہ خطرناک متعصب پیروکار، اس کے مجرموں کے گروہ اور اس کے جانبدار حواریوں نے اب تخریب کارانہ عمل ہاتھ میں لے لیا ہے اور وہ قومی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے پر تُل گئے ہیں۔ مصنف نے ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اب کام کرنے کا وقت آگیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا ہے کہ اگر سیکولرزم تمام مذاہب سے الگ نہیں ہو جاتا تو بھی یہ اُس صورت میں حرکت میں آئیگا جب مملکت سماجی اخلاق، صحتِ عامہ، انسان نوازی کے معیاروں، امن عامہ کو بچانے اور فوجداری قانون کا نفاذ کرنے کے لیے تمام مذاہب سے الگ رہے گی۔

جب کوئی ملک آزادی حاصل کرتا ہے تو اُس پر ذمہ داریوں کا بوجھ آپڑتا ہے۔ سیکولرزم اور سوشلزم کی جاندار قدروں کی حفاظت و تحفظ کی ذمہ داری اور پھیلی ہوئی سماجی۔ اقتصادی پسماندگی کو ترقیاتی مساعی سے دُور کرنا بھارتی آئین کے واضح لوازمات ہیں۔ اگر مذاہب اپنی جارحانہ مطلق العنانیت میں اپنے پیروکار کو اس متعصبانہ عقیدے میں الٰہی احکام کے ذریعے انتہائی جوش دلاتے ہیں کہ صرف اُن کے خدا ہی پرستش کے قابل ہیں اور اُن کے علاوہ دُوسروں کے خدا جھُوٹے ہیں جنھیں تلف کر دیا جائے تو اس کے نتیجے میں ہونے والی خونریزی اور مردم خوری سے مقدس عدم رواداری، خدائی خانہ جنگی عمل میں آئیگی اور جمہوریہ بھارت کے حصے بخرے ہو کر رہیں گے۔

بھارت جہاں متعدد مذاہب ہیں دیوتاؤں اور معبوروں کی بھرمار ہے، تاریخی منافرتیں ہیں۔ غیر معمولی طور پر متشددانہ الوہیت اور اشتعال پسندانہ فرقہ پرستی کا شکار ہو سکتا ہے۔ مذہبی رفاقت اور مقدس درگاہیں مشترکہ پرستش اور ادب و احترام کی مرکز ہیں۔ اور بیشتر مقامات میں جیتی جاگتی ثقافت ہیں۔ یہ ملی جُلی روحانی میراث کی ایک بڑی اُمید بن سکتے ہیں جسے بیوقوفانہ طور پر نظرانداز کیا جا رہا ہے۔ بلاشبہ اگر ہر کیمپ میں مذہبی آزادی، ترقی پسندی اور آزاد خیالی پر مبنی دینیات کو سیاسی احساسات اور نوعِ انسانی سے دوستی پر مبنی خلوص کے ساتھ آگے بڑھایا گیا ہوتا جیسا کہ رُوس تمام مذہبی رہنماؤں کے توسط سے امنِ عالم کو فروغ دے رہا ہے تو بھارت کی سرزمین پر یہ خون خرابہ نہ ہوا ہوتا اور نہ ہی یہ سرزمین مختلف آسمانی خداؤں کے نام پر جھگڑے کی جگہ بن سکی ہوتی۔

یہ سب مذہب کی پیداوار ہیں : ہر مذہب میں کٹر لوگ بڑی تعداد میں خطرناک سنگدل متعصبوں کو جنم دیتے ہیں اور بڑے بڑے مذاہب جیسے ہندو دھرم، اسلام اور کرسچین اینٹی (برنارڈ شا کرسچین اینٹی (عیسائیت) کے برعکس اس لفظ کا استعمال اس امر کا اظہار کرنے کے لیے کرتے تھے کہ اتوار کو گرجا گھر جانا پارسائی ہے اور دُوسرے دنوں کو یسوع مخالف بے عقیدگی ہے) نہ صرف بیشتر گمراہ کُن حتّٰی کہ خون آشام فرقے ہیں بلکہ وہ دنیاوی امور کو منضبط کرنے اور دنیاوی رواج کو مذہبی رسوم کا درجہ دینے کے لیے بھی کوشاں ہیں جو اُن کے عقیدے کی رُو سے مطلق العنانہ ہیں اور جن کا سلسلہ انسان اور کائناتی طاقت کے عمل کے درمیان گہرے رشتے کی اعلیٰ تر اقلیم سے بھی باہر چلا گیا ہے۔ آپ کو کیا کھانا چاہیئے، کیا نہیں کھانا چاہیئے، آپ کو لباس کیونکر پہننا چاہیئے یا کیونکر نہیں پہننا چاہیئے۔ آپ کو شادی کیونکر کرنی چاہیئے یا کیونکر نہیں کرنی چاہیئے۔ آپ کو بال کیونکر بڑھانے چاہئیں یا کیونکر کٹوانے چاہئیں۔ یہ اور ہزاروں دوسری مادی باتوں کی ہدایت مذہب کے ناقابل خلاف ورزی احکام سے دی جاتی ہیں۔ ان میں سے بیشتر باتیں کسی معاشرے کے افراد کے لیے اہم ہیں لیکن ان پر کنٹرول سماجی سیکولر، اور سائنسی مصلحتوں سے کیا جانا ضروری ہے، نہ کہ مذہبی احکام سے۔ اور جب متعدد اجارہ دارانہ مذاہب

* سابق جج، سپریم کورٹ آف انڈیا، نئی دہلی۔

کی ہدایات کہ "کیا کیا جائے یا کیا نہ کیا جائے" ایک دوسرے کے مخالف ہو جاتی ہیں۔ تو فرقہ وارانہ فسادات لازماً بھڑک اٹھتے ہیں۔ جن سے خونریزی اور خوفناک قسم کی شرارتیں عمل میں آتی ہیں۔ حتیٰ کہ جب مندر اور گوردوارے، مسجدیں اور گرجا گھر پُرامن ہم وجودیت کے ساتھ رہنے کی کوشش کرتے ہیں تو گروہی مناقشہ اور فرقہ وارانہ پارٹی بازی کی دیگر علامتیں معاشرے کی ہم آہنگی اور امن کو برباد کر دیتی ہیں۔

مذہب کے نام پر تخریب

قومی اتحاد اور ملکی ترقی ذات پات اور فرقہ وارانہ عمل تخریب کا شکار ہو جاتی ہیں جو پہلا دار کسی کے فرائض پر کرتی ہیں۔ مذہبی قیادتوں، مجرموں کے گروہوں اور متعصب پیروکار نے اس تخریب کارانہ عمل کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اور دیوی دیوتاؤں کے نام پر جنگ کے شکار کمزور ترین اور حقیر ترین افراد ہوتے ہیں۔ انسانی حقوق وسیع پیمانے پر خون میں غرق ہو گئے ہیں۔ اور متعلقہ مذاہب کی طرف سے سیکولرزم اور سوشلزم غصب کر کے اور جمہوریت کو ناروا حد تک کچل کر کے انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کو مقدس قرار دیا گیا ہے۔ نہرو نے ایک خلش زدہ وزیراعظم کے طور پر لکھا تھا "معمروں نے عجیب طور پر خود کو خانوں اور گروہوں میں بند کر رکھا ہے۔ وہ مذہب، ذات پات، رنگ و نسل، پارٹی، قوم، صوبے، زبان، رواج، دولت اور افلاس کی رکاوٹیں کھڑی کر لیتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے بنائے ہوئے قید خانوں میں رہتے ہیں۔"

(جواہر لال نہرو، انڈیا نیوز، اقتباس اگزٹ اینڈ ڈیلی، پارک پی اے۔ ۱۷ فروری ۱۹۵۸)۔

"بھارت میں اور دوسری کسی بھی جگہ جسے مذہب یا کسی بھی طرح منظم مذہب کا نام دیا جاتا ہے اُس کے تماشے نے ہم میں انتہائی خوف پیدا کر دیا ہے۔ میں کئی بار اس کی مذمت کر چکا ہوں اور اس کا صفایا کرنا چاہتا ہوں۔"

(جواہر لال نہرو: کارڈوف "بڑے آدمی مذہب کے بارے میں کیا سوچتے ہیں")

> مذہب اپنی زوال پذیر حالت میں ایک خوفناک شیطان ہے جب روحانی جہالت میں پھنسے ہوئے عوام رشیوں، پیغمبروں اور سنتوں کی تعلیمات کے روحانی جوہر کو فراموش کر دیتے ہیں، اور اس متبرک لغویت کو بوسہ دیتے ہیں کہ درست ہو یا غلط، مذہب میرا ہے اور میرے اہل مذہب کا تعلق مجھ سے ہے۔"

مذہب اپنی زوال پذیر حالت میں ایک خوفناک شیطان ہے۔ جب روحانی جہالت میں پھنسے ہوئے عوام رشیوں، پیغمبروں اور سنتوں کی تعلیمات کے روحانی جوہر کو فراموش کر دیتے ہیں اور اس متبرک لغویت کو بوسہ دیتے ہیں کہ درست ہو یا غلط، مذہب میرا ہے اور میرے اہل مذہب کا تعلق مجھ سے ہے۔ اس بیہودہ، بربریت پسندانہ زوال پذیری میں انسانیت نوازی دم توڑ دیتی ہے۔ اور رواداری، رحم اور گہری قوم پرستی کی قدریں تباہ ہو جاتی ہیں کیونکہ مذہبی وحشیانہ پن تلوار یا اسٹین گن

> اگر مذہبیت کی قیمت انسانی شرافت، سیکولر ہوش مندی، سوشلسٹ سیاسی تنظیم اور روحانی جمہوریت کی قربانی ہے تو ہمیں اس بیماری سے بچنا ضروری ہے۔ اس بیماری کی جڑیں دینیاتی امراض کی تثلیث میں دبی ہوئی ہیں۔ پھیلے ہوئے توہمات، غیر منطقی مافوقیت اور ایک مقدس فرمانروا طاقت کے آگے عاجزانہ خود سپردگی۔

تھام لیتا ہے۔ اور بھائی خدا کے نام پر بھائی کو ہلاک کرتا ہے۔ اعلیٰ تر معانی کے برعکس فرشتے خدا کو شکست دیتے ہیں اور دھرتی پر انسان آسمان پر خدائی طاقتوں کی رقابت کا بارود بن جاتا ہے۔

امراض کی تثلیث

اگر مذہبیت کی قیمت انسانی شرافت، سیکولر ہوشمندی، سوشلسٹ سیاسی تنظیم اور روحانی جمہوریت کی قربانی ہے تو ہمیں اس بیماری سے بچنا ضروری ہے۔ اس بیماری کی جڑیں دینیاتی امراض کی تثلیث میں دبی ہوئی ہیں۔ پھیلے ہوئے توہمات، غیر منطقی مافوقیت اور ایک مقدس فرمانروا طاقت کے آگے عاجزانہ خود سپردگی۔ یہاں اور یہاں کے بعد راحت اور جزا کی آخری پناہ کی اُمید بیشتر لوگوں کے لیے کشش رکھتی ہے۔ دونوں دنیاؤں میں اچھی زندگی خریدنے کے لیے پاکبازی اور تعصب، مذہب کی خفیہ تجارتی توسیع ہے۔ جب خدا اس طرح اپنی عقیدتمند رعایا پر اپنی سلطنت کا قیام کرتا ہے تو حکومتِ زر۔ تاج یا سرمایہ دار طبقہ۔ خدا کو اپنا کمانڈر انچیف بنا لیتا ہے۔ مذہب پرولتاری طبقہ (غریبوں اور مزدوروں) کے لیے نفاق انگیز بن جاتا ہے۔ اور اپنی قوتوں کے ہمراہ استحصال کنندہ نظاموں کی بقا کے لیے لڑنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور جب جذبات بھڑکتے ہیں اور ہتھیار فراہم کئے جاتے ہیں تو خانہ جنگی جیسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں اور ان کی توسیع ہوتی ہے۔ ہماری سیکولر سوشلسٹ اُمنگوں کو کچل ڈالا جاتا ہے اور ہمارا جمہوری قوم پرستانہ جامہ تار تار ہو جاتا ہے۔

ہمارے انتخابات فرقہ وارانہ جھگڑوں کا باعث بنتے ہیں۔ ہماری ترقی الٹی راہ اختیار کر لیتی ہے۔ ہمارے عوام کئی گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ہمارا واحد خدا کئی خونی فرشتوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ہماری سیاست میں ذات پات اور فرقہ واریت کی آلودگی آ جاتی ہے۔ ہماری حب الوطنی غیر ملکیوں کے ساتھ رشتوں کو فروغ دیتی ہے۔ اگر اس دردناک رجحان

کو جو بے شمار صورتوں میں جاری ہے روکا نہ گیا تو ہماری مملکت کا جہاز اپنے ہی لوگوں سے ڈوب جائے گا۔

منکروں کی تشخیص

گاندھی جی جنھیں مبالغہ آرائی سے غلط طور پر قرون وسطیٰ کا رہبر سمجھا جاتا ہے

متعلق مقصد میں اعتقاد جو موجودہ معاشرے کی زندگی اور حتیٰ کہ مجموعی طور پر نوعِ انسانی کی زندگی سے بھی بلند تر ہیں۔ قنوطیت پسندی خود جب دل کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے، جب یہ کمزوری کی بجائے طاقت کی مظہر ہوتی ہے تو وہ مذہب کی عظیم فوج کی پیشقدمی میں شامل ہو جاتی ہے۔

انھوں نے مزید کہا ہے۔

سچائی یہ ہے کہ بڑے پھیلنے پر کسی بھی بدعت کی لت، لوگوں کی بھاری تعداد کو تقدیر پرستی، اصولوں کی خلاف ورزی، دوسری دنیا (عالم بالا) کی خرافات کی ترغیب دینے اور اختلاف و تقسیم کو بڑھاوا دینے سے جمہوری بنیاد، سیکولر طاقت اور ہماری ری پبلک کی سوشلسٹ پیش قدمی کمزور پڑ جاتی ہے۔ ایڈگر سنو نے ایک بار قدیم چین اور روس کے بارے میں کہا تھا۔

یہاں اور یہاں کے بعد راحت اور جزا کی آخری پناہ کی امید بیشتر لوگوں کے لیے کشش رکھتی ہے۔ دونوں دنیاؤں میں اچھی زندگی خریدنے کے لیے پاکبازی اور تعصب مذہب کی خفیہ تجارتی توسیع ہے۔ جب خدا اس طرح اپنی معتقد رعایا پر اپنی سلطنت کا قیام کرتا ہے تو حکومتِ زر۔ تاج یا سرمایہ دار طبقہ۔ خدا کو اپنا کمانڈر انچیف بنا لیتا ہے۔

اُن کی موجودہ حالات سے یوں مطابقت ہے کہ اُن کے نزدیک تمام مذاہب اخوت لیے ہوئے ہیں۔ اختلاف میں اتحاد اُن کا آدرش ہے۔ نہرو کی مطابقت یوں ہے کہ انھوں نے انسانیت نوازی پر زور دیتے ہوئے کہا ہے کہ وہ مذہب کی روح ہے اور سچا مذہب پرست کوئی رجعت پسندانہ رسوم پرست نہیں ہے بلکہ ایک بے لاگ آفاقیت نواز ہے۔ انھوں نے اپنی سوانح عمری میں رومان رولاں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے۔ "بہت سے لوگ ہیں جو یقین رکھتے ہیں کہ وہ تمام مذہبی عقائد سے آزاد ہیں لیکن جو حقیقت میں برتر توجیہی شعور کی حالت میں مستغرق رہتے ہیں۔ اسے وہ سوشلزم، کمیونزم، انسانیت نوازی، قوم پرستی اور حتیٰ کہ توجیہہ کا نام دیتے ہیں۔ یہ غور و فکر کا معیار ہے اور اُس کا مقصد وہ نہیں ہے جو اُس کے سرچشمہ کا تعین کرتا ہے اور نہیں اس امر کا فیصلہ کرنے کی اجازت دیتا ہے کہ کیا وہ مذہب سے نکلا ہے یا نہیں۔ اگر یہ صداقت کی تلاش میں بے خوفی سے کسی بھی قیمت پر ایماندارانہ یکسوئی کے ساتھ کوئی بھی قربانی دینے کے لیے تیار ہے تو میں اسے مذہب کا نام دوں گا۔ کیونکہ اس کا مطلب ہے ایسی انسانی مساعی سے

"رومان رولاں نے جو شرائط رکھی ہیں' میرا خیال ہے کہ میں انھیں پورا نہیں کر سکتا لیکن اس لحاظ سے میں اس عظیم فوج کا ایک عاجز حاشیہ بردار بننے کے لیے تیار ہوں۔"

مارکس کے ان الفاظ کا جن کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے۔ اکثر جنھیں غلط طور پر پیش کیا جاتا ہے' تکیہ مطلب ہے' خواہ آپ مارکس کے پیرو ہیں یا نہیں۔

"مذہب اُسی طرح مظلوم مخلوق کی آہ ہے' ایک بے درد دُنیا کا احساس ہے جس طرح یہ غیر روحانی حالات کی اسپرٹ ہے۔ یہ عوام کے لیے افیون ہے۔"

(کارل مارکس ۱۸۴۴)

"مارکس کی پوزیشن کو بہت غلط سمجھا جاتا ہے... جب اُس نے مذکورہ خیالات کا اظہار کیا تھا تب یورپ میں افیون تقریباً خاص طور پر درد دُور کرنے کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ مارکس نے اس معنی میں "افیون" لفظ کا استعمال کیا تھا اور اس معنی میں نہیں کیا تھا کہ مذہب حکمران طبقہ کے ساتھ مل کر عوام کو جان بوجھ کر ماؤف بنا دیتا ہے۔ (ونیکل پیپل) سوشلسٹ لیبر پارٹی کا سرکاری ترجمان۔ ۳۱۔ جنوری ۱۹۵۹)

"روس میں مذہب عوام کے لیے افیون ہے اور چین میں افیون عوام کے لیے مذہب ہے۔"

آج کوئی بھی بھارت کی حالت میں اس امر کا طنزیہ طور پر اضافہ کر سکتا ہے کہ سیاست عوام کے لیے مذہب کے ساتھ ساتھ افیون بن گئی ہے۔ اور ادھر ہماری قیادت ہے کہ نکرومہ کے اس منصوبے پر عمل پیرا ہے۔"

"پہلے آپ سیاسی سلطنت حاصل کیجئے اور ازاں بعد سب کچھ آپ کے پاس آ جائے گا۔"

انسانی ہم آہنگی کی تباہی

ہمارا آئینی سیکولرزم مطبوعہ اعلیٰ ترین دستاویز کے طور پر بے حرکت ہے اور ہماری قومی یکجہتی غلط تصورات کو ختم کرنے کے کام کا متحمل ہو رہی ہے۔ کیونکہ ہماری الوہیت کی سیاست انسانی ہم آہنگی سماجی۔ اقتصادی انصاف اور روحانی، مادی امتزاج کو زیادہ تر پارہ پارہ کر رہی ہے۔ آج قرآن اور بائیبل، گورو گرنتھ صاحب اور وید تباہی خیز سیاست کا پرچار کرنے اور ہماری ری پبلک کی بنیاد رکھنے

والے عقیدے کو سزائے موت سنانے کے لیے
استعمال کئے جارہے ہیں۔ ہم بقا حاصل نہیں کر
سکیں گے اگر ہم اس عمل کا رُخ نہیں بدلیں گے
اور فرشتوں کے ڈھونگ کو بے نقاب نہیں کریں گے
میں ذاتِ مطلق یا تخلیق کی ہر شئے میں موجود خدائی
ظہور کا منکر نہیں ہوں اور ہر شئے میں

اور پلیک بیری کے پھولوں سے جنت کی
نشست گاہ مزین ہوتی ہے۔
اور میرے ہاتھ میں سب سے چھوٹا قلابہ تمام
مشینری کی ملامت کرتا ہے۔
اور اداسی میں سر لٹکائے جگالی کرتے ہوئی
گائے کسی بھی مجسمے کو مات کرتی ہے۔
اور ایک چوہا اربوں دہریوں کو چکرا میں

نہیں ہیں تو کم از کم وہ خطرے میں ضرور ہیں۔ ایسا
وزیر، لیجسلیٹر، یا جج یا پبلک زندگی میں لیڈر کہاں
ہے جو مذہب کو ذاتی معاملہ جانتے رکھے گا اور غیر
ذاتی خیال و فکر میں مداخلت نہیں کرے گا۔
بلاشبہ ہماری اعلیٰ عدالت نے اس قدر گر کر
اقلیتوں سے متعلق آرٹیکل ۳۰ کی غلط تاویل
کی کہ اس سے عام شکار بننے والوں کی بھاری تعداد
نے جن میں معلم، متعلم، والدین اور سیکولرزم

آج قرآن اور بائیبل، گورو گرنتھ صاحب اور وید تباہی خیز سیاست کا پرچار کرنے والے اور
سماجی رسی پبلک کی بنیاد رکھنے والے عقیدے کو سزائے موت سنانے کے لیے استعمال کئے جارہے
ہیں۔ ہم بقا حاصل نہیں کرسکیں گے اگر ہم اس عمل کا رُخ نہیں بدلیں گے اور فرشتوں کے ڈھونگ
کو بے نقاب نہیں کریں گے۔

خدا کی ذات کے اظہار
کے طور پر مذہب کا مخالف نہیں ہوں، البتہ
ارفع معانی میں مذہب اور سائنس دونوں صداقت
کے متلاشی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے رفیق
ہیں۔ اور کبھی ایک دوسرے کی ضد نہیں ہو سکتے۔
آئن سٹائن کا مشہور بیان واضح ہے۔
"میرا مذہب اُس لامحدود برتر طاقت کی
عاجزی سے مدح کرتا ہے جو خود کو ایسی باریک
تفاصیل کے ساتھ منکشف کرتی ہے جسے ہم اپنے
کمزور اور نازک ذہنوں سے محسوس کرسکتے ہیں۔ اس
برتر طاقت کی موجودگی کی جذباتی عقیدت سے
جو ناقابلِ فہم کائنات میں جلوہ گر ہے، میں خدا کے
بارے میں اپنے تصور کی تشکیل کرتا ہوں۔
(البرٹ آئن سٹائن؛ جیسا کہ میں اُسے دیکھتا ہوں؛
فلاسفیکل لائبریری)۔
والٹ وہٹمین کا ویدانت ویویکا نند کا
ویدانت ہے۔
"میرا یقین ہے کہ گھاس کا ایک پتہ ستاروں
کے سفر سے کم تر نہیں ہے۔
اور چیونٹی ایسے ہی مکمل ہے جیسا کہ ریت
کا ایک ذرہ اور رتین پرندے کا انڈہ۔
اور بجل بجھو میا اعلیٰ ترین شاہکار ہے۔

ڈاینے کے پیے کافی ہے۔"
کیا ویویکا نند نے جنھوں نے مادہ پرستی
اور ہر جگہ خدا کی لامحدود موجودگی کا عمدگی سے
امتزاج کیا تھا۔ قدامت پسند ہندوؤں
کی مذمت کرتے ہوئے نہیں کہا تھا۔
"ہمارا مذہب باورچی خانہ میں رہ گیا ہے۔
کھانا پکانے کا برتن ہمارا خدا بن گیا ہے اور ہمارا
مذہب ہے مجھے نہ چھوؤ، میں مقدس ہوں۔
(جواہر لال نہرو۔ بھارت کی دریافت)
لیکن تعصب، فرقہ پرستی اور اس کے نتیجے
میں عمل میں آنے والی پالیسیاں اور منافرت کی
سیاست، بدگمانی اور خونریزی یہ لازمی بنا دیتی ہیں کہ
خدا تمام فرشتوں کو بیرکوں میں واپس جانے کا حکم
دے اور انسان کی مادی زندگی کو سلامت بنا دے۔"
ایک ایماندار آدمی خدا کی اعلیٰ ترین تخلیق ہے ۔"
رابرٹ برنز نے کہا تھا "ایک ایماندار خدا انسان
کی اعلیٰ ترین تخلیق ہے"۔ رابرٹ انگرسول نے کہا
تھا۔

ایمانداروں کی کمی

بھارت کی سرزمین پر (اور دوسری جگہوں پر)
ایماندار آدمی اور ایماندار خدا اگر معدوم شدہ انواع

کے بھی خواہ شامل تھے،
محسوس کیا کہ وہ ایک آئینی غداری سے بیوقوف
بنائے گئے ہیں۔ کیونکہ فاضل ججوں نے یہ فیصلہ دیا کہ
ایک استعمال کنندہ تاجر جو پیدائش یا دیگر اسباب
سے ہندو نہیں ہے ایک طبی، میڈیکل، ٹیکنیکل یا دوسرے
کالج میں سرمایہ لگا کر اکثریتی فرقہ کے بھاری فیصد
کے ساتھ اپنا تعلیمی کاروبار چلا سکتا ہے۔ بیچروں اور
طلبا سے CAPITATION نہیں وصول کر
سکتا ہے۔ جانبداری سے کام لیتے ہوئے تقرری یا
برخاستگی کرسکتا ہے۔ داخلہ دے سکتا یا نکال سکتا ہے،
اور حکومت سے گرانٹ وصول کرتے ہوئے ادارہ
چلانے کے معاملے میں خود قانون بن سکتا ہے اور
تاہم تعلیمی ادارہ چلانے والے کے اقلیتی مذہب کی
بنا پر سرکاری احکام یا یونیورسٹی کی تعزیرات سے قطعی
استثنا حاصل کرسکتا ہے جس نے کالج کو چلانے میں اپنی
تجارتی ذہانت لگا دی ہے۔ حتیٰ کہ جج بھی بھارت
کے پراگندہ ماحول میں فرقہ وارانہ سیاست کا کھیل
کھیل سکتے ہیں اور کبھی کبھی کھیلتے بھی ہیں۔ اور کوئی بھی
شخص رابندر ناتھ ٹیگور کے اس کلام کو یاد رکھ سکتا ہے۔
"بھجن گانا اور مالا (تسبیح) پھیرنا بند کرو۔ تم مندر

کے اس تنہا کونے میں دروازے بند کرکے کس کی پوجا کرتے ہو - اپنی آنکھیں کھولو اور دیکھو تمھارا خدا تمھارے سامنے نہیں ہے۔ وہ وہاں ہے جہاں کاشتکار سخت زمین پر ہل جوت رہا ہے اور جہاں سڑک بنانے

امور ہوں جو چیزیں سیزر کی ہیں وہ سیزر کو سونپ دو اور جو خدا کی چیزیں ہیں وہ خدا کو سونپ دو"۔ سیکولرزم آئین کی بنیاد ہے۔

ایورسن بنام بورڈ آف ایجوکیشن میں جسٹس ہیوگو بلیک کی وضاحت سے قانونی پوزیشن واضح ہو جاتی ہے۔

اُس صورت میں حرکت میں آتا ہے جس صورت میں مملکت سماجی اخلاق، صحت عامہ، انسان دوستی کے معیاروں، امن عامہ، فوجداری قوانین کے نفاذ کے لیے تمام مذاہب سے الگ تھلگ رہتی ہے۔

وزرا ہمارے صدروں، نائب صدروں، وزرا اعظم اور وزرا اعلیٰ، چیف جسٹسوں اور کم تر رتبے کی ریاستوں کی ممتاز شخصیتوں کی طرف دیکھیے

سیکولرزم کے پُرجوش حامیوں اور سوشلسٹ انسان نوازوں کو اب آئینی فتح کے لیے جنگ چھیڑنا ضروری ہے تاکہ علیحدگی کی ایک ایسی دیوار کھڑی کی جائے جس کے ایک طرف سماجی اور سیکولر معاملات ہوں اور دوسری طرف روحانی اور مقدس امور ہوں، جو چیزیں سیزر کی ہیں وہ سیزر کو سونپ دو اور جو خدا کی چیزیں ہیں وہ خدا کو سونپ دو"۔ سیکولرزم آئین کی بنیاد ہے۔

والے پتھر توڑ رہے ہیں۔ وہ اُن کے ساتھ دھوپ اور بارش میں ہے اور اُس کا لباس گرد آلود ہے۔ اپنی متبرک چادر اُتار دو اور اُسی کی مانند گرد آلود زمین پر آ جاؤ۔

اپنی عبادت چھوڑ کر چلے آؤ اور اپنے پھول اور اگر بتیاں ایک طرف رکھ دو۔ اس میں کیا حرج ہے اگر تمھارے کپڑے پھٹ گئے ہیں اور داغدار ہو گئے ہیں۔ اس سے ملو اور اُس کی مشقت اور پیشانی کے پسینے میں اُس کے ساتھ مل کر کھڑے ہو جاؤ۔

"مذہب کے قیام سے متعلق پہلی ترمیم کی دفعہ کا مطلب کم از کم یہ ہے: نہ ریاست اور نہ ہی وفاقی حکومت ایک کلیسا قائم کر سکتی ہے۔ اُن میں سے کوئی بھی ایسے قوانین منظور نہیں کر سکتی جن سے کسی ایک مذہب یا تمام مذاہب کو امداد دی جا سکے یا کسی مذہب کو کسی دوسرے پر ترجیح دی جائے۔ کوئی بھی کسی شخص کو اس کی مرضی کے خلاف کلیسا جانے کے لیے یا اُس سے دُور رہنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتا اور نہ ایسا کرنے کے لیے اُس

جو عقیدت مندوں کو مرعوب کرنے اور دیوی دیوتاؤں کو ڈرا کر مطیع کرنے کے لیے اقتدار، وقار، محافظوں اور عہدے کے لوازمات کا استعمال کرتے ہوئے مندروں اور زیارت گاہوں میں جاتے ہیں۔ ریاستی امور کو مذہبی رنگ دیتے ہیں اور فرقہ وارانہ سیاست کو سیکولرزم کی مچھے دار تقریروں کی چاشنی دیتے ہیں۔ ہماری روزمرہ کی پبلک زندگی میں سوچنے اور بولنے

اگر سیکولرزم تمام مذاہب سے انتہائی آزادی کی جانب بھی جھکاؤ نہ رکھے تو بھی یہ صرف اُس صورت میں حرکت میں آتا ہے جس صورت میں مملکت سماجی اخلاق، صحت عامہ، انسان دوستی کے معیاروں، امنِ عامہ، فوجداری قوانین کے نفاذ کے لیے تمام مذاہب سے الگ تھلگ رہتی ہے۔

کام کرنے کا وقت

سیکولرزم کے پُرجوش حامیوں اور سوشلسٹ انسان نوازوں کو اب آئینی فتح کے لیے جنگ چھیڑنا ضروری ہے تاکہ علیحدگی کی ایک ایسی دیوار کھڑی کی جائے جس کے ایک طرف سماجی اور سیکولر معاملات ہوں اور دوسری طرف روحانی اور مقدس

پر اثر ڈالا جا سکتا ہے۔ اور نہ ہی اُسے مجبور کر سکتا ہے کہ وہ کسی مذہب میں اعتقاد رکھے یا کسی مذہب میں اعتقاد نہ رکھے۔

(ہیوگو ایل بلیک: اکثریتی رائے، ایورسن بنام بورڈ آف ایجوکیشن، ۳۳۰ یو ایس ۱ (۴۷ ۱۹)

اگر سیکولرزم تمام مذاہب سے انتہائی آزادی کی جانب بھی جھکاؤ نہ رکھے تو بھی صرف

میں دوُرُخی ایک نئی بلندی پر پہنچ گئی ہے۔ بلاشبہ قوانین بھی اوقاف کو کرایہ قانون اور زرعی اصلاحات اور تمام مذاہب کے خاندانی قوانین سے مستثنیٰ قرار دے کر مقدس کھیل کھیل رہے ہیں اور آرٹیکل ۱۴ کی برابری کی ہدایت کی خلاف ورزی کر کے بڑی بے انصافی کی جا رہی ہے۔ اگر باڑھ ہی کھیت کو کھانے لگے تو کھیت کو کون

بھاگے گا۔" (بائبل بحیثیت مبصّق)

اب کیوں نہیں؟

ایک قوم پرستانہ تناظر سے ہمیں شرم آنی چاہیئے کہ "ہر آنکھ سے آنسو پونچھنے" سے متعلق سیکولر مقصد تک بھارت کی رسائی قانون اور زندگی میں رفتہ رفتہ اُلٹی جانب بڑھ رہی ہے۔ کم از کم مذہبی تشخص رکھنے والے انتخابی نشانوں پر پابندی کیوں عائد نہیں کی جاتی۔ فرقہ وارانہ ناموں والی سیاسی پارٹیوں کو چناؤ لڑنے سے روکا کیوں نہیں جاتا نیز گاندھی اور مارکس کے نام پر تجارت کرنے والوں کو ذات اور مذہب پر مبنی گروپوں سے کولیشن نہ بنانے کو کیوں نہیں کہا جاتا۔ ؟ کیا ہم سیکولر سیاسی کلچر اور عوامی زندگی کے لیے لڑائی شروع نہیں کر سکتے ؟۔ کیا ہم ایک بڑی تحریک اور عوام کی لام بندی کے ذریعہ ہر بھارتی کو سیکولر دشمن مرض کے اجتماعی ٹیکے نہیں لگا سکتے۔ ؟ شرم سے ڈوب مرو، اگر تم ایسا کر سکتے ہو کہ ایک مُردہ شوہر یا ایک ذبح کی ہوئی گائے کے ٹکڑے کو کسی غلط جگہ رکھے جانے سے ہماری جمہوریہ بھیانک مارکاٹ کا شکار ہو جاتی ہے۔ روؤ، اگر تم ایسا کر سکتے ہو کہ سیاسی آئت اللہ بے سہارا مطلقہ عورتوں کا دفاع کرنے سے متعلق ایک سیکولر کوڈ پڑھنے پر سپریم کورٹ کو دھمکی دیتے ہیں کہ وہ اُس کی دیکھ بھال کرنے کے بجائے مٹی کا تیل ڈال کر انھیں جلا دیں گے۔ اُف میرے خدا! یہ کب تک ایسا ہوتا رہے گا ؟ سنئو دوسری ایسی آسان باتیں مزید ہیں جو مذہبی بدعنوانیوں اور اخلاقی گراوٹوں کو دُور کرنے کے لیے سہل اور ضروری ہیں۔ لیکن مکار سیاسی لیڈر ہمیں بے وقوف بناتے ہیں۔ مصنّف کی جو مراد تھی اُس سے بلند معانی

میں ڈکلا مبو گے کے اس اقتباس کے ساتھ میں اپنا مضمون ختم کرتا ہوں !!

"میں مذاہب کے خلاف مذہب کا حامی ہوں"

بقیہ: جذبۂ انسانیت ہی کشتی پار لگا سکتا ہے

تیار کرنے والوں نے ہندوستان میں بسنے والے سبھی لوگوں کو بلا لحاظ مذہب اور ذات پات مساوی حقوق دیئے ہیں۔ ہندوستان کی بقا، اس کی خوشحالی اور بطور قوم اس کی ترقی کے لیے یہی ضروری تھا۔ گاندھی جی نے یہی بات 'ہند سوراج' میں کہی تھی۔ ہم اسے سیکولرازم اور جمہوریت کے نام سے پکارتے ہیں۔ ہندوستان کی ریاست کو سیکولر ہونا ہے۔ اور ریاست کے 'حکمرانی کے اختیارات صرف ریاست ہی استعمال کر سکتی ہے۔ کوئی بھی دوسرا ادارہ خواہ وہ مذہبی ہو یا کوئی اور، اس طاقت کا استعمال نہیں کر سکتا۔ یہ اختیار صرف خالصتاً ریاست کے با اقتدار لوگوں کو ہی حاصل ہے۔"

جب کانگریس برسر اقتدار آئی تو اعلیٰ ترین نظریات صرف آئین تک ہی محدود ہو کر رہ گئے۔ گاندھی جی کی تعلیمات اور انسانی اقدار رفتہ رفتہ گھٹ رہی ہیں اور نظر انداز کی جا رہی ہیں۔ سورن ذاتوں اور مالدار طبقہ نے اقتدار سنبھالا، اور اس کے بعد انھوں نے مخصوص مفادات پر زیادہ توجہ دی۔ ان کا مفاد غیر مساوی نظام کے قیام میں تھا۔ انھوں نے آئین کی دفعات اور اس میں شامل انسانی اقدار کو بالائے طاق رکھنے کی کوشش کی۔ ہم آج یہ افسوسناک صورت حال دیکھ رہے ہیں کہ سورن ذاتوں کے لوگ پسماندہ طبقات اور شیڈول کاسٹوں نیز شیڈولڈ قبیلوں کی سروسوں میں ریزرویشن کی مخالفت کر رہے ہیں۔ بدقسمتی سے اس کی مخالفت میں انھوں نے پُرامن طریقوں کو بالائے طاق رکھا اور تشدد اور لوٹ مار کے واقعات کو ہوا دی۔ ملا جُلا تشدد اگر ایک بار شروع ہو جائے تو وہ فرقہ واریت کا رنگ اختیار کر لیتا ہے اور ...

کی بجائے نفرت جنم لیتی ہے۔

یہ اور بھی افسوسناک حقیقت ہے کہ انصاف کے مطالبے کے نام پر سکھوں کا ایک طبقہ کھلے عام مہان گرو گوبند سنگھ کے نام کا غلط استعمال کر کے ہتھیار بندی اور ان کے استعمال کا پرچار کر رہا ہے۔

اس طرح دہشت پسندی کا دیو اور فرقہ واریت کا اژدہا اپنا سر اُٹھا رہا ہے۔ اگر اسے اپنے اصولوں کے پرچار کی کھلے عام اجازت دے دی گئی، تو شہری زندگی تقریباً مفلوج ہو کر رہ جائے گی۔ منصوبہ بند ترقی اور نئے منصفانہ سماجی نظام کے بارے میں ہم جو کچھ سوچ رہے ہیں یا اُن کا نقشہ تیار کر رہے ہیں، وہ بے کار ہو کر رہ جائے گا۔ ان حالات میں مہاتما گاندھی جی کی تعلیمات کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔ کیا ہم نے حصولِ آزادی کی جدوجہد میں اُن کی قیادت محض وقتی ضرورت کے طور پر تسلیم کی تھی۔ آج سورن ذاتوں اور طبقات کے عوام اقتدار کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش میں لگے ہیں اور اپنے مخصوص مفادات کے تحفظ کے لیے تشدد پر اُتر آئے ہیں۔ اس لیے یہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے کہ مہاتما گاندھی جی کی تعلیمات کو زندہ کیا جائے۔ اگر ہم قومی اتحاد کے موضوع پر سنجیدگی سے غور کرنے کو تیار ہیں تو ہمیں اس بیش قیمت ورثے کو لازماً اپنانا ہوگا۔ انسانوں سے محبت اور ان کے تئیں جذبۂ ہمدردی ابدی اقدار کی حیثیت رکھتی ہے اور ان کو نظر انداز کرنا سراسر خطرناک ہے۔

قومیت کی بنیاد نوعِ انسانی سے محبت، انسانوں سے پیار اور انسان دوستی پر ہونی چاہیئے۔ نیز یہ سبھی کو اپنانا ہے خواہ کوئی خدا میں یقین رکھتا ہے یا نہیں۔ یہ ہماری زندگی کی ڈھال ہے۔ نئے مبنی بر انصاف سماج اور سماجی اقتصادی نظام کے لیے اس جذبے کی کلیدی اہمیت ہے۔ قومی سطح پر اس بارے میں اتفاق رائے کے لیے کوئی کسر نہیں اُٹھا ... رکھنی چاہیئے۔

مذہب پر ایک کام

عرفان حبیب•

مذاہب محض اس خرافات کو آگے بڑھاتے ہیں

قابل مصنف پروفیسر عرفان حبیب کا کہنا ہے کہ راجہ رام موہن رائے اور مہاتما گاندھی جیسے سماجی مصلحین نے اس غیر حقیقی اصول کا پرچار کیا کہ تمام مذاہب چونکہ سچے ہیں، لہٰذا یہ سب بنیادی طور پر ایک ہی ہیں اور ان کے ذریعے عوام کو ایک ہی دھاگے میں پرویا جا سکتا ہے۔ ان کی رائے میں یہ استدلال تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں اور مذہب کی روایات اور ان کی کتابوں کے صریحاً خلاف ہے اور اس کی کامیابی کی کسی بھی دور میں امید نہیں کی جا سکتی۔ ان کے خیال میں اتحاد لانے کا طریقہ یہی ہے کہ دوٹوک انداز میں جذبۂ انسانیت اور انسان دوستی نیز معقولیت پسندی کو بڑھاوا دیا جائے۔

باخبر لوگوں کی رائے میں اب سماج میں مذہب کے (بلا آئیے کے نام پر جو کچھ ہوتا ہے اس کے) رول پر ایک گہری نظر ڈالنا نہایت ضروری ہو گیا ہے۔

بحث کے آغاز میں ہمیں مان لینا چاہئے کہ ہم مذہب کو مٹا نہیں سکتے، اور نہ ہی اس کے مٹانے کی کوئی ضرورت ہے۔ جب تک سماج میں نابرابری کا وجود ہے اور افراد یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اس نابرابری کو مٹا نہیں سکتے، اور جب تک وہ روحانی ذرائع سے تسلی و تشفی حاصل کرنے کے خواہاں ہیں مذہب باقی رہے گا اور اس کا باقی رہنا ضروری بھی ہے۔ بقول مارکس، "مذہب دکھوں سے بے قرار کی سرد آہ ہے، سنگدل دنیا کے دل کی پکار ہے بے روح ماحول کی روح ہے اور عوام کے لیے افیون کی گولی ہے"۔

یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ سماجی استحصال کے خاتمے کے بعد بھی مذہب کے ماننے والے باقی رہیں گے۔ کیونکہ غیر متوقع حالات اور امکانی شخصی المیوں کی موجودگی میں عام انسان کا دل چاہے گا کہ وہ عقاید اور دعا کا سہارا لے۔ چنانچہ ابھی ایک عرصے تک عوام کے مذہب سے جڑے رہنے کا جواز باقی رہے گا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مذہب اتنی ہی شدت کے ساتھ ذہن انسانی پر حاوی رہے گا جتنا کہ آج ہے۔

جب تک ہمیں یہ ادراک نہ ہوگا کہ انسانی معاملات میں مذہب کا عمل دخل روز بروز کم سے کمتر ہوتا جا رہا ہے ہم دور جدید میں ذہن انسانی کے ارتقاء کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ فور باخ نے تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے یہ مشاہدہ کیا تھا کہ "انسان الوہی صفات میں سے زیادہ سے زیادہ اخذ کر کے اپنی صفات میں شامل کرتا جا رہا ہے"۔ اب انسان کو اپنے ماضی اور موجودہ ماحول کی جانکاری حاصل کرنے کے لیے کتب مقدسہ کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ علم اسے سائنس سے حاصل ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ڈارون کے نظریۂ ارتقا نے بیک جنبش قلم و، ودِ آدم کی تمام مذہبی روایتوں کو محض قصہ کہانی کا ہم پلہ بنا دیا ہے۔

سائنس اور عقلیت کے عروج نے نہ صرف یہ کیا ہے کہ راسخ العقیدہ لوگوں کے عقاید کو توہمات ثابت کیا ہے، اس نے چند نئی اخلاقی قدروں کو بھی جنم دیا ہے۔ مثلاً اقتصادی اور سماجی برابری کا نظریہ، عورتوں کے حقوق، روزگار و سماجی و طبی بہبود کا حق، ریاست کا یہ فریضہ کہ وہ ترقیاتی کاموں کا بیڑا اٹھائے اور انہیں فروغ دے وغیرہ وغیرہ۔ یاد رہے کہ ان خیالات و

آریہ سماج نے بظاہر ایک قدیم اور اصلی ہندو دھرم (جس کا کوئی تاریخی جواز نہیں) پیش کیا ہے جس میں سامی (یہودی، عیسائی، اسلام) کی طرح تبلیغ کی بھی گنجائش ہے۔

• پروفیسر شعبہ تاریخ، سنٹر فار ایڈوانسڈ اسٹڈی ان ہسٹری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

نظریات نے سائنسی اور عقلی سوچ کے دھاروں میں جنم لیا۔ گو کہ بعد میں اہل مذہب نے بھی انھیں کسی حد تک اپنے دامن میں جگہ دینے کی کوشش کی۔

غلامی کی مثال ہی لیجئے۔ ہندومت اور اسلام دونوں ہی غلامی کو تسلیم کرتے ہیں۔ غلام پر آقا کے حقوق کا تحفظ دونوں مذہبوں کے "دائی قوانین" میں شامل ہے۔ اسپین، پرتگال اور انگلستان کی عیسائی ریاستوں نے اپنی سلطنتیں غلاموں کی نفع بخش تجارت کے بل بوتے پر ہی قائم کیں۔ البتہ روسو کے ماننے والوں نے جو انقلاب فرانس کے دوران "عیسیٰ دشمن" پکارے جاتے تھے، پہلے پہل انسانی برابری کا نعرہ بلند کیا اور غلامی ختم کرنے کا مطالبہ کیا۔ تب کہیں جاکر اس ڈر سے کہ فرانس والے اس اخلاقی معاملے میں کہیں اولیت کا شرف نہ حاصل کرلیں، عیسائی مشنری کیمپوں میں بھی غلامی کے خاتمے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔

مختصر یہ کہ گزشتہ دو صدیوں کے دوران مذہب پر سیکولر خیالات نے زبردست اثر ڈالا ہے۔ گو کہ ہند میں سماجی اصلاح کی تحریک کو (خصوصاً عورتوں پر ظلم اور ذات پات کے خاتمے سے متعلق) جیسے راجہ رام موہن رائے، کشیب چندر سین اور مہاتما گاندھی نے شروع کیا۔ ایک مذہبی ڈھانچے میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی (موجودہ اصلاح شدہ ہندومت کا بیشتر حصہ اسی ڈھانچے پر مشتمل ہے) لیکن اس احیاء کا ذہنی ماخذ جدید یورپی فکر ہے۔ جس میں لبرل ازم سے لے کر سوشلزم تک قسم قسم کے مکتب ہائے فکر شامل ہیں۔

البتہ ناقدین کے ایک مکتب خیال نے اصلاح کو مذہب کے ڈھانچے میں پیش کرنے کے عمل پر ہمیشہ اظہار تاسف کیا کیونکہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنگالی احیاء، نمایاں طور پر "ہندو احیاء" کی شکل میں نمودار ہوا۔ اسی طرح مہاتما گاندھی نے ذات پات کا جس طرح مردانہ وار مقابلہ کیا، عورتوں کے حقوق کے لیے جو جد و جہد کی اور مذہبی فسادات میں کشت و خون کی جو مذمت کی وہ لاکھ قابل ستائش سہی، انھوں نے بھی مذہب کو جس طرح استعمال کیا، اس پر بھی نکتہ چینی کی جاسکتی ہے۔

ہمیں ان مصلحین کی خوش عقیدگی کا اعتراف ہے۔ ممکن ہے کہ شعوری طور پر انھوں نے محسوس کیا ہو کہ اگر سماج سدھار کی تحریک کو مذہبی اصطلاحوں کی مدد سے پیش کیا جائے اور کتب مقدسہ کے لغوی معنی سے پرے "ایکم برہما" کے نام پہ اپیل کی جائے، تو غالباً اصلاح کا کام زیادہ آسان ہو جائیگا لیکن اس مذہب کے نام کے استعمال کی بنا پر کامیابی محدود رہی کیونکہ اگر مذہب کا نام اصلاح کی موافقت میں لیا جاسکتا ہے تو اس کی مخالفت میں بھی لیا جاسکتا ہے۔

مزید برآں موجودہ ذرائع ابلاغ نے بڑے سے بڑے مجمع اور زیادہ سے زیادہ سامعین سے خطاب کرنا ممکن بنا دیا ہے۔ اور اس طرح مذہبی احیاء کو اتنا فروغ ملا ہے کہ وہ اب جدید کاری کے عمل کو گھن کی طرح لگ گیا ہے۔ ماہرین سماجیات (بطریق سری نواس) ہمیں بتاتے آئے ہیں کہ سنسکرت کاری نے (جس کے تحت کوئی نیچی ذات اپنے کو زیادہ اونچا دکھانے کی غرض سے اونچی ذاتوں کے طور طریقے اور اعمال کو اپنا لیتی ہے) مذہبی قدامت پرستی اور ذات پات کے بندھنوں کو زیادہ سخت اور مضبوط کر دیا ہے اور اس طرح قومی تحریک کی روایات اور مصلحین کی عظیم خدمات کی نفی کر دی ہے۔ ادھر آریہ سماج نے بظاہر ایک قدیم اور اصلی ہندو دھرم (جس کا کوئی تاریخی جواز نہیں) پیش کیا ہے جس میں سامی (یہودی، عیسائی، اسلام) کی طرح تبلیغ کی بھی گنجائش ہے۔

مسلمانوں میں بھی ایک نیا رجحان ابھرا ہے جسے آسانی کے لیے لیکن غلط طور پر "بنیادی عقاید کا رجحان" کہا جاتا ہے۔ اس کا ایک سوتا جدید مسلمانوں (مثلاً اقبال) سے ملتا ہے تو دوسرا ساتویں صدی کے اسلام کے احیاء کے خواہاں لوگوں سے (مثلاً مولانا مودودی) یہ لوگ بھی اپنی کوششوں کے آئینے میں اس قدر غیر تاریخی ہیں جتنا کہ آریہ سماج۔ ہندوستان میں بنیادی عقاید والوں کا خاص کام مسلم عائلی قانون کا دفاع ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ غلامی کو چھوڑ کر جسے خوش قسمتی سے انگریزوں نے پہلے ہی ۱۸۴۳ء میں ختم کر دیا تھا، مسلم عائلی قانون کی سبھی نامنصفانہ خصوصیات کا دفاع کیا جائے۔ بنیادی عقائد والے عورت کو ترکے میں برابر کا حصہ نہیں دینا چاہتے، وہ ایک سے زائد بیویاں رکھنے کا دفاع کرتے ہیں اور مطلقہ عورت کو نان نفقہ کا حق دینے کی مذمت کرتے ہیں۔

سکھوں میں بھی ان لوگوں کے ہم خیال پائے جاتے ہیں۔ دو سال قبل سکھوں کی ایک خاصی با اختیار کمیٹی نے ایک علیحدہ سکھ عائلی قانون کی مانگ کی۔ جس میں ایک سے زائد بیویاں رکھنے کے حق اور بیوہ کی اپنے دیور سے لازمی شادی کی مانگ شامل تھی۔

مسلمانوں میں بھی ایک نیا رجحان ابھرا ہے جسے آسانی کے لیے لیکن غلط طور پر "بنیادی عقائد کا رجحان" کہا جاتا ہے۔ اس کا ایک سوتا جدید مسلمانوں (مثلاً اقبال) سے ملتا ہے تو دوسرا ساتویں صدی کے اسلام کے احیاء کے خواہاں لوگوں سے (مثلاً مولانا مودودی) یہ لوگ بھی اپنی کوششوں کے آئینے میں اس قدر غیر تاریخی ہیں جتنا کہ آریہ سماج۔

ہندوستان میں بنیادی عقائد والوں کا خاص کام مسلم عائلی قانون کا دفاع ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ غلامی کو چھوڑ کر جسے خوش قسمتی سے انگریزوں نے پہلے ہی ۱۸۴۳ء میں ختم کر دیا تھا، مسلم عائلی قانون کی سبھی نامنصفانہ خصوصیات کا دفاع کیا جائے۔

یہ واضح ہے کہ ہندوؤں کی تنگ نظر قوم پرستی، مسلمانوں کی فرقہ پروری اور سکھوں کی علاحدگی پسندی یہ سب نہ صرف مذہب کے نام پر اپیل کرتی ہیں بلکہ مذہب سے وفاداری کو دوا در وفاداریوں یعنی ملک سے وفاداری اور دبے کچلے لوگوں کے مفاد سے وفاداری سے بالاتر گردانے کے برابر کے قصوروار ہیں۔

ان تحریکوں کی کامیابی اسی مطالبے پر مبنی ہے کہ انسان کی اولین وفاداری اس کے مذہب سے ہو، چند سال قبل تک آر ایس ایس کے پرچے "آرگنائزر" کے ایڈیٹر اور پبلشر اخبار کے لازمی اعلان نامے میں قومیت کے خانے میں اپنے کو ہندوستانی کی جگہ "ہندو" لکھتے تھے۔ معلوم نہیں حکومت نے اس بات پر کبھی ان کی سرزنش کی یا نہیں۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ یہی آر ایس ایس والے لوگ آج ان سکھ انتہا پسندوں کی ملامت و مذمت میں، جو اپنے آپ کو ایک قوم کہتے ہیں، پورا زور بیان صرف کر رہے ہیں۔

یہ واضح ہے کہ ہندوؤں کی تنگ نظر قوم پرستی، مسلمانوں کی فرقہ پروری اور سکھوں کی علاحدگی پسندی، یہ سب نہ صرف مذہب کے نام پر اپیل کرتی ہیں بلکہ مذہب سے وفاداری کو

ان مسائل کا واحد حل یہ ہے کہ بغیر کوئی سمجھوتہ کیے ایک سیکولر اور سائنسی انداز فکر کو بڑھاوا دیا جائے۔ بد قسمتی یہ ہے کہ گو ہم اکثر اپنی جمہوریت کے سیکولر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ہم میں سے بیشتر سیکولر سے صرف یہ مراد لیتے ہیں کہ دوسرے مذاہب سے رواداری برتی جائے اور اپنے مذہب کو خاص طور پر بڑھاوا دیا جائے۔

دوا در وفاداریوں یعنی ملک سے وفاداری اور دبے کچلے لوگوں کے مفاد سے وفاداری سے بالاتر گرداننے کے برابر کے قصوروار ہیں خواہ ہم اپنے ملک کو متحد دیکھنا چاہتے ہیں (نہ صرف سرحدوں پر بلکہ جذبے میں بھی) یا اس میں سوشلسٹ نظام زندگی لانے کے خواہاں ہوں، ہمیں مذہب یا ذات پات کو اپنانے پر مبنی تقسیم پسند قوتوں کے خلاف جدوجہد کو اپنے لائحہ عمل میں ایک کلیدی حیثیت دینا ہوگی۔ ہند میں ایک قدیم روایت چلی آرہی ہے جس کے نام پر رام موہن رائے اور مہاتما گاندھی نے بھی اپیل کی ہے کہ سارے مذاہب برحق ہیں، لہذا سبھی مذاہب، انجام کار، وحدانیت کی چھتری تلے ایک ہی ہیں، اور اس لیے ان میں کوئی چپقلش نہیں ہونی چاہئے۔ اور ایسا لگتا ہے کہ آزاد ہند میں کھلے یا ڈھکے طور پر یہی سرکاری نظریہ بھی بن گیا ہے۔ ہم ان لوگوں کے خلوص کا احترام کرتے ہیں جنھوں نے یہ نظریہ وضع کیا اور اس سے بھی زیادہ وہ مقصد مستحسن ہے کہ جس کے لیے یہ وضع کیا گیا ہے، یعنی مذہبی بھائی چارہ۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہ دعویٰ نہ صرف تاریخ کے خلاف ہے بلکہ مذاہب کی [illegible]ں اور روایات کے بھی اتنا خلاف کہ اس پر کوئی منطقی بحث ممکن نہیں اور نہ اس سلسلے میں ایسے ثبوت پیش کیے جاسکتے جو ایک معقول مباحثے میں درکار ہوتے ہیں۔ لہذا یہ نظریہ ایک نعرہ سے زیادہ نہیں جس سے بڑے بڑے لوگوں کے نام منسلک ہیں اور یہ امکان بہت ہی بعید ہے کہ اس کے ذریعے ان لوگوں کو ہمنوا بنایا جاسکتا ہے جن کی سب سے بڑی ڈھال خود اپنے مذہب کی کتب مقدسہ اور رسوم ہیں۔

ان مسائل کا واحد حل یہ ہے کہ بغیر کوئی سمجھوتہ کیے ایک سیکولر اور سائنسی انداز فکر کو بڑھاوا دیا جائے۔ بد قسمتی یہ ہے کہ گو ہم اکثر اپنی جمہوریت کے سیکولر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، ہم میں سے بیشتر سیکولر سے صرف یہ مراد لیتے ہیں کہ دوسرے مذاہب سے رواداری برتی جائے اور اپنے مذہب کو خاص طور پر بڑھاوا دیا جائے۔

اس دگدھا میں ہمارا آئین ہمیں راہ دکھاتا ہے۔ دفعہ ۱۵ کے تحت مذہبی بنا پر امتیاز ممنوع ہے۔ دفعہ ۲۵ آزادیٔ ضمیر کی ضامن ہے اور دفعہ ۲۷ کے تحت کسی خاص مذہب کی تبلیغ یا دیکھ ریکھ کے لیے سرکاری محاصل کے استعمال کی ممانعت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دفعہ ۳۰ کے تحت مذہبی اقلیتوں کو اپنے لیے تعلیمی ادارے قائم کرنے کے وسیع اختیارات حاصل ہیں اور قائم کردہ ادارے حکومت سے اسی طرح امداد حاصل کرسکتے ہیں جیسے کہ سیکولر ادارے۔ پھر دفعہ ۲۹۰ الف کے تحت اس کی اجازت ہے کہ کیرالا اور تامل ناڈ سرکاروں کے بجٹ میں تقریباً پچاس لاکھ روپے سالانہ کی رقم ہندو مندروں کی دیکھ ریکھ کے لیے رکھی جاسکتی ہے۔

اگر ہم ہندوستانی آئین کا امریکی آئین سے مقابلہ کریں جو خاصا قدیم ہے تو فوراً محسوس ہو جاتا ہے کہ تمام دعوؤں کے باوجود ہمارا آئین اس طرح کا سیکولر دستور نہیں جیسا کہ امریکہ کا ہے۔ کیونکہ ہمارے یہاں ریاست اور مذاہب کے درمیان ویسی مکمل علیحدگی نہیں جیسی کہ امریکی دستور اور کئی اور

ذرائع ابلاغ پر مذہب کی یلغار بھی قابل دید ہے۔ آل انڈیا ریڈیو پر سکھ گرنتھوں کے پاٹھ کا مطالبہ بڑی آسانی سے، گو جزوی طور پر مان لیا گیا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ریڈیو پر خالص مذہبی پروگرام پیش کرنے کا چلن پہلے سے ہی موجود تھا۔ اور یہ مطالبہ بھی اسی قبیل کا تھا۔

جدید دساتیر میں موجود ہے۔

اس لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ واقعی عملدرآمد کی کسوٹی پر جانچا جائے تو سیکولرزم سے ہماری حکومت کی وابستگی واضح طور پر معتبر ثابت نہیں ہوتی۔ اب یہ ایک رواج سا بن گیا ہے کہ سرکاری عمارتوں کا سنگ بنیاد رکھتے وقت جو ہر شہری سے حاصل کردہ محصول سے تعمیر ہوتی ہیں، اشلوک پڑھے جاتے ہیں اور دوسری رسوم ادا کی جاتی ہیں۔

اسی طرح بہت سے عوامی اداروں کو خالص مذہبی شخصیتوں سے موسوم کیا جاتا ہے، ان میں وہ یونیورسٹیاں بھی شامل ہیں جو کلی طور پر سرکار کی قائم کردہ ہیں اور جن کا خرچ سرکار ہی اٹھاتی ہے۔

علاوہ ازیں ذرائع ابلاغ پر مذہب کی یلغار بھی قابل دید ہے۔ آل انڈیا ریڈیو پر سکھ گرنتھوں کے پاٹھ کا مطالبہ بڑی آسانی سے، گو جزوی طور پر مان لیا گیا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ریڈیو پر خالص مذہبی پروگرام پیش کرنے کا چلن پہلے سے ہی موجود تھا۔ اور یہ مطالبہ بھی اسی قبیل کا تھا۔

کہا جا سکتا ہے کہ سرکار کے مذہبی رسومات میں حصہ لینے سے کسی خاص مذہب کی تبلیغ پر شمہ برابر بھی فرق نہیں پڑتا۔ مگر مسئلہ یہ نہیں۔ اس طرز عمل سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سرکار نہ صرف مذہبی نظریہ کی حامی ہے بلکہ اسے مدد بھی دیتی ہے۔ اس سے سرکار کا سیکولرزم کا دعویٰ خاصا مشکوک ہو جاتا ہے اور یہ مذہبی تنگ نظری کو سیاسی طور پر باعزت بنا دیتا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ سرکار کے مذہبی رسومات میں حصہ لینے سے کسی خاص مذہب کی تبلیغ پر شمہ برابر بھی فرق نہیں پڑتا۔ مگر مسئلہ یہ نہیں اس طرز عمل سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سرکار نہ صرف مذہبی نظریہ کی حامی ہے بلکہ اسے مدد بھی دیتی ہے۔ اس سے سرکار کا سیکولرزم کا دعویٰ خاصا مشکوک ہو جاتا ہے اور یہ مذہبی تنگ نظری کو سیاسی طور پر باعزت بنا دیتا ہے۔

چنانچہ اس وقت سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ حقیقی سیکولر قدروں کا اِدّعا کیا جائے اور انہیں تسلیم کرایا جائے۔ ہمیں شہری آزادی سے متعلق اداروں کی طرح غالباً ایک ایسا ادارہ قائم کرنا ہوگا جو اس بات پر نظر رکھے گا اور محاسبہ کرتا رہے گا کہ سرکار اپنے خزانے، اپنے پلیٹ فارم اور اپنے ذرائع ابلاغ کو مذہبی مقاصد کے لیے استعمال نہ ہونے دے۔

ان سب سے بالا، یہ بھی ضروری ہے کہ عوام میں ایسے سائنسی مزاج کو فروغ دیا جائے جس میں خلافِ عقل باتوں اور توہم پرستی کا کوئی شائبہ نہ ہو۔ طبیعی سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم میں زیادہ سے زیادہ روپیہ لگانے سے ہی یہ مقصد پورا نہیں ہوگا۔ غیر سائنسی علوم میں بھی سائنسی مزاج کو جاری و ساری کرنا ہوگا۔ ورنہ ان علوم میں تنگ نظری اور فرقہ پروری کے فروغ کے لیے زرخیز زمین ملتی رہے گی اور ان کو اتنا فروغ حاصل ہوگا کہ وہ سائنس دانوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیں گی۔ یہ امر قابل غور ہے کہ کتنے ہی سائنس داں اپنی لیبارٹری سے باہر نکلتے ہی ہر قسم کے توہمات کا شکار ہو جاتے ہیں۔

جب ۱۹۷۰ سے شروع ہونے والے دہے میں نیشنل کونسل آف ایڈوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ نے ثانوی اسکول کے لیے تاریخ کی چند اعلیٰ پائے کی، بہت اچھی لکھی ہوئی اور متوازن درسی کتب شائع کی تھیں، تو سارا فرقہ پرست کیمپ ان کی مخالفت پر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اگر اس تحریک کے خلاف اتنی ہی مضبوطی سے مورچہ لگایا نہ گیا ہوتا تو شاید سرکار ان کتابوں کو واپس لے لیتی۔

تعلیمی نظام میں فرقہ پروری کس طرح فروغ پاتی ہے اس کی مثال میں تاریخ سے دوں گا۔ آج بھی تاریخ کی بہتیری درسی کتب میں چند متنازعہ فیہ حقائق یا محض اساطیر کی مدد سے ہمارے ماضی کے بارے میں ایک زبردست فرقہ وارانہ اور تنگ نظر ذہنیت سکھائی جاتی ہے۔ حال میں ایک سرکاری ادارے انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ کی مدد سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں متعدد پختہ کار مورخوں کے مضامین شامل ہیں۔ جس میں کہا گیا ہے کہ

(۱) آریہ لوگ (ہند میں) باہر سے نہیں آئے تھے اور وید وادیٔ سندھ کی تہذیب سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔

(۲) دراوڑ قوم بالکل قدیم نہیں۔

(۳) پورس نے سکندر پر فتح حاصل کی تھی۔

غالباً اگلا قدم یہ ہوگا، جیسا کہ بعض مورخوں نے پہلے ہی سے کہہ رکھا ہے کہ عہد وسطیٰ کے سارے آثار قدیمہ جن میں لال قلعہ، تاج محل وغیرہ بھی شامل ہیں، ہندو راجاؤں نے بنائے تھے۔

گو کہ تاریخ لکھنے کے عمل میں حقیقی اختلاف رائے کا احترام ضروری ہے لیکن فرقہ پروری کا زہر پھیلانے والی درسی کتب پر ایک حد لگانا بھی ضروری ہے۔ ایسی کتابوں کے ساتھ وہی سلوک ہونا چاہیے جو حیاتیات کی ان درسی کتب کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے جو آج بھی نظریۂ ارتقا کی جگہ نظریۂ تخلیق کا درس دیتی ہیں (جیسا کہ اسلامی سائنس والے کرتے ہیں)۔

جب ۱۹۷۰ سے شروع ہونے والے دہے میں نیشنل کونسل آف ایڈوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ نے ثانوی اسکول کے لیے تاریخ کی چند اعلیٰ پائے کی، بہت اچھی لکھی ہوئی اور متوازن درسی کتب شائع کی تھیں، تو سارا فرقہ پرست کیمپ ان کی مخالفت پر اٹھ کھڑا ہوا تھا، اور اگر اس تحریک کے خلاف اتنی ہی مضبوطی سے مورچہ لگایا نہ گیا ہوتا

(باقی ص ۴۳ پر)

خواجہ احمد عباس*

استحصال پسندی کا دوسرا نام مذہب ہے

ایک خاص عمر تک میں بھی مذہب کو گرفتار کر کے کورٹ مارشل کرنے میں یقین رکھتا تھا۔ مذہب سے مراد ہے سب مذاہب، مجھے مذہب کے لفظ سے ہی چڑ تھی کیوں کہ یہ عوام کے لیے افیون تھی۔ خاص طور پر ہندوستان میں۔ جہاں لوگ اپنے بارے میں نہیں سوچتے بلکہ مذہب کی بعض رسومات میں یقین رکھتے ہیں جو انھیں اپنے آبا و اجداد سے وراثت میں ملتی ہیں۔

لیکن اپنا دوسرا بڑا ناول انقلاب لکھتے ہوئے جو پہلے ناول کا ہی نتیجہ تھا، میں نے تمام مذاہب کا مختصر اور بہ عجلت تقابلی مطالعہ کیا۔

پہلا مطالعہ

میں نے پہلے قرآن پڑھا۔ اسلام وہ مذہب ہے جس میں میری پیدائش اور پرورش ہوئی۔ میں نے قرآن کا ایک حصہ انگریزی میں پڑھا، کیوں کہ ایک غیر ملکی زبان میں اُسے سمجھنا آسان تھا۔ وہ حصہ یوں ہے۔

" مشرق اور مغرب دونوں خدا کے ہیں اس لیے ہم جدھر بھی رُخ کریں اُدھر ہی خدا ہے۔ مشرق یا مغرب کو مُنہ کرنے میں کوئی پاکبازی نہیں ہے۔ بلکہ پارسا ہے وہ شخص جو یتیموں، حاجتمندوں اور مسافروں کو اپنانا عزیز سمجھتا ہے۔

یہ سوچ کر کہ یہ الفاظ کارل مارکس کی ولادت کے سولہ سو سال پہلے ایک جلتے ہوئے صحرا کے اندر خانہ بدوشوں سے کہے گئے تھے۔ کیا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کیا سماج واد اور اشتراکیت کا نچوڑ یہی نہیں ہے؟

اب اس سے بھی بہت قدیم اپنشدوں کی طرف آیئے جن میں موٹے طور سے یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ بھگوان نام کا کوئی ریش دراز بزرگ جنت میں نہیں بیٹھا۔ اُپنشد کہتے ہیں۔

" وہ (ایشور) کھردرا نہیں، سخت نہیں، آگ کی مانند تاباں نہیں، پانی کی طرح جُڑا ہوا نہیں۔ اُس کی موٹائی نہیں، وہ اندھیرا نہیں، اُس میں ہوا نہیں وہ جگہ نہیں گھیرتا، اُس کا ذائقہ نہیں خوشبو نہیں، رنگ نہیں، اُس کی آنکھیں نہیں، کان نہیں، آواز نہیں، وہ سانس نہیں لیتا اور اُس کا کوئی وجود نہیں۔ (کیا یہ اس بات کو ثابت نہیں کرتا کہ خدا، ایشور یا اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے) اور بھگوت گیتا۔ وہ واحد کتاب جس کی سب ہندو عزت کرتے ہیں کہتی ہے :۔

" قدرت یا پراکرتی ہر چیز کو جنم دیتی ہے، خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان۔ پھر گیتا میں اُس افضل ترین چیز کو بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے " وہ جو پیدا نہیں ہوتی، لافانی ہے اور زمانے کی قید سے آزاد ۔۔۔ وہ ظاہر نہیں ہوتی، مرئی نہیں، اُس کے بارے میں نہ سوچا جا سکتا ہے اور نہ ہی دانش، علم، حق، ضبط نفس، فریب نظر سے آزادی، عدم تشدد، کرب اور عیش، جنم اور موت غربت اور خوشحالی اور تشفی کی تلاش میں اُسے دہم و گمان میں لایا جا سکتا ہے۔ کیا یہ سب ایک طاقت کی موجودگی کی دلیل نہیں ہے۔ جو غیر مجسم اور آشکار ہے اور جسے ایشور کہتے ہیں؟۔

مسلمانوں کے قرآن میں خدا کو اس طرح بیان کرتے ہوئے کہ وہ مرتا نہیں، اُس کی شکل نہیں، گہرائی نہیں، اور اُس کی روح نہیں۔ کم و بیش وہی الفاظ جو اُپنشد میں کہے گئے ہیں، اور زیادہ وضاحت سے یوں کہا گیا ہے :۔

" جنت اور زمین کی تخلیق میں، دن اور رات کی تبدیلی، بارش میں جو خدا جنت سے زمین پر بھیجتا ہے، جس سے زمین کو زندگی ملتی ہے اور اس کی موت کے بعد، اور ہر قسم کے مویشیوں کو بکھیرنا اور ہواؤں و بادلوں میں تبدیلی آنا جو جنت اور زمین کے درمیان خدمت بجا لاتے ہیں، یہ سب یقینی طور پر اُن سب کے لیے اُس کی علامات ہیں جو انھیں سمجھتے ہیں (سائنسدان اور فلسفی ؟ خواجہ احمد عباس)۔

* صحافی اور فلم ڈائرکٹر، بمبئی۔

اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟

ایسے لگتا ہے گویا تمام مذاہب یہ اشارہ کر رہے ہیں کہ انسانوں کو ضرورت ہے ہم آہنگی اور دوسرے انسانوں اور حیوانوں سے ہم آہنگ ہو کر رہنے کا درس دینے کی ضرورت ہے جو کہ ایک بنیادی اصول ہے۔

سب پیغمبروں اور سب مذاہب میں کونسی چیز مشترک ہے۔ ان میں رام کرشن بدھ اور مہاویر بھی شامل ہیں۔ کیونکہ کہا گیا ہے کہ پیغمبر سب کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ رگ وید میں کہا گیا ہے کہ سچائی ایک ہی ہے اور سچائی کی جانب جانے والے راستے کئی ہیں۔ سب مذاہب نے انسانی زندگی کو مقدس مانا ہے اور اندھا دھند قتل کے خلاف پرچار کیا ہے۔ قرآن کے مطابق ایک بے گناہ کا قتل پوری بنی نوع کے انسان کے قتل کے مترادف ہے۔ پھر یہ ہر ہر مہادیو اور اللہ ہو اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے جن کا مطلب ایک ہی ہے، یہ تشدد کی دوڑ اور قتل و غارت گری کس لیے جس میں ہزاروں افراد کی قربانی دی جا رہی ہے۔

پھر یہ ہندو یا مسلمان یا ہندو اور عیسائیوں اور ہندوؤں اور سکھوں میں فساد اور جھگڑے کس لیے؟ کوئی بھی۔ ہندو اس جھگڑے فساد میں شریک نہیں ہوتا سوائے اُن ہندوؤں کے جو بھگوت گیتا نہیں پڑھتے، اُن مسلمانوں کے جو قرآن نہیں پڑھتے، اُن عیسائیوں کے جو عیسیٰ کا پیغام نہیں پڑھتے۔ اور اُن سکھوں کے جو گرنتھ صاحب نہیں پڑھتے۔ جس میں ہندو اور مسلم مذاہب بڑی خوبی سے ملے جلے ہیں)۔ ہندو بھگتوں کی بانی اور مسلم صوفیوں کا پیغام ایک دوسرے کے ہم آہنگ ہے یہاں تک کہ گورو نانک بھگت کبیر کے دوہوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"کھشتری، براہمن، شودر، ویش بلکہ چنڈال بھی ایشور سے یکساں پیار کر سکتے ہیں اور مکتی پا سکتے ہیں۔ جو جی خدا کو بھا لیتا ہے نانک اس کی [illegible]"

[illegible]

تاریخ ملزم ہے

الزام بس یہ آتا ہے تاریخ پر خاص طور پر اُس تاریخ پر جو گذشتہ تین سو برسوں میں پڑھائی گئی ہے جس میں اورنگ زیب اور شیواجی کو مصنوعی طور پر ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اورنگ زیب ہندوؤں کے لیے ہوّا ہے جب کہ مسلمانوں نے شیواجی سے نفرت کرنا اور ڈرنا سیکھا ہے، حالاں کہ اصل تاریخ کی حقیقت کچھ اور تھی۔ دستاویزات ثابت کرتی ہیں کہ اورنگ زیب درحقیقت ایک قدامت پسند مسلمان تھا جس کی قدامت پسندی کا نشانہ [illegible] قسم کے استدلال پسندوں، سرمد جیسے صوفی فقیروں بلکہ مسلمان موسیقاروں سے بھی زوردار ٹکراؤ ہوا جن کا دربار میں داخلہ بند کر دیا گیا تھا، اور جنھوں نے لال قلعے کی دیواروں کے نیچے موسیقی کا جنازہ نکالا۔ جنازے کو دیکھ کر شہنشاہ نے پوچھا "کون مر گیا ہے؟" جنازے والوں نے جواب دیا "حضور یہ ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کا جنازہ ہے"۔ "تو اسے اتنا گہرا دفن کیجیے کہ یہ پھر اُٹھنے نہ پائے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ اورنگ زیب صرف مذہب پرست ہی نہیں بلکہ ایک کٹر سخت انسان اور اذیت پسند تھا۔ پھر بھی ریکارڈوں سے پتہ چلتا ہے کہ اُس نے ہندوؤں کے مندروں اور دھارمک جگہوں کے لیے ٹرسٹ اور اوقاف بنائے۔ جہاں تک شیواجی کا تعلق ہے اُسے دھرم سے گہری عقیدت تھی لیکن وہ ایک سیکولر انسان کے طور پر بھی مشہور ہے۔ کیونکہ نہ صرف اُس کے توپخانے کا کمانڈر ایک مسلمان ابراہیم توپچی تھا بلکہ اُس نے کئی خالص مشرقی اطوار کے مسلمان سپاہیوں کو اپنے ذاتی محافظوں میں ملازم رکھا ہوا تھا۔ برطانوی تاریخ دانوں نے شیواجی کی ان مثالوں کو دیدہ دانستہ چھپائے رکھا اور ایسا ثابت کیا کیونکہ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو سامراجیوں کی ایک پرانی چال ہے۔ انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں دشمنی کی فضا پیدا کی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندو مسلم فسادات یا ہندو سکھ فسادات کے لیے ہم ملزم نہیں ہیں۔ اس الزام سے ہم بچ نہیں سکتے۔

مذاہب کو بجائے خود موردِ الزام قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن ہم اپنے مذہب خواہ وہ ہندو دھرم ہو یا اسلام، بدھ دھرم ہو یا عیسائیت یا سکھ دھرم، کی نام نہاد دھارمک شعبدہ بازیوں کے بارے میں بہت متعصب ہیں۔ توہم پرستی کئی قسم کی ظلمت پسندی اور اصلاح و ترقی کی مخالفت کو جنم دیتی ہے، بجائے اس کے کہ مذہب ہم آہنگی اور امن قائم کرے ظلمت پسندی مذہبی فرقوں کے درمیان دشمنی پیدا کرتی ہے۔

ناجائز فائدہ

نہ صرف یہ مذہبی دشمنی ہی پیدا کرتی ہے بلکہ مذہب کے نام پر ہر قسم کی شعبدہ بازی کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

ایسے ہندو مندر بھی ہیں جہاں نوجوان لڑکیوں کو دیوداسی بنا کر رکھا جاتا ہے اور گاہکوں کو فروخت کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کسی مسلم فقیر کی عبادت گاہ ناجائز شراب بیچنے والوں اور اسمگلروں کے مل بیٹھنے کا کام دیتی ہے۔ مسلمانوں کے نام نہاد مذہبی رہنماؤں نے اپنے اہلِ مذہب کو ۲۰ ویں صدی کے آخر میں پٹھانوں اور مغلوں کی طرح پھر سے فتوحات کا ناممکن خواب دیکھنے کی حوصلہ افزائی کی اور ہندوؤں کو سکھایا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کی از سرِ نو فتح کے خواب کے غلبے سے ڈریں۔ باہمی خوف سے دونوں فرقوں کے درمیان دشمنی پیدا ہوئی ہے۔ انگریزوں نے جب وہ یہاں حکومت کرتے تھے ایسے خوابوں اور اُن کے دیکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی حالاں کہ کسی ہندو مسلم فساد میں ہر قتل کے لیے انھیں ذمہ دار قرار دینا نہایت مضحکہ خیز بات ہے۔

کسی نے لوگوں کو یہ نہیں بتایا کہ ہندوستان میں جتنے بھی فاتح آئے ماسوائے چند ایک کے، سب نے غیر مہذب، سخت گیر اور ظالمانہ طرزِ عمل اختیار کیا، خواہ وہ آریوں کا ہندوستان کے اصل باشندوں آدی واسیوں یا دراوڑوں سے سلوک ہو یا

پٹھان اور مغل حملہ آوروں کا یا پرتگیز فرانسیسی اور برطانوی کمپنیوں کا جو یہاں تجارت کی غرض سے آئے اور حکمران بن کر بیٹھ گئے یا نازیوں اور فاسسٹوں کا دوسری جنگِ عظیم میں ایبی سینیا یا اسپین یا مشرقی یا مغربی یورپ کے چھوٹے ممالک میں طرزِ عمل ہوا

یہ ذمہ داری ہندو اور مسلم مصلحین پر آئی، کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے پیروکاروں کو صحیح تاریخ کے بارے میں بتائیں جو قدرت کے سکھائے ہوئے ہم آہنگی کے قانون کے مطابق ہے اور جسے اشوک، اکبر اور شیواجی جیسے روشن دماغ بادشاہوں نے تدبر اور امن کا راستہ اپنانے کے لیے اختیار کیا۔

گم شدہ حصہ

جس دھرم پر آج عمل کیا جا رہا ہے اس میں دھرم کی اصل روحانیت کا کوئی جزو شامل نہیں۔ یہاں وہاں کسی خدا پرست انسان کے بارے میں (خدا والے کی نہیں) استثنا کی کچھ مثالیں ہو سکتی ہیں جو اپنا سارا وقت دھیان اور عبادت میں بسر کرتا ہو، ورنہ اکثر اللہ والے سیاست بازی میں لگے رہتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی وزیر اعلیٰ کے دربار کے رتن ہیں اور وزیر اعلیٰ سے بھی بلند مرتبہ رکھتے ہیں کیونکہ وزیر اعلیٰ بھی اُن کے پاؤں چھوتا ہے۔

جنتا پارٹی کے گورو کی مثال موجود ہے جسے اُس وقت کے وزیر ریلوے نے اُس کے اور اُس کی بیوی کے لیے مفت ریلوے پاس جاری کیا۔ وہ گورو جی ریلوے کے ایک درجہ اوّل کے دو نشستوں والے ڈبے میں اپنی بیوی کے ساتھ نہیں بلکہ اُس سے ایک بہت کم عمر اور زیادہ خوبصورت خاتون ڈاکٹر کے ساتھ سفر کرتے پکڑے گئے۔ یہ پہلے صفحہ کی خبر تھی اور راجدھانی کے بڑے اخبارات نے اسے پہلے صفحہ پر شائع کیا (دوسرے اخباروں میں اسے دبایا گیا) پارلیمنٹ ہاؤس میں فون کیا گیا اور کابینہ کی سطح کے ایک وزیر کو جسے وہاں ڈھونڈ نکالا گیا فون کا جواب دینے کے لیے بلایا گیا پولیس سے کہا گیا کہ گورو جی کو فوراً رہا کیا جائے اور خواہ اُس کی ساتھی مسافر کوئی بھی تھی اُس کے پاس کی تصدیق کر دی گئی۔ بعد ازاں فون پر اس کی اصلاح کر دی گئی اور تصدیق کی گئی۔ ازاں بعد وہ اللہ والا جنتا پارٹی کی مضبوطی اور استحکام کی غرض سے یگیہ کرنے کے لیے نیپال روانہ ہو گیا۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس بھگوان کی عبادت سے جنتا پارٹی مضبوط نہیں ہوئی بلکہ یگیہ کے چند ماہ بعد ہی اُس کا زوال آ گیا۔ پھر سے انتخابات ہوئے اور اُسے اُن لوگوں کے ہاتھوں سے ہی شکست ہوئی جنھوں نے سابقہ انتخابات میں اُسے اقتدار سپرد کیا تھا۔ تب سے ایسے اللہ والوں نے نئی دہلی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ جو پارٹی بھی برسرِ اقتدار آئی، یہ اللہ والے اقتدار کی غلام گردشوں میں گھومنے لگے۔ سورگیہ پردھان منتری تمام دھارمک عبادت گاہوں پر خواہ وہ ہندو مندر ہوں یا سکھ گوردوارے مسلمانوں کے مزار ہوں یا عیسائی گرجا گھر، اِن مقدس مقامات کا آشیرواد اور ووٹ حاصل کرنے کے لیے وہاں سر جھکا دینے کے لیے مشہور تھیں۔

یہ سب سیکولرازم کے نام پر ہوتا تھا جس سے مراد سب دھرموں کا احترام تھا اور یہ نہیں کہ سیاست کا کسی دھرم سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اِس طرح سیکولرازم کا غلط مطلب نکال کر اسے سب دھرموں کے تئیں عقیدت بنا دیا گیا ہے۔ اس کے اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے ووٹوں کے درمیان ایک قریبی تعلق پیدا ہو گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مختلف مذاہب کے رہنماؤں اور گوروؤں کو سیاسی مقاصد کے لیے خوش کرنا پڑتا ہے۔

مناسب سوال

لہٰذا یہ ایک مناسب سوال ہے کہ اِس لغویت کو کیوں برداشت کیا جائے۔ اس کا اطلاق ہر بے عقلی پر ہوتا ہے چاہے وہ ہندوؤں کی ہو مسلمانوں کی، سکھوں کی عیسائیوں کی۔

اس منظر کا المناک حصہ اس میں سرکار کا کردار ہے جو سیکولر سمجھی جاتی ہے۔ لیکن جو عام مذاہب اور اُن کے جھگڑوں اور اُن کی شعبدہ بازیوں پر عنایات ہی نہیں کرتی بلکہ اُن کی سرپرستی بھی کرتی ہے جن کا حقیقی مذہب یا روحانیت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں لیکن جو فرقہ وار دونوں پر اثر رسوخ رکھتے ہیں۔ جن کی جیت کے وقت ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کام اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ تمام مذاہب کو اُن سے ناجائز فائدہ اٹھانے والوں کے ہاتھوں سے بچایا جائے اور ہر مذہب کو گھروں اور متعلقہ عبادت گاہوں تک ہی محدود رکھا جائے۔ سرکار کو اُن لوگوں کے مذہب فروشی کے عمل سے جُدا کیا جائے اور انھیں کہا جائے کہ وہ انسان دوستی اور عقیدت کے لیے کام کریں۔ اور اسکولوں میں کسی خاص دھرم کی تعلیم کی بجائے انسان دوستی کے علم کی تعلیم دی جائے جس میں تمام مذاہب کی بہترین تعلیمات شامل ہوں۔ اس طرح تمام دھرموں کا نچوڑ انسان دوستی کے علم کے ساتھ لوگوں کو دیا جا سکے گا اور مذاہب کو اُن سے ناجائز فائدہ اٹھانے والوں اور دلالوں سے بچایا جا سکے گا۔ اس طرح ہمارے عوام انسان دوستی کے جذبے پر متحد ہوں گے نہ کہ ملی جلی ثقافت کے نظریے پر۔ اس کے لیے ہمیں انسان دوستی کے جذبے کو فروغ دینا ہوگا۔ تعلیم کی ترتیبِ نو کرنی ہوگی؛ نصابی کتابوں کو پھر سے مرتب کرنا ہوگا اور ریڈیو، ٹی۔وی جیسے دُور رس ذرائع ابلاغ اور عوامی اختیارات کو اس مقصد اور خیال کے لیے کام میں لانا ہوگا۔ ●

اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے ؟

ایسے لگتا ہے گویا تمام مذاہب یہ اشارہ کر رہے ہیں کہ انسان کو قدرت سے ہم آہنگی اور دوسرے انسانوں اور حیوانوں سے ہم آہنگ ہو کر رہنے کا درس دینے کی ضرورت ہے جو کہ ایک بنیادی اصول ہے۔

سب پیغمبروں اور سب مذاہب میں کونسی چیز مشترک ہے۔ ان میں رام کرشن بدھ اور مہاویر بھی شامل ہیں۔ کیونکہ کہا گیا ہے کہ پیغمبر سب کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ رگ وید میں کہا گیا ہے کہ سچائی ایک ہی ہے اور سچائی کی جانب جانے والے راستے کئی ہیں۔ سب مذاہب نے انسانی زندگی کو مقدس مانا ہے اور اندھا دھند قتل کے خلاف پرچار کیا ہے۔ قرآن کے مطابق ایک بے گناہ کا قتل پورے بنی نوع کے انسان کے قتل کے مترادف ہے۔ پھر یہ ہر ہر مہادیو اور اللہ ہو اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے جن کا مطلب ایک ہی ہے، یہ تشدد کی دوڑ اور قتل و غارت گری کس لیے جس میں ہزاروں افراد کی قربانی دی جا رہی ہے۔

پھر یہ ہندو یا مسلمان یا ہندو اور عیسائیوں اور ہندوؤں اور سکھوں میں فساد اور جھگڑے کس لیے ؟ کوئی بھی رہنما اس جھگڑے فساد میں شریک نہیں ہوتا سوائے اُن ہندوؤں کے جو بھگوت گیتا نہیں پڑھتے۔ اُن مسلمانوں کے جو قرآن نہیں پڑھتے، اُن عیسائیوں کے جو عیسیٰ کا پیغام نہیں پڑھتے۔ اور اُن سکھوں کے جو گرنتھ صاحب نہیں پڑھتے۔ جس میں ہندو اور مسلم مذاہب بڑی خوبی سے ملے جلے ہوا۔ ہندو بھگتوں کی بانی اور مسلم صوفیوں کا پیغام ایک دوسرے کے ہم آہنگ ہے یہاں تک کہ گورو نانک بھگت کبیر کے دوہوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"کھشتری، براہمن، شودر، ویش بلکہ چنڈال بھی ایشور سے یکساں پیار کر سکتے ہیں اور مکتی پا سکتے ہیں۔ جو بھی خدا کو پا لیتا ہے نانک اس کی خاک پا کے برابر ہے"

[illegible]

۵ار اگست [illegible]

تاریخ ملزم ہے

الزام جس پر آتا ہے تاریخ پر خاص طور پر اُس تاریخ پر جو گذشتہ تین سو برسوں میں پڑھائی گئی ہے جس میں اورنگ زیب اور شیواجی کو مصنوعی طور پر ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اورنگ زیب ہندوؤں کے لیے ہوّا ہے جب کہ مسلمانوں نے شیواجی سے نفرت کرنا اور ڈرنا سیکھا ہے۔ حالاں کہ اصل تاریخ کی حقیقت کچھ اور تھی۔ دستاویزات ثابت کرتی ہیں کہ اورنگ زیب درحقیقت ایک قدامت پسند مسلمان تھا جس کی قدامت پسندی کا شیعہ فرقے کے استدلال پسندوں، سرمد جیسے صوفی فقیروں بلکہ مسلمان موسیقاروں سے بھی زوردار ٹکراؤ ہوا جن کا دربار میں داخلہ بند کر دیا گیا تھا، اور جنھوں نے لال قلعے کی دیواروں کے نیچے موسیقی کا جنازہ نکالا۔ جنازے کو دیکھ کر شہنشاہ نے پوچھا "کون مر گیا ہے ؟" جنازے والوں نے جواب دیا "حضور یہ ہندوستانی کلاسکی موسیقی کا جنازہ ہے"۔ "تو اسے اتنا گہرا دفن کیجیے کہ یہ پھر اُٹھنے نہ پائے"۔

اس سے ظاہر ہے کہ اورنگ زیب صرف مذہب پرست ہی نہیں بلکہ ایک کٹر پنتھی انسان اور اذیت پسند تھا۔ پھر بھی ریکارڈوں سے پتہ چلتا ہے کہ اُس نے ہندوؤں کے مندروں اور دھارمک جگہوں کے لیے ٹرسٹ اور اوقاف بنائے۔ جہاں تک شیواجی کا تعلق ہے اُسے دھرم سے گہری عقیدت تھی لیکن وہ ایک سیکولر انسان کے طور پر بھی مشہور ہے۔ چونکہ نہ صرف اُس کے توپخانے کا کمانڈر ایک مسلمان ابراہیم توپچی تھا بلکہ اُس نے کئی خالص مشرقی اطوار کے مسلمان سپاہیوں کو اپنے ذاتی محافظوں میں ملازم رکھا ہوا تھا۔ برطانوی تاریخ دانوں نے شیواجی کی ان مثالوں کو دیدہ دانستہ چھپائے رکھا اور ایسا ثابت کیا کیونکہ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو سامراجیوں کی ایک پرانی چال ہے۔ انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں دشمنی کی فضا پیدا کی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندو مسلم فسادات یا ہندو سکھ فسادات کے لیے ہم ملزم نہیں ہیں۔ اس الزام سے ہم بچ نہیں سکتے۔

مذاہب کو بجائے خود مورد الزام قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن ہم اپنے مذہب خواہ وہ ہندو دھرم ہو یا اسلام، بدھ دھرم ہو یا عیسائیت یا سکھ دھرم، کی نام نہاد دھارمک شعبدہ بازیوں کے بارے میں بہت متعصب ہیں۔ توہم پرستی کئی قسم کی ظلمت پسندی اور اصلاح و ترقی کی مخالفت کو جنم دیتی ہے، بجائے اس کے کہ مذہب ہم آہنگی اور امن قائم کرے، ظلمت پسندی مذہبی فرقوں کے درمیان دشمنی پیدا کرتی ہے۔

ناجائز فائدہ

نہ صرف یہ مذہبی دشمنی ہی پیدا کرتی ہے بلکہ مذہب کے نام پر ہر قسم کی شعبدہ بازی کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

ایسے ہندو مندر بھی ہیں جہاں نوجوان لڑکیوں کو دیوداسی بنا کر رکھا جاتا ہے اور گاہکوں کو فروخت کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کسی مسلم فقیر کی عبادت گاہ ناجائز شراب بیچنے والوں اور اسمگلروں کے مل بیٹھنے کا کام دیتی ہے۔ مسلمانوں کے نام نہاد مذہبی رہنماؤں نے اپنے اہل مذہب کو ۲۰ ویں صدی کے آخر میں پٹھانوں اور مغلوں کی طرح پھر سے فتوحات کا ناممکن خواب دیکھنے کی حوصلہ افزائی کی اور ہندوؤں کو سکھایا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کی از سر نو فتح کے خواب کے غلبے سے ڈریں۔ باہمی خوف سے دونوں فرقوں کے درمیان دشمنی پیدا ہوئی ہے۔ انگریزوں نے جب وہ یہاں حکومت کرتے تھے ایسے خوابوں اور اُن کے دیکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی حالاں کہ کسی ہندو مسلم فساد میں ہر قتل کے لیے انھیں ذمہ دار قرار دینا نہایت مضحکہ خیز بات ہے۔

کسی نے لوگوں کو یہ نہیں بتایا کہ ہندوستان میں جتنے بھی فاتح آئے ماسوائے چند ایک کے، سب نے غیر مہذب، سخت گیر اور ظالمانہ طرز عمل اختیار کیا، خواہ وہ آریوں کا ہندوستان کے اصل باشندوں، آدی واسیوں یا دراوڑوں سے سلوک ہو

پٹھان اور مغل حملہ آوروں کا یا پرتگیز، فرانسیسی اور برطانوی کمپنیوں کا جو یہاں تجارت کی غرض سے آئے اور حکمران بن کر بیٹھ گئے یا نازیوں اور فاسسٹوں کا دوسری جنگِ عظیم میں ایبی سینیا یا اسپین یا مشرقی یا مغربی یورپ کے چھوٹے ممالک میں طرزِ عمل ہوا یہ ذمہ داری ہندو اور مسلم مصلحین پر آئی، کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے پیروکاروں کو صحیح تاریخ کے بارے میں بتائیں جو قدرت کے سکھائے ہوئے ہم آہنگی کے قانون کے مطابق ہے اور جسے اشوک، اکبر اور شیواجی جیسے روشن دماغ بادشاہوں نے تدبر اور امن کا راستہ اپنانے کے لیے اختیار کیا۔

گم شدہ حصہ

جس دھرم پر آج عمل کیا جا رہا ہے اس میں دھرم کی اصل روحانیت کا کوئی جزو شامل نہیں۔ یہاں وہاں کسی خدا پرست انسان کے بارے میں (خدا والے کی نہیں) استثنا کی کچھ مثالیں ہو سکتی ہیں جو اپنا سارا وقت دھیان اور عبادت میں بسر کرتا ہو، ورنہ اکثر اللہ والے سیاست بازی میں لگے رہتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی وزیر اعلیٰ کے دربار کے رتن ہیں اور وزیر اعلیٰ سے بھی بلند مرتبہ رکھتے ہیں کیونکہ وزیر اعلیٰ بھی اُن کے پاؤں چھوتا ہے۔

جنتا پارٹی کے گورو کی مثال موجود ہے جسے اُس وقت کے وزیر ریلوے نے اُس کے اور اُس کی بیوی کے لیے مفت ریلوے پاس جاری کیا۔ وہ گورو جی ریلوے کے ایک درجہ اوّل کے دو نشستوں والے ڈبے میں اپنی بیوی کے ساتھ نہیں بلکہ اُس سے ایک بہت کم عمر اور زیادہ خوبصورت خاتون ڈاکٹر کے ساتھ سفر کرتے پکڑے گئے۔ یہ پہلے صفحہ کی خبر تھی اور راجدھانی کے بڑے اخبارات نے اسے پہلے صفحہ پر شائع کیا (دوسرے اخباروں میں اسے دبا دیا گیا) پارلیمنٹ ہاؤس میں فون کیا گیا اور کابینہ کی سطح کے ایک وزیر کو جسے وہاں ڈھونڈ نکالا گیا فون کا جواب دینے کے لیے بلایا گیا پولیس سے کہا گیا کہ گورو جی کو فوراً رہا کیا جائے اور خواہ اُس کی ساتھی مسافر کوئی بھی تھی اُس کے پاس کی تصدیق کر دی گئی۔ بعد ازاں فون پر اس کی اصلاح کر دی گئی اور تصدیق کی گئی۔ ازاں بعد وہ اللہ والا جنتا پارٹی کی مضبوطی اور استحکام کی غرض سے یگیہ کرنے کے لیے نیپال روانہ ہو گیا۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس بھگوان کی عبادت سے جنتا پارٹی مضبوط نہیں ہوئی بلکہ یگیہ کے چند ماہ بعد ہی اُس کا زوال آ گیا۔ پھر سے انتخابات ہوئے اور اُسے اُن لوگوں کے ہاتھوں سے ہی شکست ہوئی جنھوں نے سابقہ انتخابات میں اُسے اقتدار سپرد کیا تھا۔ تب سے ایسے اللہ والوں نے نئی دہلی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ جو پارٹی بھی برسرِ اقتدار آئی، یہ اللہ والے اقتدار کی غلام گردشوں میں گھومنے لگے۔ سورگیہ پردھان منتری تمام دھارمک عبادت گاہوں پر خواہ وہ ہندو مندر ہوں یا سکھ گوردوارے، مسلمانوں کے مزار ہوں یا عیسائی گرجا گھر، اِن مقدس مقامات کا آشیرواد اور ووٹ حاصل کرنے کے لیے وہاں سر جھکا دینے کے لیے مشہور تھیں۔

یہ سب سیکولرازم کے نام پر ہوتا تھا جس سے مراد سب دھرموں کا احترام تھا اور یہ نہیں کہ سیاست کا کسی دھرم سے کوئی واسطہ نہیں تھا! اس طرح سیکولرازم کا غلط مطلب نکال کر اسے سب دھرموں کے تئیں عقیدت بنا دیا گیا ہے۔ اس کے اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے ووٹوں کے درمیان ایک قریبی تعلق پیدا ہو گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مختلف مذاہب کے رہنماؤں اور گوروؤں کو سیاسی مقاصد کے لیے خوش کرنا پڑتا ہے۔

مناسب سوال

لہٰذا یہ ایک مناسب سوال ہے کہ اس لغویت کو کیوں برداشت کیا جائے۔ اس کا اطلاق ہر بے عقلی پر ہوتا ہے چاہے وہ ہندوؤں کی ہو مسلمانوں کی، سکھوں کی عیسائیوں کی۔

اس منظر کا المناک حصہ اس میں سرکار کا کردار ہے جو سیکولر سمجھی جاتی ہے۔ لیکن جو تمام مذاہب اور اُن کے جھگڑالو اور اُن کی شعبدہ بازیوں پر عنایات ہی نہیں کرتی بلکہ اُن کی سرپرستی بھی کرتی ہے جن کا حقیقی مذہب یا روحانیت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں لیکن جو فرقہ وار ووٹوں پر اثر رسوخ رکھتے ہیں۔ جن کی چناؤ کے وقت ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کام اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ تمام مذاہب کو اُن سے ناجائز فائدہ اٹھانے والوں کے ہاتھوں سے بچایا جائے اور ہر مذہب کو گوردوارہ متعلقہ عبادت گاہوں تک ہی محدود رکھا جائے۔ سرکار کو اُن لوگوں کے مذہب فروشی کے عمل سے جُدا کیا جائے اور انھیں کہا جائے کہ وہ انسان دوستی اور عقیدت کے لیے کام کریں۔ اور اسکولوں میں کسی خاص دھرم کی تعلیم کی بجائے انسان دوستی کے علم کی تعلیم دی جائے جس میں تمام مذاہب کی بہترین تعلیمات شامل ہوں۔ اس طرح تمام دھرموں کا نچوڑ انسان دوستی کے علم کے ساتھ لوگوں کو دیا جا سکے گا اور مذاہب کو اُن سے ناجائز فائدہ اٹھانے والوں اور دلالوں سے بچایا جا سکے گا۔ اس طرح ہمارے عوام انسان دوستی کے جذبے پر متحد ہوں گے نہ کہ ملی جُلی ثقافت کے نظریے پر۔ اس کے لیے ہمیں انسان دوستی کے جذبے کو فروغ دینا ہو گا۔ تعلیم کی ترتیب نو کرنی ہو گی، نصابی کتابوں کو پھر سے مرتب کرنا ہو گا اور ریڈیو، ٹی۔وی جیسے دُور رس ذرائع ابلاغ اور عوامی اخبارات کو اس مقصد اور خیال کے لیے کام میں لانا ہو گا۔ ●

پی۔ این۔ ہکسر

سیکولرازم یا خود فریبی

پی۔ این۔ ہکسر کے ساتھ انٹرویو

چیف ایڈیٹر:- دہشت پسندی، فرقہ وارانہ فسادات اور احیاء پسندی۔ یہ تکلیف دہ صورت حال آج ہماری زندگی کو تباہ و برباد کرنے پر تُلی ہے۔ قومی اتحاد کو درپیش خطرہ حقیقی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اس صورتِ حال پر آپ کے تاثرات کیا ہیں۔

پی۔ این۔ ہکسر:- ایک قدیم سماج کو جیسا کہ ہمارے ساتھ معاملہ ہے، گویا کہ جس کی تاریخ کئی ہزار سال پُرانی ہے اور جو قدیم اور متوسط عہد کے سماجی اور اقتصادی تانے بانے میں جکڑا ہوا ہے، سیاسی، سماجی، اقتصادی اور ثقافتی کایا پلٹ کے پیچیدہ مسائل سے نپٹنے میں لازمی طور پر انتہائی پریشانیوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا ہے۔ یورپ کو عہدِ وسطیٰ سے دورِ جدید میں قدم رکھنے میں متعدد انقلابات دیکھنے پڑے۔ چھوٹے سے ملک انگلینڈ کو ہی لے لیجیے، وہ بھی اس تبدیلی کے عمل کو آسانی سے نہیں لا سکا۔ البتہ یورپی انقلابات کو غیر ملکی سامراجیت اور اقتدار کے سبب پیدا شدہ مسائل کا سامنا نہیں کرنا تھا۔ غیر ملکی اقتدار نے ہندوستان کو خالی کر دیا، اس کے اندرونی توازن کو مکمل طور پر بگاڑ کر رکھ دیا، اس پر غیر ملکی اداروں کا تسلط جما دیا۔ مزید برآں زبان اور ثقافت کے مسائل، ان سب کی وجہ سے حصولِ آزادی کے بعد کے دَور کے ہمارے مسائل کی پیچیدگیوں میں غیر معمولی طور پر اضافہ ہو گیا۔ لہٰذا میں سماج کے انتشار اور پریشانیوں سے اتنا متفکر نہیں ہوں جتنا کہ اس بات پر تشویش ہوں کہ یہ انتشار نئی نئی شکلوں میں روز بروز ابھرتا جا رہا ہے۔ آپ نے اپنے سوال میں کچھ مثالیں دی ہیں مثلاً فرقہ وارانہ فسادات، مختلف ذات کے لوگوں کے درمیان جھگڑے، علاقائی تنازعات وغیرہ۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ سب کچھ ہمارے اندازِ فکر کی کوتاہی اور اس کے پسِ پُشت چھپے پن کے سبب ہے۔ یہ سیاست کے تئیں وقتی اندازِ نظر کے سبب بھی ہے، نیز اقتصادی مسائل کے تئیں پیچ در پیچ اور فریب نظر پر مبنی طریقوں کے سبب بھی ہے اس کا ایک اور سبب بھی ہے جو دیگر اسباب کے مقابلے کسی طرح کم نہیں اور وہ ہے فکر و نظر کا پریشان کن حد تک فقدان۔

چیف ایڈیٹر:- فرقہ وارانہ جراثیم ہمارے سیاسی نظام میں کوئی نئی بات نہیں بلکہ یہ برابر ہماری زندگی میں زہر بھرتے رہے ہیں۔ یہ ہماری جدوجہد آزادی کے زمانے میں بھی تھے اور یہ آج بھی ہمارے ساتھ ہیں، غالباً پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ۔ آپ اس صورتِ حال کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

پی۔ این۔ ہکسر:- پچھلے سوال کے جواب کے آخر میں، میں نے کہا تھا کہ ہم جس طرح سوچتے ہیں اور جس طرح ہم دیکھتے ہیں، یا محسوس کرتے ہیں، وہ انتہائی غلط ہے۔

اس سے بھی بڑی اور المناک غلطی یہ کہ فرقہ واریت، علاقائیت یا ذات پات کی شکل میں جو تصورات رائج ہیں، ان کا ازالہ دھرم نرپکیشتا کے بظاہر معقول لیکن نقلی نعرے سے کیا جا سکتا ہے۔ ہم اس غلط فہمی اور خود فریبی میں عرصۂ دراز سے مبتلا ہیں۔ عظیم رہنما مثلاً گاندھی یا نہرو تو اس پر لفظاً و معناً عمل کر سکتے تھے اور اسے فرقہ واریت کے بدرقہ کے طور پر پیش کر سکتے تھے لیکن آج مطلعِ سیاست پر اس درجہ کا کوئی رہنما نہیں ہے، لہٰذا ہم جس مقصد کے لیے کام کر رہے ہیں، اسے حاصل کرنے کے لیے چند نقوش کی دار و رسن پر نظر نہیں کرنی پڑے گی، بلکہ اس کے لیے ایسے ادارے کھولنے اور قائم کرنے پڑیں گے جہاں عقلیت پسندی اور معقولیت پسندی کا دَور دورہ ہو اور جہاں تعصب اور تنگ نظری کا گزر نہ ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہم ناکامی میں اپنی مثال آپ بن گئے ہیں۔ آج تک ہم ہندوستانی ذہن کو سیکولر بنانے کے

★ وزیر اعظم کے سابق پرسنل سکریٹری اور سابق ڈپٹی چیئرمین پلاننگ کمیشن، نئی دہلی۔

عمل کے تقاضوں اور مضمرات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ہمارے ادارے اور ہمارے رسم و رواج سیاست کو غذا فراہم نہیں کرتے اور اس کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔ بھلے ہی کوئی ایماندار ہو لیکن سیاست کا حقیقی مدار تو ذات پات کے اختلافات یا فرقہ وارانہ اختلافات، زبان کی بنیاد پر اختلافات، نسلی اختلافات پر ہے۔ سیاست ان اختلافات کی خلیج کو پاٹتی نہیں بلکہ چوڑا کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نعرے یا جھنڈے یا نشانیاں یا علامات حقیقی عمل سے میل نہیں کھاتیں۔ انتشار پسندانہ اور پارہ پارہ کرنے والی سیاست پر کاربند رہتے ہوئے اور موجودہ اقتصادی پالیسیوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے، حیران کن بات یہ ہے کہ ملک میں تفرقے اور گڑبڑ اس سے کہیں زیادہ ہونی چاہیے تھی جتنی کہ وہ اس وقت ہے۔ سیاست میں مساوات کی بات کہی جاتی ہے جبکہ اقتصادی پالیسیاں نابرابری لانے میں معاون ثابت ہوئی ہیں۔ سیاست میں دھرم نرپیکشتا کی بات کہی جاتی ہے جبکہ عمل یہ ہے کہ فکر و نظر کو مذہبی بنیادوں پر تشکیل دیا جاتا ہے حتیٰ کہ سرکاری موقعوں اور تقاریب پر بھی ان مذہبی امور کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، پورا نظام اور مشق نیز عمل غیر سیکولر ہے۔ سب سے زیادہ خرابی ہمارے نظام تعلیم کی ہے کیونکہ اس تمام تانے بانے میں معقولیت پسندی کے جراثیم کو مردہ کر دیا گیا ہے۔

چیف ایڈیٹر:۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد ہم نے سیکولر طرز حیات اپنایا۔ لیکن اس سیکولر طرز زندگی سے جیسا کہ یہ اپنی موجودہ شکل میں ہے، ہماری زندگی کے معیار میں کوئی بہتری نہیں آئی۔ ہم اپنے تشخص کی پرورش کی خاطر کام کرتے ہیں اور اس کی خاطر جیتے ہیں۔ کیا ہمارے سامنے یہی مقصد حیات رہا ہے؟۔

پی۔ این۔ ہکسر:۔ آپ نے جس انداز میں سوال کیا ہے، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہمیں طرز فکر کی وضاحت، اس کی صفائی اور الفاظ کی صحت کی جانب ابھی کتنا کچھ کرنا اور سمجھنا ہے۔ میں یہی نہیں سمجھتا کہ ہم نے اس طرز زندگی کا انتخاب کیا جسے آپ سیکولر طرز زندگی کا نام دے رہے ہیں۔ سیکولر طرز زندگی جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ زندگی بہت پیچیدہ اور پیچ در پیچ ہے۔ انفرادی سطح پر بھی اور سماجی و معاشرتی سطح پر بھی۔ اسے سیکولر طرز زندگی یا مذہبی طرز زندگی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ ہم نے جس بات کی امید باندھی تھی، وہ یہ تھی کہ انسانی عمل کے بڑے بڑے گوشوں میں، جہاں کہ مثبت علم کی بنیاد پر فیصلے صادر کیے جا سکتے ہیں، جہاں قدرتی سائنس اور سماجی سائنس سے اخذ کردہ مثبت نتائج کی بنیاد پر فیصلے ہو سکتے ہیں۔ وہاں پالیسیوں اور فیصلوں کی تشکیل تصدیق شدہ اور قابل تصدیق حقائق کی بنیاد پر بھی عمل میں آئے۔ یہ بھی امید لگائی گئی تھی کہ ہمارا نظام تعلیم، اس قدیم سماج میں جو کہ مذہب کے نام پر قائم کیے گئے عقائد سے مغلوب ہے، سیکولر قوتوں کو ابھارے گا۔ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہماری سیاست، ہماری معیشت اور ہمارا تعلیمی نظام اور ریاست کی حقیقی کارکردگی، ہندوستان میں سیکولر قوتوں کو ابھارنے کے عمل کی نفی کرتی ہے۔ ہماری ریاست الجھے ہوئے ذہن کے مالک ماہرین قانون اور ججوں کی لکھی ہوئی عالمانہ کتابوں کے باوجود، اس طرح کی سیکولر ریاست نہیں ہے جیسا کہ امریکہ یا فرانس، یہ برطانیہ کی طرح سے سیکولر ریاست بھی نہیں ہے۔ لازمی طور پر فکر کی یہ ڈھیل، سماجی، ثقافتی اور سیاسی جھول پیدا کر چکی ہے اور ہم اسے ایک عرصے سے اپنے چاروں طرف دیکھ رہے ہیں۔

چیف ایڈیٹر:۔ جب موضوع گفتگو یہی ہے، تو کیا آپ براہ کرم بتائیں گے کہ سیکولر طرز زندگی اپنانے کے لیے ہمارے ذہن میں کیا صورت تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ ہماری آج کی زندگی وہ صورت تو پیش نہیں کر رہی ہے جو کہ اس وقت ہمارے ذہن میں تھی۔

پی۔ این۔ ہکسر:۔ میرا خیال ہے کہ میں اس سوال کا جواب پہلے ہی دے چکا ہوں۔ لیکن یہاں مختصر طور پر اس کی وضاحت کر دوں کہ ہندوستانی سیکولرازم جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ چینی سیکولرازم یا فرانسیسی سیکولرازم کے مقابلے پر نہیں رکھی جا سکتی۔ سیکولرازم عالمگیر پیمانے پر ایک تاریخی عمل ہے۔ جو علم و تجربے کی روشنی میں انسان کو عقلی دلائل کے ساتھ سوچنے اور کام کرنے کا راستہ دکھاتا ہے۔ یہ انسان کو کام کرنے کے لیے محض اس بنیاد پر حکم نہیں دیتا کہ کوئی بات چونکہ کسی صحیفے یا مذہبی کتاب میں درج ہے تو اسے کر لینا چاہیے۔ انسان کی علم کی تلاش ایک عمل مسلسل ہے۔ یورپی ملکوں کے تجربے کی روشنی میں انسانی ذہن کو سیکولر بنانے کا عمل بڑی دانشورانہ کوششوں کی مدد سے انجام دیا گیا۔ اسے نشاۃ ثانیہ یا بیداری کا نام دیا گیا۔ اسے اصلاح پسندی کی تحریک سے تعبیر کیا گیا۔ ہندوستانی سماج میں بھی اسی طرح کی بیداری لانی ضروری ہے۔ اس کے بغیر یہ ابتدائی دور کی دل دل سے باہر نہیں آ سکے گا۔

چیف ایڈیٹر:۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ مذہب انسانوں کی برادری کو پنجروں میں بانٹ دیتا ہے اور ہم اپنے اپنے پنجرے میں تنگ نظری، تعصب اور جھوٹے قسم کے فخر سے سرشار نظر آتے ہیں۔ دانستہ یا غیر دانستہ طور پر ہم اس پنجرے والی زندگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہمارا عمل اور ردعمل معقولیت پسندانہ نہیں رہ جاتا بلکہ یہ پنجرے والی زندگی کے تابع ہوتا ہے۔ آپ اس زندگی کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔؟

پی۔ این۔ ہکسر:۔ پہلے میں آپ کے آخری جملے کا جواب دوں گا۔ یعنی یہ کہ میں زندگی کو کس نظر سے دیکھتا ہوں۔ آج ہمارے ملک میں زندگی امید و بیم کی کشاکش کا شکار ہے۔ امید کی وجوہات بظاہر کافی ہیں۔ دنیا میں بہت کم ملک ایسے ہیں جنھیں قدرت نے اتنا مالا مال کیا ہو جتنا کہ بھارت کو، دنیا میں بہت کم ملک ایسے ہیں جہاں کے انسانوں کو

علم و ہنر کی فراہمی کی اس قدر آسانیاں ہیں۔ مجھے اس موقع پر جان اسٹورٹ مل کا یہ قول یاد آتا ہے کہ انسانوں کو اگر محض ان کی مناسب غذا ملتی رہے اور علم و ہنر کے حصول کی مناسب سہولتیں میسر ہوں، تو وہ کسی بھی تہذیب کی عمارت کھڑی کر سکتے ہیں۔ آج ہمارے ملک کے لکھوکھا نوجوانوں کے پیٹ خالی ہیں اور وہ کھانا مانگ رہے ہیں۔ ہمارا تعلیمی نظام محض نیم خواندہ اور ناخواندہ افراد تیار کر رہا ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہندوستانی سماج سینکڑوں ضرورت مندوں، اور بھوکے افراد پر مشتمل ہے۔ جبکہ اُن کے لیے وسائل بہت محدود ہیں۔ ان ضرورت مندوں میں وسائل کی حصولی کے لیے کھینچ تان ہے۔ اس لیے یہ لوگ آپس میں کتوں کی طرح ایک دوسرے پر غصہ اتارتے ہیں، غراتے ہیں، تاکہ ان کے درمیان پڑی چند ہڈیوں میں سے کوئی اُن کے حصے میں بھی آ جائے۔ پھر سماج میں سب برابر بھی نہیں، کچھ بڑے ہیں اور کچھ چھوٹے۔ بڑے کی مثال بل ڈاگ یعنی بڑے سر کے کتے کی طرح ہے جو بہت مضبوط ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ بل ڈاگ درمیان میں پڑی چند ہڈیوں کو ہتھیانے کے لیے خود کو مختلف لیبل کے ساتھ منظم کر لیتے ہیں۔ چنانچہ آج ہمارے ملک میں مذہب کے نام پر جو لیبل لگائے گئے ہیں، اُن کی مثال بھی ایسی ہی ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی کے نام پر مختلف تنظیمیں اور مذہبی گروہ پائے جاتے ہیں۔ اس طرح سے جاٹ، راجپوت، بھومی ہار وغیرہ کے نام پر درجہ بندی کی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کے سوال کا جواب ایک قصے کے پیرائے میں دے دیا ہے۔

کیا سیکولر بنانے کے عمل اور مذہب میں لازمی طور پر ٹکراؤ ہے؟ اس مفروضے کے بارے میں ذہن بڑا اُلجھا ہوا ہے۔ میرے نزدیک اس میں کسی ٹکراؤ کی ضرورت نہیں بشرطیکہ مذہب اور سیکولرازم دونوں کا الگ الگ اپنا دائرہ عمل واضح ہو جائے۔ مذہب کی تعریف کرنا بھی ایک مشکل امر ہے۔ ذاتی طور پر زندگی کے بارے میں جو کچھ پڑھا جانا چاہیے، اسے پڑھ کر نیز مہاتما بدھ، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمدؐ صاحب کی تعلیمات کا مطالعہ کر کے یہ بات بآسانی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے سامنے کیا مقصد تھا اور وہ کس چیز کے حصول کے لیے کوشاں تھے۔ لیکن جب مذہب منظم شکل میں سامنے آتا ہے اور آپ خود کو ان عظیم پیغمبروں اور اوتاروں کے نام پر نمائندہ کہتے ہیں، اور مہاتما بدھ، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمدؐ صاحب کے نام پر قائم کردہ ادارے آپ کے زُود برد ہیں، اور جب مذہب اور ریاست دونوں جڑ جاتے ہیں تو انسانی تاریخ اُس شکل میں سامنے آتی ہے جیسا کہ بہت سی خونی جنگوں کے مطالعے سے ظاہر ہوتی ہے۔ لہٰذا بذاتہٖ کوئی مذہب ایسا نہیں جس پر حملہ کیا جائے بلکہ یہ منظم مذہب کے سماجی اور سیاسی رواج اور ان کی کارکردگی یا حتیٰ کہ غیر منظم مذہب ہی ہے جس کو انتہائی شک کی نظروں سے دیکھا جانا چاہیے۔ انسانوں کے مذہب اور مذہبی جذبات یا روحانی تقاضے اور تصورات، دراصل اس کی اپنی شخصیت اور مقدس ہستی کے بارے میں اس کے ذاتی تصورات اور عقائد کے درمیان کا معاملہ ہے۔ ریاستی سیاست اور مذہب کو خلط ملط کر دینے سے انتہائی زہریلی اور مذموم سازشیں وجود میں آئیں اور بدستور آتی رہیں جنھوں نے انسانوں کو مذہب کے نام پر مشہور و معروف قاتل بنا دیا۔ اگر معاملے کو اس پس منظر میں دیکھا جائے تو ابراہم لنکن کا قاتل سچا عیسائی نہیں تھا اور مہاتما گاندھی کا قاتل سچا ہندو نہیں تھا یا اندرا گاندھی کا قاتل عظیم گوروؤں کا سچا پیروکار نہیں تھا۔ یہ تمام مثالیں انسان کے گناہ اور اس کی بدکاریوں کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہ اقدام جھوٹے مذہب کے نام پر کیے گئے۔

چیف ایڈیٹر:- کیا آپ براہِ کرم کچھ ایسے اقدامات کا مشورہ دیں گے جو کہ ہماری بیوروکریسی کو معقولیت پسندانہ اندازِ نظر اور جذبۂ انسانیت کے فروغ کے لیے سرگرم طریقے پر کام کرنے کے لیے آگے بڑھائے۔ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے مذکورہ دونوں صفات کو اپنانے سے بہتر دوسرا راستہ نہیں۔ کیا آپ کے خیال میں سرکار کے زیرِ اہتمام چلنے والے نشر و اشاعت کے اداروں کو اس سلسلے میں کوئی خاص رول ادا کرنا ہے؟

پی۔ این۔ ہکسر:- مجھے خدشہ ہے کہ ہندوستان میں بہت سے لوگ یہ سوچتے ہیں کہ بیوروکریسی اپنی موجودہ حالت میں بذاتہ مطلوبہ مقاصد کی تکمیل کرا سکتی ہے۔ بیوروکریسی ہوا میں معلق نہیں ہے۔ اس کے ارکان ہمارے سماج کے ہی ارکان ہیں۔ وہ سب مل کر بھی اگر ایک نظام کی شکل میں سامنے آئیں، تو ان کے اطوار اور اخلاقی معیارات اپنے سیاسی رہنماؤں کے اطوار اور اخلاقی معیارات سے مختلف نہیں ہو سکتے۔ وہ بالآخر اس سماج کا ایک حصہ ہیں جس میں ہم سانس لیتے ہیں۔ بیوروکریسی پر مبنی نظام اہلیت کارکردگی اور سالمیت کے قیام پر زیادہ زور دیتا ہے، اس کا مقصد تبدیلی لانا نہیں ہے۔ لہٰذا بیوروکریسی سے زندگی کی کوالٹی کی بہتری کی اُمید سادہ لوحی پر مبنی ہے۔

جہاں تک سرکار کے زیرِ اہتمام نشر و اشاعت کے اداروں کا تعلق ہے، تو یقیناً اسے اپنے جواز کے لیے زندگی اور تخلیقی صلاحیتوں کا ثبوت دینا ہوگا۔ اس کے ذریعے ہمارے ملک میں نشاۃِ ثانیہ یا بیداری یا اصلاحی کوششیں بروئے کار لائی جا سکتی ہیں۔ مجھے اپنے ملک کی اس روایت پر بے حد فخر ہے کہ یہاں کے لوگ تنازعات کو واد وِواد (آپسی گفت و شنید) سے حل کر لیتے ہیں۔ ہمارے ریڈیو اور ٹی۔ وی سے جو پروگرام پیش کیے جاتے ہیں اور جن میں کلاکاروں، مصنفوں، سائنس دانوں اور دیگر تخلیق کاروں کا تعاون شامل ہوتا ہے، اُن کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ معاشرتی، سیاسی، عقلی یا اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہیں اور اس لیے وہ بے جان اور کمزور ہیں۔ ریڈیو اور ٹی۔ وی نے اگر کہیں کامیابی حاصل کی ہے تو وہ اس بات میں کہ عوام کی اور ان کے مشاہدین کی خواہشات کیا ہیں۔ اسی لیے وہ اخلاقی معیار کی گراوٹ اور انتشار کا واحد سبب

(باقی صفحہ ۷۶ پر)

وسنت ساٹھے*

کاش یہ مہمل زندگی جذبۂ انسانیت سے معمور ہو جائے

اس مضمون میں فاضل مصنف مسٹر وسنت ساٹھے نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اگلی صدی میں قدم رکھتے وقت ہمیں بہتر انسان ہونا چاہیے اور اس کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ ہم انسان دوستی، اور جذبۂ انسانیت کے اصولوں کو سختی سے اپنائیں۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم توہم پرستی، تنگ نظری، اندھی تقلید، ذہن کی تاریکی اور تعصب کو ترک کر دیں کیونکہ یہ سب وہ عناصر ہیں جو ہم سے غیر ملکی اور بیہودہ حرکتیں کراتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس موضوع پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو لوگ اس موضوع پر غور و فکر سے انکار کرتے ہیں، وہ متعصب اور تنگ نظر ہیں اور جو اس پر غور و فکر کی صلاحیت نہیں رکھتے، وہ بے وقوف ہیں اور جو اس موضوع پر غور و فکر کی جرأت نہیں کر سکتے بلکہ ایسا کرنے ہوئے ڈرتے ہیں، وہ بزدل ہیں۔

میں یوجنا کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اس نے ایسے موضوعات پر اپنے خصوصی شمارے شائع کرنے کے سلسلے میں جرأت مندانہ پیشقدمیاں کیں۔ جو بے لاگ اور آزادانہ نیز معقولیت پسندانہ انداز سے غور و فکر کے محتاج ہیں اور جن پر توجہ دینا قومی مفاد میں ہے۔ اس شمارے کا موضوع ہے، "ہم کیوں غیر عقلیت پسندانہ بیہودگیوں کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں"۔ یہ موضوع وقت کی پکار ہے اور بے حد موزوں ہے۔ بے شک ہم ایک ایسے دور میں رہ رہے ہیں جبکہ سائنس اور دیگر معلومات کی پیش رفتوں اور ترقیوں نے عقلیت پسندانہ علوم کو ہماری دسترس میں لا کھڑا کیا ہے لیکن انسانی سماج پھر بھی روز بروز تعصب، تنگ نظری، توہم پرستی، اندھی تقلید، ذہن کی تاریکی کے گڑھے میں گرتا جا رہا ہے۔ یہ سب علامات غیر عقلی اور غیر معقولیت پسندانہ زندگی کی مظہر ہیں۔ ہوش اور عقل کے لغوی معنی تلاش کئے جائیں تو پتہ چلے گا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ مناسب اور درست ہو، اس کے بارے میں سوجھ بوجھ، سمجھ، جذبہ، غور و فکر، علم، وقوف، قوت فیصلہ اور فہم کا اظہار کیا جائے۔ اس کا تضاد توہم پرستی، تنگ نظری، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محرومی، اندھی تقلید اور ذہن کی تاریکی سے عبارت ہے۔ انسان کو روئے زمین پر اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔ کیوں۔؟ اس لیے کہ دیگر حیوانات کو سوچنے، سمجھنے، پرکھنے، فہم و ادراک کی قوتیں ودیعت نہیں ہوئیں جبکہ انسان ہی وہ مخلوق ہے جو اچھے اور برے میں تمیز کر سکتی ہے۔ دیگر حیوانات عقل کی قوتوں سے محروم ہیں اور وہ محض جذبہ حیوانیت سے ہی کام کرتے ہیں۔

انسان کا ارتقاء

انسان کی ارتقا کی داستان غاروں کی زندگی سے شروع ہو کر خلائی دور تک پہونچتی ہے، اس تمام عرصے میں حضرت انسان نے اگر اس قدر ترقی کی ہے تو وہ اپنی عقلی قوتوں کے سبب ہی کی ہے۔ انسان میں سوجھ بوجھ اور اس کی سمجھ بوجھ کی صلاحیتوں نے ہی اسے ترقی کے مدارج طے کرائے۔ انسان میں تجسس اور استقرار کی قوتیں ودیعت کی گئی ہیں، اس میں تلاش کرنے کی عادت ہے۔ انسان کا دماغ بالکل ایک کمپیوٹر ہے۔ اس نہاں خانہ میں اطلاعات جمع کرنے، تجربہ حاصل کرنے اور پوچھ تاچھ کرنے کی صلاحیت ہے۔ ان تمام جمع شدہ معلومات کو وہ دوبارہ اگلتا ہے۔ چنانچہ غاروں کی زندگی سے لے کر ماکروپراسیسر کے ٹکڑوں تک انسانی ذہن کی ان صلاحیتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے بعد بھی یہ کہا جاتا ہے کہ ذہنی صلاحیتیں اس قدر بے پناہ وسعتوں کی مالک ہیں کہ ابھی ان کے صرف ایک حصے سے ہی کام لیا گیا ہے۔ ذہین افراد

* فولاد، کانوں اور کوئلے کی وزارت کے مرکزی وزیر۔

... وہ سماج جہاں اس طرح کے ذہین افراد موجود ہیں، اس وقت دستیاب اطلاعات اور علوم و فنون کے ساتھ ایک نمائندہ انقلاب

ذرا اُن انسانوں پر نظر ڈالیے جو کورانہ تقلید میں یقین رکھتے ہیں جو مذہب کے نام پر ڈھونگ رچانے والے ایسے لوگوں پر یقین کرلیتے ہیں جو اپنی کرامات سے راکھ اور انگوٹھی فضا سے ہاتھ میں پکڑ کر دکھا دیتے ہیں، ہمیں اُن لوگوں پر نظر دوڑانی چاہیئے جو نوعِ انسانی کے مذاہب کے بانیوں کی تعلیمات کے برعکس ایک بلند و بالا طاقت کو ایک ماننے کی بجائے خواہ آپ اُسے کسی بھی نام سے پکاریں، اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جو کچھ کسی ایک مخصوص کتاب میں لکھا گیا ہے، وہی سچ ہے اور جو شخص اس کے علاوہ کچھ سوچتا ہے، وہ کافر ہے۔ کیا بنیادی طور پر اس سے بڑی کوئی اور حماقت ہوسکتی ہے۔

کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ روایتی انداز میں ترقی یا تھوڑی تھوڑی ترقی کے برخلاف جہاں کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے شعبے میں زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیلی آتی رہی ہے، آج کی ترقی کی رفتار بے حد تیز ہے۔ خلاء میں راکٹ اڑنے کی طرح سے ہی علوم و فنون کی توسیع و اشاعت کی رفتار تیز ہوگئی ہے۔ اطلاعاتی نظام کی ترقی، کمپیوٹر سائنس کی ترویج، ذرائع ابلاغ میں حیرتناک تیزی و تبدیلی، توليدی علم اور متعدد جدید علوم کی مدد سے ترقی کا عمل بے حد تیزی پکڑ گیا ہے۔ مختصراً یہ کہ آنے والے دَور میں جو سماج کمپیوٹر اور مائکرو پراسیسر سائنس اور ٹکنالوجی پر حاوی ہوگا، وہی نوعِ انسانی پر اپنا اقتدار جما سکے گا۔ باقی انسان اُن کے تابع ہوں گے! اسی لیے آج کے دَور کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے کہ خود کو اکیسویں صدی میں قدم رکھنے کے لیے تیار کیا جائے۔ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے، وہ محض کوئی افسانہ نہیں ہے۔ آج یہ حقیقت بن کر سامنے آرہا ہے۔ اس پس منظر میں ذرا اُن انسانوں پر نظر ڈالیے جو کورانہ تقلید میں یقین رکھتے ہیں جو مذہب کے نام پر ڈھونگ رچانے والے ایسے لوگوں پر یقین کرلیتے ہیں جو اپنی کرامات سے راکھ اور انگوٹھی فضا سے ہاتھ میں پکڑ کر دکھا دیتے ہیں۔ ہمیں اُن لوگوں پر نظر دوڑانی چاہیئے جو مذاہب انسانیت کے بانیوں کی تعلیمات کے برعکس ایک بلند و بالا طاقت کو ایک ماننے کی بجائے خواہ آپ اُسے کسی بھی نام سے پکاریں، اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جو کچھ کسی ایک مخصوص کتاب میں لکھا گیا ہے، وہی سچ ہے اور جو شخص اس کے علاوہ کچھ اور سوچتا ہے، وہ کافر ہے۔ کیا بنیادی طور پر اس سے بڑی کوئی اور حماقت ہوسکتی ہے لیکن جیسا کہ ہم نے اس سے قبل کہا ہے کہ سب سے زیادہ ازلی و انوکھی حماقت، دیوی، دیوتا اور خدائے مجازی کے تصور کی تخلیق اور پھر اسے تمام کائنات کا اقتدار سونپ دینا اور تمام اختیارات اس سے منسوب کر دینا ہے ۔ یہ انسانی ذہن کی سب سے زیادہ انوکھی ایجاد ہے۔ جب کبھی انسان کو بہت سے سوالوں کے جوابات نہیں ملے تو اس نے اس تصور میں ہی پناہ لی اور اس سے آسودگی حاصل کی۔ جب انسان غاروں میں زندگی گزار رہا تھا تو یہ ابتدائی دَور کی زندگی تھی۔ اسے آگ جلانا نہیں آتا تھا، وہ نہیں جانتا تھا کہ بارش کیوں ہوتی ہے لیکن وہ اس صورتِ حال سے خوش تھا۔ سورج کا نکلنا اس کے لیے سب سے بڑی خوشی تھی۔ اس سے اس نے گرمی پائی اور وہ اندھیرے سے روشنی میں آیا اور اس نے روشنی میں اپنے ارد گرد کی

ذرا تصور تو کیجیے کہ اب ہم کس منزل میں ہیں۔ یہ وہ منزل ہے کہ کسی مخصوص کتاب کی صحت و سچائی کے وزن پر نکتہ چینی کرنا مذہبی بے حرمتی اور غیر مذہبی عمل تصور کیا جاتا ہے۔ محض کتاب کے بارے میں کسی شبہ کے اظہار پر ہی نہیں بلکہ ان کتابوں کے مصنفین کی صحت کے بارے میں شبہ کا اظہار بھی اسی درجے میں ہے۔ حتیٰ کہ ہم انھیں اگر انسان بھی تصور کریں، بیشک روشن ضمیر انسان، مگر ایسا کرنا بھی مذہب سے انحراف اور دھوکے کے درجے میں ہے۔ یہ ایک ایسی بنیادی حماقت ہے جس نے انسانی ذہن اور سماج کو پریشان کیا ہے اور اب بھی کر رہی ہے۔

اشیاء دیکھیں۔ لیکن اسے سورج کے بارے میں
کچھ معلوم نہیں تھا۔ اسے روئے زمین اور اس
کائنات کا کوئی علم نہیں تھا۔ لہٰذا سب سے پہلے

انتہائی ذہین افراد کے سامنے ابھی تک ایسے
بہت سے سوال تھے جن کے جوابات نہیں ملے تھے۔
اس نے دل کا سکون اور قلبی راحت کے لیے یہی
راستہ اپنایا کہ کسی بڑی طاقت کے وجود کا مفروضہ تسلیم کرلے۔

خیال کرنا بھی مذہب سے انحراف اور دھوکے کے برابر
ہے۔ یہ ایک ایسی بنیادی حماقت ہے جس نے
انسانی ذہن اور سماج کو پریشان کیا ہے اور اب
بھی کررہی ہے۔

اگر آپ یہ بات تسلیم کرلیں کہ ہم فلاں چیز پر اعتراض، نکتہ چینی یا شبہ ظاہر نہیں کرسکتے۔ اور اسے عقل کی کسوٹی پر نہیں پرکھنا چاہیئے، تو یہ وہ مقام ہے جہاں ذہنی ترقی نہ صرف رک جاتی ہے بلکہ اسے زنگ لگ جاتا ہے اور اس میں جمود پیدا ہوجاتا ہے۔ جس طرح بند پانی میں فساد کی بو آتی ہے۔ اسی طرح تعصب و تنگ نظری سے ذہن خراب ہوجاتا ہے اور اس میں بھی بدبو آنے لگتی ہے۔

آگ، سورج، یہ سب چیزیں قابلِ
پرستش ٹھہرادی گئیں، انسان ان کی عظمت کے
آگے سر جھکانے لگا۔ انسان میں تجسس اور تلاش
نیز ادراک کا جذبہ فطری ہے اور اس جذبے کے
تحت اس نے یہ محسوس کیا کہ کوئی نہ کوئی ایسی
طاقت ضرور ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا۔
جب انسان نے اس طرح اس کائنات کے خالق
کے بارے میں سوچنا شروع کیا تو اس کا ذہن
الجھ کر رہ گیا۔ چنانچہ ان کے ذہن نے یہی کہا کہ

میں نے اس بات کو ذرا کھول کر بیان کرنے کی ضرورت
سمجھی کیونکہ میں حقیقی حماقت کے آغاز کا مبدا
اسی کو تصور کرتا ہوں۔

حقیقی حماقت

ذرا تصور کیجئے کہ اب ہم کس منزل پر ہیں؟
یہ وہ منزل ہے کہ کسی مخصوص کتاب کی صحت و سچائی
کے بارے میں نکتہ چینی کرنا مذہب پرستی اور غیر مذہبی
عمل خیال کیا جاتا ہے۔ محض کتاب کے بارے میں
کسی شبہ کے اظہار پر ہی نہیں بلکہ ان کتابوں کے

یہ حیرانی کی بات نہیں ہے کہ تمام اوتاروں
اور پیغمبروں نے اپنے دور کے تعصب اور تنگ نظری
کے خلاف بغاوت کی اور اسی جذبے سے انھوں نے
اپنی زندگی شروع کی۔ لیکن ان کے ماننے والوں
اور پیروکاروں نے ان کی تعلیمات کو مذہبی عقیدے
اور سخت اصولوں کی شکل میں بدل دیا۔ اگر آپ یہ
بات تسلیم کرلیں کہ ہم فلاں چیز پر اعتراض، نکتہ چینی یا
شبہ ظاہر نہیں کرسکتے اور اسے عقل کی کسوٹی پر نہیں
پرکھنا چاہیئے، تو یہ وہ مقام ہے جہاں

ہر بات کو بلا چوں و چرا تسلیم کرنے کا رجحان ایک ایسی حماقت ہے کہ اس سے بڑی دوسری حماقت نہیں ہوسکتی۔ اس سے بھی بڑی ایک غلطی اور حماقت یہ ہے کہ نوجوانوں کو جن کے ذہن کی تختی ابھی پاک و صاف ہے اور جو تعلیم یافتہ بھی ہیں اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں، ظلمت پسندی، بے چوں و چرا تسلیم کرلینے کے رجحان، غیر معقول پسندانہ باتوں کو بے دلیل تسلیم کرنے کے اصول پر لگایا جائے جس سے وہ تنگ نظری پر مبنی کورانہ پرستش کے عقائد کو تسلیم کرنے لگیں۔ یہ حماقت اپنی جگہ انتہائی خراب اور مذموم ہے۔ سماجی، سیاسی، اقتصادی، تعلیمی اور دیگر شعبوں میں اس طرح لغو باتیں، حماقتیں اور خرافات دیکھنے کو ملیں گی۔

ماورائے کائنات ایک ایسی طاقت ہے، جو
انسانی ادراک کی سمجھ بالاتر ہے۔ اس لیے اسے سمجھنے کی کوشش
بند کردینی چاہیئے لیکن اسے تسلیم ضرور کیا گیا کیونکہ

مصنفین کی صحت کے بارے میں شبہ کا اظہار
بھی اسی درجے میں ہے۔ حتیٰ کہ ہم انھیں اگر انسان
بھی تصور کریں، بیشک روشن ضمیر انسان، مگر ایسا

ذہنی ترقی نہ صرف رک جاتی ہے بلکہ اسے زنگ لگ
جاتا ہے اور اس میں جمود پیدا ہوجاتا ہے جس طرح

ہند پاک میں فساد کی بو آتی ہے اسی طرح تعصب و تنگ نظری سے ذہن خراب ہو جاتا ہے اور اس میں بھی بدبو آنے لگتی ہے۔ ظلمت پسندی کے مسلک اور دیرینہ و فرسودہ عقائد پر جمے رہنے کا طریق کار ذہنی قوتوں کو مسدود کر دیتا ہے۔ اس برائی کا سلسلہ طول پکڑ جاتا ہے اور ایسے موضوعات کی فہرست طویل ہوتی جاتی ہے جن پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ یا جنھیں بحث میں نہیں لایا جا سکتا۔ ایک مخصوص لباس ہی زیب تن کیوں کیا جائے اور پھر وہ لباس بھی بارہ مہینے بنا یہ سوال پوچھنا بھی غلط خیال کیا جائے گا۔ معقولیت پسندانہ انداز سے سوچنے پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر کوئی شخص فوج میں ہے یا کسی اور تنظیم میں جہاں کی وردی مخصوص ہے، تو وہ اس وردی کو ڈیوٹی پر رہتے ہوئے ضرور پہنے گا لیکن اگر چوبیس گھنٹے وردی پہننے کو کہا جائے یا بارہ مہینے اسے اس ایک لباس کو ہی ہر وقت زیب تن کرنے کو کہا جائے اور زندگی بھر وہ اس لباس کو پہنے، تو یہ ممکن نہیں۔ چنانچہ ایک مخصوص لباس زیب تن کرنا بھی مذہبی خیال کیا جاتا ہے اور اس لباس کو ترک کرنا غیر مذہبی یا مذہب کی بے حرمتی تصور کیا جاتا ہے۔ یہ تصور نہ صرف ایک حماقت ہے بلکہ اپنی جگہ یہ سب سے بڑی حماقت ہے۔ بہرصورت آج کے دور میں اس کے جواز کے لیے پوچھ تاچھ کیوں نہ کی جائے؛ مگر اس کی اجازت بھی نہیں ہوگی۔

اگر ہندو سماج کا قریب سے مطالعہ کیا جائے تو میرے نزدیک پیدائش کی بنیاد پر ذات پات کا نظام اور اس کا استحکام سب سے بڑی لغویات ہے یہ نظام ابتدا میں پیشہ اور صلاحیت پر مبنی تھا اور سماج کے نظم و نسق کو چلانے کے لیے یہ قائم کیا گیا تھا۔ لیکن اس کی شکل بگڑ کر اب یہ پیدائش پر مبنی ایک نظام بن گیا ہے۔ اس میں جمود آگیا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، اس جمود سے اس میں بدبو پیدا ہو گئی ہے۔ ویدوں کے ذریعے ابتدا میں جس متحرک، فعال اور تلاش و تجسس کی طرف لے جانے والے خیالات و نظریات کو پیش کیا گیا، اُن کی رُو سے سوال کرنے کا برابر حق پہنچتا ہے۔ ان نظریات کی روشنی میں پوری کائنات سے علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔

وید نے یہ حقیقت پیش کی کہ اقتدار اعلیٰ ایک ہے لیکن اسے مختلف ناموں سے پکارا گیا ہے۔ تمام مخلوق ایک ہے جو بار بار جنم لیتی ہے۔ مہاتما بدھ بھگوان مہاویر اور گورو نانک نیز دیگر سینکڑوں سادھو سنتوں نے ہمیشہ ہی سے ظلمت پسندی کے مسلک اور بے دلیل دعووں کے خلاف آواز اُٹھائی۔ اس وجہ سے ہندو سماج کو اپنے ثقافتی ورثے کی اعلیٰ صفات اور اعلیٰ اقدار کے تحفظ کا موقع مل سکا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ چونکہ تلاش اور کسی حقیقت کو پرکھنے کی صلاحیت کا راستہ بند ہو گیا اور ذہن کی کھڑکی کھلی نہیں رہی، اور ظلمت پسندی اور دیرینہ عقائد کی بے چوں و چرا تعمیل کا رجحان بڑھ گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ مذموم رجحان قوم کی سالمیت اور اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لیے اپنا سر اُٹھا رہا ہے۔

سائنس اور مذہب

سائنس اور مذہب میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ سائنس کا مدار ہی کیوں، کیا اور کیسے پر ہے؟ سوالات کا یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ مگر مذہب کا آغاز اس نقطے سے ہے جہاں کہہ دیا گیا ہے کہ "اس بات کو بے چوں و چرا تسلیم کر لو"۔ اس طرح یہ لاعلمی اور علم کے درمیان یا اندھیرے اور روشنی کے درمیان فرق واضح کرتا ہے۔ لیکن مذہب کو روحانیت سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے کیونکہ روحانی ہستیاں خواہ وہ روشن دماغ پیر فقیر ہوں، مہاتما بدھ ہوں، گورو نانک ہوں یا کبیر ہوں یا دیگر صوفی سنت ہوں، ان سب میں ایک صفت مشترک تھی، اور وہ یہ کہ ان کا ذہن سائنسی انداز فکر کا مالک تھا۔ وہ سب پہلے سے چلے آ رہے مسلمہ اُصولوں اور کٹرپن کے جواز کو معرض بحث میں لائے۔ انھوں نے تنگ نظری اور سخت گیری پر اعتراض کیا اور غیر معقولیت پسندی کے خلاف آواز اٹھائی۔ گورو نانک دیو کے بارے میں ایک دلچسپ قصہ مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک بار وارانسی میں دریائے گنگا کے کنارے پر کھڑے تھے۔ انھوں نے شمال مغرب کی جانب اپنے ہاتھوں سے گنگا جل پھینکنا شروع کیا۔ کچھ برہمنوں نے یہ عمل دیکھا اور اُن پر ہنسے اور پوچھا کہ وہ یہ مضحکہ خیز حرکت کیوں کر رہے ہیں۔ نانک نے جواب دیا کہ وہ اپنے وطن پنجاب میں اپنے کھیتوں کو پانی دے رہے ہیں اور اُن پر پانی چھڑک رہے ہیں۔ اس پر انھوں نے مضحکہ خیز ہنسی کے ساتھ کہا کہ یہ کام صرف کوئی پاگل آدمی ہی کر سکتا ہے۔ اس پر گورو نانک نے جواب دیا "اگر دریا کے طاس میں کھڑے ہو کر آپ کچھ پانی سورج کو پیش کر سکتے ہیں، تو وارانسی سے

جو لوگ سوچنے سے انکار کر دیتے ہیں، وہ متعصب اور تنگ نظر ہیں جو لوگ سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، وہ بے وقوف ہیں، جو لوگ غور و فکر کی جرأت نہیں رکھتے، وہ بزدل ہیں۔ اس موقع پر عظیم دانشور جواہر لال نہرو کا یہ قول بھی دہرانا چاہوں گا کہ "کامیابی اکثر اُنھیں کے قدم چومتی ہے جو سوچنے سمجھنے نیز عمل کرنے کی جرأت رکھتے ہیں۔"

پنجاب کا فاصلہ تو اور بھی کم ہے، وہاں تک یہ پانی کیوں نہیں جائے گا؟

اس طرح کے بہت سے قصے ہیں جن سے ہمارے سادھو سنتوں کے تحقیق و تلاش کے ذہن کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے اپنے وقت کی اندھی تقلید پر مبنی کورانہ پرستش کے طریقوں اور کٹر اصولوں کی پیروی کرنے کی غلطی کا پردہ فاش کیا ہے۔ آج اُن لوگوں کو اس طرح کے متجسس اور تحقیق پسند ذہن کی ضرورت نہیں جو کسی مذہب کے پیروکار ہیں۔ ہر بات کو بلا چوں و چرا تسلیم کرنے کا رجحان ایک ایسی حماقت ہے کہ اس سے بڑی دوسری حماقت نہیں ہو سکتی۔ اس سے بھی بڑی ایک غلطی اور حماقت یہ ہے کہ نوجوانوں کو جن کے ذہن کی تختی ابھی پاک وصاف ہے اور جو تعلیم یافتہ بھی ہیں اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں، ظلمت پسندی، بے چوں و چرا تسلیم کر لینے کے رجحان، غیر معقول پسندانہ باتوں کو بے دلیل تسلیم کر لینے کے اصول پر لگایا جائے۔ جس سے وہ تنگ نظری پر مبنی اور کورانہ پرستش کے عقائد کو تسلیم کر لینے لگیں۔ یہ حماقت اپنی جگہ انتہائی خراب اور مذموم ہے۔ سماجی، سیاسی، اقتصادی، تعلیمی اور دیگر شعبوں میں اس طرح کی لغو باتیں، حماقتیں اور خرافات دیکھنے کو ملیں گی۔ لیکن ہر جگہ اس کی ذمہ داری اُس رجحان کی پرورش پر ہے کہ ان کے خیالات اور افکار و نظریات ناقابلِ تردید ہیں اور وہ بحث سے بالاتر ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں :-

ضرورت کیا ہے ؟

جذبات کی دنیا بھی زندگی کا وہ گوشہ ہے جہاں لغویات اور مہمل باتوں نے بڑی تباہی مچائی ہے۔ جذبات، ذہن کی ایک مضمر قوت ہیں۔ ان کا تعلق دل سے نہیں بلکہ انسانی دماغ سے ہے جانوروں میں بھی جذبات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر ماں کو اپنے بچے سے محبت ہوتی ہے، بچے کو اپنی ماں سے لگاؤ ہوتا ہے، مرد کو عورت سے اور عورت کو مرد سے لگاؤ ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب آنا چاہتے ہیں۔ شادی اور ہم صحبت ہونے کی خواہش ہوتی ہے۔ لیکن انسان میں چوں کہ دماغی صلاحیت ہے، اس لیے اس نے ان تمام بنیادی باتوں کو سماجی سہولت، استحکام اور تحفظ کے نقطۂ نظر سے ایک بہتر شکل دے دی۔ اس طرح محبت شخصی سطح پر مختلف مدارج رکھتی ہے خاندان سے محبت، ذات پات اور فرقے سے محبت، زبان سے محبت، ریاست، علاقے، قوم وغیرہ سے محبت۔ یہاں تک کہ یہ جذبۂ محبت انتشار ذہنی اور دیوانگی کے درجے تک پہونچ جاتا ہے۔ آج بھی روزانہ بے گناہ انسانوں اور املاک کی تباہی کے واقعات عام ہیں کیوں کہ یہ بے سوچی سمجھی تشدد آمیز حرکتوں کے سبب ہوتے ہیں۔ لیکن ہم یہاں بھی کچھ دیر کے لیے توقف نہیں کرتے اور غور و فکر سے کام نہیں لیتے اور اس کے اسباب پر غور نہیں کرتے۔ زیادہ سے زیادہ ہماری کوشش لگی آگ کو بجھانے کی ہوتی ہے۔ جس طرح کی تبدیلی درکار ہے، اس پر غور و فکر نہیں۔ اس کے لیے رجحان کو بدلنا ضروری ہے۔

انسان کے ہر عمل کے پسِ پردہ یہ جذبہ کارفرما ہوتا ہے کہ اس کے کرنے سے اُسے اندرونی مسرت میسر آئے۔ یہاں خوشی اور اندرونی مسرت کا فرق بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ انسان نے اپنے تجربے سے یہ سیکھا ہے کہ ظاہری ضرورتوں کی تکمیل کے لیے تمام اسباب اور مال و متاع میسر آنے پر خوشی میسر ہوتی ہے لیکن اس کا تجربہ یہ بھی ہے، مادی آسائشوں کی بہتات اور مادی سامان کی فراوانی بیماری کا سبب بھی ہے۔ مثال کے طور پر مٹھائی یا چاکلیٹ اچھی ہے لیکن اس کا بے تحاشا استعمال صرف اس لیے کہ وہ کھانے میں اچھی لگتی ہیں، بیماری لے آئے گا۔ اس سے خوشی تکلیف میں بدل جائے گی۔ لہٰذا تخلیقی صلاحیتوں سے حاصل ہونیوالی خوشی زیادہ پائیدار ہے۔ اور اس سے ذہن کو مستحکم حالت میں خوشی میسر ہوگی۔ ایسے کارنامے اندرونی مسرت کا سرچشمہ ہیں جو دوسروں کی بھلائی کے لیے کیے جاتے ہیں۔ دیگر انسانوں اور مخلوقات سے ہم آہنگی پیدا کرنے سے بھی یہ مسرت مل سکتی ہے۔ قدرت کے ساتھ ہم آہنگی سے یہ ذہنی کیفیت میسر آسکتی ہے۔ انسان کا تجربہ اسے بتاتا ہے کہ دوسروں کے لیے محبت اور قربانی ایک عظیم اور بلند اقدام ہے۔ اس سے انسان کے من کو شانتی اور سکھ ملتا ہے۔ یہ مسرت اس وجہ سے ہوتی ہے کہ انسان ان عظیم آدرشوں کے لیے اپنی جان تک کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

انسان کی سب سے بڑی خواہش اور سب سے بنیادی خواہش یہی ہے کہ وہ اس دنیا میں زندہ رہے۔ مسرت دراصل سوچے سمجھے اس طریقے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے کہ اس کی مادی ضرورتیں کیا ہیں اور کن باتوں سے اسے خوشی مل سکتی ہے، سنگیت، رقص، مشاعرہ، ادب اور دیگر فنونِ اور کھیل، مہم جوئی کا جذبہ اور ہر بات کو جاننے اور اس سے واقف ہونے کی خواہش زندگی کے مقصد کی تکمیل میں معاون ہوتی ہے۔ ایک اور جذبہ جو انسان سے حماقتیں سرزد کراتا ہے، وہ ہے اس کا نام نہاد گھمنڈ، غرور اور جذبہ انا۔ خود اعتمادی اچھی بات ہے کیونکہ اس سے عزتِ نفس قائم رہتی ہے، دوسرے اس کے بارے میں، جو خیالات رکھتے ہیں، اور اس کے بارے میں جو سوچتے ہیں، وہ اس کی توفیر ہے۔ لیکن اگر ایک انسان اس سے زیادہ سوچنے لگے جو دوسرے اس کے بارے میں سوچتے ہیں، تو اسے جذبہ انا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ انا کا جذبہ خواہ کسی فرد میں ہو یا صاحبِ اقتدار قوم میں ہو، اس سے بڑی بڑی حماقتیں سرزد کرا دیتا ہے۔ اس سے مفاہمت، ہم آہنگی اور امن کو نقصان پہنچتا ہے۔ جذبۂ انا سے سرشار لوگ ایک فرضی نقاب ڈالے رہتے ہیں جس کے باعث وہ دوسروں سے ہم آہنگی اور مفاہمت

(باقی صفحہ ۴۶ پر)

جذبۂ انسانیت کا فروغ

جمال قدوائی*

صحیفوں کا ہمارے آئین سے کیا مقابلہ

جمال قدوائی صاحب کا کہنا ہے کہ احیائے مذہب کا یہ جوش خروش جو سب طرف نظر آرہا ہے، دراصل ہماری قومی تحریک ہی کا حصہ ہے۔ وہ اس نتیجے پر بھی پہنچے ہیں کہ مذہب ہماری زندگی کے ایک بہت بڑے حصے پر حاوی ہے مگر آئین میں درج بنیادی حقوق سے میل نہیں کھاتا۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس غلط مفروضے کو ترک کردیں کہ ہندوستان کے مذاہب قومی یکجہتی لا سکتے ہیں۔ جمال قدوائی صاحب کی رائے میں ہمارے سامنے صرف ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ اپنے آپ کو اس دلدل میں سے نکالیں اور معقولیت پسندی کی زندگی بسر کرنا سیکھیں۔

ہندوستان میں مذہبی امتیاز سے بالاتر رہنے کے اصول پر جو عمل درآمد ہو رہا ہے وہ آئین میں درج چند نصائح کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ قومی تحریک کا ورثہ ہے۔ آئین کی رُو سے مملکت قومی مقاصد کا غیر جانبدار آلۂ کار ہے، ملک میں بہت سے مذہب پائے جاتے ہیں مگر مملکت ان سے الگ تھلگ رہتی ہے۔ وہ جنس، ذات یا عقیدے کی پروا کئے بغیر تمام شہریوں میں معاشرتی سیاسی اور اقتصادی مساوات لانے کی پابند ہے۔ ایک شہری اور دوسرے شہری کے درمیان امتیاز روا نہ رکھنا اور سماجی اصلاح نیز سماجی تبدیلی لانا اس کا فرض ہے۔ لیکن بھلا ہو سیاست اور انتخاب کی مجبوریوں کا، ہمارے لیڈروں کو تمام فرقوں کے روایتی رسم و رواج میں شامل ہونا ہی پڑتا ہے۔

احیائے مذہب

قومی تحریک میں شروع ہی سے تجدید مذہب کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن اس میں جوش ۱۹۲۰ میں آیا۔ جب مہاتما گاندھی نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ان تحریکوں کو قومی تحریک سے منسلک کردیا جن کا مقصد مذہب کو دوبارہ زندہ کرنا تھا۔ اگلے دو برسوں میں کانگریس نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر جو تحریک خلافت چلائی اس سے ہندوؤں میں احیائے مذہب کا ولولہ پیدا ہوا۔ انھیں ہندوستان کا ماضی یاد آتا تھا جب مسلمانوں کا کوئی خوف نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ انھیں اُمید تھی کہ قوم پھر سے خالص ہندو کلچر اور قدروں کو اپنا لے گی۔ دوسری طرف مسلمانوں کے خون نے جوش مارا کہ دین کا جھنڈا بلند کریں۔ انھیں تیرہ سو سال پہلے کے ریگستانِ عرب کے جہاد یاد آتے تھے۔ انھیں ہندوستان میں اسلامی دورِ حکومت پر ناز تھا اور وہ یہ دیکھ کر پاگل ہوئے اٹھے تھے کہ پہلی جنگِ عظیم کے اتحادی۔ انگریز اور فرانسیسی۔ فتح حاصل کرنے کے بعد ترکی میں خلافت کو مٹانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں تحریکیں ایک ساتھ چلتی رہیں اور کسی نے اس بات کی طرف دھیان ہی نہیں دیا کہ ان میں بنیادی ٹکر موجود ہے۔

ان دنوں ہندوستان کے سیاسی اسٹیج پر لمبے بالوں اور بھگوے کپڑوں والے سوامی بھی دکھائی دیتے تھے اور لمبے چغوں والے باریش مولانا بھی نظر آتے تھے جو انگریزی راج کے خلاف تقاریر کرتے وقت جابجا ہندو گرنتھوں سے شلوک اور قرآنی آیات پڑھتے۔ جلد ہی سکھ بھی آدھمکے اور انھوں نے انگریزوں کے پھٹو مہنتوں کو ہٹا کر گوردواروں کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لینے کی تحریک چلائی۔ کانگریس نے ان کے کاز کی حمایت کی لیکن اس کے ساتھ ہی سکھ مت کی تجدید کی بنیاد بھی قائم ہوگئی جس کا خمیازہ قوم کو آگے جاکر بھگتنا تھا۔

لباس کے اعتبار سے گاندھی جی ہندو تھے مگر ان

* ڈائرکٹر، ماس کمیونیکیشن اینڈ ریسرچ سینٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ یونی ورسٹی، نئی دہلی۔

کا مذہب انسان دوستی کا تھا جس میں مختلف
مذہبوں کی چیدہ چیدہ اچھی باتیں شامل تھیں
جو ان کے مشن کو راس آتی تھیں۔ یسوع مسیح
سے انھوں نے عدم تشدد اخذ کیا اور محمود و ایاز
کی برابری اور بھائی چارے کا درس اسلام سے
حاصل کیا۔ گیتا سے انھوں نے یہ سیکھا کہ اپنے آپ
کو ملوث نہ کیا جائے اور صلے کی توقع کئے بغیر
بے خوف ہو کر اپنا فرض نبھایا جائے مگر وہ مہابھارت
کی اس جنگ کو نظر انداز کر گئے جس میں گیتا کا
اپدیش دیا گیا تھا۔ اور اس زمانے کی ذات پات
کو بھی بھول گئے۔ انھوں نے منوسمرتی سے کوئی
واسطہ نہیں رکھا۔ انھوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ
میں آسمانی صحیفوں کی اس تشریح کا پابند نہیں
ہوں جو عقل اور سوجھ بوجھ پر پوری نہیں اترتی۔
وہ ہندو سنتوں کی طرح گیان دھیان میں مگن نہیں
رہتے تھے بلکہ مسیح کی مانند تھے۔ جو مذہبی فرقہ
بھی تکلیف میں مبتلا ہوتا اس کا دکھ بٹانا وہ اپنا
فرض سمجھتے۔ پرنس آف ویلز کی آمد پر جب بمبئی

بن کر وہاں پہنچے اور جب تقسیم وطن کے دنوں
میں فسادات ہوئے اور ہندوؤں نے کلکتہ اور
بہار، دلی اور پنجاب میں مسلمانوں کو مارا تو گاندھی
جی نے مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ ماسوائے جواہر لعل
نہرو کے ان جیسا لیڈر پھر پیدا نہیں ہوا۔

اور ممبروں سے واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ جو
لوگ دو دو جماعتوں کے رکن ہوں وہ مستعفی
ہو جائیں۔

سیکولرازم کا دور

قومی تحریک کا ۱۹۳۰ کی دہائی کا دور سیکولر
دور تھا۔ اس زمانے میں گاندھی جی نے چھوت چھات

> اگلے دو برسوں میں کانگرس نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر جو تحریکِ خلافت چلائی اس سے ہندوؤں میں احیائے مذہب کا ولولہ پیدا ہوا۔ انھیں ہندوستان کا ماضی یاد آتا تھا جب مسلمانوں کا کوئی خوف نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ انھیں امید تھی کہ قوم پھر سے ہندو کلچر اور قدروں کو اپنا لے گی۔

اگلے دس برسوں تک کانگرس کا سیاسی
ہرجائی پن جاری رہا۔ بہت سے کانگرس کبھی
کانگرس کا ساتھ دیتے تھے کبھی مسلم لیگ سے
جا ملتے، کبھی خلافت کمیٹی کے ممبر بنے نظر آتے
اور کبھی ہندو مہاسبھا اور سکھ جماعتوں کے

کے خلاف زبردست تحریک چلائی اور جواہر لعل نہرو
نے یوپی اور بہار میں کسان تحریکوں کا جھنڈا بلند کیا
جس سے کہ آزادی کی تحریک کے سماجی اور اقتصادی
پہلو نمایاں ہوئے۔ فرقہ پرست مسلمان کانگرس
سے نکل گئے مگر ہندو فرقہ پرست ڈٹے رہے۔ اسی
زمانے میں سوشلسٹ اور کمیونسٹ کانگرس
سے آملے جس سے کہ اس جماعت کے سیکولر اور جدید
ہونے کے پہلو کو تقویت پہنچی۔ سب کچھ تو سیاسی
میدان میں ہوا۔ اس سے باہر ترقی پسند ادیبوں کی
تحریک نے تمام ہندوستانی زبانوں کے نوجوان ادیبوں
کو یکجا کیا تاکہ وہ مذہبی ظلمت پسندی کا پردہ
چاک کریں اور لوگوں کو بتائیں کہ ملک کا کسان کس
قدر زبوں حال ہے۔ ہندوستان کا آئین دراصل
قومی تحریک کے انھیں نظریاتی رنوں کی دین ہے۔
بھلا ہو نہرو اور گاندھی کا جنہوں نے تقسیم وطن کے
بعد کی صورت حال میں جس میں کہ یہ آئین وضع ہوا،
اس میں زیادہ تبدیلی نہیں آنے دی۔
آئین ہند اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ تمام

> دوسری طرف مسلمانوں کے خون نے جوش مارا کہ دین کا جھنڈا بلند کریں۔ انھیں تیرہ سو سال پہلے کے ریگستانِ عرب کے جہاد یاد آتے تھے۔ انھیں ہندوستان میں اسلامی دورِ حکومت پر ناز تھا اور وہ یہ دیکھ کر پاگل ہو اٹھے تھے کہ پہلی جنگِ عظیم کے اتحادی۔ انگریز اور فرانسیسی۔ فتح حاصل کرنے کے بعد ترکی میں خلافت کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔

میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر پارسیوں کی پٹائی
کر دی تو انھوں نے پارسیوں کا ساتھ دیا۔ مشرقی
بنگال کے مسلمانوں نے جب نواکھلی میں ہندوؤں
کو قتل کیا تو گاندھی جی ہندوؤں کے مددگار

رکن بن جاتے۔ یہ تو ۱۹۳۵ کی بات ہے جب
کانگرس نے اعلان کیا کہ فرقہ پرست جماعتوں
کی ممبری کانگرس کی رکنیت سے میل نہیں کھاتی

ہندوستانیوں کو سماجی، اقتصادی اور سیاسی انصاف ملے گا۔ ہر کسی کو خیال، اظہارِ عقیدہ، مذہب اور عبادت کی آزادی حاصل ہوگی۔ اور سب کو ترقی کے برابر مواقع ملیں گے۔ ان حقوق کی آئین کی مختلف دفعات میں ضمانت دی گئی ہے مگر ان پر عمل درآمد دفعہ ۲۵ (۱) کے تحت "پبلک امن و امان"۔ اخلاق اور صحت" کے تابع ہوگا اور دفعہ ۲۵ (۲) کے تحت اس بات کے تابع ہوگا کہ مملکت "مذہبی دستور سے تعلق رکھنے والی کسی بھی اقتصادی، مالی، سماجی یا دیگر سیکولر سرگرمی میں باقاعدگی پیدا کرنے یا اس پر پابندی لگانے کے لیے" قانون بناسکتی ہے۔

مذہبی کشمکش

ہمارے آئین کا مرکزی سیکولر نظریہ یہیں سے کچھ آتا ہے۔ ہندوستان میں تمام مذاہب کے طور طریقے ہیں بنیادی اعتقادات اور عبادت کے جن کا احترام کرنے کا آئین نے حلف اٹھا رکھا ہے۔ لیکن ان بنیادی عقیدوں کے اردگرد کچھ عارضی دنیوی رسم و رواج نے بھی گھیرا ڈال رکھا ہے جو ہر مذہب کے پیروؤں کی زندگی کے معتدبہ حصہ پر حاوی ہیں۔ ان میں اقتصادی زندگی کے اصول، وراثت اور شادی بیاہ کے قوانین بلکہ قوانین فوجداری بھی شامل ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ملک کے تمام مذاہب اور ہمارے آئین کے بنیادی حقوق کے درمیان تنازعہ پیدا ہوتا ہے۔ منوسمرتی اور ہمارے آئین کے درمیان یہیں آکر تضاد پیدا ہوتا ہے۔ آئین مرد اور عورت کے درمیان مساوات کی ضمانت دیتا ہے۔ مگر شادی اور وراثت کے متعلق مسلمانوں کا شخصی قانون اس سے لگا نہیں کھاتا۔ سکھ خالصہ کا یہ دعویٰ کہ دینی اور دنیوی دونوں اختیارات اس کے ہاتھ میں ہیں، دنیوی اختیارات کے متعلق مملکت کے دائرہ اختیار سے متصادم ہے۔

لیکن انتخابی مجبوریوں کے صدقے اسی تصادم پر زور نہیں دیا جاتا۔ ملک کے ہر فرقے کے پاس ووٹوں کی بھرمار ہے اور لیڈروں کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہر فرقہ وارانہ انا کی تسکین کریں۔ نظریہ تو یہ تھا کہ مملکت کا کسی بھی مذہب کی طرف جھکاؤ نہیں ہوگا مگر اب ہونے یہ لگا ہے کہ ملک کے ہر مذہبی فرقے یا ذات کی جانب برابر کا جھکاؤ دکھایا جانے لگا ہے۔ چنانچہ ہر فرقے کی دلجوئی کے لیے کچھ قدم اٹھائے جانے لگے ہیں، مثلاً ہولی ملن، دیوالی ملن، عید ملن، رمضان کے دنوں میں افطار پارٹیاں، کیرتن منڈروں کی رسوم اور محرس منائے جانے لگے ہیں۔ ان سب کی سرپرستی ہمارے لیڈر کرتے ہیں۔ حالانکہ آئین سائنسی رویّہ اور سائنسی مزاج پیدا کرنے کا پابند ہے، مگر ہمارے بیشتر لیڈر سنتوں، سادھوؤں، فقیروں، جیوتشیوں کا دامن تھامے ہوئے ہیں۔ یہ توہمات زوال کے دنوں میں سلطنت روما کے حکمرانوں اور جرمنی میں اعلیٰ طبقے کے نازیوں کی حالتِ زار کی یاد دلاتے ہیں۔

اس طرح کی دلجوئی کے باوجود ملک میں قومی یکجہتی پیدا نہیں ہوسکی۔ مراد آباد، علیگڑھ، بھونڈی اور بہار شریف کے مسلمان، دلی کے سکھ اور آسام کے مسلمان اور بنگالی اپنے ان زخموں کو ابھی تک چاٹ رہے ہیں جو انھیں پچھلے دنوں قتلِ عام میں کھانے پڑے تھے۔ پنجاب کے ہندوؤں کی جان سوکھی رہتی ہے کہ اب قتل ہوئے اب مکانوں کو آگ لگی۔ اُدھر گجرات میں اعلیٰ اور ادنیٰ ذاتیں تعلیمی اداروں اور ملازمتوں میں ریزرویشن کی پالیسی کے سوال پر آپس میں خون کی ہولی کھیل رہے ہیں۔

غلط مفروضہ

یہ مفروضہ غلط ثابت ہوا ہے کہ ہندوستان کے

منوسمرتی اور ہمارے آئین کے درمیان یہیں آکر تضاد پیدا ہوتا ہے۔ آئین مرد اور عورت کے درمیان مساوات کی ضمانت دیتا ہے مگر شادی اور وراثت کے متعلق مسلمانوں کا شخصی قانون اس سے لگا نہیں کھاتا۔ سکھ خالصہ کا یہ دعویٰ کہ دینی اور دُنیوی دونوں اختیارات اس کے ہاتھ میں ہیں، دُنیوی اختیارات کے متعلق مملکت کے دائرہ اختیار سے متصادم ہے۔

حالانکہ آئین سائنسی رویّہ اور سائنسی مزاج پیدا کرنے کا پابند ہے، مگر ہمارے بیشتر لیڈر سنتوں، سادھوؤں، فقیروں، جیوتشیوں کا دامن تھامے ہوئے ہیں۔ یہ توہمات زوال کے دنوں میں سلطنت روما کے حکمرانوں اور جرمنی میں اعلیٰ طبقے کے نازیوں کی حالتِ زار کی یاد دلاتے ہیں۔

مذاہب قومی یکجہتی لانے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہر مذہب بھان متی کا پٹارا ہے جس میں اپنوں کے لیے پیار محبت ملے گا۔ اور غیروں کے لیے نفرت سے لے کر رواداری تک کے ملے جلے جذبات ملیں گے۔ چنانچہ ہماری مذہبی امتیاز سے بالاتر مملکت میں واحد قابلِ اعتبار صحیفہ ہمارا آئین ہی ہے۔ وہ یہ دعویٰ نہیں کرتا ہے کہ اس پر خدائی مہر لگی ہے۔ انسانی مساوات اور وقار کے پھیلتے ہوئے نظریوں اور فرد کی قدر و منزلت کا احاطہ کرنے کے لیے اس میں ترمیم کی جا سکتی ہے۔ ہمارے لیڈر آجکل صحیفوں کی جو تشریح کر رہے ہیں، وہ ان دنوں کی تشریح سے بالکل مختلف ہے جن دنوں گاندھی جی نے صحیفوں کے جواز پر اعتراض کیا تھا، جب جواہر لال نہرو نے اس بات کی ناکام مخالفت کی تھی کہ راشٹرپتی راجیندر پرساد سومناتھ کے نئے مندر کے کھولے جانے کی رسم میں شرکت کریںگے مگر جب راجیندر پرساد سول کوڈ بل کی مخالفت پر اُتر آئے تھے تو جواہر لعل نے ان کی بات نہیں مانی تھی۔

ہم اس ملک میں تمام مذاہب کی نازبرداری کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ خصوصاً ہندو مذہب کی چونکہ وہ ملک کی غالب اکثریت کا مذہب ہے۔ لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کمال اتاترک اور اسٹالن کو مجبور ہو کر اپنی اپنی قوم کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے بیسویں صدی میں لانا پڑا تھا۔ ہم ابھی تک پوری طرح بیسویں صدی میں نہیں پہنچ پائے ہیں۔ حالانکہ ہمارے لیڈر چاہتے ہیں کہ ہندوستان کو اکیسویں صدی میں لے جائیں۔ اس کے لیے پیچھے سے دھکا دینے اور آگے سے کھینچنے کی ضرورت پڑے گی۔ اس کے لیے مضبوطی سختی اور پکے ارادے کی ضرورت پیش آئے گی۔ موجودہ حکومت کو پارلیمنٹ میں بھاری اکثریت حاصل ہے اور وہ ملک کو زور سے آگے کی طرف دھکیل سکتی ہے بشرطیکہ اُسے اپنے آئین کے بنیادی اصولوں پر اُسی طرح کا ایمان ہو جس طرح کا ایمان کہ روس کی کمیونسٹ پارٹی کو مارکس اور لینن کی تعلیمات پر تھا۔

> یہ مفروضہ غلط ثابت ہوا ہے کہ ہندوستان کے مذاہب قومی یکجہتی لانے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہر مذہب بھان متی کا پٹارہ ہے جس میں اپنوں کے لیے پیار محبت ملے گا اور غیروں کے لیے نفرت سے لے کر رواداری تک کے ملے جلے جذبات ملیں گے۔ چنانچہ ہماری مذہبی امتیاز سے بالاتر مملکت میں واحد قابلِ اعتبار صحیفہ ہمارا آئین ہی ہے۔

بقیہ: آزاد ذہن کی تشکیل

حصوں کو نکال دینے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوگا، ہمیں ایک مثبت لائحہ عمل اپنانا ہوگا تاکہ برداشت اور اخلاص کے جذبات پیدا ہوں۔ جس سے تاریخ، سائنس اور سماج کے نظریوں کو سمجھنے میں مدد ملے۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں، اس وقت مختلف زبانوں میں جو نصاب رائج ہیں ان میں سے قابلِ اعتراض حصوں کو نکالنے میں وقت ضائع کرنے کی بجائے کیوں نہ ایک مرکزی نصاب بنایا جائے جو کم از کم ۷۰ سے ۸۰ فیصد مضامین پر جو اس وقت پڑھائے جاتے ہیں، حاوی ہو۔ اس وقت بھی بہت سے مضامین ایک سے ہیں۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کچھ مصنفین کا ذہن قوم اور عوام کی ضروریات سے احاطہ نہیں کرتا۔ اور وہاں باقیماندہ ۲۰ سے ۳۰ فیصد تعلیمی نصاب کو مقامی ضرورت کے مطابق لکھا جا سکتا ہے۔

کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی ایسے بنیادی نصاب ہونے چاہئیں جو ہر طالب علم کو پڑھائے جائیں اور جن سے ان میں سماجی ارتقا، نظریات کا مقام اور سائنسی مزاج کی ضرورت کا دانشمندانہ احساس پیدا ہوگا تاکہ وہ سماجی اور ذاتی مسائل کو حل کرنے کے اہل ہو سکیں۔ مذہب کی بنیادوں اور اخلاق اور اقدار کے مقابلے میں اس کے مقام پر پوری طرح بحث ہونا چاہیے تاکہ ہر طالب علم اس اہم سوال پر خود اپنا نظریہ بنا سکے۔ وطن پر فخر، اس کے مختلف فیہ کلچر، اس کی جنگ آزادی کی قربانیوں اور اس کے روشن مستقبل پر اعتقاد اور اعتماد کے جذبات کو پیدا کرنا چاہیے۔

اس میدان میں استاد کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہے۔ آخر معقول راہ کون دکھا سکتا ہے۔ نازک معاملات پر غیر جانبدارانہ بحث کون ممکن بنا سکتا ہے۔ تبدیلی اسے نپٹنے آخر کون ہے جو طلبا کو معقول اور کھلا ذہن دے سکتا ہے۔

آخر کار ہم استادوں کی تربیت، ان کی ٹریننگ اور ان کے احیائے جدید کی ضرورت کا احساس کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا کام ہے جس کی فوری ضرورت ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ استادوں میں اس کام کو سرانجام دینے کی خواہش پائی جاتی ہے۔ ہمیں اس ارادے کو مضبوط بنانے کے لیے مالی امداد فراہم کرنا ہوگی۔ اور اس میدان میں بھی نشریات کے ذرائع آمنے سامنے کی ملاقاتیں اور خط و کتابت، بحث و مباحثہ، کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ یقیناً کام مشکل ہے جس تبدیلی کی ضرورت ہے شاید وہ بہت وقت لے لیکن ہمارے پاس کوئی چارہ بھی تو نہیں۔

موہت سین●

جذبہ انسانیت کا فروغ

رواداری کا یہ پرچار ہی کافی نہیں

فرقہ پرستی کا مقابلہ کرنے کے لیے رواداری کا پرچار کرنے سے ہی کام نہیں چلے گا۔ کیونکہ مصنف کی رائے میں کسی بھی حلقے سے کسی بھی صورت کی مذہبی ناروا داری کے اثر کو مذہبی بنا پر کالعدم نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے برعکس اس سے سب طرف مذہبی ناروا داری پیدا ہوتی ہے۔ ان کا مزید بیان ہے کہ ایک سیکولر مملکت کو ایک عقیدے اور اقدار کے تمام تر نظام کے طور پر سیکولرزم کا پرچار کرنا ہوگا۔

مذہب یقیناً خرافات نہیں ہے لیکن جو سماجی امور اور کردار مختلف اوقات میں اور مختلف ممالک میں اسے تفویض کیے گئے ہیں انھوں نے بعض موقعوں پر اسے یقیناً ایک خطرناک خرافات بنا دیا ہے۔ عام طور پر جیسا یقین کیا جاتا ہے اس کے برعکس مارکس نے محض یہ نہیں کہا کہ مذہب عوام کے لیے افیون ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گو اس نے یہ خاص الفاظ استعمال نہیں کیے ان کا اصل مصنف کریچین سوشلسٹ کنگزلی ہے جو اپنی چھینی سویپ کی رقت انگیز کہانی کے لیے زیادہ مشہور رہا ہے۔

مارکس اور گاندھی

مارکس درحقیقت عوام کے دلوں اور ذہنوں میں مذہب کے مقام کے بارے میں قطعی شاعرانہ خیالات رکھتا ہے وہ اسے بے دلی کا دل، بے روح کی روح اور ایک نقلی پھول کہتا تھا جس کا مقصد ان زنجیروں کو چھپانا تھا جنھیں پہننے کے لیے انسان مجبور کیے گئے ہیں۔ اس معنی میں اس نے اسے عوام کے لیے افیون بیان کیا تھا۔ اس نے مزید کہا کہ اس نے جس نقلی اور آرائشی رول کا ذکر کیا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ انسان کو بلا پھولوں کی زنجیریں پہن کر جینا چاہیے بلکہ یہ ہے کہ اسے حقیقی پھولوں کی جانب بڑھنا چاہیے۔ فریب کی جگہ امید کو دی جانی چاہیے۔

اگر یہ مارکس کا رویہ تھا تو اسی سوال کے تئیں مہاتما گاندھی کی رسائی کافی دلچسپ تھی۔ یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ وہی مذہب کو

مذہب یقیناً خرافات نہیں ہے لیکن جو سماجی امور اور کردار مختلف اوقات میں اور مختلف ممالک میں اسے تفویض کیے گئے ہیں انھوں نے بعض موقعوں پر اسے یقیناً ایک خطرناک خرافات بنا دیا ہے۔

تحریک آزادی میں لاتے جب اس کا عوامی سطح پر پھیلاؤ ہو رہا تھا تاکہ وہ اس کے عوامی کردار کو برقرار رکھ سکے اور وسعت دے سکے۔

ایک اہم معنی میں یہ سچ ہے کہ انھوں نے جو محاورہ استعمال کیا اس میں اور عوامی تحریک کی صورتوں میں مذہبی رنگ اور کردار تھا۔ لیکن یہ لازمی طور پر ایسا تھا کیونکہ ان کے لیے اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ ایک مذہبی آدمی تھے، ایک کرم یوگی تھے جن کا یقین تھا کہ آزاد بھارت خدائی آواز ہے وہ اپنے آپ کو ایک غریب اور کمزور انسان تصور کرتے تھے جو صرف دوسروں کی بھلائی کرنا چاہتے تھے۔

دو اہم پہلو

لیکن گاندھی جی کے دستور کار کے دو پہلو ہیں جنھیں کسی بھی صورت میں فراموش نہیں کیا جانا چاہیے۔ پہلا یہ ہے کہ وہ پورے دل سے وسیع ہندو عوام کو جو اس وقت آج کی مانند بھارت کی زبردست اکثریت تھے سیکولر بنانا چاہتے تھے اور ان کے لیے انھوں نے اپنی پوری طاقت سے کوشش کی۔ وہ ہندوؤں کو جیسا کہ وہ تھے، بھارتی بنانا چاہتے تھے اور ہندو دھرم سے متعلق اپنی نجی تشریح کی بنا پر انھیں رواداری کی ضرورت کا احساس کرانا چاہتے تھے۔ گاندھی جی بدھ اشوک اور اکبر کی روایات میں بھارت کو متحد کرنے والے

● رکن، سی۔پی۔آئی پولٹ بیورو۔

عظیم انسان تھے۔

اس کے برعکس جناح تھے جو مشکل اسلام میں ہی اعتقاد رکھتے تھے لیکن جنھوں نے اسے بروئے کار لاکر مسلمانوں کو الگ کیا، ان میں ہندوستانیت کو ختم کیا اور ہمارے ملک اور عوام کے اتحاد کو توڑا۔

مذہب کے تئیں گاندھی جی کی رسائی کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ انھوں نے اس امر کی سخت مخالفت کی کہ عوام کو غیر فعال بنانے کے لیے اس (مذہب) کا استعمال کیا جائے۔ انھوں نے کہا تھا کہ مذہب بھوکوں کے پاس روٹی کی صورت میں آتا ہے۔ انھوں نے ہی ڈٹ کر ٹیگور کو نظم وضبط پر مبنی جدوجہد کی ضرورت کی یاد دلائی کیونکہ بھارت میں نوع انسانی (ٹیگور نے آزادی کے جوہر کی پرندوں کی آزاد پرواز سے تشبیہ دی تھی)

یہاں بھی مذہب متحد کرنے والی قوت بن گیا۔ یہ ایک ایسا ذریعہ تھا جس سے دانشوروں اور ناداروں نے مل کر اپنی آزادی کی منزل کی جانب پیش قدمی کی۔

تاہم مہاتما کی زندگی میں ایسے دو اہم واقعات ظہور میں آئے جن سے اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ وہ مذہب کی محدودیت سے آگاہ تھے۔

پہلا خدا اور صداقت کے تعلق کے بارے میں ہے۔ اگر مجھے ٹھیک طور پر یاد ہے تو یہ تیس کی ابتدائی دہائی میں کسی وقت پیش آیا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ اس سے پہلے ان کی رائے میں خدا صداقت تھا لیکن انھوں نے دیکھا کہ بعض ایسے لوگ ہیں جو صداقت کے حامی ہیں لیکن خدا میں اعتقاد نہیں رکھتے چنانچہ گاندھی جی نے ماٹو کو بدل دیا اور کہا کہ اب ان کا یقین ہے کہ صداقت ہی خدا ہے۔ یہ اس کے بڑی اٹل بات ہے لیکن ہمارے پرآشوب وقت کے لیے بڑی برمحل ہے۔

دوسرا واقعہ گاندھی جی کے تاریخی آخری ایام میں

اور پوچھا کہ کیا بات ہے اور اس کے بعد انھوں نے مسلح نوجوانوں کو اپنی نیک دعائیں دیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ جہاں ناکام ہو گئے ہیں وہاں وہ (نوجوان) اس کی آزمائش کر سکتے ہیں۔

مارکس کے خیالات کو درست طور پر سمجھنے اور گاندھی جی کے خیالات اور تجربے سے مجھے معلوم ہوتا ہے کہ جب ہم اپنے سیاسی ڈھانچے کی سیکولر بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے کوشاں ہوتے ہیں تو بعض بنیادی علامتوں سے اشارہ ملتا ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔

کرنے لائق چھ باتیں

اول ـــ مذہب کو اسی طرح جلاوطن نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس کا تمسخر اڑایا جا سکتا ہے جس طرح سیکولرزم کا۔ یوں تو یہ بات ہے ہی بری۔

دوئم ـــ عقلیت پسندی اور رحم کہ انسان دوستی بھی مذہب رہن سہن سے متعلق مذہبی ہدایات اور سماج یا عوام کی مذہبی وابستگی

> مارکس کے خیالات کو درست طور پر سمجھنے اور گاندھی جی کے خیالات اور تجربے سے مجھے معلوم ہوتا ہے کہ جب ہم اپنے سیاسی ڈھانچے کی سیکولر بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے کوشاں ہوتے ہیں تو بعض بنیادی علامتوں سے اشارہ ملتا ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔

تھک کر سوتی تھی اور جب بیدار ہوتی تھی تو پہلے سے بھی زیادہ تھکی ہوتی تھی کیونکہ اسے مقوی غذا میسر نہیں تھی۔ چنانچہ آزادی کے لیے اس صورت حال کا خاتمہ ضروری تھا جسے بدلنے میں نظم وضبط، تنظیم اور جدوجہد کی ضرورت تھی۔

یہ سچ ہے کہ ناداروں کے لیے گاندھی جی کی عظیم ہمدردی میں ایک ایسا عنصر تھا جسے متبادل عنصر کہا جا سکتا ہے۔ وہ ہر آنکھ سے آنسو پونچھنا چاہتے تھے اور یہ نہیں چاہتے تھے کہ نادار خود اپنے آنسو پونچھیں اور وہ ان حالات اور اشخاص کے خلاف لڑائی میں آگے بڑھیں جنھوں نے انھیں رلایا ہے۔ لیکن ہمدردی موجود تھی اور وہ خود حرکت میں لانے والی طاقت بن گئی اس سے نام نہاد متوسط طبقہ نے اس شے کی طرف رخ کیا جسے گاندھی جی یہی پرستش، درد ناداروں کی پرستش کہتے تھے۔

۱۹۴۷ء میں کلکتہ میں پیش آیا۔ وہ یوم آزادی پر آل انڈیا ریڈیو کو پیغام دینے سے پہلے ہی انکار کر چکے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اگر یہ بڑی بات ہے تو اسے بڑی بات ہی رہنے دیجیے کیونکہ اس وقت اندر ہی اندر تاریکی چھائی ہوئی ہے۔

کلکتہ میں ہندو مسلم فسادات عروج پر پہنچے ہوئے تھے کہ ایک بار مسلح ہندو نوجوانوں کا ایک گروہ اس مکان پر آیا جہاں گاندھی جی مقیم تھے۔ یہ بعد دوپہر کی بات ہے جب وہ سو رہے تھے۔ پروفیسر نرمل بوس باہر آئے اور نوجوانوں سے دریافت کیا کہ وہ کیوں شور مچا رہے ہیں اور وہ کیا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ مہاتما جی کی نیک دعائیں لینے آئے ہیں کیونکہ وہ ہاتھ میں ہتھیار لے کر مسلمانوں کی حفاظت کرنے جا رہے ہیں۔ پروفیسر نے انھیں لعن طعن کرتے ہوئے یاد دلایا کہ مہاتما جی عدم تشدد کے حامی ہیں۔ نوجوان مصر رہے۔ شور وغل سن کر گاندھی جی باہر آئے

کا بدل نہیں ہو سکتی۔

سوئم ـــ دیگر مذاہب کے تئیں رواداری بعض مذاہب اور ان سب سے زیادہ ہندو دھرم کے ساتھ قطعی مطابقت رکھتی ہے لیکن ایک روادار مذہب کی اپنی حدود ہوتی ہیں اور غیر رواداری کو بھی ایسی ہی مذہبی توثیق حاصل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک روادار مذہب دوسرے مذہب میں رواداری کی ترغیب نہیں دے سکتا۔ کسی بھی حلقے کی طرف سے کسی بھی صورت کی مذہبی نارواداری کو مذہبی بنا پر دور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس یہ سب طرف مذہبی نارواداری پیدا کرتی ہے۔

چہارم ـــ ہمارے جیسے ملکوں میں جہاں مذہبی روایات بہت گہری ہیں اور مذہب کو عوامی شعور میں مستقل مقام حاصل ہے سیکولرزم کا روک تھام کرنا مذہب دشمن اقدام نہیں ہو سکتا۔ تاہم ہمارے عوام کی بھاری

> اگرچہ مذہبی رواداری کو بھارت کے سیکولرازم کا جز و ہونا چاہیئے۔ یہ واحد یا بڑا عنصر نہیں ہو سکتی۔ بھارتی سیکولرازم کا بڑا عنصر یہ ہونا چاہیئے کہ مذہب کا سیاست سے کوئی تعلق نہ ہو۔ بھارتی مملکت کو نہ صرف ایک لادینی مملکت ہونا چاہیئے بلکہ اسے ایک ایسی مملکت ہونا چاہیئے جس کا کسی مذہبی فرقے کے نام سے کوئی تعلق نہ ہو اور وہ کسی بھی مذہب کی دراندازی اور دخل اندازی کے خلاف ہو۔

اکثریت کو عقیدہ تمندوں کی مانند سیکولرزم کا بھی پرستار ہونا چاہیئے ٹھیک یہیں پہ گاندھی جی کا دستور کار عظیم ترین قدر و قیمت کا حامل ہے۔

پنجم — اگرچہ مذہبی رواداری کو بھارت کے سیکولرزم کا جز و ہونا چاہیئے۔ یہ واحد یا بڑا عنصر نہیں ہو سکتی۔ بھارتی سیکولرزم کا بڑا عنصر یہ ہونا چاہیئے کہ مذہب کا سیاست سے کوئی تعلق نہ ہو۔ بھارتی مملکت کو نہ صرف ایک لادینی مملکت ہونا چاہیئے بلکہ اسے ایک ایسی مملکت ہونا چاہیئے جس کا کسی مذہبی فرقے کے نام سے کوئی تعلق نہ ہو اور وہ کسی بھی مذہب کی دراندازی اور دخل اندازی کے خلاف ہو۔

ششم — ایک سیکولر مملکت کو ایک عقیدے اور اقدار کے ایک کلی نظام کے طور پر سیکولرزم کا پرچار کرنا چاہیئے۔ یہ خود کو تمام مذاہب کی برابری اور مذہبی رواداری کی قدر و قیمت کے پرچار تک محدود نہ کرے۔ اسے ایسا ضرور کرنا چاہیئے لیکن اسے اس سے بھی زیادہ لازماً کرنا چاہیئے۔ اسے مذہب سے غیر متعلق سیاست اور انسان کی بنائی ہوئی عقلیت پسندانہ تاریخ کے تصور کا پرچار کرنا چاہیئے۔

اور چار طریقے

اوّل — اس کام کو یہ چار طریقوں سے انجام دے سکتی ہے اور اسے انجام دینا چاہیئے۔ شروع میں اسے حتی الامکان زیادہ جوش کے ساتھ عظیم سیکولر تہواروں، یوم آزادی، یوم جمہوریہ اور یوم مئی کو منانا چاہیئے۔ یہ تمام واقعات اپنے تئیں جو کردار کے لحاظ سے کلیتہً غیر مذہبی ہیں کامیابیوں کو مناتے ہیں اور امنگوں کا اظہار کرتے ہیں جو تمامتر انسان کے طور پر انسان کی امنگوں کی سطح پر ہیں۔

دوئم — اس کے بعد ہماری داستان آزادی کو سیکولر انداز سے پیش کیا جانا چاہیئے۔ کہنے کا مطلب ہے کہ نہ صرف جدوجہد کے سیکولر نقطۂ نگاہ سے جس میں تمام مذاہب کے مردوں اور عورتوں نے شرکت ہی نہیں کی بلکہ جو غیر مذہبی مقاصد کے لیے لڑی گئی۔ تحریک آزادی کے رہنماؤں نے جب جدوجہد کے امور، صورتوں، وقت اور چالوں کے بارے میں فیصلے کئے تو انھوں نے یہ کام اس حقیقت کے باوجود سیکولر انسانوں کے طور پر کیا کہ ان کی بہت بھاری اکثریت ایک یا دوسرے مذہب میں اعتقاد رکھتی تھی۔ اس دستور کار کے بغیر نہ تحریک آزادی کے اتحاد کو برقرار رکھا جا سکتا اور نہ ہی عقلیت پسندانہ فیصلے کئے جا سکتے تھے اور حقیقت پسندانہ جائزے اور تجزیے

> ایک سیکولر مملکت کو ایک عقیدے اور اقدار کے ایک کلی نظام کے طور پر سیکولرزم کا پرچار کرنا چاہیے۔ یہ خود کو تمام مذاہب کی برابری اور مذہبی رواداری کی قدر و قیمت کے پرچار تک محدود نہ کرے اسے ایسا ضرور کرنا چاہیے لیکن اسے اس سے بھی زیادہ لازماً کرنا چاہیے۔ اسے مذہب سے غیر متعلق سیاست اور انسان کی بنائی ہوئی عقلیت پسندانہ تاریخ کے تصور کا پرچار کرنا چاہیے۔

پر مبنی ان عقلیت پسندانہ فیصلوں کے بغیر آزادی حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

سوئم — اس کے بعد کسی کو مزید آگے بڑھنا ہوگا تاکہ تحریک آزادی اور حصول آزادی کے بعد بھارت میں مذہب کا سیاست میں جو رجعت پسندانہ اور قوم دشمنانہ استعمال کیا گیا اسے واضح کیا جا سکے۔ یہ کوئی اتفاقیہ امر نہیں ہے کہ برطانوی سامراجیوں نے جوش سے ابھرتی ہوئی قوم پرستی کے خلاف ایک طاقتور ہتھیار کے طور پر ہندو اور مسلم سکھ اور عیسائی فرقہ پرستی کو ابھارنے کے لیے وہی کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے "تقسیم کرو اور حکومت کرو" برطانوی سامراجیوں کی ظالمانہ اور شرانگیز پالیسی تھی۔ یہ اس آزادی کو مٹانے کے لیے تخریب کاری کا بڑا ہتھیار بنی ہوئی ہے جسے دینے کے لیے سامراجی مجبور ہو گئے تھے۔ فرقہ پرستی کو بے نقاب کرنے اور اس کا مقابلہ کرنے کا کام مسلسل طور پر انجام دینا ہوگا۔ اسے ہمارے تمامتر تعلیمی نظام میں سرایت کرنا ہوگا۔ اور ذرائع نشر و اشاعت کے پروگرام کا حصہ بننا ہوگا جو حکومت کے ہاتھوں میں ہے۔

چہارم — انجام کار (اس تجویز کی طرف بہت زیادہ توجہ اور خیال دینا ہوگا کہ عوام کی جذباتی زندگی میں مذہب کو ایک غیر وجودی ترجیح دینا ہوگا جبکہ وہ سیاسی انفرادیت یا سیاسی انتخاب کے حق کے استعمال کے لیے کوشاں ہیں لیکن یہ مسئلہ کسی بھی طرح سیاسی نہیں ہے۔ یہ دراصل سماج سے تعلق رکھنے والا مسئلہ ہے)۔ یہ ایک فرد کا اس سے کہیں زیادہ بڑی ہستی سے تعلق جوڑنے زندگی کے آدرش اور مستقبل کا سوال ہے جن سے اسے آرام اور تحریک حاصل ہوگی۔

(باقی صفحہ ۴۳ پر)

پی سی جوشی ♦

جذبۂ انسانیت کو فروغ

آئیے مل کر تحریک احیائے مذہب کا مقابلہ کریں

فاضل مضمون نگار کا کہنا ہے کہ سیکولرزم یعنی مذہبی امتیاز سے بالاتر رہنے کا تصور ہماری جدوجہد آزادی کا پیدا کردہ ہے اور ملک کی اتحاد کی اساس ہے۔ ایک طرف متحدہ سیکولر ہندوستان کا نظریہ ہے اور دوسری طرف یہ حقیقت ہے کہ اس نظریے کو گھن لگ رہا ہے۔ ہمیں چوکنا ہونے کی ضرورت ہے۔ کٹر پنتھی لوگ سیکولرزم پر پے در پے حملے کر رہے ہیں۔ چنانچہ ہمارے لیڈروں کے لیے لازم ہو گیا ہے کہ وہ سیکولرزم کے دفاع کے لیے سینہ سپر ہو جائیں۔

ترقی پذیر ممالک میں ہندوستان کی امتیازی شان یہ ہے کہ اس نے سیکولرزم کا بیڑہ اختیار کیا ہے اور اسے مملکت کی پالیسی کا رہنما اصول بنا رکھا ہے۔ ہندوستانی سیکولرزم محض ایک دماغی تصور نہیں ہے اور نہ ہی دینیاتی اور درسی مباحثوں کا نتیجہ ہے۔ اسے جنگ آزادی کے شہیدوں اور ان کی قربانیوں اور ان بے شمار ہندوستانیوں نے جلا بخشی ہے اور اخلاقی قدریں عطا کی ہیں جو شدید قومی بحران کے دنوں میں سیکولرزم کے علمبردار رہے۔ اس قسم کی قربانیوں اور جدوجہد کی تاریخ نے ہندوستانی میں سیکولر روایات کو عملی جامہ پہنایا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سیکولرزم مغربی ممالک کی روشن خیالی اور اصلاحات کی دین ہے۔ اس لحاظ سے ہندوستان مغرب کا دیندار ہے کہ اس نے سیکولرزم کا نظریہ مغرب سے حاصل کیا۔ لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ یہ نظریہ برطانوی نوآبادی راج نے عطا کیا۔ نوآبادیاتی راج سیکولر راج نہیں تھا۔ اس کی پالیسی تھی "پھوٹ ڈال کر حکومت کرو۔" اور اس کی بدولت نوآبادیاتی راج نے مختلف مذاہب کو آپس میں لڑا رکھا تھا۔ کیونکہ یہ مکروہ تھا نیز بدیشی راج نے ہندوستانی تعلیم اور کلچر کو سیکولر بنانے کی پالیسی پر عمل نہیں کیا۔ اس نے تو ہندوستان کے مختلف طبقوں کو پسماندہ رکھا۔ چنانچہ ہندوستانی سماج کے سیکولرزم کی راہ پر گامزن ہونے کی راہ میں یہ ایک بڑی بھاری رکاوٹ تھی۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان میں سیکولر نظریے کو ان مغرب زدہ ہندوستانی شرفاء نے پھیلایا جو جدید مغربی فکر اور خصوصاً انگریزی صنعتی انقلاب اور فرانسیسی سیاسی انقلاب سے متاثر ہوئے۔ سیکولرزم، تاریخی مجبوریوں اور نوآبادیاتی راج کے خلاف ہندوستان کی جدوجہد کی ضرورتوں کا نتیجہ تھا۔ یہاں مختلف مذہبوں، نسلوں اور زبانوں کی کوئی کمی نہ تھی اور ہندوستان اس کوشش میں تھا کہ ایک متحدہ قومی تشخص قائم کر کے دکھائے۔

نہرو کی وضاحت

جواہرلال نہرو نے ہندوستانی قومیت کے لیے مذہبی امتیاز سے بالاتر رہنے کے نظریے کی ضرورت پر ان الفاظ میں زور دیا :

"ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مذاہب کی بھرمار ہے صحیح قومیت کی بنا سیکولرزم کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اگر تنگ نظری سے کام لیا گیا تو آبادی کے ایک حصے کو نظرانداز کرنا پڑے گا۔ اس سے قومیت کے معنی محدود ہو کر رہ جائیں گے۔"

آگے چل کر انھوں نے پھر کہا کہ

"ہمیں نہ صرف اپنے آئین میں درج آدرشوں کو پورا کر کے دکھانا ہے بلکہ انھیں اپنے فکر و دل کا ایک حصہ بنا کر پیش کرنا ہے اور اس طرح قوم کو مربوط کرنا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مذہب نہ رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہب کو عام سیاسی اور سماجی زندگی سے الگ رکھا جائے۔ ہندوستان میں اور کوئی راستہ اختیار کرنے سے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔"

سیکولرزم کا مندرجہ بالا نظریہ ہندوستانی قومیت کے ابھرتے ہوئے نظریے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ

♦ پروفیسر، انسٹی ٹیوٹ آف اکونومک گروتھ، نئی دہلی۔

اگر سیکولرزم قومی یک جہتی کا ذریعہ بنتا ہے تو اسے ایک ایسا بے جان نظریہ تصور نہیں کرنا ہوگا جو مذہبی رواداری کی دہائی دیتا ہو۔ اسے ایک جاندار نظریہ بن کر ابھرنا ہوگا جو عدم مساوات کو ختم کرکے رکھ دے۔

استصوابِ آئین کا ایک حصہ بنایا گیا۔ ہندوستانی یک قومی مملکت کا آئینی فرض ہو گیا کہ سیکولرزم کا جھنڈا بلند رکھا جائے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ سیکولرزم مغرب کی طرح مذہب کے ساتھ تنازعہ کی پیداوار نہیں ہے۔

یہاں نہرو کے الفاظ کو پھر دہرانا پڑتا ہے:

"ہم اپنی مملکت کو سیکولر کہتے ہیں۔ یہ کوئی بہت خوشگوار لفظ نہیں ہے لیکن چونکہ اس سے زیادہ بہتر لفظ نہیں مل رہا ہے اس لیے اسے ہی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کے یہ معنی تو ہرگز نہیں ہیں کہ ایسی مملکت جس میں مذہب کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے مذہب اور ضمیر کی آزادی بلکہ ان لوگوں کے لیے بھی آزادی جن کا کوئی مذہب نہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مذہب میں یا ہماری مملکت کے بنیادی نظریوں میں دخل نہ دیں ..... سیکولرزم کے کچھ اور معنی بھی ہیں۔ یہ لفظ سماجی اور سیاسی مساوات کا خیال پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ ذات پات والا سماج سیکولر سماج نہیں ہو سکتا۔ میں کسی شخص کے اعتقاد میں دخل دینا نہیں چاہتا۔ لیکن جب یہ اعتقادات فرسودہ ہو جاتے ہیں اور ذات پات کی تفریق پیدا کر دیتے ہیں تو اس سے مملکت کا سماجی ڈھانچہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کی وجہ سے ہم ملک میں مساوات نہیں لا سکتے۔"

جاندار نظریہ

چنانچہ اگر سیکولرزم کو قومی یک جہتی کا ذریعہ بننا ہے تو اسے ایک ایسا بے جان نظریہ تصور نہیں کرنا ہوگا جو مذہبی رواداری کی دہائی دیتا ہو۔ اسے ایک جاندار نظریہ بن کر ابھرنا ہوگا جو عدم مساوات کو ختم کرکے رکھ دے۔ چنانچہ نہرو نے سماجی تبدیلی اور ترقی کے ذریعے سیکولرزم کو فروغ دینے کی بات سوچی تھی۔

قبل از آزادی کے دور میں سیکولرزم کی جنگ سیاسی سطح پر لڑی گئی اور اس میں ہندوستانی سماج کے تمام طبقوں کو جدوجہد آزادی میں شریک کیا گیا۔ یہ جنگ کلچرل سطح پر بھی لڑی گئی اور اس کے لیے ہر مذہبی برادری کے کلچرل ورثہ کی از سر نو تشریح کرکے یک جہتی پیدا کرنے والے پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا اور مختلف مذاہب

حال ہی میں سیکولرزم کو جو زبردست خطرات پیش آئے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے زیرک اور احساس ہندوستانیوں کو سخت صدمہ پہنچا ہے اور تشویش بھی ہوئی ہے۔ چنانچہ سوال اٹھتا ہے کہ آئین میں درج سیکولرزم اور متحدہ ہندوستان کے نظریے اور پھر اس نظریے کی حقیقتاً بتدریج شکست و ریخت کے درمیان خلیج کیوں بڑھتی جا رہی ہے؟۔

کے درمیان میل جول کو مضبوط بنایا گیا۔ آزادی کے بعد کے دور میں سیکولرزم کی لڑائی کی شکل بدل گئی — اسے اقتصادی، سماجی اور تعلیمی سطح پر لا کھڑا کیا گیا۔ اور سیکولرزم کو بڑھاوا دینے کی ایک لازمی شرط یہ ہو گئی کہ تمام فرقوں اور خصوصاً کمزور طبقوں کے لوگوں کو ترقی کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کو کہا جائے۔

حال ہی میں سیکولرزم کو جو زبردست خطرات پیش آئے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے زیرک اور حساس ہندوستانیوں کو سخت صدمہ پہنچا ہے اور تشویش بھی ہوئی ہے۔ چنانچہ سوال اٹھتا ہے کہ آئین میں درج سیکولرزم اور متحدہ ہندوستان کے نظریے اور پھر اس نظریے کی حقیقتاً بتدریج شکست و ریخت کے درمیان خلیج کیوں بڑھتی جا رہی ہے؟ سیکولرزم کے قلعہ کو گرانے کی کوششوں سے عوام پریشان ہو رہے ہیں۔ یہ بات اور بھی زیادہ پریشان کن ہے کہ اعلیٰ طبقہ کے لوگ ابھی تک نہیں سمجھ پائے ہیں کہ سیکولرزم کو کس قدر زبردست خطرہ درپیش ہے۔ انھیں ابھی تمام حربوں کو اکٹھا کرکے ایسی پالیسیاں وضع کرنی ہیں جن کی بنا پر مملکت اور سماج اقتصادی، معاشرتی، تہذیبی، تعلیمی اور سیاسی محاذوں پر کارروائی کر سکے۔ عوام اور سیکولر عناصر کے درمیان ابھی زیادہ میل جول نہیں ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سیکولر دشمن قوتوں کی جانب سے جو نظریاتی مہم چلائی جا رہی ہے عوام اس سے متاثر ہو سکتے ہیں۔

ان حالات میں ضروری ہو جاتا ہے کہ تاریخی تجربے، موجودہ سماجی کارروائیوں اور ہندوستانی آئین کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں سیکولرزم کے نظریے کا پھر سے بغور معائنہ کیا جائے۔ سیکولرزم پر یورش کا مقابلہ کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ ملک بھر کے لوگ اس سوال کو زیر غور لائیں اور اس پر بحث کریں۔

قومی بحث اور بات چیت اسی صورت میں کارآمد ہو سکتی ہے جبکہ اس میں ہندوستان کے تمام مذاہب کے لوگ بھی حصہ لیں۔ قوم کو سیکولر بنانے کے عمل کا ایک بنیادی پہلو یہ تھا کہ مذہب کے اندر ترقی پسند اور رجعت پسند عناصر کے درمیان مڈبھیڑ رہی ہے۔ مثلاً برہمن ازم اور بدھ ازم، زمانۂ وسطیٰ میں مذہبی کٹرپن اور تحریک بھگتی کی پیدا کردہ سماجی آزادی کی قوتوں کے درمیان جھگڑا رہا ہے۔ اسی طرح حالیہ زمانے میں سوامی وویکا اور مہاتما گاندھی جیسے سنت مہاتما بھی مذہب کے اندر سیکولرزم کی حوصلہ افزائی کرنے والی تحریکیں چلاتے رہے ہیں۔

ملک میں ایک طرف تو سیکولرزم کو بڑھاوا دینے کی کوششیں جاری تھیں اور دوسری طرف انگریز کے پڑھے لکھے لوگ

> مذہب کی جانب سمجھداری کا نظریہ نہ ہونے کے باعث مذہب میں منفی رجحانات کو تقویت ملتی رہی ہے۔ منفی رجحانات سے میرا مطلب ہے ظلمت پسندی، عقیدۂ تقدیر اور مذہبی ٹولیوں کے آپسی بیر۔

مذہب کی مخالفت کر رہے تھے جنھیں خبر نہ تھی کہ مذہب کے اندر بھی سیکولرزم کو فروغ دینے کی کوششیں جاری ہیں۔ آزادی کے بعد کے زمانے میں ہندوستانی سیکولرزم کی یہی کمزوری رہی ہے۔ ہندوستانی سیکولرزم کے ان دونوں دھاروں کے درمیان رابطہ قائم کیے بغیر سیکولرزم کے قلعے پر ہونے والے نظریاتی حملوں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستانی عوام کے نزدیک اب بھی مذہب ایک فلسفۂ زندگی ہے اور تمام مذاہب کے ریفارمروں کی حمایت کے بغیر سیکولرزم کا پیغام عوام تک پہنچانا ممکن نہیں ہوگا۔ ہندوستانی سیکولرزم کی ناکامیابی کا لازمہ یہ ہے کہ آجکل کے پڑھے لکھے لوگوں کو ہندوستان کی کلچرل یعنی مذہبی روایتوں کا کوئی علم نہیں۔ اس بات کو نظرانداز کر دینا کہ ہندوستانی کلچرل روایتوں اور ہندوستانی مذہبی روایتوں کے درمیان چولی دامن کا ساتھ ہے، بنیادی تاریخی اور سماجیاتی حقائق کو بھول جانے کے برابر ہے۔

تدبیر

اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ دنیا سے مذہب کا نظریہ ذہنی طور پر فرسودہ اور عملی طور پر بے معنی اور زوال پذیر ہو چکا ہے۔ اس بات کے امکانات کی کھوج لگائی جانی چاہیئے کہ مذہب کے اندر رہتے ہوئے پھر سے تشریح کا مادہ پیدا کیا جائے اور تعمیری تجدید کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ چونکہ پڑھا لکھا طبقہ مذہب کو دقیانوسی چیز سمجھنے لگا ہے، اس لئے یہ فرض نہیں کر لینا چاہیئے کہ مذہب عوام کے لئے بھی فرسودہ چیز ہو گئی ہے۔ غلط مذہبیت اور توہم پرستی کے خلاف جنگ اور مفاد پرستوں اور ظلمت پسندوں کے درمیان گٹھ جوڑ کے خلاف جنگ ایک چیز ہے اور مذہبی روایت کے خلاف جنگ دوسری چیز۔ مذہب بڑی گہری چیز ہے۔ کٹر پنتھی اور متعصب لوگ اس کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ مذہب کی جانب سمجھداری کا نظریہ نہ ہونے کے باعث مذہب میں منفی رجحانات کو تقویت ملتی رہی ہے — منفی رجحانات سے میرا مطلب ہے ظلمت پسندی، عقیدۂ تقدیر اور مذہبی ٹولیوں کے آپسی بیر، مذہبی وفاداریوں اور جذبات کا

> اس کا یہ مطلب نہیں کہ مذہب کی موجودہ شکل کے خطرات کی طرف دھیان نہ دیا جائے۔ مذہبی اصلاح کے مثبت پہلوؤں پر زور دینے کا مطلب یہ ہے کہ مذہبی فکر و عمل کے ان پہلوؤں کے خلاف جنگ جاری رکھی جائے جو سماجی اصلاحات اور ترقیاتی پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔

سیاسی اور اقتصادی استحصال اور یہ کہ مذہبی اداروں نے بڑی بڑی جائیدادیں بنا لیں اور انھیں غلط کاموں کے لیے استعمال کیا۔ مذہب کے مسئلے کی جانب دھیان نہ دینے کے باعث مذہب کے اندر ایسے مثبت نظریے اور تعمیری قوتیں کمزور ہوتی چلی گئیں جو اعلیٰ اقدار اور اخلاق پر، رحمدلی اور انسانیت پر، تعاون اور دوسروں کی خدمت پر زور دیتی تھیں۔ مذہبی روایت کے اندر بے انتہا آدرش پسندی اور سماجی قوت کا ذخیرہ موجود ہے جس کا مقصد سب کی بھلائی ہے اور اگر اس ذخیرے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے تو قومی یکجہتی اور اونچ نیچ کو ختم کرنے کا جذبہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اگر سیکولرزم کو ہمارے مذہبی کلچرل ورثے کی خوبیوں کا علم نہیں ہے اور وہ بنیادی قدروں کے حصول کے لیے ان خوبیوں سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا تو ایسے سیکولرزم کے نظریے پر پھر سے سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا ضروری ہوگا۔

مذہب کا استحصال

اس کا یہ مطلب نہیں کہ مذہب کی موجودہ شکل کے خطرات کی طرف دھیان نہ دیا جائے۔ مذہبی اصلاح کے مثبت پہلوؤں پر زور دینے کا مطلب یہ ہے کہ مذہبی فکر و عمل کے ان پہلوؤں کے خلاف جنگ جاری رکھی جائے جو سماجی اصلاحات اور ترقیاتی پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ طاقتور مفاد پرست طبقے کو متحد ہونے سے روکنے کے لیے اور معاشرے میں اصلاحات نہ لائے جانے کے لیے مذہب کو استعمال کیا جاتا رہا ہے اور کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ عوامی ترقی کے پروگراموں اور فوری سماجی اصلاحات کو عملی جامہ پہنایا جائے تاکہ متعصب لوگ اور مفاد پرست طبقے غریبوں میں اثر و رسوخ پیدا نہ کر سکیں۔ سیکولرزم کے کاز کو سب سے زیادہ نقصان اس بات سے پہنچا ہے کہ ترقی اور سماجی اصلاح کے کاموں

> ایک طرف پسماندگی اور دوسری طرف عدم مساوات اور استحصال کو ختم کرنے کی کوشش جتنی زیادہ موثر ہوگی ہمیں سیکولر دشمن قوتوں کی جانب سے درپیش چیلنج کا مقابلہ کرنے میں اتنی ہی زیادہ کامیابی حاصل ہوگی۔ چنانچہ سیکولرزم ترقی اور سماجی انصاف ناقابل تقسیم ہیں۔

قوم کو مختلف مراحل پر جو المیے پیش آتے رہے ہیں ان میں سے ہر المیے کی پشت پر اصولوں کی قربانی اور سمجھوتوں کی تاریخ کے اوراق کھلے نظر آئیں گے۔ اس تجربے کے پیش نظر اس بات پر زور دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سیکولرزم کی قوت بالآخر ان لیڈروں کی خوبیوں پر منحصر ہوتی ہے جنہیں اپنی پالیسیوں اور اقدامات کے ذریعے نازک موقعوں پر سیکولرزم کی اسپرٹ کا تحفظ کرنا ہوتا ہے۔

میں عوام کو شامل نہیں کیا گیا اور خواندگی، تعلیم اور روشن خیالی کا پیغام گھر گھر نہیں پہنچایا گیا۔

ہماری پچھلی اور موجودہ تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی جدید قوتوں نے مذہبی نظریوں، اداروں اور احکام پر براہ راست حملہ کرنے کی کوشش کی ہے، سیکولرزم کے کاز کو نقصان پہنچتا رہا ہے۔ اس کے برعکس ترقیاتی پروگراموں کو تیز تر کر کے مذہبی ظلمت پسندی سے بالواسطہ ٹکر لینے کی پالیسی فائدہ مند ثابت ہوتی رہی ہے کیونکہ اس طرح مذہبی قوتوں کی سماجی اور اقتصادی بنیاد پر ضرب پڑتی رہی ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ مذہبی قوتوں کو پھلنے پھولنے کی طاقت اسی بات سے ملتی ہے کہ لوگ پسماندہ ہیں، ان میں اونچ نیچ پائی جاتی ہے اور غریبوں کا استحصال کیا جاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں مذہبی ظلمت پسندی اور تعصب کو ایسے کاموں سے بڑھاوا ملتا ہے جو مساوات کی بجائے عدم مساوات پیدا کرتے ہیں اور عوام کو انصاف دلانے کی بجائے ان کا استحصال کرتے ہیں۔ ایک طرف پسماندگی اور دوسری طرف عدم مساوات اور استحصال کو ختم کرنے کی کوشش جتنی زیادہ مؤثر ہوگی ہمیں سیکولر دشمن قوتوں کی جانب سے درپیش چیلنج کا مقابلہ کرنے میں اتنی ہی زیادہ کامیابی حاصل ہوگی۔ چنانچہ سیکولرزم، ترقی اور سماجی انصاف ناقابل تقسیم ہیں۔

سیکولرزم کے اصول کو سب سے زیادہ رکاوٹوں کا سامنا سیاست کے میدان میں کرنا پڑ رہا ہے۔ جمہوریت میں قدرت اور سیاسی حمایت حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں۔ عوام کی ترقی پسندانہ امنگوں اور روشن خیالی اور ذاتی مفاد کے نام پر اپیل کی جائے یا پھر ان کے رجعت پسندانہ رسم و رواج اور سماجی طور طریقے کو ابھارا جائے۔ اسی طرح ریاستی اقتدار کے اداروں کے ارباب اختیار یا تو مذہبی رو رعایت سے دور رہیں اور مذہب کے دباؤ میں نہ آئیں اور یا وقتی اور سستی مقبولیت حاصل کرنے کی خاطر ریاستی اداروں کو مفاد پرستی کی منہ بھرائی کا آلۂ کار بنا دیں اور اس طرح قوم اور سماج کے طویل المدت مفادات کو قربان کرنے کے قصور وار بنیں۔ قوم کو مختلف مراحل پر جو المیے پیش آتے رہے ہیں ان میں سے ہر المیہ کی پشت پر اصولوں کی قربانی اور سمجھوتوں کی تاریخ کے اوراق کھلے نظر آئیں گے۔ اس تجربے کے پیش نظر اس بات پر زور دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سیکولرزم کی قوت بالآخر ان لیڈروں کی خوبیوں پر منحصر ہوتی ہے جنہیں اپنی پالیسیوں اور اقدامات کے ذریعے نازک موقعوں پر سیکولرزم کی اسپرٹ کا تحفظ کرنا ہوتا ہے۔ سیاسی مفکر جمہوریت میں لیڈرشپ کی اہمیت اور لیڈرشپ کی کوالٹی پر بہت زور دیتے آئے ہیں۔ ●

بقیہ: وقت آگیا ہے کہ ہم مل بیٹھیں، سوچیں اور عمل کریں

اشاعت کرنی چاہئے اور بنی نوع انسان کے لیے زندہ رہنے کا کوئی دوسرا بہتر طریقہ نہیں ہے لیکن آنکھیں موند کر ان تحریکوں کو نظر انداز کر دینا جنہوں نے انقلاب پیدا کر دیئے، مناسب نہیں ہوگا۔ سوال محض یہ ہے کہ ان کا ذکر ہو تو کیسے۔ اگر آپ ان کا ذکر اس طرح کریں کہ انسانیت کے فروغ کا یہ تہذیبی ورثہ ہے، تو پھر چاہے آپ کسی بھی مذہب، کسی بھی کتاب، اور ان میں جو اچھی باتیں کہی گئی ہیں۔ میں ان کو سر آنکھوں پر بٹھاؤں گا۔ اور بلا تردد ان کو قبول کر لوں گا۔

یہ سب ایسا ہے جیسے باخ کا سنگیت یا صدیوں پہلے کسی نے کچھ ایسی بات کہی جو مجھے پسند آئی یا میری پسند یا ناپسند بے معنی سی بات ہے۔

یہ بات صدیوں پہلے کہی گئی تھی اور انسانیت اس دور سے گزری تھی۔ لہٰذا میرا اسے جاننا اس لیے ضروری ہے۔ آثار قدیمہ کی طرح ان میں بھی بہت سے خزانے ملتے ہیں۔ زمانۂ قدیم کی نشر و اشاعت لہٰذا ایک ضروری امر ہے۔ یہ مذہب ہو، یا کوئی اور تصور۔ یہ اس لیے برا نہیں کہ یہ ماضی میں ظہور پذیر ہوا۔ لیکن آج اس امر پر زور دینا کہ جو راستہ میں لے رہا ہوں وہی درست ہے۔ اور کبھی یہ کہنا کہ یہ درست ہے۔ پھر یہ کہنا کہ اب یہ درست ہے۔ اب میں ایک فرقہ سے بات کر رہا ہوں اس لیے دوسرے اپنے ریڈیو یا ٹیلی ویژن بند کر دیں اور پھر دوسروں سے کہنا کہ اب آپ بند کر دیں تاکہ میں دوسروں سے مخاطب ہو لوں۔ یہ سب کچھ درحقیقت رکاوٹوں کا طریقہ ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ جب آپ ایک طبقہ سے مخاطب ہوں گے تو دوسرا طبقہ ریڈیو یا ٹیلی ویژن بند تو کر ہی دیتا ہے۔ وہی لوگ سنتے ہیں جن کا آپ ذکر کرتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ایک مخلوط موضوع کی نشر و اشاعت کرنا ہوگی۔ ایک خاص قسم کے سچ کی نہیں بلکہ سب کے سچ کی۔

ہمیں اس عادت کو بھی ترک کرنا ہوگا کہ جب ہم کسی اچھی قدروں کا یا طرز زندگی کا ذکر کریں تو کسی مذہبی کتاب کے اقوال سے اس کی وضاحت کرنا شروع کر دیں۔ کیا ہم سچ کو واضح سچ کہہ کر بیان نہیں کر سکتے۔ بنی نوع انسان سے محبت۔ ساتھیوں سے پیار۔ یہ ایسی باتیں ہیں جس کے لیے مجھے کسی صحیفہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اچھا ہوا کہ یہ بات مذاہب نے بھی کہی۔ میں ان کی قدر کرتا ہوں کہ انہوں نے اس حقیقت کو بہت پہلے معلوم کر لیا۔ لیکن اس دور میں سوائے ایک دوسرے سے محبت کرنے کے اور کوئی طریقۂ حیات ہی نہیں ہے۔ یہ ضروری شرط ہے اور مجھے اس کے لیے کسی اتھارٹی کی ضرورت نہیں۔ قصہ مختصر ایک ایسے سماج کی تشکیل جس کی بنیادیں انسان دوستی اور معقول پسندی پر رکھی جائیں۔ میرے خیال میں ایک بہت بڑی للکار (چنوتی۔ چیلنج) ہے۔ اور سرکاری ذرائع نشر و اشاعت اس ضمن میں بہت اہم پارٹ ادا کر سکتے ہیں۔ ●

جذبۂ انسانیت کا فروغ

ایس۔ ایم۔ جوشی★

جذبۂ انسانیت ہی کشتی پار لگا سکتا ہے

اس مضمون کے مصنف گاندھیائی سوشلزم میں پختہ یقین رکھتے ہیں، بدقسمتی سے اس وقت صاحب فراش ہیں۔ وہ اس بات کا افسوس کرتے ہیں کہ ہم صحیح معنی میں اپنے افکار و خیالات کے لحاظ سے گاندھیائی طرز فکر اپنانے میں ناکام رہے ہیں۔ ان کے خیال میں آج ہم جن پریشانیوں اور مسائل سے دوچار ہیں اس کا سبب یہی ہے کہ ہم نے باپوجی کی تعلیمات اور راشٹر پتا کا بتایا ہوا راستہ ترک کر دیا ہے اور انھوں نے سچائی، عدم تشدد اور سماجی انصاف کا جو درس دیا تھا، اسے ہم بھلا بیٹھے ہیں۔ اگر ہم فی الواقعی قومی اتحاد لانا چاہتے ہیں تو ہمیں انسان دوستی کے راستے پر چلنا ہوگا، اور یہی راستہ ہماری زندگی کی پناہ گاہ ثابت ہو سکتا ہے۔

ہمارا ملک ایک گمبھیر خطرے اور بحران سے دوچار ہے جس سے قومی اتحاد اور علاقائی سالمیت خطرے میں پڑ گئی ہے۔ دہشت پسندی کے بڑھتے ہوئے رجحانات اور ذات پات نیز فرقہ، برادری کے نام پر تشدد کے واقعات میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ بدعنوانیاں ہماری سماجی زندگی کے تانے بانے کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں اور موجودہ حالات میں انسانی اقدار کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔

ہر صحیح الدماغ شخص کو جو خود کو ہندوستانی کہتا ہے، اس نازک موقع پر غور و فکر کو دعوت دینی ہے اور یہ سمجھنا ہے کہ وہ خواہ وہ مرد ہو یا عورت، کیا راستہ اپنائے۔ اور کیسا طرز زندگی اپنائے۔ اسے اپنے فرائض کو سمجھنا ہے۔ محض دوسروں پر الزام تراشی سے کام نہیں چلے گا۔ بلکہ گریبان میں منھ ڈال کر جھانکنا ہوگا۔ ایسا کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہم نے راشٹر پتا کی تعلیمات کو بھلا دیا ہے اور انھوں نے سچائی، عدم تشدد اور سماجی انصاف کا جو راستہ بتایا تھا، اسے ہم نے ترک کر دیا ہے۔ آج ہر شخص کھلم کھلا اپنے مفادات کی فکر میں ہے اور ایسا کرنے میں سب سے زیادہ سچائی کو قربان کرنا پڑا ہے۔ غیر سچائی والا رویہ یعنی کہ منافقت بدعنوانی کی شروعات ہے اور اس سے بالآخر سماج پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔

جوڑنے والی قوتیں

انسان کا معاشرتی مزاج ہی سماج کو ایک دھاگے سے باندھے رکھتا ہے۔ انسان کے دل میں دوسروں سے پیار و محبت اور دوسروں پر شفقت رکھانے کا جو مادہ ودیعت کیا گیا ہے وہ ہر سماج میں انسانوں کو قریب لانے اور ایک دوسرے سے باندھے رکھنے کا اہم ذریعہ ہے۔ دوسروں سے نفرت ثانوی درجہ رکھتی ہے۔ گاندھی جی زندگی کی اسی حقیقت کو سامنے رکھتے اور ہم پر اس کو سمجھنے کے لیے زور دیتے۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کو سچائی اور عدم تشدد کے راستے پر چلنے کے لیے زور دیتے رہے۔

قومی اتحاد کی راہ میں یہ آج بھی بہت ضروری ہے۔ اگر ہم آج بھی گاندھی جی کے ان اصولوں کو سمجھ لیں اور انھیں اپنا لیں تو قومی اتحاد یقینی ہے اور علاقائی سالمیت کے خطرے سے موثر ڈھنگ سے نپٹا جا سکتا ہے۔ مسلح افواج سے علاقائی سالمیت کے تحفظ کا کام لیا جا سکتا ہے لیکن قومی اتحاد کی ضمانت دلوں اور قلوب و اذہان کے جوڑنے کے بعد ہی دی جا سکتی ہے۔

ایک طرف دہشت گردی اور دہشت پسندی کے واقعات میں اضافہ ہے اور دوسری طرف ذات پات نیز فرقہ اور برادری کے نام پر تشدد کے واقعات بڑھ رہے ہیں۔ یہ صورت حال قومی اتحاد کے نقطۂ نظر سے بہت خطرناک ہے۔ اس کو طاقت سے دبانا ہی علاج نہیں ہے۔ اس سے صورت حال بحال کی جا سکتی ہے لیکن یہ علاج مختصر سے وقت کے لیے کارآمد ہو

★ مشہور سوشلسٹ لیڈر۔

سکتا ہے۔ اس کا مستقل علاج یہی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں دوسرے انسانوں سے محبت اور پریم کی شمع جلائی جائے۔ حصولِ آزادی کے بعد انسان دوستی کا یہ جذبہ سرد پڑ گیا۔

محض دوسروں پر الزام تراشی سے کام نہیں چلے گا۔ بلکہ گریبان میں منہ ڈال کر جھانکنا ہوگا۔ ایسا کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہم نے راشٹر پتا کی تعلیمات کو بھلا دیا ہے اور انھوں نے سچائی، عدم تشدد اور سماجی انصاف کا جو راستہ بتایا تھا اسے ہم نے ترک کر دیا ہے۔ آج ہر شخص کھلم کھلا اپنے مفادات کی فکر میں ہے اور ایسا کرنے میں سب سے زیادہ سچائی کو قربان کرنا پڑا ہے۔

اس بارے میں دو رائے نہیں کہ موجودہ حالات میں ملکی اتحاد اور عوام کا مل جل کر پریم و محبت اور اتحاد سے رہنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اس کے سوا دوسرا راستہ بھی نہیں۔ اگر ہم سب مل کر ایک کنبہ کے ارکان کی طرح سے رہیں گے تو اس سے ملک کی خوشحالی اور ترقی عمل میں آسکے گی۔ فرقہ وارانہ جھگڑوں سے تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا۔ قوم پارہ پارہ ہو جائے گی۔ مہاتما گاندھی نظریۂ انسانیت میں یقین رکھتے تھے۔ آج اُن کی تعلیمات کی ہمیشہ سے زیادہ ضرورت ہے۔

تقسیم وطن کے باوجود ہندوستان آج بھی ایک ایسا ملک ہے جہاں مختلف مذاہب کے لوگ بستے ہیں، مختلف زبانوں کے بولنے والے یہاں آباد ہیں، اور مختلف النسل لوگ یہاں قیام پذیر ہیں۔ سیاسی آزادی کے حاصل کرنے کے بعد ہمارا آئین جمہوری اور سیکولر بنیادوں پر تشکیل دیا گیا۔ شروع میں سیکولرازم کا لفظ یا یہ اصطلاح استعمال نہیں کی گئی لیکن بنیادی حقوق اور ہدایتی اصول میں اس کی واضح جھلک ملتی تھی۔ بعد میں ۱۹۷۶ء میں ایک آئینی ترمیم کے ذریعے آئین کی تمہید میں سیکولرازم، جمہوریت اور سوشلزم کی اصطلاحات شامل کر دی گئیں۔

بلاشبہ ہمارے ملک میں پنجسالہ منصوبے زیرعمل آچکے ہیں اور ان سے نئے سماجی اور اقتصادی نظام کی بنیاد رکھی جا چکی ہے لیکن فرقہ واریت اور ذات پات کے نام پر بڑھتے ہوئے تشدد کے رجحانات نے ترقی کے راستے مسدود کر دینے کی کوشش کی اور ترقی کے عمل کو کم و بیش ناممکن بنا دینے کی کوشش کی۔ ملک میں ایک طبقہ سماجی تبدیلی لانے کا مخالف ہے اور اس کی مخالفت میں وہ تشدد آمیز حرکتوں کو بھی جائز

اس کا مستقل علاج یہی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں دوسرے انسانوں سے محبت اور پریم کی شمع جلائی جائے۔ حصولِ آزادی کے بعد انسان دوستی کا یہ جذبہ سرد پڑ گیا۔

سمجھتا ہے، ایسی صورت میں ان مخصوص مفادات کی موجودگی میں ذات پات پر مبنی طبقات کا وجود میں آنا اور آپس میں تنازعہ کا ہونا لازمی امر ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچلے ہوئے اور استحصال پسندی کے شکار لوگ بغیر کسی طویل جدوجہد کے انصاف نہیں پا سکیں گے۔ ان پسماندہ لوگوں کو انصاف حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرنی پڑے گی۔ البتہ یہ جدوجہد پُرامن اور جمہوری طریقوں سے کی جانی ہے۔ وہ تشدد آمیز طریقوں سے کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اگر وہ تشدد کریں گے تو مخصوص مفادات کو بہانہ مل جائے گا اور وہ تشدد کے جواب میں تشدد سے اُن کو کچل ڈالیں گے۔ غیر سرکاری اور سرکاری ذرائع چونکہ دونوں اُن کے ہاتھ میں ہیں، لہٰذا وہ ان سے کام لیں گے اور ان کو کچل ڈالیں گے۔ مہاتما گاندھی نے ہمیں ستیہ گرہ کی شکل میں جو ہتھیار دیا ہے، وہ بہترین ذریعہ ہے اور کچلے، پسماندہ اور استحصال کی زد میں آئے ہوئے عوام کا بیش قیمت ہتھیار اور ورثہ ہے۔

چونکہ ہماری بقا قومی اتحاد اور علاقائی سالمیت میں مضمر ہے، لہٰذا اس بارے میں اتفاق رائے ضروری ہے کہ انصاف کو حاصل کرنے کے لیے کون سا ہتھیار استعمال کیا جائے۔ یہ بات قوم کے مفاد میں ہوگی اور دونوں فریقوں کے لیے نفع بخش ہوں گی کہ وہ یہ عہد کریں کہ وہ پُرامن اور جمہوری طریقے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں اپنائیں گے۔

کوشش

حصولِ آزادی کی جدوجہد کے دوران ہمارے قومی رہنماؤں نے اپنے پیروکاروں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ہندوستانی عوام کو بلا لحاظ مذہب، ذات پات اور زبان ایک جان اور دو قالب ہو کر جدوجہد کرنا ہے۔ اس کے ذریعے سے ہی آزادی اور ترقی کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ لوک مانیہ تلک نے لکھنؤ معاہدے پر دستخط کرنے سے اگر انکار کر دیا تھا، تو وہ بے سوچے سمجھے نہیں تھا۔ وہ دُوراندیش تھے، انھوں نے بھانپ لیا تھا کہ ملک کے دو بڑے فرقوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کو حصولِ آزادی کے لیے اور غیر ملکی سامراجیت کا جوا اُتار پھینکنے کے لیے کندھے

سے کندھا ملا کر چلنا ہے اور ایک ساتھ مل کر کام کرنا ہے۔

مہاتما گاندھی نے اپنی کتاب "ہند سوراج" میں واضح الفاظ میں بتایا کہ ہندوستانی قومیت، مذہب، زبان یا نسل پر مبنی نہیں ہے۔ لکھو کھا بھارتی عوام مختلف عقائد کے ماننے والے ہیں۔ وہ مختلف زبانیں بولتے ہیں لیکن اس تنوع کے باوجود وہ صدیوں سے ایک ساتھ رہتے چلے آرہے ہیں۔ اور انھیں مستقبل میں بھی ایسا ہی کرنا ہے۔ وہ محض ایک ساتھ ہی نہیں رہ رہے ہیں بلکہ اس ملی جلی زندگی نے ایک ملے جلے کلچر کو جنم دیا ہے، جس پر انھیں بجا طور پر فخر ہے۔ انھوں نے کثرت میں وحدت کا جلوہ پیش کیا ہے۔

۱۹۲۰ میں لوک مانیہ تلک وفات پا گئے۔ ان کی وفات کے بعد گاندھی جی نے انڈین نیشنل کانگریس کے نظم و نسق کا بار سنبھالا۔ یہ جماعت قومی مقاصد کے لیے جائز اور پرامن طریقوں کو اپنانے میں ہی شروع سے یقین رکھتی ہے۔ انھوں نے ہندوستانی عوام کو ستیہ گرہ کے مشہور طریق کار سے واقف کرایا اور قومی تعمیری سرگرمیوں میں اس کی افادیت سے روشناس کرایا۔ اس میں منجملہ دیگر اصولوں کے ہندو، مسلم اتحاد، چھوت چھات کا خاتمہ، ہندی کا قومی زبان کی حیثیت سے فروغ اور سوراج کی نشانی کے طور پر کھادی کا استعمال خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ انھوں نے انت اودے یعنی لائن میں کھڑے ہوئے آخری آدمی کو ترجیح دیے جانے کی ضرورت پر زور دیا۔ جب برطانوی سرکار نے شیڈولڈ کاسٹ لوگوں کے لیے الگ سے حق رائے دہندگی اور اس طرح پوری قوم سے اُن کو الگ کرنے کی کوشش کی تو مہاتما گاندھی نے اپنا مشہور مرن برت بطور احتجاج رکھا۔ لیکن مہاتما جی کو مرنے نہیں دیا گیا۔ ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر اعلیٰ ظرف کے انسان اور ایک عظیم ہستی تھے۔ انھوں نے گاندھی جی سے ایک معاہدہ کیا جس کی رُو سے مشترکہ رائے دہندگی کا

اگر ہم قومی اتحاد کے موضوع پر سنجیدگی سے غور کرنے کو تیار رہیں تو ہمیں اس بیش قیمت ورثے کو لازماً اپنانا ہوگا۔

اصول مان لیا گیا۔ البتہ نشستوں کی تخصیص کا اصول اپنا لیا گیا۔ اس طرح مہاتما گاندھی کی بیش قیمت زندگی کو ملک کی خدمت کے لیے بچایا جا سکا۔ یہ اقدام پوری نوعِ انسانی کے حق میں تھا۔

۱۹۳۴ میں مہاتما گاندھی کانگریس کے آئین میں ترمیم کرنا چاہتے تھے اور وہ سچے اور عدم تشدد پر مبنی طریقوں کی جگہ جائز اور پُرامن طریقے کے الفاظ لانا چاہتے تھے —— وہ ذرائع اور مقاصد کے اتحاد پر زور دیتے رہے۔ ان کا زور اس بات پر تھا کہ حقیقی معنی میں قومی اتحاد سچے اور عدم تشدد پر مبنی طریقوں کے سوا دوسرے طریقوں سے حاصل بھی نہیں ہوسکتا۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ نوجوانوں کے ایک پُرجوش طبقے نے اس تبدیلی پر اتفاق نہیں کیا تو انھوں نے بغیر کسی انتشار کے اس خیال کو ترک کر دیا۔ اس کے بعد

قومیت کی بنیاد نوعِ انسانی سے محبت، انسانوں سے پیار اور انسان دوستی پر ہونی چاہیے۔ یہ نظریہ سبھی کو اپنانا ہے، خواہ کوئی خدا میں یقین رکھتا ہے یا نہیں۔ یہ ہماری زندگی کی ڈھال ہے۔ نئے مبنی بر انصاف سماج اور سماجی اقتصادی نظام کے لیے اس جذبے کی کلیدی اہمیت ہے۔

اُنھوں نے کانگریس کے رکن کی حیثیت سے اس میں اپنا نام نہیں لکھایا۔ حالاں کہ وہ کانگریس کی وقت ضرورت رہنمائی کرتے رہے۔ وہ خود کو ان کا دوست اور رہنما سمجھتے تھے لیکن ان کو فلسفہ بتانے والا نہیں۔ اس طبقے نے مہاتما گاندھی کے عدم تشدد کے اصول کو بطور پالیسی تسلیم کیا نہ کہ ایک نظریہ کے طور پر۔

جدوجہد آزادی کے انتہائی نازک مرحلے پر جب کہ رہنماؤں نے تقسیم وطن پر اتفاق کر لیا، اُنھوں نے گاندھی جی سے رہنمائی حاصل نہیں کی۔

یہ سچ ہے کہ کانگریس کے اندر مہاتما گاندھی کے پیروکار کافی تعداد میں تھے خاص کر وہ جو کہ تعمیراتی کاموں سے خود کو وابستہ کیے ہوئے تھے۔ یہ تعمیری پروگرام اس وقت تک تعلیم اور سماجی تبدیلی لانے کا موثر ذریعہ بنا جب تک کہ ان کی رہنمائی حاصل رہی۔ جب کانگریس برسرِ اقتدار آئی، ان میں سے زیادہ تر تعمیراتی سرگرمیاں حکمراں پارٹی کے مشوروں اور رہنمائی کے تابع ہوگئیں اور اس طرح اصل محرکات وقت کے ساتھ ساتھ سرد پڑ گئے۔ نوجوان نسل کو پہلے کی طرح نہیں اُبھارا جا سکا۔ اچاریہ ونوبا بھاوے نے سروودیہ تحریک کے ذریعے نوجوانوں کو اُبھارنے کی کوشش کی لیکن یہ محض ایک عارضی مرحلہ ثابت ہوا۔

انتقالِ اختیارات کے وقت گاندھی جی کا نظریۂ انسان دوستی اور بھائی چارہ تمام فرقوں، برادریوں اور طبقات میں نفوذ نہیں کر پایا ورنہ ملک کی تقسیم عمل میں نہ آئی ہوتی۔ تقسیم وطن بہر صورت ہندو مسلم اتحاد کے مسئلے کا حل نہیں ہو سکتی تھی۔ ہندوستان میں آج بھی کئی کروڑ مسلمان آباد ہیں اور ایسی صورت میں یہ مسئلہ اور بھی دشوار ہوگیا ہے۔ ہندو یہ نہیں بھلا سکے کہ مسلمانوں نے تقسیم وطن کی حمایت کی تھی۔ لیکن مستقبل کے خیال سے اس پیچیدہ مسئلے کو حل کرنا ہے کیونکہ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ مستقبل کی نسلوں کا مفاد اسی میں ہے۔ مہاتما جی کی تعلیمات کو کسی بھی دور میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آئین کی تشکیل کے وقت اس کے خط و خال

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

پی ایم۔ بھارگو*

آیئے ہم نیا ڈھانچہ

تفرقے کی جڑ مذہب ہے

آجکل ہمارے ملک کو جو مسائل درپیش ہیں ان میں سرِفہرست ترتیب وار یہ تین مسئلے آتے ہیں۔ تعلیم، پانی اور توانائی۔ اگر ہم انھیں حل کرلیں تو باقی مسئلے خود بخود حل ہو جائیں گے۔ بہرصورت ان کے ایسے حل تو نکل ہی آئیں گے جو قابلِ عمل ہوں گے لیکن اگر ہم اوّل الذکر تین مسئلوں کو حل نہیں کر پائے تو اور کوئی مسئلہ بھی مستقل طور پر حل نہیں ہو پائیگا۔

ہم بہ حیثیت ایک قوم کے باتیں بہت کرتے ہیں لیکن ان مسئلوں کے حل کی طرف سچے دل سے توجہ نہیں دیتے، ہمارے اربابِ اختیار ماسوائے چند ایک افراد کے جن کی کوئی سُنتا نہیں ہے۔ مسائل کو حل کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے، کیونکہ ان کی زندگی میں ذاتی مفاد اور نامعقولیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

باتیں ہم مسلسل عقدہ کشائی کی کرتے ہیں، لیکن مطلب ہمارا سطحی حل سے ہوتا ہے جس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ کہیں کسی کو تھوڑی بہت راحت مل جاتی ہے تو ہم اس کا ڈھنڈورا خوب پیٹتے ہیں گویا کہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو گیا۔ ہم مسئلے کو کرید کر نہیں دیکھتے اور اگر کہیں غلطی سے کُرید بھی لیں تو ہم آنکھیں دوسری طرف کر لیتے ہیں۔ کریدنے سے پتہ چلتا ہے کہ سطح کے نیچے کتنے اسکینڈل بکھرے پڑے ہیں چاہے وہ انتولے سے تعلق رکھتے ہوں یا جاسوسی کے حالیہ انکشافات سے۔ مسئلے کی جڑ تک نہ پہنچنا ہمارا مسلک ہے کیا آپ کو کسی اور ملک میں دیکھنے کو مل سکتا ہے کہ ایک نامور سائنسداں افسر کو ہٹا کر جس نے مرکزی حکومت کے محکمۂ ماحولیات کے سیکرٹری کے طور پر عمدہ کام کر کے دکھایا ہو، ایک غیر سائنسداں پیشہ ور افسر کو تعینات کر دیا گیا ہو؟ آپ کو کسی ملک میں آئی اے ایس افسر یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر بنے نظر آئیں گے؟ اگر کہیں یونیورسٹی کے پروفیسروں کی تنخواہیں اور ان کے گریڈ عمدہ ہوتے اور اگر ان کے پاس رعب اور اختیارات ہوتے (جو کہ ہونے چاہئیں)، تو مجھے یقین ہے کہ ہمارے ملک کے سول سرونٹ مطالبہ کرتے کہ انھیں یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کا سربراہ بنایا جائے اور ان کا تبادلہ ماہ بہ ماہ/سال بہ سال ایک شعبے سے دوسرے شعبے میں مثلاً فزکس سے سیاسیات کے شعبے میں ہوتا رہے۔

مندرجہ بالا تینوں مسائل کے حل ہمیں گھور رہے ہیں ہم ان پر قابو پا سکتے ہیں لیکن ہماری سماجی سیاسی اور اقتصادی مجبوریاں ہمیں ان مسئلوں کے پاس نہیں پھٹکنے دیتیں۔

ان حالات میں یکم جنوری ۲۰۰۱ء کو ہمارے صحیح معنوں میں اکیسویں صدی میں داخل ہو جانے کی بات کرنا بے معنی سی چیز ہے۔ بات تو تب ہوتی اگر ہم نے صدقِ دل سے اور مضبوط ارادے کے ساتھ ان مسئلوں کا حل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہوتا۔

ہم اب تک ان خرافات کو کیوں برداشت کرتے آ رہے ہیں؟ شاید اس لیے کہ ہم مرض کی تشخیص نہیں کر پائے یا اس بات کا احساس نہیں کر پائے کہ یہ مرض قوم کو اندر ہی اندر گھُن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔ اگر ہمیں احساس ہو بھی گیا ہے تو ہم نے جان بوجھ کر چُپ سادھے رکھی ہے۔ کیوں کہ اگر ہم کوئی قدم اٹھاتے تو ہم اپنی مراعات سے محروم کر دیئے جاتے ہماری حالیہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب بھی ملک کے مفادات اور ہمارے انفرادی جماعتی مفاد کے درمیان ٹکر ہوئی ہے تو جیت ہمیشہ جماعتی مفاد کی ہوتی ہے۔ آیئے دیکھیں کہ ہم نامعقولیت کو کیوں برداشت کرتے چلے آ رہے ہیں۔

وجوہات

افسوس کہ ہم بیحد پھوٹ کا شکار ہیں۔ اہم مذہب، ذات، فرقے، زبان، سماجی رُتبے، کھانے پینے کی عادتوں (میں ایسی انتخابی کمیٹیوں کا ممبر رہا ہوں جن میں اُمیدوار محض اس لیے تبادلے کی مانگ کرتے رہے ہیں کہ انھیں

* ڈائرکٹر، سینٹر فار سیلولر اور مولی کیولر بائیلوجی، حیدرآباد۔

نئی جگہ کی خوراک راس نہیں آرہی اور اس لیے وہ اپنے وطن واپس جانا چاہتے ہیں)۔ رواج، روایت، تعلیم کی سہولت، مالی درجے وغیرہ وغیرہ کی بنا پر ہم آپس میں بٹے ہوئے ہیں۔ تاریخ

اعتقاد نہ ہو تو وہ مذہب ہی کہاں رہا پھر تو وہ مسلکِ انسانیت ہوگیا جو تمام مذاہب سے بالاتر ہوتا ہے اور مذہبی تشخص کو ختم کردیتا ہے کیوں کہ تمام مذہبوں کی اخلاقی اقدار ایک جیسی ہوتی ہیں۔

قبائلی بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ پھر دیکھا جائے تو برہمنوں کے بھی کئی درجے ہیں۔ مسلمانوں میں شیعہ اور سُنّی اور آغا خاں کے پیروکار اور ایسے فرقے نظر آئیں گے جنھیں کٹر مسلمان مسلمان ہی تسلیم کرنے کو تیار نہیں عیسائیوں

ہم اس لغویت کو کیوں برداشت کرتے آرہے ہیں؟ شاید اس لیے کہ ہم مرض کی تشخیص نہیں کرپائے یا اس بات کا احساس نہیں کرپائے کہ یہ مرض قوم کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔ اگر ہمیں احساس ہو بھی گیا ہے تو ہم نے جان بوجھ کر چُپ سادھے رکھی ہے۔ کیوں کہ اگر ہم کوئی قدم اُٹھاتے تو ہم اپنی مراعات سے محروم کردئے جاتے۔

اس بات کی شاہد ہے کہ کسی ملک کو بھی ایسی صورتِ حال کا سامنا نہیں رہا۔ ہم اس گوناگوں سے بھرپور فائدہ اُٹھا سکتے تھے مگر ہوا یہ کہ ہم دوسروں کو بُرا کہنے لگے۔

مذہب تفرقہ پیدا کرتا ہے

آیئے دو مثالیں سامنے رکھ کر دیکھیں کہ ہم مذہب اور تعلیم کی بنا پر کس قدر بٹے ہوئے ہیں۔ مذہب چیز ہی ایسی ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے سے

آیئے ذرا ملک کے اندر جھانک کر دیکھیں۔ ہم دنیا میں سب سے بڑی ہندو قوم ہیں — انڈونیشیا کے بعد ہم دنیا کی سب سے بڑی مسلمان قوم ہیں۔ سارے آسٹریلیا میں اتنے عیسائی نہیں بستے جتنے کہ ہمارے یہاں ہیں اور ناروے و سویڈن کی اتنی آبادی نہیں جتنی کہ ہمارے یہاں سکھ ہیں۔ ویسے پھر ہمارے ملک میں پارسی بھی ہیں اور بدھ بھی جن کا مذہب یہیں سے

میں کہیں کیتھولک ہیں تو کہیں پروٹسٹنٹ۔ الغرض اور بھی کئی طرح کی تفریق ہے۔

آدمی کا آدمی دشمن

ہر شخص اپنے سے مختلف مذہب رکھنے والے سے اُلجھا ہوا ہے۔ غیر معقول اعتقاد، رجحان اور جذبات کی بنا پر خود مذہب کی پیداوار ہیں ہمارے ملک میں کئی دفعہ جھگڑے اور خون خرابہ

مذہب چیز ہی ایسی ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے سے جُدا کرتی ہے۔ مذہب سے میرا مطلب ہے وہ اقدار، عقیدت اور غیر معقول اعتقادات جنھیں سائنسی ڈھنگ سے درست ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی وہ مذہب جو مذہبی کتابوں اور رسموں میں مذکور ہے۔ اگر مذہب میں عقیدہ اور غیر معقول اعتقاد نہ ہو تو وہ مذہب ہی کہاں رہا پھر تو وہ مسلکِ انسانیت ہوگیا جو تمام مذاہب سے بالاتر ہوتا ہے اور مذہبی تشخص کو ختم کردیتا ہے کیونکہ تمام مذہبوں کی اخلاقی اقدار ایک جیسی ہوتی ہیں۔

جُدا کرتی ہے۔ مذہب سے میرا مطلب ہے وہ اقدار، عقیدت اور غیر معقول اعتقادات جنھیں سائنسی ڈھنگ سے درست ثابت نہیں کیا جاسکتا — یعنی وہ مذہب جو مذہبی کتابوں اور رسموں میں مذکور ہے۔ اگر مذہب میں عقیدہ اور غیر معقول

شروع ہوا تھا۔
پھر ہندوؤں میں بھی مختلف فرقے اور ذاتیں ہیں۔ ذات باہر شادی کرنا منع ہے اور ایک ہی گوتر کے لڑکے لڑکیاں بھی آپس میں شادی نہیں کرسکتے۔ مزید برآں شیڈول کاسٹ اور

ہوچکا ہے۔ برہمن غیر برہمنوں سے اُلجھتے رہے ہیں، ہندو مسلمانوں سے لڑتے آئے ہیں، شیعہ سُنّیوں سے دست و گریباں ہیں اور اب سکھوں نے ساری قوم کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ اور یہ بات کبھی

یکم تا ۱۳ اگست ۱۹۸۵

کو سمجھ نہیں آتی کہ اگر مذہبی غیر معقولیت کے آگے ہتھیار ڈال دیئے جائیں تو اس قسم کے جھگڑے ہونا

ایسی ریاکاری

ہم اپنے مذہبی تشخص پر اس لیے فخر کرتے ہیں کہ ہمارا اعتقاد ہوتا ہے کہ جس مذہب کے

اگر دو چیزیں ایک ہی جگہ پر قبضہ کرنا چاہیں گی تو ان میں جھگڑا ضرور ہوگا۔ چنانچہ مذہب پھوٹ کی جڑ ہے۔ تاریخ اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مختلف مذاہب کے کٹر پیروکاروں کے درمیان بھائی بندی محض عارضی ہوتی ہے۔ ان میں جھگڑے کی جڑ قائم رہتی ہے۔

ناگزیر ہوتے ہیں۔ غیر معقول اعتقادات رکھنے والے مختلف فرقوں کے درمیان مستقل یگانگت ہونا ممکن ہی نہیں۔ اگر ایسے سماج میں جس میں مذہبوں کی بھرمار ہو لوگ کٹر پنتھی نہ رہیں تو اس میں صحیح یگانگت پیدا ہو سکتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں جب تک ہم مذہب کی بنا پر دوسروں سے بڑے بنے رہیں گے، تب تک مذہبی جھگڑے ہوتے رہیں گے اور ہم کچھ نہیں کر پائیں گے۔ ہم ان جھگڑوں کو ایک جگہ فرو کر دیں گے تو وہ دوسری جگہ سر اٹھا لیں گے۔ چنانچہ محض مذہبی رواداری سے بات نہیں بنے گی۔ ہمارے ملک میں تو یہ حکمت عملی ناکام رہی ہے۔ اس سے محض عارضی بھائی چارہ قائم ہو سکتا ہے جو ذرا سی شہ ملنے پر دشمنی کی شکل اختیار کر لے گا۔ وجہ یہ ہے کہ سوائے اخلاقی اقدار کے جو ہر مذہب میں ایک سی ہیں، مختلف مذاہب میں اور کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔ اگر دو چیزیں ایک ہی جگہ پر قبضہ کرنا چاہیں گی تو ان میں جھگڑا ضرور ہوگا۔ چنانچہ مذہب پھوٹ کی جڑ ہے۔ تاریخ اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مختلف مذاہب کے کٹر پیروکاروں کے درمیان بھائی بندی محض عارضی ہوتی ہے۔ ان میں جھگڑے کی جڑ قائم رہتی ہے۔

ہم پیروکار ہیں وہی سب سے بڑا مذہب ہے۔ اگر ہمارا یہ خیال نہ ہو تو ہم کبھی بھی دوسروں کو اپنا مذہب تبدیل کرنے کی دعوت نہ دیں۔ ایک کٹر مذہبی شخص کے دل میں اپنے سے مختلف مذہب رکھنے والے شخص کے لیے کبھی بھی صحیح معنوں میں احترام نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کے احترام کا ذکر کرنا محض دکھاوا ہے۔ میں حیاتیات کا عالم ہوں اور میں مذہب

جیسا کہ میں اوپر کہہ آیا ہوں ہمارے سماج میں پھوٹ ڈالنے والے دوسرے عنصر بھی موجود ہیں۔ مثلاً زبان، وطن، سماجی مرتبہ، تعلیمی رتبہ، خوراک کی عادات وغیرہ مگر کشمکش اور جھگڑے کو پیدا کرنے اور برقرار رکھنے کا جتنا ملکہ مذہب میں ہے اتنا دوسری چیزوں میں نہیں ہے۔ ہم دوسری زبان سے لطف اندوز ہونا اور اسے بولنا جلد ہی سیکھ لیتے ہیں بلکہ بہت سے لوگ سیکھ لیتے ہیں۔ ہم شرت چندر، شیکسپیئر اور پریم چند کی تصانیف کو پڑھ کر مزا لیتے ہیں چاہے ہماری اپنی مادری زبان کچھ بھی ہو۔ لوگوں کا سماجی اور تعلیمی درجہ بدلتا رہتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دنیا بھر میں دوسرے علاقوں کی خوراک کو پسند کیا جانے لگا ہے اور ہندوستان میں بھی ہم طرح طرح کی کھانے پینے کی چیزوں سے لطف اندوز ہونے لگے ہیں۔

اسی طرح ہمارے لیے آجکل ممکن ہو گیا ہے کہ ہم دو یا دو سے زیادہ جگہوں کو اپنا وطن مانیں۔ مذہب کی صورت میں، یا تو آپ اس مذہب کے پیروکار ہیں یا نہیں ہیں لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ

ہم اپنی مذہبی انفرادیت پر اس لیے فخر کرتے ہیں کہ ہمارا اعتقاد ہوتا ہے کہ جس مذہب کے ہم پیروکار ہیں وہی سب سے بڑا مذہب ہے۔ اگر ہمارا یہ خیال نہ ہو تو ہم کبھی بھی دوسروں کو اپنا مذہب تبدیل کرنے کی دعوت نہ دیں۔ ایک کٹر مذہبی شخص کے دل میں اپنے سے مختلف مذہب رکھنے والے شخص کے لیے کبھی بھی صحیح معنوں میں احترام نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کے احترام کا ذکر کرنا محض دکھاوا ہے۔

میں یقین نہیں رکھتا اس لیے میرے دل میں اسی شخص کے لیے کوئی احترام نہیں ہو سکتا جس کا اعتقاد ہو کہ خدائے مطلق نے اسے سوچ سمجھ کر انسان کی شکل میں اس دھرتی پر بھیجا ہے۔

دو مذہبوں کے پیروکار ہوں۔ یا پھر ایک ہی مذہب کے دو فرقوں یا دو ذاتوں کے پیرو بھی نہیں ہو سکتے۔ یہ نہیں کہ آپ تیلگو تو بہت اچھی بول سکتے ہیں ہندی اتنی اچھی نہیں بول سکتے اور تامل و ملیالم سے کچھ

خشبو رکھتے ہیں اور تمام زبانوں کی تصانیف کو پسند کرتے ہیں۔ مجھے ایک ایسے کنبے کا علم ہے جس میں والد کی مادری زبان تو تامل ہے، والدہ کی مرہٹی، لیکن بچے صرف ہندی بول سکتے ہیں، اور یہ سب کچھ قدرتی طور پر ہوتا گیا ہے۔ مذہب میں ایسا نہیں ہوسکتا۔ اعتقاد اپنا رنگ اس قدر گہرا چڑھا دیتا ہے کہ کوئی اور مفید یا خوشگوار رنگ اس شخص پر نہیں چڑھ سکتا۔

مذہب کا ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ ایک مذہب کے رسم و رواج دوسرے مذہب کے رسم و رواج سے نہ صرف یکسر مختلف ہوتے ہیں بلکہ غیر معقول بھی ہوتے ہیں۔ غیر معقول اُصولوں پر چلنے والے لوگوں کے درمیان یگانگت یا دوستی کیسے ہوسکتی ہے؟ چنانچہ ہم پھر اُسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تفرقوں کی جڑ مذہب ہے۔

مذہب کا ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ ایک مذہب کے رسم و رواج دوسرے مذہب کے رسم و رواج سے نہ صرف یکسر مختلف ہوتے ہیں بلکہ غیر معقول بھی ہوتے ہیں۔ غیر معقول اُصولوں پر چلنے والے لوگوں کے درمیان یگانگت یا دوستی کیسے ہوسکتی ہے؟ چنانچہ ہم پھر اُسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تفرقوں کی جڑ مذہب ہے۔

تعلیم بھی کم قصوروار نہیں رہی

آزادی کے بعد سے ہمارے ملک کا ایک سب سے بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ تعلیم جو انسان کو آزاد خیال بنا سکتی ہے وہی تعلیم انسان کے استحصال کا ذریعہ بن گئی ہے۔ ہمارے ملک کی افسوسناک ترین تقسیم مذہب یا ذات پات کی بنا پر نہیں بلکہ تعلیم کی بنا پر ہو رہی ہے۔ ہمارے ہاں آجکل دو طبقے ہیں۔ تعلیم یافتہ طبقہ اور غیر تعلیم یافتہ طبقہ، اور یہ طبقے اپنے آپ کو نسلاً در نسلاً قائم رکھے ہوئے ہیں کیونکہ تعلیم لوگوں کو ورثے میں ملتی رہی ہے۔ ملک کے ڈیڑھ دو کروڑ لوگ تعلیم یافتہ ہیں، جنھیں تمام مراعات حاصل ہیں۔ موٹے طور پر ایسے بیس تیس لاکھ چھوٹے کنبے ہوں گے اور ۵ لاکھ کے قریب بڑے کنبے جب کہ ملک کی آبادی ستر کروڑ ہے۔ پڑھے لکھے طبقے کے لوگوں کا ہر بچہ اسکول جاتا ہے، ہائی اسکول امتحان پاس کرتا ہے، کالج میں داخل ہوتا ہے، یونیورسٹی میں پہنچتا ہے اور پھر ڈگری حاصل کرکے نوکری کرنے لگتا ہے۔ اُن کے لڑکے لڑکیاں اور پوتے پوتیاں بھی یہی کچھ کرتے ہیں۔ یہ عمل کئی نسلوں سے چلا آیا ہے۔ کنبہ تعلیم یافتہ ضرور ہوگا چاہے کوئی بچہ یونیورسٹی میں جانے کا مستحق ہے یا نہیں ہے۔

آزادی کے بعد سے ہمارے ملک کا ایک سب سے بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ تعلیم جو انسان کو آزاد خیال بنا سکتی تھی وہی تعلیم انسان کے استحصال کا ذریعہ بن گئی ہے۔ ہمارے ملک کی افسوسناک ترین تقسیم مذہب یا ذات پات کی بنا پر نہیں بلکہ تعلیم کی بنا پر ہو رہی ہے۔

دوسری طرف باقیماندہ ۶۸ کروڑ لوگ، ۹۰ فیصدی آبادی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کا بچہ اگر پہلی جماعت میں بیٹھ جائے بھی تو بھی اس بات کا امکان ہے کہ وہ زیادہ دیر تک اسکول میں نہیں رہ پائے گا اور تیسری، پانچویں یا آٹھویں جماعت میں اسکول چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اگر وہ کسی نہ کسی طرح اسکول کی پڑھائی مکمل بھی کرلے تو بھی اُسے اچھے نمبر نہیں مل پائیں گے۔ اور وہ کالج میں داخلے کے مقابلے میں پاس نہیں ہو سکے گا۔ کیونکہ وہ جس اسکول میں پڑھتا رہا ہے وہاں وہ سہولتیں موجود نہ تھیں جو امیر اور تعلیم یافتہ طبقے کے بچوں کو ان کے اسکولوں اور گھروں میں حاصل ہوتی ہیں۔ اگر بعض بچہ وہ کالج کی پڑھائی کے بعد ڈگری حاصل بھی کرلے تو بھی اُسے ملازمت حاصل کرنے میں دقت پیش آئے گی۔ کچھ واقعات استثنا کی زد میں ضرور آتے ہیں اور جب یہ رونما ہوتے ہیں تو اخباروں میں ان کا خوب چرچا ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ ایک شیڈول کاسٹ لڑکا انڈین ایڈمنسٹریٹو سروسز کے امتحان میں اوّل آیا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق غریب طبقے کے زیادہ سے زیادہ دس ہزار لوگ ہر سال امیر طبقے کے لوگوں کے زمرے میں شامل ہو پاتے ہیں۔ اس سے دونوں طبقوں میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور دونوں میں امتیاز نسلاً بعد نسلاً چلتا رہتا ہے۔

دونوں طبقوں کے درمیان سماجی میل جول بالکل نہیں ہوتا۔ ان کے اقتصادی مفاد ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اور وہ آپس میں برسرپیکار رہتے ہیں۔ آزادی کے بعد انگریزوں کی جگہ اس تعلیم یافتہ طبقے نے لے لی ہے۔ دلخراش بات یہ ہے کہ ہم اس تعلیمی امتیاز پر جان بوجھ کر عمل کرتے آرہے ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ ہندوستان جیسے وسائل، ذمہ داریاں اور تاریخ رکھنے والا ملک

آزادی کے چالیس سال بعد بھی اپنے تمام لوگوں کے لیے معقول اور مناسب تعلیم کا بندوبست نہیں کر پایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ایسا کرنا چاہتے ہی نہیں تھے۔ معقول تعلیم کا بندوبست کرنا تعلیم یافتہ امیر طبقہ کے مفاد میں نہیں تھا۔ ہم نے اتنا ضرور کیا ہے کہ تمام بالغوں کو ووٹ کا حق دے دیا ہے۔ چنانچہ چند برسوں کے بعد ایک بار ہم غریب اور اَن پڑھ طبقے کی خوشامد ضرور کرتے ہیں۔ باقی تمام عرصہ ہم اس بات کے شاکی رہتے ہیں کہ گھریلو ملازم نہیں ملتے گویا کہ ہمارا پیدائشی حق ہے کہ ایسا طبقہ ضرور برقرار رہے ... ہمیں ووٹ کھسوٹ سکیں۔ پڑھے لکھے طبقے کے لوگ ہر طرح کی بے ایمانی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ رشوت ستانی کرتے ہیں، ٹیکس چوری کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اگر اَن پڑھ طبقہ کے لوگوں سے ایسی کوئی حرکت سرزد ہو جاتی ہے تو ہم آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔

جن عظیم تفرقوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان کے باعث ہم آپس ہی میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں تاکہ اپنا تشخص برقرار رکھ سکیں جو ایسی مراعات پر مبنی ہے جو ہمیں پیدائشی طور سے ملی ہیں اور ہماری خود حاصل کردہ نہیں ہیں۔ ان حالات میں ہمارے پاس وقت ہی کہاں ہے کہ ہم قومی مسائل کی طرف بھی توجہ دے سکیں۔!

دلخراش بات یہ ہے کہ ہم اس تعلیمی امتیاز پر جان بوجھ کر عمل کرتے آ رہے ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ ہندوستان کے سے وسائل، ذمہ داریاں اور تاریخ رکھنے والا ملک آزادی کے چالیس سال بعد بھی اپنے تمام لوگوں کے لیے معقول اور مناسب تعلیم کا بندوبست نہیں کر پایا۔

مسائل کے حل

آیئے ہم مان لیتے ہیں کہ ہمارے پاس کوئی سہل حل نہیں ہیں۔ لیکن کچھ ٹھوس قدم اٹھانا ضروری نظر آتے ہیں۔ آیئے ایک دفعہ انھیں پھر دہرائیں:-

۱۔ ہمیں اسکولوں کی تعلیم کو قومی ملکیت میں لے آنا چاہیے۔

۲۔ ہمیں قومی نصاب، نصابی کتب وغیرہ وضع کرنی چاہئیں۔ نصابی کتابیں معقول اقدار، انسان دوستی اور سائنس پر مبنی ہونی چاہئیں۔ تعلیمی نظام میں ... محض تعظیم کا موضوع نہیں ہونا چاہیے بلکہ سائنٹفک، واقعیت پسندانہ اور تاریخی اعتبار سے پرکھا جانا چاہیے۔

۳۔ ملک میں صرف ایک طرز کے اسکول ہونے چاہئیں، انھیں سرکار چلائے۔ ہر بچے کو اسکول میں داخلے کا حق حاصل ہو اور ہم یہ انتظام کریں کہ پانچ چھ سال سے لے کر سولہ سترہ اٹھارہ سال تک کی عمر کا ہر بچہ اور نوجوان اسکول میں پڑھتا ہو، اور ہر بچے کو ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کا موقع حاصل ہو۔ اس غرض سے ملک میں ۵ لاکھ ہائی اسکولوں کی ضرورت ہو گی۔ ہمارا ملک اس قابل ہے کہ بیس برسوں میں بتدریج اتنے اسکول قائم کر دے۔

۴۔ ٹیچروں کی تنخواہوں پر نظرثانی کی جانی چاہیے۔ گاؤں میں اسکول ٹیچر سے زیادہ تنخواہ کسی اور شخص کو نہیں ملنی چاہیے۔ اس بات کا احساس کتنے لوگوں کو ہے کہ اسکول کا ٹیچر یونیورسٹی کے پروفیسر سے کہیں زیادہ کام کرتا ہے! اور جس سماج یا ملک میں بھی اسکولی تعلیم کا اس قسم کا معقول انتظام موجود ہوتا ہے اعلیٰ تعلیم اپنا انتظام خود بخود کر لیتی ہے۔ اس لیے اسکولی ٹیچروں کا پارٹ کالج یا یونیورسٹی کے پروفیسروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہم ہوتا ہے۔ چنانچہ کوئی وجہ نہیں کہ اسکول ٹیچر یونیورسٹی ٹیچر سے کمتر درجے کا ہو۔

۵۔ ہمیں اپنے اسکولوں میں جدید ٹکنالوجی مثلاً مصنوعی سیاروں کی ٹکنالوجی کو استعمال میں لانا چاہیے۔ ستر اسی لاکھ اچھے ٹیچر مل جانا واضح طور پر مشکل ہو گا لیکن چند سو اچھے ٹیچر ضرور مل سکتے ہیں۔ جو پروگرام ریکارڈ کرا سکتے ہیں تاکہ مصنوعی سیاروں کی مدد سے ملک بھر کے سکولوں میں ٹیلی ویژن پر دکھائے جائیں۔ اس قسم کے ایک عمدہ پروگرام کو اوسط درجے کا ٹیچر بھی دلچسپی (لگن) کر کے پڑھا سکتا ہے۔

(باقی صفحہ ... پر)

جن عظیم تفرقوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان کے باعث ہم آپس ہی میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں تاکہ اپنا تشخص برقرار رکھ سکیں جو ایسی مراعات پر مبنی ہے جو ہمیں پیدائشی ہی سے ملی ہیں اور ہماری خود حاصل کردہ نہیں ہیں۔ ان حالات میں ہمارے پاس وقت ہی کہاں ہے کہ ہم قومی مسائل کی طرف بھی توجہ دے سکیں۔

مالکم ایس ادی سیشیہ*

بچّوں کو معقولیت پسندانہ راہ سے ہٹانے کے ذمّہ دار عناصر

فاضل مصنف مالکم ایس ادی سیشیہ تعلیم کو مذاہب کی تجارت میں ایک سرگرم شریک کار سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زندگی کی لغویات اور خرافات سے نجات پانے کے لیے تعلیم کے نظام کو نئی سمتیں دینا آسان نہیں۔ اس سلسلے کے مختلف طریقوں پر ان کی نظر ہے، مثلاً وہ آئین کے آرٹیکل ۳۰ (الف) اور (ب) کو ترک کر دینے کے حق میں ہیں، جن کی رُو سے مذہبی اقلیتوں کو اپنی پسند کے تعلیمی اداروں کو چلانے کا حق دیا گیا ہے۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ اس طرح کی کوششوں سے ایک حد تک ہی مقصد برآری ہو سکے گی ورنہ تو مکمل کامیابی کے لیے الیکٹرانک میڈیا کے رول کو نئے سرے سے بدلنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی عوام سیکولر زندگی اپنا سکیں گے۔

ہمارے قومی، سیاسی زندگی میں مذہب کا رول کیا ہو، یہ سوال آج بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ حصولِ آزادی کے وقت تھا۔ میرا اس بات میں یقین ہے کہ مذہب قطعی شخصی معاملہ ہے اور ہر شخص کی زندگی میں یہ محض ایک شخصی فعل ہے۔ انتہائی بلند اور غیر مُرئی صورت میں یہ انسان کا حقیقت ابدی سے تعلق ظاہر کرتا ہے۔ یہ خالق و مخلوق کے درمیان ایک رشتہ ہے۔ روزمرّہ کی عام زندگی میں یہ عبادات سے واضح ہوتا ہے۔ عبادات مختلف شکلوں میں ہیں۔ ایک مُرائی کہاوت کے مطابق کام ہی عبادت ہے۔ انسانوں کی خدمت خاص کر ضرورت مندوں کی خدمت جیسا کہ گاندھی جی نے درد نرائن کے بارے میں اپنا نظریہ واضح کیا ہے۔ دھیان گیان اور ہر صبح مذہبی کتاب تھرو کرال کا پاٹھ۔ غیر مُرئی اور عملی سطح کے درمیان رابطہ واضح کرنے کے لیے اخلاقیات کا ایک نظام ہے جس کی بنیاد سچائی، عدم تشدّد، جذبہ ترحم، دان، خیرات وغیرہ پر ہے۔ یہ تمام صفات قواعد ضوابط کے مطابق بھی ہیں اور مثبت بھی۔ مختلف لوگوں کے لیے ان شکلوں میں مذہب موجود رہا ہے۔ اور پھر اس سے اس کی مختلف شاخیں پھوٹی ہیں۔

ٹکراؤ کی ابتدا

مذاہب کو رواجی شکل دے دی گئی۔ ہر دستور اور رواج کے تحت مذہب کی اپنی مقدس تحریروں اور کتابوں کو فروغ دیا گیا اور دعویٰ یہ کیا گیا کہ اس مذہب کے رسم و رواج اور دستور العمل اپنی جگہ نادر ہیں۔ اور اُن جیسے دوسرے نہیں۔ اس مقام پر یہ دعویٰ کہ مذہب ذاتی معاملہ ہے، باطل ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ انسان کے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے بھی اس کے مذہب کو اپنائیں۔ اس طرح اپنے مذہب کی ترویج و اشاعت کی خواہش اور شدید تمنا ہی وہ مقام ہے جہاں ٹکراؤ شروع ہوتا ہے۔ مذہب کو کاروبار کے لیے، روزگار کے لیے، تعلیم اور حتیٰ کہ جمہوری سیاسی نظام میں الیکشن جیتنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اسے سیاسی اقتدار کی حصولی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور یہ غیر جمہوری سیاسی نظاموں کو سہارا دیتا ہے۔ اس طرح مذہب ایک قسم کی سماجی بیماری بن گیا ہے۔ یہیں شرارت شروع ہوتی ہے اور جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہے نیز سماج اور زندگی کے معاشرتی، سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی پہلوؤں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

اس طرح سماجی اور سیاسی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مذہب کی مداخلت اور اس کا غلط استعمال ہوا ہے۔ اس طرح سے صرف کسی ایک مذہب کے ماننے والوں مثلاً مذہب اسلام کے پیروکاروں، یا کسی ذیلی مذہب کے ماننے والوں جیسا کہ کیرالہ میں مشرقی لاطینی عیسائی یا نایر یا اتفاقی بنیادوں پر قائم مذہب جیسا کہ ہندو متینی تحریک کے ماننے والوں کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا

* چیرمین، مدراس انسٹی ٹیوٹ آف ڈیولپمنٹ اسٹڈیز، مدراس۔

مذاہب کو رواجی شکل دے دی گئی۔ ہر دستور اور رواج کے تحت مذہب کی اپنی مقدس تحریروں اور کتابوں کو فروغ دیا گیا اور دعویٰ یہ کیا گیا کہ اس مذہب کے رسم و رواج اور دستور العمل اپنی جگہ نادر ہیں اور اُن جیسے دوسرے نہیں۔ اس مقام پر یہ دعویٰ کہ مذہب ذاتی معاملہ ہے، باطل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ انسان کے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے بھی اس کے مذہب کو اپنائیں۔ اس طرح اپنے مذہب کی ترویج و اشاعت کی خواہش اور شدید تمنا ہی وہ مقام ہے جہاں ٹکراؤ شروع ہوتا ہے۔

ہے اور ان کی حمایت حاصل کرنے کے لیے انھیں روزگار، تعلیمی اور سماجی سہولتیں دی جاتی ہیں، یہ مذہب کا استعمال ہے اور تنزل ہے۔ اس صورتِ حال کو ہندوستانی فرقہ واریت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کمیونزم کا لفظ ہندوستان میں مندرجہ بالا مفہوم میں استعمال ہو رہا ہے، حالاں کہ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں اس کا مطلب ہے "کمیون" سے متعلق یا اس سے مراد ہے کمیون یعنی تعلق، تحصیل وغیرہ میں عوام کو منظم کرنا۔ اس میں کہیں بھی مذہب کا تصور نہیں ہے یا اس کے غلط استعمال کا بھی کوئی شائبہ نہیں ہے جیسا کہ ہندوستان میں اس کا مفہوم لے لیا گیا ہے۔ فرقہ واریت کے جراثیم گھر سے نکلتے ہیں اور مذہبی طبقوں اور تحریکوں کے زیر اثر پرورش پاتے ہیں۔ سیاسی پارٹیاں اور سماجی و سیاسی طبقے اور ٹولیاں انھیں ہوا دیتی ہیں جس طرح ہمارا رہن سہن ہماری زندگی میں جز ولاینفک بن گیا ہے، اس طرح یہ جراثیم بھی ملک کی سیاسی زندگی میں رچ بس گئے ہیں۔

درحقیقت آئین کا آرٹیکل ۳۰ مذہبی اقلیتوں کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے کھولنے اور ان کا نظم و نسق چلانے کا حق دیتا ہے۔ لیکن اس کا غلط استعمال ہوا ہے اور یہ اقدام ملک کے عظیم تعلیمی نظام کی مدد سے ملک کے بہت سے مذاہب کے فروغ میں معاون ثابت ہوا ہے۔ مذہبی اقلیتوں شلاً مسلمانوں، عیسائیوں، سکھوں، جینیوں نے اپنے اپنے اسکول اور کالج کھولے ہیں جہاں ان کے مذہب کی اشاعت ہوتی ہے اور ان کے مذہبی کلچر کی ترویج عمل میں آتی ہے۔ غیر اقلیتی فرقہ یعنی ہندوؤں نے بھی اپنے تعلیمی ادارے کھولے ہیں تاکہ اپنے مذہب کو مستحکم بنا سکیں اور اپنی ثقافت اور مذہب کی ترویج و اشاعت کر سکیں۔ لیکن سیاسی عمل میں جو فرقہ وارانہ تعصب اور اس کا استعمال پایا جاتا ہے، وہ اقلیتی اداروں سے ہٹ کر ہے۔ تمام انتخابات میں خواہ وہ قومی یا ریاستی ہوں یا مقامی، ہر جگہ حلقۂ انتخاب میں اُمیدوار ذات پات کے تصور کی بنیاد پر کھڑا کیا جاتا ہے، یعنی یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس حلقے میں کس ذات پات کے لوگ زیادہ ہیں۔ وہاں اچھوت ہیں، برہمن ہیں، نائیڈو ہیں، ریڈی ہیں، لکھتا ہیں یا نایر ہیں، جاٹ ہیں، یادو ہیں۔ غرضیکہ ہر جگہ ووٹروں کی ذات پات سامنے رکھی جاتی ہے۔

فرقہ واریت کے جراثیم گھر سے نکلتے ہیں اور مذہبی طبقوں اور تحریکوں کے زیر اثر پرورش پاتے ہیں۔ سیاسی پارٹیاں اور سماجی و سیاسی طبقے اور ٹولیاں انھیں ہوا دیتی ہیں۔ جس طرح کا رہن سہن ہماری زندگی میں جز ولاینفک بن گیا ہے، اسی طرح یہ جراثیم بھی ملک کی سیاسی زندگی میں رچ بس گئے ہیں۔

اور تعلیم کیا کرتی ہے؟

یہی نہیں بلکہ تعلیمی نظام کو بھی آج مختلف مذاہب کے فروغ و اشاعت کے سرگرم ذریعے کے طور پر حرکت میں لایا گیا ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں سے سیاسی، اقتصادی، سماجی اور ثقافتی مقاصد کے لیے مذہب کو کام میں لانا اور اس کا جائز ناجائز استعمال دُور نہیں رہ جاتا۔

لہٰذا پہلا سوال یہ کہ کیا آئین میں ترمیم کے ذریعے اس کے آرٹیکل ۳۰ الف اور ب کو اس میں سے نکال دیا جائے اور مذہبی اقلیتوں سے اُن کا یہ حق لے لیا جائے کہ وہ اپنی پسند کے تعلیمی ادارے کھولیں اور انھیں چلائیں۔ اس سے دو اور ضمنی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ کیا ایسا آئینی اقدام اس بات کی ضمانت ہوگا کہ مختلف مذاہب کے سیاسی رہنما تعلیمی اداروں کے ذریعے مذہبوں کے استعمال اور اُن کے غلط استعمال سے باز رہیں گے، یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ تعلیمی اداروں سے غیر مذہبی مقاصد کے لیے مذہب کے غلط استعمال کا خطرہ [illegible] ہیں۔ [illegible] غلط استعمال [illegible] نہیں ہیں۔

کیا جائے یا نہ کیا جائے؟

متعدد مطالعوں کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اسکول کی بہ نسبت گھر بچے کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں بہت معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر مذہبی اقلیتوں کی طرف سے قائم کردہ تعلیمی ادارے ہٹا دیئے جائیں، تو گھر میں جہاں پر کہ اس طرح کی مذہبی تربیت اور روایت فروغ پاتی ہے، مذہبی جنون کو ہوا دینے میں اور بھی زیادہ موثر کردار ادا کریں گے۔ ایسی صورت میں علیحدگی پسندی کا جذبہ اور اپنے مذہب کے بالاتر ہونے کا جذبہ فروغ پائے گا۔ مذہب کو سیاسی مقاصد یا اقتدار کے لیے کسی بھی طرح استعمال نہ کیا جائے، اس مقصد کو آئین میں مذکورہ ترمیم سے حل نہ کیا جاسکے گا۔ البتہ اس طرح کی کارروائی سے تعلیمی معیار میں نقصان پیدا ہو سکتا ہے کیوں کہ ان میں سے کچھ تعلیمی ادارے بہت اعلیٰ معیار رکھتے ہیں اور انھوں نے تعلیمی شعبوں میں رہنمایانہ کردار ادا کیا ہے۔

> درحقیقت آئین کا آرٹیکل ۳۰ مذہبی اقلیتوں کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے کھولنے اور ان کا نظم و نسق چلانے کا حق دیتا ہے لیکن اس کا غلط استعمال ہوا ہے اور یہ اقدام ملک کے عظیم تعلیمی نظام کی مدد سے ملک کے بہت سے مذاہب کے فروغ میں معاون ثابت ہوا ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ آئین کے آرٹیکل ۳۰ کی ترمیم کے ذریعے اگر مذہبی تعلیمی اداروں کو بند کر دیا جائے، تو سوال یہ ہوگا کہ تمام مذہبی اداروں کی طرف سے چلائے جا رہے تعلیمی اداروں کو بند کرنا ہوگا۔ آج سب سے زیادہ اسکول اور کالج غیر اقلیت یعنی ہندوؤں کی طرف سے چلائے جا رہے ہیں۔ ان کو بھی بند کرنا ہوگا۔ چوں کہ یہ بھی مذہب کو غیر مذہبی مقاصد کے لیے استعمال کرنے میں کسی سے کم نہیں۔

مسائل اور ان کا حل

اس سے تین اور سوال ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

پہلا:- بچے اور بالغ میں مذہبی جنون کے اثرات گھر میں ہی پیدا ہو جاتے ہیں، لہٰذا بہت سے مذاہب کی طرف سے چلائے گئے تعلیمی اداروں کے بند کرنے سے مذہب کے غلط استعمال کو نہیں روکا جاسکے گا۔ البتہ اس کی جگہ اب گھر اور اسکول ہے اور پھر صرف گھر ہی رہ جائے گا۔

> تعلیمی نظام کو بھی آج مختلف مذاہب کے فروغ و اشاعت کے سرگرم ذریعے کے طور پر حرکت میں لایا گیا ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں سے سیاسی، اقتصادی، سماجی اور ثقافتی مقاصد کے لیے مذہب کو کام میں لانا اور اس کا جائز و ناجائز استعمال دور نہیں رہ جاتا۔

دوسرا:- ہندو سماج بہت بڑا ہے۔ صبح سے شام تک آل انڈیا ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ سے شادی، بیاہ، موت اور متعدد تقاریب حتیٰ کہ عوامی جلسے، سیمینار اور لیکچر خواہ وہ سیاسی نوعیت کے ہی کیوں نہ ہوں، ہر جگہ ان کا آغاز پرارتھنا سے ہوتا ہے۔ یہی نہیں سمنٹ جیسی اشیاء کی فروخت کا معاملہ ہی لے لیجیے، ۲۳ مارچ کے "ہندو" میں یہ خبر ہے کہ "پالاناٹی، پارتھا سارتھی سمنٹس آندھرا سے ہندو مت کے ماننے والوں اور ہندوستان کے نام پیغام۔ سنکرانتی کے دوران جمع ہوئے متعدد سادھو سنتوں کی ایما پر وشنو شانتی کے لیے جو یگیہ کیا گیا، اس میں نارائن کی بانی سے پوری فضا گونج اٹھی۔ اس موقع پر کئی سو سادھو سنتوں کی آوازیں اس پر فضا اور دلفریب نیز مسحور کن ماحول میں گونج رہی تھیں اور روحانیت کی بلندیاں آکاش کو چھو رہی تھیں۔ ہمیں یہ اعلان کرتے ہوئے فخر ہوتا ہے کہ ہم پارتھا سارتھی کے پیروکار ہیں اور ہم آپ کو پارتھا سارتھی کینبے کے ارکان میں شریک کرنے کے لیے دعوت دیتے ہیں۔ آیئے مدراس میں سمنٹ کا سودا اس فرم سے کیجیے۔ یہ ہے کاویری مارکیٹنگ ایسوسی ایشن ۱-۲ اے، لشیا کار نو اسٹریٹ (کرن بیٹری فیکٹری کے مقابل) کاندی تھوپ مدراس ۶۰۰۰۷۹"۔

ایک وزیر نے ایک ریاست میں ایک مذہبی کیمپ کے افتتاح کے موقع پر کہا کہ:

"اس ریاست میں مشکل صورت حالات کے باوجود ایک طرح کا سکون دیکھنے کو ملتا ہے جو کہ کچھ دوسری ریاستوں میں یہ سکون نہیں ملتا۔ اس کا خاص سبب یہاں کے سادھو سنتوں کی طرف سے دی گئی وہ علامات ہیں جو انھوں نے اپنے روحانی تحریروں اور مقدس لٹریچر کے ذریعے ہمیں دیں اور ان کے ذریعے باہمی

> پہلا سوال یہ کہ کیا آئین میں ترمیم کے ذریعے اس کے آرٹیکل ۳۰ الف اور بے کو اس میں سے نکال دیا جائے اور مذہبی اقلیتوں سے اُن کا یہ حق لے لیا جائے کہ وہ اپنی پسند کے تعلیمی ادارے کھولیں اور انھیں چلائیں۔

اخوّت اور رواداری کے سبق بھی ہیں ... نوجوانوں کو ان مقدس کتابوں کو پڑھانا چاہیے۔ یہ کتابیں ایک واقعی پر رکھی گئی تھیں اور اس کا رُخ [illegible] کی طرف تھا) اس مقصد کے لیے مختلف سطحوں پر نصاب تعلیم کو ڈھالنے اور نوجوانوں کا رُخ ادھر موڑنے کے لیے سرکار ہر ممکن مدد دے گی" اس ایک مثال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب اور مذہبی جنون ہمارے سماج کے رگ و ریشے میں بھرا ہوا ہے اور زندگی کے ہر موڑ پر یہ سامنے آتا ہے۔ اسکولوں کا تو اُن فرقہ وارانہ روایتوں کے آگے بڑھانے میں جن میں ہم بری طرح پھنسے ہیں، جُزوی اثر ہے۔

تیسرا :۔ مذہبی اداروں اوقاف اور سوسائٹیوں کے ذریعے اسکول نہ چلائے جائیں، اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ اس کی تمام تر ذمہ داری سرکار پر ہو۔ تعلیمی معیار میں گراوٹ کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ سرکار تعلیم کے شعبے میں بہت بڑا رول ادا کر رہی ہے۔ اس کا عملاً مطلب یہ ہے کہ غیر تعلیمی بیوروکریسی جو کہ ہر ریاست میں سیکریٹریٹ میں ۳ افسروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے انتظام و انصرام کو اس گروپ کے حوالے کر دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ تعلیم کے بچے کو مذہب کے گندے پانیوں سے نکال کر باہر ڈال دیا جائے۔

اسکولوں اور کالجوں میں

ایسی صورت میں تعلیم کا رول یہی ہے کہ وہ مذہب کے بڑھتے ہوئے غلط استعمال کو روکے اور فرقہ واریت کے سدباب کے لیے کام کرے اور ملک کی سیاسی و سماجی زندگی سے اس کی بیخ کنی کے لیے اقدامات کرے۔ فرقہ واریت کے سدباب کے لیے متعدد ایسے مخصوص اقدامات ہیں جو اسکول اور کالج کر سکتے ہیں اور انھیں کرنا چاہیے۔ سب سے پہلے تو تعلیمی ادارے اسکول اور کالج کے طالب علموں میں ایک دانشورانہ ذہن پیدا کر سکتے ہیں اور جذباتی اور روحانی مفاہمت کے ذریعے ان میں یہ احساس پیدا کرا سکتے ہیں کہ وہ ہمارے ملک کے ایک رکن ہیں، اور ایک ہی سماج یا برادری یعنی ہندوستان سے ان کا تعلق ہے۔

یہ مشکل ہے کیوں کہ تفصیلی مطالعے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مذہبی تشخص بچپن میں ہی جنم لے لیتا ہے۔ ابھی بچہ ہو یا دہ سال کا بھی نہیں ہونے پاتا کہ ان میں مذہبی جراثیم پیدا کر دیے جاتے ہیں۔ آٹھ نو سال میں یہ ذہن اور پختہ ہو جاتا ہے اور لڑکے یا لڑکیاں خود کو کسی ایک مذہب سے وابستہ سمجھنے لگتی ہیں۔ اس عمر سے تعصب کی جو فضا بنتی ہے، وہ عمر بھر رہتی ہے۔ بچے یا بالغ میں اس قسم کے مذہبی جنون یا فرقہ واریت کا پیدا ہونا اسکول کی ذمہ داری نہیں ہے۔ مذہبی تشخص کا عمل تو اسکول جانے سے قبل ہی شروع ہو جاتا ہے۔ گویا کہ چار یا پانچ سال کی عمر میں اس کا سبب خاندانی رسم و رواج ہیں اور اس کے لیے وہ سماج ذمہ دار ہے جو اس طرح کے مذہبی جنون کو پیدا کرتا ہے، اسے بڑھاتا ہے اور پھر اسے مضبوط کرتا ہے۔ والدین بچوں کو مذہبی اور نسلی سماج میں پروان چڑھاتے ہیں۔ اور والدین کی تعلیمات کو مستحکم بنانے میں تیوہار، مذہبی صحیفے اور تحریریں اور عبادت گاہیں معاون بنتی ہیں۔

اس ضمن میں اسکول کو نرسری سے ہی کھل کر کام کرنا ہے اور غیر جانبداری کا [illegible] جامہ اُتارنا ہوگا۔ نیز بچوں اور بالغوں کو مذہبی تعصب کے نقصانات سمجھانے ہوں گے اور اس کے ساتھ ہی ان میں یہ جذبہ بیدار کرنا ہوگا کہ وہ ایک قوم ہیں۔ اس مقصد کے لیے اسکولوں کے نصاب تعلیم پر نظرثانی درکار ہے اور درسی کتب کی ازسرِنو تیاری ضروری ہے۔ اس نصاب تعلیم کے ذریعے ایسی تعلیمات سے نجات حاصل کرنا ہے جن سے مذہب

فرقہ واریت کے سدباب کے لیے متعدد ایسے مخصوص اقدامات ہیں جو اسکول اور کالج کر سکتے ہیں اور انھیں کرنا چاہیے، سب سے پہلے تو تعلیمی ادارے اسکول اور کالج کے طالب علموں میں ایک دانشورانہ ذہن پیدا کر سکتے ہیں اور جذباتی اور روحانی مفاہمت کے ذریعے ان میں یہ احساس پیدا کرا سکتے ہیں کہ وہ ہمارے ملک کے ایک رکن ہیں اور ایک ہی سماج یا برادری یعنی ہندوستان سے ان کا تعلق ہے۔

بچے یا بالغ میں اس قسم کے مذہبی جنون یا فرقہ واریت کا پیدا ہونا، اسکول کی ذمہ داری نہیں ہے۔ مذہبی تشخص کا عمل تو اسکول جانے سے قبل ہی شروع ہو جاتا ہے گویا کہ چار یا پانچ سال کی عمر میں اس کا سبب خاندانی رسم و رواج ہیں اور اس کے لیے وہ سماج ذمہ دار ہے جو اس طرح کے مذہبی جنون کو پیدا کرتا ہے، اسے بڑھاتا ہے اور پھر اسے مضبوط کرتا ہے۔ والدین بچوں کو مذہبی اور نسلی سماج میں پروان چڑھاتے ہیں اور والدین کی تعلیمات کو مستحکم بنانے میں تیوہار، مذہبی صحیفے اور تحریریں اور عبادت گاہیں معاون بنتی ہیں۔

کی بنیاد پر علیحدگی پسندی کو بڑھاوا ملتا ہے اور جن سے مذہب کی بنیاد پر فخر کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی سائنس اور معقولیت پسندانہ انداز نظر کو تقویت دیتی ہے۔ تاکہ زندگی کے مسائل کو حقیقی بنیادوں پر حل کیا جا سکے۔ اس کے ساتھ ہی تعلیم دینے والوں کے اندر بھی تبدیلی لانی ضروری ہے اور اُن والدین میں بھی جو کہ خاندان کی ہر تقریب کے موقع پر جیوتشی سے مشورہ لیتے ہیں۔

سنگیت اور موسیقی کے ذریعے اس مقصد کے لیے کام کیا جا سکتا ہے۔ سنگیت میں زبان کی قید ٹوٹ جاتی ہے جیسا کہ حال ہی میں مدراس میں تمام جنوبی ریاستوں کے پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کے لیے منعقدہ دس روزہ کیمپ میں دیکھنے کو ملا۔ اس کیمپ میں ۱۵ اُستادوں نے شرکت کی جو کہ سنگیت میں تربیت یافتہ تھے۔ اس موقع پر مختلف زبانوں کے سنگیت کا مظاہرہ کیا گیا۔ تیلگو میں جو گانا گایا گیا، اس نے چھوٹے بچوں کو یہ سبق دیا کہ وہ کل یعنی مستقبل کے ہندوستان کے ذمہ دار شہری ہیں۔ اُردو میں "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" اور تمل، کنڑا اور ملیالم میں مختلف گانوں کی مدد سے ہندوستان کی خوبصورتی اور اتحاد

کا پیغام دیا گیا۔ ہر اُستاد کو ایک ٹیپ ریکارڈر دیا گیا تھا۔ اس کے لیے بنے گئے کیسٹ میں، گانے آئے۔ اس طرح قومی یکجہتی، اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا پیغام ہر زبان کے ذریعے دیا گیا اور اسکولی بچوں کو ان گانوں اور اُن میں بتائے گئے پیغام سے آشنا کرایا گیا۔

> اس ضمن میں اسکول کو نرسری سے ہی کھل کر کام کرنا ہے اور غیر جانب داری کا جامہ پہنانا ہوگا، نیز بچوں اور بالغوں کو مذہبی تعصب کے نقصانات سمجھانے ہوں گے اور اس کے ساتھ ہی ان میں یہ جذبہ بیدار کرنا ہوگا کہ وہ ایک قوم ہیں۔ اس مقصد کے لیے اسکول کے نصاب تعلیم پر نظر ثانی درکار ہے اور درسی کتب کی از سر نو تیاری ضروری ہے۔

رول محدود ہے لیکن......

اسکول جانے سے قبل ہی بچے میں فرقہ واریت کے جو جراثیم سرایت کر جاتے ہیں، اُن سے نپٹنے کے لیے اسکول کا رول محدود ہے اور وہ اس نقصان کا قدرے ہی ازالہ کر سکتا ہے۔ بچہ خاندان اور اپنے والدین سے بچپن ہی سے مذہبی علیحدگی اور فوقیت و برتری کے احساسات قبول کرتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں فرقہ وارانہ تعصب جنم لیتا ہے۔ متعصب ماں باپ' متعصب بچوں کو جنم دیتے ہیں اور ان کی سماجی زندگی کے لیے انھیں وہی رُجحانات منتقل کرتے ہیں جو خود اُن میں ہیں۔ اس لیے بچوں کو صحیح اندازِ نظر سے آشنا کرنے کے لیے ایسے پروگرام ضروری ہیں' جن کے ذریعے اُن کے والدین تک پہنچا جا سکے۔ اس سلسلے میں تعلیم بالغان کا قومی پروگرام جس کے

> بچہ خاندان اور اپنے والدین سے بچپن ہی سے مذہبی علیحدگی اور فوقیت و برتری کے احساسات قبول کرتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں فرقہ وارانہ تعصب جنم لیتا ہے۔ متعصب ماں باپ، متعصب بچوں کو جنم دیتے ہیں اور ان کی سماجی زندگی کے لیے انھیں وہی رُجحانات منتقل کرتے ہیں جو خود اُن میں ہیں۔

تحت ہرات ملک بھر میں ۲ لاکھ مراکز کام کرتے ہیں' اور جہاں ہر مرکز پر ۳۰ بالغ تعلیم پاتے ہیں، مذہبی تعصب کو دُور کرانے میں اہم رول ادا کر سکتا ہے۔ ان مراکز پر تعلیم پانے والوں کو ملکی وحدت اور قومی اتحاد کا سبق دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ناخواندہ بالغ افراد مذہبی تعصب کا شکار نہیں ہیں۔ ان میں تو تعلیم یافتہ بالغ افراد فرقہ وارانہ اثرات پیدا کر دیتے ہیں۔ اور ان کے جذبات کو بھڑکاتے ہیں۔ اس کے ازالے کے لیے نشر و اشاعت کے عوامی ادارے مثلاً ریڈیو، ٹی۔ وی۔ ٹھوس کام کر سکتے ہیں۔ اس وقت وہ محض وقتی اور بے تُکے قومی یکجہتی کے نعرے اور چُٹکلے تجارتی پروگراموں کے درمیان بولتے رہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے محتاط طریقے پر وضع کیے گئے ایسے پروگرام پیش کرنے ہوں گے جن سے اس بُرائی کو دُور کیا جا سکے اور افراد اور سماج کو فرقہ واریت سے جو نقصان پہونچا ہے' اس کا ازالہ کیا جا سکے۔ اس کی جگہ سیکولرازم، قومی اتحاد اور ملکی وحدت پر مبنی پروگرام پیش کرنے ہوں گے۔

ہمارے اسکولوں اور اسکولوں سے باہر بشمول نشر و اشاعت کے عوامی اداروں کے لیے ایسے پروگرام

(باقی صفحہ ۸۷ پر)

رئیس احمد

آزاد ذہن کی تشکیل

وقت آگیا ہے کہ ہم یہ سوچیں۔ آیا مذہب نے ایک بہتر دنیا بنانے میں مدد دی ہے۔ پروفیسر احمد کا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ اس کی وجہ ان کے قول کے مطابق مذہب کی بنیادی کمزوریاں ہیں۔ یعنی اس کا یہ دعویٰ کہ وہ دوسرے مذاہب سے افضل ترین ہے۔ قدرت کے قانون تغیر سے انحراف۔ یہ کہتے ہوئے کہ وہ الہامی اور آسمانی صحیفہ ہے۔ اور مذہبی طبقہ جس کا تعلق غالب طبقے سے ہے جن میں امیر، صاحب جائداد اور صاحب ثروت افراد شامل ہیں۔

ہمارا یہ سوال جائز اور بروقت ہے کہ بے ہودگی کیوں برداشت کی جائے؟ تاہم ہمیں اس امر کا احساس ہونا چاہیے کہ یہ بے ہودگی یا عدم معقولیت ہمارے سماج میں گھر کر چکی ہے نہ صرف یہ کہ اس کی ایک تاریخ ہے جیسے تدریسے جہالت کے زمانہ سے جڑا جا سکتا ہے، بلکہ ہم یہ پائیں گے کہ سماج کے چند گروہوں یا طبقوں نے اس سے

سماجی احیا، تعلیمی سدھار اور معقولیت پسندی اور انسانیت کو قائم کرنے کے لیے جو جدوجہد کی جاتی ہے یقیناً اس میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے ہودہ خیالات کا جرأت مندانہ طور پر پردہ فاش کرنا ہوگا تاکہ سماجی ترقی ممکن ہو سکے۔

● سابق وائس چیئرمین، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، نئی دہلی۔

فائدہ اٹھایا۔ اور شروع ہی سے اس کی ترویج میں جٹے رہے۔ دوسرے الفاظ میں سماج اور انسانی خیالات کے ڈھانچوں میں ایک خاص قسم کا رشتہ ہوتا ہے۔ اور خیالات کی بے ہودگی یا عدم معقولیت کا تعلق سماج میں پائے جانے والی خود غرضی اور استحصال پسندی سے ہے۔ بلاشبہ بے ہودگی اور عدم معقولیت تباہ کن حد تک بڑھ سکتی ہے اور سماجی شورش کو ہوا دے سکتی ہے۔ جس کا انجام خیر یہ ہو کہ انصاف پسندانہ سماج قائم ہو جائے۔ جس کی بنیاد معقولیت پر ہو اور جس کے وجود سے بے ہودگی آہستہ آہستہ ختم ہو جائے۔ اس تمام بحث کا مقصد اس تصور کی تردید کرنا ہے کہ بے ہودگی قلع قمع کرنا آسان سی بات ہے۔ یا کہ مناسب تعلیم کے ذریعہ اسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ مناسب تعلیم کی ہی مخالفت کی جائے گی۔ سماجی احیا، تعلیمی سدھار اور معقولیت پسندی اور انسانیت کو قائم کرنے کے لیے جو جدوجہد کی جاتی ہے یقیناً اس میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے ہودہ خیالات کا جرأت مندانہ طور پر پردہ فاش کرنا ہوگا تاکہ سماجی ترقی ممکن ہو سکے۔

ہمارے ملک میں سب سے اہم سوال قومی ایکتا کا ہے اس کی دو وجوہات ہیں۔ اولین تاریخی ضرورت کیونکہ یہاں مختلف تہذیبوں، زبانوں اور مذاہب کے لوگ عرصہ دراز سے رہتے چلے آ رہے ہیں، اور یہی ان کا دیس ہے۔ دوئم یہ دانشمندانہ قدم ہوگا اس لئے کہ اقتصادی وسائل کا ایک دوسرے پر اسقدر انحصار ہے کہ ایک طبقہ یا ایک علاقہ کی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ دوسرا طبقہ یا علاقہ بھی ترقی پذیر نہ ہو لیکن ہو کیا رہا ہے۔ ترقی کے عمل میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر فائدہ اٹھانے اور طاقت لو کنٹرول حاصل کرنے کے لیے کوئی بھی کسر اٹھا کر نہیں جاتی۔ یہی کچھ بین الاقوامی

مذہبی اور ذات پات کے اختلاف کو ہوا دینا آسان ہے جو فکر ان کا معقولیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ اور یہ بہ آسانی بھڑکائے جا سکتے ہیں اور عوامی تحریکیں جو قطعی طور پر تباہ کن ہوتی ہیں، ان ہی کا سہارا لیتی ہیں۔

ماحول میں ہو رہا ہے۔ چند اقوام کی یہ کھلی پالیسی ہے کہ نئی آزاد قوموں کو جو اپنی آزادانہ روش کو ہمت سے قائم رکھنا چاہتی ہیں مجبور کر دیا جائے کہ وہ ان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ اور ان کے اشاروں پر ناچیں۔ ان ملکوں کو موجودہ چپقلش اور تناؤ یہ موقع بھی فراہم کر رہا ہے کہ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے دخل اندازی کر سکیں

بڑے مقاصد کے حصول کے لیے غالباً مذہبی اور ذات پات کے اختلاف کو ہوا دینا آسان ہے چونکہ ان کا معقولیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ اور یہ بہ آسانی بھڑکائے جا سکتے ہیں اور عوامی تحریکیں جو قطعی طور پہ تباہ کن ہوتی ہیں، انہی کا سہارا لیتی ہیں۔ لہٰذا آیئے معقولیت اور عدم معقولیت کے نقطۂ نگاہ سے اس امر کا جائزہ لیں کہ مذہب اور اس کے متعصبانہ اور فرقہ وارانہ جھکاؤ سے ہمارا کہاں تک تعلق ہے۔

مذہب برحق کو اگر انسانی خطاؤں اور سماجی مسائل سے الگ ہٹ کر ایک فلسفہ کے طور پر دیکھا جائے تو بلاشبہ وہ ایک بے صورت تصور ہے

> اگر ہم چاہتے ہیں کہ مذہب کوئی تعمیری سماجی مقصد کی خدمت کرے تو ہمیں اس کی کمزوریوں کا احاطہ کر کے اسے اس غیر حقیقی دعوائے رہبری سے آزاد کرنا چاہیے۔ کہ افضل اخلاقی اقدار اسی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہیں اور وہی ایک واحد حربہ ہے جس سے انصاف پسندانہ سماج تعمیر کیا جا سکتا ہے۔

اس طرح یہ انسان کے اعلیٰ مقاصد کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مذاہب کا ایک سا ہی پیغام ہے۔ یعنی سچائی، محبت اور خدمتِ خلق۔ مذاہب نے انسانی سماج کو لوٹ کھسوٹ کے دور سے نکال کر ایک دور کے پہ انحصار کرنے اور عمدہ تہذیب کی تشکیل کرنے میں جو پارٹ ادا کیا ہے اس سے انکار کرنا ممکن نہیں۔ تاہم سماجی تبدیلیاں اور انفرادی طور پر انسانوں کے کردار کو سدھارنے کے میدان میں مذہب کا اثر بے حد محدود ہے اس کا احساس بھی ضروری ہے۔ ہزاروں برس سے لگ بھگ ہر بچہ کسی نہ کسی مذہب میں پیدا ہو رہا ہے۔ اور اسی مذہب کی اقدار اور اصول اس کو پوری طور پر سکھائے جاتے ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس سے کوئی بہتر زندگی بسر کرنے کا ماحول پیدا ہوا۔ کیا انسانی رحم اور برداشت میں اضافہ ہوا کیا انسان اپنے بزرگوں سے زیادہ بے غرض اور کم تشدد پسند بنا۔ کیا نفرت، تشدد، اور استحصال انگیزی میں کچھ کمی واقع ہوئی۔ ظاہر

ہے کہ جذبات، حرص اور خود غرضی کو قابو میں لانے میں بنیادی کمزوریوں کی وجہ سے مذہب ناکام رہا ہے اور وہ کمزوریاں ہیں۔ اولیں۔ عدمِ شراکت، دوسرے مذہب سے اعلیٰ ہونے کا دعویٰ۔ دوئم: اسے الہامی اور آسمانی صحیفہ قرار دے کر۔ تبدیلی جو قدرتی عمل ہے، اسے منظور کرنے سے انکار۔ سوئم: خادم دین جن کا تعلق سماج کے جابر طبقہ سے ہوتا ہے، جو صاحب جائداد، مالدار، طاقتور اور خاص حقوق سے لیس ہوتے ہیں۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ مذہب کوئی تعمیری سماجی مقصد کی خدمت کرے تو ہمیں اس کی کمزوریوں کا احاطہ کر کے اسے اس غیر حقیقی دعوائے رہبری سے آزاد کرنا چاہیے۔ کہ افضل اخلاقی اقدار اسی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہیں اور وہی ایک واحد حربہ ہے جس سے انصاف پسندانہ سماج تعمیر کیا جا سکتا ہے۔

اعلیٰ اخلاقی اقدار سماجی ایکتا کے لیے ہی نہیں بلکہ اس کی حیات کے لیے بھی بہت اہم ہے اور یہ اقدار ہر انسان کی سرشت بن چکی ہیں۔ چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا

> ہمیں اسی امر کو بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ سماج کی ترقی کا انحصار اسی بات پر ہے کہ وہ طے شدہ باتوں پر انگلی اٹھائے، نئے حل اور نئے جواب تلاش کرے اور دانشمندانہ تحقیق سے اپنے مسائل کا جائزہ لے۔ نہ کہ بلاچوں وچرا حاکم کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور لکیر کا فقیر بن کر ہر متعصب بات پر صاد کہے۔

ہو۔ لہٰذا ہمیں اس امر کو تسلیم کرنا ہوگا کہ صدیوں میں سماج نے جو ارتقائی منزلیں طے کیں۔ اس دوران بہترین اخلاقی اقدار کی نشاندہی ہوئی اور ان کو مختلف قوانین کی صورت دے دی گئی۔ اب ان اقدار کی محافظ پارلیمنٹ ہے۔ عدالتیں ہیں اور عوامی رائے ہے۔

ہمیں اس امر کو بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ سماج کی ترقی کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ طے شدہ باتوں پر انگلی اٹھائے، نئے حل اور نئے جواب تلاش کرے اور دانشمندانہ تحقیق سے اپنے مسائل کا جائزہ لے۔ نہ کہ بلاچوں وچرا حاکم کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور لکیر کا فقیر بن کر ہر متعصب بات پر صاد کہے۔ ہمارے آئین میں جس سیکولر، سوشلسٹ اور جمہوری سماج قائم کرنے کا مقصد پیش نظر ہے وہ مذہب کے ذریعہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

مذہب اور سیکولرزم

جب مذہب، فرقہ پرستی کا روپ دھارن کر لیتا ہے تو اس میں کئی ایک نہایت غیر عقلمندانہ خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ پھر اس بات کو شہرت دیتا ہے کہ جو گروہ ایک خاص مذہب کے پیروکار ہیں۔ ان کے اقتصادی، سماجی اور سیاسی مفاد بھی مشترک ہیں۔ جو دوسرے مذاہب کے لوگوں سے لگا نہیں کھاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ہندو۔ مسلم۔ سکھ۔ اور عیسائی مفاد کا ذکر کرتے ہیں بلکہ ہندو۔ مسلم۔ سکھ تاریخوں کا بھی۔ یہ حقیقت کی خطرناک غلط بیانی ہے۔ مثال کے طور پر ہر ایک علاقے کے رہنے والوں کے معاشی مفاد مشترک ہیں۔ غلط نظریے مساوی مفاد رکھنے والی جماعتوں کو محض تقسیم کر دیتے ہیں۔ اور اس سے خود غرض طبقے کو فائدہ پہنچتا ہے اور سماج میں جو صحیح ترقی ممکن ہوتی ہے وہ

> جب مذہب، فرقہ پرستی کا روپ دھارن کر لیتا ہے تو اس میں کئی ایک نہایت غیر عقلمندانہ خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ پھر اس بات کو شہرت دیتا ہے کہ جو گروہ ایک خاص مذہب کے پیروکار ہیں۔ ان کی اقتصادی، سماجی اور سیاسی مفاد بھی مشترک ہیں۔ جو دوسرے مذاہب کے لوگوں سے لگا نہیں کھاتے۔

مذہب آج کے سماجی اور سیاسی ماحول میں قومی ایکتا کی بنیاد نہیں ہو سکتا۔ افراد میں مذہب جو اچھائی قائم رکھ سکتا ہے یا ان کی روح کو تسکین دے سکتا ہے وہ محض انفرادی طور پر ہی ہونا چاہیے۔

نہیں ہو پاتی۔ جو لوگ زیادہ فرقہ پرست ہوتے ہیں وہ تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ ایک مذہب کے پیروکاروں کے مفاد دوسرے مذہب کے نام لیواؤں کے بالکل برعکس اور متصادم ہیں۔ یہ ایک زہریلا فلسفہ ہے۔ یہ صداقت کی نفی کرتا ہے، یہ افراد میں تعصب پیدا کرتا ہے اور فرقہ پرست جماعتوں کو مائل بہ تشدد کرتا ہے جس سے قوم کا تانا بانا ٹوٹ سکتا ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب ان جماعتوں کو پوشیدہ یا ظاہر طور پر تخریبی طاقتوں سے شہ ملے۔ دو قوموں کی تھیوری اسی فلسفہ یا پروپگنڈا کا منطقی نتیجہ ہے۔ ہمیں اس قسم کے مہلک پودوں کو جڑوں سے اکھاڑ دینا چاہیئے تاکہ ترقی اور احیا کے میدان صاف ہوں۔

مذہب، آج کے سماجی اور سیاسی ماحول میں قومی ایکتا کی بنیاد نہیں ہو سکتا۔ افراد میں مذہب جو اچھائی قائم رکھ سکتا ہے یا ان کی روح کو تسکین دے سکتا ہے وہ محض انفرادی طور پر ہی ہونا چاہیئے۔ سچ تو یہ ہے کہ کئی دوسری قوموں کو اسی قسم کی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا ہے اور ہمارے ہاں بھی زندگی کے ان میدانوں میں جہاں مذہب کی ضرورت نہیں۔ مذہب سے علیحدگی کا مطلب سیکولرزم ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ہم ان اعتقادات، رویوں، ادھورے نظریوں، تعصبات، بے سمجھیوں، عدم معقولیت کا ذکر کر رہے ہیں جو جان بوجھ کر فرقہ وارانہ تحریکوں کو شہ دیتے ہیں۔ سماج کے ہاتھ میں محض ایک ہتھیار ہے — تعلیم کا۔ اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر قسم کی تعلیم کام دے سکتی ہے۔

اولین تو ملک کی سالمیت کو جو خطرہ پیش ہے اس کا احساس ہونا چاہیئے اور پھر اس کا قلع قمع کرنے کے لیے پوری ہمت سے کام لینا ہوگا۔ قوت ارادی کے بغیر تعلیم بجائے خطرہ دور کرنے کے اس کو بڑھانے کی وجہ بن سکتی ہے۔ بچے جب اسکولوں میں آتے ہیں تو ان کے ذہن ان کے والدین کے تعصبات اور خیالات میں لپٹے ہوتے ہیں۔ استاد اگر چاہیں تو

اسی خطرہ کو بار بار دہرایا گیا ہے
کہ ایسے تعلیمی ادارے جن کی
بنیاد ذات پات، فرقہ بندی،
زبان یا مذہب پر ہے، وہ پہلے
سے ہی ایک خطرناک پارٹ ادا
کر رہے ہیں۔ خاص طور پر
بحران کے دوران۔ اس سے نفرت
کو ہوا ملتی ہے اور تشدد
اور بغض پیدا ہوتا ہے۔

ان تعصبات کو اور ہوا دے کر انہیں کسی مذہب کے سخت جان سپاہی بنا سکتے ہیں۔

اس خطرہ کو بار بار دہرایا گیا ہے کہ ایسے تعلیمی ادارے جن کی بنیاد ذات پات، فرقہ بندی، زبان یا مذہب پر ہے، وہ پہلے سے ہی ایک خطرناک پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ خاص طور پر بحران کے دوران اس سے نفرت کو ہوا ملتی ہے اور تشدد اور بغض پیدا ہوتا ہے۔

اس چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے تعلیم کو کئی انداز سے عمل کرنا ہوگا۔ اولین تو اسے عوام پر اثر انداز ہونا ہوگا اور ان پر واضح کرنا ہوگا کہ فرقہ پرستی سے ملک اور قوم کو کیا خطرے لاحق ہیں۔ نشریات اور نظریات کے جتنے بھی ذرائع ہیں ان کا استعمال کرتے ہوئے یہ بتانا ہوگا کہ مذہب ایک ذاتی معاملہ ہے یہ اُجرت کا فیصلہ نہیں کرتا، نہ یہ پیداوار کے فروغ کا ذمہ دار ہے مستقبل کی منصوبہ بندی بھی اس کے ہاتھ میں نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ذہنوں پر جو کدورت کا غبار پڑا ہے اسے پورے انہماک سے دور کیا جائے۔ ہر زبان میں پمفلٹ لکھے جائیں۔ ریڈیو کے ڈرامے ہوں۔ کہانیاں نشر کی جائیں۔ اور ہر طرح سے لوگوں کا دھیان اس طرف کھینچا جائے۔ امید کرنا چاہیئے کہ ہر ریاست میں عوام کی ایسی جماعتیں ہوں گی جو ان مقاصد کو پورے ارادے سے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے تیار ہوں گی۔ ان کو جس قدر مالی امداد کی ضرورت پڑے، اسے تعلیم بالغاں کے فنڈ سے پورا کیا جانا چاہیئے۔

اور یہ بچے

ایسے اسکولوں میں جہاں طلباء پر بہ آسانی اثر ڈالا جا سکتا ہے۔ قومی ایکتا کا دھیان رکھتے ہوئے ایسے مضامین کی تعلیم دینا چاہیئے جن سے انصاف پسند جمہوری سماج کی شعاعیں منعکس ہوں۔ نصاب سے محض قابل اعتراض

(باقی صفحہ [illegible] پر)

ایسے اسکولوں میں جہاں طلباء پر بہ آسانی اثر ڈالا جا سکتا ہے۔ قومی ایکتا کا دھیان رکھتے ہوئے ایسے مضامین کی تعلیم دینا چاہیے جن سے انصاف پسند جمہوری سماج کی شعاعیں منعکس ہوں۔ نصاب سے محض قابل اعتراض حصوں کو نکال دینے سے مقصد حاصل نہیں ہوگا۔

سے-ایم کابرا

ایک معقولیت پسندانہ معاشرے کی جانب

نہایت قلیل مدت میں تیسری دنیا کے یہ نام نہاد ترقی پسند لوگ ترقی کے نشانات کو اپنی غرض میں بروئے کار لانے میں ماہر بن چکے ہیں۔ ان لوگوں کا بہترین ذریعہ عمل ہے۔ پبلک ریلیشنز۔ لیکن یہ وہ لوگ ہیں جو حقیقی ترقی کے عمل میں ناکام ہونے میں بدنام ہیں۔ لیکن یہ غربت اور بدنصیبی لانے میں سب سے آگے۔ وقتاً فوقتاً عوام ان نام نہاد ترقی پسند عناصر کا تختہ اُلٹ دیتے ہیں۔ جیساکہ ایران میں شاہ کا تختہ اُلٹ دیا گیا۔

مارشل برمن

صدیوں کے جمود اور انحطاط سے نکل کر گزشتہ چالیس برس میں جو نام نہاد ترقی کا دور آیا۔ اس کی روشنی میں دیکھا جائے کہ ہندوستان کی صورت حال کیا ہے۔ عوام نے جو امیدیں باندھ رکھی تھیں۔ یا خواب سے رکھے تھے۔ ان میں شاید ہی کچھ پورے ہوئے ہوں۔ اس امر سے تو انکار نہیں کہ برف پگھلی اور کچھ ترقیاتی قدم

جدیدیت کی تلاش

اگر ہماری تمامتر کوششیں اور انسانی صلاحیتیں انسان کی ترقی کی کسوٹی ہیں، تو یہ بات عیاں ہے کہ جدیدیت کی تلاش اور افزائش دولت کی جدوجہد نے ہمیں مخمصوں، تفرقوں اور

تصور کر لیا اور پھر بدنصیبی سے اقتصادی ترقی کو محض مالی افزائش تک محدود کر دیا۔ ہم نے موجودہ اشکال، مواد اور کنٹرول اور ان سے فائدہ اٹھانے والوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے پیداوار کی صلاحیتوں کو بڑھانے کی کوشش کی۔ ہمارا خیال تھا کہ اس طرح ہم نے ایک متحدہ قوم اور ایک مضبوط اور با اثر قومیت کی بنیاد ڈال دی ہے اور ایسی صورت پیدا کر دی ہے کہ انفرادی ترقی تمامتر لوگوں کی ترقی کی ضامن ہوگی۔ ہمارا یہ بھی خیال تھا کہ مختلف ڈھانچے بنا کر ان میں رابطہ

پیدا کر کے اور کچھ اداروں کو شکل دے کر، یا منصوبہ بندی، پبلک سیکٹر، پارلیمنٹری ڈیموکریسی کے ذریعے یا سائنس اور ٹیکنالوجی کا زیادہ سے زیادہ استعمال کر کے ہم ایک ایسا ماحول پیدا کر دیں گے جس میں اقتصادی ترقی خود بخود ہونے لگے گی، اور ایسی خوشحالی کا دور دورہ ہوگا جس سے تمام لوگ مستفید ہو کر آرام سے رہ سکیں۔ تبدیلی کے ایسے سیدھے سادے خیال نے جس کی بنیاد بلاوجہ امید پر قائم تھی۔ اور جس کے پیش نظر محض دوسرے ممالک کی تاریخ سے نقل کرنے کا ارادہ تھا قدرتی طور پر ہمیں ایک ایسے اندھے غار میں پہونچا دیا جہاں پیداوار میں خامیاں

اگر ہماری تمامتر کوششیں اور انسانی صلاحیتیں انسان کی ترقی کی کسوٹی ہیں، تو یہ بات عیاں ہے کہ جدیدیت کی تلاش اور افزائش دولت کی جدوجہد نے ہمیں مخمصوں، تفرقوں اور مصیبتوں میں ڈال دیا ہے۔

اُٹھے لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمیں کونسا راستہ اختیار کرنا ہے۔ اس [illegible]

مصیبتوں میں ڈال دیا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ ہم نے چھوٹے راستوں کو اپنا کر یہ مصیبت مول لی ہو۔ [illegible] ہے کہ ہم نے اقتصادی ترقی کو تمامتر ترقیوں کی کنجی

اور سماجی، اقتصادی، نسلی، مذہبی، علاقائی، سیاسی اور کلچرل ماحول میں عدم توازن ہو اور نتیجہ یہ ہو کہ ترقی کی رفتار کمزور پڑ جائے اور امیدوں کے چراغ ٹمٹمانے لگیں۔

یہ بات تو صحیح ہے کہ ہماری مشکلوں کا حل سائنس اور ٹیکنالوجی کے وسیع استعمال میں پنہاں ہے لیکن کیا سائنس کو غیر سائنسی انداز میں بروئے کار لایا جا سکتا ہے؟ ماہرین کو یہ بتانا ہوگا کہ وہ کیوں اور کیسے کام کریں۔ آپ آج کی ہر ایک ایجاد کو کل کی ہر ایک بات پر ترجیح نہیں دے سکتے۔

اس چیلنج کے پیش نظر ہم خود پرستی اور غلط متبادل راستوں کو چھوڑ کر کھلے بندوں سائنسی انداز سے واضح اور سیدھا ایسی بحث چھیڑ رہے ہیں تاکہ معلوم کر سکیں کہ آخر ہم کہاں اور کیسے غلطی کھا گئے یہ نظریہ غلط ہے کہ اگر ہم نے اپنے راہ عمل منصوبوں اور ماڈلوں کی گہرے طور پر نظر ثانی کی تو اس سے قومی ادارے کمزور ہو جائیں گے یا بدظنی پیدا ہوگی۔

اس قسم کے غیر دانشمندانہ اور غیر سائنسی انداز فکر کو ایک نیا استفین بنانے کے لیے جس میں ہر ایک کو مساوی فائدہ ہو۔ سماجی توازن بڑھے اور زندگی کی خوشحالی اور سکون کے وسائل میسر ہوں عوام میں بڑے طمطراق سے شہرت دی جاتی ہے۔ حال ہی میں آبادی کے مسئلہ کو سرفہرست رکھا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پیدائش کے عمل میں اکثریت کے رویہ کو انفرادی اور سماجی نقطہ نظر سے غیر معقول مان لیا گیا ہے۔ افزائش نسل کے رویہ کو بنانے میں بہت سے سماجی، نفسیاتی اور اقتصادی عنصر کا ہاتھ ہوتا ہے اور ایسا نہیں ہوتا کہ محض حیوانی جذبہ بچے پیدا کرنے کے رویہ پر حاوی ہو جاتے۔ نہ تو ایسی کوئی قاطع وجہ ہے اور نہ ہی کوئی عملی شہادت۔ جس سے یہ پتہ چلے کہ کسی سماج نے محض اپنے ذاتی مفاد کے پیش نظر افزائش نسل کی قوتوں کو اس قدر بے قابو میں کر لیا کہ پیدائش کی شرح کم ہو کر صفر رہ جائے یا بہت گر جائے۔ آبادی کی شرح تو ترقی ہونے کے بعد گرتی ہے اس سے قبل نہیں۔ لہٰذا آبادی کے بڑھنے کو اپنا اولین درد سر تسلیم کرنا غیر سائنسی رویہ ہے۔ اور یہ تو غریبوں کو ان کی غربت کا قصوروار ٹھہراتا ہے۔

یہ بات تو صحیح ہے کہ ہماری مشکلوں کا حل سائنس اور ٹیکنالوجی کے وسیع استعمال میں پنہاں ہے لیکن کیا سائنس کو غیر سائنسی انداز میں بروئے کار لایا جا سکتا ہے؟ ماہرین کو یہ بتانا ہوگا کہ وہ کیوں اور کیسے کام کریں۔ آپ آج کی ہر ایک ایجاد کو کل کی ہر ایک بات پر ترجیح نہیں دے سکتے۔ ہر جدید ترین چیز ضروری طور پر بہترین نہیں ہو سکتی۔ ٹیکنالوجی کی افادیت، ضرورت اور اس کے موزوں ہونے پر ہی اس کا انتخاب کرنا ہوگا۔ ریسرچ اور ڈیولپمنٹ کی سائنس کا وسیع طور پر استعمال کرتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ کیا کیا جائے، کیسے کیا جائے اور کون سا وقت مناسب ہے۔ اور یہی چیز کیوں چنی جائے جبکہ کئی دوسری متبادل چیزیں میسر آ سکتی ہیں۔ نقل سائنسی مزاج کی نفی ہے۔

ہم ایک ذمہ دار، دانشمند اور ہمدرد شہری ہونے کی بجائے ہمیشہ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے میں لگے رہتے ہیں۔ اور محض ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی یا کسی ایک لسانی یا نسلی گروہ کے علمبردار بنتے ہیں۔

بے مہار انفرادیت، ہر چیز کو ہڑپ کرنے کی مستی اور

خود غرض لوگ معقول رویہ اپنانے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ وہ فرقہ پرستی، جہالت اور جبریت کو ہوا دیتے ہیں۔ وہ امتیازی گروہ کے طرفدار بنتے ہیں۔ یہ جھانسہ دے کر کہ جب ان کی نظر عنایت ہوگی تو عوام تک بھی کچھ ٹکڑے آ پڑیں گے۔

لہٰذا نئی ٹیکنالوجی میں کوئی علاء الدین کا چراغ نہیں مل رہا ہے۔ بلکہ اگر نئی ایجادات کو سماجی مفاد کی کسوٹی پر نہ رکھا گیا تو اس سے ترقی کے راستے میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے۔

ملک یا غیر ممالک میں دولت کے حصول میں وہ اندھا دھند برسرپیکار ہیں اور یہی ان کا روز کا وظیفہ ہو گیا ہے۔ وہ تمدنی، ذہنی احیا اور سماجی لگاؤ اور بھائی چارے کے جذبات کو اگر وہ ان سے اپنا ذاتی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے تو محض خام خیالی تصور کرتے ہیں۔

ذاتی جائداد، مارکیٹ، پرائیویٹ کاروبار اور مقابلہ کے نظریوں سے چپٹے رہنے کی وجہ سے ہم اپنی صلاحیتوں کو وسائل کی ترقی کے ترقی میں کام نہیں لا رہے اور با معنی زندگی کا راستہ نہیں کھول رہے۔ نہ صرف اپنے ہی لیے۔ بلکہ ان کے لیے جو اس سے بہت دور تڑپ رہے ہیں۔

خود غرض لوگ معقول رویہ اپنانے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ وہ فرقہ پرستی، جہالت، اور جبریت کو ہوا دیتے ہیں۔ وہ امتیازی گروہ کے طرفدار بنتے ہیں۔ یہ جھانسہ دے کر کہ جب ان کی نظر عنایت ہوگی تو عوام تک بھی کچھ ٹکڑے آ پڑیں گے۔

ملک یا غیر ممالک میں دولت کے حصول میں وہ اندھا دھند برسرپیکار ہیں اور یہی ان کا روز کا وظیفہ ہو گیا ہے۔ وہ تمدن، ذہنی احیا اور سماجی لگاؤ اور بھائی چارے کے جذبات کو اگر وہ ان سے اپنا ذاتی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے تو محض خام خیالی تصور کرتے ہیں۔ جہاں یہ صورت حال ہو وہاں سائنسی مزاج پیدا کرنا، انسانیت اور دل و دماغ کو فروغ دینا، یا ایک سانچے تمدن کو تشکیل دینا محض ایک خواب ہے۔ جہاں کچھ لوگ تو بے حد غریب ہوں جو انسانی

صراط مستقیم

زندگی بھی بسر کرسکیں اور کچھ لیسے امیر کو جنھیں سوائے اپنی دولت کے کسی اور چیز کی فکر ہی نہ ہو۔ وہاں قومی ترقی کی فضا پیدا ہو بھی تو کیسے اور قومی ترقی سے پہلے سائنسی مزاج جس سے آنے والا کل روشن ہو، پیدا ہو تو کیونکر۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ منصوبہ کاری اور اس کی تشکیل کے لیے ایک ایسا سائنسی رویّہ اختیار کیا جائے جو تعمیر کے ارادوں اور جن کو اس سے فائدہ پہنچتا ہے۔ ان میں فرق نہ کرے

ایک فقرہ میں یوں کہا جا سکتا ھے کہ ھمیں اپنے سماجی احیا کے تمام تر ماحول کو مجموعی تعمیر کے زیر عمل لانا ھوگا۔ یقیناً یہ ایک طویل سفر ھے۔ لیکن اس منزل کو پانے کے لیے جو بھی چھوٹا بڑا قدم اٹھایا جائے وہ اس راہ کو کم کرنے کا موجب بنے۔

اور یہ تبھی ممکن ہے جبکہ ایسا نظام پیشِ نظر ہو جہاں عوام کو محض ووٹ لینے کا آلہ نہ سمجھا جائے یا انھیں محض خیرات حاصل کرنے والے انسان نہ مانا جائے، یا جن کو محض منڈی میں صارفین کا درجہ ہی نہ دیا جائے۔

ایک فقرہ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہمیں اپنے سماجی احیا کے تمام تر ماحول کو مجموعی تعمیر کے زیرِ عمل لانا ہوگا۔ یقیناً یہ ایک طویل سفر ہے۔ لیکن اس منزل کو پانے کے لیے جو بھی چھوٹا بڑا قدم اٹھایا جائے وہ اس راہ کو کم کرنے کا موجب بنے۔

آئینی طور پر ایک ایسے سیکولرزم کی ضرورت ہے جس میں پبلک پالیسیاں، پلان اور پروگرام کا کسی مذہبی رسم و رسوم سے کوئی ظاہر اواسطہ نہ رہے جہاں تک مذہب کا تعلق ہے وہ محض ذاتی اقتدار، اعتقاد، اور ان ذرائع تک محدود ہو جن سے روحانی شانتی حاصل ہو یا ذاتی یا خاندانی طرزِ زندگی بنے۔

حکومتوں کو مختلف مذاہب سے محض ایک سا دوری ہی نہیں رہنا ہوگا بلکہ اس کی احتیاط بھی کرنا ہوگی کہ کسی مذہب کو اکثریت یا غیر اکثریت کے معاملہ میں دخل اندازی کا شک تک نہ پہنچے اور اس طرح سائنسی مزاج کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ ایک معقول یکجان سماج تبھی تشکیل پا سکتا ہے جب ذاتی اعتقاد، رسم و رسوم اور ذہنی جھکاؤ نیز سماج سے تعلق رکھنے والے مسائل اور ان کی اہمیت کی حد بندی کی جائے۔ اس وقت ہم مذہبی ذہن کو نشر و اشاعت کے وسائل، پبلک جلسے جلسوں یا عوامی تحریکوں سے پیدا کرنے کی جو کوشش کر رہے ہیں اس کے مدِ مقابل نئے طرزِ عمل سے جو نتائج نکلیں گے وہ ظاہر ہیں۔ ایک مجرم کی بلا شرط مذہب، اپنی الگ حیثیت ہے جیسی کہ ایک وطن دوست یا غدار کی ہے۔ فرقہ پرستی کے خلاف یا قومی ایکتا اور انسانیت کے حق میں مذہبی اقدار کی دہائی نہیں دینا چاہیے۔ ان اقدار کی تو بجائے خود بہت اہمیت ہے۔ ان کی بنیاد سماج اور معاشی، اور نفسیاتی اقدار پر مضبوط کرنا چاہیے۔ اسی طرح ووٹ حاصل کرنے کے لیے مذہبی اپیل یا مذہبی جنون کا اگر سہارا لیا جائے۔ یا یہ شور اٹھایا جائے کہ ووٹ نہ دو گے تو قسمت کو پیٹو گے۔ تو ان باتوں کا سختی سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ ان شر انگیزوں کا پردہ فاش کر کے ان پر لعن طعن بھیجنا چاہیے۔

مخلوط مذاہب کا سماج جس کی بنیاد تمام مذاہب سے ایک سا سلوک کرنے پر ہے۔ اور جس کو مختلف مذاہب کے نشانوں اور رسم و رواج سے ہوا دی جاتی ہے اور جس میں سماجی، معاشی چونا گارا نہیں لگایا گیا اور آپسی رشتوں کی بنیاد باہمی ہمدردیوں پر قائم نہیں کی گئی وہ سیکولرزم کو کمزور کر دے گا۔

ظاہر ہے کہ تعلیم کو سائنسی رویّے اور طرزِ عمل کا مظہر ہونا ہوگا۔ مذہب کو تاریخی اور کلچرل ورثہ کے طور پر تو پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ سیکولر اصولوں کی بقا کی خاطر مذاہب کو ذاتی اعتقاد اور اقدار کی صورت میں محدود کیا جائے اور ان کی اقتصادی سماجی اور فلسفیانہ جڑوں کو غیر جانبداری کے ساتھ واضح کیا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ بھی دکھایا جا سکتا ہے کہ جابر سیاسی اور معاشی طاقتوں نے مذہب کو کس طرح سماج میں رخنہ اندازیاں پیدا کرنے میں استعمال کیا۔ ہم سماجی اور سیاسی طاقتوں کا اس لیے ذکر کرتے ہیں کیونکہ سرمایہ داری سے قبل سماج میں اقتصادی اور سیاسی طاقتیں ایک ہی تھیں۔ ان کا الگ ہونا سرمایہ داری کے زمانہ کی دین ہے۔

اسی طرح یہ بھی دکھانا ہوگا کہ غیر ملکی حکمرانوں نے مذہب کو لوگوں میں پھوٹ ڈالنے کا حربہ بنایا تاکہ وہ اپنی حکومت کو برقرار رکھ سکیں۔ سرمایہ دار سماج کی حکمراں جماعتیں امپیریلزم کے ساتھ

(باقی صفحہ پر)

مخلوط مذاھب کا سماج جس کی بنیاد تمام مذاھب سے ایک سا سلوک کرنے پر ھے۔ اور جس کو مختلف مذاھب کے نشانوں اور رسم و رواج سے ھوا دی جاتی ھے اور جس میں سماجی معاشی چونا گارا نھیں لگایا گیا اور آپسی رشتوں کی بنیاد باھمی ھمدردیوں پر قائم نھیں کی گئی وہ سیکولرزم کو کمزور کر دے گا۔

نکھل چکرورتی

ذرائع نشرواشاعت کا استعمال

آئیے اب اس ریاکاری کو ختم کریں

نکھل چکرورتی کہتے ھیں کہ یہ سیکولرزم ایک کہانی ھے افسانہ ھے جو ھم نے اپنے گرد بنا رکھا ھے۔ حقیقت تو یہ ھے کہ ھم نے لغات میں لفظ سیکولرزم کے معنی کبھی دیکھنے کی کوشش ھی نہیں کی۔ اسے طرز زندگی تو بنانا بہت دور کی بات ھے۔ کیا گاندھی جی واقعی سیکولر تھے؟ نکھل چکرورتی سوال کرتے ھیں ... ...نہیں۔ بالکل نہیں۔ کیوں اور کیسے؟ وہ اس کی وضاحت اس مضمون میں کرتے ھوئے کہتے ھیں کہ اس ریاکاری کو ختم کرنے کے لئے سرکار کو سرگرم رول ادا کرنا چاھئے۔ ھم اس قسم کی بے ھودگی کو کیوں برداشت کریں؟ وہ متنبہ کرتے ھیں کہ یہ وہ سوال ھے جس کا سامنا کرنے سے کبھی گریز نہیں کرنا چاھئے۔

ہم نے بطور ایک قوم کے اپنے گرد جو قصے کہانیاں بُن رکھے ہیں ان میں سے ایک ہمارے سیکولرزم کے بارے میں ہے۔ ملک میں شاید ہی کوئی لیڈر ہو جو اپنے آپ کو سیکولر نہیں کہتا ہو، لیکن اگر انہیں ذرا کھرچا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے اکثر فطری طور پر فرقہ پرست ہیں۔ درحقیقت ہمارے ذخیرۂ الفاظ میں جس لفظ کا سب سے زیادہ بے جا استعمال کیا گیا ہے وہ سیکولرزم ہے۔

ہم جب اس لفظ کو ریاکاری کا پردہ ڈالے بغیر بھی استعمال کرتے ہیں تب بھی ہم اس لفظ کے حقیقی معنی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہم سیکولرزم لفظ کا استعمال بڑھیاری کے متبادل کے طور پر کرتے ہیں۔ ہم میں سے بہت کم لوگ لغات میں سے اس لفظ کے معنی تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چیمبرز ٹوئنٹیتھ سنچری ڈکشنری میں صاف طور پر لفظ سیکولرزم کی تعریف اس طرح کی گئی ہے "یہ عقیدہ کہ سرکار، اصول تعلیم وغیرہ مذہب سے آزاد

ہم نے بطور ایک قوم کے اپنے گرد جو قصے کہانیاں بُن رکھے ہیں ان میں سے ایک ہمارے سیکولرزم کے بارے میں ہے۔ ملک میں شاید ہی کوئی لیڈر ہو جو اپنے آپ کو سیکولر نہیں کہتا ہو، لیکن اگر انہیں ذرا کھرچا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے اکثر فطری طور پر فرقہ پرست ہیں۔

ہم میں سے بہت کم لوگ لغات میں سے اس لفظ کے معنی تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چیمبرز ٹوئنٹیتھ سنچری ڈکشنری میں صاف طور پر لفظ سیکولرزم کی تعریف اس طرح کی گئی ہے "یہ عقیدہ کہ سرکار، اخلاقیات، تعلیم وغیرہ مذہب سے آزاد ہونے چاہئیں"۔

ہندوستان کے بارے میں بہت سے قصے کہانیاں ہیں اور ہم نے خود ان کہانیوں کو جوڑا اور پھیلایا ہے۔ ہم گاندھی جی کے عدم تشدد کا وارث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ہمیں معمولی اشتعال میں تشدد اور انتہائی گھناؤنے تشدد پر اترتے ہوئے کوئی گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہمیں آزادی پُرامن انتقال اختیارات کے ذریعہ حاصل ہوئی لیکن ہمارے رہنماؤں نے انتقال اختیارات کی پیشگی شرط کے طور پر ملک کی جو تقسیم منظور کرلی وہ بے رحمانہ فرقہ وارانہ قتل عام کے واقعات پر ہے اور اسے خواہ کوئی بھی نام دیا جائے پُرامن نہیں کہا جاسکتا۔

ڈکشنری میں صاف طور پر لفظ سیکولرزم کی تعریف اس طرح کی گئی ہے "یہ عقیدہ کہ سرکار، اصول تعلیم وغیرہ مذہب سے آزاد

● ایڈیٹر مین اسٹریم" نئی دہلی

ہونے چاہئیں۔ دوسرے الفاظ میں سیکولر سے مراد وہ چیز ہے جس کا مذہب سے کوئی تعلق نہ ہو۔ ایک نظریہ کے طور پر سیکولرزم یورپ کے احیائے علوم کی پیداوار ہے جب سماج پر کلیسا کا غلبہ ٹوٹ گیا اور سائنس نے پیشقدمی کی تو عقلیت کو بالادستی حاصل ہو گئی۔ یہ وہ پس منظر ہے جس میں سیکولرزم کا ظہور مذہبی امتناعی احکام سے پاک سماجی تعلقات کی ایک حالت کے طور پر ہوا۔

حکایت اور حقیقت

ہم اکثر سنتے ہیں کہ گاندھی جی سیکولر تھے لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ان کے کردار میں مذہب کو مضبوط دخل حاصل تھا جسے انھوں نے دیانت داری سے اپنے سیاسی و سماجی نظریے میں برقرار رکھا۔ گاندھی جی کیا تھے اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ انتہائی متحمل اور بردبار تھے اگرچہ وہ خود ہندو دھرم کو مانتے تھے تو وہ کسی اور شہری کے بدھ دھرم، اسلام یا عیسائیت کے عقیدے پر عمل کرنے کے حق کو برقرار رکھنے کیلئے کچھ بھی کرنے کو تیار تھے جب انھوں نے ہریجنوں کے مندروں میں داخلے کا جہاد شروع کیا تو وہ ذات پات کے نظام کے خلاف نہیں بلکہ اس کے ایک گھناؤنے پہلو کے خلاف مہم چلا رہے تھے۔ یقینی طور پر اس کا سماج کے سیکولر نظریے سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

اس کے کہ انھوں نے جمعہ کی نماز کے لئے لنچ کا وقفہ بڑھا دیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ بنگلہ دیش پاکستان کی اسلامی حکومت کا حصہ نہیں رہا اور سیکولر بنگلہ دیش میں جمعہ کو ہفتہ واری چھٹی قرار دینا غلط ہو گا ملا اس سے مطمئن نہیں ہوتے۔ ان کا ایک وفد حکومت کے سربراہ شیخ مجیب الرحمٰن کے پاس اپیل لے کر گیا۔ انھوں نے مولویوں کو بہت صبر سے سنا تب اپنے وزیر تعلیم کو بلایا جس نے اپنے خیال کی وضاحت کی کہ بنگلہ دیش اب پاکستان کی اسلامی حکومت کا حصہ نہیں رہا اور سیکولر بنگلہ دیش میں جمعہ کو ہفتہ واری چھٹی قرار دینا غلط ہو گا۔ مجیب الرحمٰن نے وزیر تعلیم کی بات دھیان سے سُنی اور کہا "آپ سیکولرزم کے ہندوستانی نمونے کی پیروی کریں، وہ کیا ہے؟ ہر مذہب کی ہر مذہبی تقریب پر چھٹی کر دیجائے۔"

آیئے اس کا سامنا کریں

ہمارے سیکولرزم کی تصویر یہ ہے جو ہم نے دوسرے ممالک میں اپنے دوستوں کے ذہن میں پیدا کی ہے۔ یہ ہماری متحمل مزاجی کا ضرورت سے زیادہ مشتہر کیا گیا ایک خاکہ ہے۔ ہماری سماجی و اقتصادی زندگی کو ایک معقول سائنسی شکل دینے کی کوئی کوشش نہیں کی جا رہی۔ اکثر ہمارے سیاسی پنڈت دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں ملی جلی ثقافت ہے۔ بظاہر یہ دعویٰ ایسا ہے جس کی کوئی وضاحت کرنا مشکل ہے۔ ہندوستان ایک ثقافتی دھارے کی کلاسیکی مثال ہے جس میں کئی ثقافتیں آکر شامل ہو گئی

ہماری قومی ترقی کے ایک خاص ۔۔۔ جدید رشاید مائل بہ ہے۔ صنعت کاری کی جو بنیادیں رکھی جا چکی ہیں ان کے نتیجے کے طور پر اقتصادی ڈھانچہ جدید لائنوں پر کھڑا ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم اپنے ملک میں مختلف قسم کے قبائلی طرز سے لیکر جدید صنعتی تک کئی قسم کے پیداواری تعلقات دیکھ سکتے ہیں۔ جن کے درمیان مختلف سطحیں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہی ہیں۔ ایسی بنیادوں پر استوار کیا گیا ثقافتی ڈھانچہ کبھی رسمی یا غیر مبدل نہیں ہو سکتا۔ اس میں سے انسانی شعور کی مختلف سطحوں کا عکس نظر آئے گا جن میں جاگیردارانہ شکل غالب ہے۔ یہ متوقع بھی ہے کیونکہ جدید طرز کے زرعی نظام کے اجرا کے باوجود ہماری دیہی معیشت اور دیہی ثقافت اب بھی بہت حد تک جاگیردارانہ نمونے کی ہی ہے۔

یہ جاگیردارانہ رنگ ڈھنگ

تاہم یہ سوچنا غلط ہو گا کہ جاگیردارانہ رنگ ڈھنگ صرف ان لوگوں تک ہی محدود ہے جو دیہات میں رہتے اور کام کرتے ہیں۔ شعوری رشتوں کی خانہ بندی نہیں کی جا سکتی۔ اگر ہم ارد گرد دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ ہمارے بہت سے سرکردہ سائنسدانوں کا نظریہ جاگیردارانہ ہے اور باوجود اس کے کہ انھوں نے سائنسی کاموں اور مشاغل میں عمر بسر کی ہے وہ اب بھی سماجی اور ذاتی معاملات میں جاگیردارانہ توہمات کو قبول کرتے ہیں۔ اس کا سبب تلاش کرنا

> ہمیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ہمارے سماج کے بعض حصوں میں ہمیں جدیدیت کا جو مظاہرہ نظر آتا ہے وہ بھی کسی حد تک نمائشی ہی ہے کیونکہ دوسری جانب جاگیردارانہ شعور کے ایک وسیع سمندر نے پورے سماج کو گھیر رکھا ہے۔

ہندوستان کے سیکولرزم کے بارے میں ایک دلکش مگر بہت بیانیہ کہانی ہے۔ بنگلہ دیش کی آزادی کے فوراً بعد شیخ مجیب الرحمٰن نے اقتدار سنبھالتے ہی ایک ایسے شخص کو وزیر تعلیم مقرر کیا جو بہت عقلمند، فراخدل اور جس نے زندگی بھر فرقہ پرستی کی مخالفت کی تھی۔ اس نے وزارت کا چارج لینے کے بعد تعلیمی اداروں میں جو پاکستان دور کی روایت تھی جمعہ کی چھٹی منسوخ کرنے کا اعلان کر دیا۔ مولویوں اور ملاؤں نے احتجاج کیا لیکن وزیر تعلیم جھکے نہیں سوائے

ہیں لازمی طور پر اس میل جول سے جو کلچر بنا وہ متنوع ہو گا۔ ہندوستانی ثقافت کو اس لحاظ سے ایک ملی جلی ثقافت کہا جا سکتا ہے کہ یہ مختلف ثقافتوں کے باہمی عمل سے ابھری ہے۔

لیکن ہمارے ملک میں بہت سے لوگ مشترک ثقافت کی اصطلاح کا جس ڈھیلے طور پر استعمال کرتے ہیں اس سے یہ محسوس ہوتا ہے گویا یہ ثقافتوں کا اکٹھ یا مختلف تہذیبوں کی ہم وجودیت ہے۔ انضمام کی بجائے اس قسم کی ہم وجودیت

مشکل نہیں ہے۔ اگرچہ بہت سے لوگ سائنس کا مطالعہ کرتے ہیں لیکن ان کی پرورش، تعلیم اور خاندانی ماحول کی جڑیں اب بھی جاگیردارانہ نظام زندگی کے اندر گہرائی تک گئی ہوئی ہیں۔

لہٰذا ہمیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ہماری سماج کے بعض حصوں میں ہمیں جدیدیت کا جو مظاہرہ نظر آتا ہے وہ بھی کسی حد تک نمائشی ہی ہے کیونکہ دوسری جانب جاگیردارانہ شعور کے ایک وسیع سمندر نے پورے سماج کو گھیر رکھا ہے۔

ہم نے جاگیردارانہ شعور کی ترویج کا طرز یادگار لکا اپنے حالات میں سامنا کرنے کے لیے کیا کیا ہے؟ کوئی بھی قوم جو ایک آزادانہ راستہ اختیار کرنے والی ہو اسے قومی یکجہتی کو مضبوط کرنے کے لیے اپنے افرادی و مادی ذرائع کی شیرازہ بندی کرنی ہوتی ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ یہ ہے کہ اپنے تمام لوگوں کے شعور کو نکتہ سے ہٹ کے جاگیردارانہ نظام سے بلند کیا جائے۔ اگر قوم پرستی کو جاگیردارانہ گوشوں کی تغیر دنیا کے مقابلے میں متحد کرنے والی ایک قوت تسلیم کر لیا جائے تو اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ قومی شعور کو بیدار کرنے کا کام تعلیمی ذرائع سے انجام دیا جائے۔ ہماری آزادی کی جدوجہد کے معرکۂ علم سے ہی جس میں اتحاد کے جذبے پر بہت زور دیا گیا تھا، ہمارے عوام میں قومی اتحاد کا شعور پیدا کرنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ اس سمت میں کوئی بھی کوشش فرقہ پرستی میں پائے جانے والے جاگیردارانہ نظریے کا مقابلہ کرنے کے لیے ہماری کامیابی کا پیمانہ بن سکتی ہے۔

لیکن ہم اسے برداشت کیے جا رہے ہیں

اس معاملے میں آزادی کے بعد ہماری کارکردگی مایوس کن رہی ہے۔ ہمارے آئین سازوں نے تعلیم کو ریاستی اختیارات کے دائرہ کار میں شامل کر دیا جس کا مطلب ہے کہ وہ اسے بہت کم اہمیت دیتے ہیں کیونکہ ریاستی سرکاروں سے نہ یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ قومی نظریہ اپنائیں گی اور نہ ہی ان کے پاس قومی تعمیر کے ایسے بڑے کام کے لئے کافی مالی وسیلے ہو سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آزادی کے علمبردار کی پیڑھیاں اس شعور سے کوری چلی آ رہی ہے جو صرف قومی جدوجہد آزادی کے مجموعی تصور سے انھیں دیا جا سکتا تھا۔ جدوجہد آزادی کی تاریخ کے بارے میں اس لاپرواہی کے سبب ہمارے نوجوان اپنی عظیم وراثت سے بے خبر ہیں اور اس کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ ایک برطانوی فلمساز کی طرف سے گاندھی جی کی ذاتی داستان زندگی کی معمولی تصویر کشی نے لاکھوں تماشائیوں کو اپنی جانب متوجہ کیا جن میں سے اکثر نوجوان تھے۔ ان کے لیے یہ تصویر ایک ایسی داستان سے روشناسی کی مانند تھی جس کا انھیں علم نہیں تھا۔

جہاں آزادی کے بعد تعلیم کے عمل کو دی گئی کمتر ترجیح نے ہندوستانیوں کی نسلوں کو اپنی تاریخ کے بارے میں علم اور اس کی بدولت یکتا کا جذبہ پیدا کرنے سے محروم رکھا ہے، وہاں پارلیمانی نظام نے جو ہم نے برطانوی نظام کے نمونے پر قائم کیا ہے، تنگ دل ذات پات فرقہ وارانہ وفاداریوں کو فروغ دینے میں مدد دی ہے کیونکہ ہر امیدوار کو اپنے چناؤ کے لیے حلقے میں فرقہ وارانہ ترکیب کی جانب دیکھنا پڑتا ہے اور ووٹ حاصل کرنے کی دوڑ میں ان وفاداریوں کی ناز برداری کرنی پڑتی ہے۔ اس طرح ہمیں ایک عجیب اور متضاد صورت حال کا سامنا ہے اور جہاں بالغ حق جمہوری کامیابی کی جانب ایک سنگ میل ہے وہاں اس نے ہماری سیاست کے جسم میں ذات پات اور فرقہ وارانہ وفاداریوں کے افسوسناک دباؤ بھی پیدا کئے ہیں۔

اور ذرائع ابلاغ کیا کرتے ہیں؟

اسی مرض کے ایک حصے کے طور پر کہ ہندوستان میں ذرائع ابلاغ کم و بیش فرقہ پرستی اور ذات پرستی کے خلاف جہاد میں اپنی اہم ذمہ داری سے دستکش ہو گئے ہیں، ہو سکتا ہے کہ اخبارات مجموعی طور پر فرقہ پرستی اور ذات پات کو ہوا دے رہے ہوں لیکن اس نے ہماری قومی زندگی میں سرگرمی سے جاگیردارانہ نظام کی اس گھناؤنی شکل کا مقابلہ کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ لوگوں کو توقع تھی کہ آئین اور سیکولرزم کی مدد سے سرکاری ذرائع ابلاغ فرقہ پرستی اور ذات پات کا مقابلہ کرنے کی شعوری کوشش کریں گے۔ بے شک ریڈیو اور ٹی وی سے کبھی کبھی سیکولرزم کی تلقین کرنے والے نعرے سنائی دیتے ہیں لیکن ان دونوں برائیوں کو ختم کرنے کی سمت کوئی مصمم کوشش کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا جاتا۔ بلکہ ہمیں یہ عجیب منظر دیکھنے کو ملتا ہے کہ کوئی نہایت اہم شخصیت سرکاری دائرہ کار کے کسی ادارے کا ہندو رسومات کے پورے ساز و سامان کے ساتھ افتتاح کرتی ہے۔ اور بڑی عجیب بات یہ ہے کہ ریڈیو اور ٹی وی نظام کے ذمہ دار افسران ایسی خبروں کو اپنے پروگراموں سے باہر رکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ایسی رسومات میں شرکت کرنے والا وزیر ہمارے لئے سیکولرزم کے نقطۂ نگاہ سے برا ہے لیکن اس واقعہ کو ٹیلی ویژن یا ریڈیو سے پیش کرنا اس سے بھی برا ہے۔

اس ساری صورت حال نے ہمارے ملک کو انتہائی بے ہودگی کی حالت پر لا کھڑا کیا ہے۔ ایک طرف تو ہم دن رات سیکولرزم کی وفاداری کا دم بھرتے ہیں لیکن دوسری جانب نہ ہمارا تعلیمی اور نہ ہمارا نشریاتی نظام سیکولرزم کے صحیح پیغام کو عوام تک پہنچا سکا ہے۔ ہمارا انتخابی نظام جس طرح ذات پات اور فرقہ وارانہ وفاداریوں سے اپیل کرنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اس نے ہمارے سیکولرزم کے دعوی کو مذاق بنا کر رکھ دیا ہے۔

اس لغویت کا ساتھ کیوں دیں؟ یہ ہے وہ سوال جس سے ہمیں کبھی گریز نہیں کرنا چاہئے۔ ●

لوگوں کو توقع تھی کہ آئین اور سیکولرزم کی مدد سے سرکاری ذرائع ابلاغ فرقہ پرستی اور ذات پات کا مقابلہ کرنے کی شعوری کوشش کریں گے۔ بے شک ریڈیو اور ٹی وی سے کبھی کبھی سیکولرزم کی تلقین کرنے والے نعرے سنائی دیتے ہیں لیکن ان دونوں برائیوں کو ختم کرنے کی سمت کوئی مصمم کوشش کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا جاتا۔

خشونت سنگھ*

ذرائع نشر و اشاعت کا استعمال

مذہب سماج کو بہتر بنا رہا ہے

چیف ایڈیٹر:۔ زندگی اِن دنوں بالکل انحطاط کی طرف مائل ہے، روزمرہ کی اپنی زندگی پر نظر دَوڑانے سے پتہ چلتا ہے کہ ہر طرف دہشت گردی، فرقہ وارانہ فسادات، رجعت پسندی اور ظلمت پسندی کی لہر اور کیا کچھ دیکھنے کو نہیں ملتا، کیا یہ سب وہ بیہودگیاں نہیں ہیں جن میں ہم اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ آپ کے ان سب کے بارے میں کیا محسوسات ہیں۔

بلاشبہ افراتفری کی یہ زندگی جس میں ہم سانس لے رہے ہیں، انتہائی خطرناک صورت اختیار کرتی چلی جا رہی ہے لیکن اس کے باوجود باہمی آویزش، فرقہ وارانہ ٹکراؤ اور یہ منافقانہ رنگ بدستور سرگرمی کے ساتھ ہماری زندگی میں قدم جماتا چلا جا رہا ہے۔ کیا آپ اس صورتِ حال کے بارے میں کچھ کہنا چاہیں گے؟

خشونت سنگھ:۔ میں اس بات سے متفق ہوں کہ آج ہندوستان میں زندگی وحشیانہ، غلیظ، بدمزہ اور گندہ رنگ اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ اکثر مختصر بھی ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں اس بات میں یقین رکھتا ہوں کہ اس طرح زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔ دہشت گردی ہو، یا فرقہ وارانہ تشدد ہو یا مذہبی تعصب و تنگ نظری کا اظہار ہو، ہماری ان تمام مشکلات اور مصائب کے پیچھے تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی ہے۔ ہماری زمین تنگ ہے اور اس پر بہت سے لوگ زندگی گزار رہے ہیں اور انھیں اس کی اُمید نہیں کہ وہ اپنی روزی روٹی کما سکیں گے۔ مستقبل کے بارے میں اس غیر یقینی صورتِ حال نے نوجوانوں کو توڑ پھوڑ، انتشار، لاقانونیت اور مذہبی رجعت پسندی، اندھی تقلید کی طرف موڑ دیا ہے اور وہ پریشان صورتِ حالات سے دوچار ہیں۔

چیف ایڈیٹر:۔ مذہب اپنی موجودہ صورت میں اپنی افادیت کھو بیٹھا ہے۔ یہ اب زندگی کو جوڑنے کی بجائے استحصال پسندی کا ایک ذریعہ بن گیا ہے۔ آپ اس خیال کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

خشونت سنگھ:۔ ادارہ جاتی صورت میں مذہب بلاشبہ اپنی افادیت کھو چکا ہے۔ یہ عوام کے لیے افیون نہیں بلکہ شر پسند روحانی مشروب بن گیا ہے۔ یہ اپنے ماننے والوں کو ان لوگوں کے خلاف بھڑکاتا ہے جو دوسرے مذاہب اور عقائد کے پیروکار ہیں۔ ہمیں ایک ایسا مذہب نکالنا چاہیے جو کام کے اصولوں پر مبنی ہو اور جو دوسروں کے کام اور خدمات کا احترام کرنا سکھائے۔ اس کے لیے دو نعرے ہونے چاہئیں۔ ایک یہ کہ کام ہی پوجا اور عبادت ہے لیکن عبادت یا پوجا کام نہیں ہے"۔ اور دوسرا یہ کہ آپ دوسرے انسانوں کے جذبات کو چوٹ نہ پہنچائیں۔"

چیف ایڈیٹر:۔ مذہب عملاً نوعِ انسانی کو فرقوں کے پنجروں میں بانٹتا ہے، جہاں ہمارے اندر ایک قسم کا غلط فخر اور تعصب و تنگ نظری پیدا ہوتی ہے۔ ہم زندگی میں اپنے تشخص پر زور دیتے رہے ہیں۔ کیا زندگی کو اسی طرز سے آگے بڑھنا چاہیے۔

میرا یقین ہے کہ آپ اس طرح کی پابندیوں میں یقین نہیں رکھتے جو انسانی برادری کو خانوں میں بانٹ دے اور اس سماج کو پنجرے کی زندگی گزارنا سکھائے۔ آپ کے خیال میں وہ کیا اقدامات ضروری ہیں جن سے یہ پابندیاں مٹ جائیں اور ہم محض بطور ایک انسان زندگی گزار سکیں۔

خشونت سنگھ:۔ ہمیں فرقہ کے نام پر بنے ہوئے پنجروں میں اپنی زندگی کو محصور نہیں کرنا چاہیے لیکن پھر بھی ہمیں کسی نہ کسی فرقے سے جُڑے ہونے کا احساس باقی رہنا چاہیے۔ میرا اعتقاد یہ ہے کہ خدا یا دوسری غیر مادی اشیاء کی ہستی کے بارے میں ہمیں نہ تو علم ہے اور نہ اس کا علم غالباً کبھی ہوا ہے لیکن پھر بھی اپنے جذبات کی آسودگی کے لیے یہ ضروری سمجھتا

* صحافی اور ممبر پارلیمنٹ۔

ہوں کہ میں بطور سکھ پہچانا جاؤں۔

چیف ایڈیٹر:۔ اس کے لیے واحد طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے طریقوں میں بنیادی تبدیلی لائیے۔ ان پوتر اور مقدس تحریروں کا جادو توڑ ڈالیں اور جذبۂ انسانیت اور معقولیت پسندی کی راہ پر چلنے کے لیے سرگرمی سے کام کریں۔ آپ کے اس بارے میں کیا خیالات ہیں؟

خشونت سنگھ:۔ مذہبی تحریروں کے لیے میرے دل میں بہت زیادہ عزت و توقیر نہیں ہے۔ ان میں زیادہ تر بور کرنے والی ہیں، ایک ہی بات کو بار بار دہرانے اور کہنے والی ہیں اور ادب کے شہ پارے کے روپ میں ان کی عظمت کو بہت بڑھا چڑھا دیا ہے۔ یہ بیک وقت تمام پوتر تحریروں کو پڑھنے کے مقابلے مجھے شیکسپیر کے پڑھنے سے زیادہ اخلاقی طاقت ملتی ہے۔

چیف ایڈیٹر:۔ آپ اخبارات کی کارگزاری کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس طرح کے اہم مسائل سے قطعی دلچسپی نہیں ہے۔ موجودہ زندگی کو پاک و صاف بنانے میں اُن کی کوششوں کی راہ میں فی الواقعی کیا چیز حائل ہے۔

خشونت سنگھ:۔ ہمارے اخبارات کا زیادہ تر جھکاؤ سیاسی دھڑے بندی پر ہے۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے جتنے بھی مشہور روزنامے اور رسائل ہیں، اُن کے ایڈیٹر زیادہ تر وہ ہیں جو سیاست کے علاوہ اور کچھ پڑھتے ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایڈیٹر کی کرسی پر رہتے ہوئے ان کا رعب ہوتا ہے مگر جوں ہی وہ ریٹائر ہو جاتے ہیں، ان کی عزت بہت کم رہ جاتی ہے اور وہ گوشۂ گمنامی میں چلے جاتے ہیں۔

چیف ایڈیٹر:۔ سرکار کے زیر نگرانی میڈیا کو اس کی اپنی موجودہ صورت میں آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ کیا وہ سائنسی مزاج کو فروغ کی آئینی ذمہ داری سنجیدگی سے نبھا رہا ہے۔

خشونت سنگھ:۔ سرکاری نگرانی میں کام کرنے والے نشر و اشاعت کے اداروں کا اس وقت خاص کام یہ ہے کہ وہ پروگراموں کے درمیان نصیحت آمیز کلمات نعرے کے طور پر دہراتے رہتے ہیں۔ ان اداروں کا بڑا وقت مذہب سے متعلق پروگراموں مثلاً کیرتن، قوالی اور بھجن میں ضائع ہوتا ہے۔ مذہبی امور کی بات چیت پر زیادہ اور سائنسی موضوعات پر کم بات چیت یا تبادلۂ خیال ہوتا ہے۔ سرکار کو اپنے تجربے سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ آل انڈیا ریڈیو اور دور درشن روزانہ ہی کسانوں کو فصلوں کو اُگانے اور ان کے بارے میں کھاد، جراثیم کش دواؤں کے استعمال کے بارے میں بتاتا ہے۔ اس پروگرام میں مویشیوں کی پرورش وغیرہ جیسے اہم معلوماتی موضوعات بھی شامل کئے جاتے ہیں۔ ان پروگراموں سے کھیتی کو جدید بنانے میں بہت فائدہ ہوا ہے اور ہمارے کسانوں نے اُن سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مذہب پر بدستور برابر زور دیا جاتا رہا ہے جس سے بلاشبہ بے سوچے سمجھے دیرینہ عقائد پر جمے رہنے کا ذہن تیار ہوتا ہے۔

چیف ایڈیٹر:۔ مان لیجیے کہ آپ کو سرکار کی ماتحتی میں چلنے والے ذرائع ابلاغ کی ذمہ داریاں سونپ دی جائیں تو آپ ان ذرائع سے بامقصد کام لینے کے لیے کیا ٹھوس قدم اٹھائیں گے۔

خشونت سنگھ: میں مذہب سے جڑے ہوئے تمام پروگراموں کو منسوخ کر دوں گا، جو لوگ کیرتن وغیرہ کے شوقین ہیں، وہ ان کا بندوبست مندروں، گوردواروں اور درگاہوں پر کر سکتے ہیں۔

دوسرے میں متناقض اور متضاد شخصیتوں کی اُن مفکرین سے براہ راست بات چیت کراؤں گا جو اُن سے اتفاق نہیں کرتے تاکہ عوام کے سامنے اُن کی پول کھل سکے۔ اگر جرنیل سنگھ بھنڈراں والے کو مجھ جیسے شخص سے براہ راست گفتگو کرنے کو کہہ دیا جاتا اور یہ بات چیت ٹی وی پر ہوتی تو میں نے اسے اس سے بہت پہلے جبکہ اس کا خاتمہ ہوا، بحث میں پچھاڑ دیا ہوتا۔ آج بھی ارون شوری اور میری طرح کے آدمیوں کو مسٹر لونگووال، مسٹر ٹوہرہ اور مسٹر بادل وغیرہ سے بات چیت کرنے کے لیے کہا جائے اور ان کو آنندپور صاحب کی قرارداد پر تبادلۂ خیال کے لیے تیار کر لیا جائے تو ہم اُن کے خطروں اور اندیشوں کا پردہ چاک کر سکتے ہیں کہ یہ اپنے اندر علیحدگی پسندی کا کوئی عنصر نہیں رکھتی۔ مسٹر بال ٹھاکرے کو مسٹر اے جی نورانی اور مسٹر گووند تلوالکر سے ملانا چاہیے، تاکہ عوام پر یہ ظاہر ہو سکے کہ وہ کتنی بے سوچی سمجھی بات کر رہے ہیں۔

چیف ایڈیٹر:۔ ہمارے مشوروں کے تحت ان باتوں پر زور دیا گیا ہے:۔

۱۔ مذہب کو نظر بند کر دو اور اسے گھروں اور عبادت گاہوں تک ہی رہنے دو۔ نیز ہر طرح کے مذہبی جلسے جلوسوں پر پابندی کی تحریک چلانی چاہیے۔ تعلیمی نظام میں ضروری تبدیلی لائی جائے تاکہ ذہن صحیح سمت میں موڑے جا سکیں اور سرکاری ذرائع ابلاغ سے جذبۂ انسانیت اور معقولیت پسندی کو فروغ دیا جائے۔ آپ اس پر کوئی تبصرہ کرنا چاہیں گے۔

خشونت سنگھ:۔ میں آپ سے پوری طرح متفق ہوں کہ مذہب کو گھر اور عبادت گاہوں تک ہی محصور کر دیا جائے۔ کسی بھی طبقے کو جلوس نکال کر مذہبی جنون کے اظہار کی اجازت نہ دی جائے۔ یہ گلیاں تو پہلے ہی بھیڑ بھاڑ والی ہیں، عام جگہوں پر جلسے وغیرہ کی اجازت نہ ہو اور بڑے پیمانے پر بھنڈارہ لگانے کی اجازت نہ دی جائے۔ اسکولوں اور کالجوں میں مذہبی تعلیم نہ ہو، اس سے بھی مجھے اتفاق ہے اور نہ ہی ان اداروں کی حوصلہ افزائی کی جائے جو مذہب کی توسیع و اشاعت سے وابستہ ہیں، ہمارے سماج کو پارہ پارہ کرنے میں مذہب ایک واحد ذریعہ ہے اور یہ سماج میں تباہی لانے والا عنصر ہے۔ ●

این سی مینن*

ذرائع نشر و اشاعت کا استعمال

اور یہ خرافات کا سلسلہ جاری ہے

اِس خرافاتی منظر کو بدلنا، مینن کی رائے میں بلاشبہ ایک بہت بڑا کارِ دارد ہے — لیکن اس کے ساتھ ہی آج اس امر کی یقین دہانی کرنا بہت ضروری ہے کہ فرقہ پرستی، تعصب، مذہبی کٹرپن اور تشدد کے ہاتھوں ملک کا اتحاد پارہ پارہ نہ ہو جائے۔ انھوں نے مزید کہا ہے کہ ہم سب کے لیے ضروری ہے کہ "مذہب کو اس طرح کھلا چھوڑنے" سے روکا جائے جو ہماری ملکی بیماریوں کا مرکزی نقطہ بن گیا ہے۔

ہم خرافات سے کیوں نباہ کرتے ہیں؟

اس کا فوری جواب ہے۔ کیوں کہ ہم ایک خرافاتی دُنیا میں رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم خرافات سے نباہ نہیں کرنا چاہتے تو ہمارے پاس اس دُنیا کو بدلنے کے لیے کوئی متبادل نہیں ہوگا، جس سے ایک دوسرے سے رو برو ہونے — بات چیت، تعاون اور ٹکراؤ کے روائتی طور طریقوں کو تبدیل کیا جا سکے۔

یہ بلاشبہ ایک بہت ہی بڑا کام ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار کی گہما گہمی میں متعدد ہستیوں نے دُنیا کو بدلنے کا بیڑا اٹھایا۔ بعض تو راہ ہی میں گر کر رہ گئے اور ان کی یاد بھی باقی نہیں رہی۔ دوسروں نے دُنیا کو کم و بیش حد تک بدلنے میں کامیابی حاصل کی۔ بعض کا اثر تو عالمگیر ہے۔ جیسے یسوع مسیح، بدھ اور حضرت محمدؐ جیسے مذہبی پیشوا، آئنسٹائن جیسے سائنس دان اور مہاتما گاندھی جیسے انسانیت نواز لیکن کیا اُن کے اثر کو اسی طرح ثبات حاصل رہی جس طرح شروع میں خیال کیا گیا تھا!؟ مسیح کے پیروکار کیتھولکوں اور پروٹیسٹنٹوں میں بٹ گئے اور آئرلینڈ میں ایک دوسرے کا صفایا کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ پیغمبرِ اسلام کے پیروکار شیعوں اور سُنیوں میں تقسیم ہو گئے اور تب سے نبرد آزما ہیں۔ جہاں تک بُدھ اور اس کے جانشینوں کا تعلق ہے انھوں نے بھی جنوب مشرقی ایشیا میں خودسوزی کے ذریعہ تشدد سے کام لیا ہے اور وہ سری لنکا میں سیاسی مذہبی انتہا پسند بن گئے ہیں۔

تمام مذہبی کتب میں یکساں تعلیمات دی گئی ہیں۔ مادہ برداشت، محبت، صداقت وغیرہ وغیرہ۔ ظاہراً کسی جگہ حالات کے موڑ پر مذاہب کے نام کا لیبل اُن اصولوں سے زیادہ اہم ہو گیا جن کا انھوں نے پرچار کیا تھا۔ اس کے نتیجے میں مذہب پریشان ذہنوں کے اعتقاد کے لیے آسودگی کی بجائے تعصباتی "ٹکراؤ" کا ذریعہ بن گیا۔

دوسروں کے بارے میں کیا ہوا؟ آئنسٹائن کی شاندار سائنسی ذہانت علم کی سرحدوں کو دُور تک لے گئی لیکن اس نے اجتماعی تباہی کے ہتھیاروں اور خلائی جنگ کے منظر کے فروغ میں بُزدلانہ حصہ بھی لیا ہے۔ امن کے دیوتا مہاتما گاندھی خود ایک قاتل کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔ اُن کی انسان دوستی جس کا مقصد نہایت فرد مایہ پسماندہ لوگوں کو اوپر اٹھانا تھا وہ بدترین قسم کے سرکاری کنٹرول میں آ گئی ہے جس کے ساتھ ہی گاندھی جی کے بھی پروگراموں کو غیر اصولوں والے اصلاح کاروں کے گروہوں کی طرف سے عمل میں لایا جا رہا ہے جو سماجی برائیوں کو مثالی لیکن سطحی طور پر دُور کرنا چاہتے ہیں۔

انسان دوستی کیونکر اور کیوں؟

تب اس امر کی یقین دہانی کے لیے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے کہ انسان دوستی اور عقلیت پسندی کا بول بالا ہوگا؟ ہم اس امر کی یقین دہانی کیوں کر کر سکتے ہیں کہ ملک کا اتحاد فرقہ پرستی، تعصب،

* ایڈیٹر، ہندوستان ٹائمز، نئی دہلی۔
۱۵ راگست خصوصی شمارہ

مذہبی کٹرپن اور تشدد ان چار مذہب پرستی کے گھوڑ سواروں کے ہاتھوں پارہ پارہ نہیں ہو جائے گا جو ملک کے مختلف حصوں میں دوڑ رہے ہیں؟

ہمارے بیشتر مصائب کی جڑیں اس امر میں پائی جاتی ہیں کہ ہمارے ہاں ایسا کوئی فرقہ نہیں ہے جو فرقہ وارانہ رنگت کے بغیر ہے۔ مغرب کے معانی میں ایک فرقہ ایسے لوگوں کا گروہ ہے جو قریبی طور پر رہتا ہے اُن کے مقامی مسائل یکساں ہوتے ہیں، ایک سے مقامی سٹوروں سے مال خریدتے ہیں اور اپنے بچوں کو ایک سے نواحی اسکولوں میں بھیجتے ہیں۔ اس کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں کہ کوئی عیسائی ہے یا یہودی ہے یا کچھ اور ہے۔

بدقسمتی سے ذات پات کے نظام میں ابتدائی طور پر محنت سے متعلقہ گروہوں میں گراوٹ آجانے سے ہمارے فرقے واضح طور پر ناقابلِ یقین اور بکھرے ہوئے واضح ذاتیے گروہوں کے ہجوم بن گئے ہیں جس میں ہر گروہ اپنے انتشار اور تعصبات رکھتا ہے۔ جیسا کہ ترقی پذیر ممالک میں اکثر ہوتا ہے صورتِ حال اُس وقت بدتر ہو جاتی ہے۔ جب لوگوں کی ایک بھاری تعداد کو ناکافی اقتصادی اور سماجی فوائد کے لیے بھی بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے۔

تعصب، مذہبی کٹرپن اور تشدد ایک ہی بات یعنی خوف سے پیدا ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

یہ شکست، خودداری کے مٹنے، زندگی، جائداد، غلامی، سخت گیری اور مختلف قسم کا خوف ہے۔ جو کسی شخص کو تشدد پر اترنے کے لیے کافی خطرناک بنا دیتا ہے لیکن تمام معاملوں میں خوف بے بنیاد ہوتا ہے۔ لہٰذا ردِ عمل ناقابلِ معافی ہے۔ جب کٹر مذہب پرست خمینی حکومت نے طہران میں کنٹرول سنبھالا تو اس نے اس خوف سے ہزاروں اشخاص کو موت کے گھاٹ اُتار دیا کہ وہ اُن کی حکومت کے خلاف سازش کر سکتے ہیں۔ بلاشبہ کچھ لوگ تھے جو عقیدے کی وجہ سے شاہ کی حکومت کو واپس لانا پسند کرتے تھے لیکن جن بیشتر لوگوں کو گولیوں سے بھون ڈالا گیا یہ اُن کی قدرتی غلطی تھی کہ انھوں نے کافی پہلے خمینی کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ ان ہلاک ہونے والے سینکڑوں لوگوں نے اپنے [illegible]

کے ساتھ مل کر لازماً شاہ اور خمینی سے ایک سی شدت کے ساتھ نفرت کی ہو۔ ایسا ممکن ہے۔

سِکھوں کا معاملہ

بھارت میں سِکھوں کی مثال لیجئے۔ یہ ایک محنتی اور خوشحال فرقہ ہے۔ جو آسانی سے مخالف حالات اور ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا کر لیتا ہے اور چوٹی پر پہنچ جاتا ہے، لیکن وہ بھی مذہب پرست لوگ ہیں خاص کر وہ جو دیہات میں رہتے ہیں ۔ محض سکھ لیڈروں کے ایک گروپ کی وجہ سے جن میں سے کچھ سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لیے اور کچھ اپنی سیاسی طاقت برقرار رکھنے کے لیے کوشاں ہیں انھوں نے اپنے مقصد کے لیے مذہب کو غلط صورت میں پیش کیا جس سے بعض سکھوں نے خطرہ محسوس کرنا شروع کیا۔ انھیں بتایا گیا کہ سکھوں کا تناسب فوج میں جان بوجھ کر کم کیا جا رہا ہے (بلاشبہ اُن کا تناسب کم ہوا ہے لیکن محض اس لیے کیونکہ خوشحال پنجابی کسان فوجی کیریئر اپنانے میں کم دلچسپی لے رہا ہے) پھر انھیں بتایا گیا کہ پنجاب کے خلاف اقتصادی طور پر اور ترقیاتی ترجیحات میں امتیاز برتا جا رہا ہے (اقتصادی طور پر نہیں بلکہ ریاست کچھ بڑی صنعتوں کے ساتھ ترقی کر سکتی تھی)۔

اس نوعیت کی ایک اہم بدقسمتی سے جرنیل سنگھ بھنڈراں والے کے عروج کے ساتھ [illegible] مزاج اور [illegible] تھا [illegible] تھا کچھ عرصہ تک

تمام مذہبی کتب میں یکساں تعلیمات دی گئی ہیں۔ مادہ برداشت، محبت، صداقت وغیرہ وغیرہ۔ ظاہراً کسی جگہ حالات کے موڑ پر مذاہب کے نام کا لیبل اُن اصولوں سے زیادہ اہم ہو گیا جن کا انھوں نے پرچار کیا تھا، اس کے نتیجے میں مذہب پریشان ذہنوں کے اعتقاد کے لیے آسودگی کی بجائے تعصباتی ٹکراؤ کا ذریعہ بن گیا۔

امن کے دیوتا مہاتما گاندھی خود ایک قاتل کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔ اُن کی انسان دوستی جس کا مقصد نہایت حقیر طور پر پسماندہ لوگوں کو اوپر اُٹھانا تھا وہ بدترین قسم کے سرکاری کنٹرول میں آگئی ہے جس کے ساتھ ہی گاندھی جی کے نجی پروگراموں کو غیر اصولوں والے اصلاح کاروں کے گروہوں کی طرف سے عمل میں لایا جا رہا ہے۔ جو سماجی بُرائیوں کو شمالی لیکن سطحی طور پر دُور کرنا چاہتے ہیں۔

سب نے اُس سے سیاسی طور پر فائدہ اٹھایا جبکہ
کم از کم کچھ عرصہ بعد اُسے اپنی ذاتی طاقت کی حد
کا احساس ہوا جبکہ وہ سیاستدانوں کے لیے کسی فائدے
کا نہ رہا اور اُس نے اپنے مذہبی کٹرپن کی سیاست
کا کھیل کھیلا۔
یہ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ایسے

کا بڑا مرکزی مقام یہ ہے کہ مذہب کو کھلا چھوڑ
دیا جاتا ہے اور اس صورت حال سے باہر نکلنے
کا واحد راستہ یہ ہے کہ مذہب کو افراد کے گھروں
اور پرستش کے مقامات تک محدود کیا جائے۔
پنجاب میں مصائب کا جاری رہنا ظاہراً اس
امر کا نتیجہ ہے کہ مذہب کو سیاست میں گھسیٹا
جا رہا ہے اور گوردواروں کے باہر

دور کے تصادموں میں پیدا ہوا ہو اور جو اپنے
معاشرے کی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتا ہے۔ پروپیگنڈے
کے مؤثر ہونے کے لیے عام دلچسپی کا ہونا ضروری
ہے۔ پروپیگنڈہ اُس وقت مؤثر نہیں ہوتا جب
وہ ایک فرد کے تعصب پر مبنی ہو جب وہ مجموعی
دلچسپی کے مرکز پر مبنی ہو اور عوام اُس میں شریک
ہوں وہ بہت مؤثر ہوتا ہے۔
یہی وجہ ہے کہ بھارت میں مذہبی بنیاد

لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قومی بیماریوں کا بڑا مرکزی مقام یہ ہے کہ مذہب کو کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے اور اس صورتِ حال سے باہر نکلنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ مذہب کو افراد کے گھروں اور پرستش کے مقامات تک محدود کیا جائے۔ پنجاب میں مصائب کا جاری رہنا ظاہراً اس امر کا نتیجہ ہے کہ مذہب کو سیاسیات میں گھسیٹا جا رہا ہے اور گوردواروں کے باہر لایا جا رہا ہے۔

لوگ ہیں جو فرقہ وارانہ تصادموں
سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بعض خود بخود ہونے والی
"لوٹ مار" کی تنظیم کرتے ہیں اور دوسرے ایسے
حربے استعمال کرتے ہیں جن سے وہ ووٹروں
کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو اپنی طرف کر سکیں۔ یہ
المناک حقیقت ہے کہ فرقہ وارانہ تصادم اکثر
مذہبی جنون کو بھڑکا کر کرائے جاتے ہیں۔ گائے

لایا جا رہا ہے۔
لیکن مذہبی پروپیگنڈہ اس قدر مؤثر کیوں
ہو جاتا ہے اور اپنی آغوش میں ناخواندہ اور
خواندہ اشخاص امیر اور غریب لوگوں اور ملکی باشندوں
اور غیر سکونت پذیر باشندوں کو لے لیتا
ہے۔ اس کا ایک زبردست سبب

پر مبنی پروپیگنڈہ اس قدر مؤثر ہو گیا ہے جیسا کہ
عوام زیادہ تر زیادہ گہرے طور پر مذہب پرست
ہیں اور وہ مذہبی فرقہ وارانہ بنیاد پر مبنی تقسیم
وطن اور اُس کے بعد ہونے والے قتلِ عام کے
عمل کے باعث اس وقت اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں۔
وہ محسوس کرتے ہیں کہ اُن کے مذہب کو خطرہ پیدا

جہاں تک قتل و غارت اور تباہی کا تعلق ہے بھارت کے لیے ۱۹۸۴ غیر معمولی طور پر رجائیت پسندی کے لچکدار معیاروں سے بھی ایک منحوس برس تھا۔ اب ہمیں اس امر پر غور کرنا ہے کہ ۱۹۸۵ اور اُس کے بعد کے وقت کو ہمارے فرقوں سے فرقہ پرستی ختم کر کے اور ہمارے مذہب پر مبنی تعصبات کی جگہ عقلیت پسندی لا کر کیوں کر رفتہ رفتہ بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

کی دُم ایک مندر میں پھینکی جاتی ہے یا سور کے
گوشت کا ایک ٹکڑا مسجد میں گرایا جاتا ہے، اور
پھر حالات اتنی جلدی بھڑک اٹھتے ہیں جیسے خشک
بارود کو آگ لگا دی گئی ہو یا پھر گجرات میں نشستوں
کی پالیسی پر ایجی ٹیشن شروع ہوتی ہے اور وہ فوراً
فرقہ وارانہ صورت اختیار کر لیتی ہے۔

مذہب کو کھلا چھوڑ دیا گیا

لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قومی بیماریوں

۱۰ اگست خصوصی شمارہ

یہ ہے کہ وہ بہت حد تک اجتماعی
زندگی سے جُڑا ہوا ہے۔ پروپیگنڈے کا اثر اُن
افراد پر ہو سکتا ہے جو کم و بیش شدید طور پر زندگی
کی رو و لہا میں کھیلتے ہیں۔ الگ تھلگ پڑا ہوا فرد
یا اکیلا آدمی جس کا معاشرے سے محض شاذ و نادر ہی رابطہ
ہوتا ہے۔ پروپیگنڈے کے تئیں بمشکل حساس ہوتا
ہے۔ پروپیگنڈہ اُس شخص پر اثر کرتا ہے جو اپنے

ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بیوقوف اور
مجہول لوگ نئے نئے مجلے اور نظریے ایجاد کرتے رہتے
تا کہ ایماندار لوگوں کو منصفانہ مفاہمت پر پہنچنے
سے روکا جا سکے۔

مغرب میں کیا ہوتا ہے

لیکن یہ بات ذہن میں رکھی جائے کہ تمام منظر

یکم ۔ ۳۱ اگست ۱۹۸۵

مخصوص ملک کی ترقی کی حالت پر بھی انحصار رکھتا ہے۔ مغرب میں مذہبی پروپیگنڈہ کبھی مشکل سے کامیاب ہوتا ہے، وہاں معاشرہ مجموعی طور پر اسے مذہبی مسائل میں دلچسپی نہیں لیتا۔ یہ اُن کی نجی آرار کا حصّہ ہے اور اس معاملہ پر کوئی حقیقی رائے عامہ نہیں پائی جاتی۔

یہ بات بھی یاد کی جانی چاہیے کہ صدیوں سے "بائنز نیٹم" میں ہجوموں کے درمیان بازاروں میں مذہبی سوالات پر لڑائی ہوئی۔ اِن دنوں مذہبی پروپیگنڈہ میں بڑی سمجھداری ہوتی تھی اور اس کی کامیابی کا بڑا امکان ہوتا تھا۔

اگر ہم مغرب کی نہایت ترقی یافتہ قوموں کو دیکھیں تو ٹیکنالوجی سے متعلق پروپیگنڈہ کا فوری اثر ہوتا ہے کیونکہ ہر ایک کو ٹیکنالوجی میں اسی قدر پُرجوش دلچسپی ہے جس قدر سیاست میں۔ وزیر اعظم راجیو گاندھی نے جدید ٹیکنالوجی کے ذریعہ بھارت کو اکیسویں صدی میں لے جانے کا جو طے شدہ پلان بنایا ہے اُس کے موزوں طور پر نہ سمجھے جانے

والے فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ اس وقت جن بنیادی مذہبی عناصر میں عوام بڑھ کر دلچسپی لیتے ہیں اور اُن سے آسانی سے متاثر ہونے کا رجحان رکھتے ہیں وہ رفتہ رفتہ کم پڑ جائیں گے۔ یہ تبدیلی پہلے شہروں میں محسوس کی جائے گی اور بعد میں رفتہ رفتہ دیہات میں پھیل جائے گی۔

تعصباتی اور روایاتی خیالات کسی شخص کے پس منظر کا نتیجہ ہو سکتے ہیں جو اُس کی تعلیم، کام اور ماحول وغیرہ سے بنتا ہے لیکن دلچسپی کا مرکز حقیقتاً تمام تر معاشرے کی طرف سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ دریافت کرنے کے لیے عہدِ جدید کے انسان پر ٹیکنالوجی کا بھوت کیوں سوار ہے۔ ہمیں کلی طور پر آج کے معاشرے کا تجزیہ کرنا ہوگا اور اس کے لیے عصرِ حاضر کے دلچسپی کے تمام مرکزوں کی چھان بین کرنی ہوگی۔ اس سلسلے میں یہ بات خاص طور پر دیکھنے کے قابل ہے کہ یہ دلچسپی کے مرکز دنیا کے تمام حصّوں میں زیادہ سے زیادہ ایک جیسے بنتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ سیاسی دلچسپی کے مرکز نے ایشیائی عوام، اسلامی ممالک، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ملکوں میں فروغ پایا ہے۔ دلچسپی کی ایسی توسیع سے پروپیگنڈہ لازمی طور پر جُڑا ہوتا ہے جو تمام ممالک میں یکساں نہیں ہو سکتا لیکن جو یکساں بنیادی طرز کا ہوتا ہے اور ہر جگہ دلچسپی کے ایسے ہی مرکزوں سے وابستہ ہوتا ہے۔

جہاں تک قتل و غارت اور تباہی کا تعلق ہے، بھارت کے لیے ۱۹۸۴ غیر معمولی طور پر رجائیت پسندی کے لچکدار معیاروں سے بھی ایک منحوس برس تھا۔ اب ہمیں اس امر پر غور کرنا ہے کہ ۱۹۸۵ اور اُس کے بعد کے وقت کو ہم اسے فرقوں سے فرقہ پرستی ختم کر کے اور

ہمارے مذہب پر مبنی تعصبات کی جگہ عقلیت پسندی لا کر کیونکر رفتہ رفتہ بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

سٹوٹینزیل کا نظریہ

اس سلسلے میں ایک حل تلاش کرنا ممکن ہو جاتا ہے اگر ہم جین سٹوٹیزل کے نظریہ کو عمل میں لائیں۔ سٹوٹیزل نے اس نظریے کو فروغ دیا تھا کہ ایک ہی معاملے پر ایک شخص کی دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ ایک اُس کی اپنی پرائیویٹ رائے جو وہ احتیاطاً اپنے تک ہی رکھتا ہے یا جس کا اظہار وہ صرف لوگوں کی نہایت تھوڑی تعداد کے رُو برو کرتا ہے اور دوسری ہے اُس کی "پبلک" رائے جس میں وہ اپنے گروپ کو شریک کرتا ہے۔ پروپیگنڈہ کرنے والے ایسی کارروائی کے لیے تیار کرتے ہیں جو اُس کی پرائیویٹ رائے سے تحریک پاتی ہے۔

کوئی بھی اس حقیقت کی مخالفت نہیں کرے گا کہ کسی فرد کی پرائیویٹ رائے اُس کی نجی ذات سے زیادہ مطابقت رکھ سکتی ہے۔ مثال کے طور پر جب فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے اُس کی پبلک رائے کچھ زیادہ

آج بھارت کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہے ایک ایسا "تھیم" جسے صحیح طور پر پیش کیا جائے تو وہ شہریوں کی ذہنی ترجیحات میں مذہب پر برتری حاصل کر سکے گا۔ وزیر اعظم راجیو گاندھی نے گزشتہ برس پارلیمنٹ کے انتخابات کے دوران ایک ایسے ہی تھیم ۔ اتحاد اور یکجہتی ۔ کو پکڑا لیا اور بیشتر نشستوں کیساتھ کامیابی حاصل کی۔

نو عمر طلبا کے ذہنوں میں رام، کرشن، پیغمبر اور بدھ وغیرہ کی بہادری اور نیکی کی کہانیاں بھری جاتی ہیں۔ جو بلاشبہ ایک اچھی بات ہے۔ اگر انھیں مثالی ہستیوں کے طور پر پیش کرنے کا ارادہ ہو۔ لیکن اس عمل میں کرشن کو ایک ہندو دیوتا اور محمدؐ کو مسلم پیغمبر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور اس طرح ابتدائی مرحلوں ہی میں مذہب پر مبنی تفریقیں قائم کی جاتی ہیں۔

جارحانہ ہوسکتی ہے۔ جزوی طور پر اپنے لوگوں کے دباؤ سے اور جزوی طور پر منحرف خیال کئے جانے کے خوف سے۔ ایک شخص مکان، دکان یا پرستش گاہ کو آگ لگانے کے لیے ہجوم کے ہمراہ جا سکتا ہے خواہ اُس کی پرائیویٹ رائے اُس میں جھجک پیدا کرتی ہے۔ لہٰذا بھارت میں فرد کی پرائیویٹ رائے کو تقویت دینے کے لیے پلان بنایا جانا چاہیئے۔ اگر افراد کی کافی بھاری تعداد میں ایسا کر دیا جائے تو پرائیویٹ رائے خود بخود پبلک رائے بن جائے گی۔ پرائیویٹ اور پبلک رائے کے ایسے امتزاج سے انفرادی اور اجتماعی پبلک عزم ایک ٹھوس سمت میں تقویت پائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

پروپیگنڈہ کے ایک واحد اقدام کی پہلے سے موجود رُجحان سے مقابلہ آرائی ہوگی۔ مثال کے طور پر اگر ہم ایک تقریر کریں یا ایک مضمون شائع کریں تو اُس کا اثر ظاہراً عوام کے پہلے کے موقعوں کے مطابق ہوگا۔ لیکن اسے بمشکل پروپیگنڈے کہا جائے گا۔ پہلے سے بنے ہوئے رُجحانات کو حقیقی پروپیگنڈہ سے مسمار کیا جا سکتا ہے۔ جو فرد کو وقفہ کے بغیر صبح سے رات تک، بچپن سے بڑھاپے تک اُن تمام باتوں میں گھیرے رہتا ہے جو وہ پڑھتا، دیکھتا اور سُنتا ہے اور اُسے راحت لینے یا دم لے کر سوچنے کے لیے ایک لمحہ بھی نہیں دیتا۔ لیکن اُس نوعیت کا پورا پروگرام کہیں بھی خصوصاً ایک جمہوریت میں بمشکل ممکن ہے۔

ابتدائی طور پر حکومت کا کام

لیکن زیادہ سوفسطائی اور کم قابلِ اعتراض ذرائع پر ابتدائی طور پر حکومت کی طرف سے غور کیا جا سکتا ہے اور اُنھیں ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات وغیرہ کو امداد دے کر بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ چونکہ پہلی دو صورتوں کے ذرائع پہلے ہی حکومت کے کنٹرول میں ہیں صرف اخبارات وغیرہ ہی پرائیویٹ کاروبار کے ہاتھ میں رہ جاتے ہیں۔

آج بھارت کو جس چیز کی ضرورت ہے، وہ ہے ایک ایسا "تھیم" جسے اگر صحیح طور پر پیش کیا جائے تو وہ شہریوں کی ذہنی ترجیحات میں مذہب پر برتری حاصل کر سکے گا۔ وزیراعظم راجیو گاندھی نے گذشتہ برس پارلیمنٹ کے انتخابات کے دوران ایک ایسے ہی تھیم۔ اتحاد اور یکجہتی کو پکڑ لیا اور بیشتر

> یہ کہنا افسوسناک ہے کہ حصولِ آزادی کی تین دہائیوں سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ہم اپنے آپ کو ہندوؤں، مسلمانوں یا عیسائیوں پنجابیوں، آسامیوں اور بنگالیوں، جاٹ سکھوں یا نرنکاری سکھوں، شیعوں، سُنیوں اور احمدیوں اور برہمنوں، ٹھاکروں اور بنیوں کے طور پر سوچنے کا رُجحان رکھتے ہیں۔

نشستوں کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔

اگر دوبارہ صحیح طور پر پیش کیا جائے تو حُب الوطنی ایک ایسا مسئلہ ہو سکتا ہے۔ ورنہ اس امر کا خطرہ ہے کہ یہ بآسانی جارحانہ صورت اور غیر ملکی عناصر کے تئیں منافرت اختیار کر سکتا ہے۔ اِس سے ملک کے اندر اتحاد تو آ سکتا ہے لیکن اُس سے نواحی ملکوں کے ساتھ لڑائی چھڑنے کا امکان ہو سکتا ہے۔ ڈکٹیٹر اس اصول سے انحراف کرتے ہیں جب وہ اُس وقت جنگ کا ہوّا کھڑا کر دیتے ہیں جس وقت اندرونی بے چینی بڑھنے لگتی ہے۔

عوام کے خیالات میں تبدیلی لانے کی کوشش میں ایک اہم بات کو یاد رکھنا ضروری ہے۔ انسان خود کو اکثر عقلیت پسند حیوان کہتا ہے۔ اور وہ دن کے بہت کم حصے کے لیے ایسا ہوتا ہے۔ اُس کا باقیماندہ دن مختلف سرگرمیوں، چھوٹی چھوٹی باتوں، ملنے ملانے، خواہشات کا تانا بانا بُننے اور ایسی ہی دوسری باتوں میں صرف ہوتا ہے جن کا عقلیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ انسان اکثر عقلیت پسند ہوتا ہے لیکن وہ فنکار، تخلیق پسند، سوجھ بوجھ کا مالک، متجسس، حساس، متفکر اور بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہ عقلیت پسندی یا دانشوری نہیں ہے جو اُسے حیوانوں سے ممیز کرتی ہے بلکہ کوئی زیادہ گہری چیز ہے جو ان صفات کی تہہ میں موجود ہے۔ یہ علامتی تصوروں کی تشکیل کرنے اور پُر امن طور پر خود اُس سے اور زندگی سے اُن کا رشتہ جوڑنے کی برتر طاقت ہے۔

اگر ہم انفرادی رُجحانات کو بدلنے کی توقع کرتے ہیں تو ہمیں انسانی نفسیات کے اس پہلو کو جھنجھوڑنا ہوگا اور متواتر جھنجھوڑنا ہوگا۔ ٹیلی ویژن بڑے مؤثر ڈھنگ سے یہ کام انجام دے سکتا ہے۔ لیکن حب الوطنی کا جذبہ بیسیوں فاضل فلمیں دکھانے یا سُر کے ساتھ قومی ترانہ گانے سے پیدا نہیں ہوگا۔ اس کے لیے اچھی کوششیں کرنی ہوں گی۔ مثال کے طور پر دُشمن کے علاقے میں کمانڈروں کے ایک گروپ کی شجاعت کی کہانی پیش کرنی ہوگی۔ جن میں ایک مسلمان ہو سکتا ہے۔ لیکن پروڈیوسروں کو اُس کی "اسلامیت" کو نمایاں نہیں کرنا چاہیئے اور اسے اس طرح پیش کیا جائے جیسے کہ سب قدرتی انداز میں ہو رہا ہے۔

جہاں درسی کتب غلطی پر ہیں

کسی کو بھی یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اکثریتی فرقہ میں مذہب کو ذاتی معاملہ بنائے رکھنا اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ اقلیتی فرقوں سے قوم پرستی

کا احساس پیدا کرنا ضروری ہے۔ ہماری درسی کتابوں میں اس سلسلے میں افسوسناک حد تک غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ کم عمر طلبا کے ذہنوں میں رام، کرشن، پیغمبر اور بدھ وغیرہ کی بہادری اور نیکی کی کہانیاں بھری جاتی ہیں۔ جو بلاشبہ ایک اچھی بات ہے اگر انھیں مثالی ہستیوں کے طور پر پیش کرنے کا ارادہ ہو۔ لیکن اس عمل میں کرشن کو ایک ہندو دیوتا اور محمدؐ کو مسلم پیغمبر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور اس طرح ابتدائی مرحلوں ہی میں مذہب پر مبنی تفریقیں قائم کی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر پاکستان سرحد پر کوئی شرارت کرتا ہے تو ایک بھارتی اسکول کا ایک مسلمان لڑکا غیر ضروری طور پر خود کو قصوروار ــ رنجیدہ نہیں بلکہ قصوروار محسوس کرتا ہے۔ اس کی وجہ تلاش کرنے کے لیے زیادہ دُور جانے کی ضرورت نہیں ــ وہ غلط کار پاکستانیوں کو ساتھی مسلمانوں کے طور پر دیکھتا ہے اور اپنے آپ کو بھارتی تصور نہیں کرتا جو ایک پڑوسی کے اعمال کے لیے غصہ ور یا مایوس ہونے کی وجہ رکھتا ہو۔ اور یہ تصور ہمارا ہے ایسا ہی اُس وقت ہوتا ہے جب مذہب کو ہر بات پر پورے طور پر چھا جانے کی اجازت دی جاتی ہے۔ یہ کتنا افسوسناک ہے کہ حصولِ آزادی کی تین دہائیوں سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے بعد بھی ہم اپنے آپ کو ہندوؤں، مسلمانوں یا عیسائیوں، پنجابیوں، آسامیوں اور بنگالیوں، جاٹ سکھوں یا گورسکھوں اور مزنکاری سکھوں، شیعوں، سنیّوں اور احمدیوں اور برہمنوں، ٹھاکروں اور ہنیوں کے طور پر سوچنے کا رجحان رکھتے ہیں۔ یہ کس قدر اچھی بات ہوگی اگر عوام پہلے اور ابتدائی طور پر خود کو بھارتی سمجھتے۔

اخبارات کیا کر سکتے ہیں

اخبارات جن کا کام بلا تاخیر خبریں اور آرائیں اور کبھی کبھی تفریحی مواد مُہیا کرنا ہے وہ حقیقتاً زیادہ کچھ تو نہیں کر سکتے لیکن وہ موجودہ تعصبات کو تقویت دینے کے امکانات کو کم کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ بتانے کی کیا ضرورت ہے: "ایک سکھ نوجوان بندوق کے ہمراہ پکڑا گیا۔" یا "گجراتی تاجر گرفتار کر لیا گیا یا بنگالی نوکر زیورات لے کر فرار ہو گیا۔" خبروں میں اس طرح ان کے ساتھ لیبل لگانے کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے جب تک ایسا کرنے سے احتراز نہ کیا جا سکے اور یہ خبر کے لیے ضروری نہ ہو۔ اس کے بجائے یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ ایک آدمی بھوپال میں پکڑا گیا یا ایک شخص بمبئی میں گرفتار کر لیا گیا۔

اخبارات فرقہ وارانہ تصادموں کو نہ اُچھال کر یا تشدد کی خونچکاں تفاصیل پیش نہ کر کے کافی بڑی مدد کر سکتے ہیں۔ جاننے کے حق کا اصُول ایک حد تک ٹھیک ہے لیکن اُس وقت نہیں جب وہ سماج میں گڑبڑ پھیلانے لگے۔

حکومت، تعلیمی اداروں اور ذرائع نشرو اشاعت کی تمام مساعی سے بھی یہ ایک طویل اور صبر آزما کام ہوگا۔ طویل عرصے سے چلے آ رہے انسانی رُجحانات میں فوری طور پر تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ رجعت پسندی سے پیدا ہونے والی بُرائیوں کے خلاف لڑائی محض مسلسل، ہمہ گیر مہم اور بہتر معیشت سے اور اعلیٰ ٹیکنالوجی کے دَور میں داخل ہونے سے جیتی جا سکتی ہے۔ ●

بقیہ: کاش یہ مہمل زندگی جذبۂ انسانیت سے معمور ہو جائے

پیدا کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ سماجی تعلقات کی راہ میں یہ بڑی بڑی حماقتیں ہیں۔ ایسی صورت میں معقولیت پسندانہ طرزِ فکر اور اندازِ نظر ہی انسانی تعلقات میں بہبود اور ہم آہنگی کا ضامن بن سکتا ہے۔ اس اندازِ فکر کو اپنا لینے کے بعد ہی عالمگیر اقدار کا قیام ممکن ہے۔

میری مخلصانہ طور پر یہی خواہش اور اُمید ہے کہ "سوچنا" کم سے کم اس موضوع پر عوام کو سوچنے، سمجھنے اور محنت کرنے کے لیے جھنجھوڑ سکے گا۔ اپنی کتاب "سماجی انقلاب کی جانب" میں، مَیں نے جو جملے کہے ہیں، ان کو مَیں یہاں مضمون کے آخر میں دُہرانا چاہوں گا۔

"جو لوگ سوچنے سے انکار کر دیتے ہیں، وہ متعصب اور تنگ نظر ہیں، جو لوگ سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، وہ بے وقوف ہیں، جو لوگ غور و فکر کی جرأت نہیں رکھتے، وہ بزدل ہیں۔"

اس موقع پر عظیم دانشور جواہر لال نہرو کا یہ قول بھی دُہرانا چاہوں گا کہ "کامیابی اکثر انھیں کے قدم چُومتی ہے جو سوچنے سمجھنے نیز عمل کرنے کی جرأت رکھتے ہیں۔ کاش کہ جذبۂ انسانیت جس کی بنیاد روشن خیالی پر ہے، اور جس کی عمارت سائنسی اندازِ فکر کے اُصول پر کھڑی ہے، پھلے پھولے اور پروان چڑھے۔

●

بقیہ: سیکولرازم یا خود فریبی پی۔ این۔ ہکسر کے ساتھ انٹرویو

ہیں۔ ٹی۔ وی اور ریڈیو پروگراموں میں طبع زاد کوششوں کا فقدان ہے۔ ہر چیز مستعار لی گئی ہے اور وہ ہماری حقیقی ضرورتوں سے رشتہ نہیں کھاتی۔ دریں اثنا ہمارا بیچارہ مصنوعی سیارہ مدار میں گردش کر رہا ہے۔ لیکن اس سے حقیقی ضرورتوں کی تکمیل کا کام مشکل ہی سے لیا جا رہا ہے۔

آخر میں یہ کہاوت مثال کے طور پر دہراؤں گا کہ ہاتھی کے دانت دو طرح کے ہوتے ہیں، کھانے کے اور، دکھانے کے اور۔

پی۔سی۔ چیٹرجی*

ہماری نشریات جو خرافات کا شکار ہیں

چیٹرجی نے جو آل انڈیا ریڈیو اور دُوردرشن کے ڈائریکٹر جنرل رہ چکے ہیں دو رجحانات سے پیدا شدہ ابتری کے پس منظر میں ریڈیو اور ٹی وی کی سرگرمیوں کا بغور جائزہ لیا ہے ایک رجحان کی نمائندگی کی تھی ڈاکٹر رادھاکرشنن نے جو "حقیقی مذہب" کے حامی تھے اور دوسرے کی نمائندگی نہرو نے کی تھی جو سائنسی انسانیت نوازی کے مجاہد تھے۔ مصنف کی رائے میں لفظ سیکولر براڈکاسٹنگ کی فرہنگ میں بمشکل موجود ہے۔

ایک شئے جس کی ہم بھارتی بڑی خودستائی کرتے ہیں وہ ہے ہماری روحانیت۔ یہ سچ ہے کہ اس سرزمین نے بدھ، مہاتما گاندھی اور دیگر عظیم ہستیوں کی بڑی تعداد کو جنم دیا ہے جو مبتلائے مصائب نوعِ انسانی کے لیے آدرش اور گہری ہمدردی رکھتے تھے۔ لیکن یہ ایک نہایت مشکوک بات ہے کہ کیا ہم بھارتی مجموعی طور پر دوسروں کی نسبت کم مادہ پرست ہیں۔ یہ ایسا ہو سکتا ہے: ڈاکٹر رادھاکرشنن جیسے بڑے لوگ جو ہمارے آئین کے بانی بزرگ تھے محسوس کرتے تھے کہ بھارت دُنیا کے لیے ایک پیغام رکھتا ہے۔ ایک دوسرا رجحان پنڈت نہرو کی شخصیت سے نمایاں ہوا جن کے نزدیک ثقافت سائنسی انسان نوازی میں پائی جاتی تھی۔ اور جسے انھوں نے مغرب سے لیا تھا بھارتی سیکولرزم دونوں کے درمیان غیر مستحکم سمجھوتے سے عمل میں آیا۔ رادھاکرشنن اِس امر کی وضاحت کرنے کے لیے بڑے بیتاب تھے کہ بھارتی سیکولرزم اپنے مغربی مدِمقابل کے برعکس مذہب کے خلاف نہیں ہے یہ مساوی طور پر تمام مذاہب کے تئیں ہمدردی رکھتا ہے۔ لہٰذا آئین کے آرٹیکلوں ۲۵ اور ۲۶ میں ضمیر کی آزادی اور کسی کے خلاف امتیاز کے بغیر مذہب کو ماننے اُس پر عمل کرنے اور اُس کی تشہیر کرنے کے حق کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس کے دوسری طرف ان آرٹیکلوں میں سے ہر ایک میں اہم دفعات کے ذریعے مملکت نے اخلاق، صحت اور رائے عامہ کی بنا پر مذہب میں مداخلت کرنے کا حق اپنے پاس محفوظ رکھا ہے۔ اُس نے "مذہب سے وابستہ سیکولر سرگرمیوں" میں مداخلت کرنے کا حق بھی اپنے پاس محفوظ رکھا ہے۔

بُنیادی محدُودیت: مَیں مذہب کی آزادی کو محدود کرنے سے متعلق ان دو اقدام کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں اور پہلے میں مؤخرالذکر کو لیتا ہوں۔ جس پر مَیں مختصراً اظہارِ خیال کروں گا۔ اس محدودیت کا مطلب ہے کہ مذہب یا بانی بزرگوں نے آئین ساز اسمبلی میں تقریر کے بعد تقریر میں جسے "سچا مذہب" بیان کیا اُس میں اور اُن توہمات و

* آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کے سابق ڈائرکٹر جنرل۔

ہوا ہے جس میں فرق ہے جو وقت کے لحاظ سے سیکولر یا مذہبی (مذہب) کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہیں۔ یہ یعنی مذہب ہے جو کہ عقیدہ ہے جو زندگی کو با معنی اور با مقصد بناتا ہے جس کا تحفظ کرنے میں اسے ... دلچسپی تھی، معاشرتی امور کے ممتاز ماہرین اور سائنس دانوں کو اس امر پر سخت افسوس ہے کہ حصول آزادی کے بعد توہمات، رسومات اور متعلق العقائد تقریباً سیاسی، اقتصادی اور گرد کی رقابتوں سے تحریک پاکر بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں۔

جاتا۔ بصورت دیگر عام کیجئے کو اسی طرح کی حیثیت کا شکار ہونا پڑے گا۔ اکثریتی فیصلے کے اہم حصے میں کہا گیا تھا کہ اگر کوئی رواج فرقے کی طرف سے عام طور پر مذہب کا لازمی حصہ تصور کیا جاتا ہے تو اُسے قبول کرنا ہوگا۔ لہٰذا مختصر طور پر اگر داعی ماضی میں اس خدائی حق کا استعمال کر رہا ہے اور اگر فرقہ نے اُسے قبول کیا ہے تو یہ ہمیشہ آنے والے وقت کے لیے اس کا حق ٹھہرتا ہے۔ بدقسمتی سے ایک پورے بنچ کے روبرو اس مقدمہ کی اپیل نہیں کی گئی۔ مایوسی کے عالم میں اُمید کی شعاع یہ ہے کہ

کچھ کہنا ہے جس سے مذہبی آزادی کو محدود کیا گیا ہے۔ میں امن عامہ اور صحت کے امور کو نظرانداز کرتا ہوں جو کافی حد تک واضح ہیں۔ آئین مملکت کے لیے مذہب کی تعمیل میں مداخلت کا حق محفوظ رکھتا ہے۔ اگر وہ اخلاق کے خلاف ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ بعض مذہبی رسوم مثبت طور پر اخلاق سوز ہیں اور ایسی کسی بھی رسم کو جس کی مذہب حمایت کرتا ہے روک دیا جانا چاہیئے یہ ایک نہایت سنگین مسئلہ ہے اور میں حیران ہوں کہ کتنے لوگوں نے اس کی اہمیت کو سمجھا ہے۔ اس کے منفی پہلو کو مذہب کی تنقید کے طور پر ایک طرف رکھ کر جسے اُس کے پیروکار الہامی اور ناقابلِ تنسیخ صداقت مانتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ آئین کم از کم چند بنیادی اصولوں کو ایک متبادل اخلاق، ایک سیکولر اخلاق کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ کیونکہ ہم ایک مذہبی اخلاقی اصول کو مسترد کر سکتے ہیں اگر ہم بعض دوسرے اصولوں کو بنیادی طور پر اپنائیں جو ہمارے خیال میں مذہبی اصول کی جگہ لیتے ہیں۔

ایک شے جس کی ہم بھارتی بڑی خودستائی کرتے ہیں، وہ ہے ہماری روحانیت۔ یہ سچ ہے کہ اس سرزمین نے بدھ، مہاتما گاندھی اور دیگر عظیم ہستیوں کی بڑی تعداد کو جنم دیا ہے جو مبتلائے مصائب نوعِ انسانی کے لیے آدرش اور گہری ہمدردی رکھتے تھے لیکن یہ ایک نہایت مشکوک بات ہے کہ کیا ہم بھارتی مجموعی طور پر دوسروں کی نسبت کم مادہ پرست ہیں۔

سیکولر اخلاق کس جانب کو

اب میرا بیان یہ ہے کہ گذشتہ دہائیوں میں ہم نے اس سیکولر اخلاق یعنی بعض بنیادی اصولوں کو نظرانداز کیا ہے جو ہمارے آئین میں شامل ہیں، خود سیکولرزم کی ایک ایسے نظریہ کے طور پر منفی صورت میں تشریح کی گئی ہے جو کسی مذہب کے خلاف امتیاز نہیں کرتا اور جو تمام مذاہب کے درمیان یکساں فاصلہ رکھتا ہے۔ اگر یہ کچھ ہے تو ایسی مہمل خیال کا مرتکب ہے جو اس مقولے میں شامل ہے۔ "تمام مذاہب کا لازمی اتحاد"۔

لیکن خود سیکولرزم میں اپنی مثبت بات کیا شامل ہے؟ بھارت کی سلطنت رائے کے مطابق کچھ نہیں۔ اس کے برعکس آئین کے تیسرے حصے میں بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے ...

اور سپریم کورٹ

سپریم کورٹ نے اس سوال کا نہایت افسوسناک جواب دیا ہے:۔ مذہبی رواج کیا ہے؟ یہ ایک مقدمے میں اکثریتی فیصلے سے ہوا جس میں داعی (داؤدی بوہرہ فرقہ کے سربراہ) نے بمبئی کے پریونشن آف ایکس کمیونی کیشن ایکٹ مجریہ ۱۹۴۹ کو چیلنج کیا تھا۔ بوہرہ لوگ اپنے بپتسمہ کی تقریب میں داعی کے احکام کی مکمل اطاعت کا حلف اٹھاتے ہیں جس کے اقوال کو وہ خدائی احکام تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی ایسا اخبار پڑھتا ہے جسے وہ پسند نہیں کرتا تو اس کا اخراج کیا جا سکتا ہے اور اس کا مطلب ہے کنبے سے تمام تعلقات کا قطعاً توڑنا

اُس وقت کے چیف جسٹس مسٹر بی پی سنہا نے اس سے اختلاف کیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ جس ڈھنگ سے اخراج کو عمل میں لایا جا رہا ہے وہ خالصتہً ایک مذہبی معاملہ نہیں ہے۔ انھوں نے اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ "اس (بمبئی کے پریونشن آف کمیونی کیشن ایکٹ) کا مقصد انسانی وقار کی یقین دہانی کرانا ہے اور اُن تمام پابندیوں کو ہٹانا ہے جو کسی شخص کو تب تک اپنی زندگی بسر کرنے سے روکتی ہیں، جب تک اُس نے دوسروں کے ایسے ہی حقوق میں مداخلت نہ کی ہو۔"

لیکن اب مجھے دوسرے اقدام کی بابت

انسانی مساوات، قانون کے روبرو برابری، اظہار
خیال اور ضمیر کی آزادی وغیرہ وغیرہ۔
ہدایتی اصولوں کے آرٹیکل ۴۴ میں مملکت کو
ہدایت دی گئی ہے کہ وہ ملک بھر میں شہریوں کے
لیے ایک یکساں سول کوڈ (شہری قانون) کے نفاذ کی

ہوں۔ میں ذمہ داری کے اپنے حصے سے پیچھا نہیں
چھڑا سکتا۔ کوئی یہ کہہ کر خود کو کس حد تک معاف
کر سکتا ہے۔ "میں نے یہ سوچا نہیں تھا"۔
" لفظ سیکولرزم براڈ کاسٹنگ کی فرہنگ
میں بمشکل پایا جاتا ہے۔
جس پروگرام کی تیاری کی تلقین وزارت

چاہئیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں ہندو، اسلام،
عیسائی اور دیگر مذاہب کے غیر فرقہ دارانہ نغمے
شامل ہوں جو مختلف زبانوں میں گائے گئے ہوں۔
یہ عمل کے بجائے تھیوری میں زیادہ ہے اور جنوبی
بھارت کے متعدد اسٹیشنوں میں ہفتے کے
مختلف دن متعدد ہندو فرقوں کے لیے مخصوص
کیے گئے ہیں۔ لہذا "وندنا" جو مذہبی اور لسانی
اتحاد کے ذریعہ سیکولرزم کو فروغ دینے کے لیے
مرتب کیا گیا تھا، چور دروازے سے مذہب
کو لا کر ختم کر دیا گیا ہے۔

اور یہ خرافات

کئی دہائیوں تک بیوروکریسی کے بعض عناصر
نے بھارتی براڈ کاسٹنگ کے سیکولر کردار کو برقرار
رکھنے کے لیے جد و جہد کی تاکہ مذہبی پروگراموں کو
آل انڈیا ریڈیو سے باہر رکھا جا سکے۔ "وندنا"
ایک ایسا پروگرام تھا۔ حکومت کی طرف سے یہ
دلیل دی گئی کہ یہ پروگرام ریاضت پسندانہ اور
اخلاقی ہے اور مذہبی یا فرقہ دارانہ نہیں۔ میں نے
کہا ہے کہ ایسے پروگرام حکومت کی طرف سے
شروع کیے گئے ہیں۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ ایک
وزیر یا اعلیٰ افسر کے فیصلے کے نتیجے سے عمل میں
آئے جو تنگ نظر حد تک مذہبی تھے۔ ایک بار

> یہ سچا مذہب ہے جو کہ عقیدہ ہے جو زندگی کو بامعنی اور بامقصد
> بناتا ہے جس کا تحفظ کرنے میں اُسے (آئین ساز اسمبلی کو) دلچسپی
> تھی، معاشرتی امور کے ممتاز ماہروں اور سائنسدانوں کو اس
> امر پر سخت افسوس ہے کہ حصولِ آزادی کے بعد توہمات،
> رسومات اور مطلق العنانہ تقاریب سیاسی اقتصادی اور
> گروہی رقابتوں سے تحریک پا کر بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں۔

پرستش کرے۔ (اور اس کے لیے مذہبی پرسنل قوانین
کے انحراف کو ختم کرے جو کم و بیش حد تک خواتین
کے خلاف امتیاز کرتے ہیں) بنیادی فرائض سے
متعلق حصہ چہارم اے میں ہر شہری کے لیے یہ ضرورت
بیان کی گئی ہے کہ وہ "سائنسی مزاج، انسان دوستی
اور تحقیق و اصلاح کی اسپرٹ کو فروغ دے" بھارت
میں انسانوں کے لیے ایک نئے اور تحریک بخش آدرش
کا اضافہ کرنے کے لیے یہ کافی اور ضرورت سے
زیادہ ہے۔

نشریات کا طریقۂ کار

حصولِ آزادی کے بعد سے ذرائع نشر و
اشاعت سیکولرزم کے بارے میں کیا کچھ کر رہے
ہیں؟ میں خود کو ریڈیو اور ٹیلی ویژن تک محدود
کرتا ہوں، جہاں میں نے تین دہائیوں سے زیادہ
عرصے تک کام کیا ہے۔ جہاں میں آل انڈیا ریڈیو
اور دوردرشن پر نکتہ چینی کر رہا ہوں، وہاں یہ
[illegible]

اطلاعات و نشریات کی طرف سے کی گئی ہے اُس
سے متعلق متعدد بیانات میں دو زمرے ہیں جو سیکولرزم
کے قریب آتے ہیں۔ وہ ہیں "فرقہ وارانہ اتحاد" اور
"قومی یکجہتی" اور "سائنس" پروگرام۔ چنانچہ مثال کے

> لیکن خود سیکولرزم میں اپنی مثبت بات کونسی شامل ہے؟ بھارت
> کی مسلّمہ رائے کے مطابق بالکل کچھ نہیں۔ اس کے برعکس آئین کے
> تیسرے حصے میں جن بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے وہ ہیں
> انسانی مساوات، قانون کے روبرو برابری، اظہارِ خیال اور ضمیر کی
> آزادی وغیرہ وغیرہ۔

طور پر یکجہتی پروگرام "وندنا" کے بارے میں خیال
کیا جاتا ہے کہ اس میں فرقہ وارانہ اتحاد اور لسانی
یکجہتی دونوں سے متعلق رجحانات شامل ہونے

ایک پروگرام شروع ہونے پر جاری رکھا جا سکتا
ہے اور وزیر کا دماغ ہمیشہ ایک ایسی بات ہوتی

ہے جس کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ وہ اصحاب جو پروگراموں کا اسٹائل کو مذہبی رنگ دینے کے زیادہ تر ذمہ دار ہیں وہ تھے شری بے سی ماتھر ڈائرکیٹر جنرل (۱۹۵۵ سے ۱۹۶۱ تک) اور شری ستیہ نارائن مینا جو ڈائرکٹر تھے اور بعد میں مدھیہ پردیش کے گورنر بنائے گئے۔

ثقافت کو مذہب سے جدا کرنے والا خط نہایت باریک ہے۔ نہ صرف ہمارے اپنے ملک کی بلکہ کئی دوسروں کے ناٹکوں، رزمیہ کلام، موسیقی اور رقص کی جڑیں مذہب میں سمائی ہوئی ہیں۔ ثقافت کو سیکولر رنگ دینا ایک پیچیدہ اور سست عمل ہے اور ثقافت کے لیے جو کچھ تسلیم کیا جاتا ہے، کسی خاص وقت میں اُس کا مذہب سے امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برعکس یہ آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے کہ کسی آڈیٹوریم میں یا ٹیلی ویژن پر پیش کیے جانے والا بھارت ناٹیم فن ہے مذہب نہیں۔ امتیاز کا انحصار متعدد امور پر ہے۔ ماحول جس میں پروگرام پیش کیا جاتا ہے، رسوم کی تعمیل یا عدم تعمیل، پروگرام پیش کنندگان کی شخصیت اور پس منظر اور انجام کا

اور نہایت اہم طور پر پروگرام کا مقصد کیا یہ مذہبی عقیدت ہے یا محض مظاہرہ؟ کیا یہ بات نہیں کہ مؤخر الذکر کو اول الذکر کی طرف سے انجام دیے بغیر پیش نہیں کیا جا سکتا؟ رام چرت مانس شروع میں بھوپال میں گورنر کی کوششوں سے نشر کیا گیا تھا اور بعد میں متعدد بار دہرائے جانے کے بعد جس سے تمام سامعین کی دلچسپی جاتی رہی تھی ہندی خطے کے تمام اسٹیشنوں سے اسے نشر کیے جانے کے احکام دیے گئے۔ اس میں ایک ادبی پروگرام کی دلکشی برقرار رکھنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی اور یہی بات ہفتے میں کئی صبحوں کو دلی سے نشر ہونے والے برج مادھری پروگرام کے بارے میں ہے۔ دوسرے پروگراموں کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی اور نہ ہی اس کے موضوع عیال کو وقت کی سماجی اخلاقیات سے منطقی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

دور درشن میں ہم نے حال میں زیادہ کھلے طور پر اسی مذہبی احیاء کو دیکھا ہے۔ یک سوامی

> گزشتہ دہائیوں میں ہم نے اس سیکولر اخلاق یعنی بعض بنیادی اُصولوں کو نظرانداز کیا ہے جو ہمارے آئین میں شامل ہیں۔ خود سیکولرزم کی ایک ایسے نظریہ کے طور پر منفی صورت میں تشریح کی گئی ہے جو کسی مذہب کے خلاف امتیاز نہیں کرتا اور جو تمام مذاہب کے درمیان یکساں فاصلہ رکھتا ہے۔ اگر یہ کچھ ہے تو اُس مہمل خیال کا مرکب ہے جو اِس مقولے میں شامل ہے: "تمام مذاہب کا لازمی اتحاد"۔

و جز بندہ برہمچاری کی طرف سے پیش کیے گئے یوگا سے متعلق پروگرام کا ذکر کر رہا ہوں جس میں اس مشق کے مظاہرہ کے ساتھ ساتھ مذہبی کلیات کا بھی کھل کر پرچار کیا جاتا تھا۔

یہ سائنسی پروگرام

سیکولرزم کا دوسرا پہلو بہاؤ کا سائنسی جس طرح سمجھا جاتا ہے وہ ہے سائنس کا پرچار۔ یہ دیہی اور قبائلی سامعین، صنعتی کارکنوں، خواتین اور بچوں کے لیے آل انڈیا ریڈیو کے غیر رسمی تعلیمی نشریات کے ذریعہ انجام دیا جاتا ہے جہاں تک، ایسے پروگرام اس امر کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں کہ امراض کا مقابلہ کیونکر کیا جا سکتا ہے اور سائنسی علم کی بنیاد پر صحت اور کنبہ جاتی بہبود کو کیونکر فروغ دیا جا سکتا ہے وہ توہمات اور عقائد کا توڑ مہیا کرتے ہیں۔ سائنس سے متعلق براہِ راست تعلیم بھی آل انڈیا ریڈیو اور دور درشن کے اسکولوں کے لیے نشریات میں دی جاتی ہے۔ عام سامعین کے لیے آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس کے ۷۵ فیصد سے زیادہ متعدد پینل لیکچر سائنس کے لیے وقف کیے گئے اور چاند پر انسان کے اترنے، خلائی پروازوں اور ایسے ہی دیگر حیرت انگیز سائنسی کارناموں کو بہت زیادہ پبلسٹی دی گئی۔ آل انڈیا ریڈیو کے نیٹ ورک کے ۳۳ اسٹیشنوں میں سائنسی سیل ہیں اور ان میں سے ہر اسٹیشن پر سائنسی نامہ نگار موجود ہیں۔ ۱۹۷۳ میں اسٹیشن ڈائرکٹروں کی ہوئی تھی اس کا ایک اجلاس سائنسی پروگرام کی پالیسی کی تشکیل کے لیے ہوا تھا اور اس میں "سائنسی مزاج" سے متعلق ایک خطبہ ڈاکٹر جگجیت سنگھ کی طرف سے پڑھا گیا تھا اس سے معلوم ہوا کہ سائنسی پروگرام وقت ... ہے ... سائنسی ... کا رنگ ... نہیں

ریکارڈنگ کے علاوہ حیرت انگیز ٹیکنالوجیکل کارناموں کی جس وضاحت سے پبلسٹی کی جاتی تھی اُس سے خود سائنس کو ایک جادو کی صورت ملنے کا گمان ہوتا ہے۔ پالیسی سے متعلق ایک جامع ہدایت نامہ مرتب کیا گیا۔ لیکن یہ زیادہ تر ایک بے جان دستاویز بنا ہوا ہے۔ کاغذ کا ایک بے کار ٹکڑا بنا ہوا ہے۔

اور اس کی وضاحت

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ میں اس کے لیے دو وضاحتیں پیش کرتا ہوں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دیگر متعدد وضاحتیں ہوسکتی ہیں جو بھارتی سماج کی نوعیت اور اس کے متعدد دباؤں کا اشارہ کرسکتی ہیں۔ میں آل انڈیا ریڈیو کے کوڈ کی دفعہ ۲ کا ذکر کرتا ہوں جو "مذہب یا فرقوں پر حملے" کی ممانعت کرتی ہے۔ ریڈیو کا عملہ جو عام متوسط طبقے کے گریجویٹ سے زیادہ روشن خیال نہیں ہے اور جس میں بعض غیر معمولی طور پر ذہین لوگ موجود ہیں۔ اس کا یہ مطلب لیتا ہے کہ "مذہب" پر نکتہ چینی نہیں کی جاسکتی۔ خواہ اس کا مطلب کچھ بھی ہو۔ درج ذیل کے واقعہ سے اُن کے رویّہ کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

میں نے ۱۹۷۱ء میں اپنے مذاکرات سے متعلق پلانروں اور پروڈیوسروں کو سمجھا دیا کہ جب تک ہم ریڈیو کے مذاکرات کو بحث مباحثے کا رنگ نہیں دیں گے، تب تک زیادہ لوگ انھیں نہیں سنیں گے۔ میں نے ایک سلسلے کی تجویز پیش کی، جس میں پہلے دو مذاکرات تانترک (اولیا) اور معجزوں کے بارے میں ہوں گے۔ تجویز یہ تھی کہ قومی پروگرام کے دو مذاکرات میں کے بعد دیگرے ایک شخص [illegible]

[illegible]

لفظ سیکولرزم براڈکاسٹنگ کی فرہنگ میں بمشکل پایا جاتا ہے۔ جس پروگرام کی تیاری کی تلقین وزارتِ اطلاعات و نشریات کی طرف سے کی گئی ہے اُس سے متعلق متعدد بیانات میں روزمرے ہیں جو سیکولرزم کے قریب آتے ہیں۔ وہ ہیں "فرقہ وارانہ اتحاد" اور "قومی یکجہتی" اور "سائنس" پروگرام۔

منظور کرلیا۔ ہم نے بھارت سرکار کے سابق سائنسی مشیر ڈاکٹر بھگونتم سے جو ایک تانترک مہاتما کے عقیدت کیش تھے اس کے حق میں بولنے کی درخواست کی۔ انھوں نے انکار کردیا۔ ہم نے پھر ڈاکٹر ڈی زی گری سے درخواست کی جو اُن دنوں بنگلور یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ انھوں نے قدرے جھجک دکھاتے ہوئے بعض شرائط پیش کیں، لیکن میں انھیں جانتا تھا اور انھیں یقین دلایا کہ ریڈیو کے

محسوس کرتے ہیں؟ لیکن ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم مسٹر شاہ کو بولنے کا موقع دیں گے۔ اعلان میں ہم نے کہا کہ ہمیں ایک ایسے شخص کی تلاش ہے جو مخالف نکتہ نگاہ پیش کرے۔ دو اصحاب سے جواب آیا۔ ایک عیسائی پادری تھے جو صرف یسوع مسیح کے معجزوں کا دفاع کرنے کے خواہشمند تھے اور دوسرا ایک طالب علم تھا جو کسی طرح بھی قومی پروگرام میں بولنے کی قابلیت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن جو بات اہم ہے

دُوردرشن میں ہم نے حال میں زیادہ کھُلے طور پر اسی مذہبی احیاء کو دیکھا ہے۔ میں سوامی دھیریندر برہمچاری کی طرف سے پیش کئے گئے یوگا سے متعلق پروگرام کا ذکر کررہا ہوں جس میں اس مشق کے مظاہروں کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیمات کا بھی کھُل کر پرچار کیا جاتا تھا۔

کوڈ میں ذاتی حملے شامل نہیں ہیں اور اس کی سختی سے تعمیل کی جائے گی۔ انھوں نے منظور کرلیا لیکن بعد میں اپنی بات سے پھر گئے۔ مجھے اس امر سے پریشانی ہوئی ہے کہ یہ نامور اصحاب جن باتوں میں یقین رکھتے ہیں اُن کا کھلے بندوں دفاع کرنے سے وہ کیوں عار

وہ یہ ہے کہ پروگرام نظرثانی کرنے والی میٹنگ میں مجھے اپنے سینئر عملے کے غصّے کا سامنا کرنا پڑا۔ اُن کے مذہبی جذبات مجروح ہوئے تھے اور وہ اپنے ذاتی جذبات اور اُس چیز میں امتیاز کرنے سے قاصر تھے جس کی حمایت آل انڈیا ریڈیو کرے ایک

سیکولر حکومت کے ادارے کے طور پر کرنی چاہیئے میرے خلاف جعلی ناموں سے ایک دستخطی مہم شروع کی گئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ سب ریڈیو والے اندر کے ہی لوگ تھے۔ یہ سب تحقیق کے جذبے کے لیے کیا گیا۔

ایک اور واقعہ جو انہی دنوں جنتا حکومت کے دوران عمل میں آیا، ریوتی سرن شرما کے ناٹک سے تعلق رکھتا ہے جس کا عنوان تھا "تمہارے غم میرے ہیں" یہ ایک واقعہ پر مبنی تھا جو اخبارات میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ایک ہریجن لڑکا اپنے برہمن ٹیچر کی بیٹی سے شادی کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ ایک اسکول میں جہاں وہ ملازم ہے

تعصب کو دخل نہیں ہے۔ یہ ناٹک دلی اسٹیشن سے نشر کیا گیا تھا اور یہ خاموشی کے ساتھ دیکھا گیا۔ لیکن اسٹاف کے بعض ممبروں نے اسی بنا پر اس کی مخالفت کی کہ اس میں بعض فحش کلمات ہیں۔ قومی سلسلے میں شمولیت سے پہلے میں نے اس کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ لیکن جس روز اسے ملک گیر پیمانے پر نشر کرنے کا پروگرام بنایا گیا اس کے اگلے روز مجھے معلوم ہوا کہ وزارت کے احکام کے تحت یہ براڈکاسٹ منسوخ کر دیا گیا ہے جس کی اطلاع مجھے نظرانداز کر کے میرے ایک ڈپٹی کو دی گئی اور انہوں نے بھی مجھے مطلع کرنا ضروری خیال نہیں کیا۔ میں نے یہ سب مسٹر ایڈوانی کو لکھا، جب

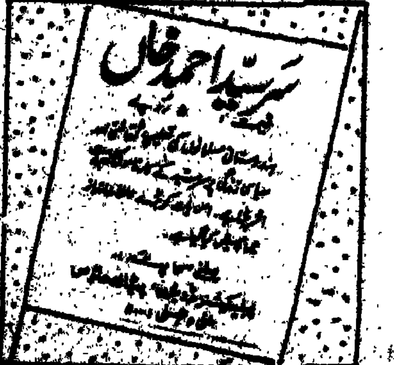
بقیہ: بچوں کو معقولیت پسندانہ راہ سے ہٹانے کے ذمہ دار عناصر

درکار ہیں اور ایسے طریقے اور تکنیک کی ضرورت ہے جو فرقہ واریت کا ازالہ کر سکے اور عوام کے ذہنوں سے تعصب اور تنگ نظری کی جڑ اکھاڑ سکے۔ اور مذہبی رواداری کا درس دے سکے نیز محبت، جذبۂ ترحم، عدم تشدد اور قومی اتحاد کا پیغام عام کر سکے۔ قومی یک جہتی کونسلوں اور کمیٹی پر جو رقم خرچ کی جا رہی ہے اسے اس پیغام کو عام کرنے پر خرچ کیا جاتا ہے، ریاستیں اور ملک کے لسانی اور ثقافتی علاقے اس کام کو انجام دے سکتے ہیں۔

ریڈیو کا عملہ جو عام متوسط طبقہ کے گریجویٹ سے زیادہ روشن خیال نہیں ہے۔ اور جس میں بعض غیر معمولی طور پر ذہین لوگ موجود ہیں اس کا یہ مطلب لیتا ہے کہ "مذہب" پر نکتہ چینی نہیں کی جا سکتی۔

ایک مصیبت میں پھنس جاتا ہے۔ ایک تہوار پر اس کی بیوی اسے اپنے ساتھ مندر جانے کے لیے کہتی ہے۔ وہ آمادہ نہیں ہوتا، لیکن آخر میں مان جاتا ہے۔ مندر کے احاطے میں اس جوڑے پر حملہ ہوتا ہے اور انہیں ننگا کر کے شہر کے بازاروں میں ان کا جلوس نکالا جاتا ہے۔ جب ہریجن عدالت میں جاتا ہے تو وکیل صفائی کی طرف سے دلیل دی جاتی ہے کہ حملہ حسد و بغض کے نتیجے میں ہوا ہے۔ عورت کے بارے میں کہا گیا کہ وہ بد چلن ہے اور اس کے سابقہ عاشق نے جوڑے پر حملہ کیا ہے۔ اس میں ذات پات کا بھی

ورکنگ گروپ آل انڈیا ریڈیو کی خود مختاری کے بارے میں کام کر رہا تھا۔ لیکن اس معاملے پر اس بات سے پردہ ڈال دیا گیا جو ریوتی سرن نے چند دنوں کے بعد مجھے بتائی۔ وہ آکاشوانی بھون کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے جب آل انڈیا ریڈیو کا ایک نہایت اعلیٰ افسر ان کے پاس آیا اور بولا "مجھے تم پر شرم آتی ہے۔ تم نے ہماری برادری کی توہین کی ہے۔" یہ ایک برہمن نے دوسرے برہمن سے کہا۔



بقیہ: رواداری کا یہ پرچار ہی کافی نہیں

تحریک آزادی نے بہت حد تک اور کافی لمبے عرصے تک عام بھارتی کو اس عظیم ہم ہستی اور آدرش کا احساس دلایا جس نے وہ مذہب، ذات اور علاقے سے اوپر اٹھایا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ یہ نیا علاقائی دباؤ اب بھی موجود ہیں اور انہوں نے ایک متوازن کرم پرستی پہچانے جانے کا خطرہ پیدا کر دیا۔ ہم تمام مکمل طور پر ہندوستانیت کے رنگ میں رنگے نہیں گئے۔

یہ ہندوستانیت اور ہندوستان کا پائو ہے جسے اب ہر ممکن طریقے سے متحرک کرنا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جو بننے کے عمل میں ہے۔ کشش کا ایسا پرچم ہے جو کروڑ ہا عوام کو ہمہ گیر ترقی کے مقصد اور سوشلسٹ مستقبل کی راہ پر لا سکتا ہے۔ اگرچہ ہم سب کی اس ہندوستانیت کی تعمیر مذہب دشمن بنیادوں پر نہیں کی جا سکتی تاہم اس کے ساتھ ہی اسے ایک متبادل بننا ہوگا اور انجام کار اس عوامی شعور کو مذہبی شعور کی جگہ لینا ہوگا۔ بھارت ایک دینی مملکت کے طور پر زندہ نہیں رہ سکے گا یہ بقا حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر اس کے شہریوں کی ابتدائی وفاداری ان کے خاص مذہب کی جانب ہو۔

اقبال نے بہت خوبصورتی کے ساتھ یہ لافانی الفاظ نظم کیے ہیں "ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا"۔ اول ہندو بننے سے پہلے ہندی بنو۔ اول مسلمان بننے سے پہلے ہندی بنو۔ اسی طرح دوسرے لوگ پہلے ہندی بنیں۔ بھارت میں اسی تحریک کو آگے بڑھنا چاہئے۔

گو یہ نہایت اہم ہے کہ ہندو ہندوستانی بنیں، اس سے مسلمانوں، عیسائیوں اور سکھوں اور دوسروں کے بھی ہندوستانی بننے کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ بھارت کی تباہی اقلیتی مذاہب کے متعصبوں اور کٹر لوگوں کے ہاتھوں اسی طرح ہو سکتی ہے جس طرح ان کے ہندو مد مقابلوں کے ہاتھوں۔ ہمیں اس کا احساس بہت تاخیر سے ۱۹۴۷-۱۹۴۷ء میں ہوا۔ بھارت کا لام پرستی کے اس ڈھانچے کے اندر حقیقی آزادی بھارت کو بچانے کے لیے ہو سکتی ہے۔ استحصال کنندگان کے خلاف محنت کش عوام کی لڑائی لیکن بھارت کو بچانے کے لیے بھارت کا پہلے ہونا ضروری ہے۔

[illegible]

بقیہ: مذاہب محض اس خرافات کو آگے بڑھاتے ہیں

تو شاید سرکار ان کتابوں کو واپس لے لیتی۔

گو کہ تاریخ لکھنے کے عمل میں حقیقی اختلاف رائے کا احترام ضروری ہے لیکن فرقہ پروری کا زہر پھیلانے والی درسی کتب پر ایک حد لگانا بھی ضروری ہے۔ ایسی کتابوں کے ساتھ وہی سلوک ہونا چاہئے جو حیاتیات کی ان درسی کتب کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے جو آج بھی نظریہ ارتقا کی جگہ نظریہ تخلیق کا درس دیتی ہیں۔ (جیسا کہ اسلامی سائنس والے کرتے ہیں)

بطور شہری ہم جائز طور پر اپنی حکومت سے مطالبہ کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی پالیسی اور عمل کو بدلے۔ لیکن اصل بنیادی کام ذہنوں پر قبضہ پانے کے لیے جد و جہد کرنا ہے ہمیں عوام سے بحث و مباحثہ کر کے انہیں ہم خیال بنانا ہے۔ ہم فرد کے اس حق کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ اپنے عقیدے اور مذہب پر عمل پیرا رہے۔ اور ہمیں اس بات کا خاص طور پر لحاظ کرنا ہوگا کہ ہم کسی کے مذہبی جذبات کو غیر ضروری طور پر ٹھیس نہ لگائیں۔ فرد کی ذاتی زندگی میں مذہب کا ایک مقام ہے۔ ہمیں تو صرف اس وقت تشویش ہوتی ہے جب مذہب — فرد، پبلک زندگی میں دخل دیتا ہے جب اسے لوگوں میں اختلاف پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور جب توہمات اور فرقہ پروری کو فروغ دے کر، جن کی جڑیں مذہب میں مل جاتی ہیں، سائنسی انداز فکر کو خراب کیا جاتا ہے اس سلسلے میں ہم جب تک عوام کی ایک بڑی تعداد کو اپنا ہم خیال بنا نہ لیں گے، بڑی جنگ تو درکنار، ہم کوئی چھوٹی جھڑپ بھی نہیں جیت سکتے۔

بقیہ: ایک معقولیت پسندانہ معاشرے کی جانب

سازشیں کرتی ہیں، ابھی تک مذہب کو وہی اپنا کردار نبھانے میں استعمال کر رہی ہیں۔ مذہب کی اصل پوترتا (پاکیزگی) کو قائم کرنے کی غرض سے اس کی موجودہ حیثیت کو ختم کرنا ہوگا۔

جو وہ چند جماعتوں کا آلہ کار بنا ہوا ہے اور یہ تب ممکن ہو سکتا ہے کہ جب کہ مذہب کو محض ذاتی اور غیر جماعتی عنصر بنا دیا جائے۔

نئے انسان کی پیدائش

محض سائنس کی تعلیم سے سائنسی مزاج پیدا نہیں ہو جاتا اس دو رخی تصویر کو بچوں میں محتسبانہ جذبہ پیدا کر کے دور کیا جا سکتا ہے اور یہ جذبہ کمزور اور بے شعوری طلبا میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور اس قسم کا تعلیمی نظام تشکیل دینے کے لیے اس امر کی ضرورت ہے کہ تعلیم محض روزی کمانے کی سطح سے اٹھ کر کچھ اعلیٰ خدمت سر انجام دے۔ تعلیم کو نئے انسان کے ظہور میں معاون ثابت ہونا ہوگا۔ جو قومی سماج کا ایک شہری بنے۔ تعلیم میں بہت سی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ اور اس مقصد کے لیے اسے عالمانہ طرز عمل اختیار کرنا ہوگا۔

مختصر یوں کہ اگر ہمیں موجودہ غیر معقول صورت حال سے علیحدگی حاصل کرنا ہے تو اولین ہمیں ان عناصر کی نشاندہی کرنا ہوگی جو ہمارے اردگرد اس غیر معقولیت کو پھیلاتے ہوئے ہیں۔ اور یہ تمام غیر معقولیت ہمارے نظام اقدار، تعلیم، مذہبی رسوم، سیاست، خاندانی رہن سہن، معاشیات میں جاری و ساری ہے۔ ہماری کم ترقی کی یہ ایک اہم وجہ ہے۔ جسے ہمارے غلط عمل نے اور خراب کر دیا ہے۔

اس غلط نظریئے کی بالادستی کے خلاف انسان کی یہ کوشش ہے کہ وہ اپنی زندگی پر پوری طرح قابو حاصل کرے تاکہ وہ اپنے سانجھے مفاد کو نئے سرے سے اور اپنے باہمی تعاون سے محفوظ کر سکے۔

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

پبلیکیشنز ڈویژن کی کتابیں

مشعلِ آزادی : ساغر نظامی — قیمت : ۳۰ روپے

ہندوستان کی جنگِ آزادی کی منظوم داستان (حصہ اوّل) ۲۲۰ صفحات پر مشتمل جس میں ۱۸۵۷ء تک کے واقعات شامل ہیں۔ دیدہ زیب کتابت و طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش۔

بھارت خلائی دور میں : — قیمت : ۱۲ روپے

خلائی سائنس کی دلچسپ داستان۔ ہریکاہریکوٹہ کی سیر، ہمارے سربستہ کا انکشاف نہایت آسان زبان۔ خلائی کوششوں کا ہلکے پھلکے انداز میں بیان، ۱۴۰ صفحات کی کتاب۔ کاغذ عمدہ، تصاویر مزین۔

پہیلیاں : — قیمت : ۸ روپے

پانچ سو سے زیادہ پہیلیوں کا مجموعہ جن سے بچے اور بڑے یکساں طور پر لطف اٹھا سکتے ہیں۔

رنگ برنگے پھول : — قیمت : ۱۰ روپے

بچوں کے شاعر شفیع الدین نیّر، سیفی سیوہاروی، افسر میرٹھی، اسمٰعیل میرٹھی، تلوک چند محروم اور دیگر بہت سے شعرا کی آسان زبان میں لکھی ہوئی نظمیں۔

آجکل کی کہانیاں : — قیمت : ۱۱ روپے

۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۸ء تک رسالہ "آجکل" میں شائع شدہ مشہور کہانیوں کا مجموعہ، جس میں واجدہ تبسم، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور دیگر افسانہ نگاروں کے شہ پارے شامل ہیں۔

کون جیتا کون ہارا : — قیمت : ۹ روپے

بچوں کے لیے آسان زبان میں لکھی ہوئی دو دلچسپ کہانیاں۔ کتاب شروع کرنے کے بعد ایک نشست میں ختم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ عمدہ کتابت۔

ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر (ڈاکٹر محمد عمر) قیمت ۱۰ روپے

ڈاکٹر تارا چند نے اپنی مشہور تصنیف میں ہندوستانی تہذیب پر مسلمانوں کے اثرات کا جائزہ لیا تھا۔ ڈاکٹر محمد عمر نے اپنی اس محققانہ کاوش میں یہ دکھایا ہے کہ ہندوستانی تہذیب مسلمانوں کی زندگی میں سرایت کئے ہوئے ہے۔

بھارتی پارلیمنٹ : — قیمت : ۲ روپے ۵۰ پیسے

یہ کتاب ان اہم اقدامات کا جائزہ پیش کرتی ہے، جو پارلیمنٹ نے پچھلے تیس برس کے دوران نافذ کئے نیز اس میں پارلیمنٹ کے قابل توجہ خدوخال، اور اس کی سرگرمیوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

مُرقّعِ اقبال : (جگن ناتھ آزاد) — قیمت : ۵ روپے

علامہ اقبال کی زندگی کے اہم واقعات، شجرۂ نسب اور نادر تصاویر اور تحریروں کا البم

یہ ہندوستان : (شیلا دھر) — قیمت : ۱۰ روپے

اس باتصویر کتاب میں سادہ اور سہل زبان میں بچوں کو ہندوستانی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ تاریخی، معاشی اور سماجی حالات سے آگاہ کیا گیا ہے۔ رنگین تصاویر۔

سرسید احمد خان : (پروفیسر خلیق احمد نظامی) قیمت : ۵ روپے

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی، ثقافتی، اور سیاسی زندگی پر سرسید کے کارناموں کا زبردست اثر پڑا ہے اس بات کو بڑے عالمانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ابوالکلام آزاد : (عرش ملسیانی) قیمت : ۵ روپے

ابوالکلام آزاد جدید ہندوستان کے معماروں میں ہیں۔ ان کی خدمات کا حسین و دلکش انداز میں بیان۔

جواہر لال کی کہانی تصویروں کی زبانی : قیمت : ۲/۵۰ روپے

محبوب رہنما اور ہندوستان کے پہلے وزیراعظم شری جواہر لال نہرو کی زندگی کے دلچسپ واقعات۔ رنگین تصاویر میں۔ بچوں کے لیے بہترین تحفہ

ہم ایک ہیں : (عرش ملسیانی) قیمت : ۱۰ روپے

ہندوستان کی ثقافتی و سماجی گوناگونی اور یک رنگی کا دلچسپ بیان۔ قومی زندگی کی توانائی کی داستان۔

پھلوں اور سبزیوں کو محفوظ رکھنے کے طریقے : قیمت ۲/۵۰ روپے

گھریلو ضرورتوں کے جام، جیلی، مارملیڈ، چٹنی مربّے اور آچار وغیرہ بنانے کے طریقے تصویروں کے ذریعے بتائے گئے ہیں جن سے بڑی آسانی سے آپ گھر بیٹھے اپنی من پسند چیزیں بنا سکتے ہیں۔

پریم چند ۔ فکر و فن از : قمر رئیس — قیمت : ۸ روپے

پریم چند کی تخلیقات کا مطالعہ، فکر و فن کی گہرائیوں کا جائزہ، عصری حقیقتوں کی ترجمانی قارئین اور طلبا کے لیے انمول تحفہ۔

"یوجنا" اردو کے خریداروں کو [illegible]

دس روپے سے کم قیمت کی کتابیں [illegible] پوسٹل آرڈر [illegible]

کتابیں ملنے کا پتہ :۔ بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن [illegible]

کسی نے ایک بار کہا تھا کہ یاگیہ ولک سے لے کر سوامی وِویکانند
تک مذہبی جوش اور احساس کی زیادتی کے غیر صحت مند اثرات واضح ہوئے
ہیں۔ روحانیت کے نام پر بڑھ چڑھ کر باتیں بنانا اب بھی بظاہر آسان
ہے لیکن ایسا کرتے ہوئے ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم مصائب و آفات
اور ذلت و تذلیل کے سرد جھونکوں سے خود کو بچاتے اور گرم رکھنے کے
لیے جس لبادہ کا استعمال کرتے ہیں، اس کی حیثیت فرضی داستانوں
اور خیالی قصوں سے زیادہ نہیں۔ ہمارا بالائی طبقہ ذہنی طور پر نادار اور روحانی
طور پر پست ہے لہذا وہ بآسانی اور بہت جلد تازہ خداؤں کے سامنے
سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے، یہ اللہ والے، اقتدار کے ٹھکانوں اور دولت کی
آماجگاہوں میں درجنوں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ استحصال
پسندی اور انسان کا حرص اور طمع کا جذبہ نوعِ انسانی کی تاریخ کی قدیم برائیوں
میں سے ہے۔ انسان بنیادی طور پر خود غرض واقع ہوا ہے اور یہی برائیاں اور نقائص
ان جرائم اور خامیوں کا سبب بنتے ہیں جنھوں نے مذہب کے نام پر نوعِ انسانی
کی تاریخ کے صفحات کو آلودہ کر دیا ہے نیز جس کے سبب ہمارے ملک کے حالات
میں ہماری زندگی کی روشنی کو تاریکی میں بدل دیا ہے اور جس کے نتیجے میں انسان اپنے مقام
سے گر گیا ہے۔

ہیرن مکرجی

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment
at Civil Lines Post Office, Delhi-110054

Vol. 5 No. 9 & 10 YOJANA (URDU) 1-31 August, 1985—Special issue

[illegible]

جسٹس وی۔ آر کرشنا ایّر

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002

یوجنا

یکم تا ۱۵، ستمبر ۱۹۸۵

ایک روپیہ

زراعت و صنعت کے مابین تجارتی رجحان کا جائزہ

(سید اطہر رضا بلگرامی)

اُتر پردیش میں تعلیم بالغان

(ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ سنگھ)

منصور احمد عثمانی

روح ایک — قالب دو
اردو — ہندی

اردو اور ہندی جو دستور ہند کے آٹھویں شیڈول کی دو اہم اور مقبول ترین زبانیں بن چکی ہیں اور اُن کا شمار ہندوستان کی بڑی زبانوں میں ہوتا ہے، تاریخی اعتبار سے یہ دو ہم رشتہ زبانیں ہیں اور ان کی اساس اور ماخذ مشترک ہے۔ نیز لسانیاتی ساخت کے اعتبار سے بھی یہ ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں لیکن اگر ان زبانوں کو سماجی لسانیاتی تناظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو ان کی جُداگانہ حیثیت بھی واضح ہوتی ہے اور یہ دو ممتاز اور منفرد زبانوں کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتی ہیں۔

بنیادی طور پر یہ ایک ہی زبان کے دو ٹکڑے ہیں جو انگریزی حکومت کی ڈپلومیسی کا نتیجہ ہیں۔ جو لوگ تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ انگریزوں نے اپنی حکومت کی کامیابی اور کامرانی کے لیے ہمیشہ "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی کو اپنایا۔ ہندو مسلم اختلافات بھی برطانوی اقتدار شاہی کے سبب مستحکم ستون بنے۔

اٹھارویں صدی سے پہلے اُردو اور ہندی میں کوئی کشیدگی نہیں تھی۔ یہ عوام کی مشترکہ زبان تھی۔ چنانچہ اُردو کی پہلی باقاعدہ غزل بھی ایک ہندو شاعر چندر بھان برہمن ہی سے منسوب ہے۔

اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کے ادیب مورخ بھی اس نظریہ پر متفق ہیں کہ اس مشترکہ زبان میں تفریق کا عمل انگریزوں کے ایما پر ہوا تاکہ ہندو مسلمانوں میں اختلاف پیدا کر کے وہ اپنی حکومت کی بنیادوں کو مضبوط بنا سکیں۔

فورٹ ولیم کالج میں اس قومی زبان کے، جس کے ہندی/ہندوی/ریختیہ/کھڑی بولی/ہندوستانی اور اُردوئے معلیٰ وغیرہ بہت سے نام تھے، دو حصے کیے گئے ایک حصہ کا نام ہندی تھا اور دوسرے کا نام اُردو مخصوص ہوا۔ اور باقی سب ناموں کو ترک کیا گیا اور دونوں کے رسم الخط بھی مقرر ہو گئے۔

شمالی ہندوستان میں اس نئی زبان کی ضرورت چونکہ عموماً درباروں، خانقاہوں، بازاروں اور فوجی لشکروں میں پڑتی تھی لہذا لشکر جسے تُرکی زبان میں اُردو کہا جاتا ہے' کی رعایت سے یہ زبان اُردو کے نام سے موسوم کی جانے لگی۔ بقول راجا شیو پرشاد "یہ پراکرت عربی و فارسی لفظوں کے سرمایہ سے مالا مال ہے اسے ہندی کہیں یا ہندوستانی برج بھاشا یا ریختیہ، کھڑی بولی یا اُردو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا بیج محمود غزنوی نے بویا تھا۔

اُردو اور ہندی کے بنیادی طور پر ایک ہی ہونے کی دسیوں دلیلیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ سید عبدالواسع ہانسوی نے جب اس زبان کا پہلا لغت لکھا تو اس کا نام غرائب اللغات ہندی ہی تجویز کیا۔ اور اسی طرح مرزا غالب کے اُردو کے مجموعے کا نام بھی عود ہندی رکھا گیا۔

بعض حضرات نظریہ کے ٹیڑھے پن کی وجہ سے اُردو کی مخالفت کرتے ہیں اور اس کا رشتہ پاکستان یا مسلمان سے جوڑتے ہیں۔

پچھلے دنوں ہمارے صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ جی نے بھی اس نظریہ کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اردو مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندوستان کی زبان ہے اور اردو کے فروغ میں دوسرے فرقوں کے لوگ بھی شامل ہیں۔

(باقی کور صفحہ ۳ پر)

منصوبہ بندی سے متعلق ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنیوالا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر ــــ آر۔ ٹھکرال
ایڈیٹر ــــ لکشمی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر ــــ محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر ــــ وسیم حیدر

جلد ۵	یکم تا ۱۵ ستمبر ۱۹۸۵	شمارہ ۱۱

۱۰ بھادر تا ۲۴ بھادر شک ۱۹۰۷ ✤ فون نمبر ۶۰۲۸۱۸

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے، ۲ سال ۳۵ روپے، ۳ سال ۵۰ روپے
فی کاپی ــــ ایک روپیہ
طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فیصد کی رعایت

اس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

بزنس منیجر: ایل۔ آر۔ بترہ ✤ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس۔ منچالے

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتہ:
ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین)
نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

ترسیل زر کا پتہ: بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

روزگار کے پروگرام: غریبی دور کرنے میں معاون

ہمارے ملک میں ترقیاتی عمل کے لیے جو اُصول وضع کیے گئے ہیں، وہ ہیں ترقی، مساوات اور سماجی انصاف۔ ہمارا بنیادی مقصد یہ رہا ہے کہ ۱۹۸۵ء تک خطِ افلاس سے نیچے زندگی گزارنے والے عوام کا فی صد تناسب ۱۰ فی صد سے بھی کم کر دیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول میں دیہات میں روزگار کے قومی پروگرام نے اہم رول ادا کیا ہے۔ خیال رہے کہ اس پروگرام کو اکتوبر ۱۹۸۰ میں کام کے بدلے خوراک' نامی پروگرام کی جگہ شروع کیا گیا تھا۔

اپریل ۱۹۸۱ سے اسے چھٹے منصوبے میں مستقل حیثیت دے دی گئی۔ اس کے ذریعے دیہی علاقوں میں زندگی گزارنے والے بے روزگار اور کم روزگار افراد کو نفع بخش روزگار مہیا کرایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دیہات میں پائیدار نوعیت کے اثاثہ جات اور تعمیرات کو مستحکم کیا جاتا ہے۔ یہی نہیں اس کے توسط سے دیہی عوام کا غذائی معیار بلند کرنے اور ان کا معیارِ زندگی اوپر اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے ذریعے دیہی محنت کش طبقے کو اُجرتوں کی ادائیگی کو مستحکم بنانے کی بھی کوشش کی جاتی ہے۔ زور اس بات پر ہوتا ہے کہ انھیں ادا کی جانے والی اُجرتیں مقررہ کم سے کم شرح سے گرنے نہ پائیں اور ان کا استحصال نہ ہو۔ اس پروگرام کا ایک خاص فائدہ یہ ہے کہ دیہی عوام کو اپنے گاؤں میں ہی نفع بخش روزگار ملنے کا امکان رہتا ہے اور وہ شہروں کی طرف بھاگنے کی مصیبت سے بچ جاتے ہیں۔ دیہات میں اس پروگرام کی بدولت ایسی سڑکیں تعمیر ہو سکی ہیں جن سے وہاں کی تجارت بڑھ سکی ہے۔ دیہات کی ترقی کے جو مختلف پروگرام چل رہے ہیں' ان کے ساتھ تال میل قائم کر کے یہ دیہی عوام کے لیے ایک نعمت ثابت ہو رہا ہے۔ اس پروگرام نے یہ حقیقت ثابت کر دی ہے کہ ترقی اور روزگار کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس پروگرام سے بحساب فی کس فی دن ۳۰ تا ۴۰ لاکھ افراد کو ہر سال روزگار دلانے کا نشانہ رکھا گیا ہے۔ مارچ ۱۹۸۵ تک اس پروگرام کے تحت بحساب فی کس فی دن ۳۰ لاکھ سے کچھ زیادہ افراد کو روزگار دلانے کا نشانہ تھا۔ دسمبر ۱۹۸۴ تک کے دستیاب اعداد و شمار کی روشنی میں اس پروگرام سے ۲۰ لاکھ ۹۳ ہزار سے زیادہ افراد کو روزگار دلایا جا چکا تھا۔ گویا مقررہ نشانے کے ۶۵ فی صد کے لگ بھگ کامیابی مل چکی تھی۔ روزگار دلانے میں پسماندہ طبقوں کا خاص کر شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔

ملک بھر میں اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری ہر ضلع کے دیہی ترقیاتی اداروں کو سونپ دی گئی ہے۔ ہر ضلع یا بلاک میں مقامی ضرورتوں کے پیشِ نظر اس پروگرام کو عملی شکل میں آگے بڑھایا جا رہا ہے، اس سلسلے کی تعمیرات میں دیہی پنچائتوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے تاکہ عوام کی شرکت اور ان کی بہبود کو یقینی بنایا جا سکے۔

ساتویں منصوبے میں خوراک' کام اور پیداواری صلاحیت کو بڑھانے پر زور ہے' لہٰذا دیہات میں روزگار کے قومی پروگرام' دیہی ترقی کے مربوط پروگرام اور دیگر ترقیاتی پروگراموں نے خاص اہمیت اختیار کر لی ہے۔ ان کو عملی جامہ پہنانے اور اُن کی افادیت کو مؤثر بنانے کے لیے ان کا وقتاً فوقتاً جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ایسے مطالعوں کی ضرورت محسوس کی گئی ہے جن سے پتہ چل سکے کہ اب تک ان پروگراموں نے عوام کی حالت بہتر بنانے میں کیا رول ادا کیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ پروگرام صحیح سمت میں جا رہے ہیں اور کیا ان سے مطلوبہ مقاصد حاصل ہو رہے ہیں۔ کچھ ریاستیں حکومتوں کے محکمہ جاتی انداز سے یا پھر اس کام کے لیے مشہور تنظیموں کے توسط سے کچھ جائزے لیے بھی ہیں۔ مثال کے طور پر کیرالا کی ریاستی حکومت نے اپنے محکمے کے ذریعے سے ہی یہ جائزہ لیا ہے یا گجرات کی حکومت نے احمد آباد میں واقع شماریات اور اقتصادی تحقیق کے سردار پٹیل انسٹی ٹیوٹ کے توسط سے ان پروگراموں کا جائزہ لیا ہے۔ اس طرح کے مطالعوں یا جائزوں میں جن پہلوؤں کو سامنے رکھا گیا ہے' وہ یہ ہیں:-

روزگار کی ضرورتوں کا اندازہ، فاضل روزگار کے مواقع، کس کس موسم میں روزگار کے کتنے مواقع رہتے ہیں' پروگراموں سے فائدہ اٹھانے والوں کی آمدنیوں کا تفاوت، ان پروگراموں سے کن کن کو فائدہ پہنچا اور کیا وہ وہی لوگ تھے جن کو فی الواقعی فائدہ پہنچانا مقصود تھا۔ کیا کیا اثاثہ جات قائم کیے جا سکے اور کیا وہ پائیدار نوعیت کے ہیں۔ نیز علاقے کی سماجی اور اقتصادی ترقی پر وہ کس حد تک اثر انداز ہوئے۔

اُمید ہے کہ یہ کوششیں ملک سے غریبی دور کرنے میں معاون ثابت ہوں گی۔

(ایڈیٹر)

سید اطہر رضا بلگرامی

زراعت و صنعت کے مابین

تجارتی رجحان کا جائزہ

معیشت کا ہر شعبہ، خواہ وہ ترقی کی کسی بھی منزل پر کیوں نہ ہو، خود مختار و خود کفیل نہیں ہوتا۔ ابتدا سے ہی ہر شعبہ دیگر شعبہ جات کا سہارا لے کر اور خود دوسروں کا سہارا بن کر ترقی کرتا ہے۔ شعبہ کے درمیان یہی باہمی انحصار دراصل اُن کی مستحکم ترقی کا ضامن ہے۔ یہ بات دیگر ہے کہ سہارا لینے دینے کی نوعیت، سمت و پیمانہ منزل بہ منزل ترقی کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ مثلاً زراعت جو معیشت کا بنیادی سیکٹر ہے، اپنی پیداوار و بشری قوت کے ذریعے انسانوں و صنعتوں کو زندگی بخشتا ہے، حکومت کو کثیر زرِمبادلہ کے خزانے عطا کرتا ہے، روزگار کا سرچشمہ ہے اور رسل و رسائل، بالخصوص ریل و سڑک وغیرہ کی ترقی و توسیع کا ذریعہ بنتا ہے۔ اسی طرح دیگر شعبہ جات اپنی پیداوار و خدمات جیسے مشین، کل پرزے، بجلی، کیمیائی کھاد، آبپاشی کے آلات و ساز و سامان، اچھے بیج، منڈیوں، گوداموں کا قیام، فصلوں کے تحفظ کے لیے ادویات، جوتنے اور بونے کے نئے ڈھنگ اور ریسرچ و تجربات کے ذریعے زراعت کی مستحکم ترقی اور اُس کے روشن مستقبل کے ضامن بنتے ہیں اور زندگی کی تمام ضروریات اور عیش و آرام کی اشیاء فراہم کر کے دیہی سماج کو بہتر و خوشحال زندگی گزارنے ... سکتے ہیں۔

اس طرح دو سیکٹر کے درمیان متبادل تجارتی تعلق اُن کی ترقی و توسیع کا ذریعہ بنے رہتے ہیں۔

لیکن معاشی ترقی کی تاریخ شاہد ہے کہ اس طرح کے تعلق کی نوعیت ترقی کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ ابتدا میں معیشت کا ہر شعبہ زراعت کے رحم و کرم کا محتاج نظر آتا ہے۔ اُن کی ترقی بڑی حد تک زراعت کے سلوک سے متاثر نظر آتی ہے، لیکن جب دھیرے دھیرے دوسرے شعبہ بالخصوص صنعت، بس و رسائل، کامرس و تجارت، اپنی ترقی کی بنیادوں کو مضبوط بنا لیتے ہیں تو پھر اس انحصاری کیفیت میں تخفیف شروع ہو جاتی ہے اور ایک طرح کی مساوی پاٹنرشپ پیدا ہو جاتی ہے۔ یہاں پھر تعلق کچھ اس طرح کا پیدا ہو جاتا ہے کہ ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم بن جائیں۔ آزادی کے بعد تیسرے پانچ سالہ منصوبہ تک زراعت و صنعت کے درمیان جو رشتہ قائم تھا، اُس میں زراعت کو مرکزی مقام حاصل رہا۔ قومی پیداوار و قومی آمدنی میں ۵۰ فیصد سے بھی زاید کی ذمہ داری صرف زراعت کی تھی۔ یعنی باقی ۵۰ فیصد یا اُس سے بھی کم میں دیگر شعبہ جات کی شمولیت تھی۔ چوتھے پلان سے چھٹے پلان کے اختتام تک دیگر شعبہ جات نے اپنی ترقی کی جڑیں اس قدر مضبوط کر لیں کہ اب اِن تمام شعبہ جات کی مجموعی حصہ داری ۶۰ فیصد سے بھی زیادہ ہو گئی۔ یعنی زراعت کی واحد شمولیت صرف ۳۹ یا ۴۰ فیصد رہ گئی۔

دو سیکٹر کے درمیان اشیا و خدمات کا لین دین کس نوعیت کا ہے، اس کی سمت کیا ہے، ماہیت کیسی ہے یہ سب ایسے سوال ہیں جن کی اگر تشریح کی جائے تو واضح ہو جائیگا کہ ایک سیکٹر اپنی ترقی کے لیے دیگر سیکٹر پر کس قدر منحصر ہے یا اُن کے درمیان پایا جانے والا تجارتی تعلق اُس کی مستقبل کی ترقی کی کس سمت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اُس سیکٹر کے ترقی کے منصوبوں، روپیہ و سرمایے کے لگانے کے فیصلوں ترقی کی سمتوں کے تعین جیسے تمام اہم فیصلوں کے وقت یہی معلومات ایک اہم رول ادا کرتی ہیں۔ اس لیے دو سیکٹر کے درمیان تجارتی رُجحان کا مطالعہ، اُس کی تشریح اور وضاحت اور اُس کا تجزیہ آج کا ایک اہم ترین موضوع ہے جو معاشی کرین کے درمیان ہمیشہ سے بحث کا باعث بنا رہا ہے۔ میں اپنے اس مضمون میں زراعت و صنعت کے مابین تجارتی رجحان کو ناپنے سے متعلق چند اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالوں گا جو شدت کے ساتھ

بحث کا موضوع بنے رہے ہیں۔

بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ دو سیکٹر (زراعت اور صنعت) کے درمیان تجارتی تعلق کو، جس کی تشریح کی جا چکی ہے، کس طرح ناپنا چاہیے۔ اگر کسی ایک سیکٹر کی اشیاء و خدمات کی مقدار کو پیمانہ بنایا جائے تو بہت سی مشکلات پیش آئیں گی۔ مثلاً یہ بتانا مشکل ہوگا کہ زرعی سیکٹر سے اجناس و دیگر خام پیداوار کی کتنی مقدار بدل کر ٹریکٹر، بجلی، بیج، کھاد، اوزار وغیرہ کو استعمال کیا گیا ہے اور اس طرح کے لین دین کا نرخ کس طرح طے کیا گیا ہے۔ کس قدر لیبر قوت دیہی علاقہ سے شہری علاقے کی طرف منتقل ہوئی اور اس کے بدلے دیہی علاقے کو کیا ملا۔ یہ کس طرح معلوم کرتا ہے، کس نرخ پر حاصل کرتا ہے اور اُن کے بدلے دوسرے سیکٹر کو کیا دیتا ہے۔ چونکہ زراعت ایک غیر یقینی پیشہ ہے اس لیے اس طرح سے اشیاء اور خدمات کو لین دین کا پیمانہ بنانا صرف غیر سائنٹفک ہوگا بلکہ ناقابلِ عمل و مشکل بھی۔ اس عمل سے برآمد شدہ تجارتی رجحانات اور اُن پر مبنی ترقیاتی منصوبوں کی سمتیں غلط اور مضر اثرات چھوڑ سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں مفکرین نے بہت سے حل تلاش کیے ہیں جن کی وضاحت ہم مندرجہ ذیل طور پر کر رہے ہیں۔

زراعت و صنعت کے مابین تجارتی تعلق کو ناپنے کے مروجہ پیمانے اور اُن کا جائزہ

ایک آسان سا حل کسی مقررہ وقت پر قیمتوں کے انڈیکس کے ذریعے تلاش کیا گیا۔ زرعی طبقہ اپنی پیداوار

معلوم کر لیا جائے تو دو سیکٹر کے درمیان تجارتی تعلق کے رجحان کا اندازہ بخوبی ہو جائے گا۔ مثلاً اگر دونوں اینڈیکس ۱۰۰ ہوں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ تجارتی تعلق توازنی کیفیت میں ہے۔ اگر وصول کی جانے والی قیمتوں کا انڈیکس ادا کی جانے والی قیمتوں کے انڈیکس سے زیادہ ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ تجارتی تعلق زراعت کے موافق رُخ کی نشاندہی کر رہا ہے اور اگر صورتحال اس کے برعکس ہو تو تجارتی تعلق زراعت کے مخالف سمت میں ہے۔ ہم اس طریقۂ کار کو ایک فارمولے کی مدد سے بھی سمجھ سکتے ہیں۔

زرعی تجارتی تعلق :

$$\frac{\text{کسانوں کے ذریعے وصول کی گئی قیمتوں کا انڈیکس}}{\text{کسانوں کے ذریعے ادا کی گئی قیمتوں کا انڈیکس}} \times ۱۰۰$$

اس فارمولے میں وصول اور ادا کی گئی قیمتوں

زرعی و صنعتی اشیاء کی قیمتوں کا انڈیکس (۱۹۵۰-۵۱ء — ۱۹۸۲-۸۳ء)

سال / منصوبے (۱)		قیمتوں کا عام انڈیکس (۲)	صنعتی اشیاء کی قیمتوں کا انڈیکس (۳)	زرعی اشیاء کی قیمتوں کا انڈیکس (۴)	صنعتی اشیاء کی قیمتیں زرعی اشیاء کی قیمتوں کی فیصد کی شکل میں (۵)	
۱۹۵۰-۵۱	پہلا منصوبہ	۱۱۱٫۸	۱۰۱٫۸	۱۱۰٫۰	۹۲٫۵	فی صد
۱۹۵۵-۵۶		۹۲٫۵	۹۹٫۶	۸۸٫۰	۱۱۳٫۲	" "
۱۹۶۰-۶۱	دوسرا منصوبہ	۱۲۴٫۹	۱۲۲٫۸	۱۲۳٫۸	۹۹٫۲	" "
۱۹۶۵-۶۶	تیسرا منصوبہ	۱۳۱٫۶	۱۱۷٫۰	۱۴۱٫۷	۸۲٫۶	" "
۱۹۷۰-۷۱	ایک سالہ پلان	۱۸۱٫۱	۱۴۹٫۷	۲۰۱٫۴	۷۴٫۳	" "
۱۹۷۵-۷۶	چوتھا منصوبہ	۱۶۳٫۰	۱۷۱٫۲	۱۵۷٫۳	۱۰۸٫۸	" "
۱۹۸۰-۸۱	چوتھا و پانچواں منصوبہ	۲۵۷٫۳	۲۵۷٫۳	۲۱۰٫۵	۱۲۲٫۲	" "
۱۹۸۲-۸۳		۲۸۸٫۳	۲۷۱٫۷	۲۴۸٫۱	۱۰۹٫۵	" "

اندازہ لگایا جائے کہ زراعت سے متعلق وہ اشیاء جن کو زرعی سیکٹر دوسرے سیکٹر سے حاصل کرتا ہے (مثلاً ٹریکٹر، بیج، کھاد، اوزار، ادویات وغیرہ) ان کے علاوہ روزمرہ کی زندگی کو بہتر و پُرسکون بنانے والی اشیاء (مثلاً جوتے، سائیکل، ریڈیو، ملبوسات، بجلی کا سامان، رہائشی سامان، عمارتی سامان وغیرہ)۔ دوسرے سیکٹر سے کس طرح حاصل کو بازار میں فروخت کر کے جو آمدنی حاصل کرتا ہے، اُس کو وہ اُن اشیاء کی خرید پر صرف کرتا ہے جن کو وہ پیدا نہیں کرتا۔ اس طرح قیمتوں کا ایک انڈیکس یہ بتلائے گا کہ کسی وقت مقررہ پر زراعت نے کیا قیمتیں وصول کیں اور دوسرا انڈیکس یہ بتلائے گا کہ اس نے کیا قیمتیں ادا کیں۔ اب وصول اور ادا کی جانے والی قیمتوں کے انڈیکس کا اگر تناسب کے انڈیکس کے تناسب کو اگر ۱۰۰ سے تقسیم کر دیا جائے تو تجارتی رُخ کی شرح کا اندازہ ہو جائے گا۔ یعنی ہم یہ بتلا سکتے ہیں کہ کتنے فیصدی تجارتی تعلق زراعت کے موافق یا غیر موافق سمت میں ہے۔ اس فارمولے کے تحت ہندوستان کے پانچ سالہ پلان میں زراعت و صنعت کے درمیان تجارتی تعلق مندرجہ بالا اعداد و شمار کے ذریعے واضح کر سکتے ہیں۔

سال	وہ زرعی اشیاء، جو غیر زرعی سیکٹر کے ذریعہ خریدی گئیں	وہ غیر زرعی اشیاء جو زرعی سیکٹر کے ذریعے خریدی گئیں	خالص تجارتی رجحان
۱۹۵۰-۵۱	۹۵٫۴۴	۹۴٫۷۶	۱۰۰٫۷۲
۱۹۵۵-۵۶	۷۳٫۸۳	۷۷٫۹۰	۹۴٫۷۸
۱۹۶۰-۶۱	۱۰۰٫۰۰	۱۰۰٫۰۰	۱۰۰٫۰۰
۱۹۶۵-۶۶	۱۳۸٫۱۸	۱۲۰٫۷۱	۱۱۴٫۴۷
۱۹۷۰-۷۱	۱۹۸٫۵۸	۱۵۵٫۹۷	۱۲۷٫۲۲
۱۹۷۴-۷۵	۳۴۳٫۷۹	۲۵۶٫۷۱	۱۳۳٫۹۲

یہ اعداد و شمار زراعت و صنعت کے درمیان تجارتی رجحان اور اُن میں ہونے والی تبدیلی اور منتقلی کی واضح تصویر پیش کرتے ہیں۔ پہلے پانچ سالہ پلان کی ابتدا میں ۱۹۵۰-۵۱ء میں صنعتی اشیاء کی قیمتیں زرعی اشیاء کی قیمتوں کی فیصد کی شکل میں (کالم نمبر ۵) ۱۰۰ سے نیچے ملتی ہیں۔ لیکن منصوبے کے اختتام یعنی ۱۹۵۵-۵۶ تک یہ قیمتیں ۱۰۰ کی سطح سے بلند ہو گئیں۔ اس طرح زراعت و صنعت کے مابین تجارتی رجحان جو منصوبے کی ابتدا میں زراعت کے موافق تھا وہ منصوبے کے اختتام تک صنعت کے موافق بن گیا۔ دوسرے پانچ سالہ منصوبے کے ابتدائی و اختتامی زمانہ پر نظر ڈالنے سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ منصوبے کے اختتام تک یعنی ۱۹۶۰-۶۱ تک یہ تجارتی تعلق زراعت کے موافق ہے کیوں کہ زرعی اشیاء کی قیمتوں کے مقابلہ میں صنعتی اشیاء کی قیمتوں کا انڈیکس ۱۰۰ کی سطح سے پست نظر آتا ہے۔ تیسرے اور چوتھے پلان کی ابتداء تک یہ تجارتی تعلق زیادہ سے زیادہ زراعت کے موافق بنتا ہوا نظر آتا ہے، کیونکہ اس دوران صنعتی اشیاء کی قیمتیں زرعی اشیاء کی قیمتوں کے مقابلہ میں مسلسل ۱۰۰ کی سطح سے گرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس کے بعد کا دور ۱۹۷۰-۷۱ تا ۱۹۸۲-۸۳ تک یہ رجحان زراعت کے مخالف بن جاتا ہے۔ اب نسبتی قیمتوں کی سطح ۱۰۰ سے بلند ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ان اعداد و شمار کے تجزیہ سے دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔ اوّل یہ کہ ۱۹۵۰-۵۱ - ۸۲-۸۳ کے ۳۲ برسوں کے دوران زراعت و صنعت کے درمیان تجارتی تعلق یکساں نہیں رہے، ان میں تبدیلی رونما ہوتی رہی اور دوسری یہ کہ ۱۹۷۰-۷۱ء، ۱۹۵۰-۵۱ء تک یہ تعلق زیادہ تر زراعت کے موافق رہا اور اس کے بعد یعنی ۱۹۸۲-۸۳ء اور ۱۹۷۰-۷۱ء تک صنعت کے موافق بن گیا۔

زراعت اور صنعت کے درمیان تجارتی تعلق اور اس کے رجحان کو معلوم کرنے کا یہ انتہائی آسان سا طریقہ ہے۔ لیکن اس طریقِ کار میں بہت سی خامیاں بتلائی گئی ہیں۔ جن کو مختصراً یہاں واضح کیا جا رہا ہے۔ اوّل یہ کہ زرعی و صنعتی اشیاء کی قیمتیں جن کو تجارتی تعلق کو دریافت کرنے کی بنیاد بنایا گیا ہے وہ تھوک قیمتیں ہیں جس میں یہ اندیشہ ہے کہ اس میں ایسی تمام اشیاء بھی شامل ہو جائیں گی جو بالعموم لین دین اور تجارت کا ذریعہ نہیں ہوتیں اور یہ عین یقینی بات ہوگی۔ کیوں کہ تھوک قیمتوں کا انڈیکس اپنے اندر اتنی وسعت رکھتا ہے کہ اس میں عمومی طور پر ہر اشیاء کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے تھوک قیمتوں کے انڈیکس کے ذریعے صحیح تجارتی رجحان کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی۔ اس سے محض ایک سطحی اندازہ ہو سکتا ہے۔ دوسری اہم کمزوری یہ بتلائی گئی کہ قیمتوں کے تعیّن کا زمانہ واضح نہیں ہے اور یہ بہت ہی اہم نکتہ ہے۔ اگر ہم نے زرعی اشیاء کی قیمتوں کو اُس وقت ناپا جب وہ سیلاب، خشک سالی یا دیگر قدرتی عذاب کا شکار ہو کر بہت چڑھی ہوئی تھیں تو یقیناً تجارتی رجحان زراعت کے موافق ملے گا جو اُس مخصوص صورتِ حال کا ایک عارضی نتیجہ ہوگا۔ دوسری طرف اگر کسی ایسے سال کو چُنا گیا جس میں فصلیں بہت اچھی ہوئی ہوں تو اشیاء کی قیمتیں بہت گری ہوئی ملیں گی اور نتیجتاً تجارت کا رجحان زراعت کے خلاف جائے گا۔ اس لیے اس طریقِ کار میں کسی ایسے سال کا انتخاب کرنا بہت ضروری ہے جس میں قیمتوں میں نہ زیادہ چڑھنے اور نہ زیادہ گرنے کا رجحان پایا جا رہا ہو تاکہ تجارتی رجحان کی صحیح سمت کا اندازہ ہو سکے۔

ان کمزوریوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے کچھ مفکرین نے اس سے بہتر طریقِ کار کو اپنایا ہے، جس کو تجارتی تعلق کا خالص لین دین کا طریقِ کار NET BARTER TERMS OF TRADE (NBTT) کہتے ہیں۔ یہاں تھوک قیمتوں کو بنیاد نہیں بنایا گیا بلکہ درآمدات و برآمدات کی قیمتوں کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ ایک سیکٹر دوسرے سیکٹر سے کیا درآمدات اور برآمدات کرتا ہے اس کے فرق کو اگر معلوم کر لیا جائے تو تجارتی رجحان کا اندازہ بہتر طور پر ہو سکتا ہے۔ برآمدات کی سطح اُس سیکٹر کی آمدنی اور درآمدات کی سطح اخراجات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اب اگر برآمدات کی سطح درآمدات سے بلند رہتی ہے تو تجارتی رجحان اُس سیکٹر کے موافق اور اگر اس کے برعکس ہے تو غیر موافق بن جائے گا۔ NET BARTER TERMS OF TRADE (NBTT) یہی بتلاتا ہے۔ اس طریقِ کار کے بموجب زراعت اور صنعت کے درمیان تجارتی تعلق کو مندرجہ بالا طور پر ناپا گیا ہے۔

اس تخمینہ کے بموجب تجارتی رجحان واضح طور پر زراعت کے موافق ہے۔ ۱۹۶۰-۶۱ء میں اگر ۱۰۰ تھا تو ۱۹۷۴-۷۵ء تک ۱۳۳٫۹۲ ہو گیا۔

۶۱ ۔ ۱۹۶۰ کے بعد یہ تعلق مسلسل زراعت کے موافق رہا ہے جبکہ اس سے قبل ۵۱ ۔ ۱۹۵۰ تا ۵۶ ۔ ۱۹۵۵ تک یہ تعلق زراعت کے موافق نہیں تھا۔

اس طریقِ کار کی بھی کچھ اہم کمزوریوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اول یہ کہ درآمدات و برآمدات کی قیمتوں کو صحیح طور پر ناپنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ برآمدات کی قیمتوں کو قصداً بلند اور درآمدات کی قیمتوں کو پست سطح پر رکھا گیا ہے۔ جس کا نتیجہ نکلا کہ فرضی طور پر تجارتی تعلق زراعت کے موافق طے ہا ہے۔ زراعتی قیمتوں کا انڈیکس مجموعی قیمتوں کے انڈیکس سے بالعموم بلند رہتا ہے۔ اسی [illegible] ڈیکس مجموعی قیمتوں کے [illegible] ت پایا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ [illegible] ن کے عام انڈیکس میں چڑھاؤ محض زرعی قیمتوں میں چڑھاؤ کی وجہ سے ہوتا ہے اور جس سے یہ نتیجہ نکال لیا جاتا ہے کہ زراعت اور صنعت میں تجارتی تعلق زراعت کے موافق جا رہا ہے۔ اگر آمدنی کے رُخ سے دیکھا جائے تو ایک عام تاثر یہ ہے کہ زرعی سیکٹر کی آمدنی مسلسل بڑھ رہی ہے جبکہ صنعتی اشیاء کے لیے اُن کے اخراجات اس قدر نہیں بڑھ رہے ہیں اور دوسری طرف اُن کے زرعی اخراجات بالعموم ٹھہرے ہوئے اور طے شدہ ہیں یا انتہائی سُست رفتار سے بڑھ رہے ہیں لیکن اس طرح آمدنی بڑھنے اور اخراجات کے اُسی قدر نہ بڑھنے کے جو فوائد ہیں وہ کسانوں کے ہر طبقہ کے لیے مساوی نہیں ہیں جو بڑے اور امیر کسان ہیں انھیں کو اس صورتِ حال کا پُورا فائدہ اُٹھانے کا موقع مل رہا ہے اور جو چھوٹے کسان ہیں وہ اس کا کوئی فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں۔ اس لیے تجارتی تعلق کو اگر طبقات میں تقسیم کر کے دیکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ زراعت کا امیر طبقہ ایک موافق تجارتی رُحجان کی نشاندہی کر رہا ہے جبکہ چھوٹا کسان غیر موافق تجارتی رُحجان کا۔ یہ طریقِ کار اس گوشہ کی طرف کوئی روشنی نہیں ڈالتا۔

زراعت اور صنعت کے مابین تجارتی تعلق کی عکاسی کے لیے جو طریقۂ کار اپنائے گئے ہیں اُن سے تجارتی تعلق کی صحیح تصویر اُبھر کر سامنے نہیں آتی۔ ہر طریقِ کار میں کچھ نقائص ہیں، کمزوریاں ہیں، کمیاں ہیں جس کی وجہ سے اُن کو صحیح معیار تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پلاننگ کمیشن، وزارت زراعت اور اس سے متعلق دیگر ریسرچ کے ادارے مل کر ایک ایسا وسیع پیمانہ پر طریقِ کار تلاش کریں جس کے ذریعے اس اہم مسئلے کا کچھ واضح اور مکمل و پائیدار حل تلاش کیا جا سکے۔ زرعی قیمتوں کے تعین کی پالیسی جس سے نہ صرف کسان بلکہ کروڑوں صارفین بھی متاثر ہوتے ہیں اُس کے مفاد کے لیے بہت ضروری ہے۔ ●

بقیہ: اُتر پردیش میں تعلیم بالغان

اِس چارٹ سے واضح ہوتا ہے کہ اس پروجیکٹ میں نو ہزار بالغ عورتوں اور مردوں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ جون ۱۹۸۵ تک ۴۳۸۰ مرد اور ۴۶۲۰ عورتیں ۳۰۰ مرکزوں پر تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۷۵ سے ۸۰ فیصد بالغ اس پروجیکٹ سے مستفید ہوئے ہیں۔ ان میں سے کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ کر ان صلاحیتوں کا استعمال کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ عورتوں نے سلائی، کڑھائی، بُنائی، صابن بنانا اور اسی طرح کے کام سیکھ لیے ہیں۔ ایک عورت اپنے گاؤں میں صابن بنانے کا گھریلو کارخانہ بنانے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ کچھ پڑھانے والی عورتوں نے فیملی ویلفیئر (Family Welfare) کا کام بھی کیا۔ ایک چشم دید واقعہ یہ ہے کہ ایک گاؤں سائیر میں ایک کمہار بالغ جو بالکل اَن پڑھ تھا اپنی چھوٹی موٹی پرچون کی دُکان کے لیے سودہ کے خرید و فروخت میں دقت محسوس کر رہا تھا۔ وہ پڑوس کے پڑھے لکھے آدمی کی مدد سے خرید و فروخت کا حساب رکھتا تھا۔ مگر تعلیم بالغان میں پڑھ کر اب وہ خرید و فروخت کا حساب کتاب خود کر لیتا ہے۔

اس پروجیکٹ میں ۳۰۰ مدرّس ہیں۔ ۱۴۶ مرد اور ۱۵۴ عورتیں۔ عورتیں گھریلو کام دھندا کرنے والی ہیں۔ مردوں میں مختلف پیشوں سے وابستہ ہیں۔ اگر تعلیم بالغان کا مقصد اور نصب العین اِن ۳۰۰ مدرّسوں کے ذریعے اُن ۱۰۰۰ گاؤں اور قصبوں کے لوگوں تک پہنچ رہا ہے تو یہ اپنے آپ میں ایک قابلِ تعریف بات ہے۔

اُتر پردیش سرکار اس وقت پردیش کے ۴۶ ضلعوں میں تعلیم بالغان کی اِکائیاں چلا رہی ہے۔ ان اِکائیوں میں دو لاکھ ۴۳ ہزار ناخواندہ بالغ عورتیں اور مرد زیرِ تعلیم لائے گئے ہیں۔ اتنے وسیع پیمانے پر اس کام کی انجام دہی میں ایک اچھے مستقبل کے آثار دیکھے جا سکتے ہیں۔

●

کرشن شرما

قدرتی گیس کی اہمیت

یہ کہنا بھی بہت حد تک دُرست ہے کہ کسی ملک کی اقتصادی ترقی کا انحصار ایندھن پر ہوتا ہے۔ جن ممالک میں قدرتی وسیلے مثلاً کوئلہ، بجلی، گیس، تیل وغیرہ کافی مقدار میں موجود ہوں ان کی اقتصادی حالت یقیناً قابلِ رشک ہوتی ہے۔ امیر اور غریب ممالک میں ایندھن کی فی کس استعمال کے فرق سے یہ بات واضح ہوتی ہے ایک اندازے کے مطابق غریب ممالک میں ایندھن کا استعمال ایک سو کیلوگرام فی کس سالانہ ہے جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں پانچ ہزار کیلوگرام فی کس سالانہ یا اس سے بڑھ کر ہے۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے یہاں توانائی کے تجارتی اور غیر تجارتی سرچشمے بہت اہم پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ یہ کہنا بھی دُرست ہوگا کہ توانائی کی تجارتی صورت نے جو ترقی حاصل کی ہے وہ غیر تجارتی صورت نے نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم صنعت و زراعت کو جدید طرز پر لانے کا پروگرام چلا رہے ہیں۔ دوسری طرف ہماری گھریلو ضرورتوں کو پُورا کرنے میں توانائی کے تجارتی سرچشموں کا حصہ بڑھتا جا رہا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ ہونا قدرتی بات ہے کیوں کہ نہ صرف ہمارے شہروں کی آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے بلکہ ہمیں اس بات کا احساس بھی ہو رہا ہے کہ گھروں میں عورتوں کی زندگی کو سہل بنایا جائے۔

ان حالات میں توانائی کا بندوبست اور منصوبہ بندی کرنے والوں کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو کم سے کم نرخ پر ان کی ضرورت بھر توانائی مُہیا کریں۔ یہ ایک ایسا کام ہے جس میں قدرتی گیس بہت اہم پارٹ ادا کر سکتی ہے کیوں کہ توانائی کی سب سے آسان شکل قدرتی گیس ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ قدرتی گیس کہاں سے اور کیسے ملتی ہے؟ قدرتی گیس دو طرح سے حاصل ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کچے تیل کے ساتھ مل ہوئی نکلتی ہے اور اس لیے مشمولہ گیس کہلاتی ہے۔ دوسرے یہ آزاد شکل میں ملتی ہے اور ایسے علاقوں سے نکالی جاتی ہے جو صرف گیس کے علاقے کہے جاتے ہیں۔

توانائی کے سلسلے میں قدرتی گیس کی اہمیت کا علم پچھلے دس برسوں سے ہی ہوا ہے۔ تب تک بہت تھوڑی سی قدرتی گیس آسام و گجرات میں ملا کرتی تھی۔ اگرچہ اس کے استعمال کرنیوالے کہیں آس پاس ہوتے تو اسے زیادہ تر ایندھن کے طور پر یا پھر کھاد تیار کرنے کے کارخانوں میں خام مال کے طور پر استعمال کر لیا کرتے تھے۔ ورنہ یہ گیس جلا کر ضائع کر دی جاتی تھی۔

لیکن ۱۹۷۰ کی دہائی میں صورتِ حال بدل گئی۔ خام تیل مہنگا ہو گیا اور پھر اس بات کو نظر انداز کرنا ممکن نہ رہا کہ ہمارے پاس قدرتی گیس بھی موجود ہے۔ چنانچہ دُنیا بھر کے ملکوں نے کوشش شروع کر دی کہ قدرتی گیس دھرتی سے نکال کر پائپ کے ذریعے یا سلنڈروں میں بھر کر استعمال میں لائی جائے اور لوگوں کے ہاتھ بیچا جائے۔ خوش قسمتی سے ہمیں بمبئی کے پاس سمندر میں قدرتی گیس کے ذخیرے مل گئے ہیں، اور جب ہم بھی اسے استعمال میں لانے کی تیاری مکمل کر لیں گے تو ہمارے یہاں پٹرولیم کی اشیاء کا چوتھا حصہ قدرتی گیس ہی پر مشتمل ہوا کرے گا۔

ہم نے دھرتی کا سینہ شق کر کے گیس نکالنے کی کوششیں تیز تر کر دی ہیں۔ خیال ہے کہ ساتویں پلان میں ہم ایک کھرب تیس ارب روپیہ اِت ساعی پر صرف کر دیں گے۔ پچھلے دس برسوں میں وہ سرچشمے جہاں سے قدرتی گیس حاصل کی جا سکتی ہے ۸ کروڑ ۸۰ لاکھ مکعب میٹر سے بڑھ کر ۴۰ کروڑ ۸۰ لاکھ مکعب میٹر حجم کے ہو گئے ہیں۔

جیسا کہ اوپر اشارہ دیا جا چکا ہے، ہم نے بمبئی کے پاس جنوبی بسئین کے خطے میں آزاد شکل میں گیس ڈھونڈ لی ہے۔ یہاں اس قدر گیس موجود ہے کہ ۲۰ سال تک روزانہ ۲ کروڑ مکعب میٹر گیس نکالی جا سکتی ہے۔ اس خطے کو ترقی دینے کا کام ہاتھ میں لے لیا گیا ہے اور اُمید کی جاتی ہے کہ ۸۷-۱۹۸۶ تک یہاں سے گیس دستیاب ہونے لگے گی۔ ہمارے سائنسدانوں کا یقین ہے کہ آئندہ خام تیل کے اتنے ذخیرے نہیں ملیں گے جتنے کہ قدرتی گیس کے ملیں گے۔

حکومتِ ہند نے قدرتی گیس کی اہمیت کو

تسلیم کرتے ہوئے اسے ترقی دینے کی خاطر ایک نئی کمپنی قائم کردی ہے جسے "گیس اتھارٹی آف انڈیا" کہتے ہیں۔ یہ کمپنی قدرتی گیس سے پوری طرح فائدہ اٹھانے اور اس کے لیے منڈی تیار کرنے کی ذمہ داری ہوگی۔ اس سلسلے میں جنوبی بستین سے حامزہ ٹرمینل تک پائپ لائن بچھائی جا رہی ہے اور اس گیس کی مدد سے کھاد تیار کرنے کے دس کارخانے قائم کرنے کا ارادہ ہے۔ ایک کارخانہ تو قریب تیار ہو چکا ہے۔ جب تک آزاد شکل والی گیس نہیں ملنے لگتی تب تک بمبئی ہائی سے اس کارخانے کو مشمولہ گیس مہیا کی جائیگی۔ باقی کارخانے ساتویں پلان کی مدت میں تیار ہونے کی توقع ہے۔

حکومت کو یہ سفارش بھی کی گئی تھی کہ قدرتی گیس کو کھاد کی تیاری کے لیے استعمال کرنے سے پیشتر اس کا بھاری حصہ الگ کر لیا جائے۔ چنانچہ قدرتی گیس سے LPG یعنی وہ گیس جو سلنڈروں میں بھر کر چولھے جلانے کے کام آتی ہے، علیحدہ کرکے اُسے کھانا پکانے کے کام میں لانے کے لیے کئی کارخانے قائم کئے جا رہے ہیں۔

آجکل ہم "بمبئی ہائی" سے تقریباً ۳، ارب ۲۶ کروڑ مکعب میٹر مشمولہ گیس، گجرات کے علاقے سے ۷۵ کروڑ مکعب میٹر اور ملک کے مشرقی خطے سے ایک ارب ۹۵ کروڑ مکعب میٹر سے بھی زیادہ مشمولہ گیس نکال رہے ہیں۔ اس میں سے "بمبئی ہائی" سے ملنے والی ایک ارب ۸۳ کروڑ مکعب میٹر سے زیادہ گیس تھل، مہاراشٹرا اسٹیٹ بجلی بورڈ اور ٹاٹا بجلی کمپنی استعمال کر رہی ہے۔ پھر بھی ایک ارب ۴۲ کروڑ مکعب میٹر سے زیادہ گیس جلا کر ضائع کردی جاتی ہے کیونکہ اس گیس کو ساحل پر لاکر استعمال کرنے کے ذرائع موجود نہیں ہیں۔ یہ دقت ۱۹۸۶ کے آغاز تک دُور ہو جائے گی۔

گجرات کے علاقے میں بھی کچھ گیس جلاکر ضائع کردی جاتی ہے اور اب منصوبے بنائے جا رہے ہیں کہ اس گیس کو بھی اکٹھا کر لیا جائے۔ مشرقی خطے میں ایک ارب ۲ کروڑ مکعب میٹر سے زیادہ گیس اس لیے جلائی جا رہی ہے کہ وہاں اس کی مانگ نہیں ہے اور اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے والی پائپ لائنیں موجود نہیں ہیں۔ اب آسام میں گیس کی مختلف پائپ لائنوں کو آپس میں ملا دینے کے لیے قدم اٹھائے جا رہے ہیں۔ چونکہ خام تیل نکالنے کے ساتھ ساتھ مشمولہ گیس بھی نکل آتی ہے اس لیے اس گیس سے بھی پوری طرح فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

کھاد تیار کرنے کے علاوہ قدرتی گیس اور بھی کئی طریقوں سے زیر استعمال آتی ہے۔ بہت سے ملکوں میں اسے پائپ کے ذریعے مہیا کیا جاتا ہے۔ آجکل ہندوستان میں آبادی کا بہت بڑا حصہ کھانا پکانے کے لیے اُپلے، مٹی کے تیل اور لکڑی کو استعمال کرتا ہے۔ لیکن کھانا پکانے کے لیے گیس جیسا سہل اور کارآمد طریقہ اور کوئی نہیں ہے۔

ہم ایک کروڑ ٹن خام تیل درآمد کرنے کے علاوہ ۳۰ تا ۴۰ لاکھ ٹن پٹرولیم کا سامان بھی باہر سے منگا رہے ہیں۔ آجکل صنعتوں کی توانائی کی جو مانگ جلانے کے کام آنے والے درآمد شدہ تیل سے پوری کی جاتی ہے اُسے بہت حد تک قدرتی گیس سے پورا کیا جا سکتا ہے۔ ہم ایسا طریقہ نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ جس سے قدرتی گیس کو ایسی شکل دی جا سکے کہ وہ ذرائع آمد و رفت میں ڈیزل تیل کی جگہ لے لے۔

اُمید ہے کہ قدرتی گیس جلد ہی مائع شکل میں ملنے والے ایندھن کی جگہ لے لے گی اور آیندہ برسوں میں زیادہ مقدار میں ملنے لگے گی۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ قدرتی گیس کے ذخیرے استعمال ہونے کے ساتھ ساتھ سوکھتے چلے ہیں اور زیادہ نہیں بنتے۔ اس لیے انھیں سوچ سمجھ کر استعمال کرنا ہوگا۔

●

بقیہ: موسمیات اور آبی وسائل

چھٹے پانچ سالہ منصوبے کے دَوران آبپاشی بڑے اور درمیانہ پلانوں سے بالترتیب ۷ ، ۹۵ اور ۱۱،۵ "می ہے می" زائد صلاحیت پیدا ہونے کا امکان ہے۔ آبپاشی کی تخلیق شدہ صلاحیت کسی وجوہات سے مکمل طور پر بروئے کار نہیں لائی جاسکی۔

قومی زرعی کمیشن نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ ۲۰۰۰ اور ۲۰۲۵ میں آب شیریں کی کل ضرورت ۵۰، اور ۱۰۵ "می ہے می" ہوگی جس میں سے آبپاشی سے متعلقہ استعمال صرف ۴۳ اور ۷۷ "می ہے می" ہوگا اور باقیماندہ پانی گھروں، مویشیوں، صنعت اور بجلی کی پیداوار کے سلسلے میں استعمال ہوگا۔ ان کمشنوں کے مطابق ۲۰۲۵ کے قریب آبی وسائل میں کمی آنے کا امکان ہے۔ اگرچہ دریاؤں کی روانی کے جامع اندازے حال ہی میں قائم کئے گئے ہیں۔ تاہم روانی کی پیمائش کے طریقے صحیح نہیں ہیں، تاریخ گواہ ہے کہ سطحی پانی کے وسائل کا صحیح اندازہ ممکن نہیں ہے۔ زمینی پانی کے وسائل کا علم سطحی پانی کے علم کی نسبت زیادہ محدود ہے۔ زمینی پانی کی باقاعدہ تشخیص اور جامع تحقیق حال ہی میں شروع کی گئی ہے لیکن ایسا تھوڑے سے علاقے میں ہی کیا جاتا ہے۔ مرکزی زمینی آبی بورڈ نے سطحی پانی کی جانچ کے لیے ۲۴۶۰ مرکزوں کا قیام کیا ہے اور ریاستی حکومتوں نے بھی ایسے مرکز قائم کئے ہیں لیکن بہت سے کنوؤں کو بعض اسباب سے استعمال میں لانا ممکن نہیں ہے۔ آبی توازن کا طریقہ بھی رائج ہے لیکن مناسب استعمال کے لیے اسے تقسیم کیا جانا چاہیئے۔ دیکھا جائے تو بارش کا تمام پانی سمندر ہی میں جاکر مل جاتا ہے جہاں وسیع طور پر بھاپ بنتی ہے۔ بھاپ سے پیدا ہونے والے پانی کا اندازہ کل بارش کا تقریباً ۳۰ فیصد لگایا گیا ہے۔

پی۔ ایس۔ دتہ

موسمیات اور آبی وسائل

تہذیب کے ارتقاء میں پانی کا اہم ترین حصہ ہے ۔ نیل، سندھ اور اُن کے معاون دریاؤں کے کناروں پر ابتدائی انسانی بستیوں کی موجودگی کی شہادت ملی ہے۔ پانی اور اُس کے استعمالات کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے پانی کی سپلائی اور آبی ترقیاتی نظام کو فروغ دیا گیا اور آبی ذخیروں کے تحفظ کے لیے باندھوں کی تعمیر کی گئی۔ کافی عرصہ تک پانی کو نہ ختم ہونے والا قدرتی وسیلہ خیال کیا جاتا تھا۔ سمندر جو کہ پانی کو بلندی میں پہنچانے کے عمل میں سب سے زیادہ رول ادا کرتا ہے آب شیریں کا بڑا سرچشمہ ہے۔ دورِ جدید کے اس عقیدے کی تشریح کہ آب شیریں فضائی بارش کی صورت میں حاصل ہوتا ہے اور وہ دھرتی کی تمام ندیوں، تالابوں اور پانی کا منبع ہے ۔ افلاطون کے مذاکرات میں ملتی ہے جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ ندیوں اور چشموں کا اصل سرچشمہ بارش ہے۔ لیکن ارسطو نے اس سے اختلاف رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ بارش ندیوں کا بڑا سرچشمہ نہیں ہے۔ بارش کی پہلی پیمائش بھارت میں عہدِ موریہ میں کوٹلیہ یعنی چانکیہ نے کی تھی۔

بھارت کا اقتصادی نظام زیادہ تر زرعی پیداوار پر انحصار رکھتا آیا ہے۔ کل قومی آمدنی کا نصف سے زیادہ زراعت سے متعلق ہے ۔ ۹۰ فیصد آبی وسائل کا استعمال آبپاشی کے لیے ہوتا ہے اور بھارت میں ۱۳۹ ملین ہیکٹر زراعتی اراضی کا ۵، فیصد بارش پر انحصار رکھتا ہے۔ ملک کی ۴۲ فیصد غذائی پیداوار بارانی علاقوں سے حاصل کی جاتی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر ملک کی آبپاشی کی تمام تر صلاحیت کو بروئے کار لایا جائے تو ۵۵ فیصد اراضی بارش پر انحصار رکھے گی ۔ دستیاب آبی وسائل کا استعمال کر کے زرعی اور گھریلو کاموں میں انھیں بروئے کار لانے کی جانب ملک میں عہدِ قدیم سے ہی توجہ دی جا رہی ہے۔ ملک میں بارش کے پانی کا درست استعمال کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ موسمیات کو اچھی طرح سمجھا جائے۔ بھارتی موسمیات کی خصوصیات میں مون سون تغیر قابلِ توجہ ہے ۔

مون سون کی آمد اور واپسی

بھارت میں جنوب مغربی مون سون، جون کے آغاز سے نصف ستمبر تک موجود رہتا ہے اور برصغیر کو متاثر کرتا ہے ۔ دوسرا مون سون شمال مشرقی مون سون ہے جو اکتوبر سے دسمبر تک موجود رہ کر فروری تک بڑھ جاتا ہے۔ کشمیر اور اُس کے نزدیکی علاقوں، جنوبی ہند کے آخری علاقوں اور مشرقی ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر ۸۰ فیصد سے زیادہ سالانہ بارش زیادہ تر جنوب مغربی مون سون میں کمی سے ہوتی ہے۔ اس کے مطابق بھارت میں بارش سے متعلقہ اعداد ۹۰ فیصد ہوتے ہیں۔

مون سونی بارش کی ابتدا کے بارے میں مکمل طور پر کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ مون سون کے باعث دیکھے جانے والے تغیر ہیں —— جنوب مغربی سمتوں سے ہوائیں، اپریل اور مئی کی گرمی سے درجۂ حرارت میں کمی اور بارش میں اضافہ۔ بھارت میں مون سون مئی کے آخر سے جون کے آغاز میں وارد ہوتا ہے۔ برصغیر میں اولاً یہ مغربی کیرل کے ساحل پر پہنچتا ہے۔

بھارت کے میدانی علاقوں میں سالانہ اوسط بارش کا اندازہ ۱۲۰ سینٹی میٹر ہے۔ تاہم وقت اور مقام کے لحاظ سے بارش کی اُفتاد وسیع طور پر مختلف ہے۔ بھارت میں دُنیا کے کسی بھی یکساں علاقے کی نسبت موسم اور آب و ہوا میں اختلاف زیادہ ہے جس کے باعث ہر برس ملک کا کوئی نہ کوئی علاقہ خشک سالی، سیلاب اور طوفان کا شکار بن جاتا ہے۔ ہمارے ملک کے تقریباً ایک تہائی حصے میں ۵۰ فیصد سے کم بارش ہوتی ہے ۔

پہاڑ اور سلسلہ ہائے کوہ بارش کی اُفتاد کے اختلاف کے اسباب ہیں۔ کھاسی اور جینتی پہاڑوں کے مغربی ڈھلانوں کی طرف بارش ۸۰۰ سینٹی میٹر سے زیادہ ہوتی ہے جبکہ شمال کی جانب وادی برہم پُتر میں بارش تقریباً ۱۲۰ سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ کھاسی جینتی پہاڑوں کے چراپونجی مقام پر دنیا میں سب سے زیادہ بارش ہوتی ہے۔ یعنی سال میں تقریباً ۱۲۰۰

سینٹی میٹر، مغربی ساحل سے مغربی گھاٹوں کے ڈھلانوں کے ساتھ ساتھ مشرق سے مغرب سمتوں میں بارش کم ہوتی جاتی ہے۔ مغربی بنگال میں تقریباً ۱۲۰ سینٹی میٹر سے بھی کم ہو کر مغربی راجستھان کے صحرائی علاقوں میں بارش ۲۰ سینٹی میٹر سے بھی کم ہو جاتی ہے۔ کاٹھیاواڑ کی گیر پہاڑیوں میں نزدیکی علاقے کی نسبت بارش زیادہ ہوتی ہے۔ مشرقی ہمالیائی علاقے میں بارش مغربی علاقے کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔

کسی برس کے خاص حصے میں بارش نارمل سے زیادہ مختلف ہوتی ہے۔ بارش کی تقسیم میں اختلاف کے متعدد اسباب سے جو کہ آبی وسائل کے منصوبے اور ترقی کے لیے اہم پیمائشی ذریعہ ہیں اس بات کا پتہ چلتا ہے۔ بعض کم بارش والے مقامات پر سارے موسم کی عام بارش ایک ہی دن میں ہو جاتی ہے۔ دھرم پور (ضلع سورت) میں ایک ہی دن (۲ر جولائی ۱۹۴۱ کو) ۱۰۰ سینٹی میٹر بارش ہوئی۔ ۱۹۱۸ میں جو کہ خوفناک خشک سالی کا سال تھا ملک میں سالانہ بارش صرف ۲۵ فیصد ہوئی تھی۔

آبی وسائل اور اُن کا استعمال

مقامی ضروریات کے مطابق ملک کے تمام حصوں میں فصل کے تینوں موسموں کے لیے آبی ذخائر اور تحفظ سے متعلق تعمیرات تیار کی گئیں۔ بارش جو پانی کا بڑا سرچشمہ ہے، سال کے کچھ مہینوں تک محدود ہوتی ہے اور اس عرصے میں شمال اور مشرقی حصوں میں ندیوں میں بہاؤ بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ غیر مون سونی مہینوں میں پانی بہت کم رہ جاتا ہے۔ اور کچھ ندیاں سوکھ جاتی ہیں۔ مغرب اور جنوب کی ندیوں میں جو کہ بارش کے پانی پر انحصار رکھتی ہیں پانی کم و بیش ہو جاتا ہے۔ بارش میں اس طرح کے تغیر کے باعث ملک میں کبھی خشک سالی اور کبھی سیلاب آ جاتا ہے۔ کسی خاص دریا کی آبی صلاحیت زیادہ تر وہاں کے موسم پر انحصار رکھتی ہے۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ جون سے ستمبر تک کے چار برساتی مہینوں کے دوران مون سون کی بحیرہ عرب کی شاخ میں تقریباً ۲۰۰ ملین ہیکٹا میٹر[۱] ہے، نمی ہوتی ہے۔ خلیج بنگال میں تقریباً ۴۰ "می ہے می" ہوتی ہے۔ کل مون سونی نمی (۱۱۰۰ می ہے می) میں سے تقریباً ۲۵ سے ۳۵ فیصد تک بارش کی صورت میں ہوتی ہے۔ برس کے باقیماندہ آٹھ مہینوں کے دوران بھی ملک میں کافی مقدار میں نمی رہتی ہے جس کا اندازہ سائنسی طور پر نہیں لگایا گیا۔ اس سے ۱۰۰ "می ہے می" بھی ہوائی بھاپ بنتی ہے جس کا کچھ حصہ برف کی صورت میں ہوتا ہے۔ برف کی رفتار سے پکا گیا علاقہ ۵۰ ہزار کلو میٹر سے بھی زیادہ دور ہے جو کہ موسم سرما کے دوران برفانی علاقے کا تقریباً ۱۰ فیصد ہوتا ہے۔ ٹھوس تخمینوں سے پتہ چلتا ہے کہ شمالی دریاؤں میں ۱۰ سے ۲۰ فیصد پانی برف پگھلنے سے حاصل ہوتا ہے۔ برف پگھلتے رہنے سے شمالی اور مشرقی دریاؤں میں تمام سال پانی رہتا ہے۔ سالانہ کل ۴۰۰ می ہے می کی کل اوسط بھاپ میں سے ۱۰۵ "می ہے می" پانی ملنے کا اندازہ ہے جس میں سے ۷۰ "می ہے می" سطحی پانی اور ۳۵ "می ہے می" زمینی پانی ہے۔ بھارت نے ابھی تک ۲۰۰ سے زیادہ سٹوریج باندھ تعمیر کئے ہیں جن کی صلاحیت ۱۳۰ ملین ایکڑ فٹ ہے۔ اگرچہ یہ قابلِ تعریف اقدام ہے، لیکن اس سے سیلاب پر مکمل کنٹرول ممکن نہیں ہے، اور نہ ہی زیادہ تر آبی وسائل کو استعمال میں لایا جا سکتا ہے ملک میں جو چھوٹے اسٹوریج تعمیر کئے گئے ہیں اُن کا ۱۰ سے ۱۵ فیصد دستیاب پانی استعمال میں نہیں لایا جا سکتا۔

ملک کے آبی وسائل کا وقت وقت پر اندازہ لگایا جاتا رہا ہے۔ ۱۹۴۹ میں ڈاکٹر اے این کھوسلہ نے بارش اور درجۂ حرارت کی صورت میں "رن آف" کے حساب کی بنیاد پر اندازہ لگایا تھا کہ کل سالانہ سطحی اور زمینی پانی کے وسائل ۱۶۷ "می ہے می" ہیں۔ آبپاشی کمیشن کی رپورٹ (۱۹۷۲) کے مطابق کل سطحی آبی وسائل ۱۸۰ "می ہے می" ہیں۔

قومی زرعی کمیشن (۱۹۷۶) کی طرف سے لگائے گئے ایک اور اندازے سے پتہ چلتا ہے کہ بارش سے سطحی پانی ۱۱۵ "می ہے می" ہوتا ہے۔ اس میں ملک کے باہر کے وسیع علاقوں میں پانی (۲۰ می ہے می) بھی شامل ہے۔ کل بارش کا تقریباً ۲۱۵ می ہے می پانی زمین میں چلا جاتا ہے۔ جس میں سے تقریباً ۱۶۵ "می ہے می" زمین کی نئی آبی نمی کی صورت میں رہتا ہے اور باقیماندہ ۵۰ "می ہے می" زمینی پانی کے طور پر رہتا ہے۔ اس طرح قومی زرعی کمیشن کے مطابق ملک کے کل آبی وسائل ۱۸۵ "می ہے می" ہیں جس میں ۱۳۵ "می ہے می" سطحی پانی اور ۵۰ "می ہے می" زمینی پانی ہے۔ مذکورہ کمیشن کے اندازے کے مطابق پانی ۷۰ "می ہے می" ہے جس میں سے ۴۵ "می ہے می" پانی غیر مون سونی عرصے میں سطح پر آ جاتا ہے اور کل پانی ۱۸۰ "می ہے می" ہوتا ہے۔ اندازہ ہے کہ آبی وسائل کے مکمل فروغ سے کل زمینی پانی ۳۵ "می ہے می" اور سطحی پانی ۱۸۵ "می ہے می" ہو جائے گا۔

یہ جاننا باعثِ دلچسپی ہوگا کہ بھارت کے تمام دریاؤں کی روانی دنیا کے تمام دریاؤں کی ۶ فیصد روانی کے برابر ہے اور می سی سی پی دریا کے طاس کے جو کہ تمام بھارت کے علاقے کے برابر ہے، "رن آف" کا اڑھائی گنا ہے۔ قدرت نے بھارت کو وافر آبی وسائل عطا کئے ہیں لیکن حال میں ان کا استعمال کل مجوزہ آبی وسائل کے تقریباً ایک تہائی کے برابر ہے۔

ایک ٹھوس اندازے کے مطابق اس صدی کے آخر تک ملک کی زیادہ سے زیادہ آبی صلاحیت ۱۴۳ "می ہے می" ہوگی جس میں سے سطحی پانی اور زمینی پانی بالترتیب ۳۷ اور ۴۰ "می ہے می" بنتے ہیں۔

(باقی صفحہ پر)

[۱] اس مضمون میں ملین ہیکٹا میٹر کی جگہ مختصراً "می ہے می" لکھا گیا ہے۔ ایک ہیکٹا میٹر = ۱۰۰ میٹر

گوپال اروڑہ

بھارت میں الیکٹرانکس کی صنعت
ایک جائزہ

الیکٹرانک صنعت کا بغور جائزہ لینے کے بعد کوئی بھی شخص اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ بھارت اس شعبے میں اپنے پچھڑے پن کو دور کرنے کے لیے لمبی چھلانگیں لگا رہا ہے، تاکہ اگر وہ ترقی یافتہ ممالک کے برابر نہیں تو کم از کم اُن کے قریب تر پہنچ جائے۔

بھارت کی الیکٹرانک (برقیاتی) صنعت جس کا مختصر پیمانے پر آغاز ۱۹۵۰ میں غیر ملکوں سے درآمد شدہ حصّوں، پُرزوں کو جوڑ کر ریڈیو سیٹ تیار کرنے کے ساتھ شروع ہوا تھا وہ اب چھلانگیں لگاتی ہوئی ترقی کی نئی منزلیں طے کر رہی ہے۔ اُس نے اب الیکٹرانک (برقیات) کے عالمی نقشے پر اپنا مقام بنا لیا ہے۔

اگرچہ بھارت ابھی بعض ترقی پذیر ممالک سے بھی اس شعبے میں بہت پیچھے ہے تاہم وہ جس رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے وہ دن دور نہیں دکھائی دیتا جب ہمارا ملک دُنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی برادری میں شامل ہو جائے گا خواہ وہ جاپان، امریکہ، سوویت یونین اور دیگر مغربی یورپی ممالک کا مقابلہ نہ کر سکے جو نہ صرف الیکٹرانک صنعت میں پیشرو ہیں، بلکہ اس شعبہ میں بہت آگے نکل چکے ہیں خصوصاً جاپان اور امریکہ کا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ اس وقت جنوبی کوریا، سنگاپور اور ہانگ کانگ میں بھارت سے زیادہ الیکٹرانک سامان تیار ہوتا ہے لیکن یقین کیا جاتا ہے کہ بھارت اپنی وسعت، آبادی، وسائل اور تکنیکی ترقی کی بدولت نہ صرف اپنی ضرورت کے لیے کافی الیکٹرانک سامان تیار کرے گا، بلکہ وہ اُسے برآمد کرنے کی صلاحیت بھی حاصل کر لے گا۔

اب ہمارے ملک میں سو قسم کی الیکٹرانک آلات اور اشیا تیار کی جا رہی ہیں جیسے کمپیوٹر، ورڈ پروسیسر، منی کمپیوٹر، برقی اور برقیاتی ٹائپ رائٹرز، الیکٹریکل کاپیئر، ٹیلی ویژن، کلر ٹیلی ویژن، الیکٹرانک کنٹرول سسٹم، مائکرو ویو ڈاٹا، مائکرو پروسیسر، برقیاتی طبی آلات، انسٹرومنٹ لینڈنگ سسٹم، آٹومیٹک الیکٹرانک وائر سوئچ، بجلی کے ریل انجنوں کے لیے ٹریکشن کنٹرول سسٹم، پروگرام لوجک کنٹرول، ویڈیو ٹیپ ریکارڈر، موسمیات سے متعلق اعداد فراہم کرنے والے پلیٹ فارم اور آٹومیٹک میسیج سوئچنگ سسٹم اور ہماری روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھنے والی بیشتر اشیاء۔

یہ تمام الیکٹرانک اشیا اب بھارت میں بن رہی ہیں جو اپنی کوالٹی کے باعث بہت اعلیٰ ثابت ہوئی ہیں۔

الیکٹرانک کارپوریشن

الیکٹرانک کے شعبے میں گذشتہ ۳۰ برسوں میں خصوصاً ۱۹۶۷ میں الیکٹرانک کارپوریشن آف انڈیا کے قیام کے بعد حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ یہ ایک پبلک سیکٹر کا ادارہ ہے جو ملک کو الیکٹرانک شعبے میں خودکفیل بنانے میں اہم حصہ ادا کر رہا ہے۔ ملک کی دس ریاستوں میں الیکٹرانک کارپوریشنیں قائم ہو چکی ہیں، ان کارپوریشنوں نے پبلک سیکٹر میں ۴۲ اور ملے جلے سیکٹر میں ۱۷ کمپنیوں کا قیام کیا ہے۔ کارپوریشن کی طرف سے مختلف قسم کے جدید ترین آلات، ٹکنالوجیاں، کمپیوٹر اور حصے پُرزے بنائے جا رہے ہیں۔ کارپوریشن کی طرف سے ۲۵ قسم کی اشیا تیار کی جا رہی ہیں۔ اس ادارہ کی طرف سے جن ٹکنالوجیوں کو فروغ دیا گیا ہے اُن کی بجلی، پٹرولیم، کیمیاوی کھاد اور صنعت فولاد میں بھاری مانگ ہے۔ بھرپور اور بڑا بجلی گھروں کی ٹربائن چلانے کی ٹکنالوجیوں کو اسی ادارہ نے فروغ دیا ہے۔

کمپیوٹر سازی

الیکٹرانک کارپوریشن نے ہی ملک میں پہلے کمپیوٹر کو فروغ دیا ہے۔ یہ ادارہ گذشتہ ۱۸ برسوں سے کمپیوٹر بنا رہا ہے اور اب وہ ملک میں کمپیوٹر سازی کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ اس کی طرف سے تیار کیے گئے کمپیوٹر نہ صرف سائنسی اور تجارتی شعبوں کے لیے کارآمد ثابت ہو رہے ہیں بلکہ وہ دفاعی اور خلائی تحقیق و مطالعہ میں بھی اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ آروی سٹیلائٹ مرکز کے لیے ۱۹۷۳ میں ایلٹینا بھی اسی ادارہ نے تیار کیا تھا۔

بھارت میں تیار ہونے والے کمپیوٹر بلاشبہ بین الاقوامی معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف ملک میں بلکہ غیر ممالک میں بھی ان کی

مانگ بڑھ رہی ہے۔ تازہ ترین اعداد کے مطابق بھارت نے ۸۴-۱۹۸۳ میں ۲۰ کروڑ روپے کی مالیت کا کمپیوٹری ساز و سامان امریکہ، مغربی یورپ، سوویت یونین، خلیجی ممالک، جنوب مشرقی ایشیا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کو برآمد کیا۔

۸۳-۱۹۸۲ میں ساڑھے ۱۳ کروڑ روپے کی برآمد کے مقابلے میں ۸۴-۱۹۸۳ میں ۴۸ فیصد زیادہ برآمد ہوئی۔ بھارت کے کمپیوٹروں کے ساز و سامان کی پیداواری لاگت مقابلتاً کم ہونے اور ملک میں صنعتی و سائنسی افرادی قوت وافر ہونے کے باعث اُن کی برآمد کے بڑے امکانات ہیں۔ توقع ہے کہ آئندہ تین برسوں میں ایک ارب روپے کی کمپیوٹری ساز و سامان کی سالانہ برآمد ہوگی۔

اس وقت تقریباً ۴۰ یونٹ کمپیوٹر تیار کر رہے ہیں جن کی سالانہ پیداوار ۵۰ کروڑ روپے کی ہے۔ حکومت کی مزید ۱۰۰ یونٹوں کو کمپیوٹر بنانے کی اجازت دیدی ہے۔

چھوٹی صنعتیں

پبلک سیکٹر کے اداروں کے علاوہ کوئی ایک ہزار دو سو سے زیادہ چھوٹے یونٹ گذشتہ برس کے آخر تک کام کر رہے تھے۔ شروع میں چھوٹے یونٹوں میں ریڈیو سیٹوں جیسی سادہ کلا شیائے صرف تیار کی جاتی تھیں لیکن اب ان میں سوفسطائی قسم کا مال بھی تیار کیا جانے لگا ہے۔ جیسے ریڈیو، ٹی۔ وی سننے کے آلات، الیکٹرانک کنٹرول سسٹم اور ڈیجیٹل پیمائشی آلات۔ چھوٹے الیکٹرانک یونٹ ملک کی تقریباً تمام ریاستوں میں موجود ہیں لیکن مہاراشٹر، کرناٹک، آندھرا پردیش، کیرل، تامل ناڈو، مغربی بنگال، پنجاب، ہریانہ اور دلی میں تو اُن کا جال پھیلا ہوا ہے۔ ملک میں تیار ہونے والے کُل الیکٹرانک سامان کا ۱۰ فیصد دلی میں تیار ہوتا ہے۔ دلی میں ہر برس دو ارب ۴۰ کروڑ روپے کا الیکٹرانک سامان بنایا جاتا ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق الیکٹرانک صنعت میں ایک کروڑ روپے کی سرمایہ کاری سے ۲۱۴ اشخاص کو روزگار دستیاب ہوتا ہے، جبکہ کیمکلوں اور پیٹروکیمکل صنعت میں اتنا ہی سرمایہ لگانے سے صرف ۳۳ افراد کو روزگار میسر ہوتا ہے۔

اس صنعت کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس سے کسی طرح کی فضائی آلودگی پیدا نہیں ہوتی۔

پیداوار میں اضافہ

الیکٹرانک صنعت کی ترقی کا جائزہ اس امر سے لیا جا سکتا ہے کہ جب سے اس صنعت کا قیام ہوا ہے، الیکٹرانک سامان کی پیداوار میں متواتر اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۷۰ میں مجموعی پیداوار پانچ ارب ۹۰ کروڑ روپے کی ہوئی تھی جو ۱۹۸۳ میں بڑھ کر ۱۲ ارب ۶۰ کروڑ روپے کی ہو گئی۔ اس سب کے باوجود ہم عالمی سطح پر اس شعبے میں ابھی بہت پیچھے ہیں۔ ۱۹۸۲ میں دنیا میں جتنا الیکٹرانک سامان تیار ہوا اُس کا محض ۵ء۰ فیصد بھارت میں بنایا گیا۔ اس برس دنیا میں ۳۰ کھرب روپے کی مالیت کا سامان تیار ہوا تھا۔ جبکہ بھارت میں اُس کا ایک فیصد بھی تیار نہیں کیا گیا، لیکن جس رفتار سے ہم پیش قدمی کر رہے ہیں اس سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ ہم ۱۹۹۰ میں ایک کھرب روپے کی پیداوار کا نشانہ حاصل کر لیں گے۔

الیکٹرانک آلات سے تعلیم

سائنس، تجارت، طب، مواصلات اور دیگر شعبوں میں جہاں الیکٹرانک سامان کا استعمال بڑھ رہا ہے، وہاں تعلیم کے شعبے میں کمپیوٹر اور ٹیلی ویژن کے بڑھنے کا بڑا امکان ہے۔ بھارت سرکار نے ۱۹۹۰ تک ۶ سے ۱۴ برس کی عمر کے تمام تر بچوں کو مفت تعلیم دینے کا پلان بنایا ہے۔ اسکولوں میں طلبا کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر کمپیوٹر اور ٹیلی ویژن کا تعلیمی مقاصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے اور آنے والے برسوں میں ان کے رول میں مزید اضافہ ہوگا۔ کیوں کہ ان سے ٹیچروں کی کمی بہت حد تک پوری کی جا سکے گی۔

اسکولوں میں کمپیوٹر کے ذریعے تعلیم دینے کے لیے ٹیچروں کو تین ہفتے کی تربیت دی گئی ہے۔ ملک کے اسکولوں میں کمپیوٹری تعلیم کے سلسلے میں چلائے جا رہے پائلٹ پلان کے تحت جون ۱۹۸۴ء میں ۱۷ مختلف مرکزوں میں کوئی ۵۰۰ اسکولی ٹیچروں کو تربیت دی گئی۔ تربیتی مرکزوں اور ۲۵۰ اسکولوں کے لیے لگ بھگ ۹۰۰ کمپیوٹروں کا اہتمام کیا گیا ہے۔

کمپیوٹری تعلیمی پلان کا سب سے زیادہ فائدہ اتر پردیش کے ۲۸ اسکولوں کو ملے گا۔ اس کے بعد دلی، مغربی بنگال اور مہاراشٹر کا مقام ہے، جہاں بیس بیس اسکولوں کو اس مقصد کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔

اسکولی تعلیم میں دوسری انقلابی تبدیلی یہ ہو رہی ہے کہ اسکولوں میں ٹیلی ویژن لگائے جا رہے ہیں۔ ملک کے تمام اسکولوں میں ۱۹۹۰ تک ابتدائی تعلیم میں یکسانیت لانے کے لیے مرکزی وزارت تعلیم نے ۱۴ ہزار چھ سو اسکولوں میں ٹیلی ویژن لگانے کا پلان بنایا ہے۔ پلان کے مطابق نیا ٹیلی ویژن خریدنے کے لیے روپیہ حکومت دیگی۔ لیکن ان کے رکھ رکھاؤ کی ذمہ داری ریاستی حکومتوں پر ہوگی۔ ان میں سے ۸ ہزار ٹیلی ویژن ایسے ہوں گے جو اُپ گرہ سے براہِ راست نشریات موصول کریں گے۔ ایسے ہر سیٹ کی قیمت ۲۰ ہزار روپے ہوگی۔ یہ سیٹ اتر پردیش، بہار، گجرات، مہاراشٹر، اڑیسہ اور آندھرا پردیش کے چیدہ اضلاع میں لگائے جائیں گے۔ باقیماندہ ۶۶۰۰ کمیونٹی سیٹ ہوں گے جن میں سے ہر ایک کی قیمت ۴ ہزار روپے ہوگی۔

الیکٹرانک ٹائپ رائٹر

دیگر الیکٹرانک اشیا کے ساتھ ساتھ بھارت نے برقیاتی ٹائپ رائٹروں کی تیاری میں بھی بڑی ترقی کی ہے۔ گذشتہ برس ایسے ۱۲۰۰ ٹائپ رائٹروں کی اتنی بڑی تعداد پہلی بار تیار کی گئی۔ امسال ان کی پیداوار ۳ ہزار تک پہنچنے کا اندازہ ہے۔

یہ جاننا بھی باعثِ دلچسپی ہوگا کہ دُنیا میں الیکٹرانک ٹائپ رائٹر کی ایجاد ہونے کے صرف چھ برس کے اندر بھارت نے بھی اس کی تیاری میں مہارت حاصل کر لی جبکہ عام ٹائپ رائٹر جو پہلے پہلا امریکہ میں بنا تھا اُس کی تیاری کے ۵۰ برس بعد بھارت اُسے

تیار کر سکا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ بھارت جو عام ٹائپ رائٹروں کے معاملے میں امریکہ سے صرف ۵۰ برس پیچھے تھا وہ الیکٹرانک ٹائپ رائٹر کے معاملے میں اُس سے صرف چھ برس پیچھے رہ گیا ہے۔ اُس نے اس فاصلے کو کم کرنے میں اپنی اعلیٰ ترین صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔

اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ بھارت نے اپنی ہی مساعی اور ٹکنالوجی سے چھ برس میں الیکٹرانک ٹائپ رائٹر تیار کرنے میں پوری کامیابی حاصل کرلی ہے۔

بھارت نے پہلی بار ۱۲۰۰۰ الیکٹرانک ٹائپ رائٹر بنانے کے ساتھ ساتھ یہ کوشش کی ہے کہ چیدہ مقامات پر اُن کی مرمت کرنے اور وقتاً فوقتاً اُن کی دیکھ بھال کرنے کا بخوبی اہتمام کیا جا سکے۔ اس کے لیے ملک بھر میں سروس سینٹر کھولے جا رہے ہیں۔

بھارت دُنیا میں ایسا ساتواں ملک ہے جو اپنے الیکٹرانک ٹائپ رائٹر بنا سکتا ہے۔ بھارت کے علاوہ جو دوسرے ملک ایسا ٹائپ رائٹر بنا سکتے ہیں، وہ ہیں امریکہ، اٹلی، جاپان، سوئٹزرلینڈ اور برازیل وغیرہ۔ دستیاب اعداد کے مطابق گزشتہ برس ایک لاکھ عام ٹائپ رائٹروں کی فروخت بھارت میں ہوئی تھی۔ یہ مانگ سالانہ ۱۵ سے ۳۰ فیصد تک بڑھ سکتی ہے۔

الیکٹرانک ٹائپ رائٹر بنانے والوں کو یہ خدشہ ہے کہ اگر ان کے تیار کِٹ غیر ممالک سے درآمد کئے جائیں گے تو اس سے اپنے ملک کی ایسی صنعتوں پر بُرا اثر پڑے گا۔ واضح ہو کہ غیر ممالک میں ٹائپ رائٹر کافی ارزاں ہیں۔ شائد اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں ان کی پیداوار بہت بڑے پیمانے پر ہوتی ہے۔ بڑے پیمانے پر کسی چیز کو تیار کرنے سے پیداواری لاگت کم ہونا یقینی ہے۔ اگر ہم ان کے پُرزوں کے کِٹ غیر ممالک سے درآمد کریں تو ان کی بنا پر الیکٹرانک ٹائپ رائٹر بنا کر انھیں ارزاں نرخوں پر فروخت کیا جا سکے گا۔

الیکٹرانک ٹائپ رائٹر تیار کرنے والی صنعتوں کو بعض حصے پُرزے غیر ممالک سے درآمد کرنے پڑتے ہیں جیسے مائکرو پروسیسر، موٹر، ڈیزی ویل اور کنڈکٹر۔ ان اشیا کو درآمد کرنے پر ۱۱۰ سے ۱۲۰ فیصد تک کسٹم ڈیوٹی دینی پڑتی ہے اور ان ٹائپ رائٹروں کی قیمت کا ۵۰ فیصد دیگر ٹیکسوں میں لگ جاتا ہے۔ اگر اس ڈیوٹی اور ٹیکس میں کمی کی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بھارت میں بنے ہوئے الیکٹرانک ٹائپ رائٹر کافی سستی قیمتوں پر دستیاب ہوں گے۔

الیکٹرانک ٹائپ رائٹروں کی برآمد کا امکان بہت کم ہے کیوں کہ غیر ممالک میں بڑے پیمانے پر اُن کی تیاری سے اُن کی قیمتوں میں کمی ہوتی ہے۔ اس کا علاج بھی یہی ہے کہ اپنے ملک میں ٹائپ رائٹروں کو بہت بڑے پیمانے پر تیار کیا جائے۔ اگرچہ عام ٹائپ رائٹر ابھی تک زیادہ تر استعمال میں آرہے ہیں تاہم دُنیا جس رفتار سے الیکٹرانک دَور میں داخل ہو رہی ہے اُس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ برسوں میں الیکٹرانک ٹائپ رائٹروں کا استعمال بڑھے گا۔

الیکٹرانک صنعت کا بغور جائزہ لینے کے بعد کوئی بھی شخص اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ بھارت اس شعبے میں اپنے پچھڑے پن کو دُور کرنے کے لیے لمبی چھلانگیں رہا ہے، تاکہ اگر وہ ترقی یافتہ ممالک کے برابر نہیں تو کم از کم اُن کے قریب پہنچ جائے۔ ●

بقیہ: چینی کے صنعت کاروں کی حوصلہ افزائی

کارکردگی کے معیار کو اہمیت دیں اور اسے مستحکم بنانے میں سخت کوشش کریں۔

چینی کے کارخانوں میں جدید آلات وغیرہ لگانے پر بھی توجہ دی جانی چاہیئے تاکہ لاگت میں ممکنہ کمی ہو سکے اور پیداوار میں اضافہ۔ جدید طور طریقہ اپنانے سے چینی کی پیداوار میں لاگت کم ہوتی ہے اور نتیجتاً عوام کو فائدہ پہنچے گا کیوں کہ چینی ایک عام ضرورت کی چیز ہے۔ ملک میں چینی کے کارخانے اگر اپنی ضمنی پیداواروں کے مناسب نکاس اور استعمال پر توجہ نہیں دیں گے تو خسارہ میں رہیں گے۔ اگر وہ اس طرف توجہ دیتے ہیں تو اس طرح چینی کی درآمد پر ان کا انحصار کم ہو جائے گا اور دیہی لوگوں کو روزگار کے کچھ مواقع بھی فراہم ہوں گے جس کے نتیجہ میں چینی پیدا کرنے والے لوگوں کی اقتصادی حالت بھی سُدھر سکے گی۔

یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ اگر مناسب بفر اسٹاک (حاجز ذخیرہ) رکھا جائے تو ایک بڑی حد تک چینی کی صنعت میں اُتار چڑھاؤ (کمی بیشی) سے بچا جا سکتا ہے اور اس کی قیمت اور دستیابی میں بھی بڑی حد تک توازن آسکتا ہے۔ گروپ مذکور ماہرین کے اس نظریہ کی بھی حمایت کرتا ہے کہ تین مہینے کی ضرورت کی مقدار کو بفر اسٹاک کے طور پر رکھنا مناسب ہوگا اور مستقبل میں اس حاجز ذخیرہ میں اضافہ کی ضرورت ہو سکتی ہے اور اسے ۱۵ سے ۲۰ لاکھ ٹن کیا جا سکتا ہے جس کا انحصار ساتویں پلان کے دوران ملک کی چینی کی اندرونی کھپت کی سطح کے پیشِ نظر ہوگا۔

۸۳ـ۱۹۸۲ کے دَوران گنّے کی پیداوار ۱۸۹ ملین ٹن تھی۔ یہ پیداوار ساتویں پلان کے خاتمے یعنی ۹۰ـ۱۹۸۹ تک ۲۳۴ ملین ٹن تک پہنچ سکتی ہے۔ گنّے کی پیداوار کے اس نشانے کو حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ موجودہ ۳۷ لاکھ ہیکٹر زیرِ کاشت رقبے میں اضافہ کیا جائے۔ آبپاشی کی بہتر سہولتیں فراہم کی جائیں۔ فصلوں کے تحفظ پر دھیان دیا جائے اور کاشتکاروں کو گنّے کی نقل و حمل کے بہتر وسیلے فراہم کئے جائیں۔

گروپ کا یہ بھی خیال ہے کہ چینی بنانے کی ہر فیکٹری سے متعلق ایک علاقہ مخصوص کیا جائے تاکہ گنّے کی کمی کے باعث کارخانے متاثر نہ ہوں۔ ●

ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ سنگھ

اتر پردیش میں تعلیم بالغان

ایڈلٹ ایجوکیشن یا تعلیم بالغان ایک عالمی تحریک ہے۔ ایشیا اور افریقہ کے کچھ ملکوں میں بڑی تعداد میں لوگوں کے ان پڑھ اور ناخواندہ رہنے سے ان ممالک کی معاشی، سیاسی اور تکنیکی ترقی میں رکاوٹ درپیش ہے۔ ان کی عام فلاح اور بہبود اور ان کے معیارِ زندگی کو اونچا اٹھانے میں دقتیں آ رہی ہیں۔ اس لیے ان ملکوں میں تعلیمِ بالغان ایک اہم ترین مسئلہ بن گیا ہے۔

تعلیم بالغان میں ۱۴ سال سے زائد عمر والوں کو پڑھنے، لکھنے اور معمولی حساب کی صلاحیتوں سے آراستہ کیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں ان صلاحیتوں کا استعمال کر کے اپنا مستقبل بہتر بنا سکیں۔ اس تحریک میں ۱۵ سے ۳۵ سال کے مرد اور عورتوں کی تعلیم پر زیادہ زور دیا جاتا ہے کیونکہ ان کی کارکردگی کی بہتری سے ملک کی پیداوار اور قومی آمدنی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ تعلیم بالغان کا مقصد صرف حروف شناسی نہیں ہے۔ بلکہ حروف کے ذریعے کارگر جانکاری دینا بھی ہے۔

تعلیم بالغان کے تین اہم پہلو ہیں:-

۱۔ ٹیچنگ میٹریلس (Teaching materials) یعنی اشیا خواندگی، بالغوں کو پڑھانے کے لیے قاعدہ (Primer) پہلی، دوسری ریڈر یا اسی قسم کی کتابوں کی ضرورت ہے۔ بالغوں کے لیے تیار کردہ قاعدہ اور دیگر کتب بچوں کی کتابوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر ان کے طریقِ تعلیم بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ان کے قاعدوں میں پڑھنا اور لکھنا سیکھنے کا آغاز بامعنی لفظوں اور جملوں سے ہوتا ہے۔ تصویروں کی مدد بھی لی جا سکتی ہے۔ جیسے حیات اللہ انصاری طریقِ تعلیم میں بالغ سب سے پہلے دو لفظ تالا اور لالا سیکھتا ہے۔ یعنی ت، ل، اور آ، ان تین حروف کی مدد سے کئی لفظ اور جملے بن جاتے ہیں۔ اسی طرح لٹرسی ہاؤس Literacy House لکھنؤ کے "نیا سویرا" طریقِ تعلیم میں آگ اور جل سے پہلا سبق شروع ہوتا ہے۔ ان اشیاء خواندگی میں پڑھنے لکھنے کے ساتھ ساتھ روزمرہ کے کام دھندے، صفائی، صحت، کاشتکاری وغیرہ کے بارے میں کارآمد معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔

۲۔ ایڈلٹ لٹریسی ٹیچر

Adult Literacy Teacher

اشیاء خواندگی بالغان بالخصوص قاعدہ اتنا آسان ہوتا ہے کہ اسے پڑھانے کے لیے زیادہ تعلیم یافتہ مدرس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ وہ طریقِ تعلیم اور بالغوں کی عادتوں، صلاحیتوں، کمزوریوں اور نفسیاتی خصوصیتوں سے واقف ہوں۔ ماہرِ تعلیم بالغان کے مطابق کم سن بچہ قاعدہ کے ہر لفظ اور جملے کو بغیر سمجھے رٹ لیتا ہے۔ مگر بالغ میں سمجھ بوجھ ہوتی ہے۔ اس میں چیزوں کو سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اسے رٹنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس لیے تعلیم بالغان میں مدرس کی تربیت ضروری سمجھی جاتی ہے۔

۳۔ ایڈلٹس یا ناخواندہ بالغ

Illiterate Adults

ان پڑھ ناخواندہ بالغوں کی سماجی، معاشی، دماغی، نفسیاتی، خصوصیتوں کو سمجھے بغیر انھیں پڑھانے کا کام نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی عادتیں، حوصلے اور دماغی کیفیتیں ان کی عمر اور دیگر امور سے وابستہ ہوتی ہیں۔ نوجوان اور بوڑھوں کی دماغی حالات اور حوصلوں میں فرق ہوتا ہے۔ اس لیے کم سن بچوں کے ساتھ جس طرح کا سلوک کیا جاتا ہے اس طرح کا سلوک ان بالغوں کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ بالغوں کی دماغی، تمدنی (Cultural) اور سماجی خصوصیتوں کو دھیان میں رکھ کر ہی انھیں پڑھنا لکھنا پڑتا ہے۔

ضلع سہارنپور میں تعلیم بالغان ؛ سہارنپور اتر پردیش

یہ ۵۶ ضلعوں میں سے ایک ہے۔ یہ ضلع مغربی اُتر پردیش میں واقع ہے۔ جس کی اپنی تاریخی اور تمدنی روایات ہیں۔ ہندوؤں کے پوتر استھان ہری دوار اور مسلمانوں کا مقدس مقام پیران کلیر شریف اسی ضلع میں ہیں۔ دیوبند میں دارالعلوم ہے جو اعلیٰ عربی تعلیم کا بین الاقوامی مرکز ہے۔ روڑکی یونیورسٹی (University of Roorkee) کو انجینئرنگ میں بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ معیشت کے اعتبار سے یہ ضلع سبز انقلاب (Green Revolution) کے دَور سے گذر رہا ہے۔ اشیاء خوردنی میں نئی تکنیک کا استعمال اعلیٰ پیمانہ پر ہوتا ہے۔ اس لیے مغربی اُتر پردیش کے سبھی ضلعے پردیش کے دیگر ضلعوں کے مقابلہ میں زیادہ ترقی یافتہ اور خوشحال سمجھے جاتے ہیں۔ مگر ۱۹۸۱ کی مردم شماری کے مطابق ضلع میں ۲۷٫۹۳ فیصد لوگ پڑھے لکھے ہیں۔ جن میں مرد ۳۸٫۹۷ اور عورتیں ۱۸٫۵۰ فیصد جبکہ اُتر پردیش میں ۲۷٫۳۸ فیصد تعلیم یافتہ ہیں جن میں مرد ۳۸٫۸۰ اور ۱۴٫۰۴ فیصد عورتیں ہیں۔

ضلع سہارنپور میں تعلیم بالغان کا کام عرصہ دراز سے چل رہا ہے۔ غیر سرکاری مگر منظم طور سے اس کا آغاز میرا بین نے ۱۹۵۱ء میں کیا تھا۔ محترمہ میرا بین کا اصلی نام میڈلین سلیڈ تھا۔ یہ گاندھی جی کے اصولوں پر عمل کرنے والوں کے صفِ اول میں تھیں۔ روڑکی شہر سے آٹھ کلومیٹر دُور ایک گاؤں مول داس پور ماجرہ میں ان کا آشرم تھا۔ جواب بوسیدہ حالت میں ہے۔ صفائی، صحت، دستکاری کے ساتھ ساتھ تعلیم بالغان کا کام بھی آشرم اور آشرم کے آس پاس کے گاؤں میں کیا گیا۔ ۵۸-۱۹۵۷ کے بعد تعلیم بالغان کے کام مرکزی اور پردیش کے اداروں کے ذریعہ کیا جارہا ہے۔

۸۴-۱۹۸۰ تک سہارنپور ضلعے کے ۱۲ بلاکوں میں سے دو بلاکوں میں یعنی بلیا کھیڑا اور پواڑکا میں تعلیم بالغان کی اسکیم لاگو کی گئی۔

جولائی ۱۹۸۴ سے سہارنپور کے دو اور بلاکوں کو اس اسکیم کے تحت لایا گیا۔ یہ بلاک ہیں روڑکی اور بھگوان پور۔

روڑکی ایڈلٹ ایجوکیشن پراجیکٹ

اس پروجیکٹ کے تحت روڑکی اور بھگوان پور بلاکوں کے ۹۰ گاؤں ہیں، جن کی کل آبادی ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۱۱۹۹۵۶ افراد جن میں ۶۵۳۴۷ مرد اور ۵۴۶۰۹ عورتیں ہیں۔ ان میں ان پڑھ اور ناخواندہ لوگوں کی تعداد ۴۵۱۹۰ مرد اور ۵۰۲۱۶ عورتیں ہے۔ پروجیکٹ کے تحت آنے والے ۹۰ گاؤں اور قصبوں کو ۱۰ حلقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور ہر حلقہ میں ۳۰ تعلیمی مرکز ہیں۔ کچھ مرکزوں میں مردوں کی تعلیم کا انتظام ہے اور کچھ میں عورتیں پڑھائی جاتی ہیں۔ ناخواندہ بالغوں کو پڑھانے والے مدرسوں میں ۱۴۶ مرد ہیں اور ۱۵۴ عورتیں۔ ان میں سے کچھ کالجوں میں پڑھنے والے طالب علم بھی ہیں۔ پڑھنے والوں میں زیادہ تر پسماندہ قوم کے ہیں۔

مسلمانوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ کیونکہ ضلع سہارنپور کے پسماندہ قوم کے لوگ ۳۰ فیصد ہیں اور مسلمان گروپوں کی آبادی بھی ۳۰ فیصد سے زیادہ ہے۔ مندرجہ بالا چارٹ میں اس پروجیکٹ کی تفصیلات دی جاتی ہیں۔

(باقی ص۶ پر)

چارٹ

حلقہ	گاؤں اور قصبوں کی تعداد	آبادی ۱۹۷۱ء			ناخواندہ افراد		تعلیم بالغان کے مرکز		تعلیم حاصل کرنیوالے بالغوں کی تعداد		
		مرد	عورتیں	کل	مرد	عورتیں	مرد	عورتیں	مرد	عورتیں	کل
۱۔ بیہڑا	۱۰	۷۸۱۳	۶۴۶۰	۱۴۲۷۳	۵۹۳۶	۶۰۳۶	۷	۲۳	۲۱۰	۶۹۰	۹۰۰
۲۔ پنیالہ	۱۰	۶۲۶۷	۵۳۰۰	۱۱۵۶۷	۴۵۵۸	۴۸۵۸	۱۳	۱۷	۳۹۰	۵۱۰	۹۰۰
۳۔ چاؤلی	۵	۴۲۴۲	۳۷۰۳	۷۹۴۵	۲۶۴۴	۳۵۲۹	۱۷	۱۳	۵۱۰	۳۹۰	۹۰۰
۴۔ کھیڑی شکوہ پور	۶	۴۹۳۸	۴۱۶۸	۹۱۰۶	۳۶۲۷	۳۸۳۹	۲۱	۹	۶۳۰	۲۷۰	۹۰۰
۵۔ گرانٹ ماجرہ	۵	۲۷۰۸	۲۳۸۳	۵۰۹۱	۲۰۲۶	۲۲۸۶	۱۸	۱۲	۵۴۰	۳۶۰	۹۰۰
۶۔ چڑیالہ	۱۱	۹۸۱۶	۷۹۴۲	۱۷۷۵۸	۷۱۹۹	۷۰۶۲	۱۹	۱۱	۵۷۰	۳۳۰	۹۰۰
۷۔ کشن پور	۸	۷۷۳۲	۶۱۷۳	۱۳۹۰۵	۵۳۴۴	۵۲۸۵	۱۹	۱۱	۵۷۰	۳۳۰	۹۰۰
۸۔ روڑکی	۹	۶۹۰۰	۵۷۵۰	۱۲۶۵۰	۴۸۱۹	۵۱۸۸	۱۰	۲۰	۳۰۰	۶۰۰	۹۰۰
۹۔ بھگوان پور	۹	۶۴۴۷	۵۵۰۹	۱۱۹۵۶	۴۹۳۹	۵۱۳۹	۱۰	۲۰	۳۰۰	۶۰۰	۹۰۰
۱۰۔ گھوگھریکی	۱۳	۸۴۸۴	۷۲۱۱	۱۵۶۹۵	۶۰۷۳	۶۷۹۴	۱۲	۱۸	۳۶۰	۵۴۰	۹۰۰
کل	۸۶	۶۵۳۴۷	۵۴۶۰۹	۱۱۹۹۵۶	۴۵۱۹۱	۵۰۲۱۶	۱۴۶	۱۵۴	۴۳۸۰	۴۶۲۰	۹۰۰۰

غزلیں

شہپر رسول

پھر سے وہی حالات ہیں، امکاں بھی وہی ہے
ہم بھی ہیں وہی، مسئلہ جاں بھی وہی ہے

کچھ بھی نہیں بدلا ہے یہاں کچھ نہیں بدلا
آنکھیں بھی وہی، خواب پریشاں بھی وہی ہے

اے وقت! کہیں اور نظر ڈال یہ کیا ہے
مدت کے وہی ہاتھ، گریباں بھی وہی ہے

یہ جال بھی اُس نے ہی بچھایا تھا، اُسی نے
خوش خوش بھی وہی شخص تھا حیراں بھی وہی ہے

ہر تیر اُسی کا ہے، ہر اک زخم اُسی کا
ہر زخم پہ انگشت بدنداں بھی وہی ہے

کل شام جو آنکھوں سے چھلک آیا تھا میری
تم خوش ہو کہ اس شام کا عنواں بھی وہی ہے

شہپر وہی بھولا ہوا قصہ وہی پھر سے
اچھا ہے تری شان کے شایاں بھی وہی ہے

★

سائل سہسرامی

جس سمت بھی نگاہ کئے جا رہا ہوں میں
ذرّوں کو مہر و ماہ کئے جا رہا ہوں میں

کیا چیز ہے یہ رسمِ محبت نہ پوچھئے
دشمن سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

اُن کی گلی میں آج جو اپنا ہوا گذر
ہر اک قدم پہ آہ کئے جا رہا ہوں میں

جن کے ستم نے عشق کو بدنام کر دیا
پھر بھی انھیں سے چاہ کئے جا رہا ہوں میں

اب جا رہا ہوں تیری گلی سے بچشمِ تر
ذرّوں کو بھی گواہ کئے جا رہا ہوں میں

نہس کر کسی کا کہنا نہ بھولیں گے عمر بھر
سائل کو بادشاہ کئے جا رہا ہوں میں

★

ہر قدم صبحِ یقیں

وقار خلیل

اپنے خوابوں کی حقیقت پر جو اتراتے ہیں لوگ
زندگی کے نام پر رقصاں نظر آتے ہیں لوگ

جب سے محنت کو ملا ہے منصبِ فرزانگی!
کتنے خوش خوش کارخانوں میں نظر آتے ہیں لوگ

دفتروں میں ہم نے دیکھا ہے فرائض کا شعور
ملک کی تقدیر کو ایسے بھی چمکاتے ہیں لوگ

اب کسی لب پر نہیں شکوہ کہ نم دیدہ ہیں ہم
رنگ و بو کی اک نئی تصویر دکھلاتے ہیں لوگ

ہر نیا دن عید جیسا، ہر قدم صبحِ یقیں
ہر نئی منزل پہ جیسے حوصلے پلتے ہیں لوگ

کتنے ہونٹوں پر مچل اُٹھتے ہیں نغمے نور کے
روشنی کے اس سفر میں جب غزل گاتے ہیں لوگ

پھول، محنت اور محبت، آدمی، انسانیت
عصرِ نو کو کچھ نئے عنوان دے جاتے ہیں لوگ

تضمین بر نظم آل احمد سرور

شاہد ساگری

سوالوں کا تو ملتا ہے جواب آہستہ آہستہ
رُخِ جاناں سے اُٹھتا ہے نقاب آہستہ آہستہ
کہ ہوتا ہے عمل پیرا شباب آہستہ آہستہ
"وطن میں آ رہا ہے انقلاب آہستہ آہستہ
حقیقت بن رہے ہیں میرے خواب آہستہ آہستہ"

تجلی خانۂ کوہ و دمن ہے محوِ آرائش
نشاط انگیز ماحولِ چمن ہے محوِ آرائش
ہمالہ کی قسم سارا وطن ہے محوِ آرائش
"عروسِ وادیٔ گنگ و جمن ہے محوِ آرائش
بُتِ کافر پہ آیا ہے شباب آہستہ آہستہ"

نشانی رہ گئی باقی یہ اک پہلی حکومت کی
ابھی پوری طرح چمکی نہیں تنویر بھارت کی
ابھی چھائی ہے تاریکی گھروں پر یاس و غربت کی
"ابھی ہیں ہند میں پرچھائیاں کچھ عہدِ ظلمت کی
نہ چھوڑے گا انھیں بھی انقلاب آہستہ آہستہ"

ہند کو جنت بنائیں دوستو!

شفیق اعظمی

آؤ کچھ کر کے دکھائیں دوستو
ہند کو جنت بنائیں دوستو

تیرگی کا اب نہ ہو نام و نشاں
علم کی شمعیں جلائیں دوستو

عزم پختہ ہو عمل کی راہ میں
غم جو ہو ہنس کر اُٹھائیں دوستو

منزلیں آسان ہوں سب کے لیے
راستہ ایسا بنائیں دوستو

لالہ و گل مسکرائیں ہر طرف
اس طرح گلشن سجائیں دوستو

پیکرِ گیتی کو دے کر رنگِ نو
عظمتِ ہستی بڑھائیں دوستو

وقت کی رفتار بھی ہو شرمسار
یوں قدم آگے بڑھائیں دوستو

کیوں نہ ہم خونِ جگر کی بوند سے
پیاس کلیوں کی بجھائیں دوستو

شادمانی چوم لے بڑھ کر قدم
نقشِ غم ایسا مٹائیں دوستو

ہے شفیق اعظمی کی یہ دعا
ابرِ رحمت بن کے چھائیں دوستو

★

فرقہ پرستی

نثار اختر انصاری

دسہرہ کے دن
راون کے ہوش ٹھکانے آ گئے
بچے بھی اُسے جلانے آ گئے
لیکن فرقہ پرستی کا
تخریبی عناصر کا
ذات پات کا
نفرت و بُرائی کا راون
آج بھی زندہ ہے
شری رام جی آؤ!
اس راون کا خاتمہ کر دو

ایس ایم عباس

اُداس مُجسمے

ماضی کے آئینے میں، میرے سامنے ایک سادی سی تصویر ہے اوبڑ کھابڑ زمین، اونچے نیچے ٹیلے، گہری کھائیاں، انھیں کے بیچ بہتے ہوئے ندی نالے۔ جنگل اور پہاڑ اور انھیں جنگل اور پہاڑ کے دامن میں بسی ہوئی چھوٹی سی بستی۔

یہ میرے گاؤں کی تصویر ہے۔

بستی کیا تھی، بس چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں تھیں۔ شام ہوتے ہی جہاں ان جھونپڑیوں میں چراغ جل اٹھتے، وہیں آپس میں مار دھاڑ، لڑائی جھگڑا، شور شرابا شروع ہو جاتا۔ یہ ہنگامے اکثر روٹی کے نام پر ہوا کرتے۔

گاؤں والوں کے پاس نہ پیٹ بھرنے کے لیے روٹی تھی، نہ تن ڈھکنے کے لیے کپڑا اور نہ سر چھپانے کے لیے کوئی معقول انتظام۔ آدمی کے لیے جب روٹی، کپڑا اور مکان ہی مسئلہ بنا ہوا ہو تو زندگی میں کوئی حسن و شعور، نظم وضبط کیسے آسکتا ہے؟ بس پورا گاؤں جیسے بس گیا۔ بس گیا تھا۔ جو جیسے رہ گیا، رہ گیا تھا۔ زندگی میں کوئی ترتیب تھی، نہ تنظیم۔ شاید اس وقت گاؤں کے سامنے زندہ رہنا ہی ایک اہم مسئلہ تھا!

گاؤں کے حالات کتنے نازک تھے؟ تھا پڑ جاتا تو جانوروں کے ساتھ آدمیوں کی جان کے بھی لالے پڑ جاتے۔ سیلاب آجاتا تو ساری جھونپڑیاں، دیکھتے ہی دیکھتے پانی پر تیرتی نظر آتیں، مٹی کی دیواریں زمین بوس ہو جاتیں اور آبادی سے زندگی کے آثار چھن جاتے۔

کیسی مصیبت کی زندگی تھی یہ۔ جو کبھی سوکھے کی نذر ہوتی تو کبھی سیلاب کی، کبھی آگ کی تو کبھی اولے کی۔ جیسے حیات بالو کی دیوار پر کھڑی ہو جو حوادث کے ایک جھٹکے کی بھی تاب نہ رکھتی ہو۔

یہ دو سال کی نہیں، صدیوں کی صورتِ حال رہی۔

حالانکہ گاؤں والے نہ تو کام چور تھے، نہ کاہل و لاپروا۔ جدوجہد ہمیشہ اُن کا شعار رہا۔ زندگی کی گاڑی، حیات کے خارزاروں سے بڑھانے میں وہ جی جان سے لگے رہتے۔ شاید اپنی فرض شناسی، مستقل مزاجی، عزم و عمل کی قوت سے ہی وہ پگڈنڈی کی وہ گھاس بن گئے تھے، جسے ہر دن جانور چر جاتے، لوگ کچل کر اُٹھائے جاتے ہیں، لیکن اس کی قوتِ نمو کبھی زائل نہیں ہوتی۔

ہاں گاؤں والے لاچار و مجبور تھے تو محض اس وجہ سے کہ ان کے پاس خوش حال و مطمئن زندگی کے وسائل ہی مفقود تھے۔ نہ تو خوشحالی کے سامان ہی بہم تھے نہ اپنے کو آفتوں اور بلاؤں سے محفوظ کرنے کی سبیل ممکن تھی اور نہ زندگی کو اوپر اٹھانے اور بہتر بنانے کی کوئی کارگر تدبیر ہوسکتی تھی۔۔۔ دراصل زندگی کی چادر اتنی کمزور و نازک تھی کہ وہ حالات کا ایک معمولی جھٹکا بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

جہاں آدمی دن رات لامحدود پریشانیوں میں گھرا ہو وہاں تعمیر و ترقی بلندی اور خوشحالی اور مستحکم زندگی کا واضح تصور قائم کرنا اس کے لیے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ جب دو وقت پیٹ بھر روٹی ملنا محال ہو تو کوئی روشن اور خوش آئند مستقبل کا خواب کیسے دیکھے؟ گاؤں والے ایک مدت تک خوبصورت زندگی کے خواب کو بھی ترس کر رہ گئے تھے۔!

نہ جانے کب تک گاؤں والوں کی زندگی پر کہر چھایا رہا، اور اُن کے ذہن میں ترقی اور خوشحالی کا خواب کروٹیں بدلتا رہا۔ گاؤں کے باشندوں نے آس پاس کا جائزہ لیا۔ دوسرے گاؤں کی ترقی کو دیکھا، انھیں یہ محسوس ہوا کہ ترقی اور خوشحالی کے لیے، خوشحالی کے ذرائع پیدا کرنا ضروری ہے۔ پھر وہ پورے عزم و یقین کے ساتھ ذرائع کی تلاش میں لگ گئے۔ انھوں نے خوشحالی کے لیے کام شروع کر دیا، مدتوں کڑی محنت کی۔ ندیوں

اور دریاؤں کے راستے روک کر اُن پر پُل اور باندھ بنائے گئے۔ بنجر زمینوں کی کوکھ سینچی گئی۔ باندھوں پر بجلی گھر بنائے گئے اور اُن سے بجلی پیدا کرکے صدیوں سے اندھیروں میں ڈوبی بستیوں کو اُجاگر کر دیا۔ سڑک بنی، ریلوے لائن بچھی، مواصلاتی کے نظام قائم ہوئے۔

وسائل کے زینے سے چڑھ کر گاؤں آسمان تک پہنچ گیا ہے۔ آج گاؤں کی دھرتی پر بڑے بڑے پراجیکٹ کام کر رہے ہیں۔ بجلی، پانی اور آمد و رفت کے وسائل نے نہ معلوم کتنے کل کارخانوں، ملوں اور فیکٹریوں کو جنم دے دیا ہے۔ اور ان سب چیزوں نے مل کر گاؤں کی کایا پلٹ دی ہے۔ گاؤں والوں کے حالات بدلے۔ زندگی میں حسن و توانائی آئی تو گاؤں کا چہرہ خود بہ خود نکھر اور سنور گیا۔

ذرائع بڑھتے گئے۔

وسائل کے زینے جُٹتے گئے۔

گاؤں کی زندگی بلند ہوتی گئی۔

ترقی و خوشحالی کا کارواں آگے بڑھتا گیا۔

جہاں کبھی دُھول اُڑتی، وہیں اب آسمان سے باتیں کرتی ہوئی عمارتیں ہیں۔ جہاں کبھی سیلاب کا زور گاؤں کی زندگی کو تباہ و برباد کر دیتا، وہاں آج طوفانوں کے زد پر ہمالیہ کی طرح بلند، عظیم اور مستحکم باندھ کھڑے ہیں۔ جہاں کبھی فصلیں قطروں کے لیے تڑپ جاتیں وہاں اب موجیں مارتی ہوئی نہریں رواں دواں ہیں۔ وہ کھیت و کھلیان جو کبھی اپنے وجود پر پشیماں تھے آج اپنے مقدر پر نازاں ہیں۔ گاؤں کی دھرتی آج سونا ہی نہیں، ہیرے اور موتی بھی اُگل رہی ہے۔

یہ بڑے بڑے پروجیکٹ۔ یہ ملیں، کل کارخانے اور فیکٹریاں، باندھ، نہر اور ٹیوب ویل، سڑک اور ریلوے اور ایسے ہی لاتعداد ذرائع جو صدیوں تک محنت اور مشقت کے بعد میسر آئے ہیں۔ گاؤں والوں کے لیے وہ مقدس چیزیں ہیں جن کے وسیلے سے ترقی اور خوشحالی کی دعائیں قبول ہوئی ہیں۔

یہی نہیں، گاؤں میں تمام بڑے بڑے پروجیکٹ۔ گاؤں کے شاندار مستقبل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ وہ زندہ مجسمے ہیں جو گاؤں کے سیاسی، سماجی، مالی، اقتصادی اور معاشرتی زندگی کا سنگِ میل ہیں۔ جب کبھی گاؤں کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی منصوبہ عمل میں آتا ہے تو اُسے یہ مجسمے نئی جہت، نئی سمت و رفتار عطا کرتے ہیں۔

گاؤں سے غربت و افلاس کے سائے مٹے ہیں۔

خوشحالی آئی ہے۔

لیکن اب بھی گاؤں کے کچھ لوگ غریبی کے نشان کے نیچے ہیں۔ گاؤں کے زندہ مجسمے ہمہ وقت یہ سرگوشی کرتے ہیں کہ —

"ابھی منزلیں اور بھی ہیں۔"

مگر قدم سے قدم ملا کر ترقی کی راہوں کے مسافر جیسے اپنا راستہ بھول بیٹھے ہوں۔ پگڈنڈیوں سے نکل کر سڑکوں تک پہنچنے والے جیسے پھر پگڈنڈیوں کی سمت لَوٹ جانا چاہتے ہوں۔

جب گاؤں میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر زبردست ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ پھر مانگیں، نعرے بازیاں، آتنک، توڑ پھوڑ، ہڑتال، تالہ بندی، آتش زنی، خون قتل اور غارت گری کا بازار گرم ہو جاتا ہے تو تعمیر کے یہ سارے زندہ مجسمے اپنا سر جُھکا لیتے ہیں۔ ترقی اور خوشحالی کے سارے وسائل بڑی بے دردی سے برباد کئے جاتے ہیں اور گاؤں والے خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں یا اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کا سامان کر کے خوش ہوتے ہیں۔

یہ کیسی بات ہے؟

کیا دیوانہ پن ہے؟

شاید اپنی بات منوانے، اپنی مانگ قبول کرانے کے سلسلے میں گاؤں والے یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ کل کارخانے، یہ ملیں، فیکٹریاں، آسمان سے باتیں کرتی ہوئی چمنیاں، عظیم الشان باندھ، گنگا جمنا کی سی مقدس نہریں، قطب مینار نما بجلی کے کھمبے، لہلہاتے باغ، مسکراتے غنچہ و گل، سونا برساتے ہوئے کھیت و کھلیان، خوشیاں لُٹاتے ہوئے پروجیکٹ وقت کے خوبصورت تحفے ہیں، جو آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے لیے ملے ہیں۔

جب گاؤں کے لوگ وقتی غم و غصہ کا شکار ہو کر خود اپنی تلوار سے اپنا گلا کاٹنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں تو گاؤں کے یہ حسین مجسمے تڑپ اُٹھتے ہیں جیسے وہ چُپکے چُپکے کہتے ہوں۔

"تم لوگ غم و غصہ میں ہمیں توڑ پھوڑ کر بیکار اور بے مصرف نہیں کر رہے بلکہ خود اپنے جسم، اپنی جان کو مفلوج بنا رہے ہو۔"

— کہ ہم تمہارا جسم، تمہاری جان و رُوح ہیں۔

ہمیں جتنا ہی سنوار و نکھار دو — تمہاری زندگی اتنی ہی سنور اور نکھر جائے گی۔

— کہ ہم تمہاری تعمیر و ترقی کی زندگی کا لوحِ محفوظ ہیں۔

تم ہمارے سہارے یہاں تک پہنچے ہو۔

— کہ ہم نے تمھیں ایک نیا یُگ، نیا جیون دیا ہے۔

"خود اپنے ہاتھوں اپنی زندگی تباہ کرنا — تعمیر کے بعد تخریب۔!

— یہ کہاں کی عقل مندی ہے؟

کاش گاؤں والے ان مجسموں کی آواز سُن سکتے۔

ان کا کرب محسوس کر سکتے۔

— یوجنا، نئی دہلی

یکم تا ۱۵ ستمبر ۱۹۸۵ء

سید اختر الاسلام

عوامی عدالتیں

عدالتوں کے مقدمے کم کرنے میں معاون

آج سے جہاں مہاتما گاندھی نے ایک بار کہا تھا کہ دیش کے شہری اپنے جھگڑوں کے تصفیے خود کریں۔ عدالتوں کا دروازہ وہ اُسی وقت کھٹکھٹائیں جب عوامی عدالتیں کوئی فیصلہ یا تصفیہ کرنے کے ناقابل ہوں۔ یہ گویا گاندھی جی کا ایک خواب تھا۔ جس کو میرٹھ میں گذشتہ ۲۳ ستمبر ۱۹۸۴ کو شرمندۂ تعبیر کیا گیا۔ یہاں عوامی عدالتوں کا قیام عمل میں آیا جس کے رُو برو عوام نے اپنے ہزاروں مقدمات پیش کرکے عدلیہ کو مقدمات کے تصفیے میں زبردست مدد دی۔

عدالتوں میں بڑی تعداد میں مقدمات کا اکٹھا ہونا، کچہریوں کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی شروع ہو جانے والا خرچ اور دیگر مشکلات سے اس وقت ملک بُری طرح دوچار ہے۔ کہاوت ہے کہ انصاف میں دیری سے بے انصافی کو ہوا لگتی ہے۔ عوامی عدالتوں کے اس نئے طریق کار سے عوام کو جلد سے جلد انصاف دلانا ہی مقصود ہے۔

اُتر پردیش سے قبل عوامی عدالتوں کا تجربہ گجرات میں بہت کامیاب رہا تھا اس لیے میرٹھ کو اس سلسلے کی دوسری کڑی کہا جا سکتا ہے۔ عوامی عدالتوں کے نظام کو عملی شکل دینے کے لیے ضلع قانونی امداد اور صلاح کار کمیٹی میرٹھ کی ایک نشست میں اس نکتہ پر غور و خوض کیا گیا۔ اس کے لیے اُتر پردیش قانونی امداد اور صلاح کار بورڈ کے رُکن شری بھوتیہ ندھی شرما ایڈوکیٹ کو گجرات میں منعقدہ کیمپ میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی۔ لوٹنے پر شری شرما نے اپنی رپورٹ پیش کی جس میں انھوں نے عوامی عدالتوں کی پالیسی، طریقہ کار اور نقطۂ نظر کے سلسلہ میں اپنے مشاہدات پیش کیے۔ جس سے میرٹھ میں عوامی عدالتیں قائم کرنے اور ان کی کارگزاری کا تجربہ کرنے کا ایک موقع فراہم ہو سکا۔ اس کے کنوینر شری شرما ہی رہے۔ بعد میں میرٹھ ضلع قانونی امداد اور صلاح کار کمیٹی کے صدر نیز ضلع جج شری ہریش چندر متل نے اس عمل کو آگے بڑھاتے ہوئے کمیٹی کا تمام بار نئے رکن سیکریٹری کے چیف جوڈیشل مجسٹریٹ شری ایس اے صدیقی کو سونپ دیا۔ کمیٹی نے ضلع جج شری ہریش چندر متل کو عوامی عدالت کے کیمپ کا صدر، میرٹھ کے ضلع ادھیکاری شری ایل آر سنگھ معاون صدر نیز چیف جوڈیشل مجسٹریٹ شری صدیقی کو رکن سیکریٹری منتخب کیا۔ عوامی عدالتوں کے قیام میں مختلف سماجی و غیر سیاسی اداروں کا تعاون بھی لیا گیا جن میں وائنس کلب، روٹری کلب، بھارتیہ وکاس پرلیشد، میرٹھ بار ایسوسی ایشن، آل انڈیا کانفرنس آف لائرس کے علاوہ اُتر پردیش خواتین پلیٹ فارم، جین ملن وغیرہ کے ارکان شامل ہیں۔

عوامی عدالتوں میں فریقین کو کس طرح بُلایا جائے — یہ ایک بڑی مشکل تھی۔ اس کے لیے ایک خبرنامہ جاری کیا گیا جس میں خصوصی طور پر کہا گیا کہ اگر آپ آپس اور باہمی سمجھوتہ کے ذریعہ اپنے مقدمات طے کرانا چاہتے ہیں تو آپ شخصی طور پر عوامی عدالت کیمپ میں تشریف لائیں اور اپنا دعویٰ پیش کریں تاکہ صلح صفائی اور تصفیہ کیا جا سکے۔ اسی طرح عوامی عدالتوں میں ایسے مقدمات پیش کیے گئے جن میں باہمی طور پر فیصلہ ہو سکے۔

مقدمات چھانٹنے کا کام رکن سیکریٹری کو سونپا گیا جنھوں نے ہر ایک عدالت کے قائم مقام ججوں کو ایسے مقدمات عوامی عدالتوں کے سامنے پیش کرنے کے لیے جو باہمی سمجھوتہ کے ذریعہ طے ہو سکتے تھے فوجداری کے معاملے میں ایسے دعوے چھانٹے گئے جن میں لین دین سے کام چل سکتا تھا۔ سی آر پی کے ایسے مقدمات کو منتخب کیا گیا جن میں دونوں فریقین امداد و تعاون دے سکتے تھے دیوانی مقدمات میں خاص طور پر ازدواجی تعلقات سے متعلق مقدمات کو فوقیت دی گئی۔ اس کے ساتھ

بھی زمینوں پر سرکاری قبضے، نگر مہاپالیکا، پبلیس' موٹر ٹیکسی ڈنڈوں وغیرہ سے متعلق جرمانے اور ہرجانے کے مقدمات شامل فہرست کیے گئے۔ اس طرح کل ۲۰۰ مقدمات عوامی عدالتوں کے روبرو لائے گئے۔

کُل مقدمات سے متعلق دس ہزار فریقین کو نوٹس بھجوائے گئے جس کے لیے پولس ڈپارٹمنٹ اور ریونیو محکمہ کا تعاون لیا گیا۔ صرف دیوانی معاملات میں فریقین کو اطلاع بذریعہ ڈاک بھجوائی گئی۔ کچھ مقدمات میں یہ اطلاع چوتھے درجے کے ملازمین کے ہاتھوں بھجوائی گئی۔

عوامی عدالتوں کے لیے پنچ منڈلوں کا انتخاب عوامی نمائندوں میں سے کیا گیا۔ پنچ منڈل میں کسی بھی جوڈیشنل آفیسر کو شامل نہیں کیا گیا۔ کُل قائم کردہ ۳۱ عوامی عدالتوں میں سے ہر ایک کے لیے ۸ نفری پنچ منڈل (ارکان جیوری) کا تقرر کیا گیا جس کے لیے بار ایسوسی ایشنوں، روٹری لائنس کلبوں، بھارتیہ وکاس پریشد، روٹری کلب کی اِنر وہیل کی خواتین ارکان کے علاوہ دیگر سماج سیوک نیز سماج سیویکاؤں کا تعاون لیا گیا۔ ایک ریزرو پنچ منڈل بھی بنایا گیا تھا جس میں ۱۰۰ ممبران رکھے گئے تھے۔ اس ریزرو پنچ منڈل کے نمائندے بوقتِ ضرورت کسی بھی عوامی عدالت میں بھیجے جا سکتے تھے۔ پنچ منڈل کے قیام میں اس بات کا خصوصی دھیان رکھا گیا تھا کہ مقدمات کی نوعیت کے پیشِ نظر عوامی عدالتوں میں مناسب پنچوں کا ہی انتخاب کیا جائے۔ تاکہ مقدمات کو طے کرنے میں کوئی تکنیکی مشکل اُٹھ کھڑی ہو تو اسی موقع پر صحیح مشورہ حاصل ہو سکے۔

اتر پردیش میں تجرباتی طور پر قائم کردہ پہلی عوامی عدالت میں ۳۱ عوامی عدالتیں قائم کی گئی تھیں جو میرٹھ کے سب سے قدیم اور وسیع و عریض مقام میرٹھ کالج کے کمروں میں الگ الگ لگائی گئیں۔ ہر عدالت میں پنچ منڈل کے سات ارکان بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے میزیں تھیں اور میزوں کے سامنے عوام الناس اپنے مقدمات اور معاملات کا تصفیہ کرانے کے لیے جمع تھے۔ یکے بعد دیگرے مقدمات میں آوازیں لگائی جاتی تھیں اور متعلقہ فریقین سامنے آکر پنچ منڈل کو اپنے جھگڑے سناتے اور اس کی تفصیل بتاتے تھے۔ پنچ منڈل کے ارکان ان کی باتیں سنتے اور خوب غور و خوض کر کے دونوں فریقین میں صلح صفائی کا طریقہ سمجھاتے۔ دونوں فریقین کے مطمئن ہو جانے پر دونوں کا فیصلہ ایک کاغذ پر تحریر کیا جاتا اور اس صلح نامہ پر مناسب کارروائی کے لیے متعلقہ عدالت کے قائم مقام پنچ کو پیش کر دیا جاتا تھا۔ کُل ۲۴۰۰ مقدمات میں تقریباً ۱۶۰۰ فریقین حاضر ہوئے۔ ان تمام کے مقدمات کی سنوائی ہوئی اور اس طرح ۱۱۳۵ مقدمات عوامی عدالتوں کے ذریعے اسی دن طے کیے گئے۔

عوامی عدالتوں کے ضمن میں کچھ لوگوں کے ذہنوں میں ہنوز شکوک و شبہات موجود تھے جن کا لبِ لباب یہ تھا کہ یہ عوامی عدالتیں انصاف کے صحیح تقاضوں کی تکمیل کرنے میں ناکام ہیں۔ اس طرح کے منفی نظریات رکھنے والوں کے غلط خیالات کا ازالہ ۲۳ ستمبر ۱۹۸۴ کے کمرہ نمبر ا میں کیا گیا جہاں ۱۹۶۴ سے چل رہے اس وقت کے میرٹھ ڈویژن میں واقع ہنڈن ہوائی اڈے سے متعلق اس جھگڑے کو سلجھایا گیا جس میں اس وقت کے میرٹھ (اب غازی آباد) ڈویژن کے آٹھ دیہات ـــ لسوڑا، بہنولا، سکندر پور، بھون پورا، نیستولی، مکرم پور، اصالت پور اور افضل پور کے کسان بھائی ملوث تھے۔ ہنڈن ہوائی اڈہ بنانے کے لیے ان دیہات کے کسانوں کی زمینیں سرکار نے اپنے دائرہ اختیار میں لے لی تھیں۔ اس کے لیے خصوصی زمین دائرہ اختیار میں لینے والے آفیسر نے جو ہرجانہ و معاوضہ طے کیا تھا وہ ان دیہاتی بھائیوں کو قابلِ قبول نہیں تھا۔ ۱۹۶۷ء میں گاؤں والوں نے اس سلسلے میں میرٹھ کے فرسٹ ایڈیشنل ضلع جج کے یہاں اپیل دائر کی تھی۔ اس طرح اس جھگڑے کو بنیاد بناکر ۲۰ مقدمات ابھی تک زیرِ غور تھے جنھیں عوامی عدالت میں بھیجا گیا جہاں ۱۶۷ مقدمات کا تصفیہ کر لینے کے بعد ۲ روپیہ ۶۰ پیسے فی مربع میٹر معاوضہ کے علاوہ ۶ فیصد سالانہ کی شرح سے سود دیے جانے کے احکامات سرکار کو دیے گئے۔ ۱۶ برس بعد طے ہوئے اس جھگڑے سے متعلق کسانوں کو قریب ۷۰ لاکھ روپیہ اب سرکار کے ذریعے بھیجا جائے گا۔

عوامی عدالت نمبر ۲۴ میں زن و شوہر کے درمیان اس جھگڑے کا تصفیہ کیا گیا جس میں دونوں فریقوں کی ہی زندگی داؤں پر لگی ہوئی تھی۔ عوامی عدالت نے دونوں فریقوں کو سمجھا بجھا کر وہ فیصلہ کر دیا جو اصل عدالت میں شاید ہی ہو پاتا۔

اتر پردیش کے پہلی عوامی عدالت کے کیمپ کا آغاز الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس شری مہیش نارائن شُکل نے کرتے ہوئے کہا کہ انصاف کو سستا اور آسان بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ فریقین میں سمجھوتہ کرا کر مقدمات کی تعداد میں تخفیف کی جائے۔ اُن کے مطابق عوامی عدالتیں اس سلسلے میں اہم تعاون دے سکتی ہیں۔

اس موقع پر سپریم کورٹ کے جسٹس شری ایم پی ٹھکر نے کہا کہ عوامی عدالت ایک نیا تجربہ ہے۔ اس کے وسیلہ سے ایسے حالات پیدا کیے جا سکتے ہیں جس سے دشمنی کا جذبہ دور ہو۔ دشمنی اور جذبہ عناد مسئلہ کا حل ممکن نہیں ہوتا۔ اس کے لیے دوستی کا جذبہ ضروری ہوتا ہے۔

اُردو — ایک ہمہ گیر زبان

کوئی زبان کسی خاص فرقہ کی زبان نہیں ہوتی، اُردو کو مسلمانوں اور ہندی کو ہندوؤں سے متعلق کر دینا نہایت درجہ کی حماقت ہے۔ جہاں تک عام بول چال کا تعلق ہے اُردو کو صرف مسلمانوں سے منسوب کرنا قطعاً نامناسب ہے۔ کیوں کہ اُردو بولنے والے ہندو تو پھر بھی لاکھوں کی تعداد میں مل جاتے ہیں لیکن بہت سے مسلمان ایسے بھی ہیں جنھیں اُردو سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ مثلاً تامل ناڈ کے مسلمان تامل بولتے ہیں اسی طرح بنگال اور گجرات کے مسلمان بھی بالترتیب بنگالی اور گجراتی بولتے ہیں۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اُردو' خالص دیسی زبان ہے یہ ہندوستان میں پیدا ہوئی اور یہیں پلی بڑھی اور پھلی پھولی اور مختلف اَدوار میں مختلف ناموں سے یاد کی گئی۔ اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے اس کی ترقی اور ترویج میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے علاوہ سکھوں' پارسیوں اور انگریزوں نے بھی حصہ لیا۔ تقریباً سوا سو یورپین اور اینگلو انڈین اُردو گو شعرا گذرے ہیں جن میں اکثر صاحب دیوان ہیں۔

سر تیج بہادر سپرو کی رائے میں اُردو تاریخی' سیاسی' معاشی اور تہذیبی لحاظ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد اور یک جہتی کا نتیجہ ہے اور اس باہمی اتحاد کی وہ عظیم الشان یادگار ہے جس کو زمانہ کبھی نہیں بھلا سکے گا۔

۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک کے قلیل عرصے میں سینکڑوں کتابیں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر اس مشترکہ زبان میں لکھیں۔ اور سینکڑوں اخبارات نکلے ان میں سے چند اخبارات اور ان کے ہندو مدیران کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں جنھوں نے اُردو ادب کی بیش بہا خدمت کی اور اُردو ادب میں اضافہ کیا۔

۱۔ قرآن السعدین — مدیر — معصوم نرائن
۲۔ محب ہند — مدیر — ماسٹر دھرم چند
۳۔ فوائد المناظرین — مدیر — ماسٹر رام چندر
۴۔ فوائد الشائقین — مدیر — پربھو دیال
۵۔ سدھاکر اخبار — مدیر — تارا موہن
۶۔ بنارس اخبار — مدیر — رگھوناتھ گھوش
۷۔ مخزن الاخبار — مدیر — لچھمن پرشاد
۸۔ الحقایق — مدیر — موتی لال
۹۔ کوہِ نور — مدیر — منشی ہرسکھ رائے
۱۰۔ خورشید عالم — مدیر — منشی دیوان چند
۱۱۔ نور الابصار — مدیر — منشی سدا سکھ لال
۱۲۔ خلاصۃ الاخبار — مدیر — متھرا داس

یہ فہرست اس وقت کی ہے جب شمالی ہند میں اخبارات اور چھاپے خانوں کا رواج نیا نیا تھا پڑھے لکھے افراد کی تعداد بھی محدود تھی۔ اس کے بعد سے ہندوؤں نے اتنے اخبارات نکالے جن کی تعداد شمار کرنا بھی مشکل ہے۔ چند مشہور اخباروں کے نام درج ذیل ہیں۔

"اودھ اخبار"۔ "اخبار عالم"۔ "ملاپ"۔ "پرتاپ" "شیر پنجاب"۔ "تیج"۔ "شیر دکن"۔ اس کے علاوہ کچھ ہفت روزنامے اور ماہناموں کے نام بھی درج کیے جاتے ہیں یہ بھی ہندو حضرات کی ادارت میں شائع ہوئے مثلاً "تفریح"۔ "آزادی"۔ "طوطئ ہند"۔ "کیسر کیاری"۔ "زمانہ"۔ "زبان"۔ "ادیب"۔ "رہنمائے تعلیم" اور "مستانہ جوگی" وغیرہ۔

اُردو نے عیسائی' سکھ' پارسی اور اسلام جملہ مذاہب کی زبردست خدمت کی ہے۔ وطن کی آزادی کی لڑائی میں ہزاروں مجاہدین اس زبان میں ترانے گاتے ہوئے سُولیوں پر چڑھ گئے، اُردو ہندوستان کے ہر حصے میں بلکہ ہندوستان کے باہر بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ انگلینڈ اور کینیڈا کے علاوہ اور بہت سے ممالک میں اُردو کے بڑے بڑے مراکز ہیں۔ اگرچہ اس میں بہت سے عربی اور فارسی کے الفاظ ہیں' لیکن عوام اس سے بدرجہ اتم مانوس ہو چکے ہیں۔

بقول ڈاکٹر رام شیام ورما، بدیسی الفاظ تو دیوتا کے مُنہ سے بولی گئی سنسکرت میں بھی مل جائیں گے، دنیا کی کوئی ایسی زبان نہیں جو سراسر خالص ہونے کا دعویٰ کر سکے۔

اُردو کو انتہائی درجہ کی صحافتی وسعت حاصل ہے۔ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اُردو بولی جاتی ہے یہاں تک کہ اُردو کے مخالفین بھی اُردو بولتے ہیں۔ اُردو اخبارات کی اشاعت جس قدر ہندوستان میں ہوتی ہے ہر شخص کو اس کا اعتراف ہے۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ ہندوستان کے جن حصّوں سے اُردو اخبارات شائع نہیں ہوتے وہاں سے ہندی اخبارات بھی نہیں نکلتے۔

مہاتما گاندھی کے قول کے مطابق ہندی لفظ ہندوؤں کی اختراع نہیں ہے بلکہ یہ نام تو مسلمانوں کے آنے کے بعد پڑا ہے اور اس سے مراد وہ زبان ہے جو اس وقت شمالی ہند کے ہندو اور مسلمان لکھتے پڑھتے تھے۔ لاتعداد مصنفین نے اپنی مادری زبان کو ہندی نام سے ہی موسوم کیا ہے جو بعد میں انگریزوں کی ڈپلومیسی کا شکار ہو کر دو حصوں میں منقسم ہو گئیں حتّٰی کہ رسم الخط بھی علاحدہ علاحدہ ہو گئے۔ اور اس طرح ایک جان دو جسموں میں سما گئے۔

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81
Vol. 5 No. 11
YOJANA (URDU)
Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment at Civil Lines Post Office, Delhi-110054
1-15th September, 1985

مس عشرت جبیں

چینی کے صنعت کاروں کی حوصلہ افزائی

پلاننگ کمیشن نے چینی کی صنعت کے لیے جو ورکنگ گروپ بنایا تھا اس نے یہ سفارش کی ہے کہ ساتویں منصوبے کے دوران چینی کی مانگ کو پورا کرنے کے لیے اس کی مناسب مقدار میں پیداوار کی خاطر کچھ حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے۔

ساتویں پلان (۱۹۸۹-۹۰) کے خاتمہ پر ایک اندازے کے مطابق ۹۶-۱۰۸ لاکھ ٹن چینی کی ضرورت ہوگی اس میں دس لاکھ ٹن برآمد کی جانے والی چینی بھی شامل ہے۔ اب تک ۸۵ لاکھ ٹن چینی کی پیداوار حاصل ہو سکی ہے۔ ۲۳ لاکھ ٹن چینی اور حاصل کرنی ہوگی تاکہ چینی کی پیداوار میں ضروری اضافہ ہو سکے۔

چھٹے منصوبے میں چینی کی پیداوار بڑھانے کے لیے نئے کارخانوں کے قیام اور پہلے سے چلے آرہے پراجیکٹوں کی توسیع پر زور دیا گیا اور اب ساتویں منصوبے میں ۸۰-۹۰ لاکھ ٹن چینی کے حساب سے پیداوار برقرار رکھنی ہوگی ـــــ چینی بنانے کے لیے کارخانے قائم کرنے کے لیے موجودہ پالیسی کے مطابق کوآپریٹو سیکٹر کو پہلے ترجیح دی جاتی ہے اور پھر پبلک سیکٹر کو اور اس کے بعد پرائیویٹ سیکٹر کو، یہ پالیسی ساتویں پلان میں برقرار رکھی جا سکتی ہے۔ موجودہ کارخانوں کی توسیع کے لیے سیکٹر سے قطع نظر سبھی کارخانوں کو جہاں کافی مقدار میں ان کے توسیعی پروگرام کے مطابق گنے کی فراہمی ممکن ہے انھیں لائسنس دے دینا چاہیئے۔

توسیع کے لیے ترجیح اُن کارخانوں کو دی جانی چاہیئے۔ جو ناگفتہ بہ حالت میں گھاٹے پر چل رہے ہیں۔ تاکہ ان کا خسارہ پورا ہو سکے اس کے بعد ایسے لائسنس ان کارخانوں کو دئے جا سکتے ہیں جو کہ اپنا توسیعی پروگرام رقبے میں اضافہ کئے بغیر پورا کر سکتے ہیں۔ زائد مقدار کے لیے لائسنس دئے جانے کے لیے ضرورت ہے کہ بین الصوبائی ترجیحات کو پیش نظر رکھا جائے تاکہ متوازن طور پر علاقائی فروغ ہو سکے، اور پسماندہ علاقوں کے ساتھ مناسب سلوک یقینی ہو سکے۔ زرعی ماحول تکنیکی اور اقتصادی پہلوؤں پر بھی مناسب توجہ دئے جانے کی ضرورت ہے تاکہ نئے چینی کے کارخانے مناسب جگہ پر ہی قائم ہو سکیں۔ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ چینی کی مقدار بڑھانے کے لیے جو لائسنس دئے جائیں وہ زیادہ تر دیہی اور پسماندہ علاقوں پر مشتمل ہوں۔ کیونکہ دیہی علاقوں کے فروغ کے لیے چینی کے کارخانے ایک خاص ذریعہ بنتے ہیں۔

۱۹۸۳-۸۴ سے ۱۹۸۹-۹۰ تک ہر سال چینی کی ضرورتوں کا تخمینہ اور ۱۹۹۰-۹۱ سے ۱۹۹۹-۲۰۰۰ تک چینی کی ملکی کھپت کا تخمینہ بھی لگا لیا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق چینی کی پیداوار میں ۵ فیصد سالانہ کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ آبادی میں سالانہ اضافہ کی شرح ۱.۹ فیصد کر دی گئی ہے۔ اس طرح ۱۹۸۵-۸۶ (ساتویں پلان کا پہلا سال) میں ۶۰-۹۰ لاکھ ٹن چینی کی ضرورت ہوگی اور ۱۹۸۹-۹۰ (ساتویں پلان کے آخری سال) میں ۹۶-۱۰۸ لاکھ ٹن چینی کی ضرورت ہوگی اس میں دس لاکھ ٹن برآمد کی جانے والی چینی بھی شامل ہے۔

اس طرح ایک ویکیوم پان چینی کی فیکٹری میں چینی کی وصولی ۱۰ فیصد رکھی جا سکتی ہے جبکہ ایک جدید کھانڈساری فیکٹری میں یہ اوسط ۷-۶ فیصد ہوگا۔ کھانڈساری کارخانہ لگانے کے لیے کم سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے اور روزگار کے زیادہ مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ لیکن ان کارخانوں میں چینی کی پیداوار کی شرح نسبتاً کم رہ جاتی ہے۔ اس لیے یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ ساتویں پلان کے دوران کھانڈساری طرز کے کارخانے کے پھیلاؤ پر زیادہ زور نہیں دیا جانا چاہیئے۔

گنے کے پیداواری رقبے میں اُتار چڑھاؤ روکنے اور ویکیوم پان چینی کے کارخانے کو گنے کی فراہمی کی مقدار بنائے رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ گنے کی قیمت مقرر کرنے سے متعلق ایک پالیسی بنائی جائے جس میں چینی، شکر، گڑ، کھانڈساری سبھی چیزوں کا جائزہ لیا جائے۔ قیمت کی پالیسی بناتے وقت چینی کی مانگ میں اُتار چڑھاؤ اور گنے کی پیداواری سطح کو بھی دھیان میں رکھا جانا ضروری ہے۔ گنے کی کم سے کم قیمت جو مقرر کی جائے وہ اتنی ضرور ہو کہ پیداواری لاگت کو پورا کر سکے۔ اچھا ہوگا اگر ایسا کوئی طریقہ اختیار کیا جائے جس سے گنے کی قیمت اور چینی کی قیمت میں کچھ تال میل بن سکے کمی یا غیر پیداواری زمانے میں چینی کی قیمتیں برقرار رکھنے کے لیے مناسب مقدار میں چینی کا ذخیرہ کیا جانا ضروری ہے۔ چینی کی پیداوار میں بہتری لانے کے لیے چینی کے صنعت کاروں کو چاہیئے کہ وہ پیداوار میں بہتری لانے کے لیے

باقی ص۔ پر

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002

یوجنا

۱۶ تا ۳۰ ستمبر ۱۹۸۵ء

ایک روپیہ

ہندوستان کی آبادی میں اضافہ

(ابو سعد)

ہماچل پردیش کے جنگلات

(سرداری لال نشتر)

زینت رشید

توانائی کا نیا ذریعہ ہائیڈروجن

توانائی دورِ حاضر میں پوری دنیا کے لیے ایک سنگین مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ ہندوستان چونکہ غریب اور ترقی پذیر ملک ہے اس لیے اس کا مسئلہ ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے میں زیادہ سنگین ہے۔ ملک میں توانائی کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش اور اس میں پائی جانے والی رکاوٹوں کو دور کرنے پر غور ضروری ہوگیا ہے۔ توانائی کے بہتر، دیرپا اور نہ ختم ہونے والے ذرائع کی کھوج کی طرف توجہ دینی ہے۔ یوں تو قدرت نے ہمیں توانائی کے بیش بہا خزانوں سے مالا مال کیا ہے اور ہماری لیے توانائی مختلف شکلوں میں ذرہ ذرہ میں پنہاں رکھی ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ دن بدن تیزی سے بڑھتی ہوئی ترقی، آرام و آسائش اور اونچا معیارِ زندگی، قدرت کے ان خزانوں کو بڑی تیزی سے صرف کرنے میں مشغول ہے۔ آج تمام دنیا کے سائنسداں توانائی کے روائتی ذرائع کے مقابلے میں نئے نئے وسائل کی تلاش میں معروف کار ہیں اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک نئے، سستے اور دیرپا ایندھن کی جستجو میں سرگرداں ہیں۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ سارے ہی ترقی یافتہ اور صنعتی ممالک ہر سال کروڑوں ڈالر کی رقم توانائی کے نئے بہتر، سستے اور نہ ختم ہونے والے ایسے ذرائع کو قابلِ استعمال بناسکنے پر خرچ کررہے ہیں، جس کی خوبیاں پٹرول اور تیل جیسے روائتی ایندھن سے کسی طرح کم نہ ہوں۔

سائنسدانوں کی محنت اور کوششوں کے نتیجے میں جو تین نئے ذرائع انسان کی گرفت میں آتے ہیں وہ ہیں شمسی توانائی، جوہری توانائی اور ہائیڈروجن Hydrogen یوں تو شمسی توانائی ایک بیحد گراں قدر نہ ختم ہونیوالا اور مفت دستیاب ہونے والا توانائی کا بیش بہا ذریعہ ہے لیکن اس قدرتی خزانے سے ہم ہر وقت مستفید نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ نہ تو سورج کا نکلنا اور غروب ہوجانا ہمارے بس میں ہے اور نہ ہی ہر موسم میں ہمیں ایک مقدار میں سورج کی روشنی میسر آسکتی ہے۔ رہا یورینیم کا معاملہ تو یورینیم زیر زمین پایا جانے والا ایک ایسا ریڈیو ایکٹو مادہ ہے جس کے خزانے لامحدود نہیں ہیں، اس کے علاوہ یورینیم ایک بیحد قیمتی مادہ ہے اس لیے اس کے استعمال کا تعلق براہِ راست بین الاقوامی معاشی صورتِ حال سے ہے۔ یورینیم کے استعمال میں جو دوسری دشواری حائل ہے وہ ہے انسانی صحت پر اس کے مضر اثرات۔ ہاں ہائیڈروجن کرۂ ارض پر پایا جانے والا ایک ایسا مادہ ہے جو سب سے زیادہ مقدار میں پایا جاتا ہے اور اس بیش بہا مادے کے پاس مستقبل میں ہماری توانائی کی ضروریات پوری کرنے کے واسطے بہت کچھ ہے۔ قدرتی طور پر ہائیڈروجن نام کا مادہ گیس کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ اس اہم مادے کی دریافت ایک انگریز سائنسداں ہنری کیونڈش Henry Cavindish نے سن ۱۷۶۶ء میں کی۔ انھوں نے سب سے پہلی بار اس گیس کو بنایا اور اس کی خصوصیات کا مطالعہ کرکے اسے "جلنے والی گیس" کا نام دیا۔

زمین پر ہائیڈروجن کی سب سے بڑی مقدار پانی میں پائی جاتی ہے (یونانی زبان میں ہائیڈروجن کا مطلب پانی بنانے والا مادہ ہے)۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں پانی آکسیجن اور ہائیڈروجن نام کے دو عناصر کے اشتراک سے بنتا ہے۔ پانی کے ایک سالمہ میں دو ایٹم ہائیڈروجن کے ہوتے ہیں اور ایک ایٹم آکسیجن کا۔ اگر ہم کسی ترکیب سے پانی کے سالمات Moleoules کو توڑیں تو ہمیں یہ دونوں عناصر الگ الگ خالص طور پر دستیاب ہوسکتے ہیں جن میں سے یہ آکسیجن ہمارے ماحول کو خوشگوار بنانے کے لیے استعمال میں لائی جاسکتی ہے اور ہائیڈروجن سے ہم توانائی حاصل کرسکتے ہیں۔ ہائیڈروجن سے ہمیں فی پونڈ جو توانائی حاصل ہوتی ہے وہ کسی بھی طریقے سے تمام روائتی ایندھنوں کے مقابلے میں کم نہیں ہے۔ جبکہ روائتی ایندھنوں کے مقابلے میں پانی کی شکل میں ہائیڈروجن ایک نہ ختم ہونے والے خزانے کی صورت میں ہمیں ہر وقت دستیاب رہتا ہے۔؟

(مسلسل جاری کور صفحہ پر)

اس شمارے میں

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر ۔ آر۔ ٹھکرال
ایڈیٹر ۔ لکھی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر ۔ محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر ۔ وسیم حیدر

جلد: ۵	۱۶ تا ۳۰ ستمبر ۱۹۸۵	شمارہ: ۱۲

۲۵ر بہادر شاہ ظفر مارگ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ فون: ۲۰۱۸۱۸

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے۔ دو سالہ ۳۵ روپے۔ تین سالہ ۵۰ روپے
فی شمارہ : ایک روپیہ
طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۲۵ فیصد کی رعایت

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے۔ مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں رہتے۔

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:-

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن ایسٹ بلاک ۴ لیول ۷ آر۔ کے۔ پورم (ویسٹ)، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

بزنس منیجر : ایل۔ آر۔ بترہ ٭ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) : آر۔ ایس۔ منہاس

خریداری کا پتہ۔ بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

قیمتیں بڑھنے سے کیسے روکیں؟

مرکزی وزارت مالیات میں بیورو آف پبلک انٹر پرائزز نے ماہرین پر مشتمل جو گروپ قائم کیا ہے، وہ قیمتوں کے نظام پر بحیثیت مجموعی نظرِ ثانی کرے گا۔ یہ گروپ سامان کی تیاری کے لیے درکار مال کی قیمتوں کے بعد اشاریہ کا بھی مطالعہ کرے گا اور اس طرح وہ پبلک سیکٹر کے کارخانوں میں تیار کی جانے والی اشیاء کی قیمتوں سے متعلق ایک جامع پالیسی مرتب کرے گا۔ اُمید کی جاتی ہے کہ مستقبل میں قیمتوں سے متعلق پالیسی ایسی ہوگی کہ اس میں کلیدی سامان کی قیمتوں کے اُتار چڑھاؤ کی تفصیلات کے لیے از خود گنجائش رکھی جائے گی اور کوئلہ اور فولاد جیسی اہم اشیا کی قیمتوں میں اضافے سے پیداواری لاگت میں اضافے کو قیمتوں کے ساتھ مربوط کر دیا جائے گا۔ کوشش اس بات کی ہے کہ مال کی تیاری میں صلاحیت سے پورا پورا کام لیا جائے اور کام کی رفتار اور صلاحیت کار میں کسی طرح سے کوئی کمی نہ آئے تاکہ انتظامیہ کی خامیوں سے اشیاء کی قیمتوں میں جو اضافہ ہوتا ہے، اسے روکا جا سکے۔ البتہ خام مال کی قیمتوں میں اضافے کو اشیاء کی قیمتوں کے تعین کے وقت ملحوظ رکھا جائے گا۔ اسی طرح کسٹم اور ایکسائز محصولات میں اضافے کو بھی خیال رکھا جائے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ ورکنگ گروپ طریقِ کار پر بھی نظر ڈالے۔ اکثر طریقِ کار کی خامیوں کے سبب مال کی تیاری میں تاخیر ہوتی ہے۔ قیمتوں میں اضافے کی روک تھام کے لیے ضروری ہے کہ ہر یونٹ پر آنے والی لاگت کو کم کیا جائے۔ پبلک سیکٹر یونٹوں میں منافع کے عنصر کو سامنے نہیں رکھا گیا ہے۔ قیمتوں کے ڈھانچے پر نظرِ ثانی کرتے وقت دو اور باتیں ضروری ہیں۔ ایک ہے زمین یا اراضی کی حصولی سے متعلق مسائل اور دوسری ہے محنت کش طبقے کو کام دیئے جانے پر زور۔ ایک اندازے کے مطابق کوئلے کے شعبے میں ۵۰ ہزار ارکان پر مشتمل افرادی قوت فاضل ہے۔ سرکاری پالیسی چونکہ عوام کو روزگار دینا ہے، لہٰذا مشینوں کے بھاری استعمال کے باوجود افرادی قوت میں کمی نہیں کی گئی ہے۔ اسی طرح فولاد وغیرہ کے شعبوں میں وہی طریقِ کار رائج ہے کہ ۲۵ برس پہلے تھا اور جس میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو کھپایا گیا تھا۔ دنیا میں مشینوں کے رواج سے لاگت گھٹی ہے مگر ہندوستان میں معیشت کی لاگت بدستور پہلے کی طرح زیادہ ہے۔ اکثر کام کرنے میں احتیاط نہ برتنے سے اور احتیاط کا عنصر غالب نہ ہونے سے بھی سامان اور بجلی وغیرہ کی تضیع کافی دیکھنے کو ملتی ہے۔ لہٰذا معیشت کو بہتر بنانے کے لیے اور اشیاء کی قیمتوں کو بڑھنے سے روکنے کے لیے اعلیٰ ترین صلاحیت وقت کی اہم ضرورت ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی: وزارت تعلیم نے نئی تعلیمی پالیسی سے متعلق ایک خاکہ تیار کیا ہے۔ اسے بجا طور پر تعلیم سے متعلق چیلنج کہہ کر پکارا گیا ہے۔ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے کہ یہاں خواندگی کی شرح کل آبادی کے مقابلے میں ۳۶ فیصد سے کچھ ہی زیادہ ہے۔ یہ شرح حصولِ آزادی کے ۳۸ برس بعد حاصل ہو سکی ہے۔ حالانکہ ہمارے ملک کے رہنماؤں نے یہ خواب دیکھا تھا کہ یہاں کم سے کم وقت میں خواندگی کی شرح سو فیصد ہو جائے۔ مگر تعلیم آج بھی منصوبہ سازوں کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ وزیراعظم شری راجیو گاندھی نے ۵ جنوری کو قوم سے خطاب کرتے ہوئے نئی تعلیمی پالیسی کا جو وعدہ کیا تھا، یہ اس کی تکمیل ہے۔ امید کہ اس کے ذریعے ملک کے عوام سائنسی اور تکنیکی اعتبار سے اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں گے اور ۲۱ویں صدی میں داخل ہو سکیں گے۔ یہ ایک اُمید افزا علامت ہے کہ تعلیم کے پھیلاؤ اور اس کو عوامی ضرورتوں کے مطابق ڈھالنے سے ہم کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ سکیں گے۔ اس سلسلے میں قابلِ ذکر بات یہ ہوگی کہ گزشتہ ۳۸ برسوں میں ہمارے ملک میں شرحِ خواندگی انتہائی کم رہی ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے عوام نے بیل گاڑی کے زمانے سے خود کو نکال کر خلائی دور میں پہنچا دیا ہے۔ اب الیکٹرانک اور کمپیوٹر کی مقبولیت کا زمانہ ہے۔ لہٰذا نئی تعلیمی پالیسی کے ذریعے عوام کو ملکی تقاضوں اور خود کفیلی کے احساس سے واقف کرانا ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی وضع کرتے وقت سابقہ خامیوں کو سامنے رکھ کر ان کو دور کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۶۸ء میں تعلیمی پالیسی کو زندگی کے تقاضوں اور عملی اندازِ فکر سے جوڑنے کی کوشش کی گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی تعلیمی مواقع کی توسیع اور معیار کو بلند کرنے پر زور دیا گیا تھا۔ مزید برآں اخلاقی اقدار کو پروان چڑھانے اور سائنس اور ٹکنالوجی کو مقبولِ عام بنانے کی کوششوں کی اہمیت واضح کی گئی تھی۔ یہ تمام مقاصد بلند ترین مقاصد ہیں لیکن ان کو جزوی طور پر ہی حاصل کیا جا سکا ہے۔ زیادہ تر گوشے ایسے ہیں کہ وہ خاطر خواہ نتائج پیش نہیں کر سکے۔ اس سلسلے میں وسائل کی کمی اور عوام کے شعور کی کمی وغیرہ مانع رہی۔ ان تمام باتوں کا جائزہ لیتے ہوئے منصوبہ سازوں نے یہ کہا ہے کہ پیشہ ورانہ تعلیم کو صنعتی سیکٹر کے روزگار سے ہی نہ جوڑنا چاہیے بلکہ اسے زراعت اور دیہی ترقی کے مختلف پروگراموں سے جوڑ دینا چاہیے۔ دیکھنا یہ ہے کہ نئی تعلیمی پالیسی کے بارے میں عوام کا ردِ عمل کیا ہے اور وہ اس پر کہاں تک عمل پیرا ہوتے ہیں۔

(ایڈیٹر)

ہندوستان کی آبادی میں اضافہ اور خاندانی منصوبہ بندی

ہندوستان کا رقبہ دُنیا کے کل رقبے کا تقریباً ۲٫۴ فیصد ہے جبکہ یہاں دُنیا کی پندرہ فیصد سے زیادہ آبادی رہتی ہے یہ آبادی کے لحاظ سے چین کو چھوڑ کر دنیا کا دوسرا بڑا ملک ہے۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق یہاں کی کل آبادی اڑسٹھ کروڑ چالیس لاکھ تھی۔ اس طرح دنیا کا ہر چھٹا آدمی ہندوستانی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۶۰۰ء میں ہمارے ملک کی کل آبادی تیرہ کروڑ تھی جو ۱۸۵۰ء میں بڑھ کر صرف پندرہ کروڑ ہوئی۔ دو سو سال میں آبادی میں بہت کم اضافہ ہوا کیونکہ اُس وقت ملک میں اونچی شرح پیدائش کے ساتھ ساتھ شرح اموات بہت زیادہ تھی۔

برطانوی حکومت کے قائم ہو جانے پر ملک میں اندرونی امن کی فضا قائم ہوئی، بیماریوں کی روک تھام کے لیے طبی سہولیات مہیا کی گئیں اور صحت کی طرف توجہ دی گئی جس سے آبادی میں تیزی کے ساتھ اضافہ شروع ہوا۔ آزادی کے بعد آبادی میں اضافے کی شرح میں اور تیزی آ گئی۔ ہندوستان کی پہلی اور غیر منقسم مردم شماری ۱۸۷۱ء میں کی گئی تھی جس کے مطابق یہاں کی کل آبادی ۲۰٫۹۰ کروڑ تھی۔ ۱۸۸۱ء میں پہلی مردم شماری کے مطابق یہاں کی آبادی ۲۵٫۳۹ کروڑ ہو گئی تھی۔ ۱۸۹۱ء میں تیسری مردم شماری ہوئی۔ ۱۸۹۱ء سے ۱۹۸۱ء تک ہوئی مردم شماری کے مطابق آبادی میں اضافے کی شرح مندرجہ ذیل جدول سے ظاہر ہے:۔

مردم شماری کے سال	کل آبادی (کروڑ میں)	دس سالوں میں کل اضافہ (کروڑ میں)	دس سالوں میں اضافہ (فیصد میں)
۱۸۹۱	۲۳٫۵۹	—	—
۱۹۰۱	۲۳٫۸۳	+۰٫۲۴	+۰٫۴۰
۱۹۱۱	۲۵٫۲۰	+۱٫۳۷	+۵٫۷۳
۱۹۲۱	۲۵٫۱۳	−۰٫۰۷	−۰٫۳۰
۱۹۳۱	۲۷٫۸۹	+۲٫۷۶	+۱۱٫۰۰
۱۹۴۱	۳۱٫۸۶	+۳٫۹۷	+۱۴٫۲۲
۱۹۵۱	۳۶٫۱۰	+۴٫۲۴	+۱۳٫۳۱
۱۹۶۱	۴۳٫۹۲	+۷٫۸۲	+۲۱٫۶۴
۱۹۷۱	۵۴٫۸۱	+۱۰٫۸۹	+۲۴٫۸۰
۱۹۸۱	۶۸٫۴۰	+۱۳٫۵۹	+۲۴٫۷۹
۲۰۰۱	۹۵٫۰۰ تخمینہ	—	—

۱۸۹۱ء سے ۱۹۸۱ء کے عرصے کے درمیان صرف ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۱ء کے بیچ ملک کی آبادی میں کمی ہوئی تھی جس کا سبب بڑے پیمانے پر قحط اور بیماریوں (ہیضہ، طاعون، چیچک اور ملیریا وغیرہ) کا پھیلنا تھا جبکہ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۸۱ء تک آبادی میں مستقل اضافہ ہوا ہے۔

ملک کی آبادی ۱۹۴۷ء میں تقریباً ۳۰ کروڑ تھی اس میں دو سے ڈھائی فیصد سالانہ اضافہ ہوا اور ۳۵ سال کی مدت میں یہ دوگنی ہو گئی۔ ہر ایک دن لگ بھگ ستاون ہزار بچے جنم لیتے ہیں۔ دس لاکھ فی مہینہ کی شرح سے ہر سال ایک کروڑ بیس لاکھ آبادی کا اضافہ ہو رہا ہے۔ آبادی میں یہ اضافہ غریب خاندانوں میں زیادہ ہو رہا ہے۔ اس طرح ایسے افراد کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے جو پیداوار میں معاون ثابت

کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں۔ تعلیم، صحت، مکان اور خوراک وغیرہ کی ان لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی ذمہ داری روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اس لیے ہمیں ۱۵۱۱ لاکھ کوئنٹل اناج، ۱۶۱۰ لاکھ میٹر کپڑا، ۱۲۰۰ لاکھ اسکول، ۳۶۰۰۵ لاکھ روزگار کے علاوہ مکان، ڈاکٹر، شفاخانے اور درسگاہ وغیرہ کے لیے فاضل ذرائع اکٹھا کرنے ہوں گے۔ سابق وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے الفاظ میں "آبادی میں زبردست اضافے کے سبب ترقی کے فوائد سبھی تک نہیں پہونچ پاتے اور اس کا بوجھ نسبتاً زیادہ غریب لوگوں پر ہی پڑتا ہے۔ ان کی تکالیف بڑھ جاتی ہیں اور ان کے لیے راہِ انتخاب کم ہو جاتی ہے۔"

ملک میں زرعی سدھار کے باعث زرعی پیداوار میں جتنا اضافہ ہوا ہے اس سے زیادہ اضافہ آبادی میں ہوا ہے۔ ۱۹۵۱ء اور ۱۹۸۱ء کے درمیان اجناس کی پیداوار میں ۱۷ فیصد کا اضافہ ہوا ہے جبکہ اسی مدت کے دوران آبادی میں ۷۰ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ ہمارے ملک میں ۳۷۰۰ لاکھ ایکڑ زرعی زمین ہے جس میں خالص بویا ہوا رقبہ Net Sown Area ۳۲۸۰ لاکھ ایکڑ ہے۔ اس طرح ۰.۴۸ ایکڑ بوئی ہوئی زمین ہر ہندستانی کے حصے میں آتی ہے۔ آبادی میں اضافے کے ساتھ ہی اس میں اور کمی واقع ہوگی۔ ۱۹۵۱ء میں ۱۰۰ ایکڑ زرعی زمین پر ۲۵ کسانوں کے خاندان انحصار کرتے تھے اور ۱۹۸۱ میں اسی رقبے پر ۴۷ خاندان انحصار کرنے لگے تھے اور یہ دباؤ مستقبل میں زیادہ ہی بڑھتا جائے گا۔ ہندوستان میں زرعی زمین کے فی مربع کلومیٹر رقبہ پر آبادی کا دباؤ ریاستہائے متحدہ امریکہ سے ۴ گنا زیادہ اور آسٹریلیا سے ۱۸ گنا زیادہ ہے۔ یہاں فی مربع کلومیٹر زرعی زمین پر ۳۸۰۰ لوگ رہتے ہیں جب کہ یہ تناسب جاپان میں ۵۶۰ آدمی، ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ۱۲۴، سوویت روس میں ۴۸ اور آسٹریلیا میں ۰.۸ آدمی فی مربع کلومیٹر ہے۔

ملک میں آبادی میں اضافے کے لیے جغرافیائی عوامل، معاشیاتی عوامل، سماجی و تہذیبی عوامل اور مذہبی عوامل ذمہ دار ہیں۔ جغرافیائی عوامل میں ہمارے ملک کی اچھی آب و ہوا، وسیع میدان اور بے شمار کھیتوں کی زرخیزی اور پانی کی دستیابی وغیرہ شامل ہیں۔ معاشیاتی عوامل کے تحت زرعی زمین اور زرعی پیداوار میں اضافہ، صنعتی ترقی، توانائی کے وسائل Power Resources معدنی ذخیرے اور ٹکنالوجی وغیرہ آبادی میں اضافے کی شرح کو متاثر کرتے ہیں۔ سماجی اور تہذیبی عوامل میں سماجی ریت رواج آبادی کو متاثر کرتے ہیں مثلاً بچوں کی کم عمر میں شادیاں کر دینا، شادی کو ایک سماجی دستور نہ مان کر مذہبی فریضہ سمجھا جانا، شادی کے لیے معاشی ذمہ داری یا خود کفالت یا جذباتی پختگی کو اولین شرط نہ ماننا، بغیر اولاد والے والدین کو حقارت کی نظروں سے دیکھا جانا، اپاہج، مریضوں اور بھکاریوں تک کی شادیوں کا ہونا وغیرہ وغیرہ۔

ہندوستان میں اونچی شرح پیدائش اور گھٹتی ہوئی شرح اموات بھی آبادی میں اضافے کے لیے ذمہ دار ہے۔ چوں کہ ہماری حکومت طبی سہولیات کی طرف خاص توجہ دے رہی ہے اور ملک سے کئی وبائی بیماریوں مثلاً چیچک، ہیضہ اور طاعون وغیرہ کا صفایا کیا جا چکا ہے، ملیریا، تپ دق وغیرہ جیسی بیماریوں کا قلع قمع کرنے کے لیے کامیاب کوششیں جاری ہیں۔ مسلسل کوششوں کے نتیجے میں ملیریا کی روک تھام کے قومی پروگرام پر عمل درآمد کے ذریعہ ملیریا کے کل واقعات میں تقریباً ۹۵ فیصد کی کمی واقع ہوئی ہے۔ بہتر طبی سہولیات کی وجہ سے ہی ملک میں دس سال میں شرح اموات ۱۵.۸ فی ہزار سے کم ہو کر ۱۲.۵ فی ہزار رہ گئی ہے اور اوسط عمر ۴۶ سال سے بڑھ کر ۵۴ سال ہو گئی ہے۔ شرح اموات اور شرح پیدائش میں تناسب رکھنا بہت ضروری ہے کیوں کہ صحت کے بہتر انتظامات اور اس کے نتیجے میں زیادہ طویل مدت تک زندہ رہنے کے امکانات اور اسی طرح کے بعض دوسرے عناصر کی وجہ سے آبادی میں اضافہ ہونے کا سلسلہ جاری رہے گا۔ ملک میں خواندگی کی کمی ہے۔ صرف ۳۶ فیصد لوگ ہی خواندہ ہیں۔ خواندگی کی کمی سے لوگ خاندانی منصوبہ بندی یا خاندانی بہبود سے متعلق پروگرام کو نہیں سمجھ پاتے۔ ایسے لوگوں کا کہنا ہے کہ بچے تو خدا کے حکم سے پیدا ہوتے ہیں اس لیے خدائی کارخانے میں دخل دینا مناسب نہیں ہے۔ اس طرح آبادی میں اضافہ جاری رہتا ہے۔

زرعی اور صنعتی پیداوار میں اضافہ، تعلیم کے پھیلاؤ، روزگار کے مواقع اور طبی سہولیات وغیرہ سے لوگوں کی اقتصادی حالت میں بہتری آئے گی، ان کے رہن سہن کا معیار بلند ہوگا، اس سے اضافہ آبادی کی شرح میں کمی آئے گی مگر یہ کمی عارضی ہوگی کیوں کہ دو چار صدیوں کے بعد آبادی میں پھر اضافہ ہونے لگے گا اس لیے بڑھتی ہوئی آبادی کے مسائل کا مستقل حل خاندانی منصوبہ بندی ہے۔ ہمارا ملک جب سے آزاد ہوا ہے تبھی سے ہماری حکومت بڑھتی ہوئی آبادی کے متعلق فکرمند رہی ہے۔ بھارت ان چند ممالک میں شامل ہے جنھوں نے سب سے پہلے خاندانی منصوبہ بندی کو قومی پالیسی کے طور پر اپنایا۔ پہلے پنج سالہ منصوبے میں خاندانی منصوبہ بندی کے لیے صرف ساڑھے ۱۴ لاکھ روپے کی رقم رکھی گئی تھی۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے میں یہ رقم بڑھ کر ۲ کروڑ ۱۶ لاکھ روپے اور تیسرے پنج سالہ منصوبے میں ۲۴ کروڑ ۸۶ لاکھ روپے ہو گئی۔ اس کے بعد تین سالہ منصوبے میں بڑھ کر ۷۰ کروڑ ۴۶ لاکھ روپے ہو گئی۔ چوتھے پنج سالہ منصوبے میں ۲.۸۴ بلین روپے، پانچویں منصوبے میں ۴.۰۹ بلین روپے اور چھٹے پنج سالہ منصوبے میں دس بلین روپے ہو گئی۔

ہندوستان میں خاندانی منصوبہ بندی اقتصادی ترقی کے منصوبے کا ایک جزو ہے اور اسے بیس نکاتی پروگرام میں ایک اہم مقام دیا گیا ہے

یوجنا نئی دہلی

[illegible] معیار زندگی کو
بلند کرتا ہے۔ اچھا معیار زندگی حاصل کرنیوالے
لوگ بچوں سے متعلق اپنا فرض بخوبی سمجھتے ہیں۔
اسلیے ایسے لوگ خود ہی اپنی فیملی کو چھوٹا رکھنے
کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ لوگوں میں شعور
بیدار ہونے کے بعد انھیں خاندان مختصر رکھنے
جانے کے فائدے خود ہی محسوس ہونے لگتے
ہیں۔ ان لوگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ انھیں
اپنی زندگی میں جو کچھ میسّر ہوا اس سے کچھ زیادہ
ہی ان کے بچوں کو حاصل ہو سکے۔ بقول سابق
وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی " اضافہ آبادی کی
روک تھام کا ایک موثر ذریعہ معیار زندگی کو
بلند کرنا ہے۔ چونکہ ہم زور زبردستی میں یقین
نہیں رکھتے اسلیے لوگوں کے ذہن کو تیار کیا
جائے اگر ان کے دل و دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی
تو وہ خود اس پروگرام میں دلچسپی لیں گے اس
کے ساتھ ہی والدین کو دلو بچوں کی صحت مند
حیات کی یقین دہانی کرانا بہت ضروری ہے۔"
لہذا بچپن میں پیدا ہونے والی بیماریوں کی
روک تھام کو خصوصی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔
بچوں کی پیدائش سے قبل اور اس کے بعد ان
کی فلاح و بہبود کے لیے بہتر سے بہتر طبی خدمات
مہیا کرائی جائیں تاکہ ان کی جسمانی، ذہنی اور
سماجی ترقی کو یقینی بنایا جا سکے۔

۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۱ء کے درمیان
خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کے نتیجے
[illegible] لاکھ اسّی ہزار بچوں
کی پیدائش روکی جا سکی اگر اس شرح پیدائش
[illegible] اضافہ تقریباً
[illegible] دوران
[illegible]
[illegible] پروگرام
[illegible]
[illegible]

کے دوران ٹیوب [illegible] فیصد نسبندی کی
آپریشن کرانے میں ۱۴ فیصد مانع حمل کے روایتی
طریقے اپنانے میں ۱۲ فیصد مانع حمل گولیاں استعمال
کرنے والوں میں ۹ ء ۲ ء ۹ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔
۱۹۸۳ - ۱۹۸۴ میں خاندانی منصوبہ بندی کے
پروگراموں کو بہت زیادہ کامیابی ملی ہے۔ کنبہ بندی
کے سبھی طریقوں کے ذریعہ ملک میں تقریباً ۱۲ کروڑ
۲۵ لاکھ بچے پیدا کرنے کے قابل جوڑوں میں سے
۲۶ فیصد جوڑوں کو موثر تحفظ دیا گیا ہے۔ امید
کی جاتی ہے کہ ۲۰۰۰ء تک ۶۰ فیصد جوڑوں کو موثر
تحفظ دینے کا نشانہ پورا کر لیا جائے گا۔ خاندانی
منصوبہ بندی کے میدان میں بھارت کی کوششوں
کو سراہا گیا ہے کیونکہ مرحومہ وزیر اعظم شریمتی
اندرا گاندھی کو ۳۰ ستمبر ۸۳ ۱۹ کو نیو یارک میں اقوام
متحدہ کا آبادی سے متعلق ایوارڈ دیا گیا تھا۔

خاندانی منصوبہ بندی کی مہم کو ایک طاقتور
اور عوامی تحریک بنانے کے لیے کوششیں کی جانی
چاہئیں تاکہ عوام کے اندر خود بخود خاندانی منصوبہ
بندی کے لیے ایک جذبہ پیدا ہو۔ اس مہم میں
سبھی ہندوستانی خاص طور سے ڈاکٹرز، اساتذہ حضرات،
طالب علم، نوجوان طبقہ اور عورتیں بڑھ چڑھ کر
حصہ لیں۔ متعدد غیر سرکاری رضاکار تنظیموں کا
تعاون بھی حاصل کیا جائے۔ ملک کے ہر باشندے
کو خاندانی منصوبہ بندی کے فوائد سے آگاہ کیا
جائے۔ تعلیمی اداروں میں آبادی کے بنیادی تصورات
کو مختلف مضامین میں شامل کیا جائے۔ اور یہ
بات مدِ نظر رکھنی چاہئے کہ وہ جو تصورات
ہیں ان کا رابطہ اس مضمون سے قائم رہے۔ شعبۂ
فیملی پلاننگ، اسکولوں، کالجوں اور دوسرے
شعبوں کی طرف سے خاندانی منصوبہ بندی کے
پروگراموں کو مقبول بنانے کے لیے گاؤں میں
کیمپ لگائے جائیں۔ لوگوں کو رضاکارانہ
[illegible] کی طرف راغب
کیا جائے۔

خاندانی منصوبہ بندی کے [illegible]
معاشی فائدوں سے ملک کے لوگوں کو [illegible]
طور سے دیہاتی علاقوں میں رہنے والوں کو
جو ہندوستان کی آبادی کا تقریباً ۸۰ فیصد
حصہ ہیں واقف کرانا ضروری ہے تاکہ وہ
خود اس بات کو سمجھیں کہ چھوٹا کنبہ ان کی
زندگی کے لیے، ان کے خاندانوں کی خوشحالی
کے لیے ضروری ہے۔ لوگوں میں نہ صرف شعور
پیدا کیا جائے بلکہ شعور پیدا کرنے کے لیے
پروگراموں کو وسیع کیا جائے اور دیکھا جائے
کہ وہ کون سے طریقے ٹھیک ہیں جن سے ہم
بہتر طریقے سے لوگوں تک پہونچ سکتے ہیں
اور ان کو اپنی بات سمجھا سکتے ہیں اور وہ
کون سی باتیں ہیں جن کو وہ سمجھنے کے لیے تیار
ہیں۔ جن کو ان کی ضرورت بھی ہے کیونکہ [illegible]
وقت یہ ہوتا ہے کہ دفتروں میں بیٹھ کر [illegible]
میں بیٹھ کر ہم ایسے منصوبے بنا لیتے ہیں [illegible]
تعلق ایک عام آدمی کی زندگی سے ایک غریب
اور بے پڑھے خاندان کی زندگی سے نہیں ہوتا
ہے چونکہ کنبہ بندی کا پروگرام سبھی لوگوں کا
پروگرام ہے، اسلیے یہ سبھی لوگوں کی ضروریات
خواہشات اور ان کی زندگی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے
بنایا جائے۔

خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کو کسی
بھی طرح کے تنازعے Controversy
میں نہیں الجھانا چاہیئے۔ اس پروگرام کی کامیابی
اسی بات پر منحصر ہے کہ لوگ اس کو اپنا پروگرام
سمجھ کر اس میں شامل ہوں۔ ہمارے ملک کے
ہر مذہب کے سمجھدار لوگ اس بات سے پوری طرح
متفق ہیں کہ خاندانی منصوبہ بندی قومی ترقی کے
لیے بہت ضروری ہے۔

(باقی صفحہ پر)

بھارت میں جدید زرعی مارکیٹنگ

مواقع و امکانات

آج کی اقتصادی اصطلاح میں زرعی مارکیٹنگ کا مطلب محض زرعی اجناس اور سروسوں کی خرید و فروخت ہی نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ نہایت وسیع ہو گیا ہے۔ آج زرعی "مارکیٹنگ" کا مطلب ہے فارم سے جہاں اناج پیدا ہوتا ہے اُسے صارفین یا صناعوں تک پہنچانا۔ اس میں زرعی اجناس کا رکھ رکھاؤ، بار برداری، نقل و حمل کو آسان بنانے کے لیے ابتدائی عمل کھائی اور پیکنگ تصنیع میں کمی، بسرعت فروختگی کے لیے زمرہ بندی اور کوالٹی کنٹرول اور صارفین کی مختلف ضروریات پوری کرنا بھی شامل ہے۔ مارکیٹنگ میں تمام امدادی سرگرمیاں بھی آجاتی ہیں جیسے مالیات کی فراہمی، نقصانات کا خطرہ برداشت کرنا اور مارکیٹنگ کے عمل میں شرکاء کو معلومات بہم پہنچانا، کاشتکاری کے لیے مارکیٹنگ سسٹم کی حکمت عملی اسے اس کی پیداوار کے نکاس کا ایک ذریعہ فراہم کرتی ہے۔ صارفین اور زرعی خام مال کے صناعوں کے لیے منظم سپلائی کی یقین دہانی اہم سروس ہے۔ زرعی مارکیٹنگ میں کاشتکاروں کو ایسی اشیا کی فراہمی بھی شامل ہے جو پیداوار بڑھانے میں مدد دیتی ہیں، جیسے کھاد، کیڑے مار دوائیاں اور دیگر زرعی کیمیکل، چارہ اور فارم مشینری اور اوزار وغیرہ۔

مارکیٹنگ کے مقاصد: مارکیٹنگ کے مقاصد مختلف حالات میں مختلف ہو سکتے ہیں جیسے دیہی اور شہری سیکٹروں کے درمیان یا دیہی سیکٹر کے اندر آمدنی کی تقسیم کو بہتر بنانا یا زیادہ لوگوں کے لیے بہتر غذا فراہم کرنا۔ ان میں سے کسی مقصد کے اندر متعدد ضمنی مقاصد ہو سکتے ہیں۔ مزید برآں ملکوں کے درمیان اور ملکوں کے اندر مقاصد اور ضمنی مقاصد مختلف ہو سکتے ہیں۔ لیکن بھارت جیسے ممالک میں جہاں زراعت بڑی اقتصادی سرگرمی ہے زرعی سیکٹر کی متوازن اور مسلسل ترقی کی یقین دہانی کے لیے زرعی مارکیٹنگ کی مجموعی ترقی کی جانب موزوں توجہ دی جانی ضروری ہے۔

ایک ترقی یافتہ اور سائنسی طور پر منظم مارکیٹنگ سسٹم کے فقدان سے خود پیداواری مساعی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اکتوبر ۱۹۴۵ میں خوراک و زراعت سے متعلق اقوام متحدہ کی کانفرنس کی مارکیٹنگ کمیٹی نے ایک رپورٹ میں بتایا تھا "مارکیٹنگ تمام تر غذائی و زرعی مسئلہ کا اہم جزو ہے۔ خوراکی پیداوار کو تب تک بڑھانا بے معنی ہے اور اسی طرح غذائیت کے اعلیٰ معیار قائم کرنا تب تک لاحاصل ہے جب تک کاشتکاروں سے صارفین تک خوراک ایک ایسی قیمت پر نہیں پہنچائی جاتی جو کاشتکاروں کے لیے منافع بخش ہونے کے ساتھ ساتھ صارفین کی قوتِ خرید کے اندر ہو۔

زرعی مارکیٹنگ کی جانب نہ صرف بھارت بلکہ دیگر ترقی یافتہ ممالک میں بھی بہت کم توجہ دی گئی ہے اور دی جا رہی ہے۔ حالیہ برسوں میں متعدد ممالک کے تجربات سے پتہ چلا ہے کہ محض پیداوار میں اضافہ سے ہی فارم اور ملکی معیشت کی سطحوں پر زراعت کی ترقی نہیں ہوتی۔ پیداواری سرگرمیوں کو سود مند بنانے سے متعلق غیر مؤثر مارکیٹنگ سسٹم کی وجہ سے ملکوں کے قلیل پیداواری وسائل کا قصداً کم یا غلط استعمال کیا جاتا ہے۔ انتہائی کم قیمتوں کے باعث نہ صرف کاشتکاری جاری رکھنے کے لیے کسانوں کی حوصلہ شکنی ہوئی ہے، بلکہ پیداوار کی سطح بھی کم ہو گئی ہے۔ مارکیٹنگ پر آنے والی زیادہ لاگت کو زیادہ تر مارکیٹنگ کے غیر مؤثر سسٹم سے منسوب کیا جاتا ہے۔ لہٰذا قانون یا دور آمدی متبادل کی مدد بڑھتی ہوئی قیمتوں کو روکنے سے متعلق حکومت کی مساعی ناکام ثابت ہوئی ہیں۔

ترقیاتی عمل میں رکاوٹ

اس سے سبق ملتا ہے کہ اگر ترقیاتی عمل میں مارکیٹنگ سسٹم موزوں طور پر کام نہ کرے تو زرعی سیکٹر کی جدید کاری سے کوئی اچھا نتیجہ نہیں نکلتا۔ یہ ایک غور طلب معاملہ ہے کہ ان حقیقت کے باوجود کہ مارکیٹنگ کو زرعی ترقی میں اہم مقام

پوجا، نئی دہلی

حاصل ہے ترقی پذیر ممالک کی ترقیاتی پالیسیوں اور پروگراموں میں مارکیٹنگ سسٹم کے فروغ کے بڑے امور پر واضح طور پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔

ایک سسٹم کے طور پر اقتصادی سرگرمیوں کی تمام تر تصویر اور خصوصاً پیداوار اور مارکیٹنگ کے ایک دوسرے پر اثر کو محض نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اسی طرح دیگر اقتصادی شعبوں کی ترقی کے لیے اس کی اہمیت کو درگذر کیا جاتا ہے۔ اس رجحان سے سرکاری سیکٹر میں اکثر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ اگر پیداوار زیادہ ہو جائے تو مارکیٹنگ کے طور طریقوں اور اداروں میں خود بخود مطابقت پیدا ہو جائے گی۔ مارکیٹنگ کا قانون بنانے اور پھر اس پر عمل نہ کرنے کا عام دستور اس رجحان کی ایک مثال ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ابھی حال ہی تک زرعی سیکٹر میں مارکیٹنگ کو پیداوار کے مقابلے میں نسبتاً کم اولیت دی گئی ہے کیونکہ اس کی تہہ میں یہ خیال پایا جاتا تھا کہ جو کچھ پیدا ہو گیا ہے وہ خود بخود منڈی میں پہنچ جائے گا۔ اقوام متحدہ کی خوراکی و زراعتی تنظیم نے اپنی ایک رپورٹ میں بتایا ہے کہ ۱۹۶۶ء میں کئے گئے تحقیقی مطالعہ کے مطابق ۱۳ ملکوں میں سے صرف تین میں زراعت کی کل متوقع سرمایہ کاری کا ایک فیصد سے زیادہ مارکیٹنگ کے لیے مخصوص کیا گیا۔ ۱۹۷۰ میں پھر ایشیا میں مارکیٹنگ سے متعلق سرکاری رجحان کا جائزہ لینے سے پتہ چلا کہ یہ ایک ایسا شعبہ ہے جس کے بارے میں بیشتر سرکاری حکام کو کافی علم نہیں۔ اس شعبے میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کے بارے میں کافی معلومات حاصل کئے بغیر فیصلے کر دیے گئے۔ بھارت میں بھی زراعت اور متعلقہ سیکٹروں میں جتنا کل سرمایہ لگایا گیا ہے اس کا معمولی حصہ زرعی مارکیٹنگ میں لگایا گیا ہے۔

بھارتی سسٹم کی ساخت : ایک باصلاحیت

مارکیٹنگ سسٹم زرعی سیکٹر کی مجموعی ترقی میں جو اضافی حصہ لے سکتا ہے اسے اب واضح طور پر سمجھ لیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں زرعی سیکٹر میں زرعی اشیا کی مارکیٹنگ سے متعلق متعدد اصلاحات اور سرمایہ کاری کے پروگرام عمل میں آنے شروع ہوئے ہیں۔ زرعی مارکیٹنگ اب بڑی مہارت کا شعبہ بن گیا ہے۔ دیہی علاقے تیزی سے شہر کاری کے عمل میں آ رہے ہیں۔ لوگوں کی خرچ کی جانے والی آمدنی بڑھ رہی ہے اور مارکیٹنگ کے طور طریقوں اور سسٹموں میں تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ اس کے نتیجے میں مارکیٹنگ کے عمل میں شرکت کرنے والوں کی طرف سے زیادہ اعلیٰ مارکیٹنگ سروسوں اور سہولیات کی مانگ بڑھ رہی ہے اس لیے اب ضروری ہو گیا ہے کہ زرعی مارکیٹنگ کے مختلف ذیلی سیکٹروں کی مربوط اور منصوبہ بند ترقی سے متعلق ایک ملکی تناظر کو فروغ دیا جائے۔

بھارت کی زرعی مارکیٹنگ مختلف امور انجام دینے والے لوگوں کی بڑی تعداد پر منحصر ہے اور ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو کاشتکاروں سے صارفین تک خوراکی پیداوار پہنچانے میں دُہرے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ جغرافیائی حالات، زراعت کی طرز پیداوار اور ملک کی ترقی کی سطح پر انحصار رکھتے ہوئے مارکیٹنگ کے مختلف مرحلوں پر مسائل کی شدت میں بہت حد تک اختلاف پایا جاتا ہے۔ دیہی مارکیٹنگ کے تصور میں تیزی سے تبدیلی لانے کے لیے بھی دباؤ بڑھ رہا ہے۔ مارکیٹنگ کو دیہی ترقی کے لیے ایک سرگرم قوت بنانا ضروری ہے اور اس کے لیے مارکیٹنگ کی تنظیم اور انتظام میں انسانی مہارت کے فروغ کو اعلیٰ ترا ولیت دینا ہو گی۔

جو امور زیادہ پیچیدہ مارکیٹنگ سسٹم پر اثر انداز ہو سکتے ہیں، وہ ہیں۔ تجارتی پیمانے پر پیداوار کا بڑھنا، زیادہ سائنسی تکنالوجیوں کا عمل میں لایا جانا، بڑھتی ہوئی لیبر اور پختہ مہارت، پیداوار اور کھپت کی جغرافیائی علیحدگی، آبادی میں اضافہ اور شہرکاری، بدلتی ہوئی غذائی عادات، قوت خرید، صارفین کی بڑھتی ہوئی نقل پذیری اور حکومت سے متعلق حالات، دوسری طرف مارکیٹنگ سسٹم میں تبدیلیوں سے ایسی سرگرم قوتیں پیدا ہوتی ہیں جو خود مجموعی اقتصادی ترقی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

ایجنسیاں اور تنظیمیں

زرعی اجناس کے مارکیٹنگ سسٹم میں ایجنسیاں، ادارے اور کارکن بڑی تعداد میں کام کرتے ہیں۔ تمام سطحوں پر انسانی قوت کی موزوں منصوبہ بندی کر کے اور پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر میں تمام متعلقہ اشخاص کی مربوط مساعی سے یہ سسٹم بخوبی کام کر سکتا ہے۔ اناج کی پیداوار میں لگے ہوئے کروڑوں کاشتکار مارکیٹنگ کی زنجیر کی پہلی کڑی ہیں۔ چند بڑے بڑے فارموں کے مقابلے میں جہاں تجارتی طرز پر پیداوار ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے مالکان اراضی کے بڑے بڑے گروپ ہیں جو گذارہ لائق کھیتی کرتے ہیں۔ اگلا اقدام ہے منڈی کو بھیجنے کے لیے اناج کو تیار کرنا۔ اس مرحلے میں اناج کی چھنائی، صفائی، سکھائی ہوتی ہے اور پھر الگ الگ کر کے پیکنگ کیا جاتا ہے۔

پیداوار منڈیوں میں

اس کے بعد پیداوار کی فروخت کا کام شروع ہوتا ہے۔ پیداوار خود فارم یا گاؤں ہی میں فروخت ہوتی ہے جسے دیہی یا چلتے پھرتے بیوپاری خریدتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو پیداوار "منڈی" میں لیجائی جاتی ہے۔ ملک میں ۲۲ ہزار سے زیادہ دیہی ابتدائی منڈیاں ہیں جہاں چھوٹے چھوٹے بیوپاری یا اُن کے دلال کام کرتے ہیں۔ ان ابتدائی منڈیوں کی اکثریت لوکل باڈیز کی ملکیت اور کنٹرول میں ہے۔ تھوڑی سی تعداد [illegible] منڈیوں کے زیر کنٹرول ہے جبکہ چند ایسی منڈیاں پرائیویٹ افراد کی ملکیت ہیں۔ کاشتکار کا [illegible]

ریسرچ کے درمیان مناسب تال میل پیدا کرنے کی بھی سخت ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں کمپنیوں کو اپنی بکری کا کم سے کم دس فیصد حصہ ریسرچ اور ترقی کے کاموں کے لیے الگ رکھ دینا ہوگا۔

صنعتوں کو پھر سے ترقی کرنے میں مدد دینا حکومت کا فرض ہے۔ اس ضمن میں بھارت سرکار کی صنعتی پالیسیوں نے اہم اور بھرپور پارٹ ادا کیا ہے۔ ان پالیسیوں پر وقت کی ضرورت کے مطابق برابر نظرثانی اور تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔

صنعتوں کی پیداوار کو بڑھانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مال کو فروخت کرنے کا انتظام بھی بہتر ہو خصوصاً بدیشی منڈیوں میں۔ اس کے لیے صنعتوں کو یہ کرنا ہوگا کہ کم لاگت پر عمدہ قسم کا مال تیار کر کے دکھائیں اور یہ مال وقت پر مہیا کر دیا جائے۔

حکومت پچھڑے ہوئے علاقوں میں پہلے سے زیادہ صنعتیں لگائے جانے کے حق میں ہے اور اس کے لیے کئی طرح کی رعایتیں اور مالی امداد مہیا کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں بنک اور دوسرے مالی ادارے بھی مدد مہیا کر رہے ہیں۔ دوسری طرف سرکار نے فیصلہ کیا ہے کہ ہر طرح کی دو پہیہ اور چوپہیہ موٹر گاڑیوں، کاغذ اور کاغذ تیار کرنے کے گودے، کیمیاوی اشیاء اور کیمیاوی کھاد تیار کرنے کی مشینری وغیرہ کی درجہ بندی کر دی جائے۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لیے پلانٹ اور مشینری میں سرمایہ کاری کی حد ۲۰ لاکھ سے بڑھا کر ۳۵ لاکھ روپے اور ضمنی صنعتوں کے لیے ۲۵ لاکھ روپے کی حد سے بڑھا کر ۴۵ لاکھ روپے کر دی گئی ہے۔ اس سے امید کی جاتی ہے کہ آئندہ برسوں میں صنعتی پیداوار میں اضافہ ہوگا۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتیں معیشت میں اہم پارٹ ادا کرتی ہیں۔ ہندوستان میں نہ صرف اس سیکٹر کی پیداوار کی رفتار بڑھ رہی ہے بلکہ اس میں بہت کم سرمایہ لگا کر بہت زیادہ لوگوں کو ملازمت مل رہی ہے۔ چھوٹی صنعتوں کی ترقی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ جہاں ۷۴-۱۹۷۳ء میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی تعداد ۴ لاکھ ۱۶ ہزار تھی، وہاں ۸۴-۱۹۸۳ء میں یہ تعداد بڑھ کر گیارہ لاکھ ۵۸ ہزار ہو گئی تھی۔ اسی عرصے میں اس سیکٹر کی پیداوار ۷ کروڑ روپے کی مالیت سے بڑھ کر ۴۱،۶۲۰ کروڑ روپے کی ہو گئی یعنی دوسرے لفظوں میں ۴۸۰ فیصدی کا اضافہ ہوا۔ اسی طرح چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں جہاں ۷۴-۱۹۷۳ میں ۳۹ لاکھ ۷۰ ہزار لوگ کام کرتے تھے، وہاں ۸۴-۱۹۸۳ میں یہ تعداد بڑھ کر ۸۴ لاکھ ۱۵ ہزار ہو گئی تھی۔ اور امید کی جاتی ہے کہ ۸۵-۱۹۸۴ میں اس تعداد میں ۷ فیصدی کا اور اضافہ ہوگا۔

چھوٹی صنعتیں ملک کی برآمد میں بھی مسلسل اضافہ کر رہی ہیں۔ یہ سیکٹر اپنی ٹیکنالوجی کو بھی بہتر بنانے کی طرف برابر دھیان دیتا رہتا ہے اور مال بھی عمدہ کوالٹی کا تیار کرتا ہے۔ اب یہ فرض بڑے پیمانے کی صنعتوں کا ہو جاتا ہے کہ وہ ضمنی صنعتوں کی صحیح معنوں میں حوصلہ افزائی کریں اور اس طرح چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو مزید ترقی کرنے میں مدد دیں۔ ●

بقیہ: ہندوستان کی آبادی میں اضافہ اور خاندانی منصوبہ بندی

کہ وہ اپنے ملک کی خوشحالی اور ترقی کے لیے خود بخود کنبہ بندی کو اپنا لے۔ بھلائی کا کوئی پروگرام اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا، جب تک کہ ملک کا ہر باشندہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے حکومت کو تعاون نہ دے۔

مصر، تیونیشیا، ترکی اور انڈونیشیا جیسے اہم مسلم ممالک ضبط تولید کے پروگراموں پر مستعدی سے عمل کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ممالک بڑے متاثر کن نتائج دکھا رہے ہیں۔ ان ممالک میں بچوں کی پیدائش کی شرح تیزی سے گھٹ رہی ہے۔ انسان کے محدود ذرائع پر بہت کم دباؤ پڑ رہا ہے۔ جامعہ ازہر کے علماء حضرات ضبط تولید کے حق میں فتویٰ صادر کر چکے ہیں۔ آیت اللہ خمینی نے اعلانیہ طور پر ضبط تولید کو روا قرار دیا ہے۔ بشرطیکہ صحت کا مناسب خیال رکھا جائے۔ امام غزالی اور رازی جیسے نامور مفکروں نے ضبط تولید کی تائید کی تھی۔ بقول امام غزالی "ضبط تولید بیوی کے حسن و شباب کو برقرار رکھنے کے لیے ایک اچھا طریقہ ہے اس سے انسان کثیر تعداد بچوں کی پریشانی سے بچ جاتا ہے۔" ●

بقیہ: اِدھر اُدھر سے

ریاستی وزرائے تعلیم کی کانفرنس

وزیراعظم مسٹر راجیو گاندھی نے اعلان کیا ہے کہ ساتویں پنجسالہ منصوبے میں ۱۵ ارب روپیہ انسانی وسائل کے فروغ کے لیے خرچ کیا جائے گا۔ مسٹر راجیو گاندھی نئی دلی میں ریاستی وزرائے تعلیم کی کانفرنس کا افتتاح کر رہے تھے جس میں ملک کی نئی تعلیمی پالیسی مرتب کرنے کی غرض سے تعلیم کے چیلنج کے عنوان سے ایک دستاویز پر تبادلۂ خیال کیا جائے گا۔

وزیر تعلیم مسٹر کے سی پنت نے وزیراعظم مسٹر راجیو گاندھی کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ وزیراعظم کے سوا ملک کا کوئی دوسرا شخص قوم کو تعلیمی انقلاب کی راہ پر آگے نہیں لے جا سکتا جس سے سماجی، ثقافتی اور اقتصادی ڈھانچے میں دور رس تبدیلیاں ہوں گی۔ انہوں نے [illegible] کرتے ہوئے کہ ملک کے مستقبل کا انحصار انسانی وسائل کے فروغ اور تمام سطحوں پر تعلیم کے فروغ کے لیے جدید تکنالوجی اختیار کرنے پر ہے۔

غیر ملکی زر مبادلہ کی فراہمی

ریزرو بینک آف انڈیا کے گورنر مسٹر آر این ملہوترا نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان کو ساتویں منصوبے کے لیے غیر ملکی زر مبادلہ کی قلت کی طرف سے تشویش کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بشرطیکہ [illegible] دو ملکی انتظامات اور متعدد ملکی انتظامات کی [illegible] زر مبادلہ اس مدت میں ساتویں منصوبے کی رقم [illegible] کم نہ ہوگا۔ ●

نثار احمد زکی

خواتین سے متعلق
بین الاقوامی دہائی

خواتین کی ترقی اور ان کی فلاح اور بہبود کے لیے عوام میں بیداری پیدا کرنے کے سلسلہ میں "بین الاقوامی دہائی" حال ہی میں پایۂ تکمیل کو پہونچی۔ اقوام متحدہ کے زیر اہتمام مذکورہ دہائی کی تیسری اور آخری کانفرنس نیروبی میں منعقد ہوئی۔ اس میں تقریباً ۱۵۵ ملکوں کے مندوبین اور اعلیٰ وفود نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کا آغاز ۱۵، جولائی کو ہوا اور چار روز تک مختلف اجلاسوں میں سرکردہ مندوبین نے عورتوں کو درپیش مسائل کے حل کے بارے میں تجاویز پیش کیں اور اپنے خیالات ظاہر کیے۔ ہندوستان نے اس کانفرنس میں اقوام متحدہ کے ایک رکن ہونے کی حیثیت کے علاوہ ناوابستہ تحریک کے چیئرمین کے طور پر شرکت کی۔

خواتین کی اس بین الاقوامی دہائی کا آغاز ۱۹۷۵ء میں میکسیکو سٹی کی پہلی کانفرنس سے ہوا۔ اس کی دوسری کانفرنس کوپن ہیگن میں منعقد ہوئی۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ عالمی سیاست پر تغیر پذیر حالات مختلف قوموں کے مستقبل کی قسمت پر گہرا اثر ثبت کرتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں خواتین بھی جو انسانی زندگی کا نصف حصہ ہیں سیاست کے تھپیڑوں سے خود کو بچا نہیں پاتی ہیں۔ نیروبی کانفرنس کے انعقاد سے قبل اس اندیشہ کا اظہار کیا جا رہا تھا کہ مغربی ممالک کے قائد کی حیثیت سے امریکہ بین الاقوامی سیاسی مسائل کو اجلاس میں زیر بحث لانے سے گریز کرنے کی کوشش کرے گا۔ ناوابستہ تحریک کے ممبر ملکوں اور دوسرے ترقی پذیر ممالک کی منشا تھی کہ بعض اہم بین الاقوامی سیاسی مسائل کو زیر بحث لایا جائے۔

یہ ناوابستہ تحریک کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے کہ کانفرنس میں بین الاقوامی سیاسی مسائل پر بڑی کھل کر گفتگو اور بحث ہوئی۔ مندوبین کی ایک بہت بڑی تعداد نے کانفرنس کے مختلف اجلاسوں کی بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ اہم سیاسی مسائل چونکہ ہر ملک کی قومی زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔ اس لیے خواتین ان حالات سے خود کو بچا نہیں سکتیں۔ ملک کی لڑائیوں کے نتائج سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ طبقہ نسواں ہی ایسے حالات میں سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ کانفرنس میں امریکی مندوبین کی لیڈر مسز مورین ریگن نے جو صدر رونالڈ ریگن کی صاحبزادی ہیں، مغربی بلاک کی جانب سے اس خدشہ کو اپنے بیان میں یہ کہہ کر دور کر دیا کہ امریکی گروپ کسی بھی ملک کو اپنے سیاسی نظریات و افکار کا اظہار کرنے سے نہیں روکے گا۔ اس کانفرنس کی دوسری اہم باتوں میں ایک بات یہ بھی ہے کہ تیسری دنیا اور مشرقی بلاک کے ملکوں نے جنوبی افریقہ میں نسل پرست سفید فام حکومت اور مقبوضہ عرب علاقوں کی آبادی پر اسرائیل کے مظالم کی کھل کر مذمت کی۔ ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ جنوبی افریقہ کا کوئی بھی مندوب شریک اجلاس نہیں تھا۔ کانفرنس کے ہال میں مختلف ملکوں کے مندوبین کے لیے جو سیٹیں محفوظ کی گئی تھیں اُن میں جنوبی افریقہ کے مندوبین کے لیے ریزرو کی گئی سیٹوں پر افریقہ میں آزادی کی لڑائی لڑنے والی مختلف تنظیموں اور جماعتوں کے نمائندے بیٹھے ہوئے نظر آئے۔

ہندوستان نے اس "بین الاقوامی دہائی" کے سلسلہ میں ناوابستہ تحریک کے ملکوں کا ایک وزارتی اجلاس گزشتہ اپریل میں نئی دہلی میں منعقد کیا تھا۔ اسی موقع پر ناوابستہ تحریک اجلاس نے ایک فیصلہ یہ بھی کیا تھا کہ "بین الاقوامی دہائی برائے خواتین" میں توسیع کی جانی چاہیئے۔ ایسا لیے کہ عورتوں کے فلاحی منصوبے سے متعلق پروگراموں پر تسلی بخش عمل درآمد نہیں کیا جا سکا ہے۔ اجلاس کی منظور شدہ قراردادوں کی ایک کاپی اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کو بھی بھیجی گئی تھی اور اس کے ساتھ ایک منسلکہ خط میں سکریٹری جنرل سے اپیل

بات کی خواہش ظاہر کی گئی تھی کہ نیروبی کانفرنس میں نئی دہلی نا وابستہ وزرائے خارجہ اجلاس کی منظور شدہ قراردادوں کو زیر بحث لایا جائے۔ عورتوں کی بین الاقوامی دہائی سے متعلق نئی دہلی کے ناوابستہ وزرائے خارجہ اجلاس کی قراردادیں بڑی جامع نوعیت کی تھیں۔ ان میں اس لیے بھی بڑی معنویت تھی کہ عورتوں کی زندگی اور ان کی ترقی کی راہ پر اثر انداز ہونے والے عالمی سیاسی احوال و کوائف کی نشاندہی کی گئی تھی۔ اجلاس نے اپنے سامنے یہ بنیادی مقصد رکھا تھا کہ خواتین کے خلاف ناروا سلوک اور استحصال اور جبر کے واقعات کے تدارک کے لیے ایک پندرہ سالہ جامع منصوبہ تیار کیا جائے۔

ہندوستان صوفیوں اور سنتوں کا ملک ہے۔ اس سرزمین پر بڑے بڑے مصلحین پیدا ہوئے۔ ان بزرگوں نے عورتوں کو سماج میں ایک قابلِ احترام مقام دینے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ ان کے نزدیک حقوق نسواں کو سلب کر کے انسانی زندگی کو مفید اور کارآمد نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ قدیم و جدید ہندوستان میں ہر شعبہ زندگی میں بہت سی خواتین نے بے مثال کارہائے انجام دئے ہیں۔ ایسی خواتین کو انگلیوں پر شمار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس ملک کی سماجی، اقتصادی اور معاشرتی زندگی میں عورتوں کا استحصال کیا جاتا رہا ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ ملک میں شرح خواندگی میں اضافے کے ساتھ خواتین کے خلاف ناروا اور ظالمانہ سلوک و واقعات بھی بڑھ رہے ہیں۔ ہندوستانی عوام کے لیے یہ باعث شرم ہے۔ کیونکہ جو قوم "جیو اور جینے دو" کی پالیسی پر چل رہی ہے اس میں عورتوں کے خلاف مظالم کے واقعات سمجھ میں نہیں آنے والی بات ہے۔ زیادتیوں کی لرزہ خیز داستانوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ حقوقِ نسواں کو سلب کرنے کی کوششیں عام ہو رہی ہیں۔

لیکن یہ امر باعث مسرت ہے کہ حکومت ہند عورتوں کو درپیش صورت سے بے خبر نہیں ہے اور اس کے تدارک کے لیے جد و جہد کر رہی ہے تاکہ عورتوں کو معاشرتی زندگی میں اس طرح مربوط اور ہم آہنگ کر دیا جائے تاکہ نسلِ انسانی کا یہ نصف حصہ اقتصادی نظام کو مضبوط و مستحکم بنانے کے لیے اپنا اثر ڈال سکے۔ اسی بنیادی مقصد کو سامنے رکھ کر مرکزی حکومت نے ۱۹۷۱ میں ایک کمیٹی قائم کی۔ اس کمیٹی نے عورتوں کے مسائل، معاشرتی زندگی میں ان کی حیثیت اور قومی زندگی میں ان کے حقوق سے متعلق تمام تفصیلات کی ایک رپورٹ مرتب کی تھی۔ اس رپورٹ میں ایسی ۲۵ سفارشات تھیں۔ جن پر بعد ازاں ایک اعلیٰ سطحی سرکاری کمیٹی میں مزید غور کیا گیا۔ اسی رپورٹ کی سفارشات کی روشنی میں حکومت نے عورتوں کے لیے ایک قومی کمیٹی قائم کی اور ایک بیورو محکمہ بنایا۔

آبادی کے اعتبار سے ہندوستان دنیا کے بڑے ملکوں میں سے ایک ہے۔ کثرتِ آبادی نے ملک میں نت نئے مسائل پیدا کئے ہیں۔ ان مسئلوں سے عورتیں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انسانی زندگی کا یہی نصف حصہ سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ یہ ہماری ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ ستر کروڑ آبادی والے ہندوستان میں تقریباً ۳ لاکھ ایسی بدقسمت عورتیں ہیں جن کا سماجی زندگی میں کوئی اقتصادی سہارا نہیں ہے۔ وہ زندہ رہنے کے لیے اپنے جسم کی تجارت کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ اسی ملک میں تقریباً ڈیڑھ سو ایسے شہر ہیں جہاں عورتیں جانوروں کی طرح زندگی گذارتی ہیں۔ ان کی حیثیت "بکاؤ مال" کی ہے یہ شرمناک زندگی ان تک ہی ختم نہیں ہو جاتی ہے بلکہ یہ سلسلہ ایک نسل سے دوسری نسل تک جاری رہتا ہے۔

ہم طبقۂ نسواں کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔ سیاہ بادلوں کے پیچھے سے روشن آفتاب کی کرنیں اس دھرتی کو اب منور کرنے ہی والی ہیں۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ حکومت اور پارلیمنٹ کے دونوں ایوان میں جانب منتخب خواتین حقوق نسواں سے بے خبر نہیں ہیں۔ وہ درپیش مسئلوں کو حل کرنے کے لیے پوری جد و جہد کر رہے ہیں۔ پارلیمنٹ میں منظور شدہ قراردادوں، ہند میں عورتوں کی حیثیت جاننے والی کمیٹی کی سفارشوں، عالمی ایکشن منصوبہ اور عورتوں سے متعلق بین الاقوامی دہائی کی سرگرمیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مرکزی حکومت نے حقوقِ نسواں کے لیے ایک قومی عمل منصوبہ مرتب کیا ہے۔ عورتوں سے متعلق دوسری فلاحی پالیسیاں بھی حکومت کے زیر غور ہیں۔ ان کے لیے دوسری رضاکار جماعتوں اور تنظیموں کو بھی شامل کرنے کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے غور کیا جا رہا ہے۔

قوی امید ہے کہ مستقبل کے ہندوستان میں عورتوں کے لیے باعزت مقام ہوگا۔ نسلِ انسانی کا یہ نصف حصہ اقتصادی اور معاشرتی زندگی کو خوشگوار اور روشن بنانے میں اپنا اہم اور سرگرم کردار ادا کر سکے گا۔

اس سرزمین کی سوندھی مٹی میں ماں، بہن اور بیوی کے مقدس رشتے کا مضبوط درخت پہلے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ سایہ دار اور ثمر آور ثابت ہوگا۔

ایسی حالت میں حضرتِ انسان ماں کی گود سے اپنا سفر شروع کر کے بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ زندگی کے تمام نشیب و فراز کی منزلیں طے کرتا ہوا آغوشِ لحد میں جا کر اپنا سفر ختم کر سکے گا۔ اور نسلِ انسانی کا یہ خوشگوار سفر صور اسرافیل کے پھونکے جانے تک برابر جاری رہے گا۔

یوجنا، نئی دہلی

اظہر مسعود

(طنز و مزاح)

ارادہ کرنا سگریٹ نوشی کے ترک کا

چالیس سال کی عمر کو پہنچ کر ایک دن خیال آیا کہ یہی عمر کینسر کے لیے سب سے زیادہ سازگار ہوتی ہے۔ سوچا جہاں بہت سی لائقِ استعمال اشیا (مثلاً دودھ، انڈا، سیب، انار وغیرہ) سے پرہیز ہے، لگے ہاتھوں سگریٹ نوشی بھی ترک کر دی جائے۔ لیکن اس خیال کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے مرزا سے بھی مشورہ ضروری تھا کہ اُن کے غلط مشوروں سے اکثر مسائل کو حل ہوتے دیکھا تھا۔

جب مَیں نے مرزا پر اپنا ارادہ ظاہر کیا تو انھوں نے لگاتار پانچواں سگریٹ، چوتھے سگریٹ سے جلاتے ہوئے کہا کہ "یار تُو پیتا ہی کتنی ہے جو چھوڑنے کی سوچ رہا ہے"۔

مَیں نے کہا "تمھیں کیسے معلوم کہ مَیں کم پیتا ہوں؟" مرزا دھوئیں کا مرغولہ چھوڑ کر پہلے تو کھنکارے اس کے بعد بلغم کا پٹاخہ فرش پر داغتے ہوئے بولے "بیس منٹ سے میرے ساتھ ہو، ابھی تک ایک بھی سگریٹ نہیں پیا تم نے۔" مَیں نے کہا "بیس منٹ میں کیوں کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بیس گھنٹے تو ہوئے نہیں۔"

"سگریٹ نوش کے لیے" مرزا نے سگریٹ کا ٹکڑا ہونٹوں سے لگا کر ایک آخری گہرا کش لیا اور جیب میں پیکٹ ٹٹولتے ہوئے بولے "نجیب الطرفین سگریٹ نوش کے لیے بغیر سگریٹ کے بیس منٹ بیس دن سے بھی زیادہ بھاری ہوتے ہیں۔" پھر بولے "والد نے وصیت کی تھی کہ ان کی قبر پر اگربتی کے بجائے سگریٹ جلائی جایا کرے اور والدہ کھانے کے دوران پانی کی جگہ بھی حُقہ ہی پیتی تھیں۔"

مَیں نے پوچھا "مرزا تم کتنی پیتے ہو؟"

"اگر ایک منٹ کا وقفہ دو سگرٹوں کے درمیان ہو جائے تو بہت جانو۔" مرزا ماچس بجاتے ہوئے بولے۔

"اس طرح تو مرزا" مَیں نے کہا "سوتے میں بھی تمھیں سگریٹ کی طلب ستاتی ہوگی!"

"خواب میں بھی

کرتا ہوں"۔ مرزا کا چھٹا سگریٹ بھی آدھے سے زیادہ ختم ہو چکا تھا، چٹکی بجا کر راکھ جھاڑتے ہوئے بولے "اور اگر ایسا نہ ہو تو سوتے میں بھی جماہیاں آنے لگتی ہیں۔"

"مرزا۔ سگریٹ کے نقصانات سے واقف ہو۔؟"

"ہاں، واقف ہوں" چھٹے سگریٹ کا ننھا سا ٹکڑا مرزا کے ساتویں سگریٹ کو جلا رہا تھا۔ ساتویں سگریٹ کا پہلا کش مرزا نے اس والہانہ انداز سے لیا جیسے دن بھر کے فاقے کے بعد پہلا سگریٹ نصیب ہوا ہو۔ پھر اُلٹا مجھ سے سوال کیا۔

"ایورسٹ کی چوٹی پر چڑھنے کے نقصانات سے واقف ہو؟ پیرا کر برٹش چینل پار کرنے کے خطرات سے آگاہ ہو؟ برف پر اسکیٹنگ کرنے کے خدشات کا علم ہے؟"

مَیں نے تنگ آ کر کہا "آخر تم جتانا کیا چاہتے ہو۔؟"

"کیا تمھیں معلوم نہیں کہ ایسے کھیلوں سے شوق رکھنے والے حضرات کس تندہی اور چابکدستی سے اپنی جان دیتے ہیں!" مرزا نے کہا "ان پر کسی کو اعتراض نہیں ہوتا ؟"

"سو تو ہے"۔ مَیں نے مرزا کو زیر کرنا چاہا۔ مگر سگریٹ نوشی سے پیدا ہونے والے امراض میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جو مرنا پڑتا ہے"۔

"اور مَیں نے جن کھیلوں کا ذکر کیا۔۔۔۔۔ خیر چھوڑو"۔ پھر سینے پر ہاتھ رکھ کر کھانستے ہوئے کہنے لگے "اسی سے ہماری جی داری کا اندازہ کر لو۔ رہا تمھارا یہ سوچنا کہ صرف سگریٹ پینے والے ہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے ہیں، سو سراسر غلط ہے۔"

مرزا سگریٹ کے جلتے ہوئے سرے پر نظریں جما کر بولے "میرے خیال میں جن کھیلوں کا مَیں نے ابھی ذکر کیا، اگر وہ بند ہو جائیں تو یقیناً پہیے دار کرسیاں اور بیساکھیاں بنانے والے سارے کارخانے ٹھپ ہو جائیں گے بلکہ اگر تحقیق کی جائے تو یہی

کارخانے ہیں جو اس قسم کے کھیلوں کو ہوا دیتے ہیں۔"

"ایسے لوگ جو ایک ٹیسٹ فتح کر لیا یا پرشانت چینل پار کر لیا، اپنے ملک کا نام اونچا کرتے ہیں۔" میں نے دلیل پیش کی۔

"خالی خولی نام اونچا کرنے یا ہونے سے ہمارے ملک کے بنیادی مسائل تو حل ہوتے نہیں۔" مرزا نے بڑی لاپروائی سے جواب دیا۔

"بنیادی مسائل — یعنی؟" میں نے پوچھا

"یعنی یہی غریبی، بے روزگاری وغیرہ۔ اور کیا!" مرزا لب لگا کر سگریٹ کا سہارا ترک کرتے ہوئے بولے۔

"تو سگریٹ پی کر ہی تم کون سے مسائل حل کرتے ہو؟"

"ہم — ارے ہم سگریٹ پینے والے سگریٹ پینا بند کر دیں تو لاکھوں افراد جو سگریٹ بنانے کے کارخانوں میں ملازم ہیں، بے روزگار ہو جائیں، اربوں روپے کا ٹیکس جو سرکار کو ملتا ہے، بند ہو جائے اور اس ٹیکس کی رقم سے چلنے والی متعدد فلاحی اسکیمیں بھی خود بخود ٹھپ ہو جائیں۔" مرزا ایک سانس میں بولتے چلے گئے۔

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے ایک تمہاری سگریٹ نوشی پر ہی سگریٹ بنانے والے کارخانے چل رہے ہیں۔" میں نے کہنے کو تو یہ کہا مگر اپنی بات کے کھوکھلے پن کا احساس تھا۔ مرزا جس رفتار سے سگریٹ پیتے ہیں، اس سے یہ اندیشہ ضرور ہے کہ اگر یہ ترک کر دیں تو کم سے کم ان کے مخصوص برانڈ کے سگریٹ بننا تو بند ہو ہی جائیں گے۔

"یہ بھی خوب کہی" مرزا ہنس کر بولے "ارے میاں ہر سگریٹ نوش یہی سوچ کر سگریٹ نوشی ترک کر دے تو نتیجہ کیا نکلے گا، اس پر بھی کبھی غور کیا؟"

"مگر مرزا — یہ تو سوچو — میں تمہارا دوست ہوں، جان بوجھ کر تم کو ہلاکت میں پڑتا نہیں دیکھ سکتا۔"

یوجنا، نئی دہلی

"یہ دوستی نہیں، خود غرضی ہے میاں خود غرضی۔" مرزا نے نئے پیکٹ کا ریپر پھاڑتے ہوئے کہا "ایک مشتِ خاک کی صحت کو گھن لگ جانے کے اندیشے اور عمرِ دراز کی خاطر لاکھوں لوگوں کے پیٹ پر لات ماردی جائے — یہ کہاں کا انصاف ہوگا!" مرزا کا لہجہ تیز ہو گیا تھا۔

"میرے بھائی میں یہ نہیں کہتا کہ تم کو کینسر ہی ہو جائے گا۔" میں نے بات کا انداز بدلتے ہوئے کہا "میں نے تو ایک اندیشے کا اظہار کیا کہ سگریٹ سے کینسر ہو سکتا ہے تو اسے ترک کر دینے میں کیا حرج ہے؟"

"یہ بھی خوب کہی" مرزا نے سینہ دبا کر ہانپتے ہوئے دلیل پیش کی: "تمہاری بات کو یوں کہتا ہوں کہ کھانا نہ کھایا جائے کیوں کہ اس سے ہیضہ ہو سکتا ہے، مئی جون کی دوپہر میں گھر سے نہ نکلا جائے کیونکہ لو لگنے کا خطرہ ہے، جاڑے میں چوبیسوں گھنٹے کمرے میں بند رہا جائے کیوں کہ باہر فالج کا ڈر ہے — پھر تم یوں کیوں نہیں سوچتے کہ جب تک ہم سگریٹ پینے کے قابل ہیں، جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا، ملک کی معیشت کو سگریٹ پی کر اپنی بساط بھر سہارا دیتے ہوئے ہیں اور اگر کینسر ہو گیا" مرزا نے دھوئیں کا چھلا چھوڑتے ہوئے کہا "تو ان لوگوں کی آمدنی کا ذریعہ بن جائیں گے جو ان کے نام پر بڑے بڑے دواخانے کھولے ہوئے ہیں اور ان طبی ماہرین کا بھی ہاتھ بٹائیں گے جنھوں نے اس موذی مرض کے علاج کی دریافت کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی ہیں۔"

"مرزا — ہر چند کہ تمہارے دلائل بہت ٹھوس ہیں پھر بھی عمداً موت کے منہ میں چھلانگ لگانا کہاں کی عقل مندی ہے۔" میں نے عاجز آ کر مرزا کو قائل کرنے کی آخری کوشش کی۔

"بہت خوب، مرزا سگریٹ کو مٹھی میں دبا کر ایک سہاپت لمبا کش لگاتے ہوئے بولے "آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دشمن سے جنگ کرتے ہوئے جو جوان میدان میں کام آجاتے ہیں وہ بے وقوف ہوتے ہیں۔"

"میں نے ایسا تو نہیں کہا۔" میں حیران ہوتے ہوئے بولا "سگریٹ کی وجہ سے صحت کو جو خطرات لاحق ہیں، میں تو ان کے ..."

"وہی میں بھی عرض کر رہا ہوں" مرزا میری بات کاٹتے ہوئے بولے "جناب کے خیال میں کیا فوجی جوان بھولے سے دشمن کی توپوں کے سامنے آ جاتے ہیں؟"

"نہیں تو — میں نے یہ تو نہیں کہا" میں بولا "وہ تو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت دشمن کا سامنا کرتے ہیں۔ ان کے سامنے چونکہ وطن کی سلامتی کا عظیم مقصد ہوتا ہے۔ اس لیے وہ بے خطر جنگ کی آگ میں کود پڑتے ہیں — ان کا یہ عمل سراسر قابلِ تعریف بلکہ قابلِ فخر ہے۔"

"بس بس" مرزا نے کھانسی کے لیے وقفہ لیتے ہوئے کہا: "جنگ دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جو بیرونی حملہ آوروں سے کی جاتی ہے اور دوسری وہ جو ان حالات سے نپٹنے کے لیے کی جاتی ہے، جو ملک کو اندرونی طور پر کھوکھلا کر دیتے ہیں — تو حضرت یہ تو پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ ہماری سگریٹ نوشی کے پیچھے کون سے عظیم مقاصد کارفرما ہیں۔"

اس ساری گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں جو پیسے جیب میں ڈال کر انڈے لینے نکلا تھا ان سب کے سگریٹ خریدے اور یکے بعد دیگرے پھونکتا ہوا خوش خوش گھر واپس آ گیا ——— بالکل اسی طرح جیسے سگریٹ کے پیکٹ پر یہ Statutory Warning لکھے ہونے کے باوجود بھی سگریٹ پینے والا بے فکری سے سگریٹ پیتا ہے کہ Cigarette Smoking Is Injurious To Health یعنی "سگریٹ نوشی صحت کے لیے مضرت رساں ہے!"

★

ہمارے منصوبے

سیّد محمود نقوی

حیات نام ہے اک جہدِ مستقل کا اگر   ہو شرط یہ بھی رہے اعتبارِ شام و سحر
کوئی حسین تصوّر بھی گر ہو پیشِ نظر   ہے التزام ضروری برائے رختِ سفر
کہ رنگ و نور کی منزل ہو کہکشانِ حیات
تمام نکہت و خوشبو ہو داستانِ حیات

شہر شہر میں اُجالا ہو تنگ ہو صحرا   بقدرِ ظرف ہوں لبریز نہر اور دریا
ہر ایک کھیت میں پانی ہو ہر طرف سبزہ   کہیں دکھائی نہ دے کوئی بھی شجر سوکھا
کھلی ہوا ہو ہر اک سانس لے سکے اس میں
کسی طرح کی نہ آلودگی، نہ بُو جس میں

حصولِ علم پہ لگنی نہ ہو کوئی قدغن   گلی گلی میں ہو اک شمع علم کی روشن
جہالتوں کا مگر دور ہی سے ہو مدفن   حیات و علم ہوں ایسے کہ جیسے جان و تن
ہر اک نگاہ میں انصاف کا ترازو ہو
جہاں یہ لطف کہ اک دوسرے کا بازو ہو

ہر ایک گوشہ ہو سیراب اتنے ہوں نل کوپ   جہاں اندھیرے ہوں پہلے وہاں ہو تازہ دھوپ
ہر ایک گاؤں کا بدلے کچھ اس طرح بہروپ   کہ ان کے پرتو سے شہروں کا نکھرے رنگ و روپ
نظر نظر میں چراغاں، حیات کے جلوے
نفس نفس میں فروزاں، حیات کے جلوے

ہماری سمت کوئی آنکھ بھی اٹھا نہ سکے   ہمارے کھیتوں سے بالی بھی اک چرا نہ سکے
وہ نظم و ضبط کہ انگشت بھی دکھا نہ سکے   ہمارے عزم کو کوئی کبھی ہلا نہ سکے
اگر ہو دوست تو حاضر ہو جان اس کے لیے
مگر جو دشمنِ جاں ہو، سنان اس کے لیے

وہ کاشتکار ہوں یا ہوں ہمارے صنعت کار   سبھی کا ایک ہو مقصد، سبھی کا ایک شعار
بڑے وثوق سے ان کے لبوں پہ ہو گفتار   ضرورتوں سے فزوں ہے ہماری پیداوار
کوئی سوالی سرِ راہ اب ملے نہ کہیں
مرا ہے بھوک سے، ایسی خبر چھپے نہ کہیں

ہمہ جہت ہو ترقی، ہمہ صفت ہو کمال   ہر ایک طرز ہو دل کش جمال ہو کہ جلال
مزہ تو جب ہے کہ دیں غیر تک بھی اس کی مثال   خدا کرے نہ ہو اس اوج کو کبھی بھی زوال
حیات جن سے عبارت، ہمارے منصوبے
حیات جن کی ضمانت، ہمارے منصوبے

★

غزل

نسیم شاہجہانپوری

دیکھ کر مائل بہ ترکِ جام و پیمانہ مجھے
جانے کیا سمجھے ہوئے ہیں اہلِ میخانہ مجھے

اہلِ زنداں میں بھی ہیں میرے جنوں کے تذکرے
یعنی دیوانے بھی اب کہتے ہیں دیوانہ مجھے

انتہائے بیکسی نے چھین لی تابِ کلام
اب لبِ خاموش سے کہنا ہے افسانہ مجھے

الوداع! ہوش اے تابِ نظارہ! الوداع
دیکھتا ہے پھر کوئی بے اختیارانہ مجھے

رفتہ رفتہ ہو گیا میں مائل بادہ کشی
آتے آتے آ گئے آدابِ میخانہ مجھے

جذبۂ صادق سلامت! دید کی نیت بخیر
وہ نظر آئیں گے خود ہی بے حجابانہ مجھے

شکوۂ تشنہ لبی میں کیوں کروں اس سے نسیم
جس نے دے رکھا ہے میخانے کا میخانہ مجھے

غزل

محمود عالم

کھڑکیاں جب سو گئیں در سو گئے
ہم بھی دل پر رکھ کے پتھر سو گئے

رات بھر مد و جزر اٹھتے رہے
صبح دم آخر سمندر سو گئے

کاش وہ لمحے پکاریں پھر کبھی
جو مجھے آواز دے کر سو گئے

جن میں ڈوبے وقت کے طوفاں کئی
وہ سمندر میرے اندر سو گئے

راہ تکتی رہ گئی اندھی گلی
آنے والے موڑ ہی پر سو گئے

محمد معظم الدین

آزادی اور ہماری ذمّہ داریاں

اگر قبلِ آزادی کا ہندوستان اور آزادی کے ۳۸ سال بعد کے ہندوستان کا جائزہ لیں تو نمایاں ترین فرق نظر آتا ہے۔ آزادی کے پہلے ہماری حالت بہت دِگرگوں تھی ہم کسی بھی معاملے میں خودکفیل نہیں تھے۔ قدم قدم پر ہمارے سامنے دشواریاں اور پریشانیاں تھیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کا ذکر ہی کیا۔ حتیٰ کہ ہم زراعت کے میدان میں بھی کافی پیچھے تھے اور شکم سیری کے لیے دوسرے ملکوں کے دست نگر تھے۔ لیکن آج ہماری پیش رفت تمام شعبہ ہائے زندگی میں بہت آگے نکل گئی ہے۔

ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے، لہٰذا اس کی زرعی پیداوار کو خودکفالت کی منزل تک پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی گئی ہے۔ پنجسالہ منصوبوں میں اس [illegible] خاص توجہ دی گئی ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا [illegible] زراعتی میدان میں ہم نہ صرف خودمکتفی ہو گئے [illegible] بلکہ آج ہمارے پاس غلّہ کا وافر ذخیرہ بھی موجود ہے جو ہماری ضروریات سے کہیں زیادہ ہے اور اس وقت حکومت کے لیے یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ زائد غلّہ کو رکھا کہاں جائے۔ ایک طرف زراعتی اور اقتصادی معاملات میں ملک جہاں خودکفیل ہو گیا ہے وہیں دوسری طرف سائنس اور ٹکنالوجی میں بھی اتنی کامیابی حاصل کر لی ہے کہ دوسرے ملکوں کے سامنے اپنا سر فخر سے بلند کر سکتا ہے۔ گزشتہ دس سالوں میں ملک نے اس سمت میں جو ترقی کی ہے وہ کافی حیرت انگیز ہے اور جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ دَور میں سائنس اور ٹیکنالوجی نے ہماری معیشت کے ہر گوشے کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔

تعلیمی میدان میں بھی روز افزوں ترقی ہوئی ہے اور وقتاً فوقتاً اس سلسلے میں نئی نئی پالیسیاں وضع کی جاتی رہی ہیں۔ ملک کی موجودہ تعلیمی پالیسی یہ ہے کہ اسے سماجی اور اقتصادی تانے بانے سے ہم آہنگ کر دیا جائے۔ یہ پالیسی ملک کے نوجوانوں کی آرزوں اور امنگوں کو پورا کرنے میں کافی حد تک ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ غربت اور بے روزگاری کو ختم کرنے کی جدوجہد جاری ہے۔ اس کے لیے ایک ترقیاتی ڈھانچے کی تشکیل ہوئی ہے، جس میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ غربت اور ترقیاتی ڈھانچے میں ایک توازن ہو۔ عدم توازن کی صورت میں اس بات کا امکان ہے کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوں یا منزل تک پہنچنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑے۔

ہندوستان کثیر آبادی کے لحاظ سے دُنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے۔ جمہوریت کی مختصر سی تعریف یہ کی جا سکتی ہے کہ اس میں سارے اختیارات و اقتدار عوام کو حاصل ہوتے ہیں۔ بقول ابراہیم لنکن "یہ عوام کی وہ حکومت ہے جو عوام کے فائدے کے لیے عوام کے ذریعہ چلائی جاتی ہے"۔ لہٰذا اس طرزِ حکومت میں عوام کی بہت ساری ذمّہ داریاں ہوتی ہیں۔ ملک کے سود و زیاں کے ضامن وہ خود ہوتے ہیں۔ ملک کی ترقی و تنزلی اُن کے تعمیری اور تخریبی رویّہ پر منحصر ہوتا ہے۔

بے شک آزادی ایک نعمت اور تحفہ ہے اور یہ اپنے ساتھ کچھ ذمّہ داریاں بھی لے کر آتی ہے۔ آزادی کو استعمال کرنے کا ہمیں پورا اختیار ہے لیکن یہاں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ آزادی ایک ذمہ داری کا نام ہے۔ یہ کوئی نراج نہیں بلکہ اس کے بھی کچھ اصول و قوانین ہوتے ہیں۔ اس میں بھی نظم و ضبط کی پابندی لازمی شرط ہے۔ بقول شخصے:

Freedom is not a licence to destroy

اس چھوٹے سے مقولے میں ہماری پوری ذمہ داری مضمر ہے۔ ایک شخص کی آزادی دوسرے کی بربادی کا سبب نہیں بننی چاہیئے بلکہ ایک دوسرے کے جذبات کی قدر کر کے ہی ہم اپنی ذمّہ داریوں سے سبکدوش ہو سکتے ہیں۔ گویا آزادی اپنی حدودِ ذات کے اندر رہ کر ہی اپنے فرائض کی ادائیگی کا نام ہے۔

کسی قوم یا ملک کا سرمایہ اس قوم کے نوجوان ہوتے ہیں اور انھیں کی کوششوں اور کاوشوں سے ملک ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو تا ہے۔ ان کی مدد اور تعاون کے بغیر ملک کی ترقی ناممکن ہی نہیں بعید از قیاس بھی ہے۔ اس صورتِ حال [illegible] ہم نوجوانوں کی ذمّہ داریاں کافی حد تک بڑھ جاتی ہیں۔ بزرگوں کے تجربات اور خیالات [illegible] جو قیمتی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں، نئی نسل استفادہ کر کے آگے

(باقی صفحہ [illegible])

سردار ی لال نشتر

ہماچل پردیش کے جنگلات

ہماچل پردیش کے گھنے جنگلات اپنے ہرے بھرے اور سرسبز درختوں کے لیے دُنیا بھر میں مشہور ہیں۔ دیودار، شیشم، شمشاد، چنار، چیل، سرو اور صنوبر جیسے خوبصورت درختوں کی قطاریں یوں لگتی ہیں جیسے کوئی فوج کی فوج، اپنے جرنیل کے حکم کے انتظار میں چوکس کھڑی ہو۔ کیل، کیکر، بلوط اور پیپل کے عظیم الشان درخت بھی خوب بہار دکھاتے ہیں۔ اور اُنکی تازگی عجب لُطف دیتی ہے۔ جہاں قدرت نے پردیش کو بے پناہ دلکشی اور دل فریبی عطا کی ہے، وہاں ان جنگلات کے کشادہ مقامات کو بھی طلسمات کی بھرپور دولت بخشی ہے۔ اس حسین و جمیل کوہستانی علاقے کے خوبصورت جنگلوں میں بلند سے بلند کوئی ایسا درخت نہیں، جس کی چوٹی پر نہ پہونچ سکیں، کوئی ایسا شگوفہ نہیں، جس تک ہاتھ کی رسائی نہ ہوسکے۔ کوئی ایسا پودا نہیں، جس کی ہر چیز چوٹی سے لے کر جڑ تک نہ دیکھ سکیں۔ یہاں کئی جنگل تو ایسے ہیں، جہاں قدموں کے اثرات، راستہ کا کوئی نشان باقی نہیں چھوڑتے اور ایسے بھی ہیں جن کا نہ آغاز نظر آتا ہے، نہ آخر! ان کے سب راستے ناپید ہیں، اور سب راہیں سَراسَر مسدود! اور جب کبھی یہاں کی پُرسکون، کامل خاموشی کو ہوا کی سرسراہٹ چھو جاتی ہے تو یہ طلسم خاموشی اس طرح ٹوٹتا ہے کہ جنگل کی ساری فضا سراپا حسین و جمیل رُوح کی صُورت اختیار کر لیتی ہے۔

خوبصورت درختوں کی سرسبزی و شادابی اُن کی بھوری، نیلی، سیاہی مائل، ملکی، مخروطی شاخیں ایک دوسری کے ساتھ گُتھی ہوئی گُنجان پھلوں اور



ہماچل پردیش کے سرسبز بلند درختوں کا ایک منظر

پھولوں سے لدی ہوئی — نگاہ کے لیے ایک پُر کیف منظر پیش کرتی ہیں۔ ہرے ٹھنڈے شیشم، دیودار اور کیل کی قُبہ نما چوٹیاں اور برگ و بار کی ہمیشہ بدلتی رہنے والی کیفیتیں اُن کے منقش وجود کو اور بھی زیادہ خوبصورت بنا دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ پیڑوں سے چھنتی ہوئی پہاڑی چڑیوں اور فاختوں کی کُوکیں، جنگلی پرندوں کا ایک دوسرے کا پیچھا کرنا، رنگین تتلیوں کا درختوں کے آس پاس ناچنا، کودنا، اور ٹھنڈی ٹھنڈی موجِ ہوا، گُلِ سوسن کی مہک بانٹتی اُفق سے اُفق تک — ایسے منظر ہیں جو دلوں کو موہ لیتے ہیں۔ سربفلک کشیدہ پہاڑوں سے گھرے ہوئے، ہماچل پردیش کے قدیم جنگلات، سرسبز بلند درخت، اودی، نیلی گھٹاؤں کے اوپر، سفید بُراق بادلوں کا دیوانہ وار بھاگتے پھرنا، اور پُرکیف فضاؤں کے دلآویز مناظر سے متاثر ہوکر شاعر بے اختیار کہہ اٹھتا ہے :—

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

یا

جنگل میں بادلوں میں ہوا میں پہاڑ میں
وہ رُوح ہے کہ جاں میری اُس پر نثار ہے

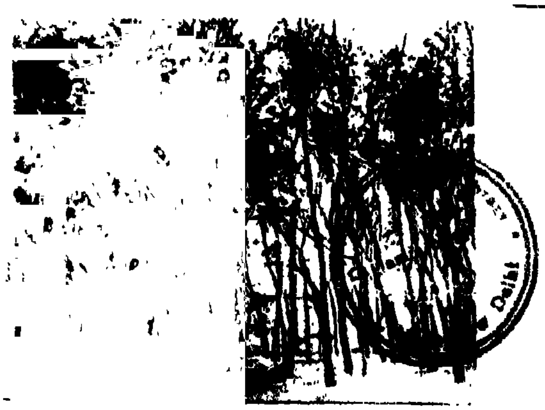
واقعی آسمان کی طرف پرواز کرتے ہوئے ہماچل کے سربلند درختوں کے پتّے پتّے پر خُدا کی

شان کا ظہور نظر آتا ہے۔

ہماچل پردیش میں تقریباً ۱۰۰ اقسام کے درخت پائے جاتے ہیں جو مختلف طریقوں سے روزمرہ کی زندگی میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ بعض درخت تو کئی کئی سو سال پرانے ہیں۔ گذشتہ سال کی نمائش میں دیودار، شیشم، چنار اور چیل کے درختوں کے تنوں کے کچھ حصے کاٹ کر دکھائے گئے تھے۔ جن کا گھیر ۲۰ فٹ تھا اور اُن کی تاریخ پیدائش ۱۳۸۲ء لکھی تھی۔ یعنی آج یہ زبانِ حال سے گذشتہ چھ سو سال کی تاریخ دُہرا رہے ہیں۔

یہاں کے چند مشہور پیڑوں کے نام درج ذیل ہیں:

نام پیڑ	مقامی نام
۱۔ دیودار	کیلو
۲۔ شیشم	شیشو
۳۔ شمشاد	شامؤ
۴۔ چنار	بیاسش
۵۔ چیل	چیلو
۶۔ سرو	رائی
۷۔ صنوبر	توس
۸۔ بلوط	بان
۹۔ پہاڑی بلوط	کھرشو
۱۰۔ نیلگوں صنوبر	کیل
۱۱۔ دیو بلوط	مورسو
۱۲۔ سال	شال
۱۳۔ پیپل	مانڈر
۱۴۔ پہاڑی بانس	نیرگال
۱۵۔ بیرچ	بھرچ
۱۶۔ بید مجنوں	انگو
۱۷۔ ملاٹن	دارل
۱۸۔ پاتھا	پاتھو
۱۹۔ ارکھل	ارکھل
۲۰۔ کیکر	کیکرو
۲۱۔ آرن	آرنو
۲۲۔ پہاڑی بید مجنوں	بیدو
۲۳۔ ہارس نٹ	کھنور
۲۴۔ بھیکس	بھیکو
۲۵۔ دیوی دیار	دیار
۲۶۔ کھرک	کھرک
۲۷۔ نرگال	نگالو
۲۸۔ موہر	موہرو
۲۹۔ کامبل	کامبلو
۳۰۔ امبل	امبلو
۳۱۔ پال	پالو
۳۲۔ رکھال	راکھلو



کلو کے جنگلات کا ایک منظر

مندرجہ بالا جنگلاتی درختوں کے علاوہ ہماچل کے کسولی، منی کرن، پاربتی گھاٹی۔ ڈھونڈی، چوپال، ہمیرپور، کوٹ گڑھ، روہڑو، مشوبرا، سراہن، منڈی، سکیت، اور شملہ میں ایسے درخت بھی ہیں جن کے نام پہاڑی دیوتاؤں کے نام سے منسوب ہیں۔ ۲۵ میٹر لمبائی اور ۱۰ میٹر محیط والے یہ مقدس پیڑ ۳۵۰ سال سے ۵۰۰ سال پرانے بتلائے جاتے ہیں۔ جن کی مندروں میں پوجا کی جاتی ہے۔ اس قسم کے قدیم درختوں میں کھورڈ دیوتا درخت، گوٹھارا کیلو، نرین دیوتا، جھلوڑ دیوتا، بڈھیا مانا، دیوتا کیلتی اور سیتہ دیوتا نامی پیڑ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ شوالک پہاڑیوں کے جنگل میں جامن کے بے شمار درخت ہیں جن کی چار چار یا پانچ پانچ جڑیں ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے اتنے بڑے درختوں کا بوجھ ان ستونوں پر قائم ہے۔ اسی طرح ضلع سرمور کے سراہن علاقہ میں ۸۰۰ سال پرانا دیودار کا درخت ہے۔ جس کی اونچائی ۵۰ میٹر اور گولائی ۱۰ میٹر ہے۔ رام پور کے نتھانی حلقہ میں بھی ایک بہت بڑا پیپل کا درخت ہے جو ۴۰۰ سال پرانا بتایا جاتا ہے جس کی گولائی ۱/۲ ۸ میٹر ہے۔ ایسے بھی زمانۂ قدیم سے پوجا جاتا ہے۔

ہماچل پردیش میں جنگلات کا مجموعی علاقہ ۲۲ ہزار مربع کلومیٹر ہے یعنی کُل جغرافیائی علاقہ کا ۱۱ء۳۹ فیصد رقبہ جنگلات پر مشتمل ہے۔ اس رقبہ میں مخصوص جنگلات اور محفوظ جنگلات بھی شامل ہیں۔ جبکہ قومی جنگلات پالیسی کے تحت جنگلات کا علاقہ ۳۳ فی صد ہونا چاہیئے۔ سارے ملک میں تقریباً ۲۲ فیصدی حصہ میں جنگل ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق پہاڑی علاقوں میں کم از کم ۵۰ فیصد جنگلات ضروری ہیں تاکہ موسم، آب وہوا اور بارش قدرتی نظام کے مطابق چلتے رہیں اور فضائی آلودگی کا تناسب بڑھ کر نقصان دہ حد تک نہ پہنچ جائے۔ بارش کے سالانہ اوسط کا انحصار بھی درختوں کی کثرت پر ہوتا ہے۔ اس طرح درختوں کی زیادتی، خشک سالی اور سوکھے کے خطرات کو ٹالنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پہاڑی پردیش میں جنگلات کو نہ صرف معاشی لحاظ سے اہمیت حاصل ہے بلکہ یہ ماحولیاتی توازن کی برقراری کے لیے بھی ضروری ہے۔

ہماچل کے جنگلات چار متوازی علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ باہری علاقہ، ناہن، سولن، بلاسپور، اُونا اور کانگڑہ کی وادی۔ پستی علاقہ، شملہ، مجتبل، کلو اور چمبہ۔ درمیانی علاقہ لبشنپر رام پور، چوُرا۔ اور چوتھا بالائی علاقہ۔ کنور، پانگی

اور ہمالیائی علاقوں پر مشتمل ہے۔ ان جنگلوں میں قسم قسم کی عمارتی لکڑی دستیاب ہوتی ہے۔ مثلاً کیکر، ببول، شیشم، فرماں، تن، کیر، چیڑ، دیودار، صنوبر، پھولا اور اخروٹ کے درخت بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایندھن چارکول، بانس، لاکھ، گوند، رال، بیروزہ، گھاس، چلغوزہ اور جڑی بوٹیاں بھی کافی مقدار میں ملتی ہیں۔ کلو، لاہول، سپتی چمبہ، بھرمور اور پانگی کے جنگلوں میں ایسی جڑی بوٹیاں پائی جاتی ہیں جو قیمتی ہونے کے علاوہ دوسری جگہوں پر نایاب ہیں۔ لیکن یہ امر افسوسناک ہے کہ ان کے استخراج کی طرف خاص طور پر توجہ نہیں دی جا رہی۔ ہماچل کے جنگلات کو اگر جڑی بوٹیوں کا خزانہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ ستاور، ست مولی، اشت پدمی، اسگندھ، تیورا، ناگوری، بن تلسی، رتن جوت، مارکنگنی، چراتھ، بنفشہ، پاکھان، شو بوٹی، زرشک، مکوہ، ساگر جوت، سمیری، بن ککڑی، واجی گندھا اور مشک بالا جیسی قیمتی اور نایاب جڑی بوٹیوں کی لازوال دولت ہماچل کے جنگلوں میں پائی جاتی ہے۔ اس دولت کے تحفظ اور اس کو ترقی دینے کے اقدامات کی اشد ضرورت ہے۔ ان کے علاوہ بلاسپور، منڈی، کانگڑہ اور کلو کے جنگلوں میں ایسے بھی درخت ملتے ہیں جن سے ربڑ کا دودھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ نیز کنور اور لاہول سپتی کے گھنے جنگلوں میں یوکلپٹس کے بھی درخت ہیں جو سونا اگلتے ہیں، بشرطیکہ اس کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جنگلات ہماری خوشحالی کی بنیاد ہیں اور ہماری معاشی، اقتصادی اور صنعتی ترقی، جنگلوں کی حفاظت پر منحصر ہے۔ نیز نباتات اور حیوانات کے درمیان توازن کو برقرار رکھنے کے لیے بھی جنگلات کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ لیکن یہ کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ بلا سوچے سمجھے جنگلوں کو کاٹ دیا جاتا ہے اور اس طرح خوشحالی کی بنیادیں کھوکھلی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس خطرناک غلطی کے نتیجے کے طور پر قدرتی توازن بگڑ جاتا ہے اور رفتہ رفتہ جنگلات کا رقبہ کم ہوتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پنج سالہ پلانوں میں جنگلات لگانے پر بہت زور دیا گیا ہے تاکہ وہ صنعتیں جن کا درختوں کی لکڑی پر انحصار ہے مشکلات سے دوچار نہ ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ جنگلوں کو سماجی لحاظ سے بہتر بنانے، حکومت کی ملکیت میں آنے والے جنگلوں کو دوبارہ آباد کرنے، زمین کو کٹنے پھٹنے سے محفوظ رکھنے کے اقدامات کرنے اور جلد اُگنے والے درخت لگانے کی اسکیمیں شامل ہیں۔ چونکہ درخت قومی ملکیت ہیں، اس لیے ان کی حفاظت اور ناجائز کٹائی کی روک تھام نہایت ہی ضروری ہے۔

جنگلات ہماچل پردیش کے پہاڑی علاقہ کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ اسی لیے ان جنگلات کو وسیع پیمانے پر فروغ دینے اور خالی شدہ رقبۂ جنگلات پر دوبارہ ہرے بھرے جنگلات قائم کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر شجرکاری کی اشد ضرورت ہے۔ ساتھ ہی جنگلات کی ناجائز کٹائی روکنے اور جنگلوں کا تجارتی مقاصد کے لیے بے جا استعمال ختم کرنے کے بھی اقدامات کرنے چاہئیں تاکہ جنگلات سے متعلقہ ذرائع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جا سکے۔ موجودہ ہنگامی حالات کے مدنظر ہم سب کا یہ فرض ہے کہ جنگلات کو تحفظ و ترقی دینے کے کام میں مکمل اشتراک دے کر شجرکاری کے پروگرام کو کامیاب بنائیں۔ ●

اِدھر اُدھر سے

تلہنوں کی پیداوار میں اضافہ

زراعت اور دیہی فروغ کے وزیر مسٹر بوٹا سنگھ نے بتایا ہے کہ تیلوں اور تلہنوں کی مانگ کو مدنظر رکھتے ہوئے ساتویں منصوبے کے لیے تلہنوں کی پیداوار کا نشانہ ۱۸۰ لاکھ ٹن مقرر کیا گیا ہے۔ ساتویں پنجسالہ منصوبے کے دوران تلہنوں کی پیداوار کے بارے میں حکمت عملی پر غور کرنے کی غرض سے قومی سطح کی میٹنگ کا افتتاح کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ موجودہ پیداوار مانگ سے کم ہے لہٰذا کثیر زرمبادلہ خرچ کر کے خوردنی تیلوں کی درآمد کرنی پڑ رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ تلہنوں کی پیداوار میں اضافہ اور خوردنی تیلوں کی درآمد میں کمی اشد ضروری ہے اس لیے ساتویں پنجسالہ منصوبے کے دوران تلہنوں کی پیداوار کو خاص اولیت دی گئی ہے۔

مسٹر بوٹا سنگھ نے مزید بتایا کہ موسم کی غیر یقینی صورت حال کے باوجود چھٹے پنجسالہ منصوبے کے دوران تلہنوں کی پیداوار کافی حد تک بڑھ گئی ہے۔ یہ پیداوار ۸۰-۱۹۷۹ء کے ۴ و ۸۷ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ۸۴-۱۹۸۳ء کے دوران ۱ ر ۱۲۸ لاکھ ٹن تک پہونچ گئی۔ جبکہ یہ نشانہ ۱۲۵ لاکھ ٹن مقرر کیا گیا تھا۔ توقع ہے کہ ۸۵-۱۹۸۴ کے دوران ۱۳۰ لاکھ ٹن کے نشانے کے مقابلے میں یہ پیداوار ۱۳۱ سے ۱۳۳ لاکھ ٹن کے درمیان رہے گی۔

انھوں نے کہا کہ یہ صورت حال اس لیے ممکن ہوئی ہے کہ تلہنوں کی کاشت کے رقبہ میں اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ رقبہ جو ۸۰-۱۹۷۹ء میں ۴ و ۱۶۹ لاکھ ہیکٹیر تھا۔ ۸۴-۱۹۸۳ء میں بڑھ کر ۱۸۷ لاکھ ہیکٹیر تک پہنچ گیا۔ اس کے علاوہ صلاحیت پیداوار بھی ۸۴-۱۹۸۳ء کے دوران ۶۸۵ کلوگرام فی ہیکٹیر ہو گئی جبکہ ۸۰-۱۹۷۹ میں یہ صرف ۵۱۶ کلوگرام فی ہیکٹیر تھی۔

(باقی صفحہ پر)

بقیہ : زرعی ترقی کا مختصر جائزہ

ملنے کا اہتمام ہوتا ہے۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اناج کی پیداوار ۱۹۶۰ میں ۱۰۸ ملین ٹن تک تھی اور یہ بڑھ کر ۱۴۵ ملین ٹن اناج ہونے کا امکان ہے۔ علاوہ ازیں ۸۱ — ۱۹۸۰ میں دودھ کی پیداوار جبکہ سترہ ملین ٹن تھی۔ امسال اس کی پیداوار چھتیس ملین ٹن ہوگئی ہے۔ انڈے کی پیداوار ۵۱ — ۱۹۵۰ میں ۱۸۳۲ ملین تھی اور امسال ۱۲۲۰۰ ملین ہوگئی ہے۔ مچھلی کی پیداوار ۵۱ — ۱۹۵۰ میں ۷۵ ملین ٹن تھی اور امسال ۲۸۰ ملین ٹن تک پہونچ گئی ہے۔ اگرچہ دالوں اور تیل والے بیجوں کی پیداوار میں خاطرخواہ ترقی نہیں ہوئی ہے، پھر بھی ۵۱ — ۱۹۵۰ میں دالوں کی پیداوار ۸ ملین ٹن تھی اور امسال ۱۲ ملین ٹن ہے اور تیل والے بیجوں کی پیداوار ۵۱ — ۱۹۵۰ میں پانچ ملین ٹن تھی اور امسال ۱۲۰۵ ملین ٹن ہوگئی ہے۔ اس طرح ہندوستان تمام ضروری خوردنی اشیا میں بہت حد تک خودکفیل ہوگیا ہے۔ ●

بقیہ : توانائی کا [illegible] ذریعہ ہائیڈ[illegible]جن

کچھ سائنسداں شمسی توانائی کی مدد سے پانی سے ہائیڈروجن علیحدہ کرنے کے سلسلے میں بھی معروف کار ہیں۔ کچھ سائنسداں کا خیال ہے کہ کوئلہ سے قدرتی گیس بنانے والے پلانٹوں کو اگر قدرتی گیس کے بجائے ہائیڈروجن حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جائے تو ان پلانٹوں کو چلانے کی قیمت میں گراوٹ آئے گی۔ ساتھ ہی ساتھ قدرتی گیس کے بجائے ہائیڈروجن حاصل کی جاسکے گی جس میں مقابلتاً زیادہ توانائی کی مقدار پوشیدہ رہتی ہے۔

آج کی دنیا میں شمسی توانائی کے سلسلے میں جو تحقیقاتی کام ہورہے ہیں ان سے ہائیڈروجن ٹکنالوجی کو بھی فروغ مل رہا ہے۔ مثال کے طور پر فوٹو کیمیائی توانائی کو ہائیڈروجن توانائی میں تبدیل کرنے اور اسٹور کرنے کے سلسلے میں تیسری بین الاقوامی کانفرنس میں شمسی توانائی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سائنسدانوں نے یہ اعلان کیا ہے کہ بہت جلد یہ بات ممکن ہوسکے گی کہ سورج کی روشنی سے ہائیڈروجن بنائی جاسکے موجود ہائیڈروجن ہی ہے۔ جب ہائیڈروجن کے دو سالمے جلتے ہیں تو ہیلیم Helium نام کی گیس بنتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ توانائی کی ایک بہت بڑی مقدار بھی خارج ہوتی ہے۔ جو گرمی کی شکل میں سورج سے ہم تک پہنچتی ہے۔

سائنسدانوں کی ان ساری کوششوں اور ہائیڈروجن ٹکنالوجی میں ہونے والی ترقی کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ دن دور نہیں جب کاروں کو چلانے کے لیے انجن میں بجائے پیٹرول یا ڈیزل ڈلوانے کے لوگ پانی ڈالا کریں گے۔ نتیجے کے طور پر ریلوں، ہوائی جہازوں اور ٹیکسیوں کے کرائے برائے نام ہوا کریں گے۔ ●

بقیہ : آزادی اور ہماری ذمّہ داریاں

بڑھ سکتی ہے۔ یہاں ہمارے بزرگوں کا بھی یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ نئی نسل کو اپنا ہر ممکن تعاون دینے سے پس و پیش نہ کریں۔ ملک کا مستقبل نوجوانوں کے ہاتھوں میں ہی پوشیدہ ہے۔ لہٰذا ہر قدم ملک کی فلاح و بہبود کے لیے ہی اٹھنا چاہیے۔ نوجوانوں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے آنجہانی وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے کہا تھا :

مجھے نوجوانوں سے جو امیدیں اور توقعات وابستہ ہیں اور ان پر مجھے جو اعتماد ہے اسی کے باعث مجھے ان کی بھلائی اور بہبود کے بارے میں کافی گہری تشویش ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ملک کا مستقبل ان کے ہاتھوں میں محفوظ رہے گا۔

حقوق اور فرائض دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور ممکن نہیں۔ فرائض کی عدم ادائیگی میں حقوق کے مطالبات کرنا نہ صرف اخلاقی جرم ہے بلکہ ہماری بزدلی اور ناکارہ پن کا ٹھوس ثبوت بھی فراہم کرتی ہے۔ لہٰذا فرض کی ادائیگی ہی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ بقول شخصے :

"ہم ہندوستانیوں میں اگر کوئی کمی ہے تو صرف کردار کی اور جب تک فرد کا کردار اونچا نہیں ہوگا یہ قوم کیسے اونچی ہوسکتی ہے"۔ کردار کی بلندی فرائض کی ادائیگی پر منحصر ہوتی ہے۔ اگر ہر شخص کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوجائے تو قوم خود بخود اونچی ہوجائے گی۔ لہٰذا ہم سبھی کا فرض ہے کہ تمام تفرقات سے بالاتر ہوکر اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں ذرا بھی پس و پیش نہ کریں۔ اگر ہم اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہوتے تو، نہ تو ہمیں قلبی سکون میسر ہوسکتا ہے اور نہ ہی ان سیاسی رہنماؤں کی روح کو تسکین مل سکتی ہے۔ جنھوں نے حصول آزادی کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کردی تھی۔ لہٰذا ہمیں مشترکہ کوششوں سے آزادی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنا ہوگا۔ حصولِ آزادی کے بعد ہندوستان کے پہلے وزیراعظم جناب جواہر لال نہرو نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا :

"ملک کی خدمت کروڑوں ستم رسیدہ انسانوں کی خدمت ہے۔ اس کا مطلب مفلسی، جہالت، بیماری اور غیر مساوی سلوک کا خاتمہ بالخیر ہے۔ ہماری نسل کے سب سے بڑے انسان کی تمنا یہ رہی ہے کہ ہر آنکھ سے ہر آنسو پونچھ لے۔ ہوسکتا ہے یہ ہمارے امکان میں نہ ہو، لیکن جب تک آنسو اور تکلیفیں موجود ہیں، تب تک ہمارا کام پورا نہیں ہوگا۔"

★

ایندھن اور ہماری معیشت

آج جو ایندھن ہم استعمال کرتے ہیں چاہے وہ گاڑیوں اور جہازوں کو چلانے کے لیے استعمال کئے جا رہے ہیں یا مختلف صنعتوں میں، گھروں میں کھانے پکانے کے لیے استعمال ہو رہے ہوں یا بجلی پیدا کرنے کے لیے یہ سب کسی نہ کسی طریقے سے ہمارے ماحول کی خوشگوار فضا کو کثیف اور آلودہ کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جیسے جیسے صنعتی ترقی اور سڑکوں پر گاڑیوں کا سیلاب بڑھ رہا ہے، ویسے ویسے ہمارے ماحول کی خوشگواری اور تازگی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ماحول کی یہ کثافت ڈیزل، پیٹرول اور قدرتی گیس کے جلنے کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے لیکن ہائیڈروجن کا بطور ایندھن استعمال ہمیں فضائی آلودگی کے ان سارے خطرات سے آزاد کرتا ہے۔ ہائیڈروجن سے توانائی حاصل کرنے کے سلسلے میں اب تک جو تحقیقاتی کام ہوئے ہیں ان کے پیش نظر وہ ساری گاڑیاں اور مشینیں جو روایتی ایندھنوں سے چلائی جاتی ہیں ان کو ہائیڈروجن سے چلانے کے لیے ان کے انجنوں میں صرف معمولی سی تبدیلی درکار ہوگی، نتیجے میں نہ صرف یہ کہ ایک نہایت ہی سستا ایندھن گاڑیوں کو چلانے کے لیے دستیاب ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ سائنسدانوں کے خیال کے مطابق ہائیڈروجن سے چلائی جانے والی گاڑیوں کے انجنوں کی کام کرنے کی صلاحیت بھی خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا ہے۔

ہندوستان میں ہائیڈروجن ایندھن پر تحقیقاتی کاموں کا سلسلہ ملک کے کئی بڑے اداروں میں شروع ہو چکا ہے۔ ہمارے ملک کے سائنسداں اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ ایسی تکنالوجی دریافت کی جا سکے جس کی مدد سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے۔ سعودی عرب کے خام تیل کی صنعت میں اچانک زبردست اضافہ کا اعلان ہندوستان جیسے غریب ملک کے لیے ایک تشویشناک مسئلہ ہے: ظاہر ہے زرمبادلہ کی اتنی بڑی رقم خرچ کرنے سے کہیں زیادہ بہتر اور نفع بخش بات یہ ہے کہ ہائیڈروجن جیسے سستے ایندھن کے لیے تحقیقاتی کام بروئے کار لائے جائیں۔

بطور ایندھن ہائیڈروجن کی خصوصیات پر کئی ترقی یافتہ ممالک پہلے سے ایمان لائے ہوئے ہیں کیونکہ اب تک رائج سارے ہی ایندھنوں میں سے تقریباً ہر ایندھن کے جلنے کی خاص وجہ اس میں موجود ہائیڈروجن ہی ہے۔ یہ ہائیڈروجن یا تو دوسری ملاوٹوں سے دور آزاد طور پر ان ایندھنوں میں موجود رہتی ہے یا پھر دوسرے کیمیاوی مرکبات کے ساتھ مخلوط شدہ حالت میں پائی جاتی ہے، جیسے کہ کول گیس اور آئیل گیس میں ہائیڈروجن کی ایک بڑی مقدار موجود رہتی ہے۔ قدرتی گیس میں بھی ہائیڈروجن دوسرے مادوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئلہ، لکڑی اور مٹی کے تیل میں بھی ہائیڈروجن خاطر خواہ مقدار میں موجود رہتی ہے۔

دنیا کے کئی ملکوں میں اب ایسی گاڑیاں بنائی گئی ہیں یا پھر بنائی جا رہی ہیں جنکو ہائیڈروجن کی مدد سے چلایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مغربی جرمنی میں اب ایسی بسیں بہت عام ہو چکی ہیں جن کو چلانے کے لیے ہائیڈروجن کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جاپان، روس، امریکہ اور سوئٹزرلینڈ کے سائنسداں بھی ایسی گاڑیوں کے بنانے کے سلسلے میں کافی پُر امید ہیں۔ ہمارا ملک بھی ہائیڈروجن گاڑیوں کو بنانے کے سلسلے میں اب پیچھے نہیں ہے۔ گذشتہ سال کانپور کے انڈین انسٹیٹیوٹ آف ٹکنالوجی نے سوئٹزرلینڈ کی فیڈریشن آف ٹکنالوجی کے اشتراک سے ایک ایسی کار کا نمونہ تیار کر لیا ہے جو ہائیڈروجن گیس سے چلا کرے گی۔ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ جلد ہی دنیا میں ایسی کاریں بنانے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائے گا جس سے فضا آلودہ نہیں ہوگی۔ امید کی جاتی ہے کہ مستقبل قریب میں اس قسم کی کاریں سڑکوں پر چلتی پھرتی نظر آئیں گی۔ اس قسم کی کاروں کے لیے ہائیڈروجن گیس کی تیاری کا سازوسامان کار کے اندر ہی نصب ہوگا۔ عوام کے لیے یہ خبر خوش آئند ہے کہ پیٹرول کے مقابلے میں ہائیڈروجن سے کار چلانے کی لاگت آدھی رہے گی۔

جاپان جیسے ترقی یافتہ ملک نے بھی ہائیڈروجن کی افادیت کو سمجھتے ہوئے ہائیڈروجن کو صنعتی پیمانے پر بنانے کی پلاننگ کی ہے۔ جبکہ امریکہ کے سائنسدانوں کو اس بات کا یقین ہے کہ ہائیڈروجن توانائی کا ایک ایسا بہترین متبادل ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے جس کی مدد سے نہ صرف گاڑیوں کو چلایا جا سکتا ہے بلکہ گھروں اور دفتروں کو گرم رکھا جا سکتا ہے اور بجلی بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔ فی الحال ہائیڈروجن کے بطور ایندھن استعمال میں جو سب سے بڑی رکاوٹ درپیش ہے اس کا تعلق اس مادّے کو اسٹور کرنے کی دشواری سے ہے۔ فی الحال اس مادّے کو زیادہ درجۂ حرارت پر گیس کی شکل میں رکھا جاتا ہے یا پھر بہت کم درجۂ حرارت (صفر سے ۲۵۳ ڈگری نیچے) ۲۵۳- ڈگری سینٹی گریڈ پر اس کو رقیق کی صورت میں اسٹور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن رقیق کے ہائیڈروجن کو اسٹور کرنے میں جو دشواری درپیش ہے وہ یہ ہے کہ رقیق ہائیڈروجن میں دھماکہ ہو جانے کے امکانات رہتے ہیں۔ پچھلے بیس سال کے عرصہ میں ہائیڈروجن کو اسٹور کرنے کی ٹکنالوجی میں بھی خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے، نتیجہ کے طور پر اب ہائیڈروجن کی ہائیڈرائیڈ میٹل الائے Hydride Metal alloy نام کے غیر نامیاتی مادوں کے ساتھ بحفاظت اسٹور کیا [illegible] یہ مادّے ہائیڈروجن کو بالکل اسی طرح جذب کر لیتے ہیں جس طرح اسفنج پانی کو کرتا ہے۔ گرم کرنے پر ان مادوں سے جذب شدہ ہائیڈروجن بحفاظت حاصل کر لی جاتی ہے۔

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

Regd.No.D(DN)204
R.N.37032/81

Licensed U(DN)65 to post without pre-payment
at Civil Lines Post Office,Delhi- 110054

Vol.5No.12 YOJANA (URDU) 16-30 September 1985

ڈاکٹر احسان اللہ خاں

زرعی ترقی کا مختصر جائزہ

ہندوستان میں آزادی کے بعد یہ کوشش شروع ہوئی کہ ملک میں خوشحالی لائی جائے۔ اس لیے ہر شعبہ میں ترقی کا منصوبہ بنایا گیا مگر ابتدا میں صنعتی ترقی پر زور زیادہ دیا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں خوشحالی بڑھی مگر اس کے ساتھ ہی ۱۹۵۰-۶۰ کی مدت میں ملک میں انسانی آبادی تیزی سے بڑھنے لگی۔ مگر بڑھتی ہوئی غذائی ضرورت قدیم طریقہ کاشتکاری سے پوری نہیں کی جا سکتی تھی لیکن اتفاق سے ۱۹۵۰-۶۰ کی ابتدائی مدت میں امریکہ میں اناج کی پیداوار کافی بڑھ گئی تھی اور امریکہ کے لیے یہ مسئلہ ہو گیا تھا کہ کس طرح ایک طرف اس پیداوار کو برقرار رکھا جائے اور دوسری طرف کاشتکاروں کو ان کے اناج کی مناسب قیمت ادا کی جا سکے۔ لہٰذا اناج کی ایک کثیر مقدار ہر سال سمندر میں ڈال دی جاتی تھی تاکہ اناج کی قیمت گرنے سے بچائی جا سکے لیکن پھر امریکہ والوں نے یہ فیصلہ کیا کہ غریب ممالک کو زائد اناج کو کم قیمت پر فروخت کیا جائے تاکہ ایک طرف ان کی غربت دور [redacted] طرف ان کے زائد اناج برباد نہ ہو پائیں اور اس [redacted] یک قانون بنایا جو عوامی قانون نمبر پی۔ ایل۔ ۴۸۰ سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہندوستان نے ایک طرف اس قانون سے فائدہ اٹھاتے ہوئے برسوں تک سستی قیمت پر امریکہ سے اناج منگانا شروع کیا تاکہ فوری غذائی ضرورت کو پورا کیا جا سکے اور دوسری طرف جدید کاشتکاری کو اپنانے کی کوشش شروع کر دی جس کے لیے ضروری تھا کہ زرعی سائنسدانوں کو ترقی یافتہ ممالک میں تربیت دلائی جائے لہٰذا امریکہ میں بہت سے زرعی سائنسدانوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجا گیا اور وہاں کی زرعی تعلیم و تربیت کا گہرا مطالعہ کیا گیا پھر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ زرعی میدان میں تحقیق کے لیے ہونہار سائنسدانوں کی تقرری کی جائے اور ان کو انتظامی اختیارات عطا کیے جائیں اور اس قسم کا پہلا مؤثر قدم ۱۹۶۵ میں اٹھایا گیا پھر گیہوں، چاول، مکئی، باجرہ وغیرہ کے زیادہ پیداواری بیج کو درآمد کیا گیا۔ علاوہ ازیں دودھ، مچھلی اور انڈے کی پیداوار میں اضافہ کرنے کی غرض سے ترقی یافتہ ممالک سے زیادہ دودھ دینے والی گائیں، زیادہ انڈے دینے والی مرغیاں اور تیزی سے بڑھنے والی مچھلیاں درآمد کی گئیں اور بھینس کی دیکھ بھال میں بہتری پیدا کی گئی۔ اس طرح تقریباً ۱۹۷۰ میں ملک میں زرعی انقلاب کا زور شروع ہوا لیکن یہ اقدامات جلدی جلدی اٹھائے گئے تھے۔ لہٰذا انتظامی معاملات میں کچھ خامیاں اسی تیزی سے سرایت کر گئیں جس سے زرعی سائنسدانوں میں بے چینی بڑھنے لگی۔ ان خامیوں کو دور کرنے کی غرض سے ۱۹۷۲ میں دوسرا مؤثر قدم اٹھایا گیا اور اس طرح زرعی سائنسدانوں کو دوبارہ بہتر کام کرنے کے مواقع فراہم کیے گئے۔ علاوہ ازیں ہر صوبے میں کم از کم ایک زرعی یونیورسٹی قائم کی گئی تاکہ وہاں کے زرعی سائنسداں اپنے اپنے علاقوں کے مخصوص مسائل پر تحقیق کر کے زرعی پیداوار میں اضافہ کریں۔ تحقیق سے جو بہتر نتائج نکلتے ہیں ان کو کاشتکاروں کے کھیت میں کر کے دکھایا جاتا ہے تاکہ اس طرز پر کاشتکاری کریں علاوہ ازیں ہر سال مختلف علاقوں میں کاشتکاروں کے لیے میلہ لگایا جاتا ہے جہاں پر زیادہ پیداواری کھیت کاشتکاروں کو دکھایا جاتا ہے اور ان کے سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں۔

ہر ضلع میں زرعی سائنسداں کاشتکاروں کی رہنمائی کے لیے رکھے گئے ہیں۔ ہر سال ہر علاقے کے لیے زیادہ پیداواری بیج بروقت فراہم کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ زیادہ پیداواری بیج سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے لیے کیمیائی کھاد اور کیڑے مکوڑوں کو مارنے کے لیے کیمیائی دوائیں بروقت

(باقی صفحہ پر)

Published by the Director,PublicationsDivision,Patiala House,New Delhi-110001
Printed by A.J.Printers,5 Bahadur Shah Zafar Marg,New Delhi-110002

یوجنا

یکم تا ۱۵ ؍ اکتوبر ۱۹۸۵

ایک روپیہ

کرناٹک میں گاندھیائی طرز کا پنچایتی راج

(ایس. کے. ڈے)



علاقائی دیہاتی بینک

(پروفیسر آر. سی. بھٹناگر)

انڈین ٹیلیفون انڈسٹریز

دنیا ۔۔ [illegible]
[illegible] ملکوں [illegible] اگرچہ ٹیلی مواصلات [illegible] ترقی یافتہ ملکوں [illegible] تعداد [illegible] ترقی پذیر ملکوں میں ترقی [illegible] بہت حاصل ہے [illegible] ٹیلی مواصلات کا [illegible] ترقی پذیر ملکوں کی خدمات کو [illegible] کے لیے بھی کافی نہیں ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے [illegible] دنیا کی تین چوتھائی آبادی ایسے ممالک میں رہتی ہے جہاں سو افراد کے لیے ٹیلی فونوں کی تعداد دس [illegible] سے بھی کم ہے اور دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی ایسے ممالک میں رہتی ہے جہاں ایک سو افراد کے لیے ٹیلی فونوں کی تعداد ایک سے بھی کم ہے۔

ہندوستان میں شاید ٹیلی فونوں کی تعداد کی سطح دنیا میں سب سے کم ہے۔ یہاں ایک ہزار کی آبادی کے لیے ٹیلیفونوں کا اوسط تعداد ۳ ہے جبکہ ٹیلی فونوں کی فیصد افراد کے لیے عالمی اوسط ۱۰،۱۹ ہے۔ امریکہ میں ایک سو افراد کے لیے ٹیلی فونوں کی اوسط ۸۳، برطانیہ میں ۶۰،۹۴، سویڈن میں ۹۰،۵، اٹلی میں ۳۳،۷ اور فرانس میں ۵۴،۸ ہے۔ بھارت کے شہروں میں بھی ٹیلی فون سہولیات کی سطح دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں دستیاب ٹیلیفون خدمات کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ جہاں بھارت میں آبادی کے مقابلے میں بڑے شہروں میں ٹیلیفون خدمت کی تعداد کی اوسط ۳ فیصد ہے وہاں واشنگٹن میں یہ اوسط ۱۲،۷ فیصد، پیرس میں ۴۳،۸ اور لندن میں ۱۸،۱ فیصد ہے۔ اس مقابلے سے دوسرے امور کے علاوہ یہ پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں ٹیلیفون کا نظام سب سے کمزور ہے جس کے سبب تاروں کے بہت سے جال ایک ساتھ الجھے ہو جاتے ہیں۔ ٹیلیفون کرنے والوں کو نوٹ ملانے کے لیے بار بار کوشش کرنی پڑتی ہے۔ جھنجھلاہٹ ہوتی ہے اور چونکہ وہ اپنے متوقع معیار سے ٹھیک طور پر بروقت رابطہ قائم نہیں کر پاتے اس لیے ٹیلیفون نظام کے بارے میں ملک میں عام طور پر بے اطمینانی پائی جاتی ہے۔ ٹیلیفون کا انتظامیہ بھی اس صورت حال سے پوری طرح غیر مطمئن ہے چونکہ منجملہ دیگر امور کے ایک تو وہ ٹیلی فون کالز پر پوری طرح آمدنی حاصل نہیں کر سکتا اور دوسرے یہ کہ مواصلات کے اس جال میں کسی نہ کسی جگہ مقامات کا تنگ ہو جانے سے محکمہ اکثر خدمات انجام دینے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ آلات اور سازوسامان پرانے ہو گئے لیکن بہت حد تک غلط استعمال کے سبب اس کی اور زیادہ دیکھ بھال اور مرمت کی ضرورت ہے یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جب ٹیلیفون کی خدمت پر اس کی صلاحیت سے زیادہ بوجھ ڈال دیا جائے گا تو وہ لازماً ناکام ہو جائے گی۔ خدمات کی سطح کو نظام کی حالت خراب کئے بغیر برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہوگا کہ نظام کو چالو رکھنے کے لیے درکار زیادہ سے زیادہ ضروری سامان اس میں شامل کیا جائے۔ لیکن اس کے باوجود ایک ایسا مقام آ جائے گا جب محض ضرورت سے زیادہ دباؤ کی وجہ سے یہ سارا سلسلہ ٹھپ ہو جائے گا۔ ہمارے ملک میں ہم بڑی تیزی سے ایسی ہی صورت حال کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ اس مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ ٹیلی فونوں کی تعداد بڑھائی جائے جس کے لیے ضروری ہو جائے گا کہ ایکسچینجوں، بیرونی تاروں، مقامی تاروں کے جال، ترسیلی نظاموں اور اس سلسلے کے تمام رابطوں میں اضافہ کیا جائے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ جب ٹیلی فونوں کی تعداد میں شہری علاقوں میں ۱۲ فیصد اور دیہی علاقوں میں دو فیصد اضافہ ہو جائے گا تو بھیڑ بھاڑ کے اس ماحول میں ٹیلی فون کالوں کی جو غیر ضروری مانگ پیدا ہوتی ہے وہ انتظامیہ حد سے باہر نہیں ہوگی۔ اس بنا پر ملک میں اس وقت دو کروڑ ۸۰ لاکھ ٹیلی فونوں کی ضرورت ہے جبکہ اس وقت کل ۴۰ لاکھ ٹیلی فون لگے ہوئے ہیں:

بھارت کی آبادی	۷۰ کروڑ
شہری آبادی کا تناسب	۲۰ فیصد
شہری آبادی	۱۴ کروڑ
دیہی آبادی	۵۶ کروڑ
۱۲ فیصد شہری آبادی کے لیے درکار ٹیلی فون	ایک کروڑ ۶۸ لاکھ
دیہی آبادی کے لیے دو فیصد ٹیلی فون	ایک کروڑ ۱۲ لاکھ
کُل ٹیلی فون	۲ کروڑ ۸۰ لاکھ
موجودہ ٹیلیفونوں کی تعداد	۴۰ لاکھ

دو کروڑ ۸۰ لاکھ ٹیلیفونوں کے لیے دو کروڑ ۴۰ لاکھ لائنوں کی صلاحیت درکار ہوگی۔ انڈین ٹیلیفون انڈسٹریز جس نے سرکاری دائرہ کار کے پہلے ادارے کے طور پر ۱۹۴۸ء سے ٹیلیفون کا سازو سامان تیار کرنا شروع کیا تھا۔

(باقی کور ۳ پر)

اس شمارے میں

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر : آر۔ ٹھکرال

ایڈیٹر : لکھی رام رانا

اسسٹنٹ ایڈیٹر : محمد عادل صدیقی

سب ایڈیٹر : وسیم حیدر

جلد ۵ | یکم تا ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۵ | شمارہ ۱۳

۹ آشون تا ۲۳ آشون ۱۹۰۷ ؛ فون ۶۰۱۸۱۸

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے، ۲ سالہ ۳۵ روپے، سہ سالہ ۴۵ روپے

فی کاپی : ایک روپیہ

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :-

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین)
نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

بزنس منیجر : ایل۔ آر۔ بترہ ★ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) : آر۔ ایس۔ منجال

ترسیل زر کا پتہ : بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

دیہی ترقی کے چند اہم پہلو

دیہی معیشت کو مضبوط بنیادوں پر آگے بڑھانے میں دیہات کی مربوط ترقی کے جو پروگرام شروع کئے گئے تھے، ان کی رفتار ترقی کا وقتاً فوقتاً جائزہ لیا جاتا رہا ہے۔ یہ پروگرام ۷۹-۱۹۷۸ میں ملک کے پانچ ہزار سے زیادہ بلاکوں میں شروع کئے گئے تھے۔ ان کا مقصد دیہات کے غریب عوام کو فائدہ پہنچانا رہا ہے۔ چنانچہ اس اسکیم کے تحت جو مختلف پروگرام چلائے گئے، ان سے دیہات کے غریب عوام کو کثیر تعداد میں فائدہ تو ضرور ہوا مگر اُس حد تک نہیں جس حد تک کہ اس سے فائدہ اٹھانے کی اُمید کی گئی تھی۔ اس کا ثبوت اُن جائزوں سے ہوتا ہے جو کہ مختلف ریاستی اداروں، منصوبہ بندی کمیشن، اور دیگر خود مختار اداروں نے لیے ہیں۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ دیہات کی مربوط ترقی کی اسکیموں پر عمل درآمد کی نگرانی کا کام سست رہا اور پھر ان کو مالی امداد یا تو بروقت نہ مل سکی یا پھر ناکافی ملی۔ اس کے علاوہ اضافۂ آبادی، ناخواندگی، دیہی عوام میں احساسِ کمتری، اعتماد کی کمی اور امیر کسانوں کی وسائل پر گرفت کے سبب بھی دیہات سے غریبی دُور نہیں کی جا سکی۔ ایک طرف اس قدر بھیانک مسائل اور دوسری طرف ان پروگراموں کے عمل درآمد کی ذمہ داری گرام سیوک کی جانِ ناتواں کے کاندھوں پر۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ دیہات کی مربوط ترقی کے پروگراموں پر عمل درآمد اور ان کی منصوبہ بندی مربوط انداز میں عمل میں نہ آ سکی۔

ہندوستان میں دیہات کی مربوط ترقی کا تصور اجتماعی ترقی کے اُس پروگرام سے لیا گیا ہے جسے ۱۹۵۲ میں ۵۵ منتخبہ بلاکوں میں شروع کیا گیا تھا۔ اس پراجیکٹ کے تحت ہر بلاک کے ۳۰۰ دیہات کو فائدہ پہنچانے کا نشانہ رکھا گیا تھا۔ اس کے لیے ۶۵ لاکھ روپے کا بجٹ تھا۔ ۱۹۵۳ء میں ان بلاکوں میں نیشنل ایکسٹنشن سروس پروگرام چلائے گئے۔ یہ شروع میں تو ۱۰۰ دیہات کے لیے تھا اور ہر بلاک کے لیے ساڑھے چار لاکھ روپے دئے گئے تھے۔ اس کے بعد دیہات کی ترقی کے لیے متعدد پراجیکٹ وضع کئے گئے۔ مثال کے طور پر ہر ضلع میں کاشتکاری کی بھرپور ترقی کا پروگرام (TADP) خشک سالی کی زد میں آنے والے علاقوں کی ترقی کا پروگرام (DPAP) پہاڑی علاقوں کی ترقی کے پروگرام (HAD) قبائلی آبادی والے علاقوں کے پروگرام (TAD) ریگستانی علاقوں کی ترقی کے پروگرام (DDP) وغیرہ۔ کچھ پروگرام اس خیال کو سامنے رکھ کر شروع کئے گئے کہ اُن سے چھوٹے اور نادار کسانوں کو فائدہ ہو سکے۔ اس طرح کے طبقوں کو فائدہ پہنچانے کے خیال سے شروع کئے جانیوالے پروگراموں میں چھوٹے کسانوں کی ترقیاتی ایجنسی (SFDA) نادار کسانوں، زرعی مزدوروں کی ترقی سے متعلق ایجنسی (MFALDA) رعائتی شرح پر مالی امداد دینے کا پروگرام، سرمایہ کاری کے لیے سبسڈی دینے کا پروگرام اور بار برداری کے لیے امداد کا پروگرام بھی اس سلسلے کی کڑی ہیں۔ اب یہ تمام اسکیمیں دیہات کے مربوط ترقی کے پروگرام میں مدغم کر دی گئی ہیں۔ ۲ اکتوبر ۱۹۸۰ سے اس پروگرام کو بھرپور انداز میں آگے بڑھانے کی کوششیں جاری ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ دیہی عوام کو روزگار مل سکے اور غریب عوام کے لیے ایسے اثاثہ جات تیار ہو سکیں جو اُن کی غریبی دور کرنے میں معاون ہوں۔ دیہات کی ترقی کے مربوط پروگرام کو وسیع بنیادوں پر قرضہ دینے کی سہولتیں دینے کی کوششیں کی گئیں تاکہ جن لوگوں کو اس پروگرام سے فائدہ پہنچانا مقصود ہے، ان کی حالت میں سدھار آ سکے۔

چھٹے منصوبے میں، ۱۵ لاکھ کنبوں کی امداد دینے کے پروگرام کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ اس پروگرام کے تحت ہر بلاک میں اوسطاً ۳ ہزار کنبوں کو ۵ سال میں فائدہ پہنچانے کا نشانہ رکھا گیا تھا۔ ۸۱-۱۹۸۰ کے بعد ہر بلاک کی ترقی کے لیے ۳۵ لاکھ روپے کی رقم دی جا رہی ہے۔

یہاں ایک اہم سوال سامنے آتا ہے، وہ یہ کہ کیا مختلف اقتصادی سرگرمیوں کے لیے دئے گئے قرضے صحیح طور پر کام میں لائے گئے اور کیا اُن سے فائدہ اٹھانے والوں کی آمدنی فی الواقعی اُن سے بڑھی ہے۔ فائدہ اٹھانے والوں سے بات چیت کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمل درآمد کا ذمہ دار عملہ زیادہ تر مطلوبہ نشانوں کی تکمیل کی کوشش میں رہتا ہے۔ وہ اس بات پر کم ہی نظر رکھتا ہے کہ ان اسکیموں سے ہونیوالے فائدے سماج کے اُن کمزور ترین طبقات تک پہنچ سکیں جن کے لیے کہ وہ اسکیمیں تیار کی گئی ہیں۔ زراعت کی مد کے تحت جن کنبوں کو کیمیاوی کھادوں، جراثیم کش دواؤں، زمین کو ہموار بنانے، چھوٹے تالاب بنانے وغیرہ کے لیے مالی امداد دی گئی، وہ اُن قرضوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ یہ رقم اُن کو مستقل نوعیت کے فائدے نہیں پہنچا سکی۔ ان تمام اشیاء کا فائدہ اُسی وقت ہوتا ہے جبکہ وہاں آبرسانی کی سہولتوں کو یقینی بنا دیا جائے۔ مویشی پروری کی مد کے تحت دودھ دینے والے جانوروں، بھیڑوں اور بیلوں کی خرید کے لیے قرض دئے گئے۔ ہمارے یہاں چھوٹے اور مارجنل کسانوں کے قطعات اراضی کل قطعات اراضی کا ۷۰ فیصد سے زیادہ حصہ بنتے ہیں۔ ان سہولتوں سے قبل، ان کسانوں کو ساہوکاروں کی طرف دیکھنا پڑتا تھا۔ انھیں سے رقم لے کر وہ مویشی خریدتے تھے۔ لیکن اب دیہات کی مربوط ترقی کے پروگرام کے تحت غریب کسان بنکوں سے قرض لیکر بھینس، بکری، بیل وغیرہ خریدتے ہیں۔ اس حد تک یہ پروگرام یقیناً بیحد کامیاب ہے مگر دودھ اور دودھ کی مصنوعات کی فروخت کا کوئی باقاعدہ نظام نہ ہونے سے ان لوگوں کو سستے داموں پر مقامی لوگوں کو دودھ دینا پڑتا ہے۔

(ایڈیٹر)

ڈاکٹر مسعود جعفری

سبز کھاد کی ضرورت

اور اس کی اہمیت

زرعی تحقیق کے مطابق ملک کی مٹی کی بیشتر اقسام میں نائٹروجن اور نامیاتی مادے کی کمی ہے۔ ان علاقوں کے علاوہ جہاں جنگلات ہیں اور آب و ہوا مرطوب ہے، باقی علاقوں میں نامیاتی نائٹروجن کی مقدار قلیل ہے۔ چونکہ نائٹروجن پودوں کی نشو و نما میں مثل ریڑھ کی ہڈی کام کرتی ہے، لہٰذا اس کی کمی کو کیمیاوی کھاد جیسے امونیم سلفیٹ، یوریا یا ڈائی امونیم فاسفیٹ سے پورا کرتے ہیں۔ حالانکہ کیمیاوی کھاد کی ملک میں فراوانی ہے اور ملک کی ضرورت پوری ہو رہی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیمیاوی کھاد (فرٹیلائزر) کیا سبز کھاد یا گوبر کی دیسی کھاد کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ یہ بات تو قطعی درست ہے کہ دیسی کھاد میں کیمیاوی اجزا جیسے نائٹروجن، فاسفورس اور پوٹیشیم کی مقدار کیمیاوی کھاد کے مقابلہ میں قلیل ہے لیکن بلحاظ نامیاتی مادہ (Organic matter) یہ کیمیاوی فرٹیلائزر کسی بھی حالت میں دیسی کھاد یا سبز کھاد کا متبادل نہیں ہو سکتی ہیں۔ نامیاتی مادہ کسی بھی صورت میں چاہے گوبر کی دیسی کھاد ہو یا سبز کھاد، اپنی مقبولیت کو قائم کیے ہے۔ نامیاتی مادہ مٹی میں بوسیدہ ہو کر ایک کیمیاوی جز ہیومس (Humus) کو جنم دیتا ہے جو مٹی کی طبعی خصوصیات کا حامل ہے۔ مٹی کی زرخیزی (Productivity) کا انحصار کیمیاوی اجزا کے علاوہ اس کی طبعی خصوصیات پر بھی بہت منحصر ہے۔ نمی کو زیادہ عرصہ تک قائم رکھنا۔ درجۂ حرارت کو کم کرنا۔ ذرات کی ماہیت، حشرات الارض اور بیکٹریائی حیات کی پرورش اور کیمیاوی سالموں (Chemical Ions) کے تبادلہ میں نامیاتی مادہ ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ آیئے اب تجربات کی روشنی میں دیکھیں کہ سبز کھاد کھیتوں کی مٹی کو کیسے زرخیز بناتی ہے۔ جن دو دالوں والی فصلوں کو بطور سبز کھاد استعمال کیا جاتا ہے وہ دو قسم کی ہیں۔

۱۔ پہلی قسم جنھیں دالوں کے لیے بوتے ہیں جیسے اُرد، مونگ، ارہر وغیرہ۔ ۲۔ دوسری قسم جنھیں مویشیوں کے چارے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ جیسے برسیم اور لوبیا۔ ان کے علاوہ سن یا سنئی کو بوتے ہیں، اس سے ریشہ حاصل کیا جاتا ہے۔ ڈھینچہ کی کاشت ہریانہ اور پنجاب میں اوسر زمین کی اصلاح کے لیے کی جاتی ہے۔

کاشت کاری کے جدید طریقوں کے مطابق ان فصلوں کو مخلوط طور پر یا مخصوص نقدی فصل جیسے گیہوں، نیشکر وغیرہ سے قبل بوتے ہیں۔ جب ان کی جڑوں میں گانٹھیں بن جاتی ہیں (تقریباً دو تین ماہ بعد) تو پھلوں کو الگ کر لیتے ہیں اور باقی پودوں کو کھیتوں میں پلٹ دیا جاتا ہے۔ اس طرح پودوں کے باقیات گل سڑ کر مٹی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ جڑوں میں مخصوص قسم کے بیکٹریا پرورش پاتے ہیں۔ جن کا کردار کلیدی ہے۔ یہ بیکٹریا جڑوں کی گانٹھوں میں نائٹروجن جمع کرتے ہیں۔ جب سبز کھاد کو کھیتوں میں پلٹ دیا جاتا ہے تو نامیاتی نائٹروجن مٹی میں شامل ہو کر اس کی زرخیزی میں اضافہ کرتی ہے اس طرح آئندہ فصل جو سبز کھاد کے پلٹنے کے بعد بوئی جاتی ہے مستفید ہوتی ہے۔ تجربات سے دریافت ہوا ہے کہ لوبیا (Cowpea) کی کاشت سے مٹی میں نائٹروجن کی حسب ذیل مقدار کا اضافہ ہوا ہے۔

جدول - ۱

لوبیا پودے کا حصہ	خشک مادہ جو فی ہیکٹر لوبیا سے ملا (کلوگرام)	نائٹروجن کی فیصد تعداد پودے میں	نائٹروجن کی فی ہیکٹر مقدار
۱۔ تنہ	۱۳۰۳٫۱۳	۱٫۸۲۷	۲۳٫۸۱
۲۔ جڑ	۱۱۹٫۰	۱٫۳۳	۱٫۵۵
کل مقدار	۱۴۲۰٫۱۰	—	۲۵٫۳۶

نائٹروجن کی جو مقدار سبز کھاد سے ملتی ہے اس کا انحصار عام طور پر سبز کھاد کی پیداوار اور اس کی قسم پر ہے جیسا کہ ذیل کے جدول سے ظاہر ہے۔

جدول - ۲

مختلف قسم کی سبز کھاد والی فصلیں اور نائٹروجن کی مقدار جو ان سے دستیاب ہوتی ہے۔

نام فصل	پودے کا حصہ	وزن (کلوگرام) فی ہیکٹر	خشک وزن (کلوگرام) فی ہیکٹر	نائٹروجن فیصد	نائٹروجن کی کل مقدار کلوگرام فی ہیکٹر
۱۔ سن سنئی یا	تنہ	۷۹۴۷	۲۳۴۸	۱٫۷	۳۹٫۹۲
	جڑ	۲۲۴	۱۳۲	۱٫۰	۱٫۳۲
کل مقدار		۸۱۷۱	۲۴۸۰	—	۴۱٫۲۴
۲۔ لوبیا	تنہ	۳۲۴۸	۸۷۱	۲٫۱	۱۸٫۲۹
	جڑ	۱۴۴	۸۹	۱٫۷۲	۱٫۵۳
کل مقدار		۳۴۲۸	۹۸۰	—	۱۹٫۸۲
۳۔ مونگ	تنہ	۱۵۳	۵۴	۱٫۸	۰٫۹۷
	جڑ	۶	۳	۱٫۴	۰٫۰۴
کل مقدار		۱۵۹	۵۷	—	۱٫۰۱

سبز کھاد کے ذریعہ کیمیاوی فرٹیلائزر کی صلاحیت اور اس کی کارکردگی کو بہتر کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً نائٹروجن اور فاسفورس والی کھاد کو اگر سبز کھاد کے ساتھ ہی دے دیا جائے تو اس سے آئندہ فصلوں کو زیادہ فائدہ پہنچتا ہے۔ نیشکر (گنا) کی کاشت میں یہ فائدہ زیادہ نمایاں طور پر دیکھا گیا ہے۔

سبز کھاد کا استعمال اُوسر اور بنجر زمین کی اصلاح کے لیے بھی کیا گیا ہے۔ ڈھینچہ (دو دالوں والی سبز کھاد) مٹی کی درستگی کے لیے کئی مقامات پر استعمال کیا گیا ہے اور کافی تسلی بخش نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ ریگ آلود مٹی جس میں نامیاتی مادہ نہایت قلیل ہے اس کی زرخیزی اور طبعی ماہیت کو سبز کھاد کے ذریعہ بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ شور آلود مٹی کو (جہاں آبپاشی کے لیے مصفا پانی دستیاب ہے) اصلاح کے بعد سبز کھاد کے ذریعہ مزید اصلاح کر سکتے ہیں۔

مونگ، اُڑد، لوبیا اور سنئی کی سبز کھاد کو خریف کے موسم میں بوتے ہیں۔ جدید طریقہ کے مطابق انھیں منتخب فصلوں کے ساتھ ساتھ بھی بوتے ہیں۔ نقدی فصل جیسے نیشکر (گنا) کے کھیتوں میں بین القطار خالی جگہوں میں ان سبز کھادوں کو بہ آسانی بو سکتے ہیں۔ اس طریقے سے کم مدت میں دو فصلوں کی پیداوار ایک ساتھ مل سکتی ہے۔ یہ طریقہ کفایتی ہے اس سے کیمیاوی کھاد کی بچت بھی ہو سکتی ہے۔ لوبیا کو مویشیوں کے چارہ کے لیے استعمال کرتے ہیں یا پھر کاٹ کر کھیت کی مٹی میں ملا دیتے ہیں۔

تجربہ کی روشنی میں یہ بات ظاہر ہے کہ لوبیا کی کھیتی سے مٹی کی زرخیزی میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ ذیل کے اعداد سے پتہ چلتا ہے کہ کیمیاوی کھاد کے ساتھ اگر سبز کھاد بھی کھیتوں میں دی جائے تو مٹی کی زرخیزی میں قابل لحاظ اضافہ ہوتا ہے۔

سبز کھاد اور کیمیاوی فرٹیلائزر کا مٹی کی زرخیزی پر اثر (صفر سے ۱۵ سینٹی میٹر کی گہرائی تک)۔

۱۔ نائٹروجن، فاسفورس اور پوٹیشیم + کھاد۔ صرف سبز کھاد کی جڑیں استعمال کی گئیں۔
۲۔ نائٹروجن، فاسفورس اور پوٹیشیم۔
۳۔ نائٹروجن، فاسفورس اور پوٹیشیم سبز کھاد۔ فاسفورس سبز کھاد کو مٹی میں ملاتے وقت دیا گیا۔
۴۔ نائٹروجن، فاسفورس اور پوٹیشیم سبز کھاد۔ صرف تنہ استعمال کیا گیا۔
۵۔ نائٹروجن اور پوٹیشیم سبز کھاد جڑ اور تنہ دونوں استعمال کیا گیا۔
۶۔ نائٹروجن، فاسفورس اور پوٹیشیم سبز کھاد۔ جڑ اور تنہ دونوں فاسفورس کی آمیزش، سبز کھاد کو بوتے وقت کی گئی۔

جدول — ۳

نائٹروجن	فاسفورس	پوٹیشیم
زرخیزی سے متعلق کیمیاوی اجزاء کلوگرام فی ہیکٹر		
۴۳۲	۵۸٫۳	۲۷۸٫۸
۳۱۶	۵۴٫۸	۲۴۶٫۱
۴۴۲	۵۵٫۳	۲۴۸٫۳
۳۷۴	۵۶٫۹	۲۴۹٫۷
۵۰۳	۳۶٫۶	۲۴۸٫۳
۵۷۷	۷۵٫۹	۲۵۰٫۵

اس سلسلے میں مزید معلومات کے لیے زرعی تجربہ گاہوں اور زرعی اداروں کو رجوع کر سکتے ہیں۔ ●

یوجنا نئی دہلی

ایس. کے. ڈے

کرناٹک میں گاندھیائی طرز کا پنچائتی راج

شری ایس. کے. ڈے نے حال ہی میں کرناٹک کا دورہ کیا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ ترقیاتی عمل میں عوامی شرکت کس حد تک دیکھنے کو ملتی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کیوں؟ پنچائتی راج سے متعلق کرناٹک میں حال ہی میں جو قانون بنایا گیا ہے، اس پر عمل درآمد کی روشنی میں اس بات کا جائزہ لینا ضروری تھا کہ عوام کو ان میں کس حد تک شامل کیا گیا ہے۔ مصنف کی نگاہ میں بھارت میں اب تک عوام کو اختیارات، ذمہ داریوں اور وسائل کی منتقلی کی جو بھی کوششیں کی گئی ہیں، ان میں یہ کوشش سب سے بڑی اور سب سے اوّل کہی جا سکتی ہے۔ انھوں نے پنڈت نہرو کا قول دُہرایا کہ کوئی بھی سماج صحت مند طریقے پر اسی وقت آگے بڑھ سکتا ہے جبکہ قومی نظام کی ہر کڑی سیاسی جمہوریت سے لیس کر دی گئی ہو۔ اس مضمون میں پنچائتی راج سے متعلق قانون کی چند اہم باتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنف نے وزیراعظم کے اس اعلان کا خیر مقدم کیا ہے کہ ملک میں پنچائتی راج کو مستحکم بنایا جائے گا۔

زمانۂ حال، زمانۂ ماضی کی بنیادوں پر قائم ہوا ہے۔ یہ ماضی کی تمام روشنیوں اور اس کی تمام تاریکیوں کو لے کر جلوہ گر ہوا ہے۔ مستقبل کا انحصار حال کی کارگزاری پر ہے، آج کے کارنامے اور حال کی کوششیں مستقبل کی تعمیر کی ضامن ہیں۔ تاریخ واقعات کے تسلسل کا نام ہے۔ ہندوستان میں میسور، ٹراونکور اور کوچین کی سابق ریاستیں نمایاں طور پر مختلف رہی ہیں۔ ان کی معیشت، انتظام، ثقافت، طرزِ بود و باش برطانوی دور کی ... بھارتی ریاستوں میں قطعی مختلف تھی۔ یہاں کا منتظمہ اور یہاں کے عوام دیگر مقامات خاص کر شمال میں آریہ ورت کے رہنے والوں سے قطعی مختلف تھے۔ حصولِ آزادی کے بعد یہ تینوں ریاستیں وقت کے پیمانے پر بہت آگے تھیں۔ ریاستوں کی تشکیلِ نو کے عمل نے ان میں نہ صرف رقبے کے لحاظ سے توسیع کی بلکہ اس کے ذریعے ان میں قوتِ عمل بھی ابھری۔ میسور کو کرناٹک تک بڑھا دیا گیا۔ یہ اُن باقی دو ریاستوں کے مقابلے ایک نمایاں چھتری کی صورت میں تھی جو کہ اس وقت کیرالہ کی نئی ریاست میں مدغم ہو گئی تھیں۔

سرزمینِ کرناٹک اور یہاں کے عوام

راجہ مہاراجہ کی حکومت کے دور میں اگرچہ اوپر کی سطح پر دادودہش اور فراخدلی کا ثبوت ملتا تھا لیکن اس کے سبب ایک زمیندار طبقہ اور ایک امیر طبقہ معرضِ وجود میں آیا۔ چنانچہ زمینداری نظام میں جمہوریت کی بات عجیب سی لگتی تھی۔ کرناٹک تک توسیع ہو جانے کے بعد بھی یہاں یہی صورتحال تھی۔ ایک ایسا سماج جو اپنی ثقافت اور اپنی امارت میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہو، خود کو رجواڑوں کے نظام سے نکال کر جمہوری نظام میں موزوں کرنے میں دشواری محسوس کر رہا تھا۔ یکایک کرناٹک کی تاریخ میں ایک اہم موڑ آیا۔ مسٹر نجلنگپا یہاں کے وزیراعلیٰ بنے اور رام کرشن ہیگڑے بھی لکھنؤ یونیورسٹی سے فارغ ہو کر سیاست میں آ چکے تھے۔ موصوف اجتماعی ترقی، پنچائتی راج اور کوآپریشن کے محکمے کے وزیر تھے۔

وزیراعظم شری جواہر لال نہرو نے ایک کانفرنس کا افتتاح کیا، اس کا موضوع تھا سابقہ دور کا پنچائتی راج، یہ دیہات اور تعلقہ کی پنچائتوں کی طرف سے بلائی گئی تھی۔ یہ اجتماع لال باغ میں ہوا تھا۔ اس موقع پر شری نہرو نے جو تقریر کی اس سے ایسا واضح ہوتا تھا کہ وہ ایک مشترک عظیم ذمہ داری میں سب کو شریک کرنا چاہتے تھے۔ لیکن انھوں نے اب سے بیس برس سے بھی زیادہ پہلے جو کچھ کہا تھا، وہ اُن کی دور اندیشی اور بصیرت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ تاریخ کیا بتاتی ہے اور عصرِ حاضر کے کیا تقاضے ہیں، اس کا اظہار ان کی تقریر سے بخوبی ہوتا تھا۔

نہرو جی کے خیالات کا نچوڑ اور خلاصہ بیان پیش کیا جا سکتا ہے۔ مجھے یہ فخر حاصل رہا ہے کہ میں نے ان خیالات سے استفادہ کیا ہے۔ شری نہرو اس بات پر زور دیتے تھے کہ ہمارا یہ ملک جغرافیائی اعتبار سے نادر الوجود ہے۔ اس کی تاریخ اور اس کا سماجی تانا بانا بھی عجیب ہے۔ بظاہر ترقی سے مراد یہی لی جاتی ہے کہ مادی وسائل کو فروغ حاصل ہو اور ایسی سہولیات میسر آئیں جن سے عوام کا طرزِ زندگی بلند ہو سکے لیکن قوموں کی تاریخ بتاتی ہے کہ عوام کی خود اعتمادی، ان کا کردار، ان کی صلاحیت و مہارت جس کا اظہار وہ اپنے نظم و نسق کے ذریعے کرتے ہیں، وہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کردار انفرادی اور اجتماعی ہر دو حالتوں میں اپنی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر عوام کی سطح پر اتفاقِ رائے سے ضرورتوں کی تکمیل اور وسائل کی فراہمی کی کوشش کی جاتی ہے تو اس قوم کی اعلیٰ اقدار فروغ پاتی ہیں اور ان کی کوششیں کامیاب ہوتی ہیں۔ اوپر اٹھنے کی اُن کی صلاحیتوں سے درجہ بدرجہ کام لیا جاتا ہے اور من حیث القوم ان سے سب کو فائدہ پہنچتا ہے۔ عوام کی اعلیٰ اقدار اور ان کے اعلیٰ درجات ہی قوم کو بڑا بنا دیتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ محض چند افراد کے کردار کی بلندی، خواہ وہ لوگ کتنے ہی بلند قامت کیوں نہ ہوں، قوم کو اونچا اٹھا دے۔

نہرو اور پنچایتی راج

شری نہرو نے کہا کہ قومی زندگی کے ہر موڑ پر سیاسی جمہوریت کے ذریعے سے ہی سماج اوپر اٹھ سکتا ہے۔ یہی تصور پنچایتی راج کے پسِ پردہ کارفرما ہے۔ اس کے بغیر جمہوریت پنپ نہیں سکتی اور استحکام نہیں پا سکتی۔ اقتصادی جمہوریت پبلک سیکٹر اور پرائیویٹ سیکٹر کے درمیان توازن رکھتی ہے۔ اسے وہ سہکاری سماج سے تعبیر کرتے تھے۔ یہ عوام کی روزمرّہ کی ضرورتوں کی تکمیل سے تعلق رکھتا ہے۔ قرضہ، اشیا کی فروخت، درجہ بندی، ذخیرہ بندی، صارفین کی ضرورتوں کی تکمیل، یہ سب سرگرمیاں دیہی سطح سے لے کر قومی سطح تک آپس میں مربوط انداز میں آگے بڑھتی ہیں۔ سماج میں ایک طبقہ وہ ہے جسے خوشحالی اور تمام سہولتیں میسر ہیں، دوسرے وہ جو محرومیوں کا شکار ہے۔ ان دونوں کے درمیان فرق بڑھتا جا رہا ہے۔ نہرو جی تیسرے نئے طریقۂ کار یا تیسرے نئے عمل کو سوشلسٹ ڈیولپمنٹ یا اجتماعی ترقی کا نام دیتے تھے۔ اس میں محروم افراد کی ترقی پر زیادہ زور دینے کی بات کہی گئی تھی۔ سیاسی، اقتصادی، اور سماجی حالات کا تقاضہ یہ تھا کہ سماج کو ایک طرف اٹھایا جائے اور دوسری طرف انھیں زیادہ امیر بننے سے روکا جائے۔ یہ سب عمل تشدد کے راستے سے یا کسی کی طرف برائی کی نیت سے نہیں بلکہ آزادانہ اور پُر امن طریقے پر آگے بڑھنے پر زور دیا گیا۔ اچھی سرکار وہی سمجھی جاتی ہے جو انسانوں کو آگے بڑھانے میں مدد دے۔ سرکار کی ذمہ داریوں میں اس عمل کی انجام دہی کے لیے اضافہ ہوتا ہے اور وہ تحقیق، تربیت، پروگراموں کی رفتارِ ترقی اور بحیثیت مجموعی منصوبہ بندی پر زور دیتا ہے۔ یہ انسانی اور مادی وسائل میں ربط قائم کرتی ہے اور ان سے عوام کی خدمت کے جذبے کے تحت بھرپور کام لینے پر زور دیتی ہے۔ اس تمام عمل میں وہ تصنیع کے عنصر پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہے۔ ہم میں ابھی تک جاگیردارانہ ذہنیت کارفرما ہے، یہ ایک تلخ حقیقت ہے مگر یہ بات اپنی جگہ سچ ہے۔

نیا قانون

سابق میں غیر منقسم کانگریس پارٹی کرناٹک میں برسرِ اقتدار تھی۔ مسٹر ہیگڑے کو، چوں کہ وہ نہرو کے بنیادی مشن کے پورا کرنے کے لیے وزیر کی حیثیت سے عہدہ سنبھالے تھے، قانون ساز اسمبلی نے کہا کہ وہ پنچایتی راج پر ایک قانون وضع کریں جو ضلع کی سطح سے لے کر گاؤں کی سطح تک ہو۔ اس وقت کے حالات کے پیشِ نظر یہ مسودہ مکمل کر لیا گیا لیکن اسے منظوری حاصل نہیں ہوئی۔ لیکن ہیگڑے کے من سے پنچایتی راج کا تصور نہیں نکلا۔ اس کے بعد تاریخی نوعیت کے دیگر واقعات ظہور پذیر ہوئے مثلاً کرناٹک میں کانگریس کا جو اجلاس ہوا، اس میں وہ دو حصوں میں بٹ گئی۔ ۱۹۷۷ء میں مرکز میں جنتا پارٹی کا اقتدار آیا جبکہ اس سے قبل ایمرجنسی لگ چکی تھی۔ پارٹی کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے مسٹر ہیگڑے نے پیش قدمی دکھائی اور جنتا سرکار نے اشوک مہتہ کمیٹی سے پنچایتی راج کے نظام کا جائزہ لینے کو کہا اور نئے تقاضوں کے مطابق اس نظام کو ڈھالنے کے لیے سفارشیں کرنے کو کہا۔ یہ رپورٹ آئی ضرور لیکن پارلیمنٹ میں کبھی پیش نہیں کی جا سکی۔ مرکز میں جنتا سرکار ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد لفظ و عمل کے قلابازیوں کا دور آیا اور پھر آخر میں راجیو گاندھی کی سرکار آئی۔ کرناٹک میں جنتا پارٹی کا راج ہوا۔ مسٹر ہیگڑے وزیر اعلیٰ بنے۔ پنچایتی راج پر ایک نیا قانون بنا جسے قانون ساز ریاستی اداروں کی منظوری ملی۔ ایک سال بعد صدر جمہوریہ ہند کی مرضی حاصل کرنے کے بعد یہ قانون بن گیا۔ اس قانون کی رُو سے دیہی عوام کو اختیارات کی منتقلی جس انداز پر کی گئی ہے، اس کی مثال بھارت میں مشکل ہی سے ملے گی۔ اس پر عمل درآمد کے ذریعے ایک انقلابی دور کا آغاز ہونے والا ہے۔ ہیگڑے سرکار کو قانون ساز اداروں میں ٹھوس اکثریت حاصل ہے۔ سورگیہ ڈاکٹر وسویشور ایا نے انتظامیہ اور ترقی کے جس عمل کو نئی سمتیں بخشیں، وہ آج بھی بخوبی یاد کی جا رہی ہیں۔ ریاست نے انتظامی اور سائنس، ٹکنالوجی، مواصلات اور ترقی کا ایک ایسا بنیادی ڈھانچہ تیار کیا جو آنے والی نسلیں یاد کرتی رہیں گی۔ حصولِ آزادی کے بعد جو تاریخ ساز قدم اٹھائے گئے جو زیادہ تر سیاسی نوعیت کے تھے، اس ڈھانچے کی بنیادوں کو [illegible] ریاست

اب بھی باقی ریاستوں سے آگے ہے۔ اس حقیقت کو آنکھوں سے دیکھ کر ہی یقین آسکتا ہے۔ پنچایتی راج کے ذریعے مکمل انحصاری سے مکمل خود اعتمادی اور خود انحصاری تک پہونچنے کے جو مراحل یہاں طے کیے گئے ہیں، ان کی مثال مشکل ہی سے ملیگی۔

قدرت کے تحائف اور ان سے استفادہ

کرناٹک کے لوگ خواہ ان کا سیاسی اقتداری مرتبہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، بولنے، بات چیت کرنے، گفتگو کرنے میں بڑے دھیمے اور میٹھے ہوتے ہیں۔ ان کے آداب اور طرز معاشرت خوش اخلاقی کا مظہر ہے۔ مجھے ایک پندرہواڑے کے دوران یہاں کی گلیوں میں گھومنے کا اتفاق ہوا اور مجھے کہیں گالی گلوج وغیرہ کا کوئی منظر دیکھنے کو نہیں ملا۔ اس ریاست میں موسم خوشگوار رہتا ہے، ساحلی خطوں کو چھوڑ کر باقی علاقہ پُر فضا ہے۔ تہذیب اور ثقافت ان کو ورثے میں ملی ہے۔ یہاں کے جغرافیائی اور معاشی حالات بہت سے معدنی ذخائر کا مخزن ہیں۔ یہاں ہر طرف سرسبزی اور ہریالی ہے۔ یہاں کے جغرافیائی حالات زراعت، باغبانی، مویشی پروری، بھیڑ پالنے، ریشم کے کیڑے پلنے، خوشبودار اگر بتیاں، دھوپ بتیاں تیار کرنے وغیرہ کے لیے سازگار ہیں۔ یہاں کے قدرتی مناظر انتہائی حسین اور دلفریب ہیں، یہ جنت نگاہ اور فردوس گوش ہیں۔ یہاں کے عوام اور ان کے سابق حکمراں قدرت کے ساتھ ہم آہنگی کے لیے نمایاں مقام پائے ہوئے ہیں۔ اس لیے یہاں کا کلاسیکی سنگیت، پورے جنوبی ہندوستان کی ضامن ہے۔

نئے خدوخال

سوال یہ ہے کہ قدرت کی اس فیاضی سے انسانوں کی خدمت کا کام کیسے لیا جائے، ان میں جانوروں کی پرورش گاہیں اور پناہ گاہیں بھی قابل ذکر ہیں۔ یہاں کے عوام مناسب تجارت سے ان تمام باتوں کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ چنانچہ پنچایتی راج اس ریاست کے اس سوال کو بڑی حد تک حل کر سکیگا۔

اس کے ذریعے ریاستی عوام میں بیداری لائی جا سکے گی اور سیاست، اقتصادیات اور سماجی سائنس میں ایک نیا انداز نظر اختیار کیا جا سکے گا۔ اس کے ذریعے ریاستی صدر مقام سے لے کر دور دراز مقامات پر واقع چھوٹے چھوٹے گاؤں تک انتظامیہ کی ایک ہی لائن بن سکے گی۔ اور عوام کے منتخب نمائندوں اور ایک مربوط نظام سے اسے مضبوط بنایا جائیگا۔ اس قانون کی رُو سے ترقیاتی معاملات میں ضلع پریشد کو جملہ اختیارات منتقل کر دئے جائیں گے۔ متعلقہ ضلع کے ایم۔ ایل اے اور ایم۔ پی اس کی سربراہی کریں گے۔ اس میں عوام کی طرف سے براہ راست چُنے گئے ارکان شامل ہوں گے۔ ہر حلقۂ انتخاب کے تقریباً ۳۵ ہزار افراد ان نمائندوں کا انتخاب کریں گے البتہ وہ علاقے جہاں آبادی خال، خال ہے، وہاں اس طرح کے انتخاب کی گنجائش نہ ہوگی۔ اس کے صدر اور نائب صدر کو بالترتیب وزیر ریاست اور نائب وزیر کا مرتبہ حاصل ہوگا، اور اس کے مطابق تنخواہیں اور دیگر بھتے ملیں گے۔ ان کی مدد کے لیے ایک چیف سکریٹری ہوگا جس کا مرتبہ ڈپٹی کمشنر کا ہوگا۔ ترقیاتی کاموں سے وابستہ تمام محکمے اپنے عملے، اداروں اور وسائل سمیت پریشد کے لیے کام کریں گے۔ اس کی مدد کے لیے کچھ کمیٹیاں قائم کر دی جائیں گی۔ ان میں فیصلہ کرنے والے تمام اداروں کے ماہرین بطور ارکان شامل کئے جائیں گے۔ پنجسالہ منصوبے کے تحت ہر ضلع کے لیے ہر سال سالانہ رقم مخصوص کر دی جائے گی۔ اس کے علاوہ ان کے لیے ایک خصوصی معاون فنڈ بھی ہوگا جسے وہ اپنی مرضی سے خرچ کر سکیں گے۔ مختلف شعبوں میں ان کو ٹیکس لگانے کا اختیار ہوگا۔ ٹیکس کی رقوم سے نیز عوامی عطیات سے، وسائل میں اضافہ کیا جائے گا۔ تاکہ لوگوں کی ضرورتیں پوری کی جا سکیں۔

ضلع پریشد کے طریقے پر منڈل پریشد بھی .... اس میں ۲۵ ہزار آبادی کے لیے استفادے کی گنجائش ہے۔ البتہ پسماندہ علاقے یا قبائلی آبادی والے یا شیڈولڈ ذاتوں والے علاقے میں ۲۵ ہزار کی آبادی کو ہی فائدے کے لیے چُنا جاتا ہے۔ ۱۹، اضلاع کے ۱۷۵ تعلقہ میں اب ۳ ہزار منڈل پنچائتیں ہیں جبکہ پہلے ریاست میں ۸۰۰۰ دیہی پنچائتیں تھیں جن کے پاس کام کرنے کے وسائل نہ ہونے کے باعث وہ کمزور سمجھی جاتی تھیں۔ اس وقت دیہات کی ۳ کروڑ آبادی کو فائدہ پہنچانے کا پروگرام ہے۔ عوام کی بہبود کے لیے سبھی شعبوں کو ان کے دائرہ کار میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ پنچائتیں اپنا پروگرام خود بھی وضع کرتی ہیں۔ ضلع پریشد بھی ان کے لیے پروگرام بناتی ہیں۔ پنچائتیں کچھ مزید پروگراموں کے لیے خصوصی فنڈ قائم کر سکتی ہیں۔ وہ ٹیکس لگا سکتی ہیں، اور رضا کارانہ طور پر چندہ کر سکتی ہیں۔ منڈل پنچایت کے صدر اور نائب صدر کے لیے ضروری ہے کہ گرام سبھا کی سال میں کم سے کم دو میٹنگ بلائی جائیں۔ منڈل پنچائت کو آئندہ سال کے لیے پروگرام وضع کرنے ہوتے ہیں۔ اور پہلے سے جاری سرگرمیوں کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔ ضلع پریشد آئندہ کے پروگرام وضع کرتے وقت اس طرح کے جائزوں کو سامنے رکھتا ہے۔ ان کو سامنے رکھ کر ہی مستقبل کی منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔

تعلقہ پنچایت کو ہٹاکر اب تعلقہ پنچایت سمیتی کا نام دیا گیا ہے۔ یہ اُس علاقے کے ضلع پریشد کے ارکان پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس میں دس سے لے کر ۱۵ ممبر ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ پانچ ارکان شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب نیز تعلقہ کی عورتوں کی طرف سے ہوتے ہیں۔ تعلقہ کے مختلف منڈل تبادلۂ خیال سے اپنے پروگراموں کو جاندار بناتے ہیں۔ تعلقہ کی سطح پر موجود تکنیکی اداروں سے تال میل قائم کیا جاتا ہے۔ بلاک ڈیولپمنٹ افسر تعلقہ کے متفرق کام اور پبلک ریلیشنز کی ذمہ داریاں

سمجھا جاتا ہے۔ اب اس کا نام تعلقہ ڈیولپمنٹ افسر کر دیا جائے گا۔

عورتوں کی سرگرم شرکت

جہاں تک سرکاری سماج کا تعلق ہے ان کے لیے قانون اور ادارے تو ضرور ہیں لیکن ان کی کارکردگی اچھی نہیں۔ کرناٹک میں پنچایت راج نظام کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ ضلع پریشد اور منڈل پنچایت میں چوتھائی نشستیں عورتوں کے لیے ہیں۔ اب تک دنیا میں کسی بھی ریاست میں اس طرح کی نمائندگی نہیں دی جاسکتی ہے۔ وقت بتائے گا کہ یہ اقدام عورتوں اور مردوں کے درمیان نابرابری دُور کرنے میں کس حد تک معاون ثابت ہوگا۔ جمہوری نظام میں مردوں اور عورتوں کو مساوی درجہ دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ دیہی ترقی کے محکمے کے وزیر مقامی آبادی کو اس کے لیے تیار کریں گے کہ وہ نظام کار چلاسکیں۔ کھاتوں کی جانچ لگا ہے بنگا ہے ان کی جانچ، خواہ وہ انفرادی معاملوں میں ہو یا کوآپریٹو معاملات میں، ضروری ہے اور وہ ایسے اداروں کو سونپی جاتی ہے، جو محکمہ کے تابع نہ ہوں۔ پنچایتی راج سے ایک مشاورتی کمیٹی متعلق کر دی گئی ہے۔ اس میں قانون ساز اداروں میں شامل سبھی پارٹیوں کے ارکان ہوں گے۔ ڈپٹی کمشنر کا عہدہ پھر سے چالو کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ یہ پنچایتی راج نظام کا سب سے بڑا افسر ہوگا۔ ریاستی صدر مقام سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے دیہات کا پنچایتی نظام اسی کے ماتحت ہوگا۔ ریاستی صدر مقام پر ٹکنالوجی اور توسیعی خدمات کے محکمے کے انچارج عام انتظامیہ سے نکل کر انھیں کے تابع ہوں گے۔ ان کے سامنے تکنیکی تحقیق اور نگرانی کے زیادہ مواقع ہوں گے۔ وہ مسائل کا عملی حل تلاش کرنے کا موقع پاسکیں گے۔ کرناٹک ریاست کے ہر محکمے میں اعلیٰ صلاحیت کا تکنیکی عملہ ہے اور اس معاملے میں وہ کسی سے کم نہیں ہے۔ اس کے باوجود اراضی سے حاصل ہونیوالی پیداوار مقابلتاً کم پاکر افسوس ہوتا ہے۔ سینکڑوں سال پرانے تالابوں اور اسی طرح پرانی جھیلوں وغیرہ کی صفائی کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔ ان سب کی تعداد ۲۰ ہزار سے زیادہ ہے۔

تخلیقی صلاحیتوں کی جانب

کرناٹک میں تغذیہ بخش خوراک کی پیداوار بڑھانے کے کثیر امکانات ہیں۔ اس سے پورے بھارت کو سال بھر جزوی مقدار میں خوراکی اشیا کی فراہمی ہوسکتی ہے۔ چنانچہ پنچایتی راج سے متعلق تازہ ترین قانون اس طرح کے تخلیقی کاموں اور پیداوار کی صلاحیتوں کے بڑھانے میں معاون ثابت ہوگا۔ یہ ریاست ۱۹ اضلاع اور ۱۷۵ تعلقہ میں بٹی ہے۔ یہاں کے ۲۷ ہزار دیہات میں تین ہزار منڈل پنچایتیں ہیں۔ وسویشورایا کی کوششوں کی بدولت اس ریاست میں تکنیکی عملے کی کمی نہیں رہی ہے۔ منڈلوں کی کوششوں سے دیہات میں بجلی پہنچائی گئی ہے۔ زراعت، باغبانی اور ریشم کے کیڑے پالنے وغیرہ کاموں میں کافی پیش رفت پہلے ہی ہو چکی ہے۔ اسکے علاوہ کورڈ اسٹوریج پراسیسنگ، پھلوں اور نایاب سبزیوں کی ڈبہ بندی سے یہاں کے عوام کو روزگار کے مختلف مواقع مل سکے ہیں۔ یہ سامان دیگر ریاستوں میں بھی جاتا ہے، عمارتی لکڑی وغیرہ نے بھی یہاں کے لوگوں کے سامنے روزگار کے مختلف مواقع پیش کئے ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کا سہارا لیکر زراعت پر مبنی مختلف صنعتوں کو دیہات میں گھر گھر عام کیا جا سکتا ہے۔ کرناٹک میں بے روزگاری اور ناقص غذائیں جرم کا درجہ رکھتی ہیں۔ شری نہرو نے ہندوستان کی ترقی کا جو نقشہ ذہن میں بنایا تھا، اسکے آغاز کیلئے کرناٹک بہترین ریاست ہے۔ ●

بقیہ: دولت کی غیر مساوی تقسیم

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس جانب سرکار کیا اقدامات کر رہی ہے اور اس مسئلہ کی نوعیت پر ان اقدامات کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں، بھارت کی سابق پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی کے بیس نکاتی پروگرام کے تحت خاص طور سے اس بات پر بھی دھیان دیا گیا ہے کہ دولت کی مساوی تقسیم ہو اور ملک کی ترقی کا فائدہ تمام لوگوں کو ان کی صلاحیت کے مطابق پہنچے۔ اسکے لیے مقروض لوگوں کو قرض سے نجات دلانے کے علاوہ بندھوا مزدوروں کو بھی آزاد کرایا گیا ہے۔ دیہی علاقوں میں بینک قائم کر کے غریب کسانوں کو کم دَر پر قرض دلایا گیا ہے جس سے پیداوار میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ قیمتوں میں کمی کر کے کسان اور مزدوروں کو راحت دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو کسان غریب ہیں اور جن کے پاس ذاتی زمین نہیں ہے ان کے لیے زمین فراہم کی گئی ہے۔ بھتے خوروں، اسمگلروں، ملک دشمن عناصر کے خلاف جہاد کر کے انھیں ختم کرنیکی کوشش کی جارہی ہے۔

ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے۔ یہاں کے زیادہ آبادی گاؤں میں رہتی اور کھیتی باڑی کرتی ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اب بھی تقریباً ۲۰ فیصد لوگوں کے پاس اپنی ذاتی زمین نہیں ہے۔ بیس نکاتی پروگرام کے تحت زمین کو سدھارنے کے ساتھ ساتھ ضرورت مندوں کو ان کی ضرورت کے مطابق زمین بھی مہیا کرائی جارہی ہے اور امید ہے کہ آنے والے وقت میں عنقریب ہمارے ملک میں کوئی بھی کسان ایسا نہیں رہے گا جس کی اپنی زمین نہ ہو۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم کی ایک وجہ یہاں کے لوگوں کے غلط سلط رسم ورواج بھی رہے ہیں۔ شادی بیاہ، موت ومیت میں ہمارے ملک میں دولت کو بری طرح بہایا جاتا ہے جس سے یہاں کی غریب آبادی مقروض ہو جاتی ہے۔ لہٰذا سرکار نے صوبائی حکومتوں کو احکامات دیے ہیں کہ ہر اس جائز طریقے کا استعمال کریں جس سے یہ رسوم کم سے کم ہو سکیں۔ اسی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کئی صوبوں میں کچھ پابندیاں بھی عائد کی گئی ہیں۔ مثلاً جہیز پر، شادی اور موت کے کھانوں وغیرہ پر۔ ان تمام انتظامات کے باوجود ہمارے ملک میں دولت کا امتیاز بدقسمتی سے آج بھی باقی ہے۔ اس میں قصور صرف سرکار ہی کا نہیں بلکہ عوام کا بھی ہے اور خاص طور سے ان لوگوں کا جو اس امتیاز کو بڑھاوا دے رہے ہیں۔ ●

پروفیسر آر. سی. بھٹناگر

علاقائی دیہاتی بینک

ملک کی آزادی کے بعد کھیتی کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے یہ محسوس کیا گیا کہ کوآپریٹیو سوسائٹیوں کے ساتھ ساتھ تجارتی بینکوں کو بھی کسانوں کی مالی ضرورتوں کو پورا کرنے میں اہم کردار ادا کرنا ہوگا۔ یہی سوچ کر ۱۹۶۹ میں ملک کے ۱۴ بڑے تجارتی بینکوں کو سرکار نے اپنے کنٹرول میں لانے کے لیے اُن کو قومیانے کا اعلان کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے دس سالوں میں بینکوں کی کارکردگی میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا۔ وہ تجارتی بینک جو کبھی دیہی علاقوں کا رُخ بھی نہ کرتے تھے، ان علاقوں میں تیزی سے اپنی برانچیں کھولنے لگے۔ کھیتی اور کسانوں کو ملنے والی امداد میں کئی گُنا اضافہ ہوگیا۔

مگر اس بڑھتی امداد کے باوجود دیہی مشکلات سے بینکوں کی ناتجربہ کاری اور دیہی برانچوں پر بڑھتے خرچے کو مدِنظر رکھتے ہوئے ۱۹۷۲ء میں بینکنگ کمیشن نے علاقائی دیہاتی بینکوں (Regional Rural Banks) کو قائم کرنے کی سفارش کی تھی۔ مگر ۱۹۷۵ تک بھارت سرکار نے اس معاملے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ پہلی بار ۲ اکتوبر ۱۹۷۵ کو اُس وقت کے وزیر خزانہ شری سُبرامنیم نے ۵۰ علاقائی دیہاتی بینکوں کو قائم کرنے کا اعلان کیا اور شروع میں پہلے ۵ بینک اتر پردیش، ۲ مغربی بنگال، ایک راجستھان اور ایک ہریانہ میں قائم کیا گیا۔

یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ ہر علاقائی دیہاتی بینک کی کارکردگی ۵ ضلعوں تک محدود ہوگی اور تقریباً ایک کروڑ کی آبادی سے اس کی وابستگی رہے گی۔ ہر بینک ایک کروڑ روپے کی رقم (Capital) سے قائم ہوگا جس کا نصف حصہ مرکزی سرکار دے گی۔ ۲۵ فیصدی حصہ تعلق رکھنے والے سرپرست تجارتی بینک کا ہوگا۔ ۱۰ فیصدی رقم صوبائی سرکار دے گی اور باقی ۱۵ فیصدی حصہ کوآپریٹو اداروں سے لیا جائے گا۔

اُمید ظاہر کی گئی کہ علاقائی دیہاتی بینک کھیتی کی علاقائی ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ چھوٹی صنعتوں اور کاری گروں کی نصف ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوششیں کریں گے۔ ان بینکوں کی کارکردگی کا جائزہ ان کے منافع سے نہیں بلکہ چھوٹے اور پچھڑے طبقوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش اور قرض دی گئی رقم کی وصول سے کیا جائے گا۔

پچھلے دس سالوں میں ان علاقائی بینکوں نے کافی ترقی کی ہے۔ ۱۹۸۳ تک ملک میں ۱۴۰ علاقائی دیہاتی بینک قائم ہو چکے تھے۔ ان بینکوں کی ساڑھے ۳ ہزار برانچیں ملک کے مختلف حصوں میں کھول جا چکی تھیں۔ ان بینکوں کی کل جمع پونجی ۵۰۰ کروڑ روپے سے زیادہ تھی اور یہ بینک ۶۰۰ کروڑ روپے کی مالی امداد مُہیا کر چکے تھے۔ یہ بھی اُمید ہے کہ ۱۹۸۵ تک ان بینکوں کی تعداد بڑھ کر تقریباً ۱۷۵ ہو جائے گی اور ان کی برانچیں ساڑھے ۳ ہزار سے بڑھ کر ۶ ہزار ہو جائیں گی۔

علاقائی دیہاتی بینکوں کا مستقبل اور دقتیں

اِن بینکوں کو قائم کرنے کی اسکیم کے تحت پچھلے دس سالوں کا (۱۹۷۵ - ۸۵) جائزہ لینے پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ تقریباً ۴۰ فیصدی علاقائی بینک گھاٹے میں چل رہے ہیں۔ گھاٹے کی دلدل میں ڈوبے ان اداروں سے دیہی ترقی میں شرکت کی اُمید کرنا عقلمندی نہیں کہی جا سکتی۔ اس بات کو نظرانداز کرنا بھی مشکل ہے کہ ڈپازٹ (Deposit) پر بڑھتی شرح سود کو دھیان میں رکھتے ہوئے، ان کا منافع مستقبل میں اور بھی کم ہو سکتا ہے۔ اسی طرح مہنگائی کے بڑھتے رہنے سے اخراجات میں بھی اضافہ ہوگا اور ان بینکوں کی مالی حالت اور بھی کمزور ہو جائے گی۔

دوسری اہم مشکل جس کا سامنا ان بینکوں کو کرنا پڑ رہا ہے وہ قرض دی ہوئی رقم کا وقت پر واپس نہ ملنا ہے۔ ۱۹۸۲ تک قرض دی ہوئی رقم کا تقریباً ۲۵ فیصدی حصہ بقایا تھا۔ اگر یہ بینک اس قرض کی وصولی میں کامیاب نہیں ہوتے تو ان کی مالی حالت اور بھی خستہ ہو جائیگی۔

علاقائی دیہاتی بینکوں کے معاملے میں ایک اہم دقت یہ بھی ہے کہ ان کی کارکردگی صرف کمزور طبقوں کی امداد تک ہی محدود ہے۔ ان قرضوں پر شرح سود بھی ۱۰ سے ۱۲ فیصدی ہی لی

جاتی ہے جو بہت کم ہے۔

اس طرح یہ بینک تجارتی بینکوں کے مقابلے میں کافی پیچھے ہیں اور ان کا گھاٹا بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ بہتر ہوگا کہ ہم ان بینکوں کی کارکردگی کے دائرے کو وسیع بنائیں اور انھیں موقع دیں کہ یہ مالی طور پر خود کفیل ہو کر اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔

ایک اور پہلو جو قابل غور ہے وہ ان بینکوں میں کام کرنے والے اسٹاف سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کے ملازم دیہی ضرورتوں کا صحیح اندازہ لگانے میں مہارت نہیں رکھتے، ناتجربہ کار ہیں۔ علاقائی حالات سے واقف نہیں۔ قرض دینے میں لاپرواہی برتتے ہیں۔ اس لیے جس ذمہ داری کی اُن سے اُمید کی جاتی ہے اُسے پورا نہیں کر پاتے۔

علاقائی دیہاتی بینکوں کی دقتوں کو دیکھتے ہوئے یہ واجب ہوگا کہ ہماری سرکار ایسے ضروری قدم اٹھائے جو ان بینکوں کی دقتوں کو دور کر سکیں اور ان کے مقررہ کردار سے دیہی ترقی کے مستقبل کو اور زیادہ پختہ اور شاندار بنایا جا سکے۔

سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان بینکوں کو قائم کرنے میں جن اداروں کا کردار ہے وہ ایک دوسرے کے ساتھ قریبی تال میل رکھیں تاکہ اُن کی رہنمائی میں یہ بینک خاطر خواہ ترقی کر سکیں۔

دوسرے جو اعلیٰ کارکن ان بینکوں کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے ہیں وہ نہ صرف خود قابل، ایماندار اور تجربہ کار ہونے چاہئیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے ماتحت ایسے لوگوں کو [illegible] دیہی [illegible] اور کمزور طبقوں کے حالات کا [illegible] اور [illegible] لوگوں [illegible] دینے کی [illegible] رکھتے ہوں۔ ان بینکوں کا مستقبل ایسے ہی تجربہ کار لوگوں سے وابستہ ہے۔

نیز یہ بھی ضروری ہے کہ اپنی برانچیں کھولنے سے پہلے کسی مدبر، مفکر اور دانشور [illegible] کے واسطے [illegible] بینک [illegible] علاقوں [illegible] ہر جگہ ہے [illegible]

میں یہ بینک اپنی برانچیں کھولتے ہیں۔ پہلے اُن کا پوری طرح سے جائزہ لے لیں۔ اگر وہ علاقے بہت پچھڑے ہوئے ہیں تو یقیناً وہاں اپنے پیر جمانے میں کافی وقت لگ سکتا ہے۔ اور ان برانچوں پر نقصان ہونے کے امکان بنے رہیں گے۔

اس کے علاوہ، ان بینکوں کی کارکردگی کو وسیع بنایا جانا بھی ضروری ہے۔ صرف کمزور طبقوں تک خود کو محدود رکھ کر یہ بینک اس بات کی توقع نہیں کر سکتے کہ آسانی سے خود کفیل ہو سکیں اور خود کو نقصان سے بچا لیں۔ اس مسئلے کا ایک حل یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جن علاقوں میں مقررہ گروپوں کو مالی امداد دینے کے امکان ناکافی ہیں، وہاں بڑے کسانوں کو کنوئیں بنانے یا ٹریکٹروں اور دوسری مشینوں کے لیے قرض دینے کی اسکیم پر غور کیا جائے۔

آخر میں یہ بات بھی اہم ہے کہ دیہی علاقوں میں کام کر رہے تجارتی بینک اور کوآپریٹو ادارے علاقائی بینکوں کو اپنا حریف سمجھتے ہیں۔ خاص طور پر کوآپریٹو ادارے جو صوبائی سرکار سے بہتر مالی امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہیں، علاقائی بینکوں پر ترجیح لے جاتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ علاقائی بینک بہتر کردار ادا کر سکیں تو یہ بھی ضروری ہے کہ نہ صرف صوبائی سطح پر بہتر مالی امداد کا ماحول قائم کیا جائے بلکہ دوسرے تجارتی بینک بھی علاقائی بینکوں کی جانب صحت مند نظریہ اختیار کریں تاکہ دیہاتی ترقی کی فضا میں اضافہ ہو اور وہاں کے باشندوں کی مالی حالت میں سدھار پیدا ہو سکے۔

بقیہ: نمک کی حمایت میں

کرتے ہیں۔ یہ ڈکٹیٹروں کا بھی مُنہ لگا ہوا ہے۔ لیکن اس نے اپنا جمہوری ذہن بالکل نہیں بدلا۔ محمود و ایاز سبھی سے وہ یکساں برتاؤ کرتا ہے۔ جہاں وہ محلوں میں انواع و اقسام کی نعمتوں میں گھل مل کر انھیں خوش ذائقہ اور مزے دار بناتا ہے وہاں فٹ پاتھ پر شب گزارنے والوں کے روکھے پھیکے نوالوں کو بھی اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ پانی سے اُتار لیے جاتے ہیں۔

مٹھاس کی آبرو بچانے میں نمک کا بڑا ہاتھ ہے۔ اگر نمک کا وجود نہ ہوتا تو مٹھاس اپنی خصوصیت کھو بیٹھتی۔ جس طرح حضرت موسیٰؑ کے پیروؤں نے من و سلویٰ سے ہاتھ کھینچ لیا تھا بالکل اسی طرح مٹھاس کو کوئی نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ ممکن ہے آپ ہم سے متفق نہ ہوں تو آپ صرف چند دن شیرینی پر گزر بسر کر کے اپنے تجربے سے آگاہ کیجئے۔ اگر صرف مٹھاس پر گزر بسر کر کے آپ اپنی زندگی پار کرنے کا کوئی منصوبہ بنائے ہوئے ہیں اور کامیاب بھی ہیں تو آپ کو انفرادیت مل سکتی ہے۔

آب و ہوا اور لوگوں کے مزاج کے موافق ہر ملک میں اشیائے خوردنی استعمال ہوتی ہیں۔ لیکن نمک کی ہر ملک میں کھپت ہے ہر جگہ اسے مانگا جاتا ہے۔ کوئی ملک مرچ سے بے نیاز ہو سکتا ہے، چکنائی میں ردّ و بدل کر سکتا ہے لیکن نمک کا خریدار بنا رہتا ہے۔ نمک عالمی سطح پر ایک جانی پہچانی جنس ہے اِسے سبھی مانتے ہیں اور اب تو باوثوق ذریعے سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ نمک زائرین ماہ کے ساتھ چاند کی سطح کو بھی چھو چکا ہے اور اس نے اُن لوگوں کے مُنہ کے ذائقہ کو وہاں بھی کیف و لذّت بخشا ہے۔

غرض کوئی غیر حساس ہی نمک کی اہمیت سے انکار کر سکتا ہے ورنہ شیرینی کے رسیا بھی نمک کا گوشہ تلاش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ساجد علی ٹونکی

دولت کی غیر مساوی تقسیم اور بھارت

ماہرین اقتصادیات کو جو مسائل خاص طور سے درپیش ہیں ان میں ایک اہم ترین مسئلہ دولت کی غیر مساوی تقسیم کا ہے۔ یہ برائی دنیا میں عام طور سے اور ترقی پذیر ممالک میں خاص طور سے پائی جاتی ہے۔ چونکہ بھارت ایک پچھڑا اور غریب ملک ہے لہذا یہاں اس مرض کا پایا جانا کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ دولت یا آمدنی کی غیر مساوی تقسیم کے معنی اس ملک کے لوگوں کی دولت، آمدنی یا فراہم ہونے والے مواقع میں بہت زیادہ فرق سے ہوتا ہے۔ ایسے ملکوں میں جہاں ایک جانب دولت کی بھرمار ہوتی ہے تو دوسری طرف آبادی کا ایک بڑا حصہ نانِ شبینہ کا محتاج ہوتا ہے۔ کچھ لوگ اپنے عالیشان محلوں میں تعیش پسندی سے زندگی گذارتے ہیں اور وہیں دوسری جانب ایک گروہ اُن لوگوں کا ہوتا ہے جن کا بستر خاک کا اور تکیہ ہاتھوں کا نیز جن پر سایہ آسمان کا ہوتا ہے۔ ایک طبقہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرونی ملکوں میں بھیجتا ہے، جہاں وہ اچھے اسکولوں میں تعلیم حاصل کرکے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں جبکہ ایک طبقہ محنت مزدوری کرتا ہے ان کے بچے رکشا کھینچتے یا ٹھیلہ دھکیلتے ہیں اگر یہ بھی میسر نہ ہو تب چوری کرکے یا بھیک مانگ کر اپنا گذارا کرتے ہیں۔ دراصل ان کی غریبی ہی انھیں غریب بناتی چلی جاتی ہے یعنی ان پر ظلم کی زیادتی ہونے لگتی ہے اور یہیں سے امن کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

ملک کی ترقی پر دولت کی غیر مساوی تقسیم کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ایک طبقہ زیادہ دولت سمیٹ لیتا ہے تو وہ راس المال (Investment) کے ذریعہ اپنی پیداوار بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ جب پیداوار کا پیمانہ بڑھتا ہے تو اس کی پوزیشن بھی مستحکم ہو جاتی ہے۔ اچھی ٹیکنالوجی سے پیداوار کی لاگت کم آتی ہے جس سے نفع بڑھ جاتا ہے۔ اپنے اس نفع کو مزید بڑھانے کے لیے وہ ہر اس طریقے کا استعمال کرتا ہے جس سے اُسے کامیابی مل سکے اور یہیں سے مزدور کا استحصال شروع ہوتا ہے جو غیر مساوی تقسیم کی ایک خاص وجہ ہے۔ ہمارے ملک میں گرچہ حکومت بڑی سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور کر رہی ہے اور بہت حد تک اس فرق کو کم کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے جس میں اسے کچھ کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے لیکن اس کامیابی کو اطمینان بخش نہیں کہا جا سکتا۔

مختلف لوگوں نے انفرادی طور پر اور کچھ تنظیموں نے مل کر ہمارے ملک میں دولت کی غیر مساوی تقسیم کا تجزیہ کیا ہے اور جو معلومات حاصل ہوئیں انھیں وقتاً فوقتاً شائع بھی کیا ہے۔ اس سلسلے میں "ایچ، ایف لائیڈال" کے اعداد و شمار قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے ۵۶-۱۹۵۵ میں یہ پتہ لگایا کہ ہندوستان میں ۲۸ فیصد لوگ ایسے ہیں جن کی فی کس آمدنی (اس وقت کی موجودہ فی کس آمدنی ۲۵۵ روپے سالانہ) سے زیادہ ہے جبکہ ایسے لوگوں کا حصہ خالص قومی آمدنی میں ۵۱ فیصد ہے اور ۷۲ فیصد لوگ ایسے تھے جن کی آمدنی اس اوسط آمدنی سے کم تھی۔ جب کہ ان لوگوں کا حصہ قومی آمدنی میں صرف ۴۹ فیصد تھا۔ اس طرح ہندوستان کے مرکزی بینک نے بھی دولت کی غیر مساوی تقسیم سے متعلق کچھ اعداد و شمار شائع کئے تھے۔ یہ اعداد و شمار ۵۷-۱۹۵۳ کے بیچ کے تھے۔ ریزرو بنک آف انڈیا نے اپنی رپورٹ میں جو فہرست پیش کی وہ حسب ذیل ہے:۔

طبقہ	آمدنی	نیصد
	دیہی	شہری
۱۔ سب سے زیادہ مالدار (۵ فیصد)	۱۷٫۰۰	۲۶٫۰۰
۲۔ سب سے زیادہ خوشحال (۱۰ فیصد)	۲۵٫۰۰	۳۷٫۰۰
۳۔ سب سے زیادہ مالدار (۵۰ فیصد)	۲۹٫۰۰	۷۵٫۰۰
۴۔ سب سے کم آمدنی والے (۲۰ فیصد)	۹٫۰۰	۶۴۴

مذکورہ بالا اعداد و شمار سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ کتنا گمبھیر رُوپ لے چکا ہے۔ اس سلسلے میں NCAER کے اعداد و شمار بھی اہم تصور کئے جاتے ہیں ــــ اقتصادیاتی تحقیق کی قومی کونسل نے ۱۹۶۰ کے اپنے سروے کے بعد جو رپورٹ

پیش کی اس کے مطابق بھارت کے دیہی علاقے میں دس فیصد خاندانوں کے پاس جن کی آمدنی سب سے زیادہ ہے، کل آمدنی کا ٣٣٫٠٦ فیصد حصہ ہے۔ جبکہ شہروں میں تقریباً اتنے ہی لوگوں کے پاس شہری آمدنی کا ٣٤٫٢٤ فیصد حصہ ہے۔ اس کے برعکس سب سے زیادہ غریب ٢٠ فیصد خاندانوں کے پاس دیہی اور شہری آمدنی کا صرف ٨ فیصد حصہ ہی ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ شہروں میں مقابلتاً زیادہ دولت ہے۔ اسی کونسل کے مطابق شہری علاقوں میں ٨٦ فیصد ایسے خاندان ہیں جن کی سالانہ آمدنی تین ہزار روپے سے کم ہے جبکہ دیہی علاقوں میں یہ تناسب (Ratio) ٩٤ فیصد ہے۔

پنج سالہ منصوبوں کے دوران بھی اس مسئلہ پر خاص دھیان دیا گیا۔ اور اس بات کی کوشش کی گئی کہ دولت کا یہ فرق کس طرح کم سے کم ہو سکے۔ چنانچہ ان منصوبوں کے دوران دوسری دہائی میں چند حضرات نے اس سلسلے میں کچھ اعداد و شمار جمع کرنے کی کوشش کی جنھیں مندرجہ ذیل گوشوارے میں پیش کیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:-

سب سے غریب دس فیصد لوگوں کی صرف ٣٫١٤ فیصد آمدنی تھی۔ مونوپولی کمیشن نے سروے کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ بھارت میں چُنی ہوئی تقریباً ننانوے ضروری اشیاء، جیسے چائے، چینی، کپڑا، دوائیں وغیرہ میں ٥٥ چیزوں کی پیداوار صرف کچھ ہاتھوں میں مرکوز ہے۔

اس کمیشن کے مطابق بھارت کے تین بڑے پونجی پتی ان اشیاء کی کُل پیداوار کا تقریباً ٥٠ فیصد مال خود پیدا کرتے ہیں۔ دولت کی غیر مساوات کا معاملہ صرف آمدنی تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ زراعتی زمین کے معاملے میں بھی یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ نہالا نویس نے جو اعداد و شمار پیش کیے تھے اس کے مطابق ٤٤ فیصد خاندانوں کے پاس ٢٫٥ ایکڑ کے اوسط سے ۔ان کی زمین ہی تھی جبکہ ٤٠ فیصد خاندانوں کے پاس پانچ ایکڑ کے اوسط سے کاشتکاری کے لائق زمین کا ١٧ فیصد حصہ تھا۔ اس کے برعکس مالدار ٥ فیصد خاندانوں کے پاس ١٠٫٢٠ ایکڑ اوسط کے حساب سے کھیت تھے جو کُل زراعتی زمین کا ٤٠ فیصد ہوتا ہے۔

فی کس آمدنی کی تقسیم

دس دس فیصد کے آبادی گروپ (کم آمدنی والے)	اقتصادی تحقیق کی قومی کونسل کے مطابق ١٩٦٤-٦٥	اوجھا اور بھٹ کے مطابق ١٩٦٣-٦٤ اور ٦٥-٦٦	رن ریڈی ١٩٧١-٧٢	احمد اور بھٹا چاریہ ١٩٦٣-٦٤
١- ٠ — ١٠	٣٫١٤	٣	٣٫٢٩	٣٫٥
٢- ١٠ — ٢٠	٤٫٣٦	٤	٤٫٣١	٤٫١
٣- ٢٠ — ٣٠	٥٫١٥	٥	٥٫٢١	٥٫١
٤- ٣٠ — ٤٠	٥٫٩٩	٦	٦٫٢٥	٦٫٢
٥- ٤٠ — ٥٠	٦٫٨٥	٦	٦٫٧٠	٦٫٩
٦- ٥٠ — ٦٠	٧٫٧٢	٧	٨٫٠٦	٨٫٤
٧- ٦٠ — ٧٠	٨٫٨١	٩	٨٫٨٦	٩٫٤
٨- ٧٠ — ٨٠	١٠٫٥١	١٢	١٠٫٩٠	١٠٫٧٧
٩- ٨٠ — ٩٠	١٤٫١٤	١٣	١٥٫٩١	١٤٫١١
١٠- ٩٠ — ١٠٠	٣٣٫٣٥	٣٥	٣٠٫٨٩	٣١٫٥

مندرجہ بالا گوشوارے سے پتہ چلتا ہے کہ اقتصادی تحقیق کی قومی کونسل کے مطابق سب سے زیادہ مالدار ١٠ فیصد لوگوں کی آمدنی ٣٣٫٣٥ فیصد تھی جبکہ

اس غیر مساوی صورت حال کے لیے بہت سی چیزیں ذمہ دار ہیں، مثلاً کچھ لوگ تو اپنے ورثے میں بڑی بڑی زمینیں حاصل کر لیتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی دو نمبر کی آمدنی کو سود پر دے کر بلا محنت کیے روپیہ کماتے ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ملکی ترقی کا زیادہ فائدہ غریب کے مقابلے میں مالدار لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔ جس سے ان کی دولت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اس وجہ سے کہتے ہیں کہ ایک بشر کے غریب ہونے کی وجہ اس کا غریب ہونا ہی ہے۔" ڈانڈ ٹیکر اور رتھ کے مطابق۔ ملک کی ترقی کا فائدہ زیادہ تر اعلیٰ آمدنی والے یا متوسط لوگوں کو ہی ملتا ہے جبکہ یہ لوگ کُل آبادی کے عام طور سے ٢٠ فیصد ہی ہوتے ہیں۔

دولت کی غیر مساوی تقسیم کی ایک وجہ مزدور کا استحصال ہے۔ پونجی پتی لوگ مزدور کی کمزوری، غریبی اور بے بسی سے فائدہ اُٹھا کر انھیں کام کے مطابق مزدوری نہ دے کر موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چونکہ ہندوستان میں مزدوروں کی فراہمی بہت زیادہ ہے لہٰذا اس کے نرخ بہت کم ہیں۔ مالک لوگ غریبوں کا خون چوس کر زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ اس جانب اب سرکار بہت محتاط ہو گئی ہے اور ٹریڈ یونین کے ذریعے مزدوروں کو کافی مراعات دلائی گئی ہیں: یہ فائدے انتظامیہ میں مزدوروں کو حصہ دیکر ان کو نفع میں حصہ دے کر نیز بیماری، بیمہ، بونس، کام کے گھنٹے وغیرہ میں تبدیلی کر کے مزدور کو پہنچائے جاتے ہیں۔

دولت کی غیر مساوی تقسیم کچھ صنعتوں میں مونوپولی سے چور بازاری، رشوت خوری وغیرہ سے بھی بڑھنے لگتی ہے۔ کبھی کبھی سرکار کی کچھ پالیسیوں کی وجہ سے بھی اس برائی کو ہوا ملتی ہے۔ مثلاً ٹیکس پالیسی یا صنعتی لائسنسنگ پالیسی وغیرہ۔ کچھ لوگوں کے کام کرنے کی صلاحیت میں بھی فرق ہونے سے دولت کا یہ فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً کچھ لوگ بیمار رہتے ہیں، یا کچھ پیشے اس قسم کے ہوتے ہیں جن میں بالائی آمدنی ہوتی ہے —

سیمول سن (Samuelson) کے مطابق

"ایک خوشحال خاندان کا چھ سال کا بچہ گندی بستی کے چھ سال کی عمر والے بچے سے ترقی میں کافی آگے نکل جاتا ہے اور یہ فرق عمر کے ساتھ بڑھتا چلا جاتا ہے۔

(باقی صفحہ پر)

عزیز مراد آبادی

جوہری توانائی اور ہندوستان

یوں تو بھارت ایک زرعی ملک ہے، لیکن اسے سونے کی چڑیا بھی کہا جاتا رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بھارت آج بھی سونے کی چڑیا سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اس حقیقت کا ثبوت قدرت کی وہ نوازشیں ہیں، جو وقتاً فوقتاً ہمارے دیش پر ہوتی رہتی ہیں۔ یعنی ـ مختلف و متعدد معدنیات کا زیرزمین پتہ چلنا اور انھیں حاصل کرنا... کہیں کوئلے کی کان دریافت ہوئی تو کہیں تیل کا سُراغ مل گیا۔ کہیں ہیرے جواہرات کا علم ہوا تو کہیں جوہری توانائی میں کام آنے والی معدنیات کا پتہ چل گیا۔ البتہ سونے کی چڑیا کو سجانے، سنوارنے اور چمکانے کے لیے انسانی محنت اور جدوجہد درکار ہے۔ ہم قدرت کے عطا کردہ وسائل سے کس قدر فائدہ حاصل کرتے ہیں؟ اسکا انحصار ہماری کڑی محنت پر ہے۔

یہ ہم پر منحصر ہے! آخر وہ کون کون سے اہم وسائل ہیں، جو ہماری محنت و مشقت کے خواہاں ہیں۔ اس سوال کے جواب کے لیے توانائی کے وسائل کا مختصراً ذکر کردینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

بھارت میں توانائی کے وسائل

ہمارے یہاں میسّر توانائی کے وسائل کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۔ قدیم وسائل :۔ قدیم وسائل کے زمرے میں انسانی قوت، حیوانی قوت، ہوائی قوت اور ایندھن کی قوت آتی ہے ـ ان وسائل کی بھی ملک کی ترقی و تعمیر کے لیے ہر لمحہ ضرورت پڑتی ہے۔ (ہمیں یہاں قدیم وسائل کی تفصیل میں نہیں جانا ہے)۔

۲۔ جدید وسائل :۔ جدید وسائل کے خانے میں کوئلہ، معدنی تیل (پٹرولیم)، آبی قوت اور جوہری یا ایٹمی توانائی آتی ہے اور جدید ترین دریافت ہے، شمسی توانائی۔

دَورِ جدید میں کوئلہ سب سے بڑا وسیلہ تھا۔ اور آج بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں ہے۔ کوئلے کی پیداوار میں ہندوستان کا دُنیا بھر میں چھٹا مقام ہے۔ کوئلے کے ذخائر تیرہ ہزار کروڑ ٹن ہیں اور ۹ ہزار کروڑ میٹرک ٹن بہتر کوئلہ محفوظ ہے۔ معدنی تیل یا پٹرول کو زرِ سیّال کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ پٹرولیم سے مٹی کا تیل، ڈیزل، پٹرول، موبل آئل تو ملتے ہی ہیں، ساتھ ہی ویسلین، گریس، عطر، موم اور بہت سی دوسری کاربن والی اشیاء بھی حاصل کی جاتی ہیں۔ دُنیا میں ہندوستان کا معدنی تیل کی پیداوار میں بارہواں مقام ہے۔ یہاں صرف دنیا کا ۵ر۰ فی صد تیل ہی ملتا ہے۔ ہندوستان میں پانی کی توانائی کی اہمیت بہت ہے۔ اس توانائی کا یہاں لامحدود ذخیرہ موجود ہے۔ پلاننگ کمیشن کا اندازہ ہے کہ پانی کی قوت کے ذریعے ملک میں ۴ کروڑ کلو واٹ بجلی پیدا کی جاسکتی ہے، مگر ہم پانی کی توانائی کا ایک ذرا سا حصّہ ہی کام میں لا رہے ہیں۔ جبکہ یہ مذکورہ وسائل میں سب سے سستا وسیلہ ہے۔

جوہری توانائی

جوہری توانائی تکنیکی ترقی کا نتیجہ ہے اور یہ بیسویں صدی کی عظیم الشان دریافت ہے۔ اس توانائی کے استعمال کو محدود خیال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے استعمال کو اگر محدود نہ کیا جائے تو ساری کائنات کا وجود خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ ہاں، اگر ایٹمی توانائی کو پُرامن مقاصد کے لیے استعمال میں لایا جائے تو یہ سنسار سُورگ کا رُوپ دھار سکتا ہے۔ اگر اس کے برعکس اس کا استعمال میدانِ جنگ میں کیا جائے تو تمام انسانیت پل بھر میں تباہ و برباد ہوکر رہ جائے گی۔ ایٹمی طاقت کا اندازہ اس سچائی سے بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے کہ اس توانائی کو پیدا کرنے میں معاون صرف یورینیم کو ہی لیں تو، ایک پونڈ یورینیم سے جتنی بجلی پیدا ہوگی، اُتنی بجلی حاصل کرنے کے لیے ۲۵ لاکھ ٹن کوئلہ جلانا ہوگا۔

حالاں کہ جوہری توانائی کو حاصل کرنے کے لیے لگائے جانے والے پلانٹوں پر دوگنا خرچ آتا ہے۔ لیکن ایک بار پلانٹ نصب ہوجانے کے بعد توانائی

کیونکہ سستی پڑتی ہے۔ اس کا علم اُن ہی ملکوں کو ہے جو اس میدان میں پیش پیش ہیں۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر بھارت بھی اس سمت میں تیزی سے پیش رفت کر رہا ہے۔

بھارت میں کیرل اور تمل ناڈو میں ساحلی علاقوں کے ریت اور بہار میں چھوٹا ناگپور کے پہاڑ اتنے بڑے ہیں کہ انھیں دُنیا میں سب سے مالدار کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ریڈیم، لیتھیم، پلاٹینیم، بیریلیم، یورینیم، بیریلیم اور گریفائٹ وغیرہ کے ذخائر بھی ملک کے مختلف حصّوں میں پائے جاتے ہیں۔ یورینیم کے علاوہ باقی سبھی معدنیات بھارت میں کافی مقدار میں موجود ہیں۔ اور یہی معدنیات جوہری توانائی پیدا کرنے کے کام آتی ہیں۔

آج دُنیا بھر میں ایٹمی توانائی کے ۳۰۲ اسٹیشن ہیں اور یہ صرف ۲۵ ممالک کے پاس ہیں۔ امریکہ میں سب سے زیادہ ۸۲ ایٹمی مراکز ہیں۔ بھارت میں پانچ مراکز توانائی حاصل کرنے کی جستجو میں شب و روز سرگرم ہیں۔ ان کی مختصر تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ ٹراہبے ایٹمی پلانٹ

بمبئی کے نزدیک ٹراہبے میں ۱۹۵۶ میں بھابھا جوہری تحقیقی مرکز (Bhabha Atomic Research Centre) کی زیرِ نگرانی اَپسرا نامی پہلی ایٹمی بھٹی قائم کی گئی ہے۔ یہ ایشیا کی بھی اوّلین ایٹمی بھٹی ہے۔ اسے پُوری طرح بھارتی سائنسدانوں نے ہی تیار کیا ہے۔ اس کی بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت ۴ لاکھ کلو واٹ ہے۔ جوہری توانائی کے چیئرمین مسٹر راجہ رمنا کے اعلان کے مطابق ماہ اگست ۱۹۸۵ میں بھابھا اٹامک ریسرچ سنٹر کا جوہری بجلی کا ری ایکٹر، جس کا نام دُھرُوو ہے، چالو ہو گیا ہے۔

۲۔ تاراپور ایٹمی پلانٹ

بمبئی کے نزدیک ہی ۱۹۶۹ میں قائم کیا گیا ہے اس کی صلاحیت ۴ لاکھ کلوواٹ بجلی پیدا کرنے کی ہے۔ لیکن یورینیم کی کمی کی وجہ سے صرف ایک لاکھ کلو واٹ بجلی پیدا کی جا رہی ہے۔ مگر کچھ عرصے سے یہ مرکز بند پڑا ہے کیونکہ اس کے لیے یورینیم امریکہ سپلائی کرتا تھا۔ اس نے کچھ وجوہ کی بنا پر یورینیم کی سپلائی بند کر رکھی ہے۔

کلپکم ایٹمی پلانٹ

یہ مرکز مدراس سے ۶۰ کلو میٹر کے فاصلے پر کلپکم مقام پر قائم کیا گیا ہے۔ اس کی پیداواری صلاحیت ۴ لاکھ کلو واٹ ہے۔ یہاں پہلا یونٹ ۱۹۸۳ میں چالو کیا گیا تھا۔ جس کی صلاحیت ۲۳۵ میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کی ہے اور اس کی ساری بجلی تامل ناڈو کو ہی سپلائی کر دی جاتی ہے۔

یہ انتہائی مسرت کا مقام ہے کہ ۱۲ اگست ۱۹۸۵ کو تقریباً دوپہر ڈیڑھ بجے دوسرا ایٹمی بجلی یونٹ چالو کر دیا گیا ہے۔ اس کی صلاحیت بھی ۲۳۵ میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کی ہے۔ ایندھن کے طور پر قدرتی یورینیم کا استعمال اور اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے بھاری پانی کا استعمال کیا جائے گا۔ اس یونٹ کا ڈیزائن اور تعمیر وغیرہ جملہ امور ہندوستانی سائنسدانوں کے ذریعہ انجام پائے ہیں۔ اُمید ہے کہ مختلف تجربات کرنے کے بعد ستمبر، اکتوبر میں یہ یونٹ بجلی پیدا کرنے لگے گا۔ اس یونٹ کی کُل بجلی کا نصف حصّہ تامل ناڈو کو اور باقی جنوبی ریاستوں کو سپلائی کیا جائے گا۔ اس تقسیم کا انتظام مرکزی سرکار نے کیا ہے۔

اطلاع ہے کہ پہلے یونٹ میں بھی ضروری تبدیلیاں کر کے اس کی کارکردگی اور صلاحیت کو مزید بہتر بنایا جائے گا۔

کوٹا ایٹمی بجلی گھر

راجستھان میں کوٹا نامی مقام پر ۱۹۷۳ میں ایٹمی پلانٹ قائم کیا گیا تھا جس میں ۲ لاکھ کلو واٹ بجلی پیدا کی جاتی ہے۔

نرورا ایٹمی توانائی مرکز:۔ ۱۹۷۴ء میں اترپردیش میں بلند شہر ضلع کے نرورا نامی مقام پر ایک ایٹمی پلانٹ کی تعمیر شروع کی گئی تھی۔ ۱۹۸۶ تک اس میں بجلی کی پیداوار شروع ہو جائے گی۔ اس بجلی گھر کے لیے ایندھن بھی بھارت میں ہی تیار ہوگا۔

مندرجہ بالا توانائی کے مراکز سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ یقین ہے کہ بتدریج یہ مراکز اپنی منزل کی جانب پیش قدمی کرتے رہیں گے۔

ایٹمی تجربہ

۱۸ مئی ۱۹۷۴ء کو بھارت نے راجستھان کے پوکھرن مقام پر سطح زمین سے ۱۰۰ میٹر نیچے ایٹمی دھماکہ کر کے اپنا نام دُنیا کے چھٹے ایٹمی توانائی والے ممالک کی فہرست میں درج کرا لیا ہے۔ لیکن یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ بھارت کی ایسی تمام کوششیں پُرامن مقاصد حاصل کرنے کے لیے ہیں۔

توانائی کے حصول کے لیے پنجسالہ منصوبوں میں گنجائشیں

جیسا کہ باخبر لوگوں کو علم ہے کہ پہلا پنجسالہ منصوبہ یکم اپریل ۱۹۵۱ء سے شروع ہوا تھا اور دوسرا یکم اپریل ۱۹۵۶ء سے! توانائی حاصل کرنے کے ذرائع پر دونوں ہی منصوبوں میں کُل خرچ کا ۷۰۹ فیصد خرچ کیا گیا۔ دونوں ہی منصوبوں کے مقاصد میں توانائی کو دُوسرے نمبر پر رکھا گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرکار توانائی کے ذرائع کو وسعت و ترقی دینے کے لیے کس قدر کوشاں ہے! مزید ثبوت کے لیے ایک نظر کُل خرچ پر بھی ڈال لیں، کُل ۴۶۷۲ کروڑ روپے خرچ ہوئے۔ جن میں توانائی کے مختلف وسائل پر ۲۲۵ کروڑ روپے خرچ کیے گئے تھے۔

تیسرا منصوبہ یکم اپریل ۱۹۶۱ کو شروع کیا گیا تھا۔ اس میں توانائی کے وسائل کو تیسرے نمبر پر رکھا گیا تھا۔ کُل ۸۵۷۷ کروڑ روپے اس منصوبے پر

خرچ آیا تھا۔ جن میں سے ۱۲۵۲ کروڑ روپے توانائی کی مد میں صرف ہوئے۔ اسی طرح تیسرے منصوبے میں کل خرچ کا ۱۲٫۶ فیصد توانائی کے حصول پر صرف کیا گیا۔

چوتھا منصوبہ یکم اپریل ۱۹۶۹ کو شروع ہو سکا تھا۔ اس میں بھی توانائی کو تیسرا درجہ دیا گیا اور منصوبے کی کل رقم (۱۶۲۰۱ کروڑ روپے) کا ۱۷٫۸ فیصد یعنی ۲۸۸۰ کروڑ روپے توانائی کے ذرائع پر خرچ کئے گئے۔ گویا چوتھے منصوبے میں بھی توانائی کی مد کے لیے خاصی رقم مخصوص کی گئی تھی۔

پانچویں پنجسالہ منصوبے کا آغاز یکم اپریل ۱۹۷۴ کو ہوا۔ اس کے لیے مخصوص شدہ کل رقم (۵۳۴۱۱ کروڑ روپے) کو بڑھانا پڑا۔ اب کل رقم ۳۹۴۲۶ کروڑ روپے خرچ ہوئی۔ جس میں سے توانائی پر خرچ کی گئی رقم ۷۳۹۹ کروڑ روپے یعنی کل خرچ کا ۱۸٫۸ توانائی پر خرچ کیا گیا — ہم نے دیکھا کہ پنجسالہ منصوبے میں بھی توانائی کی مد میں کافی روپے لگائے گئے۔

موجودہ چھٹے پنجسالہ منصوبے کی شروعات یکم اپریل ۱۹۸۰ کو ہوئی تھی، جو ابھی ابھی پایۂ تکمیل کو پہونچا ہے — اس منصوبے میں بھی توانائی کے ذرائع کو ترقی دینے اور توانائی کی تعطیع کو رد کرنے کے لیے خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ یوں سمجھئے کہ چھٹی یوجنا میں اخراجات کے لیے کل ۹۷۵۰۰ کروڑ روپے مختص کئے گئے ہیں۔ ان میں سے توانائی پر ۲۶۵۳۵ کروڑ روپے خرچ کئے جانے تھے، گویا کل اخراجات کا ۲۷ فیصد حصہ!! — چھٹے منصوبے میں بھی اس مد میں حسب توقع بڑی رقم مختص کی گئی ہے۔

مندرجہ بالا اہم منصوبوں میں توانائی حاصل کرنے کے (جس میں ایٹمی توانائی بھی شامل ہے) لیے رکھی گئی گنجائش اس حقیقت کی غماز ہے کہ ہمارا دیش بھی تیزی سے اس میدان میں رواں ہے۔

جوہری توانائی کا صحیح استعمال

جیسے اوپر اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر جوہری توانائی کو جنگی مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے گا تو پل بھر میں دُنیا تہہ وبالا ہو کر رہ جائے گی۔ اندازہ ہے کہ آج دُنیا کے پاس اتنے ایٹمی اسلحہ ہیں کہ سارے کرۂ ارض کو ایک بار نہیں، بلکہ ۹ بار بے نام ونشان کیا جا سکتا ہے۔ اب ذرا غور فرمایئے کہ ایٹمی طاقت کو جنگ کے کام میں لانے والے ممالک خود کو کس خول میں محفوظ رکھ سکیں گے؟ ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے گئے بموں کے نتائج آج تک ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ گویا ایٹمی جنگ میں بچ رہنے والے بھی مُردہ لوگوں سے زیادہ بدتر ہو جائیں گے۔ بھارت امنِ عالم کی خاطر ایٹمی طاقت کے پُرامن استعمال کے لیے پوری طرح کوشاں ہے۔

ایٹمی توانائی کی وافر مقدار میں تیاری ہو جانے پر ہم اُن مشکل اور دِقّت طلب امُور کو بہ آسانی انجام دے سکتے ہیں، جو عموماً ناممکن نظر آتے ہیں۔ مثلاً زمین کے نیچے دھماکا کرکے بڑے بڑے پتھروں کو ہٹا کر مختلف قیمتی معدنیات حاصل کر سکتے ہیں۔ ریگستانی علاقوں میں بڑے بڑے تالاب بنائے جا سکتے ہیں۔ ذرائع آمد و رفت اور ذرائع حمل ونقل کو مزید سستا اور آسان بنایا جا سکتا ہے۔ پہاڑوں میں آسانی سے سُرنگیں کھودی جا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ بجلی پیدا کرنے کا اس سے عمدہ ذریعہ شمسی توانائی تو ہو سکتا ہے، مگر اس کی طاقت جوہری طاقت کا فی الحال مقابلہ نہیں کر سکتی ہے۔ مستقبل کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

توانائی کے وسائل میں کوئلہ اور معدنی تیل کے ذخائر کم ہوتے جا رہے ہیں۔ لہٰذا اس اندیشے کو بھی پسِ پشت نہیں ڈالا جا سکتا کہ دونوں معدنیات کے ذخائر کسی دن ختم بھی ہو سکتے ہیں۔ اس وقت پانی اور ایٹم ہی ہمارے لیے توانائی کا ذریعہ رہ جائیں گے۔ ہاں، کچھ حد تک سورج بھی ہمارا ہاتھ بٹا سکتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ جتنی تیزی سے جتنی زیادہ ایٹمی توانائی کے حصول میں کامیابی حاصل کی جا سکتی ہو، کی جائے

بقیہ: اندرونِ ملک سیاحت کا فروغ

سرکردہ شہریوں اور دوسرے زمروں کے افراد کے لیے مجموعی سیاحتی دوروں کا اہتمام کرتی ہے۔

اندرونِ ملک سیاحت کے منصوبے پر عمل درآمد کے دو خاص شعبے ہوں گے۔ ایک یہ کہ سیاحت کے فروغ اور تشہیر کے لیے وسیع پیمانے کی مہم شروع کی جائے گی اور دوسرے یہ کہ ملک میں سیاحت کی ترقی سے متعلقہ افراد اور اداروں کا سرگرم تعاون حاصل کیا جائے گا۔ لوگوں کے لیے تحریک عمل کے پروگرام میں انھیں کہا جائے گا کہ وہ ایسے علاقوں کا سفر کریں جو ان کے عام دائرے سے باہر ہیں۔ مضمون نویسی اور "بوجھو تو جانیں" قسم کے مقابلے بھی اس مہم کا ایک اہم حصہ ہوں گے۔"

اُمید کی جاتی ہے کہ آئندہ برسوں میں ملکی سیاحت سے روزگار، آمدنی کے وسائل، سیاحت کے امدادی ڈھانچے کی تعمیر اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لوگوں اور خیالات کے تبادلے جیسے کئی فوائد حاصل ہوں گے جن سے ہمیں مربوط اور مضبوط قومی عمارت کی تعمیر میں مدد ملے گی۔

تعمیرِ نو

شورؔ فتح پوری

از سرِ نو وہ مرتّب ہوا آئینِ چمن
سینۂ گُل میں نہ کھٹکے کسی کانٹے کی چبھن

شرحِ تعمیرِ بہاراں ہو ہر اک سرو وسمن
برق افشاں ہو لبِ ابرِ رواں دل کی لگن

زندگی، تشنگیٔ خوں کی گنہگار نہ ہو!
رہزنِ ہوش، کوئی قافلہ سالار نہ ہو!

شدّتِ کرب سے ہو آنکھ نہ گریاں کوئی
ہو نہ بے مہریٔ ایّام سے نالاں کوئی
تنگدستی میں نہ ہو چاک گریباں کوئی
اپنے ہی گھر میں نہ ہو بے سروساماں کوئی

بھوک کا زہر نہ شریانوں میں گھلنے پائے!
اُلٹی سانسوں لئے کوئی خون اُگلنے پائے!

سیم و زر ہی کا خدا، مالکِ دنیا کیوں ہو؟
مرگِ انبوہ سے ہی جشنِ تماشا کیوں ہو؟
حاصلِ عمر یہ اندیشۂ فردا کیوں ہو؟
موت ہی رنجِ فراواں کا مداوا کیوں ہو؟

رنگ کھیتوں کا کھِلے، مہکے ہوا گلشن کی!
کوکھ دھرتی کی پھلے، گونجے فضا آنگن کی!

دامِ ہر موجِ ہوا بستۂ پائے گرداب
رہ گئے اپنے ہی مرکز پہ سمٹ کر سیلاب
عشق نے پیدا کیے خود ہی جنوں کے اسباب
ریگزاروں کو کیا خونِ جگر سے سیراب

لے کے گنگا کو اُتر آئے بھگیرتھ دیکھو!
دَورِ آگاہیٔ انساں کے یہ "تیرتھ" دیکھو!

بھاکڑہ بندھ، وہ سرچشمۂ اُمید یقیں
سجدہ گاہِ مہ و انجم ہے دمودر کی زمیں
سنگِ تعمیر کی وہ تابندہ، درخشندہ جبیں
اپنے مستقبلِ رنگیں کی امیں ہے کہ نہیں؟

پیاسی دھرتی نے قدم چوم لیے نہروں کے
جگمگا اُٹھے درو بام نئے شہروں کے

کانڈلا، سندری، بھلائی، کوچین جاگ اُٹھا
رمزِ کیلا کا دلِ کوہ شکن جاگ اُٹھا
وہ ہُنر سازیٔ فنکار کا چلن جاگ اٹھا
بستۂ قوّتِ بازو تھا جو فن جاگ اٹھا

آ کے چترنجن و بنگلور کو دیکھے کوئی
جشنِ تعمیر کے اس دور کو دیکھے کوئی

کارخانوں کی رگ و پے میں مشینوں کا لہو
گرمیٔ جذبۂ تعمیر کا روشن پہلو
وہ پسینے میں بسی، مٹی کی سوندھی خوشبو
غنچۂ شوق سا کھِلتا ہوا احساسِ نمو

ابر کی چھاگلیں بھر بھر کے ہوا لاتی ہے
جھومتی، اکاتی ہوئی بادِ صبا آتی ہے

دیس سے اپنے غریبی کو مٹانے کے لیے
مذہب و رنگ کی تفریق مٹانے کے لیے
حق و انصاف کا احساس جگانے کے لیے
ظلم و بیداد کی طاقت کو ہرانے کے لیے

بڑھ کے موجوں کی طرح لڑ گئے طوفانوں سے
کامراں لوٹے ہیں ہم جنگ کے میدانوں سے

اک نئے دَور کا آغاز کیا ہے ہم نے
شوق کو مائلِ پرواز کیا ہے ہم نے
درد کو زمزمہ پرداز کیا ہے ہم نے
ایک اعجاز سا اعجاز کیا ہے ہم نے

شمعِ احساسِ فراواں کو فروزاں کر کے
رکھ دیا تیرگیٔ شب میں چراغاں کر کے

گاؤں کی شہروں کی تصویر بدل دی ہم نے
"زر" کی "جاگیر" کی تفسیر بدل دی ہم نے
لوحِ دستور کی تحریر بدل دی ہم نے
حُسنِ تدبیر سے تقدیر بدل دی ہم نے

سرد بازار ہوا جنگوں کی دلالی کا
اک نیا باب کھُلا، قوم کی خوشحالی کا

ایک ہی جہدِ طلب، ایک ہی مقصودِ سفر
ایک سے نقشِ قدم، ثبت سرِ راہ گزر
ایک ہی جذبۂ دل، ایک ہی پیمانِ نظر
ایک ہی رنگِ شفق بیز بہ اندازِ دگر

ایک ہی بادۂ سرجوش ہے پیمانوں میں!
ایک ہی ذوقِ جنوں ہے ترے دیوانوں میں!

غزلیں

ڈاکٹر جاوید وششٹ

ساز جب دل کے ٹوٹ جاتے ہیں
عمر بھر تار جھنجھناتے ہیں!

درد سے اپنے دل کو پگھلا کر
جام و آئینہ ہم بناتے ہیں!

اہلِ دل جانے یاد میں کس کی
برہ کے گیت گنگناتے ہیں!

آرزو اک طلسمِ ہوش رُبا
جس میں الیاس غوطے کھاتے ہیں!

ابرِ نیساں ہے یہ گھٹا غم کی
دیدہ و دل گہر لٹاتے ہیں!

خود فریبی ہے آگہی کا بھرم
اہلِ عرفاں فریب کھاتے ہیں!

آپ ہوتے ہیں ناخدا جن کے
وہ سفینے ہی ڈوب جاتے ہیں!

پُشتِ مقتول میں جو خنجر تھا
لوگ اسے آپ کا بتاتے ہیں!

دَورِ بے چہرگی میں دیکھو ہو
جھوٹے چہرے سبھی لگاتے ہیں!

باقی رہتا ہے درد کا رشتہ
اور سب رشتے ٹوٹ جاتے ہیں!

درد کی کارگہ میں ہم جاویدؔ
سنگریزوں کو دل بناتے ہیں! ★

ڈاکٹر کمار پانی پتی

بدنصیبی مرا نصیب سہی
میرے مقسوم میں صلیب سہی

تیرے قدموں میں تو ستارے ہیں
ذرّہ ذرّہ مرا رقیب سہی

ہیں جو قسمت میں سانس لیتے ہیں
لاکھ دشمن مرا طبیب سہی

چاند ہے اشتہا چاند چمکے گا
بادلوں میں مرا حبیب سہی

اب کہاں وہ ادب کی لگ لپٹ
ان گنت مجلسی ادیب سہی ★

یوجنا، نئی دہلی

ضیا حسنی

نمک کی حمایت میں

ہم نمک کے پروردہ اور پرداختہ ہیں۔ ہماری رگ رگ میں نمک رچا اور بسا ہے بلکہ اس حقیقت کو بھی واضح کرتے چلیں کہ اس جسم خاکی کی نشو ونما میں مٹھاس کے بہت ہی کم، اور نمک کا وافر حصہ رہا ہے اس لیے ہم اس کے طرفدار ہیں اور اس کے گن گاتے ہیں۔ نمک حلال جو ٹھہرے۔

ابتدائے آفرینش ہی سے نمک نے انسان سے ناطہ جوڑ لیا تھا اور پھر ایسی گاڑھی چھننے لگی کہ انسان نے اسے خصوصی حیثیت دیدی۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ گیہوں، دالیں، دودھ، گھی، مکھن اور بادام کا بھی گاہے گاہے ضمنی طور پر تذکرہ کر دیتا لیکن نمک کی بات بالا رکھتا تھا۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس کے ایسے ہم جنس جو نمک کا حق ادا کرتے تو وہ نہ صرف اُن کے اس عمل کو سراہتا بلکہ اُنھیں نمک حلال بھی کہتا تھا اور ایسے افراد جو اس سے انحراف کرتے تو وہ اُنھیں نہ صرف نمک حرام کہتا بلکہ اُنھیں اس طرح حقیر ذلت و رُسوائی میں گرا دیتا کہ اُن کی رُسوائی نسلاً بعد نسل جاری رہتی۔ چنانچہ جب کبھی نمک حرامی کی بات چلتی ہے تو بے اختیار جعفر او صادق یاد آجاتے ہیں۔

نمک کے سلسلہ میں ہم نے کافی چھان پھٹک کی ہے۔ ایسا خیال ہے کہ برگزیدہ نبیوں اور خدا رسیدہ بزرگوں سے بھی اس کا قریبی تعلق رہا ہے۔ بابا آدم اور ماں حوّا کے ساتھ یہ جنت سے آیا ہے اور صدیوں پہلے اس نے حضرت عیسیٰؑ کا دامنِ اقدس پکڑ کر اس نے اپنے بارے میں دقیع رائے سے نوازنے کی استدعا کی تھی۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے حواریّین سے فرمایا "تم سوسائٹی میں ویسے ہی بن جاؤ جیسے کھانے میں نمک ہوتا ہے۔" آج یہ تلقین پوری انسانیت کو جگا رہی ہے۔ ذات پات کے جھگڑے گورے کالے کی تفریق، مذہب کے نام پر منافرت انسان کی ان بداعمالیوں سے کھانے میں گھلا ہوا نمک نہ صرف نفرت کرتا ہے بلکہ دعوتِ اتحاد اور اتفاق بھی دیتا ہے۔

آج ہم نمک کی جو بات چھیڑ رہے ہیں تو آپ یہ نہ سمجھیں کہ نمک سے یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔ ہم کافی معروف رہتے ہیں اور پھر کسی طرح ناچا بھی کرتے ہیں اس لیے کسی بات کے سوچنے سمجھنے میں تاخیر ہو ہی جاتی ہے کچھ ایسا ہی معاملہ نمک کے ساتھ بھی ہوا۔ ہم سے اس کا قریبی تعلق کب اور کیسے ہوا اس کو بتانے کے لیے ہم آپ کو تمہید کے خارزار سے گزاریں گے جسے آپ گوارا کریں۔ ہم نے ایک گنجان آبادی والے شہر میں کافی وقت گزارا۔ رات ایک سستے ہوٹل میں بسر کرتے اور ناشتے اور کھانے کے اوقات میں کسی ریستوران کا سہارا لیتے تھے۔ معروف شہروں میں ان کا وجود کافی غنیمت ہے۔ انسانی آبادی میں بے وفائی کا چلن بڑھ رہا ہے کوئی کسی کو نہیں پوچھتا رشتا سا بھی بے خانماں لوگوں کو دیکھ کر کترا کر نکل جاتے ہیں۔ اگر یہ ریستوراں بے گھر لوگوں کو سہارا نہ دیں تو یہ بے چارے کہاں جائیں؟ غرض ہم مہینوں ان کا دامنِ رنگین پکڑے ہوئے شب و روز گزارتے رہے۔ وہاں کافی دل لگتا تھا۔ حالاتِ حاضرہ سے واقفیت کے لیے روزنامے، منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے انواع و اقسام کی خوش ذائقہ اور لذیذ غذائیں اس کے علاوہ کانوں میں دل کش موسیقی بھی رس گھولا کرتی لیکن ذہن، کانوں، آنکھوں، پیٹ کی آسودگی کے باوجود ہم اندر اندر ٹوٹتے جا رہے تھے۔ ادھر ایک خوشگوار تبدیلی بھی رونما ہوگئی تھی اسے بھی سنتے چلیے۔ ہم کئی وقت بھوک سے بالکل بے نیاز ایک پیالی چائے اور چند بسکٹوں پر صبح سے شام کر دیتے ہیں۔ صورتِ حال اچھی لگی کہ جیب پر کوئی بوجھ نہ پڑتا ورنہ دن میں کھانے کی مدّمیں دس بارہ روپیہ صرف ہو ہی جاتے اور اب دو چار روپے میں کام چل جاتا تھا۔ ایک دن ہم ٹہلتے ہوئے ایک ڈاکٹر کی کلینک جا پہنچے، انھوں نے ہمارا طبی معائنہ کرتے ہوئے فرمایا "اگر تندرستی سے دل چسپی ہے تو اپنی پسندیدہ غذائیں چھوڑ دیں اسی میں عافیت ہے۔ ان کا ظاہر دلکش

لیکن یہ کمزوری باطنی بھی ہوتی ہے۔" آخر تھک کر ہم نے اپنا منافق صفت غذاؤں سے ناطہ توڑا، اور شہر کے کنارے ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگے اور لگے ہاتھوں اپنا کھانا بھی تیار کرنے لگے لیکن گزشتہ وقتوں میں ہمارے جو بھی کام آچکا ہے اسے ہم بھولتے نہیں چنانچہ جب اسٹوو کے قریب بیٹھے ہوئے روٹیاں پکاتے تو ہمیں سکۂ رواں کی طرح چلتے ہوئے سجے سجائے ریستوراں بے اختیار یاد آتے بلاشبہ جبکہ ہم نمک خور بھی ہیں اور یہ بھی محسوس کرتے کہ ان ریستوراں نے ہمیں کتنے مخمصوں سے آزاد کر رکھا تھا۔ یہ ایک معزز مہمان کی طرح ہماری پذیرائی کرتے اور خوش ذائقہ اور لذیذ غذاؤں سے تواضع بھی کرتے تھے اور ہم مستعمل برتنوں کو میز پر چھوڑ کر واش بیسن کی طرف بڑھ جاتے۔ تولیے سے منہ پونچھتے ہوئے ٹھاٹ سے باہر چلے جاتے۔ کب کاہے کو وہ آزادی کے دن واپس آئیں گے۔

ساری ذمہ داری اب ان کمزور کاندھوں پر آن پڑی ہے۔ پھر کھانا تیار کرنا کوئی آسان کام نہیں کافی چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ روٹی کچی نہ رہے، داغ دار نہ ہو، سبزی آنچ کی تیزی سے بچی رہے، دودھ اُبلنے نہ پائے کیوں کہ جوانی یا دودھ اُبل کر تلچھٹ ہی چھوڑ جاتے ہیں اور پھر اُن میں ویسی بات کہاں آتی ہے؟۔

غرض کھانا پکانے کے دوران نمک سے تجدید ملاقات ہوئی اور دن میں دو تین بار روزانہ اس سے علیک سلیک ضرور ہو جاتی۔ جب ہم اسے چمچے میں لے کر سبزی میں ڈالنے لگتے تو وہ ہمیں ہاتھ سنبھالے رکھنے کی تلقین کرتا۔ ہمیں یوں لگتا جیسے وہ کہہ رہا ہو" جب مجھ سے کوئی بے نیازانہ گذر جاتا ہے تو میں گزرے وقت اور بچھڑے ساتھی کی یاد دلاتا ہوں۔ پھر وقتِ طعام وہ مجھے استعمال کرتا ہے۔ تو مجھے عذر تو نہیں ہوتا لیکن وقت گزرنے کے بعد میں ویسا دلکش روپ دکھا نہیں پاتا۔ وقت پر سبھی کام اچھے لگتے ہیں۔ اگر کوئی شخص عالمِ شباب میں گوشہ نشین ہو کر توبہ استغفار کرنے لگے یا کوئی عمر رسیدہ شخص پیرانہ سالی میں عشق بازی کی طرف مائل ہو جائے تو ان دونوں پر اُنگلیاں اُٹھائی جائیں گی۔ غرض میں وقت پر ہی بخوبی کام آسکتا ہوں۔ اگر کوئی حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے اور میری مقدار میں اضافہ کر دیتا ہے تو میں کھانے کے وقت ایک تلخ کلام اور کج اخلاق شخص کا روپ اختیار کر لیتا ہوں جس سے دوبارہ ملنے کو جی نہیں چاہتا اور جو شخص توازن قائم رکھتا ہے، ہاتھ سنبھالے رکھتا ہے تو اس کے سامنے میں ایک خوش اطوار اور ملنسار شخص کی طرح اُبھرتا ہوں۔

جب ہم کھانا کھانے بیٹھتے ہیں تو نمک ایک بھلے آدمی کا روپ اختیار کر کے ہمارے سامنے آتا ہے۔ ایسا نیک نفس اور ملنسار آدمی جس سے بار بار ملنے کو جی چاہتا ہے۔

نمک کی کمی بیشی کی بات چل رہی ہے تو ہمیں ایسے باورچی اور خواتین بے اختیار یاد آ رہے ہیں جن کے ہاتھ اِدھر اُدھر بہک ہی جاتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کی یادداشت کمزور ہوتی ہے۔ کبھی نمک نہ ڈالنا کبھی دوبارہ ڈال دینا ان کا روزانہ کا معمول بن جاتا ہے۔ چند مالک اور شوہر نیک، خاموش اور صلح پسند ہوتے ہیں۔ سر جھکا کر کھانا کھا لیتے ہیں اور حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ سنتے چلئے! ایک سنجیدہ، خوش اطوار اور صلح جو شخص نے دُنیا سے کنارا کر لیا تھا اور اُن کا جسدِ خاکی سامنے رکھا ہوا تھا۔ اُن کی بے احتیاط بیوی بین کر رہی تھیں" ہائے! ہائے! مرنے والے میں کیتی اچھائیاں تھیں۔ مرتے مر گئے لیکن کیا مجال کبھی کھانے کے سلسلے میں مجھے لعن و طعن بھی کیا ہو۔ میں اپنا عیب کیوں چھپاؤں؟ آئے دن میرا ہاتھ بہک ہی جاتا اور جب میں کھانا کھانے بیٹھتی اور تیز نمک کچوکے لگاتا اور نوالے نگلنا دشوار ہو جاتا تو میں ان سے کہتی" تمھیں چُپکی کیوں لگ جاتی ہے؟ نمک کی کمی بیشی کو بتاتے کیوں نہیں؟" یہ بے چارے مسکرا کر چُپ ہو جاتے۔ افسوس! ان کا ساتھ چھوٹ رہا ہے۔ کلیجہ منہ کو آ رہا ہے۔" ایسے بلا لیگ پیپر صفت، اور فتنہ انگیز لوگوں کا بیان ہو جائے جنھوں نے نمک کی کمی بیشی کے سلسلہ میں اپنی بیویوں کی تذلیل اور رسوائی کا کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہیں کیا۔ کبھی کھانے کی پلیٹ اٹھا کر پھینک دی اور کبھی زدوکوب بھی کیا اور بعضوں نے فرطِ غضب سے طلاق بھی دے دی۔ جہاں تک باورچیوں کا تعلق ہے انھوں نے اپنی اس چوک کی بنا پر نہ صرف ڈانٹ پھٹکار سہی بلکہ گالی گلوج کو بھی شربت کے گھونٹ کی طرح پی گئے، پھر بھی بعضوں کو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑا۔ لیکن جو عادت بن جاتی ہے وہ مشکل سے جاتی ہے۔ چنانچہ وہ اب بھی ہیرا پھیری سے باز نہیں آتے۔ اور اُن کا ہاتھ بہک ہی جاتا ہے۔ ہمیں بھی اعتراف ہے کہ کئی بار ہم سے بھی چوک ہو گئی لیکن کھانا تیار کرنے اور ایسے کھانے کی پلاسٹرکیت جیسے صرف ہماری ذمہ داری ہے اس لیے جب کبھی ایسی بات سامنے آئی تو خاموشی سے اس مرحلہ سے گزر گئے ویسے اب ہمارا ہاتھ پیمانہ بن گیا ہے۔

بلاشبہ نمک سستی شئے ہے۔ ضروری چیزوں کے نرخ سرپٹ دوڑ رہے ہیں اور بے چارا نمک پچھڑا ہوا ہے اور وہ ان سبھی کی گرد کو بھی نہیں پاتا۔ یہ سب صحیح ہے لیکن اس سلسلہ میں ہم یہ بھی عرض کریں گے کہ آپ اسے سستی چیز سمجھ کر اس طرح حقارت سے دیکھنے نہ لگیں کہ جیسے ایک متمول اور آسودہ حال شخص اپنے بے مال و منال ہم جنس کو حقارت سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے اور کبھی اس کی حالت پر طنز کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ نمک سے آپ کی بے نیازی بالکل چل نہیں سکتی آپ اس کی جدائی کو ایک دو وقت تو کسی طرح برداشت کر سکتے ہیں لیکن پھر آپ اسے جگہ جگہ ڈھونڈتے پھریں گے اور جب وہ مل جائے گا تبھی آپ کو یکسوئی ملے گی۔

نمک کی رسائی صدرِ مملکت کے ایوان، وزیر اعظم

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

خلیل اکمل

انسان پر برقی روشنی کے اثرات

انسان کے آرام اور سکون کا انحصار اُس کے ماحول پر ہوتا ہے جو اُس کی طبیعت اور نفسیات پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ جب ماحول میں تپش کا اضافہ ہوتا ہے تو ہماری شریانیں پھیل جاتی ہیں۔ نبض کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ گویا ہمارے جسمانی نظام میں یہ عمل خود بخود انجام پاتا ہے۔ تاکہ ہمارا ٹمپریچر نارمل رہ سکے۔ جب فضائی تپش حد سے زیادہ تجاوز کر جاتی ہے تو انسان نقل مقام پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ماحول کے اثرات کو ہمارے جسم پر مرتب کرنے میں ہماری آنکھ کو بڑا دخل حاصل ہے۔ جو روشنی کے بغیر بے بس ہو جاتی ہے۔ دراصل آنکھ کے حساس خلیے ماحول کے اثرات جیسے روشنی، حرارت اور ہوا کے دباؤ وغیرہ کو دماغ کے خلیوں تک پہنچاتے ہیں۔ جس سے ہماری طبیعت میں اُن حالات کے تحت ردِ عمل واقع ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہمیں غذا کی ضرورت ہوتی ہے تو ہماری طبیعت اس طلب کی تکمیل تک بے چین رہتی ہے۔ بہ الفاظِ دیگر ہماری طبیعت نفسیات کے زیر اثر کام کرتی ہے۔ اسی لیے غصے اور خوف کی حالت میں ہمارا دورانِ خون تیز ہو جاتا ہے اور پسینہ کا اخراج عمل میں آتا ہے جو اس امر کی عکاسی کرتا ہے کہ ہماری طبیعت اور نفسیات دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم اور ملزوم ہیں۔ عرصہ دراز سے ہی اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے کہ ماحول ہماری صحت اور کام کرنے کی صلاحیت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسی لیے کوئی بھی کام ایک روشن فضا میں بہت خوبی اور لگن سے انجام پا سکتا ہے اور مدھم روشنی میں کام کرنے والا بے چین اور مضطرب رہتا ہے۔ اور وہ اپنی اس عادت سے بینائی کمزور کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ہم روزانہ صبح سے شام تک دن کی روشنی کے اوسطاً ۴۰ ہزار (LUX) یونٹ سے مستفید ہوتے ہیں۔ اس روشنی کی شعاعی ترکیب موسم کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ طول بلد، عرض بلد، دن کے اوقات میں سورج کے عروج اور زوال سے روشنی کی اس اکائی میں اُونچ اور نیچ ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں برقی روشنی کی صرف دو سو تا چار سو اکائیاں روزانہ ہمارے تصرف میں آتی ہیں۔ برقی روشنی کا مبدا بلب یا ٹیوب لائٹ ہے جو ہمارے لیے روشنی کا ذریعہ ہے۔ برقی یا شمسی روشنی - ULTRA VIOLET یعنی بالا بنفشی اور INFRA RED یعنی زیریں سُرخ شعاعوں کی مرکب ہے۔ روشنی کے سائنسی تجزیہ سے معلوم ہوا ہے کہ بلب کی روشنی میں بالا بنفشی شعاعیں بہت ہی کم ہوتی ہیں۔ جب کہ ٹیوب لائٹ میں روشنی کا چھٹا حصہ موجود ہیں۔ بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ برقی روشنی میں بالا بنفشی شعاعیں مجموعی اعتبار سے دن کی روشنی میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ زیریں سُرخ شعاعیں ٹیوب لائٹ میں نہیں پائی جاتیں لیکن بلب کی روشنی میں سورج کی روشنی کے مقابلہ میں دس گنا زیادہ ہوتی ہے۔ جس کے مختلف لہری طول (SHORT WAVE LENGTH) ہوتے ہیں۔ چھوٹے لہری طول کے زیریں سُرخ شعاعوں سے خون کی نالیاں پھیل جاتی ہیں اور دل کی حرکت تیز ہو جاتی ہے۔ بڑے لہری طول کی شعاعیں آنکھ میں مستقلاً سُرخی پیدا کرتی ہیں جسکو GLASS BLOWER EYES کہا جاتا ہے۔ لیکن درمیانہ درجہ کی - INFRA RED شعاعوں سے انسان کو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف بڑے لہری طول LONG WAVE LENGTH کی بالا بنفشی شعاعیں جلد کو رنگ دار بنا دیتی ہیں اور اُن کے اثر سے آنکھیں سُوجھ جاتی ہیں جیساکہ برقی ویلڈنگ (ARC WELDING). کا دیر تک مشاہدہ کرنے سے ہوتا ہے۔

روشنی کے اثر کو کلر ٹمپریچر COLOOR TEMPERATURE سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ جو ایک تقابل کرنے کا طریقہ ہے چنانچہ ان کی روشنی کا کلر ٹمپریچر پانچ ہزار تا چھ ہزار کیلون (KELVIA) اور بلب کا تین ہزار درجہ کیلون ہوتا ہے اور ٹیوب مختلف کلر ٹمپریچر کے بازار میں دستیاب ہوتی ہیں۔ ہماری روزمرہ کی مصروفیات کے لیے

کمرے کا ٹمپریچر چار ہزار درجہ کیلون رکھنا مناسب ہے۔ لیکن موسم کی مناسبت سے اس کو موسم سرما میں تین ہزار اور گرما میں پانچ ہزار ڈگری کیلون برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ روشنی میں رنگوں کا امتزاج اور اس کی ترتیب بھی ہمارے مزاج اور نفسیات کو متاثر کرتی ہے۔ چنانچہ تیز چبھتے ہوئے رنگ دردِ سر اور آنکھوں میں جلن پیدا کرتے ہیں۔

روشنی انسان پر دو طرح سے اپنے اثرات مرتب کرتی ہے۔ پہلا آنکھوں سے دوسرا ہماری جلد سے آنکھوں سے تو شعاعیں منعکس ہو جاتی ہیں۔ لیکن جلد میں یہ اہلیت نہیں ہوتی۔ اس لیے روشنی کا کچھ حصہ حرارت میں تبدیل ہو کر ہمارے جسم کی تپش بڑھاتا ہے جس کا اثر قدرتاً زائل ہو جاتا ہے لیکن مابقی حصہ جلد میں جذب ہو کر کیمیائی تعمل پیدا کرتا ہے جس سے خون کا جز۔ BILI RUBIN) تغیر پذیر ہو کر جسم سے خارج ہو جاتا ہے۔ یہ اخراج ایک خاص یرقان کے

HYPER BILI RU BNEAMIA

علاج میں سود مند بتایا گیا ہے۔ یہ بیماری ۱۰ تا ۲۰ فیصد نوزائدہ بچوں میں عام ہے۔

تجربات اور مشاہدات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ٹیوب لائٹ سے تھکاوٹ محسوس ہوتی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اس روشنی میں بالا بنفشی شعاعیں موجود رہتی ہیں۔ مغربی جرمنی میں ٹیوب لائٹ کے اثرات کا تجربہ چند طلباء پر کیا گیا۔ ان طلبا کو مسلسل دو ہفتوں تک ساڑھے تین ہزار Lux قوت کی روشنی میں رکھا گیا۔ اس مدت کے بعد اُن کے خون اور پیشاب میں ایک مخصوص ہارمون کے ارتکاز کی جانچ کی گئی۔ جس سے پتہ چلا کہ یہ طلبا تھکاوٹ کا شکار ہو گئے تھے۔ اسی قسم کا ایک اور تجربہ انگلینڈ میں کیا گیا۔ جس میں دس ہزار لکس قوت کی روشنی استعمال کی گئی جو بے ضرر ثابت ہوئی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ یہ روشنی بالواسطہ ماحول کو منور کرتی تھی جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ راست انعکاس GLARE نہ ہونے کی صورت میں زیادہ قوت کی روشنی بھی بے ضرر ہو سکتی ہے۔ سورج کی روشنی میں بالا بنفشی شعاعوں کی بکثرت موجودگی سے جلدی کینسر لاحق ہو سکتا ہے۔ خصوصاً ان شعاعوں کا انعکاس پانی کی سطح سے زیادہ عمل میں آتا ہے۔ اس لیے جلدی کینسر مچھیروں میں بہت عام ہے۔

برقی روشنی انسان کے لیے فائدہ مند بھی ہے۔ ایک بند کمرے کی روشنی ایک کھلی فضا کی اوسط روشنی کے مقابلہ میں ۲۰ گنا کم ہوتی ہے۔ اگر روشنی کی اس مقدار کو شمسی روشنی کے مساوی کیا جائے تو اس سے انسان کو فائدہ پہنچ سکتا ہے کیوں کہ بعض سائنسدانوں کا خیال ہے کہ بالا بنفشی شعاعیں ہمارے جسم میں وٹامن ڈی (VITA-MIN-D) پیدا کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ سردی اور زکام، انفلوئنزا اور دانتوں کی بیماریوں کے خلاف مدافعتی قوت حاصل ہوتی ہے۔ نیز چھوٹے لہری طول (SHORT WAVE LEGTH) کی زیریں سرخ شعاعیں جلد میں سرایت کرنے کی خاصیت رکھتی ہیں۔ اس لیے جسم اور جوڑوں کے درد کو دُور کرنے کے لیے ان شعاعوں کے استعمال کی سفارش کی جاتی ہے۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ہمارا ماحول ٹھنڈی اور گرم روشنی کا تابع ہے۔ جس کا اثر ہمارے اعصا پر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے روزمرہ کے معمولات کی کارکردگی ماحول کے زیر اثر آجاتی ہے۔ اسی لیے روشن ماحول میں ہمارا انہماک اور یکسوئی برقرار رہتی ہے۔ یہاں ٹھنڈی اور گرم روشنی سے مراد اس کا ٹمپریچر نہیں ہے بلکہ روشنی کا وہ اثر ہے جس کا ردِ عمل انسان پر ہوتا ہے۔ چنانچہ جب انسان منور سے مدھم روشنی میں آجاتا ہے تو اس کو یہ محسوس ہوتا ہے گویا ماحول کا ٹمپریچر اچانک کم ہو گیا۔ اسی طرح روشنی کا بے ترتیب پھیلاؤ (DISPERSION) اور انعکاس (Glare) یا پھر رنگوں کا خراب امتزاج دردِ سر اور آنکھوں میں جلن کا باعث ہوتا ہے۔

روشنی کے حیاتیاتی پہلوؤں پر تحقیقات سے واضح ہوا ہے کہ آرام دہ روشنی انسان اور حیوان دونوں کی نشوونما کے لیے ازحد ضروری ہے۔ ماہرین حیاتیات اور امراضِ چشم کا خیال ہے کہ برقی روشنی سے انسان کو وہ قدرتی رنگ میسر نہیں آتے جو سورج کی روشنی میں پائے جاتے ہیں۔ جس سے ہماری صحت متاثر ہو سکتی ہے اس لیے موسم گرما میں ٹھنڈی اور سرما میں گرم روشنی سے استفادہ کریں۔ یہ سچ ہے کہ انسان کے لیے بالا بنفشی شعاعیں بھی ضروری ہیں جن کا مبدا ٹیوب لائٹ ہے۔ لیکن اس کی شعاعی ترکیب میں وہ تسلسل اور یکسانیت نہیں پائی جاتی جو بلب کی روشنی میں ہوتی ہے۔ اس لیے ٹیوب لائٹ کا کثرت سے استعمال نہ کریں اور اس کے استعمال کی صورت میں اپنے جسم کو ڈھانک لیں۔ ٹیوب لائٹ سے ایک ہفتہ میں جو بالا بنفشی شعاعیں ہمیں مل سکتی ہیں وہ دن کی صرف ۵ منٹ کی روشنی سے میسر آ سکتی ہیں۔

غرض کہ برقی روشنی انسان کے لیے فائدہ مند بھی ہے اور مضرت رساں بھی۔ اس لیے سائنس کی روشنی میں ہی برقی روشنی کا استعمال بہتر ہے۔●

مانک پور کا نیا کارخانہ

یہ کمپنی گزشتہ ۳۶ برس سے مواصلاتی سامان تیار کر رہی ہے۔ یہ کمپنی میسرز آٹومیٹک ٹیلیفون اینڈ الیکٹرک بلجیم کے اشتراک سے معمولی پھیلنے پر آلات کو جوڑنے والے ایک ادارے کے طور پر بنگلور میں قائم کی گئی تھی تاکہ وہاں محکمہ ڈاک و تار کی ضرورت کے لیے سوئچنگ کا سامان اور ٹیلیفون تیار کیے جا سکیں لیکن اب وہاں کراس بار اور الیکٹرانک سوئچنگ سسٹم بھی تیار کیے جا رہے ہیں۔ اس وقت انڈین ٹیلیفون انڈسٹریز کے تحت دو کارخانے کام کر رہے ہیں۔ ایک بنگلور میں اور دوسرا رائے بریلی میں جہاں پہلی ٹکنالوجی کی بنا پر ٹیلیفون ایکسچینج تیار کیے جا رہے ہیں۔ جدید ترین ٹکنالوجی کے مطابق سوئچنگ کا سامان تیار کرنے کے لیے اتر پردیش کے ضلع گونڈہ میں مانک پور کے مقام پر ایک نیا کارخانہ لگایا جا رہا ہے۔ مانک پور کارخانہ ۱۹۸۹ء میں پوری صلاحیت سے کام کرنے لگے گا تب ملک کی ہر سال ۲ لاکھ ۸۰ ہزار لائنیں تیار کرنے کی صلاحیت میں ہر سال ۵ لاکھ لائنوں کا اضافہ ہوگا۔ لیکن سٹروجر قسم کے پرانے قسم کے سامان کی تیاری میں بتدریج کمی کر دینے کے سبب ۱۹۹۵ء تک ملک میں نئی لائنوں کی تیاری کی صلاحیت کم ہو کر ۷ لاکھ رہ جائے گی۔ اگر صلاحیت یہاں آ کر رک جائے اور درآمدات نہ کی جائیں تو ۲۰۱۶ء میں جا کر کہیں ملک کو درکار دو کروڑ ۴۰ لاکھ لائنوں کی صلاحیت حاصل ہو سکے گی۔ اگر بنگلور میں قائم کیا جا رہا دوسرا کارخانہ بھی پروگرام کے مطابق وقت پر چالو ہو جائے تو اس تاریخ کو گھٹا کر ۲۰۰۶ء تک لایا جا سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ تب تک آبادی میں اضافہ ہو جائے گا اور دو کروڑ ۴۰ لاکھ لائنوں کی صلاحیت کو بھی بڑھانا ہوگا۔ لہٰذا اگر لائنیں تیار کرنے کی ملکی صلاحیت کو موجودہ سطح پر منجمد کر دیا جائے تو مزید ۲۵ برس تک بھارت میں ٹیلی مواصلات کی انتہائی غیر تسلی بخش صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ ایک ایسی حالت ہے جسے کسی طور بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اگر اس صدی کے آخر تک ہمیں دو کروڑ ۸۰ لاکھ ٹیلی فونوں اور دو کروڑ ۴۰ لاکھ لائنوں کے نظام کا نصب العین حاصل کرنا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر دو سال بعد ۵ لاکھ لائنوں کی صلاحیت تیار کرنے کا ایک کارخانہ ملک میں لگایا جائے۔ اسی عرصے میں ۳۵ لاکھ کلومیٹر کیبل تیار کرنے کی صلاحیت میں بھی ۱۰ گنا اضافہ کرنا ہوگا۔

انڈین ٹیلی فون انڈسٹریز نے ڈاک تار محکمے کے قریبی اشتراک سے ان کی سوئچنگ کے سازوسامان ٹیلیفون کے آلات اور ترسیل کے سازوسامان کی اکثر ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داری سنبھالی ہے۔ اس کے علاوہ اس کمپنی نے کئی خصوصی اقسام کا سامان تیار کر کے ریلوں، بجلی بورڈوں، محکمہ دفاع، صنعتوں اور غیر سرکاری اداروں کو مہیا کیا ہے۔ اس عرصے میں اس کمپنی نے بنگلور میں اپنے کمپلیکس کے علاوہ اتر پردیش میں نینی اور رائے بریلی، جموں کشمیر میں سرینگر اور کیرل میں پال گھاٹ کے مقام پر اپنے کارخانے لگائے ہیں۔ گزشتہ برس یہ کمپنی اتر پردیش میں مانک پور کے مقام پر جدید ترین الیکٹرانک سوئچنگ کا سامان تیار کرنے کا کارخانہ لگانے میں مصروف عمل رہی ہے جس کے لیے فرانس کی کمپنی میسرز سی آئی ٹی ایلکٹل کا ٹیکنکل اشتراک حاصل کیا گیا۔

مانک پور کے سوئچنگ سازوسامان تیار کرنے کے کارخانے پر اخراجات کا اندازہ ایک ارب ۷۷ کروڑ روپیہ ہے اور توقع ہے کہ وہاں چالو برس میں ۲۰ ہزار لائنیں تیار ہوں گی اور چار برس میں یہ کارخانہ اپنی پانچ لاکھ لائنوں کی پوری صلاحیت سے کام کرنے لگے گا۔

کمپنی نے ۳۱ مارچ ۱۹۸۵ء کو ختم ہونے والے مالی سال میں ۲۲۶ کروڑ روپے کا بے مثال کاروبار کیا جبکہ ۱۹۸۳-۸۴ء میں یہ مالیت دو ارب ۱۲ کروڑ روپے تھی۔ اس میں سے ایک ارب ۳۴ کروڑ ۸۷ لاکھ روپے کا کاروبار بنگلور، ۴۰ کروڑ کا نینی، ۴۸ کروڑ ۴۳ لاکھ روپے کا رائے بریلی، دو کروڑ ۵۰ لاکھ کا پال گھاٹ اور چار کروڑ ۸۶ لاکھ روپے کا کاروبار سرینگر کے کارخانے سے ہوا۔

۱۹۸۴-۸۵ میں ٹیکس کی ادائیگی سے قبل کمپنی کے منافع کا اندازہ ۱۸ کروڑ روپے تھا۔ کاروبار کے اعداد و شمار میں ۲۷ کروڑ روپے کی وہ ادائیگی شامل نہیں ہے جو پیداواری محصول اور بکری ٹیکس کی صورت میں کی گئی۔

۲۲۶ کروڑ روپے کے مال کی فروخت میں سے ۲۶ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے کا مال غیر ڈاک تار خریداروں مثلاً محکمہ دفاع ریلوں، سرکاری و نجی شعبے کی صنعتوں وغیرہ نے خرید کیا جو کہ کمپنی کے کل کاروبار کے تقریباً ۶۸،۱۱ فیصد کے برابر ہے۔

چھٹے منصوبے کے آخری برس یعنی ۱۹۸۴-۸۵ء میں انڈین ٹیلیفون انڈسٹریز نے اپنی پیداواری کوششوں سے ٹیلیفون کے ۶۳۷،۹۸ آلات سوئچنگ کے سامان کی ۲۴۹۹۵،۷ لائنیں اور ۶۰ کروڑ روپے کی مالیت کی ترسیلی لائنیں مہیا کیں۔ اس کے علاوہ ۱۵ کروڑ روپے کی مالیت کے فاضل حصے اور پرزے بھی فراہم کیے گئے۔

پورے چھٹے پانچسالہ منصوبے کے دوران انڈین ٹیلیفون انڈسٹریز نے ۲۶ لاکھ ۶۰ ہزار ٹیلیفون، سوئچنگ سامان کے لیے ۱۱ لاکھ ۷۰ ہزار لائنیں اور دو ارب ۵۶ کروڑ روپے کی مالیت کا ترسیلی سامان تیار کر کے دیا۔ مالی اصطلاح میں کمپنی نے کل ۸ ارب ۶۲ کروڑ ۳۸ لاکھ روپے کا سامان تیار کر کے مہیا کیا۔ اس کارکردگی کے مطابق ٹیلیفونوں کی بہم رسانی میں ۲۶ فیصد، سوئچنگ کے سامان میں ۱۰ فیصد اور ترسیلی لائنوں کی بہم رسانی میں پانچویں منصوبے کی کامیابیوں کے مقابلے میں ۸۵ فیصد کا اضافہ ہوا۔

Regd.No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment
at Civil [illegible] Office, Delhi-110054

اندرون ملک سیاحت کا فروغ

اندرون ملک سیاحت کو ایک ملکی سرگرمی کی نسبت زیادہ اہمیت کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جانا چاہیئے۔ جو بین الاقوامی سیاحوں کی آمد سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک امدادی نظام کی حیثیت رکھتی ہو۔ یہ امر خاص طور پر ہندوستان میں زیادہ نمایاں ہے۔ جہاں آبادی اور جغرافیائی حدود بہت وسیع ہیں اور مذہب، ثقافتی روایات اور آداب کا ایک رنگارنگ پس منظر موجود ہے۔ ہم محسوس کر رہے ہیں کہ بعض علاقوں میں باہمی وابستگی کی کمی ہے بلکہ بعض خطوں میں اتحاد کی عمارت جو کبھی بہت مضبوط تھی کمزور پڑتی جا رہی ہے۔ ان رجحانات کا بنیادی سبب اکثر آبادی کے ایک طبقے کی دوسرے طبقے کے بارے میں لاعلمی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بداعتمادی میں دیکھا جاسکتا ہے۔

چنانچہ اس پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے سرکار اب ملکی سیاحت کے فروغ پر زیادہ زور دے گا۔ ملکی سیاحت کے لیے جو سہولیات مہیا کی جائیں گی ان سے نہ صرف روزگار کے مواقع پیدا کرنے اور غیر ملکی سیاحوں کی تواضع میں مدد ملے گی بلکہ سیاحت کی صنعت سے وابستہ افراد کو عالمی سیاحوں کی آمد میں کمی کے دنوں میں روزگار کی کمی کو پورا کرنے میں بھی مدد ملے گی۔ ملکی سیاحت آمدنی اور مزید روزگار پیدا کرنے میں بھی محرک ثابت ہوسکتی ہے۔

دلکش سفر

ملکی سیاحت میں ایک بڑا مسئلہ جس پر غور کیا جانا چاہیئے۔ رہائش اور سفر کا خرچ ہے۔ ہمارے ملک میں ایک روایت ہے کہ اندرون ملک سفر یا دورے کو ایک عیاشی تصور کیا جاتا ہے، لہٰذا محکمۂ سیاحت عام آدمی کے وسیلوں کے مناسب مجموعی سیاحت کے پروگرام مرتب کرنا چاہتا ہے۔ ملک بھر میں سیاحت کے لیے جو سہولیات مہیا کی گئی ہیں ان میں متوسط درجے کے سیاحوں کے طبقے کی ضروریات کو اعلیٰ ترجیح دی جائے گی۔ زیارت کے مقامات پر رہائش کے جو انتظامات کئے گئے ہیں ان میں سے ۴ فیصد جگہ کم آمدنی والے طبقے کے لیے مخصوص ہوگی۔

محکمے نے کم خرچ سیاحت کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی کچھ اقدامات شروع کئے ہیں۔ ان میں سیاحوں کے لیے ریاستی سرکاروں، سیاحتی کارپوریشنوں اور نجی دائرہ کار کے اشتراک سے کم خرچ ہوٹلوں اور کمروں کی تعمیر اور گذرگاہوں پر سہولیات کا قیام شامل ہے۔

سفر، رہائش اور خوراک پر مشتمل مجموعی اخراجات کے دوروں کا اہتمام کرتے ہوئے ریاستوں کی سیاحتی کارپوریشنیں ان امور کو مدنظر رکھیں گی۔

یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں کی مدد سے "ہندوستان کی کھوج" جیسی خصوصی اسکیمیں بھی شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ بیاحت کا محکمہ کم خرچ ہوٹلوں کی تعمیر اور کاروں و موٹر گاڑیوں کو چلانے کے لیے قرضوں پر سود میں امداد بھی دے گا۔

ہندوستان کی لمبائی چوڑائی اور آب و ہوا کے تنوع کو دیکھتے ہوئے یہاں نقل و حمل کے ذرائع پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ تیسری سطح کی ہوائی جہازوں کی سروس وایو دوت نے ہری دوار، رشی کیش اور کلومنالی جیسے زیارت اور چھٹی منانے کے مقامات کے لیے پہلے ہی سفر اور رہائش کے اخراجات کے مجموعی انتظامات شروع کر رکھے ہیں۔ اس مجموعی انتظام میں ہوائی جہاز سے سفر، بذریعہ سڑک قابل دید مقامات کا سفر اور ہوٹل میں رہائش کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اس سے درمیانہ آمدنی والے سیاحوں کے طبقے کو مدد ملے گی جن کے لیے خصوصی دورے سے الگ ہوائی سفر بہت مہنگا ہوگا۔

اس قسم کے مجموعی دورے کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ چونکہ اس عمل میں ریاستی اداروں کا دخل ہوتا ہے اس لیے ان اسکیموں سے نہ صرف سیاحت کو فروغ حاصل ہوتا ہے بلکہ بہت سے علاقوں میں سیاحتی سرگرمیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ وایو دوت شیلانگ، چیرا پونجی، راجستھان اور گجرات کے مقامات کی سیاحت کے لیے بھی مجموعی سیاحتی دوروں کا منصوبہ بنا رہا ہے۔

۱۹۸۵ء جو نوجوانوں کا بین الاقوامی برس ہے۔ وایو دوت طلبا کے لیے مجموعی بجٹ کے دوروں کا اہتمام کرے گی جس میں انہیں ہوائی جہاز کے کرائے میں ۵۰ فیصد کی رعایت دی جائے گی۔

اندرون ملک سیاحت کی ترقی کا ایک بڑا پراجیکٹ چھٹی منانے کے مجموعی سیاحتی دورے کے لیے ہندوستانی ریلوں اور وایو دوت کے اشتراک کا منصوبہ ہے۔ ہندوستان کی سیاحتی ترقی کی کارپوریشن، طلبا، تیس برس سے کم عمر والے نوجوانوں

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, N.D.-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002

۱۶ تا ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۵

ایک روپیہ

تعلیم کے مسائل

(ایم اروڑہ)

نیشنل کیپیٹل ریجن

(ضیاء الرحمٰن غوثی)

عابد صدیقی

اودھم سنگھ

۱۳ اپریل ۱۹۱۹ کی شام جلیان والا باغ کے وسیع و عریض میدان میں بیس ہزار سے زائد عوام جمع تھے ان میں مرد خواتین اور معصوم بچے بھی شامل تھے ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھے بلکہ صرف اور صرف جذبۂ آزادی سے سرشار ایک شمع تھی جو ہر دل میں روشن تھی۔ یہ ہزاروں لوگ بیساکھی کے میلے کے دن جلیان والا باغ میں انگریز سامراج کے مظالم کے خلاف اپنے شدید غم و غصہ کا مظاہرہ کرنے جمع ہوئے تھے ان میں ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی سب ہی شامل تھے۔ ان کا یہی اٹوٹ اتحاد اور آزادی کی جدوجہد کو جاری رکھنے کا عزم صمیم انگریزوں کے لیے چیلنج بن گیا۔ لالہ ہنس راج کی جوشیلی تقریر ان کے حوصلوں کو گرماتی رہی۔ چند لمحوں بعد ہندوستان کی آزادی کا دشمن اور انگریز سامراج کے نمائندہ جنرل ڈائر نے نہتے اور معصوم عوام پر کھلے فائرنگ کا حکم دے دیا۔ دس منٹ تک گولیوں کی بوچھار رہی، سرفروشانِ آزادی کے سینے گولیوں سے چھلنی کر دیے گئے۔ سینکڑوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ چند ہی لمحوں میں جلیان والا باغ کی سرزمین کو خون سے سرخ کر دیا گیا۔ انگریز سامراج کی بربریت کا یہ ہولناک منظر اس بھرے مجمع میں ۱۹ برس کا ایک نوجوان دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور اس نے سینکڑوں شہیدوں کے آگے عہد کیا کہ وہ اس کا بدلہ لے کر رہے گا۔ یہی نوجوان اودھم سنگھ تھے جو سردار بھگت سنگھ کے ہمراہ ہندوستانیوں پر ڈھائے گئے مظالم کا نظارہ کر رہے تھے۔ ان کے عزائم نے نئی انگڑائی لی۔ جلیان والا ہماری تحریکِ آزادی کا ایک نیا موڑ ثابت ہوا۔ ہزاروں ہندوستانی عوام کو اس حادثہ نے ایک نیا ولولہ اور جوش عطا کیا تھا۔ اودھم اس زمانے میں ایک یتیم خانے میں تھے انھوں نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ زخمیوں اور مرنے والوں کی خدمت کی وہ اپنے ننھے ہاتھوں سے زخمیوں کی مرہم پٹی کر رہے تھے لیکن ان کے دل پر ایک بوجھ تھا اور آنکھوں میں جنرل مائیکل ڈائر کا غضبناک چہرہ تھا۔ جس کے آگے ہٹلر اور مسولینی بھی شرماتے نظر آتے تھے۔ اودھم سنگھ ۱۹۲۸ میں لاہور گئے جہاں بھگت سنگھ نے انھیں طلب کیا تھا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۳۱ کو سردار بھگت سنگھ کو پھانسی دے دی گئی اور اودھم سنگھ کو جیل میں رکھا گیا بعد میں انھیں رہا کر دیا گیا انھوں نے اپنا نام رام محمد سنگھ آزاد رکھا تھا۔ وہ ہندو مسلم سکھ اتحاد کے زبردست علمبردار تھے۔ انھوں نے آزادی کو پسند کیا اس لیے وہ خود کو آزاد کہتے اور رام ان کے ہندو ہونے، محمد مسلمان ہونے اور سنگھ، سردار ہونے کی علامت بن گیا اور یہ تینوں فرقے بھی آزادی کے طلب گار تھے۔ اس عظیم بہادر اور سورما نے قومی یکجہتی کا بھی زبردست پیام دیا تھا۔

اودھم سنگھ نے عوام میں انگریزوں کے خلاف حقارت اور غم و غصہ پیدا کرنے کے لیے باقاعدہ تحریک چلائی اس لیے انگریز سرکار ان کے خلاف رہی وہ ۱۹۳۲ میں جرمنی چلے گئے سیاسی حالات بدل رہے تھے، لیکن اودھم سنگھ کے دل میں انتقام کی آگ ابھی سرد نہیں ہونے پائی تھی، انھوں نے سخت محنت کی اور نہایت کوششوں کے بعد لندن پہنچ گئے اس وقت سر مائیکل ڈائر بھی لندن واپس پہنچ چکا تھا چنانچہ جلیان والا باغ کے حادثے کے عین ۲۱ برس بعد ۱۳ مارچ ۱۹۴۰ کو انڈین ایسوسی ایشن کا ایک اجلاس لندن میں منعقد ہوا جس میں کئی معزز انگریز شریک تھے، ان میں سابق لیفٹننٹ گورنر پنجاب سر مائیکل ڈائر بھی تھا اس موقع پر ڈائر نے تقریر بھی کی۔

(باقی کور صفحہ پر)

منصوبہ بندی سے متعلق ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنیوالا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

اس شمارے میں

چیف ایڈیٹر ——— • آر۔ ٹھکرال

ایڈیٹر ——— • لکھی رام رانا

اسسٹنٹ ایڈیٹر ——— • محمد عادل صدیقی

سب ایڈیٹر ——— • وسیم حیدر

جلد ۵	۱۶ تا ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۵	شمارہ ۱۴

۲۴ آشون تا ۹ کارتک شک ۱۹۰۷ فون : ۶۰۱۸۱۸

شرحِ چندہ

سالانہ ۲۰ روپے، ۲ سال ۳۵ روپے، ۳ سال ۵۰ روپے

فی کاپی ——— ایک روپیہ

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فیصد کی رعایت

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

بزنس منیجر: ایل۔ آر۔ بترہ ❁ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس۔ منجال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین)

نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

ترسیلِ زر کا پتہ : بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

دیہی ترقی کے مسائل

حصول آزادی کے بعد یوں تو ہندوستان نے سبھی شعبوں میں ترقی کی ہے، لیکن زراعت کے شعبے میں حاصل ہونے والی کامیابیاں اور بھی نمایاں ہیں۔ مگر ترقی کے اس عمل کے ساتھ کچھ پریشان کن حالات بھی سامنے آئے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ دیہات میں رہنے والے افراد اپنی خود کفیلی اور خود انحصاری کے لیے مشہور تھے، مگر آج انھیں زرعی آلات کے لیے شہروں میں کام کرنے والی صنعتوں کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ اسی طرح آبپاشی کی سہولتوں میں اضافے کی مسلسل کوششوں کے باوجود آج بھی کسانوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں مانسون کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ بجلی کی فراہمی، ڈیزل اور کیمیاوی کھادوں نیز جراثیم کش دواؤں کی دستیابی پر انحصار کرنے کی وجہ سے کسانوں کو خارجی عناصر کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ زراعت کی ترقی کا ایک اور پریشان کن پہلو یہ ہے کہ اس سے گاؤوں میں نابرابری بڑھی ہے اور اس کی وجہ سے علاقائی عدم توازن پیدا ہوگیا ہے۔ دیہی علاقے میں ترقی کے مختلف پروگراموں سے فائدہ اٹھانے والوں میں سماج کے امیر طبقے کے لوگ اور مالی طور پر بہتر کسان شامل ہیں، اور وہاں بسنے والے سماج کے کمزور اور غریب طبقے مثلاً بے زمین مزدور، چھوٹے اور حاشیائی کسان وغیرہ ان پروگراموں سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ حالاں کہ ان پروگراموں سے غریب ترین طبقے کو فائدہ پہنچانا ہی اصل مقصد ہے اس وجہ سے دیہات کے علاقوں میں سماجی اور اقتصادی تناؤ بڑھا ہے۔

اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے فوری اقدامات ضروری ہیں۔ اس کے لیے دیہات کی مربوط ترقی کا پروگرام ضروری ہے تاکہ سماج کے سبھی طبقوں کو یکساں طور پر فائدہ پہنچ سکے۔ اس پروگرام کو ترجیحی بنیادوں پر تیزی سے آگے بڑھانے کی ضرورت بخوبی واضح ہے۔ اس کے عمل درآمد میں لامرکزیت لاکر اس عمل کو اور موثر بنایا جاسکتا ہے۔ دیہات کی کثیر تعداد کو ایک ساتھ جوڑ کر ان کے لیے پائیدار اثاثہ جات تعمیر کیے جاسکتے ہیں اقتصادی سرگرمیوں کو مختلف سمتیں دی جاسکتی ہیں۔ دیہات میں صنعتی اور تکنیکی ڈھانچے کو مضبوط کیا جاسکتا ہے اور دیہی نظم ونسق میں اصلاح وبہتری لائی جاسکتی ہے اور مقامی وسائل سے بہتر طور پر کام لیا جاسکتا ہے۔ دیہات محض شہر میں تیار ہونیوالی مصنوعات کی کھپت کی منڈی نہیں ہیں، بلکہ اُن کو خودکفیل بنانا اور ان کی ضرورتوں کا سامان دیہات میں تیار کرنا بہت ضروری ہے۔

زرعی سیکٹر کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہماری قومی آمدنی کا تقریباً نصف حصہ اسی سیکٹر سے ملتا ہے۔ ہمارے ملک کی آبادی کا تقریباً ۷۰، فیصد حصہ زراعت سے ہی گزارا کرتا ہے۔ اس کے ذریعے صنعتی سیکٹر کو کچا مال فراہم کیا جاتا ہے۔ ملک کی برآمدات میں بھی اس کا نمایاں رول ہے۔ زرعی پیداوار کی فروخت اور اس کی درجہ بندی قومی معیشت پر مختلف طرح سے اثر انداز ہوتی ہے۔ اس لیے حصول آزادی کے بعد ملک میں زرعی تحقیق کے کاموں کو اہمیت دی گئی۔ اس ضمن میں زرعی تحقیق کی بھارتی کونسل (Indian Council of Agricultural Research) کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ یہ ادارہ زراعت، مویشی پروری اور ماہی گیری وغیرہ کی تعلیم و تحقیق کے لیے بیش بہا خدمات انجام دے رہا ہے۔ یہ کام مرکزی حکومت کے زرعی تحقیق اور تعلیم کے ادارے کے توسط سے انجام پاتے ہیں۔ ڈیپارٹمنٹ آف ایگری کلچرل ریسرچ اینڈ ایجوکیشن دسمبر ۱۹۷۳ء میں قائم کیا گیا تھا یہ زرعی تحقیق کی بھارتی کونسل کی ذمہ داریوں میں تال میل قائم کرتا ہے۔ زرعی تعلیم کے شعبے میں کونسل ہذا کا رول وہی ہے جو عام تعلیمی یونیورسٹیوں کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا ہے۔ ہر بڑی ریاست میں زرعی تحقیق کی ایک یونیورسٹی ہے۔ مہاراشٹر اور اترپردیش میں تو ایک سے زیادہ یونیورسٹیاں ہیں۔ کونسل ہذا نے ملک کے مختلف حصوں میں کرشی وگیان کیندر یعنی زرعی سائنس کے معلوماتی اور تحقیقی مرکز کھولے ہیں تاکہ کسانوں، بے روزگار دیہی نوجوانوں، اسکولی تعلیم درمیان میں چھوڑ دینے والوں وغیرہ کو تربیت دی جاسکے۔ ان میں تعلیم دینے والوں کی تربیت کے لیے سات ٹریننگ سنٹر الگ سے قائم کیے گئے ہیں۔ اُمید ہے کہ ان مختلف اقدامات سے دیہی مسائل کو حل کرنے میں مدد مل سکے گی اور یہ مسائل زیادہ دانشمندی اور تیزی سے حل ہوسکیں گے۔

(ایڈیٹر)

پریم اروڑہ

تعلیم کے مسائل

تعلیم کی غرض و غایت کیا ہے؟ کیا یہ امتحان پاس کرنے کا ایک ذریعہ ہے؟ کیا اس کا مقصد محض ڈگری حاصل کرنا ہے۔ کیا یہ ڈگری ایک ایسا اجازت نامہ یا پاسپورٹ ہے جس کے ذریعے سفید کالر کی کوئی جاب یا ملازمت حاصل کی جا سکتی ہے کیا یہ ایک ایسا عمل نہیں ہے جس کا تعلق زندگی بھر سیکھنے سکھانے سے ہے؟ کیا یہ اچھے شہری بنانے کے لیے نہیں؟ کیا یہ عوام کو جمہوری اور سیکولر اقدار سے واقف کرانے کے لیے نہیں ہے؟ کیا یہ نوجوانوں کو از خود روزگار کے اہل بنانے کے لیے نہیں ہے؟ کیا یہ طلبا اور طالبات کی ضرورتوں کی تکمیل اور انھیں عملی زندگی کے لائق بنانے کے لیے نہیں ہے؟ کیا یہ کام کی عظمت اور ہاتھ کے فن سے طلبا کو واقف کرانے کے لیے نہیں ہے۔ کیا یہ نوجوانوں کو اکیسویں صدی میں قدم رکھنے کے لائق بنانے کے لیے نہیں ہے؟ آج ہمارے سماج اور ہمارے نظامِ تعلیم کو اس طرح کے مسائل کا سامنا ہے۔ اس طرح کے عوامل کا تجزیہ اس دستاویز میں کیا گیا ہے جو کہ "چیلنج آف ایجوکیشن" کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ اس دستاویز میں ملک میں ابتدائی، ثانوی اور ملکی تعلیم کی موجودہ صورتِ حال کا تفصیلی بیان ہے۔ اس میں تعلیم کے نظام میں چند بنیادی تبدیلیاں لانے کی بات کہی گئی ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ اب ہمارا ملک اکیسویں صدی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ آج جو بچے آنکھ کھول رہے ہیں، وہ اگلی صدی کی ابتدا تک پرائمری تعلیم اور ابتدائی تعلیم ختم کر سکیں گے۔ ان کو جس طرح کی زندگی کا سامنا کرنا پڑے گا، اس کی مثال نوعِ انسانی کی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔ اس بھاگ دوڑ اور عملی کوششوں میں وہی طلبا کامیاب اور سرخرو ہوں گے، جنھوں نے خود کو اس کے لیے تیار کیا ہے تبدیلی کا عمل تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ عالمی سطح پر ٹکنالوجی جس قدر تیزی سے بدل رہی ہے، اس نے یہ ضرورت سامنے لا کھڑی کی ہے کہ ہم بھی ان چیلنجوں کا مقابلہ کریں اور خود کو ان کے لیے تیار کر سکیں۔ یہ مسائل یقیناً اہم ہیں اور اُن سے روگردانی ممکن نہیں۔ کل کے ہمارے ملک کے شہری کس معیار سے زندگی گزارتے ہیں، اس کو دیکھ کر یہ کہا جا سکے گا کہ وہ داخلی اور خارجی چیلنجوں کے مقابلے کے لیے تیار رہیں۔ ان چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تعلیم کا نظام سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس دستاویز میں اس بات سے آگاہ کرایا گیا ہے کہ انگریزی دورِ حکومت سے چلا آ رہا تعلیمی نظام کل کی ہماری ضرورتوں کو پورا نہ کر سکے گا۔ چنانچہ جدید تقاضوں کے پیشِ نظر اگر وافر اقدامات نہیں اٹھائے گئے تو اقتصادی عدم توازن، علاقائی نابرابری اور سماجی ناانصافیوں کا سلسلہ بدستور بڑھتا رہے گا جس سے ملک میں انتشار پسندانہ قوتوں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ مناسب تعلیم کے ذریعے اقتصادی اور سماجی ترقی کے عمل کو تیزی سے آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ ہمارے سامنے جس قدر وسائل ہیں، ان سے بھرپور استفادے کے لیے انسانی وسائل کا فروغ ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم پر سرمایہ کاری ترقیاتی پروگراموں کی سرمایہ کاری میں دفاع کے بعد سے زیادہ اہم ہے اور یہی وہ تصور ہے جسے اب بڑے پیمانے پر تسلیم کیا جا رہا ہے۔

انسانی وسائل کا فروغ:

اس پس منظر میں وزیرِ اعظم شری راجیو گاندھی نے ۲۹ر اگست ۱۹۸۵ کو اعلان کیا کہ ساتویں منصوبے میں انسانی وسائل کے فروغ کے لیے ۱۵۰۰ کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی ہے۔ اس رقم کا بڑا حصہ تعلیمی پروگراموں پر خرچ کیا جائے گا۔ یہ اعلان نئی دلی میں منعقدہ ریاستی وزرائے تعلیم کی کانفرنس میں کیا گیا۔ یہ کانفرنس نئی تعلیمی پالیسی کی تشکیل کے لیے اندازِ نظر پر بحث کرنے کے لیے بلائی گئی تھی۔ وزیرِ اعظم نے کہا کہ موجودہ نظامِ تعلیم، اپنے وقت میں اسے جو کام کرنا تھا، وہ کر چکا، مگر اب ضرورت اس بات کی ہے کہ آنے والے برسوں میں اس کی از سرِ نو تشکیل کی جائے۔

انھوں نے تعلیم کے اس رول کی وضاحت کی جو زندگی کے سبھی پہلوؤں سے متعلق ہے اور جو برابر اپنا کام کیا کرتا ہے، جس کا مقصد محض

ڈگری کا حصول نہیں اور جو اس لحاظ سے اپنی آبرو کھو چکا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تعلیم کا ایک اہم رول یہ ہے کہ وہ آزادانہ طور پر بنیادی تنازعوں اور عمل اور ردِ عمل کے باہمی سلسلوں کو فروغ دے۔ طلبا کو قومی تاریخ پڑھا کر ان میں ایک نئی روح بیدار کی جائے۔ اور انھیں زندگی کے مثبت اطوار سے واقف کرایا جائے تعلیم کی مدد سے سیکولرازم، جمہوریت، سماجی انصاف، خاندانی بہبود اور زندگی کے سلیقے کے تئیں مناسب رویوں کو پیدا کرنے پر زور دیا جائے۔ امتحان کا طریقہ کار اپنی افادیت اور اپنا اعتبار کھو چکا ہے، اس لیے انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ اس میں جلد سے جلد تبدیلی لائی جائے۔ انھوں نے کہا تعلیم سے سبھی کو اور خاص کر نچلی سطح پر سب کو فائدہ پہنچنا ضروری ہے۔ اس طرح لڑکیاں، شیڈولڈ کاسٹ، شیڈولڈ ٹرائب اور سماج کے دیگر کمزور طبقے اس نئے نظام تعلیم سے پوری طرح مستفید ہو سکیں۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے داخلوں کو منظم پیمانے پر آگے بڑھانا ضروری ہے، پرائیویٹ اور پبلک سیکٹر کے ارکان کے فائدے کے لیے پیشہ ورانہ تعلیم سستی ہو، یونیورسٹیاں ٹھیک ڈھنگ سے کام کریں اور وہ اپنی کارگزاری کے لیے جوابدہ ہوں، تعلیم کو سیاست سے آزاد رکھا جائے، عوامی ذرائع ابلاغ کی مدد سے تعلیم کو عام کیا جائے۔ تعلیم کا معیار بلند ہو، استادوں کا تعلیمی معیار بلند ہو۔ یہ سب وہ امور ہیں جہاں ہمارے نظام تعلیم کو خصوصی طور پر غور کرنا ہے۔

وزیراعظم نے پیشہ ورانہ تعلیم کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ اس محاذ پر اب تک ہماری کارگزاری غیر تسلی بخش رہی ہے۔ اس سلسلے میں ہندوستان کو دیگر ملکوں کے تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ مناسب افرادی قوت، ہنرمندی اور نظم و نسق سے ملک اکیسویں صدی میں قدم رکھنے کے لیے خود کو اہل بنا سکے گا۔ اس سلسلے میں بجلی گھروں کی کارگزاری، مینوفیکچرنگ، سامان کی تیاری، اور سروس سیکٹر کی کارگزاری کو بطور خاص بہتر بنانا ہوگا۔

ریاستی وزرائے تعلیم نے وزیراعظم سے اتفاق کیا کہ یہ تعلیمی نظام فرسودہ ہو چکا ہے، اس میں بنیادی تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے تاکہ آنے والے دور کے چیلنجوں سے نپٹا جا سکے۔ اس دستاویز میں اچھی بات یہ بتائی گئی کہ اس نے پہلی بار حقیقت پسندانہ پس منظر میں تعلیمی پالیسی کی تشکیل اور اس پر عمل درآمد کی دشواری کو صحیح صورت سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس میں تعلیم کے نظام نو کے لیے نئے خیالات پیش کیے گئے اور ملک گیر پیمانے پر تبادلۂ خیال کی دعوت دی گئی۔ بلاشبہ مجوزہ اقدامات کو مقامی ضرورتوں کے مطابق بنانے کی ضرورت ہوگی۔ اس کانفرنس کے بعد مرکزی وزیر تعلیم شری کے۔ سی۔ پنت نے اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا تھا کہ تعلیمی نظام پر نظرثانی کرنے اور اس میں کسی طرح کی کوئی تاخیر روا نہ رکھنے پر سبھی متفق ہیں۔ انھوں نے کہا کہ تعلیم کو عالمگیر پیمانے پر پھیلانے، اس کا معیار بلند کرنے اور اس کے ذریعے سماجی انصاف لانے پر سبھی نے اتفاق ظاہر کیا ہے۔

یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ وزرائے تعلیم کی کانفرنس میں اس بات پر سبھی متفق تھے کہ تعلیم کا قومی نظام وضع کیا جانا چاہیے۔ اس نظام سے پورے ملک کے بچے اور بالغ یکساں طور پر فائدہ اٹھا سکیں گے۔ تعلیمی معیار بہتر ہو سکے گا، تعلیم کو پیشہ ورانہ بنایا جا سکے گا۔ اور تعلیم قومی یکجہتی لانے کا ذریعہ بن سکے گی۔ نصاب تعلیم کا ایک مشترکہ کوڈ شروع کیے جانے کے خیال سے بھی سبھی متفق تھے، تری پورہ اور مغربی بنگال کو چھوڑ کر باقی سبھی ریاستوں نے اس سے اتفاق کیا۔ وزرائے تعلیم نے یہ تو نہیں بتایا کہ نصاب تعلیم کیا ہو۔ لیکن نئی تعلیمی پالیسی کے مسودے میں دستیاب مواد کی بنیاد پر مشترکہ نصاب میں مختلف مہارتوں کی یکساں صلاحیت حاصل کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جسمانی صحت، موزونیت، ہاتھ کا کام، حساب کتاب اور قومی یکجہتی کی تعلیم وغیرہ پر زور دیا گیا ہے۔ قومی یک جہتی کے لیے ملک کی جدوجہد آزادی کی تاریخ اور یہاں کے ثقافتی ورثے سے طلبا کو روشناس کرانے کے لیے کہا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی آبادی کے بارے میں طلبا کو ضروری تعلیم اور حقائق سے آگاہ کرانے کی کوشش کی جائے گی۔ وزرائے تعلیم نے

ہاتھ کا کام اور سماجی خدمات کو ہر مرحلے پر شروع کرنے سے اتفاق کیا۔ دس جمع دو نظام تعلیم والوں کو پیشہ ورانہ تعلیم دلانے پر زور دیا گیا۔ کچھ وزیر اس بات پر مُصر تھے کہ آٹھویں جماعت کے بعد پیشہ ورانہ تعلیم شروع کرا دی جائے۔ تمام وزیروں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ کوئی بھی ریاست اپنے وسائل سے قومی سطح پر تربیتی پروگرام نہیں دے پائے گی۔ اس لیے مرکز کے زیر اہتمام بڑے پیمانے پر ان اسکیموں کا جاری رہنا ضروری ہے تاکہ ریاستوں کی طرف سے شروع کیے گئے پروگراموں کو تقویت مل سکے۔

تمام شرکائے کانفرنس نے نئی تعلیمی پالیسی پر عمل درآمد کے لیے تفصیلی حکمت عملی کی ضرورت بتائی۔ انھوں نے کہا کہ اس پر عمل درآمد کی ذمہ داری ریاستی سرکاروں کی ہونی چاہیے۔ ضلع اور تعلقہ کی سطح پر تعلیمی نظام میں لامرکزیت لانے کی ضرورت سمجھی گئی تاکہ اسکولی نظام کو موثر طور پر چلایا جا سکے۔ اور اُستادوں کی کارکردگی بہتر ہو سکے۔ وزرائے تعلیم نے بتایا کہ تعلیم کے ضمن میں اُستاد کی اہمیت اور اس کے رول سے روگردانی نہیں کی جا سکتی۔ انھوں نے کہا کہ فی زمانہ طریقِ تعلیم اور اس کا نصاب تعلیم فرسودہ ہو چکا ہے۔ اُستادوں کی سیاسی وابستگی پر بھی تشویش ظاہر کی گئی۔

لڑکیوں، شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب طلبا کی تعلیم پر خصوصی توجہ کی ضرورت سمجھی گئی۔ اسی طرح تعلیمی حیثیت سے پسماندہ ریاستوں میں بھی تعلیمی ضرورتوں کو اہمیت دیے جانے کی بات کہی گئی۔ ریاستوں کے تعلیمی مصارف بڑھانے کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا۔ اس کے لیے انھیں غیر منصوبہ جاتی اخراجات پر نظرثانی کرنی ہوگی۔

اعلیٰ تعلیم کے داخلے کے قواعد و اصولوں کے سلسلے میں مغربی بنگال اور تری پورہ کو چھوڑ کر، سبھی نے یہ کہا کہ ثانوی سطح پر طلبا کے سامنے گوناگوں پیشہ ورانہ نصابات ہونے چاہئیں، اور ہر طالب علم کے رجحان اور اس کی صلاحیت اور کارکردگی کی جانچ کا نظام معرضِ وجود میں آنا چاہیے مراسلاتی نصابوں وغیرہ کے ذریعے اعلیٰ تعلیم فراہم کرنے کے مواقع سامنے آنے چاہئیں اور شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب نیز سماج کے کمزور طبقوں کے لیے تحفظات کا نظام وضع کیا جانا چاہیے

موجودہ امتحانی طریق کار کو خطرناک اور بے سود بتاتے ہوئے ریاستی وزرائے تعلیم نے کہا کہ اس کا ہماری حقیقی ضرورتوں سے کوئی ربط نہیں ہے۔

پیشہ ورانہ تعلیم کو طلبا کے لیے جلد سے جلد شروع کرانا چاہیے۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ ہمارے یہاں انجینئروں اور ناخواندہ ورکروں کی کافی تعداد ہے۔ مگر ایسے ہنرمند عملے کی کمی ہے جو کہ درمیانی سطح پر کارآمد ہو سکے۔ اکیسویں صدی میں صنعتوں کو جن چیلنجوں سے نپٹنا ہے، ان کے لیے اس طرح کے عملے کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اسی لیے کمپیوٹری نظام کی ترویج اور مائکرو پراسیسر کی تعلیم ضروری ہے۔ اس نئی پالیسی میں پیشہ ورانہ تعلیم کو زراعت سے جوڑنے کی بات کہی گئی ہے۔ اور دیہی ترقی کے مختلف پروگراموں سے اسے مربوط کر دینے پر زور ہے۔ مقصد یہ ہے کہ دیہی نوجوان از خود روزگار پیدا کر سکے۔ مسودۂ پالیسی میں موجودہ سہولتوں سے بھرپور استفادے کے لیے کہا گیا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم کو مضبوط بنانے پر زور ہے، تعلیم کو جدید بنانے اور اس میں جدید سائنس اور ٹکنالوجی کو سمونے کی بات کہی گئی ہے۔ ریاستی وزرائے تعلیم نے مختلف ٹیکسوں وغیرہ کے ذریعے وسائل جمع کرنے پر زور دیا ہے۔ لیکن تعلیم پر سرمایہ کاری بڑھانے کی ضرورت سے سبھی اتفاق کرتے ہیں۔ حالاں کہ یہ مہنگا سودا ہے لیکن بقول مرکزی وزیر تعلیم شری کے۔ سی۔ پنت، ایسا نہ کرنا طویل المدتی عرصے میں اور بھی مہنگا سودا ہوگا۔ جاپان، امریکہ اور روس میں اُن کی مجموعی قومی آمدنی کا چھ فیصد تعلیم پر خرچ ہوتا ہے۔ جبکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی مجموعی قومی آمدنی بھی ہمارے مقابلے بہت زیادہ ہے لیکن ہندوستان میں یہ خرچ صرف ۳ فیصد ہے۔ یکے بعد دیگرے مختلف منصوبوں میں تعلیم کے اخراجات مسلسل کم ہوتے رہے۔ پہلے منصوبے میں یہ ۷ فیصد تھا، جبکہ چھٹے منصوبے میں یہ صرف ۲.۶ فیصد رہ گیا۔ اور ساتویں منصوبے میں بھی یہ تقریباً چھٹے منصوبے کی سطح پر ہی رہیگا۔ اس لیے تعلیم پر مزید اخراجات ضروری ہیں۔ اس دستاویز میں کہا گیا ہے کہ سیاسی پارٹیوں، رضاکار اداروں، استادوں، نوجوانوں، پیشہ ورانہ تنظیموں، ثقافتی اور سائنسی اداروں کو ایسے مشورے دینے چاہئیں جن کی بنیاد پر قومی سطح پر نظامِ تعلیم کے لیے اتفاق ہو سکے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس سلسلے کے مختلف مسائل پر غور کریں اور اخبارات، ریڈیو، نیز ٹی۔ وی کے ذریعے اپنی رائے سب کے سامنے رکھیں۔ ●

[illegible]

زرعی ترقی کی ایک جھلک

گذشتہ پانچ برسوں میں تمام بڑی بڑی فصلوں مثلاً چاول، گندم و دوسرے اناجوں اور دالوں اور تلہن کی پیداوار میں ہمہ جہت ترقی ہوئی ہے۔ ۸۴-۱۹۸۳ء میں اناج کی پیداوار ۱۵ کروڑ ۱۵ لاکھ ٹن تھی، جبکہ ۸۵-۱۹۸۴ء کے عارضی اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ پیداوار میں مزید اضافہ ہوگا۔ اناج کی پیداوار میں اضافے کی شرح ۱۹۸۰ء سے شروع ہونے والے پانچ برسوں میں اس سے پہلے کے منصوبے کے پانچ برسوں کی نسبت زیادہ تھی، گندم اور چاول کی پیداوار میں اضافے کی شرح جو بالترتیب ۴.۸ و ۴ اور ۳.۰ فیصد سالانہ تھی، خاص طور پہ قابلِ ذکر تھی۔

تلہن اور دالوں کی پیداوار بھی جسے بیس نکاتی پروگرام میں اعلیٰ ترجیح دی گئی ہے، قریب پانچ فیصد سالانہ کی شرح سے بڑھی۔ ان پانچ برسوں میں دوسری بڑی فصلوں کی پیداوار میں بھی نمایاں اضافہ ہوا۔

پیداوار میں یہ اضافہ اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ گذشتہ پانچ برسوں میں موسمی حالات ناموافق رہے۔ مون سون ناکافی رہا یا سیلاب آگئے۔ گذشتہ پانچ برسوں میں سبز انقلاب کے پانچ برسوں اور اس سے قبل کے برسوں کی بہ نسبت کھیتی کے انتظام میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ جہاں سبز انقلاب سے پہلے زیادہ زور زیرِ کاشت رقبہ بڑھانے پر دیا گیا۔ وہاں سبز انقلاب کے دوران زیادہ زور پیداوار دینے والے بیجوں کی کاشت پر دیا گیا۔ گذشتہ پانچ برسوں میں پیداوار کے بڑے بڑے اسباب میں کھیتی کے کام آنے والی اشیاء کا بہتر انتظام، ان اشیاء اور زرعی خدمات کی کسانوں کو بہتر بہم رسانی اور زیادہ اچھی توسیعی خدمات کا نظام شامل ہیں۔ حکومت ٹیکنالوجی کی بنیاد مضبوط کرنے کیلئے زوردار کوششیں کر رہی ہے، جس کے نتیجے کے طور پر پیداوار

(باقی صفحہ ۱۶ پر)

۲۶ تا ۳۱ راکتوبر ۱۹۸۵ء

ایم ایل بجاج

جنگل بانی کے پروگراموں کا جائزہ

سماجی جنگل بانی نہ صرف آج ملک کی جنگل بانی کو ترقی دینے کا اہم ترین ذریعہ ہے بلکہ وہ معاشرت کی دیہی ترقی کو بڑھاوا دینے کا اہم اقدام بھی بن گئی ہے۔ ملک اور تمام مرکزی منتظم علاقوں میں سماجی جنگل بانی کے پروگرام جنگلات اور دیہی ترقیات کے محکموں کے بجٹ سے عمل میں لائے جا رہے ہیں۔

سماجی جنگل بانی کے پانچ بڑے حصے ہیں جو درختوں کی کاشت پر مبنی ہیں' یہ ہیں:

۱۔ مالکان اراضی کی طرف سے درخت لگانا۔ ۲۔ دیہات میں پنچائتی اور سرکاری زمینوں پر درخت لگانا۔ ۳۔ سڑکوں' نہروں' دریاؤں اور ریلوے لائنوں کے ساتھ ساتھ تنگ اور لمبی زمینوں پر درخت لگانا۔ ۴۔ جنگلات کی اُن زمینوں پر درخت لگانا جہاں سے پیڑ پودے اکھاڑ لیے گئے ہیں اور ۵۔ غریبوں اور بے زمین کسانوں کو خاص مقصد سے دی گئی زمین پر درخت لگانا۔

چھٹے پانچسالہ منصوبے میں سماجی جنگل بانی پر تین ارب ۱۵ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کی گئی جو جنگل بانی کے منصوبے کے تمام تر اخراجات کا کوئی ۵۱ فیصد تھی۔ اس منصوبے میں تقریباً ۱۶ لاکھ ہیکٹیئر زمین سماجی جنگل بانی کے تحت لائی گئی جبکہ اس کے مقابلے میں پچھلے ۳۰ برسوں میں مجموعی طور پر ۱۴ لاکھ ہیکٹیئر زمین کو جنگل بانی کے تحت لایا گیا۔

اس کے علاوہ مارچ ۱۹۸۵ کو ختم ہونے والے چار برسوں میں فارمی جنگل بانی کے تحت تقریباً تین ارب ۸۰ کروڑ تخمی پودے تقسیم کئے گئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں پہلے کی نسبت زیادہ مالی اور طبیعاتی وسائل وقف کئے گئے اور ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں اس سے کئی گنا زیادہ وسائل اس کے لیے مخصوص کئے جائیں گے۔

سماجی جنگل بانی کے پروگراموں کا جائزہ درحقیقت انتہائی پیچیدہ اور جامع ہو سکتا ہے یا وہ خصوصی امور پر مرکوز ہو سکتا ہے۔ تاہم ان پروگراموں کی جانچ پڑتال کرتے اور جائزہ لیتے ہوئے سماجی جنگل بانی کے پروگراموں کے مقاصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ یہ ہیں: جلانے کی لکڑی اور بیشتر دوسری متعلقہ اشیا کی پیداوار کو ابتدائی طور پر بڑھانا۔

شروع میں غریبوں اور ناداروں کو فائدہ پہنچانا اور بعد ازاں درخت لگانے اُن کی حفاظت اور دیکھ بھال اور پیداوار کی تقسیم کی ذمہ داری حکومت سے پنچائت کو منتقل کرنا۔

اس کام کی جانچ پڑتال مقررہ وقت کے اندر بنیادی، کلیدی داخلی ترقیاتی اشیا کی طبیعاتی اور مالی پیش رفت سے کی جا سکتی ہے۔ ان داخلی اشیا میں شامل ہیں۔ عملے کے لیے بجٹ کی رقم' سول کام، گاڑیاں، انتظامی منصوبے اور زمین (استقرار، حصول) یہ کلیدی ترقیاتی داخلی اشیا ہیں اور ہر پروگرام کے لیے کسی اشتراکیے تغیرات کا ہونا ضروری ہے۔ ان اشیا کی کارکردگی کا انحصار قلیل اور طویل مدت کے لیے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر عملے کی منظوری و تعیناتی اور خرچ کئے گئے روپیہ سے پیڑ پودے لگانے اور سول کاموں میں عام کارکردگی کا جائزہ قلیل مدت کی بناء پر لیا جا سکتا ہے اور پروگرام کی تکمیل (یا اس کی توسیع) پروگرام کی از سرِ نو تشکیل اور روزگار کے اثرات کا جائزہ طویل مدت کی بنا پر لیا جا سکتا ہے، جو گاڑیاں فراہم کی جاتی ہیں۔ اُن کے باعث عملہ زیادہ حرکت پذیر ہو جاتا ہے اور وہ قلیل مدت اور طویل مدت کے لیے پنچائت اور انفرادی کاشتکاروں سے زیادہ میل جول بڑھا سکتا ہے۔ دیہی انتظامی منصوبوں سے پروگرام کے بارے میں پنچائت اور دیہی یونٹوں سے مشورہ کیا جا سکتا ہے اور اُن کے ساتھ میل جول بڑھایا جا سکتا ہے۔ اس سے اس پروگرام میں پنچایت کی شرکت بہت حد تک بڑھ سکتی ہے۔

جانچ پڑتال کے کاموں کا زیادہ تعلق عملی سرگرمیوں سے ہے۔ ان میں نرسریوں کا قیام' فارمی جنگل بانی' ریلوے لائنوں اور سڑکوں کے ساتھ درخت لگانا' پنچائتی اور سرکاری زمینوں پر پیڑ پودے اگانا' اُجڑے ہوئے جنگلات کی بحالی اور توسیع و پیغام رسانی اور تحقیق و تربیت شامل ہے۔

(باقی صفحہ پر)

ضیاالرحمٰن غوثی

نیشنل کیپیٹل ریجن

دلی میں ہر سال ڈھائی کروڑ کے قریب نئی آبادی آکر بستی ہے۔ اس کی وجہ سے دلی پر تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کا دباؤ مسلسل بڑھتا جارہا ہے۔ جو اپنے آپ میں ایک بڑا مسئلہ ہے۔ دوسری طرف دلی کی زبردست ترقی ہوئی ہے لیکن کئی وجوہ سے یہ ترقی پوری طرح منصوبہ بند نہیں کہی جاسکتی۔ انھیں باتوں کو مدِنظر رکھ کر سب سے پہلے ۱۹۷۳ء میں "نیشنل کیپیٹل ریجن" کا منصوبہ بنانے کا خیال ہوا تھا جس کے تحت نیشنل کیپیٹل ریجن یعنی "قومی راجدھانی خطہ" کے کچھ اہم مقامات کو خاص طور سے فروغ دینے کا خیال تھا۔ یہ بات بھی زیرِ غور ہے کہ راجدھانی کے آس پاس میرٹھ، ہاپوڑ، پانی پت، الور، گوڑگاؤں، ریواڑی، رہتک، سونی پت، مودی نگر، سکندر آباد، بلند شہر، خورجہ، پلول وغیرہ چھوٹے چھوٹے شہروں کو منصوبہ بند طریقے سے فروغ دے کر ان میں صنعت اور تجارت کے مرکز قائم کیے جائیں۔ اس طرح قومی راجدھانی خطے میں دلی کے ۳۰ ہزار مربع کیلومیٹر کے علاقے میں اترپردیش، ہریانہ اور راجستھان کے کچھ علاقے شامل کرنے کا منصوبہ تھا۔

۱۹۷۵ء تک اس منصوبے پر تیزی سے غور و خوض ہوا لیکن پھر جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ کچھ سال قبل ورکس اینڈ ہاؤسنگ کے مرکزی وزیر نے اعلان کیا تھا کہ حکومت ہند قومی راجدھانی خطے کے منصوبے پر پھر سے اور تیزی سے غور کررہی ہے۔ اندازہ تھا کہ ۱۰ سال کی مدت میں اس پروجکٹ پر تقریباً دو ارب روپے خرچ ہوں گے۔ بین الریاستی خطے کے اس مجوزہ پروجکٹ کے لیے ۳۰٬۲۹۲ مربع کیلومیٹر علاقہ میں پھیلی تقریباً ڈیڑھ کروڑ کی آبادی کے لیے منصوبہ بنانا تھا۔ صنعت اور دوسرے امور کی ترقی کے لیے بنیادی ڈھانچہ تیار کرنا تھا۔ متعلقہ ریاستوں کی زمین کو ہموار کرنے، عمارتیں تعمیر کرنے، اور رسل و رسائل وغیرہ کے بارے میں باہمی تال میل سے کام کرنا تھا۔ یہ بھی تجویز تھی کہ ٹیکس کی وصولی کا یکساں طریقہ پورے علاقے میں ہو اور چیک پوسٹ وغیرہ کی پابندیاں اٹھائی جائیں۔

اس طرح نیشنل کیپٹل ریجن کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے متعلق کاموں کی جانچ پڑتال کرنے کے لیے ایک اعلیٰ اختیار والی اتھارٹی قائم کی گئی اور اہم امور کو بروئے کار لانے کے لیے ایک ارب ۹۳ کروڑ روپے کے خرچے کی تجویز ہوئی۔ "رِنگ شہروں" میں ۱۰ ہزار رہائشی اکائیوں اور دس لاکھ مربع فٹ میں دفتروں کی تعمیرات کی بھی تجویز ہوئی۔ یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ دلی کے ان رِنگ شہروں سے ملنے والی ٹرینوں اور بسوں کی سروس بھی بہتر بنانے کے لیے متعلقہ اکائیاں مربوط کوششیں کریں گی۔

اگر قصبات کے معیارِ زندگی کو بہتر اور دلکش بنایا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ راجدھانی اور گھنی آبادی والے شہروں کے گھٹے ہوئے ماحول سے نکل کر لوگ ان کھلے اور صحت مند ماحول والے علاقوں میں منتقل ہونا پسند نہ کریں۔

۱۹۸۳ میں اپنے موجودہ عہدہ کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد سے ہی دلی کے چیف ایگزیکیٹیو کونسلر شری جگ پرویش چندر نیشنل کیپٹل ریجن پلاننگ بورڈ کے قیام کے لیے مرکزی وزیر پر برابر زور ڈالتے رہے۔ تاکہ دلی اور اس کے آس پاس کے علاقے کی ترقیاتی سرگرمیاں اچھے اور منصوبہ بند ڈھنگ سے جاری رہیں۔

نیشنل کیپٹل ریجن کے تمام پہلوؤں پر پورے غور و خوض کے بعد ۱۷ ستمبر ۱۹۸۴ کو پالیکا کیندر کے افتتاح کے موقعے پر ورکس اینڈ ہاؤسنگ کے مرکزی وزیر شری بوٹا سنگھ نے اعلان کیا کہ نیشنل کیپٹل ریجن پلان کو بروئے کار لانے کے لیے ایک اسٹیچوٹری بورڈ کے قیام کے

[illegible] گا۔ اگر [illegible] مرکزی علاقہ دلی کا ایسا کوئی قانون ساز ادارہ نے متعلقہ بل کو پہلے ہی منظوری دے دی تھی۔ پارلیامنٹ کے گذشتہ اجلاس میں یہ بل منظوری کے لیے پیش کیا گیا تھا لیکن ممبروں کی گہری دلچسپی کے باوجود کام کی زیادتی کی وجہ سے گذشتہ اجلاس اس بل پر غور و خوض کرکے اسے منظوری نہ دے سکا۔

اس لیے گذشتہ اکتوبر میں آرڈیننس کے ذریعہ نیشنل کیپٹل ریجن کے لیے ترقیات سے متعلق منصوبہ تیار کرنے کے لیے ایک پلاننگ بورڈ کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ اس بورڈ کے ۲۱ ممبر ہونگے۔ ورکس اینڈ ہاؤسنگ کے مرکزی وزیر بورڈ کے چیرمین ہوں گے۔ اترپردیش، ہریانہ، راجستھان کے وزرائے اعلیٰ اور مرکزی علاقہ دلی کے ایڈمنسٹریٹر (لیفٹننٹ گورنر) دیگر ممبران ہوں گے۔ بورڈ منصوبے کو بروئے کار لانے کے بارے میں تال میل قائم کرے گا اور زمین کے استعمال اور مربوط نگہداشت کے ساتھ ترقیاتی سرگرمیوں میں بھی تال میل قائم کرے گا۔ نیشنل کیپٹل ریجن میں اندھا دھند تعمیرات کے عمل کو بھی بورڈ روکے گا۔

اس طرح اُمید کی جاتی ہے کہ اب نیشنل کیپٹل ریجن پلاننگ بورڈ کے قیام سے دلی پر تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کا دباؤ کم ہو جائے گا۔ اور راجدھانی کی آبادی کا بیشتر حصہ دلی کے آس پاس ابھرنے والے ۱۸ مجوزہ صنعتی رنگ شہروں میں منتقل ہو جائے گا۔

بورڈ مختلف علاقائی منصوبے بھی تیار کرے گا۔ اس کے علاوہ متعلقہ ریاستوں کی طرف سے سب ریجنل پلان اور پروجیکٹ پلان کی تیاری کے لیے بھی کوشش کرے گا۔ اس کے علاوہ بورڈ مرکزی اور ریاستی منصوبوں کے فنڈ اور دوسرے وسائل سے متعینہ ترقیاتی پروجیکٹوں کے لیے رقم مہیا کرنے کا انتظام کرے گا۔ بورڈ اس بات کا بھی قصہ دار ہوگا کہ متعلقہ ریاست اور مرکزی علاقہ دلی کے پروگرام ٹھیک ڈھنگ سے طے ہوں اور مختلف پروجیکٹوں پر بہتر طور پر عمل ہو اور جن امور کو ترجیح دینا ضروری ہو ان کو یقینی ترجیح دی جائے۔

بورڈ کے آٹھ ممبروں کو مرکزی حکومت متعلقہ ریاستوں اور مرکزی علاقہ دلی کے ایڈمنسٹریٹر کی سفارشوں پر نامزد کرے گی۔ نیشنل کیپٹل ریجن میں جو علاقے شامل ہوں گے وہ نیشنل کیپٹل ریجن بورڈ کی سنٹرل پلاننگ کے تحت آئیں گے۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں ہو سکتی کہ نیشنل کیپٹل ریجن پلان کے بروئے کار لائے جانے اور اس کی کامیابی کے نتیجے میں صورت حال بہتر ہوگی۔ لیکن ایسے اہم مسائل بھی ہیں، جنھیں زیرِ غور رکھنا ہوگا۔ سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ترقیاتی منصوبوں کو بروئے کار لانے کے لیے رقم کی فراہمی۔ اس سال کے شروع میں ورکس اینڈ ہاؤسنگ کے مرکزی وزیر نے متعلقہ وزرائے اعلیٰ کو یقین دلایا تھا کہ مرکزی حکومت ضروری فنڈ مہیا کرانے میں کبھی پیچھے نہیں رہیگی۔ دوسری اُمید افزا بات انھوں نے یہ بھی کہی تھی کہ ساتویں پنجسالہ منصوبے کے لیے رقم کی فراہمی پر غور و خوض ہو رہا ہے اس لیے نیشنل کیپٹل ریجن پلان کے لیے وسائل اکٹھا کرانے کا اچھا موقع ہے۔

دوسرا مسئلہ ہے چنگی، سیلس ٹیکس، انکم ٹیکس، دولت ٹیکس، اکسائز ڈیوٹی وغیرہ سے متعلق، قاعدے قانونوں کو سبھی متعلقہ ریاستوں اور مرکزی علاقہ دلی میں یکساں بنانے کی جس پر بہت پہلے سے زور ڈالا جا رہا ہے۔ اگر یہ قاعدے قانون عام علاقوں میں یکساں نہیں ہیں، اس مسئلے پر تمام اکائیوں کا متفق ہونا ضروری ہوگا۔

[illegible] سے بہ گروہ [illegible] مڈلیوں اور پبلک سیکٹر کے دفاتر کی منتقلی کا۔ اس عمل میں مفاد پرست عناصر کو رکاوٹ ڈالنے کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔

●

بقیہ: جنگل بانی کے پروگراموں کا جائزہ

* محض اس امر کی رپورٹ تیار کرنا کافی نہیں ہے کہ ایک نرسری میں تخمی پودوں کی کتنی پیداوار ہوئی۔ فوری جائزے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ کتنے تخمی پودے چھوٹے چھوٹے مطلوبہ کاشتکاروں میں مفت یا کم قیمت پر تقسیم کیے گئے یا عام افراد کے ہاں اور اسکولوں میں کتنی نرسریوں کا پھیلاؤ ہوا۔

داخلی اور بیرونی اشیا کی جانچ پڑتال کے ساتھ ساتھ جائزے کا بڑا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ کیا مطلوبہ گروپ اس پروگرام سے مستفید ہو رہے ہیں۔

اس پروگرام کے مقاصد ہیں:-

- زمین کے استعمال اور جنگلاتی انتظام کے طور طریقوں میں تبدیلی جس سے عوام محض جنگلات کی پیداوار سے فائدہ اٹھانے کے بجائے ایک ایسے انتظامی سسٹم کی طرف توجہ دیں جو ماحولیاتی تحفظ کے لحاظ سے زیادہ مضبوط ہو۔
- سماجی جنگل بانی کی زیادہ تر ذمہ داری جنگلات کے محکموں سے مقامی پنچایتوں کو منتقل کی جائے۔
- پیداشدہ وسائل کا منصفانہ استعمال کرکے بے زمین اور چھوٹے کاشتکاروں کے لیے روزگار پیدا کیا جائے۔
- مویشیوں اور ان کے چرنے کے موجودہ طور طریقوں میں تبدیلی کی جائے۔

سائنسی و صنعتی تحقیقی کونسل کا شاندار کردار

کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (سی ایس آئی آر) جس کا آغاز ایک معمولی ادارہ کے طور پر ۱۹۴۲ میں ہوا تھا، آج ایک بہت بڑا سائنسی ادارہ بن چکی ہے، جو ملک کی سائنسی ترقی میں نمایاں رول ادا کر رہا ہے۔ یہ نہ صرف دھرتی کا پیٹ چاک کر کے اس میں سے طرح طرح کی معدنیات حاصل کر رہا ہے، بلکہ سمندر کے بطن سے بھی مینگنیز، تانبہ، لوہا، نکل اور کوبالٹ جیسی بیش قیمت دھاتیں نکال رہا ہے جن کے ارضی ذخیرے دنیا کی ضروریات کے باعث تیزی سے ختم ہو رہے ہیں۔ یہ کام اس کونسل کے ایک دوسرے ادارے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوشنو گرافی (این آئی او) کی طرف سے انجام دیا جا رہا ہے۔ یہ انسٹی ٹیوٹ ڈونا پولا (گوآ) میں واقع ہے اور گذشتہ چار برس سے اُن ملکوں کے کلب میں شامل ہو گیا ہے جو گہرے سمندر میں کام کرتے ہیں۔ تب ایسے ترقی یافتہ ممالک کی تعداد چھ تک محدود تھی۔

یہ دھاتوں کے گولے گوبھی کے پھولوں سے مشابہت رکھتے ہیں اور یہ دھاتوں کے اُن ذرات سے تشکیل پاتے ہیں جو ہزاروں برسوں سے سمندر میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اندازہ ہے کہ اس وقت ان کے ذخائر ...

اس انسٹی ٹیوٹ نے سیچلز جزائر کے قریبی سمندر سے ۳۵ کلوگرام دھاتوں کے گولے نکالے تھے۔ بعد ازاں اس کے ہاتھ ایسے گولوں کا بڑا ذخیرہ آیا جو ۱۲ کلوگرام فی مربع میٹر تک پھیلا ہوا تھا۔ کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کے سائنس دانوں نے ان گولوں سے دھاتیں نکالنے میں کامیابی حاصل کی ہے اور ان میں سے کچھ دھاتیں بڑے بڑے میڈلوں کی صورت میں مرحوم وزیر اعظم اندرا گاندھی کو پیش کی گئی تھیں۔

یہ کونسل ایک بہت بڑے ادارے کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اس کی ۴۰ ریسرچ لیبارٹریاں اور ایک سو سے زیادہ توسیعی مرکز ہیں۔ اس کا بنیادی ڈھانچہ ایک ارب روپے کی مالیت کا ہے۔ اس ادارے سے تقریباً ۴۰۰۰ سائنس دان اور ٹیکنالوجی کے ماہرین وابستہ ہیں جنہیں ۱۰ ہزار سے زیادہ سائنسدانوں اور تکنیکی ماہروں کی امداد حاصل ہے۔ اس کے دفاتر نئی دلّی میں واقع "انوسندھان بھون" میں ہیں۔

"سی ایس آئی آر" کی ٹیکنالوجی میں اس قدر گوناگونی پائی جاتی ہے کہ آج وہ دنیا میں ایک بے نظیر سائنسی تنظیم ہو گئی ہے۔ یہ کوئی پیداواری تنظیم نہیں ہے بلکہ اس کی ٹیکنالوجیوں کی بنا پر کئی طرح کی اشیا، کیمیکل، دوائیاں اور دیگر مصنوعات تیار ہوتی ہیں۔ ان اشیا کا وسیع سلسلہ اشیائے صرف سے لے کر اعلیٰ سائنسی تک پھیلا ہوا ہے۔ ایک طرف ہلکے مشروبات، مصالحہ جاتی مصنوعات اور ٹیلی ویژن ریسور ہیں تو دوسری جانب ادویات، کیمیکل، لیزر گلاسس، پلازما سائنس اور خلائی ساز و سامان ہے۔ کونسل نے ایسی ٹیکنالوجیوں کو فروغ دیا ہے جن سے نہ صرف کام کاج سے لدے پھندے کسانوں کا بوجھ ہلکا ہوا ہے اور ان کی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے بلکہ قدرت کے کئی رازہائے سربستہ کو بھی وا کیا جا سکا ہے۔ اس کے بیشتر سائنس دانوں کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے ـــــ اسے ایک نمایاں کامیابی سیمکولوجی اور دوائیوں کے شعبے میں ہوئی ہے۔ اس کی کامیابی کی داستان نے کئی سنگ میل قائم کئے ہیں۔

ایشیا میں منتقل کلورو سیلنز تیار کرنے کا پہلا پلانٹ اس ٹیکنالوجی کی مدد سے نصب کیا گیا ہے جسے پونے میں واقع کونسل کی ایک لیباریٹری نیشنل کیمیکل لیباریٹری میں فروغ دیا گیا ہے۔ یہ کیمیکل سلی کون کی تیاری میں استعمال ہوتا ہے جو صنعت میں وسیع پیمانے پر بروئے کار لائی جاتی ہے۔ جن

اِدھر اُدھر سے

کلسٹ نے ان کیمیکل کی تیاری کے عمل کو فروغ دیا تھا انھوں نے اسے اپنے تک ہی محدود رکھا تھا۔

نیشنل کیمیکل لیبارٹری کی تکنیکی مہارت سے ملک میں "ایکری لیٹس" تیار کرنے کا پہلا عظیم ترین تجارتی پلانٹ بھی قائم کیا گیا ہے۔ یہ کیمیکل چمڑے کی صنعت میں ریشوں کی تیاری اور رنگ روغن اور دیگر سطحی پالشوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اب اس لیبارٹری کی طرف سے کیٹلسٹ اور "پالمر" تیار کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے جن سے انجینئرنگ پلاسٹک اور مرکب دھاتوں کے شعبے میں بنیادی تبدیلیاں عمل میں آئیں گی۔ پونے لیبارٹری نے اپنے زیر تکمیل عملوں کی مجموعی بکری کے سلسلے میں دو لاکھ روپے کے نشانے کو پار کر لیا ہے۔ اس کی دو دوائیاں ون بلاسٹن (VINBLASTIN) اور ون کرسٹین (VINCRISTIN) کینسر کے علاج میں مفید پائی گئی ہیں۔

نیشنل کیمیکل لیبارٹری کی مانند کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کی ایک اور لیبارٹری ریجنل ریسرچ لیبارٹری حیدرآباد میں کیمیکلوں کے شعبے میں شاندار کام انجام دے رہی ہے۔ اس کی طرف سے ایک کیمیکل "گلائی اوکسل" (GLYOXAL) تیار کیا گیا ہے جو ٹیکسٹائل اور کاغذ کی صنعتوں میں وسیع پیمانے پر استعمال ہوتا ہے اور پیچش کی دوائیں میں بھی کام آتا ہے۔ یہ کیمیکل حال تک درآمد کیا جاتا تھا۔ اسی لیبارٹری کی طرف سے ایک کیڑے مار دوائی "مونوکروٹوفوس" (MONOCROT PHOS) کی تیاری کا عمل بھی زیر عمل ہے۔ ملک میں اس کیمیکل کی تیاری سے تقریباً ۴ کروڑ روپے کے زرِ مبادلہ کی بچت ہوگی۔ اسی لیبارٹری کو بھارت میں پہلی بار ایک ایسی دوائی تیار کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے جو گٹھیا کے علاج میں استعمال ہوتی ہے۔ اس لیبارٹری کے احاطے کے اندر اس کے قریب ہی ایک اور عمارت زیر تعمیر ہے جس میں سینٹر فار سیلولر اینڈ مولیکیولر بائلوجی" قائم کیا جائے گا جو پہلے ہی جدید بائلوجی (حیاتیات) میں ترقی یافتہ ریسرچ کے بڑے مرکز کے طور پر بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکا ہے۔

اس احاطے کے قریب کونسل ہذا کا ایک اور ادارہ، نیشنل جیو فزیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ واقع ہے جس نے ایک ایسے سسٹم کو فروغ دیا ہے جس سے زمین کی گہرائیوں میں چھپی معدنیات کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔

اسی طرح بنگلور میں نیشنل ایروناٹیکل لیبارٹری ہے جس سے چند کلومیٹر کی دوری پر عظیم "ٹرئی سونک ونڈ ٹنل" ہے جو ملک میں ہوائی جہاز کے ماڈلوں پر تجربے کرنے کے لیے اپنی قسم کا واحد ادارہ ہے۔ اس کی طرف سے بھارتی خلائی تحقیق تنظیم کے لیے راکٹوں اور میزائلوں کے ماڈلوں پر تجربے بھی کئے گئے ہیں۔

اس کے علاوہ کونسل ہذا کا ایک اور ادارہ سینٹرل ڈرگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ میں دیسی جڑی بوٹیوں سے دوائیاں تیار کرنے کے کام میں مصروف ہے۔ غرضیکہ سائنس کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جس میں کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ یا اس کے کسی ادارہ کی طرف سے کام انجام نہیں دیا جا رہا ہو۔ ●

چاول کی پیداوار

آسام، بہار، اڑیسہ، مغربی بنگال کے

مشرقی ریاستوں اور مدھیہ پردیش کے لیے چاول کی پیداوار کا ایک خاص پروگرام نمونے کے طور پر ۸۵-۱۹۸۴ میں ۱۵ بلاکوں میں شروع کیا گیا۔ ملک بھر کے ۵ ہزار بلاکوں میں چھوٹے اور معمولی کسانوں کی امداد کے لیے ایک اسکیم ۸۴-۱۹۸۳ میں شروع کی گئی جس میں تلہن کی پیداوار بڑھانے پر زیادہ توجہ دی گئی۔

قدرتی گیس

بھارت میں قدرتی گیس کی دستیابی دھیرے دھیرے بڑھ رہی ہے۔ گھریلو، صنعتی اور توانائی کے سیکٹروں میں قدرتی گیس کو توانائی کے وسیلے کے خام مواد کی حیثیت سے استعمال میں لانے کی گنجائش بے انتہا معلوم ہوتی ہے۔ حکومت نے قدرتی گیس کی صنعت کو فروغ دینے اور گیس کے وسائل سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کے لیے متعدد اقدام کئے ہیں۔

جب سے مغرب کے دور دراز ساحلی علاقوں میں قدرتی گیس کے ذخائر دریافت ہوئے ہیں بھارت سرکار نے دس کیمیاوی کھاد کے پلانٹ قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے جن میں سے چار ساحل کے پاس ہی تعمیر کئے جائیں گے اور چھ ملک کے مرکزی اور شمالی حصوں میں ہوں گے۔ ان میں سے آٹھ پلانٹوں کو قدرتی گیس مہیا کرنے کی غرض سے تقریباً ۱۷۰۰ کلومیٹر لمبی پائپ لائن کا بڑا پراجیکٹ زمین پر ہی تعمیر کیا جا رہا ہے۔

چھوٹی بچت: چھوٹی بچت اسکیم کے تحت اپریل سے جولائی ۱۹۸۵ تک کل [illegible] کروڑ روپے جمع کئے گئے جبکہ گذشتہ سال کے اسی عرصہ کے دوران کل [illegible] کروڑ روپے جمع ہوئے تھے۔ اس طرح اس سال اس مدت میں [illegible] فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ توقع ہے کہ سال [illegible] کروڑ روپے کا مقررہ نشانہ حاصل کر لیا جائے گا۔

— یوجنا، نئی دہلی

ایم ایم راجندر

منزلے

فرامجی ٹرسٹ کا دفتر پونہ کی سب سے گنجان سڑک کے وسط میں ایک بڑی بلڈنگ کی پہلی منزل میں تھا اور اس بلڈنگ میں لفٹ نہیں تھی۔ فرامجی ٹرسٹ پونہ کا ایک پرانا اور بڑا خیراتی ادارہ تھا جو سینکڑوں محتاج انسانوں اور طالب علموں کو مالی مدد اور وظیفے دینے کے علاوہ ایک ہسپتال اور دو ہائی اسکولوں کا انتظام بھی کرتا تھا۔ اس دفتر میں بوڑھے ہیڈ کلرک نارائن راؤ کی سرکردگی میں نو کلرک کام کرتے تھے جن میں تین عورتیں اور چھ آدمی تھے۔ عورتوں میں سب سے چھوٹی پاروتی تھی۔ جس کی عمر چوبیس پچیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ باقی سب کام کرنے والے ادھیڑ عمر کے یا بوڑھے تھے۔ شاید وہ سرکاری ملازمتوں سے ریٹائرڈ آدمی ہوں یا مدت سے اس ٹرسٹ میں کام کرتے ہوں گے۔ اس دفتر میں تنخواہ سب کو سب کچھ ملا کر چار سو سے نو سو روپے کے درمیان ملتی تھی کیونکہ یہ ایک خیراتی ادارہ تھا۔ پاروتی صرف ایک سال پہلے نوکر ہوئی تھی اور اس کی تنخواہ چار سو روپے تھی۔ وہ ایک غریب گھر کی میٹرک پاس لڑکی تھی جسے ٹائپ کرنا سکھایا گیا تھا۔ وہ اس دفتر کے ماحول، ضبط اور تنظیم سے بہت خوش تھی۔ پھر اس دفتر میں روزانہ کا کام اس طرح ہوتا تھا جیسے پہلے سے کوئی بھی طے ہوتا تھا۔ اس لیے وہ بھی اس کی عادت سے مطمئن تھی۔ وہ دبلے پتلے سانولے رنگ کی چنچل سی لڑکی تھی۔

جس نے کبھی کوئی میک اپ نہیں کیا تھا۔ وہ دفتر ایک سادہ سی شوقی دھوتی میں آتی تھی۔ تاہم اس کے چہرے میں کافی کشش تھی۔

دفتر میں کام بڑھ جانے کی وجہ سے ٹرسٹ کے چیرمین نے ایک اور کلرک کے رکھے جانے کی منظوری دے دی تھی۔ اور اس کے لیے آج ہیڈ کلرک نارائن راؤ نے چھ امیدواروں کو انٹرویو اور ٹائپنگ ٹیسٹ کے لیے بلایا تھا۔ ان امیدواروں میں ایک آدمی ایسا بھی تھا جس کی ایک ٹانگ گھٹنے سے نیچے کٹی ہوئی تھی اور وہ بڑی مشکل سے ایک لوہے کی پتلی چھڑی کے سہارے اوپر چڑھ کر آیا تھا۔ اس کا نام امرناتھ تھا۔ اس کی ٹانگ جب وہ تیرہ سال کا تھا ایک ریل کے حادثے میں کٹ گئی تھی۔ اس نے بی اے پاس کر لیا تھا مگر بہت کوشش کے باوجود اسے کوئی ملازمت نہ مل سکی تھی۔ اب وہ تیس سال کا ہو گیا تھا۔ وہ ٹائپ بھی کر لیتا تھا اگرچہ اس کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔ وہ اب تک ٹیوشن وغیرہ کر کے اپنا پیٹ بھر رہا تھا۔ اگرچہ امرناتھ ٹائپ کے ٹیسٹ میں تو پاس نہیں ہوا مگر نارائن راؤ کو وہ حساب کتاب اور خط و کتابت کے کام میں ہوشیار نظر آیا۔ نارائن راؤ ویسے بھی ایک رحم دل آدمی تھا مگر وہ امرناتھ کو رکھنے میں اس لیے ہچکچا رہا تھا کہ وہ دفتر میں ہر روز اوپر کیسے چڑھے گا۔ مگر جب امرناتھ نے اسے یقین دلایا کہ اسے اوپر چڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی اور نہ وہ کبھی لیٹ ہوگا تو نارائن راؤ نے اسے رکھ لیا اور اس طرح سے امرناتھ بھی فرامجی ٹرسٹ کے دفتر کے کنبے کا ایک فرد بن گیا۔

امرناتھ شواجی نگر سے بس میں بیٹھ کر ہر روز کام پر آتا تھا۔ وہ ایک منٹ بھی کبھی لیٹ نہیں ہوتا تھا۔ گھٹنے سے نیچے اس کی داہنی ٹانگ مصنوعی تھی اور وہ اس میں ایک خاص قسم کے جوتے پہنتا تھا۔ وہ اپنی چھڑی کے سہارے آسانی سے چل لیتا تھا لیکن اوپر چڑھنے اور نیچے اترنے میں اسے بلاشبہ کچھ تکلیف ہوتی تھی۔ امرناتھ دفتر سب سے پہلے پہنچ جاتا تھا اور سب سے بعد میں اٹھتا تھا۔ اس لیے اس کی اس دقت کو نارائن راؤ اور پاروتی کے سوا دفتر کے کسی اور آدمی نے کبھی محسوس نہیں کیا۔ نارائن راؤ نے اس لیے کہ وہ امرناتھ سے کبھی پہلے دفتر پہنچ جاتا تھا اور اس کو گرتے پڑتے اور ہانپتے ہوئے دفتر میں داخل ہوتے دیکھا تھا اور پاروتی نے اس لیے کیونکہ وہ ایک نوجوان اور جذباتی لڑکی تھی اور اس کے لیے یہ احساس کرنا مشکل نہیں تھا کہ امرناتھ کو اوپر چڑھنے اور نیچے اترنے میں دشواری ہوتی ہوگی۔

امرناتھ اور پاروتی دفتر میں ایک دوسرے کے بالمقابل بیٹھتے تھے۔ امرناتھ اپنے رجسٹر وغیرہ تو بھرتا ہی تھا مگر خطوں کے جواب ہاتھ سے لکھ کر

[illegible] ٹپ کر لیتا اور کبھی کبھی [illegible]
[illegible] نے اس کی چھٹیوں کو ٹائپ کرنے
[illegible] خود ہی کی تھی۔ لنچ کے گھنٹے میں سب لوگ
[illegible] عورتیں بھی شامل تھیں، اپنا اپنا لنچ باکس
[illegible] اور نیچے اُتر کر کینٹین میں چلے جاتے تھے۔ کینٹین
میں عورتوں کے الگ بیٹھنے کا انتظام تھا۔ کینٹین
سے یہ لوگ سموسا چائے پکوڑے اور سبزی وغیرہ لے
لیتے تھے کیوں کہ امرناتھ کے لیے اوپر چڑھنا مشکل
ہوتا تھا وہ لنچ کے گھنٹے میں اکیلا رہ جاتا تھا اور اپنی
ماں کی بنائی ہوئی روٹی کھا لیتا تھا۔ نارائن داس اپنا
لنچ الگ کمرے میں بیٹھ کر کرتا تھا۔

ایک روز امرناتھ نے دیکھا کہ پاروتی لنچ کے
گھنٹے میں نیچے کینٹین نہیں گئی اور اپنی میز پر ہی بیٹھی
رہی۔ امرناتھ نے سوچا کہ شاید پاروتی آج لنچ نہیں
لائی۔ امرناتھ نے اس سے کہا۔

"پاروتی جی شاید آپ آج لنچ نہیں لائیں۔
ماں نے آج آلو کے چار بڑے بڑے پراٹھے اور چٹنی
دی ہے۔ میں اُن میں سے دو رکھ لیتا ہوں اور دو آپ
اس ڈبے میں سے لے جائیں۔"

پاروتی مسکرا کر بولی۔

"جی میں اپنا لنچ لائی ہوں لیکن میں نیچے کینٹین
میں نہیں جاؤں گی۔ میں کئی دنوں سے یہ سوچ رہی ہوں
کہ آپ اوپر اکیلے رہ جاتے ہیں اور ہم سب نیچے مل
کر کھاتے ہیں۔ مجھے تو یہ بہت بُرا لگتا ہے۔ میں نے
سوچا ہے کہ انسانیت کے ناطے مجھے آپ کا ساتھ
دینا چاہیے۔ میں کینٹین میں صرف سبزی لیتی تھی لیکن
آج سے میں نے سبزی بھی لانی شروع کر دی ہے۔"

"نہیں نہیں" امرناتھ بولا "آپ میرے لیے
اپنا طریقہ نہ بدلیے۔ میرے بارے میں تو آپ نے
ناحق سوچا۔ مجھے تو اکیلے بیٹھنے، کھانے اور رہنے کی
عادت ہے۔ آپ میرے لیے اپنا مزہ کیوں خراب
کرتی ہیں؟"

"آخر تہذیب اور اخلاق بھی تو کوئی چیز ہے
کھولیے اپنا ڈبہ" پاروتی نے کہا۔

[illegible] جاتے" امرناتھ [illegible] "مجھے تو کبھی یہ
محسوس بھی نہیں ہوا کہ میں اوپر اکیلا رہ جاتا ہوں۔
بلکہ آپ اگر میرے ساتھ کھانا کھایا کریں گی اور اپنی
سہیلیوں کے ساتھ نہیں جائیں گی تو وہ بُرا مانیں گی اور
دفتر میں کچھ لوگ بے کار کی باتیں بھی بنا سکتے ہیں۔"

"مجھے کسی کے کہنے سننے کی کچھ پرواہ نہیں
ہے۔" پاروتی اپنا ڈبہ میز پر رکھتی ہوئی بولی "میری
اپنی بھی تو کوئی پسند یا ناپسند ہے۔"

اس روز امرناتھ اور پاروتی نے مل کر کھانا
کھایا۔ امرناتھ کو اس سے پہلے کھانے میں اتنا لطف
کبھی نہیں آیا تھا۔ اُسے آج پہلی مرتبہ پاروتی کافی
خوبصورت نظر آئی۔ اُسے یہ بھی شدت سے محسوس ہوا کہ
خوبصورتی شاید کوئی اندرونی شے ہے۔ وہ دونوں دن
بھر دفتر میں جی لگا کر کام کرتے لیکن لنچ کا وہ
گھنٹا جو آتے ہی پَر لگا کر اُڑ جاتا، امرناتھ کے لیے
دن بھر کا بہترین وقت ہوتا جس کا وہ بے تابی سے
انتظار کرتا۔ وہ مہینوں اسی طرح اکٹھے کھاتے اور
باتیں کرتے رہے اور آہستہ آہستہ امرناتھ دل ہی دل
میں یہ محسوس کرنے لگا کہ شاید پاروتی اُس کے لیے
بنی ہے۔ لیکن پھر وہ فوراً ہی اس خیال کو دل سے
نکال دیتا کیوں کہ وہ ایک اپاہج تھا اور وہ پاروتی
کی انسانی ہمدردی کو شاید غلط سمجھ رہا تھا۔

وقت کا یہ آوارہ پرندہ اسی طرح اُڑتا رہا
اور امرناتھ کو اس دفتر میں کام کرتے ہوئے ایک سال
ہو گیا۔ اس مختصر سے عرصے کی گود میں امرناتھ کے
لیے پاروتی کے ساتھ بیتے ہوئے وہ خوشگوار لمحے تھے
جنھیں وہ آسانی سے نہیں بھلا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ
بہت سی کی ہوئی باتیں شاید بے معنی تھیں مگر اسے
ان سے بے انتہا خوشی ملی تھی۔ جذباتی طور پر وہ ایک
دوسرے کے قریب آ گئے تھے اور امرناتھ پاروتی کو
پارو اور پاروتی امرناتھ کو امر کہنے لگی تھی۔ وہ ایک
دوسرے کو بہت پسند کرتے تھے اور دفتر میں
پاروتی امرناتھ کی بڑی مدد کرتی تھی تاکہ امرناتھ کو دفتر
میں بار بار اُٹھ کر چلنا نہ پڑے۔

ایک روز امرناتھ دفتر کی عمارت کے
سامنے ٹیکسی سے اُترا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ
پاروتی سیڑھیوں کے پاس پہنچ کر اس کا انتظار
کر رہی تھی۔ وہ بولا۔

"پارو تم آج اتنی جلدی کیسے آ گئیں؟"

"میں اب ہر روز اتنی جلدی آیا کروں گی" پاروتی
مسکرا کر بولی۔ "میں کئی دن سے سوچ رہی تھی کہ آپ
سڑک کیسے پار کرتے ہوں گے کیوں کہ اس سڑک
پر بڑی ٹریفک ہوتی ہے اور پھر کیا میں آپ کو
تھوڑا سا سہارا دے کر اوپر چڑھنے میں مدد نہیں دے
سکتی؟"

امرناتھ پاروتی کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ پھر
اچانک بولا۔

"ہاں کیوں نہیں۔ تم شوق سے ایسا کر سکتی ہو،
لیکن میں تو پہلے ہی سے محتاج ہوں۔ مجھے تو سہاروں
سے آزادی چاہیے۔ مجھے اتنا سہارا دے کر اور کیوں
محتاج بنا رہی ہو؟"

پاروتی نے امرناتھ کا بازو پکڑ لیا اور آج پاروتی کے
سہارے امرناتھ نے بڑی آسانی اور پھرتی سے سیڑھیاں
طے کریں۔ اس روز اکٹھے کھانا کھاتے ہوئے امرناتھ نے اس سے کہا۔

"پارو ہمیں ایک دوسرے کو جانتے ہوئے ایک سال سے زیادہ
ہو گیا۔ اس رفاقت میں تم نے مجھے ہمیشہ سہارا دیا اور میری
مدد کی۔ کیا یہ سہارا مجھے ہمیشہ کے لیے نہیں مل سکتا یعنی کیا ہم
ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے نہیں ہو سکتے؟"

"میں نے آپ کا ہاتھ چھوڑنے کے لیے نہیں پکڑا
ہے۔" پاروتی نیچی نظر کر کے بولی "آپ اس بارے میں
مجھ سے بہتر سوچ سکتے ہیں۔" اور جب شام کو دفتر
کے بعد امرناتھ اور پاروتی دفتر کے زینے سے نیچے
اُتر رہے تھے تو انھوں نے ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کا
ہو جانے کا عہد کر لیا۔ امرناتھ جذباتی سا ہو کر بولا۔

"تم نے مجھے واقعی بڑا سہارا دیا ہے۔ اب [illegible]
زندگی کٹ جائے گی۔"

"سہارا [illegible]
[illegible]
مسکرا کر [illegible]"

یوجنا، نئی دہلی

غزلیں

نیاز سلطانی

میرے ناکردہ گناہوں پہ نہ جاؤ لوگو
حق سے ہے عکم سزا مجھ کو سناؤ لوگو

تم نے سینچا ہے اسے خونِ جگر سے برسوں
آرزوؤں کے چمن کو نہ جلاؤ لوگو

وہ بھی شاید کہیں خوابوں کی گذرگاہ میں ہو
چشمِ حسرت کو نہ چھیڑو نہ جگاؤ لوگو

اس میں محفوظ ہے قرآن بھی رامائن بھی
خانۂ دل کو نہ اس طرح جلاؤ لوگو

یہ بھی ممکن ہے دعاؤں میں ضرورت ہو مری
میں کہ اک لفظ ہوں مجھ کو نہ مٹاؤ لوگو

راہ بھولا ہوا بے سمت مسافر ہے نیازؔ
اس کو روکو کہ بھٹکنے سے بچاؤ لوگو

تشنہ بلگرامی

تعصب کی عینک سے جب بات ہوگی
بساطِ سیاست پہ تب مات ہوگی

ہر انسان انسانیت سے گریزاں
نہ جانے یہ کب تک خرافات ہوگی

مری زندگی چاند تاروں کی گردش
کہیں دن کٹے گا کہیں رات ہوگی

نہ مغرور ٹھہرے گا کوئی جہاں میں
مرے آنسوؤں کی جو برسات ہوگی

اگر صبر کا چھوٹ جائے گا دامن
تو مجروح میری روایات ہوگی

سکوں ایک لمحہ نہ ہوگا میسر
جو دنیا سے رخصت مساوات ہوگی

جو جاہ سے تشنگیؔ کا خاندان ہوگا
نشانہ ہماری عبادات ہوگی

جب ان کی رقابت میں معصومیت ہے
یقیناً خلافت میں بھی گھات ہوگی

بھلا کو وہ حرم کی اس طرح تشنہؔ
ہاں سے چمن کی ملاقات ہوگی

پیامی بہرائچی

خط بھی تو اُن کا آیا نہ خط کے جواب میں
اب کیا وہ مل سکیں گے بھلا ہم سے خواب میں

پردہ اُٹھا کے اس نے جو فوراً گرا لیا
نظریں اُلجھ کے رہ گئیں تارِ نقاب میں

ملتا نہیں ہے چین مجھے اب کسی گھڑی
جاں میری پھنس گئی ہے خدایا عذاب میں

یا آج اُن کا حسن ہے پورے شباب پر
یا شمع جل رہی ہے گلابی نقاب میں

آباد جس کے دم سے تھا جب وہ نہیں رہا
آئے گا کون پھر دلِ خانہ خراب میں

چھوڑو پیامیؔ اُن سے ملاقات کا خیال
یکجائی ہے محال مہ و آفتاب میں

معصوم انصاری

تمام عمر عجب خواہشوں کا چکر تھا
مگر ملا ہے وہی جو مرا مقدر تھا

کہیں سے مل گئیں خوشیاں تو بانٹ دیں میں نے
کوئی غریب نہ مجھ سا غریب پرور تھا

کسی نے سنگ اُچھالا کسی نے گالی دی
میں اپنے وقت کا جیسے کوئی پیمبر تھا

میں جس کی چوٹ سے اب تک ہوں تلملایا ہوا
وہ پھول جیسا کوئی لفظ تھا کہ پتھر تھا

اُداس روح پریشاں دماغ و دل کی قسم
یہ ارتقا ہے تو اس سے زوال بہتر تھا

یہ اور بات مصیبت میں ساتھ چھوڑ گئے
بڑا بھروسہ مجھے اپنے دوستوں پر تھا

مرے نصیب میں صحرا کی پیاس تھی معصومؔ
نظر کے سامنے پھیلا ہوا سمندر تھا

نئی صبح

ناوک حمزہ پوری

کرن کرن بکھرنے لگی ہے ایک تازگی
ہے پھول پھول کے لبوں پہ مسکراہٹ اک نئی
تبسم آفریں ہے گلشنِ حیات کی کلی

نئی کرن جگانے آگئی ہے روشنی لیے
اُٹھو کہ آئی صبحِ نو پیامِ زندگی لیے

اُٹھو کہ ذرے ذرے میں نئی اُمنگ جاگ اُٹھی
اُٹھو کہ قطرے قطرے میں نئی تڑپ ہے زیست کی
اُٹھو کہ سمت سمت چھا گئی ہے ایک دلکشی

چمن چمن طیور جاگ اُٹھے ہیں نغمگی لیے
اُٹھو کہ آئی صبحِ نو پیامِ زندگی لیے

اُٹھو کہ نغمہ ریز ہے پری حسیں فضاؤں کی
اُٹھو کہ رقص کر رہی ہیں دیویاں دِشاؤں کی
اُٹھو تمہیں بلا رہی ہے اپسرا ہواؤں کی

اُٹھو بڑھو، بڑھے ہی جاؤ جامِ زندگی لیے
اُٹھو کہ آئی صبحِ نو پیامِ زندگی لیے

اُٹھو کہ آگے آگے ہی چلیں گے ہم بڑھیں گے ہم
اُٹھو چلو کہ ہر نئی بلندی پر چڑھیں گے ہم
اُٹھو کہ اپنی قسمت اپنے ہاتھ سے گڑھیں گے ہم

اُٹھو، بڑھے چلو، چراغِ علم و آگہی لیے
اُٹھو کہ آئی صبحِ نو پیامِ زندگی لیے

ع حسن انصاری

تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بیکاری کا مسئلہ

مندرجہ بالا عنوان پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جائیگا یہ مسئلہ مفکرین، ماہر اقتصادیات سیاستدانوں اور ارباب حکومت کے زیر غور ہے مگر ابھی تک اس کا کوئی تشفی بخش حل تلاش نہیں ہو سکا ہے۔

اس مسئلہ کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعلیم یافتہ بیکار نوجوانوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کے لیے روزگار کے ذرائع اگر کم نہیں ہو رہے ہیں تو بڑھ بھی نہیں رہے ہیں۔ غرضیکہ تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کی تعداد اور روزگار کے ذرائع میں کوئی تناسب نہیں رہ گیا ہے۔

اگر اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو اس کا بنیادی سبب ہمارا موجودہ تعلیمی نظام پایا جائے گا جو نوجوانوں کو نہ ایک اچھا شہری بنانے ہی میں معاون ثابت ہوتا ہے اور نہ ان کو روزی کمانے کے وسائل فراہم کرنے میں خاطر خواہ مدد دیتا ہے۔

موجودہ نظامِ تعلیم برٹش گورنمنٹ کی دین ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب ملکہ وکٹوریہ نے ہندوستان کی عنانِ حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی سے اپنے ہاتھ میں لی اور اس ملک کے نظم و نسق کی پوری ذمہ داری برٹش پارلیمنٹ نے قبول کر لی تو اس کے نمائندوں کو جو اس ملک میں حکومت کرنے کے لیے تعینات کئے گئے، ضرورت پیش آئی بابوؤں کی اور کلرکوں کی جن کو وہ اپنے ملک سے نہیں لا سکتے تھے، لہٰذا ایسے بابوؤں کو تیار کرنے کے لیے ایک ایسے نظامِ تعلیم کی ضرورت پیش آئی جو مقامی باشندوں کو انگریزی زبان سے بھی روشناس کر سکے اور ان میں سے کلرک بھی تیار کر سکے جو حکومت کے چلانے میں برٹش افسروں کے معاون و مددگار ثابت ہو سکیں۔ لارڈ میکالے Lord Macaulay کو ایسا نظامِ تعلیم مرتب کرنے کی خدمت تفویض کی گئی۔ جس نے یہ کام بخیر و خوبی انجام دیا۔ اور اس طرح بابو بنانے والی مشین کی تشکیل ہو گئی۔

یہ نظامِ تعلیم برٹش راج کے زمانے میں بہت مفید ثابت ہوا جس کے ذریعے سے تھوڑے سے انگریز افسر بابوؤں کی کثیر تعداد کی مدد سے اتنے بڑے ملک پر حکومت کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ مگر حصولِ آزادی کے بعد اس تعلیمی نظام نے اپنی افادیت کھو دی اس لیے کہ موجودہ دورِ حکومت میں جو فلاحی اور اصلاحی ہے، محض بابوؤں کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی۔ اب ضرورت پیش آئی۔ قوم و ملک کے معماروں کی جو سائنس، ٹیکنالوجی، انجینیئرنگ اور ڈاکٹری کی ٹریننگ پا کر عوام کی خدمت کر سکیں اور ملک کو معاشی، اقتصادی اور ٹیکنالوجی کے میدان میں آگے بڑھا سکیں مگر افسوس ہے کہ ایسا نظامِ تعلیم جو موجودہ دور کے تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق ہو، اب تک مرتب نہ کیا جا سکا۔ اور وہی فرسودہ بابوگر نظامِ تعلیم جاری رہا جس نے ایک بڑی فوج تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی تیار کر دی جو اس ملک کے لیے ایک بڑا مسئلہ بن گئے۔ بے کاری محض تعلیم یافتہ نوجوانوں کے زرخیز دماغ روزگار کے وسائل کے فقدان کے سبب تخریبی کارروائیوں کی طرف منتقل ہو گئے۔

حصولِ آزادی کو ۳۰ سال گزر چکے ہیں اور اب تک ہم اسی پرانی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ وقت کا تقاضہ ہے کہ اب مزید وقت ضائع کئے بغیر ایک نیا نظامِ تعلیم تشکیل دیا جائے۔

موجودہ بابوگر تعلیمی اداروں کی جگہ ٹیکنالوجی، سائنس اور موجودہ طب کے کالج قائم کئے جائیں زراعت اور تجارت کو ترویج دینے کے لیے مغربی ممالک کے تعلیمی نظام کو اپنایا جائے۔ ہائی اسکول تک بچے کو لسانیات، جغرافیہ، تاریخ، سائنس، اقتصادیات اور قانون کی ابتدائی تعلیم سے روشناس کرایا جائے تاکہ وہ ایک اچھا شہری بن سکے۔ اس کے بعد اس کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے اور اس کے رجحانات اور میلان طبع کو دیکھا جائے

اور پھر آٹھ ماہ تعلیم اس کو اسی شعبہ میں دی جائے۔ اس طرح ایک جانب تو ہمارے نوجوان غلط طریقِ تعلیم کے حصول سے بچ جائیں گے اور دوسری جانب ہم ان میں سے اچھے سائنسداں، ڈاکٹر، ماہر اقتصادیات و زراعت تیار کر سکیں گے جو ملک کے لیے ایک بوجھ نہ ہو کر اس کے لیے باعثِ فخر خادم ملک و قوم بن سکیں گے۔

تعلیم روزگار سے وابستہ (JOB ORIENTED) ہو جس سے روزی کمانے کے وسائل اور ذرائع دستیاب ہو سکیں، نوجوان تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے والدین اور سماج پر بوجھ نہ بن کر خود کفیل ہو سکیں اور ملک و قوم کی خدمت کر سکیں۔

مختلف مصنوعات کی ٹریننگ دینے کے ساتھ ساتھ زراعت، مویشی پالنے اور مرغی پالنے کی تربیت بھی بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے جس سے اچھے روزگار کے مواقع فراہم ہو سکتے ہیں۔ چھوٹی صنعتیں اور گھریلو دھندوں کو فروغ دینے سے کم سرمایہ لگا کر دیہاتوں میں نوجوان گذر اوقات کر سکتے ہیں۔ ان کو روزگار کی تلاش میں شہروں کی طرف جانے سے بچایا جا سکتا ہے۔ اس وقت تک چھوٹی صنعتوں کے فروغ کی طرف کم توجہ دی گئی ہے۔

اب تک دیہی علاقہ کی ترقی کو نظرانداز کر کے بڑے شہروں کی ترقی کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے اور چھوٹی صنعتوں کے مقابلے میں بڑی مشینوں اور کارخانوں کے قیام کو فروغ دیا گیا ہے، اس سے دیہی اور شہری علاقوں میں آبادی کا توازن بگڑ گیا ہے۔ دیہات ویران ہوتے جا رہے ہیں۔ پڑھے لکھے نوجوان شہروں کی طرف بھاگ رہے ہیں، جہاں رہائش، رسل و رسائل، شہری ضروریات جیسے بجلی، پانی اور سڑکوں کے ایسے مسائل پیدا ہو گئے ہیں جو حکومت کے لیے پریشان کن ہیں۔ اگر اس انتقالِ آبادی کو روکنا ہے اور بے روزگاری کا مسئلہ حل کرنا ہے تو چھوٹے پیمانے کی دیہی صنعتوں کو ترقی دینا ہوگا اور بڑے شہروں جیسے دہلی، بمبئی، کلکتہ، مدراس، کانپور، احمد آباد کے مضافات کے علاقوں کو ترقی دینا ہوگا۔ ان شہروں میں نہ صرف مل اور کارخانے اتنے بڑھ گئے ہیں کہ جن کا مزید قیام وہاں ناممکن ہو گیا ہے بلکہ مختلف دفاتر کی تعداد میں بھی بہت اضافہ ہوا ہے۔ دہلی کے قرب میں غازی آباد، تغلق آباد، نیلو کھیڑی، مراد نگر، اور بلند شہر کے علاقوں میں کارخانے بھی قائم کیے جا سکتے ہیں اور دفاتر کو بھی منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح لکھنؤ کے مضافات میں بارہ بنکی، ملیح آباد، موہن لال گنج کو اور کانپور کے نزدیک اناؤ کو (SATELLITE TOWN) بنایا جا سکتا ہے۔

ذہین اور ہوشیار نوجوانوں کو بیرونِ ملک میں صنعتی ٹیکنالوجی اور دیگر فنونِ تعلیم کے لیے جیسے جاپان، جرمنی وغیرہ میں بھیجا جائے جہاں سے وہ صنعت و حرفت کی اعلیٰ ٹریننگ حاصل کر کے لوٹیں اور اپنے ملک کی صنعت و حرفت اور تجارت کو فروغ دیں۔ جس سے اس ملک کی مصنوعات دیگر ممالک میں بھیجی جا سکیں اور اس سے زرِ مبادلہ کمایا جا سکے۔

زراعت اب بھی آبپاشی کے لیے بارش پر منحصر ہے۔ حالاں کہ ہمارے ملک کی ترقی خواہ وہ صنعتی ہو یا روزگار پانے سے متعلق ہو بڑی حد تک زراعت پر ہی منحصر ہے۔

کاشتکاری کی ترقی جب ہی ممکن ہے کہ جب میکنائزڈ طریقہ (MECHANISED METHOD) سے کھیتی کی جائے کہ جہاں کھیتوں میں ٹریکٹر اور دیگر آلات زراعت کا بھرپور استعمال کیا جا سکے۔ اس کے لیے بڑے بڑے فارموں کی ضرورت ہوگی۔ موجودہ چھوٹی چھوٹی جوتیں کاشتکاری کی ترقی میں ایک بڑی رکاوٹ ہیں۔ حصولِ آزادی کے بعد خاتمہ زمینداری ایکٹ مختلف ریاستوں میں نافذ کیا گیا۔ مگر اس ایکٹ میں خصوصاً اترپردیش میں اتنی ترمیمیں ہو چکی ہیں کہ اصل ایکٹ کی دفعات داستانِ پارینہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ یہ ایکٹ زراعت کی ترقی کے لیے کسی طرح بھی معاون نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ اس میں ایسی دفعات رکھی جائیں کہ جس سے زراعت میں تربیت یافتہ نوجوانوں کو زمینیں دی جا سکیں۔ ان کو مالی امداد فراہم کی جا سکے اور ان کے لیے جدید آلاتِ کاشتکاری دئے جا سکیں، جس سے وہ نوکریوں کی تلاش چھوڑ کر اپنے ہی گاؤں میں زراعت کے ذریعے روزی کما سکیں۔

زراعت کے ساتھ ساتھ اس سے متعلق دیہی صنعتوں جیسے دودھ کا کاروبار DAIRY مرغی پالنا POULTRY FARMING کو بھی پلان میں خاص اہمیت دی جائے۔ ان صنعتوں کی ترقی امداد باہمی کے ذریعے بخوبی ہو سکتی ہے۔

زراعت کے بعد پارچہ بافی کی صنعت دوسرے نمبر پر آتی ہے۔ مل اور کارخانے کے بنے ہوئے کپڑوں کا مقابلہ ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے نہیں کر پا رہے ہیں۔ اور دھیرے دھیرے اس صنعت میں لگے لوگ، جنکی مصنوعات ایک زمانہ میں شہرۂ آفاق تھیں، بے کار کاشتکار ہوتے جا رہے ہیں۔ اس صنعت کو فروغ دینے کے لیے زراعت کی طرح نوجوانوں کو ٹیکنیکل تعلیم دی جائے۔ سرکاری اداروں میں صرف ہاتھ کے بنے کپڑے کا استعمال ہو اور نوجوانوں کو اس صنعت کے چلانے کے لیے فنی اور مالی امداد دی جائے تاکہ اس صنعت سے وابستہ نوجوان شہروں کی طرف نوکریوں کے لیے نہ بھاگیں۔ ●

...سے پید محکموں جیسے ...
اور تعلیم کو جوڑ کر ...تمام شعبوں کے لیے نوکریوں کی ضرورت باقی نہ رکھی جائے۔

تمام صنعتی، اقتصادی اور تکنیکی محکموں کے لیے صنعتی اور فنی تعلیم ہی کو ملازمت کا ذریعہ بنایا جائے۔

آجکل محض بی۔ اے۔ ایم۔ اے کی تعلیم حاصل کرنا اور ڈگریاں دینا بے سود ہو گیا ہے۔ ہر سال تعلیمی اداروں سے ایک کثیر تعداد بے روزگار نوجوانوں کی نکلتی ہے، جو روزگار کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ ایک جانب بے روزگاری کا مسئلہ مشکل سے مشکل ہوتا جا رہا ہے تو دوسری جانب ایسے تعلیم یافتہ نوجوانوں سے ملک کی صنعت و حرفت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تعلیمی اداروں میں نظم و نسق کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ بے روزگار نوجوانوں کا ذہن سیاست کی طرف زیادہ مائل ہوتا جا رہا ہے۔ مختلف سیاسی جماعتوں نے تعلیمی اداروں کو اپنی ریشہ دوانیوں کا اکھاڑہ بنا لیا ہے اور نوجوانوں کے ذہنی انتشار سے فائدہ اُٹھا کر سیاسی تحریکات کا آلۂ کار بنا لیا ہے۔ جہاں پہنچ کر وہ اچھے شہری بن پاتے ہیں اور نہ اچھے صنعت کار۔ ان کی تمام توجہ تعلیم سے ہٹ کر سیاسی تحریکوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور آگے چل کر ایسے نوجوان ایسی تخریبی کارروائیوں میں لگ جاتے ہیں، جو ان کے ملک اور ان کے خاندان کے لیے باعث شرم ہوتی ہیں۔

نوجوانوں کی بے روزگاری کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے مرکزی اور ریاستی حکومتوں میں علیحدہ سے ایک ایک وزارت قائم کی جائے جو بے کاری کے مسائل حل کرنے اور روزگار فراہم کرنے کے لیے اسکیمیں مرتب کرے۔

ایک ایسے نظامِ تعلیم کی تشکیل کی جائے کہ جہاں سے تعلیم پا کر طلبا روزگار کے معاملہ میں خود کفیل ہو سکیں۔ ان کو عام تعلیم کی جگہ تکنیکی و اقتصادی، سائنسی اور فنی تعلیم دی جائے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ان کو اپنے روزگار قائم کرنے کے لیے فنی اور مالی امداد دی جائے۔

دیہی صنعتوں کو فروغ دیا جائے تاکہ دیہی نوجوان شہروں کی طرف نہ بھاگیں۔ زراعت میں تکنیکی طریقہ اپنا کر اسے سود مند پیشہ بنایا جا سکے۔ وہ محض قدرت کے رحم و کرم پر ہی نہ رہے۔

تعلیمی اداروں کو سیاسی اکھاڑہ ہونے سے محفوظ رکھا جائے۔ طلبہ کے ذہنوں کو سیاسی گندگی سے مسموم نہ کیا جائے۔ نوجوانوں میں بے روزگاری کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے حکومتِ وقت، معاشرے کے مفکرین اور والدین کا تعاون ضروری ہے۔ ●

یوجنا نئی دہلی

بقیہ: انڈوکرائن گلینڈس اور جسمِ انسانی

یہ تناسب قائم نہیں رہ پاتا ہے۔ جتنے (Cell) ضائع ہوتے ہیں اس سے کم پیدا ہوتے ہیں نتیجتاً جلد میں جھریاں آجاتی ہیں۔ سائنسداں اس راز کی حقیقت کو منکشف کرنے کی بے پناہ کوششیں کر رہے ہیں لیکن وہ ہنوز ناکام ہیں۔ آخرکار انھوں نے ایک ترکیب نکالی۔ وہ یہ کہ مردہ خلیوں کا تناسب قائم رکھنے کے لیے مصنوعی طور پر نئے (Cell) پیدا کر دئے جائیں۔ یہ کام مصنوعی ھارمون کی مدد سے بہ آسانی ہو سکتا ہے۔ اس طرح سائنسداں بڑھاپے کی یورش روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر بھی ایک پیچیدگی باقی ہی رہی وہ یہ کہ جیسے ہی ہارمون والی کریم کا استعمال ترک ہوا۔ جھریاں پھر لوٹ آئیں۔ ●

بقیہ: زندگی ترقی کی ایک جھلک

...ں بار اضافہ ہوگا۔ مثال کے طور پر نہیں چھوٹے تھیلوں کی سپلائی جو پہلے ایک لاکھ تھیلے تھی۔ گذشتہ پانچ برسوں میں بڑھ کر ۵۰ لاکھ تھیلے ہو گئی۔ اسی مدت کے دوران کیمیاوی کھادوں کی کھپت میں ۵ فیصد اضافہ ہوا۔

زراعتی ترقی کے لیے حکومت کی امداد کا ایک بڑا جزو قیمتوں کا مقرر کیا جانا اور مال کی فروخت کے بارے میں حکمتِ عملی ہے۔ زرعی قیمتوں اور اخراجات کا کمیشن زرعی اجناس کے پیداوار کے اخراجات اور قیمتوں کی مجموعی صورتِ حال کا جائزہ لیتا ہے۔ اخراجات زندگی، اُجرتوں کا ڈھانچہ اور مانگ و بہم رسانی کی حالت بھی مدِ نظر رکھی جاتی ہے جس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ کسانوں کو اُن کی پیداوار کے اخراجات پورے کرنے کے بعد معقول منافع دلایا جا سکے۔

اناجوں کی امدادی قیمتوں میں گذشتہ پانچ برس میں ۳۴ سے ۴۰ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ دالوں کی قیمتوں میں ۵۵ سے ۷۰ فیصد اور تلہن کی قیمتوں میں ۳۴ سے ۸۶ فیصد اضافہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ ہندوستانی کسان کو اب مجبوری کی حالت میں مال فروخت کرنا پڑتا اور نہ ہی اسے دلالوں اور لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کے نمائندوں کے رحم و کرم پر رہنا پڑتا ہے۔

کھیتی کے میدان میں جو دیگر کوششیں پیداوار بڑھانے میں معاون ثابت ہوئی ہیں وہ پانی کا بچاؤ اور بہتر استعمال، پودوں کی حفاظت، زرعی خدمات کے مرکزوں کی سہولت اور کٹائی کے بعد ٹیکنالوجی کے بارے میں صلاح و مشورہ ہے۔ تربیت اور ملاقات کا جو پروگرام شروع کیا گیا ہے اس سے ٹیکنالوجی کی ترقی کو ... کسانوں کے کھیتوں تک پہنچانے میں مدد ملی ہے۔ ●

خورشید اکرم

انڈوکرائن گلینڈس اور جسمِ انسانی

جسم انسانی میں مختلف غدود کی موجودگی اور ان کی کارکردگی اب محتاج تعارف نہیں رہی ہے۔ یہ غدود (Glands) مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں اور ان کی اپنی اپنی اہمیت ہے۔ لیکن ان غدودوں میں انڈوکرائن گلینڈس (Endocrine glands) مخصوص اہمیتوں کے حامل ہیں۔ عام غدود میں جن مادّوں کی تشکیل ہوتی ہے وہ نلیوں کے ذریعے دوسرے مقامات تک جاتے ہیں۔ یعنی وہ نلیاں ان مادّوں کے تبادلے کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ جو عام گلینڈس میں بنتے ہیں۔ لیکن انڈوکرائن گلینڈس میں ایسی بات نہیں ہوتی۔ ان غدودوں میں تشکیل شدہ مادّے جنھیں ہارمونس کہتے ہیں، کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جانے کا ذریعہ مخصوص نلیاں نہیں ہوتیں بلکہ یہ مادے (ہارمونس) خون سے براہِ راست مل کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک جاتے ہیں۔ چونکہ انڈوکرائن گلینڈس میں پیدا شدہ مادے ہارمونس بغیر کسی نلی کی مدد کے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں، اس لیے انھیں Ductless glands بھی کہا جاتا ہے۔ کچھ انڈوکرائن گلینڈس ایسے بھی ہیں جن میں ہارمونس کے علاوہ دوسرے مادّے بھی بنتے ہیں۔ پینکریاز (PANCREAS) اسی طرح کا ایک غدود ہے جس میں (Pancreatic Juice) کے علاوہ انسولین (Insuline) نام کے ایک ہارمون کی تشکیل بھی ہوتی ہے۔

جسم انسانی میں پائے جانے والے مختلف انڈوکرائن گلینڈس کی مندرجہ ذیل قسمیں ہیں۔

۱۔ پینکریاز (PANCREAS)

یہ ایک اہم غدود ہے جس کے خلیے Pancreatic Juice پیدا کرتے ہیں۔ اس عرق میں مختلف طرح کے انزائمس (En-zymes) پائے جاتے ہیں۔ پینکریاز معدے کے قریب پایا جاتا ہے۔ اس میں Insuline ہارمون کی تشکیل ہوتی ہے۔ جسم میں اس کی کمی کے باعث ذیابیطس (Diabetis) کا مرض لاحق ہوجاتا ہے جس میں پیشاب میں چینی آنے لگتی ہے۔

۲۔ تھائروائڈ گلینڈ

یہ گردن کی جڑ میں پایا جانے والا اہم غدود ہے۔ اس غدود میں بننے والے ہارمون کی خاصیت کے علم سے بہت پہلے دنیا کے بعض علاقوں میں بہت ہی چھوٹے قد کے بونے انسان پائے جاتے تھے جن کی اونچائی تقریباً ایک میٹر ہوتی تھی۔ ان کے ہاتھ پیر بڑے ہی عجیب اور نہایت چھوٹے ہوتے تھے اور ان کی جگہ بالکل سوکھی ہوتی تھی۔ اتنا ہی نہیں اس طرح کے انسانوں کی ذہنی نشوونما بھی بہت کم ہوتی تھی اور ان کا مزاج بچوں جیسا ہوا کرتا تھا۔ ایسے انسانوں کے خون میں (THYROID GLANDS) کا عرق داخل کرنے سے بہت سارے لوگ نارمل ہوگئے، ان کا جسم سڈول ہوگیا اور ذہنی نشوونما بھی عمر کے ساتھ ٹھیک ہونے لگی۔ تھائروائڈ گلینڈ میں بننے والے ہارمون کو Thyroid Glands کہتے ہیں، جس کا خاص جز "Iodin" ہے۔ تھائراکسین کی کمی سے تھائروائڈ گلینڈ سوج کر بھاری ہوجاتا ہے، جو گلے میں گھیگا کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اس لیے Iodin کی مناسب مقدار سے گلے کے گھیگھ کا علاج کیا جاتا ہے۔ Throxin کے فقدان سے وزن بھی بے تحاشہ بڑھنے لگتا ہے۔ اس کی ضرورت سے زیادہ مقدار بھی جسم کے لیے نقصاندہ ہے۔ انسان ذہنی کھنچاؤ کا شکار رہتا ہے، سانس جلد پھول جاتی ہے، حرکتِ قلب کی رفتار تیز ہوجاتی ہے۔ مزاج میں چڑچڑاپن اور گھبراہٹ آجاتی ہے ناخن سخت اور کھردرے ہوجاتے ہیں اور سر کے بال جھڑنے لگتے ہیں۔ جلد کی تازگی ختم ہوجاتی ہے۔ پسینے بہت آتے ہیں۔ علاوہ ازیں جسم کا وزن بھی گھٹ جاتا ہے۔ ان تمام شکایتوں کا علاج بھی Iodin سے کرتے ہیں جو ایک ہلکی پھلکی دوا ہے اور اس کے ضمنی اثرات بھی نہیں کے برابر ہیں۔

پیراتھائیروائڈ (PARATHY ROID)

یہ تھائیرائڈ کے قریب ہوتے ہیں۔ اس میں Parathormone نام کا ہارمون بنتا ہے۔ اس کے اہم کام (Muscles) کو متحرک رکھنا، ہڈیوں و دانتوں کی نشوونما میں توازن برقرار رکھنا وغیرہ ہیں۔ اس ہارمون کی کمی کے باعث جسم میں کیلشیم اور فاسفورس کی کمی ہو جاتی ہے جس سے دانتوں و ہڈیوں کی نشوونما میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ مناسب مقدار سے اگر ہارمون زیادہ ہو تب کیلشیم اور فاسفورس کے نمک ہڈیوں سے نکل کر پیشاب کے ذریعہ جسم سے باہر نکل جاتے ہیں جس سے ہڈیاں نرم اور ٹیڑھی بھی ہو جاتی ہیں۔

۴۔ آڈرے نال گلینڈس

یہ گردوں کے بالائی حصوں میں پائے جاتے ہیں جن میں Cortin اور ADRENAL GLANDS نام کے دو ہارمون بنتے ہیں۔ Cortin کی کمی سے خون کا نمک اور پانی پیشاب کے ساتھ باہر نکل آتا ہے۔ علاوہ ازیں کبھی کبھی مر جاتی ہے (Cortin) کی زیادہ مقدار جب جسم میں پیدا ہو جاتی ہے۔ تب کبھی کبھی انسانوں کی جنس تبدیل ہونے لگتی ہے۔ خاص کر عورتوں میں یہ شکایت ہو جاتی ہے اور ان میں مردوں کے اوصاف پیدا ہونے لگتے ہیں۔

دوسرے ہارمون Adrenalin کی زیادتی سے حرکتِ قلب تیز ہو جاتی ہے۔ آنکھیں بڑی اور پتلیاں چوڑی ہو جاتی ہیں۔ جب کبھی مریض کے دل کی رفتار دھیمی پڑتی ہے تب اسے Adrenalin کا انجکشن لگایا جاتا ہے۔ جسم میں آڈرے نال کی کارکردگی کے ماند پڑنے سے انسان جلد ہی تھک جاتا ہے۔ کسی بری خبر کے ملنے پر چہرہ زرد ہو جاتا ہے اور وہ بہت جلد ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ بعض اوقات دورانِ گفتگو کسی شخص کا چہرہ غصے سے سرخ ہو جاتا ہے۔ جلد کے یہ آثار چڑھاؤ اور رنگوں کی تبدیلیاں Adrenalin کی وجہ سے ہی ہوتی ہیں۔

۵۔ پی ٹوئی ٹری گلینڈ :
(PITUITARY GLAND)

یہ جسمِ انسانی کا اہم ترین انڈوکرائن گلینڈ ہے جو دماغ میں پایا جاتا ہے۔ اس کی جسامت مٹر کے برابر ہوتی ہے علاوہ ازیں یہ جسم کے دوسرے انڈوکرائن گلینڈس کو کنٹرول کرتا ہے۔ اسکی اہمیت جسم میں اس قدر ہے کہ اسے ماسٹر گلینڈ (MASTER GLANDS) بھی کہا جاتا ہے۔ اس غدود میں کم از کم تیرہ طرح کے ہارمونس کی تشکیل ہوتی ہے۔ پی ٹوئی ٹری گلینڈ کے بعض ہارمون جسمانی نشوونما کا تعین کرتے ہیں۔ ان ہارمونس کے فقدان سے انسان پستہ قد ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی انکی زیادتی کی وجہ سے ڈیڑھ اعشاریہ سات میٹر تک لمبے انسان دیکھے گئے ہیں Pituitary gland کے چند دوسرے ہارمونس اور Ovary میں گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ اوری کے مختلف ہارمونس بھی پی ٹوئی ٹری کے ہارمونس کی موجودگی میں ہی پیدا ہوتے ہیں ۔ Ovary دراصل عورتوں کے جسم میں پایا جانے والا ایک غدود ہے جس میں تین طرح کے ہارمونس پیدا ہوتے ہیں۔ اسپٹروجن، پروجیسٹرون اور اینڈروجن۔ اسپٹروجن عورت کی نسوانیت کے فروغ میں معاون ہے پروجیسٹرون ماں کے پیٹ میں بچے کی حفاظت ابتدائی ایام میں کرتا ہے۔ تیسرا ہارمون اینڈروجن نسوانی ہارمون نہیں ہے۔ یہ ایک مردانہ ہارمون ہے۔ یہ بات حیرت انگیز ہو سکتی ہے کہ عورتوں میں بھی مردانہ ہارمون بنتے ہیں۔ دراصل مرد بھی زنانہ ہارمون پیدا کرتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ عورتوں میں زیادہ مقدار میں زنانہ ہارمون کی تشکیل ہوتی ہے اور مردانہ ہارمون بہت ہی قلیل۔ اسی طرح مرد بھی اسی تناسب میں زنانہ ہارمون پیدا کرتے ہیں۔ یہ تناسب ایک اور پندرہ کا ہوتا ہے۔ تناسب کا یہ فرق مرد اور عورت کی پیدائش کا ذمہ دار ہے۔ مرد جو زنانہ ہارمون پیدا کرتے ہیں اسے اسپٹروجن کہتے ہیں جو سر پر بال اگاتے ہیں۔ مردوں کی داڑھی، مونچھیں اور سینے کے بال اسی کے مرہونِ منت ہیں۔

پی ٹوئی ٹری کی ماہیت اور کارکردگی جاننے پر ڈاکٹر تُلے ہوئے ہیں۔ لیکن ہارمون سے کھیلنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ اس سے کینسر (Cancer) پیدا ہو سکتا ہے۔ پی ٹوئی ٹری گلینڈ کا ایک ہارمون Prolactin بچوں کے لیے ماں کے دودھ کی تشکیل میں معاون ہوتا ہے۔

دنیا کے سائنسدانوں نے جب ہارمونس کی اہمیت دیکھی تو انھوں نے مصنوعی ہارمون بنانے کے بارے میں سوچا۔ ڈاکٹروں اور سائنسدانوں کی یہ کوشش کامیاب ہو گئی۔ مصنوعی ہارمون تجربہ گاہوں میں تیار کئے گئے۔ انھیں انجکشن، کریم اور لوشن کی شکل میں ڈھال دیا گیا۔ ہارمون کریم وغیرہ کا استعمال ممکن ہے مفید ثابت ہو لیکن ابھی تک اس کے ضمنی اثرات کا پتہ نہیں چلا ہے۔ کچھ برسوں پہلے یورپ میں حاملہ عورتوں کی صحت کے لیے ایک دوا تیار کی گئی جس کا نام "تھالی ڈوسا یڈ" تھا۔ جرمنی میں تیار شدہ اس دوا کو سینکڑوں عورتوں نے استعمال کیا۔ مگر جب ان کے یہاں بچے پیدا ہوئے تو کسی کا ہاتھ غائب تھا تو کسی کا پاؤں نہیں تھا۔ ان بچوں کی مائیں صدموں سے بے حال ہو گئیں اور بعض نے بچوں کی پیدائش کے فوراً بعد ہی انھیں مار ڈالا۔ جو بچے بچ گئے وہ آج تک معذور ہیں۔

ہاں! بڑھاپا ایک ایسی بیماری ہے جس میں ہارمون کا علاج کافی حد تک کامیاب رہا ہے۔ جوانی میں جسمِ انسانی میں جتنے Cells مرتے ہیں اتنے ہی پھر پیدا ہو جاتے ہیں لیکن بڑھاپے میں Cells کی موت و پیدائش کا

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

محمد رضی الدین معظم

سماجی برائیاں

ترقی کے میدان میں رکاوٹ

علم سماجیات کا اگر ہم تھوڑا غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کریں تو اس کی اہم ترین شاخ اطلاقی یا عملی سماجیات APPLIED SOCIOLOGY میں سماجی برائیوں اور سماجی بیماریوں سے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ سماجی برائیاں معاشرتی ہم آہنگی اور توازن میں زبردست رکاوٹ پیدا کرتی ہیں اور سماجی خوشحالی اور ترقی کے لیے ایک سدِ راہ بن جاتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ تہذیب و تمدن کی نشو و نما کے لیے خطرہ بن جاتی ہیں اور ان کا فروغ بالآخر سماجی تنظیم اور سماجی ڈھانچہ کی تباہی و بربادی کا سامان مہیا کرتا ہے۔ عملی سماجیات میں سماجی برائی کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مجموعی تمدنی خدوخال کے مختلف عناصر کے درمیان ایسی شدید بے ربطی اور بے آہنگی پیدا کرتی ہے جس سے فرد، سماج، گروہ اور بالآخر قوم و ملک تک کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے اور افراد کی ترقی ماحول کی نشو و نما اور قومی مفادات کی تکمیل میں ایسی رکاوٹ پیدا کر دیتی ہے کہ سماج کی ہیئت ترکیبی یکسر بدل کر رہ جاتی ہے۔

علم سماجیات کے بین الاقوامی ماہر ای ایس بوگارڈس E.S. BOGARDUS نے یہ خاص بات بیان کی ہے کہ اگر افراد سماج میں ایک دوسرے سے ملنے جلنے، سماجی تعلقات پیدا کرنے، باہمی ہمدردی حاصل کرنے اور سماجی یگانگت اور میل ملاپ بڑھانے میں دقت محسوس کرتے ہوں تو ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اپنے سماج میں برائیاں اور بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اس لحاظ سے ہمارے ہندوستانی سماج کی برائیوں کی ایک طویل فہرست ہے جیسے افلاس و ناداری بے روزگاری، بے گھر پن، ادنیٰ معیار رہائش، ادنیٰ معیار زندگی، سماجی ناہمواری اور بے ربطیاں، سماجی تنظیم اور افراد کے درمیان عدم توازن، عیوب و جرائم کی کثرت اور شدت، نظم و ضبط کا فقدان، تمدنی، تہذیبی اور اخلاقی اقدار کا انحطاط، افراد کا سماجی تبدیلی سے عدم مطابقت، سماجی، معاشی اور سماجی بحران اور انتشار، سماجی تصادم اور سماجی تناؤ SOCIAL TENSION OR SOCIAL CONFLICT قدامت پرستی، روایات پرستی، فرسودہ عقائد اور تباہ کن رسم و رواج سے ناگزیر وابستگی، ناقص و ادنیٰ معیارِ تعلیم، خاندانی انتشار، مشترکہ خاندانی نظام، غیر منصفانہ اور غیر مساویانہ تقسیم دولت، گداگری، ذاتی اغراض اور مفادات خصوصی کی تکمیل، معاشی و سماجی مساوات اور انصاف کا فقدان، ذات پات کا امتیاز، لسانی تعصب اور تنگ نظری، فرقہ واریت اور فرقہ واریت کا جنون، صوبہ واریت اور علاقہ پرستی کے جذبات کی شدت، اشیا کی قلت و کمیابی اور آمیزش و ملاوٹ کی کثرت، افراطِ زر اور اسمگلنگ کا فروغ، ذخیرہ اندوزی اور زائد منافع کی پراگندہ ذہنیت، قیمتوں میں روز افزوں اضافہ اور ہولناک گرانی، زندگی کے تمام سماجی و معاشی معاملات میں بے اعتمادی، کاہلی اور ادنیٰ معیار کارکردگی، جہالت اور ناخواندگی، قومی ملکی خدمت کے جذبہ کا فقدان اور انسانی اقدار سے بیزاری، ماحول کی گندگی اور آلودگی، بد اخلاقی، بدکرداری، رشوت خوری اور بدعنوانی کا فروغ، مخرب الاخلاق محرکات کی نشو و نما اور عریانیت کی مقبولیت، بحیثیت مجموعی سماج کو فائدہ پہنچانے کے جذبے سے محرومی، شادی بیاہ کے فرسودہ اور قدامت پرستانہ رسم و رواج سے حقیقی جذباتی وابستگی، بالخصوص گھوڑے جوڑے کی رقم اور جہیز کی لعنت وغیرہ وغیرہ، یہ تمام ایسی سماجی برائیاں ہیں جو ہماری سماجی، تمدنی، تہذیبی اور قومی ترقی اور خوشحالی میں زبردست رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔

درحقیقت ان تمام سماجی برائیوں اور بیماریوں کے ہم سب ذمہ دار ہیں کیونکہ معاشرہ نام ہے افراد کے مجموعہ کا، جس میں ان تمام برائیوں کی حامل ذہنیتوں کے افراد بھی شامل ہوتے ہیں جو خود غرضی اور زر پرستی کو اپنا سماجی مسلک قرار دیتے ہیں اور سماجی برائیوں کا استعمال کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہماری تہذیبی اقدار اور اخلاقی معیارات دن بدن انحطاط پذیر ہوتے جا رہے ہیں۔ ذاتی مفادات کے حصول کے جذبات نے ہماری ہمہ جہتی ترقی کی منزل کو بہت دور کر دیا ہے۔

اپنے ہندوستانی تہذیبی اثاثہ کی ایسی عمارت تعمیر نہیں کی جس پر ہم فخر و ناز کر سکیں۔ اس کے علاوہ سیاسی آزادی کے بعد سے سماجی برائیوں کے بندھنوں سے آزاد ہونے کی جدوجہد بھی ہم نے نہیں کی، جس کی وجہ سے ہمارا ہندوستانی سماج رو بہ تنزل یا زوال پذیر سماج قرار دیا جانے لگا ہے۔ تعجب خیز بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ موجودہ ایٹمی اور حرکیاتی سماج میں گھوڑے جوڑے کی رقم اور جہیز کی لعنت اور علیحدگی پسندی کو روا رکھا گیا ہے۔ یہ ایسی سماجی برائیاں ہیں جس کی وجہ سے ہزاروں خاندان تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ اور متوسط و غریب افراد پر مشتمل خاندان زندہ در گور ہو گئے ہیں۔ اس منحوس سماجی لعنت نے ہزاروں افراد کو افلاس، غربت، فاقہ کشی اور گوناگوں جرائم پسندی میں گرفتار کر لیا ہے جو اکثر اوقات صدر خاندان اور افراد خاندان کی خودکشی کا محرک بھی بنتی جا رہی ہیں۔

ہمارے معاشرہ کی تمام سماجی برائیوں میں یہ ایسی تباہ کن و جان لیوا رسم ہے جس کی بنیاد کسی مذہبی اصول یا عقیدہ میں نہیں پائی جاتی۔ البتہ ایام جاہلیت کی اس رسم کی بدلی ہوئی شکل ہے جس کی رو سے لڑکوں کے لیے لڑکیوں کی خرید اور فروخت روا رکھی جاتی تھی جس کو ہم موجودہ اصطلاح میں عام اشیا کی طرح لڑکیوں کا تاجرانہ کاروبار یا لڑکیوں کی شادی کو تجارتی معاملہ یعنی COMMERCIAL TRANSACTION کہہ سکتے ہیں۔ اس قسم کا تاجرانہ کاروبار اور معاملہ لڑکیوں کے والدین اور سرپرستوں کے لیے "شادی خانہ آبادی" کی بجائے "شادی خانہ بربادی" بن جاتا ہے۔ دنیا کا کوئی مذہب یا عقیدہ بالخصوص اسلام، ہندو مت، عیسائیت، یہودیت اس سنگین سماجی برائی کی ہرگز اجازت نہیں دیتے، کیوں کہ یہ محض سماجی رسم ہے جو کسی مذہب کا قانون، اصول یا حکم الٰہی نہیں ہے۔ سماجی نقطۂ نظر سے گھوڑے جوڑے کی رقم اور جہیز کا مطالبہ ایام جہالت کی باقیات ہے اور رشوت کی ایک گندہ متبادل شکل ہے جس کو ہر مذہب نے ناجائز قرار دیا ہے۔

ہمارے مادر وطن کے ممتاز مفکرین، دانشوروں، مفکروں، سماجی مصلحین، سماجی قانون کے ماہروں کا، یہ مقدس فریضہ ہے کہ وہ حکومت کے ساتھ اس سماجی برائی کے خاتمے کے سلسلے میں سماجی قانون سازی کے لیے جدوجہد کریں کیوں کہ گھوڑے جوڑے کی رقم اور جہیز کے مطالبے نے لڑکیوں کے وجود کو اس ترقی یافتہ دور میں ایک سماجی بوجھ بنا دیا ہے۔ اور ماں باپ کی زندگی ذہنی انتشار، ذہنی افکار کا شکار بنتی جا رہی ہے۔ کیونکہ اب شادی مہذب پیرایہ میں لڑکیوں کی خرید و فروخت کا ذریعہ بن چکی ہیں جس کے کاروبار میں لڑکی کے دام لڑکے کے ماں باپ اور سرپرست سے وصول کیے جاتے ہیں۔ اس قسم کی سودے بازی میں ہر مذہب کے نام نہاد مذہبی پیشوا، مرشد، مولوی، عالم، مفتی، پنڈت، پروہت اور پادری عملی طور پر شریک ہیں۔ یہ ایسی سودے بازی ہے جس میں جائز و ناجائز اور حلال اور حرام کمائی وغیرہ کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ حالانکہ اس عمل سے ہر مذہب کے بنیادی عقائد کی خلاف ورزی کی جاتی ہے۔ ہر مذہب نے ناجائز کمائی اور کاروبار کو گناہ عظیم اور اہم پاپ قرار دیا ہے۔ غرضیکہ شادی ایک سماجی ادارہ کی حیثیت سے گھوڑے جوڑے کی رقم اور جہیز کے مطالبے کی وجہ سے مختلف سماجی برائیوں کا مرکز بنی ہوئی ہے، چنانچہ خاندانی انتشار، طلاق کی کثرت، ننھے ننھے بچوں کی نگہداشت اور ان کی تعلیم و تربیت سے محرومی اور نوجوان لڑکیوں کے بعد جب حسب خواہش گھوڑے جوڑے کی رقم اور جہیز کا سامان فراہم نہیں کیا جاتا ہے تو لڑکی کی ازدواجی زندگی کو جہنم کا نمونہ بنا دیا جاتا ہے اور ذہنی انتشار اور نفسیاتی بیماری میں مبتلا کر کے مرد کی جانب سے فلسفۂ اذیت کی روشنی میں انتقام لیا جاتا ہے اور اس طرح وہ اپنے لیے تسکین کے سامان فراہم کر لیتا ہے۔ اس قسم کے طرز عمل سے عورت اپنی زندگی خودکشی کے ذریعہ ختم کر دیتی ہے۔ یا پھر ناموافق زندگی کے سایہ میں گھل گھل کر بہت جلد غیر فطری موت کا شکار ہو جاتی ہے۔

موجودہ پیچیدہ سماجی نظام میں کوئی تعلیم یافتہ نوجوان اپنی سماجی و معاشی ضرورتوں کی تکمیل نہیں کر سکتا اور سماجی تعمیر اور ترقی میں اپنا خاطر خواہ حصہ نہیں ادا کر سکتا۔ نظام تعلیم کو سماجی تقاضوں کے مطابق ہونا چاہیے تاکہ ہر فرد تعلیم سے عملی فائدہ اٹھا سکے اور خود کو ملک و قوم کے لیے مفید ثابت کر سکے۔ اس نقطۂ نظر سے تعلیمی نظام میں ایسی مقصدی اور افادی کتابوں کو شامل کیا جانا چاہیے جن سے نوجوانوں کا اخلاق و کردار آراستہ ہو سکے۔ انسانی اقدار کی نشو و نما ہو، ملکی و قومی مفاد کا حصول ہو اور سب سے بڑھ کر اعلیٰ پیمانہ پر شخصیت سازی ہو۔ تعلیم کا نظام ایسا ہونا چاہیے کہ جس سے سماجی برائیاں دور ہو سکیں اور سماجی نظم و ضبط قائم ہو سکے۔ ہمارے مدارس، کالج اور جامعات نوجوانوں کے لیے ذہنی و دماغی صلاحیتوں کو اجاگر کریں تاکہ ملک کا مستقبل جگمگا اٹھے اور ہمارے نوجوان طالب علم باہمی میل ملاپ، رواداری، خلوص و محبت، باہمی ہمدردی کا درس لے سکیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کے ذہن و خیال میں سماجی برائیوں کو ختم کرنے کے سوا اور کوئی دوسرا جذبہ کارفرما نہ ہو اور ان کا مقصد حیات صرف ملک و قوم کی ہمہ جہتی ترقی و خوشحالی قرار پائے۔ سماجی برائیوں کی دنیا میں افلاس، بے روزگاری اور امیری و غریبی کے فرق نے بہت ہی شدت اور اہمیت اختیار کر لی ہے۔ ہمارے ملک کی آبادی کا ۵۰ فیصد حصہ بدترین افلاس و غربت میں زندگی کاٹ رہا ہے۔ افلاس و بے روزگاری ہمارے سماج میں جس طرح جڑ پکڑے ہوئے ہے پیداواری عوامل کو ترقی دے کر اس کا خاتمہ وقت کی ضرورت ہے۔

مجاہد آزادی

جلسے کا کنوینر ابھی شکریہ ادا کر رہا تھا کہ اسٹیج کے قریب دوسری یا تیسری قطار سے اودھم سنگھ نے ڈائر پر گولیاں برسائیں اور ڈائر ہلاک ہوگیا۔ سکریٹری آف اسٹیٹ لارڈ زیٹ لینڈ کو بھی گولی کا نشانہ بنایا گیا وہ زخمی حالت میں بھاگ گیا۔ سر لوئی ڈین سابق لفٹننٹ گورنر پنجاب لارڈ لمنگٹن سابق گورنر بمبئی بھی زخمی ہوگئے، لوئی ڈین کے بازو پر اتنے زخم آئے کہ اس کا بازو جسم سے علیحدہ ہوگیا، اودھم سنگھ گولیاں برساتے رہے اور انگریزوں کے دل کانپنے لگے اودھم سنگھ چاہتے تو بھاگ سکتے تھے لیکن وہ پستول ہاتھ میں لیے نہایت صبر و سکون کے ساتھ ٹھہرے رہے۔ انھیں جنرل ڈائر سے انتقام لینا تھا جو وہ لے چکے تھے۔ انگریزی حکومت نے انھیں گرفتار کر لیا اور عدالت میں انھیں پیش کرنے پر جج نے ان سے سوال کیا کہ انھوں نے جنرل ڈائر پر گولی کیوں چلائی تو اودھم سنگھ نے بیباکی کے ساتھ کہا کہ جنرل ڈائر اس کا مستحق تھا کیوں کہ اس نے معصوم ہندوستانیوں پر کافی ظلم ڈھائے تھے اگر مجھے سخت سزا دی جاتی ہے تو مجھے اس کا کوئی پرواہ نہیں ہے۔ میں اپنے ملک کی عزت اور اس کے وقار کے لیے مرنے کو تیار رہوں۔ میرا مقصد صرف ہندوستان کی آزادی ہے اس مقصد میں میری جان بھی لے لی جائے تو میرے ارادوں میں کوئی لغزش نہیں آئے گی، جج نے جب ان سے نام دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ ان کا نام رام محمد سنگھ آزاد ہے۔ انھیں چند مہینے جیل میں رکھا گیا۔ اودھم سنگھ نے جیل میں کئی کتابوں کا مطالعہ کیا وہ پنجابی، اُردو اور ہندی کی بہت ساری کتابیں پڑھتے تھے انگریز سرکار نے اودھم سنگھ کو برٹش جیل سے پنٹان جیل پھانسی دینے کی غرض سے منتقل کیا۔ ایسے عظیم سورما کو ۳۱ر جولائی ۱۹۴۰ء کو پھانسی دے دی گئی اور ہندوستان کی آزادی کا یہ عظیم سپوت ملک کے تحفظ، عزت و وقار کے لیے ایثار اور قومی یکجہتی کا پیام دے کر رخصت ہو گیا۔

ہندوستان کی آزادی کی تاریخ میں اودھم سنگھ کا نام سنہری حرفوں سے لکھا جائے گا، کیوں کہ اس عظیم مرد مجاہد نے فرقہ پرستی، علاقہ واریت اور لسانی تعصب سے بے نیاز ہو کر اپنے ملک اور قوم کی خدمت کی تھی۔

جنگِ آزادی کے اس سورما کا جنم پنجاب کے ضلع سنگرور سونامی گاؤں میں ۲۶ر دسمبر ۱۸۹۹ میں ہوا۔ دو برس کے تھے کہ ان کی ماں کا انتقال ہوا اور جب اودھم سنگھ سات برس کے ہوئے تھے تو ان کے والد سردار ٹہل سنگھ کی وفات ہو گئی اس طرح بچپن ہی میں یہ ماں باپ کے سایہ سے دور ہو گئے ان کی پرورش یتیم خانہ میں ہوئی وہ اپنے چھوٹے بھائی مادھو سنگھ کے ساتھ زندگی گزارنے لگے انھیں ہندی اور انگریزی اور پنجابی زبانوں پر عبور تھا۔ وہ دوسروں کے مذاہب اور عقائد کا احترام کرتے اس لیے ان کے دل میں سب ہی مذاہب سے گہری عقیدت اور تمام مذاہب کے ماننے والوں سے گہرا پیار تھا۔ انھوں نے محسوس کیا تھا کہ تمام ہندوستانی بلا لحاظ مذہب زبان اور علاقے کے آزادی کا حق متحدہ طور پر طلب کر رہے ہیں اور یہ حق انھیں ضرور ملے گا۔ وہ فرقہ وارانہ اتحاد کے زبردست حامی رہے اس لیے انھوں نے اپنا نام بھی تبدیل کر لیا تھا تاکہ ہندوستان کے تمام فرقوں کے اتحاد کو نمایاں کیا جا سکے۔ پنجاب کے اس عظیم سورما کی زندگی ان کے نظریات اور ان کی موت ہر ہندوستانی کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ملک کے موجودہ حالات میں فرقہ وارانہ اتحاد اور یکجہتی وقت کی ضرورت بن گئی ہے کیوں کہ چند مٹھی بھر قوم دشمن عناصر ملک کی ایکتا اور اس کے خوبصورت اتحاد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے ملک کی آزادی اور اس کے اتحاد کو برقرار رکھیں اور اس اتحاد کی حفاظت اور اس کی بقاء کے لیے جدوجہد کریں۔ ہم میں مذہب، زبان اور علاقہ کا بھید بھاؤ ختم ہونا چاہیے، یہ بھید بھاؤ ہماری انفرادی زندگی ہی کو نہیں بلکہ پورے قومی اتحاد کے تار و پود کو بکھرنے اور منتشر کرنے کا باعث بن جائے گا۔ ہم نے تمام امتیازات سے بالاتر ہو کر آزادی کی جنگ جیتی تھی اور اب معاشی آزادی و خوشحالی اور تعمیر و ترقی کے لیے بھی ہمیں ویسا ہی اندازِ فکر اور طرزِ عمل اپنانا ہوگا اس ملک پر سب کا حق ہے اور دستور کی نظر میں سب برابر ہیں، اس کی آزادی کے لیے سب نے ایثار و قربانیاں دی ہیں تو پھر ہم کیوں تفریق اور امتیازات کی دیواریں کھڑی کریں ہندوستان کے حُسن کو چار چاند لگانے اور اسے خوب سے خوب تر بنانے کے لیے اودھم سنگھ کا سا کردار ہماری نوجوان نسل میں پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ آزادی کے اس متوالے نے قومی یکجہتی اور ملک کی خاطر اپنے ذاتی مفاد بلکہ اپنی جانِ عزیز کی بھی قربانی دے دی۔ ایسی ہی مثالیں ہمارے فکر کو روشنی اور ہمارے حوصلوں کو مہمیز کرنے کا باعث بنتی ہیں۔

آئیے وطن کے اس عظیم جانباز کو ہم قومی یکجہتی اور وطن کی خدمت کے عہد کے ذریعے اپنا خراجِ عقیدت پیش کریں۔

★

Regd. No. D(DN) 204
R.N.37052/81

Licensed U(DN) 65 to post without pre-payment at Civil Lines Post Office, Delhi-110054.

Vol. 5 No. 14 YOJANA (URDU) 16-31 October 1985

سردار احمد (علیگ)

ٹیلی ویژن ہندوستان میں

ہم سب کو معلوم ہے کہ ہندوستان، الیکٹرانک انقلاب کے دور میں داخل ہو چکا ہے، اور بڑی تیز رفتاری سے اس میدان میں آگے بڑھ رہا ہے۔ سائنسی فکر و عمل و ایجادات کے چمتکاروں میں ٹیلی ویژن کی اہمیت مسلّم ہے۔ ٹیلی ویژن نے ہمارے شہروں اور گاؤں کے اُفق پر بیداری کی نئی کرن دکھائی ہے اور پورے ہندوستان میں تعلیم، جذباتی ہم آہنگی، قومی یکجہتی اور عام معلومات کی باتوں کو پھیلانے کا ایک طاقتور ذریعہ بن کر اُبھرا ہے۔ اسی وجہ سے وزارت اطلاعات و نشریات کی جانب سے چھٹی یوجنا کے آخر تک ملک کی ستر فیصدی آبادی کو ٹیلی ویژن سے جوڑ دیا جائے گا۔ اس طرح شہری آبادی کا قریب قریب چھیاسی فیصدی حصہ اور گاؤں کی آبادی کا پینسٹھ فیصدی حصہ ٹیلی ویژن جیسے طاقتور ذریعۂ ترسیل و ابلاغ کے زیر اثر آ جائے گا۔

ٹیلی ویژن کا اولین مرکز دلی میں ۱۵ ستمبر ۱۹۵۹ء کو کھولا گیا۔ دوسرا مرکز بمبئی میں ۱۹۷۲ء کو شروع کیا گیا۔ ہماری سابق وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی ذاتی دلچسپی کے نتیجے میں نویں ایشیائی کھیلوں کے سال میں بہت سے ٹیلی ویژن مراکز اور کھولے گئے اور ٹی۔ وی کی توسیع میں مدد دینے کے لیے انسیٹ۔ ایک بی کو خلا میں چھوڑا گیا، جس کے بعد ۱۹۸۴ء ختم ہوتے ہوتے ٹیلی ویژن کی مقبولیت اور اہمیت عوام و خواص میں بڑی تیزی کے ساتھ بڑھتی چلی گئی جس کے نتیجے میں چھوٹی بڑی سیکڑوں کمپنیاں، صنعتی ادارے اور اس کے طفیلی پیشے شہروں شہروں نظر آنے لگے۔

انسان کی جمالیاتی حس نے رنگین ٹیلی ویژن میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ اس کا تجربہ ۱۹۸۲ء میں "ایشیاڈ" کے موقع پر ہو چکا ہے۔ ہندوستان میں ٹی۔ وی کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ آئندہ چند برسوں میں رنگین ٹی۔ وی کی مانگ اتنی بڑھنے لگے گی کہ "بلیک اینڈ وائٹ" پیچھے رہ جائے گا۔ جیسا کہ [illegible] دنیا میں ہو چکا ہے۔ بھارتیہ سرکار نے رنگین ٹی۔ وی کو فروغ دینے کے جذبے کے تحت اس کے ضروری پرزوں جس میں انٹی گریٹیڈ سرکٹ، کپیسیٹر اور رنگین ٹیوب شامل ہیں، کے لیے ٹیکس میں بھاری کمی کر دی ہے۔ نجی سرمایہ کاری کرنے والے سبھی چھوٹے بڑے صنعت کار الیکٹرانک پرزوں کے لیے سرکاری درآمد پالیسی سے خوش ہوئے ہیں۔ سرکار کی سرپرستی اور دلچسپی کو دیکھتے ہوئے قوی اُمید ہے کہ ۱۹۹۰ء میں ٹی۔ وی سیٹ کی تیاری دس ہزار کروڑ روپے کی مالیت سے آگے نکل جائے گی۔

ٹی وی کا تعلیمی پہلو بہت زیادہ اہم ہے۔ اس کے اثرات اخبارات اور رسائل سے زیادہ گہرے ہیں کیوں کہ خبر کی بہ نسبت نظر کی اہمیت ہر طرح مسلّم و مستحکم ہے۔ اس لیے تعلیم کے فروغ، قومی یکجہتی کے حصول، مذہبیت کی جگہ روحانیت کی دل نشینی، سائنٹفک نظریوں اور پوری انسانی دنیا کو ایک کنبہ ماننے اور سمجھنے کا جذبہ جس قدر آسانی سے ٹیلی ویژن کے ذریعے دلوں میں اُتارا جا سکتا ہے اتنا کسی اور ذرائع ابلاغ سے ممکن نہیں ہے۔ تاریخ، جغرافیہ، سائنس اور ادب کی موثر تعلیم کے لیے ٹی۔ وی ایک نعمت ثابت ہو سکتا ہے۔ ہر چیز اپنا صحیح استعمال چاہتی ہے۔ یہی حال ٹی۔ وی کا بھی ہے۔ ہماری سرکار اسی وجہ سے ٹی۔ وی جیسے ادارہ کو اپنی سرپرستی میں رکھ کر اسے مفید بنانے کے لیے کوشاں ہے اور ہمارے معزز وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے بھی ٹیلی ویژن پروگراموں کو مفید اور دلچسپ بنانے کے احکام صادر کئے ہیں۔

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, N.D.-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002

یوجنا

یکم تا ۱۵ نومبر ۱۹۸۵

ایک روپیہ

دور درشن پر ایک قریبی نظر
(ہرش اروڑہ)

اترپردیش میں ابتدائی تعلیم
(محمد مرتضیٰ)

اُرملا دیوی

کھادی اور دیہی صنعتوں کا فروغ

دیہی ترقی میں کھادی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جدوجہد آزادی کے دوران جہاں مہاتما گاندھی نے عدم تشدد کا راستہ اختیار کیا وہاں چرخے کو بھی اپنایا اور عوام کو چرخہ کاتنے اور کھادی پہننے کی تلقین کی۔ مقصد یہ تھا کہ لوگ اپنی ضرورت کے لیے سوت خود کاتیں، کھادی پہنیں اور ولایتی کپڑے کا بائیکاٹ کریں تاکہ ملک کا روپیہ ملک سے باہر نہ جائے۔ چنانچہ کھادی کی تحریک حصولِ آزادی میں ممد و معاون بنی۔ آزادی کے بعد قومی حکومت نے کھادی اور دیہی صنعتوں کے فروغ پر توجہ دی اور چوں کہ بھارت تو گاؤوں میں ہی بستا ہے لہٰذا بھارت کی ترقی کے لیے ضروری تھا کہ کھادی اور دیہی صنعتوں کو فروغ دیا جائے۔

کھادی اور دیہی صنعتوں کی ترقی کا پروگرام ۱۹۵۰ کی دہائی کے اوائل سے شروع کیا گیا۔ کھادی اور دیہی صنعتوں کا کمیشن ایک مرکزی ادارہ ہے۔ ریاستوں میں کھادی اور دیہی صنعتوں کے بورڈ قائم ہیں۔ کمیشن ان ریاستی بورڈوں کے ذریعے یہ کام آگے بڑھاتا ہے۔ ریاستی بورڈ رضاکار اور کوآپریٹو اداروں کے ذریعے پروگراموں کو عملی جامہ پہناتے ہیں۔ کھادی اور دیہی صنعتوں کا کمیشن اُن ریاستوں میں جہاں ریاستی بورڈ نہیں ہیں یا ٹھیک سے کام نہیں کر رہے ہیں، رضاکار انجمنوں کو براہِ راست امداد دیتا ہے۔ ۹۶ مخصوص صنعتوں کو جو بحیثیت دیہی صنعتی سرگرمیوں پر محیط ہیں۔ مینوفیکچرنگ سرگرمیوں کے لیے امداد دی جاتی ہے۔ ان میں کیمیکلز اور الیکٹرانکس وغیرہ شامل نہیں ہیں جن کا شمار جدید صنعتوں میں ہوتا ہے۔ سرمایہ جاتی آثاثہ اور کاروباری سرمایہ کے لیے نیز مارکیٹنگ ایجنسیاں قائم کرنے کے لیے مالی امداد فراہم کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں بنیادی پروڈکشن اور بعد کی پروسیسنگ کے لیے بھی مالیات فراہم کی جاتی ہیں۔ سود کی شرح بھی کم رکھی جاتی ہے۔ کھادی کے لیے دی جانی والی امداد پر کوئی سود نہیں لیا جاتا۔ دیہی صنعتوں کو ملنے والی امداد پر صرف چار فیصد کی شرح سے سود لیا جاتا ہے۔ کھادی اور دیہی صنعتوں کا کمیشن اور کھادی و دیہی صنعتوں کے بورڈ کھادی اور بعض دیہی صنعتوں کی مصنوعات مثلاً جوتے اور غیر خوردنی تیل سے بننے والے صابن وغیرہ کی فروخت میں چھوٹ بھی دیتا ہے۔

کھادی اور دیہی صنعتوں کے کمیشن کے زیرِ سرپرستی شروع کیے گئے پروگراموں کو ایسی بنیادی سہولیات حاصل ہیں جنھیں زیادہ مند ڈھنگ سے مربوط دیہی ترقی کے پروگرام سے جوڑا جا سکتا ہے۔ یہ سہولیات ہیں:-

کاروباری سرمایہ کے لیے مالیات

کھادی اور دیہی صنعتوں کا کمیشن کاروباری سرمائے کے لیے صرف چار فیصد شرح سود پر رقم فراہم کرتا ہے۔ سامان کی تیاری کے لیے بھی وہ رعایتی دروں پر مالیات کا انتظام کرتا ہے۔

رضاکار انجمنیں

رضاکار انجمنوں کی بیشتر تعداد رجسٹریشن آف سوسائٹیز ایکٹ ۱۸۶۰ء کے تحت رجسٹرڈ ہے۔ ان میں ایسے مخلص کارکن بھی ہوتے ہیں جو دیہی علاقوں میں کام کرنے کو تیار ہیں۔ ان سے تکنیکی عملے کا استعمال دوسروں کو تربیت دینے کے لیے کیا جا سکتا ہے۔ (مسلسل جاری کور صـ۳ پر)

• منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنیوالا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر • آر. تھکرال

ایڈیٹر • لکھی رام رانا

اسسٹنٹ ایڈیٹر • محمد عادل صدیقی

سب ایڈیٹر • وسیم حیدر

شمارہ ۱۵	یکم تا ۱۵ نومبر ۱۹۸۵ء	جلد ۵

۱۰/۸۱ | ۱ کارتک تا ۲۴ کارتک شک ۱۹۰۷ : فون ۶۰۱۸۱۸

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے۔ دو سالہ ۳۵ روپے۔ سہ سالہ ۵۰ روپے

فی کاپی : ایک روپیہ

طالب علموں، اُستادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت

اس شمارے میں

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:-

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر. کے. پورم (مین)
نئی دہلی

بزنس منیجر: ایل. آر. بترہ • اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) : آر. ایس منجال

ترسیلِ زر کا پتہ : بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

• یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے۔ مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

اداریہ

ترقّی اور خاندانی بہبود

آج کے دور میں ترقی یافتہ نیز ترقی پذیر دنیا کے ملکوں کے درمیان زبردست فرق پایا جاتا ہے۔ ترقی یافتہ دنیا میں اوسط عمر ۷۲ سال ہے۔ جبکہ ترقی پذیر ملکوں میں یہ صرف ۵۰ سال ہے۔ ترقی پذیر ممالک کی عورتوں کے بچے ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ صورتِ حال یقیناً تشویشناک ہے۔ اس کی وجہ سے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں کے عوام کے معیارِ زندگی میں بڑا فرق دیکھنے کو ملتا ہے۔ گزشتہ دس برس میں ترقیاتی پروگراموں کی منصوبہ بندی میں اضافۂ آبادی کے مسائل نے منصوبہ سازوں کی توجہ خصوصیت سے اپنی طرف مبذول کرائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ترقی سے متعلق پالیسیوں، منصوبوں اور پروگراموں کو وضع کرتے وقت آبادی، وسائل اور ماحول کے آپسی تعلق کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ اضافۂ آبادی کے مسائل اور ترقیاتی ضرورتوں کو مربوط طریقے پر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ قدرتی وسائل کے تحفظ اور استعمال نیز ماحولیات کے بچاؤ کے لیے آبادی اور ترقی کے تمام ضروری لوازمات کو ترجیح دی جاتی ہے۔

اُمید افزا بات یہ ہے کہ اب اس ضرورت سے سب لوگ بخوبی آگاہ ہیں۔ چنانچہ اس محاذ پر اندازِ نظر کی تبدیلی اور رضاکارانہ کوششوں کی کامیابی حوصلہ افزا ہے۔ شرحِ اموات میں کمی آئی ہے، بیماریوں پر قابو پایا جا سکا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کیا جانا باقی ہے اور اب تک کی کامیابی کی بنا پر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھنا ہے۔ خاندانی بہبود کے پروگراموں نے شرحِ پیدائش کو یقیناً کم کیا ہے۔ بھارت کا شمار ان ملکوں میں ہوتا ہے جو آبادی میں اضافے کو قومی ترقیاتی منصوبوں کے لیے مُضر سمجھتا ہے۔ اگر اس مسئلے پر قابو نہیں پایا گیا تو ملک مختلف طرح کے مسائل سے دوچار ہو جائے گا مثلاً بے روزگاری، خوراک کی کمی، ماحولیاتی وسائل کا اندھا دھند استعمال، بیماری وغیرہ وغیرہ۔ آبادی اور ترقی کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے معاون ہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ یہ کام اتنا اہم ہے کہ اس میں بغیر تاخیر سماج کے سبھی طبقوں کو پوری طرح اپنا تعاون دینا ہے۔ پروگراموں کو مقامی ضرورتوں اور وسائل سے ہم آہنگ کرنا ہے۔ شخصی اور سماجی اقدار کو پیشِ نظر رکھنا ہے۔ اس کی ضرورت سے عوام کو پوری طرح باخبر کرنا ہے۔ یہاں اس ضرورت کا احساس ہوتا ہے کہ سماج میں عورتوں کا احترام اور ان کی اہمیت بڑھائی جائے۔ کنبہ کو محدود رکھنے کے لیے یہ اقدام بہت ضروری ہے۔ ترقیاتی پروگراموں کے مختلف عوامل میں عورت کو پوری طرح ذمہ داریاں سونپی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں سماجی اور سرکاری ہر دو طرح کی مکمل امداد ضروری ہے۔ مردوں اور عورتوں کو سماجی اعتبار سے ایک ہی سطح پر رکھنا ہے۔ خاندان کی زندگی کو بہتر بنانے، بچوں کی نگہداشت کرنے اور خاندانی بہبود کے پروگرام کو آگے بڑھانے میں مردوں اور عورتوں کی برابر کی ذمہ داری ہے۔ اَن چاہے بچے پیدا کرتے رہنے سے فرد اور کنبہ کی زندگی پر خراب اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ زیادہ بچے پیدا کرنا، جلدی جلدی بچوں کا پیدا ہونا، بہت جلدی بچوں کا ہونا، ان سب باتوں سے بچوں میں بیماریاں جڑ پکڑ لیتی ہیں اور انھیں اسباب سے بچوں کی کم سنی میں اموات واقع ہوتی ہیں۔ خاندانی بہبود کے پیغام کو اگرچہ کافی حد تک عام کر دیا گیا ہے، تاہم ابھی تک بہت سے وہ لوگ ضرور ہیں جو خاندانی بہبود کے مؤثر اور مفید و محفوظ طریقوں سے ناواقف ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ۲۰۰۰ء تک دنیا میں ۱ء۶ بلین عورتیں بچے پیدا کرنے کی عمر میں ہوں گی۔ ان میں سے ۱ء۳ بلین عورتیں ترقی پذیر ملکوں میں ہوں گی۔ شادی شدہ جوڑوں اور افراد کو اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ وہ کم بچے پیدا کریں نیز ان کی پیدائش کے دوران مناسب وقفہ رکھ کر زندگی کی حقیقی مسرتوں سے لطف اندوز ہو سکیں۔ اس کے لیے بڑے پیمانے پر خاندانی بہبود کی تعلیم اور اس کے ذرائع کو عوام تک پہنچانا ہے۔ مانعِ حمل موجودہ طریقوں نے اگرچہ عوام میں کافی مقبولیت حاصل کی ہے لیکن اس کے لیے کثیر سرمایہ درکار ہے۔ اس محاذ پر تحقیق اور تحفظ کے عنصر کو اور زیادہ تیزی سے آگے لیجانا ہے۔ پرائمری ہیلتھ سنٹر پر بچہ، زچہ کی نگہداشت کے پروگراموں کو اسی وجہ سے زیادہ مؤثر ڈھنگ سے آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ بچے کی زندگی بہتر بنانے اور اس میں ایک انقلاب لانے کے لیے کچھ پروگرام خاص توجہ کے طالب ہیں مثلاً ماؤں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ چھاتی سے بچوں کو دودھ پلانا، بچوں کی صحت کے لیے زیادہ مفید ہے، اس طرح بچوں کے لیے تغذیہ بخش خوراک، صاف پانی اور ٹیکہ لگانے کی سہولت وغیرہ فراہم کی جانی چاہیے۔

(باقی صفحہ ۱۳ پر)

ایم۔ ایل۔ بجاج

بھارتی مزدوروں کے مسائل

کسی بھی ملک میں صنعتی تعلقات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہاں مزدوروں نے سال میں کتنے دن کام کیا اور ہڑتالوں اور تالہ بندی میں کتنے انسانی دنوں کا نقصان ہوا۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو ۱۹۸۳ء کوئی بُرا سال نہیں تھا۔ ۱۹۸۴ میں کُل ۳ کروڑ ۸ لاکھ ۲۰ ہزار انسانی دنوں کا نقصان ہوا۔ ان میں بعض ریاستوں کے اعداد شامل نہیں ہیں۔ اندازہ ہے کہ یہ نقصان ۱۹۸۳ کی سطح کے اِردگِرد رہا۔ تاہم ۱۹۸۲ اور ۱۹۸۳ء کے لیے حکومت کی طرف سے جو اعداد فراہم کیے گئے ہیں، اُن میں وہ نقصان شامل نہیں تھا جو بمبئی میں کپڑا ملوں میں ہڑتال کے باعث ہوا، لیکن ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ ۱۹۸۴ء میں اتنے بڑے پیمانے پر کام بند نہیں ہوا جتنے بڑے پیمانے پر ۱۹۸۲ میں بنگلور کے پبلک سیکٹر اور ۱۹۸۲، اور ۱۹۸۳ میں بمبئی میں کپڑا ملوں میں ہڑتال سے ہوا تھا۔

بُنیادی امُور

ہڑتالوں اور تالہ بندی سے انسانی دنوں کا جو کم نقصان ہوا ہے اُس سے کسی خوش فہمی کا جھوٹا احساس پیدا نہیں ہونا چاہیئے۔ جو امور اچھے صنعتی تعلقات کے لیے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، اُنھیں متواتر نظرانداز کیا جا رہا ہے۔ ہڑتالیں مزدور یونینوں کی طرف سے کرائی جاتی ہیں لیکن ابھی تک کوئی ایسا طریقہ مرتب نہیں کیا جا سکا جس سے یہ پتہ چل جائے کہ کسی مزدور یونین کے ممبروں کی تعداد کتنی ہے۔ چیف لیبر کمشنر نے مزدور یونینوں کی مرکزی تنظیموں کی کئی میٹنگیں بلائی ہیں تاکہ کوئی ایسا طریقہ مرتب کیا جائے جس سے اُن سے ملحقہ تنظیموں کے ممبروں کی تعداد معلوم کی جا سکے۔ ستمبر ۱۹۸۲ میں نیشنل لیبر کانفرنس کی طرف سے قائم کردہ ایک سہ پارٹی کمیٹی نے سفارش کی کہ ہر ممبر سے تحریری منظوری لے کر جانچ پڑتال کے سسٹم کو عمل میں لایا جائے اور یہ منظوری تین برس کے لیے ہونی چاہیئے۔

ممبرشپ کی تصدیق

ایک انڈسٹریل ریلیشنز کمیٹی کی تشکیل جو انتظامیہ سے الگ تھلگ صنعتی تنازعوں کی مصالحت اور ثالثی کا کام نپٹائے۔ مجوزہ سسٹم کی ابتدائی شرط ہے۔ اس کمیٹی کو یونینوں کی نمائندگی کی بھی تصدیق کرنا ہوگی۔ ایسے ادارے کے قیام سے ٹریڈ یونینوں کا یہ خدشہ بھی دُور ہو جائے گا کہ حکومت یونینوں کی ممبرشپ کا تعین کرنے میں مداخلت کرے گی۔ مزدوروں سے متعلق قومی کمیشن نے بھی سفارش کی تھی کہ انڈسٹریل ریلیشنز کمیٹی قائم کی جائے۔ چنانچہ اچھے صنعتی تعلقات کے قیام کے مفاد میں اس سفارش پر سنجیدگی سے غور کیا جانا چاہیئے۔

موجودہ سسٹم کے تحت کوئی بھی یونین ایک صنعتی تنازعہ کے بعد دو فریقوں کے درمیان ہوئے تصفیہ کو چیلنج کر سکتی ہے۔ اس سے اجتماعی معاہدے کے عمل میں زبردست رکاوٹ پڑتی ہے۔ آجر اور اجتماعی گفت و شنید کے ذریعہ جو معاہدہ ہو جائے اُسے اُس عرصے میں چیلنج نہیں کیا جانا چاہیئے جس عرصے کے لیے وہ کیا جائے۔ موجودہ اہتمام کے تحت مزدور کسی بھی وقت ہڑتال کر سکتے ہیں۔ پبلک سیکٹر کے اداروں میں بھی جہاں ۱۵ روز کا نوٹس دیا جانا ضروری ہے۔ ایسی مثالیں ملی ہیں جہاں نوٹس کے بغیر ہی ہڑتال کر دی گئی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اچانک ہڑتال ہو جاتی ہے اور کام بند کر دیا جاتا ہے۔ مزدوروں کے اس

نامناسب عمل کو روکنے کے لیے ہڑتال کے لیے بیلٹ (ووٹ) کے سسٹم کو سمجھا دیا گیا ہے۔ ایک صنعتی ادارے میں ہڑتال تب ہونی چاہیئے جب بیلٹ سے معلوم ہو جائے کہ ۶۰ فیصد مزدور ہڑتال کی حمایت کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں پبلک سیکٹر کے اداروں کے لیے نوٹس کا عرصہ ہونا چاہیئے۔ اسی طرح کسی آجر کی طرف سے تب تک تالہ بندی کا اعلان نہیں کیا جانا چاہیئے جب تک کہ اجتماعی معاہدہ کی بات چیت ناکام نہ ہو جائے اور بصورت دیگر قانون کے تحت اس کی اجازت نہ ہو۔

چنانچہ غیر قانونی ہڑتالوں کے لیے مزدوروں اور غیر قانونی تالہ بندی کے لیے آجروں کو گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ عملی طور پر پبلک سیکٹر کے اداروں میں ہڑتال کے لیے کبھی کوئی قانونی چارہ جوئی نہیں کی گئی۔ قانون کے نفاذ نہ کیے جانے سے سبھی صنعتوں میں ڈسپلن کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ یہ تمام اہم امور ہیں جن سے ملک میں صنعت کی صحت کا تعین ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں کوئی بھی قانون بنانے سے پہلے ایک ملکی بحث و مباحثے کا انعقاد مناسب ہوگا جہاں تمام اُتار چڑھاؤ پر غور کیا جائے اور اتفاق رائے سے سارا کام کیا جائے۔

اُجرتیں اور پیداواریت

اُجرتیں صنعتی تعلقات میں نہایت اہم رول ادا کرتی ہیں اور کم از کم تنازعوں کی نصف تعداد کا تعلق اسی امر سے ہوتا ہے۔ حالیہ برسوں میں پبلک سیکٹر کے کارخانوں نے سب سے زیادہ روزگار مہیا کیا ہے۔ درحقیقت پرائیویٹ سیکٹر میں ۷۵ لاکھ کے آس پاس ہی جمود طاری ہے پبلک سیکٹر کے اداروں میں ایک کروڑ ۴۶ لاکھ افراد کام کر رہے ہیں۔ پبلک سیکٹر میں عملاً بھاری صنعت، توانائی اور مالیات کے تمام ادارے شامل ہیں۔ پبلک سیکٹر میں اُجرتوں پر ہر تین یا چار برس میں نظرثانی کی جاتی ہے۔ وزارت خزانہ کے تحت بیورو آف پبلک انٹرپرائزز مرکزی پبلک سیکٹر کے لیے اُجرتوں پر نظرثانی کے بارے میں راہبرانہ خطوط متعین کرتا ہے۔ بیورو نے فیصلہ کیا تھا کہ اُجرتوں میں ۱۰ فیصد سے زیادہ اضافہ نہ کیا جائے۔ لیکن کوئلہ صنعت میں نومبر ۱۹۸۳ کے معاہدے کی رُو سے اُجرتوں میں ۲۰ فیصد کا اضافہ کیا گیا جو یکم جنوری ۱۹۸۳ سے لاگو کیا گیا، کیوں کہ صنعت میں سب سے زیادہ لوگ یعنی کوئی ۷ لاکھ افراد کام کرتے ہیں۔ اسی طرح بینکوں اور بندرگاہوں کے ملازموں کی تنخواہوں میں بھی اضافہ ہوا، لیکن ان میں سے کسی بھی معاملے میں اُجرتوں میں اضافے کا تعلق کارکردگی یا پیداواریت سے نہیں تھا۔

پبلک سیکٹر میں اُجرتوں پر نظرثانی یکساں طور پر کی جانی چاہیئے اور اس کے ساتھ ہی وہ تمام صنعتوں کے لیے کی جانی چاہیئے۔ کسی صنعت میں پیداواریت کا انحصار نہ صرف لیبر پر ہے بلکہ بیشتر دوسری باتوں پر بھی ہے۔ مثال کے طور پر فرٹیلائزر صنعت میں پیداواریت کا انحصار کسی خاص پلانٹ کی ٹیکنالوجی پر ہے۔ فرٹیلائزر کارپوریشن آف انڈیا کے تحت مختلف پلانٹوں میں یکساں کام پر مامور کارکنوں کے لیے ظاہراً اُجرتوں کی مختلف شرحیں نہیں ہو سکتیں۔ انفرادی اور گروہی پیداکاری کو فروغ دینے، کوالٹی کو بہتر بنانے اور پیداواری لاگت میں کمی کرنے کے لیے پلانٹ کے لحاظ سے ترغیبات کی اسکیمیں مرتب کرنا ہوں گی جو اُجرتوں کے عام معاہدوں کا حصہ نہیں ہونی چاہیئں۔

کنبوں کی آمدنی کا سروے : بین الاقوامی مزدور

تنظیم نے سفارش کی تھی کہ ہر پانچ برس کے بعد کنبوں کی آمدنی اور خرچ کے بارے میں نئے سرے سے سروے کیا جائے۔ چنانچہ بھارت میں ۷۱-۱۹۷۰ میں سروے کیا گیا۔ بعد ازاں پروفیسر نیل کنٹھ رتھ کی صدارت میں ۱۹۷۷ میں ایک سہ پارٹی کمیٹی قائم کی گئی۔ اس کے بعد ۱۹۸۰ میں حکومت کی طرف سے ۱۹۸۰ میں کنبوں کی آمدنی اور خرچ کا نئے سرے سے سروے کرنے کے متعلق ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی جس نے ۸۱-۱۹۸۰ میں کام شروع کیا اور ۱۹۸۱ میں اپنی سفارشات پیش کیں۔ اس کی سفارشات کے بارے میں ابھی فیصلہ کیا جانا ہے۔ مکانوں کے کرائے کے اشاریہ سے متعلق اس کمیٹی کی سفارشات رتھ کمیٹی کی سفارشات سے بہتر ہیں لیکن راشن کی دکانوں سے راشن حاصل کرنے سے متعلق سفارشات ویسی ہی ہیں۔

خطِ افلاس سے اوپر لانے کی کوششیں

تمام لیبر قوانین میں کم از کم اُجرتوں کا قانون بیشتر مزدوروں پر جن میں زرعی مزدور شامل ہیں، اثر انداز ہوتا ہے۔ اس قانون کو لوگوں کو خطِ افلاس سے اوپر لانے میں اہم رول ادا کرنا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ مرکزی اور ریاستی علاقوں میں اس پر بہت کم عمل کیا جا رہا ہے اور اس صورتِ حال کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ اُجرتیں کم از کم حد سے بھی نیچے کیوں ہیں۔ اس کی وجہ دیہات میں بے روزگاروں اور نیم روزگاروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ چھٹے منصوبے کی دستاویز کے مطابق جس میں ۱۹۸۰ کے بے روزگاروں کی تعداد بھی شامل ہے۔ منصوبے کے عرصے کے آخر تک ۱۵ سے ۵۹ برس کی عمروں کے بے روزگاروں کی کل تعداد ۸ کروڑ ۲۷ لاکھ ۶۰ ہزار تھی۔ ان میں کوئی

۱۰ فیصد تعلیم یافتہ ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کم از کم اُجرت قانونی سطح سے نیچے چلی گئی ہے۔

مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام، قومی دیہی روزگار پروگرام اور دیہی مزدور روزگار گارنٹی پروگرام خاص طور پر دیہی سیکٹر میں بے روزگاری کو دور کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ منصوبے میں مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام کے لیے ۴۵ ارب روپے فراہم کئے گئے ہیں۔ اس میں سے ۳۰ ارب روپے مالی اداروں سے آنے تھے۔ ہر بلاک میں ۳ ہزار غریب ترین گھرانوں یا ملک میں ایک کروڑ ۵ لاکھ کنبوں کی نشاندہی اثاثہ، آمدنی اور ذات (شیڈول کاسٹ اور شیڈول قبائل) کی بنا پر کی جانی تھی۔ ضلعی دیہی ترقیاتی ایجنسی کو اُن کے اقتصادی مسائل کی جانچ کرنی تھی اور اُن کی آمدنی اور روزگار بڑھانے کے لیے موزوں اسکیمیں مرتب کرنا تھی۔ جائزہ لینے کے لیے جو تحقیق و مطالعہ کیا گیا اُس سے انکشاف ہوا کہ ان پروگراموں کو بہت کم حد تک عمل میں لایا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان پروگراموں کو کئی برسوں تک دیہات میں روزگار پیدا کرنے کے لیے کام کرنا ہوگا۔

بندھوا مزدور

دیہی معیشت کی ایک اور لعنت بندھوا مزدوری ہے۔ ملک میں بندھوا مزدوروں کی تعداد کا پتہ لگانے کے لیے کئی بار کوشش کی گئی ہے۔ گاندھی امن فاؤنڈیشن کی ۱۹۸۱ء کی رپورٹ میں ان کی تعداد کا اندازہ ۲۶ لاکھ ۲۰ ہزار لگایا گیا ہے۔ لیکن جون ۱۹۸۴ میں اُن کی تعداد کم ہو کر ایک لاکھ ۶۷ ہزار رہ گئی۔ ریاستی حکومت کی جانچ کے مطابق ان کی تعداد بتدریج کم ہو رہی ہے۔ دراصل بیشتر ریاستوں میں حالیہ برسوں میں ایسی کوئی جانچ ہی نہیں کی گئی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسئلہ ختم ہو گیا ہے جبکہ صورت حال یہ ہے کہ بے روزگاری بڑھنے سے بندھوا مزدوروں کی تعداد بڑھی ہے۔

مزدوروں کی شرکت

بھارت شاید واحد بڑا صنعتی ملک ہے جہاں قانون سازی کے ذریعے صنعتوں میں مزدوروں کی شرکت رائج کی گئی ہے۔ صنعتی تنازعہ قانون کی دفعہ ۳ (۱) کے تحت مزدوروں کی کمیٹیوں کا قیام لازمی ہے۔ کمیٹی میں مزدوروں کا چناؤ کیا جانا ضروری ہے۔ لیکن مختلف سیاسی پارٹیوں سے تعلق رکھنے والی یونینوں کی کثرت اور بھارتی آجر کی مزاحمت سے تقریباً تمام صنعتوں میں یہ کمیٹیاں بے اثر ہو گئی ہیں۔

حکومت کی طرف سے ۳۰ دسمبر ۱۹۸۳ء کو ایک اسکیم کا اعلان کیا گیا جو تمام شاپ اور پلانٹ سطحوں پر کام کرے گی۔ اس میں ایسا اہتمام بھی ہے کہ اسے بعد میں بورڈ کی سطح پر لاگو کیا جائے گا۔ اسکیم میں شاپ سطح پر مزدور نمائندوں کی شرکت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ کام آجر اور مزدوروں میں مشورے کے ذریعے انجام دیا جائے گا۔ شاپ فلور اور پلانٹ سطح پر آجر اور مزدوروں کو مساوی نمائندگی حاصل ہوگی۔ حکومت کے اعلان میں ان کمیٹیوں کے ذمہ ۲۰ کام سونپے گئے ہیں۔ لیکن ان کے مقاصد واضح نہیں ہیں۔ اُمید ہے کہ اس سلسلے میں بھی جلد کام شروع ہو جائے گا۔ ●

بقیہ، کھادی اور دیہی صنعتوں کا فروغ

۵۔ موزوں ساز و سامان اور آلات کے انتخاب کے لیے ایک باضابطہ طریق عمل ہونا چاہیئے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ کھادی اور دیہی صنعتوں کا بورڈ اور کمیشن پروسیسنگ کی جدید ٹیکنالوجی سے پیچھے ہیں۔ مربوط دیہی ترقی کے پروگرام میں بھی کوئی ایسا سسٹم نہیں ہے جس میں یہ طے کیا گیا ہو کہ پروگرام سے مستفید ہونے والے افراد کم از کم کس معیار کا سامان خریدیں۔ کمیشن مذکور اور دیہی ترقی کے محکموں کو اس بات پر توجہ دینی چاہیئے۔

اس بات کی ضرورت ہے کہ دیہی ترقی کی ضلعی ایجنسیاں دیہی کاریگروں اور دستکاروں کی شناخت کریں اور انھیں آمدنی پیدا کرنے والا اثاثہ خریدنے کے لیے ابتدائی مالیات فراہم کریں۔ کھادی اور دیہی صنعتوں کے بورڈ کا رول یہ ہو سکتا ہے وہ ایسے کاریگروں اور دستکاروں سے رابطہ قائم کر کے انھیں کاروباری سرمایہ اور خام مال بہم پہنچا دے اور ان کی مصنوعات کو بازار تک پہنچا دے، تکنیکی رہنمائی فراہم کرے اور ان کی مصنوعات کی کوالٹی پر کنٹرول رکھے۔ ان دونوں پروگراموں میں باقاعدہ تال میل مربوط دیہی ترقی اور کھادی و دیہی صنعتوں کے کمیشن کے پروگرام کو بہت آگے لے جا سکتا ہے۔ ●

ہرش اُروڑہ

دُور درشن پر ایک قریبی نظر

دُور درشن کے قریبی درشن

پہلی ستمبر ۱۹۵۹ کو دلّی میں اوّلین دور درشن مرکز کا قیام ہوا تھا اور آج ۱۹۸۵ میں تمام ملک میں دُور درشن کے ۱۷۸ اسٹیشن کام کر رہے ہیں۔ ان ۲۵، ۲۶ برسوں میں دور درشن نے پیغام رسانی کے شعبے میں عہد آفرین سفر کیا ہے۔

جن مقاصد کے لیے دُور درشن کی داغ بیل ڈالی گئی تھی اُن میں سے چند درج ذیل ہیں:۔

سماجی تبدیلی لانے میں سرگرم رول ادا کرنا، قومی یکجہتی کو فروغ دینا، عوام الناس میں سائنسی تصور پیدا کرنا، زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے ضروری جانکاری اور اطلاعات نشر کرنا، آبادی پر کنٹرول اور خاندانی بہبود کے سلسلے میں خاندانی منصوبہ بندی کا پیغام گھر گھر پہنچانا، ماحولیاتی تحفظ اور فطری توازن بنائے رکھنے میں مدد دینا، خواتین، بچوں اور غریب اور کمزور طبقوں کی فلاح کے متعدد اقدامات کی طرف توجہ دلانا، کھیل کود میں شوق پیدا کرنا اور فنون اور ثقافتی میراث کے تئیں بیداری اور فخر پیدا کرنا اور ان سب کے علاوہ عوام کے لیے تفریحی پروگرام پیش کرنا۔

اگرچہ بھارتی ٹیلی ویژن نے ۱۹۷۶ء کے بعد سے زبردست ترقی کی ہے جب اُسے آکاش وانی سے الگ کر کے ایک آزاد ادارہ بنا دیا گیا تاہم اس کی زندگی میں نیا موڑ آیا۔ ۱۹۷۵ میں جب نشریات کی وُسعت کو بڑھانے کے لیے امریکی مصنوعی سیارہ، اے۔ ٹی۔ ایس، ۶ کے استعمال سے ایک بے مثل تجرباتی اقدام کیا گیا۔ یہ مصنوعی سیارہ بھارت کو ایک برس کے لیے امریکہ نے مستعار دیا تھا۔ اس مصنوعی سیارے کے ذریعے چھ ریاستوں کرناٹک، آندھرا پردیش، اُڑیسہ، بہار، مدھیہ پردیش اور راجستھان کے ۲۴۰۰ دیہات تک دُور درشن کے پروگرام پہنچائے گئے۔ اس عمل میں ۱۵۰۰ گھنٹوں کے پروگرام کنڑا، تیلگو، اُڑیہ اور ہندی میں نشر کئے گئے۔ امریکی مصنوعی سیّارہ کی واپسی کے بعد اُس سے مستفید ہونے والے علاقوں کے مفادات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے گلبرگہ، حیدرآباد، سمبل پور، مظفر پور، رائے پور اور جے پور میں دُور درشن کے ٹرانسمیٹر نصب کئے گئے جہاں سے آج بھی گرد و نواح کے دیہی علاقوں کے لیے باقاعدگی سے پروگرام نشر کئے جا رہے ہیں۔ یہ پروگرام حیدرآباد، کٹک اور دلّی میں واقع اَپ گرہ دُور درشن مرکزوں پر تیار کئے جاتے ہیں۔

بعدازاں زیادہ سے زیادہ علاقے اور دیہات میں دُور درشن کے پروگراموں کو پہنچانے میں "سائٹ" (سائنٹفک اِنسٹرکشنل ٹیلی ویژن ایکسپریمنٹ) پراجیکٹ نے اہم رول ادا کیا۔

اس امر کو دیکھتے ہوئے کہ دُور درشن کے ذریعے تعلیمی اور ترقیاتی سرگرمیوں میں تیزی اور وُسعت لائی جا سکتی ہے، فیصلہ کیا گیا کہ چھٹے پانچسالہ منصوبے کے آخر تک ملک میں ٹرانسمیٹروں کی تعداد ۱۸۰ تک بڑھا دی جائے اور دُور درشن کے پروگرام ملک کی ۷۰ فیصد آبادی تک پہنچائے جائیں۔ ۳۱ مارچ ۱۹۸۵ تک ان ٹرانسمیٹروں کی تعداد ۱۷۲ تک پہنچا دی گئی تھی جو اب ۱۷۸ ہو گئی ہے۔ اب دُور درشن کے ٹرانسمیٹر ملک کے ایک کونے سے دُوسرے کونے تک پھیلے ہوئے ہیں۔ شمال میں کرگل اور لیہہ (جموں و کشمیر) سے لے کر جنوب میں ترویندرم، شمال مشرق میں تیج پور اور دیبروگڑھ اور مغرب میں

دوارکا تک ان کا جال پھیلا ہوا ہے۔ ان میں ایک اور دس کلوواٹ طاقت کے ٹرانسمیٹر ہیں اور ۱۰۰ واٹ صلاحیت کے کم طاقت والے ٹرانسمیٹر بھی ہیں۔ موخرالذکر کی تعداد بلاشبہ زیادہ ہے۔ جہاں ۱۰ کلوواٹ کے ٹرانسمیٹر سے نشر کئے جانے والے پروگرام ۱۲۶ کلومیٹر کے دائرے میں آنے والے علاقے میں دیکھے جاسکتے ہیں وہاں ایک کلوواٹ اور ۱۰۰ واٹ کے ٹرانسمیٹر کی نشریات کا دائرہ بالترتیب ۴۰ اور ۲۵ کلو میٹر ہے۔ ملک میں ۱۹۷۵ کے آخر تک ٹی۔وی سیٹوں کی تعداد ساڑھے چار لاکھ تھی جو ۱۹۸۲ء کے آخر تک ۲۰ لاکھ اور ۱۹۸۴ کے آخر تک ۴۰ لاکھ تک بڑھ گئی۔

لیکن اس موقع پر یہ کہنا بے موقع و محل نہیں ہوگا کہ دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ٹیلی ویژن ہمارے ملک میں کافی دیر سے آیا۔ ۱۹۸۳ میں ایشیائی کھیلوں کی نشریات کے سلسلے میں رنگین نشریات کی اہمیت کا احساس کیا گیا۔ جب یہ فیصلہ ہو گیا کہ ہمیں دیگر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنا ہے، چنانچہ رنگین نشریات کی جانب گہری توجہ دی گئی۔ اور دو برس کے عرصہ میں ہی ہمارے ۸۰ فیصد پروگراموں کو رنگین نشریات میں پیش کیا جانے لگا ہے۔ ایشیائی کھیلوں کے دنوں میں ۱۸، الگ الگ مقامات سے ۲۱ کھیلوں کو دکھایا گیا۔ یہ ایک ایسا مشکل کام تھا جسے کوئی بہت بڑا ادارہ ہی انجام دے سکتا تھا اور دوردرشن نے اس کام کو انجام دینے میں بڑی مہارت کا ثبوت دیا۔ اسی اسکیم کے سلسلے میں ملک کے ۲۰ مختلف چھوٹے بڑے شہروں میں کم صلاحیت کے ٹرانسمیٹر نصب کئے گئے۔ انہی کی بدولت راجدھانی اور نواحی علاقوں کے لوگوں نے جہاں لاکھوں کی تعداد میں اپنے گھروں میں بیٹھ کر ان پروگراموں کا مشاہدہ کیا وہاں راجدھانی کے باہر اور دور افتادہ علاقوں کے لوگ بھی لاکھوں کی تعداد میں ان کھیلوں سے محظوظ ہوئے۔

سچ تو یہ ہے کہ اے۔ ٹی ایس۔ ۶ کے تجربے سے ثابت ہو گیا تھا کہ صرف مصنوعی سیاروں کے ذریعے ہی ملک کے بہت بڑے علاقے میں کم محنت اور لاگت سے ٹی۔وی پروگرام پہنچائے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ متعدد مقصدی نشریاتی مصنوعی سیاروں کا ایک منصوبہ بنایا گیا جس کے سلسلے میں پہلے پہل انسیٹ اے تیار کیا گیا۔ چونکہ اس میں بعض تکنیکی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں اس لیے اس کا استعمال تھوڑے عرصے تک ہی کیا جا سکا۔ اس کے بعد اسی سلسلے کا ایک دوسرا مصنوعی سیارہ ۱۹۸۳ میں زمین کے مدار میں چھوڑا گیا، جو تقریباً دو برس سے ٹیلی ویژن، ریڈیو اور ٹیلیفون جیسے پیغام رساں ذرائع کی ترقی اور نشریات میں اہم حصہ ادا کر رہا ہے۔ دوردرشن کے لیے اس کے دو "ٹرانسپونڈر" دستیاب ہیں جن کے استعمال سے ملک بھر میں پھیلے ہوئے ٹرانسمیٹروں کو وہ تمام پروگرام ریلے کرنے کے لیے مل جاتے ہیں، جو زمین پر بنے سینٹر (ارتھ اسٹیشن) سے انسیٹ ایک بی تک بھیجے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت چھ ریاستوں کو آپ گرہ ریاستوں کا نام دیا گیا ہے۔ یہ ریاستیں ہیں۔

آندھرا پردیش، بہار، گجرات، مہاراشٹر، اڑیسہ اور اتر پردیش۔ ان ریاستوں میں تین تین ضلعوں کے گروپ چنے گئے ہیں جہاں دوردرشن کی طرف سے ۱۰ کلوواٹ طاقت کے ٹرانسمیٹر لگائے گئے ہیں اور ایسے ٹی۔وی سیٹ لگانے کا انتظام کیا گیا ہے جو مصنوعی سیارہ سے براہ راست پروگرام موصول کرتے ہیں۔ جن بڑے مقامات پر یہ ٹرانسمیٹر نصب کئے گئے ہیں اُن کے نام ہیں حیدرآباد، رانچی، راجکوٹ، ناگپور، کٹک اور گورکھپور۔ ان کی بدولت ملک کے وسیع حصوں میں زراعت، افزائش مویشیاں، صحت و صفائی، دیہی صنعتوں، خاندانی بہبود، قومی یکجہتی، تعلیم بالغان اور ترقیات سے متعلق پروگرام نشر کئے جاتے ہیں۔

نیشنل پروگرام

مشاہدین کو ملک کے مختلف حصوں کی ثقافتی، سماجی اور اقتصادی سرگرمیوں سے روشناس کرنے، کثرت میں وحدت کا پیغام اُن تک پہنچانے اور عوام میں قومی یکجہتی کا احساس بڑھانے کے لیے ۱۵؍ اگست ۱۹۸۲ سے ایک نیشنل پروگرام شروع کیا گیا جو تمام ٹرانسمیٹروں سے ایک ساتھ نشر کیا جاتا ہے۔

اس برس نیشنل پروگرام میں ۵ نئے سیریل پروگرام شروع کئے گئے اور دیگر کئی سیریل جاری رکھے گئے۔ ایک ہے "ہم لوگ" جو بہت زیادہ مقبول عام ہوا ہے، جس کا مقصد خواتین کی بہبود اور خاندانی منصوبہ بندی جیسے سماجی مقاصد کو بڑھاوا دینا اور سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کو دکھا کر انھیں دور کرنے پر زور دینا ہے۔ اس کے علاوہ "بستی" بھی کافی مقبول ہے۔ اس میں جھگی جھونپڑی والوں کے حالات زندگی دکھائے جاتے ہیں۔

بعد میں "اڑوس پڑوس"، "خاندان"، "رجنی" اور "بیرسٹر ونود" جیسے دلچسپ پروگراموں کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اب "بیرسٹر ونود" کی جگہ "جاسوس کرم چند" نے لے لی ہے۔ اور "بی بی ناتیوں والی" کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا ہے۔

دیگر دلچسپ پروگراموں میں فیچر فلمیں اور چترہار دکھایا جاتا ہے۔ فیچر فلم اتوار کو دکھائی جا رہی ہے۔ کچھ عرصہ تک ہفتہ میں دو فیچر فلمیں

یو کھائی جاتی رہیں۔ ایک ویروار (جمعرات) اور دوسری اتوار کو، اب ویروار کا فلمی پروگرام منقطع کردیا گیا ہے۔ چترہار ہفتے میں دو روز بدھوار اور شکروار کو نشر کیا جاتا ہے۔ اس میں بعض مناظر اخلاقی معیار سے پست ہوتے ہیں جنھیں گھر میں بال بچوں کے ساتھ دیکھنا بہت برا لگتا ہے۔ ان کی یہ مانگ بجا ہے کہ مناظر اور فلمیں صاف ستھری ہونی چاہئیں۔

دوسرا چینل

دلی دور درشن نے دوسرا چینل بھی شروع کردیا ہے۔ اس سروس کا افتتاح مرحومہ وزیر اعظم اندرا گاندھی نے ۹ ستمبر ۱۹۸۴ کو کیا تھا۔ اب اس چینل پر روزانہ شام کو دو گھنٹے کے لیے پروگرام نشر کیا جاتا ہے۔ بمبئی میں بھی دوسرا چینل کھل گیا ہے۔ اب اس طرح مدراس اور کلکتہ مرکزوں پر بھی ٹیلی ویژن سروس کا دوسرا چینل شروع کرنے کی تجویز ہے۔ دلی دور درشن مرکز پر دوسرا چینل چالو ہونے پر ہندی کی علاقائی خبریں اسی چینل سے نشر کی جارہی ہیں۔ اب اس سروس کی توسیع ہونے کی تجویز بھی زیر غور ہے۔

ٹیلی ویژن سازی سے متعلق پالیسی

لوک سبھا میں ایک سوال کے جواب میں نائب وزیر برقیات (الیکٹرانکس) نے ملک کی صنعتی لائسنسنگ اور غیر ملکی اشتراک کار سے متعلق پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ملک میں ٹی۔ وی سیٹ بنانے کے لیے غیر ملکی اشتراک کار یا جانکاری ضروری نہیں اور ملک میں غیر ملکی کمپنیوں کو رنگین ٹیلی ویژن سیٹ بنانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ زائد پیداواری صلاحیت کا ۵۰ فیصد تربیت یافتہ انجینیروں کے لیے محفوظ کیا گیا ہے۔ زائد پیداواری صلاحیت کا کچھ حصہ مرکزی اور ریاستی سرکاروں کے پبلک اداروں اور صنعتی ترقیاتی کارپوریشنوں کے لیے محفوظ کیا گیا ہے۔

الیکٹرانکس کارپوریشن آف انڈیا لمیٹڈ میں ٹی۔ وی سیٹ بنانے کے لیے ٹی۔ وی شعبہ ۷۲-۱۹۷۱ میں کھولا گیا اور یہاں بڑھیا، پائدار اور کفائتی ٹی۔ وی سیٹ بنتے ہیں۔ اس کے سیٹ بھارت میں بہت مقبول عام ہیں اور وہ کسی بھی درآمد شدہ سیٹ کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ ۸۲-۱۹۸۱ میں ۳۰ ہزار سیٹوں کی نصب شدہ پیداواری صلاحیت تھی لیکن حقیقی پیداوار ۲۱۶۷۴ سیٹوں کی ہوئی۔ اس کے علاوہ رنگین ٹی۔ وی سیٹوں کی زائد پیداواری صلاحیت ۳۰ ہزار سیٹ سالانہ تھی۔ کارپوریشن ہذا کے علاوہ دیگر بیشتر صنعتی یونٹ ٹی۔ وی سیٹ تیار کررہے ہیں۔ اور ان میں ۵۰ یونٹ ایسے ہیں جو رنگین سیٹوں کی تیاری میں مصروف ہیں۔ ۲۰ دیگر صنعتی یونٹ بھی جلد ہی ایسے سیٹوں کی تیاری شروع کردیں گے۔

۱۹۸۱ میں ملک میں ۳ لاکھ ۷۰ ہزار ٹی وی سیٹ تیار کئے گئے اور ۱۹۸۳ میں یعنی دو سال میں یہ تعداد تقریباً دگنی ہوگئی جبکہ ۷ لاکھ ۱۰ ہزار سیٹ سالانہ کی شرح سے تیار کئے جانے لگے۔ حکومت کی طرف سے ایک کروڑ ۲۰ لاکھ سیٹوں کی تیاری کے لیے بڑے ملے جلے شعبے (سرکاری وغیر سرکاری)، پبلک، پرائیویٹ اور چھوٹی صنعتوں کے شعبوں میں پیداواری صلاحیت کی منظوری دی گئی ہے جس سے ٹی۔ وی کی تیاری میں صحتمندانہ مقابلہ ہوگا اور صارفین کو بڑھیا، پائدار سیٹ مناسب داموں پر دستیاب ہونگے۔ ساتویں منصوبے کے آخری برس ۹۰-۱۹۸۹ء کے لیے ۳۰ لاکھ کالے اسفید اور ۱۰ لاکھ رنگین ٹی۔ وی سیٹ کی تیاری کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

خواتین کی بہبود: خواتین کے بعض حلقوں کی طرف سے یہ مطالبہ بجا طور پر کیا جارہا ہے کہ دور درشن سے خصوصاً دوپہر کو جب عورتیں گھر کے کام کاج سے فارغ ہوجاتی ہیں، ایسے پروگرام شروع کئے جائیں جن سے انھیں گھریلو کام دھندوں کی تربیت ملے۔ اس سے وہ نہ صرف کنبوں کے اخراجات میں کمی کرسکیں گی بلکہ اُن کی آمدنی میں بھی اضافہ کرسکیں گی۔ انھوں نے تجویز کیا ہے کہ انھیں سلائی وکڑھائی، کتائی، بُنائی، چٹائیاں بُننے، مٹی کے کھلونے بنانے اور موم بتیاں تیار کرنے جیسے گھریلو دھندوں کی تربیت دینے کے علاوہ مصوّری، بُت تراشی اور باٹک کے فنون سے بھی روشناس کیا جائے۔ دوسرے جن کام دھندوں کی تربیت کا سجھاؤ دیا گیا ہے وہ ہیں، پٹ سن کے ریشوں سے بیگ اور دیگر آرائشی اشیا کی تیاری، گڑیاں بنانا، بیوٹی کلچر، اکے بانا اور بونسائی، سنگیت اور ناٹک وغیرہ، مضمون نویسی اور صحافت، فوٹو گرافی اور طباخی وغیرہ کے عمل میں تیزی آئے گی۔

اشتہارات

دور درشن کو اپنی آمدنی اُن اشتہارات سے ہوتی ہے جو بڑی بڑی کمپنیوں اور تجارتی گھرانوں کی طرف سے اُس پر دکھائے جاتے ہیں۔ اسی لیے اس نے سیٹ رکھنے والوں سے لی جانے والی ۵۰ روپیہ سالانہ فیس معاف کردی ہے۔ بڑودہ کے آپریشنز ریسرچ گروپ کی طرف سے کئے گئے ایک سروے کے مطابق دور درشن کو ۸۶-۱۹۸۵ میں اشتہارات سے ۶۰ کروڑ روپے سے زیادہ کی آمدنی ہوگی جو موجودہ تمام تخمینوں سے بہت زیادہ ہوگی۔

دلی دور درشن کو ۸۵-۱۹۸۴ میں ۳۷ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے کی آمدنی ہوئی جو نیشنل نیٹ ورک سے ہونے والی کل آمدنی کا ۵۷ فیصد تھی۔

اس طرح دور درشن کو ہر شعبے میں جو ترقی ہورہی ہے، توقع ہے کہ اُس سے ملک کو آگے لے جانے میں مدد ملے گی۔ ●

محمد مزمل

اترپردیش میں ابتدائی تعلیم ترقی اور توقعات

چودہ سال تک کے بچوں کی باضابطہ تعلیم، جسے ابتدائی تعلیم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، تمام طرح کی تعلیمی، سماجی اور معاشی ترقی کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ اسی لیے تمام ترقی پذیر ممالک اور اُن کی ریاستی اور مقامی سرکاریں ابتدائی تعلیم کی عالمگیر فراہمی کو اپنا نصب العین قرار دیتی ہیں۔ ہندوستان کے آئین میں بھی یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ ۱۴ سال تک کے بچوں کی تعلیم مفت دی جائیگی؛ اور یہ بھی، بچوں کو پورے ملک میں یکساں طور پر فراہم کی جائے گی۔ حالاں کہ آزادی ملنے کے بعد اور پنجسالہ منصوبوں کے دوران تعلیم کے معاملے میں پورے ملک میں اور صوبہ اترپردیش میں کافی ترقی ہوئی ہے مگر صورت حال پر نظر ڈالنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی بھی بہت کچھ کیا جانا باقی ہے۔

اُترپردیش میں صفر سے ۱۴ سال تک کے عمر کے بچوں کی تعداد کل آبادی میں ۴۲ فیصدی کے برابر ہے۔ ریاست کے تمام پنجسالہ منصوبوں میں ان بچوں کے واسطے ابتدائی تعلیم کو وسعت اور فروغ دینے کے لیے اقدامات کئے گئے۔ یہاں تک کہ ریاست کے مختلف پنجسالہ پلان میں تعلیم پر خرچ ہونے والی رقوم کا ۶۰ فیصدی سے زیادہ حصہ صرف ابتدائی تعلیم پر خرچ کیا گیا اور ریاست کے سالانہ تعلیمی بجٹ کا ۵۰ سے ۵۰ فیصدی حصہ ابتدائی تعلیم پر صرف کیا گیا۔ لیکن ان سب ترجیحات اور مالی بہم رسانی کے باوجود اُترپردیش کی کل آبادی میں پڑھے لکھے لوگوں کا تناسب ابھی بھی بہت کم ہے۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ملک کے کل ۲۲ صوبوں میں صرف چار صوبے (بہار، راجستھان، جموں وکشمیر اور سکم) ایسے تھے جہاں پر اترپردیش کے مقابلے میں کم لوگ تعلیم یافتہ تھے۔ جبکہ ۱۹۸۱ کی مردم شماری کے مطابق اب سکم بھی اترپردیش سے آگے نکل گیا ہے۔ یعنی اس وقت حرف شناسی کے اعتبار سے اُترپردیش صرف تین ریاستوں (بہار، راجستھان، اور جموں وکشمیر) کو چھوڑکر باقی سبھی ریاستوں سے پیچھے ہے۔

منصوبہ بند ترقی کے دوران اُترپردیش میں تعلیم کی ترقی کو گوشوارہ نمبر ۱ میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ۱۹۵۱ میں حرف شناسی کا فیصد تناسب ۸ر۱۰ تھا جو ۱۹۸۱ میں بڑھ کر ۴ر۲۷ فیصد ہوگیا۔ جبکہ اسی مدت میں پورے ملک میں حرف شناسی کا تناسب ۶ر۱۶ سے بڑھ کر ۸ر۳۴ فیصد تک پہنچ گیا۔ اس سے ایک بات یہ ضرور واضح ہوتی ہے کہ اُترپردیش میں ابتدائی تعلیم کی ترقی کی رفتار پورے ملک کی اوسط رفتار سے تیز ہے۔

اس صدی کے شروع سے ہی اترپردیش تعلیم کے اعتبار سے بہت پیچھے رہا ہے۔ خصوصاً عورتوں کی تعلیم تو قریب قریب نہیں کے برابر تھی۔ اس میں اضافے کی رفتار بھی بہت سست رہی۔ ۱۹۴۱ تک اترپردیش میں صرف ۸ فیصدی لوگ ہی تعلیم یافتہ تھے اور صوبے میں تعلیم یافتہ عورتوں کا تناسب ۱۹۳۱ تک ایک فیصدی سے بھی کم رہا۔

اترپردیش میں ابتدائی تعلیم کے پروگرام کو مندرجہ ذیل تین سطحوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلی سطح :- پری بیسک (نرسری) یا پری پرائمری تعلیم۔

دوسری سطح :- جونیر بیسک یا لوور پرائمری تعلیم۔

تیسری سطح :- سینیر بیسک (مڈل) یا ہائر پرائمری تعلیم۔

مندرجہ بالا تینوں سطحوں کی تعلیم کی ترقی کا جائزہ لینے کے لیے ان تین باتوں پر غور کیا گیا ہے۔

۱۔ تعلیمی اداروں کی تعداد۔

۲۔ اساتذہ کی تعداد، اور

۳۔ طلباء کے داخلوں کی تعداد۔

پری بیسک (نرسری) یا پری پرائمری تعلیم :
(PRE-BASIC (NURSERY) OR PRE-PRIMARY EDUCATION)

۳ سے ۵ سال تک کے بچوں کے لیے نرسری تعلیم دی جاتی ہے۔ اس سطح کی تعلیم کا بیشتر انتظام نجی اداروں کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ اس وقت ریاست میں ۸۸ نرسری اسکول چل رہے ہیں۔ اِن میں نرسری طریق کی ہی تعلیم دی جاتی ہے اور یہ سبھی اسکول شہری علاقوں میں ہی واقع ہیں۔ ان میں سے ۴۵ اسکول لڑکوں کے لیے اور ۴۳ اسکول لڑکیوں کے لیے ہیں۔ ان اسکولوں میں ۲۱ ہزار لڑکے اور ۱۱ ہزار لڑکیاں زیر تعلیم ہیں۔ ان مدارس میں قریب ۷۰۰ اساتذہ ہیں جن میں ۸۰ فیصدی خواتین ہیں۔

اترپردیش میں نرسری تعلیم کی ترقی کو گوشوارہ نمبر ۲ میں درج کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ۵۱-۱۹۵۰ سے ۸۳-۱۹۸۲ تک کی ۳۲ سالہ مدت میں نرسری اسکولوں کی تعداد میں ۱۴ گنا اور طلباء کی تعداد میں تقریباً ۴۰ گنا کا اضافہ ہوا۔ اسی دوران اساتذہ کی تعداد میں ۳۲ گنا کا اضافہ ہوا۔ لیکن ان سب کے باوجود ابھی بھی ریاستی سرکار کے ابتدائی تعلیم کے بجٹ کا بہت کم حصہ نرسری تعلیم پر صرف ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ

یہ ہے کہ نرسری تعلیم کی فراہمی نسبتاً بہت مہنگی پڑتی ہے۔ اس وقت پورے صوبے میں ریاستی سرکار دس راجکیہ شششو کیندر تجربے کے طور پر چلا رہی ہے۔ چند سرکاری اور غیر سرکاری نرسری اسکولوں کو سرکار مالی امداد بھی فراہم کرتی ہے۔

جونیئر بیسک یا لوور پرائمری تعلیم :

(JUNIOR BASIC OR LOWER PRIMARY EDUCATION)

جونیئر بیسک اسکولوں میں ۶ سال سے ۱۱ سال کی عمر کے بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ اس میں درجہ اوّل سے درجہ پانچ تک کی تعلیم شامل ہے۔ اس وقت پورے صوبے میں تقریباً ۷۲ ہزار جونیئر بیسک اسکول چل رہے ہیں۔ ان میں سے ۶۵ ہزار اسکول دیہی علاقوں میں ہیں۔ پردیش کے پرائمری اسکولوں میں ایک کروڑ چار لاکھ طلبار زیر تعلیم ہیں۔ ان میں سے ۷۲ لاکھ لڑکے ہیں اور ۳۲ لاکھ لڑکیاں۔ ان درسگاہوں میں اساتذہ کی تعداد ۲ لاکھ ۷۴ ہزار سے زیادہ ہے۔ جن میں تقریباً ۴۴ ہزار خواتین ہیں۔

جونیئر بیسک تعلیم کی ترقی کو گوشوارہ نمبر ۳ میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ۵۱-۱۹۵۰ سے ۸۳-۱۹۸۲ تک کی ۳۲ سالہ مدت میں پرائمری اسکولوں کی تعداد میں سوا دو گنا اضافہ ہوا۔ اسی دوران اساتذہ کی تعداد میں ساڑھے تین گنا اور طلبا کی تعداد میں چار گنا سے کچھ کم اضافہ ہوا۔

ابتدائی تعلیم کے پروگرام میں جونیئر بیسک تعلیم سب سے اہم ہے۔ اس میں ایک طرف جہاں طلبار اور اساتذہ کی کثیر تعداد ہے وہیں دوسری جانب سرکار کے تعلیمی بجٹ کا بیشتر حصہ اسی سطح کی تعلیم پر خرچ کیا جاتا ہے۔

سینئر بیسک (مڈل) یا ہائر پرائمری تعلیم

(SENIOR BASIC (MIDDLE) OR HIGHER PRIMARY EDUCATION)

یہ تعلیم سینئر بیسک، یا مڈل اسکولوں میں ۱۱ سال سے ۱۴ سال تک کے بچوں کو دی جاتی ہے۔ اس میں درجہ ششم سے درجہ آٹھ تک کی تعلیم شامل ہے۔ اس وقت اتر پردیش میں ۱۴ ہزار سینئر بیسک اسکول چل رہے ہیں۔ ان میں سے تقریباً ۴ ہزار اسکول لڑکیوں کے لیے مخصوص ہیں۔ دیہی علاقوں میں سینئر بیسک اسکولوں کی تعداد ۱۲ ہزار کے قریب ہے۔ پردیش کے مڈل اسکولوں میں ۱۸ لاکھ ۹ ہزار بچے زیر تعلیم ہیں۔ ان میں سے ۱۴ لاکھ ۴۶ ہزار لڑکے اور ۳ لاکھ ۶۳ ہزار لڑکیاں ہیں۔ ان اسکولوں میں اساتذہ کی تعداد تقریباً ۷۰ ہزار ہے۔ جن میں ۱۷ ہزار خواتین ہیں۔

سینئر بیسک تعلیم کی ترقی کو گوشوارہ نمبر ۴ میں دکھایا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ۵۱-۱۹۵۰ سے ۸۳-۱۹۸۲ تک کی ۳۲ سالہ مدت میں مڈل اسکولوں کی تعداد میں ۵ گنا اضافہ ہوا۔ اسی طرح اساتذہ کی تعداد میں اسی دوران ۵ گنا سے کچھ کم اور طلبار کی تعداد میں تقریباً سوا پانچ گنا اضافہ ہوا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ گذشتہ ۳۲ سال کی مدت میں سینئر بیسک اسکولوں، ان میں اساتذہ اور طلبار کی تعداد میں کم و بیش ۵ گنا کا اضافہ ہوا۔

فی لاکھ آبادی پر اتر پردیش میں ۷۸-۱۹۷۷ میں ۷۷ جونیئر بیسک اسکول تھے جبکہ آندھرا پردیش میں یہ تعداد ۹۱، مغربی بنگال میں ۹۴، مدھیہ پردیش میں ۱۲۸، اڑیسہ میں ۱۴۶ اور پورے ملک میں اوسطاً ۸۷ تھی۔

اسی طرح فی لاکھ آبادی پر ۷۹-۱۹۷۸ میں اتر پردیش میں ۱۰، مڈل اسکول تھے جبکہ مدھیہ پردیش میں ۱۵، بہار میں ۱۸، اڑیسہ میں ۲۳ اور کرناٹک میں ۳۴ مڈل اسکول تھے۔

اُستاد، شاگرد تناسب :

(TEACHER-PUPIL RATIO)

ابتدائی تعلیم کی تینوں سطحوں میں اُستاد، شاگرد تناسب کو گوشوارہ نمبر ۵ میں پیش کیا گیا ہے۔ اس پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵۱-۱۹۵۰ سے ۸۳-۱۹۸۲ تک کی ۳۲ سالہ مدت میں نرسری اسکولوں میں فی اُستاد طلبار کی تعداد ۲۴ سے بڑھ کر ۴۶ ہو گئی۔ اسی طرح جونیئر بیسک اسکولوں میں اُستاد شاگرد تناسب ۳۹ سے بڑھ کر ۴۲ اور سینئر بیسک اسکولوں میں یہ تعداد ۲۴ سے بڑھ کر ۲۶ ہو گئی۔ ۶۶-۱۹۶۵ میں جونیئر بیسک اسکولوں میں فی اُستاد طلبار کی تعداد سب سے زیادہ (۵۲) تھی جو ۷۸-۱۹۷۷ میں گھٹ کر ۳۷ ہو گئی، اور پھر بڑھ کر ۴۲ پر پہنچ گئی۔

داخلہ تناسب :

(ENROLMENT RATIO)

۵۱-۱۹۵۰ میں جونیئر بیسک اسکولوں میں داخلوں کی تعداد اس عمر (۶ سے ۱۱ سال) کے بچوں کی مجموعی تعداد کا ۳۲ فیصدی تھی۔ داخلے کا یہ تناسب ۸۱-۱۹۸۰ میں بڑھ کر ۶۹ فیصدی ہو گیا۔ (جس میں لڑکوں کا داخلہ تناسب ۹۱ فیصدی اور لڑکیوں کا ۴۶ فیصدی تھا۔) ۸۱-۱۹۸۰ میں مڈل اسکولوں میں داخلہ تناسب اس عمر کے بچوں (۱۱ سال سے ۱۴ سال) کی مجموعی تعداد کا ۲۱ فیصدی تھا۔ (لڑکوں کا ۳۵ فیصدی اور لڑکیوں کا صرف ۶ فیصدی)۔ اتر پردیش کے یہ دونوں داخلہ تناسب، یعنی ۶۹ فیصدی جونیئر بیسک تعلیم میں اور ۲۱ فیصدی سینئر بیسک تعلیم میں، پورے ملک کے اوسط تناسب بالترتیب ۸۲ فیصدی (۱۰۵ فیصدی لڑکے اور ۵۸ فیصدی لڑکیاں) اور ۲۹ فیصدی (۴۱ فیصدی لڑکے اور ۱۲ فیصدی لڑکیاں) سے بہت کم ہیں۔ توقع ہے کہ اتر پردیش میں داخلہ تناسب ساتویں منصوبے کے شروع ہوتے وقت یعنی ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۶ سے ۱۱ سال کے بچوں کے لیے ۸۴ فیصدی اور ۱۱ سے ۱۴ سال کے بچوں کے لیے ۴۵ فیصدی ہو گیا ہوگا۔ (ابھی قطعی تعداد شمار آنا باقی ہے)۔

ساتویں پلان کے مسودے میں اتر پردیش سرکار نے یہ نشانہ رکھا ہے کہ ساتویں منصوبے کے اختتام پر (یعنی ۹۰-۱۹۸۹ء تک) ۶ سے

۱۱ سال کی عمر کے بچوں کا داخلہ تناسب ۱۰۰ فیصدی اور ۱۱ سے ۱۴ سال کی عمر کے بچوں کا داخلہ تناسب ۴۹ فیصدی ہو جائے گا۔ یہاں پر یہ بات نہ بھولنا چاہیئے کہ ۱۰۰ فیصدی داخلہ تناسب کی حالت میں بھی مقررہ عمر کے سبھی بچوں کا داخلہ نہیں ہوا ہوگا۔ کیوں کہ جونیر بیسک تعلیم کے داخلوں میں ہمیشہ ایسے بچوں کو بھی داخلہ مل جاتا ہے جن کی عمر ۶ سال سے کم یا پھر ۱۱ سال سے زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا جب کسی خاص عمر کے بچوں کا داخلہ تناسب ۱۱۵ فیصدی کے آس پاس ہو تب ہی یہ سمجھنا چاہیئے کہ مقررہ عمر کے سبھی بچے اسکول میں داخل ہو چکے۔ اس انکشاف کی روشنی میں یہ بات بہت واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ موجودہ پروگراموں کے مطابق ۱۹۹۰ء تک بھی اترپردیش میں جونیر بیسک سطح کی تعلیم میں حقیقی ۱۰۰ فیصدی داخلہ تناسب کو حاصل نہیں کیا جا سکے گا۔

ابھی وقت ہے اگر ریاستی سرکار اس طرف رجوع کرے اور ساتویں منصوبے کو آخری شکل دینے کے قبل، معقول تعلیمی پالیسی اختیار کرے تو بجٹ پر بار بڑھائے بغیر ریاست میں داخلہ تناسب کے مذکورہ بالا نشانے کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ ابتدائی تعلیم کی تین سطحیں ہیں لیکن ان میں سے جونیر بیسک تعلیم کی سطح پر سب سے زیادہ زور دیا جانا چاہیئے کیوں کہ اسی کی وسعت و فروغ سے ابتدائی تعلیم کی عالمگیر فراہمی کے مقصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔

مشورے

* اس ضمن میں چند مشورے حسب ذیل ہیں۔ ان میں وہ اقدامات شامل نہیں ہیں جن کا تذکرہ سرکار خود اپنے پنجسالہ منصوبوں، دیگر پالیسی دستاویزوں اور بجٹ تقاریر میں برابر کرتی رہتی ہے۔

۱۔ جونیر بیسک اسکولوں میں استاد اور طلباء کا تناسب مختلف سالوں میں فی استاد ۳۵ سے لے کر ۵۲ تک رہا ہے۔ جبکہ مڈل اسکول میں یہ تناسب فی ٹیچر ۲۱ سے ۲۷ تک رہا ہے۔ کوٹھاری کمیشن ۶۶-۱۹۶۴ء نے یہ سفارش کی تھی کہ جونیر بیسک اسکولوں میں کلاس کا سائز ۵۰ طلباء کا اور سینیر بیسک (مڈل) اسکولوں میں کلاس کا سائز ۴۵ طلباء کا ہونا چاہیئے۔ اُترپردیش میں چوں کہ مڈل اسکول میں فی ٹیچر زیادہ سے زیادہ ۲۷ طلباء ہی رہے ہیں لہٰذا اب مڈل اسکولوں میں مزید اساتذہ کی بھرتی پر زور دینے کے بجائے جونیر بیسک اسکولوں میں نئے اساتذہ کی بھرتی کو ترجیح دی جائے اس سے ان اسکولوں میں نئے طلباء کے داخلوں پر نئے اساتذہ کی ضرورت کو بہ آسانی پورا کیا جا سکے گا۔

۲۔ گذشتہ ۳۲ برسوں میں جونیر بیسک اسکولوں میں فی اسکول طلباء کی تعداد ۸۵ سے بڑھ کر ۱۳۴ ہو گئی ہے جبکہ سینیر بیسک اسکولوں میں فی اسکول طلباء کی تعداد ۱۲۲ سے کم ہو کر ۱۰۶ رہ گئی ہے۔ اس سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ مڈل اسکول کے مقابلے جونیر بیسک اسکول کھولنے کو ترجیح دی جائے۔

۳۔ دور دراز کے چھوٹے چھوٹے گاؤں اور چند گھروں کی چھوٹی چھوٹی بستیوں میں ہر گاؤں اور ہر بستی میں ایک اسکول قائم کرنے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ وہاں کے چند بچوں کے لیے کوئی مقامی اُستاد مقرر کیا جائے یا جسے قریب کے اسٹاف میں شامل کر لیا جائے۔ اس سے کئی فائدے حاصل ہوں گے۔ ایک طرف سرکار کا خرچ کم سے کم ہوگا۔ اور دوسری جانب بچوں کو اُس وقت تعلیم دی جا سکے گی جب وہ گھریلو مصروفیات سے فارغ ہوں گے۔

۴۔ سرکار اعلیٰ تعلیم کو عمومی بنانے کی غرض سے اُس کی وسعت اور فروغ پر بہت سرمایہ صَرف کرتی جا رہی ہے جو موجودہ اعلیٰ تعلیمی معیار کو دیکھتے ہوئے حق بجانب نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سرکار ابتدائی تعلیم کی طرف اپنے مالی وسائل رجوع کرے۔ کیوں کہ اس کی عالمگیر فراہمی سرکار پر قانوناً لازمی ہے۔

۵۔ تعلیم کی مالیہ کاری کو خصوصاً ابتدائی تعلیم کی مالیہ کاری کو کچھ خاص قسم کے ٹیکسوں کی آمدنی سے جوڑ دیا جائے۔ میرے خیال سے اگر دیہی علاقوں سے حاصل ہونے والی مال گذاری اور شہری علاقوں میں میونسپل اداروں کے ذریعے لگائے جانے والے مکانوں پر ٹیکس کی آمدنی کو بالترتیب دیہی اور شہری علاقوں میں ابتدائی تعلیم کی مالیہ کاری پر خرچ کیا جائے تو اس سے ابتدائی تعلیم جیسی اہم مد کے لیے پُر اعتماد اور دوامی مالی وسائل دستیاب ہو جائیں گے۔

گوشوارہ نمبر ۱

اُترپردیش میں حرف شناسی کا فیصد تناسب (منصوبہ بندی کے دَوران)

سال	مردوں کا تناسب (MALE)	عورتوں کا تناسب (FEMALE)	دونوں کا اوسط (PERSON)
۱۹۵۱	۱۷٫۴	۳٫۶	۱۰٫۸
۱۹۶۱	۲۷٫۳	۷٫۰	۱۷٫۶
۱۹۷۱	۳۱٫۵	۱۰٫۷	۲۱٫۷
۱۹۸۱	۳۸٫۹	۱۴٫۴	۲۷٫۲

(SOURCE: CENSUS REPORTS OF UTTAR PRADESH)

ماخذ۔ اُترپردیش کی مردم شماری کی رپورٹ

گوشوارہ نمبر ۲
اُتر پردیش میں نرسری یا پری بیسک تعلیم کی ترقی

سال	اسکولوں کی تعداد	اشاریہ	اساتذہ کی تعداد	اشاریہ	طلباء کی تعداد	اشاریہ
۱۹۵۰ — ۵۱	۶	۱۰۰	۲۲	۱۰۰	۸۰۹	۱۰۰
۱۹۵۵ — ۵۶	۲۶	۴۳۳	۱۸۴	۸۳۶	۲۴۹۸	۳۱۰
۱۹۶۰ — ۶۱	۷۳	۱۲۶۷	۳۹۹	۱۸۱۴	۷۵۴۵	۹۳۶
۱۹۶۵ — ۶۶	۱۵۳	۲۵۵۰	۹۲۲	۴۱۹۱	۱۹۶۲۷	۲۴۳۵
۱۹۷۳ — ۷۴	۱۲۹	۲۱۵۰	۹۵۱	۴۳۲۳	۲۱۷۰۴	۳۰۹۵
۱۹۷۷ — ۷۸	۸۸	۱۴۶۷	۷۰۱	۳۱۸۶	۱۹۵۷۷	۲۴۲۸
۱۹۸۰ — ۸۱	۸۸	۱۴۶۷	۷۰۱	۳۱۸۶	۲۹۶۱۹	۳۶۷۵
۱۹۸۲ — ۸۳	۸۸	۱۴۶۷	۷۰۱	۳۱۸۶	۳۲۲۶۱	۴۰۰۲

SOURCE: ANNUAL PROGRESS REPORTS OF EDUCATION DIRECTORATE OF EDUCATION, GOVT. OF U.P.

گوشوارہ نمبر ۳
اُتر پردیش میں جونیر بیسک تعلیم کی ترقی

سال	اسکولوں کی تعداد	اشاریہ	اساتذہ کی تعداد	اشاریہ	طلبار کی تعداد	اشاریہ
۱۹۵۰ — ۵۱	۳۱۹۷۹	۱۰۰	۷۰۳۹۹	۱۰۰	۲۶۲۷۱۲۹	۱۰۰
۱۹۵۵ — ۵۶	۳۱۸۹۸	۱۰۰	۷۷۵۷۵	۱۱۰	۲۷۳۷۸۷۷	۱۰۰
۱۹۶۰ — ۶۱	۴۰۰۸۳	۱۲۵	۹۹۰۵۴	۱۴۱	۳۹۵۸۸۲۸	۱۴۵
۱۹۶۵ — ۶۶	۶۰۲۴۳	۱۸۸	۱۶۸۵۷۷	۲۳۰	۸۷۸۸۱۰۷	۳۲۲
۱۹۷۳ — ۷۴	۶۳۶۹۵	۱۹۹	۲۳۴۹۳۹	۳۳۴	۱۱۵۴۹۰۸۳	۴۲۳
۱۹۷۷ — ۷۸	۶۶۲۹۸	۲۰۷	۲۳۳۴۹۷	۳۳۲	۸۵۴۶۵۶۱	۳۱۳
۱۹۸۰ — ۸۱	۷۰۹۳۱	۲۲۲	۲۴۴۷۱۲	۳۴۸	۹۴۲۷۳۸۹	۳۴۶
۱۹۸۲ — ۸۳	۷۲۲۰۰	۲۲۶	۲۴۷۹۷۸	۳۵۲	۱۰۴۵۹۹۰۶	۳۸۴

SOURCE: AS FOR TABLE (2)

گوشوارہ نمبر ۴
اُتر پردیش میں سینیر بیسک تعلیم کی ترقی

سال	اسکولوں کی تعداد	اشاریہ	اساتذہ کی تعداد	اشاریہ	طلباء کی تعداد	اشاریہ
۱۹۵۰ — ۵۱	۲۸۵۴	۱۰۰	۱۴۵۰۵	۱۰۰	۳۴۸۱۳۷	۱۰۰
۱۹۵۵ — ۵۶	۳۶۴۰	۱۲۸	۱۹۹۹۶	۱۳۸	۴۲۷۰۲۵	۱۲۳
۱۹۶۰ — ۶۱	۴۳۳۵	۱۵۲	۲۲۲۵۹	۱۶۰	۵۴۹۸۲۷	۱۵۸
۱۹۶۵ — ۶۶	۶۱۵۴	۲۱۶	۳۵۸۶۷	۱۴۷	۹۸۳۸۵۰	۲۸۳
۱۹۷۳ — ۷۴	۱۰۰۷۶	۳۵۰	۵۷۱۴۲	۳۹۴	۱۴۷۲۴۴۷	۴۲۳
۱۹۷۷ — ۷۸	۱۱۴۰۹	۴۰۰	۵۷۵۲۳	۳۹۷	۱۳۱۳۰۸۴	۳۷۷
۱۹۸۰ — ۸۱	۱۳۴۰۷	۴۷۰	۶۸۱۷۴	۴۷۰	۱۴۱۹۹۲۳	۴۰۸
۱۹۸۲ — ۸۳	۱۴۰۶۹	۴۹۲	۷۰۱۵۹	۴۸۴	۱۸۰۹۵۱۹	۵۲۰

SOURCE: AS FOR TABLE (2)

بقیہ : اداریہ

اس طرح کے پروگراموں کو آگے بڑھانے میں غیر سرکاری تنظیمیں اور رضاکارانہ ادارے نیز مقامی ادارے، ٹریڈ یونینیں اور عورتوں کی تنظیمیں اہم رول ادا کر رہی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پچھلے دس برسوں میں دُنیا کی آبادی ۷۷ء ملین سے بڑھ کر ۷۷ء ۴ بلین تک پہونچ چکی ہے۔ اس سے بین الاقوامی برادری اضافۂ آبادی کے خطرات کو پوری طرح محسوس کرنے لگی ہے۔ اس طرح آبادی میں اضافے کی روک تھام ترقیاتی حکمتِ عملی کا ایک جزوِ لازم بن گئی ہے۔ یہ پروگرام انسانی بہبود اور سماجی ترقی کے عظیم مقصد کو آگے لے کر آگے بڑھ رہا ہے۔ دراصل ترقی ہی سب سے بڑا مانع حمل نسخہ ہے اور اس نسخہ کی افادیت عوام کے ذہن نشین کرانی ہے۔

(ایڈیٹر)

گوشوارہ نمبر ۵
ابتدائی تعلیم کی تینوں سطحوں میں اُستاد شاگرد تناسب
(فی اُستاد طلباء کی تعداد)

سال	نرسری اسکولوں میں	جونیر بیسک اسکولوں میں	سینیر بیسک اسکولوں میں
۱۹۵۰ — ۵۱	۳۷	۳۹	۲۴
۱۹۵۵ — ۵۶	۱۴	۳۵	۲۱
۱۹۶۰ — ۶۱	۱۹	۴۰	۲۴
۱۹۶۵ — ۶۶	۲۱	۵۲	۲۷
۱۹۷۲ — ۷۳	۲۶	۴۹	۲۶
۱۹۷۷ — ۷۸	۲۸	۳۷	۷۳
۱۹۸۰ — ۸۱	۴۲	۳۹	۲۱
۱۹۸۲ — ۸۳	۴۶	۴۲	۲۶

SOURCE: CALCULATED ON THE BASIS OF FIGURES IN TABLE (2) (3) AND (4)

(گوشوارہ ۲، ۳ اور ۴ میں دیئے گئے اعداد و شمار کی بنیاد پر)

کرشن شرما

مربوط دیہاتی ترقی کا پروگرام

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے حال ہی میں مدھیہ پردیش، اڑیسہ اور راجستھان کے بعض دیہی علاقوں کا دورہ کیا ہے۔ ان علاقوں میں خاص طور پر گئے جہاں ہمارے آدی باسی رہتے ہیں۔ انھوں نے ان غریبوں کی حالتِ زار دیکھی — اپنی آنکھوں بہت کچھ دیکھا اور اپنے کانوں بہت کچھ سُنا۔ انھوں نے اس بات کا خصوصی اندازہ لگایا کہ ملک کے ترقیاتی پروگراموں کو کس طرح عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔

اپنے دورے کے بعد شری راجیو گاندھی نے فرمایا کہ افلاس پر براہِ راست حملہ کرنے کا ہمارا طریقہ کافی مفید مطلب ثابت ہوا ہے مگر مربوط دیہاتی ترقی کے پروگرام اور کاموں کی فراہمی کے خصوصی پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے کے طریقِ کار میں بعض خامیاں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے دیکھا کہ ان پروگراموں سے فائدہ اٹھانے والوں میں ہمیشہ غریب اور نادار لوگ شامل نہیں کئے جاتے ہیں۔ دوسرے انھوں نے مشاہدہ کیا کہ لوگوں کو مالی امداد مہیا کئے جانے میں دیر لگتی ہے اور پوری رقم بھی ان تک نہیں پہنچ پاتی۔ تیسری بات جو وزیر اعظم نے کہی وہ یہ تھی کہ ان لوگوں کو جو ضرورت کی اشیا مہیا کی جاتی ہیں۔ وہ مقامی حالات سے میل نہیں کھاتیں اور ان پروگراموں میں لوگوں کی نمائندہ جماعتوں کی شمولیت کہیں نظر نہیں آتی۔

جیسا کہ ہمارے پڑھنے والوں کو معلوم ہے حکومت اس بات کا تہیہ کر چکی ہے کہ خطِ مفلسی سے نیچے کی آبادی کو ۱۹۹۵ تک دس فیصدی سے کم کی سطح تک لے آئے۔ اس سلسلے میں ہمارے پاس سب سے بڑا حربہ "مربوط دیہی ترقی کا پروگرام" ہے جس میں ضرورت مندوں کو مثلاً چھوٹے کسانوں، بے زمین مزدوروں، دیہات کے دست کاروں وغیرہ کو مالی امداد اور قرضے مہیا کئے جاتے ہیں۔ ان کے لیے آبپاشی کے چھوٹے چھوٹے کام شروع کئے جاتے ہیں، انھیں دودھ دینے والے مویشی خرید کر دئے جاتے ہیں، مرغیاں پالنے کی ترغیب دی جاتی ہے، بھیڑ بکریاں اور سور پالنے کو کہا جاتا ہے تاکہ وہ ان کام دھندوں سے اپنی حالت کو سدھار سکیں۔ اسی طرح ظروف سازی، بڑھئی کے کام، مرمت کے لیے ورکشاپ کھولنے، جوتوں کی مرمت، کپڑوں کی سلائی اور رکشا چلانے کا کام دھندا شروع کرنے کی ترغیب بھی دی جاتی ہے۔ ان کاموں کے لیے ایک کنبے کو امداد کے طور پر تین ہزار روپے تک کی رقم مل سکتی ہے۔ قبائلی لوگوں کو پانچ ہزار روپے یا اسکیم کی نصف لاگت کی رقم مل سکتی ہے۔

اب معلوم ہوا ہے کہ جہاں تک اس پروگرام کی کوالٹی کا تعلق ہے، اسے بہتر ڈھنگ سے عملی جامہ پہنانا ضروری ہو گیا ہے۔ پلاننگ کمیشن، ریزرو بنک اور بعض دیگر اداروں کے ان شعبوں نے جو ان کاموں پر کڑی نظر رکھ رہے ہیں، اپنی رپورٹوں میں کہا ہے کہ مربوط دیہی ترقی کے پروگرام میں انھیں بھی کئی خامیاں نظر آئی ہیں۔

چنانچہ ان خامیوں کی نشاندہی کی روشنی میں اور وزیر اعظم کے زیرِ ہدایت اس پروگرام کو نئے سرے سے ترتیب دی جا رہی ہے اور مندرجہ ذیل قدم اٹھائے جا رہے ہیں:۔

۱۔ آئندہ ضرورت مند خاندان کو پہلے سے زیادہ مالی امداد یعنی کم سے کم چھ ہزار روپے تک کی رقم ملا کرے گی تاکہ سرمایہ کاری کا معقول فائدہ اٹھایا جا سکے۔

۲۔ چھٹے پانچ سالہ پلان کے دوران جو کنبے اپنی کوششوں کے باوجود خطِ مفلسی سے اوپر نہیں اٹھ پائے انھیں مزید امداد مہیا کی جائے گی۔

۳۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ سب کو یکساں امداد دی جاتی تھی۔ آئندہ یہ کیا جائے گا کہ غربت کو دیکھتے ہوئے مالی امداد دی جائے گی۔

۴۔ یہ بتانا کہ امداد کے مستحق کون ہیں، اس کام میں لوگوں کے نمائندوں کو بھی شریک کیا جائے گا۔

۵۔ اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے والی خواتین کی تعداد بڑھا کر ۳۰ فیصدی کر دی جائے گی۔

۶۔ لوگوں کی تربیت کے لیے دیہاتی ٹریننگ اور ٹیکنالوجی کے ملے جلے مرکز قائم کئے جائیں گے۔ معاملہ زیر غور ہے اور جلد ہی حکومتِ ہند ہدایت جاری کرے گی۔

۷۔ بلاک، ضلع اور ریاست کی سطح پر جہاں بھی ضروری ہو انتظامیہ کو بہتر بنایا جائے گا۔

۸۔ بنکوں کی کارکردگی میں بہتری پیدا کی جائے گی۔

۹۔ مربوط دیہی ترقی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے کام میں رضاکار اداروں کو بھی شامل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

امید ہے کہ ان اقدامات کو اختیار کر لینے سے دیہاتی ترقی کی اسکیم زیادہ فعّال اور مربوط ہو جائے گی اور اس کے زیادہ مفید مطلب نتائج نکلیں گے۔ دوسرے دیہات میں بسنے والے غرباء کو اس اسکیم کی خامیوں کے متعلق جو شکائتیں تھیں وہ بھی بہت حد تک دور ہو جائیں گی۔

دیہی افلاس کو دور کرنے کے لیے ایک اور حکمتِ عملی بھی اختیار کی گئی ہے۔ یہ حکمتِ عملی طے کرتے وقت تسلیم کر لیا گیا تھا کہ چوں کہ افلاس کا مسئلہ ملک میں بے روزگاری کی حقیقت سے منسلک ہے اس لیے غربت کو دور کرنے کے لیے لوگوں کو روزگار دلانے کے خاص پروگرام شروع کرنا ضروری ہوگا۔ اس غرض سے "قومی دیہاتی روزگار پروگرام" اور بے زمین دیہاتی مزدوروں کو روزگار کی گارنٹی دلانے کا پروگرام شروع کیا گیا تاکہ دیہاتی علاقوں کے غرباء اور بے زمین مزدوروں کو روزگار کے زائد مواقع مہیا کئے جائیں خصوصاً ان دنوں میں جبکہ کھیتوں پر زیادہ کام دھندا نہیں رہتا اور مزدور بیکار ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔

قومی دیہاتی روزگار کے پروگرام کا نصف خرچ مرکزی حکومت برداشت کرتی ہے اور نصف ریاستی سرکار، لیکن بے زمین دیہاتی مزدوروں کو روزگار کی گارنٹی دلانے کے پروگرام کا سارا خرچ مرکزی سرکار ادا کرتی ہے۔ یہ پروگرام اگست ۱۹۸۳ء میں شروع کیا گیا تھا۔ اس پروگرام کا مقصد دیہات کے ہر بے زمین کنبے کے کم سے کم ایک رکن کو سال میں ایک سو دن کے روزگار کی گارنٹی دلانا ہے۔ ان دونوں پروگراموں کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ مزدوروں کو طے شدہ کم سے کم اُجرت ملنے لگی ہے۔ دیہات کے غریب لوگوں کو بہتر غذا مہیا ہونے لگی ہے۔ اب دیہات کے غریب لوگ شہروں کی جانب پہلے سے کم بھاگتے ہیں۔ دیہاتی علاقوں میں ذرائع آمد و رفت بہتر ہو گئے ہیں، کھیتی باڑی کے لیے سینچائی کی سہولتیں بڑھ گئی ہیں اور بعض ضروری بنیادی لوازمات مثلاً اسکولی عمارتیں، مویشیوں کے لیے دواخانے اور دیہی میڈیکل سنٹر وغیرہ مہیا کر دئے گئے ہیں۔

ساتویں پانچ سالہ پلان کے دوران جن باتوں پر زور دیا جائے گا وہ یہ ہیں:-

۱۔ مندرجہ بالا دونوں دیہی پروگراموں کے تحت بیس فیصدی روپیہ شجرکاری پر صرف کیا جائے گا۔

۲۔ بے زمین دیہاتی مزدوروں کو روزگار کی گارنٹی دلانے کے پروگرام کے تحت اس بات کی خصوصی کوشش کی جائے گی کہ پچھڑی درج ذاتوں اور پچھڑی درج قبیلوں کے لیے رہائش اور مکانات کا بندوبست کیا جائے اور بندھوا مزدوروں کو آزاد کرایا جائے۔ ساتویں پانچ سالہ پلان کے عرصہ میں ہر سال دس لاکھ مکانات تعمیر کرنے کی تجویز ہے۔

۳۔ ریاستوں سے کہا گیا ہے کہ وہ پراجکٹوں میں سے کچھ ورکروں کو چُن کر دیہات کے بے زمین مزدوروں کے کنبوں کو ایک ایک کارڈ جاری کریں جس کی رُو سے انھیں سال میں ایک سو دن کی ملازمت کی گارنٹی ملے۔ اس کارڈ کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ معلوم کیا جا سکے گا کہ ان مزدوروں کو سال میں کتنے دن روزگار ملا ہے۔

۴۔ علاقے میں کچھ اثاثہ اکٹھا کیا جائے تاکہ مزدوروں کو مسلسل ملازمت دلائی جا سکے۔

مزید برآں دیہی افلاس کو کم کرنے کی حکمتِ عملی کا اہم جزو ہے کہ زرعی اصلاحات کو کامیابی کے ساتھ عملی جامہ پہنایا جائے۔ وجہ یہ ہے کہ غربت دور کرنے کے پروگرام کا اصل مقصد ان لوگوں کی مالی مدد دینا ہے جن کے پاس کوئی سرمایہ یا اثاثہ نہیں ہے۔ اسی لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ زمین کو از سرِ نو تقسیم کرنے کی اصلاحات کو عملی جامہ پہنایا جائے اور مزارعوں کو پٹے کا تحفظ دلایا جائے۔ حالاں کہ زرعی سُدھاروں کو عملی جامہ پہنانے کا کام کچھ آگے بڑھا ہے۔ ابھی اس کی رفتار میں تیزی لانے کی بہت گنجائش ہے تاکہ بے زمین لوگوں کو خاطر خواہ فائدہ پہنچ سکے۔

ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ جو کام ہو رہا ہے اس کی کوالٹی پر کڑی نظر رکھی جائے۔ ان پروگراموں کو ریاستی سرکاریں عملی جامہ پہناتی ہیں۔ اور انھیں بھی دیہاتی لوگوں کی بہبودی کا اتنا ہی خیال ہے جتنا کہ مرکز کو ہے۔ لیکن چونکہ اس پروگرام کا طول و عرض بہت زیادہ ہے اس لیے کوالٹی کی ضمانت ہمیشہ نہیں دی جا سکتی۔ کوالٹی برقرار رکھنے کا یہی طریقہ ہے کہ جو کام ہو رہا ہو اس پر برابر نظر رکھی جائے اور اس کا جائزہ لیا

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

قیام نیر

نئے رشتے

ارشد کو جیسے ہی بیٹے کی شادی کا پیغام ملا، وہ اپنے ایک دوست اقبال کو ساتھ لے کر لڑکی والے کے گاؤں کی طرف، روانہ ہوگیا۔ دل ہی دل میں انھوں نے پہلے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ کھیت میں لگی فصل تیار ہوتے ہی وہ گھر میں بہو لے آئیں گے۔ اُن کے بیٹے کی عمر بھی پچیس سال سے زیادہ ہو چکی تھی اور اس سال کھیت میں لگی فصل بھی اچھی تھی۔

جب وہ لڑکی والے کے گاؤں پہنچے تو وہاں کی حالت دیکھ کر انھیں بہت مایوسی ہوئی۔ کھیتوں میں لگی فصل سوکھ رہی تھی، سینچائی کا کوئی مناسب انتظام نہ تھا۔ پوری کھیتی قدرت پر منحصر تھی۔ گاؤں کی پتلی پتلی گلیاں بہت نیچی تھیں۔ کھیتی کے پرانے طریقے رائج تھے اسی لیے گاؤں کے تقریباً سارے لوگ غریب تھے۔ کسی کے بدن پر اچھا لباس نہ تھا اور نہ رہنے کے لیے اچھا مکان۔ ارشد کے دوست اقبال نے گاؤں والوں کے پچھڑے پن کو دیکھ کر ارشد سے کہا۔

"آپ اپنے بیٹے کی شادی کی بات اس گاؤں میں طے نہ کریں کیوں کہ اس گاؤں کے لوگ بہت پچھڑے ہوئے ہیں۔ جنھیں خود کھانے اور رہنے کا ٹھکانا نہیں ہے وہ آپ کو جہیز کیا دیں گے اور آپ کی عزت بھی کیا کریں گے۔ اس کے علاوہ گاؤں کی گلیاں اتنے نشیب میں ہیں کہ برسات میں گاؤں کی بہو بیٹی کے پیر کیچڑ سے بھرے رہتے ہوں گے۔ ایک ایسا گاؤں جہاں لوگ نہ اپنی صفائی کا خیال رکھتے ہوں اور نہ بہو بیٹی کا، نہ نئے ڈھنگ کی کھیتی ہوتی ہو، نہ سائنس کی روشنی پہنچی ہو، نہ کسی کو نئی تکنیک سے کوئی واقفیت ہو، ایسی جگہ لڑکے کی شادی کرنے سے آپ کی اور آپ کے لڑکے کی کیا عزت ہوگی۔"

ارشد نے اپنے دوست کے مشورے پر کچھ دیر غور کرنے کے بعد جواب دیا۔

"زیادہ جہیز لینا اور دینا، دونوں قانوناً جرم ہے۔ جہیز کے رِستے ہوئے ناسور سے ہمیں بچنا ہوگا اور دوسرے کو بھی بچانا ہوگا۔ زیادہ جہیز کے لین دین نے آج کے سماج میں ایک ایسا زہر گھول دیا ہے جس سے سارا معاشرہ سارا سماج پریشان ہوتا جا رہا ہے۔ جہیز کی زیادتی کی وجہ سے بے جوڑ شادیاں ہو رہی ہیں، لڑکیوں کی تعلیم اور خوبصورتی بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ ہمیں اس لعنت کو ختم کرنے کے لیے عملی قدم اٹھانا ہوگا۔ جب ہمارے جیسے پڑھے لکھے آدمی لمبے جہیز لینے کے بارے میں سوچیں گے تو ایک عام طبقے کا کیا حال ہوگا۔

اب رہ گئی بات اس گاؤں کے پچھڑے پن کی، تو ہمیں لڑکے کے رشتے کی بات نامنظور کرنے کے بجائے سنجیدگی سے یہ سوچنا ہوگا کہ اس گاؤں کے لوگ غریب کیوں ہیں؟ اس گاؤں کی گلیاں نیچی کیوں ہیں؟ سائنس کی روشنی اور کھیتی کے نئے نئے طریقے اس گاؤں تک کیوں نہیں پہنچے ہیں؟ کس چیز کی کمی ہے کہ یہاں کے لوگ غریبی کی سرحد سے نیچے ہیں؟ اس گاؤں والے کی مفلسی کی کیا وجہ ہے؟ اس گاؤں کا پچھڑاپن کیسے دور ہوگا؟ اس گاؤں میں خوشحالی کیسے دوڑے گی۔ اس گاؤں کی بہو بیٹی کے پیر کیچڑ میں لت پت ہونے سے کیسے بچیں گے؟ اس گاؤں میں علم کی روشنی کیسے پھیلے گی؟"

"ٹھیک کہتے ہیں آپ، ہمیں تصویر کے ایک پہلو کو نہیں دونوں پہلوؤں کو دیکھنا ہوگا۔"

اقبال نے سنجیدگی سے کہا۔ ارشد کی باتیں پوری طرح اس کی سمجھ میں آگئی تھیں۔

"آپ سرپنچ ہیں۔ آپ مجھ سے زیادہ معلومات رکھتے ہیں۔ آپ ان لوگوں کی راہیں ہموار کر سکتے ہیں — ان لوگوں کو نئے راستے دکھا کر ان لوگوں میں خوشحالی دوڑا سکتے ہیں۔ ان لوگوں کے مویشیوں کی بیماریوں کو دور کرا سکتے ہیں۔"

"ہاں اقبال! ہمیں تو ان لوگوں کو ترقی کی نئی نئی راہیں دکھانی ہوں گی، ان لوگوں کو نئی تکنیک سے آگاہ کرنا ہوگا۔ حکومت کی طرف سے چلائے گئے بیس نکاتی پروگرام سے یہ لوگ ناآشنا ہیں، انھیں بیس نکاتی پروگرام سے روشناس کرانا ہوگا، انھیں بیس نکاتی پروگرام کے فوائد بتانے ہوں گے تاکہ ان لوگوں کے اندر زندگی کا ایک نیا جوش، ایک نیا ولولہ پیدا ہو سکے اور یہ لوگ اپنے آپ کو خوشحال بنا سکیں۔ زندگی کے ہر شعبۂ حیات میں انھیں اوپر اٹھانا ہوگا تاکہ سماج میں ان کا بھی نام ہو۔ ملک کے دوسرے شہروں کی طرح یہ لوگ بھی باوقار زندگی گزار سکیں۔" ارشد نے اقبال کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر شادی کی بات طے کر لی جائے"۔ اقبال نے جواب طلب نگاہوں سے ارشد کی طرف دیکھا۔

"ہاں، میں اپنے لڑکے کی شادی کی بات طے کروں گا، لیکن لڑکی والے کے سامنے ایک شرط رکھوں گا۔ شرط یہ ہوگی کہ جب تک اس گاؤں کے لوگ خوشحال نہ ہو جائیں گے تب تک میں لڑکے کی شادی نہیں کروں گا۔"

ارشد نے سنجیدگی سے کہا۔

"بہت اچھا خیال ہے آپ کا — تو پھر لڑکی والے سے یہ بات صاف صاف کہہ دیجئے۔" اقبال نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

جب لڑکی والے کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی تو انھیں یقین نہ آیا لیکن ارشد کے سمجھانے پر ان لوگوں نے حامی بھر لی۔

ارشد گھر واپس آنے کے بجائے سیدھے اپنے بلاک پہنچے اور بی ڈی او سے مل کر اس گاؤں کے متعلق ساری باتیں بتائیں — بی ڈی او نے پوری طرح مدد کرنے کا وعدہ کیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے حکومت کی طرف سے چلائی گئی اسکیم "کام کے بدلے اناج" کے تحت اس گاؤں کے دو تالابوں کی کھدائی شروع ہو گئی اور اس مٹی سے گاؤں کی نشیبی گلیاں بھری جانے لگیں۔ حکومت کی طرف سے چلائے گئے "دیہی ترقیاتی پروگرام" پر بھی تیزی سے عمل درآمد ہونے لگا۔

دوسرے سال ارشد اپنے بیٹے کی شادی کی تاریخ مقرر کرنے اس گاؤں میں گیا تو اس گاؤں کی بہتر حالت دیکھ کر بہت خوش ہوا — کھیتوں میں لگی فصلیں لہلہا رہی تھیں — گاؤں والے جو کل تک اندھی عقیدت کے شکار تھے آج ان کے اندر زندگی کا ایک نیا جوش تھا — کل تک جو لوگ کھیتی باڑی میں صرف بارش پر منحصر تھے آج ان کے یہاں سینچائی کا مکمل انتظام تھا۔ نئے بیج، کیمیائی کھاد اور کھیتی کے نئے نئے طریقے نے ان لوگوں کے گھروں کو اناج سے بھر دیا تھا۔ مویشیوں کی حالت بہت حد تک سدھر گئی تھی اس لیے دودھ میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔

گاؤں کے لوگوں نے ارشد کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا — بہو بیٹی کی نگاہیں احسان کے بوجھ سے نیچے جھک گئیں۔

"آپ کا احسان ہم زندگی بھر نہیں بھولیں گے۔ آپ نے ہم لوگوں کو ایک نئی زندگی دی ہے۔ اب ہر طرف خوشحالی دوڑ گئی ہے۔ گاؤں کی گلیاں اب نیچی نہیں رہیں۔ اب کسی بہو بیٹی کے پاؤں کیچڑ میں لت پت نہیں ہوتے۔ آپ نے ہم لوگوں پر بہت بڑا احسان ... ..."

"یہ احسان میرا نہیں، حکومت کا ہے جس نے بیس نکاتی پروگرام کے تحت غریبوں کو خوشحال بنا دینے کا تہیہ کر رکھا ہے۔"

ارشد نے گاؤں والوں کی بات کاٹ کر کہا — سارے لوگوں کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ایک فاتحانہ مسکراہٹ! ●

غزل

ہلال فرید

اب نہ وہ ابر نہ بجلی کی کڑک باقی ہے
پھر بھی دیواروں میں اس دن کی دھمک باقی ہے

ہم نے چاہا تھا نہ ہو پھر بھی کسک باقی ہے
یعنی احساس کے سینے میں دھڑک باقی ہے

آج بھی آس کے سورج میں چمک باقی ہے
کہ ابھی سر پہ دعاؤں کے فلک باقی ہے

آج تنہائی بلاتی ہے کہ تنہا خود ہے
ہم لپکتے ہیں کہ سینے میں ہمک باقی ہے

کوئی آئے جو مرمت پھر سے بنائے اس کو
کہ ابھی اس کے زخموں میں سنھرک باقی ہے

مجھ سے ملتا ہے خد و خال بدل کر لیکن
اس کے چہرے میں ابھی اس کی جھلک باقی ہے

آج ہر سمت سے گھیرا ہے ہواؤں نے لیکن
کچھ چراغوں میں ہلال اب بھی لپک باقی ہے
●

میر عظمت علی

بچوں میں پس اندازی کی عادت

ہر سال ۳۰ ستمبر کو سارے ملک میں "یوم پس اندازی" منایا جاتا ہے۔ درج ذیل مضمون کے ذریعے اسکول کے بچوں میں "پس اندازی" کے موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اسکول کے بچوں میں پس اندازی (بچت) کی عادت ہماری قومی بچت تحریک کا ایک لازمی پہلو ہے۔ ابتدا میں دوسرے بنکوں کی طرح، نیشنل سیونگس آرگنائزیشن نے بچوں میں پس اندازی کی عادت کو فروغ دینے کے لیے بعض منتخب اسکولوں میں ایک مہم چلائی اور اس مقصد کے لیے انھیں رعائتی قیمتوں پر بچت باکس فراہم کئے گئے یا بچت ٹکٹ خریدنے کی ترغیب دی گئی لیکن یہ اہم کوشش ناکافی ثابت ہوئی۔ حکومتِ ہند نے محسوس کیا کہ اسکولی بچوں میں پس اندازی کی عادت کو مزید مستحکم بنانے کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ توجہ درکار ہے۔

چنانچہ ۷۱-۱۹۷۰ء کے دوران بچوں کے لیے ایک مخصوص بنک اسکیم "سنچائیکا بنک" مرتب کی گئی۔ یہ اسکیم تعلیمی نظام اور قومی زندگی کے لیے ایک اہم موڑ ثابت ہوئی۔ اسکیم کا مقصد بچوں میں پس اندازی کی عادت پیدا کرنا، رقومات کے درست استعمال کی تربیت دینا اور بچوں میں قائدانہ صلاحیت کو فروغ دینا ہے۔

پس اندازی کی تعلیم

مشہور مفکر جوزف کینس کا قول ہے "عادتیں کردار سے ہی بنتی ہیں اور کردار منزلِ مقصود ہے"۔ جبکہ ایمرسن کا خیال ہے کہ "پس اندازی ایک وصف ہے" اور زندگی کا طریقہ و سلیقہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور سبب اور اثرات کسی حقیقت کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ "پس اندازی" کے اسباب مختلف صورتوں یعنی بچت، خودکفالت، تحمل، قوتِ ارادی، دور اندیشی اور ترغیب کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں۔ جبکہ نظم و ضبط خوشحالی اور شاداں زندگی کا موجب ہوتا ہے۔ ایک مفکر کا نظریہ ہے کہ سبب پوشیدہ ہے لیکن اثرات ظاہر ہیں۔ اسی طرح بچت اسکیم کی تعلیم کے اثرات بھی عیاں ہیں جن کی عظیم تر اہمیت اور ضرورت برقرار ہے۔ ممتاز انگریزی شاعر ورڈز ورتھ کے مطابق طفل، فرد کا باپ ہوتا ہے۔ جب کہ ایمرسن نے کہا کہ فرد کی تشکیل والدین ہی کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بچے والدین کے بیجا لاڈ و پیار کے باعث بچپن ہی سے فضول خرچی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بہت کم والدین ایسے ہوں گے جو بچوں کو پیسے دینا پسند نہیں کرتے۔ بچوں میں پیسے حاصل کرنے اور اسے خرچ کرنے کی عادت رفتہ رفتہ پختہ ہو جاتی ہے اور اسے دور کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ بچپن میں پروان چڑھی ہوئی عادت کے اثرات دیرپا اور تاعمر قائم رہتے ہیں۔ چنانچہ ہاتھ میں پیسہ آنے کے بعد بچے خاموش نہیں رہ سکتے اور کسی مٹھائی یا آئس کریم کینڈی شاپ پر جا کر گلچھرے اڑاتے رہتے ہیں۔ بچوں میں فضول خرچی کے اس رجحان کو موزوں ہدایات اور تربیت کے ذریعے 'پس اندازی' یا بچت میں بدلا جا سکتا ہے۔

رقم کے استعمال کا سلیقہ

ساز و سامان اور خدمات رقومات کا متبادل ہوتی ہیں۔ بچوں میں یہ احساس پیدا کرایا جائے کہ رقم جس سے جنس جیسے غذا،

کپڑے، کتابیں، خریدی جاتی ہیں اور خدمات جیسے بس کا کرایہ، اسکول فیس وغیرہ ادا کیے جاتی ہیں، والدین کی محبت و شفقت سے حاصل ہوتی ہے، اس رقم کو کمال ہوشیاری سے صرف انہی چیزوں کے حصول کے لیے استعمال میں لایا جانا چاہیئے جو زندگی گذارنے کے لیے ناگزیر ہوتے ہیں۔ رقم کا بے جا یا محض تفریح طبع کے لیے استعمال بچّہ کی صحت و ماحول دونوں کو تباہ کرکے رکھ دیتا ہے۔ بچّوں کو یہ بات ذہن نشین کرا دینی چاہیئے کہ رقم ایک گرانقدر شئے اور لہٰذا ذاتی افادیت دستیاب نہیں ہوتی اسی لیے بعض مقاصد کے حصول جیسے پین، گھڑی یا سائیکل کی خریداری کے لیے رقومات کا صحیح طور پر استعمال کیا جانا چاہیئے۔

بعض حد تک حرص اور قیمتی اشیاء کی خریداری کے لیے بچت کی خواہش، فرد کی زندگی کا ایک اہم حصّہ ہوتی ہے۔ بچّوں کو رقم کے حساب کتاب (بہی کھاتہ) کا طریقہ بھی سکھایا جانا چاہیئے۔ مہاتما گاندھی نے بھی رقم کا کھاتہ رکھنے اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت پر زور دیا تھا۔

قائدانہ صلاحیت کا فروغ

آج کا بچّہ کل کا شہری ہے۔ اسکول میں سیونگس بنک کے ذریعے بچّوں میں شروع ہی سے سماجی بہبود کے کاموں اور اسکول کے امور میں دلچسپی پیدا کی جاسکتی ہے۔ انھیں ان کی مالیاتی ذمّہ داری سنبھالنے کی بھی تربیت دی جاسکتی ہے تاکہ وہ رقومات کے درست استعمال اور ان کا حساب کتاب رکھنے کا اہل بن سکیں اور خانگی معاملات میں مکمل راز داری برتتے ہوئے دوسروں کے احساسات کا احترام کرسکیں۔

سنچائیکا (بچت) بنک کیا ہے؟

سنچائیکا بنک کا انتظام ایک بورڈ آف ٹرسٹیز کرتا ہے جو اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ ماسٹر دو ٹیچرس اور دو طلباء پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ ٹرسٹی دو سال تک کارگزار رہتے ہیں۔ بورڈ آف ٹرسٹیز میں کوئی جائیداد مخلوعہ ہو تو پرنسپل یا ہیڈ ماسٹر عارضی طور پر کسی فرد کو نامزد کرتے ہیں اور جلد از جلد انتخابات کے انعقاد کی کارروائی کرتے ہیں۔

سنچائیکا، اسکول کے نام پر ایک واحد سیونگس بنک اکاؤنٹ کھولتے ہیں۔ ہر ماہ کوئی ایک یا زائد دن مقرر کیے جاتے ہیں تاکہ بچّے اپنی خواہش سے اپنی بچت کے پیسے جمع کریں۔ اس مقصد کے لیے ایک کاؤنٹر کھولا جاتا ہے جس کے ذریعے بچّے اپنی رقومات جمع کرسکتے ہیں۔ یا انھیں کھاتہ سے نکال سکتے ہیں۔ کھاتوں کی دیکھ بھال کا انتظام ٹرسٹیز کی طرف سے منتخب بعض طلباء کرتے ہیں جن کی نگرانی ٹیچر ٹرسٹیز کرتے ہیں۔ لیجر اور پاس بک کے اندراجات پر دستخط اور معائنہ کا کام ٹرسٹیز کرتے ہیں۔ اور بعد میں پاس بک متعلقہ طالب علم کو واپس کردی جاتی ہے۔ وصول شدہ رقم بعد میں سنچائیکا سیونگس بنک اکاؤنٹ میں جمع کردی جاتی ہے اور ۲۵ روپیے، جزوی رقم، واپس لینے والوں کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ کھاتہ پر حاصل ہونے والے سود کی رقم سہ ماہی کی بنیاد پر کم از کم ۱۰ روپے رکھنے والے کھاتہ دار طلباء کے اکاؤنٹ میں محسوب کردی جاتی ہے۔

سنچائیکا کا مقصد بچّوں میں نہ صرف بچت کی عادت ڈالنا ہے بلکہ انھیں بنک کاری اور کھاتہ داری کے امور سے واقف کروانا بھی ہے، کھاتہ دار طلباء کو ایک چیک بک بھی دی جاتی ہے جس میں ایک روپے کی مالیت کے چیک رہتے ہیں تاکہ طلباء بوقت ضرورت اپنا پیسہ نکال سکیں۔ اپنے بڑوں کی طرح اپنا علیحدہ کھاتہ رکھنے پر انھیں بڑی مسرت محسوس ہوتی ہے خاص طور پر اس وقت جب وہ چیک پر دستخط کرتے ہیں۔ سنچائیکا کے لیے اسٹیشنری اور دوسرے کاغذات، نیشنل سیونگس آرگنائزیشن کی جانب سے مفت سربراہ کیئے جاتے ہیں۔

حیدرآباد میں اب ۵۸۵ سنچائیکا بچت بنک کام کر رہے ہیں اور ان میں ۱۳،۴۷،۱۳ ارکان بطور کھاتہ دار شامل ہیں۔ طلبا نے اپنے کھاتوں میں مجموعی طور پر ۱۳ لاکھ ۴۰ ہزار روپیے جمع کرائے ہیں۔ اس طرح طلباء سنچائیکا مشعل تھام کر اپنے خوشحال مستقبل کی طرف رواں دواں ہیں۔ ●

بقیہ: مربوط دیہاتی ترقی کا پروگرام

جاتا رہے۔ اگر ہمارے ممبرانِ مجالس قانون ساز اپنے اپنے انتخابی حلقوں کی فلاح و بہبود کی خبر رکھنے کے علاوہ اپنے حلقے سے باہر کوئی ایک بلاک چن کر وہاں کے کام کی دیکھ بھال کرتے رہا کریں تو اس سے افسران بھی چوکنّے رہیں گے۔ اور کام میں بھی سدھار ہوگا۔ نیز وہ یہ بھی بتا سکیں گے کہ پروگراموں کو اور زیادہ موثر بنانے کے لیے کیا طریقے اختیار کیے جائیں۔

اس سلسلے میں وزیر اعظم نے حال ہی میں ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ سے درخواست کی تھی کہ پنچایتی راج کے اداروں کی مدد سے لوگوں کی شرکت کا بندوبست کیا جائے اس کے لیے ضروری ہوگا کہ پنچایتوں کے برابر الیکشن ہوتے رہیں، انھیں معقول اختیارات حاصل ہوں اور مالی امداد بھی ملتی رہے۔

دیہی افلاس کے خلاف جدوجہد بڑا طویل اور مسلسل عمل ہے۔ اس کے لیے ہم سب کی امداد اور تعاون کی ضرورت ہوگی۔ ●

بقیہ : بچّوں کی بہبود

طفلی مرکزوں میں دو پہر کے کھانے کے ساتھ ساتھ غذائیت کے خصوصی پروگراموں پر بھی عمل کیا جاتا ہے۔ اس وقت قریب ۰، لاکھ لوگ ان پروگراموں سے مستفید ہو رہے ہیں۔ سماجی بہبود کا مرکزی بورڈ، ہریجن سیوک سماج، بھارتیہ آدی باسی سیوک سماج، کستوربا گاندھی میموریل نیشنل ٹرسٹ مل کو تقریباً ۲ ہزار بال واڑیاں چلا رہے ہیں۔ تین سے ۵ برس کی عمر کے زائد از ۳ لاکھ بچّوں کو اضافی غذا مُہیا کی جاتی ہے۔

دست اور پیچش کے نہایت سادہ اور موثر علاج کے طور پر پانی پلانے کے طریقہ علاج کا وسیع پیمانے پر پرچار کیا گیا ہے۔ اس طریقہ علاج کی جو آزمائش کی گئی ہے اس کی بدولت ہندوستانی دیہات میں اموات کی تعداد میں ۵۰ فیصد کمی ہوئی ہے۔ پانی نمک اور چینی کو ملا کر دستوں کے سادہ طریقۂ علاج کو اطلاعات و نشریات کے ذرائع، توسیعی کارکنوں اور عوامی استعمال کے مقامات پر دیواری اشتہاروں اور بورڈوں سے خوب مقبول کیا گیا ہے۔

خاندانی بہبود کے پروگراموں کے سلسلے میں پیش آنے والی رکاوٹوں میں کارکن طبقے کے کنبوں کا یہ نظریہ ہے کہ بچّہ اس دنیا میں صرف کھانے کے لیے مُنہ لے کر ہی نہیں آتا ہے بلکہ کام کرنے کے لیے دو ہاتھ لے کر اور کنبے کی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لیے بھی آتا ہے اور یہی رُجحان بچّوں سے مزدوری کرانے، بھیک منگوانے، اسکول نہ بھیجنے اور اسکول کی تعلیم چھڑوا لینے جیسی سماجی برائیوں کا ایک بڑا سبب بھی ہے۔

اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے حکومت دوہری کوشش کر رہی ہے۔ ایک طرف تو بچّوں سے مزدوری کرانے کے واقعات کا پتہ لگانے کے لیے متواتر چوکسی برتی جاتی ہے اور قانون کی مدد سے قانونی کارروائی کی جاتی ہے تاکہ اس خرابی کو ایک معیّنہ مدت میں مکمل طور پر ختم کیا جاسکے اور دوسری جانب ایسے پروگرام شروع کئے جا رہے ہیں جن سے غریب لوگوں کے دلوں میں یہ اعتماد پیدا ہو سکے کہ دس یا بارہ برس کی عمر کے بچّے کو کمانے والا فرد شمار کرنا ضروری نہیں ہے۔ اسے اسکولوں میں تعلیم دے کر کوئی کام کرنے کا موقع دیا جاسکتا ہے۔

جو بچّے اسکول چھوڑ دیتے ہیں ان میں سے کچھ چھوٹے بچّوں کو کھلانے کا کام کرتے ہیں جبکہ ان کے والدین کام کرنے کے لیے گئے ہوتے ہیں۔ لہذا کارکن عورتوں کے بچّوں کی دن میں دیکھ بھال کی جانب زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ لیکن جب تک ان پروگراموں سے فائدہ اٹھانے کے اہل افراد کو اس بارے میں صحیح جانکاری نہیں ہوگی یہ سہولیات ان کے لیے بیکار ہوں گی۔

اطلاعات و نشریات کے عوامی ذرائع بچّوں کے لیے اور بچّوں سے متعلق پروگراموں پر زیادہ سے زیادہ توجہ دے رہے ہیں تاکہ صحیح قسم کا ماحول بن سکے۔

بچّوں سے مزدوری نہ کرانے کے بارے میں پہلے سے ہی ایک قانون موجود ہے۔ بچّوں کی مزدوری سے متعلق مرکزی وزارت محنت کا محکمہ بچّوں کی فلاح و بہبود کے پروگراموں پر مستقل نگاہ رکھتا ہے اور بچّوں کی فلاح کا کام کرنے والے رضاکار اداروں کو امداد دیتا ہے۔

اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سماج کے کمزور طبقوں خاص طور پر خانہ بدوش کنبوں پر ظلم اور لوٹ کھسوٹ کو ختم کرنے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ترغیبی عمل اور توسیعی پروگراموں سے ان کا کوئی رابطہ نہیں ہوتا اور وہ اُن سے خاطر خواہ فائدہ نہیں کر پاتے۔

چھٹے پلان کا نصب العین آئندہ دس برسوں میں ۱۴ برس تک کی عمر کے تمام بچّوں کو کم از کم بنیادی تعلیم مُہیا کرنا تھا۔ منصوبے میں تعلیم کے لیے تخصیص زر کا ۳۶ فیصد حصہ اس مقصد کے لیے مخصوص تھا۔ ابتدائی تعلیم عام کرنے کی غرض سے ایک قومی اسکیم شروع کی گئی تاکہ قومی داخلوں کا ماحول پیدا کیا جائے اور حاضری پر نگاہ رکھی جاسکے اور اسکول چھوڑ دینے کی عادت کو روکا جاسکے۔

اکثر ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں نے لازمی تعلیم کے قوانین بنا دئے ہیں۔ پہلی سے پانچویں جماعت کی ابتدائی تعلیم اب ہر جگہ مفت ہے۔ اسکول جانے کی عمر سے قبل بچپن کی تعلیم پر آٹھ ریاستوں میں عمل کیا جا رہا ہے۔

اسکول چھوڑ دینے والے بچّوں کی تعداد کم کرنے کی کوششوں کے نتائج تب معلوم ہونگے جب دیہی سماج کی خواہشات میں تبدیلی آئے گی اور زندگی کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے نئی خود اعتمادی پیدا ہوگی۔ غریبی دُور کرنے کے پروگراموں نے ماضی قریب میں یہ جذبہ پیدا کرنے میں بہت مدد کی ہے جن سے والدین کو اپنے بچّوں کے بہتر مستقبل کی امید پیدا ہوئی ہے۔ اور اب وہ صرف یہ نہیں سوچتے کہ بچّہ دس سال کا ہو کر ماں باپ کے روائتی پیشے میں شریک ہو جائے گا۔ بچّوں سے مزدوری کرانے کی بُرائی کو مکمل طور پر ختم کرنے کے لیے صرف قانونی مدد ہی کافی نہیں کیونکہ جن بچّوں سے مزدوری کرائی جاتی ہے خود انھیں ہی اپنی بدحالی کا احساس نہیں بلکہ وہ اس لحاظ سے اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے کنبے کی آمدنی میں کچھ روپوں کا اضافہ کر رہے ہیں۔ چھوٹے بچّے بہتر [illegible] متواتر روزگار سے اس کام میں بہت ترقی [illegible]

پروسیسنگ کی سہولیات

گذشتہ ۲۵ برسوں سے کھادی اور دیہی صنعتوں کی سرپرستی میں چلنے والی ایجنسیوں کو لامرکزی انداز میں بہت سی مصنوعات کی اجتماعی پروسیسنگ کی سہولیات حاصل ہیں۔

مارکیٹنگ ایجنسیاں

ملک بھر میں اندازاً پانچ ہزار مارکیٹنگ ایجنسیاں ہیں۔ ان سبھی ایجنسیوں کے درمیان باہمی رابطہ ہوتا ہے جس کی بدولت ایک مرکز پر تیار ہونے والا سامان ملک بھر میں فروخت کیا جا سکتا ہے۔

مارکیٹنگ ایجنسیاں

کھادی اور دیہی صنعتوں کے کمیشن اور کھادی و دیہی صنعتوں کے بورڈ نے یہ ہدایت کر رکھی ہے کہ ان سے امداد پانے والی ایجنسیاں مناسب جانچ پڑتال کے بعد صرف مخصوص قسموں کا سامان خریدیں۔

اگرچہ زیادہ کمزور طبقوں کے لیے اسکیمیں بنائی گئی ہیں لیکن اس کے باوجود کھادی اور دیہی صنعتوں کے کمیشن کے زیر سرپرستی شروع کیے گئے پروگراموں کا زیادہ جھکاؤ انفرادی کاریگروں کی جانب نہیں ہوگا۔ کھادی اور دیگر مصنوعات تیار کرنے کا کام انجمنیں ہی کرتی ہیں۔ مربُوط دیہی ترقی کے پروگرام کے تحت دیہات کے انفرادی کاریگروں کی تیار کی ہوئی مصنوعات کی فروخت اور ان کو خام مال کی بہم رسانی میں زیادہ مدد نہیں دی جاتی۔ ابتدائی مالی امداد کی فراہمی کے بعد کاروباری سرمایہ کی فراہمی کا انتظام نہیں کیا جاتا۔ کاریگروں کو اپنی بعد کی ضروریات کے لیے بینکوں سے بارہ تیرہ فیصد شرح سوُد پر قرض لینا پڑتا ہے۔ کاریگروں کی بنائی ہوئی لکڑی کی چیزوں اور ان کی جمع کردہ کھالوں یا ان کے ذریعے رنگی گئی کھالوں کی اجتماعی پروسیسنگ یا صفائی وغیرہ کی سہولیات موجود نہیں ہیں۔

غیر زراعتی شعبے کی مربوط ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ان خامیوں کو دُور کیا جائے اور یہ کام مربوط دیہی ترقی سے مستفید ہونیوالوں کی سرگرمیوں کو اُن اداروں اور انجمنوں سے باقاعدہ طور پر منسلک کرکے کیا جا سکتا ہے جو کھادی اور دیہی صنعتوں کے کمیشن یا بورڈ کے زیر سرپرستی چل رہے ہیں۔ اس کے لیے درج ذیل طریقِ کار اختیار کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ دیہی ترقی کی ضلعی ایجنسیوں اور کھادی اور دیہی صنعتوں کے ریاستی بورڈ کو ان انجمنوں کا پتہ لگانا چاہیئے جو کھادی و دیہی ترقی کے بورڈ کی سرپرستی میں کام کر رہی ہوں اور مربُوط دیہی ترقی کے پروگرام سے مستفید ہونیوالوں کی تیار کی ہوئی اشیاء کو فروخت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ کھادی و دیہی صنعتوں کا کمیشن اور کھادی و دیہی صنعتوں کا بورڈ اس کے لیے فاضل کاروباری سرمایہ فراہم کر سکتے ہیں، اور مزید مارکیٹنگ ڈپو قائم کرنے میں مدد دے سکتے ہیں۔

۲۔ کھادی اور دیہی صنعتوں کا بورڈ خام مال کی سپلائی کے ڈپو کھول سکتا ہے جہاں سے انفرادی طور پر کام کرنے والے کاریگروں کو خام مال مل سکے، جیسے بڑھئی کو مختلف سائزوں میں کٹی ہوئی لکڑی یا لوہار کو لوہا یا موچی کو چمڑہ وغیرہ۔ بورڈ ایسے ہول سیل ڈپو بھی کھول سکتا ہے جو کاریگروں سے ان کا تیار کیا ہوا سامان اکٹھا کریں۔

۳۔ دیہی صنعتوں کے فروغ کے لیے ریاستی سطح پر کچھ کارپوریشنیں بھی قائم کی گئی ہیں۔ مثلاً دستکاری کارپوریشن، اُون کارپوریشن، جنگلات سے متعلق کارپوریشن وغیرہ۔ لیکن مالیات کی کمی اور بینکوں کی اُونچی شرح سُود کے سبب یہ کارپوریشنیں زیادہ وسیع پیمانے پر کام کرنے سے قاصر ہیں۔ مربُوط دیہی ترقی کا پروگرام ایسی کارپوریشنوں کے بعض کاروباری اخراجات کے لیے رقوم فراہم کر سکتا ہے اور کھادی و دیہی صنعتوں کا کمیشن اور بورڈ کاروباری سرمائے کی ضرورتیں پوری کر سکتا ہے بشرطیکہ یہ تنظیمیں دیہی کاریگروں کو خام مال مُہیا کرنے اور ان کی تیار کردہ مصنوعات کو خریدنے کو تیار ہوں۔

۴۔ مربوط دیہی ترقی کے پروگرام کے تحت سپلائی کا تعلق اثاثہ کی خرید سے ہوتا ہے۔ یہ اثاثہ زیادہ تر بیل گاڑی، اونٹ گاڑی، آلاتِ زراعت اور آب رسانی کے پائپوں وغیرہ کی صورت میں ہوتا ہے جو اپنا روزگار آپ شروع کرنے کے لیے حاصل کیا جاتا ہے۔ ان میں سے بہت سی اشیاء کھادی و دیہی صنعتوں کے بورڈ اور کمیشن کے زیرِ سرپرستی چلنے والوں اداروں سے، جن کے پاس اپنے ورکشاپ ہوتے ہیں، حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ان ورکشاپوں کا درجہ بڑھا کر ان میں ایسا سامان بھی تیار کیا جا سکتا ہے۔ جو اس وقت وہاں تیار نہیں ہوتا۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ شہری علاقوں سے زیادہ دام پر سامان منگانے کے بجائے مقامی طور پر ہی خریدا جا سکتا ہے اور روزگار کے مواقع بھی پیدا کیے جا سکتے ہیں۔

(باقی ص ۵ پر)

Regd.No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment
at Civil Lines Post Office, Delhi-110054

Vol. 5 No. 15 YOJANA (URDU) 1-15th November, 1985

ایس شیو شنکر پلے

بچوں کی بہبود

بچے ہماری آبادی کا ۴۰ فیصد حصہ ہیں، چار برس تک کی عمر کے بچوں کا تناسب ۱۲٫۶ فیصد، ۵ سے ۹ ۱۴٫۲ فیصد اور ۱۰ سے ۱۶ برس کا تناسب ۱۹۸۱ کی مردم شماری کے مطابق ۱۲٫۹ فیصد ہے۔ اب چھوٹے کنبے کے تصور پر زیادہ زور دیے جانے سے آئندہ پانچ یا دس برسوں میں کل آبادی میں بچوں کا تناسب مستحکم ہو جانے کا امکان ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ نسل مستقبل کی کارکن طاقت ہے۔

ہمیں اپنے بچوں کی زندگی کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ زیادہ اموات اور امراض ناقص غذائیت کے سبب ہی ہیں۔ ان کے نتیجے کے طور پر بعض عارضی یا مستقل جسمانی معذوریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کچھ ایسے شعبے بھی جہاں مسائل اور بھی پیچیدہ ہیں۔ بچوں کی مزدوری، آوارہ گردی اور اس سے متعلقہ مسائل ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں، لیکن حکومت ہند نے بچوں کے بارے میں ۱۹۷۰ میں طے کی گئی قومی پالیسی کی بنا پر بچوں کی مربوط ترقی کا جو پروگرام ۱۹۷۵ میں شروع کیا تھا، اس نے بچوں کے بارے میں آگاہی کی ایک فضا پیدا کی ہے صحت، غذا، تعلیم اور بچوں کی بحالی کے لیے جو متعدد پروگرام شروع کئے گئے ہیں ان پر عمل تیز ہو رہا ہے۔ یہ پروگرام ۱۹۷۵ میں ۳۳ بلاکوں میں شروع کیا گیا تھا لیکن ملک بھر میں زائد از ۱۲۰۰ بلاکوں میں اسے رائج کیا جا چکا ہے۔

بچوں کی مربوط ترقی کے پروگرام میں آنگن واڑی کارکن گاؤں کی سطح پر ایک اہم رابطے کا کام دیتی ہیں اور کئی اقسام کی تبدیلی کے لیے آلۂ کار ثابت ہوتی ہیں۔ چونکہ یہ خواتین کارکن مقامی ہوتی ہیں اس لیے ان کا بچوں اور ماؤں سے سیدھا تعلق ہوتا ہے۔ وہ انہیں صحت اور غذا کے بارے میں تعلیم بھی دیتی ہیں۔ وہ حفظانِ صحت اور ٹیکے لگانے والے مقامی عملے کی بھی مدد کرتی ہیں اور بلدیاتی اداروں اور اسکولوں سے بھی تال میل رکھتی ہیں۔

بچوں کی مربوط ترقی کی اسکیم نے بچوں کی زندگی پر اچھے اثرات چھوڑے ہیں۔ اس کا اندازہ پیدائش کے وقت بچوں کے وزن میں اضافے سے کیا جا سکتا ہے دوسرے اب ایسے بچوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے جو بیماریوں سے بچنے کے لیے مختلف طرح کا ٹیکہ لگواتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اب ۶ برس تک کی عمر کے بچوں میں خراب غذا کا تناسب ۱۹٫۱ فیصد سے کم ہو کر ۴٫۵ فیصد رہ گیا ہے۔ پراجیکٹوں کے علاقوں میں بی سی جی، ڈپتھیریا اور پولیو کے ٹیکے بالترتیب ۴۶ فیصد، ۴۴ فیصد اور ۴۳ فیصد بچوں کو لگائے گئے جبکہ غیر پراجیکٹ علاقوں میں یہ تناسب بالترتیب ۱۸٫۲۵ اور ۱۶ فیصد تھا۔ بچوں کی مربوط ترقی کی اسکیم کے زیر عمل علاقوں میں شیر خوار بچوں کی اموات کی شرح ۸۳-۱۹۸۲ میں ۸۳٫۳ فی ہزار تھی جبکہ اموات کا قومی اوسط ۱۱۴ فی ہزار تھا۔

ماں اور بچے کی دیکھ بھال کی خدمت کی توسیع سے شیر خوار بچوں کی اموات کی شرح جو آزادی کے وقت ۱۳۴ فی ہزار تھی کم ہو کر ۱۹۸۰ میں ۱۱۴ رہ گئی تھی۔ اگر بچوں کے زندہ رہنے کی امید بڑھ جائے تو اس سے والدین میں اپنے کنبوں کے سائز کو محدود رکھنے کے لیے اعتماد بڑھتا ہے جس سے معیارِ زندگی خود بخود بلند ہوتا ہے۔

بچے اور ماں کی صحت کی دیکھ بھال کی خدمتوں میں لگاتار اضافہ ہو رہا ہے۔ اور اس وقت ملک میں زائد از سات ہزار پرائمری ہیلتھ سنٹر، ہزار سب سنٹر اور خاندانی بہبود کے اڑھائی ہزار شہری مرکز کام کر رہے ہیں۔ یہ مراکز زچگی سے قبل دیکھ بھال، پیدائش، زچگی کے بعد کی دیکھ بھال، چھاتی سے دودھ پلانے کی ترغیب نیز مختلف نوعیت کی متعدی بیماریوں سے بچاؤ کے ٹیکے، اور دست و ہیضہ جیسی بیماریوں کی روک تھام کے لیے مؤثر خدمات مہیا کرتے ہیں۔

حکومت چاہتی ہے کہ اس قسم کے مزید ذیلی سنٹر کھولے جائیں تاکہ پانچ ہزار کی آبادی کے لیے کم از کم ایک ذیلی سنٹر اور ہر دس ہزار کی آبادی کے لیے ایک پرائمری ہیلتھ سنٹر قائم ہو سکے۔ بچوں کو ڈپتھیریا، ٹیٹنس، پولیو جیسی بیماریوں سے بچاؤ کے ٹیکے لگانے اور وٹامن کی کمی کو روکنے کے لیے جو کم غذائیت سے مل کر بچوں میں اندھے پن کا بڑا سبب بنتی ہے، کئی اقدامات کئے گئے ہیں۔ ایک سے پانچ برس کی عمر کے بچوں کو ہر چھ مہینے کے بعد دو لاکھ یونٹ "وٹامن اے" دیا جاتا ہے۔ ۸۵-۱۹۸۴ میں ۳۵ لاکھ بچوں اور ۸ لاکھ حاملہ عورتوں کو اضافی غذا دینے کی خدمت مہیا کی گئی۔ آنگن واڑی اسکیم کے تحت بچوں کے لیے کھیلنے اور سیکھنے اور عورتوں و بچوں کی دیکھ بھال، غذائیت، صفائی اور تعلیم کی تربیت کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔

(باقی صفحہ ۲ پر)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, N.D.-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002

یوجنا

۱۶ تا ۳۰ ستمبر ۱۹۸۵

اکیسویں صدی اور تعلیم

(کے. کے. کھلّر)

۱۶ تا ۳۰ نومبر ۱۹۸۵

منصوبہ بندی، تاریخ اور درس

(موہت سین)

چندن کتھوریہ

کابینہ کی ردوبدل حقائق کے آئینے میں

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے گزشتہ دنوں مرکزی کابینہ کی نئی تشکیل دی۔ یہ پہلا موقع ہے کہ کابینہ کی ردو بدل پر اس قدر کھل کر بحث ہوئی اور اس بار نئی کابینہ سے جس قدر توقعات وابستہ کی گئی ہیں، اتنی شاید پہلے کبھی نہ کی گئی ہوں۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ نئی کابینہ ملک کو درپیش مسائل کے حل میں کس درجہ موثر ثابت ہوتی ہے۔ یہ تبدیلی محض اس لیے وجود میں نہیں آئی کہ وزیر اعظم کو یکایک اس کے بدلنے کا خیال آیا اور انھوں نے اپنے اس خیال کو یک لخت یہ شکل دیدی ہو بلکہ یہ اقدام مختلف وزارتوں کی کارکردگی کا جائزہ لے کر اٹھایا گیا ہے۔ اس جائزے میں مختلف وزارتوں کے مابین تال میل کا سوال بھی سامنے رہا۔ اس تال میل کی ضرورت یوں محسوس کی گئی کہ ہر وزارت کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ بہتر نتائج دکھا سکے۔ گزشتہ دنوں شری راجیو گاندھی نے عہدہ سنبھالنے کے بعد کہا تھا کہ ہر وزیر کی کارکردگی پر نظر رکھی جائے گی اور جہاں کمی نظر آئے گی، انھیں کابینہ سے الگ کر دیا جائے گا۔ وزیر اعظم نے ہر وزارت کے وزیر سے کارکردگی کے بارے میں بات چیت کی تاکہ ہر وزارت کے مسائل سامنے آسکیں۔ اور یہ دیکھا جا سکے کہ پالیسی اور پروگراموں پر عمل درآمد میں کیا دشواری پیش آرہی ہے۔ دوسرے یہ کہ مختلف وزارتوں کے درمیان تال میل کیس طرح بڑھایا جا سکتا ہے۔ یہ ردو بدل مذکورہ مطالعوں کی روشنی میں ہی کی گئی ہے۔ کوشش یہ کی گئی کہ ہر وزیر موزوں جگہ پر رہے۔ وزیر اعظم نے کچھ نئے چہرے ان کی افادیت کے پیش نظر شامل کیے۔

مرکزی وزارتوں کی از سر نو زمرہ بندی کا مقصد یہ ہے کہ پالیسی اپنی واضح صورت میں عملی جامہ پہن سکے۔ وزیر اعظم نے ایک ہی کام کو مختلف وزارتوں اور دفاتر سے نکال کر ایک ہی جگہ اس کی انجام دہی مناسب سمجھی۔ موثر انتظامیہ میں عبوری نظام کا سلسلہ اور ایک ہی ذمہ داری کو دو، دو جگہ نبھانے کا سلسلہ راستہ کی رکاوٹ بنتا ہے۔ ملک کو اگر اکیسوی صدی میں پہنچانا ہے تو کام کی رفتار بڑھانی ہوگی۔

انسانی وسائل کا فروغ

وزیر اعظم نے انسانی وسائل کے فروغ پر خصوصی توجہ دی ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے ایک نئی وزارت کا قیام عمل میں آیا ہے جس کا نام ہے انسانی وسائل کے فروغ کی وزارت Ministry of Human Resources اسے ایک تجربہ کار وزیر شری پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ کو سونپا گیا ہے وزیر موصوف اس سے قبل وزارت دفاع دیکھ رہے تھے۔ وزیر اعظم کے اعلان کے مطابق اس کے لیے ۱۰۰ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ اس رقم کا بڑا حصہ تعلیم، ثقافت اور دیگر سرگرمیوں پر خرچ کیا جائے گا۔ نئی تعلیمی پالیسی وضع کرنے کے علاوہ یہ ۱۱۳، ایسے موضوعات پر حاوی ہوگی جس کا تعلق قومی تعمیری سرگرمیوں سے ہے۔ یہ پانچ محکموں پر مشتمل ہوں گی تعلیم نوجوانوں کے امور اور کھیل، فنون لطیفہ، ثقافت اور عورتوں کی بہبود۔ یہ نئی وزارت پرائمری سطح سے لیکر اعلیٰ اور تکنیکی تعلیم کے سبھی پہلوؤں کو دیکھے گی۔ جن میں ۲۰ تعلیمی اور ثقافتی اداروں کا نظم و نسق بھی شامل ہے۔ اقوام متحدہ کی تعلیمی سائنسی اور ثقافتی تنظیم (یونیسکو) کے جملہ موضوعات، ہندوستان میں ملکی اور غیر ملکی طلبا کے وظائف، ریاستی سرکاروں کے اداروں کو عطیات، تکنیکی تعلیم کی کل ہند کونسل کے زیر اہتمام لیے جانے والے امتحانات، یہ سب موضوعات یہ نئی وزارت ہی دیکھے گی۔ قومی عجائب گھر، کتب خانے، قدیم یادگار عمارتیں، آثار قدیمہ کی دیکھ بھال، ثقافتی محکمے کی ذمہ داری ہے۔ ملک میں دکھائی جانیوالی فلموں کی منظوری اور جانچ

اب ثقافتی امور کے محکمے کو سونپ دی گئی ہے۔ اس سے قبل یہ وزارت اطلاعات و نشریات کی ذمہ داری تھی۔ وزیر اعظم نے عورتوں کی بہبود کی ذمہ داری کو بھی کافی اہمیت دی ہے۔ چنانچہ کھیلوں، عورتوں اور نوجوانوں کے امور کی وزیر مملکت شریمتی مارگریٹ الوا اب اس ذمہ داری کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ تعلیم اور ثقافت کی دیکھ بھال کے لیے وزیر مملکت شریمتی سوشیلا رہتگی ہیں۔

• منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنیوالا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر • آر. ٹھکرال
ایڈیٹر • لکھمی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر • محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر • وسیم حیدر

جلد ۵	۱۶ تا ۳۰ نومبر ۱۹۸۵	شمارہ ۱۶

۲۵ کارتک تا ۹ اگرہائن شک ۱۹۰۷ فون: ۶۰۱۸۱۸

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے۔ دو سالہ ۳۵ روپے۔ سہ سالہ ۵۰ روپے

فی کاپی: ایک روپیہ

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت

اس شمارے میں

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر. کے. پورم (مین)
نئی دہلی

بزنس منیجر: ایل. آر. بترہ • اسسٹنٹ ڈائریکٹر (پروڈکشن): آر. ایس. منچال

ترسیلِ زر کا پتہ: بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

• یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے۔ مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی ترجمانی نہیں کرتے۔

اداریہ

عورتیں پسماندہ کیوں؟

مہاتما گاندھی نے بہت پہلے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان کی سماجی، اقتصادی اور ثقافتی زندگی میں عورتوں کا کردار بہت اہم ہے۔ ملک کی جدوجہد آزادی اور اقتصادی ترقی کی کوششوں میں عورتوں کے رول کی اہمیت پہ ہندوستان میں زمانۂ قدیم سے ہی زور دیا جا رہا ہے۔ مہاتما گاندھی نے عورتوں کو گھروں سے باہر آنے کی دعوت دی اور انھیں ملکی معاملات میں سرگرم حصّہ لینے کے لیے تلقین کی۔ حصولِ آزادی کے بعد ان کی تعلیمات کو سامنے رکھا گیا۔ جواہر لال نہرو نے سماجی تبدیلی لانے کے عمل کو تیز تر کرنے کے لیے عورتوں کی شمولیت کو ضروری بتایا۔ شریمتی اندرا گاندھی نے عورتوں کے مسائل کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا۔ ان تمام کوششوں کی بدولت ہندوستان کی خواتین کو سیاسی، اقتصادی اور سماجی حقوق حاصل ہو سکے ہیں۔ ہندوستان نے پنجسالہ منصوبوں کے تحت سریع اقتصادی ترقی کی ہے۔ ان اقتصادی فائدوں سے سماج کے سبھی طبقے مستفید ہوئے جن میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ لیکن قدیم اور فرسودہ رسم و رواج کی بدولت نیز غریبی اور ناخواندگی کے بھیانک مسائل کے سبب وہ ترقیاتی پروگراموں سے اتنا فائدہ نہیں اٹھا سکیں جتنا انھیں اٹھانا چاہیئے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں اس خامی پر قابو پانے کے لیے حکومتِ ہند نے بھارتی خواتین کے مرتبے کو بلند کرنے کے خیال سے ایک کمیٹی مقرر کی تھی تاکہ عورتوں کی ترقی کے مسائل کا مجموعی طور پر جائزہ لیا جا سکے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ نے کچھ بنیادی نوعیت کے سوالات کھڑے کر دیئے۔ چنانچہ چھٹے منصوبے میں یعنی ۱۹۸۰ سے ۱۹۸۵ کے درمیانی عرصے میں "عورت اور ترقی" کے عنوان سے ایک باب کا اضافہ کیا گیا تھا۔ یہ ہندوستان کی منصوبہ بندی کی تاریخ میں پہلا موقع تھا کہ اس عنوان سے عورتوں کی ترقی کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ عورتوں کی بہبود سے متعلق پالیسیوں کے تحت زیادہ زور محض بہبودی پروگراموں پر نہیں بلکہ ترقیاتی پروگراموں پر ہے۔ اب یہ بہبودی پروگرام محض عورتوں کی تعلیم، صحت اور سماجی خدمات سے ہی متعلق نہیں بلکہ ان کا دائرہ وسیع کر کے انھیں اقتصادی ترقی کے پروگراموں کے ساتھ مربوط کر دیا گیا ہے۔ ان کو زراعت، دیہی ترقی، تربیتی سہولتوں، سرمایہ کاری کی سہولتوں جیسے پروگراموں سے جوڑ دیا گیا ہے۔ دیہات کی مربوط ترقی کے تحت عورتوں کو از خود روزگار کے لیے قرضے دیئے جاتے ہیں۔ حال ہی میں وزارتوں کی جس طور پر تشکیل عمل میں آئی ہے، اس سے بھی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عورتیں ملک میں مردوں کے دوش بدوش رہیں۔ انسانی وسائل کے فروغ پر ساتویں منصوبے میں ۱۵، ارب روپے کے اخراجات کا اندازہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے کے بہت سے پروگرام عورتوں کی بہبود سے متعلق ہوں گے۔

یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ چھٹے منصوبے میں از خود روزگار کے لیے دیہی نوجوانوں کی تربیت اور اسی طرح کمزور طبقات کی مدد کے لیے شروع کیئے گئے بہت سے پروگراموں میں ہر جگہ عورتوں کا کوٹہ مقرر کر دیا گیا تھا۔ عورتوں کی صحت بہتر بنانے میں شادی کی عمر بڑھانے کا اقدام سودمند ثابت ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ۵ سال سے ۹ سال تک کی بچیوں کے لیے لازمی پرائمری تعلیم دینے پر خصوصی زور ہے۔ اب لڑکیوں کی شادی کی کم سے کم عمر ۱۸ سال سے اوپر ہے۔ خاندانی بہبود کے پروگراموں کی کامیابی کا انحصار اس امر پر بھی ہے کہ کم سن بچوں کی شرحِ اموات کم کی جائے۔ عورتوں کی ترقی کی راہ میں تعلیم کی کمی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ کچھ لڑکیاں خاندانی حالات و موثرات نیز خستہ حالی کے باعث اسکول کی تعلیم حاصل نہیں کر پاتیں۔ ملک کے نئے تقاضوں سے روشناس کرانے کے لیے تعلیمی مواقع کی توسیع وقت کی بڑی ضرورت ہے۔

(ایڈیٹر)

کے. کے. کھلر

اکیسویں صدی اور تعلیم

اکیسویں صدی کے آغاز اور اس کی تیاری کی بات سب سے پہلے وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے کی ہے۔ آج پیدا ہونے والے بچے اکیسویں صدی کے آغاز میں اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے ہوں گے۔ پچھلے ۳۷ سالوں میں حکومت نے تعلیم کو اتنا فروغ دیا ہے جس کی مثال سارے ایشیا میں نہیں ملتی۔ دفاع کے بعد تعلیم کا ہی ایسا شعبہ ہے جہاں قومی سرمایہ سب سے زیادہ خرچ کیا گیا ہے۔ خواندگی کی شرح ۱۹۵۱ء میں ۱۶٫۶۷ تھی جو ۱۹۸۳ میں بڑھ کر ۳۶٫۸۱ ہو گئی تھی، آج یہ ۳۷٫۱۶ ہے۔ ابتدائی تعلیم کے ادارے ۱۹۵۱ میں ۲٫۲۳ لاکھ تھے۔ آج ۶٫۲۷ لاکھ سے بھی اوپر ہیں۔ صرف ۲۷ یونیورسٹیاں تھیں ۱۹۵۱ میں۔ آج ۱۴۰ ہیں۔ تکنیکی اور میڈیکل اسکولوں اور کالجوں میں بھی کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۵۱ میں مڈل اسکول صرف ۱۳٫۶ لاکھ تھے، آج ۱۲۵ لاکھ سے زیادہ ہیں۔ ۱۹۵۱ میں ثانوی اسکولوں کی تعداد ۷٫۳۰۰ تھی، ۱۹۸۳ میں بڑھ کر ۵۲۲۷۹ ہو گئی۔ ۱۹۵۱ میں سارے ملک میں شاید ہی کوئی ادارہ پیشہ ورانہ تعلیم کیلئے ہو مگر آج دو ہزار سے زیادہ ادارے پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے ہیں جن میں آدھے سے زیادہ تامل ناڈو میں ہیں۔ پالی ٹکنیک اور آئی ٹی آئی اداروں کا ملک میں جال پھیلا ہوا ہے۔ لیکن اتنا کچھ ہونے کے باوجود ۲۰۰۰ء میں خواندگی کی شرح ۵۰ فیصد سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اس کا مطلب ہے کہ ۵۰ فیصد لوگ پھر بھی اَن پڑھ رہیں گے۔ ایک بین الاقوامی جائزے کے مطابق اکیسویں صدی کے آغاز میں دنیا کے ۵۲ فیصد اَن پڑھ بالغ ہندوستانی ہوں گے۔ آزادی کے بعد اَن پڑھ لوگوں کی آبادی ۶ کروڑ تھی۔ آج ۲۶ کروڑ ہے۔ عورتوں کی خواندگی صرف ۲۴٫۸ فیصد ہے۔ شہری اور دیہاتی نابرابری بھی افسوسناک ہے۔ دیہی اور شہری تعلیمی اخراجات میں بڑا فرق ہے۔ ہندوستان کا دل آج بھی دیہات میں دھڑکتا ہے، لیکن آبادی کے مطابق دیہات میں تعلیمی سہولتیں بہت کم ہیں۔

ظاہر ہے کہ وقت آن پہنچا ہے کہ ۱۹۶۸ء کی تعلیمی پالیسی کا جائزہ لیا جائے۔ مرکزی وزارتِ تعلیم نے حال ہی میں ایک دستاویز پارلیمنٹ میں پیش کی ہے۔ اس دستاویز کا نام ہے "تعلیم کی چنوتی"۔ ۱۱۱ صفحات پر مبنی یہ ایک کتاب ہے جس پر آجکل سارے ملک میں بحث مباحثے ہو رہے ہیں۔ یقیناً یہ اہم دستاویز نئی تعلیمی پالیسی کی تشکیل میں بہت مدد کرے گی۔ وہ تعلیم جس کے ساتھ سارے ملک کا مستقبل جڑا ہوا ہے اور جس کے بغیر آج کی زندگی میں ایک قدم اٹھانا بھی مشکل ہو گیا۔

پیش لفظ میں واضح کر دیا گیا ہے کہ پچھلی دو دہائیوں کی ترقی کے تجربے سے ایک بات نمایاں ہو کر ابھرتی ہے کہ حسبِ منشا نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۶۸ء میں جو تعلیمی پالیسی مرتب کی گئی تھی۔ اس کے بامقصد اور فکر انگیز خاکے میں خاطر خواہ وسائل مہیا نہیں کئے گئے اور اسے عملی شکل دینے کے لیے اقدامات نہیں کئے گئے۔ اب جبکہ اکیسویں صدی ہمارے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ تعلیم سے دلچسپی اور لگاؤ رکھنے والے پوچھ رہے ہیں کہ نئی تعلیمی پالیسی کے مقاصد کیا ہوں گے اور اگر ان مقاصد کو سامنے رکھ لیا جاتا ہے تو کیا سوسائٹی اور قوم ان کو پورا کرنا اپنا فرضِ اولین سمجھ کر مناسب اقدام اٹھائے گی۔

سب سے اہم بات یہ جو اس دستاویز میں کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس ضرورت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا گیا ہے کہ ایک سیکھنے والا سماج وجود میں آئے جس میں ہر عمر اور ہر طبقے کے لوگوں کی پہنچ ہو۔ ایسی صورت میں کھلی غیر رسمی تعلیم، تعلیم بالغان اور جزوقتی تعلیم، رسمی تعلیم کی طرح بامعنی ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ملک کی ترقی

ہوئی اَن پڑھ آبادی کا بوجھ رسمی تعلیم کے ادارے نہیں اٹھا سکتے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ غیر رسمی تعلیم دوسرے درجے کی تعلیم ہے، یہ سراسر غلط ہے۔ غیر رسمی تعلیم رسمی تعلیم کو مضبوط کرتی ہے۔ نقصان نہیں پہنچاتی۔ کہا جاتا ہے کہ اکیسویں صدی کے شروع میں دُنیا کے ۵۲ فیصد اَن پڑھ لوگ ہندوستانی ہوں گے۔ یہ منظر اتنا بھیانک ہے کہ ہر سوچنے والے کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اکیسویں صدی میں داخل ہوتے وقت جب نئی نسل اپنے آپ کو بے سہارا اور کمزور پائے گی تو پُرانی نسل یعنی موجودہ نسل کو کوسے گی، ذمہ دار ٹھہرائے گی۔ وہ اس دلیل کو تسلیم نہیں کرے گی کہ تعلیم میں خامیاں اس وجہ سے رہ گئی تھیں کہ مرکز اور صوبائی رشتوں کا ڈھانچہ ناقص تھا یا محکمہ جاتی ذمہ داریاں پوری طرح سے نہیں نبھائی گئیں۔ اس اعتبار سے یہ دستاویز نئی تعلیم کی تشکیل میں ایک سنگِ میل ثابت ہو گی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ تعلیم کا مقصد کیا ہے۔ نیا سماج پیدا کرنا، مکمل انسان بنانا، اچھا شہری بنانا یا اسے صرف روزگار کے ساتھ جوڑنا یا پھر روزگار مہیا کرنا۔ ان باتوں پر پچھلے ۳۰ برسوں سے کافی بحث ہو چکی ہے۔ اور ہر طرح کا ایکسپیریمنٹ بھی ہو چکا ہے۔ کوٹھاری تعلیمی کمیشن ۶۶ – ۱۹۶۴ کی رپورٹ میں ان مقاصد پر یوں لکھا گیا ہے۔

"مقداری طور پر تعلیم کو سماجی انصاف کے آگے بڑھانے یا پیچھے ہٹانے کے لیے منظم کیا جا سکتا ہے۔ تاریخ ایسے بہت سے واقعات کی گواہ ہے کہ جہاں مختصر سماجی گروہوں اور طبقہ اعلیٰ نے تعلیم کو اپنی حکومت کے اختیار تک کے طور پر استعمال کیا اور اپنے اقتدار اعلیٰ کو برقرار رکھنے اور ان اقتدار کو برقرار رکھنے کی کوششیں کیں جن پر اس کا دار و مدار تھا۔ دوسری جانب ایسے بھی واقعات ہیں کہ جہاں ہر ایک کو تعلیم کے مساوی مواقع فراہم کیے گئے اور تعلیم کو جان بوجھ کر افراد کی خوابیدہ صلاحیتوں کی زیادہ سے زیادہ ترقی کے لیے استعمال کیا گیا تاکہ ملکی مسائل کے حل ڈھونڈے جا سکیں۔ اور پورے نظام میں سماجی اور ثقافتی انقلاب برپا کر سکیں۔ یہی امور تعلیمی وصف کے لیے بھی درست سمجھے جائیں گے۔ یونیورسٹی تعلیم کا ایسا نظام کہ جو بڑے تناسب میں لائق پیشہ ور افراد پیدا کرتا ہے دراصل پیداوار بڑھانے اور اقتصادی ترقی کو بڑھاوا دینے میں بہت زیادہ معاون ثابت ہوگا۔ اعلیٰ تعلیم کا ایک دوسرا نظام جس میں فارغ شدہ اتنے ہی ہوں مگر اس میں غیر محتاط تعلیم یافتہ آرٹس گریجویٹ افراد کا تناسب کافی زیادہ ہو تو ان میں بہت سے بے روزگار یا ناقابل روزگار رہ جائیں گے۔ یہ لوگ سماجی تناؤ پیدا کریں گے اور اقتصادی ترقی کا رخ بھی موڑ سکتے ہیں۔ صحیح ڈھنگ کی تعلیم ہی جو ایک موزوں پیمانے پر مہیا کی جائے، قومی ترقی کا سبب بن سکتی ہے۔ ان شرائط کو پورا نہیں کیا جائے گا تو ہو سکتا ہے کہ اُلٹے اثرات مرتب ہوں۔"

مرکزی وزارت کی رپورٹ کے مطابق

"۱۹۶۸ میں جو قومی تعلیمی پالیسی پیش کی گئی تھی اس میں نظام تعلیم سے متعلق ایک بنیادی تبدیلی کو ملحوظ رکھا گیا تھا تاکہ تعلیم عوام کی زندگی سے مزید قریب ہو جائے اور لوگوں کو وسیع تر تعلیمی مواقع فراہم ہو سکیں۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی خیال رکھا گیا تھا کہ تمام سطحوں پر اعلیٰ معیار کو برقرار رکھا جا سکے ساتھ ہی سائنس اور تکنیکی ترقی اور اخلاقی اور سماجی اقدار کے فروغ پر زور دیا جا سکے اس تعلیمی پالیسی کا مقصد اس لحاظ سے کسی بھی طرح کم نہیں تھا جس سے کہ طلبہ میں نظم و ضبط پیدا ہو اور ایسے نوجوان مرد اور عورتیں تیار ہوں جو باکردار ہوں اور قومی فلاح و فروغ کے جویا ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہم ان مقاصد کو پوری طرح حاصل نہ کر سکے۔

اکیسویں صدی کے تقاضے

اکیسویں صدی ایک ایسی صدی ہو گی جو سائنس اور ٹیکنالوجی کی صدی ہو گی۔ آج بھی ٹیکنالوجی روزمرہ کی زندگی میں کسی نہ کسی طرف سے گھس رہی ہے اس کے بغیر زندہ رہنا مشکل ہے۔ یورپ میں تین تین چار چار سال کے بچے کمپیوٹر سے کھیلتے ہیں۔ امریکہ اور رُوس میں کھیل کود کے میدان میں سائنس اور ٹیکنالوجی چھائی ہوئی ہے۔ اس بڑھتی ہوئی آبادی اور صنعتی ترقی کے پس منظر میں اگر معیار اور مواقع میں مساوات کا حصول نہ ہوگا تو ترازو غلط طرف جھک جائے گی۔ آج سائنس نے رسل و رسائل کے تمام فاصلے مٹا دئے ہیں۔ کیا ہمارے پاس ایسی تعلیم کا ڈھانچہ تیار ہے۔ جو اکیسویں صدی کی ضروریات کو پورا کر سکے کیا ہمارے پاس اتنی نوکریاں ہیں جو سبھی تعلیم یافتہ لوگوں کو دی جائیں۔ خاص کر اس حالت میں جبکہ اس ملک میں کوئی اَن پڑھ نہ رہے گا۔ نئی تعلیمی پالیسی کی شروعات سب سے پہلے وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے اپنے پہلے براڈ کاسٹ یعنی ۵ جنوری ۱۹۸۵ میں کی تھی۔ اس وقت سے ملک میں ایک نیا اعتماد اور نیا ولولہ پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس قومی جذبے کو بروقت عملی جامہ نہ پہنایا گیا تو ایک اور موقعہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ تعلیم کی تاریخ میں ایسے موقعے بار بار نہیں آتے۔ ۱۹۵۱ میں اسکولوں اور کالجوں

میں داخلہ لینے والوں کی تعداد صرف ۲،۸ کروڑ تھی۔ ۱۹۸۲ میں بڑھ کر یہ تعداد ۴،۱۱ کروڑ ہو گئی۔ ۱۹۹۰ میں یہ دوگنی ہو جائے گی اور ۲۰۰۰ء میں تگنی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہم اس کے لیے تیار ہیں جبکہ آج صرف ۵،۸۵ فیصد اسکولوں میں بلیک بورڈ ہیں اور صرف ۲۸ فیصد اسکولوں میں لائبریری، آسام کے پرائمری اسکولوں میں صرف ۹،۱۹ فیصد بلیک بورڈ ہیں اور مغربی بنگال کے ابتدائی اسکولوں میں صرف ۴ فیصد لائبریری کی سہولتیں موجود ہیں۔ بہار میں صرف ۱۵ فیصد ابتدائی اسکولوں میں کھیل کا سامان مہیا ہے۔ مدھیہ پردیش میں صرف ۲۱ فیصد ابتدائی اسکولوں میں پینے کے پانی کی سہولت دستیاب ہے۔ مغربی بنگال کے ۶۰ فیصد اسکول ایسے ہیں جن میں پینے کے پانی کا کوئی انتظام نہیں۔ چوتھے کل ہند تعلیمی سروے کے مطابق جو ۱۹۸۰ میں ہوا تھا۔ ابتدائی تعلیم کے لیے ۹ فیصد اسکولوں میں عمارتیں نہیں تھیں۔ اس طرح کے اسکولوں کی تعداد پنجاب، بہار اور اُتر پردیش میں سب سے زیادہ تھی۔ لیکن پھر بھی پچھلے ۳۸ سالوں میں تعلیمی اداروں کی تعداد ۳،۲ لاکھ سے بڑھ کر ۹،۶ لاکھ ہو گئی۔

لاکھوں اسکولوں کے پاس اپنی کوئی بلڈنگ نہیں ہے۔ حالانکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ڈیفنس سیکٹر کے بعد ہندوستان میں سب سے زیادہ خرچ والا شعبہ تعلیم کا ہی ہے۔ آزادی کے بعد تعلیمی نظام بہت تیزی سے پھیلا ہے۔ لیکن بڑھتی ہوئی آبادی نے اس کا سارا اثر ضائع کر دیا۔ اس بات پر سبھی لوگ متفق ہیں کہ نیا تعلیمی ڈھانچہ چھوٹی موٹی تبدیلیوں سے بہترین بنایا جا سکتا ہے۔ تعلیم گورنمنٹ کی ذمہ داری تو ہے ہی لیکن جس وقت تک اسے مکمل سماجی تعاون حاصل نہ ہوگا سو فیصد نتائج کی اُمید نہیں کی جا سکتی۔ نئی تعلیم مساوات پر مبنی ہو۔ ہر ایک کلو میٹر کے دائرے میں ایک پرائمری اسکول ہو اور ہر تین کلو میٹر پر مڈل اسکول۔ رضاکار انجمنیں تعلیمی پروگراموں کو فروغ دیں۔ سوسائٹی اور سماج گورنمنٹ کا ہاتھ بٹائے۔ تعلیم ایک تحریک کی شکل اختیار کر لے۔ کچھ ڈگریوں کو ملازمت سے علیحدہ کر دیا جائے۔ پیشہ ور تعلیم اور تکنیکی تعلیم زیادہ پیش قدمی کرے۔ تعلیم کے لیے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے۔ کھلے اسکول اور کھلی یونیورسٹیاں قائم کی جائیں۔ اندرا گاندھی قومی اوپن یونیورسٹی کھل چکی ہے۔ ایسی درجنوں یونیورسٹیاں کھلنی چاہئیں۔ رسمی اور غیر رسمی تعلیم ایک دوسرے کی معاون بنیں، مخالف نہیں۔ ذہین طلبا کے لیے ایسے انتظامات کئے جائیں کہ وہ پڑھائی جاری رکھ سکیں۔ اس سلسلے میں ہر ضلع میں جہاں تک ہو سکے دیہاتوں میں ماڈل اسکول کھولے جا رہے ہیں۔ تعلیم نسواں اور تیزی سے بڑھے۔ اقلیتوں کی تعلیم پر خاص دھیان دیا جائے۔ تعلیم ایسی ہو کہ طلبا کے دل میں بیداری اور فکر پیدا کرے، برداشت تحمل اور امداد باہمی کا ماحول پیدا کرے۔ سماجی انصاف اور سیکولرازم کے اصولوں کے تئیں عقیدوں کو پختہ کرے۔ عدم تشدد کے اصولوں پر مبنی ایک سماج پیدا کرے۔ قومی سالمیت کے لیے لگن پیدا کرے محنت اور کام کو عزت سے دیکھے۔ دوسرے کے نقطۂ نظر کو برداشت کرنے کا مادہ پیدا کرے۔

اب واضح ہے کہ جو لوگ تعلیم کی تجارت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں ان کو نئی پالیسی موافق نہیں آئے گی۔ مثال کے طور پر کیپی ٹیشن فیس لینے والے ادارے۔ پرائیویٹ تعلیمی دکانیں، کوچنگ سنٹرز والوں کو آج کے امتحانوں کا طریق کار پسند ہے کیونکہ اس سے ان کے گلشن کا کاروبار خوب چل رہا ہے۔ اور اگر نئی تعلیمی پالیسی میں یہ ضروری ہو گیا کہ ہر اُستاد کو کلاس میں پڑھانا ہی پڑے گا تو ہزارہا اساتذہ کے لیے وبال جان بن جائے گا۔ نئے طریقوں سے پڑھانے سے پہلے انھیں خود پڑھنا پڑے گا۔ آج یونیورسٹی کے اساتذہ کی کوئی ٹریننگ ہی نہیں ہوتی۔ اور اگر ڈگریوں کو ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا تو کئی تعلیمی اداروں کے ایڈمنسٹریشن اس قدم کی پُر زور مخالفت کریں گے یہاں یہ بات صاف ہو جانی چاہیئے کہ ڈگری اور ملازمت کی علیحدگی کا سوال کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے اور پھر ساری ملازمتیں ڈگری کی شرط سے مبرا نہیں ہوں گی۔ کچھ ایسی آسامیاں ہیں جہاں ڈگری بے ضرورت ہے مثال کے طور پر ٹائپسٹ اور اسٹینوگرافر کی پوسٹ، جہاں ہائر سیکنڈری کے بعد ایک سال کی ٹریننگ کافی ہے۔ موسیقی میں گھرانہ سے سیکھے ہوئے طالب علموں سے کو ایم۔ اے سے کہیں زیادہ موسیقی کا علم اور ریاض ہے۔ ڈگریوں کو ملازمتوں سے (DELINK) ڈی لنک کرنے والا قدم ایک پختہ اور آگے بڑھنے والا قدم ہے۔ پیچھے لے جانے والا قدم نہیں۔ یہ ایک ترقی پسند قدم ہے۔ ایسے قومی امتحان یا قومی ٹیسٹ وجود میں آنے چاہئیں جو بغیر ڈگری کے طلبا کی اہلیت کا اندازہ لگا سکیں۔ پھر کئی قسم کی معاشی اور مالی رکاوٹیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ پچاس فیصد اَن پڑھ آبادی کے ساتھ اگر ہم اکیسویں صدی میں داخل

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

موہت سین

منصوبہ بندی تاریخ اور درس

کافی کایا پلٹ نہیں ہوئی

بھارت میں منصوبہ بندی کے عمل کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے موہت سین محسوس کرتے ہیں کہ ۱۹۵۵ کا مہالانوبس منصوبہ کا ڈھانچہ نہرو کی کُل سیاسی بصیرت کا آئینہ دار تھا۔ پبلک سیکٹر کو اولیت، بھاری صنعتوں کا فروغ اور دس برس کے بعد بے روزگاری کا خاتمہ اس کے نمایاں پہلو تھے۔ اُن کا خیال ہے کہ ملک کی ناکافی کایا پلٹ کے لیے سیاسی عزم کا فقدان نہیں بلکہ ایک خاص قسم کا سیاسی عزم ذمہ دار ہے۔ نہرو مہالانوبس ماڈل کو کام کرنے کے لیے کبھی بھی موقع نہیں دیا گیا۔ موہت سین کی رائے میں یہ سماجی، سیاسی قوتوں کے لازمی اتحاد اور کولیشن کے نہ ہونے سے ناکام ہوا۔

بعض باثر حلقوں میں جیسے حالات ہیں اُس سے کسی کو بھی اس امر کا تعجب ہوتا ہے کہ منصوبہ بندی کے شعبے میں جو کچھ باقی رہ جائے گا کیا وہی اُس کی تاریخ ہوگی اور اگرچہ تاریخ سبق دیتی ہے اور تاریخ کا سلسلہ زمانہ حال میں جاری رہتا ہے۔ تاہم تاریخ آخرکار اُسی کے بارے میں ہوتی ہے جو گذر چکا ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر ساتویں پانچسالہ منصوبے کی دستاویز اب انجام کار کابینہ میں جانے والی ہے اور وہاں سے وہ قومی ترقیاتی کونسل بھیجی جائے گی اور پھر وہ تاریخ کا رُخ کرے گی۔ عام لوگوں میں اس کے لیے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اور سماجی واقتصادی شعبے میں تو بیشتر اہل اختیار کے دلوں میں اس کے تئیں قریب قریب باطنی منفرت پائی جاتی ہے۔ ہمارے ملک کے مفادات خصوصی کا بظاہر یہ رویّہ ہے کہ پلان آئیں یا پلان جائیں مگر ہم تو ہمیشہ خوشحال رہیں گے۔

پہلے ایسا نہیں تھا۔ پہلے پلان کی بنیادی اہمیت خواہ کچھ بھی تھی لیکن اُس نے اختلاف رائے، کشمکش، اشتیاق اور حتیٰ کہ جوشش پیدا کر دیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بھارت نئی اور اہم مہم جوئی کی شاہراہ پر روانہ ہونے والا ہے۔ ایسی مہم جوئی جو اُسے خود کے بارے میں باشعور بنا دے۔ ہم جلد ہی تقدیر کے آگے سرخم نہیں کر رہے تھے بلکہ خود اپنی تقدیر بنارہے تھے، ایک حد تک اس کی وجہ یہ تھی کیونکہ منصوبہ بندی اُن حلقوں میں سے ایک تھی جو ہماری تحریکِ آزادی کے رہبروں نے ۱۹۳۰ کی ابتدائی دہے میں لیے تھے۔

ابتدائی حالات

یہ بلاشبہ ہمارے لیے فخر کی بات ہے کہ دنیا میں ہماری تحریکِ آزادی پہلی ایسی تحریک تھی جس نے خود مختارانہ ترقی یا "آر تھک سوراج" سے متعلق ترقی کے لیے منصوبہ بندی کی اہمیت اور ناگزیری کو سمجھا اور سوشلزم کو حقیقتاً "نرودے" کے طور پر جانا۔

حتیٰ کہ ۱۹۲۹ میں بھی جب سوویت یونین میں پہلے پانچسالہ منصوبے کے شروع کئے جانے پر شک وشبہات کا اظہار کیا جارہا تھا اور کوسا جارہا تھا تو یہ پنڈت جواہر لال نہرو تھے جنہوں نے اپنی بیٹی اندرا پریہ درشنی کو لکھا تھا کہ سوویت رہنماؤں نے لفظ "منصوبہ بندی" میں کیونکر جادو ڈال دیا ہے۔ یہ اُن کی تحریک اور نیتاجی سبھاش چندر بوس کے تعاون کا نتیجہ ہی تھا جو کانگریس کے صدر تھے کہ کانگریس نے ۱۹۳۸ میں نہرو کی

اجلاس میں نیشنل پلاننگ کمیٹی کا قیام کیا۔

منصوبہ بندی رواں دواں رہی۔ یہ سرمایہ دار ملکوں کی عظیم کساد بازاری (۳۲ - ۱۹۲۹) کے درمیان سوویت یونین کی کامیابی کی بدولت رفتار سے کھڑی رہی کہ تقریباً ہر کوئی منصوبہ ساز بن گیا۔ گاندھی جی کے مقلدوں نے اپنا منصوبہ تیار کیا۔ اسی طرح ٹاٹا اور برلا والوں نے بھی اپنا منصوبہ بنایا۔ ایم۔ این۔ رائے بھی اپنا "عوامی منصوبہ" لے کر میدان میں آئے۔

ترقی کی واحد راہ

منصوبہ بندی کے لیے اس "جنون" کی پشت پر صرف دانائی ہی نہیں تھی بلکہ مجبوری بھی تھی۔ ہندوستان اس قدر وسیع، اس قدر پسماندہ اور اس قدر مضطرب تھا کہ غیر مرئی ہاتھ سے یہ دعا کرنے سے کام نہیں چل سکتا تھا کہ "پرائیویٹ برائی کو پبلک خوبی بنا دیا جائے" اور دوسرے ملکوں کو غریب بنا کر اُسے امیر بنا دیا جائے۔ ایسے آزاد بھارت کے اعلیٰ قصر کی بنیادوں کی تعمیر کرنے کے لیے مربوط جامع سماجی ضروری تھیں اور ممکن بھی تھیں جو خوشحال اور انصاف کا مسکن ہو۔ منصوبہ بندی ہمارے عوام کے لیے ترقی کا ایک طریقہ ہی نہیں تھا بلکہ وہ واحد طریقہ تھا۔

تب ایک اور نئی بات پیدا ہوئی اور وہ تھی قومی خود اعتمادی۔ ۱۹۴۷ میں جو کچھ ہوا اُسے "انتقالِ اختیارات" بیان کیا گیا ہے۔ دراصل یہ ایک رزمیہ داستان کا نقطۂ عروج تھا۔ گویہ بعض لحاظ سے عوام کی تحریکِ آزادی تھی۔ گاندھی جی، پنڈت جی، نیتاجی، بھگت سنگھ، تلک جیسے درخشندہ ستاروں کی عظیم شخصیتوں اور صفات نے اس رزمیہ داستان میں ایک زبردست کردار ادا کیا۔ لیکن حقیقی ہیرو بھارت کے مرد، عورتیں اور بچے تھے جنھوں نے بہادری سے لڑائی لڑی اور مشکلات کے آگے نہ جھک کر اس لڑائی کو جیتا۔

آرتھک سوراج کے لیے

جن لوگوں نے سامراج کو شکست دی تھی وہ اپنی ہی غریبی، پسماندگی، ظلم و استبداد اور استحصال پسندی کو شکست دے سکتے تھے۔ اور یقینی طور پر دیں گے۔ لیکن جیسا تحریک آزادی کی حالت میں ہوا تھا اس کیلئے شیرازہ بندی اور تنظیم کی ضرورت تھی۔ "آرتھک سوراج" اور انصاف کے لیے یہ تحریک جو صورت اختیار کر سکتی تھی وہ محض منصوبہ بندی ہی ہو سکتی تھی۔ اس امر کا اکثر احساس نہیں کیا جاتا اور اس پر بہت کم زور دیا جاتا ہے کہ منصوبہ بندی آزادی کی ایک اور وُسعت ہے یعنی تمام اقتصادی سرگرمیوں کی اقتصادی بنیاد کی باشعور تعمیر۔

فرانسائن فرینکل نے اپنی اعلیٰ کتاب "بھارت کی سیاسی معیشت (۷۷ - ۱۹۴۷)۔ بتدریج انقلاب" میں درست تجزیہ کیا ہے کہ بھارت میں منصوبہ بندی گاندھیائی، سوشلسٹ اتفاق رائے کا نتیجہ ہے۔ کوئی بھی اس میں لفظ "سمجھوتے" کا اضافہ کر سکتا ہے۔ اس کا اطلاق اتفاق رائے کرنیوالے دونوں شریکوں پر ہو سکتا ہے۔ یہ اتفاق رائے والا سمجھوتہ تھا جس کی مراد تھی تیز رفتار اقتصادی ترقی، نابرابریوں کو بتدریج دُور کرنا حتیٰ کہ طبقاتی فرق ختم ہو جائیں۔ دولت کے حصول کی جبلت محدود ہو جائے، امدادِ باہمی کو فروغ حاصل ہو، اس کے حصول کے لیے اداراتی تبدیلیاں رائج ہوں۔ اقتصادی طاقت کے چند ہاتھوں میں اجتماع کو روکا جائے جس میں مملکت بھی شامل ہے۔ ترقی کے تیسرے راستے پر چلنے پر بھی زور دیا گیا تھا جو دونوں سرمایہ دارانہ اور سوشلسٹ سسٹموں سے الگ تھا۔ اس تیسرے طریقے کی تہہ میں اقتصادی ترقی اور پُرامن سماجی تبدیلی کو یکجا کر دیا گیا تھا۔

پہلے منصوبے کا آغاز

اس اتفاقِ رائے کا اظہار پہلے منصوبے میں ہوا تھا۔ اُس منصوبے میں حکومت کا کردار اپنی کمتر قدامت پسندانہ صورت میں سماجی سرمایہ کی تخلیق اور پرائیویٹ کاروبار کی توسیع کے لیے مالی ترغیبات کے اہتمام تک محدود تھا۔ غیر ملکی سرمایہ کا پُرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ اعلیٰ ترین اولیت زراعت، دیہی ترقی، آبپاشی اور بجلی کو دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی انقلابی نوعیت کی زرعی اصلاحات سے احتراز کیا گیا، گو منصوبے کی حتمی صورت میں زمینوں کی حد مقرر کرنے کی حمایت کی گئی۔

یہ قطعاً کوئی اُمید افزا آغاز نہیں تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ منصوبہ بندی کے لیے قطعاً کوئی آغاز ہی نہیں تھا۔ تاہم یہ ایک آغاز تھا۔ اور اس کا شرف پنڈت نہرو کو حاصل تھا۔ انھیں کی بدولت منصوبہ بندی بھارت کی کارکردگی کا ہی جزو لاینفک بنی۔ انھیں کی بدولت ایک طاقتور، بامقصد اور بااقتدار منصوبہ بندی کمیشن قائم کیا گیا۔

اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ انھوں نے نامور ماہرِ اقتصادیات پروفیسر کے ایں راج کی امداد کے ساتھ منصوبہ بندی میں استدلال اور بصیرت کو سمویا۔ یہ پہلے منصوبے کی تمہید کے دو قابلِ ذکر حصوں میں شامل ہیں:۔ خواہ کوئی سرمایہ کی تشکیل کے مسائل یا نئی ٹیکنیکوں کے اجرا یا معاشرتی اقدامات کی توسیع یا معاشرے کے اندر پیداواری قوتوں اور طبقاتی تعلقات کی مجموعی صف بندی کے بارے میں غور کرے، وہ ناگزیر طور پر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ مملکت کی اقتصادی اور سماجی ذمہ داریوں کی تیز

رفتار توسیع سے ہی عوام کی جائز توقعات پوری ہوسکیں گی۔ اس کے لیے پیداوار کے وسائل کو مکمل طور پر قومیانے یا زراعت یا تجارت و صنعت میں پرائیویٹ اداروں کو ختم کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ضرور ہے کہ پبلک سیکٹر کی بتدریج توسیع کی جائے اور پرائیویٹ سیکٹر کو منصوبہ بند معیشت کی ضروریات کا ہمنوا بنایا جائے۔

اس تمہید سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بھارت کی پسماندگی کا بنیادی سبب لازماً جدید ٹکنالوجی کا فقدان نہیں ہے بلکہ "بعض رکاوٹ ڈالنے والے سماجی اقتصادی اداروں کی مسلسل موجودگی ہے جو معیشت میں بیشتر متحرک قوتوں کی ٹانگیں کھینچتے ہیں۔ چنانچہ ترقی کو آگے بڑھانے کے لیے معاشرتی اداروں اور معاشرتی تعلقات میں ازسرنو مطابقت پیدا ہونا ضروری ہے... لہٰذا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ موجودہ ڈھانچے کے اندر محض اقتصادی سرگرمیوں کو ازسرنو رواں کیا جائے۔ بلکہ خود اس ڈھانچے کی ازسرنو تشکیل کرنا ہوگی۔

دوسرا منصوبہ

ان تعبیرتوں کو اُس کام کے ساتھ ہی عملی صورت دی جا سکی جو دوسرے منصوبے (۱۹۵۶) کی تیاری میں کیا گیا۔ گزشتہ تین دہائیوں پر نظر ڈال کر کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ محض تب سنجیدہ منصوبہ بندی کا آغاز ہی نہیں ہوا بلکہ اس سے منصوبہ بندی کے عمل کو پُرزور حرکت اور سمت ملی جو جاری رہی اور جسے درحقیقت پھر عمل میں لانا ہوگا۔

یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ دوسرا منصوبہ صنعتی پالیسی سے متعلق نظرثانی شدہ قرار داد (۱۹۵۶) کے ساتھ ہی وجود میں آیا جو سوویت یونین اور "سوشلسٹ طرز کے سماج" سے متعلق اوادی قرارداد کے مابین جامع تعاون میں تیز رفتاری کا مظہر تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ منصوبہ بندی ایسے سوشلسٹ طرز کے سماج کے قیام کے مقصد سے عمل میں لائی جانی چاہیے جہاں پیداوار کے بڑے بڑے وسائل سماجی ملکیت یا کنٹرول کے تحت ہوں۔"

مہالانوبس منصوبے کا ڈھانچہ

اس دستورکار کو مزید ٹھوس صورت دی گئی پی سی مہالانوبس کے مشہور منصوبے کے ڈھانچے میں جس کی اشاعت مارچ ۱۹۵۵ میں ہوئی۔ جب یہ فیصلہ کرنا پڑے کہ نہرو کے پیچیدہ نظریات کو منصوبہ بندی کے حقیقی عمل میں زیادہ تر لانے کے لیے کون ذمہ دار ہے تو ایسے اشخاص کا الگ طور پر نام لینا مناسب نہیں ہے۔ تاہم بعض اوقات بھی نامناسب ہے کہ ستائش کے لیے ان اشخاص کا نام نہ لیا جائے۔ جبکہ ملامت کے لیے ایسا آسانی سے کیا جاتا ہے۔ یہ پروفیسر پرسنتا چندر مہالانوبس ہیں۔ جنھیں اس سلسلے میں شہرت حاصل ہے۔ وہ کسی بھی معیار سے قابلِ تعریف انسان ہیں۔ یہ اِس عہد کی ایک عجیب بات ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے وہ انھیں بمشکل جانتے ہیں اور کبھی اُن کا ذکر نہیں کرتے۔

مہالانوبس کے منصوبے کے ڈھانچے کے چھ بنیادی عناصر ہیں۔ اوّل، پبلک سیکٹر کے دائرہ کو بڑھاؤ اور اس طرح "سوشلسٹ طرز کے سماج" کو آگے لے جاؤ۔ دوئم، بھاری صنعتوں کو فروغ دو اور اقتصادی خودمختاری کی بنیادیں مضبوط کرو۔ سوئم، مزدوروں کی کثیر آبادی والے دیہات اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے ذریعہ اشیائے صرفہ کی پیداوار بڑھاؤ اس سے سماج کے غریب تر طبقوں میں روزگار بڑھے گا اور آمدنی میں اضافے کا بڑا تناسب اُنھیں ملے گا۔ چہارم، دس سال کے بعد بے روزگاری کا خاتمہ کرو۔ زراعت کی پیداواری قوت بڑھاؤ، خصوصاً سماج کے غریب تر طبقوں کے لیے سماجی خدمات کا معیار بہتر بناؤ۔

پروگرام میں امپیریل بینک اور زندگی بیمہ کو قومیانے، اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن قائم کرنے، اور دولت، اخراجات اور سرمایہ جاتی منافع ٹیکس رائج کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ پروگرام کے تحت بچت بڑھانے کے لیے کھپت کو منضبط کرنے، قیمتوں پر کنٹرول کرنے اور اناج اور لازمی اشیائے صرفہ میں سرکاری تجارت شروع کرنے کو کہا گیا تھا۔

یہ وہ وقت تھا جب پنڈت نہرو نے خصوصاً جنوری ۱۹۵۹ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ناگپور اجلاس میں نہ صرف انسداد زمینداری سے آگے بڑھ کر اصلاحاتِ اراضی رائج کرنے پر زور دیا تھا بلکہ امداد باہمی کی بنا پر مشترکہ کھیتی باڑی پر بھی اصرار کیا تھا۔

اس سب سے مخالفت کا طوفان کھڑا ہوگیا۔ خود کانگریس کے اندر بھی مخالفت ہوئی جس سے انجام کار سوتنتر پارٹی کا قیام عمل میں آیا۔

پنڈت نہرو نے خصوصاً اس قرارداد کی تعمیل کے لیے وقت مقرر نہ کرکے اس حملے کے رُوبرو پسپائی اختیار کرلی۔ انھیں ایسا اس لیے کرنا پڑا کیونکہ وہ سماجی، سیاسی قوتوں کی لازمی کولیشن کی تنظیم اور شیرازہ بندی نہ کرسکے جو اس حملے کو پسپا کرسکتی اور منصوبے کی تعمیل کے لیے

قوت فراہم کرسکتی۔ افسر شاہی اور صرف حکمران پارٹی پر انحصار رہنے جس کے اندر خود ایک دوسرے کے دشمن عناصر تھے اس کا خاتمہ ہو گیا اور کئے کرائے پر پانی پھر گیا۔

جب کوئی کہتا ہے کہ وہ ضروری سماجی، سیاسی کولیشن کی تنظیم کرنے میں ناکام رہے تو اُسے ۱۹۵۹ میں کیرل کی وزارت کی برطرفی کا خیال آتا ہے جس کی قیادت کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ہاتھ میں تھی۔ جب کوئی کہتا ہے کہ وہ یہ کام نہیں کرسکے تو وہ اُس قسم کی مصیبت کا خیال کرتا ہے جو ۱۹۵۹ میں تبت کے مسئلہ نے پیدا کردی تھی۔

اس کے باوجود دوسرے منصوبے کا دستور کار تیسرے منصوبے (۱۹۶۱-۶۶) میں بھی موجود رہا۔ یہ جون ۱۹۵۹ کے مشہور اُوٹی سیمنار کے آغاز کے ساتھ ہی واضح ہو گیا تھا۔ اس سیمنار نے جس میں پنڈت نہرو نے شرکت کی تھی اس نظریہ کو مسترد کردیا کہ منصوبہ بندی کے عمل میں پیداوار میں تیزی لانے کے کام کو آمدنی کی ازسرِنو تقسیم پر فوقیت دی جائے۔ اُس نے اس امر پر زور دیا کہ منصوبوں کو ملک کو سوشلسٹ سماج کی اُس کی منزل کی جانب ایک قدم آگے لے جانا ہے۔ اس نے اس امر پر زور دیا کہ ادارتی تبدیلی کی تکمیل زرعی بچت اور فاضلات کی شیرازہ بندی کرنے کا نہائت مؤثر طریقہ ہے۔ اس سلسلے میں مشترکہ کوآپریٹو کاشت کاری، اناج کی سرکاری تجارت اور مزدوروں کے کوآپریٹو اداروں کو اہم مقام دیا گیا۔

بیرونی دباؤ

اس بار اس دستور کار کے خلاف حملہ عالمی بینک اور تمام پانسورتیم طاقتوں کی طرف سے کیا گیا جن میں امریکہ کی طرف سے اصرار کیا جا رہا تھا کہ اولیت زراعت کو دی جائے اور بھاری صنعت کو نہیں اور اس کے بعد اسی سلسلے میں اپریل ۱۹۵۹ میں فورڈ فاؤنڈیشن کی رپورٹ آئی جس کا عنوان تھا "بھارت کا غذائی بحران اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے اقدامات" اس نے چیدہ پسندیدہ شعبوں میں شدید ترقی کی پالیسی کے ساتھ ساتھ ادارتی دستور کار کے خلاف اعلیٰ تکنیکی دستور کار کی حمائت کی۔

ایک بار پھر منصوبے کو قطعی صورت دینے میں پہلے کی طرح کا سمجھوتہ ہوا۔ بنیادی دستور کار کو برقرار رکھا گیا اور شدید علاقائی ترقیاتی پروگرام کو پنچایت راج اسکیم کی توثیق کے ساتھ منتقی کردیا گیا۔ لیکن اصلاحات اراضی کی تکمیل، کوآپریٹو اداروں کی تنظیم یا اناج کی سرکاری تجارت شروع کرنے کے بارے میں وقت کا اعلان نہیں کیا گیا۔

تیسرے منصوبے کو درحقیقت تکمیل کے لیے کبھی وقت نہیں ملا۔ شدید سوکھے کے علاوہ چین اور پاکستان کے ساتھ جنگیں لڑی گئیں اور ان سب سے زیادہ تھی پنڈت نہرو کی علالت اور انتقال۔ لیکن وہ آخری دم تک موزوں طور پر ڈسٹرکٹ سطح کی منصوبہ بندی کی میراث چھوڑنے کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔

پبلک سیکٹر کی فوقیت

اس سلسلے میں جنوری ۱۹۶۴ میں کانگریس کے بھوبنیشور اجلاس میں جمہوریت اور سوشلزم کے بارے میں ایک قرارداد منظور ہوئی۔ اس قرارداد میں منصوبہ بندی کے متعدد گونہ مقاصد، تسلی بخش شرح افزائش، مضبوط صنعتی بنیاد، افلاس کے خاتمے اور سوشلسٹ سماج کے قیام پر زور دیا گیا۔ اس میں ۱۹۵۶ء کی صنعتی پالیسی سے متعلق قرارداد کی توثیق کی گئی، انفرادی آمدنی اور پرائیویٹ جائداد کی حد مقرر کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ اور دو برس میں اصلاحات اراضی کو مکمل کرنے اور دیہی علاقوں میں کھیتی باڑی کے مشترکہ کوآپریٹو ادارے قائم کرنے کی تلقین کی گئی تھی۔ چاول ملوں کو بتدریج سرکاری تحویل میں لینے کی تجویز کی گئی تھی اور اناج کی سرکاری تجارت، قیمتوں پر کنٹرول نافذ کرنے اور بینکوں کو سماجی کنٹرول میں لینے کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ پبلک سیکٹر کو بڑے پیمانے کی صنعت و تجارت، خصوصاً بھاری اور بنیادی صنعتوں اور اشیائے ضروریہ کی تجارت میں بتدریج ترقی کرنا لازمی ہے۔"

پنڈت نہرو کی موت سے منصوبہ بندی کی موت نہیں ہوئی لیکن اُس میں یقیناً تنزل اور گراوٹ آگئی۔ یہ سچ ہے کہ وہ اپنے عروج کے دنوں میں بھی ہماری معیشت کو حقیقتاً ایک منصوبہ بند معیشت میں منتقل نہیں کرسکے یہ زیادہ تر ایک مارکیٹ اور حق کو غیر منصفانہ معیشت رہی۔ منصوبوں کے مقاصد، اُن کے نشانوں اور مطلوبہ تعمیری نوعیت کی تبدیلیوں کو عمل میں نہیں لایا گیا۔ سوشلزم کا نعرہ جو اُس کے پرچم پر شان کے ساتھ چمک رہا تھا، مذاق کا موضوع بن کر رہ گیا۔

تاہم واضح ترقی ہوئی ہے۔ جمود کا شیطانی چکر ٹوٹ گیا ہے اور تعمیرو ترقی کی قوتیں حرکت میں آئی ہیں جو پرانی سرمایہ دارانہ نوعیت کی نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ رکھنے والی سامراج دشمن قومی ترقی کی قوتیں ہیں۔ بھارتی سماج مجموعی طور پر اپنے نوآبادیاتی ماضی کے مقابلے میں جمہوری جدوجہد کرچکا ہے گو وہ ایسے مرحلے پر ابھی نہیں پہنچا جسے سوشلزم کا راستہ کہا جاسکے۔ پبلک سیکٹر قریب قریب معیشت کی بلندی

پہنچ چکا ہے اور سپنلہ سوویت اقتصادی تعاون معیاری طور پر ایک نیا اور اہم عنصر بن گیا ہے۔

اس کے بعد بھارت میں منصوبہ بندی کے لیے مصیبت اور تباہی کے برس تھے۔ اس کا اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ چوتھے منصوبے کے مسودے کے خدوخال محض اگست ۱۹۶۶ میں ہی تیار کیے جا سکے۔

منصوبہ بندی کے عمل میں شکست و ریخت

مئی ۱۹۶۴ سے تب تک منصوبہ بندی کے عمل میں پیش قدمی اور ترقی کے عناصر کو ڈرامائی بلکہ المناک طور پر ترک کر دیا گیا۔

پلاننگ کمیشن غیر سرگرم ہو گیا کنٹرولوں سے رُخ موڑ کر بڑی بڑی تجارتوں کے لیے ترغیبات کی جانب توجہ دی گئی۔ سرمایہ کاری بنیادی صنعتوں سے ہٹا کر زراعت پر کی جانے لگی۔ نئی زراعتی پالیسی میں اس امر پر زور دیا گیا کہ آبپاشی کے رقبوں میں جدید داخلی اشیاء جیسے فرٹیلائزر وغیرہ کا استعمال کیا جائے۔ صنعتی سیکٹر میں پرائیویٹ بھارتی اور غیر ملکی سرمایہ کاری کے کردار کی توسیع کی گئی۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی میں مطلوبہ تیزی نہیں آئی اور نابرابریوں میں بھاری اضافہ ہوا۔

پلاننگ کمیشن کی اور اُس کے لیے بنائی گئی مزدوری مشینری رفتہ رفتہ ٹوٹنے لگی۔ اب وہ اقتصادی امور سے متعلق ایک قومی پالیسی ساز جماعت نہیں رہی بلکہ ماہرین کی مشاورتی کمیٹی بن گیا۔ اس سے بھی زیادہ قابلِ رحم بات یہ تھی کہ پلاننگ کمیشن نے جس کی از سرِ نو تشکیل پروفیسر ڈی آر گیڈگل کی قیادت میں ہوئی تھی؛ چوں چراں کیے بغیر اپنے لیے اس گھٹے ہوئے کردار کو منظور کر لیا۔

منصوبوں کی عدم تعمیل

سالانہ منصوبوں کے تین برس (۱۹۶۶ - ۶۹) ایسے برس تھے جن میں درحقیقت پلان پر عمل نہیں کیا گیا اور جن میں معیشت کے لیے محض نوآبادیاتی طرز کا بجٹ بنانے کے سوائے کچھ نہیں کیا گیا۔ ضمناً مجھے طویل عرصے سے خیال آ رہا ہے کہ جب پارلیمنٹ اپنے طویل ترین اجلاس میں پانچ سالہ منصوبے پر بحث کرتی ہے تو کیا ایوان میں کورم بھی ہوتا ہے۔

چوتھے پانچ سالہ منصوبے (۱۹۶۹) کا نیا مسودہ اسی حالت میں تیار کیا گیا۔ اس میں استحکام کے ساتھ ترقی کے لیے کہا گیا، ترقی کی خاطر نابرابریوں کو قبول کیا گیا۔ پبلک سیکٹر کی پہلکاریوں پر زیادہ سے زیادہ انحصار کیا گیا، صنعت اور معدنیات میں طویل ترین کٹوتیوں کی ہدایت دی گئی اور "مارکیٹ کو پوری طور پر کھل کھیلنے کی چھوٹ دی گئی۔

چوتھے منصوبے پر جلد ہی سیاسی میدان کے واقعات کا غلبہ ہو گیا جو ۱۹۶۹ میں اپنے عروج پر پہنچے اور ایسے واقعات کے سلسلے کو حرکت میں لائے جو ۱۹۷۵ کے ہنگامی حالات اور ۱۹۷۷ میں جنتا کی فتح کے باعث بنے۔ ۱۹۷۴ میں اس کا خاتمہ ہو گیا جسے نہ کسی نے جانا اور نہ کسی نے آنسو بہائے۔

قیمتوں کا استحکام اور پانچواں منصوبہ

اس سے پہلے پانچویں منصوبے کی نظریاتی دستاویز میں جو مئی ۱۹۷۲ میں ظہور میں آئی، بعض قسم کی تبدیلی یا نہرو مہالانوبس دستورِ کار کی تنسیخ دیکھی جا سکتی تھی۔ اس میں "سوشلسٹ خطوط پر ترقی کے لیے کہا گیا تھا کہ تاکہ اقتصادی ترقی اور روزگار کی رفتار تیز تر ہو۔ آمدنی اور دولت میں نابرابری کی کمی ہو، اقتصادی طاقت چند ہاتھوں میں جمع نہ ہو اور ایک آزاد اور مساوی سماج کے لیے اقدار اور رجحانات کی تخلیق ہو۔" اس میں ایک ایسی پالیسی اختیار کرنے کو کہا گیا تھا جو انسدادِ افلاس کے مقصد سے براہِ راست تعلق رکھتی تھی اس میں گیہوں اور چاول کی تھوک تجارت کو سرکاری ہاتھوں میں لینے اور اناج اور دیگر اشیائے ضروریہ کی سرکاری تجارت کی ایک جامع اسکیم کو عمل میں لانے کی تلقین کی گئی تھی۔ اس کے تحت معیاری کپڑے، چینی اور خوردنی تیلوں کی وصولی اور پبلک تقسیم کی جانی تھی۔ یہ سب کچھ قیمتوں میں استحکام لانے کا ایک ذریعہ تھا۔

صنعتی پیداوار کو اعلیٰ طبقے کی اشیائے صرف کے بجائے عوامی اشیا کی صورت اختیار کرنا تھی اور اس کے ساتھ ہی سماجی کھپت یعنی تعلیم، صحت، پینے کے پانی اور مکانوں وغیرہ کو عوام کی زیادہ سے زیادہ پہنچ کے اندر لانا تھا۔

اس میں براہِ راست ٹیکسوں سے ہونے والی کم آمدنی کو بڑھانے اور شہری جائداد اور زرعی آمدنی پر ٹیکس لگانے کو کہا گیا تھا۔ اس میں زمینی ملکیت کی مناسب حد مقرر کرنے اور سروس کوآپریٹوں کے قیام پر زور دیا گیا تھا۔

لیکن پانچویں منصوبے کی تقدیر میں کبھی سر چڑھنا نہیں لکھا تھا۔ اس کا مسودہ جو ڈی پی دھر کی زیرِ ہدایت مکمل ہوا تھا، اُن کے جانشین پی این ہکسر کی طرف سے زائد المیعاد قرار دیا گیا۔ اس کا قطعی مسودہ (جو ۱۹۷۴ سے ۱۹۷۹ کے برسوں کے لیے تھا) ۱۹۷۶ میں شائع کیا گیا۔ گرچہ اصل مسودہ کی پالیسی کے لحاظ سے ایک غیر موثر صورت تھی تاہم اس میں تکنیکی سوشلزم کے

اعلیٰ ترین سطح پر نہرو۔ مہالانوبس ڈھانچے کی طرف لوٹنے کو کہا گیا تھا۔ اس سب میں پروفیسر لکشمن سوسنے چکرورتی کا بڑا ہاتھ تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ کچھ کیا جا سکے اس پر ۱۹۷۷ کا سایہ پڑا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی منصوبے کو منظور کرانے کے لیے انہیں دباؤ کی وجہ سے زبردست کوششیں کرنا پڑتی تھیں جو وزیر اعظم اندرا گاندھی پر بڑھ گیا تھا۔

اس کے بعد "رولنگ پلان" شروع کیا گیا۔ لیکن اس سے بھی نہ کچھ بن پایا اور اسے بھی ۱۹۸۰ تک لپیٹ کر رکھ دیا گیا۔

چھٹا منصوبہ بحالی کی جانب

چھٹا منصوبہ اس لحاظ سے خوش قسمت تھا کہ وہ اپنے پورے عرصے تک کام کر سکا، اپنی قومی آمدنی کی شرح افزائش کے تقاضے اور اپنے بعض مادی اور اخراجاتی نشانے پورے کر سکا۔ لیکن یہ کسی نئی ترقی یا پس روی کے لحاظ سے کوئی خصوصی امتیازی منصوبہ نہیں تھا۔ شاید اسے اس لیے بہترین بیان کیا جا سکتا ہے کہ یہ بحالی کا منصوبہ تھا اور یہ اس لحاظ سے بھی اہم تھا کہ ۱۹۷۴ کے بعد اس نے اپنی تمام تر محدودیت کے ساتھ منصوبہ بندی کے مستحکم عمل کو شروع کیا۔

پلاننگ کمیشن کی کسمپرسی

منصوبے میں اگرچہ ترقی اور بحالی کے کچھ آثار دیکھنے کو ملے لیکن منصوبہ بندی کمیشن کے ضمن میں ایسا کچھ دیکھنے کو نہیں ملا۔ ایسی بات نہیں کہ اس کے ارکان ممتاز اور مشہور نہ ہوں لیکن بات دراصل یہ تھی کہ ۱۹۶۰ کے وسط سے منصوبے کی شکست و ریخت کا جو عمل شروع ہو چکا تھا، اس سے باہر آنا ابھی تک ممکن نہ ہو سکا۔ پلاننگ کمیشن اس مقام پر واپس نہیں آیا اور شاید کبھی آ سکتا ہے جہاں وہ تھا اور جہاں پنڈت نہرو کے زمانوں میں اتنا کچھ کیا جا سکا تھا۔ اس قدر اقتدار اور وقار دوبارہ حاصل کیے بغیر منصوبوں کی تشکیل اور حتیٰ کہ تعمیل بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن منصوبہ بندی تاریخی تحقیق کا معاملہ بنا رہیگا اور کمیشن تاریخ سازی کے ایک کلیدی ادارہ کی صورت اختیار نہیں کر سکے گا۔

ساتواں منصوبہ باقاعدہ طور پر تیار ہو چکا ہے گو وہ ابھی تک مسودہ کی صورت میں ہے۔ کم از کم یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں نہ ہی عوام کو اور نہ ہی کسی دوسرے کو دلچسپی ہے۔ اس کے دوسرے محاسن کچھ بھی ہو سکتے ہیں لیکن منصوبہ بندی کے عمل کی پیش قدمی اس میں شامل نہیں ہے۔

منصوبہ بندی پر اختلاف رائے زیادہ تر اس کے اقتصادی پہلوؤں پر مرکوز ہوتا ہے یعنی کل ملکی پیداوار کی شرح افزائش، فی کس آمدنی کی سطح، بچت اور سرمایہ کاری کے تناسب اور سرمایہ۔ پیداوار کی شرح وغیرہ پر۔ یہ بحث زیادہ تر بے معنی ہے کیوں کہ کوئی بھی زیادہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ ان میں سے کتنا منصوبے کے باعث ہے اور کتنا افزائش کے خودکارانہ عمل سے ہوا ہے۔ یہ واضح نہیں ہے کہ رہنمائی کرنے والے ہاتھ کو کتنا کریڈٹ دیا جائے اور غیر مرئی ہاتھ کو کتنا۔

لیکن نتیجے کے طور پر دو نکات پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ناقص اور منطقی طور پر ان دونوں کا تعلق منصوبہ بندی کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے ہے۔

ایک نتیجہ یہ ہے کہ سماجی طور پر اور تنگ تر اقتصادی معانی میں جو تعمیری تبدیلیاں ہمارے ملک میں حصولِ آزادی کے بعد عمل میں آئی ہیں، وہ اہم ہیں لیکن کافی نہیں ہیں۔ اس کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ ہمارے منصوبے درست طور پر ۱۹۶۴ کے سماجی، اقتصادی پراجیکشن تک محدود رہے۔ بھارت کی کایا پلٹ نہیں ہوئی ہے اس کی وجہ سیاسی عزم کا فقدان نہیں ہے بلکہ بھارت کے منصوبہ ساز کایا پلٹ کرنے میں غیر آمادگی اور ہچکچاہٹ سے کام لے رہے ہیں۔

دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ درست منصوبہ بندی خواہ جو کم کی گئی تھی اور نہرو۔ مہالانوبس ماڈل میں تجویز کی گئی تھی اور اس میں موجود تھی وہ درحقیقت کبھی بھی عمل میں آنے کا موقعہ نہیں پا سکی۔ اس کی زیادہ سے زیادہ زندگی سات برس رہی جس کے بعد جنگ اور پنڈت نہرو کی موت نے اسے ٹھکانے لگا دیا۔ وہ ناکام ہو گئی کیوں کہ سماجی، سیاسی قوتوں کا اتحاد اور کولیشن کبھی عمل میں نہیں آیا اور کسی نے بھی کبھی اس کی تعمیر کی کوشش نہیں کی۔ اس کے باوجود منصوبہ بندی نے اس کولیشن کی تعمیر کے امکانات بڑھا دیے ہیں جس کے پروگراموں کا ایک بڑا ستون منصوبہ بندی کی تجدید اور پیش قدمی ہے۔

عالم الیس ادی سیشیہ

منصوبہ بندی
کارگزاری کی تاریخ کے آئینے میں

منصوبہ بندی کی ۴۵ سالہ تاریخ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اب اس امر پر غور و خوض ضروری ہے کہ کیا ایک چھوٹا منصوبہ جس میں اغراض ومقاصد کو بہت صاف صاف بیان کر دیا گیا ہو اور جس کے نشانے قابل حصول ہوں، منصوبہ بندی کے ایک ایسے پروگرام کے مقابلے جہاں کہ منصوبہ میں وسائل دوگنے ہو جاتے ہوں اور نشانوں کا حصول کم ہوتا چلا گیا ہو، قابل ترجیح ہے۔ مقررہ نشانوں اور ان کی حقیقی تکمیل کے درمیان فرق بڑھتا جا رہا ہے۔ چھٹے منصوبے میں خوراکی اجناس، کچے تیل، اور آبادی کو چھوڑ کر دیگر تمام معاشی شعبوں اور ذیلی شعبوں میں حاصل شدہ کامیابیاں مقررہ نشانوں سے کم رہی ہیں۔

منصوبہ بندی کی تاریخ بتاتی ہے کہ جو پارٹی الیکشن جیت لیتی وہ اپنے الیکشن مینی فیسٹو میں شامل کیئے گئے اقتصادی مسائل اور ان کے حل کی تفاصیل کا رُخ پنجسالہ منصوبوں کے اغراض ومقاصد کی رُخ موڑ دیتی ہے۔ یہ صورتِ حال اس سے مختلف ہے جو پنجسالہ منصوبوں کے اغراض ومقاصد کے بارے میں موٹے طور پر پہلے منصوبے کے آغاز پر بیان کی گئی تھی۔ اس میں مذکور تھا کہ "بھارت میں منصوبہ بندی کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ترقی کا ایسا عمل شروع کیا جائے جس سے معیارِ زندگی بلند ہو سکے اور جس سے عوام کے سامنے نئے مواقع آ سکیں اور جس سے وہ اپنی زندگی کو زیادہ متنوع اور مالا مال کر سکیں۔ ترقی کا عمل سماج کے پاس دستیاب اور امکانی وسائل کو بروئے کار لانے سے متعلق ہے۔ اس کا نام اقتصادی منصوبہ بندی ہے۔ دوسرے منصوبے میں اغراض و مقاصد کو ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا۔ اس میں اغراض ومقاصد کے تحت آمدنی میں اضافے، صنعت کاری کے عمل میں اضافہ، بھاری صنعتوں پر زور، روزگار کے مواقع بڑھانے پر زور اور بے روزگاری گھٹانے کی کوششوں کا ذکر کیا گیا۔ تیسرے منصوبے میں یہ بات اور آگے بڑھائی گئی۔ چنانچہ اس منصوبے کے مقاصد میں درج ذیل باتوں کو شامل کیا گیا ہے:۔

۱۔ ۵ فیصد سالانہ ترقی۔
۲۔ خوراکی اجناس میں خود کفیل۔
۳۔ صنعت کاری کے عمل کو دس سال کے اندر اندر وسعت دینے کے خیال سے بنیادی صنعتوں اور صنعتی ڈھانچے کی توسیع۔
۴۔ روزگار کے مواقع میں توسیع۔
۵۔ آمدنی اور دولت میں نابرابری کو کم کرنا۔

۶۔ چوتھے منصوبے میں استحکام اور خود کفیل پر زور دیا گیا۔ اس میں بھرپور آبپاشی کے ذریعے کاشت اور زراعت میں اضافے اور بنیادی نوعیت کی صنعتوں کی جدید کاری پر زور دیا گیا۔ اس میں اقتصادی قوتوں کے ارتکاز کو کم کرنے کے

زور دیا گیا اور ترقی کے فائدوں کو یقینی بنانے کی کوشش کی گئی تاکہ ان کی تقسیم منصفانہ طور پر عمل میں آسکے۔

پانچویں منصوبے میں غریبی دور کرنے اور خود کفیل و خود انحصاری حاصل کرنے پر زور دیا گیا۔ اس میں زراعت، نیم مصنوعہ مال تیار کرنے والوں، اہم صنعتوں اور تعلیم یافتہ طبقے کو روزگار دلانے کی کوششیں کی گئیں، چھٹے منصوبے میں دس مقاصد واضح کئے گئے۔ ان کا تعلق سریع تدریجی ترقی کے عمل سے لیکر عوامی شرکت تک کے پروگراموں سے تھا۔ ساتویں منصوبے میں زرعی پیداوار بڑھانے، روزگار کے مواقع بڑھانے، پیداواری صلاحیت بڑھانے وغیرہ وغیرہ پر خاص زور دیا جا رہا ہے۔

جائزہ

اس کے ساتھ ہی منصوبہ بندی سے ایک اور سبق جو سیکھنے کو ملا، وہ یہ کہ پنجسالہ منصوبے کے آغاز سے قبل معیشت کی کارکردگی کا اندازہ ضروری ہے تاکہ پیش نظر منصوبے کے لیے وسائل کو فراہم کرنے میں آسانی رہے۔ اس کے لیے ان گوشوں کی نشاندہی ضروری ہے جن پر زور دیا جانا چاہیئے۔ اس موقع پر ضروری تبدیلیوں پر سوچ بچار کر لینا چاہیئے نیز اُن گوشوں کی بھی نشاندہی ہونی چاہیئے جن پر مقابلتہً کم زور رہے گا منصوبہ بندی کے تحت وسط مدتی جائزہ ضروری ہے تاکہ نشانوں کی تکمیل، سرمایہ کاری وغیرہ کے خیال سے ضروری تطبیق عمل میں آسکے۔

اس طرح ساتواں منصوبہ شروع کرتے وقت سابقہ تجربوں کی بنیاد پر درج ذیل امور پیش نظر رہنے ضروری ہیں :۔

۱۔ نشانے زیادہ حقیقت پسندانہ انداز میں قائم کئے جائیں، پبلک سیکٹر میں ضرورت سرمایہ کاری حقیقت پسندانہ انداز میں کی جائے۔ سرمایہ اور اس کے تناسب سے حاصل ہونے والی پیداوار کے نشانوں میں تیزی لائی جائے بنیادی سامان کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے، صلاحیت کا پورا پورا استعمال کیا جائے۔ انتظامی صلاحیتوں کو بڑھایا جائے، بچتوں میں اضافہ کیا جائے۔ ثانوی حیثیت کی صنعتوں میں جدید کاری کو فروغ دے کر گزشتہ ۳۵ برسوں میں قومی آمدنی میں اس کا حصہ ۱۸٫۸ فیصد سے بڑھا کر ۲۹٫۹ فیصد کر دیا گیا ہے اور اس میں پبلک سیکٹر کی طرف سے اضافہ ۱٫۸ فیصد سے بڑھ کر ۲۸٫۹ فیصد ہوا ہے۔ زرعی ٹکنالوجی میں نیاپن لاکر کئی محاذ پر کامیابیاں حاصل کی گئی ہیں مثلاً زیر کاشت رقبے میں اضافہ، پیداوار میں اضافہ، فصلوں سے حاصل ہونے والی پیداوار بحساب فی ہیکٹیر میں اضافہ نیز ان کے ساتھ ہی انسانی وسائل کے فروغ میں اضافہ ہو سکا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اب تک کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ سرمایہ منڈی کی تنگی کو درست کرنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ مختلف شکلوں میں موجود مالیاتی ادارے اور ان کے مفوضہ امور کے درمیان عدم توازن کو دور کیا جانا بھی ضروری سمجھا گیا ہے۔ درآمدات و برآمدات، غیر ملکی وسائل کے اندرونِ ملک داخلہ کے عدم توازن کے سبب نیز تجارتی شرطیں غیر موافق ہونے، قرضہ، سروس تناسب میں اضافہ ہونے کے سبب خود کفیلی لانے سے متعلق پالیسی پر عمل درآمد نظرثانی چاہتا ہے تاکہ اسے زیادہ موثر انداز میں لاگو کیا جاسکے۔ سماجی انصاف کو بڑھانے کا ریکارڈ بھی خراب ہے کیونکہ بجٹی فی کس اوسط کھپت میں اضافہ بحیثیت مجموعی ۴۶ فیصد ہے جبکہ دیہی غریب عوام میں یہ اضافہ صرف ۱۴ فیصد اور غریب شہری عوام میں یہ صرف ۳ فیصد ہے۔ دیہی علاقوں میں ۵۱ فیصد سے زیادہ لوگ اب بھی غریبی کی سطح سے نیچے ہیں جبکہ شہری علاقوں میں ۳۸ فیصد لوگ غریبی کے خط سے نیچے ہیں۔ وسط مدتی جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فولاد، کوئلہ، آبرسانی، خوراکی اجناس اور غیر آہن آمیز دھاتوں کی پیداوار کم ہوئی۔ سولہ دیگر شعبوں میں پیداوار میں کمی دیکھنے کو ملی۔ چنانچہ اہم معاشی شعبوں میں پبلک سیکٹر کی سرمایہ کاری میں اضافہ کا فیصلہ کرنا پڑا۔

منصوبہ بندی کی مختلف سطحیں

منصوبہ بندی کے گزشتہ ۳۵ برسوں کے تجربے سے ایک بات یہ سامنے آتی ہے کہ اس سلسلے میں جو نمونے تیار کئے گئے، ان میں جدید ترین نظام اور پیچیدگیوں کو زیادہ سے زیادہ شامل کرنے کی کوشش کی گئی چنانچہ معیشت کے مختلف سیکٹروں کو آنکنے کے لیے مختلف کمپیوٹری نظاموں سے مدد لی گئی۔ ان کا آغاز ۲۴×۲۴ ماڈل سے ہوا اور پھر ۶۰×۶۰ اور اس کے بعد ۸۰×۸۰ کے ماڈل کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ معیشت کے شعبے میں آنے والی کئی ہزار صنعتوں اور پیشوں کو تیز رفتار کمپیوٹروں کی مدد سے جانچنے کی کوشش کی گئی۔ ان کے ذریعے ترقی کے عمل کو متوازن بنانے کی کوشش کی گئی اور مطلوبہ سیکٹروں اور صنعتوں کو دوسروں کی بہ نسبت زیادہ تیزی سے آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی اور کھپت کے بدلتے ہوئے پیمانوں کے بارے میں پیش گوئی کی گئی۔ منصوبے کے باب دوم میں دس تا پندرہ سال کے عرصے کو سامنے رکھ کر اندازے پیش کئے گئے اور باب سوم میں ۵ سال کے عرصے کو سامنے

بعد عوامی سیکٹر کے پیداواری نشانے رکھے گئے ان ماڈلوں کو مزید تیز کرنے کی ضرورت ہے تاکہ جدید ترین پیش رفتوں کا بھی احاطہ کیا جا سکے مثلاً بمبئی ہائی میں تیل کی تلاش اور دریافت ، نئی زرعی ٹکنالوجی جس کی رُو سے زراعت ، ماڈل میں آنکی گئی ترقی کے مقابلے زیادہ تیز رفتاری سے پیداوار دے گی ۔ اس نظام میں پیداواری صلاحیت کی کمی کو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا جو کہ بڑھتے ہوئے سرمایہ ۔ پیداوار تناسب سے واضح ہے اور جس کی وجہ سے پیداوار کی عملی شرح کے بارے میں قبل از وقت کہنا دشوار ہوتا ہے ۔

چھٹے منصوبے میں خوراکی اجناس ، خام تیل اور آبادی کو چھوڑ کر ، دیگر تمام سیکٹروں اور ذیلی سیکٹروں میں حاصل شدہ کامیابیاں مطلوبہ نشانوں سے کم ہیں ۔ اس کا ایک سبب جس پر سبھی کا اتفاق ہے ، وہ یہ کہ منصوبہ بندی میں لامرکزیت نہیں ہے اور اسے نچلی سطح پر شروع نہیں کیا گیا ہے ۔ اسی لیے علاقائی ، ریاستی اور ضلع واری سطح کی ترقی کے لیے ماڈل مرتب کئے جا رہے ہیں ۔ یہ عمل پبلک اور پرائیویٹ ہر دو سیکٹروں میں جاری ہے ۔ علاقائی اور ریاستی سطح پر کارکردگی اور پبلک سیکٹر کے دو ذیلی معیار قائم ہیں ۔ ان کے ساتھ ہی ریاستوں کے مابین سامان کی ترسیل کی صورت حال بھی جڑی ہے ۔ ضلع اور مقامی سطح پر یہ ماڈل ضلع کی اپنی گھریلو پیداوار پر توجہ مرکوز کرتا ہے اور اس کا جائزہ لیتے وقت غریبی ، بے روزگاری اور نابرابری کے پہلوؤں کو سامنے رکھتا ہے — " چیو کوڈنگ " کے ذریعے ان اعداد و شمار کو اکٹھا کر لیا جاتا ہے ۔ ریاستی سطح سے کم سطح پر اس طرح کے ماڈلوں کے استعمال کے امکانات پر غور ہو رہا ہے ۔ منصوبہ بندی کے تجربے کی روشنی میں ضلع / بلاک کی سطح کی منصوبہ بندی کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے ۔ چنانچہ اس ادنیٰ سطح کی منصوبہ بندی کو اہمیت حاصل ہو رہی ہے ۔

نشانوں کا تعین اور ترقی معکوس

منصوبہ بندی سے ایک اور یہ سبق ملا ہے کہ قومی سطح پر آمدنی کا نشانہ ۳۵ برسوں میں ۵ فیصد سالانہ کی شرح سے رہا ہے ۔ اور فی کس این این پی کا اندازہ ۲ فیصد لگایا گیا ہے ۔ لیکن حقیقت میں یہ نشانے ۵ ر ۳ فیصد سالانہ کے حساب سے ہی پورے کئے جا سکے ہیں جیسا کہ این این پی کے رجحان سے واضح ہے ۔ ساٹھ کی دہائی میں فی کس سالانہ آمدنی کا اوسط ۵۶ ر ۱ فیصد اور ستر کی دہائی میں ۲۲ ر ۱ فیصد رہا ہے ۔ اس طرح یہ نشانے نہ صرف یہ کہ پوری طرح پورے نہیں کئے جا سکے بلکہ ستر کی دہائی میں ۶۰ کی دہائی کی بہ نسبت ترقی معکوس دیکھنے کو ملتی ہے ۔ ساٹھ کی دہائی میں خوراکی اجناس کے معاملے میں فی کس ۵۸ ر ۱ فیصد کی شرح ترقی ستر کی دہائی میں ۷ ر ۰ فیصد گھٹ گئی ۔ آج خوراکی اجناس کے ذخیرے بڑھ کر ۳ کروڑ ٹن تک پہونچ چکے ہیں ، لہٰذا اس ۸۰ والی دہائی میں فی کس اناج کی کھپت کا اوسط بڑھ جانا چاہیئے ۔ ہندوستان سے اناج باہر بھیجنے سے قبل اس بات پر زور ہے کہ یہاں کم تغذیہ بخش خوراک اور ناقص خوراک کا سدباب ہو سکے ۔ اسی طرح بجلی کی پیداوار جو ساٹھ کی دہائی میں فی کس ۸ فیصد سالانہ کے حساب سے بڑھی تھی ، وہ ستر کی دہائی میں گھٹ کر فی کس سالانہ ۴ ر ۴ فیصد رہ گئی ۔ مصنوعات کے زمرے میں اضافہ شدہ قیمت میں ۱۶ ر ۵ فیصد کی بڑھوتری ساٹھ کی دہائی میں نظر آتی ہے مگر وہ ستر کی دہائی میں گھٹ کر ۱۳ ر ۴ رہ گئی ۔ تعلیم بالغان کے شعبے میں خواندگی کی شرح جو ۱۹۶۱ میں ۲ ر ۲۴ فیصد تھی ، وہ بڑھ کر ۱۹۷۱ میں ۸۴ ر ۲۹ اور ۱۹۸۱ میں ۲۳ ر ۳۶ فیصد ہو گئی لیکن ناخواندہ افراد کی تعداد ۱۹۶۱ میں ۳۳ کروڑ ۷۰ لاکھ تھی جو بڑھ کر ۱۹۷۱ میں ۳۸ کروڑ ۷۰ لاکھ اور ۱۹۸۱ میں ۴۴ کروڑ ۲۰ لاکھ ہو گئی ۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ منصوبے میں محض اقتصادی ترقی کے لیے ہی کام نہیں ہوا بلکہ اس میں متعدد مقاصد کو پیش نظر رکھا گیا ۔ مثلاً دولت کی ازسرِ نو تقسیم ، روزگار کی فراہمی ترقی ، بنیادی ضرورتوں کی تکمیل ، انسانی وسائل کا فروغ اور اقتصادی توازن وغیرہ ۔

بُنیادی ڈھانچہ کا فروغ

منصوبہ بندی سے ایک اور سبق یہ ملا کہ سرکار کو بنیادی ڈھانچہ کو فروغ دینا ہے ۔ اس لیے کہ اس کے لیے بھاری سرمایہ کاری درکار ہے اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج بھی فوری نہیں ہیں بلکہ ان کے لیے بھی ایک عرصہ درکار ہوتا ہے ۔ سڑکوں کی تعمیر ، ریلوں کو چلانا ، بجلی ، خام تیل کی پیداوار ، پیٹرولیم کی مصنوعات کی تیاری ، جہاز رانی ، لوہے اور فولاد کی صنعت ، غیر آہن آمیز دھاتوں کی حصولی اور کوئلہ وغیرہ اسی زمرے میں آتے ہیں ۔ دنیا میں بھاری صنعتوں کو شامل کر کے ان سب کو پبلک سیکٹر کا نام دیا جاتا ہے ۔ ان مدات پر ہونے والے اخراجات پبلک سیکٹر کے مصارف کہے جاتے ہیں ۔ ہمارے ملک میں چھ پنجسالہ منصوبے تکمیل پا چکے ہیں ۔ اس دوران اس حقیقت کو سامنے رکھا گیا کہ بھاری صنعتوں کے ضمن میں خود کفیل سے ملک بڑی حد تک اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہو سکے گا ۔ اگر یہ فیصلے اس انداز فکر کے ساتھ نہ کئے گئے ہوتے تو بصورت دیگر ہمارا ملک دیگر ترقی پذیر ملکوں کی طرح سے

ہی چل رہا ہوتا۔ (کبھی کبھی ہندوستان کو ان کی مثال دے کر کہا جاتا ہے کہ یہاں بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا)۔ یہ ممالک کم سرمایہ والی اشیاء کی تیاری پر توجہ دیتے ہیں۔ یہ کام کو اشیائے صارفین کو جوڑنے اور انھیں حتمی شکل میں پیش کرنے تک ہی محدود رکھتے ہیں جبکہ نیم مصنوعہ مال باہر ملکوں کے اشتراکِ عمل سے تیار کیا جاتا ہے اور اکثر اسے پرزوں کی شکل میں باہر سے منگایا جاتا ہے اور اپنے یہاں اُن کو صرف پیچ کش سے کس لیا جاتا ہے۔ یہ ممالک بھاری مشینیں باہر ملکوں سے ہی منگاتے ہیں۔

منصوبہ بندی کے آغاز سے قبل ہمارے ہندوستان میں فولاد ساز کارخانہ صرف ایک تھا اور بھاری صنعتوں سے تعلق رکھنے والی مشینری کی تیاری کا کوئی ذکر ہی نہ تھا لیکن ملک میں بھاری صنعتوں کے فروغ سے خود کفیل بننے کی راہ پر آگے بڑھنے میں مدد ملی ہے اور زرعی ترقی نیز مینو فیکچرنگ صنعتوں کے درمیان تعلق بڑھا ہے اور اسی طرح مال کی تیاری سے متعلق مختلف سیکٹروں اور ذیلی سیکٹروں کے درمیان رابطہ کو فروغ ملا ہے۔

غریبی دُور نہیں ہو سکی

منصوبہ بندی سے ایک سبق یہ ملا کہ غریبوں کی تعداد بڑھی۔ کل آبادی میں ان کا فیصد تناسب، ان کی تعداد، ان کی حالت، ان کی آسائشیں اور غریبی دور کرنے کے اقدامات، ان کے معیارِ زندگی بلند کرنے کے اقدامات، یہ سب امور موجبِ تشویش ہیں۔ ایسے اقدامات پہ زور رہا ہے کہ ان کا معیارِ زندگی عام انسانی زندگی کے معیار تک پہنچ سکے۔

اگرچہ ملک سے غریبی دور کرنے کی بات دادا بھائی نوروجی کے وقت سے کی جاتی رہی ہے، اور اگرچہ ملک میں منصوبہ بندی کے آغاز کے وقت سے ہی اس پہلو کو سامنے رکھا گیا ہے، اور اگرچہ تناظرِ منصوبہ بندی کے شعبے میں ماہرینِ اقتصادیات اور سرکار افراد کو ۱۹۶۲ء میں ایک ساتھ بٹھا کر غریبی کی تعریف واضح کی گئی تھی جس کی رُو سے وہ لوگ غریب قرار دیئے گئے جن کی دیہات میں روزمرّہ کی خوراک میں فی کس ۲۴۰۰ کیلوری شامل نہ ہوں جبکہ شہروں میں وہ آبادی غریب قرار دی گئی جن کی یومیہ خوراک میں ۲۱۰۰ کیلوری شامل نہ ہوں اور جس تعریف کی روشنی میں دیہات میں ۲۰ روپے فی کس سے کم ماہانہ اخراجات والے افراد نیز شہروں کو ۲۵ روپے ماہانہ سے کم اخراجات والے افراد غریب قرار دیئے گئے۔

گزشتہ ۳۵ برسوں میں (اُس وقت اشیاء کی قیمتیں ۱۹۶۰ کے پیمانے سے لگائی گئی تھیں)۔ اس تعریف کو سامنے رکھ کر غریب افراد کی تعداد ۳۰ کروڑ سے زیادہ رہی۔ اس عرصے میں بالغ ناخواندہ افراد کی تعداد بھی بڑھی اور پرائمری تعلیم درمیان میں چھوڑ دینے والے طلبا کی تعداد بھی بڑھی! اس کا سبب خاص طور پر یہ رہا کہ ملک میں غریبی دوُر کرنے کے اقدامات پر پوری طرح عمل درآمد نہ ہو سکا۔ ۵۰-اور ۱۹۶۰ کے دہے میں منصوبے میں ترقی پر زیادہ زور رہا۔

۱۹۷۰ کے دہے میں آغاز سے غریبی دُور کرنے کے مسئلے پر زیادہ توجہ دی گئی اور زراعت نیز اشیاء کی تیاری میں، ترقیاتی پروگراموں کے علاوہ پانچویں منصوبے سے یہ کوشش کی گئی کہ پروگرام اس نوعیت سے وضع کئے جائیں کہ ان کا فائدہ صحیح معنوں میں انھیں کو مل سکے جن کے لیے وہ وضع کئے گئے ہیں۔ اس مقصد کے تحت اشیائے صارفین کی تیاری بڑھائی گئی، چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو بڑھاوا دیا گیا تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار مل سکے، اصلاحات اراضی پر زور رہا۔ ان کے علاوہ دیہات میں روزگار کی فراہمی کا قومی سطح والا پروگرام، دیہات کی مربوط ترقی کا پروگرام، دیہی نوجوانوں کو تربیت دے کر ان کو روزگار دلانا اور دیگر بہت سے پروگرام تیزی سے آگے بڑھائے گئے۔

عمل درآمد میں کمی

پروگراموں کی تشکیل اور ان پر عمل درآمد کی کمی بھی اس عرصے میں واضح نوعیت سے سامنے آئی۔ سابق میں سیکٹروار، قومی سطح پر اور ریاستی سطح پر نشانے متعین کئے گئے۔ مگر پالیسی پر عمل درآمد کے لیے یہ نشانے سیاسی سطح پر متعین کئے گئے۔ ایک طرف مختلف ماڈلوں کے ذریعے ترجیحات اور پروگراموں کا سلسلہ تھا تو دوسری طرف منصوبوں پر عمل درآمد کی رفتار بہت کم تھی۔ دوسرے پنجسالہ منصوبے سے منصوبے پر عمل درآمد اور اس کے نظم ونسق کے بارے میں الگ سے ایک باب شامل کیا گیا ہے لیکن اس نے نشانوں کی تکمیل کے لیے کوئی خاص اثر نہیں دکھایا ہے۔ اس کے مختلف اسباب ہیں۔ منصوبے کے اصولوں کا اطلاق سرکار کے زیرِ اہتمام چلنے والے اقتصادی سیکٹر پر ہوتا ہے، خواہ وہ مرکزی سرکار کے تحت ہوں یا ریاستی سرکار کے۔ مگر یہ مجموعی معیشت کے صرف ۲۰ فیصد کے برابر ہے۔ باقی ۸۰ فیصد اقتصادی سرگرمیوں کے لیے بالواسطہ تکنیک اپنائی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ قیمتوں کو سہارا دینا، ٹیکسوں کی ادائیگی کے لیے رعائتیں دینا، غیر ملکی زرِ مبادلہ الاٹ کرنا، درآمد شدہ سامان کو ترجیح دینا وغیرہ، ان کا نظم ونسق ٹھیک ڈھنگ سے نہیں ہو پاتا بلکہ اس سے "کالے سیکٹر" کو بڑھاوا ملتا ہے۔ اس سے مختلف طرح کی کورپشن اور تقنیع دیکھنے کو ملتی ہے۔

حتیٰ کہ خود سرکاری اقتصادی سیکٹر میں بھی

کبھی اس منافع کو سامنے نہیں رکھا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہاں یہ ہے کہ مطلوبہ نشانے پوری طرح حاصل نہیں ہو پاتے۔ ابھی تک یہ بات معرضِ بحث ہی ہے کہ کیا ایک ایسا چھوٹا منصوبہ جس میں مقاصد واضح ہوں اور جس کے نشانوں کی تکمیل قابلِ عمل ہو، ایک ایسے منصوبے کے مقابلے قابلِ ترجیح ہے جہاں وسائل کو ہر منصوبے میں دوگنا کرنا پڑتا ہو، اور نشانوں کی تکمیل اور کم ہوتی جاتی ہو۔

آبادی کے مضر اثرات

ایک اور سبق بھی منصوبہ بندی سے حاصل کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ ملک میں اضافۂ آبادی نے معیشت کی ترقی کی رفتار تیز تر ہونے سے روک دی ہے۔ اس کی وجہ سے نہ تو کنبہ کی بہبود سامنے آسکی ہے اور نہ فردِ واحد کو اپنی ترقی کا موقع ملا ہے۔ اگرچہ منصوبہ بندی کے آغاز سے ہی اضافۂ آبادی کے مسائل کو سامنے رکھا گیا ہے، خاص کر تیسرے منصوبے سے تو اس پر اور بھی زور دیا جانے لگا ہے، اگرچہ اضافۂ آبادی کی روک تھام کے لیے ہر پلان کے مصارف پہلے سے زیادہ کر دیئے گئے ہیں لیکن پھر بھی آبادی میں اضافہ کی شرح منصوبہ بندی کی تمام مدت میں ۲ فیصد سے کچھ اوپر ہی رہی ہے۔ اس وجہ سے ملک میں آبادی کا دباؤ بڑھ رہا ہے۔ اگر اضافۂ آبادی اسی رفتار سے جاری رہا تو اب سے ۳۵ برس بعد بھارت کا شمار دنیا میں بہت زیادہ آبادی والے ملکوں میں ہوگا۔

چھٹے منصوبے کے آغاز میں ۶۷ کروڑ ۳۰ لاکھ افراد کی آبادی کا اندازہ لگایا گیا تھا جبکہ ۱۹۸۱ کی مردم شماری سے یہ تعداد ۶۸ کروڑ ۵۰ لاکھ ہو گئی۔ ساتویں منصوبے میں بہت سے پروگراموں کو اس بنیاد پر وضع کیا گیا کہ اس عرصے میں اضافۂ آبادی کی شرح ۱.۵ فیصد کے حساب سے گھٹے گی۔ منصوبہ بندی سے ہم نے صحیح معنوں میں کوئی سبق نہیں لیا ہے۔ ترقی پر اضافۂ آبادی کے اثرات سے یہ واضح ہے کہ منصوبے کے پروگراموں پر عمل درآمد سے غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والے ۰۰ لاکھ افراد خطِ افلاس سے اوپر آسکے ہیں۔ لیکن اضافۂ آبادی سے اتنی ہی تعداد غریبی کے خط سے نیچے آگئی ہے۔ اس طرح غریبوں کی تعداد جوں کی توں رہی۔

کالی معیشت اور بے اثر کنٹرول

منصوبہ بندی سے ایک اور بات یہ واضح ہوتی ہے کہ اس میں کنٹرول کے لمبے چوڑے نظام جو کہ لائسنسوں، اجازت ناموں، صنعتی لائسنسوں، امپورٹ کنٹرول، آر اے پی لائسنس، قرضہ کنٹرول وغیرہ کی شکل میں ہے، اور اس کے ساتھ ہی پرائیویٹ سیکٹر نیز کالی معیشت نے منصوبوں کو ان کے حقیقی مقاصد سے دُور کر دیا ہے۔ ان کنٹرولوں سے زراعت اور صنعتی ترقی کی راہ دشوار ہوئی ہے، اور ہر جگہ اس کی وجہ سے کورپشن پھیلی ہے اور پلان کے حقیقی مقاصد سے دُوری بڑھی ہے۔ اب اسی طرح تھوک میں کنٹرول جلد جلد ہٹائے جا رہے ہیں اور ایسے حقیقی کنٹرولوں کی ضرورت سے صرفِ نظر کی جا رہی ہے جو غریب عوام کے لیے ضروری اشیاء کی تیاری بڑھا سکتے ہیں۔

صنعتی پالیسی اور اس کے شیڈول الف، ب، ج، کے تحت نیز صنعتوں کی ترقی و ضوابط سے متعلق ایکٹ مجریہ ۱۹۵۱ کے تحت جس میں ۱۹۷۵، ۱۹۷۹ اور ۱۹۸۱ میں مختلف ترمیمیں کی جا چکی ہیں، اور اسی طرح اجارہ داری کے طریقوں والی تجارت کی روک تھام سے متعلق ایم۔ آر۔ ٹی۔ پی ایکٹ اور فیرا اور کافی پوسا ایکٹ کے تحت پرائیویٹ سیکٹروں کے مینوفیکچرروں کو مختلف کنٹرولوں سے سابقہ پڑتا ہے جو پیداوار، صلاحیت بڑھانے، صنعتی ترقی لانے اور صنعتی ترقی کے فائدوں کو منصفانہ ڈھنگ سے تقسیم کرنے کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ اس لیے منصوبے میں پرائیویٹ سیکٹر سے معاہدہ کرنا ہوگا۔ اس کے لیے اشاراتی منصوبہ بندی کی ضرورت ہوگی کالی معیشت کا دائرہ کار تو پلان میں آتا ہی نہیں جبکہ ملک کی قومی آمدنی کا ۴۰ فیصد کالے دھن پر مشتمل ہے۔ اس کالے سیکٹر کو قومی معیشت کے ۵ تا پندرہ فیصد تک کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ اس کیلئے رائے عامہ ہموار کرنی ہوگی۔ سیاسی سرگرمیوں کو اس سے الگ کرنا ہوگا۔ ٹیکسوں کی وصولی کے قوانین کو بہتر بنانا ہوگا۔ ٹیکسوں کی ادائگی میں کوتاہی کرنیوالوں کے لیے سخت سزائیں دینی ہونگی، اور گاہے گاہے کچھ سکوں کو منڈی سے واپس لے لیا جائے گا۔

بقیہ، پبلک سیکٹر کی اہمیت

گئی ہے۔ ان کی مدد کے لیے ایک نائب وزیر شری جی گومنگو ہیں۔

زراعت اور دیہی ترقی کی از سرِ نو ترتیب دی گئی۔ وزارت کیمیاوی کھادوں کی تقسیم، ان کی قیمتوں اور ان کی پیداوار کی ذمہ داری سنبھالے گی۔ اس سے قبل یہ کام کیمیکلز اور فرٹیلائزرز کی وزارت کے پاس تھا۔ ملک میں بنیادی نوعیت کی صنعتیں ترقی کے لیے کلیدی رول ادا کرتی ہیں۔ اس لیے پروگراموں پر عمل درآمد کی ایک نئی وزارت تشکیل دی گئی ہے۔ یہ بجلی، کوئلہ، سیمنٹ، فولاد اور ریلوں کے محکمے کے درمیان تال میل قائم کریگی۔ اس سے قبل یہ ذمہ داری کیبنٹ سیکریٹریٹ کی تھی۔ یہ وزارت مرکز کی طرف سے شروع کی گئی اسکیموں کی رفتارِ ترقی کا جائزہ لیتی رہے گی۔ تعمیرات و مکانات کی وزارت کو شہری ترقی کی وزارت میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس سے شہری علاقوں کی مربوط انداز پر ترقی ہو سکے گی۔ پٹرولیم کی وزارت کا نام بدل کر پٹرولیم اور قدرتی گیس کی وزارت کر دیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ گیس کو ازجی کے وسیلے کے طور پر زیادہ بڑا کردار ادا کرنا ہے۔ ●

غزلیں

راجیندر بہادر موج

وفا ملتی نہیں اہلِ جہاں میں
نہیں فرق اب زمین و آسماں میں

اندھیرا ہی اندھیرا صرف دیکھا
بشر نے آنکھ جب کھولی جہاں میں

جہاں اُن کی جفا کا تذکرہ ہے
وہ ہے دلچسپ حصہ داستاں میں

مجھے دراصل اُس کی جستجو ہے
جو آسکتا نہیں وہم و گماں میں

ترے جانے سے اے جانِ بہاراں
بہار آئی نہیں پھر گلستاں میں

چھپا رکھی ہے ہر تنکے میں بجلی
نہیں محفوظ اب میں آشیاں میں

تشدد کے پرستارو سمجھ لو
سکوں ملتا نہیں تیر و کماں میں

جسے کچھ اپنی منزل کا پتہ ہو
کوئی ایسا نہیں اس کارواں میں

مری اے موج ہے اتنی حقیقت
کہ اک قطرہ ہوں میں بحرِ جہاں میں

●

منصور سبزواری

شرمندگی ہے شہرِ ملامت سے زیادہ
شاید تجھے چاہا گیا چاہت سے زیادہ

دُکھ اس کا ہے ہر لمحہ رفاقت کے سبب سے
دونوں میں بڑھے فاصلے ہجرت سے زیادہ

اِک خواہشِ سرکش رہی خواہش سے بہت کم
اِک تیری ضرورت تھی ضرورت سے زیادہ

کھلتے ہیں لبِ گریہ سے شب میں در و روزن
گھر چیختے ہیں شہرِ ہلاکت سے زیادہ

وُہ پُتلیاں کرتی ہوئی گردش پسِ انبوہ
اک چہرہ سا چہروں کی حقیقت سے زیادہ

الزام ہمیں مرگِ مفاجات کا مت دے
ہم لوگ جئے جینے کی تہمت سے زیادہ

خودرو کوئی سبزہ، نہ کہیں گرد کی چادر
وادی یہ برہنہ رہی غربت سے زیادہ

●

قطعات

کشنے دت طوفان

ہر جادۂ حیات میں یوں کامراں ہوں میں
جب ولولے ہیں دل کے جواں نوجواں ہوں میں
حُبِّ وطن ہے حاصلِ مقصودِ زندگی
خدمت گزارِ جنتِ ہندوستاں ہوں میں

کانوں میں پڑ چکی ہے صدا اتحاد کی
شیدا ہے روحِ دل بخدا اتحاد کی
جانبازِ اتحاد ہوں طوفاں پسِ فنا
آئے گی قبر سے بھی صدا اتحاد کی

پیغامِ ایکجہتی

تحسین احمد کوثر

نفرت و تعصب کے جو کانٹے ہیں ہٹا دیں
اور اُن کی جگہ پھول محبت کے کھلا دیں

تاریکیاں چھائی ہیں جو نفرت کی دلوں پر
اب اُن کو محبت کی ضیاؤں سے مٹا دیں

جو فرقہ پرست امن کے ہیں ملک میں دشمن
بربادی خود اُن کی بھی ہے یہ اُن کو سمجھا دیں

جو بُغض کے شعلوں سے بھرے پھرتے ہیں سینے
اُن سینوں سے اُن بُغض کے شعلوں کو بجھا دیں

تخریب کے بانی ہیں فسادات کے بانی
تخریب کو تعمیر کی تصویر بنا دیں

مذہب نہیں کہتا ہے کسی سے کہ لڑو تم
مذہب پہ یہ الزام لگانا بھی بھلا دیں

دُنیا میں وطن اپنا ہو فی الواقعی جنت
اخلاق و محبت کے یہاں پھول کھلا دیں

ہم تم کو جدا کرنے کے جو لوگ ہیں کوشاں
ہم ایک ہیں ہم ایک ہیں یہ اُن کو دکھا دیں

تبصرہ

محبِ وطن اقبال

مصنفہ سید مظفر حسین برنی، گورنر ہریانہ۔

کوئی کہتا ہے کہ اقبال ہے صوفی مشرب
کوئی کہتا ہے کہ شیدائے حسیناں ہوں میں
زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

اس طرح کی مرکب اور مجموعہ اضداد شخصیت کے بارے میں کسی بنے بنائے سانچے سے کام نہیں لیا جا سکتا بلکہ اس کے مطالعے کے لیے محنتِ شاقہ درکار ہے، بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ وہ خود بیانِ غلطی دے رہا ہو ؎

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

اس پس منظر میں اقبال کی سیرت و شخصیت کے تعین کی مخلصانہ کوشش کا بارِ عظیم سید مظفر حسین برنی، گورنر ریاست ہریانہ نے اٹھایا ہے۔ آپ بلند شہر کے ایک ذی وقار خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں جس میں خدمتِ علم و ادب کی ایک دیرینہ اور طویل روایت ہے۔ حال ہی میں آپ کی تازہ ترین تصنیف "محبِ وطن اقبال" اپنے حسن صوری و معنوی کے ساتھ منظرِ عام پر آئی ہے۔ اس کے دیباچے میں موصوف نے فرمایا کہ جو باتیں جتنی زیادہ مشہور اور عام طور پر تسلیم کی جانے والی ہوتی ہیں، تخلیقی کاوش اور تجزیہ و تحلیل کی کسوٹی پر وہ اتنی ہی بے اصل ثابت ہوتی ہیں۔ اس سے مراد آپ نے یہ لی ہے کہ دورِ حاضر میں اس غلط فہمی کا ازالہ وقت کی بڑی ضرورت ہے کہ اقبال محض ایک اسلامی شاعر تھے یا وہ نظریۂ پاکستان کے خالق تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ "اسلامی فکر کی طرف اقبال کا جھکاؤ اس باعث تھا کہ وہ ایک ایسا نظامِ حیات ہے جس میں خودی کا بیج برگ و بار لا سکتا ہے، اور ایک ایسی فکر ہے جس کی سیادت اس وقت کے مشرق میں یقیناً مسلم تھی"۔ وہ اقبال کو تجزیہ و تحلیل کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد سائنسی اندازِ نظر سے یہ بتانے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں کہ "۱۹۰۷ کے بعد اقبال نے اس ہندوستان میں دوبارہ جنم لیا جسے وہ "سارے جہاں سے اچھا" کہتے تھے اور جسے نظریۂ حیات و کائنات ہی کو نہیں سراہتے بلکہ پہاڑوں، دریاؤں اور وادیوں کی بھی تعریف کرکے اپنے نغموں میں دیش بھگتی اور حُبّ الوطنی کا رس پیدا کرتے ہیں"۔ اس کتاب میں اقبال کے نظریۂ وطن، ہندوستان اور ہندوستانیت کے بارے میں ان کی فکر، ان کی شاعری میں قومی اتحاد کے عناصر اور ان کے پیغامات میں قومی یکجہتی کے تصورات کی واضح، مدلل اور مفصل بحث کی گئی ہے جس سے مصنف کی فکری صلاحیتوں، اثرپذیر اندازِ نظر، تلاش و تحقیق کے شوق اور دیانتدارانہ تحقیق و جستجو کی لگن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اقبال کو صحیح پس منظر میں پیش کرنے کی کوشش نہ صرف ادب کی بیش بہا خدمت ہے بلکہ ہر محبِ وطن کے لیے اقبال شناسی کی صحیح سمت کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ آج کے دور میں قومی یکجہتی کے عناصر کی تلاش وطنِ عزیز کی اعلیٰ ترین خدمت اور وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ ان حالات میں ان غلط فہمیوں کا ازالہ بے حد ضروری ہے جن کے باعث قومی اتحاد کو ٹھیس پہونچتی ہے۔ کاش یہ جذبہ ہمارے ملکی اور وطنی سبھی پروگراموں کا روحِ رواں بن سکے۔

برنی صاحب نے اقبال کے بارے میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان کے جذبۂ وطن پرستی کی آنچ کبھی بھی مدھم نہیں ہونے پائی ؎

ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام
ہند ہی بنیاد ہے اس کی نہ فارس ہے نہ شام

اقبال کا ایمان تھا کہ اپنے وطن سے غداری سب سے زیادہ گھناؤنا جرم ہے جو کسی سے سرزد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے بنگال کے میر جعفر اور دکن کے میر صادق کو ملک و مذہب کے لیے باعثِ ننگ بتایا۔ انھوں نے اقبال کی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق" اور "ضربِ کلیم" کی نظموں نیز شعاعِ امید کے مختلف اشعار سے اقبال کی حُبّ الوطنی کے ثبوت دئے ہیں۔ ارمغانِ حجاز سے اقبال کی وطن سے محبت اور اس کو آزاد دیکھنے کی خواہش کے مظہر اشعار بھی ثبوت کے طور پر پیش کئے گئے ہیں۔ برنی صاحب نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ علامہ اقبال اسلامی تعلیمات کی صحیح تصویر پیش کرتے ہیں جو فراخ دلی اور رواداری سے عبارت ہے۔ اقبال اسلام کو

جدید سائنسی علوم اور فلسفے کی روشنی میں حیات نو بخشنا چاہتے تھے۔ وہ اسلامی تفکر اور اسلامی تصورات کی تعمیر نو کے حامی تھے۔ وہ شر کے خلاف جدوجہد کرکے خیر کی فتح کے خواہاں تھے ان کا کلام وطن دوستی کے جذبات سے پُر ہے ہندوستان کے حالات انھیں خون کے آنسو رُلاتے ہیں۔ انھوں نے بحرانی دور میں پرورش پائی تھی۔ اور اپنی شاعری میں انگریزی سامراجیت کی بھرپور مخالفت کی۔ ہندو مسلم اتحاد پر دل کو چھُو لینے والی نظمیں لکھیں۔ وہ پاکستان کے تصور کے خالق نہیں تھے بلکہ مسلم علاقوں کو ہندوستان کے وفاقی ڈھانچے میں رکھنا چاہتے تھے۔

اس کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ علامہ اقبال گوتم بدھ کو پیغمبروں میں شمار کرتے تھے انھوں نے ہندوؤں کے مقدس منتر گائتری کو نظم کیا' انھوں نے سنسکرت بھی پڑھی تھی۔ وہ بھگوت گیتا کے فلسفۂ عمل سے متاثر تھے' سری کرشن جی کا نام بڑی عزت و احترام سے لیتے تھے۔ وہ سنسکرت کے مشہور شاعر بھرتری ہری کے مدّاح تھے۔ وہ ہندوستانی فلسفے دیومالا اور مذہبی عقائد سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ انھوں نے رامائن کو اُردو میں نظم کرنے کا ارادہ کیا تھا' اس کے لیے انھوں نے مہاراجہ سرکشن پرشاد سے عہدِ جہاں گیری کا وہ نسخہ طلب کیا جو کہ اس رزمیہ کا فارسی ترجمہ تھا۔ بدقسمتی سے یہ نسخہ دستیاب نہ ہو سکا اور یہ رزمیہ اُردو میں ترجمہ کرنے کا کام رہ گیا۔ ہندوستانی اوتاروں' سنتوں کا احترام' ہندوستان کی تعریف' گاندھی جی کی تعریف' ان کے کلام سے پوری طرح واضح ہے۔ انھوں نے سودیشی تحریک کی حمایت کی تھی۔ ان جملہ موضوعات کو اس کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال کی نجی زندگی کے ایسے واقعات بھی اس کتاب میں قلمبند کر دیئے گئے ہیں جن سے اُن کی وسیع المشربی'

انسان دوستی' ہندوؤں اور سکھوں سے تعلقات اور ان کا احترام' ان سبھی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کو برہمن نژاد ہونے پر فخر ہے۔ اقبال کے کلام کو گرفت میں لاکر اس میں نئے تعمیری رنگ و آہنگ کی تلاش جس سے نوجوان نسل مستفید ہو سکے' ملک کا مستقبل روشن ہو سکے اور دُنیائے انسانیت منوّر ہو سکے' اس کتاب کا مرکزی خیال ہے۔

۱۷۸ صفحات پر مشتمل "محبِ وطن اقبال" سید مظفر حسین برنی کے اس خطبے کی توسیع شدہ شکل ہے جو ۱۴ر جنوری ۱۹۸۴ء کو "اقبال اور قومی یکجہتی" کے موضوع پر بھوپال یونیورسٹی کے زیر اہتمام پڑھا گیا تھا۔ اس کتاب کے موضوع کی مناسبت سے اسے آنجہانی شریمتی اندرا گاندھی کے نام معنون کیا گیا ہے جنھوں نے قومی یکجہتی اور ملک کی سالمیت کے لیے اپنی جان عزیز تک قربان کر دی۔ یہ نقش ثانی، نقش اوّل سے یقیناً افضل ہے۔ اسے ہریانہ ساہتیہ اکیڈمی' چنڈی گڑھ نے خوبصورت انداز سے شائع کیا ہے۔ دورِ حاضر میں اقبال شناسی کے شائقین بالخصوص کالج کے طلبا کے لیے یہ کتاب مستند مواد فراہم کرتی ہے۔ کتاب کے آخر میں "کتابیات" کے عنوان سے جو فہرست کتب دی گئی ہے وہ نہ صرف مصنف کی وُسعت نظری کی غماز ہے بلکہ آنے والی نسل کے لیے مشعلِ راہ بھی ہے۔ مصنف کا یہ قول سو فیصد دُرست ہے کہ اس کتاب کے ذریعے ہندوستان کے ادبی وفکری ماحول میں اقبال کو بحال REINTEGRATE یا INTEGRATE کرنے کی ایک دیانتدارانہ کوشش کی گئی ہے تاکہ غلط فہمیوں کے گرد وغبار سے نکل کر اقبال ہمارے مجمعٔ شعرا میں اسی طرح ضو پاش ہونے لگیں جیسا کہ انھیں شاعرِ مشرق کی حیثیت سے ہونا چاہیئے۔

کسی اُردو کتاب کا پہلا ایڈیشن اتنے مختصر سے وقت میں ختم ہو جائے تو یہ معجزے سے کم نہیں۔ یہ کتاب کی مقبولیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس سلسلے میں یہ خبر اور بھی حوصلہ افزا ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہو رہا ہے۔ جو کہ خود اپنی جگہ قومی یکجہتی کی ایک مضبوط بنیاد ہے۔

دورِ حاضر میں کاغذ اور طباعت کی ہوشربا گرانی کو دیکھتے ہوئے عمدہ کاغذ پر لکھی اور آفسیٹ پر چھپی اس کتاب کی قیمت ۲۵ روپے بالکل واجبی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم سب اس کے مطالعے کا شرف حاصل کریں۔

عادل صدیقی •

بقیہ : اکیسویں صدی اور تعلیم

ہوئے تو ہمارا کیا حال ہوگا۔

بہرحال قوم کو وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کا شکر گذار ہونا چاہیئے جن کی کوششوں نے آج سارے ملک کے دانشوروں کو سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ جگہ جگہ سیمنار ہو رہے ہیں۔ گوشٹیاں، ورکشاپیں، کانفرنسیں وغیرہ۔ اُمید ہے کہ نئی تعلیمی پالیسی کی تشکیل اپریل، مئی ۱۹۸۶ء تک ہو جائے گی اور وہ سب خامیاں جو پچھلے برسوں نظر آئی ہیں' دُور کی جائیں گی۔ اپنی ایک اور تقریر میں وزیر اعظم نے فرمایا ہے کہ نئی تعلیمی پالیسی ایسی ہو جس سے عورتیں اور نوجوان سب سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ پچھڑے ہوئے لوگ آگے بڑھیں اور ملک اور قوم اس قابل بن سکے کہ اکیسویں صدی کے چیلنج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جا سکے۔

بیمہ: فصل بیمہ اسکیم

حالانکہ ملک میں انفرادی سطح پر چند تجرباتی اسکیمیں شروع کی گئیں، لیکن یہ اسکیمیں ناسازگار مالی نتائج کے باعث ناقابل عمل پائی گئیں۔ ہمارے وسیع و عریض ملک میں جہاں کھیتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے انفرادی سطح پر فصل بیمہ اسکیم تیار کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اول اعداد و شمار فراہم کرنا، دوئم، بیمہ پالیسیوں کو جاری کرنے میں فصلوں کی کٹائی کی دیکھ بھال اور دعووں کے نپٹانے پر آنے والی بھاری انتظامیہ لاگت۔ ان تمام امور پر کافی غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس کا واحد حل علاقائی بنیاد پر فصل بیمہ اسکیم کی تیاری ہوگا۔

انجام کار اس نظریہ کو سامنے رکھتے ہوئے بھارتی جنرل بیمہ کارپوریشن نے ۱۹۷۹ء میں علاقائی بنیاد پر ایک اسکیم تیار کی جو اس وقت سے ریاستی سرکاروں کے تعاون سے زیر عمل ہے۔

یہ اسکیم مالی اداروں کی طرف سے دئے گئے پیشگی قرضوں سے وابستہ ہے۔ اور اگر کسی خاص علاقے کی پیداوار ضمانت شدہ پیداوار سے کم ہوتی ہے تو کسانوں کو معاوضہ اسی تناسب سے دلایا جاتا ہے۔ یہ تجرباتی اسکیم کامیاب رہی ہے اور اسے بارہ ریاستوں نے اپنایا ہے۔

موجودہ اسکیم کی افادیت

سوکھے، سیلاب، کیڑوں کے حملے، ژالہ باری اور دیگر قدرتی آفات کے باعث فصل اچھی نہ ہونے پر مالی امداد دستیاب کرانے، فصل کو نقصان ہونے پر کسانوں کو اگلے موسم کے لیے قرضہ فراہم کرنے اور دالوں اور تلہنوں کی پیداوار کو بڑھاوا دینے کے لیے مرکزی سرکار نے حال ہی میں ملک بھر میں فصل بیمہ کی جامع اسکیم لاگو کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو ۱۹۸۵ء کی خریف فصل سے شروع ہو رہی ہے۔ یہ اسکیم بھارتی جنرل بیمہ کارپوریشن کی طرف سے ریاستی سرکاروں کے تعاون سے چلائی جائے گی۔

یہ اسکیم کسانوں کے کوآپریٹو قرضہ جاتی اداروں، تجارتی بینکوں اور علاقائی دیہی بینکوں سے موصول ہونے والے زرعی قرضوں سے وابستہ ہوگی۔ تمام زرعی قرضوں کو اس بیمہ کے تحت محیط کیا جائے گا۔ شروع میں چاول، گیہوں، جوار، باجرے، تلہنوں اور دالوں پر اسے لاگو کیا جائیگا۔ چاول، گیہوں اور جوار باجرے کے لیے بیمہ شدہ رقم کا ۲ فیصد اور تلہنوں اور دالوں کے لیے بیمہ شدہ رقم کا ایک فیصد بیمے کے چندے کی صورت میں لیا جائے گا۔ بیمہ پر لیا جانیوالا چندہ یعنی پریمیم بیمہ شدہ رقم کی بنیاد پر لیا جائے گا۔ اور یہ کسی خاص فصل کے سلسلے میں قیمت کے علاوہ ہوگا۔ یہ اسکیم ملک کے اُن تمام مقررہ علاقوں میں عمل میں لائی جائے گی جن کے بارے میں پچھلے پانچ برس سے فصل کی پیداوار کے اعداد دستیاب ہیں۔

فصل بیمہ کے تحت مقررہ علاقے (بیمہ شدہ موسم میں فصل کی کٹائی کے تجربوں کی بنا پر مقررہ) کے لیے اگر بیمہ شدہ فصل کی فی ہیکٹیر حقیقی پیداوار مقررہ پیداوار سے کم ہو جائے گی تو مقررہ علاقے میں اس فصل کو پیدا کرنے والے تمام کسانوں کو اس کمی سے متاثرہ یا اُس کا شکار تصور کیا جائے گا اور ایسے علاقے کے تمام کسانوں کو معاوضہ دیا جائے گا۔

اس اسکیم کی تعمیل کے لیے بھارتی جنرل بیمہ کارپوریشن پیشرو بیمہ کار کے طور پر کام کرے گا اور ریاستی سرکاروں، بھارتی ریزرو بینک، قومی زرعی و دیہی ترقیاتی بینک، ریاستی کوآپریٹو بینکوں، تجارتی بینکوں اور علاقائی دیہی بینکوں کے ساتھ لگاتار قریبی رابطہ بنائے رکھنے کے لیے ریاستوں کی راجدھانیوں میں فصل بیمہ سیلوں کا قیام کرے گا۔

شروع میں ریاستی سرکاریں ایک دو کروڑ روپیے کے فصل بیمہ فنڈ قائم کریں گی جن میں ریاستی سرکاروں اور مرکزی سرکار کا برابر برابر حصہ ہوگا۔ ریاستی بیمہ فنڈ کا انتظام ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی کرے گی جس کا چیرمین ریاستی سرکار کا چیف سکریٹری ہوگا۔ یہ کمیٹی اسکیم کا لگاتار جائزہ لے گی اور اس پر نگرانی رکھے گی اور اسکیم کی کامیاب تعمیل کے لیے ریاستی سرکاروں کے مختلف محکموں کے درمیان تال میل رکھنے کے طریقے مرتب کرے گی۔

یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ چھوٹے چھوٹے کسانوں کو فصل بیمہ کے پریمیم میں ۵۰ فیصد تک کی رعائت دی جائے گی جس میں مرکزی اور ریاستی سرکاریں برابر برابر حصہ ڈالیں گی۔ مالی ادارے کسانوں کو فصل قرضوں کی منظوری دیتے وقت پریمیم کی رقم لے لیں گی اور جمع کی گئی پریمیم کی یہ رقم علاقے اور بیمہ کی رقم کی تفصیل کے ہمراہ بھارتی جنرل بیمہ کارپوریشن کو بھیج دی جائے گی جو ایسے مالی اداروں کے نام پر "ماسٹر پالیسی" جاری کریگا۔

۱۹۸۶ء ـ ۱۹۸۵ء کے دوران مرکزی سرکار چھوٹے چھوٹے کسانوں کو مراعات کی صورت میں ساڑھے چار کروڑ روپیے دے گی اور تقریباً اتنی ہی رقم ریاستی سرکاروں کی طرف سے دی جائیگی۔

اس اسکیم کو ڈھنگ اور خوش اسلوبی سے عمل میں لانے کے لیے ریاستی سرکاروں کے مختلف محکموں اور مرکزی سرکار کے درمیان قریبی تال میل ضروری ہے۔ اس اسکیم کو لاگو کرنا آسان کام نہیں۔ فصل بیمہ اسکیم اپنا متعیّن کردار اسی صورت میں ادا کر سکتی ہے جب زرعی ترقی کے لیے اسے ایک مکمل پروگرام کے حصّے کے طور پر لاگو کیا جائے۔

ریاستی سرکاروں کو اس سلسلے میں انتظامیہ ڈھانچے کو مضبوط کرنا ہوگا۔ اس مقصد کے لیے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ریاستی سرکاروں کو ضرورت کے مطابق مالی امداد دی جائے۔

پبلک سیکٹر کی اہمیت

پبلک سیکٹر کے اداروں کی کارکردگی بہتر بنانے اور کام میں بہتر قسم کا تال میل قائم کرنے کے لیے بیورو آف پبلک انٹرپرائزز اور بھاری صنعتوں کے محکمے کو جوڑ دیا گیا ہے۔ اس تال میل سے پبلک سیکٹر کے اداروں میں مالیاتی اور عملی درآمد کے پہلوؤں کو موثر ڈھنگ سے آگے بڑھایا جاسکے گا۔ وزارتِ صنعت میں اب صنعتی ترقی کا محکمہ، کمپنی امور کا محکمہ، کیمیکلز اور پیٹرو کیمیکلز کا محکمہ، اور پبلک سیکٹر انٹرپرائزز کا نیا محکمہ شامل ہیں۔ اس سے قبل کیمیکلز اور پیٹرو کیمیکلز کا محکمہ، کیمیکلز اور فرٹیلائزر کی وزارت میں تھا۔ اسی طرح پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر کا جملہ صنعتی نظام شری این ڈی تیواری کو دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے وہ اُتر پردیش کے وزیر اعلیٰ تھے۔ جہاں سے انھوں نے استعفیٰ دیدیا ہے۔ ان کی مدد کے لیے دو وزرائے مملکت رکھے گئے ہیں۔ شری آر۔ کے جناردھن کیمیکلز کے اور شری ایم ارونا چلم صنعتوں کے انچارج ہوں گے۔ البتہ فولاد اور کانوں کی وزارت کے تحت آنوالی صنعتیں اس میں شامل نہیں ہیں۔

دہشت پسندوں سے نپٹنے کی اہم ذمہ داری وزارتِ امور داخلہ میں داخلی سلامتی کے وزیر مملکت شری ارون نہرو کو سونپی گئی ہے۔ یہ محکمہ ملک کے اتحاد اور سالمیت کو درپیش خطرات کا مقابلہ کریگا۔ ملک کی پولیس، نیم فوجی قوتیں، انٹیلیجنس بیورو اور سی بی آئی ان کے ماتحت ہے۔ وہ لا اینڈ آرڈر کو درست رکھنے کی ذمہ داری سنبھالے ہیں۔ ان امور کے پیشِ نظر وزارتِ داخلہ کو از سرِ نو ترتیب دیا گیا ہے۔ اسے چار محکموں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ یعنی داخلی سلامتی، ریاستیں (مرکز اور ریاست کے تعلقات)، سرکاری زبان، اور امور داخلہ۔ یہ وزارت شری ایس۔ بی چوان کی ماتحتی میں کام کرے گی۔ ان کی مدد کے لیے دو وزیر مملکت ہیں، یعنی شری ارون نہرو اور شری پی اے سنگما۔ اب مرکز ریاستوں کے تعلقات کا اہم موضوع کمیشنوں کے رحم وکرم پر نہیں رہا۔ جموں کشمیر، پنجاب، آندھرا، کرناٹک، تمل ناڈو پر علاقائی نوعیت کی پارٹیاں حکمراں ہیں۔ اس وجہ سے ریاستوں کے مابین اور مرکز، ریاستوں کے درمیان اختلافات سامنے آسکتے ہیں۔ راجیو۔ لونگووال معاہدے پر عمل درآمد سے پنجاب، ہریانہ، راجستھان کی ریاستی سرکاروں اور مرکز کے درمیان معاملات اہم نوعیت کے حامل ہیں۔ یہ اہم ذمہ داری شری پی اے سنگما کو سونپی گئی ہے۔

اب تک ہمارے ملک میں مرکزی بجٹ پارلیمنٹ میں پیش کرنے سے قبل ریل بجٹ بھی پیش کیا جاتا رہا ہے۔ آئندہ سال سے ایسا نہیں ہوگا۔ اب ریلوے وزارت ٹرانسپورٹ کا ایک حصہ ہے۔ اس وزارت کے ذریعے ملک کے ذرائع نقل و حمل کے مسائل پر مربوط انداز نظر اپنانے میں مدد ملے گی۔ گودیاں اور قومی اہمیت کی شاہراہیں وزارت ہذا کے اس محکمے کو سونپ دی گئی ہیں جسے خشکی کے راستے ٹرانسپورٹ کا محکمہ کہا گیا ہے۔ یہ محکمہ لائٹ ہاؤس، لائٹ شپ، موٹر گاڑیوں کی انشورنس سڑکوں کی منصوبہ بندی اور اندرون ملک آبی راستوں کا نظم ونسق سنبھالنے کی ذمہ داری نبھائے گا۔ شہری ہوابازی کو بھی اس توسیع شدہ وزارت میں شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ طیاروں اور فضائی نیوی گیشن کا نظم و نسق بھی سنبھالے گی۔ ملک میں فضائی ٹریفک کی ذمہ داری بھی اسی کے ذمے کردی گئی ہے۔ ٹرانسپورٹ کے وزیر کابینہ شری بنسی لال کی مدد کے لیے تین وزیر مملکت ہیں یعنی شری مادھو راؤ سندھیا (ریلویز) شری راجیش پائلٹ (خشکی کے راستے ٹرانسپورٹ)، اور شری جگدیش ٹائٹلر (شہری ہوابازی)۔

انرجی کی تمام شکلوں اور صورتوں کو وزارت انرجی کے تابع کردیا گیا ہے۔ کوئلے کے محکمے کو بجلی اور انرجی کے غیر روایتی وسیلوں کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ انرجی کے متبادل وسائل کی تلاش پر زور دیا گیا ہے تاکہ اس پر غیر ملکی زرمبادلہ کے اخراجات کم کیے جاسکیں۔ اس وزارت کو شری وسنت ساٹھے کو سونپا گیا ہے اور ان کی امداد کے لیے وزیر مملکت شری عارف محمد خاں کو رکھا گیا ہے۔

آبی وسائل کی دیکھ بھال

آب رسانی کی وزارت کا نام بدل کر اب آبی وسائل کی وزارت کردیا گیا ہے تاکہ ملک میں دستیاب فاضل آبی وسائل سے موثر ڈھنگ سے کام لیا جاسکے۔ یہ وزارت زرعی پیداوار کے لیے پانی، پن بجلی کے فروغ، پینے کے پانی کی فراہمی اور ماحول کے صنعتی استعمالات اور تحفظ پر اپنی توجہ دے گی۔ مختلف ریاستوں کے درمیان پانی کے جھگڑے کو بھی یہی طے کرے گی سنٹرل واٹر کمیشن اور سنٹرل فلڈ کنٹرول بورڈ بھی اسی کے ماتحت آتا ہے۔ زمین پر پانی کی کھوج اور ٹیوب ویلوں کی کھدائی بھی اسے ہی سونپ دی گئی ہے۔ اس کابینہ میں شری بی آر بھگت کو امور خارجہ کی وزارت سونپی گئی ہے اس وزارت میں کابینہ کے درجے کے ایک وزیر کی ضرورت عرصۂ دراز سے محسوس کی جارہی تھی۔

وزیراعظم شری راجیو گاندھی نے پچھلے دنوں اڑیسہ کے قبائلی آبادی والے علاقوں کا دورہ کیا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا تھا کہ سماج کے کمزور طبقات بشمول شیڈولڈ ذاتوں اور شیڈولڈ قبائل کے ارکان کی بہبود کے کام پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جاسکی ہے۔ ان طبقات کی بہبود کے پروگراموں کی منصوبہ بندی کے لیے ایک نئی وزارت یعنی پروگراموں پر عمل درآمد کا جائزہ لینے والی وزارت تشکیل کی گئی ہے۔ اس وزارت کی ذمہ داری شری اے بی اے غنی خاں چودھری کو کابینہ کے مرتبے کے وزیر کی حیثیت دیکر سونپ دی گئی ہے۔ اس سے قبل یہ کام وزارت امور داخلہ کے پاس تھا۔ وزیر مملکت شریمتی راجیندر کماری باجپئی کو اس کی ذمہ داری سونپی

(باقی صـ۱۶ پر)

Regd. No. D (DN) 20
R.N. 37032/81
Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment at Civil Lines Post Office, Delhi-110054.
VOL. 5 No. 16 [illegible]A (URDU) 16-30 November, 1985

فصل بیمہ اسکیم

ہماری ملکی معیشت کا زیادہ تر دار و مدار زراعت پر ہے اور تقریباً ۷۰ فیصد آبادی کسی نہ کسی صورت میں زراعتی سرگرمیوں سے وابستہ ہے۔ اب تو ملک میں صنعتی ترقی بھی کافی ہوئی ہے اور صنعتی پیداوار میں اضافہ ہو رہا ہے، تاہم کُل ملکی پیداوار کا ۴۰ فیصد زرعی شعبے سے حاصل کیا جا رہا ہے۔ زراعت جہاں ہمارے لیے اناج اور اشیائے ضروریہ کی فراہمی کرتی ہے وہاں وہ کارخانوں کے لیے خام مال کی فراہمی کا ذریعہ بھی بنی ہوئی ہے۔ اگرچہ ہمارے ملک میں زراعت نے بڑی ترقی کی ہے اور ملک اناج کی پیداوار میں خودکفیل ہو گیا ہے اور وہ اب اناج برآمد بھی کر رہا ہے تاہم یہ ترقی اُن علاقوں میں ہی زیادہ تر محدود ہے جہاں ندی نالوں، نہروں، تالابوں اور دیگر ذرائع سے آبپاشی کی جاتی ہے۔

ملک کے کُل زرعی علاقے کے ۷۰ فیصد میں بارانی کاشت ہوتی ہے لیکن اس میں اناج کی کُل پیداوار کا صرف ۴۲ فیصد حصہ ہی ہوتا ہے۔ اگر ہم اناج کی پیداوار بڑھانا چاہتے ہیں تو ہمیں خشک زمینوں کو سیراب کرنے اور ان کی پیداواری صلاحیت کو بڑھانے کی جانب توجہ دینا ہوگی۔ جن علاقوں میں آبپاشی نہیں ہوتی وہاں فصلوں کی پیداوار میں زیادہ خطرہ مول لینا پڑتا ہے اور وہاں پیداواری صلاحیت میں کمی کے ساتھ پیداوار میں بھی کبھار اُتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ بارانی زمینوں کی کاشت میں اچھے بیجوں، کیمیاوی کھاد اور کیڑے مار دواؤں پر زیادہ سرمایہ کاری کرنا ہوتی ہے۔ ان علاقوں کے چھوٹے چھوٹے کسان پیداوار بڑھانے کے لیے غالباً تب تک ضروری سرمایہ کاری کے لیے تیار نہیں ہوں گے جب تک انھیں فصل بیمہ کی سہولیات دستیاب نہیں ہوں گی۔

ساتویں پانچسالہ منصوبے کی پالیسی دستاویز میں اناج کے لیے ۵ فیصد اور تمام زرعی شعبے کے لیے ۴ فیصد شرح افزائش کا اندازہ کیا گیا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ کسان کھیتی باڑی پر سرمایہ کاری کریں لیکن وہ اس کے لیے تب تک تیار نہیں ہوں گے جب تک انھیں یہ یقین نہ ہو جائے کہ قدرتی آفات سے فصلوں کی تباہی کی صورت میں انھیں خاطر خواہ معاوضہ مل جائے گا جو فصل بیمہ سے ہی ممکن ہے۔

فصل بیمہ کیلئے وجہ جواز: اس طرح فصل بیمہ کسانوں کو اس قدرتی تباہی سے سلامتی مہیا کرتا ہے جو اُن کے قابو سے باہر ہے۔ اس سے بہت حد تک کھیتی باڑی سے ہونے والی آمدنی یقینی ہوتی ہے اور دیہی حلقے کی عام اقتصادی حالت میں زیادہ استحکام پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اس سے کسان پیداوار بڑھانے کے لیے بلا جھجک نئی اور اونچی لاگت کی ٹیکنالوجی بھی اپنا سکتے ہیں۔ زرعی قرضہ کے سلسلے میں بھی کسانوں کی حالت میں بہتری آئے گی۔ انھیں زرعی قرضہ چُکانے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی اور فصل نہ ہونے کی صورت میں بھی انھیں نئے قرضہ کے لیے نااہل قرار نہیں دیا جائے گا۔ ایسے حالات میں فصل بیمہ اسکیم اُن کی (قرضہ کی) ادائیگی کا خیال رکھے گی۔ اور کسان نئے موسم کے لیے خود بخود نئے قرضہ کے مستحق تصور کئے جائیں گے۔ اس سلسلے میں کسانوں پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ انھیں اس اسکیم سے کسی منافع کی توقع نہیں کرنی چاہیئے۔ فصل بیمہ کا مقصد بھی بیمہ زندگی کی مانند ناگہانی آفات سے سلامتی مہیا کرنا ہے۔

موزوں اسکیم

حصولِ آزادی کے بعد سے بھارت سرکار کی یہ کوشش رہی ہے کہ فصل بیمہ کی کوئی موزوں اسکیم رائج کی جائے۔ سرکار نے کئی اسکیمیں مرتب کیں اور انھیں ریاستی سرکاروں کے پاس بھیجا، لیکن وہ زیادہ تر اقتصادی وسائل کی کمی کے باعث ان میں سے کسی بھی اسکیم پر عمل کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوئیں۔ بعد میں بھارتی جنرل بیمہ کارپوریشن نے کیمیاوی کھاد تیار کرنے والوں کے

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002.

یوجنا

یکم تا ۱۵ دسمبر ۱۹۸۵

ایک روپیہ

چھوٹے عمر، بڑا بوجھ

(لکشمی چندر)

نوجوانوں کا سال اور اُن کے مسائل

(شیام سندر چاولہ)

ہریش اروڑہ

توانائی کی کمی اور پن بجلی

دُنیا بھر میں توانائی کے ذرائع جب
وسائل یعنی تیل اور کوئلے کی دن بدن بھارتی
کمی ہو رہی ہے جس سے ان کی قیمتوں میں آئے
دن اضافہ ہو رہا ہے۔ توانائی لکڑی سے بھی حاصل
کرنے کا ایک ذریعہ ہے لیکن جنگلات کے دھڑا
دھڑ کٹنے سے نہ صرف جنگلات ختم ہوتے جا رہے
ہیں بلکہ ماحولیات پر بھی اثر ہو رہا ہے۔ شمسی
توانائی بھی بہت کارآمد ہے لیکن تجارتی پیمانے
پر ابھی اس کی زیادہ پیداوار نہیں ہو رہی، اس
لیے اس سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایٹمی بجلی
گھروں میں تیار ہونے والی جوہری توانائی ارزاں
ہے لیکن نہ ہی اس کی تیاری کے وسیع اقدامات
کئے گئے ہیں اور نہ ہی اسے قبولیت حاصل ہوئی ہے۔
البتہ توانائی کا ایک وسیلہ جو وافر مقدار میں موجود
ہے اور آسانی سے دستیاب ہے وہ ہے ہائیڈرو
الیکٹرک یعنی پن بجلی۔ ہمارے ملک میں دریاؤں
کی کمی نہیں ہے۔

فطرت کا آبی گردش کا سلسلہ اہم ترین
اور دلچسپ ہے۔ ہر برس تقریباً ۳۷، ارب مکعب
میٹر پانی اس سلسلے میں بارش کے ذریعے سمندر
سے میدان اور میدان سے دوبارہ سمندر میں جاتا

ہے سوال اٹھتا ہے کہ توانائی کے اس عظیم ترین
وسیلہ کو کیسے کر بروئے کار لایا جا سکتا ہے جس
سے اُس سے توانائی یعنی بجلی حاصل کی جا سکے۔
ملک کے شمال میں ہمالیہ اور وسطی حصہ میں
وندھیاچل اور دیگر حصوں کے پہاڑوں میں جو
دریا بہہ رہے ہیں انھیں بجلی پیدا کرنے کے
لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ایک تحقیقی اندازے
کے مطابق ۶۰ فیصد لوڈ فیکٹر کی بنا پر ملک کی
بجلی کی پیداواری صلاحیت تقریباً ۷۵ ہزار
میگاواٹ ہے۔ لیکن سردست صرف ۱۲ فیصد
صلاحیت کو بروئے کار لایا جا رہا ہے۔ جبکہ مستقبل
قریب میں مزید ۷ فیصد توانائی پیدا کرنے کے
لیے پراجیکٹ مرتب کئے جا رہے ہیں۔ اس
دہائی کے آخر تک مختلف وسائل۔ پانی، حرارت
اور ایٹم سے تقریباً ۸۱۶۰۴ میگاواٹ بجلی تیار
کئے جانے کا امکان ہے۔ ان میں پن بجلی کا حصہ
کوئی ۲۱ فیصد ہوگا۔ ان تمام نشانوں کو پیش
نظر رکھتے ہوئے ۱۹۸۲ میں بھارت سرکار کی طرف
سے قومی پن بجلی توانائی کارپوریشن کا قیام کیا گیا۔
اس کارپوریشن کے قیام سے پہلے بڑے بڑے
پراجیکٹوں پر کام سست روی سے ہو رہا تھا یا

رکا پڑا تھا۔ ان میں بڑے بڑے پراجیکٹ تھے۔
ہماچل پردیش میں ۱۸۰ میگاواٹ صلاحیت کا
بیرا سیول، منی پور میں ۱۰۵ میگاواٹ کا لوک ٹک
اور جموں و کشمیر میں ۳۴۵ میگاواٹ صلاحیت
کا سلال پراجیکٹ۔

اپنے قیام کے تین برس کے عرصے
میں ہی اس کارپوریشن نے بیرا سیول، لوک ٹک
اور نیپال میں دیوی گھاٹ پراجیکٹوں پر قابو پا
لیا ہے۔ دراصل بجلی پیدا کرنے کے لیے سب
سے پہلے کسی آبی ذخیرہ پر کوئی موزوں مقام منتخب
کیا جاتا ہے۔ بعد ازاں اس چنیدہ مقام پر
باندھ بنایا جاتا ہے۔ باندھ کے ذریعے پانی جمع
کر کے تیز رفتاری اور طاقت سے اُسے چھوڑا
جاتا ہے جس سے بجلی پیدا ہوتی ہے۔

بھارت میں متعدد بڑے اور چھوٹے پن بجلی
باندھ بنائے گئے ہیں۔ مستقبل کے لیے بھی متعدد
اہم پراجیکٹ عمل میں لائے جائیں گے جیسے
جموں و کشمیر میں دلہستی، ہماچل میں چمیرا، میزورم
میں دھالیشوری، بہار میں کوئل کارو، اترپردیش
میں ٹنک پور اور بھیڑی وغیرہ۔

(باقی کور صفحہ ۳ پر)

منصوبہ بندی سے متعلق ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر ——— آر. ٹھکرال
ایڈیٹر ——— لکشمی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر ——— محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر ——— وسیم حیدر

جلد ۵	یکم تا ۱۵ دسمبر ۱۹۸۵	شمارہ ۱۷

۱۰ تا ۲۲۴ اگرہائٹ شنک ۱۹۰۷ ٭ ٹیلیفون ۰۱۸۱۸

اس شمارے میں

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے، ۲ سال ۳۵ روپے، ۳ سال ۵۰ روپے
فی کاپی ——— ایک روپیہ
طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فیصد کی رعایت

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:۔

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر. کے. پورم (مین)
نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

بزنس منیجر: ایل. آر. بترہ ٭ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن): آر. ایس. منجال

ترسیل زر کا پتہ، بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

بچوں کی بہبود

ھندوستان میں غریبی دور کرنے کے لیے سماجی بہبود کے متعدد پروگرام شروع کئے جا چکے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ سماج میں اقتصادی طور پر کمزور طبقے اوپر اُٹھ سکیں، ان کا معیارِ زندگی بلند ہو اور وہ زندگی کی مختلف راحتوں سے لطف اندوز ہو سکیں۔ عوام کا معیارِ زندگی بلند کرنے سے وہ پیداواری عمل میں موثر کردار ادا کر سکتے ہیں اور اپنی خوابیدہ صلاحیتوں سے پوری طرح کام لیکر ملک و قوم کی خدمت کا مقدس فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔ ان اقتصادی پروگراموں سے ملک کے غریبوں میں خود اعتمادی کا جذبہ فروغ پاتا ہے اور وہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی لعنت سے بچ جاتے ہیں۔ ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں افرادی قوت ایک بڑے وسیلے کے طور پر موجود ہے، اس لحاظ سے سماجی بہبود کے جو بھی مختلف اقدامات کئے جاتے ہیں، اُن کی حیثیت سرمایہ کاری کی ہے جو انسانی وسائل کی تعمیر و تشکیل کے لیے کی جا رہی ہے۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اقتصادی ترقی اور سماجی ترقی ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں اور ان دونوں کے لیے سرمایہ کاری کو ایک ساتھ آگے بڑھانا ضروری ہے۔ ہندوستان ان چند ممالک میں سے ایک ہے جنھوں نے سماجی اور اقتصادی ترقی کو ایک ساتھ مربوط کرنے پر زور دیا ہے۔ سرکار نے بیس نکاتی پروگرام کے ذریعے سے یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ عمل اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ چنانچہ بیس نکاتی پروگرام کے تحت قومی ترجیحات کا جو تعین کیا گیا ہے، وہ بحیثیت مجموعی ملک کی ترقی کا ہی ایک اہم جزو ہے۔

بچے بھی قومی اثاثہ شمار کئے جاتے ہیں، ملک کا مستقبل ان بچوں کے ہاتھ میں ہی ہے۔ سرکار نے اگست ۱۹۷۴ میں بچوں سے متعلق جو قومی پالیسی تشکیل دی تھی، اس میں بچوں کو اہم ترین اثاثہ کہا گیا ہے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت، ان کی بہبود اور ان کی ترقی نیز ان کی شخصیت کا فروغ سماج کی اعلیٰ ترین ذمہ داری ہے۔ وزیراعظم کی زیرِ ہدایت بچوں کی بہبود سے متعلق بورڈ بچوں کی منصوبہ بندی اور ان کی بہبود سے متعلق مختلف ذمہ داریاں نبھاتا ہے۔ یہ بچوں کی بہبود سے متعلق مختلف پروگراموں کے درمیان تال میل بھی قائم کرتا ہے۔

آئین کے آرٹیکل ۳۹ میں مذکور ہے کہ ریاست کا فرض ہے کہ وہ کم سن بچوں کے لیے ایسی سہولتیں فراہم کرے جن سے صحت مند طریقے پر اُن کی نشوونما ہو سکے اور وہ آزادانہ ماحول اور وقار کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔ بچوں اور نوجوانوں کو استحصال سے بچانا بھی ایک آئینی ذمہ داری ہے۔ بچوں کے حقوق سے متعلق اقوام متحدہ کا جو منشور ہے، اس پر ہندوستان نے بھی دستخط کئے ہیں گویا ہندوستان اس منشور کی روشنی میں بچوں کی شخصیت کے فروغ کا پابند ہے۔ ہندوستان میں تقریباً ۲۷ کروڑ ۲۰ لاکھ بچے ہیں، اُن کی صحت کی دیکھ بھال، ان کے لیے تغذیہ بخش خوراک کی فراہمی، تعلیمی سہولتیں اور تفریحی مشاغل، یہ سب ذمہ داریاں سرکار کو سنبھالنی ہیں۔ کم سن بچوں کی اموات کا مسئلہ سنگین ترین ہوتا جا رہا ہے۔ ان کی ناقص غذاؤں کا مسئلہ بھی توجہ طلب ہے۔ ملک میں جس قدر اموات ہوتی ہیں، ان کی نصف تعداد ۵ سال سے کم عمر بچوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

ملیریا، ٹی۔ بی اور کوڑھ کے امراض تو اپنی جگہ سنگین ہیں ہی۔ ان کے علاوہ سانس کے ذریعے انفیکشن، اسہال، جلدی امراض، خون کی کمی وغیرہ بھی اکثر جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ سرکار نے ۱۹۷۵ میں ۳۳ تجرباتی پراجیکٹوں کے تحت بچوں کی بہبود کی مربوط اسکیمیں شروع کیں۔ ان کے ذریعے بچوں کے لیے تغذیہ بخش خوراک، ٹیکہ وغیرہ کی سہولتیں اور طبی معائنے وغیرہ شروع کئے گئے۔ ان کے علاوہ عورتوں کو صحت سے متعلق تعلیم اور زچہ بچہ کی خورد و پرداخت کے کام کو تیزی سے آگے بڑھایا گیا۔ یہ کام آنگن واڑی کے ذریعے پھیلایا گیا۔ دیہی اور شہری علاقوں میں ایک ہزار کی آبادی پر ایک آنگن واڑی کا بندوبست کیا گیا۔ قبائلی علاقوں میں ۷۰۰ کی آبادی کے لیے ایک ایک آنگن واڑی رکھی گئی۔ تربیت یافتہ خاتون رضا کار کو اس آنگن واڑی کی ذمہ داریاں نبھانی ہوتی ہیں۔ ان پروگراموں کی کامیابی حوصلہ افزا ہے۔ بچوں کی بہبود سے متعلق پروگرام کی رفتارِ ترقی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۸۰ میں اس کے لیے ۳۳۱ پراجیکٹ تھے جن کی تعداد بڑھ کر مارچ ۱۹۸۵ تک ۱۰۱۹ تک پہنچ گئی۔ ان پراجیکٹوں کے ذریعے ۹۳۹۵۰ آنگن واڑی کے مراکز ۵۰ لاکھ سے زیادہ بچوں اور دس لاکھ سے زیادہ ماؤں کو تغذیہ بخش خوراک فراہم کیا کرتے تھے۔ ۸۰۰ سے زیادہ آنگن واڑی مراکز پر اسکول جانے سے قبل کی عمر کے بچوں کو ضروری تعلیم دی جاتی ہے۔ ساتویں منصوبے میں اس پروگرام کے تحت مزید دو ہزار پراجیکٹ شروع کئے جانے ہیں۔ ([illegible])

لکشمی چندر

چھوٹی عمر، بڑا بوجھ

نہ صرف بھارت میں بلکہ بیشتر ترقی پذیر ممالک میں غریب و نادار خاندانوں کے بچوں کو کم عمر میں ہی محنت مزدوری کرکے اپنا پیٹ پالنا پڑتا ہے یا اپنے گھر کے اخراجات میں ہاتھ بٹانا پڑتا ہے۔ ان کی تعلیم یا تو بالکل نہیں ہوتی یا ادھوری رہ جاتی ہے وہ زندگی کی آسائشوں سے محروم رہتے ہیں اور مفلوک الحالی میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق بھارت میں ایک کروڑ ستر لاکھ بچے محنت مزدوری کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کروڑ بچے دیہی علاقوں میں اور صرف سات فیصد بچے شہری علاقوں میں کام کرتے تھے۔ دیہات میں یہ بچے زیادہ تر کھیت مزدوروں کا کام کرتے تھے۔ ان کی ایک قلیل تعداد گلہ بانی، ماہی پروری یا باغات میں کام کرکے اپنی روزی کماتی تھی۔ بھارت میں گھر سے باہر تعلیم کی سہولت صرف اونچے طبقوں کے بچوں کو حاصل تھی۔ نچلے اور غریب طبقوں کے بچے گھر پر ہی کام سیکھتے تھے اور تعلیم سے محروم رہتے تھے۔ آج صورت حال تو کچھ بہتر ہے، پھر بھی آپ کو گاؤں میں ایسے لوگ ملیں گے۔ خاص کر غریب طبقوں کے لوگ جو تعلیم کی افادیت کو نہیں سمجھتے۔ بچوں کے تعلیم سے بے بہرہ رہ جانے کی ایک وجہ غریبی اور مشکل نصاب تعلیم بھی ہے جس کی وجہ سے بہت سے بچے اسکول جانا چھوڑ دیتے ہیں اور پڑھائی پر کمائی کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ یا ان کے والدین معمولی سا فوری فائدہ تو دیکھتے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ پڑھائی چھوڑ دینے سے ان کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مزدور بچوں کی تعداد کم نہیں ہو پاتی۔

دیہات میں زمین کی تقسیم بہت غیر مساویانہ ہے۔ نچلی پچاس فیصد آبادی کے پاس صرف چار فی صد زمین ہے۔ کُل دیہی آبادی میں سے ۲۷ فیصد افراد لگان پر کھیتی باڑی کرتے ہیں اور ۳۲ فیصد کھیت مزدوروں کا کام کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ غریب والدین اپنے بچوں کو تعلیم دلانا تو درکنار ان کا پیٹ تک نہیں پال سکتے۔ لہٰذا وہ کم عمری ہی میں انھیں مزدوری پر لگا دیتے ہیں۔

محنت مزدوری کرنے والے بچوں کی تعداد میں اضافے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ بہت سے مالکان بالغوں کی بہ نسبت بچوں کو کام پر رکھنا بہتر سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر رکھا جا سکتا ہے اور ان سے زیادہ کام لیا جا سکتا ہے اور سونے پر سہاگہ یہ کہ انھیں کم مزدوری دینا بھی آسان ہوتا ہے۔ یہ استحصال نہیں تو اور کیا ہے۔ مفلسی اور ناداری کی وجہ سے بچہ یہ تو سیکھ لیتا ہے یا اسے یہ سکھا دیا جاتا ہے کہ وہ کس طرح اپنے ماں باپ کی آمدنی بڑھا سکتا ہے۔ لیکن وہ یا اس کے والدین یہ نہیں سمجھتے کہ اس کے مستقبل پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ ایک بچہ بڑا ہو کر کیا بنے گا اس کا دار و مدار تو اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ کس ماحول میں رہتا ہے اور کیسی تعلیم و تربیت حاصل کرتا ہے۔ اگر کوئی یہ بات سمجھتا بھی ہے تو غریبی اسے کچھ کرنے نہیں دیتی۔

لہٰذا یہ معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ وہ بچوں کی دماغی، جسمانی، اخلاقی و روحانی، نفسیاتی و جذباتی ترقی و نشو ونما کے لیے پورے مواقع مہیا کرے اور ان وجوہات کو ختم کرے جن کی وجہ سے بچوں میں مزدوری کا رجحان بڑھتا ہے۔

ایک تحقیقی جائزہ

بنگلور یونیورسٹی کے دیہی ترقی سے متعلق مطالعات کے مرکز نے دیہی علاقوں میں محنت مزدوری کرنے والے بچوں کے بارے میں ایک جائزہ مرتب کیا ہے جس میں اس بات کا پتہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دیہات میں بچے کن حالات میں کام کرتے ہیں، ان کی زندگی کا

[illegible] اور مزدور بچوں کی حیثیت سے ان کی تحقیقات کیا گیا۔ اس جائزے میں پانچ سے پندرہ برس تک کی عمر کے ان بچوں کو منتخب کیا گیا ہے جو پڑھائی چھوڑ کر یا پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیتوں یا کارخانوں میں یا گھریلو نوکروں کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ یہ جاننے کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ بچپن ہی سے مزدوری کرنے والے بچوں کی نشوونما پر کیا اثر پڑتا ہے۔

ضلع بنگلور کے ۱۰ گاؤں آسالامانجی اور [illegible] ورا کے ساٹھ بچوں کو کہیں کہیں سے ایک سیمپل سروے کے لیے چُنا گیا۔ جو کھیتوں میں کام کر رہے تھے یا ایک گلاس فیکٹری میں۔ یہ بچے ایسے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے جن کی آمدنی چھ سو روپے سے کم تھی۔ ان میں ۲۳ لڑکے اور [illegible] لڑکیاں تھیں۔ تفصیلات ایک سوالنامے کے ذریعے حاصل کی گئیں جس میں ۶۴ سوال تھے جو خاندان کے معاشی پس منظر، خاندان کے دیگر ارکان کے پیشے، بچے کے تعلیمی پہلو، کام کی جگہ کے حالات، کام کی نوعیت، کام کے گھنٹوں اور مزدور بچوں کی خواہشوں اور اُمنگوں کے بارے میں تھے۔ ۱۲ سال یا اس سے زیادہ عمر والے مزدور بچوں کا فیصد تناسب سب سے زیادہ تھا۔ تقریباً ۵۰ فیصد بچے پانچویں درجے تک تعلیم پا چکے تھے باقی ۱۵ فیصد نے ایس ایس ایل سی تک تعلیم حاصل کی تھی۔ جائزے سے معلوم ہوا کہ مزدوری کرنے والے بچوں کے والدین میں سے ۳۳ فیصد کے پاس کچھ جائداد تھی جبکہ ۶۷ فیصد والدین دستکار تھے جن کے پاس کوئی جائداد نہیں تھی۔ ۸۰ فیصد مزدور بچوں کے باپ بھی محنت مزدوری کر رہے تھے، جبکہ ۶۷ فیصد مزدور بچوں کی مائیں بھی مزدوری کرتی تھیں۔ صرف آٹھ فیصد مزدور بچے ایسے تھے جن کے باپ زندہ نہیں تھے۔ ۹۵ فیصد خاندان جھونپڑیوں میں رہ رہے تھے جبکہ باقی خاندان کرائے کے مکانوں میں رہائش پذیر تھے۔ سیمپل کا نوّے فیصد حصہ درج فہرست ذاتوں کا تھا جبکہ باقی دوسری ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے۔

زیادہ تر مزدور بچوں نے اپنے باپ کا ہی پیشہ اختیار کیا اور یہ پیشہ کھیت مزدوری تھا۔ سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ مزدور بچوں کی اکثریت درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں سے تعلق رکھتی تھی اور یہ محض ایک اتفاق تھا کیوں کہ سیمپل میں دانستہ طور پر ان ذاتوں اور قبیلوں کا انتخاب نہیں کیا گیا تھا۔ ۵۴ فیصد مزدور بچے چھ تا دس ارکان والے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے جبکہ ۴۶ فیصد پانچ یا اس سے کم ارکان والے چھوٹے خاندانوں کے تھے۔

زیادہ تر بچے جہاں کام کرنے جاتے تھے وہ جگہ ان کے گھروں کے نزدیک تھی۔ انھیں دن میں آٹھ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ لیکن ان میں ۱۶ فیصد بچے ایسے تھے جنھیں آٹھ گھنٹے سے زائد کام کرنا پڑتا تھا۔ ان بچوں کی اکثریت دو سے چار روپے روز تک کمائی تھی۔ ان میں سے پچاس فیصد کو اپنی اُجرت روزانہ ملتی تھی، اور باقی کو ہفتہ وار ادائیگی کی جاتی تھی۔ ۶۵ فیصد مزدور بچوں کو بحالت مجبوری مزدوری شروع کرنی پڑی جبکہ تقریباً ۳۰ فیصد نے اپنی مرضی سے کام کرنا شروع کیا۔ لیکن ان سبھی کے لیے بوجہ مجبوری کام کرنا ضروری تھا۔ تقریباً ۵۱ فیصد بچوں نے کام کرنے کے بجائے اپنی تعلیم جاری رکھنے کی خواہش ظاہر کی جبکہ ۴۹ فیصد بچے ایسے نکلے جو پھر سے اسکول جانے کو تیار نہ تھے۔ تعلیم جاری رکھنے کی خواہش ظاہر کرنے والے بچوں میں ۲۶ فیصد ایسے تھے جو ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کرنا چاہتے تھے، دو فیصد بچے پی یو سی تک جانا چاہتے تھے اور ۲۳ فیصد اعلیٰ تعلیم پانا چاہتے تھے۔

صرف پچاس فیصد مزدور بچے کتابیں وغیرہ پڑھنے میں دلچسپی رکھتے تھے جبکہ تقریباً ۲۸ فیصد اخبارات پڑھنا چاہتے تھے۔ ۷۰ فیصد بچے کسی بھی کھیل میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ تقریباً ۱۸ فیصد بچوں نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ انھیں کام کرنے کے لیے پڑھائی چھوڑنی پڑی اور ان میں سے ۱۵ فیصد نے کام کرنے کے ساتھ ساتھ اسکول جانے کی خواہش ظاہر کی۔ اگرچہ تمام مزدور بچوں نے اس بات پر فخر ظاہر کیا کہ وہ کام کر رہے ہیں۔ لیکن ۳۸ فیصد بچے یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ اتنی چھوٹی عمر میں مزدوری شروع کر کے اپنی زندگیاں برباد کر رہے ہیں۔

تقریباً ۹۳ فیصد مزدور بچوں کا خیال تھا کہ ان کے پاس فاضل وقت نہیں ہے۔ ۲۰ فیصد بچے ایسے تھے جن کو تھوڑا بہت وقت ملتا تھا جسے وہ گپ شپ میں گزارتے تھے۔ تقریباً ۴۵ فیصد بچے ایسے تھے جو مہینے میں ایک بار سینما دیکھ آتے تھے۔ ایسے بچوں کی تعداد ۱۷ فیصد تھی جو سال میں ایک بار سینما دیکھ پاتے تھے۔ ۹۰ فیصد بچوں کا کوئی محبوب مشغلہ یا کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔

سیمپل کے لیے چُنے گئے ۶۰ بچوں میں سے سبھی نے یہ بتایا کہ اُن کی کمائی ان کے والدین کو جاتی ہے جو گھر کا خرچ چلاتے ہیں [illegible] سبھی نے یہ کہا کہ ان کے مالکان ان کے ساتھ بُرا سلوک نہیں کرتے نہ ہی انھیں کوئی سزا دیتے ہیں۔

اس تجزیے میں سب سے زیادہ دلچسپ

بات جو اُبھر کر آئی وہ یہ تھی کہ لڑکے کمائی کرنے کے زیادہ خواہش مند تھے جبکہ لڑکیاں پڑھنا چاہتی تھیں۔ لڑکیاں ہائی اسکول سے زیادہ نہیں پڑھنا چاہتی تھیں جبکہ پڑھنے کی خواہش رکھنے والے بچے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے آرزو مند تھے۔ بہت سے بچے ایسے تھے جنھیں مجبوری میں اسکول چھوڑنا پڑا کیوں کہ مزدوری کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیم جاری رکھنا بہت مشکل تھا۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ فصل کی کٹائی کے دنوں میں مزدوری روزانہ ادا کی جاتی تھی اور ایک دن کا بھی ناغہ کرنے سے خاندان کو آمدنی کا نقصان ہوتا ۔ لڑکیوں کو جو کام کرنا پڑتا تھا اور جن حالات میں کرنا پڑتا تھا اس سے وہ مطمئن نہ تھیں۔ جبکہ لڑکے زیادہ آمدنی والا کام چاہتے تھے۔ مزدور بچوں کی اکثریت ایسی تھی جن کی زندگیوں کا کوئی نصب العین نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی حالت سے خوش نہیں تھے۔

جائزے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آئی ہے کہ یہ معاشی مجبوریاں اور ناگزیر حالات ہیں جن کی وجہ سے بچوں کو تعلیم چھوڑ کر کم عمری میں ہی محنت مزدوری شروع کرنی پڑتی ہے۔

"بچے ملک کی مُسکان ہیں"، "بچے قوم کا مستقبل ہیں"، "بچے کل کے شہری ہیں"۔ اس قسم کے نعرے اکثر سُننے میں آتے ہیں۔ بچوں کے بین الاقوامی سال کے دوران بہت سے ملکوں میں بچوں کی فلاح و بہبود کے اقدامات کیے گئے۔ بھارت میں بھی بچوں کی صحیح داشت و پرداخت اور ان کا مستقبل بہتر بنانے کے لیے کئی اقدامات کیے گئے۔ لیکن ان کے باوجود محنت مزدوری کرنے والے بچوں کا مسئلہ موجود ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ بچہ مزدوری سے متعلق قوانین کو سختی سے نافذ کیا جائے اور بچوں کے استحصال کو روکا جائے۔ غریبی کم کرنے کے پروگراموں کی رفتار تیز کی جائے اور غریب والدین پر تعلیم کی اہمیت واضح کی جائے جس سے کہ وہ اپنے معمولی سے فوری فائدے کے لیے اپنے بچوں کو اسکول سے نہ اٹھائیں۔ بچوں کا مستقبل حکومت اور معاشرے کی مشترکہ کوششوں ہی سے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ ●

بقیہ، نوجوانوں کا سال اور اُن کے مسائل

۱۴۔ اینٹ بھٹہ، سیمنٹ کی جالی یا برتن بنانے کی دُکان۔

مندرجہ بالا تمام خود روزگار اسکیمیں ہیں، جنھیں نوجوان دیہی و شہری علاقوں میں اختیار کر سکتے ہیں۔ اس سے نہ اُنھیں صرف خود کام کرنے کا فخر حاصل ہوگا بلکہ محنت کی قدر و قیمت مزید بڑھ جائے گی۔ خود روزگار سے جہاں اُن کا کنبہ خوشحال اور خود کفیل ہو جائے گا وہاں وہ ملک کی اقتصادی و سماجی ترقی کے بھی حصے دار رہیں گے۔ ملک میں مساوات کا جذبہ بیدار ہوگا۔ نوجوانوں کا تیار کردہ مال ملک کے علاوہ غیر ممالک کو بھی برآمد ہوگا۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ اپنا ملک دیہات کا ملک ہے۔ یہاں کوئی ۵ لاکھ دیہات ہیں۔ ہمارے نوجوان دیہات سے شہروں میں روزگار کی تلاش میں آتے ہیں اور پھر وہیں آباد ہو جاتے ہیں۔ گاندھی جی کے الفاظ میں "بھارت کی رُوح دیہات میں بسی ہوئی ہے"۔ جب تک ان دیہات کی ہمہ گیر ترقی نہیں ہوگی۔ بھارت کی حقیقی ترقی ممکن نہیں ہے"۔ دیہات کے کم یا زیادہ یا غیر تعلیم یافتہ نوجوان جدید زرعی تکنیک کو بروئے کار لاکر دیہی ترقی میں ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔

دیہات میں توہمات پرستی، قدامت پسندی اور دقیانوسی خیالات کو ختم کرنے میں نوجوان اہم حصہ ادا کر سکتے ہیں اور دیہی گھریلو صنعتوں کو فروغ دینے میں مدد دے سکتے ہیں۔ دیہات میں سڑکوں اور نالیوں کی تعمیر و مرمت کرنے اور دیہات کو صاف ستھرا رکھنے میں بھی نوجوان سرگرم حصہ ادا کر سکتے ہیں۔ وہ تعلیم بالغان، رات کے اسکولوں اور لائبریریوں کا اہتمام کر کے بھی دیہات میں بیداری لا سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان تمام امور میں سرگرم حصہ ادا کر کے نوجوان دیہات کی کایا پلٹ سکتے ہیں۔ ●

بقیہ، نوجوانوں میں سائنسی مزاج پیدا کرنے کی کوششیں

بنی نوعِ انسانی کے وسائل کو ان کے حقیقی پس منظر میں سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس لیے روزمرّہ کی کی زندگی اور انسانی کوششوں کے ہر پہلو کے سلسلے میں اخلاقیات سے لیکر سیاسیات اور اقتصادیات تک سائنسی طریقوں کو استعمال میں لانے پر زور دیا جا رہا ہے۔ سائنسی مزاج استفسار اور حالات کی حقیقت جاننے اور اس بارے میں سوالات کرنے کا حق دیتا ہے۔ اس سے مُراد یہ بھی ہے کہ سائنسی مزاج کی نشوونما کے لیے سابقہ خیالات، عقائد، مسائل اور قوانین کو تجزیہ کی روشنی میں غلط ثابت کیجیے۔ اس لیے یہ ایک مسلسل عمل ہے جو توثیق اور تجربات پر زور دیتا ہے۔ زندگی اور مسائل ایکدوسرے کے ساتھ جُڑے ہوئے ہیں۔ زندگی کی قدر و قیمت کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم کس حد تک مسائل سے نپٹنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور اس ضمن میں ہماری کوششیں کس حد تک کامیاب ہوتی ہیں۔ ●

راجیو کمار

زرعی مارکیٹنگ کی توسیع و ترقی پر ایک نظر

بھارت بنیادی طور پر ایک زراعتی ملک ہے۔ یہاں کے اسّی فیصد لوگ زراعت پیشہ ہیں۔ آزادی کے بعد ملک کی زرعی پیداوار میں قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے لیکن زرعی مارکیٹنگ کی سہولیات ابھی تک پوری طرح تسلّی بخش نہیں ہیں۔ اس امر کا احساس کرنے کی ضرورت ہے کہ زرعی پیداوار میں اضافہ اور زراعت کی جدید کاری سے اس وقت تک خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے جب تک کہ سارے ملک میں زرعی پیداوار کی مارکیٹنگ کا وسیع نظام موجود نہ ہو۔ ہمارے ملک میں ابھی تک بہت سی جگہیں ایسی ہیں جہاں نقل و حمل کی خاطر خواہ سہولیات موجود نہیں ہیں یا جو دشوار گذار اور منڈیوں سے دُور ہیں۔ چنانچہ وہاں کے بیشتر کاشت کاروں کو اپنی پیداوار استعمال کنندگان اور کمیشن ایجنٹوں کو اونے پونے داموں پر فروخت کرنی پڑتی ہے، کبھی اپنی ضرورتوں سے مجبور ہو کر اور کبھی اس ڈر سے کہ کہیں ان کی پیداوار ان کے پاس پڑی پڑی خراب نہ ہو جائے۔ بہت سے گاؤں ایسے ہیں جہاں کے کسان اپنی پیداوار کو بیل گاڑیوں یا سائیکل پر لاد کر منڈیوں میں لے جاتے ہیں۔ کچھ علاقے ایسے بھی ہیں جہاں آج بھی غریب کسانوں کو اناج سر پر ڈھو کر منڈیوں تک لے جانا پڑتا ہے۔

مارکیٹنگ کی سہولیات کی اہمیت

ظاہر ہے کہ ان حالات میں مارکیٹنگ سہولیات میں اضافہ و بہتری کی بڑی اہمیت ہے۔ جدید اصطلاح میں مارکیٹنگ کا مطلب صرف بکری یا فروخت ہی نہیں ہے۔ یہ ایک جامع اصطلاح ہے جس کے دائرہ عمل میں زرعی پیداوار کو صحیح طریقے سے محفوظ رکھنا، ان کی قسم یا کوالٹی کا تعین کر کے ان کی درجہ بندی کرنا اور انھیں منڈی یا بازار تک پہنچانا شامل ہے۔

کوآپریٹو مارکیٹنگ سوسائٹیاں

آزادی سے بہت پہلے ۱۹۲۸ء میں رائل کمیشن برائے زراعت نے اپنی رپورٹ میں کوآپریٹو مارکیٹنگ سوسائٹیاں قائم کرنے کی سفارش کی تھی۔ ایسی سوسائٹیاں قائم بھی ہوئیں لیکن ان کی تعداد میں مزید اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ سوسائٹیاں کسانوں کی پیداوار اپنے پاس رکھ کر انھیں فوراً روپیہ دے دیتی ہیں اور بعد میں صحیح قیمت ملنے پر متعلقہ ممبر کی رضامندی سے فروخت کر دیتی ہیں۔ کوآپریٹو مارکیٹنگ سوسائٹیاں دو قسموں کی ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جو منڈی کی سطح پر کام کرتی ہیں اور دوسری وہ جو ریاستی سطح پر کام کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ جگہوں پر ضلعی سوسائٹیاں بھی کام کر رہی ہیں۔ ۸۳-۱۹۸۲ میں کوآپریٹو مارکیٹنگ سوسائٹیوں نے ۲۳ ارب روپے کا کاروبار کیا تھا۔ سال مذکور کے دوران ۲۷،۴۲ لاکھ ٹن گیہوں خریدا گیا تھا۔ اس میں سے ۲۷،۲۰ لاکھ ٹن گیہوں کوآپریٹو سوسائٹیوں کے ذریعے خریدا گیا۔ اتر پردیش میں گنّے، مغربی بنگال میں پٹ سن، دارجلنگ میں چائے، کرناٹک میں تمباکو، گجرات میں روئی اور کیرل میں ربڑ کی مارکیٹنگ کا کام کوآپریٹو سوسائٹیاں بحسن و خوبی انجام دے رہی ہیں۔

نافیڈ NAFED بھی اس شعبے میں اچھا کام کر رہی ہے۔ ۸۳-۱۹۸۲ء میں اس ادارے نے تقریباً ایک ارب پانچ کروڑ روپے کا کاروبار کیا اور آلو، سرسوں، پیاز،

کالی مرچ، مکئی اور ارہر وغیرہ اجناس کافی مقدار میں خریدیں۔ نافیڈ کے علاوہ ملک میں ۱۲ مرکزی اور ریاستی سطح کی سوسائٹیاں اور ۲۷۵ دیگر سوسائٹیاں کام کر رہی ہیں۔ ملک میں تقریباً پانچ کروڑ ٹن پھل اور سبزیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کا ۲۵ فیصد حصہ محفوظ ذخیرہ گاہوں کی عدم موجودگی کے سبب ضائع ہو جاتا ہے۔ اس تضییع کو کولڈ اسٹوریج (سردخانوں) اور ریل اور روڈ ٹرانسپورٹ سے نقل و حمل کی سہولیات میں اضافہ کر کے کم کیا جا سکتا ہے۔

مارکیٹنگ سہولیات کو بہتر بنانے کے اقدامات

مرکزی وزارت زراعت و دیہی ترقی زرعی مارکیٹنگ کی سہولیات بڑھانے اور کسانوں کی حالت بہتر بنانے کے مختلف اقدامات کر رہی ہے

پسماندہ علاقوں کے بہت سے گانوؤں میں ہفتہ وار بازار لگتے ہیں جن میں کسان اپنی پیداوار بیچتے اور اپنے استعمال کی چیزیں خریدتے ہیں۔ اس طرح انھیں خرید و فروخت کے لیے دُور اُفتادہ بازاروں میں نہیں جانا پڑتا جس سے کرائے بھاڑے کی بچت بھی ہو جاتی ہے۔

وزارت زراعت و دیہی ترقی نے ان ابتدائی دیہی بازاروں اور تھوک بازاروں کی ترقی کے لیے ایک اسکیم ۷۸-۱۹۷۷ء سے شروع کر رکھی ہے۔ جس کے تحت ہر ابتدائی دیہی بازار میں بنیادی سہولیات کو بہتر بنانے کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپے تک کی امداد دی جاتی ہے۔ پہاڑی علاقوں کی ترقی، آدی باسیوں کی مربوط ترقی اور خشک سالی سے متاثر ہونے والے علاقوں کی ترقی کے پروگراموں کے تحت پسماندہ علاقوں میں واقع ہر دیہی تھوک بازار کے لیے پانچ لاکھ روپے تک کی امدادی رقم مہیا کی جاتی ہے۔

مرکزی حکومت نے ۸۳-۱۹۸۲ء تک ۱۸۸۳ ابتدائی دیہی بازاروں کی ترقی کے لیے ۴۰۰.۸ لاکھ روپے کی امداد دی۔ پس ماندہ علاقوں میں ۱۰۴ تھوک دیہی بازاروں کو ۳۶۷.۰۵ لاکھ روپے کی رقم بنیادی سہولیات میں اضافہ کرنے کے لیے فراہم کی گئی۔

پھلوں اور سبزیوں کے مضافاتی بازاروں کو امداد دینے کے لیے ایک لاکھ اور اس سے زیادہ آبادی والے ۲۱۶ شہروں کا انتخاب کیا گیا۔ اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام اور عالمی ادارہ خوراک و زراعت کے تعاون سے ڈائرکٹوریٹ آف مارکیٹنگ اینڈ انسپکشن نے بازاروں سے متعلق ایک اسکیم شروع کی ہے جس کے تحت پھلوں اور سبزیوں کے لیے تھوک اور دیہی بازاروں کی تنظیم و منصوبہ بندی، تکنیکی سہولیات کی فراہمی اور دُور افتادہ بازاروں سے جلد خراب ہو جانے والی چیزوں کی بروقت ترسیل کے لیے امداد دی جاتی ہے۔ مارکیٹنگ ریسرچ کا ایک پروگرام بھی زیر عمل ہے جس کے تحت ایسے علاقوں کا سروے کیا جاتا ہے جہاں مختلف زرعی اشیا کے تعلق سے کوئی نہ کوئی مسئلہ درپیش ہے۔ ایسے جائزوں کے بعد جو رپورٹیں ملتی ہیں ان کی روشنی میں مارکیٹنگ کی سہولیات کی اصلاح و ترقی کے لیے وقتاً فوقتاً نئی اسکیمیں شروع کی جاتی ہیں۔

زرعی مارکیٹنگ اور انسپکشن کا ڈائرکٹوریٹ ان دونوں ہی مقاصد کے لیے کام کرتا ہے کہ زراعت، مویشی پروری اور باغبانی کا کام کرنے والوں کو اپنی پیداوار کی مناسب قیمت ملے اور صارفین کو خالص اشیاء دستیاب ہوں۔ اس کے لیے زرعی پیداوار کی درجہ بندی اور مارکنگ (نشان زدگی) کے قانون کے تحت ۱۴۱ اشیاء کی درجہ بندی کے لیے ہدایات جاری کی گئیں۔ ڈائرکٹوریٹ کا شعبۂ معیار بندی اشیاء کا معیار مقرر کرتا ہے۔

ایگ مارک اور درجہ بندی

بہت سی تجارتی اشیاء مثلاً لال مرچ، کالی مرچ، گرم مصالحہ، خام تمباکو، الائچی، خوردنی تیل، اخروٹ، پیاز، ادرک، آلو اور دالوں وغیرہ کی برآمد سے قبل لازمی درجہ بندی کی جاتی ہے۔ ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۲۹،۲۱۴ کروڑ روپے کی مالیت کی اشیاء کی درجہ بندی کی گئی۔ وزارت زراعت و دیہی ترقی کا مارکیٹنگ اور انسپکشن ڈائرکٹوریٹ صارفین کو عمدہ قسم کا مال بہم پہنچانے اور پیداوار کنندگان کو صحیح قیمت دلانے کے لیے ایک ریاست سے دوسری ریاست میں بھیجے جانے والی زرعی پیداوار مثلاً گھی، تیل، مکھن، شہد، پسے ہوئے مصالحہ جات اور کیمیاوی کھاد وغیرہ کی ایگ مارک کے تحت درجہ بندی کی جاتی ہے۔ آٹا، دالوں، انڈوں، پھلوں اور آلو وغیرہ کی درجہ بندی ریاستوں کے مارکیٹنگ، نگراں کرتے ہیں۔ ۸۳-۱۹۸۲ء میں اندرونِ ملک استعمال کے لیے ۴۰۰ کروڑ روپے سے زائد مالیت کی زرعی اشیاء درجہ بند کی گئیں۔

منتخب باقاعدہ بازاروں میں کپاس، پٹ سن، تمباکو، مونگ پھلی اور کاجو جیسی نقد آور فصلوں کی پیداوار کنندگان کی سطح پر درجہ بندی کے مرکز قائم کرنے کے لیے مالی امداد دینے کے واسطے ۷۸-۱۹۷۷ء میں ایک اسکیم شروع کی گئی تھی۔ ۱۹۸۴ء تک پیداوار کنندگان کی سطح پر قائم کیے گئے درجہ بندی مراکز کی تعداد ۷۵۰ کے لگ بھگ تھی۔ ۸۳-۱۹۸۲ء اور ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۱۶۶۳ کروڑ روپے سے

ترپورہ ریاست کی زرعی اجناس کی پیداوار کنندگان کی سطح پر درجہ بندی کی گئی۔ ان میں گیہوں، مکئی، گیہوں، چنا، جوار، مونگ پھلی، سرسوں، دال، مونگ پھلی، آلو، گڑ اور کپاس وغیرہ اہم اجناس شامل تھیں۔

کولڈ اسٹوریج

زرعی پیداوار کا ایک بڑا حصہ خاص کر سبزیاں اور پھل وغیرہ گرمی کے موسم میں جلد خراب ہو جاتا ہے کیوں کہ چھوٹے کسانوں کے پاس جلد خراب ہونے والی اشیاء کو محفوظ رکھنے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ لیکن کولڈ اسٹوریج یا سردخانوں کے قیام سے یہ نقصان کافی حد تک کم ہو گیا ہے۔ ان کی بدولت کسانوں کو اپنی پیداوار جلد از جلد اونے پونے داموں پر فروخت کرنے کی جلدی نہیں رہتی۔ سردخانوں میں اشیاء کو محفوظ رکھ کر اس وقت بیچا جا سکتا ہے جب اس کے منافع بخش دام مل سکیں۔

حکومت نے ڈاکٹر سوامی ناتھن کمیٹی کی سفارش پر عمل کرتے ہوئے ایک قومی باغبانی بورڈ قائم کیا ہے۔ عالمی بینک کی ایک اسکیم کے تحت اتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش، ہریانہ اور مغربی بنگال میں ۱۰۰ کولڈ اسٹوریج قائم کرنے کی منظوری دی گئی ہے، جن کی صلاحیت ۹۶ ر ۳ ٹن ہوگی۔

مرکزی وزارت زراعت و دیہی ترقی کے کولڈ اسٹوریج سے متعلق آرڈر کے تحت سردخانوں کی ترقی و توسیع میں باقاعدگی لائی جاتی ہے۔ سردخانوں کی تعمیر کے لیے لائسنس جاری کیے جاتے ہیں اور بے قاعدہ اور خراب سردخانوں کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ ۱۹۸۳ میں ۱۱۳۱ لائسنس یافتہ کولڈ اسٹوریج کام کر رہے تھے جن کی صلاحیت ۹۲۹۴۱۸ ٹن تھی۔

اسی سال نئے سردخانوں کے لیے ۵۲ مزید لائسنس جاری کیے گئے۔ ۵۴ سردخانوں کی صلاحیت بڑھائی گئی اور ۳۹ صنعتوں کو ۶۲۰۰۰ ٹن کی صلاحیت والے کولڈ اسٹوریج قائم کرنے کی منظوری دی گئی۔ علاوہ ازیں ۲۷۲ سردخانوں کو مشاورتی خدمات بہم پہنچائی گئیں۔

گوداموں کی تعمیر

وزارت زراعت و دیہی ترقی ۸۰-۱۹۷۹ سے ایک اسکیم کے تحت دیہی گوداموں کا ایک قومی گرڈ بنا رہی ہے۔ اس کے ذریعے کسانوں کو ان کے کھیتوں کے نزدیک گوداموں کی سہولیات بہم پہنچائی جا رہی ہیں۔ یہ گودام اناج اور دیگر زرعی اشیاء مثلاً پھل، سبزیاں اور مویشیوں سے حاصل ہونے والی چیزوں کو محفوظ رکھنے کے کام آتے ہیں۔ بیجوں اور کیمیاوی کھاد کو بھی ان گوداموں میں رکھا جا سکتا ہے۔

کارکنوں کی تربیت

وزارت زراعت و دیہی ترقی کا مارکیٹنگ اور انسپکشن ڈائرکٹوریٹ ریاستی سرکاروں، کوآپریٹو سوسائٹیوں، باقاعدہ بازار کمیٹیوں اور مختلف اشیاء کے بورڈوں اور کارپوریشنوں کے کارکنوں کی تربیت کے لیے کئی اقسام کے تربیتی نصابات کا اہتمام بھی کرتا ہے جن میں کارکنان بہتر اور سائنٹی فک ڈھنگ سے کام کرنے کی تربیت حاصل کرتے ہیں۔

جے پور میں زرعی مارکیٹنگ کا ایک نیا مرکز قائم کرنے کی تجویز پر بھی غور کیا جا رہا ہے۔ جس میں زرعی مارکیٹنگ کے شعبے میں تحقیق و تربیت کا کام کیا جائے گا۔ اس میں تربیت پانے والے افراد ملک کی زرعی مارکیٹنگ کے پروگراموں کو مستعدی سے عمل میں لائیں گے۔ اس مرکز کے تحقیقی پروگراموں سے ملک کے دیگر اداروں کے تحقیقی کام میں بھی مدد ملے گی۔

بقیہ صنعت پارچہ بافی میں خواتین کا حصہ

ریاست کیرالہ نے سلائی اور کڑھائی وغیرہ کے سلسلہ میں خواتین کے لیے چند ایسی امداد باہمی کی سوسائٹیاں تشکیل دی ہیں جن میں صد فیصد خواتین ہی کام کرتی ہیں اور وہ کامیابی کے ساتھ چل رہی ہیں مگر ایسی کوششیں بس خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک گیر پیمانے پر منصوبہ بند طریقے سے ہر سمت و شعبے میں اس کے حصول کے لیے جدوجہد کی جائے اور بلا تفریق نسل و مذہب اس میں تمام مذاہب و ملل کی خواتین کو شریک کیا جائے اور ان کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی کی جائے۔ پھر یہ بات یقینی طور سے کہی جا سکتی ہے کہ اس طرح کی کوششوں سے بڑے خوش آئند نتائج برآمد ہوں گے۔ منجملہ دیگر فوائد و ثمرات کے قومی آہنگی کے لیے بھی اس قسم کی کوششیں ہمیں مستقبل میں نئے خطوط فراہم کریں گی اور ذہنی و سماجی بیداری میں معین و مددگار ثابت ہوں گی۔ ماضی میں جن ممالک میں بھی اس نوع کے تجربات کیے گئے ہیں، وہاں بڑے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ جن کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ ●

شیام سندر چاؤلہ

نوجوانوں کا سال اور اُن کے مسائل

۱۹۸۵ء نوجوانوں کے بین الاقوامی سال کے طور پر منایا جارہا ہے۔ جسم انسانی میں جو مقام نوجوانی کو حاصل ہے وہی مقام ملکی اور سماجی زندگی میں نوجوانوں کو حاصل ہے۔ دراصل نوجوان ہی کسی ملک کے رُوحِ رواں ہوتے ہیں۔ مدبّر، دانشور، سیاستداں اور اہلِ اختیار جو جو پروگرام مرتب یا پیش کرتے ہیں، نوجوان اُن کی تعمیل کرتے ہیں۔ اور اُنھیں آگے لے جاتے ہیں۔ اب جبکہ ملک ۲۱ ویں صدی میں قدم رکھنے جارہا ہے یہ قدرتی امر ہے کہ ملکی رہنماؤں کی توجہ نوجوانوں کی جانب مبذول ہوئی ہے۔ نوجوانوں کی ہمہ گیر ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اُن کی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی نشو ونما کے ساتھ ساتھ اُنھیں ایسی تعلیم دی جائے جس سے وہ نہ صرف آزادانہ طور پر اپنے پاؤں پر کھڑے ہوسکیں بلکہ اپنی معاشی زندگی بھی بہتر بنا سکیں۔ لیکن آج صورتِ حال یہ ہے کہ نوجوانوں میں اضطراب پایا جاتا ہے۔ اُنھیں اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ اسکولوں اور کالجوں سے تعلیم حاصل کرکے نکلتے ہیں تو وہ ملازمت حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں تو اُن کے دلوں میں بے چینی کا طوفان اُٹھنے لگتا ہے۔ روٹی چاہیئے وہ نہیں ملتی، کپڑا چاہیئے وہ نہیں ملتا۔ سر چھپانے کو جگہ چاہیئے وہ نہیں ملتی۔ اُس سے اُنھیں اپنے سامنے تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے۔ اس کے نتیجے میں بعض نوجوان بھٹک جاتے ہیں لہٰذا راہزنی اور بنک ڈکیتوں کے واقعات کے بارے میں جو کچھ سُنتے یا اخبارات وغیرہ میں پڑھتے ہیں اُن میں زیادہ تر ان تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ہاتھ ہوتا ہے جن کے سامنے روزی کے تمام دروازے بند ہوتے ہیں۔ یہ بدقسمتی نہیں تو کیا ہے کہ جس سماج نے اُن کی پرورش و پرداخت کی، سکھایا پڑھایا اور اُن سے توقعات وابستہ کیں وہی اُس سماج کے دشمن بن گئے۔

اس سب کے لیے نوجوانوں کو قصوروار ٹھہرانا دراصل حقیقت، تلخ حقیقت سے آنکھیں موندنا ہے۔ نوجوان غلط پلاننگ کا شکار ہوئے ہیں۔ جس کے لیے ہم سب ذمہ دار ہیں بلکہ زیادہ موزوں طور پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ پلاننگ ابھی شروع ہوئی ہی نہیں۔ جو کچھ ہورہا ہے وہ اُس سامراجی نظام کی باقیات ہیں جو دو صدی سے زائد عرصے تک ہمارے ملک پر مسلّط رہا۔ اُس سامراج کی طرف سے جو تعلیمی نظام رائج کیا گیا اُس کا مقصد ملک کی تعمیر و ترقی کو بڑھاوا دینا نہیں تھا بلکہ ایسے کلرک تیار کرنا تھا جو اُس مشینری کے پُرزوں کا کام دے سکیں۔ برطانوی دور میں ایسا ہی ہوتا رہا۔ اُس سے کسی بہتری کی توقع کرنے کا مطلب خود کو جان بوجھ کر دھوکہ دینے کے مترادف تھا۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ اُس منظر کے ہٹ جانے کے بعد بھی اُس تعلیمی نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی عمل میں نہیں آئی۔ اسکول و کالج اُسی طرح کلرکوں اور بے روزگاروں کی فوج تیار کررہے ہیں۔ طبّی، انجینئرنگ اور تکنیکی شعبوں میں کچھ بہتری ضرور ہوئی ہے لیکن اُن میں روزگار کے مواقع محدود ہونے سے نوجوانوں کا مسئلہ حل نہیں ہوا۔

چنانچہ ان تمام حالات کا احساس کرتے ہوئے وزیرِاعظم جناب راجیو گاندھی نے اپنے عہدے کا قلمدان سنبھالتے وقت قوم کے نام اپنا پیغام نشر کرتے ہوئے کہا تھا کہ طلباء کو

پیشہ ورانہ تعلیم دی جائے گی جو صنعت، زراعت، پیغام رسانی اور معیشت کے دیگر پیداواری شعبوں کے ساتھ منسلک ہوگی۔ اس سلسلے میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے بہترین کام یہ ہوگا کہ اُن طلباء کو پیشہ ورانہ تعلیم دی جائے جو سینئر ثانوی سطح پر اپنی عام تعلیم ختم کرتے ہیں یا پھر ایسے طلبا کو یہ تعلیم دی جائے جنہیں ایسی تعلیم کی ضرورت ہے۔

تمام طلبا کو تعلیم دینے کا مطلب ہوگا کہ اُن نوجوانوں کو تعلیم دینا جو وکیل، ڈاکٹر، انجینئر، ایڈمنسٹریٹر، منتظم بننا چاہتے ہیں اور ان کے علاوہ انھیں بھی تعلیم دینا جو بعض خصوصی پیشوں میں تربیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے پلاننگ کمیشن کو ریاست اور ضلع کی سطحوں پر پیشہ ورانہ تعلیم کو صنعت، زراعت، پیغام رسانی اور معیشت کے دیگر پیداواری شعبوں کے ساتھ منسلک کرنے اور مختلف شعبوں میں روزگار کے امکانات کا پتہ لگانے کے لیے بڑا رول ادا کرنا ہوگا۔

طلبا خواہ کوئی بھی علم حاصل کر رہے ہوں وہ تعلیم کے اختتامی نصاب کے طور پر ملک کے ترقیاتی پراجیکٹوں میں ایک برس کے لیے قومی خدمت انجام دے کر پیشہ ورانہ تعلیم یا کام کا تجربہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس طرح نوجوانوں کو اپنے ہاتھوں سے کام کرنے کے لیے اعلیٰ تربیت دستیاب ہو جائے گی۔ اور اس کے علاوہ انھیں ترقی اور عوام کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے سے متعلق ملک کی ضروریات کا کماحقہ علم ہو جائے گا۔

ملکی اور ریاستی سطحوں پر پلاننگ مشینری پہلے ہی موجود ہے۔ اضلاع میں ڈسٹرکٹ کلکٹر، ڈی۔ ایس۔ پی، ڈی۔ ای۔ او، ڈی ایم او، ڈسٹرکٹ انجینئر، ڈسٹرکٹ بینک منیجر اور سرکردہ تاجروں، دو مشہور کسانوں، دو صنعت کاروں اور دو امیر اور با اثر اشخاص کی خدمات کو بروئے کار لا کر ترقیاتی کونسلیں آسانی سے قائم کی جا سکتی ہیں۔ یہ کونسلیں سڑکوں، پمپوں، نہروں، باندھوں، اسکولوں، ہسپتالوں اور ایسی صنعتوں کے بارے میں اضلاع کی ضروریات کا پتہ لگانے کے لیے لازمی سروے کر سکتی ہیں جو ضلعوں، خاندانی صحت کی دیکھ بھال، غذائیت، اشیائے صرف، مکانوں کی ضروریات اور دستیاب مادی وسائل اور افرادی قوت کے لیے موزوں ہوں۔ ایسا کرنے کے بعد وہ اپنے ضلعی ترقی کے پلانوں کے بارے میں فیصلہ کر سکتی ہیں۔ اور زیادہ تر مقامی وسائل اور افرادی قوت کے ساتھ جن میں اپنی تعلیم ختم کرنے والے طلباء شامل ہوں ان پلانوں کی تعمیل کر سکتی ہیں۔ مزید ضروریات ریاستوں اور مرکز کی طرف سے پوری کی جا سکتی ہیں۔

اگر آمدنی ٹیکس میں مراعات اور سرمایہ کاری سے ہونے والے منافع میں سے موزوں حصہ اور ایسی ہی ترغیبات دی جائیں تو کافی سرمایہ مقامی طور پر دستیاب ہو سکتا ہے۔ اور ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں پائی جانے والی کمی بھی بہت حد تک دُور ہو سکتی ہے۔ ایسی اسکیم سے سارا ملک قومی تعمیر کے عظیم کام کی جانب متوجہ ہو سکتا ہے اور اس سے جہاں افلاس، امراض، بدحالی اور پسماندہ طبقوں کے مصائب دُور کرنے میں مدد ملے گی وہاں ہمارے نوجوانوں کو ضروری تربیت بھی فراہم ہو گی۔

نوجوان تخلیقی قوت کے مالک ہیں اور ملازمتوں کے بجائے خود روزگار میں دلچسپی رکھتے ہیں وہ پیشہ ورانہ تربیت کے بعد مختلف کام دھندے شروع کر سکتے ہیں۔ آج ان کام دھندوں کے لیے تمام قومی ملکیت بینکوں کی طرف سے کم شرح سود پر قرضے فراہم کئے جا رہے ہیں۔ تعلیم یافتہ نوجوان مندرجہ ذیل کام دھندوں میں سے اپنے لیے کوئی بھی دھندہ گاؤں یا قصبے میں شروع کر سکتے ہیں:۔

۱۔ دواؤں، چائے یا بیکری کی دکان۔
۲۔ پرچون فروشی، جنرل اسٹور یا سِلے سلائے کپڑوں کی دکان۔
۳۔ سلائی، کڑھائی یا کشیدہ کاری کا دھندہ۔
۴۔ بڑھئی، لوہار یا ہتھ کرگھہ کی دکان۔
۵۔ جوتے، کھلونے یا بیڑی بنانے کا دھندہ۔
۶۔ سائیکل، اسکوٹر مکینک یا گیس اسٹوو کی مرمت کی دکان۔
۷۔ چوبی فن کاری کا کام، چوڑیاں، لوہا یا سیمنٹ کی دکان۔
۸۔ معمارگری، ہیئر کٹنگ یا زرگری کا کام۔
۹۔ کاشتکاری کے شعبے میں، افزائش مویشیاں، مرغبانی یا دودھ کا دھندہ۔
۱۰۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے دھندے۔ شہد کی مکھیاں پالنا۔ ریشم کے کیڑے پالنا یا کھُمبی وغیرہ کی کھیتی کرنا۔
۱۱۔ نمکین، مٹھایا یا اچار بنانے کی دکان۔
۱۲۔ فرنیچر، لکڑی کی ٹال یا کوئلہ وغیرہ کی دکان۔
۱۳۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن مکینک یا بجلی کے سامان کی دکان۔

(باقی صفحہ ۔۔ پر)

نریندر جوشی

بھارت کی ہینڈلوم صنعت پر ایک نظر

بھارت میں کپڑا صنعت زراعت کے بعد سب سے بڑی اقتصادی سرگرمی ہے۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ کوئی ایک کروڑ سے زیادہ بنکر اس صنعت میں کام کررہے ہیں اور وہ ۱۳ کروڑ میٹر کپڑا سالانہ تیار کررہے ہیں۔ یہ صنعت نہ صرف ملک کے بہت بڑے حصے کی کپڑے سے متعلق ضروریات کو پورا کر رہی ہے بلکہ سمندر پار ممالک کو کپڑا برآمد کرکے زر مبادلہ بھی کمارہی ہے جس سے ہمارے غیر ملکی بیوپار میں عدم توازن کو دُور کرنے میں بڑی مدد مل رہی ہے۔ حالیہ برسوں میں بُنکروں کے روایاتی ہنروں کا احیا کرنے کے لیے زبردست کوششیں کی گئی ہیں۔ تاکہ بھارتی کپڑے کی کوالٹی کو بہتر بنایا جاسکے جس میں پاورلوموں کی طرف سے بہت بڑے پیمانے پر کپڑے کی تیاری کے باعث گراوٹ آئی ہے۔ دی ہینڈی کرافٹس اینڈ ہینڈلومز ایکسپورٹ کارپوریشن آف انڈیا لمیٹڈ نئی دلی کی طرف سے اس امر کا تعین کیا جارہا ہے کہ ہتھ کرگھے کے کپڑے کی کوالٹی ایسی ہو جو مشینی کپڑے کی نہیں ہوسکتی اور اس کے علاوہ اعلیٰ درجے کے ماہر بُنکروں کی نشاندہی کی جاسکے۔

بھارت میں ہتھ کرگھے سے کپڑا کوئی پانچ ہزار برس سے تیار ہورہا ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ بھارت دنیا میں اس صنعت میں پیشرو ہے۔ ہم رامائن، مہابھارت کے عہد میں اعلیٰ درجے کے کپڑوں کا ذکر پاتے ہیں۔ عہد موریہ میں اور اس کے بعد بھارت میں ریشمی کپڑوں کا نہ صرف استعمال ہوتا تھا بلکہ سمندری راستوں سے اُن کی برآمد بھی ہوتی تھی۔ ڈھاکہ کی ململ کی کوالٹی کی تو کوئی نظیر نہیں ملتی جس کا ایک پورا تھان انگوٹھی میں سے نکل جاتا تھا۔ تمام سُوتی، ریشمی اور اونی کپڑا ہتھ کرگھے پر ہی بنایا جاتا تھا۔ دراصل یہ کاریگروں کی ہنرمندی، بصیرت، بناوٹ کی اعلیٰ ٹیکنالوجی اور قدرتی وسائل تھے جو ہزاروں برس پہلے اس قدر فروغ پاچکے تھے کہ انھوں نے اس کپڑا صنعت کو جو طاقت بخشی اُس نے ہزاروں برس کے اتار چڑھاؤ کے باوجود اس صنعت کو زندہ رکھا۔ تصورات، علامات اور اعلیٰ سوجھ بوجھ کی وسیع روایات کے باعث بھارتی کپڑا صنعت میں کوئی جمود پیدا نہیں ہوسکا کیونکہ اگرچہ اس کے فیشن اور بناوٹ کا کئی بار اعادہ کیا گیا تاہم نقل کے ارادے کے ساتھ ایسا کبھی نہیں کیا گیا اور فنکاری کی ہر شئے میں انسانی جذبات اور دلچسپیوں کا آفاقی اظہار پایا جاتا تھا۔

رنگوں کی بہار

ابتدائی عہد سے مختلف صورتوں سے کے پارچہ جات، سر کے لباس، جوتے اور جواہرات تیار کیے جارہے ہیں۔ ہر نسلی گروہ نے اپنے رنگ کردار کو برقرار رکھا ہے جو اُن کے تشخص کی علامات بن گئے ہیں اور جنھوں نے اُنکے مشترکہ حسب ونسب کا سلسلہ قائم کرنے میں مدد دی ہے۔ آج تک گجرات، کاٹھیاواڑ اور راجستھان میں گوالوں، شتربانوں، بھیلوں اور خانہ بدوش گوجروں کی عورتیں بھڑکیلے لہنگے، کُرتے اور سر کے لباس پہن رہی ہیں، جو پکے رنگوں سے تیار کیے جاتے ہیں۔ ہر گروپ کا لباس امتیازی فیشن اور رنگ کا ہوتا ہے جس سے اُن کی نشاندہی آسانی سے کی جاسکتی ہے۔

مشرق میں آسام سے ہرے بھرے بنگال سے لے کر اُترپردیش، اڑیسہ اور آندھرپردیش تک جو خطہ پھیلا ہوا ہے۔ اُسے بُنائی کا عظیم خطہ کہا جاتا ہے۔ اس میں ہمیشہ بناوٹ، فیشن اور نقشوں پر زور دیا جاتا ہے۔ یہاں اعلیٰ سوتی، ریشمی کپڑوں کے علاوہ موٹا کپڑا بھی بنا جاتا ہے۔

مغرب میں بلوچستان اور سندھ سے کاٹھیاواڑ کے صحراؤں سے ہوتا ہوا راجستھان اور گجرات تک جو خطہ پھیلا ہے وہ رنگوں کا عظیم خطہ ہے۔ جنوب میں مہاراشٹر کی پہاڑیوں اور آندھر پردیش میں لوگوں کا ہلکے رنگوں سے لگاوٹ جبکہ

اور ہریالی یا سفید رنگ پسند کیا جاتا ہے۔

بھارت کے لوک گیتوں اور شاعری میں رنگوں کا بڑا چرچا ہے۔ رنگوں سے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ سرخ رنگ چنری اور ساری سے وابستہ ہے اور سہاگ کی علامت ہے۔ یہ پوشاک "ابھیسارِکا" پہنتی ہے یعنی وہ نوعمر عورت جو رات کی تاریکی میں اپنے محبوب کی منتظر ہے۔ زعفرانی رنگ یوگیوں اور تارکانِ دنیا کا رنگ ہے۔ پیلا بسنت یعنی موسمِ بہار، آم کے بور، شہد کی مکھیوں کے جھنڈ کا رنگ ہے۔ گہرا بادامی اور سیاہ رنگ ماتم کے مظاہر ہیں۔ نیلا رنگ کرشن جی کا بھی رنگ ہے۔ اسی طرح بڑے بڑے دیوتاؤں کے بھی اپنے اپنے رنگ ہیں جیسے برہما کا رنگ سرخ، شِو کا سفید اور وشنو کا نیلا ہے۔

بھارتی کپڑے کا عروج

بھارت میں کپڑا قدرتی رنگوں سے رنگا جاتا تھا اور یورپ اور دیگر ممالک میں اس کپڑے کی بھاری مانگ رہتی تھی لیکن انگلینڈ میں صنعتی انقلاب کی آمد سے درآمد و برآمد کا نقشہ ہی بدل گیا۔ یورپ، افریقہ اور جنوب مشرق ایشیا کی منڈیوں میں جہاں بھارتی کپڑے کے انبار لگے رہتے تھے وہاں ان کی مانگ کم ہونی شروع ہوگئی۔ اس کی جگہ مانچسٹر کے کپڑے نے لینی شروع کردی جو جدید مشینوں اور پاور لوموں پر بنتا تھا اور جو مصنوعی رنگوں سے رنگا جاتا تھا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھارتی بنکروں کے کام دھندوں اور زندگی میں زبردست تبدیلیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بھارت کے خوشحال طبقوں نے جو مغربی رنگ میں رنگے جارہے ہیں۔ ہاتھ سے کتے ہوئے نفیس سوتی اور ریشمی کپڑوں نے جن کے لیے سبھی بھارتی کاریگر دنیا بھر میں مشہور تھے، رُخ پلٹنا شروع کردیا اور وہ غیر ممالک کیا بھی جارحیت اور گریب کے گرویدہ ہوگئے، لیکن تحریکِ آزادی کے لیڈروں اور خصوصاً مہاتما گاندھی نے اپنی دُوررس نگاہوں سے اس بیماری کو بھانپ لیا جو خاص طور پر دیہی معیشت میں سرایت کررہی تھی۔ چنانچہ انھوں نے سودیشی تحریک چلائی جس کا چرخہ جزو لاینفک تھا۔ یہ تحریک برطانیہ کی کپڑا صنعت کو چنوتی تھی۔

حصولِ آزادی کے بعد ۱۹۵۳ میں پنڈت نہرو کی مساعی سے آل انڈیا ہینڈلوم بورڈ کا قیام عمل میں آیا جس میں بنکروں کے مفادات کے بڑے بڑے نمائندوں کو یکجا کیا گیا اس کے بعد ۱۹۵۵ میں آل انڈیا ہینڈلوم فیبرکس مارکیٹنگ کوآپریٹو سوسائٹی قائم کی گئی۔ یہ ایک بڑی جماعت تھی جس کا زیادہ تر کام ہینڈلوم کوآپریٹو تنظیموں کے ذریعے تیار کردہ کپڑے کو فروخت کرنا تھا۔ تقریباً اسی وقت ہینڈلوم صنعت کا ایک بڑا شعبہ جو بعد میں "دیورز سروس سینٹرز" کے نام سے موسوم ہوا اور ہینڈلوم ٹیکنالوجی کے دو ادارے بھی قائم کیے گئے۔ انھوں نے ہینڈلوم کی ترقی کے لیے ایک بنیادی ڈھانچہ قائم کیا۔ جس کا تعلق عملی تحقیق، سروس اور تربیت سے تھا۔ اس کے بعد ۱۹۵۸ میں ہینڈی کرافٹس اینڈ ہینڈلومز ایکسپورٹس کارپوریشن آف انڈیا کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس کا مقصد ہتھ کرگھے سے بنے کپڑے کو یورپ اور امریکہ کی نئی نئی منڈیوں کو برآمد کرنا تھا۔

حال تک ترقی کا بڑا زون سوتی اور ریشمی کپڑے پر رہا ہے اور ان کی برآمد میں ڈرامائی طور پر اضافہ ہوا ہے۔ ۶۰ کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں ۱ کروڑ روپے کی مالیت کے کپڑے کی برآمد ہوئی جو ۸۳–۱۹۸۲ میں بڑھ کر ساڑھے تین ارب روپے کی ہوگئی۔ یہ ہینڈلوم کے ترقیاتی اخراجات کا اعادہ ہے کہ ہاتھ سے کتی ہوئی، بُنی ہوئی اور فنیشن کی ہوئی اون کی ترقی کا کام اپنے ہاتھ میں لیا جائے۔ ۱۹۸۳ میں آل انڈیا ہینڈلوم کارپوریشن کا قیام اس مقصد سے کیا گیا کہ کوآپریٹو شعبہ سے باہر کے بُنکروں کو امداد مہیا کرنے کے لیے ایک بنیادی ڈھانچہ بنایا جائے۔

۱۹۸۲ میں یہ دیکھنے کے لیے ایک پراجیکٹ شروع کیا گیا کہ ہینڈلوم میں موجودہ ہنروں کی کس حد تک توسیع کی جاسکتی ہے۔

چنانچہ برطانیہ میں بھارتی میلے میں ایک بڑی نمائش کا انعقاد کیا گیا جس کا عنوان تھا "وِشوکرما۔ بھارت کے ماہر بنکروں کو خراجِ عقیدت"۔ نمائش میں رکھے ہاتھ سے بُنے ہوئے کپڑے کی اعلیٰ کوالٹی اور بے پناہ ہنرمندی نے اس ملک کے عظیم فنون میں اپنا مقام بنالیا ہے۔ رنگ، ساخت، بناوٹ اور تکنیک کا سنگم اور فروغ عقیدت مند ڈیزائنر اور نوعمر منتظموں کی سرفسطائی رہنمائی اور سرپرستی میں ہوا ہے۔ یہ کپڑے اس قدر شاندار تھے جتنے کہ وہ گذشتہ تین سو برس میں کبھی نہیں تیار کیے گئے تھے۔

مستقبل

ہینڈلوم صنعت کا مستقبل کیا ہے؟ اس کی بڑی طاقت بنکر کی بے مثل ہنرمندی، رنگ، بناوٹ اور کارکردگی کے بارے میں اس کی سوجھ بوجھ، بدلتے حالات سے مطابقت پیدا کرنے اور چھوٹے چھوٹے گروں میں طرح طرح کے ڈیزائن تیار کرنے سے متعلق اسکی صلاحیت ہے۔ ایک حالیہ تجربے میں جو جلد ہی ہینڈلوم ٹیکسٹائل ٹریڈ کو دستیاب کیا جائے گا، بنکروں نے بھورے کپڑے کے ساڑھے چھ سو ڈیزائنوں

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

مسرت جہاں کاظمی

صنعت پارچہ بافی میں خواتین کا حصّہ

زندگی کے تمام شعبوں میں ہر دور میں عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ چلتی آئی ہیں۔ دورِ حاضر میں بھی جس سمت نگاہ اٹھائیے کسی نہ کسی درجہ میں خواتین، مردوں کی شریک کار نظر آئیں گی۔ چاہے وہ تعلیم کا میدان ہو یا تدریس کا، ریسرچ و مطالعہ کا شعبہ ہو یا حکمت و سیاست کا، ادب وفنون کا زمرہ ہو یا دستکاری و صناعی کا صیغہ! غرض ہر کام پر خواتین کسی نہ کسی شکل میں موجود نظر آئیں گی۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ کہیں ہمسری ہے تو کہیں معاونت، کہیں سرپرستی کا معاملہ ہے تو کہیں ماتحتی کا، کہیں اجیر ہے تو کہیں مُستاجِر! حتیٰ کہ بعض صیغہ ہائے فنون و صنعت میں بلا شرکتِ غیرے تنہا بھی۔

دیگر صنعتوں کی طرح پارچہ بافی کی صنعت میں بھی عورتوں کا ایک خاص مقام ہے اور اس کے تمام ہی شعبوں میں کسی نہ کسی نہج پر ان کی اہمیت و ضرورت مسلّم ہے۔ آرگنائزڈ یا ان آرگنائزڈ سیکٹروں میں کتائی و بنائی کے کارخانوں میں، رنگریزی و چھپائی کی یونٹوں میں یا ٹکسٹائل کوآپریٹو اداروں میں، صنعت ہذا کے تعلیمی و تربیتی مراکز میں، اور پبلک سیکٹر کے چھوٹے بڑے کارخانوں میں، غرضکہ ہر مقام پر عورتیں مردوں کی شریک کار ہیں۔ خواہ وہ انتظامی امور ہوں یا انصرامی۔ بالخصوص ہتھ کرگھوں کا جہاں تک معاملہ ہے تو اُس میں خواتین کی قربانیاں مردوں سے بھی بڑھی ہوئی ہیں۔ گزشتہ دنوں صوبہ تملناڈو میں کئے گئے ایک سروے کی رپورٹ کے مطابق گھریلو طور پر ہتھ کرگھے کی صنعت سے منسلک بنکروں کی مجموعی تعداد پورے صوبہ میں ۲۸۲۵۴ تھی جبکہ اس میں مرد بنکر ۱۴۱۵۲ ہیں اور خواتین ۱۴۱۰۲ ہیں۔ اسی ایک تمثیل سے مجموعی حالت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کیوں کہ ملک کے دیگر حصّوں میں بھی کم و بیش یہی کیفیت ہے، اور پھر بنائی کے علاوہ مثلاً وائنڈنگ، سائزنگ و وارپنگ وغیرہ امور میں مردوں کے مقابلہ میں عورتیں ہی زیادہ حصّہ لیتی ہیں۔ کشمیر سے کنیا کماری تک اس صنعت میں خواتین کا جو حصّہ ہے اس کے بغیر اس صنعت کا تصور بھی ناممکن ہے۔ آندھرا پردیش، کرناٹک اور کیرالہ کی صورت حال بھی کم و بیش تملناڈو ہی کی طرح ہے۔ بلکہ کیرالہ میں تو کوآپریٹو سوسائٹیوں تک میں خواتین بنکروں کی تعداد مردوں سے زیادہ نظر آتی ہے جس میں کہ عیسائی لڑکیوں کی تعداد بھی خاطر خواہ ہے۔

اڑیسہ اور کرناٹک میں ریشم کی صنعت کو بڑا فروغ حاصل ہے۔ وہاں پر تو ریشم کی ملوں میں آٹھ دس برس کی بچیاں بھی چھوٹے سے لیکر بڑے تک سب کام کرتی ہیں مگر ان تمام باتوں کے باوجود مردوں کے مقابلے میں عورتوں کو بہت ہی کم اُجرت دی جاتی ہے جو کہ یقیناً تکلیف دہ بات ہے۔ یہ معاملہ صرف کرناٹک یا اڑیسہ میں ہی نہیں بلکہ معمولی فرق کے ساتھ ہر جگہ موجود ہے۔ اس طرح کا امتیازی سلوک کسی طرح بھی مناسب نہیں گویا یہ اُن کی خدمات کے اعتراف کی بجائے ان کی محنتوں اور قربانیوں کی تذلیل ہے۔

آسام کے تعلق سے یہ بات بہت مشہور ہے کہ وہاں پر گھریلو ضروریات کے لیے عورتیں خود کپڑا تیار کرتی ہیں اور انتہائی آسان و سہل طریقہ سے اس کی بنائی کرتی ہیں۔ وہ بانے کا ایک سِرا اپنی کمر میں باندھ لیتی ہیں اور دُوسرا سِرا ایک لکڑی میں پھنسا لیتی ہیں اور اس حالت میں وہ جب

[illegible] اپنے کپڑے بنتے ہوئے جاتی ہیں حتیٰ کہ بازار وغیرہ میں بھی خرید و فروخت کے ساتھ ساتھ بُنائی کا عمل جاری رہتا ہے گویا کہ چلتا پھرتا کرگھا اپنے ساتھ لیے پھرتی ہیں۔ جس طرح بہت سی عورتیں کروشیہ کی بُنائی اس تندہی سے کرتی ہیں کہ جہاں دیکھیے وہاں اُن کے ہاتھوں میں سلائی اور دھاگہ نظر آتا ہے۔

بنگال اور پنجاب کے بعض علاقوں میں کپڑوں کی چند ایسی بھی قسمیں ہیں جن کی بُنائی محض عورتوں کے لیے مخصوص ہے کیوں کہ مرد اُن کپڑوں کو اس خوبی اور نفاست سے تیار نہیں کر سکتے جس طرح کہ عورتیں کرتی ہیں لہٰذا ایسی چند اقسام صرف خواتین کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی ہیں۔

ناگالینڈ کے اکثر قبائل میں یہ عام دستور ہے کہ خاندان کے تمام افراد کا کپڑا گھر کی عورتیں ہی بُنتی ہیں۔ وہ باہر سے کپڑا نہیں خریدتے۔ شادی بیاہ کے وقت اُن میں یہ رسم صدیوں سے مروّج ہے کہ دُولہے کا کپڑا خود دُلہن کو اپنے ہاتھوں سے بُن کر تیار کرنا پڑتا ہے۔ جب تک کہ دُلہن دُولہے کے لیے کپڑا تیار نہ کر لے اُن کی شادی نہیں ہوسکتی۔

ناگالینڈ اور آسام کے بعض علاقوں میں تو لوگ مروّجہ قسم کے ہتھ کرگھے کے استعمال ہی کے سخت مخالف ہیں۔ بلکہ ان کی موجودگی کو بھی وہ بدشگونی تصور کرتے ہیں۔ یہ دراصل اس لیے ہے کہ وہ تہذیبِ نو سے ناآشنا، گردشِ روزگار و ترقی کی رفتار سے ناواقف، رسومِ جاہلیہ میں گھِرے اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے غیروں کی محتاجی کو اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ دنیا میں ہر ایک کی اغراض دوسرے کے ساتھ جُڑی ہوئی ہیں۔ یہ تمثیل دراصل اُن کی خودداری کی بھی آئینہ دار ہے۔ اور ان کی خودداری کا تقاضہ یہ ہے کہ اپنی بنیادی ضروریات کے خود ہی کفیل ہوں کسی غیر کی مدد و معاونت اُن کی غیور طبیعت کے منافی ہے۔ تاہم اب رفتہ رفتہ اُن علاقوں میں بھی تبدیلیاں لائی جا رہی ہیں اور اُن قبائل کو بھی علوم و فنون کی روشنی میں لاکر نئی تہذیب سے ہم آہنگ کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔

سوامی وویکانند کا قول ہے کہ "کسی قوم کی ترقی کو جانچنے کا تھرمامیٹر یہ ہے کہ وہ قوم اپنی عورتوں کے حق میں کیسا سلوک رکھتی ہے۔" یہ مسلمہ امر ہے کہ مرد کی حیثیت ایک فرد کی ہے اور عورت کی حیثیت ایک خاندان کی۔ اسی طرح مردوں میں تعلیم و تہذیب کا آجانا افراد کی ترقی ہے مگر عورتوں میں علم و عمل کا آجانا اقوام کی ترقی ہے۔ تاریخ بھی اس پر شاہد ہے کہ جن اقوام کی عورتوں نے علم و آگہی کے زیور کو اپنایا اور درک و بصیرت کے گوہر سے زینت اختیار کی وہ قومیں تہذیب و ترقی کے افلاک تک پہنچی ہیں۔ انگریزی کی مشہور کہاوت ہے کہ "جو ہاتھ ہنگھوڑے ہلاتے ہیں (یعنی ماں کے ہاتھ) وہ بالواسطہ حکومت کرتے ہیں۔" جس قوم کی عورتوں میں جتنی روشن خیالی اور اخلاقی بلندی پائی جائے گی، بلاشبہ اُن کی آنے والی نسلیں بھی انھیں صفات سے متصف ہونگی اور اس کے برعکس جس قوم کی عورتوں میں جتنی توہم پرستی، ناخواندگی اور پست کرداری پائی جائے گی، اُن کی آنے والی نسلیں لامحالہ انھیں صفاتِ رزیلہ کی آئینہ دار ہوں گی۔

یوں تو اس سلسلہ میں ہمارے یہاں ماضی میں بھی مساعی ہوتی رہی ہیں اور فی زمانہ بھی جاری ہیں۔ تعلیم نسواں کی ترویج و اشاعت، نت نئے علوم و فنون کی تحصیل میں خواتین کی خصوصی مراعات کی فراہمی اور ان کے ثقافتی و معاشرتی کردار کی بحالی وغیرہ امور بھی اس قسم کی کوششوں کا ایک لازمی حصہ ہیں تاہم ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سلسلہ میں جدوجہد کے میدان کو وسیع بنایا جائے اور جہاں عورتوں کے سماجی و معاشرتی کردار کی بحالی کے لیے اتنے جتن کئے جاتے ہیں وہیں ان کے معاشی مسائل کو بھی حل کرنے کی سعی کی جائے۔ کیونکہ خواتین میں تعلیم و تربیت کا فقدان اور علم و ادب سے کم آگہی انہی وجہ کی بنا پر ہوتی ہیں کہ معاشی بدحالی کی وجہ سے وہ کئی ایسی مصروفیات میں گرفتار ہو جاتی ہیں کہ پھر ان مشاغل سے یکسو ہونا اُن کے لیے محال ہوتا ہے۔ اور جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دیگر اہم امور پر خاطرخواہ توجہ نہیں دے پاتیں۔ حتیٰ کہ اپنی اولاد کی تادیب و تربیت پر بھی اتنی توجہ نہیں دے پاتی جتنا کہ اس کا حق ہے لہٰذا یہ امر نہایت ضروری ہے کہ ان کے اقتصادی مسائل کو حل کرنے کی بھی یکساں کوشش کی جائے اور اس کے لیے نہایت موثر و کارگر طریقہ یہی ہے کہ گھریلو قسم کی صنعت و دستکاریوں کو خواتین میں فروغ دیا جائے اور پھر سرکاری و نیم سرکاری اداروں کے ذریعے یا امدادِ باہمی کی سوسائٹیوں کے ذریعے اُن کی سرپرستی کی جائے اور انھیں معقول روزگار فراہم کیا جائے پھر ان کی محنت کے شایانِ شان اُجرت دِلوائی جائے۔ ہتھ کرگھے کی صنعت زراعت کے بعد دوسری سب سے بڑی صنعت ہے، جو کثیر افراد کو روزگار فراہم کرتی ہے۔ لہٰذا اس میں بھی اگر عورتوں کی خصوصی سوسائٹیاں قائم کی جائیں یا اس صنعت سے منسلک ادارے عورتوں کے مناسب حال کپڑوں کی بُنائی کے لیے انھیں معقول اُجرت پر خام مال مہیا کریں اور اُن سے کپڑا تیار کروائیں تو اس سے خاطرخواہ نتائج برآمد ہونگے اسکے ساتھ ہی شدید ضرورتمندوں کو کرگھے بھی فراہم کئے جائیں اور امداد باہمی کی سوسائٹیاں اُنکے روزگار کی ضمانت لیں۔ اسطرح ہتھ کرگھے کی صنعت سے عورتوں کو اُنکی محنت کا مناسب معاوضہ مل سکے گا۔

(باقی صفحہ پر)

عظیم اقبال

ہم اہلِ قفس

سامنے کی تصویر کافی جاذبِ نظر تھی۔ نیچے درج تھا۔ 'بے بسی' پس منظر ہلکے نیلے رنگ سے مزین تھا۔ آکاش کی وسعتوں میں دو پرندے اُڑ رہے تھے۔ جانے کس جذبے کے تحت مصور نے اس تصویر میں رنگ آمیزی کی ہوگی؟ اختر کے ذہن میں یہ سوال باربار اُبھر رہا تھا۔ کھلی فضا، پھر پرندوں کا محوِ پرواز ہونا آزادی کی دلیل ہے، لیکن سامنے جو اصل شبیہ تھی اُس کا معمہ حل نہیں ہوتا تھا۔ ایک مہ جبیں خوبصورت لباس زیبِ تن کئے ہوئے پلنگ پر گاؤتکیہ کے سہارے نیم دراز تھی۔ اس کے گیسو شانوں پر بکھرے تھے۔ آنکھوں میں مستی تھی۔ ہونٹوں پر شگفتگی اور رخساروں پر تازہ پھولوں جیسا نکھار! اس دوشیزہ کا پورا جسم موٹی اور بھدی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ حسینہ کو دیکھ کر بیک وقت لطافت اور وحشت کے احساسات بیدار ہوتے تھے۔

پچھلے کئی دنوں سے لگاتار وہ آرٹ گیلری آرہا تھا۔ معروف فن کاروں کی پینٹنگز کی نمائش تھی۔ بیشک سوہال میں ایک سے ایک شاہکار تصویریں ٹنگی تھیں لیکن اختر کی نگاہیں "بے بسی" کے سامنے گویا جم جاتی تھیں۔ اُسے محسوس ہوتا تھا جیسے رنگوں کے اِس امتزاج کے پیچھے انگنت داستانیں ہوں، صدیوں کی تاریخ پوشیدہ ہو، قرنوں کی سسکیاں ہوں، برسوں کی گھٹن ہو!۔

اُس کی مٹھیاں خود بخود بھینچنے لگتیں۔ لاعلمی کے جال میں پھنسا ہوا انسان، ناپختہ اور غیر تربیت یافتہ دماغ، اس کی خود غرضی، اس کی جھوٹی انا — سب مل کر مستقبل کی نسلوں کی شریانوں میں زہر گھول رہے ہیں۔

الفاظ کے تانے بانے گڈمڈ ہوگئے۔ نقطے بنے، لکیریں بنیں اور پھر زندہ خاکوں کا وجود ہوا۔

اُونگھتے ہوئے حافظ جی نے چھڑی گھمائی ہے۔

" نالائق، گدھے — یہ ایک ادنیٰ کام نہیں ہوتا — پیر نہیں داب سکتے۔ اپنے باپ سے سیکھ لو، پھر مدرسہ آنا۔"

تڑاخ'... تڑاخ...

"اوں ... اوں ..."

مسکین صورت اختر روئے جارہا ہے۔ دعائیں مانگ رہا ہے۔

" یا اللہ! حافظ جی کو دوزخ میں ضرور بھیجنا۔ اس مولوی کی بکری مرجائے!۔

"مردُود! غلط ہجّے کرتا ہے۔"

تڑاخ...!

حافظ جی لڑکوں کو روز پیٹتے ہیں، گالیاں دیتے ہیں۔ گھنٹوں سب کو بیگار کرنا پڑتا ہے۔ لڑکے اکثر مدرسہ سے فرار ہوجاتے ہیں۔ گرمی کا دن ہے۔ لُو کے تھپیڑے چل رہے ہیں۔ سب گلی گلی آوارہ گردی کرتے ہیں۔

" وہ دیکھو، گرگٹ —! مارو، مارو — ثواب ملے گا۔"

سب کنکر، پتھر پھینکنے لگتے ہیں۔ ننھی سی جان اِدھر اُدھر بھاگتی ہے۔ اُسے مار کر سب تالیاں بجاتے ہیں۔

کڑی دھوپ میں سب گھومتے ہیں — تربوز کھانے دریا کے کنارے پہنچ گئے، کھیتوں میں گھس پڑے۔

کسی نے کہا۔" یہ چوری ہے، گناہ ہوگا!"

" ابے مُفت کا مال ہے، چُپ چاپ کھا! ایسی چوری سے تو ثواب ملے گا!" کسی اور نے کہا ہے۔

شام کے جُھٹ پٹے میں سب گھر پہنچے ہیں۔ امّاں نے اختر کا ماتھا چُھوا ہے۔ گرم لُو کے مانند تپ رہا ہے۔ کئی روز سے وہ بستر بیمار پڑا ہے۔

کو چین آ جاتا۔ حافظ جی کہتے ہیں۔ جن کا سایہ ہو گیا ہے۔ دم کیا ہوا پانی پلایا جاتا ہے۔ کئی کئی تعویذ پہنائے جا چکے ہیں۔ کسی کا اثر نہیں۔ آخر میں ڈاکٹر کو دکھایا جاتا ہے۔ قیمتی دوائیں آتی ہیں۔

دوا کھاتے وقت اختر کہتا ہے۔ "بسم اللہ!"

اماں کہتی ہیں۔ "دوا بغیر بسم اللہ پڑھے ہوئے کھانی چاہیے، نہیں تو دوا کا اثر زائل ہو جائے گا۔"!

وہ گولیاں نگلتا ہے۔ کڑواہٹ سے مُنہ بھر گیا ہے۔

دن گذرتے جا رہے ہیں۔ مدرسہ چھوٹ گیا ہے۔ ہائی اسکول میں اختر کا داخلہ ہو گیا ہے۔ کلاس میں اوّل آیا ہے۔ وظیفہ ملا ہے۔ خوب جی لگا کر پڑھ رہا ہے۔ ہندوستان گوتم بدھ، مہاویر، اشوک کی سرزمین ہے۔ اکبر اور شیر شاہ کی دانشمندی ہماری لاج ہے۔ شیواجی، ٹیپو سلطان اور مہارانا پرتاپ کی بہادری ہمارا فخر ہے۔ نہرو، آزاد اور پٹیل کی نفس کشی ہماری آن ہے۔

وہ اپنے ملک سے محبت کرتا ہے۔ وہ فرقہ پرستی سے شدید نفرت کرتا ہے۔ رام اور شیام، رفائل اور گورو بچن سنگھ، سب اس کے دوست ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو بے پناہ چاہتے ہیں۔

اختر بہترین کھلاڑی ہے۔ مباحثوں میں پہلا انعام لیتا ہے۔ امتحانات میں سرفہرست رہتا ہے۔ اُستاد اُسے عزیز رکھتے ہیں۔ ہمجولی اُس کی دوستی پر نازاں ہیں۔

کئی لوگ کہتے ہیں۔

"دنیا فانی ہے۔ یہاں کی چمک دمک پر مت جاؤ۔ مٹی سے بنے ہو، مٹی میں مل جاؤ گے"

اختر اپنے ماحول کو دیکھتا ہے۔ جہالت، بیماری، مفلسی، محتاجی...

مسئلے وہی ہیں جو پہلے تھے۔ اسحٰق بھائی کے گھر میں دسویں لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ بیاہی جوان لڑکیاں سپنوں میں ہر رات شہنائی کی گونج سنتی ہیں۔ اور دن کے اُجالے میں کواڑ کی اوٹ سے راہگیروں کو حسرت و یاس بھری نگاہوں سے گھورتی ہیں۔ چولہا سرد ہے، پیٹ خالی ہیں۔

اسحٰق بھائی فرماتے ہیں۔

"اللہ کی مرضی یہی ہے، وہ جس حال میں رکھے۔"!

رات بھر وہ گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔ ان کے آنسو نہیں تھمتے۔

بجو تو پہلوان دن میں رکشہ چلاتا ہے اور رات میں تاڑی پی کر سنیما کا مزہ مارتا ہے۔ گھر میں ماں باپ، بہن بھائی فاقہ کرتے ہیں۔

اسحٰق بھائی کہتے ہیں۔ "اس گنہگار کو معبود صراطِ مستقیم پر لائے گا، کریم میاں! داتا کے حضور منت مان لو!"!

آج ہنڈیا شاہ کے مزار پر قوالی ہے۔ لوگ جوق در جوق پہنچ رہے ہیں۔

اکثر رات میں پاس پڑوس سے چیخیں بلند ہوتی رہتی ہیں۔

شاکرہ کو نخرو نے پھر پیٹا ہے۔ وہ زور زور سے بین کر رہی ہے۔ بیچ بیچ میں بددعائیں دیتی ہے۔

"تیرے ہاتھ کانپیں، تیرے بدن میں پتو پڑیں"

"چھنو کی ماں! تمھیں طلاق دے دونگا!" نخرو چلاتا ہے۔

"میرے قدموں کے نیچے بڑی جنت ہے ایسی جنت سے تمھیں محروم کر دوں گا۔"

چٹاخ

بچے بھی رونے لگے ہیں۔

"تیرے لیے آٹھ آٹھ بچے پیدا کر چکی اب مجھے طلاق دو گے۔ میرا سب کچھ لُوٹ چکے تب مجھے چھوڑنے کی دھمکی دیتے ہو"

"چپ حرام خور!"

اختر کانوں میں انگلیاں ٹھونس رہا ہے۔ شدتِ احساس سے اس کے جبڑے کسنے لگے ہیں۔ پیشانی پر شکنیں پڑ گئی ہیں۔ نیند کا پتہ نہیں۔ لمحہ لمحہ اُسے یہی فکر ستاتی ہے کہ یہ خرابات کیسے دُور ہوں گے؟ یہ لعنتیں کس طرح ختم ہوں گی؟ یہ تاریکیاں — یہ مایوسی، یہ زوال!!

جدھر سے گذر جائیے، اُسے یہی سماں نظر آتا ہے۔ ہر جگہ ایسے ہی لوگ ہیں۔ وقت کی نبض پر کسی کی انگلیاں نہیں پڑتیں۔ ہوٹلوں میں، اشرافوں بڑا گھر کی چہار دیواری کے اندر۔ یکساں گھٹن ہے۔ کھوکھلی ہنسی، چہروں پر مُردنی، پست جذبے، چھچھلے خیالات۔ اختر کو مستقبل کا خوف کھائے جا رہا ہے۔

وہ لوگ کیا کر سکیں گے جنھیں اپنی ہستی کا اندازہ نہیں، حقائق کی خبر نہیں — یہ سب زندہ لاشیں ہیں، بے گور و کفن!

اُس نے تاریخ پڑھی ہے۔ معاشیات اور عمرانیات کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ سمجھتا ہے، اصل بیماری کہاں ہے۔ یہاں فرد مجرم نہیں، پورے معاشرے پر جرم عائد ہوتا ہے!

.... سامنے کی تصویر اب سربستہ راز نہیں تھی۔ ایسی حسینہ کے جسم پر لپٹی ہوئے زنجیروں نے اختر پر یہ عیاں کر دیا تھا کہ زنجیریں جو کبھی کبھی ہمارے اجسام کو لپیٹ لیتی ہیں، قابلِ ملامت ہیں لیکن دکھائی نہ دینے والی زنجیریں" جن کی داغ بیل خیالات اور تعصبات سے پڑی ہے۔ ہمارے اذہان کو بُری طرح جکڑ لیتی ہیں اور یقیناً یہ زیادہ خرابی کا باعث ہیں۔

لاشعوری طور پر اختر کے ہونٹ پر

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

غزل

منظر اعجاز

زندگی کے خوابوں کو پھول کی جوانی لکھ
آگ کے الاؤ پر برف کی کہانی لکھ

ہے کلی کے ہونٹوں پر آبلہ تبسم کا
زرد زرد پتوں پر شبنمی کہانی لکھ

پھر لبوں پہ پھیلی ہے تشنگی سرابوں کی
صفحۂ حقیقت پر بوند بوند پانی لکھ

صبح کے اُجالے میں شام کا دھندلکا ہے
تیرگی کے سائے میں رنگ زندگانی لکھ

میں تری عدالت کا بے گناہ مجرم ہوں
اپنے فیصلہ میں تو کچھ تو مہربانی لکھ

دیکھ اپنے شیشے میں اپنے روپ کی پرچھائیں
یا لہو کے چھینٹے کو آنسوؤں کا پانی لکھ

آج اپنی دھرتی بھی لے رہی ہے انگڑائی
یہ نیا زمانہ ہے بات مت پرانی لکھ

کل تو مسکراتی تھی ہر کلی بہاروں کی
آج ہے ہواؤں میں کیسی بدگمانی لکھ؟

کرشن مراری

چاہت کے رنگین گگن میں کھوئی سی
دھیرے دھیرے رُت السائی جوبن کی
تشنہ سے کچھ لمحوں سے وابستہ سہی
پہچانوں میں گم تھی لذت بانہوں کی
شوخ شوخ سے خوابوں کی تعبیر بنی
پایل پایل بے کل سی جھنکار تھی
اک ننھا دلبر سی شوخ البیلے سی
کرن کرن سی آنگن آنگن اُتری تھی
لمحوں کی اک شورش کا ذردان بنی
کہنے کو تو یار وہ بات ذرا سی تھی
سوچ نگر کے باسی تھے ہم اس کارن
چھنا ناگن سانجھ سویرے ڈستی تھی
اک لمحہ جو شبنم شبنم برسا تھا
شوخی اس کی آس بنی تھی منظر کی
جاگے جاگے کچھ سپنے صد رنگ لیے
لرزاں لرزاں پلکوں پر بے تابی تھی
سرد سرد سے سناٹوں کے عالم میں
سوچوں کا حاصل تو صرف اداسی تھی
اے میرے دلدار تری پوجا کے لیے
من مندر میں جھلمل جھلمل جوت جلے

ولی احمد ولی

میری وفا کا کوئی طلبگار اب نہیں
خونِ جگر کا کوئی خریدار اب نہیں
مہرِ سکوت لب پہ لگا دی ہے وقت نے
اے شوق مجھ میں جرأتِ اظہار اب نہیں
سنتا ہوں روز درد و غمِ دل کی داستاں
آلامِ زندگی سے میں بیزار اب نہیں
دیکھا جہاں بھی چوم لیا نقشِ پائے یار
"دل میں نیاز حسرتِ دیدار اب نہیں"
یہ عرصۂ حیات ولی کیوں نہ تنگ ہو
دل کیفیاتِ عشق سے سرشار اب نہیں

کب تلک

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشا

کوچہ کوچہ خونیں منظر کب تلک
خود بشر پھیلائے گا شر کب تلک
ہوں گے پیوستِ رگِ جاں بے سبب
نفرتوں کے تیز خنجر کب تلک
آپ اپنی کج خیالی کے طفیل
رنج و غم کے ڈیرے گھر گھر کب تلک
تا کجے یہ ناروا ظلم و ستم
زندگانی ہوگی دوبھر کب تلک
ساز و سامانِ طرب ہوتے ہوئے
لطفِ ہستی نا میسر کب تلک
دل کہاں تک ہونگے وقفِ درد و کرب
آنکھیں اگلیں گی سمندر کب تلک
کھیل کا اک ذریعہ بنتا جائے گا
ہم غریبوں کا مقدر کب تلک
آپ ہی کہیئے بھلا راس آئے گا
آپ کو پھولوں کا بستر کب تلک
منشا ان ناگفتہ بہ حالات میں
ہوں گے لب بستہ سخنور کب تلک

صاحب علی خان

ملاوٹ

ایک اہم مسئلہ

اشیائے خوردنی کئی اقسام کی چیزوں سے مل کر بنتی ہیں۔ اگر ان میں سے کچھ بھی نکال لیا جائے یا شامل کر دیا جائے تو عناصر اشیائے خوردنی کے توازن میں فرق پڑ جاتا ہے۔ اس کو ہم ملاوٹ کہتے ہیں، مثلاً شکر میں سکروس ۸ر۹۱ فی صد، نمی ۱ر۰ فیصد اور سلفر ڈائی آکسائیڈ ۷۰ پی پی ایم ہونی چاہیے۔ اگر اس میں سے کوئی بھی چیز نکال لی جائے یا کچھ دوسری چیز شامل کر دی جائے تو اُسے شکر میں ملاوٹ کہا جائے گا۔

اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کے مسئلہ پر ۷۲-۱۹۷۱ میں ملک گیر پیمانے پر ایک سروے ہوا تھا۔ اس سروے سے یہ نتائج سامنے آئے تھے کہ سب سے زیادہ ملاوٹ اُڑیسہ میں ہوتی ہے اور دوسرے نمبر پر راجستھان ہے۔ یعنی اُڑیسہ میں ۲ر۶۸ فیصد اور راجستھان میں ۲ر۴۷ فیصد ملاوٹ ہوتی ہے۔ اسی طرح آسام میں ۸ر۳۸ فیصد اور مدھیہ پردیش میں ۹ر۳۳ فیصد خوردنی چیزوں میں ملاوٹ کی جاتی ہے۔ دراصل بھارت میں ملاوٹ کا یہ زہر کافی عرصہ دراز سے چلا آ رہا ہے۔ پہلے تو ملاوٹ کچھ مخصوص چیزوں میں اور کم مقدار میں ہوتی تھی مگر گذشتہ چند برسوں سے جیسے جیسے آبادی اور مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے ویسے ویسے اشیائے خوردنی میں آمیزش کی شکل بھی اپنا خطرناک روپ دھارن کرتی جا رہی ہے۔

بلاشبہ خوردنی چیزوں میں ملاوٹ کی صورت بدلتی جا رہی ہے۔ ہمارے ملک میں پہلے دیہی اور پسماندہ علاقوں میں فروخت ہونے والی اشیائے خوردنی میں ملاوٹ بہت کم اور شہری علاقوں میں بہت زیادہ ہوتی تھی۔ لیکن آج حالات کچھ مختلف ہو گئے ہیں۔ دیہی اور پسماندہ علاقوں میں تقریباً ۷۰ فیصد اور شہروں میں لگ بھگ ۴۰ فیصد اشیائے خوردنی میں نقصان دہ ملاوٹ پائی جاتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دیہی علاقوں میں اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کو روکنے کے لیے کوئی معقول اور مناسب ذریعہ نہیں ہے۔ جبکہ شہروں میں اس پر قابو پانے کے لیے کسی نہ کسی طرح کا انتظام ضرور ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ ہمیں بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں صورتوں میں متاثر کرتی ہیں۔ اکثر کھانے میں ملی ہوئی نقصان دہ چیزیں ہمارے جسم میں فوراً اپنا جادو نہیں دکھاتی ہیں بلکہ وہ جسم میں آہستہ آہستہ مختلف امراض پیدا کرتی ہیں۔ ان ملاوٹ کی چیزوں کے استعمال سے ہماری صحت پر انتہائی بُرا اثر پڑتا ہے۔ دماغ، گردے، لیور اور آنکھوں پہ مُضر اثرات ہوتے ہیں جس سے کینسر جیسا مہلک مرض، الرجی اور پیٹ کی مختلف بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ لیکن کیا مجال جو اُن منافع خوروں کے دل میں عوام الناس کے لیے ہمدردی کا ذرا بھی جذبہ بیدار ہو۔ لوگ مرتے ہیں تو مریں وہ تو اپنی تجوریاں بھر کر ہی دم لیں گے۔ چنانچہ یہ معلوم ہو گیا کہ ملاوٹ بھی اُن وجوہات میں سے ایک ہے جس سے آج کسان کو گاڑھی کمائی کا ایک بڑا حصہ علاج پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔

جیسے جیسے ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو رہا ہے، تاجروں اور ساہوکاروں کے کچھ بیہودہ گروہ ملاوٹ کے معاملے میں اتنے ہوشیار اور تجربہ کار ہوتے جا رہے ہیں کہ انھیں پکڑنا اور قابو میں لانا آسان کام نہیں۔ آٹے میں سافٹ اسٹون کا پاؤڈر، چاول میں کیمیائی چاول یا اسی طرح کے پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ملا

میں باریک کانچ کے چھوٹے چھوٹے دانے، استعمال شدہ چائے کو رنگ کر دوبارہ چائے میں ملانا، نمک میں سائلٹ، اسٹون پاؤڈر، شہد میں گڑ یا شکر، بیسن میں مکئی یا دال کا پاؤڈر، دودھ میں شکر قندی یا بلاٹنگ پیپر کے ٹکڑے، گھی میں سستے تیلوں اور رنگوں کی ملاوٹ، لونگ میں اسی طرح کی جھوٹی اور پتلی کلیں، کالی مرچ میں پپیتے کے بیج اور مردار چینی میں لکڑی وغیرہ کی ملاوٹ کرنا آجکل عام بات ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ کھلے، پسے یا کٹے ہوئے مصالحوں میں تو ملاوٹ کا اوسط تقریباً ۵۰ فیصد ہے۔ دھنیا میں اسی رنگ کا برادہ یا کبھی کبھی گھوڑے کی سوکھی لید، ہلدی میں اینٹ کا پاؤڈر یا نئے ملباو کا استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح ملاوٹ نے نہایت بھیانک اور مکروہ شکل اختیار کر لی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ آج کل زیادہ سے زیادہ منافع خوری کے اندھے مقابلے میں ملاوٹ نے زہر کو دعوت دے دی ہے۔

دنیا میں آج اشیائے خوردنی کو دلکش اور خوبصورت بنانے کے لیے تک بھگ ۵۰ قسم کے مصنوعی اور غیر مصنوعی رنگوں کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر رنگ گورنمنٹ سے منظور شدہ ہوتے ہوئے بھی صحت کے لیے مضر ثابت ہوتے ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ مصنوعی رنگوں کا استعمال ڈنمارک میں ہوتا ہے۔ یہاں پر تقریباً ۳۴ قسم کے رنگوں کا استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بعد انگلینڈ ہے جہاں تک بھگ ۲۵ قسم کے رنگوں کا استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح جاپان میں ۲۲، امریکہ میں ۱۹ اور کناڈا میں ۱۰ طرح کے رنگوں کا استعمال کھانے پینے کی چیزوں میں کیا جاتا ہے اور جہاں تک بھارت کا تعلق ہے یہاں جتنے بھی رنگ کھانے میں استعمال کیے جاتے ہیں، اُن میں سے ایک تہائی رنگ مصنوعی ہیں۔ یہاں پتے کی بات یہ ہے کہ مصنوعی رنگ بہت مہنگے ملتے ہیں اس لیے زیادہ تر رنگ بنانے والے لوگ ان رنگوں کی جگہ پر سستے اور نقصان دہ رنگوں کا استعمال کرتے ہیں اور جو رنگ منظور شدہ ہیں، اُن میں سے اکثر لوگ ٹارٹر جائینے، سینٹ ائیلو اور کاموسائین کا استعمال زیادہ کرتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ چوری چھپے غیر منظور شدہ رنگوں کا بھی استعمال کرتے ہیں۔

اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کی رفتار پر قابو پانے کے لیے عملی قانون موثر نہیں دکھائی دیتا تھا چنانچہ اس میں جلد ہی ترمیم کر کے ملاوٹ کرنے والوں پر جرمانے اور قید کی میعاد بڑھا دی گئی۔ مگر یہ ترمیم بھی تشفی بخش نہیں تھی اس لیے ۱۹۷۶ء میں ترمیم شدہ قانون میں خاطر خواہ اصلاح اور ترمیم کی گئی اور تبھی سے آج تک اس پر عمل جاری ہے۔ اس قانون کو باقاعدہ نافذ کرنے کی ذمہ داری کچھ ریاستی حکومتوں کو سونپ دی گئی ہے۔ مثلاً دلی، مہاراشٹر، گجرات، آندھرا پردیش اور پانڈی چیری نے اپنے اپنے یہاں اسے لاگو کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔ اس کے علاوہ آسام، پنجاب، ہریانہ، کرناٹک، جموں و کشمیر اور مدھیہ پردیش وغیرہ نے ملاوٹ جیسی لعنت کو ختم کرنے کے لیے اپنے اپنے یہاں کچھ مخصوص افسروں کا تقرر بھی کر دیا ہے۔

ملاوٹ پر کنٹرول پانے کی غرض سے مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو معقول اور مناسب صلاح دینے کے لیے ۱۹۷۲ء میں ایک کمیٹی کی تشکیل ہوئی تھی۔ اس کمیٹی کی پہلی سفارش یہ تھی کہ سب سے پہلے اُن موجودہ تجربہ گاہوں کے کام کرنے کی قوت اور معیار کو بڑھایا جائے جو بوسیدہ حالت میں ہیں۔ یعنی جہاں کام کرنے کے لیے حسب ضرورت اسٹاف نہیں ہے اور نہ جدید ہی ہتھیار ہیں مگر افسوس! یہ سفارش ابھی تک فائلوں کی زینت بنی ہوئی ہے۔

بلا شک و شبہ ملاوٹ کا رجحان ایک ایسا مسئلہ ہے جس کو صرف کا غذی قانون سے ختم کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس لعنت کو کیسے دور کیا جائے اور اس پر کیسے قابو پایا جائے۔ لوگ کہیں گے کہ اس لعنت کو دور کرنے کی ذمہ داری حکومت اور اس کے عملہ پر ہے۔ اور یہ بڑی حد تک درست بھی ہے۔ عوام سے کھلواڑ کرنے والے ملک موت کی تجارت کرنے والے تاجر کسی رعایت کے مستحق نہیں۔ حکومت کو ان سے سختی سے نپٹنا چاہیئے۔

ملاوٹ کے خلاف عوامی تحریک چلائی جائے ایسے منافع خور تاجروں اور دوکانداروں کا ناطقہ بند کر دیا جائے۔ سماج میں ان کے لیے کوئی عزت کی جگہ نہیں ہونی چاہیئے۔ ان کا سوشل بائیکاٹ کیا جانا چاہیئے اور حکومت کو بھی مجبور کیا جانا چاہیئے کہ قانون کے مطابق ان کے خلاف کارروائی کرے لیکن موجودہ سماج میں ایک برائی یہ پھیلی ہوئی ہے کہ لوگ ہر بات کے لیے حکومت ہی کی طرف دیکھتے ہیں۔ آج ہر شخص کو راتوں رات مالدار بن جانے کی فکر ہے اور اس کے لیئے ہر جائز و ناجائز کام کرنے کو تیار رہتا ہے۔ اس صورت میں کون کس کی اصلاح کرے۔ آج جب سماج کا ہر فرد اپنی ذات اور اپنے مفادات کی تکمیل تک محدود ہو کر رہ گیا تو کیا جواز ہے حکومت کی کوتاہی اور غفلت شعاری کی شکایت کا۔ ارباب حکومت کسی اور دنیا کے افراد تو نہیں ہیں، وہ ہم ہی میں سے ہیں۔ پھر ان سے کردار کا غازی بننے کی توقع کیوں ہے؟

منظفر الاسلام جالوی

جہیز

سماج کا ناسور

لفظ جہیز ہم لوگوں کے لیے کوئی نیا لفظ نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا لفظ ہے جس سے ہر مذہب اور ہر طبقہ کے لوگ آشنا ہیں بلکہ یہ ایک ایسی لعنت ہے کہ جس میں تمام لوگ ملوث ہیں۔ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج ہمارے سماج کے اندر بہت ساری لڑکیاں صرف جہیز کے ڈر سے خودکشی کر رہی ہیں اور اگر شادی کی رسم پوری بھی کر دی گئی تو جلد ہی ان کو جلا کر خاک کر دیا جاتا ہے۔

جہیز کی رسم نے سماج کو بُری طرح جکڑ لیا ہے اور خاص طور پر سماج میں پلنے والے غریب طبقہ کے لیے یہ ایک پریشان کُن اور جان لیوا مسئلہ بن چکا ہے۔ ایسے والدین جن کی استطاعت جہیز دینے کے قابل نہیں ہے۔ بعض اوقات خود بھی خودکشی سے گریز نہیں کرتے اور یہ اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک کہ اس زہر کو ہم لوگ سماج اور معاشرہ سے الگ نہیں کر دیتے۔

افسوس اور شرم کا مقام ہے کہ اس کو بُرا تصور کرتے ہوئے بھی ہم لوگ اس کو عملی جامہ پہنانے سے دور نہیں ہوتے۔ ہر شخص یہ اصولی طور پر جانتا ہے کہ جہیز کا لینا اور دینا دونوں بُری بات ہے، مگر عملی زندگی میں وہ اس سے بہت قریب ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ ناممکن ہے کہ ہمارا سماج، ہمارا معاشرہ اور ہمارا ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو۔ اس ملک کے نوجوان ملک کی مقدس امانت ہیں وہ ملک کا مستقبل ہیں، انھیں اس برائی کو ہر قیمت پر دور کرنا ہے۔

جہیز کی رسم کے خلاف تحریک کا آغاز راشٹر پتا مہاتما گاندھی نے کیا۔ مگر آزادی کے بعد پھر یہ تحریک دھیمی پڑ گئی۔ گو کہ آج بھی رہنمائے قوم اس تحریک کو عمل میں لانے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ مگر اس محاذ پر خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی ہے۔

مگر کیا کبھی ہم لوگوں نے یہ بھی سوچا ہے کہ یہ لعنت کس طرح ختم ہوگی؟ عورتوں کا خون کب تک ہوتا رہے گا؟

تاریخ شاہد ہے کہ کوئی بھی تحریک نہ تو تنہا چلی ہے اور نہ چلے گی، خواہ ہم لوگ قیامت تک کیوں نہ فرداً فرداً چلاتے اور چیختے رہ جائیں ان رسوم میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

یہ مسئلہ دراصل نوجوانانِ ہند کا ہے اور ہر نوجوان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے سماج اور اپنے معاشرہ کو جہیز جیسی لعنت سے پاک رکھے۔ ان باتوں میں حکومتِ ہند کا ساتھ دے اور اس کی بھرپور مدد کرے۔ ورنہ حکومت بھی مجبور رہے جب تک ہم لوگ حکومت کو تعاون نہیں دیں گے ہمارے مسئلہ کا حل مشکل ہے۔ اس لعنت کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے سخت قربانیوں کی ضرورت ہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم لوگ آپس میں اتحاد پیدا کریں۔ مسئلہ جہیز کو قوم و ملت کے مسئلہ کے ساتھ ساتھ اپنا ذاتی مسئلہ تصور کریں اور اس کو دُور کرنے کی بھرپور کوشش کریں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم لوگ سچے دل سے وعدہ کریں کہ نہ تو ہم لوگ خود جہیز لیں گے اور نہ دوسروں کو لینے دیں گے۔ یہی ایک راستہ ہے جس پر عمل کیا جائے تو اس زہریلے عنصر سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ ●

یوجنا ہاشمی دہلی

بقیہ: ہم اہلِ قفس

ایک طنز بھری مسکراہٹ رینگ گئی۔ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا وہ پیکا سوپال سے باہر آنے لگا۔ صدر دروازہ سے ابھی ابھی ایک نوجوان جوڑا داخل ہوا تھا۔ ان کے ساتھ ایک ننھا بچہ بھی تھا۔ ماں کی انگلی پکڑے ہوئے وہ اندر آیا تھا۔ اختر نے دیکھا کہ بچہ ماں کی انگلی چھوڑ چکا ہے۔ وہ دوڑ کر ہال کے باہر گھاس کی جانب مُڑ رہا ہے۔ ماں مسکرا پڑی ہے۔ مرد نے دھیرے سے کچھ کہا ہے۔ دونوں بھرپور ہنسی ہنسنے لگے ہیں۔

اختر کی نگاہوں میں ایک تیز کرن سی لہرائی ہے۔ اس کے کھنچے ہوئے اعصاب کو کچھ تسکین ملی ہے۔ شاید وہ مستقبل سے ناامید نہیں ——
شاید نئے معاشرے کا اس کا خواب پورا ہو جائے!
شاید نیا فرد اتنا بے بس نہ ہو!

اب وہ تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔

●

بقیہ: بھارت کی ہینڈلوم صنعت پر ایک نظر

کو فروغ دیا ہے۔ یہ ایک ایسا کمالِ فن ہے جسے صرف ٹیکسٹائل ڈیزائنر سمجھ سکتے ہیں۔ ہینڈلوم کے سوائے کوئی دوسری ٹیکنالوجی ایسا کارنامہ انجام نہیں دے سکتی اور ہینڈلوم کے سوائے دوسری صنعت ضروری لمبائی اور مقدار میں اسے مارکیٹ میں نہیں لا سکتی۔ آج اوزاروں اور ٹیکنالوجی کے لحاظ سے ہینڈلوم ایک چھوٹی صنعت ہے لیکن روزگار کے امکانات کے لحاظ سے بہت بڑی صنعت ہے۔ اس میں زراعت کے بعد سب سے زیادہ آدمی کام کر رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان لوگوں کی آمدنی میں اضافہ ہو اور ان کی طرزِ رہائش بہتر ہو۔ اس ملک کے اعلیٰ ماہر کاریگر قومی اثاثہ ہیں اور انھیں اس صورت میں تسلیم کیا جانا چاہیے۔

●

ہائیڈرو الیکٹرک باندھ

مختلف پردیشوں میں مندرجہ ذیل ۴۳ ہائیڈرو الیکٹرک باندھ بنائے گئے ہیں۔ جیسے اروناچل پردیش ۱۹، آسام۔ ۱، ہماچل پردیش۔ ۶، جموں وکشمیر ۳، کرناٹک ۱، منی پور ۴، ناگالینڈ ۱، راجستھان ۱، تامل ناڈو۔ ۳، تری پورہ ۳، اُترپردیش۔ ۴، اور مغربی بنگال۔ ۱۔

ان کے علاوہ مستقبل میں ۸۳ مزید باندھ بنانے کے منصوبے ہیں۔ باندھ بناکر بجلی پیدا کرنے کا طریقہ کافی عرصہ سے ملک میں رائج ہے۔ سب سے پہلے ۱۸۸۷ میں دارجلنگ میں پن بجلی باندھ بنانا شروع کیا گیا تھا۔ بڑے دریاؤں میں باندھ بناکر نہر نکالنے کا کام اور اُس سے پن بجلی پیدا کرنے کا طریقہ تب سے زیرِ عمل ہے۔ اسی طرح پنجاب میں بھی جوگیندر نگر میں پن بجلی کا پراجیکٹ بہت عرصہ پہلے تیار کیا گیا تھا۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں دریائے گنگا پر آٹھ ایسے پراجیکٹ تیار کئے گئے تھے۔ ذیل میں ہمارے ملک اور نواحی ملک نیپال کے بعض پن بجلی پراجیکٹوں کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

بیرا سیول

بھارت میں قومی پن بجلی توانائی کارپوریشن کی طرف سے تیار کردہ یہ پہلا پلانٹ ہے۔ ہماچل پردیش کے ضلع چمبہ میں واقع یہ پلانٹ دریائے راوی کے تین دھاراؤں کے ملے جلے بہاؤ سے کام کر رہا ہے۔ یہ ہیں بیرا، سیول اور بالید۔ ۶۰ میگا واٹ کی صلاحیت والا تین یونٹوں سے بنا ہوا یہ پلانٹ اپریل ۱۹۸۲ سے کام کرنے لگا ہے۔ یہ تینوں یونٹ متواتر توانائی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

لوک ٹک

منی پور کا یہ پراجیکٹ بلند پہاڑوں کے دامن میں واقع ہے۔ اس کی پیداواری صلاحیت ۱۰۵ میگا واٹ ہے۔ یہ توانائی پیدا کرنے کے علاوہ ۲۳ ہزار ہیکٹیئر اراضی کو سیراب کرنے کے لیے پانی بھی فراہم کرتا ہے۔ اس پلانٹ میں ۳۵ میگا واٹ صلاحیت کے تین یونٹ ہیں۔ یہ پراجیکٹ منی پور ندی پر واقع ہے۔

دیوی گھاٹ

یہ پراجیکٹ جو نیپال میں کاٹھمنڈو سے ۷۰ کلومیٹر شمال مغرب میں واقع ہے بھارت سرکار کے تکنیکی امدادی پروگرام کے تحت تیار کیا گیا ہے۔ گو اس پراجیکٹ کی صلاحیت ۱۴ میگا واٹ ہے تاہم اس کی ۴.۷ میگا واٹ کی صلاحیت والا پہلا یونٹ جون ۱۹۸۳ تک نصب ہو چکا ہے۔ اس پراجیکٹ میں ترسولی توانائی پلانٹ سے دستیاب پانی استعمال ہوتا ہے۔

سلال

جموں وکشمیر ریاست کے ضلع اودھم پور میں دھیان پور میں دریائے چناب پر اس پراجیکٹ کی تعمیر کی گئی ہے۔ اس کی کل توانائی کی پیمائش ۶۹۰ میگا واٹ کی گئی ہے۔ پہلے دور میں اس پلانٹ میں ۱۱۵ میگا واٹ صلاحیت کے تین یونٹ ہیں۔ اس سے ایک سال میں ۲۲ء۴۴ ارب یونٹ توانائی ملنے کی توقع ہے۔

کومل کارو

یہ پراجیکٹ جنوبی بہار میں دیا میں دریائے کومل پر واقع ہے۔ اسے اسی دریا کا پانی دستیاب ہوتا ہے اور اس کے پلانٹ سے ۷۱۰ میگا واٹ بجلی تیار کی جائے گی۔

ڈلہستی

ریاست جموں وکشمیر کے ضلع ڈوڈا میں واقع یہ پراجیکٹ دریائے چناب کے پانی سے کام کرتا ہے۔ پہلے مرحلے میں اس سے ۳۹۰ میگا واٹ بجلی تیار کی جائے گی اور دوسرے دور میں اس سے دگنی۔

ٹنک پور

اترپردیش میں دریائے شاردا کے ساتھ ساتھ ۱۹ پراجیکٹوں کے لیے مقامات متعین کئے گئے ہیں جن میں سے یہ پہلا پن بجلی پراجیکٹ ہے۔ اس پراجیکٹ سے ۱۲۰ میگا واٹ بجلی تیار کرنے کا پروگرام ہے۔

چمیرا

ہماچل پردیش کے ضلع چمبہ میں واقع اس پراجیکٹ کے پہلے مرحلے میں ۵۴۰ میگا واٹ بجلی تیار کی جائے گی۔ اس کے لیے دریائے راوی کا پانی استعمال کیا جائے گا۔

اُڑی

یہ پلانٹ ریاست جموں وکشمیر میں دریائے جہلم پر بنایا جا رہا ہے۔ اس کی پیداواری صلاحیت ۴۸۰ میگا واٹ ہے۔

شاردا راوی پراجیکٹ

ہمالیہ کے پہاڑوں میں سے بہتا ہوا دریائے شاردا بھارت اور نیپال کی سرحدوں کو جدا کرتا ہے۔ ریاست میں داخل ہوتے ہی یہ دریا اترپردیش میں بہتا ہوا دریائے گنگا میں جا ملتا ہے۔ دریائے شاردا اپنے معاون دریاؤں دھولی گنگا، گوری گنگا اور مشرقی رام گنگا کے ساتھ مل کر کل ۱۲۲۵ میگا واٹ بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس میں سے دھولی گنگا سے ۹۰۰ میگا واٹ، گوری گنگا سے ۲۴۵ میگا واٹ اور مشرقی رام گنگا سے ۸۰ میگا واٹ پن بجلی حاصل کی جائیگی۔

دھالیشوری

اس پلانٹ سے جو میزورم کے ضلع ایزاول کے موضع بیرابی میں واقع ہے۔ ۸۰ سے ۱۰۰ میگا واٹ بجلی حاصل کی جائے گی۔ ملک میں باندھوں اور پن بجلی کے پراجیکٹوں کے پھیلے ہوئے جال کی بدولت ہمارا ملک بجلی کے شعبے میں خود کفیل ہو جائیگا۔ ●

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment at Civil Lines Post Office, Delhi-110054.

یونس صدیقی

نوجوانوں میں سائنسی مزاج پیدا کرنے کی کوشش

سائنس سے دلچسپی بڑھانے والی اسکیمیں

سائنس اور ٹکنالوجی کی مرکزی وزارت (شعبۂ سائنس و ٹکنالوجی) نے نوجوانوں میں سائنسی مزاج پیدا کرنے اور سائنس کے مضمون سے ان کی دلچسپی بڑھانے کے لیے ایک اسکیم شروع کی ہے۔ اس اسکیم کے تحت بہت سے تحقیقی پراجیکٹ، سیمنار اور سمپوزیم شروع کیے جائیں گے۔ ان کا بنیادی مقصد سائنس اور ٹکنالوجی کے مختلف شعبوں میں سائنسی ذوق و شوق پیدا کرنا ہے۔ محکمۂ ہذا اس کے لیے مالی امداد فراہم کرتا ہے۔ اس شعبے کی سائنس اور انجینئرنگ ریسرچ کونسل نے ریسرچ کے معیار کو بلند کرنے پر زور دیا ہے۔ اور اس کے لیے اس کام کی طرف راغب سائنس دانوں کو مالی امداد دینے کا پروگرام وضع کیا ہے۔

مقاصد

اس اسکیم کے ذریعے سائنسدانوں میں سائنس کے تئیں دلچسپی پیدا کرنے پر عمر کے اُس حصّے میں زور دیا جائے گا جو ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو دکھانے کی عمر ہے۔ سائنس دانوں کو تبادلۂ خیال اور آپسی ربط ضبط بڑھانے کا موقع دیا جائیگا۔

کون درخواست دے؟ اس اسکیم سے ۱۸ سال سے ۳۵ سال کے سائنس داں فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے کسی بھی شعبے سے کافی دلچسپی اور گہری واقفیت رکھنے والے امیدوار اس اسکیم سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ عمر کے مذکورہ زمرے میں ہوں۔

سرگرمیاں

ایسے پراجیکٹ شروع کیے جا سکتے ہیں جن کی مدت دو سال ہو اور جن کے لیے بنیادی سرمایہ ایک لاکھ روپے تک درکار ہو۔ اس سلسلے میں سماجی اور اقتصادی ترقی کے پراجیکٹوں، سیمناروں، سمپوزیم نیز ایوارڈز کی ہمت افزائی کی جائے گی۔ دنیا کے شہرت یافتہ سائنسدانوں کے ساتھ رابطہ اور بین الاقوامی سفری سہولتوں کی بھی ہمت افزائی کی جائے گی۔ اس سلسلے میں مجوزہ فارم پر درخواست سال کے کسی بھی وقت دی جا سکتی ہے۔ یہ فارم ڈیپارٹمنٹ آف سائنس و ٹکنالوجی (سائنس و ٹکنالوجی پروموشن ڈویژن)، ٹکنالوجی بھون، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۶ سے مل سکتا ہے۔

ایک اور اسکیم

سائنس و ٹکنالوجی کی وزارت کی ایک اور اسکیم سائنس اور انجینئرنگ کی تحقیقی کونسل کی نوجوان سائنسدانوں کے لیے اسکیم کے نام سے موسوم ہے۔ یہ ایسے نوجوان سائنسدانوں کے تحقیقی مطالعوں کے لیے فوری امداد فراہم کرتی ہے۔ جو سائنس اور ٹکنالوجی کے جدید ترین شعبوں میں اپنے خیال و فکر سے تحقیقی مطالعوں کو بڑھاوا دینا چاہتے ہیں۔ یہ تحقیق کی مربوط کوششوں کے لیے مدد دیتی ہے۔ اور ادارہ جاتی پروگراموں وغیرہ میں مدد دیتی ہے۔

یہ اسکیم ۳۰ سال سے کم عمر نوجوانوں کے لیے ہے۔ جن سائنسدانوں نے پی ایچ ڈی یا اس کے بعد کے کاموں میں کوئی نمایاں پیش رفت کی ہے، وہ اس امداد کے مستحق ہیں۔ اس کے لیے درخواست کسی ادارے کی معرفت آنی ضروری نہیں۔ البتہ تجویز کی منظوری کے بعد کسی ادارے سے وابستگی کی تصدیق کے لیے سرٹیفکیٹ منسلک کرنا ضروری ہے۔ اس اسکیم کے تحت دو سالہ پراجیکٹوں کو منظوری دی جاتی ہے۔ اس عرصے کے لیے پراجیکٹ کی مجموعی لاگت ڈھائی لاکھ روپے رکھی گئی ہے۔ مجوزہ فارموں پر سال میں دو بار درخواست دی جاتی ہے۔ ایک بار جنوری کے آخر تک اور دوسری بار جولائی کے آخر تک۔

حصولِ آزادی کے بعد ملک کے عوام میں سائنسی مزاج کی نشو و نما کے لیے خصوصی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ سائنسی مزاج کا مطلب محض حقائق جمع کرنے سے نہیں ہے۔ اس کے ذریعے ہمارے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے

(باقی ص۳ پر)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002

یوجنا

۱۶ تا ۳۱ دسمبر ۱۹۸۵

ایک روپیہ

تعمیری کام کے لیے نوجوانوں کی شیرازہ بندی

(ڈاکٹر پی۔ ڈی۔ شرما)

سماجی جنگل بانی یا جنگل میں منگل

(گوپال لاروڑہ)

پریم اروڑہ

اعلیٰ تعلیم کے جمہوری انداز

اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی

سورگیہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی ۶۹ ویں سالگرہ کے موقع پر وزیر اعظم ہند شری راجیو گاندھی نے نئی دلّی میں ۱۹ نومبر کو اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کا سنگِ بنیاد رکھا۔ زیر نظر مضمون میں اس ادارے کی اہم خصوصیات اور اس کی افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۹ نومبر ۱۹۸۵ کو سورگیہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی سالگرہ کے موقع پر وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے راجدھانی میں اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اس کے ذریعے اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں عام کردی گئیں۔ اب تک ملک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا صرف اُن لوگوں کے بس کی بات سمجھی جاتی رہی جن کے مالی و اقتصادی حالات ٹھیک ہیں، غریبی کے سبب ہزاروں، لاکھوں طلبا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہے ہیں۔ تعلیم کے اعلیٰ اداروں میں وقت اور مناسب سہولتوں کی کمی کے باعث بھی بہت سے طلبا داخلہ نہیں لے پاتے۔ اس ادارے کے قیام کا مقصد اسی طرح کی کمیوں اور خامیوں کو دُور کرنا ہے۔

یہ یونیورسٹی پچھڑے، غریب اور مستحق لوگوں کو تعلیم کے مواقع فراہم کرے گی، اس کے ذریعے تعلیمی سہولتوں کی فراہمی کے عمل میں جمہوریت لائی جاسکے گی۔ اس میں داخلے کے قواعد و ضوابط میں اتنی لچک پیدا کردی گئی ہے کہ ملک کے سبھی لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اور معیاری تعلیم حاصل کرسکتے ہیں۔ اس یونیورسٹی کا طریقۂ تعلیم ایسا ہے کہ ہر طالب علم اپنی رفتار کی مناسبت سے تعلیم حاصل کرتا چلا جائے۔ ہر طالب علم کو اس سہولت اور اس کے پاس دستیاب وقت کی مناسبت سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ اسے مضامین اختیار کرنے میں بھی پوری آزادی حاصل ہوگی۔ اس سے گھروں کا کام کاج کرنے والی عورتیں بھی فائدہ اٹھائیں گی۔ اکثر عورتیں کم عمری میں شادی کے سبب تعلیم ترک کردیتی ہیں، کچھ طالب علم مالی دشواریوں کے باعث کالج سے نام کٹا لیتے ہیں، از خود روزگار اور دھندہ کرنے والے طلبا جو کہ کالج جانے کا موقع نہیں پاتے۔ اوپن یونیورسٹی کے ذریعے ان سب کو سہولتیں دی جائیں گی۔ جدید ترین ٹکنالوجی کو کام میں لایا جائے گا۔ ریڈیو، دُوردرشن اور ٹیلی ویژن وغیرہ کی مدد سے تعلیم دی جائے گی۔ روائتی قسم کے بلیک بورڈ اور کلاس روم کا طریقہ نہ اپناتے ہوئے مواصلاتی ذرائع سے کام لیا جائے گا۔

اوپن یونیورسٹی ۸۷-۱۹۸۶ سے کام شروع کرے گی۔ پروفیسر جی رام ریڈی کو یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنا دیا گیا ہے۔

(باقی کورصٓ پر)

اس شمارے میں

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر • آر۔ ٹھکرال
ایڈیٹر • لکھی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر • محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر • وسیم حیدر

جلد ۵	۱۶ تا ۳۱ دسمبر ۱۹۸۵	شمارہ ۱۸

۲۵ اگرہائن تا ۱۰ پوش ۱۹۰۷ ؛ ٹیلیفون :- ۶۰۱۸۱۸

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے۔ ۲ سالہ ۳۵ روپے۔ سہ سالہ ۵۰ روپے
فی کاپی :- ایک روپیہ
طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت

• یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے ـــ مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت ہی نہیں کرتے ہیں۔

بزنس منیجر : ایل۔ آر۔ بترہ ❖ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس۔ منجال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :-
ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین)
نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

ترسیل زر کا پتہ :- بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

ساتواں منصوبہ

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کی صدارت میں نئی دلی میں منعقد دو روزہ ایک میٹنگ میں نیشنل ڈیولپمنٹ کونسل نے ساتویں منصوبے کے مسودے کو حتمی منظوری دے دی ہے۔ اس پلان میں ۳۲۲۳۶۶ کروڑ روپے کی کل سرمایہ کاری کی جائے گی۔ یہ منصوبہ ۱۹۸۵ سے ۱۹۹۰ تک کے لیے ہے۔ سال ۸۵-۱۹۸۴ کی قیمتوں کی بنیاد پر یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس پلان میں ۳۰۲۳۶۶ کروڑ روپے گھریلو بچتوں سے لگائے جائیں گے۔ اس کے علاوہ ۲۰ ہزار کروڑ روپے باہر سے حاصل کئے جائیں گے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کل سرمایہ کاری کا تقریباً ۹۴ فیصد حصہ اندرون ملک ہی فراہم کیا جائے گا۔

یہ میٹنگ ۸ اور ۹ نومبر کو ہوئی جس میں ۲۲ ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے لیفٹیننٹ گورنر اور ایڈمنسٹریٹر شریک ہوئے۔ ان کے علاوہ مرکزی وزیر خزانہ شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ، انسانی وسائل کے فروغ سے متعلق مرکزی وزیر شری پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ، منصوبہ بندی کمیشن کے ڈپٹی چیرمین ڈاکٹر من موہن سنگھ اور منصوبہ بندی کمیشن کے وزیر مملکت شری اجیت پنجا نیز ارکان منصوبہ بندی کمیشن شریک ہوئے۔

ساتویں منصوبہ میں کل سرمایہ کاری کا ۴۸ فیصد یعنی ۱۵۴۲۱۸ کروڑ روپے پبلک سیکٹر میں اور باقی ۱۶۸۱۴۸ کروڑ روپے پرائیویٹ سیکٹر میں لگائے جائیں گے۔

اس منصوبے میں پبلک سیکٹر کے اخراجات ۸۵-۱۹۸۴ کی قیمتوں کے بموجب ۱۸۰۰۰۰ کروڑ روپے ہوں گے۔ ان میں سال رواں کے ۲۵۷۸۲ کروڑ روپے کے اخراجات شامل ہیں۔

عالمی بنک نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان کو ساتویں منصوبے میں ۵ فیصد کی شرح سے ترقی کرنے کے لیے صنعتی اور تجارتی پالیسیوں میں بہت دور رس تبدیلیاں لانی ہوں گی۔ چنانچہ ملک کے صنعتی ڈھانچے میں بہت سی رعائتیں دینے کی پالیسی اپنائی گئی ہے۔ ۱۹۷۳ سے ۱۹۸۳ کے درمیان دس سال کے عرصے میں معیشت کی شرح ترقی ۴ فیصد سے لے کر ۴.۲ فیصد تک رہی ہے۔ لیکن یہ بہرصورت ۵ فیصد سے کم ہے۔ وسائل سے پوری طرح فائدہ نہ اٹھانے کے باعث یہ کمی دیکھنے کو ملی ہے اور سرمایہ پیداوار کی بڑھوتری کی شرح ۷۹-۱۹۷۸ میں ۴.۳ تھی جو بڑھ کر ۸۲-۱۹۸۱ میں ۵.۸ فیصد رہی۔ اس حساب سے مجموعی قومی پیداوار کے ۲۴ فیصد کے بقدر سرمایہ کاری کی جا سکی۔ اس بنیاد پر ساتویں منصوبے میں ۵ فیصد شرح ترقی کا نشانہ حاصل کرنا کافی مشکل ہوگا، سرمایہ کاری کے عوض بڑھا ہوا منافع حاصل کرنے پر زور دیے بغیر شرح ترقی کا نشانہ پورا کرنا دشوار ہوگا۔ ساتویں منصوبے میں صنعتی محاذ پر سات فیصد کے حساب سے ترقی دکھانی ہوگی چنانچہ تجارت اور صنعتی پالیسیوں کو وضع کرتے وقت ان امور کو سامنے رکھنا ضروری ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی آئندہ پانچ برسوں میں برآمدات میں اضافہ ضروری ہے۔

ساتویں منصوبے میں زراعت کے لیے ۱۰۵۷۳.۶۲ کروڑ روپے، دیہی ترقی کے لیے ۹۰۷۴.۲۲ کروڑ روپے، خصوصی رقبوں کی ترقی کے لیے ۳۱۴۴.۶۹ کروڑ روپے، آبرسانی اور سیلابوں کی روک تھام کے لیے ۱۶۹۷۸.۶۵ کروڑ روپے مختص کیے گئے ہیں۔ معیشت میں انرجی سیکٹر کی اہمیت کو پوری طرح سمجھتے ہوئے ۵۴۸۲۱.۲۶ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ اس میں سے ۳۴۲۷۳.۴۶ کروڑ روپے بجلی کی تیاری اور ۵۱۹.۵۵ کروڑ روپے انرجی کے نئے اور متبادل وسائل کی کھوج کے لیے ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی ۱۲۶۲۷.۷۶ کروڑ روپے پٹرولیم کے لیے، ۷۴۰۰.۸۵ کروڑ روپے کوئلے کے لیے رکھے گئے ہیں۔ صنعتوں اور معدنی اشیاء کے لیے ۲۲۴۶۰.۸۳ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ ان میں سے ۲۷۵۲.۷۴ کروڑ روپے دیہی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لیے ہوں گے جبکہ ۱۹۷۰۸.۰۹ کروڑ روپے بڑی اور متوسط صنعتوں کے لیے ہوں گے۔ ٹرانسپورٹ سیکٹر کے لیے بحیثیت مجموعی ۲۲۹۷۱.۰۲ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ ان میں سے ریلوں کا حصہ ۱۲۳۳۴.۵۵ کروڑ روپے ہے اور سڑکوں کی تعمیر کے لیے ۵۲۰۰.۰۴ کروڑ روپے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سڑکوں کے ذریعے نقل و حمل کے لیے ۱۹۹۱.۰۱ کروڑ اور ٹرانسپورٹ کے دیگر ذرائع کے لیے ۳۳۴۶.۳۳ کروڑ روپے ہونگے۔ مواصلات اور اطلاعات و نشریات کے لیے ۴۴۷۲.۲۴ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے لیے ۲۴۶۶.۰۰ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ سماجی بہبود کے لیے ۲۹۳۵۰.۴۲ کروڑ روپے ہونگے۔ ان میں سے ثقافت تعلیم اور کھیلوں کے لیے ۶۳۸۲.۶۵ کروڑ روپے، خاندانی بہبود کیلئے ۳۲۵۶.۲۶ کروڑ روپے اور صحت کیلئے ۳۳۹۲.۸۹ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ تعمیر مکانات اور شہری ترقی کے لیے ۲۴۵۸.۹۵ کروڑ روپے ہوں گے۔ پانی کی فراہمی اور صفائی ستھرائی کے پروگراموں کے لیے ۶۵۲۲.۴۷ کروڑ روپے، شیڈولڈ کاسٹ شیڈولڈ ٹرائب اور سماج کے کمزور طبقات کے لیے ۱۵۲۰.۴۳ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ سماجی بھلائی اور عورتوں کی بہبود کے لیے ۱۰۱۲.۳۶ کروڑ روپے، تغذیہ بخش خوراک کی فراہمی کے لیے ۱۷۴۰.۱۸ کروڑ روپے، محنت اور سماجی بہبود کے لیے ۳۳۲.۷۲ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ (باقی صفحہ ۴۰ پر)

پربھو چودھری

ہمارے منصوبوں کی بنیادیں

سرمایہ کاری اور غیر ملکی امداد

ترقی پذیر ممالک کے رو برو اقتصادی ترقی کا مسئلہ اس قدر وسعت اختیار کر چکا ہے کہ اس کے حل کا کوئی ایک بڑا پہلو اختیار کرکے اس پر قابو پانا ناممکن سا معلوم ہوتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک کے پاس کافی سرمایہ، ٹیکنالوجی، جدید مشینری اور بنیادی سروسوں کی عموماً کمی رہتی ہے اور دستیاب وسائل میں بھی توازن نہیں پایا جاتا۔ اس کے ساتھ ہی ان ممالک کی شرح ترقی میں تیزی لانا بھی بہت ضروری ہے۔

آجکل بھارت جیسے ترقی پذیر ممالک منصوبوں کے ذریعے اقتصادی ترقی کے نشانوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بھارت میں زراعت اور صنعت کاری میں ہم آہنگی بنائے رکھنے کے لیے پہلے پانچ سالہ منصوبے میں زرعی اور دوسرے پانچ سالہ منصوبے میں صنعتی ترقی پر زور دیکر اور پھر منصوبہ کاری کے تمام عرصہ میں دونوں سیکٹروں میں ضرورت کے مطابق سرمایہ کاری کے ذریعے متوازن ترقی کی راہ اختیار کی گئی۔ زراعتی جدید کاری اور صنعت کاری کے نشانوں کے حصول کے لیے کافی بچت اور سرمایہ کی ضرورت ہے۔ لیکن بد قسمتی سے مختلف اقتصادی اور سماجی اسباب سے زیادہ کنبوں کی آمدنی کم اور خرچ زیادہ ہے۔ ملک میں ۵۰ فیصد لوگ خط افلاس کے نیچے رہتے ہیں۔ اور یہ فاصلہ لگاتار بڑھ رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں ملک میں بچت خاص صورت میں یا ضرورت کے مطابق ممکن نہیں ہوتی۔ بچت کی کمی سے سرمایہ کی فراہمی اور سرمایہ کاری حسب ضرورت یا صحیح صورت میں ممکن نہیں ہو پاتی۔

اعداد و شمار سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ بھارت میں کافی مقدار میں سرمایہ کاری کے لیے سرمایہ کی فراہمی نہیں ہو رہی۔ اس کے دو بڑے اسباب ہیں۔ اول، ملک میں بیروزگاری زیادہ ہے اور عام لوگوں کی آمدنی بھی کم ہے۔ دوئم، زیادہ تر اشیا کی قیمتیں اپنی بلند ترین سطح پر پہونچ چکی ہیں۔ اور عموماً کنبے کی وسعت بھی بڑھی ہے جس سے خرچ زیادہ ہونے کے باعث بچت نہیں ہو پاتی۔ بچت کی کمی سے سرمایہ جمع نہیں ہوتا۔ سرمایہ کی کمی سے منصوبہ بندی اور اقتصادی ترقی میں زبردست مشکل آجاتی ہے۔

اعداد و شمار سے متعلق مرکزی ادارہ کی طرف سے ملکی بچت اور سرمایہ کی فراہمی کے بارے میں جو اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں وہ زیادہ حوصلہ افزا معلوم نہیں ہوتے۔

۱۹۷۰-۷۱ سے ۱۹۸۱-۸۲ تک کے اعداد مندرجہ ذیل گوشوارہ میں پیش کئے گئے ہیں:-

سال	مارکیٹ قیمت پر کل ملکی پیداوار کا فیصد		مارکیٹ قیمت پر خالص ملکی پیداوار کا فیصد	
	کل ملکی بچت	کل ملکی سرمایہ کی فراہمی	خالص ملکی بچت	خالص ملکی سرمایہ کی فراہمی
۱	۲	۳	۴	۵

۱۹۷۰-۷۱	۱۶٫۸	۱۷٫۸	۱۲٫۰	۱۳٫۰
۱۹۷۱-۷۲	۱۷٫۳	۱۸٫۴	۱۲٫۴	۱۳٫۶
۱۹۷۲-۷۳	۱۹٫۲	۱۹٫۹	۱۱٫۳	۱۱٫۹
۱۹۷۳-۷۴	۱۹٫۳	۲۰٫۰	۱۵٫۰	۱۵٫۷
۱۹۷۴-۷۵	۱۸٫۲	۱۹٫۱	۱۳٫۸	۱۴٫۸
۱۹۷۵-۷۶	۲۰٫۰	۲۰٫۷	۱۵٫۴	۱۵٫۳
۱۹۷۶-۷۷	۲۲٫۳	۲۰٫۷	۱۷٫۷	۱۶٫۰
۱۹۷۷-۷۸	۲۱٫۸	۲۰٫۱	۱۷٫۲	۱۵٫۴
۱۹۷۸-۷۹	۲۴٫۳	۲۴٫۴	۱۹٫۶	۱۹٫۷
۱۹۷۹-۸۰	۲۲٫۵	۲۳٫۰	۱۷٫۴	۱۸٫۰
۱۹۸۰-۸۱	۳۱٫۹	۲۳٫۸	۱۹٫۷	۱۸٫۷
۱۹۸۱-۸۲	۲۲٫۸	۲۵٫۳	۱۷٫۵	۲۰٫۱

بھارت میں منصوبہ بندی ۱۹۵۱ سے شروع کی گئی تھی۔ کُل چھ پانچ سالہ منصوبوں اور متعدد سالانہ منصوبوں سے اگر پوری اقتصادی ترقی عمل میں نہیں آسکی تو اس کا سبب کافی سرمایہ کی کمی ہی رہا ہے۔ اقتصادی ترقی کی شرح نشانے سے کم رہنے سے ملک کی پیش قدمی سست رہی ہے۔ پانچ سالہ منصوبوں کے عرصے میں ترقی کی سالانہ شرح کا نشانہ چالو قیمتوں پر اور ۱۹۷۰-۷۱ کی قیمتوں کی بنیاد پر حسبِ توقع نہیں رہا۔ چھٹے پانچ سالہ منصوبے میں اس نشانے کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

غیر ملکی سرمایہ کاری

بھارت سرکار کی صنعتی پالیسی میں تمام قسم کی صنعتوں کے قیام اور ترقی پر زور دیا گیا ہے۔ حکومت کی طرف سے اس امر کو بڑی اہمیت دی گئی ہے کہ صنعت کاری کے لیے سرمایہ کی کمی کو دور کرنے کے لیے ضرورت پڑنے پر چند شرائط کو منظور کر کے غیر ملکی سرمایہ کا اہتمام کیا جا سکتا ہے

یوں بھی غیر ملکی سرمایہ پر جتنا کنٹرول رکھا جائے اُتنا ہی بہتر ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بہت زیادہ غیر ملکی سرمایہ کی آمد سے نہ صرف ملکی سرمایہ کا دائرہ کم ہو جاتا ہے بلکہ صنعتی شعبے میں غیر ملکی اثر بڑھ جاتا ہے۔ جو ملکی مفاد میں نہیں ہے۔ اس بات کا واضح ثبوت کچھ ہی عرصہ پہلے بھوپال کے یونین کاربائیڈ گیس سانحہ سے ملا جس نے بھوپال کے شہریوں کی زندگی کو ناکارہ بنا دیا۔

اس سلسلے میں بھارتی پالیسی کے بارے میں سرکاری حلقوں کی طرف سے بتایا گیا ہے کہ "صنعتی ترقی میں تیزی لانے کے سلسلے میں مالی وسائل اور تکنیکی علم کی کمی کو پورا کرنے کے لیے بھارت سرکار نے اس امر کی اجازت دیدی ہے کہ بعض مطلوبہ شعبوں میں غیر ملکی سرمایہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ غیر ملکی سرمایہ سے متعلق پالیسی (۱۹۴۸) کے تحت صنعتی پالیسی کے بارے میں فیصلے اور ۱۹۴۹ میں کئے گئے سرکاری اعلان کے مطابق غیر ملکی سرمایہ اور صنعت کی شراکت کو قومی مفاد میں احتیاط کے ساتھ منضبط کیا جاتا ہے"۔ حکومت کی طرف سے غیر ملکی کمپنیوں پر بعض کئی قسم کی پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔

حکومت کی طرف سے غیر ملکی کمپنیوں پر متعدد قسم کے کنٹرول عائد کئے گئے ہیں اور انھیں ریزرو بینک سے براہِ راست وابستہ کر دیا گیا ہے۔ غیر ملکی سرمایہ کی ضرورت کے بارے میں پوری جانکاری حاصل کرنے کے بعد ہی غیر ملکی سرمایہ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

غیر ملکی زرِ مبادلہ کے قانون ۱۹۷۳ کے تحت غیر ملکوں میں واقع کمپنیوں اور ایسی بھارتی کمپنیوں کو جن میں غیر ملکیوں کا حصہ ۴۰ فیصد سے زیادہ ہے ریزرو بینک سے براہِ راست اجازت لینے کی ضرورت ہے۔ حکومت کی طرف سے جو معیار مقرر کئے گئے ہیں اُن کے مطابق غیر ملکی کمپنیوں کی شاخوں کو جن کا غیر ملکی سرمایہ ۴۰ فیصد، ۵۱ فیصد اور ۷۴ فیصد کے درمیان ہے۔ بھارتی کمپنیوں کے طور پر کام کرتا رہا ہے۔

مارچ ۱۹۸۳ تک منظور شدہ غیر ملکی امداد کی رقم ۳۱۶۱۷٫۴۳ کروڑ روپے اور استعمال میں لائی گئی رقم ۲۴۰۱۵٫۶ کروڑ روپے کی ہوگی۔ اس میں سے ۲۷۸۰۲٫۲ کروڑ روپے قرضوں اور باقیماندہ رقم عطیات کی صورت میں منظور کی گئی تھی۔

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ۲۷۸۰۲٫۲ کروڑ روپے کے قرضوں میں سے ۲۰۷۵۵ روپے یعنی ۷۴٫۶ فیصد کا استعمال مارچ ۱۹۸۳ء تک ہو گیا تھا۔ لیکن منظور شدہ عطیات ۳۸۱۵٫۲ کروڑ روپے کا مقابلتہً زیادہ یعنی ۶۴٫۵ فیصد اس وقت تک استعمال میں لایا جا چکا تھا۔ اپریل ۱۹۸۴ میں اقتصادی اشتراکِ کار کے فیصلے اور ترقیاتی تنظیم کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۳ء کے آخر تک بھارت پر ۲۰۶۸٫۷ کروڑ ڈالر کا غیر ملکی قرضہ واجب الادا تھا اور ترقی پذیر

اس شمارے میں

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

- چیف ایڈیٹر • آر۔ ٹھکرال
- ایڈیٹر • لکھی رام رانا
- اسسٹنٹ ایڈیٹر • محمد عادل صدیقی
- سب ایڈیٹر • وسیم حیدر

جلد ۵	۱۶ تا ۳۱ دسمبر ۱۹۸۵	شمارہ ۱۸

۲۵ اگرہائن تا ۱۰ پوش ۱۹۰۷ ؛ ٹیلیفون :۔ ۶۰۱۸۱۸

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے ۔ ۲ سالہ ۳۵ روپے ۔ سہ سالہ ۵۰ روپے

فی کاپی :۔ ایک روپیہ

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فیصدی رعایت

• یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے ـــ مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت ہی محدود نہیں ہیں۔

بزنس منیجر : ایل۔ آر۔ بترہ ✣ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس۔ منچالے

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :۔

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین)

نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

ترسیل زر کا پتہ :۔ بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

ساتواں منصوبہ

وزیرِ اعظم شری راجیو گاندھی کی صدارت میں نئی دلی میں منعقد دو روزہ ایک میٹنگ میں نیشنل ڈیولپمنٹ کونسل نے ساتویں منصوبے کے مسودے کو حتمی منظوری دیدی ہے۔ اس پلان میں ۳۲۲۳۶۶ کروڑ روپے کی کُل سرمایہ کاری کی جائے گی۔ یہ منصوبہ ۱۹۸۵ سے ۱۹۹۰ تک کے لیے ہے۔ سال ۸۵-۱۹۸۴ کی قیمتوں کی بنیاد پر یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس پلان میں ۳۰۲۳۶۶ کروڑ روپے گھریلو بچتوں سے لگائے جائیں گے۔ اس کے علاوہ ۲۰ ہزار کروڑ روپے باہر سے حاصل کئے جائیں گے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کُل سرمایہ کاری کا تقریباً ۹۴ فیصد حصہ اندرونِ ملک ہی فراہم کیا جائے گا۔ یہ میٹنگ ۸ اور ۹ نومبر کو ہوئی جس میں ۲۲ ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ اور مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں کے لیفٹننٹ گورنر اور ایڈمنسٹریٹر شریک ہوئے۔ ان کے علاوہ مرکزی وزیرِ خزانہ شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ، انسانی وسائل کے فروغ سے متعلق مرکزی وزیر شری پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ، منصوبہ بندی کمیشن کے ڈپٹی چیرمین ڈاکٹر من موہن سنگھ اور منصوبہ بندی کمیشن کے وزیرِ مملکت شری اجیت پنجا نیز ارکانِ منصوبہ بندی کمیشن شریک ہوئے۔

ساتویں منصوبہ میں کل سرمایہ کاری کا ۴۸ فیصد یعنی ۱۵۴۲۱۸ کروڑ روپے پبلک سیکٹر میں اور باقی ۱۶۸۱۴۸ کروڑ روپے پرائیویٹ سیکٹر میں لگائے جائیں گے۔

اس منصوبے میں پبلک سیکٹر کے اخراجات ۸۵-۱۹۸۴ کی قیمتوں کے بموجب ۱،۸۰،۰۰۰ کروڑ روپے ہوں گے۔ ان میں سالِ رواں کے ۲۵۷۸۲ کروڑ روپے کے اخراجات شامل ہیں۔

عالمی بنک نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان کو ساتویں منصوبے میں ۵ فیصد کی شرح سے ترقی کرنے کے لیے صنعتی اور تجارتی پالیسیوں میں بہت دُور رس تبدیلیاں لانی ہوں گی۔ چنانچہ ملک کے صنعتی ڈھانچے میں بہت سی رعائتیں دینے کی پالیسی اپنائی گئی ہے۔ ۱۹۷۳ سے ۱۹۸۳ کے درمیان دس سال کے عرصے میں معیشت کی شرح ترقی ۴ فیصد سے لے کر ۴ء۲ فیصد تک رہی ہے۔ لیکن یہ بہرصورت ۵ فیصد سے کم ہے۔ وسائل سے پوری طرح فائدہ نہ اُٹھانے کے باعث یہ کمی دیکھنے کو ملی ہے اور سرمایہ پیداوار کی بڑھوتری کی شرح ۸۰-۱۹۷۹ میں ۴ء۲۳ تھی جو بڑھ کر ۸۲-۱۹۸۱ میں ۱۸ء۵ فیصد رہی۔ اس حساب سے مجموعی قومی پیداوار کے ۲۴ فیصد کے بقدر سرمایہ کاری کی جاسکی۔ اس بنیاد پر ساتویں منصوبے میں ۵ فیصد شرح ترقی کا نشانہ حاصل کرنا کافی مشکل ہوگا، سرمایہ کاری کے عوض بڑھا ہوا منافع حاصل کرنے پر زور دیئے بغیر شرح ترقی کا نشانہ پورا کرنا دشوار ہوگا۔ ساتویں منصوبے میں صنعتی محاذ پر سات فیصد کے حساب سے ترقی دکھانی ہوگی چنانچہ تجارت اور صنعتی پالیسیوں کو وضع کرتے وقت ان امور کو سامنے رکھنا ضروری ہوگیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی آیندہ پانچ برسوں میں برآمدات میں اضافہ ضروری ہے۔

ساتویں منصوبے میں زراعت کے لیے ۱۰۵۷۳۲ کروڑ روپے، دیہی ترقی کے لیے ۹۰۷۴،۲۲ کروڑ روپے، خصوصی رقبوں کی ترقی کے لیے ۱۳۴۴،۶۹ کروڑ روپے، آبرسانی اور سیلابوں کی روک تھام کے لیے ۱۶۹۷۸،۶۵ کروڑ روپے مختص کیے گئے ہیں۔ معیشت میں انرجی سیکٹر کی اہمیت کو پوری طرح سمجھتے ہوئے ۵۴۸۲۱،۲۶ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ اس میں سے ۳۴۲۷۳،۴۶ کروڑ روپے بجلی کی تیاری اور ۵۱۹،۵۵ کروڑ روپے انرجی کے نئے اور متبادل وسائل کی کھوج کے لیے ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی ۱۲۶۲۷،۶۷ کروڑ روپے پٹرولیم کے لیے، ۷۴۰۰،۵۸ کروڑ روپے کوئلے کے لیے رکھے گئے ہیں۔ صنعتوں اور معدنی اشیاء کے لیے ۲۲۴۶۰،۸۳ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ ان میں سے ۲۷۵۲،۷۴ کروڑ روپے دیہی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لیے ہوں گے جبکہ ۱۹۷۰۸،۰۹ کروڑ روپے بڑی اور متوسط صنعتوں کے لیے ہوں گے۔ ٹرانسپورٹ سیکٹر کے لیے بحیثیت مجموعی ۲۲۹۷۱،۰۲ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ ان میں سے ریلوں کا حصہ ۱۲۳۳۴،۵۵ کروڑ روپے ہے اور سڑکوں کی تعمیر کے لیے ۵۲۰۰،۰۴ کروڑ روپے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سڑکوں کے ذریعے نقل و حمل کے لیے ۱۹۹۰،۱۰ کروڑ اور ٹرانسپورٹ کے دیگر ذرائع کے لیے ۳۴۴۶،۳۳ کروڑ روپے ہونگے۔ مواصلات اور اطلاعات و نشریات کے لیے ۶۴۷۲،۴۲ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے لیے ۲۴۶۶،۰۰ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ سماجی بہبود کے لیے ۲۹۳۵۰،۴۲ کروڑ روپے ہونگے۔ ان میں سے ثقافت تعلیم اور کھیلوں کے لیے ۶۳۸۲،۶۵ کروڑ روپے خاندانی بہبود کیلئے ۳۲۵۶،۲۶ کروڑ روپے اور صحت کیلئے ۳۳۹۲،۸۹ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ تعمیرِ مکانات اور شہری ترقی کے لیے ۴۲۵۹،۰۵ کروڑ روپے ہوں گے۔ پانی کی فراہمی اور صفائی ستھرائی کے پروگراموں کے لیے ۶۵۲۲،۴۷ کروڑ روپے، شیڈولڈ کاسٹ شیڈولڈ ٹرائب اور سماج کے کمزور طبقات کے لیے ۱۵۲۰،۴۳ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ سماجی بھلائی اور عورتوں کی بہبود کے لیے ۱۰۱۲،۳۶ کروڑ روپے، تغذیہ بخش خوراک کی فراہمی کے لیے ۱۷۴۰،۱۸ کروڑ روپے، محنت اور سماجی بہبود کے لیے ۳۳۳،۲۷ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ (باقی صفحہ ۲۰ پر)

ہمارے منصوبوں کی بنیادیں

پربھو چودھری

سرمایہ کاری اور غیر ملکی امداد

ترقی پذیر ممالک کے رو برو اقتصادی ترقی کا مسئلہ اس قدر وسعت اختیار کر چکا ہے کہ اس کے حل کا کوئی ایک بڑا پہلو اختیار کر کے اس پر قابو پانا ناممکن سا معلوم ہوتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک کے پاس کافی سرمایہ، ٹیکنالوجی، جدید مشینری اور بنیادی سروسوں کی عموماً کمی رہتی ہے اور دستیاب وسائل میں بھی توازن نہیں پایا جاتا۔ اس کے ساتھ ہی ان ممالک کی شرح ترقی میں تیزی لانا بھی بہت ضروری ہے۔

آجکل بھارت جیسے ترقی پذیر ممالک منصوبوں کے ذریعے اقتصادی ترقی کے نشانوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بھارت میں زراعت اور صنعت کاری میں ہم آہنگی بنائے رکھنے کے لیے پہلے پانچ سالہ منصوبے میں زرعی اور دوسرے پانچ سالہ منصوبے میں صنعتی ترقی پر زور دیکر اور پھر منصوبہ کاری کے تمام عرصہ میں دونوں سیکٹروں میں ضرورت کے مطابق سرمایہ کاری کے ذریعے متوازن ترقی کی راہ اختیار کی گئی۔ زراعتی جدید کاری اور صنعت کاری کے نشانوں کے حصول کے لیے کافی بچت اور سرمایہ کی ضرورت ہے۔ لیکن بدقسمتی سے مختلف اقتصادی اور سماجی اسباب سے زیادہ کنبوں کی آمدنی کم اور خرچ زیادہ ہے۔ ملک میں ۵۰ فیصد لوگ خطِ افلاس کے نیچے رہتے ہیں۔ اور یہ فاصلہ لگاتار بڑھ رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں ملک میں بچت خاص صورت میں یا ضرورت کے مطابق ممکن نہیں ہوتی۔ بچت کی کمی سے سرمایہ کی فراہمی اور سرمایہ کاری حسبِ ضرورت یا صحیح صورت میں ممکن نہیں ہو پاتی۔

اعداد و شمار سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ بھارت میں کافی مقدار میں سرمایہ کاری کے لیے سرمایہ کی فراہمی نہیں ہو رہی۔ اس کے دو بڑے اسباب ہیں۔ اول، ملک میں بیروزگاری زیادہ ہے اور عام لوگوں کی آمدنی بھی کم ہے۔ دوئم، زیادہ تر اشیا کی قیمتیں اپنی بلند ترین سطح پر پہونچ چکی ہیں۔ اور عموماً کنبے کی وسعت بھی بڑھی ہے جس سے خرچ زیادہ ہونے کے باعث بچت نہیں ہو پاتی۔ بچت کی کمی سے سرمایہ جمع نہیں ہوتا۔ سرمایہ کی کمی سے منصوبہ بندی اور اقتصادی ترقی میں زبردست مشکل آجاتی ہے۔

اعداد و شمار سے متعلق مرکزی ادارہ کی طرف سے ملکی بچت اور سرمایہ کی فراہمی کے بارے میں جو اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں وہ زیادہ حوصلہ افزا معلوم نہیں ہوتے۔

۷۱-۱۹۷۰ سے ۸۲-۱۹۸۱ تک کے اعداد مندرجہ ذیل گوشوارہ میں پیش کئے گئے ہیں:-

سال	مارکیٹ قیمت پر کل ملکی پیداوار کا فیصد		مارکیٹ قیمت پر خالص ملکی پیداوار کا فیصد	
	کل ملکی بچت	کل ملکی سرمایہ کی فراہمی	خالص ملکی بچت	خالص زائد سرمایہ کی فراہمی
۱	۲	۳	۴	۵

۱۹۷۰-۷۱	۱۶٫۸	۱۷٫۸	۱۲٫۰	۱۳٫۰
۱۹۷۱-۷۲	۱۷٫۳	۱۸٫۴	۱۲٫۴	۱۳٫۶
۱۹۷۲-۷۳	۱۶٫۲	۱۶٫۹	۱۱٫۳	۱۱٫۹
۱۹۷۳-۷۴	۱۹٫۳	۲۰٫۰	۱۵٫۰	۱۵٫۷
۱۹۷۴-۷۵	۱۸٫۲	۱۹٫۱	۱۳٫۸	۱۴٫۸
۱۹۷۵-۷۶	۲۰٫۰	۲۰٫۷	۱۵٫۴	۱۵٫۳
۱۹۷۶-۷۷	۲۲٫۳	۲۰٫۷	۱۷٫۷	۱۶٫۰
۱۹۷۷-۷۸	۲۱٫۸	۲۰٫۱	۱۷٫۲	۱۵٫۴
۱۹۷۸-۷۹	۲۴٫۳	۲۴٫۴	۱۹٫۶	۱۹٫۷
۱۹۷۹-۸۰	۲۲٫۵	۲۳٫۰	۱۷٫۴	۱۸٫۰
۱۹۸۰-۸۱	۳۱٫۹	۲۳٫۸	۱۶٫۷	۱۸٫۷
۱۹۸۱-۸۲	۲۲٫۸	۲۵٫۳	۱۷٫۵	۲۰٫۱

بھارت میں منصوبہ بندی ۱۹۵۱ سے شروع کی گئی تھی۔ کُل چھ پانچ سالہ منصوبوں اور متعدد سالانہ منصوبوں سے اگر پوری اقتصادی ترقی عمل میں نہیں آسکی تو اس کا سبب کافی سرمایہ کی کمی ہی رہا ہے۔ اقتصادی ترقی کی شرح نشانے سے کم رہنے سے ملک کی پیش قدمی سُست رہی ہے۔ پانچ سالہ منصوبوں کے عرصے میں ترقی کی سالانہ شرح کا نشانہ چالو قیمتوں پر اور ۱۹۷۰-۷۱ کی قیمتوں کی بنیاد پر حسبِ توقع نہیں رہا۔ چھٹے پانچ سالہ منصوبے میں اس نشانے کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

غیر ملکی سرمایہ کاری

بھارت سرکار کی صنعتی پالیسی میں تمام قسم کی صنعتوں کے قیام اور ترقی پر زور دیا گیا ہے۔ حکومت کی طرف سے اس امر کو بڑی اہمیت دی گئی ہے کہ صنعت کاری کے لیے سرمایہ کی کمی کو دور کرنے کے لیے ضرورت پڑنے پر چند شرائط کو منظور کر کے غیر ملکی سرمایہ کا اہتمام کیا جا سکتا ہے

یوں بھی غیر ملکی سرمایہ پر جتنا کنٹرول رکھا جائے اُتنا ہی بہتر ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بہت زیادہ غیر ملکی سرمایہ کی آمد سے نہ صرف ملکی سرمایہ کا دائرہ کم ہو جاتا ہے بلکہ صنعتی شعبے میں غیر ملکی اثر بڑھ جاتا ہے۔ جو ملکی مفاد میں نہیں ہے۔ اس بات کا واضح ثبوت کچھ ہی عرصہ پہلے بھوپال کے یونین کاربائیڈ گیس سانحہ سے ملا جس نے بھوپال کے شہریوں کی زندگی کو ناکارہ بنا دیا۔

اس سلسلے میں بھارتی پالیسی کے بارے میں سرکاری حلقوں کی طرف سے بتایا گیا ہے کہ "صنعتی ترقی میں تیزی لانے کے سلسلے میں مالی وسائل اور تکنیکی علم کی کمی کو پورا کرنے کے لیے بھارت سرکار نے اس امر کی اجازت دیدی ہے کہ بعض مطلوبہ شعبوں میں غیر ملکی سرمایہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ غیر ملکی سرمایہ سے متعلق پالیسی (۱۹۴۸) کے تحت صنعتی پالیسی کے بارے میں فیصلے اور ۱۹۴۹ میں کئے گئے سرکاری اعلان کے مطابق غیر ملکی سرمایہ اور صنعت کی شراکت کو قومی مفاد میں احتیاط کے ساتھ منضبط کیا جاتا ہے۔" حکومت کی طرف سے غیر ملکی کمپنیوں پر بھی کئی قسم کی پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔

حکومت کی طرف سے غیر ملکی کمپنیوں پر متعدد قسم کے کنٹرول نافذ کئے گئے ہیں اور انھیں ریزرو بینک سے براہِ راست وابستہ کر دیا گیا ہے۔ غیر ملکی سرمایہ کی ضرورت کے بارے میں پوری جانکاری حاصل کرنے کے بعد ہی غیر ملکی سرمایہ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

غیر ملکی زرِ مبادلہ کے قانون ۱۹۷۳ کے تحت غیر ملکوں میں واقع کمپنیوں اور ایسی بھارتی کمپنیوں کو جن میں غیر ملکیوں کا حصہ ۴۰ فیصد سے زیادہ ہے ریزرو بینک سے براہِ راست اجازت لینے کی ضرورت ہے۔ حکومت کی طرف سے جو معیار مقرر کئے گئے ہیں اُن کے مطابق غیر ملکی کمپنیوں کی شاخوں کو جن کا غیر ملکی سرمایہ ۴۰ فیصد، ۵۱ فیصد اور ۷۴ فیصد کے درمیان ہے، بھارتی کمپنیوں کے طور پر کام کرتا رہا ہے۔

مارچ ۱۹۸۳ تک منظور شدہ غیر ملکی امداد کی رقم ۳۱۶۱۷٫۴۴ کروڑ روپے اور استعمال میں لائی گئی رقم ۲۴۰۱۵٫۶ کروڑ روپے کی ہوگی۔ اس میں سے ۲۷۸۰٫۲ کروڑ روپے قرضوں اور باقیماندہ رقم عطیات کی صورت میں منظور کی گئی تھی۔

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ۲۷۸۰۲٫۲ کروڑ روپے کے قرضوں میں سے ۲۰۷۵۵ کروڑ روپے یعنی ۷۴٫۶ فیصد کا استعمال مارچ ۱۹۸۳ء تک ہو گیا تھا۔ لیکن منظور شدہ عطیات ۳۸۱۵٫۲ کروڑ روپے کا مقابلتاً زیادہ یعنی ۵۴٫۶ فیصد اس وقت تک استعمال میں لایا جا چکا تھا۔ اپریل ۱۹۸۴ میں اقتصادی اشتراک کار کے فیصلے اور ترقیاتی تنظیم کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۳ء کے آخر تک بھارت پر ۲۰۶۸٫۷ کروڑ ڈالر کا غیر ملکی قرضہ واجب الادا تھا اور ترقی پذیر

[illegible] نقصانات بھی [illegible]
جاسکتا ہے کہ [illegible] مصنوعی سیارے نے
خلیج بنگال کی چند تصویریں لی تھیں جن سے پتہ چلا
تھا کہ اس سمندر کے ۵۰ ہزار کلومیٹر علاقے میں گہرائی
کم ہو گئی ہے جس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ گنگا اور
برہم پُتر دریاؤں نے بے پناہ مٹی اس سمندر میں
بہا دی ہے جس سے وہ سمندری تہہ میں بیٹھ گئی ہے
اور گہرائی کم ہو گئی ہے۔ بقول مسٹری سندر لال
بہوگنا جو چپکو تحریک کے بانی ہیں "ہمالیہ کی دولت
سمندر میں بہہ رہی ہے۔"

ڈیم بھی متاثر

سمندروں کے علاوہ باندھوں اور پن بجلی
پراجیکٹوں میں بھی دریا مٹی پہنچا رہے ہیں۔ صرف
بھاکڑا ڈیم میں ہی اس قدر مٹی جمع ہو گئی ہے کہ وہ
اب ۵۰ برس کے بجائے ۵۵ برس [illegible] ہی کارآمد
رہے گا۔ اسی طرح دیگر ڈیموں کو بھی نقصان پہنچ
رہا ہے جس کا اندازہ ۱۰ ہزار ملین روپے یعنی ۱۰
ارب روپے لگایا گیا ہے۔

ایسے ہی حالات تقریباً تمام ممالک خصوصاً
تیسری دنیا میں پیدا ہو گئے ہیں جنھوں نے انسان
کے مستقبل کو مخدوش بنا دیا ہے۔ اس سے تمام
ممالک کے ذمہ دار حلقوں میں تشویش کا پیدا ہونا
قدرتی ہے۔ چنانچہ گذشتہ ماہ روم میں منعقدہ عالمی
خوراکی و زرعی تنظیم کے ۲۳ ویں اجلاس میں اس
صورت حال پر غور کیا گیا۔ یہ اجلاس زرعی معیشت
کی رفتار ترقی کو تیز کرنے اور ماحولیات کو بہتر
بنانے کے سلسلے میں عالمی پیمانے پر اقدامات کرنے
کے لیے بلایا گیا تھا۔

اجلاس میں بھارتی نمائندے جناب
بوٹا سنگھ وزیر زراعت نے دیگر امور کے ساتھ
اس امر پر زور دیا کہ اس سے پہلے کہ معاملہ ہاتھ

[illegible] کی صورت میں قدرت کے مظاہرات کے [illegible]
لیے فوری اقدامات کرنے ہوں گے۔ انھوں نے اس
امر پر گہری تشویش کا اظہار کیا کہ بیشتر ترقی پذیر
ممالک میں ماحولیات بچانے روک ٹوک بگاڑ
جاری ہے تو اس صورت حال کا حل کیا ہے؟ سب
سے پہلے اولیت اس امر کو دی جانی چاہیئے کہ درختوں
کا بے تحاشہ کاٹا جانا بند کیا جائے۔ بڑے بڑے
صنعتی ادارے اور ذاتی علاقہ جات کے لوگ جن
اسباب سے جنگلات کو کاٹتے ہیں انھیں دُور کیا
جائے۔ اگر لکڑی کے متبادل تلاش کیے جائیں تو
پیڑوں کا کٹنا بہت حد تک بند ہو سکتا ہے۔ مثال
کے طور پر ذاتی علاقہ جات کے عوام زیادہ تر ایندھن
کے لیے پیڑوں پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ اگر انھیں
تیل، گیس یا کوئلہ ارزاں نرخوں پر دستیاب ہو تو
اس مسئلہ کو حل کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔ اس
طرح مکانات اور فرنیچر وغیرہ کی تعمیر میں کوئی ایسی
ٹیکنالوجی تلاش کی جانی چاہیئے جس سے اُن میں
لکڑی کا استعمال کم از کم ہو جائے یا اُن کا کوئی متبادل
ڈھونڈھ لیا جائے۔

سماجی جنگل بانی اور روزگار

اس مسئلہ کا علاج ہے سماجی جنگل بانی،
یعنی پہاڑوں، دیہات اور نیم شہری علاقوں میں
جہاں پیڑ کاٹے گئے ہیں وہاں نئے پیڑ لگائے
جائیں۔ دراصل یہ پروگرام ہنگامی سطح پر شروع
کیا جانا چاہیئے اور اس میں نہ صرف عوام کی شرکت
لازمی ہے بلکہ انھیں اس پروگرام کی اہمیت سے
روشناس کیا جانا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ دیکھا گیا
ہے کہ برسوں پہلے شروع کیا گیا "بن مہوتسو" اس
لیے کامیاب نہیں ہو سکا کیونکہ اُسے عوامی شرکت
حاصل نہیں۔ اگر سماجی جنگل بانی کے سلسلے میں پیڑ
پودے بڑے پیمانے پر ویران اور بنجر زمینوں،

[illegible] اور نہروں کے کناروں پر لگائے جائیں تو اس
سے نہ صرف اس نقصان کی تلافی بہت حد تک ہو
سکتی ہے جو جنگلوں کے کاٹے جانے سے ہو رہا ہے
بلکہ اُن لوگوں کو بھی روزگار مل سکتا ہے جو جنگلی
علاقوں اور دیہات سے شہروں کا رُخ کرتے ہیں۔
ایک اندازے کے مطابق اس پروگرام سے سالانہ
ہیں ۵۰ کروڑ انسانی دِنوں کا روزگار پیدا ہو سکتا ہے۔
مسئلہ کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے ملک کی
بعض ریاستوں، اترپردیش، گجرات، تامل ناڈو،
مغربی بنگال، بہار، مہاراشٹر اور مدھیہ پردیش
میں بڑے پیمانے پر سماجی جنگل بانی کا پروگرام
شروع کیا گیا ہے جس کے لیے بین الاقوامی اداروں
کی طرف سے ۲/۴ ارب ۵۰ کروڑ روپے دینے
کا یقین دلایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھارت
سرکار بھی ۱۰۱ چیدہ اضلاع میں اس پروگرام
کے لیے سرمایہ فراہم کر رہی ہے۔

درختوں کا انتخاب

اس پروگرام کو زیادہ موثر اور مفید بنانے
کے لیے ایک دیہی مربوط ترقیاتی اسکیم مرتب کی
جانی چاہیئے جو جنگلات کی پیداوار پر مبنی ہونی
چاہیئے۔ سماجی اور حلقہ جاتی جنگل بانی کی اسکیموں
کے تحت موزوں درختوں کا انتخاب کر کے انھیں
مقامی حالات کے مطابق اُگایا جائے۔ یہ دیکھنا
ضروری ہے کہ ان درختوں کے مقامی لوگوں کی مانگ
پوری ہوتی ہے اور وہ تیزی سے اُگ سکتے ہیں۔
دیہاتیوں کو عموماً ایسے پیڑ درکار ہیں جن سے وہ
پھل، تیل، ایندھن اور چارہ حاصل کر سکیں۔ اس سلسلے
میں وہ جو درخت اُگا سکتے ہیں۔ بیل، آم، کٹھل، جامن،
کرم، امرود اور بیر وغیرہ۔ جبکہ وہ تیل حاصل
کرنے کے لیے نیم، کسم، مہوا اور کرنج وغیرہ اُگا
سکتے ہیں۔

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

غیر ملکی سرمایہ کی درآمد ـ برآمد

بھارت کے جواں سال وزیراعظم جناب راجیو گاندھی ملک کی اقتصادی ترقیاتی سرگرمیوں کو تیز تر کرکے بھارت کو عالمی اقتصادی دوڑ میں اگلی صف میں کھڑا کرنا چاہتے ہیں کیا یہ ممکن ہوگا جبکہ بھارت خود ایک ترقی پذیر ملک ہے جہاں اقتصادی وسائل کی بھاری کمی ہے؟ بہت سے بڑے بڑے اقتصادی پراجیکٹوں کو محض ملکی وسائل کے سہارے پورا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی کامیابی دراصل غیر ملکی اعلیٰ ٹیکنالوجی جدید ترین مشینوں اور دیگر خام مال کی متواتر فراہمی پر انحصار رکھتی ہے جو کہ غیر ملکی سرمایہ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ بھارت میں عام طور پر غیر ملکی سرمایہ بین الاقوامی مالی اداروں ــــ بین الاقوامی مالی فنڈ، عالمی بینک، بین الاقوامی ترقیاتی ادارہ اور ایشین بینک سے آتا ہے۔ اس کے علاوہ بھارت کو غیر ملکی سرمایہ اپنے دوست ممالک ـ سوویت یونین، امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جاپان وغیرہ سے دستیاب ہوتا ہے۔

حال ہی میں دلی میں گول میز میٹنگ کا اہتمام یورپی مینجمنٹ فورم کی طرف سے کیا گیا جس میں دنیا کے تاجروں سے اپیل کرتے ہوئے جناب راجیو گاندھی نے کہا کہ بھارت میں غیر ملکی سرمایہ کاری کے لیے بڑی منڈی ہے۔ وہ یہاں چند بعض شعبوں، جیسے بجلی و توانائی، مواصلات اور ٹرانسپورٹ، مٹی کے تیل کو صاف کرنے والے اداروں اور کچھ بنیادی صنعتوں میں غیر ملکی سرمایہ لگا سکتے ہیں۔ اس سے بلاشبہ ملک میں غیر ملکی سرمایہ کی آمد بڑھے گی جس سے معیشت کو قدرتاً حرکت ملے گی۔

بھارت میں غیر ملکی سرمایہ کی درآمد کوئی نئی نہیں ہے۔ ۶ اپریل ۱۹۴۸ کو صنعتی پالیسی کے اعلان ہونے کے ساتھ ہی بھارت میں غیر ملکی سرمایہ کاری کے سلسلے میں غیر یقینی حالت ختم ہو گئی تھی جس سے غیر ملکی سرمایہ کاروں میں بھارت میں سرمایہ لگانے کے لیے اعتماد پیدا ہوا اور اس کے ساتھ ہی مختلف پانچ سالہ منصوبوں میں بھارت کی طرف سے غیر ملکی سرمایہ حاصل کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

پہلے پانچ سالہ منصوبے سے تین پانچ سالہ منصوبوں تک (۱۹۵۱ تا ۱۹۶۹) بھارت میں غیر ملکی سرمایہ کی درآمد میں توقع سے بڑھ کر اضافہ ہوا اس عرصے میں غیر ملکی امداد ۱۹۴ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۲۲۴۲ کروڑ روپے تک پہنچ گئی۔ اس طرح کل منصوبہ جاتی اخراجات میں غیر ملکی امداد کا حصہ ۸،۵ فیصد سے بڑھ کر ۲۰ فیصد تک پہنچ گیا۔

چوتھے، پانچویں اور چھٹے منصوبوں کے عرصے میں بھارت میں غیر ملکی سرمایہ پر سخت پابندیاں عائد کی گئیں کیونکہ بھارتی معیشت پر غیر ملکی قرضوں کا بوجھ بڑھ گیا تھا اور پھر بھارت کے ادائیگیوں کے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے یہ فیصلہ نہایت مناسب تھا۔ چوتھے پانچ سالہ منصوبے میں غیر ملکی امداد کا حصہ ۱۲،۹ فیصد تھا جو چھٹے پانچ سالہ منصوبے میں متواتر کم ہو کر محض ۳،۹ فیصد رہ گیا۔ ساتویں منصوبے میں بھارت کا غیر ملکی امداد پر انحصار بڑھ کر ۱۱ فیصد ہونے کا امکان ہے۔ پلاننگ کمیشن کا یہ فیصلہ بھارت کی ادائیگیوں کے توازن، غیر ملکی سرمایہ کے فنڈوں اور معیشت کی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے اہم ہے۔

بھارت میں غیر ملکی امداد کی کل رقم کا گوشوارہ

سال	قرضہ جات	سود	عطیات	کل امداد
۱۹۸۰ ـ ۸۱	۵۱۶،۶۸	۲۸۶،۶۰	۱۳۵۸	۲۱۶۲
۱۹۸۱ ـ ۸۲	۵۳۸،۰	۳۱۱،۱۱	۱۰۳۹	۱۸۸۸
۱۹۸۲ ـ ۸۳	۸۸۷،۶۱	۳۶۰،۶۴	۱۳۰۳	۲۲۵۰
۱۹۸۳ ـ ۸۴	۶۲۲،۱۱	۴۰۳،۶۳	۱۵۵۱	۲۵۶۹

سال منصوبے کے پچھلے چار برسوں میں قرضہ جات
اُن پر سُود ادا اجداد کی قرضہ جات ۸۰،۸۱۵ کروڑ
روپے سے بڑھ کر ۱۰،۲۲۲ کروڑ روپے، سُود
۲۸۹،۰ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۲۰۰۳،۰۳ کروڑ
روپے اور غیر ملکی عطیات ۱۳۵۰،۰ کروڑ روپے
سے بڑھ کر ۲۵۷۶ کروڑ روپے ہو گئے ہیں۔

عالمی بینک کی رپورٹ کے مطابق تیسری دنیا کے ممالک میں غیر ملکی قرضہ جات کے لحاظ سے بھارت کا مقام چھٹا ہے۔ اِس میں بھارت کے ترقیاتی پروگراموں کی سراہنا کی گئی ہے اور غیر ملکی امداد کے استعمال پر اظہار اطمینان کیا گیا ہے۔

بھارت میں غیر ملکی قرضوں کے بڑھتے بوجھ، ادائیگیوں کے عدم توازن اور اقتصادی استحصال پسندی کی بنیاد پر ملک میں غیر ملکی امداد پر سخت نکتہ چینی کی جا رہی ہے لیکن ہمیں سوچنا ہوگا کہ کیا ایک لنگڑا آدمی بیساکھیوں کی امداد کے بغیر آسانی سے چل سکتا ہے؟ بھارت ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ معیشت کو مضبوط کر کے، اقتصادی ترقی کی شرح تیز کر کے اور اقتصادی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اسے خودکفیل بنانے کے لیے غیر ملکی بیساکھیوں کا سہارا لینا ہوگا لیکن غیر ملکی امداد سے متعلق سمجھوتہ کرتے وقت ملک کے عزت و وقار، آزادی اور دیگر امور کا خیال رکھنا ہوگا۔

اِس کے علاوہ بھارت میں قرضہ جات کے پھندے کو کم کرنے کے لیے برآمدات بڑھانا ہوں گی اور درآمدات میں کمی کرنا ہوگی۔ بڑے بڑے صنعتی ممالک کا مفاد بھی اِسی بات میں ہے کہ بھارت جیسے ترقی پذیر ملک تیزی سے ترقی کریں۔ انھیں غیر ملکی امداد فراہم کی جائے اور ان کی برآمدات کو بڑھا کر اُن کے پیسے کا کارگر استعمال کیا۔ جناب راجیو گاندھی کا بھی یہی اندازِ فکر ہے۔ وہ ایک طرف صنعتی شعبے میں تمام پابندیوں اور کنٹرولوں کو کم کر کے، پیداوار کے شعبے میں غیر ملکی تکنیک اور جدید ترین طریقوں کا استعمال کر کے ملک کو خودکفیل، طاقتور اور خوشحال بنانا چاہتے ہیں وہاں دوسری طرف برآمدی صنعتوں کو بڑھاوا دے کر برآمدات میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کام کے لیے وہ غیر ملکی امداد کو بہت ضروری خیال کرتے ہیں۔ اگر اُن کی یہ مساعی کامیاب ہو گئیں تو بلاشبہ وہ بھارتی معیشت کو نئی سمت دینے میں ایک کامیاب پائلٹ ثابت ہوں گے۔ ●

بقیہ، سماجی جنگل بانی یا جنگل میں منگل

جہاں تک ایندھن اور لکڑی کے حصول کا سوال ہے وہ چکندڑی، سیسو، سیمل، اسن اور ارجن وغیرہ کے پیڑ لگا سکتے ہیں۔ لاکھ اور ریشم کے کویا پالنے کیلئے وہ پلاش، کسم اور شہتوت کے پیڑ لگا سکتے ہیں۔ آدی باسیوں کو لاکھ اور ٹسر کے کیڑے پالنے میں بڑی دلچسپی ہے اور اس سے اُن کی اقتصادی حالت بہتر ہو سکتی ہے۔ کھائیوں کے کنارے اور کھیتوں میں بسائی گھاس اُگائی جا سکتی ہے۔ دو برس کے بعد اسے کاٹا جا سکتا ہے۔ رسّے اور کاغذ بنانے میں اس گھاس کا بڑا استعمال ہوتا ہے۔ دیہاتی عوام اسے بھی آمدنی کا بڑا ذریعہ بنا سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ بانس بھی اُگائے جا سکتے ہیں۔ چار برس کے بعد اُن کے مسلسل کٹائی کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ کاغذ سازی میں تو بانسوں کا بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ کاغذ ملیں تو بانسوں کو بہت بڑے خام مال کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ یوکلپٹس کی بھی کاغذ کے گودے اور ریان کی صنعتوں کے لیے بڑی مانگ ہے۔ کرناٹک کی ملیں تو اسے بھاری قیمت پر خریدنے کے لیے بھی تیار ہیں اور اس کے لیے وہ پیشگی رقم بھی دیدیتی ہیں۔ یوکلپٹس کے ایک ایکڑ سے جب وہ کٹائی کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، ۴۰ ہزار روپے تک کمایا جا سکتا ہے اس کے نتیجے میں گجرات کے بیشتر کسانوں نے خوراکی فصلوں کے بجائے یوکلپٹس اُگانا شروع کر دیا ہے۔

گھریلو صنعتیں

جنگلاتی پیداوار پر مبنی گھریلو صنعتیں بھی شروع کی جا سکتی ہیں جو دیہاتیوں اور آدی باسیوں کے لیے منفعت بخش ثابت ہو سکتی ہیں۔ وہ آرائشی پودے اُگا سکتے ہیں۔ درختوں پر شہد کی مکھیاں پال سکتے ہیں۔ اسکے لیے بکسوں کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ایک بکس میں، ایک کلو شہد جمع کیا جا سکتا ہے اور مانگ اور پیداوار کے مطابق ان بکسوں کی تعداد بڑھائی جا سکتی ہے۔ اسن، ارجن اور شہتوت کے پیڑوں پر ریشم اور ٹسر کے کیڑے پالے جا سکتے ہیں۔ اسکے علاوہ بانسوں اور بید کی پیداوار بھی بڑے پیمانے پر کی جا سکتی ہے جس سے دیہاتی عوام ٹوکریاں، چٹائیاں، سائیکل کیریر اور دیگر اشیا بڑے پیمانے پر تیار کر سکتے ہیں۔ لکڑی سے کھلونے اور پتوں سے بیڑیاں تیار کرنے کے دھندے بھی شروع کئے جا سکتے ہیں۔ آمدنی بڑھانے کا ایک اور ذریعہ ہے طبی جڑی بوٹیوں کی پیداوار۔ ان سے گھریلو کھپت پوری کرنے کے علاوہ انھیں برآمد بھی کیا جا سکتا ہے۔

اگر اس پروگرام کو ملک گیر پیمانے پر باقاعدگی کیساتھ شروع کیا جائے اور دیہاتیوں اور آدی باسیوں کو ذرائع ابلاغ اور دیگر طریقوں سے تربیت دی جائے تو اس سے جہاں جنگلوں کے پیے ہونے والے نقصان کی تلافی بہت حد تک ہو جائے گی اور صحراؤں اور بنجر زمینوں کی توسیع رُک جائے گی وہاں اُن لوگوں میں خوشحالی آئے گی اور ان کا حصولِ روزگار کے لیے شہروں میں جانا خود بخود بند ہو جائے گا اور اس طرح جنگل میں منگل ہو جائے گا۔ ●

آندھرا پردیش میں منڈل سسٹم کا قیام

آندھرا پردیش کی حکومت نے نظم ونسق کو غیر مرکوز کرنے اور عوام کو سہولت پہنچانے کے لیے تعلقہ کے بجائے "منڈل" کے قیام کا غیر معمولی اور انقلابی اقدام کیا ہے جہد یوں پرانے موروثی دیہی نظام کو برخاست کرکے اس کی جگہ منڈل نظام قائم کیا گیا ہے۔ پہلے ہمارا پنچایت نظام تین درجوں، ضلع پریشد، پنچایت سمیتی اور گرام پنچایت پر مشتمل تھا اب نئے مروجہ نظام میں ضلع اور منڈل دو مرحلے ہی رہیں گے۔

آندھرا پردیش نے ریاست میں مالگزاری ڈھانچے کی تنظیم جدید کی جانب اہم قدم اٹھاتے ہوئے ۳۵ تا ۵۰ ہزار آبادی کے لیے ایک منڈل قائم کیا ہے۔ اس طرح ۳۰۵ تعلقہ جات کی جگہ کل (۱۱۰۴) ریونیو منڈل قائم کئے گئے ہیں، اور ان منڈلوں نے ۲۵ مئی ۱۹۸۵ء سے کام کرنا بھی شروع کر دیا ہے۔ ریونیو منڈل کا تجربہ سارے ملک میں پہلی بار آندھرا پردیش میں کیا جا رہا ہے تاکہ نظم ونسق کو عوام سے قریب کیا جائے اور انتظامی اصلاحات کو روبہ عمل لایا جائے۔ چنانچہ دیگر ریاستیں بھی اس انقلابی اقدام کے کامیاب نتائج کی منتظر ہیں۔

منڈل دو قسم کے ہیں، ایک گریڈ ۱ اور دوسرا گریڈ ۲، ریونیو منڈل کا نگراں ایک منڈل افسر ہوگا جس کا درجہ تحصیل دار یا ڈپٹی تحصیل دار کا ہوگا۔ مگر سب منڈل افسروں کو تحصیل دار کے اختیارات کے علاوہ اگزیکٹو مجسٹریٹس کے اختیارات بھی دئے گئے ہیں۔ عام طور پر تعلقہ ہیڈ کوارٹر ہی منڈل ہیڈ کوارٹر ہوگا۔ منڈل ہیڈ کوارٹر پر نئی عمارت کی تعمیر یا کرایہ پر خانگی عمارات کے حصول کے لیے فی الحال ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے کی منظوری دی گئی ہے اور مرحلہ وار پروگرام کے تحت دو یا تین سال میں ہر منڈل میں سرکاری بلڈنگس تیار ہو جائیں گی۔ پہلے ۵۰ تا ۶۰ دیہات پر ایک تعلقہ ہوتا تھا مگر اب ایک منڈل میں دس تا پندرہ[۱۵] دیہات ہوں گے۔ جس کے باعث دیہی عوام سے نظم ونسق قریب رہیگا، اور حکومت بھی ترقیاتی امور پر زیادہ سے زیادہ توجہ کر سکے گی۔

ان منڈلوں کے ذریعے حکومت یہ کوشش کر رہی ہے کہ ہر منڈل ہیڈ کوارٹر میں پولیس اسٹیشن مارکٹ سنٹر، اگرو سروس سنٹر اور صحت و طبابت نیز تعلیمی سہولتیں مرحلہ وار بنیادوں اور ترجیحی اساس پر فراہم کی جائیں۔

فی الحال منڈلوں کے نگراں تحصیل دار ہیں۔ منڈلوں کے انتخابات کے بعد ان عہدے داروں کی جگہ منتخب نمائندے لے لیں گے۔ منڈلوں کے انتظامی مصارف کے لیے ابتداً ۲۰۵ کروڑ روپے مختص کئے گئے ہیں۔ حکومت نے ان منڈلوں کے قیام کے لیے آندھرا پردیش ڈسٹرکٹ (فارمیشن) ایکٹ ۱۹۷۴ء میں ترمیم کی ہے۔ اور کابینہ کی ایک سب کمیٹی اس موضوع پر سفارشات پیش کرنے کی غرض سے قائم کی گئی تھی۔ ریونیو منڈل کے علاوہ پنچایت منڈل بھی ریاست میں قائم کئے جائیں گے۔ پنچایت منڈل اور ریونیو منڈل ایک دوسرے کے ممد و معاون ہوں گے۔

(باقی صفحہ پر)

ڈاکٹر کے بھکتہ وتسل راؤ

بھارت ترقی کی راہ پر

آزادی کے بعد از سرِ نو ترقیاتی
کاموں کو پایۂ تکمیل تک لانا ایک اہم مسئلہ تھا۔
کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں۔ لوگ پوری طرح
سے آزادی کا مفہوم سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ گو حکومت
کی باگ ڈور ہمارے نیتاؤں کے ہاتھ میں تھی۔
لیکن وہ معاشی مسائل سے دوچار تھے۔ سردار
ولبھ بھائی پٹیل کا خصوصی کارنامہ ریاستوں کا
انضمام تھا۔ جاگیردارانہ رویّہ میں تبدیلی لانا تھا۔
ہندوستان کا نیا نقشہ پیش کیا گیا۔ ہمارا خاص
پیشہ زراعت رہا ہے۔ دیش کے لیے غذا مہیا
کرنے کے لیے اناج درآمد کرنا پڑتا تھا۔ سوچ وچار کے
بعد، بیرونی ممالک کا جائزہ لینے کے بعد حکومت
ہند نے پنڈت نہرو کی سرکردگی میں پانچ سالہ
منصوبے بنائے۔ پنڈت نہرو وزیرِ اعظم کی حیثیت سے،
سیاسی مدبر کی حیثیت سے، محبِ وطن کی حیثیت
سے، معمار کی حیثیت سے ساری دنیا پر مقبولیت
حاصل کر چکے تھے۔ عالمی مسائل کا حل بھی انھوں نے
ڈھونڈھ نکالا تھا۔ ہندوستان میں بھاکرہ ننگل،
دامودر ویلی، ناگ ارجن ساگر کے پراجیکٹ تیار
کیے گئے، عمل آوری ہوئی، وہ کہتے تھے کہ یہ پراجیکٹ
دورِ حاضرہ کے مندر ہیں جس سے لوگ خوشحال

ہو سکیں گے۔ سائنسی پالیسی کو پارلیمان میں
اپنایا گیا۔ عشری نظام کو معاشی معاملوں میں
اپنانے سے زندگی کی ایک نئی لہر آ گئی۔ یہ نظام بچوں
کے لیے، بڑوں کے لیے، بوڑھوں کے لیے سہل
ثابت ہوا ہے۔ سماج سدھار کے لیے کئی
منشور نکالے گئے۔ عام انتخابات ۱۹۵۱ء سے
شروع کیے گئے۔ ہر پانچ سال بعد عام انتخابات
کیے جا رہے ہیں۔ ہر شہری کو ذاتی، مذہبی، سیاسی،
سماجی آزادی ہے۔ وہ ہندوستان کے آئین کے مطابق
کسی کونے میں بھی تجارت کر سکتا ہے۔ سکونت
اختیار کر سکتا ہے۔ جائداد بیچ سکتا ہے۔ خرید
سکتا ہے۔ حکومت نے غیر جانبدارانہ رویّہ اختیار
کیا ہے۔ غیر مذہبی نظامِ حکومت کا مطلب
لامذہبیت نہیں بلکہ مذاہب کے ماننے والوں
کو خوشحال رہنے کے لیے مواقع، سہولتیں فراہم
کرنا اور ہم آہنگی، میل ملاپ کی اشاعت
کا انتظام کرنا۔
معاشی امور پر تحقیق کے لیے اولاً بیس
ادارے قومی سطح پر کئی مقامات پر کھولے گئے۔ تکنیکی
تعلیم کے لیے ٹکنالوجی کے انسٹی ٹیوٹ، مدراس،
بمبئی، کانپور، دہلی، کھڑک پور میں کھولے گئے۔ آج
تیس سال ہو گئے ہیں، ان اداروں سے کامیاب ہو کر نکلنے
والے امیدواروں نے اپنی لیاقت اور مہارت کا سکہ ہر جگہ
بٹھایا ہے۔ یہ افراد سول، ملٹری اور ریلوے میں غرضیکہ
ہر جگہ اپنی خدمات سے فیض پہنچا رہے ہیں۔ بیرونی ممالک
میں انکی قدر ہے۔ تعلیم کے احاطہ کے لیے تین چار کمیشن
قائم کیے گئے۔ رادھا کرشنن کمیشن، مدلیار کمیشن،
کوٹھاری کمیشن کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کی
کوشش صد قدرلی کیسا تھ کی گئی ہے۔ استاد کی عزت میں
بھی معاشی اعتبار سے اضافہ ہو چلا ہے۔ ان
اڑتیس سالوں میں یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کا انعقاد
ہوا۔ کئی جامعات کو گرانٹس دیئے جا رہے ہیں۔
یومِ آزادی پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کے وقت صرف
اڑتالیس جامعات تھے۔ آج ایک سو اڑتالیس
جامعات ہیں۔ اقامتی جامعات ہیں ملحقہ جامعات
کی کمی نہیں۔ اعلیٰ تعلیم کا معیار بھی بڑھا ہے۔ ہر طرف کامیابی
کی جھلک ملتی ہے۔ حکومتِ ہند کی طرف سے نو جامعات
چلائے جا رہے ہیں مثلاً علی گڑھ یونی ورسٹی،
بنارس ہندو یونی ورسٹی، یونی ورسٹی آف
حیدر آباد۔ اس کے علاوہ یو۔ جی سی کی طرف سے
چند ادارے جامعہ کے مماثل سمجھے گئے ہیں،
مثلاً ستیہ سائی انسٹی ٹیوٹ پٹہ پرتی، سنٹرل

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

یونس صدیقی

ساتویں منصوبے کی خصوصیات

نیشنل ڈیولپمنٹ کونسل

ساتویں منصوبے کی منظوری دے چکی ہے۔ اس میں ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے پلان کے مجموعی مصارف ۸۰۴۴۲ کروڑ روپے ہوں گے۔ ان میں سے ۸۰۶۹۸ کروڑ روپے ریاستوں کو اور ۳۷۶۸ کروڑ روپے مرکز کے زیر انتظام علاقوں کو دئے جائیں گے۔ خصوصی علاقوں کی ترقی کے خصوصی پروگراموں کے لیے مرکز کی طرف سے ۲۵۵۹ کروڑ روپے کی رقم فراہم کی جائے گی۔ ان خصوصی علاقوں میں پہاڑی علاقے، سرحدی علاقے، مغربی گھاٹ، شمال مشرقی کونسل کے علاقے اور کچھ دیگر علاقے شامل ہیں۔

ریاستوں کے پلان مصارف اس طرح ہیں:۔

۱۔	آندھرا پردیش	۵۲۰۰	کروڑ روپے
۲۔	آسام	۲۱۰۰	〃 〃
۳۔	بہار	۵۱۰۰	〃 〃
۴۔	گجرات	۶۰۰۰	〃 〃
۵۔	ہریانہ	۲۹۰۰	〃 〃
۶۔	ہماچل پردیش	۱۰۵۰	〃 〃
۷۔	جموں کشمیر	۱۴۰۰	کروڑ روپے
۸۔	کرناٹک	۳۵۰۰	〃 〃
۹۔	کیرالہ	۲۱۰۰	〃 〃
۱۰۔	مدھیہ پردیش	۷۰۰۰	〃 〃
۱۱۔	مہاراشٹر	۱۰۵۰۰	〃 〃
۱۲۔	منی پور	۴۳۰	〃 〃
۱۳۔	میگھالیہ	۴۴۰	〃 〃
۱۴	ناگالینڈ	۴۰۰	〃 〃
۱۵۔	اڑیسہ	۲۷۰۰	〃 〃
۱۶۔	پنجاب	۳۲۸۵	〃 〃
۱۷۔	راجستھان	۳۰۰۰	〃 〃
۱۸۔	سکم	۲۳۰	〃 〃
۱۹۔	تری پورہ	۴۴۰	〃 〃
	تمل ناڈو	۵۷۵۰	〃 〃
۲۱۔	اترپردیش	۱۰۴۴۷	〃 〃
۲۲۔	مغربی بنگال	۴۱۲۷	〃 〃

مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے پلان مصارف:۔

۱۔	انڈمان و نکوبار	۲۸۵	کروڑ روپے
۲۔	اروناچل پردیش	۴۰۰	〃 〃
۳۔	چنڈی گڑھ	۲۰۳	〃 〃

۴۔	دادرا نگر حویلی	۱۷٫۲۴	کروڑ روپے
۵۔	دلی	۲۰۰۰	〃 〃
۶۔	گوا، دمن، دیو	۳۶۰	〃 〃
۷۔	لکش دیپ	۴۳٫۸۳	〃 〃
۸۔	مزورم	۲۶۰	〃 〃
۹۔	پانڈی چری	۱۷۰	〃 〃

مالی وسائل

ساتویں منصوبے کی مجموعی مدت میں ۱۴۸۴۳ کروڑ روپے کے وسائل فراہم کئے جاتے ہیں۔ اس میں پبلک سیکٹر کے ۳۲۲۳۶۶ کروڑ روپے کے سرمایہ کاری اخراجات اور ۲۵۷۸۲ کروڑ روپے کے رواں ترقیاتی اخراجات شامل ہیں۔ سرمایہ کاری اخراجات کو ۳۰۲۳۶۶ کروڑ روپے کی گھریلو بچتوں سے اور ۲۰ ہزار کروڑ روپے کے غیر ملکی سرمائے سے پورا کیا جائے گا۔

گھریلو بچتوں میں سرکاری سطح پر بچت سے پبلک سیکٹر کے غیر مالیاتی اداروں کو بچتوں سے اور پبلک سیکٹر کے مالیاتی اداروں کی

بچتوں سے ۲۲۲، ۵ کروڑ روپے کی رقم مل سکے گی۔ باقی ۴۴۹۴۴۲ کروڑ روپے پرائیویٹ بچتوں سے بشمول کارپوریٹ، کوآپریٹو اور گھریلو بچتوں سے حاصل ہونے کا نشانہ رکھا گیا ہے۔ منصوبے کی مدت میں کُل بچتوں کا ۱۹ فیصد سرکاری بچتوں سے حاصل ہوگا۔ باقی ۸۱ فیصد بچتیں پرائیویٹ سیکٹر سے حاصل ہوں گی۔ پرائیویٹ سیکٹر میں بچتوں کا وہ حصہ جو گھریلو بچتوں سے ملے گا، اس سیکٹر کی کُل بچتوں کا ۶۱،۵ فیصد ہوگا۔

ساتویں منصوبے میں ۳۴۸۱۴۸ کروڑ روپے کے مجموعی مصارف میں سے ۱۸۰،۰۰۰ کروڑ روپے پبلک سیکٹر میں اور ۱۶۸۱۴۸ کروڑ روپے پرائیویٹ سیکٹر میں صرف ہوں گے۔ پبلک سیکٹر کے اخراجات میں ۱۵۴۲۱۸ کروڑ روپے کے سرمایہ کاری اخراجات اور ۲۵،۸۲ کروڑ روپے، حالیہ ترقیاتی اخراجات کے لیے رکھے گئے ہیں۔

منصوبے میں پبلک سیکٹر کی اپنی بچتوں سے سرمایہ کاری کے لیے ۴۹۱۵۶ کروڑ روپے دستیاب ہوں گے۔ ساتویں منصوبے میں پبلک سیکٹر کو ۱۵۴۲۱۸ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کے لیے دیگر معاشی سیکٹروں سے ۸۰،۶۲ کروڑ روپے بچانے ہونگے۔ اس کے ساتھ ہی ۱۸ ہزار کروڑ روپے غیر ملکی بچتوں سے حاصل کرنے ہوں گے۔

کُل سرمایہ کاری میں پبلک سیکٹر کی سرمایہ کاری کا حصہ ساتویں منصوبے میں ۴۸ فیصد رہے گا جبکہ چھٹے منصوبے میں یہ ۵۳ فیصد تھا۔

فاضل وسائل

مرکز اور ریاستیں مل کر ساتویں منصوبے میں ۴۴،۲۰۲ کروڑ روپے کی فاضل رقوم مہیا کرائیں گی۔ مرکز ۲۲۴۹۰ کروڑ روپے اور ریاستیں ۲۲۲۱۲ کروڑ روپے فاضل وسائل کے طور پر اکٹھا کریں گی۔ ہر سال اقتصادی صورتِ حال کا اندازہ لگاکر فاضل وسائل اکٹھا کرنے کی کوششیں کی جائیں گی۔

مرکز اپنے پلان وسائل سے ۲۹،۳۷ کروڑ روپے ریاستوں کو منتقل کریگا۔ مرکز کے پلان وسائل میں ۱۲۹۰۳۹ کروڑ روپے کا اندازہ لگایا گیا ہے۔

مختلف وسائل سے اکٹھی کی گئی رقوم ۱۶۶،۰۰۰ کروڑ روپے کے بقدر ہوگی جب کہ پبلک سیکٹر کے مجموعی اخراجات ۱۸۰،۰۰۰ کروڑ روپے ہوں گے۔ اس طرح ۱۴۰۰۰ کروڑ روپے کی کمی پڑے گی جسے خسارہ مالیات کے ذریعے پورا کرلیا جائے گا۔ خسارہ مالیات کی یہ سطح ملک کی اقتصادی حالت اور اشیاء کی قیمتوں کی صورتِ حال کے پیشِ نظر محفوظ حدود میں کہی جاسکتی ہے۔

روزگار

ساتویں منصوبے میں روزگار میں بحساب فی کس فی سال ۴ کروڑ افراد کو معیاری روزگار مل سکے گا جبکہ اس عرصے میں محنت کش طبقے میں ۳ کروڑ ۹۰ لاکھ افراد کا اضافہ متوقع ہے۔ روزگار میں ۴ فیصد فی سال کا اضافہ متوقع ہے جبکہ محنت کش افراد میں یہ اضافہ ۲،۶ فیصد ہونے کی توقع ہے۔ ساتویں منصوبے کے آغاز پر بے روزگار افراد کی پہلے سے چلی آرہی تعداد ۹۲ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔

منصوبے کا بڑا مقصد روزگار کے مواقع میں تیزی سے اضافہ لانا ہے۔ اور یہ اضافہ محنت کش افراد کی تعداد میں اضافہ کے مقابلے زیادہ ہونا چاہیئے لہٰذا زراعت، دیہی ترقی، دیہی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں، تعمیراتی سرگرمیوں، پبلک ایڈمنسٹریشن اور دیگر سروسز میں روزگار دلانے والی سرگرمیوں کی توسیع و ترقی پر زور دیا جائے گا۔ زراعتی سیکٹر میں روزگار کے امکانات کی سالانہ شرح ترقی ۳،۵ فیصد ہوگی۔ جب کہ غیر زرعی سیکٹر کی روزگار کی سرگرمیوں میں ۴،۵ فیصد سالانہ کے حساب سے اضافہ ہوگا۔ دیہی علاقوں میں مکمل روزگار کے لیے اس منصوبے میں خصوصی زور ہے۔

غریبی دُور کرنے پر زور

نیشنل سیمپل سروے کی روشنی میں ۷۸-۱۹۷۷ اور ۸۳-۱۹۸۲ کے درمیان ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ افراد غریبی کی سطح سے اُوپر آسکے۔ غریبی کے خط سے نیچے زندگی گزارنے والوں کی تعداد کا کُل آبادی کے ساتھ تناسب ۸۵-۱۹۸۴ میں ۹،۳۶ فیصد تھا جو گھٹ کر ۹۰-۱۹۸۹ تک ۸،۲۵ رہ جانے کی توقع ہے۔ دوسرے لفظوں میں غریبوں کی تعداد ۸۵-۱۹۸۴ میں ۲۷ کروڑ ۲۷ لاکھ ہے جو گھٹ کر ۹۰-۱۹۸۹ میں ۲۱ کروڑ ۱۰ لاکھ رہ جائے گی۔ اس خوشحالی میں زیادہ فائدے دیہات کے غریب عوام اٹھائیں گے۔ اس سلسلے میں دیہات میں روزگار کا قومی پروگرام، دیہات کے بے زمین افراد کے لیے روزگار کی ضمانت کا پروگرام کو جو کہ چھٹے منصوبے میں شروع ہو چکے ہیں، تیزی سے آگے بڑھائے جائیں گے۔ ان پروگراموں کی توسیع سے بحساب فی کس فی دن ساتویں منصوبے میں مزید ۲۴۵۸ ملین افراد کو روزگار ملے

سکے گا۔ غریبی دور کرنے کے پروگرام شہروں میں شروع کئے جائیں گے اور گندی بستیوں کی صفائی پر زیادہ زور دیا جائے گا۔

شرح ترقی

ساتویں منصوبے میں مجموعی گھریلو پیداوار میں ۵ فیصد سالانہ کے اضافے کا نشانہ رکھا گیا ہے اور بعد کے پنجسالہ منصوبے میں بھی اس شرح ترقی کو برقرار رکھنے کے لیے کہا گیا ہے۔ ساتویں منصوبے میں خوراک، کام اور پیداواری صلاحیت بڑھانے پر زور ہے۔ اس پلان میں خوراکی اجناس کی پیداوار تیزی سے بڑھائی جائے گی۔ اس پلان میں علاقائی عدم توازن کو دور کرنے پر زور دیا جائے گا۔ ماحول کے تحفظ کو بھی اہمیت دی گئی ہے اور اسے ساتویں منصوبے ترقیاتی حکمت عملی کا جزو سمجھا گیا ہے۔

ساتویں منصوبے میں طویل المدتی ضروریات کو سامنے رکھا گیا ہے اور ۱۹۸۵ سے ۲۰۰۰ء تک کی ضروریات پر نظر رکھی گئی ہے۔ اس عرصے میں معیشت کو خود کفیل بنانے کے لیے کوششیں کی جائیں گی۔ صنعتی سیکٹر میں بین الاقوامی مقابلے پر آنے کے لیے کوششیں ہوں گی۔ ہندوستان کو جدید لائنوں پر لانے، تکنیکی اعتبار سے خودکفیل بنانے اور معیشت کو وسعت بخشنے کے لیے بھرپور کوششیں کی جائیں گی۔ اس عرصے میں مطلوبہ مقاصد کی تکمیل کے لیے عمل درآمد کے پہلو کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔ اس عرصے میں بحساب فی کس خوراک اور پارچات کی کھپت میں بہتری لائی جا سکے گی۔ اس عرصے میں عمل درآمد کی رفتار ترقی کا وقتاً فوقتاً جائزہ لیا جاتا رہے گا۔ منصوبہ بندی کے عمل میں لامرکزیت لاکر اور عوام کا بھرپور تعاون حاصل کر کے ملک کی ترقی کے عمل کو آگے بڑھایا جائے گا اور اس سلسلے میں منصوبہ بندی کمیشن کے ورکنگ گروپ نے ضلع کی سطح پر منصوبہ بندی کی جو ضرورت و اہمیت واضح کی ہے، اس کو سامنے رکھا جائے گا۔ ●

بقیہ، اداریہ

وزیر اعظم نے اس میٹنگ میں یہ واضح طور پر کہا کہ ملک کی ترقی میں پبلک سیکٹر کی اہمیت بدستور قائم رہے گی اور ملک کی ترقی کے لیے وہی پالیسیاں چلتی رہیں گی جو پنڈت جواہر لال نہرو اور شریمتی اندرا گاندھی نے بنائی تھیں۔

ساتویں منصوبے کے دوران دیہی عوام کے ذریعے پیداواری ڈھانچے کو مضبوط کرنا خاص طور پر ضروری ہے۔ ملک کی ترقی کو ناپنے کے لیے محض شرح ترقی کو دیکھنا ہی کافی نہیں ہوگا بلکہ ملک میں پیداواری ڈھانچے کو مضبوط کرنا، عوام کے لیے روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع نکالنا، اور عوام کا معیاری زندگی بلند کرنا بھی ضروری ہوگا۔ (ایڈیٹر)

بقیہ، اعلیٰ تعلیم کے جمہوری انداز

اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی

طریقہ تعلیم

اس یونیورسٹی میں باقاعدگی سے کلاسیں نہیں ہوا کریں گی اور اس میں استاد اور شاگردوں کا براہ راست رابطہ کم ہی ہوگا۔ تعلیم کیلئے مراسلاتی نصابات، سماعی و بصری آلات اور ذرائع ابلاغ سے کام لیا جائے گا۔ ریڈیو، آڈیو کیسٹ، ٹیلی ویژن ویڈیو، ویڈیو ڈسک، کمپیوٹر اور کتابوں، رسائل وغیرہ پر زیادہ انحصار کرنا پڑے گا۔ اس دوری کے احساس کو مٹانے کے لیے موجودہ کالجوں میں اسٹڈی سنٹر قائم کر دیئے جائیں گے۔ چھٹی کے دن یا روزمرہ کے معمولات سے بچے ہوئے وقت میں ان مرکزوں پر رابطہ پروگرام وضع کیے جائیں گے۔ اور تعلیم پانے والوں سے ربط و ضبط قائم کیا جائیگا۔ اسٹڈی سنٹروں کے کام میں تال میل لانے کے لیے ریجنل سنٹر رکھے جائیں گے۔

تنظیم

دیگر سنٹرل یونیورسٹیوں کی طرح سے صدر جمہوریہ ہند اس یونیورسٹی کے وزیٹر ہوں گے۔ اس کے لیے وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر، ڈائرکٹرز، رجسٹرارز، فائننس آفیسر اور کچھ دیگر عہدیداران ہوں گے۔ چانسلر اور چیف ریکٹر کا عہدہ نہیں ہوگا۔ اسکولوں کی سربراہی ڈین نہیں کریں گے بلکہ وہ ڈائرکٹر کہلائیں گے ان کو انتظامی اور تعلیمی ہر دو طرح کی ذمہ داریاں نبھانی ہوں گی۔ بالعموم یونیورسٹیوں میں ایک ہی رجسٹرار ہوتا ہے لیکن یہاں کئی رجسٹرار ہوں گے۔ یونیورسٹی کے لیے بورڈ آف مینجمنٹ ہوگا۔ اکیڈمک کونسل، پلاننگ بورڈ، بورڈ آف ری کوگنیشن، اسکول آف اسٹڈیز اور فائننس کمیٹی اس کے دیگر انتظامی ادارے ہوں گے۔ یونیورسٹی میں کورٹ (سینیٹ) کی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔ دولت کی تقسیم کی نابرابری یا مواقع کی عدم برابری نے تعلیمی نظام میں جو اونچ نیچ پیدا کردی ہے، اس کے ذریعے اسے دور کرنے کی کوشش کی جائے گی بہت سا سماجی تناؤ اسی کے دم سے ہے۔ اس کے طریق تعلیم سے محض اوپن یونیورسٹی کے مندرج طلبا ہی فائدہ نہیں اٹھائیں گے بلکہ وہ بھی فائدہ اٹھا سکیں گے جن کا اس یونیورسٹی میں اندراج نہیں ہے اور وہ بھی اس کے تعلیمی مواد کا استفادہ کر سکیں گے۔ ●

ڈاکٹر کے. بھکتہ وتسل راؤ

بھارت ترقی کی راہ پر

آزادی کے بعد ازسرِ نو ترقیاتی کاموں کو پایۂ تکمیل تک لانا ایک اہم مسئلہ تھا۔ کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں۔ لوگ پوری طرح سے آزادی کا مفہوم سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ گو حکومت کی باگ ڈور ہمارے نیتاؤں کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن وہ معاشی مسائل سے دوچار تھے۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل کا خصوصی کارنامہ ریاستوں کا انضمام تھا۔ جاگیردارانہ رویہ میں تبدیلی لانا تھا۔ ہندوستان کا نیا نقشہ پیش کیا گیا۔ ہمارا خاص پیشہ زراعت رہا ہے۔ دیش کے لیے غذا مہیا کرنے کے لیے اناج درآمد کرنا پڑتا تھا۔ سوچ وچار کے بعد، بیرونی ممالک کا جائزہ لینے کے بعد حکومت ہند نے پنڈت نہرو کی سرکردگی میں پانچ سالہ منصوبے بنائے۔ پنڈت نہرو وزیر اعظم کی حیثیت سے، سیاسی مدبر کی حیثیت سے، محبِ وطن کی حیثیت سے، معمار کی حیثیت سے ساری دنیا پر مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ عالمی مسائل کا حل بھی انھوں نے ڈھونڈھ نکالا تھا۔ ہندوستان میں بھاکرہ ننگل، دامودر ویلی، ناگ ارجن ساگر کے پراجیکٹ تیار کیے گئے، عمل آوری ہوئی، وہ کہتے تھے کہ یہ پراجیکٹ دورِ حاضرہ کے منادر ہیں جس سے لوگ خوشحال ہو سکیں گے۔ سائنسی پالیسی کو پارلیمان میں اپنایا گیا۔ جمہوری نظام کو معاشی معاملوں میں اپنانے سے زندگی کی ایک نئی لہر آگئی۔ یہ نظام بچوں کے لیے، بڑوں کے لیے، بوڑھوں کے لیے سہل ثابت ہوا ہے۔ سماج سدھار کے لیے کئی منشور نکالے گئے۔ عام انتخابات ۱۹۵۱ء سے شروع کیے گئے۔ ہر پانچ سال بعد عام انتخابات کیے جا رہے ہیں۔ ہر شہری کو ذاتی، مذہبی، سیاسی، سماجی آزادی ہے۔ وہ ہندوستان کے آئین کے مطابق کسی کونے میں بھی تجارت کر سکتا ہے، سکونت اختیار کر سکتا ہے۔ جائداد بیچ سکتا ہے۔ خرید سکتا ہے۔ حکومت نے غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ غیر مذہبی نظامِ حکومت کا مطلب لامذہبیت نہیں بلکہ مذاہب کے ماننے والوں کو خوشحال رہنے کے لیے مواقع، سہولتیں فراہم کرنا اور ہم آہنگی، میل ملاپ کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

معاشی امور پر تحقیق کے لیے اولاً بیس۲۰ ادارے قومی سطح پر کئی مقامات پر کھولے گئے۔ تکنیکی تعلیم کے لیے ممکنا ذوجی کے انسٹی ٹیوٹ، مدراس، بمبئی، کانپور، دہلی، کھڑگ پور میں کھولے گئے، آج تیس۳۰ سال ہو گئے ہیں، ان اداروں سے کامیاب ہو کر نکلنے والے امیدواروں نے اپنی لیاقت اور مہارت کا سکہ ہر جگہ بٹھایا ہے۔ یہ افراد سول، ملٹری اور ریلوے میں غرضکہ ہر جگہ اپنی خدمات سے فیض پہنچا رہے ہیں۔ بیرونی ممالک میں انکی قدر ہے۔ تعلیم کے احاطے کے لیے تین چار کمیشن قائم کیے گئے۔ رادھا کرشنن کمیشن، مدلیار کمیشن، کوٹھاری کمیشن کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش صدقدلی کیساتھ کی گئی ہے۔ استاد کی عزت میں بھی معاشی اعتبار سے اضافہ ہو چلا ہے۔ ان اڑتیس سالوں میں یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کا انعقاد ہوا۔ کئی جامعات کو گرانٹس دیئے جا رہے ہیں۔ یوم آزادی پندرہ اگست ۱۹۴۷ کے وقت صرف اڑتالیس جامعات تھے۔ آج ایک سو اڑتالیس جامعات ہیں۔ اقامتی جامعات ہیں ملحقہ جامعات کی کمی نہیں۔ اعلیٰ تعلیم کا معیار بھی بڑھا ہے۔ ہر طرف کامیابی کی جھلک ملتی ہے۔ حکومتِ ہند کی طرف سے نو جامعات چلائے جا رہے ہیں مثلاً علی گڑھ یونی ورسٹی، بنارس ہندو یونی ورسٹی، یونی ورسٹی آف حیدر آباد۔ اس کے علاوہ یو۔ جی سی کی طرف سے چند ادارے جامعہ کے مماثل سمجھے گئے ہیں۔ مثلاً ستیہ سائی انسٹی ٹیوٹ پٹہ پرتی، سنٹرل

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

یونس صدیقی

ساتویں منصوبے کی خصوصیات

نیشنل ڈویلپمنٹ کونسل

ساتویں منصوبے کی منظوری دے چکی ہے۔ اس میں ریاستوں اور مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں کے پلان کے مجموعی مصارف ۴۴۶۶ ۸ کروڑ روپے ہوں گے۔ ان میں سے ۸۰۶۹۸ کروڑ روپے ریاستوں کو اور ۳٫۶۸ کروڑ روپے مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں کو دیئے جائیں گے۔ خصوصی علاقوں کی ترقی کے خصوصی پروگراموں کے لیے مرکز کی طرف سے ۲۵۵۹ کروڑ روپے کی رقم فراہم کی جائے گی۔ ان خصوصی علاقوں میں پہاڑی علاقے، سرحدی علاقے، مغربی گھاٹ، شمال مشرقی کونسل کے علاقے اور کچھ دیگر علاقے شامل ہیں۔

ریاستوں کے پلان مصارف اس طرح ہیں:۔

۱۔	آندھرا پردیش	۵۲۰۰ کروڑ روپے
۲۔	آسام	۲۱۰۰ 〃 〃
۳۔	بہار	۵۱۰۰ 〃 〃
۴۔	گجرات	۶۰۰۰ 〃 〃
۵۔	ہریانہ	۲۹۰۰ 〃 〃
۶۔	ہماچل پردیش	۱۰۵۰ 〃 〃
۷۔	جموں و کشمیر	۱۴۰۰ کروڑ روپے
۸۔	کرناٹک	۳۵۰۰ 〃 〃
۹۔	کیرالہ	۲۱۰۰ 〃 〃
۱۰۔	مدھیہ پردیش	۷۰۰۰ 〃 〃
۱۱۔	مہاراشٹر	۱۰۵۰۰ 〃 〃
۱۲۔	منی پور	۴۳۰ 〃 〃
۱۳۔	میگھالیہ	۴۴۰ 〃 〃
۱۴	ناگالینڈ	۴۰۰ 〃 〃
۱۵۔	اڑیسہ	۲۷۰۰ 〃 〃
۱۶۔	پنجاب	۳۲۸۵ 〃 〃
۱۷۔	راجستھان	۳۰۰۰ 〃 〃
۱۸۔	سکم	۲۳۰ 〃 〃
۱۹۔	تریپورہ	۴۴۰ 〃 〃
	تمل ناڈو	۵۷۵۰ 〃 〃
۲۱۔	اترپردیش	۱۰۴۴۷ 〃 〃
۲۲۔	مغربی بنگال	۴۱۲۷ 〃 〃

مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں کے پلان مصارف:۔

۱۔	انڈمان و نکوبار	۲۸۵ کروڑ روپے
۲۔	اروناچل پردیش	۴۰۰ 〃 〃
۳۔	چنڈی گڑھ	۲۰۳ 〃 〃
۴۔	دادرا، نگر حویلی	۱۷٫۴۶ کروڑ روپے
۵۔	دلی	۲۰۰۰ 〃 〃
۶۔	گوا، دمن، دیو	۳۶۰ 〃 〃
۷۔	لکش دیپ	۴۳٫۸۳ 〃 〃
۸۔	میزورم	۲۶۰ 〃 〃
۹۔	پانڈی چری	۱۷۰ 〃 〃

مالی وسائل

ساتویں منصوبے کی مجموعی مدت میں ۱۴۰۸۴۳ کروڑ روپے کے وسائل فراہم کیے جانے ہیں۔ اس میں پبلک سیکٹر کے ۳۲۲۳۶۶ کروڑ روپے کے سرمایہ کاری اخراجات اور ۲۵۰۸۲ کروڑ روپے کے رواں ترقیاتی اخراجات شامل ہیں۔ سرمایہ کاری اخراجات کو ۳۰۲۳۶۶ کروڑ روپے کی گھریلو بچتوں سے اور ۲۰ ہزار کروڑ روپے کے غیر ملکی سرمائے سے پورا کیا جائے گا۔

گھریلو بچتوں میں سرکاری سطح پر بہت سے پبلک سیکٹر کے غیر مالیاتی اداروں کو بچتوں سے اور پبلک سیکٹر کے مالیاتی اداروں کی

بچتوں سے ۲۲۲،۵ کروڑ روپے کی رقم مل سکے گی۔ باقی ۴۴۹۴۴۲ کروڑ روپے پرائیویٹ بچتوں سے بشمول کارپوریٹ، کوآپریٹو اور گھریلو بچتوں سے حاصل ہونے کا نشانہ رکھا گیا ہے۔ منصوبے کی مدت میں کل بچتوں کا ۱۹ فیصد سرکاری بچتوں سے حاصل ہوگا۔ باقی ۸۱ فیصد بچتیں پرائیویٹ سیکٹر سے حاصل ہوں گی۔ پرائیویٹ سیکٹر میں بچتوں کا وہ حصہ جو گھریلو بچتوں سے ملے گا، اس سیکٹر کی کل بچتوں کا ۶۵،۱ فیصد ہوگا۔

ساتویں منصوبے میں ۳۴۸،۱۴۸ کروڑ روپے کے مجموعی مصارف میں سے ۱۸۰،۰۰۰ کروڑ روپے پبلک سیکٹر میں اور ۱۶۸،۱۴۸ کروڑ روپے پرائیویٹ سیکٹر میں صرف ہوں گے۔ پبلک سیکٹر کے اخراجات میں ۱۵۴،۲۱۸ کروڑ روپے کے سرمایہ کاری اخراجات اور ۲۵،۷۸۲ کروڑ روپے، عامہ ترقیاتی اخراجات کے لیے رکھے گئے ہیں۔

منصوبے میں پبلک سیکٹر کی اپنی بچتوں سے سرمایہ کاری کے لیے ۴۹،۱۵۶ کروڑ روپے دستیاب ہوں گے۔ ساتویں منصوبے میں پبلک سیکٹر کو ۱۵۴،۲۱۸ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کے لیے دیگر معاشی سیکٹروں سے ۸۰،۰۶۲ کروڑ روپے بچانے ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی ۱۸ ہزار کروڑ روپے غیر ملکی بچتوں سے حاصل کرنے ہوں گے۔

کل سرمایہ کاری میں پبلک سیکٹر کی سرمایہ کاری کا حصہ ساتویں منصوبے میں ۴۸ فیصد رہے گا جبکہ چھٹے منصوبے میں یہ ۵۳ فیصد تھا۔

فاضل وسائل

مرکز اور ریاستیں مل کر ساتویں منصوبے میں ۴۴،۷۰۲ کروڑ روپے کی فاضل رقوم مہیا کرائیں گی۔ مرکز ۲۲۴۹۰ کروڑ روپے اور ریاستیں ۲۲۲۱۲ کروڑ روپے فاضل وسائل کے طور پر اکٹھا کریں گی۔ ہر سال اقتصادی صورتِ حال کا اندازہ لگا کر فاضل وسائل اکٹھا کرنے کی کوششیں کی جائیں گی۔

مرکز اپنے پلان وسائل سے ۲۹،۳۷ کروڑ روپے ریاستوں کو منتقل کریگا۔ مرکز کے پلان وسائل میں ۱۲۹۰۳۹ کروڑ روپے کا اندازہ لگایا گیا ہے۔

مختلف وسائل سے اکٹھی کی گئی رقوم ۱۶۶،۰۰۰ کروڑ روپے کے بقدر ہوگی جب کہ پبلک سیکٹر کے مجموعی اخراجات ۱،۸۰،۰۰۰ کروڑ روپے ہوں گے۔ اس طرح ۱۴،۰۰۰ کروڑ روپے کی کمی پڑے گی جسے خسارہ مالیات کے ذریعے پورا کرلیا جائے گا۔ خسارہ مالیات کی یہ سطح ملک کی اقتصادی حالت اور اشیاء کی قیمتوں کی صورتِ حال کے پیشِ نظر محفوظ حدود میں کہی جاسکتی ہے۔

روزگار

ساتویں منصوبے میں روزگار میں بحساب فی کس فی سال ۴ کروڑ افراد کو معیاری روزگار مل سکے گا جبکہ اس عرصے میں محنت کش طبقے میں ۳ کروڑ ۹۰ لاکھ افراد کا اضافہ متوقع ہے۔ روزگار میں ۴ فیصد فی سال کا اضافہ متوقع ہے جبکہ محنت کش افراد میں یہ اضافہ ۲،۶ فیصد ہونے کی توقع ہے۔ ساتویں منصوبے کے آغاز پر بے روزگار افراد کی پہلے سے چلی آرہی تعداد ۹۲ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔

منصوبے کا بڑا مقصد روزگار کے مواقع میں تیزی سے اضافہ لانا ہے۔ اور یہ اضافہ محنت کش افراد کی تعداد میں اضافہ کے مقابلے زیادہ ہونا چاہیئے لہذا زراعت، دیہی ترقی، دیہی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں، تعمیراتی سرگرمیوں، پبلک ایڈمنسٹریشن اور دیگر سروسز میں روزگار دلانے والی سرگرمیوں کی توسیع و ترقی پر زور دیا جائے گا۔ زراعتی سیکٹر میں روزگار کے امکانات کی سالانہ شرح ترقی ۳،۵ فیصد ہوگی۔ جب کہ غیر زرعی سیکٹر کی روزگار کی سرگرمیوں میں ۴،۵ فیصد سالانہ کے حساب سے اضافہ ہوگا۔ دیہی علاقوں میں مکمل روزگار کے لیے اس منصوبے میں خصوصی زور ہے۔

غریبی دور کرنے پر زور

نیشنل سیمپل سروے کی روشنی میں ۷۸-۱۹۷۷ اور ۸۳-۱۹۸۲ کے درمیان ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ افراد غریبی کی سطح سے اوپر آسکے۔ غریبی کے خط سے نیچے زندگی گزارنے والوں کی تعداد کا کل آبادی کے ساتھ تناسب ۸۵-۱۹۸۴ میں ۳۶،۹ فیصد تھا جو گھٹ کر ۹۰-۱۹۸۹ تک ۲۵،۸ رہ جانے کی توقع ہے۔ دوسرے لفظوں میں غریبوں کی تعداد ۸۵-۱۹۸۴ میں ۲۷ کروڑ ۲۷ لاکھ ہے جو گھٹ کر ۹۰-۱۹۸۹ میں ۲۱ کروڑ ۱۰ لاکھ رہ جائے گی۔ اس خوشحالی میں زیادہ فائدے دیہات کے غریب عوام اٹھائیں گے۔ اس سلسلے میں دیہات میں روزگار کا قومی پروگرام، دیہات کے بے زمین افراد کے لیے روزگار کی ضمانت کا پروگرام کو جو کہ چھٹے منصوبے میں شروع ہوچکے ہیں، تیزی سے آگے بڑھائے جائیں گے۔ ان پروگراموں کی توسیع سے بحساب فی کس فی دن ساتویں منصوبے میں مزید ۴۳۵۸ ملین افراد کو روزگار ملے

جائے گا۔ غریبی دور کرنے کے پروگرام شہروں میں شروع کیے جائیں گے اور گندی بستیوں کی صفائی پر زیادہ زور دیا جائے گا۔

شرحِ ترقی

ساتویں منصوبے میں مجموعی گھریلو پیداوار میں ۵ فیصد سالانہ کے اضافے کا نشانہ رکھا گیا ہے اور بعد کے پنجسالہ منصوبے میں بھی اس شرحِ ترقی کو برقرار رکھنے کے لیے کہا گیا ہے۔ ساتویں منصوبے میں خوراک، کام اور پیداواری صلاحیت بڑھانے پر زور ہے۔ اس پلان میں خوراکی اجناس کی پیداوار تیزی سے بڑھائی جائے گی۔ اس پلان میں علاقائی عدم توازن کو دور کرنے پر زور دیا جائے گا۔ ماحول کے تحفظ کو بھی اہمیت دی گئی ہے اور اسے ساتویں منصوبے ترقیاتی حکمتِ عملی کا جزو سمجھا گیا ہے۔

ساتویں منصوبے میں طویل المدتی ضروریات کو سامنے رکھا گیا ہے اور ۱۹۸۵ سے ۲۰۰۰ء تک کی ضروریات پر نظر رکھی گئی ہے۔ اس عرصے میں معیشت کو خود کفیل بنانے کے لیے کوششیں کی جائیں گی۔ صنعتی سیکٹر میں بین الاقوامی مقابلے پر آنے کے لیے کوششیں ہوں گی۔ ہندوستان کو جدید لائنوں پر لانے، تکنیکی اعتبار سے خود کفیل بنانے اور معیشت کو وسعت بخشنے کے لیے بھرپور کوششیں کی جائیں گی۔ اس عرصے میں مطلوبہ مقاصد کی تکمیل کے لیے عمل درآمد کے پہلو کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔ اس عرصے میں بحساب فی کس خوراک اور پارچات کی کھپت میں بہتری لائی جا سکے گی۔ اس عرصے میں عمل درآمد کی رفتارِ ترقی کا وقتاً فوقتاً جائزہ لیا جاتا رہے گا۔ منصوبہ بندی کے عمل میں لامرکزیت لاکر اور عوام کا بھرپور تعاون حاصل کرکے ملک کی ترقی کے عمل کو آگے بڑھایا جائے گا اور اس سلسلے میں منصوبہ بندی کمیشن کے ورکنگ گروپ نے ضلع کی سطح پر منصوبہ بندی کی جو ضرورت و اہمیت واضح کی ہے، اس کو سامنے رکھا جائے گا۔ ●

بقیہ، اِداریہ

وزیر اعظم نے اس میٹنگ میں یہ واضح طور پر کہا کہ ملک کی ترقی میں پبلک سیکٹر کی اہمیت بدستور قائم رہے گی اور ملک کی ترقی کے لیے وہی پالیسیاں چلتی رہیں گی جو پنڈت جواہر لال نہرو اور شریمتی اندرا گاندھی نے بنائی تھیں۔

ساتویں منصوبے کے دوران دیہی عوام کے ذریعے پیداواری ڈھانچے کو مضبوط کرنا خاص طور پر ضروری ہے۔ ملک کی ترقی کو ناپنے کے لیے محض شرحِ ترقی کو دیکھنا ہی کافی نہیں ہوگا بلکہ ملک میں پیداواری ڈھانچے کو مضبوط کرنا، عوام کے لیے روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع نکالنا، اور عوام کا معیاری زندگی بلند کرنا بھی ضروری ہوگا۔ (ایڈیٹر)

بقیہ، اعلیٰ تعلیم کے جمہوری انداز

اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی

طریقہ تعلیم

اس یونیورسٹی میں باقاعدگی سے کلاسیں نہیں ہوا کریں گی اور اس میں اُستاد اور شاگردوں کا براہِ راست رابطہ کم ہی ہوگا۔ تعلیم کیلئے مراسلاتی نصابات، سماعی و بصری آلات اور ذرائع ابلاغ سے کام لیا جائے گا۔ ریڈیو، آڈیو کیسٹ، ٹیلی ویژن ویڈیو، ویڈیو ڈسک، کمپیوٹر اور کتابوں، رسائل وغیرہ پر زیادہ انحصار کرنا پڑے گا۔ اس دُوری کے احساس کو مٹانے کے لیے موجودہ کالجوں میں اسٹڈی سنٹر قائم کر دیے جائیں گے۔ چھٹی کے دن یا روزمرہ کے معمولات سے بچے ہوئے وقت میں ان مرکزوں پر رابطہ پروگرام وضع کیے جائیں گے۔ اور تعلیم پانے والوں سے ربط و ضبط قائم کیا جائیگا۔ اسٹڈی سنٹروں کے کام میں تال میل لانے کے لیے ریجنل سنٹر بھی قائم کیے جائیں گے۔

تنظیم

دیگر سنٹرل یونیورسیٹوں کی طرح سے صدر جمہوریہ ہند اس یونیورسٹی کے وزیٹر ہوں گے۔ اس کے لیے وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر، ڈائرکٹرز، رجسٹرارز، فائننس آفیسر اور کچھ دیگر عہدیداران ہوں گے۔ چانسلر اور چیف ریکٹر کا عہدہ نہیں ہوگا۔ اسکولوں کی سربراہی ڈین نہیں کریں گے بلکہ وہ ڈائرکٹر کہلائیں گے۔ ان کو انتظامی اور تعلیمی ہر دو طرح کی ذمہ داریاں نبھانی ہوں گی۔ بالعموم یونیورسٹیوں میں ایک ہی رجسٹرار ہوتا ہے لیکن یہاں کئی رجسٹرار ہوں گے۔ یونیورسٹی کے لیے بورڈ آف مینجمنٹ ہوگا۔ اکیڈیمک کونسل، پلاننگ بورڈ، بورڈ آف ری کوگنیشن، اسکول آف اسٹڈیز اور فائننس کمیٹی اس کے دیگر انتظامی ادارے ہوں گے۔ یونیورسٹی میں کورٹ (سی نیٹ) کی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔ دولت کی تقسیم کی نابرابری یا مواقع کی عدم برابری نے تعلیمی نظام میں جو اُونچ نیچ پیدا کر دی ہے، اس کے ذریعے اسے دور کرنے کی کوشش کی جائے گی بہت سا سماجی تضاد اسی کے دم سے ہے۔ اس کے طریقِ تعلیم سے محض اوپن یونیورسٹی کے مندرج طلبا ہی فائدہ نہیں اٹھائیں گے بلکہ وہ بھی فائدہ اٹھا سکیں گے جن کا اس یونیورسٹی میں اندراج نہیں ہے اور وہ بھی اس کے تعلیمی مواد کا استفادہ کر سکیں گے۔ ●

جدید مواصلاتی ٹکنالوجی ذریعہ تعلیم

حال ہی میں نئی دلی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر رام ریڈی نے کہا کہ اس یونیورسٹی میں مختلف سہولتوں کی دستیابی کی غرض سے ۱۵ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔ اس سے ۱۹۸۵ سے ۱۹۹۰ تک اپنی یونیورسٹی چلانے کے اخراجات پورے کئے جائیں گے۔ لیکن اگر ضرورت پڑی تو مزید رقم دی جائے گی۔ یونیورسٹی کے انڈر گریجویٹ نصابات میں داخلے کے لیے داخلہ کا کوئی امتحان نہ ہوگا۔ پوسٹ گریجویٹ نصابات میں داخلے کے لیے کریڈٹ سسٹم اپنایا جائے گا اس کی تفاصیل جلد ہی مرتب کر لی جائیں گی۔ یہ یونیورسٹی ڈگری، ڈپلومہ اور سرٹیفکیٹ نصابات کا اہتمام کرے گی۔ یہ یونیورسٹی تعلیم مسلسل کے طریقے پر زور دیگی۔ اس طرح مختلف طرز کے کاموں میں مصروف افراد بھی اپنی تعلیم کے ذریعے اپنی مہارت کو دوچند کر سکتے ہیں۔

اوپن یونیورسٹی کی چند خصوصیات: اس میں داخلے کی شرائط اور قواعد و ضوابط آسان ہوں گے۔ اگر کسی امیدوار کے پاس رسمی کوالی فیکیشن نہیں ہے۔ تو یہ اس کی تعلیم کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں بنے گی۔ ہر شخص اپنی تعلیمی رفتار اور اپنی سہولت کے مطابق تعلیم حاصل کر سکے گا۔ اس میں "ٹرانسفر آف کریڈٹ" کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اور اس کے مطابق وہ ایک پروگرام سے دوسرے پروگرام میں شمولیت کر سکتا ہے، خواہ وہ پروگرام روائتی انداز کا ہو یا غیر روائتی۔ تعلیم گھر پر رہتے ہوئے ملے گی۔ اس کے لیے کلاس روم نہیں ہوگا۔ تعلیم کے معاملے میں کسی ایک مضمون کے لیے کسی ایک استاد پر بھروسہ نہیں کرنا پڑے گا۔ اس کے لیے مواصلاتی ٹکنالوجی سے مدد لی جائے گی اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے بھی تعلیم دی جائے گی۔ تعلیم کا معیار بلند ہوگا۔ اور ملک میں بہترین افراد اور ماہرین کو تعلیمی پروگرام اور اسباق بنانے کے لیے کہا جائے گا۔ یہ ڈگری، ڈپلومہ اور سرٹیفکیٹ کورسز کا اہتمام کرائے گی ان کے علاوہ تعلیم مسلسل اور توسیعی پروگراموں کی تشکیل بھی دی جائے گی۔

ترقی کے پروگرام اور اس میں یونیورسٹی کا رول

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی بل ۱۹۸۵ پارلیمنٹ نے پاس کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی کے مقاصد کے سلسلے میں بتایا گیا ہے کہ یہ ادارہ تعلیم، تحقیق و تربیت اور توسیع کے ذریعے مثبت رول ادا کر کے ملک کے ترقیاتی پروگراموں کو مضبوط بنانے میں مدد دے گا۔ یہ ملک کے بیش قیمت ثقافتی ورثے پر مبنی ہوگا۔ اس سے ہندوستانی عوام کے کلچر کو فروغ ملے گا۔ اور انسانی وسائل کو آگے بڑھایا جا سکے گا۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے روزگار کے تقاضوں کے بموجب ڈگری، سرٹیفکیٹ اور ڈپلومہ نصابات کو مستحکم بنایا جائے گا اور ملک کی معیشت کو مستحکم بنانے پر زور دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں قدرتی وسائل اور انسانی وسائل سے بھرپور کام لیا جائے گا۔ ملک کی آبادی کے کثیر حصے کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم کئے جائیں گے۔ دور دراز اور دیہی مقامات پر رہنے والے تعلیم حاصل کرنے کے خواہشمند افراد، جو وسائل کی کمی کے باعث تعلیم سے محروم رہے ہیں، اس یونیورسٹی سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ تیزی سے بدلتے ہوئے سماج کے تقاضوں کے مطابق تعلیم دی جائے گی۔ اور علم، تربیت اور ہنرمندی کے معیار کو بڑھانے پر زور دیا جائے گا۔ جدید کاری کی تربیت کا بندوبست کیا جائے گا اور انسانی کوششوں کے مختلف شعبوں میں امور تحقیق کو آگے بڑھایا جائے گا۔ یونیورسٹی کی سطح کی تعلیم کے لیے ایک جدید نظام معرض وجود میں آئے گا۔ اس میں بہت زیادہ لچک ہوگی۔ یہ کھلی یونیورسٹی ہوگی۔ ذرائع تعلیم اور رفتار تعلیم کے معاملے میں لچکیلا نظام ہوگا۔ نصابات کا جوڑ، داخلے کی شرائط، عمر کی پابندی، امتحانات کا طریقہ کار، ان سب میں لچکدار اور نرم قواعد و ضوابط ہوں گے۔ جدید علوم کی تعلیم کے لیے ہمت افزائی کی جائے گی۔ ہندوستان میں تعلیمی معیار بڑھانے میں یہ معاون ہوگی۔ رسمی تعلیم کی معاونت کے لئے یہ غیر رسمی انداز کا ایک نظام ہے جس میں ٹرانسفر آف کریڈٹ اور استادوں کا تبادلہ عمل میں آ سکے گا۔ اور یونیورسٹی اس سلسلے میں جو درسی کتب تیار کرے گی، ان سے فائدہ اٹھایا جا سکے گا۔ مختلف علوم و فنون اور ہنرمندی اور کاموں کی تعلیم و تربیت دی جائے گی۔ استادوں کی تربیت کا بندوبست کیا جائے گا۔ اور تحقیق کو آگے بڑھایا جائیگا اور مناسب پوسٹ گریجویٹ نصابات کا اہتمام کیا جائے گا۔ اس ادارے کے طالب علموں کی رہنمائی اور پیشہ ورانہ تربیت کے سلسلے میں مشوروں کا بندوبست کیا جائے گا۔ انسانی شخصیت کے فروغ اور قومی یکجہتی اور قومی اتحاد کو آگے بڑھانے کے لیے بھی یہ ادارہ کام کرے گا۔ تمام بھارت اس یونیورسٹی کے دائرہ کار میں آتا ہے۔ ہندوستان کے سبھی حصوں کے طلبا اس کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ یہ یونیورسٹی عمرانیات، سماجی سائنسوں، پیشہ ورانہ اور تکنیکی ڈسپلن کی تربیت و تعلیم دے گی۔ مختلف مدتوں اور وقفوں کے پیشہ ورانہ مہارت والے پروگراموں کا بھی بندوبست کرے گی جس سے عملے کے مختلف زمرے فائدہ اٹھائیں گے۔

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81.

Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment at Civil Lines Post Office, Delhi-110054.

VOL. 6 No. 18 YOJANA (URDU) 16-31 December, 1985

محمد راشد انور

فضائی آلودگی

انسانیت کے لیے خطرہ

فضائی آلودگی ساری انسانیت کے لیے خطرہ بن گئی ہے۔ انسانی زندگی ہر لمحہ اس آلودگی سے متاثر ہو رہی ہے۔ انسان نے خود اپنی بربادی کی راہیں تیار کی ہیں۔ انسان ایک طرف اپنی عظمت اور بڑائی کا پرچم لہراتا ہے تو دوسری طرف مختلف قسم کی سائنسی ایجادوں، کل کارخانوں، مہلک گیسوں کی وجہ سے فضائی آلودگی میں اضافہ کرتا ہے۔ حال ہی میں زہریلی گیس خارج ہو جانے سے بھوپال کے ہزاروں انسان موت کی وادی میں جا بسے اور ہزاروں لوگ مفلوج ہو گئے۔ بچوں پر اس گیس کا اثر بہت خراب پڑا اور بچے ناکارہ ہو گئے۔

زمین اور آسمان کے درمیان موجود تمام جاندار کھلی فضا میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ اس سے ان کی صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے مگر فضائی آلودگی کی وجہ سے انسان موت کے دہانے پر کھڑا نظر آتا ہے۔ لندن میں سن ۱۹۵۲ء میں برف اور کہرے کی وجہ سے تین چار دنوں کے اندر تین چار ہزار انسانوں کی موت واقع ہو گئی۔ فضائی آلودگی سے بمبئی کا صنعتی شہر بری طرح متاثر ہے۔ متھرا ریفائنری سے تاج محل کے سنگ مرمری جسم پر شگافیں پڑ گئی ہیں۔ سن ۱۹۷۲ء میں عراق میں پارے سے تقریباً پانچ سو لوگوں کی موت ہو گئی۔ فضائی آلودگی دراصل صنعتوں کے بچھے ہوئے جال، کارخانے، بجلی گھروں اور ریفائنریوں کی چمنیوں سے نکلے ہوئے دھوئیں، ان کی غلاظت سے پیدا ہوئی زہریلی گیس، پٹرول، ڈیزل گاڑی سے چھوڑا جانے والا دھواں، بھٹیوں میں کوئلوں کے نامکمل جلتے رہنے سے اور فضائے بسیط میں شدید گرمی اور از خود جلن سے نکلی موخر گیس اور ہوائیں گرد غبار کے ذرات فضائی آلودگی کے خاص اسباب ہیں۔

فضائی آلودگی سے پیدا ہونے والی بیماریوں میں کینسر، دمہ، ٹی۔ بی، الرجی، آنکھوں میں خلش، آنتوں کا السر، خون کا زہریلا ہونا، جلدی امراض، ذہنی کمزوری، بچوں کے پیدا ہوتے ہی موت وغیرہ عام ہیں۔ انسان کو فضائی آلودگی سے بہت خطرات ہیں۔ فضائی آلودگی سے تحفظ کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ آج ہر خطۂ زمین پر جو بے کار ہو شجرکاری کی شدید ضرورت ہے۔ شجرکاری ہی فضائی آلودگی اور کثافت کو کم کر سکتی ہے۔ یہ ایک پرانی کہاوت ہے کہ درخت انسان کے دوست ہوتے ہیں۔ انسان کو درختوں کے جھرمٹ میں اپنا بسیرا کرنا چاہیئے۔ کچھ ناتجربہ کار لوگوں کی غلطی کی وجہ سے جنگلوں کی اندھا دھند کٹائی ہو رہی ہے اس پر فوراً پابندی کی ضرورت ہے۔ ہم لوگوں کو ایسی صنعت اور ایسی ٹیکنیک ایجاد کرنی چاہیئے جس سے فضائی آلودگی کم ہو یا پھر ختم ہو جائے۔

آج کے دور میں نیوکلیائی دھماکوں اور نت نئے خلائی تجربوں نے انسانیت کے لیے ایک بڑے خطرے کا نشان کھڑا کر دیا ہے۔ ایسے دھماکوں پر جس سے انسانیت کو خطرہ ہو پابندی عائد کرنی چاہیئے۔ ہندوستان اس کیلئے پوری شدت سے اپنی آواز اٹھا رہا ہے۔ ◆

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001

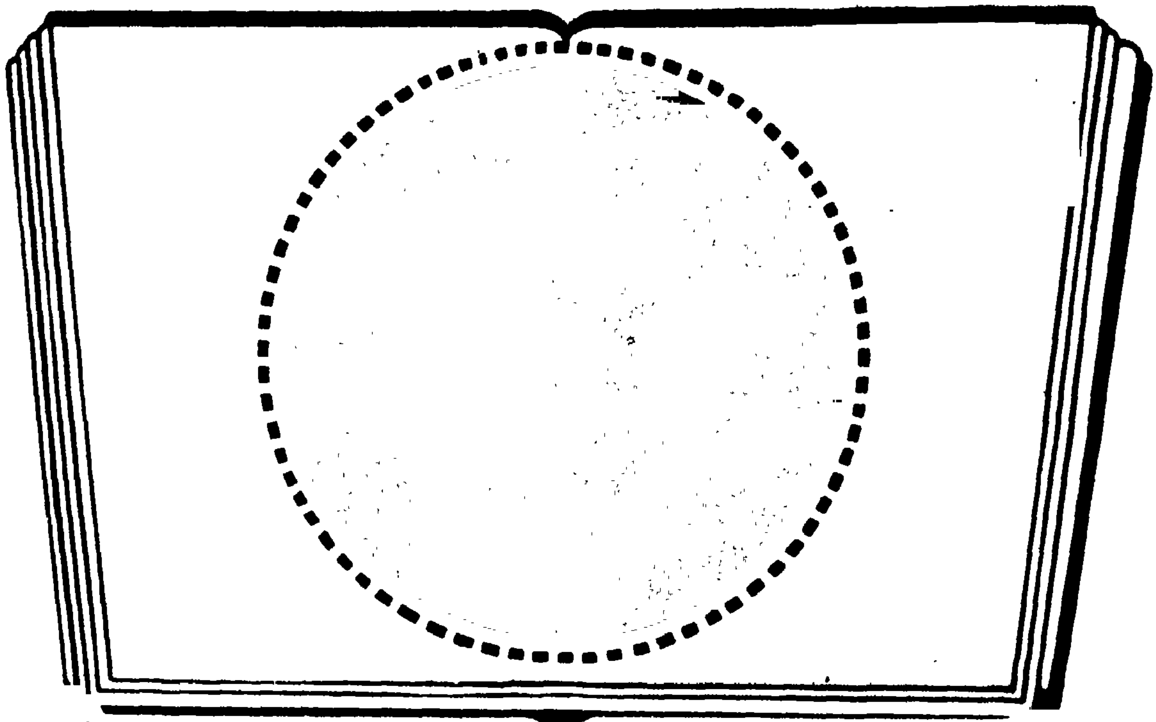
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002.

۲۶ جنوری ۱۹۸۶ کا خصوصی شمارہ

جلد : ۵
شمارہ : ۱۹، ۲۰
قیمت : دو روپے

یوجنا

تعلیم



تلاش میں

ڈاکٹر آر. کے. پودار، ڈاکٹر ونجا آئنگر، پریم کرپال، ڈاکٹر پی. ایم بھارگو، ڈاکٹر ڈی. ایم ننجنڈپا، پروفیسر رئیس احمد، ڈاکٹر ایل. کے. جھا، ڈاکٹر امریک سنگھ جسٹس پی. این. سنگھل، پروفیسر ڈی. این سنہا، ڈاکٹر مادھوری آر. شاہ، پروفیسر پی. این سریواستو، ڈاکٹر مالکم ایس. ادی سیشیہ، ڈاکٹر جی. سیتھا رام، پروفیسر اقبال نرائن، پروفیسر اُپیندر بخشی، پروفیسر رام لال پاریکھ، پروفیسر ایس. این. مہروترہ۔

ہمارے ملک میں حصولِ آزادی کے وقت سے ہی تعلیم ایک موروثی معاملہ رہا ہے۔ یہ ملک کی مجموعی آبادی کے ۳ فی صد حصّے کا ہی استحقاق بنا رہا۔ گویا تعلیم ملک کے صرف ۳۰ لاکھ چھوٹے کنبوں اور ۵ لاکھ بڑے کنبوں تک ہی محدود رہی ہے۔ آبادی کا یہ وہ زمرہ ہے جہاں گھر کا بچّہ بچّہ اسکول جاتا ہے۔ ہائی اسکول پاس کرکے یونی ورسٹی میں داخلہ لیتا ہے، ڈگری حاصل کرتا ہے اور پھر ملازمت۔ یہی بات ان کے بچّوں اور پوتے پوتیوں، نواسے، نواسیوں کے لیے بھی سچ ہے۔ اس عبارت کو پڑھنے والے یا پھر وہ جنھوں نے 'یوجنا' کے اس شمارے کے لیے لکھا ہے اسی زمرے سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی طرح ہر زمرے کے سرکاری ملازم بھی مذکورہ طبقے سے ہی تعلق رکھتے ہوں گے۔ اب رہا باقی ۹۷ فیصد عوام کا معاملہ۔ ان کے بچّے بہت ممکن ہے اسکول جانے کا موقع ہی نہ پاسکیں یا پھر وہ پہلی، تیسری، پانچویں یا آٹھویں کلاس تک پہونچ کر درمیان سے اُٹھا لیے جائیں۔ بہت تھوڑے لوگ کسی نہ کسی طرح ہائی اسکول تک پہونچیں گے اور ممکن ہے کہ وہ کسی نہ کسی طور ڈگری بھی حاصل کرلیں لیکن وہ اپنی اس تمام تعلیمی زندگی میں اس قدر محرومیوں کا شکار رہے ہوں گے کہ ان کے لیے مقابلے کے امتحان میں آنا ہی دشوار ہوگا اور وہ ۳ فیصد استحقاق یافتہ بچّوں کے ساتھ مقابلے میں کامیابی حاصل نہیں کرپائیں گے۔

ڈاکٹر پی۔ ایم۔ بھارگو

اس شمارے میں

خصوصی شمارہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر : آر۔ ٹھکرال

ایڈیٹر : لکھشی رام رانا

اسسٹنٹ ایڈیٹر : محمد عادل صدیقی

سب ایڈیٹر : وسیم حیدر

جلد ۵	یکم تا ۳۱ جنوری ۱۹۸۶	شمارہ ۱۹ اور ۲۰

۱۱ پوش تا ۱۱ ماگھ شک ۱۹۰۷ ✤ ٹیلیفون : ۶۰۱۸۱۸

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے۔ ۲ سال ۳۵ روپے۔ ۳ سال ۵۰ روپے

فی کاپی ایک روپیہ ✤ خصوصی شمارہ دو روپے

طالب علموں، اُستادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے پورم، مین

نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

بزنس منیجر • ایل۔ آر۔ بترہ • اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس۔ منچال

ترسیلِ زر کا پتہ • بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

راؤ گارو! حرف

مسٹر نرسمہا راؤ! یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ ہمارے ملک میں جس وقت انسانی وسائل کے فروغ سے متعلق معاملات کی سربراہی اور رہنمائی آپ کے ہاتھوں میں ہے، اسی وقت نئی تعلیمی پالیسی کا اہم مسئلہ بھی زیرِ غور ہے۔ اس سلسلۂ روز و شب کے دوران ایک بھاری بھرکم ذمہ داری آپ کے سامنے ہے۔ ایک طرف تو ہمارا یہ عزم کہ سلسلۂ حیات اور معیارِ زندگی کو بہتر بنایا جائے ــــــ جی ہاں وہ بھی تسلسل کے ساتھ چلی آرہی غربت اور ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی بدعنوانیوں کے درمیان ــــــ اور دوسری طرف عالمی بنک کی چونکا دینے والی وارننگ کہ سن ۲۰۰۰ء تک ہمارے اپنے ملک میں ہی دنیا کے ناخواندہ افراد کی نصف تعداد ہوگی جو فی الواقعی ایک بھیانک صورتِ حال ہے لیکن یہ لاعلاج بھی نہیں بشرطیکہ ہم کسی طرح اس خطرے سے نبٹنے کا عہد کرلیں۔

ان حالات میں ہم قدرے روائتی ڈگر چھوڑ کر آپ کی توجہ دو اہم مسئلوں کی طرف مبذول کراتے ہیں۔ پہلا یہ کہ پالیسیوں پر ایمانداری سے عمل درآمد کے لیے مناسب فضا بنانے اور ہموار کرنے کی شدید ضرورت اور دوسرا مالیات اور رقوم کے اکٹھا کرنے کے لیے کچھ ترش روئی کے فیصلے تاکہ ان کے ذریعے سے اتنی رقومات ضروزمیسر آسکیں کہ مطلوبہ نشانے پورے کئے جاسکیں۔ لیکن ان مسائل پر تفصیل سے گفتگو کرنے سے قبل ہمیں خود سے سنجیدگی سے یہ دریافت کرنا ہوگا:۔

ہم اپنی بے راہ روی اور غلط کاموں کی ذمہ داری سماج میں ڈھونڈنے کا سلسلہ کب تک جاری رکھیں گے؟ ہم ایسا کیوں سوچتے ہیں کہ تعلیم کی کامیابی یا ناکامی کی فیصلہ سازی سماج ہی کے ہاتھ میں ہے؟ کیا سماج حکمرانوں اور عوام الناس سے کچھ الگ ہے؟ بھلا سماج میں حکمرانوں کو اپنے شہریوں کے مفاد میں کام کرنے سے کون روکتا ہے؟ ہم کیوں بار بار مالی مشکلات کی شکایت کرتے ہیں جبکہ سوچ سمجھ کر ترجیحات کا تعین اور پھر اُن مدّات کے لیے رقومات کی فراہمی کا کام خود ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہے؟ یہ سوالات ذرا بے چین کرنے والے تو ہیں لیکن ہیں بہت اہم۔

لگتا ایسا ہے جیسے جانے انجانے ہم اپنے اعمال کی ہی گرفت میں ہیں۔ ہم نے خود ایسے حالات پیدا کئے ہیں جہاں نیک جذبہ رکھنے والا انسان خود کو یکہ و تنہا پاتا ہے۔ یہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ہماری افسر شاہی اور خاص طور پر افسران بالا کے کام کرنے کا انداز کیا ہے۔ ان کا انداز نہ صرف مایوس کن ہے بلکہ سنگ دلانہ بھی۔ تجربہ شاہد ہے کہ افسر شاہی، معاملوں کو توڑ مروڑ کر اُلجھانے اور اپنے سارے نکمے پن کو سیاسی آقاؤں کے سر تھوپنے کے فن میں ماہر ہوچکی ہے۔ کبھی کبھی یہ سرگرمِ عمل بھی نظر آتے ہیں مگر یہ صرف اُسی وقت جب ایسا کرنا خود ان کے مذموم عزائم کو پورا کرنے میں ممد و معاون ہو۔ اب یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اگر ہمارے درمیان ایک بدعنوانت

پانچ منٹ

سیاستدان پھل پھول رہا ہے تو کم سے کم ایک درجن ایسے کورپٹ افسران بھی ہمارے درمیان موجود ہیں جو پھل پھول رہے ہیں۔ اگر یہی چلتا رہا تو ہمیں خال خال اور کہیں کہیں کامیابی بھلے ہی مِل جائے لیکن کسی بھی طرح ہم مطلوبہ نشانے پورے نہیں کرسکتے۔ چنانچہ نشانوں کی تکمیل کو یقینی بنانے کی خاطر اس بات کی یقین دہانی ضروری ہے کہ تعلیمی پروگراموں کی ترتیب و تشکیل اور ان پر عمل درآمد کے کام سے صرف وہی لوگ وابستہ ہوں جو خود کو تعلیم کے لیے وقف کئے ہوئے ہیں اور وہ براہِ راست آپ کو جوابدہ ہوں نہ کہ کسی اور کے، جیساکہ ہمیشہ ہوتا ہے۔

اب وہ وقت آگیا ہے کہ یہ صورتِ حال بدلے۔ ماحول سازگار ہے اور لگن اور محنت سے کام کرنے کے لیے مناسب فضا بھی۔ چند گوشوں میں اس کام کا آغاز ہو ہی چکا ہے۔ آیئے باقی شعبوں میں بھی کوشش کریں۔

شاید صحیح اور ٹھوس کام کے لیے ہی فلم سنسر شپ کو آپ کے زیرِ نگرانی لایا گیا ہے، گو یہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ریڈیو اور ٹی۔ وی جیسا موثر اور ہمہ جہت میڈیا آپ سے دُور کیوں ؟

جناب۔ چند لمحے اور ۔ اب بنیادی مسئلہ ہے زیادہ سے زیادہ رقوم فراہم کرنا اور ملک سے ناخواندگی کو جڑ سے اُکھاڑنا۔ ہماری اصل مہم میں دیہات کے غریب عوام ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ ان میں سے اکثریت اُن کی ہے جو بے زمین زرعی مزدور ہیں۔ ان کی حالتِ زار کوئی ڈھکی چھُپی نہیں ہے پھر بھی بے زمین کھیت مزدوروں کو زمین دلانے کا مسئلہ بدستور جُوں کا تُوں بنا ہوا ہے۔ کم سے کم اُجرتوں کی ادائیگی کا مسئلہ بھی محض ایک خواب بن کر رہ گیا ہے ——— اگر زندگی کا یہی ڈھچر ہے تو پھر ہم کس بَل بُوتے پر تعلیم کو سب کے لیے ضروری بنا دینے کا نشانہ اپنے سامنے رکھے ہوئے ہیں۔ یقیناً ہماری بندشیں ہی ہمارے راستے کا روڑہ بن گئی ہیں اور ہم وہ نہیں کر پاتے جو بالکل واضح ہے۔ پھر کیوں نہ متبادل راستے کی تلاش کی جائے۔ مشورہ ہے زراعت پر ٹیکس جسے خالصتاً تعلیم کے لیے ہی کام میں لایا جائے۔ کے۔ این۔ راج کمیٹی کی سفارش کے مطابق اس سے اب ہمیں ۰۰ ۷ کروڑ روپے سال کی فاضل آمدنی ہوسکتی ہے۔ شاید آپ اس موضوع پر اپنے رفقائے کار کو مطمئن کرسکیں اور اُس کی ضرورت کا احساس دلاسکیں۔ ہاں اگر یہ ناقابلِ عمل ہو تو ایک متبادل گاندھی جی کے طرز پر یہ بھی ہے کہ دیہات کے امیر لوگوں کو ہر ضلع میں کم سے کم پانچ ہائی اسکول کھولنے پر آمادہ کیا جائے۔ چلتے چلتے ایک بات اور ۔ کیوں نہ ہر ضلع میں ماڈل اسکول کے پراجکٹ سے ماڈل کا دُم چھلا ہٹا دیں کیونکہ اس اصطلاح سے کچھ غلط فہمی سی پیدا ہوگئی ہے۔

ٹھیک ہے۔ اگر یہ بھی قابلِ عمل نہیں جس کے امکانات زیادہ ہیں تو پھر کیوں نہ ہم تعلیم کو سب کے لیے عام کرنے اور اس کے لیے مطلوبہ رقم فراہم کرنے کے لیے تعلیم پر ہی ٹیکس لگا دیں۔

(چیف ایڈیٹر)

اس شمارے میں اظہارِ خیال کرنیوالی شخصیتیں اور ان کا مختصر تعارف

ڈاکٹر پی۔ ایم۔ بھارگو

ڈائرکٹر، سنٹر فار سیلولر اینڈ مولی کیولر بائیولوجی، حیدرآباد۔

ڈاکٹر ایل۔ کے۔ جھا

نئی دلی میں انتظامی اصلاحات سے متعلق مشیر برائے وزیر اعظم۔

ڈاکٹر آر۔ کے۔ پودار

ممبر پارلیمنٹ، پروفیسر آف بائیوفزکس نیز کلکتہ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر۔

پروفیسر پی۔ این۔ سریواستو

وائس چانسلر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔

پروفیسر (شریمتی) ونجا آینگر

وائس چانسلر، پدماوتی وومنس یونیورسٹی، ترپتی (آندھرا پردیش)

پروفیسر ڈی۔ این۔ سنہا

ڈائرکٹر، اے۔ این سنہا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل اسٹڈیز، پٹنہ (بہار)

پریم کرپال

نامور ماہر تعلیم، نیز سابق سکریٹری مرکزی وزارتِ تعلیم، نئی دہلی۔

پروفیسر رئیس احمد

سابق وائس چیئرمین یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، نئی دہلی۔

جسٹس پی۔ این۔ سنگھل

چوتھے تنخواہ کمیشن کے چیئرمین نیز سپریم کورٹ آف انڈیا کے سابق جج، نئی دہلی۔

ڈاکٹر (شریمتی) مادھوری۔ آر۔ شاہ

چیئرپرسن، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، نئی دہلی۔

ڈاکٹر مالکم ایس ادی سیشیہ

چیئرمین، مدراس انسٹی ٹیوٹ آف ڈیولپمنٹ اسٹڈیز نیز سابق وائس چانسلر مدراس یونیورسٹی، مدراس۔

پروفیسر ایس۔ این۔ مہروترہ۔

وائس چانسلر، جودھپور یونیورسٹی (راجستھان)

پروفیسر رام لال پاریکھ

وائس چانسلر، گجرات ودیاپیٹھ، احمد آباد۔

ڈاکٹر ڈی۔ ایم۔ ننجنڈپا

سکریٹری، پلاننگ، بنگلور (کرناٹک)

پروفیسر اقبال نرائن

ممبر سکریٹری، انڈین کونسل آف سوشل سائنس ریسرچ، نئی دہلی، نیز سابق وائس چانسلر، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی۔

پروفیسر اُپیندر بخشی

ڈائرکٹر، ریسرچ، انڈین لاء انسٹی ٹیوٹ نیز پروفیسر آف لاء، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

ڈاکٹر امریک سنگھ

مشہور ماہر تعلیم، نئی دہلی۔ نیز سابق وائس چانسلر، پنجابی یونیورسٹی۔

ڈاکٹر جی۔ این۔ سیتھارام

فیکلٹی ممبر، ایڈمنسٹریٹو اسٹاف کالج آف انڈیا، حیدرآباد۔

ڈاکٹر پی. ایم. بھارگو

موجودہ صورتِ حال کے لیے تعلیم ہی کو موردِ الزام قرار دیا جانا چاہیے

'یوجنا' کے چیف ایڈیٹر نے مشہور ماہرِ تعلیم اور سائنس داں ڈاکٹر پی. ایم. بھارگو سے سوال جواب کی صورت میں ایک انٹرویو لیا۔ اس کا متن درج ذیل ہے۔ (ایڈیٹر)

چیف ایڈیٹر: کچھ مہینوں سے تعلیم سے متعلق ایک دستاویز ملک گیر سطح پر بحث کے لیے گشت کرائی جا رہی ہے۔ کیا آپ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ یہ دستاویز جیسا کہ یہ ہے، آج کے تعلیمی نظام کا حقیقت پسندانہ جائزہ ہے اور اس میں جن سمتوں کی نشاندہی کی گئی ہے وہ اکیسویں صدی میں بحیثیت ایک متحرک اور فعال قوم داخل ہونے کے لیے ہماری ضرورتوں سے ہم آہنگ ہیں۔

پی ایم بھارگو: نہیں، میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ یہ دستاویز ناکافی ہے۔ اس میں، منجملہ دیگر باتوں کے درج ذیل اہم امور پر غور و خوض کے لیے جگہ نہیں دی گئی ہے۔

الف: دستاویز میں اس بات کو تسلیم نہیں کیا گیا کہ اب تک ملک کے سامنے جو مسائل رہے ہیں، اور آج ملک کے سامنے جو مسائل ہیں، ان میں پانی اور بجلی کے ساتھ تعلیم اہم ترین مسئلہ ہے۔ آپ ہی کے الفاظ کو استعمال کرتے ہوئے میں کہوں گا کہ جس قدر اسکولی تعلیم کا نظام فعال اور متحرک ہوگا، اسی قدر وہ ملک بھی فعال اور متحرک ہو سکے گا جہاں کہ وہ تعلیم دی جا رہی ہے۔ ذرا فرانس، امریکہ، برطانیہ، جاپان، جرمنی اور روس کے اسکولی نظاموں کا ہی مطالعہ کر لیا جائے تو اس بیان کی صداقت معلوم ہو جائیگی۔

ب: ہمارے ملک میں حصولِ آزادی کے وقت سے ہی تعلیم ہماری کُل آبادی کے تقریباً ۲ فیصد لوگوں کا ہی حق بن کر رہی ہے۔ چند خاندان جہاں پہلے سے تعلیم تھی، بس وہیں تعلیم چلی آ رہی ہے۔ یہ آبادی صرف تقریباً ۳۰ لاکھ چھوٹے کنبوں اور ۵ لاکھ بڑے کنبوں پر مشتمل ہے۔ آبادی کا یہ وہ زمرہ ہے جہاں ہر بچہ اسکول جائے گا اور ہائی اسکول پاس کر کے یونیورسٹی میں داخلہ لیگا، ڈگری حاصل کر کے ملازمت حاصل

دے گا۔ یہی بات ان کے بچوں اور پوتوں، نواسوں، نواسیوں، پڑپوتوں وغیرہ کے لیے بھی درست ہے۔ اس عبارت کو جو پڑھیں گے اور وہ جھونپڑے پوچھنا کہ اس شمار سے کسے لیے لکھا ہے، وہ اسی ندرت سے تعلق رکھتے ہونگے اسی طرح ہزاروں سالوں کا بھی ملازم اس معدودے چند خاندانوں سے ہے۔ باقی ۹۷ فیصد کے بارے میں اسکول جانے کے اوّل تو امکانات نہیں یا اگر وہ چلے بھی گئے تو انھوں نے پہلی، تیسری پانچویں یا آٹھویں کلاس میں تعلیم ترک کردی۔ بہت تھوڑے سے طلبا یا طالبات ہائی اسکول تک پہنچتے ہیں اور ان میں سے کچھ ڈگری تک تعلیم لے لیتے ہیں۔ لیکن اپنے تعلیمی کیریر میں وہ محرومیوں کا اس قدر شکار ہیں کہ وہ ۳ فیصد استحقاق یافتہ طبقے کے بچوں سے مقابلے کے امتحان میں پچھڑ جاتے ہیں۔ داخلوں میں ریزرویشن کا نظام اسی سلسلے کی کڑی ہے اور آج آزادی ملے ۴۰ برس ہو گئے، پھر بھی یہ نظام باقی رکھا جا رہا ہے، ہمارے ملک میں پرائمری اسکولوں کی تعداد جس قدر ہے، ان کا صرف دس فیصد ہائی اسکولوں کی تعداد ہے جبکہ جتنے پرائمری اسکول ہیں، اتنے ہی ہائی اسکول ہونے چاہئیں۔ ہمارا اندازہ ہے کہ ۱۰ ــ ۲۰ ہزار سے زیادہ افراد بلحاظ تعلیم غیر استحقاق یافتہ گروپ سے، استحقاق یافتہ گروپ میں منتقل نہیں ہو پائے۔ اس سے کسی بھی گروپ کے اقتداری نظام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لہٰذا تعلیم گویا کہ تعلیم کی کمی ہی ملک کی تقسیم کا سب سے بڑا سبب بنتا جا رہا ہے۔ اس کا اثر مذہب، ذات پات یا دیگر عناصر کے مقابلے سب سے زیادہ نمایاں ہے۔

ج: کسی بھی فرد، گروپ، طبقے یا سماج کے لیے علم و اطلاعات اہم ترین اثاثہ جات ہیں۔ اس محاذ پر عدم توازن سے استحصال پسندی کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ اس طرح کی عدم مساوات ہندوستان کی آج کی صورتِ حال ہے۔ لہٰذا تعلیم جوکہ علم و اطلاعات کے حصول کے لیے ضروری بھی ہے اور اس کے لیے ذریعہ بھی، ۹۷ فیصد غیر استحقاق یافتہ آبادی کا ۳ فیصد استحقاق یافتہ آبادی کے ہاتھوں استحصال کا ذریعہ بن گئی ہے۔ جب تک تعلیمی مواقع سب کے لیے یکساں نہیں ہو جاتے یعنی کہ ہائی اسکول کی سطح تک اسکولی تعلیم سب کے لیے نہیں ہوتی اور دس سال تک رسمی انداز سے تعلیم کے مواقع سب کے لیے نہیں مل پاتے، اس وقت تک ہم اپنے ملک کو جمہوری ملک نہیں کہہ سکتے۔ تعلیم کے موجودہ نظام نے ہمارے ملک میں جمہوریت کا مذاق اُڑایا ہے۔ اس دستاویز میں اس حقیقت کو نیز ہمارے آئین میں شامل مقاصد کی تکمیل کے لیے تعلیم کے اہم رول کو تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔

د: اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہمیں تعلیم کو عام کرنا ہے اور اسکولی تعلیم کو جمہوری انداز پر لانا ہے۔ لہٰذا ہمیں ملک میں ایک ہی طرح کے اسکول لانے ہیں یعنی کہ سرکاری سطح کے اسکول۔ اس کے لیے پرائیویٹ اور پبلک اسکولوں کو ختم کرنا ہوگا، قومی سطح پر نصاب تیار کرنا ہوگا، البتہ نصابات کی تیاری میں لچک پیدا کرکے مقامی اور علاقائی ضرورتوں کو اس میں شامل کرنا ہوگا۔ اگر اسکولی تعلیم کی مناسب طریقے پر دیکھ ریکھ کرلی جائے تو کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم خود بخود صحیح راستے پر آجائے گی۔ جیسا کہ دنیا کے دیگر ممالک میں ہوا ہے، جن میں سے کچھ کے نام اوپر لیے جا چکے ہیں۔

ہ: اسکولی اساتذہ کو ملک کے اہم ترین اثاثہ کے روپ میں شمار کیا جانا چاہیے۔ ان کی تنخواہیں ان کی ذمہ داریوں کے مطابق ہونی چاہئیں۔ انھیں ایسا سماجی رول اور اہمیت دی جائے جس سے وہ قومی ترقی کے عمل کو موثر طور پر آگے بڑھا سکیں۔ آج ملک میں اسکولی اساتذہ کی دیکھ بھال پر سب سے کم توجہ دی گئی ہے۔

چیف ایڈیٹر: آپ کے خیال میں ۱۹۶۸ کی تعلیمی پالیسی کے کیا نقائص یا خامیاں ہیں۔ کیا براہِ کرم آپ اُن گوشوں کی نشاندہی کریں گے جہاں کہ ہم اپنے مقاصد کے حصول میں بُری طرح ناکام رہے ہیں۔

جے۔ ایم۔ بھارگو: کیا فی الواقعی ہم نے ۱۹۶۸ میں کوئی پالیسی وضع کی تھی؟ درحقیقت کوئی پالیسی ہی نہ تھی۔ پالیسی تو ہم اسے کہہ سکتے ہیں جو قابلِ عمل ہو، اور جس پر عمل درآمد سے سماجی طور پر ایسے پسندیدہ مقاصد کی تکمیل ہو سکے۔ جن سے ہم آگے بڑھ سکیں۔ لہٰذا ۱۹۶۸ کی نام نہاد پالیسی سے یہ مقاصد حل نہیں ہوئے

تھے۔ یہ ایک طرح سے تعلیم کے عمل کو جوں کا توں آگے بڑھانے کی حکمتِ عملی تھی۔ گویا کہ تعلیم کو استحصال پسندی کے ایک ذریعے کے طور پر نہ کہ ایک عمل کے طور پر آگے بڑھانا تھا۔ یہ ملک کے سبھی عوام کی حقیقی ترقی کا ذریعہ نہ تھی، یہ تو صرف چند منتخبہ عوام کے لیے ہی تھی۔

چیف ایڈیٹر:۔ آج تعلیم پر الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ اس نے سماج میں نابرابری پیدا کی ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ سرکاری تعلیم اور سرکاری اسکولوں کے مروجہ نظاموں کے پیشِ نظر یہ نابرابری پائی جاتی ہے۔ تعلیم بالخصوص اعلیٰ تعلیم زیادہ مہنگی ہوتی جارہی ہے۔ اور یہ نچلے درجے کے درمیانہ طبقے اور غریبوں کی دسترس سے باہر ہوتی جارہی ہے۔ یہ نابرابری کیسے دور ہو سکتی ہے۔

پی۔ ایم۔ بھارگو:۔ آپ صحیح کہتے ہیں حصولِ آزادی کے وقت سے تعلیم وہ واحد سب سے بڑا سبب ہے جس نے سماج میں نابرابری پیدا کی ہے۔ تعلیم کو نئی سمتیں دینے کے لیے چند اقدامات کی پہلے ہی وضاحت کی جاچکی ہے۔ تاکہ ان کے ذریعے مطلوبہ مقاصد حاصل کئے جاسکیں، اور زیادہ نابرابری دور کی جاسکے۔ مثال کے طور پر ہمارے ملک میں ایک ہی طرح کے اسکول ہونے چاہئیں اور وہ ریاست کے زیرِ انتظام ہونے چاہئیں۔ ہمیں اسکولی تعلیم پر کالج کی تعلیم سے زیادہ توجہ دینی چاہیئے اور اس بات کو یقینی بنانا چاہیئے کہ اسکولوں کو بہتر کارگزاری دکھانے کے لیے درکار تمام ضروری سہولتیں انھیں میسّر آئیں۔ ان سہولتوں کا ذکر میں نے پہلے بھی نیو کیوسٹ (New Quest ۹، ۱۹) میں مئی، جون کے شمارے میں کیا ہے۔

چیف ایڈیٹر:۔ ہر ضلع میں مرکزی سیکٹر میں ماڈل اسکول کھولنے کے فیصلے کا سوال ہے تاکہ ذہین دیہی طلباء کو معیاری تعلیم دی جاسکے قطع نظر اس کے کہ ان کی مالی حالت کیا ہے۔ اس سے نابرابری دور کرنے میں کس حد تک مدد ملے گی۔

پی۔ ایم۔ بھارگو:۔ میں اس فیصلے سے متفق نہیں ہوں کہ اس سے صرف استحقاق یافتہ، اور غیر استحقاق یافتہ طبقوں کے درمیان فرق کی جڑیں اور گہری ہوں گی۔ ملک میں ہر اسکول ایک ماڈل اسکول ہونا چاہیئے۔ بنیاد اگر وسیع ہے تبھی ذہین طلباء کے لیے اسکولوں سے کچھ حاصل ہوگا۔ ہر طالب علم کو ہر طرح کے امتیاز سے بالاتر کرکے برابر کے مواقع دینے ضروری ہیں تاکہ پوری آبادی میں سے ذہین طلباء کی تلاش عمل میں آسکے۔ یہ ذہین طلباء تھوڑی سی آبادی ہی میں سے نہیں لیے جانے چاہئیں۔ موجودہ صورتِ حال تو استحصال کے لیے زمین ہموار کرے گی۔ اس سے قومی ترقی ممکن نہیں۔ مجوزہ ماڈل اسکول استحقاق یافتہ عوام کے ہاتھوں غیر استحقاق یافتہ عوام کے استحصال کا ایک اور موقع فراہم کریں گے۔

چیف ایڈیٹر:۔ یہ دستاویز پورے ملک کے لیے تعلیم کے مرکوزہ پروگراموں کی ضرورت پر زور دیتی ہے تاکہ اقتصادی، سماجی، سیاسی اور ثقافتی، پیشہ رشتوں کے مقاصد حاصل کئے جاسکیں۔ اس کے لیے مشترکہ بنیادی و کلیدی نصاب کی تیاری کی ضرورت بتائی گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ نصاب کس نوعیت کا ہو؟ اس میں درس و تدریس کے روایتی طریقوں کو سامنے رکھا گیا ہو یا اسے نوعِ انسانی سے محبت اور معقولیت پسندی کے اصولوں سے محبت کی بنیاد پر وضع کیا جائے۔ کیا اس کے ذریعے عوام میں سائنسی مزاج پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے؟

پی۔ ایم۔ بھارگو:۔ بنیادی و کلیدی نوعیت کے نصاب کی تیاری کا خیال بہت اچھا ہے۔ اس بات کو میں نیو کیوسٹ کے مذکورہ آرٹیکل میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں اور بھی متعدد موقعوں پر میں نے اس کا اعادہ کیا ہے۔ جہاں تک نصابات کی بنیاد کا سوال ہے، اس کے لیے میں ایک نوٹ اس سے منسلک کر رہا ہوں۔ یہ نوٹ میں نے این سی ای آر ٹی (نیشنل کونسل فار ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ) کے لیے تیار کیا تھا۔ میں اس ادارے کی متعلقہ کمیٹی کا صدر تھا اور اس موقع پر میں نے اسے پیش کیا تھا۔ اس

میں تعلیم کے مقصد کو مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ اور ان خطوط کی نشاندہی کی گئی ہے جن کی بنیاد پر نصاب تیار کیا جا سکتا ہے۔

چیف ایڈیٹر: اس بات پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ مقصد رہتے ہیں نام نہاد سیکولرزم کی اصطلاح سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہم گذشتہ برسوں میں مسلسل اس کی ترویج و اشاعت کرتے رہے ہیں تاکہ عوام کے درمیان تنازعات اور اختلافات دور ہو سکیں۔ کیا اس تصور نے سماج میں اتحاد اور ہم آہنگی لانے کے سلسلے میں ذہنوں کے ارتباط کے لیے کسی بھی طرح مدد کی ہے۔

ڈی۔ ایم۔ بھارگو: نہیں۔ ہم محض الفاظ کے ذریعے تخریب پسندانہ، انتشار پسندانہ اور آپس میں انسانوں کو بانٹنے والے رجحانات سے نہیں بچ سکتے مگر ہم کر یہی رہے ہیں۔ کیا کبھی فی الواقع کسی نے عملی طور پر اور ٹھیک انداز میں یہ بتلانے کی کوشش کی کہ ہماری تعلیم ہمیں کہاں لے جا رہی ہے۔ ملک میں تعلیم کے مقاصد کیا ہیں۔ ذہنوں کا اختلاط و ارتباط، نیز اتحاد اور ہم آہنگی کی اصطلاحات کا مقصد اس حوالے سے جس میں کہ آپ نے انھیں استعمال کیا ہے، میرے سامنے کچھ نہیں ہے۔ میرے نزدیک یہ اضافی اصطلاحات ہیں، بنیادی نہیں۔ تعلیم کے ذریعے بنیادی اقدار کی پرورش ضروری ہے۔ اور ایسی اقدار کا پروان چڑھانا ضروری ہے جو کہ ابھی بیان کی جا چکی ہیں۔ اس مقصد کی تکمیل سے ہمارا ادعا مسئلہ حل ہو جائے گا تعلیم کے ذریعے ایک ایسا نوجوان ابھر کر سامنے آنا چاہیے جو مذکورہ اقدار کا نمونہ ہو۔ جہاں تک کھانے پینے، رہن سہن کی عادتوں اور طبائع کے اختلافات کا سوال ہے، ان کو گوارا کیا جانا چاہیے اور نہ صرف گوارا بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے اس طرح کے اختلافات تو ترقی کا ذریعہ بنتے ہیں، لیکن یہ شعور صحت مند بنیادوں پر آگے بڑھنا چاہیے۔

چیف ایڈیٹر: اس دستاویز کی رو سے مطلوبہ رجحانات اور صلاحیتوں کے حامل افراد کو تیار کرنا اور انھیں عملی زندگی میں لانا ہی تعلیم کا بنیادی فریضہ ہے جس سے کہ ملک تیزی سے اقتصادی اور سماجی سطح پر آگے بڑھ سکے۔ آپ کے خیال میں کیا تعلیم نے اس مقصد کو پورا کیا ہے؟ آج ملک میں دہشت پسندی، فرقہ وارانہ جھگڑے اور احیاء پرستی کے جذبات کیا یہ نہیں بتاتے کہ تعلیم اپنے مقصد میں ناکام رہی ہے؟

ڈی۔ ایم۔ بھارگو: جی ہاں تعلیم اب تک ملک میں ان مقاصد کی تکمیل میں ناکام رہی ہے جن کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ اس کا بالآخر تجزیہ یہی بتاتا ہے کہ آج ان برائیوں کی ذمہ داری جن کا آپ نے ذکر کیا ہے، تعلیم ہی کے سر جاتی ہے۔

چیف ایڈیٹر: کچھ حلقوں سے یہ مانگ ہو رہی ہے کہ تعلیم کو آئین کی یونین لسٹ میں شامل کیا جائے، تاکہ سرکار تعلیمی نظام کو یکساں طور پر ملک گیر پیمانے پر پھیلا سکے۔ کیا اس سے مدد ملے گی؟ آپ اس بارے میں کیا سوچتے ہیں؟

ڈی۔ ایم۔ بھارگو: میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ یکسانیت کس طرح کی ہو؟ اس پر بہت محتاط طریقے سے غور کرنا ہوگا۔

چیف ایڈیٹر: دستاویز میں کہا گیا ہے کہ ۱۹۶۸ کی تعلیمی پالیسی کی ناکامی کی بڑی وجہ وسائل کی کمی اور عدم دستیابی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ اس پالیسی کو بروئے کار لانے کے لیے ضروری اقدامات نہیں کیے جا سکے۔ میرا مشورہ ہے کہ وسائل کی فراہمی کے لیے ٹیکس بڑھائی جائے۔ اجتماعی طور پر رقومات لی جائیں۔ اور اعلیٰ تعلیم کی افرادی قوت سے استفادہ کرنے والے محکموں سے عطیات لیے جائیں۔ اس ضمن میں آپ کی رائے میں کیا کیا جانا چاہیے۔

ڈی۔ ایم۔ بھارگو: میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ تعلیم کے لیے وسائل کافی نہیں تھے، خاص کر دسویں جماعت تک کی تعلیم کے لیے۔ اس سلسلے کے ضروری اعداد و شمار میں نے اس مضمون میں دیے ہیں جو کہ نیوکیوسٹ (New Quest) میں شائع ہوا ہے اور جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ البتہ فیصلہ کرنے والی سطح پر سماجی، اقتصادی اور سیاسی عزم کی کمی اس کا اصل سبب ہے۔ تعلیم کو جمہوری انداز پر آگے

بڑھانے کے لیے کون کوشاں ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو ایسا کرنے کے اختیارات نہیں رکھتے۔

چیف ایڈیٹر:۔ ملازمتوں کے لیے ڈگری کی شرط ہٹا دینے کی تجویز کے لیے ملے جلے خیالات ہیں۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس سے چیدہ چیدہ طبقات کے لوگ فائدہ اٹھائیں گے جبکہ کچھ ایسا سمجھتے ہیں کہ انڈر گریجویٹوں کا بڑھتا ہوا دباؤ کم ہو سکے گا بشرطیکہ ان کے لیے تربیت کے مواقع اور ملازمت کی یقین دہانی کرادی جائے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟۔

پی۔ ایم۔ بھارگو:۔ ملازمت کے لیے ڈگری کی شرط ضرور ہٹا دینی چاہیئے۔ دس جمع دو جمع تین فارمولے کا اصل مقصد بھی یہ تھا۔ مطلب یہ تھا کہ ہائی اسکول کے بعد دو تہائی طلبا سے لے کر تین چوتھائی طلبا تک پیشہ ورانہ تربیت کے لیے جانا پسند کریں گے۔ امید یہ کی گئی تھی کہ ہر طالب علم ہائی اسکول ضرور پاس کرلے گا۔ البتہ باقی ایک تہائی یا ایک چوتھائی تعلیمی مقصد کے لیے خود کو لگا دیں گے۔ پیشہ ورانہ تربیت لینے والے امیدوار مخصوص نوعیت کے کاموں پر جُٹ جائیں گے، وہ ڈگری نہیں لیں گے۔ ان پیشہ ورانہ کاموں میں تعلیم اور ملازمت کو جوڑ دیا جائے گا۔ البتہ جو طلباء اعلیٰ تعلیم حاصل کریں گے وہ خالص علمی نوعیت سے اپنی تعلیم کو جاری رکھیں گے۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ انسانی ترقی کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ تعلیم کو محض تعلیم کے لیے ہی حاصل کیا جائے۔ بنیادی تحقیق میں سرمایہ کاری کے لیے یہی وجہ بتائی جاتی ہے۔ یونیورسٹی کی سطح کی تعلیم اعلیٰ معیار کی ہوگی۔ ملازمتوں کے لیے ڈگری کی شرط لگانے سے معیار اعلیٰ نہیں رہے گا۔ اور ملک تعلیمی معیار میں پیچھے رہے گا۔ دنیا کے دیگر ملکوں کے مقابلے تعلیمی سطح کا ہمارا معیار کم تر پایا جائے گا۔ سماج وادی ملکوں میں بھی اعلیٰ تعلیم یعنی کہ یونیورسٹیوں کی ڈگری وغیرہ کو ملا ... کے لیے ضروری نہیں سمجھا گیا ہے۔

چیف ایڈیٹر:۔ کچھ یونیورسٹیوں میں برابر لاقانونیت پائی گئی۔ وہ بدنظمی کا شکار ہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے احاطے میں سیاسی عمل دخل تھا۔ یہ تصور کیوں ترقی پا رہا ہے۔ اس کے سدباب کے لیے آپ کی رائے میں کیا کرنا چاہیئے تاکہ یونیورسٹیوں کا ماحول بہتر ہو سکے۔

پی۔ ایم۔ بھارگو:۔ زیادہ تر یونیورسٹیوں میں جب طلبا کو تعلیم سے دلچسپی یا سروکار نہ ہو تو آپ کیا اُمید کریں گے؟۔ زیادہ تر اُستادوں کو تعلیم دینے اور پڑھانے سے دلچسپی نہیں، کہیں کہیں تو وہ تعلیم دینے کے اہل ہی نہیں۔ پھر انتظامیہ ایسا کہ اسے تعلیمی ضرورتوں کا علم ہی نہیں۔ پھر یہ سب کچھ سیاسی نظام والے ایک ایسے ملک میں جہاں تعلیم کو اپنے مفادات کے لیے کام میں لایا جائے۔ اس کے لیے بنیادی شرط یہی ہے کہ پرائمری تعلیم سب کے لیے عام اور ضروری کی جائے، اسے جمہوری طریقوں پر آگے بڑھایا جائے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ اگر ہم اسکولی تعلیم پر دھیان دیں تو یونیورسٹی سطح کی تعلیم خود بخود درست ہو جائے گی۔ اور نچلی سطح سے جو تقاضے اُبھریں گے وہ یونیورسٹی سطح کی تعلیم درست کردیں گے، جیسا کہ دوسرے ملکوں میں ہوا ہے۔

پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک کے لیے نظرثانی شدہ نصابات کا ایک خاکہ

ضروری باتیں

۱۔ ۱۹۷۶ میں این سی ای آر ٹی (NCERT) نے چھٹی اور ساتویں جماعتوں کے لیے سائنس کی مربوط تعلیم کے واسطے ایک ایڈیٹوریل بورڈ قائم کیا تھا اور اس بورڈ کے لیے نصابات کا یہ خاکہ تیار کیا گیا تھا۔

ایڈیٹوریل بورڈ نے ۱۷ اپریل ۱۹۷۶ کو نئی دلی میں منعقدہ اپنی میٹنگ میں اسے منظوری دی تھی۔

۲۔ یہ خاکہ اصولی طور پر دیگر مضامین کے لیے بھی قابلِ عمل سمجھا گیا۔ اسکول میں پڑھائے جانے والے مضامین، مثلاً سائنس، سماجی سائنس، لسانیات، ریاضی، فنونِ لطیفہ، جسمانی کسرت وغیرہ جیسے موضوعات کے لیے بھی یہ موزوں سمجھا گیا۔ این سی ای آر ٹی کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر رئیس احمد سے میں نے ذاتی طور پر درخواست کی تھی کہ وہ اسے این سی ای آر ٹی کے دیگر ایڈیٹوریل بورڈوں میں گشت کروا دیں لیکن شاید ایسا نہ ہو سکا۔ اس کا

بڑا مقصد یہ تھا کہ مختلف درسی کتب اس طرح نہ لکھی جائیں کہ وہ بلحاظ مقاصد آپس میں ٹکرائیں اور ایک کتاب اپنے مقصد کے لحاظ سے دوسری کتاب کے مقصد کی نفی کرے۔

تعلیم کے مقاصد

۱۔ ان اقدار اور تصورات کی تشہیر اور ان کی بیداری (سیکولرازم، جمہوریت) جن کے لیے قوم نے عہد کیا ہے اور قوم جن کے لیے پابند ہے۔

۲۔ ایسے علم کا حصول جس سے کہ وہ ماحول کو سمجھ سکے اور مقصدیت اور سوجھ بوجھ نیز معقولیت پسندی کے راستے درست فیصلوں پر پہنچ سکے۔ نیز ہر سطح پر دوسروں کے فیصلوں کو پرکھ سکے یعنی برادری، قومی اور بین الاقوامی سطح پر کیے گئے فیصلوں کے صحیح یا غلط ہونے کی جانچ کر سکے۔ ان عادتوں سے ہم روزمرہ کی زندگی میں کام لینے کے عادی بن سکیں۔

۳۔ ایسی ہنرمندی کا حصول جو روزی روٹی کمانے میں معاون ہو سکے اور کوئی مفید، نفع بخش اور پیداوار بڑھانے میں معاون دھندہ شروع کر سکے۔ جس میں اس کا ذہن کام کر سکے، اور جہاں وہ اپنی صلاحیتوں سے بھرپور کام لے سکے۔

۴۔ مذکورہ بالا مقاصد کی تکمیل اس ڈھنگ سے ہو کہ وہ سماجی تبدیلی لانے کا ذریعہ بن سکے۔

درسی کتابوں نیز نصابات کے ذریعے کن اقدار یا تصورات کی پرورش اور تشہیر کی جانی چاہیئے

۱۔ ہمیں سائنس، ٹکنالوجی، قانون، سرکار، سیاسی نظاموں، اقتصادیات اور منصوبہ بندی کے علوم آنے چاہئیں، جن سے ماحول کو سمجھا اور پرکھا جا سکے۔ ان کے جاننے کے بعد ہی ان کی پرکھ ہو سکتی ہے اور اس کے بعد ہی دوسروں کی طرف سے کیے گئے فیصلوں کے حسن و قبح کو سمجھا جا سکتا ہے۔

۲۔ علم کا حصول سائنسی طریقے پر ہی ہونا چاہیئے۔ اس کی بنیاد معقولیت پسندی پر ہونی چاہیئے۔ صاف ذہن، کھلے ذہن، ہر بات کو وجہ کے ساتھ سمجھنے کی صلاحیت، فیصلہ کی قوت وغیرہ کا ملکہ پیدا کرنے کی کوشش ہونی چاہیئے۔

۳۔ ماضی کو جاننے اور پھر اسے سمجھنے کی صلاحیت۔

۴۔ صحیح جانچ پڑتال اور اندازہ صحیح صحیح لگانے کی صلاحیت کا فروغ۔

۵۔ کام کی عظمت، صحت کی عظمت یعنی یہ کہ (تمام کام دلچسپ ہیں)، آرام کی قیمت اور اس کا مفہوم اور اہمیت۔

۶۔ تعلیم اور کام کے درمیان تعلق اور ان کا ایک دوسرے پر انحصار۔

۷۔ انسانی وقار اور اس کی عظمت، دوسروں کی تعظیم و تکریم، ان کے حقوق کو پہچاننا، سماجی بیداری، مشترکہ بھلائی کا تصور، ضوابط کی پابندی۔

۸۔ سیکولرازم، قومی یکجہتی، مساوات بلحاظ جنس، ذات پات، مذہب، گروپ وغیرہ۔ مسائل مثلاً چھوت چھات بین الاقوامیت (عالمی تاریخ و جغرافیہ سے واقفیت)، قوموں کے درمیان باہمی انحصار، غیر جانبداری۔

۹۔ سوشلزم، استحصال کے خلاف جنگ، سماجی انصاف، شخصی املاک کے تئیں رویئے۔

۱۰۔ جمہوریت۔

۱۱۔ کثرت الوجود سماج کا تصور۔

۱۲۔ امن۔

۱۳۔ آرگنائزیشن کا تصور اور غلط روی یا ابتری کے مقابلے میں اس کی اہمیت۔

۱۴۔ آزادی کا تصور (آزادی اور پابندی)، حقوق اور ذمہ داریاں، سوال پوچھنے کا حق۔

۱۵۔ تخلیقی صلاحیتوں کا فروغ، صحتمند استفسارات، سوالات کے جوابات مہیا کرنا اور اس کے لیے کوششیں کرنا۔

۱۶۔ جدیدیت، حالات کے مطابق ڈھلنے کی صلاحیت، محنت بچانے اور نچلے درجے کے کاموں کو ٹھیک ڈھنگ سے انجام دینے کے طریقے۔

۱۷۔ صلاحیت، خیالات اور افکار و عمل کی تنظیم۔

۱۸۔ بہتر سے بہتر کام انجام دینے کا شوق۔

۱۹۔ مستقبل کے مسائل کو حل کرنے کی تشویش۔

۲۰۔ خاندانی منصوبہ بندی۔

۲۱۔ قدرتی اور دیگر وسائل کا تحفظ، پانی،

(باقی صفحہ ۲ پر)

ڈاکٹر ایل۔ کے۔ جھا

تعلیم کا مسئلہ کیسے حل کیا جائے

ڈاکٹر ایل۔ کے جھا کے خیالات

ملک کے لیے ایک موزوں تعلیمی پالیسی کی تشکیل کے بارے میں ڈاکٹر ایل۔ کے جھا کے خیالات جاننے کے لیے مدیرِ اعلیٰ "یوجنا" نے موصوف سے مفصل ملاقات کی۔ ان کے اس انٹرویو کا متن درج ذیل ہے۔

مدیرِ اعلیٰ: تعلیم کا چیلنج۔ ایک حکمتِ عملی کا تناظر" نامی دستاویز کو جاری ہوئے کئی ماہ ہو چکے ہیں۔ کیا آپ اس بات سے متفق ہیں کہ یہ دستاویز آج کے تعلیمی نظام کا حقیقت پسندانہ تجزیہ پیش کرتی ہے اور اس میں تعلیم کو جو سمت دینے کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے وہ ایک پُرجوش، متحرک اور باعمل قوم کی حیثیت سے ہمارے اکیسویں صدی میں داخلے کی ضرورتوں کے مطابق ہے؟

ڈاکٹر ایل۔ کے جھا: بھئی سب سے پہلے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں اس قسم کی بحث کا خیر مقدم کرتا ہوں کیوں کہ یہ دستاویز سرکاری فیصلوں کے اعلانات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ یہ بھارت کے تمام عوام کو، بالخصوص ماہرینِ تعلیم کو اپنے خیالات ظاہر کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج اور آج سے پہلے کے حالات کا جو تجزیہ پیش کیا گیا ہے وہ واجبی حد تک درست ہے اور اس میں جو مسئلے اُٹھائے گئے ہیں وہ اہم اور حقیقی ہیں۔ اس میں جن امُور پر زور دیا گیا ہے، میں ان سے متفق ہوں۔

مدیرِ اعلیٰ: آپ کی رائے میں، ہم نے ۱۹۶۸ء میں جو تعلیمی پالیسی اختیار کی تھی، اس میں کیا خرابی تھی؟ کیا آپ مختصراً یہ بتائیں گے کہ وہ کون سے بڑے شعبے تھے جن میں ہم اپنے مقاصد حاصل کرنے میں بُری طرح ناکام رہے ہیں؟

ڈاکٹر جھا: بھئی میں نہیں سمجھتا کہ میں ۱۹۶۸ء کی پالیسی کی ناکامی کی وجوہات یا اس

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] مانگ کے اندر سے [illegible] والی مانگ
کے درمیان فرق ہوتا ہے۔ ہمیں اس
مسئلے کی جڑ تک پہنچنا ہوگا۔ ہمیں
ماننا چاہیے کہ عام لوگ جو اپنے
بچوں کو اسکول اور کالج بھیجتے ہیں
ان کا آخری مقصد اعلیٰ اور برگزیدہ
طبقے کی طرح صرف ثقافت کو جذب
کرنا نہیں ہوتا بلکہ یہ ہوتا ہے کہ ان
کے بچے اس قابل بن جائیں کہ ملازمت
حاصل کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے
کالجوں اور ایسی ڈگریوں کی مانگ بہت
زیادہ ہے جن کی بدولت سرکاری
اور کاروباری اداروں میں ملازمت
حاصل کی جاسکے کیوں کہ ہر جگہ گریجویٹ
ہی مانگے جاتے ہیں۔ اس لیے جو
والدین اپنے بچوں کو تعلیم دلانا چاہتے
ہیں وہ انھیں ڈگری حاصل کرنے کے
لیے کالج بھیجتے ہیں۔ لہٰذا اعلیٰ تعلیم
کے انتظام کے لیے زیادہ وسائل
مختص کیے جاتے ہیں۔ پرائمری تعلیم
یا خواندگی کو ماہرین تعلیم بہت اہم
سمجھتے ہیں لیکن لوگ نہیں سمجھتے کہ
اس کی کوئی زیادہ افادیت ہے۔

مثال کے طور پر اگر میں ہل جوتنے
والا کسان یا موچی یا لوہار ہوں اور اگر
میرے لڑکے کو بھی یہی کام کرنا ہے
تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ
پڑھا لکھا ہے یا اَن پڑھ۔ اس طرح
پرائمری سطح کی تعلیم کے بارے میں عوام
میں کوئی کشش نہیں ہے اور ریاستی
حکومتیں جو انتخابات میں عوام کے
سامنے جواب دہ ہیں، وہ ماہرین تعلیم
کے مشورے پر عمل کرنے کی بجائے
عوام کی مانگ کو پورا کرنا پسند کرتی
ہیں۔

مدیر اعلیٰ: آج تعلیم پر سماج میں نابرابری
پیدا کرنے کا الزام بھی عائد کیا جاتا
ہے۔ میرا مطلب پبلک اسکولوں
اور سرکاری اسکولوں سے ہے۔
تعلیم، بالخصوص اعلیٰ تعلیم زیادہ مہنگی
اور غریب اور نچلے متوسط طبقوں کی
پہونچ سے باہر ہوتی جارہی ہے۔ یہ
نابرابری کیسے دور کی جاسکتی ہے؟

ڈاکٹر جھا: بھائی میں نہیں سمجھتا کہ میں
اس خیال سے اتفاق کرتا ہوں کہ تعلیم
نابرابریاں پیدا کرتی ہے۔ ہاں
نابرابری کے نتیجے میں نظام تعلیم مسخ
ہو جاتا ہے۔ امیروں کے بچے بہتر
تعلیم حاصل کرسکتے ہیں لیکن ایسا
اقتصادی شعبے میں تعلیمی نظام کی
وجہ سے نہیں ہے بلکہ خود اقتصادی
نظام کی وجہ سے ہے۔ لیکن ایک کمزوری
جو میں فلاحی نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہوں
اور جس کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں
یہ ہے کہ ہم تعلیم کو سب کی پہونچ کے
اندر لانے کے لیے اپنے کالجوں کی
فیس بہت کم رکھتے ہیں۔ اس طرح دیکھا
جائے تو کالجوں کے تمام طلبا ایک طرح
سے سرکاری مدد سے پڑھتے ہیں۔ ان میں
زیادہ امیر والدین کے لڑکے بھی شامل
ہیں۔ لیکن اتنے زیادہ وسائل ہمارے
پاس ہیں نہیں۔ ہم تعلیم کے لیے وسائل
کی کمی کی شکایت کرتے ہیں لیکن یہ وسائل
کا پُرتعیش استعمال ہے۔ میں تو ایسے
نظام کو پسند کروں گا جس میں فیس
بڑھا دی جائے لیکن ساتھ ہی وظیفوں
کی تعداد اتنی زیادہ رکھی جائے کہ جو لوگ
تعلیم کی پوری قیمت نہیں دے سکتے
اور جو غریب ہیں ان سے (Subsidy) سرکاری
امداد کی بنا پر کم فیس لی جائے یا پھر
انھیں وظیفے دیے جائیں۔ اس طرح
ہمیں آمدنی کی سطحوں میں نابرابری کو
جو اقتصادی نظام ہی کا ایک حصہ ہے
گھٹانا ہوگا۔ ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہیے
کہ تعلیم کا کوئی ایسا ڈھانچہ ہو سکتا ہے
جو ازخود نابرابری کو کم کر دے گا۔

بعض اوقات یہ خیال ظاہر کیا
جاتا ہے کہ زیادہ مہنگی قسم کی تعلیم جو
کوالٹی کے لحاظ سے بہتر ہوسکتی ہے
لیکن جسے صرف امیر لوگ ہی حاصل
کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں، اس
کی حوصلہ افزائی نہیں کی جانی چاہیے
کیوں کہ اس سے نابرابریوں کو بڑھاوا
ملے گا۔ میں اس سے اتفاق نہیں
امیروں اور غریبوں کے درمیان نابرابری

کو، جو بلاشبہ ایک حقیقت ہے اور باعثِ تشویش ہے، اقتصادی محاذ پر مناسب اقدامات کے ذریعے کم کیا جانا چاہیئے۔ لیکن جہاں تک آمدنی کی نابرابریوں کا تعلق ہے وہ تو نہ صرف ہمارے یہاں، بلکہ تمام ملکوں میں موجود ہیں لہٰذا لازمی طور پر امیر لوگ وہ بہت سی چیزیں حاصل کر سکیں گے جو غریب حاصل نہیں کر سکتے۔ مجھے کوئی وجہ نہیں دکھائی دیتی کہ ہم غریبوں سے کہیں کہ وہ بہتر مکانات میں رہ سکتے ہیں، بہتر کھانا کھا سکتے ہیں اور اُن بہت سی آسائشوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو بہتوں کو حاصل نہیں ہیں۔ لیکن وہ اپنے بچوں کو غریب ترین لوگوں سے بہتر تعلیم نہیں دلا سکتے۔ اگر کچھ لوگ ایسے ہیں جو دوسروں سے زیادہ مالدار ہیں تو میں یہی چاہوں گا کہ وہ دیگر مرغوب اشیا پر روپیہ خرچ کرنے کی بجائے اپنے بچوں کو بہتر تعلیم دلانے پر خرچ کریں۔ دراصل ہونا تو یہ چاہیئے کہ ہم اس بات کو یقینی بنانے کے لیے قدم اٹھائیں کہ غریبوں کے ہوشیار اور ذہین ترین بچے بھی بہترین تعلیم پا سکیں اور ایسے راستے ڈھونڈ سکیں جن سے وہ سہولیات جو صرف امیروں کو ہی دستیاب ہیں انھیں بھی حاصل ہوں۔

مدیرِ اعلیٰ: اب دیہات کے پڑھائی میں ہوشیار بچوں کو، ان کی اقتصادی حیثیت کا لحاظ کئے بغیر اعلیٰ قسم کی تعلیم دلانے کے لیے ہر ضلع میں ماڈل اسکول قائم کرنے کا جو فیصلہ کیا گیا ہے اس کے بارے میں کچھ فرمایئے۔ کیا اس سے نابرابری دور کرنے میں مدد ملے گی؟

ڈاکٹر چھابڑہ: جی ہاں میرا خیال ہے ملے گی کیونکہ جن دیہی علاقوں میں صحیح معنوں میں اچھے اسکول نہیں ہیں وہاں کے بچوں کو دوہری مجبوریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ بہتر تعلیم، خاص کر وہ تعلیم جو غیر سرکاری طور پر چلائے جانے والے پبلک اسکولوں میں دی جاتی ہے، زیادہ خرچیلی ہوتی ہے بلکہ اگر انھیں اپنے بچوں کو شہر کے ہوسٹلوں میں بھیجنا پڑے تو طلبا کے شہر میں رہنے کا خرچ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ غریب والدین برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لیے لوگوں کی جائے رہائش کے قریب، یا یوں کہئے کہ ہر ضلع میں بہتر اسکول کھول کر ہم دراصل نابرابریوں کو کم کر رہے ہیں نہ کہ پیدا کر رہے ہیں۔

مدیرِ اعلیٰ: دستاویز میں اقتصادی، سماجی، سیاسی اور ثقافتی ترقی کے واسطے سارے ملک کے لیے تعلیم کے مربوط پروگرام کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ اس کے لیے اس میں ایک عام بنیادی (CORE) نصاب تعلیم کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ یہ نصاب کس قسم کا ہونا چاہیئے؟ کیا یہ روایتی طریق تعلیم کی طرز کا ہونا چاہیئے یا اسے نئے سرے سے اس طرح مرتب کیا جائے کہ اس میں ہمارے عوام میں سائنسی مزاج کی نشوونما کے ذریعے معقولیت پسندی اور انسان دوستی شامل کی جا سکے۔

ڈاکٹر چھابڑہ: میرا خیال ہے کہ تعلیم سے عوام میں سائنسی مزاج پیدا ہونا چاہیئے۔ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ آپ خود اپنے دماغ سے کام لیں نہ کہ کسی اور برتر اقتدار شخصیت کے خیالات کو صرف اس لیے مقدس سمجھتے ہوئے اختیار کریں کہ وہ عظیم قومی اہمیت کی کسی گذشتہ یا موجودہ شخصیت کی دین ہیں۔ اب اگر طلبا کے سامنے عقائد کا کوئی مجموعہ پیش ہے وہ ایک عام (CORE) نصاب کا حصہ ہی کیوں نہ ہو، اس لیے رکھا جائے کہ وہ بلا چوں وچرا اسے تسلیم کریں تو اس سے خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ لیکن اگر ہم ان کی حوصلہ افزائی کریں کہ وہ خود اپنے ذہن سے کام لیں جیسے کہ ایک سائنس داں کرتا ہے تو بہتر نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ سائنس داں ہمیشہ اپنے پیش روؤں کی تحقیقات سے یا نظریات بلا جھجک مسترد کر دیتے ہیں، خواہ وہ کتنے ہی بڑے سائنسدانوں کے پیش کئے ہوئے کیوں نہ ہوں۔ نیوٹن کے نظریات کتنے مسلّم تھے لیکن آئنسٹائن نے انھیں تسلیم نہ کیا اور بے جھجک اڑا دیا۔ لیکن دوسرے شعبوں میں، میرا مطلب ہے غیر سائنسی شعبوں میں ہمیشہ سے یہ رجحان رہا ہے کہ اگر کسی وقت کسی بڑے آدمی نے کوئی بات کہی ہے تو اسے ایک گہری سچائی سمجھ کر تسلیم کیا جائے اور اگر آپ اسے بدلنا چاہیں تو پھر آپ اسے

اپنی پسند کے مطابق مختلف انداز میں پیش کرنا شروع کردیں۔ یہ ریاکاری ہے لہٰذا ہمیں راست غور و فکر، واقعیت پسندانہ غور و فکر اور آزادانہ غور و فکر کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔ اور اس غور و فکر کا سامان مہیا کرنا چاہیئے انھیں زبان جاننی چاہیئے، علم ریاضی جاننا چاہیئے اور منطقی اور درست انداز میں سوچنے کا طریقہ سیکھنا چاہیئے لیکن سوچنے آپ ان کو اپنے ڈھنگ سے دیجیئے۔

؟ : ایک بات اس سے قریبی تعلق رکھتی ہے اور وہ ہے مشترکہ ثقافت کا نظریہ جسے ہم اتنے برسوں سے عوام کے ذہن نشین کرانے کی (انگریزی کے محاورے میں بیچنے کی کوشش) کرتے رہے ہیں تاکہ وہ اپنے اختلافات کو ختم کردیں۔ کیا اس نظریئے سے عوام کے دلوں میں یگانگت کا جذبہ پروان چڑھا ہے اور ؟ سے معاشرے میں اتحاد و ہم آہنگی پیدا کرنے میں کوئی مدد ملی ہے ؟

ڈاکٹر چھا: دیکھیے ثقافت ایسی چیز نہیں جسے بیچا جاسکے اور جو بیچی جاتی ہے۔ وہ ہرگز ثقافت نہیں ہوتی۔ ثقافت تو ایسی چیز ہے جو خود بخود نمو پاتی ہے۔ اس لیے ہم کوئی ترکیبی ثقافت نہیں رکھ سکتے جو اپنی تجربہ گاہ یا آرٹ اسٹوڈیو میں بیٹھے ہوئے کچھ لوگ ایک مکسچر تیار کرکے بنائیں۔ ایک نئے اتحاد اور ایک امتزاج کی کونپلیں تو اس وقت پھوٹتی ہیں جب ذہنوں کو مختلف ثقافتوں کے لیے کھلا رکھا جائے۔ یہ وصف اہمیت رکھتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ آپ پہلے سے کھانا تیار کرکے طلباء سے کھانے کے لیے نہیں کہہ سکتے آپ کو انھیں بتانا چاہیئے کہ کھانا کیسے پکائیں۔ آپ کو انھیں اس کے لیے ضروری سامان بھی فراہم کرنا ہوگا۔ تبھی آپ ان میں تخلیقی صلاحیت پیدا کرسکتے ہیں اور اسی تخلیقی صلاحیت ہی کی بدولت ثقافتوں کا ایک مرکب تیار کرسکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے ہمارے پاس کثرت ہے اور ہمیں کبھی ملک کے ایک حصے کے آرٹسٹ کو جو قدرت کو ایک خاص نظر سے دیکھتا ہے ملک کے کسی اور حصے میں رہنے والے آرٹسٹ یا زمانہ ماضی کے کسی آرٹسٹ کی نظر سے دیکھنے پر مجبور کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے بلکہ اس کی تخلیقی صلاحیت کو محفوظ رکھنا چاہیئے۔

مدیر اعلیٰ : دستاویز کی رُو سے تعلیم کو ایک ایسے کور سیکٹر (CORE SECTOR) یعنی مرکزی اہمیت کے شعبے کے طور پر فروغ دیا جائے گا جو تیز تر اقتصادی سماجی ترقی کے لیے مطلوب رجحانات اور صلاحیتوں والے افراد فراہم کرسکے۔ کیا آپ کی رائے میں تعلیم ان مقاصد کو پورا کرسکی ہے؟ کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ دہشت گردی، فرقہ وارانہ تصادم اور احیائے مذہب کے جن مسائل سے ہم آج دوچار ہیں ان کی وجہ یہ ہے کہ تعلیم اپنا رول ادا کرنے میں ناکام رہی ہے؟

ڈاکٹر چھا: میں اس کا جواب یوں دوں گا کہ آج تعلیم یافتہ افراد میں ناکامی و محرومی کا جذبہ بہت زیادہ پایا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے یہ تمام غیر صحتمندانہ رجحانات ہماری سماجی زندگی میں رونما ہو رہے ہیں۔ آپ کو نظامِ تعلیم اور اقتصادی نظام کے درمیان جو تعلق ہے اسے بھی دیکھنا ہوگا۔ ہاں اب یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مختلف پیشوں اور شعبوں میں ملازمت کے کیا موقعے پیدا ہونگے لیکن ان مواقع کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں لگایا جاسکتا اور بالفرض درست اندازہ لگا بھی لیا جائے تو سوال یہ اٹھتا ہے کہ آپ مختلف خاندانوں کے طلباء کو کس طرح اس بات کے لیے تیار کریں گے کہ کسی خاص شعبۂ تعلیم میں طلباء کی اتنی ہی تعداد جائے جتنی کہ اندازے کے مطابق جانی چاہیئے کیونکہ ہر شخص تو اپنا انتخاب آپ کرتا ہے۔ طلباء تو اسی شعبے کا انتخاب کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے لیے بہت سے راستے کھل جائیں۔ اس کے علاوہ تعلیم کا موضوع ریاستی حکومت کے دائرۂ اختیار میں آتا ہے۔ اب ایک ریاست میں ملازمت کے مواقع ایک خاص قسم کے ہوسکتے ہیں۔ ملک بھر میں دوسری نوعیت کے۔ چونکہ ایک ریاست کے لوگ دوسری ریاست میں بھی جاتے اور کام کرتے ہیں اس لیے ایسا تعلیمی نظام نہیں رکھا جاسکتا جو ٹھیک ٹھیک اُتنے ہی افراد تیار کرے جتنی کہ ان کی اپنی ریاست میں ضرورت ہو۔ اس کے علاوہ کچھ طلباء دوسری ریاستوں سے

اُن کے یہاں اور اُن کے یہاں سے دوسری ریاستوں میں جائیں گے اور کچھ دوسری جگہوں پر کام کریں گے۔ اس لیے اس بارے میں میری رائے یہ ہے کہ مختلف پیشوں کے لیے بھرتی حتی الامکان جلد سے جلد مرحلے پر کی جانی چاہیے اور اگر آدمی کو اس کا یقین ہو جائے کہ اسے ملازمت کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے خواہ سرکاری اداروں میں یا پرائیویٹ سیکٹر میں یا ٹیکنیکل کام کے لیے یا ہوٹل چلانے کے لیے یا ہاتھوں سے کیے جانے والے کسی کام کے لیے۔ یہاں مجھے اس بات کا یقینی فیصلہ کرنا ہوگا کہ مجھے یہی کیریر اختیار کرنا ہے تبھی میں وہ کورس لونگا جو مطلوبہ ہنرمندی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہوگا۔ لیکن اگر میں نہیں جانتا کہ میں کسی ہوٹل میں کام کروں گا تو مجھے ہوٹل کے کام کی تربیت حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر میں پہلے کسی کورس میں شامل ہوتا ہوں اور پھر اس کے مطابق ملازمت حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہوں تو اس کا کیا فائدہ؟ میں نے ہوٹل کے کام کی تربیت تو حاصل کر لی لیکن وہ کس کام کی؟ یہی وجہ ہے کہ میں اس بات کے حق میں ہوں کہ ملازمت کے لیے ڈگری کو ضروری نہ سمجھا جائے۔ انھیں ابتدائی اسٹیج پر بھرتی کیجیے اور پھر جو مضمون اُن کے کام میں مددگار ثابت ہو سکیں اُن کی ڈگریاں انھیں دیجیے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ انھیں تنگ نظر انسان بننے کی تربیت دیجیے۔ بہت سے ایسے کام ہیں جن کے لیے آپ کو وسیع النظر لوگوں کی ضرورت ہے۔ انھیں روشن خیال پیدا کرنے والی تعلیم دیجیے لیکن کسی مقصد کے ساتھ دیجیے۔ یہ نہیں کہ کوئی شخص عربی پڑھے۔ اور کام ایڈمنسٹریشن (نظم و نسق چلانے) کا کرے۔ کیوں کہ جو کچھ اس نے پڑھا ہے اور جو کام وہ کر رہا ہے اس میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔

مدیرِ اعلیٰ: کچھ حلقوں میں یہ مانگ کی جاتی رہی ہے کہ تعلیم کو آئین کی مرکزی فہرست میں شامل کیا جانا چاہیے۔ خاص کر اس لیے کہ حکومت تعلیمی نظام میں یکسانیت پیدا کر سکے۔ کیا اس سے مدد ملے گی؟ آپ کا کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر جھا: یقیناً۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ تعلیم کا بہت بڑا میدان ایسا ہے جس کے لیے مرکزی سطح پر منصوبہ بندی کی ضرورت ہے نہ کہ ریاستی سطح پر۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ ملازمت کے مواقع ریاست کے اندر ہی محدود نہیں ہیں۔ لہٰذا ایک ملک گیر قومی نظریے کی ضرورت ہے۔ لیکن نچلی سطحوں کی تعلیم کے لیے مقامی ضروریات زیادہ اہم ہیں۔ اگر آپ ان پر توجہ نہیں دیں گے تو مقامی لوگ انھیں پورا کرنے کیلئے دستیاب نہیں ہوں گے۔ اب اگر آپ زرعی علاقے کے ایک آدمی کو اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے کے لیے کہتے ہیں تو اُسے یہ محسوس کرانا ضروری ہے کہ اسکول کی تعلیم اور نواحی علاقوں میں جو پیشے چل رہے ہیں ان میں باہمی تعلق ہے۔ ہاں اگر وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا یا کہیں اور بھیجنا چاہتا ہے تو اور بات ہے مگر دونوں ہی کی گنجائش ہے۔ بہر حال مرکز کے لیے ایک اہم رول ادا کرنے کی کافی زیادہ ضرورت ہے، خاص کر اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں۔ یہ تو میں کہہ ہی چکا ہوں کہ میں اس بارے میں کوئی ایسا سیاسی مباحثہ شروع نہیں کرنا چاہتا، جس میں تعلیم کی ماہیت اور مقاصد و تعلیم کی اصلاح ایسے سوالات کے تابع ہو جائے کہ کس ریاست میں کون سی پارٹی برسرِ اقتدار ہے اور یہ تعلیم کے مستقبل پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ اس لیے میں مرکز کی طرف سے اس پر زور نہیں دینا چاہتا۔ پھر بھی مجھے بہت خوشی ہوگی اگر ریاستی سطح پر نظامِ تعلیم میں مرکز کے عظیم تر رول کے حق میں عام رائے پیدا ہو جائے۔

مدیرِ اعلیٰ: دستاویز میں ۱۹۶۸ء کی تعلیمی پالیسی کی ناکامی کی بڑی وجہ کافی وسائل کی عدم دستیابی اور پالیسی کے مطابق تعلیمی ڈھانچے کی ازسرِ نو ترتیب کے لیے اقدامات کی کمی بتائی گئی ہے۔ اس میں دوسری باتوں کے علاوہ یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ فیس میں اضافے، عوام کے چندوں اور اعلیٰ تعلیم پائے ہوئے لوگوں کا استعمال کرنے والے محکموں کے عطیات کے ذریعے وسائل میں اضافہ کیا جائے۔ آپ کی رائے

میں اس سلسلے میں کیا کرنا ضروری ہے؟

ڈاکٹر جھا: سب سے پہلے تو یہ ایک حقیقت اور رہے گی کہ تعلیم کے لیے کافی روپیہ نہیں رہا ہے۔ لیکن ہمارے پاس وسائل کی کمی ہے۔ ہر محکمہ روپے کی کمی محسوس کرتا ہے اور ہر محکمہ یہ کہنے کو تیار ہے کہ دوسروں کے مقابلے میں وہی اسے اعلیٰ ترجیح کا حقدار ہے۔ اب مجھے سب سے زیادہ فکر اس بات کی ہے کہ مختص کیے گئے اتنے زیادہ وسائل کا غلط استعمال ہوتا ہے اس طرح کہ کچھ شعبوں میں تو فاضل رقومات بچ رہتی ہیں اور کچھ میں مختص کیے گئے روپے سے زیادہ خرچ ہو جاتا ہے۔ جن شعبوں میں روپیہ بچ رہتا ہے وہاں پُر از تصنیع مصارف ہوتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ رقومات بہتر منصوبہ بندی اور تال میل کے ساتھ مختص کی جائیں اور پبلک کو بھی متحرک و بیدار کیا جائے۔ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ اگر آپ طلبا کی بھرتی ابتدائی اسٹیج پر کریں تو اس سے یہ ہوگا کہ جتنے لوگوں کو ملازمت مل سکتی ہے اُن سے زیادہ کو اعلیٰ تعلیم دلانے کی ضرورت نہ رہیگی اور اعلیٰ تعلیم پر ہونے والا خرچ کم ہو جائے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ کم فیس رکھنا ایک بڑی غلطی ہے۔ ہمیں اقتصادیات کے اعتبار سے ایک نارمل فیس مقرر کرنی چاہیئے تیسری بات میں یہ کہنا چاہوں گا کہ تعلیم کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو پبلک سیکٹر میں ہو یعنی جس کے لیے رقوم کی فراہمی صرف حکومت ہی کی ذمہ داری ہو۔ حصولِ آزادی سے قبل بھی ہندوستان کے لوگ تعلیمی ادارے قائم کرتے تھے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم تعلیم کے لیے لوگوں سے عطیات یا چندے حاصل کرنے کی حوصلہ افزائی نہ کریں۔ ہاں یہ احتیاط ضرور برتنی چاہیئے کہ کیپی ٹیشن فیس (Capitation Fee) سے ہونے والا استحصال اور بدعنوانیاں نہ ہونے پائیں۔ اگر آپ تعلیم کے معیاروں کو برقرار رکھنے کا یقینی انتظام کرلیں تو ایک تعلیمی ادارہ کافی فیس لے کر خود کفیل بن سکتا ہے اور اُسے سرکاری عطیات وغیرہ پر انحصار رکھنے کی ضرورت نہ رہیگی۔ چنانچہ ہمیں ایسے طریقے سوچنے ہیں جن سے نہ صرف مرکزی یا ریاستی حکومتوں سے بلکہ دیگر ذرائع سے بھی تعلیم کے لیے زیادہ روپیہ حاصل کیا جا سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اس بات کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ بے مصرف اخراجات پر روپیہ برباد نہ ہو۔

مدیرِ اعلیٰ: نوکریوں کے لیے ڈگریوں کی شرط کو ختم کرنے کی تجویز کا عوام میں ملا جلا ردِ عمل ہوا ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے بہترین حل بتایا ہے، جب کہ دوسروں کا خیال ہے کہ اس سے انڈر گریجویٹوں (یعنی بی۔ اے سے کم سطح کی تعلیم پانے والوں) کی تعداد کم ہو جائے گی بشرطیکہ ٹریننگ یا تربیت کی سہولیات دستیاب ہوں اور نوکریوں کا یقین دلایا جائے۔ آپ اس بارے میں کیا کہنا چاہیں گے؟

ڈاکٹر جھا: بھئی میں تو ایک مدت سے نوکریوں سے ڈگریوں کا واسطہ نہ رکھنے کی بات کرتا رہا ہوں۔ جب میں کشمیر کا گورنر تھا اور ایک پسماندہ علاقے میں گیا تبھی میں اس نتیجے پر پہنچا تھا۔ وہاں کے لوگوں نے کہا: "ہمیں پرائمری اسکول نہ دیجیئے۔ ہمیں کالج دیجیئے"۔ اور اپنے اس مطالبے کی وضاحت انھوں نے یوں کی کہ "سرکاری ملازمت گریجویٹوں کو ہی ملتی ہے اور اگر ہمیں اپنے بچوں کو ڈگری حاصل کرنے کے لیے جموں، سرینگر یا کسی بڑے شہر میں بھیجنا پڑے تو اس پر اتنا خرچ آتا ہے کہ ہم برداشت نہیں کر سکتے اور پھر شہروں میں رہنے کی وجہ سے بچے بھی ہم سے جسمانی و ذہنی طور پر دُور ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ہمارے بچوں کے واسطے یہیں کالج کھلوایئے"۔ اب درمیانی راہ یہی ہے کہ طلباء کی بھرتی پلس ٹو (جمع دو) اسٹیج پر ہی کی جائے۔ اس سے ملک بھر میں کم سے کم اس سطح کی اچھی تعلیم یقینی ہو جائے گی۔ اس کے بعد ملازم کے مالک کو ملازم کی مزید تعلیم کا اہتمام کرنا چاہیئے، خواہ یہ ڈگری کی تعلیم ہو یا کوئی ٹیکنیکل کورس یا کوئی خصوصی مہارت کا نصاب۔ اس طرح سے کام کے مختلف شعبوں میں مہارت یافتہ افراد اور عام کارکنان کی مانگ (یعنی ضرورت) اور سپلائی کے درمیان ایک نزدیکی تعلق ہو جائے گا۔ صحیح ہے کہ

آپ دوسروں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے جانے سے نہیں روک سکتے۔ مگر وہ خود اپنی ذمہ داری پر ایسا کریں گے انھیں معلوم ہوگا کہ انھیں ملازمت کے لیے بھرتی نہیں کیا گیا ہے اور انھیں ملازمت نہیں ملے گی۔ پھر ہمارا ملک تو ایک آزاد ملک ہے اگر وہ مزید تعلیم کا خرچ برداشت کر سکتے ہیں تو کیوں نہ آگے بڑھیں؟ بہرحال میری رائے میں نوکریوں کے لیے ڈگری کی لازمی شرط کا ختم کیا جانا ایک بہت اچھا قدم ہے۔ اس سے تعلیمی نظام کی صورت حال بہتر ہوگی اور پھر یونیورسٹیوں اور کالجوں میں صرف سنجیدگی سے تعلیم حاصل کرنے والے ہی جائیں گے۔ ان میں سے بہتوں کو ملازمتوں کا یقین دلایا جا چکا ہوگا جبکہ دوسرے لوگ وہ ہوں گے جو کسی مضمون کا گہرائی سے مطالعہ کرنا، ڈگری حاصل کرنا، پڑھانا یا ریسرچ کا کام کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہم پھر اس اسٹیج پر لوٹ آئیں گے جہاں ایک وائس چانسلر اپنی حیثیت اور تشخص کو کام میں لاسکیگا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کی حیثیت سے نہیں۔

مدیر اعلیٰ: کچھ یونیورسٹیوں میں سیاست کے داخل ہو جانے کی وجہ سے اکثر لاقانونیت اور ڈسپلن کا فقدان دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ بڑھتا ہی کیوں جا رہا ہے؟ آپ کی رائے میں اسے ختم کرنے اور یونیورسٹیوں کا ماحول بہتر بنانے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

ڈاکٹر جھا: سب سے پہلے تو، جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے، یہ صورت حال اس وجہ سے ہے کہ طلبا کو اپنا مستقبل غیر یقینی نظر آتا ہے جس کے نتیجے میں ان کے اندر مایوسی اور محرومی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ اگر وہ نوجوانی میں ہی سیاست میں داخل ہو جائیں تو شاید کچھ کر سکیں اور آج کل سیاست بھی ایک پیشہ بنتی جا رہی ہے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ یونیورسٹیوں میں جس قسم کی سیاست دیکھنے میں آتی ہے وہ جانبدارانہ قسم کی ہوتی ہے۔ حقیقت کو وہاں کے چناؤں میں بھی عام انتخابات کی کمزوریاں اور سیاسی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ تمام سیاسی جماعتیں اس بارے میں فیصلہ کریں گی کہ انھیں یونیورسٹیوں میں کس طرح اور کس حد تک سیاست کو داخل کرنا چاہیے اور کہاں انھیں کسی بھی سیاسی جماعت کے نظریات و عقائد کا پابند ہوئے بغیر اپنے بارے میں خود سوچنے کے لیے آزاد چھوڑ دینا چاہیے۔ ●

بقیہ، تعلیمی نظام میں اصلاحات کے لیے ضروری اقدامات

بلاک یا دیہات کا گروپ اس کام کے لیے متعین کرنا چاہیے جہاں طویل المدتی بنیادوں پر ترقیاتی کام چلائے جا سکیں۔ نیشنل سروس اسکیم کا موجودہ طرز ناکافی ہے، اس کی جگہ اُستادوں اور لڑکوں کو پورے سال متعلقہ علاقے میں خدمت کرنی چاہیے۔ یونیورسٹی کو اس سلسلے میں ماڈل نصابات تیار کرنے چاہئیں تاکہ تعلیم کا معیار بلند ہو سکے اور تعلیمی شعبے سے جمود کو دُور کیا جا سکے۔

تعلیم کی مختلف سطحوں پر اخلاقی اور روحانی اقدار کی تعلیم کو بحیثیت مجموعی تعلیم کا جزو لازم بنانا ضروری ہے۔ ہائی اسکول اور ہائر سیکنڈری مراحل کو ایک ساتھ جوڑنے کی ضرورت ہے تاکہ آٹھویں سے بارہویں جماعت تک ۵ سال سیکنڈری تعلیم کے لیے مل سکیں۔

ایک اوپن یونیورسٹی ہونی چاہیے جو ہندی اور انگریزی میں کام کر سکے۔ اگر ہر یونیورسٹی اوپن یونیورسٹی کے طرز پر کام کرے تو بہت منافع ہوگا۔ مراسلاتی نصابات اور تعلیم مسلسل کے نصابات اس سلسلے میں معاون ہونگے تمام کلرکوں کے لیے ڈگری کی شرط ہٹا دی جائے۔ صرف دسویں پاس طلبا ہی کلرک بن سکیں۔ ان کی بھرتی کے لیے سرکاری سطح پر ٹیسٹ ہو جائے۔ میڈیکل اور انجینئرنگ نصابات میں داخلے کے لیے نمبروں کی شرط ہٹا دینی ضروری ہے۔ اس کے لیے داخلہ کا الگ سے انتخاب ہو اور صرف اس کی بنیاد پر ہی داخلے ہوں، اس طرح اسکولی نظام کے تحت، عام طلبا کو میڈیکل، انجینئرنگ اور دیگر ایسے ہی نصابات کی تیاری کے بوجھ سے بچا سکتے ہیں۔ طلبا اور استادوں کے لیے چھٹی کا سسٹم ختم کیا جائے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم پر بدستور توجہ دی جانی چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی عمرانیات اور دیگر سماجی سائنسوں پر توجہ دی جائے۔ ان کے بغیر انسانی ترقی اور انسانی نشوونما کا عمل غیر متوازن رہے گا۔ بہر صورت اس وقت فوری عمل در آمد کے لیے ایک عملی منصوبہ درکار ہے۔ ●

ڈاکٹر آر۔ کے پودار

جلد بازی سے کام لیا گیا ہے

ڈاکٹر پودار کا خیال ہے کہ دستاویز "تعلیم کا چیلنج: ایک حکمتِ عملی کا تناظر" کے مصنفوں نے آج کے مایوس کن تعلیمی منظر کا غلط طور پر جائزہ لیا ہے اور "حکمران طبقے کے لوگوں" کو مطمئن کرنے کے لیے اس میں بہتری لانے کے سلسلے میں بے تابی میں بعض جلد بازانہ اقدامات تجویز کئے ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ ۱۹۶۸ کی قومی پالیسی میں دئے گئے اہم رہبرانہ خطوط کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ وہ دستاویز کے پالیسی تناظر کے خلاف ہیں۔ ڈاکٹر پودار چاہتے ہیں کہ غریب لائق طلبا کے لیے ہر ضلع میں "ماڈل" اسکول قائم کرنے کی تجویز ترک کی جائے کیونکہ اُن کے بیان کے مطابق انجام کار وہ دیہی اور شہری دولتمندوں کے مفاد میں کام کریں گے۔

دستاویز بعنوان "تعلیم کا چیلنج: ایک حکمتِ عملی کا تناظر" ہمارے مروجہ تعلیمی منظر کی مایوس کن حالت کے خلاف بظاہر ایک اُمڈتا ہوا طوفان ہے۔ لیکن دستاویز کے مصنفوں نے اس افسوسناک صورت حال کی ذمہ داری غلط کندھوں پر ڈالی ہے۔ حکمران طبقے کے قول کے مطابق اُنھوں نے "اصلاحات" کے لیے اپنی بے تابی میں بعض جلد بازانہ اقدامات تجویز کئے ہیں۔ لیکن میری رائے میں ہمارے عوام کی غالب اکثریت کے لیے تعلیمی مواقع کو بہتر بنانے کے لیے وہ کوئی اُمید نہیں جگاتے۔

پالیسی جو تشنہ تکمیل رہی

جیسا کہ اظہر من الشمس ہے موجودہ تعلیمی نظام اُس نظام کا ہی تسلسل ہے جسے برطانوی عہد میں رائج کیا گیا تھا، گو اس میں وقتاً فوقتاً بعض تبدیلیاں کی گئی ہیں اور تازہ ترین تبدیلی

قومی تعلیمی پالیسی (۱۹۶۸) کے ذریعے کی گئی ہے۔ آؤ ہم ذرا پیچھے کی طرف جھانک کر دیکھیں کہ یہ کیوں کر عمل میں آئی۔

گذشتہ تعلیمی کمیشن نے جو دوسرے ملکوں کے ساتھ ساتھ امریکہ، سوویت یونین، برطانیہ، فرانس اور جاپان کے ۱۰ ممبروں پر مشتمل تھا، ممتاز ترین ماہر طبیعیات و تعلیم پروفیسر ڈی۔ ایس کوٹھاری کی زیر صدارت پرائمری سے یونیورسٹی مرحلوں تک ہمارے تمام تر تعلیمی نظام پر نظر ثانی کرنے کا عظیم کام بڑی محنت سے انجام دیا تھا۔ اس نے ڈیڑھ برس ۶۶-۱۹۶۴ کام کیا، کوئی ۹۰۰۰ اشخاص سے بات چیت کی، تقریباً ۲ ہزار عرضداشتوں کی جانچ پڑتال کی اور متعدد مذاکرات اور سیمناروں کا اہتمام کیا اور انجام کار لگ بھگ ...۱ چھپے ہوئے صفحات کی ضخیم رپورٹ مرتب کی۔ اس رپورٹ پر تمام علمی حلقوں اور پارلیمنٹ نے کھلے بندوں سیر حاصل بحث کی۔ اس قومی تعلیمی پالیسی کو جس میں اس رپورٹ کی بڑی بڑی سفارشات شامل تھیں پارلیمنٹ نے ۱۹۶۸ میں اتفاق رائے سے منظور کیا۔ کوٹھاری کمیشن کی بعض سفارشات اور رہبرانہ خطوط جو درج ذیل ہیں یاد دہانی کے قابل ہیں۔

۱۔ بھارت ایک ایسے سماج سے جس میں تعلیم ایک چھوٹی سی اقلیت کا استحقاق ہے۔ ایک ایسے سماج میں بدل رہا ہے جس میں وہ عوام الناس کو دستیاب ہو سکتی ہے۔ (سیکشن ۱.۰۷)

۲۔ سائنس کو ہماری تعلیم و ثقافت کا بنیادی جزو بنایا جانا چاہیئے۔ (سیکشن ۱.۲۱)

۳۔ یہ تعلیمی نظام کی ذمہ داری ہے کہ وہ مختلف سماجی طبقوں اور گروہوں کو یکجا کرے اور اس طرح ایک مساوی اور مربوط سماج کو ظہور میں لائے۔ لیکن سردست ایسا کرنے کے بجائے تعلیم خود سماجی علیٰحدگی کو بڑھا رہی ہے اور طبقاتی امتیاز کو جاری رکھتے ہوئے اُسے وُسعت دے رہی ہے۔ (سیکشن ۱.۳۶)

۴۔ اگر ہمیں ان بدعتوں کا انسداد کرنا کرنا ہے تو ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم تعلیم عامہ کے مشترکہ اسکولی نظام کے مقصد کی جانب پیش قدمی کریں جو تمام بچوں کے لیے کھلا ہوگا اور جس کی بخوبی دیکھ بھال کی جائے گی اور جس میں اخراجات کا بار نہیں اٹھانا پڑے گا۔ (سیکشن ۱.۳۸)

۵۔ تعلیم کا تمام مرحلوں میں مادری زبان یا علاقائی زبانوں کے ذریعے دیا جانا ضروری ہے۔ (سیکشن ۱.۵۱)

اور آخر میں (۶) ہمارے تعلیمی نظام کو ہماری شاندار میراث اور روایات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے اور اس میں انسانیت نوازی کے اُن عظیم تصورات کو لازمی طور پر شامل کیا جانا چاہیئے جو انقلاب فرانس، کارل مارکس اور یورپ کی روشن خیالی کی دین ہیں۔ (سیکشن ۱.۷۷)

مجھے افسوس ہے کہ نئی دستاویز کے مصنفوں نے ان رہبرانہ خطوط کا ذکر نہیں کیا۔ یا شاید وہ چاہتے ہیں کہ ہم اُنھیں اس لیے فراموش

دستاویز کے مصنفوں نے اس افسوسناک صورت حال کی ذمہ داری غلط کندھوں پر ڈالی ہے۔ حکمراں طبقہ کے قول کے مطابق اُنھوں نے "اصلاحات" کے لیے اپنی بے تابی میں بعض جلد بازانہ اقدامات تجویز کیے ہیں۔ لیکن میری رائے میں ہمارے عوام کی غالب اکثریت کے لیے تعلیمی مواقع کو بہتر بنانے کے لیے وہ کوئی اُمید نہیں جگاتے۔

مرکز عوام کو تعلیم دینے سے متعلق اپنی ذمہ داری سے عملاً دست بردار ہو گیا اور اُس نے یہ ذمہ داری ریاستوں کے کندھوں پر ڈال دی جن کے پاس اس بھاری ذمہ داری کو اٹھانے کے لیے کافی فنڈ نہیں ہیں۔

کردیں کیوں کہ اُن میں سے کوئی بھی ابھی تک مکمل طور پر عمل میں نہیں لایا گیا۔ اگر ان (کوٹھاری) کی پالیسی کی بعض تجاویز کو عمل میں لایا جائے تو وہ ناگزیر طور پر کوٹھاری کمیشن کی سفارشات کے برعکس ہوں گی۔

آؤ ہم عوامی تعلیم کے مسئلہ پر ایک نگاہ ڈالیں۔ ۱۹۸۱ کی مردم شماری کی رپورٹ اور چوتھے کل بھارت تعلیمی سروے میں جو "این سی ای آر ٹی" کی طرف سے کیا گیا تھا، مایوس کن تصویر پیش کی گئی ہے۔ ہمارے ۴۰ فیصد پرائمری اسکولوں کی چھتیں ہی نہیں ہیں۔ تقریباً ۲ لاکھ اسکولوں میں تختہ سیاہ (بلیک بورڈ) ہی نہیں ہیں۔ ایک لاکھ ۶۵ ہزار اسکولوں میں صرف ایک ٹیچر ہے جبکہ لگ بھگ ۶۰ فیصد طلبا پرائمری مرحلے کے آخری برس تک پہنچنے سے پہلے ہی اسکول چھوڑ دیتے ہیں۔

عوام کی تعلیم نظرانداز

نہ ہی کوٹھاری کمیشن اور نہ ہی قومی تعلیمی پالیسی (۱۹۶۸) نے ایسی صورتِ حال کا خواب لیا تھا۔ یہ گذشتہ چار دہائیوں کے دوران مرکزی حکومت کی طرف سے عوام کی تعلیم کو قطعی طور پر نظرانداز کرنے کا نتیجہ ہے۔ ان برسوں میں اُس نے سال میں اپنے بجٹ کا صرف لگ بھگ ایک فیصد تعلیم پر خرچ کیا جبکہ کوٹھاری کمیشن نے کم از کم ۶ فیصد کی سفارش کی تھی۔ چھٹے منصوبہ کے عرصے کے دوران ۹۰۵ کروڑ روپے کے اخراجات میں سے مرکز نے اس مد کے لیے صرف ۴۵ کروڑ روپے دیے یعنی کل اخراجات کا تقریباً ۲ فیصد۔ اس طرح مرکز عوام کو تعلیم دینے سے متعلق اپنی ذمہ داری سے عملاً دست بردار ہوگیا۔ اور اُس نے یہ ذمہ داری ریاستوں کے کندھوں پر ڈال دی جس کے پاس اس بھاری ذمہ داری کو اُٹھانے کے لیے کافی فنڈ نہیں ہیں۔ چنانچہ عوامی تعلیم کے محاذ پر ناکامی اچھی پالیسی کے فقدان کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ اس لیے ہوئی ہے کیونکہ مرکز اس کے لیے کافی فنڈ دینے کے لیے رضامند نہیں ہے۔

یہ دستاویز ہمیں اس امر کا یقین نہیں دلاتی کہ اکیسویں صدی تک ہمارا کوئی بھی پرائمری اسکول چھتوں اور بلیک بورڈوں کے بغیر نہیں رہے گا، کہ ہر اسکول میں کم از کم دو ٹیچر ہوں گے اور کہ طلبا کو درسی کتابیں مفت فراہم کی جائیں گی اور کہ طلبا تعلیم ادھوری چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔

خوراک برائے تعلیم کا پروگرام

ہمارے موجودہ تعلیمی نظام میں بہتری کے لیے ایمانداری سے کوشش کی جانی چاہیئے اور اس کے لیے اس مسئلہ کو دلیری سے حل کرنے کی ضرورت ہے۔ نئی دستاویز ہمیں اس امر کا یقین نہیں دلاتی کہ اکیسویں صدی تک ہمارا کوئی بھی پرائمری اسکول چھتوں اور بلیک بورڈوں کے بغیر نہیں رہے گا کہ ہر اسکول میں کم از کم دو ٹیچر ہوں گے اور کہ طلبا کو درسی کتابیں مفت فراہم کی جائیں گی، اور کہ طلبا تعلیم ادھوری چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ اس کے بجائے یہ عوام کو پرائمری تعلیم دینے کے لیے غیر رسمی ذرائع پر علامتی سرمایہ کاری کی

ہم مُلکی دفاع پر اپنے بجٹ کا تقریباً ۱۵ فی صد خرچ کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہماری سرحدوں کے دفاع کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے لیکن اگر ہم اپنے انسانی وسائل کو فروغ دینے کے لیے کافی خرچ نہیں کریں گے تو ہم اُس کا موزوں طور پر استفادہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں گے جس کے دفاع کی ہمیں دیکھ بھال کرنی ہے۔

حمایت کرتی ہے۔ اور موجودہ پرائمری اسکولوں کی مزید ترقی سے متعلق کوئی عہد و پیمان نہیں کرتی۔ ہم مرکزی حکومت سے درخواست کریں گے کہ وہ اپنے زائد اناج کے بھاری ذخائر یعنی ۳۰ کروڑ ٹن اناج کا بہتر ین استعمال کرتے ہوئے "اناج برائے تعلیم" کا پروگرام شروع کرے یعنی ایک غریب گھرانے کے بچے کو روزانہ ایک کلوگرام چاول یا گیہوں دیا جاسکتا ہے تاکہ وہ اسکول میں جائے اور تعلیم کو ادھورا نہ چھوڑے۔ مقامی طور پر دستیاب خام مال سے پائدار اسکولوں کی تعمیر کے لیے بھی اناج کا خصوصی طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے جن میں بنا "چھت والے" اسکولوں کو منتقل کیا جاسکتا ہے۔ ان کے علاوہ تعلیم کے لیے بجٹ کا عطیہ ایک فیصد سے کم ازکم ۱۰ فیصد تک بڑھایا جائے۔ ہم ملکی دفاع پر اپنے بجٹ کا تقریباً ۱۵ فیصد خرچ کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہماری سرحدوں کے دفاع کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے لیکن اگر ہم اپنے انسانی وسائل کو فروغ دینے کے لیے کافی خرچ نہیں کریں گے ہم اُس کا موزوں طور پر استفادہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں گے جس کے دفاع کی ہمیں دیکھ بھال کرنی ہے۔

"ماڈل اسکول" کیوں؟

سیکنڈری (ثانوی) تعلیم کے مرحلے پر آتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ نئی دستاویز "مشترکہ اسکول" کے سسٹم کے بارے میں خاموش ہے۔ جس کی سفارش کوٹھاری کمیشن نے کی ہے۔ کمیشن نے پرائیویٹ طور پر چلائے جانے والے "تعیشی" اور "زمی وقار" اسکولوں کو ختم کرنے کی بھی پُرزور سفارش کی ہے۔ درحقیقت نئی دستاویز اس دستور کار کو ختم کرنا چاہتی ہے اور اس کے بجائے سفارش کرتی ہے کہ مرکزی حکومت ہر ضلع میں ایک نام نہاد "ماڈل اسکول" قائم کرے۔ یہ اسکول بظاہر تمام مرکزی ترقیاتی فنڈوں کو ہضم کر جائیں گے جبکہ عام اسکول جن میں ہمارے ۹۹ فیصد طلباء تعلیم پا رہے ہیں اپنی موجودہ قابلِ رحم حالت میں متواتر سسکتے رہیں گے۔ یہ دلیل کہ صرف "محاسن" کی بنا پر طلبا ہی ان اسکولوں میں داخل کئے جائیں گے، دو وجوہات سے قابلِ قبول نہیں ہے۔

(۱) "محاسن" جس کا مطلب داخلے کے نام نہاد معائنوں میں نمبر ہوگا۔ پرائیویٹ ٹیوشن کے ذریعے خریدا جاسکے گا اور اب کم ازکم ۲۰ گنا طلباء جو اپنے ہی محاسن کے مالک ہوں گے "ماڈل اسکولوں" کے باہر تعلیم حاصل کر رہے ہوں گے عملی طور پر یہ "ماڈل اسکول" مرکزی فنڈوں کی بھاری امداد کے ساتھ دیہی اور شہری دولت مندوں کی اُمنگیں پوری کریں گے جن کا آخر میں مطلب ہوگا غریبوں سے ٹیکس جمع کرنا۔ لہٰذا ہر ضلع میں، ایک ماڈل اسکول قائم کرنے کی یہ تجویز ترک کردی جانی چاہیئے۔ اور تمام اسکولوں میں کسی امتیاز کے بغیر کتابوں، لیباریٹریوں، کھیلوں وغیرہ کی بنیادی سہولیات بڑھائی جانی چاہیئں۔ پرائیویٹ تعلیم اور پرائیویٹ اسکولوں کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیئے۔ پرانے اور نئے دولتمندوں کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو مشترکہ اسکولوں میں بھیجیں۔ اگر اُن کے پاس کافی روپیہ فالتو ہے تو افراد اور کمپنیوں کی آمدنی پر تعلیمی ٹیکس کیوں نہ لگایا جائے؟

"ماڈل اسکولوں" کی تجویز میکالے کی تجاویز کی یاد دلاتی ہے جو تعلیم کی سامراجی پالیسیوں پر مبنی تھیں۔ یہ تھیوری اس یقین پر مبنی تھی کہ اگر سماج کے ایک چھوٹے سے اونچے طبقے کو موزوں طور پر تعلیم یافتہ بنایا جائے تو ایسی تعلیم کے فوائد رفتہ رفتہ اوپر سے نیچے عوام الناس تک پہنچ جائیں گے۔ ایسی تجاویز کو ہمارے قومی رہنماؤں نے کلیتہً مسترد کردیا تھا۔ بڑے قومی رہنما بنکم چندر چیٹر جی نے یہ کہہ کر اس کا تمسخر اڑایا تھا کہ تعلیم کوئی پانی نہیں ہے اور عوام کوئی ریت کے مینار نہیں ہیں۔ یہ نہایت افسوسناک بات ہے کہ حصول آزادی کی چار دہائیوں کے بعد صدی پرانے رجعت پسندانہ خیالات کا ایک مختلف پردے کے پیچھے احیاء کیا جارہا ہے۔

> ہر ضلع میں ایک ماڈل اسکول قائم کرنے کی یہ تجویز ترک کردی جانی چاہیئے اور تمام اسکولوں میں کسی امتیاز کے بغیر کتابوں، لیباریٹریوں، کھیلوں وغیرہ کی بنیادی سہولیات بڑھائی جانی چاہیئں۔ پرائیویٹ تعلیم اور پرائیویٹ اسکولوں کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیئے۔

شاید ہمارے نئے دانشمند بھی کسی حساب کے چکر میں پڑ گئے ہیں۔ نئی اقتصادی اور صنعتی پالیسیوں سے وسیع پیمانے پر خودکاری اور کمپیوٹر سسٹم رائج ہونے کا امکان ہے جس کے نتیجے میں تھوڑی سے تھوڑی تعداد میں اعلیٰ ہنر یافتہ اشخاص کی ضرورت ہوگی۔ یہ سب ضرورتیں آسانیاں ماڈل اسکولوں، خود مختار کالجوں اور آئی آئی ٹی اور آئی ٹی ایم جیسے اعلیٰ تعلیمی اداروں کی طرف سے بآسانی پوری کی جائیں گی۔ لہٰذا تمام صحیح الدماغ اشخاص کو ماڈل اسکولوں کی اس غیر جمہوری عوام دشمن اور اعلیٰ طبقاتی تجویز کی مخالفت کرنی چاہیے۔

مجوزہ لسانی فارمولا غیر سائنسی : نئی دستاویز میں ماڈل اسکولوں میں ذریعہ تعلیم کے لیے ایک نیا فارمولا تجویز کیا گیا ہے۔ اس گرد و پیش کے زیر کنار جس میں ماڈل اسکول واقع ہے سائنس اور ریاضی کے لیے انگریزی اور سماجی سائنسوں کے لیے ہندی۔ یہ فارمولا نہ صرف فطری طور پر غیر سائنسی ہے بلکہ اب تک قومی تعلیمی پالیسی (۱۹۶۸) کے منظور شدہ رہبرانہ خطوط کے بھی خلاف ہے جن میں دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے:

"بھارت کی زبانوں اور ادب کی پُرجوش ترقی تعلیمی اور ثقافتی ترقی کی لازمی شرط ہے۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو عوام کی تخلیقی توانائیاں ظہور میں نہیں آئیں گی۔ تعلیم کے معیار میں بہتری نہیں ہوگی۔ عوام میں علم کا پھیلاؤ نہیں ہوگا اور دانشوروں اور عوام میں خلیج بنی رہے گی۔ بھلے ہی وہ وسیع ہو، علاقائی زبانیں پہلے ہی پرائمری اور ثانوی مرحلوں میں ذریعہ تعلیم کے لیے مستعمل ہیں۔ اب انھیں یونیورسٹی مرحلے پر ذریعہ تعلیم کے طور پر اپنانے کے لیے فوری اقدامات کیے جانے چاہئیں۔

چنانچہ دستاویز کا فارمولا ہماری قومی تعلیمی پالیسی (۱۹۶۸) کے ایک بنیادی اصول کی خفیہ تنسیخ کے سوائے کچھ نہیں۔ اسے صرف اسی وجہ سے مسترد نہیں کیا جانا چاہیے۔ اس کے لیے مزید وزن دار دلائل ہیں۔ ایک غیر ملکی زبان سیکھنا اور ایک غیر ملکی زبان کے ذریعے مختلف علوم سیکھنا ایک ہی بات نہیں ہے۔ اگر ایک نوعمر طالب علم کو ایک ایسی زبان میں تعلیم دینے کی کوشش کی جائے جو اس کے ماحول کے لیے اجنبی ہو تو اس کا نتیجہ ہوگا اُسے محض امتحان کے لیے تیار کرنا جو طبع زاد اور تنقیدی اندازِ فکر میں اس کی دلچسپی میں مصدقہ رکاوٹ ہوگا۔ اس موضوع پر گذشتہ دہائیوں میں اس قدر بحث ہو چکی ہے کہ اس پر دوبارہ زور دینے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے وزیر اعظم آجکل بجا طور پر رابندر ناتھ ٹیگور کے تعلیمی تصورات کی سراہنا کر رہے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ نئی دستاویز کے حواری اس سلسلے میں رابندر ناتھ کی تحریروں پر نگاہ ڈالیں اور اپنے لغو خیالات کی بیہودگی کو دیکھیں۔

اعلیٰ تر تعلیم پر پابندی کیوں؟

دستاویز میں ہمارے یونیورسٹی نظام پر نکتہ چینی کی گئی ہے۔ اس میں عام تاثر کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ اعلیٰ تر تعلیم کی غیر منصوبہ بند توسیع بہت زیادہ ہوئی۔ ہمارے ملک میں اب تقریباً ۱۲۰ یونیورسٹیاں، ۵ ہزار کالج اور لاکھوں ہی طلبا ہیں۔ یہ ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں بہت زیادہ نہیں ہیں۔ اگر ہم اپنے میں کسی کو ناخواندہ نہ رہنے دیں تو ہمارے جیسے ایک بڑے ملک میں مزید چار یا پانچ گنا کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہو سکتی ہیں۔ یہ ہماری اقتصادی اور تعلیمی پسماندگی اور روزگار کے مواقع کا فقدان ہے جس سے ہمارا زیادہ تر اعلیٰ تعلیمی نظام بظاہر ضرورت سے زیادہ وافر ہو گیا ہے۔ ان بنیادی امور کو حل کرنے کے لیے دلیرانہ اقدامات کا سجھاؤ دینے کے بجائے دستاویز

> یہ ہماری اقتصادی اور تعلیمی پسماندگی اور روزگار کے مواقع کا فقدان ہے جس سے ہمارا زیادہ تر اعلیٰ تعلیمی نظام بظاہر ضرورت سے زیادہ وافر ہو گیا ہے۔ ان بنیادی امور کو حل کرنے کے لیے دلیرانہ اقدامات کا سجھاؤ دینے کے بجائے دستاویز میں اعلیٰ تر تعلیم پر پابندی کو علاج قرار دیا گیا ہے۔ یہ یقیناً قابلِ عمل نہیں ہوگا۔

یں اعلیٰ تر تعلیم پر پابندی کو علاج قرار دیا گیا ہے۔ یہ یقیناً قابلِ عمل نہیں ہوگا ہمارے عوام تعلیم کے لیے جائز اُمنگ رکھتے ہیں۔ اور وہ تعلیم کے ذریعے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کی اُمید کرتے ہیں۔ کسی بھی جمہوری حکومت کو اس اُمنگ کو ٹھکرانے کے بجائے اس کا احترام کرنا چاہیئے۔ "ناقابلِ روزگار گریجویٹوں" کا لفظ ہمارے نوجوانوں کے لیے باعثِ تذلیل ہے۔ یہ یونیورسٹی تعلیم اعلیٰ طبقوں اور دولتمند لوگوں تک محدود کرنے کا ایک اور بہانہ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ

تجویز اِس امر کا اظہار کرتی ہے کہ ہمارے تعلیمی آقاؤں کا ذہن کیوں کر کام کر رہا ہے۔ چوں کہ ان تجاویز کو عام دانشوروں کی حمایت حاصل نہیں ہے جو محنت کش عوام کے مفاد میں تعلیمی اداروں پر جمہوری کنٹرول نافذ کرنا چاہتے ہیں اس لیے ٹیچروں، ملازموں اور طلباء کو اپنے نمائندوں کو منتخب کرنے کے حق سے محروم کیا جا رہا ہے۔ اس پالیسی پر پہلے ہی مرکزی یونیورسٹیوں میں عمل درآمد ہو چکا ہے۔ اور اب اسے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے

پروگراموں کی تعمیل کے بارے میں ایک متبادل پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کر رہا ہے اور اس ضمن میں وہ ٹیچروں، طلباء اور ملازموں کو شرکت کا پورا پورا جمہوری حق دے رہا ہے۔ اس پالیسی کے نتیجے میں ہم بجا طور پر صحتمندانہ علمی ماحول پیدا کرنے میں قدرے کامیابی کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

یہ بات واقعی پریشان کُن ہے کہ مرکزی حکومت کے ترجمان ٹیچروں کو جمہوری حقوق دینے سے خائف ہیں گو انھیں خود کم از کم

مَیں شدید طور پر محسوس کرتا ہوں کہ اعلیٰ تر تعلیم کے حلقے میں پائی جانے والی بدنظمی اور ابتری دُور کی جا سکتی ہے اور اس کے لیے تعلیمی اداروں کے انتظام اور تعلیمی پروگراموں کی تعمیل میں تعلیمی برادری کو جمہوری اور سیاسی حقوق عطا کرنے ہوں گے اور اُن پر پابندی لگانا نہیں ہوگی۔

طلبا کے اعلیٰ گروہوں کو نام نہاد عام طلبا سے دُور رکھا جائے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں۔ بدقسمتی سے شیشے کے گھر میں اُگائے جانے والے پودے حقیقی زندگی کے حالات میں پنپ نہیں سکتے۔ اس سے پہلے کہ ہم اپنی یونیورسٹیوں کو نام نہاد ناقابلِ روزگار گریجویٹ پیدا کرنے کے لیے قلمزد کریں ہمیں اس حقیقت کو ذہن میں رکھنا چاہیئے۔

جمہوری تعلیمی ادارے

یونیورسٹیوں کا حقیقی مسئلہ ان سب کے لیے مالی اور انتظامی خود مختاری کا فقدان ہے جن سے درحقیقت یونیورسٹی کی تشکیل ہوتی ہے۔ ہزاروں عام کالجوں اور ۱۰۰ سے زائد یونیورسٹیوں کی متوازن ترقی کے مسئلوں کو نظر انداز کرتے ہوئے چند خود مختار کالجوں اور اعلیٰ علمی مرکزوں کو فروغ دینے

ذریعے تمام ریاستی یونیورسٹیوں پر نافذ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ان اقدامات سے ہی مطمئن نہ ہو کر کمیشن ہذا یونیورسٹی احاطوں میں خاص پولیس اور خاص ٹربیونلوں کو تعینات کرنے اور طلبا کی منتخبہ یونینوں کی اجازت نہ دینے کی تجویز کر رہا ہے۔ یہ آنے والے رُجحانات ہیں۔ لیکن ان سے بھارت کے علمی حلقوں میں جمہوری قدروں اور اصولوں کے لیے بڑھتی ہوئی کشمکش اور اس کے نتیجے میں موجودہ مفادِ خصوصی کے احساس خوف کا بھی اظہار ہوتا ہے جو اس وقت ہمارے اعلیٰ تر تعلیمی نظام کے فوائد کی فصل کاٹ رہے ہیں جیسا کہ آپ سب کو علم ہے کہ مغربی بنگال نے اس جمہوریت دُشمن دستور کار کو مسترد کر دیا ہے۔ اور اس کی جگہ وہ تعلیمی اداروں کے انتظام اور علمی

اصولی طور پر بینکوں اور پبلک سیکٹر کے اداروں کے ملازموں کو ایسے حقوق دینا منظور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں منتخبہ نمائندگی کے بجائے نامزدگی کے اصول میں زیادہ دلچسپی ہے اُن کا استدلال ہے کہ انتخابات ہمیشہ کھلے سیاسیات سے آلودہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن آج کے بھارت میں ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ نامزدگی بدترین قسم کی پس پردہ سیاست ہے۔ یہ کوئی ڈھکا چھپا راز نہیں ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن یا دوسری جماعتوں کی کیونکر تشکیل ہوتی ہے۔ صرف وہی افسر نامزد کیے جاتے ہیں جو سرکار کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ ریاستی یونیورسٹیوں کو مرکزی طور پر مقررہ گورنر دُور سے کنٹرول کرتے ہیں، جن کی بات یونیورسٹیوں کے معاملوں میں حرفِ آخر

ہوتی ہے اور جو بعض اوقات ریاستی حکومتوں اور یونیورسٹیوں کی خواہشات کو نظرانداز کردیتے ہیں اس طرح مرکزی حکومت ہماری یونیورسٹیوں کو سیاست سے پاک کرنے کی تجویز کررہی ہے۔

جو لوگ بچوں کی توتلی حالت سے فطرتی خوش ہیں وہ ہمیشہ یہی مشورہ دیتے ہیں کہ باہر کی دنیا میں جو کچھ ہورہا ہے اُس کی پرواہ کئے بغیر ٹیچر اچھی طرح تعلیم دیں اور

مرکزی یونیورسٹیوں کی دیکھ بھال مرکزی وزارت تعلیم کی براہ راست ذمہ داری ہونی چاہیئے جس طرح کہ ریاستی یونیورسٹیوں کی دیکھ بھال ریاستی محکمہ ہائے تعلیم کی طرف سے کی جاتی ہے اسی طرح کمیشن ہذا تمام مرکزی اور ریاستی یونیورسٹیوں کی ترقیاتی ضروریات کی دیکھ بھال کسی امتیاز کے بغیر مساوی سطح پر کرسکے گا۔

طلبا محنت سے پڑھائی کریں۔

لیکن وہ بے وقوفوں کی جنت میں رہ رہے ہیں۔ آزادی کے دنوں کے دوران اور اس کے بعد کے برسوں میں جو جدوجہد ہوئی اُس میں ہمارے بیشتر بہترین ٹیچروں اور بہترین طلبا نے دکھادیا کہ وہ آزادی اور بہتر زندگی سے متعلق عوام کی جدوجہد سے الگ نہیں رہ سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بعض بیوروکریٹوں یا وزراء کے مشورہ پر اس ترقی پسندانہ روائت کو ترک نہیں کرسکتے۔

خود مختاری کو سلب نہ ہونے دو

میں شدید طور پر محسوس کرتا ہوں کہ اعلیٰ تر تعلیم کے حلقے میں پائی جانے والی بدنظمی اور ابتری کو دور کیا جاسکتا ہے۔ اور اس کے لیے تعلیمی اداروں کے انتظام اور تعلیمی پروگراموں کی تکمیل میں تعلیمی برادری کو جمہوری اور سیاسی حقوق عطا کرنے ہوں گے اور اُن پر پابندی لگانا نہیں ہوگی۔ جیسا کہ مغربی بنگال میں کیا جارہا ہے۔ یونیورسٹی کی خود مختاری چانسلر یا اُس کے چنیدہ وائس چانسلر کی مطلق العنانہ حکمرانی سے سلب نہیں ہونی چاہیئے۔ اس کے برعکس اس کا مطلب ہونا چاہیئے، ٹیچروں، طلبا اور دیگر ماہروں کے منتخب شدہ نمائندوں کی طرف سے خود انتظامی جن سے سینیٹ یا کورٹ آف دی یونیورسٹی کی تشکیل ہوتی ہے۔

یہ امتیاز کیوں؟

ہمارے اعلیٰ تعلیمی نظام کی خوش کارکردگی میں ایک اور بڑی رکاوٹ ہے مرکز یا یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے کنٹرول کی کوشش جو غالباً اس یقین کے ساتھ کی جاتی ہے کہ تمام دانائی مرکزی حکومت میں جمع ہے۔ چونکہ ہمارا ملک جغرافیائی طور پر بہت بڑا ہے اور یہ گونا گوں ثقافتوں کا گہوارہ ہے اس لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن یک چشمی جانور کی مانند ریاستی یونیورسٹیوں یا ریاستی حکومتوں سے ہمیشہ اُلجھتا رہتا ہے۔ جس امر کی ضرورت ہے وہ ہے اس کی لامرکزیت اور صحیح وفاقی اصولوں پر اس کی ازسرنو تشکیل۔ کمیشن ہذا عملی طور پر مرکزی یونیورسٹیوں کے مسئلوں میں دھنسا رہتا ہے۔ کیوں کہ موجودہ قانون کی رُو سے وہ یونیورسٹیوں کی دیکھ بھال اور ترقیاتی ضروریات کا خیال رکھتا ہے گو ریاستی یونیورسٹیوں کے تئیں اُس کی ذمہ داری ہر پانچ برس تک اُن کی ترقیاتی ضروریات کی دیکھ بھال تک محدود ہے۔ اس انتظام کے نتیجے میں کمیشن ہذا کے تقریباً تین چوتھائی فنڈ مرکزی اداروں کو ملتے ہیں۔ جبکہ وہ باقیماندہ فنڈ ۱۰۰ سے زیادہ ریاستی یونیورسٹیوں میں بانٹ دیتا ہے۔ ریاستی یونیورسٹیوں کو ہمیشہ مالی مشکلات کا سامنا رہتا ہے مرکزی یونیورسٹیوں کے ٹیچروں کو پھر بہت بڑے بڑے بھتے بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ غم و غصہ اور تناؤ متواتر بنا رہتا ہے۔ مرکزی یونیورسٹیوں کی دیکھ بھال مرکزی وزارتِ تعلیم کی براہ راست ذمہ داری ہونی چاہیئے جس طرح کہ ریاستی یونیورسٹیوں کی دیکھ بھال ریاستی محکمہ ہائے تعلیم کی طرف سے کی جاتی ہے۔ اس طرح کمیشن ہذا تمام مرکزی اور ریاستی یونیورسٹیوں کی ترقیاتی ضروریات کی دیکھ بھال کسی امتیاز کے بغیر مساوی سطح پر کرسکے گا۔

تعلیمی شعبہ ریاستوں کے حوالے کرو

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اپنے ایک

دوسرے فرض کو بھی پورا نہیں کرسکا وہ ہے تمام بھارتی یونیورسٹیوں کے لیے یکساں تعلیمی معیاروں کو فروغ دینا۔ اس کورسے آدرش کو کسی دوسرے ملک میں محض اس لیے عمل میں نہیں لایا جارہا کیوں کہ کسی یونیورسٹی یا کسی بھی دوسرے تعلیمی اداروں کے تعلیمی معیار کا دار و مدار ٹیچروں اور طالب علموں کی نوعیت، ثقافتی ماحول اور بنیادی وسائل پر ہوتا ہے۔ یہ قریب قریب ناممکن ہے کہ ان امور کو تمام بھارت میں یکساں بنایا جائے۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ مرکزی حکومت ہمارا آئین بنانے والوں کی دانشمندی کا احترام کرے اور تعلیم کا شعبہ ریاستی حکومتوں کے سپرد کردیا جائے۔ تعلیم کے لیے مرکزی عطیات ریاستوں میں مساوی طور پر تقسیم کئے جائیں۔

نئی تعلیمی کونسل

ہر ریاست کا اپنا مستقل تعلیمی کمیشن ہونا چاہیے۔ ریاستی تعلیمی کمیشنوں کے چیرمین اور مرکزی حکومت کی طرف سے نامزد ماہرین پر مشتمل قومی تعلیمی کونسل بنائی جائے جو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی جگہ لے۔ اس کونسل کا صدر وزیر اعظم ہو اور اس میں تعلیم، صحت، سائنس اور ٹیکنالوجی، زراعت، خلائی سائنس، برقیات، ایٹمی توانائی اور بحری ترقیات کے مرکزی وزراء کو بھی شامل کیا جائے۔ قومی کونسل ملک میں اعلیٰ تر تعلیم سے متعلق تمام سرگرمیوں کی نگرانی کرے گی اور اتفاق رائے کی بنا پر اس سلسلے میں ملکی پالیسی مرتب کریگی۔ یہ تال میل کرے گی لیکن یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی مانند آقائے نامدار کے طور پر کام کرنے سے احتراز کرے گی۔

ٹیچروں کا رتبہ بڑھاؤ

دستاویز کے مصنفوں کا خیال ہے کہ گویا ٹیچر ہی شرارت کی جڑ ہیں جو تعلیمی شعبے میں خرابیاں پیدا کررہے ہیں۔ لیکن کیا ہم نے ٹیچروں کو وہ سماجی رتبہ اور وقار دیا ہے۔ جس کے وہ مستحق ہیں؟ ابھی حال تک بعض سرکاریں پرائمری ٹیچروں کو اپنے درجہ چہارم کے ملازموں کے برابر تنخواہوں کے اسکیل دینے کو بھی تیار نہیں تھیں۔ زندگی کے دوسرے شعبوں میں برابر کی تعلیمی قابلیت رکھنے والے لوگوں کے مقابلے میں وہ ابھی تک اپنی واجب تنخواہیں نہیں پارہے۔ اب تو اُن کا نمائندگی کا جمہوری حق بھی چھینا جارہا ہے۔ اب تجویز کیا جارہا ہے کہ اُن کی پولیس کے ذریعہ اُسی طرح جانچ پڑتال کرائی جائے جس طرح برطانوی دور میں کرائی جاتی تھی۔ چنانچہ ایسے حالات سے دوچار ہونے پر اُن کے مضطرب اور نامراد ہونے پر کوئی تعجب کیا جاسکتا ہے؟

پارلیمنٹ کی کمیٹی بناؤ

میں آخر میں محسوس کرتا ہوں کہ دستاویز کی بڑی بڑی تجویزیں ہمارے جیسے ملک میں ہم لوگوں کو قطعاً نامنظور ہیں۔ جو عوامی تعلیم کے لیے وقف ہیں چونکہ یہ سب ۱۹۶۸ میں پارلیمنٹ کی طرف سے منظور شدہ قومی تعلیمی پالیسی اور کوٹھاری کمیشن کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہیں اس لیے میں تجویز کروں گا کہ پارلیمنٹ کی ایک کمیٹی تمام ریاستوں کا دورہ کرکے اس دستاویز پر علمی حلقوں کی آراء لے اور ایک سال کے اندر اپنی رپورٹ تیار کرکے پارلیمنٹ کو دے جو اس پر غور کرے۔ ●

دستاویز کے مصنفوں کا خیال ہے کہ گویا ٹیچر ہی شرارت کی جڑ ہیں جو تعلیمی شعبے میں خرابیاں پیدا کررہے ہیں۔ لیکن کیا ہم نے ٹیچروں کو وہ سماجی رتبہ اور وقار دیا ہے جس کے وہ مستحق ہیں؟ ابھی حال تک بعض سرکاریں پرائمری ٹیچروں کو اپنے درجہ چہارم کے ملازموں کے برابر تنخواہوں کے اسکیل دینے کو بھی تیار نہیں تھیں۔ زندگی کے دوسرے شعبوں میں برابر کی تعلیمی قابلیت رکھنے والے لوگوں کے مقابلے میں وہ ابھی تک اپنی واجب تنخواہیں نہیں پارہے۔ اب تو اُن کا نمائندگی کا جمہوری حق بھی چھینا جارہا ہے۔ اب تجویز کیا جارہا ہے کہ اُن کی پولیس کے ذریعہ اُسی طرح جانچ پڑتال کرائی جائے جس طرح برطانوی دور میں کرائی جاتی تھی۔ چنانچہ ایسے حالات سے دوچار ہونے پر اُن کے مضطرب اور نامراد ہونے پر کوئی تعجب کیا جاسکتا ہے؟

پروفیسر پی۔ ایس سریواستو

نہیں، آپ تعلیم کو قربانی کا بکرا نہیں بنا سکتے

صاحبِ مضمون اس بات سے متفق نہیں ہیں کہ تعلیم نے ملک کا ساتھ نہیں دیا ہے۔ اُن کا یقین ہے کہ آج تعلیم میں جو "بحران" پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ پر عمل درآمد نہیں ہوا ہے اور ہمارے منصوبے میں تعلیم کو کمتر ترجیح دی گئی ہے۔ تعلیم کو مناسب سہولیات کا انتظام کئے بغیر غیر منصوبہ بند طریقے پر پھیلنے دیا گیا ہے۔ پروفیسر سریواستو محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں ٹیکنالوجی میں تیزی سے ہونے والی تبدیلی کا سامنا کرنے کے لیے افرادی قوت کی قابلِ عمل منصوبہ بندی کرنی چاہیئے اور ملک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا علم رکھنے والی وسعت پذیر افرادی قوت کو جذب کرنے کے لیے ایک قابلِ اعتماد ماڈل تیار کرنا چاہیئے۔

یہ دیکھ کر بہت اطمینان ہوتا ہے کہ آج قوم نئی تعلیمی پالیسی پر کارآمد بحث کر رہی ہے۔ گذشتہ بیس برسوں کی ترقیات کے تجزیئے سے یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ کی سفارشات پر جس کے بعد ۱۹۶۸ء کی قومی پالیسی اختیار کی گئی تھی، عملدرآمد نہ ہونے کی وجہ سے مطلوبہ اصلاحات ظہور پذیر نہیں ہو پائی ہیں۔ کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ میں سوچ سمجھ کر با مقصد طریقے سے جو سمت دینے کی کوشش کی گئی تھی اُس میں آگے بڑھنے کے لیے نہ تو خاطر خواہ وسائل فراہم کئے گئے نہ تعلیمی ڈھانچے کی تنظیمِ نو کے لیے موزوں اقدامات کئے گئے۔ اس رپورٹ کو بیس سال کا ایک تعلیمی منصوبہ سمجھا جانا چاہئے تھا۔ یہ بیس سال ۱۹۸۵ء میں ختم ہو گئے اور رپورٹ کو ہَوا تک نہ لگی۔ رپورٹ کی صرف زراعتی تعلیم سے متعلق اہم سفارشوں پر ہی صدق دل سے عمل کیا گیا اور اس سے سبز انقلاب لانے میں

بڑی مدد ملی جس پر ہم اتنا فخر کرتے ہیں۔ باقی تمام سفارشوں کو بالائے طاق رکھ دیا گیا جس کی وجہ سے آج ہم کو ایک بحران کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

نہیں، تعلیم موردِ الزام نہیں!

یہ کہنا بہت نامناسب ہوگا کہ تعلیم نے

غیر منصوبہ بند توسیع

تعلیم کو بہت بڑے مسائل کا سامنا ہے۔ مثلاً کم سہولیات، عمل کی ناقص بھرتی سے پیدا شدہ کم صلاحیت کارکردگی، کیریئر (CAREER) اور پیشہ ورانہ ترقی کے درمیان غیر تسلی بخش رشتہ اور چاروں

ایسی ہیں جن کے لیے موزوں افراد نہیں ملتے۔ پچھلے تیس برسوں میں فی طالب علم تعلیم کا خرچ پرائمری تعلیم پر لگ بھگ پانچ گُنا، سیکنڈری تعلیم پر ساڑھے تین گُنا اور اعلیٰ تر تعلیم پر ڈھائی گُنا بڑھ گیا ہے۔ یہ اعداد اصل صورتِ حال کی پوری عکاسی نہیں کرتے کیونکہ درکار سامان

> گذشتہ بیس برسوں میں ترقیات کے تجزیئے سے یہ بات صاف ہوگئی ہے کہ کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ کی سفارشات پر، جس کے بعد ہی ۱۹۶۸ء کی قومی پالیسی اختیار کی گئی تھی، عمل درآمد نہ ہونے کی وجہ سے مطلوبہ اصلاحات ظہور پذیر نہیں ہو پائی ہیں۔

> یہ کہنا بہت نامناسب ہوگا کہ تعلیم نے ملک کا ساتھ نہیں دیا ہے اگر تعلیم مدد نہ کرتی تو ہم آج خوراک کے معاملے میں خود کفیل نہ ہوئے ہوتے اور دنیا کے دس صنعتی ترقی یافتہ ملکوں میں ہمارا شمار نہ ہوتا۔

ملک کا ساتھ نہیں دیا ہے۔ اگر تعلیم مدد نہ کرتی تو ہم آج خوراک کے معاملے میں خود کفیل نہ ہوئے ہوتے اور دنیا کے دس صنعتی ترقی یافتہ ملکوں میں ہمارا شمار نہ ہوتا۔ تعلیم کی بدولت ہی ہمارے اندر اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت پیدا ہوئی ہے اور ہماری سیاسی لیڈرشپ کو اس کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا ہے۔ آج بھارت میں زراعت سے لے کر ایٹمی توانائی تک سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں بڑی استعداد و صلاحیت پیدا ہو چکی ہے۔

طرف ڈسپلن اور صلاحیت میں گراوٹ۔ ہمیں ان مسائل کا دو طرح سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ خود تعلیمی نظام کی ضروری اصلاح کے ذریعے اور حکومت کی سیاسی منظوری اور مالی امداد کے ذریعے۔ تعلیم میں غیر منصوبہ بند طریق پر، یا یوں کہئے کہ اندھا دھند توسیع ہوئی ہے، خاص کر ۱۹۶۰ء سے، لیکن خاطر خواہ ضروری سہولیات کے بارے میں نہ تو سوچا ہی گیا نہ وہ فراہم ہی کی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو گریجویٹوں کی بہت بڑی تعداد بے روزگار ہے، دوسری طرف بہت زیادہ اسامیاں

وغیرہ کی قیمتوں میں اکثر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مستقل قیمتوں کی بنیاد پر اعلیٰ تعلیم پر فی طالب علم ہونے والے خرچ میں نمایاں کمی ہوئی ہے۔ مضبوط بنیاد والے قریب قریب ہر تعلیمی ادارے میں طالب علموں کی تعداد پندرہ بیس سال پہلے کے مقابلے میں کئی گُنا زیادہ بڑھ گئی ہے، لیکن مادی سہولیات میں برائے نام اضافہ ہوا ہے۔ اس کے نتیجے میں تجربوں کے کام کے حالات، لائبریری اور لیباریٹریوں کی سہولیات میں ابتری آئی ہے۔ طالب علموں کے رہن سہن کے حالات بھی زبوں ہو گئے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈسپلن، نظم و ضبط، اور طلبا پر پڑا ہے۔

فائدہ سیاستدانوں نے اٹھایا

اس صورت حال کا فائدہ تمام سیاسی جماعتوں نے اٹھایا ہے۔ یونیورسٹیوں کو سیاست کی آماجگاہ نہ بنانے کی مانگ بہت سے پلیٹ فارموں سے کی جاتی رہی ہے لیکن سیاسی جماعتوں کے اثر کو محدود رکھنے کا مطلب تبادلۂ خیالات، بحث و تمحیص اور قومی ترقی کے تعلق سے مختلف عقائد اور پالیسیوں پر عمل پیرائی کو حدوں میں باندھنا نہیں ہے۔

اس سوال پر سرکار کو سیاسی جماعتوں سے مشورہ کرنا چاہیئے تاکہ اُن اداروں کو محفوظ رکھا جاسکے جو قومی ترقی اور ملک کے مستقبل کے لیے بے حد ضروری ہیں۔ اگر تعلیم کو نقصان پہنچتا ہے تو کوئی چیز ملک کو بچا نہیں سکے گی۔

اسکولوں کو بنیادی سہولیات کی ضرورت ہے

کوئی بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ اعلیٰ تعلیم کا پورا فائدہ اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُس کے لیے پڑھائی کی سچی لگن رکھنے والے طلبا، جو مناسب پرائمری اور سیکنڈری تعلیم حاصل کر چکے ہوں، دستیاب نہ ہوں۔ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے یہاں ہر ایک میل پر ایک پرائمری اسکول اور ہر ڈیڑھ میل کے بعد ایک سیکنڈری اسکول ہے لیکن بدقسمتی کی بات ہے کہ بیشتر اسکولوں میں بنیادی ساز و سامان اور عملے کی کمی ہے اور یہی اس بات کی ایک بڑی وجہ ہے کہ بیچ میں پڑھائی چھوڑ دینے والوں کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ لہٰذا تمام تعلیمی اداروں میں کم از کم بنیادی سہولیات فراہم کرنا اشد ضروری ہے۔ اسکولوں کے لیے ایک ایسے نصاب تعلیم کی سفارش کی جاسکتی ہے جس کا ۵۰ فیصد حصہ ایک کور (CORE) نصاب پر مشتمل ہو اور باقی حصہ مقامی ضروریات اور ماحول کی بنیاد پر مقامی طور پر ہی تیار کیا جائے تاکہ جو طلبا بیچ میں پڑھائی چھوڑ دیں وہ اپنے علاقے میں ہی کہیں نہ کہیں جذب کئے جاسکیں۔

امتیاز دور کیجئے

آج کے تعلیمی نظام میں نابرابری کا عنصر بہت بڑی حد تک کارفرما ہے۔ ایک نابرابری تو یہ ہے کہ جو کچھ ہمیں شہری علاقوں میں دستیاب ہے، وہ دیہی علاقوں میں نہیں ہے۔ شہری اسکول عام طور پر اچھے ہوتے ہیں اور دیہی اسکول خراب۔

تعلیم کو بہت بڑے مسائل کا سامنا ہے۔ مثلاً کم سہولیات، عملے کی ناقص تربیت سے پیدا شدہ کم صلاحیت کارکردگی، کیریئر (Career) اور پیشہ ورانہ ترقی کے درمیان غیر تسلی بخش رشتہ اور چاروں طرف ڈسپلن اور صلاحیت میں گراوٹ۔

تعلیم میں غیر منصوبہ بند طریقے پر یا یوں کہیے کہ اندھا دھند توسیع ہوئی ہے خاص کر ۱۹۶۰ء سے، لیکن خاطر خواہ ضروری سہولیات کے بارے میں نہ تو سوچا ہی گیا نہ وہ فراہم ہی کی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو گریجویٹوں کی بہت بڑی تعداد بے روزگار ہے، دوسری طرف بہت زیادہ اسامیاں ایسی ہیں جن کے لیے موزوں افراد نہیں ملتے۔

دوسرے ہماری آبادی کے نصف حصے یعنی لڑکیوں کے خلاف امتیاز برتا جاتا ہے۔ عورتوں کی تعلیم عدم توجہی کا شکار ہے اس معنی میں کہ شروع میں تو اسکول میں داخل ہونے والی لڑکیوں کی تعداد اچھی ہو سکتی ہے لیکن بیچ میں پڑھائی چھوڑ دینے والی طالبات کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے بہت کم لڑکیاں اپنی تعلیم مکمل کر پاتی ہیں۔ اگر ہم یہ اُمید کرتے ہیں کہ ہم اپنی نصف آبادی کی تعلیم پر توجہ نہ دے کر دُنیا کا مقابلہ کر سکیں گے تو یہ خیال خام ہے اور خود کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے۔

افرادی قوت کو بڑھائیے

کوٹھاری کمیشن نے اپنی رپورٹ میں تعلیم کو پیشہ ورانہ بنانے کی جو سفارش کی تھی، اس پر سنجیدگی سے عمل نہیں ہوا۔ اگر دیکھا جائے تو پیشہ ورانہ اداروں میں طلباء کی تعداد کا فیصد آج کے مقابلے میں اُس وقت زیادہ تھا جب یہ سفارش پیش کی گئی تھی اور اگر پیشہ ورانہ نصابات میں داخلہ لینے والے طلباء کو دوسرے درجے کا شہری سمجھا جاتا رہا تو موجودہ فیصد بڑھے گا بھی نہیں۔ ان کے لیے پیشہ ورانہ کالجوں میں کچھ فیصد نشستیں مخصوص کر دینی چاہئیں اور ان کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے کہ وہ ان میں داخلہ لیں۔ ان کی حوصلہ افزائی کرنے کا ایک طریقہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ فیلڈ میں ان کے حاصل کئے ہوئے تجربے کی بنیاد پر نصاب کی مدت ان کے واسطے کم کر دی جائے۔ اس کے علاوہ علاقے کی چھوٹی بڑی صنعتوں اور گھریلو دست کاریوں کو ان اداروں سے وابستہ کر دیا جائے اور طلباء اپنے وقت کا کم سے کم ۲۵ فیصد فیلڈ ٹریننگ اور شاگردی پر صرف کریں۔ ایسے افرادی قوت کی نشوونما کا ذریعہ سمجھنا چاہیئے۔ اور صنعتوں، الیکٹرانکس، ٹرانسپورٹ، مواصلات، زراعت وغیرہ سے متعلق تمام وزارتوں کو اس میں حصّہ لینا چاہیئے۔

طالبوں کو خودمختار بنائیے!

امتحانات میں بدعنوانیوں کی خبریں اکثر آتی رہتی ہیں۔ مثلاً امتحان کے پرچے کا آؤٹ ہونا، طلباء کا بڑے پیمانے پر نقل کرنا اور ممتحن کا استحقاق سے زیادہ نمبر دینا۔ ان کی وجہ سے امتحانوں اور ڈگریوں کی قدروقیمت بہت کم ہو گئی ہے۔ جہاں حالات "بدترین" بتائے جاتے ہیں وہاں طلباء کے زور اور دباؤ پر امتحان کے پرچوں میں ۵ تا ۷۵ فیصد چوائس (CHOICE) رکھی جاتی ہے اور پچھلے سال کے سوالات کو دُہرایا نہیں جاتا۔

> اس سوال پر سرکار کو سیاسی جماعتوں سے مشورہ کرنا چاہیئے تاکہ اُن اداروں کو محفوظ رکھا جا سکے جو قومی ترقی اور ملک کے مستقبل کے لیے بے حد ضروری ہیں۔ اگر تعلیم کو نقصان پہونچتا ہے تو کوئی چیز ملک کو بچا نہیں سکے گی۔

> عورتوں کی تعلیم عدم توجہی کا شکار ہے اس معنی میں کہ شروع میں تو اسکول میں داخل ہونے والی لڑکیوں کی تعداد اچھی ہو سکتی ہے لیکن بیچ میں پڑھائی چھوڑ دینے والی طالبات کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے بہت کم لڑکیاں اپنی تعلیم مکمل کر پاتی ہیں۔

پڑھائی کے دنوں کی تعداد کم ہو گئی ہے، نصابات پورے نہیں کئے جاتے ہیں اور امتحان، جو تھوڑا بہت پڑھایا جاتا ہے اسی کی بنیاد پر لیا جاتا ہے۔ کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے نتائج سے ظاہر ہے کہ فیلوشپس (Fellow-Ships) یا وظائف کے لیے امتحان میں بیٹھنے والے طلبا میں سے بمشکل دس فیصد طالب علم ۴۰ فیصد سے زیادہ نمبر حاصل کر پاتے ہیں۔ بہت سی صورتوں میں تو فرسٹ ڈویژن پانے والے، اوّل آنے والے اور طلائی تمغے حاصل کرنے والے طالب علم بھی مقابلے کا امتحان پاس کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ تعلیمی ادارے (مضبوط اقتصادی بنیاد والے کالجوں میں سے کم از کم پچاس فیصد) ہر لحاظ سے خود مختار بنا دئے جائیں۔ انھیں اپنے طلبا کے لیے نصابات تیار کرنے اور ان کا امتحان لینے کی ذمہ داری سونپ دی جائے اور وہی انھیں اپنے کالج کی ڈگریاں دیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر انھیں یہ ذمہ داری سونپی جائے تو چاہے شروع میں یہ تجربہ پُر امید نظر نہ آئے لیکن وقت پاکر ان کی تعلیم کا معیار اونچا ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ دونوں ہی نصابات کے لیے امتحانات کا ایک خود مختار قومی نظام بنایا جائے اور طلبا کی حوصلہ افزائی کی جائے کہ اگر وہ اپنی ڈگریوں کو قابلِ قدر اور معتبر بنانا چاہتے ہیں تو ان میں شمولیت کریں۔

افرادی قوت کی منصوبہ بندی — ایک چیلنج: ہمارے ملک میں جو سب سے بڑے مسئلے درپیش رہے ہیں۔ ان میں سے ایک ٹیکنالوجی کے میدان میں ہونے والی تبدیلی کی مناسبت سے افرادی قوت کی منصوبہ بندی کا سوال ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ اس بات کا اندازہ لگائیں کہ ہمیں کہاں کتنی افرادی قوت درکار ہوگی، اور پھر اس کے مطابق افرادی قوت تعلیم و تربیت کے ذریعے تیار کریں۔ ہمیں اس کام میں عظیم مشکلات درپیش ہیں۔ بد قسمتی سے ہمارے پاس کوئی قابلِ اعتبار ماڈل نہیں ہے جس کے مطابق ہم یہ سب کریں۔ اور قابلِ اعتبار ماڈل تو تبھی بن سکتا ہے جب ملک کا اطلاعاتی نظام قابلِ اعتبار ہو۔ تعلیمی منصوبہ بندی کے لیے کسی مجموعی اندازے کی نہیں بلکہ اس بات کی ضرورت ہوگی کہ افرادی قوت کے لیے علیحدہ بنیادوں پر اندازے مرتب کئے جائیں۔ یعنی یہ کہ کس پیشے یا شعبے میں کتنے افراد درکار ہوں گے، کتنے ڈگری یافتہ لوگ اور کتنے ڈپلوما دار، کتنے پوسٹ گریجویٹ، کتنے ریسرچ اسکالر، کتنے پی۔ ایچ ڈی، کتنے صنّاع، کتنے کاریگر وغیرہ۔ اس طرح ملک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم و تربیت پائے ہوئے لوگوں کا پوری طرح استعمال کرنے کا مسئلہ ایک دقیق مسئلہ ہے جس کا سامنا ہمیں معیشت کے ہر شعبے میں ہے۔

> بہتر ہوگا کہ تعلیمی ادارے (مضبوط اقتصادی بنیاد والے کالجوں میں سے کم از کم پچاس فیصد) ہر لحاظ سے خود مختار بنا دئے جائیں۔ انھیں اپنے طلباء کیلئے نصابات تیار کرنے اور ان کا امتحان لینے کی ذمہ داری سونپ دی جائے اور وہی انھیں اپنے کالج کی ڈگریاں دیں۔

> انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ دونوں ہی نصابات کے لیے امتحانات کا ایک خود مختاری قومی نظام بنایا جائے اور طلباء کی حوصلہ افزائی کی جائے کہ اگر وہ اپنی ڈگریوں کو قابلِ قدر اور معتبر بنانا چاہتے ہیں تو ان میں شمولیت کریں۔

اگرچہ تعلیمی پروگراموں کا کافی نہ ہونا کسی حد تک اس روگ کا سبب ہو سکتا ہے لیکن اس کی بنیادی وجہ ہمارا ترقیاتی پلان ہے جس میں نقص ہونے کی وجہ سے معیشت میں مربوط تحقیقی و ترقیاتی پروگراموں کے ذریعے ٹیکنالوجیکل ترقی کے لیے

مستقل مانگ پیدا نہیں کی جا سکی ہے اور یہی مانگ ٹیکنالوجیکل ترقی کے ذریعے ترقی و نشوونما کے عمل کو جاری رکھنے کے لیے سائنٹفک اور ٹیکنیکل افرادی قوت کی مانگ پیدا کرتی ہے۔ اس سے تعلیمی پروگراموں میں بہتری آنا یقینی ہے۔ اگر تربیت یافتہ افرادی قوت کے لیے ملازمت کے امکانات بہتر ہو جائیں تو معلموں اور شاگردوں دونوں کے خلوص و لگن میں خود بخود بہتری

اگر تربیت یافتہ افرادی قوت کے لیے ملازمت کے امکانات بہتر ہو جائیں تو معلموں اور شاگردوں دونوں کے خلوص و لگن میں خود بخود بہتری آئے گی اس کے برعکس بے مقصد تعلیم بلاشبہ وقت اور وسائل کی تضیع ہوگی۔

آئے گی۔ اس کے برعکس بے مقصد تعلیم بلاشبہ وقت اور وسائل کی تضیع ہوگی۔

بدلتی ہوئی عالمی معیشت

اس بات کو بہت صفائی سے تسلیم کرنے کی ضرورت ہے کہ دنیا آج ایک نئے صنعتی انقلاب سے گذر رہی ہے۔ آج عالمی معیشت میں جو افسردگی یا مندہ دیکھنے میں آرہا ہے اس کی وجہ سے ترقی یافتہ ممالک کے صنعتی ڈھانچوں میں بھی کچھ بہت ہی بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ جب دنیا چند برسوں میں اس صورت حال سے باہر نکل آئے گی تو پھر مختلف اقسام کے صنعتی ڈھانچے قائم ہوں گے اور ہمیں تعلیمی منصوبہ بندی کو اس چیلنج کا سامنا کرنے کے قابل بنانا ہوگا۔

بھارت کے لیے بلکہ تیسری دنیا کے دیگر ممالک کے لیے بھی یہ افسوس کی بات ہے کہ ابھی ہم انیسویں صدی کے پہلے صنعتی انقلاب سے نہیں نمٹ پائے تھے کہ ہمیں دوسرے یعنی کیمیکل انقلاب کے چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اب تیسرے یعنی مائیکرو چپ ٹیکنالوجی (MICRO CHIP TECHNOLOGY) کا کرنا پڑ رہا ہے۔ عنقریب ہمیں اکیسویں صدی میں چوتھے یعنی بایو ٹیکنالوجی (BIO-TECHNOLOGY) انقلاب کا سامنا کرنا پڑیگا۔ کام بہت مشکل ہے کیوں کہ ایک خیال کے واضح شکل اختیار کرنے اور ایسے فائدہ مند طریق پر عملی جامہ پہنانے کے لیے جو وقت درکار ہوتا تھا وہ اب کم ہوتا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر آٹوموبائلز کی صنعت میں کمبشن انجن (Combustion Engine) کی تیاری کے واسطے بنیادی اصولوں کا پتہ لگانے اور بعد میں ان اصولوں کی مدد سے ایسے انجن تیار کرنے میں نسبتاً طویل وقت لگا تھا۔ لیکن اب ایک خیال کو الیکٹرانک کمپیوٹر کی مدد سے آگے بڑھا کر ایک بڑی صنعت قائم کرنے میں صرف چند دہائیاں ہی لگتی ہیں۔ سائنٹفک اصولوں اور خیالوں کو اب صرف چند برسوں میں ہی عملی شکل دی جا سکتی ہے اور پھر مال تیار کرنے کے لیے چند سال اور چاہئیں۔

اگر ہم صدق دل سے اپنے ملک کو عزت و احترام کے ساتھ اکیسویں صدی میں لے جانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے منصوبوں میں تعلیم کو معمولی یا کمتر اہمیت دینے کی بجائے ایک بہتر اور مرکزی مقام دینا ہوگا۔

اب قوم کو پوری طرح تیار ہونا چاہیئے اور اس کے لیے تعلیمی نظام کو ایک بہت اہم رول ادا کرنا ہوگا آپ اطلاقی سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے اس وقت تک کوئی سازگار ماحول پیدا نہیں کر سکتے جب تک کہ ترقی پذیر بنیادی سائنسوں کے لیے فضا تیار نہ ہو جائے۔

اگر ہم صدق دل سے اپنے ملک کو عزت و احترام کے ساتھ اکیسویں صدی میں لے جانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے منصوبوں میں تعلیم کو معمولی یا کمتر اہمیت دینے کی بجائے ایک بہتر اور لا مرکزی مقام دینا ہوگا۔ ہم نے

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

پروفیسر (شریمتی) ونجا آئنگر

اِس نابرابری کو ختم کیجیے

پروفیسر آئنگر کی رائے میں دستاویز "تعلیم کا چیلنج: ایک حکمتِ عملی کا تناظر" مایوس کُن ہے۔ اس میں سابقہ پالیسیوں کی تعمیل میں آنیوالی مشکلات کو نمایاں کیا گیا ہے لیکن یہ واضح نہیں کیا گیا کہ اُن پر کیوں کر قابو پایا جاسکتا ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ تعلیم میں نابرابری کا تدارک، اعلیٰ تر تعلیم میں زبردست تبدیلیاں، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا صحیح کردار اور سہ لسانی فارمولے کی موزوں تعمیل بعض اصلاحات ہیں جن کی اس وقت فوری ضرورت ہے۔

ابتدا میں یہ واضح کرنا بہتر ہوگا کہ تعلیمی پالیسی سے متعلق دستاویز تیار کرلی گئی ہے اور اب تعلیمی پالیسی پر قومی بحث ہوگی اس دستاویز کا ایک قابل تعریف پہلو یہ ہے کہ تعلیمی پالیسی کو براہِ راست بعض فوری لوازمات سے منسلک کرلیا گیا ہے جیسے قومی یکجہتی اور ۲۱ ویں صدی کے لیے سائنسی اور ٹیکنالوجیکل تیاری کی ضرورت

اس کے علاوہ تعلیمی شعبے میں کامیابیوں اور ناکامیوں کا عام جائزہ لینا بھی مقصود ہے۔

مایوس کُن دستاویز

لیکن وزارتِ تعلیم نے قومی بحث و مباحثے کے لیے جو دستاویز پیش کی ہے وہ مایوس کُن ہے۔ اس میں وقت کے اندر تیزی سے کام ختم کرنے کی تمام علامتیں موجود ہیں اور تعلیمی شعبے میں درکار صورت، ڈھانچے اور پالیسیوں کے بارے میں بعض نتائج پر پہنچنے کے لیے کچھ نہیں کیا گیا۔ شائد دستاویز مختلف گروپوں اور اشخاص کی طرف سے تیار کی گئی ہے جنھیں اتفاق رائے کی صورت میں اپنے نظریوں اور خیالات

کو یکجا کرنے کے لیے وقت نہیں ملا۔ یہ نقص اس امر سے صاف طور پر واضح ہے کہ ایک حصہ کے بعد دوسرے حصے میں خصوصاً ابتدائی تعلیم، تعلیم بالغان، پیشہ ورانہ تعلیم، امتحانی نظام، وسائل کی تحقیق کی اہمیت وغیرہ سے متعلق حصوں میں بیانات کو دُہرایا گیا ہے۔

اس دستاویز کی ایک اور خامی یہ ہے کہ وہ فیصلہ کُن امور کا ذکر کرنے، ترجیحات کا بیان کرنے اور فوری ترقی اور ترقی کے تناظر سے متعلق ٹھوس تجاویز پیش کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اس افسوسناک عمل کی نمایاں ترین مثالیں اُس وقت دیکھنے کو ملتی ہیں جب اس کی اُن تجاویز کا مطالعہ کیا جاتا ہے جن میں اس امر کے بارے میں سجھاؤ دیا گیا ہے کہ پیشہ ورانہ تعلیم کب اور کیوں کر دی جائے اور کہ کیپٹیشن (Capitation) فیس پر مبنی کالجوں کی اجازت دی جائے یا نہیں۔ لیکن محض یہی اس دستور کار کی مثالیں نہیں ہیں۔

صحیح جائزے سے دستاویز کی ایک اور خامی کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ بیشتر مسئلوں اور اُن کے حلوں کی پیش بینی متعدد کمیشنوں کی طرف سے کی گئی تھی جن کا قیام مختلف اوقات پر حکومت، خصوصاً تعلیمی کمیشن ۱۹۶۴ تا ۱۹۶۶ کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ "آج کے مسائل زیادہ تر سُست رو اور بے ہنگم تعمیل اور وسائل کی تخصیص میں بتدریج کمی کا نتیجہ ہیں۔" اس میں یہ نہیں بتایا گیا کہ بے سوچے سمجھے ڈھنگ سے تعمیل کیوں ہوئی ہے اور وسائل کی تحقیق میں سُست روی سے کیوں کام لیا گیا اور لہذا ان دونوں خرابیوں کا علاج کیا ہے۔ تعلیمی کمیشن کی سفارشات دستیاب ہوئے دو دہائیاں گزر چکی ہیں جس کے دوران بیشتر مسائل کا ڈھیر لگ گیا ہے، جو فوری شدید کارروائی کا تقاضا کرتے ہیں۔ لہذا ان نئے پیدا شدہ مسائل کے تصفیہ کے لیے اہم تجاویز پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

اس امر پر زور دیا جانا چاہیئے کہ ہم ایک قوم کے طور پر ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں پچھڑتے جا رہے ہیں اور لہذا جدید ترین سائنس اور ٹیکنالوجی کی تیز رفتار ترقی کی چنوتیوں اور دباؤ کا مقابلہ کرنے کے لیے تیاری کی پوری ضرورت ہے۔

نابرابری کے تدارک کے لیے کچھ نہیں

اگرچہ دستاویز غیر پابند ہے۔ تاہم اُس کے بارے میں ابھی تک یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ نابرابری کے ڈھانچے کے اندر کام کرنے کا رُجحان رکھتی ہے۔ "انقلابی نوعیت کی تبدیلیوں" کے لیے بار بار زور دیا جا رہا ہے اور تاہم ابتدائی تعلیم کے مرحلے پر اُسے دُور کرنے یا کم از کم اُس میں تخفیف کرنے کے لیے کوئی ٹھوس تجویز پیش نہیں کی گئی جس پر نابرابری کا تمام تر نظام اور تعلیم میں نابرابری مبنی ہے۔

اس امر پر خصوصاً بحث نہیں کی گئی کہ کیا پبلک سکولوں کو جاری رہنے کی اجازت دی جائے اور کیا ابتدائی اور ثانوی تعلیمی اداروں کو قومیایا جائے۔ لیکن دستاویز کے آغاز میں یہ ضرور کہا گیا ہے کہ "ایک ایسے سماج میں جس نے ترقی کی مطلق العنانہ راہ کے بجائے جمہوری راہ اختیار کی ہے تعلیم تمام قومی مساعی کا ستون ہونی چاہیئے۔"

ٹیچروں کے تئیں دستاویز کا جو رویہ ہے اُس سے وہ یقیناً زیادہ خوش نہیں ہوں گے۔ جو کچھ حاصل ہوا ہے اور جس سے اس نظام کو پورے طور پر ٹوٹنے سے مدد ملی ہے۔ اگرچہ

اگرچہ دستاویز غیر پابند ہے تاہم اُس کے بارے میں ابھی تک یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ نابرابری کے ڈھانچے کے اندر کام کرنے کا رجحان رکھتی ہے۔ "انقلابی نوعیت کی تبدیلیوں کے لیے بار بار زور دیا جا رہا ہے اور تاہم ابتدائی تعلیم کے مرحلے پر اُسے دُور کرنے یا کم از کم اُس میں تخفیف کرنے کے لیے کوئی ٹھوس تجویز پیش نہیں کی گئی۔

اُس کے لیے اُن میں سے چند ایک کو کریڈٹ دیا جاتا ہے تاہم عام طور پر ٹیچر سارے کی برائی کی جڑ جان پڑتے ہیں۔ آج جو کچھ کیا جا رہا ہے اور جو کچھ کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی بلاشبہ اُس کے لیے زیادہ تر ٹیچر قصوروار ہیں۔ لیکن تب وہ خود عام طور پر سماج اور خاص طور پر تعلیمی نظام کی پیداوار ہیں۔ ٹیچروں کو سدھارنے کا واحد موثر طریقہ یہ ہے کہ وہ لوگ اُن کے روبرو اپنی مثال رکھیں جن کے ہاتھ میں اقتدار ہے۔ یہ خود ایک لمبا کام ہے۔ یہ محض ٹیچر ہی نہیں جو مقصد اور اعتبار سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔

> ٹیچروں کو سدھارنے کا واحد موثر طریقہ یہ ہے کہ وہ لوگ اُن کے روبرو اپنی مثال رکھیں جن کے ہاتھ میں اقتدار ہے۔ یہ خود ایک لمبا کام ہے۔ یہ محض ٹیچر ہی نہیں جو مقصد اور اعتبار سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔

ایک اور مسئلہ جس سے لاابالی کے ساتھ نپٹا جا رہا ہے وہ ہے سیاسی مداخلت۔ یہ واضح نہیں کیا گیا کہ کس قسم کے سیاسیات اور سیاستدان نقصان دہ ہیں لیکن اس میں بتایا گیا ہے کہ بڑے بڑے سیاسی مسئلوں پر بحث کی جانی چاہیئے جب کہ پارٹی سیاسیات سے احتراز کیا جانا چاہیئے۔

تمام سیاسی پارٹیاں جس گروہ بندی اور تنگ نظری سے تعلیمی اداروں تک پہنچتی ہیں اُسے بے نقاب کرنے اور اُس کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ اس خیال سے یہ سب کچھ کرتی ہیں کہ اقتدار اور سرپرستی کے مقاصد کے لیے ان اداروں پر کنٹرول کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے ان اداروں کے منتظموں، ٹیچروں، طالب علموں اور ملازموں میں سے بدعنوان اور سرگرم عناصر کی امداد لی جاتی ہے۔ یہ بدترین قسم کا سیاسی کھیل ہے۔ ان میں جو شئے موجود نہیں ہے وہ ہے بڑے بڑے موضوع خیال، فلسفہ، آدرشوں اور نظریات وغیرہ پر بحث و مباحثے۔

> تمام سیاسی پارٹیاں جس گروہ بندی اور تنگ نظری سے تعلیمی اداروں تک پہنچتی ہیں اُسے بے نقاب کرنے اور اُس کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ اس خیال سے یہ سب کچھ کرتی ہیں کہ اقتدار اور سرپرستی کے مقاصد کے لیے ان اداروں پر کنٹرول کیا جائے۔

نابرابری ایک پرانا روگ

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں تعلیم کی خرابی کی جڑ وہی ہے جو عام قومی خرابی کی ہے یعنی تمام باتوں میں غیر مساوات اور نابرابری۔ گذشتہ چار دہائیوں میں بھارت غریب تر ملک ہی نہیں بنا ہے بلکہ اس کے ساتھ ہمارے عوام کی بہت بھاری تعداد کی غریبی کے ساتھ ساتھ نابرابری بھی بڑھی ہے۔ گو تعلیم کے شعبے میں ہر سطح پر عوام کو عظیم تر رسائی حاصل ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بہترین اور اوسط قسم کے لوگوں میں فاصلہ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ ہمیں اچھی مساوات اور سماجی انصاف کی راہ پکڑنی ہے۔ ہم نے بھاری تعداد کو ایک قسم کی تعلیم دی ہے اور تھوڑی سی تعداد کو جسے استحقاق حاصل ہے، اعلیٰ قسم کی تعلیم پانے کا موقع دیا ہے لیکن یہ مسئلہ محض تعلیمی سطح پر حل نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ دستاویز میں بتایا گیا ہے۔ تعلیم محض ذیلی نظام ہے۔ نظام کو تو مجموعی طور پر بدلنے کی ضرورت ہے۔

یہ ہمارے موجودہ تعلیمی نظام پر ایک بڑا الزام ہے کہ ہمارے ۶۰ فیصد سے زیادہ عوام کو باضابطہ طور پر خواندہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ناخواندگی کے انسداد کا کام محض رضاکار اداروں پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس کے لیے وزارتِ تعلیم کے تحت ایک الگ واضح سرکاری ادارے کی ضرورت ہے جو اس کام کو ایک قومی تحریک کے طور پر عمل میں لائے۔

دستاویز میں بتایا گیا ہے کہ ابتدائی تعلیمی اداروں میں داخلے کی شرح افزائش حالیہ برسوں میں سست پڑ گئی ہے لڑکوں کی تعداد میں قدرے بہتری ہوئی ہے لیکن رفتار بہت سست ہے۔

جہاں تک لڑکیوں کا تعلق ہے، صورتِ حال پہلے کی طرح افسوسناک ہے۔

بیشتر ابتدائی اسکولوں کی حالت ہر لحاظ سے اس قدر خراب ہے کہ اُس کے بارے میں خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پبلک

نظر انداز کیا گیا ہے۔

سہ لسانی فارمولے کی سختی سے تعمیل ہونی چاہیے۔ کالج کی سطح تک تعلیم مادری زبان میں دی جائے۔ انگریزی کی تعلیم کو بڑھاوا دیا جانا چاہیے کیوں کہ یونیورسٹی کی سطح پر انگریزی تب تک ذریعہ تعلیم رہے گی جب تک کہ پوسٹ

اسے رائج کیا گیا تھا۔ وہ معاملے کی جڑ کے قریب کہیں بھی نہیں پہنچے۔ شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب کے علاوہ ریزرویشن آمدنی اور علاقے سے منسلک ہونی چاہیے۔ سماجی طور پر ذکر کرتے ہوئے ریزرویشن کی توسیع نہیں کی جانی چاہیے اور موجودہ ریزرویشن کو محض مزید دو پشتوں تک جاری رکھا جا سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ذاتوں اور قبیلوں کو دھڑا دھڑ ریزرویشن نہیں دینا چاہیے۔ وہ نابرابری کو ختم تو کیا کم بھی نہیں کرتیں بلکہ سماج میں ذات پات کی تقسیم کو تقویت دیتی ہیں اور وہ دولت اور اقتدار کے مفاداتِ خصوصی کو ختم نہ کرتے ہوئے ذاتوں میں مفاداتِ خصوصی پیدا کرتی ہیں۔

ناخواندگی کے انسداد کا کام محض رضا کار اداروں پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس کے لیے وزارتِ تعلیم کے تحت ایک الگ واضح سرکاری ادارے کی ضرورت ہے جو اس کام کو ایک قومی تحریک کے طور پر عمل میں لائے۔

اسکول اور بیش قیمت تعیشی معیاروں کے غیر سکونتی پرائیویٹ اسکول میونسپل اسکولوں اور دیہی اسکولوں کے پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ نواحی اسکولوں کا اصول جس کی سفارش کوٹھاری کمیشن نے کی تھی ابھی تک عمل میں نہیں آیا۔ جن اشخاص کی آمدنی ایک خاص حد سے کم ہے اُن کے لیے دوپہر کے کھانے کی اسکیموں اور مفت درسی کتابوں، سلیٹوں، کاپیوں اور یونیفارم کے ساتھ ساتھ مذکورہ اسکیم کی آزمائش کی جانی چاہیے۔

تمام تر ثانوی تعلیمی نظام پر نظرِ ثانی کی جانی چاہیے۔ اُن تمام طلبا کو جو ثانوی تعلیم حاصل کرتے ہیں نہ صرف عام تعلیم دی جانی چاہیے بلکہ بعض قسم کی تکنیکی مہارتوں کی تعلیم بھی دی جانی چاہیے۔ جو محض پیشہ ورانہ نہیں ہونی چاہیے۔

ذریعہ تعلیم اور داخلوں میں ریزرویشن کا مسئلہ دو ایسے پہلو ہیں جنھیں دستاویز میں

گریجویٹ مطالعات اور تحقیق کے لیے ذریعہ تعلیم کے طور پر مادری زبان کو رائج کرنے کے لیے بنیادی ڈھانچے کو مضبوط نہیں کیا جاتا۔

ریزرویشن میں تخفیف کرو

جہاں تک داخلوں میں ریزرویشن کے سسٹم کا تعلق ہے یہ کہنا ضروری ہے کہ ریزرویشن سے اُن لوگوں کی

حالت میں محض نہایت معمولی بہتری ہوئی ہے جن کے کاز کو فروغ دینے کے لیے

اعلیٰ تر تعلیم کی اصلاح کرو

اعلیٰ تر تعلیم کے شعبے میں زیادہ زور یونیورسٹیوں اور کالجوں کے موجودہ سسٹم کی اصلاح کرنے پر اُسے نئی سمت دینے اور اُس میں نئی نئی باتیں داخل کرنے پر دینا ہوگا۔ کالجوں کو یونیورسٹیوں سے غیر منسلک کرنا ہوگا۔ ملحقہ کالجوں کے لیے ایک الگ اتھارٹی قائم کرنا ہوگی جس کے ساتھ علمی نگرانی کے لیے ایک موزوں ادارہ ضروری ہوگا۔ پوسٹ گریجویٹ مطالعات کے لیے داخلہ صرف

تمام تر ثانوی تعلیمی نظام پر نظرِ ثانی کی جانی چاہیے۔ اُن تمام طلبا کو جو ثانوی تعلیم حاصل کرتے ہیں نہ صرف عام تعلیم دی جانی چاہیے بلکہ بعض قسم کی تکنیکی مہارتوں کی تربیت بھی دی جانی چاہیے جو محض پیشہ ورانہ نہیں ہونی چاہیے۔

یونیورسٹیوں میں ہونا

اگر اعلیٰ تر تعلیم کو قومی ترقی کا
ذریعہ بننا ہے۔ تو اُسے مرکزی معاملات کی
نقیب بننا ہے تو اُسے مرکزی معاملات کی
فہرست میں [illegible] تعلیم کی دیگر [illegible] کے
[illegible] یونیورسٹیوں کو [illegible]
[illegible] پیدا کرنے

خود مختاری کے پیشِ نظر کوٹھاری کمیشن کا
مندرجہ ذیل بیان قابلِ ذکر ہے :-
"یہ پسندیدہ بات نہیں ہے کہ حکومت
یونیورسٹیوں سے براہِ راست نپٹے۔ اس امر
سے ہمیشہ فائدہ ہوگا کہ حکومت اور یونیورسٹیوں
کے درمیان ایک کمیٹی

حاصل کیا جانے والا علم دوسروں تک پہنچتا ہے۔
اس امر کا ذکر برمحل ہوگا کہ ہمارے
آئی آئی ٹی اور آئی آئی ایم بھارتی عوام کی قیمت
پر غیر ملکی صنعتوں کے لیے تربیت یافتہ عملہ فراہم
کر رہے ہیں۔ اگر اُن کا یہی مقصد ہے جسے وہ
پورا کر رہے ہیں تو شاید انھیں اپنی یونیورسٹیوں
میں واپس لایا جانا چاہیے

اعلیٰ تر تعلیم کے شعبے میں زیادہ زور موجودہ یونیورسٹی، کالج سسٹم کی اصلاح کرنے، اُسے نئی سمت دینے اور اُس میں نئی نئی باتیں داخل کرنے پر دینا ہوگا۔ کالجوں کو یونیورسٹیوں سے غیر منسلک کرنا ہوگا۔ ملحقہ کالجوں کے لیے ایک الگ اتھارٹی قائم کرنا ہوگی جس کے ساتھ علمی نگرانی کے لیے ایک موزوں ادارہ ہونا چاہیے۔

ضرورت نہیں بلکہ اُن کے لیے
ضروری ہے کہ وہ فوری اور براہِ راست
قومی ضروریات سے زیادہ وابستگی پیدا کریں۔
یونیورسٹیوں کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے
براہِ راست فنڈ ملنے چاہئیں۔ خود مختار اعلیٰ تر

ہو، ایسے اشخاص کی کمیٹی جو
اپنے سیاسی عمل یا سرکاری رتبے کے بجائے اپنے
علم اور حیثیت کی بنا پر منتخب کی جائے۔ ایسے
طریقے سے حکومت اور یونیورسٹیوں کے درمیان
ضروری تال میل یقینی ہو جاتا ہے۔ سرکاری

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے
رول سے متعلق کوٹھاری کمیشن کی سفارش کو
عملی جامہ پہنایا جانا چاہیے۔
یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو
"...... اعلیٰ تر تعلیم کے تمام تر سلسلے

اس امر کا ذکر برمحل ہوگا کہ ہمارے آئی آئی ٹی اور آئی آئی ایم بھارتی عوام کی قیمت پر غیر ملکی صنعتوں کے لیے تربیت یافتہ عملہ فراہم کر رہے ہیں۔ اگر اُن کا یہی مقصد ہے جسے وہ پورا کر رہے ہیں تو شاید انھیں اپنی یونیورسٹیوں میں واپس لایا جانا چاہیے۔

تعلیمی اداروں کی جان ہے اور وہ طلبا اور
سماج کے روبرو جوابدہ ہوں۔ ایسا ہونے پر
یونیورسٹیوں کو مختلف تعلیمی وزارتوں اور
افسر شاہی کی طرف سے نہیں چلایا جائے گا اور
نہ ہی وہ اُن کے ماتحت کام کریں گی۔
یونیورسٹیوں کی تیزی سے ختم ہونے والی

عطیات اعلیٰ تر تعلیمی اداروں کی ضروریات
کا بغور اندازہ کر کے دیے جاتے ہیں اور
اس پر بھی وہ نامناسب سیاسی اثر سے آزاد
رہتے ہیں۔" یونیورسٹیوں میں پھر سے ریسرچ
ہونا ضروری ہے۔ سب باتوں سے بالا تر یونیورسٹی
میں علم کی تخلیق ہونا ضروری ہے کیوں کہ وہیں سے

کی نمائندگی کرنی چاہیے ...... ہم اس کی پُرزور
حمایت کرتے ہیں کہ تمام اعلیٰ تر تعلیم کو ایک مربوط
مکمل سلسلہ تصور کیا جانا چاہیے کہ پیشہ ورانہ تعلیم
کو عام تعلیم سے کلیتہً الگ نہیں کیا جا سکتا اور کہ
یہ ضروری ہے کہ تمام اعلیٰ تر تعلیم کو جس میں

یکم تا ۳۱ جنوری ۱۹۸۶

زراعت، انجینیرنگ اور طب شامل ہیں۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے عمل دخل میں لایا جائے۔ یہ حتمی سمت ہے جس میں پیش قدمی کرنی چاہیئے۔"

نیشنل اوپن یونیورسٹی کو اولیت

نیشنل اوپن یونیورسٹی اور بذریعہ ریڈیو تعلیم کو اہم رول ادا کرنا ہے۔ نیشنل اوپن یونیورسٹی کو کسی ریاستی اوپن یونیورسٹی کے خطوط پر کام نہیں کرنا چاہیئے۔ درحقیقت ریاستی اوپن یونیورسٹی کا از سر نو نام اوپن کالج رکھا جانا چاہیئے تاکہ انھیں نیشنل اوپن یونیورسٹی سے ممیز کیا جاسکے۔ نیشنل اوپن یونیورسٹی اعلیٰ تر تعلیم کی اعلیٰ ترین سطح تصور کی جانی چاہیئے۔ بنیادی طور پر اس کے دو مقاصد ہونے چاہئیں۔ ایک یہ مقصد ہے کہ یونیورسٹی میں ہونے والے اہم تحقیق و مطالعہ کے نتائج اور حاصل ہونے والے نئے علم کو اعلیٰ ترین سطح پر دستیاب کرانا۔ یہ ایک ایسا ادارہ ہونا چاہیئے جو علمی دھماکے اور معلوماتی انقلاب سے اُبھرنے والے امور کو نپٹائے۔ اسے متواتر تحقیق و مطالعہ میں لگے رہنا چاہیئے۔ اس کا دوسرا مقصد ہونا چاہیئے قوتِ حافظہ کو تحریک دینا اور اُس کے افقوں کی بھی توسیع کرنا۔ زور اس امر پر دینا ہوگا کہ ماہرین نے جو علم حاصل کیا ہے اُسے عوام تک براہِ راست طور پر یا اُس صورت میں پہنچایا جائے جسے قوم وسیع طور پر مختلف سطحوں پر آسانی سے

موثر طور پر بروئے کار لاسکے۔ مختصر طور پر یہ کسی مقررہ وقت پر جدید ترین علم کی تعلیم اور تشہیر کرلے۔

اِس قسم کی اوپن یونیورسٹی کو ڈگریاں دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کام ریاستی سطحوں پر اوپن کالجوں پر چھوڑا جاسکتا ہے۔ ایسی یونیورسٹی کے لیے ایسے نہایت کم مستقل عملہ کی ضرورت ہے جو بنیادی طور پر واقعی

> **نیشنل اوپن یونیورسٹی اعلیٰ تر تعلیم کی اعلیٰ ترین سطح تصور کی جانی چاہیئے۔ بنیادی طور پر اس کے دو مقصد ہونے چاہئیں۔ ایک یہ مقصد ہے کہ یونیورسٹی میں ہونے والے اہم تحقیق و مطالعہ کے نتائج اور حاصل ہونے والے نئے علم کو اعلیٰ ترین سطح پر دستیاب کرایا جائے۔ یہ ایک ایسا ادارہ ہونا چاہیئے جو علمی دھماکے اور معلوماتی انقلاب سے اُبھرنے والے اُمور کو نپٹائے۔**

شاندار تعلیمی منتظموں اور ناظموں پر مشتمل ہو۔ اس کے اساتذہ اعلیٰ ترین معیار کے ہونے چاہئیں جو محدود عرصے کے لیے مختلف یونیورسٹیوں سے آئیں اور پھر وہ اُنہی یونیورسٹیوں میں واپس چلے جائیں جہاں وہ مستقل طور پر پڑھانے اور تحقیق و مطالعہ کرتے ہیں۔ پھر نیشنل اوپن یونیورسٹی باضابطہ تعلیم کا نعم البدل یا متبادل نہیں ہوگی بلکہ وہ تمام اعلیٰ تر تعلیمی نظام کے اوپر

ہوگی۔ اسے تمام تر نظام کو تحریک دینی چاہیئے اور اس کی جڑیں حقیقتاً اس نظام میں ہونی چاہئیں۔ یہ ریاستی اوپن کالجوں کو بصری آلات، کیسٹ اور دیگر تعلیمی امدادی سامان تیار کرنے میں مدد دیگی۔

ذرائع ابلاغ کی اہمیت

پھر اوپن کالج ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے کالجوں کے کام انجام دیں گے جو دُور دراز تک اشاعتِ تعلیم کی تکنیکوں کے ذریعہ تربیت اور ڈگریاں دیں گے۔ اس سے تعلیم بالغان اور عملی تعلیم کی مانگیں پوری ہوسکتی ہیں اور اس کے علاوہ اُن کی اُمنگوں کو بھی پورا کیا جاسکتا ہے، جو اپنی تعلیمی قابلیتوں کو بہتر بنانا چاہتے ہیں یا اپنے علم و ہنر میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔

آخر میں ایک تعلیم یافتہ معاشرہ کی تعمیر کے بارے میں چند الفاظ کا ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو تعلیم کے ایک ذیلی نظام کے بجائے تمام سماجی نظام سے تعلق رکھتا ہے۔ جمود میں جکڑا ہوا معاشرہ ایک خواندہ معاشرہ نہیں بن سکتا۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں زندگی ایک معمول کی صورت اختیار کرتی ہے۔ جو جامد ہے اور جس میں بھاری اکثریت کے لیے عمودی یا اُفقی حرکت پذیری کا زیادہ امکان نہیں ہے ایک خواندہ معاشرہ نہیں ہوسکتا۔

یہ محض عوام ہی ہوتے ہیں جنھیں چنوتیوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے اور جنھیں اپنے وجود کے لیے ترقی کرنا ہوتی ہے اور جنکی اُمنگیں

(باقی صفحہ ۱۲۰ پر)

پروفیسر درگا نند سنہا

تعلیم میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت

زیرِ نظر مضمون میں مصنّف نے "تعلیم کا چیلنج۔ ایک حکمتِ عملی کا تناظر" نامی دستاویز کو مایوس کُن قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ "یہ دستاویز ایک حقیقت پسندانہ تعلیمی پالیسی کی تشکیل کے لیے ایک مربوط پس منظر پیش کرنے میں ناکام رہی ہے جو بیحد ضروری ہے۔ علاوہ ازیں اس میں تعلیمی پروگرام پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کے لیے کسی مانیٹرنگ نظام کا اہتمام بھی نہیں کیا گیا ہے۔ شری سنہا کا خیال ہے کہ "دستاویز میں اکیسویں صدی کے مطالبات کی پیش بینی کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ طلباء میں بنیادی اقدار کا احترام بیدار کرنے اور ان کا کیرکٹر بنانے کی طرف بھی توجہ نہیں دی گئی ہے۔ نیز تحقیق اور تحقیقی اداروں کے رول کو بھی نظرانداز کیا گیا ہے۔" ان کا کہنا ہے کہ یہ سب اس بات کے متقاضی ہیں کہ تعلیم کے اسٹائل، طریقوں اور ذرائع میں انقلابی تبدیلیاں لائی جائیں۔

دستاویز مایوس کُن ہے۔

وزیرِ اعظم نے کوئی آٹھ ماہ بیشتر اعلان کیا تھا کہ قومی منصوبوں میں تعلیم کو اعلیٰ ترجیح دی جائے گی۔ ایک نئی تعلیمی پالیسی عنقریب لاگو کی جائے گی جو نہ صرف ماضی کی پالیسیوں سے بہت مختلف ہوگی بلکہ قوم کو اکیسویں صدی میں داخل ہونے کے لیے تیار کرے گی۔ ان کے اس اعلان سے نہ صرف ماہرینِ تعلیم ہی بلکہ ملک کی ترقی و فلاح و بہبود میں دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے دل میں بڑی بڑی اُمیدیں پیدا ہوگئی تھیں اور یہ اُمیدیں بیجا بھی نہیں تھیں کیونکہ یہ کہا گیا تھا کہ نئی پالیسی بیوروکریٹوں، سیاستدانوں اور نام نہاد ماہرین کے کٹّر خیالات اور پُرانے عقائد کی روشنی

میں نہیں بنائی جائے گی۔ بلکہ ایک قومی بحث
کے ذریعے تشکیل دی جائے گی۔
ایک ایسی دستاویز کے پیش کیے جانے
کا مہینوں انتظار کیا گیا جو سختی اور دلیری کے ساتھ
شعبۂ تعلیم کی صورتِ حال کی حقیقی تصویر پیش
کرے اور بنیادی امور کی نشاندہی کرے جس
سے ان پر قومی پیمانے پر بحث شروع ہو سکے
اور اسے بامعنی سمت عطا کی جا سکے۔ لیکن مہینوں

سے عمل درآمد کا پروگرام صرف کاغذات تک
ہی محدود نہ رہے بلکہ اسے پورا کرنے کی سنجیدہ
کوشش کی جائے۔ اس کے علاوہ تحقیقی جائزہ
کا انتظام بھی ہونا چاہیئے تاکہ عمل درآمد کے
مختلف منصوبوں کے اثرات و نتائج کا پتہ
لگایا جا سکے اور ضروری اصلاحی اقدامات کیے
جا سکیں۔
ہماری قومی زندگی کے تقریباً ہر شعبے
میں اعلان کردہ مقاصد اور ان کے حصول کے لیے

خوفناک نہ ہوتا جتنا کہ آج ہے۔ جب تک پالیسی
کے بیان میں مانیٹرنگ کا ایک جامع انتظام کرنے
کی بات شامل نہیں کی جاتی ساری مشق کھوکھلی
رہے گی اور عوام کو لمبے چوڑے بیانات اور
خوش آئند جملوں سے دھوکہ دیا جاتا رہے گا۔

حقائق کو نظر انداز کرتی ہے

کچھ اہم پہلو جنھیں اس دستاویز میں
ظاہرہ طور پر نظر انداز کیا گیا ہے مختصراً یوں
بیان کیے جا سکتے ہیں۔ یہ دستاویز ایک

ایک ایسی دستاویز کے پیش کیے جانے کا مہینوں انتظار کیا گیا جو سختی اور دلیری کے ساتھ شعبۂ تعلیم کی صورتِ حال کی حقیقی تصویر پیش کرے اور بنیادی امور کی نشاندہی کرے جس سے ان پر قومی پیمانے پر بحث شروع ہو سکے اور اسے بامعنی سمت عطا کی جا سکے۔ لیکن مہینوں کے انتظار کے بعد وزارتِ تعلیم نے جو دستاویز "تعلیم کا چیلنج۔ ایک حکمتِ عملی کا تناظر" کے عنوان سے جاری کی ہے وہ مایوس کن ہے۔

کے انتظار کے بعد وزارتِ تعلیم نے جو دستاویز
"تعلیم کا چیلنج۔ ایک حکمتِ عملی کا تناظر"
کے عنوان سے جاری کی ہے وہ مایوس کن ہے۔

مانیٹرنگ کو نظر انداز کرتی ہے

کوئی بھی پالیسی وضع کرتے وقت پالیسی
کے اجزائے ترکیبی اور اُن ضرورتوں کو، جن کے
لیے پالیسی بنائی جاتی ہے، پیشِ نظر رکھنا ضروری
ہوتا ہے۔ پالیسی میں نصب العینوں کی مکمل وضاحت
کر دی جانی چاہیئے اور نشانے مقرر کر دیئے جانے
چاہئیں نیز ان کے حصول کے لیے طریقِ کار یا
پروگرام طے کر دیا جانا چاہیئے۔ اس میں مانیٹرنگ
کا ایسا انتظام بھی شامل کیا جانا چاہیئے جس

کی جانے والی کوششوں یا اصل حصولیابیوں
میں بڑا فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک
کو ایک "نرم ریاست" کہا جانے لگا ہے۔ لہٰذا
اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہماری تعلیمی پالیسی محض
ایک مقدس اُمید بن کر نہ رہ جائے تو ضروری ہے
کہ اسکیموں پر عمل درآمد کے ساتھ ساتھ ان
کی مانیٹرنگ اور تحقیقی جائزے لینے کا بھی
انتظام کیا جائے۔ ویسے تو ہماری ۱۹۶۸ء کی
تعلیمی پالیسی اور آزادی کے بعد مقرر کیے گئے
مختلف تعلیمی کمیشنوں کی عمدہ سفارشات میں
اعلیٰ آدرش مقرر کیے گئے تھے۔ اگر ان سفارشوں
پر تھوڑا سا بھی عمل کیا جاتا تو تعلیمی منظر اتنا

حقیقت پسندانہ پالیسی کی
تشکیل کے لیے ایک مربوط پس منظر پیش
کرنے میں ناکام رہا ہے جو بیحد ضروری ہے۔
اس میں تعلیم کی مختلف سطحوں کے بارے میں چند
مفید معلومات تو فراہم کی گئی ہیں، لیکن دورِ حاضر
کے تعلیمی پس منظر کی افسوسناک حقیقتوں کو
صاف صاف اور دلیری کے ساتھ پیش کرنے
سے احتراز کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس یہ ادیبانہ
اور خطیبانہ اقوال، نعروں اور بار بار دوہرائی ہوئی
باتوں سے بھری ہوئی ہے جو بنیادی امور کو روشن
کرنے کی بجائے ابہام پیدا کرتے ہیں اور صورتِ
حال کی ناخوشگوار حقیقتوں کو چھپانے کی کوشش

کرتے نظر آتے ہیں۔ اس طرح پورے تعلیمی عمل کے کچھ اہم پہلوؤں کو اگر نظر انداز نہیں کیا گیا ہے تو ان پر توجہ بھی نہیں دی گئی ہے جس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دستاویز سرسری انداز میں تیار کی گئی ہے اور اسے تیار کرنے میں پورے تعلیمی منظر کو مکمل اور مربوط انداز سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ چونکہ اس مضمون میں ان تمام امور پر جن پر توجہ مرکوز نہیں کی گئی ہے مفصل روشنی ڈالنا ممکن نہیں ہے اس لیے میں صرف چند اہم ترین پہلوؤں کا ذکر کرنے پر اکتفا کروں گا۔ یہ پہلو ہیں:

۱۔ اکیسویں صدی کے مطالبات اور انھیں پورا کرنے کے اقدامات کی پیش بینی کے لیے کسی سنجیدہ کوشش کا نہ کیا جانا۔

۲۔ پرائمری سے قبل کی تعلیم اور

۳۔ ریسرچ (تحقیق) اور تحقیقی اداروں کا رول۔

خاندانی اور سماجی رشتے بھی بدل رہے ہیں۔ اس سب کا صحیح صحیح اندازہ لگایا جانا چاہیے اور اسی کے مطابق ہماری تعلیمی پالیسی وضع کی جانی چاہیے۔ یہ پالیسی ایسی ہونی چاہیے جو عوام میں مناسب سائنسی، صنعتی اور تکنیکی قابلیت پیدا کرے اور ایسی تنظیمیں اور ادارے قائم کرے نیز عوام میں ایسی اقدار اور رجحانات پیدا کرے جو ان تبدیلیوں کو مؤثر طور پر جذب کر سکیں اور ان نئی ترقیوں سے پوری طرح بہرہ ور ہو سکیں۔ صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ ہم!

دنیا کی کل ناخواندہ آبادی کا ۵۴ فی صد حصہ اپنے ساتھ لے کر اکیسویں صدی میں داخل نہیں ہو سکتے۔ تعلیم کے نفس مضمون، اسٹائل اور میڈیا (Media) میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہوگی۔ مختلف سطحوں کے تعلیمی نصاب میں اس وقت جو کچھ

مضامین کی سرحدیں ٹوٹتی جا رہی ہیں اور مخلوط مضامین کا مطالعہ رواج پا رہا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ بایولوجی (Biology) یعنی علم حیاتیات اور فزکس (Physics) یعنی علم طبیعیات کے بمقابلہ بایوفزکس (Bio Physics) کا مطالعہ زیادہ مفید مطلب بنتا جا رہا ہے۔ ہمیں ایسے ہی علمی کلچر کو فروغ دینا ہوگا۔ بجائے اس کے کہ الگ الگ مضمون کی سلطنتیں بنائی جائیں۔

اور کام کرنے کا نیا کلچر

ٹیکنالوجی کے نئے انقلاب کا تقاضا ہے کہ منظم ہو کر ایک ٹیم کی طرح کام کیا جائے۔ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہم ہندوستانی جب انفرادی طور پر کام کرتے ہیں تو ترقی یافتہ ممالک کے افراد کے برابر بلکہ بہتر کارکردگی دکھا سکتے ہیں لیکن جب ہمیں دوسروں کے ساتھ مل کر بحیثیت ایک ٹیم کے کام کرنا پڑتا ہے تو ہم حیرت انگیز کوتاہیوں کا ثبوت دیتے ہیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ایک

> ہمارے قومی زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں اعلان کردہ مقاصد اور ان کے حصول کے لیے کی جانے والی کوششوں یا اصل حصولیابیوں میں بڑا فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک کو ایک "نرم ریاست" کہا جانے لگا ہے۔

انقلابی تبدیلیوں کی متقاضی ہے

پہلی بات تو یہ ہے کہ تعلیم میں اصلاح مستقبل کو نظر میں رکھتے ہوئے کی جانی چاہیے۔ یعنی انسانی وسائل کو اس طرح ترقی دینا چاہیے کہ نئی ٹیکنالوجی اور معاشرہ میں ہونے والی تبدیلیوں سے پیدا شدہ ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے جس سے کہ ہمارا ملک دنیا کی ترقی یافتہ اقوام سے پیچھے نہ رہے۔ صنعتی انقلاب سے ہونے والی تبدیلیوں کے مقابلے میں آج کے ٹیکنالوجی میں ہونے والے انقلاب سے پیداواری عمل، نقل و حمل اور مواصلات کے نظام میں تیزی سے وسیع اور انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور نہ صرف عوام کا طرز زندگی بلکہ ان کے

شامل ہے وہ فرسودہ اور پرانا ہے۔ اسے ترک کرنا پڑے گا، خواہ کتنی ہی مخالفت کیوں نہ ہو۔ ہمیں ابتدا میں ہی سوچ سمجھ کر بنائے گئے کھیل، کھلونوں کا استعمال کرکے بچوں کا ذہن سائنٹفک اصولوں کی طرف موڑنا ہوگا اور ملکے مضامین کے مقابلے میں سائنس اور تعلیم ریاضی پر زیادہ سے زیادہ زور دینا ہوگا۔ آج دنیا کے علم میں

ہندوستانی دو جرمنوں یا دو جاپانیوں کے برابر ہے لیکن تین ہندوستانی مل کر ایک جرمن یا ایک جاپانی سے کم ہیں۔ آشیش نندی نے کچھ سرکردہ ہندوستانی سائنس دانوں کے بارے میں عمیق مطالعے کیے ہیں۔ ان مطالعوں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ انفرادی حیثیت سے ان سائنسدانوں کا

کا کام اپنی مثال آپ تھا۔ لیکن جب اُنھوں نے
ایک ٹیم یا تنظیم بنائی تو ان کے کام میں وہ بات نہ رہی۔ یہ صحیح بھی ہے کہ جب ہمیں مشکل حالات یا دباؤ میں کام کرنا پڑتا ہے تو ہم حیرت انگیز کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں جیسا کہ ایشیائی کھیلوں اور ناوابستہ ممالک کی کانفرنس کے وقت دیکھا گیا۔ لیکن اپنی عام یا روزمرہ زندگی میں ہم سُست ہو جاتے ہیں اور "چلتا ہے" کلچر کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ٹیکنالوجی کے نئے انقلاب کے مطالبات کو، جو شروع بھی ہو چکا ہے پورا کرنے کے لیے صرف ناخواندگی کو مٹانا ہی کافی نہیں ہے بلکہ نیا علم، نئی معلومات حاصل کرنا اور رجحانات اور کام کرنے کے طریقوں میں انقلابی تبدیلیاں لانا بھی ضروری ہے۔ ہمیں سیکھنا ہوگا کہ ٹیم میں کیسے کام کیا جائے ایسی

تنظیمیں کیسے بنائی جائیں جو فرد کے مقابلے میں زیادہ دیر تک زندہ رہیں۔ ہمیں کام کرنے کا ایسا طریقہ اختیار کرنا ہوگا جس میں سُستی، ذمہ داری سے

بچنے اور جوابدہی سے کترانے کی کوئی گنجائش نہ ہو اور فرض کے لیے سچی لگن موجود ہو۔ اور کام کرنے کا ایسا کلچر بنانے کی ذمہ داری تعلیم

باضابطہ اور بے ضابطہ دونوں قسموں کی تعلیم پر ہے۔ اگر اس کی ضرورت اور اہمیت پر ہماری نئی تعلیمی پالیسی میں توجہ نہ دی گئی تو یہ ایک خطرناک غلطی ہوگی۔

یہاں صرف عام مسائل ہی اُٹھائے گئے ہیں۔ اس قسم کے مضمون میں تفصیل کے ساتھ یہ بتانا ممکن نہیں ہے کہ ٹیکنالوجی کے نئے انقلاب، جس کی رفتار اس صدی کے آخر تک تیز تر ہو جائے گی، کی وجہ سے کیا مطالبات درپیش ہوں گے اور ان کو پورا کرنے کے لیے تعلیم میں کیا تبدیلیاں کی جانی چاہئیں۔ اس بارے میں تفصیلات کی شناخت اور اکیسویں صدی کے مطالبات کو پورا کرنے کے لیے تعلیم کی مختلف سطحوں کے واسطے موزوں پروگرام بنانے کے سلسلے میں تجاویز حاصل کرنے کے لیے قومی پیمانے پر بحث ہونی چاہیے۔ صرف اس نعرے کو دہرانا کافی نہ ہوگا کہ ہمیں اکیسویں صدی میں داخل ہونے کے لیے نہایت سنجیدگی سے غور و خوض کرنا ضروری ہے۔

یہ دستاویز ایک حقیقت پسندانہ پالیسی کی تشکیل کے لیے ایک مربوط پس منظر پیش کرنے میں ناکام رہی ہے جو بیحد ضروری ہے۔ اس میں تعلیم کی مختلف سطحوں کے بارے میں چند مفید معلومات تو فراہم کی گئی ہیں لیکن دورِ حاضر کے تعلیمی پس منظر کی افسوسناک حقیقتوں کو صاف صاف اور دلیری کے ساتھ پیش کرنے سے احتراز کیا گیا ہے۔

صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ ہم دُنیا کی کُل ناخواندہ آبادی کا ۵۴٫۸ فیصد حصّہ اپنے ساتھ لے کر اکیسویں صدی میں داخل نہیں ہو سکتے۔ تعلیم کے نفسِ مضمون، اسٹائل اور میڈیا (MEDIA) میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہوگی۔ مختلف سطحوں کے تعلیمی نصابات میں اس وقت جو کچھ شامل ہے، وہ فرسودہ اور پُرانا ہے۔

پرائمری سے پہلے کی تعلیم ضروری

دُوسرا پہلو جو توجہ سے محروم رہا ہے، پرائمری سے پہلے کی تعلیم ہے۔ ہم بجا طور پر ابتدائی تعلیم پر زور دیتے رہے ہیں۔ یہ یاد کرنے کی ضرورت ہے کہ تعلیم کا عمل اس

سے بہت پہلے شروع ہو جاتا ہے اور بعد کے
درجوں پر اپنا اثر چھوڑتا ہے۔ ابتدائی تعلیم کی
سطح پر ایک چونکا دینے والی بات یہ ہے کہ
پہلے سال میں داخل کیے جانے والے [illegible] بچوں
میں سے صرف ۲۳ بچے آٹھویں درجے تک پہنچ
پاتے ہیں۔ [illegible] پڑھائی چھوڑ دینے والے بچوں
میں غیر مناسب [illegible] زیادہ [illegible] خدمت
زیادہ [illegible] اور قبیلوں [illegible] غریب طبقوں
کا ہوتا ہے۔ مطالعات سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ
دوسروں کے مقابلے میں بہت کم ایسے بچے بیچ
میں پڑھائی چھوڑتے ہیں جو پرائمری سے پہلے ہی
کسی قسم کی تعلیم سے روشناس ہو چکے ہوتے
ہیں۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ بچے بعد کے
درجوں میں اکتساب تعلیم کے لیے ضروری سمجھ
بوجھ اور زبان کو سمجھنے کی اہلیت بہت شروع
میں ہی حاصل کرتے ہیں۔ اگر ان کے گھر یا خاندان
کا ماحول متحرک ہو اور وہ نرسریوں یا کنڈر گارڈن
میں ڈالے جائیں تو ان کے اندر یہ صلاحیتیں جلد
پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے ابتدائی تعلیم
کے پروگراموں کو کامیاب بنانے کے
لیے پرائمری میں داخل ہونے سے
قبل کی مدت پر بھی توجہ دینا
ضروری ہے۔ جس میں بچوں کا
گھریلو ماحول اور ان کے
خاندانوں کے تجربات بھی شامل
ہیں۔ دوسرے ملکوں کی طرح ہمارے
یہاں بھی ایسے بہت سے جائزے لیے گئے
ہیں جن سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بعد کے
درجوں میں صحیح ڈھنگ سے تعلیم پانے کی صلاحیت
پیدا کرنے میں گھریلو ماحول اور خاندان
کے حالات بہت ممد و معاون ہوتے ہیں اور
اگر گھر، خاندان یا اسکول کا ماحول درست نہ ہو

تو اس کا خراب اثر پڑتا ہے۔ چوں کہ یہ مسئلہ
خاص کر غریب اور پسماندہ طبقوں میں
زیادہ شدید ہے لہٰذا ان میں پرائمری سے
قبل کی تعلیم اور گھریلو ماحول سے متعلق مشکلات
پر عبور پانے کے لیے مناسب حکمتِ عملی بنانا
ضروری ہے۔ اگر دیسی کھیلوں کا سوچ سمجھ کر
استعمال کیا جائے اور مقامی طور پر دستیاب
چیزوں سے ایسے تعلیمی کھلونے بنائے جائیں
جن سے بچوں میں ضروری سمجھ بوجھ ہو سکے اور
وہ دوسروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا یا مل کر
رہنا سیکھ سکیں تو اس سے تعلیم کے لیے
ایک ٹھوس بنیاد تیار کرنے میں بڑی مدد ملے
گی۔ اگر شروع میں ہی ضروری اقدامات
کیے جائیں تو بیچ میں پڑھائی چھوڑ دینے
والے بچوں کی تعداد کم کی جا سکتی ہے اور
پھر یہ دیکھنے میں نہیں آئے گا کہ بچے ٹھیک
سے پڑھتے نہیں ہیں، خاص کر غریب اور

ایسے خاندانوں کے بچوں میں نظر آتا ہے، جہاں
ماں اور باپ دونوں ملازمت پیشہ ہوتے
ہیں اور نہ تو وہ خود بچوں کی دیکھ بھال کر پاتے
ہیں نہ اپنے رشتہ داروں وغیرہ کے ذریعے ان
کی دیکھ بھال کا انتظام کر سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ
کھاتے پیتے متوسط گھرانوں میں زیادہ شدت
اختیار کرتا جا رہا ہے۔ والدین پر کام کاجی زندگی
کے دباؤ کے سبب بچے عدم توجہی کا شکار ہو
جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سی صلاحیتیں،
اقدار اور رجحانات جو بچوں میں گھریلو ماحول سے
پیدا ہوتے ہیں، اور جو اکتساب تعلیم میں بہتر
کارکردگی کے لیے ضروری بھی ہوتے ہیں، وہ نہیں
ہو پاتے اور سارا انحصار اسکول پر ہی ہو جاتا ہے۔
والدین کی ذاتی دیکھ بھال کی اس کمی کو دھیرے
دھیرے ایسے ادارے قائم کر کے دُور کیا جا
سکتا ہے جو بچوں کی دیکھ بھال کر سکیں اور
متعلقہ ضروری خدمات مہیا کر سکیں۔ ایسے
ادارے سماج خود بہتر طور
پر منظم کر سکتا ہے
لیکن جن جگہوں
پر جہالت

ٹیکنالوجی کے نئے انقلاب کے مطالبات کو، جو شروع بھی ہو چکا ہے، پورا کرنے کے لیے صرف ناخواندگی کو مٹانا ہی کافی نہیں ہے بلکہ نیا علم، نئی معلومات حاصل کرنا اور رُجحانات اور کام کرنے کے طریقوں میں انقلابی تبدیلیاں لانا بھی ضروری ہے۔

یا اقتصادی وجوہ کے سبب ایسی خدمات دستیاب
نہ ہوں وہاں ریاست کو ان کی کمی دُور کرنے کے
لیے آگے آنا چاہیے۔ غریب بچوں کے لیے
بال واڑیوں وغیرہ کے پروگرام پہلے ہی سے
چلائے جا رہے ہیں۔ ضروری ہے کہ انھیں زیادہ
مؤثر بنایا جائے اور اُن میں بچوں کی ابتدائی

والدین کی دیکھ بھال کی ضرورت

اس مسئلے کا ایک اور پہلو بھی ہے جو بالخصوص
پسماندہ طبقوں کے نونہال۔

تعلیمی وسماجی تربیت کا انتظام بھی کیا جائے
خاص کر پسماندہ طبقوں کے بچّوں کے لیے۔

کردار کا بُحران

تیسری بات جس پر زیادہ توجہ نہیں
دی گئی ہے، بنیادی اقدار، کیرکٹر یا کردار کی تعمیر
اور اخلاقی تعلیم سے تعلق

یہ بنیادی اقدار سماج میں مِل جُل کر
رہنے سے اوائل عمر میں ہی دلنشیں ہو جاتی
ہیں۔ جیسا کہ سُدھیر ککّڑ نے دکھایا ہے عوام
کی زندگی کے دَوران مختلف اوقات میں جو
مذہبی رسوم اور خاندانی تقریبات ہوتی ہیں
وہ ہندوستان کی روح کا جزو بن جاتی ہیں۔
لیکن جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کنبہ یا

پھر اس کی اصلاح بھی ممکن نہ ہوگی۔ لہٰذا یہ
امر باعث اطمینان ہے کہ وزیر اعظم نے اپنی
ایک حالیہ تقریر میں کیرکٹر بنانے اور شخصیت
کی نشوونما میں تعلیم کے رول پر زور دیا ہے۔

اور سماجی اقدار

انسان کی صحت مندانہ نشوونما اخلاقی
اور روحانی اقدار اور عمدہ تربیت پر منحصر ہے۔

> **ہمیں سیکھنا ہوگا کہ ٹیم میں کیسے کام کیا جائے، ایسی تنظیمیں کیسے بنائی جائیں جو فرد کے مقابلے میں زیادہ دیر تک زندہ رہیں۔ ہمیں کام کرنے کا ایسا طریقہ اختیار کرنا ہوگا جس میں سُستی، ذمّہ داری سے بچنے اور جوابدہی سے کترانے کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ اور فرض کے لیے سچّی لگن موجود ہو اور کام کرنے کا ایسا کلچر بنانے کی ذمّہ داری تعلیم ـ باضابطہ اور بے ضابطہ دونوں قسموں کی تعلیم پر ہے۔ اگر اس کی ضرورت اور اہمیت پر ہماری نئی تعلیمی پالیسی میں توجہ نہ دی گئی تو ایک خطرناک غلطی ہوگی۔**

رکھتی ہے۔ دستاویز میں سائنسی
مزاج، جمہوریت اور سیکولرزم کا ذکر موجود ہے
لیکن بُنیادی اقدار اور کیرکٹر کی خصوصیات مثلاً
سچائی، ایمانداری، دیانتداری، دوسروں کا
دل نہ دُکھانے، نفس خواہشات پر قابو رکھنے
اور دوسروں کی مدد کرنے وغیرہ پر توجہ نہیں
دی گئی ہے۔ اگر اخلاقی اقدار کا فقدان ہو تو
جمہوری اقدار اور سیکولرزم بے معنی ہیں۔
بھارت میں ہم کردار کے بدترین بُحران سے
دوچار ہیں۔ یہ کہہ دینے سے ڈھارس نہیں
بندھتی کہ اخلاقی اقدار کی کمی کا مسئلہ ساری دُنیا
کو درپیش ہے۔ ہمیں ایسی دلیلوں سے مسئلے
کو ٹالنے کے بجائے اس کا ڈٹ کر سامنا کرنا
چاہیئے۔

خاندان تیزی سے اپنے اس رول سے الگ
ہوتا جا رہا ہے اور مذہبی رسوم اور تقریبات کو
پُرانے زمانے کی اور فرسودہ کہہ کر ترک
کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح اقدار کا ایک خلا
پیدا ہو گیا ہے جس کی جھلک ہم اپنی سماجی
تقریبات میں دیکھتے ہیں۔ آج ایک ایماندار اور
سیدھے سادے آدمی کو بے وقوف سمجھا جاتا
ہے اور اخلاقی اقدار پر قائم افراد کو کرٹ اور
پُرانے فیشن کا گردانا جاتا ہے۔ بے ایمانی
اور دھوکہ دھڑی طرزِ زندگی بن گئی ہے اور ستم
یہ کہ سماج شاذ ہی اس کی مذمّت کرتا ہے۔
اگر یہ مجنونانہ تماشہ یوں ہی جاری رہتا ہے
تو ہمارا سارا سماجی ڈھانچہ بگڑ جائے گا اور

بدقسمتی سے جاری شدہ دستاویز میں اس اہم
ضرورت پر کم توجہ دی گئی ہے۔ خاندان کے تجربات
اور سماج میں مِل جُل کر رہنے کے عمل کی اہمیت
پر پہلے ہی اظہارِ خیال کیا جا چکا ہے۔ اب رہا
ابتدائی تعلیم اور تربیت کا رول۔ یہ کہنے کی
ضرورت نہیں ہے کہ بہت سی اقدار متبادل یا
کہانی قصّوں سے اخذ کی جاتی ہیں۔ اُس بندر
کی کہانی نے، جس نے دُودھ والے کے منافع
کا وہ حصہ جو اس نے دودھ میں پانی مِلا کر کمایا
تھا، دریا میں پھینک دیا تھا۔ ہمارے دلوں
میں ایمانداری کی زندگی کی قدر پیدا کی۔
اس طرح کی نصیحت آمیز کہانیاں بچّوں کے

[illegible]
بجائے مونو پولی (MonoPoly) کی قسم [illegible]
[illegible]
کتابوں [illegible]
[illegible] تو بچوں کی کتابوں میں [illegible]
کرنا بھی [illegible]
کی سماجی و ثقافتی اقدار پیدا کر [illegible]

یہ امر قابل توجہ ہے کہ سماجی [illegible] یا سیکولرزم وغیرہ کے رجحانات بچے بیشتر والدین، تعلیم اور میڈیا (Media) کے زیر اثر آٹھ یا نو سال کی عمر تک اپنے آپ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے [illegible] پر کنٹرول رکھنے کے لیے موزوں حکمت عملی تیار کرنا ضروری ہے۔

بچوں کا کیرکٹر بنانے اور ان میں صحیح اقدار پیدا کرنے میں یہ بات بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ ان کے سامنے کیسے ماڈل یا نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ بچے اپنے خاندان، سماج، کتابوں اور میڈیا (یعنی فلم اور ٹیلی ویژن وغیرہ) کے ماڈلوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہ بات قدرے تشویش کا باعث ہے۔ بہت سے بچے فلم "شعلے" کے ڈاکو گبر سنگھ کے طرز گفتگو کی نقل کرتے ہیں اور شوقیہ طور پر اس کے بعض مکالمات بھی بولتے ہیں۔ بہت سے بچے ہماری فلموں میں دکھائی جانے والی دولت کی نمائش، بدترین مادہ پرستی اور گروہی ثقافت سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ بے ایمان اور بد دیانت لوگ سماجی و سیاسی میدان میں حاوی ہو رہے ہیں اور سارے معاشرتی ڈھانچے

[illegible] تعلیم کا ایک مقصد کردار بنانا [illegible] ثقافتی اقدار کو ذہن نشین [illegible] ہماری قومی تعلیمی پالیسی کی [illegible] پروگرام کا بھی حصہ ہونے چاہئیں [illegible] کافی نہیں ہے کہ [illegible] مضمونوں میں سے ایک [illegible] حکمت عملی [illegible] کی جانی چاہیے۔

ریسرچ کی ضرورت کیوں؟

[illegible] بات یہ ہے کہ کوئی بھی تعلیمی پالیسی جو مستقبل پر نظر رکھتی ہو، ریسرچ (تحقیق) اور ریسرچ کرنے والے اداروں کے رول کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ کہا جا سکتا ہے کہ یونیورسٹیاں اس خیال سے کھولی گئیں کہ وہ علم عطا کرنے اور علم کو بڑھانے کی جگہ بنیں، طلباء میں بعض مہارتیں

اور قابلیتیں پیدا کریں اور ان کے اندر زندگی اور سماج کے تئیں صحت مندانہ نظریات پیدا کریں۔ توقع کی گئی تھی کہ وہ علم کا سرچشمہ بنیں گی۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ علم کا استعمال مسائل کو حل کرنے، دولت پیدا کرنے اور تجارتی مصنوعات کی تیاری کے لیے کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں ایک نئی قسم کی ترقیاتی ریسرچ کا سلسلہ شروع ہو گیا تاکہ ریسرچ کے نتائج کو مستقبل میں فائدہ مند طریقے سے استعمال کیا جا سکے۔ خالص [illegible] نے اس قسم کی اطلاقی تحقیق کو یونیورسٹیوں کے اصل مقصد سے ہم آہنگ نہیں سمجھا۔ دوسری طرف ریسرچ یا تحقیق بھی پیچیدہ نوعیت اختیار کرتی گئی جس کے لیے وافر رقوم اور ٹیم ورک کی ضرورت تھی اور یونیورسٹیوں پر درس و تدریس کا بوجھ بڑھ رہا تھا۔ چنانچہ یونیورسٹیاں ریسرچ کرنے کی جگہ نہ رہیں۔ انھیں وجوہ اور کچھ دیگر اسباب کی بنا پر ۱۹۵۰ء سے شروع ہونے والی دہائی کے وسط میں قومی سائنسی پالیسی تشکیل دی گئی اور قومی لیباریٹریوں (رصدگاہوں) اور سائنس کو ملک کی ضرورتوں کے لیے استعمال کرنے کے خصوصی انسٹی ٹیوٹوں کا ایک سلسلہ قائم کیا گیا۔ اگرچہ سوشل سائنس کے لیے قومی پالیسی کبھی مرتب نہیں کی گئی تاہم سائنس کی پالیسی اس پر بھی لاگو ہوتی تھی۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد ملک بھر میں سوشل ریسرچ (سماجی تحقیق) کے

اگر ایسے کھلونوں کا سوچ سمجھ کر استعمال کیا جائے اور مقامی طور پر دستیاب چیزوں سے ایسے تعلیمی کھلونے بنائے جائیں جن سے بچوں میں ضروری سوجھ بوجھ پیدا ہو سکے اور وہ دوسروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا یا مل کر رہنا سیکھ سکیں تو اس سے تعلیم کے لیے ایک ٹھوس بنیاد تیار کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔

ے قائم ہوئے اور ان کے لیے مالیات
فراہمی اور ان کے درمیان تال میل رکھنے کا
کام آئی سی ایس ایس آر (ICSSR) کے

امداد دی جاتی ہے تو یہ ہمارے قلیل وسائل
پر ایک غیر ضروری بوجھ ہوگا۔
اعلیٰ درجے کی تحقیقی سرگرمیوں کی بدولت
سائنس اور ٹیکنالوجی سمیت مختلف شعبوں میں

مقابلہ کر سکتا ہے۔ سوشل سائنسوں میں بھی اعلیٰ
درجے کی تحقیق کے ذریعے حقائق و معلومات
اور ماڈل اکٹھا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ انھیں
انسانی بہبود کے لیے پالیسی اور عملی پروگراموں کی

بھارت میں ہم کردار کے بدترین بحران سے دوچار ہیں۔ یہ کہہ دینے سے ڈھارس نہیں بندھتی کہ اخلاقی اقدار کی کمی کا مسئلہ ساری دنیا کو درپیش ہے۔ ہمیں ایسی دلیلوں سے مسئلے کو ٹالنے کے بجائے اس کا ڈٹ کر سامنا کرنا چاہیے۔

ہاتھ میں رہا۔ اس وقت آئی سی ایس
ایس آر کے زیر سرپرستی کم از کم بیس
ادارے حقائق و معلومات جمع کرنے اور
ایسے جائزے مرتب کرنے میں مصروف
ہیں جو پالیسی کی تشکیل اور اس پر عمل درآمد
میں مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ سائنسوں
اور سوشل سائنسوں دونوں سے متعلق
تحقیقی ادارے اعلیٰ تعلیم کے لیے مختص کی
گئی رقوم کا ایک بڑا حصہ صرف کرتے
ہیں۔ خاص کر سوشل سائنسوں کے شعبے
میں ملک بھر میں بہت سے تحقیقی
ادارے وجود میں آ گئے ہیں اور ان میں
سے کچھ اداروں کے ساتھ طاقت ور
سیاسی شخصیتوں کے نام وابستہ ہیں اور
وہ زور و باؤ ڈلوا کر تھوڑی بہت
سرکاری امداد بھی پا رہے ہیں۔ ان سے
پرائیویٹ اداروں میں سے بہت سے ادارے
اچھا کام کر رہے ہیں لیکن ان کی ایک بڑی تعداد
ایسی ہے جس کا کام غیر معیاری ہے اور اگر انھیں
تسلیم کیا جاتا ہے اور انھیں سرکاری فنڈ میں سے

اگر تعلیم کا ایک مقصدی کردار بنانا اور بنیادی سماجی و ثقافتی اقدار کو دلنشیں کرنا ہے تو یہ دونوں کام ہماری قومی تعلیمی پالیسی کی طرح عملی پروگرام کا بھی حصہ ہونا چاہئیں۔ صرف یہ کہنا ہی کافی نہیں ہے کہ یہ ہمارے تعلیمی نصب العینوں میں سے ایک ہے بلکہ انھیں بڑھانے کے لیے موزوں حکمت عملی ہماری تعلیمی پالیسی میں شامل کی جانی چاہیے۔

کام کرنے والا
ہمارا اعلیٰ تربیت یافتہ پیشہ وارانہ عملہ
پیداوار کے نئے اور بہتر طریقوں سے متعارف
ہو سکتا ہے اور دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں سے

تشکیل میں استعمال کیا جا سکے۔ اس لیے تسلیم
کی کسی بھی قومی پالیسی میں اعلیٰ تحقیق کی ضرورت
اور ملک میں قائم شدہ تحقیقی اداروں
کے رول کو تسلیم کرنا ہوگا۔

اور یہ تحقیقی ادارے

متعدد امور ایسے ہیں جن پر
بالتفصیل بحث ہونی چاہیے اور حکمت
عملی طے کر دی جانی چاہیے۔
۱۔ بہت سی یونیورسٹیوں
اور کچھ تحقیقی اداروں میں کی جانے
والی تحقیق کی کوالٹی اتنی عمدہ نہیں
ہے جتنی ہونی چاہیے۔ تحقیق کے
لیے ہدایات اور کوالٹی کنٹرول
کا معاملہ بہت اہم ہے۔ چند سال
پہلے برطانیہ میں اعلیٰ تعلیم کے بارے
میں لارڈ رابنز نے ایک بہت اچھی
رپورٹ تیار کی تھی۔ اس میں انھوں نے
جو خدشات ظاہر کیے تھے وہ بھارت میں بھی
صحیح ثابت ہوئے ہیں۔ تقرر اور ترقی کے لیے

(باقی صفحہ ۱۰۴ پر)

پریم کرپال

تعلیم کے لیے معیاری تبدیلیوں کی ضرورت

نامور ماہرِ تعلیم پریم کرپال کا بیان ہے کہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے کہ تمام سطحوں پر تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے پر موزوں زور دیا جائے۔ اُن کا خیال ہے کہ ایک نوحی تعلیمی پالیسی کے لیے ضروری ہے کہ فوری ترجیحات اور موزوں طریقوں کو یکجا کیا جائے تعلیمی پروگراموں کا تعلق عصرِ حاضر کے انسان کی ضروریات سے ہونا چاہیئے جو تیزی سے بدلتے ہوئے مستقبل کی جانب دیکھ رہا ہے۔

وزارت تعلیم کی حالیہ دستاویز بعنوان "تعلیم کا چیلنج: ایک حکمتِ عملی کا تناظر" ایک واضح اور قابلِ مطالعہ دستاویز ہے جس کا مقصد بھارتی تعلیم کے مستقبل پر ملک گیر بحث ہے۔ دستاویز کے وسط میں تعلیمی ترقی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس سے وسیع پیمانے پر بحث کی بنیاد قائم کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ شروع اور آخر میں "تعلیم، سماج اور ترقی کے بارے میں عام ذکر ہے اور تعلیم کو ایک نئی سمت دینے کے لیے ایک دستور کار تھا سجھا دیا گیا ہے۔ یہ دونوں باتیں غیر قطعی اور ناکافی ہیں۔ چیلنج کو بخوبی پیش کیا گیا ہے لیکن رد عمل مایوس کن ہے۔

بحث و مباحثہ کے لیے چنوتی ضروری اور بروقت ہے اور کوئی بھی اُمید کریگا کہ اس سے اب دانشمندانہ پالیسیوں میں سے کسی کا انتخاب کیا جاسکے گا اور اس کی بامعنی تعمیل ہوسکے گی۔ حصولِ آزادی کے بعد اور اس کے پہلے سے بھی ہم نے تعلیم سے متعلق شاندار خیالات اور تجاویز کا ڈھیر جمع کر لیا ہے لیکن بدقسمتی سے اُنھیں بہت کم عملی صورت دی گئی ہے۔ تبدیلی یقیناً عمل میں آئی ہے لیکن وہ زیادہ تر زندگی اور حالات کے دباؤ سے عمل میں آئی ہے اور پالیسی سازوں اور اُن کے اداروں کی باشعور اور دانستہ رضا سے نہیں۔ خیالات کی اس نئی فضا میں جو خوش قسمتی سے تعلیمی تبدیلی میں وزیر اعظم کے گہرے اعتقاد سے پیدا ہوئی ہے۔ ذیل میں اس کے سلسلے میں چند خیالات اور تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔

وقت کی ضرورت: وقت کی بڑی ضرورت ہے کہ

> یہ تعلیم کے مرکزی مشاورتی بورڈ کی رپورٹ تھی جو عرفِ عام میں سارجنٹ رپورٹ کے نام سے مشہور تھی۔

> اگر تعلیم میں مساوات لانے کی خواہش حقیقی اور وَلولہ انگیز ہے تو اس سے یقیناً سماجی، اقتصادی تبدیلی اور تعلیمی کایا پلٹ میں مدد ملتی ہے لیکن تعلیمی تبدیلی کے امکانات محدود ہو جاتے ہیں اگر سماجی، اقتصادی فضا سازگار نہ ہو اور وہ تبدیلی کی مزاحم بھی ہو۔

جب میں ۱۹۴۵ میں لاہور میں یونیورسٹی کی تدریس سے حکومتِ ہند کے محکمہ تعلیم میں آیا تو زمانہ مابعد جنگ کی تعلیمی ترقی سے متعلق ایک نیا، دلیرانہ، جوش انگیز اور سوجھ بوجھ والا پلان بڑی بڑی اُمیدوں کے ساتھ منظور کیا گیا۔ یہ تعلیم کے مرکزی مشاورتی بورڈ کی رپورٹ تھی۔ جو عرفِ عام میں سارجنٹ رپورٹ کے نام سے مشہور تھی۔ اس پلان کے شروع میں مندرجہ ذیل الفاظ تھے جو وہائٹ پیپر سے مستعار لیے گئے تھے جو برطانوی تعلیمی نظام کی زمانہ مابعد جنگ کی توسیع سے متعلق پالیسیوں کو سموئے ہوئے تھا۔ "اس ملک کے عوام کی تعلیم پر اس ملک کی تقدیر کا دارومدار ہے۔" اس کے بیس سال بعد وزیرتعلیم ایم سی چھاگلہ کی طرف سے مقرر کیے گئے بھارتی تعلیمی کمیشن نے ۱۹۶۶ میں تعلیمی اصلاح سے متعلق ایک جامع رپورٹ پیش کی جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوا۔ "بھارت کی تقدیر اب اُس کی جماعتوں (کلاسوں) میں بن رہی ہے۔" رپورٹ کے اگلے حصوں میں قومی مقاصد کی تکمیل میں تعلیم کو غالب کردار سونپا گیا۔ یہ قومی مقاصد تھے جدید سائنس اور قدیم رجحانات کے تخلیقی ارتباط کی بنیاد پر بھارتی عوام کا معیارِ زندگی بلند کرنا اور اعلیٰ نوعیت کی زندگی کا حصول۔

تمام سطحوں پر تعلیمی معیار کو بہتر بنانے پر پہلے سے موزوں زور دیا جائے اور اس سلسلے میں تمام طریقوں کو زیادہ موثر طور پر عمل میں لایا جائے۔ تعلیمی نظام کے محض پھیلاؤ کی ضرورت سے خود نظام کے ڈھانچے اور مشمولات میں انقلابی اور معیاری نوعیت کی تبدیلی، تعلیمی منصوبہ سازوں اور ناظموں کے لیے مشکل اور اہم ذمہ داریاں پیش کرتی ہے۔ اُن کا کام تعلیم سے متعلق ایک واضح، ٹھوس اور مربوط پالیسی کے فقدان سے مزید پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ۱۹۶۴-۶۶ کے بھارتی تعلیمی کمیشن کی رپورٹ (کوٹھاری رپورٹ) ایک جامع رپورٹ ہے۔ اور اس میں واضح سفارشات کی گئی ہیں لیکن رپورٹ کو کبھی بھی ایک قومی پالیسی کے طور پر عمل میں نہیں لایا گیا۔ نام نہاد قومی پالیسی کی دستاویز میں محض چند رہبرانہ خطوط کا ذکر کیا گیا تھا اور تعمیل کے لیے کوئی طریقے وضع نہیں کیے گئے تھے۔ یہ رہبرانہ خطوط وسیع مقاصد سے متعلق عام بیانات کے الگ الگ حصے تھے، جنہیں کبھی بھی ایک جامع بیان کی صورت نہیں دی گئی۔ ایک قومی پالیسی کے لیے ضروری ہے کہ وہ مقاصد، فوری ترجیحات اور عمل کے موزوں طریقے واضح کرے جس سے اس میں جامع اور مربوط تبدیلی لائی جاسکے جسے تمام ممکن وسائل اور مؤثر طریقوں سے عملی صورت دی جاسکے۔ اس کے لیے ہم نے کبھی کوشش نہیں کی اور ہم اُن سفارشات کے بیچ میں ہی بھٹک رہے ہیں۔ جو کانفرنس اور میٹنگوں کے لامتناہی سلسلے سے وجود میں آئی ہیں۔ اور جن کی بامقصد تعمیل کو یقینی بنانے کے لیے کچھ نہیں کیا گیا۔ اس غیر یقینی اور تذبذب کی حالت کا اب خاتمہ ہونا چاہیے۔

تعلیمی عمل کی نوعیت اور تاحیات تعلیم اور غیر رسمی تعلیم کی نئی ضروریات نے منصوبہ سازوں اور ناظموں پر خاص ذمہ داریاں عائد کی ہیں جن کا کام دیگر ترقیاتی شعبوں میں مقابلتہً آسان ہے۔

معیاری تبدیلی کے لیے

تعلیم کے شعبے میں خیال و عمل کے درمیان پائے جانے والی مسلسل تفاوت کو واضح کرنے کے لیے میں ماضی کے بعض تجربات کا ذکر کروں گا۔

بھارت میں کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ کے ظہور میں آنے کے چھ برس بعد یونیسکو میں بین الاقوامی سطح پر ساری دنیا کے لیے ایسا ہی کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں ایک رپورٹ بعنوان "حصولِ علم۔ آج اور کل کی دنیائے تعلیم" مرتب کی گئی ہے جسے ۱۹۷۲ میں تمام ممبر ملکوں کی عام کانفرنس کے ایگزیکٹو بورڈ کی طرف سے مجھے پیش کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ یونیسکو کی رپورٹ ایک بین الاقوامی کمیشن نے فرانس کے ایک سابق وزیر اعظم ایڈگر فور کی صدارت میں پیش کی جس کے آغاز میں تعلیم اور انسان کی تقدیر سے متعلق ایک تمہید تھی اور جس میں دو بنیادی تجاویز پر زور دیا گیا تھا۔ تاحیات تعلیم اور خواندہ معاشرہ۔

دوسرے الفاظ میں علم کے فراہم کیے ہیں جو معیاری اور توسیعی تعلیم کی مانگ کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ یہ اب ہمارا کام ہے کہ ہم انھیں جانیں کہ وہ کس مقصد کے لیے ہیں۔ اور اس مقصد کے لیے انھیں استعمال کرنے کی اہلیت پیدا کریں۔"

کرنے کا عزم ہو۔ ٹیکنالوجی ممکن طور پر جو کچھ پیش کرتی ہے اُسے کسی بھی معاشرہ میں بہت اخلاقی اور انسانیت نواز قوتوں کے سرگرم عمل اور سماجی سرگرمیوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے، خواہ وہ سماج اقتصادی طور پر کتنا ہی کم ترقی یافتہ ہو۔ تقریباً تمام معاشرے تعلیم کی مطلوبہ اصلاحات حاصل کرنے میں کسی نہ کسی حد تک

ہمیں تعلیمی اداروں کی روایاتی قدامت پسندی کو ختم کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے ایک زیادہ لچکدار اور تخلیقی نظریہ اختیار کرنا ہوگا جو جدت طرازیاں پیدا کرے اُنھیں پروان چڑھا سکے اور ہمارے وسیع اور کثیرالمذہبی معاشرے میں مختلف گروہوں اور انفرادی رجحانات رکھنے والوں کو اظہارِ خیالات کے لیے عظیم تر سہولیات پیش کر سکے۔

ناکام رہے ہیں۔ ہم ناخواندگی کے عظیم مسئلہ کے سلسلے میں تھوڑی سی بھی پیشرفت کرنے میں ناکام رہے ہیں اور آٹھ برس کی ملک گیر ابتدائی تعلیم مہیا نہیں کر سکے ہیں۔ جیسا کہ سارجنٹ رپورٹ اور اس کے بعد کی ترمیمات میں تجویز کیا گیا تھا، اور

کوئی بھی قابلِ ذکر تبدیلی تب تک عمل میں نہیں آ سکتی جب تک ٹیچر تیار نہیں ہوں گے، والدین منظوری نہیں دیں گے اور طلبا سمجھیں اور قبول نہیں کریں گے اور یہ صرف اُس وقت ہو سکتا ہے جب ٹیچر تمام سطحوں پر منصوبہ بندی اور فیصلہ سازی میں پورے طور پر شریک ہوں اور والدین اور طلبا کے درمیان باقاعدہ صلاح مشورے ہوں۔

اس بین الاقوامی رپورٹ میں مختلف ملکوں، معاشیات اور تمدنوں کی عالمی برادری کے ضمن میں ان دونوں تجاویز کو واضح کیا گیا اور اُمید اور چنوتی کے مندرجہ ذیل الفاظ میں مستقبل کی جانب رجائیت سے دیکھا گیا۔

" تبدیلی کے اس دور نے ہمیں ایسے ذرائع عظیم توسیع اور عمل و تنظیم کی موزوں تکنیکوں کے ذریعے اُس کے بے پناہ استعمال سے ہم تعلیم میں کوئی بھی مطلوبہ تبدیلی لا سکتے ہیں بشرطیکہ ہم اُن میں امتیاز اور انتخاب کر سکیں اور ہم میں کام کرنے اور مقصد حاصل

ہم نے قومی ترقی کے مقصد کے لیے تعلیم کو بڑھاوا دینے کے لیے بھی کچھ نہیں کیا۔ جیسا کہ کوٹھاری کمیشن میں تجویز کیا گیا تھا، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تاحیات تعلیم اور خواندہ معاشروں

ڈھانچہ صورت و عمل کے لحاظ سے تقریباً وہی رہا جو سامراجی دور سے میراث میں ملا تھا' اور اچھے اداروں کو کئی لحاظ سے لاپروائی، غفلت اور تساہل کا شکار ہونا پڑا۔ جس سے معیار گر گیا محض تعداد بڑھی اور ہم فخر کے ساتھ ان بڑھتے ہوئے اعداد و شمار کو پیش کرتے رہے اور جو خرابی آگئی تھی اُس کو نظر انداز کرتے رہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ منصوبہ بندی کی بہتر مشنری قائم کی جائے۔ تربیتی سہولیات کی توسیع اور بہتری کی جائے اور ان سب سے زیادہ تمام متعلقین کی سرگرم شرکت سے حقیقی اور تیز رفتار تعمیل کو یقینی بنایا جائے جس کے لیے لامرکزیت اور مقامی اہلکاروں کے ذریعہ سماجی وسائل کی شیرازہ بندی کی جائے۔

ٹیچر کو واجب احترام دیا جائے

۵۔ لیکن اوّل اور اہم ترین اقدام ہے تعلیمی عمل میں ٹیچر کی اہمیت تسلیم کرنا اور تعلیمی تبدیلی لانے کے لیے اُسے مرکزی رول دینا۔ کوئی بھی قابلِ ذکر تبدیلی تب تک عمل میں نہیں آئے گی جب تک ٹیچر تیار نہیں ہوں گے، والدین منظوری نہیں دیں گے اور طلبا سمجھیں اور قبول نہیں کریں گے اور یہ صرف اُس وقت ہو سکتا ہے جب ٹیچر تمام سطحوں پر منصوبہ بندی اور فیصلہ سازی میں پورے طور پر شریک ہوں' اور والدین اور طلبا کے درمیان باقاعدہ صلاح و مشورے ہوں۔ بھارت کے تعلیمی منظر پر بیوروکریٹ اور سیاستداں متواتر چھائے ہوئے ہیں اور انھوں نے ٹیچر کو گھٹیا رتبہ اور غیر فعال رول دے رکھا ہے اور والدین اور طلبا کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ حصولِ آزادی کے بعد سے تعلیم کے شعبے میں سیاستدانوں کی طاقت اور بیوروکریٹوں کی گرفت بڑھ گئی ہے۔ اور ٹیچروں اور والدین کو فراموش کر دیا گیا ہے اور طلبا کو تو بالکل کچھ نہیں سمجھا جا رہا۔ ہمارے لیے اب ضروری ہے کہ ان رجحانات کا رُخ بدل دیا جائے اور ٹیچر کو اُس کا واجبی حصّہ دیا جائے۔ اگرچہ

> **ضرورت اس بات کی ہے کہ نظامِ تعلیم کی روش کو قدرے تبدیل کیا جائے۔ تعلیم کا نظام لوچ دار، روزگار بخش اور پیشہ ورانہ نوعیت کا ہونا چاہیئے جو کہ خصوصاً سماج کے نچلے طبقوں مثلاً دیہی علاقوں اور شہری گندی بستیوں نیز عورتوں اور بچّوں کی ضروریات پوری کر سکے۔**

قومی پالیسی بلاشبہ انجام کار عوام کے منتخبہ نمائندوں کی طرف سے وضع کی جانی چاہیئں جس میں دستیاب بہترین تکنیکی علم سے استفادہ کیا جانا چاہیئے۔ تاہم ایسی پالیسیاں اُن اشخاص کے گہرے صلاح مشورے کے ساتھ مرتّب کی جانی چاہیئں جو تعلیمی عمل میں قریبی طور پر شامل ہیں یعنی ٹیچر، والدین اور طلبا۔

تعلیم و ثقافت

کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ کی اشاعت کے بعد کی دہائی میں ایسی رفتار اور ایسے پیمانے پر تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں جو پہلے کبھی نہیں دیکھی گئیں۔ وقت تیزی سے آگے بڑھا ہے اور اسی طرح تعلیم کے تصور اور طریقے بھی۔ جمہوریت کاری کی بڑھتی ہوئی طاقت، "تا حیات علم کے اُبھرتے ہوئے تصور اور پیغام رسانی کی انقلابی ٹیکنالوجیوں کی طرف سے فراہم شدہ مواقع سے اب اُمید پیدا ہو گئی ہے کہ تعلیم اور ثقافت ایک نئی کوشش میں یکجا ہو کر انسانی اسپرٹ کو آزاد کرائیں گے،، انسانی ذہن کو مالا مال کریں گے اور انسانی اقدار کو انسان اور انسانیت کی خدمت کے لیے بروئے کار لائیں گے۔ ہم بلاشبہ خواندہ معاشرہ کی دہلیز پر ہیں۔

تعلیم کا ضروریات سے تعلق

انسان کو زندگی بھر دی جانے والی مستقبل کی تعلیم اس ڈھنگ سے ہونی چاہیئے جس سے مقامی، ملکی اور عالمی سطحوں پر ایک انفرادی شخص، ایک تخلیقی کارکن اور معاشرے کے رکن کے طور پر اُس کی تکمیل ہو۔ تعلیمی پروگرام اور عوامل کا تعلق عصرِ حاضر کے انسان کی ضروریات سے ہونا چاہیئے۔ جو تیزی سے تبدیل ہونے والے مستقبل کی جانب دیکھ رہا ہے۔ تعلیم کے موزوں نظام سے حاصل ہونے والی انسان کی ایمانداری' قابلیت اور مکمل شخصیت فرد اور اس کے معاشرہ کا نہایت قیمتی اثاثہ ہے اور یہ وہی مقصد ہے جسے اب نصابی جزو بننے کی ضرورت ہے۔ تعلیمی پروگرام اور تجربے کے ایسے نصابی جزو کا تاحیات تعلیم کے ضمن میں پلان بنایا جانا ضروری ہے جس کا مقصد ابتدائی طور پر علم کی شوقین شخصیت

کو فروغ دینا اور نکھارنا ہے تاکہ وہ ایک آزاد اور تخلیق پسند انسان بن جائے اور اس کا ذہن اور اسپرٹ آزاد ہوں۔

جب علم تیزی سے بڑھتا ہے اور تکنیکی مہارتیں تیزی سے بدلتی ہیں تو تعلیم ایک ایسا مکمل انسان بنانے کا پختہ عنصر بن جاتی ہے جو مادی اور نفسیاتی طور پر تبدیلی سے مطابقت پیدا کر سکے اور اپنی تقدیر کا مالک بن سکے تاحیات تعلیم کی بنیادوں اور اسے اختیار کرنے اور جدت پیدا کرنے کی صلاحیت کو کردار سازی اور اخلاقی و روحانی شخصیت کو تقویت دینے پر بہت زیادہ زور دینا چاہیئے۔

پانچ اہم امور

ہمارے ملک کے ابھرتے ہوئے مستقبل کی تعلیم کم از کم نئے پانچ جوڑنے والے امور کی متقاضی ہے۔ جو ہمارے اپنے ترقی کے نمونے سے متعلق قومی فرائض اور مقاصد سے تعلق رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے ہمیں اپنے قدیم اور مصدقہ ماضی کو زمانہ حال کے موجودہ حقائق اور مقاصد اور امنگوں کے ابھرتے ہوئے مستقبل کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور یہ سب کچھ قومی تشخص کی کھوج میں ہونا چاہیئے۔ صرف اس کے بعد ہی ہمیں علم ہوگا کہ تاحیات تعلیم کے نظام کے ذریعے ہمیں کس قسم کے شخص کی تربیت کرنی چاہیئے۔ اور کون سے طرز ہائے زندگی اور اقدار کو پیش کیا جانا چاہیئے اور انھیں تقویت دی جانی چاہیئے۔ دوسرا امر یہ ہے کہ قدرے حقیقی اور بامعنی قومی یک جہتی کے حصول کے لیے یہ ضروری ہے کہ تعلیمی مواقع اور موزوں اداروں اور رسمی و غیر رسمی تعلیمی پروگراموں کے ذریعہ شہری لوگوں اور دیہی عوام کو منسلک کیا جائے تیسرا امر یہ ہے کہ نوجوانوں کو اس امر کا قوی احساس ہونا چاہیئے کہ سماج کو عظیم تر بنانے کا کام اُن کا اپنا ہے اور اس میں انھیں پوری شرکت کرنی ہے۔ نوجوانوں کی طاقت اور عوام کی طاقت مل کر نئی قسم کی زندگی سے متعلق ترقیاتی کاموں کو انجام دے سکتی ہے۔ چوتھے، سائنس کا رشتہ روحانیت سے جوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ ماضی کی رہنے سہنے کی روایات جدید سائنس کی موزوں ٹیکنالوجیوں کے ساتھ ساتھ جاری رہیں اور کہ ہم خود جان بوجھ کر اپنے لیے طرز زندگی اور ترقی کے ملکی طریقے کا انتخاب کریں۔ انجام کار، رسمی تعلیم کی دنیا کو کام کی دنیا اور ثقافت کی دنیا کے ساتھ منسلک کیا جائے تاکہ عمر بھر کی تعلیم اور مکمل انسان بنانے کی ضروریات پوری کی جا سکیں۔ یہ تعلیمی تبدیلی کی نہایت امید افزا سمت ہے۔ رسمی تعلیم اور ثقافتی علم کے علاوہ ہمیں کام کے ذریعے، کام کے لیے اور کام سے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ زندگی کو مکمل بنایا جا سکے۔ مربوط شخصیت کو نکھارا جا سکے۔ اور ہم آہنگ معاشرے کو ظہور میں لایا جا سکے۔ میں نے ان پانچ جوڑنے والے امور کا نہایت مختصر ذکر کیا ہے۔ ان کا تعلق انسانی ترقی اور اعلیٰ قسم کی زندگی کے لیے بلاشبہ تعلیم کی وسیع تر اشاعت سے ہے۔

پانچ ترجیحات

اگر ہماری تعلیمی ترقی کو ان خطوط پر نئی سمت دی جاتی ہے تو میں مجموعی تعلیمی پالیسی کی تشکیل کے لیے پانچ ترجیحات کا مشورہ دوں گا۔ ان کے لیے مفاد، زور و وسائل کے ضمن میں ترجیحات کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اول، اعلیٰ تر تعلیم پر خرچ کئے جانے والا بہت زیادہ سرمایہ عوامی تعلیم کی بہتری کے لیے منتقل کیا جائے۔ اس کا نتیجہ عظیم تر سماجی انصاف اور تعلیم کی ثمر آوری میں نکلے گا۔ سردست شہری شرفا جو زیادہ تر اعلیٰ تعلیم سے مستفید ہو رہے ہیں۔ دیہی عوام کی قیمت پر قومی وسائل کا بڑا حصہ حاصل کر رہے ہیں۔ دوئم، روایاتی علوم کو انسان کی ذات سے تعلق رکھنے والے حقیقی مسئلوں، موضوعات اور پراجیکٹوں کو منتقل کرنے سے تعلیمی عمل زیادہ دلچسپ اور سازگار ہو جائے گا۔ سوئم، ہمیں رسمی تعلیم کی نسبت غیر رسمی تعلیم پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے۔ جس سے عظیم تر آزادی اور لچیلا پن پیدا ہوگا۔ میری چوتھی ترجیح یہ ہوگی کہ اکادمی تعلیم کے زیر اثر کردار سازی کی بہ نسبت ثقافتی تعلیم اور انسانی اقدار کے عمل پر زور دیا جائے۔ یہ بلاشبہ ایک ایسا مکمل انسان بنانے کے لیے ضروری ہے جو بلند خیالات سے آگاہ ہونا چاہیئے جو بہتر زندگی بنانے کی صلاحیت رکھتا ہو اور جو انسانی تعلقات کو فروغ دے سکے اور زندگی میں ہم آہنگی اور تخلیق پسندی لا سکے۔ انجام کار تعلیم کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے ضرورت اس بات کی ہے کہ نظامِ تعلیم کی روش کو قدرے تبدیل کیا جائے۔ تعلیم کا نظام لوچ دار، روزگار بخش اور پیشہ ورانہ نوعیت کا ہونا چاہیئے، جو کہ خصوصاً سماج کے نچلے طبقوں مثلاً دیہی علاقوں اور شہری گندی بستیوں نیز عورتوں اور بچوں کی ضروریات پوری کر سکے۔ علمی سرگرمیوں کی ایسی ترجیحات اور منتقلی سے انسانی وسائل کو مالا مال کرنے، پیداواری قوت کو بڑھانے، سماجی انصاف، قومی یک جہتی اور بہتر خاندانی منصوبہ بندی میں مدد ملے گی۔

یہ واضح ہے کہ تعلیم سے متعلق ایک ملکی

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

پروفیسر رئیس احمد

ضرورت ہے کام کرنے کے ارادے کی

مضمون نگار کا کہنا ہے کہ مطلوبہ تعلیمی تبدیلیوں کے بارے میں وقتاً فوقتاً بہت سے مباحثے اور کوششیں ہو چکی ہیں۔ اس سے مُراد یہ ہے کہ تجاویز کا جو خاکہ اب تک بنایا جا چکا ہے وہ عوام کو قابلِ قبول ہوگا کیونکہ وہ تعلیم کے کردار کے حقیقی جائزے پر مبنی تھا۔ مضمون نگار کا خیال ہے کہ اس بنیادی خاکے کو خیرباد کہنے سے اختلاف رائے کی شدت اور بھی بڑھ جائے گی۔ اُس کا کہنا ہے کہ تعلیم کے بارے میں قومی پالیسی پر عملدرآمد میں کمی خواہ وہ سب کے لیے تعلیم کے بارے میں ہو یا دس جمع دو جمع تین کے بارے میں یا تعلیم کو پیشہ ورانہ بنانے کے بارے میں نکتہ چینی کا ایک اور موضوع ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حکومت ایسے خوشحال طبقوں پر مشتمل ہے جو اُن اچھے وعدوں کو عملی جامہ نہیں پہنانا چاہتے جو وہ کرتے ہیں۔ مضمون نگار کی رائے میں ایک منصوبہ تیار کرنا اور اس پر عمل کرنا بجائے خود ایک چیلنج ہے۔

یہ سوال کرکے کہ مرکزی اور ریاستی سرکاریں تعلیم کے بارے میں جو وعدے کرتی ہیں وہ پورے کیوں نہیں ہوتے یا جو تعلیمی پالیسی پارلیمنٹ منظور کرتی ہے یا آئین میں شامل ہے اُس پر عمل کیوں نہیں ہوتا، ہم بیک وقت ایک نہایت سیدھا اور نہایت پیچیدہ سوال کر رہے ہیں۔ سیدھا اس لیے کہ کوئی جمہوری نظام لوگوں کو مطلوب ضروری تبدیلیوں کا کم از کم بظاہر وعدہ کیے بغیر کھڑا نہیں

رہ سکتا۔ غربت کا خاتمہ، مواقع کی مساوات، سماجی انصاف اور مذاہب کا مساوی احترام وغیرہ سب کے بارے میں خواہ برسرِاقتدار جماعت یا اقتدار سے محروم جماعت کی سیاسی شکل کچھ بھی ہو، وعدہ کرنا ہوتا ہے اور یہ سوال پیچیدہ اس لیے ہے کہ بڑی بڑی تعلیمی تبدیلیاں الگ تھلگ طور پر نہیں کی جا سکتیں۔ ہر ایسی تبدیلی کا حکومت اور سماج کی دوسری سرگرمیوں اور ڈھانچے پر اثر پڑتا ہے اور اس کے برعکس دوسرے شعبوں نے جو پالیسیاں اور پروگرام اور طریقۂ کار اختیار کر رکھا ہوتا ہے وہ تعلیمی پالیسی کی راہ میں روکاوٹ بن جاتا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مختلف اقسام اور سطحوں کی تعلیم حکومت کی کم از کم نصف درجن وزارتوں کے زیرِ اہتمام ہے۔ یہ تعلیم کی نوعیت کے مطابق ہے لیکن اکثر اس پر غور ہی نہیں کیا جاتا۔ لہذا متعلقہ مفادات، جیسے چل رہا ہے ویسے چلنے دو کی عمومی سہل پسندی اور روایت پسندی کا مجموعی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مجوزہ تبدیلیاں کاغذ کی زینت ہی بنی رہتی ہیں۔

تعلیم کی بے لگام اشاعت

تاہم روزگار اور سماجی مرتبے سے مناسبت کے سبب تعلیم کی مانگ بڑھتی رہتی ہے۔ اس طرح آبادی میں اضافے سے بھی تعلیم کی مانگ میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ تمام امور تعلیم کے خارجی معاملات ہیں۔ لہذا "جیسے چل رہا ہے اس میں اضافہ" ایک قاعدہ بن جاتا ہے اور ایک بہت پھیلا ہوا مگر بہت حد تک ضروریات سے غیر متعلق نظام اپنے مسائل کھڑے کر دیتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ اور شدید ہوتے جاتے ہیں اور اس سے اس حد تک بے اطمینانی اور مایوسی پیدا ہو سکتی ہے کہ پورا سماج اس کی لپیٹ میں آ سکتا ہے۔ آج ہمیں ایسی حالت کا سامنا ہے اور ہمارا تجربہ کوئی انوکھا نہیں ہے۔ بہت سے ترقی پذیر ممالک کو بھی مسئلہ درپیش ہے۔

اگر ہمیں اس حقیقت کو سمجھنا ہے کہ ان مشکلات کا صحیح ڈھنگ سے مقابلہ کرنے اور کئی دوسری تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ تعلیمی تبدیلیوں کے بارے میں سوچنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے تو ہمیں تعلیم کو سماج، حکومتی ڈھانچے، تاریخ اور انسانی رویّے کے بارے میں ہمارے علم کے ارتقا کے سیاق و سباق میں دیکھنا ہوگا۔

اگر ہمیں اس حقیقت کو سمجھنا ہے کہ ان مشکلات کا صحیح ڈھنگ سے مقابلہ کرنے اور کئی دوسری تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ تعلیمی تبدیلیوں کے بارے میں سوچنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے تو ہمیں تعلیم کو سماج، حکومتی ڈھانچے، تاریخ اور انسانی رویّے کے بارے میں ہمارے علم کے ارتقا کے سیاق و سباق میں دیکھنا ہوگا۔ قدرتی طور پر اتنی بڑی تبدیلی کے لیے ہمارے سماج کے نصب العین کے واضح تصور اور انھیں حاصل کرنے کے لیے ایک پختہ حکمتِ عملی اور منصوبے کی ضرورت ہے۔ اگر اس بارے میں دخل اندازی مصلحت یا حکومت کی فطرت میں کوئی ابہام ہو تو اس سے یقینی طور پر یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ کوئی بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوگی اور صرف بعض حاشیائی قسم کے جو بعض اوقات حیران کن بھی ہو سکتے ہیں، قدم اٹھائے جائیں گے۔

ملک گیر پیمانے پر مباحثے کی موجودہ مشق اگرچہ بہت اچھی ہے کیونکہ اس سے مسئلے کے بارے میں بڑے پیمانے پر بیداری پیدا ہوگی لیکن اس کے وزارتِ تعلیم کی "ایک اُپج" ہی بنے رہنے کا خدشہ ہے۔

میری رائے میں آئینی ہدایات اور تعلیم کے بارے میں قومی پالیسی میں بالواسطہ بلکہ صریحاً ایسی دور رس تعلیمی تبدیلیوں کی ضرورت ظاہر کی گئی جو حکومت صرف وزارتِ تعلیم کے ذریعہ عمل میں نہیں لا سکتی۔ ملک گیر پیمانے پر مباحثے کی موجودہ مشق اگرچہ بہت اچھی ہے کیوں کہ اس سے مسئلے کے بارے میں بڑے پیمانے پر بیداری پیدا ہوگی۔ لیکن اس کی وزارتِ تعلیم کے "ایک اُپج" ہی بنے رہنے کا خدشہ ہے۔ لہذا

چیلنج یہ ہے کہ تعلیم کا اس کے تمام پہلوؤں سے واضح تصور کیا جانا چاہیے اور صرف اُسی صورت میں ملک ایک خصوصی ڈھانچے پر متفق ہو سکتا ہے جس کو عملی جامہ پہنانا حکومت کی مجموعی ذمہ داری ہوگی کیوں کہ لوگ اُس کی جانچ اس لحاظ سے کریں گے۔

ابتدا ہی سے محدود

یاد رہے کہ صدیوں تک تحصیلِ علم متمول لوگوں، کلیسا اور اُن لوگوں کا ہی حق تھا جو کسی سماج میں برسرِ اقتدار ہوتے تھے۔ اس تعلیم کا مقصد ایک فرد کو خواندگی، روایات اور ثقافت کی شناسائی اور عام شائستگی سے بہرہ ور کرنا ہوتا تھا۔ خود ریاست کا تصور ابھی ارتقائی مرحلے میں تھا اس لیے تعلیم نجی اسکولوں میں دی جاتی تھی جو اکثر مندروں، مسجدوں، گرجا گھروں بلکہ گھروں میں بھی افرادی یا مذہبی تحریکات سے چلائے جاتے تھے۔ یہ بھی درست ہے کہ حکمران اکثر تعلیم کو اچھا نہیں سمجھتے تھے یا اس کے مخالف رہتے ہیں کہ کہیں یہ طلبا کے ذہن میں دوسری قسم کے خیالات داخل نہ کردے یا ناپسندیدہ قسم کا ادب اُن تک نہ پہنچ جائے۔ اس بارے میں نمایاں مثالیں عملاً ہر ملک (جہاں غلاموں، مزدوروں، یا نچلے ذاتوں یا خواتین کو تعلیم سے بے بہرہ رکھا جاتا تھا) اور ہندوستان سے بھی دی جا سکتی ہیں۔ جب ہندوستان میں انگریزی کو اسکولوں میں ذریعۂ تعلیم بنانے کی تجویز پہ برطانیہ کی پارلیمنٹ میں بحث ہوئی تو بلند آواز میں ان خدشات کا اظہار کیا گیا کہ تعلیم کے اس عمل سے ہوا بے چینی اور بغاوت ہو سکتی ہے۔

غیر مُلکی مدد کیلیے توسیع

شاید صنعتی انقلاب کے بعد میں سوچے جانے والے نتائج اور قوم کے نظریہ پر مبنی ملک کے تصور کے ارتقا کے طور پر زیادہ پیداواری صلاحیت کے لیے صنعتوں میں تعلیم یافتہ افرادی قوت کی ضرورت اور عام شہری سہولیات مہیا کرنے کے بارے میں حکومت کی ذمہ داری کے خیالات کو تسلیم کیا گیا اور کچھ ملکوں نے سب کے لیے ابتدائی تعلیم کی پالیسی اپنائی۔ پھر بھی یہ اہتمام کیا گیا کہ تعلیمی نصابات میں مذہب یا حکومت کے خلاف یا متنازعہ قسم کا مواد شامل نہ ہو۔ سماج کے حقیقی مسائل یعنی دورِ حاضرہ کے سماجی وسیاسی معاملات، مناسب غذائیت یا صفائی کی ضروریات، کسانوں اور مزدوروں کا استحصال اور دوسری تکلیفات کو نصابات سے خارج رکھا گیا۔ یہ تعلیم ایک فرد کے لیے تھی جس کا خرچہ اُسے برداشت کرنا ہوتا تھا اور تعلیمی ادارے قومی زندگی کے دھارے سے الگ کھڑے دکھائی دیتے تھے۔ لوگوں کی حقیقی زندگی سے یہ فاصلہ اتنا بڑھا کہ ہندوستان میں تمام نصابی کتابیں یا تو

> تعلیم کی اِس لحاظ سے ہمہ گیر نوعیت کو بھی اب اچھی طرح سمجھا جانے لگا ہے کہ یہ صرف کتابوں سے حاصل نہیں ہوتی یا صرف اساتذہ یا اسکولوں سے ہی نہیں لی جا سکتی بلکہ یہ کائناتی شعاعوں کی مانند ہر سمت اور بہت سے ذرائع سے آتی ہے۔ ذرائع ابلاغ تسمیہ تعلیمی پروگراموں بلکہ جو کچھ بھی عوام کو پیش کیا جاتا ہے اُس کے ذریعے عوام کو تعلیم دے سکتے ہیں یا تعلیم کے اثرات کو غیر موثر کر سکتے ہیں۔

> اگر تعلیم قدرتی ماحول، سماجی حقیقت اور انسانی رویّے کو سمجھنے میں مدد دے اگر مل جل کر زندگی گذارنے اور زیادہ پیداواری صلاحیت کے لیے درکار اہلیت کی جانب مناسب توجہ دی جائے تو تعلیم ایک زیادہ مربُوط اور مطمئن طبقے یا قوم کی تشکیل کے لیے ایک قومی آلۂ کار ثابت ہو سکتی ہے۔

برطانیہ سے درآمد کی جائیں یا اُن کے خطوط پر مبنی ہوتیں۔ مطلب یہ کہ اگر تعلیم ناگزیر ہو گئی ہے تو یہ واضح خطوط پر مقصد براری کے لیے ہونی چاہیے۔

لیکن اِس سے علم کی اشاعت ہوئی

مزید برآں اگر فرد کی محدود تعلیم کا حکومت کو کچھ فائدہ تھا اور تعلیم کی اشاعت کو محدود رکھنا ممکن نہیں تھا، تو حکومت نے چپکے سے تعلیم کو اپنی پالیسی کے ایک آلۂ کار کے طور پر استعمال کرنے کا منصوبہ باندھا۔

لیکن جب ۱۹۱۷ میں مارکس کے اس فلسفے کی بنا پر کہ علم کا مثبت مقصد حقیقت کو تبدیل کرنا ہے۔ سوویٹ رُوس وجود میں آیا تو تعلیم کو ایک نیا مرتبہ اور ایک ترجیح حاصل ہو گئی یعنی عوام کو سرکاری اخراجات پر تعلیم دی جاتی تھی۔ اور تعلیم کا مواد ایسا ہونا چاہیے جس سے لوگ لُوٹ کھسوٹ پر رضامندی اور قسمت پر قناعت جیسے عقائد سے نجات حاصل کر سکیں۔ اسی طرح تعلیم کے نئے اجزاء میں سماج واد، رکاوٹوں پر قابو پانے کے لیے انسان کی قوت اور نئی قسم کی زندگی کی شروعات کے لیے قدرتی ذرائع کے استعمال جیسے معاملات شامل تھے۔ ہم میں سے پُرانی نسل کے بہت سے لوگوں کو یاد ہوگا کہ اس نئے تعلیمی نظام کی خاص طور پر مغرب میں کتنی شدت سے مخالفت ہوئی۔ [illegible] اور اس قسم کی تعلیم حاصل کرنے [illegible] نقصان [illegible] کہا جا سکتا ہے کہ

بہرحال ملک تعلیم کو اپنی مقصد براری کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اکثر ممالک تعلیم کو موجودہ حالت جُوں کی توں قائم رکھنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں جبکہ سوویت رُوس میں تعلیم کو پرانے سماج کو تبدیل کر کے اُن کے نظریات کے قریب لانے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔

سماجی تبدیلی کی رفتار کو تیز کرنا

یہ چیز قابلِ غور ہے کہ نوآبادیوں میں آزادی کی تحریکوں اور خود ہندوستان میں

> ہر کوئی یہ تسلیم کرتا ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی، ماحول کے تحفظ اور سب کے لیے صحت جیسے پروگرام تعلیمی شعبے کے بھرپور تعاون کے بغیر مؤثر طور پر عمل میں نہیں لائے جا سکتے۔

ہماری جدوجہد بہت زور سے ایسے تعلیمی نظام کی نکتہ چیں تھی جو حالات کو جُوں کا توں رکھنا چاہتا ہو۔ جہاں اساتذہ کی طرف سے نسل بہ نسل دئیے جا رہے خیالات بنا تنقید قبول کیے جا رہے تھے اور جس میں جدوجہد آزادی کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ جیسا کہ بعض افراد کا خیال ہے حقیقی زندگی کے مسائل کو نظرانداز کرنے اور ایسے متنازعہ امور کی بے جا تاویلیں کرنے سے جو پوری قوم کے لیے باعثِ تحریک بنے ہوئے تھے واقعیت پسندی یا مسائل کے غیر جانبدارانہ جائزے میں کوئی مدد نہیں مل رہی تھی بلکہ ایسے معاملات پر خاموشی حکومت کی طرفداری کرنے کا سب سے واضح طریقہ تھا۔ علاوہ ازیں ہمارے رہنماؤں کے ذہن میں تعلیم کا ایک نیا نمونہ تشکیل پا رہا تھا۔ کیونکہ جونہی سیاسی اقتدار اُن کے ہاتھ میں آیا انھیں خود ہندوستانی سماج کی تعمیر کے مسئلے کا سامنا کرنا تھا۔ چنانچہ ہمارے معاملے میں بھی جوں کی توں حالت نہیں بلکہ تبدیلی کی ضرورت محرک قوت بن گئی اور آج بھی ہماری یہ ایک ایسی خواہش ہے جو ابھی پوری نہیں ہوئی۔

اور اقتصادی ترقی

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دوسری جنگِ عظیم نے برطانوی شہنشاہیت کو سخت چوٹ لگائی اور ایشیا افریقہ اور دوسرے خطوں میں بہت سے ممالک آزاد ہو گئے۔ اس لیے ترقی پذیر ممالک میں سماجی تعمیرِ نو اور اقتصادی ترقی کے مسئلے کے سبب ایک واضح طور پر بیان کردہ یہ پالیسی عمل میں آتی ہے کہ تعلیم کا نہ صرف ایک ذاتی اور انفرادی کردار ہے بلکہ وہ لوگوں کو متحرک کرنے اور تجارتی اجناس اور مصنوعات کی پیداوار میں تیزی سے اضافہ کرنے نیز مواصلات، نقل و حمل، صحت، صفائی اور تفریح کے بارے میں اجتماعی خدمات کی بہم رسانی میں بہت بڑا آلۂ کار بن سکتی ہے۔ اور وہ اعداد و شمار جمع کرنے اُن کا مقابلہ کرنے، اُن کی تشریح، منصوبہ بندی اور عمل درآمد میں بھی مددگار ہو سکتی ہے۔

مستقبل کی تشکیل کے لیے ایک نظام کے طور پر تعلیم کی طاقت کو تسلیم کیا جانے لگا ہے اور سرگرمیوں کے دوسرے شعبوں کے ساتھ تعلیم کے مربوط جائزے کے نظریے کو قبول کر

یا گیا ہے، انسانی ذہن کی تشکیل کے لیے تخلیقی عمل اور اُن قدروں کے لحاظ سے تعلیم کی قوت کو پوری طرح سراہا جانے لگا ہے جو انسانوں میں پیدا کرنی ضروری ہیں۔ مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف ثقافتوں اور مذہبی عقائد میں یقین رکھنے والے افراد کو متحد رکھنے یا بین الاقوامی معاملات اور ترقیات کے دیگر امور کے بارے میں آزادانہ فیصلہ کرنے کے احساس فخر جیسے قومی مفادات کے تحفظ کے لیے ذہن کی تعمیر و تشکیل ضروری ہے۔

ہے۔ تعلیم کی اس لحاظ سے ہمہ گیر رغبت کو بھی اب اچھی طرح سمجھا جانے لگا ہے کہ یہ صرف کتابوں سے حاصل نہیں ہوتی یا صرف اساتذہ یا اسکولوں سے ہی نہیں لی جا سکتی بلکہ یہ کائناتی شعاعوں کی مانند ہر سمت اور بہت سے ذرائع سے آتی ہے۔ ذرائع ابلاغ محض تعلیمی پروگراموں کے نام پر ہی نہیں بلکہ جو کچھ بھی عوام کو پیش کیا جاتا ہے اس کے ذریعے عوام کو تعلیم دے سکتے ہیں یا تعلیم کے مضر اثرات کا ازالہ کر سکتے ہیں۔

مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے تعلیم سے مدد

اگر کوئی ترقی پذیر تعلیم کا اس لحاظ سے مجموعی جائزہ لے کہ تعلیم کن اشیاء کا مجموعہ ہے تب وہ مطلوبہ مستقبل کی تعمیر کے لیے تعلیم کا شعوری استعمال کر سکتا ہے۔ لیکن مستقبل کا تصور بجائے خود واضح ہونا چاہیے۔ کیا ہمیں ایک ایسے سیکولر سماج وادی اور جدید ہندوستان کی ضرورت ہے جو بہت حد تک ہماری اپنی ٹیکنالوجی پر تعمیر کیا گیا ہو۔ جس میں ہماری ثقافت کی اچھی قدروں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہو اور ایسی قدروں کو دور کیا جاتا ہو جو تعاون کا سبب ہیں اور ہمیں غیر معقولیت پسندانہ کا سبق دیتی ہوں؟ کیا ہمیں ایسی زندگی کی ضرورت ہے جو کفایت شعاری، توانائی اور دوسرے وسیلوں کی بچت پر مبنی ہو۔ جس میں سائنس اور فنون کے شعبوں میں تخلیقی کار اور اعلیٰ لوگ ہوں جو کافی مقدار میں چیزیں پیدا کرتے ہوں۔ اور ان کی معقول تقسیم کرتے ہوں تاکہ بڑھ رہی نابرابریوں کو دور کیا جا سکے۔ یا کیا ہم اپنے ایسے اقتصادی تعلقات کو بنیادی طور پر برقرار رکھنا چاہتے ہیں جن میں پیچیدہ مشینیں درآمد کی جائیں اور آسان مشینیں اور خام مال برآمد کیا جائے۔ ٹیکنالوجی کے لیے ترقی یافتہ ممالک پر انحصار رکھا جائے جو اس صورت حال کو متضاد اقتصادی اور سیاسی معاملات میں ہم پر دباؤ ڈالنے کے لیے استعمال کر سکیں، کسی اقلیت کی اچھی بھلی زندگی کو وقت کے ساتھ ساتھ زوال پذیر ہونے دیں، مغربی سماج کی پیروی کریں جس کے اشیاء کے استعمال اور فضول خرچ اسالیب زندگی کے سبب دنیا میں پھر سے استعمال کے قابل نہ رہنے والے ذرائع بڑی تیزی سے کم ہوتے جا رہے ہیں اور جیسے اپنے ملکوں میں روزگار کی ایک سطح برقرار رکھنے کے لیے بظاہر ایک ایٹمی تباہی کے خطرے کی فہرست دکھائی دیتی ہے؟

> ہم تعلیم کے بارے میں اپنے تذبذب صرف پالیسی کی ایسی حدود اپنا کر دور نہیں کر سکتے جو ہمیں سماج وادی، سیکولر اور جمہوری ملک کے آئینی وعدوں اور ذمہ داریوں سے دور لے جائیں۔

موزوں حکمت عملی کے ساتھ

اگر نقطۂ نظر صاف اور واضح ہو تو مقاصد موزوں پالیسیاں اور منصوبے مرتب کر کے حاصل کیے جا سکتے ہیں جن میں تمام شعبوں میں تال میل پایا جاتا ہو۔ مثال کے طور پر اگر دیہی زندگی کو بہتر بنانا ہے تب ہر ایک بلاک میں مال اور اشیاء، ٹیکنالوجی اور ٹیکنیکل افرادی قوت کی ضرورت میں مناسب امداد کی ضرورت ہوگی سڑکیں، بجلی، ذرائع مواصلات، صحت اور صفائی کے انتظامات مہیا کرنے ہوں گے جن میں سے ہر ایک کے لیے کئی اقسام کی مطلوبہ ٹیکنالوجی میں اچھی طرح تربیت یافتہ افرادی قوت کے ساتھ ساتھ کاروباری اور بینکنگ کے ابتدائی انتظامات قائم کرنے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام ضرورتیات کا ایک دوسرے پر کتنا انحصار ہے اور بلاک کے اندر ہی ان شعبوں کے باہمی ربط کی کتنی ضرورت ہے۔ ان کی نگرانی اور کارکردگی میں پورے معاشرے کے اشتراک عمل کی ضرورت ہے۔ اس جذبے کے ساتھ ہر سطح پر جو تعلیمی

ڈھانچے تعمیر ہوں گے اور جن کی امداد ذرائع ابلاغ ضلع سے ریاست تک اور قومی پیمانے پر کریں گے وہ یقینی طور پر سماج کی تبدیلی کے عمل کا جزو لاینفک بن جائیں گے۔ طلبا متعلقہ ٹیکنالوجی، اسکول اور کھیت یا عملی زندگی میں سیکھ سکیں گے۔ موزوں نصابات تجویز کرنے اور پورے وقت کے لیے کام کرنے والے اساتذہ کی مدد کے لیے کئی اقسام کے افراد مل سکیں گے اور جو لوگ کامیاب ہوں گے وہ جہاں تک کاموں یا ملازمتوں کا تعلق ہے ناموزوں نہیں ہوں گے اور نہ ہی اس لحاظ سے اپنے کنبے کے افراد کے لیے اجنبی ہوں گے کہ انھوں نے جو کچھ اسکول میں سیکھا ہے، اور جو روزمرہ کی زندگی میں عمل میں آتی ہے اس میں بھاری فرق پایا جاتا ہے۔ اگر تعلیم قدرتی ماحول، سماجی حقیقت اور انسانی رویے کو سمجھنے میں مدد دے۔ اگر مل جل کر زندگی گذارنے اور زیادہ پیداواری صلاحیت کے لیے درکار اہلیت کی جانب مناسب توجہ دی جائے تو تعلیم ایک زیادہ مربوط اور سلطنت طبقے یا قوم کی تشکیل کے لیے ایک قومی آلۂ کار ثابت ہو سکتی ہے۔ ایسی تعلیم ہر لحاظ سے پیداواری ہوگی اور وہ کمیاب وسائل کو صرف کرنے کی بجائے وسائل پیدا کرے گی۔

سماجی واقتصادی تبدیلی سے ربط

یہ خیال اب اچھی طرح ثابت ہو چکا ہے کہ تعلیم ایک پورے سماجی نظام کا ایک محرک موثر اور تفاعلی حصہ ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد آزاد ہونے والے کئی ممالک نے تعلیم کو اس ڈھنگ سے سمجھا ہے اور اسے ایک ساتھ سماجی و اقتصادی اور تعلیمی تعمیر کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

ہمارے آئین کی تمہید کے مطالعہ سے پتہ چلنے لگا کہ ہم تعلیم کے پورے اشتراک عمل کے بغیر مطلوبہ قابل تعریف نصب العین حاصل نہیں کر سکتے۔ ساتویں منصوبے میں بیان کردہ اغراض و مقاصد جن میں خوراک، پیداواری صلاحیت اور روزگار پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ سب کا تعلق، تجزیوں کی اشاعت اور نئے علم کی تخلیق سے ہے۔ دوسری جانب سب کے لیے تعلیم اور بالغوں کی ناخواندگی دور کرنے کے عظیم کام اس وقت تک پورے نہیں ہو سکتے جب تک کہ تمام ترقیاتی ادارے اور پورا معاشرہ اس میں سرگرم طور پر شامل نہ ہو۔ تعلیم کو پیشہ ورانہ خطوط پر ڈھالنے کیلئے کام کے دوران تجربے کی غرض سے جزوی وقت کے پیشہ ور معلموں کی ضرورت ہے اور اس کے لیے اکثر اداروں جاتی سہولیات میں حصے داری کی ضرورت ہے۔ مختلف ایجنسیوں اور محکموں کی باہمی امداد کے بغیر یہ ضرورت پوری نہیں ہو سکتی۔ ہر کوئی یہ تسلیم کرتا ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی، ماحول کے تحفظ اور سب کے لیے صحت جیسے پروگرام تعلیمی شعبے کے بھرپور تعاون کے بغیر موثر طور پر عمل میں نہیں لائے جا سکتے۔ اسی لیے ہم پانچویں منصوبے سے ہی باہمی ربط کی ضرورت کی بات کر رہے ہیں۔ منصوبہ بندی کے دستاویزوں میں درجنوں بار "رابطے کی کمی" کو اسکیموں کی ناکامی اور "رابطوں کے قیام" کو کامیابی کی ضمانت قرار دیا گیا ہے۔ یہ نہیں سمجھا جاتا کہ غیر مربوط سرگرمیاں، اکثر ایک دوسرے کے مقاصد کے الٹ کام کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک مشہور مثال ہے کہ حکومت کے ایک محکمے نے کشمیر میں قالین سازی کی صنعت کی حوصلہ افزائی کی جس سے کم عمر بچوں کو اس صنعت میں بڑے پیمانے پر روزگار حاصل ہوا،

> عوامی مانگ اب یہ دکھائی دیتی ہے کہ جو پالیسی اپنائی جا چکی ہے اُس پر بحث کی اتنی ضرورت نہیں جتنی اس پر عمل کے ذرائع اور طریقۂ کار پر جو ابھی مرتب نہیں ہوئے۔ عمل درآمد میں کمی کی وجہ سے حکومت پر نکتہ چینی ہو سکتی ہے کہ حکومت خوشحال طبقوں کی ہے اور ہمارے تعلیمی اداروں کے ناقص معیار یا کارکردگی کا یا محروم طبقوں کی خدمت کرنے میں اُن کی ناکامی کا خوشحال لوگوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے یہ لوگ جو خوبصورت وعدے کرتے ہیں انھیں عملی جامہ نہیں پہنانا چاہیے۔

لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسکولوں سے نکل آئے۔

تعلیم سرمایہ کاری کے طور پر

ہندوستان میں نہ صرف آزادی سے پہلے کا اندازِ فکر بلکہ آئین (۱۹۵۰) میں سب کے لیے ابتدائی تعلیم کو ترجیح دیئے جانے کا ذکر ہے جس کا مطلب ہے کہ اسے کم از کم بنیادی ضروریات سے بھی بڑا درجہ دیا گیا ہے۔ سائنس کے بارے میں پالیسی کی قرارداد (۱۹۵۸) دی گئی واضح مثال ایک فلاحی ملک کے قیام کے لیے صنعت کاری (جس میں زراعت کی جدید کاری بھی شامل ہے) کی ضرورت ہے اور جس کے لیے سائنس کی تعلیم کے زور دار اقدام مطلوب ہیں۔ تکنیکی ہنروں کی تربیت کے بارے میں تعلیمی کمیشن کی رپورٹ (۱۹۶۶) میں کہا گیا ہے "ملک کی اُمنگوں کو پورا کرنے کے لیے علم، ہنروں اور سب لوگوں کے میلانات اور قدروں میں تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور یہ کہ ایک روایت پرست معاشرہ کی اقتصادی ترقی در حقیقت ایک عظیم عروج ہے جس کے لیے بہت بڑے پیمانے پر تبدیلی کی ضرورت ہے جس کا ایک اور واحد طریقہ تعلیم ہی ہے اور آخر میں یہ کہ تعلیم کے بارے میں پالیسی (۱۹۶۸) کا یہ بیان کہ "حکومتِ ہند کو یقین ہے کہ تعلیمی کمیشن کے تجویز کردہ خطوط پر تعلیم کی انقلابی تعمیر نو ملک کی اقتصادی اور ثقافتی ترقی کے لیے، قومی یکجہتی کے لیے اور معاشرے کے لیے سماج وادی ڈھانچے کے حصول کے لیے نہایت ضروری ہے۔ یہ سب تبصرے ہمہ گیر ترقی کے لیے تعلیم کو ایک عنصر بنانے کے وسیع تر نظریہ سے میل کھاتے ہیں۔ تعلیم میں چھوٹی موٹی اصلاحات کرنے، تعلیم کو چند نجی افراد کی طبع آزمائیوں کے رحم و کرم پر چھوڑنے یا تعلیم کو چند افراد کی آرائش تک محدود کرنے کے لیے ہم پوری ایک صدی واپس نہیں جا سکتے۔ ہمیں تعلیم کو دوسری سماجی و اقتصادی تبدیلیوں کے ایک حصے کے طور پر جن کی وضاحت کی جانی چاہیئے، ڈھالنے کا سنجیدہ کام شروع کرنا ہوگا۔ اس لیے مالی لحاظ سے تعلیمی اخراجات کو ترقی کے لیے سرمایہ کاری شمار کرنا ہوگا۔ اور جیسا کہ موجودہ حالت ہے اسے ایک سماجی خدمت پر خرچ نہیں سمجھنا ہوگا۔ کیوں کہ اس وقت تو تعلیم منصوبے کے قلبی حصے میں بھی شامل نہیں ہے۔

مشق شروع ہو چکی ہے

پرائمری ثانوی اور یونیورسٹی کی سطح پر نصابات اور تعلیم دینے کے طریقوں اور پورے تعلیمی نظام کے ڈھانچے نیز اسکے اداروں اور انتظامیہ میں کون سی تبدیلیاں ہوں۔ خوش قسمتی سے نہایت قابل افراد کے بہت سے گروپوں نے اُن کی تفصیلات مرتب کی ہیں۔ منصوبہ بندی کمیشن نے حال ہی میں ساتویں منصوبے کے بارے میں کئی عاملہ جماعتیں قائم کی تھیں جن کے مطالعہ کے بارے میں ایک مجموعی رپورٹ موجود ہے۔ دو سو سے زیادہ ماہرین اور اہل کاروں نے اس مشق میں حصہ لیا۔ اسکولوں اور اعلیٰ تعلیم کے اساتذہ کے بارے میں قائم کیے گئے دو کمیشنوں نے مارچ ۱۹۸۵ میں اپنی رپورٹیں حکومت کو پیش کی ہیں جن کے لیے انھوں نے ہزاروں اساتذہ، منتظمان اور عوام الناس سے صلاح مشورہ کیا اور تعلیم میں اصلاحات کی کی سفارش کرنے کے لیے انھیں تمام پہلوؤں کا مجموعی طور پر بالائی جائزہ لینا پڑا۔ تمام ہندوستانی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں نے پورا ایک دن عام تعلیمی اور فوری یونیورسٹی اصلاحات پر مباحثے کے بعد ایک عاملہ جماعت قائم کی جس کی دو طویل میٹنگیں ہوئیں اور آخر کار ایک نہایت معقول دستاویز یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو بھیجنے کے لیے تیار کی گئی جس نے یہ دستاویز قبول کر کے حکومت کو بھیج دی۔

موجودہ دستاویز اور اس کے بارے میں مذاکرات کی مجلسوں کے ذریعے غالباً ہزاروں افراد نے تعلیمی پالیسی کے بارے میں مباحثے میں حصہ لیا ہوگا۔

عمل میں کمی

دستاویز پر جاری بحث، تعلیمی کمیشن کی رپورٹ، ۱۹۶۸ میں پارلیمنٹ میں منظور کی جا چکی قومی تعلیمی پالیسی اور مذکورہ اداروں کی مثبت سفارشات سے واقف کسی بھی شخص کو یہ پتہ لگ جائے گا کہ ان مذاکروں میں زیادہ تر اختلافِ رائے اُن سفارشات سے بظاہر انحراف کے بارے میں پایا جاتا ہے۔ اس لیے ہم اس نتیجے پر پہونچنے والے ہیں کہ تجاویز کا جو بنیادی ڈھانچہ پہلے طے ہو چکا ہے وہ لوگوں کو بالعموم منظور ہوگا۔ محض اس لیے کہ یہ سفارشات سماجی تبدیلی کے لیے تعلیم کے کردار کے حقیقی جائزے اور ہمارے ملک کی ضروریات کے ٹھوس ڈھانچے پر مبنی ہیں۔ اُس ڈھانچے سے کوئی علیحدگی یا انحراف اختلافات کو اور شدید کر دے گا اور عمل میں رکاوٹ بنے گا۔ ہم تعلیم کے بارے میں اپنے تذبذب صرف پالیسی کی ایسی حدود اپنا کر دور نہیں کر سکتے جو سماج وادی، سیکولر اور جمہوری ملک کے آئینی وعدوں اور ذمہ داریوں سے دُور لے جائیں۔ سب سے زیادہ تشویش تعلیم کے بارے میں قومی پالیسی پر عملدرآمد میں کمی پر ظاہر کی گئی ہے۔ خواہ یہ کمی سب کے لیے

تعلیم یا دسنا جمع، دو تین یا تعلیم کو پیشہ ورانہ خطوط پر لانے کے بارے میں تھی یا مجموعی قومی پیداوار کا چھ فیصد حصہ تعلیم پر خرچ کرنے کے بارے میں تھی۔ اگر ہم نے پالیسی پر بہتر طور پر عمل کیا ہوتا تو شائد ہمارے مسائل اتنے شدید نہ ہوتے جتنے اب ہیں۔ عوامی مانگ اب یہ دکھائی دیتی ہے کہ جو پالیسی اپنائی جا چکی ہے اُس پر بحث کی اتنی ضرورت نہیں جتنی اس پر عمل کے ذرائع اور طریقۂ کار پر جو ابھی مرتب نہیں ہوسکے۔ عمل درآمد میں کمی کی وجہ سے حکومت پر یہ نکتہ چینی ہوسکتی ہے کہ حکومت خوشحال طبقوں کی ہے اور ہمارے تعلیمی اداروں کے ناقص معیار یا کارکردگی کا یا محروم طبقوں کی خدمت کرنے میں اُن کی ناکامی کا خوشحال لوگوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے یہ لوگ جو خوبصورت وعدے کرتے ہیں اُنھیں عملی جامہ نہیں پہنانا چاہتے۔ یہاں پر "متواتر اور بھرپور عمل درآمد کی ضرورت" کے بارے میں تعلیمی کمیشن کی رپورٹ سے جو بیس برس ہوئے لکھی گئی تھی حوالہ دینا بے محل نہیں ہوگا۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا "بے شک آزادی کے بعد کے عرصے میں تعلیمی ترقی کے ضمن میں بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے اور جیسے کہ یہ کمیشن قائم کرنے کے بارے میں حکومت کی قرارداد میں کہا گیا ہے، خیالات اور عمل میں ایک وسیع اور تشویشناک خلیج متواتر چلی آرہی ہے۔ اور تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کے پروگرام حالانکہ وہ بہت سوچ بوجھ سے اور اتفاق رائے سے بنائے گئے تھے اُنھیں تسلی بخش طور پر عمل میں نہیں لائے جاسکے۔ لہٰذا مسئلے کا یہ پہلو ہمارے لیے بڑی تشویش کا باعث ہونا چاہیئے۔ کمیشن کی رپورٹ عمل کا نعم البدل نہیں بن سکتی۔ اس کا مقصد عمل پیدا کرنا ہے۔ ایک رپورٹ جسے بالائے طاق رکھ دیا جائے یا جس کے نتیجے کے

(باقی صفحہ ۱ پر)

بقیہ: موجودہ صورتحال کے لیے تعلیم ہی کو موردِ الزام قرار دیا جانا چاہیئے

بجلی اور خوراک کا باکفایت استعمال اور اس کا شعور۔

۲۲۔ زرق برق لباس اور نام و نمود اور دکھاوے کے کاموں کے تئیں رویّے۔

۲۳۔ ماحول کی آلودگی۔

۲۴۔ علم معیشت حیوانات۔

۲۵۔ صفائی، شخصی صفائی اور اس کے سائنسی طریقے۔

۲۶۔ جمالیاتی احساسات و شعور۔

۲۷۔ اچھی خوراک اور اس کے تئیں سائنسی نظریات۔

۲۸۔ مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت اور امدادِ باہمی کے تصور کے زیر اثر کام کرنے کی صلاحیت۔

۲۹۔ مقابلے میں ہار جیت کا تصور۔

۳۰۔ صحت اور صفائی۔

۳۱۔ توہمات، ظلمت پسندی کو دُور کرنے کے لیے سائنسی شعور کی بیداری۔

۳۲۔ رسم و رواج، روایات اور موروثی طریقوں کے تئیں سائنسی اندازِ نظر۔

۳۳۔ عمر اقتدار کے لیے سائنسی شعور۔

۳۴۔ شخصی صفات، قوّتِ برداشت، ہمت، جذبۂ ترحم، دوسروں کے لیے جذبہ اور خیال، سچائی، عاجزی، ایمانداری، وفاداری، جذبہ رواداری، اعتماد، خود ضبطی، نظم و نسق کی پابندی کی عادت اور احساسِ ذمہ داری۔

۳۵ رویّوں اور معاملات کے ضابطے۔

درسی کتب اور نصابات کی تیاری کیلئے کچھ دیگر رہنمایانہ خطوط

۱۔ یہ مواد ایسا ہو جو زیادہ تر پورے ہندوستان کے لیے کارآمد اور مفید ہو۔

۲۔ اس میں حسبِ ضرورت تبدیلی لائی جاسکے۔

۳۔ ماحول سے مطابقت۔

۴۔ مربُوط اندازِ نظر۔

۵۔ ہر مسئلے، ہر سوال اور ہر تصور کے لیے الگ الگ غور و فکر، سب کو ایک باب میں شامل کرنے کی بجائے الگ الگ ان کی وضاحت۔

۶۔ سابقہ سیکشن میں بیان کردہ مقاصد سے کسی ایک کے ساتھ تعلق پیدا کرنا (اقدار، متعلقہ علم اور ہنرمندی)۔ اس طرح سے قائم کردہ تعلق مذکورہ سیکشن ۲۰ میں درج اقدار و تصورات کے لیے وجہ جواز بن سکے۔

۷۔ نصاب استادوں اور دیگر افراد کے لیے قابلِ عمل ہو، نصاب تفصیلی ہو نیز اس میں ایسی لچک ہو جس میں تبدیلی سمائی جاسکے۔

۸۔ نصابات میں مختلف لیکچروں کے عنوانات اور مشمولات کا ذکر ہونا چاہیئے۔ ہر کلاس میں ہر مضمون کے لیے متعینہ گھنٹوں کا بھی لحاظ رکھنا ہوگا۔ مثال کے طور پر، ہر سال ساتویں اور آٹھویں کلاس میں ۲۵۵ گھنٹے ہوں گے۔ نصاب کو سیکشن وار بنا دینا اچھا رہے گا۔

۹۔ اس میں تعلیم دینے کے لیے ضروری امدادی سامان کے لیے بھی ضروری مشورے دئے گئے ہوں۔ ●

جسٹس پی۔ این۔ سنگھل

یہ یونیورسٹیاں نہیں رہے

مصنّف کی شدید خواہش یہ ہے کہ کچھ ایسے فوری اقدامات کئے جائیں جن سے یونیورسٹیاں اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ سے پا سکیں۔ یہ یونیورسٹیاں علم کی حقیقی عبادت گاہیں ثابت ہوں، اور ان اداروں میں طلبا ہر روز عقیدت کا جذبہ لے کر جائیں۔ علم کی ان عبادت گاہوں میں ان کا سرِ نیاز عقیدت سے جھکا ہو اور امید کا دامن ان کے ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ مصنف نے ان مقاصد کے حصول کے لیے چند مشورے دئے مثلاً یہ کہ یونیورسٹیوں میں داخلہ محدود ہو بھلے ہی اس سلسلے میں کچھ سخت اقدامات اُٹھانے پڑیں۔ اِن میں ٹھوس لیاقت رکھنے والے اور علمی دنیا میں ممتاز مقام رکھنے والے افراد کو ہی وائس چانسلر بنایا جائے۔ انھوں نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے لیے وسیع اختیارات دینے کی ضرورت بتائی اور یونیورسٹی کے معاملات کو سیاسی مداخلت سے بچانے پر زور دیا۔

یونیورسٹی تعلیم میں نئے سمتوں یا اصلاحات کی باتیں بہت بڑھ چڑھ کر کی جا رہی ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس سلسلے میں بڑی تبدیلی لائی جا رہی ہے لیکن تبدیلی کیا آتی ہے، یہ دیکھنا باقی ہے۔ اگرچہ میں معتدبہ تبدیلی لانے کا خواہشمند ہوں، لیکن میں تبدیلی برائے تبدیلی کا قائل نہیں ہوں۔ میں پرانی روشنی کا آدمی ہوں اور مجھے کسی ایسی اسکیم سے ہی اطمینان ہو

سکتا ہے جس سے یونیورسٹیوں کا کھویا ہوا وقار انھیں مل سکے گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا ممکنہ تبدیلیاں ہیں جو یونیورسٹی کی تعلیم میں لائی جا رہی ہیں۔ ممکن ہے کہ میں اس حالت میں جو کچھ لکھوں، وہ سیاق و سباق سے علیحدہ یا غیر متعلق ہو۔ ان پیش رفتوں سے بے خبری کے عالم میں، میں کچھ ایسے بنیادی حقائق کی طرف توجہ ہی دلا سکتا ہوں جو تبدیلی کے کسی بھی ڈھانچے میں موزوں ثابت ہو سکتے ہیں۔

یونیورسٹی وہ درس گاہ ہے جہاں شخصیت کی بحیثیت مجموعی تعمیر و تشکیل کے لیے تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ وہ بنیادی کردار ہے جس کی بحالی ضروری ہے۔ جو طلبا تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے یونیورسٹی میں داخلہ لیں، انھیں علم کے حصول کی قدر و قیمت معلوم ہونی چاہیے اور ان کا سر علم کے ان منادر میں عقیدت سے جھک جانا چاہیے۔ یہ طلبا ہر روز یونیورسٹی میں عقیدت کے جذبے کے ساتھ جائیں۔ یونیورسٹی جاتے ہوئے ان کا دل عجز و انکسار سے مملو ہونا چاہیے اور امید کا دامن ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹنا چاہیے۔ ان طلبا سے یہ جذبات کیوں دور ہوئے، ان اسباب کا پتہ لگا کر ان کا سدِباب کیا جانا چاہیے خواہ اس کے لیے کچھ شدید قسم کے اقدامات ہی کیوں نہ ضروری ہوں۔ یونیورسٹیوں کا بلند مقام انکو واپس ملنا چاہیے۔ اس سلسلے میں داخلوں پر پابندی لگانا ناگزیر ہے۔ اگرچہ یہ ایک ناخوشگوار قدم ہے۔ صرف انھیں طلبا کو داخلہ ملنا چاہیے جو یونیورسٹی کے حکام کو یہ یقین دہانی کرا سکیں۔ وہ فی الواقعی تعلیم حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں۔ ابتدائی مراحل پر جن کا تعلیمی ریکارڈ غیر تسلی بخش ہے، یا جو کچھ دیگر وجوہات سے داخلہ لینا چاہتے ہیں، ان کو داخلہ نہ ملنا چاہیے۔ سیاسی یا دیگر خارجی اسباب کی بنیاد پر داخلہ نہیں ملنا چاہیے۔ یونیورسٹی کا حکم نامہ اس قدر صاف ستھرا اور ایمانداری پر مبنی ہونا چاہیے کہ اس کی معروضیت کے سبھی قائل ہوں یہ اپنے نئے ماحول کا نقیب ہونا چاہیے۔ داخلہ میں طرفداری کا ایک بھی کیس نہ ملنے پر ہر شخص کو اس کی ایمانداری کا یقین ہو سکے گا اور اس طرح یونیورسٹیاں اپنا مناسب اور بلند مقام دوبارہ سے حاصل کر سکیں گی۔

> **جو طلبا تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے یونیورسٹی میں داخلہ لیں، انھیں علم کے حصول کی قدر و قیمت معلوم ہونی چاہیے اور ان کا سر علم کے ان منادر میں عقیدت سے جھک جانا چاہیے۔ یہ طلبا ہر روز یونیورسٹی میں عقیدت کے جذبے کے ساتھ جائیں۔ یونیورسٹی جاتے ہوئے ان کا دل عجز و انکسار سے مملو ہونا چاہیے اور امید کا دامن ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹنا چاہیے۔ خواہ اس کے لیے کچھ شدید قسم کے اقدامات ہی کیوں نہ ضروری ہوں۔**

> **یہ ضروری ہے کہ مشہور و معروف علمی شخصیتیں اور صاحبِ کردار انسان ہی وائس چانسلر کے مفتخر عہدے پر فائز ہوں۔ اس مقصد کے لیے وائس چانسلر کے عہدے کی تنخواہیں، سہولتیں بڑھائی جائیں اور شرائطِ ملازمت دلکش بنائی جائیں تاکہ روزگار کے دیگر شعبوں کے مقابلے ادھر آنے کی رغبت ہو سکے۔**

وائس چانسلر کیسے ہوں؟

پہلے یونیورسٹی کے چانسلر ایسے لوگ

ہوا کرتے تھے جو علم و دانش کا خزانہ ہوتے، جن کی کردار و سیرت اپنی پختگی کے لیے مشہور ہوتی تھی طلبا کو اس بات پر فخر رہتا کہ وہ اُن سے وابستہ رہے ہیں۔ خواہ یہ وابستگی کتنی ہی دوری لیے ہوئے کیوں نہ ہوتی۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ مشہور و معروف علمی شخصیتیں اور صاحبِ کردار انسان ہی وائس چانسلر کے مفتخر عہدے پر فائز ہوں۔ اس مقصد کے لیے وائس چانسلر کے عہدے کی تنخواہیں سہولتیں بڑھائی جائیں اور شرائطِ ملازمت دلکش بنائی جائیں۔ تاکہ روزگار کے دیگر شعبوں کے مقابلے ادھر آنے کی رغبت ہو سکے۔ اس سے ان کا ادب و احترام ہر جگہ ہو سکے گا۔ وائس چانسلروں کے انتخاب میں سیاسی رشتہ دوانیوں کو دخل نہ ملنا چاہیے۔

میں کیا فیصلہ کرنے والا ہے۔

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا رول:- یونیورسٹی

> یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کافی عرصے سے کام کر رہا ہے۔ اس کے رول اور اس کی ذمّہ داریوں پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ کمیشن کے ذمّے محض یہی نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ یونیورسٹی کو روپیہ تقسیم کر دے، اس کو از سرِ نو تشکیل دینا ضروری ہے۔ اس میں کُل ہند شہرت یافتہ ماہرینِ علوم شامل ہونے چاہیئں، ان کے پاس تجربہ ہونا چاہیئے اور ان سب کو پورے وقت کے لیے اس کے رُکن کی حیثیت سے کام کرنا چاہیئے۔

> ہر دوسرے یا تیسرے برس اُستاد کی کارگزاری کا جائزہ لیا جانا چاہیئے۔ اگر اس کی دو رپورٹیں مسلسل غیر تسلّی بخش آئیں تو قواعد و ضوابط کی رُو سے اسے ملازمت سے ہٹا دینا چاہیئے۔

رکن کی حیثیت سے کام کرنا ہے۔ پانچ یا چھ ممبر کافی ہیں لیکن ان کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا جانا چاہیئے تاکہ یونیورسٹیوں کا احترام پورے ہندوستان میں بڑھ سکے۔ ان اہم عہدوں کو سیاست دانوں سے بچانا ضروری ہے۔ یونیورسٹی کمیشن ہندوستان بھر کی یونیورسٹیوں کی ذمہ داری لے، یونیورسٹیوں کی خودمختاری مجروح نہ ہونے پائے، اس کا لحاظ بیحد ضروری ہے۔ اگر کسی یونیورسٹی میں حالات انتہائی خراب ہو جائیں تو یونیورسٹی کو اس کی منظوری ختم کرنے کے اختیارات ہونے چاہئیں۔ اسے ہر تنازعے پر فیصلہ کے اختیارات ہونے چاہئیں۔ یونیورسٹی اپنے متنازعہ امور کمیشن کے روبرو پیش کرے اور وہ اس پر فیصلہ کرے۔

اُستادوں کا وقار اور ان کی قابلیت

عام طور پر جیسا کہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ چانسلر یا وزیٹر کا یونیورسٹی کے نظم و نسق میں دخل ضروری ہوتا ہے، اس بات کو یقینی بنانا ضروری ہے کہ وہ سیاسی مداخلت سے بالاتر ہو اور یونیورسٹی کے معاملات میں اس کے اپنے فیصلے ہوں۔ ریاستی تعلیمی محکمے کو اس میں مداخلت کرنے کا آسانی سے اختیار نہ ہو۔ اسے یہ بھی نہ معلوم ہونا چاہیئے کہ چانسلر یونیورسٹی معاملات

گرانٹس کمیشن کافی عرصے سے کام کر رہا ہے۔ اس کے رول اور اس کی ذمہ داریوں پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ کمیشن کے ذمّے محض یہی نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ یونیورسٹی کو روپیہ تقسیم کرے، اس کو از سرِ نو تشکیل دینا ضروری ہے۔ اس میں کُل ہند شہرت یافتہ ماہرین علوم شامل ہونے چاہئیں، ان کے پاس تجربہ ہونا چاہیئے۔ اور ان سب کو پورے وقت کے لیے اس کے

یونیورسٹی اپنے اساتذہ کے بل بوتے پر جانی پہچانی جاتی تھی۔ طلبا مضامین کا انتخاب یہ سوچ کر کیا کرتے تھے کہ فلاں مضمون کا پڑھانے والا کون ہے۔ استادوں کا انتخاب میرٹ اور لیاقت کی بنیاد پر ہونا چاہیئے۔ اس راستے میں علاقائی یا ریاستی تصورات مانع نہیں ہونے چاہئیں۔ ہر دوسرے یا تیسرے برس اُستاد کی

کارگزاری کا جائزہ لیا جانا چاہیے۔ اگر اس کی دو رپورٹیں مسلسل غیر تسلی بخش آئیں تو قواعد و ضوابط کی رو سے اسے ملازمت سے ہٹا دینا چاہیے۔

یونیورسٹی انتظامیہ اور طلباء

یونیورسٹی امور میں طلبا کی آواز بھی ہونی چاہیے۔ اس حساب سے قواعد و ضوابط مرتب کیے جانے چاہئیں۔ طلبا میں احساسِ ذمہ داری پیدا کرانا ضروری ہے۔ وہ مفید مشورے بھی دے سکیں اور مفید صحتمند نکتہ چینی بھی کر سکیں۔ ان کے مشورے صائب ہونے کی صورت میں ہی وہ قابلِ قبول اور قابلِ عمل ہو سکتے ہیں۔ تعلیم کا معیار اور نصاب کی ترتیب ایک بڑا کام اور عظیم ذمہ داری ہے۔ یونیورسٹی کا وقار اس پر بڑی حد تک منحصر ہے۔ یونیورسٹی کمیشن کی منظوری کے بعد ہی ان کو حتمی کہا جانا چاہیے۔ اس پر پوری صدق دلی اور ایمانداری سے عمل کرایا جانا چاہیے۔ امتحان کے طریق کار میں بنیادی نوعیت کی تبدیلی لانی ضروری ہے۔ تاکہ وہ حالاتِ حاضرہ سے مطابقت پیدا کر سکے۔ یونیورسٹیوں میں یونیورسٹی لیکچر کا سلسلہ شروع کیا جانا چاہیے۔ ملک بھر کے دانشوروں سے لیکچر دلوانے چاہئیں۔ اور انھیں اس مقصد کے لیے بلانا چاہیے۔ یہ لیکچر افادیت لیے ہوئے ہونے چاہئیں اور یہ ایسے مفید لیکچر ہونے چاہئیں کہ طلبا کو ان کے سننے کا اشتیاق اور ضرورت محسوس ہو۔ یہ لیکچر سبھی کے لیے ہونے چاہئیں۔ جو بھی یہ لیکچر دینے آئیں، وہ ایسی شخصیتیں ہوں کہ علمی دنیا میں ان کا احترام کیا جاتا ہو۔ یونیورسٹی دراصل ایک ایسی درس گاہ ہے جہاں سبھی کے لیے تعلیم کی روشنی ہو۔ اور جہاں زندگی کی رہنمائی ہر لحاظ سے ہو سکے۔ استاد یا طالب علم وہاں عزت کا مقام پا سکے۔ اور اس کی عزت کا معیار اس کا علم ہو، اسی بنیاد پر اور اسی معیار پر استادوں اور طلبا کو پرکھنا ضروری ہے اور اسی کی بنیاد پر ان کی قدر و قیمت کا تعین کیا جانا چاہیے۔ ●

> **تعلیم کا معیار اور نصاب کی ترتیب ایک بڑا کام اور عظیم ذمہ داری ہے۔ یونیورسٹی کا وقار اس پر بڑی حد تک منحصر ہے۔ یونیورسٹی کمیشن کی منظوری کے بعد ہی اسے حتمی کہا جانا چاہیے۔ اس پر پوری صدق دلی اور ایمانداری سے عمل کرایا جانا چاہیے۔**

بقیہ: نہیں، آپ تعلیم کو قربانی کا بکرا نہیں بنا سکتے

اپنے پہلے پلان میں اپنے بجٹ کا ۷٫۵ فیصد تعلیم پر خرچ کیا تھا لیکن اب تعلیم پر ہمارا خرچ گھٹ کر صرف ۲٫۰ فیصد کے لگ بھگ رہ گیا ہے۔ سال ۸۶-۱۹۸۵ء کے بجٹ میں تعلیم کے لیے ۸،ر۱۳۵ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں جب کہ گذشتہ سال ۴۷،ر۸۴۸۴ کروڑ روپے رکھے گئے تھے۔ یہ شاندار آزادی کے بعد، کل بجٹ کے فیصد کے اعتبار سے تعلیم کی تاریخ میں سب سے کم ہے۔ یہ بجٹ کا تقریباً ۱٫۲ فیصد ہے۔ اگر ہم آج تعلیم پر سرمایہ نہیں لگائے تو اکیسویں صدی میں صورتِ حال بہت تاریک ہو جائے گی۔ میں صرف اُمید ہی کر سکتا ہوں کہ ہماری قوم اور ہمارے رہنما حالات کے اس قدر خراب ہو جانے تک انتظار نہیں کریں گے اور جلد اقدامات کریں گے۔ اگر ہم اپنے بجٹ کا ۷٫۵ فیصد حصہ مناسب منصوبوں کے ساتھ تعلیم پر خرچ کرتے رہتے تو ہو سکتا ہے کہ معاشی ترقی کا اوسط سالانہ شرح اس سے کچھ کم رہتی جتنی کہ ہوئی مگر آج ہم ٹھوس تعلیمی ترقی کی دہلیز پر کھڑے ہوئے۔ تعلیم کوئی ایسی صنعت نہیں جس میں جلد ہی منافع ہونے لگے۔ ہمیں اپنی کوششوں کے بار آور ہونے کے لیے پندرہ بیس سال انتظار کرنا ہوگا۔ ۱۹۶۰ء سے شروع ہونے والی دہائی میں ہم نے جو کچھ کیا اسی کی وجہ سے آج ہمیں تعلیم میں بحران کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ●

ڈاکٹر (شریمتی) مادھوری آر شاہ

اعلیٰ تعلیم ہمارے لیے کس طرح مفید ہو سکتی ہے؟

اعلیٰ تعلیم کیسی ہو جس سے ہمارے ملک کے عوام کی اُمنگوں اور آرزوں کی تکمیل میں مدد مل سکے اور وہ انھیں اکیسویں صدی میں ایک متحرک، فعال قوم کی حیثیت سے قدم رکھنے کا اہل بنا سکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم محض نظامِ تعلیم کی اندھا دھند پیروی نہ کریں بلکہ اس طرح کے منصفانہ اور صلاحیت مندانہ طرزِ عمل کو اپنانے کی کوشش کریں جو انسانی اقدار سے مملو ہو۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر مادھوری شاہ نے کیا ہے انھوں نے کہا کہ تعلیم کے ذریعے طلبا میں سچائی کے راستے پر چلنے کا مادہ پیدا ہونا چاہیئے اور وہ ذات پات، نسل، فرقہ اور دولت، استحقاق کے تنگ نظری پر مبنی تصورات سے خود کو آزاد کر سکیں۔ طلبا میں معقولیت پسندی کا انداز ہونا چاہیئے اور وہ شخصی مفاد کو وسیع تر قومی مفادات کے تابع کر سکیں۔

حصول آزادی کے بعد ملک میں تعلیم کے محاذ پر بے پناہ توسیع دیکھنے کو ملی ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعداد ۵۰-۵۱ء کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہو گئی۔ کالجوں کی تعداد اس عرصے میں ۷۰۰ سے بڑھ کر ۵۵۰۰ تک اور یونیورسٹیوں کی تعداد ۱۸ سے بڑھ کر ۱۴۰ تک پہنچ گئی ہے۔ ہر سال تقریباً سو نئے کالج کھل جاتے ہیں۔ گویا کہ ہر تیسرے چوتھے روز اوسطاً ایک کالج۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلے کی رفتار تقریباً ۷ فیصد سالانہ کے حساب سے بڑھ رہی ہے۔ اس طرح طلباء کی تعداد ہر دس برس بعد دوگنی ہو جاتی ہے۔ اس وقت ۱۷ سال سے ۲۳ سال تک کی عمر کے جتنے نوجوان ہیں، ان میں ۴ فیصد سے زیادہ نوجوان کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم پا رہے ہیں۔

روشنی اور اندھیرا

نظام تعلیم کی تاریخ روشنی لیے ہوئے بھی

ہے اور تاریکی بھی۔ یہ کامیابیوں کی داستان بھی ہے اور ناکامیوں کی بھی۔ نظام تعلیم کی ابتری کے لیے بالعموم بحران کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ میں اسے بحران نہ کہہ کر غیر تسلی بخش صورت حال کہوں گی جس کا سبب غیر معمولی توسیع، فنڈز کی کمی، معیار کے اختلافات، طلبا میں تعلیم کے تئیں بے رغبتی، بڑھتی ہوئی بے روزگاری اور یونیورسٹیوں کے نظام کار میں سیاسی مختلف طرح کی مداخلت ہے۔ ان تمام خامیوں کے باوجود تعلیمی نظام میں اصلاح و بہتری کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے تاکہ تعلیم کا معیار بلند ہو۔ ان اقدامات سے بہت سی اُمیدیں وابستہ کی گئیں۔ میرا ذاتی خیال بھی اُمید افزا ہے، بشرطیکہ عزم کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔

میں اس بات میں پورا یقین رکھتی ہوں کہ ہم اعلیٰ تعلیم کے ایک ایسے دَور میں قدم رکھ رہے ہیں جو نیا بھی ہے اور اُمید افزا بھی۔ یہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے پہلے سے مختلف ہوگا لیکن عوام کی تخلیقی صلاحیتوں اور ضرورتوں اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق ہوگا۔ آج کے پریشان کن مسائل اور آج کا آزمائشی دَور زیادہ بامقصد اعلیٰ تعلیمی نظام کی رہنمائی کرے گا اور وہ عصری ضرورتوں کو پورا کرنے میں زیادہ زود حس واقع ہوگا۔

معیار کی ابتری

خوش قسمتی سے ہمارے طلبا بھی ہمیشہ کی طرح سے اچھے ہیں اور ہمارے نصابات بھی اعلیٰ معیار کے ہیں۔ ہمارے بہت سے ادارے اور یونیورسٹیاں نمایاں خدمات انجام دے رہی ہیں اور ان کے اعلیٰ کام کے سبب انھیں اعزازات بھی مل رہے ہیں۔ درحقیقت اگر ہمارے ملک میں گزشتہ برسوں میں منصوبہ بندی اور ترقیاتی سرگرمیوں میں بتدریج ترقی عمل میں آئی ہے تو اس کامیابی کا سہرا اِن یونیورسٹیوں اور اداروں کے سر ہے جو اعلیٰ تعلیم دیتے ہیں اور جو ملک میں اعلیٰ معیار کا محنت کش طبقہ تیار کرتے ہیں۔ ان تمام کامیابیوں کے باوجود ایک تکلیف دہ حقیقت سامنے آئی ہے جس سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں اور وہ یہ کہ ہماری یونیورسٹی تعلیم کے معیار میں بالعموم کمی آئی ہے۔ اور بہت سے کالجوں سے جو گریجویٹ نکلتے ہیں، ان کا علمی معیار کم ہوتا ہے۔

اس حقیقت کے باوجود کہ یونیورسٹی سطح کی تعلیم کا معیار غیر تسلی بخش ہے، اعلیٰ تعلیم کے لیے سماجی مطالبہ میں بدستور اضافہ جاری ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کی حقیقت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ ماہرینِ اقتصادیات کے مطالعے کی روشنی میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ملک میں اعلیٰ تعلیم کے لیے بڑے پیمانے پر سرکاری امداد ملتی ہے جس کی وجہ سے وہ سستی ہے۔ لہٰذا اس مد پر سرمایہ کاری اپنے کمتر معیار کے باوجود انفرادی نقطۂ نظر سے نفع بخش ہے۔ دوسرے لفظوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد زندگی بھر جو کمائی کرتے ہیں، وہ کمائی اُن کے مقابلے زیادہ ہے جو اس طرح کی تعلیم نہیں رکھتے۔ لڑکیوں کو یونیورسٹی سطح

میں اس بات میں پورا الیقین رکھتی ہوں کہ ہم اعلیٰ تعلیم کے ایک ایسے دَور میں قدم رکھ رہے ہیں جو نیا بھی ہے اور امید افزا بھی۔ یہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے پہلے سے مختلف ہوگا۔ لیکن عوام کی تخلیقی صلاحیتوں اور ضرورتوں اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق ہوگا۔

درحقیقت اگر ہمارے ملک میں گزشتہ برسوں میں منصوبہ بندی اور ترقیاتی سرگرمیوں میں بتدریج ترقی عمل میں آئی ہے تو اس کامیابی کا سہرا ان یونیورسٹیوں اور اداروں کے سر ہے جو اعلیٰ تعلیم دیتے ہیں اور جو ملک میں اعلیٰ معیار کا محنت کش طبقہ تیار کرتے ہیں۔

کی تعلیم سے سماجی اور ثقافتی فائدے حاصل
ہوتے ہیں جو اقتصادی لحاظ سے بھی سودمند ہیں۔
نئی تعلیمی پالیسی زیرِ تشکیل ہے۔ وزیرِاعظم
پورا نظامِ تعلیم بدلنا چاہتے ہیں تاکہ قومی ترقیاتی
پروگراموں کی تکمیل نیز عصری تقاضوں کو بخوبی پورا
کیا جا سکے۔ آئندہ کے خیال

طالب علم سماج کے لیے تبھی مفید ہوگا جبکہ
وہ ذاتی فائدوں کو وسیع تر سماجی فائدوں کے
تابع کرے۔ علمی سطح پر اسے رٹ کر ہی اپنے
اسباق یاد کرنے کا فن نہیں آنا چاہیئے، بلکہ
اس کو علم کے حصول کا ایک ایسا شوق پیدا ہو
جس سے وہ عمر بھر علم کی تلاش و جستجو میں رہے۔
اس میں سوچنے سمجھنے جاننے پرکھنے

ملازمتوں کی تلاش

یہ سوال پوری دُنیا میں زیرِ بحث ہے کہ
اعلیٰ تعلیم کا معیار کیا ہو۔ بہت سے مُلکوں
میں اس بارے میں شعور زیادہ تیزی سے فروغ
پا رہا ہے کہ تعلیم اور خاص کر اعلیٰ تعلیم اقتصادی
اور سماجی تبدیلی لانے کا اہم ذریعہ ہے۔ اعلیٰ

اخلاقی سطح پر طالب علم میں سچائی، حُسن اور اچھائی کی پہچان اور
اس کے تئیں خود کو بلند کرنے کا رُجحان پیدا کرانا ہے۔ سماجی سطح پر طالب علم کو ذات
پات، رنگ و نسل، فرقہ واریت، دولت اور خصوصی مراعات کی سطح سے اوپر
اُٹھانا ہے تاکہ قومی یکجہتی کے جذبات پروان چڑھ سکیں۔

یونیورسٹی تعلیم کو اعلیٰ بنانا ہے۔ اس کے لیے ایسے حالات پیدا کرنے
ہیں جن سے اعلیٰ معیارِ تعلیم کے حصول میں مدد مِل سکے۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی
امتحانات بڑی رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔ ان امتحانات نے اپنی وقعت، قدر و قیمت
اور اپنا اعتبار کھو دیا ہے اور اس سلسلے میں کچھ کہنا اس لیے غیر ضروری ہے کہ اس حقیقت
سے سبھی آگاہ ہیں۔

سے تعلیمی پالیسی میں چار عناصر داخل کرنے بہت
ضروری ہیں۔ اخلاقی تعلیم، سماجی تعلیم، علمی تعلیم
اور پیشہ ورانہ تعلیم۔ اخلاقی سطح پر طالب علم
میں سچائی، حسن اور اچھائی کی پہچان اور اس
کے تئیں خود کو پابند کر لینے کا رجحان پیدا کرانا
ہے۔ سماجی سطح پر طالب علم کو ذات پات،
رنگ و نسل، فرقہ واریت، دولت اور خصوصی
مراعات کی سطح سے خود کو اوپر اُٹھانا ہے تاکہ
قومی یکجہتی کے جذبات پروان چڑھ سکیں۔

اور نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا ہونی چاہیئے۔
اس میں ہر بات کو کیوں اور کیا کے جذبے کے
تحت جاننے کی عادت ڈالنی چاہیئے۔ پیشہ ورانہ
طور پر اسے وہ کام سیکھنا چاہیئے جس میں اس کی
طبعی مناسبت ہو۔ تعلیم سے متعلق پالیسی کے
لیے رقم ہی نہیں بلکہ بہتر انتظام ضروری ہے تاکہ اس
پر عمل درآمد ہو سکے۔ اور تعلیم صحیح معنی میں اپنے
مقاصد کو لے کر آگے بڑھ سکے۔

تعلیم اس وقت بہتر ہو سکتی ہے جب کہ اس کی
بنیاد اچھی اور ٹھوس ہو۔ چنانچہ ترقی کے عمل کو
ٹھوس بنیادوں پر آگے لے جانے کے لیے تعلیم کا
ٹھوس نظام ضروری ہے۔ ملک میں کم استحقاق یافتہ
طبقے کے لیے اچھی اور اعلیٰ تعلیم کی فراہمی پر توجہ
دینے کی ضرورت واضح ہو چکی ہے۔ اور اس بارے
میں تشویش پائی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی تعلیمی

اداروں میں طلباء کی تعداد میں غیر معمولی اضافے اور گرتے ہوئے معیار کی ضرورت ہے۔ بے روزگار گریجویٹوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ روزگار کے مواقع اتنی تیزی سے نہیں بڑھ پا رہے ہیں جو اس تعلیم یافتہ طبقے کو کھپا سکیں۔

ہم جس دور میں رہ رہے ہیں، وہاں علم تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ نئی تکنیک اور نئے علوم نے پیداواری صلاحیت بڑھانے، بھوک پر قابو پانے، انرجی کے مسائل حل کرنے اور انسان کی مادی اور ثقافتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے نئے امکانات پیدا کر دیئے ہیں۔ ان تبدیلیوں سے ہماری عادات اور ہمارے رویّوں پر بھی اثر پڑا ہے۔ ہمارے سامنے جو وسائل ہیں، انکو بروئے کار لانے کے لیے تعلیمی پالیسی ہی مددگار ہوگی۔ اس سے عوامی ضرورتوں کو پورا کرنے میں مدد مل سکے گی۔

بے پناہ توسیع

بہت سے ترقی پذیر ملکوں میں آزادی کے بعد تعلیم پر توجہ کی گئی۔ پہلا قدم تو یہی اٹھایا گیا کہ جو نظام پہلے سے رائج تھا اور جو سہولتیں پہلے سے دستیاب تھیں، ان میں توسیع کی جائے اس طرح تعلیمی مواقع بڑھے ضرور مگر ان کے لیے کوئی واضح سمت کا تعین نہ ہو سکا۔ لہٰذا محض عوامی توسیع معرضِ بحث میں آئی اور تعلیم کو قومی مقاصد کے ڈھانچے میں فِٹ کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی اور سماجی، سیاسی اور اقتصادی ترقی کو دوش بدوش آگے لیجانے پر زور دیا گیا۔

تعلیمی ترقی کو قومی مقاصد سے ہم آہنگ کرنے پر زور دیا جانے لگا۔ اس سلسلے میں کچھ تبدیلیاں عمل میں لائی گئیں لیکن یہ نظام بنیادی طور پر رہا وہی جسے ہم نے نو آبادیاتی نظام سے آزاد ہونے کے وقت لیا تھا۔ اس نظام میں ان تمام تبدیلیوں کو سمانے کی کم ہی گنجائش ہے۔ جو کہ مستقبل میں متوقع ہیں۔

اُستادوں کی کارگزاری کا معیار بڑھانا اور ان کے اخلاق کی سطح کو بلند کرنا، تعلیمی اداروں میں اصلاح و بہتری کے لیے بہت ضروری ہے، مگر سوال یہ ہے کہ یہ کام کیسے انجام پائے۔ اس سلسلے میں ایک مشورہ یہ ہے کہ یونیورسٹی اپنے اساتذہ کے لیے ضابطۂ اخلاق مرتّب کرے۔

نصابِ تعلیم اور طلباء

یہ بھی ضروری ہے کہ مواقع کی برابری کا تصوّر اور اس کے مضمرات کو سمجھ لیا جائے۔ اس تصوّر کے زیرِ اثر ملک میں نشستوں کی تخصیص اور اس طرح کے بہت سے دوسرے اقدامات کیے گئے لیکن انفرادی طور پر صلاحیتوں کے اُتار چڑھاؤ، تعلیم کے امکانات، پس منظر اور اس سلسلے کی دیگر خامیوں کو پوری طرح نگاہ میں نہیں رکھا گیا۔ زیادہ تر نصابات چونکہ پہلے سے طے شدہ ہوتے ہیں، ان پر عمل درآمد بھی سختی سے ہوتا ہے اور صلاحیت کو ناپنے کا معیار بھی انھیں کو سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا اس طریق عمل سے انفرادی طور پر ہر شخص کے ساتھ انصاف نہیں ہو پاتا۔ مختلف اسباب کی بناء پر نصاباتِ تعلیم بہت زیادہ بوجھل ہوتے ہیں۔ اور اس طرح سے اکثر سیکھنے والے کے پس منظر اور اس کی ضرورتوں کے درمیان بہت فرق پایا جاتا ہے۔ اس پس منظر میں غیر رسمی تعلیم کے طریقے اپنا کر تعلیم کے حصول کی کوشش کو جانچنا بھی ضروری ہے۔

امتحانات میں اِصلاحات

یونیورسٹی تعلیم کو اعلیٰ بنانا ہے۔ اس کے لیے ایسے حالات پیدا کرتے ہیں جن سے اعلیٰ معیارِ تعلیم کے حصول میں مدد مل سکے۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی امتحانات بڑی رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔ ان امتحانات نے اپنی وقعت، قدر و قیمت اور اپنا اعتبار کھو دیا ہے اور اس سلسلے میں کچھ کہنا اس لیے غیر ضروری ہے کہ اس حقیقت سے اب سبھی آگاہ ہیں۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن اور ان کے رفقائے کار نے اس یقین کا اظہار کیا تھا کہ یونیورسٹی تعلیم میں اگر صرف کسی ایک اصلاح لانے کی بات کہی جائے تو وہ امتحانات کی اصلاح کی ہوگی۔ انھیں کم سے کم وقت میں ہندوستانی یونیورسٹیوں میں امتحان کے کسی معتبر طریقے کی تلاش تھی اور اس بارے میں وہ

نکربند تھے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے اسی لیے کچھ عرصے تک سمسٹر سسٹم کی حمایت کی تاکہ طلبا کے کام کی جانچ کا عمل برابر جاری و ساری رہے اور یہ حتمی امتحان میں مددگار ثابت ہوسکے۔

بدعنوانیوں کا انسداد

کُل ہند بنیادوں پر مختلف سطحوں پر امتحان ہونا ضروری ہے جن میں مختلف یونیورسٹیوں کے طلبا رضاکارانہ طور پر شرکت کرسکیں اس طرح یونیورسٹیوں کے طلبا کا اس نقطۂ نظر سے امتحان لیا جاسکے گا کہ کُل ہند پس منظر میں طلبا کی حیثیت کیا ہے۔ اس سے طریق تعلیم اور نصاب تعلیم میں بڑی حد تک یکسانیت آسکیگی۔ یونیورسٹی امتحانات سے بدعنوانیوں، بُرائیوں، خامیوں کو دور کرنے سے، تعلیم کا معیار بڑھ سکے گا۔

اُستادوں کیلیے ضابطۂ اخلاق

اُستاد تعلیم کے میدان میں بنیادی ستون اور کلیدی اہمیت کے حامل ہیں، اُستادوں کی کارگزاری کا معیار بڑھانا اور ان کے اخلاق کی سطح کو بلند کرنا، تعلیمی اداروں میں اصلاح و بہتری کے لیے بہت ضروری ہے مگر سوال یہ ہے کہ یہ کام کیسے انجام پائے۔ اس سلسلے میں ایک مشورہ یہ ہے کہ ہر یونیورسٹی اپنے اساتذہ کے لیے ضابطۂ اخلاق مرتب کرے۔ لیکن استاد اور ان کی انجمنیں اس طرف سے غافل رہی ہیں۔ ان کو اس سے ڈر یہ ہے کہ ان کی آزادی میں فرق پڑ جائے گا اور اس طریقِ کار کا غلط استعمال کیا جائے گا۔ اب اُستادوں نے تو اس خیال کی حمایت نہیں کی مگر یونیورسٹیوں کو تعلیم اور تعلیمی پیشے کے وسیع تر مفاد میں اسے لاگو کرنا چاہیئے۔ اس طرح کا ضابطۂ اخلاق دُنیا کی بہت سی یونیورسٹیوں میں لاگو ہے اور اُستادوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس پر پوری طرح کاربند ہوں گے۔ اُستادوں کی جائز شکایات کے ازالے کے لیے مناسب نظام وضع کرنا بھی ضروری ہے اور ان کے معاملات میں یونیورسٹی کے حکام کو جلد سے جلد فیصلے کرنے ہوں گے

یونیورسٹیوں سے سیاست کو دُور رکھنے کی کوشش

یونیورسٹیوں کیمپس میں سیاسی عمل دخل اور سیاسی مداخلت سے یونیورسٹی کے نظم و نسق میں عدم اہلیت کا عنصر بڑھا ہے اور اس کے سبب بدنظمی پائی گئی ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ یونیورسٹی کیمپس میں زیادہ تر سیاسی سرگرمیاں اسفل ترین نوعیت کی ہوتی ہیں، اور وہ محض موقع پرستی اور مصلحت بینی کے سبب چلائی جاتی ہیں۔ ملک میں سیاسی پارٹیوں نے جو کمتر نوعیت کے سیاسی معیارات قائم کئے ہیں یہ اسی کا براہِ راست اثر ہے۔ سیاسی معیارات میں گراوٹ نہ آنے دینے کی سابق میں اُن سے کی گئیں اپیلیں صدا بصحرا ثابت ہوئی ہیں۔ مستقبل میں بھی اس کے آثار نہیں کہ سیاسی معیارات بلند ہوسکیں گے۔ ہمیں اپنے سے خود یہ سوال کرنا ہے کہ کیا اب وہ وقت نہیں آگیا ہے کہ بیرونی مداخلت سے یونیورسٹیوں کو سیاست سے پاک صاف کرنے کی کوششوں کی طرف دیکھنے کی بجائے خود یونیورسٹیاں ہی اس طرف قدم بڑھائیں، اور یونی ورسٹی کیمپس کو سیاست سے پاک و صاف بنائیں۔ اور ایسی تمام غیر صحتمندانہ سرگرمیوں سے تعلیمی اداروں کو پاک کردیں جو تعلیم کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ اگر تمام وائس چانسلر اور اُستاد سیاسی دباؤ سے خود کو آزاد کرانے کے لیے تیار نہیں ہیں، تو یونیورسٹی کی خود مختاری کے معنی ہی کیا رہ جاتے ہیں، بس پھر تو اعلیٰ تعلیمی اداروں کو سرکاری محکموں کی طرح سے ہی چلنا رہ جائے گا۔ المیہ یہ ہے کہ یونیورسٹیوں کے دلچسپی کی کمی اور بے عملی کے سبب، بہت سی ریاستی سرکاروں نے اپنی اپنی یونیورسٹیوں

> افسوس کی بات ہے کہ یونیورسٹی کیمپس میں زیادہ تر سیاسی سرگرمیاں اسفل ترین نوعیت کی ہوتی ہیں اور وہ محض موقع پرستی اور مصلحت بینی کے سبب چلائی جاتی ہیں۔ ملک میں سیاسی پارٹیوں نے جو کمتر نوعیت کے سیاسی معیارات قائم کئے ہیں، یہ اسی کا براہِ راست اثر ہے۔

پر مختلف طرح کی ایسی پابندیاں عائد کردی ہیں جن کا قبول کرنا، صحیح معنی میں کسی بھی باعزت یونیورسٹی کے لیے باعثِ توہین ہے۔

یونیورسٹی قانون میں یکسانیت

یونیورسٹیوں کے انتظامی طریقِ کار کو سہل بنانے کی ضرورت ہے۔ ایک سادہ سا یونیورسٹی ایکٹ جو پورے ملک پر یکساں طور پر لاگو ہوسکے، جس میں کافی لچک ہو، اور جو مختلف طرح کی یونیورسٹیوں کے لیے کافی ہوسکے،

معیار اور علمی سطح کو بہرصورت بلند رکھنا چاہیئے۔

مالی مشکلات سے نجات

یونیورسٹی کے فنڈز وغیرہ میں اضافہ کرکے اس کی مالی مشکلات دور کی جانی چاہئیں۔ اور جس مد پر جو رقم خرچ کی جائے، اس کے لیے جوابدہی ہونی چاہیئے اور یہ یقین ہونا چاہیئے کہ جو رقم جس مقصد سے خرچ کی گئی ہے، اس سے وہ مقصد پورا ہوا ہی نہیں۔ مالیات کی کمی بھی یونیورسٹی کے تعلیمی معیارات

چاہیئے۔ یونیورسٹیوں نے ملک میں تکنیکی عملے اور اعلیٰ سائنسدانوں کی تیاری کا عظیم کام بھی سنبھالا ہوا ہے۔ لیکن اس کام میں بدلتی ہوئی ضرورتوں کا کم ہی احاطہ کیا گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عملی سطح پر تمام ضروری اور جدید ترین اعداد و شمار اور تجربات اپنے پاس رہیں۔ اور منصوبوں پر موثر عمل درآمد کے لیے بھی ایسا کرنا ضروری ہے۔ اس میں تمام اداروں اور مختلف طرح کی تنظیموں کا تعاون درکار ہے۔ ان اعداد و شمار کو جدید ترین علمی و عملی نظریات اور اعداد و شمار سے مسلسل لیس کیا جانا چاہیئے۔ لیکن آج متعدد یونیورسٹیاں اس طرح سے کام کرنے

> المیہ یہ ہے کہ یونیورسٹیوں کی دلچسپی کی کمی اور بے عملی کے سبب بہت سی ریاستی سرکاروں نے اپنی اپنی یونیورسٹیوں پر مختلف طرح کی ایسی پابندیاں عائد کردی ہیں جن کا قبول کرنا صحیح معنی میں کسی بھی باعزت یونیورسٹی کے لیے باعثِ توہین ہے۔

اور جو ملک کے مختلف خطوں میں چل سکے، جلد سے جلد وضع کیا جانا چاہیئے۔

یونیورسٹی کی کارکردگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے کے لیے ایک واحد عنصر وائس چانسلر کا انتخاب ہے۔ یونیورسٹی کے مزاج اور اس کے ضمیر کے رکھ رکھاؤ کی ذمہ داری وائس چانسلر پر ہی ہے۔ اسے اپنی شخصی مثال سے اخلاق کا اعلیٰ ترین معیار پیش کرنا ہوگا اور یونیورسٹی کو بدنظمی سے بچانا ہوگا، یونیورسٹی سے خرابیوں کو دور کرنا ہوگا۔ اپنی شخصیت کی بلندی اور اپنی ذمہ داریوں کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے ہر طرح کے دباؤ کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیئے اور معیار کو کسی بھی قیمت کم نہیں ہونے دینا چاہیئے اور طلباء کے اخلاق

میں گراوٹ کا سبب بنا ہے۔ ہر منصوبے کے مقابلے کے بعد کے منصوبے میں تعلیمی حقیقی اخراجات میں کمی کے رجحان پر روک لگانی چاہیئے۔ یونیورسٹیوں کی لیباریٹریوں کو جدید ترین سامان سے لیس کرنے پر کروڑوں روپے درکار ہوں گے۔ اس کے بعد ہی وہ جدید تقاضے اور عصرِ حاضر کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تیار نظر آئے گی۔

منصوبہ بندی میں بہتری

آج کے دور میں بہتر کارگزاری کے لیے یوں تو ہر جگہ بہتر منصوبہ بندی درکار ہے تاہم یونیورسٹیوں میں تو اس کا اور بھی عمل دخل ہونا

کے وسائل نہیں رکھتیں۔ ان کی منصوبہ بندی غیر حقیقی اعداد و شمار پر ہوتی ہے اور مقصد میں ہم آہنگی نہیں ہوتی۔ پروگرام کی رفتار ترقی کو ناپنے کا کوئی نظام نہیں ہوتا۔ تعلیمی معیار میں اس وجہ سے گراوٹ آرہی ہے اور اس کی منصوبہ بندی ناقص نظر آتی ہے۔

یونیورسٹی کے قوانین پر نظرِ ثانی کی ضرورت

آج یونیورسٹیوں سے متعلق قوانین کئی لحاظ سے فرسودہ ہوچکے ہیں، حالیہ پیش رفتوں کی

(باقی صفحہ ۱۲۳ پر)

ڈاکٹر مالکم ایس آدی سیشیہ

نظامِ تعلیم میں لامرکزیت لانے کی ضرورت

فاضل مصنف نے نظامِ تعلیم میں لامرکزیت لانے پر زور دیا ہے۔ انھیں ڈر ہے کہ نئی تعلیمی پالیسی میں مجوزہ اقدامات سے نظامِ تعلیم مرکزی نظام کے تابع آجائے گا۔ اس سلسلے میں انھوں نے بنیادی نصابِ تعلیم کی تشکیل، تعلیم کی یونین لسٹ میں شمولیت، انڈین ایجوکیشن سروس کی تشکیل اور ہر ضلع میں ماڈل اسکول کے قیام کی تجاویز کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے آٹھ نکاتی عملی پلان کا ذکر کیا ہے اور اس کے تحت پرائمری تعلیم کو عام کرنے اور ملک سے ناخواندگی دور کرنے کے کام کو اوّلین ترجیح کا مستحق بتایا ہے۔

ایک طرف تعلیم ہے اور دوسری طرف تعلیم کے حصول کے ذرائع ہیں جن میں اُستاد، طالبِ علم، اسکول، کالج، یونیورسٹیاں، لائبریریاں، لیباریٹریاں، کھیل کے میدان، نصابات، درسی کتب، امتحانات اور ڈپلومہ وغیرہ شامل ہیں۔ تعلیم کا تعلق تو سیکھنے سے ہے اور نظامِ تعلیم کے تحت وہ تمام ذرائع آتے ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی تعلیمی نظام سے بحث کرتی ہے نہ کہ تعلیم سے۔ تعلیم ایک طرح سے دانشورانہ سرگرمیوں اور سیکھنے کے عمل میں آزادی کی نشاندہی کرتی ہے اور نظامِ تعلیم مختلف عناصر پر انحصار رکھتا ہے۔ اس کا تعلق ترقی کی سیاسی معیشت سے ہے۔

سیاسیات کا تانا بانا

نئی تعلیمی پالیسی کی دستاویز میں اس بات کی تصدیق کی گئی ہے کہ سیاسی تانا بانا ہی ہر جگہ تعلیمی ترقی کی رفتار کا تعین کرتا ہے۔ آدم اسمتھ

اور جان اسٹورٹ مل نے کہا تھا کہ سرکار کو تعلیم میں سرمایہ کاری کرنی چاہیئے۔ جس سے کہ اس کے شہری ہوشیار اور ڈسپلن کے پابند ہو سکیں۔ گاندھی جی نے کہا تھا کہ دیہی دستکاریوں پر مبنی تعلیم سب کے لیے عام

> نئی تعلیمی پالیسی کی دستاویز میں اس بات کی تصدیق کی گئی ہے کہ سیاسی تانابانا ہی ہر جگہ تعلیمی ترقی کی رفتار کا تعین کرتا ہے۔

ہونی چاہیئے کیونکہ ہندوستان کی زیادہ تر آبادی دیہات میں بستی ہے۔ نہرو جی نے غریبی دُور کرنے کے لیے سائنس کے استعمال، اس کی ضرورت اور افادیت کو واضح کیا تھا اور اس کے لیے سائنس پالیسی کی قرار داد منظور کرائی تھی، اندرا جی نے ٹیکنا لوجی پر زور دیا تھا جیسا کہ ٹیکنا لوجی سے متعلق پالیسی کے بیان میں مذکور ہے۔ مرارجی دیسائی نے ۲۵ کروڑ بالغوں کی ناخواندگی دُور کرنے پر زور دیا تھا۔ راجیو گاندھی نے تعلیم کے بحیثیت مجموعی تصور پر زور دیا ہے اور آزاد ہندوستان میں پہلی بار اس تصور نے جنم لیا ہے۔ بہرصورت شروع سے آخر تک ایک بات واضح ہوتی ہے کہ تعلیم سیاسی فیصلوں کے تابع رہی ہے۔ سیاسی سطح پر فیصلہ ہو چکا ہے اور اب ماہرین تعلیم اس فیصلے کو پروگرام کی شکل دے رہے ہیں۔

چنانچہ تعلیم کا چیلنج نامی دستاویز میں ماضی کے تجربات کے تجزیہ اور آگے کے لیے اعداد و شمار کو بنیاد بنا کر کہا گیا ہے کہ ساتویں منصوبے میں پرائمری تعلیم کو عام کرنے اور اسے گھر گھر پہونچانے کے کام کو اعلیٰ ترین ترجیح دی جائے، اور ناخواندہ بالغوں کے لیے تعلیم کی سہولت کو پھیلایا جائے۔ اس وقت پرائمری اسکولوں میں داخلہ کی قوت ۲۳ فیصد ہے جسے ساتویں منصوبے کے آخر تک سو فیصد کر دینے کے لیے متعدد اقدامات کئے جائیں۔ یہ کام اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ تعلیم کو درمیان میں ترک کرنے والے طلباء کے والدین کی غریبی دور ہو جائے اور ملک میں ہر ضلع کا تعلیمی نصاب لامرکزیت کے تحت تشکیل پائے۔ اس میں محض قومی سطح کی نصاب تعلیم کی باتیں ہی شامل نہ ہوں۔ غریبی دور کرنے اور تعلیم میں لامرکزیت لانے کی وہ دو بنیادی شرطیں ہیں جو کہ سیاسی عمل کا ہی تتمہ ہیں۔ ابتدائی تعلیم پر اخراجات ۱۹۸۱ میں ۱۵۷۰ کروڑ روپے تھے جو بڑھ کر ۱۹۹۰ تک ۴ ہزار کروڑ روپے کر دینے ہوں گے۔ تعلیم بالغان کے لیے بڑے پیمانے پر ایک مہم چلائی ہوگی، اس کے لیے استادوں اور طلبا کا تعاون درکار ہوگا۔ پہلے مرحلے پر ایک ناخواندہ کو خواندہ بنانے کے لیے چھ ماہ کا عرصہ درکار ہے۔ اس کام میں یونیورسٹیوں، کالجوں اور ہائر سیکنڈری اسکولوں کے طلبا اور استادوں کی مدد لینی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی درسی مواد کی بڑے پیمانے پر تیاری ضروری ہوگی، اس کے ساتھ ہی سماعی و بصری آلات، اور الیکٹرانکس پر مبنی بہت سے پروگرام درکار ہوں گے۔ تعلیم بالغان پر اخراجات کا اندازہ ۳ ہزار کروڑ روپے ہے۔ تعلیمی اخراجات پر ساتویں منصوبے میں ذمہ داری کے تحت ۲۳ ہزار کروڑ روپے اور

> ساتویں منصوبے میں پرائمری تعلیم کو عام کرنے اور اسے گھر گھر پہنچانے کے کام کو اعلیٰ ترین ترجیح دی جائے، اور ناخواندہ بالغوں کے لیے تعلیم کی سہولت کو پھیلایا جائے، اس وقت پرائمری اسکولوں میں داخلہ کی قوت ۲۳ فیصد ہے جسے ساتویں منصوبے کے آخر تک سو فیصد کر دینے کے لیے متعدد اقدامات کئے جائیں۔

۳ ہزار کروڑ روپے درکار ہوں گے۔

ثانوی تعلیم کی توسیع

ابتدائی تعلیم عام کرنے کے نتیجے میں،

نویں اور دسویں جماعت میں داخلے پر دباؤ بڑھے گا۔ اس لیے ان دونوں کلاسوں کی توسیع ضروری ہوگی۔ ان کلاسوں میں طلبا کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کی سہولتیں عام کرنی ہوں گی۔ نصاب تعلیم کے ساتھ ایک ایسے پروگرام کو جوڑنے کی ضرورت ہے جو سماجی اعتبار سے مفید ہے اور جو آگے چل کر پیشہ ورانہ تعلیم میں مفید کہے جا سکتے۔

ہائر سیکنڈری تعلیم میں گیارہویں اور بارہویں جماعت شامل ہیں۔ اسے اسکولی نظام کے ماتحت ہونا چاہیے۔ ہر اسکول میں علمی اور پیشہ ورانہ دو دھاروں کے درمیان ان کی تقسیم ضروری ہے۔ ان دونوں طرز کے درمیان داخلہ نصف روزگار کے لیے تربیت پا سکیں گے۔

موجودہ یونیورسٹیاں برقرار رہیں

آرٹ، سائنس کے کالج اور یونیورسٹیاں برقرار رہنی چاہئیں۔ ان میں داخلے کے لیے طلبا کے ذوق و شوق اور رجحان کا ایک امتحان ہونا چاہیے۔ نصابات

آرٹ، سائنس کے کالج اور یونیورسٹیاں برقرار رہنی چاہئیں۔ ان میں داخلے کے لیے طلبا کے ذوق و شوق اور رُجحان کا ایک امتحان ہونا چاہیے۔ نصابات میں عملی تعلیم شامل رہنی چاہیے۔ طلبا کو دیہات اور شہری گندی بستیوں میں جا کر کلاس روم میں سیکھے ہوئے کاموں کو عملی طور پر انجام دینا چاہیے۔ کالجوں اور یونیورسٹی تعلیم کے لیے فیس لی جانی چاہیے۔

ساتویں منصوبے میں تعلیم کے منصوبہ جاتی اور غیر منصوبہ جاتی اخراجات کے لیے ۴۵ ہزار کروڑ روپے درکار ہیں۔ اس رقم کا ۶۰ فیصد مرکزی حکومت اور ریاستی سرکاروں سے لیا جائے اور باقی رقم صنعت، زراعت پر ٹیکس لگا کر اور پرائیویٹ ایجنسیوں اور فاؤنڈیشن سے آمدنی کر کے حاصل کی جائے۔

ثابت ہو سکے۔ اس کے ذریعے ہر طالب علم میں اپنے طور پر کوئی دھندہ شروع کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ ہر ضلع میں جو ماڈل اسکول کا مشورہ دیا ہے، اس کی افادیت کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے، خاص طور پر آندھرا پردیش کے ہر ضلع میں ماڈل اسکولوں اور کیندروں کو دیکھ کر جو ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں، نتائج حوصلہ افزا نہیں

نصف کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ اس کے لیے رُجحان اور ذوق کا امتحان ضروری ہے۔ جو والدین ۱۵۰۰ روپے ماہانہ سے زیادہ کماتے ہیں، وہ اپنے لڑکوں کے لیے فیس ادا کریں۔ امتحان کا موجودہ طریقہ ختم کر کے سال بھر کی کارگزاری کو سامنے رکھ کر ایک نیا نظام امتحان وضع کیا جائے اس طرح ۸۰ تا ۸۵ فیصد طلبا از خود

میں عملی تعلیم شامل رہنی چاہیے۔ طلبا کو دیہات اور شہری گندی بستیوں میں جا کر کلاس روم میں سیکھے ہوئے کاموں کو عملی طور پر انجام دینا چاہیے۔ کالج اور یونیورسٹی تعلیم کے لیے فیس لی جانی چاہیے۔ فیس ۱۵۰۰ روپے یا اس سے زیادہ ماہانہ آمدنی رکھنے والے والدین سے لی جائے۔ ہر کالج کو

داخلے کے لیے اپنے نصابات اور قواعد و ضوابط مرتب کرنے چاہئیں۔ امتحان کے لیے سال بھر کے ریکارڈ کو سامنے رکھا جائے۔

پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی سامان کی فراہمی کے واسطے ۵۰۰ کروڑ روپے فراہم کئے جانے چاہئیں۔ ہر ریاست میں میڈیکل سائنس کی یونیورسٹی قائم کی جانی چاہیئے۔

تعلیم کے لیے وسائل کو حرکت میں لانا

ساتویں منصوبے میں تعلیم کے منصوبہ جاتی اور غیر منصوبہ جاتی اخراجات کے لیے ۴۵ ہزار کروڑ روپے درکار ہیں۔ اس رقم کا ۶۰ فیصد حصہ مرکزی حکومت اور ریاستی سرکاروں سے لیا جائے اور باقی رقم صنعت، زراعت پر ٹیکس لگا کر اور پرائیویٹ ایجنسیوں اور فاؤنڈیشن سے آمدنی کرکے حاصل کی جائے۔ ہر ریاست میں ایک ایجوکیشن فائنینس کمیشن قائم کیا جائے "تاکہ وہ مالی فضول خرچیوں کی نشاندہی کر سکے اور تصنیع کو روک سکے اور اخراجات میں کم سے کم ۲۰ فیصد کفایت لا سکے۔ اس کے علاوہ ۲۰ فیصد رقم فیس سے وصول کی جائے نیز مختلف مالیاتی اداروں اور زرعی تحقیق و ترقی

سے متعلق قومی بنک سے قرض لیا جائے۔

نئی تعلیمی پالیسی سے تعلیم کو ایک مرکزی نظام کی حیثیت دینے کے لیے استعمال نہ کیا جائے جیسا کہ اس سے واضح ہے۔ تعلیم کی یونین لسٹ میں شمولیت، بنیادی نصاب تعلیم کی تشکیل، انڈین ایجوکیشن سروس کی تشکیل اور ہر ضلع میں ماڈل اسکول کے قیام کی تجویز سے اس کے مرکزی نظام کے تحت آنے کے امکانات ہیں۔ تعلیم کو سیکھنے کا ایک ایسا عمل ہے جس کا آغاز بچپن سے ہی ہو جاتا ہے۔ بچے کا ذہن شروع ہی سے اس میں مصروف نظر آتا ہے۔ اسکولی نظام کے ذریعے اس کو تعلیم دینا ہی مقصود ہونا چاہیئے اسے دلی یا مدراس یا ناگپور جیسے دور دراز مقام سے ہدایات کے تابع نہیں بنایا جا سکتا۔

رسمی تعلیم میں انقلاب کی ضرورت

بالآخر تعلیم کے آزادانہ نظام اور اس کی ضرورت منظر عام پر آنے لگی ہے۔ چنانچہ ہر ریاست میں ایک اوپن سیکنڈری اسکول کا نظام رائج ہونا چاہیئے۔ اسی طرح ہر ریاست میں اوپن ہائر سیکنڈری نظام اور ایک اوپن یونیورسٹی ہونی چاہیئے۔ یہ اسکولی ادارے خط و کتابت

کے ذریعے اور دور دراز مقامات پر رہنے والے طلباء کو تعلیم دیں۔ جن طلباء نے پہلے سے کوئی تعلیم حاصل نہیں کی، وہ ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے لیے نظام تعلیم اور نصاب تعلیم میں جدت کی ضرورت ہوگی۔ نئے نصاب تعلیم، تحریری مواد، ٹی۔ وی، ریڈیو اور الیکٹرانک میڈیا وغیرہ کی مدد سے اس طریق تعلیم کو عام کیا جا سکے گا۔ اس سے رسمی نظام تعلیم کو عام کیا جا سکے گا۔ اور اس میں ایک انقلاب آ سکے گا۔

●

> **تعلیم کو سیکھنے کا ایک ایسا عمل ہے جس کا آغاز بچپن سے ہی ہو جاتا ہے۔ بچے کا ذہن شروع ہی سے اس میں مصروف نظر آتا ہے۔ اسکولی نظام کے ذریعے اس کو تعلیم دینا ہی مقصود ہونا چاہیئے۔ اس کو دلی یا مدراس یا ناگپور جیسے دور دراز مقام سے ہدایات کے تابع نہیں بنایا جا سکتا۔**

بقیہ، اساتذہ میں لگن ہونی چاہیئے

اس کو عمل میں لانے والے عناصر وہ ہیں جن کا ہر روز کمرۂ جماعت میں طلباء کے ساتھ واسطہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر دوسری چیز سے پہلے اس چیز کا اہتمام ہونا چاہیئے کہ بجائے اس کے کہ کمرہ جماعت میں ہر روز ایک جرم کا ارتکاب ہو کمرہ جماعت طلباء اور اساتذہ کے بامعنی اور تخلیقی باہمی عمل کا منظر بننا چاہیئے۔ اس ضمن میں مجھے ایک عیسائی اسکول کے باہر لکھی عبارت یاد آئی ہے۔ جو یوں ہے:-

"آپ جو کچھ کرتے ہیں اس کے بارے میں محتاط رہیے، کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ آپ وہ واحد بائبل ہوں جسے کچھ لوگوں کو پڑھنے کا کبھی موقع ملا ہو۔

●

ایس. ایف مہروترہ

ہماری تعلیمی پالیسی کس طرح کی ہو؟

اس مختصر سے مضمون میں ڈاکٹر مہروترہ نے نئی تعلیمی پالیسی کے سلسلے میں یہ بتایا ہے کہ قوم کو تعلیم پر اپنی مجموعی قومی پیداوار کا دس فیصد حصہ خرچ کرنا چاہیئے اور اگر ضرورت ہو تو تعلیمی ٹیکس بھی لگایا جائے تاکہ ملک کے کروڑوں عوام کے لیے تعلیم کی ترویج و اشاعت کا کام تیزی سے آگے بڑھ سکے۔ وہ تعلیم کو یونین لسٹ میں شامل کرنے پر زور دیتے ہیں اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی ازسرِ نو ترتیب و تشکیل کی ضرورت واضح کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ ملک گیر پیمانے پر پرائمری تعلیم کو قابلِ ترجیح سمجھتے ہیں نیز تعلیمی نظم و نسق میں لامرکزیت لانے پر اصرار کرتے ہیں۔

تعلیم کا رول کیا ہو؟

۱۹۶۸ کی تعلیمی پالیسی کے تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے ابتدا میں ہی اس بات پر زور دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چوں کہ تعلیم سماج کا ذیلی نظام ہے، لہٰذا یہ سماج میں تبدیلی اسی حد تک لا سکتا ہے جس حد تک سماج نے تبدیلی لانے کے لیے خود کو پابند کیا ہے اور جس حد تک کہ متعلقہ عملے نے اس پر عمل درآمد کرنے کا عزم کیا ہے۔ چنانچہ سیاسی سطح پر عزمِ صمیم اور پھر اس کے لیے وافر وسائل وہ بنیادی شرطیں ہیں جن سے نئی تعلیمی پالیسی پر مؤثر طرح سے عمل درآمد کیا جا سکتا ہے۔

اتحاد کو کیسے فروغ دیں؟

ملک کے اتحاد اور سالمیت کے لیے نیز

ملک میں قومی یکجہتی لانے کے لیے تعلیم کے قومی نظام کی بڑی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے دس جمع دو جمع تین کے طرزِ تعلیم کو یکساں طور پر ملک بھر میں نافذ کیا جائے۔ یہ کام جتنا جلدی ممکن ہو، کیا جانا چاہیے۔

سماج کے کمزور طبقات کی امداد

۱۴ سال تک کی عمر کے بچے بچیوں کے لیے ملک گیر پیمانے پر ابتدائی تعلیم کے کام کو اعلیٰ ترین ترجیح دی جائے۔ خاص کر سماج کے کمزور طبقات کے لیے تو یہ اور بھی ضروری ہے۔ اس نظام کو غیر رسمی جز وقتی، تعلیمی نظام کی مدد سے موثر اور مکمل بنانے کی کوشش کرنی چاہیے

پیشہ ورانہ انداز نظر تعلیمی پالیسی کا بنیادی جزو ہونا چاہیے۔ پیشہ ورانہ تعلیم کو محض روزگار اور صنعت سے جوڑنا ہی نہیں بلکہ اسے زراعت، سروس سیکٹر، دیہی ترقی کے مختلف پروگراموں وغیرہ سے مربوط کرنا ہے، اس کے ذریعے نوجوانوں کو از خود روزگار کے لیے تیار کرنا ہے۔

تربیتی افرادی قوت

پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم

کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ عام اور پیشہ ورانہ تعلیم کے درمیان رابطہ قائم رہنا چاہیے۔ مختلف طرح کے تعلیمی نصابات کے درمیان تال میل رہنا بھی ضروری ہے۔

اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں اور پیشہ ورانہ اداروں میں داخلہ پانے والوں کو کافی جانچ پڑتال کے بعد لینا چاہیے۔ ان کے رجحان کا اندازہ کرکے، ان کی صلاحیتِ کار کو پرکھ کر ہی یہ داخلے ہونے چاہئیں۔ اس سلسلے میں اوپن یونیورسٹی کا طریقِ کار جس سے مراسلاتی نصابات کے ذریعے تعلیم دی جا سکے اور جو دُور دراز مقامات پر رہتے ہوئے بھی تعلیم دے سکے اور جو

> **ملک کے اتحاد اور سالمیت کے لیے تیز ملک میں قومی یکجہتی لانے کے لیے تعلیم کے قومی نظام کی بڑی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے دس + دو + تین کے طرزِ تعلیم کو یکساں طور پر ملک بھر میں نافذ کیا جائے۔**

> **پیشہ ورانہ تعلیم کو محض روزگار اور صنعت سے جوڑنا ہی نہیں بلکہ اسے زراعت، سروس سیکٹر، دیہی ترقی کے مختلف پروگراموں وغیرہ سے مربوط کرنا ہے اس کے ذریعے نوجوانوں کو از خود روزگار کے لیے تیار کرنا ہے۔**

تاکہ محنت کش بچے بھی ان سے استفادہ کر سکیں۔ ابتدائی تعلیم دینے والے اسکولوں کی بنیادی اصلاحات ضروری ہیں تاکہ بچوں کو اسکولوں سے رغبت پیدا ہو اور یہ ان کے لیے دلکشی کا باعث ہوں۔

عملی انداز نظر : تعلیم کے ثانوی مرحلے میں

کے لیے محتاط طریقے پر سوچے سمجھے منصوبہ بند پروگرام کو شروع کرنا چاہیے۔ تاکہ تربیت یافتہ افرادی قوت کی مانگ پوری کی جا سکے۔ اس سلسلے میں صنعتوں کو بھی تعاون دینا ہوگا اور وہ ترقیاتی کوششوں میں آلات اور دیگر ضروری سامان کی فراہمی کے ذریعے معاون ہو سکتی ہیں۔ تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم میں صنعتوں کے تعاون

رابطہ پروگراموں کے ذریعے تعلیم کو عام کر سکے، ایک خوش آئند اقدام ہے۔ جو طلبا باقاعدہ کالج نہیں جا سکے یا جو یونیورسٹی میں داخلہ نہیں پا سکے، وہ اس سے بخوبی فائدہ اٹھا سکیں گے۔ اعلیٰ تعلیم کے موجودہ پروگراموں میں اوپن یونیورسٹی کا طریقِ کار بے حد معاون ثابت ہوگا۔ اقتصادی طور پر کمزور کالجوں میں پیشہ ورانہ نصابات کو

مستحکم بنانے کی ضرورت ہے۔ قومی لیبارٹریوں اور دیگر تحقیقی اداروں اور صنعتوں کی مدد اور ان کے تعاون سے عملی تحقیق کے کاموں کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ ملازمتوں کے لیے ڈگری کی قید ہٹا دیئے جانے کے مشوروں پر بھی غور کیا جانا چاہیئے اور اس کے نتائج کا کافی محتاط طریقے پر اندازہ لگانا چاہیئے۔

ذریعے خواندگی کو پھیلانے، عملی تعلیم دینے اور سماجی شعور پیدا کرنے پر زور دیا جانا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں مختلف ملکوں کے درمیان تال میل بڑھانا ضروری ہے۔ تعلیم مسلسل اور خواندگی کے بعد کی تعلیم نیز لائبریری خدمات کا استحکام بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ اس کام میں رضاکار اداروں کا تعاون بے حد ضروری اور کارآمد ثابت ہوگا۔

مشترکہ نصاب تعلیم

ایک وسیع تر ڈھانچے میں رہتے ہوئے مشترکہ نصاب ترتیب دیا جانا چاہیئے۔ اس میں کافی لچک رکھی جائے۔ اور ماحولیات کی ضرورتوں اور عصری تقاضوں کا دھیان رکھا جائے۔ طلبا کو قومی تاریخ پڑھانا ضروری ہے۔ اس کی مثبت اقدار سے انھیں آگاہ کر دیا جائے۔ ان کی سیرت کی تعمیر کے لیے کوشش کی جائے۔ اور سیکولرازم، جمہوریت نیز سماجی انصاف کے تئیں مناسب رجحان پیدا کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی خاندانی بہبود، اور بہتر سے بہتر کی تلاش کا جذبہ ان میں پیدا کیا جائے۔ سہ لسانی فارمولے پر صدق دلی سے عمل درآمد ہو، ڈگری دینے سے قبل ایک سال قومی سماجی خدمت کو ضروری کر دیا جائے۔

نئی تعلیمی پالیسی پر موثر عمل درآمد کے لیے اور اسے وقت مقررہ کے اندر عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے یونین لسٹ میں شامل کیا جائے۔ مرکز اس سلسلے میں تال میل لانے اور مختلف تعلیمی پروگراموں کو متحد اور یکجا کرنے کی اہم ذمہ داری سنبھالے گا۔ ہر کام قوم کے وسیع تر مفاد میں ہوگا۔

داخلی جانچ اور اندازہ لگانے کا طریقۂ کار

آج کل روایتی انداز پر سالانہ امتحانات ہوتے ہیں۔ ان کی جگہ جانچ کا ایک ایسا داخلی نظام مروج ہونا چاہیئے۔ جس سے سال بھر کی کارگزاری سامنے رہے۔ یہ کام سیمسٹر

تعلیم بالغان

تعلیم کے قومی نظام میں ۱۵ سال سے ۳۵ سال تک کی عمر کے افراد کے لیے تعلیم بالغان کا مستحکم پروگرام شامل کرنا ضروری ہے۔ اس پروگرام کے

تعلیم کے چیلنج کو قبول کیا جانا چاہیئے۔ اکیسویں صدی میں قدم رکھنے کی خاطر ہمیں بھرپور کوششیں کرنی ہیں تاکہ اس نئی صدی میں ہم خواندہ قوم کی حیثیت سے قدم رکھ سکیں اور ہندوستانی سماج تعلیم و تربیت حاصل کرنے والا سماج کہلائے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے تقاضوں سے ہم منہ نہیں موڑ سکتے۔ اخلاقی اور روحانی اقدار سے اسے جوڑنا ضروری ہے۔ ہندوستان کو اس امتزاج کے لیے جان توڑ کوشش کرنی ہے۔

کی بنیاد پر بھی ہو سکتا ہے لیکن اس کے لیے کافی تحفظی اقدامات درکار ہوں گے۔ امتحان لینے کے لیے قومی سطح پر ایک سروس بنانی ضروری ہے۔ اور اس کا نزدیغ جدید طرز پر کیا جانا چاہیئے۔

تعلیم کو سیاست سے الگ رکھا جائے

تعلیم میں اُستاد کلیدی رُتبہ رکھتا ہے لہٰذا اُستادوں کا انتخاب دیکھ بھال اور سوچ سمجھ کر نیز ان کی اخلاقی، ذہنی اور تعلیمی صلاحیتوں کو مدِنظر رکھ کر کیا جانا چاہیئے۔ اس سلسلے میں ان کی تربیت بھی اس انداز سے ہونی چاہیئے جس سے وہ نمونہ بن سکیں۔ تربیتی نصابات کی گاہے بگاہے تجدید ضروری ہے۔ استادوں کو تھوڑے تھوڑے وقفے سے تجدیدی نصابات سے روشناس کرانا ضروری ہے۔ اُستادوں کی تنخواہوں، ان کے رُتبے اور ان کی شرائط ملازمت نیز ان کے تحفظ کے لیے مناسب اقدامات کئے جانے ضروری ہیں۔ تعلیم کو سیاست سے الگ رکھا جائے۔ اُستادوں کو عملی سیاست سے قطعی دُور رکھا جائے۔

تعلیم کو یونین لسٹ میں شامل کرنے کی ضرورت

نئی تعلیمی پالیسی پر مؤثر عمل درآمد کے لیے اور اسے وقت مقررہ کے اندر عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے یونین لسٹ میں شامل کیا جائے۔ مرکز اس سلسلے میں تال میل لانے، اور مختلف تعلیمی پروگراموں کو متحد کرنے کی اہم ذمہ داری سنبھالے گا۔ یہ کام قوم کے وسیع تر مفاد میں ہوگا۔

ابتدائی تعلیم کا نظم و نسق ضلع پریشد کی ذمہ داری ہونی چاہیئے۔ سیکنڈری اسکولوں اور کالج کے اُستادوں کی شرائط ملازمت قومی سطح پر ایک نظام کے تحت ہونی چاہئیں۔ البتہ پرائیویٹ سیکٹر کو انتظامی امور چلانے اور ان کی نگرانی کے فرائض بجا لانے کی ذمہ داری بدستور سونپے رہنے دیں۔ ٹیکنیکل تعلیم ریاستی سرکار کی ذمہ داری ہونی چاہیئے۔ تعلیم بالغان اور تعلیم مسلسل میں رضاکارانہ خدمت کرنے والے ادارے اہم رول ادا کرسکتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے ادارے اور یونیورسٹیوں کو صحیح معنی میں خود مختاری دی جائے۔

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی ترتیب نو

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی از سرِ نو تشکیل عمل میں آنی چاہیئے۔ اس کا نام بدل کر یونیورسٹیز کمیشن رکھنا چاہیئے۔ اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ کیا جانا چاہیئے اور یہ ملک کی تمام یونیورسٹیوں کے نظم و نسق کو چلانے کا ذمہ دار ہو۔ ہر ریاست میں ایک باضابطہ اسٹیٹ یونیورسٹیز کوآرڈی نیشن کمیٹی ہونی چاہیئے۔ جو ریاست کی مختلف یونیورسٹیوں کے درمیان تال میل قائم کرسکے۔ یونیورسٹیز کمیشن اور مذکورہ کمیٹیوں میں ممبروں کی نصف تعداد ماہرِ تعلیم پر مشتمل ہونی چاہیئے۔ یونیورسٹیز کمیشن کا ریاستی کمیٹی سے براہِ راست تعلق ہونا چاہیئے۔ اس میں ریاستی سرکار کی مداخلت کو شامل نہیں کیا جائے۔ یونیورسٹیاں خود مختار ضرور ہوں لیکن وہ اسٹیٹ یونیورسٹیز کوآرڈی نیشن کمیٹی اور یونیورسٹیز کمیشن کے روبرو جوابدہ ہوں۔

صلاحیت بڑھانے کے اقدامات

ہر طالب علم کو اس کی صلاحیت کے مطابق تعلیم کا موقع ملنا چاہیئے۔ لہٰذا ذہین اور طباع طالب علموں کے لیے منتخبہ خصوصی ادارے قائم کرنا صحیح سمت میں ایک قدم ہوگا۔ تعلیمی مواقع کی مساوات کے اصول کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر بھی ایسا کرنا ضروری ہے۔ اس سے صحیح قسم کی لیاقت اور صلاحیت کو فروغ ملے گا۔

انتظامی لامرکزیت

ملک کے ۵، کروڑ افراد کے لیے نظم و نسق کرنے والے تقریباً دس لاکھ تعلیمی حکام کا نظم و نسق ایک عظیم ذمہ داری ہے۔ اس کے لیے انتظامیہ میں لامرکزیت لانے اور ہر سطح پر اختیارات منتقل کرنے کی ضرورت ہوگی۔ تعلیم میں انتظامیہ کے جدید اور بہترین طریقوں سے کام لیا جانا ضروری ہے۔

تعلیمی ٹیکس : تعلیم کے شعبے میں دوبارہ سے اتحاد بحال کرنے کیلئے ملک کی مجموعی قومی آمدنی کا ۱۰ فیصد حصہ تعلیم پر خرچ کرنا ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے ضرورت ہو تو تعلیم پر ٹیکس لگایا جائے۔ اجتماعی وسائل سے بھرپور استفادہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ تعلیمی وسائل سے متعلق قومی کمیشن کے قیام کا مشورہ بھی خوش آئند ہے۔

تعلیم کے چیلنج کو قبول کیا جانا چاہیئے۔ اکیسویں صدی میں قدم رکھنے کی خاطر ہمیں بھرپور کوششیں کرنی ہیں تاکہ اس نئی صدی میں ہم خواندہ قوم کی حیثیت سے قدم رکھ سکیں۔ اور ہندوستانی سماج تعلیم و تربیت حاصل کرنے والا سماج کہلائے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے تقاضوں سے ہم منھ نہیں موڑ سکتے۔ اخلاقی اور روحانی اقدار سے اسے جوڑنا ضروری ہے۔ ہندوستان کو اس امتزاج کے لیے جان توڑ کوشش کرنی ہے۔ ●

پروفیسر رام لال پاریکھ

تعلیمی نظام میں اصلاحات کیلئے ضروری اقدامات

عمل درآمد کے لیے عملی منصوبہ، وقت کی اہم ضرورت

مصنف نے تعلیمی پالیسی کو نئی شکل دینے کے لیے ایک عملی پلان پیش کیا ہے۔ وہ ایک ایسے خودمختار نظام کے حق میں ہیں جو تمام تعلیمی پروگراموں کا وقتاً فوقتاً جائزہ لے تاکہ اس میں بے عملی کے عناصر کو دُور کیا جا سکے جیسا کہ ۱۹۶۸ء کی تعلیمی پالیسی پر عمل درآمد سے واضح ہوتا ہے۔ اس پالیسی میں ہر پانچ سال بعد جائزہ لینے کے لیے کہا گیا تھا۔ پروفیسر پاریکھ ہنگامی عبوری تصورات کی بنیاد پر ڈھانچے کی تبدیلی کی ضرورت کو رَد کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ نئی تعلیمی پالیسی اتفاقِ رائے سے تشکیل دی جا سکے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کی افادیت کو تسلیم کر سکیں اور یہ مستحکم بنیادوں پر آگے بڑھ سکے۔

تعلیم سے متعلق نیشنل پالیسی پر بھارت سرکار نے ۲۴ر جولائی ۱۹۶۸ء کو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں ایک قرارداد پیش کی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ اس پر عمل درآمد کی رفتار ترقی کا ہر پانچ سال بعد جائزہ لیا جائے۔ سترہ سال گزر گئے لیکن اس سلسلے میں کوئی جامع جائزہ نہیں لیا گیا۔ ہمارے تعلیمی اقدامات میں ہر بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے مستقبل میں ایک ایسے نظام کی ضرورت ہے جس سے تعلیمی پروگراموں کا تھوڑے تھوڑے وقفے سے باقاعدگی کے ساتھ معروضی نوعیت کا جائزہ لیا جائے اور یہ جائزہ محض سرکاری اقدامات اور پیش قدمیوں کا ہی محتاج نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس بات کا یقینی بنانا بھی ضروری ہے کہ ہنگامی عبوری خیالات و نظریات کی بنیاد پر

بار بار تنظیمی ڈھانچہ کو نہ بدلا جائے۔ اس سے
اُبھرتے ہوئے نوجوانوں میں غیر یقینی حالات
پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تعلیمی
پالیسیوں کی تشکیل اتفاق رائے سے ہونی
چاہیئے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے
قابل قبول ہو اور اس کو استحکام حاصل ہو سکے۔

تک کی عمر کے بچوں کے لیے تعلیم کو عام کرنے کے
لیے کہا گیا ہے۔ اس طرح نہ صرف ابتدائی تعلیم
بلکہ پرائمری سطح سے قبل کی تعلیم کی ذمہ داری بھی
قبول کی گئی
ہے۔

نرسری تعلیم کا پھیلاؤ اس طرح ہوا ہے کہ اس میں
نہ تو کوئی تربیت دیکھنے کو ملتی ہے اور نہ ہی اس
کی افادیت سامنے آسکی ہے، البتہ اس میں
استحصال پسندی کا عنصر ضرور نظر آتا ہے، لہٰذا
پرائمری اسکولوں کے ساتھ ہی ماقبل پرائمری تعلیم
کے ایک یا دو سالہ تعلیم کو جوڑنا بے حد ضروری ہے۔
بچوں کی زندگی میں یہ حصہ وہ ہے جبکہ وہ خارجی
اور داخلی دُنیا کے اثرات تیزی سے قبول
کرتے ہیں، لہٰذا ان کی طرف عدم توجہی
نہیں برتی جا سکتی۔ یہی وہ عمر ہے
جبکہ بچے میں سماجی اور اخلاقی
اقدار کو سمونے کا عمل شروع
کیا جاتا ہے۔ انھیں کام
کی عظمت کے گُر سے
واقف کرایا جاتا ہے اور
سماجی و قومی
یک جہتی
اور

پرائمری تعلیم سے متعلق ایک ایسے کمیشن کی ضرورت ہے جس سے تعلیم کو عام کرنے میں مدد مل سکے اور چند مخصوص اقدامات کے ذریعے تعلیم کا معیار بڑھ سکے اور اس طرح ایک آئینی ذمہ داری کو پوری توجہ کے ساتھ پورا کیا جا سکے۔ پرائمری تعلیم کے بارے میں قومی سطح پر ایک ماڈل قانون نفع بخش اور مفید ہو گا۔

موجودہ تعلیمی نظام کی تعمیرِ نَو

ڈاکٹر کوٹھاری کمیشن نے جن بنیادی
اصولوں پر تعلیمی نظام کی تعمیرِ نَو کی سفارش
کی تھی، وہ آج کے دور میں بالکل درست
ہیں۔ پچھلے سترہ سال کا تجربہ
بتاتا ہے کہ پالیسیوں کی تشکیل
میں کمی کے سبب نہیں بلکہ
ان پر عمل درآمد میں کمی
کے سبب
تبدیلی
کے عمل میں
رکاوٹ پیدا
ہوئی ہے۔ لہٰذا
حقیقی پروگراموں کی
نشاندہی کے لیے صحیح صحیح
جگہ انگلی رکھنا ضروری ہے۔
تاکہ مقاصد میں کامیابی حاصل ہو
سکے۔ ہمارے آئین میں قومی مقاصد کی
وضاحت کی گئی ہے۔ اس کی تمہید اور ہدایتی
اصولوں میں ان مقاصد کی وضاحت ملتی ہے۔
اس پس منظر میں درج ذیل چند پروگرام اور
اقدامات ضروری ہیں۔

نرسری کی جماعت سے لے کر بارہویں جماعت ۔ تھوڑا وقت پیداواری کاموں کے تجربے پر صرف کرنے سے اور بعد میں کالج کی تعلیم کے دوران بھی اس سلسلے کو جاری رکھنے ر کام سے رغبت اور اسے انجام دینے کا مزاج پرورش پا سکے گا۔ یہ کام محض ڈیمانسٹریشن کے طور پر ہی نہیں بلکہ نصاب کے اصلی جزو کے طور پر انجام پانا چاہیئے۔

اتحاد کے عناصر کی پرورش
کی جاتی ہے۔ پرائمری
تعلیم، چاہے وہ سرکاری اسکولوں
میں ہو یا غیر سرکاری اسکولوں میں
ہر جگہ مفت ملنی چاہیئے۔ اور کسی سے
کوئی فیس نہیں لی جاتی ہے۔ لوئر پرائمری
اور اَپر پرائمری کی سطح پر خصوصی توجہ درکار ہے۔
پرائمری تعلیم سے متعلق ایک ایسے کمیشن کی ضرورت
ہے جس سے تعلیم کو عام کرنے میں مدد مل
سکے اور چند مخصوص اقدامات کے ذریعے
تعلیم کا معیار بڑھ سکے اور اس طرح
اس آئینی ذمہ داری کو پوری توجہ کے ساتھ
پورا کیا جا سکے۔ پرائمری تعلیم کے بارے

پرائمری
سطح سے
قبل کی تعلیم یا

نئی پالیسی پر عمل درآمد کا منصوبہ

آئین کے آرٹیکل ۴۵ میں ۱۴ سال

میں قومی سطح پر ایک ماڈل قانون نفع بخش اور مفید
ہوگا۔ خواندگی کا پھیلاؤ ضروری ہے اور ناخواندگی
دور کرنے کا عمل محض کسی ایک دَور کی ضرورت
نہیں ہے بلکہ یہ زندگی بھر کا عمل ہے۔ اس کے لیے

تعلیم کو ہر سطح پر پیشہ ورانہ رخ دینے کی
ضرورت ہے۔ یہ کام دس جمع دو کی سطح سے
پہلے ہی شروع کیا جاتا ہے۔ اس سے
کام کے تئیں رغبت پیدا ہوگی اور اس کے
وقار و عظمت کی پہچان کا ایک مزاج بن سکے گا۔

اور پیشہ ورانہ نصابات شروع کرنے کے لیے
فراخدلی کے ساتھ گرانٹ دی جانی چاہئیں۔ اس
وقت روائتی اسکولوں اور کالجوں کو سو فیصد
گرانٹ دینے اور پیشہ ورانہ اور ٹیکنیکل اداروں
کو جزوی گرانٹ دینے کا نظام حوصلہ شکن ہے۔
ہر بلاک میں ایک زراعتی اور ڈیری کی تعلیم

پوسٹ گریجویٹ تعلیم صرف یونیورسٹیوں میں دی جائے اور ملحقہ کالجوں پر اس کام کا بوجھ نہ ڈالا جائے۔

ہر سطح پر تعلیم کے میدان میں تجربات کی ہمّت افزائی کی جانی چاہیئے۔ اس مقصد کے لیے چند اسکولوں، کالجوں اور اداروں کو منتخب کرکے وہاں پراجیکٹوں کی امداد کے لیے فاضل امداد دی جائے۔

طویل المدتی انتظامات درکار ہیں اور پھر یہ بدستور
آگے بڑھتے رہنے چاہئیں۔ اس سلسلے میں جزوقتی
تعلیم کا موجودہ طریق کار اور اکاڈکا کوششیں ناکافی
ثابت ہوں گی۔ چنانچہ خواندگی کی کلاسوں کو جامع
انداز کے اجتماعی تعلیمی مراکز میں بدلنے کی ضرورت
ہے۔ یہ شبینہ مکاتب کی صورت میں چلائے جاسکتے
ہیں۔ موجودہ اسکولی عمارتوں سے ہی اس کے لیے
کام لیا جاسکتا ہے۔ ان مراکز پر پورے وقت
کام کرنے والا ایک اجتماعی ایجوکیشن آرگنائزر
درکار ہوگا۔ جزوقتی مراکز کو پورے وقت کے
اجتماعی تعلیمی مراکز میں بدل دیا جائے اور موجودہ
اخراجات کو پورے وقت کے تعلیمی مراکز پر لگایا
جائے۔ اس سے ناخواندہ افراد کے لیے وسائل کی
فراہمی میں مدد مل سکے گی۔

زیریں کی جماعت سے لے کر بارہویں
جماعت تک تھوڑا وقت پیداواری کاموں
کے تجربے پر صرف کرنے سے اور بعد میں کالج
کی تعلیم کے دوران بھی اس سلسلے کو جاری
رکھنے اور کام سے رغبت اور اسے انجام دینے
کا مزاج پرورش پا سکے گا۔ یہ کام محض
ڈیمانسٹریشن کے طور پر ہی نہیں بلکہ نصاب کے
اصلی جزو کے طور پر انجام پانا چاہیئے۔ ایک
ایسی کارپوریشن کا قیام ضروری ہے جو بچوں
کے بنائے ہوئے نمونوں اور اشیا کو خرید
سکے اس سے بچوں میں کام کرنے کی رغبت
ہوگی اور وہ اپنے مال کو بہتر سے بہتر بنا کر پیش
کرنے کے عادی ہوسکیں گے۔
دس جمع دو کی سطح پر مختلف تربیتی

دینے والا ادارہ کھولا جائے۔ ہر ضلع میں ایک
پولی ٹیکنک اور کثیر المقاصد ہائر سیکنڈری
اسکول کھولا جائے۔ ان اداروں کی وجہ سے
پیشہ ورانہ نصابات قبولیت عام حاصل کرسکیں
گے۔ اگر روائتی اسکول اس طرح کے نصابات
شروع کرنا چاہیں تو ان کی مدد کی جانی چاہیئے۔
ٹیکنکل ایجوکیشن بورڈوں کا موجودہ تحفظی رویّہ،
پیشہ ورانہ تعلیم کو عام کرنے کی راہ میں بڑی
رکاوٹ ہے۔

اجتماعی کالجوں کی ضرورت

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے نصابات کو
از سرِ نو دوسرا رُخ دینے کی جو اسکیم چلائی ہے

اس کی روشنی میں تقریباً ۲۵۰۰ کالجوں کو اجتماعی کالجوں یا کمیونٹی کالجوں میں بدلنا چاہیئے ان کے علاوہ باقی کالجوں میں داخلہ کی تعداد زیادہ سے زیادہ ایک ہزار طلبا ہونی چاہیئے۔

پوسٹ گریجویٹ تعلیم صرف یونیورسٹیوں

ڈھنگ کی کتابیں ناکافی ہوں گی۔ ہر تعلیمی ادارے میں اساتذہ اور ملازمین نیز انتظامیہ اور طلبا کے تعلقات کو خوشگوار رکھنے کے لیے ایک قانون کی ضرورت ہے جس کی رُو سے شکایات کا ازالہ کیا جا سکے۔ اس طرح متعلقہ فریقوں میں توازن قائم رکھنے میں مدد ملے گی۔ تعلیم کو

بھی ضروری ہے۔

یونیورسٹیوں اور صنعتوں میں رابطہ

یونیورسٹیوں اور صنعتی اداروں کے درمیان رابطہ نہ ہونے سے مال تیار کرنے والوں اور تعلیمی اداروں میں تیار کیے جانے والے مال کے درمیان کوئی رابطہ قائم نہیں ہو پایا ہے۔ ہر طالب علم کو ڈگری دینے سے قبل چھ ماہ کی عملی تربیت حاصل کرنے اور اشیا تیار کرنے کی تربیت حاصل کرنے کا سرٹی فیکیٹ حاصل کرنا ضروری ہونا چاہیئے، اس کے لیے اسے چھ ماہ تک کسی صنعتی ادارے کا اپرنٹس بننا ضروری ہے۔ اس مدت کو تین سالہ ڈگری کورس میں شامل کیا جانا چاہیئے۔ اپرنٹس ایکٹ کے دائرہ کار میں توسیع کی جائے اور اس

اپرنٹس ایکٹ کے دائرۂ کار میں توسیع کی جائے اور اس کے احاطۂ کار میں تمام صنعتی ادارے بشمول بینک، زندگی بیمہ کارپوریشن اور دیگر مالیاتی ادارے شامل ہوں اور وہ کالجوں کے طلبا کو بطور اپرنٹس رکھیں۔

تعلیم کی مختلف سطحوں پر اخلاقی اور روحانی اقدار کی تعلیم کو بحیثیت مجموعی تعلیم کا جزو لازم بنانا ضروری ہے۔

میں دی جائے اور ملحقہ کالجوں پر اس کا بوجھ نہ ڈالا جائے۔ کوٹھاری کمیشن کے وضع کردہ سہ لسانی فارمولے کی ہمت افزائی کی جائے۔ اس کے لیے مناسب طریقوں سے حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے۔ یونیورسٹی ٹیکسٹ بُک بورڈ ہی تمام زبانوں میں درسی کتب اور لائق مطالعہ مواد کی تیاری کا کام نہیں کر سکیں گے، اس کام کے لیے ہر یونیورسٹی میں مناسب نظام کے قیام اور اس کام کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے۔ علاقائی زبان میں مونوگراف وغیرہ تیار کر لیے جائیں۔ ہر یونیورسٹی کو اپنی ضرورت کے مطابق مطالعاتی مواد تیار کرانا ضروری ہوگا۔ زمانہ قدیم سے چلی آ رہیں پرانے

بالکل لازمی سروس کے طریقے پر ہی سمجھا جائے چنانچہ ان اداروں میں ہڑتالوں یا لاک آؤٹ پر پابندی رہے گی۔ ہر سطح پر تعلیم کے میدان میں تجربات کی ہمت افزائی کی جانی چاہیئے۔ اس مقصد کے لیے چند اسکولوں، کالجوں اور اداروں کو منتخب کر کے وہاں پراجیکٹوں کی امداد کے لیے فاضل امداد دی جائے۔

ہر اسکول میں ایک لائبریرین، ایک کلچرل انسٹرکٹر، ایک فزیکل ایجوکیشن آفیسر ہونا چاہیئے۔ ان کے علاوہ کرافٹ ٹیچر کی تقرری

کے احاطۂ کار میں تمام صنعتی ادارے بشمول بینک، زندگی بیمہ کارپوریشن اور دیگر مالیاتی ادارے شامل ہوں اور وہ کالجوں کے طلبا کو بطور اپرنٹس رکھیں۔

اپرنٹسوں کو وظیفہ بھی ملنا چاہیئے تاکہ ان ان چھ ماہ میں وہ کام بھی سیکھیں اور اس کے لیے انھیں وظیفہ بھی ملے۔ طلبا اور اُستادوں کو مختلف اقتصادی اور سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینا چاہیئے۔ اس مقصد کے لیے ہر کالج یا یونیورسٹی کے طلبا کے لیے رقبے متعین کر دیئے جائیں جہاں وہ اس سلسلے کے کام کریں۔ منصوبہ بندی کمیشن کو کوئی

(باقی صفحہ ۱۷۰ پر)

ڈاکٹر ڈی۔ ایم ننجنڈپا

تعلیم اور ترقّی کا رشتہ

اس مقالے میں ڈاکٹر ننجنڈپاؔ نے "تعلیم کے چیلنج" نامی دستاویز کو سراہا ہے لیکن کئی امور پر اُس میں کئے گئے اظہارِ رائے کے بارے میں اُنھیں تامّل ہے۔ موصوف تعلیم کو مجموعی ترقیاتی حکمتِ عملی سے مربوط کرنے کے حق میں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ افرادی قوت اور مالیات کے سلسلے میں وسائل کی تخصیص کے ضمن میں منصوبے کی ترجیحات میں ضروری تبدیلی لائی جائے۔ اُنھوں نے ڈگریوں کو ملازمتوں سے الگ کرنے کی تجویز کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا کہ اس سے محض چیدہ چیدہ طبقوں کے لوگوں کو ہی فائدہ پہنچے گا۔ اُن کے خیال میں مواقع تک یکساں رسائی کے معاملے میں یہ حل آگے چل کر ایک بہت بڑی ناانصافی کا سبب بنے گا۔ فاضل مضمون نگار تعلیم کو پیشہ ورانہ بنائے جانے کے بھی سخت مخالف ہیں کیونکہ پیشہ ورانہ حرفتوں اور صنعت کے مابین رابطے مختص ہیں۔ تعلیم کے مصارف، نصابوں پر نظرِ ثانی نیز تعلیم کو سیاسی عمل دخل سے پاک و صاف رکھنے اور اس کے انتظام و انصرام پر اُن کا اظہارِ خیال سنجیدہ غور و فکر کے قابل ہے۔

موجودہ تعلیمی نظام پر اکثر اس طرح کی نکتہ چینی کی جاتی ہے کہ یہ "ہمارے سماج سے قطعی بے جوڑ ہے"۔ یا "ماہرینِ تعلیم اور سائنسداں خوابوں کی دُنیا میں کام کرتے ہیں"۔ یا "اس کا معیار بہت گھٹیا ہے"۔ یا یہ "معاشرتی انقلاب کے لیے ایک پُر امن ذریعے کے طور پر یہ ناکام رہا ہے"۔ یا "اس کے سبب ناخواندہ افراد کی تعداد میں ۳۰ کروڑ سے ۴۴ کروڑ کا اضافہ ہو گیا ہے"۔ یا "تعلیم اور ترقی کے مابین ربط کا مکمل فقدان ہے"۔ یا "تعلیمی دیانت اور

مناسب رہنمائی کا فقدان ہے"۔ یا "یہ بے روزگاروں کے ایک لشکر کو جنم دے رہا ہے"۔ وغیرہ وغیرہ۔ نئی تعلیمی حکمت عملی پر ایک گرین پیپر شائع کرنے کے ضمن میں نئی سرکار کی طرف سے کئے گئے وعدوں سے مجنونانہ توقعات پیدا ہو گئی ہیں۔ جیسا کہ خود گرین پیپر "تعلیم کا چیلنج — ایک حکمتِ عملی کا تناظر"۔ اس مقالے میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، وہ مضمون نگار کے ذاتی ہیں۔۔۔ وہ کسی نوع بھی کرناٹک سرکار کے

تعریف بھی۔ یہ گرین پیپر کسی حد تک اُمیدیں بر لائے گا یا اُن پر پانی پھیرے گا، یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب چند صفحات پر مشتمل ایک مقالے میں نہیں دیا جا سکتا۔ تاہم اس کے اہم ترین اجزا کا اجمالی تجزیہ کیا جائے گا۔

تعلیم نظام کے نقائص کی نشاندہی

یہ سچ ہے کہ گرین پیپر میں تعلیم کے تینوں مرحلوں یعنی ابتدائی، ثانوی اور اعلےٰ تعلیم

اس گرین پیپر میں موجودہ تعلیمی نظام پر بیدردی سے الزام تراشی کی گئی ہے مگر یہ ایک پرانا قصہ ہے۔

اسی سیاق میں ۹۰ سال پیشتر کہے گئے سوامی وویکانند کے مندرجہ ذیل الفاظ کو یاد کرنا کارآمد ہوگا۔ انھوں نے کہا تھا:

"ہاتھوں میں کتابیں لیے ساحلِ سمندر پر چہل قدمی کرنا، یوروپی دماغوں سے نکلے ہوئے اُن چھچے متفرق قلم پاروں کو دوہرانا، اور ہماری کی کلرکی پانے کے لیے حد درجہ استغراق، یا زیادہ سے زیادہ ایک وکیل بننے کی کوشش،

"تعلیم کا چیلنج — ایک حکمتِ عملی کا تناظر"۔ اس مقالے میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، وہ مضمون نگار کے ذاتی ہیں۔ وہ کسی نوع بھی کرناٹک سرکار کے نہیں ہیں، جس کے تحت وہ بطور کمشنر و سیکرٹری، پلاننگ اور انسٹی ٹیوشنل فائننس محکمہ جات کام کر رہے ہیں۔

نہیں ہیں۔ جس کے تحت وہ بطور کمشنر و سیکرٹری، پلاننگ، اور انسٹی ٹیوشنل فائننس محکمہ جات کام کر رہے ہیں۔

گرین پیپر سے مُراد اُس پالیسی مقالے سے ہے، جسے بحث کے لیے شائع کیا گیا ہے۔ اس میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ اس سے ملک بھر میں اصلاح کے لیے ایک نیا جوش و خروش اور اعتماد پیدا ہو گیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مختلف چیلنجوں کا سامنا کرنے کے لیے ملک کو لگ بھگ ایک اساسی حکمتِ عملی کی تلاش تھی۔ شاید یہ پہلی بار ہوا ہے کہ تعلیم جیسے اہم موضوع پر ایک گرین پیپر شائع کیا گیا ہے تاکہ عوامی بحث و مباحثے کے بعد عوام الناس کے ردعمل کی روشنی میں حکمتِ عملی وضع کی جا سکے۔ اسے ایک نیک فال تصور کرنا چاہیے۔ اور تقابلِ

کو نشانہ بنانا آگے بڑھانے کی ضرورت تسلیم کی گئی ہے نیز اس کام کو بڑے پیمانے پر انجام دینے کے لیے کہا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ قومی ترقی صحیح تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔ اس دستاویز میں تعلیمی ترقی کے ضمن میں جن ترجیحات کی نشاندہی کی گئی ہے، ان میں اعلیٰ تعلیم کو پیشہ ورانہ بنانے اور پیشہ ورانہ تربیت کے مواقع عام کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ مزید برآں اس دستاویز میں کام، تعلیمی سمت اور طریقِ کار میں تبدیلی لانے نیز اساتذہ کا معیار بلند کرنے کی ضرورت بتائی گئی ہے۔ یہ سب کام مستقبل کی ضرورتوں اور آنے والے دور میں نئی ٹیکنالوجی اور نئے خیالات کو سمونے کے خیال سے ضروری بتائے گئے ہیں۔

بس یہی کچھ ہندوستان کے نوجوانوں کا بلند ترین مدعا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہر طالب علم کے اردگرد منڈلاتے ہوئے اُس کے بھوکے بچوں کا روٹی روٹی پکارتا ہوا جھنڈ، چنانچہ اے طالب علمو! کیا ایسی صورتِ حال میں تمہیں کتابوں، چوغوں، یونیورسٹی ڈپلوموں اور ان سب کو ڈبونے کے لیے سمندر میں کافی پانی نہیں ملتا؟۔

تعلیم میں مختلف طرح کی تبدیلیوں کی ضرورت شروع ہی میں محسوس کی گئی تھی۔ چنانچہ سابقہ کمیٹیوں اور کمیشنوں اور خاص کر ۶۵-۱۹۶۴ء کے تعلیمی کمیشن سے بھی توقعات وابستہ کی گئی تھیں جن کی تصدیق اس دستاویز کے بعد کے ابواب سے بھی ہو جاتی ہے۔ شاید آج کے مسائل سے زیادہ تر دھیمی اور اٹکل پچو تعمیل اور وسائل کے

تعین میں لگاتار گراوٹ کا نتیجہ ہیں"۔ لہٰذا لگتا ہے کہ ۶۴-۱۹۶۶ء کے ایجوکیشن کمیشن اور ۱۹۶۸ء کی قومی تعلیمی پالیسی نے نئی تعلیمی پالیسی کی ضرورت کا اندازہ کر لیا تھا۔ اگر اس کی مناسب تعمیل نہیں کی گئی تو ضرورت اس بات کی ہے کہ زیادہ بنیادی وجوہ کی چھان بین کی جائے۔ بجائے اس کے کہ انھیں یہ خیال کیا جائے کہ نئی تعلیمی پالیسی میں تعلیمی ضروریات پر نہ صرف مقاصد، تصورات اور ترجیحات کی اصلاح میں زور دیا جائے، بلکہ اس کے مقاصد کے حصول کے لیے متعلقہ مالی، مادی، تنظیمی اور بشری ضروریات کے ساتھ نفاذی حکمتِ عملی کی بھی وضاحت کی جائے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ اس دستاویز میں تعلیمی نظام کے نقائص کی نشاندہی نہیں کی جا سکی ہے۔

اس دستاویز میں تعلیمی نظام میں لامرکزیت لانے اور پرائمری تعلیم کو قومی تعلیمی پالیسی کا جزو لازم بنانے کی بات کہی گئی ہے جو کہ ایک خوش آئند امر ہے۔ دستاویز میں وسائل کی کمی اور پرائمری اسکولوں میں سہولتوں کی کمی کا ذکر بھی کیا گیا ہے چنانچہ اس پس منظر میں آنگن واڑی اور پری پرائمری اور پرائمری تعلیم کو مربوط کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ اس سے بعد کے مراحل کی تعلیم کو وسیع سے وسیع تر کیا جا سکے گا۔ اور یہ بھی کہ لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ ہو سکے گا۔ لیکن چھٹی کلاس کے مرحلے سے غیر رسمی تعلیم کو رائج کرنے پر تو اختلاف رائے ہوگا ہی۔ یہ اقدام اسی لیے سوچا گیا ہے تاکہ رسمی نظام میں تعلیم کو بیچ میں چھوڑ دینے کے رجحان کو رد کیا جائے۔ نفاذی حکمتِ عملی سے متعلق زیادہ تفصیلات کی عدم موجودگی میں ایسا لگتا ہے کہ گرین پیپر پہلی تعلیمی پالیسی سے منحرف ہو رہا ہے۔ فی الحقیقت ۱۹۶۵ کی تعلیمی پالیسی میں یہ بات خاص طور پر بیان کی گئی ہے کہ آئندہ دہوں میں اولین ترجیح یہ ہوگی کہ ہر بچے کو کم از کم سات سالہ مدت کی مفت اور لازمی عام تعلیم دی جائے۔ اس کے علاوہ یہ بھی شک ہے کہ اسی سطح پر دیہی علاقوں میں غیر رسمی تعلیم کس حد تک مؤثر ہو سکتی ہے۔

اسی کے علاوہ، ایک تجویز یہ بھی ہے کہ "اونچی تعلیم کو ایک مخصوص اہم مقام دیا جائے، کیوں کہ یہ مستقبل کی تشکیل کرنے اور تعلیم کے دیگر سبھی مراحل کو سنبھالے رکھنے کے لیے خیالات اور اشخاص مہیا کر سکتی ہے۔" اس بات پر بحث مباحثے کا امکان ہے۔ غیر جانبدار مبصرین کا خیال ہے کہ تعلیم کی ساخت میں وسائل کے تعین اور پالیسی مقاصد کی اصلاح میں توڑ مروڑ کیا گیا ہے، جس سے تعلیمی حکمتِ عملی حقائق اور عوام کی ضروریات سے دور ہو کر رہ گئی ہے۔

> اگر موجودہ نظام کی اونچی تعلیم سے صادر ہونے والے تصورات پر اعتماد باقی رکھنا ہے تو زیادہ اغلب یہ ہے کہ اس سے 'دنیائے علم' اور 'کام کی دنیا' میں ایک بڑی سے خلیج پیدا ہو جائے گی۔

اگر موجودہ نظام کی اونچی تعلیم سے صادر ہونے والے تصورات پر اعتماد باقی رکھنا ہے تو یہ زیادہ اغلب ہے کہ اس سے "دنیائے علم" اور "کام کی دنیا" میں ایک بہت بڑی خلیج پیدا ہو جائے گی۔ دراصل، اس امر کی بھی دلیل دی جا سکتی ہے کہ اونچی تعلیم میں تبھی سدھار ہو سکتا ہے۔ جب پرائمری اور ثانوی تعلیم میں سدھار ہو اور ہماری تعلیم ضرورت کی کسوٹی پر تبھی پوری اتر سکتی ہے، جبکہ اس کی جڑیں ملک کے سماجی اقتصادی ماحول میں گہرائی تک پیوست ہوں۔

نصابات پر نظر ثانی

اکیسویں صدی میں قدم رکھنے پر جن مواقع اور ٹیکنالوجیوں کا سامنا ہوگا اُن کے تقاضوں پر پورا اترنے کے لیے گرین پیپر میں بار بار اسکولی نصابات کی نظر ثانی کا ذکر کیا گیا ہے۔ نصابات پر نظر ثانی کی ضرورت کی باتیں سن سن کر گویا جی متلانے سا لگتا ہے۔ سوال اٹھتا ہے کہ ہم نے تسلی بخش طریقے سے نصابات پر نظر ثانی کیوں نہیں کی؟ حیرت کی بات ہے کہ یہ سوال صاف صاف نہیں اٹھایا جاتا۔ معاشرے اور تعلیم کے درمیان رابطے کا محض سرسری حوالہ دیا جاتا ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی کے تحت زندگی کے نئے تقاضوں کے تحت نصابات میں ضروری تبدیلیاں لانے کی امید کی گئی ہے۔

نصابات پر نظر ثانی کے لیے ضروری ہے کہ اسے سماج کی ضرورتوں کے ہم آہنگ بنایا جائے مگر ایسا تبھی ہو سکتا ہے جبکہ نظر ثانی کے کام سے وابستہ ایسے افراد ہوں جو سماج میں جو کچھ ہو رہا ہو، اس سے واقف ہوں اور اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتے ہوں کہ نصاب کی تبدیلی اور نصاب کی تبدیلی سے سماج پر مرتب ہونے والے

اثرات ایک دوسرے پر کس طرح اثر انداز ہوں گے۔ اسے مرکزی مانتا ہے کہ مختلف سطحوں پر نصابات پر نظرِ ثانی سے متعلق اب تک پیش کی گئی سبھی تجاویز بُری طرح ناکام ہو گئی ہیں۔ کیونکہ وجہ یہ رہی ہے کہ ان نصابات کی تشکیل کرنے والے پوری طرح اس کے لیے کیل کانٹے سے لیس نہیں ہیں۔ لیکن گرین پیپر اس بارے میں قطعی خاموش ہے کہ یہ اڑچنیں کیسے دُور کی جائے گی۔ نئے تقاضوں کی تکمیل کی کوشش میں گرین پیپر اسکولی سطح تک نصاب اور درسی کتب کی یکسانی کا ذکر کرتا ہے۔ نیز اس میں ایسا احساس کیا گیا ہے کہ جب تک تعلیم کے بارے میں مرکز کا کردار نہیں بڑھتا، صحیح خطوط پر اس کی نشو و نما نہیں ہو پائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس کی بیزاری کی وجہ وہ مشترک فہرست ہے جس میں کہ تعلیم کا شعبہ مندرج ہے۔ لہٰذا اس کا آسان علاج یہ ہے کہ اضلاع میں اس رجحان پر مائل کرنے والے اسکولوں کا جال پھیلا کر مرکز کے رول کو وسعت دینا چاہئے۔ اس کے پیشِ نظر کیندریہ ودیالیہ نظام کے تحت آنے والے سنٹرل اسکولوں کے جال پھیلائے جانا چاہئیے۔

بچوں کے لیے ہیں جن کا تبادلہ ملک بھر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ ہوتا رہتا ہے، نیز اُن کے لیے بھی جنھیں کہ یہ زعم ہو گیا ہے کہ ایسے اسکول میں داخلہ برگزیدہ ترڈھانچے کو فروغ دے گا۔ ملک نے پیشہ ورانہ نصابات کی تربیت دینے والے اداروں سے کوئی سبق نہیں لیا۔ جبکہ ملک کے عوام کے ذہن کو بنانے میں ان اداروں کی بڑی اہمیت ہے۔ ان اداروں نے یونیورسٹیوں اور

اس مسئلے کی بنیادی باتوں کو حل کرنے میں بُری طرح ناکام رہا ہے۔ پھر بدقسمتی ہے کہ کیپی ٹیشن فیس (ذی کس محصول) پر اختلاف رائے پر محض غور کیا جاتا ہے، مگر اس پر فیصلوں کو محفوظ ہی رکھا جاتا ہے۔ کیا اسے "سرمایہ داری کی جیت" کی ایک اور مثال سمجھ لیا جائے۔؟ یہ وہ جملہ ہے جسے عالمی بینک نے استعمال کیا تھا۔

ڈگریوں کو روزگار سے الگ کر دینا ایک ملجھانے والا متبادل عمل ہے جس کے بارے میں یہ خوش فہمی ہے کہ اس کے ذریعے تعلیم کے تئیں جمہوری

نصابات کو معاشرے اور سماجی ضروریات سے جوڑنے کی غرض سے، اُن پر نظرِ ثانی اُسی صورت میں ممکن ہے جب اُس پر عمل کرنے والوں کو سماج میں جو کچھ ہو رہا ہو، اُس سے نیز بار بار کیے جانے والے اور تفاعلی عمل کیسے قائم کئے جا سکتے ہیں، اُس سے، صحیح معنوں میں آشنا کیا جائے۔

یونیورسٹیوں کی سُبکی

یہ بات صاف نہیں ہے کہ کیا مرکزی سرکار کے چلائے ہوئے اسکولوں کے جال کے پھیلاؤ سے لسانی تنگ نظری کو دُور کرنے کا ہمارا مقصد حل ہو سکے گا۔ دراصل تجربہ شاہد ہے کہ سنٹرل اسکول بے خاص طور پر اُن سرکاری ملازمین کے

کالجوں کو کمتر مرتبے کی طرف دھکیل دیا ہے۔

ڈگریوں کو روزگار سے الگ کرنا

بلا شک یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تعلیم اور پڑھے لکھے بے روزگاروں سے متعلق ملک کو جن مسائل کا سامنا ہے اُن کا کوئی آسان حل نہیں ہے۔ یہ اُس حکمتِ عملی کا نتیجہ ہے جس میں پیداوار پر زور دیا گیا ہے۔ اور جو اپنے ساتھ آمدنی اور اثاثہ جات کی زیادہ مساوی تقسیم لیے ہوئے، معیشت میں انتظامی تبدیلیاں نہیں لائی۔ ایسا خیال پیش کر کے کہ ڈگریوں کو ملازمتوں سے الگ کر دینے سے اُونچی تعلیم دینے والے اداروں اور یونیورسٹیوں پر دباؤ میں کمی ہو گی، گرین پیپر

اندازِ نظر اپنایا جا سکے گا اور اسے چند اُونچے طبقوں کی جاگیرداری سے نکالا جا سکے گا۔ یونیورسٹیوں میں داخلے سے متعلق معیارات اور نظم و ضبط کے معاملے میں ناکامی کے نتیجے میں قطعی پالیسی کی حالت میں اب یہ مختصر راستہ تجویز کیا گیا ہے جیسا کہ ہر کوئی جانتا ہے، ڈگریوں میں امتیاز حاصل کرنے جیسے قابلیت کے معروضی ثبوتوں کی موجودگی میں بھی خاصا سیاسی عمل دخل رہتا ہے، جو راست طور پر تعلیمی نظام کی اقدار کی گراوٹ کے لیے ذمہ دار ہے، نئی تجویز کے تحت تعلیمی نظام میں سیاسی عمل دخل نیز اسے ذاتی جاگیر بنا لینے کی بے پناہ گنجائش ہو جائے گی اور یہ اس مطلب کے لیے ایک خوش کُن جولانگاہ بن جائے گا۔ یہ ایک طے شدہ رائے ہے کہ روزگار سے ڈگری کی شرط ہٹا لینے پر

روزگار کے یکساں مواقع کے حصول کے ضمن میں آگے چل کر زیادہ بے انصافی ہوگی۔ اب بھی سماج میں ڈگریوں کے رتبہ کا جادو طاری ہے، انھیں یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے کی غرض سے، جانے کو

میں سے ایک ہے، پرائمری تعلیم کے معاملے میں تختہ ہائے سیاہ جیسی ضروریات کی کمی، اسکول کے احاطوں میں پینے کے پانی کی قلت، نیز کمروں کی کمی وغیرہ کو دُور کرنے کے لیے وسائل کے تعین کو اوّلین ترجیح دیکر

ہے۔ بہت ہی کم فیس کے ڈھانچے نے اسے مستفید ہونے والوں کے لیے یونیورسٹیوں اور کالجوں کو "ویٹنگ روم" (کمرۂ انتظار) بنا دیا ہے۔ چونکہ فیس کی شکل میں کل لاگت کا محض برائے نام جزو ہی وصول کیا جاتا ہے اس لیے اعلیٰ تعلیم پانے والوں میں مقصد کی سنجیدگی نہیں رہی۔ اعلیٰ تعلیم اور پیشہ ورانہ تکنیکی تعلیم کے ضمن میں ان کے متلاشیوں کو لاگت کے ڈھانچے کی بنیاد پر ان میں

ڈگریوں کو روزگار سے الگ کر دینا ایک للچانے والا متبادل عمل ہے جس کے بارے میں یہ حسنِ ظن ہے کہ اس کے ذریعے تعلیم کے تئیں جمہوری اندازِ نظر اپنایا جا سکے گا اور اسے چند اونچے طبقوں کی جاگیرداری سے نکالا جا سکے گا۔ یونیورسٹی میں داخلے سے متعلق معیارات اور نظم و ضبط کے معاملے میں ناکامی کے نتیجے میں قطعی مایوسی کی حالت میں اب یہ مختصر راستہ تجویز کیا گیا ہے۔

روکا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا یہ رائے دی جاتی ہے کہ اونچی تعلیم پر دباؤ کو روکنے کے لیے عقل کی بات یہ ہوگی کہ برملا یہ کہہ دیا جائے کہ یونیورسٹیوں میں داخلہ صرف انھیں مل پائے گا جنھوں نے اوّل درجہ حاصل کیا ہو اور کہ اس سے

یہ ایک طے شدہ رائے ہے کہ روزگار سے ڈگری کی شرط ہٹا لینے پر روزگار کے یکساں مواقع کے حصول کے ضمن میں آگے چل کر زیادہ بے انصافی ہوگی۔

کم درجہ پانے والوں کو پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنا ہوگی۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ ان سطحوں پر تعلیمی راہنمائی کرنے والے مخلص انسان ایسی تبدیلی بڑی آسانی سے لا سکتے ہیں۔ لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ آیا ایسے تعلیمی راہنما یا مخلص افراد خاصی تعداد میں مل بھی جائیں گے۔

تعلیمی اخراجات بیحد ضروری ہے!

یہ یقینی بنانا کہ تعلیمی ادارے مناسب ساز و سامان سے پوری طرح لیس ہوں نیز داخلوں کو باقاعدہ بنانے کے لیے مناسب قوانین وضع کرنا، نئی تعلیمی پالیسی کے لیے حل طلب بڑے مسائل

ان خامیوں کو ختم کرنا چاہیئے۔ اسکول اور پیشہ ورانہ تربیت کی سطحوں کو چھوڑ کر، فیس کے ڈھانچے نیز امدادی رقوم کی نوعیت کے مسئلے پر مکمل غور کیا جانا چاہیئے۔ اس پہلو کا پھر گرین پیپر میں محض ایک سرسری ذکر کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اسکول اور پیشہ ورانہ تربیت کی سطحوں کو چھوڑ کر سبھی مراحل پر تعلیم کے اخراجات پر دوبارہ غور کرنا ہوگا۔ اس ضمن میں کم سے کم یہی کہا جا سکتا ہے کہ جن نئے تقاضوں کا ڈھنڈورہ پیٹا جا رہا ہے، ان کا یہ بہت ہی مایوس کن پہلو ہے۔ تعلیم، بالخصوص تکنیکی اور طبی تعلیم پر مشتمل اعلیٰ تعلیم وہ برتری عطا کرتی ہے جو متعلق افراد میں محدود ہو کر رہ جاتی

سرمایہ کاری کی نفسیات پیدا کرنی چاہیئے۔ ایسا تعلیم پر آنے والی لاگت کی پوری وصولیابی سے یہ لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ اس کے پیشِ نظر کیا ایسی تعلیم حاصل کرنا کارآمد ہوگا؟ سماجی ناانصافی کو روکنے کے لیئے اُن افراد کو جو صحیح معنوں میں لائق ہوں، لیکن کمزور طبقوں سے تعلق رکھتے ہوں، حسبِ ضرورت وظائف دیئے جا سکتے ہیں۔ تاہم ان سطحوں پر تعلیم میں عطیات کی شکل میں پیسہ خرچ کرنے کے موجودہ طریقِ کار کو قرضہ جات کے طریقِ کار سے بدلا جا سکتا ہے۔ ایسا کرنے میں فالتو خرچہ بھی

نہیں ہوگا۔ اس لیے فقط سرمایہ کاری کے طریقے میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ وہ رقوم جو اب اداروں اور یونیورسٹیوں کو عطیات کے طور پر دی جاتی ہیں، وہ تب اعلیٰ تعلیم کے لیے مستحق ہر طالب علم کو دیئے گئے قرضے کے ذریعے آنے والی کُل لاگت فیس کے طور پر اُن تک پہنچے گی۔ یہ قرضہ ایسی تعلیم پر آنے والی کُل لاگت کے برابر ہوگا۔ جسے اب گورنمنٹ کی جانب سے عطیات کے ذریعے دی جانے والی امدادی رقوم سے پُورا کیا جاتا ہے۔ یہ قرضہ ایک طالب علم کو اُس کی ولدیت یا والدین کی آمدنی سے جوڑے بغیر ہی دیا جائے۔ اس طرح طالب علم کو اُس کے وقار کا احساس بھی دلایا جا سکتا ہے۔ نیز اُسے یہ بھی احساس ہوگا کہ وہ اس رقم کا ٹھیک استعمال کرے کیوں کہ یہ اُسے برسرِروزگار ہونے پر لوٹانا بھی ہے۔

> ایک تجویز یہ بھی ہے کہ "اونچی تعلیم کو ایک مخصوص اہم مقام دیا جائے کیونکہ یہ مستقبل کی تشکیل کرنے اور تعلیم کے دیگر سبھی مراحل کو سنبھالے رکھنے کیلئے خیالات اور اشخاص مہیّا کر سکتی ہے۔"

> یہ رائے دی جاتی ہے کہ اُونچی تعلیم پر دباؤ کو روکنے کے لیے عقل کی بات یہ ہوگی کہ برملا یہ کہہ دیا جائے کہ یونیورسٹی میں داخلہ صرف اُنھیں مل پائے گا جنھوں نے اوّل درجہ حاصل کیا ہو، اور کہ اس سے کم درجہ پانے والوں کو پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنا ہوگی۔

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب کہ گرین پیپر نئے خیالات کا ذکر کرتا ہے، اعلیٰ تعلیم میں سرمایہ لگانے کے اس جدید طریقے میں کیوں ہچکچاہٹ محسوس کی گئی ہے۔

اساتذہ کے لیے ضابطۂ اخلاق

اگر تعلیم سماجی انقلاب کے لیے آلۂ کار بننے میں ناکام رہی ہے تو اس کی کئی وجوہ ہیں۔ لیکن اُن میں سے اہم ترین وجہ حالات کو جوں کا توں قائم رکھنے اور جلدی جلدی امیر بن جانے کے لیے وابستہ مفادات کی سعی ہے۔ تعلیم کے میدان میں اقدار کی گراوٹ نے سماج کو سب سے بڑی زک پہنچائی ہے۔ اساتذہ اور تعلیم کے منتظمین میں آپس میں کوئی ربط نہیں ہے۔ ایسی حالات میں اساتذہ کے سامنے بلند و بالا نظریات نہیں ہیں اور وہ صرف راتوں رات امیر بننے کی دُھن میں اخلاقی ضابطوں سے صرف نظر کر لیتے ہیں۔ ایسی صورت میں ضرورت ہے کہ اُستادوں کی تنظیمیں ایک ضابطۂ اخلاق مرتب کریں۔

گرین پیپر میں اس امر کی جانب بہت سرسری اشارہ کیا گیا ہے، حالانکہ تعلیمی نظام میں یہ کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ "اساتذہ سے متعلق قومی کمیشنوں نے سفارش کی ہے کہ اگر یہ تنظیمیں ایک ضابطہ تیار نہیں کر پاتیں، تو یہ کام سرکار کو پورا کرنا چاہیئے۔" تاہم یہ مسئلہ فقط ماہرینِ تعلیم تک ہی محدود نہیں ہے۔ نہ ہی اسے لاگو کرنا اتنا آسان ہے۔ البتّہ یہ ایک عظیم کام اور ذمہ داری ہے اور سماج کی کایا پلٹ کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی اس امر کو تسلیم کرنے میں قاصر رہی ہے کہ جب سماج میں مجموعی طور پر اخلاق کا دیوالہ نکل چکا ہو، تنہا تعلیمی سیکٹر سے ضابطۂ اخلاق یا اخلاقیاتِ کار کی پسندیدگی کی توقع نہیں کی جا سکتی، خواہ وہ امتحانات کے بارے میں ہو، یا پڑھائی یا تحقیق یا انتظامی ذمہ داریوں کے ضمن میں ہو۔ ایک ترقی پذیر معاشرے میں کام کے ہر ایک شعبے میں، سیاسی عمل دخل، بدعنوانی اور زندگی کی اعلیٰ اقدار سے بے پروائی جیسی بُرائیوں نے وہ دیوقامت صورت اختیار کر لی ہے کہ جس میں کوئی بھی خطیبانہ الفاظ رتی بھر کارگر نہیں ہو سکتے۔ تعلیمی نظام کی کامیابی کے لیے اخلاقی سطح پر سماج کی اصلاح بہت ضروری ہے۔

تعلیم کو پیشہ ورانہ بنانا ناقابلِ عمل

تعلیم کے پیشہ ورانہ نظام پر کچھ بھروسہ کیا جا رہا ہے اور پہلی تعلیمی پالیسی کے بیانیئے

میں بھی یہ بات کہی جا چکی ہے۔ پیشہ ورانہ تعلیم، کئی وجوہات کی بنا پر قابلِ لحاظ حد تک پنپ نہیں پائی۔ یہ وجوہات ہاتھ سے کام کرنیوالے لوگوں کو نظرِ حقارت سے دیکھنے کے ثقافتی تعصب سے لے کر پیشہ ورانہ مضامین اور صنعت کے دیکھ بھال اکثر پیشہ ور منتظمین کرتے ہیں، جو یہ بھی نہیں جانتے کہ پیشہ ورانہ نظام ہے کیا۔ لہٰذا اس سسٹم کو پوری طرح رد کیا جانا چاہیئے۔ اگر ضروری ہو تو قانون کے ذریعے صنعت کو مجبور کیا جائے کہ مختلف ہنرمندیوں کی ضرورتوں نیز مطلوبہ ہنرمند افراد کے بارے

صنعت جو اپنی تربیت یافتہ افرادی قوت کے لیے سرکاری سیکٹر کے اداروں پر انحصار رکھتی ہے۔ ایسی درخواستوں پر کسی تاثر کا اظہار تک نہیں کرتی، جن میں اُس سے کہا جاتا ہے کہ وہ یہ مُطلع کرے کہ کن اقسام کی ہنرمندیوں

بہت ہی کم فیس کے ڈھانچے نے اس سے مستفید ہونیوالوں کیلیے یونیورسٹیوں اور کالجوں کو "ویٹنگ روم" (کمرۂ انتظار) بنا دیا ہے۔ چونکہ فیس کی شکل میں کُل لاگت کا محض برائے نام جزو ہی وصول کیا جاتا ہے اس لیے اعلیٰ تعلیم پانے والوں میں مقصد کی سنجیدگی نہیں رہی۔

اساتذہ اور تعلیم کے منتظمین میں آپس میں کوئی رابطہ نہیں ہے۔ ایسی حالت میں اساتذہ کے سامنے بلند و بالا نظریات نہیں ہیں اور وہ صرف راتوں رات امیر بننے کی دُھن میں اخلاقی ضابطوں سے صرف نظر کر لیتے ہیں۔ ایسی صورت میں ضرورت ہے کہ اُستادوں کی تنظیمیں ایک ضابطۂ اخلاق مرتب کریں۔

مابین ناقص رشتوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ گرین پیپر میں ٹھیک طور پر یہ تجویز کیا گیا ہے کہ پیشہ ورانہ کورسوں کو زراعت، شعبۂ خدمات اور دیہی ترقی کے مختلف پروگراموں کے ساتھ مربوط کیا جائے۔ تاہم یہ کچھ ایسے پالیسی اقدامات کی اہمیت جاننے میں ناکام رہا ہے، جو پیشہ ورانہ نظامِ تعلیم کی کامیابی کے لیے قطعاً ضروری ہیں۔

موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ ہماری

کی ضرورت ہے۔ اور کہ اُن کی مانگ کیا ہوگی، تاکہ پیشہ ورانہ منصوبہ بندی اس چیلنج کا مؤثر ڈھنگ سے سامنا کر سکے۔ دوم پیشہ ورانہ اداروں میں وہ لوگ کام کرتے ہیں، جو کسی خاص پیشے میں اپنی ملازمت کے دَوران تربیت اور تجربے کی بدولت اوپر نہیں اُٹھے۔ اُن میں سے زیادہ تر اپنی ڈگریوں کی بنا پر منتخب کئے جاتے ہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ پیشہ ورانہ نظام کی

میں مُطلع کرے۔

صنعتوں کو تربیتی پروگراموں میں بھی براہِ راست شرکت کرنی چاہیئے۔ پیشہ ورانہ تعلیم دینے والے اداروں میں داخلہ پانے والے نئے اُمیدواروں کو خود صنعت میں کامیاب رہ نمائیوں یا تجربہ کار کارکنوں کی طرف سے تربیت دی جانی چاہیئے۔ کُل منصوبہ بندی اور انتظامی ذمہ داری اُس

شخص کو سونپی جانی چاہیے جو اپنے پیشے میں ڈگری کے بجائے اپنے کام اور حقیقی تجربے کی بنا پر کامیاب ہوا ہو، اور ترقی کے بلند ترین زینے پر پہنچا ہو۔ اگر پیشہ ورانہ نظام کے مقاصد کا حصول مقصود ہے تو اسے نوکر شاہی کے چنگل سے بچانا ہوگا۔

اداروں میں ہوئے سانحات کی بدولت اُن کی سرگرمیاں اور تعلیمی پروگرام اُتھل پتھل ہو جاتے ہیں۔ اس کے حل کے طور پر گرین پیپر میں اعلیٰ تعلیمی معیار والے اداروں کو خود مختاری عطا کرنے کی وکالت کی گئی ہے۔ اگر کسی نظام کے تحت ملحقہ کالجوں کو یونیورسٹیوں سے الگ کر دیا جاتا ہے تو آگے چل کر اس لامرکزیت کے عمل سے تعلیم میں سدھار ہونے کی اُمید کی جا سکتی ہے۔

ایسی تجویز کے کئی فائدے پیشِ نظر ایسا کرنا ممکن نہیں۔ گرین پیپر میں کہا گیا ہے کہ کوئی بھی یونیورسٹی کسی ملحقہ کالج کو ٹھیک ڈھنگ سے نہیں چلا سکی ہے۔ اس کی زیادہ تر وجہ یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں اور ملحقہ کالجوں کے پرنسپلوں نیز اُن کے ماتحت عملے کے مابین تال میل کی کمی ہے۔ ان کے مابین تبادلۂ خیالات کا واحد موقع، جو اکثر ایک بہت ہی محدود انداز میں میسر آتا ہے، تعلیمی کونسل یا سینیٹ کی نشستوں کی شکل میں ہوتا ہے۔ مگر ایسی حالت میں بھی تمام کالجوں

تعلیم کا انتظام و انصرام ایک چیلنج ہے

پیشہ ورانہ نظام کی دیکھ بھال اکثر غیر پیشہ ور منتظمین کرتے ہیں، جو یہ بھی نہیں جانتے کہ پیشہ ورانہ نظام ہے کیا۔ لہٰذا اس سسٹم کو پوری طرح رد کیا جانا چاہیے۔

صنعتوں کو تربیتی پروگراموں میں بھی براہِ راست شرکت کرنی چاہیے۔ پیشہ ورانہ تعلیم دینے والے اداروں میں داخلہ پانے والے نئے اُمیدواروں کو، خود صنعت میں کامیاب رہنماؤں یا تجربہ کار کارکنوں کی طرف سے تربیت دی جانی چاہیے۔ کُل منصوبہ بندی اور انتظامی ذمّہ داری اُس شخص کو سونپی جانی چاہیے، جو اپنے پیشے میں ڈگری کے بجائے اپنے کام اور حقیقی تجربے کی بنا پر کامیاب ہوا ہو۔

گرین پیپر میں تعلیم کے انتظامی نظام کی اہمیت پر جائز طور پر زور دیا گیا ہے۔ ثانوی تعلیم کے بورڈز اور یونیورسٹیاں ملحقہ کالجوں سے متعلق کام کے بوجھ سے دبے ہوتے ہیں۔ دوسری طرف اکثر ملحقہ کالجوں کو مشکلات کا سامنا ہے۔ کیوں کہ اُن کی نمائندگی کے باوجود دیگر

تو ہیں لیکن صورتِ حال کے حقائق کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ملک میں کالجوں کو ملحقہ بنانے کا مروجہ طریقہ کار کسی مرضی سے نہیں بلکہ ایک خاص مقصد کے تحت چلایا گیا ہے۔ نظریاتی طور پر کالجوں کی ذمہ داری سے مبرا اقامتی یونیورسٹیاں بہترین ہوں گی، لیکن تعلیم کے لیے دستیاب وسائل کے

کی نمائندگی نہیں کی جاتی۔ لیکن وائس چانسلروں کے لیے تمام ملحقہ کالجوں کے پرنسپلوں کی بکثرت میٹنگیں بلانے اور ان کی تعلیمی رہنمائی کرنے میں کوئی امر مانع نہیں رہا۔ البتہ کچھ کالجوں میں تھوڑے تھوڑے وقفے پر کی جانے والی ایسی

گفت و شنید امن اور ضبط کی بحالی کا ایک ذریعہ بھی ثابت ہوتی ہے۔

منتظمین کے کیڈر کی ضرورت

اسی سیاق و سباق میں ایک بڑا مسئلہ تعلیم کے محاذ پر لائن منتظمین کی جانب سے رہنمائی کئے جانے کا ہے۔ یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ گرین پیپر میں تعلیمی منتظمین کی تربیت کے لیے اساتذہ اور تعلیمی ماہرین کی ایک مناسب جمعیت تیار کرنے کی ضرورت کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن یہ بات ضروری ہے کہ ایسی جمعیت اُن اشخاص پر مشتمل ہو جو قوی دماغی قابلیت اور اخلاق کے مالک ہوں۔ کوئی بھی نئی حکمت عملی تعلیم کو سیاست سے پاک رکھنے اور تسلی بخش تعلیمی رہنمائی فراہم کرنے کا فی نفسہ باعث نہیں بن سکتی۔ بھارتی تعلیمی نظام کی اصلاح کی جنگ آدھی حد تک جیتی جا سکتی ہے بشرطیکہ ایسے تعلیمی منتظمین دستیاب ہوں جو ایک یا دوسری ٹولی سے خود کو وابستہ کئے بغیر اپنے پیروں پر کھڑے رہ سکیں۔ طلباء کی جائز ضروریات کی پیش بینی کر کے انھیں پورا کرنے کے لیے بسرعت عمل نہ کر سکیں، اپنی بے خطا راست بازی کا مظاہرہ کر سکیں اور انصاف، مساوی برتاؤ اور موزونیت کو یقینی بنانے کے لیے تعلیمی نظام کی کارکردگی کی تفصیلات کی چھان بین کرنے کے لیے اَن تھک قوت کے مالک ہو سکیں۔ جب تک پالیسی اقدامات واضح صورت میں سامنے نہیں آئیں گے، تعلیمی منتظمین کے مناسب کیڈر کی تشکیل نہیں ہو سکتی۔ ایک خیال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انڈین ایجوکیشنل سروس کا احیاء کیا جائے۔

تعلیم میں سیاسی عمل دخل دور کیا جائے

اُسی تعلیمی نظام نے کہ جسے وسیع ملامت کا ہدف بنایا جا رہا ہے، دُنیا کے کسی بھی حصے میں دوسروں کے مقابلے میں بہترین علماء، سائنس داں اور ٹیکنالوجسٹ پیدا کئے ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ تاہم اس نظام کو ایسا سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ گوناگوں عمدگی عطا کرنے کی اب بھی امکانی قوت رکھتا ہے۔ لیکن بڑے پیمانے پر سیاسی عمل دخل اس خوبی کو زائل کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ کام کے سلسلے میں ضابطۂ اخلاق نہ ہونے سے بھی معیار کی گراوٹ دیکھنے کو ملی ہے۔ چند استثنیات کو چھوڑ کر، باقی سبھی شعبوں میں، خواہ وہ تعلیم ہو، انتظامیہ ہو یا صنعت ہو، راست بازی انتہائی تنزل کی حالت میں ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل سے چند خاص خاص طبقوں کے لوگوں نے فائدہ اٹھایا اور مخصوص مفادات کو پنپنے کا موقع ملا۔

بڑھتی ہوئی ناخواندگی اسے مزید ہوا دے رہی ہے۔ تعلیم بالغان کے پروگراموں پر عمل درآمد سنجیدگی کے ساتھ نہیں کیا گیا۔ جس طرح کہ ہونا چاہیئے تھا۔ گرین پیپر میں کہی گئی اس بات پر یقین لانا قدرے مشکل ہے کہ ناکامیوں کی وجہ مالی دقتیں رہی ہیں۔ اس ضمن میں یہ بتا دیا جائے کہ اُن حالات میں بھی کہ جہاں روپے پیسے کی کمی نہ تھی، ان پروگراموں کو بروئے کار لانے میں نتائج بہت زیادہ حوصلہ افزا نہیں رہے۔

دیہات کے تعلیم یافتہ طبقے کے لیے روزگار کی فراہمی کے لیے جو متعدد پروگرام شروع کئے گئے اور اسی طرح دیہات کے مزدوروں کے لیے روزگار کی ضمانت وغیرہ کے جو پروگرام شروع کئے گئے، ان سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔

> نظریاتی طور پر کالجوں کی ذمّہ داری سے مُبرّا اقامتی یونیورسٹیاں بہترین ہونگی، لیکن تعلیم کے لیے دستیاب وسائل کے پیش نظر ایسا کرنا ممکن نہیں۔

> کوئی بھی نئی حکمت عملی تعلیم کو سیاست سے پاک رکھنے اور تسلی بخش تعلیمی رہنمائی فراہم کرنے کا فی نفسہ باعث نہیں بن سکتی۔

ان طبقات نے تعلیم بالغان کے سلسلے کی عملی کوششوں سے باقاعدہ استفادہ نہیں کیا۔ اس کے جواز میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ ناخواندگی دور کرنے کے لیے ابھی ذہن تیار نہیں ہو سکا ہے۔ "نوکرشاہی ثقافت" اور "تعلیمی ثقافت" آپس میں متصادم ہیں، جس کا بظاہر کوئی حل

پالیسی سازوں کو بھی ماہرین تعلیم کے ساتھ رابطے سے ہر عمل اور اس کے ردِ عمل کا علم ہونا چاہیئے۔ اس کے بغیر تعلیم کے چیلنج کا سامنا کرنا محض ایک نعرہ ہی رہ سکتا ہے۔

ہم گرین پیپر سے کسی پالیسی تجویز کی پوری تفصیلات بیان کرنے کی توقع نہیں کر سکتے۔ تاہم یہ ضروری لگتا ہے کہ تعلیم کو ترقی کے

کو بند کر دینا اور طلباء اور اساتذہ کو زندگی کے حقائق کا مطالعہ کرنے کے لیے کھیتوں اور گاؤں میں جانے پر آمادہ کرنا چاہیئے تاکہ وہ واپس آکر بہتر معلومات سے پھر اپنی پڑھائی اور معلمی کے کاموں میں لگ سکیں۔ اس راہ میں حائل دشواریوں کی وجہ سے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ گرین پیپر کے حتمی پیرا میں یہ درج

> دیہات کے متعلیم یافتہ طبقے کے لیے روزگار کی فراہمی کے لیے جو متعدد پروگرام شروع کیے گئے اور اسی طرح دیہات کے مزدوروں کے لیے روزگار کی ضمانت وغیرہ کے جو پروگرام شروع کیے گئے، ان سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ ان طبقات نے متعلیم بالغان کے سلسلے کی عملی کوششوں سے باقاعدہ استفادہ نہیں کیا۔ اس کے جواز میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ ناخواندگی دور کرنے کے لیے ابھی ذہن تیار نہیں ہو سکا ہے۔

> ترقی سے متعلق پالیسی سازوں، ترقی کرنے والوں نیز تعلیمی ماہرین کے مابین مسلسل رابطہ قائم رہنا چاہیئے۔ اس سلسلے کی براہِ راست معلومات کے ذریعے وہ نصابات کی از سرِ نو تشکیل کر سکتے ہیں۔

نہیں ہے۔ ماہرین تعلیم کو شدید ضرورت ہے اور ترقی کے عمل کا پتہ چلانے کے لیے کھیتوں، فیکٹریوں اور انجمنوں میں جانا ہوگا۔ ترقی سے متعلق پالیسی سازوں، ترقی کرنے والوں نیز تعلیمی ماہرین کے مابین مسلسل رابطہ قائم رہنا چاہیئے۔ اس سلسلے کی براہِ راست معلومات کے ذریعے وہ نصابات کی از سرِ نو تشکیل کر سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ فقط ماہرین تعلیم ہی کو معاشرے کا مزاج جاننا ہے۔ ترقی کے

ساتھ جوڑنے کے کچھ خد و خال مجمل طور پر بیان کر دیئے گئے ہیں۔ لگتا ہے کہ گرین پیپر کچھ ٹھوس اور سخت حکمتِ عملیاں ظاہر کرنے میں ہچکچا گیا ہے۔ ان کے اظہار میں اس لیے پس و پیش نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ حکمتِ عملیاں گوارا نہیں ہوں گی۔ مثال کے طور پر سبھی سطحوں پر نصابات پر مناسب نظرِ ثانی کو یقینی بنانے کے لیے ایک بنیادی اقدام ضروری ہے اور کچھ عرصے کے لیے، مثال کے طور پر ایک سال کے لیے ادارے

ہے کہ "ترقی کے لیے مکمل ماحول، مشقت اور عمدگی فقط اس پروگرام کے ذریعے آ سکتی ہے جس میں ہر فرد نئے رویّوں اور خیالات کو ترقی دینے اور قبول کرنے والا ہو۔"

تعلیم کو ترقی کے ساتھ جوڑیئے

بالآخر کوئی بھی تعلیمی پالیسی، خواہ وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ بنی ہو، کامیاب نہیں

ہو سکتی جب تک کہ اسے ملک کی مجموعی ترقیاتی حکمتِ عملی کے ساتھ مربوط نہ کیا جائے۔ جب تک آمدنیوں اور اُجرتوں سے متعلق ایک قومی پالیسی نہ ہو، پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کی تنخواہیں بڑھانے کا سوال حل نہیں کیا جا سکتا۔

لیے ایک ڈھانچہ فراہم کرے گی۔ لیکن سبھی ریاستوں میں یہ نہیں ہو رہا۔

اسکولی تعلیم، پیشہ ورانہ تعلیم نیز تعلیم بالغان کے لیے جن امور کی اشد ترین ضرورت ہے، انھیں مکمل طور پر لازماً پورا کیا جانا چاہیے۔

کوئی بھی تعلیمی پالیسی، خواہ وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ بنی ہو، کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ اسے مُلک کی مجموعی ترقیاتی حکمتِ عملی کے ساتھ مربوط نہ کیا جائے۔

جب تک مالی اور بشری ہر دو وسائل کے تعین کے معاملے میں پلان ترجیحات کو بدلنے کا ارادہ نہ ہو، پرائمری اور تعلیم بالغان کے

اور ملک کے مجموعی وسائل کے سیاق میں یہ ایک امرِ محال نہیں ہونا چاہیے۔

جب تک مالی اور بشری ہر دو وسائل کے تعیّن کے معاملے میں پلان ترجیحات کو بدلنے کا ارادہ نہ ہو، پرائمری اور تعلیم بالغان کے میدانوں میں پائی جانے والی مایوس کن صورتحال کو کسی بھی سوچ بچار سے مؤثر طور پر سلجھایا نہیں جا سکتا۔

میدانوں میں پائی جانے والی مایوس کن صورتِ حال کو کسی بھی سوچ بچار سے مؤثر طور پر سلجھایا نہیں جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ تعلیم کے لیے مالی وسائل کی کھوج کے لیے مرکز اور ریاستوں کا ایک مشترکہ کمیشن قائم کرنے کی تجویز سے مفید نتائج برآمد نہ ہوں۔ [illegible] منصوبہ بندی کے تحت وسائل کو مجتمع کرنے کا کام خانوں میں نہیں بانٹا جا سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ مقامی پیش قدمی اور عام لوگوں کی امداد کو حرکت میں لایا جائے۔ اس مقصد کے لیے ضلع پریشدوں، پنچایت یونینوں اور منڈل پنچائتوں جیسے جمہوری اداروں کے قیام سے لامرکزی منصوبہ بندی اور اقتدار کی لامرکزیت مقامی شرکت کے

بقیہ: اقدار کی حفاظت وقت کی ضرورت

اعلیٰ اقدار رہ سکیں۔ نوجوانوں میں تلاش و کا جذبہ پیدا کرنا ضروری ہے۔ انھیں قدرت پر فتح پانے اور خیالات کو نئے سرے سے سوچنے، سمجھنے اور پرکھنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ انھیں اپنے چاروں طرف محروم افراد اور معذور لوگوں کی مدد کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ سماجی خدمت کے پروگراموں سے یہ کام آگے بڑھ سکتا ہے۔ نئی نسل کے تعلیم یافتہ نوجوان کو روادار ہونا چاہیے اور اسے متبادل طریقوں پر سوچنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ کیوں کہ کوئی بھی فردِ واحد دنیا کی تمام دانشوری اور عقل نیز فہم و فراست کا مالک نہیں ہو سکتا۔

یہ وقت کام کرنے کا ہے

دنیا میں ترقی کا محور اب زمین اور صنعتی وسائل نہیں بلکہ انسانی وسائل بنتے جا رہے ہیں۔ زرعی تہذیب کے زمانے میں سارا زور زراعت پر تھا اور صنعتی دور میں قدرتی وسائل سے فائدہ اٹھانے پر زور تھا جو کہ مغربی تہذیب کی بنیاد ہے۔ لیکن جاپان میں انسانی وسائل سے فائدہ اٹھانے پر زیادہ زور دیا گیا۔ ہمارے یہاں مختلف طبقات ہیں، انسانوں کی ایک بھیڑ ہے۔ یہ اپنی ذہانت کے اعتبار سے دنیا کے کسی بھی خطے کے نوجوانوں کے برابر ہیں۔ لہٰذا ہمیں اس ذہنی قوت سے فائدہ اٹھانا ہے۔ ان کو قومی مقاصد کی تکمیل کی خاطر بامقصد طریقے پر آگے بڑھانا ہے۔ ناقص غذاؤں سے ان کی ذہنی قوتوں کو جو نقصانات پہونچتے ہیں، ان کو دور کرکے نئے ہندوستان کی تعمیر میں انھیں لگانا ہے۔ ہندوستان کے غریب عوام کے بچے جسمانی، ذہنی اور روحانی قوتوں کو آگے بڑھانے کے بے پناہ امکانات رکھتے ہیں لیکن ناقص غذاؤں نے ان کی ترقی کی راہ میں جو رکاوٹیں کھڑی کی ہیں، ان کو دور کرنا ہے۔ ہمارے تعلیمی نظام اور اس سے بننے والے نئے بھارت، کے ذریعے سے ہی مغرب اور جاپان کے چیلنجوں کا سامنا کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کے افکار و خیالات نے پوری دنیا کو متاثر کیا ہے۔ یونان کو چھوڑ کر کسی بھی ملک میں اس قدر دانشورانہ افکار سامنے نہیں آئے۔ چنانچہ ہندوستان کو نوجوانوں کی اس قوتِ فکر و عمل کو از سرِ نو بیدار کرکے اس قدیم ہندوستان کے مستقبل کی تعمیر عمل میں آ سکتی ہے۔ یہ ایک حقیقت پسندانہ اور عظیم ذمہ داری ہے اور اس کے انجام دینے کا یہی وقت ہے۔

پروفیسر اقبال نرائن

ناخواندگی کے خلاف عوام کو بیدار کیجیے

زیرِ نظر مضمون میں فاضل مصنف نے ملک میں وسیع پیمانے پر پائی جانے والی ناخواندگی کی وجوہات بیان کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اس وقت ملک کو ترقی کے راستے کی اس بڑی رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے ایک عوامی تحریک اور ایک صدقِ دل قیادت کی ضرورت ہے جو اسے صحیح سمت عطا کر سکے۔ ان کا کہنا ہے کہ "ہمیں تحریک آزادی کے دوسرے دور کے لیے ایک اور گاندھی کی ضرورت ہے۔ اس وقت رہنماؤں، سیاسی پارٹیوں اور عوام کو ایک چیلنج کا سامنا ہے اور اس کا مقابلہ کرنے کا موقع بھی ہے۔ کیا وہ اُٹھیں گے اور کچھ کر دکھائیں گے؟"

بھارت نے بطور ایک قوم کے اتنی خود اعتمادی حاصل کر لی ہے کہ وہ تعمیری انداز میں اپنی کمزوریوں اور خرابیوں کا تنقیدی جائزہ لے سکتا ہے۔ تنقیدی جائزوں کی ان مشقوں کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ غلطیوں کی اصلاح کر کے قومی تعمیر کی مساعی کو تیز تر کیا جائے۔ اور انھیں صحیح سمت دی جائے۔ اس کے لیے پہلے کے اندازِ فکر، پالیسیوں اور طریقِ عمل میں اصلاح کی جا سکتی ہے اور اگر ضروری ہو تو انھیں ترک بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات سمجھنے کے لیے مرکزی وزارت انسانی وسائل و ترقی (محکمۂ تعلیم) کی تازہ ترین دستاویز "تعلیم کا چیلنج: ایک حکمتِ عملی کا تناظر (۱۹۸۵) سے بہتر کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔ (اس مضمون میں آگے چل کر اس کا ذکر صرف دستاویز کہہ کر کیا جائیگا۔)

یہ دستاویز تعلیم کے شعبے میں نیچے سے اوپر کی طرف حکومت کی مساعی محدود کامیابیوں اور ناکامیوں کے بارے میں ایک اقبالیہ بیان، ایک سرکاری تنقید ہے۔ اور بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ ہمارے نوجوان، باعمل اور کشادہ ذہن وزیر اعظم کی دعوت پر اس بات کا موقع فراہم کرتی ہے کہ تعلیم کے موضوع پر ایک قومی بحث شروع کی جائے تاکہ نئی تعلیمی پالیسی نظریات اور عمل درآمد کے اعتبار سے ایک عوامی پالیسی بن سکے۔ یہ بحث، یہ تبادلۂ خیالات ہنوز جاری ہے۔ اور یہ مضمون اپنی محدود نوعیت کے باوجود اسی سلسلے کی ایک کوشش ہے۔

> **نوآبادیاتی حکومت سے عام ناخواندگی اور بالغان کی ناخواندگی کا جو مسئلہ ہمیں ورثے میں ملا تھا اس کے حدود بہت وسیع تھیں۔ لہذا یہ اُمید کرنا ایک غیر حقیقت پسندانہ بات تھی کہ کوئی حکومت بچوں کی ناخواندگی کے اتنے بڑے مسئلے کو دس سال کے اندر حل کرلے گی۔**

ناخواندگی کا مسئلہ

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ خواندگی اور تعلیم بالغان کے مختلف محاذوں پر اس وقت تک جو کوششیں کی گئی ہیں انھیں توقعات سے بہت کم کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ لیکن ایسا کہنے کا مطلب اس حقیقت سے انکار نہیں ہے کہ حصولِ آزادی کے بعد ملک میں تعلیم میں بہت بڑے پیمانے پر توسیع ہوئی ہے۔ لیکن اس توسیع کے باوجود خواندگی کی شرح ۱۹۵۰-۵۱ میں ۱۶٫۶۷ سے بڑھ کر ۱۹۸۲-۸۳ میں صرف ۲۳٫۵۷ تک ہی پہونچی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ملک میں مزدوروں میں نصف سے زیادہ اور عورتوں میں دو تہائی سے زیادہ تعداد ناخواندہ ہے۔

دیہی ہندستان میں صورت حال اور بھی ابتر ہے جہاں خواندگی کی شرح ۲۹٫۶۵ فیصد ہے جبکہ شہری علاقوں میں ۵۷٫۴۰ فیصد ہے۔ عورتوں میں اب بھی خواندگی کی شرح کم ہے بالخصوص آندھرا پردیش، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان، اڑیسہ اور اترپردیش کی مقابلتاً کم ترقی یافتہ ریاستوں میں جہاں خواندگی ملک کی کل آبادی کا ۷۷٫۵۲ فیصد ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جہاں جتنی زیادہ آبادی ہوگی وہاں خواندگی کی شرح اتنی ہی کم ہوگی اور خواتین میں تو اور بھی کم ہوگی۔ نتیجتاً وسیع پیمانے پر آبادی کی باقاعدہ، بے قاعدہ اور غیر رسمی تعلیم کی ضرورت پر زور دینا ہوگا۔ خاص کر دیہی ہندستان اور کم ترقی یافتہ ریاستوں میں موخرالذکر دو اقسام کی تعلیم پر۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں میں تعلیم کی شرح علی الترتیب ۲۱٫۳۸ فیصد اور ۱۶٫۳۵ فیصد ہے تو مایوسی کا احساس ہوتا ہے جب ہمیں یاد آتا ہے کہ اسکولوں میں "درجہ اول میں داخل ہونے والے ہر سو بچوں میں سے صرف ۲۳ بچے آٹھویں درجے تک پہونچتے ہیں اور باقی بیچ میں پڑھائی چھوڑ دیتے ہیں" (مذکورہ بالا دستاویز کے پیراگراف نمبر ۳٫۰۹ سے منقول)، تو تصویر اور بھی دھندلی نظر آتی ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارا حکمران طبقہ ہمارے آئین میں مندرج سرکاری پالیسی کے ہدایتی اصولوں کے آرٹیکل ۴۵ میں کیے گئے اس وعدے کو پورا کرنے میں ناکام رہا ہے کہ: "ریاست اس آئین کے نفاذ کے بعد دس

> **اگرچہ ملک سیاسی طور پر آزاد ہو گیا لیکن سماجی بہبود کے ہر کام جس میں تعلیم اور خواندگی بھی شامل ہیں، کے لیے حکومت پر انحصار رکھنے کی ذہنیت بدستور بنی رہی ہے۔**

> **اگر زیادہ وسیع پس منظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ عوام کی حکومت پر انحصار رکھنے کی اس ذہنیت کی وجہ یہ ہے کہ بھارت کی مختلف حکومتیں عوام کو قومی تعمیر کے کام میں عوام کو اسطرح شامل کرنے میں ناکام رہیں جسطرح مہاتما گاندھی نے جدوجہد آزادی کے دوران کیا تھا۔**

سال کے اندر اندر تمام بچوں کی، اُن کے ۱۴ سال کی عمر کو پہنچنے تک مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام کرنے کی کوشش کریگی۔"

بالغ اور بچے

اگرچہ آزادی کے بعد بالغ آبادی کی تعلیم میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا ہے، پھر بھی بلحاظ تعداد بالغ ناخواندگی میں مزید اضافے کا خطرہ موجود ہے۔ اگر ۱۹۵۱ء میں ۱۷۳،۵۷ ملین بالغ ناخواندہ تھے تو ۱۹۸۱ء میں ان کی تعداد ۲۴۵ ملین ہوگئی۔ دستاویز میں مندرج، عالمی بنک کے تخمینوں کے مطابق اِس تعداد کے ۲۰۰۰ء میں ۵۰۰ ملین ہو جانے کا احتمال ہے۔ اس طرح ۱۵ سے ۱۹ سال تک کی عمر کے زمرے میں، دُنیا کے ۵۴،۸ فیصد ناخواندہ افراد بھارت میں ہونگے۔

یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ ملک میں بالغان اور بچوں کی ناخواندگی کے درمیان ایک ٹھوس باہمی تعلق موجود ہے۔ شری جے۔ پی۔ نائک نے بھی کہا ہے کہ:۔

"پڑھے لکھے والدین اس بات کی بہترین گارنٹی ہوتے ہیں کہ ان کے بچے اسکول بھیجے جائیں گے۔ اور وہ وہاں پڑھیں گے نیز ان پر اتنی توجہ دی جائے گی کہ وہ اسکول میں اپنے داخلے اور حاضری سے پوری طرح مستفید ہو سکیں۔ دوسرے لفظوں میں والدین کی ناخواندگی اسکولوں میں بچوں کے داخلے اور ان کی تعلیم کے جاری رہنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہے۔ اسکول سے بچوں کے اٹھا لیے جانے یا ان کی تعلیم ادھوری یا ناقص رہ جانے کی بھی یہی سب سے بڑی وجہ ہے۔"

حکومت نے اشاعتِ تعلیم کے لیے جو کوششیں کیں انھیں بہت چھترے انداز میں پھیلانا پڑا کیونکہ بچوں کی تعداد گھنی اور پھیلی ہوئی تھی اور چیلنج بہت بڑا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نِکلا کہ پبلک اور پرائیویٹ اسکول پھلتے پھولتے رہے جن میں فیس وغیرہ زیادہ ہونے کے سبب صرف اعلیٰ طبقے کے لوگ اپنے بچوں کو پڑھا سکتے تھے۔

جتنا کچھ حکومت کر سکی وہ عوام، بالخصوص دیہی عوام کی ضروریات کے مطابق نہیں ہوا۔ دیہی ہندوستان میں چیلنج یہ تھا کہ بالغوں اور بچوں کو کیسے تعلیم دی جائے کہ وہ پڑھ بھی جائیں اور ان کی معمولی سی کمائی پر بھی اثر نہ پڑے۔

پانچ خامیاں

اگر اعداد و شمار پیش کیے جائیں تو یہ سلسلہ بہت طویل ہو جائے گا اور پھر اس کی ضرورت بھی نہیں ہے کیوں کہ بات صاف ہے اور پوری طرح ثابت ہو چکی ہے۔ اب تو وہ اسباب معلوم کرنے کی ضرورت ہے جن کی وجہ سے تصویر اتنی تاریک ہے۔ یہ اسباب ہیں:۔

(۱) نوآبادیاتی حکومت سے عام ناخواندگی اور بالغان کی ناخواندگی کا جو مسئلہ ہمیں ورثے میں ملا تھا اس کی حدود بہت وسیع تھیں۔ لہٰذا یہ اُمید کرنا ایک غیر حقیقت پسندانہ بات تھی کہ کوئی حکومت بچوں کی ناخواندگی کے اتنے بڑے مسئلے کو دس سال کے اندر حل کر لے گی۔ خاص کر اس لیے بھی کہ اُس وقت کی حکومت کے سامنے صرف یہی ایک مسئلہ تو تھا نہیں۔ تعلیم بالغان تو ایجنڈے کا ایک نیا اور اضافی مسئلہ تھا۔ اگرچہ یہ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، بچوں کی خواندگی کے سلسلے میں ایک بنیادی اہمیت کا حامل تھا۔

(۲) آبادی میں مسلسل اضافے سے ناخواندگی کا مسئلہ اور بھی زیادہ پیچیدہ ہو گیا۔ مثال کے طور پر ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ملک کی آبادی ۵۴،۸۲ کروڑ تھی جس میں سے ۴۳،۹۱

کروڑ دیہات میں اور ۱۰ء۱۹ کروڑ شہروں میں تھی۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری میں کل آبادی ۶۸ء۵۲ کروڑ ہو گئی جس میں سے ۵۲ء۵۵ کروڑ لوگ دیہات میں اور ۹۷ء۱۵ کروڑ شہروں میں تھے۔ لہٰذا یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ آبادی بڑھنے سے خواندگی کے محاذ پر حاصل کی گئی کامیابی بے اثر ہو گئی۔

(۳) اگرچہ ملک سیاسی طور پر آزاد ہو گیا لیکن عوام کی، سماجی بہبود کے ہر کام، جس میں تعلیم اور خواندگی بھی شامل ہیں، کے لیے حکومت پر انحصار رکھنے کی ذہنیت بدستور بنی رہی ہے۔ اگر زیادہ وسیع پس منظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ عوام کی حکومت پر انحصار رکھنے کی اس ذہنیت کی وجہ یہ ہے کہ بھارت کی مختلف حکومتیں عوام کو قومی تعمیر کے کام میں عوام کو اس طرح شامل کرنے میں ناکام رہی ہیں جس طرح مہاتما گاندھی نے جدوجہد آزادی کے دوران کیا تھا۔ اس ناکامی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب کبھی عوام کو قومی تعمیر کے کاموں میں بھرپور حصہ لینے کی دعوت دی گئی، تو اس کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ اگرچہ پرائمری اسکولوں اور حفظان صحت کے ابتدائی مراکز کا قیام دیہی ہندوستان کے عوام کی ترجیحی فہرست میں بھی شامل تھا۔

(۴) حکومت نے اشاعتِ تعلیم کے لیے جو کوششیں کیں انھیں بہت چھتر سے انداز میں پھیلانا پڑا کیوں کہ بچوں کی تعداد گھنی اور پھیلی ہوئی تھی۔ اور چیلنج بہت بڑا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پبلک اور پرائیویٹ اسکول پھلتے پھولتے رہے جن میں فیس وغیرہ زیادہ ہونے کے سبب صرف اعلیٰ طبقے کے لوگ ہی اپنے بچوں کو پڑھا سکتے تھے۔ اس طرح امیر اور غریب کے درمیان خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی جب کہ ملک سماج وادی طرز کا معاشرتی نظام قائم کرنے کا عہد دوہراتا رہا۔ اس پس منظر میں موجودہ وزیر اعظم کے ماڈل اسکول قائم کرنے اور سینٹرل اسکولوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے وعدے کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

(۵) جتنا کچھ حکومت کر سکی وہ عوام — بالخصوص دیہی عوام کی ضروریات کے مطابق نہیں ہوا۔ دیہی ہندوستان میں چیلنج یہ تھا کہ بالغوں اور بچوں کو کیسے تعلیم دی جاتی کہ وہ پڑھ بھی جاتیں اور ان کی معمولی سی کمائی پر بھی اثر نہ پڑے۔ اس کے لیے اس بات کی ضرورت تھی کہ دیہی عوام کے ضمیر کو خواندگی کے حق میں بیدار کیا جاتا۔ اور ساتھ ہی ساتھ

آزادی کے بعد کی مدت کی تاریخ ہمیں اس بات کا یقین دلانے کے لیے کافی ہے کہ قومی تعمیر کے کام کو صرف حکومت کی سرپرستی میں نہیں چھوڑا جا سکتا۔ یہ بات ناخواندگی اور تعلیم بالغان کے معاملے میں بھی لاگو ہوتی ہے ہمیں قومی تعمیر کی مساعی کو تقویت دینے اور ناخواندگی اور تعلیم بالغان کے چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے ایک اور ملک گیر عوامی تحریک کی ضرورت ہے۔

پروگرام کے لیے سرکاری عملی اور مالی امداد کی اتنی ہی اہمیت ہوگی جتنی انسانی جسم میں ریڑھ کی ہڈی کی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ طالب علموں، ٹیچروں، دیگر پیشوں کے لوگوں اور سرکاری ملازمین (ریٹائرڈ اور برسر ملازمت دونوں)، رضا کار اداروں کے اراکین اور کہنا چاہیئے کہ ان تمام شہریوں کو جو مطلوبہ صلاحیت رکھتے ہوں (اور یہ صلاحیت تو تربیتی پروگراموں کے ذریعے پیدا بھی کی جا سکتی ہے)، پروگرام پر عملدرآمد میں حصہ لینا چاہیئے۔

ان کی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اسکول سسٹم ایسا بنایا جائے کہ انھیں اسکول جانے کا وقت بھی مل جاتے اور اپنا کام کرنے کا بھی بگران دونوں ہی پہلوؤں کے اعتبار سے صورت حال میں کوئی تسلی بخش تبدیلی عمل میں نہیں آئی۔ گاؤں والوں کو اپنے بچوں کو پرائمری تعلیم نہ سہی صرف پڑھنا لکھنا سکھانے کی ضرورت کا احساس کرانے کے بھی بہت کم کوششیں کی گئی ہیں۔ بالغوں کے لیے، بلکہ بچوں کے لیے بھی پڑھائی کے ایسے اوقات ڈھونڈنے پڑیں گے جب وہ روزی روٹی کمانے میں مصروف نہ ہوں۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ ٹیچروں سے، خاص کر ان سے جو ایک ٹیچر والا اسکول چلاتے ہیں، رات کو بالغوں کی کلاس لینے کو بھی کہا جائے گا۔ قدرتی بات ہے کہ انھیں اس میں کوئی دلچسپی نہ ہوگی اور ایسی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔

> **خواندگی اور تعلیم بالغان کے جڑواں مسئلے کو حل کرنے کے لیے یہ بہتر ہوگا کہ تعلیمی ادارے گاؤں، قصبوں اور شہروں میں مشنریوں کے سے جوش و خروش کے ساتھ کام کریں۔ اس سے حکومت کی کوششوں میں بہت مدد ملے گی۔**

راستہ کیا ہے؟

پھر راستہ کیا ہے؟ اگرچہ مسئلے کی شناخت کرنے کی کوشش کرنا مسئلے کو حل کرنے کی تجاویز سمجھانے سے زیادہ آسان ہے، پھر بھی یہاں کچھ تجاویز پیش کی جا رہی ہیں چاہے وہ جیسی لائق ہوں۔

اصولی طور پر ہر ملک اور خاص کر تیسری دنیا کے کسی ملک کی تحریک آزادی کے دو دور ہوتے ہیں۔ ایک آزادی سے پہلے کا اور دوسرا آزادی کے بعد کا۔ آزادی سے پہلے کے دور کا نصب العین آزادی کا حصول تھا، جبکہ آزادی کے بعد کے دور کا نصب العین قوم کی تعمیر ہے جس کے معنی ہیں، بھوک، غریبی، بیماری، ناخواندگی وغیرہ کے خلاف جدوجہد۔ اعلیٰ طبقہ، خاص کر سیاست داں عوام کو ان دونوں نصب العینوں کے لیے حرکت میں لانے اور ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔

مہاتما گاندھی کی بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے عوام میں تحریک عمل پیدا کر کے ان کا تعاون حاصل کیا اور ایک ایسی تحریک، جو برگزیدہ طبقے تک محدود تھی کانگریس کے زیر سرپرستی آزادی کی ایک بہت بڑی عوامی تحریک میں بدل دیا۔ اگرچہ اس سے پیشتر بھی اس کی چھوٹی چھوٹی مثالیں دیکھنے میں آچکی تھیں۔

یہ عوامی تحریک ہے

لیکن یہ سلسلہ آزادی کے بعد کے دوسرے دور میں جاری نہ رہ سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قومی تعمیر کے چیلنج کا سامنا کرنے کی ذمہ داری بڑی حد تک حکومت پر چھوڑ دی گئی اور عوام سرگرم شرکائے کار کے بجائے دور بیٹھ کر نکتہ چینی کرنے والے نقاد بن گئے۔ تحریک آزادی کے دوسرے دور میں ان کی حمایت و تعاون حاصل کرنے کے لیے کوئی گاندھی نہ تھا۔ کانگریس خود کو ایک تحریک کے بجائے ایک سیاسی پارٹی بنانے میں لگ گئی اور آزادی سے پہلے کا قومی پلیٹ فارم کئی سیاسی پارٹیوں میں منقسم ہو گیا اور یہ سب پارٹیاں اقتدار میں آنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئیں۔ آزادی کے بعد کی مدت کی تاریخ ہمیں اس بات کا یقین دلانے کے لیے کافی ہے کہ قومی تعمیر کے کام کو صرف حکومت کی سرپرستی میں نہیں چھوڑا جا سکتا۔ یہ بات ناخواندگی اور تعلیم بالغان کے معاملے میں بھی لاگو ہوتی ہے۔ ہمیں قومی تعمیر کی مساعی کو تقویت دینے اور ناخواندگی اور تعلیم بالغان کے چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے ایک اور ملک گیر عوامی تحریک کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایک بار پھر ایک قومی پلیٹ فارم کی ضرورت ہے جہاں معاشرے کے تمام طبقات، اعلیٰ و ادنیٰ، امیر و غریب، ملازمت کرنے والے اور ملازمت سے سبکدوش افراد بلا لحاظ مذہب، ملت اور ذات پات یا خطے یا علاقے کی تفریق کے بغیر شانے سے شانہ ملا کر تعلیم کے چیلنج کا بالعموم اور ناخواندگی اور تعلیم بالغان کی چنوتی کا بالخصوص پُرزور مقابلہ کر سکیں۔ مختصر یہ کہ اس وقت ایک عوامی

تحریک کی ضرورت ہے جس کی رہنمائی ایک ایسی
پُرخلوص اور پابندِ قول قیادت کے ہاتھوں میں
ہو جو اسے صحیح سمت عطا کر سکے اور عوام کو اس
تحریک کی ریڑھ کی ہڈی بنا سکے، ایک جملے میں
اسے یوں کہا جا سکتا ہے کہ خواندگی اور تعلیم
بالغان کے لیے ایک عوامی تحریک وقت کی
ایک اہم ضرورت ہے۔ ہمیں تحریک آزادی
کے دوسرے دور کے لیے ایک اور گاندھی چاہیے
اس وقت رہنماؤں
سیاسی پارٹیوں
اور عوام کو ایک
چیلنج کا سامنا ہے
اور اس کا مقابلہ کرنے
کا موقع بھی ہے۔ کیا
وہ اٹھیں گے اور کچھ کر
دکھائیں گے؟

اختیار کیا جانا چاہیے۔ پروگرام کے لیے سرکاری
عمل اور مالی امداد کی اتنی ہی اہمیت ہوگی
جتنی انسانی جسم میں ریڑھ کی ہڈی کی ہوتی ہے
اس کے علاوہ طالب علموں، ٹیچروں، دیگر پیشوں
کے لوگوں اور سرکاری ملازمین (ریٹائرڈ اور
برسرِ ملازمت دونوں)، رضا کار اداروں کے
اراکین اور کہنا چاہیے کہ ان تمام شہریوں کو
جو مطلوبہ صلاحیت رکھتے ہوں (اور یہ صلاحیت
تو تربیتی پروگراموں کے ذریعے پیدا بھی کی

۳۔ پڑھنا لکھنا سکھانے والوں میں ضروری
مہارت پیدا کرنا۔
۴۔ سیکھنے والوں میں مسائل کو حل کرنے
کی قابلیت پیدا کرنا۔
۵۔ ریکارڈ رکھنا اور پڑھنا لکھنا سیکھنے
والوں نے کیا پڑھا، کیا سیکھا، اس کا جائزہ
لیتے رہنا تاکہ انھیں پڑھائی جاری رکھنے میں
مدد دی جا سکے۔
(انڈین ایکسپریس ۲ر نومبر ۱۹۸۵ء)

یہ محض ایک مثال ہے۔ کیوں کہ ان
کے رول اور تربیت کے نصاب کو
خواندگی اور تعلیم بالغان کے بارے
میں کیے گئے مختلف مطالعات
سے حاصل شدہ حقیقی
تجربات کی روشنی میں
اور بڑھایا جا سکتا
ہے۔ اس بات
سے انکار نہیں کیا
جا سکتا کہ پروگرام کے
مقاصد اور انسٹرکٹروں
کے رول کے بارے میں
ذہن کا صاف ہونا بہت ضروری ہے۔

**چوں کہ ہمارے تعلیمی نظام میں امتحانات کی
بڑی اہمیت ہے اس لیے اگر طلبا کو خواندگی اور تعلیم
بالغان کے شعبے میں کام کرنے کے لیے امتحان میں کریڈٹ
دیا جائے تو اس سے کوئی نقصان نہ ہوگا لیکن یہ کریڈٹ
سختی سے اس بات کی جانچ کرنے کے بعد ہی دیا
جانا چاہیے کہ انھوں نے واقعی اچھا کام کیا ہے۔**

اگر اسے موضوع سے
انحراف نہ سمجھا جائے تو میں یہ بتانا
چاہوں گا کہ تیسری دنیا کے ملکوں میں ہمیں
مختلف قسم کی سیاسی پارٹیوں کی ضرورت
ہے یعنی ایسی پارٹیوں کی جو پارٹیاں بھی ہوں
اور تحریک بھی۔ ہمارے یہاں آزادی سے قبل
جو قومی تحریک تھی وہ اب سیاسی پارٹیوں کی
شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ کانگریس اور
دوسری سیاسی پارٹیوں میں بھی یہ رجحان پیدا
ہو رہا ہے۔

مشنریوں کا سا جوش چاہیے

آخری بات یہ کہ عوام کو خواندگی اور
تعلیم بالغان کی اہمیت کا احساس کرا سکنے
والی عوامی تحریک اور مطلوبہ تبدیلی لا سکنے والے
ذرائع کے بارے میں ایک نیا نقطۂ نگاہ

جا سکتی ہے) پروگرام
پر عمل درآمد میں حصہ لینا چاہیے۔ اس کے لیے
یہ طے کرنا ضروری ہوگا کہ انسٹرکٹروں کو کیا کرنا
ہے۔ چھٹی یونیسکو ریجنل ورکشاپ (جس میں
ایشیا اور بحرالکاہل کے خطے کے دس ملکوں
نے حصہ لیا تھا) کی آخری رپورٹ کے مسودے
میں انسٹرکٹروں کے فرائض یوں بیان کیے
گئے ہیں:-
۱۔ تعلیم بالغان کا پروگرام شروع کرنے
کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنا۔
۲۔ تعلیم بالغان کے مراکز منظم کرنا۔

اگر اسے تجاوز نہ سمجھا جائے تو میں یہ
کہنا چاہوں گا کہ قومی تعمیر کے چیلنج کا پوری طرح
مقابلہ کرنے کے لیے تعلیمی اداروں اور سماج
کے درمیان باہمی ربط پیدا کرنا ضروری ہے۔
خواندگی اور تعلیم بالغان کے قومی مسئلے کو حل
کرنے کے لیے یہ بہتر ہوگا کہ تعلیمی ادارے
گاؤں، قصبوں اور شہروں میں مشنریوں کے
سے جوش و خروش کے ساتھ کام کریں۔ اس
سے حکومت کی کوششوں میں بہت مدد
ملے گی۔

یکم تا ۱۳ر جنوری ۱۹۸۶

صحیح تو یہ ہے کہ قومی تعمیر کے کام میں اور خاص کر خواندگی اور تعلیم بالغان کے لیے ٹیچروں اور طالب علموں کی جگہ کوئی اور نہیں لے سکتا۔ لہٰذا میری تجویز ہے کہ انھیں اس کام میں زیادہ سے زیادہ شریک کیا جائے۔ چونکہ ہمارے تعلیمی نظام میں امتحانات کی بڑی اہمیت ہے اس لیے اگر طلبا کو خواندگی اور تعلیم بالغان کے شعبے میں کام کرنے کے لیے امتحان میں کریڈٹ دیا جائے۔ تو اس سے کوئی نقصان نہ ہوگا لیکن یہ کریڈٹ سختی سے اس بات کی جانچ کرنے کے بعد ہی دیا جانا چاہیے کہ انھوں نے واقعی اچھا کام کیا ہے۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ ایک ہی جگہ پر ایک ہی کام ایک سے زیادہ ایجنسیاں نہ کریں۔ دیہی علاقوں میں عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ مختلف ایجنسیاں ایک ہی جگہ ایک ہی جیسا کام کر رہی ہوتی ہیں۔ اس سے یہ ہوتا ہے کہ کچھ جگہوں پر ضرورت سے زیادہ کام ہو جاتا ہے اور کچھ جگہوں پر کم ہوتا ہے یا بالکل نہیں ہوتا۔ اس سے پروگرام پر اثر پڑتا ہے۔

اَمِٹ چھاپ چھوڑیے

اور بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ کوششیں صرف کوششیں ہی نظر نہ آئیں بلکہ دلوں پر خلوص اور صداقت دلی کی چھاپ چھوڑیں اور ان کا اثر دیر تک بنا رہے۔ اس کے لیے حقیقت پسندانہ پلاننگ، مطلوبہ انسانی و مادی وسائل کی تخصیص، غیر سرکاری ذرائع سے امداد، لامرکزیت سے متصف پنچایتی راج، کوآپریٹو اور رضاکار انجمنیں ضروری ہوں گی اور سب سے زیادہ اہم بات یہ ہوگی کہ جو کام کیا جا رہا ہے اس کی لگاتار مانیٹرنگ (Monitoring) کی جائے۔ اور یہ مانیٹرنگ آزاد تعمیری ایجنسیوں کے ذریعے ہونی چاہیے۔

اگر یہ سب کیا جائے تو خواندگی اور تعلیم بالغان کا قومی مسئلہ، جو حل ہونے میں نہیں آرہا ہے۔ عوام کے تعاون اور بھرپور قومی کوششوں سے جنھیں سیاسی رنگ نہ دیا گیا ہو، اس صدی کے آخر تک بڑی حد تک حل ہو سکتا ہے۔ خواندگی اور تعلیم بالغان کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں مختلف سیاسی پارٹیوں اور بارسوخ گروہوں کے درمیان مکمل اتفاق رائے ہونا چاہیے۔ انھیں اپنے تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر قوم کے وسیع تر مفاد کے لیے شانے سے شانہ ملا کر اس چیلنج کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ قوم کی زندگی میں ایسے موقعے بھی آتے ہیں اور ایسے اسباب بھی پیدا ہوتے ہیں جب برگزیدہ سیاسی گروہوں اور سیاسی پارٹیوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے اپنے محدود مفادات اور نظریاتی اختلافات سے اوپر اٹھ کر قومی تعمیر کے وسیع تر مفاد کے لیے تعاون کا ہاتھ بڑھائیں اور آج کے حالات میں شائد خواندگی اور تعلیم بالغان کی توسیع کے سوال سے زیادہ اہم کوئی اور بات نہیں ہوگی۔

بقیہ، ضرورت ہے کام کرنے کے ارادے کی

طور پر کوئی عمل نہ ہو وہ بہت برا ہے۔ کیونکہ اس سے امیدیں پیدا کر کے انھیں پورا نہ کرنے سے مایوسی ہی پیدا ہوتی ہے۔ وقت مسئلے کا تجویز ہے۔۔۔۔"

عمل کی نیت۔ ایک چیلنج

اسے معلوم ہونا چاہیے کہ جب ایک بار آزمائشی طور پر کسی پالیسی کا خاکہ مرتب ہو جاتا ہے اور اس کے مطابق ایک ایسا منصوبہ بنایا جاتا ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تعلیم میں کونسی تبدیلیاں اور متعلقہ وزارتوں، محکموں، روزگار کے ڈھانچوں وغیرہ میں کون سی تبدیلیاں درکار ہیں تو اسکے بعد متعلقہ گروپوں سے اعلیٰ سطح پر گہرے تبادلۂ خیال کی ضرورت ہوگی۔ تب ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ پالیسی اور اس پر عمل کی اسکیم کو اتفاق سے حمایت حاصل ہے۔ اس صورت میں تمام وزارتیں اور محکمے سرکاری اور نجی صنعت تعلیم کے نئے ڈھانچے کی پابند ہوگی۔ مرکز اور ریاستوں کے تعلقات کا سوال بار بار اٹھنا لازم ہے لیکن مباحثے میں شریک ہونے والوں کو یہ یقین دلانا ضروری ہے کہ تعلیم کا جو ڈھانچہ تیار کیا جا رہا ہے، اس سے سب کو فائدہ پہنچے گا۔ اور اس پر مقصد کی اسی یکسوئی سے عمل ہوگا جیسے کہ ملک کی سلامتی اور دفاع کے معاملے میں ہوتا ہے۔ لہٰذا امید کی جاتی ہے کہ تعلیم کے بارے میں وزیر اعظم کی گہری تشویش اور اس شعبے کے بارے میں انسانی وسائل کے فروغ کے مرکزی وزیر واضح خیالات کی بدولت اس تمام تر عمل کو ایسے نتیجے پر لا سکیں گے، جس سے ہمیں ایسی تعلیم حاصل ہوگی جس کے دعا سے ہم گذشتہ چالیس برس سے گزر رہے ہیں۔ ایک اتنی بڑی تبدیلی کے منصوبے کو مرتب کر کے اس پر عمل کرنا بجائے خود جمہوری نظام کی صلاحیت کے لیے ایک چیلنج ہے۔

پروفیسر اُپیندر بخشی

تعلیم بالغان کے لیے گریجویٹوں کی جبری بھرتی

پروفیسر بخشی کے بیان کے مطابق ناخواندگی ۲۱ ویں صدی کی جانب پیش قدمی میں رکاوٹ ہے۔ اُنھوں نے تحریر کیا ہے کہ تعلیم بالغان کے پروگرام کے لیے ملک کے تمام گریجویٹوں کی جبری بھرتی کی جائے اگر خواندگی کو ترقی اور بقاء کے لیے لازمی تصور کیا جاتا ہے جیسا کہ نئی تعلیمی پالیسی میں کہا گیا ہے۔ اُن کی رائے میں یہ دستاویز موجودہ نظامِ تعلیم پر تمام نکتہ چینیوں کو جائز تسلیم کرتی ہے اور اس میں محض مسائل اور تجاویز کی از سرِ نو قواعد بندی کی گئی ہے۔ اس میں آئین کے اُن مقاصد کو بھی نظر انداز کیا گیا ہے جس میں سوشلسٹ طرز کے ڈھانچے کا قیام کرنے کو کہا گیا ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی جسے اب ہمیں انسانی وسائل کی نئی ترقیاتی پالیسی کا نام دینا ہوگا ایک قابلِ تعریف پالیسی ہے۔ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے کسی کو بھی ہوائی جہاز کے اُترنے کے وقت کاک پٹ سے کیے جانیوالے اعلان کی یاد آجاتی ہے جس میں کیبن عملہ کو دروازوں سے تمام رُکاوٹوں کو ہٹانے کو کہا جاتا ہے۔ اس دستاویز میں کچھ ایسا ہی کہا گیا ہے۔ بار بار ایمانداری سے تسلیم کرتے ہوئے کہ تمام نکتہ چینیاں جائز ہیں نقادوں کے دماغ سے تمام تعلیمی پالیسیوں کو ہٹا دیا گیا ہے اور اس طرح سلامتی کا پاس کیا گیا ہے کیوں کہ بقول شیخ سعدیؒ "اگر خواہی سلامت برکنا راست۔"

نئی تعلیمی پالیسی کی دستاویز کا موزوں طور پر عنوان رکھا گیا ہے "تعلیم کا چیلنج" اور

اسس کا ذیلی عنوان ہے۔ (ایک حکمت عملی کا تناظر)

صدی کی جانب نہیں بڑھے گا اگر ناخواندگی کو دور
نہیں کیا جاتا اور عالمگیر خواندگی کا ماحول پیدا

کے اقوال کا مطالعہ نہیں کیا۔ اس لیے وہ ایسے
بچکانہ کلمات پر ہی مطمئن ہو گئے ہیں۔" ایسا
محسوس ہوتا ہے کہ رضاکار اداروں کو تحریک میں اہم
کردار ادا کرنا ہے لیکن یہ کردار کیوں کر ادا کیا
جا سکتا ہے۔ یہ ایک متنازعہ فیہ سوال ہے"۔
چنانچہ ملک کیا بحث کرے گا؟ ایک متنازعہ فیہ
سوال؟ اگر حقیقی مسئلہ یہ ہے کہ تعلیم بالغان کا
کون محرک ہو سکتا ہے تو پالیسی تناظر کے ذریعے یہ
کہنا کوئی جواب نہیں ہے کہ "یہ متنازعہ فیہ سوال
ہے۔ بعض جوابات دئیے جانے چاہئیں تھے خواہ
وہ متنازعہ فیہ ہوتے۔

چوں کہ یونیورسٹیوں کو ڈگریاں منسوخ کرنے کا اختیار ہے۔ اس لیے حصول آزادی کے بعد بھارتی یونیورسٹیوں کے تمام گریجویٹوں کو ماسوائے اُن کے جو معمر یا جسمانی طور پر معذور ہیں تعلیم بالغان کے پروگراموں میں لازمی حصہ لینا چاہئیے اور جو ایسا نہ کرے اُس کی ڈگریاں منسوخ کر دینی چاہئیں۔

جو گمراہ کن توقعات پیدا کرتا ہے۔ یہ ایک
تناظر نہیں ہے اگر بلاشبہ خود چیلنج کو تسلیم
کرتے ہوئے اُسے ایک پالیسی تناظر تصور نہ
کیا جائے۔

نہیں کیا جاتا۔ (اس سے یہ سوچنا ممکن ہو جاتا ہے
کہ ملک ایک ٹانگ پر یا بیساکھیوں کی مدد سے
بھی آگے بڑھ سکتا ہے)، اگر ایسی بات ہے تو نئی
تعلیمی پالیسی کی تشکیل میں پہلے

مثال کے طور پر بھارت میں ہر خواندہ شخص
بالغوں کو تعلیم دینے کے لیے جبراً بھرتی کیا جا
سکتا تھا۔ کسی بھی طالب علم کو تعلیمی پروگراموں
میں لازمی شرکت کے بغیر ڈگری سرٹیفکیٹ نہیں
دیا جانا چاہئیے۔ چونکہ یونیورسٹیوں کو ڈگریاں
منسوخ کرنے کا اختیار ہے اس

مثال کے طور پر تعلیم بالغان اور عملی
تعلیم کا تجزیہ کیجئے۔ یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ
۲۰۰۰ء میں بھارت میں ۵۰ کروڑ افراد ناخواندہ
ہوں گے اور کہ اتنے بڑے پیمانے کی ناخواندگی
۲۱ویں صدی کی جانب پیش قدمی میں رکاوٹ
ہوگی۔ نئی دستاویز میں کہا گیا ہے کہ "غور سے
سوچنے" کے بعد ہمیں ہمیشہ کے لیے فیصلہ کر
لینا چاہئیے کہ کیا یہ ادراک" بھارت کے لیے جائز
ہوگا کہ ناخواندگی کا تدارک سیاسی فیصلہ سازی
اور قومی تعمیر کے عمل میں عوام کی پُر معنی شرکت
کی ایک لازمی شرط ہے۔ دوسرے الفاظ میں
رپورٹ کے مصنفین کو یقین نہیں ہے کہ یہ پالیسی
تناظر ہے۔

جس امر کی ضرورت ہے وہ طلبا اور ٹیچروں کے جمہوری حقوق کو کچلنا نہیں بلکہ وہ ہے نظام میں کلیدی افسران کی تقرری۔ خواہ وہ وائس چانسلر، اسکول بورڈوں کے ممبر، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیئرمین اور ممبر ہوں یا این سی ای آر ٹی کا معاملہ ہو۔ محض علمی رُتبے اور ذاتی ایمانداری کے لحاظ سے تقرری کی جانی چاہئیے۔

بعد میں انجام کار نئی
تعلیمی پالیسی زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ خواندگی
"ترقی اور بقا کے لیے ابتدائی شرط ہے"۔ یہ
ایک صداقت ہے کہ ملک دو ٹانگوں پر ۲۱ویں

ہچکچاہٹ سے کام کیوں لیا گیا تھا؟

ناخواندگی کا تدارک لازمی

تو کیا کیا جائے؟ نئی تعلیمی پالیسی
کے مصنفوں نے بظاہر اس عنوان سے لینن

لیے حصول آزادی کے بعد بھارتی یونیورسٹیوں
کے تمام گریجویٹوں کو ماسوائے اُن کے جو معمر
اور جسمانی طور پر معذور ہیں، تعلیم بالغان کے
پروگراموں میں لازمی حصہ لینا چاہئیے۔ اور جو ایسا

ذکرے اُس کی ڈگریاں منسوخ کردینی چاہئیں۔ اگر خواندگی ملک کی ترقی اور بقا کے لیے لازمی ہے تو یقیناً خواندہ بھارتیوں سے ایسی مانگ کرنا بہت بڑی بات نہیں ہے۔ اگر بالغ بھارتیوں کو ملکی سلامتی کے تحفظ کے لیے جنگ کے دنوں میں جبراً بھرتی کیا جاسکتا ہے تو ناخواندگی کے خلاف جنگ میں اُنھیں جبراً بھرتی کیوں نہیں کیا جاسکتا ہے؟۔

سیاست کاری ایک رکاوٹ

آؤ ہم ایک اور مثال کا ذکر کریں۔ نئی تعلیمی پالیسی میں تعلیم کی بدعنوانیوں اور سیاست کاری کو تسلیم کرلیا گیا ہے۔ اس میں اس امر پر اظہار افسوس کیا گیا ہے کہ ٹیچر بھاری تعداد میں ٹیوشن کر کے اور اسکولی اوقات میں تعلیمی فرائض کو نظرانداز کر کے بھاری رقوم پیدا کر رہے ہیں۔ اس میں وقتاً فوقتاً ہونے والے امتحانی اسکینڈلوں کا ذکر کیا گیا ہے لیکن یہ کہا گیا ہے کہ ان بُرائیوں پر قابو پانا "مشکل" ہے۔

کیوں؟ سیاست کاری کی وجہ سے اور سیاست کاری تعلیمی اصلاحات میں شدید اندرونی رکاوٹ ڈالتی ہے۔ دستاویز کے مصنفین کے مطابق تعلیم کو سیاسی پھندے سے نکالنے کا مطلب یہ ہوگا کہ "بیشتر سیاسی پارٹیاں اپنے کارکنوں سے محروم ہوجائیں گی اور انھیں معلوم نہیں ہوگا کہ وہ انتخابات لڑنے، مظاہروں، پروٹسٹ، مارچوں اور جلوسوں میں شرکت کے لیے اپنی افرادی قوت کہاں سے لائیں گی"۔ اس کے علاوہ سیاست کا پھندا ختم ہونے سے اُن لوگوں کا کیریئر بھی ختم ہو جائے گا۔ جو ریسرچ اسکالروں اور ٹیچروں کے طور پر مشکوک سندوں کے مالک ہیں۔

اس رکاوٹ کو کیونکر ختم کیا جائے؟ نئی تعلیمی پالیسی میں سفارش کی گئی ہے کہ کیمپس میں سیاست پر دانشورانہ بحث کی آزادی ہونی چاہیے۔ تقریر، اظہارِ خیال، ضمیر اور اجتماع وغیرہ کی آزادی کے بنیادی حقوق کا استعمال اعلیٰ دانشوری کا دشمن تصور کیا جاتا ہے۔ ادارتی سیاست کو محض منفی انداز میں دیکھا جاتا ہے۔ جو کچھ وسیع طور پر معاشرے کے لیے اچھا ہوسکتا ہے وہ تعلیمی اداروں کے لیے اچھا نہیں ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی کی محض منطق "تعلیم میں" جمہوریت مردہ باد ہے۔ یہ ایک پالیسی تناظر ہے یا پولیس تناظر؟

ملک سے "پالیسی" کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اس میں محض مسائل اور تجاویز کی از سرِ نو قواعد بندی کی گئی ہے۔ اس میں خوش فہمی اور لااُبالی ہے۔ یہ عوامی تعلیم سے اپنے متکبرانہ سلوک اور "سیاست کاری" سے متعلق اپنے جبلّی جمہوریت دشمن رویّہ کی وجہ سے خطرناک بھی ہے۔ یہ آئین سے آنکھیں موندنے کی وجہ سے بھی خطرناک ہے۔

غیر جانبدارانہ تقرریاں اہم

یقیناً سیاسی اغراض کے لیے یونیورسٹی نظامت کا استعمال اور اس عمل میں یہ خیال پیدا کرنا کہ علم اقتدار سے حاصل ہوتا ہے غلط اور نقصان دہ ہے۔ جس امر کی ضرورت ہے وہ طلبا اور ٹیچروں کے جمہوری حقوق کو کچلنا نہیں بلکہ وہ ہے نظام میں کلیدی افسران کی تقرری ـ خواہ وہ وائس چانسلر، اسکول بورڈوں کے ممبر، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیئرمین اور ممبر ہوں یا این سی ای آر ٹی کا معاملہ ہو۔ محض علمی رتبے اور ذاتی ایمانداری کے لحاظ سے کی جانی چاہیئے۔ اس کے علاوہ امدادی یا ترقیاتی عطیات کی منظوری یا تقسیم میں اختیار تمیزی کا عنصر جو سیاسی محتاجی پیدا کرتا ہے وہ بھی ختم کیا جانا چاہیئے۔

لیکن "یونیورسٹی کا انتظامیہ سسٹم کسی سیاسی پارٹی کے مقاصد کے لیے استعمال نہیں کیا جانا چاہیئے اور نہ ہی اس میں کوئی تخریب کاری کرنی چاہیئے۔ لیکن رپورٹ میں یہ نہیں بتایا گیا کہ انتظامیہ سسٹم (خواہ اسکول بورڈ ہوں یا وائس چانسلر) کیوں کر مقرر کیا جائے جس سے وہ پارٹی سیاست سے بالاتر رہیں اور امدادی عطیات یا ترقیاتی عطیات کے انتظامی نظام کو سیاسی پھندے سے کیوں کر الگ رکھا جائے۔

چوں کہ ایسا نہیں کیا گیا اس لیے رپورٹ نے خوفناک جمہوریت شکن رُخ اختیار کرلیا ہے۔

آئین سے رہنمائی لیجیے

نئی تعلیمی پالیسی کے مصنفوں کو محض یہ علم ہے کہ بھارت کے آئین کی فہرست میں تعلیم کے بارے میں قانون وضع کرنے کے اختیارات ہیں

اور کہ ابتدائی تعلیم کو عالمگیر بنانے کے بارے میں مملکت کیلئے پالیسی بنانے کا ہدایتی اصول بھی موجود ہے۔ وہ تعلیم میں "عمدگی"، "وسائل"، "معیار" یا "انتظام" لانے میں مساوات، بھائی چارہ، آزادی اور انصاف کی اقدار کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ تعلیمی نظام میں "نظم و ضبط" اور جوابدہی سے متعلق اپنے تصورات کی بنیاد کے طور پر بھارت کے شہریوں کے بنیادی فرائض کو قبول نہیں کرتے۔ جنھوں نے اب تشریح کی ہے کہ سیاست سے ہم سب کی مراد کیا ہونی چاہیئے، وہ نہیں جانتے کہ ہمارا آئین سوشلسٹ طرز کا ہے۔ کم از کم ۱۹۷۶ کے بعد سے جبکہ اس کی تمہید میں ترمیم کی گئی تھی۔ وہ آرٹیکل ۳۰ کا بھی کوئی خیال نہیں کرتے جس میں ثقافتی اقلیتوں کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور چلانے کا تحفظ دیا گیا ہے۔ یا پسماندہ طبقوں کے لیے تعلیمی ریزرویشن کی پالیسیوں اور پروگراموں کو بامعنی اور مؤثر بنانے کو کہا گیا ہے اور نہ ہی ہدایتی اصولوں میں اُس دفعہ کا خیال کیا جاتا ہے۔ جس میں معاشرے کے کمزور طبقوں کی طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت کا ذکر کیا گیا ہے۔

مزید چرچا کرنا بے معنی ہے۔ ملک سے ایک "پالیسی" کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اس میں محض مسائل اور تجاویز کی از سرِ نو قواعد بندی کی گئی ہے۔ اس میں خوش فہمی اور لاابالی ہے۔ یہ عوامی تعلیم سے اپنے متکبرانہ سلوک اور "سیاست کاری" سے متعلق اپنے جبلّی جمہوریت دشمن رویہ کی وجہ سے خطرناک بھی ہے۔ یہ آئین سے آنکھیں مُوندنے کی وجہ سے بھی خطرناک ہے۔ آؤ ہم اُمید کریں کہ اس کے بعد جو قومی بحث ہوگی اُس میں ایک ایسی پالیسی کا ڈھانچہ مہیا کیا جائیگا جس کے بارے میں خیال کیا گیا تھا کہ وہ نئی تعلیمی پالیسی کی طرف سے مہیا کیا جائیگا۔ ●

بقیہ، تعلیم میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت

تحقیق کو لازمی قرار دئیے جانے سے تحقیق کی کوالٹی گھٹ گئی ہے۔ لہٰذا ایک ایسی پالیسی وضع کرنے کی ضرورت ہے جس سے یہ یقینی ہو جائے کہ تحقیق اعلیٰ درجے کی ہوگی۔

۲۔ تحقیقی اداروں کا رول اور تعلیم کی عام اسکیموں میں ان کا مقام طے کرنا ضروری ہے۔ یونیورسٹیوں، حکومت اور سماج کے ساتھ ان کے رشتوں کی وضاحت بھی کر دی جانی چاہیئے۔ تحقیقی اداروں کو تعلیم کے عام دھارے سے الگ تھلگ رکھنے سے نہ صرف یونیورسٹیوں کے عملے اور وسائل میں کمی آئی ہے بلکہ یہ خود ان اداروں کے لیے بھی فائدہ مند نہیں ہے۔ اگرچہ پرائیویٹ یا غیر سرکاری کوششوں سے تحقیقی اداروں کا قائم کیا جانا قابلِ تعریف بات ہے لیکن ان کے ضمن میں یہ ضروری ہے کہ سند یا سرٹیفکیٹ دینے کا طریقہ شروع کرکے اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ ان کا کام معیاری ہوگا۔

۳۔ یہ بھی ضروری ہے کہ تحقیقی جائزوں کے نتائج کا حکومت اور تحقیق کرانے والی ایجنسیاں پورا پورا استعمال کریں۔

مفید مطلب حقائق و معلومات کیسے جمع کی جائیں اور مختلف ایجنسیاں انھیں کسطرح فائدہ مند طریقے سے استعمال کریں۔ اس بارے میں بھی مفصّل غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے۔ اطلاقی ریسرچ یا تحقیق ایک فضول اور بیکار مشق ہو کر رہ جائے گی اگر اس کے نتائج پر گرد جمتی رہے اور ان کا فائدہ مند استعمال نہ ہو۔ ان تمام باتوں اور ایسے ہی دیگر متعلقہ وسائل پر بڑا احتیاط بحث کی ضرورت ہے۔ اگر تحقیق اور تحقیقی اداروں کو قومی تعلیمی پالیسی میں کوئی جگہ نہیں دی جاتی تو یہ تعلیم کی توسیع کی کوششوں میں ایک بڑی بھول ہوگی۔ ●

بقیہ، اِس نابرابری کو ختم کیجیے

بہتر علم اور سازوسامان سے پوری کی جاسکتی ہیں اور جو تحصیلِ علم کی عادت پیدا کریں گے۔ ایسے سماج کے بغیر تاحیات علم کی بات محض رسمی بن جاتی ہے۔

لیکن جہاں علم کو کسی چنوتی کا مقابلہ کرنے کی ضرورت نہیں وہاں وہ کسی تردد کے بغیر کم از کم تفریح کی صورت میں دیا جاسکتا ہے اور دیا ہوگا۔ یہ نہ ہونے سے بہتر ہوگا دُور درشن پر پہلے ہی سوال و جواب سے لے کر (LIVING PLANET) اور (SURVIVAL) (CIVILIZATION) وغیرہ کے سلسلوں کے پروگرام دکھائے جا رہے ہیں۔ جس سے ہمارے سماج کو تعلیم دینے میں بڑی مدد ملی ہے۔ ایسی باتوں سے میں بہتری کی جاسکتی ہے۔ اُن میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اور اُنھیں تعلیم جاری رکھنے کا زیادہ مؤثر ذریعہ بنایا جاسکتا ہے جو انجام کار ایک ایسے چنوتی دینے والے سماج کی تعمیر میں مدد دے سکتا ہے جو بدلے میں ایک خواندہ سماج کی جانب لے جائے گا۔

ڈاکٹر امریک سنگھ

اساتذہ میں لگن ہونی چاہیئے

مضمون نگار کی رائے ہے کہ تعلیمی پالیسی کی کامیابی کے لیے اُستاد یا معلّم ایک ایسا شخص ہونا چاہیئے جس کا پیشے کے تئیں خلوص، تعلیم پانیوالوں میں دلچسپی بڑھانے کی خواہش اور تنظیم کی قابلیت کے بارے میں درست رجحان ہو۔ تدریس اُس کے لیے محض پیشہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اُس نے جو بھی تعلیمی شعبہ اختیار کیا ہے اُس میں اُس کی دلچسپی سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ مضمون نگار کا خیال ہے کہ پالیسی بنانے کے عمل میں ماہرینِ تعلیم کا اشتراکِ عمل حاصل کرنا اور سرکاری طریقہ یعنی افسروں کے ذریعہ حکمتِ عملی کی تشکیل کے زہریلے اثرات کو کم کرنا مناسب ہوگا۔

یہ فرض کیا جارہا ہے کہ جو کوششیں کی جارہی ہیں اُن کے نتیجے کے طور پر صحیح ڈھنگ کی تعلیمی پالیسی بن جائے گی لیکن یہ سوال اب بھی باقی ہے کہ اس کو کس طرح عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ ایک رکاوٹ وسائل کی کمی ہو سکتی ہے۔ اگر دلیل کے طور پر مان بھی لیا جائے کہ مطلوبہ رقوم حاصل ہو جائیں گی پھر بھی کیا یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ طے پایا ہے اُسے عمل میں لایا جا سکے گا۔

فرض شناس اساتذہ۔ سب سے بڑی ضرورت :۔ میری رائے میں جو ایک بہت بڑی رکاوٹ پیش آئے گی وہ صحیح رجحان رکھنے والے مرد اور خواتین اساتذہ کی دستیابی ہے۔ میں اپنی چالیس برس کی پیشہ ورانہ زندگی میں سیکڑوں افراد سے ملا ہوں۔ اُن میں ۱۵ یا ۲۰ سے زیادہ ایسے افراد نہیں تھے جن کے بارے میں میں کہہ سکوں کہ تعلیم کے بارے میں اُن کا

رویہ درست تھا۔ باقی لوگوں کا اس پیشے میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے لیکن وہ وہاں تھے اور اُن کے بارے میں کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر صاف گوئی سے کام لیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ خواہ اس معاملے میں کسی کی رائے کچھ بھی ہو، حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ ہر روز جماعت کے کمرے میں پڑھانے کی ایک رسم پوری کرتے ہیں اور

لیے آیئے ان میں سے ایک ایک خوبی پر غور کریں۔

تعلیم محض ایک پیشہ

ہر شخص تعلیم دینے کا پیشہ اختیار نہیں کرتا۔ بہت سے لوگ مجبوراً اس جانب آتے ہیں وہ کچھ اور کرنا چاہتے تھے لیکن کئی اسباب سے اُن کی وہ خواہشات پوری نہ ہو سکیں۔ تعلیم دینا

تعلیمی پھیلاؤ ہوا ہے اُس کی بدولت اِس پیشے میں کسی دوسرے پیشے کی نسبت روزگار کے زیادہ مواقع حاصل ہوتے ہیں۔

تاہم یہ پیشہ اختیار کرنے کے بعد کچھ لوگوں کو پتہ چلا کہ وہ اسے پسند کرتے ہیں لیکن یہ بات ہر شخص کے بارے میں درست نہیں اُن میں سے بہت سے لوگ اس پیشے کو ملازمت سمجھتے ہیں جو بہرحال کرنی ہی ہوتی ہے اور وہ کچھ اور بھی کر سکتے تھے۔ پیشے کے لیے لگن کی لازمی شرط یہ ہے کہ انھیں کسی خاص مضمون میں جو انھوں نے اختیار کیا ہے دلچسپی ہو، خواہ یہ حساب ہو یا جغرافیہ۔ لیکن انھوں نے جو بھی مضمون اختیار کیا ہے اُس میں اُن کی دلچسپی ہونی چاہیئے۔ اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ جب انھوں نے یہ پیشہ اختیار کیا انھیں اُس مضمون کے بارے

> **پیشے کے لیے لگن کی لازمی شرط یہ ہے کہ اُنھیں کسی خاص مضمون میں جو اُنھوں نے اختیار کیا ہے دلچسپی ہو، خواہ یہ حساب ہو یا جغرافیہ۔ لیکن انھوں نے جو بھی مضمون اختیار کیا ہے اُس میں اُن کی دلچسپی ہونی چاہیئے۔**

> **ایک معلّم کے طور پر مؤثر ثابت کرنے کے لیے یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے کہ جو شخص دوسروں کو تعلیم دینے کا پیشہ اختیار کرتا ہے وہ اُن لوگوں میں بھی دلچسپی رکھتا ہو جنھیں وہ پڑھاتا ہے۔ اُس کی اُن میں طالب علم اور بطور بنی نوع انسان دونوں طرح سے دلچسپی ہونی چاہیئے اِن دونوں کرداروں کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔**

اُن کے رحم و کرم پر جو نازک زندگیاں چھوڑی گئی ہیں اِن کے مستقبل کے ساتھ کھلواڑ کرتے ہیں۔

اب سوال یہ اُٹھتا ہے کہ ٹھیک قسم کے رجحانات کیا ہیں؟ جہاں تک تعلیم کا سوال ہے میں درج ذیل کا شمار کروں گا:-

الف:- پیشے کا شوق (ب) دوسرے انسانوں میں دلچسپی۔ (ج) انسانوں کو ایسے ڈھانچے میں ڈھالنے کی خواہش جو ایک شخص نے مطالعہ اور تجربات کے نتیجے کے طور پر بنایا ہو اور (د) کسی کام کو ایسے ڈھنگ سے منظم کرنے کی قابلیت جس سے وہ ان مقاصد کو پورا کر سکے۔ مختصراً یہ کہ جب تک ایک معلّم میں یہ چار خوبیاں نہ ہوں وہ اُس سے وابستہ توقعات کو پورا نہیں کر سکتا۔ اس دلیل کی مزید تشریح کے

دوسرا حاصل ذریعہ تھا۔ اور اُنھیں اسے اپنانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔ لیکن وہ تدریس کے پیشے کو پیشے کی بجائے ذریعہ معاش سمجھتے ہیں۔ بہرحال اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ گذشتہ تیس چالیس برسوں میں جو بھاری

میں جو علم تھا اُس سے زیادہ جاننے کی خواہش ہونی چاہیئے۔ اب یہ فیصلہ کرنا ہر قاری کا فرض ہے کہ جو معلّم اُسے پڑھاتے تھے اُن میں سے کتنے لوگوں میں تحصیل علم کی یہ پیاس تھی اور اُن میں سے کتنے اساتذہ نے اُس میں اس پیاس

کو بیدار کیا۔

نہیں۔ یہ انسان دوستی کا کام ہے

اس سے قریبی تعلق رکھنے والا ایک اور معاملہ بھی ہے۔ کوئی ایسی صورت حال بھی پیدا ہو سکتی ہے اور ہوتی بھی ہے کہ جب ایک شخص اُس موضوع میں دلچسپی رکھتا ہو جو وہ پڑھا رہا ہے لیکن اس مضمون کے بارے میں وہ جو کچھ جانتا ہو وہ دوسروں کو بتانے میں اُتنی دلچسپی نہ رکھتا ہو۔ دوسروں کو علم دینے کی خواہش اور ایسا کرنے کی صلاحیت یا قابلیت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اکثر اوقات یہ دونوں چیزیں ایک ہی شخص میں پائی جاتی ہیں۔ خواہ ان کی شدّت مختلف ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن ایسی کچھ مثالیں ہمیشہ ملتی ہیں جہاں تعلیم دینے کی خواہش تو موجود ہو لیکن ایسا کرنے کی صلاحیت یا قابلیت نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ایسی مثالیں بہت کم ہوں لیکن ایسی مثالیں ضرور موجود ہیں۔ اگر دوسرے الفاظ میں کہا جائے تو معلّمین المیہ معاملات کا نام دیا جا سکتا ہے۔ جہاں بھی ایسے افراد پائے جائیں اُنھیں ایسے پیشے سے نکلنے اور کوئی اور کام کرنے میں مدد دی جانی چاہیئے۔

کچھ ایسے لوگ ہیں جن کا طالب علموں پر بھاری اثر پڑتا ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں جو اُنھیں خالی الذہن اور پریشان خیال چھوڑ دیتے ہیں۔ پہلے زمرے کے نہ کہ دوسرے زُمرے کے لوگ اچھے معلّم کہلاتے ہیں۔ اس چیز کو واضح طور پر سمجھ لینا چاہیئے اور پالیسی میں اس کی پیچیدگیوں کو مناسب اہمیت دینی چاہیئے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ جو نئے لوگ اس پیشے میں داخل ہوں وہ یہ ہُنر حاصل کر کے آئیں۔ اس میں ضروری اور اہم بات یہ ہے کہ تحصیلِ علم کی خواہش اگرچہ ایک اہم ضرورت ہے لیکن بجائے خود کافی نہیں۔ مروجہ اصطلاح میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لازم تو ہے لیکن موزوں ضرورت نہیں۔ ایک معلّم کے طور پر مؤثر ثابت ہونے کے لیے یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے کہ جو شخص دوسروں کو تعلیم دینے کا پیشہ اختیار کرتا ہے وہ اُن لوگوں میں بھی دلچسپی رکھتا ہو جنھیں وہ پڑھاتا ہے۔ اُس کی اُن میں طالب علم اور بطور بنی نوع انسان دونوں طرح سے دلچسپی ہونی چاہیئے۔ ان دونوں کرداروں کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہم دوسروں کو علم مہیا کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں تو یہ تعلیم مشین صفت آدمی کو نہیں بلکہ بنی نوع انسان کو دی جانی چاہیئے۔ انسانوں

مرکزی سطح پر فیصلہ کرنے کے عمل میں جو لوگ شامل ہیں اُن میں سے بہت کم لوگ ماہرِ تعلیم ہوتے ہیں۔ ماہرینِ تعلیم کو پالیسی بنانے کے کام میں شامل کرنے کا طریقہ کار سر جان سارجنٹ نے دوسری جنگِ عظیم کے دَوران شروع کیا تھا، لیکن بتدریج اس کا استعمال کم ہوتا گیا۔ اب وقت ہے کہ اس معاملے پر پھر سے غور کیا جائے۔

تعلیم پانے والوں میں دلچسپی ضروری

علم کی ترسیل کی قابلیت اگر خلقی نہ بھی ہو حاصل کی جا سکتی ہے۔ اکثر لوگ یہ قابلیت کام کرتے ہوئے حاصل کرتے ہیں حالانکہ

کی اپنی اپنی خصوصیات، قوتیں اور کمزوریاں اور سب سے بڑھ کر اپنی دلچسپیاں اور رجحانات ہوتے ہیں۔

لہٰذا ایک اچھے معلّم کے لیے ضروری ہے کہ

وہ اپنے طلبا کو انسان سمجھے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس سے اُس کی تعلیم دینے کی صلاحیت اور قابلیت کمزور ہوگی۔ طلبا کو انسان سمجھنے کے لیے دو پیشگی شرائط پوری کرنا لازم ہے۔ پہلی یہ کہ اُسے اپنے طلبا میں بطور انسان دلچسپی ہونی چاہیئے اور دوسری یہ کہ اُسے ان طالب علموں کو سمجھنے

بیشک اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جو دوسروں کی صحبت میں بے چینی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اکثر لوگ دوسروں کی صحبت پسند کرتے ہیں یہ ہونا بھی چاہیئے۔ جو شخص بھی تعلیم دینے کا پیشہ اختیار کرتا ہے اُس کی شخصیت کی تعمیر میں یہ بنیادی خوبی ہونی چاہیئے۔ اگر اُس کی شخصیت ایسی ہو پھر بھی اُس کے ذہن میں یہ بات صاف ہونی

اُنھیں ویسے ہی قبول کر لیا اور انھیں یہ حق دینا کہ وہ جیسے بھی رہنا چاہتے ہیں رہیں۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ وہ غلطی پر ہیں پھر بھی اگر اُسے اپنے نقطۂ نگاہ کی جانب مائل کرنا ہے تو یہ ترغیب سے کیا جانا چاہیئے۔ لہٰذا رواداری ایک ذاتی خوبی نہیں بلکہ ہر بنی نوع انسان کی بنیادی ضرورت بھی ہے۔ کچھ لوگ روادار اور کچھ غیر روادار ہوتے ہیں۔ بہت حد تک اس کا پتہ اُس طریقے سے لگتا ہے کہ کوئی شخص اپنے جذبات پر

اگر ہر دوسری سطح پر کارکردگی کی سطح غیر تسلی بخش ہے تو اساتذہ سے مختلف طرزِ عمل کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔ اساتذہ بھی اُسی سماج سے تعلق رکھتے ہیں جس سے دوسرے لوگوں کا تعلق ہے لہٰذا اُن کا نظریہ اور رجحان بھی کم و بیش دوسرے لوگوں جیسا ہی ہے۔

ایک لحاظ سے یہ دُرست ہے کہ معلّم سماج کے دوسرے اراکین سے مختلف نہیں ہو سکتے لیکن دوسری جانب اُن کے پیشے کی ضروریات کا تقاضا ہے کہ وہ عام لوگوں سے مختلف ہوں۔

کی قابلیت حاصل کرنی چاہیئے۔ لہٰذا تعلیمی نفسیات کی کچھ سوجھ بوجھ تدریس کے ہُنر کا حصہ ہونے چاہیئے۔

قدریں۔ جنھیں معلّموں کو بیان کرنے کی ضرورت ہے

دوسرے انسانوں کو کسی حد تک ایک خاص ڈھانچے میں ڈھالنے کی خواہش مذکورہ بالا دوسری لازمی شرط کی ہی ایک شاخ ہے۔ انسانوں میں دلچسپی ہونا تعلیم دینے کا ایک بنیادی اصول ہے۔ ہر سماج میں ایسے افراد ہوتے ہیں

چاہیئے کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ بلکہ اس کے بارے میں یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ اُس کے پاس قدروں کا ایک مجموعہ ہونا چاہیئے جو وہ اپنے طالب علموں کو دینا چاہتا ہو۔

رواداری یا قوتِ برداشت ایک اچھی چیز ہے۔ بعض لوگ تنک مزاج ہوتے ہیں اور وہ معمولی اختلاف رائے کو بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بُردباری کسی شخص کی شخصیت کا ایک بنیادی جزو ہونا چاہیئے۔ اس کا مطلب ہے کہ دوسرے جیسے بھی ہیں

کس طرح قابو رکھتا ہے۔ لیکن رواداری صرف جذبات کا معاملہ ہی نہیں۔ روادار یا غیر روادار ہونے کی خوبی کے پیچھے بہت حد تک معقولیت یا اس کی عدم موجودگی کا ہاتھ رہتا ہے۔ ہمیں بچوں کی جانب یہ جانتے ہوئے دیکھنا چاہیئے کہ رواداری کوئی پیدائشی خوبی نہیں ہے بلکہ یہ مفاہمت، صبر، اور دوسروں کے ساتھ نباہ کے ارادے سے حاصل ہوتی ہے۔

رواداری، سچائی اور انصاف

رواداری اُن رجحانات اور اوصاف کی

ایک مثال ہے جو انسان میں ہونے چاہئیں اور جو دوسروں کو منتقل ہوتے ہیں۔ جنھیں ایک شخص کے طالب علم بننے کا اتفاق ہوتا ہے۔ بیسیوں اور اوصاف اور رجحانات ہیں جو کسی شخص کی تعمیر میں شامل ہوتے ہیں۔ اگرچہ انسان میں متضاد صفات پائی جاتی ہیں، لیکن بعض میلانات ایسے ہیں جن کی ایک عام انسان سے توقع کی جاسکتی ہے۔ رواداری ان میں سے ایک ہے۔ راست گوئی ایک اور خوبی اور مساوی برتاؤ یا انصاف ایک اور وصف ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کی مدد کرنے کی خواہش کسی شخص کی تشکیل کا لازمی جزو نہ ہو لیکن یہ ایک اہم اور مفید وصف ہے جو کسی میں ہونا چاہیئے۔ ان تمام امور کے سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص بھی تعلیم کے پیشے میں جاتا ہے وہ یہ میلانات حاصل کرتا ہے۔ کچھ ایسے لوگ ہیں جن کا طالب علموں پر بھاری اثر پڑتا ہے اور کچھ ایسے ہیں جو انھیں خالی الذہن اور پریشان خیال چھوڑ دیتے ہیں۔ پہلے زمرے کے نہ کہ دوسرے زمرے کے لوگ اچھے معلّم کہلاتے ہیں۔ اس چیز کو واضح طور پر سمجھ لینا چاہیئے اور پالیسی میں اس کی پیچیدگیوں کو مناسب اہمیت دینی چاہیئے۔

یہ تینوں اوصاف انفرادی حیثیت میں اساتذہ کی پہچان شمار کیے جاتے ہیں لیکن اساتذہ کو مجموعی حیثیت سے بھی کام کرنا ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک معلّم کو ایسے فرائض انجام دینے کے لیے کہا جاتا ہے جن کے عوض دوسروں کو بھی اس کے بارے میں ویسے ہی ذمہ داریاں نبھانی پڑتی ہیں۔ تمام انتظامی ذمہ داریاں اسی زمرے میں شمار ہوتی ہیں۔ کوئی شخص کسی شعبے کا انچارج یا برسر یا پرنسپل یا ڈین ہو سکتا ہے۔ لیکن کسی شخص کا مرتبہ یا ذمہ داریاں خواہ کچھ بھی ہوں، بنیادی اصول ایک ہی ہے۔ کام کی اس ڈھنگ سے تنظیم کرنی ہوتی ہے کہ مذکورہ بالا اوصاف کو کسی شخص کے کام کرنے کے لیے ہدایتی اصول بنانا پڑتا ہے۔ مالیات کا ذمہ دار شخص ایک ڈھنگ سے کام کرتا ہے اور طالب علموں کا ذمہ دار کسی اور طریقے سے کام کرتا ہے۔ لیکن کام کرنے کا طریقہ خواہ کچھ بھی ہو، جن بنیادی خوبیوں کا قبل ازیں ذکر کیا گیا ہے انھیں قربان کرنے یا کم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

> طالب علموں کے ردِّ عمل کو نہ چھپایا جاسکتا ہے نہ نظرانداز کیا جاسکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے بارے میں کھُل کر بات نہ کریں لیکن اُن کے اطوار سے ہر چیز کا پتہ لگ جاتا ہے۔ اگر کوئی معلّم اِس اشارے کو نظرانداز کر دیتا ہے تو صرف اس لیے کہ اُسے اِس پر کوئی خفّت محسوس نہیں ہوتی۔ اُسے نہ اپنے پیشے سے پیار ہے نہ خود پر فخر ہے۔

انتظامی قابلیت

بہت سے افراد میں انفرادی طور پر کام کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے لیکن جب کسی انتظامیہ میں کام کرنے کا موقع آتا ہے تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ جم نہیں رہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ ہر شخص انتظام کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ایک خاص قسم کے ذہن اور اوصاف کے اجتماع کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ اچھا بھی ہے کہ ہر شخص کے ذہن کا ڈھانچہ ایک رنگ میں ڈھلا نہیں ہوتا کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو لوگ ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ اُلجھے ہی رہتے۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں اور اکثر افراد الگ الگ طور پر ہی کام کرتے ہیں۔ لیکن اُن کے کام کے معیار کی جانچ کسی حد تک اس انتظامی ڈھانچے سے کی جاتی ہے جس میں انھیں کام کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا انتظامیہ کا معیار کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے غیر اہم کہا جا سکے۔ کئی ایسی صورتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں جن میں وہ لوگ جنھیں انتظام

> لہٰذا ہر دوسری چیز سے پہلے اِس چیز کا اہتمام ہونا چاہیئے کہ بجائے اس کے کہ جماعت کے کمرے میں ہر روز ایک جرُم کا ارتکاب ہو کمرہ جماعت طلبا اور اساتذہ کے بامعنی اور تخلیقی باہمی عمل کا منظر بننا چاہیئے۔

کرنا ہوتا دوسروں کے لیے کام کرنا مشکل کر دیتے ہیں۔ جب ایسی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے تو یہ ایک افسوسناک معاملہ ہوتا ہے جس کے لیے کوئی دلیل یا بچاؤ نہیں ہو سکتا اور اس صورتِ حال کو جلد یا دیر تبدیل بھی کرنا پڑتا ہے۔ لیکن جب تک یہ صورتِ حال بنی رہتی ہے تمام متعلقہ افراد کے لیے تکلیف کا باعث بنی رہتی ہے۔

اگر مجھے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں بہت سے ایسے لوگ نہیں ملے جن میں یہ خوبیاں ہوں تو ایک نتیجہ نکالنا ناگزیر ہے۔ ایسے لوگوں کا تناسب اتنا زیادہ نہیں ہے۔ لیکن اگر ہمیں کامیاب ہونا ہے تو ایسے لوگوں کا زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہونا ضروری ہے۔ کسی حد تک یہ انتظام ہو سکتا ہے وہ بھی اس صورت میں کہ تعلیم دینے کے لیے جو انسان دستیاب ہوں وہ ایسے ہوں کہ اُن کی اصلاح کی جا سکے۔ جوہر کی شناخت، افراد کے موزوں تعین، انھیں صحیح رُخ پر ڈالنے اور تربیت و پیشہ ورانہ تجربے سے جس حد تک بھی انتظام ہو سکے کرنا چاہیئے۔ اگر ہمیں کسی بھی قسم کی حکمتِ عملی کو بھی عمل میں لانا ہے تو ایسے افراد کی دستیابی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

پالیسیوں کو عمل میں لانے کا ارادہ

یہ سب کچھ یہ فرض کر کے کیا گیا ہے کہ تعلیم کے شعبے میں جو کچھ کرنے کی ضرورت ہے اُس کے بارے میں اتفاق رائے سے رقوم دستیاب ہوں گی۔ یہ دونوں مفروضات ایسے ہیں جن پر حرف گیری کی جا سکتی ہے اور کوئی بھی شخص یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ ایسے مفروضے بنانا غیر حقیقی ہے۔ کسی حد تک یہ ٹھیک بھی ہے۔ لیکن جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اکثر لوگ جو تعلیمی پالیسی مرتب کرنے کی بات کرتے ہیں شائد اچھی طرح یہ نہیں جانتے کہ کچھ اور بھی بلکہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے والی رکاوٹیں بھی ہیں۔ اِن میں سے سب سے اہم رکاوٹ یہ ہے کہ نئی حکمتِ عملی کو عمل میں کون لائے گا۔

انتظامیہ سطح پر ایسے لوگ ہیں جنھیں فیصلے کرنے کے اختیارات حاصل ہیں۔ ان میں سیکرٹری، ڈائرکٹر تعلیم، وائس چانسلر، پرنسپل اور وہ لوگ شامل ہیں جو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، میڈیکل کونسل آف انڈیا جیسے تال میل پیدا کرنے والے اداروں میں کام کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے کردار اور کارکردگی کا تجزیہ کئے بغیر بھی ایک چیز واضح ہے۔ اِن میں سے اکثر قواعد کی بنا پر کام کرتے ہیں۔ نتائج کو سامنے رکھ کر نہیں۔ سادہ الفاظ میں یہ کہ وہ قواعد کے مطابق عمل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اس عمل کے دوران وہ چیز نہیں ہو پاتی جو مطلوب ہوتی ہے اُس سے اُنھیں کبھی پریشانی نہیں ہوتی۔ جب تک ان لوگوں میں ایک نیا جذبہ اور کام کرنے کا جوش پیدا نہ ہو وہ اُس ڈھنگ سے کام نہیں کر سکیں گے جس ڈھنگ سے اُنھیں کام کرنا چاہیئے۔ بدقسمتی سے متعدد گی ہند تال میل پیدا کرنے والے ادارے بھی سرکاری دفاتر کی مانند کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کام کرنے کا سرکاری انداز اتنا ہمہ گیر ہے کہ تعلیم سے تعلق رکھنے والے ادارے بھی اس کی رُو سے نہیں بچ سکے۔

اگر کچھ اصلاحات کی جائیں تو اُن سے فائدہ ہو سکتا ہے۔ جیسے کہ عام خیال پایا جاتا اُس کے برعکس حکومت میں جتنے بھی فیصلے ہوتے ہیں اُن میں سے اکثر وزیر نہیں افسر کرتے ہیں۔ وزرا پالیسیاں بنانے میں نہیں بلکہ سرپرستی میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ اکثر ریاستوں کا یہی تجربہ ہے۔ لوگ اس کا زیادہ ذکر نہیں کرتے کیوں کہ افسر موجودہ صورتِ حال کو جاری رکھنا چاہتے ہیں اور وہ اس بارے میں ذکر کرنا ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ جہاں تک کہ وزرا کا سوال ہے ان کا یہ کہنا باعثِ فخر نہیں کہ وہ غیر متعلق سے بھی زیادہ بے بس ہیں۔ اس لیے یہ بہت اہم بات ہے کہ جو لوگ تعلیم کے معاملات سے تعلق رکھتے ہیں وہ ایسے ہونے چاہئیں جو کسی عقیدے کے پابند ہوں اور جنھیں کچھ مہارت ہو۔

ریاستی سطح پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ کافی بُرا ہے اور جو کچھ مرکزی سطح پر ہو رہا ہے وہ بھی ٹھیک ڈھب پر نہیں۔ مرکزی سطح پر فیصلہ کرنے کے عمل میں جو لوگ شامل ہیں اُن میں سے بہت کم لوگ ماہرِ تعلیم ہوتے ہیں۔ ماہرِ تعلیم کو پالیسی بنانے کے کام میں شامل کرنے کا طریقہ کار سر جان سارجنٹ نے دوسری جنگِ عظیم کے دوران شروع کیا تھا لیکن بتدریج اس کا استعمال کم ہوتا گیا۔ اب وقت ہے کہ اس معاملے پر پھر سے غور کیا جائے۔ تاہم یہ اس مسئلے کا ایک جزوی یا معمولی حصہ ہے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ سرکاری کام کاج کے طریقے کے مضر اثرات کو کم کرنے کی مصمم کوشش کی جائے۔

معلم ماحول کی پیداوار ہیں

اگر یہ معمولی چیزیں کر بھی لی جائیں تو بھی یہ کلیدی سوال باقی رہے گا کہ تعلیم دینے کا پیشہ کس حد تک اس تقاضے کو پورا کر سکتا ہے۔ یونہی یہ سوال اس ڈھنگ سے پیش کیا

جائے گا تو اساتذہ کے طرفدار جھٹ یہ کہیں گے کہ اساتذہ ملک کے باقی لوگوں سے الگ نہیں ہو سکتے۔ اگر ہر دوسری سطح پر کارکردگی کی سطح غیر تسلی بخش ہے تو اساتذہ سے مختلف طرزِ عمل کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔ اساتذہ بھی اسی سماج سے تعلق رکھتے ہیں جس سے دوسرے لوگوں کا تعلق ہے لہٰذا اُن کا نظریہ اور رُجحان بھی کم و بیش دوسرے لوگوں جیسا ہی ہے۔ اُن سے مختلف قسم کی کارکردگی کی توقع رکھنا اُن سے ایسا مطالبہ کرنا ہے جو ممکن یا قابلِ عمل نہیں۔ عام طور پر ایسا ہی کوئی موقف اختیار کیا جاتا ہے اور اُسے قائم رکھا جاتا ہے۔

لیکن انہیں مُختلف ہونا ہوگا

یہ معاملہ کئی موقعوں پر اٹھایا گیا ہے اور راقم سمیت کئی افراد نے اس سے نپٹنے کی کوشش کی ہے۔ پھر بھی یہ معاملہ اتنا اہم ہے کہ اس پر ایک بار پھر غور کیا جا سکتا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ درست ہے کہ معلّم سماج کے دوسرے اراکین سے مختلف نہیں ہو سکتے۔ لیکن دوسری جانب اُن کے پیشے کی ضروریات کا تقاضہ ہے کہ وہ عام لوگوں سے مختلف ہوں۔ ہر دوسرا آدمی ایک الگ فرد کے طور پر عمل کرتا ہے۔ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے یا نہیں کر سکتا اُس کا اثر ذات پر یا ایک دو ایسے لوگوں پر ہوتا ہے جن سے اُس کا تعلق ہوتا ہے۔ اگر اُس کی کارکردگی کم ہے یا نتائج مایوس کُن ہیں تو وہ کسی کو الزام نہیں دے سکتا اور اُن کے نتائج وہ خود بھگتتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ نجی دائرہ کار اور سرکاری دائرہ کار میں کام کرنے والوں کے اندازِ فکر میں ایک واضح فرق ہے۔ نجی دائرہ کار میں کام کرنے والے جانتے ہیں کہ وہ جتنے مؤثر ڈھنگ سے کام کریں گے اتنا ہی زیادہ فائدہ ہوگا۔ اگر وہ مؤثر ڈھنگ سے کام کر سکے تو اُس کے لیے کوئی عذر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ سرکاری دائرہ کار میں سوچنے کا ڈھنگ مختلف ہے۔ ہر شخص دوسرے شخص کو الزام دے رہا ہے، اور جو نتیجہ ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔

تدریس کے معاملے میں صورتِ حال مختلف ہے۔ تدریس کو سرکاری دائرہ کار میں کام کرنے کے ہم پلّہ نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیونکہ ایک شخص ایسے لوگوں کے لیے کام کرتا ہے جو ہر روز کمرہ جماعت میں موجود رہتے ہیں۔ ہمیں ان لوگوں کو مطمئن کرنا ہے نہ کہ اُن کو جو ہماری تقرری کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنے روبرو بیٹھے طلبا کی ٹولی کی بجائے اپنے آپ کو ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل یا وائس چانسلر کو جوابدہ سمجھتے تو یہ دفتری اندازِ فکر کی ایک مثال ہوگی۔ کمرۂ جماعت کی صورتِ حال معیاری لحاظ سے کسی دفتر یا کارخانے کی صورتِ حال سے مختلف ہے۔

کارکردگی۔ یومیہ بیلنس شیٹ

دفتر کے ماحول میں جو کچھ حاصل کیا جاتا ہے وہ اتنی آسانی سے نظر نہیں آتا۔ صرف سال کے آخر میں جا کر بیلنس شیٹ تیار ہوتا ہے اور کچھ پتہ چلتا ہے کہ نفع کیا ہے اور نقصان کیا ہے لیکن کمرۂ جماعت میں یہ بیلنس شیٹ ہر روز بنتا ہے۔ فوراً پتہ چلتا جاتا ہے کہ ایک شخص مؤثر طور پر کام کر رہا ہے، اپنے خیالات دوسروں تک پہنچا رہا ہے یا صرف اپنی کارگزاری کا بہانہ ہی کر رہا ہے۔ اگر کوئی شخص بہانے بازی کی کوشش کر رہا ہے جیسا کہ اکثر ہوتا ہے تو یہ حقائق کا سامنا نہ کرنے کی ارادی کوشش ہے کہ وہ شخص ایسے بھی کام چلا سکتا ہے۔ طالب علموں کے ردِّ عمل کو نہ چھپایا جا سکتا ہے نہ نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے بارے میں کھُل کر بات نہ کریں، لیکن اُن کے اطوار سے ہر چیز کا پتہ لگ جاتا ہے اگر کوئی معلّم اس اشارے کو نظرانداز کر دیتا ہے تو صرف اس لیے کہ اُسے اس پر کوئی خِفّت محسوس نہیں ہوتی۔ اُسے نہ اپنے پیشے سے پیار ہے نہ خود پر فخر ہے۔

اس معاملے کو ایک اور ڈھنگ سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ تدریس کے عمل میں دوسرے بنی نوع انسان بھی شامل ہوتے ہیں جو سوچتے اور محسوس کرتے ہیں۔ اگر اُن کے خیالات اور احساسات پر مناسب طور سے غور نہ کیا جائے تو جلدی یا بدیر یا تو کوئی بحران پیدا ہو جاتا ہے (جو بہت کم ہوتا ہے) یا معلّم اور طالب علم دونوں کی طرف سے تنک چڑھے کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے۔ جہاں ایک معلّم کو ایسا تنک چڑھا پن اختیار کرنے کی چھوٹ ہے وہاں اس جذبے کو اُن نازک ذہن اور علم کے متلاشی بچوں تک پہنچانا جو اُس کے سپرد کیے گئے ہیں سخت ناانصافی ہے۔ یہ چھوٹے بچے ایک ایسے شخص کی نگرانی میں دیے گئے ہیں جسے انھیں تعلیم دینے کے لیے مقرّر کیا گیا ہے۔ اگر معلّم اپنا فرض ادا کرنے میں ناکام رہتا ہے اور اُس کی بجائے انھیں لاپرواہی، بے رغبتی یا سلبیت دیتا ہے تو وہ ایک ایسا جُرم کرتا ہے جو بے شک قانون کی نگاہوں میں قابلِ دست اندازی پولیس نہ ہو مگر وہ بہرحال ایک جُرم ہے۔

ناکارکردگی ایک جُرم

صورتِ حال کا المیہ یہ ہے کہ ہزاروں اساتذہ ہر روز یہ جُرم کر رہے ہیں۔ اگر ہم ایک نئی تعلیمی پالیسی مرتّب کرنا چاہتے ہیں، اور ہماری خواہش ہے کہ اس پر عمل بھی ہو تو

(باقی صفحہ ۱۴۲ پر)

ڈاکٹر جی۔ ایس۔ سیتھارام

اقدار کی حفاظت وقت کی ضرورت

اس مضمون میں فاضل مصنف نے گرتی ہوئی تعلیمی اقدار کو سنبھالنے کی ضرورت بتاتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ اس بارے میں کچھ نہ کچھ کرنا ہے، ورنہ تو بحیثیت ایک قوم ہماری شناخت خطرے میں ہے۔ اور یہی وہ چیلنج ہے جو ماہرین تعلیم کے سامنے ہے۔ اس رجحان پر قابو پائے بغیر اس قدیم سرزمین پر ہمارا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے گا۔ تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے سماج میں ہمیں متبادل اقدار کا ایک نمونہ تیار کرنا ہے جس کی بنیاد ہمارے آئین یا پھر اسی طرح کی دستاویزات پر ہو۔

حصول آزادی کے بعد تعلیم میں بلحاظ تعداد زبردست انقلاب نہ دیکھنے کو ملا ہے۔ اس انقلاب کی سطح یکساں نہیں رہی۔ اسی عرصے میں تقریباً تین سو یونیورسٹیاں کھولی گئیں، مختلف سطح کے ۵۰ ہزار اسکول قائم کیے گئے، سینکڑوں کالج قائم ہوئے۔ ۱۹۴۷ میں بھارت میں انجینئروں کی تعداد ۱۸ ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ آج صرف ایک سال میں ہی اتنے انجینئر تیار ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۴۷ میں ہندوستان میں ایلوپیتھک کے ۲۰ ہزار ڈاکٹر تھے، آج ۲۰ ہزار ڈاکٹر ہر سال میڈیکل کالجوں سے باہر آتے ہیں۔

۱۹۵۰ء میں ہندوستان میں خواندہ آبادی کی تعداد چھ یا ساڑھے چھ کروڑ تھی۔ آج ۳۰ کروڑ سے زیادہ خواندہ افراد ملک میں ہیں۔ یہ تعداد چین کو چھوڑ کر دنیا کے کسی بھی ملک کی آبادی کے برابر ہے۔ آج بھی ہندوستان کا شمار بہت سے لوگوں کے نزدیک ناخواندہ افراد

والے ملکوں میں ہے جبکہ ہم دنیا کے چند ایسے ملکوں میں ہیں جو انتہائی خواندہ ہیں۔ اس عرصے میں ملک میں سائنسی اور تکنیکی تربیت یافتہ عملے کی تعداد بڑھی ہے۔ اتنا اضافہ جاپان کو چھوڑ کر ایشیا کے کسی بھی ملک میں نہیں ہوا۔ اسی طرح افریقہ اور لاطینی امریکہ کے کسی بھی ملک میں اس قدر اضافہ دیکھنے کو نہیں ملا ہے۔ یہ اضافہ چند مغربی ممالک اور روس میں ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔

> مغرب کا آدمی اور ان ملکوں کا سماج ٹیکنالوجی کے محاذ پر اکیسویں صدی میں قدم رکھ چکا ہے۔ ہمارے اور ان کے درمیان فرق بڑھتا جا رہا ہے۔ کم سے کم تکنیکی سطح پر اس فرق کو کم کرنا اور ایک طرح سے دور کرنا ہے اس فرق کو دور کرنے کے کام وہ سب سے بڑا چیلنج ہے جو آج ہندوستانی دانشوروں کے سامنے ہے۔

کوالٹی کے اعتبار سے ترقی

اعداد و شمار کے لحاظ سے یہ اضافہ یقیناً بے مثال ہے۔ ہمارے صنعتی تربیتی اداروں اور طبی اداروں میں تربیت یافتہ افراد کا معیار دنیا کے کسی بھی حصے کے تربیت یافتہ عملے سے کسی طرح کم نہیں۔ نیوکلیر ازجی اور خلائی تحقیق میں ہمارے پیش رفت ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے میں غیر اہم نہیں۔ بائیو ٹیکنالوجی اور افزائش نسل یعنی جین وغیرہ کے سلسلے میں تحقیق جاری ہے۔ ہمارے ڈاکٹر، انجنیئر، ماہرین ٹیکنالوجی، باہر دنیا کے ملکوں میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ حال ہی میں امریکی صدر کا آپریشن جن چھ ڈاکٹروں نے کیا، ان میں سے ایک ہندوستانی تعلیمی نظام سے ہی فیضیاب تھا۔ لہٰذا چند ایسے شعبے ہیں جہاں ہمارے تعلیمی معیار نے نمایاں اثرات واضح کئے ہیں۔

> ہندوستان کے ترقیاتی عمل میں اقدار کی گراوٹ کی سب سے بڑی کمی دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ کمی گزشتہ ۴۰ برسوں میں ہندوستان میں دیکھنے کو ملی ہے۔ جس طرح کہ ایک انسان، اسی طرح ایک قوم بھی اقدار کی گراوٹ سے اپنا سبھی کچھ کھو دیتی ہے۔ ہندوستان میں آج کے دور میں عوام کے اقداری معیار کی گراوٹ سے بڑا خطرہ ہے اور یہ خطرہ سرحد پار کے ایٹم بم خطرے سے بھی زیادہ ہے۔

ہمہ جہت ترقی

یہ ہمہ جہت ترقی اور تبدیلی ہندوستان کے سماجی ڈھانچے میں رہتے ہوئے کی گئی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہاں ۴۰ سال کے مختصر سے عرصے میں اس قدر تبدیلیاں کبھی بھی دیکھنے کو نہیں ملی ہیں۔ ۱۹۸۶ کا بھارت ۱۹۴۷ کے بھارت سے بہت آگے ہے۔ یہ ترقی ہر محاذ پر دیکھنے کو ملی ہے۔ معیشت کا محاذ ہو، یا تکنیکی ترقی اور تبدیلی کا، سیاسی ڈھانچہ ہو، سماجی وسائل ہوں، ہر جگہ تبدیلی نظر آتی ہے، ذات پات کے بندھنوں کا ٹوٹنا ہو، کنبہ کی زندگی ہو یا دیگر روایتی ادارے ہوں، تبدیلی ہر جگہ نظر آتی ہے۔ مواصلاتی نظام اور ذرائع نقل و حمل کے نظام میں تبدیلی سے ہندوستان میں زبردست تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہندوستان کے چپے چپے اور ہر جگہ دیہات میں ٹرانسسٹر اور ٹی۔وی کا جال پھیلا دیا گیا ہے۔ اندرونی اور بیرونی مسائل کے بارے میں عوامی شعور بڑھتا جا رہا ہے۔ عوام کی امیدیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر عوامی شعور اور ان کا مطالعہ ان کو اپنی محرومیوں کے بارے میں آگاہ کر رہا ہے۔ ان تمام تبدیلیوں نے ہندوستانی عوام کے شعور اور ان کے اندازِ فکر کو بدل دیا ہے۔ اس سے

ان کے ذہنوں میں ایک ارتعاش اور بیداری آئی ہے۔ لکھوکھا عوام باہر ملکوں کو جا رہے ہیں اور پھر وہاں کے سماجی حالات کا مطالعہ اور مشاہدہ کرکے ہندوستانی لوٹ رہے ہیں۔ لکھوکھا غیر ملکی ہندوستان آ رہے ہیں۔ اس طرح سے سائنس اور ٹیکنالوجی کے محاذ پر ایک

ہندوستان نے بہت سے شعبوں میں نمایاں ترقی کی ہے لیکن اس ترقی کے باوجود ہندوستان کے تعلیمی نظام میں کہیں نہ کہیں کوئی خامی ضرور ہے۔

کو حیرانی میں ڈالنے والی ہے۔ ایسے ایسے نئے خیالات آتے ہیں گویا کہ وہ کسی فیکٹری میں ڈھل کر باہر آ رہے ہوں۔ مغربی ملکوں میں حالیہ تکنیکی انقلاب اتنا تیزی سے آ رہا ہے جس کی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ بائیولوجی اور اس کی جدید شاخوں کے سبب زندگی کو روئے زمین پر وجود میں لانا ممکن ہو گیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ عرصہ بعد حضرتِ انسان کی تخلیق بھی اسی سائنس کے بل بوتے پر ممکن ہو سکے۔ سلیکون چپ کے انقلاب سے نیز پرسنل کمپیوٹروں کی تیاری سے اب فیکٹریوں کی ضرورت ہی باقی نہ رہے گی۔

نہیں رکھتے۔ گویانا میں ۹۰۰ امریکیوں کی اجتماعی خودکشی اس کی ایک مثال ہے۔

مغرب کا آدمی اور ان ملکوں کا سماج ٹیکنالوجی کے محاذ پر اکیسویں صدی میں قدم رکھ چکا ہے۔ ہمارے اور ان کے درمیان فرق بڑھتا جا رہا ہے۔ کم سے کم تکنیکی سطح پر اس فرق کو کم کرنا اور ایک طرح سے دور کرنا ہے۔ اس فرق کو دور کرنے کے کام وہ سب سے بڑا چیلنج ہے جو آج ہندوستانی دانشوروں کے سامنے ہے۔ اس ضمن میں تعلیمی نظام کو زبردست رول ادا کرنا ہے۔ ہندوستان آئندہ صدی میں مغرب کے اس چیلنج سے کس طرح نبرد آزما ہو سکتا ہے اور جاپان کے اس چیلنج کا کس طرح مقابلہ کر سکتا ہے، اس پر ہندوستان کے عالمی

جب تک ہم اقدار کی شکست و ریخت کے اس عمل کو نہیں روکتے، اس وقت تک طویل المدتی بنیادوں پر ہم بحیثیت قوم اپنی شناخت خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ آج کے تعلیمی نظام کے سامنے یہی سب سے بڑا چیلنج ہے۔ اس دھارے کا رخ موڑا جا سکتا ہے اور بالآخر اسے موڑنا ہی ہے۔

ثقافتی در اندازی دیکھنے کو ملتی ہے۔ رہن سہن، مذہب، اخلاقیات وغیرہ میں ایک طرح کا ثقافتی حملہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ شہری طبقے اور بالائی طبقے میں یہ تاثرات اور بھی تیزی سے جڑ پکڑ رہے ہیں۔ صورتِ حال بدل رہی ہے۔ قدیم ہندوستانی تحریروں میں جن کا ذکر نہیں تھا، وہ تمام باتیں سامنے آ رہی ہیں۔ مثال کے طور پر شمالی امریکہ میں اب سے تقریباً دس سال بعد کمپیوٹر کی ترقی یافتہ شکل سے انسانی اعمال کے تمام مراحل طے کئے جانے کے امکانات ہیں۔ ان حالات میں ہماری سابقہ تحریریں ہمیں کوئی روشنی نہیں دیتیں۔ ہندوستان میں اقدار تیزی سے گر رہی ہیں، خاص کر شہری علاقوں میں اقدار کی ابتری تیزی سے دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہندوستان کے مستقبل کو یہ سب خطرات ہیں۔

اس سے بھی بڑا چیلنج

دریں اثنا دنیا کے دوسرے حصوں میں، خاص کر مغرب اور جاپان میں تبدیلی کی رفتار ذہن

کنبہ اور شادی کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے۔ خلاء میں آبادی یا کالونیوں کا قیام ممکن ہو چلا ہے۔ مغربی دنیا کے افراد کی ذہنی کاوشیں، اور مسائل کو حل کرنے کی صلاحیتیں اور قوتیں بے پناہ آگے جا رہی ہیں۔ اس پس منظر میں نئے نئے مسائل اور چیلنجوں کا سامنا ہے۔ انسان اور دیوتا کے کاموں میں اب امتیاز کرنا دشوار ہو سکتا ہے۔ ان حالات نے مغربی ملکوں کے حالات کو بھی ایک نئی کشمکش سے دوچار کیا ہے۔ بہت سے لوگ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کی سکت

برادری میں تعین کا دار و مدار ہے۔

اقدار کی گراوٹ

بلاشبہ ہندوستان نے بہت سے شعبوں میں نمایاں ترقی کی ہے، جس کا مختصر ذکر اوپر کیا گیا ہے، لیکن اس ترقی کے باوجود ہندوستان کے تعلیمی نظام میں کہیں نہ کہیں کوئی خامی ضرور ہے۔

ہندوستان کے ترقیاتی عمل میں اقدار کی گراوٹ کی سب سے بڑی کمی دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ کمی گزشتہ ۳۸ برسوں میں ہندوستان میں دیکھنے کو ملی ہے۔ جس طرح کہ ایک انسان اسی طرح ایک قوم بھی اقدار کی گراوٹ سے اپنا سبھی کچھ کھو دیتی ہے۔ ہندوستان میں آج کے دور میں عوام کے اقداری معیار کی گراوٹ سب سے بڑا خطرہ ہے اور یہ خطرہ سرحد پار کے ایٹم بم خطرے سے بھی زیادہ ہے۔ مذہب کے ناطے پر اقداری نظام مرتب کیا گیا تھا، وہ آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر شکست وریخت کی طرف جارہا ہے۔ ہندوستان کی زیادہ تر برادریاں اور طبقے اسی شکست وریخت کی زد میں ہیں۔ نئے ہندوستان کا نیا اقداری نظام جس کا ہمارے آئین میں ذکر ہے، جڑ پکڑنے سے قاصر رہا ہے، اس کے سبب تعلیم یافتہ ہندوستانی ایک ڈھانچے میں منسلک ہونے کی بجائے پارہ پارہ ہو گئے۔ خوش قسمتی یہ ہے کہ ابھی اس افتراق کی جڑیں گہری نہیں ہوئی ہیں۔ ابھی صحیح اور غلط میں ہی پوری طرح فیصلہ نہیں ہو پایا ہے۔ ہمارا تعلیمی نظام اقدار کی گراوٹ کو روک نہیں پایا ہے بلکہ یہ خود گراوٹ کی زد میں آگیا ہے۔ جو لوگ اس تعلیمی نظام سے گزرتے ہیں، ان میں گراوٹ آنے کا امکان اُن سے زیادہ ہے جو اسکول نہیں گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ تعلیمی سیڑھی پر جو جس قدر زیادہ چڑھتا ہے، اس پر گراوٹ کا اثر زیادہ نمایاں ہے۔ اس ملک کے عوام میں وسائل سے بھرپور فائدہ اٹھانے کا مادّہ پیدا نہیں ہو پایا ہے۔ صنعت اور مہم جوئی یہاں کا مزاج نہیں بن پائی ہے۔ تبدیلی لانے کا ذہن نہیں بن پایا ہے، عوام تبدیلی کے مخالف ہیں۔ مثال کے طور پر بنکوں میں بال پین سے دستخط کئے گئے چیک قبول نہیں کئے جاتے تھے۔ اور صرف اس تبدیلی لانے میں دس سال لگ گئے۔ اسکول، گھر یا دفتر یا کارخانے ہر جگہ مطلق العنانہ اندازِ نظر کی کارفرمائی ہے۔ تخلیقی عمل کی ہمت افزائی نہیں ہوتی۔ ہاں میں ہاں ملانے سے ہی بات بنتی نظر آتی ہے۔ اختلاف رائے یا اپنی ذہنی اُپج سے کسی بات کا اظہار ناراضگی کا سبب بنتا ہے۔ سوال اب یہ ہے کہ ایک ملین آبادی والے ملک کو صدی کے آخر تک اس کی آبادی ...۱۰۰ کروڑ تک پہونچ جائے گی۔ اکیسویں صدی کے تکنیکی دور تک کیسے لے جائیں اور اس چیلنج کا کس طرح مقابلہ کریں۔ کیونکہ اس دوڑ میں جو پیچھے رہ جائے گا، وہ راستے سے ہٹ جائے گا۔ چنانچہ جاپان دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے، جنوب مشرقی ایشیا میں خوشحالی چمک رہی ہے اور مغربی ممالک کی تہذیب ہمارے تصور سے بھی آگے ترقی کی منزلوں پر ہے ان کا ساتھ نہ دینے کی صورت میں ہم کہاں ہوں گے۔ اور ہماری اقتصادی اور سیاسی خود مختاری کا کیا ہوگا اور

ہندوستان کے تمام مذاہب کا گہرا مطالعہ کیا جانا چاہیئے تاکہ ایسی اقدار جو قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں سامنے لائی جاسکیں۔ یہ کوشش اکیسویں صدی میں قدم رکھنے والی جمہوریت کی آزاد خیال اُمنگوں سے ہم آہنگ ہوگی۔ مختصراً یہ کہ ایک ضابطۂ اخلاق مرتب کرنا ہوگا۔

اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم داستانوں پر مبنی ماضی سے اپنا رشتہ توڑ لیں۔ ہمیں شاندار مستقبل کی طرف دیکھنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ اس تک ہماری رسائی کیسے ہو۔ ہندوستانیت کا جذبہ دلوں میں سمانا اور مضبوط کرنا ہے۔ اس جذبہ کی بنیاد سیکولرازم، جمہوریت، سائنسی مزاج اور سماجی انصاف پر ہونی چاہیئے۔ مختلف سیمناروں اور مجالس مذاکرہ کے ذریعے ان اقدار کی پرورش کیجاتی ہے۔

ہم دُنیا میں ترقی کے بغیر اپنا صحیح مقام کیسے پا سکیں گے؟ ہمارے کاروباری لوگ، چند کو چھوڑ کر، ہر جگہ اپنے کاروبار اور مصنوعات کے آرڈر کم سے کم پاسکے جا رہے ہیں کیوں کہ وہ مختصر المدتی منافعوں پر زیادہ زور دیتے ہیں،

> تعلیم حاصل کرنے کے عمل میں طلباء کی عملی شرکت ضروری ہے۔ کلاسوں میں محض لیکچر نہ ہونے چاہئیں بلکہ وہاں طلباء اور اُستادوں کے درمیان گفت و شنید اور تبادلۂ خیال کے طرز پر اسباق ہونے چاہئیں۔

اور طویل المدتی فائدوں کو سامنے نہیں رکھتے۔ چند مخصوص لوگوں پر مشتمل طبقے احساس ذمہ داری اور انسانیت کے جذبات سے عاری ہوتا جا رہا ہے۔ لاکھوں عوام کسی مناسب پناہ کے بغیر بمبئی جیسے بڑے شہروں سے باہر آ رہے ہیں۔ شہروں کو خوبصورت بنانے کے نام پر اس آبادی کو وہاں سے نکالا جا رہا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کی پرورش، تعلیم اور جمالیاتی احساسات میں کوئی نہ کوئی کمی یا غلطی ضرور ہے کہ وہ تکلیف حالات کی مظہر انسانی آبادیوں پر بلڈوزر پھروانے میں خوبصورتی محسوس کرتے ہیں۔ ان آبادیوں میں بسنے والے جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزارتے ہیں۔ ہم اپنی دادِ عیش لینے کے لیے اخراجات کو خواہ کسی بھی طرح فضول خرچیوں کا مظہر بنالیں مگر وہ ہمارے احساس پر بار نہیں ہوتا۔ یہ سب فضول خرچیاں ایک ایسے ملک میں ہیں جہاں دو وقت کا کھانا مل جانا ہی ۸۰ کروڑ عوام کے لیے بھگوان کے درشن سے

تعبیر کیا جاتا ہے۔ انسانی برادری سے خلوص، جذبہ ترحم اور برادرانہ جذبات آہستہ آہستہ ختم ہو رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ ہر طرف وحشیانہ جذبات اور بربریت کے خیالات پرورش پا رہے ہیں۔ ہم مل جُل کر کام کرنے کی عادت سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ اور یہی ٹیم کے جذبے سے کام کرنا وہ خوبی ہے جس نے جاپان کو حیرت انگیز ترقیاں دکھائی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کی بُرائی کرنے پر وقت

> نوجوانوں میں سوال پوچھنے کی عادت کو فروغ دینا چاہیئے۔ ہر بات کو وجہ کے ساتھ سمجھنے کی عادت ڈالنی چاہیئے۔ انھیں یہ احساس ہونا چاہیئے کہ وہ اس عظیم انسانی ڈرامہ کا ایک حصہ ہیں اور وہ ملک کو خوشحال بنانے کی عظیم ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں۔

صرف کرتے اور ضائع کرتے ہیں۔ دوسروں سے نفرت اور بغض و عداوت اور دوسروں کی برائی کرنے میں ہی ہمارا وقت چلا جاتا ہے۔ بلکہ کے بڑے بڑے راز صرف چند بوتلوں کے عوض فروخت کر دیتے ہیں۔ اور یہ بُرائی ہمارے سماج میں پیوست ہو چکی ہے۔ تعلیم یافتہ غنڈا

کی اصطلاح اب عام ہو چکی ہے۔ یونیورسٹیوں سے نکلنے والے ان تعلیم یافتہ نوجوانوں کا عمل روائتی قسم کے اَن پڑھ دادائوں سے بھی زیادہ شرمناک ہوتا ہے۔ یہی کالج کے طلباء جو کہ تعلیم کے پردے میں غنڈہ گیری کرتے ہیں، بہت سی سیاسی پارٹیوں کے لیے سہارا بنتے ہیں۔ اس طرح جرائم منظم پیمانے پر جاری زندگی کے معیار کو گرا رہے ہیں۔ اس سے سماجی ماحول خراب ہو گیا ہے۔ مختصراً یہ کہ جب تک ہم اقدار کی شکست و ریخت کے اس عمل کو نہیں روکتے، اس وقت تک طویل المدتی بنیادوں پر ہم بحیثیت قوم اپنی شناخت کو خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ آج کے تعلیمی نظام کے سامنے یہی سب سے بڑا چیلنج ہے۔ اس دھارے کا رُخ موڑا جا سکتا ہے اور بالآخر اسے موڑنا ہی ہے۔ اس محاذ پر کامیابی کے بعد ہی اس قدیم سرزمین پر ہمارا وجود بحیثیت ایک قوم مستحکم بن سکے گا۔

اقدار کے نئے ڈھانچے کی ضرورت

تعلیمی نظام کے تحت محض لائق افراد ہی وجود میں نہیں آنے چاہئیں بلکہ ان میں نئے ہندوستانی ہونے کا جذبہ پروان چڑھنا

چاہیے۔ یہ کام ابتدائی مرحلے سے ہی انجام پانا چاہیے۔ اقدار سے متعلق ایک نیا ڈھانچہ جو بدلتے ہوئے حالات کو رکھ کر بنایا گیا ہو سامنے آنا چاہیے۔ اس میں کم سے کم آنے والی دو نسلوں کی ضرورتوں کا اندازہ لگایا گیا ہو، یہ بھارتی عوام کی آرزوؤں اور اُمنگوں کا آئینہ دار ہو، یہ ہندوستانی آئین کے ڈھانچے میں رہ کر ہی تیار کیا گیا ہو۔ ہندوستان کے تمام مذاہب کا گہرا مطالعہ کیا جانا چاہیے تاکہ ایسی اقدار جو قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں، سامنے لائی جا

طرف دیکھنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ اس تک ہماری رسائی کیسے ہو۔ ہندوستانیت کا جذبہ دلوں میں سمانا اور مضبوط کرنا ہے۔ اس جذبہ کی بنیاد سیکولرازم، سائنسی مزاج اور سماجی انصاف پر ہونی چاہیے۔ مختلف سیمناروں اور مجالس مذاکرہ کے ذریعے ان اقدار کی پرورش کی جانی چاہیے۔ ہمارے زیادہ تر اسکول وہ ہیں جہاں اُستاد صرف لیکچر دیا کرتے ہیں۔ تعلیم حاصل کرنے کے عمل میں طلبار کی عملی شرکت ضروری ہے۔ کلاسوں میں محض لیکچر نہ ہونے چاہئیں، بلکہ وہاں طلبا، اور اُستادوں کے

خوشحال بنانے کی عظیم ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہوئے ہیں۔ ایک اور امر جس پر توجہ دی جانی چاہیے وہ یہ کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو صحتمند طریقے پر ملنے جُلنے دینا چاہیے۔ ہم افریقہ کی نسلی پالیسی کی تو مذمت کرتے ہیں لیکن خود اپنی سرزمین پر اپنی نوعیت کے امتیازات برتتے ہیں اور لڑکے، لڑکیوں کو ایک دوسرے سے دور رکھا جاتا ہے۔ یہ بات انسانی رشتوں کو سُدھارنے میں مانع ہے۔ نوجوانوں کو اپنے دماغ کا موقع دینا چاہیے۔ اور مادی فنون اور آرٹ سے اُن کی دلچسپی بڑھانا چاہیے۔ انسان کے ذہن اور اس کے جسم کو پروان چڑھانے کے لیے ایک ساتھ کوششیں ضروری ہیں۔ مادی آرٹ کی ٹریننگ ان میں خود اعتمادی پیدا کرے گی اور یہ قوت کا سرچشمہ ثابت ہوگی۔ یہ جذبہ طلبار کی زندگی میں کارآمد ہوگا۔ ایسی صفات کا پروان چڑھانا ضروری ہے جن سے جمہوریت اور فرد کا احترام کرنے کا جذبہ مستحکم

ایسی صفات کا پروان چڑھانا ضروری ہے جن سے جمہوریت اور فرد کا احترام کرنے کا جذبہ مستحکم ہو سکے۔ مقاصد کے تعین اور اُن کے حصول کے لیے ذرائع کی پاکیزگی پر برابر زور دینا چاہیے۔

سکیں۔ یہ کوشش اکیسویں صدی میں قدم رکھنے والی جمہوریت کی آزاد خیال اُمنگوں سے ہم آہنگ ہوگی۔ مختصراً یہ کہ ایک ضابطۂ اخلاق مرتب کرنا ہوگا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے جدید کارناموں سے قدیم دانشوروں کی فہم و فراست کا ایک تقابلی مطالعہ کرکے دونوں میں ایک امتزاج پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ مذہب کی ایسی اقدار جو جمہوری ہندوستان کی آرزوؤں اور اُمنگوں سے میل نہ کھاتی ہوں اور جو ہندوستان کے آئین کے منافی ہوں اور جو محض موجودہ نسلوں پر ایک بوجھ ہوں اور انھیں آگے بڑھنے سے روکتی ہوں، ان کو ختم کر دینا ہوگا۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم اساطیری داستانوں پر مبنی ماضی سے اپنا رشتہ توڑ لیں۔ ہمیں شاندار مستقبل کی

درمیان گفت و شنید اور تبادلۂ خیال کے طرز پر اسباق ہونے چاہئیں۔ بہت سے طلباء آزاد خیالی اور از سرِ نو فکر کے لیے شعور نہیں رکھتے اور نہ انھیں اس سے دلچسپی ہونی چاہیے۔ وہ تو صرف امتحان کے لیے تیاری کرتے ہیں اور کتابیں پڑھتے ہیں۔ غیر روائتی اندازِ فکر کے لیے ذہن کو تربیت دینی ضروری ہے۔ بالعموم طلبار میں ذہنی توانائیاں ہوتی ہیں مگر ان کی پرورش نہیں ہو پاتی۔ نوجوانوں میں سوال پوچھنے کی عادت کو فروغ دینا چاہیے۔ ہر بات کو وجہ کے ساتھ سمجھنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ انھیں یہ احساس ہونا چاہیے کہ وہ اس عظیم انسانی ڈرامہ کا ایک حصہ ہیں اور وہ ملک کو

ہو سکے۔ مقاصد کے تعین اور اُن کے حصول کے لیے ذرائع کی پاکیزگی پر برابر زور دینا چاہیے۔ نوجوانوں صحت مند مقابلے کا فروغ ضروری ہے۔ نوجوانوں کو تحریص اور ترغیب عمل کے ذریعے آگے بڑھانا چاہیے۔ ایک مشہور امریکی ماہرِ نفسیات ڈیوڈ میک لی لینڈ کے مطالعے میں یہ بات آئی ہے کہ مختلف ملکوں میں اقتصادی ترقی کی شرح میں جو فرق پایا جاتا ہے اس کا ایک سبب نوجوانوں کو ترغیب عمل دینے کے معاملے کا فرق بھی ہے۔ اگرچہ یہ بات جزوی طور پر ہی ٹھیک ہو سکتی ہے، لیکن نوجوانوں کو اپنی رزم اور بزم کی داستانوں کے ذریعے ترغیب عمل دلانے ضروری ہے تاکہ ہمارے سامنے اپنے ملک کی

(باقی صفحہ ۹۳ پر)

تعلیم ایک چیلنج

ایم یونس صدیقی

افرادی قوت کے فروغ کی مرکزی وزارت کی طرف سے اگست ۱۹۸۵ء میں "تعلیم کا چیلنج — ایک حکمت عملی کا تناظر" نامی دستاویز اس مقصد سے ملک گیر بحث کے لیے جاری کی گئی ہے کہ ۱۹۶۸ کی تعلیمی پالیسی سے بہتر نئی پالیسی طے کی جائے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ تعلیم ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اور اس کی شاخیں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ تعلیم کے بارے میں نیا واضح اور متعین نقطہ نظر مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے فیصلہ کن عناصر۔ ممبران پارلیمنٹ، ماہرین تعلیم، دانشوروں، اساتذہ، والدین، طلباء اور صنعت کاروں وغیرہ کے مشوروں سے اختیار کرنا ہوگا۔ اس دستاویز میں مختلف نقطہ ہائے نظر کو صاف صاف طریقے سے پیش کر دیا گیا ہے۔

ہندوستان اس وقت اکیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑا ہے۔ اس میں داخلہ کی تیاری کے لیے نیز کسی قسم کی خلل اندازی کے بغیر ہمہ جہت ترقی کی غرض سے ملک گیر ماحول پیدا کرنے کے لیے تعلیمی نظام کی تشکیل نو ضروری ہے کیوں کہ صرف تعلیم ہی عوام میں وہ معلومات، احساس مقصد اور خود اعتمادی پیدا کر سکتی ہے جو ایک ایسی فعال، متحرک اور متحدہ قوم کی تعمیر کے لیے ضروری ہے جو اپنے عوام کو ایک بہتر، تخلیقی، بھرپور اور زیادہ با مقصد زندگی گزارنے کے لیے درکار وسائل فراہم کر سکے۔

ہندوستان کے آئین میں فرد کے وقار، ملک کے اتحاد اور سالمیت کی خاطر انصاف نیز مساوات پر مبنی اور خوشحال معاشرہ کی تشکیل کو مقصد قرار دیا گیا ہے جس کے معنی ہیں کہ ہر شخص کو مساوی مواقع فراہم کیے جائیں گے۔ خاص طور سے ہر فرد کو علم اور مہارت حاصل کرنے کا حصہ حاصل ہوگا۔

ہندوستانی پالیسی کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فرد پر زور دیا گیا ہے اور اس میں خود اعتمادی سے بھرپور فرد کی نشوونما اور جمہوری اقدار و قومی اتحاد کی اہمیت کو نمایاں مقام حاصل ہو گیا ہے۔

تعلیم کیوں؟

تعلیم عوام، معاشی و معاشرتی گروہوں اور علاقوں کے درمیان عدم مساوات کی خلیج کو پاٹنے میں مدد دیتی ہے جس سے انتشار پسندانہ رجحانات ختم ہو جاتے ہیں۔ اس سے وہ افرادی قوت پیدا ہوتی ہے جس کا تمام دوسرے وسائل کی افادیت پر کئی گنا اثر پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ترقی کے لیے سرمایہ کاری ہے۔

تعلیم کا اہم ترین مرحلہ ابتدائی تعلیم ہے کیوں کہ اسی مرحلہ میں کسی فرد کی ہمہ گیر شخصیت کی نشوونما کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

اقتصادی ترقی کی خاطر افرادی قوت

کی فراہمی اور پیداوار، روزگار اور تعلیمی عمل کے درمیان واسطہ کی فراہمی کی غرض سے پیشہ ورانہ تعلیم بہت ضروری ہے۔

اعلیٰ تعلیم مستقبل کی تشکیل کی غرض سے نظریات اور انسانوں کی فراہمی نیز تعلیم کے دوسرے مرحلوں کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ اس سے ہمیں لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی وہ حساس افزادی قوت ملتی ہے جس کی صنعتوں زراعت، سروسوں اور انتظامیہ کو ضرورت پڑتی ہے۔

اس سب کے باوجود تعلیم معاشرہ کی سب ہی خامیوں کو دور نہیں کرسکتی۔ یہ معاشرہ کا محض ایک ذیلی نظام ہے۔ اس لحاظ سے اس میں پورے ماحول کی خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔

تعلیمی پالیسی کے معاشرتی جواز کی خاطر اس کے ذمہ داروں کو تعلیم کے معیاری اور مقداری مقاصد کا تعین کرنا ہوگا۔

تعلیم کی موجودہ حالت کی ذمہ داری بڑی حد تک ڈگریوں کے حصول پر بہت زیادہ زور دینے اور امتحان کے اس طریقہ کار پر ہے جس سے طلبار کی تعلیمی قابلیت کو سالانہ وقفہ پر بڑی حد تک رٹے رٹائے سبقوں کی بنیاد پر پرکھنے کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ امتحانات اور ڈگریوں کا جواز بڑی حد تک ختم ہوکر رہ گیا ہے جب تک تعلیم کے احیار نو کے ذریعہ اس طریقہ کو ختم نہ کیا جائے گا اس وقت تک استحصال، عدم تحفظ اور تشدد کو ختم کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ذات پات، مذہب اور علاقے کی بنا پر پیدا ہونے والی علیحدگی پسندانہ طاقتوں کا خاتمہ بھی ضروری ہے کیوں کہ ان کی وجہ سے قومی سالمیت کا احساس ختم ہوتا جارہا ہے۔ قومی انفرادیت اور تشخص پر فخر کے احساس کو دوبارہ پیدا کرنا ضروری ہے۔

تعلیم کی جدید کاری اس لیے ضروری ہے کہ اس طرح پیداوار، سروسوں اور بنیادی ڈھانچہ کی جدید کاری ممکن ہے۔

تعلیم کی حالت

آزادی کے بعد سے تعلیم کے میدان میں پیدا ہونے والی زبردست ترقی کے باوجود ملک آج بھی اُن اُمنگوں کو پورا کرنے میں ناکام ہے جو تعلیم کے معیار، اس کی مساویانہ تقسیم اور سب ہی کو اس سے مستفیض ہونے کے احساس سے پیدا ہوتی ہیں۔ خواندگی کے معاملہ میں ہندوستان کا شمار آج دُنیا کے انتہائی پسماندہ ممالک میں ہوتا ہے۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق ملک میں خواندہ افراد کا تناسب صرف ۳۶٫۲ فیصد تھا۔ ان میں سے عورتوں اور اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کا تناسب علی الترتیب صرف ۲۴٫۹ فیصد۔ ۲۱٫۴ فیصد اور ۱۶٫۴ فیصد تھا۔ پہلے سے آٹھویں درجہ تک پچھتر فیصد سے زائد طلبار درمیان ہی میں اپنی تعلیم چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ملک سب ہی کے لیے تعلیم کے مقصد کے حصول میں ناکام ہے۔ یہ شرح اقوام و قبائل مندرجہ فہرست اور لڑکیوں میں تو بہت ہی زیادہ ہے۔

مڈل، ہائی اور سیکنڈری اسکولوں میں پڑھنے والے طلبار کی تعداد جو ۱۹۴۷ء میں بائیس لاکھ تھی۔ ۱۹۸۳ تک بڑھ کر تین کروڑ ۸۴ لاکھ تک پہونچ گئی تھی۔ ایسے اسکولوں کی تعداد ۱۹۴۷ میں تیرہ ہزار تھی جو اب ایک لاکھ پچھتر ہزار تک پہونچ گئی ہے۔

۱۹۶۰ — ۶۱ میں ہائر سیکنڈری امتحان پاس کرنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد نو لاکھ ۷۳ ہزار تھی جو ۸۲ — ۱۹۸۱ تک بڑھ کر اکسٹھ لاکھ ۴۰ ہزار ہوچکی تھی۔ ایسے طلبار اور طالبات میں سے تقریباً اسی فیصد کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلہ کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ ان میں سے صرف بیس فیصد کو پیشہ ورانہ اور ٹیکنیکل تعلیم کی داخلہ مل پاتا ہے۔

۱۹۶۸ کی تعلیمی پالیسی میں طے کیا گیا تھا کہ دسویں کلاس پاس کرنے والوں میں سے پچاس فیصد کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کئے جائیں۔ تاہم ۸۳ — ۱۹۸۲ تک پیشہ ورانہ کورسوں میں دسویں کلاس پاس کرنے والے صرف ساٹھ ہزار طلبار اور طالبات کو داخلہ مل سکا۔

اس وقت ملک میں پانچ ہزار دو سو چھیالیس کالج اور ایک سو چالیس یونیورسٹیاں ہیں۔ ان میں زیرِ تعلیم طلبا و طالبات کی تعداد ۳۳ لاکھ ۶۰ ہزار ہے۔ ان میں سے لڑکیوں کی تعداد نو لاکھ ۷۶ ہزار ہے۔ ۱۹۴۷ میں ہندوستان میں صرف سات سو کالج اور بیس یونیورسٹیاں تھیں جن میں چار لاکھ طلبار و طالبات تعلیم پارہے تھے۔

ملک نے اگرچہ کچھ عظیم کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ تاہم ۱۹۶۸ کی تعلیمی پالیسی کا یہ مقصد حاصل نہ ہوسکا۔ کہ تعلیم کو روزمرہ کی زندگی کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ کیا جائے۔ حصول تعلیم کے مواقع میں وسعت پیدا کی جائے۔ تعلیم کا معیار بلند ہو۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے فروغ پر زور دیا جائے۔ سائنس و ٹکنالوجی میں فروغ کے نتیجہ ہی میں تعلیمی ضروریات پیدا ہوگئی ہیں۔

ناکامیاں

عوام عام طور سے ایسی تعلیم کے بارے میں

بے حِس رہتے ہیں جس کا اُن کی روزمرہ کی ضروریات سے تعلق نہ ہو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسکول نظام ایک ایسی افسرشاہی کا حصہ بن کر رہ گیا ہے جو مقامی سطح پر مداخلت کے کافی مواقع ہی فراہم نہیں کرتی بلکہ اساتذہ کو پیش قدمی اختیار کرنے کی ہمت شکنی بھی کرتی ہے۔ اسی لیے تعلیمی نظام بڑی حد تک حکومت کی ذمہ داری بن کر رہ گیا ہے۔

ملک میں ناخواندہ افراد کی تعداد ۱۹۷۱ میں تیس کروڑ تھی جو ۱۹۸۳ء تک چار لاکھ سینتیس لاکھ تک پہنچ گئی۔ آبادی کے تناسب کے لحاظ سے ۱۹۷۱ میں خواندہ افراد پوری آبادی کا ۶۶ء۱۶ فیصد تھے اور ۱۹۸۵ میں یہ تناسب ۲۳ء۳۶ فیصد تک پہنچ گیا تھا۔ تاہم اس معاملہ میں مختلف علاقوں کے درمیان ہونے والی ترقی میں زبردست عدم مساوات موجود ہے۔

اس صورتِ حال سے اِس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ آبادی میں ہونے والے زبردست اضافے کی وجہ سے وہ مثبت نتائج بے معنی ہوکر رہ گئے ہیں جو ابتدائی تعلیم اور تعلیم بالغان سے حاصل ہوتے تھے۔ صورتِ حال خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، حقیقت یہ ہے کہ اگر آج کے حالات بدستور موجود رہتے ہیں تو ۲۰۰۰ء تک ملک میں ناخواندہ افراد کی تعداد پچاس کروڑ تک پہونچ جائے گی۔

اقوام متحدہ کے کمیشن برائے تعلیم و معاشیات (یونیسکو) کی رپورٹ کے مطابق تعلیم بالغان کے لیے ستر فیصد آبادی کا خواندہ ہونا بنیادی شرط ہے۔

۱۹۷۸ء میں کرائے گئے ایک کُل ہند جائزے سے اس امر کا انکشاف ہوا کہ بہت سے پرائمری اور مڈل اسکولوں میں بنیادی ضرورت کی ایسی اشیاء کا بھی فقدان ہے جیسے اسکول کی عمارت، تختۂ سیاہ، لائبریری کی سہولیات اور کھیل کا میدان۔

جمع دو کے اسٹیج پر پیشہ ورانہ تعلیم کے اعداد و شمار اتنے کم ہیں کہ ان کا ذکر نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ ۱۹۶۸ کی تعلیمی پالیسی کے مطابق جمع دو کی سطح پر ۵۰ فیصد طلباء و طالبات کا داخلہ پیشہ ورانہ نوعیت کے اداروں میں ہونا چاہیے تھا۔

کالجوں اور یونیورسٹیوں کی حالت بحیثیت مجموعی تشویشناک ہے کیوں کہ ان میں سے بہت سے اداروں میں ذات پات، علاقائیت اور نسل پرستی کا بول بالا ہے۔ ان میں سے کچھ تو عملاً میدانِ جنگ بن کر رہ گئے ہیں۔ یہاں سیاسی اور دیگر نوعیت کی ٹولیاں سے اساتذہ اور عملہ کے دوسرے افراد کی پشت پناہی سے اقتدار اور بالادستی کے حصول کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ جم کر لڑائی لڑتی ہیں۔

بڑے پیمانے پر یہ احساس پایا جاتا ہے کہ ماہرِ تعلیم کی موجودہ حالت بہت بڑی حد تک بیرونی، ایجنسیوں کی اعلانیہ اور خفیہ مداخلت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو تعلیمی معیار برقرار رکھنا اور اختراعی نوعیت کے پروگراموں کو فروغ دینا ہے۔ تاہم اس کے تعلیمی معیار کو برقرار رکھنے اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کارکردگی کی ایک کم از کم سطح کے حصول کے لیے کی گئی کوششوں پر اعتراضات ہوتے ہیں۔

کالجوں کے گریجویٹوں کا معیار اور اُن کی کام کرنے کی صلاحیت دونوں بری طرح مفلوج ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آرٹس اور ہیومینٹیز کے شعبوں میں تعلیم کے جو پروگرام پیش کیے جاتے ہیں ان کا حقیقی زندگی کی ضروریات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اور سائنس کے شعبہ میں تعلیم اس طرح دی جانے لگی ہے کہ لیباریٹری کے آلات اور کٹوں جیسی اہم بنیادی نوعیت کی اشیاء کی مدد کے بغیر ہی اصولوں اور نظریات کی وضاحت کردی جاتی ہے۔

تکنیکی تعلیم کو اس وقت سخت مسائل سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجود مشینیں اور آلات پرانے اور فرسودہ ہونے کی وجہ سے رفتہ رفتہ متروک اور ازکار رفتہ ہوتے جارہے ہیں اور ٹکنالوجی کے نئے میدانوں میں تحقیق اور ٹریننگ کے لیے درکار آلات مشینوں اور وسائل کا فقدان ہے۔

مروجہ طریقۂ تعلیم میں اساتذہ کے کردار کی اہمیت مسلمہ ہے لیکن اس کا موجودہ معیار مطلوبہ معیار سے بہت کم ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ درس و تدریس کا پیشہ بھی سیاسی بازیچہ گری کا شکار ہوچکا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اب یہ ایسا پیشہ بن گیا ہے کہ جس کو کہیں اور ملازمت نہ ملے اس کو اس کے دامن میں پناہ مل جاتی ہے۔ اساتذہ کے لیے قابلیت و صلاحیت کی بنا پر ترقی کی اسکیم پر جس طرح عمل ہو رہا ہے اس سے بہت سے طبقوں میں تشویش پائی جاتی ہے۔

تعلیم کے موجودہ طریقۂ کار میں اس کی دسترس، اصول معدلت اور اثرات کے نقطۂ نظر سے زبردست عدم مساوات پائی جاتی ہے۔ دیہاتی آبادی گرچہ پورے ملک کا تین چوتھائی حصہ ہے لیکن تعلیمی شعبہ میں

ان کو بہت کم وسائل دستیاب ہو پاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اقوام و قبائل مندرجہ فہرست اور معاشرہ کے دوسرے کمزور طبقات کے بچے عام معیار سے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔

تعلیم اور روزگار کی منڈیوں کے درمیان جو مسائل پائے جاتے ہیں، اُن کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے درمیان کسی طرح کے ارتباط کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ اسکولوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے اُس میں کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جس سے زراعت یا دیہات سے تعلق رکھنے والے غیر منتظم سیکٹر کے پیشوں میں کام کرنے کے لیے طالب علم کی صلاحیت میں اضافہ ہو سکے۔

فی طالب علم ہونیوالے خرچ میں کمی

تعلیم کے لیے ۵۱-۱۹۵۰ میں ایک ارب چودہ کروڑ روپے مخصوص کیے گئے اور اور ۷۷-۱۹۷۶ میں یہ رقم بڑھ کر تئیس[۲۳] ارب چار کروڑ سولہ لاکھ روپے تک پہونچ گئی تھی۔ رقم میں اس زبردست اضافے کے باوجود ان برسوں میں عملاً تعلیم پر ہونیوالے خرچ میں زبردست کمی ہوئی ہے۔ ۵۱-۱۹۵۰ سے ۷۷-۱۹۷۶ تک کالج کی تعلیم کے لیے فی طالب علم ہونے والا خرچ چارسو اڑسٹھ[۴۶۸] روپے اسّی پیسے سے کم ہو کر تین سو تیس روپے نوّے پیسے اور پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے ایک ہزار چھ سو چالیس روپے سے کم ہو کر آٹھ سو نوّے روپے دس پیسے رہ گیا۔ البتہ ابتدائی تعلیم کے نام پر فی طالب علم خرچ میں ادا فیصد ہی کا برائے نام اضافہ ضرور ہوا۔ اس مد پر ۵۱-۱۹۵۰ میں فی طالب علم خرچ اکتالیس روپے نوّے پیسے تھا، جو ۷۷-۱۹۷۶ میں پچپن روپے بیس[۲] پیسے ہو گیا تھا۔

ابتدائی چار منصوبوں میں تعلیم کے لیے ہونے والے پورے خرچ میں ابتدائی تعلیم کا حصہ بتدریج کم ہوتا رہا ہے۔ پہلے پنج سالہ منصوبے میں یہ حصہ چھپّن فیصد دوسرے منصوبہ میں پینتیس فیصد۔ تیسرے منصوبے میں ۳۴ فیصد اور چوتھے منصوبے میں تیس[۳۰] فی صد تھا۔ چھٹے منصوبے میں یہ حصہ بڑھا کر چھتیس[۳۶] فیصد کر دیا گیا تھا۔ برخلاف اس کے کہ یونیورسٹی اور کالجوں کے تعلیم کے حصہ میں مسلسل اضافہ ہوا۔ پہلے منصوبہ میں اس مد کا حصہ نو فیصد تھا، جو چھٹے منصوبے میں سولہ فیصد تک پہنچ گیا۔

ریاستیں تعلیم پر ہونے والے پورے خرچ کا تقریباً ستّر فیصد حصّہ برداشت کرتی ہیں۔ تعلیم کی ترقی میں سُست رفتاری کی بڑی وجہ وسائل کی کمی رہی ہے۔ اس مد کے لیے مخصوص رقم کا تقریباً اسّی فیصد حصہ تنخواہوں اور انتظام پر خرچ ہو جاتا ہے۔

تکنیکی تعلیم کے طریقوں میں موثر اصلاح کے لیے مندرجہ ذیل امور پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔ اچھے اساتذہ کو راغب کرنا، صنعتوں کے ساتھ باہمی رابطوں میں اضافہ، دیہات کے غریب باشندوں کی فلاح وبہبود کی غرض سے جدید ٹکنالوجی کے استعمال میں فیکلٹیوں کو شامل کرنا۔ خصوصی نوعیت کے کالجوں، علاقائی کالجوں اور ٹکنالوجی کے ہندوستانی اداروں کے درمیان موجودہ عدم مساوات کو کم کرنا اور مختلف قسم کے اداروں کے درمیان باہمی ربط کے جال کا قیام۔

یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ منظّم نجی سیکٹر کو تکنیکی تعلیم کی کسی حد تک مدد کرنے کے لیے مجبور کیا جائے کیوں کہ اس طرح کی تعلیم سے پیدا ہونے والی انفرادی قوّت کا بڑا حصّہ اسی سیکٹر میں کھپ جاتا ہے۔

نیا نقطۂ نظر

تعلیم کے لیے نئے نقطۂ نظر کا اختیار کرنا ضروری ہے۔ پالیسیوں کی تشکیل، وسائل کی تقسیم، مختلف شعبوں کے درمیان باہمی رابطو کو یقینی بنانے، معیاروں کو بلند کرنے، کارکردگی پر نظر رکھنے اور اس کی افادیت کو پرکھنے کے طریقوں میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ نئے نقطۂ نظر میں سیکھ سکنے کی صلاحیت کو اس سے زیادہ اہمیت دی جائے گی جو سیکھا گیا ہے۔ خاص زور تعلیم کو جاری رکھنے پر دیا جائے گا۔ اخلاقی اور معاشرتی قدروں پر بہت زیادہ دھیان دیا جائے گا۔ تعلیم کی دست رس، اس کی معدلت، اور نوعیت کو باریک بینی سے کی گئی منصوبہ بندی کے ذریعہ یقینی بنایا جائے گا۔

تعلیمی پالیسی مستقبل کی تشکیل کا ذریعہ ہے، اس کا اثر پوری نسل پر پڑتا ہے۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ اس مسئلہ پر ہونے والی بحث میں اور مختلف مسائل اور نقطہائے نظر پر ہونے والے تبادلہ خیال میں تعلیم کے پیشے سے تعلق یا دلچسپی رکھنے والے افراد کو بھی شریک کیا جائے۔

تعلیم کو جو فرض انجام دینا ہے وہ سائنسی مزاج اور جمہوری اقدار کے حامل ایسے افراد تیار کرنا تو ہے ہی جن میں جسمانی، دماغی اور اخلاقی خوبیاں باہم مربوط ہوں، لیکن اس کے علاوہ تعلیم کا فرض طلبا میں سخت محنت کے لیے صنعتمندانہ رجحان اور محنت کے وقار کا احساس پیدا کرنا بھی ہے۔ ان میں سیکولرازم، معاشی انصاف

اور ملک کی سالمیت اس کے وقار اور ترقی کے لیے تڑپ پیدا کرنا بھی اس کا کام ہے۔ اس کے علاوہ عوام میں اقتصادی ترقی اور روزگار کے لیے ضروری معلومات اور صلاحیت پیدا کرنا بھی اسی کی ذمہ داری ہے۔ اس لیے تعلیم تک سب ہی شہریوں کی مساویانہ دسترس لازمی ہے۔ تعلیم ترقی کے سب ہی شعبوں کے لیے درکار بنیادی ضرورت ہے۔

چیلنج

یہ احساس بڑا عام ہے کہ صرف معمولی تبدیلیوں سے طریقۂ تعلیم کی اصلاح نہیں ہو سکتی اور یہ وقت اس میں بنیادی نوعیت کی کوشش ہے۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ موجودہ نظام تعلیم میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیوں سے ان مفاد پرست عناصر کے ساتھ تصادم کا ہونا لازمی ہے جو اس سے فائدے اٹھا رہے ہیں۔ امتحان کے موجودہ طریقہ میں تبدیلیاں۔ درس و تدریس کے نئے اختراعی نقطۂ نظر کا اختیار کرنا۔ نصاب تعلیم کی اصلاح۔ ڈسپلن کا نفاذ۔ انتظامیہ کی تشکیلِ نو۔ انتظامی اختیار کی لامرکزیت ایسے معاملات ہیں جن کی بڑی سختی سے مخالفت کی جائے گی۔

تعلیمی اداروں کو سیاست سے صاف کرنے کی مخالفت نہ صرف وہ سیاستداں کریں گے جن کو اس طرح اپنے حامی رضاکاروں سے محروم ہونا ہوگا بلکہ کچھ مفاد پرست تدریسی اور غیر تدریسی عملہ بھی اس کوشش کی مخالفت کرے گا، کیوں کہ اس طرح وہ تعلیمی اداروں کو تخریب پسندی کا شکار بنانے کے مواقع سے محروم ہو جائیں گے۔

ان کے علاوہ دوسری مشکلات بھی ہیں جن کا تعلق تعلیم کے ذرائع کے صحیح استعمال سے ہے، مثلاً کمپیوٹر ٹکنالوجی کے فروغ کے لیے تربیت یافتہ افرادی قوت کی کمی کسی ایسے ٹیلی ویژن چینل کا نہ ہونا جو صرف تعلیمی اغراض کے لیے مخصوص ہو یا دور دراز فاصلے پر تعلیم دینے کے لیے کسی منظم فنِ تعلیم کا فقدان ہے۔

ابتدائی تعلیم کو عام کرنے کی راہ میں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مفلس طبقے کو حصولِ تعلیم کے موانع وقت سے ملتے ہیں۔ تکنیکی اداروں میں تحقیق و ترقی کے شعبہ کی موجودہ جدید کاری بھی مفلس طبقہ کے لیے دشواریاں پیدا کر سکتی ہے۔

تعلیم سے متعلق وسائل کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے مرکز اور ریاستوں کا ایک مشترکہ کمیشن قائم کیا جا سکتا ہے جو طویل المدتی بنیاد پر ان وسائل کے حصول کے لیے حکمتِ عملی کا تعین کرے گا کیوں کہ ضروری وسائل کی عدم موجودگی کی صورت میں ابتدائی تعلیم کو عام کرنا، پیشہ ورانہ تربیت کے دائرہ کو وسعت دینا۔ جہالت کا خاتمہ، درس و تدریس کے معیار کو بلند کرنا اور اعلیٰ درجہ کے اداروں کا قیام ممکن نہ ہوگا۔

اس صورت میں کہ تعلیم آئین کی مشترکہ فہرست میں شامل ہے، مرکز کو یہ طے کرنا ہوگا کہ ترجیحات اور اولیتوں کے معاملہ میں معیاری اصلاح کی غرض سے وہ قومی تعلیمی نظام میں کس حد تک مداخلت کرے۔ اس سیاق و سباق میں نیز قومی یکجہتی کے مقصد کے حصول کی خاطر پورے ملک کے لیے یکساں نصاب کی ضرورت اور اس کے لیے ضروری طریقۂ کار پر بھی غور کرنا ہوگا۔

ایک اور مسئلہ جس پر غور کرنا ہوگا ایسا ہے کہ جس پر کافی بحث و مباحثہ ہو چکا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ کیا مرکزی حکومت کو تعلیمی اداروں کو سیاست سے پاک کرنے اور اُن کی جدید کاری کے لیے خود کوئی طریقۂ کار اختیار کرنا ہوگا۔

ملک میں اساتذہ کی تعداد ۱۹۸۱ء میں اکیس لاکھ ستّر ہزار تھی اور ۱۹۹۰ تک بائیس لاکھ مزید اساتذہ کی ضرورت ہوگی۔ یہ اندازہ اس مفروضہ کی بنیاد پر لگایا گیا ہے کہ اسکولی تعلیم کے معیار میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ کم از کم عملے سہولیات کی فراہمی میں مزید تاخیر نہیں کی جا سکتی۔

تعلیم کے فروغ اور اس کے معیار کی بلندی کے لیے کسی بھی حکمتِ عملی پر اُس وقت تک غور نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک پڑھنے والا ایک ایسا معاشرہ قائم نہ ہو جائے جس میں ہر عمر کے افراد اپنی تعلیم کو جاری رکھنے کے لیے عملی حصہ نہ لیں۔ اس سے خاندانی بہبود، توانائی کے تحفظ، جنگلات کے کٹاؤ کو روکنے، صحت کے تحفظ اور امراض سے تحفظ کے پروگرام کو ایک نئی طاقت ملنے کے علاوہ جمہوریت کی بنیاد بھی مضبوط تر ہو گی۔

سیکنڈری تعلیم کے دس جمع دو پروگرام کے جزو کے طور پر پیشہ ورانہ تعلیم کو صنعت، زراعت، سروسوں کے سیکٹر اور دیہی ترقی کے مختلف پروگراموں میں روزگار کے مواقع کے ساتھ منسلک کرنے کے علاوہ مردوں اور عورتوں کو اپنا روزگار خود چلانے کے لیے بھی تیار کرنا ہوگا۔

تعلیمی نظام کو اگر لامرکوز کر دیا جائے

اور اس کا انتظام اس میں حصہ لینے والوں یا اس سے فائدہ اُٹھانے والوں کے سپرد کر دیا جائے تو تعلیم کے تمام مراحل اور مخارج کو نئے معنی عطا ہو جائیں گے۔ تجویز یہ ہے کہ اسکولی تعلیم کو زیادہ سے زیادہ دیہاتی آبادی کے ہاتھوں میں دے دیا جائے۔

ضلع کا تعلیمی مرکز، تعلیم کی منصوبہ بندی، ٹریننگ، اس پر نظر رکھنے، اس کی توسیع اور تحقیق کا بنیادی مرکز ہوگا۔

یہ تجویز بھی ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے انتظامیہ پر اسکولی تعلیم پاس کرنیوالوں کے داخلہ کے لیے ٹیسٹ لینے کے بوجھ کو کم کر دیا جائے اور ملازمتوں کے لیے ڈگری کی شرط کو ختم کر دیا جائے۔

انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے جواز اور معیار کو بہتر کرنے کے لیے چند اور تجاویز بھی ہیں۔ یہ تجاویز ہیں کہ زیادہ سے زیادہ کالجوں کو مزید اور بامقصد انداز کی خود مختاری دی جائے۔

مقصد یہ ہے کہ طالب علموں کے ذوق، معاشرہ اور کام کی دنیا کے درمیان زیادہ قریبی رابطہ قائم کیا جائے۔

یہ تجویز ہے کہ موجودہ طریقۂ تعلیم والے کالجوں کی تعداد میں اضافے پر پابندی لگا دی جائے اور صرف پیشہ ورانہ نوعیت کے ایسے کالجوں کے کھولے جانے کو ترجیح دی جائے جن کا زراعت، گھریلو معیشت، جنگلات کے اُگانے، ارضی اور آبی ترقی، شہری منصوبہ بندی، نقل و حمل کے انتظام، عوامی انتظامیہ اور دفتروں کے انتظام جیسے متعدد شعبوں سے گہرا رابطہ ہو۔

نئی تعلیمی پالیسی کے لیے جو بھی متعدد رُخی حکمتِ عملی اختیار کی جائے ایسی ہونی چاہیے۔ ابتدائی تعلیم کو عام کرنے کی ضروریات، نئی اور روز بروز پیدا ہونے والی جدید تخلیقی ٹکنالوجی سے عہدہ برآ ہوسکنے کے قابل انتہائی باصلاحیت افرادی قوت، متنوع پیشہ ورانہ تعلیم اور تعلیم بالغان نیز تعلیم کے فروغ کے ذریعے پیدا شدہ ترقی کے "ہمہ گیر اور ہمہ جہتی ماحول کی پیداوار کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوسکے۔ اس طرح جو نئی تعلیمی پالیسی وجود میں آئے گی وہ اس حد تک کامیاب رہے گی جس حد تک یہ انسانی وسائل کے فروغ کے لیے مکمل قومی ذمہ داریوں کی عکاسی کرے گی۔

●

بقیہ، تعلیم کے لیے معیاری تبدیلیوں کی ضرورت

پالیسی یا ریاستی سطح پر بھی پالیسیاں اب تعلیم کی وزارتوں اور محکموں کی طرف سے بھی جس صورت میں اُن کی سرِدست تشکیل ہوئی ہے۔ خصوصی طور پر مرتب نہیں کی جاسکتیں۔ انسانی وسائل کی تخلیق اور استعمال سے متعلق ایک مربوط دستورکار اس امر کا مقتضی ہے کہ تعلیم کے شعبے میں اب جو کام اور ثقافت کی وسیع دُنیاؤں اور عمر بھر کی تعلیم کو احاطہ کئے ہوئے ہے پالیسی بنانے کے لیے ایک نئے دستورکار کی ضرورت ہے۔ پالیسی، منصوبہ بندی، سرمایہ کاری، نظامت اور انتظام کو جوڑنے والی کڑیوں کو مضبوط بنانے کی ضرورت ہے۔ اگر پالیسی کمزور اور غیر واضح ہے تو کارروائی کا سارا سلسلہ ہی غیر مؤثر ہو جاتا ہے۔ ملک گیر بحث شروع ہو چکی ہے اور اب مُلکی عادات اور روایات کے مطابق سیمینار اور سمپوزیم شروع ہوں گے جن کا سلسلہ اہم ترین شخصیتوں (وی آئی پی) کی طرف سے افتتاحیہ تقاریب اور تقاریر کے ساتھ بڑھ جائے گا۔ ان میں مختلف قسم کے خیالات کا اظہار کیا جائے گا۔ کیا اس سے واقعی ایک دانشمندانہ اور قابل کار پالیسی کی تشکیل ہوگی جس میں پلان اور مقررہ وقت کے اندر اُن کی تعمیل کا اہتمام ہو اور اس امر کا یقین ہو کہ وہ پالیسیاں انجام کار الفاظ اور اداروں سے پُرمعنی کارروائی کی جانب پیش قدمی کریں گی۔

●

بقیہ، اعلیٰ تعلیم ہمارے لیے کس طرح مفید ہوسکتی ہے

روشنی میں وہ نظرِثانی کے محتاج ہیں۔

اگر صورتِ حال یہی رہی اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ذمّے محض فنڈز کی فراہمی کی ہی ذمّہ داری رہی، تو یقیناً یونیورسٹی کے قوانین نظرِثانی کے محتاج ہیں۔ اور اس میں بدلتے ہوئے تقاضوں اور ضرورتوں کو سمانا ضروری ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے نظم و نسق کے ذمہ داروں کو انسانی اقدار کو شامل کرکے نصابات میں یکسانیت لانی ہے اور اسے اُوپر اُٹھانا ہے۔ انھیں محض کسی ایک نظام کے تابع نہ رہ کر عصری تقاضوں کو ساتھ لے کر چلنا ہے۔ اس کے بغیر اعلیٰ تعلیم عوامی اُمنگوں اور آرزوؤں کو پیدا نہ کرسکے گی۔ ہمیں نوجوانوں کو اکیسویں صدی میں قدم رکھنے کے لائق بنانا ہے۔ یہ وہ موقع ہوگا جب کہ ملک متحرک جمہوری ملک کی صورت میں تیزی سے بدل رہا ہوگا۔ ●

پبلیکیشنز ڈویژن کی کتابیں

مشعلِ آزادی : ساغر نظامی قیمت : ۳۰ روپے
ہندوستان کی جنگِ آزادی کی منظوم داستان (حصہ اول) ۴۰۰ صفحات پر مشتمل جس میں ۱۸۵۷ء تک کے واقعات شامل ہیں۔ دیدہ زیب کتابت و طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوشش۔

بھارت خلائی دور میں : قیمت : ۱۲ روپے
خلائی سائنس کی دلچسپ داستان۔ زمین سے کوٹھی کی سیر، رازہائے سربستہ کا انکشاف نہایت آسان زبان، خلائی کوششوں کا ہلکے پھلکے انداز میں بیان۔ ۱۴۰ صفحات کی کتاب۔ کاغذ عمدہ، تصاویر مزین۔

پہیلیاں : قیمت : ۸ روپے
پانچ سو سے زیادہ پہیلیوں کا مجموعہ جن سے بچے اور بڑے یکساں طور پر لطف اٹھا سکتے ہیں۔

رنگ برنگے پھول : قیمت : ۱۰ روپے
بچوں کے شاعر شفیع الدین نیر، سیفی سیوہاروی، افسر میرٹھی، اسمٰعیل میرٹھی، تلوک چند محروم اور دیگر بہت سے شعرا کی آسان زبان میں لکھی ہوئی نظمیں۔

آجکل کی کہانیاں : قیمت : ۱۱ روپے
۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۸ء تک رسالہ "آجکل" میں شائع شدہ مشہور کہانیوں کا مجموعہ، جس میں واجدہ تبسم، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور دیگر افسانہ نگاروں کے شہ پارے شامل ہیں۔

کون جیتا کون ہارا : قیمت : ۹ روپے
بچوں کے لیے آسان زبان میں لکھی ہوئی دو دلچسپ کہانیاں۔ کتاب شروع کرنے کے بعد ایک ہی نشست میں ختم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ عمدہ کتابت۔

ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر (ڈاکٹر محمد عمر) قیمت ۲۰ روپے
ڈاکٹر تاراچند نے اپنی مشہور تصنیف میں ہندوستانی تہذیب پر مسلمانوں کے اثرات کا جائزہ لیا تھا۔ ڈاکٹر محمد عمر نے اپنی اس محققانہ کاوش میں یہ دکھایا ہے کہ ہندوستانی تہذیب مسلمانوں کی زندگی میں سرایت کئے ہوئے ہے۔

بھارتی پارلیمنٹ : قیمت : ۷ روپے ۵۰ پیسے
یہ کتاب ان اہم اقدامات کا جائزہ پیش کرتی ہے، جو پارلیمنٹ نے پچھلے اٹھائیس برس کے دوران نافذ کئے نیز اس میں پارلیمنٹ کے قابلِ توجہ خد و خال اور اہم سرگرمیوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

مُرقعِ اقبال : (جگن ناتھ آزاد) قیمت : ۵۰ روپے
علامہ اقبال کی زندگی کے اہم واقعات، شجرۂ نسب اور نادر تصاویر اور تحریروں کا البم

یہ ہندوستان : (شیلا دھر) قیمت : ۱۰ روپے
اس باتصویر کتاب میں سادہ اور سہل زبان میں بچوں کو ہندوستانی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ تاریخی معاشی اور سماجی حالات سے آگاہ کیا گیا ہے۔ رنگین تصاویر۔

سرسید احمد خاں : (پروفیسر خلیق احمد نظامی) قیمت : ۵ روپے
ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی، ثقافتی، اور سیاسی زندگی پر سرسید کے کارناموں کا زبردست اثر پڑا ہے۔ اس بات کو بڑے عالمانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ابوالکلام آزاد : (عرش ملسیانی) قیمت : ۵ روپے
ابوالکلام آزاد جدید ہندوستان کے معماروں میں ہیں۔ ان کی خدمات کا حسین و دلکش انداز میں بیان۔

جواہر لال کی کہانی تصویروں کی زبانی : قیمت : ۲/۵۰ روپے
محبوب رہنما اور ہندوستان کے پہلے وزیرِ اعظم شری جواہر لال نہرو کی زندگی کے دلچسپ واقعات۔ رنگین تصاویر میں۔ بچوں کے لیے بہترین تحفہ

ہم ایک ہیں : (عرش ملسیانی) قیمت : ۱۰ روپے
ہندوستان کی ثقافتی و سماجی گوناگونی اور یک رنگی کا دلچسپ بیان۔ قومی زندگی کی توانائی کی داستان۔

پھلوں اور سبزیوں کو محفوظ رکھنے کے طریقے : قیمت ۲/۵۰ روپے
گھریلو ضرورتوں کے جام، جیلی، مارملیڈ، چٹنی مربّے اور اچار وغیرہ بنانے کے طریقے تصویروں کے ذریعے بتائے گئے ہیں جن سے بڑی آسانی سے آپ گھر بیٹھے اپنی من پسند چیزیں بنا سکتے ہیں۔

پریم چند - فکر و فن از : قمر رئیس قیمت : ۸ روپے
پریم چند کی تخلیقات کا مطالعہ، فکر و فن کی گہرائیوں کا جائزہ، عصری حقیقتوں کی ترجمانی قارئین اور طلبا کے لیے انمول تحفہ۔

یوجنا اردو کے خریداروں کو ۱۰ فیصد کی رعایت، محصول ڈاک ہمارے ذمے

پچیس روپے سے کم قیمت کی کتابیں بذریعہ وی۔ پی نہیں بھیجی جائیں گی۔ پوسٹل آرڈر بھیجئے یا وی۔ پی طلب کیجئے۔

کتابیں ملنے کا پتہ : بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

تعلیم کے شعبے میں اقدار کی مکمل گراوٹ سے سماج کو سب سے زیادہ نقصان پہونچا ہے۔ اساتذہ اور منتظمین کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اساتذہ کے سامنے بلند و بالا نظریات نہیں ہیں اور وہ صرف راتوں رات امیر بننے کی دُھن میں اخلاقی ضابطوں سے مُنھ موڑ لیتے ہیں۔ چنانچہ بظاہر اس بات کی ضرورت ہے کہ اُستادوں کی تنظیمیں ایک ضابطۂ اخلاق مرتّب کریں۔ لیکن نئی تعلیمی پالیسی میں اس حقیقت کو نظر انداز کیا گیا ہے کہ محض تعلیمی شعبے سے ضابطۂ اخلاق یا کام کے سلسلے میں کسی اصولی نظام کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے، خواہ وہ اخلاقی ضابطہ امتحانات سے متعلق ہو، درس و تدریس سے متعلق ہو، یا تخلیقی ذمّہ داریوں یا انتظامی ذمّہ داریوں سے، جبکہ بحیثیت مجموعی سماج کا اخلاقی تانا بانا پوری طرح ٹوٹ چکا ہو۔ ایک ترقی پذیر معاشرے میں کام کے ہر ایک شعبے میں سیاسی عمل دخل، بدعنوانی اور زندگی کی اعلیٰ اقدار سے بے پروائی جیسی بُرائیوں نے وہ دیو قامت صورت اختیار کرلی ہے کہ اس سلسلے میں کوئی بھی خطیبانہ انداز رتّی بھر کارگر نہیں ہوسکتا۔ تعلیمی نظام کی کامیابی کے لیے اخلاقی سطح پر سماج کی اصلاح بہت ضروری ہے۔

ڈاکٹر ڈی۔ ایم نیجنڈپّا

Regd. No. D.(DN) 204
R.N. 37052/81

Licensed U (DN) 65 to post without prepayment at Civil Lines Post Office, Delhi-110054.

VOL. 5 No. 19-20 YOJANA (URDU) 1-31 January 1986
Special Issue

ایسے ڈھالو میرے بچے کو

ابراہیم لنکن کا ایک ہیڈ ماسٹر کے نام خط

"HE WILL HAVE TO LEARN, I know, that all men are not just, all men are not true. But teach him also that for every scoundrel there is a hero, that for every selfish politician there is a dedicated leader. Teach him that for every enemy there is a friend. It will take time, I know, but teach him if you can that a dollar earned is of far more value than five found. Teach him to learn to lose and also to enjoy winning. Steer him away from envy, if you can teach him the secret of quiet laughter. Let him learn early that the bullies are the easiest to lick. Teach him, if you can, the wonder of books but also give him quiet time to ponder the eternal mystery of birds in the sky, bees in the sun and flowers on a green hillside.

"In school, teach him it is far more honourable to fail than to cheat. Teach him to have faith in his own ideas, even if everyone tells him they are wrong. Teach him to be gentle with gentle people and tough with the tough. Try to give my son the strength not to follow the crowd when everyone is getting on the bandwagon. Teach him to listen to all men but teach him also to filter all he hears on a screen of truth, and take on the good that comes through.

"Teach him, if you can, how to laugh when he is sad. Teach him there is no shame in tears. Teach him to scoff at cynics and to beware of too much sweetness. Teach him to sell his brawn and brain to the highest bidders, but never to put a price tag on his heart and soul. Teach him to close his ears to a howling mob and to stand and fight if he thinks he's right.

"Treat him gently, but do not cuddle him, because only the test of fire makes fine steel. Let him have the courage to be impatient, let him have the patience to be brave. Teach him always to have sublime faith in himself, because then he will always have sublime faith in mankind."

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002.

یوجنا

یکم تا ۱۵ رفروری ۱۹۸۶

ایک روپیہ

تعلیم اور اقلیتیں

(اے. کے. کھنّہ)

لوک عدالتیں

(پریم پال اشک)

خلیل اکمل

ہندوستان میں پٹرولیم مصنوعات کی تیاری

کسی بھی ملک کی صنعتی ترقی کا انحصار اُس ملک کے قدرتی وسائل پر ہوتا ہے۔ اِن وسائل میں خصوصاً پٹرول کی دستیابی ملک کی خوشحالی کی ضامن ہے۔ چنانچہ آج پٹرول قوموں اور ملکوں کی ترقی کا پیمانہ بن گیا ہے اور وہی ملک متمول اور ترقی یافتہ کہلاتا ہے جہاں پٹرول کی فراوانی ہو۔ ہماری روزمرہ زندگی میں پٹرول نہ صرف ذرائع نقل و حمل میں استعمال کیا جارہا ہے بلکہ یہ کئی مصنوعات کی تیاری میں بھی مدد دیتا ہے۔ ہندوستان میں خام پٹرول کے ذخائر کا اندازہ تین سو ملین ٹن لگایا گیا ہے اور ہماری کھوج کے نتیجہ میں ہر سال ان ذخائر میں اضافہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ ہمارے ملک میں خام پٹرول کی پیداوار ۳۴ ملین ٹن ہے، جس کا ۶۰ فیصد صرف بمبے ہائی میں پیدا ہوتا ہے۔ ہمارا سالانہ خرچ ۵۰ ملین ٹن سے تجاوز کر گیا ہے اس لیے مائع پٹرول درآمد کرنا ناگزیر ہے۔

پٹرول کئی کیمیاوی مرکبات کا ایک پیچیدہ آمیزہ ہے، جس کا بیشتر حصہ ہائیڈرو کاربنس یعنی کاربن اور ہائیڈروجن سے بنے ہوئے نامیاتی مرکبات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ اس میں گندھک اور نائٹروجن جیسے عناصر بھی موجود ہیں۔ جب یہ خام حالت میں زمین سے نکالا جاتا ہے تو یہ کسی مصرف کا نہیں ہوتا کیونکہ یہ ڈامبر کی طرح سیاہ اور گاڑھا سیال ہوتا ہے۔ اِس لیے اِس کو عمل کشید کے ذریعے مختلف کشیدوں میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ پہلے لطیف کشید سے میں ۲۵ فیصد گیسولین یا پٹرول ۷ فیصد پکوان گیس اور ۵۶ فیصد نفت NAPHTHA ہوتا ہے۔ دوسرے نسبتاً کثیف کشید سے میں ۱۲ فیصد مٹی کا تیل ۶۲ فیصد ہائی اسپیڈ ڈیزل (High Speed Diesel) اور ۷ فیصد لائٹ ڈیزل آئل (Light Diesel Oil) ہوتا ہے۔ جبکہ تیسرے کثیف کشید سے میں ۵۷ فیصد Furnace oil اور ۱۳ فیصد Bitumen پایا جاتا ہے۔

پٹرولیم مصنوعات کی دریافت، پیداوار اور نکاسی کے لیے حکومت ہند نے ۱۹۵۶ میں دوسرے پنجسالہ منصوبہ کے تحت ایک منظم پروگرام مرتب کیا۔ تاکہ ان مصنوعات کو عوامی سطح پر ترقی دی جاسکے۔ چنانچہ اسی سال محکمہ آئل اینڈ نیچرل گیس کمیشن اور پھر ۱۹۶۳ میں پٹرولیم اور کیمیکلز کی وزارت تشکیل دی گئی۔ ہندوستان میں پٹرول کی تلاش کا کام اُنیسویں صدی میں شروع ہوا اور ۱۹۷۶ء تک خام پٹرول کی پیداوار آسام اور گجرات میں ہوا کرتی تھی۔ لیکن "بمبے ہائی" سے تیل کی دستیابی کے بعد اس کی پیداوار ۸ ملین ٹن سے بڑھ کر ۲۱ ملین ٹن سالانہ تک پہنچ گئی۔

ہندوستان میں پٹرول صاف کرنے کے چار بڑے کارخانے ہیں جہاں پٹرول کیساتھ ساتھ پٹرولیم کی دوسری مصنوعات بھی پیدا کی جاتی ہیں ان کارخانوں میں انڈین آئل کمپنی لمیٹڈ، بھارت پٹرولیم کمپنی لمیٹڈ، ہندوستان پٹرولیم کارپوریشن اور آسام آئل کمپنی شامل ہیں۔ ہماری بڑھتی ہوئی ضروریات کی تکمیل کے لیے دو اور فیکٹریاں کوچین اور مدراس ریفائنری لمیٹڈ کے نام سے قائم کی گئیں۔ جن مقامات پر پٹرول صاف کرنے کے کارخانے کام کر رہے ہیں ان میں بمبئی، مدراس، ویزاگ، برونی، کویالی، ہلدیہ، کوچین اور گوہاٹی قابل ذکر ہیں۔ ان میں ۲۵ ملین ٹن سالانہ خام تیل صاف کر کے ۸ ملین ٹن گیسولین حاصل کیا جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہمارا ملک ۱۹۹۰ء تک پٹرول کی پیداوار میں خود کفیل ہو جائے گا۔

پٹرولیم مصنوعات آج ہماری زندگی کے ہر شعبے میں سرایت کر چکی ہیں۔ ان میں پلاسٹک، مصنوعی ربڑ و ریشہ، پکوان گیس، مصنوعی کھاد، کیمیائی مرکبات، ڈٹرجنٹ اشیاء اور ایندھنی تیل یا (Furnace oil) بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ پٹرول کی سب سے اہم صنعت گھریلو پکوان گیس کی ہے جس کی سالانہ پیداوار ۴ لاکھ ٹن ہے۔ یہ گیس عمل کشید اور Cracking کیمیائی عمل سے حاصل ہوتی ہے۔ عمل کشید سے حاصلہ گیس تیل صاف کرنے والے کارخانوں میں ہی خرچ ہو جاتی ہے۔ لیکن کیراکنگ سے تیار ہونے والی گیس عوام تک پہنچائی جاتی ہے۔ یہ گیس دراصل Butane اور Propane گیسوں کا آمیزہ ہے۔ جس کو ۱۵ سو پونڈ فی مربع انچ دباؤ کے تحت سلنڈر میں بھرنے سے یہ مائع میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس مائع کی ایک سی سی فضائی دباؤ پر ۲۵۰ سی سی گیس فراہم کرتی ہے۔

(باقی کور صفحہ ۳ پر)

اس شمارے میں

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر — • آر. ٹھکرال

اسسٹنٹ ایڈیٹر — • محمد عادل صدیقی

سب ایڈیٹر — • وسیم حیدر

جلد ۵	یکم تا ۱۵ فروری ۱۹۸۶	شمارہ ۲۱

۱۲ تا ۲۶ ماگھ، شک ۱۹۰۷ سمہ ٹیلیفون ۶۰۱۸۱۸

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے، ۲ سال ۳۵ روپے، ۳ سال ۵۰ روپے

فی کاپی — ایک روپیہ

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فیصد کی رعایت

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ ہے

ایڈیٹر یوجنا (اردو)، پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر. کے. پورم (مین)
نئی دہلی

بزنس منیجر، ایل. آر. بترہ • اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن)، آر. ایس. منچال

سلسلہ کتابت: بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی

آجکل افرادی وسائل کی تعمیر و تشکیل پر خاص زور دیا جا رہا ہے لیکن ہمارے ملک میں چند مخصوص مفادات سائنس اور ٹکنالوجی کی ہندوستانی پس منظر اور ہندوستانی حالات کے مطابق ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہیں۔ ان کی خواہش یہی ہے کہ حالات جوں کے توں بنے رہیں۔ اور باہر سے درآمد کی گئی ٹکنالوجی پر ہی انحصار رہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے طریقے اور ایسے تحقیقی امور انجام دیئے جائیں جو ہندستان کے معاشی حالات میں سدھار لاسکیں اور ملک سے غریبی دور کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکیں۔ یہ کام اندازِ فکر میں تبدیلی لائے بغیر انجام نہیں دیا جا سکتا اس کے لیے سائنسی شعور بیدار کرنا، سائنسی مزاج بنانا، سائنسی ذوق و شوق پیدا کرنا اور اس پس منظر میں ایک نئے کلچر کو فروغ دینا ضروری ہے۔ آج جب سائنس اور ٹکنالوجی کے فروغ کی بات کی جاتی ہے تو اس کے مفاہیم بے حد وسیع ہوتے ہیں اور اسی طرح جب ہندوستان کی ترقی کے متعلق ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے مُراد محض صنعتی ترقی نہیں ہوتی۔ ویسے ہمارے شعور میں ترقی کی اصطلاح کے بالعموم جو معنی پوشیدہ ہیں، اس سے اقتصادی ترقی کا ہی گمان ہوتا ہے۔ ترقی سے مراد ہے سماج کی ایسی ترقی جس میں سائنس اور ٹکنالوجی کا کلیدی کردار ہو۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے سائنسی مزاج کی اصطلاح استعمال کی تھی، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آج کے حالات میں یہ سائنسی شعور ہمارے اپنے مزاج میں رچ بس گیا ہے؟ کہیں ہم نے اس کا مفہوم محض چند لیباریٹریوں کے کھولنے تک ہی تو محدود نہیں کر لیا ہے؟ یا اس سے مراد چند اعلیٰ تربیت یافتہ سائنسدانوں کو تیار کرنے سے تو نہیں لے لی ہے؟ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ مزاج بنانا پہلی شرط ہے، سائنسداں بنانا بعد کی۔ یہ کام اوپر سے نہیں نچلی سطح سے شروع ہوتا ہے۔ اگر ہم اقتصادی ترقی بھی کرنا چاہیں تو وہ بھی سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ شروع میں اس بارے میں شبہات تھے کہ کیا واقعی ہندوستان کا کسان یا ہندوستان کے عوام سائنس اور ٹکنالوجی کی جدید ترین پیش رفتوں سے استفادہ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ لیکن تجربہ شاہد ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی سے ہمارے کسانوں نے کس قدر فائدہ اٹھایا اور یہی وجہ ہے کہ [illegible] ثابت کر دکھایا ہے کہ بغیر ہمارا ملک ترقی یافتہ ملکوں کے دوش بدوش نہیں [illegible] وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے نئی دلی کی ایک حالیہ کانفرنس میں جس میں کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ہندوستانی پس منظر میں افادیت کے موضوع پر گفتگو کی جا رہی تھی بجا طور پر فرمایا کہ ماضی کی پالیسیوں نے اچھا اثر دکھایا ہے۔ اس پالیسی کے تحت جو کچھ کہا گیا ہے، اس میں شاید ہی کوئی بات قابلِ تنازعہ ہو۔ بلاشبہ اس نے ملک کے مختلف شعبوں میں نمایاں ترقی دکھائی ہے۔ اس سلسلے میں خلائی ترقی، ایٹمی ترقی، انرجی اور حیاتیاتی شعبوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کیا بحیثیت مجموعی یہ ترقی کافی ہے۔ کیا اس نے ہمارے عوام کا مزاج بدلا ہے۔ کیا ہمارے معمولی اور ایک عام آدمی کو سائنس کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی تشہیر اور اس کا فروغ کیا اس انداز پر ہو رہا ہے کہ اس سے سبھی کو یکساں طور پر فائدہ پہونچے؟ چنانچہ ان تمام معلومات اور ان تمام فائدوں کو ملک کے عوام کے لیے عام کرنا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے فروغ میں انتظامی دشواریاں اور خامیاں بھی حائل ہو رہی ہیں۔ انتظامیہ میں اس سلسلے میں مناسب رہنمائی سے اچھے نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ آج ہمارے ملک میں سائنس اور ٹکنالوجی کا جو ڈھانچہ مرتب ہو گیا ہے، اس کے ذریعے ہم مستقبل کی تعمیر کو دیکھ سکتے ہیں اور اس کا منصوبہ بنا سکتے ہیں۔ ہم نے بہت سے شعبوں میں نمایاں ترقی کر کے ترقی پذیر ملکوں میں اہم مقام حاصل کر لیا ہے۔

شری رانا، ایڈیٹر یوجنا' اُردو ریٹائر ہو گئے

قارئین کے علم میں یہ بات لائی جا رہی ہے کہ ایڈیٹر یوجنا اُردو ۵۸ سال تک اپنی سرکاری ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی نبھانے کے بعد ۳۱ دسمبر ۱۹۸۰ کو سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ آپ کا شمار یوجنا اُردو کے بانی ایڈیٹر کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ آپ نے یکم اپریل ۱۹۸۱ کو یوجنا اُردو کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھالیں اور ۶ ماہ کے قلیل عرصے کے بعد یہ آپ کی ادارت میں پندرہ روزہ ہو گیا۔ اس عرصے میں آپ نے یوجنا اُردو کے چند خصوصی شمارے نکالے جو بیحد پسند کئے گئے۔ ان میں معذورین نمبر، ایشیائی کھیل، 'یہ گندے لوگ یہ گندہ کھیل'، سائنسی مزاج، نساتواں منصوبہ، رضاکارانہ ادارے خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ آپ نے آخر میں نئی تعلیمی پالیسی سے متعلق خصوصی نمبر کی اشاعت کے لیے خصوصی کوششیں کیں۔ آپ کو اُردو کے کاز سے زبردست ہمدردی رہی۔ اس سے قبل آپ نے فیلڈ پبلسٹی اور پی آئی بی میں متعدد اہم ذمہ داریاں سنبھالیں۔ ادارہ ہذا کی طرف سے جو الوداعی پارٹی آپکو دی گئی اس میں اس ادارے کے ڈائرکٹر جناب شیام سنگھ ششی اور چیف ایڈیٹر جناب آر۔ تھنکرال نے آپکی خدمات کو سراہا۔ ادارہ آپکو نیک خواہشات پیش کرتا ہے اور خدا سے دعا کرتا ہے کہ آپ جہاں رہیں خوش و خرم رہیں۔

(اسسٹنٹ ایڈیٹر)

اترپردیش میں

ثانوی تعلیم کی ترقی

درجہ نو سے درجہ بارہ تک کی تعلیم کو ثانوی تعلیم یا سیکنڈری ایجوکیشن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ پورے تعلیمی نظام کی وہ سطح ہے جو ملک کی سماجی اور معاشرتی ترقی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ مختلف ماہرینِ تعلیم اور ماہرینِ معاشیات نے ثانوی تعلیم کی اہمیت کو بہت واضح طور پر اُجاگر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ کئی تعلیمی نظام کی جانچ پڑتال کرنے والے کمیشنوں نے بھی ثانوی تعلیم کے اہم رول پر اپنی اتفاقِ رائے کا اظہار کیا ہے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ ایک حد کے بعد ابتدائی تعلیم کی وسعت اور فروغ کو ترجیح دینے کے بجائے ثانوی تعلیم کی ترقی کو نصب العین بنایا جانا چاہیئے بقول اُن کے پورے تعلیمی نظام کی مضبوطی اور اُس کا وقار ثانوی تعلیم کی سطح پر ہی منحصر ہے۔

اترپردیش میں ثانوی تعلیم کے دو حصے ہیں: درجات نو اور دس جسے ہائی اسکول کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور درجات گیارہ اور بارہ کی تعلیم جو انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کہلاتی ہے۔

ریاست میں ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ درجات میں تعلیمی کورس مقرر کرنے، تعلیمی اداروں کی نگرانی کرنے اور ہائی اسکول و انٹرمیڈیٹ کے امتحانات لینے کے لیے ۱۹۲۱ میں ایک سرکاری ایکٹ کے ذریعے "بورڈ آف ہائی اسکول اینڈ انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن اُترپردیش" نام کا ایک بورڈ قائم کیا گیا۔ اسے اُترپردیش مادھیمک شکشا پریشد کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے پہلے یہ کام الٰہ آباد یونیورسٹی انجام دیتی تھی۔ پردیش میں سرکاری اور غیر سرکاری سنسکرت پاٹھ شالاؤں کی نگرانی اور ثانوی تعلیم کے لیے اساتذہ کی ٹریننگ کا کام بھی اسی ایجوکیشن بورڈ کے ذمہ ہے۔ پورے پردیش میں ثانوی تعلیم کی سطح پر کورس مقرر کرنا، امتحانات لینا اور نئے تعلیمی اداروں کو سرکاری منظوری دینا اسی مادھیمک شکشا پریشد کی ذمہ داری ہے۔ مختلف تعلیمی اداروں کا معائنہ کرنا اور انھیں سرکار کی طرف سے مالی امداد فراہم کرنے کی منظوری دینا بھی اسی ایجوکیشن بورڈ کی ذمہ داری ہے۔

ریاست میں ثانوی تعلیم کی سطح پر سب سے بڑا سرکاری حاکم ایجوکیشن ڈائرکٹر ہوتا ہے اور وہی مادھیمک شکشا پریشد کا چیرمین بھی ہوتا ہے۔ ثانوی تعلیم پر نگرانی رکھنے کے لیے پورے صوبے کو گیارہ انتظامی حلقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اُن کے نام اس طرح ہیں:۔

میرٹھ، آگرہ، بریلی، الٰہ آباد، جھانسی، گورکھپور، وارانسی، فیض آباد، لکھنؤ، نینی تال اور پوڑی گڑھوال۔ ان سبھی حلقوں میں ایک نائب ایجوکیشن ڈائرکٹر ہوتے ہیں اور لڑکیوں کے اسکولوں کے واسطے ایک ایک خاتون انسپکٹر ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ کئی دیگر حکام بھی ان کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ پنجسالہ منصوبوں میں پردیش میں ثانوی تعلیم کی وسعت اور فروغ دینے کا مکمل خاکہ بھی یہی بورڈ تیار کرتا ہے۔ یہ سرکاری پلان پر عمل درآمد کرتا ہے اور پردیش میں سرکار کی طرف سے طے کئے جانے والے تعلیمی نشانوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایجوکیشن ڈائرکٹر کا ہیڈ آفس الٰہ آباد میں ہے اور اس کا کیمپ آفس لکھنؤ میں ہے۔

[illegible] سے بہت بڑھ گیا ہے۔ ۱۹۸۱ سے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات سے متعلق سارے کام کمپیوٹر کے ذریعے کرائے جا رہے ہیں۔

منصوبہ بند ترقی کے دوران پردیش میں ثانوی تعلیم کے فروغ میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ سال ۱۹۸۲-۸۳ کی تعداد شمار کے مطابق پورے صوبے میں لڑکوں کے ۴۸۸۷ اور لڑکیوں کے ۸۲۲، کل ملاکر ۵۶۱۰ ہائر سکنڈری اسکول چل رہے ہیں جن میں سے ۳۶۳۸ دیہی علاقوں میں واقع ہیں۔ سکنڈری اسکولوں کی تعداد میں اضافے کو گوشوارہ نمبر۱ میں درج کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ۱۹۵۰-۵۱ سے ۱۹۸۲-۸۳ تک کی ۳۲ سالہ مدت میں ثانوی اسکولوں کی تعداد میں ۵۶۸ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۵۰-۵۱ میں پورے صوبے میں صرف ۹۸۷ سکنڈری اسکول تھے۔ جن کی تعداد ۱۹۶۰-۶۱ میں بڑھ کر ۱۷۷۱، ۱۹۷۳-۷۴ میں ۴۱۲۵ اور ۱۹۸۲-۸۳ میں ۵۶۱۰ ہوگئی۔ اسکولوں کی تعداد میں اضافے سے متعلق ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ ۱۹۵۰-۵۱ میں صرف ۳۰۵ اسکول دیہی علاقوں میں تھے جو کل اسکولوں کی تعداد کا ۳۱ فیصدی تھا۔ ۱۹۶۵-۶۶ تک آدھے سے زیادہ اسکول شہری علاقوں تک ہی محدود تھے جبکہ اس کے بعد سے دیہی علاقوں میں اسکولوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ اور اب ۶۵ فیصدی اسکول دیہی علاقوں میں ہی ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ چوتھے، پانچویں اور چھٹے منصوبوں کے دوران ثانوی تعلیم کی وسعت اور فروغ میں دیہی علاقوں کو ترجیح دی گئی ہے۔ اسی طرح منصوبہ بندی کے دوران لڑکیوں کے اسکولوں کی تعداد میں بھی بہت نمایاں اضافہ حاصل ہوا ہے۔ اُن کی تعداد ۱۹۵۰-۵۱ میں ۱۵۴ تھی جو ۱۹۸۲-۸۳ میں بڑھ کر ۸۲۲ ہوگئی۔ لیکن ابھی بھی ضرورت کو دیکھتے ہوئے لڑکیوں کے اسکولوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس طرف مزید اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ چھٹے منصوبے کے شروع میں فی لاکھ آبادی پر اُتر پردیش میں ۴ سکنڈری اسکول تھے۔ جبکہ بہار میں یہ تعداد ۵، کرناٹک میں ۷، اڑیسہ میں ۸، مغربی بنگال میں ۹ اور مہاراشٹر میں ۱۱ تھی۔

ثانوی تعلیم میں طلبا کی تعداد میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ گذشتہ ۳۲ برسوں میں طلبا کی تعداد تقریباً نو گنا بڑھ گئی ہے۔ ثانوی تعلیم میں داخلوں کی تعداد میں اضافہ کو گوشوارہ نمبر۲ میں پیش کیا گیا ہے۔ پہلے پنجسالہ پلان کے شروع میں داخلوں کی تعداد ۴ لاکھ ۱۷ ہزار تھی جن میں تقریباً ۵۰ ہزار لڑکیاں تھیں۔ ۱۹۶۰-۶۱ میں یہ تعداد بڑھ کر ۹ لاکھ ۱۲ ہزار ہوگئی جن میں ایک لاکھ ۴۵ ہزار لڑکیاں تھیں۔ ۱۹۸۲-۸۳ میں یہ تعداد بڑھ کر ۳۷ لاکھ ۳۰ ہزار ہوگئی جن میں ۹ لاکھ ۲۶ ہزار لڑکیاں تھیں۔ گذشتہ ۳۲ برسوں کی مدت میں لڑکیوں کے داخلے کی تعداد میں تقریباً ۱۶ گنا کا اضافہ ہوا ہے جبکہ لڑکوں کے داخلوں کی تعداد ۸ گنا بڑھ گئی ہے۔ ۱۹۵۰-۵۱ میں ثانوی تعلیم کے کل داخلوں میں ۱۲ فیصدی لڑکیاں تھیں۔ یہ تناسب ۱۹۸۲-۸۳ء میں بڑھ کر ۲۲ فیصدی ہوگیا۔ مختلف پنجسالہ پلانوں کے دوران سرکار نے ایسے کئی اقدامات کئے جن سے لڑکیوں کے داخلہ تناسب میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ مگر ابھی بھی سکنڈری اسکولوں میں لڑکیوں کا داخلہ اُن کی مجموعی تعداد کو دیکھتے ہوئے بہت کم ہے [illegible] سرکار نے لڑکیوں کے اسکولوں میں اُن کے لیے زیادہ بہتر سہولیات مہیا کرانے کے لیے اقدامات کئے ہیں۔ ابھی بھی سکنڈری تعلیم میں کل داخلہ تناسب اس عمر کے بچوں کی کل تعداد کا تقریباً ۸۰ فیصدی ہے۔ حالانکہ سکنڈری تعلیم میں داخلہ تناسب کی تعداد کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے پھر بھی اس سے یہ بات ضرور واضح ہوتی ہے کہ ابتدائی تعلیم کے بعد ثانوی تعلیم میں طلباء کی تعداد (داخلہ تناسب) بہت کم ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ میں پرائیویٹ امتحان دینے کی سہولت بھی دستیاب ہے۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ گذشتہ کئی برسوں سے یو۔ پی بورڈ پرائیویٹ امیدواروں کے امتحان الگ سے لیتا ہے۔

ثانوی تعلیم میں اساتذہ کی تعداد میں نسبتاً کم تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ نتیجے کے طور پر فی اُستاد طلبا کی تعداد وقت کے ساتھ بڑھ گئی ہے۔ سکنڈری اسکولوں میں اساتذہ کی تعداد کو گوشوارہ نمبر۳ میں درج کیا گیا ہے۔ ۱۹۵۰-۵۱ میں پورے صوبے میں اساتذہ کی تعداد ۱۸ ہزار تھی جن میں ۲۷۷۴ خواتین تھیں۔ ۱۹۶۰-۶۱ میں اساتذہ کی تعداد بڑھ کر ۳۰ ہزار ہوگئی جن میں ۵۰۵۷ خواتین تھیں۔ ۱۹۷۳-۷۴ میں مجموعی تعداد بڑھ کر ۹۶ ہزار سے زیادہ ہوگئی جن میں خواتین کی تعداد تقریباً ۱۷ ہزار تھی۔ ۱۹۸۲-۸۳ میں اساتذہ کی تعداد ایک لاکھ ۱۹ ہزار ہوگئی جس میں ۲۲ ہزار سے زیادہ خواتین تھیں۔ اس طرح کل اساتذہ میں خواتین کی تعداد کا تناسب ۱۹۵۰-۵۱ میں ۱۵ فیصدی سے بڑھ کر ۱۹۸۲-۸۳ میں ۱۹ فیصدی ہوگیا۔ مادھیہ مک شکشا پریشد اساتذہ کی ٹریننگ کا بھی انتظام کرتی ہے جس سے تعلیم کے معیار کو

[illegible]
[illegible] اسکول [illegible]
[illegible] ۱۹ [illegible]
[illegible] دوران ان اسکولوں طلبا [illegible] بڑھ کر [illegible] ہو گئی۔
[illegible]

ثانوی تعلیم پورے تعلیمی نظام کی ایک [illegible] کی منفرد اہمیت ہے۔ اول تو [illegible] سطح ہے جس کے بعد طالب علم اعلیٰ تعلیم [illegible] قدم رکھتا ہے اور اسی طرح اعلیٰ تعلیم کا معیار بہت کچھ اس بات پر منحصر ہے کہ ثانوی تعلیم [illegible] طلبا فارغ ہو رہے [illegible] ثانوی تعلیم اعلیٰ تعلیم کا معیار طے کرتی ہے۔ دوسری یہ کہ بہت سے طلبا ثانوی تعلیم کے [illegible] کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ [illegible] ثانوی تعلیم [illegible] حیثیت رکھتی ہے۔ اور [illegible] اور روزگاری تعلیم کے لیے

اور [illegible] کیا جائے کہ [illegible] سے بہتر طریقے سے [illegible] سکے۔ [illegible] ثانوی تعلیم کا [illegible] تیزی کی ضرورت ہے جسے ابھی تک حل نہیں کیا جا سکا ہے۔

اس سلسلے میں چند مشورے حسب ذیل ہیں:-

۱۔ نئے سکنڈری اسکول کھولنے کی پلاننگ اس طرح کی جانے کہ ہر علاقے میں یکساں طور پر طلبا کا سکنڈری اسکول میں داخلہ تناسب حاصل کیا جا سکے۔ ثانوی تعلیم کے معیار کو بلند کیا جائے جس سے پورے تعلیمی نظام کو بہتر بنایا جا سکے۔ ذہین طلبا کا پتہ لگا کر انھیں مزید سہولیات فراہم کی جائیں۔

۲۔ ثانوی تعلیم کے فروغ کے لیے ضلع کی سطح پر ایک پروگرام بنایا جائے جس کے ذریعے ایک مقررہ مدت میں عوام کے بچوں کو ثانوی تعلیم فراہم کی جائے۔ دیہی علاقوں کی طرف زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔

۳۔ روزگاری تعلیم کے کورس کو سکنڈری [illegible] کے لیے طلبا [illegible] طرح کی روزگاری [illegible] بندوبست کیا جائے۔ اس [illegible] ٹرانسپورٹ، [illegible] وغیرہ [illegible]

۴۔ مختلف طریقوں [illegible] کھولنے کے لیے ایک [illegible] پالیسی [illegible] جس سے ہر جگہ مقامی ضرورت کے [illegible] کھل سکیں۔

۵۔ ثانوی تعلیم کی [illegible] ضرور ہے مگر یہ اس کا آئینی فریضہ [illegible] اس لیے ثانوی تعلیم میں طلبا سے [illegible] میں اضافہ کیا جانا چاہیے۔ غریب [illegible] طلبا کو فیس معافی کی سہولت [illegible] کر فراہم کی جائے۔ [illegible] نہ اٹھایا جا سکے۔ ثانوی تعلیم کی [illegible] لیے ریاستی سرکار کو پرائیویٹ [illegible] طرف بھی رجوع کرنا چاہیے۔

مندرجہ ذیل گوشوارے [illegible]

گوشوارہ نمبر ۱

اترپردیش میں سکنڈری اسکولوں کی تعداد

سال	لڑکوں کے	لڑکیوں کے	کل تعداد	دیہی علاقوں میں
[illegible]	[illegible]	۱۵۴	۹۰۵	۳۰۵
[illegible]	[illegible]	۲۲۱	۱۴۱۴	۵۹۲
[illegible]	[illegible]	۲۸۲	۱۷۵۱	۷۴۹
[illegible]	[illegible]	۴۴۱	۲۵۰۰	۱۷۱۲
[illegible]	[illegible]	۴۶۴	[illegible]	۲۲۵۰
[illegible]	[illegible]	۵۰۹	۵۲۶۲	۳۳۸۲
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۵۹۱۰	۳۶۳۸

[illegible]

سال	[illegible]	خواتین	کل تعداد
[illegible]	[illegible]	۵۸۷۱۸	[illegible]
[illegible]	۸۵۰۹۸۰	۸۵۵۹۹	۹۴۴۸۲۳
۱۹۶۰	۴۵۴۵۹۴۳	۱۵۴۲۸۵	[illegible]
۱۹۶۵	۱۴۲۱۰۳۸	۳۲۹۸۲۲	۱۸۵۸۹۰۶
۱۹۷۲	۲۱۵۹۰۳۵	۵۱۸۱۲۷	۲۹۹۸۱۶۲
۱۹۸۰	۲۸۳۷۱۸۶	۶۳۹۹۱۶	۳۴۷۷۱۰۲
۱۹۸۲	۳۸۰۴۳۹۹	۹۴۰۷۱۵	۴۷۴۵۲۲۲

گوشوارہ نمبر ۳

سکنڈری اسکولوں میں اساتذہ کی تعداد

سال	مرد	خواتین	کل تعداد
۱۹۵۰ — ۵۱	۱۵۷۵۳	۲۶۶۴	۱۸۴۲۷
۱۹۵۵ — ۵۶	۲۴۵۶۱	۴۱۳۰	۲۸۶۹۱
۱۹۶۰ — ۶۱	۳۰۲۲۲	۵۵۵۴	۳۶۰۶۷
۱۹۶۵ — ۶۶	۴۵۵۱۴	۱۰۴۹۶	۵۶۰۱۰
۱۹۷۲ — ۷۳	۶۹۹۹۹	۱۹۹۱۴	۹۰۹۹۱
۱۹۸۰ — ۸۱	۹۲۲۹۴	۲۰۰۵۶	۱۱۲۳۵۰
۱۹۸۲ — ۸۳	۹۶۵۸۹	۲۲۵۰۸	۱۱۹۱۴۷

گوشوارہ نمبر ۴

سکنڈری تعلیم میں فی استاد اور فی اسکول طلباء کی اوسط تعداد

سال	فی استاد طلباء کی تعداد	فی سکول طلباء کی تعداد	[illegible]
۱۹۵۵ — ۵۶	۲۲	۲۴۰	[illegible]
۱۹۶۰ — ۶۱	۲۵	۲۱۵	[illegible]
۱۹۶۵ — ۶۶	۲۵	۲۲۳	[illegible]
۱۹۷۲ — ۷۳	۲۸	۲۶۰	[illegible]
۱۹۸۰ — ۸۱	۳۰	[illegible]	[illegible]
۱۹۸۲ — ۸۳	۳۱	[illegible]	[illegible]

تعلیم اور اقلیتیں

اقلیتوں کی تعلیم کا مسئلہ کافی [illegible]نک مسئلہ ہے۔ دو بات چاہے کچھ بھی ہوں یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کے باقی لوگوں کے مقابل مسلمان اور پوری تعلیمی حیثیت میں کہیں زیادہ پچھڑے ہوئے ہیں۔ سماجی پسماندگی تعلیمی پسماندگی ہی کا شاخسانہ ہے اس کا صرف ایک ہی حل ہے بنیادی تعلیم کا پھیلاؤ اور تعلیم بالغان۔ ہندوستانیوں کو خاص کر مسلمانوں کو سیکھنا [illegible] ممالک میں کئی قسم کی نوکریاں [illegible] ہیں۔ مثلاً ڈرائیونگ۔ ڈرافٹنگ۔ [illegible]سنگ۔ ٹائپنگ۔ لیب ٹکنیشین، سائیکل [illegible] الیکٹرانکس۔ کمپیوٹر پروگرامنگ۔ ظاہر [illegible] حاصل کرنے کے لئے پیشہ ورانہ [illegible] ہے کہ اگر [illegible] [illegible] [illegible] کے کورس کے [illegible]

ہندوستان میں دیہی پلمبر یا کارپینٹر ۲۰ یا تیس روپے سارے دن میں کماتا ہے۔ سعودی عربیہ میں کافی ہندوستانی مسلمان برسر روزگار ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستان میں مسلمان بستیوں میں میکنک بنانے، باڈی میکنک بنانے اپ ہولسٹری وغیرہ کی ورکشاپیں کھولی جائیں۔ ویسے تو نئی تعلیمی پالیسی میں جگہ جگہ اس بات کا ذکر آتا ہے کہ طلبا کے نصاب میں ایسے مضامین شامل کئے جائیں جو عملی زندگی میں کارآمد ہو سکیں۔ مثلاً سیاحت، کتابوں کی طباعت اور اشاعت، دفتری تعلیم۔ مارکیٹنگ تشہیری کاروبار ایڈورٹائزنگ کے ساتھ ساتھ میٹرک پاس سکنڈری اور بی۔ اے وغیرہ کی تعلیم بھی رکھی جائے۔ کوئی بھی اس امر سے منکر نہیں ہو سکتا کہ تعلیمی مسائل اقتصادی مسائل سے بہت مضبوطی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔

۱۹۷۶ء میں دہلی یونیورسٹی نے ملک میں جو کمیشن اسٹڈیز کا سب سے پہلا [illegible] قائم کیا۔ یہ تجربہ کافی کامیاب رہا۔ چنانچہ [illegible] یہ اسکیم ملک کے [illegible]

کالجوں میں نافذ کی گئی۔ جب [illegible] ۲۰۰۱ کی اسکیم تیار کی تو اس میں [illegible] شامل کئے گئے۔ کچھ ایسی کتابیں [illegible] کی گئیں جو طلبا امتحان دینے کی خاطر [illegible] شوقیہ تفریح کی خاطر پڑھیں۔ بچے [illegible] پڑھتے ہیں جو کورس میں نہیں ہیں۔ [illegible] مطالعہ بڑھانے علم پختگی میں تعلیم کے [illegible] پیدا کرتی ہے۔ ایسی تعلیم کو علاقائی [illegible] زبانوں میں ہونی چاہئے۔ [illegible] لیے ماس میڈیا کی ترقی یافتہ [illegible] جانا چاہئے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن [illegible] کچھ اور بہت جلدی سیکھ جاتے [illegible] سے کوئی منکر نہیں کہ کتابوں کے [illegible] کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ [illegible] نقصان دہ ثابت ہو رہے [illegible] پڑھتے ہیں۔ لہٰذا بچوں کو ٹیلی ویژن کے [illegible] سے کتابیں پڑھ کر سنائی جانی چاہئیں۔

این سی ای آر ٹی نے کئی [illegible] کتابیں اردو میں تیار کی ہیں۔ زبان دوم کی [illegible] کی اسکیم کے تحت اردو میں بھی کتابیں [illegible]

[illegible]

... اور لکھنؤ، اورنگ آباد ...
... کے ساتھ چلا رہے ہیں۔
... مضمون میں لکھتے ہیں ...
... سب کے بچوں کا
... کون انکار کر سکتا ہے کہ
... کی زبان ہے اور اس نے ہندوستان
... سب سے زیادہ فروغ دیا ہے ...
... پیدا کیے ہیں۔

... لڑکیوں کے ۱۶ ...
... سطح پر لڑکیوں کے
... فہرست ...
... تعلق رکھنے والے
... بالترتیب ۳، ۲ اور
[illegible]

[illegible] عام طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ کچھ ایسے اسکول ہیں جہاں مختلف مضامین کے لیے کوالیفائیڈ استاد نہیں ملتے ہیں۔ اساتذہ کی ٹریننگ کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں ہے۔ اردو کی ٹریننگ کے سینٹر گورنمنٹ نے [illegible] میں کھولے ہیں لیکن ان تین سنٹروں میں آج تک صرف ایک سو اردو کے استادوں کی ٹریننگ مکمل ہوئی ہے۔ تعلیم بستیوں میں [illegible] حالت اطمینان بخش نہیں کہی جا سکتی۔ اب حیدرآباد شہر کو لیجیے۔ اس شہر کی آبادی کا [illegible] مسلمان ہے۔ اور اس شہر میں کافی تعداد میں [illegible] اور کار، موٹر سائیکل اور اسکوٹروں کی [illegible] کے کارخانے ہیں۔ ان [illegible] میں کاریگروں کے بچوں کی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے۔ [illegible] بچوں کو اردو [illegible] تعلیم دی جا سکتی ہے۔ بالغوں کی تعلیم کا بھی انتظام [illegible] کیا جا سکتا ہے [illegible] اور سنٹرل گورنمنٹ کی [illegible] جہاں تعلیم بالغان کو اردو [illegible] پڑھایا جا رہا ہے۔ تعلیم [illegible] کے سینٹرل [illegible]

[illegible]

ایک سروے کے مطابق ۱۲ اضلاع میں جو ۲۰ فیصد آبادی پر مشتمل ہیں، بچوں کی اینرول منٹ پرائمری سطح پر اس طرح ہے۔ وہاں کل مسلمانوں کی آبادی ۲۲.۱۷ فیصد ہے جبکہ پرائمری کے بچوں کے داخلے کی شرح ۱۲.۳۹ فیصد ہے۔ اتر پردیش کے میرٹھ ضلع میں مسلمانوں کی آبادی ۳۵ فیصد ہے لیکن مسلمان بچوں کے داخلے کی شرح صرف ۱۰ فیصد ہے۔ بجنور ضلع میں مسلمانوں کی آبادی کل آبادی کے بالمقابل ۴۳.۰۷ فیصد ہے جبکہ مسلمان بچوں کے داخلے کی شرح پرائمری سطح پر ۳۴.۰۸ فیصد ہے۔ مرادآباد ضلع میں مسلمانوں کی آبادی ۴۳.۸ فیصد ہے جبکہ داخلہ لینے والے مسلمان بچوں کی شرح کافی کم ہے۔ ڈراپ آؤٹ (Drop-out) ریٹ مسلمان بچوں میں قومی سطح کے اوسط سے زیادہ ہے۔ بہت سے مسلمان بچے اپنے گھروں میں اپنے والدین کے ساتھ چمڑا بنانے کا کام یا برتن بنانے کا کام یا سوت بننے کا کام، درزی کا کام، رنگ سازی کا کام یا پھر خوشبوئیں تیار کرنے کا کام کرتے ہیں۔ ان کی بستیاں ان جگہوں سے بہت دور ہیں جہاں یا تو اسکول ہیں یا آئی ٹی آئی۔

اردو والے آج جان گئے ہیں کہ اردو کی ترقی تعلیم کے عام دھارے سے الگ ہو کر نہیں بلکہ اسی کے نیچے رہ کر ہی ہو سکتی ہے۔ پارلیمنٹ سے منظور شدہ سہ لسانی فارمولا ہر علاقائی زبان کو فروغ دیتا ہے۔ اردو کی ترقی سہ لسانی فارمولے سے باہر نہیں بلکہ اندر ہونی چاہیئے۔ اردو کے ساتھ ریاضی اور سائنس کی تعلیم نہایت ضروری ہے۔ جاپان کی ترقی کا راز اس کے انجینئرنگ کے طلبا تھے اسکی انڈسٹری کی منجمنٹ تھی۔ ان کے ملک کا تعلیمی نصاب انڈسٹری کا اور زراعت کے اداروں سے جڑا ہوا ہے۔ نصاب اتنے [illegible] جاتا ہے۔ اب چونکہ اکیسویں صدی ایک صنعتی [illegible] ہندوستان بھی ایک اعلیٰ درجے کا صنعتی ملک ہوگا۔ سارے ہندوستان کو لیکن اقلیتوں کو خاص کر صنعتی ترقی میں حصہ لینا ہوگا۔ منسٹری آف لیبر نئے آئی ٹی آئی ادارے ان بستیوں میں کھولے جہاں تعلیم سے پچھڑی ہوئی اقلیتیں زیادہ تعداد میں رہتی ہیں۔ اگر یہ باقاعدہ صحیح پلاننگ کے ساتھ کیا جائے تو مسلمان نوجوان خلیج ممالک کی طرف ایک آنکھ بھی نہ دیکھیں گے۔ سعودی عربیہ نے حال ہی میں ملازمتوں میں بیرونی افراد کا تناسب ۶۰ فیصد سے گھٹا کر ۲۰ فیصد کر دیا ہے۔ صرف پیشہ ور استاد، ڈاکٹرز اور انجینئر ہی لیے جائیں گے دوسرے خلیج ممالک یعنی کویت، دوبئی، بحرین، قطر، عراق اور ایران تو ایسے اقدام پہلے ہی اٹھا چکے ہیں اور ہندوستانیوں کی وہاں ملازمتیں کم ہو گئی ہیں۔ صرف سعودی عربیہ رہ گیا تھا وہاں بھی اب مشکل ہو گئی ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق جاپان میں دس ہزار طلبا میں صرف ایک وکالت کی تعلیم حاصل کرتا ہے اور صرف تین اکاؤنٹس کی جب امریکہ میں یہ تناسب ۲۰ وکلا اور ۴۰ اکاؤنٹنٹس کا ہے۔

ہندوستان میں ایسے آٹھ طلبا ہائر سکنڈری کر کے کالج میں آرٹس کلاسس میں داخل ہوتے ہیں جہاں امریکہ میں صرف ایک اور یورپ میں ڈیڑھ یا زیادہ سے زیادہ دو۔ ایک مسلمان دوست سے جب میں نے پوچھا کہ ان کا لڑکا بی۔ اے کے بعد کیا کر رہا ہے تو وہ بولے۔ ویزے کا انتظار کر رہا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ویزے کا انتظار کب تک۔ اپنے ہی ملک میں اگر ماحول پیدا کر دیا جائے ابتدائی تعلیم بنیادی تعلیم اور تعلیم بالغان کے سینٹر ان بستیوں میں کھولے جائیں جہاں لوگ جہالت کی زندگی بسر کر رہے ہیں تو ویزے کا انتظار [illegible] ختم تو نہیں بلکہ کم ہو سکتا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق حیدرآباد جیسے شہر میں انجینئرنگ کی تعلیم صرف ۲ فیصد اقلیتیں لے رہی ہیں۔ رکشا اور آٹو رکشا چلانے والے نوجوانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ پنجاب میں آج بھی کشمیری لوگ سردیوں میں کام کی تلاش میں آتے ہیں اور گندی بستیوں میں رہتے ہیں۔ ان کے لیے جالندھر امرتسر پٹھانکوٹ جیسی جگہوں پر تعلیم بالغان کے سنٹر کھولے جا سکتے ہیں۔ بہار اور آندھرا پردیش اور اتر پردیش کے مزدوروں کے لیے چند ہی گڑھ میں علیحدہ تعلیمی سنیٹر کھولے جائیں۔ جہاں رات کے وقت یہ غریب لوگ کچھ پڑھ لیں تاکہ وہ اور کچھ نہیں تو حساب کتاب اور چٹھی لکھنا تو سیکھ لیں۔ کہتے ہیں کہ ملک کے کلچر اور تہذیب کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس ملک کی اقلیتوں کے ساتھ کیسے برتاؤ کیا جاتا ہے۔

حکومت ہند نے ۴۶ کمیونٹی پالیٹیکنک کھولے ہیں جہاں اقلیتوں کو دستکاری اور کئی قسم کی ٹریڈز کی ٹریننگ تین سے چھ مہینے تک دی جاتی ہے۔ اس وقت تک ۲۰۰ لڑکے، لڑکیاں ٹریننگ پا چکے ہیں۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ایک ایسی اسکیم بنائی ہے جس کے تحت اقلیتوں کو مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھنے کی تیاری کرائی جاتی ہے۔ بیس یونیورسٹیاں اور گیارہ کالج اس اسکیم پر عمل کر رہے ہیں۔ ایک پری کوچنگ بھی چلائی رہی ہے جس کے تحت کمزور طلبا کو خاص توجہ دے کر ان کو اس قابل بنایا جاتا ہے کہ وہ کلاس کے ساتھ شانہ بشانہ چل سکیں۔ بیورو آف پروموشن آف اردو نے ایک لاکھ تیس

...کی اصلاح سازی کا کام مکمل ہو چکا ہے۔ ان میں سے چار مضامین کی فرہنگیں نباتیات، معاشیات، لسانیات اور کیمیا چھپ چکی ہیں۔ جغرافیہ، سیاسیات، تاریخ، فلسفہ، تعلیم، نفسیات، قانون، انتظامیہ، طبیعیات، لائبریری سائنس، سماجیات، ارضیات، ریاضی، شماریات اور کامرس کی فرہنگیں پریس میں ہیں۔ حال ہی میں نئے موضوعات پر اصطلاح سازی کا کام شروع ہوا ہے — انجینئرنگ، میڈیسن، صحافت، ذرائع ابلاغ اور اُردو این سائیکلو پیڈیا بھی ترتیب دیا جا رہا ہے۔

جس طرح کتابت سے متعلق سلیبس سب کے لیے یکساں کر دیا گیا ہے اسی طرح مدرسہ ایجوکیشن کا نصاب بھی سارے ملک کے لیے یکساں کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ سنٹرل گورنمنٹ ہزار ہا مکتبوں اور مدرسوں کو گرانٹ دیتی ہے۔ ہندوستان میں کل ملا کے ۱۲,۰۰۰ مکتب ہیں۔ ۶,۰۰۰ دارالعلوم اور ۶,۰۰۰ دوسرے ادارے چلائے جا رہے ہیں۔ ۱۸۳۷ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے فارسی زبان کو ختم کر دیا تو یہ مکتب اور مدرسے عربی اسکولوں اور دینی اداروں کی صورت میں چلتے رہے، جہاں قرآن شریف کے ساتھ ساتھ اخلاقی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ جب سے ملک کے کونے کونے میں مدرسوں کی تعلیم کا پُرانا نظام نیا کیا جا رہا ہے۔ ان مدرسوں میں دینی اور اخلاقی تعلیم کے ساتھ جدید سائنس اور ماحول کی تعلیم بھی دی جانے لگی ہے۔ بچّوں کو پیشہ ورانہ کام سیکھنے کی تربیت بھی دینے کا پروگرام بھی ان مدرسوں میں بنایا جا رہا ہے۔

ہندوستان کی رنگارنگ تہذیبوں کے میل پر مبنی ہو جو ماضی کی روایات اور حال کے تجربات کی حامل ہو جو طالب علم کو تندرست، دیانتدار اور دانشمند بنائے۔ بچّوں کے خط کا اچھا ہونا بھی ایک تعلیمی کام ہے۔ بچّوں کو حروف لکھنے سے پہلے سیدھی اور ٹیڑھی لکیریں، چکون پرندوں اور پھول پتیوں کی شکلیں بنانا سکھانا چاہیئے۔ اس طریقے سے بچّے اپنے خط آپ ہی سدھار لیں گے۔ تعلیم وہ ہے جو انسان کی ضروریات کو پورا کرے۔ ماہرینِ تعلیم کے مشورے سے مدرسے اور مکتب کے نصاب میں سائنس اور ریاضی جیسے مضامین شامل کئے جانے چاہئیں۔

گاندھی جی کی بنیادی تعلیم جو بعد میں واردھا تعلیمی اسکیم کے نام سے مشہور ہوئی، ہندوستانی نظریات پر مبنی تھی۔ واردھا اسکیم میں بچّوں کی جسمانی ذہنی، اخلاقی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا تھا۔ تعلیم، روزگار اور تہذیب کے ساتھ جُڑی ہوئی ہونی چاہیئے۔ گاندھی جی کی تمنا تھی کہ ہر گاؤں میں بنیادی اسکول کھولے جائیں۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ ہندوستان کے ہر گاؤں کا بچّہ سُوت کاتنا سیکھے۔ بچّے اپنے ہاتھوں سے کام کرنا سیکھیں۔ گاندھی جی کا کہنا تھا کہ وہ قوم جو محنت اور مشقت کے کاموں سے گریز کرتی ہے۔ بہتر ہے کہ وہ اَن پڑھ رہے اور پھر پورے گاؤں کے ہر بچّے کو پتہ ہونا چاہیئے کہ روئی کس طرح پیدا ہوتی ہے، تکلی کی چکتی کیسے بنتی ہے۔ سُوت سے کپڑا کیسے بنتا ہے۔ سُوت کے تاروں کو کس طرح گنا جاتا ہے۔ سوت کاتنے کے ساتھ ساتھ بچّے گنا بھی سیکھیں۔ گاندھی جی اسے نئی تعلیم کے نام سے پکارتے تھے۔ اسکول میں جھاڑو دینا سب

پہ مبنی ہے۔ تعلیم انگریزی میں نہیں بلکہ مادری زبان میں ہونی چاہیئے۔ تعلیم کا مقصد بھلی زندگی کو تقویت دینا ہے۔ رسکن، ٹالسٹائی اور ٹیگور کے نظریات پر مبنی گاندھی جی کی نئی تعلیم آج بھی اتنی ہی حالات کے مطابق ہے جتنی پہلے تھی۔

گاندھی جی اچھوتوں کو تعلیمی نظریے سے پچھڑے ہوئے طبقوں میں شمار کرتے تھے۔ جنوبی افریقہ کے فونکس کے اسکول میں جہاں وہ ہیڈ ماسٹر تھے انہوں نے نائی، موچی، بہشتی، ملازم، باورچی، درزی، ڈاکٹر، جولاہے، معلّم، چرخہ چلانے والے کا کام خود اپنے ہاتھوں سے کیا۔ جیل میں انھوں نے اتنی عمدہ چپلیں بنائیں کہ سردار ولبھ بھائی پٹیل حیران رہ گئے۔ یہ فن انھوں نے اپنے جرمن دوست کیلن باخ سے سیکھا تھا۔ ایک دفعہ انھوں نے گاؤں میں چماروں کو مرے ہوئے بیل کی کھال اُتارتے ہوئے دیکھا، ایک معمولی سے دیہاتی چاقو سے اسے نقصان پہنچائے بغیر اس کے جسم سے کھال اُتار لی۔ گاندھی جی اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے کہا کہ ہمارے ڈاکٹروں کو سبق سیکھنا چاہیئے۔ گاندھی جی کا کہنا تھا کہ میڈیکل کا طالب علم بھی انسانی جسم کی چیر پھاڑ کرتا ہے لیکن اس سے بہتر کام ہمارے گاؤں کے چمار کر سکتے ہیں لیکن ان کو عزت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ تعلیم اس طرح سے دی جائے کہ ہر انسان کی عزت ہو۔ انھوں نے پتہ لگایا کہ ہر سال ہندوستان سے ۹ کروڑ روپے کا چمڑا باہر جاتا ہے۔ اسی چمڑے کو صاف کر کے کروڑوں روپے کی چیزیں ہندوستان میں بنائی جا سکتی...

[illegible] بنانے والے چمڑہ مفید پیشے کار بیٹھے رہتے ہیں۔ گاندھی جی حیران تھے کہ چمڑے کا کاروبار کرنا ایک ذلیل پیشہ کیسے بن گیا۔ چمڑہ بنانا ہندوستان کی دیہی صنعت ہے جو نصاب میں داخل ہونی چاہیئے۔

اپنے تجربے کو کامیاب بنانے کے لیے انھوں نے سابرمتی آشرم میں چمڑہ بنانے کا ایک شعبہ کھولا۔ آشرم میں چمڑہ بنایا گیا۔ ایک ہی سال میں پچاس ہزار روپے کمائے اور اس کو آشرم کے اخراجات کے لیے لگایا۔ پھر گاندھی جی نے چماروں کی تعلیم کے لیے اسکول کھولے۔ انھوں نے خود چماروں کی بستیوں میں پڑھایا۔ مندر بنوائے۔ کنویں کھدوائے۔ ان سے وعدہ لیا کہ شراب پینا اور مردہ گوشت کھانا چھوڑ دیں۔ گاندھی چپل نام کی ایک چپل کافی چلی۔ جنوبی افریقہ میں انھوں نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی چپل جنرل اسمٹ Gen Smuts کو بطور تحفہ دی۔ اسی طرح انھوں نے چھاپہ خانہ چلایا۔ ایسے ماڈل اسکول کھولے جہاں طالب علموں کو کتابی تعلیم کے ساتھ ساتھ کھانا پکانا اور صفائی کا کام بھی سکھایا۔ مثالی اسکول ان کی نظر میں وہ تھا جہاں بچے اپنا سارا کام آپ کریں۔ یہاں تک کہ اپنا پاخانہ بھی خود صاف کریں۔ جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ اگر آپ کو ایک دن کا وائسرائے بنا دیا جائے تو آپ کیا کریں گے تو گاندھی جی نے جواب دیا کہ میں وائسرائے ہاؤس کے پاس بھنگیوں کے جو گندے ٹھکانے ہیں انہیں صاف کروں گا!!

جب جنوبی افریقہ میں گورے نائی نے ایک کالے آدمی کے بال کاٹنے سے انکار کر دیا تو گاندھی جی نے بال کاٹنا سیکھ لیا۔ جیل میں ان کو "نائی" بنا ہوا دیکھتے تھے۔ دھوبی کا کام خود کیا۔ اس طرح سے گاندھی جی نے اپنے ہاتھ سے اپنی مدد کے تصور کو فروغ دیا۔ ہاتھ سے کام کرنے والوں کو عزت بخشی۔

۱۹۶۸ کی تعلیمی پالیسی میں اقلیتوں کی تعلیم کے بارے میں خاص طور پر زور دیا گیا ہے۔ اسکی شق ۱۶ میں یہ بات واضح طور پر لکھی گئی ہے کہ اقلیتوں کے نہ صرف حقوق کی حفاظت کی جائے بلکہ ان کی تعلیم کے لیے وہ قدم اٹھائے جائیں جو کہ اگست ۱۹۶۱ کی چیف منسٹروں کی کانفرنس میں طے پایا تھا۔ لسانی اقلیتوں کے بارے میں تو گورنمنٹ نے پہلے ہی سے ایک اسپیشل آفیسر مقرر کیا ہوا ہے جو اقلیتوں کے لسانی حقوق کی تعلیمی اداروں میں حفاظت کرتا ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی میں بھی پہلے کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ قدم اٹھائے جائیں گے جو کہ تعلیمی اعتبار سے پچھڑی ہوئی اقلیتوں کے مفاد کو بڑھاوا دیں گے کیونکہ تعلیم ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو پورا انسان بناتی ہے اور ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرتی ہے۔

نئے اور اچھے ٹیچرز ٹریننگ اسکولوں کا قیام۔ اچھے اور قابل استادوں کا تقرر مسلم خواتین ٹیچرز کے لیے ٹیچرز ٹریننگ سینٹروں میں اضافہ، اردو میڈیم اسکولوں میں پیشہ ورانہ نصابات کی شروعات، ہوسٹلوں کا اہتمام، درسی کتابوں کی علاقائی زبانوں میں دستیابی کچھ ایسی تجاویز ہیں جو اقلیتوں کے تعلیمی مسئلوں کا حل ہو سکتی ہیں۔ مسلم اسکولوں کے مسائل علاقائی زبانوں اردو زبان اور انگریزی زبان کے رسائل اور اخبارات میں چھپنے چاہیئں۔

طلبار کی اعلیٰ اور پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے خود اپنے ہی طبقے سے قرضوں اور وظیفوں کا بندوبست ہونا چاہیئے۔ ذہین لڑکوں اور اچھے ٹیچروں کی حوصلہ افزائی کا پروگرام بھی اقلیتوں کی تعلیم میں فروغ پیدا کرے گا۔

سائنسی تعلیم کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنایا جائے۔ سیکنڈری اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم کو ملازمت کے ساتھ جوڑا جائے۔ تعلیمی پروگراموں میں استادوں اور والدین کی شرکت لازمی ہے۔ پردہ اور کم عمری کی شادی کے مسائل پر بحث و مباحثہ کر کے کوئی خاطر خواہ حل نکالا جائے۔

اب وہ وقت بھی آ گیا ہے کہ اکثریت اپنی ذمہ داری کو محسوس کرے۔ گھر میں اگر ایک فرد بیمار ہو تو یہ سارے گھر کی ذمہ داری ہے کہ اس کی دیکھ بھال کریں اور اگر اس دیکھ بھال میں کچھ مزید رقم بھی خرچ ہوتی ہو تو کریں۔ یہ صاف ہے کہ اقلیتیں چونکہ اپنے پاؤں پر تعلیمی اور معاشی اعتبار سے کھڑا نہیں ہو پائیں گی۔ اس لیے اکثریت کی ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ گورنمنٹ کی اسکیمیں بھی پوری طرح سے عمل میں نہیں لائی جاتیں۔ اس کی وجہ یا تو نچلی سطح کے عملے کی سستی ہے یا پھر اقلیتوں کو اپنے حقوق کا احساس ہی نہیں ہے۔ مسلم تنظیمیں اس سلسلے میں نگران کی حیثیت سے کام کریں اور مرکزی اور صوبائی افسروں کی غفلتوں کی طرف توجہ دلائیں تاکہ جو رقم الاٹ ہو اس کا پورا اور صحیح استعمال ہو۔ ہر ضلع میں انفرمیشن سینٹر کھولے جائیں جہاں اقلیتوں کی تعلیم کی اسکیموں کے بارے میں اطلاعات بہ آسانی مل سکیں۔

اسعد

ہندوستان میں گندم کی کاشت

بنی نوع انسان نے سب سے پہلے کب گندم کا بطور غذا استعمال شروع کیا، اس امر کا کوئی مسلّم تاریخی ثبوت نہیں ملتا لیکن پھر بھی یہ بات طے ہے کہ انسان اور گندم کا رشتہ حضرت آدم کے زمانے سے چلا آرہا ہے۔ گندم کا استعمال آج سے ہزاروں سال قبل سندھ گھاٹی تہذیب اور میسوپوٹامیہ تہذیب کے دور میں شروع ہو چکا تھا۔ لیکن گندم سب سے پہلے کس مقام پر پیدا ہوا اس کا صحیح تعین اب تک نہیں کیا گیا۔ گندم کو ٹرائی ٹیکم۔ Tri-ticum کی متعدد اقسام سے حاصل کیا گیا، اور وہ گندم جس سے روٹی بنائی جاتی ہے ٹریٹیکو۔ ولگیر Tritiou - Vulgare کہلاتا ہے جو، شاید پہلی بار فلسطین میں پیدا کیا گیا۔

ہندوستان میں گندم کی فصل ربیع موسم کی اہم فصل ہے۔ یہ ملک کے ایک بڑے علاقے میں عوام کی بنیادی اور اہم غذا ہے اسی لیے ملک کی اہم غذائی فصل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی پیداوار کا ملک کی معیشت اور عام لوگوں کی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ گندم میں پروٹین اور کاربو ہائیڈریٹ کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے۔

ہندوستان میں گندم کی نشوونما کے طبعی عوامل میں آب وہوا کو کلیدی عامل کی حیثیت حاصل ہے۔ اپنی نشوونما کے ابتدائی مراحل میں گندم کو سرد اور مرطوب آب وہوا کی ضرورت ہوتی ہے بعد میں گرم خشک اور چمکدار دھوپ کی ضرورت پڑتی ہے۔ گندم کو بونے کے وقت دس سے پندرہ ڈگری سینٹی گریڈ اور پکنے کے وقت بیس سے بائیس ڈگری سینٹی گریڈ درجۂ حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پکتے وقت تیز دھوپ بھی مفید ہوتی ہے لیکن تیز ہوائیں نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔ اس فصل کے لیے پچاس سے پچھتر سینٹی میٹر بارش کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے کم بارش والے علاقوں میں سینچائی کے ذریعہ فصل اگائی جاتی ہے۔ زیادہ بارش والے علاقوں میں اس کی فصل نہیں اگائی جاتی۔ بوائی کے بیس دن بعد اور فصل کے پکنے سے بیس دن پہلے اگر سائیکلونک بارش ہو جاتی ہے تو اس فصل کو بہت فائدہ پہونچتا ہے۔ ہمارے ملک میں گندم کی کاشت کے لیے ربیع کا موسم سازگار ہے۔

ہندوستان میں گندم مختلف اقسام کی مٹی پر کاشت کیا جاتا ہے اس کی کاشت کے لیے بہترین مٹی بھاری دومٹ اور ہلکی چکنی مٹی ہوتی ہے اس کا رنگ گہرا، زرخیزی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ مٹیار مٹی بھی موزوں ہے۔ کالی مٹی میں بھی اس کی کاشت اچھی ہوتی ہے۔ معمولی ڈھلان دار اور ایسے میدان جہاں پانی کا نکاس عمدہ ہو گندم کی کاشت کے لیے موزوں ترین زمین ہے۔ ہمارے ملک میں گندم کی کاشت کے لیے معاشی عوامل بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ کیونکہ کھیتوں کو جوتنے، گندم کو بونے اور دانوں کو ڈنٹھل سے الگ کرنے میں کافی محنت کی ضرورت ہوتی ہے لہذا یہاں گندم کی کامیاب کاشت کے لیے ارزاں محنت کا حصول ایک اہم معاشی عامل ہے۔

ہندوستان، ایشیا میں گندم پیدا کرنے والا دوسرا بڑا ملک ہے جبکہ عالمی سطح پر گندم پیدا کرنے والے اہم ملکوں میں اس کا شمار چوتھے ملک کے طور پر ہوتا ہے۔ پچھلے

[illegible]

[illegible] پانچ [illegible] کا اضافہ ہوا ہے۔ مشہور زرعی سائنسدان [illegible] نارمن بورلاگ نے [illegible] کی زرعی یونیورسٹی میں ایک مباحثہ کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ پچھلے تین سالوں میں ہندوستان نے گندم کی پیداوار میں سات گنا اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے تمام ترقی پذیر ملکوں پر زور دیا کہ وہ اس معاملے میں بھارت کی تقلید کریں۔ انھوں نے فرمایا کہ اگر بھارت اسی طرح اپنی زرعی پیداوار میں ترقی کرتا رہا تو وہ اپنی موجودہ زرعی پیداوار میں سات گنا اضافہ کر سکے گا۔

وزیر اعظم کے بیس نکاتی پروگرام کے تحت زراعت کے میدان میں جو ترقی ہوئی ہے اور جو "سبز انقلاب" آیا ہے اس میں سب سے زیادہ حصہ گندم کی فصل کا ہے۔ حکومت کی [illegible] رہی ہے کہ زرعی خود کفالت کے لیے کسانوں کو سستے داموں پر زرعی استعمال کی چیزیں فراہم کی جائیں، آبپاشی کے نظام کو بہتر بنایا جائے اور بہتر قسم کے بیج استعمال کیے جائیں [illegible] اب کسان کھیتی کے متعلق [illegible] ہندوستانی کسان [illegible] کے اوپر بھروسہ کرتا [illegible] انقلاب وہ [illegible] کاشت [illegible] استعمال [illegible]

[illegible] گندم [illegible] کے شمالی اور وسطی حصے میں واقع ہیں۔ اتر پردیش، پنجاب، ہریانہ، مدھیہ پردیش، راجستھان، گجرات، بہار اور بنگال میں گندم کا نوے فیصد رقبہ پایا جاتا ہے۔ گندم کی نئی قسموں کی پیداواری صلاحیت سے متاثر ہو کر کسانوں نے زیادہ سے زیادہ رقبہ میں گندم بونا شروع کر دیا ہے۔ پورے ملک میں گندم کا رقبہ جو ۶۶-۱۹۶۵ میں تقریباً ایک کروڑ پندرہ لاکھ ہیکٹر تھا۔ ۱۹۷۴ میں دو کروڑ بیس لاکھ ہیکٹر ہو گیا۔ تاہم آنے والے سالوں میں گندم کی اضافی پیداوار کے لیے مزید رقبے کا حصول دشوار ہوتا جائیگا۔ اس لیے گندم کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے اگر رقبہ بڑھانے کے بجائے پیداواری عوامل کے متناسب استعمال، کاشت کے جدید طریقوں اور بہتر انتظامی صلاحیتوں سے فی ہیکٹر پیداوار بڑھانے پر توجہ دی جائے تو نہ صرف گندم کی مجموعی پیداوار میں اضافہ ہو سکے گا بلکہ کاشتکاروں کی آمدنی اور منافع کی سطح بھی بہتر ہوگی۔ ملک میں فی ہیکٹر پیداوار بڑھانے پر خاص توجہ دی جا رہی ہے تاہم اس میں اب بھی اضافے کی گنجائش موجود ہے۔

صدیوں کی کاشتکاری اور تجربے کے نتیجے میں آب و ہوا اور مٹی کے حوالے سے گندم کی بے شمار اقسام وجود میں آ چکی ہیں۔ ان میں سے چند مخالف آب و ہوا اور طبعی حالات والے علاقوں میں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ گندم کی نئی قسمیں میکسیکن Mexican کلیان سونا، سونالیکا، سونیرا ۲۲۷، ۳۰۸، ۲۲۷، کلیان سونا، شربتی سونیرا اور سفید [illegible] جیسے گندم کی چند اقسام میں انقلاب برپا [illegible] ہے۔ ان نئی قسموں میں گندم [illegible] والی

[illegible] سے محفوظ رہنے کی صلاحیت [illegible] جس سے بیماریوں کے [illegible] واقع ہوتے ہیں۔ ان نئی قسموں [illegible] کھاد کا موزوں اور متناسب استعمال [illegible] آبپاشی کے وسائل سے پورا پورا فائدہ [illegible] مشینی طریقے استعمال کرنے [illegible] سہولیات کا فائدہ اٹھایا جائے اور بہتر [illegible] اقسام کے تصدیق شدہ بیج استعمال [illegible] گندم کی پیداوار میں مزید اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کے شمالی مغربی علاقوں میں گندم کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے۔ اتر پردیش [illegible] ملک کا تینتیس فیصد گندم پیدا کرنے والا [illegible] ہے۔ شمال اور جنوب کی پہاڑیوں اور [illegible] علاقوں کو چھوڑ کر اتر پردیش کے [illegible] گندم کی کاشت ہوتی ہے۔ اتر پردیش کی زرعی زمینوں کے اکتیس فیصد حصے پر گندم [illegible] ہے [illegible] [illegible] میں [illegible] کے [illegible] [illegible] کی زرعی [illegible] کی کاشت ہوتی ہے۔ مشرقی اور [illegible] کے [illegible] میں گندم کی پیداوار کم [illegible] پیدا کرنے والے [illegible] پنجاب کا اہم [illegible] پنجاب میں امرتسر، لدھیانہ، گرداسپور [illegible] جالندھر اور فیروزپور خاص طور سے گندم پیدا کرنے والے اہم اضلاع ہیں، پنجاب پورے ملک کا بیس فیصد گندم پیدا کرنے والا دوسرا بڑا صوبہ ہے جہاں فی ہیکٹر گندم کی پیداوار سبھی صوبوں سے

[illegible] جنوب مشرق [illegible]

[illegible] کے میدانی علاقوں میں [illegible] ہوتی ہے۔ مدھیہ پردیش [illegible] تقریباً [illegible] فیصد گندم پیدا [illegible] مہاراشٹر، ہماچل پردیش اور ناسک [illegible] بیجاپور، گجرات میں ماہی [illegible] کانٹھا میں، راجستھان میں گنگا [illegible] کوٹہ، الور، بھیل واڑہ اور ٹونک [illegible] بنگال میں نادیا، مغربی دیناج پور، [illegible] آباد، بہار کے کچھ علاقوں میں گندم کی [illegible] ہوتی ہے۔

آئندہ ربیع کے موسم کے دوران گندم کی پیداوار بڑھانے کے لیے ایک آزمائشی پروجیکٹ قائم کیا جائے گا۔ اس پر سترہ ریاستوں کے [illegible] بلاکس کونڈوں Block Development میں عمل آوری ہوگی۔ اس [illegible] کے تحت زیادہ سے زیادہ رقبے میں زیادہ پیداوار دینے والی قسمیں اگانے، بروقت کاشت کرنے، بیجوں اور کیمیاوی کھادوں کا مناسب استعمال کرنے پر زور دیا جائے گا۔ ریاستی سرکاروں سے کہا گیا ہے وہ اس پروجیکٹ پر عمل درآمد کے لیے ان علاقوں کی نشاندہی کریں جہاں یہ یوجنا چلائی جائے گی۔ یہ ریاستیں ہیں آسام، اڑیسہ، بہار، گجرات، مدھیہ پردیش، راجستھان، مغربی بنگال، اترپردیش، جموں و کشمیر، مہاراشٹر، میزورم [illegible] سکم، میگھالیہ، ناگالینڈ، منی پور، اور ہماچل پردیش۔ ربیع موسم کے لیے چار کروڑ

بہت نقصان ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ موسمی حالات کے اثرات کا مداوا کرنا انسانی [illegible] کے باہر ہے لیکن سائنسی ترقی کے موجودہ دور میں بروقت احتیاطی تدابیر کے ذریعہ ایسے حالات کے نتیجے میں ہونے والے نقصان میں کمی کی جاسکتی ہے۔ فصلوں کا بیمہ کرا کے کسانوں کو ہونے والے نقصان سے کچھ حد تک راحت دلائی جاسکتی ہے۔ مدھیہ پردیش کی حکومت کی حکومت نے کچھ خاص خاص فصلوں کے لیے بیمہ کی یوجنا شروع کی ہے۔ اترپردیش حکومت بھی یہ یوجنا شروع کرنے والی ہے۔ صوبائی حکومتوں کے یہ اقدام قابل تعریف ہیں۔ امید ہے کہ دوسری صوبائی حکومتیں بھی اس طرف قدم اٹھائیں گی۔ فصلوں کی قیمت طے کرتے وقت کھیتی میں کام آنے والی تمام چیزوں کی قیمت پر دھیان دینا چاہیے۔ اس سلسلے میں حکومت نے زرعی فصلوں کی قیمت طے کرنے والے کمیشن کو خاص ہدایتیں دی ہیں تاکہ کسانوں کو ان کی محنت کا جائز معاوضہ حاصل ہو سکے۔ ۱۹۷۳-۷۴ میں گندم کی سرکاری قیمت ۷۶ روپیہ فی کوئنٹل تھی جو کہ بڑھ کر ۱۹۸۰ میں ۱۵۵ روپیہ فی کوئنٹل ہو گئی۔

اس کے علاوہ بھی گندم کی ریکارڈ پیداوار ہوئی ہے۔ اس کے لیے وزیراعظم کے بیس نکاتی پروگرام میں زراعت اور کسانوں کو دی جانے والی سہولیات کی تعریف کرنی ہوگی۔ کئی سال تک اپنی ضروریات درآمد کے ذریعہ پوری کرنے کے بعد گزشتہ چند سال سے ملک اس اہم جنس کی پیداوار میں [illegible]

[illegible] طویل مدتی مالیاتی پالیسی

کہ ہمارے ملک نے آزادی کے بعد بہت کچھ ترقی کی ہے، پیداوار اور آمدنی میں قابل لحاظ اضافہ ہوا ہے اور یہ بات بھی درست ہے کہ امیری اور غریبی کے درمیان فرق بھی بڑھ گیا ہے۔

اب پہلی مرتبہ ملک میں امیری اور غریبی کے فرق کو کم کرنے، کالے دھن کے خاتمے اور غربت کے انسداد کے لیے طویل مدتی مالیاتی پالیسی تشکیل دی گئی ہے جس کے نتائج و اثرات دور رس اور دیرپا ہوں گے۔

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ معاشی عدم مساوات کا خاتمہ ضروری ہے۔ سماج کا ایک حصہ مصیبت اٹھائے اور دوسرا کالے دھن کے بل بوتے پر آرام کی زندگی گزارے۔ ساتویں پلان کے دوران اس نئی طویل مدتی پالیسی کے ذریعے غریبوں کو راحت دلانے اور انھیں خط غربت سے اونچا اٹھانے کی کوشش کی جائے گی۔ اس پالیسی کے تحت ساتویں پلان کے دوران ایک نیشنل ڈپازٹ اسکیم بھی شروع کی جائے گی جس کی وجہ سے ملک میں بچت اور سرمایہ کاری میں اضافہ ہوگا۔ ان تمام کے علاوہ طویل مدتی مالیاتی پالیسی کی بدولت صنعت اور تجارت کو فروغ ملے گا اور امید ہے کہ ملک ساتویں پنچ سالہ پلان کے دوران معاشی ترقی کی جانب ایک [illegible] چھلانگ لگائے گا۔

هندوستان زنک لمیٹڈ

سیسے اور جست کا پبلک سیکٹر کا کارخانہ

بھارت ابتدا سے بھی دھاتوں کے شعبہ میں پیش رو رہا ہے۔ یہاں کے اعلیٰ فولاد سے بنی تلواریں اور دیگر ہتھیار عہد ماضی میں دیگر ملکوں میں بڑی قیمت پاتے تھے۔ تانبے پیتل اور دیگر دھاتوں سے بنے برتن دنیا بھر میں مشہور تھے۔ یہاں نہ صرف کانوں سے دھاتیں نکالی جاتی تھیں بلکہ انھیں صاف بھی کیا جاتا تھا اور ان سے طرح طرح کی اشیا بنائی جاتی تھیں۔ بشمول [illegible] کے بعض امراض کے لیے متعدد قسم کی دھاتوں کے استعمال کا مشورہ بھی دیا جاتا تھا۔

ان دھاتوں میں سیسے اور جست کو بھی [illegible] مقام حاصل تھا۔ راجپورہ، دریبہ میں صدیاں [illegible] گئی ہیں۔ اور ان کے نزدیک [illegible] پائے گئے ہیں جن سے پتہ [illegible] بھارت میں سیسے اور جست [illegible] جاتا تھا۔ ان کانوں سے ان [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] مطابق یہ

قبل مسیح ۵۰۰ سے ۲۵۰۰ برس پہلے کے ہیں۔

برطانیہ اور بھارت کے ماہرین آثار قدیمہ نے زوار (راجستھان) میں جن قدیم کانوں کا تحقیق و مطالعہ کیا ہے اُن سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ وہاں ۱۰ ہزار برس پہلے سے بھی جست نکالا جاتا تھا۔ چنانچہ زوار کی کانیں دنیا میں اولین ہیں جن سے جست نکالا جاتا تھا حتیٰ کہ ۱۷ ویں صدی تک بھی یورپ میں جو جست استعمال ہوتا تھا وہ بھارت اور دیگر مشرقی ممالک سے درآمد کیا جاتا تھا۔

بتایا جاتا ہے کہ قرون وسطیٰ میں میواڑ کے مہاراجاؤں نے زوار کی کانوں میں سے جست نکالنے کا کام شروع کیا تھا۔ یہاں سے جست نکال کر اسے صاف کیا جاتا تھا اور پگھلا کر منجمد کیا جاتا تھا اور یہ سلسلہ ۱۸۱۲ء تک جاری رہا۔ تاہم یہ کام ۱۹۴۲ء سے پہلے دوبارہ شروع نہیں کیا جا سکا اور وہ بھی معمولی سطح پر جاری ہوا۔

حصول آزادی کے بعد بھارت سرکار نے اس طرف خاص طور پر توجہ دی تاکہ اس کی درآمد کو کم کیا جا سکے جو صنعتی سرگرمیوں میں اضافہ ہونے سے بڑھ گئی تھی۔ اس وقت ملک کی پیداوار بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا نہیں کر پاتی تھی، اور اس کام کے لیے بھاری سرمایہ خرچ [illegible] شروع شروع میں میٹل کارپوریشن [illegible] انڈیا دیگر دھاتوں کے ساتھ ساتھ جست [illegible] سیسہ درآمد کرتی تھی لیکن ۱۹۶۶ء میں [illegible] ایکٹ کے تحت ہندوستان زنک لمیٹڈ [illegible] میں آیا اور اُس نے یہ کام اپنے ہاتھ [illegible] پہلے پہل اس کی طرف سے زوار (راجستھان) میں ۵۰۰ ٹن جست اور سیسہ [illegible] صاف کیا جاتا تھا اور ٹنڈو (بہار) میں [illegible] ۳۶۰۰ ٹن سیسہ نکال کر صاف کیا جاتا [illegible] رفتہ رفتہ زوار کی پیداواری صلاحیت [illegible] یومیہ تک پہونچ گئی۔ اور ڈیبری اودے پور (راجستھان) میں سال میں بجلی سے ۱۸ ہزار [illegible] سیسہ پگھلا کر صاف کیا جانے لگا۔

اس طرح ۱۸ برس (۱۹۶۶) تا ۱۹۸۴ء کے مختصر عرصے میں ہندوستان زنک لمیٹڈ کی جست نکالنے کی صلاحیت ۵۰۰ ٹن یومیہ سے ۷ ہزار ٹن یومیہ تک بڑھ گئی اور جست صاف کرنے کی صلاحیت صفر سے ۹۵ ہزار ٹن سالانہ تک بڑھ گئی اور سیسہ صاف کرنے کی صلاحیت جو ۳۶۰۰ ٹن سالانہ تھی بڑھ کر ۱۸ ہزار ٹن سالانہ ہو گئی۔ اور اس کی پیکنگ [illegible]

روپے کی معمولی رقم سے بڑھ کر ایک ارب ۱۸ کروڑ روپے ہو گئی۔ اس کی سرمایہ کاری بھی ۸ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۲ ارب ۶۴ کروڑ روپے ہو گئی ہے اور اب اس میں ۱۲ ہزار سے زیادہ افراد کام کرتے ہیں جبکہ ۱۹۶۶ میں محض ۲ ہزار افراد ملازم تھے۔

آج ہندوستان زنک لمیٹڈ کے پاس سات کانیں ہیں اور تین دھات صاف کرنے والے کارخانے ہیں جو چار ریاستوں ۔ راجستھان، بہار، آندھرا پردیش اور اڑیسہ میں واقع ہیں۔ ہیں۔

مانگ اور سپلائی

غیر آہنی دھاتوں سے متعلق پلاننگ کمیشن کے ورکنگ گروپ نے ایک رپورٹ تیار کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ سیسہ کی مانگ ساڑھے چار فیصد سالانہ کی مرکب شرح پر ہونا ممکن خیال کی جا سکتی ہے۔ اس حساب سے موجودہ دہائی کے آخر میں سیسہ کی مانگ ۷۰ ہزار ٹن اور جست کی مانگ ۱۰۰۰۰۰ ٹن سے کم نہیں ہوگی جبکہ جہاں تک ان دھاتوں کی سپلائی کا تعلق ہے وہ ۲۷ ہزار ٹن (سیسہ) اور ۹۰ ہزار ٹن (جست) سے زیادہ نہیں ہوگی کیونکہ پبلک اور پرائیویٹ ادارے ان سے زیادہ مال تیار نہیں کر سکیں گے۔ مانگ اور سپلائی کے اس فرق کو دور کرنے کے لیے ہندوستان زنک لمیٹڈ کو یہ کام سونپا گیا تھا کہ وہ راجستھان کے ضلع بھیلواڑہ میں

کانیں	خام دھاتوں کی صلاحیت (یومیہ پیداوار ٹنوں میں)
زوار گروپ کی کانیں (اودے پور)	۲۰۰۰
موچیا	۲۰۰۰
بلاریا	۴۰۰
راجپورہ ۔ دریبہ (اودے پور)	۳۰۰۰
ٹین راک فاسفیٹ (اودے پور)	۶۰۰
اگنی گنڈالا (گنٹور) (آندھرا پردیش)	۲۴۰
سارگیپالی (سندرگڑھ) (اڑیسہ)	۵۰۰
جست صاف کرنے والے کارخانے	سالانہ صلاحیت (ٹنوں میں)
ڈیبری (اودے پور)	۴۵۰۰۰ + ۴۰۰۰ = ۴۹۰۰۰ (ہیپچ ریزیڈیو پلانٹ کی تنصیب کے نتیجے میں)
وشاکھاپٹنم (آندھرا پردیش)	۳۰۰۰۰
سیسہ صاف کرنے کا کارخانہ	
ٹنڈو (دھنباد ۔ بہار)	۸۰۰۰
وشاکھاپٹنم (آندھرا پردیش)	۲۲۰۰۰

رہا ہے۔ اگرچہ میں جست کے امکان کی کھوج کرے۔ چنانچہ یہ کام فوراً ۱۹۸۰ میں شروع کیا گیا اور دو سال کے بعد حکومت کو رپورٹ پیش کی گئی۔

اس طرح کان کنی اور دھاتوں کی صفائی کے نئے یونٹوں کے قیام سے جست کی کُل پیداوار ۱۳۴۰۰۰ ٹن اور سیسے کی کُل پیداوار ۵۸۵۰۰ ٹن ہو جائے گی اور پیداوار ۷۰ فیصد پیداواری صلاحیت کے استعمال سے حاصل کی جائے گی۔ اس طرح ہندوستان زنک لمیٹڈ ۹۰-۱۹۸۹ میں مارکیٹ میں سیسے کی ۸۴ فیصد اور جست کی ۸۷ فیصد مانگ پوری کر سکے گا۔ یہ رپورٹ اب حکومت کے زیر غور ہے اور اس پر جلد ہی قطعی فیصلہ ہو جائے گا۔

ہندوستان زنک لمیٹڈ اپنے پیداواری یونٹوں کے نزدیک صاف ستھرا اور صحتمندانہ ماحول برقرار رکھنے اور فطری توازن کو بنائے رکھنے کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری سے آگاہ ہے۔ آلودگی پر عام کنٹرول کرنے کے علاوہ ایسے اقدامات بھی کئے جا رہے ہیں جن سے سیّال فاضلات اور گیسوں کے اخراج سے متعلق قانونی تقاضوں کو پورا کیا جا سکے۔ پانی کو دوبارہ صاف کیا جا سکے۔ کانوں کو بربادی سے بچانے کے لیے سبزہ زار لگایا گیا ہے۔ جدید قسم کی مشینیں حاصل کی گئی ہیں اور چارے کو الگ کرنے کی مشین لگائی گئی ہیں (اگرچہ یہ سرمایہ کاری منفعت بخش نہیں ہے) اور دیگر اقدامات کئے گئے ہیں۔

ہندوستان زنک لمیٹڈ کے نئے توسیعی پروگرام کے مکمل ہونے پر نہ صرف اس دہائی کے آخر تک جست اور سیسے سے متعلق ملک کی زیادہ تر ضروریات پوری ہوں گی بلکہ بھارت دنیا میں جست اور سیسہ پیدا کرنے والا بڑا ملک بن جائے گا۔

پریم پال اشک

لوک عدالتیں

ہمارے یہاں لوک عدالتوں کا تصور کوئی نیا نہیں ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ عہدِ قدیم میں حتیٰ کہ آریاؤں کے زمانے میں بھی لوک عدالتیں قائم تھیں۔ پورانوں تک میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ اور آج کے دیہات میں بھی پنچایت کا چلن عام ہے اور پنچوں کو پرمیشور کا درجہ دیا جاتا ہے اور وہاں کیے گئے تمام فیصلوں کو حکمِ الٰہی تصور کیا جاتا ہے اور اگر کوئی ان فیصلوں پر پابندی سے انکار کرنے کی جرأت کرتا ہے تو گاؤں کی پنچایت اس کا حقہ پانی بند کر دیتی ہے اور کئی بار تو مجرموں کو جرمانہ تک بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس کارروائی پر فوری عمل ہوتا ہے اور پنچایت کے فیصلے کے خلاف کوئی اپیل نہیں کی جا سکتی۔ دراصل پنچائتی نظام کا دوسرا نام ہی لوک عدالت ہے۔ ان عدالتوں کے قیام کا بنیادی مقصد غریب عوام کو جلد از جلد انصاف دلانا اور اُن کے مقدمات کا فوری فیصلہ کرانا ہے۔ تاکہ وہ عدالتوں کی بے جا پریشانیوں سے بچ سکیں۔ ان کا وقت بھی ضائع نہ ہو اور وہ مالی پریشانیوں کے بھی شکار نہ ہوں۔ یوں تو عموماً عام دیوانی مقدمات کے فیصلوں کو کئی کئی برس لگ جاتے ہیں اور آجکل تو فوجداری مقدمات میں بھی اتنی ہی مدت صرف ہوتی ہے اور فریقین کو جو ذہنی اذیت ہوتی ہے وہ علیٰحدہ اور پیسہ تو پانی کی طرح بہانا ہی پڑتا ہے اور آخر عدالتی فیصلوں کے عمل درآمد کے لیے جگہ جگہ بھٹکنا پڑتا ہے۔

انھیں اُلجھنوں اور پریشانیوں کے پیشِ نظر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس عالی جناب پی۔ این۔ بھگوتی نے ۱۹۷۰ء کے دہے کے دوران جب وہ گجرات ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدے پر فائز تھے، لوک عدالتیں قائم کیں۔ عوام کی قانونی پریشانیاں دور کرنے اور انھیں جلد از جلد انصاف دلانے کے اس منصوبے کو بعد میں مہاراشٹر میں بھی لاگو کیا گیا۔ مذکورہ دونوں ریاستوں میں یہ تجزیہ نہایت کامیاب رہا۔ اور اس کی کامیابی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پچھلے سال ماہ اکتوبر میں نئی دلّی میں ریاستی حکومتوں کے وزرائے اعلیٰ، بالا کی ہائی کورٹوں کے منصفین اعلیٰ اور مرکزی حکومت کی وزارتِ قانون کے اعلیٰ حکام کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ وزیرِ اعظم نے اس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ عوام کی مشکلات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہمارے عدالتی نظام میں اصلاح ہونی چاہیئے اور عوام کو جلد از جلد انصاف ملنا چاہیئے تاکہ ان کا وقت اور پیسہ برباد نہ ہو۔ اسی پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہمارے عدالتی نظام کے تحت پچھلے سال اکتوبر کے پہلے ہفتے میں ہائی کورٹوں اور ڈسٹرکٹ کورٹوں کے ریٹائرڈ ججوں اور دلّی کے ممتاز وکیلوں نے لوک عدالتوں کے جج بننے کی ذمہ داری سنبھال لی اور پانچ لوک عدالتوں نے مقدمات کی پہلی شنوائی کی۔ اس میں ۱۸۵ مقدمات کے فیصلے فوری طور پر کر دیے گئے۔ یہ فیصلے دونوں فریقین کو منظور تھے۔ اور فیصلوں پر فوری طور پر عمل بھی کیا گیا۔ اس لوک عدالت کا افتتاح سپریم کورٹ کے چیف جسٹس عالی جناب پی۔ این۔ بھگوتی نے کیا۔ اسی طرح دلّی میں لوک عدالتوں میں درج مقدمات کی دوسری شنوائی پچھلے سال ماہ دسمبر میں ہوئی۔ اس میں ۲۵۰ سے زائد مقدمات کا فیصلہ فوری طور پر کر دیا گیا۔ ان لوک عدالتوں کی ایک خوبی یہ بھی رہی کہ فائلیں تیار کرنے اور دعویٰ کرنے والوں کے مقدمات تیار کرنے کے لیے انھوں نے دلّی یونیورسٹی کی فیکلٹی آف لاء کے تیس طلبا سے امداد و تعاون

بھی حاصل کیا۔

لوک عدالتوں کے قیام کا بنیادی مقصد عدالتوں کا بوجھ کم کرنا بھی ہے۔ تاکہ عدالتوں کو انصاف بھی جلد از جلد مل سکے۔ ایک اطلاع کے مطابق ملک کے ۱۹۸ مختلف مقامات پر لوک عدالتیں قائم کی جا چکی ہیں اور بیس ہزار سے زائد مقدمات کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سماجی خدمت انجام دینے والے رضاکار ادارے سامنے آئیں۔ عوام کو اس منصوبے سے روشناس کرائیں اور ان میں بیداری پیدا کریں۔ یہ ادارے اپنے اپنے علاقوں میں کمیٹیاں قائم کریں۔ اس کے لیے ایک بورڈ قائم کیا گیا ہے جو ان کے علاقائی معاملات اور مسائل کو نپٹانے کے لیے ججوں کی مدد کرے گا۔ تین ہزار روپے سے کم کی مالیت، میاں بیوی کے جھگڑوں، آس پڑوس کے تنازعوں، مار پیٹ اور گالی گلوچ وغیرہ کے معاملات ان علاقائی لوک عدالتوں میں پیش کیے جائیں گے اور انھیں باہمی سمجھوتے سے نپٹانے کی کوشش کی جائے گی۔ کوشش یہ ہوتی ہے کہ یہ عدالتیں مہینے میں کم از کم دو بار ضرور بیٹھیں۔ یہ امر بھی توجہ طلب ہے کہ ان لوک عدالتوں کا ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ سے بالواسطہ یا بلا واسطہ کسی قسم کا ٹکراؤ یا تصادم نہیں ہوتا۔ لوک عدالتیں اپنی اپنی سطح پر کام کرتی ہیں اور فیصلوں کا اطلاق بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس کے فیصلوں کے خلاف کوئی اپیل نہیں کی جا سکتی۔ فیصلوں پر عمل بھی فوری ہوتا ہے اور باہمی رنجش بھی نہیں رہتی۔ جہاں تک کلیموں کے بھگتان کا تعلق ہے دلی کی لوک عدالتوں کی پہلی پیشی میں ۲۵ لاکھ ۱۸ ہزار پانچ سو اور دوسری پیشی میں ڈیڑھ کروڑ روپے سے زائد رقم کے کلیم بھگتائے گئے۔

لوک عدالتوں کے قیام کے سلسلے میں قبائلی علاقوں کو کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں لڑائی جھگڑوں کا اندیشہ زیادہ رہتا ہے اور بدقسمتی سے وہاں یہ کیفیت پشتوں تک برقرار رہتی ہے۔ اور بدلہ لینے کا جذبہ تشدد کی انتہا تک پہونچ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دیہات میں رہنے والے غریب کسان، سرمایہ دار، ساہوکاروں اور زمینداروں کے استحصال کے زیادہ شکار ہوتے ہیں۔ اس پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے اڑلیسہ کے ضلع میور بھنج میں لوک عدالتیں قائم کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ اس کا سہرا ایک غیر سیاسی رضاکار ادارے اڑلیسہ اکھشیتر مزدور کسان پریشد کے سر بندھتا ہے اس نے وہاں لوک عدالتیں قائم کرنے کا تجزیہ کیا۔ تاکہ غریب عوام کو اُن کے دروازے پر ہی فوری اور موثر انصاف دلایا جا سکے۔ اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی تحریک نامور گاندھیائی لیڈر اور آل انڈیا ہریجن سیوک سنگھ کی نیتا کماری نرملا دیش پانڈے سے ملی۔ اس میں مخلص سماج سیوکوں کے ایک دستے نے سماجی خدمت کے اس پروگرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور اس کے نتائج بھی حوصلہ افزا نکلے۔ اس دستے کے رہنما نامور سماج سیوک اور اڑلیسہ کے سرودے لیڈر شری پرسنتا موہنتی تھے۔ وہاں کے زمیندار کس طرح غریب کسانوں کا خون چوستے ہیں اس کی مثال اس واقعہ سے مل سکتی ہے کہ ایک ساہوکار نے ایک غریب کسان کو اُس کی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں دو ہزار روپے ۱۰ فیصد ماہانہ شرح سود پر قرض دئے اور دو برس میں یہ رقم بڑھ کر اصل سمیت چھ ہزار آٹھ سو روپے ہو گئی۔ اس میں سود ہی ۴۸۰۰ روپے تھا۔

جب صلح صفائی سے معاملہ طے کیے جانے کی تمام کوششیں بے سود ہو گئیں تو اُس غریب اور بے بس کسان کو مفت قانونی امداد فراہم کی گئی اور عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ عدالت نے اُس حریص ساہوکار کا دعویٰ خارج کر دیا اور اس طرح وہ بے چارہ کسان اس استحصال سے بچ سکا۔ اس طرح پریشد نے ایک پسماندہ ذات کے غریب کسان مہیش پاترہ کو اُس کی ڈیڑھ ایکڑ زمین ایک غیر قبائلی زمیندار دنیش چند سے چھڑوا کر دلائی تھی۔ جو علاقے قانونی امداد پراجیکٹ کے تحت آتے ہیں وہاں کی گرام پنچایت کو گرام کمیٹی کے تمام ممبروں پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی جاتی ہے اسے لوک عدالت کہا جاتا ہے۔ یہ عدالت کھلے صحن میں لگتی ہے۔ پریشد کا پراجیکٹ ورکر اس عدالت میں موجود ہوتا ہے اُسے عوام کو اُن کے قانونی حقوق اور مراعات کے متعلق آگاہ کیے جانے کی خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔

گرام پریشد اور لوک عدالتوں کے اراکین دیہی طبقے کے آزاد خیال اور منصف مزاج افراد ہوتے ہیں۔ گاؤں کا کوئی جھگڑا ہو، اُسے سب سے پہلے پریشد کی طرف سے قائم قانونی امدادی سنٹر میں لایا جاتا ہے پریشد اس تنازعے سے متعلق فریقین کے درمیان سمجھوتہ کرانے کے لیے مقدمہ لوک عدالت کے سامنے پیش کراتا ہے۔ جب سمجھوتے کے تمام آثار معدوم ہو جاتے ہیں تو پریشد کی طرف سے ضرورتمند اور غریب فریق کو مفت قانونی امداد فراہم کیے جانے کا قدم اٹھایا جاتا ہے اور جب لوک عدالتیں جھگڑا نپٹانے میں ناکام ہو جاتی ہیں تو قانونی امداد حاصل کرنے والے فریق کو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کا موقع دیا جاتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود یہ امر مسلمہ ہے کہ لوک عدالتوں کا بنیادی مقصد فریقین میں صلح کرا کے متاثرہ فریق کو جلد از جلد اور موثر انصاف دلانا اور مقدمات کے فوری فیصلے کرانا اور اُن پر سرعت کے ساتھ عمل کرانا ہے تاکہ غریبوں کو کچھ ذہنی اور مالی راحت مل سکے۔

●

سکتہ ۱۳، ۹، ۶، ۱۹۸۷

مس شاہین پروین

سماج کے کمزور طبقے اور مکانات

اس ملک میں لاکھوں لوگوں کو سر چھپانے کی جگہ دستیاب نہیں ہے۔ سرکاری ذرائع کے مطابق ملک میں ۲ کروڑ ۲ لاکھ مکانوں کی کمی ہے، جس میں سے ایک کروڑ ۸۰ لاکھ دیہی علاقوں میں اور باقی شہری علاقوں میں ہے۔ ان بے گھر انسانوں کے لیے رہائش کا انتظام کرنا بے حد ضروری ہے۔

دنیا میں رہائش کے مسئلہ کو دھیان میں رکھتے ہوئے اقوام متحدہ نے ۱۹۸۷ کے سال کو بین الاقوامی رہائش کا سال منانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس لیے حکومتِ ہند نے اس کی جانب خاص دھیان دیا ہے۔ دیہی ترقی کی وزارت نے سبھی صوبائی حکومتوں کو اس طرف فوراً قدم اٹھانے کے لیے کہا ہے۔ صوبوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں سے کہا ہے کہ وہ اپنی کمیٹیاں بناکر قومی ڈھانچے کے مطابق ۱۹۸۷ء تک بے گھروں کو گھر دینے کی پالیسی اور منصوبہ بنائیں تاکہ ۲۰۰۰ء تک سبھی کو گھر اور صاف ماحول مل سکے۔

ان تمام کوششوں کے باوجود ملک کے ان کروڑوں لوگوں کے لیے رہائش کا کوئی خاص انتظام نہیں ہو سکا۔ جو بے گھر ہیں اور گندی بستیوں یا کھلے آسمانوں کے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ پلاننگ کمیشن کے کئے گئے ایک اندازے کے مطابق ڈھائی کروڑ لوگوں کے لیے رہائش فراہم کرانے کے لیے ۱۵ ہزار کروڑ روپے کی لاگت آئیگی۔ ظاہر ہے کہ حکومت اس سرمایہ کاری کو ایک ہی منصوبے میں مکمل نہیں کر سکتی۔ یہ اتنی بڑی رقم ہے کہ اس کو محض سرکاری سطح پر ہی فراہم نہیں کیا جاسکتا۔ ضرورت ہے کہ رضا کار ادارے آگے بڑھیں اور اس کام میں ہاتھ بٹائیں۔

رہائش کا مسئلہ شہری اور دیہی دونوں علاقوں میں برابر بنا ہوا ہے۔ جتنے بھی صنعتی شہر ہیں ان میں رہائش کا مسئلہ بہت نازک ہے۔ ایسا اس لیے ہو رہا ہے کہ ملک میں جتنے مکانوں کی ضرورت ہے اتنے مکان بن نہیں رہے ہیں۔ اس لیے مکانوں پر آبادی کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ صنعتی شہروں میں مزدور بستی کی حالت بہت بدتر ہے۔ گزشتہ دنوں مکانات کی صورتِ حالات کے مطابق ایک جائزہ لیا گیا اس کی ایک رپورٹ کے مطابق ایک چوتھائی مکانوں کی دیواریں، فرش اور چھتیں کچی تھیں۔ لگ بھگ ۴۴ فیصد مکان ایک کمرے کے تھے۔ لگ بھگ ۴۹ فیصد مکانوں میں ۱۰۰ مربع فٹ فی کس سے کم رقبہ پایا گیا۔ پلاننگ کمیشن کے مطابق بمبئی، کلکتہ اور مدراس جیسے بڑے شہروں میں ۱۰۰ سے ۱۵۰ گندی بستیاں پائی جاتی ہیں۔ اور اس میں شہروں کی ۲۰ فیصد آبادی رہائش پذیر ہے۔ صنعتی شہروں میں جھگی جھونپڑی اور گندی بستیوں میں سماج کے کمزور طبقے رہائش پذیر ہیں، جنھیں سر چھپانے کیلئے مناسب جگہ تک نصیب نہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں تو فٹ پاتھ پر سونے کے لیے بھی کرایہ دینا پڑتا ہے۔

جھگی جھونپڑی اور گندی بستیوں میں رہنے والوں کی زندگی تاریک ہے۔ یہ لوگ معاشی، سماجی اور سیاسی نقطۂ نظر سے بھی پچھڑے ہوئے ہیں اور بنیادی سہولتوں سے بھی محروم ہیں۔ بجلی، پانی اور سڑک تو ان کے لیے عیش و آرام کی چیزیں ہیں۔ آج بھی ملک کے پانچ لاکھ ۳۹ ہزار گاؤں میں سے ۲ لاکھ ۳۹ ہزار گاؤں ایسے ہیں جہاں ابھی بجلی نہیں پہنچی ہے۔ کل ۲ لاکھ ۲۰ ہزار گاؤں

یکم تا ۱۵ فروری ۱۹۸۶

یوجنا، نئی دہلی

میں پینے کے پانی کی فراہمی ایک مسئلہ بنی ہوئی تھی ان میں سے ایک لاکھ ۷۰ ہزار ۴۲۰ گاؤں میں پینے کا پانی فراہم کرایا گیا ہے۔ اسی طرح پچھلے سال مارچ تک صرف ایک لاکھ ۹۰ ہزار ۲۰۹ گاؤں کو پکی سڑکوں سے جوڑا جا سکا تھا۔

بیت الخلاء اور پیشاب گھروں کی حالت بھی بہت خراب ہے۔ پوری بستی میں ایک یا دو بیت الخلا ہوتے ہیں۔ جس میں لمبی قطاریں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ پھر اس میں پانی یا صفائی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چاروں طرف بدبو اور گندگی پھیلی ہوتی ہے۔

اب اقوام متحدہ کی کوششوں سے بے گھر لوگوں کو کچھ آس بندھی ہے۔ حکومت ہند نے اپنی کوششوں کو تیز کر دیا ہے۔ دیکھنا اب یہ ہے کہ ۲۱ ویں صدی کی صبح تک سبھی بے گھر لوگوں کو گھر مہیا ہوتا ہے یا نہیں۔ نائب صدر جمہوریہ شری وینکٹ رمن نے بھی فرمایا ہے کہ ساتویں منصوبے کے دوران ایک کروڑ ۷۰ لاکھ رہائشی مکانوں کا انتظام ہونا چاہیئے۔

۹ مارچ کو نئی دہلی میں رہائشی مسئلے پر ایک بین الاقوامی کانفرنس بھی ہوئی تھی جس میں امریکہ، انگلینڈ، فرانس، کینیڈا، پاکستان سری لنکا، بنگلہ دیش اور نیپال نے حصہ لیا تھا۔ کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے ہندوستان کے نائب صدر شری وینکٹ رمن نے اس بات پر زور دیا کہ بے گھر لوگوں کو مکان فراہم کرانا وقت کی معقول مانگ ہے۔ رہائش کی سہولت بہم پہونچانے کے لیے تین باتوں کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔ سب سے ضروری بات تو یہ ہے کہ ایسے منصوبہ بند طریقے سے عمل میں لایا جائے۔ دوسری بات یہ کہ کم لاگت والے مکانوں کو بنانے میں ترجیح دی جائے۔ تیسری بات ہے سرمایہ مہیا کرانا۔ اس کے لیے ریزرو بینک کو رہائشی قرض پر سے ہر طرح کی پابندیاں ہٹا دینی چاہیئے تاکہ اس صدی کے آخر تک سبھی بے گھر لوگوں کو مکان مل سکے۔ بغیر سود کے یا کم سود پر رہائشی قرض کا منصوبہ بنانا ہوگا۔ نئی دلی میں اس سلسلے میں منعقدہ کانفرنس میں رہائشی قرض پر سود کی شرح گھٹا کر ۵ فیصد کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔

اُمید ہے کہ ان اقدامات سے ملک کو رہائش کے بنیادی مسئلے کو حل کرنے میں مدد ملیگی اور سماج کے کمزور طبقات ان مختلف سہولتوں سے فائدہ اٹھائیں گے جو انھیں تعمیر مکانات اور تعمیر شدہ مکانات کی فراہمی کے سلسلے میں دی جا رہی ہیں۔ ●

بقیہ "ہندوستان میں پٹرولیم مصنوعات کی تیاری"

ہے جس کو عموماً کپڑوں کی تیاری میں استعمال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کے استعمال سے گرمی یا سردی کا احساس نہیں ہوتا اور اُن کو بآسانی دھویا سکھایا جا سکتا ہے۔ اس ریشہ سے کھاد کے تھیلے کشتیوں کے Insulation Tapes Covers بنتے ہیں۔ اس کی سالانہ پیداوار ۳۰ ہزار ٹن ہے۔ اکریلک ریشہ مصنوعی ریشے کی تیسری مقبول قسم ہے جو سلک کے مماثل ہوتا ہے اور اُون کی خصوصیات رکھتا ہے۔ اس لیے اس سے مفلر، سویٹر، قالین اور کمبل تیار ہوتے ہیں۔

پٹروکیمیکلز مصنوعات میں مصنوعی ربر کی پیداوار کا آغاز ہندوستان میں ۱۹۵۵ء میں کیا گیا۔ جبکہ وہ صرف ۲ ہزار ۴۰۰ ٹن سالانہ تیار کی جاتی تھی۔ لیکن ۱۹۶۳ء میں SYnthetic کیمیکلز کمپنی لمیٹڈ نے "بریلی کامپلکس" قائم کیا جس میں Styrene Butadein اور Nitrile ربر سالانہ ۳۰ ہزار ٹن تیار کیا جانے لگا۔ یہ ربر مارکیٹ میں Synaprene اور Chemaprene کے نام سے فروخت ہوتا ہے۔ اس کا ۶۰ فیصد صرف ٹائروں کی تیاری میں صرف ہوتا ہے۔ بریلی پراجیکٹ کے آغاز سے اب تک کوئی ایک لاکھ ٹن سے زائد ربر پیدا کیا جا چکا ہے جس سے تقریباً ۳۵ کروڑ روپے کا زرمبادلہ بچایا جا سکا۔

پلاسٹک سازی، مصنوعی ریشہ اور ربر کی تیاری کا دارومدار صرف پٹرولیم کے نامیاتی مرکبات کی پیداوار پر ہے۔ اس کے پہلے پٹروکیمیکلز کامپلکس Petro Chemical Complex کا قیام ۱۳ مارچ ۱۹۶۹ میں بڑودہ میں کیا گیا جس میں سب سے بڑی گنجائش کا Naphtha Cracking Unit نصب کیا گیا۔ نامیاتی مرکبات سے ڈٹرجنٹ پاوڈر، ڈرائی کلیننگ کیمیکلز Pharmaceuticals کیڑے مار ادویات اور مصنوعی رنگ تیار کیے جاتے ہیں۔

پٹرولیم کی ان تمام مصنوعات سے نہ صرف ملک کی معیشت کو سہارا ملتا ہے بلکہ یہ انفرادی طور سے ہمارے معیار زندگی کو بھی بلند کرتے ہیں۔ اس حقیقت کی بنا پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پٹرول ایک سیال سونا Liquid Gold ہے۔ ●

پٹرولیم کیمیکلز کے چار گروپ

پٹرولیم مصنوعات کی دوسری پیداوار مصنوعی کھاد ہے جو مرکب NAPHTHA سے تیار کی جاتی ہے۔ اس مرکب کی پیداوار اس کی کھپت کے پیش نظر گذشتہ ۵ سال میں ۲۰ لاکھ ٹن سے بڑھا کر ۳۵ لاکھ ٹن سالانہ کردی گئی۔ NAPHTHA کی پیداوار کا انحصار گیسولین کے صرفہ پر ہے۔ اگر ہم سالانہ ۲۵ فیصد گیسولین کی بچت کریں تو پٹرول صاف کرنے کے دوران ۲۵ ہزار ٹن NAPHTHA زیادہ پیدا کرسکیں گے اسی لیے ملک میں گیسولین یا پٹرول کی کفایت کے لیے عوام کی توجہ مبذول کرائی جاتی ہے۔ تاکہ مصنوعی کھاد کی پیداوار کو فروغ دیا جاسکے۔

ایک عرصہ سے ہندوستان میں مصنوعی کھاد کی چار بڑی فیکٹریاں ٹرامبے، گورکھپور، کوٹا اور مدراس میں کام کر رہی ہیں لیکن ۱۹۷۲ء میں کھاد کی بڑھتی ہوئی طلب کی تکمیل کے لیے چھ اور فیکٹریاں گوا، کوچین، درگاپور، منگلور، برونی اور ٹیوٹی کورن میں قائم کی گئیں۔ ان چھ زائد فیکٹریوں میں ۱۱ ملین ٹن NAPHTHA کا صرفہ ہوگا۔ اس لیے اس کی درآمد ناگزیر ہے۔ ان فیکٹریوں میں درحقیقت یہ مرکب ہائیڈروجن گیس کی تیاری میں استعمال کیا جاتا ہے جس سے امونیا کھاد کے مرکبات یوریا (UREA) اور امونیم فاسفیٹ Ammonium Phosphate تیار کئے جاتے ہیں۔

خام پٹرول کی صفائی کے دوران حاصل ہونے والا دوسرے درجہ کا مرکب مٹی کا تیل بھی پٹرولیم مصنوعات میں شامل ہے۔ جس کی سالانہ پیداوار ۴ ملین ٹن ہے۔ اس کی کل پیداوار کا دو تہائی بطور ایندھن اور ایک تہائی حصہ گھریلو روشنی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی زمرہ کی مصنوعات میں ہائی اسپیڈ ڈیزل ۱۱ ملین ٹن اور لائٹ ڈیزل آئل دو ملین ٹن سالانہ تیار ہوتے ہیں۔ پٹرول کے تیسرے درجہ کے کثیف کشید سے میں سب سے اہم مرکب Furnace oil یا ایندھنی تیل ہے جس کو صنعتی توانائی کا منبع تصور کیا جاتا ہے۔ یہ ہمارے کارخانوں میں ۵ ملین ٹن سالانہ پیدا ہوتا ہے۔

پٹرولیم مصنوعات میں نامیاتی کیمیائی مرکبات (Organic Chemicals) کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ ان مرکبات کی صنعت انیسویں صدی کے اواخر میں شروع ہوئی جس میں کوئلہ بطور خام شئے (Raw Material) استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن ۱۹۲۰ء کے بعد پٹرول کو ارزانی کی بناء پر اہمیت حاصل ہوگئی۔ سوائے جنوبی افریقہ کے دنیا کے تمام ممالک پٹرول کو نامیاتی مرکبات کی تجارتی سطح پر تیاری کے لیے استعمال کرنے لگے۔ پٹرول کے ان بنیادی مرکبات میں Toluene-Benzene اور Xylene شامل ہیں۔

پٹرول کیمیکلز کو چار گروپ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا گروپ پلاسٹک کا ہے۔ دوسرے گروپ میں مصنوعی ریشہ آتا ہے تیسرا مقام مصنوعی ربر کو حاصل ہے جبکہ آخری اور اہم درجہ نامیاتی مرکبات کو دیا گیا ہے۔ ہندوستان میں پلاسٹک سازی کا آغاز ۱۹۲۶ء میں ہوا جبکہ صرف درآمد کردہ خام اشیاء سے کنگھیاں، صابن دانیاں اور ASHTRAY بنائی جاتی تھیں۔ لیکن ۱۹۵۸ء میں امپیریل کیمیکلز کمپنی نے پلاسٹک کی باقاعدہ تیاری شروع کردی۔ آج ہندوستان میں پلاسٹک کی اشیاء بنانے کے کوئی دس ہزار یونٹس کام کر رہے ہیں۔ جن میں ۹۰ فیصد کا تعلق چھوٹی مصنوعات سے ہے۔ جن میں سرمایہ کاری ۱۵ ہزار سے ۵ لاکھ روپئے تک کی جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں یوں تو ہمہ اقسام کے پلاسٹک اشیاء تیار ہوتی ہیں لیکن POLYSTRENE-POLYETHENE اور PVC اور POLYPROPYLENE کی اشیاء کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ پلاسٹک سے کھلونے، فوٹوگرافی فلم، ٹیپ ریکارڈر کے فیتے، کھیل کود کی اشیاء جیسے فٹ بال، ٹینس بال، کرکٹ بال، گلف بال، الیکٹرانک کل پرزے بال بیرنگ اور مصنوعی دانت، آنکھ، ناک، کان وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں پلاسٹک کی صنعت کو گذشتہ تیس سال میں کافی ترقی ہوئی اس کی پیداوار ۱۹۶۰ سے ۱۹۷۳ تک ۸ ہزار ٹن سے بڑھ کر ۱۱ ہزار ۳ سو ٹن سالانہ تک پہنچ گئی۔ لیکن ۱۹۷۳ء میں عرب اسرائیل جنگ کی وجہ سے پٹرول کی قیمتوں میں اضافہ کے سبب پلاسٹک کی صنعت کو سخت دھکا پہنچا ہے۔ اس کے بعد اس کی پیداوار ۱۲ ہزار ٹن سالانہ برقرار ہے۔ پلاسٹک کی صنعت کو دوسرے پنجسالہ منصوبے سے کافی تقویت پہنچی۔ چنانچہ اس کے بعد اس صنعت میں کوئی ۴ سو کروڑ روپئے کا سرمایہ لگایا گیا جس سے تقریباً ساڑھے تین لاکھ افراد کو روزگار فراہم ہوسکا۔

مصنوعی ریشہ بھی کاربن کا مرکب ہے۔ جس سے نائلون Nylon پالی ایسٹر POLYESTER اور اکریلک (ACRYLIC) کپڑے تیار ہوتے ہیں۔ نائلون کے کپڑوں کو ۱۹۶۲ سے ہندوستان میں تیار کیا جانے لگا۔ نائلون کی اشیاء بہت مضبوط اور پائیدار ہوتی ہیں۔ ان خصوصیات کی وجہ سے یہ کافی مقبول ہوئیں۔ پہلے پہل نائلون کی پیداوار صرف ۲ سو ٹن سالانہ تھی لیکن اس کی غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے یہ بڑھ کر ۲۰ ہزار ٹن سالانہ تک پہنچ گئی۔ نائلون سے کپڑے، رسیاں، مچھلیاں پکڑنے کی جال، ٹائر وغیرہ تیار ہوتے ہیں۔ مصنوعی ریشہ کی دوسری قسم پالی ایسٹر

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment at Civil Lines Post Office, Delhi-110054.

VOL. 5 No. 21 YOJANA (URDU) 1-15th February 1986

عبدالرؤف محبوب نگری

ساتواں پنچسالہ منصوبہ اور طویل مدتی مالیاتی پالیسی

کسی بھی ملک کی معاشی و اقتصادی ترقی میں مالیاتی پالیسی ایک اہم و موثر رول ادا کرتی ہے۔ صحیح اور صحت مند مالیاتی پالیسی معاشی ترقی کے حصول کا ایک زبردست ہتھیار ہوتی ہے۔ وزیر فینانس مسٹر وشوا ناتھ پرتاپ سنگھ نے ۱۹ دسمبر کو لوک سبھا میں حکومت ہند کی جس نئی طویل المدتی مالی پالیسی کا اعلان کیا ہے وہ غریبی کے خاتمے اور تیز رفتار معاشی ترقی کے حصول میں بلاشبہ ممد و معاون ثابت ہوگی۔ ملک میں پہلی مرتبہ اس قسم کی طویل مدتی مالی پالیسی اپنائی جا رہی ہے جو ساتویں منصوبے کے ساتھ ساتھ روبہ عمل لائی جائے گی۔ ساتواں پنچسالہ منصوبہ ۱۹۹۰ء میں ختم ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ جس طویل مدتی مالیاتی پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے وہ بھی ختم ہو جائے گی۔ اس نئی مجوزہ طویل مدتی مالیاتی پالیسی کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ انکم ٹیکس اور دولت ٹیکس کی موجودہ شرح ۵ سال تک باقی رہے گی اور کارپوریٹ ٹیکس کی شرح کو آئندہ پانچ سال تک نہیں گھٹایا جائے گا۔ جاریہ سال کے بجٹ میں ہی کا [illegible] شرح کو کافی گھٹا دیا گیا تھا۔ جس پر کارپوریٹ شعبے نے اطمینان کا اظہار کیا۔ اس اعلان پر کہ ۵ سال تک ٹیکس کی شرح جوں کی توں رہے گی تو اس شعبہ کو اور بھی سکون حاصل ہوگا۔

اس نئی طویل مدتی مالیاتی پالیسی کے ذریعے ٹیکس سسٹم میں ترقی پسند اصلاحات کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ پروفیسر کولڈر KALDOR نے ایک بار ہمارے ٹیکس کے نظام کو بے کار اور بے اثر اور مفلوج کہا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ موجودہ محاصل نظام ٹیکس سے گریز اور دھاندلیوں کا موقع فراہم کرتا ہے۔ بڑے بڑے صنعت کار، تاجر، سرمایہ دار اور فلم اسٹار جن کی لاکھوں کی آمدنیاں ہیں بڑی آسانی سے ٹیکس کی ادائیگی سے بچ جاتے ہیں اور ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جاتی اور اگر کارروائی کی بھی جاتی ہے تو وہ بے اثر ہوتی ہے۔ ٹیکس کی چوری "کالے دھن" کو جنم دیتی ہے اور کالا دھن معیشت کو کالے ناگ کی طرح ڈس رہا ہے جس کے زہریلے اثرات نہ صرف صنعت اور تجارت بلکہ تمام شعبۂ حیات میں سرایت کرتے جا رہے ہیں۔

کالا دھن ہماری معیشت کو کھوکھلا کر رہا ہے اور اس سے ہر چیز آسانی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ بڑے بڑے بنگلے، عالی شان کوٹھیاں، قیمتی کاریں وغیرہ غرض کونسی چیز نہیں جو کالے دھن کے جادو سے حاصل نہیں ہوتی۔ ادھر کالے دھن کے دیو کو آواز دو ادھر پلک جھپکتے ہی مطلوبہ چیز کو سامنے پاؤ۔

سیاسی پارٹیوں کو عطیے اور چندے، الیکشن اور انتخابی مہم پر لاکھوں روپیہ کا صرف، شادی بیاہ کے موقعوں پر کھانے، روشنی، گھوڑے جوڑے، بینڈ باجے اور دیگر چاؤ چونچلوں پر بے دریغ فضول خرچی، کوئی بتائے کہ ان تمام کے لئے روپیہ پیسہ کہاں سے آتا ہے۔ یہ سب کالا دھن نہیں تو اور کیا ہے؟

ہمارے ملک میں ایک طرف غریب ہیں جو دن بھر محنت کرتے ہیں، پسینہ بہاتے ہیں۔ اس کے باوجود اپنی بیوی بچوں کی جائز مانگیں اور بنیادی ضروریات پوری نہیں کر پاتے۔ اور دوسری طرف ہمیں وہ لوگ نظر آتے ہیں جو اپنے سرمائے اور دولت کے بل بوتے پر کوٹھیوں پر کوٹھیاں، کاروں پر کاریں خریدتے جاتے ہیں۔ کوئی دل پر ہاتھ رکھ کر یہ بتائے کہ ٹھنڈی چھاؤں اور ایرکنڈیشنوں میں رہنے والے ان امیرزادوں کے پاس روپیہ پیسہ آتا کہاں سے ہے۔ کیا عجب ہے محنت سے کماتے ہوں گے مگر محنت ہمارے کسان بھائی کرتے ہیں۔ پھر کیوں وہ مالا مال نہیں ہیں۔ یہ اور اس قسم کے بہتیرے سوالات کے جوابات ہمارے معاشی ماہرین اور پالیسی سازوں کے پاس موجود ہیں۔ یہ صحیح ہے

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002.

یوجنا

۱۶تا۲۸رفروری ۱۹۸۶

ایک روپیہ

دہلی میں امدادِ باہمی تحریک

(سید محمود نقوی)

سماج کے کمزور طبقوں کے لیے سستا اناج

(پریم ارورہ)

ڈاکٹر منموہن سنگھ

منصوبہ بند ترقی اور نئے سماج کی تعمیر

پچھلے [illegible]
[illegible]
مثال کی اہمیت رکھتا ہے۔

ہماری [illegible] وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اپنے ملک میں منصوبہ بندی کو منظم ترقی کا ذریعہ عمل قرار دیا تھا جو وقت اور تجربہ کا ایک ایسا ساختہ [illegible] کام کرتا ہے جو مختلف سطحوں پر خطوں اور ریاستوں کو آپس میں جوڑتا ہے اور ہر سال کی کوشش کو آئندہ کے برسوں سے وابستہ کرتا ہے۔ کل ملک اور ریاستوں نیز خطوں کے سماجی اور اقتصادی تار و پود کو مضبوط کرکے منصوبہ بندی نے قومی یکجہتی کے حصول میں بڑا قومی کردار ادا کیا ہے۔ منصوبہ بندی کے طریق کار نے ہماری ترقی کے بنیادی مقاصد کی پالیسیوں اور اسلوب کے بارے میں اہم نوعیت کا قومی اتفاق رائے تشکیل [illegible] حصہ لیا ہے۔

اہم مقاصد

طویل مدتی منصوبہ بندی کے لیے لازمی ہے کہ وہ مستقبل کی دور اندیشی پر مبنی ہو۔ اس کے اختتام میں ایک طویل المدتی تناظر ہونا چاہیے تاکہ اس دور اندیشی کو حقیقت میں بدل کر عمل میں لایا جاسکے۔ اس لیے ساتویں منصوبے کو پندرہ سال کے تناظر میں متعین کیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ۲۰۰۰ سال تک ایسے حالات پیدا ہو جائیں جس سے ترقی کی صورت حال خود بخود جاری رہے اور تمام لوگوں کی بہبود کے لیے مادی نوعیت کی بنیادی ضروریات مہیا ہوں۔

ساتویں منصوبے کے اغراض و مقاصد ایک طویل المدتی پالیسی کے جزو کی حیثیت سے تشکیل دیے گئے ہیں اور یہ پالیسی ایسی ہے جو ۲۰۰۰ء کے سال تک غریبی اور ناخواندگی کو عملی طور سے ختم کر دینا چاہتی ہے۔ عملی طور پر روزگار مہیا کر دینا چاہتی ہے، خوراک، کپڑے اور مکان کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل چاہتی ہے اور سب کے لیے صحت مندی کی خواہاں ہے۔

پچھلے دہے میں بھارت کی ترقیاتی کارکردگی قابل ذکر حد تک بہتر ہوئی ہے۔ ساتویں منصوبے میں کوشش ہے کہ اس موافق رجحان کا فائدہ اٹھاکر معاشیات کی شرح فروغ میں پانچ فیصد اوسط کے حساب سے اضافہ کرلیا جائے۔

خوراک، کام اور پیداواریت ایسے تین بنیادی عناصر ہیں جو منصوبہ بندی کے کام میں مشعل راہ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بنیادی ڈھانچہ اور انسانی وسائل پر خصوصی توجہ دی گئی ہے کیونکہ فروغ کے طاقت کار کو برقرار رکھنے کے اعتبار سے ان کی بڑی اہمیت ہے۔

روزگار کے مزید مواقع

روزگار کے تعلق سے منصوبے کا اہم مقصد یہ ہے کہ روزگار کے مواقع کا فروغ یقینی طور پر [illegible] میں اضافے کی نسبت زیادہ تیز ہو۔ زرعی فروغ کیلئے آبپاشی کی سہولیات میں اضافہ تیزی سے ہو اور روزگار کے پروگرام مزید شدت کے ساتھ چلائے جائیں اور جاری رکھے جائیں جیسے نیشنل رورل ایمپلائمنٹ پروگرام اور دیہی افراد کے لیے روزگار کی گارنٹی کا پروگرام۔ ایسے پروگرام دیہی علاقوں میں روزگار کے مزید مواقع پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کر سکیں گے۔

صنعتوں کے فروغ کی تیز رفتار اور پرائیویٹ سیکٹر میں مکانات کی تعمیر کا کافی وسیع پروگرام جس کے لیے مالی امداد ادارہ جاتی ذرائع سے فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی، دونوں مل کر غیر زرعی سیکٹر میں ماضی کی نسبت زیادہ روزگار پیدا کریں گے۔ عرصہ کار میں روزگار کے امکانات ۴۰۰ لاکھ معیار کے افرادی سال تک بڑھ جانے کی توقع ہے جس کے مقابلے میں کارکن فورس میں مزید ۳۹۰ لاکھ افراد تک کا اضافہ ہوگا۔ ساتویں منصوبے کے دوران روزگار کے امکانات چار فیصد سال کے حساب سے بڑھیں گے جو کارکنوں کی متوقع شرح فروغ یعنی ۲.۵ تا ۲.۶ فیصد سے کافی زیادہ ہوں گے۔

(باقی کور صفحہ ۳ پر)

منصوبہ بندی کی وزارت ... کی جانب سے شائع ہونے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر ـــــ • آر. ٹھکرال

اسسٹنٹ ایڈیٹر ـــــ • محمد عادل صدیقی

سب ایڈیٹر ـــــ • وسیم حیدر

جلد ۵	۱۶ تا ۲۸ فروری ۱۹۸۶	شمارہ ۲۲

۲۷، ماگھ تا ۹ پھاگن شک ۱۹۰۷، فون ٹیلیفون ۶۰۱۸۱۸

شرحِ چندہ

سالانہ ۲۰ روپے، ۲ سال ۳۵ روپے، ۳ سال ۵۰ روپے

فی کاپی ـــــ ایک روپیہ

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فیصد کی رعایت

اس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:

ایڈیٹر یوجنا (اردو)، پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر. کے. پورم، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

• اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن): آر. ایس. منچاں

ترسیلِ زر کا پتہ: بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

عورتوں کی بہبود

ہندوستان کی آبادی میں تقریباً نصف تعداد عورتوں کی ہے۔ اس لیے کسی ملک کی تعمیر و ترقی اور یہاں کی سماجی و اقتصادی ترقی میں عورتوں کا کردار اہم رہا ہے۔ ملک میں عورتوں کی کل آبادی کا تقریباً ۸۰ فیصد دیہی علاقوں میں آباد ہے۔ اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ بات اہم ہے کہ عورتوں میں سے ۷۵ فیصد عورتیں دیہات میں ہی آباد ہیں۔ ان عورتوں نے ملک کی اقتصادی اور سماجی ترقی میں قابل قدر کام کیا ہے۔ لیکن یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی خدمات کو خاطر خواہ انداز میں تسلیم نہیں کیا جا سکا ہے۔ ۱۹۸۱ کی مردم شماری کے اعداد کی روشنی میں تقریباً عورتوں کی نصف تعداد دیہی مزدوروں کی حیثیت سے کام کر رہی ہے لیکن ان کی اجرت مردوں کی اجرت کا تناسب صرف چوتھائی کے بقدر ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً ۳۰ فیصد عورتیں گھریلو صنعتوں میں اور دیگر متفرق شعبوں میں ۲۰ فیصد عورتیں کام کر رہی ہیں۔ ۱۰ فیصد گھریلو صنعتوں اور ۱۰ فیصد دیگر متفرق شعبوں میں بھی سرگرم ہیں۔

دیہات کے لوگ اب بھی زیادہ تر زراعت پر ہی انحصار کرتے ہیں۔ عورتوں کو کھیتوں میں مردوں کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے۔ عورتوں کو ایک طرف گھر کی آمدنی بڑھانے کے لیے کام کرنا پڑتا ہے اور دوسری طرف گھریلو کام بھی کرنے ہوتے ہیں۔ اس بات سے عورتوں پر کام کا بوجھ کافی بڑھتا ہے۔ اس کے باوجود عورتوں کو پینے کا صاف پانی، تعلیم، تغذیہ بخش خوراک اور حفظان صحت کی بنیادی سہولتیں فراہم نہیں ہو پاتیں۔ اس وجہ سے وہ مشکل حالات میں زندگی گزارتی ہیں۔ اضافہ آبادی کے سبب زرعی زمین پر دباؤ بڑھا ہے۔ اسی سبب قطعات اراضی چھوٹے چھوٹے ہو گئے ہیں اور جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔ بہتر قسم کی ٹیکنالوجی کی عدم دستیابی، آبپاشی کی ناکافی سہولتیں وغیرہ ایسی مشکلات ہیں جن سے آج بھی کسان دوچار ہیں۔ اس کی وجہ سے پیداواری صلاحیت متاثر ہوتی ہے اور ان کنبوں کی آمدنی متاثر ہوتی ہے۔ بلا شبہ ملک کی منصوبہ بند ترقی کے تحت کسانوں اور دیہی آبادی کے فائدے کے لیے بہت سے پروگرام شروع کئے جا چکے ہیں اور ساتویں منصوبے میں ان کو آگے بڑھانے پر زور دیا گیا ہے لیکن ان پروگراموں سے جب تک عورتوں کو پوری طرح فائدہ نہ پہنچ سکا بحیثیت مجموعی ملک کے عوام کا بھلا نہیں ہو سکتا۔ عورتوں کو آج اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہونے کی ضرورت ہے کیونکہ مردوں پر مالی انحصار ان کے راستے کا زبردست روڑا بن گیا ہے۔ چھٹے منصوبے میں عورتوں کی ترقی سے متعلق الگ سے ایک باب کا اضافہ اس بات کا ثبوت تھا کہ عورتوں کی تعلیم و ترقی کی اہمیت سے سرکار بخوبی واقف ہے۔ ساتویں منصوبے میں عورتوں کی ترقی پر زور دینے کی بات کہی گئی ہے۔ نئے بیس نکاتی پروگرام میں عورتوں کی بہبود، بچوں کی دیکھ بھال اور تغذیہ بخش خوراک کی فراہمی پر زور دیا جا رہا ہے۔

زچہ بچہ کی بہبود کے پروگرام خاص طور پر آگے بڑھائے گئے ہیں۔ نئے وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے ساتویں منصوبے میں عورتوں کی ترقی پر اور بھی زیادہ زور دیا ہے۔ عورتوں کو تکنیکی تربیت دینے کی کوششیں جاری ہیں جس سے وہ اقتصادی پروگراموں میں ہاتھ بٹا سکیں اور اپنی ذہانت اور محنت سے ملک و قوم کی بھلائی کے کام انجام دے سکیں۔ عورتیں اپنی ذہانت اور صلاحیت سے بہت سے کام شروع کر سکتی ہیں لیکن انہیں مناسب تربیت ملے۔ عورتوں میں بالعموم سلائی، کڑھائی، اچار، مربے وغیرہ کی تیاری اور دیگر بہت سے کھانے اور مشروبات کی تیاری کا فطری شوق ہوتا ہے۔ عورتیں پاپڑ اور اگربتی وغیرہ بنانے کی صنعت میں بھی قدم دکھا سکتی ہیں۔ اس طرح ملک میں ہزاروں عورتوں کو اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہونے میں مدد مل سکتی ہے۔ اسی طرح کی ایک کوشش دہلی ایڈمنسٹریشن نے کھنجاولہ بلاک میں یونیسیف کی مدد سے شروع کی ہے۔ اس طرح کی سرگرمیوں کو آگے بڑھا کر عورتوں کو نفع بخش روزگار دلایا جا سکتا ہے۔ اس سے نہ صرف عورتوں کا اپنا بھلا ہوگا بلکہ ان کنبوں کی آمدنی بڑھے گی اور بحیثیت مجموعی ملک کی معیشت پر خوشگوار اثرات مرتب ہوں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دیہات کی عورتوں کی صلاحیت بڑھانے کے لیے ان کو بنیادی سہولتیں فراہم کی جائیں۔ مثلاً ایسی سڑکوں کی تعمیر ضروری ہے جس سے وہ تیار کیا مال شہری مراکز تک بآسانی پہنچا سکیں۔ عورتوں اور ان کے بچوں کے لیے تعلیم و تربیت کی ضروری سہولتیں فراہم کرنا بھی ضروری ہے۔ تغذیہ بخش خوراک کی کمی کے باعث ان کی صحت متاثر ہوتی ہے۔ سماجی خدمات کی بڑے پیمانے پر فراہمی اور بنیادی سہولتوں کی توسیع کے ملے جلے عمل سے عورتوں کی حالت بہتر بنانے میں مدد ملیگی۔

تعلیم بالغان کا پروگرام بھی اس سلسلے میں معاون ثابت ہوگا۔ دیہی سطح پر مہیلا منڈلوں کے قیام، عورتوں کی تعلیم اور صحت سے متعلق ان کے شعور کو جگانے میں مدد دے گا۔ یہ پروگرام ملک کی مجموعی ترقیاتی حکمت عملی کے ایک موثر جزو کے طور پر آگے بڑھائے جانے چاہئیں۔ کسی عورت کو کسی کام کی طرف راغب کرنے سے قبل یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے خاندانی پس منظر، تعلیمی سطح، رجحان، تربیت حاصل کرنے کی صلاحیت اور مقامی ضرورتوں کا بھی خیال رکھا جائے۔ غذا کی تیاری، بیڈ لیمپ، پر کپڑے کی تیاری، ناریل کے ریشے کی صنعتیں، کتائی، بنائی، کپڑوں کی سلائی، ریشم کے کیڑوں کی پرورش، ماچس کی تیاری اور اسی قسم کی بہت سی صنعتیں مقامی عورتوں کے لیے نفع بخش روزگار مہیا کر سکتی ہیں۔

(اسسٹنٹ ایڈیٹر)

بھارت کا اتحاد ہر دوسری چیز پر مقدم

صدر جمہوریہ ہند کی تقریر

صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ نے یوم جمہوریہ کے موقع پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ یوم جمہوریہ ہم سب کے لیے ایک خوشی کا موقع ہے جو ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہم آزاد و خود مختار ہیں اور اپنی قوم کے مستقبل کے مالک اور معمار ہیں۔ یہ دن ہمیں اپنی کامیابیوں کا جائزہ لینے اور ان کاموں کے بارے میں سوچنے کا موقع دیتا ہے جنھیں ابھی مکمل کرنا ہے۔ اس قسم کا جائزہ ہمیں مستقل مزاجی اور زیادہ خود اعتمادی سے حالات کا مقابلہ کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ہماری جمہوریت کی بنیاد سماج واد، جمہوری طرز عمل اور سیکولرازم پر قائم ہے۔ بردباری اور ایک دوسرے کا احترام ہمارے جمہوری نظام کی اہم خصوصیات ہیں۔ جمہوریت مختلف حامل قوتوں میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے اور سماج کو ایک مشترکہ نصب العین کی جانب لے جاتی ہے۔ جمہوریت ہمارے آئین کے ڈھانچے کے اندر قائم کئی اداروں کے ذریعہ کام کرتی ہے۔ ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں اور ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ اس امر کا خیال رکھے کہ یہ جمہوری ادارے مناسب ڈھنگ سے کام کریں اور ان میں ہم آہنگی کو برقرار رکھا جائے۔ اس سے ہمارے جمہوری ڈھانچے کی بنیادیں مزید مضبوط ہوں گی۔

جب سے ہم جمہوریہ بنے ہیں ہم نے جمہوری نظام کو کامیابی سے چلانے میں بہت سے تجربے حاصل کیے ہیں۔

اس کے لیے یہ امر باعث فخر ہے کہ ہمارے رائے دہندگان نے اپنے ووٹ کا استعمال بے خوفی اور پختگی سے کیا ہے۔ اور جمہوریت کی جڑیں ہماری سرزمین میں کافی گہری ہو گئی ہیں۔ اپنے آئین کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے ہمیں ملک کے بنیادی اتحاد کو قائم رکھنا اور مضبوط کرنا ہے۔ جمہوری اصولوں کی سختی سے پیروی کرتے ہوئے ہمیں اپنی اقتصادی ترقی کی رفتار کو تیز کرنا ہے۔ اگر ہمارے درمیان کوئی اختلافات بھی پیدا ہوں تو انھیں تبادلہ خیال اور باہمی خیرسگالی سے نپٹایا جانا چاہیے۔

بھارت کا اتحاد ہر دوسری چیز

پر مقدم ہے۔ یہ نہ صرف سیاسی اتحاد ہے بلکہ یہ جذبات و احساسات کا بھی اتحاد ہے جس کی جڑیں ہمارے قومی شعور میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ہماری تمام تر تاریخ میں روحانی رہنماؤں نے ان قدروں کی آبیاری کی ہے۔ [illegible] سچائی، محبت، رحمدلی، بردباری اور دوسروں کے تئیں احترام جیسی روحانی قدروں پر مبنی ان باتوں کو ہمارے آئین میں بھی سمویا گیا ہے۔ تاہم یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ ان قدروں پر عمل میں کمی دیکھنے میں آتی ہے۔ اس سے کئی غیر پسندیدہ نتائج نکلتے ہیں۔ قدروں میں اس گراوٹ کے لیے اپنے آپ کو ہی ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ مجبوری کے نام پر اس ذمہ داری سے گریز کرنا ممکن نہیں ہے۔ لوگ اعلیٰ اخلاقی قدروں کے لیے رہنماؤں کی جانب دیکھتے ہیں۔ چنانچہ سب سیاسی جماعتوں کو اعلیٰ قدریں قائم کرنی چاہئیں اور انھیں اپنے اعمال اور کارناموں سے برقرار رکھنا چاہیے۔

قانون کی حکمرانی ہمارے جمہوری نظام کا ایک اور اہم اصول ہے۔ یہ ہر شہری کو یکساں تحفظ دیتا ہے۔ اس کا مطلب قانون کے روبرو ہر شخص کی یکساں حیثیت بھی ہے۔ ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ قوانین کا پاس کرے۔ اس طرح قانون نافذ کرنے والے اداروں کا بھی فرض ہے کہ وہ امن پسند سماج کے مفاد میں قوانین کا سختی سے اطلاق کریں۔

ملکی معیشت کی کارکردگی گزشتہ برس بہت اچھی رہی ہے اور ساتویں منصوبے کے آغاز سے معیشت کے مستقبل کی راہ عمل اچھی طرح متعین ہو گئی ہے۔ منصوبے میں ۵ فیصد سالانہ کی اقتصادی رفتار ترقی کا نصب العین مقرر کیا گیا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کئی ایک پروگراموں اور پالیسیوں کا سلسلہ مرتب کیا گیا ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ منصوبے میں خاص زور غریبی دور کرنے کے پروگراموں پر دیا گیا ہے۔ ملک کے کسی بھی حصے میں کسی بھی شکل میں غریبی کی موجودگی ہمارے استحکام اور اتحاد کے لیے خطرہ ہے۔ انصاف کے ساتھ متوازن ترقی ہمارے منصوبہ بند عمل کی بنیادی خصوصیت ہے۔ ملک کی ابھرتی ہوئی سماجی و اقتصادی تمناؤں کا یہی ایک جواب ہے۔ یہ امر باعث اطمینان ہے کہ ساتویں پانچسالہ منصوبے کا ایک بڑا مقصد اس بات کا یقینی اہتمام کرنا ہے کہ ملک میں روزگار کے نئے مواقع کی تعداد محنت کشوں کی نئی تعداد سے کہیں زیادہ رہے۔ حکومت کا فرض یہ ہے کہ وہ سرمائے اور محنت کشوں کے درمیان خوشگوار تعلقات کی حوصلہ افزائی کرے کہ پیداواری اضافے میں مدد دے کیونکہ انھیں ساتویں منصوبے پر عمل درآمد میں ایک اہم کردار ادا کرنا ہے۔ انتظامیہ اور محنت کشوں کے باہمی تعلقات ایسے ہونے چاہئیں جن سے باہمی کشیدگی کم کرنے میں مدد ملے جو قومی معیشت کو نقصان پہنچاتی ہے۔ منصوبے پر عمل کرنے والے تمام اداروں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس کی کامیابی کے لیے پوری لگن کے ساتھ کام کریں۔ منصوبے سے لوگوں، خصوصاً شہری اور دیہی علاقوں کے پڑھے لکھے نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی بے چینی [illegible]

(باقی صفحہ [illegible] پر) ●

سید محمود نقوی

دہلی میں امدادِ باہمی تحریک

اقدامات و امکانات

دہلی میں امدادِ باہمی تحریک دوسرے صوبوں اور مرکزی علاقوں کے برعکس شہری نوعیت زیادہ رکھتی ہے۔ یہاں زیادہ تر امدادِ باہمی تنظیمیں یا تو ٹرانسپورٹ اور ہاؤسنگ سے متعلق ہیں یا صارفین کی روزانہ ضرورت کی تقسیم سے۔ دراصل یہ لازمی نتیجہ ہے یہاں راجدھانی کی مسلسل بڑھتی ہوئی آبادی کا۔

جون ۱۹۸۵ کے خاتمے پر دہلی مرکزی علاقے میں مجموعی طور پر تمام امدادِ باہمی تنظیموں کی رکنیت ۹٫۸۴ لاکھ تھی۔ اس رکنیت میں پچاس فیصد رہائشی تنظیموں اور ۴۵ فیصد ٹرانسپورٹ تنظیموں کا حصہ تھا۔ رکنیت، حصص پر مشتمل سرمایہ اور جمع شدہ سرمایہ کی تفصیلات اس طرح ہیں:

امدادِ باہمی تنظیم	رکنیت کی تعداد (لاکھوں میں)	حصص پر مشتمل سرمایہ (لاکھوں میں)	جمع شدہ سرمایہ
[illegible]	۰٫۲	۲۰۰٫۲۵	۶۸۶٫۳۵
[illegible]	۲٫۲۵	۱۴۷٫۳۰	۳۴٫۷۰
۳۔ ٹرانسپورٹ	۴٫۳۲	۹۷۰٫۰۰	۳۹۴۶٫۰۰
۴۔ ہاؤسنگ	۰٫۳۳	۴۲٫۸۷	۲۱۵٫۱۰
۵۔ گروپ ہاؤسنگ	۲٫۲۲	۲۳۰٫۸۰	۱۶۰٫۵۰
۶۔ پیکیج	۰٫۵۲	۴۶٫۸۷	۷٫۸۵
میزان	۹٫۸۴	۱۶۳۸٫۰۸	۵۰۵۱٫۴۰

امدادِ باہمی رہائشی تنظیمیں

دہلی کی بے روک ٹوک بڑھتی ہوئی آبادی کی رہائش کا مسئلہ برسوں سے کافی مشکل رہا ہے۔ اس مسئلے کو کسی حد تک حل کرنے کے لیے امدادِ باہمی رہائشی تنظیموں نے خوشگوار کام انجام دیا ہے۔ ۱۹۰۲ میں جب نئی گروپ ہاؤسنگ سوسائٹیوں کے رجسٹریشن کا کام برسوں کے انتظار کے بعد ڈیڑھ مہینے کے لیے شروع کیا گیا تو ابتدائی طور پر ۲۰۰۹ درخواستیں موصول ہوئیں۔ جب سے ۱۳۸۲ سوسائٹیاں رجسٹرڈ ہو چکی ہیں اور ۴۴۳ سوسائٹیوں کے معاملے دہلی ڈیولپمنٹ اتھارٹی کو زمین کے الاٹمنٹ کے لیے بھیجے جا چکے ہیں۔ ساتویں منصوبے کے دوران نئی گروپ ہاؤسنگ سوسائٹیوں کے ذریعہ دو لاکھ رہائشی مکان تیار ہو جانے کی امید ہے۔

دہلی کوآپریٹو ہاؤسنگ فائنینس سوسائٹی کا حصص پر مشتمل سرمایہ ۱۰ کروڑ روپے اور ادا شدہ حصص ڈھائی کروڑ روپے ہیں۔ اور اب تک ۲۴ گروپ ہاؤسنگ سوسائٹیوں کو ۳۷۶۰ رہائشی اکائیاں بنانے کے لیے ۳٫۶۵ کروڑ روپے کے مالی قرضے دیے جا چکے ہیں۔ دہلی انتظامیہ اس کے حصص پر مشتمل سرمایہ میں ۱۲ کروڑ روپے مزید دینے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ سوسائٹی آئندہ

منصوبے کے دوران پچاس ہزار فلیٹ تعمیر کئے جانے کے لیے مالی قرضے دینے کا پروگرام رکھتا ہے۔

صارفین امدادِ باہمی تنظیمیں

صارفین امدادِ باہمی تنظیمیں (کنزیومرس کوآپریٹو سوسائٹیز) عوامی تقسیمی طریقۂ کار (پبلک ڈسٹری بیوشن سسٹم) کی حیثیت سے کارکردگی کے لیے ایک قابلِ اعتبار وسیلہ ثابت ہوئی ہیں۔ انھیں دہلی انتظامیہ سے برابر تعاون ملتا رہا ہے۔ نئے کوآپریٹو اسٹوروں کی حصص پر مشتمل سرمایہ میں شریک ہوکر، ساز و سامان کی صورت میں قرضے دے کر اور انتظامی امور میں تعاون و اشتراک سے حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اس طرح پرائمری کوآپریٹو اسٹوروں کی تعداد جو ۱۹۸۰ میں ۵۹۰ تھی وہ ۱۹۸۴ء میں ۶۵۴ تک پہونچ گئی اور ۱۹۸۵ء کے دوران بھی اس میں قابلِ لحاظ اضافہ ہوا۔ سنٹرل گورنمنٹ ایمپلائز کنزیومر کوآپریٹو سوسائٹی (کیندریہ بھنڈار) اس سلسلے میں لائق تحسین خدمات انجام دے رہی ہے۔ اس کی سالانہ فروخت تقریباً ۷ کروڑ تک پہونچ گئی ہے اور اس کی ۳۸ شاخیں قائم ہو چکی ہیں۔

اسی طرح سے سُپر بازار بھی قابلِ لحاظ طور پر اس میدان میں سرگرم عمل ہے۔ دہلی مرکزی علاقے میں اس کی ۷۳ شاخیں لوگوں کو ان کی ضروریاتِ زندگی مناسب قیمت پر فراہم کرنے میں مصروف ہیں۔ سُپر بازار کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا اندازہ اس کی سالانہ خرید و فروخت کی رقم میں اضافے سے لگایا جاسکتا ہے — ۸۰-۱۹۷۹ء اس کی خریداری ۱٫۱۲ کروڑ روپیے کی تھی جو ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۲۱ کروڑ روپے تک پہونچ گئی۔ اسی طرح اس کی فروخت کی رقم جو ۸۱-۱۹۸۰ء میں لگ بھگ ۲۰ کروڑ روپیے تھی وہ ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۲۹ کروڑ روپے

ہوگئی۔ اسی طرح سے مجموعی منافع کی رقم میں بھی اضافہ ہوا اور ۸۲-۱۹۸۱ میں یہ رقم ۱٫۶۱ کروڑ روپیے ہوگئی جبکہ ۸۰-۱۹۷۹ء میں منافع کی رقم ۱٫۱۱ کروڑ روپیے ہی تھی۔

دہلی میں کوآپریٹو سوسائٹیوں کا فروغ

چھٹے پنجسالہ منصوبے کے دوران دہلی میں امدادِ باہمی تحریک کو قابلِ لحاظ طور پر فروغ حاصل ہوا۔ مختلف طرح کی کوآپریٹو سوسائٹیوں کی تعداد جو ۱۹۸۰ میں ۳۹۱۸ تھی وہ جون ۱۹۸۴ کے خاتمہ پر ۵۷۹۷ تک پہونچ گئی تھی اور وسط ۱۹۸۵ میں یہ تعداد ۵۹۸۰ ہو گئی تھی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً پچاس فیصد کا اوسطاً اضافہ ہوا جس کی تفصیل درج ذیل ہے:-

۱۔ سال کے دوران کوآپریٹو سوسائٹیوں کے رجسٹریشن کی تعداد
(۱) ۸۱-۱۹۸۰ / ۷۳
(۲) ۸۲-۱۹۸۱ / ۱۶۵
(۳) ۸۳-۱۹۸۲ / ۱۱۸
(۴) ۸۴-۱۹۸۳ / ۱۴۷۸
(۵) ۸۵-۱۹۸۴ / ۱۷۹

۲۔ ممبروں کی تعداد بلحاظ سال:-
(۱) ۵۲۹ (۲) ۵۸۲ (۳) ۶۹۳ (۴) ۹۵۸ (۵) ۹۰۴

۳۔ حصص پر مشتمل سرمایہ کا سالانہ جائزہ:-
(۱) ۱۱۰۷ (۲) ۱۲۳۴ (۳) ۱۲۷۵ (۴) ۱۴۷۴ (۵) ۱۶۳۸

۴۔ سالانہ جمع رقم[1]:-
(۱) ۳۵۳۸ (۲) ۳۰۸۲ (۳) ۴۷۲۴ (۴) ۴۲۲۶ (۵) ۵۰۵۱

۵۔ سالانہ وصولیابیاں:-
(۱) ۲۷ (۲) ۱۵ (۳) ۲۱ (۴) ۲۴ (۵) ۲۹

[1] اس میں نئی گروپ ہاؤسنگ سوسائٹیوں کی جمع رقم شامل نہیں ہے۔

چھٹے پنجسالہ منصوبے کے دوران اس بہتر کارگزاری کے باعث حوصلوں اور امیدوں میں

کوآپریٹو سوسائٹی کی قسم	۳۰ جون کو موجود تعداد ۱۹۸۰ء	۱۹۸۴ء	۱۹۵۸ء	پانچ سال میں اضافہ کا فیصد
۱۔ صنعت	۱۰۱۰	۱۲۱۹	۱۲۹۹	۲۸٫۶۰
۲۔ صارفین	۵۹۰	۶۵۴	۶۸۵	۲۳٫۰۰
۳۔ ٹرانسپورٹ	۸۲۲	۱۰۰۰	۱۰۱۱	۱۶٫۱۰
۴۔ ہاؤسنگ	۲۳۳	۲۳۲	۲۲۹	—۱٫۷
۵۔ گروپ ہاؤسنگ	۵۲۰	۱۹۴۱	۱۹۹۸	۲۸۴٫۲۳
۶۔ پیکیج (دیہی)	۷۵۳	۷۵۱	۷۵۸	۰٫۷
میزان	۳۹۲۸	۵۷۹۷	۵۹۸۰	۵۲٫۲

۸۱-۱۹۸۰ء سے ۸۵-۱۹۸۴ کے گذشتہ پانچ مالی برسوں کے دوران امدادِ باہمی تنظیموں کی تعداد میں جو قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے۔ اس کا اندازہ درجِ ذیل خاکہ سے لگایا جاسکتا ہے۔

اضافہ ہوا ہے اور ساتویں منصوبے میں تقریباً ۱۵ کروڑ روپے کی رقم امدادِ باہمی تحریک کے فروغ کے لیے رکھی گئی ہے۔ کمزور طبقوں کے افراد کو تعمیری کاموں، مرغی پالنے اور چمڑے کا سامان بنانے سے متعلق امدادِ باہمی تنظیموں کے لیے ترجیحی طور پر زیادہ امداد فراہم کی جائے گی۔ ●

پریم اروڑہ

سماج کے کمزور طبقوں کے لیے

سستا اناج

حصولِ آزادی کے بعد ہمارے ملک میں اناج باہر ملکوں سے منگانا پڑتا تھا اور ایک طرح سے یہاں کے عوام کا گذارہ ہی غیر ملکی اناج پر ہوتا تھا۔ اگر باہر سے غلّہ آنے میں تاخیر ہوئی، تو یہ ایک بڑی خبر بن جاتی تھی اور اخبارات کی شاہ سُرخیاں اسی خبر سے بنتی تھیں۔ حصولِ آزادی کے بعد ہمارے ملک میں جن مختلف محاذوں پر ترقی دیکھنے کو ملی، ان میں سے ایک محاذ خوراک کا بھی ہے جہاں سبز انقلاب نے حالات ہی بدل کر رکھ دیئے۔ اب ہمارے ملک میں فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کے پاس اناج کے وافر ذخیرے رہتے ہیں۔ لیکن اس عمل سے اُن غریب عوام کو خاطر خواہ فائدہ نہیں ہو سکا تھا جو ملک کے دُور دراز علاقوں اور پسماندہ علاقوں میں زندگی گذار رہے ہیں۔ قبائلی آبادی اور پسماندہ عوام کو اناج کی دستیابی ان کی حسبِ منشا اور ان کی سہولت کے مطابق نہیں ہو پا رہی تھی۔ اول تو یہ دُور دراز مقامات تھے اور پھر چند مخصوص مفادات بھی راستہ میں رکاوٹ تھے اس لیے اناج کی سپلائی کا نظام غریب عوام کے نقطۂ نظر سے نفع بخش نہیں تھا۔ اس کے نتیجے میں ملک کے چند حصوں میں اناج وافر مقدار میں ملتا تھا لیکن چند ایسے بھی علاقے تھے جہاں اناج کی کمی محسوس کی جاتی تھی۔ وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کی یہ خواہش رہی ہے کہ ان دُور دراز مقامات پر بسنے والے غریبوں کو بھی اناج کی فراہمی میں کوئی دشواری نہ ہو، اس طرح سے ان غریبوں کو تغذیہ بخش خوراک کی فراہمی اصل مقصد ٹھہرا۔ نومبر ۱۹۸۵ء میں قومی ترقیاتی کونسل کی میٹنگ ہوئی جس میں پالیسی کے طور پر یہ بیان دیا گیا کہ سرکار ملک کے غریب طبقوں کو رعائتی نرخ پر اناج فراہم کرے گی تاکہ اناج کی تقسیم کے نظام سے پسماندہ خطّوں اور غریب لوگوں کو فائدہ ہو سکے۔

مرکزی سرکار نے دسمبر ۱۹۸۵ء کے پہلے ہفتے میں قبائلی علاقوں میں اناج کی سستے داموں پر فراہمی کی ایک اسکیم شروع کی۔ ریاستوں سے ملنے والی اطلاعات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اسکیم قبائلی آبادی والے علاقوں کی مربُوط ترقی والے بلاکوں میں بے حد مقبول ہوئی ہے۔ ابتدا میں یہ اسکیم قبائلی آبادی کے بلاکوں میں ہی شروع کی گئی اور وہاں اسے بے حد پسند کیا گیا۔ ابھی اس اسکیم کی توسیع ہونی باقی ہے۔ ملک میں قبائلی آبادی کی ترقی سے متعلق ۱۸۱ پراجیکٹ ہیں جن کے تحت ۶۳۳ بلاک آتے ہیں۔

مرکزی سرکار کی طرف سے اُس اناج پر سبسڈی دی جاتی ہے جسے ریاستی سرکاریں اناج کی تقسیم کے سرکاری نظام کے تحت تقسیم کراتی ہیں۔ اس طرح بڑے علاقوں کے لیے کثیر المقاصد سوسائیٹوں کے تحت تقسیم کئے جانے والے اناج پر بھی سبسڈی ملتی ہے۔ جن علاقوں میں اناج کی تقسیم کے لیے کوئی ایجنسی نہیں ہے، وہاں نیشنل کیڈٹ کور اور علاقائی افواج کے ارکان سے یہ کام کرایا جاتا ہے۔ اس اسکیم کے تحت گندم مطلوبہ علاقوں میں ڈیڑھ روپے فی کلوگرام کے حساب سے تقسیم کرایا جا رہا ہے۔ چاول کی عام قسموں کو ایک روپیہ ۸۵ پیسے فی کلوگرام کے حساب سے تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ قبائلی علاقوں میں بسنے والے لوگ بالعموم پچھڑے ہوئے اور غریب ہوتے ہیں۔

اس تمام آبادی کو کسی قسم کے امتیاز کے بغیر اس اسکیم سے فائدہ پہونچایا جارہا ہے۔ ملک میں ۵ کروڑ افراد اس اسکیم سے فائدہ اُٹھارہے ہیں۔ اس اسکیم سے فائدہ اُٹھانے والے زیادہ تر غریب عوام ہیں جو کہ بازار سے اناج نہیں خرید سکتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اناج کی تقسیم کے سرکاری نظام سے فائدہ نہیں اُٹھارہے ہیں۔ ان کے علاوہ ناگالینڈ، میگھالیہ، ارونا چل پردیش، میزورم، لکشدیپ اور دادرا نگر حویلی کی قبائلی آبادی بھی رعائتی نرخ پر اناج پارہی ہے۔ مرکزی سرکار کے سینئر افسران مختلف ریاستوں کا دورہ کررہے ہیں اور ریاستی سرکاروں کی اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے میں مدد کررہے ہیں۔ یہ اسکیم ۱۹۸۷ تک چلے گی۔ اس کے بعد اس کی کارگزاری اور افادیت پر نظرثانی کی جائے گی۔ اس اسکیم کو باآسانی عملی جامہ پہنانے کے لیے خوراک اور شہری رسومات کی وزارت اشیا کی تقسیم کے سرکاری نظام کو مستحکم کرے گی۔ اس سلسلے میں جہاں کہیں ممکن ہوگا قومی ملکیت کے بنکوں سے مدد لی جائے گی۔ اس اسکیم کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ملک کے غریب اور پسماندہ طبقوں کو تغذیہ بخش خوراک مل سکے۔ اس اسکیم کو وضع کرنے اور اسے عملی جامہ پہنانے میں بڑی مدد اس بات سے ملی کہ فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کے پاس خوراک کے وافر ذخیرے موجود ہیں۔ یکم جولائی ۱۹۸۵ کو یہ ذخیرے سب سے زیادہ تھے یعنی اس کے پاس ۲ کروڑ ۹۰ لاکھ ٹن اناج کا ذخیرہ تھا۔ یکم دسمبر ۱۹۸۵ کو یہ گھٹ کر ۲ کروڑ ۴۰ لاکھ ٹن رہ گیا۔ اس میں سے گندم ہی کا ذخیرہ ایک لاکھ ۶۰ لاکھ ٹن کے قریب تھا۔

چنانچہ سرکار نے دس لاکھ ٹن اناج دیہات میں روزگار کے قومی پروگرام اور بے زمین افراد کے لیے روزگار کی ضمانت کے پروگرام کے لیے مخصوص کردیا۔ ان اسکیموں کے تحت دیہات میں بے روزگار افراد کو نہ صرف روزگار ملتا ہے بلکہ اس کے عوض انھیں تغذیہ بخش خوراک بھی ملتی ہے۔ چھوٹے بچوں، حاملہ عورتوں، اور دودھ پلانے والی ماؤں کو رعائتی نرخ پر اناج فراہم کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے تاکہ وہ تغذیہ بخش خوراک لے سکیں۔ یہ اسکیم یکم فروری ۱۹۸۶ سے لاگو کی گئی ہے۔

فوڈ کارپوریشن آف انڈیا نے اناج کی سپلائی کا نظام برابر بنائے رکھنے کے لیے اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کی ہے کہ اس کے گوداموں میں ہر وقت اناج موجود رہے اور اس ذخیرے میں کمی نہ آنے پائے۔ دیہی علاقوں میں گوداموں کی تعمیر کے کام کو بڑھاوا دینے کے لیے قبائلی آبادی والے علاقوں کے مربوط پراجیکٹ کے فنڈ کا دس فیصد ان کی تعمیر پر خرچ کیا جائے گا۔ اس سے اناج کے ذخیرے محفوظ رکھنے میں مدد ملے گی اور ملک کے غریب عوام کو اناج کی فراہمی یقینی بنا دی جائے گی۔ سرکار نے بے روزگار گریجویٹوں سے کہا ہے کہ وہ قبائلی آبادی والے دور دراز علاقوں میں اناج کی تقسیم کا کام سنبھالیں۔ ان کے کوآپریٹو اداروں اور عورتوں کے کوآپریٹو اداروں کے لیے سرکار کی طرف سے کھلی پیشکش ہے۔

اناج کی تقسیم کے سرکاری نظام میں کچھ خامیاں ضرور ہیں اور اس کی وجہ سے ملک کے کمزور طبقوں میں تقسیم کیا جانے والا اناج کھلے بازاروں میں فروخت کے لیے آجاتا ہے۔ حال ہی میں حیدرآباد میں دیہی ترقی کے قومی ادارے میں سپلائی منیجمنٹ کے موضوع پر منعقدہ ایک ورکشاپ میں اناج کی تقسیم کے سرکاری نظام کی متعدد خرابیوں پر توجہ دلائی گئی۔ اس میں کہا گیا کہ یہ نظام کافی اچھی طرح کام کررہا ہے تاہم اس کا دائرہ شہروں میں زیادہ ٹھیک ہے جبکہ دیہی علاقوں کی طرف توجہ کم کی جاسکی ہے۔ دیہات میں بہت سی فیئر پرائس شاپس برائے نام ہیں۔ ملک کے دور دراز علاقوں میں یہ مسئلہ اور بھی شدید نوعیت کا ہے۔ یہ بھی عام شکایت ہے کہ ان دکانوں پر ملنے والا اناج بہت گھٹیا کوالٹی کا ہے۔ جنوری ۱۹۸۶ میں خوراک اور شہری رسدات کے وزیر شری کے پی نشنڈے کی طرف سے بلائی گئی ایک پریس کانفرنس میں اخبار نویسوں نے کہا کہ ان دکانوں پر چاول کی اچھی قسمیں دستیاب نہیں ہیں۔ وزیر موصوف نے کہا کہ فوڈ کارپوریشن آف انڈیا اعلیٰ اقسام کو ریاستوں کو دے رہا ہے۔ لہذا اس صورت حال میں خرابی کی ذمہ داری اشیا کی تقسیم کے سرکاری نظام پر ہے۔ اس سے واضح ہے کہ قبائلی علاقوں میں اناج کی تقسیم کا کام کافی مشکل اور توجہ طلب ہے۔ اس کی بہت سی خامیاں دور کی جانی ہیں۔ اس کے لیے صارفین کی تحریک چلانا اور صارفین کو اس پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ عوام کے تعاون کے بغیر ایسی کوئی اسکیم کامیاب نہیں ہوسکتی۔ تقسیم کے نظام کو موثر بنانے کے لیے مختلف سطحوں پر نگرانی کام کافی اہمیت رکھتا ہے۔ خوراک میں ملاوٹ کی روک تھام سے متعلق ایکٹ اور اسی طرح کے دیگر قوانین موثر ڈھنگ سے لاگو کئے جانے چاہئیں تاکہ اناج کی تقسیم کے سرکاری نظام کی خامیوں پر قابو پایا جاسکے۔

جمہوریت کے طریق کار کے تحت عوام کو محض سیاسی حقوق کا حاصل ہونا ہی کافی نہیں۔ عوام کو بھوک سے نجات دلانا بھی ضروری ہے۔ اس کے لیے ایک طرف تو پیداوار بڑھانا ضروری ہے اور اس کے ساتھ ہی اناج کی تقسیم کے نظام کو ٹھیک ڈھنگ سے چلانا ہے تاکہ ملک کے کمزور طبقوں کا نقصان نہ ہو۔ قبائلی آبادی والے علاقوں اور سماج کے کمزور طبقوں کے لیے رعائتی نرخ پر اناج کی فراہمی کی اسکیم صحیح سمت میں ایک قدم ہے۔ اس کے ذریعے ملک سے بھوک مٹائی جاسکتی ہے۔ ●

ایم۔ یونس صدیقی

ضروری اشیا کی فراہمی کا پروگرام اور اسکی اصلاح و بہتری

منصوبہ بندی کمیشن نے

ضروری اشیاء کی فراہمی کے پروگرام اور اس کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے ہدایت کی تھی۔ نئے بیس نکاتی پروگرام کے تحت اس کام کی ضرورت سمجھی گئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ اس نظام میں پائی جانے والی خامیوں اور خرابیوں کو دور کیا جا سکے۔ چھٹے پنجسالہ منصوبے میں یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ ضروری اشیاء کی فراہمی کے پروگرام اور سرکاری دکانوں کے ذریعے اشیاء کی تقسیم کا نظام اشیاء کی قیمتوں کی روک تھام کے لیے ضروری ہے۔ اس کی وجہ سے اشیاء کی قیمتوں کا اتار چڑھاؤ کم سے کم ہوتا ہے اور ضروری اشیاء کی صارفین تک فراہمی یقینی بن جاتی ہے۔ اس نظام کے تحت سماج کے کمزور طبقوں کی ضرورتوں کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور صنعتی کارکن، طلباء وغیرہ اس سے بطور خاص فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دیہات کے غریب اور پسماندہ عوام نیز دور دراز مقامات پر بسنے والے لوگ اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ اس کے توسط سے صارفین کے تحفظ کی تحریک مضبوط ہوتی ہے۔ چنانچہ پروگراموں پر عمل درآمد کا جائزہ لینے والی تنظیم نے اشیاء کی تقسیم کے نظام میں چند خامیوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور صارفین کے استفادے کے نقطۂ نظر سے بہت سے اقدامات کی سفارش کی ہے۔ اس کی رپورٹ میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ ان سفارشات پر ٹھیک ٹھیک عمل درآمد سے صارفین کے لیے بہت سی آسانیاں پیدا ہوں گی اور اس نظام کو زیادہ موثر انداز سے چلایا جا سکے گا۔ اس تنظیم کی طرف سے کیے گئے مطالعے میں ۱۳۲۵ ایسے افراد کو لیا گیا ہے جن کے پاس راشن کارڈ تھے۔ ان میں سے ۶۶۰ افراد شہری علاقے اور ۶۶۵ افراد دیہی علاقوں کے تھے۔ اس اسکیم کے مسائل اور اس کی دشواریاں اور تفاصیل جاننے کے لیے ضلع کی سطح پر سینیر افسران اور ریاستی سطح کے ۱۸ افسران سے بات چیت کی گئی۔ یہ وہ ارکان تھے جو سول / فوڈ سپلائیز محکمے سے وابستہ تھے۔ اس مطالعے میں آسام، میگھالیہ، ناگالینڈ، سکم، اور مرکز کے زیر انتظام نو علاقوں کو چھوڑ کر ۱۸ ریاستوں کو لیا گیا۔ اسا دکانوں پر راشن کارڈ رکھنے والوں، فیئر پرائس شاپس کے مالکوں، ضلع اور ریاستی سطح کے سول سپلائیز کے محکمے کے افسروں سے بات چیت کر کے ضروری اعداد و شمار جمع کیے گئے۔ یہ اعداد و شمار تین مختلف موقعوں پر حاصل کیے گئے۔

مطالعے میں کہا گیا ہے کہ اس نظام کو چلانے والی مشینری اگرچہ تسلی بخش ہے تاہم عمل درآمد کے دوران اس کے چند پہلو ناقص رہ جاتے ہیں جہاں اصلاح و بہتری لانے کی ضرورت ہے۔ رپورٹ میں مذکور ہے کہ اس مطالعے میں گیارہ اشیاء کو شامل کیا گیا ہے لیکن ان میں سے کوئی ایک آئٹم بھی ایسا نہیں ہے جسے راشن کارڈ رکھنے والے باقاعدگی سے خریدتے ہوں۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ان اشیاء کی فراہمی کبھی ہوتی ہے اور کبھی نہیں، اور دوسرے یہ کہ ان دکانوں کے ذریعے تقسیم کی جانے والی اشیاء کی کوالٹی گھٹیا ہوتی ہے۔ اس لیے صارفین باقاعدگی سے ان اشیاء کو نہیں خریدتے۔

اس مطالعے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ

فیئر پرائس شاپس کے صرف ۱۷ فیصد یا اس سے کچھ زیادہ دکاندار ہی نو اشیاء کو فروخت کرتے ہیں۔ ۹۲ فیصد فیئر پرائس شاپس پر چینی کی تقسیم ہوتی ہے۔ ۸۰ فیصد دکانیں چاول، ۶۷ فیصد گندم، ۵۳ فیصد مٹی کا تیل، ۵۲ فیصد پام تیل، ۱۷ تا ۱۹ فیصد سوجی، میدہ، گندم کا آٹا وغیرہ فروخت کرتی ہیں۔ ان نو اشیاء کے علاوہ ۳۶ء۱۱ فیصد دکانوں پر کنٹرول نرخ کا کپڑا بھی فروخت ہوتا ہے۔ ۶۸ء۵ فیصد دکانوں پر لڑکوں کے لیے کاپیاں وغیرہ فروخت ہوتی ہیں۔

شہروں کی دکانوں کے مقابلے میں دیہات کی دکانیں زیادہ تر ایسی ہیں جو منظور شدہ سب کا سب کوٹہ نہیں لیتیں، حتیٰ کہ دیہات میں چینی بھی سب دکاندار نہیں لیتے۔ فیئر پرائس شاپس پر ملنے والی اشیاء کی کوالٹی گھٹیا ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ اشیاء کھلے بازار میں دستیاب ہوتی ہیں۔ چنانچہ ان وجوہات کی بناء پر عوام سرکاری دکانوں سے سامان نہیں خریدتے۔ گندم، چاول، سوجی، میدہ اور کاپیاں، یہ پانچ ایسے آئٹم ہیں جو ان کے منظور شدہ کوٹے سے ۴۳ تا ۵۰ فیصد کم فروخت ہوتے ہیں۔ دکانوں کو اکثر و بیشتر وقت پر سامان نہیں ملتا۔ آدھے دکانداروں کو اپنے کوٹے کو اٹھانے کے لیے ہر مہینے کئی کئی چکر کاٹنے پڑتے ہیں۔ دوسرے فیئر پرائس شاپس کو چلانے میں نفع بھی کم بتلاتے ہیں۔ تقریباً ۷۶ فیصد دکانداروں نے ایسا ہی بتایا ہے۔ راشن کارڈ ہولڈروں اور فیئر پرائس شاپس کے دکانداروں کو شکایت ہے کہ ان کو مال ناکافی مقدار میں ملتا ہے اور جو ملتا ہے اس کا معیار ناقص ہوتا ہے اور پھر وہ وزن میں بھی پورا نہیں ہوتا۔ مال کی فراہمی کا کوئی باقاعدہ نظام اور اس میں ترتیب اور پابندی نہ ہونے کی بھی شکایت عام ہے۔ صارفین کے تحفظ کے لیے شہر یا گاؤں میں کہیں بھی کوئی تحریک نہیں ہے۔

اصلاح و بہتری لانے کے اقدامات

اشیاء کی تقسیم اور سرکاری دکانوں پر ان کی فروخت کا نظام چند اصلاحات چاہتا ہے۔ اس سلسلے کی ایک سفارش یہ کہ ضروری اشیاء کی فراہمی کے پروگرام اور اشیاء کی سرکاری دکانوں کے ذریعے تقسیم کے نظام کو موثر بنانے کے لیے ایک ایسی کتاب شائع کی جائے جس میں اس محکمے کے تمام ضروری باتیں درج ہوں تاکہ ڈپارٹمنٹ آف سول سپلائیز کے حکام اور اس سے استفادہ کرنے والے دیگر لوگ اس کو ٹھیک ڈھنگ سے چلا سکیں۔ اس کے علاوہ دوہری قیمتوں کی پالیسی اپنانے کی سفارش کی گئی ہے۔ تاکہ اس اسکیم کا فائدہ ملک کے غریب عوام اٹھا سکیں۔ ایک اور سفارش یہ کہ سول اینڈ فوڈ سپلائیز ڈپارٹمنٹ کا عملہ اپنا الگ سے ہونا چاہیئے اور اسے دیگر محکموں سے ڈیپوٹیشن پر نہیں حاصل کرنا چاہیئے۔ اس رپورٹ میں ایسے اقدامات کی سفارش کی گئی ہے جن سے فیئر پرائس شاپس کو اشیاء کی ہر وقت سپلائی ہو سکے اور اور پھر وقت مقررہ پر باقاعدگی سے اناج اور دیگر سامان ملتا رہے۔ کل سپر بنیادوں پر کمپیوٹری نظام کی مدد سے اشیاء کی تقسیم کو موثر بنانے کے لیے کہا گیا ہے۔ اس رپورٹ میں مذکور ہے کہ فیئر پرائس شاپس پر گندم، چاول، کے تھیلے ۵، ۱۰، اور ۲۰ کلو کے ہونے چاہئیں تاکہ صارفین کو معیاری مال بغیر کسی ملاوٹ کے مل سکے۔ فیئر پرائس شاپ کے ذریعے فروخت کے لیے صرف ایسی ہی اشیاء کو شامل کیا جائے جو عوام کے زیادہ بڑے طبقے کے لیے کار آمد ہوں اور جن کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ آنے کے امکانات رہتے ہوں۔ دکانوں کے لیے منظور شدہ کوٹے اور اس کو حقیقی طور پر فراہم کئے جانے والے مال میں فرق کے عنصر کو کم سے کم کیا جائے اور اس کے لیے قواعد و ضوابط میں اصلاح لائی جائے۔ دکانداروں کو الاٹ کی گئی مقدار، اسکے ذریعے فروخت کی گئی مقدار وغیرہ کے ضمن میں سرکار کو تفصیلی رپورٹ وقتاً فوقتاً ملتی رہنی چاہیئے۔ تاکہ اس کی روشنی میں فی یونٹ مقدار کا تعین ہو سکے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس کا فائدہ مل سکے۔ دکاندار جہاں سے اپنا مال اٹھائیں اور جہاں سے وہ اپنا مال فروخت کریں، دونوں جگہ اس کے صحیح صحیح تول کو یقینی بنانے کی ضرورت ہے۔ دکانداروں کی مالی پوزیشن اور ان کے استحکام وغیرہ کے لیے گاہے بگاہے مطالعے ہونے چاہئیں تاکہ جن دکانداروں کے پاس کافی سرمایہ نہیں ہے یا جن کے پاس جگہ اور افرادی قوت کی کمی ہے، ان کے لائسنس منسوخ کئے جا سکیں۔ دکانداروں کو اشیا کی فروخت پر کتنا منافع ہے، اس کا مطالعہ کیا جانا ضروری ہے۔ اس بات کو یقینی بنانا ضروری ہے کہ ان دکانداروں کو ان کی سرمایہ کاری پر مناسب منافع مل سکے۔ صارفین کے تحفظ کیلئے کنزیومرز کونسل تشکیل دی جانی چاہیئے۔ یہ کونسل مقامی رہنماؤں، رضا کار اداروں، نوجوانوں کے کلبوں، گرام پنچائتوں وغیرہ کی معاونت میں دیہی اور شہری علاقوں میں قائم ہونی چاہئیں۔

رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ریاستی سرکاروں کو دیہی پنچائتوں کو یہ اختیارات دے دینے چاہئیں کہ وہ فیئر پرائس شاپس کی کارگزاری کی جانچ کر سکیں۔ چنانچہ جن ریاستوں میں گرام پنچائتوں کو اپنے حلقے کی فیئر پرائس شاپ کو جانچنے کے اختیارات حاصل نہیں ہیں، وہاں اس طرح کے اختیارات کی تفویض پر زور دیا گیا ہے۔

●

امتیاز خالق

نظامِ تعلیم ایک تجزیہ

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ کسبِ علم ہماری بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ہے اور جس کا مقصدِ حصول یہ ہے کہ اس کی سوز و تپش سے انسانی ضمیر روشن ہوجائیں، فکر و نظر میں گیرائی و گہرائی پیدا ہوجائے۔ جواہرِ خفتہ درخشاں و تابندہ ہوجائیں۔ نہاں صفات و کمالات عیاں ہوجائیں۔ فطری صلاحیتیں پوری طرح اُجاگر ہوجائیں۔ حقائق کو بے تامل ماننے لینے کی صفت پیدا ہوجائے اور اطوار و اخلاق میں حسن و شائستگی پیدا ہوجائے۔ فہم و تدبر اور درک و بصیرت کی روشنی سے قلب منور ہوجائے۔ تعلیم صحیح معنوں میں اپنے اندر بے پناہ وسعت و جامعیت رکھتی ہے مگر افسوس صد افسوس کہ آج ہم نے تعلیم کو محض کسبِ معاش کی چہار دیواری میں محصور کر رکھا ہے جو کہ از خود جہالت ہے۔ فی زمانہ تعلیم کی اہمیت و افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہے ہاں یہ ممکن ہے کہ اس کے اغراض و مقاصد میں جزوی اختلاف کی گنجائش نکل آئے۔

ہمارے مروجہ نظامِ تعلیم کو جن خطوط پر استوار کیا گیا ہے وہ کچھ اس انداز کا ہے کہ اس کے ذریعے قومی سطح پر بے شمار سماجی، سیاسی و معاشی تبدیلیاں لائی جاسکتی ہیں چنانچہ ہمارا طریقِ علم جس قدر جامع و موثر ہوگا اس کے اثرات بھی اسی قدر صحیح و صالح ہوں گے اور اُس سے مثبت نتائج مرتب ہوں گے۔

آزادی کے بعد سے خصوصاً گزشتہ دو دہوں میں سنجیدگی سے غور و فکر کیا گیا ہے کہ موجودہ تعلیمی نظام میں کس طرح خوشگوار تبدیلیاں لائی جاسکتی ہیں۔ اور اُس میں غایت درجہ ترمیم و اصلاح کے ذریعے کیوں کر اُس کی تقصیرات و مضرات کا تدارک کیا جاسکتا ہے؟ چنانچہ دریں اثناء سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ ثانوی درجہ کے تعلیمی مقاصد و عوامل پر از سرِ نو غور و فکر کیا جائے اور اُسے اس طرز پر مرتب کیا جائے کہ جس سے اوّل تو ایک جمہوری ملک کے لیے اعلیٰ درجہ کے شہری تیار ہوسکیں دوم اپنے مخصوص شعبۂ علم میں کہ جس میں وہ زیرِ تعلیم ہیں، ان کی صفات و صلاحیتیں اس طرح نکھر جائیں کہ عملی میدان میں وہ شخص پوری طرح کامیاب و کامران ثابت ہو۔ سوم، شخصی اعتبار سے ان میں پوری طرح کاملیت و جامعیت پیدا ہوجائے۔ بعد ازاں کوٹھاری کمیشن نے اس ضمن میں کچھ وسیع تر خاکہ پیش کیا تھا جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ تعلیمی خاکہ کچھ اس انداز پر مرتب کیا جائے کہ جس سے طلباء کی قوتِ کار اور فطری صلاحیتوں کے نکھرنے کے علاوہ اُن میں باہم اُخوت و قومی ہم آہنگی بھی پیدا ہوسکے۔ گویا اس کمیشن کا غالب عنصر "قومی یکجہتی" کا فروغ تھا۔

مذکورہ تمام تبدیلیوں اور اصلاحی کوششوں کے باوجود عصرِ حاضر کے تعلیمی نظام کی خامیوں اور خرابیوں سے چشم پوشی ممکن نہیں اور آج ہمارے تعلیمی اداروں میں تعلیم و تدریس کے نام پر کیا ہو رہا ہے یہ کوئی مخفی چیز نہیں رہی بلکہ اس پر بڑے شد و مد کے ساتھ تنقیدیں بھی کی جارہی ہیں۔ طلباء میں بے راہ روی کا بڑھتا ہوا رجحان، اساتذہ کی پست روی و اخلاق سوزی، سرپرستوں کی غفلت و عدم توجہی۔ عوام کی اس تعلیمی نظام سے بے اعتمادی اور مستزاد تعلیم

یافتہ نوجوانوں میں بے روزگاری کی بڑھتی ہوئی شرح وغیرہ، بے شمار حقائق ہیں جن کی تردید ممکن نہیں۔

وقتاً فوقتاً نظامِ تعلیم میں جو اصلاحات و ترمیمات ہوتی رہی ہیں اُس سے دائرہ تعلیم میں وسعت ضرور پیدا ہوئی مگر مطلوبہ ثمرات حاصل نہ ہو سکے گویا مقدار تو حاصل ہوئی مگر معیار مفقود! محض سطحی نتائج برآمد ہوئے اور جس کے لازمی نتیجہ میں تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بے شعوری، کج فہمی، مصلحت نااندیشی، سہل پسندی، آرام طلبی، غیر مستقل مزاجی، خود فریبی، انتشار ذہنی اور تخریب پسندی وغیرہ وغیرہ بے شمار مخربات پیدا ہو گئے اور ان سے اسی صورت میں مفر ممکن ہے کہ موجودہ نظامِ تعلیم میں بنیادی اصلاحات کی جائیں۔

اگرچہ ۱۹۶۸ کی تعلیمی پالیسی میں ان تمام شواہد و حقائق کو مدِّ نظر رکھ کر اس میں بہت سی ضروری و غیر ضروری تبدیلیاں بھی لائی گئی تھیں مثلاً اس پالیسی کے چند روشن پہلو یہ تھے کہ تعلیم کو حقائقِ زندگی سے قریب تر کیا جائے۔ اعلیٰ تعلیم کے مواقع سب کے لیے یکساں طور پر فراہم کئے جائیں۔ اعلیٰ معیارِ تعلیم کے حصول کی سعی کی جائے۔ سائنس و ٹکنالوجی اور فنی تعلیم پر خصوصیت سے توجہ دی جائے اور معاشرتی و اخلاقی اقدار کی توثیق کی جائے۔

یہ بلند و بانگ مقاصد ظاہر میں بڑے خوش آئند معلوم ہوتے ہیں مگر جب ہم مروجہ تعلیمی نظام کے طویل تجربات و مشاہدات پر نگاہ ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ مقاصد میں سے کسی ایک میں بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ جن پر تحریری دستاویزات بھی شاہد ہیں۔

آج لوگ کھلم کھلا ہماری تعلیمی پالیسیوں کو ہدفِ ملامت بنا رہے ہیں۔ اور ان مقاصد کے حصول کے لیے ہم نے جو غلط روش اختیار کی ہے اور جن خامیوں کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا ہے وہ تمام باتیں تنقید و تمسخر کا موضوع بنی ہوئی ہیں۔ اس کوتاہ اندیشی کی بھی علی الاعلان نشاندہی کی جاتی ہے کہ ہمارا تعلیمی بجٹ کس طرح اپنے بنیادی تقاضوں کے تکفّل کے لیے قطعی ناکافی ہوا کرتا ہے۔ ابتدائی درجوں کی قابلِ رحم تعلیمی حالت پر بھی تبصرہ کیا جاتا ہے۔ تعلیمِ بالغان و تعلیمِ نسواں کے تعلق سے بھی ہماری کوتاہیوں اور کمزوریوں کو اُچھالا جاتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ آج پچاس فیصد سے زائد لڑکیاں اسکول کا مُنہ بھی دیکھنے نہیں پاتیں۔

ہمارے پُرانے تعلیمی نظام کی خرابیوں کو اگر شمار کیا جائے تو ہمیں بے شمار چیزیں نظر آتی ہیں۔ ابتدائی اور ثانوی درجات سے لے کر کُلیات و جامعات تک کا تعلیمی و اخلاقی معیار قابلِ رحم حالت تک گر چکا ہے اور اعلیٰ تعلیمی اداروں و ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹوں کی حالت اور بھی خراب ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ صوبوں کا تعلیمی بجٹ اس کے لیے ناکافی ثابت ہو رہا ہے۔ پھر ہمارے تعلیمی وسائل بھی محدود ہیں۔ نیز تعلیمی منصوبوں کو روبعمل لانے میں بے شمار رکاوٹیں بھی حائل ہیں۔ موجودہ نظامِ تعلیم کا ایک تاریک پہلو امتحانات کا موجودہ طریقہ بھی ہے کہ جو امتحانات کے عنوان پر "امتحان" کے علاوہ سب ہی کچھ ہے۔

موجودہ تعلیمی نظام کو قومی و عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرکے نئی شاہراہوں پر گامزن کرنے کے تعلق سے وزیر اعظم ہند جناب راجیو گاندھی نے جنوری ۱۹۸۵ میں جو اعلان کیا تھا اور بعد ازاں ۲۰ راگست ۱۹۸۵ کو پارلیمنٹ نے Challenge of Education - A Policy Perspective کے عنوان سے ۱۰۰ صفحات پر مشتمل جو دستاویز پیش کی گئی اُس کا مقصد عوام میں اس موضوع پر تبادلۂ خیال و مباحثہ کی تحریک ہے تاکہ مختلف خیالات و نظریات کی روشنی میں ہر ممکنہ زاویے سے پیش کردہ تجاویز پر روشنی ڈالی جا سکے اور مقاصدِ عالیہ کے پیشِ نظر اسے قطعی مکمل و جامع تر بنایا جا سکے اور اس کی تعمیل سے قبل یہ تمام متوقع خامیوں اور خرابیوں سے پاک ہو جائے۔

مذکورہ دستاویز میں بے شمار نئے اور پُرانے مباحث کو چھیڑا گیا ہے۔ بہت سے اہم اور ضروری پہلوؤں پر صاف و شستہ انداز میں نکات پیش کئے گئے ہیں تاہم کہیں کہیں تشنگی و تناقص کا بھی احساس ہوتا ہے۔ باعتبار مجموعی اس کے مندرجات اس قابل ہیں کہ ان پر اخلاص و دیانت داری کے ساتھ غور و فکر کیا جائے اور نظامِ تعلیم کی نئی ترتیب کے سلسلہ میں پیش کردہ مباحث و مسائل پر سر جوڑ کر بیٹھا جائے اور ملک کے دانشور اور باشعور طبقہ کو دعوتِ فکر دی جائے۔

یوں تو ۱۸۵۴ سے لے کر اب تک تقریباً تمام ہی تعلیمی کمیٹیوں اور کمیشنوں نے طریقِ تعلیم و نصابِ تعلیم میں خود روزگاری کی افادیت و ضرورت پر بہت زور دیا ہے مگر تجویز کردہ اس نئے تعلیمی نظام میں خود روزگاری کو تعلیم کے اوّلین مقاصد میں رکھا ہے اور ووکیشنلائزیشن کو مطمحِ نظر بنا کر نظامِ تعلیم کے پورے خط و خال کو از سرِ نو مرتب کیا گیا ہے۔ پیش کردہ دستاویز میں اس کے علاوہ چند باتیں جو نہایت اہم ہیں وہ یہ ہیں کہ نظامِ تعلیم کو تمام جڑ بنیاد سے ہی از سرِ نو ترتیب

دیا جائے گا کیوں کہ فنقط جزوی و استثنائی تبدیلیاں کارآمد نہ ہوں گی۔ ابتدائی درجات سے لے کر اعلیٰ مدارج تک تمام تعلیمی ادارے یونیورسٹی کے زیر عمل آجائیں گے۔ امتحانات نئے طریقے پر منعقد کئے جائیں گے۔ تعلیم بالغان کے دائرہ کو حتی المقدور وسیع کرنے کی سعی کی جائے گی۔ ووکیشنلائزیشن کے تحت محض صنعتی اداروں کی ضرورتوں کو مدنظر نہیں رکھا جائے گا بلکہ اسے فن زراعت سے بھی مربوط کیا جائے گا اور مختلف دیہی اور ترقیاتی منصوبوں سے بھی منسلک رکھا جائے گا، تاکہ اس سے فارغ التحصیل میں خود روزگاری کی صلاحیت و استطاعت بدرجہ اتم پیدا ہو سکے۔ اس امر کی بھی وکالت اس دستاویز میں کی گئی ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے مواقع صرف باصلاحیت و باشعور طلباء کے لیے ہی محدود ہوں گے اگر واقعی ایسا ہوا تو یہ بڑی اعلیٰ و ارفع بات ہوگی کہ جس سے ڈونیشن کے ذریعے ہونے والے داخلے خود بخود بند ہو جائیں گے اور ہر ایک کے لیے یکساں طور پر جدوجہد و مسابقت کا میدان کھلا ہوگا اور تعلیم کے تسلسل کو بھی لازمی قرار دیا جائے گا اور سب سے اہم چیز جس پر خصوصی طور سے روشنی ڈالی گئی ہے وہ یہ کہ سماجی و اخلاق قدروں پر بہت زیادہ توجہ دی جائے گی۔

لیکن اس دستاویز میں اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ ان ڈگریوں سے ملازمتوں کے حصول کی کوششیں کس طرح ختم ہو جائیں گی اور ان ڈگریوں کی کامیابی کے لیے ہمارے پاس کونسی تمثیل یا کسوٹی موجود ہے کہ جس کی بنیاد پر موجودہ ڈگریوں کے خاکے مکمل طور پر تبدیل کر رہے ہیں۔ ان تمام تغیرات و تبدیلیوں کے لیے ۱۹۹۰ء میں جو بجٹ درکار ہوگا وہ ۸۱ - ۱۹۸۰ کے بجٹ سے چار گنا زیادہ ہوگا اور ملک کو ۱۹۹۰ میں مزید ۲۲ لاکھ اساتذہ کی ضرورت پیش آئے گی۔ جبکہ ۱۹۸۱ میں اساتذہ کی کل تعداد ۲۷ لاکھ تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ۱۹۹۰ میں ہمیں جو معتدبہ بجٹ درکار ہے کیا اسکے ذرائع ہمارے پاس موجود ہیں؟ اور کیا اساتذہ کی مطلوبہ تعداد اتنی آسانی سے دستیاب ہو جائے گی؟ اور کیا صحیح معنوں میں اس طریق تعلیم کے ذریعے خود روزگاری کی بھرپور صلاحیتیں اجاگر ہو جائیں گی کہ جو اس کا اصل مقصود ہے! ۱۹۹۰ء تک کے نشانے کے مطابق ابتدائی تعلیم اور تعلیم بالغان کی شرح بین الاقوامی سطح تک پہونچ سکے گی؟ اور کیا یہ نیا تعلیمی نظام ایک ایسے ملک و قوم کے تعلیمی، سماجی، معاشی و اخلاقی اقدار کا ضامن ہو سکے گا کہ جو مختلف ادیان و لسان کی حامل، مختلف تہذیب و ادب سے وابستہ اور مختلف رسم و رواج کی پروردہ ہیں! اور کیا واقعی اس سے موجودہ طریق امتحان کی کلی طور پر اصلاح ہو سکے گی؟ اور سب سے اہم یہ کہ ایک متمدن جمہوری ملک کے لیے حسن اخلاق و اوصاف سے مزین افراد مطلوب ہیں کیا یہ نظام نو اس بات کا چیلنج قبول کرتا ہے کہ یہ محض صنعتی بازار کی ضرورتوں اور کسب معاش کی سہولتوں تک ہی محدود نہ ہوگا بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد سے کہیں زیادہ ملک کو شائستہ و مہذب باشندے فراہم کرے گا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ مذکورہ تمام مباحث پر نئے زاویوں سے روشنی ڈالی جائے اور یہ صرف ماہرین فن تعلیم و ارباب درس و تدریس کی ہی ذمہ داری نہیں بلکہ ملک کے ہر ذی فہم و شعور یافتہ شخص پر لازم ہے کہ وہ دیانت و متانت کے ساتھ ان نہایت اہم مسائل پر غور و فکر کرے۔ ان کے مثبت پہلوؤں پر نگاہ ڈالیں، نیز دانشور منفی نتائج پر بھی غور کریں اور ان کی خامیوں اور منزلتوں کی بھی نشاندہی کریں۔ اس نئے تعلیمی نظام کی اصلاح دراصل آنے والی نسلوں کی اصلاح ہے اور اس کے برعکس اس میں جو خامیاں اور خرابیاں راہ پا جائیں گی وہ یقیناً ہمارے مستقبل کی خامیاں اور خرابیاں ثابت ہوں گی۔

تعلیم کے تعلق سے عام طور پر یہ نظریہ ہمارے ہاں پایا جاتا ہے کہ تعلیم کا مقصد فہرست موجودات سے آگہی یا سرکاری دفتروں اور صنعتی بازاروں کی ضرورت کا دوسرا نام ہے حالانکہ یہ درست نہیں بلکہ اتنے پر ہی اکتفا کر لینا اس کے مقصد عظیم کو محدود کر لینا ہے۔ دنیا بھر کے مذاہب و مکاتیب، نظریات و اعتقادات اور ادب و فلسفہ کی روشنی میں تعلیم کا مقصد مجملاً ایک جملہ میں یہ ہے کہ اس سے انسان میں "خود آگہی" پیدا ہو جائے۔ اب اس عظیم مقصد کے پیش نظر تعلیمی نظام کا نیا ڈھانچہ کس حد تک موثر ثابت ہو سکتا ہے۔ اس مسئلہ پر سر جوڑ کر بیٹھنے کی ضرورت ہے۔ ●

بقیہ، آلودگی۔ ایک اہم مسئلہ

کر کے کوئی کامیاب حل اخذ کرنے کے لیے قومی و بین الاقوامی حل معرض وجود میں آچکے ہیں۔ اس سلسلے میں پیرس میں ایک کانفرنس ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۲ میں اسٹاک ہوم میں ایک دوسری انسانی ماحولیاتی کانفرنس بھی منعقد ہوئی۔ اگر عملی سرگرمیاں تیز تر نہ کی گئیں تو منصوبے محض فائلوں میں دب کر رہ جائیں گے۔

اندھا دھند بڑھتی ہوئی انسانی آبادی کی رفتار کم کی جائے۔ زیادہ سے زیادہ پیڑ پودے لگائے جائیں۔ نیوکلیائی اسلحہ پر پابندی لگائی جائے۔ لاؤڈ اسپیکر اور ہارن کا استعمال کم کیا جائے اور جنگلوں کی اندھا دھند کٹائی پر سخت پابندی لگائی جائے تو آلودگی کے چیلنج کا مقابلہ کافی حد تک کیا جا سکتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آلودگی تنہا ایک انسان یا کسی ایک ملک کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک عالمی مسئلہ ہے اس لیے آلودگی سے نجات حاصل کرنے کے لیے کرۂ ارض پر بسنے والے تمام انسانوں کو مل جل کر کوشش کرنی چاہیے۔ ●

صاحب علی خاں

آلودگی

ایک اہم مسئلہ

ماحول کی آلودگی آج کے ترقی یافتہ انسان کے لیے ایک زبردست چیلنج بنی ہوئی ہے۔ کارخانوں، بجلی گھروں اور ریفائنریوں سے دھواں اگلتی ہوئی فلک بوس چمنیاں ہوں یا سُپر سونک جیٹ طیارے پٹرول اور ڈیزل سے چلتی ہوئی ریل گاڑیاں ہوں یا موٹریں، سبھی ہوا کو آلودہ کرنے میں برابر کی شریک ہیں۔ صرف ہوا ہی نہیں، پانی اور زمین بھی آلودگی سے پُر ہیں۔ بلا شبہ ہوا سانس لینے کے قابل نہیں رہ گئی ہے، پانی گندہ اور زہریلا ہوتا جا رہا ہے۔ اس طرح پورا ماحول آلودگی کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ تبھی تو آج کا انسان خطرناک اور مہلک امراض جیسے کینسر، دل کی بیماری، بلڈ پریشر، اندھاپن، آنتوں کا السر، ٹی بی اور خون کی کمی وغیرہ کا شکار ہو رہا ہے۔ اور اس میں روز بروز اضافہ ہونے کی وجہ سے آلودگی کا مسئلہ ایک زبردست سوالیہ نشان بنتا جا رہا ہے۔ ہمارا ماحول تین بڑے وسائل ہوا، پانی اور مٹی پر مشتمل ہے جو قدرت کی طرف سے عطا کردہ ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ لیکن آبادی میں اندھا دھند اضافے کے علاوہ مختلف صنعتوں کے پھیلاؤ کی وجہ سے دورِ جدید میں ماحول عجیب و غریب آلودگیوں کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔

ہوائی آلودگی

ہوا، جانداروں اور پیڑ پودوں کے لیے یکساں اہمیت رکھتی ہے۔ بغیر اس کے زندگی ممکن ہی نہیں۔ ماہرینِ طب کا کہنا ہے کہ ہم بغیر ہوا کے دو منٹ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ یُوں تو فضائی آلودگی خلقت کے سبھی طبقات کو بُری طرح متاثر کرتی ہے مگر اس نے انسانی زندگی کو تو براہِ راست قربان گاہ پر لا کھڑا کر دیا ہے۔

لندن میں ۱۹۵۲ کے دوران صرف تین چار دنوں میں اسماگ (SNOW+FOG) کی وجہ سے چار ہزار لوگوں کی موت، جاپان میں اتائی اور مینی ماتا بیماریوں کا تلخ تجربہ، ۱۹۷۲ء میں عراق میں پارے سے تقریباً پانچ سو افراد کی موت، فضائی سڑاند سے بھرپور بمبئی میں چمبور کا صنعتی علاقہ، متھرا ریفائنری سے تاج محل کے سنگ مرمری جسم پر پڑتی شکنیں، اندر پرستھ، پاور اسٹیشن سے دہلی کے آس پاس کی مہلک فضا، نیز جنگلات کی اندھا دھند کٹائی وغیرہ کی وجہ سے ۱۹۷۸ء میں آئے بھیانک سیلاب سے ہمالیہ کے علاقہ میں دو ہزار لوگوں سے زائد افراد کی موت اور گوالیار ریئن سِلک کمپنی کی وجہ سے آس پاس کی برباد شدہ آب و ہوا وغیرہ اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ فضا ایک مدت سے آلودگی کا شکار ہوتی چلی آ رہی ہے۔

ہوا کو گندہ کرنے میں انسان بڑی حد تک خود ذمہ دار ہے۔ انسان اپنی ضروریات کے لیے ایک طرف جنگلات کاٹ رہا ہے اور دوسری طرف موٹروں، کارخانوں اور ریفائنریوں میں مختلف قسم کے ایندھن جلا کر زہریلی گیسوں کا انبار لگاتا جا رہا ہے۔ یہ زہریلی گیسیں کاربن مونو آکسائیڈ، کاربن ڈائی آکسائیڈ، سلفر ڈائی آکسائیڈ، نائٹروجن آکسائیڈ اور ہائیڈروجن فلورائیڈ وغیرہ ہیں جو

ماحول کو آلودہ اور زہریلا کرتی رہتی ہیں۔

کاربن مونو آکسائیڈ ایک قسم کی آلودہ گیس ہوتی ہے۔ جو صحت کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔ یہ گیس خون کی ہیموگلوبین سے مل کر بہت جلد ہی کاربن ہیمو گلوبین بناتی ہے۔ جس سے خون میں آکسیجن کا نقصان ہو جاتا ہے اور جس کے نتیجے میں خون اور پھیپھڑوں کا کینسر اور استھما جیسی مہلک بیماریاں ہو جاتی ہیں۔ بمبئی میں چیمبور کا علاقہ جو کبھی سرسبز و شاداب ماحول کے لیے مشہور مقام تھا آج ایک گیس کی دنیا میں تبدیل ہو چکا ہے۔ کیوں کہ یہاں تیل اور کیمیاوی کھاد کے کارخانے ماحول کو آلودہ کرتے رہتے ہیں۔ جس سے یہاں کے لوگ عموماً استھما اور برونکائٹس جیسے امراض کے شکار ہوتے ہیں۔

کاربن ڈائی آکسائیڈ کی زیادتی فضا میں بیحد نقصان دہ ہے۔ یہ دو طرح سے اثرانداز ہوتی ہے اولاً تو یہ زمین کی حرارت کو فضا میں نہیں پھیلانے دیتی ہے۔ جس سے موسم کی بروقت تبدیلی ہو جایا کرتی ہے اور دوسری طرف اسی کاربن ڈائی آکسائیڈ کی وجہ سے سورج کی شعاعیں زمین پر نہیں پھیلنے پاتیں۔ جس سے توانائی ضائع ہو جایا کرتی ہے۔ گذشتہ ایک صدی میں تقریباً ۱۵ فیصد سے زیادہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار میں اضافہ ہوا ہے۔ سائنسدانوں کا اندازہ ہے کہ اگلی صدی کے آخر تک فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار دوگنی ہو جائیگی، اور دنیا کا درجۂ حرارت 5% F اور قطبوں پر 15% F تک بڑھ جائے گا۔ جس سے سرسبز و شاداب علاقے ریگستان میں تبدیل ہو سکتے ہیں اور قطب جنوبی کی برف کے مکمل پگھلنے سے پوری دنیا سیلاب میں غرق ہو سکتی ہے۔

سلفر ڈائی آکسائیڈ پودوں کے خلیات کو مارتی ہے اور پتیوں کو سکھاتی ہے۔ انسانی جسم کے لیے مضر ہوتی ہے۔ متھرا ریفائنری سے خارج ہونے والی یہی سلفر ڈائی آکسائیڈ گیس حسین تاج محل کے حسن کو خراب کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ ایتھنس کے آثار قدیمہ جو تقریباً دو ہزار سال تک محفوظ تھے موجودہ صدی کے دوسرے دہے سے تیزی کے ساتھ خراب ہو رہے ہیں۔ کشمیر کی خوبصورت ڈل جھیل بھی آلودگی کے باعث سکڑ رہی ہے اور زہریلے اجزا کا تناسب بڑھ رہا ہے۔

نائٹروجن آکسائیڈ اور ہائیڈروجن فلورائیڈ یہ دونوں گیسیں انتہائی خطرناک اور آلودگی سے پر ہیں۔ یہ انسانی جسم بالخصوص آنکھوں اور پھیپھڑوں کے لیے مہلک ہوتی ہیں۔ ان گیسوں کے علاوہ اور بھی بہت سی زہریلی گیسیں فضا میں تحلیل ہو کر متعدد قسم کے نقصانات پہونچاتی ہیں۔

ہوائی آلودگی انسان کی بیماری کے علاوہ آہستہ آہستہ موت کا سبب بنتی جا رہی ہے۔ سائنس دانوں کے نزدیک فضائی آلودگی سے پیدا ہونے والی بیماریوں میں کینسر، الرجی، دمہ، ٹی بی۔ آنکھوں کی روشنی میں کمی، پھیپھڑے پر گہرے مضر اثرات، آنتوں کا السر، خون کا زہریلا ہونا، جلدی امراض، ذہنی کمزوری اور بچوں کے پیدا ہوتے ہی موت وغیرہ عام ہیں۔ جہاں ایک طرف فضائی آلودگی انسان کو موت کے دہانے پر لا کھڑا کر رہی ہے وہاں دوسری طرف اپنے مضر اثرات کی وجہ سے کئی طرح کی دھاتوں، پودوں اور دیگر اشیا کو بھی نقصان پہونچا رہی ہے۔

پانی کی آلودگی

ہوا کے بعد پانی زندگی کی دوسری اہم ضرورت ہے۔ کارخانوں اور شہروں کی گندگی اور فضلے پانی میں بہانے کی وجہ سے سمندروں اور دریاؤں کا پانی بے انتہا آلودہ اور زہریلا ہوتا جا رہا ہے جس سے انسانی زندگی کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ پینے کے پانی میں مہلک جراثیم موجود ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہیضہ، ٹائیفائیڈ اور پیچش وغیرہ جیسی بیماریاں وبائی صورت میں پھیلتی رہتی ہیں۔ بمبئی کا گندہ پانی بحیرہ عرب میں برابر گرتا رہتا ہے۔ شائد اسی وجہ سے فروری ۱۹۷۲ء میں ساحل کے نزدیک پانچ کلومیٹر کے رقبے میں لاتعداد مردہ مچھلیاں پائی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ سین ڈیاگو میں تقریباً چالیس لاکھ مچھلیاں سمندر میں گندے اور زہریلے پانی کی وجہ سے مر گئی تھیں۔

آبی آلودگی کے لیے سب سے زیادہ ذمہ دار انسان ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کی زیادتی نے غذائی پیداوار بڑھانے کی مہم تیز کر دی ہے۔ اجناس پیدا کرنے کے لیے نئی نئی کیمیاوی کھادوں اور کیڑا مار دواؤں کا رواج ہو چکا ہے۔ جو پانی کے ساتھ دریاؤں میں بہہ جاتی ہیں، اور پانی کو آلودہ کر دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ گندے نالوں کی غلاظت اور صنعتی فضلے سمندروں میں نیوکلیائی تجربے، تجربہ گاہوں میں تابکاری مادوں کا استعمال، حرارتی بجلی گھروں اور صنعتی مراکز سے گرم پانی کی نکاسی آبی آلودگی کے خاص اسباب ہیں۔

گنگا کے پوتر جل (Holy Water) میں کانپور، بنارس اور الہ آباد کی شہری گندگی اور چمڑے وغیرہ کارخانوں کے فضلات اور سالانہ ۲۰ سے ۲۵ لاکھ ٹن راکھ کے ساتھ آدھ جلے مردوں کا گوشت مل کر اسے آلودہ کر دیتے ہیں۔ گنگا کی مزید آلودگی کا سبب جمنا کا پانی بھی ہے۔ جو گنگا میں ملتا ہے جس میں دہلی کے تقریباً ۸۰ کارخانوں، متھرا ریفائنری اور آگرہ کے چمڑہ

کارخانوں کے فضلات ملتے رہتے ہیں۔ ایک اندازہ کے مطابق جمنا میں روزانہ تین لاکھ مکعب میٹر انسانی فضلہ اور بیس ہزار مکعب میٹر زہریلا صنعتی فضلہ بہتا ہے۔ اسی طرح بہار کا دریائے دامودر اسٹیل پلانٹ اور کوئلے کی کانوں کے فضلہ سے آلودہ ہے۔ اس کے علاوہ نیوکلیائی ری ایکٹروں میں استعمال شدہ پانی، جھیلوں، ندیوں اور سمندروں میں گر کر آبی زندگی کو تباہ کر دیتا ہے۔

ماہرینِ طب کا تجربہ ہے کہ پانی کی آلودگی سے آنتوں کی بیماریاں، پیچش، پیلیا، جگر کا درد، میعادی بخار، یرقان، پولیو، ہیضہ اور دماغی امراض پیدا ہوتے ہیں۔ سچ مچ تیسری دنیا میں تباہی مچا دینے والی تمام تر بیماریوں کی وجہ آبی آلودگی ہی ہے۔ عالمی صحت تنظیم کی رپورٹ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ۷۵ سے ۸۰ فیصد افراد کو پینے کا صاف پانی میسر نہیں ہے اور یہاں ہر سال پانچ کروڑ افراد پانی کی آلودگی سے متاثر ہوتے ہیں، اور لگ بھگ بیس لاکھ لوگ ہر سال آبی آلودگی کی وجہ سے موت کے شکار ہو رہے ہیں۔

زمین پر آلودگی

بڑھتی ہوئی آبادی کو زندہ رہنے کے لیے ہوا، پانی اور غذا کی ازحد ضرورت ہے۔ اور غذائی خوراک کو پورا کرنے کے لیے آج کا انسان کیمیاوی کھاد اور کیڑے مار دواؤں کے استعمال پر مجبور ہو گیا ہے۔ جبکہ اس کے استعمال سے نہ صرف مٹی آلودہ ہو رہی ہے بلکہ اس کی زرخیز صلاحیت بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ کارخانوں کے فضلات بھی مٹی کی آلودگی میں شریک ہیں۔ پلاسٹک مٹی میں روز بروز آمیزش بڑھتی جا رہی ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق مہاراشٹرا میں پیدا ہونے والے آلوؤں میں کم و بیش ۲ر۴ حصہ ڈی۔ڈی۔ٹی اور ۲ سے ۷ حصے ڈائی ایلڈرن کے اجزاء پائے گئے ہیں۔ ڈی۔ڈی۔ٹی بآسانی گھل جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے جانوروں کے دودھ میں شامل ہو جاتی ہے اور پھر دودھ کے ذریعے انسانی جسم میں سرایت کر کے نقصان پہونچاتا ہے۔

شوروغل فضائی آلودگی کا ایک ناقابلِ فراموش جزو ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اس کا احساس نہیں کرتے جبکہ یہ آہستہ آہستہ انسانی دماغ پر بھرپور وار کرتا رہتا ہے۔ عموماً شور ہم اس آواز کو کہتے ہیں جو سننے والے کو گراں گزرتی ہے۔ لاؤڈ اسپیکر کی فلک شگاف آوازیں، مشینوں کی گھڑگھڑاہٹ، گاڑیوں کے بجتے ہوئے ہارن کا شور، ٹائروں کے پھٹنے کی آوازیں اور ہوائی جہاز کی گرج صرف زندگی کا سکون ہی نہیں چھین لیتی ہیں بلکہ دل و دماغ، معدے اور آنکھوں کی باریک نسوں پر مضر اثرات بھی ڈالتی ہیں۔ اس کے علاوہ شوروغل کان کے پردوں کو نقصان پہنچانے کے ساتھ ہی ساتھ مزاج میں جھنجھلاہٹ، ذہنی تناؤ اور کام کرنے کی قوت میں کمی، سردرد، تکان، بلڈ پریشر میں زیادتی اور دل کا دورہ جیسی مہلک بیماریوں کے ذمہ دار بھی ہوتے ہیں۔ ماہرینِ سائنس کا کہنا ہے کہ انسان ۳۰۔۴۰ ڈیسی بل آواز آسانی سے بغیر کسی قباحت کے برداشت کر سکتا ہے اور ۱۵۰ ڈیسی بل آواز انسان کو بہرہ کر دیتی ہے اور ۱۸۰ ڈیسی بل آواز انسان کو موت کے منہ میں دھکیل دیتی ہے۔ ہمارے ملک کے بڑے شہر دہلی، کلکتہ اور بمبئی دنیا کے سب سے زیادہ شوروغل کے شہروں میں سے ہیں۔ دہلی میں کچھ گنجان علاقوں میں دن کے وقت شور کی سطح ۰۰ ڈیسی بل تک ریکارڈ کی گئی ہے۔

ان سب کے علاوہ موجودہ دور کے نیوکلیائی دھماکوں نے تو زندگی کو قربان گاہ پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ ایٹمی دھماکوں اور تابکاری مادوں سے نکلنے والی شعاعیں خصوصاً گاما شعاعیں بے انتہا خطرناک ہوتی ہیں۔ جو پورے ماحول کو آلودہ کر دیتی ہیں۔ ہیروشیما اور ناگاساکی ہی کی طرح، اورا، جہاں فرانس نے نیوکلیائی تجربہ کیا ہے، میں پیدا ہونے والے افراد دماغی کینسر کا شکار ہو رہے ہیں۔ انھیں دھماکوں میں سے ۵ فیصد ریڈیو ایکٹیو اسٹرانشیم ۹۰ نکلتا ہے جو پودوں سے جانوروں میں اور اس کے بعد انسانی جسم میں سرایت کر کے ہڈیوں کا کینسر پیدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ نیوکلیائی ری ایکٹروں میں استعمال شدہ پانی ندیوں اور سمندروں میں گر کر آبی زندگی کو تباہ کر دیتا ہے۔

بلاشبہ آلودگی کے باعث انسانی زندگی تباہ کن ہو گئی ہے اور پیڑ پودے اور حیوانات ختم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ہرے بھرے باغات مٹ رہے ہیں۔ پانی کے ذخیرے آلودہ اور زہریلے اجزاء سے پُر ہو رہے ہیں۔ نیلگوں آسمان زہریلی گیسوں سے بھرا ہوا ہے۔ اگر آلودگی مسلسل بڑھتی رہی اور حیوانات، پیڑ پودے ختم ہوتے رہے تو انسان کا سانس لینا مشکل ہو جائے گا۔

فضا کے تحفظ سے میرا مطلب ترقیاتی منصوبوں پر ضرب کاری سے ہرگز نہیں ہے۔ ہمیں تو "ترقی بغیر تنزلی" کا قائل ہونا چاہیے۔ صنعتوں میں ایسی تکنیک اپنائی جانی چاہیے جس سے یا تو آلودگی ختم ہو جائے یا کم ہو جائے۔ نہایت خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں مختلف سائنٹفک اداروں میں بڑی سرگرمی سے سائنسدانوں نے تحقیق شروع کر دی ہے اور اس کے اچھے نتائج بھی سامنے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ آلودگی جیسے اہم مسئلہ پر غور و خوض

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

ڈاکٹر مسعود جعفری

بھارت میں تیزابی مٹی اور اس کی اصلاح

بھارت میں تقریباً ۲۵.۹ لاکھ ہیکٹیئر آراضی پر تیزابیت کا اثر ہے اور مٹی کی پی۔ایچ PH ۶.۵ سے کم ہے۔ کچھ ایسے علاقے بھی ہیں جہاں مٹی کا پی۔ایچ ۴.۴ سے ۵.۰ تک ہے۔ خصوصاً آسام، مغربی بنگال اور کیرالہ کے جنگلاتی علاقوں کی مٹی کافی تیزابی ہے۔ تیزابیت کی پیمائش ہائیڈروجن کی "قوتِ ارتکاز" سے کی جاتی ہے اور اس کی اکائی پی۔ایچ ہے۔ ایک معیاری مٹی کا پی۔ایچ ۷ رہتا ہے۔ ۷ سے کم صفر تک تیزابی اور ۷ سے ۱۴ تک قلوی اکائی ہے۔ عموماً تیزابی مٹی کا پی۔ایچ ۴ سے ۶ تک دیکھا گیا ہے۔ مٹی میں تیزابیت کا رجحان کئی وجوہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اوّل شدید بارش کے ساتھ ساتھ گرم درجۂ حرارت۔ دوئم مٹی میں نامیاتی مادّے کی کثرت ہے۔ بارش کی زیادتی سے مٹی کے کیلسی اجزاء پانی میں تحلیل ہو کر بہہ جاتے ہیں۔ اس طرح مٹی میں ہائیڈروجن اور المونیم کے اجزاء نسبتاً زیادہ مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ یہی سالمے مٹی کو تیزابی بناتے ہیں۔ نامیاتی مادّہ جو جنگلاتی مٹی میں کثیر مقدار میں موجود ہے۔ گلتا سڑتا رہتا ہے۔ بیکٹریائی عمل گلنے سڑنے میں معاون ثابت ہوا ہے۔ اس کیفیت میں کئی نامیاتی و تیزابی مرکبات بنتے ہیں جو مٹی کو ترش بنا دیتے ہیں۔ بھارت کے کچھ علاقوں میں لیٹرائٹ مٹی (سرخ مٹی) بھی ہے۔ عام طور پر ان علاقوں کی آب و ہوا گرم اور مرطوب ہے۔ لہٰذا مٹی میں کیلسی اجزاء کی مقدار قلیل لیکن فولادی اور المونیم کے اجزاء کثیر ہیں۔ المونیم کے سالمے آبپاشی کے عمل سے مٹی کو ترش بناتے ہیں۔ لیٹرائٹ مٹی، آسام، اڑیسہ، آندھرا پردیش، تامل ناڈو اور مہاراشٹر ریاستوں کے وسیع علاقے میں ملتی ہے۔ یہاں آب و ہوا گرم مرطوب ہے۔ مختلف ریاستوں میں تیزابی مٹی کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

آسام

یہاں تیزابی مٹی کامروپ، کچار، گوالپاڑا، برہم پتر اور ٹیلہ اضلاع میں پائی جاتی ہے۔ چائے کے باغات کی مٹی کا پی۔ایچ ۴.۵ سے ۶.۰ تک دیکھا گیا ہے۔ والدل یا کھیل مٹی بھی تیزابی ہے۔ یہ مٹی سیاہ خاکستری رنگ کی ہے۔ نامیاتی مادہ کثیر ہے۔ مانسونی دور میں نشیبی علاقہ زیر آب رہتا ہے۔ اوزیتم بھار میں بورو دھان کی کاشت ہوتی ہے۔ تخمینہ کے مطابق ریاست میں ۵۰ فیصد مٹی تیزابیت سے متاثر ہے۔ زرعی تجربات سے منکشف ہوا ہے کہ چونے کے استعمال سے فصلوں کی پیداوار میں مزید اضافہ ہوا ہے۔

اڑیسہ

ریاست میں مزروعہ آراضی کا ۵۰ فیصد رقبہ تیزابیت سے متاثر ہے۔ شمالی پلیٹو کی سرخ مٹی میں وسطی میدانی علاقے کے بنسبت تیزابیت زیادہ ہے۔ مشرقی لیٹرائٹ اور ساحلی علاقے کی ریت آلود مٹی نسبتاً خفیف تیزابی ہے۔ سندرگڑھ، کیونجھر، میور بھنج، شمالی پلیٹو، وسطی میدانی علاقہ خصوصاً سمبل پور، بولان گیر، ڈھنکانال، مشرقی گھاٹ، کالاہانڈی، کوراپٹ، پھلبنی اضلاع کی مٹی تیزابی ہے۔ دھان

نیشکر، گیہوں، راگی، آلو اور مختلف اقسام کی دالوں کی کاشت کی جاتی ہے۔

آندھرا پردیش

یہاں کی لیٹرائٹ سٹی کا پی۔ ایچ ۴ء۰ سے ۵ء۰ تک پایا گیا ہے۔ ایسی مٹی ضلع میڈک اور نیلور میں ہے۔ اس کے علاوہ وشاکھاپٹنم میں لیٹرائٹ جیسی مٹی ملتی ہے۔ دھان، جوار، مکا، راگی، مونگ پھلی اور مرچ یہاں کی مخصوص فصلیں ہیں۔

انڈمان نکوبار (جزائر)

چھوٹا انڈمان، اور نیل جزیرہ میں سرخی مائل زرد مٹی ہے۔ جس کا پی۔ ایچ ۵ء۰ سے ۶ء۳ تک دیکھا گیا ہے۔ کچال، نان کوری جزائر میں پہاڑی علاقوں کی مٹی تیزابی ہے۔ اس کے علاوہ شمالی وسطی اور جنوبی انڈمان تیزاسا کی مٹی بھی تیزابی ہے۔ چونے کے استعمال سے فصلوں کی پیداوار میں مزید اضافہ ہوا ہے۔

اتر پردیش

ریاست کے پہاڑی اضلاع، چمبولی، گڑھوال، نینی تال، پتھورا گڑھ، پوڑی، اتر کاشی، دہرہ دون اور الموڑہ میں مٹی تیزابی ہے۔ ریاست کا ۳ء۴ فیصد علاقہ ایسی مٹی پر مشتمل ہے۔ مٹی خفیف تیزابی یا معتدل ہے۔ یہاں بارش کا سالانہ اوسط ۱۵۰۰ ملی میٹر ہے۔ قدرتی جنگلات صنوبر اور شاہ بلوط کے درختوں پر مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ جنگلات میں لمبی گھاس کثرت ہے۔

بہار

رانچی میں تقریباً ۷۰ فیصد (پی۔ ایچ۔ ۲ء۵ سے ۵ء۶ تک) ہزاری باغ اور دھنباد میں ۶۰ فیصد (پی۔ ایچ ۶ء۵ سے ۵ء۶ تک) سنگھ بھوم اور پالاموں میں ۳۰ فیصد علاقہ تیزابیت سے متاثر ہے۔ ان علاقوں کی مٹی عموماً سرخی مائل زرد یا زرد ہے۔ اس کے علاوہ پورنیا ضلع کے سرحدی علاقے اور سنگھ بھوم میں مٹی زیادہ تیزابی ہے اور اس کا پی۔ ایچ ۵ء۵ یا اس سے بھی کم دیکھا گیا ہے۔ چونے کے استعمال سے کئی فصلوں پر مفید اثرات پائے گئے ہیں۔ اس کے ذریعے کیمیاوی کھاد کی صلاحیت میں اضافہ پایا گیا ہے۔ ارہر، سویابین، کپاس، چنا، مسور، مٹر، مونگ پھلی، مکا، جوار، جو، گیہوں، مروا، گوندلی گُرا، دھان (آؤس) سرسوں وغیرہ فصلوں کی مزید پیداوار حاصل ہوئی ہے۔

تامل ناڈو

ریاست کے زیادہ بارش والے علاقے جیسے نیل گری اور پہاڑی علاقے تیزابیت سے متاثر ہیں۔ ان علاقوں میں مٹی لیٹرائٹ ہے۔ تنجور ضلع کے جنوبی اور مشرقی ساحلی علاقے میں کہیں کہیں پر مٹی کا پی۔ ایچ ۵ء۰ دیکھا گیا ہے۔

جموں و کشمیر

یہاں مزروعہ آراضی کا ۲۰ فیصد رقبہ تیزابیت سے متاثر ہے۔ مجلتا، بھدرروا، پونچھ اور منڈھر بلاک کی مٹی تیزابی ہے۔ پی۔ ایچ۔ ۴ء۵ سے ۶ء۰ تک دیکھا گیا ہے۔

کرناٹک

ریاست کے ساحلی اور ملناڈ اضلاع میں تقریباً ۵۰ سے ۷۰ فیصد رقبہ تیزابیت سے متاثر ہے۔ جنوبی میدانی علاقے میں بھی تقریباً تیزابیت کا یہی اوسط ہے۔ شمالی میدانی علاقہ میں تقریباً ۵ فیصد علاقہ تیزابیت سے متاثر ہے۔ شدید بارش والے علاقے اور جنوبی میدانی اضلاع میں پی۔ ایچ ۵ء۳ سے ۶ء۰ تک ہے۔ ان علاقوں کے لئے تیزابیت کو زائل کرنے کے لئے ۲ء۲ سے ۵ء۵ ٹن فی ہیکٹیئر تک چونے کی مقدار تجویز کی گئی ہے۔

کیرالہ

ریاست میں مختلف اقسام کی مٹی ہے جن کا پی۔ ایچ مختلف ہے۔ جنگلات کی مٹی میں نامیاتی مادّہ کثیر ہے اور اس کا پی۔ ایچ ۵ء۱ ہے۔ لیٹرائٹ مٹی کا پی۔ ایچ ۵ء۵۔ ریت آلود اور دریاؤں کی لائی ہوئی مٹی کا پی۔ ایچ بالترتیب ۵ء۰ اور ۵ء۱ ہے۔ دلدلی مٹی جسے کری مٹی کہتے ہیں کوٹایام اور الپئی اضلاع میں ہے اور اس کا پی۔ ایچ ۴ء۷ ہے۔ ریاست میں سرخ مٹی بھی کہیں کہیں پر ہے جس کا پی۔ ایچ ۴ء۳ ہے۔

گجرات

ریاست میں لیٹرائٹ مٹی کے علاوہ پہاڑی علاقوں میں جنگلات کی مٹی تیزابی ہے جہاں بارش کا سالانہ اوسط ۲۰۰۰ ملی میٹر ہے۔ ڈانگس، بڑودہ، سندر نگر، امریلی، جوناگڑھ کے جنگلاتی مٹی تیزابیت سے متاثر ہے۔

مدھیہ پردیش

ریاست میں مہاندی دریا کا بیسن، مشرقی اضلاع جیسے بستر، رائے پور، رائے گڑھ، درگ، بلاس پور، سرگجا اور چھتیس گڑھ کا میدانی علاقہ تیزابیت سے متاثر ہے۔ ریاست کے کل رقبہ کا تقریباً ۵ء۶ فی صد سرخ اور زرد مٹی پر مشتمل ہے جس کا پی۔ ایچ ۵ء۵ ہے۔ یہاں سال، ساگون کے جنگلات ہیں اور دھان یہاں کی مخصوص فصل ہے۔

مغربی بنگال

ترائی کے علاقے کی مٹی تیزابی ہے۔ ہمالیائی دریا تیسٹا، مہانندا تورسا، جل ڈھاکہ

کی لائی ہوئی مٹی تیزابیت سے متاثر ہے۔ جلپائی گوڑی، دارجلنگ، مغربی دیناج پور، کوچ بہار کے اضلاع میں مٹی کا پی۔ ایچ ۲ء۴ سے ۲ء۶ تک پایا گیا ہے۔ لیٹرائٹ مٹی بیر بھوم، بردوان، بنکورا اور مدناپور کی مٹی بھی تیزابی ہے۔ جس کا پی۔ ایچ ۸ء۴ سے ۵ء۶ تک ہے۔ سرخ مٹی بیر بھوم بنکورا، پورلیا، مالدہ، بنکورا اور مغربی دیناج پور میں ہے جس کا پی۔ ایچ ۴ء۵ سے ۶ء۶ تک پایا گیا ہے۔

جنگلات کی بھوری مٹی بلند مقامات پر ہے، خصوصی طور پر دارجلنگ ضلع میں جہاں بارش کا سالانہ اوسط ۳۵۵۶ ملی میٹر ہے۔ یہ مٹی بھی کافی تیزابی لیکن زرخیز ہے۔ سنترہ، الائچی، آڑو، مکا اور آلو یہاں کی مخصوص پیداوار ہے۔

ھماچل پردیش

یہاں کی خاکستری مٹی جو تحصیل پالم پور، کانگڑہ، منڈی اور چمبا میں ہے خفیف تیزابی ہے۔ جس کا پی۔ ایچ ۵ء۶ ہے۔ بارش کا سالانہ اوسط ۲۰۰۰ ملی لیٹر ہے۔

مٹی کی زرخیزی پر تیزابیت کا اثر:-

مٹی کی زرخیزی کا انحصار اس میں موجود معدنی و غیر معدنی سالموں کے حصول پر ہے۔ حقیقی معنوں میں یہ حصول مٹی کی قلویت اور تیزابیت سے مربوط ہے۔ جیسا کہ پیشتر سطور میں بتایا گیا ہے کہ قلویت یا تیزابیت کی پیمائش ہائیڈروجن سالموں کے ارتکاز سے کی جاتی ہے جسے پی۔ ایچ کہتے ہیں۔ ایک معیاری مٹی کا پی۔ ایچ ۷۔ قلوی مٹی میں پی۔ ایچ ۷ سے متجاوز ۱۴ تک اور تیزابیت آلود مٹی میں ۷ سے کم صفر تک متعین کیا گیا ہے۔ حالانکہ تیزابی مٹی میں عموماً پی۔ ایچ ۴ سے ۵ء۶ تک اور قلوی مٹی میں پی۔ ایچ ۸ سے ۹ تک ہی دیکھا گیا ہے۔

فصلوں پر تیزابیت کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ حالانکہ کچھ فصلیں ایسی بھی ہیں جو تیزابیت سے جلد متاثر نہیں ہوتیں جیسے چنا، مونگ، لوبیا بیشتر فصلوں کی مزید پیداوار حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے اس کی اصلاح کر لی جائے۔ جن فصلوں پر اصلاح کے بعد معدنی و کیمیاوی کھادوں کا مفید اثر ہوا ہے وہ حسب ذیل ہیں:-

نام فصل	مزید پیداوار (کلوگرام فی ہیکٹر)
سویابین	۸۴۸
مونگ پھلی	۵۶۷
چنا	۶۶۳
جو	۴۴۲
کپاس	۳۷۲
ارہر	۷۹۷
مٹر	۵۹۰
مسور	۵۰۹

اصلاح کے لیے عموماً چونے کا استعمال کیا جاتا ہے۔ متذکرہ بالا فصلوں کے علاوہ دھان، گیہوں، مکا پر بھی مفید نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ جن علاقوں میں تیزابیت کا اثر ہے وہاں کی مٹی کا کیمیاوی تجزیہ کر لیا جائے تاکہ چونے کی مقدار جو اصلاح کے لیے درکار ہے، معلوم ہو جائے۔ اس عمل سے کسانوں کو کفایت کے ساتھ ساتھ مٹی کی صحیح اصلاح بھی ہوگی۔ ●

بقیہ: بقائے انسانی کیلئے جنگلی جانوروں کا تحفظ

کہ جنگلی جانوروں کی نسل میں اضافہ ہوتا رہے۔

عالمی طور پر جنگلی جانوروں کے تحفظ کے سلسلے میں مختلف اقدامات ہو رہے ہیں۔ جنگلی جانوروں کے تحفظ کے لیے حکومت ہند نے ۱۹۰۳ میں ایک قومی حکمت عملی منصوبہ تشکیل دیا تھا جس کے تحت محکمۂ ماحولیات نے گینڈوں کو گوہاٹی سے اُتر پردیش کے "دودھوا نیشنل پارک" منتقل کیا ہے۔ اس اقدام کا مقصد گینڈے کی ختم ہونے والی نسل کی ایک نئی جگہ پر محفوظ انداز میں پرورش کرنا ہے۔

آندھرا پردیش میں عادل آباد کے جنگلات جنگلی جانوروں کے لیے شہرت رکھتے ہیں۔ ریاستی حکومت ان کی نگہداشت اور تحفظ کے لیے کئی اقدامات پر عمل آوری کر رہی ہے۔ جن سے ان جانوروں کے تحفظ کے امکانات روشن ہوتے جا رہے ہیں۔

ماحولیات کا محکمہ جنگلی جانوروں کو اُن کے قدرتی ماحول میں پرورش کی غرض سے شروع کئے گئے طویل مدتی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ اب تک اس سلسلے میں اندرونِ ملک ۱۴ مقامات کی نشاندہی کی جا چکی ہے اور نیل گری (کرناٹک اور کیرالہ) نندا پہا (ارونا چل) اُتر کھنڈ اور نندا دلوی (اُتر پردیش) کے لیے پروجیکٹ سے متعلق دستاویزات تیار کی جا چکی ہیں۔

ساتویں پانچ سالہ منصوبہ میں جنگلی جانوروں کے تحفظ کو خاص اہمیت دی گئی ہے اور جس نسل کے جانور کم ہونے لگے اُن کے شکار کو بالکل بند کئے جانے کے حکم پر سختی سے نظر رکھی جانے لگی ہے۔

جنگلی جانوروں کا وجود انسانیت کی بھلائی کے لیے اس لحاظ سے ضروری قرار پاتا ہے ان کا ذکر ہماری مقدس کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ بہادری کی کہانیوں کا اختتام یا آغاز بھی ان ہی جنگلی جانوروں سے ہوتا رہا ہے اس لحاظ سے جنگلی جانور ہندوستان کی مقدس کتابوں کے لحاظ سے ہمارا تہذیبی اور تاریخی ورثہ ہیں، اور ہم ہندوستانیوں کا یہ فرضِ اوّلین ہونا چاہیئے کہ ہم اس ورثہ کی حفاظت کریں۔ ●

محمد عبداللہ

معاشی انقلاب بذریعہ آئی۔ آر۔ ڈی۔ پی

Integrated Rural Development Programme جسے مختصراً I.R.D.P. کہتے ہیں۔ پہلی مرتبہ ۱۹۷۸ میں تجربے کے طور پر مختلف بلاکوں نے اپنے اپنے طور سے شروع کیا۔ اس وقت اسے صرف ۲۰۰۰ بلاکوں میں نافذ کیا گیا۔ اس کے امید افزا نتائج سے متاثر ہوکر بھارت سرکار نے ۲ر اکتوبر ۱۹۸۰ کو ملک کے سبھی بلاکوں میں اس اسکیم کو لاگو کر دیا۔ I.R.D.P. کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسے ۲۰ نکاتی پروگرام میں تیسرے نکات میں رکھا گیا ہے۔ اس اسکیم کا ایک ہی مقصد ہے کہ لوگ معاشی لحاظ سے زیادہ خوشحال ہوں۔ اسی لیے اس پروگرام کے تحت ایسے لوگوں کی مدد کی جا رہی ہے جو کہ غریبی لائن کے نیچے ہیں اور جن کے کنبے کی سالانہ آمدنی ۳۵۰۰ سے زیادہ نہیں ہے۔

اس پروگرام کو مارچ ۱۹۸۵ تک چلنا تھا۔ مگر اس کی مقبولیت اور اس کے بہتر نتائج کو دیکھتے ہوئے اب اسے ۱۹۹۰ تک اور بھی زیادہ منظم طریقے پر چلانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

ساتویں پنچسالہ منصوبے میں اس پروگرام کے تحت غریبی لائن سے نیچے کی ایک چوتھائی آبادی کو غریبی لائن کے اوپر لانے کا نشانہ رکھا گیا ہے۔ اس میں کچھ تبدیلی لائی گئی ہے جو کہ مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ اب تک اس پروگرام کے تحت کم سے کم قرض دینے کی کوئی حد مقرر نہ تھی جبکہ زیادہ سے زیادہ ۱۰ ہزار کی حد رکھی گئی تھی اب I.R.D.P کے تحت ۴۰۰۰ سے کم Finance نہیں کیا جائے گا۔ شروع میں جب یہ پروگرام نافذ کیا گیا تو اس سے منسلک عہدیداروں اور بینک کے بعض افسروں کو بھی اس کے بہتر نتائج کی توقع نہیں تھی اس لیے ایسے لوگوں نے محض خانہ پری کے طور پر بہت کم پیسے دیئے۔ اس سے نقصان یہ ہوا کہ وہ غریب طبقہ اس کم پیسے کا بہتر مصرف نہ کر سکا۔ اس طرح Under Finance کی وجہ سے بہت سی جگہ پر اس کے بہتر نتائج سامنے نہیں آئے۔

۲۔ دوسری بڑی تبدیلی اس میں یہ کی گئی ہے کہ اب اس پروگرام کے تحت کئے گئے کل Finance کا ۹۰ فیصد Re-Finance کرنا ہے۔ اس طرح وہ لوگ جو کہ ۸۱-۱۹۸۰ یا ۸۲-۱۹۸۱ میں اس کے تحت قرض لے چکے ہیں اور اسے یا تو لوٹا چکے ہیں یا اس کا صحیح مصرف کیا ہے ان کی پھر سے مدد کی جائے گی تاکہ اُن کی حالت اور بہتر ہو اور وہ سماج کے ایک مضبوط رکن بن جائیں۔

۳۔ تیسری بات اس میں یہ بڑھا دی گئی ہے کہ اب کم از کم ۲۰ فیصد عورتوں اور ۳۰ فیصد شیڈول کاسٹ کے لوگوں کی مدد کرنی ہے۔ شیڈول کاسٹ کے لوگوں کو رعایت Subsidy ۵۰ فیصد دی جاتی ہے جبکہ عام لوگوں کو یہ رعایت ۳۳ فیصد کی ہے لیکن شرح سود سب کے لیے یکساں یعنی ۱۰ فیصد ہے۔ ایک بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ Subsidy کی شکل میں رعایت کسی بھی حالت میں ۳۰۰۰ سے زیادہ نہیں ہے۔

۴۔ شیڈول قبائل جو کہ افریقہ کے بعد سب سے زیادہ ہمارے ملک میں ہیں اور جن کی آبادی ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق

۴۸ ملین سے ان کی فلاح و بہبود کے لیے بھی خاص توجہ مرکوز کرائی گئی ہے۔ یہ ملک کی کُل آبادی کا ۷ فیصد ہیں اور اُن کی ۹۶ فیصد آبادی دیہات میں بستی ہے۔

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں کی بہت بڑی آبادی زراعت ہی کو پیشے کے طور پر اختیار کئے ہوئے ہے پھر بھی یہاں کے ۷۰ فیصد کسان ایسے ہیں جن کے پاس ۲ ہیکٹیر سے بھی کم زمین ہے اور اُن کی فصل زیادہ تر ہی سیلاب یا سوکھے کی نذر ہوتی رہتی ہے۔ چھوٹے کسان انھیں سب وجوہات سے اپنے قرض کی ادائگی وقت پر نہیں کر پاتے ہیں۔ جون ۱۹۸۱ تک ۵۶۰, ۷ کروڑ روپے ایسے لوگوں کے پاس بقایا تھا اُن میں ۰۰۰, ۳ کروڑ روپیہ یعنی ۴۰.۵ فیصد صرف تجارتی بینکوں کا تھا ضرورت ہے بہت زیادہ لوگ کھیتی میں نہ پھنسے رہیں اس لیے I.R.D.P. کے ذریعے Fisheries مرغی پالن اور Sheep-Rearing کے لیے بھی Animal Husbandary امداد دی جارہی ہے۔ کاریگروں، بُنکروں اور دستکاروں کو اپنا کام چلانے کے لیے پیسے اور صحیح صلاح ومشورے بھی دئے جارہے ہیں۔

ہمارے ملک میں Fisheries چھوٹے چھوٹے پوکھرے تالاب کی بہتات ہے جوکہ عموماً جل کھمبی اور سیتوار جیسی بیکار چیزوں سے بے مصرف پڑے رہتے ہیں، لیکن اب مچھلی پالن کی طرف خاص توجہ دی گئی ہے تاکہ تالاب اور پوکھروں کا مصرف لیا جاسکے اور لوگوں کو روزگار کے مواقع ملیں۔ اس کام کے لیے دو طرح کی مدد دی جارہی ہے ایک تو Development of Pond تالاب کی صفائی اور مرمت تاکہ وہ مچھلی پالنے کے لائق ہوسکے۔ دوسرے ذریعہ ڈالنے والے جال خریدنے اور اس سے متعلق دوسرے کام کے لیے بھی Finance کیا جارہا ہے۔ عموماً اس کام کے لیے ایسے لوگوں کو چُنا گیا ہے جوکہ Fisheries Department سے ٹریننگ لے چکے ہوتے ہیں۔ پورے اُترپردیش بہار میں یہ کام بہت تیزی سے ہورہا ہے۔

Sheep-Rearing بھیڑ پالن بھی کافی منافع بخش تجارت بن چکی ہے۔ حالانکہ یہ کام بہت پرانا تھا مگر نتیجے میں لوگ اس کام کو کم تر سمجھ کر چھوڑتے جارہے تھے۔ حال ہی میں بھارت سرکار اور تامل ناڈو گورنمنٹ نے مل کر اس کام کو فروغ دینے کی اسکیم بنائی اس کے لیے تامل ناڈو کے کچھ علاقوں کو چُنا گیا جن میں کوسلیم قابل ذکر ہے۔

مچھلی پالن، بھیڑ پالن، مدھو مکھی پالن کے علاوہ سلک انڈسٹری، لاکھ انڈسٹری اور دوسرے کاٹیج انڈسٹری کے لیے بھی بڑھاوا دیا جارہا ہے۔ اس پروگرام کا ایک ہی مقصد ہے کہ گاؤں کا وہ غریب طبقہ جوکہ غریبی لائن کے نیچے گذر بسر کررہا ہے اس کا معیار زندگی Standard of Living اُوپر اُٹھے۔ اور معاشی پسماندگی دور ہو، یہ پروگرام کافی حد تک کامیاب رہا ہے اور اس کے دور رس نتائج سامنے آرہے ہیں۔ اوّل تو لوگوں کے Standard of Living میں سُدھار کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ دوسرے یہ کہ روزگار حاصل کرنے کے لیے شہر کی جانب جانے کا رُجحان جوکہ بہت تیزی سے بڑھ رہا تھا اس میں گراوٹ آئی ہے۔

اِتنا ہونے کے باوجود بھی ایسا لگتا ہے کہ غریبی اپنی جگہ پر ہے۔ لوگوں کی حالت میں برائے نام سدھار آیا ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ ابھی بھی ایک کام کرنے والا آدمی کُنبے کے دوسرے افراد کو بھی بھاری بوجھ کی طرح ڈھو رہا ہے۔ بیوی اور بچّوں (جن کی تعداد ابھی بھی مجموعی طور پر پانچ سے کم نہیں ہے)، ماں باپ، ایک یا دو بھائی یا بہن بھی ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں اس پروگرام سے پہلے اگر کنبہ کے ہر فرد کی آمدنی ایک روپیہ یومیہ تھی تو اب بڑھ کر تین روپیہ یومیہ ہوتی ہے یعنی پہلے ایسے پانچ افراد کے ایک خاندان کی سالانہ آمدنی ۳۶۰۰ تھی، اب بڑھ کر ۱۰۸۰۰ سالانہ ہو جاتی ہے۔ اس طرح آمدنی تین گُنا بڑھی لیکن یہ بھی تو سوچیے کہ تین روپے میں ایک آدمی کا مشکل سے کھانا اور کپڑا ہوگا اس لیے کسی بھی فلاحی اسکیم کا فائدہ اس وقت تک نظر نہیں آئے گا جب تک کہ کمانے والوں پر انحصار کرنے والوں کی تعداد کم نہ ہو۔

مختصر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ I.R.D.P. ایک ایسی گاڑی ہے جوکہ انتہائی غریب لوگوں کو غریبی لائن کے اوپر لانے میں لگی ہے۔ ●

بقیہ، بھارت کا اتحاد ہر دوسری چیز پر مقدم

ہندوستان اُن ملکوں میں سے ایک ہے جن پر برابر بڑھ رہی آبادی کا دباؤ بڑھ رہا ہے۔ حکومت اور لوگوں کو اس چیز کو مد نظر رکھنا چاہیے۔ آبادی میں اضافے کی رفتار کی منصوبہ بندی کے لیے قدم اٹھائے جانے چاہئیں اس کے ساتھ ہی ہمارے اقتصادی وسائل، ترقی کی رفتار اور روزگار کے مواقع مدنظر رکھتے ہوئے مستقبل میں انفرادی قوت کی منصوبہ بندی کی بھی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ یہ ایک قومی مسئلہ ہے۔ اور عوام کے سب طبقوں کو اسے اسی ڈھنگ سے دیکھنا چاہیے۔ ●

غریبی دُور کرنے کے اقدامات

ہندوستان میں منصوبہ بندی کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ یہاں سے غریبی دُور ہو سکے۔ منصوبے میں غریبی دور کرنے کے لیے جو مختلف پروگرام شامل کیے گئے ہیں، ان کا دائرہ وسیع کرنے پر زور دیا جا رہا ہے۔ منصوبے میں یہ بات مدِّ نظر رکھی گئی ہے کہ سماج کے زیادہ متاثرہ طبقوں جیسے درجِ فہرست ذاتوں، قبیلوں اور عورتوں نیز بچّوں کے مسائل پر خصوصی توجہ دی جائے۔ منصوبے میں تسلیم کیا گیا ہے کہ ترقیاتی پروگراموں کو آگے بڑھانے کے سلسلے میں محض مردوں کی ضرورتوں اور پیشقدمیوں کا تصوّر ہی پیشِ نظر نہ ہونا چاہیئے بلکہ عورتوں کی خصوصی ضروریات اور مسائل کو بھی سامنے رکھا جائے۔ ان تمام اقدامات کے نتیجے میں غریبی کا تناسب ۱۹۸۴-۸۵ کے ۳۷ فیصد سے کم ہو کر ۱۹۸۹-۹۰ میں ۲۶ فیصد سے بھی نیچے ہو جائے گا۔

اس منصوبے کی تیاری میں کارگزاری بہتر بنانے اور پیداواری صلاحیت بڑھانے کی خصوصی ضرورت سمجھی گئی ہے۔ آبپاشی، گندگی کے نکاس اور زمین کے استعمال کے انتظام کو مربوط ڈھنگ سے قابو میں لانا ہوگا تاکہ نئی طرز کی زرعی ٹیکنالوجی کے تحت متعدد فصلیں اُٹھانے کے امکانات دستیاب ہو سکیں۔ صنعت میں جدید کاری، اور ٹیکنالوجی کو جدید بنانے پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔

بہتر طرز کا بُنیادی ڈھانچہ

زراعت اور صنعت میں تیز تر ترقی کے لیے بنیادی ڈھانچے پر سرمایہ کاری کے لیے زیادہ زور دیا گیا ہے تاکہ جس پیمانے کی سرگرمیاں منصوبے میں شامل کی گئی ہیں ان کے لیے بجلی، ٹرانسپورٹ اور کوئلے کی کمی پیدا نہ ہو۔

پبلک سیکٹر کے بجٹ میں سے کافی حصّہ توانائی کے لیے مخصوص کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ پبلک سیکٹر کے بجٹ کا تقریبًا ۳۱ فیصد حصّہ توانائی کے لیے ہے۔ بجلی کی پیداوار منصوبے کے دوران ۱۲،۲ فیصد کی اوسط سالانہ شرح کے حساب سے بڑھنے کی توقع ہے۔ منصوبے میں دیہی علاقوں کے لیے توانائی کی ضرورت پوری کرنے پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ اس میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ ۱۵،۱ لاکھ گاؤں کو بجلی کا فائدہ بہم پہنچایا جائے اور ۱۳،۹ لاکھ پمپسوں کو آبپاشی کے لیے توانائی بھی دی جائے۔

منصوبے میں تمام کی تمام دیہی اور شہری آبادی کے لیے پینے کا پانی مُہیا کرنے کی مناسب سہولتوں کا اہتمام بھی شامل کیا گیا ہے۔ جہاں تک گاؤں کے لیے صحت کے ذیلی مرکزوں، صحت کے ابتدائی مراکز اور متعدد مقاصد والے صحت کے کارکنوں کا سوال ہے، منصوبے کی مدت کے خاتمے تک صحت کی ابتدائی دیکھ بھال کا بنیادی ڈھانچہ کام کرنا شروع کر دے گا۔ اس طرح صحت کی نگہداشت کے لیے ہمارے یہاں مُلک بھر کا ایک نظام ہو جائے گا جس میں انسدادی، معالجاتی اور ترقیاتی خدمات کا ایک مِلا جُلا متوازن سِلسلہ ہوگا۔ ساتویں منصوبے کا ایک امتیازی پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں حیوانات کی معیشت میں توازن کے علاوہ ماحولیات کی حفاظت اور برقراری پر بھی زیادہ زور دیا گیا ہے۔

عملی درآمد میں تیزی

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایک منصوبے کا پیمانہ ارادہ نہیں بلکہ کامیابی ہے۔ مالی بجٹ نہیں بلکہ اس کے فوائد ہیں۔ یہ جس قدر سابقہ منصوبوں پر لاگو ہوتا ہے اسی طرح ساتویں منصوبے پر بھی۔ چنانچہ ساتویں منصوبے کا تاثر اس سنجیدگی اور ارادے پر منحصر ہے جس کے ساتھ اس کو عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ منصوبے کی دستاویز میں کئی ایسے شعبوں کی فہرست دی گئی ہے جن میں ساتویں منصوبے کے مقاصد اور نشانے حاصل کرنے کے لیے گزشتہ کارکردگی کے مقابلے میں بہتر صورتِ حال پیدا کرنی ہوگی۔ ہمیں ایسے موثر اقدامات بھی اختیار کرنے چاہئیں جن سے عوام بھی قومی ترقی کے تمام مراحل میں صحیح معنوں میں شریک ہوں۔ ضرورت ہے کہ ہم پنچایتی راج کے ادارے کی تہہ میں چھپے امکانات کو استعمال میں لا کر عوام کی توانائی کو ملک کی تقدیر سے وابستہ سرگرمیوں میں پوری طرح بروئے کار لائیں۔ اسی کے ساتھ ہی ہمیں ان رضاکار تنظیموں کی تخلیقی صلاحیتوں کو بھی پوری طرح استعمال میں لانا ہے جو قومی ترقی کے کام میں مصروف ہیں۔

آئندہ کے فرائض

منصوبہ بندی، ہمارے ملک میں قوم کے لیے بنیادی مقاصد اور نشانے حاصل کرنے کا ایک ہتھیار ہے۔ مہاتما گاندھی کا یہ ایک خواب تھا کہ ملک کے ہر فرد کی آنکھوں کے آنسو پونچھے جائیں۔ ہمیں صحیح طور پر اس ترقی پر فخر ہے جو ہم نے منصوبہ بند ترقی کا پروگرام تیار کرنے کے بعد حاصل کی ہے پھر بھی ابھی ان گنت ایسے افراد ہیں جنکی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ گویا ہمارا فرض ہمارے سامنے ہے۔ ہمیں غریبی کے خلاف اس سے بھی زیادہ شدید مُہم چلانی ہے۔

آئندہ کا کام آسان نہیں ہے۔ ہمیں بہت سے چیلنجوں پر غیر یقینی حالتوں کا سامنا کرنا ہے۔ لیکن ہمارے مُلک میں زبردست لچک اور مضبوطی موجود ہے اور اس نے ماضی میں بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کیا ہے۔

یہ منصوبہ بھارتی عوام کی اس مجموعی رضا کا اظہار ہے جس کے تحت وہ اس سے بھی زیادہ رفتار کے ساتھ ترقی، خوشحالی، سماجی انصاف اور خود انحصاری کی شاہراہ پر آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment at Civil Lines Post Office, Delhi-110054.

VOL. 5 No. 22 YOJANA (URDU) 16-28 February 1986

عظیم الرحمٰن

بقائے انسانی کے لیے جنگلی جانوروں کا تحفظ

جنگل جہاں موسموں کے توازن کو برقرار رکھتے ہیں وہیں ان جنگلوں میں پرورش پانے والے جنگلی جانور بھی انسانیت کے لیے سرمایہ ہیں۔ جنگلوں میں شیر، چیتا، ہرن اور کئی خطرناک جنگلی جانور صدیوں سے اپنی زندگی بسر کرتے آرہے ہیں۔ یہ جانور ہم انسانوں کے لیے بھی مفید اور فائدہ بخش رہے ہیں۔

وہ ملک حقیقت میں خوش قسمت ہیں، جو جنگلی جانوروں کی دولت سے مالا مال ہیں۔ جانور بجا طور پر عطیۂ قدرت ہوتے ہیں اور ان کی حفاظت کرنا فرائضِ انسانی میں ہے۔ انسانوں نے ہر عہد اور ہر زمانے میں جانور کی نگہداشت کی، انھیں پالا، پوسا اور سدھایا، سنوارا اور اُن سے محبت کی۔

شیر کو جنگلی جانوروں کا بادشاہ کہا گیا ہے۔ اس کے بارے میں کئی کہانیاں مشہور ہیں۔ ہندوستان کے جنگلوں میں شیر اور دوسرے جنگلی جانور صدیوں سے اپنی زندگی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اور ہر زمانے میں انسان نے اس پر قابو پایا ہے۔ سیر اور شکار کے شوقین لوگ عام طور پر اپنے شکار کے لیے جنگلوں کا رُخ کرتے ہیں اور ان غریب جانوروں کا شکار کرکے اپنی بہادری کے کارنامے ظاہر کرتے ہیں۔ حکومت جہاں جنگلات کی حفاظت کے لیے آئے دن اچھے اچھے کام انجام دیتی ہے وہیں اس کی طرف سے جنگلی جانوروں کے تحفظ پر بھی زور دیا جاتا ہے۔

جانوروں سے محبت کرنے والوں اور اُن کی حفاظت کا دم بھرنے والوں کو چاہیے کہ وہ اُن کے تحفظ کے لیے اُنہی کے من پسند فطری ماحول کو بنائے رکھیں۔ جنگلوں کے بیچ انسانی آبادیوں کا وجود میں آنا بھی تو ایک مسئلہ ہے جس کا حل تلاش کرنا ضروری ہے۔ حکومت نے اس جانب توجہ مرکوز کی ہے۔ جنگلی جانور جنگلوں کے بیچ آباد بستیوں والوں کو، اُن کے کھیتوں اور مویشیوں کو نقصان پہنچاتے رہے ہیں۔ مگر وہاں کے جانور اور انسان ایک دوسرے کے مسئلے کو سمجھ کر ایک ہم آہنگ فضا کو بنائے رکھنے میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔

حکومت کی طرف سے جنگلی جانوروں کے تحفظ کے اقدامات اور اس سلسلے میں عوام الناس کے شعور کی بیداری دونوں کی ایک ساتھ ضرورت ہے۔ بلاشبہ جنگلی جانور کچھ نقصانات بھی کرتے ہیں لیکن اس کا مناسب تدارک کیا جانا چاہیے اور اس کے ساتھ ہی جنگلی جانوروں کے تحفظ کی اہمیت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

یہ صحیح ہے کہ بعض اوقات یہ جنگلی جانور انسانوں کا بھی شکار کرتے ہیں۔ آئے دن ہم نے اخبارات میں پڑھا ہے کہ کسی شیر نے کسی دیہاتی پر حملہ کردیا یا کسی چیتے نے کسان کو اپنا نشانہ بنایا۔ یہاں یہ بات غور کرنے کی ہے کہ کوئی جاندار کسی دوسرے جاندار کو بلا وجہ یا بلا سبب نشانہ نہیں بناتا اگر ہم کسی کو نہ چھیڑیں تو دوسرا بھی ہم کو نہ چھیڑے یہ قانونِ قدرت ہے۔ جب شکاری لوگ جنگلوں میں شیر، چیتا اور ہرن کا شکار کرتے ہیں تو یہ جانور بھی اپنا بدلہ لینے کی خاطر ان پر حملہ کرتے ہیں۔ اس طرح یہ بات تسلیم کرلینا چاہیے کہ جنگلوں میں جس جگہ جو جانور رہتے ہیں انھیں اپنی نسل کو بڑھانے کے پورے مواقع مہیا ہوں۔ ہمارا ملک ہندوستان جنگلوں، پہاڑوں اور دریاؤں کا مالک ہے۔ اگر جنگلوں سے جانور ختم کیے جائیں تو جنگل ویران ہوجائیں گے۔ اگر دریاؤں سے پانی خالی کیا جائے تو وہ خشک ہوجائیں گے اگر پہاڑوں پر دست اندازی کی جائے تو پہاڑوں کی اہمیت اور طوفانوں سے بچاؤ کے اسباب ختم ہوجائیں گے۔

جنگل قدرت کا بیش بہا عطیہ ہے اور جانور ان جنگلوں کی زینت ہے۔ اس لیے ہمیں ہر زمانے میں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے

(باقی صفحہ 18 پر)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001

Printed by A.J. Printers, 5 Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002.

یوجنا

یکم تا ۱۵ مارچ ۱۹۸۶

ایک روپیہ

سائنس کی ترقی وزیر اعظم کی نظر میں

بجلی کا سفر نئی منزل اور راہ کی دشواریاں

(راجیو کمار)

محمد یونس صدیقی

ساتویں منصوبے میں بنیادی ضرورتوں کی تکمیل

ساتویں منصوبے میں بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کے پروگرام پر خاص زور دیا گیا ہے۔ اس کے لیے اس پروگرام کو غریبی دور کرنے کے دیگر پروگراموں اور دیہی ترقی کے جملہ پروگراموں کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے تاکہ عوام کو بنیادی اشیاء کی فراہمی کا نظام تسلسل کے ساتھ فائدہ پہونچا سکے۔ اور انھیں بنیادی اشیاء کی فراہمی مناسب داموں پر کرائی جا سکے۔ ساتویں منصوبے میں بھی اس پروگرام کو موثر بنانے کے لیے چند اقدامات بھی کئے گئے ہیں۔ ان میں گھریلو طور پر استعمال میں آنے والے ایندھن کی فراہمی، سرکاری دکانوں کے ذریعے بنیادی اشیاء کی فروخت اور دیہات میں صفائی ستھرائی کے پروگراموں کو تیز کرنے کی حکمتِ عملی شامل ہے۔

بنیادی ضرورتوں کے پروگرام کے تحت ابتدائی تعلیم، تعلیم بالغان، دیہی صحت، دیہات میں پانی کی فراہمی، دیہی سڑکوں کی تعمیر، دیہات میں تعمیر مکانات، ماحول کی صفائی، شہری گندی بستیوں کی صفائی اور تغذیہ بخش خوراک کی فراہمی کو شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح مذکورہ جملہ شعبوں میں بنیادی اشیاء اور خدمات کی فراہمی سے دیہات کے غریب عوام کو اوپر اٹھنے کا موقع مل سکے گا۔ انسانی وسائل کے فروغ کے سلسلے میں یہ ایک اہم قدم ہے۔

اخراجات :-

ساتویں منصوبے میں بنیادی ضرورتوں کی فراہمی کے پروگرام کے تحت ریاستوں/مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں کی مدات کے ضمن میں ۱۰۰۸۱ کروڑ ۲ لاکھ روپے اور مرکزی سیکٹر کے ضمن میں ۴۶۴۱ کروڑ ۲۲ لاکھ روپے رکھے گئے ہیں۔ اس میں سے ۱۰۳۰ کروڑ ۴۵ لاکھ روپے ریاستوں اور مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں میں ابتدائی تعلیم پر خرچ کئے جائیں گے، جبکہ مرکزی سیکٹر میں ۱۰۰ کروڑ روپے ابتدائی تعلیم کے لیے ہیں۔ منصوبہ کے دوران رسمی تعلیم کے تحت ۲ کروڑ ۵۵ لاکھ ۳۰ ہزار بچے داخل کرنے کا نشانہ رکھا گیا ہے، جبکہ ڈھائی کروڑ بچے غیر رسمی طریقوں سے تعلیم پا رہے ہوں گے۔ تعلیم بالغان کے لیے ریاستی اور مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں میں ۲۳۰ کروڑ روپے متعین کئے گئے ہیں۔ مرکزی سیکٹر میں اس مد پر ۱۴۰ کروڑ روپے کے اخراجات ہوں گے۔ اس پروگرام سے ۱۵ سال سے ۳۵ سال تک کی عمر کے تمام بالغ افراد مستفید ہوں گے۔ یہ پروگرام ۱۹۹۰ تک غیر رسمی تعلیم کے ذریعے سب کو فائدہ پہنچائے گا۔ دیہات میں عوام کی صحت کی بہتری کے لیے ریاستوں اور مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں کے پلان کے مصارف ۱۰۶۳ کروڑ ۳۵ لاکھ روپے ہوں گے جبکہ مرکزی سیکٹر میں یہ رقم ۴۳ کروڑ روپے ہوگی۔ اس کی رُو سے ۵۴ ہزار ذیلی مراکز کھولے جائیں گے اور دیہی علاقوں کے موجودہ ۳۰ ہزار ذیلی مراکز کو مستحکم کیا جائے گا۔

بارہ ہزار پرائمری ہیلتھ مراکز قائم کئے جائیں گے نیز موجودہ گیارہ ہزار پرائمری ہیلتھ سنٹروں کو مضبوط کیا جائے گا۔ ۱۵۵۰ کمیونٹی ہیلتھ سنٹر قائم کئے جانے کی تجویز ہے۔ فی الحال ۶۴۹ کمیونٹی ہیلتھ سنٹر قائم ہیں۔ جو آبادی کے ۶۵.۴۰ فیصد حصے کو فائدہ پہنچائیں گے۔ سنہ ۲۰۰۰ تک ہر کمیونٹی ڈیولپمنٹ بلاک میں ایک لاکھ آبادی کے لیے ایک کمیونٹی ہیلتھ سنٹر قائم کرنے کا نشانہ رکھا گیا ہے۔

دیہات میں پینے کے پانی کی فراہمی کے لیے پلان میں ریاستوں اور مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں کے تحت ۲۲۵۳ کروڑ ۲۵ لاکھ روپے اور مرکز کے تحت ۱۲۰۱ کروڑ ۲۲ لاکھ روپے کے بقدر اخراجات کئے جائیں گے۔ ۳۹ ہزار ایسے دیہات میں جہاں پینے کے پانی کی فراہمی کو ایک مسئلہ سمجھ لیا گیا ہے، ترجیحی بنیادوں پر پانی فراہم کیا جائیگا۔ ان کے بعد دیگر دیہات میں پینے کے صاف پانی فراہم کیا جائے گا۔

دیہات میں سڑکوں کی تعمیر کے لیے ۱۵۰۰ افراد یا اس سے زیادہ آبادی والے ۲۱۱۵۷ گاؤں میں سڑکیں بنانے کا نشانہ رکھا گیا ہے۔ ان کے علاوہ ایک ہزار سے لے کر ڈیڑھ ہزار تک کی آبادی والے ۵۰۵۷ دیہات میں سڑکیں بنائی جائیں گی۔ اس مد پر ریاستوں اور مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں میں ۱۷۲۹ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے خرچ کئے جانے ہیں۔ ۱۹۹۰ تک ایک ہزار یا اس سے زیادہ آبادی والے تمام باقی ماندہ گاؤں کو نیز دیہات کی کُل تعداد کے نصف کو سڑکوں کی تعمیر کے ذریعے ایک دوسرے سے مربوط کر دیا جائے گا۔

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

- چیف ایڈیٹر آر. ٹھکرال
- اسسٹنٹ ایڈیٹر محمد عادل صدیقی
- سب ایڈیٹر وسیم حیدر

جلد ۵	یکم تا ۱۵ مارچ ۱۹۸۶	شمارہ ۲۳

۱۰ تا ۲۴ پھالگن شک ۱۹۰۷ ٭ ٹیلیفون نمبر ۶۰۱۸۱۸

اس شمارے میں

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے، ۲ سالہ ۳۵ روپے، سہ سالہ ۵۰ روپے

فی کاپی :- ایک روپیہ

طالب علموں، اُستادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت

یوجنا' منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتہ :-

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر. کے. پورم (مین)

نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر. ایس. منجال

ترسیلِ زر کا پتہ :- بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

مکانات کی فراہمی — اہم ترین ضرورت

ترقی پذیر ملکوں میں بے گھر لوگوں کے لیے گھر ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، شہری اور دیہی دونوں علاقوں میں۔ رہائشی مکانوں کی بھاری قلت ہے۔ شہروں اور قصبوں میں غیر منصوبہ بند اور بے قاعدہ طور پر انسانی بستیوں کا قیام اس مسئلے کو اور بھی زیادہ سنگین بنا دیتا ہے۔ شہری بستیوں میں رہنے والے لوگوں کا تناسب تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ جس کے نتیجے کے طور پر بڑی تعداد میں گندی بستیاں وجود میں آتی ہیں اور لوگ ناجائز زمین پر قبضہ کرکے بیٹھ جاتے ہیں۔ اس سارے عمل سے زندگی کا معیار گرتا ہے، شہری زندگی میں زوال آتا ہے، ماحول آلودہ ہوتا ہے اور ضروری شہری خدمات میں تعطل پیدا ہوتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان میں اس وقت دو کروڑ ۵ لاکھ رہائشی مکانوں کی قلت ہے جس میں سے ایک کروڑ ۹ لاکھ مکانات دیہی علاقوں اور ۶۰ لاکھ شہری علاقوں میں درکار ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں مکانوں کی قلت دور کرنے کے لیے ہمہ جہتی کوششوں کی ضرورت ہے۔

یہ ایک حوصلہ افزا امر ہے کہ مکانات مہیا کرنے کے شعبے میں بین الاقوامی تعاون کی ضرورت کا بہتر طور پر احساس کیا جا رہا ہے۔ بین الاقوامی فضا میں ہندوستان امن اور خوشحالی کے فروغ کی پالیسی پر گامزن ہے۔ ہمارا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ کم ترقی یافتہ ملکوں کی اہم ترقیاتی ضرورتوں کے سلسلے میں دنیا کو مجموعی طور پر ایک متوازن اور متحد منصوبہ اپنانے کی ضرورت ہے۔ قوموں کے نظریاتی اختلافات اس شعبے میں موثر اور مربوط پروگرام اختیار کرنے کے آڑے نہیں آنے چاہئیں۔ ہندوستان نے اس سلسلے میں اعلان کیا ہے کہ ۱۹۸۷ء کا سال بے گھر لوگوں کو سایہ مہیا کرنے کے سال کے طور پر منایا جائے۔ ایک حوصلہ افزا قدم ہے اور ہمارا ملک تمام بے گھر افراد کو ۲۰۰۰ء تک مکان مہیا کرنے کے نصب العین پر قائم ہے۔

اس سلسلے میں قومی ضروریات کا پتہ لگا لیا گیا ہے۔ ریاستوں میں بھی ضروریات کے نشانے متعین کرنے کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ چنانچہ فی الحال ملک میں مکانوں کی قلت دور کرنے اور ماحول کی اصلاح کے اقدامات پر عمل جاری ہے۔ ساتویں منصوبے میں ان مدات پر تخصیص زر میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔

رہائشی سہولت مہیا کرنا ملک کے ترقیاتی منصوبوں کا ایک اہم حصہ ہے۔ دیہات کے بے زمین کنبوں کو مکانات بنانے کے لیے قطعات اراضی مہیا کرنے اور انھیں مکان کی تعمیر کے لیے قرضے وغیرہ فراہم کرنے کے پروگرام کو ۲۰ نکاتی پروگرام میں شامل کر لیا گیا ہے جو ہماری اقتصادی ترقی کا منشور ہے۔ اس کے ساتھ ہی اقتصادی طور پر کمزور طبقوں کے لیے مکانات کی تعمیر پر زور ہے۔ یہ حکمت عملی بنیادی ضروریات کی فراہمی کے پروگرام کا لازمی جزو ہے۔ مکانات کی قلت دور کرنے کے پروگرام کے لیے تخصیص زر اور اداروں نیز پروگراموں پر عمل درآمد کرنے والی ایجنسیوں کے قیام کی صورت میں عظیم کوششوں کی ضرورت ہوگی۔ اس مقصد کے لیے تعمیر مکانات کی غرض سے مالی مدد دینے والے اداروں کی سرگرمیوں میں بھی اضافے کی ضرورت ہوگی۔

تعمیر مکانات کے تمام پروگراموں کو کامیابی سے عملی جامہ پہنانے کے لیے ادارہ جاتی انتظامات کی فراہمی ایک بنیادی شرط ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ تعمیر مکانات کے کاموں میں مصروف اداروں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ اور موجودہ اداروں کی توسیع کی جائے نیز انھیں مضبوط بنایا جائے۔ مرکزی مالیاتی اداروں اور بنکوں کو مکانات بنانے کے لیے قرض دینے کے عمل میں زیادہ سرگرمی سے شامل کرنے کی تجویز ہے۔ بے گھر افراد کو رہائش کے لیے جگہ مہیا کرنے کے پروگرام کو کلیتاً ایک منافع بخش پروگرام کے طور پر مرتب نہیں کیا جا سکتا اور بے گھر لوگوں کو چھت کا سایہ مہیا کرنے کا ایک اہم پہلو تعمیر مکانات کے لیے کم لاگت والے طریقوں کی اختراع ہے۔ کیونکہ ہندوستان اور دوسرے ترقی پذیر ملکوں میں جس بڑے پیمانے پر مکانات کی تعمیر درکار ہے اس کے لیے تعمیر کے عام طریقوں پر انحصار نہیں کیا جا سکتا جن میں مہنگے اور کمیاب عمارتی سامان مثلاً سیمنٹ، فولاد اور عمارتی لکڑی شامل ہیں۔

(اسسٹنٹ ایڈیٹر)

سائنس کی ترقی

وزیراعظم کی نظر میں

"سائنس اور ٹیکنالوجی کو بھارتی رنگ دے کر اُن مفادات خصوصی کے خلاف لڑو جو "جوں کی توں" حالت بنائے رکھنا اور درآمدشدہ ٹیکنالوجی پر انحصار رکھنا چاہتے ہیں"۔ ان الفاظ پر زور دیتے ہوئے وزیراعظم راجیو گاندھی نے اُن سائنس دانوں سے خطاب کیا جنھوں نے "بھارت میں سائنس اور ٹیکنالوجی۔ ماضی و مستقبل کے آئینے میں" سے متعلق کانفرنس میں شرکت کی تھی جو حال ہی میں نئی دلی میں منعقد ہوئی تھی۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں جس بات کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ہے ہمارے اندازِ فکر میں تبدیلی اور ایک نئے کلچر کے لیے کوشش جو ہمارے عوام کے سائنسی مزاج سے پیدا ہوا ہو۔

ہم یہاں محض سائنس یا ٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے اکٹھے نہیں ہوئے ہیں، بلکہ وسیع المعانی میں بھارت کی ترقی کے بارے میں بات چیت کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں، لیکن اس کا مطلب محض صنعتی ترقی نہیں ہے، کسی نہ کسی طرح لفظ "ترقی" کے معنی محدود ہوکر براہِ راست اقتصادی ترقی کے ساتھ جُڑ گئے ہیں۔ مگر یقینی طور پر یہ وہ امر نہیں ہے جس کا ذکر جواہر لال جی نے کیا تھا یا جس کا مطلب ہم واقعی آج لے رہے ہیں۔ ترقی کا لازماً مطلب ہے ہمارے سماج کی ترقی اور سائنس اور ٹیکنالوجی کو لازمی طور پر اُس ترقی میں کلیدی کردار ادا کرنا ہے۔ پنڈت جی نے سائنسی مزاج کو فروغ دینے کے بارے میں ذکر کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے اس لفظ کا استعمال کیا تھا۔ چنانچہ میں یہ سوال دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا ہم نے اس سائنسی مزاج کو فروغ دیا ہے یا بعض ایسی لیبارٹریوں کو فروغ دیا ہے جن سے بعض بہت زیادہ تربیت یافتہ سائنس داں وابستہ ہیں؟ یہ دو کلیتہً مختلف باتیں ہیں۔ اگر ہم پہلے اس مزاج کو فروغ دیں گے تو اُس صورت میں ہی سائنس داں تیار کیے جائیں گے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی ضروری : ہماری ترقی ترقی کے خالصتاً رُخ کے لیے بھی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ضرورت ہے۔ جب پنڈت جی نے پہلے پہل سائنس اور ٹیکنالوجی کا ذکر کیا تھا تو یہ ایک ایسا وقت تھا جب کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ بھارت اس سلسلے میں واقعی بہت کچھ کرسکتا ہے۔ اُس وقت بہت زیادہ شک و شبہ کا اظہار کیا جاتا تھا اور آپ کو بخوبی یاد ہوگا کہ اُن دنوں خالصتہً دیہی گھریلو صنعت کو اپنانے اور موزوں جدید صنعت کو اختیار کرنے کے بارے میں کس قسم کے دلائل دیے جاتے تھے اور چرچے کیے جاتے تھے اور یہ واقعی مفاداتِ خصوصی کے خلاف لڑائی چھیڑنے جا رہی ہے جو "جوں کی توں" حالت کو بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔ اس وقت ایک خاص قسم کے مفاداتِ خصوصی تھے آج وہ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ آج یہ مفاداتِ خصوصی درآمد شدہ ٹیکنالوجی میں موجود ہیں وہ مارکیٹ کے اُس حصے میں موجود ہیں جو کسی نے حاصل کیا ہے اور وہ دوسرے لوگوں کو بڑے دھارے میں آنے سے روک رہے ہیں۔ اگر آپ کو یہ بدعت ختم کرنا ہے تو اسے سائنس اور ٹیکنالوجیوں سے ہی کرنا ہوگا۔

اور ایک ایسے ماحول کو فروغ دینا ہوگا جس میں ایسا کیا جا سکے۔

پرانی ٹیکنالوجی کی جگہ نئی ٹیکنالوجی

سابقہ پالیسیوں نے بخوبی کام کیا ہے۔ ان سے متعدد شعبوں میں کافی ترقی ہوئی ہے لیکن ان سے کئی مسائل بھی پیدا ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں خلائی، ایٹمی توانائی، بعض حیاتیاتی اور بعض دیگر شعبوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہاں! ہم نے ان میں اچھا کام کیا ہے۔ لیکن کیا مجموعی طور پر اچھا کام ہوا ہے؟ کیا ان سے ہمارے عوام کے کلچر اور رہن سہن میں کوئی تبدیلی آئی ہے؟ میں نہایت اعلیٰ سائنسی انداز میں بات نہیں کرتا۔ کیا ایک عام آدمی کو سائنس اور ٹیکنالوجی کا کوئی بنیادی خیال بھی ہے؟

آج ہم آگے کی جانب دیکھ رہے ہیں۔ ایک مضبوط سائنسی اور ٹیکنالوجیکل بنیاد پر کھڑے ہو کر آگے کی جانب دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم کرنے کے لیے آگے کی جانب دیکھنا ہے کہ بھارت جو ایک موڑ پر کھڑا ہے کیونکر ترقی کرے گا؟ ہمارا ملک ایک ترقی پذیر ملک ہے لیکن ایسے بیشتر شعبے ہیں جن میں ہم ترقی پذیر ملکوں سے بہت آگے ہیں اور بلاشبہ اُن شعبوں میں ہمارے ملک کو ترقی پذیر نہیں گردانا جا سکتا لیکن سوال یہ ہے کہ ہم دیگر شعبوں میں ترقی کیونکر کر سکتے ہیں؟

درآمدی نعم البدل

ایک بنیادی مسئلہ نے ہمیشہ ہماری رفتار میں سستی پیدا کی ہے۔ یہ ہے درآمدی نعم البدل کا خبط۔ یہ امر ۲۵ برس پہلے بہت اہم تھا جب ہم بعض قسم کی مشکلات میں گرفتار تھے۔ لیکن آج صورتِ حال بہت زیادہ بدل گئی ہے۔ ہماری درآمدات میں قدرے لچک آگئی ہے۔ ہمیں ہر شئے کا نعم البدل بنانے کے لیے مجبور نہیں ہونا چاہیے۔ نعم البدل کی قیمت ایک ایسا امر ہے جس کی طرف توجہ دینا ضروری ہے۔ اگر کسی ایسے چھوٹے سے پرزے کی تیاری پر بہت زیادہ لاگت آتی ہے، جس کی درآمد پر حقیر ترین خرچ اُٹھتا ہو تو میرے خیال میں اُسے تیار کرنا مناسب نہیں۔ البتہ اگر یہ فوجی ساز و سامان یا کسی دوسری شئے کا اہم حصہ پرزہ ہو تو صورت مختلف ہو سکتی ہے لیکن روزمرہ کے استعمال میں آنے والی چیزوں کی حالت میں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں۔

درآمدی نعم البدل نے جو دوسرا مسئلہ پیدا کیا ہے میرے خیال میں وہ بہت زیادہ سنگین ہے کیونکہ اس نے ہمیشہ ہمارے خیال و فکر کو اُس ٹیکنالوجی تک محدود کیا ہے جسے بدلنے کی ہم کوشش کر رہے ہیں۔ اگر آپ کو بعض درآمدی پُرزے بدلنے ہیں اور اُن کا نعم البدل تیار کرنا ہے تو یہ پُرزے دراصل وہ تھے جسے پہلے فروغ دیا جا چکا ہے۔ یہ پُرزہ دراصل صفِ اول کی شئے نہیں ہے ورنہ وہ اُسے ہمارے ہاتھوں فروخت نہ کرتے۔ اور ہم اُسے بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور جس وقت ہم اُسے بنا لیتے ہیں تب تک وہ پُرزہ کلیتہً زائد المیعاد ہو چکا ہوتا ہے۔ اور ہم نے دراصل کیا کیا ہے؟ ہم نے اپنے سائنسدانوں اور ماہرین ٹیکنالوجی کو نہایت کمزور نشانے دئے ہیں۔ ہمیں اس رُجحان کو بدلنا ہے۔ ہمیں اُنھیں بتانا ہے کہ نہیں! آپ کو پُرزے کی جگہ پُرزہ تیار نہیں کرنا۔ آپ کو ساری چیز نئی کی نئی تیار کرنا ہے اور اس میں کوئی جدّت پیدا کرنا ہے کوئی ایسی جدّت جو ترقی یافتہ ہو اور اُس وقت دستیاب ہو۔ یہ اُس صورت میں ہی ہوگا جب ہمارے سائنسداں اور ماہرینِ ٹیکنالوجی واقعی نئے نئے میدانوں کی جانب بڑھنا شروع کریں گے اور دوسرے مُلکوں کی سائنس اور ٹیکنالوجی کے ہم پلّہ آنے کی کوشش کریں گے۔

بُنیادی ریسرچ

ہمیں اپنی ضروریات کی طرف دیکھنا ہے۔ مجھے پہلے دونوں باتوں کو الگ کرنے دو کیونکہ جیسا کہ آپ نے کہا ہے کہ بنیادی تحقیق و مطالعہ کی بڑی ضرورت ہے اور یہ کوئی ایسی شئے نہیں ہے جو اس لحاظ سے جوابدہ ہو کہ ہم نے اس سے کس قدر حاصل کیا ہے کیونکہ ہم نے جو کچھ کیا ہے کیا وہ اُس سے پایا ہے؟ میرے خیال میں بنیادی تحقیق و مطالعہ اس لحاظ سے جوابدہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی جوابدہی ہونی ہی نہیں چاہیے۔ بنیادی تحقیق و مطالعہ کے لیے بھی قدرے جوابدہی ہونا ضروری ہے۔ آپ کے لیے ضروری ہے کہ آپ اپنے نشانے مقرر کریں اور ایک خاص سمت میں پہنچنے کے لیے کوئی میعاد مقرر کریں۔

مُلکی ٹیکنالوجی کو فروغ دو

صنعت میں ہمارے لیے بڑی وسیع بُنیاد ہے لیکن یہ وسیع بنیاد کیا ہے؟ کیا یہ واقعی ہماری صنعت ہے یا کوئی ایسی شئے ہے جسے ہم نے خرید کیا ہے اور خود اسے سمجھ بھی نہیں سکے ہیں؟ میرا خیال نہیں کہ ہم نے ایک معمولی پیپر کلپ کی تیاری میں بھی کوئی بہتری پیدا کی ہے۔ ہم کوئی چیز بناتے ہیں اور درحقیقت جو کچھ ہوتا ہے وہ یہ ہوتا ہے کہ مال مسالے میں گراوٹ آجاتی ہے اور جو شروع میں قابلِ قبول شئے تیار ہوتی ہے وہ انجام کار قابلِ استرداد بن جاتی ہے۔ ہماری صنعت آج تقریباً تمام تر درآمد شدہ ٹیکنالوجی پر کام کر رہی ہے۔ درآمد شدہ ٹیکنالوجی خریدی جا سکتی ہے اور اُس کی نقل کی جا سکتی ہے لیکن ہماری صنعتیں کس قدر بھارتی فروغ شدہ ٹیکنالوجی پر واقعی کام

کر رہی ہیں؟ ان کا بہت کم حصہ ایسا کر رہا ہے۔ اس چیز کو ہمیں بدلنا ہے۔ کیا ہم نے اپنے مصنوعات کی کوالٹی کو بہتر بنانے اور اس میں عمدگی لانے کے لیے کافی کام کیا ہے؟ پھر یہ سوچنے کا انداز ہے۔ یہ ہمارے کلچر کا حصہ ہے۔ بدقسمتی سے کلچر کا مطلب رقص و سرود اور ایسی ہی دوسری باتوں سے لیا جاتا ہے۔ کلچر رقص و سرود نہیں ہے۔ کلچر سے مراد یہ ہے کہ ہم کیوں کر رہتے ہیں، کیونکر سوچتے ہیں اور کیونکر عمل کرتے ہیں۔ اگر سائنسی مزاج آج ہمارے کلچر میں داخل نہیں ہوتا تو ہم آئندہ صدی میں بہت کمزور ہو کر رہ جائیں گے۔ یہ ایک ایسا پہلو ہے جس پر ہمیں غور کرنا ہوگا۔

کوالٹی کنٹرول

کوالٹی جس سے عمدگی آتی ہے، زیادہ کوالٹی کنٹرولوں سے عمل میں نہیں آتی۔ اس کا آغاز استعمال کنندگان یا صارفین سے ہونا چاہیئے۔ انہی لوگوں سے کوالٹی کی مانگ کا آنا ضروری ہے۔ پبلک سیکٹر کے ایک کارخانے کی بنی ہوئی معمولی چیزوں کو ہی لیجیئے جو حکومت کو فراہم کی جاتی ہیں۔ کیا وہ ہمیں کباڑ دینے سے باز آ سکتے ہیں؟ کیا وہ تاخیر سے باز آ سکتے ہیں جس سے ہمارے کئی برس برباد ہو جاتے ہیں کیوں؟ کیوں کہ ٹیکنالوجی زیادہ اچھی نہیں ہے۔ وہ جس ٹیکنالوجی کا استعمال کر رہے ہیں جس کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ محض کوئی مشکل سی ٹیکنالوجی نہیں ہے۔ میں تو کارکن کو بھی ٹیکنالوجی میں شامل کر رہا ہوں کیونکہ وہ اس عمل کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اگر کارکن کا مزاج سائنسی نہیں ہے تو وہ مال میں کوالٹی پیدا نہیں کر سکے گا۔ وہ وقت پر مال تیار نہیں کر سکے گا۔ ہم اس سبب کے لیے کس قدر نقصان اٹھاتے رہیں گے۔ میرے خیال میں ہمیں پہلے اس امر کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیئے کہ ہم کسی خاص ریسرچ کو کیونکر انجام دیں۔ یہ کام ایک کمان کے تحت انجام دیا جانا ضروری ہے۔ اگر یہ ایک لیبارٹری ہے تو ساری ریسرچ اُس میں ہی کی جانی چاہیئے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ ریسرچ کا ایک خاص پہلو عمل میں لایا جائے یا پراجیکٹ کا بہت سے لوگوں تک پھیلاؤ کیا جائے اور اس کی ذمہ داری مختلف سطحوں اور مختلف مقامات پر ڈال دی جائے۔ ذمہ داری ایک خاص مقام پر ڈالی جائے وہ کوئی بھی ہو۔ اس کے علاوہ ہمیں ترقی کی پڑتال کرنے کا بھی کوئی خیال رکھنا ضروری ہے۔ کوئی ایسا مقام ہونا چاہیئے جہاں ہم ریسرچ کو منقطع کریں اور کہیں" بہت اچھا! ہم نے اس میں کوئی پیش رفت نہیں کی ہے۔ آؤ! ہم اسے ختم کر دیں۔ کوئی دوسری ریسرچ شروع کریں آؤ! ہم کسی دوسری چیز کی کھوج کریں یا اگر آپ اسے ختم کرنا نہیں چاہتے تو ممکن ہے کہ آپ سمت بدلنا چاہتے ہیں۔ ہم اس خاص سمت میں کافی کچھ حاصل نہیں کر رہے آؤ! ہم کسی دوسری سمت میں کوشش کریں۔ لہذا ہمیں اس قسم کے پڑتالی مقامات تعمیر کرنے ہونگے اور بلاشبہ ایک ایسا مقام ہونا ضروری ہے جہاں تحقیقی سرگرمیاں حتمی طور پر ختم ہونی چاہئیں اگر آپ محسوس کرتے ہوں کہ حالات اس حد تک پہونچ گئے ہیں کہ ہم نے کچھ حاصل نہیں کیا تو کام بند کر دینا چاہیئے اور کوئی دوسرا تحقیقی کام شروع کرنا چاہیئے۔ اگر ہم ایسا نہیں کر سکتے تو ہماری ٹیکنالوجی کبھی زمانے کے مطابق نہیں چلے گی اور پچھڑ جائے گی۔ شائد سائنس سے کام لینا ایک مسئلہ ہے اور ہمیں دراصل اس بارے میں زیادہ سوچنا ہوگا کہ ہم سائنس سے کیونکر کام لیں۔

چند مقاصد ۔ بہتر نتائج

آپ نے کچھ کام کیا ہے اور ہم مشن یعنی مقاصد لے کر آئے ہیں۔ اب مقاصد سے متعلق میرا تصور ہے محدود تعداد میں شعبے جن کے نشانے نہایت واضح ہوں۔ محدود تعداد اس لیے کیونکہ اگر اُن کی تعداد بہت زیادہ ہو تو وہ مشن نہیں رہتے۔ یہی وہ بات ہے جو آج ہم کسی نہ کسی طرح کر رہے ہیں۔ اگر ہمارے روبرو ۸۰ ـ ـ ، کام ہوں تخصیص کرنے کی ہم کوشش کریں تو ہم اُن میں سے کسی پر بھی اپنی توجہ مرکوز نہیں کر سکیں گے اور اُن پر ایک سا زور نہیں دیا جا سکے گا۔ جیسا کہ آجکل ہو رہا ہے۔ مشن سے متعلق تصور یہ ہے کہ ہم مثال کے طور پر چھ یا زیادہ سے زیادہ دس شعبوں کا انتخاب کریں جہاں ہم واقعی اچھا کام انجام دے سکتے ہیں۔ دس شعبے جہاں ہم ۵ یا دس برس میں اُن خاص شعبوں میں ٹیکنالوجی یا سائنس میں لیڈر ہوں گے ہمیں اُن مطلوبہ شعبوں کی سمتوں میں کوشش کرنی چاہیئے جن سے ہمیں براہ راست فائدہ پہنچے گا۔ ان میں خاندانی منصوبہ بندی ایک شعبہ ہو سکتا ہے۔ زراعت، توانائی دوسرے بنیادی شعبے ہو سکتے ہیں، جو افلاس ختم کر سکتے ہیں لیکن وہ لازماً ایسے مشن ہوں جو "اے" سے "زیڈ" تک تمام شعبوں سے متعلق ہوں۔ ان میں سائنس والوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی شامل ہوں چونکہ سائنس اسے فروغ دے سکتی ہے۔ اس لیے ٹیکنالوجی اسے عمل میں لانے اور حقیقی زندگی میں اُتارنے کی کوشش کرے گی لیکن آپ کو ایک ایسے انتظامیہ کی ضرورت ہے جو اسے واقعی کروڑوں عوام تک لے جا سکے۔ لہذا اس جیسے مشن کا محض سائنسی دباؤ سے وسیع تر عمل ہونا چاہیئے۔ ہمیں ایسے مشن بھی اختیار کرنے چاہئیں جن کے آخر میں سائنسی یا ٹیکنالوجیکل نتائج برآمد ہوں۔ ہمارے پاس ابھی تک مشنوں کی فہرست نہیں ہے۔ یہی

بھی بجلی کے مختلف نظاموں کے مابین تعلق اور میل کو ریاستی سطح سے بڑھا کر خطے کی سطح پر لانے کے لیے کئی اہم اقدامات کئے گئے۔ بجلی کے نظاموں کو چلانے اور ان کی منصوبہ بندی کے لیے ملک کو پانچ خطوں میں بانٹا گیا۔ شمالی خطے میں اتر پردیش، پنجاب، ہریانہ، راجستھان، جموں و کشمیر، ہماچل پردیش اور دہلی شامل ہیں۔ مغربی خطہ مہاراشٹر، گجرات، مدھیہ پردیش اور گوا کی ریاستوں پر مشتمل ہے۔ جنوبی خطے میں تامل ناڈو، کیرالہ، آندھرا پردیش، کرناٹک اور پانڈیچری شامل ہیں۔ مشرقی خطے میں مغربی بنگال، اڑیسہ اور بہار کی ریاستیں اور شمال مشرقی خطے میں آسام، میگھالیہ، تریپورہ، ناگالینڈ، منی پور، میزورم اور اروناچل پردیش آتے ہیں۔ خطہ جاتی گرڈوں کی تشکیل کے عمل کو تیز تر کرنے کے لیے بھارت سرکار نے ریاستی بجلی بورڈوں کو قرضے فراہم کئے تاکہ ریاستی منصوبے سے باہر ان قرضہ جات کی مدد سے بین ریاستی لائینیں بنائی جا سکیں۔ اس کے علاوہ ہر خطے میں ایک ریجنل بجلی بورڈ بھی بنایا گیا جس کے لیے عملے وغیرہ کی سہولیات بھارت سرکار نے فراہم کیں۔

غیر تسلی بخش پیش رفت

سینٹرل الیکٹریسٹی اتھارٹی کے رکن شری ایل۔ سی۔ جین نے اپنے ایک مقالہ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ گذشتہ ۱۵ برسوں میں جو تنظیمی اور مالی اقدامات کئے گئے ان کے باوجود بجلی کے مختلف نظاموں کے اعلیٰ طریق کارکردگی اور انھیں مربوط انداز میں چلانے کے سلسلے میں ہوئی پیش رفت کو کسی طور تسلی بخش نہیں کہا جا سکتا۔ ملک میں برقی نظاموں کو مربوط کرنے کی تمام تر تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی مراحل میں بڑا مقصد ہر خطے میں مختلف ریاستی گرڈوں کو متوازی انداز میں چلانا تھا، جس سے فریکوئینسی میں استحکام اور مختلف ریاستوں کے درمیان بجلی کا مختصر المدتی لین دین ہو سکے۔ شمالی خطے کے تمام ریاستی گرڈ مئی ۱۹۸۲ سے مسلسل متوازی انداز میں کام کرتے رہے ہیں۔ اگرچہ مختلف ریاستوں کے درمیان استحقاق سے زیادہ بجلی لینے کا مسئلہ درپیش رہا ہے۔ مغربی خطے میں مہاراشٹر اور گجرات کے برقی نظام تاراپور اٹامک پاور اسٹیشن کے ذریعے ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ لیکن مدھیہ پردیش فریکوئینسی میں فرق ہونے کی وجہ سے الگ تھلگ کام کر رہا ہے۔ جنوبی خطے میں کیرالہ، تامل ناڈو اور کرناٹک کے برقی نظام بڑی حد تک متوازی انداز میں کام کر رہے ہیں لیکن آندھرا پردیش کا گرڈ الگ تھلگ کام کرتا ہے۔ مشرقی خطے میں بہار، دامودر ویلی کارپوریشن اور مغربی بنگال کے برقی نظام متوازی طور پر چل رہے ہیں۔ جبکہ اڑیسہ کا گرڈ علیحدگی میں کام کر رہا ہے۔ جو نظام متوازی انداز میں چلائے جا رہے ہیں ان میں بھی مسائل کا سامنا ہوتا رہتا ہے اور واقعہ تو یہ ہے کہ اس بارے میں شکوک کا اظہار کیا جانے لگا ہے کہ منصوبہ سازی کے لیے بنیادی فلسفے میں کچھ انقلابی تبدیلیاں کئے بغیر برقی نظاموں کو مربوط انداز میں چلایا جا سکتا ہے یا نہیں۔ لہٰذا وقت آ گیا ہے کہ سارے معاملے پر گہری نگاہ ڈالی جائے تاکہ ایسے اصلاحی اقدامات کئے جا سکیں جو کم سے کم مدت میں ایک نیشنل پاور گرڈ بنانے کے ہمارے نصب العین کی تکمیل کے لیے ضروری ہیں۔

دشواریاں اور حل

ڈاکٹر ایل۔ سی۔ جین کے مطابق نیشنل پاور گرڈ بنانے کی راہ میں حائل چند دشواریاں یہ ہیں:-

(۱) ہمارے ملک میں ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مختلف ریاستیں اپنی اپنی عمل داری میں سپلائی پوزیشن کے مطابق فریکوئینسی کے مختلف معیار اختیار کرتی ہیں۔ مقامی مانگ کو پورا کرنے کے لیے کافی بجلی خود نہ پیدا کر سکنے کے سبب کمی والی ریاست اپنے برقی نظام کو معمول سے کم تر فریکوئینسی پر چلاتی ہے جس کی وجہ سے اسے ملحقہ نظاموں سے بجلی لینی پڑتی ہے۔ بہتر پوزیشن رکھنے والی ریاست کو اپنے برقی نظام پر ہونے والے مخالفانہ اثرات اور بجلی کے بھاری بہاؤ کے سبب انٹر کنکشنوں کو کھولنا پڑتا ہے۔ چنانچہ مانگ اور سپلائی کے درمیان توازن برقرار رکھنا ضروری ہے۔ دراصل ہونا تو یہ چاہیئے کہ مربوط نظام کے ہر رکن کو ایک متفقہ گرڈ فریکوئینسی اختیار کرنی چاہیئے اور اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے موزوں انتظامات کئے جانے چاہئیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں تو اس کام کے لیے نیپسک NAPSIC نامی ایک ادارہ ۱۹۶۳ء میں ہی بنا دیا گیا تھا۔ جس میں ایک چیئرمین اور ایک سکریٹری کے علاوہ مشرقی نظاموں کے برقی اداروں اور مغربی نظاموں کے چار آپریٹنگ گروپوں کے ۲۲ نمائندہ رکن شامل ہیں۔ یہ ادارہ ممبر نظاموں کے درمیان تال میل اور کنٹرول رکھتا ہے۔ بھارت میں ریجنل بجلی بورڈوں کو مربوط نظاموں کی کامیابی کے لیے اس ادارے کے اصولوں پر کاربند ہونا چاہیئے۔ لیکن گذشتہ پندرہ سالوں کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ یہ بورڈ مربوط منسلک نظاموں کو چلانے میں مختلف ریاستوں کے درمیان مطلوبہ تعاون و اشتراکِ عمل پیدا کرنے میں زیادہ موثر ثابت نہیں ہوئے ہیں۔

کر رہی ہیں؟ ان کا بہت کم حصہ ایسا کر رہا ہے۔
اس چیز کو ہمیں بدلنا ہے۔ کیا ہم نے اپنے مصنوعات کی کوالٹی کو بہتر بنانے اور اُس میں عمدگی لانے کے لیے کافی کام کیا ہے؟ پھر یہ سوچنے کا انداز ہے۔ یہ ہمارے کلچر کا حصہ ہے۔ بدقسمتی سے کلچر کا مطلب رقص و سرود اور ایسی ہی دوسری باتوں سے لیا جاتا ہے۔ کلچر رقص و سرود نہیں ہے۔ کلچر سے مُراد یہ ہے کہ ہم کیوں کر رہتے ہیں، کیونکر سوچتے ہیں اور کیونکر عمل کرتے ہیں۔ اگر سائنسی مزاج آج ہمارے کلچر میں داخل نہیں ہوتا تو ہم آئندہ صدی میں بہت کمزور ہو کر رہ جائیں گے۔ یہ ایک ایسا پہلو ہے جس پر ہمیں غور کرنا ہوگا۔

کوالٹی کنٹرول

کوالٹی جس سے عمدگی آتی ہے، زیادہ کوالٹی کنٹرولوں سے عمل میں نہیں آتی۔ اس کا آغاز استعمال کنندگان یا صارفین سے ہونا چاہیئے۔ انہی لوگوں سے کوالٹی کی مانگ کا آنا ضروری ہے۔ پبلک سیکٹر کے ایک کارخانے کی بنی ہوئی معمولی چیزوں کو ہی لیجیئے جو حکومت کو فراہم کی جاتی ہیں۔ کیا وہ ہمیں کباڑ دینے سے باز آسکتے ہیں؟ کیا وہ تاخیر سے باز آسکتے ہیں جس سے ہمارے کئی برس برباد ہو جاتے ہیں کیوں؟ کیوں کہ ٹیکنالوجی زیادہ اچھی نہیں ہے۔ وہ جس ٹیکنالوجی کا استعمال کر رہے ہیں جس کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ محض کوئی مشکل سی ٹیکنالوجی نہیں ہے۔ میں تو کارکن کو بھی ٹیکنالوجی میں شامل کر رہا ہوں کیونکہ وہ اُس عمل کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اگر کارکن کا مزاج سائنسی نہیں ہے تو وہ مال میں کوالٹی پیدا نہیں کر سکے گا۔ وہ وقت پر مال تیار نہیں کر سکے گا ہم اس سب کے لیے کس قدر نقصان اُٹھاتے رہیں گے۔ میرے خیال میں ہمیں پہلے اس امر کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیئے کہ ہم کسی خاص ریسرچ کو کیونکر انجام دیں۔ یہ کام ایک کمان کے تحت انجام دیا جانا ضروری ہے۔ اگر یہ ایک لیبارٹری ہے تو ساری ریسرچ اُس میں ہی کی جانی چاہیئے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ ریسرچ کا ایک خاص پہلو عمل میں لایا جائے یا پراجیکٹ کا بہت سے لوگوں تک پھیلاؤ کیا جائے اور اس کی ذمہ داری مختلف سطحوں اور مختلف مقامات پر ڈال دی جائے۔ ذمہ داری ایک خاص مقام پر ڈالی جائے وہ کوئی بھی ہو۔ اس کے علاوہ ہمیں ترقی کی پڑتال کرنے کا بھی کوئی خیال رکھنا ضروری ہے۔ کوئی ایسا مقام ہونا چاہیئے جہاں ہم ریسرچ کو منقطع کر دیں اور کہیں "بہت اچھا! ہم نے اس میں کوئی پیش رفت نہیں کی ہے۔ آؤ! ہم اسے ختم کر دیں۔ کوئی دوسری ریسرچ شروع کریں آؤ! ہم کسی دوسری چیز کی کھوج کریں یا اگر آپ اسے ختم کرنا نہیں چاہتے تو ممکن ہے کہ آپ سمت بدلنا چاہتے ہیں۔ ہم اس خاص سمت میں کافی کچھ حاصل نہیں کر رہے آؤ! ہم کسی دوسری سمت میں کوشش کریں۔ لہٰذا ہمیں اس قسم کے پڑتالی مقامات تعمیر کرنے ہونگے اور بلاشبہ ایک ایسا مقام ہونا ضروری ہے جہاں تحقیقی سرگرمیاں ضمنی طور پر ختم ہو جانی چاہئیں اگر آپ محسوس کرتے ہوں کہ حالات اس حد تک پہونچ گئے ہیں کہ ہم نے کچھ حاصل نہیں کیا تو کام بند کر دینا چاہیئے اور کوئی دوسرا تحقیقی کام شروع کرنا چاہیئے۔ اگر ہم ایسا نہیں کر سکتے تو ہماری ٹیکنالوجی کبھی زمانے کے مطابق نہیں چلے گی اور پچھڑ جائے گی۔ شاید سائنس سے کام لینا ایک مسئلہ ہے اور ہمیں دراصل اس بارے میں زیادہ سوچنا ہوگا کہ ہم سائنس سے کیونکر کام لیں۔

چند مقاصد ۔ بہتر نتائج

آپ نے کچھ کام کیا ہے اور ہم مشن یعنی مقاصد لے کر آئے ہیں۔ اب مقاصد سے متعلق میرا تصور ہے محدود تعداد میں شعبے جن کے نشانے نہایت واضح ہوں۔ محدود تعداد اس لیے کیونکہ اگر اُن کی تعداد بہت زیادہ ہو تو وہ مشن نہیں رہتے۔ یہی وہ بات ہے جو آج ہم کسی نہ کسی طرح کر رہے ہیں۔ اگر ہمارے روبرو ۰۰ ۔ ۔ ۷ کام ہوں جنھیں کرنے کی ہم کوشش کریں تو ہم اُن میں سے کسی پر بھی اپنی توجہ مرکوز نہیں کر سکیں گے اور اُن پر ایک سا زور نہیں دیا جاسکے گا جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے۔ مشن سے متعلق تصور یہ ہے کہ ہم مثال کے طور پر چھ یا زیادہ سے زیادہ دس شعبوں کا انتخاب کریں جہاں ہم واقعی اچھا کام انجام دے سکتے ہیں۔ دس ایسے شعبے جہاں ہم دیا دس برس میں اُن خاص شعبوں میں ٹیکنالوجی یا سائنس میں لیڈر ہوں گے ہمیں اُن مطلوبہ شعبوں کی سمتوں میں کوشش کرنی چاہیئے جن سے ہمیں براہِ راست فائدہ پہنچے گا۔ ان میں خاندانی منصوبہ بندی ایک شعبہ ہو سکتا ہے۔ زراعت، توانائی دوسرے بنیادی شعبے ہو سکتے ہیں، جو افلاس ختم کر سکتے ہیں لیکن وہ لازماً ایسے مشن ہوں جو "اے" سے "زیڈ" تک تمام شعبوں سے متعلق ہوں۔ ان میں سائنس دانوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی شامل ہوں چونکہ سائنس اسے فروغ دے سکتی ہے۔ اس لیے ٹیکنالوجی اُسے عمل میں لانے اور حقیقی زندگی میں اُتارنے کی کوشش کرے گی لیکن آپ کو ایک ایسے انتظامیہ کی ضرورت ہے جو اسے واقعی کروڑوں عوام تک لے جاسکے۔ لہٰذا اس جیسے مشن کا محض سائنسی دباؤ سے وسیع تر عمل ہونا چاہیئے۔ ہمیں ایسے مشن بھی اختیار کرنے چاہئیں جن کے آخر میں سائنسی یا ٹیکنالوجیکل نتائج برآمد ہوں۔ ہمارے پاس ابھی تک مشینوں کی فہرست نہیں ہے۔ یہی

میں بجلی کے مختلف نظاموں کے مابین تعلق اور میل کو ریاستی سطح سے بڑھا کر خطے کی سطح پر لانے کے لیے کئی اہم اقدامات کیے گئے۔ بجلی کے نظاموں کو چلانے اور ان کی منصوبہ بندی کے لیے ملک کو پانچ خطوں میں بانٹا گیا۔ شمالی خطے میں اتر پردیش، پنجاب، ہریانہ، راجستھان، جموں، کشمیر، ہماچل پردیش اور دہلی شامل ہیں۔ مغربی خطہ مہاراشٹر، گجرات، مدھیہ پردیش اور گوا کی ریاستوں پر مشتمل ہے۔ جنوبی خطے میں تامل ناڈو، کیرالا، آندھرا پردیش، کرناٹک اور پانڈیچری شامل ہیں۔ مشرقی خطے میں مغربی بنگال، اڑیسہ اور بہار کی ریاستیں اور شمال مشرقی خطے میں آسام، میگھالیہ، تریپورہ، ناگالینڈ، منی پور، میزورم اور اروناچل پردیش آتے ہیں۔ خطہ جاتی گرڈوں کی تشکیل کے عمل کو تیز تر کرنے کے لیے بھارت سرکار نے ریاستی بجلی بورڈوں کو قرضے فراہم کیے تاکہ ریاستی منصوبے سے باہر ان قرضہ جات کی مدد سے بین ریاستی لائنیں بنائی جا سکیں۔ اس کے علاوہ ہر خطے میں ایک ریجنل بجلی بورڈ بھی بنایا گیا جس کے لیے عملے وغیرہ کی سہولیات بھارت سرکار نے فراہم کیں۔

غیر تسلی بخش پیش رفت

سینٹرل الیکٹریسٹی اتھارٹی کے رکن شری ایل۔ سی۔ جین نے اپنے ایک مقالہ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ گزشتہ ۱۵ برسوں میں جو تنظیمی اور مالی اقدامات کیے گئے ان کے باوجود بجلی کے مختلف نظاموں کے اعلیٰ طریق کارکردگی اور انھیں مربوط انداز میں چلانے کے سلسلے میں ہوئی پیش رفت کو کسی طور تسلی بخش نہیں کہا جا سکتا۔ ملک میں برقی نظاموں کو مربوط کرنے کی تمام تر تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی مراحل میں بڑا مقصد ہر خطے میں مختلف ریاستی گرڈوں کو متوازی انداز میں چلانا تھا، جس سے فریکوئنسی میں استحکام اور مختلف ریاستوں کے درمیان بجلی کا مختصر المدتی لین دین ہو سکے۔ شمالی خطے کے تمام ریاستی گرڈ مئی ۱۹۸۲ سے مسلسل متوازی انداز میں کام کرتے رہے ہیں۔ اگرچہ مختلف ریاستوں کے درمیان استحقاق سے زیادہ بجلی لینے کا مسئلہ درپیش رہا ہے۔ مغربی خطے میں مہاراشٹر اور گجرات کے برقی نظام تارا پور اٹامک پاور اسٹیشن کے ذریعے ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ لیکن مدھیہ پردیش فری کوئنسی میں فرق ہونے کی وجہ سے الگ تھلگ کام کر رہا ہے۔ جنوبی خطے میں کیرالا، تامل ناڈو اور کرناٹک کے برقی نظام بڑی حد تک متوازی انداز میں کام کر رہے ہیں لیکن آندھرا پردیش کا گرڈ الگ تھلگ کام کرتا ہے۔ مشرقی خطے میں بہار، دامودر ویلی کارپوریشن اور مغربی بنگال کے برقی نظام متوازی طور پر چل رہے ہیں۔ جبکہ اڑیسہ کا گرڈ علیحدگی میں کام کر رہا ہے۔ جو نظام متوازی انداز میں چلائے جا رہے ہیں ان میں بھی مسائل کا سامنا ہوتا رہتا ہے اور واقعہ تو یہ ہے کہ اس بارے میں شکوک کا اظہار کیا جانے لگا ہے کہ منصوبہ سازی کے لیے بنیادی فلسفے میں کچھ انقلابی تبدیلیاں کیے بغیر برقی نظاموں کو مربوط انداز میں چلایا جا سکتا ہے یا نہیں۔ لہٰذا وقت آ گیا ہے کہ سارے معاملے پر گہری نگاہ ڈالی جائے تاکہ ایسے اصلاحی اقدامات کیے جا سکیں جو کم سے کم مدت میں ایک نیشنل پاور گرڈ بنانے کے ہمارے نصب العین کی تکمیل کے لیے ضروری ہیں۔

دشواریاں اور حل

ڈاکٹر ایل۔ سی۔ جین کے مطابق نیشنل پاور گرڈ بنانے کی راہ میں حائل چند دشواریاں یہ ہیں:-

(۱) ہمارے ملک میں ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مختلف ریاستیں اپنی اپنی عمل داری میں سپلائی پوزیشن کے مطابق فریکوئنسی کے مختلف معیار اختیار کرتی ہیں۔ مقامی مانگ کو پورا کرنے کے لیے کافی بجلی خود نہ پیدا کر سکنے کے سبب کمی والی ریاست اپنے برقی نظام کو معمول سے کم تر فریکوئنسی پر چلاتی ہے جس کی وجہ سے اسے ملحقہ نظاموں سے بجلی لینی پڑتی ہے۔ بہتر پوزیشن رکھنے والی ریاست کو اپنے برقی نظام پر ہونے والے مخالفانہ اثرات اور بجلی کے بھاری بہاؤ کے سبب انٹر کنکشنوں کو کھولنا پڑتا ہے۔ چنانچہ مانگ اور سپلائی کے درمیان توازن برقرار رکھنا ضروری ہے۔ دراصل ہونا تو یہ چاہیے کہ مربوط نظام کے ہر رکن کو ایک متفقہ گرڈ فریکوئنسی اختیار کرنی چاہیے اور اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے موزوں انتظامات کیے جانے چاہئیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں تو اس کام کے لیے نیپسک NAPSIC نامی ایک ادارہ ۱۹۶۳ء میں ہی بنا دیا گیا تھا۔ جس میں ایک چیئرمین اور ایک سکریٹری کے علاوہ مشرقی نظاموں کے برقی اداروں اور مغربی نظاموں کے چار آپریٹنگ گروپوں کے ۲۲ نمائندہ رکن شامل ہیں۔ یہ ادارہ ممبر نظاموں کے درمیان تال میل اور کنٹرول رکھتا ہے۔ بھارت میں ریجنل بجلی بورڈوں کو مربوط نظاموں کی کامیابی کے لیے اس ادارے کے اصولوں پر کاربند ہونا چاہیے۔ لیکن گزشتہ پندرہ سالوں کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ یہ بورڈ مربوط منسلک نظاموں کو چلانے میں مختلف ریاستوں کے درمیان مطلوبہ تعاون و اشتراکِ عمل پیدا کرنے میں زیادہ موثر ثابت نہیں ہوئے ہیں۔

مشکل تو یہ نظر آتی ہے کہ انٹر کنکشن تو بنا دیئے گئے ہیں لیکن ممبر نظاموں کو کامیابی سے چلانے کے لیے ضروری انتظامات نہیں کئے گئے ہیں یا ان پر عمل نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں ایک ضروری بات یہ ہے کہ ہر ممبر کو مانگ اور سپلائی کے درمیان توازن برقرار رکھنے کو تیار ہونا چاہیئے۔

(۲) ہمارے ملک میں مربوط و ملحق برقی نظاموں میں سلامتی یا سیکیورٹی کے انتظامات ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں خاطر خواہ نہیں ہیں۔ اس کی بڑی وجہ ناکافی اسپننگ ریزرو اور کمزور ٹرانسمشن لائنیں ہیں۔ ۵۰۰ میگاواٹ کے زیادہ بڑے یونٹ لگانے پر تو سیکیورٹی حالت اور زیادہ خراب ہو جائے گی۔

(۳) زیادہ تر برقی نظام عام طور پر وولٹیج کی کم سطحوں پر چلائے جاتے ہیں اور بالخصوص پنجاب، مہاراشٹر، ہریانہ، تامل ناڈو وغیرہ کی ریاستوں میں صورتِ حال اور بھی خراب ہوتی نظر آتی ہے کیونکہ وہاں کل لوڈ کا ۴۲ تا ۵۰ فیصد حصہ زراعتی پمپ سیٹوں پر خرچ ہوتا ہے۔ وولٹیج کی کم سطحوں کی وجہ سے جو کبھی کبھی ۲۲۰ کلو واٹ جس پر ۱۸۰ کلو واٹ ہو جاتی ہے، بجلی کا بہاؤ یکساں و مستحکم نہیں رہ پاتا اور سیکیورٹی بھی کم ہو جاتی ہے۔ اس لیے شنٹ کیپے سیٹرز (Shunt Capacitors) لگا کر صورتِ حالات کو درست کرنے کی ہر امکانی کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ بہت سے شنٹ کیپے سیٹرز جو لگائے بھی جا چکے ہیں، وہ خرابیوں کی وجہ سے کام نہیں کر رہے ہیں۔ اس مسئلے پر فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ایک اور مسئلہ زیادہ وولٹیج کا بھی ہے۔ کبھی کبھی جب بجلی کی مانگ کم ہو جاتی ہے تو اس وقت برقی گرڈوں کو اوور وولٹیج Over Voltage یعنی زیادہ وولٹیج کے مسئلے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ برقی گرڈوں کے لیے بعض وجوہات کی وجہ سے زیادہ وولٹیج کو کنٹرول کرنا ہمیشہ ممکن نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی تو ۲۲۰ کلوواٹ کے اسٹیشنوں پر ۲۵۰ تا ۲۶۸ کلو واٹ کی وولٹیج بھی دیکھنے میں آتی ہے، جس کی وجہ سے ٹرانسفارمروں وغیرہ میں اہم ساز و سامان کو نقصان پہنچتا ہے۔ زیادہ وولٹیج ہونے پر کبھی کبھی ہلکے لوڈ والی لمبی ٹرانسمشن لائنوں کا سوئچ بند کر دیا جاتا ہے مگر اس سے پاور سسٹم کی سیکیورٹی کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے زیادہ وولٹیج کے امکان والے منتخب مقامات پر شنٹ ری ایکٹر (shunt Reactor) لگانے کی ضرورت ہے۔ جن جگہوں پر وولٹیج دن میں بہت زیادہ اور کبھی بہت کم رہتی ہے وہاں پر سائن کمپینیٹر سسٹم، (Static Compensator System) لگایا جا سکتا ہے۔

(۴) مربوط برقی نظاموں کی رواں کارکردگی کے لیے لوڈ ڈسپیچ سینٹروں کے قائم کئے جانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے اب تک جو کوششیں کی گئی ہیں ان میں تال میل کی کمی رہی ہے۔ لہٰذا اب ریاستی سطح کے لوڈ ڈسپیچ سینٹروں کے قیام کے لیے ایک مربوط منصوبہ زیرِ عمل لایا جا رہا ہے۔ دہلی میں کمپیوٹر والا ایک ریجنل لوڈ ڈسپیچ سینٹر قائم کیا جا رہا ہے۔

ریاستی سطح پر صرف یو۔پی اور راجستھان وغیرہ کے چند نظاموں میں معمولی سہولیات میسّر ہیں۔ لیکن مغربی اور مشرقی خطوں میں صورتِ حال بہتر ہے کیونکہ وہاں خطے اور ریاست کی سطح پر کمپیوٹر والے لوڈ ڈسپیچ سینٹر قائم کئے جا رہے ہیں جن میں تمام جدید سہولیات موجود ہیں۔

لیکن ریاستی سطح پر ڈسپیچ کی مکمل سہولیات کی فراہمی کے لیے انھیں کافی زیادہ بڑھانا ہوگا، بالخصوص مشرقی خطے میں۔ جنوبی خطے میں خطے اور ریاست دونوں ہی سطحوں کے ڈسپیچ سینٹر کام کر رہے ہیں گو ان میں کچھ بنیادی سہولیات موجود ہیں۔ لیکن انھیں جدید طرز کا بنانے کی ضرورت ہے جس کے لیے مربوط طریقے پر اسکیمیں بنائی جا رہی ہیں۔ شمال مشرقی خطے کے لیے بھی ایک مربوط اسکیم زیرِ تشکیل ہے۔ لیکن ہر خطے اور بحیثیت مجموعی سارے ملک کے لیے طریقِ عمل اور کنٹرول کی مشترکہ و متفقہ پالیسی بنانے کی ضرورت ہے۔

مواصلات کی اہمیت

برقی نظاموں کو سلامتی، کفایت اور حسن و خوبی سے چلانے میں قابلِ انحصار مواصلاتی انتظامات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ تمام ضروری معلومات کا باہم تبادلہ انھیں کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ برقی نظاموں کے لیے مواصلات کے جو انتظامات درکار ہوتے ہیں ان میں ٹیلیفون، ٹیلی میٹرنگ، ٹیلی سگنلنگ اور ٹیلی پرنٹر وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن اس وقت بجلی کی لائنوں پر چلنے والی مواصلاتی سہولیات پر ہی انحصار رکھا جاتا ہے۔ زیادہ تر برقی نظاموں کو اپنی مواصلاتی ضروریات کے لیے محکمۂ ڈاک و تار کے چینلوں کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ لیکن شری ایل۔ سی۔ جین کے بقول یہ تجربہ غیر تسلی بخش نہیں رہا ہے۔ محکمۂ ڈاک و تار کا عملہ مواصلاتی انتظامات میں رکاوٹ کی شکائتوں پر ترجیحی توجہ نہیں دیتا جس کے نتیجے میں پاور سرکٹ کئی کئی دن خراب رہتے ہیں اور بجلی کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

شیام سُندر چاؤلہ

دیہی ترقی اور

علاقائی دیہی بینک

علاقائی دیہی بینک جو گذشتہ ایک دہائی سے سرگرم عمل ہیں۔ دیہات کی ترقی میں اہم حصہ لے رہے ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے اور ماجنیلے کسانوں کو قرضے دے کر نہ صرف زرعی پیداوار بڑھانے اور غیر زرعی سرگرمیوں کو فروغ دینے میں مدد کر رہے ہیں بلکہ اُنھیں مہاجنوں کے چُنگل سے چُھڑانے کے لیے بھی بہت کچھ کر رہے ہیں۔ لیکن اس سب کے باوجود اس عمل میں بعض مسائل پیش آ رہے ہیں جن سے اس ترقی کے مسدود ہونے کا اندیشہ ہے اور ان میں ایک مسئلہ ہے بے ایمان اور رشوت خور بینک افسروں کا ...

علاقائی دیہی بینک دیہات میں خصوصًا زرعی شعبے میں شاندار رول ادا کر رہے ہیں۔ دیہات میں بچت اور قرضوں کا سوال طویل عرصے سے زیرِ غور تھا جسے حاصل کرنے کے لیے ان بینکوں سے کام لینے کا منصوبہ بنایا گیا۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۷۵ میں یو پی کے ضلع مراد آباد میں پہلا علاقائی دیہی بینک قائم کیا گیا تھا اور اس کا اہتمام سرکاری سیکٹر کے بینک سنڈیکیٹ بینک کی طرف سے "پرتھم گرامین بینک" کے طور پر کیا گیا تھا۔ پہلے برس میں کوئی ایسے چھ بینک قائم کیے گئے جن کی تعداد بڑھ کر ۱۹۸۰ کے آخر میں ۸۷ ہو گئی اور یہ بینک تقریبًا ۱۴ اضلاع میں کام کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید ترقی کی اور اس طرح مارچ ۱۹۸۴ کے آخیر میں ان کی تعداد ۱۵۹ تک پہنچ گئی اور ان کی ۸۲۱۳ شاخیں ۲۸۱، اضلاع میں پھیل گئیں۔ اب یو پی میں ان کی تعداد سب سے زیادہ ہے یعنی ۳۵ بینک ۴۳، اضلاع میں ۱۸۰۰ شاخوں کے ذریعے اپنی سرگرمیاں انجام دے رہے ہیں۔

اگرچہ علاقائی دیہی بینک قانون میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ ان کا مقصد تجارت، زراعت، دیہی صنعتوں اور دیگر متعلقہ پیشوں کے لیے سرمایہ فراہم کرنا اور انھیں فروغ دینا ہے۔ تاہم یہ زیادہ تر زرعی سرمایہ کاری میں حصہ لے رہے ہیں۔ ان بینکوں کی طرف سے ۷۰ فیصد قرضے زراعت اور اس سے متعلق سرگرمیوں کے لیے فراہم کیے جا رہے ہیں۔

کمرشل بینکوں کے برعکس علاقائی دیہی بینک ہمیشہ ڈیپازٹوں سے بڑھ کر قرضے دے رہے ہیں۔ ان کی طرف سے شروع میں کُل ۳۲،۳۳ کروڑ روپے کے قرضے دیئے گئے تھے۔ ۱۹۷۶ کے آخیر میں ان قرضوں کی رقم ۲۰ر۳۴ کروڑ روپے ہو گئی۔ جبکہ مارچ ۱۹۷۹ء تک ان کی طرف سے ۹۷ر۱۴۲ کروڑ روپے اور جون ۱۹۸۰ تک ۲۲ر۱۸۹ کروڑ روپے کے قرضے تقسیم کیے گئے تھے۔ دسمبر ۱۹۸۳ تک ان بینکوں کی طرف سے کُل ملا کر ۷، ارب ۲ کروڑ ۲۸ لاکھ روپے کے قرضے دیئے گئے تھے جو ۲۰۴۰۷۱۴ اُدھار کھاتوں میں تقسیم کیے گئے تھے۔ علاقائی دیہی بینکوں کے کام کاج کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ ان قرضوں کی وصولی مقابلتہً بہت زیادہ ہو رہی ہے۔

جب کہ کوآپریٹو حتیٰ کہ کمرشل بینک بھی ترجیحی سیکٹر کے قرضوں کی وصولی میں ۵۰ فیصد کے نشانے کو بمشکل پار کر پاتے ہیں۔ علاقائی دیہی بینکوں کی پوزیشن اس معاملے میں بہت اچھی ہے۔ دسمبر ۱۹۸۳ کے آخیر تک ۱۴۰۱۶۶۵ کھاتوں میں ایک ارب ۸۲ کروڑ ۴۵ لاکھ روپوں کی ادائیگی واجب تھی۔ یہ رقم کُل قرضوں کا تقریباً ۸۵ء۳۵ فیصد تھی۔ ڈیپازٹ اور قرضے کا تناسب شروع سے ہی بہت اچھا رہا ہے۔ یہ تناسب ۱۰۰ اور ۱۰۸ ہے جو کسی بھی مالی ادارے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ ڈیپازٹ اور قرضے کے اعلیٰ تر تناسب اور ۸۵ فیصد قرضوں کی وصولی کو اس لحاظ سے مزید اچھا کہا جا سکتا ہے کہ ان بینکوں کی طرف سے زرعی سیکٹر کو کافی قرضہ دیا گیا ہے۔ جون ۱۹۸۴ کے آخیر تک زراعت کے لیے کُل ۵۳۶ کروڑ روپے کے قرضے دیئے گئے جن میں سے ۵۰۹ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے کی رقم بلا واسطہ سرمایہ کے طور پر دی گئی۔ علاقائی دیہی بینکوں نے گزشتہ برسوں میں زبردست ترقی کی ہے جسے دیکھتے ہوئے بعض حلقوں کی طرف سے اس خدشے کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ ممکن ہے کہ حکومت ان بینکوں کے لیے بہت بڑے بڑے نشانے مقرر کر دے جن کے پورا نہ ہونے پر ان کی ساکھ پر دھبہ لگ جائے۔

کام کاج کے کم اخراجات

ان اداروں کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ان کے قیام اور کام کاج پر کم لاگت آتی ہے۔ نشانوں کو بڑھانے اور اس کی شاخوں کو توسیع دینے سے تنخواہوں، فرنیچر اور دیگر سامان اور رکھ رکھاؤ کی لاگت اور دیگر اخراجات میں اضافہ ہونے کا امکان ہے۔ اس کے علاوہ شاخوں کی تعداد بڑھنے سے اُن کے تال میل میں اور انتظام کا مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔ واضح رہے کہ قومی ملکیت میں لیے جانے کے بعد کمرشل بینکوں کی بھاری توسیع کے دوران یہی مسئلہ پیش آیا تھا۔ لہٰذا ماہرینِ اقتصادیات کی رائے میں مناسب ہوگا کہ ان بینکوں کی توسیع کے جوش کو ایک حد کے اندر رکھا جائے تاکہ موجودہ شاخوں کا استحکام کیا جا سکے۔

اگرچہ دیہی ترقی کا زیادہ تر دارومدار علاقائی دیہی بینکوں پر ہے اور وہ اس سلسلے میں شاندار رول ادا کر رہے ہیں تاہم وہ بھی اپنی بعض جبلّی بدعتوں سے مبرّا نہیں ہیں جس کی طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ یہ امر مشاہدے میں آیا ہے کہ بڑے بڑے کسان زیادہ تعداد میں ان بینکوں سے قرضے حاصل کر رہے ہیں جبکہ وہ قانونی طور پر ان قرضوں کے مستحق نہیں ہیں۔

بعض رکاوٹیں

چھوٹے کسان بنکنگ کی سہولیات سے آگاہ نہیں ہیں۔ ان میں سے بیشتر لوگ بنکوں کی طرف سے مقرّرہ بعض غیر موافق شرائط سے خوفزدہ ہیں۔ انھیں ڈر ہے کہ ہو سکتا ہے کہ بعض مفاداتِ خصوصی کی طرف سے یہ ڈر ان میں پیدا کر دیا گیا ہو کہ اُن سے بہت زیادہ سُود وصول کیا جا سکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرضے لینے کے لیے کئی ضابطوں کو پورا کرنا پڑتا ہے اور اثر و رسُوخ کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ سب سے بڑی مشکل انھیں یہ پیش آتی ہے کہ وہ اس امر کا سرٹیفکیٹ پیش نہیں کر سکتے کہ "اُن پر کوئی قرضہ واجب نہیں ہے"۔ جو قاعدہ کی رُو سے قرضہ حاصل کرنے کے سلسلے میں پیش کیا جانا ضروری ہے۔ پھر کمرشل بنکوں میں بھی اُن کی کوئی پہونچ نہیں ہوتی۔

چنانچہ ساہوکار اور مقامی نوعیت کے لیڈر اُن کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ چھوٹا کسان ساہوکار یا مہاجنوں سے اس لیے قرضہ لینا اور زیادہ سُود دینا پسند کرتا ہے کہ وہ بینک کے قرضوں کے لیے "دھکے کھانا" نہیں چاہتا۔ جہاں تک کمرشل بینکوں کا تعلق ہے مقامی لیڈر چھوٹے کسانوں کا بینکوں سے تعارف کرا دیتے ہیں اور انھیں قرضے دلا کر اپنی مٹھی بھی گرم کر لیتے ہیں۔

چنانچہ بعض ماہرینِ اقتصادیات کی طرف سے سجھاؤ دیا گیا ہے کہ ہر کسان کو ضلع حکام کی طرف سے ایک "لون پاس بک" جاری کی جائے جس میں بینک حکام کی طرف سے قرضوں کی وصولی اور واپسی کا اندراج کیا جائے۔ اگر "لون بک" سے یہ ثابت ہو جائے کہ کسان پر کوئی قرضہ واجب نہیں ہے تو اُسے قرضہ دے دیا جائے۔

چھوٹے کسان اور قرضے

چھوٹے کسانوں کو عدم سلامتی کا احساس رہتا ہے۔ اس لیے انھیں مکان بنانے اور پُرانے قرضوں (مہاجن سے لیے گئے قرضوں) کی ادائیگی کے لیے قرضے دیئے جانے چاہئیں۔ اگر انہیں ایسے قرضے نہ دیئے گئے تو وہ مہاجن کے چنگل سے کبھی باہر نہیں آ سکیں گے۔ وہ بڑے کسانوں کی نسبت زیادہ سرگرم ہیں۔ لہٰذا انھیں بڑے کسانوں کے مقابلے میں زیادہ قرضے دئے جانے چاہئیں لیکن چھوٹے کسانوں کو دیئے جانے والے زیادہ سے زیادہ قرضے کی رقم بڑے کسانوں کے مقابلے میں کم ہونی چاہیئے۔

چنانچہ پہلے بتایا گیا ہے کہ چھوٹے کسان بڑے کسانوں کی نسبت زیادہ سرگرم ہیں۔ اُن کا

دعویٰ ہے کہ وہ زرعی پیداوار میں بھاری اضافہ کر سکتے ہیں، بشرطیکہ انھیں پمپ سیٹ لگانے کے لیے آسان شرائط پر قرضے دیئے جائیں اور اُن کی بکھری ہوئی اراضیات کی چک بندی کر دی جائے۔

دراصل چھوٹے کسانوں کو بیجوں، فرٹیلائزر، آبپاشی، کیڑے مار دواؤں اور ایسی ہی دیگر اشیا کے لیے کافی قرضے کی ضرورت ہے جس سے وہ اپنا کام کاج چلا سکیں۔ انھیں مستقل سرمایہ کی بھاری رقم کی ضرورت نہیں بلاشبہ دیہات کی تیز رفتار ترقی کے لیے محنت اور ایماندار نظم و نسق کی ضرورت ہے۔ علاقائی دیہی بینکوں، اراضی ترقیاتی بینکوں، امداد باہمی کے اداروں، چک بندی کی اسکیموں اور بجلی بورڈوں کے بے ایمان اور رشوت خور افسر دیہی ترقی میں رکاوٹ بنے ہیں۔ دیہی ترقی کی کامیابی کے لیے ایسے افسروں کا "صفایا" کیا جانا ضروری ہے۔

مارجینل کسان

مارجینل کسانوں (برائے نام زمینوں کے مالک یعنی وہ کسان جن کے پاس اپنی ایک یا دو بیگھہ زمین ہے) کو بھی قرضوں کی ضرورت ہے۔ وہ کھیتی میں کام آنے والی اشیاء کا کفایتی طور پر استعمال کرنا بھی نہیں جانتے۔ مثلاً وہ اپنی ایک دو بیگھہ زمین کے لیے سارا سال بیل گاڑی رکھتے ہیں جبکہ وہ بُوائی کے وقت آسانی سے بیل گاڑی یا ٹریکٹر کرایہ پر حاصل کر سکتے ہیں۔ انھیں دراصل کام چلانے کے لیے سرمایہ کے لیے قرض کی ضرورت ہے۔ انھیں پمپ سیٹوں اور تھریشروں وغیرہ جیسے مشینی آلات کے لیے قرضہ کی ضرورت نہیں۔ ایسے کسانوں کو متعلقہ سرگرمیوں کے لیے قرضہ دیا جا سکتا ہے۔

مارجینل کسانوں میں سے زیادہ تر (۸۰ فیصد) کے شکار ہیں۔ وہ معمول کی ضروریات یعنی شادی، مکانوں کی تعمیر، دودھ دینے والے مویشیوں کی خرید کے لیے قرضہ لیتے ہیں اور وہ بھی بہت اُونچی شرح سُود پر یعنی ۳۷ فیصد سالانہ پر مہاجن اُن سے بیگار لیتے ہیں۔ وہ اُن کے حسابات میں گڑبڑ کرتے ہیں اور عمر بھر کے لیے انھیں بندھوا مزدور بنا لیتے ہیں مہاجن قرض داروں کو ہراساں کرتے ہیں اگر وہ اُن کے فارموں پر مُفت کام نہ کریں۔ واضح رہے کہ مہاجن ہی عموماً بڑے کسان ہوتے ہیں۔ اس قسم کی صورتِ حال کا مداوا بینک ہی کر سکتے ہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ علاقائی دیہی بینک ہی مارجینل کسانوں کو کھیت اور پیداوار کے قرضے دے کر اُن کے معیارِ زندگی کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ علاقائی دیہی بینکوں سے کھیت کے قرضے لیے بغیر ایسے کسان بندھوا مزدوری کے چنگل سے آزاد نہیں ہوں گے۔ امیر غریبوں کی قیمت پر امیرتر ہوتے جائیں گے۔

مارجینل کسان قرضوں کے بغیر کاشتکاری نہیں کر سکتے کیونکہ وہ اس قدر غریب ہیں کہ وہ کچھ بچا نہیں سکتے اور انھیں ہمیشہ قرضوں پر انحصار رکھنا پڑتا ہے۔ اگر علاقائی دیہی بینک اور کمرشل بینک انھیں سرمایہ مہیا کرنے کے لیے دلیرانہ اقدام کریں تو اُن کی اقتصادی حالت بہتر ہو جائے گی ورنہ اُن کی حالت دن بدن بدتر ہوتی جائے گی اور دیہی ترقی محض ایک ڈھکوسلہ بن کر رہ جائے گی۔ انھیں بیج، فرٹیلائزر، کیڑے مار دوائیں، بھینسیں، بھیڑیں اور بیل گاڑیاں خریدنے یا آبپاشی اور کھیتی باڑی کے اخراجات ادا کرنے یا ریشم صنعت اور متعلقہ سرگرمیاں شروع کرنے کے لیے کم تر سود پر قرضے دیئے جانے چاہئیں۔ وہ پُرانے قرضوں کی ادائیگی کے لیے بینکوں سے قرضے لینے کے لیے تیار ہیں۔

صرف کمرشل اور علاقائی دیہی بینک ہی مارجینل کسانوں کی مدد کر سکتے ہیں۔ کیونکہ دیگر مالی ادارے اُن کی مدد کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ امداد باہمی کے اداروں نے صرف بڑے اور چھوٹے کسانوں کو ہی فائدہ پہنچایا ہے جو خود کو مارجینل کسان ظاہر کر کے قرضے حاصل کر رہے ہیں۔

چھوٹی تجارتیں اور گھریلو صنعتیں

چھوٹی تجارت اور گھریلو صنعت کاریگروں کے لیے زراعت سے متعلقہ ایک سرگرمی ہے۔ انھیں زرعی مقاصد کے لیے قرضے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لہٰذا بینکنگ اداروں کو چاہیئے کہ وہ انھیں تجارت اور چھوٹی صنعتوں کے لیے قرضے دیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ دیہی کاریگروں کو چھوٹی رقم کا قرضہ درکار ہوتا ہے جو عموماً ہزار روپے سے کم ہوتا ہے۔ ایسی چھوٹی رقم سے انھیں بڑا فائدہ پہونچ سکتا ہے اور اُن کا معیارِ زندگی آسانی سے بہتر ہو سکتا ہے۔ یہ امر بھی مشاہدے میں آیا ہے کہ چھوٹی تجارتوں اور دیہی صنعتوں کو دیئے گئے قرضوں کی ادائیگی رکتی نہیں۔ جہاں کہیں بھی علاقائی دیہی بینک کی شاخ نے دیہی علاقوں میں کاریگروں کو قرضے دیئے ہیں اُن کے حالاتِ زندگی بہتر ہوئے ہیں۔ اور اُن کے اندازِ کار میں تبدیلی آئی ہے۔ اُن میں مہاجنوں سے سلامتی اور حفاظت کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔

بے زمین مزدور

بے زمین مزدوروں کو قرضے کی سخت ضرورت ہے کیونکہ وہ اس قدر غریب ہیں کہ

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

ایم۔ ایل۔ بجاج

ماہی گیری کی صنعت



حال ہی میں ماہی گیری اور ماہی گیروں کے متعلق ایک چار روزہ قومی سیمینار کا انعقاد ہوا جس میں ماہی گیری کو فروغ دینے اور ماہی گیروں کی حالت بہتر بنانے پر غور کیا گیا ہے۔ وزیر اعظم جناب راجیو گاندھی کی طرف سے کوآپریٹو اداروں کے ذریعے ماہی گیروں کو قرضے دینے کی سفارش کی گئی۔

خوراک ایک ایسا مسئلہ ہے جس نے ازل سے ہی انسان کو پریشان کر رکھا ہے۔ وہ خوراک کے پہاڑ کے پہاڑ ہی کھا چکا ہے جو شمار سے باہر ہیں اور پانی کے سمندروں کے سمندر ہی پی چکا ہے جو پیمائش سے بعید ہیں۔ لیکن ابھی تک "تنور شکم، دم بدم تا فتن" والی بات ہے۔ یہ مسئلہ سال بہ سال، ماہ بہ ماہ اور دن بہ دن سنگین ہوتا جا رہا ہے کیونکہ آبادی بے تحاشہ بڑھتی جا رہی ہے اور ہر تین گھنٹے کے بعد ایک تندرست معدہ خوراک کی فرمائش ہی نہیں بلکہ اس کے لیے اصرار کرتا ہے اب وہ وقت قریب قریب آہی گیا ہے جب اکیلے دھرتی انسان کا "پیٹ بھرنے" سے قاصر ہے گی۔ چنانچہ اب انسان نے اپنی غذائی کمی کو پورا کرنے کے لیے سمندر کی طرف آنکھ لگا دی ہے جو اپنے دامن میں پروٹین سے بھرپور لامحدود غذائی ذخائر لیے ہوئے ہے۔ اگرچہ وہ سمندروں سے پہلے بھی خوراک حاصل کرتا رہا ہے لیکن اب اُس نے عالمی غذائی بحران کو دیکھتے ہوئے سمندری خوراک کے حصول کے لیے اپنی مساعی تیز تر کر دی ہیں۔ کیونکہ اب اُسے سمندروں میں اُمید کی شعاع نظر آنے لگی ہے۔

قدیم ترین پیشہ

ماہی گیری دنیا کا قدیم ترین پیشہ ہے۔ نہ صرف سمندری ساحل والے ملکوں میں ماہی گیری ہو رہی ہے بلکہ اُن ملکوں میں بھی مچھلیاں پکڑنے کا دھندہ قدیم ترین زمانے سے جاری ہے، جہاں دریا، تالاب اور جھیلیں موجود ہیں۔ تاریخی کتب میں بھی ماہی گیری کا ذکر پایا جاتا ہے۔ چنانچہ "کوٹلیہ ارتھ شاستر" میں جس کے مصنف چانکیہ بتائے جاتے ہیں، پکڑی گئی مچھلیوں کا چھٹا حصہ بطور ٹیکس ادا کرنے کو کہا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی ۲۳۰۰ برس قبل عہد میں بھی ماہی گیری بڑے پیمانے پر ہوتی تھی۔ اسی طرح شہرۂ آفاق سنسکرت شاعر کالی داس کے ناٹک "شکنتلا" میں بھی جو چوتھی صدی عیسوی میں لکھا گیا تھا، ماہی گیری کا اشارہ ملتا ہے۔

اب بھارت کے ۵۹۰۰ کلومیٹر لمبے ساحلی علاقے میں ماہی گیری ہو رہی ہے جہاں ماہی گیروں کی بستیاں اور دیہات پھیلے ہوئے ہیں۔ جن میں ایک اندازے کے مطابق ۲۰ لاکھ ماہی گیر آباد ہیں۔ ماہی گیروں کے یہ علاقے گوآ، مہاراشٹر، گجرات، آندھرا پردیش، کیرل، تامل ناڈو، پانڈیچری، کرناٹک، مغربی بنگال، اڑیسہ اور آسام کی ساحلی ریاستوں میں واقع ہیں۔ ان کے علاوہ ماہی گیروں کی کچھ تعداد ایسی بھی ہے جو دریاؤں اور جھیلوں

وی. کے. اروڑہ

انگلیوں کے اشاروں پر اطلاعات

ہندوستان نے ۱۹۵۹ میں
الیکٹرانک کی دنیا میں قدم رکھا۔ اسی سال دہلی میں
دوردرشن کا اسٹوڈیو قائم کیا گیا اور دہلی کے
باشندوں کے لیے ٹیلی ویژن سروس شروع ہوئی۔
۱۹۸۲ میں ملک نے الیکٹرانک کی دنیا میں دوسرا
قدم رکھا، جب رنگین ٹی۔ وی سروس شروع ہوئی۔
تیسرا اہم قدم تھا ۱۹۸۳ میں، اِنسٹ وَن بی
(INSAT 1-B) کا خلاء میں چھوڑا جانا۔ آج
۱۰۴ کم طاقت والے ٹرانسمیٹرز کے ذریعے،
(Low power transmittors) جو
انسٹ وَن بی سے جڑے ہیں۔ ملک کے ۷۰
فیصد عوام تک ٹیلی ویژن کا پروگرام پہنچ رہا ہے۔
ایک اور قدم تھا دہلی دوردرشن اسٹوڈیو سے
ٹیلی ٹکسٹ TELETEXT سروس کی نشریات۔
ٹیلی ٹکسٹ سروس کا افتتاح ہندوستان کے
وزیراعظم شری راجیو گاندھی نے ۱۴ر دسمبر
۱۹۸۵ کو کیا۔ ٹیلی ٹکسٹ سروس کے شروع ہونے
سے ہندوستان کا الیکٹرانک کی دنیا میں داخل
ہونے کا دوسرا دور پورا ہو گیا۔ اس قدم سے ہندوستان
اب ان ترقی پذیر ملکوں کے برابر پہنچ گیا ہے،
جہاں الیکٹرانک انقلاب (electronic
Revolution) انتہائی عروج پر ہے۔

اب دہلی کے شہری صرف ایک بٹن دبا کر اہم
موضوع پر معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ سروس
دوردرشن سے ۱۰ بجے سے دوپہر ۴-۲ بجے
تک اور شام ۴ بجے سے رات کے ۱۱ بجے تک
مفت دی جاتی ہے۔ اس کی مدد سے آپ گھر
بیٹھے اپنے رنگین ٹیلی ویژن کے (Key pad)
کو دبا کر ہندوستان اور دوسرے ملکوں کی خبریں،
ریل گاڑیوں کے آنے اور جانے کی اطلاع حاصل
کر سکتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ کونسی گاڑی
کس وقت پر آرہی ہے، یا کتنی دیر سے آرہی ہے۔
اسی طرح سے اندرونِ ملک اور بین الاقوامی
INTERNATIONAL جہازوں کے
بارے میں بھی ضروری اطلاعات مل سکتی ہیں۔ اس
سروس کے ذریعے موسم کے بارے میں اور
بین الاقوامی زرِ مبادلہ (Foreign
exchange rates) کے بارے میں بھی معلومات
حاصل ہو سکتی ہیں۔ بمبئی، کلکتہ، مدراس، احمد آباد
کے اسٹاک ایکسچینجوں کے شیئرز (حصص) کے
نرخ کے بارے میں بھی معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔
لگ بھگ ۹۰ صفحات کی اطلاعات ٹیلی ٹکسٹ سے
نشر ہوتی رہتی ہیں۔ اُمید کی جاتی ہے کہ جلد ہی ریلوے
کے مسافروں کی سہولت کے ریزرویشن کی اطلاع
بھی ٹیلی ٹکسٹ سے نشر کی جائے گی۔

اسے کیسے حاصل کریں

ہندوستان میں ٹیلی ٹکسٹ سروس کا نام
ان ٹکسٹ (Intext) دیا گیا ہے۔ اس
سروس کی شروعات سب سے پہلے انگلینڈ سے
ہوئی۔ اور بعد میں یہ مغربی ملکوں میں جلد ہی پھیل گئی۔
یہ سروس فرانسیسی تکنیک (ANTIOPE)
کی بنیاد پر ہے۔ پہلے اس طرح کی خدمات اخباروں،
دفتروں، اسٹاک ایکسچینجوں وغیرہ میں ٹیلی پرنٹر
کے ذریعے دستیاب تھیں۔ اب ایک عام آدمی
بھی تھوڑا پیسہ خرچ کرکے یہ خدمات حاصل کر سکتا
ہے۔ اس کے لیے رنگین ٹیلی ویژن کا ہونا ضروری ہے،
کیونکہ یہ سروس بلیک اینڈ وہائٹ (BLACK
& WHITE) ٹی۔وی پر دستیاب نہیں ہے۔
رنگین ٹی۔وی کی سرکٹوں میں کچھ تبدیلی اور ڈیکوڈر
(Decoder) کا لگایا جانا ضروری ہے۔
ڈیکوڈر ایک قسم کا آلہ ہے جو ٹیلی ٹکسٹ
کے اشاروں کو الیکٹرانک کی زبان-ELECTRO
NIC LANGUAGE بائٹ (Byte)

ایم۔ایل۔بجاج

ماہی گیری کی صنعت

حال ہی میں ماہی گیری اور ماہی گیروں کے متعلق ایک چار روزہ قومی سیمینار کا انعقاد ہوا جس میں ماہی گیری کو فروغ دینے اور ماہی گیروں کی حالت بہتر بنانے پر غور کیا گیا ہے۔ وزیراعظم جناب راجیو گاندھی کی طرف سے کوآپریٹو اداروں کے ذریعے ماہی گیروں کو قرضے دینے کی سفارش کی گئی۔

خوراک ایک ایسا مسئلہ ہے جس نے ازل سے ہی انسان کو پریشان کر رکھا ہے۔ وہ خوراک کے پہاڑ ہی کھا چکا ہے جو شمار سے باہر ہیں اور پانی کے سمندروں کے سمندر ہی پی چکا ہے جو پیمائش سے بعید ہیں۔ لیکن ابھی تک "تنور شکم دم بدم تافتن" والی بات ہے۔ یہ مسئلہ سال بہ سال، ماہ بہ ماہ اور دن بہ دن سنگین ہوتا جا رہا ہے کیونکہ آبادی بے تحاشہ بڑھتی جا رہی ہے اور ہر تین گھنٹے کے بعد ایک تندرست معدہ خوراک کی فرمائش ہی نہیں بلکہ اس کے لیے اصرار کرتا ہے اب وہ وقت قریب قریب آ ہی گیا ہے جب اکیلے دھرتی انسان کا "پیٹ بھرنے" سے قاصر رہے گی۔ چنانچہ اب انسان نے اپنی غذائی کمی کو پورا کرنے کے لیے سمندر کی طرف آنکھ لگا دی ہے جو اپنے دامن میں پروٹین سے بھرپور لامحدود غذائی ذخائر لیے ہوئے ہے۔ اگرچہ وہ سمندروں سے پہلے بھی خوراک حاصل کرتا رہا ہے لیکن اب اُس نے عالمی غذائی بحران کو دیکھتے ہوئے سمندری خوراک کے حصول کے لیے اپنی مساعی تیز تر کر دی ہیں۔ کیونکہ اب اُسے سمندروں میں اُمید کی شعاع نظر آنے لگی ہے۔

قدیم ترین پیشہ

ماہی گیری دنیا کا قدیم ترین پیشہ ہے۔ نہ صرف سمندری ساحل والے ملکوں میں ماہی گیری ہو رہی ہے بلکہ اُن ملکوں میں بھی مچھلیاں پکڑنے کا دھندہ قدیم ترین زمانے سے جاری ہے جہاں دریا، تالاب اور جھیلیں موجود ہیں۔ تاریخی کتب میں بھی ماہی گیری کا ذکر پایا جاتا ہے۔ چنانچہ "کوٹلیہ ارتھ شاستر" میں جس کے مصنف چانکیہ بتائے جاتے ہیں، پکڑی گئی مچھلیوں کا چھٹا حصہ بطور ٹیکس ادا کرنے کو کہا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی ۲۳۰۰ برس قبل عہد مور یہ میں ماہی گیری بڑے پیمانے پر ہوتی تھی۔ اسی طرح شہرۂ آفاق سنسکرت شاعر کالی داس کے ناٹک "شکنتلا" میں بھی جو چوتھی صدی عیسوی میں لکھا گیا تھا، ماہی گیری کا اشارہ ملتا ہے۔

اب بھارت کے ۵۹۰۰ کلو میٹر لمبے ساحلی علاقے میں ماہی گیری ہو رہی ہے جہاں ماہی گیروں کی بستیاں اور دیہات پھیلے ہوئے ہیں۔ جن میں ایک اندازے کے مطابق ۲۰ لاکھ ماہی گیر آباد ہیں۔ ماہی گیروں کے یہ علاقے گوآ، مہاراشٹر، گجرات، آندھرا پردیش، کیرل، تامل ناڈو، پانڈیچری، کرناٹک، مغربی بنگال، اڑیسہ اور آسام کی ساحلی ریاستوں میں واقع ہیں۔ ان کے علاوہ ماہی گیروں کی کچھ تعداد ایسی بھی ہے جو دریاؤں اور جھیلوں

وی. کے. اروڑہ

انگلیوں کے اشاروں پر اطلاعات

ہندوستان نے ۱۹۵۹ میں الیکٹرانک کی دنیا میں قدم رکھا۔ اسی سال دلی میں دوردرشن کا اسٹوڈیو قائم کیا گیا اور دلی کے باشندوں کے لیے ٹیلی ویژن سروس شروع ہوئی۔ ۱۹۸۲ میں ملک نے الیکٹرانک کی دنیا میں دوسرا قدم رکھا، جب رنگین ٹی۔ وی سروس شروع ہوئی تیسرا اہم قدم تھا ۱۹۸۳ میں، انسٹ وَن بی — (INSAT 1-B) کا خلا میں چھوڑا جانا۔ آج ۴۱ کم طاقت والے ٹرانسمیٹرز کے ذریعے، (Low power transmittors) جو انسٹ وَن بی سے جڑے ہیں۔ ملک کے ۷۰ فیصد عوام تک ٹیلی ویژن کا پروگرام پہنچ رہا ہے۔ ایک اور قدم تھا دلی دور درشن اسٹوڈیو سے ٹیلی ٹکسٹ TELETEXT سروس کی نشریات' ٹیلی ٹکسٹ سروس کا افتتاح ہندوستان کے وزیراعظم شری راجیو گاندھی نے ۱۴ دسمبر ۱۹۸۵ کو کیا۔ ٹیلی ٹکسٹ سروس کے شروع ہونے سے ہندوستان کا الیکٹرانک کی دنیا میں داخل ہونے کا دعویٰ پورا ہو گیا۔ اس قدم سے ہندوستان اب ان ترقی پذیر ملکوں کے برابر پہنچ گیا ہے، جہاں الیکٹرانک انقلاب (electronic Revolution) انتہائی عروج پر ہے۔

اب دلی کے شہری صرف ایک بٹن دبا کر اہم موضوع پر معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ سروس دوردرشن سے ۱۰ بجے سے دوپہر ۲-۴۵ بجے تک اور شام ۴ بجے سے رات کے ۱۱ بجے تک مفت دی جاتی ہے۔ اس کی مدد سے آپ گھر بیٹھے اپنے رنگین ٹیلی ویژن کے (Key pad) کو دبا کر ہندوستان اور دوسرے ملکوں کی خبریں' ریل گاڑیوں کے آنے اور جانے کی اطلاع حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ کونسی گاڑی کس وقت پر آ رہی ہے، یا کتنی دیر سے آ رہی ہے۔ اسی طرح سے اندرونِ ملک اور بین الاقوامی INTERNATIONAL جہازوں کے بارے میں بھی ضروری اطلاعات مل سکتی ہیں۔ اس سروس کے ذریعے موسم کے بارے میں اور بین الاقوامی زرِ مبادلہ (Foreign exchange rates) کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ بمبئی، کلکتہ، مدراس، احمد آباد کے اسٹاک ایکسچینجوں کے شیئرز (حصص) کے نرخ کے بارے میں بھی معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ لگ بھگ ۹۰ صفحات کی اطلاعات ٹیلی ٹکسٹ سے نشر ہوتی رہتی ہیں۔ اُمید کی جاتی ہے کہ جلد ہی ریل کے مسافروں کی سہولت کے ریزرویشن کی اطلاع بھی ٹیلی ٹکسٹ سے نشر کی جائے گی۔

اسے کیسے حاصل کریں

ہندوستان میں ٹیلی ٹکسٹ سروس کا نام ان ٹکسٹ (Intext) دیا گیا ہے۔ اس سروس کی شروعات سب سے پہلے انگلینڈ سے ہوئی۔ اور بعد میں یہ مغربی ملکوں میں جلد ہی پھیل گئی۔

یہ سروس فرانسیسی تکنیک (ANTIOPE) کی بنیاد پر ہے۔ پہلے اس طرح کی خدمات اخباروں' دفتروں، اسٹاک ایکسچینجوں وغیرہ میں ٹیلی پرنٹر کے ذریعے دستیاب تھیں۔ اب ایک عام آدمی بھی تھوڑا پیسہ خرچ کر کے یہ خدمات حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے لیے رنگین ٹیلی ویژن کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ یہ سروس بلیک اینڈ وہائٹ (BLACK & WHITE) ٹی۔وی پر دستیاب نہیں ہے۔ رنگین ٹی۔وی کی سرکٹوں میں کچھ تبدیلی اور ڈیکوڈر (Decoder) کا لگایا جانا ضروری ہے۔

ڈیکوڈر ایک قسم کا آلہ ہے جو ٹیلی ٹکسٹ کے اشاروں کو الیکٹرانک کی زبان -ELECTRO NIC LANGUAGE بائٹ (Byte)

میں حاصل کر کے اس کو آسان لفظوں اور ہندسوں میں بدل کر ٹیلی ویژن کے پردے پر دکھاتا ہے۔ اس طرح آپ تصویر کی جگہ لکھے ہوئے الفاظ اور ہندسے دیکھتے ہیں جو آپ کو مختلف جانکاری فراہم کرتا ہے۔ خاص بات تو یہ ہے کہ اس کی نشریات دوردرشن کی عام نشریات میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا۔ آپ جب چاہیں پروگرام دیکھتے دیکھتے ایکدم انٹکسٹ کی اطلاع لے سکتے ہیں۔ اور (Key pad) کا بٹن دوبارہ دباکر اپنے پہلے پروگرام کو پھر سے دیکھ سکتے ہیں۔ کمال تو صرف انگلی دبانے کا ہے۔

(Key pad) فاصل کنٹرول (remote control) کے ذریعے تبدیلی لاتا ہے جو انفرا۔ ریڈ (Infra-red) شعاعوں سے کام کرتا ہے۔ اگر کنجی پیڈ اور ڈیکوڈر کے بیچ کوئی رکاوٹ ہے (یعنی کوئی سامان درمیان میں رکھا ہو یا کوئی آدمی کھڑا ہو) تو یہ کام نہیں کرتا ہے۔

کئی کمپنیاں ڈیکوڈر کو ۴۵۰۰ روپیے میں دے رہی ہیں جبکہ ان کے انجینئر اس کی مفت خدمات کے لیے دیئے جاتے ہیں۔ مفت خدمات کا مطلب یہ ہے کہ ٹی۔ وی کو سرکٹوں میں بدلنا اور گھر پر آکر ڈیکوڈر کا آپ کے رنگین ٹی۔ وی کے ساتھ تال میل ملانا۔

انٹکسٹ کا صفحہ

انٹکسٹ کے ہر صفحہ پر ۲۵ لائنیں ہوتی ہیں اور ہر لائن میں ۴۰ الفاظ یا ہندسے ہوتے ہیں۔ لیکن دہلی کی نشریات میں انٹکسٹ میں ایک صفحے پر ۱۸ لائنیں ہیں اور ہر لائن میں ۳۸ الفاظ یا ہندسے ہیں۔ نشری خبریں دو حصوں میں منقسم ہیں۔ اسٹیٹک (Static) یعنی جو کھڑی ہے، ساکن ہے یا جلدی نہیں گھوم رہی ہے۔ دوسری ہے سائی کلک (Cyclic) یعنی جو تیز رفتار سے آجا رہی ہو۔ ساکن اطلاع پیڈ کی کنجی دبانے پر تقریباً ۳۰ سیکنڈ بعد ٹی۔ وی کے پردے پر آتی ہے اور سائی کلک اطلاع ۲۰ سیکنڈ میں پردے پر آجاتی ہے اور سائی کلک اطلاع میں ہے — خبریں (عام)، مالیاتی خبریں اور کھیل کود کی خبریں اسٹاک ایکس چینجوں کے ساکن حصے میں اطلاع آتی ہے۔

پردے پر اطلاع سات رنگوں میں دکھائی جا سکتی ہیں۔ اس لیے مختلف طرح کی خبریں الگ الگ رنگوں میں دکھائی جاتی ہیں۔ تاکہ الگ الگ رنگوں کو دیکھنے سے آنکھوں کو لطف بھی آئے اور وہ تھکیں بھی نہیں۔

خاص اطلاع پردے پر فلیشنس FLASH کے طریقوں سے دکھائی جا سکتی ہے۔

ٹیلی ٹیکسٹ اشارے

ٹیلی ٹکسٹ اشارے اس وقفہ میں بھیجے جاتے ہیں، جب ٹی۔ وی کی تصویر کے آخری اور شروع کے درمیان کا خالی وقت ہو۔ یہ وقفہ کل سیکنڈ کے بہت ہی چھوٹے حصے (۰،۲ امل سیکنڈ) کے برابر ہوتا ہے اور اس کے اشارے ٹی۔ وی کے عام پروگرام میں چھپے ہونے کی وجہ سے ٹی۔ وی کے پردے پر دکھائی نہیں دیتے انھیں دیکھنے کے لیے ٹی۔ وی کے ساتھ ڈیکوڈر DECODER کا جوڑنا ضروری ہوتا ہے۔ جس وقفہ میں ٹیلی ٹکسٹ کے اشارے بھیجے جاتے ہیں اسے Vertical Blanking Interval کہتے ہیں۔

ڈیکوڈر عام بریف کیس کی شکل کا ہوتا ہے اور ٹی۔ وی کے اوپر رکھا جاتا ہے اور ٹی۔ وی کے ساتھ پلگ، تار وغیرہ سے جڑا ہوتا ہے۔

ڈیکوڈر کا طریقۂ عمل (Remote Control) اور Key pad سے ہوتا ہے اور یہ دیکھنے میں ٹی۔ وی کے Remote Control نظام کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ جب ٹیلی ٹکسٹ کا بٹن دبایا جاتا ہے تو ٹی۔ وی کے پردے پر کچھ نہیں دکھائی دیتا اور ۲۰ سے ۳۰ سیکنڈ بعد ٹیلی ٹکسٹ کا صفحہ ٹی۔ وی کے پردے پر آجاتا ہے۔ صفحہ کا رنگ اور الفاظ اور ہندسوں کا رنگ الگ الگ ہوتا ہے تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو اور آنکھوں پر اثر نہ پڑے۔ ٹیلی ٹکسٹ کا صفحہ آپ اپنی مرضی کے مطابق جتنی دیر چاہیں پردے پر روک کر دیکھ سکتے ہیں اور جب چاہیں اسے ہٹا سکتے ہیں۔

فی الحال ڈیکوڈر کے سارے پرزے دوسرے ملکوں سے درآمد کیے جا رہے ہیں جنھیں یکجا کر کے الیکٹرانک ڈیپارٹمنٹ کی سرکاری کارپوریشن الیکٹرانک بزنس اینڈ ٹیکنیکل ڈویلپمنٹ کارپوریشن کو فراہم کرتی ہے۔ ہندوستان کی کمپیوٹر انڈسٹری ماسٹر ایپروم (Master Eprom) دوسرے (EPROM) بنا رہا ہے۔ ہندوستان میں ڈیکوڈر جس طرح کے طرز پر تیار کیے جا رہے ہیں وہ ایپروم ماڈل ہے۔

اشاروں کے ماخذ

۱۴ نومبر ۱۹۸۵ کو جب یہ سروس شروع کی گئی تو صرف ۸۰ صفحات ٹیلی ٹکسٹ کے ذریعے نشر ہوئے تھے۔ اب اس کی تعداد ۹۰ صفحات ہو گئی ہے اور بعد میں اس کی تعداد بڑھ کر ۱۰۰ ہو جائے گی۔ مغربی ملکوں میں اس کی تعداد ۸۰۰ صفحوں تک پہنچ چکی ہے۔

ٹیلی ٹکسٹ یعنی انٹکسٹ سروس کے ماخذ میں چار ہاٹ لائن HOT LINE ٹیلیفون ہیں۔ ایک ٹیلیفون سے خبریں اور اندرون ملک پروازوں کے بارے میں

(باقی صفحہ پر)

ظہیر نیازی

ہندوستان میں کوئلے کی صنعت

"کول انڈیا" کے قیام سے پہلے

کوئلے کی صنعت میں انتظامی بہتری اور صحتمند کارکردگی کے پیشِ نظر کچھ تبدیلیاں خاص طور پر اس وقت کی گئیں جب ۱۹۷۱ میں بہار و بنگال کی ۱۴۴ کوئلہ کانیں قومی تحویل میں لے لی گئیں. "اسٹیل اتھارٹی آف انڈیا" کے طرز پر کول سائنس اتھارٹی آف انڈیا (COAL MINES AUTHORITY OF INDIA) کا قیام عمل میں آیا اور کوکنگ کوئلے کی خصوصی اہمیت کے پیشِ نظر جھریا کول فیلڈ کی تقریباً سبھی کوئلہ کانوں کو "بھارت کوکنگ کول لمیٹڈ" نامی کمپنی کی ماتحتی میں دے دیا گیا۔ نیشنلائزیشن کے دوسرے مرحلے (۱۹۷۳) میں ملک بھر کی تقریباً ۹۵ فیصد کوئلہ کانیں قومی تحویل میں لے لی گئیں۔

کوئلے کی موجودہ صنعت ان مندرجہ ذیل کمپنیوں کے ماتحت چل رہی ہے. (۱) کول انڈیا لمیٹڈ. (۲) سینگارینی کولریز کمپنی لمیٹڈ. (۳) انڈین آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی لمیٹڈ. (۴) ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی، ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل

کمپنی (TISCO) ٹاٹا کی ملکیت ہے۔ اس کمپنی کے ماتحت جھریا کول فیلڈ، ہزاری باغ کول فیلڈ (ویسٹ بوکارو) اور کچھ اور علاقوں میں کچھ کانیں ہیں۔ انڈین آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی (ISCO) بھی پہلے "ٹیسکو" کی طرح پرائیویٹ کمپنی تھی۔ اس کمپنی کے سرکاری تحویل میں چلے جانے کے بعد اس کے ماتحت برن پور، اور اس کے نواحی علاقے میں واقع تمام کانیں بھی سرکاری ملکیت میں چلی گئیں۔ "سینگارینی کولریز کمپنی لمیٹڈ" میں حکومت ہند اور ریاستی حکومت آندھرا پردیش کی ساجھے داری ہے اور اس کمپنی کی کوئلہ کانیں 'گوداوری' ندی کی وادی میں کھمم عادل آباد وغیرہ کے علاقے میں واقع ہیں۔

جہاں تک کول انڈیا (COAL INDIA) کا تعلق ہے، یہی سب سے بڑی کوئلہ کمپنی ہے اور ملک کی تقریباً ۹۵ فیصد کوئلہ کانیں اس کے ماتحت ہیں ۔ اس کا قیام یکم نومبر ۱۹۷۵ء (۱۹۷۵-۱۱-۱) کو عمل میں آیا۔ اسی اہم ترین تاریخ کو پبلک سیکٹر کی بڑی کمپنی این سی ڈی سی (جو سی ایم اے' C.M.A. سینٹرل زون' کے نام سے

جانی جانے لگی تھی)، ٹوٹ گئی اور ' NCDC کا نیا نام CCL پڑا۔ این سی ڈی سی کی مدھیہ پردیش میں واقع بہت سی کانیں "ویسٹرن کول فیلڈ" میں چلی گئیں. یہ پانچ کمپنیوں کو ملا کر بنائی گئی. انکے نام ہیں ۱. سی سی ایل ۲. بی سی سی ایل ۳. ای سی ایل ۴. ڈبلیو سی ایل ۵. سی ایم پی ڈی آئی.

سی سی ایل C.C.L. یعنی سینٹرل کول فیلڈ لمیٹڈ، کا صدر دفتر رانچی، بہار میں رہا اور اس کے ماتحت بہار، اڑیسہ اور مدھیہ پردیش کے کچھ علاقوں کی کانیں رہیں۔

(۲) بی سی سی ایل BCCL یعنی 'بھارت کوکنگ کول لمیٹڈ' کا صدر دفتر دھنباد میں رہا اور جھریا اور دھنباد کے علاقے کی کوئلہ کانیں اس کے ماتحت آئیں ۔

۳۔ ای سی ایل ECL یعنی 'ایسٹرن کول فیلڈ لمیٹڈ'، کا صدر دفتر سنکتوریہ میں رکھا گیا اور بہار کے کچھ علاقے کی اور بنگال کے بہت بڑے علاقے کی کوئلہ کانیں اس کمپنی میں آئیں ۔

(۴) ڈبلیو سی ایل WCL یعنی 'ویسٹرن کول فیلڈ لمیٹڈ' کا صدر دفتر ناگپور میں رہا اور مدھیہ پردیش

اور بہار اسٹیٹ کی کوئلہ کانیں اس کے ماتحت آتی ہیں۔

(۵) سی ایم پی ڈی آئی CMPDI یعنی سینٹرل مائننگ پلاننگ اینڈ ڈیزائننگ انسٹی ٹیوٹ کا صدر دفتر بھی سی سی ایل کی طرح رانچی میں ہے اور اس کا کام تمام کوئلہ کمپنیوں کو تکنیکی امور میں تعاون دینا ہے۔

(۶) چھٹی کمپنی آسام کے کوئلہ علاقے پر ہے اور اس کا نام ہے "نارتھ ایسٹرن کول فیلڈ لمیٹڈ" NECL یہ کمپنی مندرجہ بالا پانچ کمپنیوں کے بعد قائم ہوئی۔

کول انڈیا ملازمت کا ایک بہت بڑا ذریعہ

کول انڈیا ہمارے ملک میں پبلک سیکٹر میں، دوسرا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ (ملک کا سب سے بڑا ادارہ ہے "انڈین ریلوے") اس قومی ادارے میں مستقل ملازموں کی تعداد چھ لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔ کوئلہ سے جڑے ہوئے کاموں میں ٹھیکیداروں کے ماتحت جو بہت سارے ملازمین کام کرتے ہیں اور اسی کوئلے سے متعلقہ متعدد جنس کی تیاری کے کاموں والے پلانٹوں، کارخانوں اور فیکٹریوں میں جو لوگ ملازم ہیں ان کی بڑی تعداد کو بھی جوڑیں تو یہ ریلوے سے بھی بڑا ادارہ ہے۔ یہ ایک طرح سے سب سے بڑا ذریعۂ ملازمت ہے۔

کول انڈیا میں لگی پونجی

کول انڈیا میں ایک بہت بڑی پونجی لگائی گئی ہے۔ اس کی معاون کمپنی "سی سی ایل" کا سرمایہ ۴۱۴ کروڑ روپے سے بھی زائد تھا۔ ۱۹۸۰ کے اعداد و شمار کے مطابق بی سی سی ایل کا ۲۱۱ کروڑ روپے کے قریب سرمایہ تھا۔

بھاری اور دیو قامت مشینوں پر بہت زیادہ لاگت درکار ہوتی ہے۔ ایک ایک ڈریگ لائن کی قیمت ۹ کروڑ روپے سے بھی زیادہ ہے۔ ایک ڈمپر (بھاری ٹرک) ۱۵ سے ۲۵ لاکھ تک کی قیمت کا ہوتا ہے۔ ڈرل، بلڈوزر، شاول وغیرہ بھی بہت قیمتی ہیں۔ یہ مشینیں جدید ترین تکنیک کی حامل ہیں اور کھلی کانوں میں استعمال ہوتی ہیں۔ زمین دوز کانوں کے مقابلے کھلی کانیں محفوظ بھی ہوتی ہیں، مفید بھی اسی لیے موجودہ ۳۵ فیصد کی جگہ ۶۵ فیصد کام مستقبل قریب میں اسی جدید ترین تکنیک سے کرنے کے منصوبے ہیں۔

کول انڈیا کے ملازمین بیحد خوشحال!

اوور ٹائم کے بوتے پر یہاں کچھ لوگ چار چار ہزار روپے ماہوار تک کما لیتے ہیں۔ ۸۱-۱۹۸۰ کے مالی سال کے اختتام پر جب انکم ٹیکس کٹنے کا وقت آیا تو دو ملازم (ایک مکینک اور دوسرا بلڈوزر آپریٹر) ایسے بھی "منظر عام" پر آئے جن کے بارے میں یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ ان میں سے ایک کی سالانہ آمدنی تھی ۴۶ ہزار روپے، دوسرے کی ۴۸ ہزار روپئے دوسرے لفظوں میں کولری کے پراجیکٹ افسر عرف "بڑے صاحب" کی تنخواہ سے بھی زیادہ۔ لیکن ایسا ہر کولری میں نہیں۔

بحیثیت مجموعی "کول انڈیا" کے افسر اور سپروائزر تو بہت بہتر تنخواہ اور سہولتیں پاتے ہی ہیں، مزدوروں کو بھی جو تنخواہ اور سہولتیں فراہم ہیں وہ پبلک سیکٹر کے بہت سارے اداروں میں نہیں۔ ۲ سے ۸ آٹھ روپے ماہوار کرایہ پر کوارٹر، بجلی، پانی، ایندھن، دوائیں مفت، ہونہار طالب علموں کو وظائف، خاندانی منصوبہ بندی کی اسکیموں میں سلائی مشینوں وغیرہ کے تحائف، کھیل کود، ثقافتی امور، بہتر کارکردگی وغیرہ کے لیے حوصلہ افزائی اور انعامات، ملک میں اور ملک سے باہر غیر ملکوں میں تربیت حاصل کرنے کے بہترین مواقع، اور سماجی فلاح و بہبود — کوآپریٹو اسٹور، کریڈٹ سوسائٹی، وغیرہ کی سہولتیں، یہ سب یہاں فراہم ہوتی ہیں، لوگ اس سے خاطر خواہ طور پر مستفیض ہوتے ہیں۔

کوئلے کی اہمیت، ہمارے ملک کے لیے ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے لیے ہمارے آج کے زمانے میں بہت بڑھ گئی ہے۔ اس کے پیش نظر ہماری قومی حکومت نے اس صنعت کو فروغ دینے کے لیے بڑی بڑی اسکیمیں ترتیب دی ہیں۔ جن سے اچھے نتائج سامنے آرہے ہیں۔ ●

بقیہ: بجلی کا سفر

ایسی صورت میں ایک ہی راستہ ہے کہ پاور اسٹیشنوں کے لیے خصوصی لنک فراہم کیے جائیں۔ ابھی حال تک صرف اتر پردیش بجلی بورڈ اور دامودر ویلی کارپوریشن کو ہی اپنا مائکروویو کمیونکیشن نظام رکھنے کا اختیار دیا گیا ہے۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملک کے لیے ایک نیشنل پاور گرڈ بنانے کی کوششوں کی رفتار قدرے سست رہی ہے اور اس کی وجہ مختلف تکنیکی، کمرشل اور تنظیمی عناصر ہیں۔ ان عناصر پر قابو پانے کے لیے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود مربوط برقی نظاموں کی کامیابی کا راز اس میں مضمر ہے کہ برقی نظاموں کے تمام رکن کارکردگی کے ڈسپلن کو برقرار رکھیں اور باہمی تعاون و اشتراک عمل کے جذبے سے کام کریں۔ ●

بقیہ، ساتویں منصوبے میں بنیادی ضرورتوں کی تکمیل

دیہات میں بجلی پہنچانے کے لیے ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے بجٹ میں ۴۹۰ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے رکھے گئے ہیں۔ ۹۰-۱۹۸۹ تک ۶۵ فیصد دیہات میں بجلی آجائے گی۔

دیہات میں بے زمین مزدوروں کے لیے تعمیر مکانات کے واسطے اراضی دی جا چکی۔ اس پروگرام کے تحت ۷ لاکھ ۲۰ ہزار کنبوں کو تعمیر مکانات کے لیے جگہ فراہم کی جائے گی۔ اس طرح اس پروگرام کا نشانہ سو فیصد مکمل ہو سکے گا۔ ۳۷ لاکھ دس ہزار ایسے کنبوں کو جن کے پاس پہلے سے مکان بنانے کی جگہ ہے، تعمیر مکانات کے لیے قرضے وغیرہ دیے جائیں گے۔

۱۹۹۰ تک تمام بے زمین مزدوروں کو تعمیر مکانات کے لیے امداد مل سکے گی۔ اس امداد میں تعمیر مکانات کے لیے جگہ، عمارتی سامان، پینے کا پانی اور سڑکوں وغیرہ کی سہولتیں شامل ہیں۔ شہری علاقوں میں گندی بستیوں کی صفائی کے لیے ۲۶۹ کروڑ ۵۵ لاکھ روپے فراہم کیے گئے ہیں۔ ابھی تک گندی بستیوں میں رہنے والے ایک کروڑ ۵۰ لاکھ افراد میں سے ۹۰ لاکھ افراد کو اس پروگرام سے مدد پہنچایا جا سکے گا۔ ۱۹۹۰ تک جملہ شہری آبادی جو کہ گندی بستیوں میں رہتی ہے، اس پروگرام سے فائدہ اٹھا سکے گی۔ اس پروگرام کے تحت پینے کے پانی کی سہولت، سیوریج، سڑکوں کی تعمیر، پانی کے نکاس کے لیے نالیوں کی تعمیر اور اجتماعی سنڈاس وغیرہ شامل ہیں۔ شیڈولڈ کاسٹ آبادی کی بستیوں کو بہتر بنانے پر خاص زور ہوگا۔

ساتویں منصوبے میں ایک کروڑ دس لاکھ مستحق آبادی کو تغذیہ بخش خوراک فراہم کی جاتی رہے گی۔ اس کے تحت خوراک کو تغذیہ بخش بنانے والی اشیاء کی فراہمی اور بچوں کی نشو و نما کی سروسوں کی فراہمی وغیرہ پر زور دیا جائے گا۔ اس مد میں ۱۲۱ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے کے اخراجات کا اندازہ ہے۔ دوپہر کے کھانے کی اسکیم کو صحت، پینے کے پانی کی فراہمی اور صفائی ستھرائی کے پروگرام کے ساتھ مربوط کر دیا جائے گا۔

کم از کم ضرورتوں یا بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کا پروگرام پانچویں پنجسالہ منصوبے میں شروع کیا گیا تھا۔ اس کے ذریعے ایک مقررہ وقت میں بنیادی سروسوں اور سہولتوں کی فراہمی کے لیے زور دیے جانے کی بات کہی گئی تھی مقصد یہ تھا کہ عوام کو ایک کم سے کم معیار زندگی ضرور میسر آسکے۔ اس کے ذریعے علاقائی بنیادوں پر پائے جانے والے عدم توازن کو دور کرنے پر بھی زور ہے۔ یہ انسانی فروغ کے لیے بنیادی حیثیت کا حامل پروگرام ہے۔ اسے انسانی وسائل کے فروغ کے لیے بہترین سرمایہ کاری کہا جا سکتی ہے۔ ●

بقیہ، بنجر زمین کو زرخیز بنانے کے اقدامات

ماحولیات کا تحفظ پالیسی کے طور پر نہیں بلکہ عوام کے عملی اشتراک کی بدولت ہوتا ہے۔

خود وزیر اعظم" زمین کے استعمال اور بنجر زمین کے فروغ سے متعلق قومی کونسل کے چیئرمین ہیں، اور ریاستوں نیز مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے وزرائے اعلیٰ اس کے ممبر ہیں۔ بنجر زمین کے فروغ کا بورڈ جون ۱۹۸۵ سے کام کر رہا ہے۔ اور اس کی سربراہ ڈاکٹر کملا چودھری ہیں۔ بورڈ کا مقصد یہ ہے کہ بڑے پیمانے پر جنگلات اور درخت اگانے کے پروگراموں سے ملک کی بنجر زمینوں کو پیداوار کے قابل بنایا جائے۔ اسے ملک میں بنجر زمینوں کے انتظام اور فروغ کے لیے آئندہ کے لیے منصوبے اور پروگرام وضع کرنے ہیں۔ نیز ملک کی ان بنجر زمینوں کی نشاندہی بھی کرنی ہے۔ جو اس پروگرام کے تحت آئیں گی۔

دوسری باتوں کے علاوہ بورڈ کو تعلیم کے ذریعے عوام میں، بنجر زمین کے فروغ کے حق میں ایک آگہی بھی پیدا کرنی ہے۔ رضا کار ایجنسیاں ہی زیادہ تر بورڈ کے کام میں معتبر کردار ادا کریں گی۔

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ مذکورہ بورڈ کو سرکاری نیز غیر سرکاری ایجنسیوں کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ تاکہ حکمت عملی کے ایک ضروری عنصر کے طور پر دیہی عوام کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے۔ بورڈ قائم کرنے میں حکومت نے یہ بات اچھی طرح واضح کر دی ہے کہ جنگل کی پیداوار کے مقابلے میں صنعتی مانگوں پر عوام کی ضروریات کو ترجیح دی جائے۔ اسکیم کا اہم مدعا یہ ہے کہ جنگلات کے قریب رہنے والے غریب عوام کی ایندھن، چارے اور چراگاہوں سے متعلق ضروریات کا دھیان رکھتے ہوئے ان کے رہن سہن کا معیار اونچا کیا جائے۔

یہ کام بڑی اہمیت کا حامل ہے لیکن صرف اس سے ہم اس حالت تک پہنچ سکتے ہیں جہاں ملک میں جنگلات کا رقبہ بہتر ہو اور اس سے بالآخر ہمیں زیادہ صاف اور زیادہ محفوظ ماحول میسر ہو۔ ●

اِدھر اُدھر سے

وزیرِ اعظم کی سائنسی مشاورتی کونسل

حکومت نے وزیرِ اعظم کے لیے سائنسی امور سے متعلق مشاورتی کونسل قائم کی ہے جو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنسز، بنگلور کے ڈائریکٹر پروفیسر سی این آر راؤ کی صدارت میں قائم کی گئی ہے۔

مذکورہ کونسل ایک مشاورتی ادارہ ہوگی اور وزیرِ اعظم کو (الف) سائنس اور ٹیکنالوجی کو درپیش بڑے بڑے معاملات (ب) ملک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی حالت اور جس سمت میں اسے آگے بڑھنا چاہیے نیز (ج) اکیسویں صدی کے خیال سے مستقبل کے منصوبے کے بارے میں مشورے دے گی۔

پروفیسر ایم۔ جی۔ کے۔ مینن کو وزیرِ اعظم کے مُشیر برائے سائنسی امور کی حیثیت سے مقرر کیا گیا ہے۔ وہ منصوبہ بندی کمیشن کے ممبر بھی رہیں گے

مدھیہ پردیش کا سالانہ بجٹ

۱۹۸۶-۸۷ کے لیے مدھیہ پردیش کے منصوبے کا سالانہ بجٹ ۱۳۸۱ کروڑ روپے مختص کیا گیا ہے۔

منی پور کا سالانہ منصوبہ

۱۹۸۶-۸۷ کے لیے ریاست منی پور کے منصوبے کا بجٹ ۸۰ کروڑ روپے مقرر کیا گیا ہے۔ ریاست کے لیے سالِ رواں کا بجٹ ۷۰ کروڑ روپے ہے۔ اور ساتویں منصوبے کے لیے لگ بھگ ۳۴۰ کروڑ روپے مختص کیے گئے ہیں۔

تیل کی تلاش کے لیے بھارت اور رُوس کا تعاون

بھارت اور روس نے حال ہی میں ایک معاہدے پر دستخط کیے، جس میں دونوں ملکوں نے کیمبے اور کاویری کی وادیوں میں ان علاقوں کا قطعی تعیّن کیا گیا ہے۔ جہاں روس کے ماہرین تیل کی وسیع اور مربوط تلاش کا کام انجام دیں گے۔

کیمبے کی وادی میں روس کے ماہرین کی ٹیم پٹن، تھارڈ اور سینچور کے نشیبی علاقوں میں ۱۵۰۰ مربع کلومیٹر علاقے میں تیل کی تلاش کرے گی۔

تیل کی دریافت

حکومت نے اپنے دور دراز ساحلی علاقوں کے ۲۷ بلاکوں میں تیل دریافت کرنے کی غرض سے تیل کی بڑی بین الاقوامی کمپنیوں سے ٹنڈر طلب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ دور از ساحل علاقوں کے جن بلاکوں کے لیے مذکورہ ٹنڈر طلب کیے گئے ہیں ان میں مغربی ساحل کا سوراشٹر طاس اور کیرالا کونکن طاس اور مشرقی ساحل کے کاویری، کرشنا گوداوری، پالار اور مہاندی کے طاس کے علاقے شامل ہیں۔

مُرغبانی کا فروغ

چھٹے منصوبے کے آخر یعنی ۱۹۸۴-۸۵ تک ملک میں مُرغبانی کی صنعت کی قومی پیداوار کا تخمینہ ۱۳۵۰ کروڑ انڈوں اور چھ کروڑ مرغوں کا لگایا گیا ہے۔ لہٰذا ۱۹۸۹-۹۰ تک مُلک میں ۱۸۹۰ کروڑ انڈے اور ۱۳ کروڑ ۷۰ لاکھ مُرغ مُرغیاں پیدا کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے ساتویں منصوبے کے دوران بطخوں وغیرہ کی افزائشِ نسل پر بھی مناسب توجہ دی جائے گی۔

کپڑوں کی بر آمدات میں اضافہ

۱۹۸۵-۸۶ میں ملک سے تیار کپڑوں کی برآمد کا رُجحان حوصلہ افزا رہا ہے۔ اپریل سے دسمبر ۱۹۸۵ میں ملک سے ۴۷۸ کروڑ روپے کی مالیت کے کپڑے اور بنے ہوئے پارچہ جات برآمد کیے گئے جبکہ ۱۹۸۴ کی اسی مدت میں ۵۵۴٫۷۵ کروڑ روپے کے یہ کپڑے برآمد کیے گئے تھے۔

مصنوعی سیاروں کا پروگرام

محکمہ ٹیلی مواصلات کی طرف سے ۱۹۸۲-۸۷ء میں ملک کے پہاڑی، دُور اُفتادہ علاقوں اور جزائر میں مصنوعی سیاروں سے پیغام رسانی کرنے والے ۱۸ مستقل زمینی مرکز قائم کرنے کی تجویز ہے۔

معدنیات کے چھوٹے ذخیروں کا بہتر استعمال

حکومت مقامی اور علاقائی اقتصادی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لیے معدنیات کے چھوٹے ذخیروں کو استعمال میں لانا چاہتی ہے۔

معدنیات کے چھوٹے ذخیروں کی مناسب ترقی اور اُن کے استعمال کے بارے میں کان کنی کی صنعت سے ٹھوس تجاویز مانگی گئی ہیں۔

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment at Civil Lines Post Office, Delhi-110054.

Vol. 5 No. 23 YOJANA (URDU) 1-15th March 1986

بنجر زمین کو زرخیز بنانے کے اقدامات

بنجر زمین کو پیداوار کے قابل بنانے کے لیے ہماری حکومت جنگل بانی کا ایک بھاری پروگرام شروع کرنے والی ہے۔ ہندوستان کا تقریباً نصف رقبہ گھٹیا درجے کی بنجر زمین پر مشتمل ہے۔ لہٰذا ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کی بنیادی ضروریات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس رقبے کا مناسب استعمال لازمی ہے۔

بڑی بھاری اور بڑھتی ہوئی

آبادی والے ایک بڑے ملک کو قدرتی طور پر قلت زدہ علاقوں کے ساتھ ساتھ ان مسائل سے بھی نپٹنا پڑے گا جو انسان نے خود پیدا کر لیے ہیں۔ ہندوستان میں بہت سی بنجر زمین اور اس کے ساتھ جنگلات کاٹ کر انھیں ختم کرنے کا مسئلہ اس صورتِ حال کی واضح مثال ہے۔

یہاں ۳۲۹.۰ لاکھ ہیکٹیئر کے کُل رقبے میں سے ۱۷۵.۰ لاکھ ہیکٹیئر رقبہ بیکار خیال جاتا ہے۔ اب تقریباً ۳۳۰ لاکھ ہیکٹیئر رقبہ [redacted] سے ڈھکا ہوا ہے۔ اس کا ایک تہائی حصہ علمِ معیشت حیوانات کے نقطۂ نظر سے اور لوگوں کی ایندھن نیز مویشیوں کے لیے چارے جیسی بنیادی ضرورتوں کے لیے لازمی ہے۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں جنگلات کا رقبہ ہر سال ۱۵ سے ۲۵ لاکھ ہیکٹیئر کے حساب سے کم ہو رہا ہے۔

ماحولیاتی نقصان کی روک تھام

اس خطرناک صورتِ حال کے پیدا کرنے میں کئی عناصر ذمہ دار ہیں۔ ہمارے یہاں بہت بڑی اور بڑھتی ہوئی وسیع آبادی ہے لہٰذا لکڑی اور چارے کی ضروریات کے لیے جنگلات پر بڑھتی ہوئی دسترس جنگلات کو بنجر زمین میں بدل دینے کا اہم سبب رہی ہے۔

اگر ترقی کی سرگرمیوں کو بھی، ماحولیاتی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر خاص دور اندیشی کے ساتھ منصوبہ بند صورت میں زیرِ عمل نہ لایا گیا تو جنگلات ختم ہوتے رہیں گے اور مٹی کٹاؤ کا شکار ہو جائے گی۔ سڑکیں بنانے کے لیے پہاڑوں کا بارود سے اڑانا، باندھ تعمیر کرنا اور تیز رفتاری سے صنعت کاری بھی ایسی سرگرمیوں میں شامل ہے۔

اس طرح جنگلات اور ماحول کو نقصان پہنچنے کی وجہ سے ہر سال خشک سالی سے نجات پانے اور طغیانیوں کی روک تھام کرنے کے اقدامات پر کروڑوں روپے کا خرچ ضروری ہو جاتا ہے۔ جنگلوں کے معقول استعمال کے ساتھ ساتھ منظم ڈھنگ سے جنگل بانی کرنے سے ان علاقوں میں بہت خرچ کی بچت ہو سکتی ہے۔

بنجر زمین کے فروغ کا قومی بورڈ

چونکہ جنگلات پر دباؤ اور اس کی وجہ سے زمین میں تنزلی بالعموم عام آدمی کی روزمرہ کی ضروریات اور گاؤں کے رہن سہن سے منسلک ہے۔ اس لیے زمین کی بہتری اور اسے قابلِ کاشت بنانے کے پروگرام حقائق کے قریب ہونے چاہئیں اور ان پر عمل درآمد کے لیے عوام کا اشتراک ضروری ہے۔

وزیرِاعظم شری راجیو گاندھی نے ۵ جون ۱۹۸۵ کو قوم سے خطاب کرتے ہوئے جنگلات کی لگاتار کٹائی کو ایک بڑے سماجی، اقتصادی اور حیوانات کی معیشت سے متعلق مسئلے سے موسوم کیا تھا چنانچہ انھوں نے بنجر زمین کے فروغ سے متعلق قومی بورڈ کے قیام کا اعلان بھی کیا تھا جو ایندھن کی لکڑی اور چارے کے لیے پچاس لاکھ ہیکٹیئر زمین کو ہر سال باغات میں بدلنے کا اہتمام کرے گا۔ جنگلات سے متعلق پالیسی اب نئے راستے پر چل رہی ہے۔ اس کے ذریعے ملک میں معاشی توازن قائم رکھنا ہے اور عوام کی بنیادی ضرورتوں کو بھی مدِنظر رکھنا ہے۔

(باقی صفحہ ۲ پر)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001

Printed by A.J. Printers, 5 Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002.

یوجنا

۱۶ تا ۳۱ مارچ ۱۹۸۶

ایک روپیہ

معیشت کا نیا رُخ

(گیانی ذیل سنگھ)

طویل المدتی پالیسی کے مثبت اور منفی پہلو

(ڈاکٹر مالکم ایس ادی سی سیشیہ)

صنعتی ترقی

ہندوستان میں تیار ہونے والی بیشتر اشیاء کی صورت میں خام مال سے لے کر تیار مصنوعات تک صنعتی بنیاد بہت وسیع ہو چکی ہے۔ صنعتی عمل میں داخل ہونے والے نئے صنعت کاروں کا دائرہ بھی بہت پھیل گیا ہے۔ اور آج ہمارے ہاں چھوٹے سے چھوٹے صنعتی ادارے سے لے کر بڑے سے بڑے صنعتی ادارے کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ ان میں سے بہت سے کارخانے ایک مدت ہوئی لگائے گئے تھے لہذا ان میں سے کئی ایک کی جدید کاری ضروری ہو چکی ہے۔

بین الاقوامی سطح پر ٹیکنالوجی میں بڑی تیزی سے تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ اگر ہم مستقبل قریب پر نگاہ ڈالیں تو یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ حیاتیاتی ٹیکنالوجی، ریشے دار بصری سامان، کلشو کلچر اور کوئلے کے ریشوں اور بہتر قسم کی طبعی خصوصیت کے حامل کیمیائی اور ملے جلے مادوں کے خام مال کی تیاری میں ترقی ہوئی ہے۔ اس کے سبب بعض روائتی اور پختہ بنیادوں پر کھڑی صنعتوں میں انقلابی تبدیلیاں ہونے والی ہیں۔

اگرچہ تقلیل المدتی قدم کے طور پر مستند ٹیکنالوجی خریدنا ممکن ہونا چاہیئے تاکہ اس سے فوری فائدہ اٹھایا جا سکے۔ لیکن بہت سی مصنوعات اور پیداواری عمل کے لیے باہر سے ٹیکنالوجی حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ بہت سے محاذوں پر کوشش کرنی چاہیے۔

اول یہ کہ ٹیکنالوجی کو بہتر بنانے کے درجے کا تعین کرنے کے لیے صنعت وار جائزہ لیا جانا چاہیئے۔ تاکہ یہ پتہ لگ سکے کہ وہاں فوری تجدید کے لیے کیا کیا کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد ٹیکنالوجی حاصل کرنے کے مناسب ترین ذریعہ کا انتخاب کرنا ہوگا۔ ٹیکنالوجی کی یہ منتقلی لائسنس کے انتظامات یا مشترکہ صنعتی عمل کے ذریعے کی جانی چاہیئے۔

تحقیقی پراجیکٹ

دوسرے یہ کہ نمونے تیار کرنے اور صنعتی تحقیق سے متعلق اداروں کو اور بڑے پیمانے پر اس قابل بنانا چاہیئے کہ وہ ٹیکنالوجی کے منتخب شعبوں میں، جہاں کوئی نمایاں کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے، ترقی اور تحقیق کے مشترکہ پراجیکٹ شروع کر سکیں۔ یہاں بالخصوص کاموں کے انتخاب چند شعبوں تک محدود رکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ ملک میں تحقیق کی مجموعی کوشش بہت بڑے حلقے میں پھیلی ہوئی ہے۔

جہاں تک گھریلو صنعت وار تحقیق کا تعلق ہے وہاں سرمایہ کاری اور داخلی صلاحیتوں کے لحاظ سے عام طور پر ایک حد مقرر ہو گئی ہے۔ جس سے نیچے کسی ادارے کے لیے کوئی اہم تحقیق و ترقی کی کارروائی کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس حد سے نیچے کوئی واحد ادارہ زیادہ سے زیادہ دوران عمل کسی تحقیقی کام پر کوئی کارروائی کر سکتا ہے۔ لیکن اگر اس حد سے آگے کام کیا جائے تو منظم پیمانے پر تحقیق اور نمونہ سازی کی ترقی کے کام شروع کرنا ممکن ہو سکتا ہے۔ ایسے اداروں کو یہ ترغیب دینے کے لیے کہ وہ اپنے ہاں تحقیق کی سہولیات قائم کریں۔ پوری پوری کوشش کرنی ہوگی۔

آیئے اب کچھ اہم صنعتوں میں جدید کاری اور ترقی کے مواقع کا تجزیہ کریں۔ یہ تجزیہ صرف ایسی منظم اور بڑے پیمانے کی صنعتوں تک محدود ہے جو مصنوعات کی مالیت کے اضافے میں نمایاں حصہ ادا کرتی ہیں جیسا کہ صنعتی پیداوار کے عدد اشاریہ سے ظاہر ہے۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے اپنے مسائل ہیں اور اس سیکٹر کے لیے حل بھی مختلف ہوگا۔ اس مختصر مضمون میں اس سیکٹر کا تفصیل جائزہ لینا ممکن نہیں ہے۔

(باقی کور صفحہ ۳ پر)

منصوبہ بندی سے متعلق ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنیوالا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر — آر. ٹھکرال
اسسٹنٹ ایڈیٹر — محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر — وسیم حیدر

جلد ۵	۱۶ تا ۳۱ مارچ ۱۹۸۶	شمارہ ۲۴

۲۵ پھالگن تا ۱۰ چیتر شک ۱۹۰۷ ٹیلیفون ۶۰۱۸۱۸

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے، ۲ سال ۳۵ روپے، ۳ سال ۵۰ روپے
فی کاپی — ایک روپیہ
طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فیصد کی رعایت

اس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر. ایس. منجال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر. کے. پورم (مین)
نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

ترسیل زر کا پتہ: بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

کمزور طبقات کی بہبود کے اقدامات

نئی دلی میں گزشتہ دنوں فلاح و بہبود کے امور سے متعلق وزیروں کی دو روزہ کانفرنس بلائی گئی جس میں ۲۱ ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام آٹھ علاقوں کے سیکریٹریوں نے شرکت کی ۔ اس کانفرنس میں بہت سے اقدامات کی نشاندہی کی گئی جن سے سماج کے کمزور اور پچھڑے ہوئے عوام کی حالت میں سدھار آسکتا ہے ۔ ان اقدامات کا تعلق تعلیم، تعمیر مکانات، محنت کش لڑکیوں کے لیے ہوسٹلوں کی تعمیر، شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب عوام کی بہبود سے متعلق اسکیموں اور از خود روزگار کے لیے آسان شرائط پر قرضوں کی فراہمی وغیرہ سے ہے ۔

یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ اس کانفرنس میں سماجی بہبود کے وزیروں نے کمزور طبقات کی بہبود کے پروگراموں کو وقت مقررہ کے اندر ختم کرنے پر زور دیا ہے اور چند اہم پروگراموں کے لیے مزید وسائل کی تخصیص کی ضرورت بتائی ہے ۔ خاص کر تعلیمی شعبوں اور قبائلی آبادی والے علاقوں میں روزگار کے پروگراموں کی اہمیت پُر زور انداز میں واضح کی گئی ہے ۔ کمزور طبقات کے بچوں کے لیے میٹرک کی تعلیم سے قبل اور اس کے بعد کے درجات میں وظائف کی فراہمی کو بڑی اہمیت دی گئی ہے ۔ یہی نہیں ان کے لیے تعلیم اور کوچنگ کے خصوصی انتظامات پر زور دیا گیا ہے ۔ کانفرنس میں بجا طور پر اس خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ ان جملہ مراعات کے باوجود کمزور طبقات بالخصوص شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب کے ارکان غریبی کے خط سے اوپر نہیں آسکے ہیں اور بیشتر لوگوں کی حالت ابھی تک تسلی بخش نہیں ہے ۔ ساتویں منصوبے میں بنیادی طور پر ملک کے نوجوانوں کی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کرنے پر زور دیا جارہا ہے ۔ اس لیے غریبی دور کرنے، اقتصادی نابرابری کو ختم کرنے اور پیداواری صلاحیت بڑھانے کے پروگراموں کو مربوط طریقے پر آگے بڑھایا جارہا ہے ۔ اس سلسلے میں کھادی اور دیہی صنعتوں کے کمیشن نے ملک کے مختلف حصوں میں تحقیق کا ایک ڈھانچہ فراہم کرکے بڑے پیمانے پر خدمات انجام دی ہیں ۔ واردھا میں ۱۹۵۵ میں قائم شدہ جمنا لال بجاج سنٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دیہی صنعتوں کے ضمن میں مفید خدمات انجام دے رہا ہے ۔ اسی طرح احمد آباد میں اُدیوگ سمیتی سوتی کھادی کی تحقیق اور اسے بڑھاوا دینے کے لیے بیش قیمت کام کر رہی ہے ۔ مغربی بنگال میں مالدہ کے مقام پر ریشم کو مقبول عام بنانے کے لیے تسلی بخش طور پر کام ہو رہا ہے ۔ کیرالہ میں تریچور میں ململ کو بہتر سے بہتر بنانے پر زور ہے ۔ کھادی اور دیہی صنعتوں کے کمیشن نے نہ صرف مذکورہ مقامات پر بلکہ ریجنل ریسرچ لیباریٹری حیدرآباد، سنٹرل لیدر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، مدراس، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی دلی اور کانپور وغیرہ میں بھی تحقیقی امور کو بڑھاوا دے کر ملک میں تیار کی جانے والی مصنوعات کا معیار اور ان کی دلکشی و افادیت میں اضافہ کیا ہے ۔ اس کمیشن نے بمبئی میں کوربا میں بائیو گیس ریسرچ سنٹر کھولا، کرناٹک میں خانا پور کے مقام پر مٹی کے برتنوں کے بنانے کی تربیت اور تحقیق کا ایک مرکز قائم کیا جس نے مٹی کے برتنوں کی تیاری کو معیاری بنانے میں مدد دی ۔ اینٹوں کے پکانے کے لیے ایسے بھٹے بنائے گئے جن میں ایندھن کی کفایت ہو سکے، مدراس میں تاڑ سے گڑ تیار کرنے کی صنعت کا ایک تحقیقی و تربیتی مرکز کھولا گیا ۔ ناسک میں صابن بنانے اور غیر خوردنی تیلوں کی تحقیق و تربیت کے مرکز نے جنگل کی چھوٹی موٹی پیداوار سے تیل نکال کر اس سے صابن بنانے کی تکنیک نکالی ۔ اس طرح کے مختلف اقدامات سے نہ صرف ملک میں اشیائے صارفین کی تیاری میں اضافہ ہو رہا ہے بلکہ عوام الناس کو بڑے پیمانے پر روزگار کے مواقع بھی مل رہے ہیں اور اس طرح ان کا معیارِ زندگی بلند ہو رہا ہے ۔

ساتویں منصوبے میں ٹیلی کمیونیکیشن کی توسیع

ملک میں ترقیاتی پروگراموں کو تیزی سے آگے بڑھانے اور ملک کے عوام کا معیارِ زندگی اوپر اٹھانے میں ٹیلی مواصلات کی بڑی اہمیت ہے ۔ چنانچہ منصوبہ بندی کمیشن نے ٹیلی کمیونیکیشن سروسز کے لیے ۴۰۱۰ کروڑ روپے کے پلان مصارف رکھے ہیں ۔ اندازہ ہے کہ اس پلان میں تقریباً گیارہ لاکھ ٹیلی فون دیے جاسکیں گے ۔ ملک کی قومی معیشت میں اس نظام کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسی مد پر اس قدر سرمایہ کاری کی جارہی ہے ۔ ٹیلی کمیونیکیشن کے منصوبوں کے لیے کچھ رقم پلان کے مصارف میں سے ہی دی جائیگی اور کچھ رقم منڈی سے قرض لیکر اور دیگر طرح سے فاضل وسائل اکٹھا کرکے دی جائیگی ۔ اسکے علاوہ ٹیلیکس خدمات کی توسیع پر خصوصی توجہ دی جارہی ہے ۔ امید ہے کہ ان اقدامات سے مواصلات کا مربوط نظام ترقی پاسکیگا ۔ (اسسٹنٹ ایڈیٹر)

گیانی ذیل سنگھ

معیشت کا نیا رُخ

صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ نے نئی دہلی میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں جو ۱۹۸۶ کا پہلا اجلاس تھا، تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

عوامی خدمات کی کارکردگی کو بہتر کرنے اور بے ایمانیوں کی روک تھام کے لیے سخت قدم اٹھائے گئے ہیں۔ ہر سطح پر عملہ کے اچھے نظم و نسق اور اس کی عمدہ تربیت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ عام لوگوں کی شکایتیں دُور کرنے کے لیے انتظام کر دیا گیا ہے اور اس کے نتائج کا مسلسل جائزہ لیا جا رہا ہے۔ مختلف پروگراموں پر عمل درآمد کو جانچنے کے لیے ایک نئی وزارت قائم کی گئی ہے۔ تمام سرکاری محکموں کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ اگلے مالی سال کے لیے تفصیلی اور قابل عمل منصوبے بنائیں جن کی بنیاد پر ان کے کام کے بارے میں رائے قائم کی جائے گی۔ انتظامی اصلاح ایک مسلسل عمل ہے۔ اس نظام کو ایک نئی سمت دینے کے لیے تفصیلی مشقیں کی جا رہی ہیں تاکہ فیصلے تیزی سے کئے جا سکیں اور ان پر بہتر طریقے سے عمل درآمد ہو سکے۔

صدر جمہوریہ نے کہا کہ حکومت انصاف دہی میں تاخیر کو ختم کرنے پر تُلی ہوئی ہے۔ لوک عدالتوں کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ اس بیماری کو دُور کرنے کے لیے ایک نئے طریقے کی ضرورت ہے۔ انتظامی عدالتوں کے قیام سے سبھی عدالتوں کا بوجھ ہلکا ہوگا اور وہ اپنے مقدموں کو فیصل کرنے کی طرف زیادہ وقت دے سکیں گی۔ بہرحال انصاف کو سستا اور غریبوں کی دسترس کے اندر بنانے کی جانب یہ محض پہلے اقدام ہیں۔ ورنہ اس سمت میں سخت تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ حکومت نے ایسی تبدیلیوں کی سفارش کرنے کا کام قانون کمیشن کے سپرد کیا ہے۔

حکومت نے اگست ۱۹۸۵ میں "تعلیم کے چینوتی" کے عنوان سے ایک دستاویز شائع کی تھی جس کا مقصد مسئلوں اور متبادلات پر ایک قومی بحث شروع کرنا تھا۔ حکومت کو اطمینان ہے کہ اس بحث پر ملک کے تمام طبقے شریک ہوئے اور بہت سے مفید خیالات و نظریے سامنے آئے۔ نئی تعلیمی پالیسی کا ایک مسودہ جلد ہی پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے گا۔

حکومت نے عورتوں کی ترقی کی دیکھ بھال کے لیے ایک نیا محکمہ قائم کیا ہے اور عورتوں کے لیے ایک جامع قومی پروگرام بھی تیار کیا جا رہا ہے اس پروگرام کا مقصد یہ ہوگا کہ عورتیں ایک مضبوط اور جدید قوم کی تعمیر میں پورا حصہ لے سکیں۔

نوجوانوں کی فلاح و بہبود کے لیے بنائے گئے پروگرام کافی آگے بڑھے ہیں لیکن اس شعبے میں ابھی بہت کچھ کیا جانا باقی ہے۔

بنجر زمین کی بحالی کا بورڈ قائم کر دیا گیا ہے جس نے جنگل بانی کے ایک بہت بڑے پروگرام پر عمل درآمد شروع کر دیا ہے۔ ایک حالیہ اجلاس میں تمام ریاستی حکومتوں نے زمین کے استعمال سے متعلق قومی پالیسی نیز بنجر زمین

کی بحالی کے لیے دستورِ عمل اور پالیسیوں کی جانب ایک مربوط اقدام کے لیے اتفاق رائے ظاہر کیا۔

مرکزی گنگا اتھارٹی بھی قائم ہو چکی ہے۔ متعلقہ ریاستی حکومتوں کے تعاون سے گنگا کی آلودگی ختم کرنے کے لیے پورے زور و شور سے کام شروع ہو گیا ہے۔

نئی کپڑا پالیسی کا اعلان جون ۱۹۸۵ میں کیا گیا تھا۔ اس کا مقصد غریب عوام کے لیے سستے دام کا کپڑا مہیا کرنا ہے۔ اس پالیسی کا ایک اتنا ہی اور اہم مقصد ہتھ کرگھے کے بنکروں کے مفادات کی حفاظت کرنا ہے۔ یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ساتویں منصوبے کے دوران میں ۷۰ کروڑ مربع میٹر جتنا کپڑا اور کنٹرول قسم کے کپڑے کی تمام تر پیداوار ہتھ کرگھے کے شعبے کو منتقل کر دی جائے گی۔ ہتھ کرگھوں کی پیداوار کے لیے اشیاء کی تخصیص کا قانون مجریہ ۱۹۸۵، اس اہم شعبے کو تقویت دینے کے لیے بنایا گیا ہے جس سے لاکھوں لوگوں کو روزی روٹی ملتی ہے۔ اس پالیسی کو مکمل اور موثر طور پر نافذالعمل کرنے کے لیے اقدام کئے جا رہے ہیں۔

حکومت نے صنعتی سلامتی اور خطرناک اشیاء کے انتظام سے متعلقہ امور کا جائزہ مکمل کر لیا ہے اور اس کے بارے میں قانون کا مسودہ پارلیمنٹ کے اس اجلاس میں پیش کر دیا جائے گا۔

حکومت ملک کی ثقافتی یکجہتی کے جذبے کو فروغ دینے کے لیے سات علاقائی ثقافتی مراکز قائم کرے گی ان میں سے تین مراکز پہلے ہی قائم کئے جا چکے ہیں۔ یہ مراکز علاقائی اور لسانی حدود سے ماورا ہو کر متمول علاقائی ثقافتی گوناگونی اور ان میں پنہاں اتحاد کو نمایاں کریں گے۔ وہ ہماری ثقافت کے بہترین حصوں کو لوگوں تک پہنچائیں گے اور اسے ان کی زندگی اور جدوجہد سے ہم آہنگ کریں گے۔ یہ مراکز نوآبادیاتی دور میں عوام اور بھارت کی قدیم ثقافت کی روایات کی تمام شکلوں کے درمیان کھڑی کی گئی مصنوعی دیواروں کو توڑنے پر زور دیں گے اور ایسے فنون کا احیاء بھی کریں گے جنھوں نے ملک کی قومی ثقافت کو مالا مال کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

معاشی ترقی

اب میں ملک کی معیشت میں بڑے بڑے رجحانات کا ذکر کروں گا۔ قومی ترقیاتی کونسل نے ساتویں پانچسالہ منصوبے کی منظوری دے دی ہے۔ منصوبے کی بنیادی حکمت عملی، غریبی کو ختم کرنے، عوام کے تمام طبقوں میں سرکاری معاملات میں شرکت کا احساس پیدا کرنے اور ایک مضبوط خودکفیل اور جدید معیشت کی تعمیر کے طویل المدت تناظر میں ڈھالی گئی ہے۔ منصوبے میں غریبی کو ختم کرنے کے پروگراموں پر توجہ میں اضافہ کیا گیا ہے جنھیں اب اور زیادہ وسعت سے عمل میں لایا جائے گا۔ منصوبے میں معیشت کے کلیدی شعبوں میں کافی سرمایہ کاری کا بھی اہتمام کیا گیا ہے جس سے قومی معیشت میں ترقی کی صلاحیت کو تقویت دی جا سکے۔

منصوبے کی تکمیل کے لیے سرمایہ کاری کی غرض سے کافی وسائل بروئے کار لانے کے لیے پوری لگن اور مصمم ارادے کی ضرورت ہے ایک مضبوط خوشحال، خودکفیل ہندوستان کے تصور کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے انتھک محنت، قربانی کی صلاحیت اور مشکلات برداشت کرنے کی ہمت کی ضرورت ہے۔ افراطِ زر میں اضافے کے رجحان سے مبرا ترقی کا راستہ اختیار کرنے کے لیے کافی مقدار میں بچتوں کی ضرورت ہے۔ اور اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان بچتوں کا موثر طور پر استعمال کیا جائے۔ اس چیلنج کا مقابلہ کرنا ہی ہوگا۔ ترقی کے لیے کوئی آسان راستہ نہیں ہے اور محنت شاقہ کا کوئی متبادل نہیں ہے۔

غریبی دور کرنے کے پروگراموں پر زوردار عمل درآمد سے نمایاں نتائج حاصل ہوئے ہیں۔ چھٹے پانچسالہ منصوبے کا نصب العین مربوط دیہی ترقی کے پروگرام کے تحت ڈیڑھ کروڑ کنبوں کی مدد کرنا تھا۔ جبکہ درحقیقت ایک کروڑ ۶۶ لاکھ کنبوں کی مدد کی گئی۔ ان میں سے ۴۶ لاکھ کنبے درجِ فہرست ذاتوں اور درجِ فہرست قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان پروگراموں میں اضافہ کیا جا رہا ہے اور غلے کے فاضل ذخیرے، ۸۷-۱۹۸۶ میں دیہات میں روزگار کے قومی پروگرام اور دیہات کے بے زمین افراد کو روزگار مہیا کرنے کی ضمانت کے پروگرام کے تحت مزید دس لاکھ کنبوں کو مدد دینے کے لیے استعمال کئے جائیں گے۔ ساتویں پانچسالہ منصوبے میں درجِ فہرست ذاتوں اور درجِ فہرست قبیلوں اور آزاد کرائے گئے بندھوا مزدوروں کو تعمیر مکانات کے لیے ہر سال ایک ارب روپے دینے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

مارچ ۱۹۸۵ کے آخر تک پینے کے صاف پانی کی قلت والے ۲ لاکھ ۳۱ ہزار دیہات میں سے ایک لاکھ ۹۲ ہزار دیہات کو صاف پانی کی بہم رسانی کا کم از کم کوئی ایک ذریعہ مہیا کیا جا چکا تھا۔ ۸۶-۱۹۸۵ میں پروگرام کی رفتار تیز کی گئی۔

۸۶-۱۹۸۵ میں زراعت میں مسلسل پیش رفت جاری رہی۔ نومبر ۱۹۸۵ میں حکومت کے پاس اناج کا ذخیرہ ۱۹۸۴ کی نسبت تقریباً ۱۵ فیصد زیادہ تھا۔ اس سے حکومت قابل

علاقوں اور معاشی طور پر کمزور طبقوں بالخصوص درج فہرست ذاتوں، حاملہ عورتوں، بچوں وغیرہ میں خاص طور پر امدادی نرخوں پر اناج مہیا کرنے کی اسکیم لاگو کر سکی ہے۔ خریف کی فصل کے لیے خاص خاص علاقوں میں فصلوں کے لیے بیمے کی ایک نئی جامع اسکیم رائج کی ہے۔ حکومت ان اسکیموں میں مزید توسیع کرنے پر غور کر رہی ہے۔

۸۶ – ۱۹۸۵ کے پہلے سات ماہ میں صنعتی پیداوار میں ۶٫۳ فیصد کا اضافہ ہوا۔ حکومت نے جو پالیسی اختیار کی ہے اس سے سرمایہ کاری کی حوصلہ افزا فضا پیدا ہوئی ہے۔ بنیادی سہولیات کی صنعتوں کی کارکردگی بہت اچھی رہی ہے۔ گزشتہ برس کے پہلے نو ماہ کے مقابلے میں بجلی کی پیداوار میں ۸٫۲ فیصد قابلِ فروخت فولاد کی پیداوار ۹٫۲ فیصد اور کیمیائی کھاد کی پیداوار میں زائد از ۱۰ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ ہماری بندرگاہوں نے ۱۳٫۲ فیصد زیادہ مال کا نقل و حمل کیا اور ریلوں نے مال کے نقل و حمل کے تمام سابق ریکارڈ مات کر دیئے۔

۸۶ – ۱۹۸۵ میں مرکزی منصوبے کے لیے تخصیص زر میں ۸۵ – ۱۹۸۴ کی نسبت ۱۵ فیصد کا اضافہ کیا گیا۔ یہ اضافہ زیادہ تر غریبی دور کرنے کے پروگرام، انسانی وسائل اور بنیادی سہولیات کے فروغ کے پروگراموں میں کیا گیا۔ ریاستی منصوبوں کے مصارف میں بھی کافی اضافہ ہوا۔ حکومت نے اندازاً ۸۶ – ۱۹۸۵ء میں خوراک میں مالی مدد کے طور پر ۱۶۵۰ کروڑ روپے اور کیمیائی کھاد میں مدد کے طور پر ۲۰۵۰ کروڑ روپے کی رقوم خرچ کیں۔ سرکاری ذرائع سے اشیاء کی تقسیم کے نظام کو تقویت دی گئی اور رسدات کے دانشمندانہ انتظام کے سبب اشیاء کی قلت نہیں ہوئی۔ یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ سرکاری سرمایہ کاری میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔

ٹیکسوں کی وصولی میں بہت اضافہ ہوا ہے جنھوں نے مایوسانہ خدشات کو غیر حقیقی ثابت کر دیا ہے۔ بلاواسطہ ٹیکسوں کی فراہمی میں گزشتہ برس کی نسبت ۲۳ فیصد اضافہ ہوا ہے اور بالواسطہ ٹیکسوں کی فراہمی بقدر ۲۲ فیصد بڑھی ہے۔ ٹیکس کی مجموعی وصولی میں ۲۲ فیصد اضافہ ہوا ہے جو گزشتہ دس برسوں میں سب سے زیادہ ہے۔ ٹیکس چوروں، اسمگلروں اور کالا دھندا کرنے والوں کے خلاف ایک موثر مہم شروع کی گئی ہے۔ ان افراد کے خلاف بھی کارروائی کی گئی ہے جن کی اقتصادی جرائم کرنے والوں سے ملی بھگت تھی۔ حکومت ملک کی معاشی زندگی کو صاف ستھرا بنانے اور کالے دھن کی بدعت کا مقابلہ کرنے کا مصمم ارادہ رکھتی ہے۔

پہلی بار پانچسالہ منصوبے سے وابستہ ایک طویل المدت مالی پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے۔ اقتصادی پالیسی کے لیے بھی ایک طویل المدت ہدایت دی گئی ہے۔ حکومت کو اعتماد ہے کہ اس پالیسی سے اقتصادی ترقی اور پیداواری سرمایہ کاری میں توسیع نیز روزگار کے مواقع میں یقینی اضافہ ہوگا۔

سماجی انصاف کے ساتھ ساتھ فروغ کے اپنے بنیادی مقاصد پورا کرنے کے لیے معاشی ڈھانچے سے متعلق مسائل کی جانب توجہ دینا بھی ضروری ہے۔ بھارت کی ترقی اور فروغ کا انحصار سرکاری سرمایہ کاری میں بتدریج اضافہ پر ہے۔ اس سرمایہ کاری کے لیے سرمایہ کیسے فراہم کیا جائے۔ گزشتہ منصوبوں میں بڑے پیمانے پر کی گئی سرمایہ کاری سے کافی فائدہ ملنا چاہیئے۔ پیداوار کے اخراجات میں کمی لائی جانی چاہیئے۔ قومی بچتوں کے ہر پیسے کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا ہوگا نہیں تو خود کفالت پر مبنی ترقی کی رفتار کو قائم رکھنے، غریبی ہٹانے کے پروگرام کو وسعت دینے اور اپنی معاشی آزادی کا تحفظ کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کرنے کے لیے حقیقی وسائل حاصل کرنا مشکل ہو جائے گا۔ جلد یا دیر سے بلکہ جلد ہی ہمیں صورتِ حال کا سامنا کرنا ہے۔ ترقی و فروغ، سماجی انصاف، قرضوں میں استحکام، اور خود کفالت بغیر ڈسپلن، اہلیت اور ذمہ داری کے حاصل نہیں کی جا سکتی۔

صدر جمہوریہ نے فرمایا کہ ہمیں پیداوار میں کام آنے والے ساز و سامان کی لاگت کی قیمتوں کو کم کرنا ہوگا نیز معیاری مصنوعات اور خدمات کی قیمتوں میں بھی کمی لانا ہوگی۔ نہیں تو ملک میں اور غیر ملکی مارکیٹ میں ہمارا مال نہیں بِک پائیگا۔

منصوبہ بندی کے عمل کا مستقبل اس بات پر منحصر ہوتا ہے کہ ہم مشکل حالات میں کس قدر صلاحیت و اہلیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم کس حد تک سخت فیصلے کر سکتے ہیں۔ ان فیصلوں میں قربانی کرنی پڑ سکتی ہے لیکن اس کے بغیر ترقی کرنا مشکل ہے۔ غریب لوگوں کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے ترقی انتہائی ضروری ہے۔ کیا ہم ایسے فیصلے ٹال سکتے ہیں جن سے ترقی و فروغ کے عمل کو استحکام اور تحفظ ملتا ہے۔ جو نسلیں مستقبل کو خوبصورت اور تابناک بنانے کے لیے قربانی دے سکتی ہیں، وہی قومی تعمیر و ترقی کی اہل سمجھی جاتی ہیں۔

ادائیگیوں کے توازن کی صورتِ حال نے ایک چیلنج سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ ۸۶ – ۱۹۸۵

میں ہماری برآمدات میں منداری آئی اور ہماری درآمد میں کمی آئی ہے۔ پٹرولیم کی مصنوعات اور خوردنی تیلوں کی برآمد ملک کی صلاحیت سے کافی زیادہ ہوئی۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ آیا ہم اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتے ہیں یا نہیں۔ اگر ہم ایسا چاہتے ہیں تو ہمیں پٹرولیم کی مصنوعات کی بڑھتی ہوئی کھپت پر قابو پانا ہوگا اور ہمیں تلہن کے معاملے میں خودکفیل ہونا ہوگا۔ ہمیں اپنی بڑی سرمایہ کاری کے مال کی درآمد پر بھی از سرِنو غور کرنا ہوگا۔ ہم نئی ٹیکنالوجی کو روک نہیں چاہتے کیونکہ اس سے ہمیں نقصان ہوگا، لیکن ہمیں دیکھنا ہوگا کہ ایسی ٹیکنالوجی ہماری ضرورت کے سخت معیار اور جانچ کے اصول پر پوری اُترے۔ بیرونی سرمایہ کی ضرورت ہے لیکن حکومت نے مستحکم ارادہ کیا ہوا ہے کہ ہم غیر ملکی بینکوں اور اداروں کے رحم وکرم پر نہ رہیں۔ ہماری ترقی وفروغ کے فلسفے کا مرکزی نقطہ معاشی آزادی اور خودکفالت ہے۔ ہم اپنی معاشی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے ہر قیمت ادا کریں گے۔

۸۶-۱۹۸۵ اور اس کے بعد کے لیے کچھ ترجیحی زمروں کی نشاندہی کرتے ہوئے صدرِ جمہوریہ ہند نے فرمایا کہ:-

وقت کا مطالبہ ہے کہ غریبوں کا معیارِ زندگی بلند کیا جائے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کو بھی اس بنیادی مقصد کی حمایت کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں سرکار ٹیکنالوجی کے مشن مندرجہ ذیل شعبوں میں قائم کر رہی ہے۔

۱۔ تمام گاؤں کے لیے پینے کا پانی۔
۲۔ ناخواندگی کا خاتمہ۔
۳۔ بچوں کو ٹیکے لگانا اور متعدد بیماریوں سے ان کا تحفظ۔
۴۔ تلہن کی پیداوار اور خوردنی تیلوں کی تیاری۔
۵۔ بہتر مواصلات۔

مذکورہ سال کے دوران صنعت اور زراعت میں پیداواری صلاحیت کو بہتر بنانے کے سلسلے میں ٹیکنالوجی کے استعمال کے مقصد سے مزید شعبوں کی نشاندہی کی جائے گی۔ ان منتخب شعبوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی مہموں سے بھارت کو سائنسی سرگرمیوں کی پہلی صف میں پہنچانے کی کوشش کی جائیگی۔

ایک جامع پالیسی تیار کی جائے گی تاکہ فصل اُگانے کے بہترین طریقے کو فروغ دیا جا سکے، پانی اور مٹی کے انتظام کو بہتر بنایا جا سکے، سبھی فصلوں کی پیداواری صلاحیت کو بڑھایا جا سکے، چھوٹے کسانوں کی آمدنیوں میں اضافہ کیا جا سکے نیز تلہنوں اور دالوں کی پیداوار بڑھا کر سخت محنت سے حاصل کی گئی اناج کی خودکفالت میں اضافہ کیا جا سکے۔ ملک کے مشرقی خطے میں سبز انقلاب لانے کے لیے ایک مقررہ وقت کے اندر عملی منصوبہ تیار کیا جائے گا۔

یہ بات قابلِ اطمینان ہے کہ اس بارے میں ملک میں اتفاقِ رائے ہے کہ پانی ایک قومی وسیلہ ہے۔ حکومت پانی سے متعلق ایک قومی پالیسی تیار کرنے کو بہت زیادہ ترجیح دیتی ہے جس سے زرعی صنعتی اور دیگر سماجی ضرورتوں کے لیے پانی کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جا سکے گا۔

حکومت نے خاندانی منصوبہ بندی کے پروگراموں کا گہرائی سے جائزہ لیا ہے۔ ماضی کے تجربہ سے استفادہ کرتے ہوئے خاندانی منصوبہ بندی کے لیے ایک زیادہ موثر حکمتِ عملی تیار کی جا رہی ہے اور اس حکمتِ عملی کا جلد ہی اعلان کیا جائے گا۔

غریبی ختم کرنے کے پروگراموں پر اور زیادہ توجہ مرکوز کی جائے گی۔ نظرثانی شدہ بیس نکاتی پروگرام سے حاصل ہونے والی کامیابی کی بنیاد پر ایک نیا پروگرام تیار کیا جا رہا ہے۔ جس کا اعلان جلد ہی کیا جائے گا۔ اس نئے پروگرام کے تحت ایک عظیم قومی کوشش میں سبھی عناصر، پالیسیاں اور پروگرام شامل ہونگے تاکہ سبھی پہلوؤں کو مدِنظر رکھتے ہوئے بڑے پیمانے پر غربت کے مسئلہ، خاص طور سے درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے مسائل سے نپٹا جا سکے۔ درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں و دیگر کمزور طبقوں کے لیے سماجی، اقتصادی، تعلیمی اور ثقافتی ترقی کے پروگراموں پر موثر طریقے سے عمل درآمد کیا جائے گا۔ بڑھتے ہوئے معاشی مواقع پر خصوصی زور دیتے ہوئے اقلیتوں کی ترقی کے لیے پندرہ نکاتی پروگرام کے عمل درآمد پر قریبی نگاہ رکھی جائے گی۔

روزگار میں تیزی سے اضافہ کرنے، پسماندہ علاقوں کی ترقی کو تیزتر کرنے نیز عوام کی زیادہ بہتر خدمات کی غرض سے بھارتی صنعت کی صلاحیت میں اضافہ کرنے کے سلسلے میں صنعتی پالیسی کے ایک زیادہ جامع ڈھانچے کی ضرورت ہے۔ ہماری صنعتی پالیسی میں پہلے ہی بہت سی تبدیلیاں کی جا چکی ہیں۔ جن کا اثر اب جدید کاری، نئی ٹیکنالوجی اپنانے اور ملکی ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے نئی کوشش کی شکل میں جھلکتا ہے، زیادہ لاگت اور نااہل صنعت کا شکار غریب ہوتے ہیں کیونکہ یہ چیزیں ان وسیلوں کو ختم کر دیتی ہیں جن کی غریب لوگوں کے لیے نئے روزگار پیدا کرنے میں ضرورت ہوتی ہے۔ دیہی اور شہری

علاقوں میں عوام کے لیے سامان تیار کرنے اور خدمات مہیا کرنے میں ایک بڑا اضافہ ہوا ہے۔ یہ اضافہ غریبی دور کرنے کی ہماری حکمتِ عملی کے لیے ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے پیداوار کی نصب شدہ صلاحیت کے استعمال، ملکی ٹیکنالوجی کا حصہ، مزدوروں کی پیداواری صلاحیت، چھوٹی اور درمیانہ صنعت کے لیے مستقبل کے امکانات نیز موجودہ نظم و نسق اور انتظامی ساز و سامان سے متعلق پالیسیوں پر ایک نئی نظر ڈالنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ صنعت عوام کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرے۔

ادائیگیوں کا توازن برقرار رکھنے کے چیلنج سے نپٹنے کے سلسلے میں برآمدات اور سیاحت کے فروغ کے لیے ایک بڑی کوشش کی ضرورت ہے۔ اس محاذ پر پیش رفت میں کوئی بھی ڈھیل ترقی کی ہماری حکمتِ عملی کو نقصان پہنچائے گی۔ حکومت اس اہم شعبے میں نئے اقدامات کرے گی۔

ہمارے انتظامی ڈھانچے میں تبدیلیاں کرنا لازمی ہو گیا ہے تاکہ یہ سماجی انصاف کے ساتھ ترقی کے حصول کے مقصد کو پورا کر سکے۔ سرکاری انتظامیہ کو ایک نیا سماجی نظریہ عطا کرنا ہے۔ یہ اوپر سے کوئی چیز تھوپنے کا سوال نہیں ہے بلکہ اصلاح کے لیے تحریک اندر سے پیدا ہونی چاہیے۔ پوری قوم کو انتظامی ڈھانچہ کی کارکردگی پر اثر انداز ہونے والے امور پر تبادلۂ خیالات کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اس طرح پروگراموں پر عمل درآمد کے لیے ایک واضح لائحہ عمل اُبھر کر سامنے آئے گا۔ ہمیں کارکردگی اور جوابدہی کو بہتر بنانے پہ زور دینا چاہیئے۔

ایک طاقتور بھارت کی جھلک صرف مردوں اور خواتین کی حقیقی زندگیوں میں نظر آئے گی جو کردار اور مقصد کی مضبوطی اور عمدگی کی تلاش کے پابند ہیں۔ انسانی وسائل کے فروغ کے لیے حکومت کی حکمتِ عملی کا مقصد ہماری قومی زندگی میں ان خوبیوں کو فروغ دینا ہے۔ تعلیم سے متعلق پالیسی اس حکمتِ عملی کا ایک لازمی حصہ ہوگی جس کا مقصد ایک مربوط طریقہ سے سماج کی جسمانی، ذہنی، ثقافتی اور اخلاقی ترقی کا حصول ہے۔

صرف مقاصد بیان کرنا ہی کافی نہیں ہے۔ تعلیمی پالیسی پر عمل درآمد کے لیے درکار وسائل کے لیے ساری قوم کی شرکت اور تعاون ضروری ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ اس قومی کوشش کو ایک نئی سمت دینے میں نوجوان، طلبا، اساتذہ، دانشور، مزدور اور کسان شریک ہوں۔ ہمارے خوابوں کے بھارت کی تعمیر کے لیے یہ ضروری ہے کہ تعلیم کو کلاس کے کمرے تک محدود ایک سرگرمی سے اوپر اٹھا کر ایک سماجی عمل کی شکل دی جائے۔ تعلیم کے لیے ضروری ہے کہ ایک طرف پیداواری عمل کے ساتھ اور دوسری طرف ہمارے ثقافتی ورثے کو محفوظ رکھنے اور اس میں اضافہ کرنے کے قومی عزم کے ساتھ اس کا قریبی تعلق ہو اور اس طرح ہم بھارتی ہونے پر فخر کر سکتے ہیں۔

آنے والے سال چنوتی کے سال ہیں۔ حکومت نے سماجی انصاف کے حصول کے لیے کئی اقدامات کئے ہیں جن کا مقصد ترقی کو تیز تر کرنا، معیشت کو جدید بنانا اور اپنے پروگراموں کو نیا متن دینا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ پروگراموں پر فوراً عمل درآمد کیا جائے۔

●

۱۹۸۶ - ۸۷ ابجٹ کے اہم نکات

وزیر خزانہ شری وی پی سنگھ نے ۸۷-۱۹۸۶ء کے بجٹ میں درج ذیل امور کو اہم ترجیحات دی ہیں :-

- پبلک سیکٹر کو تقویت دینا۔
- غریبی دور کرنیکے پروگراموں پر مزید زور دینا۔
- خود انحصاری کو فروغ دینا۔
- عام آدمی کو راحت پہنچانا۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے وزیر خزانہ نے درج ذیل اقدامات کئے ہیں :- منصوبہ جاتی اخراجات میں ۲۰.۵ فیصد کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ساتویں پنجسالہ منصوبے کے پہلے دو برسوں میں مجموعی اخراجات کے ۴۰ فیصد کی سرمایہ کاری کیجائیگی جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔

دیہات میں غریبی ختم کرنے کے لیے پروگراموں کیلئے اس سال ۶۵ فیصد کا اضافہ کیا گیا ہے جو کہ بے مثل اضافہ ہے۔ شہری غریبی کے مسائل حل کرنیکے لیے رکشے والوں، موچیوں، دھوبیوں، نائیوں، ہاکروں اور بیل گاڑی والوں کے لیے سامان خریدنے کے لیے ایک نئی اسکیم شروع کی گئی ہے۔ اس اسکیم کے تحت انھیں قرضہ کے ساتھ امدادی قیمتوں پر ساز و سامان بھی فراہم کیا جائے گا۔ ریلوے قلیوں اور میونسپل کمیٹی کے خاکروبوں کے لیے حادثے کی صورت میں دوہرے فائدے کے بیمے کی نئی اسکیم شروع کی جا رہی ہے۔ سرکاری ملازموں اور دیگر کارکنوں کے پراویڈنٹ فنڈ کی بچتوں پر شرح سود ۱۰.۵ فیصد سے بڑھا کر ۱۲ فیصد کر دی گئی ہے۔

تنخواہ پانیوالے ملازمین کو ٹیکس میں راحت پہنچائی گئی ہے۔ انھیں اپنی تنخواہ میں سے ۱۰۰۰ روپے کی اسٹینڈرڈ منہائی کی چھوٹ دی گئی ہے۔ اسکے علاوہ تمام ملازمین کو کم از کم ۱۰۰۰۰ روپے تک آمدنی ٹیکس کی چھوٹ ملی ہوئی ہے۔ زندگی بچانیوالی اہم ادویات پر ایکسائز محصول میں چھوٹ دی گئی ہے۔

مٹی کے تیل کی تمام اقسام کے اسٹوو، برنر،

(باقی صفحہ ۱۶ پر)

ڈاکٹر مالکم ایس ادی سیشیہ

طویل المدتی پالیسی کے مثبت اور منفی پہلو

ڈاکٹر ادی سیشیہ کا خیال ہے کہ طویل المدتی مالی پالیسی کا براہِ راست فائدہ یہ ہے کہ ساتویں منصوبے کے مالی نتائج واضح طور پر متعین کئے جا سکے ہیں اس کی وجہ سے منصوبے کی مدت کے دوران سرکار اور پبلک کو بڑے بڑے اقتصادی فیصلوں کے سلسلے میں رہنمائی حاصل ہو سکے گی۔ اس کی وجہ سے سالانہ بجٹ کی سمتوں کے تعین اور تال میل میں رہنمائی مل سکے گی نیز منصوبے کے مالی مقاصد اور سالانہ بجٹ کے درمیان تعلق قائم کیا جا سکے گا۔ البتہ ان کے خیال میں اس پالیسی کی ایک بڑی بُرائی یہ ہے کہ اس سے موجودہ غیر مساوی ٹیکس ڈھانچے میں تبدیلی نہیں آ سکے گی جس سے صورتِ حال اور خراب ہو سکتی ہے۔ بالواسطہ ٹیکسوں سے موجودہ بڑی آمدنیوں میں شاید پہلے کے مقابلے اور اضافہ ہو مگر اس کو ساتویں منصوبے میں توازن ادائیگی سے جو کہ پہلے ہی گمبھیر ہے، نہیں جوڑا جا سکا ہے۔

دسمبر ۱۹۸۵ میں طویل المدتی مالی پالیسی کا اعلان پارلیمنٹ میں کیا گیا۔ اس مہینے وزارتِ مالیات نے اسکی وضاحت کے لیے ایک دستاویز جاری کی۔ اس پالیسی کے بہت سے مثبت پہلو ہیں۔

مثبت پہلو

اس میں چار مقاصد یا چار نکات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے پیرا ایک /دس سے لے کر ایک /تیرہ تک بیان کردہ فائدے ٹھوس ہیں۔ ان کی رُو سے سالانہ بجٹ بناتے وقت رہنمائی مل سکے گی اور تال میل بڑھ سکے گا۔ اس کے ساتھ ہی منصوبے کے مالی مقاصد اور سالانہ بجٹ میں رابطہ قائم ہو سکے گا۔ یہ دعویٰ ابھی بڑھ چڑھ کر معلوم ہوتا ہے اور اس کے نتائج کے بعد ہی اس کے جواز میں کچھ کہا جا سکے گا۔

منصوبے کے اخراجات اور مالیات

اس سلسلے کے وضاحتی بیان میں پلان کے اُن وسائل کا ذکر کیا گیا ہے جو کہ ساتویں منصوبے کے دوران ہر سال درکار ہوں گے۔ اس کے پیرا دو سے لے کر ۹ تک آئندہ چار برسوں کے لیے مجوزہ پلان مصارف کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح ان مصارف کے لیے رقومات کی فراہمی کی وضاحت گوشوارہ نمبر ۳ میں کی گئی ہے۔ یہ رقومات عوامی بچتوں، گھریلو قرضوں، غیر ملکوں سے خالص سرمائے کی آمد، بیرونی تجارتی قرضوں وغیرہ کے ذریعے اکٹھی کی جاتی ہیں۔ آئی ڈی اے اور باہمی وسیلوں سے حاصل ہونے والی رعایتی شرحوں پر قرضوں میں کمی کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بین الاقوامی سرمایہ منڈی سے لیے جانے والے قرضوں میں اضافہ ہوگا۔ گھریلو قرضوں میں خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہوں، انحطاط واقع ہو رہا ہے۔ منڈی کے قرضوں،

بجٹ کے خسارہ اور دیگر شکلوں میں قرضوں میں کمی کا رجحان لانا ہے۔ ساتویں منصوبے کے آخری سال عوامی بچتوں کی میزان گھریلو قرضوں کے مقابلے زیادہ ہونی چاہیئے۔ پبلک سیکٹر اداروں کی کارگزاری بہتر بنانے پر زور دینا ہے تاکہ ان کا حصّہ اندرون ملک مجموعی پیداوار کے ۳ر۹ فیصد سے بڑھ کر ۴ر۹ فی صد تک پہونچ سکے۔ یہ حصّہ ایک طرح سے عوامی بچت کا ہی ایک حصّہ ہے۔ یہ سب وہ اُمیدیں ہیں جو حقیقی کارگزاری کی بنیاد پر نہیں بلکہ قوم کی طرف سے ان یونٹوں میں کی گئی بڑی سرمایہ کاری کی بنیاد پر باندھی گئی ہیں۔ مالیات کے اندازے اس وقت بہترین اندازے لگائے جا سکتے ہیں لیکن ان میں غلطی کا امکان بھی ہے اور عدم استحکام کا عنصر بھی۔

منصوبہ اور غیر منصوبہ جاتی اخراجات

گوشوارہ نمبر ۴ میں مالیات کی فراہمی کے طریقوں کی وضاحت کے سلسلے میں بالواسطہ اور بلا واسطہ ٹیکسوں سے ہونے والی آمدنی بتائی گئی ہے۔ ساتویں منصوبے کے ہر سال اس مد سے آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی غیر منصوبہ جاتی اخراجات یعنی دفاع، سُود کی ادائیگی، خوراک اور کیمیاوی کھاد پر سبسڈی وغیرہ کا بھی اس میں ذکر ہے۔ ان آئٹموں کا ہر سال تخمینہ لگایا جاتا ہے اور ساتویں منصوبے میں اس مد کے کل اخراجات کو سال بہ سال تقسیم کیا جاتا ہے۔ غیر منصوبہ جاتی اخراجات میں سود کی ادائیگی پر اخراجات سب سے زیادہ ہیں۔ ۱۹۸۵-۸۶ میں یہ اخراجات جی ڈی پی کے ۴ فیصد سے بڑھ کر ۱۹۸۹-۹۰ میں ۱ر۴ فی صد تک پہونچ جائیں گے۔ دوسرے نمبر پر دفاع کے اخراجات ہیں اور ان میں سال بہ سال اضافہ کا رجحان ہے۔ ساتویں منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے دفاع، سبسڈی اور دیگر تمام اخراجات میں کفایت لانی ضروری ہے۔

بجٹ کی رازداری کا خاتمہ

ساتویں منصوبے کے مالی گوشوارے سے دو مثبت نتائج سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ اب تک بجٹ کی تیاری میں رازداری کو سامنے رکھا جاتا تھا، مگر اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہنی چاہیئے۔ ابھی تک اس کے بڑے بڑے اصولوں کی ترتیب و تشکیل میں پارلیمنٹ اور کونسل وزرا کو بھی مداخلت کی گنجائش نہیں مل پائی تھی۔ سالانہ بجٹ اب کھلے طور پر بن سکتے ہیں۔ ان پر کھل کر بحث ہو سکتی ہے۔ اور پھر مناسب بحث اور جانچ کے بعد پارلیمنٹ کی منظوری مل سکتی ہے۔ بہتر ہے اگر اسے کمیٹی کے مرحلے پر منظور کر لیا جائے۔ اس کی بحث میں عوام اور سرکاری مالیات کے ماہرین خصوصی حصہ لے سکتے ہیں۔ بجٹ کی تیاری صیغہ راز میں رکھنے کا رواج برطانوی دَور کی پیداوار ہے۔ اسے آنکھ بند کر کے اپنا لیا گیا مگر اب اسے ترک کر دینا چاہیئے۔ دوسرا مثبت پہلو یہ ہے کہ ساتویں منصوبے کے مالی نتائج اب واضح طور پر متعین کیے جا سکتے ہیں اور منصوبے کے دوران سرکار اور پبلک کو بڑے بڑے اقتصادی فیصلوں کے ضمن میں رہنمائی مل سکے گی۔ ساتویں منصوبے کے مالی تقاضوں اور سالانہ بجٹوں کے درمیان رابطہ قائم کرنے میں کامیابی مل سکے گی۔

آمدنی ٹیکس

مالی پالیسی میں شخصی آمدنی اور دولت ٹیکس کی موجودہ شرحوں کو برقرار رکھنے کے وعدے سے فائدہ یہ ہوگا کہ سرکار کی آمدنی کو استقلال حاصل ہوگا اور ٹیکس دہندگان کو بھی یک گونہ اطمینان رہے گا۔ انکم ٹیکس کے قوانین کو آسان بنا دینے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اور اس سلسلے میں قانون سازی کے لیے کہا گیا ہے۔ ہر دو تین سال کے اندر ٹیکسوں کی شرح پر افراطِ زر کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے بھی کہا گیا ہے۔

بچتوں کے لیے تحریکِ عمل

نیشنل ڈپازٹ اسکیم (نئی سیریز) کی تجاویز اور کارپوریٹ انٹرپرائزز کی اسکیم کے ذریعے بچتوں کو بڑھانے کی جو بات کہی گئی ہے، وہ اس کا ایک اور مثبت پہلو ہے۔ شخصی آمدنی کے تحت ان بچتوں کی نصف رقم آمدنی ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگی۔ کارپوریٹ انٹرپرائزز اسکیم کے تحت منافع کا ایک حصّہ آئی ڈی بی آئی کے یہاں جمع کرانا ہوگا جسے وہ پلانٹ اور مشینری میں سرمایہ کاری کے طور پر لگائیں گے۔

منفی پہلو

اس پالیسی کا تاریک پہلو یہ ہے کہ براہِ راست ٹیکسوں کی شرح اگر پانچ سال تک اسی کمتر سطح پر چلتی رہی اور بالواسطہ ٹیکسوں سے آمدنی میں اضافہ ہوتا رہا تو یہ پالیسی ٹیکسوں کے موجودہ غیر مساوی ڈھانچے کو منجمد کر دے گی۔ جس سے صورتِ حال خراب ہو سکتی ہے۔ گوشوارہ پانچ واضح کرتا ہے کہ مرکزی سرکار کی طرف سے جمع کیے گئے براہِ راست ٹیکسوں کی میزان مجموعی ٹیکسوں کی میزان کے مقابلے گھٹی ہے اور تناسب ۱۹۷۰-۷۱ کے ۲ر۲۶ فیصد سے گھٹ کر ۱۹۸۴-۸۵ میں ۲۱ فیصد رہ گیا ہے جب کہ بالواسطہ ٹیکسوں کی میزان ۸ر۷۲ فیصد سے بڑھ کر اس عرصے میں ۹ر۷۰ فیصد ہو گئی ہے۔ آمدنی کا ٹیکس کا حصّہ ۱۹۷۰ کے بعد تقریباً ۵ سال تک

۱۴ر۲ فیصد تھا جو گھٹ کر چھٹے منصوبے میں ۱ر۹ فیصد رہ گیا۔ کارپوریشن ٹیکس میں جمود کی حالت رہی۔ گوشوارہ نمبر ۴ واضح کرتا ہے کہ ساتویں منصوبے کے دوران بالواسطہ ٹیکسوں سے آمدنی بڑھے گی۔

۸۶ – ۱۹۸۵ میں بالواسطہ ٹیکسوں سے ہونے والی آمدنی کا تناسب جی ڈی پی کا ۶ر۱۳ فیصد رہا۔ جب کہ یہ ۹۰ – ۱۹۸۹ میں بڑھ کر ۷ر۱۳ فیصد ہو سکے گا۔ اس عرصے میں بلاواسطہ ٹیکسوں سے ہونے والی آمدنی کا تناسب ۵ر۱ فیصد سے بڑھ کر ۱ر۲ فیصد ہوگا۔ رواں سال کے پہلے چھ ماہ میں ٹیکسوں کی وصولی کے لیے اقدامات تیز کیے گئے اور آمدنی ٹیکس کی شرحوں کو گھٹانے کا جواز بھی یہی دیا گیا کہ اس کے ذریعے وصولی بڑھے گی۔ ان چھ ماہ کے وسائل کے تجزیاتی مطالعے کی عدم موجودگی میں ٹیکسوں کی وصولی کے ذریعے آمدنی میں اضافے کا خیال فریب کن ثابت ہو سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ساتویں منصوبے میں جب وسائل کا بحران پیدا ہوگا، اس وقت ٹیکسوں کی شرحوں میں استحکام اور معیشت کے اضافے کی بنیاد پر وسائل میں استحکام کا تصور کمزور ثابت ہوگا۔ ٹیکسوں کی وصولی پر زور دیا گیا ہے اور ٹیکسوں کی چوری کو روکنے کے اقدامات پر زور دے کر آمدنی بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن یہ اقدامات جن شکلوں میں تجویز کیے گئے ہیں، ان سے اور مسائل پیدا ہوں گے۔

اخراجات ٹیکس

اخراجات ٹیکس کی جانب اٹھایا گیا قدم جو کہ مجوزہ نیشنل ڈپازٹ اسکیم کے لیے وجہ جواز ہے، یہ ہے کہ تمام خالص بچتیں اور صرف وہی نہیں کہ جو اس اسکیم سے جوڑی گئی ہیں، احاطہ کر لی جائیں۔ جامع انداز پر تمام خالص بچتوں کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ دولت ٹیکس اور تدریجی تحفہ ٹیکس کا بھی ایک مکمل نظام درکار ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی آمدنیوں اور بچتوں کی اطلاعات کا ایک جامع نظام درکار ہوگا نیز اسٹیٹ ڈیوٹی کا احیاء ضروری ہوگا۔

بالواسطہ ٹیکسوں میں تاخیر

سنٹرل ایکسائز اور کسٹمز محصولات کو معقولیت پسندانہ انداز پر لانے اور طریق کار کو سہل بنانے کے سلسلے میں بہت سے مطالعے کیے جا چکے ہیں۔ وزارت کی طرف سے مزید مطالعوں کی ضرورت نہیں، جیسا کہ اس کے پیرا ۶ تا ۱۷ میں کہا گیا ہے۔ اسی طرح اعلیٰ اختیارات کی کمیٹی کے ذریعے ان مستحکم اصلاحات کو عملی جامہ پہنائے جانے کی بھی ضرورت نہیں جیسا کہ پیرا ۲ سے لے کر پیرا ۲۸ تک مذکور ہے۔

تقریباً ۵ برس پہلے منوٹ کی سفارش کی گئی تھی جو کہ کافی سوچ وچار کر اور محتاط طریقے پر تشکیل دی گئی تھی۔ اس کی رو سے مینوفیکچرر کی طرف سے بڑھائی گئی قیمتوں پر ٹیکس رکھا گیا تھا جو کہ منوٹ کے نام سے تھا۔ اس کی جگہ موڈوٹ کو دینے کی بات دل کو نہیں لگتی۔ موڈوٹ میں برائی یہ ہے کہ اس میں سرکار کی رائے پر بہت کچھ انحصار ہے۔ کون کون سی اشیاء پر ٹیکس لگے اور کتنا کتنا لگے، دونوں ہی سرکار کی رائے پر ہے۔

سالانہ شرح ترقی کی حقیقتیں

ساتویں منصوبے کے دوران معیشت کے اہم شعبوں کے ضمن میں چند مفروضات قائم کیے گئے ہیں۔ چند مفروضات غیر حقیقی ہونے کے سبب ان میں بڑی حد تک ترمیم و تنسیخ کے امکانات ہیں، تمام کوشش کا حاصل یہ ہے کہ معیشت کی شرح ترقی ۵ فیصد سالانہ کے اوسط سے ہو سکے۔ چھٹے منصوبے میں ۵ فیصد کی شرح ترقی ۸۰ – ۱۹۷۹ کے ۵ر۱ فیصد کی کمتر بنیاد پر تھی۔ ساتویں منصوبے میں یہ رعایت حاصل نہیں ہے۔ اس عرصے میں شرح ترقی کی حقیقت ۶ر۳ فیصد ہونے کے باوجود ۵ فیصد شرح ترقی کے حصول کی امید کر لی گئی ہے۔

افراطِ زر

ایک اور مفروضہ یہ ہے کہ افراطِ زر کی شرح کو صفر مان لیا گیا ہے۔ شخصی آمدنی ٹیکس کی شرحوں کے ضمن میں افراطِ زر کا حوالہ ضروری ہے۔ اصل صورتِ حال یہ ہے کہ تیسرے منصوبے سے افراطِ زر کی شرح نے منصوبے کے وسائل کو نیز منصوبے کی کارگزاریوں کو کھوکھلا کیا ہے۔ ساتویں منصوبے میں اس صورتِ حال سے بچا نہیں جا سکتا۔ منصوبے کے وسائل کا تخمینہ لگاتے وقت افراطِ زر کو خیال میں نہ رکھ کر غیر یقینی صورتِ حال کو دعوت دی گئی ہے۔

ادائیگوں کے توازن کا خسارہ

آخری بات یہ ہے کہ طویل المدتی مالی پالیسی ادائیگوں کے توازن سے جڑی ہوئی نہیں ہے۔ ساتویں منصوبے میں اس توازن کے بحران کا سامنا ہے۔ ساتویں منصوبے کی دستاویز میں ۰۰ر۲۴۴ کروڑ روپے کے تجارتی خسارے کا ذکر ہے۔ اس میں ۲۰ ہزار کروڑ روپے کے بقدر ادائیگوں کے توازن میں خسارہ ہے۔ یہ پانچ سال کے اندر ہے۔ اپریل تا جولائی ۸۶ – ۱۹۸۵ کے تجارتی خسارے کے رجحان سے واضح ہوتا ہے کہ یہ خسارہ اندازے سے کہیں زیادہ ہوگا۔ پہلے چار ماہ کے دوران یعنی مذکورہ مدت میں درآمدات میں ۳۰ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ جبکہ برآمدات میں اضافہ اعشاریہ ۴ فیصد کی شرح سے ہو رہا ہے۔ اس لیے ان چار ماہ میں ۹ر۳۰۷ کروڑ روپے کا تجارتی خسارہ ہے۔ جبکہ ایک سال قبل کے ان چار ماہ میں یہ خسارہ ۵ر۱۷۰۰ کروڑ روپے تھا۔ یہ اعداد و شمار تو امپورٹ پالیسی کو نرم بنانے سے قبل کے ہیں، اس کے عمل میں آنے کے بعد یہ فرق اور بڑھ جائے گا۔ ہماری مالیاتی پالیسی میں اس حقیقت کو سامنے نہیں رکھا گیا ہے۔ ●

پروفیسر بی. بی. بھٹاچاریہ

طویل المدتی مالی پالیسی کتنی کامیاب؟

یہ مسئلہ ہمارے ذہن کو پریشان کر رہا ہے

صاحب مضمون کا کہنا ہے کہ طویل المدتی مالی پالیسی منصوبوں کے لیے وسائل جٹانے کے کلیدی مسئلے کا حل پیش کرنے میں ناکام رہی ہے جو درحقیقت ایک کٹھن مسئلہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ساتواں منصوبہ مخالف حالات میں شروع ہوا ہے جن کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ سال ۱۹۷۰ سے پبلک بچتوں میں تیزی سے کمی ہوتی رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پبلک سرمایہ کاری کے لیے قرضہ جاتی وسائل پر انحصار بڑھ گیا ہے اور اس سے قرضوں کے بوجھ میں اضافہ ہوا ہے۔ مضمون نگار کی نظر میں واحد حل یہ ہے کہ ٹیکسوں اور دیگر ذرائع سے ہونے والی آمدنی کو تیزی سے بڑھایا جائے اور غیر منصوبہ جاتی اخراجات کو سختی سے کم کیا جائے۔

یہ بات سبھی کو معلوم ہے کہ ماضی میں اکثر مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے سالانہ بجٹ متعلقہ پنجسالہ منصوبے میں مضمر مالی پالیسی سے اگر مختلف نہیں تو اس کے عین مطابق بھی نہ تھے۔ اس کی ایک نمایاں مثال قیمتیں کم رکھنے کے لیے سرکار کی طرف سے مہیا کی جانے والی امدادی رقوم کی فراہمی سے متعلق پالیسی کا وہ فرق ہے جو ہمیں چھٹے پنجسالہ منصوبے اور اس منصوبے کی مدت کے دوران مرکزی حکومت کے سالانہ بجٹوں کے درمیان دیکھنے کو ملا۔ چھٹے منصوبے میں یہ سفارش کی گئی تھی کہ منصوبے کے لیے مزید وسائل حاصل کرنے کے لیے خوراک اور کیمیاوی کھاد کے لیے دی جانے والی امدادی رقوم کی سطح میں کمی کی جانی چاہیئے۔ لیکن ہوا کیا؟ منصوبے کی مدت میں سالانہ مرکزی بجٹوں میں امدادی رقوم کی فراہمی کے لیے اور زیادہ رقومات مختص کی جاتی رہیں۔ لہٰذا مرکز کی طرف سے دی جانے والی امدادی رقوم کی کل تعداد منصوبے سے قبل کی سطح سے کم ہونے کے بجائے بڑھ گئی اور ۸۰-۱۹۷۹ء میں ۱۶۸۰ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۷۰۴۷ کروڑ روپے تک پہونچ گئی۔

طویل المدتی پالیسی کیوں؟

سب سے عمدہ بات تو یہ ہے کہ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے سالانہ بجٹ پنجسالہ منصوبے کی سالانہ صورت پر مبنی ہوں۔ ایسا کرنے سے یہ

ہوگا کہ پبلک سیکٹر کے منصوبہ جاتی اخراجات کے لیے پنجسالہ منصوبہ ہی بنیادی رہنمائی فراہم کرے گا اور دیگر تمام اخراجات اور ذرائع آمدنی منصوبے میں مندرجہ نشانہ اخراجات کے مطابق طے پائیں گے۔ لیکن عملاً سالانہ بجٹوں کو پنجسالہ منصوبے سے پوری طرح ہم آہنگ کرنا مختلف وجوہات کے سبب مشکل ہوگا۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ پنجسالہ منصوبے معیشت کے ایک طویل المدت اور کسی حد تک وسط مدتی تناظر کو سامنے رکھتے ہوئے بنائے جاتے ہیں۔ مختصر المدتی امور مثلاً موسم کے سبب زرعی پیداوار میں ہونے والی تبدیلیوں وغیرہ کو اتنا ملحوظ نہیں رکھا جاتا جتنا کہ طویل المدت تناظر کو رکھا جاتا ہے لیکن مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے بجٹوں میں معیشت کے مختصر المدتی حالات کا بھی مناسب خیال رکھا جانا چاہیے۔ افراط زر کی صورت حال پبلک سرمایہ کاری کے لیے رقوم کی تخصیص کو منصوبے کی بہ نسبت سالانہ بجٹ میں زیادہ متاثر کرسکتی ہے۔ چنانچہ معیشت کے طویل اور مختصر المدتی تناظروں کے فرق کے نتیجے میں بجٹ میں منصوبہ کے لیے رقوم کی تخصیص میں کچھ تبدیلیاں ہوسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ معیشت کے طویل المدتی تناظر پنجسالہ منصوبے کی مدت میں بدل بھی سکتے ہیں جس کی وجہ سے منصوبے کی ترجیحات میں بیچ راستے میں تبدیلی کی ضرورت پیش آسکتی ہے اور پھر اس کے نتیجے میں بجٹ میں مختلف مدوں کے لیے مختص کی گئی رقومات میں بھی تبدیلی کرنی پڑسکتی ہے۔

سالانہ بجٹوں کی پنجسالہ منصوبے کیساتھ تطبیق کے راستے میں ایک اور بڑا مسئلہ یہ ہے کہ منصوبے کا تعلق زیادہ تر پبلک سیکٹر پر سرمایہ کاری سے ہوتا ہے جبکہ بجٹ مالی نظام کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے لہٰذا ان دونوں کے دائرہ کار اور مقاصد مختلف ہیں اور اس اختلاف کی وجہ سے بجٹوں میں منصوبے کے تعلق سے کچھ رد و بدل کرنی ضروری ہوسکتی ہے۔

مالیات کی فراہمی

ان مسائل کی وجہ سے ہی ایک ایسی طویل المدتی مالی پالیسی کی ضرورت محسوس کی گئی جو پنجسالہ منصوبے کے لیے مالیات فراہم کرنے کے طریقے سے مطابقت رکھتی ہو۔ لہٰذا حکومت نے جس طویل المدتی مالی پالیسی کا اعلان کیا ہے وہ ایک [illegible] ہے۔ یہ پالیسی ساتویں پنجسالہ منصوبے کی مدت کے ساتھ ہی ختم ہوگی۔ اُمید کی جاتی ہے کہ طویل المدتی مالی پالیسی ساتویں منصوبے اور اس منصوبے کی مدت کے دوران مرکزی حکومت کے سالانہ بجٹوں کے درمیان ایک پُل بنا سکے گی۔

اندرونِ ملک بچتوں کے ذریعے

طویل المدتی مالی پالیسی کے دُرست یا نادُرست ہونے کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ساتویں منصوبے کے مقاصد کو پورا کر پاتی ہے یا نہیں۔ ساتویں منصوبے میں کُل ملکی پیداوار GDP کی شرح ترقی کا نشانہ، عنصری لاگت کی بنیاد پر، پانچ فیصد سالانہ مقرر کیا گیا ہے۔ ساتویں منصوبے کی شرح ترقی کے اس نشانے کو پورا کرنے کے لیے کُل ۳۲۲۳۶۶ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کی ضرورت ہوگی۔ اس میں سے ۳۰۲۳۶۶ کروڑ روپے، ۱۹۸۴ـ۸۵ء کی قیمتوں کی بنیاد پر، گھریلو بچتوں (Domestic Savings) سے حاصل کرنے ہوں گے۔ مطلوبہ بچتیں پیدا کرنے کے لیے کُل گھریلو بچتوں کی شرح ۱۹۸۴ـ۸۵ء میں ۲۳٫۳ فیصد سے بڑھا کر ۱۹۸۹ـ۹۰ء میں ۲۴٫۵ فیصد کرنی ہوگی۔ یا ساتویں منصوبے کی مدت میں بچتوں کی مارجینل (Marginal) شرح ۲۸٫۴ فیصد ہونی چاہیے۔ اگرچہ اندرونِ ملک بچتوں کا بہت بڑا حصہ گھریلو سیکٹر (Household Sector) سے ملنے کی اُمید ہے۔ لیکن کُل اندرونِ ملک بچتوں میں گھریلو بچتوں کا حصہ ۱۹۸۴ـ۸۵ء کے ۷۵ فیصد سے گھٹ کر ۱۹۸۹ـ۹۰ء میں تقریباً ۷۰ فیصد رہ جانے کا احتمال ہے جبکہ پبلک سیکٹر کی بچتوں کا حصہ ۱۹۸۴ـ۸۵ء میں تقریباً ۱۸ فیصد سے بڑھ کر ۱۹۸۹ـ۹۰ء میں تقریباً ۲۱ فیصد ہو جانے کی توقع ہے۔ اسی طرح کارپوریٹ سیکٹر کی بچتوں کا حصہ ۱۹۸۴ـ۸۵ء میں تقریباً ۷ فیصد سے بڑھ کر ۱۹۸۹ـ۹۰ء میں تقریباً ۹ فیصد ہو جانے کی اُمید ہے۔

ساتویں منصوبے کے لیے پبلک سیکٹر کے منصوبہ جاتی مصارف، ۱۹۸۴ـ۸۵ء کی قیمتوں کی بنیاد پر، ۱۸۰٬۰۰۰ کروڑ روپے کے بقدر رکھے گئے ہیں جس میں سے ۹۵۵۳۴ کروڑ روپے مرکزی منصوبے کے لیے مختص ہیں۔ مرکز کی طرف سے مرکزی منصوبے اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے منصوبوں کے لیے نیز ریاستی منصوبوں کی امداد کے واسطے ۱۹۸۴ـ۸۵ء کی قیمتوں کی بنیاد پر کُل ۱۲۹۰۳۹ کروڑ روپے کے وسائل بروئے کار لائے جائیں گے۔

لہٰذا ساتویں منصوبے کے لیے درج ذیل اقدامات کی ضرورت ہے

۱۔ گھریلو بچتوں (Domestic Savings) کی شرح ۱۹۸۴ـ۸۵ء میں ۲۳٫۳ فیصد سے بڑھا کر ۱۹۸۹ـ۹۰ء میں ۲۴٫۵ فیصد کی جائے۔

۲۔ پبلک سیکٹر میں بچتوں کی شرح میں اضافے کے لیے کوئی اہم قدم اٹھایا جائے۔

۴۔ مرکزی، ریاستی اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے منصوبوں کے لیے مرکز کی جانب سے بیشتر وسائل جٹائے جائیں۔

آئیے اب یہ دیکھیں کہ طویل المدتی مالی پالیسی ان مقاصد کو کہاں تک پورا کر سکے گی۔

صرف مرکزی بجٹوں کے لیے

سب سے پہلے تو ہمیں یہ بات دھیان میں رکھنی چاہیئے کہ طویل المدتی مالی پالیسی کا تعلق صرف مرکزی بجٹوں سے ہے۔ اگر مرکز ساتویں منصوبے کی مدت میں اس پالیسی پر سختی سے عمل پیرا ہو تو بھی اس میں اس بات کا یقین دہانی نہیں کی گئی ہے کہ ریاستی حکومتیں بھی ایسی ہی مالی پالیسی پر عمل کریں گی۔ صرف اُمید ہی کی جا سکتی ہے کہ چونکہ مرکزی حکومت منصوبہ سازی اور منصوبہ کے لیے وسائل کو حرکت میں لانے میں ایک نمایاں رول ادا کرتی ہے اس لیے بیشتر ریاستی حکومتیں بھی مالی پالیسی کے معاملے میں مرکزی حکومت کے دکھائے ہوئے راستے پر چلیں گی۔

اندرونِ ملک بچتیں ساکن

طویل المدت مالی پالیسی کے مضمرات کا تجزیہ کرنے سے پہلے چھٹے منصوبے کے لیے مالیات کی فراہمی کے انداز پر طائرانہ نظر ڈالنا بہتر ہوگا۔ ساتویں پنجسالہ منصوبے کے مطابق چھٹے منصوبے کے دوران ۵ر۲ فیصد سالانہ کی شرح ترقی کا موٹا نشانہ حاصل کر لیا گیا ہے۔ (یاد رہے کہ چھٹے منصوبے کا آغاز معیشت کی مقابلتاً کم تر بنیاد پر ہوا تھا)۔ چھٹے منصوبے میں سرمایہ کاری کی شرح نشانے سے کم رہی۔ کل اندرونِ ملک بچتوں کی شرح جو ۷۹-۱۹۷۸ میں ۶ر۲۴ فی صد تک پہونچ گئی تھی، چھٹے منصوبے کے دوران لگ بھگ ۲۳ فیصد پر ساکن رہی۔ اس طرح ساتویں منصوبے کا مقصد محض چھٹے منصوبے سے پہلے کی کل گھریلو بچتوں کی شرح کو بحال کرنا ہے۔

چھٹے منصوبے کے لیے پبلک سیکٹر کے مصارف کے لیے ۸۰-۱۹۷۹ کی قیمتوں کی بنیاد پر ۹۷،۵۰۰ کروڑ روپے رکھے گئے تھے لیکن تازہ ترین تخمینوں کے مطابق اصل مصارف کی کل رقم چھٹے منصوبے کی مدت کے دوران رواں قیمتوں کی بنیاد پر ۱۱۰،۸۲۱ کروڑ روپے ہوگئی۔ لیکن ۸۰-۱۹۷۹ کی قیمتوں کی بنیاد پر دیکھیں تو یہ تقریباً ۸۴۰۰۰ کروڑ روپے ہی رہی۔ دوسرے الفاظ میں پبلک سیکٹر کے مصارف میں اصلیت میں تقریباً ۱۵ فیصد کی کمی واقع ہوئی۔ اس کمی کی بڑی وجہ سرکاری انتظامیہ کی بچتوں میں کمی ہونا ہے۔

پبلک سیکٹر کی کارکردگی

چھٹے منصوبے کی مدت میں پبلک سیکٹر کی کارکردگی وسائل کو حرکت میں لانے کے معاملے میں سرکاری انتظامیہ سے نسبتاً بہتر رہی۔ لیکن منصوبے کے وسائل میں پبلک سیکٹر کے کارخانوں کا حصّہ اصل معنوں میں شروع میں مقرر کیے گئے نشانے سے بہت کم رہا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی دھیان میں رکھنی چاہیئے کہ پبلک سیکٹر کے کارخانوں کی بچتوں میں جو بہتری واقع ہوئی اس کا ایک بڑا حصہ پبلک سیکٹر کی آئل کمپنیوں کی اُن بڑھی ہوئی بچتوں کا مرہونِ منّت ہے جو ملک کے اندر تیل کی پیداوار میں تیز اضافے کی بدولت ممکن ہوئیں۔ ساتویں منصوبے کی مدت میں اس قسم کی ترقی یا اضافے کا امکان بہت کم ہے۔

وسائل کی فراہمی میں کمی

چھٹے منصوبے میں منصوبے کے لیے ۸۰-۱۹۷۹ کی قیمتوں کی بنیاد پر ۴۶۲۵۰ کروڑ روپے کے وسائل مرکز کی طرف سے فراہم کیے جانے کا نشانہ رکھا گیا تھا۔ اس میں سے ۳۰۹۰۰ کروڑ روپے مرکزی منصوبے (مرکزی انتظام کے علاقوں کے منصوبے سمیت) کے لیے مختص کیے گئے تھے اور باقی ۱۵۳۵۰ کروڑ روپے مرکزی منصوبوں کے لیے مرکز کی امداد کے واسطے مخصوص کیے گئے تھے۔ لیکن منصوبے کے لیے رواں قیمتوں کی بنیاد پر تو تقریباً ۴۷۹۴۳ کروڑ روپے جٹائے گئے لیکن ۸۰-۱۹۷۹ء کی قیمتوں کی بنیاد پر یہ لگ بھگ ۴۳،۵۹۵ کروڑ روپے کے برابر تھے۔ یعنی مرکز کی طرف سے وسائل کے جٹائے جانے میں تقریباً آٹھ فیصد کی کمی ہوئی۔

اگر ہم مرکز کی طرف سے وسائل کے جٹائے جانے کے طویل المدتی طریق کار پر (جس میں ریاستی منصوبوں کے لیے مرکزی امداد کے واسطے وسائل جٹانا بھی شامل ہے) نظر ڈالیں تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ پبلک بچتوں کا حصہ — بجٹ کی رواں آمدنی جمع پبلک سیکٹر کے کارخانوں کی بچتیں — ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۵ء میں ۳۶ فیصد سے گھٹ کر چھٹے منصوبے کے اختتام پر ۳۰ فیصد سے بھی کم ہوگیا ہے۔ (گوشوارہ نمبر ۱) زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ بجٹ کے رواں ریونیو محاصل بی سی آر BCR کا حصہ ۷۵-۱۹۷۰ میں ۲۲ فیصد کے مقابلے میں ۸۵-۱۹۸۴ء میں گھٹ کر صرف تین فیصد رہ گیا ہے۔ اس طرح ساتواں منصوبہ مالی وسائل کی پوزیشن کے لحاظ سے مخالف حالات میں شروع ہوا ہے۔

گوشوارہ نمبر ۱

مرکز کے ذریعے منصوبے کے لیے وسائل کی فراہمی کی تفصیل :-

	اوسط ۱۹۷۱–۷۶	اوسط ۱۹۷۶–۸۰	اوسط ۱۹۸۰–۸۵	اوسط ۱۹۸۴–۸۵
منصوبے کے لیے مرکز کے جمع کردہ وسائل مجموعی گھریلو پیداوار GDP کے فیصد کی صورت میں۔	۵ر۰	۷ر۸	۹ر۲	۱۰ر۳
وسائل کو حرکت میں لانے کا انداز (فی صد تقسیم)				
۱۔ پبلک بچتیں	۳۶	۳۱	۳۰	۲۹
(ا) BCR (بجٹ کے روانی ریونیو محاصل)	۲۲	۱۷	۸	۳
(ب) پبلک سیکٹر کے کارخانوں کا حصہ۔	۱۴	۱۴	۲۲	۲۶
۲۔ غیر ممالک سے ملنے والا خالص سرمایہ۔	۲۱	۱۴	۱۳	۱۴
۳۔ اندرونِ ملک لیے گئے قرضے۔	۴۳	۵۵	۵۷	۵۷
(ا) بازار سے لیے گئے قرضے۔	۱۴	۱۹	۲۳	۱۸
(ب) بجٹوں کا خسارہ۔	۱۰	۱۴	۱۴	۱۰
(ج) دیگر۔	۱۲	۲۳	۲۰	۲۲

(یہ تفاصیل طویل المدت مالی پالیسی کے گوشوارہ نمبر ۱ صفحہ ۷ سے لی گئی ہیں)

غیر منصوبہ جاتی مصارف میں اضافہ

مرکزی بجٹ میں پبلک بچتوں کے حصے میں گراوٹ کے رجحان کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مرکز کے غیر منصوبہ جاتی اخراجات میں، ریونیو سے ہونے والی آمدنی کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ ریونیو سے ہونے والی آمدنی ۱۹۷۵ سے ۱۹۸۵ تک کی گزشتہ دہائی میں ملک کی کل پیداوار GDP کے تناسب کی صورت میں لگ بھگ ۱۰ر۵ فیصد ہی ساکن رہی ہے۔ ٹیکسوں سے ہونے والی آمدنی میں کمی واقع ہوئی ہے۔ جی ڈی پی میں ٹیکسوں سے ہونے والی آمدنی کا حصہ پانچویں منصوبے کے دوران ۸ر۲ فیصد سے گھٹ کر چھٹے منصوبے کی مدت میں ۷ر۱۹ فیصد رہ گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں مرکز کے غیر منصوبہ جاتی اخراجات، بالخصوص کم قیمتوں پر اشیا کی فروخت کے لیے دی جانے والی امدادی رقوم نیز سود کی ادائیگیوں میں گزشتہ ساڑھے دس سالوں میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا ہے۔ چونکہ مرکز کے منصوبہ جاتی وسائل میں پبلک بچتوں کا نسبتی حصہ کم ہو گیا ہے اس لیے مرکز کو پبلک سرمایہ کاری کے لیے قرض لیے ہوئے وسائل پر دن بدن زیادہ انحصار رکھنا پڑا ہے۔ جوں جوں قرضوں کی رقم بڑھتی گئی سود کی ادائیگی میں اضافہ ہوتا گیا اور اس طرح ریونیو سے ہونے والی آمدنی گھٹتی گئی۔ ۷۶-۱۹۷۱ کی مدت میں مرکز کے غیر منصوبہ جاتی ریونیو اخراجات میں سود کی ادائیگی کا حصہ تقریباً ۲۰ فیصد ہوا کرتا تھا لیکن چھٹے منصوبے کی مدت میں یہ بڑھ کر ۲۵ فیصد کے لگ بھگ ہو گیا اور اندازہ ہے کہ چھٹے منصوبے میں یہ غیر منصوبہ جاتی اخراجات کا ۳۵ فیصد ہو جائے گا۔ ادائیگی سود کے بڑھتے ہوئے بوجھ سے عہدہ برآ ہونے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ریونیو آمدنی ــ ٹیکسوں اور ٹیکسوں سے علاوہ دوسرے ذرائع آمدنی کو بڑھایا جائے۔

سرمایہ کاری: ایک پیچیدہ مسئلہ

طویل المدتی مالی پالیسی کا بنیادی کام پبلک اور پرائیویٹ دونوں سیکٹروں میں سرمایہ کاری کے لیے کافی زیادہ وسائل پیدا کرنا ہونا چاہیے۔ ساتویں منصوبے میں پبلک سیکٹر کے منصوبہ جاتی مصارف کے لیے ۱۸۰۰۰ کروڑ روپے مخصوص کئے گئے ہیں جس میں سے ۱۲۹۰۳۹ کروڑ روپے مرکز کو فراہم کرنے ہوں گے۔ اگر اس نشانے کو پورا کرنا ہے تو ساتویں منصوبے میں مرکز کی ٹیکسوں اور دیگر ذرائع سے ہونے والی آمدنیوں کو غیر منصوبہ جاتی ریونیو اخراجات کی بہ نسبت زیادہ تیزی سے بڑھنا چاہیے۔ طویل المدتی مالی پالیسی میں اس بنیادی مسئلے کو تسلیم تو کیا گیا ہے لیکن اسے حل کرنے کے لیے ٹھوس تجاویز نہیں پیش کی گئی ہیں۔

ٹیکسوں کی وصولیابیوں میں اضافہ مشکل

طویل المدت مالی پالیسی میں زیادہ زور

ٹیکسوں کے نظام کو مستحکم بنانے پر دیا گیا جو کہ حالیہ برسوں میں سُست ہو گیا ہے۔ گزشتہ دس برسوں میں جی ڈی پی میں ٹیکسوں سے ہونے والی آمدنی کا تناسب کم ہوتے ہوتے ۶ر۱۵ فیصد سے ۳ر۱۴ فیصد رہ گیا ہے۔ اسی مدت میں جی ڈی پی میں غیر کارپوریٹ انکم ٹیکس کا تناسب تو اور بھی زیادہ گرا ہے اور ۳ر۲ فیصد سے گھٹ کر ۵ر۱ فی صد ہو گیا ہے۔ بالواسطہ ٹیکسوں پر جس کا حصہ مرکز کے کُل ریونیو میں ۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۵ء تک کے دوران ۷۳ سے ۹۰ فیصد ہو گیا ہے، زیادہ انحصار سے ٹیکس سسٹم نہ صرف رجعت پسندانہ بلکہ افراطِ زر کی مشکلات پیدا کرنے والا بن گیا ہے۔ طویل المدت مالی پالیسی کا مقصد بلا واسطہ (ڈائرکٹ) ٹیکسوں سے ہونے والی آمدنی کے حصے کو ٹیکس دہندگان سے بہتر وصولی کے ذریعے بڑھانا ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ گزشتہ دس برسوں میں ذاتی آمدنی پر ٹیکس کی شرح میں بتدریج کمی سے انکم ٹیکس کی وصولیابیوں پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے جیسا کہ طویل المدتی پالیسی کے صفحہ ۲۲ کے نقشہ نمبر ۷ سے ظاہر ہے۔ گزشتہ دہائی کے تجربے کی روشنی میں طویل المدتی مالی پالیسی کی یہ اُمید کہ ٹیکس دہندگان کی طرف سے ٹیکسوں کی بہتر اور دیانتدارانہ ادائیگی کے ذریعے انکم ٹیکس کی وصولیابیوں کو بڑھایا جا سکے گا، بجا نظر نہیں آتی۔

بچتوں پر رعائتیں، دانشمندانہ؟

گزشتہ دس برسوں کی ایک اور قابلِ توجہ خصوصیت بچتوں کے لیے دی جانے والی بتدریج بڑھتی جانے والی مالی رعائتیں ہیں۔ آج کل منظور شدہ صورتوں میں چالیس ہزار روپے سالانہ تک کی گھریلو بچتیں ذاتی انکم ٹیکس میں رعائتوں کی مستحق ہیں۔ طویل المدتی مالی پالیسی اس حد کو، ٹیکس سے رعایت والی گھریلو بچتوں کی ایک نئی اسکیم کے ذریعے اور بڑھانا چاہتی ہے۔ اس اسکیم کے لاگو ہونے پر مزید گھریلو آمدنی ذاتی انکم ٹیکس کے دائرے سے باہر ہو جائے گی۔

بے لگام غیر منصوبہ جاتی ریونیو اخراجات

طویل المدتی مالی پالیسی میں غیر منصوبہ جاتی ریونیو اخراجات میں اضافے کو روکنے کے لیے کوئی خاص تجاویز شامل نہیں کی گئی ہیں۔ اصلیت تو یہ ہے کہ اگر طویل المدتی مالی پالیسی کی ٹیکسوں سے متعلق تجاویز پر عمل درآمد ہوتا ہے تو اس سے غیر منصوبہ جاتی اخراجات میں سریع تر اضافہ ہو سکتا ہے۔ سب سے پہلے تو ٹیکس سے ہونے والی آمدنی میں نسبتاً سُست تر اضافے کی وجہ سے ملک کے اندر سے اور زیادہ قرضے لینے کی ضرورت پڑے گی، جس کے نتیجے میں ادائیگیٔ سود کی ذمہ داریاں بڑھ جائیں گی اور اس سے بجٹ کی روزاں ریونیو آمدنی گھٹ جائے گی۔ دوسرے، ٹیکس سے ہونے والی آمدنی میں سُست تر اضافے کے سبب یا تو خسارے کی مالیات کا طریقہ اپنانے کی ضرورت پڑے گی یا پبلک سیکٹر کے کارخانوں کی بچت کو بڑھانا ہوگا یا پھر ان دونوں ہی حالتوں کا سہارا لینا ہوگا۔ اگر اول الذکر طریقے کا بہت زیادہ سہارا لیا گیا تو قیمتوں میں اضافہ اور اس کے نتیجے میں غیر منصوبہ جاتی اخراجات میں اضافہ ہو سکتا ہے اور خاص کر تنخواہوں اور اُجرتوں کا بل بڑھ سکتا ہے۔ اگر پبلک سیکٹر کے کارخانوں کی بچت ان کی تیار کردہ چیزوں کی قیمتیں بڑھا کر، بڑھائی جاتی ہے تو اس سے افراطِ زر کی حالت پیدا ہو سکتی ہے اور یہ پبلک بچتوں پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔

"قرضوں کا جال" جس سے بچنا محال ہے

طویل المدتی مالی پالیسی میں پبلک سرمایہ کاری کے لیے مالی مراعات کے ذریعے گھریلو بچتوں کو حرکت میں لانے پر زور دیا گیا ہے۔ اس پالیسی میں تین بڑی خامیاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ مالی نظام کو رجعت پسندانہ بناتی ہے۔ دوسرے یہ ٹیکسوں سے ہونے والی آمدنی کے مقابلے میں قرضوں کے حصے کو نسبتاً بڑھاتی ہے۔ قرضے لے کر پبلک سرمایہ کاری میں لگانے سے مستقبل میں سود کی ادائیگی کی ذمہ داریاں بڑھتی ہیں۔ اگر ٹیکسوں اور دوسرے ذرائع سے ہونے والی آمدنی اپنی سطح پر رہے تو مزید قرضے لینے کی ضرورت پڑتی ہے اور پھر مستقبل میں ادائیگیٔ سود کی ذمہ داریوں میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح قرضوں کا ایک جال سا بن جاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ مالی رعائتوں کے ذریعے بچتوں کی ترغیب و فراہمی ٹیکس دہندگان کے وسائل کی فراہمی کو محدود کرتی ہے۔ ٹیکس ادا نہ کرنے والے عام طور پر مالی رعائتوں کا فائدہ پائے بغیر سرکاری ہُنڈیاں نہیں خریدتے۔

غیر حل شُدہ مسائل جوں کے توں

آخر میں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حکومت نے حال ہی میں جس طویل المدتی مالی پالیسی کا اعلان کیا ہے وہ منصوبے کے لیے مالیات کی فراہمی کے کلیدی مسئلے اور اس مشکل کا حل پیش کرنے میں ناکام رہی ہے کہ ٹیکسوں اور دیگر ذرائع سے ہونے والی ریونیو آمدنی کی بہ نسبت غیر منصوبہ جاتی ریونیو اخراجات میں زیادہ تیزی سے اضافہ ہوتا ہے۔ اگر طویل المدتی مالی پالیسی کی ٹیکسوں سے متعلق تجاویز کو دیانتداری کے ساتھ عملی جامہ پہنایا جائے تو اس سے ڈائرکٹ یا بالواسطہ ٹیکسوں کی وصولی میں کوئی نمایاں بہتری ہوئے بغیر ٹیکس سسٹم اور زیادہ رجعت پسندانہ ہو سکتا ہے۔ طویل المدتی مالی پالیسی کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس کا مقصد مرکزی حکومت کے غیر منصوبہ جاتی اخراجات کو ایک سطح پر مستحکم کیے بغیر ٹیکس سسٹم کو مستحکم

کرنا ہے۔ دراصل طویل المدتی مالی پالیسی میں ٹیکسوں کی رعایتیں دے کر ہاؤس ہولڈ (گھریلو) بچتوں کو بڑھانے پر جو زور دیا گیا ہے اس کے نتیجے میں سود کی ادائیگی کی ذمہ داریاں بڑھ سکتی ہیں جس سے مستقبل میں منصوبے کے لیے مالیات کی فراہمی کا زیادہ بڑا مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔ ●

بقیہ، صنعتی ترقی

بنی بنائی مشینیں درآمد کی ہیں۔ چنانچہ ہم یہ معلومات اب بھی غیر ملکوں سے مستعار لے رہے ہیں یا خرید رہے ہیں۔ حالانکہ ہم دنیا میں سائنسی افرادی قوت کے سب سے بڑا ذخیرہ رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس وسیع وسیلے کو کام میں لانا ایک چیلنج ہے جس کا مقابلہ ہمارے منصوبہ سازوں، صنعت کے رہنماؤں اور ملک بھر کی ڈیزائن اور ڈویلپمنٹ تنظیموں کو کرنا ہے۔

صنعت کا اگلا اہم گروپ نقل و حمل کا سازوسامان ہے۔ اس شعبے میں اگرچہ کاریں، موٹر سائیکل، ٹرک، اسکوٹر وغیرہ جیسی گاڑیاں تیار کرنے میں قابلِ ذکر ترقی ہوئی ہے لیکن اس ترقی کا بیشتر حصہ مستعار لی گئی ٹیکنالوجی کی بدولت حاصل کیا گیا ہے۔ اس شعبے میں خاص طور پر ہماری ضروریات اور سڑکوں کے حالات کے لیے موزوں گاڑیاں تیار کرنے کی غرض سے بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اس لیے آنے والے برسوں میں اس پہلو کی جانب توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔

سیمنٹ اور کاغذ

ہمارے سیمنٹ کے نئے کارخانوں میں بہت سی اصلاح شدہ اور جدید خصوصیات شامل کی گئی ہیں۔ پھر بھی ماحولیاتی آلودگی کو روکنے کے مناسب اقدامات اور نظاموں کی صلاحیت کے لحاظ سے کئی خلا پُر کرنے باقی ہیں تاکہ ان کارخانوں کو زیادہ سے زیادہ صلاحیت سے چلایا جا سکے۔ کاغذ اور گودے کی تیاری کے شعبے میں ہمیں اپنے کثیر قدرتی وسائل سے فائدہ اٹھانے پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے جس میں گنّے کی بھوسی بھی شامل ہے۔

بقیہ، انگور کی کاشت

بیچ کچھ فاصلہ رکھیں۔ نرائی گڑائی ہر دوسرے ہفتے کرنی چاہیے لیکن اس بات کا خاص دھیان ہونا چاہیے کہ کسی قلم کی جڑ ننگی نہ ہو جائے۔

قلموں کی آنکھوں سے جب تک شاخیں نہیں پھوٹتی تو سینچائی فوارے سے کریں۔ اگر ہوا میں کافی نمی موجود ہو تو فوارے سے سینچائی کا چھڑکاؤ ہفتے میں ایک بار کریں۔ زیادہ نمی سے اینٹو نیج (Antonage) نام کی بیماری قلموں کی جڑوں کو پکڑ لیتی ہے اور پتوں پر داغ دھبے نظر آنے لگتے ہیں۔

منڈپ بنائیے

انگور کی بیل منڈپوں کے اوپر چڑھائی جاتی ہے۔ قلم کی اوپر کی آنکھ سے نکلتی ٹہنی یا ڈالیاں پھل دینا شروع کر دیتی ہیں۔ سب سے نچلی آنکھ ٹہنی یا ڈالی اکثر پھل نہیں دیتی۔ منڈپوں میں ڈالیوں کا اچھی طرح سے دیکھ بھال کریں تاکہ پھل دینے والی ڈالیاں وزن سنبھال سکیں۔ فالتو بیلوں کی کاٹ چھانٹ کرنا بڑا ضروری ہے۔ پھلدار ٹہنیوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ بیلوں کی کاٹ چھانٹ سے متعلق کرشی ماہرین سے رجوع کرنا چاہیے۔

اتر پردیش میں میرٹھ کمشنری نے اس سلسلے میں پہل کی ہے۔ مہاراشٹر، آندھرا پردیش اور ہریانہ میں حصار، سرسا، جنید، بھوانی، سونی پت، روہتک، کرنال، گڑگاؤں، مہندر گڑھ ضلعوں میں انگور کی کھیتی شروع کی جا رہی ہے۔ ۲۵۰۰ ایکڑ رقبہ میں انگور کی بیل لگانے کا منصوبہ ہے۔ امسال ہریانہ میں ۱۲۰۰ ایکڑ رقبہ میں انگور کی کاشت کی جائیگی۔

اگر ملک کے چھوٹے درجے کے کسان اس طرف دھیان دیں تو کسی حد تک غربت دور ہو سکتی ہے اور اس کے ساتھ غیر ملکی زرِ مبادلہ بھی محفوظ ہو سکتا ہے۔ ●

بقیہ، ۸۷-۱۹۸۶ بجٹ کے اہم نکات

کنگھے، چھاتے، چاک اور دیگر سامان کو ٹیکسوں سے مکمل چھوٹ دی گئی ہے۔ ۵۰ روپے تک کی قیمت کے جوتوں کی ڈیوٹی معاف کر دی گئی ہے۔

ہتھ کرگھے کے فائدے کے لیے ہتھ کرگھے کی تنظیموں کو فراہم کئے جانیوالے مرکب پولی سٹر دھاگے اور پولی سٹر وسکوز دھاگے کو پوری طرح محصول سے چھوٹ دیدی گئی ہے۔ سستی اون اور مصنوعی اونی کپڑوں کو بھی مکمل طور پر محصول سے مستثنیٰ کیا جا رہا ہے۔ گھریلو صنعت کے بھاری سامان کو تحفظ بخشنے کے لیے درآمد کی جانیوالی مشینری پر دس فیصد کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ گھریلو صنعت کو مشینری کے لیے متعلقہ سازوسامان کم نرخوں پر درآمد کرنے کی اجازت دی جائے گی۔ اس سے گھریلو پیداوار میں اضافہ ہوگا۔

تلہن کی کاشت کے لیے بڑی ترغیبات دی گئی ہیں۔ چاول کے چھلکے، مہوے اور آم کی گٹھلیوں سے نکلے ہوئے ادنیٰ درجے کے تیلوں کو ایکسائز سے قابلِ قدر راحت دی گئی ہے۔ چاول کی بھوسی اور دیگر ادنیٰ درجے کے تیلوں سے تیار صنعتی تیلوں کو ایکسائز محصول سے مکمل چھوٹ دی گئی ہے۔ اس سے تلہنوں اور خوردنی تیلوں کی ملکی پیداوار میں اضافہ ہوگا۔

امیر آدمیوں کو کاروں، رنگین ٹی۔ وی۔ ایئر کنڈیشنوں اور مہنگے کپڑوں کے لیے زیادہ دام دینے پڑیں گے۔ ●

پروفیسر کے. این کابرا

کیا تنہا طور پر کام چل سکتا ہے؟

طویل مدتی مالی پالیسی کو منصوبہ بندی اور بجٹ سازی کے عمل کے مابین تعلقات کا نئے سرے سے تعین کرنے کے سلسلے میں ایک قدم بیان کرتے ہوئے فاضل مصنف نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ ریاستوں کو اس اہم عمل میں شامل کیا جانا چاہیئے تھا کیونکہ یہ ملک کے تمام تر مالی نظام کو محیط کئے ہوئے ہے۔ وہ حیران ہیں کہ اس کے بغیر منصوبہ بندی ایک وفاقی نظام میں ایسی پالیسی سے کیونکر طاقت حاصل کر سکتی ہے۔

طویل مدتی مالی پالیسی کے اعلان کو بھارت میں منصوبہ بندی اور بجٹ سازی کے عوامل کے درمیان تعلقات کا نئے سرے سے تعین کرنے کے سلسلے میں بخوبی ایک اقدام تصور کیا جا سکتا ہے۔ بھارتی منصوبہ بندی اپنے تغیر پذیر کردار کے سبب جس ڈھنگ سے متعدد پراجیکٹوں، پروگراموں اور پالیسیوں سے متعلقہ پبلک اخراجات کے ساتھ کام کرتی ہے اُسے دیکھتے ہوئے مالی پالیسی کو منصوبے کی تعمیل کے ذریعے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک بار ایک درمیانی مدت کے منصوبے کو منظوری دے دی جائے اور پھر اسے، سال بہ سال مرحلہ وار بنیادوں پر تقسیم کیا جائے تو اس سے ہر سال بجٹ بنانے پر کافی زیادہ اثر پڑے گا۔ یہ بھی سچ ہے کہ منصوبہ سازی کے عمل میں مالی پیچیدگیوں اور دشواریوں کو فیصلہ کن عناصر کے روپ میں سامنے رکھنا ہوگا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مالی متبادلات کو اس وقت تک عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا اور ان میں پلان سے بے نیاز ہو کر اس وقت کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی، جب تک کہ خود منصوبے کو ہی چند مجبوریوں اور تقاضوں کے تحت نہ بدل دیا جائے یا پھر یہ سمجھا جائے کہ پلان مالی مجبوریوں اور پابندیوں کو ذہن میں رکھ کر مرتب نہیں کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی وجوہات بار بار پیدا نہیں ہوتیں۔ لیکن منصوبہ بندی اور بجٹ سازی کے درمیان بار بار ہونیوالا باہمی عمل اب تک اس ڈھنگ سے بڑھ گیا ہے کہ بہت سے لوگوں کو یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ سالانہ بجٹ تیار کرنے کے عمل میں وزیر خزانہ یا زیادہ صحیح طور پر وزارت خزانہ کے محکمہ اقتصادی امور کی جانب سے پانچسالہ منصوبوں کو عارضی طور پر دوبارہ مرتب کیا جا رہا ہے اور اس کام میں دونوں کے درمیان ایسا کوئی منطقی تعلق نہیں ہوتا جسے باہر کے لوگ دیکھ سکیں۔ اس سے محض یوجنا بھون والوں کی وقعت ہی کم نہیں ہوتی بلکہ منصوبہ بندی کے عمل میں کافی گراوٹ آتی ہے۔ مختلف پانچسالہ منصوبوں کے پانچسالہ عرصے میں پلان کے اخراجات کا مرحلہ وار موازنہ کرنے سے اس طرح کے فرق اور تبدیلیوں کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس طرح کے فرق کو بتانے کے لیے کسی منطق کی تلاش کرنا مشکل ہو سکتا ہے، گو

کوئی ہمیشہ ان باتوں کو حق بجانب ٹھہرانے کے لیے کئی بہانے گھڑ سکتا ہے۔ منصوبہ بندی اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہی منطق پر مبنی ہے جو اچانک ہونے والی بڑی تبدیلیوں کی صورت میں انحراف کر سکتی ہے۔

کسی بھی حالت میں منصوبہ بندی اور بجٹ سازی کے درمیان تعلقات اُسی طرح کے اخراجات میں تبدیلی کرنے کے معاملات نہیں رہے جس طرح بجٹ سازی وسائل کی فراہمی کا عمل نہیں رہی۔ ہمارے منصوبے صرف اُن سرگرمیوں کا ہی اظہار نہیں کرتے جو مختلف پبلک اداروں کی طرف سے انجام دی جاتی ہیں بلکہ وہ اُن پروگراموں کی بھی وضاحت کرتے ہیں جو پرائیویٹ اداروں کی طرف سے عمل میں لائے جاتے ہیں۔ منصوبے سے اُنھیں پہلے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اُنھیں کیا سرگرمیاں انجام دینا ہیں یا اُن کی پیشنگوئیوں کے خدوخال کا پتہ چل جاتا ہے۔ چونکہ مالی پالیسی پرائیویٹ سیکٹر پر کئی طریقوں سے اثر انداز ہوتی ہے اس لیے وہ پرائیویٹ سیکٹر کو پلان کے اشارے (سگنل) اور ترغیبات بتانے اور انھیں ایک ایسے ڈھنگ سے عمل کرنے کے قابل بنانے کا ایک نظام کار ہے جو پلان میں خصوصاً بچت، سرمایہ کاری اور کھپت کے فیصلوں کے بارے میں طے کیا جاتا ہے۔ یہ فیصلے عام آدمی کے لیے (دونوں پبلک اور پرائیویٹ کھپت کے ذریعے) آمدنی کمانے کے مواقع اور حقیقی آمدنیوں پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ لہٰذا سالانہ بجٹ کی جسامت کا تعین پلان سے کیا جاتا ہے۔ اور وہ پلان کی بلاواسطہ اور بالواسطہ تعمیل کرنے کے ذریعے کے طور پر کیا جاتا ہے۔ کسی بھی سال کے بجٹ میں خصوصاً حقیقی معانی میں کسی بھی انحراف سے مسلسل انحرافات اور تبدیلیوں کے سیلاب آنا شروع ہو جائیں گے۔

مالی پالیسی کا تناظر

لہٰذا ہر پانچسالہ منصوبہ اپنی مالی پالیسی کے تناظر کو واضح کرتا ہے گو وہ اُس کے سالانہ مرحلوں پر خاموش رہا ہے۔ عام معانی میں ایسے عمل بڑے وسیع رہے ہیں اور جہاں تک مرکزی حکومت کی بجٹ سازی کے فیصلوں کا بھی تعلق ہے وہ بیشتر پالیسی انتخاب، پسندیدہ امور اور رہبرانہ خطوط پر عموماً مبہم یا خاموش رہے ہیں۔ ریاستوں، مرکزی منتظمہ علاقوں یا لوکل باڈیوں کے لیے بجٹ بنانے کی بات تو بہت دُور کی رہی۔ یہ بھارتی منصوبہ بندی کی ایک بڑی کمزوری ہے۔ طویل مدتی مالی پالیسی میں کہا گیا ہے "طویل مدتی پالیسی ساتویں منصوبے کے پانچسالہ مالی نشانوں اور سالانہ بجٹوں کے درمیان ایک پُل کا کام کرے گی اور اس سلسلے میں مالی پالیسی کے لیے سال بہ سال خدوخال کے اشارے دیگی۔ یہ ہمارے منصوبہ بندی کے عمل میں کارکردگی کے ایک اہم نقص کو دُور کرنے کی جانب ایک قدم ہے۔ کسی کو خواہ طویل مُدتی مالی پالیسی یا اس سے بھی بہتر طور پر ساتویں منصوبے کی درمیانہ مدّت کی مالی پالیسی کے ڈھانچے میں شامل فیصلہ سازی اور مالی تجاویز سے متعلق خصوصی پالیسی اور معیاروں پر اختلاف ہو اس حقیقت سے کہ ایسا عمل اختیار کیا گیا ہے اور اُسے ظاہر کیا گیا ہے ہماری منصوبہ بندی کی ایک تسلیم شدہ کمزوری دور ہو جاتی ہے اور وہ معروضی پیمانے کا کام دیتی ہے جس سے ہر برس کے بجٹ کا جائزہ لیا جا سکتا ہے اور اس سے پلان کی تعمیل کے لیے "اعلان کے موافقانہ اثرات" پیدا ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ پالیسی کی تشکیل پلان کے مطابق ہو اور اس سے ایسے بیشتر عوامل جو اب تک عوامی نگاہ سے غیر ضروری طور پر چھپے ہوئے تھے عوامی پڑتال کے لیے ظہور میں آجائیں۔

ریاستی بجٹوں کا ذکر ہی نہیں

اس مرحلے پر کہا جا سکتا ہے کہ طویل مدتی مالی پالیسی اب تک اس سلسلے میں صرف کچھ فاصلے تک گئی ہے کیونکہ اس نے ریاستی بجٹوں کو اپنے دائرہ سے باہر رکھا ہے۔ ہمارا منصوبہ بندی نظام کئی سطحوں پر ہے جس میں ریاستوں کو زیادہ اہم حصہ ادا کرنا ہے اور کم تر سطح کے ادارے زیادہ تر غیر فعال ہیں کیونکہ ان کی کوئی اپنی مالی بنیاد نہیں ہے۔ جسکی وجہ ریاستی سطح سے نیچے ایسے اداروں کے لیے مالی خودمختاری کا فقدان ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ طویل مدتی مالی پالیسی جو مرکز اور ریاستوں پر مشتمل تمام تر مالی نظام کو محیط کئے ہوئے ہو ایک ایسی دستاویز نہیں ہو سکتی جسے صرف مرکزی وزارت خزانہ کی طرف سے قطعی صورت دی گئی ہو۔ یہ تمام متعلقہ فریقوں کی ایک مشترکہ دستاویز ہونی چاہیئے۔ لیکن پلان کے جوڑ کے طور پر جسے مرکزی حکومت اور ریاستوں کی طرف سے مشترکہ طور پر قطعی صورت دی گئی ہو اور منظور کیا گیا ہو (جو "تیار" کرنے سے مختلف ہو) نہ صرف تکنیکی اور آئینی طور پر ضروری ہے بلکہ پلان کی تکمیل کے طاقت ور ترین ذریعے کے طور پر ناگزیر بھی ہے۔ طویل مدتی مالی پالیسی کی تشکیل کا عمل اُس وقت مکمل ہو جائیگا اور وہ اپنے اعلانیہ مقاصد کو پورا کرے گا جب مالی پالیسی کے احاطہ کو مکمل کرنے کے لیے ریاستوں کے ساتھ مذاکرات کئے جائیں گے۔ ریاستوں کو اس کام میں شامل کرنے کی اہمیت، مثال کے طور پر اس امر سے دیکھی جا سکتی ہے کہ ۸۴-۱۹۸۳ میں مرکز کی ٹیکسوں سے وصولی کل ملکی پیداوار

اس کا تقریباً ۸ فیصد تھی، مرکز اور ریاستوں کی ٹیکسوں سے مشترکہ وصولی ۱۲۵ و ۱۶ فیصد تھی۔ کوئی بھی شخص حیران ہوگا کہ ایک مشترکہ، باہمی طور پر امدادی اور مسلسل پالیسی کو جس میں ریاستوں کو شامل نہ کیا گیا ہو اختیار کرکے ایک وفاقی حکومت کی منصوبہ بندی مالی پالیسی سے کیونکر طاقت اور سکت حاصل کر سکتی ہے۔ چنانچہ درمیانہ مدت کی مالی پالیسی (طویل مدتی مالی پالیسی غلط نام ہے) کا فروغ عوامی سرمایہ کو منصوبہ بندی کے باہر خود مختارانہ راستے پر جانے سے روکنے اور اُسے منصوبے کی تکمیل کا ایک منصوبہ بند ذریعہ بنانے کے لیے مفید عمل ہے۔ لیکن ریاستی بجٹ ابھی تک "ایڈہاک" (عارضی) بنیاد پر تیار کیے جاتے ہیں اور وہ "طویل مدتی مالی پالیسی کا جزو لاینفک نہیں ہیں اس لیے یہ عمل ادھورا ہی ہے۔

طویل مدتی مالی پالیسی سے پیدا ہونے والے مخصوص امور پر غور کرنے سے پہلے کوئی بھی شخص ایسے عناصر کی طرف اشارہ کرنا پسند کرے گا جسے طویل مدتی مالی پالیسی کی دستاویز میں بیان نہیں کیا گیا۔

دعوے اور حقائق

سترہ میں بگڑتے ہوئے بیرونی ماحول کو تسلیم کیا گیا ہے گو بیان میں ایسی باتیں مندرج ہیں جنھیں غیر ضروری خیال کیا جا سکتا ہے جیسے کہ اس امر کی بڑ ہانکنا کہ ترقیات اور اس کے انتظام سے متعلق ہماری حکمت عملی سے افزائش و ترقی کا جوش برقرار ہے۔ آخر کار نہ تو شرح ترقی درحقیقت اتنی ہے جتنا کہ دعویٰ کیا گیا ہے اور نہ ہی وہ اتنی بامعنی ہے جیسا کہ اُس کا مطلب لیا گیا ہے۔ چھٹے پانچسالہ منصوبے میں سرمایہ کاری کے طریقے میں اُتھل پُتھل ہوگئی جیسا کہ موجودہ آمدنیوں کے توازن (بی سی آر) کے بگڑنے اور غیر منصوبہ جاتی اخراجات ۸۵،۲۲۰ کروڑ روپے تک بڑھ جانے سے منعکس ہوا ہے جب کہ ان اخراجات کا اندازہ ۴۰.۵،۶۲ کروڑ روپے تک لگایا گیا تھا۔

اسی طرح بیرونی سرمائے کے رول کو کم تر دکھانے کی کوشش کی جا رہی ہے (اسے نہایت معمولی بتایا گیا ہے) جب کہ یہ امر روشن ہے کہ ہم نے اس عرصے کے دوران بین الاقوامی فنڈ سے مزید رقم حاصل کرنے کی کوشش کی، سمندر پار ممالک سے روپیہ پراجیکٹوں کے لیے قرضہ لیتے رہے اور قرضے کے رول کو کم کرنے کے لیے یہ ظاہر کرتے رہے کہ وہ پلان کے کُل مالی وسائل کا ایک حصّہ ہے اور پلان کے لیے ضروری بیرونی سرمائے کا حصہ نہیں۔ ایسے قرضوں سے ہونے والے درآمدی فاضلات نے قلیل مدت اور طویل مدت کے انتظام میں اہم رول ادا کیا اور پھر بھی اسے "نہایت معمول" بات کہا جا رہا ہے۔

براہِ راست ٹیکسوں کا حصہ

دستاویز میں کئی جگہ بلاواسطہ ٹیکسوں کا حصہ بڑھانے کو کہا گیا ہے جبکہ اُس نے بلاواسطہ ٹیکسوں کی شرح کو منجمد کر دیا ہے اور کسی نئے براہِ راست ٹیکس کی تجویز نہیں کی گئی۔ اُس کے اپنے حساب سے پتہ چلتا ہے کہ ساتویں منصوبے کے آخر میں بالواسطہ ٹیکسوں کا حصہ کافی زیادہ رہے گا (۱ اور ۲ فیصد بلاواسطہ ٹیکسوں کے مقابلے میں جی ڈی پی کا ۱۳ر۷ فیصد) اور ۵ر۰ بلاواسطہ ٹیکسوں کے حصے میں متوقع ۴ر۰ فیصد اضافے کے مقابلے میں زیادہ ہوگا، بالواسطہ ٹیکسوں کا حصہ تقریباً دُگنی شرح سے بڑھ جائے گا یعنی وہ زیادہ صحیح طور پر ایک فیصد ہو جائے گا۔ پس جو حقائق پیش کیے گئے ہیں اُن سے قطعی مختلف صورت حال کا پتہ چلتا ہے جو طویل مُدتی مالی پالیسی کے مقاصد میں بیان کی گئی ہے۔

اسی طرح قرضے کے رول کے بارے میں کوئی واضح اطلاع نہیں دی گئی۔ اصولی طور پر بتایا گیا ہے کہ پلان کا مقصد قرضوں کی رقومات میں کمی کرنا ہوگا۔ لیکن نہ ہی کُل قرضوں کی رقم اور نہ ہی اُس کے نسبتی حصّے کو کم کرنے کی تجویز کی گئی ہے۔ جیسا کہ پالیسی ہذا کے پیروں 2.5 اور 2.11 میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر سُود کی ادائیگی کا حصہ ۹۰-۱۹۸۹ تک ۳ سے ۴ر۱ فیصد تک بڑھ جائیگا چونکہ رعایتی داموں پر دی جانے والی خوراک میں خوردنی تیلوں اور چینی کی شمولیت بیان کی جاتی ہے۔ اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غلط بیانی کو بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی گئی۔

کُل مُلکی پیداوار ایک پیمانے کے طور پر

پالیسی ہذا کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کُل ملکی پیداوار کے فیصد کے مطابق عملاً تمام معلومات پیش کی گئی ہیں۔ گو اس سے بعض موازنے آسان اور واضح ہو جاتے ہیں، تاہم اس میں بہت کچھ چھپانے کی کوشش کی گئی ہے جو محض کُل اعداد و شمار سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بیشتر اخراجات کو پلان کے اخراجات، مرکزی ریونیو، کُل پبلک اخراجات، اور پبلک سرمایہ کاری وغیرہ کے تناسبوں کے طور پر دکھایا گیا ہے چونکہ تمام اخراجات سے "جی ڈی پی" کے کسی مخصوص تناسب پر اثر پڑنے کی اُمید نہیں کی جاتی اس لیے دستاویز کو پیش کرنے کے اس ڈھنگ سے صاف تصویر کا پتہ نہیں چلتا۔ عدم معلومات سے بہت حد تک احتراز کیا جا سکتا تھا اگر کم از کم کُل پراجیکٹوں کا بھی اظہار کر لیا جاتا۔ اس قسم کی دستاویز کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس سے پیدا ہونے والے بیشتر اثرات کا اعلان کیا جاتا ہے لیکن بیان کے اس مختصر اور غیر واضح طریقے سے ایسے اثرات کمزور پڑ

جاتے ہیں یا ختم ہو جاتے ہیں۔ جہاں کہیں کُل اعداد دیئے گئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۸۵-۱۹۸۴ کی قیمتوں کے بارے میں ہیں۔ لیکن انتصاری منطق اور سابقہ تجربے سے پتہ چلتا ہے کہ وسائل کی فراہمی کا عمل جس کے لیے ساتویں منصوبے کے عرصے کے افراطِ زر کی صورتِ حال کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھا گیا، پورا نہیں ہو سکتا۔ پلان کے پہلے سال میں تھوک قیمتوں کا اشاریہ تقریباً ۲۰ پوائنٹ بڑھنے سے یہ ضروری تھا کہ پالیسی ہذا میں قیمتوں کے استحکام کی پالیسی کے عناصر کو واضح کیا جاتا اور قیمتوں کے ناگزیر اضافے کو روکنے کے طریقوں کا بھی ذکر کیا جاتا۔ پلان کے لیے ضروری سرمایہ کو بڑھانا ہوگا اگر حقیقی پلان کا تحفظ کیا جانا ہے۔ ایسی پالیسی کے خدوخال سے خود تکمیلی کے بجائے قیمتوں کے استحکام میں بڑا اعتماد پیدا ہو جاتا۔

درحقیقت ایک واضح پالیسی کے عمل کا کُل مقصد متبادل مفروضات پر مبنی صورتِ حال کا مکمل جائزہ لینا ہے اور پالیسی کے متبادلوں کو عیاں کرنا ہے۔ چونکہ ساتویں پلان کا اہم مقصد افراطِ زر کی افزائش کو روکنا ہے اس لیے مالی پالیسی کو افراطِ زر کے خلاف اپنی کارروائی کو تیز کرنا ہوگا۔ اس کام میں بیشتر پریشان کن آلجھنیں اور بعض سخت قسم کے فیصلے ملوث ہیں۔ کیا ہم بڑھتی ہوئی لاگتوں کے پیشِ نظر منتظم قیمتوں میں اضافہ کریں یا انھیں مختلف طریقوں سے جذب کریں۔ ان لاگتوں کو کم کرنے کا ایک طریقہ بہتر کارکردگی بھی ہے؟ زراعتی ترقی کی حکمتِ عملی کے ساتھ قیمتوں میں استحکام کیونکر آسکتا ہے جو کھادوں اور بیجوں کے شدید استعمال پر زور دیئے بغیر پیداوار بڑھانے پر زور دیتی ہے؟ کیا فیاضانہ درآمدات سے درآمدی قیمتیں اُس سطح پر نہیں آجائیں گی جو سپلائی کی بڑھی ہوئی سطح کے مطابق نہ ہوں؟ کیا پبلک اداروں کو قیمتوں میں اضافے کی اجازت نہ دینے سے اُن کے فاضلات ختم نہیں ہو جائیں گے؟ کیا آمدنی اور قیمتوں کی پالیسی کا راستہ مالی پالیسی پر پڑنے والے دباؤ کے سبب ترک کر دیا گیا۔

کیا کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تمام بنیادی اور اہم امور جو دو گذشتہ دہائیوں میں جمع ہوتے رہے ہیں طویل مدتی پالیسی کے پاس اُن کا جواب نہیں ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں منصوبے کے پبلک سیکٹر کے اخراجات کے بھاری مالی بوجھ کو دیکھتے ہوئے طویل مدتی مالی پالیسی نے اپنی توجہ تقریباً خصوصی طور پر وسائل کی فراہمی کی جانب لگا دی ہے۔ لہٰذا پبلک اخراجات کے تمام تر سوال کو پلان کی تخصیص کے مطابق سرمایہ کو دستیاب کرنے کی قابلیت کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ یہ ڈیفنس، سُود کی ادائیگیوں، خوراک اور فرٹیلائزر پر دی جانے والی امداد کے رُوبرو قطعی بے بسی کا اظہار کرتی ہے جن پر غیر منصوبہ جاتی ریونیو اخراجات کا ۷۰ فیصد حصّہ صَرف ہو جاتا ہے۔ لاگت میں کمی، زیرو (صِفر) پر مبنی بجٹ سازی اور متعدد سالانہ تخصیصوں کا کوئی بھی ٹھوس نتیجہ "بی سی آر" کے بدلتے ہوئے ردِّ عمل کی صورت میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ بھارتی نظامت کو سب سے زیادہ قیمتی اور برتر آقا کہا جاتا تھا۔ وہ طویل مدتی مالی پالیسی کے اس معاملے میں خاموش ہے گویا ہمارے بے دریغ پبلک اخراجات کے لیے کوئی قطعی یا نسبتی جواز موجود ہے۔ اگرچہ بچت اور سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کے لیے ترغیبات کی بھاری لاگت کو تسلیم کیا گیا ہے اور یہ بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ ان سے ٹیکس چوری کی راہیں کھُلی ہیں، تاہم معلوم ہوتا ہے کہ ریونیو کے نقصان کا جائزہ لینے اور بچت اور سرمایہ کاری کے حقیقی اور امکانی اضافے کے ساتھ اُس کا مقابلہ کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا گیا۔

ٹیکس چوری کی روک تھام (جو کالے دھن کا سراغ لگانے اور اُس کے پھیلاؤ کو روکنے کے مقابلے میں کم پُرجوش کام ہے) سے متعلق پالیسیاں محتاط اندازے کے مطابق ۴۷ ہزار کروڑ روپے کے کالے دھن کے محض چھوٹے سے حصّے کو چھُو سکتی ہیں۔ لہٰذا کوئی بھی طویل مدتی مالی پالیسی کی بنا پر نہیں کہہ سکتا کہ ۸۰ کی دہائی کے آخر میں مالی حالت زیادہ ترقی پسندانہ اور پلان کے مقاصد سے زیادہ مطابقت رکھنے والی ہوگی۔

اس پالیسی سے رعائتوں پر زور رہے گا لیکن عرصۂ دراز سے چلے آ رہے چیلنجوں سے نپٹنے کے لیے کوئی خاطر خواہ عمل سامنے نہیں آ سکے گا۔ اس سے پلان کے لیے سرمایہ فراہم ہو سکے گا۔ مگر ضروری نہیں کہ وہ بھی کافی مقدار میں میسر آ سکے۔ یہ اس سے کچھ ہی زیادہ ہوگا جس کا بہتر عمل آوری کے ذریعے جُٹانے کا وعدہ کیا گیا ہے۔

کیمیائی کھاد کے کارخانے

مصنوعات کی مالیت میں جو اضافہ ہوا ہے اس میں اس وقت سب سے زیادہ حصہ کیمیاوی اشیاء اور کیمیاوی کھادوں کے گروپ کا ہے صنعتوں کے اس گروپ میں کیمیائی کھاد کے کارخانوں کا خاص طور پر نام آتا ہے۔ کیمیائی کھاد کی صنعت میں کام آنے والے خام مال کی تیاری کے لیے ہر قابلِ فہم قسم کا مال کام میں لایا جارہا ہے اور اس صنعت میں اس وقت ایک کھیپ میں جتنا مال تیار ہوتا ہے وہ دنیا میں کہیں بھی تیار ہونے والے مال کے بڑے سے بڑے پیمانے کی نسبت زیادہ ہے۔

اگرچہ کھاد کے نئے کارخانوں میں جدید ترین ٹیکنالوجی استعمال کی جارہی ہے لیکن ہمیں ابھی بھی خاص طور سے ایسے پرانے کارخانوں کے مسائل درپیش ہیں جو ۱۹۶۰ اور ۱۹۷۰ کے دہوں میں قائم ہوئے تھے اور جو نفت، تیل اور کوئلے وغیرہ سے کھاد تیار کرتے ہیں۔ بالعموم ۱۹۷۵ سے قبل قائم کئے گئے کارخانوں میں توانائی کو زیادہ سے زیادہ اہلیت سے استعمال کرنے یا ماحولیاتی آلودگی کو روکنے کے مناسب انتظامات نہیں ہیں۔ لہذا ان کارخانوں میں جدید کاری اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے ان پہلوؤں کو مدِنظر رکھنا ہوگا۔

اس گروپ کی دوسری صنعتوں مثلاً کاسٹک سوڈا، سوڈا ایش، تھرموپلاسٹک، ریزنز اور مصنوعی ریشوں کی صنعتوں میں نئی عالمی ٹیکنالوجی بڑی تیزی سے ابھر رہی ہے مثال کے طور پر کلورالقلی کی صنعتوں میں برقی رَو کے داخلے کے لیے دھات سروں کا استعمال اور نباتات و حیوانات کے خلیوں کی ٹیکنالوجی شامل کرنے سے پیداوار میں فی یونٹ توانائی کی کھپت کم ہوئی ہے اور اس کے پہلو بہ پہلو ماحولیاتی آلودگی بھی کم ہوگئی ہے۔ کیونکہ ان اشیاء کی تیاری میں پارے کا استعمال ختم کردیا گیا ہے۔

تھرموپلاسٹک اور مصنوعی ریشوں کی صنعت میں اس وقت بڑے پیمانے کے کارخانے قائم کئے جارہے ہیں لیکن پہلے سے قائم چھوٹے پیمانے کے کارخانوں کے مسائل ابھی تک باقی ہیں۔ چھوٹے کارخانوں کے لیے شائد بہترین حل یہ ہوگا کہ وہ اپنی مشینری میں موزوں تبدیلیاں کرکے خصوصی ضروریات پر توجہ مرکوز کریں تاکہ وہ منافع بخش پیمانے پر کام کرنا جاری رکھ سکیں کیونکہ جب بڑے پیمانے کے کارخانوں کی کم خرچ کارکردگی ثابت ہوجائے گی تو چھوٹے پیمانے کے کارخانوں کے لیے بالا خرروائتی قسم کا مال تیار کرتے رہنا ممکن نہیں رہے گا۔

مصنوعی ریشہ کپڑے کی صنعت کا ایک اہم خام مال ہے۔ ہمارے لیے یہ لازمی ہے کہ گرم خطّوں کے لیے موزوں دھاگوں اور ریشوں کی تیاری شروع کریں جس میں روائتی ریشوں اور دھاگے کی پسندیدہ خصوصیات کو بھی شامل رکھا جائے۔

حیاتیاتی ٹیکنالوجی کے شعبے میں ہونے والی ترقی کی وجہ سے ادویہ سازوں کی صنعت میں قابلِ ذکر تبدیلیاں ہورہی ہیں۔ جہاں مستقبل قریب میں ٹیکنالوجی کے معیار میں لائسنسوں کے اہتمام سے بہتری ہوسکتی ہے وہاں یہ ضروری ہے کہ کم ازکم بڑی کمپنیوں اور اداروں کی سطح پر حیاتیاتی ٹیکنالوجی اور قدرتی پیداوار کو طبی مقاصد کے لیے استعمال میں لانے کے لیے طویل المدت تحقیقی پروگرام شروع کئے جائیں۔

بجلی اور مشینوں کا سازوسامان

صنعت میں ایک اور اہم گروپ بجلی کی مشینری ہے۔ اس شعبے میں بجلی کی پیداوار اور ترسیل کے لیے شائد سب سے زیادہ سازوسامان کی ضرورت ہے۔ اگرچہ ہم نے بجلی کے کارخانوں میں فی یونٹ پیداوار کے لحاظ سے ترقی کی ہے، لیکن ان کارخانوں کے بلا رکاوٹ کام کرنے اور ان کی دیکھ بھال دونوں کے لیے کافی ترقیاتی کام کی ضرورت ہے۔ بجلی کی ترسیل اور استعمال کے لیے سازوسامان کی تیاری میں مائکروپروسیسر نظام اور بجلی کی پوری صلاحیت کو کام میں لانے کے طریقے شامل کرنے کی کافی گنجائش ہے۔

جدید کاری اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے لحاظ سے مشینری اور مشینی اوزار کی صنعت شاید سب سے اہم گروپ ہے۔ یہ اہمیت جدید کاری کی اس کی اپنی ضروریات کے لحاظ سے اتنی نہیں جتنی اس لحاظ سے ہے کہ یہ مشینیں ایسا بنیادی بھاری سازوسامان ہیں جو عملاً مختلف اشیاء تیار کرنیوالی سبھی صنعتوں میں استعمال کیا جاتا ہے ماضی میں اس صنعت میں ہماری ٹیکنالوجی کا بیشتر حصہ اُدھار لیا گیا تھا جو اس حقیقت سے ظاہر ہے کہ ماضی قریب میں حکومت نے جتنے بھی لائسنسنگ انتظامات کی منظوری دی ہے اُن کا ایک بڑا حصہ مشینری تیار کرنے والی صنعتوں کے لیے تھا۔ ماضی قریب میں صرف اہم اوزار اور کچھ حد تک واحد مقصدی مشینری کا خصوصی سازوسامان ہی خوراک، کیمیادی عمل وغیرہ صنعتوں میں کام میں لایا جاسکا ہے۔

اس شعبے میں ٹیکنالوجی کی ترقی، نقشوں اور نمونوں کی خریداری یا لائسنسوں کے انتظامات کی صورت میں ہی محدود رہی ہے۔

مصنوعات اور ان کی تیاری کے طریقوں کے بارے میں اصل علم اب بھی دوسرے ملکوں کے پاس ہے کیونکہ ہم نے ترقی کے مقصد کے لیے

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

Regd. No. D (DN) 65
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment at Civil Lines Post Office, Delhi-110054.

VOL. 5 No. 24 YOJANA (URDU) 16-31 March 1986

ارشاد احمد صدیقی

انگور کی کاشت

آج ہندوستان میں انگور کی کاشت کی طرف خاص توجہ دی جا رہی ہے اس کے خاطر خواہ اور بہتر نتائج بھی برآمد ہو رہے ہیں۔ مشرقی اتر پردیش اور ہریانہ کے کاشت کاروں نے بھی انگور کی کھیتی کی طرف غیر معمولی توجہ دینی شروع کر دی ہے جو ملک کی خوشحالی کے لیے نیک فال ہے۔

چند سال پہلے تک انگور افغانستان، پاکستان اور غیر ممالک سے آتا تھا۔ آج ملک کے کچھ حصوں کے کاشت کاروں نے انگور کی کھیتی اپنے یہاں شروع کر دی۔ ہندوستان میں انگور کی کھیتی بھی خوب کامیاب ہو سکتی ہے۔ مہاراشٹر کے سرکاری اداروں کے ذریعے اسے خوب بڑھاوا دیا گیا۔ مہاراشٹر میں انگور لگانے کے کامیاب تجربات ہمارے سامنے ہیں۔ شروع میں بوئے ہوئے انگور میٹھے اور ذائقہ دار نہ ہوئے لیکن آہستہ آہستہ اب انگور کی فصل میں بہتری آ گئی۔ مہاراشٹر، آندھرا پردیش اور ملک کے کچھ دوسرے صوبوں میں انگور کی پیداوار خوب اچھی ہونے لگی۔ تھامپسن سیڈلیس انگور، ہرا موٹا انگور، کالا انگور، لال چھلکے والا انگور جس میں بیج نہ نکلے۔ اسکے علاوہ بھی کئی قسم کے لمبے انگور کی کاشت شروع کر دی گئی ہے۔

اگر اسی کامیاب رفتار سے انگور کی کاشت ہوتی رہی تو وہ دن دور نہیں کہ ہم غیر ملکی منڈیوں سے اچھا خاصا زر مبادلہ کما سکتے ہیں۔ چھوٹے درجے کے کسانوں نے اس طرف دلچسپی لینی شروع کر دی۔ ہریانہ کے کرشی وبھاگ نے انگور کی کاشت کے لیے ۴۴ ہزار روپے فی ایکڑ قرضہ دینے کی مہم شروع کی ہے۔ اس سلسلے سے متعلق ہریانہ حصار کرشی یونیورسٹی نے انگور کی پیداوار بڑھانے کے لیے پودوں کی سپلائی اور دیکھ بھال کے لیے خاص انتظامات کئے ہیں۔

انگور کی قلم لگانے کا دن

انگور کی پود ماہ فروری کے دوسرے ہفتے تک لگائی جاتی ہے۔ انگور کی پود لگانے کے لیے قلمیں تیار کی جاتی ہیں۔ قلم بناتے وقت تین باتوں پر خاص دھیان دینا ازحد ضروری ہے۔

۱۔ قلم کی موٹائی گولائی میں ہونی چاہیے۔

۲۔ قلم چمکدار ہونی چاہیے۔

۳۔ قلم کے اوپر کم از کم تین آنکھیں ہونی چاہئیں۔ قلم پنسل جتنی موٹی اور قریب ۸ انچ لمبی ہونی چاہیے۔ اس کے نیچے کا کٹا ہوا گول اور اوپر کا کٹاؤ ترچھا ہونا چاہیے۔ قلموں کے چھوٹے چھوٹے بنڈل بنا کر تین چار ہفتے کے لیے انھیں سیدھا گڈھے میں رکھ دینا چاہیے۔ قلموں کا بنڈل گاڑنے سے پہلے پانی چھڑکنا چاہیے تاکہ نمی برقرار رہے۔ قلم کو دیمک یا کیڑوں مکوڑوں سے بچانے کے لیے پانی کے ساتھ دوائی بھی چھڑکیں۔ گڈھوں پر مٹی اچھی طرح سے ڈال دیں اور اگر موسم خشک ہو تو دس دس دن کے وقفے سے گڈھوں کے اوپر ہلکی سینچائی کر دیں۔ قلموں کی بڑھوار قریب تین ہفتے میں نکلنی شروع ہو جاتی ہے چار ہفتے کے بعد بڑھوار ایک انچ تک ہو جاتی ہے۔ بس اب قلم تیار ہے۔ قلم کی تیاری میں ہریانہ کرشی یونیورسٹی سے ایک ہدایت نامہ جاری ہوا ہے کہ قلم ایسی پود کی نہ لی جائے جس میں پہلے کبھی بیماری لگی ہو یا کیڑے مکوڑے چڑھے ہوں۔ یہاں تک کہ ایک سال پہلے کوئی بیماری یا کیڑے لگے ہوں۔ سوکھا لگے پودوں کی قلم بھی نہیں بنانی چاہیے۔

چھوٹے چھوٹے کیاریاں

انگور کی قلمیں چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں لگتی ہیں۔ قلم کی ایک دو آنکھیں زمین کے اندر اور دو تین زمین کے باہر ہونی چاہئیں۔ کیاریاں جس کھیت پر بنائیے اسے اچھی طرح سے جوت لیں۔ اور گھاس پات اُگ آئے تو اچھی طرح سے نرائی کر لیں کھیت میں ریت کی معمولی سطح بھی ہو تو اچھا ہے گوبر کی کھاد اور بی۔ ایچ۔ سی ملا کر ریت کی نچلی سطح پر ڈالیں۔ کیاریوں کے بیچ نالیاں بنائیے تاکہ سینچائی آسانی سے کی جا سکے۔ قلموں کا فاصلہ ۸۔۱۰ سینٹی میٹر رکھیں اور قطار کے بیچ کا فاصلہ دو یا ڈھائی فٹ تک رکھیں۔ اور قطاروں کے

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001.
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002.